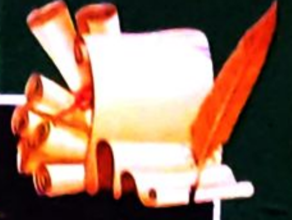
دوسرا ایڈیشن



حصہ دوم

تاریخِ اُمتِ مُسلمہ

35 ھجری تا 73 ھجری

- تاریخ روایات کی تحقیق وتنقیح کے اصول،
- دورِ مشاجرات خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ، جنگ جمل، جنگ صفین خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عہد یزید، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جدوجہد، سانحہ کربلا وسانحہ حرہ، خلافت وشہادت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ،
- دورِ فتن سے حاصل شدہ اسباق،
- پہلی صدی ہجری میں امت کی علمی واخلاقی تربیت کرنے والے مشاہیر صحابہ وتابعین کا تعارف،
- اہم شبہات کے جوابات



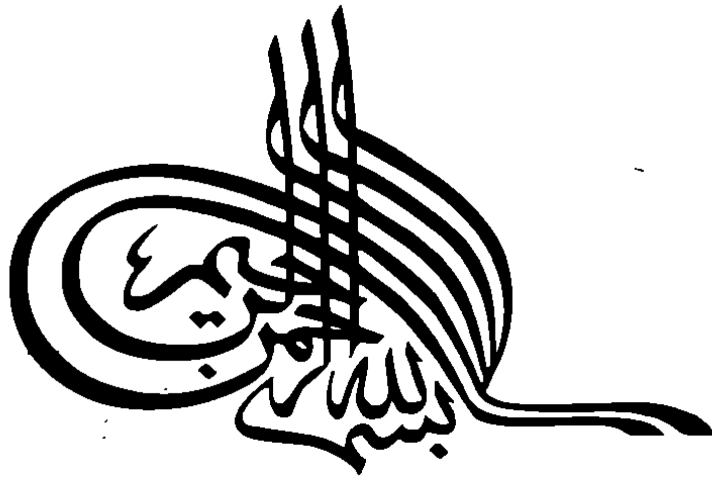






کاوش
مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی




بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخ اُمتِ مُسلمہ

- تاریخی روایات کی تحقیق وتنقیح کے اصول
- جنگ جمل، جنگ صفین، سانحۂ کربلا، سانحۂ حرہ، شہادت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ
- دورِ فتن سے کشیدہ کردہ نتائج
- اہم شبہات کے جوابات

حصۂ دوم

تحقیق

مؤرخِ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ



بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009، 0321-2000870

www.almanhalpublisher.com

almanhalpublisher@gmail.com

تاریخِ اُمتِ مسلمہ

تحقیق

مؤرخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ



دکان نمبر 3، ... کراچی
021-34914596, 0324-2855000
Idaratunnoor@gmail.com



پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لاہور

مکتبہ رحمانیہ	0343-9697395 042-37224228
اعجاز احمد	0332-4959155
المیزان	042-37122981
مکتبہ العلم	042-37211788
الفلاح پبلشرز	0333-4101085

راولپنڈی

اسلامی کتاب گھر	0514-830451
اکلیل پبلشنگ	0332-5459409

ملتان

مکتبہ حقانیہ	0300-4541093
مکتبہ امدادیہ	0300-6380664
مکتبہ امداد العلوم	0302-9635918

فیصل آباد

اسلامی کتاب گھر	0323-2000921

اسلام آباد

مکتبہ فریدیہ	0343-5846073

حیدرآباد

محمد احسن	0321-8728384
مکتبہ اصلاح و تبلیغ	0320-3015228

کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ	0333-7825484

کوہاٹ

مکتبہ حسین بن علی	0334-8299029

پشاور

دار الاخلاص	0300-5831992 091-2567539
بیت العلم	0300-9348654
مکتبہ عمر فاروق	0311-8845717 091-2580103
مکتبہ فاروق اعظم	0345-9597693
مکتبہ عثمانیہ	0300-5990822

چمن

دار العلم	0315-4105987
مکتبہ عزیزیہ	0315-7788573

ڈیرہ اسماعیل خان

برکی کتب خانہ	0346-7851984 0336-9755780
مکتبہ حقانیہ	0346-5435446

درہ پیزو

مکتبہ حلیمیہ	0305-9571570

سرائے نورنگ

مکتبہ ختم نبوۃ کتاب گھر	0302-5565112

بنوں

مکتبۃ الاسلام	0334-5345720
مکتبہ عرفان	0333-9749663
مکتبہ شیخ الہند	0336-9243535

میران شاہ

مکتبہ رحمانیہ

مردان

مکتبہ الاحرار	0321-9872067
مکتبہ امام محمد	0311-9383776

کرک

مکتبہ حقانیہ	0313-9836011

اکوڑہ

مکتبہ سید احمد شہید	0332-9984701

سوات

مکتبہ صدیقیہ	0334-9332627
مکتبہ عزیزیہ	0344-8178216

مانسہرہ

ادارہ محمود دینی کتب خانہ	0311-8790712

ہنگو

مکتبہ دیوبند	0332-4345384

سواڑی بازار

مکتبہ حسن	0335-9520022
مکتبہ حبیبیہ	0333-9691389
مکتبہ صدیقیہ	0333-9705047

نوشہرہ

القاسم اکیڈمی	0346-4010613
ادارۃ العلم	0321-9746859

دیربالا

ادارہ محمودیہ	0300-5571532
مکتبہ صدیقیہ	0331-8174101

صوابی

اسلامی کتب خانہ	0303-8004066
مدنی کتب خانہ	0302-5687765

شبقدر

مکتبہ بیت العلم	0345-0947410

مری

مکتبہ محمدیہ	0321-7484917
مکتبہ عزیزیہ	0310-2197703

ٹانک

مکتبہ حماریہ	0304-0988857

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعة العلوم الإسلامية
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراتشی - ۷۴۸ - پاکستان



Ref. No. ____________ Date. ____________

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين.

أما بعد:

روایتی علوم میں سے علم التاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس کی ضرورت کا انکار بھی مشکل ہے اور اس پر کلی اعتماد کی گنجائش بھی کم ہے جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ تاریخی روایات کی سند حزم واحتیاط کے اس اعزاز سے عموماً محروم رہتی ہیں جو حزم واحتیاط حدیثی روایات کو حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ تاریخی روایات میں مؤرخ ذاتی تأثرات اور ماحولیاتی اثرات سے بہت کم محفوظ رہ پاتا ہے، اس لئے بلا امتیاز تاریخی روایات کو اعتماد واستناد کے درجے پر رکھ کر نظریہ وفکر قائم کرنا عموماً فکری انحراف کی طرف دھکیل دیتا ہے، اس لئے تاریخ کے طالب علم کو تاریخ کا مطالعہ کرنے سے قبل کم از کم تین امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱.....مطالعہ تاریخ سے پہلے ایسے مبادی تاریخ کا استحضار درکار ہے جن میں امت مسلمہ کے مسلمہ افکار اور فکری بنیادوں کا بیان ہو، جسے آپ مطالعۂ تاریخ کے بنیادی اصول اور ضروری آداب سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۲.....مطالعہ تاریخ کے لئے مستند اور غیر مستند مآخذ، مصنف مزاج اور غیر محتاط مؤرخین کے بارے میں آگاہی بھی ہونی چاہئے۔

۳.....بسا اوقات نامور مؤرخین کے ہاں مشہور مآخذ میں بھی علی سبیل التذکرہ بہتیری غیر ثقہ روایات در آئی ہیں، اس لئے تاریخی مآخذ کے محاسن اور مساوی ہر دو کے بارے میں معتمد معیارات اور واضح اشارات کا ادراک بھی ضروری ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے لئے یہ قابل لحاظ بنیادی امور، کتب تاریخ یا ان کے متعلقات میں یکجا، مربوط ومرتب انداز میں بہت کم ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ باتوفیق اہل علم سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے "تاریخ امت مسلمہ" کے نام سے ایک مجموعہ ہمارے سامنے آیا ہے جس میں درج بالا تینوں بنیادی امور کا لحاظ پایا جاتا ہے۔

مزید یہ کہ (جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں) یہ مجموعہ، روایات میں احتیاط، فکر ومیلان میں اعتدال، حسنِ ترتیب اور جودتِ تعبیر کے لحاظ سے منفرد اور معیاری کاوش ہے۔ امید ہے یہ مجموعہ عوام وخواص سب کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیتِ عامہ سے ہم کنار فرمائے، آمین! وما ذلك على الله بعزيز

وصلى الله وسلم على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين.

فقط والسلام

عبد الرزاق اسکندر

(مولانا ڈاکٹر) عبد الرزاق اسکندر

مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 3491953l, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk



حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لولیہ والصلوۃ علی نبیہ

امابعد!

یقیناً آج امت مسلمہ خارجی یلغار و داخلی خلفشار کی وجہ سے انتہائی بھیانک قسم کے بحران سے دوچار ہوچکی ہے اور آئے دن راہ نجات دارتقاء سے دن بدن دور بھٹکتے ہوئے تنزلی کے دلدل میں دھنستی جارہی ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ جہاں قرآن سنت سے درساً وعملاً دوری ہے وہیں اپنے اکابر و اسلاف کی تاریخ عزیمت سے لاعلمی بھی ہے جو کہ کسی بھی عظیم سانحہ ولاعلاج موذی روحانی مرض سے کم نہیں۔

فضلا علی ھذا اگر کوئی ایک آدھ شخص علم تاریخ سے شغف رکھتا بھی ہے تو اس کا واسطہ ایسی تاریخ کے ساتھ پڑتا ہے جو اس کے ذہن میں اسلاف کے خلاف زہریلا بیج بن کر اُگتا ہے اور یہ نام نہاد تاریخ اسلامی دین اسلام کے دفاع کے بجائے اسلام کے قلعے میں نقب زنی کا کام دیتی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر العیاذ باللہ تاریخ اسلامی میں ایسی من گھڑت اسرائیلی روایات ہیں جو قرآن وسنت کے ساتھ تصادم کے زمرے میں آتی ہیں ایسی روایات سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام جیسی معصوم عن الخطاء ہستیاں بھی محفوظ نہ رہیں۔

ایسے میں بلاشک تاریخ اسلام سے آشنائی حد درجہ ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ امت پر حالات کی سختی وپستی، خارجی یلغار، داخلی خلفشار، سیاسی عدم استحکام، باہم نااتفاقی وناچاقی اور دشمنان اسلام کی رکیک چالیں اور ان سے آگاہی کے ساتھ ان تمام چیزوں کا سدباب وتدراک کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے اور اس بارے میں ہمارے اکابر و اسلاف کا عمل کیا تھا یہ سب ہمیں اسلام کی تاریخ سے ہی ممکن ہے جس کے لیے صحیح ومستند واہیات سے پاک قرآن وسنت سے غیر مزاحم تاریخ اسلامی کا علم ہونا ضروری تھا۔

جس کے لیے ہمارے برادر مکرم مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی جو کہ کئی کتب کے مصنف بھی ہیں جناب موصوف نے ماشاء اللہ کافی بڑھیا جدوجہد کی ہے جو کہ بندہ کی طرف سے بالخصوص اور امت مسلمہ کی طرف سے بالعموم لائق تحسین وآفرین ہیں۔

اللہ تعالیٰ جناب موصوف کی اس کاوش کو دارین میں باعث نجات وترقی کا سبب بنائے اور قارئین کے لیے استفادہ عامہ کا سبب بنائے۔

منظوم تقریظ برائے

''تاریخ امت مسلمہ''

منجانب: شاعرِ اسلام، حضرت اثر جونپوری مدظلہ العالی

باب جہد و عزم و استقلال جب وا ہو گیا
مہرباں اک بندۂ مخلص پہ مولیٰ ہو گیا
اک مورخ پھر کمربستہ ہوا جی جان سے
کاوشیں برسوں کی آخر رنگ لائیں شان سے
امتِ سرکار ﷺ کو انمول تحفہ دے گیا
وہ جواں ایسا ضعیفوں سے جو بازی لے گیا
رہ گئے حیران خود قرطاس و خامہ کیا کہوں
پا گیا انجام ایسا کارنامہ کیا کہوں
فکر کی پرواز پہنچی رفعتِ مریخ پر
جب قلم اس نے اٹھایا طائرِ تاریخ پر
ہار کر ہتھیار ڈالے خارِ قال و قیل نے
یوں بکھیرے علم کے ریحان اسماعیل نے
شہرِ یادِ رفتگاں ایسا سجا کر رکھ دیا
آئینہ پیشِ مسلماں گویا لا کر رکھ دیا

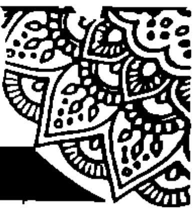
عکس اپنا جس میں سارے اہلِ ایماں دیکھ لیں
کس طرح سے مشکلیں ہوتی ہیں آساں دیکھ لیں
کس طرح جھیلی مشقت سیدِ ابرار ﷺ نے
پرچمِ دیں کیسے لہرایا مرے سرکار ﷺ نے
کس اندھیرے میں ہوئے روشن ہدایت کے چراغ
کس طرح سینچا صحابہؓ نے لہو سے دیں کا باغ
اک طرف اوجِ ثریا کا نظارہ پرُحلل
اک طرف تحت الثریٰ کا خارزارِ جاں گسل
ایک طرف ایثار، تقویٰ اور اخوت بے مثال
دوسری جانب تعصب، حرصِ مسند، حبِ مال
پہلا طبقہ مستحق نعمتِ دنیا و دیں
دوسرے طبقے کا کوئی مرکز و محور نہیں
اے خدا آہِ اثر پر کھول دے بابِ اثر
جیتے جی تعبیر پائے جلد ہی خوابِ اثر
پھر سے دکھلا عہدِ زریں شوکتِ اسلام کا
پھر سے نقارہ بجے دنیا میں تیرے نام کا
کاوش اسماعیل ریحاں کی خدا مقبول کر
غنچۂ اخلاص کو خلدِ بریں کا پھول کر

فہرست مضامین















☆☆☆



''تاریخِ اُمّتِ مُسلِمہ'' کی خصوصیات ایک نگاہ میں

☆ سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ کے بارے میں ناقابلِ اعتماد مواد سے پاک
☆ حضرت آدم علیہ السلام سے دورِ حاضر تک اوّلین مفصل اردو تاریخ
☆ حصہ اوّل میں علم تاریخ کے تعارف ومبادیات پر مشتمل مقدمہ
☆ حصہ دوم میں تاریخ کی تحقیق وتنقیح کے قواعد وضوابط پر مشتمل رسالہ
☆ تاریخی روایات کی اصولِ محدثین کے مطابق تحقیق وتنقیح
☆ مغازی اور مشاجرات کی روایات پر اساتذہ وطلبۂ حدیث کے لیے نہایت مفید تشریحی مباحث
☆ علم رجال کی روشنی میں روایات کی اسناد کا جائزہ اور رجال کی ابحاث
☆ اہل سنت والجماعت کے اجماعی عقائد ونظریات کی تائید میں موقع بموقع مضبوط عقلی ونقلی دلائل
☆ مختلف فرقوں کے ظہور پر تحقیق اور ان کے غلط عقائد ونظریات پر اصولی تنقید
☆ مشکوک واقعات کا سنداً ومتناً، روایتاً ودرایتاً تجزیہ
☆ دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے واقعات تفصیل کے ساتھ
☆ اسلامی تاریخ کی تمام بڑی جنگوں اور معرکوں کا مفصل تذکرہ
☆ واقعات خصوصاً سیرت اور مغازی کی صحیح توقیت اور عیسوی تقویم سے اس کی مطابقت کی حتی الوسع کوشش
☆ اصل، قدیم ترین اور مستند مآخذ سے مواد لینے کا حتی الامکان اہتمام
☆ ہر بات مکمل حوالہ جات کے ساتھ
☆ قابلِ فخر مسلم خلفاء، سلاطین اور مشاہیر کے خلاف باطل فرقوں، سیکولر مؤرخین اور مستشرقین کے پروپیگنڈے کی مدلل تردید
☆ تاریخ سے حاصل شدہ عبرتوں، نصیحتوں اور اسباق کا موقع بموقع ذکر
☆ مختلف ادوار میں علمی، اصلاحی اور قومی خدمات انجام دینے والی عظیم شخصیات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ
☆ مشکل الفاظ سے احتراز، رواں دواں سلیس اردو عبارت
☆ قارئین کو اپنی گرفت میں رکھنے والا دلچسپ اندازِ تحریر
☆ حواشی میں علماء وطلبہ کے لیے نہایت مفید علمی ابحاث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضروری گزارش

ان اوراق کے متعلق درج ذیل چند اصولی باتیں ذہن نشین کرلیں:

1. کسی تاریخی روایت یا کسی تاریخی واقعے سے کوئی بھی شخص صحابہ کرام کے متعلق اسلامی عقائد سے ہٹ کر کوئی رائے یا تصور ہرگز قائم نہ کرے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم اس سے بری ہیں۔
2. صحابہ کرام کے بارے میں وہی عقائد رکھنا لازم ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں اسلاف نے اختیار کیے ہیں اور جن کی تفصیل الفقہ الاکبر، العقیدۃ الطحاویہ، شرح عقائد نسفیہ اور العقیدۃ الواسطیہ جیسی کتبِ عقائد میں موجود ہے۔
3. تاریخی واقعات کی حیثیت، تاریخی معلومات ہی کی ہے نہ کہ عقیدے کی۔ تاریخ کا اصل مقصد ماضی سے رشتہ استوار رکھنا اور اس سے سبق حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایک تاریخ کی حیثیت سے نقلِ واقعات کا مقصد یہاں بھی یہی ہے۔
4. ہم ان مشکوک باتوں کی حقیقت بھی سامنے لانا چاہتے ہیں جو ضعیف اور کذاب راویوں نے صحابہ کی طرف منسوب کی ہیں۔ مشاجرات کی تاریخ میں ہماری پوری کوشش یہی ہے کہ مستند روایات کو سامنے لایا جائے اور ضعیف یا جعلی روایات کو مسترد کیا جائے۔ ہم جمہور علماء کے اس موقف کی تائید کے لیے کوشاں ہیں جو کتب عقائد میں صحابہ کرام کے بارے میں درج ہے۔
5. صحابہ کرام کے بارے میں جمہور اُمت مسلمہ کا عقیدہ یہ ہے کہ:

☆ انبیائے کرام کے بعد لوگوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق ہیں، پھر حضرت عمر بن الخطاب الفاروق، پھر حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین، پھر حضرت علی بن ابی طالب المرتضٰی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ ①

☆ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی افضلیت اور تمام اُمت پر فوقیت کی وجہ سے پہلا خلیفہ مانتے ہیں، پھر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو، پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو۔ یہی خلفائے راشدین اور ائمہ ہدایت ہیں۔

☆ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی محبت میں غلو نہیں کرتے اور نہ ہی کسی

① الفقه الاكبر للامام ابی حنيفة، ص ٤١، ط مكتبة النعمان

سے اظہار برات کرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو صحابہ سے نفرت کرتے ہیں اور جو ان کا ذکر بھلائی کے سوا کرتے ہیں۔ ہم صحابہ کا ذکر بھلائی کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔ ان کی محبت دین، ایمان اور نیکی ہے اور ان سے نفرت کفر، نفاق اور سرکشی ہے۔ [1]

☆ صحابہ میں سے ادنیٰ فرد بھی اس طبقے سے بہتر ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا۔ اگر یہ لوگ بہت زیادہ اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں تب بھی وہی حضرات جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی اور آپ ﷺ کو دیکھا اور سنا، وہی افضل ہوں گے کیوں کہ انہیں تابعین پر صحبت کی فضیلت حاصل ہے، اگرچہ (بعد والے) ہر قسم کے اعمال خیر کرلیں۔ [2]

☆ اہل سنت روافض کے طریقے سے برات ظاہر کرتے ہیں جو صحابہ سے بغض رکھتے ہیں اور انہیں برا بھلا کہتے ہیں، وہ ناصبیوں کی روش سے بھی برأت ظاہر کرتے ہیں جو اہلِ بیت کو قول یا عمل سے اذیت دیتے ہیں۔ اہل سنت صحابہ کے مشاجرات کے بارے میں احتیاط اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی برائیوں پر مشتمل روایات میں سے بعض تو جھوٹ ہیں، بعض میں کمی زیادتی کی گئی ہے اور ان کی اصل شکل بدل دی گئی ہے۔ جہاں تک اس قسم کی صحیح روایات کا تعلق ہے، تو وہ حضرات اس میں معذور تھے۔ یا تو مجتہد مصیب تھے یا مجتہد مخطی تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اہل سنت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ صحابہ کبیرہ یا صغیرہ گناہوں سے معصوم تھے بلکہ فی الجملہ ان سے گناہوں کا صدور ممکن تھا اور ان کے لیے ایسے مناقب اور فضائل ہیں کہ ان سے جو کچھ ہوا، اس کی مغفرت کا موجب بن گئے یہاں تک کہ صحابہ کی ایسی سیئات بھی معاف ہیں جو بعد والوں کی معاف نہیں ہوسکتیں اس لیے کہ ان کے پاس سیئات کو مٹانے والی ایسی نیکیاں ہیں جو بعد والوں کے پاس نہیں، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ان کے لیے ثابت ہے کہ وہ خیر القرون ہیں اور ان کا ایک مد صدقہ بعد والوں کے احد پہاڑ کے برابر صدقہ کرنے سے افضل ہے۔

جو علم و بصیرت کے ساتھ ان کی سیرت اور ان پر اللہ کے احسانات و فضائل کو دیکھے گا وہ یقینی طور پر جان لے گا کہ وہ انبیائے کرام کے بعد بہترین لوگ تھے، نہ ان جیسا کوئی ہوا نہ کوئی ہوگا۔ وہ اس امت کا نچوڑ اور عرق تھے جسے اللہ نے بہترین امت بنایا اور اس پر انعام کیا۔ [3]

☆ صحابہ کے مابین جو تنازعے اور جنگیں واقع ہوئیں ان کے لیے محمل اور تاویلیں موجود ہیں۔ پس انہیں برا بھلا کہنا اور ان پر طعنہ زنی کرنا اگر ایسا ہو جو دلائلِ قطعیہ کے مخالف ہے تو ایسا طعن کفر ہوگا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت۔ ورنہ بدعت اور فسق ہوگا۔ [4]

☆☆☆

---

① العقیدۃ الطحاویۃ للامام ابی جعفر الطحاوی، ص ۸۱، ط المکتب الاسلامی ② اصول السنۃ للامام احمد بن حنبل، ص ۳۹، ۴۰

③ العقیدۃ الواسطیۃ، امام ابن تیمیۃ، ص ۱۱۹، ۱۲۰ ④ شرح عقائد نسفی، ص ۳۷۲، ۳۷۳، ط البشری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند عشروں سے ہماری تاریخ کو بدلنے کی سازشیں بڑی سرگرمی کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ خصوصاً صحابہ کرام کو ہدفِ تنقید بنانے کے لیے مستشرقین کے بڑے بڑے ادارے، عالمی طاقتوں کے تعاون سے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ان میں کام کرنے والے اسکالرز کو ہر قسم کی سہولیات مہیا اور ہر طرح کے وسائل میسر ہیں۔ اس مواد کی اشاعت پر بے پناہ اخراجات صرف کیے جا رہے ہیں۔

صحابہ کرام اور اسلامی تاریخ کی عظیم المرتبت ہستیوں کے خلاف ایک لٹریچر تو وہ ہے جو اشتعال انگیز انداز میں لکھ کر گلی کوچوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ سنجیدہ اور تحقیقی انداز کے لبادے میں بھی یہ کام ہو رہا ہے۔ قدیم وجدید کتب کے حوالوں سے بھرپور کتب مارکیٹ میں مسلسل آرہی ہیں اور ہر زبان میں ان کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ انٹرنیٹ پر سرچ کر کے دیکھیں تو آپ کو ان ہستیوں کے خلاف مواد فراہم کرنے والی ان گنت ویب سائٹس ملتی چلی جائیں گی۔ لوگ ان چیزوں سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ میں مثال کے طور پر ایک حساس مسلمان کے تاثرات نقل کرتا ہوں جو انہوں نے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی خدمت میں لکھے تھے:

"اسلامی تاریخِ قدیم کا ذخیرہ ایک عجوبے سے کم نہیں...... علمائے کرام نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ قرآن وسنت اور آثارِ سلف کے ماہر علماء کا ایک بورڈ مقرر کر کے اختلافِ روایات پر تحقیق کرتے، اور کم از کم اہلِ سنت کو ابتدائی تاریخ ایسی ملتی، جس میں اکابرِ صحابہ اور خیر القرون کی ایک اچھی اور متفق علیہ تصویر ہوتی۔ اب بھی وقت گیا نہیں۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں؟ ورنہ ہو سکتا ہے آنے والی نسلیں دوسرے مذاہب ہی نہیں بلکہ سیاسی وملکی رہنماؤں کی تاریخوں کو بے عیب اور متفق علیہ پا کر اور اسلامی تاریخ کے پورے ذخیرے کو اختلافات اور کشت وخوں سے بھرا ہوا پا کر خلافِ اسلام مشنریز کے پروپیگنڈے میں آ کر، محمد عربی ﷺ کی ذاتِ گرامی اور ان کے خلاف کھلم کھلا زبان درازی پر اتر آئیں۔ اعوذ باللہ من شر ذلک "

حضرت موصوف نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"کوئی شک نہیں کہ تاریخ کو اس طرح چھان پھٹک کر مرتب کرنا بہت ضروری ہے، لیکن آج ہم جس دور سے

گزر رہے ہیں، اس میں کام بے شمار ہیں، آدمی کم۔ کوئی شخص کیا کیا کام انجام دے...... کوشش کروں گا کہ احباب کو اس طرف متوجہ کروں۔"①

یہ خط چار عشرے پہلے کا ہے۔ اس وقت دردمند اُمتی جو خطرات ظاہر کر رہے تھے، اس وقت کہیں زیادہ شدت سے سامنے آچکے ہیں اور ایسے تحقیقی کام کی ضرورت پہلے کی بہ نسبت کئی گنا بڑھ گئی ہے جو اسلاف کے علمی منہج کے مطابق ہو اور جس میں افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہو۔ اسی لیے راقم نے اپنے اکابر، اساتذہ اور بزرگوں سے متعدد بار یہ سنا کہ تاریخ کی تنقیح کا کام اُمت کے ذمے باقی ہے، اس میدان میں جیسا کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہوسکا۔ دوسری طرف، تحقیق کے نام پر آزاد خیال لوگوں نے جو کام شروع کیا ہے، وہ بجائے خود ایک نیا فتنہ بن گیا ہے۔ ہمارے اکابر کو اس صورتحال کا بھی بڑی شدت سے احساس تھا۔ اس لیے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے نہایت دردمندانہ انداز میں تحریر فرمایا:

"بغیر کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے، بڑی بڑی شخصیتوں کو آزاد جرح وتنقید کا ہدف بنالینا، ایک علمی خدمت اور محقق ہونے کی علامت سمجھی جانے لگی ہے۔ اسلاف امت اور ائمہ دین پر تو یہ مشقِ ستم بہت زمانے سے جاری تھی، اب بڑھتے بڑھتے صحابہ کرام تک بھی پہنچ گئی۔ اپنے آپ کو اہل السنۃ والجماعۃ کہنے والے بہت سے اہلِ قلم نے اپنی ریسرچ وتحقیق اور علمی ذَہانت کا بہترین مصرف اسی کو قرار دے لیا کہ صحابہ کرام کی عظیم شخصیتوں پر جرح وتنقید کی مشق کی جاوے۔ بعض حضرات نے ایک طرف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کی تائید وحمایت کا نام لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی اولاد بلکہ پورے بنی ہاشم کو ہدفِ تنقید بنا ڈالا اور اس میں صحابہ کرام کے ادب واحترام تو کیا اسلام کے عادلانہ اور حکیمانہ ضابطۂ تنقید کی بھی ساری حدود وقیود کو توڑ ڈالا۔ اس کے بالمقابل دوسرے بعض حضرات نے قلم اٹھایا تو حضرت مُعاویہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں پر اسی طرح کی جرح وتنقید سے کام لیا۔ نئی تعلیم پانے والے نوجوان جو علوم دین اور آدابِ دین سے ناواقف، یورپ سے درآمد کی ہوئی نئی تہذیب کے دل دادہ ہیں، وہ ان دونوں سے متاثر ہوئے اور ان کے حلقوں میں صحابہ کرام پر زبانِ طعن دراز ہونے لگی۔"②

افراط وتفریط پر مشتمل مواد کے جواب میں علمائے راسخین نے صحابہ کے متعلق صحیح اعتقاد کی وضاحت، رافضیت وناصبیت کی تردید اور تاریخ صحابہ سے متعلق الگ الگ موضوعات پر محققانہ کام میں کوئی کمی نہیں کی۔

ان تمام علمی کاوشوں کے باوجود تاریخ صحابہ سمیت دورِ حاضر تک کی ایک مکمل اور محققانہ تاریخ کی ضرورت باقی ہے، لہٰذا ہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اپنے اکابر کی منشأ کے مطابق تحقیق کے اصول استعمال کرتے ہوئے صحابہ کی مستند تاریخ، امت کے سامنے پیش کریں۔ قارئین اس کی قبولیت کے لیے دعا گو رہیں۔

① فتاویٰ عثمانی، مفتی محمد تقی عثمانی: ۱/۱۸۰ ② مقام صحابہ، ص ۱۰۹، ط ادارۃ المعارف کراچی

☆☆☆

تاریخ امت مسلمہ حصہ اوّل میں آپ نے پڑھا کہ کفر وشرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں کے درمیان کس طرح شمع اسلام روشن ہوئی اور کس طرح حق نے جہالت کی تاریکیوں کو چیر کر اپنا لوہا منوایا، کس قدر نا ساز گار ماحول میں نبی امی فداہ ابی وامی ﷺ نے اسلام کی دعوت کا آغاز کیا اور کس طرح وہ سعادت مند ہستیاں جنہیں صحابہ کرام کہا جاتا ہے، آپ ﷺ کے گرد جمع ہوئیں۔ آپ ﷺ کو مکہ سے نکالا گیا تو انصار مدینہ نے آپ ﷺ کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔

مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد دعوت کے ساتھ جہاد کا سلسلہ شروع ہوا اور آخر کار دس برس کے اندر اندر پورے عرب میں توحید کا کلمہ گونجنے لگا۔ مکہ فتح ہوا۔ لات وہبل توڑ دیے گئے اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ خلفائے راشدین کے دور میں اسلام کے نام لیواؤں نے جزیرۃ العرب سے نکل کر قیصر وکسریٰ کی استبدادی حکومتوں سے ٹکر لی اور صدیوں سے ظلم وستم کی زنجیروں میں جکڑی انسانیت کو نجات دلا کر ان کی جبینوں کو معبود حقیقی کے سامنے جھکنے کی آزادی بخشی۔ یوں چند عشروں میں ایمان وروحانیت سے بھرپور ایک پر امن ماحول، ایک پاکیزہ تمدن اور ایک بہترین معاشرہ وجود میں آیا جس پر تا قیامت انسانیت فخر کرتی رہے گی۔

تاریخ امت کے ''حصہ اوّل'' میں ہم اس عہد کا تفصیل سے جائزہ لے چکے ہیں۔

☆☆☆

اب تاریخ امت کا ''دوسرا حصہ'' آپ کے سامنے ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب مشاجرات کے دور کی سرگزشت بیان کرتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح فتوحات کے عروج کے بعد ایک تبدیلی کا دور شروع ہوا۔ عالم اسلام میں اندرونی خلفشار کیسے پیدا ہوا۔ اندرونی فتنوں نے کیوں کر سر اٹھایا۔ یہ امت کی تاریخ میں فتنوں کا پہلا دور تھا جس کا دورانیہ ۳۴ھ سے ۴۰ھ تک لگ بھگ پونے سات سال بنتا ہے۔ بظاہر فتنے کی ابتداء ۳۴ ہجری میں ہوئی تھی مگر اس کی جڑیں پہلے سے لگ چکی تھیں۔ اس فتنے کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا جس نے پوری امت کو ششدر کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں بھی فتنہ پرور عناصر سرگرم رہے۔ اس دوران ہماری تاریخ کے دو مزید سانحے جنگ جمل اور جنگ صفین کی شکل میں پیش آئے جن میں پہلی بار ہم امت محمدیہ کے مابین تلوار چلتے دیکھتے ہیں۔

اس کش مکش میں تین گروہ تھے: ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا۔ دوسرا ان سے اختلاف کرنے والے صحابہ وتابعین کا۔ اور تیسرا ان عناصر کا جو پس پردہ سازشوں میں مصروف تھے۔ یہ ہنگاموں کا دور تھا۔ ایسے حالات میں اصل خبروں سے کہیں زیادہ افواہوں کا زور ہوتا ہے جنہیں عموماً سماج دشمن عناصر عام کیا کرتے ہیں، پس اس دور کے بارے میں بھی بہت سی افواہوں اور جھوٹی روایتوں کو خوب شہرت ملی۔ ایسی کئی چیزیں بعد میں تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ ان میں سے بعض روایات صحابہ کرام کے مابین کش مکش کا غیر حقیقی اور مسخ شدہ روپ دکھاتی ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس دور کو



غیر معمولی اہتمام اور احتیاط سے دیکھا جائے اور فن اسماء الرجال کی روشنی میں مشکوک روایات کی تحقیق کی جائے۔اس لیے یہ حصہ چند سالوں کی سرگزشت بیان کرتے کرتے بھی خاصا پھیل گیا۔صحیح روایات کی تلاش،ضعیف روایات کی تحقیق،راویوں کے احوال کی تفتیش اور شرائط کے مطابق فنِ درایت سے کام لینے کے باعث ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

☆☆☆

دوسرا باب خلافتِ راشدہ کے خاتمے اور خلافتِ عامہ کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سونپ دی۔اس کے نتیجے میں امن وامان اور فتوحات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا جو بیس برس تک جاری رہا۔اس حصے میں انہی بیس سالوں کی روداد بیان کی گئی ہے۔اس زمانے میں ناکامی سے دوچار ہونے والے سازشی عناصر نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے انتقامی پروپیگنڈے کا ہدف بنالیا اور ان کے خلاف ایسی وضعی روایات عام کیں جو تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ہم مسلمانوں کی ایمانی وعلمی ضرورت سمجھتے ہیں کہ انہیں تصویر کا اصل رخ دکھایا جائے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کو صحیح روایات کی روشنی میں سامنے لایا جائے اور غلط روایات کا محاکمہ کیا جائے۔چنانچہ اس سعی میں بیس برس پر مشتمل یہ دوسرا دور بھی ضخامت کے اعتبار سے کچھ بڑھ گیا ہے۔تاہم اسے پڑھ کر آپ اپنے ایمان وایقان میں نئی تازگی محسوس کریں گے۔ان شاء اللہ۔

☆☆☆

تیسرا باب اس دورِ فتن کی روداد بیان کرتا ہے جو یزید کی تخت نشینی سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کے زمانے کو محیط ہے۔۶۰ھ سے ۷۳ھ تک کے اس دورانیے میں سانحہ کربلا،وقعۂ حرہ اور مدینہ اور مکہ پر اموی افواج کی فوج کشی سمیت کئی نازک ابحاث سامنے آتی ہیں۔ان واقعات میں بھی بہت سی ضعیف اور من گھڑت روایات شامل ہیں جس میں سے صحیح مواد کا انتخاب کرنے اور حقیقت تلاش کرنے میں طویل مدت اور غیر معمولی محنت صرف ہوئی ہے۔

☆☆☆

چوتھا باب ان مشاہیر کے حالات پر مشتمل ہے جنہوں نے پہلی صدی ہجری میں اُمت مسلمہ کے لیے علمی،ایمانی،فکری اور اخلاقی حوالوں سے عظیم خدمات انجام دیں۔

☆☆☆

پانچواں باب ''ازالۂ شبہات'' کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے۔چونکہ دورِ مشاجرات کے متعلق عام ذہنوں میں لاتعداد اشکالات اور سوالات پائے جاتے ہیں،لہٰذا اس دور کے صحیح حالات بیان کرنے کے ساتھ ایسے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ضروری تھا۔چنانچہ متن اور حواشی میں بھی اس کا خیال رکھا گیا اور آخر میں یہ مستقل باب قائم کرکے اس ضرورت کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔

☆☆☆

ہماری اس کاوش کا اصل دار و مدار ''علم اسماء الرجال'' اور ''قواعدِ جرح و تعدیل'' پر ہے۔ یہ سینکڑوں اوراق اس شخص کے لیے بے معنیٰ ہوں گے جو اُمتِ مسلمہ کے ''علم اسماء الرجال'' کو مشکوک سمجھتا ہو۔ ہم نے ''اسماء الرجال'' کی تحقیق میں اگرچہ امام بخاری، امام مسلم، امام عجلی، امام عقیلی، محمد بن سعد، ابن ابی حاتم، ابن حبان، ابن جوزی اور ابن عدی اور امام مزی رحمہم اللہ جیسے صفِ اوّل کے ناقدین سے حتی الامکان استفادہ کیا ہے مگر ہمارا زیادہ دار و مدار حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ کی آراء پر ہے جنہوں نے متقدمین علماء کی آراء کو شرح و بسط کے ساتھ نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا نچوڑ بھی پیش کر دیا ہے۔ کسی راوی کے بارے میں اختلافِ آراء کے موقع پر ماہرینِ فن ان دونوں حضرات کی تحقیق پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے آئے ہیں۔

جرح و تعدیل کے قواعد میں دیگر کتب کے علاوہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''**نخبة الفكر**''، امام سیوطی رحمہ اللہ کی ''**تدريب الراوی**''، مولانا عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ کی ''**الرفع والتكميل**'' اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی ''**قواعد فی علوم الحديث**'' رحمہ اللہ کو بطورِ خاص سامنے رکھا ہے۔

خاص تاریخی روایات کے متعلق ضوابط میں مقدمۂ ابن خلدون رحمہ اللہ، امام سخاوی رحمہ اللہ کی ''**الاعلان بالتوبيخ**'' اور علامہ کافیجی رحمہ اللہ کے رسالے ''**المختصر فی علم التاريخ**'' سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

تاریخی مواد کو مرتب کرنے میں ہم نے اوّلاً کتبِ حدیث اور ثانیاً کتبِ تاریخ سے مدد لی ہے۔ ذخیرۂ حدیث میں ہم نے صحاحِ ستہ، مؤطا امام مالک، امام ابوبکر ابن ابی شیبہ کی مُصَنَّف، مُسندِ احمد بن حنبل، مستدرک امام حاکم اور امام عبدالرزاق بن ہمام کی مُصَنَّف سمیت متقدمین کے ہر دستیاب مأخذ سے حتی الامکان استفادہ کیا ہے۔

اسی طرح حسبِ مقدور تاریخ کے ہر قدیم مأخذ کو کھنگالا گیا ہے۔ مؤرخین میں سب سے پہلے خلیفہ ابن خیاط، محمد بن سعد، ابن جَریر طبری اور ابن ابی خیثمہ جیسے متقدمین کی روایات پر بھروسہ کیا گیا ہے جو بطورِ ناقد بھی نامور تھے۔ ان کے بعد علامہ بلاذُری، علامہ ابن جوزی، علامہ ابن عبدالبر، ابن اثیر الجزری، حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر، علامہ ابن خلدون، حافظ ابنِ حجر رحمہم اللہ کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ نازک معاملات میں سند اور متن کو دیکھنے بھالنے کا حتی الامکان پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان تحقیقی کتب کو جن میں اسناد کی صحت و ضعف کو واضح کیا گیا ہے، بطورِ خاص دیکھا گیا ہے۔ ان میں دکتور محمد بن عبداللہ غبان صبحی کی ''**فتنة مقتل عثمان** رضی اللہ عنہ'' بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ دکتور محمد بن طاہر البرزنجی اور دکتور محمد صبحی حسن حلاق کی ''صحیح تاریخ الطبری'' سے بہت مدد لی گئی ہے۔ تاریخ طبری کی روایات کی اسنادی تحقیق میں اکثر و بیشتر اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث کی اسناد کے بارے میں شیخ ناصر الدین البانی، دکتور شعیب الارنؤوط اور دکتور احمد محمد شاکر کے تحقیقی کام کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر ان حضرات کی آراء سے اختلاف کی بھی گنجائش محسوس ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ شہادتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کے احوال بڑی دقتِ نگاہ کا

تقاضا کرتے ہیں۔ مشاجرات صحابہ اور ہماری تاریخ کے کئی نازک ترین مباحث اسی دور میں آتے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں مختلف طبقات فکر اور فرقوں کی الگ الگ آراء ہیں اور انہی پر اختلاف سے فرقہ بندیوں کی ابتداء ہوئی ہے۔ اسی لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معرفت، ان کے درجات اور ان میں پیش آنے والے باہمی اختلافات کا فیصلہ کوئی عام تاریخی مسئلہ نہیں بلکہ معرفتِ صحابہ تو علمِ حدیث کا اہم جزو ہے جیسا کہ مقدمہ ''اصابہ'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور مقدمہ ''استیعاب'' میں حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقام اور باہمی تفاضل و درجات اور ان کے درمیان پیش آنے والے اختلافات کے فیصلے کو علمائے امت نے عقیدے کا مسئلہ قرار دیا اور تمام کتب عقائدِ اسلامیہ میں اس کو ایک مستقل باب کی حیثیت سے لکھا ہے۔ ایسا مسئلہ جو عقائدِ اسلامیہ سے متعلق ہے اور اسی مسئلے کی بنیاد پر بہت سے اسلامی فرقوں کی تقسیم ہوئی ہے، اس کے فیصلے کے لیے بھی ظاہر ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص اور اجماعِ امت جیسی شرعی حجت درکار ہیں۔ اس کے متعلق اگر کسی روایت سے استدلال کرنا ہے تو اس کو محدثانہ اصولِ تنقید پر پرکھ کر لینا واجب ہے۔ اس کو تاریخی روایتوں میں ڈھونڈنا اور ان پر اعتماد کرنا اصولی اور بنیادی غلطی ہے، وہ تاریخیں کتنے ہی بڑے ثقہ اور معتمد علمائے حدیث ہی کی لکھی ہوئی کیوں نہ ہوں۔ ان کی فنی حیثیت ہی تاریخی ہے جس میں صحیح وسقیم روایات جمع کر دینے کا دستور ہے۔''[1]

چونکہ راقم کا مقصد تاریخ کی تنقیح ہے، اس لیے تاریخی روایات سے مواد لینے میں تقلیدی طرز اختیار نہیں کیا گیا۔ محدثین کے اصولِ تنقید کے مطابق سینکڑوں روایات کو جانچا اور راویوں کے حالات کو چھانا گیا ہے اور اس سعی میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ اللہ جل شانہٗ کے لطف و کرم نے ہر جگہ راہنمائی کی۔ اسی کی توفیق سے علمی و فکری آبلہ پائی کے بعد راقم نے یہ صحرا عبور کیا ہے۔

یہ قدم اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

☆☆☆

قریبی دور میں کچھ محققین حضرات نے ''دفاعِ صحابہ کرام'' کے عنوان سے اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور پر تحقیقی کام کی کوشش کی ہے۔ صحابہ کا دفاع ہمارا اہم ترین ہدف ہے مگر ہمارے اور ان حضرات کے منہج میں اصولی فرق ہے۔ ان کا منہج، اسلاف سے برگشتہ کر کے ''انکارِ حدیث'' کی سمت لے جاتا ہے۔ ان کے منہج کا حاصل چار نکات ہیں:

① ہر ایسی روایت مردود مانی جائے گی جس سے ہمارے ذہن میں کوئی خلجان پیدا ہوتا ہو۔ چاہے وہ روایت سنداً صحیح ہو یا ضعیف۔ ذخیرۂ تاریخ میں ہو یا ذخیرۂ حدیث میں۔

---

[1] مقام صحابہ، ص ۲۹

② ایسی روایات کے ناقل مؤرخین یا محدثین کو کسی گمراہ فرقے کا آلۂ کار تصور کیا جائے گا۔
③ ماہرین اسماء الرجال میں سے کسی کی وہ شاذ رائے بھی مان لی جائے گی جو ہمارے طے شدہ نظریات کی مؤید ہو۔ جبکہ اس کے برخلاف ماہرینِ فن کے جمِ غفیر کی رائے بھی مسترد کر دی جائے گی۔
④ جمہور علمائے اُمت کے اجماعی نظریات کو حتمی حیثیت نہیں دی جائے گی۔ اپنی نئی تحقیق کو حتمی مانا جائے گا۔

یہ منہج سراسر تشدد اور تعصب پر مبنی ہے۔ تحقیق کا درست منہج وہی ہے جو جمہور علماء اور اسلاف اُمت کا رہا ہے۔ اس منہج کے چار بنیادی اصول ہیں:

① جن اسلاف کی امانت و دیانت اور علمی مقام کو عمومی طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور ان کی کتب سے جمہور علمائے اُمت استفادہ کرتے آرہے ہیں، انہیں صحیح العقیدہ، امین، دیانت دار اور اُمت کا محسن ہی سمجھا جائے گا۔
② اسلاف معصوم عن الخطاء نہیں، ان سے علمی لغزشیں ہو سکتی تھیں، لہٰذا ان سے اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ کسی تالیف و تصنیف میں ان کے مقرر کردہ معیار پر بھی تنقید کی جاسکتی ہے۔ کسی بیان، استدلال یا تحقیق کو مسترد کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کے ایمان کو مشکوک یا انہیں گمراہ فرقوں کا آلۂ کار سمجھ لینا بہت بڑی زیادتی ہے۔
③ جن نظریات پر قرونِ اولیٰ سے جمہور علمائے اُمت کا اتفاق اور اجماع چلا آرہا ہے، وہاں اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں۔ ''تحقیق'' کے نام پر ایسا اختلافِ رائے ہمیشہ کسی نئے فرقے کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔
④ روایات کو قبول یا مسترد کرنے میں اصولِ حدیث اور فنِ تاریخ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے گا۔ محض ذہنی خلجان یا کوئی اشکال پیدا ہونا، کسی روایت کو جھٹلانے کے لیے کافی نہیں۔ (اگر یہ معیار رکھا جائے تو بہت سی صحیح مرفوع احادیث بھی مسترد کرنا پڑیں گی کیوں کہ کم علمی یا کم فہمی کے سبب وہاں بھی خلجان پیدا ہو سکتا ہے۔)

ہم اصولِ تاریخ کی بحث اور پھر تاریخ کی تحقیق کے دوران ان شاء اللہ ان چار نکات کی حدود میں رہیں گے۔

☆☆☆

''تاریخِ اُمتِ مُسلِمہ'' کا حصۂ دوم جو اس وقت قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، ۲۰۱۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ وقفے وقفے سے یہ کام جاری رہا اور پانچ سال بعد اس کی تکمیل ۲۰۱۷ء کے اواخر میں ہوئی ہے۔

اس دوران اکابر و اساتذہ اور اہلِ علم دوستوں سے مشاورت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اسی دوران راقم کو اللہ عزوجل نے فریضۂ حج ادا کرنے کی توفیق نصیب فرمائی، وہاں اس کام کی تکمیل اور قبولیت کے لیے جی بھر کے دعائیں کیں۔ حرمِ مکہ میں اپنے محسن حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب دامت برکاتہم (سربراہ جامعۃ الرشید کراچی) سے تاریخی تحقیق کے منہج اور اصول و ضوابط کے سلسلے میں استشارہ و استفادہ کا خوب موقع ملا۔ حضرت مفتی محمد زرین صاحب (رئیس دارالافتاء جامعۃ الرشید) نے بھی کام کے منہج کے بارے میں قیمتی مشوروں سے نوازا، اصول الروایۃ کے بارے میں بہت مفید مآخذ کی طرف توجہ دلائی اور بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ ان اکابر کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔



روزنامہ اسلام کے پرانے کارکن اور اپنے دوست مولانا محمد عاشق الٰہی کا شکرگزار ہوں جنہوں نے بڑی لگن، اہتمام اور محنت سے حصۂ اوّل کی تمام تر اور حصۂ دوم کے بیشتر حصے کی کمپوزنگ کی۔ ادارہ علوم القرآن کے استاذ جناب حامد محمود صاحب نے چند اہم ابواب کی کمپوزنگ بہت کم وقت میں کر کے دی۔ مفتی عبدالخالق صاحب نے تصحیح اور نظرِ ثانی میں بڑی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا۔ میں ''المنہل'' کے ڈائریکٹر جناب مولانا محمد الطاف میمن، بھائی حامد علی کھوکھر اور ''ادارۃ النور'' کراچی کے منیجر مولانا محمد علی کا تہہ دل سے ممنون ہوں جن کے بھرپور اور مخلصانہ تعاون سے یہ کاوش منظر عام پر آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو دنیا و آخرت میں بہترین جزائے خیر دے جن کی کسی بھی قسم کی معاونت اس کارِ خیر میں شامل رہی ہے۔

حصہ اوّل کے آغاز میں ''علمِ تاریخ'' کے تعارف پر راقم کا ایک رسالہ شامل تھا۔ یہاں بھی ابتداء میں روایات کی تحقیق اور تنقیح کا طریقہ سمجھانے کے لیے پر ایک مقالہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں ان اصولوں کی ضرورت ثابت کی گئی ہے جو ہماری اگلی تمام تاریخی بحث کے لیے اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد اسماعیل ریحان

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ، 6/فروری 2018ء

rehanbhai@gmail.com

☆☆☆

علامات و رموز اور حوالوں کی مراجعت کے لیے اشارات

☆ م ...... متوفی۔متوفیٰ (تاریخ وفات بیان کرنا مقصود ہے۔)[1]

☆ تر ...... ترجمہ (حالاتِ زندگی)

☆ ۱۲۲/۳ ...... جلد نمبر تین، صفحہ نمبر ۱۲۲ (نشان/ کے دائیں طرف جلد نمبر، بائیں طرف صفحہ نمبر)

☆ ص ...... صفحہ نمبر

☆ ح ...... حدیث نمبر، روایت نمبر

☆ ط ...... مطبع/ناشر

☆ تخ ...... تخریج

☆ ت ...... تحقیق

تنبیہات

❶ بہت سے مقامات پر ایک ساتھ دو یا زائد کتب کے حوالے نقل کر دیے گئے ہیں۔ ایسا عموماً اس بناء پر کیا گیا ہے کہ قارئین کو ان میں سے جو ماٴخذ دستیاب ہو، اس میں دیکھ لیں۔ مگر بعض اوقات اس ضرورت کی بناء پر بھی متعدد ماٴخذ کا حوالہ ایک ساتھ دے دیا گیا ہے کہ واقعے کے اجزاء منتشر شکل میں کچھ ایک ماٴخذ میں ہیں اور کچھ دوسرے میں۔ اس لیے اگر مراجعت کے وقت قارئین کو ایک ماٴخذ میں پورا واقعہ متن میں پیش کردہ شکل کے مطابق نہ ملے تو باقی ماٴخذ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ ان شاء اللہ تھوڑی سی محنت سے پورا واقعہ اسی شکل میں سامنے آجائے گا۔

❷ کوشش کی گئی ہے کہ حوالوں کے لیے کتب کے نئے، تحقیق شدہ اور زیادہ مروج نسخوں کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ آخر میں "کتابیات" سے معلوم ہو جائے گا کہ کس مطبع کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ قارئین اسی مطبع کے نسخے کو دیکھیں گے تو ان شاء اللہ فوراً اپنی مطلوبہ چیز پالیں گے۔ مگر بعض اوقات ایک ہی مطبع کی کسی کتاب کے نئے ایڈیشن میں دو چار صفحات کی کمی بیشی ہو جاتی ہے، اس لیے قارئین کو محولہ صفحے پر مطلوبہ مواد نہ ملے تو دو چار صفحے آگے پیچھے بھی دیکھ لیں۔

❸ اگر نسخوں کے فرق کی وجہ سے کوئی واقعہ محولہ جلد اور صفحے میں نہ ملے تو اکثر کتب تاریخ میں اسے سن ہجری کے تحت تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یا حکومتوں اور حکمرانوں کے تحت تلاش کر لیں۔ ان شاء اللہ ناکامی نہیں ہوگی۔

☆☆☆

---

① اس لفظ کو مُتَوَفِّی اور مُتَوَفَّیٰ (فا کے کسرہ یا فتحہ کے ساتھ) دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔
(الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ لشمس الدین السخاوی، ص ۸۵، ط دار الکتب العلمیۃ بیروت)

مقدمہ

مطالعۂ تاریخ اور تحقیق و تنقیح کے اصول

مشکوک روایات کی تحقیق و تنقیح
کن قواعد وضوابط کے تحت ہو؟

محمد اسماعیل ریحان

ماضی کے مؤرخین کے طرزِ تالیف پر ایک نگاہ

کچھ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ تاریخ پڑھتے ہوئے بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صحابہ کرام بھی بدعنوان، دنیا پرست اور بدکردار تھے (نعوذ باللہ)۔ اس تاثر کے بعد آدمی یا تو صحابہ کرام سے بددل ہو جائے گا یا کتبِ تاریخ سے۔

راقم اس مسئلے کی اصل وجوہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ ایسی غلط فہمیاں چار وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں:

1. پہلی وجہ اپنے زاویۂ نگاہ کی خرابی اور ایمانی کمزوری ہے جو آج کل عام ہے۔ ایک واقعہ اپنی جگہ مثبت ہوتا ہے مگر انسان اسے غلط رُخ سے دیکھتا ہے تو منفی تاثر لیتا ہے۔ آدھ گلاس پانی کو مثبت رُخ سے دیکھیں تو کہا جائے گا کہ الحمدللہ! آدھا گلاس پانی میسر ہے۔ منفی رُخ سے دیکھیں تو کہا جائے گا کہ افسوس! آدھا گلاس خالی ہے۔
2. دوسری وجہ واقعات کی صحیح تاویل کی صلاحیت نہ ہونا ہے۔ صحیح تاویل وہی شخص کر سکتا ہے جو علمِ عقائد و کلام، فقہ، حدیث اور شروحِ حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کر چکا ہو۔ ایک واقعے کے دیگر پہلوؤں کو واضح کرنے والی منتشر روایات بھی اس کی نگاہ میں ہوں۔ ہر شخص کا مطالعہ اتنا وسیع نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ خلجان پیدا کرنے والی روایت کی صحیح تاویل نہیں کر سکتا۔
3. تاریخ کے ساتھ بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ''اُمّھاتُ الکتب'' (بنیادی ماٴخذ) بھی شروح سے محروم ہیں، اس لیے کوئی اشکال دور ہونا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قابلِ اشکال روایات ذخیرۂ حدیث میں بھی ہیں مگر کتبِ حدیث کی بہت سی شروح موجود ہیں جن کے ذریعے اشکالات دور کیے جاسکتے ہیں۔ تاریخ میں ہمیں یہ سہولت میسر نہیں۔
4. تاریخ میں واقعی کمزور، مشکوک اور قابلِ تحقیق مواد موجود ہے۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کا آغاز ہوا تو منافق قسم کے لوگوں نے ایسی جعلی خبریں مشہور کرنا شروع کر دیں جن سے مشاجرات میں شریک صحابہ کے دونوں طبقوں کی کردار کشی ہوتی تھی۔ ایسی خبریں سینہ بسینہ نقل ہوتی رہیں۔ جو راوی کسی ایک گروہ کے حق میں متشدد تھے انہوں نے کارِ ثواب سمجھ کر اس مہم میں حصہ لیا۔ چونکہ وہ دور ایسا تھا کہ ہر قسم کی روایات جمع کی جا رہی تھیں، اس لیے اس دائرے میں ایسی ضعیف، مشکوک اور جعلی روایات بھی شامل ہو گئیں۔ عام مؤرخین نے ان روایات کو اسلاف کی تُراث کی حیثیت سے پوری امانت کے ساتھ من وعن آگے منتقل کر دیا۔ یہ اصول طے ہے کہ ضعیف روایات کو اعتقاد کا مدار نہیں بنایا جا سکتا مگر اس اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے ان روایات پر اعتقاد کر کے کچھ لوگ رافضیت اور کچھ ناصبیت کی طرف مائل ہو گئے۔ جبکہ جمہور علمائے اسلام نے ضعیف روایات کو نقل کرنے کی گنجائش رکھنے کے باوجود ان سے کوئی ایسا استدلال جائز نہیں سمجھا جو عدالتِ صحابہ کے خلاف ہو۔



علم حدیث اور تاریخ میں فرق

اہل علم جانتے ہیں کہ کذاب راویوں نے یہی کارستانیاں احادیث میں بھی دکھائیں اور ہزاروں خودساختہ روایات مشہور کیں مگر حدیث میں ائمہ حدیث نے برسہابرس کی محنت سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا، جبکہ تاریخی روایات کی تنقیح اور تحقیق وتفتیش میں اتنی باریک بینی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ علمائے اصول نے اس شرط کے ساتھ انہیں نقل کرنے کی گنجائش رکھی کہ ان سے کسی عقیدے یا شرعی حکم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے میں یہ بھی ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ان کے ضعف یا درجۂ ضعف کی نشان دہی کر کے ہی انہیں نقل کیا جائے۔ ①

تاہم ائمہ جرح وتعدیل نے رجال کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے اور علمائے اصول نے روایات کا مرتبہ طے کرنے کے جو قواعد مقرر کیے ہیں ان کی بنیاد پر صحیح، حسن، ضعیف، منکر اور جعلی روایات کو آج بھی پہچانا جاسکتا ہے۔ قدیم کتب تاریخ میں موجود ہر روایت کی سند کو دیکھ کر آج بھی ان روایات کی چھان بین کی جاسکتی ہے۔

سیرتِ نبویہ، احوالِ صحابہ اور تاریخ کی اکثر کتب میں بیشتر مواد ایسے ضعیف راویوں سے منقول ملے گا جو ''اخباری'' یا مؤرخ کے طور پر مشہور تھے۔ مثلاً دوسری اور تیسری صدی ہجری میں مدون کی گئی سیرتِ محمد بن اسحٰق، سیرتِ ابن ہشام، واقدی کی فتوح الشام، بلاذری کی فتوح البلدان، محمد بن سعد کی الطبقات الکبریٰ اور بلاذری کی انساب الاشراف اٹھالیں۔ ان سب کا اکثر مواد ضعیف السند ہے۔ راوی بھی تقریباً ملتے جلتے ہیں، یعنی: ابومخنف، سیف بن عمر، ہشام کلبی، محمد بن سائب کلبی وغیرہ۔ روایات کا مواد بھی ملتا جلتا ہے۔ صحیح، حسن، ضعیف، قابلِ اعتراض یا قابلِ ترک مواد ان سب میں ہے۔ اس کے باوجود اہلِ علم کے ہاں ان سب سے استفادہ بہت عام ہے۔

ان کے بعد امام طبری جیسے فقیہ کی تاریخ الرسل والملوک، ابن حبان جیسے ناقد کی سیرت النبی، علامہ ابن جوزی جیسے محدث کی المنتظم، ابن اثیر الجزری جیسے وسیع النظر مؤرخ کی الکامل، حافظ ذہبی جیسے امام جرح وتعدیل کی تاریخ الاسلام اور حافظ ابن کثیر جیسے محقق کی البدایہ والنہایہ دیکھ لیں۔ ان سب میں پیش کیا گیا اکثر تاریخی مواد ضعیف الاسناد ہے۔

ماضی کے علماء نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم جیسی صحیح السند تاریخ مرتب کیوں نہ کی؟

اب سوال یہ ہے کہ ماضی کے جلیل القدر علماء نے حدیث کے صحیح مجموعوں: صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی طرح ''صحیح اور معتبر روایات'' پر مشتمل تاریخ کیوں نہ مرتب کی؟

تو بات یہ ہے کہ تاریخ، روزمرہ کی اہم خبروں اور معلومات عامہ (جنرل نالج) کے مجموعے کا دوسرا نام ہے، جس کے لیے معتبر اور باوثوق ذرائع پر اصرار کرنا اکثر اوقات اصل مقصد سے محروم کر دیتا ہے۔ کسی ایک دن کی خبروں کا حصول بھی صرف صحیح اور ثقہ راویوں سے ہونا بہت مشکل ہے۔ اتفاقیہ طور پر تو ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ کو جو خبر درکار ہے،

① ویجوز عند اهل الحدیث وغیرهم التساهل فی الاسانید وروایة ما سوی الموضوع من الضعیف والعمل به من غیر بیان ضعفه فی غیر صفات الله تعالیٰ والاحکام کالحلال والحرام ومما لاتعلق له بالعقائد والاحکام. (تدریب الراوی: ۱/۳۵۰، ط قرطبہ)

اس کے چشم دید گواہ اور درمیانی واسطے سبھی نیک سیرت، سمجھ دار، دیانت دار اور معتبر ہوں۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ درحقیقت کسی بھی زمانے میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ اگر آپ چار صفحات کا ایک روزنامہ نکالنا چاہیں اور ساتھ میں آپ کی یہ بھی آرزو ہو کہ اس میں ایک عام آدمی کو درکار تمام ضروری ملکی اور بین الاقوامی خبریں پیش کر دی جائیں تو آپ کو راویوں یعنی رپورٹروں اور ذرائع خبر رسانی میں گنجائش رکھنا ہوگی۔ اگر آپ یہ شرط لگا دیں کہ خبر بھیجنے والا فسق وفجور سے پاک، باشرع، کسی مدرسے کا فاضل، کسی خانقاہ سے وابستہ یا کم از کم تبلیغ میں تین چلے لگائے ہوئے ہو تو آپ کو مدارس کے جلسوں، اصلاحی بیانات اور بعض شخصیات کی نمازِ جنازہ جیسی کچھ خبروں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

فطری بات ہے کہ خبر جس ماحول کی ہوگی آپ کو چشم دید گواہ بھی اسی ماحول کے ملیں گے۔ مساجد، مدارس، خانقاہوں، علماء وصلحاء، محدثین ومفسرین کے حلقوں میں صالحین کی کثرت ہوتی ہے۔ یہاں کی خبروں کے بہت سے راوی عادل اور ثقہ ہوں گے۔ مگر ظاہر ہے یہ خبریں حلال حرام کے احکام، نیک کاموں کی فضیلتوں، گناہوں کے نقصانات کے متعلق ہی ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو بعض بزرگوں کے کچھ نجی حالات، کچھ تجربات اور کچھ معمولات کی خبریں بہترین سند سے مل جائیں گی۔

لیکن ایوانِ اقتدار، فوج، پولیس، سیاست، محاذِ جنگ اور بازار سے لے کر دنیا کے کسی بھی شعبے میں آپ کو امانت و دیانت کے اعتبار سے عام لوگ ملیں گے۔ یہ عام لوگ امین بھی ہو سکتے ہیں، خائن بھی۔ زبان کے سچے بھی ہو سکتے ہیں اور پکے جھوٹے بھی۔ بھلکڑ اور وہمی بھی ہو سکتے ہیں اور مبالغہ آرائی کرنے والے بھی۔ یہ صورتحال ہر دور میں رہی ہے۔ اگرچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خیر القرون میں نیکی کا چلن زیادہ تھا مگر آپ دیکھ سکتے ہیں کہ محدثین نے اس زمانے میں بھی صحابہ کے سوا کسی کو آنکھیں بند کر کے عادل نہیں مانا۔

عام دنیا کی خبریں عام لوگوں کے توسط ہی سے پھیلتی ہیں، عام لوگ ہی انہیں پہلے جانتے اور آگے نقل کرتے ہیں۔ گاؤں کی خوشی غمی کی خبریں سب سے پہلے نائی کو پتا چلتی ہیں یا اس کے پاس بیٹھنے والے فارغ لوگوں کو۔ مجرمانہ واقعات کی اطلاعات اوّلاً مجرموں اور غنڈوں کو ہوتی ہیں، دوسرے نمبر پر پولیس اور پھر کچہری، عدالت یا ہسپتال آنے جانے والے ان سے آگاہ ہوتے ہیں۔ عام شہری شام کو ٹی وی دیکھ کر یا اگلے دن اخبار کے ذریعے مطلع ہوتے ہیں کہ کیا ہوا تھا۔ جبکہ امانت ودیانت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کے حضرات جو تعلیم، تحقیق، اصلاحِ امت یا خدمتِ خلق جیسے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہوتے ہیں، اکثر ایسی خبروں سے لاعلم رہتے ہیں یا دیر سے آگاہ ہوتے ہیں۔

غرض یہ فطری بات ہے کہ دنیا کے حالات کی خبریں عام لوگوں سے نقل ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کی سند خود بخود ضعیف ہو جاتی ہے۔ جب ہم دنیا کے حالات سے واسطہ رکھتے ہیں تو پھر ان خبروں پر یقین بھی کرنا پڑتا ہے بشرطیکہ وہ ناممکن بات نہ ہو۔ ہر اخبار کو روزانہ درجنوں خبریں ایسی ایجنسیوں سے وصول کر کے قارئین تک پہنچانا پڑتی ہیں جن کے رپورٹروں کے بارے میں یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان ہیں یا دہریے۔ پس دنیا کے حالات کی خبروں میں ثقہ اور



صالح لوگوں کو واسطہ بنانا پسندیدہ تو ہے مگر ہر خبر میں اسی معیار کی شرط لگا دینا سخت مشکل ہے۔ (حالاں کہ آج ہر قسم کے تیز ترین ذرائع مواصلات موجود ہیں) قدیم دور میں بھی اس کا اہتمام کرنا کتنا دشوار بلکہ ناقابلِ تحمل ہوگا؟ اپنی مشکلات پر قیاس کر کے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تاریخی مواد جمع کرنے میں متقدمین کی محتاط کاوشیں

ایسا نہیں کہ علمائے راسخین باوثوق اور محتاط ذرائع سے خبریں جمع کرنے سے غافل رہے۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں کئی بزرگوں نے ایسی کوششیں کیں۔ مثلاً امام بخاری کے استاد خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ کی تاریخ جو ''تاریخ خلیفہ بن خیاط'' کہلاتی ہے، اسی زمرے میں آتی ہے۔ پھر خود امام بخاری رحمہ اللہ نے احوالِ رجال پر ''التاریخ الکبیر'' اور ''التاریخ الاوسط'' مرتب کیں۔ خلیفہ بن خیاط نے سنہ ہجری کے حساب سے حالات لکھے۔ امام بخاری نے شخصیات کے ناموں کے اعتبار سے حالات جمع کیے۔ یہی کام محدث ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ نے کیا۔

خلیفہ بن خیاط نے عمدہ اسناد کی روایات لانے کی کوشش کی تو اڑھائی صدیوں کی تاریخ کا صرف خلاصہ پیش کر پائے۔ اتنی طویل تاریخ ساڑھے چار سو صفحات میں سمٹ گئی۔ ایک سال کو مشکل سے ڈیڑھ صفحہ ملا۔ آپ اس میں جنگِ قادسیہ کا قصہ دیکھیں تو صرف ایک صفحہ ملے گا۔ جنگِ یرموک صرف نصف صفحے پر ہے۔ فتح بیت المقدس کا واقعہ صرف دو تین سطروں میں ہے۔ دورِ صدیقی اور دورِ فاروقی کی عظیم الشان فتوحات جو واقدی کی ''فتوح الشام'' میں ساڑھے پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، تاریخ خلیفہ میں صرف پچاس صفحات میں سمٹ گئی ہیں۔ اتنی احتیاط کے بعد بھی خلیفہ بن خیاط ضعیف روایات لینے پر مجبور ہوئے۔ اس لیے ان کی تاریخ میں بھی ضعیف مواد ہے۔

اب اس معاملے کا دوسرا پہلو دیکھیں۔ تاریخ خلیفہ بن خیاط سنداً سب سے بہتر ہونے کے باوجود تاریخ طبری یا البدایہ والنہایہ کی طرح مقبول نہیں ہوسکی۔ اس میں واقعات کے اسباب وعلل، پسِ منظر، مابعد اثرات اور دیگر پہلوؤں پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی کیوں کہ جو مواد چنا گیا ہے وہ محدود ہے۔ اسے پڑھ کر انسان ہر واقعے کو ادھورا محسوس کرتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ اگر خبروں اور واقعات کے متعلق ''کیا، کیوں، کیسے، کون، کہاں اور کب'' کے چھ بنیادی سوالات حل نہ ہوں تو تشنگی باقی رہتی ہے۔ ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ نے خلیفہ بن خیاط سے نصف صدی بعد اپنی ''التاریخ الکبیر'' پیش کی مگر اس میں بھی واقعات کو ان کی اہمیت کے تناسب سے جگہ نہ مل سکی۔ مثلاً اس میں تحویل قبلہ کا واقعہ تو سات صفحات پر مشتمل ہے جبکہ غزوۂ بدر کو ایک صفحہ بھی مکمل نہیں ملا۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں اس بارے میں اپنے اساتذہ سے بہتر سند کی چند مختصر روایات ہی ملی تھیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی ''التاریخ الکبیر'' اور ''التاریخ الاوسط'' میں بھی ہدف یہ نہیں تھا کہ واقعات کی زیادہ سے زیادہ جزئیات سامنے لائی جائیں۔ بلکہ ہدف یہ تھا کہ احتیاط کے ساتھ راویوں کے حالات جمع کیے جائیں۔ اس کے باوجود صحیح سند کی شرط وہ بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ اب رجال کے حالات کے اعتبار سے ''التاریخ الکبیر'' ایک بہترین ماخذ کا

درجہ رکھتی ہے لیکن اگر آپ اس میں اسلامی تاریخ کے کسی اہم واقعے مثلاً ایران وشام کی فتوحات یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سانحۂ شہادت کی تہہ میں جانا چاہیں تو آپ کو سینکڑوں صفحات چھان کر بھی ناکافی مواد ملے گا۔

مگر اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ کیوں کہ جہاں اعلیٰ معیار طے کر دیا جائے وہاں چناؤ مختصر ہو جاتا ہے۔ بہترین اجزاء جمع ہو جاتے ہیں اور بہت کچھ ترک کرنا پڑتا ہے۔

یہ مسئلہ صرف تاریخ میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی اسی طرح پیش آیا۔ صحیح البخاری میں ۷۵۶۳ روایات ہیں۔ اس کا نام یعنی "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ ﷺ وسننہ وایامہ" ہی صحت روایت اور اختصار کی غمازی کرتا ہے۔ مگر بہت سے محدثین نے صحیح کے ساتھ ضعیف روایات کو بھی جمع کیا ہے۔ مثلاً مصنف عبدالرزاق میں ساڑھے انیس ہزار، مسند احمد بن حنبل میں ساڑھے ستائیس ہزار اور مصنف ابن ابی شیبہ میں تقریباً ۳۸ ہزار روایات ہیں۔ ایسی درجنوں کتب حدیث میں ضعیف روایات بکثرت ہیں۔ پس یہ اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا کہ کتب تاریخ میں اس قدر ضعیف روایات کیوں ہیں۔ (یہ بات نہ بھولیں کہ ضعیف کا مطلب "غلط" نہیں ہوتا۔)

پس تاریخ میں بھی جہاں باوثوق روایات پر اکتفا کی کوشش کی گئی تو "تاریخ خلیفہ" جیسی مختصر کاوشیں سامنے آئیں۔ لیکن جب ایسی کتب ماضی سے آگاہی کے لیے ناکافی محسوس ہوئیں تو ضعیف روایات بھی جمع کر لی گئیں۔ اگر آج ہمارے پاس فتوح البلدان، تاریخ طبری، الطبقات الکبریٰ اور انساب الاشراف جیسی کتب (جن میں صحیح وضعیف مواد یکجا ہے) نہ ہوتیں تو ہمارے لیے پہلی اور دوسری صدی ہجری کے حالات سے کماحقہٗ آگاہی مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتی۔

واقعات کی منطقی ترتیب

کتب تاریخ میں ضعیف روایات کو جمع کرنے کی ایک بڑی وجہ "خبریت" کی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔ روزانہ وصول ہونے والی اطلاعات اور معلومات میں سے جو باتیں "خبر" کے معیار پر ہوتی ہیں، ان کا مجموعہ "اخبار" بن جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد "اخبار" کے مجموعوں سے تاریخ مرتب کی جاتی ہے۔ تاریخ اگر "خبریت" کے تقاضے پورے نہ کرے تو اسے تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ اگر کوئی اطلاع "خبریت" کے معیار پر نہ ہو تو اسے "اخبار" کی زینت نہیں بنایا جاتا۔ اگر کوئی دکاندار یہ کہے کہ "آج میں نے دکان کھولی تھی" تو یہ کوئی خبر نہیں ہوگی۔ لیکن اگر یہ اطلاع ملے کہ "وزیر اعظم نے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کی" تو یہ ایک "خبر" کہلائے گی۔

خبریت کے چھ بنیادی سوال

"خبریت" کی پہلی شرط ہے بات کا قابلِ ذکر ہونا۔ "خبریت" کا معیار ہے کسی بھی قابلِ ذکر بات کو مالہ وماعلیہ کے ساتھ سامنے لانا۔ یہ معیار چھ سوالوں کا جواب طلب کرتا ہے: کیا، کیوں، کیسے، کہاں، کون، کب۔

یعنی: ① کیا ہوا۔ ② کیوں ہوا۔ ③ کیسے ہوا۔ ④ کہاں ہوا۔ ⑤ کس نے کیا۔ ⑥ کب کیا۔

"کیا ہوا" کے جواب میں کوئی قابلِ ذکر بات ہونی چاہیے۔ قاری یا سامع کو ایک نئی بات معلوم ہونی چاہیے۔




اگر یہ بتایا جائے کہ ''محمود غزنوی نے سومنات فتح کیا'' تو یہ ایک قابلِ ذکر بات ہے مگر یہ بتانا کہ ''سومنات کا قلعہ زمین کے اوپر بنایا گیا تھا'' قابلِ ذکر نہیں۔ کیونکہ یہ تو سبھی کو معلوم ہے۔

''کیوں ہوا'' اور ''کیسے ہوا'' کے جواب سے منطقی ربط پتا چلتا ہے۔ اصولِ درایت کے تحت واقعات کی منطقی ترتیب کو ملحوظ رکھنا اور اسے ثابت کرنا بہت اہم ہے۔ اللہ مسبب الاسباب نے کائنات کو عالم اسباب بنایا ہے۔ شاذ و نادر صورتوں کو مستثنیٰ کر کے یہ طے ہے کہ ہر کام اور ہر واقعہ اپنے سے گزشتہ کسی واقعے کا اثر ہوتا ہے اور پھر خود یہ واقعہ آگے کسی نہ کسی واقعے کا سبب بن رہا ہوتا ہے۔

پھر واقعات، حالات اور انقلابات جس قدر غیر معمولی ہوتے ہیں، ان کے اسباب وعلل بننے والے واقعات بھی اسی قدر غیر معمولی ہوتے ہیں۔ جس طرح گندم کے بیج سے آم کا پیڑ نہیں لگ سکتا، اسی طرح کسی جگہ کریانے کی دکان کھول لینے سے ملک کی حکومت نہیں بدل جاتی۔ واقعات کے درمیان تناسب کو ''منطقی ربط'' کہتے ہیں جس کا لحاظ رکھے بغیر کوئی تاریخ مکمل ہو سکتی ہے نہ مفید۔ تاریخ تو کیا ایک شخصیت کے حالاتِ زندگی بھی اگر اس منطقی ربط سے خالی ہوں تو وہ ایک معما بن جائیں گے۔ چند سطروں کا واقعہ بھی اس ربط سے محروم ہو تو وہ ایک پہیلی ثابت ہوگا جو عبرت و نصیحت کی بجائے قاری یا سامع کے لیے ذہنی تشویش کا باعث ہوگا۔ مثلاً اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں کوئی لکھے:

''عالم گیر نامور مغل حکمران تھا۔ عالمگیر کے دور میں مرہٹہ سردار شیوا جی مغلوں سے باغی ہوا۔ پھر تابع دار ہو کر پایہ تخت آیا، پھر دوبارہ باغی ہو کر فرار ہو گیا۔ عالمگیر نے مرہٹوں کی قوت کچل ڈالی۔''

اب یہاں خود بخود ''کیوں اور کیسے'' کے بعض سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ مثلاً: شیوا جی باغی کیوں ہوا؟ پھر وہ تابع دار کیسے بن گیا؟ دوبارہ باغی کیوں ہوا۔''

منطقی ربط میں وہ چیزیں سامنے لانا ضروری نہیں ہوتا جو پہلے سے ظاہر ہوں یا جنہیں نظر انداز کرنے سے واقعاتی ربط متاثر نہ ہو۔ مثلاً مذکورہ پیراگراف میں ''عالم گیر نامور مغل حکمران تھا'' سے کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال بھی اہم نہیں کہ مرہٹوں کی طاقت ''کیوں'' کچلی گئی؟ جواب ظاہر ہے کہ وہ باغی تھے، انہیں کچلنا ضروری تھا۔

منطقی ربط کے لیے ضعیف مواد ناگزیر تھا

شروع کے دور کے مسلم مؤرخین نے تاریخ کی روایات کو فقط جمع کرنے کا کام کیا تھا، جبکہ بعد میں آنے والوں مثلاً علامہ ابن اثیر اور علامہ ابن خلدون نے منطقی ربط کا خیال رکھا ہے۔ جس سے واقعات کی باہمی ترتیب آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ منطقی ترتیب کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر طور پر ضعیف روایات سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ ضعیف روایات سے مواد لینے کی شرائط اصولِ روایت میں طے ہیں (آگے ان کا ذکر آرہا ہے) اور مؤرخین نے عموماً ان کا لحاظ رکھا ہے، تاہم بعض جگہ ان مؤرخین سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

☆☆☆

کیا تاریخ میں وضعی مواد موجود نہیں؟

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ”احادیث میں تو صحیح وضعیف، منکر یا موضوع کی تحقیق کرنا اور اس کا فرق کرنا درست ہے مگر تاریخ میں اس کی سرے سے ضرورت نہیں۔“

یہ خیال اس صورت میں درست مانا جاسکتا ہے جب یہ ثابت کر دیا جائے کہ روایت سازی کا کام صرف عقائد، سنن، احکام اور آداب وغیرہ کی روایات میں ہوا ہے، تاریخ میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وضعی روایات تیار کرنے کا سلسلہ جب شروع ہوا تو اس کے ابتدائی دور میں ایسا کوئی فرق نہیں کیا گیا تھا کہ روایتیں صرف عقائد، احکام اور سنن کے شعبوں میں گھڑی جائیں، سیرت اور تاریخ میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل فرقوں کے راویوں نے ہر شعبے میں من گھڑت روایات بنا کر پھیلائیں۔۔ روایت سازی کا یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا تھا اور چوتھی صدی ہجری تک بڑی سرگرمی سے جاری رہا۔ جعل سازوں نے جس طرح اسلامی عقائد وسنن اور احکام کے مقابلے میں جعلی عقائد اور احکام کو رواج دینے کی کوشش کی اسی طرح اصل تاریخی روایتوں میں اپنی خانہ ساز روایات بھی داخل کیں تا کہ اگلی نسلوں کو صحابہ اور ان کے عقیدت مند جمہور مسلمین سے بدگمان کر کے اپنے اپنے فرقوں کا ہمدرد بنایا جائے۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب امام مالک، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام طحاوی اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے صحیح اور ضعیف روایات کو الگ الگ کرنے کا کام شروع کیا تو ان کے نزدیک زیادہ اہمیت عقائد، سنن، احکام وآداب کی تھی تا کہ اصل دین کے دلائل مرتب شکل میں محفوظ رہیں۔ اسی دور میں بعض حضرات نے سیر، مغازی اور مناقب اور فضائل صحابہ کے عنوانات کے تحت بہت سی تاریخی روایات بھی جمع کیں لیکن ان کی اسناد پر محدثانہ بحث نہیں کی۔ کیوں کہ یہ اصول سب کو معلوم تھا کہ ایسی روایات سے اسلامی عقائد واحکام کے خلاف کوئی استدلال کرنا جائز ہی نہیں۔ اب اگر کوئی اس کا یہ مطلب لے کہ تاریخی روایات کو ان کے حال پر اسی لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہ عقیدے اور احکام کے لیے بھی بلا تحقیق قابل قبول ہیں تو یہ خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

یاد رہے کہ دوسری صدی ہجری میں جب حدیث وتاریخ کے مجموعے منظر عام پر نہیں آئے تھے تبھی یحییٰ بن معین، ابن ابی حاتم، ابن حبان اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسے ائمہ جرح وتعدیل نے ایسی روایات کی بناء پر کتنے ہی راویوں کو ضعیف، منکر اور کذاب قرار دے دیا تھا جو تاریخی روایات میں صحابہ کے معائب اور دیگر عجیب وغریب چیزیں نقل کرتے تھے۔ یہ حضرات ایسے راویوں کو خوب پہچانتے تھے اس لیے ان کے بارے میں ان حضرات کی رائے عموماً سخت دکھائی دیتی ہے کیوں کہ یہ حضرات چاہتے تھے کہ امت ان کی روایات سے ہوشیار رہے۔ مگر چونکہ مؤرخین کا ہدف عقیدے یا احکام کے مستدلات جمع کرنا نہیں تھا، اس لیے انہوں نے ایسے بہت سے راویوں کی تاریخی روایات پر کوئی حکم لگائے بغیر انہیں نقل کر دیا جس سے تاریخ میں ایسی روایات بھی شامل ہوگئیں جن کی محدثانہ اصول کے ساتھ درایت کے تحت جانچ پڑتال کی جائے تو وہ ناقابل اعتبار ثابت ہوں گی۔

کیا روایات نقل کرنے کا مطلب انہیں اپنا عقیدہ قرار دے دینا ہے؟

بعض حضرات کا خیال ہے کہ جب بڑے بڑے مؤرخین مثلاً: تاریخ طبری کے مدوّن ابن جَریر طبری، الکامل فی التاریخ کے مؤلف ابن اثیر جزری، تاریخ الاسلام کے مؤلف حافظ ذہبی اور البدایہ والنہایہ ترتیب دینے والے حافظ ابن کثیر نے بھی ضعیف راویوں کی روایات کو نقل کیا ہے، اور ان میں بہت سی روایات بظاہر طعنِ صحابہ سے آلودہ بھی ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ مؤرخین یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ صحابہ کرام عادل نہ تھے اور مؤرخین نے یہی ثابت کرنے کے لیے یہ روایات نقل کیں۔ ان کے نزدیک یہ روایات اور ان کے راوی معتبر تھے جبکہ صحابہ کرام غیر معتبر اور پست کردار۔

یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ ان حضرات نے ان روایات کو صرف فنی حیثیت سے نقل کیا ہے اور ان میں سے بیشتر روایات کی صحیح تاویل بالکل اسی طرح ہو سکتی ہے، جس طرح ان احادیث کی ہو سکتی ہے جن میں کوئی بات قابلِ اشکال ہے۔ تاویل کو ہم زاویۂ نگاہ کا فرق کہہ سکتے ہیں۔ ایک ہی شخص کا ایک ہی واقعہ اس کے مداحوں کے نزدیک کارنامہ ہوگا جب کہ اس کے مخالفین اس پر اس کی مذمت کریں گے۔ ①

بیشتر روایات جنہیں بظاہر جرحِ صحابہ سے آلودہ سمجھا جاتا ہے، اسی قبیل کی ہیں۔ ایسی روایات فقط کتب تاریخ میں نہیں کتب حدیث میں بھی ہیں۔ مگر ایسی روایات تاریخی ہوں یا حدیثی، صحیح ہوں یا ضعیف، عدالتِ صحابہ کے عقیدے کے خلاف نہیں۔ اگر زاویۂ نگاہ درست کر لیا جائے تو ان پر کوئی خاص اشکال باقی نہیں رہے گا۔ اکثر و بیشتر ایسے واقعات تدبیر و انتظام میں لغزش، خطائے اجتہادی یا رنج، غم یا غصے جیسی کسی عارضی کیفیت پر مشتمل ہوں گے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ حدیثی روایات کو شارحین کی بھرپور خدمات میسر آئی ہیں، نیز محشی حضرات نے بھی جا بجا وضاحتی نوٹ درج کر دیے ہیں اس لیے وہاں خلجان نہیں ہوتا۔ تاریخی کتب میں ایسے واقعات کی تشریح نہیں ہوتی جن سے خلجان پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان مؤرخ حضرات نے ایسی کسی روایت کو نقل کر کے کہیں بھی اس سے یہ عقیدہ یا نتیجہ نہیں نکالا کہ صحابہ کرام نعوذ باللہ بدکردار تھے۔ یہ اصول ہم بالکل شروع میں واضح کر چکے ہیں کہ صحابہ کے بارے میں اعتقاد جاننے کے لیے کتب عقائد کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ ضعیف تاریخی روایات کی حیثیت صرف معلوماتِ عامہ کی سی ہے۔ ان سے کبھی ہمارے اسلاف نے کوئی عقیدہ اخذ کیا ہے نہ آج ایسا کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ صحابہ کے کردار اور مشاجرات کی بحث میں اگر تاریخی روایات کو سامنے رکھ کر کوئی استدلال کیا جائے گا، تو اس سے پہلے ان روایات کی اسنادی حیثیت کو محدثانہ طرز سے جانچنا ضروری ہوگا اور صحیح وسقیم کا فرق ضرور کیا جائے گا۔

اسلاف میں سے کئی ایسے ہیں جنہوں نے کتب تواریخ بھی مرتب کی ہیں اور عقائد پر بھی تصانیف پیش کی ہیں مثلاً: حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر، امام سیوطی اور امام طبری رحمہم اللہ۔ ان کا عقیدہ، ان کی اپنی مرتب کردہ کتب عقائد میں

① مثلاً قیامِ پاکستان کو اہلِ پاکستان بانیٔ پاکستان محمد علی جناح اور ان کے رفقاء کا کارنامہ مانتے ہیں مگر بھارتی شہری بلاتفریق ہندو مسلم اسے ایک بہت بڑی سازش سمجھتے ہیں۔

دیکھا جائے تو وہ قرآن وسنت اور جمہور مسلمین کے اجماع کے عین مطابق ہے۔[1]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی مثال دیتے ہوئے اس مسئلے کو یوں واضح فرماتے ہیں:

''ابن کثیر رحمہ اللہ جو حدیث و تفسیر کے مشہور امام اور بڑے ناقد معروف ہیں، روایات میں تنقید و تحقیق ان کا خاص امتیازی وصف ہے مگر جب بھی بزرگ تاریخ پر ''البدایہ والنہایہ'' لکھتے ہیں تو تنقید کا وہ درجہ باقی نہیں رہتا۔''

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

''فنِ تاریخ میں ان حضرات ناقدین نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کسی واقعے کے متعلق جتنی روایات ملتی ہیں سب کو جمع کر دیا جائے، ان پر جرح و تعدیل اور نقد و تبصرہ اہلِ علم کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اور یہ کسی خاص شخص کی اتفاقی غلطی نہیں بلکہ تمام ائمہ فن کی سوچی سمجھی روش تاریخ میں یہی ہے کہ فنِ تاریخ میں ضعیف و سقیم روایات کو بلا تنقید ذکر کر دینا کوئی عیب نہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان روایات سے دین کے عقائد و احکام شرعیہ کو ثابت کرنا نہیں، عبرت و نصیحت اور تجاربِ اقوام کے فوائد حاصل کرنا ہیں۔ وہ یوں بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان تاریخی روایات سے کسی ایسے مسئلے پر استدلال کرنا چاہتا ہے جس کا تعلق اسلامی عقائد یا احکام عملیہ سے ہے تو اس کی اپنی ذمہ داری ہے کہ روایات کی تنقید اور راویوں پر جرح و تعدیل کا وہی ضابطہ اختیار کرے جو حدیث کی روایات میں لازمی و ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس کا استدلال جائز نہیں۔ اور یہ کہنا کہ کسی بڑے ثقہ اور امام حدیث کی کتاب تاریخ میں یہ روایت درج ہے، اس کو اس ذمہ داری سے سبک دوش نہیں کرتا۔

اس بات کو اس مثال سے سمجھئے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہیں جو فنِ طب کے بھی ماہر ہیں جیسے امام شافعیؒ۔ اور بعض حضرات کی تصانیف بھی فنِ طب میں موجود ہیں۔ یہ حضرات اگر کسی طب کی کتاب میں اشیاء کے خواص و آثار بیان کرتے ہوئے یہ لکھیں کہ شراب میں فلاں فلاں خواص و آثار ہوتے ہیں، خنزیر کے گوشت پوست اور بال کے فلاں فلاں خواص و آثار ہیں۔ پھر کوئی آدمی طب کی کتاب میں ان کے کلام کو دیکھ کر ان چیزوں کو جائز قرار دینے لگے اور استدلال میں یہ کہے کہ فلاں امام یا عالم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور وہاں اس کے حرام ہونے کا ذکر بھی نہیں کیا تو کیا اس کا یہ استدلال درست ہوگا؟''[2]

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کے اس نفیس کلام سے یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ مؤرخین نے روایات کی صحت یا کمزوری کا فیصلہ کیوں صادر نہیں کیا۔ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ کسی مؤرخ یا محدث کا کسی روایت کو نقل کر دینا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ اس روایت کو کسی اسلامی عقیدے کے خلاف معنوں میں بھی قابلِ استدلال سمجھتے ہوں گے۔ یہ بات خود ان علماء کے

① مثلاً عقائد میں امام طبری کی ''صریح السنۃ''، حافظ ذہبی کی ''المنتقیٰ من منہاج الاعتدال'' اور امام سیوطی رحمہ اللہ کی ''حقیقۃ السنۃ والبدعۃ'' دیکھیے۔ ان کتب میں قرآن وسنت سے اخذ کردہ عقائد کے سوا کچھ نہیں مگر انہی امام طبری کی ''تاریخ الرسل والملوک''، حافظ ذہبی کی ''تاریخ الاسلام'' اور امام سیوطی رحمہ اللہ کی ''تاریخ الخلفاء'' میں کمزور اور مشکوک روایات بھی ہیں۔ اگر ہر روایت ان کے اعتقاد کی ترجمان ہوتی تو عقائد میں وہ جمہور مسلمین کی وکالت کیوں کرتے؟

② مقام صحابہ، ص ۲۶، ۲۷

بیانات سے واضح ہے۔ بطورِ مثال تین علماء کی عبارات ملاحظہ ہوں جو حدیث اور تاریخ میں یکساں مہارت رکھتے تھے:

ابن جَرِیر طبری کا بیان

ابن جَرِیر طبری عظیم محدث اور فقیہ تھے۔ تاریخ میں ان کا ہدف صرف روایات کو جمع کرنا تھا۔ انہوں نے ہر روایت کی سند واضح کر دی تا کہ اہل علم خود جانچ سکیں۔ ابن جَرِیر طبری رحمہ اللہ خود اپنی کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

''قارئین یہ جان لیں کہ اس کتاب میں، میں جو مواد بھی ذکر کر رہا ہوں یا جس کے بارے میں میں نے طے کیا ہے کہ اسے لکھوں گا، اس میں میرا بھروسہ بس انہی خبروں پر ہے جو میں ذکر کروں گا اور انہی روایات پر ہے جن کو میں ان کے راویوں کی سندوں کے ساتھ بیان کروں گا۔ اس میں وہ حصہ بہت کم ہے جسے عقلی دلائل اور وجدانی استنباط کے ذریعے حاصل کیا ہو؛ کیوں کہ ماضی کے حالات کا نہ ہم نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہے نہ ہم نے وہ دور پایا ہے۔ ان حالات کا علم ہمیں صرف ناقلین اور راویوں کی بیان کردہ خبروں ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ عقلی دلائل اور وجدانی قرائن سے۔ پس اگر میری اس کتاب میں کوئی روایت بھی ایسی ہو جسے پڑھنے والا عجیب سمجھے یا سننے والا ناپسند کرے کیوں کہ اس کے صحیح ہونے کی کوئی منطق سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو ایسے موقع پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی روایات ہماری اختراع نہیں، بلکہ وہ گزشتہ دور کے ناقلین سے ہمیں اسی طرح پہنچی ہیں۔ ہم نے اسی طرح پیش کر دی ہیں جیسے ہمیں پہنچی تھیں۔'' [1]

ابن جَرِیر کے اس بیان سے دو باتیں پتا چلتی ہیں: ایک یہ کہ انہوں نے روایات کو من وعن نقل کیا ہے۔ دوسرے اس میں یہ بھی غور و فکر نہیں کیا کہ عقلی لحاظ سے کوئی واقعہ اس طرح ممکن بھی تھا یا نہیں۔ انہوں نے ایسے مشکوک واقعات کو نقل کرنے کے باوجود ان کی ذمہ داری گزشتہ راویوں پر ڈالی ہے اور خود کو محض ایک درمیانی واسطہ قرار دیا ہے جو ماضی والوں کے بیانات کو آگے نقل کر رہا ہے۔ صحیح یا غلط کا فیصلہ انہوں نے قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔

علامہ ابن اثیر جزری کا بیان

ابن اثیرؒ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف ''الکامل فی التاریخ'' میں طبری کی روایات کو سند اور مکرر روایات کو حذف کر کے جمع کر دیا ہے۔ ضعیف راویوں کا بہت سا قابل تنقید مواد اس میں بھی شامل ہو گیا ہے۔ ابن اثیر الجزری جہاں اپنی تصنیف کی تعریف اور خوبیاں بتاتے ہیں وہاں وہ اس میں مواد کی تحقیق یا اس کی صحت کی ذمہ داری لینے کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ صاف بتاتے ہیں کہ انہوں نے زیادہ تر مواد طبری سے لیا ہے اور اسے مرتب انداز میں نقل کر دیا ہے۔

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے طبری کی تاریخ سے آغاز کیا ہے، اس لیے کہ وہی ایسی کتاب ہے جس کا سب حوالہ دیتے ہیں اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پس میں نے اس کے تمام (سالوں کے) حالات کو لے لیا۔ کسی سال کے

[1] تاریخ الطبری: ۱/۸،۷

حال میں بھی کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ البتہ طبری نے ایک ہی واقعے میں کئی کئی روایات نقل کر دی ہیں جن میں سے ہر روایت گزشتہ روایت ہی کی طرح ہے، بس تھوڑی سی کمی ہے یا تھوڑی سی زیادتی ہے، تو میں نے ان میں سے سب سے تفصیلی روایت کو لے لیا اور اسی کو نقل کر دیا۔ پھر دوسری روایتوں میں سے بس وہ چیز لے کر اس میں شامل کر دی جو اس (مکمل) روایت میں نہیں تھی۔ میں نے ہر شے کو اسی کی جگہ پر لگا دیا۔ تو اس واقعے کی تمام جزئیات جو الگ الگ سندوں سے منقول تھیں ایک ہی لڑی میں آ گئی ہیں جیسا کہ تم دیکھ لو گے۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے دوسری مشہور تاریخوں سے وہ چیزیں لے کر شامل کر دیں جو تاریخ طبری میں نہیں تھیں اور ہر چیز کو اس کی جگہ رکھ دیا۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ابن اثیر نے زیادہ تر طبری کی روایات کو نقل کر دیا ہے۔ روایات کے تکرار اور اسناد کو حذف کر کے واقعات کو مربوط کر دیا ہے۔ تاہم وہ ان روایات کی صحت یا ضعف کی ذمہ داری نہیں اٹھا رہے۔ انہوں نے طبری کی روایات کی اسناد کو جانچنے اور کھرے اور کھوٹے کو الگ کرنے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اس کے ساتھ وہ خود بتا رہے ہیں کہ انہوں نے بہت سی روایات ایسی بھی درج کر دی ہیں جو طبری میں نہیں ہیں۔

چونکہ علامہ ابن اثیر نے ان دوسری کتب کے حوالے نہیں دیے اس لیے ان کی سند کا پتا لگانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اگر کسی متنازعہ مسئلے میں ان کی کوئی روایت سنداً ضعیف یا بے سند ثابت ہو جائے تو ظاہر ہے، وہ قابلِ ترک ہی ہوگی۔

حافظ ابن کثیر کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نہایت جلیل القدر عالم، محدث، مفسر، نقاد اور مؤرخ تھے۔ ان کے بارے میں بھی یہ خیال درست نہیں کہ جو روایت انہوں نے نقل کر دی وہ یقیناً صحیح السند ہوگی، اس لیے کہ خود حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ دعویٰ نہیں کرتے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے طرزِ تالیف کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کا ہدف یہ نہیں تھا کہ صرف صحیح روایات بیان کی جائیں۔ بلکہ انہوں نے بھی بنیادی طور پر ابن جَریر طبری کی روایات کو پیش کیا ہے۔ ان میں ایسی روایات بھی ہیں جو ضعیف یا قابلِ نقد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حدیث و تاریخ کے دیگر مجموعوں سے ملنے والی ان معتبر روایات کو بھی نقل کر دیا ہے جو ان واقعات کی الگ انداز میں منظر کشی کرتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس طرح بڑی دیانت داری کے ساتھ دو طرفہ دلائل جمع کر دیے ہیں تاکہ ناظرین انصاف کی نگاہ سے فیصلہ کر سکیں۔

اگرچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی کوشش یہی رہی کہ مشکوک اور من گھڑت روایات کی قلعی کھولی جائے مگر اس کے باوجود انہوں نے ہر جگہ یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ روایت معتبر ہے یا ضعیف۔ کئی مقامات پر انہوں نے ضعیف روایات کو کسی قسم کا تبصرہ کیے بغیر نقل کر دیا ہے۔ مثلاً واقعہ کربلا میں وہ کئی صفحات تک ابومخنف کی روایات نقل کرتے چلے گئے ہیں، کہیں اس کے ضعف کا ذکر نہیں کیا۔

---

[1] الکامل فی التاریخ، ابن اثیر الجزری: ۱/۶،۷



البتہ سانحۂ کربلا کے آخر میں وہ خود فرماتے ہیں:

"جو کچھ ہم نے نقل کیا ہے اس کا بعض حصہ مشکوک ہے۔ اگر ابن جَرِیر طبری جیسے حفاظ اور ائمہ نے اسے نقل نہ کیا ہوتا تو میں بھی اسے بیان نہ کرتا۔ اس کا زیادہ تر حصہ ابو مخنف سے منقول ہے جو شیعہ تھا، ائمہ کے نزدیک واقعات بیان کرنے میں ضعیف تھا۔ لیکن چونکہ وہ اخباری اور حالات کو محفوظ رکھنے والا ہے اور اس کے پاس بہت سی ایسی باتیں ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں ملتیں، اس لیے بعد میں آنے والے بہت سے مصنفین نے اس قصے میں اس کی روایات کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا ہے۔" ①

غرض کسی روایت کا ابن جَرِیر، ابن کثیر یا دیگر بزرگوں کی تواریخ میں ہونا اس کے صحیح السند اور حجت ہونے کا ثبوت نہیں کہ اس سے کوئی عقیدہ اخذ کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہو۔ ہاں یہ بزرگ خود فرمائیں کہ یہ روایت صحیح ہے اور ہمارے نزدیک اس سے یہ مسئلہ ثابت ہو رہا ہے تو بات الگ ہے۔ لیکن اگر انہوں نے روایت کو صرف نقل کر دیا ہے تو پھر کوئی مسئلہ زیرِ بحث آنے پر اسے سنداً و متناً جانچا جائے گا۔ تب جا کر اس کے قابلِ استدلال ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

ضعیف روایات کو قبول کرنے میں توسع کن شرائط کے تحت تھا؟

بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ "قدیم علماء کا مجروح، بدعتی اور مشکوک راویوں سے مواد لینا اور ضعیف روایات کو نقل کرنا، کسی شرط کا پابند نہیں تھا بلکہ یہ ان کی کم فہمی، کم نظری یا سوچی سمجھی اسلام دشمنی تھی جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کے راویوں سے ہر طرح کا مواد نقل کرتے چلے گئے۔" حالاں کہ ایسا قطعاً نہیں تھا۔ ان حضرات کے ہاں کچھ اصول طے کر لیے گئے تھے جن کے مطابق ایسی روایات کو بعض شرائط ملحوظ رکھتے ہوئے نقل کرنے، پڑھنے اور محتاط انداز میں ان سے استفادے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ ان شرائط کو علمائے اصول نے پوری وضاحت سے بیان کیا ہے۔

گمراہ فرقوں کے راویوں کے قابلِ قبول یا مردود ہونے کا پیمانہ:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بدعتی اور گمراہ فرقوں کے راویوں کی روایت قبول یا مسترد کرنے کی شرائط یوں بیان فرماتے ہیں:

"معتمد بات یہ ہے کہ ایسے شخص کی روایت کو مسترد کیا جائے گا جو شریعت کی کسی ایسی متواتر نقل ہونے والی بات کا انکار کرتا ہو جس کا دین ہونا قطعی طور پر معلوم ہو، یا جو اس کے برعکس کرتا ہو۔ (یعنی ایسی چیز کو ثابت سمجھتا ہو جو شریعت میں قطعی طور پر ممنوع ہے۔)" ②

مطلب یہ کہ ایسا راوی جو بدعتی ہو مگر اس کی گمراہی کفر کی حد میں داخل نہ ہو، تو اس کی روایت قبول کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس روایت میں ایسا مواد نہ ہو جو اس بدعتی راوی کے غلط نظریے کی تائید کرتا ہو۔

اگر کوئی راوی بدعت یا بدعقیدگی میں مبتلا ہے اور ساتھ ہی اس کی روایت میں اسلامی عقائد و نظریات کے خلاف

---

① البدایة والنهایة: ۱۱/۳۷۵، ۳۷۶ ② والمعتمد ان الذی ترد روایته من انکر امرا متواترا من الشرع معلوما من الدین بالضرورة وکذا من اعتقد عکسه. (نخبة الفکر، ص ۳)

کوئی بات ہے، تو یہ امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس نے ایسی باتیں خود وضع کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ ایسی صورت میں وہ روایت سخت مشکوک اور نا قابلِ قبول شمار ہوگی۔ ①

ضعیف روایات کو نقل کرنے یا ان پر عمل کرنے کا حکم؟

ضعیف روایت کے بارے میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

① اس کا نقل کرنا کیسا ہے؟ ② اس پر عمل کرنا کیسا ہے؟

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''تدریب الراوی'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ:

ضعیف روایت کو نقل کرنا جائز ہے بشرطیکہ ضعف اتنا نہ ہو کہ اس پر ''موضوع'' (جعلی) ہونے کا حکم لگ جائے۔

ضعیف روایات پر عمل بھی دو شرائط کے ساتھ جائز ہے:

❶ اس روایت میں اسلامی عقائد کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ (پس اگر ضعیف روایت میں اللہ کی صفات، عصمتِ انبیاء یا عدالتِ صحابہ وغیرہ کے خلاف کوئی بات ہو تو اسے ترک کر دیا جائے گا۔)

❷ اس میں اسلام کے طے شدہ احکام (حلال وحرام) کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ ②

محدثین کی اصطلاحات کو سمجھنے کی ضرورت:

کسی روایت کو ''صحیح'' یا ''حسن'' قرار دینا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح کسی روایت کو ''ضعیف'' یا ''موضوع'' یعنی اس کے جعلی اور من گھڑت ہونے کا حکم لگا دینا بھی معمولی بات نہیں بلکہ یہ فنِ روایت کے ماہرین کا کام ہے۔

بعض حضرات جرح وتعدیل کی کتب تو کھول کر بیٹھ جاتے ہیں مگر اصولِ روایت سے واقف نہیں ہوتے، اس لیے کسی روایت کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کی آراء مثلاً: ﴿لا یصح﴾ (صحیح نہیں) ﴿لا یثبت﴾ (ثابت نہیں) وغیرہ دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ روایت من گھڑت ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کسی راوی کے بارے میں ﴿ضعیف، واہٍ، غیر ثقة، شیعی، لیس بشیء﴾ جیسے الفاظِ جرح دیکھ اپنے طور پر یہ طے کر لیتے ہیں کہ اس کی تمام روایات سراسر من گھڑت ہی ہوں گی۔ کچھ لوگ یہاں تک کمال دکھاتے ہیں کہ کسی شخصیت کی روایات اور اس کی علمی خدمات کو بیک جنبشِ قلم ساقط کرنے کے لیے اس کے بارے میں دو چار افراد کی جرح کو تو زور وشور سے دہراتے ہیں مگر اس کے بارے میں بڑے بڑے ائمہ کی تعدیل کے درجنوں اقوال کو شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر جاتے ہیں۔ ③

① یقبل من لم یکن داعیة الی بدعته فی الاصح، الا ان روی ما یقوی بدعته فیرد علی المختار. (نخبة الفکر لابن حجر العسقلانی، ص ۳)

② تدریب الراوی، للامام جلال الدین سیوطی: ۱/۳۵۰، ط دار طیبة

③ ایک طبقہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں یہی روش اپنائے ہوئے ہے۔ کچھ مہربانوں نے حدیث کے مرکزی امام ابن شہاب زہری، تفسیر اور تاریخ کے مدوّن اوّل امام طبری، سیرت کے اولین مؤلف محمد بن اسحاق اور امام احمد بن حنبل کے استاذ امام عبدالرزاق صنعانی جیسے بلند پایہ محدثین کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا ہے۔ دراصل اصولِ حدیث ایک بہت وسیع اور گہرا علم ہے۔ چند اصطلاحات پڑھ کر خود کو اس فن کا ماہر سمجھنا اور اسلاف کی تحقیقات پر غیر علمی طریقے سے تنقید کرنا قطعاً غلط ہے۔

ایسے حضرات جب "تحقیق" کرنے بیٹھتے ہیں تو اصول سے ناواقفیت کی بناء پر عجیب عجیب کرشمات دکھاتے ہیں۔ کسی کو فقہ حنفی کے سینکڑوں مستدلات ضعیف بلکہ جعلی محسوس ہوتے ہیں۔ کسی کو تفاسیر کا بہت بڑا حصہ قصے کہانیاں لگتا ہے۔ کسی کے نزدیک کتبِ سیرت کی بیشتر روایات افسانے ٹھہرتی ہیں اور کوئی اسلامی تاریخ کے بنیادی ماخذ کو غرق کرنے کے قابل سمجھتا ہے۔ کاش یہ حضرات برصغیر کے عظیم فقیہ علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ کے اس بیان پر غور کریں:

"جب محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہمارے سامنے صحیح ہونے کی شرائط ظاہر نہیں ہوئیں۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ روایت فی الواقع جھوٹی ہے۔ کیوں کہ یہ ممکنات میں سے ہے کہ جھوٹا راوی سچ نقل کر رہا ہو اور بکثرت غلطیاں کرنے والا صحیح بات نقل کر رہا ہو۔ اکثر اہلِ علم کا قول یہی ہے۔" [1]

پھر فرماتے ہیں:

"محدثین بہت دفعہ کہتے ہیں: "لا یصح، ولا یثبت" جنہیں (اصولِ روایت کا) علم نہیں، وہ اس سے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ روایت من گھڑت یا ضعیف ہے۔ حالاں کہ یہ گمان محدثین کی اصطلاحات سے جہالت اور ان کے واضح بیانات سے لاعلمی کی پیداوار ہے۔ ملا علی قاری نے "تذکرۃ الموضوعات" میں لکھا ہے کہ "کسی بات کے ثابت نہ ہونے سے اس کا من گھڑت ہونا لازم نہیں ہو جاتا۔"

نیز دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں:

"روایت کے صحیح نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ من گھڑت ہو۔" [2]

دورِ صحابہ وتابعین کی تاریخ کے بارے میں قدیم مؤرخین کا طرزِ تالیف درست تھا یا غلط؟

ہم تاریخی روایات کو پیش کرنے کے قدیم طریقے کی مذمت کرنا اور اسلاف کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں سمجھتے۔ قدیم مؤرخین پر کوئی الزام لگانا اصولِ روایت کو نہ سمجھنے کا شاخسانہ ہے۔ اگر کوئی تاریخی تحقیق کی اہمیت سمجھنے کے دوران اسلاف سے بدظن ہو گیا ہو تو ہم اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہیں گے۔ البتہ اپنے دور میں عائد ہونے والی ذمہ داری کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس کا ہم دوسروں کو بھی احساس دلانا چاہتے ہیں۔

اسلاف اور ہمارے اکابر میں سے یہ دعویٰ کسی کو نہیں تھا کہ کتبِ تاریخ سے عقیدہ اخذ کیا جائے گا، نہ ہی وہ یہ فرماتے تھے کہ تاریخ کی ہر روایت ہر موقع پر قابلِ استدلال ہے، نہ ہی کوئی یہ کہتا تھا کہ تاریخ میں ضعیف اور موضوع روایات نہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان میں صحیح اور ضعیف اور بعض موضوع روایات ملی جلی ہیں مگر قدیم مؤرخین نے اپنی روایات کو محدثین کے انداز میں اپنے سلسلۂ اسناد کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے اہلِ علم صحیح، حسن اور ضعیف کا پتا لگا سکتے ہیں۔ اسی لیے کتبِ تاریخ کے بیشتر مواد کو اصحابِ جرح وتعدیل قابلِ اعتماد قرار دیتے آئے ہیں۔

[1] الرفع والتکمیل لابی الحسنات عبدالحئی لکھنوی، ص ۱۸۹
[2] الرفع والتکمیل، ص ۱۹۱

مانا کہ عقائد، احکام وسنن کی بحث میں ضعیف روایات قابلِ استدلال نہیں ہوتیں، اسی طرح اہل اصول نے اسلامی عقائد کی مخالفت، بدعات کی حمایت اور صحابہ پر طعن سے آلودہ ضعیف روایات کو بھی ساقط الاعتبار کہا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ضعیف مواد ہر جگہ ہر وقت قابلِ ترک ہو۔ بعض حضرات کا یہ خیال کہ ضعیف روایات کو یکسر ترک کر دینا چاہیے، بظاہر کتنا ہی احتیاط پسندانہ معلوم ہو مگر درحقیقت یہ ایک متشددانہ طرزِ عمل ہے؛ کیوں کہ اس طرح حدیث، سیرت اور تاریخ کا خاصا حصہ متروک ہو جائے گا، اعمال کے فضائل، صحابہ کرام کی فتوحات، ان کے فضائل و مناقب اور اسلامی تہذیب وتمدن کے بہت بڑے ذخیرے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ جس طرح حدیث میں فضائل و مناقب سے متعلقہ روایات کو ضعف کے باوجود قبول کیا جاتا ہے، اسی طرح تاریخ میں بھی جزئیات کے لیے ضعیف روایات مقبول ہوتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر، حافظ ذہبی، حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہم اللہ جیسے محتاط اور نقاد حضرات کو بھی ان سے استفادہ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔ راہِ اعتدال یہی ہے کہ ضعیف روایات سے اصول کے تحت فائدہ اٹھایا جائے۔

کیا ایک روایت کو متعدد مصنفین کا نقل کر دینا اس کے معتبر ہونے کی دلیل ہے؟

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ضعیف روایات کو ہر جگہ یقینی درجہ دے دیا جائے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک آدھ جگہ منقول ضعیف روایت چاہے، مشکوک سہی لیکن اگر کوئی تاریخی روایت کئی کتابوں میں منقول ہو یا بہت مشہور ہو، تو اسے معتبر اور قطعی درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ بھی ایک سطحی سوچ ہے۔ تاریخی روایت کے معتبر ہونے کا دارومدار اس بات پر نہیں وہ درجن بھر کتب میں منقول ہو۔ کسی اخباری خبر یا تھانے میں درج کرائی جانے والی رپورٹ کی طرح، کسی تاریخی روایت کے معتبر یا مشکوک ہونے کا دارومدار بھی اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے چشم دید گواہ کون تھے؟ کتنے تھے؟ اور ان سے نقل کرنے والے کیسے لوگ تھے؟ پھر ان ناقلین سے مصنفینِ کتب تک کے واسطے مضبوط تھے یا ان میں کوئی واسطہ کمزور بھی تھا؟

یہ بات بخوبی ذہن نشین ہونی چاہیے کہ کسی بھی خبر کو نقل کرنے والوں کا سلسلہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ہوتا ہے۔ زنجیر کی ہر کڑی کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک کڑی بھی کمزور ہو تو پوری زنجیر بے کار ہو جائے گی۔ اسی طرح شروع، آخر یا درمیان میں کسی راوی کے کمزور ہونے سے پوری خبر کی حیثیت کمزور ہو جاتی ہے۔

اگر ایک واقعہ شروع میں ایک ضعیف گواہ نے بیان کیا ہو، پھر اس سے تین افراد نے نقل کر کے اپنی کتب میں لکھ دیا ہو، بعد میں سینکڑوں عالم فاضل لوگوں نے اسے نقل کر دیا تو اس طرح ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے جانے سے اصل واقعے کے ثبوت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر شروع کے راوی ضعیف ہیں تو واقعہ ضعیف ہی ثابت ہوگا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے قتل کی واردات ہوتے دیکھی اور کہا کہ یہ فلاں وزیر صاحب کی کارستانی ہے۔ اس بات کو دس افراد نے سنا۔ ان دس افراد سے سن کر پچاس مبصرین نے اس موضوع پر مذمتی تقریریں کر ڈالیں۔ تو اس سے وزیر صاحب کا مجرم ہونا یقینی نہیں ہوگیا۔ ایک عام آدمی کے نزدیک چاہے یہ بات یقینی ہو مگر علمی

میزان میں یہ چیز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔ اگر کسی عدالت میں یہ قضیہ پیش کیا گیا تو وزیر صاحب کے خلاف ان دس افراد اور پچاس مصریین سے گواہی نہیں دلائی جاسکتی۔ گواہی کے لیے صرف وہ پہلا چشم دید گواہ طلب کیا جائے گا۔ اگر وہ معتبر ہے اور اپنے بیان کا کوئی ثبوت پیش کرسکتا ہے تو وزیر صاحب کو مجرم مانا جائے گا ورنہ نہیں۔

جعلی روایات میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ناقابلِ اعتماد راوی سے منقول ہوتا ہے، وہ راوی اسے خود گھڑتا ہے یا اصل بات کو مبالغے کے ساتھ سناتا ہے۔ اس طرح وہ آگے کئی ناقلین پیدا کرلیتا ہے۔ ان ناقلین سے بہت سے مؤرخین روایت لے لیتے ہیں کیوں کہ اس واقعے میں جو تفصیلات ہوتی ہیں وہ انہیں کہیں اور دستیاب نہیں ہوتیں۔ آہستہ آہستہ اس بات کو تاریخی حقیقت کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی بنیاد بہت کمزور ہوتی ہے۔

☆☆☆

اگر ایک ضعیف راوی کئی ثقہ راویوں سے واقعہ نقل کرے تو کیا وہ معتبر ہوگا؟

ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی راوی خود ضعیف ہے مگر اس کے استاذ ثقہ ہیں جن سے وہ یہ روایت نقل کررہا ہے تو کیا ایسی روایت مضبوط شمار ہوگی؟

اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے۔ ایسی سند کمزور شمار ہوگی۔ جیسا کہ درمیان میں کمزور کڑی رکھنے والی زنجیر کمزور شمار ہوتی ہے۔ اس کو مثال کے ساتھ یوں سمجھئے کہ کہیں قتل کا کوئی واقعہ پیش آجائے۔ اس کے چند برسوں بعد کوئی شخص عدالت میں گواہی دے کہ مجھے فلاں فلاں بزرگوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے اس قتل کو بچشم خود دیکھا تھا اور قاتل فلاں فلاں تھے۔ تو اس گواہی کو ان بزرگوں کی گواہی کے مترادف نہیں سمجھا جائے گا، کیوں کہ عین ممکن ہے یہ شخص ان کی طرف جھوٹ منسوب کررہا ہو۔ ہاں اگر وہ بزرگ خود آکر گواہی دے سکیں تو اسے مضبوط گواہی مانا جائے گا۔ اگر وہ فوت ہوچکے ہوں تو اس شخص کی بات کو ان بزرگوں کا بیان نہیں مانا جائے گا۔ پس ضعیف راوی اگر ثقہ راویوں کا نام لے کر کوئی روایت سناتا ہے تو وہ مشکوک ہی شمار ہوگی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ جعل ساز راوی بسااوقات کسی واقعے کو گھڑ کے اس کی سند بھی اپنی طرف سے بنالیتے ہیں۔ بعض اوقات ایک جعلی واقعے کی کئی کئی سندیں بنالیتے ہیں جن میں بڑے بڑے ثقہ راویوں کے نام ہوتے ہیں، اس طرح وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مجھ سے فلاں، فلاں اور فلاں بزرگ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

محدثین نے ایسی روایات کی پہچان کا طریقہ بھی بتادیا ہے، وہ یہ کہ بغور دیکھا جائے کہ اس واقعے کو ان بزرگوں سے اس ضعیف راوی کے علاوہ ان کے دوسرے شاگردوں نے بھی نقل کیا ہے یا نہیں۔ اور اگر نقل کیا ہے تو انہی الفاظ کے ساتھ یا مختلف الفاظ کے ساتھ اور الفاظ کا یہ فرق معمولی ہے یا غیر معمولی۔ اگر اس واقعے کو ان بزرگوں سے دیگر ثقہ شاگرد بھی نقل کررہے ہوں اور اسی انداز میں، تو اس ضعیف راوی کے بیان کو بھی مان لیا جائے گا۔ لیکن اگر سند میں نام تو بڑے بڑے بزرگوں کا ہو، مگر ان بزرگوں سے پوری دنیا میں صرف یہی ایک ضعیف راوی اس بات کو نقل کررہا ہو تو پھر

اس بات کو مشکوک سمجھا جائے گا۔اس سے کسی استدلال کی گنجائش نہیں ہوگی۔
اگر غور کیا جائے تو ابو مخنف اور نصر بن مزاحم جیسے کذاب قسم کے راویوں کی اسناد میں آپ کو یہ کمزوری جگہ جگہ نظر آجائے گی۔اسی لیے محدثین ان سے روایت نہیں لیتے تھے۔

حافظ ابن کثیر اور علامہ ابن خلدون نے تمام مشکوک روایات پر تبصرہ کیوں نہیں کیا؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ جیسے محققین نے تاریخی روایات کا کئی جگہ ناقدانہ محاکمہ کیا ہے اور روایت و درایت کے اصول استعمال کر کے بہت سے ایسے کمزور مواد پر جرح کی ہے جسے لوگ حتمی حقائق تصور کرنے لگے تھے۔مگر اس کے باوجود ان حضرات نے کئی مقامات پر مشکوک اور کمزور مواد کو نظر انداز بھی کیا ہے۔تو کیا یہ حضرات اس مواد کی کمزوری سے واقف نہ تھے؟
اصل بات یہ ہے کہ ہر دور کے کچھ اہم مسائل ہوتے ہیں جن پر اس زمانے کے معاشرے میں بحث ہو رہی ہوتی ہے اور ان مسائل کی بابت غلط فہمیاں بہت عام ہوتی ہیں۔اس لیے قدرتی طور پر ایک محقق انہی عام غلط فہمیوں کے ازالے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ہمارا طرز عمل بھی یہی ہوتا ہے۔ہم اپنے سامنے روزانہ کتنی ہی غلطیاں ہوتی دیکھتے ہیں مگر ہم اپنے مضامین، گفتگو، خطبات اور تقاریر و بیانات میں انہی معاملات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں زیادہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ جیسے حضرات نے اپنے دور میں تاریخ کی جن غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، اس دور میں وہی زیادہ اہم تھیں۔دور حاضر کے معاملات الگ ہیں۔آج صحابہ سے منسوب تاریخ کی ہر گری پڑی روایت لے کر اس سے طرح طرح کے استدلالات کیے جا رہے ہیں۔اس لیے ان روایات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرنا کہ آیا یہ واقعی قابل استدلال ہیں یا نہیں، بہت ضروری ہو گیا ہے۔

تاریخی روایات پر دین کا مدار نہیں تو ان میں صحیح وضعیف کی تحقیق کی کیا ضرورت؟

کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب تاریخی روایات کا ہمارے دین و ایمان اور عقائد و احکام سے کوئی تعلق نہیں تو ہم ان میں تحقیق و تفتیش کیوں کریں؟ اس کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟
اس بارے میں عرض ہے کہ آج کل تاریخ کے طالب علم کے لیے بہر حال یہ ضروری ہے۔آج کل جو شخص تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، یہ اس کے لیے احکام کا نہیں، ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔کیوں کہ اگر وہ صحیح اور ضعیف روایات میں فرق ملحوظ نہ رکھ سکے تو صحابہ کرام کے بارے میں اس کا ذہن شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ وہ ان عظیم المرتبت شخصیات سے بد اعتماد ہو جائے۔چونکہ صحابہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے درمیان وہ پہلی کڑی ہیں جس کے ذریعے امت تک دین پہنچا ہے۔اس لیے ان سے بداعتمادی اور ان پر نکتہ چینی کا نتیجہ پورے دین سے بدگمانی اور اسلام سے برگشتہ ہونے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔لہٰذا تاریخ کا وہ حصہ جو صحابہ کرام کے حالات کا احاطہ کرتا ہے (جو تقریباً سن ۱۰۰ ہجری تک کا ہے) اسی حزم و احتیاط اور جانچ پڑتال کے ساتھ پڑھنا چاہیے جیسے احادیث۔



محدثین کی اپنی اصطلاح میں بھی صحابہ کرام کے اقوال وافعال کو "حدیث" یا "اثر" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کے قول وفعل اور تائیدات کو شرعی دلیل مانا جاتا ہے۔ اسی لیے اُن کے معیار کو بار بار جانچا اور پرکھا جاتا رہا ہے۔

تو پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ صحابہ کرام سے متعلق ان روایات کو بھی پورے حزم واحتیاط سے دیکھا بھالا جائے جن کا تعلق صحابہ کے کردار، شخصیت اور ان کی امانت ودیانت سے جا نکلتا ہے۔ اگر ایک صحابی کی طرف منسوب قول، احکام کے باب میں اس لیے قبول نہیں کیا جاتا کہ بیچ میں کوئی راوی مشکوک نکلتا ہے، تو ایسی روایت کو بھی بلا تاویل من وعن قبول نہیں کیا جاسکتا جو خود صحابی کی عدالت اور دین داری کو متاثر کر رہی ہے اور اس کا راوی ضعیف یا مشکوک ہو۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے فرمایا ہے:

"تاریخی روایات میں ان راویوں کے قابلِ اعتماد ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے بیان کیے ہوئے وہ واقعات بھی بے چوں وچرا تسلیم کر لیے جائیں جن کی زد عقائد یا احکام پر پڑتی ہے۔ کسی بات کے محض "تاریخی" ہونے کا فیصلہ صرف اس بات سے نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی تاریخ کی کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ بلکہ اگر تاریخی کتابوں میں عقائد واحکام سے متعلق کوئی چیز آئے گی تو اسے جانچنے کے لیے لازماً وہی اصول استعمال کرنا پڑیں گے، جو عقائد واحکام کے استنباط کے لیے مقرر ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض راویوں کے بارے میں علماء نے جو یہ کہا ہے کہ "ان کی روایتیں احکام کے معاملے میں مردود اور سیر وتواریخ میں مقبول ہیں" اس سے مراد سیر وتواریخ کے وہ واقعات ہیں، جن سے عقائد واحکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کون سا غزوہ کون سے سن میں ہوا؟ اس میں کتنے افراد شریک تھے؟ اس کی قیادت کس نے کی؟ اس میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی؟ ظاہر ہے کہ یہ اور اس جیسے دوسرے واقعات ایسے ہیں کہ ان سے عقائد واحکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان معاملات میں ضعیف راویوں کی روایات کو بھی گوارا کر لیا گیا ہے۔ لیکن مشاجرات صحابہ اور صحابہ کی عدالت کے وہ مسائل جو خالص عقائد سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی بنیاد پر اسلام میں کئی فرقے پیدا ہو گئے ہیں، ان میں ان راویوں کی روایات ہرگز قبول نہیں کی جاسکتیں، مذکورہ بالا مسائل کا فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع کے مضبوط دلائل ہی سے ہوسکتا ہے۔"①

نیز فرماتے ہیں:

"اہلِ سنت کی لکھی ہوئی عقائد وکلام کی تمام کتب پڑھ جایئے، وہ اوّل سے آخر تک اس معاملے میں یک زبان نظر آئیں گی کہ صحابہ کرام سے کسی گناہ کا صدور خالصۃً عقائد کا مسئلہ ہے اور اس کا اثبات ضعیف، مجروح، منقطع یا بلاسند تاریخی روایتوں سے نہیں ہوسکتا۔ خاص طور سے مشاجرات صحابہ کے معاملے میں اس اصول کی بڑی شدت کے ساتھ پابندی کی ضرورت ہے۔"②

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، مفتی محمد تقی عثمانی، ص ۱۳۵ ② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۹

مشاجرات کی روایات، مقامِ صحابہ اور تحقیقی منہج

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے گیارہویں سال (۳۴ھ) سے عالمِ اسلام، دورِ فتن میں داخل ہوا جو کم از کم چھ سات سال باقی رہا۔ اس کے ابتدائی دو سالوں میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیانہ تحریک منظرِ عام پر آئی جس کے سرغنوں نے آخرکار مدینہ منورہ میں دامادِ رسول کے خون سے ہاتھ رنگے۔ اس کے بعد خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت طلحہ، حضرت زبیر، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے بعض سیاسی واجتہادی اختلافات رونما ہوئے جو بعض غلط فہمیوں، بعض لغزشوں اور بعض عناصر کی شرپسندی کے باعث جنگوں پر منتج ہوئے۔

یہ جنگیں تو بلاشبہ ہوئی تھیں مگر بعض غیر منصف مزاج راویوں نے ان واقعات کو غلط رنگ دے کر بھی پیش کیا جیسا کہ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے فرمایا ہے:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سبائی پروپیگنڈہ کے اثر سے صحابہ کرام پر بے بنیاد تہمت طرازیوں کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس پروپیگنڈے کے اثرات سے مشاجرات کے زمانے کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہ سکی۔''①

سبائی پروپیگنڈہ دراصل دو دھاری تلوار تھا۔ اس نے ایک طرف جہاں حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے متعدد کبار صحابہ کے خلاف روایت سازی کی، وہیں اس نے مبالغہ آمیز اور جھوٹی روایات کے ذریعے یہ ذہنیت بھی عام کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے والے اکثر قاتلینِ عثمان یعنی ہمارے سبائی طبقے کے لوگ تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساری طاقت اور قوت سبائیوں ہی کے دم سے تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریبی رفقاء اور عہدے داروں میں قاتلینِ عثمان شامل تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ انہی سبائیوں کے کہنے پر چلتے تھے، پس یہی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اصل گروہ اور یہی حقیقی مؤمن تھے۔

سبائیوں نے یہ روایات اوّلاً اس لیے گھڑی تھیں تاکہ اپنے گروہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ اور اپنے طبقے کو اہلِ حق کا طبقہ باور کرا سکیں۔ ثانیاً ان کا بڑا مقصد صحابہ کی اکثریت پر طعن کرنا تھا تاکہ لوگ سمجھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ برحق ہونے کے باوجود ان سے صحابہ کی اکثریت نے نہیں بلکہ اقلیت نے بیعت کی تھی۔ اس طرح کی روایت سازی کے ذریعے سبائی عناصر صحابہ کی اکثریت پر دنیا طلبی اور حق سے کنارہ کشی کا الزام لگانا چاہتے تھے۔②

---

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۹ ② ناصبیت تحقیق کے بھیس میں، مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ، ص ۲۳۹



اس سبائی پروپیگنڈے کا ایک نہایت خطرناک اثر یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے جو حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت مُعاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے صحابہ کا دفاع کرنا چاہتے تھے، واقعی یہ سمجھ لیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے والے اکثر سبائی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اقتدار انہی کے دم سے قائم تھا، پس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان لوگوں نے یہی نظریہ قائم کر لیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت مشکوک تھی۔ ان میں سے بعض یہاں تک کہنے لگے کہ علی رضی اللہ عنہ ایک دنیا پرست حکمران تھے، وہ اس قابل ہی نہیں تھے کہ خلافت کی ذمہ داریاں انجام دے سکتے، ان کے دور میں جتنا قتل وقتال ہوا، اس کی ساری ذمہ داری انہی پر ہے۔ ①

یوں صحابہ کے دفاع کی کوشش میں یہ لوگ غلط رُخ پر گامزن ہو گئے۔ سبائیوں کے اپنے لوگ براہِ راست سبائیت گزیدہ تھے، جبکہ یہ لوگ بالواسطہ سبائیت گزیدہ بن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور پھر درجہ بدرجہ ان کے رفقاء صحابہ پر نہ صرف تنقید کرنے لگے بلکہ ان کے خلاف تاریخی روایات میں بھی قطع وبرید، اضافے اور مبالغہ آرائی کرنے لگے۔ یوں تاریخی روایات کا ایک بہت بڑا حصہ ایک پُر پیچ جنگل بن گیا جس میں داخل ہو کر کسی بھی شخص کے لیے صحیح نتائج تک پہنچنا نہایت دشوار گیا۔

دورِ صحابہ کی اس تاریخ کے بارے میں صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے انسان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں جن کے جوابات نہ ملیں تو بعض اوقات نہ صرف صحابہ کرام بلکہ دین اسلام پر اعتماد متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اس لیے دورِ فتن سے متعلق روایات کی تحقیق بہت ضروری ہے جس کا پہلا قدم یہ ہے کہ تاریخ کے صحیح اور غلط مواد کو الگ کرنے اور متضاد روایات میں سے کسی کو ترجیح دینے کے اصول اچھی طرح سمجھ لیے جائیں۔

صحابہ کرام محفوظ ہیں:

اسلامی عقیدے کے مطابق صحابہ کرام معصوم نہیں، مگر محفوظ ضرور ہیں۔ ''محفوظ'' کا مطلب یہ نہیں کہ کسی صحابی سے کسی معصیت کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو عصمت ہے جو انبیائے کرام کا خاصہ ہے۔ محفوظ کا مطلب یہ ہے کہ:

❶ اگر صحابہ سے خطائیں ہوئی ہیں تو بھی وہ آخرت میں مواخذے سے محفوظ ہیں کیوں کہ وہ بہت جلد توبہ و استغفار کرنے والے تھے۔

❷ دنیا میں وہ طعن وتشنیع سے محفوظ ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی صحابی کو غلطی یا معصیت پر بُرا بھلا کہے یا بُرا سمجھے۔

اگر صحیح سند سے کسی صحابی کی کوئی لغزش ثابت ہو تو علمائے اسلام اس روایت کی تردید نہیں کرتے۔ بعض صحابہ کا شربِ خمر یا سرقہ یا کسی اور کبیرہ گناہ میں مبتلا ہونا صحیح احادیث میں ہے۔ بعض صحابہ کا حکمران کے خلاف ''خروج'' روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ انہیں جھٹلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ایسی روایات کے متعلق چند باتیں یاد رکھی جائیں:

---

① النواصب الذین یقولون انه کان ظالما طالبا للدنیا و انه طلب الخلافة لنفسه، وقاتل علیها بالسیف وقتل علیٰ ذالک الوفا من المسلمین حتیٰ عجز عن انفراده بالامر وتفرق علیه اصحابه وظهروا علیه فقتلوه''(منهاج السنة: ۲/۵۹)

"ولقد صنف لهم(ای للنواصب) فی ذلک مصنفات مثل کتاب المروانیة الذی صنفه الجاحظ، وطائفة وضعوا لمعاویة فضائل و رووا احادیث عن النبی ﷺ فی ذلک، کلها کذب و لهم فی ذلک حجج طویلة."(منهاج السنة: ۴/۴۰۰)

① خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ، امہات المؤمنین، سادات اور صفِ اوّل کے صحابہ کے بارے میں ایسی کوئی صحیح السند روایت کہیں مذکور نہیں۔

② اگر ایسی روایت مل بھی جائے تو اس میں عام طور پر تاویل کی پوری گنجائش ہوتی ہے۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ روایت کا مطلب وہ نہیں جو ظاہری الفاظ سے سمجھ آ رہا ہے۔

③ بعض واقعات میں جو چیز واقعہ پڑھنے والے کو غلط محسوس ہوتی ہے، وہ صحابی کا اجتہاد ہوتا ہے، یعنی انہوں نے اپنے علم کے لحاظ سے صحیح اقدام کیا تھا، اگرچہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک وہ غلط ہو۔

④ بعض جگہ کوئی سیاسی یا انتظامی فیصلہ تھا۔ اگر وہ نتائج کے لحاظ سے مفید ثابت نہ ہوا تو اسے زیادہ سے زیادہ تدبیر یا انتظام کی غلطی کہا جا سکتا ہے۔ اس سے کسی گناہ کا ارتکاب لازم نہیں آتا۔

⑤ بعض صحابہ کے بارے میں بعض لغزشوں یا بعض معاصی کی کچھ صحیح روایات ملتی ہیں، جن کی تعداد بہت کم ہے۔

⑥ یہ بھی طے ہے کہ اللہ نے ان حضرات سے صادر ہونے والی غلطیاں معاف فرما دی ہیں۔ ان نفوس قدسیہ کی تربیت ہی کچھ ایسے سانچے میں ہوئی تھی کہ ان سے بعید نہیں کہ کسی غلطی کا ارتکاب ہوا ہو اور انہوں نے اس پر توبہ نہ کی ہو۔

⑦ ان غلطیوں کے صدور میں اللہ کی تکوینی حکمتیں بھی کارفرما تھیں۔ ایک بڑی حکمت یہ تھی کہ مقامِ عصمت اور مقامِ حفاظت میں فرق ہو جائے۔ ایک حکمت شرعی احکام کی تعلیم اور ان کا عملی نفاذ تھا۔ شرعی سزاؤں سے متعلق کسی حکم کا عملی نمونہ تب ہی سامنے آ سکتا تھا جب کسی امتی سے سزا کے قابل کوئی کام ہوا ہوتا۔ اللہ کی حکمتِ بالغہ نے صحابہ کے حالات میں ایسے نمونے بھی پیدا کر دیے تاکہ سزاؤں کا نفاذ ہو اور شریعت کی ہر لحاظ سے تکمیل ہو جائے۔

⑧ یہ حضرات ایسی غلطیوں سے پہلے بھی برگزیدہ تھے، ان کے ارتکاب کے بعد بھی ویسے ہی عظیم المرتبت اور پاکیزہ رہے۔ توبہ و استغفار اور شرعی سزا کے ذریعے نہ صرف انہیں معافی مل گئی بلکہ ان کے درجات پہلے سے بھی بلند ہو گئے۔

یہ ساری گفتگو صحیح روایات سے ثابت شدہ لغزشوں کے بارے میں ہے۔ ان سے بھی ان حضراتِ صحابہ کی عظمت اور شان میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے یہ حضرات بہرحال نہایت سچے، ایثار پیشہ، مخلص، پاکباز اور اللہ و رسول ﷺ کے مقرب تھے جیسا کہ قرآن مجید جگہ جگہ اس کا اعلان کرتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآنی تصویر:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کردار کے متعلق اسلامی عقیدے کا مدار آیاتِ قرآنیہ اور صحیح احادیث پر ہے جن کی صداقت شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ صحابہ کرام کے ایمان، اخلاص، اخلاق اور کردار کے بارے میں قرآن مجید کا بیان یہ ہے:

۱ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ.①

''وہ لوگ جو آپ (ﷺ) کے ساتھ ہیں، کفار کے مقابلے میں سخت گیر اور آپس میں بڑے مہربان ہیں۔''

① سورۃ الفتح، آیت: ۲۹

ا أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ. [1] ''وہ سب کے سب ہدایت یافتہ ہیں۔''

ا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ. [2]

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پرہیزگاری کے لیے جانچ لیا ہے۔''

ا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا. [3]

''یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں مومن ہیں۔''

ا يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ [4] ''اللہ کو ان سے اور انہیں اللہ سے محبت ہے۔''

ا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا [5] ''وہ اللہ کا فضل اور رضامندی تلاش کرتے ہیں۔''

یعنی ان کی تگ و دو اور ساری سرگرمیوں کا اصل مقصد اللہ کی رضا پانا ہے۔

ان صفات کے حامل صحابہ کرام سے اگر کبھی بشری تقاضے کے تحت کوئی معصیت یا غلطی و کوتاہی ہو بھی گئی، تو وہ بہت جلد توبہ واستغفار کرنے والے تھے۔ [6] اللہ توبہ واستغفار، حسناتِ عظیمہ اور دین کے لیے قربانیوں کے باعث ان کے گناہوں اور لغزشوں کی معافی کا اعلان فرما چکا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

ا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ [7] ''میں ضرور ان کے گناہوں کو ان سے دور کردوں گا۔''

ا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ [8]

''بلاشبہ اللہ نے ان کو معاف کردیا۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا بردبار ہے۔''

ا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ [9] ''اللہ ان سب سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔''

ان نصوص کی روشنی میں صحابہ کرام کا کردار نہایت شاندار، اُجلا اور قابلِ رشک دکھائی دیتا ہے۔ اگر بعض احادیث یا بعض تاریخی روایات اس کے خلاف محسوس ہوتی ہوں تو اکثر مواقع پر ان کا مناسب محمل موجود ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ ایسی روایات بشری تقاضے کے تحت صادر ہونے والی لغزشوں یا اجتہادی فیصلوں نیز تکوینی حکمتوں پر محمول ہیں۔

---

[1] سورۃ الحجرات، آیت: ۷

[2] سورۃ الحجرات، آیت: ۳

[3] سورۃ المائدۃ، آیت: ۵۴

[4] سورۃ المائدۃ، آیت: ۵۴

[5] سورۃ الفتح، آیت: ۲۹

[6] جیسا کہ اہلِ ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾
''اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب وہ کر بیٹھتے ہیں کوئی بے حیائی کی بات، یا ظلم کر بیٹھتے ہیں اپنی جانوں پر، تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور وہ بخشش مانگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہے سوائے اللہ کے اور وہ نہیں اڑتے اس پر جو کچھ کہ انہوں نے کیا ہے جبکہ وہ جان لیتے ہیں۔'' (سورۂ آل عمران، آیت: ۱۳۵)

[7] سورۃ آل عمران، آیت: ۱۹۵

[8] سورۃ آل عمران، آیت: ۱۵۵ [9] سورۃ البینۃ، آیت: ۸

عصمتِ انبیاء اور عدالتِ صحابہ میں فرق:

جمہور مسلمین انبیائے کرام کی عصمت اور صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں۔ انبیائے کرام معصوم ہیں اور صحابہ عادل۔

عصمتِ انبیاء کی وضاحت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ یوں فرماتے ہیں:

"تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں۔"

آگے فرماتے ہیں:

"البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ کی طرف سے ان پر عتاب بھی ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔ ایسے واقعات کا حاصل باتفاقِ امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاء و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا۔ غلطی اجتہادی ہوتی ہے یا خطاء و نسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاحِ شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا اور یہ سہو و نسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال و اعمال میں ایسا سہو و نسیان ہو سکتا ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔" ①

کیا صحابہ کرام کو عصمت حاصل ہے؟

جمہور مسلمین صحابہ کرام کو عادل مانتے ہیں، معصوم نہیں۔ امام ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں:

"جو کوئی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے عصمت کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا ہے۔" ②

---

① معارف القرآن، مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ: ۱/۱۹۵

یاد رہے کہ ایک طبقے کی رائے میں عصمتِ انبیاء کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبوت سے پہلے اور بعد تمام کبیرہ گناہوں سے محفوظ ہیں، اسی طرح قصداً وہ صغیرہ گناہوں کے مرتکب بھی نہیں ہوتے البتہ بلا قصد ان سے صغیرہ گناہوں کا صدور ہو سکتا ہے مگر وہ اس پر برقرار نہیں رہ سکتے بلکہ اللہ کی طرف سے فوراً انہیں متنبہ کر کے توبہ کی توفیق دے دی جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: والجمهور يقولون بجواز الصغائر عليهم يقولون: إنهم معصومون من الإقرار عليها وحينئذ فما وصفوهم إلا بما فيه كمالهم فإن الأعمال بالخواتيم. ثم قال: وما ذهب إليه الجمهور هو ما دلت عليه الأدلة من الكتاب والسنة من ذلك قوله تعالى: وعصىٰ آدم ربه فغوى. (سورۂ طٰہٰ/آیت: ۱۲۱)

مگر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مذکورہ عبارت میں جن محققین کی رائے نقل کی ہے ان کے نزدیک انبیائے کرام کی طرف جن گناہوں کی نسبت کی گئی ہے، وہ دراصل صغیرہ گناہ بھی نہیں تھے بلکہ وہ خطائے اجتہادی یا رائے و تدبیر کی غلطی یا اتفاقی لغزش تھی جسے بھول چوک کہا جا سکتا ہے۔

"الفقہ الاکبر" میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی عبارت بھی اسی رائے کو ثابت کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: والأنبياء عليهم الصلوة والسلام كلهم منزهون عن الصغائر والكبائر والكفر والقبائح وقد كانت منهم زلات وخطايا. (الفقه الأكبر، ص ۳۷)

② "وكل من ادعى العصمة لأحد بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو كاذب." (العواصم من القواصم، ص ۴۷)

البتہ عصمتِ صحابہ کو اگر اس معنیٰ میں لیا جائے کہ صحابہ کسی غلط بات پر جمع نہیں ہو سکتے تھے تو یہ مفہوم بالکل درست ہے۔ تمام علماء کے نزدیک اُمتِ محمدیہ باطل پر متفق ہو جانے سے معصوم ہے۔ یعنی اس کے دینی اکابر کسی گمراہی پر اجماع نہیں کر سکتے۔ پس صحابہ کرام کا کسی غلط بات پر اتفاق کرنا بدرجۂ اولیٰ ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے جمہور علمائے اُمت کے نزدیک اجماعِ امت حجتِ شرعیہ قطعیہ ہے۔ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل خود فرامینِ رسول ہیں۔ ①

مذکورہ مفہوم سے ہٹ کر جمہور علماء صحابہ کی عصمت کے قائل نہیں۔ یہ صحابہ کرام کی تعظیم میں تفریط ہے، جس سے جمہور علماء نے منع کیا ہے۔ ② صحابہ کرام کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کسی صحابی سے کبھی کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، درحقیقت انہیں مقامِ عصمت پر فائز کرنا ہے۔ حالاں کہ عصمت صرف انبیائے کرام کی خصوصیت ہے۔ ③

بعض لوگ عقیدت میں مبالغے کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ کسی صحابی سے کبھی کوئی اجتہادی خطا بلکہ انتظامی غلطی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اگر وہ کسی صحیح روایت میں بھی کسی صحابی کا کسی بھول چوک، بشری تقاضے یا اضطراری کیفیت سے دوچار ہونا پڑھ لیں تو بلا تکلف اس روایت کا انکار کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ غم و غصے، خوف، سہو اور بھول چوک جیسی بشری کیفیات اور اضطراری حالتوں سے انبیائے کرام بھی دوچار ہوتے رہے۔ بعض غیر منصوص امور میں انبیائے کرام سے خطائے اجتہادی بھی سرزد ہوئی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وحی کے ذریعے انہیں متنبہ کر کے اس امر کی اصلاح کر دی گئی۔ پس ضروری ہے کہ عدالتِ صحابہ کا وہی مفہوم ذہن میں رکھا جائے جو جمہور علمائے اسلام کے ہاں طے ہے۔

عدالتِ صحابہ کا مطلب:

فقہاء و محدثین کی اصطلاح میں ''عدالت'' ایک ایسی صفت ہے جس کا حدیث کے راوی میں ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ پیغمبر ﷺ کی تعلیمات کا آگے نقل کرنا ایک اہم ذمہ داری ہے، جس طرح قاضی کے سامنے کسی مقدمے میں گواہی دینے والے کا عادل ہونا ضروری ہے، اسی طرح حدیث کو محفوظ اور قابلِ اعتماد بنانے کے لیے یہ شرط عائد کی

---

① ان اللہ لایجمع امتی علی الضلالۃ ویداللہ مع الجماعۃ، ومن شذ شذ فی النار...... وقال الترمذی: وتفسیر الجماعۃ عند اھل العلم ھم اھل الفقہ والعلم والحدیث. (بے شک اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کی تائید جماعت کے ساتھ ہے اور جو الگ ہوا الگ ہو کر آگ میں جا گرے گا۔ امام ترمذی کہتے ہیں: اہلِ علم کے نزدیک جماعت سے مراد فقہاء، علماء اور محدثین کی جماعت ہے۔ (سنن الترمذی، باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ بسند صحیح)
واخرجھا الحاکم بسند آخر عن ابن عباس فیہ "وید اللہ علی الجماعۃ." (المستدرک، ح: ۳۹۸، ورواہ البغوی فی شرح السنۃ، ۱/۲۱۵)

② ونحب اصحاب رسول اللہ ﷺ ولا نفرط فی حب احد منھم ولا نتبرأ من احد منھم. (العقیدۃ الطحاویۃ، ص ۸۱)

③ امام ابوبکر باقلانی اس مسئلے پر دلائل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ویدل علی ھذا اعتراف الخلفاء الراشدین بانھم غیر معصومین ...... ھذا ابوبکر یقول: اطیعونی ما اطعت اللہ فاذا عصیت اللہ فلا طاعۃ لی علیکم ...... وھذا عمر یقول: رحم اللہ امرأ اھدیٰ الینا عیوبنا ولولا علی لھلک عمر، ولو لا معاذ لھلک عمر. (تمھید الاوائل وتلخیص الدلائل: ۱/۴۷۶، ط مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ)
"اس کی دلیل خود خلفائے راشدین کا یہ اعتراف ہے کہ وہ معصوم نہیں ...... یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جو فرماتے ہیں: میری اطاعت کرو، جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں، جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تمہارے ذمے میری اطاعت نہیں ...... اور یہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو فرماتے ہیں: اللہ اس شخص پر رحم کرے جو ہمیں ہمارے عیوب سے آگاہ کرے۔ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض مواقع پر یہ بھی فرمایا) اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ اگر معاذ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

گئی کہ راوی عادل ہو۔ [1] فاسق کی روایت قبول نہیں ہو سکتی۔ [2]

عدالت کا مطلب یہ ہے کہ راوی عاقل، بالغ مسلمان، فسق کے اسباب اور خلافِ شرافت کاموں سے بچنے والا ہو۔'' [3]

عدالت کی صفت ثابت ہونے کے متعلق محدثین فرماتے ہیں: ''دو عادل آدمیوں کی گواہی یا (اچھی) شہرت سے عدالت ثابت ہو جاتی ہے۔ پس اہلِ علم کے درمیان جس کی عدالت مشہور ہو اور اس کے عادل ہونے کی توصیف عام ہو تو یہ کافی ہے۔'' [4] صحابہ کرام کی امانت و دیانت، پاکبازی و پرہیزگاری، رشد و ہدایت اور عظمت و شرافت کی گواہی خود قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے، اس لیے یہاں کسی اور گواہی کی ضرورت نہیں۔ [5]

---

① تشترط العدالة في الراوي كالشاهد، ويمتاز الثقة بالضبط والاتقان فان انضاف الى ذلك معرفة والاكثار فهو حافظ. (الموقظة في علم مصطلح المحدثين للذهبي، ص٦٧، ٦٨، ط مكتبة المطبوعات الاسلامية)...... وفي الحديث: "لاتاخذوا العلم الا ممن تقبلوا شهادته." رواه البيهقي في المدخل من حديث ابن عباس مرفوعاً وموقوفاً. (تدريب الراوي للسيوطي: ٣٥٢/١، دار طيبة)

② قال السخاوي: الفسق مانع من القبول. (فتح المغيث: ٢٠/٢) وقال ايضا: اذا علمنا زوال الفسق ثبت العدالة لانه لاثالث لهما فمتى عُلِمَ نَفيُ احدهما ثبت الآخر. (فتح المغيث: ٢١/٢) وقال الملا على القاري الهروي: لا تقبل رواية المستور للاجماع على ان الفسق يمنع القبول، فلا بد من ظن عدمه وكونه عدلا وذلك مغيب عنا. (شرح نخبة الفكر: ٥١٩/١، ط دار الارقم بيروت)

③ "العدالة ان يكون الراوي بالغا مسلما عاقلا، سليما من اسباب الفسق وخوارم المروءة." (المنهل الروي، بدرالدين الكناني الحموي، ص ٦٣) والمراد بالعدل من له ملكة تحمله على ملازمة التقوى والمروءة. والمراد بالتقوىٰ اجتناب الاعمال السيئة من شرك او فسق او بدعة. (نخبة الفكر لابن حجر العسقلاني، ص٢) وقال الحافظ زين العراقي: بيان لشروط العدالة: وهي خمسة: الاسلام والبلوغ والعقل والسلامة من الفسق وهو ارتكاب كبيرة او اصرار على صغيرة والسلامة مما يخرم المروءة. (التقييد والايضاح شرح مقدمة ابن الصلاح: ٣٢٧/١)

فسق سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں امام شمس الدین السخاوی فرماتے ہیں: "وهي ارتكاب كبيرة او اصرار علىٰ صغيرة." (الغاية في شرح الهداية في علم الرواية: ١١٩/١) یعنی کبیرہ گناہ کا ارتکاب یا صغیرہ گناہوں پر اصرار فسق ہے۔

مروءۃ (شرافت) کے خلاف کام کیا ہیں؟ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "كالبول في الطريق، وصحبة الارذال وامثال ذالك، ومجملها الاحتراز عما يذم عرفا." جیسے راستے میں بول و براز کرنا، گھٹیا لوگوں کے ساتھ رہنا اور اس قسم کے کام۔ خلاصہ یہ ہے کہ مروت کا مطلب ان کاموں سے احتراز کرنا ہے جو عرف میں مذموم سمجھے جاتے ہیں۔ (شرح نخبة الفكر، ملا على القاري الهروي: ٢٤٨)

④ "تثبت العدالة بتنصيص عدلين عليها او بالاستفاضة فمن شهرت عدالته بين اهل العلم وشاع الثناء عليه بها كفى بها.
(التقريب والتيسير للنووي، ص ٤٨؛ المنهل الروي بدرالدين الكناني الحموي، ص ٦٣)

⑤ پس اگر حدیث یا تاریخ کی صحیح روایات سے بعض صحابہ کی بعض خطائیں ثابت ہو بھی جائیں، تب بھی ان کی عدالت و شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ ہرگز ہرگز فاسق نہیں ٹھہرتے؛ کیوں کہ اکثر مواقع پر ان خطاؤں کی مناسب تاویلات موجود ہیں۔ جن مواقع پر ان خطاؤں کی تاویل ممکن نہیں مثلاً: بعض صحابہ کا شربِ خمر یا سرقہ وغیرہ تو وہاں بھی قرآن مجید کی آیات اور احادیث میں صحابہ کے لیے مذکور عمومی مناقب و بشارتوں کے پیشِ نظر یہی مانا جائے گا کہ ان کی توبہ اور بخشش یقینی ہے، اس لیے وہ خطا، یا گناہ سے پہلے بھی عادل تھے اور بعد میں بھی عادل رہے۔ علامہ صلاح الدین دمشقی العلائی لکھتے ہیں:

والذي ذهب اليه جمهور السلف والخلف ان العدالة ثابتة لجميع الصحابة رضي الله عنهم وهي الاصل المستصحب فيهم الىٰ ان يثبت بطريق قاطع ارتكاب واحد منهم لما يوجب الفسق مع علمه، وذالك مما لم يثبت صريحا عن احد منهم بحمدالله، فلاحاجة الى البحث عن عدالة من ثبت له الصحبة ولا الفحص عنها بخلاف من بعدهم. (تحقيق منيف الرتبة لمن ثبت له شريف الصحبة، ص ٦٠)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب عدالتِ صحابہ کے درست مفہوم کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی سے بعض مرتبہ تقاضائے بشریت ''دو ایک یا چند'' غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں۔ لیکن جس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرما دیا۔ اس لیے وہ ان غلطیوں کی بنا پر فاسق نہیں ہوئے۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی صحابی نے گناہوں کو اپنی ''پالیسی'' بنا لیا ہو، جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جا سکے۔'' (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ١٣٠)



عدالتِ صحابہ سے متعلق دو اہم شبہات کا جواب

پہلا شبہ:

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ عدالتِ صحابہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین روایتِ حدیث میں صادق تھے۔ عام زندگی میں ان کا عادل، متقی اور پرہیز گار ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ فاسق بھی ہو سکتے تھے کیوں کہ وہ معصوم عن الخطاء نہ تھے۔ یہ حضرات اس ذیل میں کتبِ عقائد کی کچھ عبارات بھی پیش کرتے ہیں۔ ①

اس شبہے کا جواب حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے:

"فقہاء و محدثین کی تصریحات میں "عدل" اور "عدالت" کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان عاقل بالغ ہو، اور کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو، کسی صغیرہ پر مصر نہ ہو اور بہت سے صغیرہ گناہوں کا عادی نہ ہو۔ یہی مفہوم شرعی ہے "تقویٰ" کا۔ جس کا مقابل فسق ہے۔ جس شخص کی عدالت کو ساقط قرار دیا جائے گا تو اصطلاحِ شرع میں اس کو فاسق کہا جائے گا۔ جن حضرات سے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے "عدول" ہونے پر اجماعِ امت نقل کیا گیا ہے، ان کی اپنی اپنی عبارتوں سے بھی "عدل" اور "عدالت" کی یہی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔" ②

نیز حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"بعض علماء نے جو عدمِ عصمت اور عمومِ عدالت کے تضاد سے بچنے کے لیے عدالت کے مفہوم میں یہ ترمیم فرمائی کہ یہاں "عدالت" سے مراد تمام اوصاف و اعمال کی عدالت نہیں بلکہ صرف روایت میں کذب نہ ہونے کی عدالت مراد ہے، یہ لغت و شرع پر ایک زیادتی ہے جس کی کوئی ضرورت اور کوئی وجہ نہیں۔ اور ان حضرات کے پیشِ نظر بھی اس ترمیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس کی رو سے کسی صحابی کو اپنے عمل و کردار کی

---

① ان حضرات کی پیش کردہ بعض عبارات یہ ہیں: اکثر السلف والخلف علی عدالة الصحابة فلا یبحث عنها فی روایة ولا شهادة لانهم خیر الامة ومن طرأ له منهم قادح کسرقة اوزنا عمل بمقتضاه، فلیس المراد بکونهم عدولا ثبوت العصمة لهم واستحالة المعصیة علیهم، بل انه لایبحث عن عدالتهم. (الیواقیت والدرر شرح شرح نخبة الفکر: ۲/۲۱۳، علامة عبدالروف المناوی)

ولکن قد یغلط فی مسمی العدالة فیظن ان المراد بالعدل من لا ذنب له، ولیس کذلک بل هو المؤتمن علی الدین وان کان له مایتوب الی اللّٰه تعالیٰ منه فان هذا لاینافی العدالة کمالاینافی الایمان والولایة. (صب العذاب علیٰ من سب الاصحاب، علامة محمود آلوسی: ۱/۳۹۴)

ان الصحابة کلهم عدول لتعدیل اللّٰه عز وجل لهم وثناء ه علیهم. ومعنی العدالة هنا انهم عدول فی دینهم وفیما یروون وینقلون من الشریعة وان ماحصل من بعضهم من اجتهاد، فانه لایقدح عدالتهم ولاینقصها لمضی ثناء اللّٰه عزوجل علیهم مطلقا. (شرح الطحاویه، اتحاف السائل بما فی الطحاویة من مسائل للشیخ صالح بن عبدالعزیز آل شیخ: ۱/۶۲۴)

فالعدالة لا تعنی انه لایرتکب احد منهم خطاء اوفسقا او نحو ذالک، انما العدالة فی نقل الدین. (مجمل اصول اهل السنة للشیخ ناصر عبدالکریم العقل: ۱۰/۱۴)

② مقام صحابہ، ص ۶۰، باختصار یسیر

حیثیت سے ساقط العدالۃ یا فاسق قرار دینا چاہتے ہیں۔ ان کے کلمات دوسرے مواقع پر خود اس کی نفی کرتے ہیں۔"[1]

دوسرا شبہ:

علمائے اسلام کے موقف پر حملہ کرتے ہوئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایک طرف مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معصوم نہ تھے، ان سے کبیرہ صغیرہ ہر طرح کے گناہ کا صدور ہو سکتا ہے اور بعض صحابہ سے ہوا بھی ہے، ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ صحابہ سب کے سب "عدول" ہیں اور "عادل" کا مطلب سب کے نزدیک یہ ہے کہ جو کسی گناہِ کبیرہ کا مرتکب اور صغیرہ پر مصر نہ ہو۔ یعنی جس شخص سے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب یا صغیرہ پر اصرار ثابت ہوگا، اس کی صفتِ عدل ختم ہو جائے گی اور وہ فاسق کہلائے گا۔ یہ موقف واضح تضاد پر مبنی ہے کہ سب صحابہ عدول بھی ہوں، ان سے کبیرہ و صغیرہ گناہوں کا ارتکاب یعنی فسق ممکن بلکہ بعض سے ثابت بھی ہو۔ پھر بھی ان میں سے کوئی فاسق نہ ہو۔ اس متضاد موقف کو صحیح عقیدہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟

اس شبہے کا جواب بھی حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کے الفاظ میں پیشِ خدمت ہے:[2]

"اس کا جواب جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ صحابہ کرام سے اگرچہ کوئی بڑا کبیرہ گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے اور ہوا بھی ہے، مگر ان میں اور عام افرادِ امت میں ایک فرق ہے کہ گناہِ کبیرہ وغیرہ سے جو کوئی شخص ساقط العدالۃ یا فاسق ہو جاتا ہے، اب اس کی مکافات توبہ سے ہو سکتی ہے۔ جس نے توبہ کر لی یا کسی ذریعے سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی حسنات کی وجہ سے اللہ نے اس کا یہ گناہ معاف کر دیا، وہ پھر "عدل" اور "متقی" کہلائے گا۔ اور جس نے توبہ نہ کی، وہ ساقط العدالۃ فاسق قرار دیا جائے گا۔

اب توبہ کے معاملے میں عام افرادِ امت اور صحابہ کرام میں ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ عام افرادِ اُمت کے بارے میں یہ ضمانت نہیں ہے کہ انہوں نے توبہ کی یا نہیں کی؟ اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی حسنات نے سب سیئات کا کفارہ کر دیا۔ ان کے بارے میں جب تک توبہ کا ثبوت نہ ہو جائے یا کسی ذریعے سے عنداللہ معافی کا علم نہ ہو جائے ان کو ساقط العدالۃ فاسق ہی قرار دیا جائے گا۔ نہ ان کی شہادت مقبول ہوگی نہ دوسرے معاملات میں ان کا اعتبار کیا جائے گا۔ مگر صحابہ کرام کا معاملہ ایسا نہیں۔ اول تو ان کے حالات جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ گناہ سے کتنے ڈرتے اور بچتے تھے۔ اور کبھی کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اس کی توبہ صرف زبانی کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ کوئی اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لیے پیش کر دیتا ہے، کوئی اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیتا ہے، جب تک قبولِ توبہ کا اطمینان نہیں ہو جاتا اس کو صبر نہیں آتا۔

---

① مقام صحابہ، ص ۵۶

② یہ شبہ بھی حضرت علام نے نقل کیا ہے جسے ہم نے کچھ تسہیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جس نے بہت سے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔

صحابہ کرام کے اس خوف وخشیت کا تقاضا یہ ہے کہ جن حضرات سے توبہ کرنے کا اظہار بھی نہیں ہوا ہم ان کے بارے میں بھی یہی ظن رکھیں کہ انہوں نے ضرور توبہ کرلی ہوگی۔ دوسرے ان کے حسنات اور سوابق اتنے عظیم اور بھاری ہیں کہ ان کے مقابلے میں عمر بھر کا ایک آدھ گناہ حق تعالیٰ کے وعدے کے مطابق معاف ہی ہو جانا چاہیے۔ وعدہ یہ ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ.

یہاں تک تو ہر مسلمان کو خود بھی بغیر کسی واضح دلیل کے یہ اعتقاد واعتماد رکھنا عقل وانصاف کا تقاضا ہے۔ مگر صحابہ کرام کے معاملے میں ہمارا صرف یہ گمان ہی نہیں، قرآنِ کریم نے اس گمان کی بار بار تصدیق کردی، کبھی صحابہ کرام کی خاص خاص جماعتوں کے لیے اس کا اعلان کردیا۔ کبھی صحابہ کرام وسابقین وآخرین کے لیے اعلانِ عام کردیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔"[1]

☆☆☆

روایات کو قبول یا مسترد کرنے کے اصول

روایات کو قبول یا مسترد کرنے کے اصول وضوابط کو جاننا بہت ضروری ہے۔ ان کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے اچھے اچھے دانشور بھیڑ چال کا شکار ہوئے ہیں۔ عام طرز یہ رہا ہے کہ کسی پختہ اصول یا کسوٹی کو اپنائے بغیر روایات پڑھ پڑھ کر مجموعی طور پر جو تاثر بنا، اس کو صحیح موقف، تحقیق اور حقیقت کا نام دے دیا گیا...... اس پہلو کو نظر انداز کردیا گیا کہ روایت کے راوی کون ہیں؟ ان کی ثقاہت یا ضعف کا کیا درجہ ہے؟ ان کی روایت ثقہ راویوں کی روایت سے ٹکرا تو نہیں رہی؟ قرآنِ کریم اور صحیح احادیث سے تو معارض نہیں؟ ایسی روایت سے اعتقادی استدلال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس صورتحال نے ایک طبقے کو صحابہ کرام کے معائب کی روایتیں اندھا دھند نقل کرنے اور ان سے صحابہ کی عدالت کے خلاف استدلال کرنے پر آمادہ کر رکھا ہے اور اس طرز کو انصاف پسندی اور غیر متعصبانہ اندازِ فکر نام دیا گیا ہے۔ اس طبقے نے "اصولِ روایت" کو تو بالکل نظر انداز کردیا ہے اور "درایت" میں بس یہ پیش نظر رکھا ہے کہ جو بات "امکان" کی حدود میں ہو، اسے مسترد نہ سمجھا جائے۔ سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ انداز سراسر غیر علمی، غیر اسلامی اور غیر تحقیقی ہے جو کسی اصول وضابطے کا پابند نہیں۔ اس میں سارا مدار انسان کے اپنے وجدان، رجحان اور ذوق پر منحصر ہو جاتا ہے کہ وہ جس قسم کی روایات کو چاہے قبول کرلے، جن روایات کو چاہے ترک کردے۔

رہی بات "امکان کی حدود" کی تو بعض اوقات امکانات کی حدود میں بھی روایتیں ٹکرا ہی جاتی ہیں۔ اب کس کو مانا جائے، کسے مسترد کردیا جائے۔ کیا کسی مؤرخ ومحقق کو اپنے ذوق یا عصبیت کی بناء پر اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے؟

[1] مقام صحابہ، ص ۵۵ تا ۵۸

مثلاً ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو وہ بڑے خوش ہوئے اور اسے اپنا کارنامہ قرار دیا۔ دوسری روایت بتاتی ہے کہ اس خبر پر سخت غم گین ہوئے اور دردناک اشعار پڑھے۔ اب اگر کوئی شخص دوسری روایت کو بالکل نظر انداز کر کے پہلی روایت کو صرف اس لیے قبول کرلے کہ وہ امکانات کی دنیا کے اندر ہے، تو اس حرکت کو تحقیق کہا جائے گا یا خدا واسطے کا بیر!!

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے تاریخی مواد کی تحقیق کے متعلق جو اصولی بات تحریر کی ہے وہ قابل غور ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"ہمارے پاس علمِ تاریخ پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس میں ایک ہی واقعے سے متعلق کئی کئی روایتیں ملتی ہیں۔ اور تاریخ میں روایت کی چھان پھٹک اور جرح و تنقید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو حدیث میں حضرات محدثین نے اختیار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایتیں درج ہوگئی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ کسی معاملے کی حقیقت پسندانہ تحقیق کرنی ہو تو یہ ضروری ہے کہ رطب و یابس کے اس مجموعے میں سے صرف ان روایات پر اعتماد کیا جائے جو روایت اور درایت کے اصولوں پر پوری اترتی ہوں۔ اگر کوئی عالم جسے جرح و تعدیل کے اصولوں سے واقفیت ہو، ان روایتوں کو انہی اصولوں کے مطابق چھانٹتا ہے تو شکوک و شبہات کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں ختم ہوجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں عبداللہ بن سبا کی سازش نے جو تحریک شروع کی تھی، اس کے دو بڑے مقاصد تھے: ایک صحابہ کی عظمت کو مجروح کرنا، اور دوسرے جھوٹی روایتیں پھیلانا۔ چنانچہ انہوں نے بے شمار غلط سلط حکایتیں معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ حضرات محدثین نے پوری تندہی اور جانفشانی کے بعد احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس سبائی تحریک کے اثرات سے جدو جہد کر کے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا۔ لیکن علمِ تاریخ میں وہ اہتمام نہ ہوسکا اور وہ روایتیں کتابوں میں درج ہوتی رہیں جو خالص سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار تھیں۔

ہاں محتاط مؤرخین نے اتنا ضرور کیا ہے کہ ہر روایت کی سند لکھ دی ہے، اور اب تحقیقِ حق کرنے والوں کے لیے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ علم اسماء الرجال کی مدد سے وہ روایتوں کی تحقیق کریں۔ اور جن روایتوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ سبائی تحریک کے کسی فرد کی بیان کی ہوئی ہیں، ان پر صحابہ کے بارے میں اعتماد نہ کریں۔ کیوں کہ صحابہ کے فضائل و مناقب اور ان کا اللہ کے نزدیک انبیاء کے بعد محبوب ترین امت ہونا قرآنِ کریم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس سبائی پروپیگنڈے پر کان دھر کر قرآن و سنت کے واضح ارشادات کو دریا برد نہیں کیا جاسکتا۔

اہل سنت کا جو عقیدہ ہے کہ مشاجرات صحابہ کی تحقیق میں پڑنا درست نہیں، بلکہ اس معاملے میں سکوت اختیار

کیا جائے، یہ کوئی تلخ حقائق سے فرار نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایات میں صحیح اور غلط، اور سچی اور جھوٹی کا امتیاز ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لیے جو شخص جرح و تعدیل کے اصولوں سے ناواقف رہ کر ان روایات کو پڑھے گا وہ ہرگز کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ صحیح روایات میں مشاجرات صحابہ سے متعلق جو مواد آیا ہے، اسے سامنے رکھ کر اہل سنت کے تمام مرکزی علماء نے متفقہ طور پر یہ عقیدہ اختیار کیا ہے کہ اگرچہ صفین اور جمل کی جنگوں میں حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا لیکن ان کے مقابل، حضرت عائشہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کا موقف بھی سراسر بے بنیاد نہیں تھا۔ یہ حضرات اپنے ساتھ شرعی دلائل رکھتے تھے اور ان سے جو غلطی صادر ہوئی وہ خالص اجتہادی نوعیت کی تھی۔ ①

راوی کی ثقاہت اور ضعف کو جانچنا کیوں ضروری ہے؟

کسی شخصیت یا کسی واقعے کے بارے میں خبر نگاروں کی تضاد بیانی کا فیصلہ کرنا ہر دور میں ایک مسئلہ رہا ہے۔ اگر کسی شخص یا کسی واقعے کے متعلق چند خبر نگار الگ الگ اور متضاد منظر کشی کریں تو کسی ایک کی بات ماننا بلاشبہ ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی اس مسئلے کے حل کے لیے افراد کو گننا کافی سمجھے یعنی اگر دو افراد واقعے کی ایک شکل بیان کر رہے ہیں اور چار افراد اس سے الگ، تو چار افراد کی بات مان لی جائے، لیکن اہل خرد سے سوال یہ ہے کہ کیا صرف افراد کو گن لینا کافی ہے؟ کیا خبر دینے والے افراد کی شرافت و دیانت اور دیگر مطلوبہ صفات کو نہیں دیکھا جائے گا جو کسی واقعے کی صحیح اور مصدقہ خبر رسانی کے لیے بنیادی چیز ہے؟ غور فرمایئے! اگر ایک خبر دو پرانے اور پختہ کار صحافی بیان کر رہے ہوں جن کی شرافت اور ایمان داری شک وشبہے سے بالاتر ہو اور ان کی خبر کے برخلاف پانچ چھ ایسے خبر نگار جن کے اخلاق اور کردار پر انگلیاں اٹھتی رہی ہوں، کچھ اور کہانی بیان کر رہے ہوں، تو کس کی بات مانی جائے گی؟ ظاہر ہے کہ پرانے، پختہ اور شرافت و دیانت کے حامل خبر نگاروں کی بات پر اعتبار کیا جائے گا۔ ان کی تردید کرنے والے کمزور کردار کے حامل صحافیوں کی خبر کو کم از کم مشکوک ضرور سمجھا جائے گا۔ یہ مثال جس طرح آج کل کے قضیوں میں صادق آتی ہے، اسی طرح ماضی کے احوال میں بھی اس کسوٹی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی اس بارے میں اصولی بات یوں پیش فرماتے ہیں:

”عقل کا فطری تقاضا ہے کہ جس شخص کی زندگی میں مجموعی طور پر خیر غالب ہو، اس پر کسی گناہِ کبیرہ کا الزام، اس وقت تک درست تسلیم نہ کیا جائے جب تک وہ مضبوط اور قوی دلائل سے ثابت نہ ہو چکا ہو۔“ ②

پس اگر چند ثقہ، باکردار اور معتبر راوی ایک شخصیت یا ایک واقعے کی ایک طرح تصویر کشی کرتے ہوں اور دوسری طرف بہت سے کمزور کردار والے راوی اس کے برعکس عکاسی کرتے ہوں تو عقل و فہم اور علمی و تحقیقی اندازِ کار کا

① فتاویٰ عثمانی: ۱/۱۷۶، ۱۷۷

② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۳، ۱۳۴

تقاضا یہ ہے کہ معتبر راویوں کی بات کو ترجیح دی جائے۔ پس صحابہ کرام کے بارے میں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کونسی بات ثقہ راویوں سے مروی ہے اور کون سی ضعیف راویوں سے۔ ①

حیثیتِ عرفی کا معاملہ:

اس مسئلے پر ایک قدم آگے بڑھ کر غور کریں؟ اختلافِ روایات کا یہ معاملہ اس وقت اور نازک ہو جاتا ہے جب بحث کسی ایسی شخصیت کے بارے میں ہو جسے معاشرے میں بے حد عزت واحترام حاصل ہو۔ ہر شخص کو اپنے اخلاق و عادات، تعلقات، سابقہ خدمات، لین دین، پیشہ ورانہ زندگی اور دیگر امور کی بناء پر معاشرے میں ایک خاص کردار کا حامل سمجھا جاتا ہے، خیر غالب ہوتو اسے اچھا مانا جاتا ہے۔ ② اس کی یہ شہرت اور ساکھ، اس کا قانونی حق بن جاتی ہے جسے ''حیثیتِ عرفی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ دنیا کا قانون اس بات کو مانتا ہے کہ کسی کی حیثیتِ عرفی کو مجروح کرنا جرم ہے۔

مثلاً ایک اسکول ٹیچر اخلاق و دیانت میں مشہور ہے۔ اپنے حلقے میں اس کی اچھی بھلی عزت ہے۔ کوئی شخص پختہ ثبوت پیش کیے بغیر اس پر رشوت ستانی کا الزام عائد کر دے، تو اسکول ٹیچر یا اس کے وکیل کو حق ہوگا کہ وہ الزام لگانے والے کے خلاف ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کرے اور اس کو عدالت میں طلب کرے۔ اگر الزام لگانے والا وہاں بھی ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہے تو اسے ہتکِ عزت کی سنگین سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ حیثیتِ عرفی محفوظ رکھنے کا حق اداروں اور کمپنیوں کو بھی حاصل ہے۔ کسی ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچانے والا عدالت میں لاکھوں کروڑوں روپے جرمانے کی سزا پا سکتا ہے۔ مردہ انسانوں کی حیثیتِ عرفی کو بھی قانونی تحفظ دیا جاتا ہے۔ کسی کے مرحوم باپ دادا کو بدنام کرنے کی کوشش جیل کی ہوا کھانے کا باعث بن سکتی ہے۔

عقل وفہم اور انصاف پسندی کے تقاضے کے تحت جس طرح حیثیت عرفی کا حق موجودہ معاشرے میں بسنے والوں کو ہے، یہ حق تاریخی شخصیات کے لیے بھی محفوظ مانا جائے گا۔ تاریخ میں جو بھی معزز، نامور اور قابل احترام شخصیات گزری ہیں، انصاف یہ ہے کہ ان کی معروف حیثیت کو مجروح کرنے والے مواد کو ایک غیر ثابت شدہ الزام سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے۔ ہاں اگر اس الزام کے حق میں کوئی ایسا ثبوت موجود ہو جسے کوئی منصف مزاج آدمی تسلیم کر سکے تو الگ بات ہے۔ اس کے بغیر اس روایت کی حیثیت ایک الزام سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔

مثلاً بعض تاریخی روایات خلفائے ثلاثہ کو غاصب ظاہر کرتی ہیں، بعض حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث بتاتی ہیں، بعض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو منافق باور کراتی ہیں۔ تو کیا ایسے مواقع پر یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لی جائیں گی کہ امکان کی دنیا میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے؟ کیا ایسی خبر الزام اور ازالہ حیثیت عرفی کے زمرے میں نہیں آئے گی؟ انصاف کی بات یہی ہوگی کہ جن حضرات کی عرفی حیثیت، عزت، وقار اور دیانت پر مبنی ہے ان کے بارے

---

① بحوث فی تاریخ السنۃ المشرفۃ، الدکتور اکرم ضیاء عمری، ص ۲۱۱

② قال الحافظ الذهبی: انما العبرة بکثرة المحاسن. (سیر اعلام النبلاء: ۲۰/۴۶، ط الرسالة)



میں منفی خبروں کی چھان بین ضرور کی جائے اور خبر دینے والے کے احوال و کردار کا جائزہ ضرور لیا جائے۔ جب تک تحقیق کی توفیق نہ ہو سکے تب تک ایسی روایات کو جو جلیل القدر ہستیوں کی معروف شہرت کے خلاف ہیں، ایک الزام ہی تصور کیا جائے۔ جس طرح ہم اپنے چلتے پھرتے معاشرے میں کسی معزز شخصیت کی کردار کشی پر مبنی ہر آواز کو "معتبر خبر" سمجھ کو مان لینے کی حماقت نہیں کرتے، اسی طرح ماضی کی عظیم شخصیات کے بارے میں بھی ہمیں ہر گری پڑی روایت پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ اہل علم کے لیے ایسی خبر اور خبر نگار کی جانچ پڑتال ضروری ہوگی۔ یقیناً یہ علمی، تحقیقی اور منصفانہ طرزِ عمل نہیں ہوگا کہ ہم خبر نگاروں اور راویوں کو ایسے الزامات لگاتا دیکھ کر بھی ان کی خانہ تلاشی نہ لیں۔

ماضی کے مسلم مؤرخین نے روایات میں اتنی احتیاط نہیں کی تو ہم کیوں کریں؟

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ماضی کے مؤرخین نے صحابہ کے بارے میں اس قدر حساس رویہ اختیار نہیں کیا تھا، وہ ان کے معائب کی ضعیف روایات کو بھی نقل کر دیتے تھے، اس کے باوجود ان کے ایمان وایقان اور صحابہ سے عقیدت پر کوئی حرف نہیں آتا تھا۔ تو آج اتنی احتیاط سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ دورِ حاضر میں مستشرقین اور اعدائے اسلام نے صحابہ کے خلاف علمی، فکری اور ابلاغی محاذ پر سخت خطرناک ماحول پیدا کر دیا ہے جس کا بنیادی مقصد صحابہ کرام کی عادلانہ حیثیت کو مجروح کرنا ہے۔ یہ چند جزئی واقعات کا مسئلہ نہیں جنہیں ہم نظر انداز کر دیں۔ یہ عقیدے اور ایمان کا معرکہ بن چکا ہے۔ ان جزئی واقعات کو لے کر صحابہ کی عادلانہ حیثیت کو مجروح نہ کیا جاتا تو ممکن ہے کہ اس وقت ہمیں بھی ایسی روایات پر تحقیق کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر اس وقت علمی ونظریاتی محاذ پر صحابہ کرام کی حیثیت مدعی علیہ کی سی ہے جن پر فریق مخالف الزامات کی بارش کر رہا ہے۔ ان الزامات کے لیے پیش کیے گئے شواہد پر جرح نہ کرنا فریق مخالف کا دعویٰ قبول کر لینے کے مترادف ہے۔ گلی محلے کی وقتی اور عارضی لڑائی میں اگر کوئی کسی کو بزدل، خائن یا رشوت خور کہہ دے تو پروا نہیں کی جاتی۔ مگر جب یہی الزام تراشی عدالت میں ہو اور کوئی دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو مدعی کے ایک ایک جملے اور دلیل پر جرح کی جاتی ہے۔

اس وقت عالمگیر سطح پر صحابہ کی عدالت کو زیرِ بحث لا کر ان کی حیثیتِ عرفی کو چیلنج کیا جا رہا ہے اس لیے اسے مجروح کرنے والے مواد کو جانچنا اور اس کا معیار متعین کرنا پڑے گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کوشش میں ایسے غلو کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں جس کے پیچھے لاشعوری طور پر "عدالتِ صحابہ" کی بجائے "عصمتِ صحابہ" کی ذہنیت کارفرما ہو اور جو محدثین، فقہاء اور اسلاف سے اعتماد کو ختم کر کے انسان کو انکارِ حدیث کی طرف لے جائے۔

تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کیسے کی جائے؟

خبر نگاروں اور راویوں کے معیار کے جائزے کو علم جرح وتعدیل، فنِ رجال اور علم الاسناد کہا جاتا ہے۔ اس فن میں یہ دیکھا جاتا ہے کوئی روایت کتنے واسطوں سے، کن کن لوگوں سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ ایک ایک فرد کے علم، دیانت، تقویٰ اور قوت حافظہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بیچ میں کوئی کڑی ٹوٹی ہوئی تو نہیں۔ اس طرح

کئی پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی روایت کی مضبوطی یا کمزوری کی تعیین اور درجہ بندی کر دی جاتی ہے۔

فن رجال کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب حدیث کی تدوین کا کام ایک حد تک ہو چکا تھا۔ اس وقت محدثین نے دیکھا کہ بہت سی کمزور روایات بھی ذخیرۂ حدیث میں شامل ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ احادیث کی مضبوطی اور کمزوری کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جائے، معلوم کیا جائے کہ کون سی روایت مستند ہے اور کونسی غیر مستند۔ ان حضرات نے راویوں کے حالات دیکھ کر ان پر اعتماد یا عدم اعتماد ظاہر کرنے کے لیے درجات متعین کیے۔ اعلیٰ درجے کے قابل اعتماد راویوں کو ''ثقہ'' یا ''ثبت''، درمیانے درجے والوں کو ''صدوق'' یا ''صالح'' اور نا قابل اعتبار راویوں کو ''متروک''، ''ہالک'' اور ''تالف'' کہا جاتا تھا۔ انتہائی درجے کے نا قابلِ اعتماد راوی ''کذاب'' اور ''دجال'' کہلاتے تھے۔ راویوں کے بارے میں ماہرینِ رجال کی یہ آراء دوسری صدی سے ساتویں صدی ہجری تک مختلف تصانیف میں جمع ہوتی رہیں جن میں بڑی تفصیل سے ہزاروں راویوں کے کوائف جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان کتب کی مدد سے کسی بھی حدیثی یا تاریخی روایت کی سند کو جانچ کر اس کے قابل اعتماد یا نا قابل قبول ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

روایت کے درجات: صحیح، حسن، ضعیف:

صحیح: جس روایت کے تمام راوی ثقہ، دیانت دار، عمدہ حافظے والے اور محتاط ہوں، سند متصل ہو، اور میں کوئی علت (مخفی عیب) اور شذوذ (اجنبی پن) نہ ہو، اسے ''صحیح'' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ قوت میں پہلے درجے پر ہوتی ہے۔

حسن: معیار کے لحاظ سے جو روایت صحیح سے کم تر اور ضعیف سے بہتر ہو، اسے ''حسن'' کہا جاتا ہے۔

ضعیف: اگر راوی کا حافظہ کمزور ہو یا اس کی امانت و دیانت اور صداقت مشکوک ہو یا وہ بدعات و بدعقیدگی کا مرتکب ہو، تو اس کی نقل کردہ روایت کو ''ضعیف'' کہا جاتا ہے۔ (طرق متعدد ہو جانے سے ضعیف ''حسن لغیرہ'' اور حسن ''صحیح لغیرہ'' بن جاتی ہے۔) آگے ضعیف روایت کی کئی قسمیں بنتی ہیں...... مثلاً: منکر، منقطع، موضوع

منکر: اگر ضعف اس وجہ سے ہے کہ متن میں کوئی عجیب و غریب بات ہے جو معتبر روایات کے متن کے خلاف ہے تو ایسی ضعیف روایت کو ''منکر'' کہا جاتا ہے۔

منقطع: اگر ضعف اس وجہ سے ہے کہ ناقلین کا سلسلہ مکمل نہیں بلکہ کہیں سے ٹوٹا ہوا ہے تو ایسی روایت کو ''مرسل'' یا ''منقطع'' کہتے ہیں۔[1]

موضوع: اگر سند میں کوئی کذاب، کوئی جھوٹ گھڑنے والا راوی ہے اور اس روایت کا متن بھی یقینی و قطعی خبروں کے خلاف ہے تو ایسی روایت کو ''موضوع'' یعنی من گھڑت قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی روایت بالکل غیر معتبر ہوتی ہے۔[2]

---

① مرسل اور منقطع کی تعریف میں کئی اقوال ہیں، عام فہم قول وہ ہے جس میں دونوں کو یکساں کہا گیا ہے۔ "المنقطع مثل المرسل و کلاهما شاملان لكل مالا يتصل اسناده." (التقييد والايضاح شرح مقدمة ابن الصلاح: ۱/۸۰)

② قواعد فی علوم الحدیث، مولانا ظفر احمد عثانی، ص: ۷۸ تا ۸۱...... یاد رہے کہ فقط سند میں کذاب راوی کی موجودگی سے روایت ''جعلی'' ثابت نہیں ہو جاتی جب تک کہ دیگر قرائن اور علامات نہ ہوں۔ ہاں اسے نہایت ضعیف بہر حال مانا جائے گا۔ (شرح التبصرة والتذكرة للعراقي: ۱/۳۰۷)



ضعیف روایت کا ضعف کب دور ہوسکتا ہے اور کب نہیں؟

اگر کوئی روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کے راوی کا حافظہ کمزور تھا یا اس کی سند منقطع تھی، یا اس میں کوئی راوی مجہول تھا تو اگر ایسی ضعیف روایت کی تائید کسی دوسری ضعیف روایت سے ہو جائے تو اس کا ضعف ختم ہو جاتا ہے اور اسے ''حسن لغیرہٖ'' کے درجے میں تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی روایت اس وجہ سے ضعیف قرار دی گئی ہے کہ اس کا راوی فاسق وفاجر یا کذاب تھا تو ایسی روایت اسی قسم کے دوسرے راوی کی روایت کی مدد سے مضبوط نہیں مانی جاسکتی بلکہ اس کا ضعف باقی رہے گا۔[1]

صحیح اور ضعیف روایات کے فرق کا نتیجہ کیا ہوگا؟

غرض راویوں کے احوال کا علم وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعے روایات کے درجات متعین کیے جاسکتے ہیں۔ اس تعیین کے بعد آسان ہو جاتا ہے کہ مواد کے اختلاف اور تعارض کی صورت میں کس روایت کو قبول کیا جائے اور کس کو مسترد۔ ہر انسان کی عقل یہی کہے گی کہ بہتر روایت (صحیح) کو مانا جائے اور اس سے متصادم کمزور (ضعیف) روایت کو مسترد کیا جائے۔ اس کے برعکس ضعیف کو مان کر صحیح کو مسترد کرنا کسی صحیح العقل شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔

اگر صحیح وسقیم روایات کا فرق ملحوظ رکھنے کے نکتے کو اصولی طور پر مان لیا جائے تو صحابہ سے متعلق تاریخی روایات کیا اکثر اختلافات خود بخود نمٹ جائیں گے کیوں کہ صحابہ کے حوالے سے قابلِ اشکال روایات کو شمار کریں تو ان میں سنداً صحیح یا حسن بہت کم ہوں گی۔ اکثر روایات ضعیف نکلیں گی۔ ان کا کوئی نہ کوئی راوی غیر ثقہ ثابت ہوگا۔ بعض پر دروغ گوئی اور احادیث وضع کرنے کا الزام ہوگا۔ بعض راوی بدعتی، گمراہ اور رافضی ہوں گے۔ پس ایسی روایات متن کی نکارت اور سند کے ضعف کی وجہ سے کردارِ صحابہ کے مسئلے میں خود بخود ناقابلِ استدلال ہو جائیں گی۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

''قاعدہ یہ ہے کہ ہر اس ضعیف روایت کو رد کر دیا جائے گا جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو، خواہ وہ روایت تاریخ کی ہو یا حدیث کی۔''[2]

طعنِ صحابی پر مشتمل صحیح السند روایات کو مانا جائے گا یا نہیں؟

رہی یہ بات کہ طعنِ صحابی پر مشتمل روایات اگر سنداً مضبوط (صحیح یا حسن) ثابت ہوں تو انہیں قبول کیا جائے گا یا نہیں؟ تو اس بارے میں اصول یہ ہے کہ:

1. ایسی روایات مسترد نہیں کی جائیں گی، ان کے الفاظ کو قبول کیا جائے گا تاہم دیگر صحیح روایات کی روشنی میں ان کا مناسب مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے گی جسے ''تأویل'' کہا جاتا ہے۔

تاویل سے یہ مراد نہیں کہ کسی روایت سے خواہ مخواہ کوئی مطلب ثابت کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس سے مراد یہ

---

① مصطلح الحدیث، محمد بن صالح العثیمین، ص ۹، ط مکتبۃ العلم

② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۴۳ کا حاشیہ

ہے کہ روایت کے الفاظ میں جن معنوں کی گنجائش ہو، ان میں سے بہترین اور مناسب ترین معنی تلاش کیا جائے۔[1]

❷ اگر ایسی کسی صحیح روایت کے الفاظ میں کسی اور مطلب کی گنجائش نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ وہ صحیح روایت کسی اہم روایت سے معارض تو نہیں یا اسے محدثین نے معلّل تو قرار نہیں دیا (یعنی کسی باریک علت کی بناء پر محلِ نظر تو نہیں سمجھا) کسی دوسری اصح روایت سے تعارض ہونے یا معلّل ہونے کی صورت میں بھی روایت قابلِ تحقیق ہوگی۔ ایسے میں سند و متن کی مزید تحقیق، قرائن پر غور و فکر اور درایت کے اصول سامنے رکھتے ہوئے روایت کو قبول یا مسترد کیا جائے گا۔ (اصولِ درایت کی وضاحت ذرا آگے آرہی ہے۔)

❸ اگر کسی ایسی صحیح روایت کے الفاظ میں کسی اور مطلب کی گنجائش نہ ہو اور اس مطلب کا کسی دوسری صحیح روایت سے کوئی تعارض بھی نہ ہو، وہ علل سے بھی پاک ہو تو صحابی کی خطا کو مان لیا جائے گا مگر صحابہ کی عظمت و توقیر کی دیگر نصوص کے پیشِ نظر صحابی کو نہ تو زبان سے برا بھلا کہا جائے گا، نہ ہی دلی عظمت میں کوئی کمی کی جائے گی۔ حتی الامکان خطاء کو بھول چوک یا خطائے اجتہادی مانا جائے گا۔ اگر وہ صریح معصیت ہو تو بھی اسے بشری لغزش پر محمول کیا جائے گا۔[2]

جیسے بعض غیر متعارض صحیح روایات میں بعض صحابہ کے سرقہ یا شربِ خمر یا خروج علی الائمہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ تو ان روایات کا انکار نہیں کیا جاتا کیوں کہ اسلامی عقیدے کے مطابق صحابہ کرام معصوم نہیں، ان سے غلطیوں کا صدور ممکن ہے۔ تاہم ایسی لغزشوں کے پسِ پردہ تکوینی حکمتیں بھی ملحوظ رہنی چاہئیں۔ مثلاً: بعض حکمتیں یہ تھیں کہ:

- صحابہ اور پیغمبر کے مراتب میں فرق واضح ہو سکے کہ نبی معصوم ہیں اور صحابہ غیر معصوم۔
- بعض شرعی مسائل جیسے: قصاص، شراب، چوری، زنا، خروج و بغاوت کی سزا وغیرہ کے احکام نافذ ہو سکیں۔

بہرکیف صحابہ کرام امت میں عظیم ترین اور اعلیٰ و افضل ہیں۔ ان کی لغزشیں نصِ قرآنی ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ کے تحت معاف کی جاچکی ہیں۔ قرآن مجید انہیں اللہ کی خوشنودی کا مژدہ سنا چکا ہے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

---

[1] علامہ ابن حجر ہیثمی لکھتے ہیں: والواجب ایضا علیٰ کل من سمع شیئا من ذالک ان یتثبت فیه ولا ینسبه الی احدمنهم بمجرد رویته فی کتاب او سماعه من شخص بل لابدان یبحث عنه حتیٰ یصح عنده نسبته الی احدهم فحینئذ الواجب ان یلتمس لهم احسن التاویلات واصوب المخارج اذ هم اهل لذلک. (الصواعق المحرقة: ۲/۶۲۱)

"جو شخص (صحابہ کرام کی لغزشوں کے بارے میں) کچھ سنے تو اس پر واجب ہے کہ اس معاملے میں تحقیق سے کام لے اور صرف کسی کتاب میں دیکھ لینے یا کسی شخص سے سن لینے کی بناء پر اس غلطی کو ان میں سے کسی کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ لازم ہے کہ اس کی تحقیق کرے یہاں تک کہ اس کی نسبت ان کی طرف ثابت ہو جائے۔ اس مرحلے پر یہ واجب ہے کہ ان کے لیے بہترین تاویل اور صحیح ترین محمل تلاش کرے؛ کیوں کہ یہ حضرات (صحابہ) اسی کے اہل ہیں۔"

نیز دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: لا یجوز لاحد ان یذکر شیئا مما وقع بینهم یستدل به علیٰ بعض نقص من وقع له ذلک والطعن في ولایته الصحیحة او لیغری العوام علیٰ سبهم وثلبهم ونحو ذلک من المفاسد.

"صحابہ کرام کے درمیان جو واقعات ہوئے ہیں، کسی کے لیے جائز نہیں کہ انہیں ذکر کرکے ان کے نقص پر استدلال کرے اور اس کے ذریعے کسی صحابی کی ولایتِ صحیحہ پر اعتراض کرے یا عوام کو انہیں برا بھلا کہنے پر اکسائے۔" (تطهیر الجنان، ص ۶۵)

[2] کیف نقرأ تاریخ الآل والاصحاب، عبدالکریم بن خالد الحربی، ص ۳۵، ط دار الکتب المصریة

اُصولِ درایت سے کیا مراد ہے؟

درایت کا مطلب ہے کہ روایت میں پیش کردہ واقعے کا عقلی امکانات کی روشنی میں جائزہ لینا تاکہ پتا چل سکے کہ اس میں کسی مبالغہ آمیزی یا وہم کا دخل تو نہیں۔ درایت کے ذریعے مضبوط ثابت ہونے والی روایات کو سنداً ہم پلہ دوسری روایات پر ترجیح دی جاتی ہے۔

یاد رہے کہ درایت کا اصول فقہاء کے اصولِ قیاس کی طرح ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ بسا اوقات احکام کی صحیح روایات میں بھی تعارض ہوتا ہے۔ مثلاً صحیح روایات کا ایک مجموعہ بتاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے آگ پر پکی ہوئی چیزیں کھانے کے بعد وضو کا حکم دیا ہے۔ صحیح روایات کا دوسرا مجموعہ بتاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اسے ضروری نہیں سمجھا۔ تو ایسے موقع پر فقہاء قیاس سے کام لے کر روایات کے کسی ایک مجموعے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چونکہ آگ سے پکی ہوئی چیزوں کے استعمال سے وضو ٹوٹ جانا قیاس کے خلاف ہے۔ اس لیے فقہاء نے روایات کے دوسرے مجموعے کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح اصولِ درایت میں متعارض روایات کا عقلی جائزہ لے کر کسی ایک کو ترجیح دی جاتی ہے۔

مثلاً دو روایات کو دیکھیے جو سنداً قوت و ضعف میں یکساں ہیں (دونوں ضعیف ہیں) مگر ان کا متن باہم متضاد ہے:

① طبری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خوش ہوئے اور فخریہ طور پر کہا: میں اللہ کا ایسا بندہ ہوں کہ وادیٔ سباع میں ہوتے ہوئے عثمان کو قتل کر ڈالا۔ یہ بھی فرمایا: ''میں جب کسی زخم کو کریدتا ہوں تو اسے پھاڑ کر چھوڑتا ہوں۔'' (یعنی یہ سارا کیا دھرا میرا ہے۔)

② طبری کی دوسری روایت میں ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سخت غم کا اظہار کیا اور غم انگیز اشعار پڑھے اور فرمایا: ''جنگ ہو کر رہے گی۔ جس نے زخم کریدا ہے وہ اسے پھاڑ کر چھوڑے گا۔''

ان دونوں متعارض روایات کو درایت کی روشنی میں دیکھیں تو پہلی روایت کا من گھڑت ہونا واضح ہے؛ کیوں کہ اگر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی منصوبہ بندی کی تھی تو کام پورا ہوتے ہی فوراً اپنی سازشوں کی قلعی از خود کیسے کھول دی؟ سازشی لوگ تو حتی الامکان خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں، وہ ایسے احمق نہیں ہوتے کہ دوسروں کے سامنے اپنی سازش کا اعتراف کرتے پھریں۔ دوسری روایت قابلِ قبول اور عقل و قیاس کے مطابق ہے؛ کیوں کہ جس واقعے سے عام مسلمان بھی غم گین ہوئے اور اسے پڑھ کر آج تک غمزدہ ہوتے ہیں، اس سے، اُس دور کے حوادث کا سامنا کرنے والے ایک صحابی کو دکھ کیوں نہ ہوا ہوگا۔

یوں اصولِ درایت کی روشنی میں، ہم صحت و ضعف میں یکساں قوت کی حامل دو متعارض روایات میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ مرجوح روایت کو راوی کے وہم یا کسی اور علت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

اصولِ درایت کے مؤسس علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''اگر خبر میں محض نقل پر اعتماد کر لیا جائے اور اصولِ عادت، قواعدِ سیاست، عمرانیاتی خصوصیات اور معاشرتی

حالات کو کسوٹی نہ بنایا جائے، اور موجود کو غیر موجود پر اور حاضر کو غائب پر قیاس نہ کیا جائے تو بہت سی غلطیوں، لغزشوں اور سچائی سے بھٹکنے کا امکان رہتا ہے۔" ①

ضعیف روایات کے متعلق چند اہم تنبیہات

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ضعیف یا صحیح ہونا محدثین کی اصطلاح ہے اور یہ کہ ضعیف روایات کمزوری کے اعتبار سے کئی قسم کی ہوتی ہیں: بعض قابلِ ترک اور بعض قابلِ قبول ہوتی ہیں۔ ضعیف روایات کی اس فنی حیثیت کو سمجھے بغیر تاریخ کی صحیح جانچ پرکھ ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل چند اہم نکات یاد رکھے جائیں:

1. کسی ضعیف روایت کو مسترد کرنا اس وقت ضروری ہوگا جب اس میں کوئی چیز صفاتِ باری تعالیٰ، عصمتِ انبیا، عدالتِ صحابہ یا کسی شرعی حکم کے خلاف ہو۔ ②

2. اگر ضعیف روایت میں مذکورہ علت نہ ہو، تب بھی اسے عقلی قرائن اور دلائل کی بناء پر مسترد کیا جا سکتا ہے، مگر اس صورت میں تردید جوازی ہوگی نہ کہ وجوبی۔ اسے قبول یا مسترد کرنا محقق کے علم وفہم پر منحصر ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ (عقائد اور احکام کے سوا) عام خبروں میں ضعیف روایات کو قبول یا گوارا کرنے کے متعلق فرماتے ہیں:

"گوارا کرنے کا مفہوم یہاں بھی یہ نہیں ہے کہ ان روایتوں کا مطالعہ کرتے وقت نقد ونظر کے تمام اصولوں پر بالکل ہی تالا ڈال دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف ان راویوں کے ضعف کی بنیاد پر ان روایتوں کو رد نہیں کریں گے۔ چنانچہ اگر کچھ دوسرے دلائل ان کے خلاف مل جائیں تو ان روایات کو تسلیم کرنے پر اصرار نہیں کیا جائے گا۔" ③

3. اگر ضعیف روایت میں کسی عظیم المرتبت شخصیت کی کسی خطائے اجتہادی، انتظام وتدبیر کی کسی لغزش یا طبعِ بشری کے تحت صادر ہونے والی کسی بات کا ذکر ہو تو اسے مسترد کرنا ضروری نہیں۔ اگر مؤرخ واقعات کی منطقی ترتیب کو برقرار رکھنے یا کسی اور ضرورت کے لیے اس روایت کو لینا چاہے تو تاویلِ صحیح کے ساتھ لے سکتا ہے۔

4. ضروری نہیں کہ ضعیف روایت کا مواد ہمیشہ جھوٹ ہو۔ قرائن کی تائید مہیا ہو تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ ④

5. اگر صحیح روایات سے کوئی بات مختصراً ثابت ہو اور بعض ضعیف روایات میں اسی اجمال کی تفصیل بیان ہوئی ہو تو ان ضعیف روایات کو ایک ثابت شدہ متن کی تفصیل کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جنگِ جمل، جنگِ صفین یا واقعۂ کربلا سے متعلق بعض باتیں صحیح روایات میں ہیں۔ کچھ ضعیف روایات میں انہی ثابت شدہ باتوں کی تفصیل آگئی ہے جو اصولِ دین یا روایاتِ صحیحہ سے متصادم نہیں، انہیں قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

① تاریخ ابن خلدون مقدمہ: ۱۳/۱

② المختصر فی علم التاریخ للکافیجی، ص ۷۱ ④ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۵ کا حاشیہ

③ فان الراوی الضعیف لا یکذب او یخطئ دائما فربما تقبل روایته اذا تأیدت بقرائن کما تقرر فی اصول الحدیث. (تکملة فتح الملهم مفتی محمد تقی عثمانی: ۵۰۱/۲)



❷ مواد کا سنداً ضعیف ہونا الگ بات ہے اور قابلِ اعتراض یا توہین آمیز ہونا الگ۔ کتبِ حدیث اور کتب تاریخ میں ضعیف مواد بکثرت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سارا مواد نا قابلِ قبول یا گستاخانہ ہے۔

یکساں قوت کی حامل متعارض روایات میں ترجیح کا بہترین طریقہ:

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ صحیح روایات سے متعارض ضعیف روایات کو قابلِ استدلال نہیں مانا جائے گا۔ اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی واقعے میں دو مختلف قسم کی روایات ملتی ہیں جو قوت وضعف میں بھی یکساں ہوتی ہیں۔ دونوں صحیح السند ہوتی ہیں یا دونوں ضعیف ہوتی ہیں۔ اسنادی لحاظ سے ترجیح دینے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ یہ مسئلہ زیادہ گھمبیر اس وقت ہو جاتا ہے جب ایک واقعے میں یکساں قوت کی کچھ روایات کسی صحابی کے کردار کو مثبت ظاہر کرتی ہیں اور اسی قوت کی کچھ روایات اسی واقعے میں اس صحابی کے کردار کو منفی انداز میں پیش کرتی ہیں۔ پس ایک ہی مسئلے میں یکساں قوت کی متعارض روایات میں سے ہم کسے قبول کریں اور کسے مسترد؟

سرسری نگاہ میں اس اختلاف کو حل کرنے کے چار طریقے ہو سکتے ہیں:

① ایک یہ کہ مثبت ومنفی دونوں قسم کی روایات کو مان لیا جائے۔ ایک ہی واقعے میں بیک وقت دو متضاد بیانات کو مان کر چلیں۔ اس طریقے کا خلافِ عقل ہونا بالکل ظاہر ہے۔ کوئی سمجھ دار انسان کسی بھی مسئلے میں ایسا نہیں کر سکتا۔

② دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں قسم کی روایات کو مسترد کر دیں۔ مگر یہ ایک غیر علمی طریقہ ہوگا۔ کیوں کہ دو متضاد بیانات میں یقیناً ایک درست اور ایک غلط ہوگا۔ دونوں کو مسترد کر دینا ایک سنجیدہ مسئلے سے محض جان چھڑانے والی بات ہے۔

③ تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو بیان صحابہ کی قرآنی تصویر کے خلاف ہو یعنی صحابہ کا کردار منفی ظاہر کرتا ہو اس کو مان لیا جائے اور جو قرآن مجید کی مطابقت کرتے ہوئے، صحابہ کی اچھی صفات کے حق میں جاتا ہو، اسے مسترد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے لیے یہ طریقہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ قرآن کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ کوئی معتدل مزاج غیر مسلم بھی اس طرز کو اختیار کرنا پسند نہیں کرے گا، کیوں کہ قرآنی علوم کی پختگی کو تو غیر مسلم بھی مانتے آئے ہیں۔ اس طریقے کو وہی اختیار کرے گا جسے کسی خاص وجہ سے صحابہ کرام سے عناد ہوگا۔

④ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ جو بیان قرآن مجید کے مطابق ہو، یعنی اصحابِ رسول کی قرآنی تصویر کی عکاسی کرتا ہو اسے قبول کر لیا جائے اور جو بیان اس کے خلاف ہو اس کو ترک کر دیا جائے۔

اگر غور کیا جائے تو یہی طریقہ سب سے آسان، واضح اور عقل وفہم سے قریب تر ہے۔ کیوں کہ اس سے تمام زیرِ بحث مسائل ایک حل تک پہنچائے جا سکتے ہیں۔ جبکہ دیگر طریقے تعصب یا جہل پر مبنی ہیں۔ یہ طریقے کسی حل تک پہنچانے کے بجائے مسئلے کو اور الجھا دیتے ہیں۔

طریقہ ④ کے بہتر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اسے قرآن مجید کی تائید حاصل ہے جو ایسی کتاب ہے

کہ جس کے مضامین کے سچے ہونے کا غیر مسلموں نے بھی اقرار کیا ہے۔ ہزاروں بڑے بڑے غیر مسلم دانشور قرآن مجید کے کتاب اللہ ہونے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی بہرحال اس کو تاریخی لحاظ سے ایک ایسی محفوظ ترین دستاویز مانتے آئے ہیں جس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ اس لیے قرآن مجید کا ساتھ دینے والے تاریخی مواد کو ایسی وجہ ترجیح حاصل ہے جو اس کی مخالف روایات کو حاصل نہیں۔

مطلق شیعی اور ناصبی راویوں کی روایات کی حیثیت:

یہاں ایک اہم مسئلہ ان راویوں کا ہے جنہیں مطلق شیعہ یا مطلق ناصبی کہا گیا ہے۔ ان کے بارے میں نہ تو غالی، متعصب، رافضی، کذاب یا دجال ہونے کی کھلی جرح ملتی ہے اور نہ ہی ان کی تعدیل منقول ہے۔ ہوسکتا ہے کہ محض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت دینے یا تفضیلی تشیع کی وجہ سے انہیں شیعہ کہا جاتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے وہ رافضی اور کذاب ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینے والے ناصبی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ فقط سیاسی موقف میں وہ اہلِ شام کے ہم خیال ہوں۔

خبر اور واقعات کی تحقیق کے قواعد وضوابط کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان حضرات کی روایات کو مشاجراتِ صحابہ کے باب میں ضرور مشکوک مانا جائے گا، بالخصوص اس وقت جبکہ راوی کے شیعی ہونے کے علاوہ بھی شبہے کے دیگر قرائن موجود ہوں۔ جب تک دیگر روایات یا قرائن سے تصدیق نہ ہو جائے، اس روایت کی توثیق نہیں کی جائے گی۔

ہم محدثین کا یہ قاعدہ بتا چکے ہیں کہ کسی بدعتی کی روایت جب اس کی بدعت کی تائید میں ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا؛ کیوں کہ غالب امکان یہ ہے کہ وہ تعصب سے کام لے کر کسی کمزور بات کو بلا تحقیق نقل کر رہا ہے یا اپنی طرف سے گھڑ کے پیش کر رہا ہے۔ یا صحیح مواد میں کچھ ملاوٹ کر کے دے رہا ہے۔ یہی شک اس موقع پر پیدا ہو جاتا ہے جب کسی ایک جماعت سے وابستگی رکھنے والا، دوسری جماعت کے اکابر کے خلاف کوئی منفی اور تعجب انگیز بات نقل کرے۔

اسی اصول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف سیاسی وفکری گروہ سے تعلق رکھنے والے مروانی یا ناصبی راویوں کی وہ روایات بھی مشکوک ہوں گی جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، سادات کرام یا بنوامیہ کے مقابلے میں آنے والے صحابہ کرام (مثلاً عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ) کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو، بالخصوص جبکہ اس روایت کے مشکوک ہونے کے دیگر قرائن بھی موجود ہوں۔

تحقیق کے یہ منصفانہ اصول سب کے لیے ناگزیر ہیں:

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہ اصول کسی خاص مکتب فکر کے کام کے ہیں یا بلا تفریق کے ہر کسی کے لیے مفید ہیں؟

تو عرض ہے کہ یہ منصفانہ اصول درحقیقت ہر اس شخص کو تحقیق میں مدد دیں گے جو انصاف پسند ہو۔ شیعہ و ناصبی حضرات ہی نہیں، بلکہ غیر مسلموں کو بھی ان اصولوں کا عقلی وزن محسوس کرنا چاہیے۔ اس بات کو ہر منصف مزاج شخص تسلیم کرے گا کہ ہر

تاریخی روایت کو آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مؤرخین کی ہر روایت بلا تاویل اور بلا تحقیق قابل قبول ہے چاہے وہ سنداً ضعیف ہو، چاہے اس میں صحابہ کرام کی کردار کشی ہو تو پھر تاریخی روایات کے اس جنگل میں حضرت علی، حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور بنو ہاشم اور دیگر ساداتِ کرام سے متعلق بھی عجیب، ناخوشگوار بلکہ توہین آمیز روایات مل جائیں گی تو کیا انہیں بھی من وعن تسلیم کر لیا جائے گا؟

چند مشہور ضعیف اور ثقہ راوی: ایک مختصر تعارف

ضعیف اور ثقہ راویوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان سب کی پہچان اعلیٰ پائے کے نقاد علماء ہی کر سکتے ہیں۔ تاہم علم رجال سے کسی قدر مناسبت پیدا کرنے کے لیے یہاں ایسے گیارہ راویوں کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے جن سے دورِ صحابہ سے متعلق تاریخی روایتوں کا بہت بڑا ذخیرہ منقول ہے:

① لُوط بن یحییٰ ابو مِخْنَف (م: ۱۵۷ھ)
② محمد بن سائب الکَلْبی (م: ۱۴۶ھ)
③ ھِشام بن محمد بن سائب الکَلْبی (م: ۲۰۴ھ)
④ محمد بن عمر الوَاقِدِی (م: ۲۰۷ھ)
⑤ عمر ابن شَبَّہ (م ۲۶۲ھ)
⑥ ابن شِھاب الزُّھْرِی (م: ۱۲۴ھ)
⑦ ابو الحسن المَدائِنی (م: ۲۲۵ھ)
⑧ محمد بن سعد (م: ۲۳۰ھ)
⑨ خلیفة بن خَیَّاط (م: ۲۴۰ھ)
⑩ محمد بن اسحاق (م: ۱۵۱ھ)
⑪ سَیْف بن عمر (م: ۱۸۰ھ)

چار کمزور ترین راوی:

ان میں سے شروع کے چار راوی: ابو مخنف، ابن سائب کلبی، ہشام کلبی اور واقدی نہایت ضعیف شمار ہوتے ہیں، ان کا ضعف اس حد تک ہے کہ انہیں روایات گھڑنے اور بے دریغ جھوٹ نقل کرنے (وضع اور کذب) میں ملوث مانا جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان میں سے تین تو ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک پکے شیعہ اور رافضی ہیں، یعنی: ابو مخنف، محمد بن سائب الکلبی اور ہشام کلبی..... واقدی کو ائمہ جرح و تعدیل کی اکثریت نے حدیث میں ناقابلِ اعتبار اور تاریخ میں بڑی حد تک قابلِ اعتماد مانا ہے۔ تاہم واقدی کی بہت سی روایات میں صحابہ کرام پر ایسے طعن ہیں جن کی تاویل

مشکل ہے۔ واقدی کی بعض روایات مستند ثقہ تاریخی روایات کے بھی خلاف ہیں۔

اب آپ ان چاروں راویوں کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے!

① ابومخنف لوط بن یحییٰ: (م ۱۵۷ھ)

اس کے متعلق ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شیعی، محترق، صاحب اخبار هم." (جلا بھنا شیعہ اور اُن کا خبر نگار ہے۔)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا یوثق به." (اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔)

ابن معین رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

"لیس بشئی." (اس کی کچھ حیثیت نہیں۔)[1]

② محمد بن سائب کلبی (م: ۱۴۶ھ)

اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"متهم بالكذب ورمی بالرفض." (اس پر کذب کا الزام ہے، رافضیت کا الزام بھی ہے۔)[2]

③ ہشام بن محمد کلبی: (م: ۲۰۴ھ)

اس کے بارے میں ابن عساکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"رافضی لیس بثقة." (رافضی ہے، نا قابل اعتماد ہے۔)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا یوثق به." (اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔)[3]

④ محمد بن عمر الواقدی (م: ۲۰۷ھ)

دوسری صدی ہجری کے تاریخی راویوں میں محمد بن عمر الواقدی کو سب سے زیادہ شہرت ملی ہے۔ ان کی کتب و رسائل میں کارآمد اور مفید مواد بھی بکثرت ہے مگر واقدی نے جمعِ روایات کے لیے کوئی معیار نہیں رکھا، اس لیے ان کے جمع شدہ مواد میں بہت سی عجیب وغریب خرافات اور جعلی روایات بھی شامل ہوگئی ہیں۔[4] اس نا قابلِ قبول مواد کی

① میزان الاعتدال للذهبی: ۴۱۹/۳

② تقریب التهذیب، ابن حجر عسقلانی، ترجمه نمبر: ۵۹۰۱

③ میزان الاعتدال: ۳۰۴/۴، سیر اعلام النبلاء: ۲۶۲/۹، ط الرسالة

④ واقدی کی کتب کا معیار بھی الگ الگ دکھائی دیتا ہے مثلاً المغازی جو واقدی کی سب سے ضخیم تالیف ہے اور تین بڑی جلدوں میں ہے، اعلیٰ پایے کی معلوم ہوتی ہے، اس کا اکثر مواد حدیث اور سیرت کے دیگر مآخذ سے بلکہ بعض جگہ صحیحین کی روایات کے مطابق ہے۔ جبکہ بعض کتب مثلاً الجمل، کتاب صفین جو مشاجرات سے متعلق ہیں، بالکل الگ طرز کی ہیں اور بکثرت مشکوک مواد سے آلودہ ہیں، اس لیے بعض محققین مثلاً علامہ زرکلی کے نزدیک ان کتب کی نسبت ہی واقدی کی طرف غلط ہے۔ البتہ کتاب المغازی، نیز طبقات ابن سعد میں مروی واقدی کی روایات کی نسبت واقدی کی طرف بلاشبہ درست ہے۔



کثرت کو دیکھتے ہوئے ائمہ جرح وتعدیل نے واقدی کے بارے میں سخت آراء پیش کی ہیں۔ [1]

ان آراء کو سامنے رکھتے ہوئے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نتیجے کے طور پر فرماتے ہیں:

"استقر الاجماع علی وهن الواقدی." (واقدی کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔) [2]

یاد رہے کہ تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور انساب الاشراف جیسی "تاریخی موسوعات" میں محمد کلبی، ہشام کلبی، ابو مخنف اور واقدی سے سینکڑوں روایات لی گئی ہیں جن میں سے بہت سی طعنِ صحابہ سے آلودہ ہیں۔ شیعہ، ناصبی، خوارج اور مستشرقین ان روایات کو بطورِ خاص پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ آج کل تاریخ کے جو طلبہ تحقیق کی بجائے سطحی مطالعے پر اکتفا کرتے ہیں وہ اکثر انہی چار افراد (ابو مخنف، اور واقدی) کی روایات کی وجہ سے صحابہ سے بدگمان ہوتے ہیں، حالاں کہ عدالتِ صحابہ کے خلاف یہ ضعیف روایات اصولاً قابلِ استدلال نہیں ہوسکتیں۔

باقی سات رواۃ کا حال:

اب باقی سات راویوں کے متعلق اصحابِ جرح وتعدیل کی آراء ملاحظہ ہوں:

⑤ عمر بن شَبَّہ (م ۲۶۲ ھ)

عمر بن شبّہ کی ولادت ۱۷۳ھ کی ہے، ۹۰ سال کے لگ بھگ عمر پا کر ۲۶۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس طرح ان گیارہ راویوں میں سے یہی سب سے آخر میں فوت ہونے والے ہیں۔ امام ابن ماجہؒ کے شیوخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں امام دارقطنی فرماتے ہیں: "ثقة"۔ یہی خطیب بغدادی کا قول ہے۔

ابن حبان نے بھی انہیں "ثقات" میں شمار کیا ہے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: "صدوق" [3]

---

① امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "هو كذاب يقلب الاحاديث." (وہ جھوٹا ہے، احادیث کو ادلتا بدلتا ہے۔) ابن معین کہتے ہیں: "ليس بثقة." (قابلِ اعتماد نہیں) لایکتب حدیثه. (اس کی روایت نہ لکھی جائے) امام نسائی فرماتے ہیں: "وضع الاحادیث." (روایات گھڑتا تھا۔) امام بخاری فرماتے ہیں: "متروک." (قابلِ ترک ہے۔) امام دارقطنی فرماتے ہیں: "فیه ضعف." ابن عدی کا کہنا تھا: "احادیثه غیر محفوظة. (اس کی روایات محفوظ نہیں) امام شافعی کی رائے ہے: "کتب الواقدی کذب." "واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔" (میزان الاعتدال: ۳/ ۶۶۲، ۶۶۳)

مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ واقدی کی ہر روایت کو آنکھیں بند کر کے یکسر جھٹلا دینا بھی کوئی انصاف کی بات نہیں۔ سیرت اور تاریخ صحابہ وتابعین میں واقدی کی روایات کو بڑے بڑے ائمہ نے لیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی مسند میں سیر ومغازی سے متعلق ایک پورا باب واقدی کی مرویات پر مشتمل ہے۔ یہی نہیں بلکہ احکام میں بھی امام شافعیؒ نے واقدی کی بعض مرویات سے استفادہ کیا ہے۔ (مسند الشافعی، باب ومن کتاب السیر علی سیر الواقدی، ص ۳۵۳)

اسی طرح امام طحاوی نے احادیث وفقہ کے کئی دقیق مباحث حل کرنے میں واقدی کے اقوال سے توابع کے طور پر مدد لی ہے۔ (شرح معانی الآثار، ح: ۶؛ شرح مشکل الآثار، ح: ۳۲، ۱۴۸۷، ۲۱۹۸، ۲۳۷۸)

واقدی پر جرح ہے تو تعدیل بھی کی گئی ہے۔ حافظ ذہبی واقدی کے بارے میں ائمہ کے اقوال نقل کر کے فرماتے ہیں:

ومع هذا فلا یستغنی عنه فی المغازی وایام الصحابة واخبارهم.

"ان تمام باتوں کے باوجود مغازی اور صحابہ کی تاریخ میں واقدی سے استغنا نہیں برتا جاسکتا۔" (سیر اعلام النبلاء: ۹/ ۴۵۵، ط الرسالة)

ساری بحث کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ واقدی کو ایک ضعیف راوی مانا گیا ہے۔ ان کی روایات سے بعض شرائط کے تحت استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ضعیف راویوں کی روایات کو کن شرائط کے تحت قبول اور کن صورتوں میں مسترد کیا جائے گا؟ اس پر ہم حصہ اول کے شروع میں مختصر اور حصہ دوم کے آغاز میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

② تهذیب التهذیب: ۷/ ۴۶۰؛ الجرح والتعدیل: تر ۷۲۳؛ تهذیب الکمال: ۲۱/ ۳۹۰

⑥ امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ (م: ۱۲۴ھ)

ابن شہاب الزہری ان راویوں میں سب سے پہلے ہیں۔ان کی ولادت ۵۸ھ کی ہے۔ان کا شمار سنت کے بڑے ائمہ اور سیرت و تاریخ کے بڑے بڑے حافظوں میں ہوتا ہے۔سنت کا بہت بڑا ذخیرہ ان سے نقل ہوا ہے۔امام بخاری اور امام مسلم نے بھی ان سے روایات لی ہیں۔بعض حضرات نے ان پر جرح کی ہے مگر جمہور نے انہیں ثقہ مانا ہے۔[①]

تاہم ان کی بعض روایات میں یہ چیز قابلِ غور ہے کہ وہ اپنی پیدائش (۵۸ھ) سے بھی پہلے رونما ہونے والے بہت سے واقعات براہِ راست نقل کرتے ہیں مثلاً: سیرتِ نبویہ اور دورِ خلافت راشدہ کے حالات، جنگ جمل، صفین اور تحکیم کے واقعات۔امام زہری رحمہ اللہ بسا اوقات اس راوی کا ذکر نہیں کرتے جس سے انہوں نے روایت سنی ہو۔اصول محدثین کے تحت ایسی روایت کو مرسل یا منقطع کہا جاتا ہے،اور ان کی اسنادی حیثیت کم زور ہو جاتی ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ تاریخی جزئیات میں اکثر ضعیف روایات بھی قابلِ قبول ہیں،لیکن اگر کسی ضعیف روایت میں کوئی چیز عجیب یا خلافِ معمول محسوس ہو تو اس پر بلا تأمل یقین بھی نہیں کیا جا سکتا۔امام زہری کی بعض روایات میں صحابہ کے متعلق کچھ عجیب چیزیں بھی مذکور ہیں۔اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ جب زہری رحمہ اللہ خود یہ حالات دیکھ نہیں سکے تھے تو انہوں نے کس سے سن کر یہ باتیں نقل کیں۔انہوں نے خود یہ بات واضح نہیں کی،پس بعد والوں کے لیے راوی کی تحقیق ممکن نہیں۔اس طرح سند مرسل یا منقطع ہو جاتی ہے اور اس میں کسی قدر ضعف ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی لیے مشہور محدث یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ فرماتے تھے:''زہری کی مرسل روایات کی مثال ہوا جیسی ہے۔''[②]

⑦ ابوالحسن المدائنی،علی بن محمد (م:۲۲۵ھ)

ابن معین رحمہ اللہ انہیں "ثقہ" کہتے ہیں،حافظ ذہبی رحمہ اللہ "الحافظ، الصادق، صدوق." کہہ کر یاد کرتے ہیں۔[③] تاریخی روایات پر ان کے درجنوں رسائل تھے مگر تقریباً سبھی نایاب ہو گئے۔

---

① قال الذھبی: الامام، العَلَم حافظ زمانه. (سیر اعلام النبلاء: ۵/۳۲۶)

② کان یحییٰ بن سعید القطان لایری ارسال الزھری وقتادۃ شیئا ویقول: ھو بمنزلة الریح. (الجرح والتعدیل: ۱/۲۴۶)

یہاں ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ ابن شہاب الزہری سے منقول سنن واحکام کی روایات کی طرح ان کی اکثر تاریخی روایات بھی معتبر ہیں اگرچہ وہ مرسل ہوں۔ ہم صرف ایسی روایات کو محلِ نظر کہہ رہے ہیں جن میں صحابہ پر طعن کا پہلو نکلتا ہو۔سند کے ضعف اور طعن کے پہلو کو دیکھ کر معاملہ قابلِ تحقیق ہو جاتا ہے۔

نیز اسلاف نے امام زہری کی بعض ایسی صحیح اور متصل الاسناد روایات کو بھی وہم پر محمول کیا ہے جو دیگر ثقہ راویوں کے بیان سے متعارض ہیں،مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے میں چھ ماہ تاخیر کرنا صحیح بخاری میں امام زہری سے بسند متصل منقول ہے۔(باب غزوۃ خیبر،حدیث نمبر:۴۲۴۰) مگر محققین نے اسے راوی کے وہم پر محمول کیا ہے۔ (فتح الباری: ۷/۴۹۵،ط المعرفه) کیوں کہ دیگر ثقہ راویوں سے منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً بیعت کر لی تھی۔ (عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ، مستدرک حاکم،ح: ۴۴۵۷؛ السنن الکبریٰ للبیهقی،ح: ۱۶۵۳۸)

بہر کیف ابن شہاب الزہری کی عام روایات پر (خصوصاً وہ جو سند متصل سے منقول ہوں) شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔بعض حضرات نے اس معاملے میں یہاں تک تشدد اختیار کیا ہے کہ ابن شہاب کو چھپا ہوا تقیہ باز رافضی قرار دے کر ان کی ایسی بعض متصل روایات کو بھی جعلی کہہ دیا ہے جو امام بخاری نے پیش کی ہیں۔مثلاً حدیث قرطاس وقلم جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد: "عندنا کتاب اللہ حسبنا" منقول ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب العلم،ح: ۱۱۴)

اس قسم کی "تحقیقات" کو انکار حدیث کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے۔

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۴۰۱۔۔۔نوٹ: ابوالحسن المدائنی علی بن حفص (م۲۰۱ھ) جو امام احمد بن حنبل اور ابوبکر بن ابی شیبہ کے شیخ ہیں،الگ شخصیت ہیں۔

⑧ محمد بن سعد رحمہ اللہ (م: ۲۳۰ھ)

انہیں بھی ثقہ مانا گیا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تعارف کراتے ہوئے انہیں "الحافظ، العلامة، الحجة" کے القاب سے یاد کیا ہے اور ابن ابی حاتم کے حوالے سے انہیں ''صدوق'' بتایا ہے۔[①]

سیرتِ نبویہ اور تاریخِ صحابہ وتابعین پر مشتمل ان کی شہرۂ آفاق تالیف ''الطبقات الکبریٰ'' اسلامی تاریخ کا سب سے قدیم مأخذ ہے جس سے بعد والے ہر سیرت نگار اور مؤرخ نے استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کی روایات کا اکثر حصہ واقدی سے منقول ہے، حالاں کہ ایسا نہیں۔ انہوں نے ساٹھ مشایخ سے روایات نقل کی ہیں۔ پس واقدی کو چھوڑ کر ثقہ راویوں سے ان کی روایات قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ جو روایات واقدی سے لی ہیں وہ سند کے ضعف کی وجہ سے کم از کم محلِ نظر ضرور ہوں گی۔

⑨ خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ (م: ۲۴۰ھ)

یہ نہایت ثقہ مؤرخ اور انتہائی قابلِ اعتماد راوی ہیں، بہت چھان بین کر کے اکثر صحیح یا حسن سند سے روایات لاتے ہیں۔ ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صدوق، متیقظ الرواة.'' (سچے اور چوکنا راوی۔)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان سے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں سات سے زائد روایات نقل کی ہیں۔ بہت سچے اور سیرت، تاریخ اور رجال کے امام ہیں۔''[②]

⑩ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ (م: ۱۵۱ھ)

محمد بن اسحٰق پر امام مالک رحمہ اللہ اور امام دارقطنی رحمہ اللہ نے سخت جرح کی ہے مگر جمہور محدثین نے انہیں سیرت وتاریخ میں قابلِ اعتماد مانا ہے۔ ابن حبان نے ان کا ذکر ''الثقات'' میں کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے انہیں ''صدوق'' اور حافظ ذہبی نے ''صالح الحدیث'' قرار دیا ہے۔[③]

⑪ سیف بن عمر (م: ۱۸۰ھ)

ابن عدی رحمہ اللہ نے ان کی حدیث کو منکر اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے انہیں متروک راوی قرار دیا ہے مگر جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے تو سیف بن عمر کی وہ تاریخی روایات جو نکارت اور طعنِ صحابہ سے پاک ہیں، معتبر ہیں۔[④]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سیف بن عمر کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کی بحث کا خلاصہ یوں نکالا ہے:

"ضعیف فی الحدیث، عمدة فی التاریخ." (حدیث میں ضعیف اور تاریخ میں قابلِ اعتماد۔)[⑤]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۶۶۵/۱۰، ط الرسالۃ

② سیر اعلام النبلاء: ۴۷۳/۱۱، ط الرسالۃ ③ تقریب التہذیب، نمبر: ۵۷۲۵؛ میزان الاعتدال: ۴۶۹/۳

④ محمد بن اسحٰق اور سیف بن عمر دونوں متنازعہ ہیں مگر ضعف کے باوجود ان کی روایات کا اکثر حصہ صحیح احادیث اور ثقہ مؤرخین کی تاریخی روایتوں کا ساتھ دیتا ہے لہٰذا وہ تاریخی حیثیت سے قابلِ قبول ہے۔ ہاں جو روایات عصمتِ انبیاء، عدالتِ صحابہ یا مسلّمات کی روایات سے متصادم ہوں، انہیں رد کر دیا جائے گا۔

⑤ تقریب التہذیب، نمبر: ۲۷۲۴

اسی لیے ابن عساکر، علامہ ذہبی اور ابن خلدون رحمہم اللہ جیسے محققین نے سیف بن عمر کی بیشتر روایات کو قبول کیا ہے۔

اگر چہ سیف بن عمر کی بعض روایات کے بعض حصے عدالتِ صحابہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے نکارت پر مبنی ہیں مگر اکثر روایات بابِ مشاجرات میں نہ صرف یہ کہ صحابہ کرام کا دفاع کرتی ہیں بلکہ جعل ساز خبر نگاروں کی ملاوٹی روایات کا پردہ بھی چاک کرتی ہیں۔ یہی روایات عبداللہ بن سبا کی نقاب کشائی کر کے منافقین کی کاریوں کو کھولتی ہیں۔

اہلِ تشیع اور مستشرقین سیف بن عمر کی روایات کو بڑے شد و مد سے مسترد کرتے ہیں کیوں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے عہدِ مشاجرات تک اکثر جگہ سیف ابن عمر نے حقائق نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ واقدی اور سیف کی روایات کئی جگہ باہم متعارض نظر آتی ہیں۔ سیف بن عمر کی روایات بتاتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جو فساد ہو رہا تھا اس کے پیچھے ابن سبا کی سازش کار فرما تھی۔ اس کے برخلاف واقدی کی روایات بتاتی ہیں کہ ان کے خلاف سازش میں اصل کردار حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت مُعاویہ اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کا تھا۔ اب دو راویوں کی ان دو داستانوں میں سے یقیناً ایک سچی اور ایک بالکل جھوٹی ہے۔ اب سیف کو سچا مانیں یا واقدی کو۔ تو ہمارے پاس سچ کا معیار جانچنے کا آسمانی ترازو قرآنِ مجید موجود ہے، دیکھ لیا جائے کہ کونسی روایات قرآنِ کریم کی ان نصوص سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں جو صحابہ کرام کے حق میں وارد ہیں۔

مؤلفینِ حدیث کی تاریخی روایات

سیرتِ نبویہ اور صحابہ کرام کی تاریخ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہمیں محدثین کرام کی وساطت سے پہنچا ہے۔ ان میں امام بخاری، امام مسلم اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے حضرات بھی ہیں جن کے حدیثی مجموعوں میں تاریخ وسیر کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ان کی ثقاہت پر تمام اُمت متفق ہے۔ ان کے علاوہ تین محدثین: ابوبکر ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق صنعانی اور حاکم نیشاپوری رحمہم اللہ کا کام بھی بہت اہم ہے جنہوں نے احادیثِ نبویہ اور آثارِ صحابہ کے ضخیم مجموعے پیش کیے ہیں جن سے علمائے اسلام نے ہر دور میں بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ذیل میں ان تینوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

① امام ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ:

ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کے متعلق حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امام، جلیل القدر، حفاظ کے سردار، عظیم الشان کتب کے مؤلف...... وہ عمر، ولادت اور حافظے میں احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور علی بن مدینی کے ساتھی تھے۔''[1]

امام ابوبکر ابن ابی شیبہؒ نے عبداللہ بن مبارک، وکیع بن جراح اور سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ جیسے نامور محدثین سے علم حاصل کیا۔ ان کے تلامذہ میں امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ جیسے جبالِ علم شامل تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ انہیں

① "الامام العلم، سيد الحفاظ، صاحب الكتب الكبار ... وهو من اقران احمد بن حنبل، واسحق بن راهويه وعلى بن المديني في السن والمولد والحفظ. (سير اعلام النبلاء: ١١/١٢٢، ط الرسالة)

"صدوق" قرار دیتے تھے۔ علامہ عجلی رحمہ اللہ انہیں ثقہ اور حافظِ حدیث کہتے تھے۔ علامہ ابو عبید رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"حدیث کا انحصار چار افراد پر ہے جن میں سب سے بڑے راوی ابوبکر بن ابی شیبہ، سب سے بڑے فقیہ احمد بن حنبل، سب سے زیادہ روایات کے جامع یحییٰ بن معین اور سب سے بڑے عالم علی بن مدینی ہیں۔" ①

ان کا مجموعۂ روایات "مُصَنَّف ابن ابی شیبہ" حدیث کے قدیم اور ضخیم ترین مجموعوں میں سے ہے جس میں تقریباً ۳۸ ہزار روایات ہیں۔ سنتِ نبویہ اور آثارِ صحابہ کے اس بحرِ ذخار میں ہر موضوع پر بکثرت اور مفید روایات موجود ہیں۔ ②

③ امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی رحمہ اللہ:

مصنف عبدالرزاق کے مؤلف، امام عبدالرزاق بن ہمام رحمہ اللہ دوسری صدی ہجری میں یمن کے سب سے بڑے محدث اور ثقہ راوی تھے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی رحمہم اللہ جیسے ائمہ ان کے تلامذہ تھے اور فقہ میں بھی ان پر اعتماد کرتے تھے۔ ③ حافظ ذہبیؒ کے بقول: "**احد الاعلام الثقات**" اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول: "**احد ائمة الاعلام الحفاظ**" تھے۔ ④

④ امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ:

مستدرک حاکم کے مؤلف امام حاکم نیشاپوری چوتھی صدی ہجری کے عظیم محدثین میں سے ایک تھے۔ امام دارقطنی نے ان کا استاذ ہو کر بھی ان سے سماعِ حدیث کیا تھا۔ ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ ان کے شاگرد تھے۔ ⑤

امام حاکم رحمہ اللہ اور امام عبدالرزاق صنعانی رحمہ اللہ پر رفض کا الزام:

واضح رہے کہ آج کل بعض حضرات امام حاکمؒ اور امام عبدالرزاقؒ کو بے دھڑک "شیعہ" بلکہ رافضی تک کہہ دیتے ہیں۔ طرّہ یہ کہ اس پر اُمت کا "اجماع" بھی بتاتے ہیں اور یہ جھوٹا دعویٰ بھی کر جاتے ہیں کہ "حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی ان دونوں حضرات کو رافضی کہا ہے اور حاکم کے بارے میں تو یہاں تک لکھا ہے: **رافضی خبیث**۔"

مگر یہ دعویٰ بالکل جھوٹا ہے۔ حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے ان دونوں بزرگوں میں سے کسی پر ہرگز ایسا الزام نہیں لگایا بلکہ دوسروں کے الزامات ذکر کر کے ان کی تردید کی ہے اور ان حضرات کے ثقہ ہونے پر اُمت کا اجماع بتایا ہے۔

حافظ ذہبیؒ امام حاکمؒ کا تذکرہ یوں شروع کرتے ہیں: "**الامام، الحافظ، الناقد، العلامة، شیخ المحدثین.**" ⑥

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۲۲/۱۱، ط الرسالۃ

② راقم نے "مُصَنَّف ابن ابی شیبہ" کی آخری جلد سے زیادہ استفادہ کیا ہے جہاں جنگِ جمل و جنگِ صفین اور خوارج سے متعلق روایات ہیں۔ میں نے روایات نمبر کا حوالہ دیا ہے لیکن نسخوں کے اختلاف کی وجہ سے پھر بھی مواد ڈھونڈنے میں دشواری ہو تو اکثر مطلوبہ روایات آخری جلد کے آخری ابواب میں مل جائیں گی۔

③ سیر اعلام النبلاء: ۵۶۴/۹ ط الرسالۃ

④ میزان الاعتدال: ۶۰۹/۲؛ لسان المیزان: ۴۸۷/۷

⑤ تاریخ الاسلام للذهبی: ۱۲۳/۲۸، ط: محمد بن عبدالله الحاکم النیسابوری ۔۔۔ یاد رہے کہ انہی کے ہم نام و ہم مقام ابو احمد حاکم نیشاپوری (م ۳۷۸ھ) بھی گزرے ہیں جنہیں "حاکم کبیر" کہا جاتا ہے۔ ان کی کتب "شعار اصحاب الحدیث"، "عوالی مالک"، "فوائد ابی احمد الحاکم" مشہور ہیں (سیر اعلام النبلاء: ۳۷۰/۱۶)

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۱۶۳/۱۷

حافظ ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں حاکم کے ثقہ ہونے سے متعلق ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال نقل کرنے کے بعد الخطیب ابوبکر کا قول: ''کان یمیل الی التشیع .'' پھر ابواسماعیل انصاری کی جرح: ''رافضی خبیث'' اور پھر ابن طاہر کی رائے: ''کان شدید التعصب للشیعۃ فی الباطن و کان یظهر السنن .'' نقل تو کرتے ہیں، مگران الزامات کو وہ ہرگز قبول نہیں کرتے بلکہ اسے تشدد پر محمول کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اما انحرافه عن خصوم علیّ فظاهر، اما امر الشیخین فمعظم لهما بكل حال. فهو شیعی لا رافضی.

(حاکم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین سے نالاں ہونا تو ظاہر ہے مگر جہاں تک حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا معاملہ ہے، وہ ان کی بہر حال تعظیم کرتے تھے۔ پس وہ شیعی تھے، رافضی نہیں۔)[1]

سیر اعلام النبلاء میں فرماتے ہیں: ''کلا لیس هو رافضیا بل یتشیعّ.'' (وہ رافضی ہرگز نہ تھے بلکہ شیعی تھے۔)

ابوسعد مالینی نامی ایک عالم نے دعویٰ کیا تھا کہ مستدرک میں کوئی روایت بخاری ومسلم کی شرط پر نہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے ابوسعد کی تردید کرتے ہوئے کہا: ''یہ ضد اور غلو ہے۔ ابوسعد کا یہ مقام نہیں کہ وہ اس کا فیصلہ کر سکے۔''

پھر مستدرک حاکم کے بارے میں نہایت معتدل رائے دیتے ہوئے بتایا:

''اس کا لگ بھگ تہائی حصہ بخاری ومسلم یا دونوں میں سے کسی ایک کی شرط پر ہے اگرچہ اسناد میں دقیق ومؤثر علتیں بھی ہیں، چوتھائی حصہ حسن اور جید الاسناد ہے، باقی منکر اور عجیب روایات ہیں، جن میں سو کے قریب موضوع ہیں جنہیں میں نے الگ رسالے میں جمع کر دیا ہے۔ بہر حال مستدرک ایک مفید کتاب ہے جس کا میں نے خلاصہ بھی مرتب کیا ہے۔''[2]

حافظ ذہبیؒ اس الزام کو پرزور انداز میں مسترد کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ کی قسم اعباس اپنی قسم میں جھوٹا ہے، اس نے بہت برا کہا، ایسے شیخ الاسلام اور محدث وقت پر الزام لگایا

اب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے ملاحظہ ہو، وہ امام حاکمؒ کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''امام صدوق''

پھر ان پر الزامات کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اللہ کو انصاف پسند ہے، یہ صاحب رافضی نہیں فقط شیعی تھے۔''[3]

پھر فرماتے ہیں: ''حاکم کی شان اس سے کہیں بلند وبالا اور عظیم ہے کہ انہیں ضعیف راویوں میں شمار کیا جائے۔''[4]

اسی طرح امام عبدالرزاقؒ کو جن کی کنیت ''ابوبکر'' ہی ان کے صحیح العقیدہ ہونے کا ثبوت ہے، رافضی سمجھنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ امام عبدالرزاق صنعانیؒ کا مقام یہ تھا کہ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور علی بن مدینی رحمہم اللہ جیسے ناقدین حدیث ان کے تلامذہ تھے۔ حافظ ذہبیؒ انہیں فقط ''شیعی'' مانتے ہیں اور ان کا دفاع بھی کرتے ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ: ۱۶۵/۳، ۱۶۶، ط العلمیۃ [2] سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۱۷۴، ۱۷۵، ط الرسالۃ

[3] "ان الله یحب الانصاف. ما الرجل برافضی بل شیعی فقط." لسان المیزان: ۲۳۳/۵ (شیعی اور رافضی کا فرق آگے آ رہا ہے۔)

[4] "والحاکم اجل قدراً واعظم خطراً واکبر ذکراً من ان یذکر فی الضعفاء. (لسان المیزان: ۲۳۳/۵)

ایک عالم عباس بن عبدالعظیم نے امام عبدالرزاق رحمہ اللہ کی کردار کشی کرتے ہوئے لکھ دیا تھا:

"اللہ کی قسم! عبدالرزاق کذاب ہے اور واقدی اس سے زیادہ سچا ہے۔"

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس الزام کو پرزور انداز میں مسترد کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ کی قسم! عباس اپنی قسم میں جھوٹا ہے، اس نے بہت برا کہا، ایسے شیخ الاسلام اور محدث وقت پر الزام لگایا جس سے صحاح کے تمام مؤلفین نے دلیل لی ہے، اگرچہ عبدالرزاق کے کچھ غلط وہم بھی ہیں اور کچھ دوسرے حضرات حدیث میں ان سے زیادہ ماہر ہیں مگر جو ان پر کذب کی تہمت لگاتا ہے اور واقدی کو جس کے متروک ہونے پر حفاظ کا اجماع ہے، ان پر ترجیح دیتا ہے وہ اپنے قول میں ایک یقینی اجماع کی مخالفت کر رہا ہے۔" [1]

بعض حضرات عبدالرزاق بن ہمام کے رافضی ہونے کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر تک سننا پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے: "لَا تُقَذِّرُ مَجْلِسَنَا بِذِكْرِ وَلَدِ اَبِیْ سُفْيَان." (ہماری مجالس کو ابوسفیان کے بیٹے کے ذکر سے آلودہ نہ کرو۔) مگر درحقیقت عبدالرزاق بن ہمام کے متعلق یہ بات فقط محمد بن اسحٰق بن یزید بصری نامی شخص سے منقول ہے جو مجہول ہے۔ اس ایک روایت کے سوا اس کا نام ونشان بھی کہیں نہیں ملتا۔ [2]

خود امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اپنی مُصَنَّف میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعدد احادیث نقل کی ہیں اور اپنے تلامذہ کے توسط سے اُمت تک حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا علمی فیض پہنچاتے رہے ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ محمد بن اسحٰق بن یزید کی یہ روایت جھوٹی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی عبدالرزاق کو تشیع میں مبالغے سے بری تسلیم کیا ہے۔ جب ان کے صاحبزادے نے ان سے پوچھا: "کیا عبدالرزاق تشیع میں مبالغہ کرتے تھے؟"

تو امام احمدؒ نے جواب دیا: "میں نے ان سے ایسا کچھ نہیں سنا۔ ہاں وہ خبروں اور واقعات کو پسند کرتے تھے۔" [3]

شیعی اور رافضی میں فرق:

شیعہ ایسے لوگوں کو کہا جاتا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آلِ نبی کے سیاسی حامی، عقیدت مند اور مداح تھے۔

جبکہ رافضی کا اطلاق ان شیعوں پر ہوتا ہے جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ [4]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۹/۵۷۱، ۵۷۲، ط الرسالة

② ممکن ہے کہ یہ محمد بن اسحاق بن یزید الصینی (م ۲۳۶ھ) ہو جو ضعیف ہے بلکہ بعض ائمہ جرح وتعدیل نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ (تاریخ بغداد: ۱/۲۵۴، ط العلمیہ) صین بصرہ کے قریبی شہر واسط کا مضافاتی قریہ ہے۔ (توضیح المشتبہ: ۵/۴۴۶) ممکن ہے اس مناسبت سے صینی کو بصری بھی کہا جاتا ہو۔

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۱۶۴، ۱۶۵، ط الرسالة

④ لغت میں شیعہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: فالشیعة قوم یهوون هوی عترة النبی ﷺ ویوالونهم.

"شیعہ وہ گروہ ہیں جو حضور ﷺ کی اولاد سے محبت کرتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں۔" (لسان العرب: ۸/۱۸۹)

وقد غلب هذا الاسم علی کل من یتولی علیا واهل بیته حتی صار لهم اسما خاصا.

"اس لفظ کا اطلاق ہر اس گروہ پر ہونے لگا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کا حامی تھا۔ یہاں تک کہ یہ انہی کا خاص نام ہو گیا۔" (اصول مذهب الشیعة الامامیة الاثنی عشریة عرض ونقد، للدکتور ناصر بن عبدالله القفاری: ۱/۳۱)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "شیعہ" کی اصطلاحی تعریف یوں کرتے ہیں:

"متقدمین کی تعریف کے مطابق شیعہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے، مشاجرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصیب اور ان کے مخالفین کے خطئی ہونے اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی سب صحابہ پر ترجیح اور افضل ترین ہونے کا اعتقاد رکھا جائے۔"①

یہی بات تمام جلیل القدر علماء نے لکھی ہے۔ انتہائی نقاد عالم امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ منہاج السنہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ ساتھی تھے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے افضل سے مانتے تھے۔ (جمہور مسلمین سے ان کا) اختلاف صرف اس بات پر تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے تھے۔ اس وقت کوئی ایسا نہ تھا جسے امامی یا رافضی کہا جاتا۔"②

رافضی اور شیعہ میں فرق، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تشریح:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "شیعہ" اور "رافضی" میں فرق کی بہت عمدہ وضاحت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ شیعانِ علی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نظریے پر حرف بحرف عمل پیرا تھے، شیعہ اولیٰ کہلاتے تھے۔ جمہور مسلمین

① فالتشیع فی عرف المتقدمین هو اعتقاد تفضیل علیؑ علیٰ عثمان وان علیا کان مصیبا فی حروبه و ان مخالفه مخطئی مع تقدیم الشیخین و تفضیلهما. (تهذیب التهذیب: ۱/۹۴)

ایک دلچسپ واقعہ

ایک گروہ مشاجرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاطی، ان کے رفقائے کرام کو باغی جبکہ اہلِ شام کو برحق اور مصیب مانتا ہے اور ساتھ ہی اہلِ سنت کا حقیقی ترجمان ہونے کا دعوے دار بھی ہے۔ اس گروہ کے ایک صاحب آکر راقم سے فرمانے لگے: "حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشاجرات میں مصیب اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطئی ماننا شیعوں کا عقیدہ ہے، اہلِ سنت کا ہرگز نہیں۔" راقم نے اس کی دلیل مانگی تو بڑے جوش سے فرمایا: "تہذیب التہذیب" میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

فالتشیع فی عرف المتقدمین هو اعتقاد تفضیل علیؑ علیٰ عثمان وان علیا کان مصیبا فی حروبه و ان مخالفه مخطئی."

راقم نے پوچھا: "آپ کے خیال میں اس تعریف کا ہر جزو اہلِ سنت کے عقیدے کے خلاف ہے یا بعض حصہ؟"

فرمانے لگے: "جو شیعوں کا عقیدہ ہے وہ اہلِ سنت کا عقیدہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہر ہر جزو ہمارے عقیدے کے خلاف ہے۔"

میں نے انہیں "تہذیب التہذیب" دکھا کر کہا: "آپ کے بڑوں نے حافظ ابن حجر کی عبارت کے آخری الفاظ حذف کر دیے ہیں۔ وہ بھی پڑھیے: مع تقدیم الشیخین و تفضیلهما ...... کیا اہلِ سنت ہونے کے لیے اس جزو سے بھی اختلاف کرنا ہوگا؟ اگر کوئی "لا اله الا الله محمد رسول الله علی ولی الله ووصی رسول الله" کو اپنا کلمہ کہے تو کیا اہلِ سنت ہونے کے لیے نعوذ باللہ ہمیں لا اله الا الله کا انکار کر دینا ہوگا؟؟"

وہ چپ ہو گئے تو راقم نے کہا: "جس طرح اس تعریف میں "مع تقدیم الشیخین و تفضیلهما" اہلِ سنت اور شیعانِ متقدمین دونوں کے ہاں اتفاقی ہے، اسی طرح "ان علیا کان مصیبا فی حروبه و ان مخالفه مخطئی." بھی دونوں کے ہاں اتفاقی ہے۔ جس کی دلیل ائمہ اہل سنت کی درجنوں عبارات ہیں۔ اختلاف "تفضیل علیؑ علیٰ عثمان" میں ہے۔ پھر راقم نے انہیں حافظ ابن حجر ہی کی عبارت دکھادی: وفی قوله ﷺ: "تقتل عمارا الفئة الباغیة" دلالة واضحة علیٰ انّ علیاً ومن معه کانوا علی الحق وان من قاتلهم کانوا مخطئین فی تاویلهم ...... (فتح الباری، ابن حجر عسقلانی: ۶/۶۱۹، ط دار المعرفة) پھر ان سے کہا: "جس عقیدے کی آپ ترجمانی کر رہے ہیں، خود حافظ ابن حجر اسے ناصبیوں کا عقیدہ قرار دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انہیں حافظ ابن حجر کی درج ذیل عبارت دکھائی: وفی هذا الحدیث علم من اعلام النبوة وفضیلة ظاهرة لعلیّ وعمار و ردّ علی النواصب الزاعمین ان علیاً لم یکن مصیبا فی حروبه. "اس حدیث میں نبوت کی نشانی، علی اور عمار رضی اللہ عنہما کی فضیلت کا اظہار اور ناصبیوں پر رد ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں برحق نہ تھے۔" (فتح الباری: ۱/۵۴۳)

وہ صاحب نہایت پریشانی کے عالم میں یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ "آج پتا چلا کہ اندر سے حافظ ابن حجر بھی تقیہ باز شیعہ تھے۔"

② وکانت الشیعة اصحاب علیؑ یقدمون علیه ابابکر وعمر، وانما کان النزاع فی تقدمه علیٰ عثمان ولم یکن حینئذ یسمیٰ احد امامیا ولا رافضیا. (منهاج السنة النبویة لابن تیمیة الحرانی: ۲/۹۶، ط الجامعة الامام محمد بن سعود)



سے ان کا اختلاف فقط اس بات پر تھا کہ جمہور کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ جبکہ شیعہ اولیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے تھے۔ یہ ایک فروعی نزاع تھا جو جمہور کے نزدیک ایسا نہ تھا کہ اس کی وجہ سے شیعہ اولیٰ کو گمراہ یا بدعتی قرار دیا جاتا۔ بلکہ انہیں اہلِ سنت ہی کا ایک گروہ سمجھا جاتا تھا۔[1]

اس دور میں کچھ شیعہ ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ سے افضل مانتے تھے مگر خلفائے ثلاثہ سمیت سب کا احترام کرتے تھے اور کسی صحابی پر تبرا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں شیعہ تفضیلیہ کہا جاتا تھا۔ مسئلہ تفضیل کے سوا ان کا شیعہ اولیٰ سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مگر جب روافض نے خود کو شیعہ کہلوانا شروع کیا تو شیعانِ اولیٰ اور شیعہ تفضیلیہ نے بھی اہلِ سنت والجماعت کا لقب اختیار کر لیا تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"تاریخ کی قدیم کتابوں میں اساطین اہل سنت کے لیے جو یہ الفاظ: "فلان من الشیعۃ" مذکور ہیں تو یہ الفاظ اپنی جگہ درست ہیں کیوں کہ پہلے ایسے حضرات شیعان اولیٰ کا یہ لقب تھا...... اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ یہ حضرات مذکورین ایسے شیعہ ہرگز نہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رفاقت کے سبب شیعان علی کہلاتے تھے۔"[2]

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ ایک عام مفہوم ہے اور رافضی خاص۔ ہر رافضی شیعہ ہوتا ہے مگر ہر شیعہ رافضی نہیں ہوتا۔ آج کل شیعوں میں رافضی زیادہ ہیں جبکہ قرونِ اولیٰ میں اس کے برعکس رافضی کم تھے اور عام شیعہ زیادہ۔ پس اگر اصحابِ جرح و تعدیل نے حاکم یا عبدالرزاق رحمہ اللہ کو "شیعی" کہا بھی ہے تو اس کا مطلب آج کل جیسا اثنا عشری یا اسماعیلی قسم کا شیعہ نہیں۔ اُس وقت ایک بڑی تعداد بس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر ماننے کے باعث شیعہ کہلاتی تھی۔ امام عبدالرزاق رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ کا تشیع بھی اس سے زیادہ نہ تھا۔ لہٰذا جمہور علماء کے نزدیک امام حاکم رحمہ اللہ اور امام عبدالرزاق رحمہ اللہ شیعی ہونے کے باوجود بالاتفاق ثقہ مانے گئے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بھی متعدد راوی شیعی ملیں گے مگر اس کے باوجود وہ ثقہ شمار کیے جاتے ہیں۔[3]

☆☆☆

---

[1] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: هذه المسئلة، مسئلة عثمان و علیؓ، ليست من الاصول التي يضلل المخالف فيها عند جمهور اهل السنة.
"یہ مسئلہ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا مسئلہ، ان اصولی مسائل میں سے نہیں کہ جن کے مخالف کو جمہور اہل سنت کے نزدیک گمراہ قرار دیا جاتا ہو۔ (العقيدة الواسطية، ص ۱۱۷، ط اضواء السلف)

[2] تحفہ اثنا عشریہ (اردو)، ص ۳۹، ۴۰

[3] مثلاً صحیح بخاری میں سلمۃ بن کہیل کی دس، عوف بن ابی جمیلہ کی ۲۶ اور عبیداللہ بن موسیٰ کی ۴۳ روایات ہیں، علاوہ ازیں امام بخاری نے عبدالعزیز بن سیاہ، یحییٰ بن یعلی کوفی اور عبدالملک بن اعین سے بھی اکا دُکا روایات لی ہیں۔ یہ سب حضرات شیعہ راوی تھے۔
اسی طرح صحیح مسلم میں سلمۃ بن کہیل کی ۱۹، ہشام بن سعد کی ۸، جعفر بن سلیمان کی ۱۳، اور عبیداللہ بن موسیٰ کی ۲۴ روایات ہیں، علاوہ ازیں امام مسلم نے سلیمان بن قرم، علی بن زید بن جدعان، عوف بن ابی جمیلہ، عبدالعزیز بن سیاہ اور یحییٰ بن یعلی کوفی سے بھی کہیں کہیں روایت لی ہے۔ یہ سب شیعہ راوی ہیں یا ان پر تشیع کا الزام لگایا ہے۔ دیگر کتب حدیث میں (سوائے مؤطا امام مالک کے) شیعہ راویوں کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے۔

مشاجراتِ صحابہ کو حذف کرنا کیوں ممکن نہ ہوا؟

جنگِ جمل اور جنگِ صفین ہماری تاریخ کے دو نازک ترین ابواب ہیں۔ یہ تاریخی حالات ایک خاردار اور گھنے جنگل کی مانند ہیں جس میں نجانے کتنے لوگ راستہ بھٹک چکے ہیں۔ ایک طبقہ نصر بن مزاحم اور ابو مخنف جیسے نا قابلِ اعتبار راویوں کے بیانات کو بھی یقینی درجہ دے کر صحابہ کرام سے متنفر ہے۔ دوسرا طبقہ دوسری انتہاء پر جا کر مشاجرات کا سرے سے انکار کر رہا ہے۔ حالاں کہ نفسِ واقعات معتبر تاریخی وحدیثی مواد سے ثابت ہیں۔ فقہائے اسلام نے خروج جیسے سیاسی قضایا کے احکام انہی واقعات پر مشتمل صحیح روایات سے اخذ کیے ہیں۔

اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ عوام کے سامنے مشاجراتِ صحابہ کا ذکر ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ اگر ہوسکتا تو راقم بھی اس باب سے کترا کر گزر جاتا۔ مگر چند وجوہ سے یہاں اس کی گنجائش نہیں:

① جب ایک مسلسل تاریخ لکھی جارہی ہو تو اہم واقعات کو حذف کر دینا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ تاریخی حوادث ایک کہانی کی طرح کڑی در کڑی ملے ہوتے ہیں۔ ایک پیراگراف بھی چھوٹ جائے تو داستان تشنہ رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی اور حافظ ابن کثیر جیسے محتاط علماء نے بھی مشاجرات کے واقعات اپنی تواریخ میں درج کیے ہیں۔

② دورِ حاضر میں ان واقعات کو میڈیا خصوصاً انٹرنیٹ پر مسلسل معرضِ بحث بنایا جارہا ہے۔ ایسے میں اگر ہم تاریخ کی تحقیق کرتے ہوئے مشاجرات کا باب حذف کرتے ہیں، تو وہ بے شمار لوگ جو پہلے ہی ان معاملات میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں، یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ یہ واقعات نا قابلِ بیان حد تک گھناؤنے ہیں۔ لہٰذا تاریخ لکھتے ہوئے ان قضایا کو چھوڑ دینا ان لوگوں کے شکوک وشبہات کو مزید پختہ کر دے گا جو ان مسائل سے دو چار ہیں۔

③ تاریخ کی تنقیح میں ہمارا اہم ترین ہدف صحابہ کا دفاع، ان کے متعلق پھیلائے گئے شکوک کا ازالہ، غلط تاریخی روایات کی تردید اور مشکوک قضایا کی اصل شکل کو سامنے لانا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ ہم تاریخ کے اس دور کو حذف نہ کریں بلکہ چھان بین کر کے حقائق کو سامنے لائیں۔ ایسے میں مشاجرات کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔

مشاجراتِ صحابہ کے متعلق سکوت کا حکم اور کلام کی گنجائش:

مشاجراتِ صحابہ کے متعلق سکوت اختیار کرنے کی شرعی نصوص اور ارشاداتِ اکابر راقم کے سامنے بھی ہیں اور کاش کہ اس بحث سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش ہوتی۔ مگر جہاں ایک مسلسل تاریخ میں یہ بحث ناگزیر ہے، وہاں درپیش صورت حال میں اس پر کلام کی شرعی گنجائش بھی نکلتی ہے بلکہ جن بزرگوں کے ایماء پر راقم نے یہ ذمہ داری اٹھائی ہے، ان کی رائے میں اس وقت یہ کام ناگزیر ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ امر نہایت جانکاہ ہے جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے اس کے جواز اور اس کی نزاکت دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"البتہ بعض حضرات نے روافض وخوارج اور منافقین کی شائع کردہ روایات سے عوام میں پھیلنے والی غلط فہمی

دور کرنے کے لیے مشاجراتِ صحابہ میں کلام کیا ہے، جو اپنی جگہ صحیح ہے، مگر پھر بھی وہ ایک مزلّۃ الاقدام ہے جس سے صحیح وسالم نکل آنا آسان کام نہیں۔"

پھر چند صفحات بعد حضرت موصوف اس بحث کا درست منہج پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر عقل وانصاف آج بھی کسی چیز کا نام ہے تو ایک کام کر کے دیکھیے کہ مشاجراتِ صحابہ اوران کی باہمی جنگوں میں جو حضرات پیش پیش تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت مُعاویہ، حضرت طلحہ وزبیر، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم وغیرہ، ان حضرات کے حالات اور ایک دوسرے کے خلاف مقالات کچھ حدیث کی کتابوں میں بھی روایاتِ حدیث کے اصول پر پرکھ کر جمع شدہ موجود ہیں، اور انہی حضرات کے کچھ حالات ومقالات تاریخی روایات میں بھی آئے ہیں۔ ان دونوں قسم کی روایات کو الگ الگ پڑھ کر اپنے دلوں اور دماغوں کا جائزہ لیں کہ علمِ حدیث میں آئی ہوئی روایات انہی معاملات کے متعلق کیا تاثر دیتی ہیں؟ اور تاریخی روایات ان کے بالمقابل کیا تاثر چھوڑتی ہیں؟ ذرا سا تقابل کر کے دیکھیں تو کوئی شک نہیں رہے گا کہ حدیث میں جمع شدہ روایات سے اگر کسی صحابی کی کوئی زیادتی یا لغزش بھی معلوم ہوتی ہے تو اس کا مجموعی تاثر یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ان کی شخصیت مجروح اور ناقابلِ اعتماد ہوجائے، بخلاف تاریخی روایات کے کہ ان کو پڑھ کر ایک انسان دونوں فریق کو یا کم از کم ایک فریق کو غلط کار، اقتدار پسند اور اقتدار ہی کے پیچھے جنگ لڑنے والا قرار دے گا۔"①

اخذِ روایت میں ہمارا طریقِ کار:

اکابر کی رہنمائی کے مطابق مشاجرات کی نازک بحث میں ہمارا منہج یہی رہے گا۔ اوّلاً ہم ذخیرۂ حدیث سے مدد لیں گے۔ ثانیاً ذخیرۂ حدیث سے مطابقت رکھنے والی تاریخ کی صحیح وحسن روایات سے۔ تیسرے درجے میں ان سے مطابقت رکھنے والی ضعیف روایات سے۔ جو جزئیات ذخیرۂ حدیث یا صحیح تاریخی روایات میں موجود نہیں، صرف ضعیف روایات میں ملتی ہیں انہیں ہم بعض جگہ بقدرِ ضرورت لیں گے وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآن وحدیث کی کلیات اور کسی صحیح روایت کی جزئیات سے متصادم نہ ہوں۔ قرآن وحدیث اور صحیح تاریخی روایات سے معارض ضعیف روایات کو بالکل ترک کر دیں گے۔ نہ صرف ہمارے ایمان وایقان بلکہ تحقیق اور انصاف پسندی کا تقاضا بھی یہی ہے۔

یاد رکھیے گا کہ متعارض روایات کے قضیے کا ایک حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صحابہ کے بارے میں جو قرآن وسنت میں مروی ہے بس اسی کو مانیں، روایات کے اختلاف سے یکسو رہیں۔ ان حضرات کے حالات وواقعات کی تفصیلات کا معاملہ اللہ کے حوالے کریں۔ یعنی اس بارے میں کچھ سوچنے، پڑھنے، تحقیق کرنے سے کنارہ کش ہوجائیں۔ ایک عام انسان کے لیے یہی طریقہ یقیناً سلامتی کے قریب تر ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اہلِ علم، خصوصاً تاریخ کے طالب علم اس سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔ پس اہلِ علم کے لیے مسئلے کا حقیقی حل یہی ہوسکتا ہے کہ متعارض روایات میں سے وہ حصہ مانا جائے

① مقام صحابہ، ص ۹۷، ۱۰۳

جو قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔

دورِ ماقبل از اسلام سے لے کر دورِ صحابہ کی فتوحات تک راقم نے روایت کی نقل میں توسع اختیار کیا تھا۔ طبری، الکامل، البدایہ والنہایہ اور ہر متداول کتاب سے حسبِ موقع مواد لیا تھا کیوں کہ یہ فتوحات ایسی جیتی جاگتی حقیقت ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انہی کی بدولت کرۂ ارض کے ایک بڑے حصے میں مسلمان آباد ہیں۔ ان کی جزئی تفصیلات ضعیف راویوں سے بھی لی جاسکتی ہیں۔ مگر اب ہم دورِ فتن اور مشاجرات صحابہ کے زمانے کے اوراق پلٹنے لگے ہیں جس میں منافقین اور سبائیوں کی سازشیں بھی جا بجا کارفرما دکھائی دیں گی۔ راقم کی پوری کوشش ہوگی کہ انصاف، دیانت داری اور صحیح ثبوتوں کے ساتھ ان سازشوں سے بھی پردہ اٹھایا جائے۔ متنازعہ مسائل میں صحتِ روایت کا التزام ہوگا۔ جزوی واقعات میں ضعفِ روایت قابل قبول ہوگا۔ حافظ ذہبی نے مستدرک حاکم پر تعلیقات ڈال کر اس کی بہت سی روایات کے صحیح یا ضعیف ہونے کی صراحت بھی کی ہے۔ ہم مستدرک سے جو مواد لیں گے وہ حافظ ذہبی کی تعلیقات دیکھ کر لیں گے۔ جہاں شبہ ہوگا وہاں اصولِ روایت کے تحت سند کی جانچ پڑتال کریں گے۔[1] یہی طریقہ ہر اس روایت کے ساتھ ہوگا جس کے ناقلین نے اس کے صحیح، حسن یا ضعیف ہونے کی وضاحت نہیں کی۔

مشاجرات اور فقہی زاویۂ نگاہ:

مشاجرات کی نازک بحث کو عام طور پر تاریخی نقطۂ نگاہ ہی سے دیکھا گیا ہے اور ان معاملات پر جو بنیادی طور پر عقیدے، شریعت اور قضا سے متعلق تھے، مدوّن اسلامی فقہی ذخیرے کے زاویۂ نظر سے غور نہیں کیا گیا۔ حالاں کہ اگر فقہی ذخیرے اور فقہاء کی عبارات کو سامنے رکھ کر ان مسائل کو دیکھا جائے تو دو فائدے ہوتے ہیں:

1. بعض پیچیدہ اور متنازعہ قضایا صاف و شفاف ہوجاتے ہیں۔ ان میں دوسری رائے کی گنجائش نہیں رہتی۔
2. بعض ایسی ضعیف روایات کا مبالغہ آرائی یا تعصب پر مبنی ہونا ثابت ہوجاتا ہے جن سے بعض خلفائے راشدین یا بعض صحابہ کی منفی تصویر کشی ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ فقہ کے مدوّن ذخیرے میں اگرچہ مسلسل ترقی ہوتی رہی ہے مگر ابتدائی اور بنیادی مآخذ کی تدوین دوسری صدی ہجری میں ہوچکی تھی۔ خصوصاً فقہ حنفی کا وہ اساسی کام جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کر گئے، دوسری صدی ہجری میں مکمل ہوچکا تھا۔ ان ائمہ مجتہدین نے اکابر تابعین سے علم حاصل کیا تھا۔ مشاجرات کی جو روایات ان تک پہنچیں اور انہوں نے ایک فقہی امانت کے طور پر آگے نقل کیں، وہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔

ہم نے ان معاملات میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی الفقہ الابسط، الفقہ الاکبر اور کتاب الآثار، امام محمد بن حسن رحمہ اللہ

---

[1] قال الشیخ ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ، فی "قواعد فی علوم الحدیث" نقلاً عن ابن الصلاح:
"فما صححہ (الحاکم) ولم نجد فیہ لغیرہ من المعتمدین تصحیحاً ولا تضعیفاً حکمنا بانہ حسن، الا ان یظہر فیہ علۃ توجب ضعفہ. اہ ملخصاً ... قلتُ: وقد اغنانا عن ذلک الذھبی فما اقرہ علیہ فھو "صحیح"، وماسکت عنہ ولم یعقبہ بشیء فھو کما قال ابن الصلاح "حسن." (ص: ۷۱)

کی ''السیر الصغیر'' اور شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ کی ''المبسوط'' کو بالخصوص سامنے رکھا ہے۔

مشاجرات میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں یا تو مدوّن فقہِ اسلامی کو صحیح ماننا پڑتا ہے یا تاریخی روایات کو۔ ایسے میں ہم چار وجوہ سے فقہی روایات ہی کو ترجیح دیں گے:

① فقہِ اسلامی کا انکار شریعت کے انکار کے مترادف ہے جبکہ تاریخی روایات کے انکار سے (بالخصوص جبکہ روایات بھی ضعیف ہوں) کوئی دینی یا دنیوی نقصان لاحق نہیں ہوتا۔

② فقہ کی تدوین تاریخی کتب (طبری وغیرہ) سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس لیے فقہی روایات کی سند عالی ہے۔

③ فقہی فیصلوں کی بنیاد قرآن مجید، احادیث یا آثارِ صحابہ ہیں جن کی سند متصل اور پختہ ہے۔ جبکہ تاریخ میں ضعیف اور منقطع روایات بکثرت ہیں۔

④ فقہ اسلامی کا تحقیقی منہج، تاریخ سے بہت اعلیٰ ہے۔

تاریخی تحقیق میں لغزش سے حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ مدوّن شدہ فقہ سے متصادم تاریخی روایات کو محلِ نظر سمجھا جائے۔ ممکن ہو تو ان کی تاویل کی جائے۔ ورنہ مسترد کر دیا جائے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی نہایت اہم رائے

عظیم مؤرخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے مشاجرات کے بارے میں جو تحریر کیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ضرورت ہے کہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے ان اختلافات کا مطالعہ کیا جائے جو صحابہ کرام کے درمیان پیش آئے اور جن میں سے بعض اختلافات اتنے بڑھے کہ جنگ کی نوبت آگئی، جن لوگوں کو ان حالات کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، ان پر جلد بازی میں کوئی حکم لگا دینا اور بے دھڑک ان کو زیغ و ضلال میں مبتلا، دنیا پرست، جاہ و مال کا طالب، اور بدنیت کہہ دینا مناسب نہیں ہے۔ یہ تاریخی تجربات کا تقاضا ہے، نیز خالص علمی انداز میں ان حوادث کا ایجابی انداز میں تجزیہ کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو براہِ راست ان حالات سے گزرے، اور جنگ و جدال کی نوبت آگئی، ان کے گرد و پیش جو حالات تھے، جس پیچیدہ قسم کے معاشرے سے ان کا سابقہ تھا، اور اس وقت کا جو ماحول بن گیا تھا، بغیر ان سب کا مطالعہ کیے ہوئے، عجلت اور جذباتیت میں کسی کے خلاف کوئی بات طے کر لینا صحیح نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ قریب میں جو حوادث پیش آتے ہیں، ان کے سمجھنے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے؛[1] کیوں کہ ہم حالات اور ماحول کا صحیح اور متوازن اندازہ نہیں

---

[1] مثال کے طور پر ماضی قریب کے بعض معاملات ابھی تک شک و شبہ کی زد میں ہیں اور ان پر متضاد تبصرے موجود ہیں۔ ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا، مصر کے جمال عبدالناصر، پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل محمد ضیاء الحق، عراق کے صدام حسین، لیبیا کے کرنل قذافی میں سے ہر ایک کے حامی اور ناقد موجود ہیں۔ ایک حکمران ایک شخص کے نزدیک فرشتہ ہے اور دوسرے کی نگاہ میں کفار کا ایجنٹ۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ، سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان، نائن الیون کا حملہ، جنرل ضیاء الحق کے طیارے کا حادثہ، بے نظیر بھٹو کا قتل، ایبٹ آباد آپریشن اور اسامہ بن لادن۔ ایسے کتنے ہی حوادث ہیں جو ہمارے سامنے گزرے ہیں مگر حقائق اب بھی مشتبہ اور متنازعہ ہیں۔

کر سکتے، لہٰذا اس دور کے حوادث جن پر ایک زمانہ گزر چکا ہے اور وہ ہمارے ماحول سے بہت مختلف ماحول میں پیش آئے، اس وقت کے محرکات کیا تھے، اور جو افراد ان سے دوچار تھے، ان کے لیے کیا دواعی وجذبات تھے، جب تک ان کو اچھی طرح نہ سمجھا جائے، ان کے مقاصد، حالات کے صحیح پسِ منظر، خود ان کے دینی رجحانات، سابقہ خدمات، ان سب کو ایک ساتھ رکھ کر اور ایک دوسرے سے مربوط کر کے مطالعہ نہ کیا جائے، انصاف اور عدل کی راہ کا پالینا دشوار ہوگا۔"[1]

راقم کی حتی الامکان یہی کوشش ہے کہ مذکورہ تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے، اور حقائق کو اپنی بساط کی حد تک پوری احتیاط کے ساتھ حسنِ ترتیب اور عام فہم انداز میں پیش کیا جائے۔ مؤرخین کی محض اندھی تقلید نہ کی جائے بلکہ ہر چیز کو اصولِ روایت ودرایت پر جانچا جائے۔

اس منہج کو اختیار کرنے کی وجہ سے راقم کئی مقامات پر گزشتہ علماء کے بیانیے سے اختلاف پر بھی مجبور ہوا ہے۔ کئی جگہوں پر مؤرخین کے بیانات سے قطعاً اطمینان نہ ہوسکا۔ کھوج اور تحقیق وتفتیش کا فطری عنصر آمادہ کرتا رہا کہ اس معاملے کی مزید تحقیق کی جائے۔ چنانچہ ہر ممکنہ پہلو اور ہر ممکنہ علمی مأخذ کو لے کر اس معاملے کو دیکھا گیا جس کے نتیجے میں انجام کار ایک پختہ اور واضح حقیقت سامنے آگئی۔ بعض مواقع پر ذہن میں ایک بالکل نیا پہلو آیا اور تاریخی، حدیثی اور فقہی روایات کو مزید دیکھنے سے اس کی تائید ہوتی چلی گئی اور آخر اس پہلو کے درست ہونے کا اطمینان ہوگیا۔

اگرچہ راقم خود کو ایک ادنیٰ طالب علم سمجھتا ہے اور بزرگوں کے علم وعمل کے سامنے ایک فقیرِ بے متاع کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم جس ''پروسس'' کو اختیار کر کے یہ کاوش آپ کے سامنے پیش کی جارہی ہے، اور جس کی اہمیت خاصی وضاحت سے بیان کی جاچکی ہے، راقم اس کی پابندی پر مجبور ہے۔ اس بناء پر بعض مقامات پر کچھ ایسی ''جسارتیں'' بھی ہوئی ہیں جو شاید بعض احباب کو ناگوار گزریں مگر راقم کی معذوری ان پر ظاہر ہونی چاہیے۔

بعض اُمور میں راقم کو تحقیق کے ابتدائی دور میں اسلاف کی اجماعی آراء بھی مشکوک محسوس ہوئیں اور روایات کی تحقیق کرتے کرتے اسلاف سے شدید اختلاف کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ اسلاف سے ہٹ کر آراء رکھنے والے جدید محققین کی کتب نے بھی کئی جگہ متاثر کیا۔ راقم نے اس دوران محمود عباسی، مولانا مودودی اور مولانا اسحٰق سندیلوی سے لے کر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور مولانا بشیر احمد حامد حصاری تک درجنوں مصنفین کی کتب پورے غور وخوض کے ساتھ پڑھیں۔ عرب دنیا میں گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں ان موضوعات پر جو لکھا گیا ہے، وہ ایک الگ کتب خانہ ہے۔ حتی الامکان اس کی بھی چھان بین کی۔ خصوصاً قضیۂ قصاصِ عثمان، حدیث الفئۃ الباغیۃ، واقعۂ کربلا، کردارِ یزید اور خلافتِ راشدہ کے اطلاق کے مسائل میں راقم کی صحرانوردی بہت طویل تھی۔ شیعوں کی تاریخ، سبائی فتنے کی حقیقت، حدیث وتاریخ پر تشیع کے اثرات، گمراہ فرقوں کی نشوونما کے مختلف پہلو بھی بہت گہرائی کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔ اہلِ تشیع کی تردید میں لکھی گئی

[1] المرتضیٰ، ص ۲۴۳، ۲۴۴



کتب خاص طور پر تفصیل سے پڑھیں مگر کوئی چیز مقلد بن کر نہیں دیکھی۔ ہر مکتبِ فکر کے دلائل سامنے رکھ کر ان پر غور کرتا رہا۔ کسی مقام پر آخری خیمہ نہیں گاڑا اور خصوصاً جو خطوط اسلاف کی اجماعی آراء سے ہٹ کر تھے، وہاں یہ امکان ضرور ذہن میں رکھا کہ ہوسکتا ہے کہ اسلاف کی تائید میں کوئی اور پختہ دلیل بھی ہو جو مجھ تک نہ پہنچی ہو۔ غرض سراغ رسانی اور تحقیق و مطالعے کا سفر جاری رہا۔ یہ سفر جہاں ختم ہوا، وہاں سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے۔

ہر طرح کی امکانی احتیاط کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کہ یہ کام مکمل اور یہ مندرجات حرفِ آخر ہیں۔ راقم نے قصداً خیانت کی جسارت کہیں نہیں کی مگر جس طرح بندہ خود ناقص ہے، یہ کام بھی نقص سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اہلِ علم سے اصلاح اور رہنمائی کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ میں اس کاوش کی کسی چیز کو حتمی حیثیت نہیں دیتا سوائے جمہور مسلمین کے ان اجماعی عقائد و نظریات کے جو کتبِ عقائد و کلام میں واضح طور پر مذکور ہیں۔ ان امور کو چھیڑے بغیر اہلِ علم کو راقم کی کسی بھی عبارت، کسی بھی رائے، کسی بھی تجزیے سے اختلاف کا پورا حق ہے۔ راقم کے اندازِ تعبیر میں بھی اصلاح اور ترمیم کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بسا اوقات کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کی غلطیاں بھی سوالیہ نشان پیدا کرسکتی ہیں۔ ایسے کسی بھی اصلاحی پہلو کی طرف توجہ دلانے والے قارئین خصوصاً اہلِ علم کی آراء کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اگر کوئی علمی قواعد کے مطابق اصلاح اور بہتری کے لیے اختلافِ رائے کرے یا مشورہ دے تو یہ اس کی نوازش ہوگی۔ لیکن اگر کوئی کسی قضیے میں بحث برائے بحث کی فضا بنانا چاہتا ہے تو ہم ایسی کسی فضا کا حصہ بننے سے احتراز کریں گے۔

اللہ کی شانِ غفاری و ستاری سے امید ہے کہ وہ کریم میری نادانستہ غلطیوں سے درگزر فرمائے گا اور اسی عارضی زندگی میں اصلاحِ اغلاط کی توفیق مرحمت فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو فکر و نظر میں افراط و تفریط سے محفوظ رکھے اور جمہور مسلمین کے موقف کے مطابق ایمان و عقیدے پر استقامت نصیب فرمائے۔ آمین

استغفر اللّٰہ لی ولسائر المسلمین

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ واصحابہ واھل بیتہ اجمعین

محمد اسماعیل ریحان

(rehanbhai@gmail.com)

جمعہ، ۲۴ محرم ۱۴۳۷ھ

6 نومبر 2015ء

پہلا باب

تاریخ اُمَّتِ مُسلِمَہ

خلافتِ راشدہ

دورِ مشاجرات

۳۴ھ تا ۴۰ھ

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کر نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات

☆☆☆

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

☆☆☆

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم

سازشی تحریک کا زیرِ زمین دور

۲۸ھ......تا......۳۳ھ

حصۂ اوّل میں مسلمانوں کی فتوحات اور خوشحالی کا جو قابل رشک ماحول دکھایا گیا ہے، وہ دورِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دورِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے گیارہویں سال تک اسی طرح برقرار تھا۔ یہ چوبیس برس اسلامی خلافت کا دورِ عروج تھے، ہر طرف امن وامان تھا اور فتوحات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ عوام خوشحال اور امراء امانت دار تھے۔ اُمت متحد تھی، کہیں کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود آخر تک ایک نہایت مثالی حکمران کا کردار پیش کیا تھا...... البتہ آخری برسوں میں کچھ شرپسندوں نے اُن کی حکومت گرانے کی سرتوڑ کوششیں شروع کیں جو آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے دردناک سانحے کا باعث بنیں، یہ وہ فتنہ تھا جس کی پیش گوئی احادیث میں کردی گئی تھی...... اور یہ وہ موڑ تھا جہاں سے اُمت داخلی فتنوں کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

توحید کا ہمہ گیر بول بالا، شرک کا استحصال، اللہ تعالیٰ کے نظام کا نفاذ اور اسلام کا غلبہ شیطان کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس نے بنی نوع انسان کی دنیا وآخرت تباہ کرنے کے لیے ہزاروں برس تک جو محنت وسعی کی تھی، اس کے رائیگاں جانے پر اب وہ تلملا رہا تھا۔ وہ اسلام کے گلشن کو اُجاڑ دینا چاہتا تھا، مگر کیسے؟ عالم اسلام کے باہر بدی کی جو بھی قوتیں تھیں وہ فرزندانِ توحید سے شکست کھا چکی تھیں اور عالم اسلام کی حدود کے اندر انسان ابلیس کی بندگی سے نکل کر خدا کی بندگی میں جا چکے تھے!!! اب شیطان کرتا تو کیا کرتا۔ وہ خود تو سامنے آکر مقابلہ کرنے سے رہا!!! اس کی عادت تو ہمیشہ دوسروں کو استعمال کرنے کی رہی ہے۔

ایسے میں کچھ ایسے لوگ شیطان کے آلۂ کار بنے جو اسلامی خلافت کی رعایا تو تھے مگر ان کے دل قبائلی تعصب سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ وہ اسلام کی سطوت کو دیکھ کر دب گئے تھے اور کلمہ بھی پڑھ لیا تھا مگر ان کو مہاجرین وانصار اور قریش کی ترقی سے شدید جلن محسوس ہوتی تھی۔ اسلامی خلافت کو وہ خدا کے نظام کے طور پر نہیں قریش کی بادشاہت کی شکل میں دیکھتے تھے، ان کے لیے یہ بات زیادہ خوشی کا باعث ہوسکتی تھی کہ کسی طرح خلافتِ اسلامیہ دولخت اور کمزور ہوتی۔ اور اس کی جگہ ان کے اپنوں کا اقتدار قائم ہوتا۔ ان میں سے بعض وہ تھے جن کے دلوں میں ایمان داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ اس ملے جلے گروہ میں عرب بھی تھے اور مجوسی بھی۔ یہودی بھی تھے اور عیسائی بھی۔ یہی لوگ تھے جو آیندہ اسلام



کی جڑوں کو کاٹنے کے لیے شیطان کے گماشتوں کا کردار ادا کرنے پر آمادہ تھے۔

جس طرح زمین کی تہہ میں چھپے بیج کے پھوٹنے کا وقت نامعلوم ہوتا ہے، اسی طرح یہ بات پورے یقین سے نہیں بتائی جاسکتی کہ سازشی تحریک کا آغاز کب ہوا تھا۔ تاہم ہم اندازہ لگاسکتے ہیں کہ جو تحریک ۳۴ھ میں ایک کانٹے دار جھاڑی کی طرح پھیلی اس کا بیج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے پہلے بودیا گیا تھا۔ آج مواصلات اور نقل وحمل کے تیز ترین ذرائع کی موجودگی میں بھی ایسی تحریکیں منظر عام پر آنے سے پہلے آٹھ دس سال کا وقت لے لیتی ہیں، اس قدیم دور میں کسی حکومت مخالف تحریک کی آبیاری میں بیس پچیس برس لگ جانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ اس کے برعکس یہ بات بالکل سطحی ہے کہ شورش پسند جماعت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری چند سالوں میں یکا یک جنم لیا، راتوں رات اپنی جڑیں دور دور تک پھیلا دیں اور اتنی تیزی سے ابھری کہ نہ صرف خلیفہ کو شہید کرنے میں کامیاب ہوگئی بلکہ اس کے بعد بھی کئی عشروں تک خلفائے اسلام کے لیے دردِ سر بنی رہی۔ چونکہ شورش پسند جماعتوں کے سرغنے اور اصل ماسٹر مائنڈ افراد ہمیشہ پسِ پردہ کام کرتے ہیں، لہٰذا اِس سازشی جماعت کی اصل قیادت بھی روپوش اور گمنام رہی۔ ہم اس تحریک کے جھانسے میں آنے والے عام شہریوں اور دیہاتیوں کو باغی، فسادی، شورش پسند اور بلوائی جبکہ ان غیر مرئی شخصیات کو ''سازشی عناصر'' کہہ کر یاد کریں گے۔ یادر ہے کہ یہ ہیولے کسی وہم کی تخلیق نہیں بلکہ واقعی ایسے لوگوں کا وجود تھا۔ اسی لیے ان میں سے ایک شخص کا نام وثوق سے لیا جاسکتا ہے۔ یہ عبداللہ بن سبا تھا۔[1]

عبداللہ بن سبا

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنے چند برس گزرے تھے کہ یمن کے صدر مقام صنعاء کے ایک کالے بجنگ یہودی نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور عبداللہ بن سبا کے نام سے اس کی پہچان ہوئی۔ اسلام قبول کرنے کا اعلان کرنے کے بعد ابن سبا نے کسی صحابی کی خدمت میں وقت نہیں گزارا۔ اس نے یمن سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور چند برسوں میں حجاز، کوفہ، بصرہ اور شام تک کے سفر کر ڈالے۔ وہ بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر مشہور ہوا۔ اس لیے خود کو ایسے مصلح کے طور پر پیش کیا جو نیکی کا حکم دیتا اور گناہوں سے منع کرتا تھا۔[2]

جس طرح پولس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مبالغہ آمیز محبت پر مبنی نئے عقائد کا اظہار کر کے عیسائیوں میں مقبولیت حاصل کی تھی اسی طرح ابن سبا نے بھی یہی داؤ آزما کر جاہلوں میں مذہبی پیشوا کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ سادہ لوح قسم کے بہت سے لوگ اسی کو اسلام کا سب سے بڑا معلّم ومرشد تصور کرنے لگے۔

یہودیوں کے اس گماشتے کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے عروج کا راز اُن کے اتحاد میں مضمر ہے اور یہ اتحاد صحابہ سے امت کی عقیدت ومحبت، صحابہ کے باہمی تعلق اور خلفائے اسلام پر اُن کے غیر متزلزل اعتماد کی وجہ سے مستحکم ہے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو صحابہ سے بد اعتماد کرنے اور منصب خلافت ہی کو متنازعہ بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

[1] تاریخ دمشق: ۲۹/۵ تا ۹　[2] البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۶۳

نئے عقائد کی ترویج:

ابن سبا نے اپنے نظریات کے پرچار کا آغاز حضور نبی اکرم ﷺ سے غیر معمولی اظہارِ محبت کی شکل میں یوں کیا کہ رسول اللہ ﷺ یقیناً عیسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ لہٰذا وہ دنیا میں ضرور واپس آئیں گے۔''[1]

اس من گھڑت عقیدے کی دلیل میں وہ یہ آیت پڑھتا: ﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ﴾[2]

''بے شک جس نے تم پر قرآن نازل کیا ہے وہ ضرور تمہیں تمہاری منزل پر لوٹائے گا۔''

یہ آیت جو حضور ﷺ کی مکہ سے ہجرت کے وقت نازل ہوئی تھی، یہ بتا رہی تھی کہ اللہ آپ ﷺ کو اس شہر میں عزت کے ساتھ واپس لے آئے گا، مگر تفسیر سے ناواقف لوگ آیت کا وہی مطلب مان لیتے جو ابن سبا انہیں بتاتا۔[3]

ابن سبا اگلا سبق یہ پڑھاتا: ''ہر نبی کا ایک وصی یعنی جانشین ہوتا ہے اور حضور ﷺ کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضور ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور علی رضی اللہ عنہ خاتم الاوصیاء۔''[4]

اگلے مرحلے میں وہ اپنے ہم خیال لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت پر اُکساتے ہوئے کہتا:

''اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو حضور ﷺ کی وصیت پر عمل نہ ہونے دے اور نبی کے وصیت کردہ فرد کا حق غصب کرلے اور خود امت کے معاملات کا مالک بن جائے۔''

جب یہ ناسمجھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کا غاصب ماننے لگتے تو انہیں بھڑکاتے ہوئے کہتا: ''نبی کے وصی کی موجودگی میں عثمان نے خلافت پر ناحق قبضہ کیا ہوا ہے، اب اس تحریک کو لے کر اُٹھو اور حرکت میں آجاؤ۔''[5]

فتنے کے مراکز:

اسلامی معاشرے میں جنم لینے والے اس پہلے سیاسی و نظریاتی فتنے کے علانیہ مراکز تین شہر تھے: کوفہ، بصرہ، اور مصر کا صدر مقام فسطاط۔ ان شہروں کو آباد ہوئے تقریباً بیس برس ہوئے تھے۔ مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ نقل مکانی کر کے یہاں آگئے تھے اور ایک ملی جلی معاشرت وجود میں آگئی تھی۔ پھر یہ شہر تجارتی مراکز بھی تھے اس لیے ہر وقت ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔ تجارت کی وجہ سے یہ تینوں شہر بہت جلد گنجان ہوگئے۔ تاریخی تجربات سے ثابت ہے کہ نئے شہروں میں جہاں مخلوط اور گنجان آبادی ہو اور تجارتی نقل و حرکت جاری رہتی ہو، بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، وہاں جرائم پیشہ افراد یا کسی تحریک کے کارکنوں کا آکر بسیرا کرنا اور اپنی سرگرمیاں انجام دینا آسان ہوتا ہے۔ کوفہ، بصرہ اور فسطاط ایسے ہی نئے شہر تھے جہاں شرپسندوں کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔

کوفہ اور بصرہ کے متعلق یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایام ہی میں جبکہ یہ شہر ابتدائی نشوونما کے دور سے گزر رہے تھے، یہاں کے لوگوں میں امراء کی اطاعت سے انحراف کا مرض پیدا ہو چکا تھا۔

---

[1] البدایة والنهایة: ۲۶۳/۱۱
[2] سورۃ القصص، آیت: ۸۵
[3] تاریخ الطبری: ۳۴۰/۴
[4] تاریخ الطبری: ۳۴۰/۴
[5] تاریخ الطبری: ۳۴۱/۴

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو بھانپ کر بصرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تقرر کرتے ہوئے کہا تھا:
''میں آپ کو ایسی جگہ کا ذمہ دار بنا کر بھیج رہا ہوں جہاں شیطان انڈے دے چکا اور چوزے بھی نکل آئے ہیں۔''①
بصرہ کی طرح کوفہ میں بھی یہی کیفیت تھی جس کی آبادی ایک لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اہلِ کوفہ حکام کو بدلواتے رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور میں پریشان رہے کہ ایک لاکھ افراد ہیں جو کسی امیر سے خوش نہیں رہتے۔②
دورِ فاروقی میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی کوفہ کے گورنر رہے جو عشرۂ مبشرہ میں سے تھے۔ انہیں بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ بعض لوگوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو شکایت لگائی کہ وہ نماز صحیح نہیں پڑھاتے۔③
ایک شخص نے انہیں یہاں تک کہہ دیا: ''نہ تم انصاف کرتے ہو، نہ برابر مال تقسیم کرتے ہو، نہ جہاد کرتے ہو۔''④
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کی جگہ نرم مزاج عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو تعینات کیا تو اہلِ کوفہ نے سیاسی سمجھ بوجھ میں کمزور قرار دے کر انہیں بھی ہٹوا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مضطرب ہو کر فرمایا: ''ان لوگوں پر مضبوط حاکم مقرر کرتا ہوں تو یہ اس کی بُرائی کرتے ہیں۔ نرم آدمی کو متعین کرتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر کرتے ہیں۔''⑤
ان تین شہروں کے علاوہ ایک چوتھا شہر بھی غیر محسوس طور پر فتنے کا مرکز بننے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ شہر دِمشق تھا جو مزاج و ترکیب میں پہلے تینوں مراکز سے مختلف ایک قدیم شہر تھا۔ یہ ایک مضبوط عرب خاندان بنواُمیہ کا عسکری و سیاسی مرکز تھا۔ یہاں رہنے بسنے والے لوگ منظم، جیالے اور اپنے امراء سے وفاداری کے عادی تھے۔ ان کے بیچ میں مقامی حکام کے خلاف لب کشائی کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے دِمشق کے لیے ابن سبا کی پالیسی بھی بالکل الگ رہی جو نہایت خفیہ اور بڑی آہستہ روی پر مبنی تھی، اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آخر تک یہاں کچھ بھی نہ ہوا۔
بہرکیف یہ حقائق بتاتے ہیں کہ سرکش اور مرکز گریز عناصر کی تحریک نے گزشتہ خلفاء کے دور ہی میں زیرِ زمین کام کرنا شروع کر دیا تھا اور کوفہ و بصرہ جیسے شہروں میں اس کے اثرات اسی وقت سے دکھائی دینے لگے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی میں فرق اور اس کے اثرات:

عام طور پر مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت کے ابتدائی چھ سالوں میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت پر چلتے رہے مگر اس کے بعد وہ بدل گئے۔ اس تبدیلی کو ایک طبقہ اس معنیٰ میں لیتا ہے کہ چھ سال بعد معاذ اللہ وہ ظلم و ستم، بددیانتی اور خیانت میں ملوث ہو گئے تھے جس کی وجہ سے قوم ان کی مخالفت پر اتر آئی۔ کچھ حضرات اس کے بالکل برعکس یہ کہتے ہیں کہ سرِ مو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔
ان دونوں آراء میں سے پہلی تو بالکل غلط اور سراسر کذب و افتراء پر مبنی ہے۔ جہاں تک دوسری رائے ہے وہ ان معنوں

① تاریخ الطبری: ۴/۷۰، ۷۱ ② تاریخ الطبری، سن ۲۲ھ ۴/۱۶۳ تا ۱۶۶
③ صحیح البخاری، ح: ۷۵۵، باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم
④ صحیح البخاری، ح: ۷۵۵، باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم
⑤ فتوح البلدان، ص ۲۷۷ اس کے بعد مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا تقرر فرمایا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات تک وہاں متعین رہے۔



میں درست ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہلے چھ سالوں کی طرح آخری چھ سالوں میں بھی عادل، امین، ملک وقوم کے خیر خواہ اور ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے شرعی احکام اور قومی مفاد ہی کو سامنے رکھ کر چلتے رہے تھے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۲۷ھ سے ۲۹ھ تک عالم اسلام کے منظرنامے میں ایک فرق آ گیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس دور میں دنیائے اسلام کے آٹھ صوبے تھے:

جزیرۃ العرب میں: مکہ، مدینہ، یمن اور بحرین۔ مشرق میں: کوفہ اور بصرہ۔ مغرب میں: دِمشق اور مصر۔

مدینہ سمیت جزیرۃ العرب کے کسی بھی صوبے یعنی مکہ، یمن، بحرین میں فوجی چھاؤنی قائم نہیں تھی۔ یہاں کے گورنروں کے پاس صرف انتظامی امور ہوتے تھے۔ فوجی چھاؤنیاں دِمشق مصر، کوفہ اور بصرہ تھے۔ رقبے، آمدن اور آبادی میں بھی بڑے صوبے یہی تھے۔ ملک کی عسکری قوت بھی انہی چاروں صوبوں کے گورنروں کے پاس رہتی تھی۔

۲۷ھ تک صورتحال یہ تھی کہ ان چار بڑے صوبوں میں سے دو کے گورنر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔ یعنی شام میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور کوفہ میں حضرت ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ۔ جبکہ باقی دو صوبوں کے گورنر دیگر قبائل کے تھے۔ یعنی بصرہ میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور مصر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

۲۷ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو گورنر بنا دیا۔ ۲۹ھ میں بصرہ سے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھی ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا تقرر کر دیا۔

ان تقرریوں کے پیچھے کوئی ذاتی غرض تھی نہ خاندانی، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں نرمی، فیاضی اور مروّت بہت زیادہ تھی، اس لیے وہ صلہ رحمی میں بھی عام صحابہ کرام سے ممتاز تھے۔ اسی صلہ رحمی کے جذبے کے تحت انہوں نے پہلے بھی ایک دو کام ایسے کیے تھے جو بلاشبہ جائز بلکہ ایک لحاظ سے مستحسن تھے مگر عام لوگوں نے انہیں عجیب تصور کیا۔[1] اس کے علاوہ اپنے خاندان اور برادری کے مفلس لوگوں کو اپنی جیب سے دل کھول کر بڑے بڑے عطیات دیتے تھے۔ ان کی مالی حالت بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں معاشرے میں بھی ترقی اور عزت دلانا چاہتے تھے اور ان میں سے قابلِ اعتماد نوجوانوں کو عہدے دے کر ان سے اُمت کی خدمت لینا بھی انہیں پسند تھا۔

---

① مثلاً ان کے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب بھی تھے، جب مرتد ہو کر مکہ کے مشرکین سے جا ملے تو اس حرکت پر نہ صرف عام صحابہ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی غضب ناک ہوئے اور فتح مکہ کے موقع پر عام معافی سے عبداللہ بن ابی سرح کو مستثنیٰ رکھا اور ان کا خون بہانا جائز فرما دیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں امان دے دی۔ اور پھر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور کہا: عبداللہ کو بیعت فرما لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار توجہ نہ فرمائی۔ اس کے بعد بیعت فرما لیا مگر صحابہ سے یہ بھی کہا: تم میں سے کوئی سمجھ دار شخص ایسا نہ تھا کہ مجھے اس کی بیعت قبول کرنے سے رکتا دیکھ کر اسے قتل کر دیتا؟ صحابہ نے عرض کیا: ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کا ارادہ کیا ہے، آپ آنکھ سے ہی اشارہ فرما دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ آنکھ سے فریب کا اشارہ کرے۔ (**سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۵۹، باب حکم فیمن ارتد، بسند صحیح**) آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں معاف کر دیا۔ (**سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۵۸ بسند حسن**) وہ دوبارہ اسلام لا کر بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ (**سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۳، ط الرسالۃ**)

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا حکم بن العاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وجہ سے جلاوطن کر دیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ..... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس پسِ منظر میں اپنے اقارب کو غالب کرنے کی کسی شعوری یا سوچی سمجھی کوشش کے بغیر گورنروں کی تبدیلی کرتے کرتے عالم اسلام میں اہم ترین عہدوں کا منظر نامہ یہ بن گیا:

❶ مدینہ منورہ: مرکزِ خلافت تھا، پورے عالم اسلام کو یہاں سے احکام جاری ہوتے تھے۔ تمام اہم امور کا فیصلہ یہیں سے ہوتا تھا۔ یہاں دیوانِ خلافت کا انتظام اموی نوجوان مروان بن حکم کے ہاتھ میں تھا۔ [1]

❷ دمشق: یہاں سے پورے شام، لبنان، فلسطین، اردن اور ایشیائے کوچک کو سنبھالا جاتا تھا۔ گزشتہ دور سے یہاں کے گورنر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے جو اموی تھے۔ [2]

❸ مصر: یہاں سے پورے افریقہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ۲۷ھ میں یہاں عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو گورنر بنایا گیا جو امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی تھے۔ [3]

❹ بصرہ: یہاں سے پورے ایران، خلیج فارس اور خراسان کا نظام سنبھالا جاتا تھا۔ ۲۹ھ میں یہاں حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا گیا، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ [4]

❺ کوفہ: یہاں سے عراق اور الجزیرۃ کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ۲۵ھ سے ۲۹ھ تک یہاں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ گورنر رہے۔ [5] ۲۹ھ میں ان کی جگہ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو لایا گیا۔ وہ ۳۴ھ تک اس عہدے پر رہے۔ دونوں اموی تھے۔ [6]

اس طرح ملک کے چاروں بڑے صوبوں کی گورنری اور مرکز کی وزارت ایک ہی خاندان کے افراد کے پاس آگئی۔ پھر چونکہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اموی تھے، اس لیے نادان لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہونے لگا کہ انہوں نے قومی خیر خواہی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے خاندان کو بالادست کرنے کے لیے یہ تقرریاں کی ہیں۔ اگرچہ یہ سراسر بدگمانی اور نہایت غلط سوچ تھی مگر لوگوں کو ایسی باتوں پر یقین کرنے سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری چھ سالوں میں اگر واقعی کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ یہی تھی اور اسی قدر تھی۔ چونکہ یہ حدِ جواز کے اندر تھی، اس لیے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس پر

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ﴾ ...... دورِ خلافت میں ان کو واپس بلالیا، ایک لاکھ (درہم یا دینار) عطیہ بھی دیے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۰۸، ط الرسالۃ) پھر مزید صلہ رحمی یہ کی کہ ان کے بیٹے مروان کو اپنا کاتب اور معاونِ خاص بنالیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۷۷، ط الرسالۃ)
چونکہ بعض مسلمانوں کی نگاہ میں وہ اب بھی معتوب تھے۔ اس لیے یہ بات بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پروپیگنڈے کا حصہ بنالی گئی۔ آپ کی طرف سے رشتہ داروں پر مالی عنایات کو بھی یہ سمجھا گیا کہ آپ سرکاری اموال سے یہ داد و دہش کر رہے ہیں۔ ان الزامات کے جوابات آگے تفصیل سے آرہے ہیں۔

﴿حاشیہ صفحہ موجودہ﴾

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۹ ② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۸

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۸ ... عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ اس سے پہلے صعید مصر کے عامل تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۴، ط الرسالۃ)

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۸، ان سے پہلے فارس کا گورنر الگ ہوتا تھا اور بصرہ کا الگ۔ مگر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیک وقت دونوں صوبوں کے گورنر بنے۔

⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۸۔ ولید بن عقبہ اس سے پہلے الجزیرہ کے عرب علاقے میں جہاں بنو تغلب رہتے تھے، صدقات وصول کرنے کے افسر تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۱/۱۴۲، ط دکن)

⑥ سعید بن العاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ۹ برس کے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۵/۳۱، ط صادر) اتنے شریف، سمجھدار اور قابل نوجوان تھے کہ بقول بعض خلیفہ بننے کے قابل تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۴۵، ط الرسالۃ)

خاموشی اختیار کی۔ اگر معاملہ جواز کی حدود سے متجاوز ہوتا تو وہ یقیناً اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرتے۔

یہ تو حالات کا ایک قابلِ اطمینان پہلو تھا۔ مگر اس کے ساتھ دوسرا رُخ جو یقیناً تشویش ناک تھا، یہ تھا کہ سبائی گروہ جواب تک زیرِ زمین تھا، اسے ان ایک دو باتوں کے ساتھ سو افسانے ملا کر مسلمانوں کو لڑانے کے لیے ایک باقاعدہ تحریک اٹھانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ خیر و برکت کے اُس دور میں کوئی بھی شورش بالکل ہوائی باتوں کے ذریعے نہیں پنپ سکتی تھی۔ قدرتی اور فطری بات ہے کہ ہر حکومت مخالف تحریک کو کچھ نہ کچھ شوشے درکار ہوتے ہیں جن کو بڑھا کر وہ لوگوں کو مشتعل کرتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھٹے سال سبائیوں کو یہی ایک حرف ایسا ملا جسے انہوں نے اپنی داستان کا نقطۂ آغاز بنالیا۔ یہاں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی دور بینی اور غیر معمولی عاقبت اندیشی کا۔ جس طرح وہ دیگر فضائل و مناقب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سمیت اپنے تمام جانشینوں سے فائق تھے، اسی طرح وہ حکمت و تدبر میں بھی بہت آگے تھے۔

ان کی حکمت عملی کا ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ اپنے اعزہ و اقارب اور ہم قبیلہ افراد کو حتی الامکان اعلیٰ عہدوں اور بڑے مناصب سے دور رکھا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی بدخواہ کو یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع ہی نہ ملے کہ خلافت پر ایک خاندان کی اجارہ داری ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو بطورِ خاص یہ نصیحت کی تھی کہ اگر تمہیں خلیفہ بنا دیا جائے تو اپنے اعزہ و اقارب کو لوگوں کا حاکم نہ بنانا۔ [1]

مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر اپنے رشتہ داروں کو عہدے دینا ملک و ملت کے لیے مفید ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وصیت کوئی شرعی حکم نہ تھا کہ اسے بہر صورت ماننا واجب ہوتا۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انتظامی ضروریات کے تحت بعض رشتہ داروں کو اعلیٰ عہدے بھی دیے۔ یہ قطعاً گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی سے لاپرواہی اور اُمت سے بد دیانتی کرتے ہوئے ایسا کیا ہوگا۔ انہوں نے جو کیا، ایک سربراہِ حکومت کی حیثیت سے وہ اسی کو قومی مفاد میں سمجھتے تھے۔ پھر ان عہدے داروں سے رعایا کو کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ عام حالات میں کسی کو موقع نہیں مل سکتا تھا کہ ان حضرات کے خاندان یا قبیلے کو لے کر کوئی مسئلہ کھڑا کرے۔

☆☆☆

---

[1] روی عبدالرزاق فی مصنفه بسند صحیح متصل فيه: وان كنت يا عثمان علىٰ شيئ فاتق الله ولا تحمل بني ابي معيط على رقاب الناس. (ح: ۹۷۷٦). ورواه ابو محمد الحارث ابن ابي اسامة (م ۲۸۲ھ) باسناد متصل رجاله ثقات. (مسند الحارث مع بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث: ۲/ ٦۲۲) و رواه ابن ابي شيبة في مصنفه (ح: ۳۷۰۷۱ بسند صحيح الى حسن بن محمد بن الحنفية)

وفي رواية الطحاوي: " وان كنت يا عثمان على شيئ من امر الناس فلا تحملن بني ابي معيط علىٰ رقاب الناس وان كنت يا علي على شيئ من امر الناس فلا تحملن بني هاشم علىٰ رقاب الناس. (شرح مشكل الآثار، ح: ۳۹۵۵، ط الرسالة)

(طحاوی کی عبارت کا ترجمہ) ''اے عثمان! اگر تمہیں لوگوں کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا جائے تو ابی معیط کی اولاد کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہ کرنا۔ اور اے علی! اگر تمہیں لوگوں کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا جائے تو اولادِ ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط نہ کرنا۔''

مگر شورش پسند گروہ پہلے ہی فتنہ برپا کرنے کے لیے تیار تھا، چنانچہ اس نے اس پسِ منظر میں جھوٹی باتیں پھیلا کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہ کچھ کیا جس کا ذکر اب تفصیل سے آرہا ہے۔ [1]

سبائی مہم اور اسلامی امراء کی کردار کشی

شورش پسند سبائی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی۔ خلافت کو کمزور بلکہ پارہ پارہ کرنا اور مسلمانوں کو لڑانا اس کا ہدف تھا۔ ملک کے اہم ترین امراء کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے رشتہ داری کو ان بدبختوں نے اپنے مکروہ پروپیگنڈے کا بہانہ بنالیا۔

انہوں نے اوّل تو اس بات کو ہوا دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نعوذ باللہ اقربا پرور ہیں، اپنوں کو نوازتے اور غیروں کو محروم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی مشہور کیا کہ اپنے رشتہ داروں کو آگے لانے کے لیے اکابر صحابہ کو معزول کر کے بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ بعض اوقات ایک بات بالکل سچ ہوتی ہے مگر اسے دیکھنے کا زاویہ نگاہ الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ بات درست تھی کہ نوجوانوں کو آگے لایا گیا تھا جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر اکابر پیچھے ہوگئے تھے۔ [2]

مگر سوال یہ تھا کہ اگر یہ نوجوان صحابہ کرام قابل تھے تو انہیں عہدے دینے میں کونسا بڑا نقصان ہوا۔ [3]

---

① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے ضرورت کی بناء پر اقارب کو عہدے دینے کی شرعی گنجائش بھی واضح ہوگئی۔ اگر وہ بہر صورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی پر عمل کرتے جو انتہائی تقویٰ پر مبنی تھی تو شاید یہ ایک مستقل ضابطہ بن جاتا اور کوئی دین دار حاکم ناگزیر حالات میں بھی اپنے اعزہ کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھاسکتا۔

② کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے جبکہ ان کی جگہ لینے والے ولید بن عقبہ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے یعنی آخری صف کے صحابی تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴۱۳/۳، الاصابة فی تمییز الصحابة: ۴۸۲/۶، ط علمیة) ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بعد آنے والے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ بھی کم عمر صحابہ میں تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۳۱/۵، ط صادر) حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی جگہ تعینات کیے گئے عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ ایک بار مرتد ہونے کی وجہ سے اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔ البتہ فتح مکہ کے وقت دوبارہ اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں استقامت نصیب رہی۔ (طبقات ابن سعد، متمم الصحابة، الطبقة الرابعة: ۴۴۹/۱) ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی جگہ بصرہ پر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا گیا جو ۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، یعنی (۲۹ھ میں) گورنر بنتے وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ (تاریخ الاسلام للذهبی: ۲۵۸/۴، ت تدمری ، ۵۱۶/۲، ت بشار)

③ حقیقت یہ ہے کہ یہ نوجوان صحابہ قیادت کی ان تمام عسکری وسیاسی صفات سے بخوبی آراستہ تھے جن میں بنواُمیہ دیگر قبائل عرب سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ اگر طبقاتِ صحابہ اور تاریخ کی کتب اٹھا کر دیکھا جائے تو مؤرخین نے ان سب کو سخی، شجاع، شریف، دوراندیش اور عادل شمار کیا ہے۔ سوائے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر لگائے گئے اس الزام کے جس کا ذکر آگے آرہا ہے، ان میں سے کسی کا کوئی عیب کسی ضعیف روایت سے پیش کرنا بھی مشکل ہے۔ عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ سے ماضی میں جو ہوا، سو ہوا۔ ''الاسلام يهدم ما كان قبله'' کے بمصداق انہیں بھی کسی بات پر عار نہیں دلائی جاسکتی تھی۔

الغرض امراء کی بعض غلطیوں یا عوامی شکایت کے دو چار الزامات اگر درست مان بھی لیے جائیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارہ سالہ طویل دور میں ۴۴ لاکھ مربع میل کی حکومت میں اکادُکا ایسے واقعات پیش آجانا بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر سبائی تحریک ان کی کردار کشی کر کے فضا خراب نہ کرتی تو ملک میں یقیناً امن وامان بحال رہتا اور لوگ خیر وبرکت کے ساتھ خوش وخرم رہتے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہ ہوتی کہ ان پر حکمرانی کرنے والا کون سا امیر کس خاندان اور کس برادری کا ہے؟ یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر انسان کو اپنے ضروری حقوق سے غرض ہوتی ہے۔ اگر وہ حقوق اسے کسی غیر نسل یا غیر قوم کے حکمران سے بھی ملیں تو وہ مطمئن رہتا ہے۔ اور اگر حق تلفی اپنے خاندان والوں سے بھی ہو تو وہ اسے برداشت نہیں کرتا۔ پس ایسے وقت میں جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھانٹ کر اچھے اور مستعد افراد کو ان کی خدمت پر مامور کیا تھا، عام لوگوں کو فی الواقع حکومت سے کوئی شکایت نہیں ہوسکتی تھی بلکہ خود بعض ایسے بزرگ صحابہ سے جن کی جگہ نوجوانوں کو لایا گیا تھا، اپنے تبادلے کے لیے تعریفی کلمات منقول ہیں۔ جب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ ان کی جگہ بصرہ پر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے تقرر کا فیصلہ کیا گیا ہے تو انہوں نے اہل بصرہ کو کہا: ''تمہارے پاس ایسا نوجوان آرہا ہے جو دادیوں اور پھوپھیوں کے لحاظ سے نہایت شریف النسب ہے۔'' (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۶۱)

مگر افسوس کہ سبائیوں نے امن وآشتی کی فضا خراب کرنے کے لیے معمولی باتوں کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ بہت سے لوگ ان کے جھانسے میں آگئے اور ایک باطنیانہ تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جن نوجوان صحابہ کو آگے بڑھایا، انہوں نے حسب توقع اچھی کارکردگی دکھائی۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کا گورنر بن کر خراسان میں جو فتوحات حاصل کیں وہ تاریخ کا روشن باب ہیں۔ اسی طرح عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے مصر اور افریقہ کی آمدن میں غیر معمولی اضافہ کر کے دکھایا اور جہاد کے سلسلے کو بھی خوب آگے بڑھایا جس کی ایک مثال غزوۃ ذات الصواری ہے۔ ①

مگر شر پسند لوگ ان انتظامی فیصلوں کو منفی رنگ دے کر اُمت کو منتشر کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ لٰہذا عبداللہ بن سبا نے اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے قریبی ساتھیوں کے سامنے یہ لائحہ عمل پیش کیا:

''کام کا آغاز عثمان کے عاملین کی کردار کشی کے ذریعہ کرو، ساتھ ساتھ لوگوں کو نیکی کی تلقین اور گناہوں سے پرہیز کی تاکید کرتے رہو تاکہ تم اُن کے دل جیت سکو۔ پھر انہیں اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دو۔'' ②

چونکہ یہ چند سرکردہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''وصی'' مان چکے تھے اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کا خاتمہ ان کے لیے ایک نیک مقصد تھا اور ان کا ضمیر اس حرکت پر مطمئن تھا۔ ان کا ابتدائی پروپیگنڈا صرف اسی حد تک تھا کہ نوجوان امراء کی تقرریوں کو ایک خاندان کی اجارہ داری اور دوسرے قبیلوں کے استحصال سے تعبیر کر کے لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے امراء سے متنفر کریں۔ وہ معاشرہ بھی ایک انسانی معاشرہ تھا۔ اس لیے یہ باتیں چل نکلیں اور فقط عام لوگ نہیں بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی گود میں پرورش پانے والے محمد بن ابی حذیفہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بھی اس فتنے کی لپیٹ میں آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سخت ناقدین میں شامل ہو گئے۔ ③

☆☆☆

ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کا قضیہ

انہی دنوں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا کہ جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے ان کے خلاف فضا ہموار کرنے کا بہترین موقع تصور کیا۔ ہوا یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ پر جو کوفہ کے گورنر تھے، مے نوشی کا الزام لگا دیا گیا۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ حضرت ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ نے حسن انتظام اور بہترین اخلاق سے سب کے دل جیت رکھے تھے۔ ان کے گھر پر دروازہ تک نہ تھا۔ ہر وقت ہر کوئی ان سے مل کر اپنی ضروریات بیان کر سکتا تھا۔ ④

ان سے مے نوشی کا ارتکاب بالکل غیر متوقع تھا۔ آج بھی یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ آیا واقعی انہوں نے اس معصیت کا ارتکاب کیا تھا؟ یا ان کے خلاف کوئی سازش تیار کی گئی تھی جو اتنی پختہ تھی کہ اُس دور کے اکابر صحابہ کو بھی اس کا یقین آ گیا، جیسا کہ صحیح روایات کے مطابق ان کے خلاف شرعی گواہی (جو صرف عادل افراد دے سکتے ہیں) قائم ہوئی

---

① ان فتوحات کی تفصیل تاریخ خلیفہ اور تاریخ طبری میں ۲۷ ہجری سے ۳۳ ہجری کے حالات کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

② تاریخ الطبری: ۳/۳۴۱

③ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۶۰۲، ت تدمری؛ سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ط الرسالۃ

④ تاریخ الطبری: ۳/۲۷۵



تھی اوران پر حدِ شرعی بھی جاری کی گئی تھی۔ ①

تاہم انہی روایات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شروع میں اس الزام کی تصدیق میں تامل ضرور تھا۔ غالباً وہ معاملے کی تحقیق کرتے رہے، جس سے سزا کے نفاذ میں تاخیر ہوئی اور لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں کہ شاید انصاف کا تقاضا پورا نہ ہوگا۔ حالاں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصد ہرگز یہ نہ تھا کہ شرعی حکم کو ٹالا جائے۔ ②

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۶ (باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ)، ح ۳۸۷۲ (باب هجرة الحبشه) ؛ صحیح مسلم، ح: ۴۵۵۴، کتاب الحدود

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد جاری کیے جانے سے متعلق صحیح بخاری ومسلم کی روایات کا مکمل ترجمہ اگلے حاشیے پر پیش کیا جارہا ہے۔

② بخاری کی روایت میں ہے: عبیداللہ بن عدی بن خیار کہتے ہیں کہ مسور بن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن اسود بن عبدیغوث نے مجھے کہا: "آپ کو اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ آپ اپنے ماموں عثمان سے ان کے (چچازاد) بھائی ولید کے بارے میں بات کریں؛ کیوں کہ لوگ اس کام کے بارے میں بہت کچھ کہہ سن رہے ہیں جو انہوں نے کیا۔" پس جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نماز کے لیے نکلے تو میں ان کے پاس گیا۔ میں نے کہا: "مجھے آپ سے ایک کام ہے، وہ ایک خیر خواہی کی بات ہے۔" کہنے لگے: "ارے میاں! میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں تم سے۔" پس میں لوگوں کے پاس لوٹ گیا۔ جب میں نے نماز ادا کرلی تو مسور بن مخرمہ اور ابن عبدیغوث کے پاس جا بیٹھا اور ان کو اپنی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی گفتگو بتادی۔ دونوں کہنے لگے: "تم نے اپنے اوپر عائد ذمہ داری ادا کردی۔" میں ابھی ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاصد (بلانے) آگیا۔ ان دونوں حضرات نے کہا: "تم کو اللہ نے آزمائش میں ڈال دیا۔" (یعنی دونوں کو خیال ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں بلاکر ڈانٹ پلائیں گے۔ حالاں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اخلاق اس سے بدرجہا بلند تھا۔)

پس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ انہوں نے فرمایا: "تمہاری خیر خواہی کی بات کیا ہے، جس کا تم نے ابھی ذکر کیا تھا؟" میں نے کلمہ شہادت پڑھا۔ پھر کہا: "اللہ سبحانہ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب نازل کی۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہا، اور ان پر ایمان لائے۔ آپ نے دو پہلی ہجرتیں کیں اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی اور ان کی سیرت کو دیکھا مگر لوگ ولید کے معاملے میں (آپ کے تامل کی وجہ سے) بہت کچھ کہہ سن رہے ہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ ان پر حد جاری کریں۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: "بھتیجے! تم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا؟" میں نے کہا: "نہیں مگر رسول اللہ ﷺ کی جو تعلیمات پردے میں کنواری لڑکی تک پہنچ چکی ہیں، وہ مجھے بھی پہنچی ہیں۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کلمہ شہادت پڑھا اور فرمایا: "بے شک اللہ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا، ان پر کتاب نازل کی۔ میں اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے والوں میں سے تھا۔ حضور ﷺ جس دعوت کو دے کر بھیجے گئے میں اس پر ایمان لایا۔ اور جیسا کہ تم نے کہا، پہلی دو ہجرتیں بھی کیں۔ میں حضور ﷺ کی صحبت سے فیض یاب بھی ہوا، آپ سے بیعت بھی کی ہے۔ پس اللہ گواہ ہے کہ میں نے کبھی آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی نہیں کی اور نہ آپ ﷺ کے ساتھ کوئی فریب کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دی۔ اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ میں نے ان کے حکم سے بھی کبھی سرتابی نہیں کی اور نہ ان کے ساتھ کوئی فریب کیا۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ میں نے ان کے حکم سے بھی کبھی سرتابی نہیں کی اور نہ ان کے ساتھ کوئی فریب کیا۔ تو کیا جب مجھے ان کا جانشین بنایا گیا ہے تو مجھے تم پر وہ حقوق حاصل نہ ہوں گے جو ان حضرات کو مجھ پر حاصل تھے؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں۔" فرمایا: "پھر ان باتوں کے لیے کیا جواز رہ جاتا ہے جو تم لوگوں کی طرف سے مجھے پہنچتی رہتی ہیں لیکن تم نے ولید کے حالات کا جو ذکر کیا ہے تو ان شاء اللہ ہم اس معاملے میں حق پر ہی قائم رہیں گے۔" پس آپ رضی اللہ عنہ نے ولید کو چالیس کوڑے لگوائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کوڑے لگائیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کوڑے لگایا کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۸۷۲، کتاب المناقب، باب هجرة الحبشه)

صحیح بخاری کی اس روایت سے اس ماحول کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو اس وقت طاری تھا۔ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بخوبی محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے اپنے قریبی لوگ بھی عام فضا سے کچھ نہ کچھ متاثر ہیں اور انہیں اقربا پرور تصور کرکے ان پر تنقید کے لیے تیار ہیں۔ اسی لیے انہیں پہلے اپنے بھانجے کی بات سننا فضول لگا مگر جلد ہی ان کی حق شناسی اور خود احتسابی نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ خیر خواہی کے عنوان سے کہی جانے والی ہر بات سن لیں۔ پھر اس گفتگو کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک ایک لفظ سے یہ جھلک رہا ہے کہ وہ اپنے بارے میں لوگوں کی بلاوجہ بداعتمادی سے سخت دل گرفتہ تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی ویسے ہی اطاعت کی جائے جیسی گزشتہ خلفاء کی، کی جاتی رہی تھی۔ بلاشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس توقع میں حق بجانب تھے۔

صحیح مسلم میں ہے: حصین بن المنذر کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا جب ان کے پاس ولید بن عقبہ کو لایا گیا جو صبح کی نماز دو رکعت پڑھا کر کہنے لگے تھے: کیا تمہیں اور پڑھادوں؟ اس پر ان کے خلاف دو آدمیوں نے گواہی دی تھی، ان میں سے ایک کا نام حمران تھا جس نے گواہی دی کہ ولید بن عقبہ نے شراب پی ہے۔ دوسرے شخص نے گواہی دی کہ میں نے انہیں (شراب کی) قے کرتے دیکھا ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "انہوں نے شراب نہ پی ہوتی تو قے نہ کرتے۔" پھر فرمایا: "اے علی! کھڑے ہوجاؤ۔ انہیں کوڑے لگاؤ۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "اے حسن! کھڑے ہوجاؤ...... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شرعی شہادت دیکھتے ہوئے مملکت کے اعلیٰ افسر اور اپنے ماں شریک بھائی کو سزا دلوائی اور ساتھ ہی انہیں معزول کر کے حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ یہ واقعہ سن ۲۹ یا ۳۰ ہجری کا ہے۔ [1]

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ﴾ ۔۔۔انہیں کوڑے لگاؤ۔" انہوں نے کہا: "اس کام کی تپش وہی سہے جسے اس کی ٹھنڈک ملی ہو۔" گویا کہ وہ اس بات پر ناراض تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "اے عبداللہ بن جعفر! کھڑے ہو جاؤ، انہیں کوڑے لگاؤ۔" پس انہوں نے کوڑے لگائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ گنتے رہے۔ جب چالیس کوڑے ہو گئے۔ تو فرمایا: "بس کرو۔" پھر فرمایا: "حضور ﷺ نے چالیس کوڑے لگائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس کوڑے لگائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسّی۔ ہر ایک سنت ہے مگر مجھے یہی پسند ہے۔" **(صحیح مسلم، ح: ۴۵۵۴، کتاب الحدود، باب حد الخمر، ط دار الجیل)**

نوٹ: صحیح مسلم کی اس حدیث کے مطابق حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو شرب خمر کی حد چالیس کوڑے لگائی گئی تھی۔ امام شافعی کا راجح مسلک یہی ہے، البتہ ان کے نزدیک اگر حاکم چاہے تو سزا بڑھا کر ۸۰ کوڑے بھی لگا سکتا ہے۔ حنفی، مالکی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک ۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اجماعی فیصلہ یہی تھا۔ **(فتح الملہم لابن الملہم: ۵/ ۳۱۰، ۳۱۱)** چونکہ یہ خالص فقہی بحث ہے، لہٰذا تفصیل کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جائے

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر الزام کی تحقیق ایک دوسرے زاویۂ نظر سے:

چونکہ یہ واقعہ حدیث کے صحیح ترین مجموعوں میں موجود ہے، اس لیے اگر اسے یہ کہہ کر مسترد کیا جائے کہ ایک صحابی سے ایسا شنیع فعل ممکن ہی نہ تھا، تو اس دلیل کے مطابق صحیح بخاری و مسلم بلکہ تمام کتب حدیث کی وہ تمام روایات مسترد کرنا پڑیں گی جن میں رسول اللہ ﷺ کی حیات میں متعدد صحابہ کرام پر حدود کے نفاذ کا ذکر ہے؛ کیوں کہ اگر ہم بعد کے دور میں بھی ایسی خطا کا وقوع ناممکن مانیں تو پھر شمع رسالت کی موجودگی میں اس کا امکان ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر جمہور علماء کی پیروی میں یہ مان لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات میں بھی اکا دکا بعض صحابہ سے بشری تقاضے کے تحت ایسی لغزشیں ہوئی تھیں تو پھر یہ ماننے میں کوئی اصولی رکاوٹ نہیں رہتی کہ بعد کے دور میں بھی ایسی لغزشوں کا امکان ہے۔ یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جرم ثابت ہوئے بغیر ہی ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد جاری کر دی ہوگی؛ کیوں کہ اس طرح تو ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو بچانے کی کوشش میں ان سے کہیں زیادہ برگزیدہ صحابی پر ظلم کا الزام لگ جائے گا۔

تاہم امام طبری کی نقل کردہ بعض تاریخی روایات اس مسئلے کی الگ تصویر پیش کرتی ہیں جن کے مطابق یہ ابوزینب، مُوَرِّع اور جندب نامی تین افراد کی سوچی سمجھی سازش تھی اور گواہ جھوٹے تھے جنہوں نے اپنی دشمنی نکالنے اور ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کے لیے یہ کھیل کھیلا تھا۔ ان لوگوں کے اوباش بیٹوں کو کچھ مدت پہلے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے قصاص میں قتل کیا تھا: کیوں کہ انہوں نے ابن حَیسمان نامی ایک شخص کو سرِعام بڑی بے دردی سے مار ڈالا تھا۔ مجرموں کو سزا ملنے کے کچھ دنوں بعد ان کے گھر والوں نے انتقاماً دعویٰ کر دیا کہ حضرت ولید بن عقبہ شرابی آدمی ہیں۔ (ابن سبا کی طرف سے انہی دنوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عاملین کی کردار کشی کی مہم بھی شروع کی گئی تھی۔ کوئی بعید نہیں کہ اس کے کارندوں نے اس دعوے کو شہرت دینے میں پورا حصہ لیا ہو۔)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شکایت سن کر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ بلوایا اور پوچھ گچھ کی۔ بعض کوفیوں نے ان کے خلاف گواہی بھی دے دی۔ ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کی کوشش کی اور عرض کیا: "امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! یہ گواہ میرے دشمن اور ضدی لوگ ہیں، ان کی بات پر یقین نہ کریں۔" مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اس سزا میں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، ہمیں تو اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا جیسے بات ہم تک لائی گئی ہے۔ اس کے بعد جو کوئی حقیقت میں زیادتی کا مرتکب ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا اور جس پر ظلم ہوگا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر محفوظ رہے گا۔" (تاریخ طبری: ۳/ ۲۷۵) اس کے بعد آپ نے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ جیسا کہ صحیحین کی روایت میں گزرا۔

اس توجیہ پر یہ اشکال ضرور ہوتا ہے کہ طبری کی روایت سنداً ضعیف ہے۔ اس سے صحیحین کی روایت کو مسترد کرنا کیسے درست ہوگا؟

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے اس کا مفصل جواب دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ صحیح روایات سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف گواہی قائم کر کے ان پر حد جاری کی گئی۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فی الواقع بھی انہوں نے شراب پی تھی۔ حاکم ظاہری شہادت پر عمل کرتا ہے۔ اس کے کسی شخص پر حد جاری کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شخص نفس الامر میں بھی مجرم ہو۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے: "ہو سکتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ دلیل دینے میں دوسرے سے زیادہ تیز ہوں۔" **(تکملہ فتح الملہم، کتاب الحدود: ۲/ ۴۹۸ تا ۵۰۱)**

حاشیہ صفحہ موجودہ:

[1] "تاریخ خلیفہ بن خیاط" میں اسے ۲۹ ہجری کا واقعہ بتایا گیا ہے جبکہ امام طبری اور امام ابن اثیر نے اسے ۳۰ ہجری کے واقعات کے تحت نقل کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر الزام لگنے کا قضیہ ۲۹ھ کے اواخر کا تھا۔ اس کے بعد ان کے متعلق شکایت کے مدینہ پہنچنے، خود ان کی مدینہ طلبی، شہادتوں پر غور و فکر، حد کے اجراء اور نئے گورنر کی تقرری میں ۳۰ھ شروع ہو گیا۔ اسی لیے ان کی معزولی اور سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی تقرری ۳۰ھ کے حالات کے تحت نقل کی گئی۔

براہِ راست خلیفہ کی کردار کشی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شریعت کے سامنے قریبی رشتوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنے چچیرے بھائی پر حد جاری کی اور انصاف کا بول بالا کرتے ہوئے سب کو مطمئن کر دیا۔ وہ لوگ بھی چپ ہو گئے جو ان پر خویش نوازی کا الزام دھرتے تھے۔ کیوں کہ اقربا پرور حکمران ایسے مواقع پر آئینی ضابطوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کسی بھی طرح اپنوں کو بچا لیتے ہیں۔

حاسدین اب امرائے دولت کی بجائے براہِ راست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کردار کشی کا کوئی بہانہ تلاش کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد (۳۰ھ میں) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ طبرستان کے علاقے میں جہاد کرنے گئے۔ اس سفر میں انہوں نے لوگوں کو الگ الگ طریقے سے قرأت کرتے دیکھا۔ انہوں نے واپس آ کر کوفہ کے عمائد کو اس مسئلے پر متفکر کیا اور پھر مدینہ منورہ جا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس صورتحال کے عواقب کی طرف متوجہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے مشورہ کر کے امت کو قرآنِ مجید کے ایک رسم الخط پر متفق کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مصحف منگوایا گیا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتب کیا گیا تھا اور ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ تھا۔ اس کی نقول تیار کر کے عالم اسلام میں نشر کی گئیں اور سرکاری نگرانی میں تیار کردہ تصدیق شدہ نسخے کے سوا کلام اللہ کے تمام نسخے تلف کرا دیے گئے۔ اس اقدام کو اہل فکر و نظر نے خوب سراہا، مگر سازشی عناصر نے اسے توہینِ قرآن کے مترادف قرار دیا اور اسے ایک گھناؤنے جرم کا رنگ دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جی بھر کے کوسا۔ مگر تمام صحابہ کرام اس مسئلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم خیال تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے تھے:

''عثمان نے یہ کام ہماری تائید کے ساتھ کیا تھا، اگر یہ معاملہ میرے سپرد ہوتا تو میں بھی حضرت عثمان ہی کی پیروی کرتا۔''[1]

اس طرح یہ پروپیگنڈا بھی بری طرح ناکام رہا۔

عبداللہ بن سبا شام میں:

اس دوران ابن سبا فتنے کو بال و پر دینے کے لیے شام پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر کوشش کی کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف آوازیں بلند ہوں اور اس احتجاج کی ابتدا خود صحابہ کرام سے ہو، تا کہ اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔

اس نے شام کے اکابر کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف اکسانے کی پوری کوشش کی۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور بولے: ''تو ہے کون؟ بخدا میرا خیال ہے تو اب بھی یہودی ہی ہے۔''

اس کے بعد ابن سبا نے عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی مگر انہیں بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ شریر آدمی ہے۔ وہ اسے پکڑ کر سیدھا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے، جنہوں نے تنبیہ کر کے اسے چھوڑ دیا کیوں کہ اس کی شرارتوں کا کوئی ظاہری ثبوت موجود نہ تھا۔[2]

---

[1] الکامل فی التاریخ، تحت ۳۰ ھجری [2] تاریخ الطبری: ۲۸۴، ۲۸۳/۴ ..... بظاہر ابن سبا کو شام میں کوئی کامیابی نہ ہوئی مگر آگے چل کر جس طرح شام میں مرکز گریزی پھیلی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سبا وہاں زیرِ زمین ''تشیع'' کے ردِ عمل میں ''عثمانیت'' کا جذبہ بھڑکانے کا انتظام کر گیا تھا۔

سبائی تحریک کے اجزائے ترکیبی:

سبائی تحریک سے متاثر افراد کے حالات کا گہرا تجزیہ بتاتا ہے کہ اس تحریک کے اجزائے ترکیبی اس طرح تھے:

① کچھ لوگ تحریک کے اصل منصوبہ ساز تھے۔ یہ وہ یہودی تھے جو شروع سے اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں معروف رہے تھے۔ ان میں سے صرف عبداللہ بن سبا کا نام ملتا ہے۔[1]

② دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کی طبیعت باغیانہ تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر ان عرب قبائل کے تھے جو قریش کی سیادت سے جلنے لگے تھے۔[2]

③ تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو دین داری کے غرور و تکبر کا شکار تھے۔ ان میں تنقید کا مادہ بہت زیادہ تھا، اس لیے یہ لوگ بعد میں اس تحریک سے الگ ہو کر ''خوارج'' کے نام سے مشہور ہوئے۔[3]

④ تحریک میں شامل چوتھی قسم کے لوگ وہ تھے جنہیں حکومت نے کسی جرم پر سزا دی تھی۔ اب وہ انتقام لینے کے لیے اس تحریک میں شامل ہوئے تھے۔[4]

⑤ پانچویں قسم کے لوگ وہ تھے جو دولت کے بھوکے تھے۔ سرکاری خزانوں میں محصولات کی مد میں جمع ہونے والے پیسے کو اپنی مٹھی میں لینے کے لیے بے تاب تھے۔[5]

⑥ کچھ وہ نوجوان تھے جو من پسند عہدے نہ ملنے کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

⑦ باقی سادہ لوح عوام تھے جو کسی بھی پکار پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں کسان، مزدور، غلام وغیرہ شامل تھے۔

تحریک میں شامل خاص ارکان کو ''سبائی'' یا ''سَبَئِیَّہ'' کہا جاتا تھا۔ اس دور کے حالات میں ''سَبَئِیَّہ'' کا لفظ طبری اور دوسری قدیم تواریخ میں کثرت سے آتا ہے۔[6]

سبائی سازش کا اصل مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانا تھا، اس لیے مختلف قبائل اور مختلف علاقوں کے لوگوں کو بعض صحابہ کی محبت میں غلو اور بعض کے خلاف تعصب میں مبتلا کیا جا رہا تھا۔ سبائی مہم کے اثرات فقط رفض کی شکل میں نہیں ابھرے بلکہ اگلے دور میں شام، عراق اور بحرین کے بعض شہروں میں بنو ہاشم اور سادات سے نفرت کی جو فضا قائم ہوا

---

① تاریخ الطبری: ۴/۳۱۴

② تاریخ الطبری: ۴/۳۲۶، ۳۲۷

③ مصنف ابن ابی شیبۃ، باب ما ذکر فی الخوارج

④ تاریخ الطبری: ۴/۳۱۸

⑤ تاریخ الطبری: ۴/۳۲۳

⑥ اصل لفظ یہی ''سَبَئِیَّہ'' ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر ''سبائی'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ دیکھیے: مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۱۲۳۶، ط الرشد اردو میں بھی ''سبائی'' استعمال ہوتا ہے۔ اس منافقانہ تحریک کو مزید جاننے کے لیے تاریخ کے درج ذیل حوالوں کو دیکھیے:

- الفتنۃ ووقعۃ الجمل، سیف بن عمر، ص ۹۲، ۹۸، ۱۰۳، ۱۱۶، ۱۵۸
- اخبار الدولۃ العباسیۃ، ص ۱۰۵؛ المعارف لابن قتیبۃ دینوری، ص ۶۲۲، ۶۲۳
- تاریخ الطبری: ۴/۳۲۶، ۳۳۸، ۳۴۴، ۳۵۴، ۵۱۲، ۵۴۱، ۵۴۳، ۵/۱۹۳، ۲۷۲، ۶/۲۵، ۸۴، ۷/۳۲۵
- المنتظم، ابن جوزی: ۵/۷۷، ۸۱، ۸۹، ۹۴، ۹۵؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۴۷۰، ۱۲/۳۸، ۴۰، ۱۳/۲۵۰
- تاریخ ابن خلدون: ۲/۶۰۴، ۲/۶۰۵، ۲/۶۱۷، ۲/۶۱۸، ۲/۶۲۱

(جس نے کہیں ناصبیت اور کہیں خارجیت کا رنگ اختیار کیا) وہ بھی سبائی سازش ہی کا بالواسطہ نتیجہ تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے معاملہ:

اسی سال (۳۰ھ میں) حضور ﷺ کی انگوٹھی مبارک جو آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق وعمر رضی اللہ عنہما سے ہوتی ہوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی تھی، مدینہ طیبہ سے دو میل (لگ بھگ سوا تین کلومیٹر) دور واقع مسجد قبا کے کنویں ''بیراریس'' میں گر کر غائب ہوگئی تھی۔ اس کی گم شدگی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور مسلمان بے حد رنجیدہ ہوئے تھے، اسے کسی خطرے اور فتنے کا پیش خیمہ سمجھا جا رہا تھا۔[1]

اس دوران شام میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنی درویشانہ طبیعت کے باعث لوگوں پر زور دے رہے تھے کہ وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اس صورتحال سے معاشرے میں ایک بدمزگی پیدا ہونے لگی۔ ڈر تھا کہ کہیں امیر و غریب کے درمیان طبقاتی کش مکش کی نوبت نہ آجائے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس صورتِ حال کی اطلاع دے دی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک طرف ابوذر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر کہا کہ وہ مدینہ تشریف لے آئیں۔[2] ساتھ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا:

''فتنے کی جڑیں نمودار ہوچکی ہیں، وہ عن قریب پھیلنے والا ہے، تم اس زخم کو مت کریدنا۔ بس جہاں تک ہو سکے عوام کو سنبھالے رکھو اور خود کو بھی۔ ہاں ابوذر کو عزت واحترام کے ساتھ راہبر اور سامانِ سفر دے کر میرے پاس بھیج دو۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ آگئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ان کے پاس مدینہ ہی میں رہیں مگر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے شہر سے دور ''ربذہ'' کے نخلستان میں قیام پسند کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اونٹوں کا ایک ریوڑ اور دو غلام دے دیے تاکہ اُن کی اچھی طرح گزر بسر ہوتی رہے۔[3]

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مناسب اور متوازن فیصلے کے ذریعے ایک طرف شام میں طبقاتی کش مکش کے خطرے کو دور کر دیا، دوسری طرف ایک جلیل القدر صحابی کی عزت واحترام میں بھی کمی نہ آنے دی۔[4]

مگر سازشی گروہ نے اس بات کو بھی اُچھالنا شروع کر دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم صحابی سے بدسلوکی کی

---

① الکامل فی التاریخ، تحت ۳۰ ھجری

② صحیح البخاری، ح: ۱۴۰۶، کتاب الزکوۃ، باب ما ادی زکاتہ؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۰۶۱۰، ط الرشد

ایک غلط فہمی کا ازالہ: سیف بن عمر کی ضعیف تاریخی روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ عبداللہ ابن سبا کے بہکاوے میں آکر لوگوں کو زہد وقناعت کا درس دینے لگے تھے۔ ان روایات کی بناء پر بعض مورخین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا فتویٰ اور فلسفہ ابن سبا سے ماخوذ تھا مگر یہ باتیں درست نہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بہت اعلیٰ پائے کے عالم فاضل صحابی تھے۔ انہیں کسی گمراہ شخص کی باتوں میں آکر غلط فتوے دینے والا مشہور کرنا ایک غلط الزام ہے۔ سیف بن عمر کی ضعیف روایات کا استناد نہیں کہ ایک صحابی پر جرح کی جا سکے۔ درحقیقت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا زہد وقناعت پر زور دینا نصوصِ شرعیہ کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی بناء پر تھا۔ اسی لیے ان کی بعض آراء منفرد نوعیت کی تھیں مگر وہ اپنے اجتہاد کی بناء پر اس میں معذور تھے۔

③ تاریخ الطبری: ۲۸۴/۴؛ صحیح البخاری، ح: ۱۴۰۶، کتاب الزکوۃ، باب ما ادی زکاتہ فلیس بکنز

④ تاریخ الطبری: ۲۸۵/۴

اور انہیں جلاوطن کرایا۔ (یہ الزام آج تک دہرایا جارہا ہے۔)

ابن سبا کا اثر مصر میں:

سن ۳۱ ہجری میں سازشی عناصر مصر میں بھی متحرک رہے۔ یہاں مشہور کیا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ حاکم مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نااہل ہیں۔ کچھ شرفاء بھی حقائق سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان میں محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکر جیسے عالی نسب بھی تھے۔

سن ۳۲ ہجری میں بحیرۂ روم میں 'ذات الصواری' کی خون ریز جنگ کے دوران مجاہدین نے محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکر کو مسلمانوں سے الگ دیکھا، وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اتنے بدظن ہیں کہ ان کے مقرر کردہ امیر عبداللہ بن سعد کے تحت لڑنا گوارا نہیں کرتے۔ ①

۳۳ ہجری کا آغاز: نئے حوادث:

۳۳ ہجری اس حال میں شروع ہوا کہ سازشی گروہ اندر ہی اندر خاموشی سے کام کر رہا تھا، خصوصاً کوفہ اور بصرہ میں ان کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ کوفہ کے گورنر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ تھے اور بصرہ کے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ۔

سن ۳۳ ہجری میں کوفہ اور بصرہ میں دو واقعات ایسے پیش آئے کہ حکام کو خلافِ معمول تادیبی اقدامات کرنا پڑے۔

پہلا واقعہ کوفہ میں پیش آیا، وہاں حاکم شہر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی مجلس میں چند عرب شہریوں نے ایک نوجوان کو صرف اس لیے زدوکوب کیا کہ اس نے حکام کی تعریف میں کوئی بات کہہ دی تھی۔ یہ اشتعال انگیز حرکت ایسی تھی کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان لوگوں کو تادیب کے لیے حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیج دیا گیا۔

سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی معاشرتی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مہمانوں کی طرح ٹھہرایا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اصل میں یہ لوگ احساسِ کمتری اور جلن کے مریض ہیں، قریش کی سیادت سے حسد کر رہے ہیں۔ انہوں نے نرمی سے سمجھانے کے بعد ان سے فرمایا:

''اچھا جو چاہو کرو مگر اللہ کی شریعت کو ترک نہ کرنا۔ اللہ کی نافرمانی کے سوا تمہاری ہر بات قابل برداشت ہے۔''

ساتھ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے بارے میں لکھ بھیجا:

''یہ بے عقل لوگ ہیں، عدل وانصاف دیکھ دیکھ کر اکتا گئے ہیں۔'' ②

اس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جو حمص کے والی تھے، ان لوگوں کی حرکتوں سے آگاہ ہو کر انہیں اپنے ہاں طلب کر لیا اور ذرا سخت تنبیہ کی۔ انہوں نے اپنی حرکتوں کی معافی مانگی تو حضرت

---

① تاریخ الطبری: ۲۹۲/۴

② تاریخ الطبری: ۳۱۸/۴ تا ۳۲۱، ۳۲۸



عبدالرحمن بن خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں آزاد کر دیا۔ ①

ابن سبا عراق میں:

کوئی گروہ اپنی بدتمیزیوں سے توبہ تائب ہوا تو انصاف پسند حکام کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا ناکام ہو گیا۔ عبداللہ بن سبا اس پر بہت جھنجلایا اور خود بصرہ پہنچ کر خفیہ ذہن سازی شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو عبداللہ بن سبا کو حراست میں لے لیا۔ اس سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے باتیں بنا کر اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے اسے علاقے سے بھگا دیا۔

ابن سبا اب کوفہ پہنچا۔ وہ یہاں نئے گماشتے تیار کر رہا تھا کہ حاکمِ شہر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو اس کی موجودگی کا پتا چل گیا۔ انہوں نے بھی اسے شہر بدر کر دیا۔ سنگین کارروائی اس لیے نہیں کی گئی کہ انصاف کا دور تھا، عدالتوں میں ثبوت پیش کیے بغیر ہرگز سزا نہیں دی جاتی تھی۔

ابن سبا نے مصر واپس آ کر کوفہ اور بصرہ میں اپنے حامیوں سے خفیہ خط وکتابت جاری رکھی، ان کا مقصد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو بدنام کر کے معزول کرانا اور خلافت کو متنازعہ بنانا تھا۔ ②

x x x

① تاریخ الطبری: ۳۲۱/۴، ۳۲۲

② تاریخ الطبری: ۳۲۶/۴، ۳۲۷

۳۴ہجری: جب سازشی عناصر منظر عام پر آئے

سن ۳۴ ہجری کا آغاز ہوا تو کوفہ کی شر پسند جماعت اپنے حاکم حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے خلاف احتجاج کے لیے تیار تھی۔ حاکم شہر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورے کے لیے مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ اس دوران مقامی شورش پسند لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو معزول کرنے کا مطالبہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا ایک ٹولہ اپنے مطالبات لے کر مدینہ منورہ روانہ ہوا، راستے میں سعید بن العاص رضی اللہ عنہ واپس آتے ہوئے ملے۔ کوفی گروہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہماری ان تلواروں کے ہوتے ہوئے سعید کوفہ میں داخل نہیں ہونے پائے گا۔'' حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کو راستہ روکنے پر مُصر پایا تو بولے:

''اس کام کے لیے ایک نمایندے کو امیر المؤمنین کی طرف اور ایک کو میرے پاس بھیج دینا کافی تھا۔''

یہ کہہ کر وہ واپس مدینہ منورہ پہنچے اور امیر المؤمنین کو ساری صورتِ حال بتائی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مفاہمت کا پہلو اختیار کیا اور احتجاج کرنے والوں کے مطالبے کے مطابق حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر فرما دیا۔[1]

قاتلانہ حملے کی ناکام کوشش:

اسی زمانے میں کمیل بن زیاد نامی ایک کوفی مدینہ پہنچا[2] اور لباس میں خنجر چھپا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملے کے لیے آگے بڑھا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چہرے سے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور دھکا دے کر اس کا حملہ ناکام بنا دیا۔ لوگ جمع ہوگئے۔ کمیل نے قسم کھا کر کسی غلط ارادے کی تردید کی۔ لوگ کہنے لگے: ''ہم اس کی تلاشی لیں گے۔''

مگر پیکرِ حیاوشرافت نے فرمایا: ''میں نہیں چاہتا کہ یہ جھوٹا ثابت ہو۔'' پھر یہ کہہ کر اسے چھوڑ دیا:

---

① تاریخ الطبری: ۳۳۵/۴، ۳۳۶ یاد رہے کہ سن ۳۴ ہجری کے حالات میں واقدی سے مروی ہے کہ اس سال صحابہ کرام نے ایک دوسرے کو خطوط لکھ کر دعوت دی کہ جہاد کرنا ہے تو ہمارے ہاں آکر کرو۔ (یعنی اُمت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی دعوت دی) یہ روایت بالکل بے اصل ہے۔ ان خطوط کی حقیقت آگے آئے گی۔ یہ ملحوظ رکھیں کہ واقدی جیسے ضعیف راوی کی روایت اصحابِ رسول پر طعن کے بارے میں قابل اعتبار ہرگز نہیں ہوسکتی۔

② امام بخاری نے کمیل بن زیاد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت لینے والوں میں شمار کیا ہے۔ (التاریخ الکبیر: ۲۴۳/۷) مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں اس کی روایات ملتی ہیں جو زیادہ تر حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کمیل اس حرکت کے بعد تائب ہوگیا تھا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحبت نے اسے صالح بنا دیا تھا، غالباً اسی لیے مدائنی نے اسے کوفہ کے عابدین میں شمار کیا ہے۔ ابن سعد، ابن حبان، عجلی اور یحییٰ بن معین نے اسے ثقہ مانا ہے۔ تاہم کمیل پر سخت جرح بھی ہوئی ہے۔ محمد بن عبداللہ بن عمار نے اسے ''رافضی'' اور ''بلاء من البلاء'' قرار دیا ہے۔ (تھذیب الکمال: ۲۱۹/۲۴)

''اگر تم سچے ہو تو اللہ تمہیں اجر عظیم دے اور اگر جھوٹے ہو تو اللہ تمہیں ذلیل کرے۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اکابر صحابہ سے مشاورت:

ان ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو مدینہ منورہ طلب کر کے عالم اسلام کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں مشورہ کیا، سب کا اتفاق تھا کہ ایک گروہ مذموم مقاصد لے کر ان کے پیچھے پڑا ہے اور بھولے بھالے عوام کو بھڑکا رہا ہے۔ مجلسِ مشاورت میں کسی گورنر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلوں، اقدامات اور رویے کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ صرف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کچھ تنقید کی مگر پھر تنہائی میں خود ہی وضاحت کر دی کہ مقصد صرف یہ تھا کہ جو لوگ حکومت کے مخالف ہیں وہ میرے سامنے اپنے دل کی باتیں کھول دیں اور ان کی اصلاح کی جا سکے۔

بصرہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''لوگوں کو جہاد میں مشغول کر دیں تا کہ کسی اور طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ رہے۔''

شام کے والی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے رائے دی: ''آپ افواج کے امراء سے کام لیں کہ ہر ایک اپنے علاقے کے لوگوں کو قابو میں رکھے۔ شام والوں کا ذمہ میں لیتا ہوں۔''

مصر کے گورنر عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا: ''لوگوں پر خوب خرچ کر کے ان کی ہمدردیاں جیت لیں۔''

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا: ''مرض کی جڑ کاٹ ڈالی جائے، یعنی عوام کو مشتعل کرنے والے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کر کے انہیں نشانہ عبرت بنا دیا جائے، باقی لوگ خود تتر بتر ہو جائیں گے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو سن کر کہا:

''اگر کچھ اندیشے لاحق نہ ہوتے تو یہی کرنا چاہیے تھا۔''

دراصل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ جب حکومت کے خلاف زیرِ زمین سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے آہنی ہاتھ استعمال کیا جائے گا تو پکڑ دھکڑ میں ثبوت اور یقینی شہادتوں کا وہ معیار قائم نہیں رکھا جا سکے گا جو عدالت اور آئین سے مطابقت رکھتا ہے، بلکہ ایسے میں مخبری اور خفیہ اطلاعات پر ہی ہر قسم کی کارروائی کرنا ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجرموں کے ساتھ ساتھ بہت سے بے گناہ بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں، اس طرح تشدد، تشدد کو اور آئین سے ماورا اقدامات لاقانونیت کو جنم دیتے ہیں۔ ان پہلوؤں کے پیشِ نظر امیر المؤمنین نے کسی سخت اقدام کی اجازت نہ دی اور عمال کو اس تائید کے ساتھ رخصت کر دیا کہ لوگوں کو جہاد کے لیے بھیجنے کی تیاری کی جائے۔

اس پالیسی کے مطابق اس سال کوفہ سے سرکردہ امراء فوجیں لے کر ہر طرف نکلے، بہت کم صحابہ کوفہ میں باقی رہے۔ اس لیے شہر اکابر سے خالی لگتا تھا۔[2]

---

① تاریخ الطبری: ۴/۳۰۳ بروایت سیف

② تاریخ الطبری: ۴/۳۴۱

پروپیگنڈا اور تین جھوٹے الزام:

منافقین نے اسلامی معاشرے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فضا عام کرنے کے لیے تین الزامات بہت مشہور کر دیے تھے:

① انہوں نے غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کی۔

② غزوۂ احد سے فرار ہو گئے تھے۔

③ بیعتِ رضوان میں شرکت نہیں کی تھی۔

ان اشکالات کی تردید میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے عالم فاضل صحابی کے مدلل جوابات صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ جب کسی شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزامات عائد کیے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے واضح فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے غزوۂ بدر میں ساتھ نہیں تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (اپنی اہلیہ) حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے روک دیے گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے رکنا ان پر لازم ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مہم میں شریک مجاہدین کے برابر مالِ غنیمت سے حصہ بھی دیا تھا۔

غزوۂ اُحد سے فرار ہونے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے وضاحت کی کہ اس خطا کی معافی کا اعلان خود قرآنِ مجید نے کر دیا تھا۔ اس لیے کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں رہتا۔ ①

رہی بات بیعتِ رضوان میں شرکت نہ کرنے کی، تو یہ بات جہالت کی بدترین مثال ہے کیوں کہ بیعتِ رضوان کا انعقاد ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاطر ہوا تھا۔ انہیں قریش نے نظر بند کر رکھا تھا اور ان کی شہادت کی افواہ پھیل گئی تھی، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے بیعت لی کہ ہم عثمان کے خون کا بدلہ لے کر رہیں گے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا ہاتھ رکھا۔

ابن سبا کا نیا کھیل:

اگلے مرحلے میں عبداللہ بن سبا کے گروہ نے "میڈیا مہم" چلائی۔ ہر شہر کے سازشیوں نے دوسرے شہروں کے لوگوں کے نام جھوٹے خطوط لکھے جن میں حکومت کے جبر و تشدد اور عوام کی مظلومیت کے افسانے تھے۔

حکومت کی زیادتیوں کے یہ افسانے اس شدت اور مہارت سے پھیلائے گئے کہ ہر شہر کے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ہمارے علاقے کو چھوڑ کر باقی عالم اسلام میں ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ چونکہ یہ محض پروپیگنڈا تھا اسی لیے کسی صوبے یا شہر کے لوگوں کو خود حکومت کی جانب سے کسی زیادتی کا تلخ تجربہ نہیں ہوا تھا مگر ہر کوئی یہ تصور کر رہا تھا کہ باقی ملک میں نظام بگڑ چکا ہے، اور لوگ بڑی تکلیف میں ہیں۔ ②

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۸، فضائل الصحابۃ، باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ ؛ سنن الترمذی: ح ۳۷۰۶ یہ اشارہ ہے ارشادِ باری "ولقد عفا عنکم" (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۵۲) کی طرف ② تاریخ الطبری: ۳۴۱/۴



حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تحقیقاتی ٹیم:

یہ افواہیں سن کر اہل مدینہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وضاحت چاہی۔ آپ نے تردید کی اور فرمایا: ''ہر جگہ امن و سلامتی ہے۔'' مزید تسلی کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دے کر ہر صوبے کے حالات کی تفتیش کرائی۔ یہ حضرات ہر صوبے میں عوام وخواص سے مقامی حکام کے کردار اور رویے کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے واپس آئے اور بتایا: ''ہم نے کوئی گڑ بڑ نہیں دیکھی، کسی کو کوئی شکایت نہیں۔''[1]

اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گورنروں نے تحقیقات کر کے یہ بھی بتا دیا کہ کس کس شہر میں کون کون لوگ شر انگیزی کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ مصر سے عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے لکھ بھیجا کہ فتنے کے سرغنہ یہاں عبداللہ بن سبا، خالد بن مُلجَم، سُودان بن حُمران اور کِنانہ بن بِشر ہیں۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تحقیقاتی وفد کی رپورٹ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے عالم اسلام میں منادی کرا دی کہ ''اس سال (۳۴ ہجری) حج کے موقع پر وہ تمام لوگ مجھ سے روبرو ملاقات کریں جنہیں مجھ سے یا میرے نائبین سے کسی قسم کی کوئی شکایت ہو۔ پھر وہ چاہیں تو بدلہ لے لیں چاہیں تو معاف کر دیں۔''

جب یہ اعلان عالم اسلام کے گلی کوچوں میں سنایا گیا تو لوگ جو کہ پہلے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے افسران کے عدل وانصاف کے گرویدہ تھے، رو پڑے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے دعائیں کرنے لگے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس دوران حکام کو مزید تاکید کرتے رہے: ''تم لوگ عوام کا خیال رکھو، ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ ہاں اگر اللہ کے حقوق پامال ہوں تو خاموش مت رہنا۔''[3]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خدشات اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلِ مدینہ کے لیے خیر خواہی:

مستقبل کے خطرات کو بھانپ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ شام تشریف لے چلیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوس کسی قیمت پر ترک نہیں کر سکتا، چاہے میری گردن کٹ جائے۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''میں آپ کی حفاظت کے لیے شام سے فوج بھیج دیتا ہوں جو مدینہ منورہ میں رہ کر آپ کی حفاظت کرے گی۔''

فرمایا: ''میں فوج کی خوراک ورسد اور مصارف کی وجہ سے مدینہ والوں کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، جنہوں نے مہاجرین کو ٹھکانہ دیا تھا اور نصرت کی تھی۔''

---

① تاریخ الطبری: ۳۴۱/۴

② تاریخ الطبری: ۳۴۱/۴ اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری سالوں میں عبداللہ بن سبا مصر میں رہائش پذیر تھا۔

③ تاریخ الطبری: ۳۴۳/۴

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”مجھے آپ پر ناگہانی حادثے کا ڈر ہے۔“

فرمایا: ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ ①

یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دوراندیشی تھی کہ آپ نے شروع سے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کے حقوق کے خیال میں اتنی باریک بینی سے کام لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے کہ فوج کی موجودگی کا مطلب ایک مستقل چھاؤنی کا قیام ہوا کرتا ہے جہاں فوج کے مفادات اصل اور شہریوں کے حقوق ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اہل مدینہ کو ان تکالیف سے بچائے رکھنا چاہتے تھے، اس لیے فوج طلب کرنے کا مشورہ مسترد کر دیا۔

☆☆☆

اکابر صحابہ کی جماعت کا معتدل طرزِ عمل

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ سبائی جماعت مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے امراء کو بدنام کرنے میں بڑی شدت سے مشغول تھی جسے عام سمجھ دار مسلمان سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ شام کے لوگوں کو بنو ہاشم اور سادات کے خلاف بغض و نفرت میں مبتلا کرنے کی بھی مہم جاری تھی۔ ②

شام میں ایک طویل عرصے سے اموی امراء کی گورنری چلی آرہی تھی اور بنو امیہ کے سینکڑوں خاندان، اپنے موالی اور خدام سمیت یہاں شہروں اور چھاؤنیوں میں آباد تھے۔ عربوں کا یہ خاندان نہایت جنگجو اور سیاست دان تھا۔ عوام بھی اس کے گرویدہ تھے۔ اس صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے سبائی تحریک نے شام میں الگ انداز سے کام کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ شر کا بیج اسی وقت بو دیا گیا تھا جب عبداللہ بن سبا شام میں تھا۔ شر انگیزی کی اس مہم کے تحت بنو ہاشم کی کردار کشی کی گئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، ان کے عمال اور اموی امراء کی عقیدت و محبت میں مبالغے کا سبق پڑھایا گیا۔ نیز بعض شہروں میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنانے کی حمایت میں ذہن سازی کی گئی۔ ③

یہ تھے سبائی تحریک کے ابتدائی اثرات جو شکلوں میں ظاہر ہو رہے تھے۔ جیسے غلط چیز جسم میں داخل ہو کر ری ایکشن

① تاریخ الطبری، تحت ۳۵ ھجری، باب: رجع الحدیث الی حدیث سیف عن شیوخہ

② ایسے متشدد لوگ اگلے دور میں نہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بلکہ بنو امیہ کے ہر ہر فرد کے دفاع اور حمایت میں حد سے آگے بڑھ گئے اور اس جوش نے تعصب کا ایسا رنگ اختیار کر لیا کہ یزید اور حجاج بن یوسف کی محبت بھی دین و ایمان کا حصہ قرار پائی جبکہ حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو برملا ملت کا غدار یا کم از کم نالائق اور نادان کہا جانے لگا۔ چونکہ اس ذہنیت کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حمایت اور دفاع کے عنوان سے ہوا تھا، اس لیے یہ گروہ ”عثمانی“ کہلانے لگا۔ عثمانی گروہ میں بھی دو قسمیں تھیں: ایک وہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص سے احتیاط کرتے تھے، البتہ انہیں مجتہد مخطی قرار دیتے تھے۔ ان میں بعض راویانِ حدیث بھی شامل تھے۔ اسماء الرجال کی کتب میں ایسے بعض حضرات کے ذکر میں انہیں ”عثمانی“ قرار دیا گیا ہے، جو ہلکے قسم کی جرح شمار ہوتی ہے۔ ان میں دوسرا طبقہ جو متشدد تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لعنت ملامت کرتا تھا۔ یہ لوگ ناصبی یا مروانی کہلاتے تھے اور اس کے افراد زیادہ تر شامی تھے۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں جو لوگ حد پر قائم رہے وہ شیعانِ علی کہلائے، ان میں کوفہ کے نامور رواۃ حدیث شامل تھے۔ علمائے اُمت نے انہیں ثقہ مانا ہے، مگر ان میں سے جو لوگ سبائیت کا شکار ہوئے وہ خلفائے ثلاثہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ یہ لوگ رافضی کہلائے اور علمائے اُمت نے انہیں گمراہ شمار کیا۔

③ اما اهل البصرة فانهم كانوا يشتهون طلحة واما اهل الكوفة فانهم كانوا يشتهون الزبير. (تاريخ الطبرى: ۳۴۹/۴)

کرتی ہے، اسی طرح اذہان میں اتارے جانے والے منفی خیالات بھی منفی جذبات ابھارتے ہیں۔ بدی کی طاقت کا ہدف ایک تھا یعنی اسلامی جذبے کی جگہ تعصب کو ابھارنا جس کے مظاہر الگ الگ عظیم المرتبت شخصیات کی محبت و عقیدت کے رنگ میں نمایاں ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ عوام میں تفاخر و مباہات کا وہ مزاج عام ہوگیا جسے اسلام نے کبھی پسند نہیں کیا۔[1] بہت سے سادہ لوح، پُرجوش اور دلیر نوجوان اپنے اپنے صوبوں کو اپنی شمشیروں کا خراج اور خاندانی جاگیر تصور کرنے لگے[2] اور اپنے قبیلے کو عرب کے تمام قبائل پر فائق سمجھتے ہوئے مہاجرین وانصار کی حکومت کو ناپسند کرنے لگے۔[3]

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جن قبائلی تعصبات کو اسلامی جذبے نے دبا دیا تھا، سبائیت نے غیر شعوری انداز میں اسے دوبارہ جگا دیا۔ کسی علاقے کے عوام یہ سوچنے لگے کہ خلافت بنوہاشم کو ملنی چاہیے۔ کسی صوبے کے لوگ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو اس نگاہ سے دیکھ کر خوش ہونے لگے کہ وہ بنوامیہ کی خلافت ہے اور انہیں یہ امکان بھی ناگوار لگنے لگا کہ خلافت بنوامیہ سے نکل کر کسی اور خاندان میں جائے۔ یہ تو مسلم معاشرے پر سبائی تحریک کے ابتدائی اثرات تھے۔ آگے چل کر اس نے جو مفاسد پیدا کیے، وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سالوں میں ایک طرف تو سبائی تحریک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے گورنروں کو قطعاً نااہل قرار دے رہی تھی اور ان پر جھوٹے الزامات لگانے میں بھی اسے کوئی باک نہ تھا۔

دوسری طرف ان کے ردِعمل میں کچھ لوگوں نے یہ موقف اختیار کرلیا کہ حکومتی نظام میں کسی اصلاح کی طرف توجہ

---

① قبائلی مفاخر کی یہ نظیریں دیکھنے کے لیے مفضل بن محمد الضبی م ۱۶۸ھ کی ''المفضلیات'' ملاحظہ ہو، جو اسلامی دور کا قدیم ترین شعری مجموعہ شمار ہوتا ہے۔

② تاریخ الطبری: ۳۲۳/۴، فقال الأشتر: اتزعم ان السواد الذی افاء اللّٰہ علینا باسیافنا بستان لک ولقومک.

③ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اس فتنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے "باب بدء الانتقاض علیٰ عثمان رضی اللہ عنہ" کے تحت فرماتے ہیں:

لما استکمل الفتح واستکمل للملۃ الملک ونزل العرب بالامصار فی حدود ما بینھم وبین الامم من البصرۃ والکوفۃ والشام ومصر. وکانت المختصون بصحابۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم والاقتداء بھداہ وآدابہ المھاجرون والانصار من قریش واھل الحجاز ومن ظفر بمثل ذلک من غیرھم. واما سائر العرب من بنی بکر بن وائل وعبدالقیس وسائر ربیعۃ والازد وکندۃ وتمیم وقضاعۃ وغیرھم فلم یکونوا من تلک الصحبۃ بمکان الا قلیلا منھم وکان لھم فی الفتوحات قدم فکانوا یرون ذلک لانفسھم مع مایدین بہ فضلاؤھم من تفضیل اھل السابقۃ من الصحابۃ ومعرفۃ حقھم وما کانوا فیہ من الذھول والدھش لامر النبوۃ وتردد الوحی وتنزل الملائکۃ فلما انحسر ذلک العباب وتنوسی الحال بعض الشیء وذل العدو واستفحل الملک کانت عروق الجاھلیۃ تنفض ووجدوا الریاسۃ علیھم للمھاجرین والانصار من قریش وسواھم فانفت نفوسھم منھم.

''جب فتوحات مکمل ہوگئیں اور امت کو پوری طرح حکومت مل گئی اور عرب قبائل دوسری قوموں کے ساتھ بصرہ اور کوفہ سے شام و مصر تک آباد ہوگئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے ممتاز اور ان کی سیرت وآداب کے (پورے) تابع دار مہاجرین وانصار تھے جن کا تعلق مہاجرین وانصار، قریش اور اہل حجاز سے تھا، یا وہ لوگ جو ان کے علاوہ بھی اس شرف سے بہرہ ور ہوئے۔ رہے عرب کے باقی قبائل جیسا کہ بنی بکر بن وائل، اور عبدالقیس اور پورا ربیعہ، ازد، کندہ، تمیم اور قضاعہ وغیرہ تو یہ لوگ اس صحبت میں اس مقام پر نہ تھے سوائے اس کے کہ ان میں سے بعض کو صحبت کا قلیل حصہ ملا تھا مگر ان کا فتوحات میں بڑا حصہ تھا، پس وہ دل میں خود کو یہی (فتوحات کا باعث) سمجھنے لگے، باوجود اس کے کہ ان کے فضیلت والے لوگ صحابہ میں سے سابقین کی فضیلت مانتے تھے اور ان کا حق پہچانتے تھے۔ انہیں نبوت، وحی کے نزول اور فرشتوں کی آمد نہیں بھولی تھی مگر جب یہ بادل چھٹ گئے اور وہ حالت کسی قدر فراموش ہوگئی اور دشمن مسخر ہوگئے اور مملکت مضبوط ہوگئی تو جاہلیت کی رگ کھل گئی اور وہ مہاجرین وانصار، قریشی اور دیگر قبائل کی اپنے اوپر حکومت کو ناپسند کرنے لگے اور ان کے دل ان سے نالاں ہوگئے۔'' (تاریخ ابن خلدون: ۵۸۶/۲)

دلانا بھی گویا غداری کے مترادف ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنے والا قابلِ گردن زنی ہے۔[1]

ایسے میں مدینہ منورہ کے اکابر صحابہ کرام نے درمیانی راہ اختیار کی۔انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کو بھی تسلیم کیا۔ان کے خلاف جھوٹے الزامات کی بھی تردید کی مگر ساتھ ہی حکومتی انتظامات میں اصلاح کی گنجائش کو بھی مانا اور کوشش کی کہ وہ ان دونوں طبقات کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرسکیں اور مفاہمت کی کوئی بہترین شکل نکل آئے۔جن تاریخی روایات میں مذکور ہے کہ مدینہ کے اکابر صحابہ خصوصاً حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض بلکہ ان کے دشمن تھے، ان میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور ثابت شدہ بات اسی قدر ہے کہ ان حضرات کو اعلیٰ عہدوں پر کسی ایک قبیلے کے غلبے سے عوام میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔اور جب واقعی غلط فہمی کی فضا عام ہونے لگی تو ان حضرات نے امیر المؤمنین کو نیک مشورے دیے۔اس دوران بعض مواقع پر ان حضرات میں بحث ومباحثہ بھی ہوا، اختلافِ رائے کی نوبت بھی آئی اور بشر ہونے کے ناتے بعض اوقات کچھ تلخ کلامی بھی ہوگئی مگر یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اخلاص اور خیر خواہی پر مبنی تھا۔چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آپس میں شیر وشکر ہوجاتے تھے۔[2] ان حضرات کے کہنے سننے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تشویش سے بچانے کے لیے ان معاملات میں بھی لچک اختیار کرلی۔غرض ان تمام معاملات میں مدینہ کے اکابر صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مددگار رہے۔جیسا کہ آگے سارا واقعہ تفصیل سے آرہا ہے۔

☆☆☆

---

[1] اس صورتحال نے بعض شرفاء کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، جس کے نظائر تاریخ ہی نہیں ذخیرۂ حدیث میں بھی ہیں۔مثلاً: ابوالغادیہ جہنی (ثقہ راوی، قول مشہور کے مطابق صحابی) نے مسجد قباء میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کچھ کہتے سن لیا تو کہا کہ میں مددگار پاتا تو انہیں (عمار رضی اللہ عنہ کو) قتل کرڈالتا۔(طبقات ابن سعد: ۳/۲۶۰، ط صادر. عفان بن مسلم عن ربیعة بن جبر) اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔نیز اس کے مویدات بھی ہیں۔(راجع: طبقات ابن سعد: ۳/۲۶۰ ط صادر، عن عفان بن مسلم عن حماد بن سلمة عن ابی حفص ؛ المستدرک للحاکم، ح: ۵۶۵۸ بسند صحیح ؛ المعجم الاوسط، ح: ۹۲۵۲)

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں اشتر نخعی بہت سرگرم تھا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) اس شخص کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کی آراء یہ ہیں:
"مالک بن اشتر النخعی کوفی ،تابعی ثقة (الثقات للعجلی: ۱/۴۱۷) ابن حبان نے بھی ثقہ شمار کیا ہے۔(الثقات، ح: ۵۳۳۸) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "ثقة من الثالثة" (تعجیل المنفعة، تر: ۱۰۲۹) اس قسم کے شرفائے قوم زبان کے پکے سچے ہونے کے باوجود غلط فہمی، جذباتی پن، متشددانہ مزاج یا ایک حد تک حب جاہ کے باعث غلط روش ہوگئے۔دوسری صف میں مروان بن الحکم ایسی ہی ایک مثال ہے جو ایک طرف ثقہ راوی مانا گیا ہے اور دوسری طرف اشتر نخعی کی طرح بعض نہایت غلط کاموں میں ملوث دکھائی دیتا ہے۔

[2] امام ابوبکر خلال رحمہ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس بارے میں بعض روایات ذکر کی ہیں۔ایک روایت میں حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو سب کچھ کہہ ڈالا مگر کچھ ہی دیر بعد دونوں ایک دوسرے سے راضی تھے اور ایک دوسرے کے لیے استغفار کررہے تھے۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہی واقعہ ایک دوسری سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جس کے آخر میں ہے کہ (بحث کے بعد) دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے گویا کہ دونوں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔

عن سعید بن المسیب قال شهدت علیاً و عثمان ... فما ترک واحد منهما لصاحبه شیئا الا قاله ... ثم لم یبرحا حتی اصطلحا واستغفر کل واحد منهما لصاحبه. (السنة لابی بکر الخلال، ح: ۴۱۵، ط دارالرایة) عن ابی سعید الخدری ... فما صلیت الظهر حتی دخل احدهما آخذاً بید صاحبه کانهما اخوان لاب وام یعنی عثمان وعلیاً رحمهما الله (السنة لابی بکر الخلال، ح: ۴۱۶)

سبائیوں کی منصوبہ بندی

قرائن اشارہ کناں ہیں کہ ۳۵ ہجری میں سازشی گروہ اُمت کو لڑانے اور خلافت کو پارہ پارہ کرنے کی منصوبہ بندی مکمل کر چکا تھا۔ منصوبے کے چار رُخ تھے۔ تاکہ اگر ایک رُخ پر کامیابی نہ ہو تو دوسرا سہی۔ یہ چار رُخ درج ذیل تھے۔

① عراق اور مصر کے لوگوں کو جو بنو ہاشم کی طرف زیادہ مائل ہیں، استعمال کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی ایسی تحریک اٹھائی جائے گی، جس میں مدینہ کے تین اکابر صحابہ: حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم بھی ملوث ہو جائیں۔ ان میں سے ہر ایک کو خلافت کا مدعی بنا کر اُمت کو لڑوا دیا جائے۔

② اگر ایسا نہ ہو سکا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جبری استعفیٰ لیا جائے گا۔ مسندِ خلافت خالی ہوتے ہی اکابرِ مدینہ اسے پُر کرنے کی کوشش کریں گے، اس موقع پر اتفاقِ رائے کو ناکام بنا کر خانہ جنگی کی کوشش کی جائے گی۔

③ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مستعفی نہ ہوئے تو انہیں قتل کر کے الزام حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، عمرو بن العاص اور اُمہات المومنین رضوان اللہ علیہم اجمعین سمیت متعدد اکابر پر لگا کر ایسی افراتفری پھیلا دی جائے کہ اُمت کی نگاہ میں یہ اکابر ناقابلِ اعتماد ہو جائیں اور مہاجرین وانصار کسی خلیفہ پر متفق نہ ہو سکیں۔ مسلمانوں کی طاقت بکھر جائے۔

④ اگر پھر بھی مہاجرین وانصار کسی شخصیت پر متفق ہو جائیں تو پروپیگنڈہ کیا جائے کہ اسی شخص نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے سابق خلیفہ کو مروایا ہے۔ اس بات کو اس قدر بڑھایا جائے کہ سابق خلیفہ کے عقیدت مند امراء کسی طرح بھی نئے خلیفہ پر اعتماد نہ کر سکیں اور جنگ چھڑ کر رہے۔ یوں مسلمانوں میں افتراق کی دیوار کھڑی ہو جائے۔

سبائی قافلہ الزامات کی فہرست کے ساتھ مدینہ میں

فتنے کی چنگاری سلگانے اور تخریبی ماحول کو ہوا دینے کے لیے طے کیا گیا کہ ایک وفد کو ان الزامات اور شکایات کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جائے، جنہیں عوام میں مشہور کیا جا چکا ہے۔ یہ وفد واپس آ کر پرچار کرے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی زیادتیوں کا اعتراف تو کر لیا ہے مگر اپنی روش چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ اس طرح خلیفہ کے خلاف عوام کو مشتعل کیا جائے۔ رجب سن ۳۵ ہجری میں سبائیوں کا وفد مصر سے روانہ ہوا۔ والی مصر عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ ان کی حرکات سے باخبر تھے، انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ یہ لوگ آپ کو معزول کرنے کے درپے ہیں۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو مسجد نبوی میں سرِ عام بات چیت کا موقع دیا۔ صحابہ کرام نے اتفاق رائے سے

① تاریخ الطبری: ۳۵۷/۴

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وفد کے ارکان کو بغاوت کے ارتکاب میں قتل کر دیا جائے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شکایت کنندگان کو شک کا فائدہ دے کر ان کے خلاف کسی کارروائی کی اجازت نہ دی، بلکہ خود محاسبے کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پسند کیا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احتساب کے کٹہرے میں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا نسخہ منگوا کر سامنے رکھا، وفد کے الزامات سنے اور ایک ایک بات کا واضح جواب دیا۔ شر پسند لوگ ہر سوال کے ساتھ طنزیہ انداز میں کہتے: ''آپ کو اللہ نے اجازت دی تھی یا آپ اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں؟'' مگر آپ رضی اللہ عنہ بڑے تحمل کے ساتھ تسلی بخش جواب دیتے اور پھر فرماتے: ''اور کوئی بات ہو تو کہو۔''[2]

گفتگو کی مختلف روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھلی کچہری تھی جس میں سرکاری اشتہار کے ذریعے مختلف شہروں کے لوگ بلائے گئے تھے۔ جس نے جو چاہا سوال کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جوابات پر سبائی گنگ ہو گئے جبکہ عام لوگوں نے کھل کر آپ کی سچائی کا اعتراف کیا۔ اس مجلس میں درج ذیل سوال و جواب ہوئے:

① اعتراض کرنے والوں نے کہا: آپ نے ''بقیع'' کی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کر کے اسے ''حمیٰ'' (علاقۂ ممنوعہ) قرار دے دیا ہے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ﴿لا حمی الا للہ ولرسولہ﴾ (اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کو ایسی حد بندی کا اختیار نہیں۔)''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ سلسلہ میں نے شروع نہیں کیا بلکہ پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ مجھ سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدقات کے اونٹوں کے لیے چراگاہیں مخصوص کیں۔ جب مجھے حکومت ملی تو صدقات کے اونٹ زیادہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں نے اونٹوں کی کثرت کی وجہ سے چراگاہوں کا رقبہ بڑھا دیا۔''[3]

مطلب یہ تھا کہ حدیث ''لَاحِمیٰ اِلَّا لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ'' میں جو ممانعت ہے وہ اس صورت میں ہے کہ قبیلوں کے سردار اپنے جانوروں کو چرانے کے لیے جنگلات پر قبضہ کر لیں۔ اس حدیث میں ''لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ'' سے صاف پتا چلتا ہے کہ اگر مسلمانوں کا سربراہ سرکاری اموال اور مویشیوں کی حفاظت کے لیے جنگلات کو مخصوص کر دے تو یہ کوئی ناروا بات نہیں۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود چراگاہیں مخصوص فرمائی تھیں، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے رقبے میں اضافہ فرمایا تھا یہ اقدام بیت المال اور سرکاری اثاثوں میں شامل جانوروں کی عمدہ پرورش کے لیے ضروری تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے کو ترقی دی کیوں کہ بیت المال میں صدقات وغیرہ کے اونٹوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اسی طرح مجاہدین کے لیے گھوڑوں کی بھی مزید ضرورت تھی۔[4] پس سرکاری چراگاہوں کو ترقی دینا ایک کارنامہ تھا، جرم نہیں۔ اور یہ ترقی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی مویشیوں کی نہیں، سرکاری اموال کی تھی۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۴۵/۴ ② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۰۸، ۱۰۹

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۰۹؛ تاریخ طبری: ۳۴۷/۴ ④ اخرجہ احمد بسند صحیح، فی فضائل الصحابہ، ح: ۷۶۵

جہاں تک ذاتی جانوروں کا تعلق تھا اس بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''خلافت سے پہلے پورے عرب میں مجھ سے زیادہ مویشیوں والا کوئی نہ تھا۔ آج میرے پاس صرف ایک بکری اور حج کے لیے دو اونٹ ہیں۔'' یعنی باقی سب صدقہ و خیرات اور عطیات میں خرچ کر دیے تھے۔[1]

(۲) دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ قرآنِ مجید کے کئی نسخے تھے، آپ نے انہیں تلف کر کے ایک نسخے کو رائج کیا۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''قرآن ایک ہے، ایک ذات کی طرف سے آیا ہے، میں نے اس بارے میں جو کیا وہ سب کے اتفاق سے تھا۔''[2]

یہ بھی فرمایا: ''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے مشورے پر میں ایسا کرنے پر آمادہ ہوا تا کہ قرأتِ قرآن میں ویسا اختلاف نہ ہو جائے جیسا کہ اہلِ کتاب میں ہوا۔''[3]

(۳) یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ آپ نے حج کے موقع پر منیٰ میں ظہر، عصر اور عشاء چار چار رکعات پڑھانا شروع کر دیں، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما مسافروں کی طرح دو، دو رکعات (قصر) پڑھایا کرتے تھے۔[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

''مکہ میں میرا گھر ہے، اہل و عیال ہیں، اس لیے میں وہاں (مقیم کی حیثیت سے) پوری نماز پڑھتا ہوں۔''[5]

(۴) اگلا اعتراض یہ کیا گیا کہ حکم بن العاص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر بدر کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی زندگی میں انہیں واپس آنے کی اجازت نہ ملی۔ آپ نے انہیں واپس مدینہ کیوں بلا لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''حکم بن العاص مکی ہیں، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے طائف بھیجا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کیا (یعنی واپسی کی اجازت دے دی تھی) تو کیا میں نے درست نہیں کیا۔''

سب نے کہا: ''بالکل ٹھیک کیا۔''[6]

---

(۱) تاریخ الطبری: ۳۴۷/۴ (۲) تاریخ الطبری: ۳۴۶/۴

(۳) تاریخ المدینۃ، عمر بن شبہ: ۱۱۱۴/۳، ط جدہ ... اس کی تائید میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ صحابہ کا اجتماعی فیصلہ تھا۔'' یہ بھی فرمایا: ''اگر میں خلیفہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔'' (تاریخ المدینۃ، عمر بن شبہ: ۹۹۵/۳؛ تاریخ الطبری: ۱۱۴/۵؛ فتح الباری: ۱۸/۹، ط دار المعرفۃ)

(۴) رہی یہ بات کہ قرآنِ مجید کے نسخے جلائے گئے، تو اس بارے میں علماء و فقہاء کا اتفاق چلا آ رہا ہے کہ اگر یہ عمل قرآنِ مجید کو بے حرمتی سے بچانے اور کسی بگاڑ سے حفاظت کے لیے ہو تو بلاشبہ درست ہے، ہاں اگر توہین اور نفرت کی نیت سے ہو تو کفر ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سرکاری طور پر غیر تصدیق شدہ نسخے تلف کرنے کا حکم قرآن کی حفاظت ہی کے لیے دیا تھا۔ خدانخواستہ کوئی غلط مقصد ہوتا تو حضرت علی، حضرت عباس، حضرت معاویہ، حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ بھلا تائید کیوں کرتے۔ غرض یہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا احسان تھا۔ آپ نے یہ فیصلہ صحابہ کرام کی متفقہ رائے سے کیا تھا تا کہ امت محمدیہ یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی آسمانی کتاب کے الفاظ کے حوالے سے تفرقہ بازی میں نہ پڑ جائے۔ (فتح الباری: ۱۱/۹)

(۵) تاریخ الطبری: ۳۴۶/۴، ۳۴۷ ... دراصل حج کر کے واپس جانے والے دیہاتیوں اور نومسلموں میں یہ غلط فہمی پھیل رہی تھی کہ ظہر، عصر اور عشاء کی فرض نماز ہر حالت میں دو، دو رکعات ہے۔ ایک دیہاتی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روبرو کہہ دیا: ''جب سے آپ کو (منیٰ میں) دو رکعت پڑھاتے دیکھا ہے، میں ہمیشہ دو رکعت نماز ہی پڑھتا رہا ہوں۔'' (فتح الباری: ۵۷۱/۲) اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہاں چار رکعات پوری پڑھانا شروع کیں۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ وہاں مکہ معظمہ میں نکاح کر لیا اور گھر بھی آباد کر لیا۔ اس طرح وہ وہاں شرعاً مقیم کے حکم میں آ گئے۔

(۶) اس بات کی وضاحت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کر کے حکم بن العاص کی جلاوطنی کی سزا ایک مدت بعد معاف (بقیہ اگلے صفحہ پر)

⑤ پھر یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ نے نوجوانوں کو بڑے بڑے عہدے دے دیے اور اکابر صحابہ کو معزول کیا۔[1]

ابن شبہ کی روایت کے مطابق ان لوگوں نے کہا کہ آپ نے اپنے نادان قریشی رشتہ داروں کو حاکم بنایا ہے۔[2]

اس الزام کے جواب میں خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

''میں نے صرف قابل، سمجھ دار اور پسندیدہ نوجوانوں کو عہدے دیے ہیں۔ جن کے اخلاق وکردار اور برتاؤ کے بارے میں ان کے شہر والوں سے پوچھا جا سکتا ہے۔ پھر نوجوانوں کو امیر بنانے کی روایت تو پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر نہیں بنایا تھا؟''

عام حاضرین نے کہا: ''بالکل۔ یہ لوگ ایسے اعتراضات کر رہے ہیں جنہیں وہ ثابت نہیں کر سکتے۔''[3]

پھر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شہر کے لوگ کھڑے ہو کر بتائیں کہ وہ کسے گورنر بنانا پسند کرتے ہیں، میں اسی کو گورنر بنا دوں گا۔ جسے وہ ناپسند کرتے ہیں، اسے معزول کر دوں گا۔''

یہ سن کر اہلِ بصرہ نے کہا: ''ہم عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ پر ہی راضی ہیں۔''

اہلِ شام نے کہا: ''ہم مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر ہی راضی ہیں۔''

اہلِ مصر نے کہا: ''عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر کر دیں۔''[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرنے کی اجازت لے لی تھی مگر عام لوگوں کو اس کا علم نہ تھا، حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دور میں اسے واپس نہ بلایا جا سکا، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اختیار ملا تو آپ نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اسے مزید سزا میں مبتلا نہ رہنے دیں۔ نیز حکم بن العاص کی جلاوطنی کا حکم مدینہ منورہ سے نہیں مکہ معظمہ سے تھا۔ پس مکہ سے شہر بدر کیے جانے والے کو مدینہ میں رہائش کی اجازت دینے میں کون سا گناہ تھا؟ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حکم بن العاص کو مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا تو ہر سزا کی کوئی حد مثلاً دو سال، پانچ سال ضرور ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک پندرہ سال گزر چکے تھے۔ اب سزا ختم ہو جانا ہی انصاف کا تقاضا تھا۔

﴿حاشیہ صفحہ موجودہ﴾

① تاريخ الطبری: ۳۴۷/۴ ② تاريخ المدينة، عمر بن شبہ: ۱۱۱۴/۳، ط جدہ

③ تاريخ الطبری: ۳۴۷/۴ ... پھر آپ نے اکابر صحابہ کرام میں سے کسی کو معزول کیا تو اس کی معقول وجہ موجود تھی۔ مغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو معزول اس لیے کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت یہی تھی کہ انہیں ہٹا کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنایا جائے۔ (الکامل فی التاریخ: ۴۵۳/۲) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو معزول کیا تو اس کی وجہ قرض کا ایک معاملہ تھا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیت المال سے قرض لے کر واپس نہ کر سکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عوام کو بدگمانی سے بچانے کے لیے ان کو معزول کر دیا۔ (تاریخ الطبری، سن: ۲۵ھ) حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو صرف اس لیے مصر سے معزول کیا گیا کہ مصر جیسے زرخیز ملک سے حسب توقع خراج وصول نہیں ہو رہا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو والی بنایا تو خراج دوگنا ملنے لگا۔ (تاریخ یعقوبی، ص ۱۷۱) رہی بات نوجوانوں کو عہدے دینے کی تو اصل میں عہدے دینے میں معیار قابلیت تھا جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہرحال ملحوظ رکھا تھا۔

ان تمام باتوں کے علاوہ عقلاً بھی عمر کے ایک خاص حصے میں جا کر سرکاری ملازمین کی مدت ملازمت ختم ہو جانی چاہیے۔ دورِ حاضر میں ساٹھ سال کی عمر میں ملازمین کو ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جنہیں معزول کیا ان میں سے اکثر کی عمریں اس سے زائد ہی تھیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ کے ناظم بیت المال تھے۔ ۳۲ھ میں جب معزول ہوئے تو بیمار بھی تھے۔ اسی سال فوت ہو گئے۔ ان کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر تھی (اسد الغابۃ، ابن اثیر جزری: ۳۸۱/۳، ط العلمیۃ) عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ۷۰ برس کے ہو چکے تھے۔ (الاصابۃ: ۵۴۰/۴ کے مطابق وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سات برس بڑے تھے جو ۲۳ ہجری میں ۶۳ سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ اس طرح عمرو بن العاص اس وقت ۶۵ سال کے تھے اور ۲۷ ہجری میں معزولی کے وقت ان کی عمر ۶۸ برس بنتی ہے۔)

صرف سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی معزولی ساٹھ سال سے کم عمر میں ہوئی تھی۔ وہ ۵۶ھ میں ۸۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۲۴/۱، ط الرسالۃ) اس حساب سے ۲۵ھ میں معزولی کے وقت وہ ۵۱ برس کے تھے۔

④ تاريخ المدينة، عمر بن شبہ: ۱۱۱۴/۳، ط جدہ باسناد رجالہ ثقات الا جهیم لکن وثقہ ابن حبان



⑥ یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ والی مصر کو افریقہ کے مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ انعام کیوں دیا۔

جواب میں خلیفہ سوم نے فرمایا: ''اسے مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کا پانچواں حصہ (چار فیصد) دیا تھا (کیوں کہ افریقہ کی مہم سے پہلے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے یہ وعدہ ہو چکا تھا) یہ شرعاً غلط نہیں تھا۔ ایسے انعامات حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی دیتے رہے تھے۔ بہر حال جب سپاہیوں نے ناگواری کا اظہار کیا تو میں نے (ان کی دلجوئی کی خاطر) وہ انعام واپس لے کر ان پر تقسیم کر دیا جبکہ وہ ان کا کوئی واجب حق نہ تھا۔''[①]

⑦ یہ مضحکہ خیز شکایت بھی کی گئی کہ آپ اپنے اہل خاندان سے محبت کرتے اور انعامات دیتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''خاندان والوں سے محبت ضرور کرتا ہوں مگر کسی پر ظلم تو نہیں کرتا، جہاں تک انہیں انعام دینے کا تعلق ہے وہ میں اپنی جیب سے دیتا ہوں۔ بیت المال کی دولت جو عام مسلمانوں کی ہے، میں اپنے لیے، نہ کسی اور کے لیے حلال سمجھتا ہوں۔ اپنی جیب سے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے سے عطیے دیتا چلا آرہا ہوں۔ جوانی میں یہ حال تھا تو اب جبکہ زندگی کی شام ہو چکی ہے، میں بھلا کیوں بخل کروں گا۔''[②]

⑧ الزامات کی فہرست میں یہ بھی شامل تھا کہ شہر والوں پر مالی بوجھ اور ٹیکس بڑھا دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

''جو یہ الزام لگاتا ہے میں اس شہر کے محصولات کا کام اس کو سونپتا ہوں، وہ جائے اور اس شہر کے محصولات وصول کرے۔ میرے پاس تو پیداوار کے پانچویں حصے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس میں سے بھی میں اپنی ذات کے لیے ایک پیسہ تک حلال نہیں سمجھتا۔ تقسیم کا بھی تمام اختیار دوسرے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، وہی اس دولت کو عوام پر خرچ کرتے ہیں۔ میں اپنے خرچ کے لیے اس سے کچھ نہیں لیتا۔ اپنی معاش پر انحصار کرتا ہوں۔''[③]

⑨ یہ بھی کہا گیا کہ آپ نے (بنوامیہ کے علاوہ بھی) کچھ افراد کو ناجائز طور پر زمینیں ہدیہ کی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی:

''یہ مسئلہ مہاجرین وانصار کی ان زمینوں کا ہے جو فتح ہوئیں تو انہیں اس میں حصے ملے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہیں ان زمینوں میں آباد ہو گئے، کچھ واپس اپنے گھروں کو آگئے۔ میں نے ان کے مشورے سے وہ زمینیں جو ان کی ملکیت میں باقی تھیں، وہاں کے عرب زمینداروں کو فروخت کر دیں۔ قیمت یہاں ان کے حوالے کر دی، اب جو کچھ

---

① تاریخ الطبری: ۳۴۷/۴

② تاریخ الطبری: ۳۴۷/۴، ۳۴۸

③ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۴

ہے انہی کے پاس ہے، میں نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا۔"[1]

⑪ ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ آپ نے سرکاری اموال سے مروان بن الحکم کو پندرہ ہزار اور عبداللہ بن خالد کو پچاس ہزار کا عطیہ دے دیا۔ (یہ دونوں اموی تھے، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا گیا)

آپ رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی کہ یہ عطیے میں نے اپنے ذاتی مال سے دیے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ یہ لوگ غریب ہیں۔ آپ نے فرمایا: "میرا خیال ہے کہ مجھے اس کا حق حاصل ہے (کہ اپنے ذاتی مال سے عطیے دوں) لیکن پھر بھی اگر آپ لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں تو مجھے ٹوک دیا کریں۔ میری رائے آپ لوگوں کی رائے کے تابع ہے۔"

آپ کا جواب سن کر سب مطمئن ہو گئے اور کہا: "آپ نے ٹھیک کیا، اچھا کیا۔"[2]

اپنی برأت ثابت کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان شرپسندوں کو اصلاحِ احوال کا موقع دے کر واپس جانے دیا، حالاں کہ عام لوگ اصرار کر رہے تھے کہ انہیں بغاوت کی سزا میں قتل کیا جائے۔[3]

☆☆☆

---

① تاریخ الطبری: ۳۴۸/۴

نوٹ: امام طبری نے اسی مقام پر نقل کیا ہے کہ ایک الزام بنواُمیہ کو زمینیں اور مال دینے کا تھا۔ ساتھ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ آخری عمر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کی انتہا کر دی تھی۔ آپ کی ذاتی جائیداد اور دولت بے حساب تھی، آپ نے اسے بنواُمیہ میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ اپنی اولاد کو بھی قبیلے کے عام افراد کے برابر حصے دیے، کوئی امتیاز نہیں برتا۔ یہ کوئی قابلِ الزام بات نہیں بلکہ رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کی ایک شاندار مثال تھی۔

② تاریخ الطبری: ۳۴۵/۴

③ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۴



سبائی جماعت کا راست اقدام

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شورش پسندوں کو گفت وشنید کا موقع دے کر صلح وصفائی کے ساتھ واپس بھیجا تھا۔ مگر اس نرم اور باعزت رویے کے بعد بھی یہ لوگ ذرا نہ شرمائے۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کے سامنے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو قبول کر لیا ہے، جس کے بعد انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے مگر وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی عہدے سے مستعفی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گروہ کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ خلیفہ بڑھاپے میں حکومتی ذمہ داریاں انجام دینے کے قابل نہیں۔ ان سے حکومت لے کر کسی قابل ترین صحابی کے ہاتھ دے دی جائے تو اس میں مسلمانوں کا بھلا ہے۔ [1]

جعلی خطوط:

اس کے فوراً بعد باغیوں نے مدینہ منورہ کے اکابر صحابہ: حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے جعلی خطوط تیار کرا کے راتوں رات کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے شہروں میں پھیلا دیے جن میں اکابر صحابہ کی طرف سے عوام کو دعوت دی گئی تھی کہ اگر انہیں جہاد کرنا ہے تو وہ احتجاجی تحریک کا حصہ بن کر مدینہ طیبہ آ جائیں اور حکومت کی تبدیلی کی کوششوں میں ان کا ساتھ دیں۔ [2]

سبائی قافلوں کی روانگی:

اب انقلابی مدینہ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ ایک قافلہ کوفہ میں، ایک بصرہ میں اور ایک مصر میں تشکیل دیا گیا۔ مرکزی لیڈروں کے ذہنوں میں کارروائی کا مکمل خاکہ موجود تھا مگر انہوں نے اپنے خاص لوگوں کے سامنے بھی صرف اسی حد تک اظہار کیا: ”ہم حاجیوں کے بھیس میں نکلیں گے اور مدینہ پہنچیں گے، عثمان کا گھیراؤ کر کے انہیں معزول کر دیں گے، اگر وہ نہ مانے تو انہیں قتل کر دیں گے۔“ [3]

لیکن ابھی سازش کے پہلے رُخ پر کام کیا جا رہا تھا۔ یعنی متفقہ اور متحدہ خلافت کو سبوتاژ کرنے کے لیے اقتدار کے

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۲۷۵ تا ۲۷۷

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۲۷۷

③ تاریخ الطبری: ۴/۳۴۶۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بے خبر نہیں بیٹھے تھے بلکہ ان کے بھیجے ہوئے دو مخبر باغیوں میں گھل مل کر ان کی منصوبہ بندی کی یہ خبریں اُڑا لائے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اطلاع سن کر ان گمراہوں کے لیے ہدایت کی دعا کی تھی۔ (تاریخ الطبری: ۴/۳۴۶)

متعدد دعوے دار کھڑے کرنا۔ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ بصرہ کے انقلابیوں میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، کوفہ والوں میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور مصر والوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ زیادہ مقبول تھے۔ چنانچہ بصرہ والوں کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جائے گا۔ کوفہ کے قافلے کو یہ ہدف دیا گیا تھا کہ وہ جا کر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے ملیں اور انہیں خلیفہ چنیں۔ مصر والے انقلابیوں کو ان کی خواہش کے عین مطابق یہ بتایا گیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ ①

دراصل مدینہ منورہ میں اکابر صحابہ کے درمیان جو مخلصانہ اختلافِ رائے تھا، اس کی خبریں باہر بھی نکل جاتی تھیں۔ جس طرح آج بہت سے لوگ ان باتوں کو صحابہ کی باہمی عداوت پر محمول کرتے ہیں، اس وقت بھی بہت سے لوگوں نے یہی سمجھا۔ کچھ لوگوں کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ یہ سمجھے کہ اہلِ مدینہ اور یہ اکابر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیادت اور بنوامیہ کی ترقی سے جلتے ہیں۔ اُدھر سبائیوں تک یہ باتیں پہنچیں تو انہیں اُمید ہونے لگی کہ اکابرِ مدینہ موجودہ خلیفہ کا تختہ اُلٹنے میں ان کا ساتھ دیں گے۔ حالاں کہ ان کی یہ توقع بالکل غلط تھی۔

شوال ۳۵ھ میں کوفہ، بصرہ اور مصر سے یہ قافلے روانہ ہوئے۔ ہر قافلے میں ایک ہزار کے لگ بھگ افراد تھے۔ ②

ایسا نہیں تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے گورنر اور دوسرے اکابر ان سرگرمیوں اور ان کے ممکنہ نتائج سے بے خبر تھے۔ کوفہ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگ خروج کے لیے نکلے ہیں، اس کا کیا انجام ہوگا تو بلا تامل فرمایا: ''بخدا یہ لوگ انہیں قتل کر کے چھوڑیں گے، پھر ان کا مقام جنت میں ہوگا اور اللہ کی قسم! ان کے قاتل جہنمی ہوں گے۔'' ③

سبائی قافلوں کی مدینہ آمد: پہلے رُخ پر کوشش ناکام:

مدینہ منورہ اسلامی شہروں کے درمیان واقع تھا، دور دور تک کفار کی کوئی سرحد نہیں تھی، اس لیے یہاں حفاظتی انتظامات کی کوئی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ مدینہ میں فوج برائے نام ہی ہوا کرتی تھی۔ شوال کے آخر میں حاجیوں کا بھیس دھارے فسادیوں کے تینوں قافلے مدینہ منورہ سے اڑتالیس میل (ساڑھے ۷۷ کلومیٹر) دور رُکے۔ عام کارکنوں کو یہاں ٹھہرا کر خاص لوگ آگے چل دیے۔

دراصل عام لوگوں کو یہی سمجھا کر لایا گیا تھا کہ مدینہ میں ایک ظالم حکومت مسلط ہے جس سے خود صحابہ بے زار ہیں۔ اس تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اپنے آدمیوں کو جب تک ممکن ہو، مدینہ کے حالات سے بے خبر رکھا جائے اور بعد میں بوقتِ ضرورت یکدم مشتعل کر کے آگے لایا جائے۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۵۰/۳

② تاریخ الطبری: ۳۴۸/۳، ۳۴۹

③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۶۷، ط الرشد



خاص لوگوں نے آگے جا کر پڑاؤ ڈالا۔ ان میں سے مصر والے وادیٔ ذی المروۃ، بصرہ والے وادیٔ ذی خشب اور کوفہ والے وادیٔ اعوص میں ٹھہرے۔ پھر قافلوں کے قائدین خاص ساتھیوں کو لے کر مدینہ میں داخل ہوئے۔ جب انہوں نے امہات المؤمنین، حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی تو ہر ایک کو اپنی تحریک سے نالاں پایا۔ شرپسندوں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی کا مطالبہ کرنے کی بجائے صرف اتنا کہا:

''ہم کچھ گورنروں کو معزول کرانے کا مطالبہ لے کر آئے ہیں۔''

مگر اکابر صحابہ میں کسی نے ان کو منہ نہ لگایا۔ ①

مدینہ کے باہر صحابہ کرام کا پہرہ:

حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کو اندازہ ہوگیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فضا بنانے کے لیے ان کا نام استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ حضرات مدینہ کے باہر الگ الگ دستوں کے ساتھ کھڑے ہوگئے؛ کیوں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے بہت فکر مند تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اور اسی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے دونوں بیٹوں کو ذمہ داری سونپ دی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذاتی حفاظت کے لیے چوکس رہیں۔ ②

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بھی مدینہ کی حفاظت کے لیے ضروری انتظامات سے غافل نہیں تھے، آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس گھڑسواروں کا دستہ ذی خشب کی طرف بھیج دیا تھا۔ ③ اس لیے باغی اس وقت بزورِ قوت شہر میں گھسنے کی جرأت نہ کرسکے۔

باغیوں کی اکابر صحابہ سے الگ الگ ملاقاتیں:

مصری باغیوں کے سرکردہ لوگ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو مدینہ کے باہر فوجی دستے سمیت موجود تھے، باغیوں نے پیش کش کی کہ وہ انہیں خلیفہ ماننے کے لیے تیار ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور فرمایا: ''نیک لوگ جانتے ہیں کہ ذی مروہ اور ذی خشب میں ٹھہرنے والے قافلوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے لعنت کی گئی ہے۔''

بصرہ کے لیڈر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یہی پیش کش لے کر پہنچے، مگر انہیں بالکل یہی جواب ملا۔ کوفہ کے باغی سرداروں کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بعینہٖ یہی جواب ملا۔ ④

---

① تاریخ الطبری: ۳۵۰/۴

② تاریخ الطبری: ۳۵۰/۴

③ تاریخ دمشق لابن عساکر: ۳۲۲/۳۹، ترجمۃ عثمان رضی اللہ عنہ، ط دار الفکر

④ تاریخ الطبری: ۳۵۰/۴

غرض حضور ﷺ کی پیش گوئی کے علم، فطری حزم واحتیاط اور اپنی ایمانی بصیرت کی وجہ سے اکابر صحابہ سازش کے جال میں نہ آئے اور امت کو تین ٹکڑوں میں بانٹنے کی سبائی سازش کو ناکام بنا دیا۔

اکابر صحابہ کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد یہ لوگ نرم پڑ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی مکمل تسلی کے لیے بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''تمہیں اللہ کی کتاب کے مطابق حقوق دیے جائیں گے۔''

قافلے میں عام لوگ سیدھے سادے تھے جنہیں بہکا کر لایا گیا تھا۔ وہ آپس میں کہنے لگے: ''رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد اور امیر المؤمنین کے نمایندے اللہ کی کتاب کے مطابق بات کر رہے ہیں، اسے قبول کر لینا چاہیے۔''[1]

قضیے کو حتمی طور پر نمٹانے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود مدینہ سے باہر ایک بستی میں آ کر ان لوگوں سے ملاقات کی۔[2] قرآنِ مجید کھولا گیا...... باغی رہنما مختلف آیات پڑھ کر خلیفہ ثالث کے بعض اقدامات پر اعتراضات کرتے رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر بات کا تسلی بخش جواب دیتے گئے۔[3]

باغی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی کے مطالبے سے دست بردار ہو کر صرف گورنروں کی تبدیلی پر راضی ہو گئے تھے، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں پیش کش کی:

''آپ لوگ جس عامل کو پسند کریں گے میں اس کا تقرر کر دوں گا، جسے ناپسند کریں گے اسے ہٹا دوں گا۔''[4]

بدلے میں آپ نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ انتشار نہیں پھیلائیں گے اور جب تک حکومت اپنے عہد پر قائم ہے وہ بھی امت کے اجتماعی دھارے میں شامل رہیں گے۔ ان لوگوں نے خوشی سے یہ باتیں مان لیں۔[5]

مصر والوں کو ان کی خواہش کے مطابق محمد بن ابی بکر کی گورنری کا پروانہ بھی لکھ دیا گیا تھا۔[6]

یہ معاہدہ یکم ذی قعدہ ۳۵ ہجری کو ہوا تھا۔[7]

قافلوں کی واپسی:

معاہدے کی اطلاع سے عالم اسلام کے دیگر شہروں میں ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور تشویش کے شکار مسلمانوں نے چین کا سانس لیا۔[8] شورش کی آگ بظاہر ٹھنڈی پڑ گئی اور باغی تحریک کے کارکن اپنے علاقوں کے لیے واپس روانہ ہونے لگے۔ البتہ مالک بن اَشتر نخعی اور حُکَیم بن جَبَلہ کسی نامعلوم مصلحت کے تحت مدینہ منورہ ہی میں رہ گئے۔[9]

[1] تاریخ دمشق: ۳۹/ ۳۲۸، ترجمہ: عثمان رضی اللہ عنہ

[2] فاستقبلهم فكان فى قرية خارجاً من المدينة. (مصنف ابن ابى شيبة، ح: ۳۷۶۹۰، ط الرشد)

[3] تاريخ خليفة ابن خياط، ص ۱۶۹

[4] قال: فليقم اهل كل مصر يسألوني صاحبهم الذى يحبونه فاستعمله عليهم واعزل عنهم الذى يكرهون. (مصنف ابن ابى شيبة، ح: ۳۷۶۹۱)

[5] تاريخ خليفة بن خياط، ص ۱۲۸

[6] البداية والنهاية: ۱۰/ ۲۸۱

[7] تاريخ خليفه بن خياط، ص ۱۶۸ بروايت مدائنى

[8] مصنف ابن ابى شيبة، ح: ۳۷۷۵۷، كتاب الجمل

[9] تاريخ الطبرى: ۳/ ۳۷۵ عن محمد بن عمرو

سازش کا دوسرا رُخ: جعلی خط اور باغیوں کا دوبارہ حملہ:

اگر یہ فطری شورش ہوتی تو اس متفقہ معاہدے کے بعد ختم ہو جاتی مگر شورش کی اصل باگ ڈور جن عیاروں کے ہاتھ میں تھی وہ طے کیے ہوئے تھے کہ فساد کی آگ کسی نہ کسی بہانے بھڑکا کر رہیں گے۔ ①

مصر واپس جانے والا قافلہ راستے میں تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک شخص دکھائی دیا، وہ انہیں دیکھ کر بھاگا، پھر قریب آیا اور دوبارہ فرار ہو گیا۔ قافلے کے لوگوں کو شک ہوا تو تعاقب کر کے پکڑ لیا اور پوچھا: ''تم کون ہو؟'' کہنے لگا: ''میں حاکمِ مصر کی طرف امیر المؤمنین کا قاصد ہوں۔'' تلاشی لی گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زبانی لکھوائی گئی ایک تحریر برآمد ہوئی جس میں مصر کے گورنر کو حکم دیا گیا تھا کہ جب یہ قافلے والے مصر پہنچیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔'' ②

قافلے والے یہ تحریر دیکھ کر غصے سے بے حال ہو گئے۔ تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے اس تیزی سے مدینہ واپس پہنچے کہ مقامی لوگ حیران و پریشان رہ گئے۔ اس بار اہلِ قافلہ میں سے کسی کو پیچھے نہ رکھا گیا۔ سبھی باغی شہر میں گھس گئے۔ ③

آناً فاناً بصرہ اور کوفہ جانے والے بھی لوٹ آئے اور اس باغیانہ کارروائی میں شریک ہو گئے۔ شہر کے راستوں اور ناکوں پر قبضہ کر کے انہوں نے اہلِ شہر کو بے بس کر دیا۔ پھر چند باغی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور بولے:

''آپ ہمارے ساتھ عثمان کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بے زاری سے کہا: ''اللہ کی قسم! میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔''

وہ بولے ''تو پھر آپ نے ہمیں وہ خطوط کیوں لکھے (جن میں انقلاب کی دعوت دی گئی تھی)؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔'' یہ سن کر عام بلوائی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور کہنے لگے: ''ارے! تم اس شخص کی خاطر لڑ رہے ہو، اِس کے لیے غصہ کر رہے ہو۔'' ④

دراصل عام باغیوں کو پتا ہی نہیں تھا کہ صحابہ کی جانب سے انقلاب کی دعوت پر مشتمل خطوط جعلی تھے۔

یہی باتیں کوفہ والوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے اور بصرہ والوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے کیں۔ صحابہ نے باغیوں کو یہ بھی کہا: ''آخر تم کو دوسرے قافلوں کے ساتھیوں کا حال معلوم کیسے ہوا؟ تم لوگ الگ الگ سمتوں میں کوچ کر چکے تھے، تمہارے درمیان کئی دنوں کا فاصلہ تھا۔ ہو نہ ہو، یہ پہلے سے طے شدہ سازش ہے۔'' ⑤

اب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر پوچھا: ''آپ نے ہمارے بارے میں یہ مراسلہ لکھا ہے؟''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدھی اور اصولی بات کی، فرمایا: ''دو باتوں میں سے ایک اختیار کر لو، یا تو اس پر دو مسلمانوں کی گواہی لے آؤ کہ یہ مراسلہ میں نے لکھوایا ہے یا مجھ سے اللہ کی قسم لے لو کہ میں نے نہ یہ لکھا ہے نہ لکھوایا

① تاریخ الطبری: ۳۵۰/۴

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۶۹؛ تاریخ المدینة لابن شبة: ۱۱۴۹/۴

③ تاریخ الطبری: ۳۵۱/۴

④ تاریخ الطبری: ۳۵۵/۴ ⑤ تاریخ الطبری: ۳۵۱/۴

ہے، نہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہوں؛ کیوں کہ مہر جعلی بھی لگائی جا سکتی ہے۔''

باغی کوئی شرعی گواہی پیش کر سکے نہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حلف لینے پر آمادہ ہوئے۔ ایک انتہا پسندانہ سوچ کے ساتھ ان کی ایک ہی رَٹ تھی ''تم نے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔''[1]

باغیوں نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ آپ کا خط نہیں تو پھر یہ کیا دھرا مروان کا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کیا جائے۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ سازش مروان نے کی ہے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خدشہ تھا کہ یہ بپھرے ہوئے لوگ مروان کو قتل ہی نہ کر ڈالیں، اس لیے انہوں نے مروان کو ان کے سپرد نہ کیا۔[2]

مشہور ہے کہ خط لے جانے والا شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام تھا جسے ان کے کاتب مروان نے بھیجا تھا مگر صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام اس سازش میں استعمال نہیں ہوا تھا۔ سازشیوں نے جھوٹ موٹ یہ

---

① تاریخ خلیفة، ص ۱۶۹ ② تاریخ الطبری: ۳۷۴/۴

کیا خفیہ خط کی سازش کا مجرم مروان تھا؟

مشہور ہے کہ خفیہ خط کی سازش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کاتب مروان نے کی تھی مگر سوال یہ ہے کہ کیا مروان کو اندازہ نہ تھا کہ یہ حرکت پکڑی گئی تو کس قدر مہنگی پڑے گی جس کے نتیجے میں مسلح بغاوت برپا ہو سکتی ہے اور حکومت گر سکتی ہے۔ مروان کو اس سے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ اس طرح تو اس کا موجودہ منصب بلکہ جان بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور مروان دونوں اس الزام سے بری تھے۔ ان کی برأت اور خط کے جعلی ہونے کی ناقابلِ تردید دلیل یہ ہے کہ مکتوب الیہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ اس وقت مصر میں تھے ہی نہیں بلکہ مصری باغیوں کی روانگی کے بعد وہ بھی ان کے پیچھے مصر سے نکل کر شام و حجاز کی سرحد کے قریب آٹھہرے تھے تاکہ اگر ضرورت پڑے تو مدینہ پہنچ جائیں۔ ضرورت نہ ہو تو مصر واپس چلے جائیں۔ درج ذیل تاریخی عبارات اسے ثابت کرتی ہیں:

ثم ان عبداللّٰہ بن سعد خرج الی عثمان فی آثار المصریین، وقد کان کتب الیه یستاذنه فی القدوم علیه، فاذن له، فقدم ابن سعد حتیٰ اذا کان بایلة بلغه ان المصریین قد رجعوا الی عثمان وانهم قد حصروه. ''عبداللہ بن سعد مصریوں کے پیچھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مراسلہ بھیج کر ان کے پاس آنے کی اجازت لے چکے تھے اور وہ انہیں آنے کی اجازت دے چکے تھے۔ پس عبداللہ بن سعد آ کر جب ایلہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مصریوں نے لوٹ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محصور کر لیا ہے۔'' **(تاریخ الطبری: ۳۷۸/۴ عن الواقدی)**

فخرج عبداللّٰہ بن سعد من مصر فنزل علی تخوم ارض ممایلی فلسطین فانتظر مایکون من امر عثمان. ''عبداللہ بن سعد مصر سے نکل کر فلسطین سے ملحقہ علاقے میں آ گئے اور منتظر رہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا پیش آتا ہے۔'' **(تاریخ الطبری: ۵۴۶/۴ عن ابی مخنف)**

کان عبداللّٰہ بن سعد القرشی امره عثمان رضی اللہ عنہ علیٰ مصر فخرج علیٰ عثمان رضی اللہ عنہ وافداً حین تکلم الناس فی عثمان رضی اللہ عنہ (ثم ذکر الراوی خروج ابن ابی حذیفة وغلبته علی مصر ومراجعة عبداللّٰہ بن سعد الی مصر ومنع البغاة ایاه عند جسر بحیرة قلزم) --- فانصرف الیٰ عسقلان وکره ان یرجع الیٰ عثمان وقتل عثمان رضی اللہ عنہ وهو بعسقلان.

''عبداللہ بن سعد قریشی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر کا امیر بنایا تھا۔ جب لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیے تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملنے روانہ ہوئے۔ (اس کے بعد ان کی غیر موجودگی میں مصر میں ابن ابی حذیفہ کی بغاوت اور عبداللہ بن سعد کی مصر کی طرف مراجعت اور بحیرۂ قلزم پر باغیوں کے پہرے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکنے کا ذکر کر کے راوی کہتا ہے:) پس وہ عسقلان لوٹ گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹنا پسند نہ کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے وقت وہ عسقلان ہی میں تھے۔'' **(تاریخ المدینة لابن شبه: ۱۱۵۳/۴)**

حاکم مصر کا اپنے صوبے میں نہ ہونا ایک سرکاری خبر تھی جس کی اطلاع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور مروان کو (جو ساری خط و کتابت، حساب کتاب اور دفتری امور کا نگران تھا) ہو چکی تھی۔ پس یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ عبداللہ بن ابی سرح کے نام یہ مراسلہ بھیجیں کہ جب قافلہ مصر پہنچے تو تم انہیں قتل کرا دینا؛ کیوں کہ انہیں تو معلوم تھا کہ مکتوب الیہ مصر سے باہر آ چکا ہے۔ یہ مراسلہ جس نے بھی بنایا تھا وہ کوئی ایسا آدمی تھا جو اس سرکاری راز سے لاعلم تھا۔ غالب گمان یہ ہے کہ حُکَیْم بن جبلہ نے جو قافلوں کی روانگی کے باوجود مدینہ میں پیچھے رہ گیا تھا، جعلی خط کا کھیل کھیلا تھا۔ اَشترنخعی پر بھی شک ہو سکتا ہے مگر کم کیونکہ اس کی طبیعت میں سازش کی بجائے حماقت، جوش اور تیز مزاجی کی کارفرمائی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے زیادہ گمان یہ ہے کہ یہ کام حُکَیْم بن جبلہ نے کیا ہوگا جسے بعض روایات میں ''لِصٌّ مِن لصوص عبد القیس'' یعنی عبدالقیس کے چوروں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ **(تاریخ الطبری: ۴۳۵/۴)**



مشہور کردیا کہ ان کا غلام پکڑا گیا ہے۔ [1]

باغی مسجد نبوی میں:

باغی چند دنوں تک مدینہ میں دندناتے رہے۔ مدینہ کے لوگ فساد کے ڈر سے گھروں میں بیٹھ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس دوران مسجد نبوی میں نمازیں پڑھاتے رہے...... جمعے کا دن آیا تو آپ نے منبر پر خطبہ دیا۔ اس دوران باغیوں نے ہنگامہ کردیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کنکروں کی بارش کردی۔ آپ رضی اللہ عنہ زخمی ہوگئے اور غشی طاری ہوگئی، صحابہ کرام آپ کو اُٹھا کر گھر لے گئے۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی عیادت کے لیے آئے اور اس صورتِ حال پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ [2]

محاصرہ:

پہلے باغیوں نے آپ کے نماز پڑھانے اور خطبہ دینے پر پابندی لگائی۔ پھر نماز باجماعت کے لیے مسجد میں داخلہ بند کیا، اور پھر کچھ دنوں بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کا محاصرہ کرلیا۔ [3]

باغیوں کا مطالبہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت سے استعفاد دے دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اس بارے میں پہلا اور آخری فیصلہ یہ تھا: ''میں اس قمیص کو نہیں اُتاروں گا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنائی ہے۔'' دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کو تاکیدی وصیت تھی کہ اللہ کی طرف سے خلافت کی ذمہ داری ملے تو اس سے دست بردار نہ ہونا۔ [4]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک تھا: ''اے عثمان! اگر اللہ تمہیں کسی دن یہ منصب عطا کرے پھر منافقین چاہیں کہ اللہ نے تمہیں جو کرتا پہنایا ہے اسے اتار دیں تو تم مت اتارنا۔'' نطقِ رسالت سے یہ ارشاد بطورِ تاکید تین بار دہرایا گیا تھا۔ [5]

---

[1] اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ لوگ اس غلام کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کردیتے۔ اگر اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہوتا تو باغی اسی سے مجمع عام میں گواہی دلوا کر اپنا دعویٰ ثابت کرسکتے تھے۔ خط کے اصلی یا جعلی ہونے سے کہیں زیادہ ایک انسان کی گواہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مجرم ظاہر کرسکتی تھی مگر تاریخی ریکارڈ کے مطابق اس شخص کو کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ غور کیا جائے تو یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ سازش کے مرکزی کرداروں نے پہلے سے جعلی مہر تیار کی ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے انہوں نے جعلی خط تیار کیا اور اپنے ایک شخص کو خط دے کر اسے جان بوجھ کر قافلے کے سامنے ظاہر ہونے کا کہا۔ وہ جس طرح مصری قافلے کے پاس ظاہر ہوا اور پھر دور بھاگا، اس سے بھی سازش کی بو صاف محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ اسے پاس سے گزرنے اور پھر بھاگ کر دوسروں کو شک میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی طرح اہلِ قافلہ کے پوچھنے پر اس کا فوراً یہ کہہ دینا کہ ''میں حاکم مصر کی طرف بھیجا گیا خلیفہ کا قاصد ہوں'' بھی عجیب تھا۔ اگر وہ واقعی خلیفہ کا وفادار تھا اور خفیہ پیغام لے جارہا تھا تو اپنی شناخت ضرور چھپاتا۔ یاد رہے کہ واقدی کی روایات میں اس شخص کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غلام ظاہر کرتے ہوئے اس کا نام ابوالاعور بن سفیان السلمی بتایا گیا ہے جو ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ ابوالاعور بن سفیان السلمی کوئی غلام نہیں، بنو عبد شمس کے شرفاء میں سے تھے، اصل نام عمرو بن سفیان تھا۔ یہ ان صحابہ میں سے تھے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں قبرص کی فتح میں شریک تھے اور بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سالار رہے۔ (الاصابۃ: ۴/۵۲۹، ۵۳۰، ط العلمیۃ)

[2] تاریخ الطبری: ۴/۳۵۳

[3] تاریخ الطبری: ۴/۳۴۸

[4] سنن الترمذی، ح: ۳۷۰۵ باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، قال الالبانی: صحیح

[5] یا عثمان ان ولاک اللّٰہ ھذا الامر یوماً فارادک المنافقون ان تخلع قمیصک الذی قمصک اللہ فلا تخلعہ یقول ذلک ثلاث مرات. ﴿سنن ابن ماجۃ، ح ۱۱۲. قال الالبانی: صحیح﴾

یہ صحیح حدیث واضح طور پر ثابت کررہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کے سرغنہ صحابہ کرام نہیں تھے بلکہ اس کے بانی منافق قسم کے لوگ تھے۔ کیونکہ زبانِ رسالت کی پیش گوئی میں انہیں ''المنافقون'' کہا گیا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب اُشتر نخعی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مل کر انہیں خلافت سے دستبرداری پر مجبور کرنے کی کوشش کی تو دامادِ مصطفیٰ نے فرمایا: ''اللہ نے مجھے جو قمیص پہنائی ہے، میں اسے نہیں اتاروں گا۔ اگر میری گردن بھی کٹ جائے تو یہ مجھے پسند ہے مگر یہ گوارا نہیں کہ امت کا یہ حال کر جاؤں کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں۔''

اُشتر نے مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں کھلم کھلا لڑائی کی دھمکی دی۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تم نے ایسا کیا تو آئندہ کبھی آپس میں باہم محبت نہیں کر سکو گے، کبھی سب ایک ساتھ نماز نہ پڑھ سکو گے، کبھی اکٹھے جہاد نہیں کر سکو گے۔''[1]

باغیوں کا مطالبہ کیوں نہ مانا گیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس فتنے کی تفاصیل سے بھی آگاہ کر دیا تھا جس کی انتہاء آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت تھی۔ رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت نہ چھوڑنے کی اتنی سخت تاکید کیوں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گروہ جو آپ کی معزولی کا مطالبہ کر رہا تھا، امت کی رائے عامہ کا ترجمان ہرگز نہیں تھا۔ وہ محض اُمت کو لڑوانا چاہتا تھا۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ایسے گروہ کے مطالبے پر جو اُمت کا صحیح نمائندہ نہیں تھا، خلافت چھوڑ دیتے تو قیامت تک یہ روایت بن جاتی کہ جب کسی عادل حکمران، یا دیندار امیر کو گرے پڑے لوگوں کی شورش اور احتجاج سے واسطہ پڑتا اسے عہدے سے مستعفی ہونا پڑتا۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی باغیوں کا مطالبہ نہ ماننے کی رائے پر جمے رہنے کا مشورہ دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: ''اگر آپ خلافت چھوڑ دیں تو کیا آپ ہمیشہ دنیا میں رہیں گے؟ اور اگر آپ خلافت نہ چھوڑیں تو کیا یہ لوگ آپ کو قتل کرنے سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں؟ مجھے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ آپ اس قمیص کو اُتاریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہنائی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو ایک روایت چل پڑے گی کہ جب بھی کسی جماعت کو اپنا خلیفہ یا امیر پسند نہیں آئے گا وہ اسے معزول کر دیں گی۔''[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلوار نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیوں کیا؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مزید سخت امتحان یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شورش پسندوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی جگہ صبر وتحمل اور برداشت کا حکم دیا تھا۔ جب لوگوں نے باغیوں کے خلاف مسلح کارروائی کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک وعدہ لے رکھا ہے۔ پس میں اپنی جان کو اسی پر کاربند رکھتے ہوئے صبر کروں گا۔''[3]

حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے لڑائی پر اصرار کیا تو خلیفۂ ثالث نے فرمایا:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین میں سے وہ پہلا شخص نہیں بننا چاہتا جو امت کا خون بہائے۔''[4]

---

① تاریخ الطبری: ۳/۳۷۱، ۳۷۲، عن یعقوب بن ابراھیم

② طبقات ابن سعد: ۶۶/۳، ط صادر، بسند صحیح ؛ تاریخ المدینۃ لا بن شبہ، ۱۲۲۹/۴ ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۰

③ مسند احمد، ح: ۲۴۲۵۳ ؛ سنن ابن ماجۃ، ح ۱۱۳، باسناد صحیح

④ مسند احمد، ح: ۴۸۱

حضرت عبداللہ بن زبیر، کعب بن مالک اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے حضرات نے پیش کش کی کہ اجازت ہو تو دشمن کو مار بھگائیں۔ فرمایا: ''مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں۔''[1]

ممانعت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کو کشت و خون کا مقام نہیں بنانا چاہتے تھے۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا: ''مدینہ سرزمین محترم ہے، نہ اس کا درخت کاٹا جائے، نہ اس میں کسی شرانگیزی کا ارتکاب کیا جائے۔ جو اس میں شرانگیزی کرے گا، اس پر اللہ کی، تمام فرشتوں کی اور سب انسانوں کی لعنت۔''[2]

دیگر شہروں کے مسلمانوں کی بے چینی اور سبائیوں کی غلط خبر رسانی:

خلیفہ کے گھیراؤ کی خبر سن کر مختلف شہروں سے مسلمان مدینہ کی طرف روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ بعض لوگ اس مہم کے لیے نکل بھی پڑے تھے۔[3] اس دوران خبر آئی کہ معاملہ صلح وصفائی سے حل ہو گیا ہے۔ شورش پسند کوفہ، بصرہ اور شام تک غلط خبریں پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے مدینہ کی صحیح صورتحال ان شہروں کے وفادار مسلمانوں تک نہ پہنچنے دی۔ چنانچہ امن بحال ہونے کی اطلاع ملنے پر لوگ سفر کا خیال چھوڑ کر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔[4]

کھانے اور پانی کی بندش، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدد کی کوششیں:

گرمی شدید ہوئی تو باغیوں نے محاصرے کی سختی بھی بڑھا دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر اشیائے خورد ونوش اور پانی لے جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ پہلے پہل حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہ کچھ ضروریات کا سامان پہنچا دیتے تھے مگر پھر باغیوں نے انہیں بھی روک دیا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے کھانے پینے کا ذخیرہ ختم ہونے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو باغیوں سے کہا: ''تمہاری یہ حرکت مسلمانوں جیسی ہے نہ کافروں جیسی۔ رومی اور ایرانی کافر بھی قیدیوں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اس شخص نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے جو تم اس کے گھیراؤ اور قتل پر تلے ہوئے ہو۔''

مگر یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو اپنا عمامہ کھول کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں پھینک دیا تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ علی رضی اللہ عنہ آئے ضرور تھے مگر کچھ کر نہ پائے۔[5]

امہات المؤمنین کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نصرت کی کوشش:

ایک دن ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان لاد کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف تشریف لائیں مگر باغیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی لاج بھی نہ رکھی، ان سے بدتمیزی کی، سامان چھین لیا اور خچر کو اس طرح مار کر بھگایا کہ ام المؤمنین گر کر زخمی ہوتے ہوتے بچیں۔[6]

---

① طبقات ابن سعد: ۷۰/۳ ط صادر ؛ مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۰۸۲ ؛ تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۳

② صحیح البخاری، ح: ۱۸۶۷، کتاب الحج، باب حرم المدینة

③ تاریخ الطبری: ۳/ ۳۵۱، ۳۵۲ ؛ التاریخ الاوسط: ۱/ ۹۲، ط دار الوعی، فیه "فجاء بنصر عثمان"

④ مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۵۷، ط الرشد

⑤ تاریخ الطبری: ۳۸۶/۳ ⑥ تاریخ الطبری: ۳۸۶/۳

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محاصرے کے بقیہ دن بڑی تکلیف میں گزارے، آپ کے پڑوسی حضرت عَمرو بن حزم رضی اللہ عنہ بہت چھپ چھپا کر تھوڑا بہت کھانا پینا اپنے گھر سے آپ کے پاس بھیج دیتے تھے جس سے کچھ نہ کچھ گزارا چلتا رہا۔[1] ایک دن اُم المؤمنین حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے نکلیں مگر راستے ہی میں اَشتر نخعی نے ان کی سواری کو طمانچے مار کر واپس کر دیا۔[2]

ایک دن اَشتر نخعی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں رائے معلوم کرنا چاہی۔ وہ سخت لہجے میں بولیں: ''معاذ اللہ! میں مسلمانوں کا خون بہانے اور ان کے خلیفہ کو قتل کرنے اور حرام کو حلال کرنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہوں۔''[3]

خلیفہ ثالث کو جان سے زیادہ حج کے انتظامات کی فکر:

حج کے ایام آ گئے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ حجاج کے قافلے کی قیادت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ روانہ ہو جائیں۔ انہوں نے عرض کیا: ''امیر المؤمنین! اللہ کی قسم، ان شر پسندوں سے جہاد کرنا میرے نزدیک حج سے بڑھ کر ہے۔'' مگر خلیفۂ ثالث نے قسم دے کر انہیں اس حکم کی تعمیل کا کہا تا کہ حج کا عظیم الشان اسلامی رکن حسبِ معمول پورے اہتمام سے ادا ہو۔[4]

بعض اکابر مدینہ شہر چھوڑ گئے:

حج کے لیے قافلہ تیار ہوا تو اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی قافلے کے ساتھ حج پر روانگی کا ارادہ کر لیا تھا، کیوں کہ باغیوں کے تسلط کے بعد آپ کو شدید خطرہ لاحق ہو چکا تھا کہ کہیں یہ شر پسند حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد امہات المؤمنین کو بھی نشانہ نہ بنائیں۔ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ اور صَفِیّہ رضی اللہ عنہا کی سر عام توہین کے بعد یہ خدشہ ہرگز بے بنیاد نہیں تھا۔[5] حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جیسے اکابر ان غیر یقینی حالات میں اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔[6]

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے سیاسی ماہر بھی اس بحران کی تاب نہ لا سکے اور شدید ندامت کے عالم میں شہر سے روانہ ہونے لگے۔ روانگی سے قبل انہوں نے اہلِ شہر کو مخاطب کر کے کہا:

''مدینہ والو! ہر وہ شخص جو یہاں موجود ہے اور اس کے سامنے عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے تو اللہ اسے ذلت وخواری میں مبتلا کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا جو شخص عثمان کی مدد کی سکت نہیں رکھتا وہ یہاں نہ رہے۔''

---

① تاریخ الطبری: ۳۸۷/۴

② مسند ابن الجعد: ۱/ ۳۹۰ بسند صحیح

③ تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۴/ ۱۲۲۴، ۱۲۲۵ ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۷٦ بسند صحیح
شاید ام المؤمنین کی اس فہمائش کا اثر تھا کہ اَشتر سمیت بہت سے بلوائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے منصوبے سے متفق نہ رہے۔ (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۰۹ بسند صحیح، ط الرشد)

④ تاریخ الطبری: ۳۸۷/۴

⑤ تاریخ الطبری: ۳۸٦/۴ ⑥ تاریخ الطبری: ۳۸٦/۴، ۳۸۷



یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر فلسطین چلے گئے۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور بہت سے لوگ اسی طرح شہر چھوڑ گئے۔ ①

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی دل برداشتہ ہو کر مدینہ سے باہر چلے گئے، باغی انہیں اپنی تحریک کا سرپرست مشہور کر رہے تھے۔ غالباً حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس طرح ان بدبختوں سے دور جا کر ان سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ ②

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا پیغام:

مدینہ کے نواح میں بنو عمرو بن عوف ایک بڑا قبیلہ تھا جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار تھا، چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا:

''میں آپ کا تابع دار ہوں، آپ چاہیں تو آپ کے گھر آپ کے ساتھ رہوں اور ذاتی حیثیت میں ساتھ دوں۔ فرمائیں تو ابھی میں جہاں ہوں وہیں ٹھہرا رہوں۔ بنو عمرو بن عوف کے لوگ مشورہ کر چکے ہیں کہ یہاں میرے پاس جمع ہو جائیں۔ میں جو کہوں گا وہ کریں گے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا کہ وہ وہیں مقیم رہیں اور بنو عمرو بن عوف کے وعدے کے ایفاء کا انتظار کریں، شاید اللہ ان کے ذریعے اس قضیے کو نمٹا دے۔ ③

اِصلاحی خطاب:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس دوران پوری ہمدردی کے ساتھ کوشش کی کہ شرپسندوں میں سے جو لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر اس بغاوت میں شریک ہیں وہ توبہ تائب ہو جائیں۔ آپ نے مکان کے بالاخانے پر کھڑے ہو کر ان سے خطاب کیا، جس میں فرمایا: ''میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے ہی رومہ کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا۔''

سب نے کہا: ''جی ہاں''

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس کے باوجود تم نے اس کا پانی مجھ پر کیوں بند کر رکھا ہے؟''

پھر فرمایا: ''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے ہی آس پاس کی زمین خرید کر مسجد نبوی کی توسیع کرائی تھی...... بتاؤ میرے علاوہ کسی اور کو جانتے ہو، جسے اس سے پہلے مسجد میں نماز سے روک دیا گیا ہو۔''

یہ باتیں ایسی لرزا دینے والی تھیں کہ خود باغیوں میں سے کچھ لوگ کہنے لگے:

''ہمیں امیر المؤمنین پر دست درازی نہیں کرنی چاہیے، انہیں موقع دینا چاہیے۔'' ④

---

① تاریخ الطبری: ۵۵۸/۴ عن سیف

② تاریخ الطبری: ۳۹۲/۴

③ تاریخ دمشق: ۳۷۴/۳۹، ترجمۃ: عثمان، عن مصعب بن عبداللہ بسند حسن

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۷۲

خلیفۂ ثالث نے حق اور باطل کو دو اور دو چار کی طرح واضح کرنے کے لیے مزید فرمایا:

''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ حرا پہاڑ پر تشریف فرما تھے..... اچانک پہاڑ لرزنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے ٹھوکر مار کر فرمایا: ٹھہر جا..... تیرے اوپر نبی، صدیق اور شہید کے سوا کوئی نہیں۔ اس دن میں آپ ﷺ کے ساتھ ہی تھا۔'' یہ حدیث یاد دلا کر دامادِ رسول نے باغیوں پر واضح کر دیا کہ اگر وہ قتل ہوئے تو شہید ہوں گے، جس کا مطلب یہ تھا کہ قتل کرنے والے اہل باطل اور ظالم ہوں گے۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے رسول اللہ ﷺ نے بیعتِ رضوان کے دن جبکہ وہ مجھے مشرکین کے پاس مکہ بھیج چکے تھے، اپنے ہاتھ کے بارے میں فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔''

پھر فرمایا: ''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کی تنگ دستی کے وقت فرمایا تھا: کون ہے جو اللہ کے راستے میں مقبول خیرات کرے..... تو میں نے آدھے لشکر کا ساز و سامان مہیا کیا تھا.....''

آپ رضی اللہ عنہ ہر ہر بات قسم دے کر پوچھتے رہے۔ باغیوں اور اہل مدینہ میں سے کئی افراد آپ کی ہر بات کی تصدیق کرتے رہے۔ ①

انہی ایام میں آپ نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا:

''تم مجھے کس جرم میں قتل کرو گے؟ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مسلمان کا قتل صرف تین صورتوں میں جائز ہے: جب وہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بدکاری کا مرتکب ہو یا وہ کسی کو ناحق قتل کرے یا مرتد ہو جائے۔ اللہ کی قسم! میں نے نہ تو زمانۂ جاہلیت میں کبھی بدکاری کی اور نہ اسلام میں۔ میں نے کسی کو قتل بھی نہیں کیا کہ مجھ سے قصاص لیا جائے۔ جب سے اسلام قبول کیا ہے، کبھی دین سے برگشتہ نہیں ہوا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر یہ لوگ مجھے کیوں قتل کرنے پر آمادہ ہیں۔''②

---

① مسند احمد، ح: ۴۲۰

② البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۲/۱۰

سازشی تحریک کا تیسرا رُخ: سانحۂ شہادت

ایامِ حج کے بعد مدینہ میں اطلاعات آنے لگیں کہ حاجی واپس آ رہے ہیں۔[1] یہ خبر بھی مشہور تھی کہ کوفہ، بصرہ اور شام سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے افواج آنے کو ہیں۔[2]

باغی خلیفہ سے استعفاء لینے میں بھی ناکام ہو چکے تھے۔ اس لیے سازشی منصوبے کے تیسرے رُخ کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ طے ہوا کہ مکان پر اچانک دھاوا بول کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا جائے۔[3]

اَشتر نخعی جیسا صفِ اول کا باغی بھی سازش کے اس بھیانک حصے سے متفق نہ تھا، اس نے اُمّ المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو بھیج کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر سے کہیں اور منتقل کرنا چاہا مگر دوسرے باغی سرداروں نے اَشتر کو جھڑک دیا اور اس تدبیر کو کامیاب نہ ہونے دیا۔[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آخری ایام میں ایک دن بالاخانے سے جھانک کر باغیوں سے آخری بار خطاب کیا جس میں فرمایا: "اللہ کی قسم! اگر تم نے مجھے قتل کیا تو پھر کبھی اکٹھے نماز نہیں پڑھ سکو گے، کبھی مل کر دشمن سے جہاد نہیں کر پاؤ گے، تم اختلافات کی انتہا کی وجہ سے یوں گتھم گتھا ہو جاؤ گے۔" یہ کہہ کر آپ نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دکھائیں۔[5]

آخری خطبے میں لوگوں سے کہا:

"مدینہ والو! تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تمہیں میرے بعد اچھی حکومت عطا فرمائے۔"[6]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیابت کی طرف واضح اشارے اور آخری پیغام:

ان آخری ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"خلافت کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملنا مجھے کسی اور کے خلیفہ بننے سے زیادہ پسند ہے۔"[7]

---

① تاریخ الطبری: ۳۸۸/۴

② تاریخ الطبری: ۳۸۵/۴ عن سیف

③ تاریخ الطبری: ۳۸۸/۴ عن سیف

④ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۰۹، ط الرشد ؛ صححہ الحافظ اسنادہ فی فتح الباری: ۱۳/۵۷، ۵۸، ط المعرفۃ

⑤ تاریخ دِمَشق: ۳۹/۳۵۱، ۳۵۲، ترجمہ: عثمان بن عفان

⑥ تاریخ الطبری: ۳۸۵/۴

⑦ ولان یلیھا ابن ابی طالب احب الی من ان یلی غیرہ (تاریخ المدینۃ لابن شبّۃ: ۱۲۰۶/۴)



ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی وساطت سے صحابہ کرام کو پیغام بھیجا:

''میرے نزدیک تم میں سے سب سے امانت دار اور بہتر وہ ہے جو اپنا ہاتھ روک کر رکھے مگر میرے گھر میں جمع کچھ لوگ اپنی جان نچھاور کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کا خون بہنا گوارا نہیں۔ آپ حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ لوگوں کا معاملہ اب آپ کے حوالے ہے۔ آپ وہی کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالیں۔ پھر زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں، انہیں بھی یہ بات بتادیں۔''

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس رائے کو پسند کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے مگر ان کے گھر کے باہر ایک ہجوم تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دروازہ بند کر کے بیٹھے تھے؛ اس لیے ملاقات نہ ہوسکی۔ پھر یہ حضرات، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے یہ رائے سن کر کہا:

''امیر المومنین نے انصاف کی بات کی ہے۔''

اب یہ حضرات، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ پیغام سن کر زار و قطار رونے لگے۔ [1]

آخری دن: دشمنوں سے جھڑپ، حفاظتی انتظامات کا خاتمہ:

۱۸ ذوالحجہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا روزہ تھا، اس دن آپ نے بیس غلام آزاد کیے۔ عادت کے خلاف پاجامہ منگوا کر زیب تن کیا کہ کہیں حملے کی زد میں آتے ہوئے ستر نہ کھل جائے، پھر تلاوت میں مصروف ہوگئے۔ [2] گزشتہ رات آپ کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: ''عثمان! افطار ہمارے ساتھ کرنا۔'' [3]

اس وقت مکان کے دروازے پر صحابہ اور تابعین کا ایک مجمع داماد رسول کی حفاظت کے لیے سربکف تھا، جن میں حضرت ابوہریرہ، حضرت حسن و حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہم اور محمد بن طلحہ اور مروان بن حکم جیسے جری افراد شامل تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دہری زرہ پہنے موجود تھے۔

باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے گھر کے دروازے پر دھاوا بولا تو ان حضرات نے بھرپور دفاع کیا، اس طرح دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ [4]

---

① تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۱۲۰۲/۴، ۱۲۰۵

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ایک آدھ دن پہلے یعنی ۱۷ ذوالحجہ کا واقعہ ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ''تاریخ المدینۃ'' کی ان دونوں روایات کو خاص طور پر ذہن نشین رکھیں؛ کیوں کہ ان سے اکابر صحابہ کے باہمی اعتماد اور تعلق کا پہلو نمایاں ہوجاتا ہے۔ ناصبیوں کا یہ الزام بے بنیاد ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں معاونت کی تھی یا اس موقع پر بے مروتی ضرور برتی تھی۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر آخر تک اتنا بھروسہ کیوں کرتے کہ خلافت کے لیے نگاہ انہی پر جمتی۔ اسی طرح مذکورہ روایات سے روافض کا یہ کہنا بھی غلط ثابت ہوجاتا ہے کہ اکابر صحابہ باہم دشمن تھے اور ان کی ہوسِ اقتدار کے باعث سارا فتنہ رونما ہوا۔ (نعوذ باللہ)

② رواہ احمد، فضائل الصحابہ، ح: ۸۰۹، ط الرسالۃ

③ مجمع الزوائد للھیثمی، ح: ۱۲۰۰۷، ط القدسی۔ طبقات ابن سعد، ۷۴/۳ ط دار صادر، یہ روایت العلمیۃ کے نسخے میں طباعت سے رہ گئی ہے۔

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۳، ۱۷۴

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اس وقت زرہ پہنے امیر المؤمنین کے دفاع کے لیے آن پہنچے اور تیر چلانے لگے۔ [1]

مگر اسی دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قسم دے کر اپنے حامیوں کو کہلوایا کہ سب لوگ اندر آ جائیں، چنانچہ یہ حضرات واپس آ گئے اور مکان کا پھاٹک بند کر دیا۔ [2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اب اپنے محافظوں کو حتمی طور پر کہہ دیا کہ وہ پہرہ ختم کر کے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ آپ رضی اللہ عنہ یہ واضح فرما دینا چاہتے تھے کہ خلافت کو آپ نے اللہ اور رسول کی امانت کے طور پر سنبھالا ہوا ہے، یہ کوئی بادشاہی نہیں جسے سرمائے اور عیش و آرام کے سامان جمع کرنے کے لیے چھینا جھپٹا جاتا ہے اور اپنے مفادات کے لیے عوام کا خون بے دریغ بہایا جاتا ہے۔ آپ نے ساتھیوں سے فرمایا:

''تم میں سے جو بھی میرے حکم کی تعمیل ضروری سمجھتا ہے وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اسلحہ رکھ دے۔'' [3]

حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما سب سے آخر میں دارِ عثمان سے نکلے:

حکم کی تعمیل میں سب لوگ چلے گئے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نہ اٹھے۔ آپ نے قرآن منگوایا اور پڑھنے لگے، اس دوران حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: ''تم کو قسم دیتا ہوں کہ چلے جاؤ'' پھر دو آدمیوں کو بلا کر بیت المال کی حفاظت کی ذمہ داری انہیں سونپ دی۔ [4] گویا آخری وقت میں بھی فکر تھی تو امت کے حقوق کی۔

آپ نے ایک ایک کر کے سب کو پہرے سے ہٹا دیا۔ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سب سے آخر میں نکلے۔ [5]

صحابہ کرام اور تابعین نے آخری وقت میں آپ کے گھر کی حفاظت صرف اس لیے ترک کی تھی کہ وہ آپ کے حکم کے پابند تھے ورنہ وہ دل و جان سے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ [6]

آپ رضی اللہ عنہ گھر کے مردانہ حصے میں تنہا تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ زنان خانے میں اہل و عیال کے سوا کوئی نہ تھا۔ [7] قصر کا دروازہ کھلا پڑا تھا، کوئی بھی اندر آ سکتا تھا۔ [8]

محمد بن ابی بکر اور کچھ بلوائیوں کی ندامت:

باغیوں نے مطلع صاف دیکھا تو ایک پستہ قد شخص کو گھر کے اندر کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ وہ بھیڑیے کی طرح دبے پاؤں گیا، اندر جھانک کر دیکھا کہ کوئی پہرہ نہیں ہے۔ [9]

---

① عن عبد الرحمن ابن ابی لیلیٰ قال: رایت طلحة یوم الدار یرامیهم وعلیه قباء فکشفت الریح عنه فرایت بیاض الدرع من تحت القباء (تاریخ المدینة لابن شبة: ۴/۱۱۶۹)

② تاریخ الطبری: ۴/۳۸۸

③ تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۳

④ تاریخ الطبری: ۴/۳۹۲، ۳۹۳، بروایت سیف بن عمر

⑤ تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۴

⑥ متعدد روایات سے یہ ثابت ہے، دیکھیے: طبقات ابن سعد: ۳/۷۰، صادر ؛ تاریخ دمشق: ۳۹/۳۹۹، ۴۰۰

⑦ فتح عثمان الباب ووضع المصحف بین یدیه. (تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۴ ؛ تاریخ الطبری: ۴/۳۸۴ باسناد صحیح او حسن)

⑧ ففتحوا الباب وخرج ودخلوا الدار فقتلوا عثمان رضی اللہ عنہ. (تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۳)

⑨ فجاء رویجل کانه ذئب فاطلع من باب. (تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۴ ؛ طبقات ابن سعد، ۳/۷۳ ط صادر ؛ تاریخ طبری: ۴/۳۷۴

اب باغیوں نے بے فکر ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے ایک شخص کو بھیجا، یہ انہی نادان لوگوں میں سے ایک تھا جو غلط فہمیوں میں مبتلا کیے گئے تھے، اسے یکدم حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی، بس اتنا کہہ پایا:

''آپ خلافت چھوڑ دیں۔ ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

آپ نے فرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قمیص کو کیسے اُتار سکتا ہوں۔ میں اسی حال میں رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سعادت مندوں کو معزز اور بدبختوں کو ذلیل کر کے دکھائے گا۔''

وہ شخص لرز گیا اور باہر نکل کر کہنے لگا: ''ان کا قتل ہمارے لیے حلال نہیں۔''[1]

ایک اور شخص آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: ''میرے اور تمہارے درمیان یہ اللہ کا کلام موجود ہے۔''

اس شخص کے ضمیر میں بھی کچھ رمق باقی تھی۔ وہ بھی ہچکچایا اور باہر نکل گیا۔[2]

باغیوں نے یکے بعد دیگر آدمی بھیجے مگر ہر ایک نادم ہو کر واپس نکلتا رہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن ابی بکر بھی غلط فہمی کا شکار ہونے والوں میں سے تھے، وہ اندر آئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا:

''کیا تمہارا یہ غیظ و غضب اللہ کی عطا کے خلاف تو نہیں؟ (کہ اس نے مجھے خلافت کیوں بخشی؟) میں نے تمہارا کون سا جرم کیا ہے، سوائے یہ کہ حق لے کر حق دار کو دیا ہے۔''[3] پھر کہا: ''تم میرے قاتل نہیں ہو سکتے۔''[4]

ایک روایت میں ہے کہ محمد بن ابی بکر نے آپ کی ڈاڑھی مبارک پکڑ لی تو آپ نے فرمایا:

''تم مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہے ہو جو تمہارے والد دیکھتے تو کبھی پسند نہ کرتے۔''[5]

محمد بن ابی بکر یہ سن کر کانپ اُٹھے اور ندامت کے مارے اپنا چہرہ کپڑے سے چھپائے ہوئے باہر نکل گئے اور باغیوں کو بھی واپسی کا مشورہ دینے لگے مگر قتل پر آمادہ لوگوں نے ان کی بات پر توجہ نہ دی۔[6]

غرض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس حکمتِ عملی کے باعث، نادانی کے سبب اس تحریک کا حصہ بن جانے والے بہت سے لوگ دست درازی سے باز آ گئے اور توبہ تائب ہوتے دکھائی دیے۔ تب سازش کے مرکزی کرداروں اور بدبخت ترین افراد نے بلاتاخیر اپنے گھناؤنے عزائم کو خود پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۱/۴

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۷۴

③ تاریخ الطبری: ۳۹۱/۴

④ فقال له عثمان: "یاابن اخی لست بصاحبی." (الاستیعاب: ۱۰۴۶/۳) ⑤ تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۴

⑥ البدایة والنهایة: ۳۰۲/۱۰؛ تاریخ الاسلام للذهبی، ت تدمری، ۳۵۵،۳۵۴/۳، عن ریطة مولاة اسامة

نوٹ: یہاں یہ ذہن میں رہے کہ آج کل کی عام اردو تواریخ میں مذکور ہے کہ قاتل محمد بن ابی بکر کی قیادت میں تھے اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے گھر سے متصل دیوار ''خوخہ'' (بڑی کھڑکی) پھاند کر اندر گھسے تھے مگر یہ روایات یا تو واقدی کی ہیں جو تاریخ طبری میں مذکور ہیں۔ ان کا ضعف ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ یہ سعید بن مسیب کی طرف منسوب ایک طویل روایت سے ماخوذ ہیں، جسے محدثین من گھڑت قرار دیتے ہیں۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال: ۴۸۸/۷) مگر پہلے علامہ ابن عساکر نے اسے تاریخ دمشق میں اور وہاں سے علامہ سیوطی نے اسے 'تاریخ الخلفاء' میں نقل کر دیا۔ ''تاریخ الخلفاء'' اختصار اور حسن ترتیب کی وجہ سے عام ہو گئی، اس کے تراجم بھی ہو گئے، چنانچہ بعد کے مؤرخین نے اسے ایک حتمی حقیقت مان کر مزید شہرت دے دی۔



سبائیوں کا قاتلانہ حملہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت:

یہ لوگ اندر گھس گئے۔ امیر المؤمنین گھر کے مردانہ حصے میں اسی طرح اللہ سے لو لگائے ہوئے، اپنی جان سے بالکل بے نیاز ہو کر قرآنِ مجید سامنے رکھے سورۃ البقرہ کی تلاوت میں مشغول تھے۔ باغیوں میں سے ایک شخص رومان نے لوہے کی بھاری لاٹھی دے ماری۔[1] عبدالرحمٰن بن غافقی نے بھی آہنی ہتھیار سے ضرب لگائی۔[2]

پھر ایک شخص جو 'الموت الاسود' کہلاتا تھا، آگے بڑھا اور پوری طاقت سے آپ کا گلا گھونٹ دیا۔ آپ تڑپنے لگے، ادھر اس نے تلوار نیام سے نکالی اور آپ پر وار کیا، خون کے چھینٹے قرآنِ مجید پر پڑے اور آیت ﴿فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ﴾ سرخ ہو گئی۔[3]

ایک بد بخت نے نیزے کا وار کیا، آپ کی زبان مبارک سے نکلا: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ﴾ ساتھ ہی خون کی دھار اُبل پڑی۔[4]

گھر کے زنانہ حصے تک اس ہنگامے کی آوازیں پہنچیں تو اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ اور آپ کی بیٹیاں آپ کو بچانے کے لیے چیخ و پکار کرتی ہوئی دوڑ کر آ گئیں۔[5]

حضرت نائلہ نے وفاداری کی انتہا کر دی اور بچانے کے لیے آپ پر گر گئیں۔[6] تب سُودان بن حُمران نامی ظالم، تلوار کھینچ کر آگے بڑھا، حضرت نائلہ نے تلوار کی دھار پکڑنے کی کوشش کی تو ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔[7]

مصر کے ایک شخص نے تلوار کی نوک آپ کے سینے پر رکھ کر اپنا پورا وزن اس پر ڈال دیا۔ تلوار جسم سے آر پار ہو گئی اور دامادِ پیغمبر، خلیفۂ ثالث، ذوالنورین سیدنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روحِ پاک جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔[8]

اِنَّا لِلّٰہ و اِنَّا اِلیہ راجعون

۱۸ ذوالحجہ ۳۵ ہجری کے غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے کا وقت تھا، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ افطار کرنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا مقدر تھا۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کچھ غلام جنہیں آپ نے اس روز اس شرط کے ساتھ آزاد کیا تھا کہ وہ ہتھیار نہ اٹھانے کا وعدہ کریں، دوڑتے ہوئے اِس طرف آ گئے۔ ان میں سے ایک غلام نے

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۸/۱۰ بروایت ابن عساکر
② تاریخ الطبری: ۳۹۱/۳
③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۴، ۱۷۵
④ البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۰/۱۰ بروایت ابن عساکر
⑤ تاریخ الطبری: ۳۹۳/۳
⑥ البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۸/۱۰
⑦ البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۸/۱۰
⑧ تاریخ الطبری: ۳۹۳/۳

سُودان بن حُمران پر تلوار کا وار کیا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ دوسرے غلام نے قُتَیرہ نامی باغی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ تیسرے نے کلثوم بن تُجَیب نامی ظالم کو جو حضرت نائلہ سے دست درازی اور فحش کلامی کر رہا تھا، مار ڈالا۔ پھر ان میں سے دو غلام وہیں دوسرے باغیوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ①

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم، ہنگامے کی آواز سن کر گھر میں واپس گھس گئے اور باغیوں سے لڑتے لڑتے شدید زخمی ہو گئے۔ بعد میں مدینہ کے لوگوں نے ان تینوں کو لہولہان حالت میں اٹھایا۔ ②

باغیوں نے گھر کی ہر چیز لوٹ لی، برتن بھی نہ چھوڑے۔ پھر بیت المال کی طرف لپکے اور اسے بھی لوٹ لیا۔ ان کا یہ پست کردار گواہ تھا کہ وہ دنیا پرست اور فتنہ پرور لوگ ہیں۔ ③

نمازِ جنازہ اور تدفین:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح مدینہ منورہ میں پھیل گئی۔ اسی رات حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت حسن، حضرت زید بن ثابت، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم اور عام صحابہ جوق در جوق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے آئے۔ جنازے میں شرکت کے لیے مدینہ منورہ کی خواتین اور بچے تک شہر کی جنازہ گاہ میں جمع ہو گئے۔ ④

جنازے میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ جنازہ قصرِ عثمان میں رکھا گیا اور لوگ گروہ در گروہ اندر جا کر زیارت کرتے رہے۔ ایک بدبخت باغی نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طمانچہ ضرور مارے گا۔ جنازے کی چارپائی کے پاس آ کر اس نے چہرہ مبارک پر دست درازی کرنا چاہی، اسی وقت ہاتھ مفلوج ہو گیا۔ ⑤

شہید کو غسل نہیں دیا گیا، کپڑے ہی کفن قرار پائے، جنازے کی چارپائی لائی گئی۔ مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد جنازے کو بقیع کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ عفت و حیا کا یہ آفتاب بقیع کی خاکِ پاک میں روپوش ہو گیا۔ ⑥

یہ بات طے ہے کہ شہادت کے وقت مدینہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی صحابہ اور تابعین بڑی تعداد میں موجود تھے، وہ آپ کے دفاع پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کا ہاتھ روکے رکھنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قسم دینے کی وجہ سے تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قسم دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے باعث تھا۔ باغی مدینہ منورہ پر اس طرح قابض نہیں تھے کہ

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۱/۴

② الاستیعاب: ۱۰۴۶/۳ بسند حسن، ط دار الجیل بیروت؛ فتنة مقتل عثمان لدکتور محمد بن عبداللہ غبان الصبحی: ۲۰۵/۱

③ تاریخ الطبری: ۳۹۱/۴

④ تاریخ الطبری: ۴۱۴/۴

⑤ تاریخ دمشق: ۴۵۸/۳۹، ترجمة: عثمان رضی اللہ عنہ

⑥ تاریخ الطبری: ۴۱۴/۴



صحابہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی بالکل بے بس ہوتے۔ اس لیے ضعیف روایات میں منقول یہ باتیں مشکوک ہیں کہ جنازہ بے گور وکفن پڑا رہا، بس چند افراد نے نمازِ جنازہ پڑھی اور چھپ چھپا کر کسی گمنام گوشے میں تدفین کردی۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ فتنے، ہنگامے اور خوف کی فضا کے باعث نمازِ جنازہ میں اتنے لوگ شریک نہیں ہوئے ہوں گے جتنے امن وامان کی حالت میں شریک ہوتے۔ ان ضعیف روایات کو اگر مانا جائے تو اسے اسی قدر پر محمول کیا جائے گا۔

دورانِ تدفین کرامت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بقیع کے قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ تدفین میں شریک ایک صاحب ابوحبیش کا بیان ہے کہ ہمیں ایک بہت بڑا مجمع اپنے پیچھے آتا دکھائی دیا، ہم حیران ہوئے تو آواز آئی:

''گھبرائیں نہیں، ہم آپ کے ساتھ شریک ہونے آئے ہیں۔''

یہ فرشتے تھے جو جنازے اور تدفین میں شامل ہوئے تھے۔ [1]

اس سانحے پر اکابر کے تاثرات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صحیح قول کے مطابق بیاسی سال کی عمر میں ایسی مظلومانہ حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ ہر مسلمان کا دل صدمے سے پارہ پارہ ہوا جاتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں تیرے سامنے عثمان کے خون سے اپنی براءت ظاہر کرتا ہوں، میں نے نہ انہیں قتل کیا، نہ کسی کو اس پر آمادہ کیا۔'' [2]

یہ بھی فرمایا: 'جس دن عثمان شہید ہوئے اس دن میری عقل ماؤف ہوگئی۔ میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔'' [3]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو ﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾ پڑھا اور فرمایا:

''اللہ حضرت عثمان پر رحمت نازل کرے اور اُن کے خون کا بدلہ لے۔''

بالکل یہی تاثرات حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمائے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''الٰہی! ان لوگوں کو ندامت میں مبتلا کر اور پھر اپنی پکڑ میں لے لے۔'' [4]

حضرت سَمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اس حادثے پر فرمایا: ''اسلام ایک مضبوط قلعے میں محفوظ تھا مگر ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے اس قلعے میں شگاف ڈال دیا ہے جو قیامت تک بند نہ ہوگا۔''

بدری صحابی حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اب میں مرتے دم تک نہیں ہنسوں گا۔'' [5]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۳۱۹

[2] طبقات ابن سعد: ۳/۸۰، ط صادر م؛ تاریخ دمشق: ۳۹/۴۷۲، ترجمۃ: عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

[3] مستدرک حاکم، ح: ۴۵۲۷ بسند صحیح

[4] تاریخ الطبری: ۴/۳۹۲

[5] طبقات ابن سعد: ۳/۸۱، ط دار صادر

حضرت سعید بن زید بن عَمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''اگر احد پہاڑ کسی سانحہ پر ریزہ ریزہ ہوسکتا تو حضرت عثمان کی شہادت پر ہوجانا چاہیے تھا۔''①

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر آتا تو بے ساختہ کہہ اُٹھتے:

''ہائے ہائے!'' اور پھر زاروقطار رونے لگتے۔②

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس حادثے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

''جس نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدگوئی کی، اس پر بھی اللہ کی لعنت ہے۔''③

حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مدینہ میں باغیوں کی آمد پر بے بسی اور صدمے کے عالم میں فلسطین چلے گئے تھے، وہاں انہیں جب یہ خبر ملی تو بے اختیار منہ سے نکلا: ''وَا عُثْمَانَاہ!''

پھر یہ درد بھرے اشعار پڑھے:

يَــا لَهْفَ نَـفْسِـيْ عَلـىٰ مَـالِك ۞ وَهَـلْ يَصْـرِفُ اللَّهْفُ حِفْظَ الْقَدْر

أَنْـزِعُ مِـنَ الْـحَـرِّ اَودىٰ بِهِـمْ ۞ فَـأَعْـذِرُهُـمْ اَمْ بِـقَـوْمِـيْ سَكَـر

''ہائے! میری جان مالک پر قربان۔ مگر کیا یہ آہ وبکا تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ کیا اس طرح میں انہیں (جنگ کی) گرمی سے بچاسکتا ہوں۔ کیا میں ان لوگوں کو معذور سمجھوں یا میری قوم نشے میں دُھت تھی۔''

پھر فرمایا: ''اللہ عثمان پر رحم فرمائے اور ان کی مغفرت کرے۔''

ساتھ ہی انہوں نے پیش گوئی کی:

''اب جنگ تو ہوگی کیوں کہ جو کسی دانے کو کرید ے وہ اسے پھاڑ کر ہی چھوڑے گا۔''④

مطلب یہ تھا کہ جن سازشی عناصر نے اس فتنے کا آغاز کیا ہے وہ آگے مسلمانوں میں باقاعدہ جنگ بھی کرواکے چھوڑیں گے۔

پورے عالم اسلام میں اس المیے پر سوگ کی حالت طاری تھی۔ لوگ زاروقطار روتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خوبیوں کو یاد کرتے تھے۔ ایک صحابی کلیب جرمی رضی اللہ عنہ جو بصرہ میں رہتے تھے، فرماتے ہیں:

''میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر پر بزرگوں کو جس قدر روتے دیکھا اس کی کوئی اور مثال کبھی نہیں دیکھی۔ لوگ اتنا رو رہے تھے کہ ڈاڑھیاں بھی آنسوؤں سے تر ہوگئی تھیں۔''⑤

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۸۶۲، کتاب المناقب، باب مناقب سعید بن زید

② طبقات ابن سعد: ۳/ ۸۱، ط صادر

③ التاریخ الکبیر للامام البخاری: ۱/ ۲۶، ط دکن، بحواشی محمود خلیل

④ تاریخ الطبری: ۴/ ۵۵۹

⑤ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۵۷، کتاب الجمل، ط الرشد

قیصر کا اچانک حملہ اور اللہ کی غیبی مدد:

اس دوران جب کہ مسلمان مرکزِ خلافت میں ایک شدید بحران سے گزر رہے تھے، قیصرِ روم، قسطنطین بذاتِ خود عالم اسلام کی سرحدوں پر آدھمکا۔ ایک ہزار بحری جہازوں کے ساتھ وہ فلسطین کے ساحل پر اترنے کو تھا کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد سمندری طوفان اور تیز ہواؤں کی شکل میں نازل ہوئی، جس نے دشمن کی فوج کو تتر بتر کر دیا۔ قیصر جان بچا کر بمشکل سسلی پہنچا جہاں خود اس کے درباریوں نے اسے فوج کی تباہی کا ذمہ دار گردانتے ہوئے حمام میں قتل کر ڈالا۔

اگر رومی اس آسمانی آفت کا شکار نہ ہوتے تو شدید خطرہ تھا کہ انتشار کی اس حالت میں کفر کی یلغار سے عالم اسلام پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔[1]

قیصر کا ان حالات میں اتنی زبردست فوج کے ساتھ خود عالم اسلام پر حملہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ مؤرخین نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حملہ کئی سوالات پیدا کرتا ہے؟ مثلاً کیا قیصر کو پتا تھا کہ مسلمان کس سیاسی بحران سے گزر رہے ہیں؟ مدینہ میں بدامنی کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن تھی، اتنے سے وقت میں قیصر کو اطلاع بھی پہنچ گئی اور وہ فوج تیار کر کے دو تین ماہ کی مسافت بھی طے کر آیا، یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر اسے پہلے سے اندازہ یا علم تھا کہ مسلمانوں میں ایک سیاسی بحران پیدا ہونے والا ہے تو کیا اس سے یہ امکان نہیں نکلتا کہ عالم اسلام کے اس سیاسی بحران کے پیچھے خود قیصر کا بھی ہاتھ تھا یعنی وہ درپردہ سازشی عناصر سے تعاون کر رہا تھا؟

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اتنی بڑی تحریک بہت بڑی مالی امداد کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ بات معلوم نہیں کی جاسکی کہ باغیوں کے مالی اخراجات کہاں سے پورے ہوتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں ایک خفیہ کارروائی کے دوران ایک نصرانی جاسوس کو گرفتار کیا جس سے ایک کروڑ تیس لاکھ دینار (آج کل کے تقریباً دو کھرب ساٹھ ارب روپے) برآمد ہوئے۔ یہ رقم اسے قیصر روم نے فراہم کی تھی۔[2] اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شورش پسندوں کو بیرونی قوتیں رقم مہیا کر رہی تھیں اور وہ بھی بے پناہ۔ تاکہ کم عقل لوگوں کے دین وایمان کو خریدا جاسکے۔

قیصر کے اس حملے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ خود فوج کے ساتھ تھا۔ عام مہمات میں بادشاہ خود قیادت نہیں کرتا۔ وہ کسی غیر معمولی فتح یا فیصلہ کن جنگ کے لیے ہی نکلتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قیصر کو اس وقت کسی بڑی فتح کی پوری توقع تھی۔ اس قدر پرامید ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی کہ مسلمان اس وقت اندرونی شورش کا شکار تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس بحران کی خبروں کو دبانے کی کوشش کے باوجود قیصر کو اس کی ساری تفصیلات کا علم تھا، جس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ وہ خود سازش کے اصل بانیوں کے ساتھ رابطے میں تھا۔

---

[1] تاریخ الطبری: ۳/ ۳۴۱

[2] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/ ۲۶۲

ان امکانات پر غور کریں تو صاف دکھائی دے گا کہ اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے ایک ہی وقت میں دوطرفہ وار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سازشی عناصر اندر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قیصر اس دوران سرحدوں پر فوج لے آیا۔

اسلام کا محافظ اللہ ہے۔ اس نے اپنی غیبی قدرت کا اظہار کر کے دکھا دیا کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ اس کا حکم ہوا تو قیصر کا لاؤلشکر سمندری طوفان کی نذر ہوگیا اور چراغِ اسلام کو مکمل طور پر بجھانے کی آرزو ابلیس اور اس کے کارندوں کے دل کی پھانس بن کر رہ گئی۔

قاتل کون کون تھے؟

یہ بات تو ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے عام باغی نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت تھے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ قتل کے لیے حملہ کرنے والے کئی افراد تھے جنہوں نے مختلف ہتھیاروں سے آپ رضی اللہ عنہ کو مارا مگر عجیب بات یہ ہے کہ آپ پر جان لیوا وار کرنے والے زیادہ تر افراد کے احوال و کوائف، قبیلہ، سکونت وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں مل پاتی۔

مؤرخین اور رواۃ اس بارے میں خاموش ہیں۔ دراصل اس بارے میں روایات اتنی مختلف ہیں کہ حد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قتل کے فوراً بعد سبائی گروہ نے جان بوجھ کر فرضی واقعات اور غیر معروف ناموں کی روایتیں بکثرت پھیلا دیں تا کہ حقیقت بالکل چھپ جائے۔

اس بارے میں واقدی کی روایت سب سے مشہور ہے جو سند اور متن دونوں لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ اس میں تین افراد کے نام لیے گئے ہیں:

① كِنانة بن بِشر تُجَيْبى

② سُودان بن حُمران

③ عَمرو بن الحَمِق

واقدی کے مطابق پہلے کِنانہ بن بِشر نے لوہے کی وزنی چیز مار کر سر پھاڑ دیا تھا۔ پھر سودان نے قاتلانہ وار کیا تھا اور آخر میں عَمرو بن الحَمِق نے سینے پر چڑھ کر نو زخم لگائے تھے۔

یاد رکھیے عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ ایک مشہور صحابی تھے۔ واقدی کی اس کمزور روایت اور ابو مخنف کذاب کی ایک روایت کے سوا عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہونا کہیں مذکور نہیں۔ ①

ایسی فاسد روایات سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں کسی صحابی کی شرکت ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی۔ پس حضرت عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کو قاتلوں میں شمار کرنا سراسر تہمت ہے۔

---

① تاريخ الطبرى: ٣٦٥/٥

قاتلانہ حملے کی قیادت کس نے کی تھی؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں ایک انتہائی پر اسرار شخص کا ذکر آتا ہے جسے "الموت الاسود" کہا جاتا تھا۔ غالباً یہ اس کا خفیہ نام تھا جو اسے اس کی بے رحمی اور سخت دلی کی بنا پر دیا گیا ہوگا۔ مگر وہ حقیقت میں کون تھا؟ اس کی حتمی تحقیق تو ممکن نہیں۔ مگر ہم کچھ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اتنی بات طے ہے کہ:

❶ وہ مصر سے آیا ہوا ایک سیاہ فام آدمی تھا جس نے قاتلانہ حملے کی قیادت کی تھی اور شہادت کے بعد دونوں ہاتھ بلند کر کے کارروائی کی تکمیل کا اعلان کیا تھا۔[①]

❷ اس کے دو لقب تھے۔ "الموت الاسود" یعنی سیاہ موت۔[②] اور "جبلۃ" یعنی کالا آدمی۔[③]

❸ اس کا نسبی تعلق بنی سدوس سے تھا۔[④]

اب اگر غور کریں تو یہ حیرت انگیز بات سامنے آئے گی کہ یہ تمام علامات سازش کے مرکزی کردار، منافقین کے سردار عبداللہ بن سبا پر منطبق ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ رنگت کے لحاظ سے سیاہ فام تھا۔[⑤] اس زمانے میں مصر میں تھا۔ اس کی کنیت "ابن السوداء" (کالی عورت کا بیٹا) تھی[⑥] یہ لفظ قاتل کے لقب "الموت الاسود" سے ملتا جلتا ہے۔

قاتل کا ایک لقب "جبلہ" تھا، یہ نام یمن کے یہودی رکھا کرتے تھے۔[⑦] اور عبداللہ بن سبا بھی یمن کا یہودی تھا۔

پھر اس حقیقت کو بھی ساتھ ملائیں کہ بنی سدوس یمنی قبیلے کہلان بن سبا کی اولاد تھے۔[⑧] اور عبداللہ بن سبا بھی یمنی تھا۔ اس سے بھی ابن سبا کی طرف سراغ جاتا نظر آتا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سب سے زیادہ اشتعال پھیلانے والا اور ان سے شدید ترین بغض رکھنے والا عبداللہ بن سبا تھا۔ ایک غیر ملکی ایجنٹ ہی ایسا سنگدل اور بے رحم ہوسکتا ہے کہ اس بے دردی کے ساتھ ایک بیاسی سالہ بزرگ انسان کو قتل کر ڈالے۔ قتل کے لیے بھیجے جانے والے دوسرے لوگ اندر آ کر شرمسار ہو رہے تھے اور چپ چاپ واپس جا رہے تھے، ابن سبا پورے ہنگامے کے دوران پس منظر میں رہا مگر ظاہر ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا بلکہ وہ اپنا کھیل خفیہ انداز میں، دوسروں کو آگے رکھ کر کھیلتا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے

---

① طبقات ابن سعد: ۸۳/۳، ط صادر عن کنانۃ مولیٰ صفیۃ رضی اللہ عنہا؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۶ عن الحسن البصری رحمہ اللہ

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۴ بروایت ابی سعید

③ التاریخ الکبیر امام بخاری: ۲۳۷/۷؛ طبقات ابن سعد: ۸۳/۳، ۸۴، ط صادر

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۴، بسند صحیح

⑤ "عن زید بن وھب عن علیؓ قال مالی ومال ھذا الحمیت الاسود؟" (تاریخ دمشق: ۷/۲۹)

⑥ فلم یفجاھم الا کتاب من عبداللہ بن سعد بن ابی سرح یخبرھم ان عمارا قد استمالہ قوم بمصر وقد انقطعوا لہ منھم عبداللہ بن السوداء. (تاریخ الطبری: ۳۴۱/۴)

⑦ قال الحموی تحت ذکر مواضع الیمن جبلۃ و ذو جبلۃ: جبلۃ رجل یھودی کان یبیع فی الفخار. (معجم البلدان: ۱۰۶/۲)

⑧ ما طی فھو ادد بن زید بن کھلان بن سبا، فمن بطون طی جدیلۃ و نبھان و بولان وسلامان وھنی وسدوس. (المختصر فی اخبار البشر: ۱۰۲/۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شروع میں دوسروں کے ہاتھوں قتل کرانے کی کوشش کی ہو مگر جب دیکھا ہو کہ اس فرشتہ سیرت و نورانی صورت بزرگ پر کسی کا ہاتھ نہیں اُٹھتا تو کیا بعید ہے کہ وہی اپنے چند بد بخت ترین ساتھیوں کو لے کر اندر گھس گیا ہو اور قاتلانہ کارروائی خود انجام دی ہو۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہ تھا کہ اس مہم میں اپنا اصل نام چھپا کر کوئی اور لقب اختیار کر لیتا۔ ممکن ہے اسی لیے شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی تاریخی روایات میں اس کا نام نہیں آسکا ہو، مگر کئی سراغ اس کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔

☆☆☆

کیا عبداللہ بن سبا کا وجود ایک مفروضہ ہے؟

دورِ حاضر میں مستشرقین، سیکولر تاریخ دانوں اور شیعہ مؤرخین کی اکثریت ابن سبا کے وجود سے انکار کر رہی ہے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ابن سبا کا ذِکر صرف سیف بن عمر کی روایات میں ملتا ہے جو نہایت ضعیف راوی ہے، حالاں کہ یہ بات غلط ہے۔ ابن سبا کے کرتوتوں کا ذِکر تاریخ کی صحیح اور معتبر روایات میں بھی ہے۔ دیکھیے:

① حافظ ابن حجر ثقہ راویوں اور صحیح سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے عبداللہ بن سبا کا ذِکر کیا گیا تو وہ بولے مجھے اس خبیث کالے کلوٹے سے کیا غرض۔ [1]

② ابن عساکر بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سبا کو جلا وطن کیا اور اس کے پیروکاروں کو جو "سبیئہ" کہلاتے تھے، جلا کر قتل کیا۔ [2]

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتا چلا کہ ابن سبا انہیں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فوقیت دے رہا ہے تو اسے قتل کرنے کے لیے تلوار منگوالی۔ [3]

④ ابن عساکر، امام شعبی سے جو سن ۲۰ ہجری میں پیدا ہوئے تھے، روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جھوٹ کا پرچار کرنے والا عبداللہ بن سبا ہے۔ یہ روایت حسن ہے۔ [4]

⑤ شیعہ علماء کا ابن سبا کے وجود سے انکار کرنا فضول ہے کیوں کہ خود صدیوں پہلے ان کے اکابر اس کا اقرار کر چکے ہیں۔ اہل تشیع کے امام علامہ سعد بن عبداللہ قمی (م ۲۲۹ھ) لکھتے ہیں:

''عبداللہ بن سبا پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی کی امامت اور دنیا میں ان کی واپسی کا عقیدہ پیش کیا۔ [5]

---

① لسان المیزان: ۲۹۰/۳
② تاریخ دمشق: ۳/۲۹، ترجمۃ: عبداللہ بن سبا
③ تاریخ دمشق: ۹/۲۹، ترجمۃ: عبداللہ بن سبا
④ تاریخ دمشق: ۷/۲۹، ترجمۃ: عبداللہ بن سبا
⑤ المقالات والفرق، ص ۲۰، مطبع حیدری طہران

⑥ رجال پر شیعوں کی مشہور ترین کتاب ''رجال کشی'' میں جو چوتھی صدی ہجری میں محمد بن عمر الکشی نے لکھی، درج ذیل روایت منقول ہے:

''عبداللہ سبا یہودی تھا، اس نے اسلام قبول کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اظہار محبت کیا، جب وہ یہودی تھا تو یوشع بن نون کو حضرت موسیٰ کا وصی کہتا تھا، اسلام لایا تو یہی عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے پیش کیا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی کی امامت کے لازم ہونے کا پرچار کیا، ان کے دشمنوں سے بے زاری ظاہر کی، ان کے مخالفین کے پردے کھولے اور ان کو کافر قرار دیا۔''[1]

⑦ تیسری صدی ہجری کے شیعہ عالم نوبختی کا بیان ہے:

''عبداللہ بن سبا ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے ابوبکر وعمر وعثمان اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کی۔''[2]

غرض اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کی معتبر کتب عبداللہ بن سبا کے کرتوتوں کی گواہ ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی شخص اس کے وجود کے انکار کرتا ہے تو اسے سنیوں اور شیعوں کی تمام تواریخ سے یکسر دست بردار ہو جانا چاہیے۔

☆☆☆

---

① رجال الکشی، ص ۱۰۸، ۱۰۹

② فرق الشیعۃ، ص ۴۳، مکتبہ حیدریہ، نجف

سیرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے چند قابلِ توجہ پہلو

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت سیدھے سادھے اور بھولے بھالے انسان تھے، ان میں ہوشیاری، معاملہ فہمی اور قوتِ فیصلہ جیسی صفات نہیں تھیں، غلطیوں پر کسی کو روکنے ٹوکنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے، عمال کو تنبیہ کرنے سے گھبراتے تھے، ان سے دب جاتے تھے، جو جیسی پٹی پڑھا دیتا تھا آپ مان لیتے تھے، جس کے نتیجے میں نظام حکومت کی باگیں ڈھیلی پڑ گئیں اور فسادیوں کو اپنا کھیل پوری طرح کھیلنے کا موقع مل گیا۔ مگر یہ تاثر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا سرسری جائزہ لینے اور حقائق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔

اگر خلیفہ سوم رضی اللہ عنہ کے کردار کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ آپ کی نرمی اور عفو و درگزر کے معاملات اپنی ذات کی حد تک تھے، آپ کی شرم و حیا طبعی تھی مگر عقل پر غالب نہ تھی، انتظامی اور شرعی امور میں آپ بے ضابطگیوں کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے...... کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی عبقریت بھی آپ کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی...... جب کوئی مسئلہ یا معاملہ آپ کے نزدیک مذہبی یا قومی و ملکی لحاظ سے ضروری ہوتا تو آپ اس بارے میں کسی کی ناراضی کی پروا نہیں کرتے تھے...... بلکہ بعض اوقات تو بات بہت معمولی محسوس ہوتی تھی، مگر آپ اس کے عواقب کا صحیح اندازہ لگا کر فوری حکم جاری فرما دیتے تھے۔ آپ کی پالیسی نرم خوئی کی تھی مگر یہ نرمی ریشمی ڈوری کی طرح مضبوط تھی۔

گورنروں کی معزولی کے اٹل فیصلے:

جب آپ رضی اللہ عنہ و حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت صحابی کا کوفہ کی حکومت پر برقرار رہنا بعض وجوہ سے خلاف احتیاط محسوس ہوا تو آپ نے فوراً انہیں معزول کر دیا۔ آپ نے فیصلے میں ان کی ذاتی وجاہت اور عظمت کا لحاظ نہیں کیا، بلکہ قومی و ملکی مفاد کو ترجیح دی۔[1] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر کی حکومتوں سے معزول کرتے ہوئے آپ ان حضرات کی بزرگی اور مرتبے سے مرعوب نہیں ہوئے، مسلمانوں کی بہتری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تبدیلیاں کسی کشش و پیچ کے بغیر کر دیں۔

ضرورت کے مطابق سزائیں بھی جاری فرماتے تھے:

شرپسندوں اور فسادیوں کو سزائیں دینے میں آپ رضی اللہ عنہ ماتحت حکام کو احتیاط اور درگزر کی تاکید ضرور کرتے تھے تاکہ کسی غلط فہمی کے باعث کج روی اختیار کرنے والے لوگوں پر زیادہ سخت سزا جاری نہ ہو جائے یا بے گناہ افراد لپیٹ

[1] البدایۃ والنہایۃ، سن ۳۵ھ



میں نہ آجائیں، مگر جب کسی کا شر و فساد ثابت ہو جاتا تو آپ اسلامی آئین اور شرع کے مطابق تعزیرات اور سزائیں جاری کرنے میں تاخیر نہیں کرتے تھے، چنانچہ آپ کے حکم سے ضابئ شاعر کو شرفاء کی ہجو کے جرم میں جیل میں ڈالا گیا تھا۔[1] کوفہ کے کئی شر پسندوں کو شہر بدر کیا گیا۔[2]

مسجد الحرام کی توسیع میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو سزا:

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مسجد الحرام کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ چاروں طرف مکانات تھے، جن کی عقبی دیواروں نے مسجد کو گھیرا ہوا تھا۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے دروازے تھے جو گلیوں میں کھلتے تھے۔ حج کے دنوں میں گلیاں نہایت تنگ پڑ جاتی تھیں اور بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ مسئلے کا واحد حل یہی تھا کہ گرد و نواح کے مکانات لے لیے جائیں، چاہے مالکان راضی ہوں یا ناراض، کیوں کہ مسجد الحرام کی تنگی کے باعث روزانہ ہزاروں لوگوں کو شدید دقت ہو رہی تھی جس کا کوئی اور متبادل حل نہیں تھا، جبکہ مقامی لوگ کہیں اور بھی رہ سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد الحرام کی توسیع شروع کرائی۔ جن لوگوں کے مکانات توسیعی منصوبے کی زد میں تھے، انہیں معاوضہ پیش کیا گیا مگر بعض نے مکان فروخت کرنے ہی سے انکار کر دیا۔ چونکہ یہ ایک قومی اور اجتماعی منصوبہ تھا اس لیے انکار کی پروا کیے بغیر ان کے مکانات ڈھا کر معاوضہ پیش کر دیا گیا مگر انہوں نے ناراضی کی وجہ سے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ رقم ''خزانۃ الکعبہ'' میں جمع کر دی جو کعبہ کے مصارف کی ایک خاص مد تھی۔ بعد میں ناراض لوگ نرم پڑ گئے اور قیمت لینا چاہی تو انہیں ''خزانۃ الکعبہ'' سے رقم دے دی گئی۔ اس توسیع میں مسجد اور اس کے آس پاس کے ماحول کو کشادہ کر دیا گیا اور مسجد کے گرد تقریباً پانچ چھ فٹ بلند ایک چار دیواری بھی بنوائی گئی۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں زائرین کی کثرت کی وجہ سے یہ توسیع بھی تنگ پڑنے لگی تو سن ۲۶ ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ارد گرد کے مزید مکانات خرید کر مسجد کی توسیع کا حکم دیا۔ اس بار بھی کچھ لوگوں نے مکانات کی قیمت لے لی اور کچھ نے کسی بھی قیمت پر مکان دینے سے انکار کیا۔ چنانچہ ان کے مکانات جبراً مسجد الحرام میں شامل کر دیے گئے۔ ان ناراض لوگوں نے اس پر احتجاج کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہیں میری نرمی نے احتجاج کرنے پر ابھارا ہے۔ یہی کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا مگر اس وقت کسی ایک نے بھی شور نہیں مچایا تھا۔''

چونکہ توسیع کی ضرورت آئندہ بھی پڑ سکتی تھی اور ہر موقع پر کچھ لوگوں کے غل غپاڑا کرنے کا امکان تھا، اس لیے آپ نے ایسے قومی منصوبوں میں رکاوٹ کی روش توڑنے کے لیے احتجاج کرنے والوں کو سزا دینا مناسب سمجھا اور انہیں جیل بھیج دیا۔ بعد میں بعض شرفائے مکہ کی سفارش پر انہیں چھوڑ دیا۔[4]

---

① تاریخ الطبری: ۴/۳۳ ② تاریخ الطبری، سن ۳۳ھ ؛ الکامل، سن ۳۳ھ

③ تاریخ المکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام لابن ضیاء الحنفی (م ۸۵۴ھ) ص ۱۵۱، ط العلمیۃ ؛ وذکرہ البخاری مختصراً (صحیح البخاری، ح: ۳۸۳۰، باب بنیان الکعبۃ) ④ تاریخ الطبری: ۴/۲۵۱

اہلِ مدینہ کو تنبیہ:

مدینہ منورہ میں کچھ شہریوں کے حدود سے تجاوز کرنے کی اطلاع ملی تو مجمع عام میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مدینہ والو! تم اسلام کی اساس ہو، تم بگڑے تو سب بگڑ جائیں گے، تم سدھرے رہے تو سب سدھر جائیں گے۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، مجھے اب تم میں سے کسی کی گڑبڑ کی اطلاع ملی تو اسے شہر بدر کر دوں گا۔''

چنانچہ اس کے بعد جو شہری ناشائستہ امور کے مرتکب ہوتے آپ انہیں شہر بدر کر دیتے۔ ①

قوتِ کلام:

جہاں تک قوت کلام اور منطق و بیان کا تعلق ہے، اس کا اندازہ آپ رضی اللہ عنہ کے ان ملفوظات، مباحثوں اور خطبات سے لگایا جاسکتا ہے جو تاریخ کے اوراق پر نقش ہیں، جن کا ایک ایک حرف بتا رہا ہے کہ آپ کوئی گم صم درویش نہیں تھے...... ہاں اتنی بات ہے کہ آپ فضول گوئی سے بچ کر مختصر اور جامع کلام فرماتے تھے، اشتر نخعی نے مذاکرات کے دوران دباؤ ڈالا کہ آپ حکومت چھوڑ دیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو آپ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میری گردن کاٹ دی جائے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے بجائے اس کے کہ میں امت محمدیہ کو آپس میں دست و گریباں چھوڑ دوں۔'' ②

سادات کی بے ادبی برداشت نہ کرتے تھے:

آپ رضی اللہ عنہ کو اصحابِ رسول خصوصاً سادات کے مقام و مرتبے کا غیر معمولی خیال رہتا تھا اور اس بارے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے...... کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے بدتمیزی کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے سزا دی اور پٹائی کی، لوگوں نے اس سختی کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا ادب کرتے تھے، میں ان کے احترام میں کوتاہی کی گنجائش کیسے دے سکتا ہوں۔'' ③

حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے:

عوام کے حالات سے باخبر رہنے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کوفہ میں کعب بن ذی الحبکہ نامی ایک شخص جادو ٹونا اور سفلی عملیات کرنے لگا تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے حاکم حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو مراسلہ موصول ہوا کہ اس شخص کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کرو، جرم ثابت ہو جائے تو سزا دو۔

حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے حکم کے مطابق ملزم کو پکڑ کر تفتیش کے بعد سزا دی۔ کوفہ کے لوگ تعجب کر رہے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی خبر کیسے رہتی ہے۔ ④

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۹/۴ عن سیف

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۷۰

③ تاریخ الطبری: ۴۰۰/۴ عن سیف

④ تاریخ الطبری: ۴۰۱/۴، ۴۰۲

منکرات کے ازالے کی فکر:

نئے اُبھرنے والے منکرات اور برائیوں سے چوکنا رہتے تھے اور انہیں ختم کرنے کی پوری کوشش فرماتے تھے۔ فتوحات کی وجہ سے اہل مدینہ کی دولت وثروت اور فارغ البالی میں اضافہ ہوا تو بعض افراد کو فضول مشاغل سوجھنے لگے۔ چنانچہ کچھ لوگ کبوتر بازی اور غلیلوں سے نشانہ بازی میں مصروف رہنے لگے۔ بعض لوگ اس طرح کی نبیذ پینے لگے جس سے نشہ پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کے ذمہ لگایا کہ وہ لاٹھی لے کر شہر میں گشت کرتا رہے اور اس قسم کی برائیوں پر روک ٹوک کرے۔ [1]

بڑھاپے کے باوجود کمزور اور لاچار نہ تھے

بڑھاپے کے باوجود قوت وتوانائی اتنی تھی کہ آخر تک نفل نماز میں قرآنِ مجید کی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ طویل قیام کرتے اور روزے رکھتے تھے۔ [2]

بلند ہمتی:

بلند ہمتی قیاس سے بالاتر تھی، ہر حال میں اطمینان قلبی اور بشاشت سے مالا مال رہتے تھے۔ جب آپ کو مخبروں نے اطلاع دی کہ باغی مدینہ میں گھس کر آپ کو معزول یا قتل کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ بے ساختہ ہنس پڑے۔ پھر ان شرپسندوں کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔ [3]

حالاں کہ ایسے مواقع پر بڑے سے بڑوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور منہ سے بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

آخری وقت میں خون کے پیاسے دشمنوں کے انتظار میں دروازہ کھلا چھوڑ کر تن تنہا تلاوت میں مشغول رہنا، آپ کی ایمانی طاقت، استقلال وعزیمت اور خالق ومالک سے جان ودل کے گہرے تعلق کا پتا دیتا ہے۔

رضی اللہ عنہ وارضاہ

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۹۸/۴ عن سیف

[2] تاریخ الطبری: ۳۸۸/۴

[3] تاریخ الطبری: ۳۴۶/۳

دورِ خلافت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

ذوالحجہ ۳۵ھ......تا......رمضان ۴۰ھ

مئی 656ء......تا......جنوری 661ء

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عالم اسلام کی صورتِ حال پر ایک نظر

N

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے عالم اسلام کا مرکز لرز کر رہ گیا تھا۔ اس عظیم سانحے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی وحدت اور ملت کی اساس شدید خطرے کی زد میں ہے۔ وہ اس عظیم فتنے کی لپیٹ میں آچکے ہیں جس کے بارے میں متعدد احادیث میں پیش گوئی کر دی گئی تھی۔ یہ مسلمانوں کی صفوں میں پہلا انتشار تھا جو ان کے متقفہ، عادل و امین خلیفہ اور ان کے رفقاء کی کردار کشی کے نتیجے میں دیکھنا پڑا تھا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مصر اور مدینہ منورہ کے سوا، باقی شہروں میں حالات معمول پر تھے۔ اندرونی طور پر کسی عام بغاوت کا کوئی خطرہ تھا نہ غیر ملکی طاقتیں مسلمانوں پر غالب آسکتی تھیں۔ مگر اصل خطرناک اور سنگین مسئلہ یہ تھا کہ خود مسلمانوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا آغاز ہو چکا تھا۔

اگرچہ خلیفۂ ثالث کے گھر کا محاصرہ اور استعفے کا مطالبہ کرنے والا ایک چھوٹا سا گروہ تھا مگر اس واردات سے یہ خطرہ عیاں ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کو اگر بروقت سنبھالا نہ گیا تو ان کی یہ دوسری نسل کج فکری، گمراہی اور راہ حق سے اعراض کا شکار ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ایک مثالی معاشرہ ہونے کے باوجود عالمِ اسلام بہرحال دیگر معاشروں کی طرح انسانوں ہی پر مشتمل ہے، جن میں فطری طور پر بشری کمزوریاں موجود ہیں اور اگر کوئی شر پسند گروہ چاہے تو ان میں بھی اشتعال انگیزی اور افراتفری کو ہوا دے سکتا ہے۔

باغیوں کا اس تحریک میں پورے جوش و خروش سے شرکت کرنا بتا رہا تھا کہ دوسرے انسانی معاشروں کی طرح اسلامی معاشرے میں بھی اصلاح، انقلاب، حقوق، تجدید اور انصاف کی بالادستی کے نعرے لگا کر لوگوں کو اس حد تک عمل پر ضرور اُبھارا جاسکتا ہے کہ معاشرے میں ہر وقت ہل چل رہے، حکومت مستحکم نہ ہو سکے اور امن و امان کی فضا قائم نہ ہونے پائے۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ جن لوگوں نے تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان میں بدنام اور بدکردار افراد کے ساتھ صلحاء اور شرفاء بھی شامل تھے، جنہیں تحریک کو نیک نام کرنے کے لئے آگے آگے رکھا گیا تھا جو محض نادانی اور غلط فہمی کا شکار ہوئے تھے۔

باغیوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے بعد نہ صرف ان کے گھر بلکہ بیت المال سے مسلمانوں کے اجتماعی

اثاثوں کو لوٹ لینا، اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ ان کا مقصد محض فساد اور انتقام تھا۔[1] اب جبکہ یہ مقاصد پورے ہوگئے تھے، انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ انہیں بہر حال اپنے معاشرے، اپنے محلے اور اپنے قبائلی نظام میں واپس جا کر کوفہ، بصرہ اور مصر کے لوگوں کے سامنے جوابدہ ہونا تھا کہ وہ کونسا انقلاب برپا کرنے گئے تھے اور کیا کر کے آئے۔

یہ تو عام باغیوں کا حال تھا کہ وہ پریشان، نادم اور مضطرب تھے۔ مگر سازش کے سرغنوں کا مقصد لوٹ مار اور انتقام نہیں، اُمت کو لڑانا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے چیلوں کے تینوں گروہوں کو الگ الگ سمت متحرک کر دیا کہ وہ مدینہ میں موجود تین بزرگ ترین صحابہ کو ایک بار پھر مسندِ اقتدار کی طرف لانے کی کوشش کریں تاکہ کسی طرح نئی کش مکش شروع ہو۔ اب بصرہ کے باغی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے، کوفہ والے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے اور مصر کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلیفہ بننے کی درخواست کرنے لگے مگر ان میں سے ہر ایک نے صاف انکار کر دیا۔ باغیوں نے مایوس ہو کر حضرت سعد بن ابی وقاص اور پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بیعت کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی آمادہ نہ ہوئے۔[2]

یوں سازشی سرغنوں کی چال ایک بار پھر ناکام ہوگئی۔ ثابت ہوگیا کہ اکابر میں سے کوئی بھی خلافت کا خواہش مند نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے واحد حق دار کیوں؟

مرکزیتِ اسلام کو بچانے اور اسلامی وحدت کے خلاف سازش کو ناکام بنانے کے لیے اکابر صحابہ حرکت میں آئے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا تہیہ کر لیا۔ مدینہ کے باقی شہری بھی ان پر متفق تھے۔ تاہم سبائی ذرائع ابلاغ نے جعلی خطوط کے ذریعے جن اکابر کو باغی تحریک کا سرپرست مشہور کر دیا تھا، ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام بھی تھا۔ غالباً سازشی سرغنے طے کر چکے تھے کہ ان میں سے جو بھی مسندِ خلافت پر بیٹھے گا، اس کے خلاف یہی مشہور کیا جائے گا کہ اسی نے سابق خلیفہ کو قتل کرا کے اپنے لئے اقتدار کی راہ صاف کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس سازش کا پورا اندازہ تھا، اس لیے وہ منصبِ خلافت قبول کرنے میں پس و پیش کرتے رہے۔

تاہم اُمت میں اس وقت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بلند مرتبہ ہستی اور کوئی نہ تھی، ان کی افضلیت، لیاقت اور تدبر میں کسی کو شبہ نہ تھا۔ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ بچپن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہے تھے، سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں شامل تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جو خاص محبت تھی اس کا اظہار اکثر و بیشتر نطقِ رسالت سے ہوتا رہتا تھا۔ ایک موقع پر فرمایا: ''جس کا میں دوست، اس کا علی دوست۔''[3]

① تاریخ الطبری: ۴/۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴ ② تاریخ الطبری: ۴/۴۳۲ عن سیف

③ من کنت مولاہ فعلی مولاہ. رواہ الامام احمد فی مسندہ، ح: ۶۴۱ یہ روایت ''حدیث غدیر خم'' کے نام سے معروف ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن اور امام طحاوی نے صحیح کہا ہے۔ امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنی ''مصنف'' میں، امام احمد بن حنبل نے ''فضائل صحابہ'' اور اپنی مسند میں، امام نسائی نے ''السنن الکبریٰ'' میں، امام طبرانی نے اپنی تینوں معاجم میں، ابویعلیٰ موصلی اور امام بزار نے اپنی مسانید میں اور ابن حجر نے ''اتحاف المَهَرَة'' میں اسے متعدد طرق سے نقل کیا ہے۔ روافض اسے عقیدۂ امامت کی بنیاد بناتے ہیں جو بالکل غلط ہے مگر اس غلط استدلال کی تردید کا یہ طریقہ نہیں کہ روایت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ امام ابوجعفر طحاوی نے اس حدیث پر نہایت محققانہ بحث کی ہے۔ انہوں نے روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا وہ معنیٰ واضح کیا ہے جو اصول قرآن و سنت، ملت اور عقل کے عین مطابق ہے۔ (شرح مشکل الآثار: ۵/۱۸، ط الرسالۃ)

ایک موقع پر انہیں مخاطب کر کے ارشاد ہوا: ''اَنْتَ مِنّی وَاَنَا مِنْکَ'' (تم مجھ سے ہو اور میں تم سے)[1]

ایک مرتبہ فرمایا: ''علی میرے ہیں اور میں اُن کا۔''[2]

ایک بار فرمایا: ''علی! تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔''[3]

بارگاہِ ربوبیت سے حضور ﷺ کو آنے والے فتنوں کے تناظر میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی اختیار کریں گے، اس لیے آپ ﷺ نے یہ بھی فرما دیا:

''علی سے ہر ایمان والا محبت کرے گا اور ان سے منافق ہی بغض رکھے گا۔''[4]

دامادِ مصطفیٰ کے علمی مقام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

''میں دارِ حکمت ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔''[5]

شمعِ رسالت سے اس قدر گہرے تعلق کی وجہ سے حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے شب و روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کے حلقے میں بے حد محبوب اور ہر دل عزیز تھے۔ سرورِ کائنات ﷺ کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں ہونا بیتِ نبوی سے آپ کے رشتے کو مزید پختہ کرتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں اپنی جانثاری کا ثبوت پیش کیا تھا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کے نائب کی حیثیت سے مدینہ منورہ کا انتظام سنبھالا تھا۔ حضور ﷺ کی وفات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر لگ بھگ تینتیس (۳۳) سال تھی اور وہ ایک شمشیر زن سپاہی سے زیادہ ایک مفکر، قائد، مشیر اور وزیر کی صلاحیتوں کے حامل ہو چکے تھے اس لئے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت کے پچیس برسوں میں آپ مدینہ منورہ میں ایوانِ خلافت کی مرکزی شوریٰ کے اہم ترین رکن اور قاضی رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو چھ رکنی کمیٹی بنائی تھی، اس کا فیصلہ دو عظیم ترین شخصیات میں سے ایک کو خلافت دینے کا تھا۔ ایک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ آخری فیصلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہوا۔ ان کی شہادت کے بعد اب بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی مستحق خلافت تھے۔

صحابہ کرام کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری ایام میں بھیجا ہوا یہ پیغام بھی یاد تھا کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہیں کہ لوگوں کا معاملہ اب آپ کے حوالے ہے۔ آپ وہی کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالیں۔''[6]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آخری ایام میں یہ بھی واضح فرما چکے تھے کہ ان کے نزدیک منصبِ خلافت کے لیے سب سے

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۲۵۱، کتاب المغازی ② سنن الترمذی، ح: ۳۷۱۹

③ سنن الترمذی، ح: ۳۷۲۰ ④ صحیح مسلم، ح: ۲۴۹، کتاب الایمان، سنن الترمذی، ح: ۳۷۳۶

⑤ ''انا دار الحکمۃ و علیٌّ بابھا۔'' (رواہ الترمذی فی ابواب المناقب)

وفی روایۃ ''انا مدینۃ العلم و علیٌّ بابھا۔'' (المعجم الکبیر للطبرانی: ۶۵/۱۱)

⑥ تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۱۲۰۳/۴، ۱۲۰۵

موزوں ترین شخصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مقام و مرتبے کے پیش نظر مدینہ کے اکثر مہاجرین وانصار انہی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ عام باغی بھی اب انہی کے دامن میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ ان کا گروہ مدینہ منورہ میں شدید بدامنی کا ارتکاب کرنے کے باوجود اس قابل نہ تھا کہ من مانی کر کے کسی کو خلیفہ بنا دیتا۔ فیصلہ اکابر صحابہ کی رائے پر ہی ہو سکتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت کس طرح منعقد ہوئی؟

آخر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سمیت مہاجرین وانصار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ایک بار پھر یہ ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست کی۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تحریک پیش کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ بار بار کہتے رہے: ''ابوالحسن! آیئے ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں۔''[2]

آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا اصرار دیکھ کر کھلے دل کے ساتھ کہا: ''چاہو تو تم میری بیعت کرلو، چاہو تو میں تم میں کسی ایک کی بیعت کرلوں۔'' دونوں نے کہا: ''ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔''[3]

یہی دونوں حضرات سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں سے تھے۔[4]

بیعت اور پہلا خطبہ:

اکابرِ امت کی گزارشات اور مسلمانوں کے عظیم تر مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ۲۴ ذوالحجہ سن ۳۵ ہجری کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں منبرِ رسول پر رونق افروز ہو کر اس عظیم ذمہ داری کو اپنے سر لیا اور عوام وخواص سے بیعتِ خلافت لی۔[5] آپ رضی اللہ عنہ نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

---

(1) ولان یلیها ابن ابی طالب احب الی من ان یلی غیره. (تاریخ المدینة لابن شبّة: ۱۲۰۶/۴)

(2) تاریخ الطبری: ۴۲۷/۴ عن ابی بشیر ؛ ۴۲۹/۴ عن محمد بن ؛ ۴۲۹/۴ عن ابن سیرین

(3) ان شئتما فبایعانی وان شئتما بایعت احدکما فقالا بل نبایعک. (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۰ بسند صحیح الی الزهری، ط المجلس العلمی)

(4) تاریخ الطبری: ۴۲۸/۴ عن عمرو بن شبه

بعض روایات میں ان دونوں اکابر صحابہ کے بیعت سے انکار یا جبراً بیعت کا ذکر ہے۔ (تاریخ الطبری، عن ابیلی و عن ابی مخنف: ۴۲۹/۴ ؛ عن رجل مجهول عن الزهری: ۴۳۰/۴ ؛ عن سری: ۴۳۴/۴ ؛ عن الحارث الوالبی: ۴۳۵، ۴۳۵/۴)

مگر یہ سب روایات سنداً ضعیف اور متن کے اعتبار سے منکر ہیں۔ کوئی ابومخنف سے منقول ہے تو کوئی کسی مجہول شخص یا کسی اور ضعیف راوی سے۔ ہم نے سند کے لحاظ سے بہتر روایات کو اختیار کیا ہے جن میں بلا اکراہ بیعت کا ذکر ہے۔

متن میں مذکورہ روایات کے علاوہ مزید صحیح روایات بھی ہیں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان صحیح سند کے ساتھ ہے:

ان طلحة والزبیر بایعا طائعین غیر مکرهین.

''بے شک طلحہ اور زبیر نے مطیع ہو کر کسی جبر کے بغیر بیعت کی۔'' (مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۷۹۹، ط الرشد)

یہی روایت حسن سند کے ساتھ بھی منقول ہے۔ (تاریخ المدینة لابن شبّة: ۱۲۷۵/۴)

''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی ایک روایت میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سمیت متعدد لوگوں کی بیعت کے متعلق مذکور ہے: بایعوا علیا طائعین غیر مکرهین. (مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۷۰۹، ط الرشد) حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (فتح الباری: ۵۴/۱۳)

(5) تاریخ الطبری ۴۲۷/۴، ۴۲۸ عن جعفر

"لوگو! میں تمہاری اس ذمہ داری کو قبول کرنا پسند نہیں کرتا تھا مگر تم مجھے منتخب کیے بغیر نہ مانے۔ آگاہ رہو کہ مجھے تمہارے بغیر کسی معاملے کا اختیار نہیں ہے۔ ہاں تمہارے (بیت المال کے) اموال کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی۔ تاہم یہ یاد رکھنا کہ میں تمہاری اجازت کے بغیر ان سے ایک درہم بھی نہیں لے سکوں گا۔ کیا تم اس پر راضی ہو؟"

سب نے کہا: "ہم راضی ہیں۔" تب آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے بیعت لی۔ ①

قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مسئلہ:

عام ذہن کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے ان فسادیوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہیے تھی جو بغاوت میں ملوث تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے اس وقت سب سے اہم چیز خود دینِ اسلام کی حفاظت تھی۔ آپ کی دوررس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ خود مذہبِ اسلام کا صحیح تشخص خطرے میں ہے، کیوں کہ اسلام کا تعارف، اس کی سند اور اس کی پہچان اصحابِ رسول ہیں اور اس وقت حالات ایسے تھے کہ خود اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ صرف اخلاص و کردار بلکہ ان میں سے بعض کے ایمان کے بارے میں بھی شبہات پیدا کر دیے گئے تھے۔ خلیفۂ ثالث کو سبائی گروہ نے "کافر" تک مشہور کر دیا تھا (جیسا کہ اس گروہ سے متاثر کچھ شیعہ مؤرخین نے ایسی روایات قبول کی ہیں)۔

ایسے میں سب سے زیادہ ضروری کام یہ تھا کہ اصحابِ رسول کی اسلام کے لئے بنیادی و اساسی حیثیت کو مجروح نہ ہونے دیا جائے، یہی چیز اس سے پہلے سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر تھی۔ چنانچہ انہوں نے گالم گلوچ سے لے کر تیز دھار ہتھیاروں کی ضربیں تک برداشت کر ڈالیں مگر آخر دم تک کسی کو یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع نہ دیا کہ نبی کے نائب نے مسلمانوں کے خون میں ہاتھ رنگے ہیں۔ ② یہی چیز اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں تھی کہ آپ نے عبداللہ بن ابی کے نفاق، اسلام دشمنی اور غداری کے بارے میں پوری آگاہی اور متعدد تلخ تجربات کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا سر قلم کرنے کی اجازت نہ دی تاکہ اسلامی اقتدار کے بارے میں دنیا والے کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں اور فرمایا: "کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرا دیتا ہے۔" ③

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی باریک نکتے کو سمجھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس سے پوری طرح آگاہ تھے، اسی لئے انہوں نے جو حکمتِ عملی اپنائی اصلاحِ احوال اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس کا پہلا قدم دفاع تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ اکابر صحابہ اور عمالِ حکومت سمیت کسی سے بھی جوش کی بناء پر کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جو شریعت کے دائرے سے باہر ہو یا جو مزید افتراق کا سبب بن جائے اور دنیا یہ سمجھے کہ مسلمان اقتدار کے

---

① تاریخ الطبری: ۴۲۸/۴

② مسند احمد، ح: ۴۸۱

③ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب ما ینھی من دعوۃ الجاھلیۃ

لیے خانہ جنگی، اختلافات اور تنازعات میں مبتلا ہیں، بلکہ اس وقت سب ہی کلمہ گو ایک صف میں ایک موقف کے ساتھ کھڑے نظر آئیں۔ آپ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ جو لوگ معمولی باتوں کو حالتِ امن میں بھی طوفان بنا دیتے ہیں، وہ حالت فتنہ میں کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لئے آپ کے نزدیک ضروری تھا کہ سب سے پہلے ''دفاع واستحکام'' کیا جائے جس کے لئے حالتِ امن اور حالتِ سکون کا قیام شرط تھا، یعنی یہ ضروری تھا کہ پہلے امت کے دلوں کو جوڑا جاتا، مسلمان کے حقوق، کلمے کی قدر اور ایک دوسرے کا احترام یاد دلایا جاتا، سب کو اپنی اصل یعنی قرآنِ مجید کے پیغام کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی جاتی، چنانچہ بیعت کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اللہ نے اپنی کتاب کو ذریعہ ہدایت بنایا ہے جو خیر وشر کو واضح کرتی ہے، پس خیر کو اختیار کرو، شر کو چھوڑ دو، اللہ نے جن چیزوں کی حرمت کھول کر بیان کی ہے، ان میں مسلمان کی حرمت سب سے زیادہ ہے۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ دین وشریعت کے تقاضے کے تحت کسی مسلمان کا احتساب کیا جائے۔ مسلمان کو اذیت دینا حلال نہیں سوائے اس کے کہ اس پر شریعت کے تحت سزا واجب ہو۔ اللہ کے بندوں اور ان کے وطن کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، جانوروں اور زمین تک کے حق کا تم سے سوال ہوگا۔''[1]

اس دل سوز وحکمت آمیز خطبے نے نادانی سے باغی تحریک کا حصہ بن جانے والوں کی سب سے بڑی غلطی پر چوٹ لگائی تھی۔ حرمتِ مسلم کا لحاظ نہ رکھنا اور اہلِ ایمان کو ایذا دینا اس سارے فساد میں قدم قدم پر نظر آتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اصلاح کا نعرہ لگانے والی کسی بھی تحریک کے جعلی اور بے حقیقت ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ بندوں کے حقوق کو نظر انداز کرتی ہو۔

x x x

نیا سال ۳۶ ہجری

نیا سال سن ۳۶ ھ شروع ہوا تو مدینہ منورہ میں صورتِ حال اس لحاظ سے سازگار نظر آتی تھی کہ نہ صرف تمام صحابہ کرام اور اہل مدینہ بلکہ باغیوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی مگر اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایسی کڑی آزمائشیں تھیں جن کا سامنا ان سے پہلے کسی خلیفہ کو نہیں کرنا پڑا تھا۔ تینوں خلفائے راشدین نے حالتِ امن واتحاد میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں مگر یہاں خود دارالخلافہ کا امن لٹ چکا تھا، خلیفہ کو شہید کیا گیا تھا اور مسلمانوں کے اتحاد کی کڑیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ غرض یہ خلافت پھولوں کی سیج نہیں، ایک راہِ خار دار تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلاشبہ شورائیت کے ذریعے تشکیل پائی تھی۔ مدینہ میں موجود تمام اکابر مہاجرین وانصار نے بیعت کر لی تھی۔ سابقہ تینوں خلفاء کی خلافت کے انعقاد کے لیے بھی اہلِ مدینہ کی بیعت کافی سمجھی گئی تھی، اسی طرح

[1] تاریخ الطبری: ۴۳۶/۴ عن سیف



اب بھی یہی کافی تھا۔ چنانچہ خلافتِ علویہ، خلفائے ثلاثہ کی خلافت کی طرح مضبوط دلائل سے ثابت ہوگئی۔ دور دراز کے شہریوں کے لیے بھی اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لینا واجب ہو گیا تھا۔ ①

---

① اگرچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اوران کے شامی رفقاء نے بیعت نہیں کی تھی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاقِ خلافت سے انہیں بھی انکار نہیں تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مرکزِ خلافت مدینہ میں تقریباً سبھی صحابہ نے بیعت کر لی تھی، اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت جمہور علماء کے نزدیک اجماعی ہے۔ کتب عقائد میں یہی لکھا ہے۔(الابانة عن اصول الديانة، امام ابو الحسن الاشعری، ص ۷۸ ؛ الاقتصاد فی الاعتقاد، امام غزالی، ص ۱۵۴ ؛ الاعتقاد للبیهقی، ص ۳۷۰ تا ۳۷۴)

علامہ ابن حجر ہیثمی لکھتے ہیں: ان الحقيق بالخلافة بعد الائمة الثلاثة هو والامام المرتضىٰ وولى المجتبىٰ، على بن ابى طالب، باتفاق اهل الحل والعقد عليه كطلحة والزبير وابى موسىٰ وابن عباس و خزيمة بن ثابت وابى هيثم بن التيهان ومحمد بن مسلمة وعمار بن ياسر. (الصواعق المحرقة: ۱/۳۴۹، ط الرسالة)

ناصبی مزاج گروہ کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کو اجماعی ماننے سے انکار کرتے ہیں، دلیل میں یہ لوگ ایسی روایات پیش کرتے ہیں جن میں بعض صحابہ کے بیعت سے گریز کا ذکر ہے۔ ایک روایت میں حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک، حضرت مسلمہ بن مُخَلَّد، حضرت ابوسعید خدری، حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت زید بن ثابت، حضرت رافع بن خدیج، حضرت فضالہ بن عبید اور کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہم کو بیعت سے گریزاں بتایا گیا ہے۔(تاریخ الطبری: ۴/۴۲۹، ۴۳۰) مگر یہ روایت ضعیف ہے؛ کیوں کہ اس کا ایک راوی شیخ من بنی ہاشم بالکل مجہول ہے۔

ایک روایت میں قدامہ بن مظعون اور عبداللہ بن سلام کو بھی انہی میں شمار کیا گیا ہے۔(تاریخ الطبری: ۴/۴۳۰) مگر اسے ایک رجل مجہول نے الزہری سے نقل کیا ہے، لہٰذا سند ضعیف ہے۔

ایک اور روایت میں اسامہ بن زید، حضرت صہیب رومی، ایوب بن زید اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم کو بھی ان لوگوں میں شمار کیا گیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کو جبر پر محمول کرتے تھے۔(تاریخ الطبری /۳۶۶، ۳۶۷) مگر یہ سیف بن عمر کی ضعیف روایت ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے بیعت اس حال میں کی کہ تلوار میرے سر پر تھی۔ اسی روایت میں بیعت نہ کرنے والوں میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت سلمۃ بن وقش رضی اللہ عنہم کے نام بھی ہیں۔(تاریخ الطبری /۴۳۰، ۴۳۱) مگر اس کا راوی واقدی ہے جس کا ضعف ظاہر ہے۔ نیز روافض سے منقول ایسی روایات بکثرت ہیں۔ روافض نے انہیں اس لیے گھڑا تھا تا کہ وہ صحابہ کرام کی اکثریت پر یہ طعن کر سکیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے اجتناب کے مجرم تھے۔ اُدھر مروانیوں کی عادت ہے کہ سبائی روایات میں اہلِ بیت کی کمزوری کا کوئی ہلکا سا بھی پہلو ملے تو اسے اپنا ایمان بنا لیتے ہیں۔ پس انہی جعلی روایات کو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد نہ ہونے کی دلیل کے طور پر مشہور کر دیا۔ حالانکہ جھوٹے رافضیوں کی روایت کا بھلا کیا اعتبار!!

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جمہور اہلِ مدینہ مہاجرین وانصار نے بیعت کر لی تھی۔ عن محمد بن الحنفية، دخل المهاجرون والانصار فبايعوه، ثم بايعه الناس. محمد بن حنفیہ سے مروی ہے کہ مہاجرین وانصار آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت ہو گئے۔(تاریخ الطبری: ۴/۴۲۷)

امام احمد بن حنبل صحیح سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں: محمد بن حنفیہ کہتے ہیں، میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے آکر کہا: ''امیر المؤمنین کو قتل کیا جانے والا ہے۔'' پھر دوسرے نے آکر کہا: ''امیر المؤمنین اسی وقت قتل کیے جا رہے ہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے خطرہ محسوس کر کے ان کی کمر پکڑ لی مگر وہ بولے: ''چھوڑ دو۔ تمہاری ماں نہ رہے۔'' یہ کہہ کر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے تو وہ شہید کیے جا چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر واپس آئے اور دروازہ بند کر لیا۔ لوگوں نے آکر دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو کر کہا: ''وہ صاحب تو شہید ہو گئے، لوگوں کا کوئی خلیفہ ہونا ضروری ہے۔ ہم آپ سے بڑھ کر اس کا حق دار کسی کو نہیں جانتے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے خلیفہ بنانے کا ارادہ مت کرو۔ میں تمہارے لیے حکمران کی جگہ وزیر اچھا ہوں۔'' لوگوں نے کہا: ''نہیں۔ اللہ کی قسم! ہم آپ سے بہتر کسی کو نہیں جانتے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر تم مانتے ہی نہیں تو پھر میری بیعت خفیہ نہیں ہوگی بلکہ میں مسجد میں جاؤں گا، جو چاہے مجھ سے بیعت کر لے۔'' پس وہ مسجد میں گئے اور لوگوں نے ان سے بیعت کر لی۔(فضائل الصحابه : ۲/۵۷۳)

امام زہری سے مروی ہے: حتىٰ اذا قتل عثمان رضی اللہ عنہ بايع الناس على بن ابى طالب.(مصنف عبدالرزاق ، ح: ۹۷۷۰ بسند صحيح مرسل)

امام خلال نے امام احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے: اصحاب رسول الله ﷺ رضوا به واجتمعوا عليه. (السنة: ۲/۴۱۳)

امام شعبی کی روایت ہے: فبايعته العامة. (تاریخ الطبری: ۴/۴۳۳)

ابوالحارثہ سے مروی ہے: فقال الجمهور: على بن ابى طالب نحن به راضون. (تاریخ الطبری: ۴/۴۳۳)

سیف بن عمر سے منقول ہے: فبايع الناس كلهم. (تاریخ الطبری: ۴/۴۳۵)

امام بیہقی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے: فبايعه الناس ولم يعدلوا به طلحة ولا غيره. (الاعتقاد، ص ۱۷۰)......... (بقیہ اگلے صفحے پر)

باغیوں سے بیعت کیوں لی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا باغیوں سے بیعت لینا محض سیاسی مصلحت نہیں تھی، بلکہ قرآن مجید کی تعلیم یہی تھی:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(ہاں وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو تمہارے ان پر قابو پانے سے پہلے توبہ ہی کر لیں تو ایسی صورت میں جان رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔)[1]

اس میں ہدایت ہے کہ اگر کوئی فسادی گروہ، زیر ہونے سے پہلے پہلے ہتھیار ڈال کر حاکم کی اطاعت اختیار کر لے، تو وہ قابلِ معافی ہے۔

مدینہ میں فساد پھیلانے والے لوگوں کی اکثریت، بغاوت کے اصل مقاصد سے لاعلم تھی اور صرف نادانی یا جوش میں مدینہ منورہ چلی آئی تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے علاقوں کے رئیس تھے جن کے پیچھے قبائل اور خاندانوں کی بڑی حمایت تھی۔ اگر ان کی بیعت قبول نہ کی جاتی تو اوّل یہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی۔ دوسرے ایسی صورتحال میں یہ لوگ اپنی حفاظت کے لیے مزاحمت کا راستہ اختیار کرتے۔ اور یوں ایک کی جگہ کئی باغی گروہ وجود میں آ جاتے، اور وہی خانہ جنگی شروع ہو جاتی جسے روکنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جان دی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ موقف کہ عام باغی بیعت کر کے مرکزِ خلافت کی وفاداری کا اقرار کر لیں، عین شرعی حکم اور حکمت پر مبنی تھا۔ بیعت کے بعد وہی خلیفہ جس پر سب اعتماد ظاہر کر چکے ہوں، اصل مجرموں کو سزا دیتا تو کسی کو اعتراض کا حق نہ رہتا۔

حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں شرعی دلائل کے تحت اسلامی سیاست میں ایک حد کے اندر حزبِ اختلاف کی سرگرمیوں کو برداشت کرنے کے قائل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید یہ کیا کہ ان میں سے محمد بن ابی بکر اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

طبقات ابن سعد میں ہے: بایعه طلحة والزبیر و سعدبن ابی وقاص وسعید بن عَمْرو بن نفیل وعمار بن یاسر و اسامة بن زید وسهل بن حُنَیف وابوایوب الانصاری ومحمد بن مسلمه وزید بن ثابت وخزیمة بن ثابت وجمیع من كان بالمدینة من اصحاب رسول اللہ ﷺ. (۳/۳۱، ط صادر)

ان میں سے آخری چند روایات میں سند اضعف ہے مگر شروع میں ذکر کردہ صحیح روایات سے ملنے والی تائید یہ ضعف دور کر دیتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ بہت سے صحابہ نے بیعت کر کے بھی سیاسی مناقشوں اور جنگوں میں حصہ لینے سے گریز کیا تھا، ان کا یہ فیصلہ فتنے کے وقت گوشہ نشین رہنے کی ہدایت پر مشتمل بعض فرامین نبویہ سے مستنبط تھا۔ ان کے جنگ سے کنارہ کش رہنے کو بیعت سے انکار پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

(حاشیہ صفحہ موجودہ)

[1] سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۴

قال الشوکانی: "لایکون هذا حکم من فعل ای ذنب من الذنوب. بل من كان ذنبه هو التعدی علی دماء العباد واموالهم." (تفسیر فتح القدیر: ۲/۴۱)

وقال وهبة الزحیلی: "هذه الاية فی المحاربین من اهل الاسلام وهم الذین خرجوا علی الناس بقصد اخذ اموالهم او قتلهم او لارهابهم، فیختل الامن والسلم." (التفسیر الوسیط: ۱/۴۵۳)

مالک بن اَشتر نخعی جیسے چند افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق عہدے بھی دے دیے۔ یہ وسعتِ ظرفی اسلامی سیاست اور خلافتِ راشدہ کا خاص امتیاز تھا جو تہذیب کی مدعی دنیا میں آج بھی کم یاب ہے۔

قاتلینِ عثمان پر گرفت میں تاخیر کی وجہ: باغیوں کی پانچ قسمیں:

یہ بات طے ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے افراد گنے چنے تھے، باقی لوگ محاصرے اور شورش میں شریک تھے۔ بیعت ہو جانے کے بعد ان سب کو سزا دینا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فقہی نگاہ میں غلط یا کم از کم قابلِ غور مسئلہ تھا۔

دراصل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے پانچ طرح کے افراد تھے:

① کچھ ہمیشہ پس پردہ رہتے تھے اور کوئی ثبوت یا سراغ نہیں چھوڑتے تھے جیسے عبداللہ بن سبا۔ ثبوت اور سراغ کے بغیر ایسوں کو سزا کیسے دی جا سکتی تھی؟

② کچھ لوگ غلط طور پر قاتل مشہور کر دیے گئے تھے جیسے حضرت عَمرو بن الحَمِق اور عبدالرحمٰن بن عُدَیس رضی اللہ عنہما۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی بے گناہی سے واقف تھے؛ اس لیے افواہوں کی بناء پر بھلا ان سے قصاص کیوں لیتے؟

③ کچھ قاتل موقعِ واردات پر مارے گئے تھے جیسے کلثوم بن تُجَیب، سُودان بن حُمران، قُتیرہ بن حمران۔[1]

④ جو قاتل باقی بچے، وہ فرار ہو چکے تھے، سالوں بعد پتا چلا کہ وہ شام و مصر کے سرحدی کوہستان میں چھپے رہے جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مکمل کنٹرول کبھی نہ ہو سکا۔ ہم جس دور کی بات کر رہے ہیں، اس وقت تو ان کا ادنیٰ سراغ بھی نہ تھا۔[2]

---

① تاریخ الطبری: ۴۸۹/۴ تا ۴۹۲

② فطعنه احدهما بمشقص فی اوداجه و علاه الآخر بالسيف فقتلوه، ثم انطلقوا هرابا، يسيرون بالليل ويكمنون بالنهار حتى اتوا بلدا بين مصر والشام، قال فكمنوا فی غار، قال فجاء نبطی من تلك البلاد معه حمار، قال فدخل ذباب فی منخر الحمار، قال فنفر حتى دخل عليهم الغار، وطلبه صاحبه فرآهم فانطلق الى عامل معاوية، قال فاخبره بهم، قال فاخذهم معاوية فضرب اعناقهم.

(پس ان میں سے ایک نے ان کی گردن پر بھالے سے وار کیا اور دوسرا تلوار لے کر ان پر چڑھ گیا۔ پس ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر ڈالا، پھر یہ سب لوگ بھاگ نکلے۔ رات کو سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مصر اور شام کے درمیان ایک علاقے میں پہنچ گئے، پھر وہ ایک غار میں چھپ گئے، پس اس علاقے کا ایک نبطی اپنے گدھے سمیت وہاں آیا، گدھے کی ناک میں مکھی گھس گئی تو گدھا بھاگ کھڑا ہوا اور ان لوگوں کے غار میں گھس گیا، اس کے مالک نے اسے ڈھونڈا تو ان لوگوں کو دیکھ لیا، اس نے جا کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عامل کو خبر کر دی۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں گرفتار کر لیا اور ان کی گردنیں مار دیں۔)

(مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۶۹۱، ط الرشد، بسند صحیح او حسن، رجاله رجال البخاری الا جهم الفهری، لكن وثقه ابن حبان)

اسی لیے امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے: فانه لم يقتله الا طائفة قليلة باغية (پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فقط ایک چھوٹی سی باغی ٹولی نے قتل کیا تھا۔)

اس کے بعد امام ابن تیمیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی کارروائی اور اصل مجرموں کے فرار کا واقعہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زبانی یوں نقل کرتے ہیں:

"قال ابن الزبير: لعنت قتلة عثمان، خرجوا عليه كاللصوص من وراء القرية، فقتلهم الله كل قتلة، ونجا من نجا منهم تحت بطون الكواكب يعنى هربوا ليلاً" (عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں پر لعنت ہو، وہ آبادی کے باہر سے ان پر چوروں کی طرح آ پڑے، پھر اللہ نے انہیں ہر طرح قتل کیا، ان میں سے جو بچا، وہ تاروں کی چھاؤں میں بچ سکا۔ یعنی وہ رات کو فرار ہو گئے۔) (منہاج السنة: ۲۹۶/۶)

قدیم علمائے تاریخ میں سے یہ روایت ابوبکر ابن الانباری (م ۳۲۸ھ) نے امام فرّاء سے نقل کی ہے۔ (الاضداد، ص ۳۴۲)

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پہرے پر تعینات تھے۔ ان کا بیان دیگر صحیح روایات کی مکمل توثیق کر دیتا ہے جن میں مذکور ہے کہ کچھ قاتل عین وقت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وفاداروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے اور کچھ بچ کر بھاگ گئے اور دور دراز کے کوہستانوں میں روپوش ہو گئے تھے۔

⑤ باقی لوگ فقط بلوائی تھے نہ کہ قاتل۔ بغاوت میں شریک ضرور ہوئے مگر اب از سرِ نو خلیفہ کی بیعت کر چکے تھے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ان پر بلا تامل قصاص جاری نہیں کیا جا سکتا تھا۔[1]
اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجماعی رائے قائم ہونے تک انہیں قومی دھارے میں شامل رہنے کا موقع دیا تھا۔

---

① حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس فقہی رائے کا ذکر جلیل القدر شارحینِ حدیث، فقہاء اور متکلمین کے کلام میں ملتا ہے۔ امام نسفی تحریر فرماتے ہیں:
"والباغي اذاانقاد لامام اهل العدل لايؤاخذ بما سبق منه من اتلاف اموال اهل العدل وسفک دمالهم وجرح ابدانهم ،فلم يجب عليه قتلهم ولا دفعهم الىٰ الطالب" ''اور باغی جب امام عادل کے مطیع ہو جائیں تو ان سے گزشتہ کاموں مثلاً اہلِ عدل کے اموال کے ضیاع، ان کا خون بہانے اور زخمی کرنے کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ پس امام پر واجب باغیوں کو قتل کرنا یا انہیں (بدلہ) طلب کرنے والوں کے سپرد کرنا واجب نہ ہوگا۔'' (الاعتماد فی الاعتقاد، شرح العُمدة في عقيدة اهل السنة والجماعة: ص، ۲۰۵)
یہی تحقیق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''قرة العينين في تفضيل الشيخين'' میں قلم بند فرمائی ہے۔
امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دفاع میں اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
طعنوا فيه بانه ماقام القصاص علىٰ قتلة عثمان رضى الله عنه ،وهذا ظلم قادح في امامته. والجواب: ان شرائط وجوب القصاص تختلف باختلاف الاجتهادات فلعلّه لم يؤد اجتهاده الىٰ كونهم موصوفين بالشرائط الموجبة للقصاص.
''لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا کہ انہوں نے قاتلینِ عثمان پر قصاص جاری نہیں کیا۔ ان کی حکومت میں یہ بڑا بھاری ظلم تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قصاص واجب ہونے کی شرائط اجتہادات کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ پس شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد میں یہ ثابت نہ ہوتا ہو کہ وہ لوگ قصاص واجب کرنے والی شرائط سے موصوف تھے۔'' (معالم اصول الدين، ص ۱۵۲)
اسی طرح علامہ سعد الدین تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وتوقف علي رضي الله تعالىٰ عنه......عن قصاص القتلة لشوكتهم او لانهم عنده بغاة ،والباغي لايؤاخذ بما اتلف من الدم والمال عندالبعض.
''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتلین کے قصاص میں توقف کرنا یا تو ان (قاتلوں) کی قوت کے باعث تھا یا اس لیے تھا کہ وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک باغی تھے اور بعض (مجتہدین) کے نزدیک باغی جس جان یا مال کا اتلاف کرے اس کا مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔'' (**شرح المقاصد: ۵۳۱/۳، ط اشاعت اسلام پشاور--- یہاں یہ ملحوظ رہے کہ یہ مذہب بعض مجتہدین کا نہیں بلکہ جمہور کا ہے، مذاہب اربعہ کی فقہی کتب سے یہی ثابت ہوتا ہے۔**)
حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قاتلینِ عثمان کی تلاش میں عراق پہنچنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مذاکرات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس موقف کو یوں واضح کرتے ہیں:
فراسلوه في ذلک فابىٰ ان يدفعهم اليهم الا بعد قيام دعوىٰ من ولي الدم وثبوت ذلک علىٰ من باشره بنفسه.
''پس انہوں نے اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مذاکرات کیے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان (باغیوں) کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا سوائے اس صورت کے کہ ان کے خلاف مقتول کے ورثا مدعی کریں اور اس بات کا ثبوت مہیا ہو جائے کہ ان لوگوں نے بذاتِ خود قتل کا ارتکاب کیا ہے۔'' (فتح الباري: ۲۱۶/۲)
استاذ عالی قدر حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی رحمہ اللہ (جن سے راقم کو استفادے کا موقع میسر آیا ہے۔) تحریر فرماتے ہیں:
''اس کی اصلی وجہ مسئلے کی شرعی صورت ہے کہ اصل قاتل معلوم نہ تھے جن پر قصاص جاری ہوتا، باقی لوگوں کی حیثیت باغیوں سے زیادہ نہ تھی اور باغی جب اطاعت قبول کر لیں تو پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ (ناصبیت تحقیق کے بھیس میں: ص ۲۶۱)
حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت معاویہ ان بلوائیوں کو قاتل سمجھتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نظر میں باغی تھے۔ باغی اگر ہتھیار ڈال دے تو اس سے زمانۂ بغاوت میں کیے ہوئے فعل کا قصاص اور ضمان نہیں۔'' (**عقائد الاسلام: ص ۱۶۰**)
حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ نے اپنے مقالات میں اس موضوع پر مفصل کلام فرمایا ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ (**ماہنامہ انوار مدینہ لاہور: ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء**)
مناسب ہوگا کہ باغیوں کے جرائم کی معافی کی شرعی حکمت بھی جان لی جائے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:
''حکمت اس استثناء کی یہ ہے کہ ایک طرف ڈاکوؤں (اور اسی طرح باغیوں) کی سزا میں یہ شدت اختیار کی گئی ہے کہ پوری جماعت میں سے کسی ایک سے بھی جرم کا صدور ہو تو سزا پوری جماعت کو دی جاتی ہے۔ اس لیے دوسری طرف اس استثناء کے ذریعے معاملہ ہلکا کر دیا گیا کہ توبہ کر لیں تو سزائے دنیا بھی معاف ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی ہے کہ ایک طاقت ور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتلِ نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانونِ اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو۔'' (معارف القرآن: ۱۲۳،۱۲۲/۳)



مطالبہ قصاص میں حضرات طلحہ وزبیر، عائشہ صدیقہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم کا فقہی نقطۂ نظر کیا تھا؟

دوسری طرف حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ مدینہ منورہ میں شورش برپا کرنے اور دارِ عثمان کو گھیرنے والے سبھی افراد بغاوت، قتل اور اعانتِ قتل کے مجرم ہیں اور ان سب کو قصاص میں قتل کرنا واجب ہے۔ ①

یہ ان حضرات کی اجتہادی رائے تھی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت بھی خلافِ تحقیق سمجھتے تھے۔ اگرچہ چند سال بعد اس بارے میں صحیح شرعی لائحہ عمل پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے یہ فقہی اختلاف سیاسی نزاع کی وجہ بنا رہا۔ ②

صحابہ کرام مختلف الرائے کیوں ہوئے؟

اس مسئلے میں صحابہ کرام کا مختلف الرائے ہونا، بلاوجہ نہیں تھا، بلکہ اس کی تین اہم وجوہ تھیں:

① قصاصِ عثمان ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ یہاں قتلِ عمد اور بغاوت کا قضیہ باہم مرکب ہو گئے تھے۔ باریک بینی سے اس کا تجزیہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ بغاوت کی حدود کہاں تک تھیں اور قتلِ عمد کا اطلاق کن کن حرکات پر ہو گا؟

---

① آگے کے سارے واقعات شاہد ہیں کہ ان کا موقف یہی تھا۔ یہ موقف بعض دلائلِ شرعیہ ہی سے مستفاد تھا مثلاً:

لو ان اهل السماء والارض اشتركوا فی دم مومن لاكبهم الله فی النار.

"اگر آسمان وزمین کے باسی مل کر ایک مومن کو قتل کریں تو اللہ ان سب کو جہنم میں ڈال دے۔" (سنن الترمذی، ابواب الدیات)

جب بصرہ میں حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کا سامنا حُکَیم بن جبلہ کے سات سو حامیوں سے ہوا تو یا کابران سب کو قاتلینِ عثمان اور قابلِ قصاص شمار فرما رہے تھے، اسی لیے انہوں نے یہ دعائیہ الفاظ کہے: الحمد لله الذی جمع لنا ثارنا من اهل البصرة، اللهم لا تبق منهم احدا، واقد منهم الیوم فاقتلهم. "اللہ کا شکر ہے جس نے اہلِ بصرہ میں سے ہمارے قابلِ انتقام افراد کو جمع کر دیا۔ اے اللہ! ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔ ان سے آج قصاص لے اور انہیں قتل کر دے۔" (تاریخ الطبری ۴/۴۷۰)

اگرچہ یہ لڑائی دفاعی تھی یعنی حملے کی ابتداء حُکَیم بن جبلہ نے کی تھی، اس لیے ان حضرات کے پاس لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر ان کے دعائیہ کلمات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان سب لوگوں کو قابلِ سزا سمجھتے تھے۔ ایسے میں جب مجرم خود ہی انہیں لڑنے پر مجبور کرنے لگے تو ان حضرات نے اسے قصاص کا بہترین موقع سمجھ کر اس زور شور سے جنگ کی کہ ان سات سو میں سے اکا دکا ہی بچ کر نکل سکے۔ باقی سب مارے گئے۔ اس کے بعد حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما نے منادی کرائی: "الا من كان فیهم من قبائلكم احد ممن غزا المدینة فلیاتنا بهم." "اس اعلان پر ایسے لوگوں کو جو شورش میں شرکت کے لیے مدینہ گئے تھے، چن چن کر گرفتار کیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: "فجئ بهم كما یجاء بالكلاب فقتلوا." (تاریخ الطبری: ۴/۴۷۲) اس کے بعد اس کامیابی کی خوشخبری کو مراسلوں میں تحریر کیا گیا: "اقبل قتلة امیر المؤمنین فخرجوا الی مضاجعهم فلم یفلت منهم مخبر الا حُرقُوص بن زهیر." (طبری ۴/۴۷۲) یہ مفصل روایت اگرچہ ضعیف راوی سیف کی ہے مگر اس کے حاصلِ مطلب کے قوی مؤیدات موجود ہیں۔ (دیکھیں: طبری ۴/۴۶۹، ۴۷۰ عن الزہری؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۸۳ عن سنان بن سلمہ)

② یاد رہے کہ آگے بھی جہاں "قاتلینِ عثمان" کا لفظ آئے گا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ ان میں سے ہر شخص براہِ راست قتل میں ملوث تھا۔ اس زمانے میں "قاتلینِ عثمان" ان لوگوں کے لیے ایک اصطلاح بن گئی تھی جو مدینہ کی شورش میں شامل تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت طلحہ وزبیر، ام المؤمنین عائشہ صدیقہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم تمام سابقہ باغیوں کو قصاصاً واجب القتل تصور کرتے ہوئے ان سب کو "قتلة امیر المؤمنین" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس طرح یہ پورا گروہ جو مدینہ میں بلوہ کرنے والے اڑھائی تین ہزار افراد پر مشتمل تھا، "قاتلینِ عثمان" کہلانے لگا۔ اس میں اصل قاتل تو دو چار ہی تھے، اکثر ان کے مددگار، حمایتی اور ہمدرد تھے۔ یہ حقیقت حضرت طلحہ وزبیر، ام المؤمنین عائشہ صدیقہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کو بھی معلوم تھی کہ ہر شخص براہِ راست قتل میں شامل نہیں مگر وہ پوری باغی جماعت پر اس کا اطلاق کر رہے تھے۔ بعض نصوص کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتے تھے کہ کسی شخص کے قتل میں معاون تمام افراد پر بہرحال قصاص جاری ہو گا چاہے وہ مہلک وار کے مرتکب نہ ہوں۔ فقہائے اسلام میں ایک رائے یہ بھی رہی ہے۔ (الحجة علی اهل المدینة، امام محمد بن حسن: ۴/۴۰۳، ۴۰۵، باب القصاص فی القتل، ط عالم الكتب)

② اختلافِ رائے کی دوسری بڑی وجہ اس بارے میں کسی سابقہ نظیر کا نہ ہونا تھا۔ مفتی، قاضی اور جج حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب بھی کوئی استفتاء، کیس یا مقدمہ سامنے آتا ہے تو ان کے لیے سب سے زیادہ سہولت کی بات یہی ہوتی ہے کہ اس جیسے مسئلے پر کوئی سابقہ فتویٰ یا فیصلہ سامنے ہو۔ اس طرح غلطی کا امکان کم ہوتا ہے اور فیصلہ سنانے میں وقت بھی کم لگتا ہے۔ لیکن اگر معاملے کی نوعیت بالکل نئی ہو، تو مفتیوں، قاضیوں اور ججوں کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ایسے میں کوئی بعید نہیں ہوتا کہ منصف پوری نیک نیتی، دیانت اور سعی کے باوجود غلط رائے قائم کرلے۔ یہاں بھی ایسی ہی صورتحال تھی۔

③ تیسری وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد جذبات کے تلاطم سے دوچار تھی۔ شہادتِ عثمان جس قدر دردناک انداز میں ہوئی تھی، اسے نقل کرتے ہوئے آج بھی قلم تھراتا ہے اور سنگ دلوں کے بھی آنسو بہہ پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو حد درجے رقیق القلب تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کی محبت اولاد کی باپ سے محبت جیسی تھی۔ یہ واقعہ ان کی زندگی میں پیش آیا تھا اور ان کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ چکے تھے۔

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسئلے کی نزاکت اور پیچیدگی دیکھتے ہوئے، جذبات کو بالکل ایک طرف رکھ کر بڑی بردباری اور سنجیدگی سے شرعی دلائل پر غور کر رہے تھے۔ قضاء کے مسائل میں شریعت کی تعلیم یہی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ﴿لا یقضی الحکم بین اثنین وھو غضبان.﴾ (کوئی قاضی غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے مابین بھی فیصلہ نہ کرے۔)[1]

پس قصاصِ عثمان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہوئے کیوں کہ وہ علم، فقاہت اور اجتہاد کے ساتھ ساتھ ضبط وتحمل کا دامن بھی تھامے رہے۔

عدالتی کارروائی میں پیچیدگیاں:

جہاں اس نئے قضیے کی تحقیق کے لیے اجتہاد کرنا کوئی آسان نہ تھا، وہاں عدالتی کارروائی کا مرحلہ مزید پیچیدہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلوں سے قصاص لینے کی ذمہ داری ہرگز نہیں بھولے تھے مگر یہ کام مشکل اس لحاظ سے تھا کہ:

❶ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں سے کچھ موقعۂ واردات پر مارے گئے تھے۔[2] باقی مجرم جو شام اور مصر کے تھے، واردات کر کے کسی نامعلوم سمت فرار ہوگئے تھے۔[3] اب قاتلوں میں سے کوئی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقے میں نہ تھا کہ اسے فوراً گرفتار کر کے شناخت کے لیے پیش کیا جاسکتا۔

❷ قاتلوں کی شناخت، گرفتاری اور سزا کے اجراء کے لیے شرعی گواہی مطلوب تھی۔ قتل کی چشم دید گواہی اُن کی اہلیہ حضرت نائلہ دے سکتی تھیں یا ان کے غلام۔ کیوں کہ شہادت کے وقت یہی افراد موقع پر موجود تھے۔ مگر غلام تو لڑتے لڑتے اپنے آقا پر قربان ہوگئے تھے اور حضرت نائلہ حملے کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اوندھی گر گئی تھیں، لہٰذا وہ مہلک وار کرنے والوں کی نشاندہی سے قاصر تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ان سے قاتلوں کے بارے میں پوچھ گچھ

---

① سنن ابی داؤد، ح: ۳۵۸۹، کتاب الاقضیۃ، باب القاضی یقضی وھو غضبان

② تاریخ الطبری: ۳/۳۹۱ ③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱ بسند حسن، ط الرشد

کی تو انہوں نے ان کے یقینی تعین سے معذوری ظاہر کی۔ فقط اتنا بتایا کہ ''محمد بن ابی بکر قاتلوں کو ساتھ لائے تھے۔''[1]

یہی شاہدین میں ایک ام المؤمنین حضرت صَفِیَہ رضی اللہ عنہا کے غلام کنانہ شامل تھے، مگر ان کا بیان صرف یہ ظاہر کرتا تھا کہ قاتل محمد بن ابی بکر نہیں، ایک سیاہ فام مصری شخص تھا، جس کا نام حمار تھا۔[2]

اس بیان سے جہاں محمد بن ابی بکر کی برأت ثابت ہوتی تھی وہیں اصل قاتل مزید مبہم ہو جاتا تھا، کیوں کہ حمار نامی شخص وہاں کوئی نہ تھا۔ جو نام لیے جا رہے تھے وہ مشہور تو ہو گئے تھے مگر ان افراد کے بارے میں شرعی گواہی ناپید تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل نقاب پہن کر اندر آئے ہوں، اسی لیے شناخت مشکل ہو رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حمار وغیرہ علامتی نام ہوں، اصل نام کچھ اور ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاتلوں نے نام دوسرے لوگوں کے ناموں پر رکھ لیے ہوں تا کہ واردات کے بعد اُن بے گناہوں ہی سے پوچھ گچھ ہو اور کوئی سراہاتھ نہ آئے۔

❸ زمانہ رسالت سے اسلامی سیاست کا اصول یہ چلا آرہا تھا کہ مجرم پر کتنا ہی شک کیوں نہ ہو اسے تشدد کے ذریعے جرم قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے نہ ماورائے عدالت انتقام و سزا کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے، اگرچہ اس اصول کی پاسداری کے باعث خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین سے اور بعد میں صحابہ کرام کو غداروں کے ہاتھوں بہت سے صدمات سہنا پڑے، مگر قانونِ شریعت کی بالادستی کو ریاستی مفادات پر ہمیشہ ترجیح دی گئی۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تو تشدد کر کے کچھ مشکوک لوگوں سے اقرارِ جرم کرا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے شرع کی پاسداری کرتے ہوئے یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ یہ دورِ صحابہ کی اسلامی سیاست کا ایک طرۂ امتیاز ہے جس میں کسی اور آئین کو ماننے والی کوئی تہذیب شاید ہی ہمسری کر سکے۔

❹ مدینہ فوجی چھاؤنی بننے کے لیے موزوں نہ تھا لہٰذا یہاں فوج نہیں رکھی جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ دارِ عثمان کے محاصرے کے وقت دفاع کے لیے چند سو سے زائد مسلح افراد نہ تھے اور اب بھی ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان چند سو افراد کے ساتھ مدینہ میں یقیناً ایسی قوت حاصل نہ تھی کہ وہ قاتلینِ عثمان کا فتنہ فرو کر سکتے۔

❺ اگر بالفرض حضرت علی رضی اللہ عنہ دو چار افراد کو پکڑ کر قصاصاً قتل کر بھی دیتے تو عبث تھا کیوں کہ قصاص کا مطالبہ کرنے والے مسلمان محاصرے میں شریک سبھی افراد کو قابلِ سزا تصور کرتے تھے، اتنی کارروائی پر قطعاً مطمئن نہ ہوتے۔

انتظامی و سیاسی مشکلات:

اس قسم کی کارروائی انتظامی و سیاسی لحاظ سے بھی مشکل تھی۔ ایسی کسی فوری کارروائی سے چار بڑے نقصان ہوتے:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں قتلِ عمد اور بغاوت سے مرکب یہ قضیہ ایک قابلِ غور اور نازک مسئلہ تھا۔ اس میں دلائلِ شرعیہ کی مزید تحقیق اور اُمت کے اہلِ فتویٰ کے اجماع کی ضرورت تھی۔ اگر بلا تامل سب باغیوں کو قتل کر دیا

[1] تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۴۶۰، ت تدمری، عن سعید بن المسیب۔ یہ ایک طویل، مشہور مگر ضعیف روایت کا ایسا ٹکڑا ہے جو طعنِ صحابہ سے محفوظ ہونے کے باعث ہم نے لے لیا ہے ورنہ اس روایت کے بہت سے ٹکڑے طعنِ صحابہ سے آلودہ اور ثقات کی روایات سے تصادم کے باعث قابلِ قبول نہیں۔ اس روایت کے مشکوک ٹکڑوں پر ہم آخر میں ''شبہات کے ازالے'' کے تحت تفصیل سے بات کریں گے۔

[2] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۵

جاتا تو شرعی حدود سے تجاوز کا خطرہ تھا۔

④ وہ لوگ جو ابھی بیعت کر کے بمشکل پر امن ہوئے تھے، عصبیت کے جوش میں آ کر اپنے ان مجرم ساتھیوں پر سزا کے اجراء میں رکاوٹ ڈالتے جس سے کشیدگی بڑھتی اور ملکی امن وامان سخت متاثر ہوتا۔

③ اس وقت سابق باغیوں میں سے اَشتَر نخعی کا کوفہ میں، حکیم بن جَبَلہ کا بصرہ میں اور محمد بن ابوحذیفہ کا مصر میں بہت اثر ورسوخ تھا۔ ان میں سے بعض سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر کے اپنے علاقوں کو لوٹ گئے تھے، ان پر قابو پانا یا میدانِ سیاست سے انہیں بے دخل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اس کوشش میں خود مسندِ خلافت بھی الٹ سکتی تھی اور پورا عالم اسلام ایک نئے بحران کی زد میں آ سکتا تھا۔

④ جلد قصاص لیا جاتا تو دوسروں کے آلۂ کار بن کر ہتھیار اٹھانے والے چند افراد عدالتی کاروائی کی زد میں ضرور جاتے مگر فتنہ پھیلانے والے اصل مجرم مزید زیرِ زمین چلے جاتے اور بعد میں کسی اور شکل میں فساد پھیلاتے۔

غرض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص میں جلد بازی سے کام لینا نہ صرف شرعی وقانونی احتیاط کے خلاف اور انتظامی و سیاسی لحاظ سے خطرناک تھا بلکہ ایسا کرنا خود شہید مظلوم کے مقصد اور ہدف کے خلاف ہوتا، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ قصاص ایسے وقت اور ایسے ماحول میں لیا جائے جب اصل مجرموں کے روپوش ہونے کی گنجائش ہو نہ سرکاری وعدالتی فیصلے کے سامنے کسی کو انکار کی جرأت۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ انسانی نفسیات سے خوب اچھی طرح واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ ایسی تحریکوں، انقلابات اور جوش وخروش کے بے ہدف مظاہروں کا ابال وقتی ہوتا ہے۔ اس دوران اگر دوسرا فریق جذباتی رویے میں حکمت کے خلاف کوئی اقدام کر گزرے تو فتنہ پرور عناصر اس اقدام کو نیا بہانہ بنا کر مزید شر پھیلانے لگتے ہیں۔ لیکن اگر مصلحت سے کام لے کر مناسب وقت کا انتظار کیا جائے تو نادان عوام کا وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور کھوکھلے نعروں پر جمع ہونے والے منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالتِ اجتماع کے بجائے حالتِ انتشار کا انتظار کر کے اُن پر ہاتھ ڈالنا آسان بھی ہوتا ہے اور اس میں بقائے امنِ عامہ کی ضمانت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

قصاصِ عثمان کے متعلق صحابہ کرام کے چار طبقے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تدبر اور تحمل میں اس وقت وہی حالت تھی جو وفاتِ نبوی پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی۔ باقی سب جذبات سے بے حال تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ٹھوس چٹان کی مانند اٹل تھے۔ وہ جذبات سے بالاتر ہو کر شریعت اور عقل وتدبیر کی باگ تھامے ہوئے تھے، ان کی حکمتِ عملی باریک بینی اور دوراندیشی پر مبنی تھی۔ دیگر حضرات کا ردِعمل جذبات کی شدت کا تھا، اس لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی کو سمجھ نہ پائے۔

پھر ان میں سے ایک طبقے نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات مان لی، ایک طبقے نے بیعت کر کے عزلت نشینی اختیار کر لی، ایک نے بیعت کے باوجود انصاف کے لیے مسلح راستہ اختیار کر لیا اور ایک نے بیعت کو ملتوی کر دیا۔ اس طرح صحابہ کرام کے چار طبقات بن گئے۔ ہر ایک امت کا خیر خواہ اور مخلص تھا۔ کسی کے پیشِ نظر ذاتی مفادات نہ تھے۔

❶ پہلا طبقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی پالیسی سے مکمل اتفاق کرنے والے حضرات کا تھا، جو قصاص لینے کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے مگر اس سے پہلے مسئلہ قصاص کی پوری تحقیق، حکومت کے استحکام اور مسلمانوں کے یکجا ہونے کو لازمی قرار دیتے تھے۔ ان میں حضرت عمار بن یاسر، حضرت عثمان بن حُنَیف، حضرت سہل بن حُنَیف، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسن، حضرت حسین، اور حضرت قَعقاع بن عمرو، رضی اللہ عنہم جیسے اکابر شامل تھے۔

❷ دوسرا طبقہ ان حضرات کا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکے تھے مگر ان کی رائے یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر تمام باغیوں سے قصاص لینا چاہیے۔ اور اگر وہ اس میں معذور ہیں تو ہم خود ان مجرموں سے انتقام لیں گے۔ یہ حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا خیال تھا۔

❸ تیسرے طبقے کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص بیعت سے بھی مقدم تھا۔ ان کے نزدیک تمام باغیوں سے قصاص لیے بغیر حضرت علی رضی اللہ عنہ، کی اپنی پوزیشن مشکوک تھی۔ اس لیے ان کا مطالبہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص لیں گے تو ان سے بیعت کی جائے گی، ورنہ نہیں۔ یہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور اہلِ شام کی رائے تھی۔

❹ چوتھا طبقہ وہ تھا جس نے مسلمانوں کے باہمی سیاسی جھگڑوں اور مناقشوں سے یکسور ہنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو تکلیف دینے کی نوبت نہ آئے۔ عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما، نیز حضرت عبداللہ بن عمر اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سمیت بکثرت اصحاب یہی رائے رکھتے تھے۔[1]

ان حضرات کے سامنے فتنوں سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث تھیں جن میں ایسے حالات میں خاموشی اور علیحدگی اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ جیسے نامور شمشیر زن ان دنوں اپنی تلوار توڑ کر مدینہ سے دور ''رَبذہ'' کے دیہات میں خیمہ لگا کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اگر کوئی انہیں کہتا کہ لوگوں کو جا کر سمجھائیں بجھائیں تو فرماتے: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا تھا کہ جب افتراق، فتنے اور اختلاف کا وقت ہو تو اپنی تلوار کو توڑ دینا، تیر توڑ دینا، کمان کی تانت کاٹ دینا اور گھر میں بیٹھ جانا، میں نے ایسا ہی کیا ہے۔''[2]

---

① ان کے علاوہ حضرت صہیب رومی، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت حسان بن ثابت، حضرت بُریدہ بن حُصَیب، حضرت ولید بن عقبہ، حضرت جَریر بن عبداللہ، سلمہ بن اَکوَع، حضرت کعب بن مالک، حضرت مَسلمہ بن مُخَلَّد، حضرت مُعاویہ بن خَدیج، حضرت ابوسعید خدری، حضرت محمد بن مَسلمہ، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت زید بن ثابت، حضرت رافع بن خَدیج، حضرت فضالہ بن عبید، حضرت ابوثعلبہ اور حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہم سیاسی مناقشوں سے الگ ہو گئے اور ان میں سے اکثر حضرات آخری عمر تک اسی پر عمل پیرا رہے مگر سیاست سے یکسوئی کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے بیعت بھی نہیں کی تھی۔ صحیح روایات کے مطابق الگ رہنے والے اکثر مہاجرین وانصار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکے تھے۔ البتہ ان میں سے کچھ نے عملاً ان کی نصرت نہیں کی تھی۔ (العواصم من القواصم، ص ۱۵۰) کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے بیعت ہی نہیں کی تھی۔

مگر اس کے ساتھ کتب حدیث کی متعدد روایات شاہد ہیں کہ بیعت یا نصرت میں توقف کرنے والے جلیل القدر حضرات نے بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے ہی کو درست قرار دیا اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بعد میں فرماتے تھے: واللّٰہ انہ لرای رایتہ واخطا رایی ''اللہ کی قسم! یہ ایک رائے تھی جو میں نے اختیار کی مگر مجھ سے خطا ہو گئی۔'' (مستدرک حاکم، روایت نمبر: ۴۶۰۱) اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بھی اپنے توقف کو غلط سمجھ کر آخری عمر میں اس پر انتہائی افسوس کرنا ثابت ہے۔ ما آسیٰ علی شیئی الا انی لم اقاتل مع علی رضی اللہ عنہ الفئۃ الباغیۃ. (مستدرک حاکم، ح: ۶۳۶۰)

② مسند احمد، ح: ۱۶۰۲۹

چونکہ کتب تاریخ میں غیر سیاسی لوگ عموماً مذکور نہیں ہوتے، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد تاریخ میں اکابر صحابہ کے اس طبقے کا ذکر کمیاب ہو گیا حالاں کہ یہ حضرات اس کے بعد برسوں حیات رہے۔ ان کا وقت زیادہ تر علمی مصروفیات، ذکر و عبادت اور دینی خدمات میں گزرتا تھا۔ اسی لیے ذخیرۂ حدیث وفقہ میں ان کا نام زندہ رہا۔ یہی مشیتِ الٰہیہ تھی کہ ایک جماعت شریعت کو محفوظ رکھنے کے لیے وقف رہے اور یہ سلسلہ تا قیامت چلتا رہے۔

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی بے چینی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

مدینہ کے اکابر صحابہ خصوصاً حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکنے کے باوجود مسئلہ قصاص میں ان کے تأمل اور توقف سے سخت پریشان تھے۔ وہ ان کی مجبوریوں کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آخر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور باغیوں کو کھلی چھوٹ ملی رہنے پر تشویش کا اظہار کیا۔ امیر المؤمنین نے حکیمانہ انداز میں فرمایا: ''دیکھو! یہ وہی ہیں جن کے ساتھ لوگوں کے غلام اور دیہاتی بھی شامل ہوئے اور انہوں نے تم کو جیسے چاہا دق کر کے رکھا، تو بتاؤ جس بات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، اس پر کچھ قدرت بھی موجود پاتے ہو؟''

دونوں حضرات نے نفی میں جواب دیا تو امیر المؤمنین نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

''اللہ کی قسم! مجھے اس کا ایک حل دکھائی دیتا ہے، جسے تم ان شاء اللہ جان لوگے۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے اشارہ دیتے ہوئے فرمایا: ''اس قصاص والی بات کو اگر ابھی چھیڑا گیا تو لوگ تین طبقوں میں بٹ جائیں گے۔ کچھ لوگ تمہاری رائے کے مطابق ہوں گے، کچھ مخالف ہو جائیں گے اور کچھ نہ تمہارا ساتھ دیں گے نہ مخالفین کا۔ لوگوں کو ٹھنڈا ہونے دو اور دلوں کو قرار آنے دو۔''[1]

مطلب یہ تھا کہ ابھی ہنگامی حالات ہیں، لوگوں کے کان نت نئی خبروں پر لگے ہوئے ہیں، ایسے میں کوئی بھی قدم اُٹھایا گیا تو اہلِ فتنہ پہلے کی طرح افواہوں، پروپیگنڈے اور ملمع کاری کے ذریعے فساد کی آگ بھڑکا دیں گے، حالات معمول پر ہوں تو فتنہ انگیزی اتنی آسان نہیں ہوگی۔ تاریخ گواہ ہے کہ امیر المؤمنین کا یہ خدشہ حرف بحرف درست نکلا۔

بلوائیوں اور موالیوں کا مدینہ سے اخراج:

مدینہ منورہ میں جمع ہونے والے مفسدین میں خاصی تعداد اُن سادہ لوح گنواروں، جاہلوں اور غلاموں کی تھی جو فساد مچانے اور لوٹ مار میں حصہ ملنے کی امید پر مدینہ آگئے تھے۔ حالات کو معمول پر لانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں فوراً مدینہ سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ آپ نے ان پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی، تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنی جتھہ بندی توڑ دیں چنانچہ ان کی ایک بڑی تعداد اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ گئی۔ کوفہ، بصرہ اور مصر کے باغی بھی اکثر واپس چلے گئے، صرف سبائیوں کا ایک جتھا مدینہ میں رہ گیا جو حبِ سادات کا خصوصی دعوے دار تھا۔[2]

---

① تاریخ الطبری: ۴۳۷/۴ عن سیف

② تاریخ الطبری: ۴۳۸/۴ عن سیف

حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کا عراق سے فوج بلوانے کا مشورہ:

انہی ایام میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اور مشورے بھی ہوئے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بصرہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کوفہ جانے کی اجازت مانگی تاکہ وہاں سے افواج لاکر مسندِ خلافت کے پایے مضبوط اور اہلِ فتنہ کو مرعوب کیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجازت دی نہ انکار کیا۔ بس اتنا فرمایا: ''سوچ کر بتاؤں گا۔''[1]

دراصل کوفہ اور بصرہ سے وقتی طور پر فوج طلب کرنا آپ رضی اللہ عنہ کے نزدیک مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اگر مدینہ منورہ میں مستقل فوج رکھی جاتی تو یہ شہر چھاؤنی بن جاتا۔ اس طرح اہلِ مدینہ کو فوج کی ضروریات اور سہولیات کے لیے بہت سی پابندیوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے شامی فوج کو مدینہ میں متعین کرنے کی تجویز مسترد کردی تھی اور یہی حقیقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی تھی۔

عراق منتقل ہونے کا فیصلہ کیوں کیا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مدینہ میں فوج رکھنے کے بجائے کسی فوجی مرکز کی طرف کوچ کرکے اُسی کو دارالخلافہ بنانا مناسب ہے۔ اس کے لیے موزوں ترین جگہ عراق تھی جہاں دو مراکز: بصرہ اور کوفہ قریب قریب تھے۔

عراق منتقل ہونے کا فیصلہ کرنے میں یہ خیال بھی کارفرما تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش جیسی کوئی احتجاجی تحریک اگر آیندہ پھوٹی اور اس کا مظاہرہ مدینہ میں ہوا تو اس مقدس شہر کی حرمت کہیں دوبارہ پامال نہ ہو۔ اس شہر کے تقدس، احترام اور اعزاز کا تقاضا یہ تھا کہ اسے مکمل طور پر ایک ''مذہبی مرکز'' رہنے دیا جائے اور اسے سیاسی معاملات سے جو کبھی بھی جنگ وجدل کی صورت اختیار کرسکتے ہیں، الگ کردیا جائے۔

اس فیصلے میں یہ حکمت بھی تھی کہ دور دراز کے محاذوں پر اسلامی لشکروں کی تشکیلات اور ان سے رابطے میں آسانی رہتی۔ ایک عالمگیر خلافت کے سیاسی ڈھانچے اور نظم ونسق کی ترقی کے لیے یقیناً یہ زیادہ مفید تھا کہ مدینہ جیسے صحرائی اور الگ تھلگ مقام کے بجائے کوفہ جیسا عسکری، سیاسی اور اقتصادی مقام مرکز قرار پائے۔ مگر کوفہ منتقل ہونے کا ارادہ ظاہر کرنے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ مناسب موقع کا انتظار کررہے تھے۔[2]

---

① تاریخ الطبری: ۴۳۸/۴ عن سیف

② امکان تو مانا جاسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ لے جانے میں کوئی امراء مثلاً اشتر نخعی اور سبائیوں کے مشورے کا دخل بھی ہو مگر راقم کو اس کے ثبوت میں کوئی صحیح روایت نہیں ملی۔ صرف ایک ضعیف روایت ہے جس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہیں:

لقد كنت نهيتك عن هذا المسير، فغلبك على رأيك فلان وفلان.

''میں نے آپ کو اس سفر سے منع کیا تھا مگر آپ کی رائے پر فلاں اور فلاں غالب آگئے۔'' (مستدرک حاکم، ح: ۴۵۵۷)

مگر اس روایت میں صحابہ پر متعدد طعن ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تعلیق میں اس کے راوی بشار بن موسیٰ کو ''واہ'' قرار دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمت ودانائی کسی دلیل کی محتاج نہیں، سبائیوں کے مختصر سے گروہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ سینکڑوں جلیل القدر صحابہ وتابعین کو اشاروں پر چلانا بھی ایک ناقابلِ یقین بات ہے۔ کوفہ جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ جارہے تھے، وہاں سبائی گروہ کے لوگ ضرور تھے مگر اقلیت میں۔ ایک ڈیڑھ صدی تک کوفہ صحابہ اور تابعین کا مرکز رہا۔ فقہ حنفی کوفہ میں مدون ہوئی۔ اہل کوفہ کی تعریف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مکتوب میں بھی ملتی ہے جو آگے متن میں نقل کیا جائے گا جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے وہاں جارہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغیوں کو مناصب کیوں دیے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جو لوگ مدینہ میں فساد مچانے میں ملوث رہے تھے، کسی اور شورش کا حصہ نہ بنے پائیں۔ اس کا طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ انہیں قومی دھارے میں منسلک رکھا جاتا، شرعی گنجائش کی حد تک ان کے ماضی سے چشم پوشی کی جاتی، انہیں مہمات میں شریک کیا جاتا اور ذمہ داریاں سونپ کر ان پر اظہارِ اعتماد کیا جاتا۔ ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اگلی ہر مہم میں یہ تدبیر کارفرما رہنے کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو معزول کیوں کیا؟

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک اور اہم مسئلہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے دور کے حکام کو معزول کرنے یا برقرار رکھنے کا تھا۔ اس بارے میں حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''آپ حضرت مُعاویہ، حضرت عبداللہ بن عامر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے باقی گورنروں کو ان کے عہدوں پر باقی رہنے دیں۔ جب ان کی اور ان کی افواج کی طرف سے بیعت کا عہد و پیمان ہو جائے تو پھر آپ چاہیں تو ان کو تبدیل کریں، چاہیں تو باقی رکھیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اب بھی انکار کیا نہ اقرار۔ اتنا فرمایا: ''سوچوں گا۔''

بعد میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی مشورہ دیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قبول نہ کیا۔ [1]

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کا مشورہ اپنی جگہ بالکل درست اور مصلحت کے مطابق تھا کیوں کہ کسی ادارے میں ایسا نہیں ہوتا کہ نیا سربراہ آتے ہی سابقہ تمام اعلیٰ افسران کو معزول کر دے۔ اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ حالات و واقعات کے پس منظر پر غور کیا جائے تو اس فیصلے کی درج ذیل وجوہ سمجھ آتی ہیں:

① ہر حکومت کی طرح خلافتِ راشدہ کو قائم رکھنے کے لیے بھی اس وقت افرادی قوت اور عوامی اعتماد کی ضرورت تھی۔ خصوصاً ان لوگوں کا بھروسہ قائم رکھنا بہت ضروری تھا جو پہلی بار بنو ہاشم کا اقتدار قائم ہونے پر خوش تھے۔ ان میں سے کچھ سردار ایسے بھی تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گورنروں سے عہدے چھین کر خود حاصل کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ یہ گورنر ان کی حرصِ مال و جاہ کی تکمیل میں رکاوٹ بنتے آرہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی چالوں کو سمجھتے تھے مگر انہیں آگاہی کا تاثر نہیں دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک درمیانی راہ اختیار کی وہ یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عاملین کو معزول کر کے ان کی جگہ دوسرے صحابہ کا تقرر فرما دیا۔ اس طرح یہ قبائلی سردار بھی ایک حد تک مطمئن ہو گئے کہ ان کی بات مانی جا رہی ہے۔ دوسری طرف حکومتی نظام صحابہ ہی کے ہاتھوں میں رہا اور اعلیٰ عہدوں پر دیانت دار افراد ہی فائز رہے۔ [2]

---

① تاریخ الطبری: ۴۳۸/۴ عن سیف ــ مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد غیر جانب دار ہو کر اپنے وطن طائف چلے گئے۔ واقعہ تحکیم کے بعد وہ شام پہنچ اور وہاں کی حکومت میں شامل ہو گئے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۳۵۸/۱۱، تر: قیس بن سعد رضی اللہ عنہ ، سیر اعلام النبلاء: ۲۹/۳، تر: مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ)

② حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو چند ماہ تک برقرار رکھا۔ (انساب الاشراف: ۲۳۰/۲) جنگ جمل سے پہلے وہاں قرظہ بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کو گورنر بنا دیا۔ جنگ صفین سے قبل یہ ذمہ داری ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو سونپ دی۔ (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیے پر)

③ آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گورنروں سے خدشہ تھا کہ وہ سابق خلیفہ سے غیر معمولی محبت اور ان کی مظلومانہ شہادت پر نا قابلِ تحمل رنج وغم کی وجہ سے کہیں کوئی جذباتی فیصلہ یا عاجلانہ اقدام نہ کر بیٹھیں، جس کے نتیجے میں شرعی حدود سے تجاوز ہو جائے، یا کچھ آلۂ کار بننے والے مجرم تو مارے جائیں مگر اصل مجرم مزید پس پردہ چلے جائیں۔

④ شرپسندوں نے جھوٹی شہادتیں دے کر یہ مشہور کر دیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پورا حصہ ہے۔ مختلف صوبوں کے گورنر جو جائے واردات سے بہت دور تھے، ان افواہوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔[1] ایسے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ سابقہ حکومت کے گورنروں کا مرکز پر اعتماد بحال نہیں ہو سکے گا اور حکومت چلانا محال ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے شام اور عراق کے تمام موجودہ گورنروں کی برطرفی کے احکام جاری کر کے ان لوگوں کا تقرر کر دیا جنہیں آپ پر اعتماد تھا۔ اس میں سابقہ گورنروں کی جانچ بھی تھی کہ وہ آپ کے وفادار ہیں یا نہیں۔ اگر وہ جانچ میں پورے اترتے تو انہیں متبادل ذمہ داریاں دی جا سکتی تھیں۔

مگر آپ کا اندیشہ درست نکلا۔ گورنروں کی برطرفی کے احکام پہنچنے سے پہلے ہی شام، مصر اور عراق میں افواہوں کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ یقین کر چکے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کے سرپرست اور قائد ہیں اور مدینہ میں برپا ہونے والی شورش انہی کے ایماء پر تھی۔ ان دنوں افواہوں کا زور کتنا تھا، اس کا اندازہ صرف اس سے لگائیے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جو مکہ میں تھیں، ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کرنے والے مصر کے لوگوں کو قتل کروا دیا ہے (جبکہ حقیقت بالکل برعکس تھی) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس خبر سے بڑی حیران ہوئیں۔ تاہم کچھ دیر بعد انہیں دوسرے ذرائع سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع مل گئی۔ تب ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''عجیب آدمی ہے، مقتول پر قاتل ہونے کا الزام لگاتا ہے۔''[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) — مکہ میں خالد بن العاص رضی اللہ عنہ کی جگہ پہلے ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ اور پھر قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کو تعینات کیا۔ یمن میں ثمامہ بن عدی رضی اللہ عنہ کی جگہ عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا۔ بصرہ سے عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، جنگ جمل کے بعد عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ عہدہ سونپ دیا۔ (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۰، ۲۰۱)

قرشی صحابہ کی جگہ آپ نے دوسرے صحابہ کو عہدے دے کر ایک موزوں تدبیر اپنائی جو اتنی کامیاب تھی کہ مال وجاہ کے حریص اور مفسدین ششدر رہ گئے۔ اشتر نخعی کو امید تھی کہ کم از کم بصرہ کی گورنری اسے مل جائے گی مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہاں بھی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو تعینات کیا تو اشتر نخعی بھری مجلس میں ایک تلخ کراہت کے ساتھ بولا: فلا ندری علام قتلنا الشیخ بالمدینۃ؟ ''تو پھر پتا نہیں ہم نے کس لیے اس بزرگ کو مدینہ میں مار ڈالا؟'' (مصنف ابن ابی شیبہ ح: ۳۷۷۵۷ ط الرشد) مطلب یہ کہ ہمارے گروہ نے ناحق گناہ سر لیا اور ہاتھ کچھ نہ آیا۔

(حاشیہ صفحہ موجودہ)

① تاریخ الطبری: ۴/۴۴۲ عن سیف۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ان طوائف شهدوا عليه بالزور عند اهل الشام انه شارك في دم عثمان. ''کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اہل شام کے سامنے جھوٹی شہادت دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھے۔'' (منہاج السنۃ: ۴/۴۰۶) بعض روایات کے مطابق ان شرپسندوں میں حجاج بن خزیمہ نامی شخص پیش پیش تھا جس نے مصر سے شام جا کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مرثیہ پڑھا: ان بنی عمک عبد المطلب هم قتلوا شيخكم بغير الكذب. (بے شک تمہارے چچازاد بھائیوں عبد المطلب کی اولاد نے تمہارے بزرگ کو قتل کیا ہے۔ اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں۔ (الاخبار الطوال، ص ۱۵۵)

② تاریخ الطبری: ۴/۴۵۹ عن عمرو بن شبہ و سیف بن عمر

سازشی گروہ کی چال کامیاب:

افواہیں پھیلانے والے وہی لوگ تھے جنہیں اسلام اور مسلمانوں کے افتراق ہی میں اپنی کامیابی نظر آتی تھی۔[1] وہ بات کو بڑھا کر مسلمانوں میں خانہ جنگی کرانا اور خلافت کو دولخت کرنا چاہتے تھے۔ اب تک اکابر صحابہ نے ایسی ہر چال کو ناکام بنادیا تھا اور اُمت کسی بڑے نقصان سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے ذریعے سازشی عناصر کو ایک ایسا بہانہ ہاتھ آگیا جس کے متعلق اشتعال انگیز افواہیں پھیلا کر وہ مسلمانوں کو لڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ عراق، شام اور مصر کے صحابہ وتابعین اپنے مقام اور مرتبے کے باوجود عالم الغیب نہیں تھے کہ دور بیٹھے ہر جگہ کے حقائق سے آگاہ ہوسکتے۔ چنانچہ وہاں شکوک وشبہات کی فضا قائم ہوگئی اور رائے یہ بن گئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے باوجود ان پر اعتماد اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک وہ قتلِ عثمان سے اپنی برأت کا ثبوت پیش نہ کریں اور یہ ثبوت صرف اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ وہ جلد از جلد تمام باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچائیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے حکام کو شام اور کوفہ سے ناکام واپس آنا پڑا جبکہ مصر کے نئے گورنر حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو کچھ مشکل کے بعد وہاں ذمہ داریاں انجام دینے کا موقع ملا کیوں کہ کچھ لوگ ان کے حامی تھے اور کچھ مخالف۔ حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ نے کسی رکاوٹ کے بغیر بصرہ پہنچ کر حکومت سنبھال لی، مگر عوامی آراء یہاں بھی متضاد تھیں۔[2]

حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گفتگو اور سفرِ عمرہ کی اجازت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بلایا اور فرمایا:

''میں جس بات کا اندیشہ ظاہر کررہا تھا وہ سامنے آگئی۔ فتنے کی مثال آگ کی سی ہے، جتنا بھڑکاؤ بھڑکتی ہے۔''

مطلب یہ تھا کہ مرکز سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کا جو خدشہ تھا، وہ حقیقت بن گیا ہے۔ ایسے میں قصاص لینے کی کوئی عاجلانہ کارروائی کی گئی تو یہ فتنے کی آگ کو مزید بھڑکانے کے مترادف ہوگا۔ مگر حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما مطمئن نہ ہوسکے اور آپ سے اس مسئلے کو اپنے طور پر حل کرنے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جب تک ممکن ہوگا میں اس بارے میں تحمل اختیار کروں گا۔ ہاں کوئی چارہ نہ ہوا تو داغنا آخری علاج ہے۔''[3]

آخر میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے سفرِ عمرہ کی اجازت طلب کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں نہ روکا۔[4]

---

① قرائن بتاتے ہیں کہ سازشی عناصر شام میں بھی سرگرم تھے اور شاید ابن سبا شام میں ذرا مختلف شکل کا نیٹ ورک قائم کرگیا تھا۔ اسی قسم کے سازشی اور فسادی لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جھوٹے اتہامات کو یقینی درجہ دے کر مشہور کیا اور اہلِ شام کو ان پر اعتماد سے روک کر متحارب بنادیا۔

② تاریخ الطبری: ۴/۴۴۲ عن سیف

③ تاریخ الطبری: ۴/۴۴۳ عن سیف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ شرعی آئین میں جہاں تک لچک ہوگی، دی جائے گی مگر جہاں شرعی گنجائش ختم ہوجائے گی وہاں ریاستی قوت استعمال کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔

④ تاریخ الطبری: ۴/۴۴۳ عن سیف



اہلِ شام سے بیعت لینے کی ایک اور کوشش:

اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاصد بھیج کر اہلِ شام سے بیعت لینے کی ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے جواب میں جو لفافہ بھیجا اس میں سادہ کاغذ تھا، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ کسی معاملے میں پہل نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے قاصد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ اہلِ شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ قاصد کے الفاظ تھے: ''میں ساٹھ ہزار افراد کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خون آلود قمیص کے پاس روتا چھوڑ آیا ہوں، جو شہید کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''①

قاصد کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ شام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتلینِ عثمان کا سرپرست ہونے کی افواہ یقین کا درجہ حاصل کر چکی ہے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس گھناؤنے جرم سے اپنی برأت ظاہر کی اور فرمایا: ''الٰہی! میں تیرے سامنے عثمان کے خون سے اپنی برأت ظاہر کرتا ہوں۔''②

مگر شام والوں کی تسلی نہ ہوئی۔ وہاں ایک جذباتی کیفیت طاری تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون آلود کرتا اور حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کی کٹی ہوئی انگلیاں جامع مسجد دِمَشق میں آویزاں تھیں اور لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لیے تلواریں تیز کر رہے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پورے اخلاص اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ قاتلینِ عثمان سے بدلہ لیے بغیر اُمت اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ وہ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری زیادہ محسوس کرتے تھے ایک تو اس لیے کہ وہ شہیدِ مظلوم کے قریبی رشتہ دار اور بنو امیہ کے خاندانی رئیس تھے۔ دوسرے اس لیے کہ اپنے پاس موجود قوت وشوکت کے ہوتے ہوئے وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص نہیں لے رہے تو جن مسلمانوں کو عسکری وسیاسی قوت حاصل ہے، انہیں چاہیے کہ وہ اس کام کا ذمہ اٹھائیں۔③

کچھ ایسے ہی حالات مکہ مکرمہ میں تھے، جہاں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما پہنچ چکے تھے اور پورے درد دل کے ساتھ قاتلینِ عثمان سے نمٹنے کے لیے مشورے کر رہے تھے۔ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سکوت اور تأمل پر مبنی تدبیر سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جتنی دیر ہوتی جائے گی، مجرم ہاتھ سے نکلتے چلے جائیں گے۔ افواہیں پھیلانے والوں نے ان حضرات کے سامنے یہ افواہ بھی اڑائی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر رضامند تھے۔④ ایسی حالت میں ان حضرات کے لیے قصاص کا قضیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چھوڑنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

① تاریخ الطبری: ۴/۴۴۳، ۴۴۴　② تاریخ الطبری: ۴/۴۴۴ عن سیف

③ بعض حضرات شیعہ راوی سُلیم بن قیس کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بڑے صاحبزادے ابان بن عثمان بھی اہلِ شام کے ساتھ تھے۔ (کتاب سُلیم بن قیس الہلالی: ۷۳۸) اس حوالے کو ضرور تار روافض پر الزامی حجت کے طور پر تو پیش کیا جا سکتا ہے مگر خود سلیم بن قیس اور اس کی کتاب کی کوئی حیثیت نہیں۔ روافض سُلیم بن قیس کو پہلی صدی ہجری کے نامور ترین تابعی کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کی کتاب کو پہلی اسلامی کتاب گردانتے ہیں حالانکہ سُلیم بن قیس ہلالی نامی کسی شخص کا ذکر تابعین بلکہ تبع تابعین میں بھی نہیں ملتا۔ اس کی کتاب بھی روافض نے یقیناً بہت بعد میں گھڑی ہے، جس کی دلیل اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ پر کھلم کھلا تبرا ہے جو شیعوں میں تیسری چوتھی صدی ہجری میں عام ہوا تھا۔ پہلی صدی ہجری میں گنے چنے سبائی بھی خفیہ طور پر ایسا کرتے تھے۔

④ ان بعض الناس صوّر لهما ان عليا كان راضيا بقتل عثمان. (الاعتقاد للبيهقي، ص ۳۷۱)

ان حضرات کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت پر ایسا شدید صدمہ تھا جس کی تاب لانا پہاڑوں کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرے کے وقت یہ ان کی کماحقہٗ نصرت نہیں کر پائے تھے۔ شاید اس وقت حالات کے تلاطم میں انہیں کوئی فیصلہ کرنا مشکل لگ رہا تھا اور خاص کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہاتھ روکنے کی تاکید کے بعد انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ مگر اب انہیں سخت قلق تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''ہم عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں (باغیوں کے خلاف) سکوت سے کام لیتے رہے، مگر اب ضروری ہے کہ ہم سختی اختیار کریں۔''[1] کبھی فرماتے تھے: ''عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں تلافی کا ذریعہ اس کے سوا کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ان کے قصاص کی کوشش میں میرا خون بہہ جائے۔''[2]

کبھی کہتے: ''الٰہی! کیا میرے بدن کا سارا لہو، عثمان کے ایک قطرۂ خوں کا بدلہ بن سکے گا۔''[3]

یہی کیفیت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تھی جنہیں حج سے واپسی پر مدینہ جاتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی تھی، وہ مکہ لوٹ آئی تھیں، وہ اس حادثے سے سخت کبیدہ خاطر تھیں۔ وہ حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی فکر وتدبیر میں شریک ہوگئیں اور مسجد الحرام کے صحن میں پردہ لگوا کر مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کیا، جس میں قاتلینِ عثمان پر شدید تنقید کرتے ہوئے فرمایا:

''جب ان لوگوں کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی بہانہ اور دلیل نہ رہی تو کھل کر ظلم وستم پر اتر آئے اور عثمان رضی اللہ عنہ کا خون بہا دیا، حرم مدینہ کی حرمت پامال کی، ناجائز لوٹ مار کی، ذی الحجہ کے محترم مہینے کی بے حرمتی کی۔ اللہ کی قسم! ان جیسے لوگوں سے ساری دنیا بھر جائے، تب بھی عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک انگلی ان سے افضل ہے۔ نجات کا راستہ یہی ہے کہ ان کے خلاف متحد ہو کر انہیں دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بنا دو۔''[4]

اس پُر اثر تقریر نے مکہ مکرمہ میں قصاص کی تحریک کو تقویت دی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس تحریک کی سرپرست تھیں، جبکہ اصل قائد حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما تھے۔ حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے طے کیا کہ کوفہ یا بصرہ جا کر وہاں اپنے عقیدت مندوں اور ہم فکر ساتھیوں کو مجتمع کیا جائے۔[5]

ان حضرات کا مقصد عوامی ذہن سازی اور عسکری اجتماعیت کے ذریعے ایسا ماحول پیدا کرنا تھا جس سے فتنہ پرور لوگوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اگرچہ اس قسم کی جدوجہد میں کسی مرحلے

---

[1] کنا قد داهنّا في امر عثمان فلا نجد بدًا من المبالغة ..... (مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۸۱، مسیر عائشة وعلی وطلحه والزبیر، بسند صحیح، ط الرشد) وعن حکیم بن جابر قال قال علیّ لطلحة انشدک الله الا رددت الناس عن عثمان، قال لا والله حتی تعطی بنو امیة الحق من انفسها. (تاریخ الطبری: ۴۰۵/۴، بسند صحیح) قال الذهبی: الذی کان منه فی حق عثمان تمغفل وتالب فعله باجتهاد ثم تغیر منه عند ما شاهد مصرع عثمان فندم علیٰ ترک نصرته. (سیر اعلام النبلاء: ۳۵/۱، ط الرسالة)

[2] "کان منی فی امر عثمان رضی اللہ عنہ مالا اریٰ کفارته الا ان یسفک دمی فی طلب دمه." (مستدرک حاکم، ح: ۵۵۹۵ بسند صحیح)

[3] انبانا العوام بن حوشب قال قال طلحة: اللهم هل یجزیء دمی کله بقطرة من دم عثمان؟ (تاریخ المدینة لابن شبة: ۱۱۶۹/۴)

[4] تاریخ الطبری: ۴۴۸/۴، ۴۴۹ عن سیف [5] تاریخ الطبری: ۴۴۹/۴، ۴۵۰ عن سیف



پر حکام سے تصادم کی نوبت آجانا ہرگز بعید نہ تھا، تاہم حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما حتی الامکان حکومت سے ٹکرانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ صرف مسلمانوں کا شرعی امیر مانتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تاکید کر رہے تھے۔ بصرہ کے رئیس حضرت اَحنف بن قیس جب حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ملے اور پوچھا: ''کس سے بیعت کروں؟'' تو تینوں نے ایک ہی جواب دیا: ''علی رضی اللہ عنہ سے۔''[1]

مکہ مکرمہ میں سعید بن العاص، ولید بن عقبہ، یمن کے سابق گورنر یعلیٰ بن امیہ اور بصرہ کے سابق گورنر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہم اس لائحہ عمل پر متفق ہوگئے۔ اور یہ قافلہ جس میں چھ سو افراد تھے، مکہ سے عراق روانہ ہوگیا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شام روانگی ملتوی، عراق جانے کا فیصلہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ شام کے خلاف لشکرکشی کا اعلان کر چکے تھے، اس بارے میں انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کی مخالفت کو بھی نظر انداز کر دیا تھا مگر اس لشکرکشی کی کوئی خاص تیاری نہ ہوسکی اور کوچ میں تاخیر ہوتی رہی، یہاں تک کہ مکہ سے حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے بصرہ کی طرف کوچ کی خبر آئی۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا تعاقب کر کے انہیں روکنے کا ارادہ ظاہر کیا اور شام کے بجائے مکہ جانے والی شاہراہ کی طرف نکلے۔ رفقاء اس اقدام سے روکتے رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی خدشات کا اظہار کیا اور رائے دی کہ حضرت طلحہ و اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو قاتلینِ عثمان سے نمٹ لینے دیا جائے۔[4]

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہا: ''امیر المؤمنین! یہاں سے مت جایئے، اگر آپ گئے تو یہاں مسلمانوں کا حکمران پھر کبھی نہیں لوٹے گا۔'' مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کی بات نہ مانی۔[5]

مدینہ منورہ سے نکل کر آپ رضی اللہ عنہ مکہ جانے والی شاہراہ پر تین میل (پونے پانچ کلومیٹر) دور جا کر ''ربذہ'' میں ٹھہر گئے۔ پانچ، چھ دن بعد جب پتا چلا کہ مکی قافلہ بصرہ کی طرف نکل گیا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے سیدھے کوفہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے وہاں جانے پر خدشات کا اظہار کیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خدشات کا وزن ماننے کے باوجود کوفہ جانا بہتر قرار دیا؛[6] کیوں کہ عراق کے حالات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ مدینہ میں بیٹھ کر انہیں کنٹرول کرنا ممکن نہیں تھا۔ مکہ جانے والے قافلے کی حکمتِ عملی کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا:

''ان حضرات نے یہی طرز اختیار کیا تو مسلمانوں کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔''[7]

---

[1] تاریخ الطبری: ۴۹۷/۴؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۰۶۲۹ بمتن مختصر و اسناد صحیح، ط الرشد

نوٹ: ہم مصنف ابن ابی شیبۃ، مکتبۃ الرشد کا جدید نسخہ استعمال کر رہے ہیں جو سات جلدوں میں ہے مگر اس مقام پر اس نسخے میں کمپوزنگ کی سخت اغلاط ہیں، اس لیے قارئین یہاں پندرہ جلد والا ''دارالسلفیۃ'' کا قدیم نسخہ دیکھیں جس میں یہ روایت: ۱۱/۱۱۸، ۱۱۹ پر ہے۔

[2] تاریخ الطبری: ۴/۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۴

[3] تاریخ الطبری: ۴/۴۵۵ عن سیف

[4] تاریخ الطبری: ۴/۴۵۶ عن سیف

[5] تاریخ الطبری: ۴/۴۵۵ عن سیف

[6] تاریخ الطبری: ۴/۴۵۹، ۴۶۰ عن سیف

[7] فان فعلوا هذا فقد انقطع نظام المسلمین. (تاریخ الطبری: ۴/۴۴۶ عن سیف)

جنگِ جمل اور اس کا پسِ منظر

حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما کی عراق کی طرف روانگی اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ انصاف کے حصول کے لیے تھی اور ان کی تمام تر کوششیں مکمل نیک نیتی اور ایمانی جذبے پر مبنی تھیں۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما کے اخلاص کا یقین تھا اور ان کا مقام و مرتبہ بھی وہ ہرگز فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ ان حضرات سے ان کی دلی محبت والفت بھی کچھ کم نہ تھی۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں حصولِ انصاف کے لیے ایک شہر کو مرکز بنا کر مسلح قوت جمع کرنے اور مجرموں کو از خود کیفرِ کردار تک پہنچانے کا فیصلہ کر لینا حکومتی نظام میں خلل اندازی اور اتحادِ اُمت کو ٹھیس پہنچنے کا باعث بن سکتا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ ان حضرات کو اپنے ساتھ شامل کر کے متفقہ لائحہ عمل اختیار کریں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بصرہ میں:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قافلہ بصرہ کے قریب ''خَـفِـیْـر'' کے مقام پر جا کر ٹھہر گیا۔ اندازہ ہے کہ آپ نے محرم ۳۶ھ کے آخری عشرے میں سفر شروع کیا۔ آپ ۷۶۷ میل (۴۸ منازل یا ۱۲۳۴ کلومیٹر) طے کر کے ربیع الاوّل کے اواخر میں بصرہ کے قریب پہنچیں۔ ۲۶ دن گفت وشنید اور مذاکرات میں گزارے، پہلے بصرہ کے اربابِ حل وعقد کے نام مکتوب لکھ کر انہیں اپنے عزائم اور مقاصد سے آگاہ کیا تا کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ حاکمِ بصرہ حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ نے عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ اور ابوالاسود دوئلی کو ام المومنین کے پاس بھیجا۔[1] ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ان سے جو گفتگو فرمائی اس کے حرف حرف سے اخلاص، خیرخواہی اور دردمندی عیاں ہوتی ہے۔ فرمایا:

''مجھ جیسی خاتون کسی خفیہ مقصد کے لیے سفر نہیں کرتی، نہ ہی اپنی اولاد سے حقیقتِ حال کو چھپایا جاتا ہے، شہروں کے اوباش لوگوں اور قبائل کے آوارہ گردوں نے مدینۃ الرسول پر چڑھائی کی، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی لعنت کے حق دار بنے، پھر مسلمانوں کے حکمران کو کسی جرم اور وجہ کے بغیر شہید کیا، ان کا ناحق خون بہایا، مال لوٹا، وہ لوگوں کے گھروں میں اس طرح ٹھہرے رہے کہ لوگ ان کے قیام سے تنگ، پریشان اور مصیبت میں تھے، نہ وہ اپنا دفاع کر سکتے تھے، نہ ان کو امن میسر تھا۔ آخر کار میں مسلمانوں کو بتانے نکل کھڑی ہوئی کہ ان شرپسندوں نے کیا آفت ڈھائی ہے اور ہمارے پیچھے عوام کا کیا حال ہے اور اب لوگوں کو

[1] تاریخ الطبری: ۳۶۱/۴، ۳۶۲ عن سیف



اصلاحِ احوال کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا. ①

(ان لوگوں کے بہت سے مشورے اچھے نہیں ہاں (اُس شخص کا مشورہ اچھا ہے) جو خیرات یا نیکی یا لوگوں میں صلح کرنے کو کہے اور جو ایسے کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے۔)

ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق، اصلاحِ قوم کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ تمہیں نیکی کا حکم دیتے اور اس پر آمادہ کرتے ہیں، گناہوں سے روکتے ہیں اور اس کے خاتمے کے ترغیب دیتے ہیں۔"②

بصرہ کے ان نمائندوں نے حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی ملاقات کی اور ان کا موقف جاننے کے بعد انہیں یاد دلایا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکے ہیں۔ دونوں حضرات کا جواب تھا:

"اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے اور قاتلین عثمان کے درمیان حائل نہ ہوں تو ہم اپنی بیعت پر قائم ہیں۔"③

ادھر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا موقف سننے کے لیے عوام کا جمِ غفیر شہر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ جس میدان میں قافلۂ مکہ ٹھہرا تھا وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ یہاں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے پُر جوش تقاریر کیں اور آخر فرمایا: "خلیفۂ مظلوم کا قصاص لینا، اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے، اسے قائم کرنے سے آپ کا نظام بحال ہو جائے گا، اسے ترک کیا تو آپ کی قوت و اقتدار خاک میں مل جائے گی، اور کوئی نظامِ حکومت باقی نہیں رہے گا۔"

آخر میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

"لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگاتے اور ان کے عمال کی کردار کشی کرتے رہے، وہ مدینہ آ کر ہم سے اس بارے میں گفت و شنید کرتے رہے، ہم نے دیکھا بھالا تو عثمان رضی اللہ عنہ کو بے قصور، نیکوکار اور عہد کا پابند پایا اور ان لوگوں کا بدکردار اور دروغ گو ہونا معلوم ہوا۔ جب ان لوگوں کو کثرت قوت حاصل ہوگئی تو خلیفہ کے گھر کو گھیر کر قتل ناحق کا ارتکاب کیا۔ اب جو کام کرنا ضروری ہے اور اس کے سوا کچھ اور کرنا مناسب نہیں، وہ ہے قاتلینِ عثمان کی گرفتاری اور کتاب اللہ کے حکم کا قائم کرنا۔"④

ان تقاریر کے جواب میں اہلِ بصرہ کی بڑی تعداد نے ان کی حمایت کا اعلان کیا، شہر کے عام لوگ اس تحریک کے پُر جوش حامی بن گئے۔ بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کا حالات پر قابو ختم ہو چکا تھا تاہم ایک گروہ یہ کہہ کر ان کے ساتھ رہا کہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکنے کے بعد ایسی تحریک چلانے کا حق نہیں رکھتے۔

---

① سورۃ النساء، آیت: ۱۱۴

② تاریخ الطبری: ۴/۴۶۱، ۴۶۲ عن سیف

③ تاریخ الطبری: ۴/۴۶۲ عن سیف

④ تاریخ الطبری: ۴/۴۶۳، ۴۶۴ عن سیف

حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے والوں میں سے بہت سے لوگ صلحاء وشرفاء تھے جو اس اصول کی بناء پر ان کا ساتھ دینے سے گریز کررہے تھے کہ خلیفہ کی اطاعت لازم ہے اور قانون ہاتھ میں لینا غلط۔

مگر مخالفین میں خاصی تعداد اُن سبائیوں کی بھی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالف تحریک کا حصہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنے والوں میں سے ایک گروہ بصرہ سے گیا تھا جس کے سربراہ حُکَیم بن جبلہ اور حُرقُوص بن زُہَیر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے کے بعد یہ لوگ واپس بصرہ آگئے تھے اور یہاں بلاوجہ اشتعال انگیزی کو ہوا دے کر اپنا سیاسی قد وکاٹھ اُونچا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ لوگ صحابہ کرام خصوصاً ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے خلاف زبان درازی کرکے یہ تاثر دے رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفادار بس ہم ہی ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکیم بن جبلہ ایسے لوگوں کو اکٹھا کرکے حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ [1]

ان بدقماشوں نے یہاں تک لن ترانیاں ہانکیں کہ وہ نعوذ باللہ ام المؤمنین کو یرغمال بنائیں گے۔ [2]

بصرہ کے شرفاء نے اس بے ہودہ گوئی کو برداشت نہ کیا اور احتجاج کرتے ہوئے کہا:

''کیا تم خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرکے بھی مطمئن نہیں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ کے خلاف اسلحہ اٹھا رہے ہو؟ صرف اس بات پر کہ وہ تمہیں حق کا حکم دیتی ہیں، بس اس لیے تم انہیں اور اکابر صحابہ کو قتل کرنا چاہتے ہو؟'' مگر ان سنگ دلوں پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کوفہ کے عمائد کے نام اپنے مراسلے میں ان حالات کا نقشہ یوں کھینچتی ہیں:

''صالح لوگوں نے ہماری دعوت قبول کی مگر جن لوگوں میں خیر کی کوئی رمق نہیں تھی، انہوں نے اسلحہ لے کر ہمارا سامنا کیا اور کہنے لگے: ہم تمہیں بھی عثمان کے پیچھے روانہ کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو مزید معطل کرتے رہیں۔ انہوں نے دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں کافر قرار دیا اور ہمارے بارے میں بے ہودہ گوئی کی، جب ہم نے کہا: أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ [3] (کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا علم دیا گیا اور وہ کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ اُن میں فیصلہ کردے تو ایک فریق اُن میں سے لاپرواہی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔) تو ان میں سے کچھ لوگوں نے میری بات پر یقین کیا اور ان میں باہم تنازع ہوگیا۔ ہم نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا، مگر اس سلوک کے باوجود ان کا پہلا گروہ میرے ساتھیوں پر ہتھیار اٹھانے سے باز نہیں رہا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے داؤ کو انہی پر موڑ دیا، ہم چھبیس دنوں تک انہیں کتاب اللہ اور حدود اللہ کے قیام کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے انکار ہی کیا۔'' [4]

---

[1] تاریخ الطبری: ۴۶۶/۳
[2] تاریخ الطبری: ۴۷۱/۴
[3] سورۃ آل عمران، آیت: ۲۳
[4] تاریخ الطبری: ۴۷۳/۴



بصرہ کا فیصلہ کن معرکہ: سبائیوں سے انتقام:

حُکَیم بن جَبَلہ جیسے سبائیوں کی شرانگیزی کی وجہ سے ۲۴ اور ۲۵ ربیع الآخر سن ۳۶ ہجری کو بصرہ میں کاروانِ مکہ اور مفسدینِ بصرہ میں یکے بعد دیگرے دو معرکے ہوئے۔ قاتلینِ عثمان اور سبائیوں کے علاوہ قبیلہ عبدالقیس اور ربیعہ کے کچھ لوگ بھی نادانی میں فسادیوں کے ہم رکاب ہوگئے تھے۔ ①

پہلے دن حُکَیم بن جَبَلہ اپنے گھڑسواروں کو لے کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رہائش گاہ کی طرف نکلا جو بصرہ کی آبادی میں مسجد کے قریب تھی۔ قافلۂ مکہ نے گھڑسواروں کو چڑھائی کرتے دیکھا تب بھی از خود لڑائی نہ کی بلکہ نیزے تان کر دفاعی ہیئت اختیار کرلی مگر حُکَیم بن جَبَلہ اپنے گھڑسواروں کو جوش دلا کر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے ام المؤمنین کے جانثاروں کو صرف مدافعت پر اکتفا کرتے دیکھا تو شیخی میں آکر چلایا:

"آج قریش اپنی بزدلی اور غصے کے سبب ہلاک ہوکر رہیں گے۔"

اس طرح وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جانثاروں کو طیش دلا کر کھلے میدان میں لڑنے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا مگر انہوں نے فراست سے کام لیتے ہوئے اس محفوظ ہیئت کو برقرار رکھا۔ جامع مسجد والی گلی کے نکڑ پر لڑائی ہوتی رہی اور ٹکراؤ بھی ہوا۔ دشمن آگے بڑھنے کے لیے زور لگاتا رہا۔ ②

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اہلِ کوفہ کے نام اپنے مراسلے میں تحریر فرماتی ہیں:

"صبح منہ اندھیرے انہوں نے حملہ کیا تاکہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو قتل کردیں۔ وہ میری رہائش گاہ کی دہلیز تک آن پہنچے۔ ان کے ساتھ ایک رہنما تھا جو انہیں میری نشان دہی کرا رہا تھا۔ مگر میرے دروازے پر انہوں نے کچھ افراد کو مستعد پایا، اب لڑائی کی چکی گھومی اور مسلمانوں نے ان کو گھیرنا اور مارنا شروع کیا۔" ③

اس اچانک مگر ناکام حملے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ بصرہ میں موجود سبائی ام المؤمنین اور ان کے ساتھیوں کی جان کے درپے ہیں اور موقع ملتے ہی وہ دوبارہ حملہ کریں گے جو زیادہ منظم اور شدید ہوگا، چنانچہ اسی رات حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے مقامی لوگوں کے مشورے سے اپنا پڑاؤ تبدیل کرکے سرکاری غلہ گودام کے پاس ڈیرے ڈال دیے، جہاں سامنے کھلا میدان تھا۔ رات بھر وہ متوقع جنگ کی تیاری میں مصروف رہے اور شہر سے ام المؤمنین کے جانثار آ آکر ان کی صفوں میں شامل ہوتے رہے۔ ④

حُکَیم بن جَبَلہ کے گرد قاتلینِ عثمان کے گروہ کے علاوہ زیادہ تر مختلف قبیلوں کے آوارہ اور دھتکارے ہوئے لوگ جمع تھے۔ یہ سب جانتے تھے کہ اگر انہوں نے قوت نہ دکھائی تو بصرہ میں ان کا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ ⑤

---

① تاریخ الطبری: ۴۷۰/۳ عن سیف

② تاریخ الطبری: ۴۶۶/۳

③ تاریخ الطبری: ۴۷۳/۳

④ تاریخ الطبری: ۴۶۶/۳

⑤ تاریخ الطبری: ۴۷۰/۳

دوسرے دن حُکیم بن جَبلہ صبح ہی صبح سبائیوں کی قیادت کرتے ہوئے نیزہ تانے باہر نکلا۔ وہ ام المؤمنین کی شان میں کھلے عام ایسی گستاخیاں کر رہا تھا کہ جس کے کانوں میں آواز پڑتی وہ لرز جاتا۔ ایک شخص سے برداشت نہ ہوا، اس نے سامنے آکر للکارا: "کس کو گالی دے رہے ہو؟" حُکیم بن جَبلہ نے نیزے کا وار کر کے اسے مار ڈالا۔

اب اسی کے قبیلے عبدالقیس کی ایک خاتون اس کی گستاخانہ باتوں سے بپھر کر آگے بڑھی اور بولی:

"ارے ناپاک عورت کی اولاد! تو مسلمانوں کی ماں کو گالی دے رہا ہے۔ تو خود ان گالیوں کا حق دار ہے۔"

حُکیم بن جَبلہ نے اسے بھی نیزے کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس دہشت گردی کا مظاہرہ کر کے وہ ان مقامی لوگوں کو مرعوب کر دے گا جو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی صف میں جمع ہو چکے تھے۔ مگر سفاکی کے اس مظاہرے سے خود اسی کے قبیلے عبدالقیس کے بہت سے لوگ جو اس کے جتھے میں شامل تھے، ناراض ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ کہہ رہے تھے: "تجھ سے اللہ خود انتقام لے گا۔"[1]

چونکہ سبائیوں کے علاوہ بہت سے عام مسلمان محض گورنر عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کی حمایت کے خیال سے اس لڑائی میں شامل ہو گئے تھے، اس لیے شروع میں قافلۂ مکہ نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے جانثاروں کو حکم دیا: "جو تم سے لڑے بس اسی سے لڑنا۔" یہ سن کر جانثاروں نے اعلان کیا: "جو شخص قاتلینِ عثمان میں شامل نہیں، وہ ہاتھ روک لے، ہم صرف ان قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، ہم خود کسی سے لڑنے کی ابتدا نہیں کریں گے۔"[2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مسلمانوں کو خون ریزی سے بچانے کے لیے مسلسل اعلان کرواتی رہیں کہ حریف کی صف میں شامل عام لوگ ہاتھ روک لیں مگر حُکیم بن جَبلہ کے ٹولے نے ایک نہ سنی۔ ان کی خودسری سے پیدا شدہ اس صورتحال نے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو موقع دے دیا کہ وہ کھل کر ظالموں سے بدلہ لے سکیں۔ انہوں نے دعا کی:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَمَعَ لَنَا ثَارَنَا مِنْ اَھْلِ الْبَصْرَةِ ، اَللّٰھُمَّ لَا تُبْقِ مِنْھُمْ اَحَدًا ، وَاَقِدْ مِنْھُمُ الْیَوْمَ فَاقْتُلْھُمْ. ﴾

(سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، جس نے بصرہ میں قاتلینِ عثمان سے قصاص کا موقع فراہم کر دیا۔ اے اللہ! ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔ ان سے آج قصاص لے لے اور انہیں قتل کر دے۔)[3]

اب ام المؤمنین کے جانثاروں نے پوری شدت سے جوابی حملہ کیا، صبح سے ظہر تک جنگ ہوتی رہی۔ قاتلینِ عثمان کے چار سرغنے: حُکیم بن جَبلہ، ذُرَیح بن عَبّاد، ابن المُحتَرِش اور حُرقُوص بن زہیر اپنے گروہوں کی کمان کر رہے تھے۔ قافلۂ مکہ میں سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حکیم کا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ذُرَیح بن عَبّاد کا، عبدالرحمٰن بن عتاب رحمہ اللہ نے ابن المُحتَرِش کا اور حضرت عبدالرحمٰن بن الحارث رحمہ اللہ نے حُرقُوص کے گروہ کا سامنا کیا۔

---

① تاریخ الطبری: ۴۷۰/۳ عن سیف

② تاریخ الطبری: ۴۷۰/۳ عن سیف ③ تاریخ الطبری: ۴۷۰/۳



حُکَیم تین سوسبائیوں کو لے کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا۔ انہوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس کے مقابلے میں بھیجا۔ وہ اپنے جانبازوں کے ساتھ اس شدت سے حملہ آور ہوئے کہ فریق مخالف کی لاشوں کے ڈھیر لگتے چلے گئے۔ حُکَیم بن جَبَلہ کا بھائی رِعَل، بیٹا اشرف اور ایک سبائی لیڈر حنظلہ مارے گئے۔ خود حُکَیم کا پاؤں کٹ گیا اور وہ اَدھ مُوا ہو کر گر پڑا، پاس سے گزرنے والے ایک مجاہد نے اسے کہا: ''اے خبیث! اللہ کے انتقام کا مزہ چکھ لے۔'' کچھ دیر بعد ضُخَیم نامی ایک مجاہد نے وار کر کے اس کا سر اُڑا دیا۔ [1]

قافلۂ مکہ میں سے صرف ایک صحابی حضرت مُجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ [2]

غلہ گودام کا میدان دشمنوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔ ذُرَیح بھی اپنے گروہ سمیت مارا گیا، صرف سبائی لیڈر حُرقُوص بن زُہَیر اپنے چند ساتھیوں سمیت زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ [3] باقی ماندہ لوگوں نے گھبرا کر صلح کی پیش کش کی۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی بلا وجہ خوں ریزی ناپسند کرتے تھے اس لیے پیش کش قبول کر لی گئی۔ [4]

لڑائی اس معاہدے پر ختم ہوئی کہ حدود اللہ کو جاری کیا جائے گا، قاتلینِ عثمان سے بدلہ لینے میں کوئی شخص رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ [5]

یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ بصرہ کا دارالامارۃ (گورنر ہاؤس)، جامع مسجد اور بیت المال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نامزد گورنر حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کی تحویل میں رہیں گے۔ کاروانِ مکہ کو بصرہ میں کسی بھی مقام پر ٹھہرنے کا اختیار ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آمد تک دونوں فریق آپس میں کسی بھی قسم کی کشیدگی اور تصادم سے گریز کریں گے۔ [6]

جو سبائی اب بھی بچ کر اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے، شہری ان سے بیزار تھے، انہیں پناہ دینے کے لیے اب کوئی تیار نہ تھا۔ [7] حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بصرہ میں اعلان کرا دیا کہ اگر کسی قبیلے میں ایسے افراد موجود ہیں، جو مدینہ میں قتل و غارت میں ملوث رہے تو انہیں ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ مشہور شرپسندوں کے نام لکھ کر مشتہر کر دیے گئے۔ چنانچہ اہل بصرہ کئی افراد کو کتوں کی طرح گھسیٹ کر لائے، جنہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی پاداش میں سزائے موت دے دی گئی۔ [8]

اس فتح اور مفسدین کے عبرتناک انجام سے اہلِ ایمان کے دل ٹھنڈے ہوئے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے خوشخبری پر مبنی خطوط عالمِ اسلام کے مختلف شہروں میں روانہ کیے۔ جن میں تحریر تھا:

---

① تاریخ الطبری: ۴/۴۷۱
② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۸۳
③ تاریخ الطبری: ۴/۴۷۱
④ تاریخ الطبری: ۴/۴۶۶ عن سیف
⑤ تاریخ الطبری: ۴/۴۷۳
⑥ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۸۳
⑦ تاریخ الطبری: ۴/۴۷۳
⑧ تاریخ الطبری: ۴/۴۷۲

''ہم جنگ کے خاتمے اور تمام طبقات میں کتاب اللہ کے احکام کے نفاذ کے لیے نکلے۔ بصرہ کے نیک اور معزز افراد نے اس مقصد کے لیے ہم سے بیعت کی، جبکہ شر پسندوں اور اوباشوں نے مخالفت کی اور ہتھیار اٹھالیے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مسلمانوں کی روش پر لوٹ آنے کے بار بار مواقع دیے، جب ان کے پاس کوئی بہانہ اور عذر نہ بچا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتل بپھر گئے اور خود اپنی قتل گاہ کی طرف چلے آئے۔ ان میں سے حُرقُوص بن زہیر کے سوا کوئی بچ کر نہ نکل سکا۔ اللہ پاک اس سے بھی انتقام لے گا۔ ہم اللہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ بھی ہماری طرح اُٹھ کھڑے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوتے وقت ہمارے پاس بخشش کا کوئی بہانہ موجود ہو اور ہم اپنے ذمے سے فریضہ ادا کر چکے ہوں۔''[1]

بصرہ کے حالات اب قافلۂ مکہ کے قابو میں تھے۔ البتہ ایک تشویش باقی تھی، وہ یہ کہ جنگ سے بچ نکلنے والا حُرقُوص بن زُہَیر جس کا تعلق بنو سعد سے تھا، اپنے قبیلے کو جاہلی عصبیت کا اشتعال دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی طرح حُکَیم بن جَبَلہ کے قبیلے عبدالقیس کے بہت سے لوگ جنگ بصرہ میں اپنے لوگوں کے قتل پر برافروختہ تھے، حالاں کہ پہلے وہ خود اُم المؤمنین کے موقف کی حمایت کر رہے تھے مگر اب ان کے بعض ہم قبیلہ لوگوں کو اپنی سرکشی کی سزا ملی تو ان کی قبائلی عصبیت بھڑک اٹھی۔ وہ بصرہ چھوڑ کر چلے گئے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کی سمت گامزن:

جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پہلے ہی کوفہ کو اپنا مرکز بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لیے آپ کا عراق جانا ناگزیر تھا۔ اس کے علاوہ آپ کو اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کہیں قصاص کی عوامی تحریک کے ہاتھوں ایسے لوگ بھی سزا کی زد میں نہ آجائیں جو شرعاً مامون ہیں۔ یہ لوگ چاہے سابق دور میں بغاوت میں شامل تھے مگر بیعت کے بعد انہیں اسلامی حکومت کے شہری ہونے کی حیثیت سے تمام حقوق حاصل تھے۔ اگر وہ غیر مسلم بھی ہوتے، تب بھی ان کی جان و مال کی حفاظت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرضِ منصبی تھا۔ نیز اس طرح کی کارروائیوں کے ردِعمل میں پورا عالمِ اسلام ایک بڑی خانہ جنگی میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے نکل کر عراق جانے کا فوری فیصلہ کرنا پڑا، تاکہ وہاں کے تمام امور آئینی دائرے میں لائے جائیں۔ عام خیال یہی تھا کہ آپ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے لڑنے جا رہے ہیں مگر آپ اپنے خاص ساتھیوں کو بتا رہے تھے کہ مقصد جنگ ہرگز نہیں ہے، رِفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے جب سفر کا مقصد پوچھا تو فرمایا: ''ہماری نیت و ارادہ بس اصلاح کا ہے۔''

پوچھا ''اگر وہ نہ مانیں تو؟''

فرمایا: ''ہم ان کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیں گے، ان کے حقوق انہیں دیں گے، خود صبر کر لیں گے۔''

---

① تاریخ الطبری: ۴۷۲/۴

② تاریخ الطبری: ۴۷۲/۴




دریافت کیا: ''اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو؟''

فرمایا: ''ہم اس وقت تک انہیں کچھ نہیں کہیں گے جب تک وہ ہمیں نہیں چھیڑیں گے۔''

پوچھا: ''اگر وہ ہمیں نہ چھوڑیں تو؟'' فرمایا: ''ہم ان سے صرف دفاع کریں گے۔''[1]

اس سے عیاں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حتی الامکان جنگ سے گریزاں اور افہام وتفہیم کے خواہاں تھے۔

اہلِ کوفہ کے نام حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مکتوب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو دارالخلافہ بنانے کا ارادہ اب پہلی بار ظاہر فرمایا اور کہا: ''کوفہ والے مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں، وہاں عربوں کے رؤسا اور اکابر ہیں۔'' پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کو مکتوب روانہ کیا:

''میں نے تمہارے درمیان قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، کیوں کہ میں تمہاری محبتِ خداوندی اور عشقِ رسول سے آگاہ ہوں۔ جو میرے پاس آکر تعاون کرے گا وہ اپنا فرض پورا کردے گا۔ تم اللہ تعالیٰ کے دین کے معاون ومددگار بن جاؤ۔ ہمارے ہاتھ مضبوط کرو۔ ہمارا مقصد صرف اصلاح ہے تاکہ امت دوبارہ بھائی بھائی بن جائے۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تاریخی خطاب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ان کے ہمراہیوں میں جو لوگ محض سادات کی محبت میں تشدد کی وجہ سے غیر متوازن ہورہے ہیں، انہیں قرآنِ مجید وسنتِ رسول کی تجویز کردہ راہِ اعتدال پر واپس لایا جائے اور مسلمانوں کو ایک امت اور ایک خاندان ہونے کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے۔ سفر کے آغاز سے قبل آپ رضی اللہ عنہ نے ایک تاریخی خطبہ دیا جو آج بھی فرقہ بندیوں سے نجات کا راستہ دکھاتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''بے شک اللہ بزرگ وبرتر نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت عطا کی اور اس کی بدولت ہمیں بلند کیا اور ہمیں ذلت، عددی کمی، باہمی حسد اور دشمنی کے دور سے نکال کر بھائی بھائی بنادیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا لوگ اس حالت پر قائم رہے۔ اسلام ہی ان کا دین اور کتاب اللہ ان کی رہنما رہی، مگر پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں سانحہ پیش آیا جنہیں شیطان نے ورغلایا تھا تاکہ اس امت میں پھوٹ ڈلوادے۔ یاد رکھنا، یہ امت فرقوں میں بٹ کر رہے گی جیسا کہ گزشتہ امتیں منتشر ہوئی تھیں۔ جو ہونے والا ہے اس کے شر سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ بے شک جو ہونے والا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ سن لو! یہ امت عنقریب تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان میں بدترین فرقہ وہ ہوگا جو خود کو میری طرف منسوب کرے گا، مگر میرے عمل کی پیروی نہیں کرے گا۔ میں بلاشبہ ایسے لوگوں کو دیکھ چکا ہوں، جان چکا ہوں۔ پس تم اپنے دین کو لازم

---

[1] تاریخ الطبری: ۴۷۹/۳ عن سیف

[2] تاریخ الطبری: ۴۷۷/۳

پکڑو۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ پر چلو، ان کی سنت کو اپناؤ، قرآنِ مجید میں جو بات سمجھ نہ آئے اسے چھوڑ دو، جس چیز کا قرآن ساتھ دے اسے اختیار کرو، جسے وہ مسترد کردے اسے ترک کردو۔ اللہ کو رب، محمد ﷺ کو رسول، اسلام کو دین اور قرآنِ مجید کو رہنما اور قائد مان کر راضی رہو۔"[1]

اس یادگار خطاب کے بعد ۳۰ ربیع الآخر سن ۳۶ ہجری کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے کوفہ کا سفر شروع کیا۔[2]

افرادی قوت میں کمی کی وجہ:

مدینہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی لشکر تیار نہیں ہوا تھا۔ فقط سات سو ساٹھ (۷۶۰) افراد تھے۔[3] وجہ یہ تھی کہ اس سفر میں خانہ جنگی کا امکان تھا جبکہ اہلِ حجاز کی اکثریت کسی سیاسی تنازعے کا حصہ بننے کے لیے تیار نہ تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کے باوجود غیر جانبداری کو ترجیح دے رہی تھی۔ اسی لیے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہلوایا تھا: "آپ شیر کے جبڑوں میں ہوتے تو بھی مجھے آپ کا ساتھ پسند ہوتا مگر اس قضیے میں میری یہ رائے نہیں۔"[4]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی صلح پسندی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کی طرف گامزن تھے کہ بصرہ میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو کسی سردار نے یہ رائے دی کہ ابھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو راستے میں صرف ایک ہزار گھڑسواروں کے ذریعہ روکا جاسکتا ہے، کیوں نہ ایسا کرلیا جائے؟

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو مسترد کرتے ہوئے جواب دیا:

"جنگ کے داؤ پیچ ہم خوب جانتے ہیں، لیکن یہاں ہم داعی بن کر آئے ہیں۔ یہ ایسا قضیہ ہے جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں۔ ہمیں امید ہے صلح ہوجائے گی، تم صبر کرو۔"[5]

اس واقعے سے اکابر صحابہ کی احتیاط اور صلح جوئی کا جذبہ بالکل ظاہر ہے۔

فقہائے کوفہ نے استقبال کیا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کوفہ پہنچے تو چار ہزار فقہاء نے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ تھے، آپ کا استقبال کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر خوش ہوکر فرمایا:

رَحِمَ اللّٰہُ ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ، قَدْ مَلَأَ ھٰذِہِ الْقَرْیَةَ عِلْماً وَفِقْھاً

"اللہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) پر رحمت کرے، وہ اس بستی کو علم اور فقہ سے پُر کرگئے۔"[6]

---

① تاریخ الطبری: ۴۷۰/۴

② تاریخ الطبری: ۴/ ۴۷۴ تا ۴۷۸ عن سیف

③ تاریخ الطبری: ۴۸۰/۴

④ صحیح البخاری، ح: ۷۱۱۰، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ للحسن ان ھذا ابنی سید

⑤ تاریخ الطبری: ۴۹۵/۴

⑥ المبسوط للسرخسی: ۲۸/۱۲، ط دار المعرفۃ بیروت۔ وانظر مقدمۃ "نصب الرایۃ" مطبوعۃ دار الحدیث قاھرہ



سیاسی کش مکش سے گریزاں صحابہ:

امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے قریب ''ذی قار'' کے مقام پر قیام فرما کر کوفہ کے عمائد، امراء اور سالارانِ فوج کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس مشکل گھڑی میں جبکہ پورے عالمِ اسلام میں ایک تشویش اور انتشار کی فضا پیدا ہو چکی ہے، حکومت پر پورا اعتماد کریں اور حالات سے نبرد آزمائی کے لیے سرکاری لائحہ عمل کا ساتھ دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا نیا گورنر حضرت قُرَظہ بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا اور ساتھ ہی اپنے کچھ نمائندوں کو بھی کوفہ بھیجا تا کہ وہ شہریوں کو تعاون پر آمادہ کریں۔ ان میں حضرت عمار بن یاسر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفد کو اس کوشش میں مشکل ضرور پیش آئی؛ کیوں کہ کچھ بزرگ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں بڑے پُر جوش تھے، دوسرے گروہ کے اکابر کے خلاف بدگوئی سے باز نہیں آرہے تھے، جس سے عوام بدظن ہو رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کوفہ کے اکابر ڈر رہے تھے کہ مسلمانوں کے دونوں گروہوں میں جنگ نہ چھڑ جائے۔ عراق میں متعدد اکابر ایسے تھے جو عوام کو اس قضیے سے بالکل کنارہ کش رہنے کا کہہ رہے تھے۔

حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ اور اَحنف بن قیس رحمہ اللہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے کے باوجود، اس معاملے میں سخت تردد لاحق تھا۔ عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کراتے رہے کہ کسی پہاڑ پر جا کر بکریاں اور دنبے چرانا، دونوں گروہوں میں سے کسی پر ہاتھ اٹھانے سے بہتر ہے۔ [2]

---

① تاریخ الطبری: ۴/۴۸۲، ۵۰۲، ۵۰۳

② تاریخ الطبری: ۴/۵۰۲، ۵۰۳

یہ حضرات ان احادیث کی روشنی میں کنارہ کشی اختیار کر رہے تھے جن میں مسلمان کے قتل پر سخت وعیدیں وارد ہیں۔ نیز بہت سی احادیث میں فتنے کے وقت گوشہ نشینی کا حکم بھی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہاں یہ بھی ذہن نشین رکھا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی یہ احادیث یقیناً تھیں، مگر ان کی نظر احادیث پر زیادہ گہری تھی، ان کے سامنے وہ احادیث بھی تھیں جن میں فتنے کے موقع پر گوشہ نشینی کا ذکر اس شرط کے ساتھ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو، جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے فتنے کے دور کا ذکر کیا تو انہوں نے پوچھا کہ ایسے موقع کے لیے آپ کی ہدایت کیا ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تلزم جماعة المسلمين وامامهم. (مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کو لازم پکڑ لو۔) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اگر مسلمانوں کی نہ جمعیت ہو نہ امام تو پھر کیا کیا جائے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: ''فاعتزل تلك الفرق كلها ولو ان تعض باصل شجرة حتىٰ يدركك الموت وانت علىٰ ذلك. (تو پھر ان سب گروہوں سے الگ ہو جانا، چاہے تمہیں کسی درخت کی جڑ کو دانتوں سے نوچنا پڑے۔ یہاں تک کہ تمہیں موت آجائے اور تم اسی حال پر ہو۔

(صحيح البخاری، ح: ۳۶۰۶، كتاب المناقب باب علامات النبوة)

اس طرح کی روایات کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ چونکہ اس وقت مسلمانوں کا خلیفہ موجود ہے، لہٰذا انہیں چاہیے کہ خلافت کے ادارے کو مضبوط کریں اور اس کے دست و بازو بنیں۔ بعض فقہائے کرام نے جو لکھا ہے کہ فتنے کے موقع پر گوشہ نشین ہو جانا چاہیے اس سے بھی یہی مراد ہے۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وماروی عن ابی حنیفة رضی الله عنه، انه اذا وقعت الفتنة بين المسلمين فينبغي ان يعتزل الفتنة ويلزم بيته، محمول علىٰ وقت خاص وهو ان لا يكون امام يدعوه الى القتال، واما اذا كان فدعاه يفترض عليه الاجابة لما ذكرنا.

''امام ابوحنیفہ سے جو مروی ہے کہ جب مسلمانوں کے درمیان فتنہ کھڑا ہو جائے تو آدمی کو چاہیے کہ اس فتنے سے کنارہ کش ہو جائے اور اپنے گھر میں بند ہو جائے، تو یہ ایک خاص وقت پر محمول ہے، وہ یہ کہ جب کوئی ایسا امام نہ ہو جو قتال کی طرف دعوت دے رہا ہو۔ رہی وہ صورت جب امام بلا رہا ہو تو پھر آدمی پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی پکار کا جواب دے جس کے دلائل ہم ذکر کر چکے ہیں۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ۷/۱۴۰، ط دار الکتب العلمیة)

عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عقیدت مند حُجَیر بن ربیع کو کہا: ''جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو منع کر دو کہ اس آزمائش میں نہ پڑیں۔'' وہ بولے: ''میں قوم کا عام آدمی ہوں کوئی سردار نہیں۔''

فرمایا: ''جاؤ میری طرف سے پیغام دے کر منع کر دو۔''

عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے تھے:

''اگر میں ایک نکٹا حبشی غلام بن کر کسی پہاڑی چشمے کے کنارے گلہ بانی کروں اور اسی حال میں مر جاؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں دونوں صفوں میں سے کسی پر تیر چلاؤں چاہے وہ نشانے پر لگیں یا نہ لگیں۔'' [1]

اسی طرح حضرت اَحنف بن قیس رحمہ اللہ بھی جو چھ ہزار جنگجوؤں کے سردار تھے، اپنے جتھے کے ساتھ بصرہ سے چھ میل (ساڑھے ۹ کلو میٹر) دور جا کر دونوں جماعتوں سے الگ قیام پذیر ہو گئے [2] کیونکہ دو مسلح جماعتوں کا آمنا سامنا ہونے کے بعد اکابر کی احتیاط اور صلح جوئی کی کوششوں کے باوجود جنگ چھڑ جانے کا امکان موجود تھا۔ [3]

اہلِ بصرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حکم پر جانیں لٹانے کے لیے تیار تھے۔ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ نے جب انہیں دونوں گروہوں سے الگ ہو جانے کی دعوت دی تو اہلِ بصرہ نے ان کی بات ماننے سے معذوری ظاہر کی۔ ان کے بزرگوں نے کہا: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو کسی حال میں بھی بے سہارا نہیں چھوڑ سکتے۔'' [4]

بہر کیف حضرت علی رضی اللہ عنہ افرادی قوت جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی طرف سے کوفہ جانے والے وفد کی کارگزاری کا حال صحیح بخاری اور کتبِ تاریخ کی روشنی میں پیش کیا جا رہا ہے۔

---

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۵/۱۸

② تاریخ الطبری: ۴۹۸/۴

③ صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی قابلِ غور ہے: عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ، قال: لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل، بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم. قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا بنت کسری، قال: لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ."

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنگِ جمل کے زمانے میں قریب تھا کہ میں اصحابِ جمل (حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہو جاتا کہ مجھے اللہ نے ایک جملے کے ذریعے نفع دیا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو حکمران بنا دیا ہے تو فرمایا ''وہ قوم ہرگز فلاح یافتہ نہیں ہو سکتی جس نے اپنا معاملہ کسی عورت کے سپرد کر دیا ہو۔''

(صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۴۴۲۵، کتاب المغازی، باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسری)

اَحنف بن قیس رحمہ اللہ کو روکنے میں بھی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا خاص کردار تھا۔ اَحنف رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت کے لیے جا رہا تھا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ملے اور مجھے خانہ جنگی کے بارے وعید پر مشتمل یہ حدیث سنا کر وہاں جانے سے روک دیا: اذا تواجہ المسلمان بسیفیھما فالقاتل والمقتول فی النار. (صحیح مسلم، ح: ۷۴۳۴، کتاب الفتن، ط دار الجیل)

تاہم امام نووی رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ وعید ان کے لیے ہے جو کسی تاویل کے بغیر عصبیت کے لیے لڑ رہے ہوں۔ صحابہ کرام کے مابین ہونے والی خونریزی اس وعید میں داخل نہیں۔ اہلِ سنت کا مذہب اور حق بات یہ ہے کہ ان حضرات کے بارے میں حسنِ ظن رکھا جائے۔ وہ مجتہد اور متأول تھے۔ معصیت اِن کا مقصد نہ تھی۔ (شرح مسلم للنووی، کتاب الفتن)

④ تاریخ الطبری: ۵۰۳/۴ بسند صحیح ، طبقات ابن سعد: ۲۸۸/۴ باسناد حسن، ط صادر

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وفد کوفہ میں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ والوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ عوام کو خلافت کا ساتھ دینے پر آمادہ کریں۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بالکل شروع میں اسلام قبول کرنے والے بزرگ مہاجر صحابی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے بارے میں آگاہ فرمایا تھا کہ یہ شیطان کے اثر سے محفوظ رہیں گے۔ ①

یہ بھی فرمایا کہ: ''عمار کو جب بھی دو امور میں سے ایک کا اختیار ملے گا تو وہ زیادہ ہدایت یافتہ کو اختیار کریں گے۔'' ②

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے۔ حضرت ابو مسعود اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما جو اہلِ کوفہ کے اکابر میں سے تھے، ان کے پاس آئے۔ باہم بات چیت شروع ہوئی تو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کہا:

''میں آپ کے ساتھیوں میں سے کسی کے بارے میں بھی کلام کر سکتا ہوں مگر آپ کے متعلق نہیں۔ جب سے آپ نے اسلام قبول کیا ہے، میں نے آپ کو کوئی ایسا کام کرتے نہیں دیکھا جو میرے نزدیک اس معاملے میں آپ کے جلدی مچانے سے زیادہ ناگوار ہو۔''

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''جب سے آپ نے اور آپ کے ان ساتھی (ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) نے اسلام قبول کیا ہے مجھے بھی آپ کا کوئی کام اس معاملے میں سستی سے زیادہ ناگوار محسوس نہیں ہوا۔''

بات چیت کا اختتام خوش گوار ماحول میں اس طرح ہوا کہ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے جو صاحبِ ثروت انسان تھے، ان دونوں دوستوں کو عمدہ جوڑے پہنائے۔ نمازِ جمعہ کے اجتماع میں یہ حضرات جامع مسجد تشریف لے گئے۔ ③

جامع مسجد کوفہ میں مجلسِ مشاورت:

جامع مسجد پہنچ کر حسن بن علی رضی اللہ عنہ منبر کے سب سے اونچے درجے پر بیٹھے اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان سے نیچے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ④

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے پہلے کوفہ کے سابق گورنر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ عوام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے پر آمادہ کریں۔ مگر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تذبذب کی حالت میں تھے۔ وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

''لوگو! یہ فتنہ ایسا ہے جس میں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ پس اس میں سویا ہوا جاگنے والے سے بہتر ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی ایک بزرگ زید بن صُوحان رحمہ اللہ نے ام المؤمنین کے خروج پر اعتراض کیا تو جواب میں شَبَث بن ربعی نامی ایک کوفی رئیس نے کہا: ''وہ تو اللہ کے حکم پر چل کر اصلاحِ امت کا کام کر رہی ہیں۔''

① الذی اجارہ اللّٰہ علیٰ لسان نبیہ ﷺ من الشیطان یعنی عمّار بن یاسر۔ (صحیح البخاری، ح: ٦٢٧٨، کتاب الاستئذان، باب من القیٰ له وسادة)

② سنن الترمذی، ح: ٣٧٩٩ بسند صحیح

③ صحیح البخاری، ح: ٧١٠٠، کتاب الفتن، باب فتنة تموج کالبحر

④ صحیح البخاری، ح: ٧١٠٢، کتاب الفتن، باب فتنة تموج کالبحر

مجلس میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا اور مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں۔
شور وغل تھا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرمانے لگے:

"لوگو! فتنہ جب آتا ہے تو شکوک وشبہات میں ڈال دیتا ہے، ہاں! جب گزر جاتا ہے تب اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ یہ فتنہ ایسا ہی ہے کہ اچھا خاصا سمجھ دار آدمی بھی اس میں کل کے بچے کی طرح ہے۔ اللہ نے ہم پر ہمارے بھائیوں کا خون اور اموال حرام کر دیے ہیں۔ لہٰذا تم تلواروں کو نیام میں رکھو اور اپنے گھروں میں بیٹھ جاؤ، میری نصیحت مانو گے تو دین ودنیا دونوں میں سلامت رہو گے۔"

زید بن صُوحان رحمہ اللہ نے پھر زور شور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کی اور حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی مخالفت کو لازمی قرار دیتے ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کہا:

"جس طرح آپ دریائے فرات کا رخ نہیں موڑ سکتے، ویسے ہی جو آپ چاہتے ہیں، وہ کر نہیں سکتے۔"
پھر مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا: "لوگو! سب جمع ہو کر امیر المؤمنین کے پاس چلو۔"

اس سے پہلے کہ بات بگڑتی، کوفہ کے سپہ سالار قَعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور مدبرانہ انداز میں فرمایا:

"بات تو وہی ہے جو امیر ابوموسیٰ اشعری نے فرمائی، کاش! ویسا ہی کرنے کی کوئی راہ ملتی۔ باقی زید بن صُوحان کی باتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک حکومت کا ہونا ضروری ہے جو لوگوں کو منظم کرے، ظالم کو روکے اور مظلوم کی مدد کرے۔ اس کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ حکمران مقرر ہو چکے ہیں۔ ان کی پکار انصاف کی پکار ہے۔ وہ اصلاح کی دعوت دے رہے ہیں، لہٰذا اس معاملے میں پوری بصیرت کے ساتھ قدم بڑھائیے۔"[1]

زید بن صُوحان کی سخت کلامی کے برعکس حضرت قَعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی شائستہ باتوں کا مجمعے پر مثبت اثر ہوا اور کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا۔ بات کو مزید واضح کرنے کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"امیر المؤمنین کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے بھائیوں کے پاس چلو۔ اس کام کے لیے لوگ تو مل ہی جائیں گے لیکن اہل عقل ودانش ساتھ دینے میں پہل کریں گے تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔"

اس دوران اَشتر نخعی نے ایک بار پھر لوگوں کے جذبات کو منفی انداز میں بھڑکانے کی کوشش کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی شروع کی جسے برداشت نہ کرتے ہوئے ایک بزرگ حضرت مقطع بن ہیثم عامری کھڑے ہو گئے اور بولے: "اللہ کی قسم! ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ ہمارے بزرگوں کا ذکر برائی کے ساتھ کیا جائے۔"

اس پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فوراً تائید کرتے ہوئے فرمایا: "بزرگ نے سچ فرمایا۔"
یہ سن کر سب لوگ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کے بعد حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے بھی تقاریر کیں۔[2]

---

① تاریخ الطبری: ۴۸۲/۳، ۴۸۳

② تاریخ الطبری: ۴۸۵/۳ عن سیف

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی تقریر:

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطاب میں موجودہ صورتحال اور ام المؤمنین کے فضائل پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''بے شک ہماری ماں عائشہ (رضی اللہ عنہا) بصرہ چلی گئی ہیں۔ واللہ! وہ دنیا و آخرت میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ ہیں، لیکن اللہ نے تمہیں آزمایا ہے کہ اس صورتِ حال میں تم (شرعی خلیفہ حضرت) علی کی اطاعت کرتے ہو یا اُن کی۔''[1]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے کوفہ والوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تائید پر آمادہ کر رہے تھے اور اس ایک اجتہادی مسئلہ اور اللہ کی طرف سے آزمائش قرار دے رہے تھے کہ آیا لوگ ان حالات میں اپنے جذبات کو دیکھ کر چلیں گے یا شرعی ضابطے کو۔

انہی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے خلاف کچھ کہا تو غصے سے فرمایا:

''دفع ہوجا!، بدکردار، بھونکنے والے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی زوجہ محترمہ کو اذیت دے رہا ہے۔''[2]

اہلِ کوفہ امیر المؤمنین کی خدمت میں:

حسن بن علی اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اہل کوفہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر آمادہ کرنے میں کامیاب رہے اور نو ہزار افراد کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔[3]

اس لشکر میں آٹھ سو انصاری اور چار سو بیعتِ رضوان سے مشرف صحابہ شامل تھے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے اس جمِ غفیر کے سامنے اپنے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے ایک تقریر کی جس میں فرمایا: ''کوفہ والو! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے تاکہ تم ہمارے ساتھ ہمارے بصرہ والے بھائیوں کے پاس چلو۔ اگر وہ اپنی رائے سے رجوع کرلیں تو یہی ہم چاہتے ہیں۔ اگر وہ نہ مانیں تب بھی ہم ان سے نرمی کا معاملہ کریں گے ہم شر کی جگہ ہر اُس چیز کو اختیار کریں گے جس میں صلح اور خیر ہو۔''[5]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ بصرہ کو ساتھ ملانے کے لیے کوشاں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ اب اپنی تدبیر کے مطابق ان لوگوں کو ساتھ لے کر اہلِ بصرہ کے لشکر کو ساتھ ملالیں، اور مسلمانوں کی یہ افرادی وفکری طاقت مل کر تمام مسائل کو حل کرے۔ مگر پہلے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی طرف سے خلیفہ کی تدبیر پر مکمل اعتماد کا اظہار ضروری تھا۔ ورنہ بات وہیں رہتی اور چند قدم ساتھ چلنے کے بعد ایک

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۱۰۰، کتاب الفتن، باب فتنۃ تموج کالبحر / ح: ۳۷۷۲، کتاب المناقب، باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۸۳، ط الرشد

② سنن الترمذی، ح: ۳۸۸۸، ابواب المناقب، باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا. قال الترمذی: ھذا حدیث حسن صحیح

③ تاریخ الطبری: ۴/ ۴۸۵ ..... یہ اصح قول ہے۔ بعض روایات کے مطابق لشکر کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تھی۔ (تاریخ طبری: ۴/۵۰۸ باسناد صحیح الی الزہری)

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۸۴، عن سعید بن جبیر بسند حسن

⑤ تاریخ الطبری: ۴/ ۴۸۷

ہی منزل کی یہ دو جماعتیں پھر الگ الگ راستوں پر ہو جاتیں۔

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا تردد:

اس دوران حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی حکمت عملی کامیاب نہیں رہی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان دنوں فرمایا کرتے تھے: ''یہ وہی فتنہ ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا تھا۔''

کسی نے کہا: ''آپ اسے فتنہ بھی کہتے ہیں اور اس میں لڑتے بھی ہیں۔''

فرمایا: ''دراصل ہم بہت غور کرتے ہیں لیکن حل سمجھ نہیں آتا۔ اب تک کوئی ایسا قضیہ پیش نہیں آیا تھا۔ پہلے ہر مہم میں ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ اب اگلا قدم کہاں رکھنا ہے، مگر اس مسئلے میں اب تک سمجھ نہیں آرہا کہ ہم آگے جارہے ہیں یا پیچھے؟''[1]

یہ تردد اس لیے تھا کہ یہ حضرات فقاہت اور اجتہاد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ نہیں تھے۔ یہ قضا اور سیاست کے نازک مسائل تھے جن میں سب سے زیادہ ادراک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تھا۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی تذبذب کے بغیر شرعی دلائل، اپنے اجتہاد اور سیاسی بصیرت کے ساتھ قدم اٹھا رہے تھے۔ جبکہ دیگر حضرات بار بار تذبذب کا شکار ہو رہے تھے۔

حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی کامیاب سفارت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی سفارتکارانہ صلاحیتوں کو بھانپتے ہوئے اور ان کی امت کے حق میں خیر خواہی کا درست اندازہ لگاتے ہوئے انہیں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی طرف سفیر بنا کر بھیجا اور فرمایا:

''انہیں محبت اور اتحاد کی دعوت دینا اور انتشار کے نقصانات سے ڈرانا۔''

حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ پہلے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ملے اور عرض کیا:

''امی جان! آپ کس مقصد سے یہاں تشریف لائی ہیں؟''

انہوں نے فرمایا: ''بیٹا! لوگوں کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے۔''

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اس مقصد سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی مجلس میں تشریف لانے کی دعوت دی اور ان سے کہا: ''ام المؤمنین اپنی آمد کا مقصد لوگوں کی اصلاح بتاتی ہیں۔ آپ اس بارے میں ان سے متفق ہیں یا مخالف؟''

دونوں نے فرمایا: ''ہم متفق ہیں۔''

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو اس اصلاح کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے؟''

دونوں نے فرمایا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو پکڑنا۔ اس قضیہ کو پسِ پشت ڈالنا قرآنِ مجید کو ترک کرنے کے مترادف ہے، اس کو حل کرنا حکمِ قرآنی کو زندہ کرنا ہے۔''

[1] تاریخ الطبری: ۴/۴۸۶



حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے برجستہ کہا: ''آپ نے بصرہ کے قاتلینِ عثمان کو قتل کر دیا ہے مگر آپ نے ان میں سے چھ سو کو مارا تو چھ ہزار آدمی آپ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بچ نکلنے والے واحد آدمی حُرقُوص بن زہیر کی حمایت میں چھ ہزار افراد کھڑے ہو گئے۔ اب اگر آپ اس شخص کو نظر انداز کرتے ہیں تو آپ خود قصاص کے مسئلے کو پسِ پشت ڈالنے والے بنیں گے۔ اگر اس کی حمایت کرنے والوں سے بھی آپ جنگ کریں گے تو جس خانہ جنگی سے امت کو بچانے کے لیے آپ نکلے ہیں، آپ خود اس میں ملوث ہو جائیں گے۔''[1]

یہ وہ تلخ حقائق تھے، جن کا احساس خود حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کو بھی تھا۔ اس لیے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کے اس حقیقت کشا تبصرے کو سن کر ام المؤمنین نے دریافت کیا:

''آپ ہی بتائیے، آپ کیا کہتے ہیں؟''

فرمایا: ''میں سمجھتا ہوں کہ اس قضیے کا حل یہ ہے کہ حالات کو پرسکون ہونے دیا جائے۔ حالات معمول پر آئیں گے تو فتنہ پروروں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ اگر آپ بیعت کر لیں تو یہ خیر کی علامت اور رحمت کی بشارت ہو گی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جا سکے گا۔ اگر آپ متفق نہ ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون ضائع ہو جائے گا۔ یہ معاملہ کوئی عام مقدمہ نہیں، یہ کسی ایک فرد کا قتل نہیں، جسے کسی ایک شخص، ایک گروہ یا ایک قبیلے نے قتل کر دیا ہو۔''

ام المؤمنین اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے بات کے وزن کو مانتے ہوئے اس سے پوری طرح اتفاق کیا اور کہا: ''اگر حضرت علی تشریف لے آئیں اور وہ یہی رائے رکھتے ہوں تو بات بن جائے گی۔''

قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آگاہ کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبائیوں سے لاتعلقی کا اعلان:

اہل بصرہ سے صلح کا امکان روشن ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ اب معاملات سلجھنے والے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ اب مخلص لوگوں کو کسی غلط فہمی اور اوباشوں کو کسی خوش فہمی میں مبتلا رکھنا درست نہیں۔ اس دوران بصرہ سے لوگ آ کر کوفہ والوں سے مل رہے تھے اور اتحاد و اتفاق کی ایک خوش گوار فضا قائم ہو گئی تھی۔

اس روح پرور ماحول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجمع عام سے بے لاگ خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

① تاریخ الطبری: ۴۸۸/۴، ۴۸۹

ان حضرات کے مطابق صرف مہلک وار کر کے خلیفہ کو مارنے والے ہی واجب القتل نہیں تھے بلکہ قاتل گروہ کے حامی، ہمدرد، مددگار بھی پر قصاص لاگو ہوتا تھا۔ اسی لیے بصرہ میں ان تمام لوگوں کو چن چن کر قتل کیا گیا تھا جو شورش کے لیے مدینہ گئے تھے چاہے وہ براہ راست قتل میں شریک تھے یا نہیں تھے۔

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ اگر قاتلوں کے مددگاروں سے بھی قصاص لینا شرعاً واجب مانا جائے تو اب اس گروہ کے نئے مددگاروں پر بھی قصاص لاگو ہونا چاہیے، چاہے یہ اضافہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہو۔ اور اگر یہاں توقف اور تامل کی گنجائش ہو گی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہی گنجائش کیوں نہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ہی حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کو سفیر بناتے وقت ایسے ٹھوس دلائل سمجھائے ہوں گے ورنہ قعقاع رضی اللہ عنہ بذاتِ خود علم و فضل میں عشرہ مبشرہ اور ام المؤمنین کے ہم پلہ نہیں تھے۔ ہاں گفتگو کے سلیقے اور عربی عبارت میں وہ بلاشبہ قابلِ رشک تھے۔

② تاریخ الطبری: ۴۸۹/۴

''جو سانحہ پیش آیا تھا، اس کے ذمہ دار وہ لوگ تھے جو دنیا پرست تھے اور اللہ کی طرف سے کچھ بندوں کو ملنے والی فضیلت پر حسد کرتے تھے۔ وہ نظام اور معاملات کو الٹ پلٹ کر دینا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کو پورا کرنے والا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے وہ مصیبت آ کر رہتی ہے۔ بہرحال میں کل (بصرہ والوں کے پاس) جا رہا ہوں۔ تم سب چلنا، ہاں! مگر جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی بھی قسم کی سرگرمی میں ملوث رہے ہوں، وہ ہرگز میرے ساتھ نہ چلیں، ایسے بے وقوف لوگ خود کو مجھ سے الگ تصور کریں۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اعلان سے جہاں مخلص مسلمانوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، وہیں سازشی عناصر ہکا بکا رہ گئے۔

ابن سبا کی خفیہ مشاورت اور نئی سازش:

عبداللہ بن سبا جو لشکر میں موجود تھا، اپنی جماعت کے دوسرے سرغنوں کے ساتھ فوراً سر جوڑ کر بیٹھا۔[2] یہ سب اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچنے لگے۔ ایک نے کہا: ''یہ علی کیا کہہ رہے ہیں؟ اللہ کی قسم! عثمان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں میں وہ قرآنِ مجید کے سب سے بڑے عالم اور باعمل انسان ہیں، تم سن چکے ہو کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں۔ وہی لوگ اب ان کے ساتھ جائیں گے جو عثمان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ جب سب لوگ ہمیں نشانہ بنائیں گے تو ہم تھوڑے سے لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟''

دوسرا جھلا کر بولا: ''طلحہ اور زبیر ہمارے بارے میں جو سوچتے ہیں وہ ہم پہلے سے جانتے تھے، مگر علی کی رائے کا ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ اللہ کی قسم! ان سب کی رائے ہمارے بارے میں ایک ہی ہے، اگر علی نے ان کے ساتھ صلح کی تو یہ صلح ہمارا خون بہانے کی شرط پر ہوگی۔ تو اب ایسا کرتے ہیں علی کو بھی عثمان کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔''

عبداللہ بن سبا نے تردید کرتے ہوئے کہا: ''بالکل غلط! علی کو قتل کیا تو بدلے میں ہم سب مارے جائیں گے۔ تم یہاں صرف پچیس یا چھبیس سو ہو۔ اُدھر طلحہ اور زبیر پانچ ہزار کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کا مقصد ہی تمہیں قتل کرنا ہے۔ ہم اُن سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

علباء بن ہیثم کہنے لگا: ''کسی دور سرزمین کی طرف بھاگ چلو جہاں ہم دوسروں کے ساتھ مل کر اپنا دفاع کرسکیں۔''

---

① تاریخ الطبری: ۴/۴۹۳

② عبداللہ بن سبا کی خفیہ مشاورت کی یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ آخر اس قدر خفیہ مشاورت کی اطلاع راوی کو کیسے ہوئی؟ لیکن اس کے باوجود عموماً مؤرخین نے اس روایت کو قبول کیا ہے؛ کیوں کہ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایسی کسی منصوبہ بندی کی تصدیق کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس گروہ کے کسی شخص نے توبہ تائب ہو کر بعد میں یہ بات راویوں تک پہنچادی ہو۔ یاد رہے کہ طبری کی اسی ضعیف روایت میں ان سرغنوں میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی ہے جو بالکل غلط ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا سبائی جماعت سے کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ تو سبائیوں سے سخت نالاں تھے، وہ کوفہ چھوڑ کر اسی لیے قرقیسیا جا کر بس گئے تھے کہ کوفہ میں اس قسم کے لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کیا کرتے تھے۔ (تاریخ بغداد: ۱/۲۰۴) چونکہ سند میں ضعیف راوی موجود ہیں اس لیے انہی میں سے کسی نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا نام بڑھا دیا ہو۔ اس خفیہ مشاورت میں اشتر نخعی کا نام بھی آتا ہے، سند کی کمزوری کے پیش نظر یہ بھی محل نظر ہے کیونکہ جمہور علمائے جرح وتعدیل نے اشتر نخعی کو ثقہ راوی مانا ہے۔ بلاشبہ وہ سرپھرا آدمی تھا مگر اس کا عبداللہ بن سبا کے ساتھ سازشوں کی منصوبہ بندی شریک ہونا مشکل لگتا ہے۔ اگر وہ عبداللہ بن سبا کا اس قدر خاص مہرہ ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے اہم فوج کی سالاری جیسے اہم عہدے نہ دیتے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ مذکورہ روایت میں کسی سبائی راوی ہی نے اشتر نخعی کا نام بڑھا دیا ہو۔ مشاہیر کو اپنا ہم مذہب باور کرانا سبائیوں کا خاص حربہ ہے۔

عبداللہ بن سبا نے فوراً کہا: ''بالکل فضول رائے ہے۔ ایسا کرو گے تو لوگ تمہیں نوچ نوچ کر ختم کر دیں گے۔''

شُریح بن اوفی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''جس کام کو جلد کرنا ہے اس میں دیر نہ کرو، ہم لوگوں کی نظر میں بدترین حیثیت کے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ کل باہم متحد ہونے کے بعد ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔''

سالم بن ثعلبہ نے کہا ''اب تو یہی کرنا ہوگا کہ لوگوں میں بکھر کر ان پر تلواریں چلا دیں تا کہ ان کے سارے معاملات تلوار کی دھار پر حل کیے جائیں۔'' ابن سبا خوش ہو کر بولا ''یہ ہوئی نا بات۔''

پھر اس نے فیصلہ سنایا: ''لوگوں سے گھل مل کر رہنے ہی میں سلامتی ہے۔ جب لوگ آپس میں مل جل رہے ہوں تو اچانک جنگ چھیڑ دو۔ انہیں غور وفکر کے لیے آرام سے مل بیٹھنے کا موقع ہی نہ دینا، پھر لوگوں کے لیے جنگ سے بچنا ممکن نہیں رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ علی، زبیر، طلحہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کو ایسے اقدامات کرنے کی نوبت ہی نہیں آسکے گی جن سے ہمیں تشویش ہو۔'' اس تجویز پر سب متفق ہو گئے اور منصوبہ بندی کر کے بکھر گئے۔ [1]

بصرہ کے لشکر میں جذباتی اور مفاد پرست لوگ:

کچھ جذباتی اور مفاد پرست لوگ حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے گرد بھی جمع تھے جن کا مقصد ہنگامہ آرائی کرنا، جنگ کو بھڑکانا اور اپنے مفادات سمیٹنا تھا۔ ایک دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کی ہلڑ بازی سے تنگ آئے تو خاموش ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگ رکنے میں نہ آئے تو رنج وحسرت سے بے قرار ہو کر فرمایا:

''افسوس صد افسوس! یہ لوگ تو لالچی مکھیوں اور آگ میں گرنے والے پتنگوں جیسے ہیں۔'' [2]

اسی قسم کے لوگ دونوں جماعتوں میں جنگ برپا ہونے کی وجہ بنے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سبائیوں سے بے زاری کے اعلان کے ردِّ عمل میں ابن سبا اور اس کے گماشتوں کی اگلی سازش کو دیکھ کر آج یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اگر امیر المؤمنین اپنے دلی تاثرات کو مزید چند دن چھپائے رکھتے تو کیا حرج تھا، اس اعلان سے تو سبائی چوکنا ہو گئے۔ اگر حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے حامیوں کے ساتھ مکمل ملاپ کے بعد یہ اعلان ہوتا تو کیا نقصان تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مجمع عام میں ایسا اعلان کیے بغیر اتحاد واتفاق کی عمومی فضا بننا بہت ہی مشکل تھا۔ بصرہ والے ایسے اعلانِ برأت کے بغیر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ مسئلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے اختلاف کا نہیں رہا تھا، بلکہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے اختلافِ رائے تک جا پہنچا تھا۔ اگر اب حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسا اعلان نہ کرتے تو رائے عامہ کا دباؤ حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما

---

[1] تاریخ الطبری: ۴/۴۹۳، ۴۹۴

[2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۸۲

کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صلح پر آمادہ نہ ہونے دیتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ سے بصرہ تک:

قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی سفارت سے مفاہمت کی امید پختہ ہوگئی تھی، مگر باقاعدہ صلح یا اتحاد نہیں ہوا تھا۔ معاملات کی تکمیل کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ سے روانہ ہوئے اور جمادی الآخرہ میں بصرہ کے سامنے پہنچ گئے۔ ①

صحیح قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نو ہزار سات سو (۹۷۰۰) افراد تھے۔ ان کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ہم مدینہ سے سات سو افراد چلے تھے، کوفہ سے سات ہزار افراد ہمارے ساتھ ہو لیے۔ راستے میں اردگرد سے مزید دو ہزار افراد شامل ہوئے جن کی اکثریت قبیلہ بکر بن وائل سے تعلق رکھتی تھی۔'' ②

دونوں جماعتیں آمنے سامنے آئیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یاد دلایا کہ وہ ایک دن ناحق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل آئیں گے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حدیث یاد آگئی، چنانچہ یہ مہم چھوڑ دینے کی قسم کھائی اور وہاں سے جانے لگے۔ ③

ان کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو عرض کیا: ''آپ علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے تو آئے ہی نہیں۔ آپ کا مقصد اصلاح ہے۔ اس لیے یہیں ٹھہریے۔ اللہ آپ کے ذریعے دونوں جماعتوں کو متحد فرما دے گا۔''

وہ بولے: ''میں قسم کھا چکا ہوں کہ ان کا مقابلہ نہیں کروں گا۔''

صاحبزادے نے اصلاحِ امت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے مشورہ دیا: ''قسم کے کفارے میں ایک غلام آزاد کر دیں اور اس وقت تک رکے رہیں جب تک مسلمانوں میں (عملی طور پر) اتحاد (وانضمام) نہیں ہو جاتا۔''

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ پسند آیا اور وہیں ٹھہر گئے۔ ④ دونوں جماعتوں نے آمنے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ دونوں طرف سے مسلمان ایک دوسرے کے خیموں میں آ آ کر ملنے ملانے لگے۔ ⑤

اکابر کی باہمی ملاقات اور صلح کا اعلان:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھیج کر طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا: ''کوئی ایسی بات ہے جو میری خلافت سے ناراضی کا باعث ہو، مثلاً کسی فیصلے میں ناانصافی یا وظائف میں حق تلفی کا اعتراض یا اور کچھ؟''

انہوں نے بڑی صفائی سے جواب دیا: ''ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں۔'' ⑥

اب دونوں کیمپوں کے بیچ ایک بڑا خیمہ لگا دیا گیا جس میں حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

---

① تاریخ الطبری: ۵۰۶/۴

② تاریخ الطبری: ۵۰۵/۴، بسند حسن عن محمد بن الحنفیہ ...... ضعیف روایات میں یہ تعداد مبالغہ آمیز حد تک زیادہ ہے۔

③ مستدرک حاکم، ح: ۵۵۷۴ صححہ الذہبی

④ مستدرک حاکم، ح: ۵۵۷۵

⑤ تاریخ الطبری: ۵۰۶/۴ ⑥ فضائل الصحابۃ للامام احمد بن حنبل، ح: ۱۰۱۵ بسند حسن، ط الرسالۃ



باہم ملاقات کی، تین دن تک یہ حضرات اس خیمے میں ملتے اور مشاورت کرتے رہے۔ انہوں نے طے کرلیا کہ باہمی کوئی جنگ نہیں ہوگی اور صلح وصفائی سے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے اپنی شرعی ذمہ داریاں پوری کی جائیں گی۔ [1]

صلح اور اتفاق کا اعلان ہوجانے سے دونوں جماعتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، مگر اس دوران فسادی گروہ شرانگیزی کی تیاری مکمل کرچکا تھا۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ اگر امن وامان کی فضا مزید برقرار رہی تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔

چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ خفیہ طور پر رات کے اندھیرے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نکل کر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے پڑاؤ میں چلے گئے، چونکہ دونوں طرف سے اب کسی کی آمدورفت پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی، اس لیے ان کا دوسرے پڑاؤ میں گھس جانا ذرا بھی مشکل ثابت نہ ہوا۔ [2]

x x x

جنگِ جمل

اس کے بعد یکایک اگلے دن فریقین میں جنگ چھڑ گئی، حالاں کہ اس کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس لڑائی کو جنگِ جمل کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس دوران حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں جس کے گرد لڑائی کا زیادہ زور تھا۔

صحیح السند احادیث سے ثابت شدہ امور:

لڑائی کی تفصیل سے پہلے اتنا جان لیں کہ اس بارے میں حدیث کی صحیح روایات سے درجِ ذیل امور ثابت ہیں:

● حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ سے حتی الامکان توقف کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر کی طرف سے جنگ چھیڑی گئی۔ [3]

● حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے حکم سے جنگ چھڑنا ثابت نہیں بلکہ عینی شاہد کے مطابق صلح کا ماحول قائم تھا کہ اچانک دونوں طرف کے لشکروں کے کچھ نوجوان نکلے اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہا، پھر تیر چلنا شروع ہوئے۔ دونوں لشکروں کے غلام بھی ان میں شامل ہوگئے، ناسمجھ لوگ بھی لڑائی میں کود پڑے۔ [4]

● اصل لڑائی زوال کے وقت شروع ہوئی تھی اور معاملہ قابو سے باہر ہونے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی کارروائی کا حکم دیا جس کے بعد فریقین میں نیزوں اور تلواروں سے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ [5]

① مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۷۷، ط الرشد ؛ تاریخ الطبری: ۵۰۶/۴

② تاریخ الطبری: ۵۰۶/۴ عن سیف

③ شرح معانی الآثار للطحاوی، ح: ۵۱۱۲، کتاب السیر، هذه الروایة عن شاهد عیان زید بن وهب من اصحاب علی رضی اللہ عنہ

④ مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۳۷۷۵۷ بسند صحیح، هذه الروایة ایضاً عن شاهد عیان عاصم بن کلیب من اصحاب علی رضی اللہ عنہ، وانظر تاریخ الطبری: ۴۹۲/۴ عن عاصم بن کلیب

⑤ مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۷۷۷۷ بسند صحیح، عن عبد خیر وهو من کبار اصحاب علی رضی اللہ عنہ ولفظ الروایة ای صیغة الجمع المتکلم یدل علیٰ انه شریک فی المعرکة.

● جنگ مختصر تھی، ظہر تا عصر جاری رہی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ختم ہوگئی۔ [1]

تاریخی تفصیلات:

تاریخی تفصیلات کے مطابق لشکرِ بصرہ میں شامل ہونے والے سبائیوں نے منصوبے کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پڑاؤ پر حملہ بول دیا۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل سبائیوں نے حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے حامیوں پر حملہ کردیا اور مسلسل تیروں کی بارش کی۔ ہر شخص یہی سمجھا کہ دوسرے فریق نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اچانک حملہ کردیا ہے چنانچہ دونوں جماعتوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل چل مچ گئی۔ [2]

حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے ہنگامہ برپا دیکھ کر وجہ دریافت کی تو بتایا گیا: ''اہل کوفہ نے حملہ کردیا ہے۔''

دراصل سبائی گروہ غلط اطلاعات پھیلانے کی منصوبہ بندی بھی کر چکا تھا، انہوں نے ایک آدمی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریب بھی مقرر کیا ہوا تھا تاکہ وہ انہیں غلط خبریں دے، چنانچہ جب ہنگامے کا شور سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ماجرا پوچھا تو انہیں بھی جواب میں یہی سننے کو ملا: ''بصرہ والوں نے اچانک ہم پر شب خون مارا ہے۔''

اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے احتیاط سے کام لیا اور جنگ کو رکوانے کی کوشش کرتے ہوئے آواز لگائی:

''لوگو! اپنے ہاتھ روک لو۔'' [3]

مگر تلواریں جو نیاموں سے نکل چکی تھیں، رکنے میں نہ آئیں۔

سمجھ دار لوگ دونوں طرف سے احتیاط کر رہے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے نیزے کی زد میں آگئے تو پوچھا: ''آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بولے: ''نہیں، آپ چلے جائیں۔'' [4]

غرض اسی طرح بہت سے لوگ ہاتھ روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سبائی، فسادی، نادان اور جوشیلے لوگ دونوں طرف متحرک ہو چکے تھے اس لیے مجبوراً بہت سے لوگوں کو اپنے دفاع کے لیے لڑنا پڑ رہا تھا۔ [5]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ سے ہٹ گئے:

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے لڑائی کو بڑھتے دیکھا تو میدانِ جنگ سے نکل جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کیوں کہ انہوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ مزاحمت کی صورت میں ان کے ہاتھوں کسی مسلمان کا خون ہوجانا بعید نہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے

---

① مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۳۳، باب مسیر عائشۃ و علی وطلحۃ والزبیر رضی اللہ عنہم، عن زید بن وھب، ح: ۳۷۷۵۷، بسند صحیح، ھذہ الروایۃ ایضاً عن شاھد عیان عاصم بن کلیب وھو من اصحاب علی رضی اللہ عنہ، ط الرشد

② تاریخ الطبری: ۴/۵۰۶، ۵۰۷ عن سیف،
اس روایت میں سبائیوں کے صبح منہ اندھیرے لڑائی چھیڑنے کا ذکر ہے مگر اس کی صحیح روایات سے تطبیق ہوسکتی ہے جو ہم آگے پیش کریں گے۔

③ تاریخ الطبری: ۴/۵۰۷ عن سیف

④ تاریخ الطبری: ۴/۵۱۲ عن عمر بن شبہ

⑤ تاریخ الطبری: ۴/۵۰۷ عن سیف، لہ "والسبئیۃ لا یفتر انشابا."

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: ''بیٹا! آج قتل ہونے والا ہر آدمی یا تو ظالم ہوگا یا مظلوم، مجھے یہ یقین ہے کہ میں مظلوم قتل کر دیا جاؤں گا۔''① یہ کہہ کر وہ میدانِ جنگ سے باہر تشریف لے گئے۔②

حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی شہادت:

جنگ کی ابتداء ہی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو ایک تیر آ کر لگا جس کے زخم سے وہ جامِ شہادت نوش کر گئے۔③

اس وقت ان کی عمر پچپن یا اٹھاون سال تھی۔④

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''الاعتقاد'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو جب تیر لگا تو جان کنی سے پہلے انہوں نے علوی لشکر کے ایک شخص کے ہاتھ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تجدیدِ بیعت کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یہ اطلاع دی گئی تو انہوں نے تکبیر بلند کی اور فرمایا: ''اللہ کو اس کے سوا کچھ منظور نہ تھا کہ وہ میری بیعت کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔''

اسی طرح جب انہیں خبر ملی کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ سے نکل گئے ہیں تو فرمایا:

''اللہ کی قسم! وہ بزدلی کی وجہ سے واپس نہیں گئے، بلکہ تائب ہو کر واپس ہوئے ہیں۔''⑤

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نرغے میں:

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میدانِ جنگ سے دور، بصرہ کی آبادی میں رہائش پذیر تھیں، بصرہ کے قاضی کعب بن سُور رحمہ اللہ نے آ کر انہیں اس المیے کی اطلاع دی اور کہا:

''آپ خود تشریف لے جا کر مسلمانوں کو تلواریں نیام کرنے کا حکم دیں شاید اللہ آپ کی بدولت صلح کی توفیق دے۔''

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۱۲۹، کتاب الجهاد، باب برکة الغازی فی ماله

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جب جنگ کی شدت دیکھی اور محسوس کیا کہ لوگ لڑے بغیر الگ ہونے والے نہیں تو فرمایا: ''میں مظلوم قتل کیا جاؤں گا۔'' اس لیے کہ انہوں نے لڑنے کا عزم نہیں کیا تھا۔ (عمدة القاری: ۱۵/۵۱، ط احیاء التراث)

یاد رہے کہ بعض ضعیف روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ لڑائی کے دوران حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو یکایک کسی نے آ کر بتایا کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں ہیں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس اچانک انکشاف پر میدانِ جنگ چھوڑ دیا۔ یہ روایت قابلِ قبول نہیں: کیوں کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ممتاز رفقاء میں سے ہونا ہر شخص کو پہلے سے معلوم تھا۔

② تاریخ الطبری: ۴/۵۳۴ عن سیف

③ متعدد روایات میں ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر مروان نے تیر چلایا تھا؛ کیوں کہ اسے شک تھا کہ وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھے۔ رمى مروان بن الحكم يوم الجمل طلحة بسهم. (مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۷۰ باسناد صحيح، ط الرشد)

سب سے بڑھ کر قصاصِ عثمان کی تحریک میں شامل مشہور تابعی قیس بن ابی حازم نے چشم دید روایت پیش کی ہے: رایت مروان بن الحكم حين رمى طلحة يومئذ بسهم۔ ابن سعد، طبرانی اور حاکم نے اسے نقل کیا ہے۔ علامہ ہیثمی اس کے متعلق کہتے ہیں: رجاله رجال الصحیح. (مجمع الزوائد، ح: ۱۴۸۲۲)

حافظ ابن حجر نے بھی اسے نقل کر کے سند کو صحیح کہا ہے۔ (الاصابة: ۳/۴۳۳، ط العلمیة)

حافظ ابن کثیر نے بھی مشہور قول اسی کو قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی اس بات کو ''اقرب'' کہا ہے کہ تیر کسی نامعلوم فرد نے مارا تھا۔ (البدایة والنهایة: ۱۰/۴۷۶)

حافظ ابن کثیر کا دوسرے قول کو ''اقرب'' کہنا محلِ نظر ہے؛ کیوں کہ اس کا راوی سیف بن عمر ضعیف ہے۔ (الفتنة ووقعة الجمل: ص ۱۵۷، تاریخ الطبری: ۴/۵۰۸) خلیفہ بن خیاط نے بھی اس دوسرے قول کو نقل کیا ہے مگر بلا سند، جبکہ پہلے قول کے لیے وہ صحیح روایات لائے ہیں۔ (تاریخ خلیفہ: ص ۱۸۱)

④ فتح الباری: ۷/۸۲

⑤ الاعتقاد للبیهقی، ص ۳۷۱

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اونٹ پر سوار میدانِ جنگ میں آئیں اور حضرت کعب کو قرآنِ مجید کا نسخہ دیتے ہوئے فرمایا: ''آپ اللہ کی کتاب لے کر آگے بڑھیے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیجیے۔''

کعب بن سُور قرآنِ کریم کے اوراق کھول کر آگے ہوگئے۔ وہ قرآنِ مجید کے حکم پر صلح کرنے کی دعوت دے رہے تھے کہ سبائیوں نے بے دریغ تیر برسا کر انہیں قتل کر دیا۔ [1] اس کے بعد ام المؤمنین پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ آپ اونٹ پر ہودج میں تشریف فرما تھیں۔ ہودج کے گرد احتیاطاً زرہیں لٹکا دی گئی تھیں پھر بھی خطرہ شدید تھا۔ [2]

ام المؤمنین اپنی جان کو فراموش کر کے اب بھی جنگ بندی کی تلقین کرتے ہوئے پکار رہی تھیں:

''اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو! میرے بیٹو! حساب کتاب کے دن کو یاد کرو۔''

مگر لوگ حملے سے باز نہ آئے، تب ام المؤمنین نے ہاتھ بلند کر کے قاتلینِ عثمان اور ان کے حامیوں کے لیے بددعائیں کرنا شروع کیں۔ آپ کے حامی اس پکار پر زور زور سے آمین کہہ رہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ آوازیں سنائی دیں تو پوچھا ''یہ گونج کیسی ہے؟''

لوگوں نے بتایا کہ ام المؤمنین اور ان کے حامی قاتلینِ عثمان اور ان کے ساتھیوں پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر خود بھی آواز لگائی: ''الٰہی! عثمان کے قاتلوں اور قاتلوں کے حامیوں پر لعنت کر۔'' [3]

اس دوران لڑائی کا دائرہ ہر طرف پھیل گیا تھا مگر سب سے شدید جنگ میدانِ جنگ کے اس حصے میں جاری تھی جہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں۔ حملہ آور محافظوں سے اونٹ کی لگام چھین کر ام المؤمنین کو اپنے جھگٹے میں لے جانا چاہتے تھے مگر ام المؤمنین کے گرد پروانہ وار مزاحمت کرنے والے کم نہ تھے۔

ام المؤمنین اب بھی جنگ سے گریز چاہتی تھی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے جواں سال صاحبزادے محمد اونٹ کی لگام تھامے پوچھنے لگے: ''امی جان! کیا حکم ہے؟'' فرمایا: ''آدم کے دو بیٹوں میں سے نیک بیٹے کی طرح بن جاؤ۔''

مگر حضرت محمد بن طلحہ لوگوں کو ام المؤمنین پر براہِ راست حملہ آور دیکھ کر کہاں ہٹ سکتے تھے، وہ چٹان کی طرح جم گئے اور ''حٰمٓ لا یُنصَرُوْن'' کا نعرہ لگا کر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ [5]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۸۵؛ تاریخ الطبری: ۵۱۳/۴

② تاریخ الطبری: ۵۱۳/۴

③ تاریخ الطبری: ۵۰۷/۴

④ تاریخ الطبری: ۵۱۳/۴، ۵۱۴ ...... یہاں یہ اشکال نہ ہو کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کو ساتھ بھی لیے ہوئے تھے اور ان پر لعنت بھی کر رہے تھے، یہ کوئی دورخی پالیسی تھی یا وہ مجرموں کے سامنے بے بس تھے۔'' دراصل یہ قضاءً اور دیانۃً کا فرق تھا۔ اصل قاتل تو بہرحال قابلِ لعنت اور قابلِ قصاص تھے جبکہ ان کے حامی یعنی سابقہ باغی چاہے بیعت کر کے قضاءً مامون ہو گئے ہوں تاہم اگر وہ دل سے تائب نہ ہوئے ہوں تو دیانۃً وہ معتوب، قابلِ ملامت اور قابلِ لعنت تھے۔

نوٹ: قضاءً سے مراد کسی مسئلے کی وہ شکل ہوتی ہے جو ظاہری دلائل اور شواہد سے ثابت ہو۔ حکمران یا قاضی اسی کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ دیانۃً سے مراد کسی مسئلے کی وہ شکل ہے جو مسئلے میں مبتلا فرد کے نزدیک ثابت ہے یا اللہ کے علم میں ہے، چاہے اس کا کوئی عدالتی ثبوت نہ ہو۔ آخرت میں فیصلہ اسی حالت کے مطابق ہوگا۔ مزید تفصیل کتبِ فقہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۳۶۶/۱۰



ان کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عتّاب اور پھر حضرت اسود بن ابوالبَختَری نے لگام تھامی اور زخمی ہو کر گرے۔ تب زخموں سے چور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دوڑ کر آئے اور لگام تھام لی۔ تب تک انہیں سینتیس زخم لگ چکے تھے۔

اتنے میں مالک بن اَشتَر نخعی سے ان کا سامنا ہوا۔ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے اور لڑتے لڑتے شدید زخمی ہو کر زمین پر گر گئے۔ دونوں کے حامیوں نے آگے آ کر انہیں کھینچا۔[1] مروان بن الحکم نے بھی اس لڑائی میں ام المؤمنین کی حفاظت کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے شانہ بشانہ زخم کھائے تھے۔[2]

قبیلہ بنو بکر بن وائل، بنو ناجیہ اور بنو ضَبّہ کے دلیر لپک لپک کر اونٹ کی لگام تھامتے رہے۔ جو بھی یہ ذمہ داری لیتا، حملہ آور اس کے ہاتھ پر وار کر کے کلائی کو کہنی سے الگ کر دیتے، پھر اسے قتل کر دیتے، اس طرح یکے بعد دیگرے ستر افراد نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔[3]

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے دفاع میں بنو ضَبّہ کے قائد بصرہ کے سابق قاضی ابن یثربی نے زبردست دلیری کا ثبوت دیا۔ وہ ام المؤمنین کے اونٹ کے آگے گھوڑے پر سوار تھے۔ ان پر ہند بن عَمرو مرادی اور پھر علباء بن ہیثم حملہ آور ہوئے، قاضی ابن یثربی نے دونوں کو آگے پیچھے مار گرایا۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لڑائی کی شدت دیکھی کہ سر کندھوں سے لڑھک رہے تھے، تو بے چین ہو کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''آج کے بعد بھلا کس خیر کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

وہ بولے: ''میں نے آپ کو شروع ہی میں اس سے منع کیا تھا۔''[5]

جنگ کا اختتام:

اس دوران حضرت قَعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رائے دی کہ کسی طرح ام المؤمنین کے اونٹ کو گرا دیا جائے کیوں کہ اہلِ بصرہ اب فقط ام المؤمنین کے دفاع کے لیے لڑ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تجویز کو پسند فرمایا، حضرت قَعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ، بُجَیر بن دُلجہ نامی ایک شخص کو لے کر آگے بڑھے جس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جماعت میں شامل اپنے بھائی عَمرو بن دُلجہ کو پکارا۔ وہ پاس آئے تو یہ حضرات اپنے لیے امان حاصل کرنے کے

---

① تاریخ الطبری: ۵۱۹/۴

② تاریخ الطبری: ۵۳۰/۴

③ البدایۃ والنہایۃ: ۳۶۳/۱۰، ۳۶۴

④ تاریخ الطبری: ۵۲۹/۴، ۵۳۰ ...... قاضی یثربی اس وقت یہ رجز پڑھ رہے تھے:

اَلْمَوْتُ أَحْلٰی عِنْدَنَا مِنَ الْعَسَلِ ...... نَحْنُ بَنُوْضَبَّةَ اَصْحٰبُ الْجَمَلِ
نَحْنُ بَنُو الْمَوْتِ اِذَا الْمَوْتُ نَزَلْ ...... نَنْعٰی ابْنَ عَفَّانَ بِاَطْرَافِ الْاَسَلْ
رُدُّوْا عَلَیْنَا شَیْخَنَا ثُمَّ بَجَلْ

ترجمہ: موت ہمارے نزدیک شہد سے زیادہ میٹھی ہے، ہم یعنی بنو ضبہ یوم جمل والے ہیں۔ ہم موت والے ہیں جب موت آ جائے، ہم نیزوں کی نوکوں سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر دیتے ہیں۔ ہمیں ہمارے شیخ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) لوٹا دو، بس ہمیں یہی کافی ہے۔ (انساب الاشراف: ۲۱۲/۳)

⑤ المستدرک للحاکم، ح: ۵۵۹۸

بعد اونٹ تک گئے، حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ یہ اعلان کرتے ہوئے آگے بڑھے کہ تم سب کو امن دیا جاتا ہے، چنانچہ اہلِ بصرہ نے بھی ہاتھ روک لیے۔[1] حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے ساتھ عبداللہ بن بُدَیل بھی تھے۔ انہوں نے ہودج کے پاس جا کر پکارا: ''ام المؤمنین! آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے دن خود مجھے کہا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن تھامو۔ اللہ کی قسم! ان میں کوئی تغیر ہوا ہے نہ تبدیلی۔'' ام المؤمنین خاموش رہیں۔

تب عبداللہ بن بُدَیل نے کہا: ''اونٹ کے پاؤں کاٹ ڈالو۔'' ان کے ساتھیوں نے حکم کی تعمیل کی۔[2] محمد بن ابی بکر اور عبداللہ بن بُدَیل نے ہودج کو گرنے سے قبل سنبھال لیا اور اسے اٹھا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے۔

انہوں نے ام المؤمنین کو پوری عزت و تکریم کے ساتھ ہودج سے نکال کر ایک خیمے میں منتقل کرایا۔ پھر خود تشریف لائے اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی خیریت معلوم کی۔ ساتھ ہی عرض کیا: ''امی جان! اللہ ہمیں بھی معاف فرمائے اور آپ کو بھی۔'' ام المؤمنین نے بھی جواباً کہا: ''اللہ ہماری اور آپ کی مغفرت فرمائے۔''[3]

یہ جنگ جو حادثاتی طور پر شروع ہوئی تھی..... ایک ناگہانی آگ تھی جو یکدم بھڑکی اور بجھ گئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اہلِ جمل سے برتاؤ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کے اختتام پر ایک مہربان اور خدا ترس حکمران کا کردار پیش کیا اور حکم دیا کہ کسی زخمی کو قتل نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، جو ہتھیار رکھ دے اسے امن دیا جاتا ہے۔

مروان بن حکم کا بیان ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ مہربان فاتح کوئی نہیں دیکھا۔ جنگ جمل میں جب ہمیں شکست ہوئی تو ان کی طرف سے منادی نے پکارا: ''بھاگنے والے کو قتل نہ کیا جائے، زخمی کو نہ مارا جائے۔''[5]

آپ رضی اللہ عنہ نے تمام مقتولین کو یکساں مرتبہ دیا اور اُن کی نماز جنازہ پڑھائی۔[6] حریف کے سامان کو مالِ غنیمت قرار نہیں دیا، بلکہ گم شدہ اموال کی حیثیت دے کر کہا کہ جس کسی کی جو چیز ہو، وہ نشانی بتا کر لے جائے۔[7]

تشدد پسند لوگوں کے اصرار کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ بصرہ کے اموال لوٹنے کی اجازت نہ دی۔

کسی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: ''جن کا خون حلال ان کا مال ہمارے لیے حرام کیوں؟''

اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طیش میں آکر کہا: ''کون ہے جو اپنی ماں ام المؤمنین کو اپنے حصے میں لینا چاہتا ہے؟''

---

① تاریخ الطبری: ۵۲۷/۴

② مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۳۱، ط الرشد

③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۳۱، ط الرشد

④ تاریخ الطبری: ۵۳۳/۴

⑤ کتاب الام للامام الشافعی: ۲۲۹/۴، ط المعرفۃ، وھکذا روی عن عبد خیر (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۷۹۰)

⑥ تاریخ الطبری: ۵۳۸/۴

⑦ قال: یا خیر من عرف شیئا فلیاخذہ. (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۳۳ ، ح: ۳۷۸۱۶، ط الرشد)

سب کے رنگ فق ہو گئے، آوازیں بلند ہوئیں: ''سبحان اللہ! وہ تو ہماری ماں ہیں۔''

پھر کسی کو یہ مطالبہ دھرانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ [1]

لڑائی کی تاریخ، دورانیہ اور مقتولین کی محتاط تعداد:

صحیح روایت کے مطابق لڑائی ظہر تا عصر نمٹ گئی تھی۔ غروبِ آفتاب تک تمام ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ [2]

جنگ کی تاریخ ۱۰ جمادی الآخرہ سن ۳۶ ہجری بتائی جاتی ہے۔ [3]

مقتولین کی تعداد میں راویوں نے نہایت مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس بارے میں درج ذیل اقوال مشہور ہیں:

① بعض نے بیس سے پچیس ہزار تک تعداد بتائی ہے، یہ تعداد صحیح روایات میں مذکور دونوں افواج کے مجموعے سے بھی متجاوز ہے۔ کیوں کہ محتاط روایات کے مطابق دونوں طرف کے لوگ مل کر بھی پندرہ ہزار سے کم تھے۔

حضرت محمد بن حنفیہ کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی تعداد نو ہزار سات سو تھی۔ [4]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ [5] اس طرح دونوں افواج کا مجموعہ پندرہ ہزار سے کم بنتا ہے۔ اس لیے مقتولین بھلا بیس پچیس ہزار کیسے ہو سکتے تھے؟

صحیح قول یہ ہے کہ فریقین کے تمام مقتولین تین ہزار کے لگ بھگ تھے۔ اہلِ کوفہ کے مقتولین پانچ سو تھے اور اہل بصرہ کے اڑھائی ہزار۔ [6]

مقتولین کی تعداد بیس پچیس ہزار تک نہ ہونے کا احتمال چند وجوہ سے مزید مضبوط ہوتا ہے:

① یہ شدید سردی کا موسم تھا، شمسی تاریخ پانچ دسمبر تھی، دن چھوٹا تھا۔ اصل لڑائی زوال کے بعد شروع ہوئی تھی اور سورج غروب ہونے سے قبل یعنی تقریباً پانچ بجے تک ختم ہو گئی۔ گویا جنگ کا دورانیہ تقریباً تین گھنٹے تھا۔

② اکثر لوگ کسی جوش وجذبے سے نہیں، خود کو بچانے کے لیے لڑ رہے تھے۔

③ لڑائی کے بعد کسی زخمی کو قتل نہیں کیا گیا نہ کسی کا تعاقب کیا گیا۔

④ روم وفارس سے بڑی بڑی لڑائیوں میں بھی بیس، پچیس ہزار مسلمان شہید نہیں ہوئے، حالانکہ وہ پورے جوش و

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۸۰ ح: ۳۷۸۳۳، ط الرشد

② فقاتلهم بعد صلاة الظهر فما غربت الشمس وحول الجمل عين تطرف ممن كان يذبه عنه. (مصنف ابن ابی شیبۃ ح: ۳۷۸۳۳)
دیگر تاریخی روایات میں فجر کے وقت سبائیوں کے حملے اور بل چل مچنے کا ذکر ہے۔ تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ لڑائی کے دو مرحلے تھے: پہلے مرحلے میں منہ اندھیرے سبائیوں کی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اِکا دُکا حملے ہوئے۔ آہستہ آہستہ بات پھیلی، انفرادی جھڑپیں اِدھر اُدھر شروع ہو گئیں۔ تیر اندازی بھی ہونے لگی۔ ظہر تک فریقین لڑائی پر کمربستہ ہو گئے۔ دوسرا مرحلہ اور شدید معرکہ ظہر کے بعد ہوا جب ام المؤمنین جنگ رکوانے کے لیے تشریف لائیں مگر اُن کے اونٹ کے گرد کشتوں کے پشتے لگے۔

③ مستدرک حاکم، ح: ۵۵۷۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۴۷۶/۱۰

④ تاریخ الطبری: ۵۰۵/۴ بسند حسن

⑤ تاریخ الطبری: ۴۹۴/۴ ⑥ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۸۶

خروش سے لڑی جانے والی جنگیں تھیں۔

⑤ جنگ غیر منظم انداز میں لڑی گئی تھی کیوں کہ اہلِ بصرہ کے قائد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ ابتدا ہی میں شہید ہو گئے تھے اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی جلد ہی میدان سے ہٹ گئے تھے، لہٰذا ایک بے قاعدہ جنگ میں اتنی خونریزی ہونا بعید از قیاس ہے کہ اتنی زیادہ لاشیں گر جائیں اور وہ بھی تین گھنٹے میں۔

جنگ کے بعد اکابرِ اُمت کا رنج وغم:

جنگ کے بعد ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس خونریزی پر افسوس کرتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا:

''کاش! میں بیس سال پہلے مرگئی ہوتی۔''①

اِدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی شدید دکھ تھا۔ کعب بن سُور رحمہ اللہ کی لاش کے پاس سے گزر ہوا تو ٹھہر گئے اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ تم حق پر قائم تھے، انصاف کا فیصلہ کرتے تھے۔'' ②

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبانی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادے محمد کی تعریف:

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی لاش میدان جنگ میں دیکھی تو رہا نہ گیا، سواری سے اتر پڑے، انہیں اپنی آغوش میں لیا، داڑھی اور چہرے سے مٹی صاف کی اور فرمایا:

''ابومحمد! اللہ تم پر رحم کرے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا ہے کہ تم کھلے آسمان تلے یوں پڑے ہو۔ الٰہی! اپنی تباہی اور لٹ جانے کی فریاد تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم! مجھے پسند ہے کہ بیس سال پہلے ہی مر گیا ہوتا۔'' ③

آپ نے اس موقع پر یہ اشک آور اشعار پڑھے:

فَتیً کَانَ یُدْنِیْہِ الْغِنیٰ مِنْ صَدِیْقِہٖ　　اِذَا مَا ھُوَ اسْتَغْنیٰ وَ یُبْعِدُہُ الْفَقْرُ

کَانَّ الثُّرَیَّا عُلِّقَتْ مِنْ جَبِیْنِہٖ　　وَفِیْ خَدِّہٖ الشِّعْریٰ وَفِی الْآخَرِ الْبَدْرُ

''یہ ایسا جوان تھا کہ خوشحالی اسے اپنے دوست کے قریب لے جاتی تھی جبکہ وہ دوست لاتعلق رہتا اور مفلسی کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار کیا کرتا۔ یہ ایسا شخص تھا کہ کہکشاں اس کی پیشانی میں ہے۔ اس کا ایک رخسار شعریٰ ستارے کی طرح اور دوسرا چودھویں کے چاند کی مانند ہے۔''④

لڑائی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن طلحہ عرف سجاد رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی لاش دیکھی تو بے اختیار "انّا للہ وانّا الیہ راجعون" پڑھی۔ پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! تم نیک وصالح نوجوان تھے۔''

---

① تاریخ الطبری: ۵۳۷/۴

② تاریخ الطبری: ۵۲۸/۴ بسند صحیح

③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۹۶، ط الرشد ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۷۳/۱۰ ؛ واخرجہ الھیثمی و قال اسنادہ حسن (مجمع الزوائد ح: ۱۴۸۲۳)

④ المستدرک للحاکم، ح: ۵۷۰۰



یہ کہہ کران کی لاش کے پاس ہی بیٹھ گئے اور رنج وغم آپ رضی اللہ عنہ کے چہرے سے ظاہر تھا۔ ①

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بصرہ میں بڑی جاگیروں کے مالک تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حفاظتی نقطہ نگاہ سے اپنی تحویل میں لے لیا۔ کچھ مدت بعد ان کے بیٹے عمران بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو یہ ساری جائیداد اُن کے حوالے کر دی اور فرمایا: ''ہمارا ارادہ ان پر قبضے کا نہیں تھا، اس ڈر سے انہیں سنبھال لیا تھا کہ لوگ قابض نہ ہو جائیں۔'' ②

یہ بھی فرمایا: ''امید ہے کہ میں، طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں شامل ہوں گے جن کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے:

وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ.

(ہم ان کے دلوں سے کدورت کو دور کردیں گے اور وہ تختوں پر آمنے سامنے بھائی بھائی بن کر بیٹھے ہوں گے) ③

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب کے بارے میں پوری وسعتِ ظرفی سے کام لیا۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ام المؤمنین نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں جانتی ہوں کہ تم ہمیشہ حق بات کہنے والے ہو۔''

وہ بولے: ''اللہ کی حمد ہے جس نے آپ کی زبان سے میرے حق میں گواہی دلوائی۔'' ④

زید بن صُوحان کون؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب لوگوں میں حضرت عمار بن یاسر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کرام کے علاوہ بڑے بڑے تابعین بھی تھے، ان میں سے کئی افراد اس معرکے میں جاں بحق ہوئے۔ زید بن صُوحان اور سَیحان بن صُوحان دو بھائی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاص مقرب تھے، معرکے کے شدید ترین مرحلے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے محافظوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ⑤

جنگ جمل میں لڑنے اور شہید ہونے والے اکثر صالحین تھے جو خود کو حق پر تصور کرتے ہوئے صرف اللہ کے دین کی خاطر لڑ رہے تھے۔ ہاں، سبائی جن کی نیت باطل اور ناپاک تھی، بری موت مرے اور کیفر کردار تک پہنچے۔

---

① مستدرک حاکم، ح: ۵۲۰۸ ② تاریخ دِمَشق: ۵۰۶/۳۳

③ مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۸۲۱، ط الرشد؛ فضائل الصحابة لاحمد بن حنبل، ح: ۱۲۹۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۹/۱

④ تاریخ الطبری: ۵۴۶/۴ ⑤ تاریخ الطبری: ۵۳۰/۴

حضرت زید بن صُوحان افواہوں سے متاثر ہو کر غلط فہمی کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک میں شریک ہو گئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال پر معترض کر کے شہر بدر بھی ہوئے تھے۔ جنگِ جمل میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ناصبی حضرات انہیں بے دریغ سبائی اور منافق کہتے ہیں۔ یہ اعتدال وانصاف کے خلاف ہے۔ ائمہ جرح تعدیل کے نزدیک وہ بالاتفاق جلیل القدر تابعی تھے۔ (الاصابة: ۵۳۲/۲، ط العلمیة؛ سیر اعلام النبلاء: ۵۲۵/۳، ط الرسالة) یہ الگ بات ہے کہ اثنا عشری انہیں اپنا ہم مذہب قرار دیتے ہیں اور انہیں رجال اثنا عشریہ میں گنتے ہیں مگر یہ تو ان کا پرانا حربہ ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے سینکڑوں نیک ہستیوں کو اپنے ائمہ اور اپنے مذہب کے راویوں اور بانیوں کے طور پر پیش کرتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ اتنی برگزیدہ ہستیاں بھی اثنا عشری تھیں تو یہی مذہب حق ہوگا۔ اب اگر اہل سنت واقعی ایسی ہستیوں کو رافضی سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگیں تو اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہوگا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ سے نکل کر مدینہ جانے والے راستے پر روانہ ہو گئے تھے۔ ایک بد بخت سبائی عُمرو بن جُرمُوز کو پتا چلا تو وہ اپنی ٹولی سمیت تعاقب کرنے لگا اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے قریب پہنچ کر نیزے کا وار کیا جس سے زبیر رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کو زخم آ گیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ فوراً سنبھل گئے اور جوابی حملہ کیا۔ اتنے میں عمرو بن جُرمُوز کے باقی ساتھی پہنچ گئے۔ سب نے مل کر حواریٔ رسول کو شہید کر ڈالا۔ [1]

عُمرو بن جُرمُوز اپنی مزید سنگ دلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے دھتکارتے ہوئے فرمایا: ''صَفِیّہ کے بیٹے کے قاتل کو جہنم کی بشارت ہو۔'' پھر فرمایا: ''ہر نبی کا ایک حواری (خاص جانثار) ہوتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری زبیر تھے۔'' [2]

عُمرو بن جُرمُوز حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی تلوار ساتھ لایا تھا۔ اسے دیکھ کر فرمایا:

''اللہ کی قسم! اس تلوار نے کتنی ہی بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے رنج و تکلیف کے آثار مٹا ڈالے تھے۔'' [3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اعزاز و اکرام:

جنگ کے بعد حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اور ان کے قافلے والوں کو جن میں زخمی لوگ بھی تھے، بصرہ میں ٹھہرایا اور ان کی دیکھ بھال کراتے رہے۔ ام المؤمنین کو شہر کی سب سے شاندار حویلی میں رہائش دی جو عبداللہ بن خلف کی تھی۔ [4] اس دوران امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو پتا چلا کہ دو آدمی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازیبا الفاظ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے انہیں گرفتار کرا لیا اور کپڑے اتروا کر ننگے بدن پر سو، سو کوڑے لگوائے۔ [5]

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۰۶۲۹؛ ح: ۳۷۷۹۸، ط الرشد.

② فضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل، ح: ۱۲۷۲؛ کنز العمال، ح: ۳۶۶۱۵

③ البدایۃ والنھایۃ: ۱۰/ ۴۸۲، ۴۸۳

ابن جُرمُوز کا انجام: ایک روایت کے مطابق ابن جُرمُوز نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ڈانٹ سننے کے بعد اسی وقت پیٹ میں تلوار گھونپ کر خودکشی کر لی تھی۔ (الثقات لابن حبان: ۲/ ۲۸۳) جبکہ راجح روایت کے مطابق وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک زندہ تھا۔ اس دور میں اس نے خود کو قصاص کے لیے پیش کیا مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کی جان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے جوتے کے تسمے کے برابر بھی نہیں۔ اس پر ابن جُرمُوز اتنا دل برداشتہ ہوا کہ خودکشی کر لی۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/ ۵۰۸، ت تدمری؛ ۲/ ۸۷۰، ت بشار)

غالباً حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے قصاص لینے سے انکار اس لیے کیا تھا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا قتل اگر ایک زاویۂ نگاہ سے قتلِ عمد تھا تو دوسرے لحاظ سے یہ جنگ کا تسلسل تھا اور ابن جُرمُوز نے انہیں تعاقب کی حالت میں قتل کیا تھا، اس طرح قاتل کو شبہ کا فائدہ مل رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ابن جُرمُوز کو صرف ڈانٹنے پر اکتفا کیا اور اس پر قصاص جاری نہیں کیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی احتیاط کا پہلو اختیار کیا اور ابن جُرمُوز کی اپنی طلب پر بھی قصاص نافذ نہ کیا مگر ساتھ ہی ابن جُرمُوز کو منع کرنے میں ایسی تعبیر اختیار کی تاکہ وہ احساسِ جرم سے بالکل عاری نہ ہو جائے اور عمر بھر توبہ استغفار کرتا رہے۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لے گا۔ بہرکیف اس فعل نے اس کے جہنمی ہونے کی اس وعید کی توثیق کر دی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنائی تھی۔

نوٹ: عمرو بن جُرمُوز کو عمیر بن جُرمُوز بھی لکھا گیا ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۱۲، ط صادر)

④ تاریخ الطبری: ۴/ ۵۳۹

⑤ تاریخ الطبری: ۴/ ۵۴۰

ام المؤمنین کی واپسی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حسنِ سلوک:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے اعزاز واکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان کی روانگی سے پہلے ان کی سواری، سامانِ سفر اور دیگر ضروریات کا بہترین انتظام کیا۔ بصرہ کے معزز گھرانوں کی چالیس خواتین کو تعظیم کے طور پر ام المؤمنین کے ہم رکاب کیا۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ طرزِ عمل دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص ہدایت کی بناء پر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب کر کے پیش گوئی فرمائی تھی: ''عن قریب تمہارے اور عائشہ صدیقہ کے درمیان کچھ کش مکش ہوگی۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پریشان ہو کر عرض کیا تھا: ''یارسول اللہ! یہ تو میری بدقسمتی ہوگی۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب تھا: ''نہیں۔ مگر جب ایسا ہو تو تم عائشہ کو ان کے محفوظ مقام تک پہنچا دینا۔'' [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وصیت پر پوری طرح عمل کیا۔ روانگی سے پہلے خود ام المؤمنین کی خدمت میں آئے۔

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میرے بیٹو! میرے اور علی کے درمیان ماضی میں بھی اس سے زیادہ کوئی مسئلہ نہیں ہوا، جو عورت اور اس کے دیور کے درمیان ہو جایا کرتا ہے۔ میرے نزدیک حضرت علی بہترین لوگوں میں سے ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس موقع پر فرمایا: ''لوگو! ام المؤمنین نے سچ فرمایا اور خوب کہا، میرے اور ان کے درمیان ایسی چھوٹی موٹی بات کے سوا کوئی رنجش نہیں رہی۔ یہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔''

اس کے بعد ام المؤمنین کا قافلہ روانہ ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کئی میل تک پیدل ساتھ گئے۔ پھر صاحبزادوں حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو اعزاز کے لیے ایک منزل (سولہ میل، پونے ۲۶ کلومیٹر) تک ساتھ جانے کا حکم دیا۔ [3]

ام المؤمنین کا قافلہ پہلے مکہ پہنچا، آپ سن ۳۶ ہجری کے حج تک وہیں مقیم رہیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ اپنے گھر تشریف لے گئیں۔ [4] اس سانحے کا اثر آپ پر آخر تک رہا۔ جب بھی جنگ جمل میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا کشت وخون یاد آتا تو اتنا روتیں کہ دوپٹہ بھیگ جاتا اور فرماتیں: ''کاش! میں بھولی بسری ہو جاتی۔'' [5]

جنگِ جمل کے مقتولین کا جب ذِکر آتا تو آپ سب کے لیے رحمت کی دعا کرتیں، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ زید بن صوحان کے لیے بھی دعائے خیر فرماتیں جبکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ کسی نے حیران ہو کر کہا: ''وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے مگر آپ ان سب کے لیے دعائے رحمت فرماتی ہیں؟ اللہ ان سب کو جنت میں کبھی اکٹھا داخل نہیں فرمائے گا۔'' ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فوراً ارشاد فرمایا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی

---

① تاریخ الطبری: ۵۴۴/۴

② مسند احمد، ح: ۲۷۱۹۸ ، شرح مشکل الآثار للطحاوی، ح: ۵۶۱۲ ، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۳۲/۱
واخرجه الهیثمی وقال: رواه احمد والبزار والطبرانی رجاله ثقات

③ تاریخ الطبری: ۵۴۴/۴ ④ تاریخ الطبری: ۵۴۲/۴ ⑤ المنتظم لابن جوزی: ۹۵/۵

رحمت کتنی وسیع ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"[1]

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت اور ام المؤمنین کی گوشہ نشینی کے ساتھ یہ تحریک بھی اختتام پذیر ہوگئی جس کا اصل مقصد اصلاحِ امت تھا مگر سازشی عناصر نے اسے خونریزی تک پہنچا کر چھوڑا۔ اس تحریک کے اکثر سرکردہ لوگوں نے ام المؤمنین کی طرح سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ولید بن عقبہ، حضرت سعید بن العاص، حضرت یعلیٰ بن امیہ، حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہم نے اس کے بعد ان سیاسی مناقشات میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آئے، کوئی حصہ نہیں لیا۔

اجتہادی اختلاف:

یہاں یہ ذہن نشین رکھا جائے کہ یہ تمام تر اختلاف ایک فقہی و اجتہادی نزاع تھا، نہ کہ اقتدار اور حکومت کی جنگ۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اقدامات میں برحق تھے مگر دیگر حضرات بھی اپنی آراء میں مجتہد تھے۔ اس دور میں اسلامی قانون اس طرح مدوّن نہ تھا جیسا ایک ڈیڑھ صدی بعد ہوا۔ عموماً صحابہ اپنے حافظے میں موجود احادیث سے مطلب اخذ کر کے عمل کرتے تھے۔ ایسے میں بعض نئے سیاسی و قضائی مسائل کا صحابہ پر مشتبہ ہو جانا بعید نہ تھا۔ پھر یہ معاملہ ایسا تھا جس کی پہلے کوئی نظیر موجود نہ تھی۔ کوئی سابقہ فتویٰ یا عدالتی فیصلہ سامنے نہ تھا۔ ایسے میں صحابہ کرام کے دو گروہوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اس قضیے کو دیکھا اور حل کرنے کی کوشش کی، جو یقیناً اجتہاد تھا۔ لہٰذا طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی غلطی بھی فسق یا گناہ نہیں بلکہ خطائے اجتہادی مانی جائے گی جس پر کوئی اخروی مواخذہ نہیں بلکہ اجر و ثواب ہے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ ان حضرات کے پاس اجتہاد کی کوئی دلیل نہ تھی۔ ایسی بہت سی روایات ان کی دلیل بن سکتی تھیں جن میں ظالم کو ظلم سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔[2] اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان حضرات کی اجتہادی رائے کا پہلو نظر انداز نہیں فرماتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے ان حضرات کے خلاف کسی کو تشدد آمیز باتیں کرتے سنا تو منع کر دیا اور فرمایا: "ایسا مت کہو۔ وہ لوگ سمجھے کہ ہم نے ان سے بغاوت کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہم سے بغاوت کی ہے، پس ہم نے باہم قتال کیا۔"[3]

---

① السنن الکبریٰ للامام البیهقی، ح: ۱٦٧١٨ ؛ مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد، ح: ٢٠٥٦٣

② مثلاً — من رایٰ منکم منکرا فلیغیره بیده. (صحیح مسلم، ح: ١٨٦، کتاب الایمان، باب النهی عن المنکر، ط دارالجیل)
انصر اخاک ظالما او مظلوما — تحجزه او تمنعه من الظلم. (صحیح البخاری، ح: ٢٤٤٤، کتاب المظالم والغصب)

③ لا تقولوا، انما هم قوم زعموا انا بغینا علیهم وزعمنا انهم بغوا علینا فقاتلنا. (تعظیم قدر الصلوٰة، ابن نصر المروزی م ٢٩٤ هـ ح ٥٩٣ ؛ منهاج السنة لابن تیمیة: ٥/٢٢٥) وفی معناه قول عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ فی صفین، قال: دیننا واحد، وقبلتنا واحدة، ودعوتنا واحدة، ولکن قوم بغوا علینا فقاتلناهم. (تعظیم قدر الصلوٰة، روایت نمبر: ٥٩٩)
وفی روایة: عن ابی البختری سئل علیّ عن اهل الجمل قال: قیل: أمشرکون هم؟ قال: من الشرک فرّوا. قیل: أمنافقون هم؟ قال: ان المنافقین لا یذکرون الله الا قلیلاً. قیل: فما هم؟ قال اخواننا بغوا علینا. (مصنف ابن ابی شیبة ح ٣٧٧٦٣، ط الرشد ؛ السنن الکبریٰ، بیهقی، ح: ١٦٧١٣)
وفی روایة سُئل علیّ عن اهل الجمل فقال: اخواننا بغوا علینا، فقاتلناهم، وقد فاء وا وقد قبلنا منهم. (السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ١٦٧٥٢)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان ارشادات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خود ان کے نزدیک بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کا اختلاف اجتہادی اختلاف تھا اور وہ نہ صرف یہ کہ انہیں اس بناء پر فاسق نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے حق میں کلماتِ خیر کے سوا کسی بات کے روادار نہ تھے۔"[1]

جنگِ جمل اور صفین کے متعلق حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کی درج ذیل عبارت بھی بار بار پڑھنے کے قابل ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات صحابہ کی یہ باہمی لڑائیاں اقتدار کی خاطر نہیں تھیں اور نہ ان کا اختلاف آج کی سیاسی پارٹیوں کا سا اختلاف تھا، دونوں فریق دین ہی کی سربلندی چاہتے تھے۔ ہر ایک کا دوسرے سے نزاع دین ہی کے تحفظ کے لیے تھا، اور یہ خود ایک دوسرے کے بارہ میں بھی یہی جانتے اور سمجھتے تھے کہ ان کا موقف دیانت دارانہ اجتہاد پر مبنی ہے چنانچہ ہر فریق دوسرے کو رائے اور اجتہاد میں غلطی پر سمجھتا تھا لیکن کسی کو فاسق قرار نہیں دیتا تھا۔"[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتظامی فیصلے اور نئی ترتیبات:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ دنوں تک بصرہ اور گردونواح کے انتظامی معاملات از سرِ نو مستحکم کرنے میں مصروف رہے۔ لوگوں سے بیعت لی کہ وہ جنگ اور صلح میں خلافتِ اسلامیہ کے وفادار رہیں گے اور حکمرانوں کے خلاف دست درازی اور بدگوئی سے احتراز کریں گے۔ بیعت میں بصرہ کے تمام لوگ شریک تھے، حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کے پرچم تلے لڑنے والے لوگوں نے جن میں زخمی تک شامل تھے، بلاتوقف بیعت میں حصہ لیا۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بصرہ کا امیر اور زیاد بن ابی سفیان کو (جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ شریک بھائی تھے) بیت المال کا خازن مقرر کیا۔[4]

آپ رضی اللہ عنہ نے جنگ میں شریک فریقین کے ہر فرد کو پانچ پانچ سو درہم تقسیم کر کے سب کے دل جیت لیے، اگرچہ سبائی گروہ نے اس پر بڑی ناراضی ظاہر کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طعنے دیے مگر آپ رضی اللہ عنہ نے پروا نہ کی۔[5]

سبائیوں کا فرار:

سبائی ناراضی ظاہر کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے ہی بصرہ سے کوچ کر گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس خدشے سے کہ

---

[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۲۴۲
[2] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۲۴۳
[3] تاریخ الطبری: ۵۴۱/۴
[4] تاریخ الطبری: ۵۴۳/۴
[5] تاریخ الطبری: ۵۴۱/۴

کہیں یہ لوگ دیگر مقامات پر بھی شر انگیزی نہ کریں، انہیں واپس لانے کے لیے ان کے پیچھے نکلے مگر یہ لوگ بڑی تیزی سے غائب ہو گئے اور دوبارہ منظر عام پر آنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔[1]

ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ناراضی کا تو بس ایک بہانہ تراشا تھا، اصل مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دور رہنا تھا تاکہ اگر ان کی طرف سے کوئی فوری پکڑ دھڑ ہو تو پیش بندی کر کے خود کو بچایا جا سکے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی عجلت پسندانہ کارروائی کی فکر میں نہ تھے بلکہ ہر قدم بڑی احتیاط سے اٹھا رہے تھے۔

جنگِ جمل کے مابعد اثرات:

جنگِ جمل اگرچہ ایک وقتی حادثہ تھا مگر اس کے اثرات مستقبل پر بڑے گہرے مرتب ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کسی نہ کسی طرح خلافتِ راشدہ کی آن بان بچانا چاہتے تھے، اس سانحے سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس جنگ میں بصرہ کے سینکڑوں لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت کوفی فوج کے ہاتھوں قتل اور زخمی ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے خاندان حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس قتل و غارت کا براہِ راست ذمہ دار نہ بھی سمجھتے ہوں اور بظاہر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے ہوں، تب بھی یہ بہت مشکل تھا کہ اب وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ اسی دل جمعی اور ثابت قدمی سے دیتے جس طرح قصاصِ عثمان کی تحریک کے پرجوش کارکن اپنے رہنماؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دستیاب اکثر فوج کوفہ و بصرہ ہی کی چھاؤنیوں سے تعلق رکھتی تھی۔ آئندہ ایام میں بعض فیصلہ کن مواقع پر اس فوج کی بددلی اور فریقِ مخالف کی صفوں میں یک جہتی کی ایک بڑی وجہ یہی جنگِ جمل کے زخم تھے جو سپاہِ عراق کی خاصی تعداد کو خلافت کے پرچم تلے لڑنے سے روکتے اور اہلِ شام کو ان کے خلاف اُکساتے رہے۔

جنگِ جمل کے بعد بھی سبائیوں کو الگ کیوں نہ کیا گیا؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کہ جنگ جمل سے پہلے سبائیوں کو الگ ہو جانے کا حکم دے چکے تھے، جنگ کے بعد ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ آخر کیوں؟

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس اقدام کے لیے جس امن و سکون کی ضرورت تھی، جنگِ جمل کے بعد وہ نصیب نہیں ہو سکا بلکہ اس کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اصل قاتل تو چند گنے چنے لوگ تھے جن کی تحقیق و تفتیش کی آپ کو یقیناً فکر تھی مگر آپ کے گرد جمع ہونے والے سابقہ باغی زیادہ تر نادان عوام تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت اور سادات کی مبالغہ آمیز حمایت کرنے والے ایک سیاسی گروہ کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عجلت میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ان میں سے شرعاً مامون لوگ بھی زد میں آ جائیں۔

---

[1] تاریخ الطبری: ۵۴۴/۴



مسئلے کی دو شکلیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا توقف:

یہ بات تو واضح تھی کہ کسی گروہ کے مسلح کے خروج کی صورت میں حکمران اس سے جنگ کرسکتا ہے مگر جو لوگ خروج ترک کر کے حکمران سے وفاداری کا عہد کرلیں، ان کا کیا حکم ہوگا؟

اس بارے میں مسئلے کی دو شکلیں تھیں:

① ایک یہ کہ ہتھیار ڈالنے والا گروہ اہلِ عدل وتقویٰ اور مجتہدین کا ہو اور اس نے کسی تاویل کی بناء پر مسلح قوت جمع کی ہو۔ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے مسئلہ بالکل واضح تھا کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ سب مامون ہوں گے۔ اسی لیے انہوں نے جنگِ جمل کے بعد متحارب فریق سے بیعت لے کر انہیں مکمل امن فراہم کیا۔

② مسئلے کی دوسری شکل یہ تھی کہ خروج کے مرتکب لوگ مجتہد نہیں بلکہ مفسد ہوں جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی ایسی شرعی دلیل نہیں تھی جس سے ثابت ہوتا کہ ان کا حکم مختلف ہوگا اور ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی ان پر سزا جاری ہوگی۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں ہتھیار ڈالنے کے بعد ایسے لوگ بھی مامون تھے۔ (بعد میں اسی مسئلے پر تمام صحابہ اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہوگیا۔)

غالباً اسی لیے آپ سبائیوں کے مسئلے میں تاخیر کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر آپ کی رائے کے خلاف واقعی کوئی شرعی دلیل ہے تو وہ سامنے آجائے۔ جب تک ایسی دلیلِ شرعی سامنے نہ آئے تب تک اس گروہ کو جو ہر وقت بنو ہاشم پر جان ومال فدا کرنے کا عزم ظاہر کرتا ہے، اپنے ساتھ پابند رکھ کر باقی عالمِ اسلام کو اس کی شرانگیزی سے بچایا جائے۔

بہرکیف حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص لینے کی ذمہ داری نہیں بھولے تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ اگر شرعاً ان پر سزا عائد ہوتی ہے تو اس کے اجراء سے قبل اس بات کو اجماعی طور پر طے کرلیا جائے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی عجلت کی نہیں، مسئلے کی تحقیق، دوراندیشی اور احتیاط کی تھی، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے جنگِ جمل کے بعد بھی سبائیوں کے خلاف کارروائی نہیں کی۔

☆☆☆

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ شام کے نزاع کی وجوہ

جنگ جمل کے المناک نتیجے، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی تحریک کے خاتمے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صلح وصفائی نے اہلِ شام کی رائے پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہاں غلط رنگ میں خبروں اور افواہوں کا زور تھا۔ کچھ لوگ سمجھ رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سرکش لوگوں کے ہاتھوں میں یرغمال اور خود کچھ کرنے سے عاجز ہیں۔ کچھ لوگ اس سے بھی کہیں بڑھ کر یہ یقین کر چکے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث اور مجرموں کے پشت پناہ ہیں اور ان کی خلافت بھی اسی شرپسند گروہ کے بل بوتے پر قائم ہوئی ہے۔

اہلِ شام کے سامنے جھوٹی گواہیاں:

شام کی فضا کو اس قدر ہیجان انگیز بنانے میں شرپسندوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا، جنہوں نے قسمیں کھا کر وہاں بے سروپا باتیں پھیلائیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"کچھ لوگوں نے اہلِ شام کے سامنے جھوٹی گواہیاں دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہیں۔ اسی چیز نے اہلِ شام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ترک کرنے پر آمادہ کیا، کیوں کہ وہ یہ یقین کر چکے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ظالم ہیں اور وہ قتلِ عثمان میں شریک تھے اور انہی نے قاتلوں کو پناہ دی ہے کیوں کہ وہ اس قتل میں مجرموں کے ساتھ تھے۔"[1]

اگرچہ ان شبہات کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک عادل و بااختیار حکمران اور قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ سے بالکل بری تھے۔ مگر پیش آمدہ حالات میں اہلِ شام کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کوئی عجیب نہ تھا جس کے تین بڑے اسباب تھے:

- شہادتِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی الم انگیزی نے ماحول میں جذباتی تلاطم پیدا کر دیا تھا، لازمی بات ہے کہ ایسے میں بعض سنجیدہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور بعض شبہات یقین کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔
- اہلِ شام اس مقام سے بہت دور تھے جہاں فتنہ برپا ہوا تھا۔ موجودہ دور میں جبکہ ہر قسم کے ذرائع ابلاغ میسر ہیں اور مغرب میں بیٹھا شخص مشرق کے حالات براہِ راست اسکرین پر دیکھ لیتا ہے، پھر بھی جائے واردات پر موجودگی اور عدم موجودگی کا فرق بہرحال رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی شہر کے کسی محلے میں پیش آنے والے کسی حادثے کو جس

---

[1] ان الراما شهدوا عليه بالزور عند اهل الشام انه شارك في دم عثمان وكان هذا مما دعاهم الى ترك مبايعته لما اعتقدوا انه ظالم وانه من قتلة عثمان وانه آوى قتلة عثمان لموافقته لهم على قتله. (منهاج السنة: ۴/۴۰۶)



گہرائی سے اہلِ محلہ جانتے اور سمجھتے ہیں، دوسرے محلے والا اس سے قاصر ہوتا ہے۔[1] پس مدینہ میں برپا ہونے والی شورش اور عراق میں ہونے والے کشت وخون کے متعلق اہلِ شام کا کسی غلط فہمی میں پڑنا قطعاً بعید نہ تھا اور ایسا ہی ہوا۔

③ شہادتِ عثمان اور جنگِ جمل سے فائدہ اٹھا کر شر پسند عناصر نے شامی عوام میں عصبیت کو ابھار دیا تھا۔ اگر چہ وہاں موجود صحابہ کی نیک نیتی شک وشبہے سے بالاتر ہے مگر عوام میں تعصب ابھر آنے کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔[2]

اس صورتحال نے افہام وتفہیم کا راستہ بند کر دیا اور جنگ ناگزیر ہوگئی۔

اہلِ شام کا موقف:

اہلِ شام حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتلِ عثمان میں ملوث یا قاتلینِ عثمان کا پشت پناہ تصور کرنے کی وجہ سے، ان سے بیعت کو مسترد کر چکے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب کا انکار نہیں کرتے تھے مگر اس تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا یہ مطالبہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خونِ عثمان سے برأت ثابت کرنے کے لیے قاتلینِ عثمان کے گروہ سے قصاص لیں یا انہیں اہلِ شام کے حوالے کر دیں، اس کے بغیر انہیں اہلِ شام کا اعتماد حاصل ہوسکتا ہے نہ ہی ان کی خلافت منعقد سمجھی جاسکتی ہے، بلکہ ان کی حیثیت اس گروہ کے سربراہ کی رہے گی جس پر سابق خلیفہ کو شہید کرنے کا الزام ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مطالبہ تھا کہ پہلے حصولِ اعتماد کی لازمی شرط ''قصاصِ عثمان'' کو پورا کیا جائے، پھر ہمیں بیعت کی دعوت دی جائے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ برملا یہ فرمایا کرتے تھے:

''میری حضرت علی سے لڑائی صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے معاملے پر ہے۔''[3]

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں اہلِ شام کے خدشات بے بنیاد تھے اور معاملے کا حل یہی تھا کہ اہلِ شام ان سے بیعت کر کے خلافت کو مضبوط کرتے، ان کی اجتہادی رائے پر غور کر کے مسئلے کی تنقیح وتحقیق کا عمل مکمل کرتے جس کے بعد شرعی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے تمام مسائل پر قابو پانا آسان ہوجاتا؛[4] کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں خلفائے راشدین کی ممتاز ترین صفات کو گنواتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمایاں ترین خوبی: ''وَاَقْضَاهُمْ عَلِيٌّ'' بیان فرمائی تھی[5] یعنی قضا کے معاملات کو سمجھنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے اعلیٰ ہیں، پس وہ اس قابل تھے کہ ان کے اجتہاد کو قبول کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں اہلِ شام کی

---

① کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیس الخبر کالمعاینۃ. (مسند احمد، روایت نمبر: ۲۴۴۷) یعنی آنکھوں دیکھی بات اور سنی سنائی بات کا معیار یکساں نہیں ہوتا۔ اہلِ عرب کی کہاوت ہے: صاحب البیت ادری بما فیہ. (گھر کا مالک گھر کی چیز سے زیادہ واقف ہوتا ہے)

② یہی متعصب عوامی گروہ بعد میں ''مروانی'' کہلایا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مع معاویۃ طائفۃ کثیرۃ من المروانیۃ وغیرھم کالذین قاتلوا معہ. ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مروانیوں اور دوسرے لوگوں کا ایک بڑا مجمع تھا جنہوں نے ان کے ساتھ مل کر قتال کیا۔'' (منہاج السنۃ: ۳۹۹/۴)

③ قال معاویۃ: ماقاتلت علیاً الا فی امر عثمان. (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۰۵۵۲ بسند حسن، ط الرشد)

④ جمہور علمائے اُمت کا یہی موقف ہے کہ اس معاملے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے خطائے اجتہادی پر مبنی تھی جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے درست تھی۔

⑤ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ارحم امتی بامتی ابوبکر، واشدھم فی امر اللہ عمر واصدقھم حیاء عثمان واقضاھم علی بن ابی طالب. (سنن ابن ماجہ، ح: ۱۵۴ بسند صحیح)

پس وپیش کو غلط قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

”بلکہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قاتلینِ عثمان پر قدرت ہوتی، اور فرض کرلیا جائے کہ انہوں نے اس واجب کو چاہے کسی تاویل کی وجہ سے، یا گناہ کرتے ہوئے ترک کیا ہوا تھا، تب بھی یہ صورتحال مسلمانوں میں تفریق کا سبب نہیں ہونی چاہیے تھی، بلکہ ہر حال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلینا، بیعت ترک کرنے کے مقابلے میں دینی مصلحت کے زیادہ مناسب، مسلمانوں کے لیے زیادہ فائدہ مند اور اللہ اور اس کے رسول کی زیادہ اطاعت والا کام ہوتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تم سے تین باتیں چاہتا ہے، ایک یہ کہ اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور یہ کہ تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں افتراق نہ کرو۔ اور یہ کہ تم اپنے حکام کی خیر خواہی کرو۔

صحیح حدیث میں یہ بھی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان شخص پر لازم ہے کہ وہ (حکام کی بات) سنے اور اطاعت کرے، چاہے خوشحالی ہو یا بدحالی، خوشی ہو یا ناگواری اور چاہے اس پر دوسروں کو ترجیح دی جائے، جب تک کہ اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ جب گناہ کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے نہ ہی ماننا۔“[1]

شبہات کے ازالے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش کش:

بہرکیف جب اہلِ شام کے شبہات دور نہ ہوئے تو ان کے ازالے کی ممکنہ کوشش کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جامع مسجد کوفہ کے منبر پر اعلان کیا: ”اے بنو امیہ! جو چاہے مجھے حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان کھڑا کر کے قسم لے لے کہ میں نے نہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے، نہ اس میں شرکت کی ہے۔“[2]

تاہم بنواُمیہ نے اس قسم پر بھی یقین نہ کیا۔

صلح کرانے کے خواہش مند حضرات:

شام میں بھی بہت سے بارسوخ صحابہ کرام غیر جانب دار تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حتی الامکان کوشش کی کہ انہیں اپنے ساتھ ملائیں۔ چنانچہ انہوں نے اَشعث بن قیس اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو جَرِیر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جو غیر جانب دار طبقے میں تھے اور شام وعراق کے سرحدی علاقے قِرقیسیا میں رہائش پذیر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفد نے انہیں کہا: ”امیر المؤمنین آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اللہ نے آپ کے دل میں اچھی بات ڈالی کہ آپ مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے الگ ہوگئے۔ میرے نزدیک آپ کا وہی مقام ہے جو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو دیا تھا۔“

حضرت جَرِیر رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ”مجھے حضور ﷺ نے یمن بھیجا تھا کہ میں وہاں کے لوگوں سے قتال کروں اور

---

[1] بل لو كان قادرا على قتل قتلة عثمان وقُدِّرَ انه ترك الواجب، اما متأولا و اما مذنبا، لم يكن ذلك موجباً لتفريق الجماعة والامتناع عن مبايعته ولمقاتلته بل كانت مبايعته على كل حال اصلح في الدين وانفع للمسلمين واطوع لله ورسوله من ترك مبايعته. (منهاج السنة: ۴/ ۴۱۱)
اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے وہ فرامین نبویہ پیش کیے ہیں جن میں معصیت کے سوا ہر حال میں حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

[2] تاريخ دمشق: ۳۹/ ۴۵۱، ترجمة: عثمان بن عفان



انہیں لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دوں، یہ کلمہ کہہ کر ان کی جان و مال محفوظ ہو جائے گی، اب میں کسی لا الٰہ الا اللہ کے قائل سے نہیں لڑوں گا۔'' حضرت جَرِیر رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر اَشعث بن قیس اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما واپس چلے آئے۔[1]

تاہم کچھ دنوں بعد حضرت جَرِیر رضی اللہ عنہ فریقین کے مابین صلح کی بات چیت کرانے کی نیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بیعت کی دعوت دیتے ہوئے حضرت جَرِیر رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر شام بھیجا، مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔[2]

کشیدگی بڑھانے والے لوگ:

کچھ لوگ اس دوران کشیدگی بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اَشتر نخعی نے حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سفارت کے ناکام واپس آنے پر حضرت جَرِیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو طعنے دیے اور خود شام جا کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بات کرنے کا عزم ظاہر کیا، اس نے کہا: ''امیر المؤمنین اگر مجھے شام بھیجتے تو میں مُعاویہ کے سامنے گنگ نہ ہوتا، میں ان کے ہوش گم کر دیتا۔'' پھر حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اگر امیر المؤمنین میری بات مانیں تو تم جیسے لوگوں کو اس وقت تک جیل میں قید رکھنا چاہیے جب تک یہ قضیہ حل نہیں ہو جاتا۔''

اَشتر نخعی جیسے لوگوں کی بدتمیزی سے ناراض ہو کر آخر کار حضرت جَرِیر رضی اللہ عنہ شام چلے گئے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔[3] اگرچہ یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے فریقین کی کسی جنگ میں حصہ لیا ہو۔

ابومسلم خولانی رحمہ اللہ کی سفارت:

کچھ بزرگ اب بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے کوشاں تھے، چنانچہ ابومسلم خولانی رحمہ اللہ ایک وفد کے ساتھ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گئے اور پوچھا:

''آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ آپ کے ہم مرتبہ ہیں؟''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بالکل نہیں، اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ بلاشبہ وہ مجھ سے افضل ہیں اور خلافت کے مجھ سے زیادہ حق دار ہیں، لیکن کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مظلومانہ حالت میں قتل کیے گئے ہیں۔ پس آپ حضرت علی سے جا کر کہیں کہ وہ قاتلینِ عثمان کو میرے حوالے کر دیں۔ میں ان کا تابع دار بن جاؤں گا۔''[4]

حضرت ابومسلم خولانی رحمہ اللہ کا وفد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ مطالبہ لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے موجود شرعی دلائل اور زمینی حقائق کے پیشِ نظر یہ مطالبہ ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔ اس لیے

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی: ۲/۳۳۴

[2] المنتظم لابن جوزی: ۵/۹۷ [3] تاریخ الطبری: ۴/۵۶۲

[4] تاریخ دمشق: ۵۹/۱۳۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۳/۱۴۰، ط الرسالۃ، عن ابی مسلم الخولانی، وھذا الاسناد حسنہ ابن حجر فقال: وقد ذکر یحییٰ بن سلیمان الجعفی احد شیوخ البخاری فی کتاب صفین فی تالیفہ بسند جید عن ابی مسلم الخولانی (فتح الباری: ۱۳/۸۶) وذکرہ ابو حنیفۃ الدینوری بسیاق آخر (الاخبار الطوال، ص ۱۶۲، ۱۶۳، ط دار احیاء الکتب العربی)

معاملہ جوں کا توں رہا۔[1]

ریاستی طاقت کے استعمال کا اختیار:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور شام کے دیگر صحابہ وتابعین کی نیک نیتی، حسنِ کردار اور اعلیٰ صلاحیتوں میں کوئی شبہ نہیں تھا، مگر شام سے آپ کے بھیجے ہوئے گورنر واپس کر دیے گئے تھے، مرکزِ خلافت کا وہاں کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ اس طرح اسلامی مملکت انتظامی طور پر دو لخت ہو گئی تھی۔ اس لیے تمام سفارتی کوششیں رائیگاں جانے کے بعد آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شام کا قضیہ حل کرنے کے لیے ریاستی قوت استعمال کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اس اختیار کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے تھے: ''اگر کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑتا تو ہم اس سے لڑتے اور اگر کوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑتا تو ہم اس سے بھی لڑتے۔''[3]

علامہ ابن حزم ظاہری فرماتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے قتال اس وجہ سے نہ تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان کی بیعت سے رُک گئے تھے، کیوں کہ اس بات کی ان کے لیے بھی گنجائش تھی جس کی گنجائش عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے (بیعت نہ کرنے والے حضرات) کے لیے تھی۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے قتال اس لیے تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احکام کو پوری سرزمینِ شام میں نافذ ہونے سے روک دیا تھا۔ حالاں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، جن کی اطاعت واجب تھی۔ پس (حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے قتال کے) اس قضیے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے درست تھی۔''[4]

شام پر فوج کشی کی تیاریاں اور افواج کی ترتیب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں ایک لشکر ترتیب دیا جو جنگِ جمل میں شامل لشکر سے بہت بڑا تھا؛ کیوں کہ بصرہ اور کوفہ کے علاوہ مدائن اور موصل کے قبائل بھی اب فوج میں شامل تھے۔[5] حضرت اَحنف بن قیس رحمہ اللہ بھی جو جنگ جمل

---

① تاریخ دمشق: ۱۳۲/۵۹؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۴۰/۳، ط الرسالة

② قال ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ: "وذهب جمهور اهل السنة الی تصویب من قاتل مع علیّ لامتثال قوله تعالی: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا، الآیة. ففیها الامر بقتال الفئة الباغیة، وقد ثبت ان من قاتل علیا کانوا بغاة وهؤلاء مع هذا التصویب متفقون علیٰ انه لا یذم واحد من هؤلاء بل یقولون اجتهدوا فاخطئوا." (فتح الباری: ۶۷/۱۳، کتاب الفتن، ط دار المعرفة)

وقال الامام النووی رحمہ اللہ: "هذه الروایات صریحة فی ان علیا رضی اللہ عنہ کان هو المصیب المحق." (شرح صحیح مسلم: کتاب الزکوٰة، باب اعطاء المؤلفة) وقال ابن العربی رحمہ اللہ: فقرر عند علماء المسلمین وثبت بدلیل الدین انّ علیّا رضی اللہ عنہ کان اماماً، وان کل من خرج علیه باغ. (احکام القرآن، سورة الحجرات)

③ ولو ان رجلاً ممن بایع ابابکر خلعه لقاتلناه، ولو ان رجلاً ممن بایع عمر خلعه لقاتلناه. (الاعتقاد للبیهقی، ص ۳۷۱، ط دار الآفاق)

④ ولم یقاتله علیّ لامتناعه من بیعته لانه کان یسعه فی ذالک ما وسع لابن عمر وغیره، لکن قاتله لامتناعه من انفاذ اوامره فی جمیع ارض الشام وهو الامام الواجبة طاعته فعلیّ مصیب فی هذا. (الفصل فی الملل والاهواء والنحل: ج 4 ص 124)

⑤ تاریخ الطبری: ۵۶۳/۴



کے موقع پر غیر جانبدار رہے تھے، اس بار اپنے سپاہیوں کے ساتھ ہم رکاب تھے۔[1] قبیلہ نخع کا رئیس اَشتَر نخعی شروع میں صفین جانے میں پس وپیش کر رہا تھا اور اپنے قبیلے کو بھی شک میں ڈال رہا تھا۔[2] بعد میں وہ اپنے جتھے سمیت لشکر میں مل گیا اور ہراول دستے کی کمان اسی کو دی گئی۔[3]

شام پر فوج کشی کا مقصد:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد جنگ نہیں تھا بلکہ مملکت کو یکجا اور اُمت کو متحد کرنا تھا۔ بڑی فوج جمع کرنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ اہل شام کو ملیامیٹ کر دیا جائے بلکہ اس میں یہ حکمت ملحوظ تھی کہ حریف پر جنگ سے پہلے ہی دباؤ پڑ جائے اور جنگ کے بغیر یا معمولی لڑائی سے معاملہ حل ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اتحاد واتفاق کے داعی تھے جیسا کہ آپ کے نائب حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ نے لشکر کی روانگی کے وقت جامع مسجد کوفہ میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! (اس مہم کے لیے) نکل پڑو۔ جو نکلے گا، مامون رہے گا۔ ہم اس بات کو عافیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں کہ اللہ امت محمدیہ میں صلح کرا دے اور ان کی محبت والفت کا رشتہ جوڑ دے۔''[4]

اہلِ عراق اور اہلِ شام کے مزاج اور تربیت کا فرق، عراقیوں کی اُفتادِ طبع

ایک ہی دین وشریعت کے پیروکار ہونے کے باوجود عراقی اور شامی لشکروں میں شامل سپاہیوں، عام افسرانِ فوج اور قبائلی رؤسا کے مزاج وافتاد میں بڑا فرق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیروکار زیادہ تر وہ لوگ تھے جو عرب کے مشرقی علاقوں میں آباد تھے، جن کے قبائل شروع سے آزاد طبع اور خود مختار چلے آئے تھے، اس پر مستزاد یہ کہ ایک طویل مدت تک ان پر ایرانی شہنشاہیت کا سایہ پڑتا رہا تھا جو عقیدے اور نظریے سے لے کر سیاست اور تہذیب وتمدن تک میں انتشار، تنوع اور خود رائی کا شکار تھی۔ اس سلطنت کے آخری چالیس، پچاس سال نہایت افراتفری کی حالت میں گزرے تھے اور حکمرانوں کی مسلسل تبدیلیوں، بغاوتوں اور محلاتی سازشوں نے عوام کو اجتماعی نظم وضبط سے آزاد رہنے کا عادی بنا دیا تھا۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں یہاں خصوصاً کوفہ اور بصرہ میں مشرقی عرب کے ایسے لوگ آکر آباد ہوئے جن کے آباؤ اجداد کھلے، بے روک ٹوک اور آزاد ماحول کے عادی چلے آرہے تھے۔

اگرچہ اسلامی عقیدے اور نفاذِ شریعت نے کوفہ وبصرہ اور گردونواح کو کفر وشرک، بداخلاقی اور فحاشی سے پاک رکھا تھا مگر یہاں کے قدیم باشندوں اور نئے آنے والے عربوں کی طبیعت میں بے باکی اور بہادری کی خوبیوں کے ساتھ خودسری اسی طرح باقی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی برسوں سے اس علاقے میں سبائی گروہ سرگرم تھا جس نے بعض لوگوں کو خفیہ طور پر بدعقیدہ بنا ڈالا تھا اور بہت سوں کو حکومت کی اطاعت اور اکابر کے ادب واحترام کے جذبات سے محروم کر دیا تھا۔ ایسے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بھی شامل تھے۔ ان کی موجودگی میں ہر وقت بدنظمی اور فتنہ انگیزی

---

[1] انساب الاشراف للبلاذری: ۲/۲۹۵، ط دار الفکر
[2] مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۸۳ بسند حسن، ط الرشد
[3] تاریخ الطبری: ۵۶۶/۴
[4] مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۷۳، ط الرشد

کا خطرہ سر پر تھا۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے لشکر کا کسی ایک لائحہ عمل پر اتفاق مشکل ہو جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کی قیادت کر کے مقاصد کو حاصل کرنا بڑا مشکل کام تھا۔

اہلِ شام کا مزاج:

دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت شام کا علاقہ صدیوں تک روم کی بادشاہت کے زیرِ انتظام رہا جو اپنی اعتقادی و عملی خرابیوں کے باوجود نظم وضبط کے لحاظ سے ایک کامیاب سلطنت مانی جاتی تھی۔ اسے فتح کرنے اور یہاں آباد ہونے والے مسلمان بھی زیادہ تر عرب کے مغرب اور شمالی قبائل سے تعلق رکھتے تھے جو شروع سے نسبتاً تہذیب یافتہ اور منظم زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ پھر شام میں گزشتہ چوبیس پچیس سال سے بنوامیہ کا ایک ہی خاندان انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہاں کے گورنر چلے آرہے تھے۔ انہیں یہاں حکومت وسیاست کا بیس سالہ تجربہ تھا، ذاتی طور پر وہ نہایت بااخلاق، صاحب تدبیر اور معاملہ فہم انسان تھے۔ بنوامیہ کی سیاسی وعسکری خوبیوں کی انتہا ان پر ہوتی تھی۔ لوگوں کو حسنِ سلوک، داد ودہش اور انعام واکرام کے ذریعے خوش رکھتے تھے۔ ان تمام وجوہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اطاعت وفرماں برداری اور نظم وضبط کے بہترین سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔

دونوں لشکروں میں نظم وضبط کا فرق:

دونوں لشکروں میں نظم وضبط کی کیفیت کا بھی واضح فرق تھا جس کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں لشکر تیار کرتے وقت آخری تنبیہ کرنے کے لیے اپنا سفیر شام بھیجا جس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبردار کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لشکر کشی کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نماز کے بعد مسجد میں مجمع عام کو یہ حالات بتا کر ان سے رائے مانگی۔ سب نے سر جھکا لیے، صرف ایک اُمیر نے کہا: ''جو آپ کی رائے وہی ہماری، آپ حکم دیں، ہمارا کام اطاعت کرنا ہے۔'' یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔

سفیر یہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لوٹ آیا، انہوں نے بھی نماز کے بعد مسجد میں لوگوں سے خطاب کیا اور اہلِ شام کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دے کر رائے مانگی۔ یہ سنتے ہی ہر شخص چلانے لگا: ''یا امیر! ایسا کریں۔ امیر المؤمنین! ویسا کریں۔'' شور وغل کی وجہ سے کسی ایک کی بات بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے منبر سے نیچے اتر گئے۔ ①

دریائے فرات سے صفین تک:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلاح مشورے کے بعد خود لشکر کی قیادت کا فیصلہ کیا اور کوفہ میں حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ کو نائب بنا کر شمال مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے تقریباً سات سو میل (۱۱۲۷ کلومیٹر) طے کر کے دریائے فرات کے کنارے

① تاریخ دمشق: ۳۹۱/۱۷، تاریخ الاسلام للذھبی: ۵۴۲،۵۴۱/۳، للطبری: ۳۰۵،۳۰۴/۲، بشار

پہنچ گئے، جو شام کی سرحد سمجھا جاتا تھا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر اور سامانِ رسد سمیت رَقّہ کے مقام سے دریا عبور کیا[2] اور ذوالحجہ ۳۶ ہجری کے ابتدائی دنوں میں لشکر کے ساتھ دریائے فرات کے پار صفین پہنچ گئے۔[3] شامی لشکر پہلے سے وہاں خیمہ زن تھا۔[4]

حالات کی گردش اور اپنے اپنے موقف پر غیر متزلزل یقین نے عالمِ اسلام کے ان دونوں بڑے رہنماؤں کو مسلح افواج کے ساتھ میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔

x x x

---

① تاریخ الطبری: ۴/۵۶۳ تا ۵۶۶

② تاریخ الطبری، ۴/۵۶۶

③ البدایۃ والنهایۃ: ۱۰/۴۹۷ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۳

نوٹ: روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا لیڈر ثابت کرنے کے لیے ایسی متعدد افواہیں اڑا رکھی تھیں (جو جعلی روایات کی شکل میں تاریخ میں بھی شامل ہیں۔) جن سے یہ محسوس ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سبائیوں نے خلیفہ بنایا تھا۔ صحابہ کی اکثریت تو ان سے الگ تھی۔ سبائی ہی ان کے ارد گرد غالب تھے، آپ رضی اللہ عنہ کے لشکروں میں بھی انہی کی اکثریت تھی اور شام پر حملہ بھی انہی کے کہنے پر ہوا تھا۔ اُدھر مروانی حضرات چونکہ روافض کی ہر ایسی روایت کو عینِ ایمان سمجھتے ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پہلو کمزور نظر آئے پس وہ انہی روایات سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سبائیوں کی اکثریت تھی، وہی شام پر حملہ آور ہوئے، صفین میں بھی اکثر سبائی ہی قتل ہوئے اور اہلِ شام نے بجا طور پر ان کو قتل کیا۔ مروانی افکار سے متاثر بعض جدید "محققین" اہلِ سنت کو راضی رکھنے کے لیے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہ تو بس سبائیوں کو کنٹرول کرنے ساتھ ساتھ شام چلے گئے تھے۔

یہ رائے کس قدر بے وزن ہے، اس پر ہم آخر میں "باب ازالہ شبہات" میں مفصل کلام کریں گے۔ یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ اہلِ سنت کا مذہب ضعیف تاریخی روایات پر نہیں سنتِ نبویہ پر قائم ہے۔ سنتِ مطہرہ بتاتی ہے کہ جنگ میں دونوں طرف اکثریت صالحین کی تھی۔ فرمانِ نبوی ہے:

"لاتقوم الساعة حتى تقتتل فئتان عظيمتان دعواهما واحدة، تمرق بينهما مارقة يقتلها اولى الطائفتين بالحق." (مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۵۸)

تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها اولى الطائفتين بالحق. (صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۷، سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۶۷)

ان احادیث کی بناء پر اہلِ سنت کا اجماع ہے کہ صفین میں فریقین صالحین اور نیک نیت تھے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صفین کے مقتولین کے بارے میں فرمایا: "قتلانا وقتلاهم في الجنة" ہمارے مقتولین بھی اور ان کے مقتولین بھی جنتی ہیں۔" (مصنف ابن ابی شیبۃ ح: ۳۸۸۰۷ ط الرشد)

اگر مروانیوں کے ہم خیال "جدید محققین" کا یہ خیال درست ہوتا کہ شام پر حملہ سبائیوں نے کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ یوں فرماتے "قتلانا في جهنم وقتلاهم في الجنة" (ہمارے مقتولین جہنمی ہیں اور ان کے مقتولین جنتی)

شرپسندوں اور منافقوں کے وجود سے انکار نہیں، وہ تو غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی جاتے تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ ہم پروہی لے جا رہے ہیں۔ جنگ صفین میں وہ تھے مگر اتنے قلیل کہ فرامینِ نبویہ میں انہیں مستثنیٰ کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔

جنگِ صفین

صفین کے میدان میں دونوں لشکر دو ماہ سے زائد مدت تک آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے رہے۔ باقاعدہ جنگ سے قبل دونوں لشکروں کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئیں اور فریقین کے نامور جرنیلوں کے مابین اکا دکا مقابلے بھی منقول ہیں۔ تاہم یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روایت نگاروں نے نقل میں جا بجا مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ ①

پانی کی بندش کی حقیقت:

اس کی ایک مثال وہ روایات ہیں جن میں منقول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لیے پانی بند کر دیا تھا اور عراقی لشکر کو خاص تنگ و دو اور کشت و خون کے بعد پانی تک رسائی ہوئی۔ ② جبکہ صحیح روایت کے مطابق اس واقعے کی حقیقت اتنی تھی کہ فریقین نے پانی کی کسی قریبی نہر کو اپنے اپنے سپاہیوں کے لیے خاص کرنے کی کوشش کی تھی۔ ③ مگر اصح روایت سے ثابت ہے کہ وہاں کوئی بڑی جھڑپ نہیں ہوئی تھی بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فوجی اس جگہ پہلے پہنچ گئے تھے اس لیے وہ اپنا حق جتا رہے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نمایندے نے جگہ دینے کا مطالبہ کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بخوشی اجازت دے دی۔ روایت یہ ہے:

"ابوصلت سلیم الحضرمی (صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپاہی) بیان کرتے ہیں کہ ہم اہل عراق اور پانی کے درمیان حائل ہو گئے۔ اتنے میں ایک گھڑ سوار آیا، وہ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے آواز لگائی: "معاویہ! اللہ سے ڈریں، امت کے حق میں اللہ سے ڈریں۔ سوچیں اگر آپ نے عراقیوں کو قتل کر دیا تو ان کی اولاد کا کفیل کون ہوگا۔ اور بالفرض ہم نے آپ سب کو قتل کر دیا تو آپ کے اہل و عیال کا سہارا کون ہوگا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا. (اگر مومنوں میں سے دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو) ④"

① جنگ صفین کی تفصیلات کا اکثر مواد ضعیف راویوں سے منقول ہے۔ ہم یہ واقعہ ان تفصیلات کو حذف کرتے ہوئے پیش کر رہے ہیں جو بلا تحقیق نقل ہوتی آرہی ہیں اور جن میں جا بجا صحابہ پر طعن ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ذخیرۂ حدیث سے زیادہ استفادہ کیا جائے اور صحیح روایات کو ترجیح دی جائے۔ البتہ جن چیزوں کا تعلق صرف خبر نگاری سے ہے مثلاً جنگ کی تاریخ، محل وقوع وغیرہ، ان میں ہم نے کچھ حصہ ضعیف تاریخی راویوں سے بھی لے لیا ہے۔

② وقعۃ صفین، نصر بن مزاحم، ص ۱۶۲ تا ۱۸۷، ط دار الجیل

③ صفین کی جگہ اب ایک بستی "بنات ابی ہریرۃ" آباد ہے جہاں اب بھی دریا سے ایک نہر آتی ہے۔ (مقالۃ عبدالقادر ریحاوی، الحولیات العربیۃ السوریۃ، ۱۹۶۹ء) غالباً اسی نہر سے پانی پینے کی جگہ پر فریقین کے بعض فوجیوں میں تنازعہ ہوا تھا۔

④ سورۃ الحجرات، آیت: ۹



حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' وہ بولے: ''ہمارے لیے پانی کا راستہ چھوڑ دیجئے۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ابوالاعور سے کہا: ''ہمارے بھائیوں کے لیے پانی کا راستہ خالی چھوڑ دو۔'' [1]

معلوم ہوا کہ پانی لینے کے لیے جگہ کے استحقاق پر اختلاف ہوا تو تھا مگر تلوار چلنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

صفین کے واقعے میں ضعیف اور کذاب راویوں نے ایسے واقعات بکثرت درج کیے ہیں جن میں مبالغہ آرائی اور تعصب کا پہلو جھلکتا ہے۔ بعض روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسے سخت گیر آمر کے روپ میں پیش کرتی ہیں جو فریق مخالف کو بے ایمان تصور کرتے ہوئے ہر قیمت پر جنگ چاہتا ہو۔ بعض روایات حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ایسے فسادی کے طور پر سامنے لاتی ہیں جو منافقت کے طور پر مسلمان بن کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے کوشاں ہو۔ ایسی روایات یقیناً قابلِ ترک ہیں۔ [2]

میدانِ جنگ میں مصالحت کی کوششیں:

معتبر روایات سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ جنگ جمل کی طرح جنگ صفین کے وقت بھی مصالحت کی کوششیں دونوں جانب سے ہوتی رہیں اور مذاکرات کا سلسلہ چلتا رہا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن دیزیل کی سند سے روایت نقل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ صفین کے میدان میں عراق اور شام کے لشکروں میں شامل قراء حضرات نے جن کی تعداد تیس ہزار تھی، اپنا الگ کیمپ لگا رکھا تھا، [3] ان میں حضرت عَبِیدہ سلمانی، حضرت علقمہ بن قیس، حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود اور حضرت عامر بن عبد قیس رحمہم اللہ جیسے حضرات شامل تھے۔ ان قراء حضرات نے فریقین کے مابین سفارت کاری کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اس ضمن میں وہ فریقین کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سفارت کاری کے دوران حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کہلوایا کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے نکلا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہلوایا کہ میرا اس خون میں کوئی حصہ نہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اصرار کرتے رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس دعوے میں سچائی کا ثبوت دینے کے لیے قاتلینِ عثمان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ [4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ دعوت دیتے رہے کہ مہاجرین و انصار نے جب میری بیعت کر لی تو اہلِ شام کو بھی ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کہلواتے کہ مہاجرین و انصار تو ہمارے ساتھ بھی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اب تک بیعت نہیں ہوئے۔ غرض یہ گفت و شنید، قراء حضرات کی وساطت سے جاری تھی۔

---

① تاریخ دمشق: ۱۳۸،۱۳۷/۹؛ ذکر اسنادہ فی الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۲۱۲/۴

② اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر ضعیف روایت کا ہر ہر جز وخلاف واقعہ ہو۔ تاریخ نگاری میں قرائن کی تائید کے ساتھ انہیں لینے کی یقیناً گنجائش ہے مگر ہم عامتِ احتیاط کے پیشِ نظر ایسی تفصیلات کو یکسر ترک کر رہے ہیں۔

③ البدایۃ والنہایۃ: ۵۰۶/۱۰ ...... یہ قراء وہ نہیں جو بعد میں خوارج بنے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ صلح پسند قراء فقہا بھی تھے اور خوارج سے الگ تھے۔

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ مطالبہ پورا نہ کرنے کی معقول اور مضبوط وجوہ تھیں جن کی تفصیل گزشتہ اوراق میں ''باغیوں سے بیعت کیوں لی؟''، ''قاتلینِ عثمان پر گرفت میں تاخیر کی وجہ''، ''عدالتی کارروائی میں پیچیدگیاں'' اور ''انتظامی و سیاسی مشکلات'' کے عنوانات کے ذیل میں آ چکی ہے۔ نیز ''باب ازالۂ شبہات'' میں ''دورِ خلافت علی رضی اللہ عنہ'' کے تحت اس پر کافی و شافی کلام ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا کام قراء نے یہ کیا کہ جب بھی دونوں لشکروں میں جھڑپ شروع ہونے کا ماحول بنتا تو یہ فوراً بیچ میں آجاتے اور فریقین کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیتے۔ ذی الحجہ کے آغاز سے صفر تک دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے رہے اور ان دو مہینوں میں پچاسی (۸۵) بار لوگ افراتفری کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف لپکے، مگر ہر بار قراء کی اس جماعت نے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب بھی تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیروکار بھی، بیچ بچاؤ کرادیا۔[1]

جنگ کا آغاز:

صلح کی ان تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد آخر کار منگل، ۷ صفر، سن ۳۷ ہجری میں دونوں لشکروں میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہاں بھی اپنی صف بستہ فوج کو یہی حکم تھا کہ وہ حملے میں پہل نہ کرے۔ آپ جنگ کی ہر مڈ بھیڑ سے پہلے افواج کو یہ خطبہ دیتے:

> **"اس وقت تک جنگ ہرگز نہ کرو جب تک حریف پہل نہ کرے۔ اللہ عز وجل کا شکر ہے کہ تم حق پر ہو اور تمہاری طرف سے جنگ کی ابتداء نہ ہونا یہ تمہارے حق پر ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ جب تم جنگ کر کے انہیں پسپا کر چکو تو کسی بھاگنے والے کو قتل نہ کرو۔ کسی زخمی پر حملہ نہ کرو اور نہ کسی مقتول کے جسم کی بے حرمتی کرو۔ اگر تم حریف کی خیمہ گاہ تک پہنچ جاؤ تو ان کے خیموں کے پردے چاک نہ کرنا۔ بلا اجازت ان میں داخل مت ہونا۔ ان کے اموال میں سے اس شے کے سوا کچھ نہ اٹھانا جو تمہیں میدانِ جنگ میں ملے۔ خواتین کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا خواہ وہ تمہاری بے عزتی کریں یا تمہارے سرداروں اور نیک لوگوں کو برا بھلا کہیں کہ خواتین جسم اور دل کے لحاظ سے کمزور ہوتی ہیں۔"**[3]

صحیح روایات کے مطابق جنگ تین دن تک جاری رہی۔[4] ان دنوں میں فریقین پوری قوت سے میدان میں نکلے اور نہایت شدومد سے تلواریں چلتی رہیں۔

علوی لشکر کے مشاہیر:

دونوں لشکروں میں صحابہ وتابعین موجود تھے۔ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ اس

---

① البدایة والنهایة: ۱۰/۵۰۶، ۵۰۷ ۔۔۔ اس روایت سے واضح ہو رہا ہے کہ امت کا ایک نیک وصالح عالم فاضل طبقہ جنگ جمل کی طرح یہاں بھی اصلاحِ احوال کے لیے سرگرم تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جنگِ جمل کی طرح اس موقع پر بھی شدت پسندوں کی طرف سے اچانک جنگ چھیڑ دینے کا خطرہ موجود تھا، قائم اس لیے قراء حضرات تیس ہزار کی بھاری تعداد میں دونوں لشکروں کے درمیان خیمہ زن ہو گئے تھے تاکہ بات بگڑنے پر معاملے کو سنبھال لیا جائے۔ جن ضعیف روایات میں اس دوران لوے لڑائیاں ہونے اور روزانہ کشتوں کے پشتے لگنے کا ذکر ہے، وہ مبالغے پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ اصل صورتِ حال غالباً اتنی ہی تھی جو اس روایت میں ہے کہ ہنگامہ یا معمولی جھڑپ شروع ہوتے ہی بیچ بچاؤ کرا دیا گیا۔

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۹۱

③ تاریخ الطبری: ۵/۱۰، ۱۱، قال لاتقاتلوا القوم حتیٰ یبدؤکم فانتم بحمد اللّٰه عز وجل علیٰ حجة وترکُکم ایاهم حتی یبدؤکم حجة اخری لکم. اگرچہ یہ روایت بہت ضعیف ہے مگر صحیح سند سے ثابت ہے کہ امیر المؤمنین کا یہی حکم جنگِ جمل میں تھا۔ (شرح معانی الآثار، ح: ۵۱۱۲، کتاب السیر) اور یہی فقہائے احناف کا مشہور قول ہے کہ باغیوں پر حملے میں پہل نہ کی جائے۔ (ہدایة، باب البغاة)

④ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۹۱

میں متعدد بدری صحابہ بھی تھے[1] اور بیعتِ رضوان سے مشرف بہت سے بزرگ بھی۔[2] لشکرِ علوی میں صف بندی کی ترتیب اس طرح تھی کہ علم بردار ہاشم بن عتبہ رحمہ اللہ تھے۔ دایاں بازو اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ اور بایاں بازو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی کمان میں تھا۔[3] عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ گھڑسواروں اور سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ پیادوں کے سالار تھے۔

---

① اصحابِ بدر میں سے مشہور نام یہ ہیں: ابوایوب انصاری (تاریخ الاسلام ذہبی: ۳۳۰/۵) ابواسید الساعدی، ابوالیسر کعب بن عمرو انصاری، رفاعہ بن رافع انصاری، سہل بن حنیف، عمار بن یاسر، خوات بن جبیر (تاریخ الاسلام ذہبی: ۵۴۵/۳) ابوفضالہ انصاری (الاصابۃ: ۲۶۷/۷، تاریخ الاسلام: ۵۸۵/۳) اسید بن ثعلبہ انصاری (اسد الغابۃ: ۲۴۰/۱) ثابت بن عبید (اسد الغابۃ: ۴۴۸/۱) ابوعمرہ انصاری بشیر بن عمرو، اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ (تاریخ الاسلام: ۵۸۵/۳، طبقات ابن سعد: ۸۳/۵) بحوالہ تحقیق

لشکرِ علوی میں صحابہ میں سے مشہور نام یہ ہیں: عبداللہ بن عباس، عبیداللہ بن عباس، عبداللہ بن جعفر، جابر بن عبداللہ، حسنین کریمین، خزیمہ بن ثابت، سلیمان بن صرد، سہل بن سعد، قیس بن سعد، قرظہ بن کعب، جندب بن عبداللہ، ابوقتادہ انصاری، عدی بن حاتم، اشعث بن قیس (تاریخ الاسلام، ذہبی: ۵۴۵/۳) عمرو بن الحمق، حجر بن عدی، (تاریخ خلیفۃ، ص ۱۹۴، ۱۹۵) الاسود بن ربیعہ (الاصابہ: ۲۲۸/۱) سلیمان بن صرد (تاریخ الطبری: ۵۲۳/۱۱) ابوواقد لیثی (التاریخ الاوسط: ۹۷/۱) بشیر بن عقبہ ابومسعود انصاری (الاستیعاب: ۱۷۷/۱) جبلہ بن عمرو انصاری (تاریخ الاسلام، ذہبی: ۲۸/۳) ربیعہ بن قیس (تاریخ ابن یونس: ۱۷۴/۱) زید بن ارقم (الاصابہ: ۴۸۸/۲) عبدالرحمن بن ابزیٰ (تاریخ خلیفہ، ص ۱۹۶) عبداللہ بن ابی طلحہ، انس بن مالک کے باپ شریک بھائی (تہذیب الاسماء واللغات: ۲۷۴/۱) فاکہ بن سعد انصاری ابوعقبہ (الاصابہ: ۲۶۸/۵) عبداللہ بن بدیل بن ورقاء: اسی لڑائی میں شہید ہوئے (تقریب التہذیب، تر: ۳۲۲۵) سعد بن الحارث بن صمۃ: اسی لڑائی میں شہید ہوئے (طبقات ابن سعد: ۵۰۸/۳) مسطح بن اثاثہ: اسی لڑائی میں شہید ہوئے (تہذیب الاسماء واللغات: ۸۹/۲) بحوالہ تحقیق

② لشکرِ علوی میں بیعتِ رضوان سے مشرف بزرگوں کی موجودگی درج ذیل روایت سے ثابت ہوتی ہے:

عن عبدالرحمن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ قال شھدنا مع علیّ ثمانیۃ مائۃ ممن بایع بیعۃ الرضوان قتل منا ثلاثۃ وستون، منھم عمار بن یاسر "ہم بیعتِ رضوان میں شامل ۸۰۰ افراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہوئے، جن میں سے ۶۳ قتل ہوئے، انہی میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھے۔" (تاریخ خلیفۃ، ص ۱۹۶)

سند یہ ہے: عبدالسلام بن حرب، یزید بن عبدالرحمن (ابو خالد الدالانی) جعفر ابن ابی المُغِیرَۃ، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبدالرحمن بن ابزیٰ

عبدالسلام بن حرب بخاری و مسلم کے ثقہ راوی ہیں۔ یزید بن عبدالرحمن صدوق، جعفر ابن ابی المغیرہ صدوق اور عبداللہ بن عبدالرحمن صدوق وثقہ ہیں جبکہ عبدالرحمن بن ابزیٰ صحابی ہیں۔ یوں سند متصل اور صحیح ہے۔ اگرچہ ایک دوسری روایت اس کے متعارض ہے جس میں امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ھاجت الفتنۃ و اصحاب رسول اللہ ﷺ عشرۃ آلاف، فما حضرفیھا مائۃ بل لم یبلغوا ثلاثین "فتنہ برپا ہوا تو اصحابِ رسول دس ہزار کی تعداد میں تھے مگر ان میں سے ایک سو بھی اس میں شامل نہیں ہوئے بلکہ ان کی تعداد تیس بھی نہیں تھی۔" (السنۃ للخلال، ح: ۷۲۸)

اس روایت کو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اصح الاسانید کہا ہے مگر یہ دعویٰ محلِ نظر ہے؛ کیوں کہ امام ابن سیرین رحمہ اللہ جنگِ صفین کے موقع پر موجود نہیں تھے۔ ابن سعد نے صحیح اور متصل سند کے ساتھ ان کے بھائی انس بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ محمد بن سیرین ۳۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۱۹۳/۷ ط صادر) یعنی جنگِ صفین کے وقت وہ چار سال کے تھے، پس روایت منقطع ہے۔ جبکہ ابن ابزیٰ رضی اللہ عنہ خود جنگ میں شریک تھے، آنکھوں دیکھی بات کو یقیناً سنی سنائی پر ترجیح ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے بیعتِ رضوان سے مشرف ۸۰۰ صحابہ کرام کا جنگِ صفین میں شریک ہونا اس سے محلِ نظر کہا ہے کہ ان اصحاب کے احوال الگ الگ بھی مرتب ہیں جن کے احوال میں یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ جنگِ صفین میں شریک تھے، وہ اتنے زیادہ نہیں۔ اس لیے یہ امکان موجود ہے کہ ابن ابزیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کے کسی راوی کو تعداد میں وہم ہو گیا ہو، اس سند میں یزید بن عبدالرحمن کے متعلق حافظ ابن حجر "صدوق یخطئی کثیرا۔" کی وضاحت کرتے ہیں۔ (تقریب التہذیب، تر: ۸۰۷۴)

اس اعتراض کو اہمیت دی جائے تب بھی اتنا تو طے ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بڑی تعداد میں صحابہ تھے جن میں بدری اور اصحابِ بیعتِ رضوان بھی تھے۔ دوسری طرف شامی لشکر میں صحابہ تھے مگر تعداد اور مراتب میں کم تھے۔ بہر صورت یہ بات ظاہر ہے کہ صحابہ کا تناسب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف زیادہ تھا۔ جہاں تک تابعین کا تعلق ہے، وہ دونوں طرف ہزارہا تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

لشکرِ علوی کے چند مشہور تابعین: احنف بن قیس، رفاعہ بن شداد، حارث بن مرۃ، صعصعہ بن صوحان، حضین بن منذر (تاریخ خلیفہ، ص ۱۹۴، ۱۹۵) ابوالاسود الدؤلی (الثقات لابن حبان: ۴۰۰/۳) ربیعہ بن قیس (الاصابۃ: ۳۹۴/۲) سوید بن غفلۃ (ابن سعد: ۶۸/۶) عبدالرحمن بن خراش الانصاری (الاصابۃ: ۲۵۴/۳) عبدالرحمن بن ابی عمرہ (ابن سعد: ۸۳/۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور امام عاصم کوفی کے استاذ شیخ القراء عبداللہ بن حبیب ابوعبدالرحمن سلمی (تاریخ طبری: ۳۰/۵) عبداللہ بن اُذَیْنَہ عاتقی (ابن سعد: ۵۱۰/۷) عمرو بن شرحبیل ابومیسرہ کوفی (تاریخ ابن ابی خیثمہ، السفر الثالث: ۱۷۲/۳) محمد بن حنفیہ (طبقات ابن سعد: ۹۳/۵) منتشر ابن اجدع (طبری: ۶۶۵/۱۱، فی الذیل المذیل) ہاشم بن عتبہ، اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ (تاریخ دمشق: ۳۲۷/۷۳) بحوالہ تحقیق

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۳

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ قریش کے امیر تھے۔ عَمرو بن الحَمِق، عدی بن حاتم، حُجر بن عدی اور جاریہ بن قُدامہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ رِفاعہ بن شداد، حارث بن مُرّۃ، اَحنف بن قیس، اور صَعصَعہ بن صُوحان رحمہم اللہ بھی مختلف قبائل کے قائد تھے۔[1] اَشتَر نخعی کے پاس قبیلہ مَذحِج کی کمان تھی۔[2]

شامی لشکر کی قیادت:

دوسری طرف شامی لشکر کے علم بردار عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ تھے۔ گھڑسواروں کے امیر عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ دایاں بازو عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور بایاں بازو حبیب بن مَسلَمہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں تھا۔ ان کے علاوہ، ابوالاعور سلمی، ذوالکلاع حِمیری، مَسلَمہ بن مُخلّد اور بُسر بن اَرطاۃ رضی اللہ عنہم الگ الگ دستوں کے امیر تھے۔[3]

جنگ کا منظر:

دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوتیں اور صف اوّل کے مردانِ کاری مقابل آتے تو نیزے آپس میں گتھ جاتے۔ نیزوں کی کثرت کا یہ عالم ہوتا کہ ایک عینی شاہد کے بقول ان پر چلنا پھرنا بھی ممکن تھا۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ خود کئی بار میدانِ جنگ میں اترے اور اپنی مشہور شمشیر ذوالفقار اس زور وشور سے چلائی کہ وہ مڑ گئی۔[5] میدانِ جنگ کی یہ حالت تھی کہ سپاہیوں کی کثرت کی وجہ سے دونوں طرف کی صفوں کے آخری سرے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دونوں جانب سے بیک وقت تکبیر کے نعرے لگتے اور کلمہ طیبہ کی صدائیں بلند ہوتیں جس سے فضا گونج گونج جاتی تھی۔[6]

---

① تاریخ خلیفۃ، ص ۱۹۴، ۱۹۵ بسند حسن ② تاریخ خلیفۃ، ص ۱۹۵ ③ تاریخ خلیفۃ ص ۱۹۵، ۱۹۶ بسند حسن

شامی لشکر میں شامل بعض صحابہ کرام کے اسماء یہ ہیں:

عَمرو بن حزم (مسند احمد، ح: ۱۷۷۸۰)، عقبہ بن عامر جہنی (الاصابۃ: ۴/۴۲۹) عَمرو بن العاص (اسد الغابۃ: ۴/۲۳۲) عبداللہ بن عَمرو بن العاص (اسد الغابۃ: ۳/۳۴۵) مَسلَمہ بن مُخلّد (سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۲۴) عبدالرحمٰن بن خالد، حبیب بن مسلمہ، بسر بن ارطاۃ، ابوالاعور السلمی (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۵، ۱۹۶) عبیداللہ بن عمر بن الخطاب، اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۵۸؛ الاصابۃ: ۵/۴۱، ۴۲) عبادہ بن اوفی (مختصر تاریخ دمشق: ۱۱/۲۰۱) ابوغادیہ جہنی (معجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/۳۶۳) حمل بن سعدانہ (الاصابۃ: ۲/۱۰۸) ذوالکلاع حمیری (الاصابۃ: ۲/۳۵۶) زمل بن عَمرو (الاصابۃ: ۲/۴۶۹) شرحبیل بن سمط (الاصابۃ: ۳/۲۶۶) عَمرو بن سبیع (الاصابۃ: ۴/۵۲۲) یزید بن اسد (الاصابۃ: ۶/۵۰۶) حوشب ذی ظلیم حمیری (الاستیعاب: ۱/۴۱۰) [illegible]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: لقد شهد معی صفین عدة من اصحاب محمد ﷺ صفین میں متعدد صحابہ میرے ساتھ تھے۔ (الآحاد والمثانی، ح: ۵۰۰)

شامی لشکر کے بعض تابعین کے اسماء یہ ہیں: عبدالرحمٰن القیسی، سابس بن سعد طائی، طریف بن الحساس، حسان بن بحدل، عباد بن یزید، ابن حی السکسکی، یزید بن عمر، حبیش بن دولجہ، شریک کنانی، مخارق بن الحارث، ناتل بن قیس، حمزہ بن مالک، یزید بن ابی انس (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۵، ۱۹۶) ظریف کا حارث حوشب ذو ظلیم، طریف بن حساس (تاریخ خلیفہ، ص ۱۹۵) حارث بن عبداللہ الازدی (الاصابۃ: ۲/۱۳۵) ملحان بن زیاد (الاصابۃ: ۶/۲۴۵) کریب کا صباح۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کریب مبارزت میں قتل ہوئے۔ (الاصابۃ: ۵/۴۷۹) رحمہم اللہ

روافض نے اپنی کتب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر طعن کے لیے یہ خود ساختہ کہانی گھڑی ہے کہ وہ اتنے حریص تھے کہ صفین میں نماز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھتے اور کھانا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھاتے تھے۔ یہ محض افسانہ ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس جنگ میں موجود نہ تھے۔ (الضوء اللامع المبین: ص ۱۲۱)

اسی طرح روافض نے عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر طعن کرتے ہوئے یہ افسانہ بھی گھڑا ہے کہ وہ جنگ میں اہل شام کے ساتھ تھے۔ کتب روافض کے سوا کسی قدیم ماخذ میں اس کہانی کا ذکر نہیں۔ اہل سنت کے ماخذ سے فقط یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقیل رضی اللہ عنہ ایک موقع پر دمشق گئے تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں خوب نوازا مگر حضرت عقیل رضی اللہ عنہ نے وہاں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا دفاع بڑی خوبی سے کیا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۱۰۰)

④ مصنف ابن ابی شیبہ ح: ۳۷۸۴۹، ط الرشد

⑤ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۷۸ بسند صحیح، ط الرشد ⑥ طبقات ابن سعد: ۷/۸۱ عن ابی العالیۃ



دونوں طرف کے بہادروں میں صحابہ اور بزرگ تابعین کثرت سے تھے جو مادی فوائد کے تصورات سے بالاتر ہو کر صرف اللہ کی رضا، جنت کے حصول اور اسلام کی بقا کے لیے لڑ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے پیادہ سپاہیوں میں اویس قرنی رحمہ اللہ جیسے بزرگ موجود تھے جو اس لڑائی میں حملہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے سید التابعین (تابعین کے سردار) کا لقب عطا کیا تھا۔ ①

ان میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقہی میراث کے امین علقمہ بن قیس رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ ان کے جانشین ابراہیم نخعی رحمہ اللہ بتاتے تھے کہ ہمارے استاد نے میدانِ جنگ میں اُتر کر اپنی شمشیر پوری توانائی سے استعمال کی۔ ②

یہ جون کا مہینہ تھا مگر لشکرِ عراق میں شامل بدری صحابی ابو عَمرہ انصاری رضی اللہ عنہ اس حالت میں بھی نفل روزے رکھ رہے تھے۔ ایک دن گرمی سے بے حال ہوئے تو غلام سے کہا: ''مجھ پر پانی چھڑکو۔''

پھر تین تیر چلائے جو کمزوری کی وجہ سے زیادہ دور نہ گئے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے جو اللہ کی راہ میں تیر چلائے، چاہے وہ لگے یا نہ لگے، اسے تیر کے بدلے قیامت میں ایک روشنی عطا ہوگی۔''

ابو عَمرہ انصاری رضی اللہ عنہ اس دن شام سے پہلے شہید ہوگئے۔ ③

جنگ میں شرکت سے احتیاط کرنے والے:

مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جو عین وقت پر تذبذب میں پڑ گئے اور کسی کے خون میں ہاتھ رنگنے سے احتراز کرتے ہوئے میدانِ جنگ سے نکل آئے۔ ④ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ایک اہم ستون حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا یہ حال تھا کہ وہ آخر تک مخالفین پر ہتھیار اٹھانے سے کتراتے رہے۔ ⑤ وہ صفین میں اس عہد کے ساتھ آئے کہ جنگ میں عملی شرکت نہیں کریں گے۔ ان کے والد حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بڑے اصرار سے انہیں ساتھ لائے تھے۔ ⑥ جنگ کے بعد حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما برملا کہا کرتے تھے: ''بھلا میرا صفین سے کیا واسطہ! مسلمانوں سے لڑنے سے بھلا مجھے کیا سروکار! اچھا ہوتا کہ میں اس سے دس سال پہلے مر گیا ہوتا۔'' ⑦

---

① مستدرک حاکم، ح: ۵۷۲۸، سکت عنه الذهبی

② " رجع علقمة یوم صفین وعضب سیفه مع علیّ." (مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۸۶۹، ۳۷۸۷۰، ط الرشد) اسناده متصل صحیح
رواة: عبدالله بن نُمَیر، اعمش، مسلم البطین (مسلم بن عمران) و ابوالبختری ـ وهذه الرواة کلهم ثقات.
یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جنگ بہرحال جنگ تھی، وہ پھولوں سے نہیں تلواروں ہی سے لڑی جاتی ہے۔ اس لیے مذکورہ بعض تفصیلات ضعیف اسناد سے بھی منقول ہوں تو ان میں عقلاً وشرعاً کوئی استبعاد نہیں۔

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/۳۸۱؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۶۸۹

④ قال ابوالعالیة: لما کان زمن علی ومعاویة وانی لشاب، القتال احب الی من الطعام الطیب، فجهزت بجهاز حسن، حتیٰ اتیتهم، فاذا صفان لا یُریٰ طرفاهما، اذا کبر هؤلاء کبر هؤلاء، واذا هلل هؤلاء هلل هؤلاء قال فراجعت نفسی، فقلت ای الفریقین انزله کافرا وای الفریقین انزله مؤمنا ومن اکرهنی علیٰ هذا، فما امسیت حتیٰ رجعت وترکتهم. (طبقات ابن سعد: ۷/۸۱؛ سیر اعلام النبلاء: ۴/۲۰۹)

⑤ طبقات ابن سعد: ۴/۲۶۶، ۲۶۷، ط صادر

⑥ مسند احمد، ح: ۶۵۳۸ ⑦ طبقاتِ ابن سعد: ۴/۲۶۶، ۲۶۷، ط صادر

غرض بہت سے حضرات وہاں موجود ہو کر بھی جنگ میں شرکت کے متعلق تذبذب میں تھے،[1] اس کے باوجود اکثریت میدان میں ڈٹی رہی اور جنگ ہوتی رہی۔

فریقین میں شرافت و دیانت کی اعلیٰ مثالیں:

جنگ صفین اِس لحاظ سے تاریخ میں ایک بالکل نئی طرز کی جنگ تھی کہ اس میں قتل وقتال کی ہولناکیوں کے ساتھ ساتھ دونوں طرف سے اخلاق، مروت، شرافت اور کشادہ دلی کی بہترین مثالیں سامنے آ رہی تھیں۔ فتنہ پرور سبائیوں اور شدت پسندوں کے ایک گروہ کو چھوڑ کر اکثریت کامل ایمان والوں کی تھی۔ یہ بنوامیہ یا بنوہاشم کی نہیں اُصول کی جنگ تھی۔ یہ دنیا کی تاریخ میں اندرونِ مملکت لڑی جانے والی کسی باقاعدہ جنگ کی پہلی مثال تھی جس میں جنگی قوانین کی مکمل پاسداری اور مخالف فریق سے شریفانہ برتاؤ کی بابت ایک معیار دیا گیا تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ دونوں طرف کی قیادت نامور صحابہ کرام کے ہاتھ میں تھی جن کا مقصدِ حیات، اللہ کے رسول کی پیروی تھا۔ چنانچہ تلواریں نیاموں میں ڈالتے ہی وہ بھائی بھائی نظر آتے، وہ ایک ہی جگہ سے پانی لیتے، رش کے باوجود کوئی کسی دوسرے کو ذرا بھی اذیت نہ دیتا تھا۔ ایک کو دوسرے کی چیز مل جاتی تو امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا اور واپس پہنچانے کی پوری کوشش کرتا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ جنگ کے ہنگاموں کے باوجود حضور ﷺ کی سنتوں کا پورا لحاظ تھا، یہاں تک کہ رات کو ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کی تسبیح کرنے کا جو معمول تھا، اسے بھی ضایع نہیں ہونے دیا۔[3]

جنگِ جمل کی طرح یہاں بھی فریقین نہ کسی زخمی کی جان لینے کی کوشش کرتے، نہ کسی بھاگنے والے پر حملہ کرتے، نہ کسی لاش سے اسلحہ اور سامان اتارتے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رحم دلی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اہلِ شام کا کوئی سپاہی گرفتار کر کے لایا جاتا تو آپ فرماتے: ''میں تمہیں ہرگز قتل نہ کروں گا، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔'' آپ یہ وعدہ لے کر اسے چھوڑ دیتے کہ وہ دوبارہ ان کے خلاف جنگ میں شرکت نہیں کرے گا اور اسے چار درہم دے کر رخصت کرتے۔[5]

حالتِ جنگ کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وسعتِ قلبی کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کسی نے آواز لگا دی: ''الٰہی! شام والوں پر لعنت فرما۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً منع کیا اور فرمایا:

---

① ابو مخنف کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے صاجزادے حسن رضی اللہ عنہ بھی لشکر میں موجود ہونے کے باوجود عملاً جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ (طبری، ۱۹/۵) ابو مخنف ہی کے مطابق ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نامور بیٹے حضرت محمد بن حنفیہ کے مقابلے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آ نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف تلواریں سونتے دیکھا تو اپنی سواری کو ایڑ لگا کر فوراً صاجزادے کے پاس گئے اور انہیں واپس بھیج دیا، پھر عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں تمہارے سامنے ہوں، لڑنا ہی ہے تو مجھ سے لڑو۔'' انہوں نے جواب دیا: ''میں آپ سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔'' یہ کہہ کر واپس لوٹ گئے۔ (تاریخ طبری: ۱۳،۱۲/۵)

② تاریخ الطبری: ۵۷۱/۴، یہ ابو مخنف کی گواہی ہے۔

③ شعب الایمان للبیہقی: ۱۲۰/۲، ط مکتبۃ الرشد

④ مستدرک حاکم، ح: ۲۶۶۰

⑤ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۵۹، ۳۷۸۶۱، ط الرشد



''شام والوں کو برا مت کہو۔ ان میں ابدال (جلیل القدر اولیاء) موجود ہیں۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ ایک عینی شاہد کے بیان کے مطابق رات کے وقت انہیں دیکھا گیا کہ اہلِ شام کے پڑاؤ کی طرف دیکھ رہے ہیں اور زبان پر یہ الفاظ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَ لَھُمْ. (اے اللہ میری بھی مغفرت فرمادے اور ان کی بھی۔)[2]

جب جنگ کے دوران کھانے پینے، آرام، شہداء کی تدفین اور نمازِ جنازہ کے لیے وقفہ ہوتا تو دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے اور بے تکلف ملتے ملاتے تھے۔[3] دونوں اطراف نمازوں کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دونوں لشکروں کے پڑاؤ میں اذانیں گونجتیں، اقامت ہوتی اور نمازیں جماعت سے ادا کی جاتی تھیں۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپاہی بلا تکلف حضرتِ مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے افسران کے پیچھے نمازیں ادا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی کھلے دل سے اجازت دی تھی۔[5] حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو دونوں فوجوں نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔[6] یہ شرافت، اخلاق اور کلمہ گوئی کی توقیر کی ایسی مثالیں تھیں جو ''احترامِ انسانیت'' کا کھوکھلا نعرہ لگانے اور انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹنے والی مغربی دنیا اب بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت:

جنگ کے تیسرے دن حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ پیش آگیا جو عراقی لشکر کے اکابر اور اسلام لانے والے اولین چند صحابہ میں سے تھے۔ اس وقت وہ بہت ضعیف ہوچکے تھے۔ عمر ۹۳ برس تھی۔[7]

اپنے موقف کی درستگی پر انہیں اتنا یقین تھا کہ فرمارہے تھے: ''اللہ کی قسم! اگر اہلِ شام ہمیں مار مار کر کوہِ ہجر کی چوٹیوں تک بھی دھکیل دیں تب بھی مجھے اپنے حق پر ہونے اور مخالفین کی غلطی کا یقین رہے گا۔''[8]

مگر اس موقف کے باوجود وہ حریف کو اپنے جیسا مسلمان ہی تصور کرتے تھے، چنانچہ جب کسی شخص نے کہا: ''شام والے کافر ہوگئے ہیں'' تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''ہمارا اور ان کا رسول ایک ہے، قبلہ ایک ہے، مگر وہ لوگ فتنے کا شکار ہو کر صحیح روش سے ہٹ گئے ہیں، جب تک وہ باز نہیں آتے، ہم پر ان سے لڑنا لازم ہے۔''[9]

اعتدال کا اس سے بڑھ کر نمونہ اور کیا ہوگا کہ دورانِ جنگ میں بھی مخالف کے متعلق انصاف کی بات کی جائے۔

جنگ کی تیسری شام کو عمار رضی اللہ عنہ نے افطار کے لیے دودھ منگوایا اور فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، تم آخری چیز

---

① اتحاف الخیرۃ: ۳۵۶/۷، ط دار الوطن ۔ مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد، ح: ۲۰۴۵۵، ط المجلس العلمی پاکستان

② مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۶۵، ط الرشد ③ مجمع الزوائد لنور الدین الھیثمی، ح: ۱۲۰۴۸

④ لحضرت الصلوۃ فاذنا واذنوا، واقمنا فاقاموا، فصلینا وصلوا. (سنن سعید بن منصور: ۳۹۷/۲، ط دار السلفیۃ)

⑤ بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب لکمال الدین ابن العدیم: ۳۰۲/۱، ط دار الفکر

⑥ تاریخ دمشق: ۳۶۰/۱۰، دار الفکر ⑦ سیر اعلام النبلاء: ۴۲۶/۱، ط الرسالۃ

⑧ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۴۰، ط الرشد ۔ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۶۰۱

⑨ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۴۱ ۔ مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۲۷۸ ۔ مسند احمد، ح: ۱۸۸۸۴ ۔ صحیح ابن حبان، ح: ۷۰۸۰

جو دنیا میں پیو گے، وہ دودھ کا ایک گھونٹ ہوگا۔" افطار کر کے وہ جنگ میں شریک ہوئے اور شہید ہو گئے۔[1]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کس نے قتل کیا؟

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو شامی فوج کے ایک مشہور فرد ابو غادیہ الجہنی نے قتل کیا تھا۔[2] اس لیے شامی فوج کے سپہ سالار عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو ہماری فوج نے قتل کیا ہے۔ امام نسائی صحیح سند سے روایت کرتے ہیں کہ ایک بار عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: "میں نہیں سمجھتا کہ جس شخص سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک محبت کرتے رہے، اسے اللہ جہنم میں داخل کرے گا۔" لوگ کہنے لگے: "ہمارا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے محبت تھی تبھی آپ کو افسر بناتے تھے۔" عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اللہ بہتر جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے محبت تھی یا میری دلداری کرتے تھے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص سے یقیناً محبت تھی۔" لوگوں نے پوچھا "وہ کون؟" عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "عمار بن یاسر۔" لوگوں نے کہا: "وہ تو صفین میں آپ ہی نے قتل کیے تھے۔" عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بے شک، اللہ کی قسم ہم نے ہی انہیں قتل کیا تھا۔"[3]

---

① الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۲۷۲؛ مسند احمد بن حنبل، ح: ۱۹۳۹۳؛ طبقات ابن سعد: ۲۵۷/۳، ط صادر

② یہ بات صحیح روایات سے ثابت ہے۔ ابوغادیہ (وقیل: ابو الغادیۃ) کا اپنا بیان کتب حدیث میں منقول ہے کہ: کنا نعد عمار بن یاسر من خیارنا فلما کان یوم صفین ماقبل یمشی اوّل الکتیبۃ راجلاً حتیٰ اذا کان من الصفین طعن رجلٌ فی رکبتہ فانکفأ المغفر فضربتہ فاذا ھو راس عمار۔
"عمار بن یاسر کو ہم اپنے اچھے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ صفین کے دن وہ پہلے دستے میں پیدل آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے بیچ میں آئے تو ایک شخص نے ان کے گھٹنے پر نیزہ مارا، وہ گرے تو ان کا خود ڈھلک گیا، میں نے وار کیا تو دیکھا وہ عمار کا سر تھا۔" (المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۶۳/۲۲، رجالہ کلھم ثقات؛ مجمع الزوائد، ح: ۸۲۲۲، قال الھیثمی ورجالہ رجال الصحیح؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۶۵۸، رجالہ ثقات)
اگر قتلِ عمار کا الزام سبائیوں پر ڈالنے کی ذرا بھی گنجائش ملتی تو ہم بالکل گریز نہ کرتے مگر صحیح سند سے ابو غادیہ کا اپنا اعترافی بیان موجود ہے۔ نیز امام بخاری اور امام مسلم دونوں متفق ہیں کہ قاتل ابوالغادیہ تھے۔ امام مسلم فرماتے ہیں: ابو الغادیۃ یسار بن سبع، قاتل عمار، لہ صحبۃ۔ (الکنیٰ والاسماء: ۶۶۹/۲) امام بخاری نقل کرتے ہیں کہ ابوالغادیہ جب شامی قائدین سے ملنے آتے تو دربان کو تعارف یوں کراتے: "قاتل عمار بالباب" (التاریخ الاوسط: ح ۷۱۸) امام دارقطنی کہتے ہیں: ابوالغادیہ یسار بن سبع، انہیں شرف صحابیت نصیب ہوا، انہی نے صفین میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ (سؤالات السلمی دارقطنی: ۴۳۱؛ المؤتلف والمختلف: ۱۷۴۳/۴) تمام محدثین اور مؤرخین کی متفقہ رائے یہی ہے۔ حافظ ابن حجر، علامہ ابن عبدالبر، ابن اثیر الجزری اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یہی لکھا ہے۔
(الاصابۃ: ۲۵۸/۷ ط العلمیۃ؛ الاستیعاب ۱۷۲۵/۴؛ اسد الغابۃ ۲۳۱/۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۵۴۴/۲، ط الرسالۃ)
یہی وجہ ہے کہ امام بخاری اور امام نووی سے لے کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تک سبھی نے اہلِ شام کو قاتلِ عمار تسلیم کرتے ہوئے "تقتلک الفئۃ الباغیۃ" سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مجتہدِ مصیب اور اہلِ شام کے مجتہدِ مخطی ہونے کا استدلال کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: شرح مسلم للنووی: ۴۰/۱۸، کتاب الفتن واشراط الساعۃ؛ فتح الباری ۸۵/۱۳، کتاب الفتن؛ عمدۃ القاری ۱۹۲/۲۴؛ مرقاۃ المفاتیح، کتاب الفضائل، باب المعجزات؛ الابواب والتراجم لصحیح البخاری شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ: ۱۶۶/۲، ۱۶۷)
وقال الشیخ المفتی محمد تقی العثمانی: "وھذا الحدیث فیہ معجزۃ ظاھرۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیث اخبر ان عمارا رضی اللہ عنہ سیموت مقتولا، ووقع کذلک، وانہ تقتلہ فئۃ تبغی علیٰ امام حق، ومن المسلم تاریخیا انہ قتل بصفین وھو من حزب علی رضی اللہ عنہ، وھو من اوضح الدلائل علیٰ ان علیا رضی اللہ عنہ کان ھو المحق المصیب فی حروبہ مع معاویۃ رضی اللہ عنہ وان کان معاویۃ واصحابہ رضی اللہ عنھم معذورین فی اجتھادھم" (تکملۃ فتح الملھم شرح صحیح مسلم: ۲۶۰/۶)

③ سنن نسائی الکبریٰ، ح: ۸۲۱۶، نصہ: قالوا: فذاک قتیلکم یوم صفین، قال قد واللہ قتلناہ (رواۃ: عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمن بن مسور بن مخرمۃ، معاذ بن ھشام الدستوائی، عبداللہ بن عون بن ارطبان، حسن البصری۔ تمام کے تمام بخاری ومسلم کے متفق علیہ راوی ہیں۔)
یہی روایت ابن سعد نے دو صحیح اسناد سے نقل کی ہے: "انا واللہ قتلناہ" ... "واللہ لقد قتلناہ۔" (طبقات ابن سعد: ۲۶۳/۳، صادر)



عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا: ﴿تقتله الفئة الباغية.﴾ ''انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔''[1]

لہٰذا ان کی شہادت کے بعد ان لوگوں کو بھی اہلِ شام سے لڑنے میں تردد نہ رہا جو کہ اب تک جنگ میں شرکت سے احتیاط برت رہے تھے۔ یوں اہلِ عراق کی طرف سے حملے میں غیر معمولی شدت آگئی۔ خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ تلوار نیام میں کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی تھی، اس لیے کہہ رہے تھے: ''جب تک عمار قتل نہ ہوں، میں نہیں لڑوں گا۔'' عمار رضی اللہ عنہ قتل ہوئے تو انہوں نے بھی تلوار سونتی اور لڑتے ہوئے جان دے دی۔[2]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا قتل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لیے بھی ایک سوالیہ نشان چھوڑ گیا اور بعض اہم شخصیات شامی لشکر سے نکل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہوگئیں جن میں حضرت زبید بن عبد الخولانی رحمہ اللہ[3] اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت ہُنَیّ رحمہ اللہ نمایاں تھے۔[4]

حضرت عَمرو بن حزم رضی اللہ عنہ نے فوراً آکر یہ اطلاع حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو دی۔ وہ گھبرائے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر کے ساتھ ساتھ ''الفئة الباغية'' والی حدیث یاد دلائی جو یہ ثابت کر رہی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد میں حق پر ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خطا پر۔[5] مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ ہم ''الفئة الباغية'' کا مصداق نہیں ہو سکتے، ہم تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ شاید ان کے پیش نظر وہ حدیث تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا: ''ان کے قدموں کے نیچے (یعنی ان کے بعد) ایک فتنہ ظاہر ہوگا اور اس موقع پر ان کے پیروکار ہدایت پر ہوں گے۔''[6]

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اصل مطلب کو نظر انداز کر کے عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہا:

''أَوَ نَحْنُ قَتَلْنَاهُ؟ إِنَّمَا قَتَلَهُ عَلِيٌّ وَأَصْحَابُهُ جَاؤُوا بِهِ حَتَّى أَلْقَوْهُ بَيْنَ رِمَاحِنَا''

(کیا عمار کو ہم نے قتل کیا ہے؟ انہیں تو حضرت علی اور ان کے ساتھیوں نے قتل کرایا ہے جو اُن کو لے کر آئے اور

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۷۵۰۶، کتاب الفتن، باب لاتقوم الساعة......؛ سنن الترمذی، ح: ۳۸۰۰، باب مناقب عمار رضی اللہ عنہ

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل سے متعلق یہ روایت صحیح ہے۔ ام المؤمنین ام سلمہ، حضرت عثمان بن عفان، ابو سعید خدری، عمرو بن حزم، انس بن مالک، عمرو بن العاص اور عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سمیت متعدد صحابہ سے مروی ہے۔ علماء نے اسے حدیثِ متواتر شمار کیا ہے۔ امام ابن تیمیہ بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔ وو الحدیث ثابت صحیح. (منهاج السنة: ۴/۴۱۸) امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صحابہ جنگِ صفین میں عمار رضی اللہ عنہ کے پیچھے چلتے تھے: کیوں کہ انہیں اس حدیث کی وجہ سے معلوم تھا کہ عمار رضی اللہ عنہ برحق جماعت کے ساتھ ہوں گے۔ (تهذيب الاسماء واللغات للامام النووی: ۲/۳۸)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی پہلے یہ رائے تھی کہ حدیث ﴿الفئة الباغية﴾ کی کوئی سند صحیح نہیں ہے۔ (السنة للخلال: ۲/۴۶۳)

مگر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فآخر الامرين منه تصحيحه یعنی امام احمد کا آخری قول اس حدیث کو صحیح قرار دینے کا ہے۔ (منهاج السنة: ۴/۴۱۴)

یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو تو قتلِ عمار رضی اللہ عنہ سے پہلے ہی اہلِ شام کے باغی ہونے میں شک نہ تھا؛ کیوں کہ باغی کی شرعی تعریف ان پر پوری آرہی تھی۔ (شک ہوتا تو وہ بغاۃ کا حکم یعنی قتالِ شرعی جاری کیوں کرتے۔) البتہ قتلِ عمار رضی اللہ عنہ سے یہ مسئلہ بہت سے ایسے لوگوں پر بھی واضح ہوگیا جو غلط فہمی میں تھے۔

[2] المعجم الكبير للطبرانی: ۴/۸۵؛ مسند احمد، ح: ۲۱۸۷۳، ۲۱۸۷۳ بسند صحيح لغيره [3] الاصابة: ۲/۵۰۲

[4] طبقات ابن سعد: ۳/۲۵۳ [5] مسند ابی یعلی، ح: ۷۱۷۵ بسند صحيح؛ مسند احمد، ح: ۱۷۷۷۸ بسند صحيح

[6] مسند احمد، ح: ۱۸۰۶۸، بسند صحيح؛ الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۱۳۸۱

ہمارے نیزوں کی زد میں ڈال دیا۔‘‘[1]

ظاہر ہے حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ توجیہ درحقیقت درست نہیں تھی مگر اس سے قتلِ عمار رضی اللہ عنہ پر ان کی اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی شدید پریشانی نمایاں ہورہی تھی۔[2] یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک بار عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے سخت بیماری کی حالت میں فرمایا تھا: ’’میں اس بیماری میں نہیں مروں گا۔ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے تھے کہ میری موت دو مؤمن جماعتوں کے درمیان قتل کیے جانے سے ہوگی۔‘‘[3] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صفین میں دونوں متحارب فریق بہرحال اہلِ ایمان اور مخلص تھے۔

لیلۃ الہریر:

منگل ۷ صفر سے جمعرات ۹ صفر تین دن تک دونوں لشکر میدانِ جنگ میں اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس دوران ہزاروں افراد کام آئے۔ دونوں فریق جنگ کا حتمی فیصلہ چاہتے تھے، اس لیے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جمعرات کو شام کا اندھیرا چھاجانے کے باوجود لڑائی نہ رکی، سپاہی لڑلڑ کر بے حال ہوچکے تھے مگر رات گئے تک جنگ کا ہنگامہ برپا رہا، تھکے ماندے سپاہیوں کے بری طرح ہانپنے، ایک دوسرے کو للکارنے اور کثرت سے نعرے لگنے کی وجہ سے تاریخ میں یہ شب ’’ **لَیْلَةُ الْهَرِیْر** ‘‘ کے نام سے یاد کی گئی، جس کا معنی غرانے اور چیخنے چلانے کی شب ہے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شب نمازِ مغرب ’’صلوٰۃ الخوف‘‘ کے طرز پر ادا کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کی عملی مشق کرائی۔[5] حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ کی شدت کی وجہ سے اپنے مسنون وظائف وقت پر ادا نہ کرسکے، مگر رات کے آخری پہر آپ نے ذرا موقع ملتے ہی ذِکر کا یہ معمول پورا کرلیا۔[6]

---

① مسند احمد، ح : ۱۷۷۷۸ ،قال المحقق شعیب الارنؤوط :اسناده صحیح،واخرجه الحاکم فی المستدرک (ح : ۲۶۶۳) بلفظه. قال الذهبی: ’’علیٰ شرط البخاری و مسلم‘‘. و هو اصح الاسانید عند اهل الاصول.

② غالباً اسی اضطراب میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے وہ بعید احتمال پیش کردیا ورنہ اس احتمال کی گنجائش نہیں تھی۔ بعض حضرات کے خیال میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ سبائیوں کی طرف تھا کہ وہی عمار رضی اللہ عنہ کو لائے اور وہی قاتل ہیں، وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں:

’’ انما قتله الذین جاء وا به.‘‘ ’’عمار کو انہی لوگوں نے قتل کیا ہے جو انہیں لے کر آئے۔‘‘(مسند احمد، ح : ۶۴۹۹)

مگر اوّل تو یہ روایت سنداً اس روایت سے کم درجے کی ہے جس میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے صریح الفاظ: ’’انما قتله علیّ و اصحابه‘‘ منقول ہیں۔ دوسرے اس روایت کے شروع میں راوی نے خود صراحت کی ہے کہ یہ الفاظ صفین سے واپسی کے وقت راستے میں کہے گئے، جبکہ پہلے صریح الفاظ پر مشتمل روایت میں راوی کی یہ وضاحت موجود ہے کہ قتل عمار رضی اللہ عنہ کے فوراً بعد وہ الفاظ کہے گئے۔ پس اصل الفاظ وہی ہیں جو پہلے کہے گئے تھے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام صراحت سے لیا گیا ہے۔ بعد والے مبہم الفاظ میں بھی سبائی مراد نہیں ہوسکتے تھے کہ قاتل کوئی خفیہ لوگ نہیں بلکہ معروف شامی افسر ابوعادیہ جہنی تھے اور ان کا سبائی ہونا کسی بھی طرح ثابت نہیں بلکہ وہ تو قصاصِ عثمان کی تحریک کے سرکردہ صحابہ میں سے ایک تھے۔ پس ان مبہم الفاظ کو سابقہ صریح الفاظ پر ہی محمول کیا جائے گا۔

③ لاموت الاقتلاً بین فئتین مؤمنین. (التاریخ الاوسط، امام بخاری : ۷۹/۱،ط دار الوعی)

④ لسان العرب: ۲۶۰/۵ ، فتح الباری، العکبر والعسبح عند المنام: ۱۲۳/۱۱

⑤ ان علیاً صلی المغرب صلاة الخوف لیلة الهریر .(السنن الکبریٰ للبیهقی، ح:۶۰۰۸، باب الدلیل علی ثبوت صلوٰۃ الخوف)

⑥ صحیح البخاری، ح: ۵۳۶۲ ،کتاب النفقات ،باب خادم المرأة،و فی صحیح مسلم :قال علیّ :ما ترکته منذ سمعته من النبی ﷺ ، قیل ولا لیلة صفین ، قال ولا لیلة صفین. (ح:۷۰۹۳).وفی مسند الحمیدی :ولا لیلة صفین، ذکرتها من آخر اللیل. (ح :۴۳ ، ط دار السقا)

جنگ کا اختتام:

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اصل مقصد اتحادِ ملت تھا اور فوج کشی کے باوجود پہلا ہدف حریف پر دباؤ ڈال کر اسے منانا تھا۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہونے پر جنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ اندازہ یہ تھا کہ اہلِ شام معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیں گے۔ مگر جنگ کی غیر معمولی شدت دیکھنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے فرمایا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا تو میں کوفہ سے ہرگز نہ نکلتا۔''[1]

لیلۃ الہریر کے آخری پہر مقتولین اور زخمیوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی، تلواریں ٹوٹ چکی تھیں اور نیزے دُہرے ہو گئے تھے۔ سپاہی تھکن سے چُور ہو کر لڑنے سے عاجز ہو رہے تھے۔ اس طرح جنگ رُک گئی۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باضابطہ وقفے کے لیے شامی سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا:

''مقتولین بہت زیادہ ہو چکے ہیں، جنگ روک کر مقتولین کی تدفین کرنی چاہیے۔''

حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مثبت جواب دیا۔ اس کے بعد دونوں فریق باہم گھل مل گئے۔[3]

یہ عارضی جنگ بندی رات کے آخری حصے میں ہوئی تھی۔ صبح کو دونوں فریق تلواریں نیام کر کے ایک دوسرے کے پاس آ جا رہے تھے اور اپنے اپنے زخمیوں اور مقتولین کو تلاش کر کے لے جا رہے تھے۔[4]

صحابہ کی نگاہ میں فریقِ مخالف کی دینی حیثیت:

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس خندق کے کنارے پر بیٹھے تھے جس میں لاشیں دفن کی جا رہی تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے ایک شخص کی لاش دفن کے لیے لائی گئی تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا:

''یہ شخص بڑا مجاہد تھا۔ کتنے ہی لوگ جو اللہ کے احکام پر سختی سے عمل پیرا تھے، مارے گئے۔''[5]

مقتولین کے بارے میں صحابہ کرام کی مجموعی رائے یہ تھی کہ وہ جنتی ہیں، چاہے کسی بھی صف میں ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ بندی ہونے پر مقتولین کو دیکھنے نکلے تو اپنے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتول سپاہیوں کے لیے یکساں

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۵۲، ط الرشد

② الاخبار الطوال، ص ۱۸۸

③ انساب الاشراف، بلاذری: ۳۲۸/۲، ط دار الفکر

بعض حضرات کا خیال ہے کہ جنگ کے آخری مرحلے میں عراقی لشکر کے اہلِ شام پر بھاری پڑنے کی روایات محض افسانہ ہیں کیوں کہ یہ ابو مخنف سے منقول ہیں۔ ابو مخنف کی روایات ہمارے نزدیک بھی بے حیثیت ہیں مگر یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ جنگ بندی کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر غالب تھا جس کا اعتراف خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا تھا۔ (مصنف ابن ابی شیبۃ بروایت نمبر: ۳۷۸۷۳، باب ماذکر فی صفین، بسند صحیح متصل، رجالہ ثقات، ط الرشد)

البتہ ابو مخنف کی روایات میں بیان کی گئی یہ بات واقعی افسانہ ہے کہ اشتر نخعی فوج کو لے کر حریف کو پسپا کرتا چلا جا رہا تھا کہ عین اسی حالتِ جنگ میں یکا یک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تاکیداً حکم دے کر اسے رکوا لیا۔ کیوں کہ دینوری اور بلاذری کی تاریخی روایات (جو متن میں پیش کی گئی ہیں) بتاتی ہیں کہ لیلۃ الہریر کے آخری حصے میں وقفہ کر دیا گیا تھا اور اگلے دن اسی وقفے کے دوران یعنی دوبارہ جنگ برپا ہونے سے پہلے صلح کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔

④ الاخبار الطوال، ابو حنیفہ دینوری: ص ۱۸۸   ⑤ انساب الاشراف، بلاذری: ۳۲۸/۲، ط دار الفکر

طور پر دعائے رحمت کی۔ کسی نے پوچھا: ''آپ نے ان کا خون بہانا حلال قرار دیا، پھر ان کے لیے دعائے رحمت کر رہے ہیں۔'' فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے قتل کو ان کے گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے۔'' [1]

اَشتر نخعی نے شامی لشکر کے مقتولین میں حابس یمانی نامی ایک صاحب کو دیکھا تو انا للہ پڑھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو اَشتر نے کہا: ''میں اسے مومن سمجھتا تھا مگر آج یہ گمراہی پر مرا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''یہ اب بھی مومن ہی ہے۔'' [2]

پھر فرمایا: ''ہم میں سے اور ان میں سے جو بھی اللہ کی رضا کا طلب گار تھا، وہ نجات پا گیا۔'' [3]

یہ بھی فرمایا: ''ہمارے اور ان کے مقتولین جنتی ہیں، معاملے کی تمام ذمہ داری مجھ پر اور مُعاویہ پر عائد ہوتی ہے۔'' [4]

کسی نے اہلِ شام کے بارے میں زبان درازی شروع کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ایسا مت کہو! وہ سمجھے کہ ہم نے بغاوت کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بغاوت کی ہے۔ پس ہم نے باہم جنگ کی۔'' [5]

جنگ کے دوران بھی حریف کے بارے میں اس قدر غیر جذباتی اور منصفانہ بات کرنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے پناہ وسعتِ ظرفی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا منصفانہ کلام ایک خلیفۂ راشد ہی کے شایانِ شان تھا۔

خوابوں میں بشارت:

خوابوں میں بھی دونوں جماعتوں کے جنتی ہونے کی بشارتیں مل رہی تھیں، ایک تابعی نے خواب دیکھا کہ وہ جنت میں داخل ہو رہے ہیں، سامنے ایک خیمہ لگا ہے، پوچھا کس کا ہے؟ جواب ملا ''ذوالکلاع رضی اللہ عنہ کا اور حوشب رضی اللہ عنہ کا (جو کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو کر صفین میں قتل ہوئے تھے۔)

خواب دیکھنے والے نے پوچھا: ''عمار رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے مقتولین) کہاں ہیں؟''

جواب ملا ''تمہارے آگے (یعنی جنت میں مزید اعلیٰ مقام پر)

پوچھا: ''یہ کیسے ہوا؟ یہ حضرات تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے (یعنی جو فریق حق پر تھا اسے جنتی اور دوسرے فریق کو دوزخی ہونا چاہیے!) جواب ملا: ''جب وہ اللہ سے ملے تو اسے وسیع مغفرت والا پایا۔'' [6]

---

① جامع الاحادیث، ح: ۳۴۳۳۴ ، کنز العمال، ح: ۳۱۷۱۵

② جامع الاحادیث، ح، ۳۴۷۸۲ ، کنز العمال، ح: ۳۱۷۱۱

③ جامع الاحادیث، ح: ۳۴۸۶۴ ، کنز العمال، ح: ۳۱۷۰۷

④ سُئل علیٌ عن قتلیٰ یوم صفین فقال: قتلانا وقتلاھم فی الجنۃ ویصیر الامر الیّ والیٰ معاویۃ. (مصنف ابن ابی شیبۃ ح: ۳۷۸۸۰ ط الرشد)

⑤ انما ھم قوم زعموا انا بغینا علیھم، وزعمنا انھم بغوا علینا، فقاتلناھم. (تعظیم قدر الصلوٰۃ لمحمد بن نصر المروزی م ۲۹۴ ھجری بروایت نمبر: ۵۹۴ ، تاریخ دمشق: ۳۴۳/۱ ، بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب: ۳۰۰/۱) وفی معناہ قول عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ فی صفین. قال: دیننا واحد، وقبلتنا واحدۃ، ودعوتنا واحدۃ، ولکن قوم بغوا علینا فقاتلناھم. (تعظیم قدر الصلوٰۃ للمروزی، ح: ۵۹۹)

⑥ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۴۴ ، ط الرشد

جنگ میں شریک سپاہ اور مقتولین کی تعداد:

عراقی سپاہی اصح قول کے مطابق ایک لاکھ تھے[1] جن میں بہت سے بدری اور بیعتِ رضوان میں شامل صحابہ بھی تھے۔[2] شامی سپاہیوں کی تعداد ستر ہزار سے کم نہ تھی۔[3] جنگ کے دوران جاں بحق ہونے والوں کی تعداد صحیح قول کے مطابق ستر (۷۰) ہزار تھی[4] جن میں ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی تھے۔[5]

لیلۃ الہریر کے بعد فریقین کی نفسیاتی حالت:

عارضی جنگ بندی لیلۃ الہریر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیغام پر ہوئی تھی تاکہ مقتولین کی تدفین کی جا سکے۔ اگلی صبح فریقین نفسیاتی کش مکش کا شکار تھے۔ عراقی لشکر کے نقصانات کم نہیں تھے جس کی وجہ سے بہت سے عراقی افسران اور امراء کا صبر و تحمل جواب دینے لگا تھا۔ لیکن دوسری طرف لشکرِ شام کی حالت کہیں زیادہ تشویش ناک تھی۔ ایک دن جنگ مزید جاری رہتی تو شاید جنگ کا فیصلہ اہلِ عراق کے حق میں ہو جاتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرار کی نوبت آ جانے کے خدشے سے ایک نہایت برق رفتار گھوڑا بھی منگوا لیا تھا۔ مگر عراقیوں کو شامی لشکر کی کیفیت کا پورا اندازہ نہیں تھا جبکہ شامی قیادت کو عراقی لشکر کے کسی شخص نے بتا دیا کہ میں عراقیوں کو سخت اضطراب کی حالت میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔[6]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۳، مسعودی کے بقول ۹۰ ہزار تھے مگر یہ ضعیف روایت ہے۔ (مُرَوّج الذھب: ۱۲۰/۳، ط الجامعۃ اللبنانیۃ)

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۶ بسند حسن اگرچہ نوّے بدری صحابہ کے قول کو امام شعبہ نے رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اصحاب بدر میں سے خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی شریک نہیں ہوا تھا۔ (السنۃ للخلال، روایت نمبر: ۷۲۶ بسند صحیح)

مگر اس قول کو حافظ ذہبی نے رد کر کے کہا ہے: "قد شھدھا عمّار بن یاسر، والامام علیّ ایضا." (سیر اعلام النبلاء: ۲۲۱/۷، ط الرسالۃ)

پس معتدل رائے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بدری صحابہ یقیناً تھے اگرچہ ان کی تعداد بظاہر سینکڑوں میں نہیں تھی۔ امام طبرانی نے معجم کبیر میں "تسمیۃ من شھد مع علی رضی اللہ عنہ" کے الفاظ کے ساتھ متعدد صحابہ کا ذکر کیا ہے جو جنگِ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے جن میں بعض بدری حضرات بھی تھے، جبکہ شامی لشکر میں کوئی بدری صحابی نہیں تھا۔ فقط عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کا لشکرِ شام میں ہونا بعض لوگوں نے نقل کیا ہے مگر کتب طبقات، معاجم صحابہ، اسماء الرجال اور کتب تاریخ سے اس کی قطعاً تائید نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ابوالہیثم مالک بن تیہان رضی اللہ عنہ کا لشکرِ عراق میں شامل ہونا غلط طور پر مشہور ہے۔

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۳۔ مسعودی کے مطابق شامی سپاہیوں کی تعداد ۸۵ ہزار تھی۔ مگر یہ ضعیف قول ہے۔ (مُرَوّج الذھب: ۱۲۱/۳)

④ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۶۰، ط الرشد؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۳ عن ابن سیرین مرسلاً بسند حسن

⑤ تاریخ خلیفۃ، ص ۱۹۳ عن عبدالرحمن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ...... مسعودی نے مقتولین کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار نقل کی ہے جو مبالغے پر مبنی ہے۔ (مُرَوّج الذھب: ۱۴۳/۳) امام بیہقی نے اپنی سند سے ایک اور قول نقل کیا ہے جس کے مطابق عراقی لشکر میں ایک لاکھ بیس ہزار افراد تھے جن میں سے چالیس ہزار مقتول ہوئے جبکہ شامی سپاہی ساٹھ ہزار تھے جن میں سے بیس ہزار مقتول ہوئے، یوں کل مقتولین ساٹھ ہزار تھے۔ (دلائل النبوۃ: ۴۱۹/۶، ط العلمیۃ)

⑥ عن عاصم بن کلیب عن ابیہ قال: انی لخارج من المسجد اذ رأیت ابن عباس حین جاء من عند معاویۃ فی امر الحکمین --- وفیہ فقال ابن عباس: ھل علمتم ان اھل الشام سألوا القضیۃ فکرھناھا وابیناھا، فلما اصابتکم الجروح وعضکم الالم ومنعتم ماء الفرات انشأتم تطلبونھا. ولقد اخبرنی معاویۃ انہ اتی بفرس بعید البطن من الارض لیھرب علیہ، لم اتاہ آت منکم فقال: انی ترکت اھل العراق یموجون مثل الناس لیلۃ النفر بمکۃ. (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۷۳، ط الرشد)

اس دن فریقین کی کیفیت کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں مگر اصح روایت یہی ہے جس کی سند یہ ہے: یحییٰ بن آدم، ابن عیینہ، عاصم بن کلیب، کلیب بن شہاب۔

یہ تمام رجال اعلیٰ پائے کے ثقہ ہیں۔ یحییٰ بن آدم بخاری و مسلم کے راوی اور نہایت ثقہ ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵۲۲/۹، ۵۲۳، ط الرسالۃ)

ابن عیینہ (سفیان بن عیینہ) حجاز کے نامور محدث اور بخاری و مسلم کے راوی ہیں۔ ثقہ، حافظ اور حجۃ ہیں۔ (تقریب التھذیب، تر: ۲۴۵۱)

عاصم بن کلیب صحاح ستہ کے راوی ہیں، امام بخاری نے ان کی روایت تعلیقاً لی ہے۔ انہیں صالح و صدوق کہا گیا ہے۔ (تقریب التھذیب، تر: ۳۰۷۵)

ان کے والد کلیب کبار تابعین میں سے ہیں جنہیں صدوق مانا گیا ہے۔ (تقریب التھذیب، تر: ۵۶۶۰)

ویسے یہ توقع مشکل تھی کہ اہلِ عراق فتح کے قریب پہنچ کر بھی صلح پر آمادہ ہو جائیں گے مگر چونکہ شامی قیادت کو عراقیوں کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ خود اپنی حالت کو ان سے چھپانے میں کامیاب تھے، اس لیے انہیں صلح کا دروازہ کھل جانے کی غالب امید ہو گئی۔ صلح کا پیغام بھیجنے سے قبل حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مزید احتیاط یہ کی کہ اپنی فوج کو جس کے مقتولین بہت زیادہ ہو چکے تھے، پیچھے ہٹا کر ایک پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ①

کتاب اللہ پر فیصلے کی پیش کش:

اب ضروری سمجھا گیا کہ مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے اور فیصلے کا مدار شریعتِ محمدیہ پر رکھا جائے۔ چونکہ شریعت کی اساس قرآنِ مجید ہے، اسی لیے، اسے ''کتاب اللہ'' کی طرف دعوت کا عنوان دیا گیا تاکہ دونوں طرف کے مسلمان قرآنِ کریم سے ایمانی وجذباتی وابستگی کے باعث جنگ بندی پر آسانی سے تیار ہو جائیں۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''قرآنِ مجید کا نسخہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج کر انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیں وہ اس پیش کش کو مسترد نہیں کریں گے۔''

ایک صاحب یہ پیش کش لے کر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا:

''ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اللہ کی کتاب (مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے) موجود ہے۔''

پھر ان صاحب نے یہ آیت پڑھی:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ وَہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ.

''بھلا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب کا ایک حصہ عطا کیا گیا، انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر بھی ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور توجہ نہیں دیتا۔'' ②

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مثبت جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''ہاں ہاں! میں تو اس پیش کش کو سب سے پہلے قبول کرنے والا ہوں۔ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔'' ③

---

① ابن نُمَیر قال حدثنا عبدالعزیز بن سیاہ قال حدثنا حبیب بن ابی ثابت عن ابی وائل: "لمّا استحر القتل فی اھل الشام بصفین اعتصم معاویۃ واصحابہ بجبل فقال عمرو بن العاص: ارسل الیٰ علیّ بالمصحف". (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۹۱۴ باسناد صحیح، ط الرشد)

احوالِ رواۃ: ابن نُمَیر (عبداللہ بن نُمَیر، م ۱۹۹ھ) اعلیٰ پائے کے ثقہ، بخاری ومسلم کے راوی (سیر اعلام النبلاء: ۲۴۴/۹، ط الرسالۃ)

عبدالعزیز بن سیاہ (م ۱۵۰ھ) بخاری ومسلم کے صدوق راوی (تھذیب الکمال: ۱۴۶،۱۴۵/۱۸)

حبیب بن ابی ثابت (م ۱۱۹ھ) بخاری ومسلم کے اعلیٰ پائے کے ثقہ راوی (سیر اعلام النبلاء: ۲۸۸/۵، ط الرسالۃ)

ابووائل (شقیق بن سلمہ، م ۹۰ھ) نہایت ثقہ، چاروں خلفائے راشدین کے شاگرد (تاریخ الاسلام للذھبی: ۹۴۲/۲، ت بشار)

② سورۃ آل عمران، آیت: ۲۳ ...... آیت سنانے کا مقصد یہ تھا کہ کسی کو بھی قرآن سے اعراض کر کے اس آیت کی وعید کا مصداق نہیں بننا چاہیے۔

③ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۹۱۴، ط الرشد؛ مسند احمد، ح: ۱۵۹۷۵؛ التفسیر النسائی: ۳۰۲/۲، باسناد صحیحۃ

صحیح بخاری میں بھی اس روایت کا کچھ حصہ ہے، ح: ۳۱۸۹، باب غزوہ الحدیبیۃ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذاکرات کی پیش کش کیوں قبول کی؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ پر گرفت مضبوط ہونے کے باوجود، مذاکرات کی پیش کش کیوں قبول کر لی۔ اور اگر صلح ہی کرنی تھی تو پہلے جنگ پر اصرار کیوں کیا؟ دراصل اس کی دو وجوہ تھیں:

① افرادی قوت کے بے پناہ ضیاع نے عراقی فوج کے بہت سے امراء کو مضطرب اور جنگ سے بے زار کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عراقی فوج میں افتراق کے آثار دیکھ کر غم زدہ تھے اور انہیں ملامت کرتے ہوئے فرما رہے تھے:

''کاش! میرے ساتھ تمہاری جگہ بنو فراس کے فقط ایک ہزار افراد ہوتے۔''[1]

② حضرت علی رضی اللہ عنہ شرع کے مطابق تلوار کو فقط ناگزیر حد تک استعمال کرنے کے قائل تھے۔ اب چونکہ اہلِ شام کی طرف سے قرآن کے فیصلے کو ماننے کی یقین دہانی کرائی جا رہی تھی لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ پیش کش قبول کر لی۔

جنگ بندی کی اس گفتگو کا ابو مخنف کو اپنے تعصب کے باوجود اقرار کرنا پڑا۔ اس کا بیان ہے:

(سالارِ عراق) اَشعث بن قیس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: میرا خیال ہے کہ قرآن مجید کے حکم پر چلنے کی جو دعوت دی گئی ہے سب لوگ اسے قبول کرنے پر مطمئن اور خوش ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں مُعاویہ کے پاس جا کر ان کا ارادہ معلوم کروں تاکہ آپ ان کے سوالات پر غور کر سکیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر آپ کا یہ خیال ہے تو جا کر ان سے دریافت کر لیں۔''

اَشعث رضی اللہ عنہ مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا: ''مُعاویہ! آپ نے قرآن کو کیوں پیش کیا؟''

وہ بولے: ''تاکہ ہم اور آپ ان احکام پر چلیں جو اللہ نے اس میں دیے ہیں۔ آپ اپنا ایک ایسا شخص پیش کریں جس پر ہم راضی ہوں اور ہم بھی ایسا ایک شخص تجویز کریں۔ فریقین پر یہ لازم ہوگا کہ وہ جو اللہ کی کتاب میں پائیں اس پر عمل کریں، اس سے سرِ مُو انحراف نہ کریں۔ یہ دونوں شخص جو طے کر دیں، دونوں فریقوں کے لیے اس پر عمل لازم ہوگا۔'' اَشعث رضی اللہ عنہ بولے: ''یہ انصاف کی بات ہے۔'' اور آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے کہا: ''ہم نے یہ بات منظور کی، ہم راضی ہیں۔''[2]

مفسدین کی طرف سے جنگ بندی کی مخالفت:

مگر عراقی لشکر کے جن لوگوں کا خیال تھا کہ ایک دن مزید جنگ لڑ کر ہم فتح حاصل کر سکتے ہیں، وہ جنگ بندی کے حق میں نہیں تھے۔ ان میں کچھ لوگ تو مخلص تھے اور ایک رائے کے درجے میں ایسا کہہ رہے تھے۔ اپنے لشکر کی اکتاہٹ

---

① یہ روایت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے: عن ابی حنیفة عن موسیٰ بن ابی کثیر عن علی رضی اللہ عنہ انه قال لابی موسیٰ رضی اللہ عنہ حین حکمه: خلصنی منها ولو بعرق رلعتی، فانه لن یصول بهم احد الا صال بالسهم الاخث، ولوددت انی معی مکانهم الف فارس من بنی فراس بن غنم ولا جتماع هؤلاء علیٰ باطلهم اشد من اجتماعکم علیٰ حقکم. (کتاب الآثار، للقاضی ابی یوسف، ح: ۹۲۹، ط العلمیة)
فراس بن غنم دورِ جاہلیت کا ایک مشہور شاعر تھا جس کی اولاد بنو فراس کہلاتی تھی اور حرب و شجاعت میں مشہور تھی۔ (معجم شعراء العرب، ص ۱۸۶۲)

② تاریخ الطبری: ۵۱/۳، ابو مخنف کی اس روایت کو چھوڑ کر جنگ بندی کے متعلق یہ تمام مواد حدیث کی صحیح روایات سے پیش کیا گیا ہے۔

کا بھی انہیں اندازہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فراست اور فقاہت پر بھی انہیں کوئی شک نہ تھا، لہٰذا رائے کے اختلاف کے باوجود ان کے ہر فیصلے پر وہ سر جھکانے کے لیے تیار تھے۔[1]

مگر ان میں کچھ لوگ محض شر پسند تھے اور چاہتے تھے کہ جنگ کی آگ تیز سے تیز تر ہو اور مسلمان لڑتے لڑتے کمزور ہو جائیں۔ ان میں سے بعض وہ تھے جو مدینہ منورہ میں شر انگیزی اور فساد کے مرتکب ہوئے تھے۔[2] انہیں ڈر تھا کہ جنگ بندی کے بعد امن وصلح کے ماحول میں ان کے خلاف کوئی مشترکہ و متفقہ عدالتی فیصلہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ ایسے لوگ فوری طور پر جنگ بندی میں رخنے ڈالنے لگے۔ ابومخنف بھی تسلیم کرتا ہے کہ جنگ بندی کی مخالفت میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک میں شامل رہے تھے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

● اَشتر نخعی جو اس وقت ہراول دستے کا قائد تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگ بندی کے حکم پر بڑا جھنجھلایا، اس نے جواباً کہلوایا کہ یہ جنگ روکنے کا وقت نہیں، ہم فتح یاب ہونے والے ہیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اسے تاکیدی حکم بھیجا گیا کہ جنگ بندی کی جائے تو اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم پر احتجاج کرتے ہوئے باقی لوگوں کو بھی بھڑکانے کی کوشش کی اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکم ماننے پر خوب برا بھلا کہا۔[3]

● بہر حال جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق جنگ بندی ہوگئی اور جنگ بندی کا مسودہ لکھا جانے لگا تو اَشتر نخعی نے اس میں شرکت کی دعوت کو مسترد کرتے ہوئے کہا: ''اگر میں اس دستاویز پر دستخط کروں تو اللہ کرے میرا دایاں ہاتھ سلامت رہے نہ بایاں۔ کیا میں اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر نہیں اور کیا مجھے اپنے دشمن کی گمراہی کا یقین نہیں؟ ارے! اگر تم اس ظلم پر اتفاق نہ کر لیتے تو فتح ملنے ہی والی تھی۔''

یہ سن کر جنگ بندی میں اہم کردار ادا کرنے والے اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اللہ کی قسم! تم نے نہ کوئی فتح دیکھی نہ کوئی ظلم۔ ہمارے ساتھ ہو جاؤ، ہمیں تم سے کوئی عداوت نہیں۔''

اَشتر جھلا کر بولا: ''عداوت کیوں نہیں، میں تم سے دنیا میں دنیا کی خاطر اور آخرت میں آخرت کی خاطر دشمنی رکھتا ہوں۔ اللہ نے میری اس تلوار کے ذریعے بہت سے لوگوں کا خون بہایا ہے، تم میرے نزدیک ان سے بہتر نہیں ہو، میں تمہارا خون بھی حرام نہیں سمجھتا۔'' یہ سن کر حضرت اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ کا طیش سے برا حال ہو گیا۔[4]

---

① کما قال عبد اللّٰہ بن عباس للخوارج: ھل علمتم ان اھل الشام سالوا القضیۃ فکرھناھا و ابیناھا ..... وفی آخرہ قال: فلا تنکروا حکمین فی دماء الامۃ وقد جعل اللہ فی قتل طائر حکمین. (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۷۳ بسند صحیح، ط الرشد)

② تاریخ الطبری: ۶/۵ عن ابی مخنف

③ تاریخ الطبری: ۴۹/۵ عن ابی مخنف

④ تاریخ الطبری: ۵۴/۵، ۵۵ عن ابی مخنف

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے بدلحاظ لوگوں کو بھلا کس طرح برداشت کر رہے تھے؟ کیوں کہ اس قسم کے لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حلقے میں بھی تھے، وہ بھی انہیں برداشت کیے ہوئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں بھی بعض منافقین اٹھتے بیٹھتے تھے اور مصلحتاً ان کی بدتمیزیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی۔

③ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ جنگ بندی کا مسودہ لے کر فوج کے مختلف حلقوں کو سناتے ہوئے بنوتمیم کے پاس پہنچے تو ان کے ایک سردار عُروہ بن اُدَیّہ نے نہ صرف اسے ماننے سے انکار کر دیا بلکہ " لا حُکْمَ اِلا لِلّٰہ " کا نعرہ لگاتے ہوئے حضرت اَشعَث رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کو تلوار دے ماری۔ ①

یہ تین مثالیں محض تائید کی غرض سے ضعیف روایات سے پیش کی گئی ہیں جن سے پتا چل رہا ہے کہ کچھ شر پسند لوگ عراقی لشکر میں موجود تھے جو جنگ بندی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

صحیح بخاری کی روایت:

اب ایک بار پھر صحیح روایات میں جنگ بندی پر شر پسندوں کے اعتراضات اور اکابر صحابہ کے سمجھانے بجھانے کا منظر ملاحظہ ہو۔ جنگ صفین کے عینی شاہد حضرت ابووائل رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی پیش کش کا مثبت جواب دیتے ہوئے) کہا: ''ہاں میں کتاب اللہ کی بات پر زیادہ عمل کرنے والا ہوں۔'' تو وہ قاری صاحبان آگئے جو بعد میں خارجی بنے۔ ہم انہیں اس وقت قاری حضرات کہا کرتے تھے۔ ان کی تلواریں ان کے کندھوں پر ہوتی تھیں۔ وہ کہنے لگے: ''امیر المؤمنین! ہم اس قوم (اہلِ شام) کے بارے میں کس چیز کے منتظر ہیں؟ کیوں نہ ہم اپنی تلواریں سونت کر ان کی طرف چلیں، یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔''

یہ سن کر حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور (اس خود رائی کے رجحان سے منع کرتے ہوئے) فرمانے لگے: ''لوگو! اپنے آپ کو یعنی اپنی رائے کو مشکوک سمجھا کرو۔ ہمیں اپنا حدیبیہ والا دن یاد ہے۔'' ②

حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کی پُر اثر تقریر:

پھر حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حدیبیہ والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوجَندَل رضی اللہ عنہ کو کفار کے حوالے کرنے کا حکم دیا جس پر بعض صحابہ کو شبہ ہوا کہ ہم حق پر ہیں تو پھر کفار سے یہ مصالحت اور نرمی کیسی؟ مگر بعد میں ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر عمل میں ہی خیر تھی اور صحابہ کرام نے سمجھ نہ آتے ہوئے بھی اسی بات پر عمل کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ ③

حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''مجھے ابوجَندَل والے واقعے کے دن اپنی کیفیت یاد ہے۔ اگر اس دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو تبدیل کروا سکتا تو ضرور کروا دیتا مگر اللہ اور اس کا رسول زیادہ علم رکھتے ہیں۔''

---

① تاریخ الطبری: ۵/۵۵ عن ابی مخنف

② مسند احمد، ح: ۱۵۹۷۵ بسند صحیح ، تفسیر نسائی: ۲/۳۰۶

③ مسند احمد، ح: ۱۵۹۷۵ ، مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۹۱۴ بسند صحیح، ط الرشد ، تفسیر نسائی: ۲/۳۰۶

پھر سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ نے موجودہ صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لوگوں سے کہا:

"موجودہ قضیے سے پہلے ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ جب بھی کسی ہولناک معاملے کے لیے ہم نے اپنے کاندھوں پر تلواریں لٹکائیں تو تلواروں نے ہمارے لیے راستہ ہموار کر کے ہمیں جانی پہچانی منزل تک پہنچایا۔" [1]

مطلب یہ تھا کہ موجودہ قضیے کی صورتحال بالکل الگ ہے، اس لیے تلوار سے ہی مسئلہ حل کرنے پر اصرار نہ کریں۔

حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہتے ہوئے جنگ بندی کو قبول فرمایا:

أَيُّهَا النَّاس! إِنَّ هذا فَتحٌ

(لوگو! بلاشبہ یہ جنگ بندی فتح ہی ہے۔) [2]

مگر شرپسند تو تفرقہ بازی کا بہانہ چاہتے تھے۔ انہوں نے اکابر کے سمجھانے بجھانے پر کان نہ دھرا۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ بندی کو مسترد کرنے کی بنیاد پر جو گروہ وجود میں آیا، وہ "خارجی" کہلایا۔ یہ لوگ "لا حُكْمَ إلَّا لِلّٰه" کا نعرہ لگاتے ہوئے دونوں لشکروں سے الگ ہو گئے۔

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ بندی سے انکار کر رہے تھے؟

بعض روایات میں ہے کہ حضرت مُعاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے دھوکہ دینے کے لیے جنگ بندی کی تھی۔ اگر روایات کا حاصل فقط اتنا سمجھا جائے کہ شامی لشکر نے خود کو بچانے کے لیے صلح کی پیش کش کی تھی تو یہ ایک فطری بات تھی کہ جنگ میں ہر فریق شکستِ فاش سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر بعض روایات میں اس معاملے کو یوں پیش کیا گیا ہے جیسے شامی صحابہ نے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے قرآنِ مجید کو بیچ میں لانے کا ڈرامہ کیا ہو۔ انہی روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس پیش کش سے انکار کرتے ہوئے اسے نہ صرف اہلِ شام کی مکاری گردانتے بلکہ شامی قائدین کو منافق قرار دینے کا ذکر بھی ہے۔ یہ روایات سنداً انتہائی ضعیف اور متن کے لحاظ سے اضطرابات و نکارات سے بھرپور ہیں۔ ان میں سے بعض روایات ابو مخنف جیسے کذاب راوی کی وضع کردہ ہیں، باقی روایات میں بھی اسی قسم کے ضعیف ترین راوی موجود ہیں۔ کوئی صحیح روایت ان ضعیف روایات کی تائید میں نہیں۔ [3]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۱۸۹، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ [2] مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۹۱۲، ط الرشد

[3] ضعیف اسناد سے یہ واقعہ کئی جگہ منقول ہے مثلاً: ● ابن شہاب الزہری عن سلیمان بن یونس۔ (طبری: ۵/۵۷، ۵۸) ● روایت ابومخنف (طبری: ۵/۴۸، ۵۱) ● روایت ابن غفذیہ (انساب الاشراف، بلاذری: ۳/۳۲۲) ● روایت مسعودی (مروج الذہب: ۳/۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۵، ۱۳۶)

ان کی اسناد کا حال دیکھیے تو ابن شہاب زہری کی روایت کی سند میں ایک راوی سلیمان بن یونس بن یزید، مجہول الحال ہے۔ ابو مخنف کا جعل ساز ہونا کسی سے مخفی نہیں۔ انساب الاشراف کی روایت کا راوی ابن جعدبہ ہے جسے اصحابِ جرح و تعدیل کے ہاں متروک اور کذاب مانا گیا ہے۔ (تقریب التہذیب، تر: ۵۷۷۲؛ موسوعۃ اقوال الدارقطنی: ۲/۲۲۷؛ الکامل فی ضعفاء الرجال: ۹/۱۲۱) مسعودی شیعی کا ضعف بھی ظاہر ہے۔ غرض ان روایات کی اسنادی حیثیت ساقط ہے۔

متن کے لحاظ سے یہ اس لیے ناقابلِ قبول ہیں کہ ان میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت مُعاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فریب دینے کے لیے قرآن مجید نیزوں پر اٹھا کر صلح کی پیش کش کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی چال کو سمجھ لیا اور فوج کو منع کیا کہ وہ شامی قیادت کے فریب میں نہ آئے۔ اور (ابو مخنف کے بقول) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوج کو حضرت مُعاویہ، حضرت عمرو بن العاص اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کہا: لیسوا باصحاب دین ولا قرآن. انا اعرف بهم منكم. قد صحبتهم اطفالا و صحبتهم رجالا فكانوا شر اطفال و شر رجال۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

شیعوں کے مستند مأخذ ''نہج البلاغہ'' میں اعلانِ جنگ بندی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک گشتی مراسلہ نقل کیا گیا ہے جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ بندی پر آمادگی کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کا ہم مذہب و ہم مسلک ہونا اور تمام کش مکش کی بنیاد صرف قصاصِ عثمان کے طریقہ کار پر اختلافِ رائے ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

یہ مراسلہ درج ذیل ہے:

"ہمارے معاملے کا آغاز اس طرح ہوا کہ ہم اہلِ شام کے ساتھ میدان میں اکٹھے ہوئے، ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا رب ایک، نبی ایک، ہماری اور ان کی اسلام کے بارے میں دعوت ایک۔ اللہ پر ایمان اور اس کے رسول کی تصدیق کے بارے میں نہ ہم ان سے بڑھ کر تھے نہ وہ ہم سے بڑھ کر۔ صرف ایک بات میں ہمارا جھگڑا ہوا یعنی خونِ عثمان۔ ہم اس سے بری ہیں۔ ہم نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ جو مقصد آج حاصل نہیں ہو سکتا اس کا عارضی حل یہ ہے کہ جنگ کی آگ کو ساکت کیا جائے اور لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا ہو جانے دیا جائے۔ جب حکومت مستحکم ہو جائے گی اور حالات سازگار ہوں گے تو ہم اتنے قوت والے ہو جائیں گے کہ حق قصاص کو اس کا مقام دے سکیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ اس کا حل صرف جنگ ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف جنگ نے پاؤں پھیلا دیے اور جڑیں پکڑ لیں، شعلے بھڑک کر پائیدار ہو گئے۔ جب سب نے دیکھا کہ لڑائی نے دونوں فریقوں کو دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا ہے اور ان میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں تو وہ میری بات ماننے پر آمادہ ہو گئے۔ میں نے بھی ان کی بات کو مانا اور تیزی سے جنگ بندی کی پیش کش منظور کر لی۔"[1]

خارجیت: خارجیوں کے پس پردہ کون تھا؟

جونہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جنگ بندی پر اتفاق ہوا، اچانک بہت سے افراد نے تحکیم کا شوشہ کھڑا کر دیا اور یکدم "لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے الگ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔۔۔ (یہ لوگ [illegible] والے ہیں نہ قرآن والے۔ میں ان کے ساتھ بچپن اور جوانی گزار چکا ہوں۔ یہ بچپن اور جوانی میں بدترین لوگ تھے۔)
[illegible] قوتِ مسلمین کے جنگ میں حرب کا شکار ہو گئی اور تلواریں نیام میں نہ رہیں جس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی صلح پر مجبور ہو گئے۔ ہم نے ان ضعیف روایات کو [illegible] کیونکہ ان کی سند بھی مشکوک ہیں اور متن بھی۔ خاص کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شانی قیادت کے متعلق رکیک الفاظ بلاشبہ جعل ساز [illegible] صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے دین و ایمان بلکہ اخلاص میں بھی کوئی شک نہ تھا۔ اسی لیے وہ فریق مخالف کے [illegible] سمجھتے تھے۔

[illegible] صحیح روایت [illegible] کو قبول کیا جا سکتا ہے کہ جنگ روکنے کے لیے قرآن مجید نیزوں پر بلند کیے گئے۔ جنگ میں شریک عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ سے [illegible] صحیح سند سے منقول [illegible] بھی اس کی تائید ہے: شهدنا مع علیّ ثمان مائة [illegible] الاربعاء ویوم الخمیس ویوم الجمعة ولیلة السبت [illegible] رفعت المصاحف ودعوا الی الصلح. "ہم آٹھ سو افراد حضرت علی کے ساتھ شریک ہوئے۔ بدھ، جمعرات، جمعہ اور شب ہفتہ کو جنگ ہوتی رہی [illegible] قرآن بلند کیے گئے اور صلح کی دعوت دی۔" (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۲)

[illegible] کہ بزرگوں نے لوگوں کو تحکیم پر [illegible] کرنے کے لیے قرآن مجید کے ایک [illegible] کے سامنے [illegible] ہو کر سب فوراً [illegible] جنگ بندی کی گفتگو بلاشبہ اسی طرح ہوئی جیسا کہ صحیح روایت کے حوالے سے ہم متن میں نقل کر چکے ہیں۔
[illegible] کے علاوہ بخاری اور مسند احمد کی صحیح روایات سے ٹکرا رہی ہیں اس لیے انہیں ترک کرنا ہی اصول کا تقاضا ہے۔

حاشیہ صفحہ ھذا: ① نہج البلاغہ شریف رضی، مراسلہ ۵۸ ط المطبعة الادبیہ بیروت

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمانوں کے خلاف یہ کھلی بغاوت محض کسی اتفاقی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اس کا پورا امکان ہے کہ جو شر پسند لوگ جنگِ جمل میں تھوڑی سی مہلت مل جانے پر اپنے بچاؤ کے لیے فریقین کو لڑوانے میں کامیاب ہو گئے تھے، وہ صفین میں بھی کوئی نئی سازش ترتیب دیتے رہے ہوں۔ یعنی وہ اس کے لیے پہلے سے تیار ہوں کہ اگر اتحاد و اتفاق کا راستہ ہموار کرنے والا کوئی اقدام ہونے لگا تو اسے خلافِ دین و ایمان اقدام مشہور کر کے لوگوں کو ورغلایا جائے گا اور انہیں الگ کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک نیا محاذ کھول دیا جائے۔

تاریخ میں واضح ہے کہ جونہی جنگ بندی کا اعلان ہوا، شدت پسندوں نے مشہور کر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے حکم کے خلاف فیصلہ دے رہے ہیں۔ بہت سے نادان لوگوں نے سوچے سمجھے بغیر اس پر یقین کر لیا، انہیں ''لا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰـہ'' (حاکمیت صرف اللہ کی ہے) کا خوبصورت نعرہ بھی دے دیا گیا جس نے سطحی ذہن رکھنے والے ہزاروں لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے محروم کر دیا اور وہ اس فیصلے کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے جو مسلمانوں کے لیے امن و امان کا ذریعہ تھا۔ احتجاجاً الگ ہونے والے یہ لوگ ''خوارج'' کہلائے۔ ان کی علیحدگی کے پیچھے یہی منصوبہ کارفرما تھا کہ شرپسند خود کو محفوظ اور خلافتِ راشدہ کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

ہمیں خارجیوں کے سرکردہ لوگوں میں کئی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے سبائی تحریک کے سرغنہ تھے جن میں حُرقُوص بن زُہیر اور عبداللہ ابن الکوّاء کے نام نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد قرائن بتاتے ہیں کہ جنگ بندی کے بعد بہت سے سبائی خصوصاً وہ لوگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تحریک میں شریک اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو مطلوب تھے، عراقی لشکر سے کھسک کر خوارج میں گھل مل گئے تھے اور عراقی لشکر میں سبائیوں کے آثار مزید مدہم ہو گئے تھے۔[1]

تحکیم کے لیے ثالثوں کی تقرری:

حضرت علی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان باہمی اختلاف کی وجہ کو دور کرنے کے لیے یہ طے ہوا کہ فریقین اپنا ایک ایک ''حکم'' یا ثالث (فیصلے کا اختیار رکھنے والا نمائندہ) مقرر کر دیں۔ دونوں ثالث مل کر بیٹھیں اور امت کے درمیان اختلاف کی وجہ دور کریں، مستقل اور پائیدار امن کا کوئی طریقہ وضع کریں۔ ان کا فیصلہ کتاب و سنت کے مطابق اور امت کے وسیع تر مفاد میں ہو جسے دونوں فریق قبول کریں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل شر پسند عناصر یہ چاہتے تھے کہ اَشتر نخعی کو ثالث بنایا جائے، اسی طبقے کے ابو مخنف جیسے لوگوں نے بعد میں یہ مشہور کیا کہ یہ خواہش خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھی،[2] یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ جبکہ دونوں فریق پہلے ہی یہ طے کر چکے تھے کہ ہر فریق اپنی طرف سے ایسا ثالث پیش کرے گا جس پر

---

① خوارج کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کش مکش کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

② تاریخ الطبری: ۵۱/۴



دوسرے فریق کو بھی اطمینان ہو۔[1] اَشتر نخعی پر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص سالاروں کو بھی اطمینان نہ تھا، اسی لیے عراقی سپہ سالار اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ کا اس موقع پر کہا گیا یہ جملہ بہت مشہور ہوا:

هَلْ سَعَّرَ الْاَرْضَ اِلَّا الْاَشْتَرِ. (زمین میں جنگ کی آگ اَشتر ہی نے تو بھڑکائی ہے۔)[2]

اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا: ''اَشتر تو یہ چاہتا ہے کہ ہم ایک دوسرے پر تلواریں لے کر پل پڑیں۔''[3]

صحیح روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس اہم کام کے لیے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھی چھوڑ کر اپنی رائے سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا اور انہیں فیصلے کا بھرپور اختیار دیتے ہوئے یہاں تک فرمادیا تھا: ''اُحْكُمْ وَلَوْ يَحُزُّ عُنُقِي.'' (تم فیصلہ کردینا، چاہے میری گردن کٹے۔)[4]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی وجہ:

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے چناؤ کی وجہ یہ تھی کہ وہ عمر، عقل، علم اور تجربے میں بھی ممتاز تھے اور ساتھ ساتھ سیاسی مناقشوں میں غیر جانبدار رہنے کی وجہ سے وہ فریقین کے لیے قابلِ قبول تھے۔ ان کی ذکاوت، دوراندیشی، علم و فضل اور معاملہ فہمی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں زبید اور عدن کا عامل بنایا تھا۔[5]

پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی وہ بصرہ اور کوفہ میں گورنر اور قاضی کے عہدوں پر رہے، ظاہر ہے اتنے بڑے مناصب پر علم و دانش سے آراستہ شخص ہی فائز ہوسکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شوریٰ کے اکابر بھی اس انتخاب پر مطمئن تھے، چنانچہ جب حضرت اَحنف بن قیس رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''آپ نے دیہی علاقوں کے ایک نرم دل انسان کو مقرر کیا ہے۔ ان کی جگہ مجھے بھیج دیں تو میں معاملے کو آپ کی مرضی کے مطابق طے کرسکوں گا۔'' تو جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا:

''اَحنف! ہمیں چھوڑ دیں۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔''[6]

افسوس کہ خانہ ساز شیعی روایات میں ایسے عالم فاضل صحابی کو نعوذ باللہ ''مغفل'' (احمق) مشہور کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ابومخنف اور نصر بن مزاحم کی روایات میں یہ جھوٹا دعویٰ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا نمائندہ بنانا چاہتے تھے مگر عراقی لشکر کے خودسر امراء کے اصرار کی وجہ سے وہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار دینے پر مجبور ہوگئے تھے۔[7]

---

① تاریخ الطبری: ۵۱/۴

② تاریخ الطبری: ۵۱/۴

③ تاریخ الطبری: ۵۱/۴

④ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۸۵۳ بسند صحیح ؛ کتاب الآثار للقاضی ابی یوسف، روایت نمبر: ۹۲۹، ط العلمیة

⑤ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص: ۹۷

⑥ انساب الاشراف: ۳۳۰/۲ باسناد حسن ،ط دار الفکر

⑦ وقعة صفین، نصر بن مزاحم، ص: ۵۰۱ ؛ تاریخ الطبری: ۵۱/۵

یہ روایات سنداً انتہائی ضعیف ہونے اور صحیح روایتوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے تقرر کی وجہ:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسئلہ تحکیم کے لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مقرر کیے گئے۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قابلِ اعتماد رفقاء میں سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ ذات السلاسل میں انہی کو امیر بنایا تھا۔[1]

شیعہ راویوں نے انہیں لالچی اور دنیا پرست مشہور کرنے کی پوری کوشش کی ہے جبکہ ان کے متعلق ارشاد نبوی ہے:

''عمرو بن العاص قریش کے صالحین میں سے ہیں۔''[2]

ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک جہادی مہم سپرد کی اور فرمایا: ''عمرو! میں تمہیں ایک مہم میں بھیجنا چاہتا ہوں، اللہ تمہیں سلامت رکھے گا اور مالِ غنیمت بھی عطا کرے گا، پھر ہم بھی تمہیں اس سے مال دیں گے۔''

انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں نے مال و دولت کے لالچ میں اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اللہ کی راہ میں جہاد اور آپ کی رفاقت میرا مقصد ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمرو! صالح آدمی کے لیے پاک مال اچھا ہوتا ہے۔''[3]

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ دنیا سے بے رغبت اور آخرت کے طلب گار تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں صالح انسان سمجھتے تھے۔ افسوس کہ خانہ ساز راویوں نے جہاں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کم عقل اور نا اہل ثابت کرنے والی روایات گھڑی ہیں، وہیں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو انتہائی مکار اور دھوکا باز آدمی قرار دینے کی کوشش بھی کی ہے حالاں کہ ان دونوں حضرات کو پوری اُمت کے اکابر کی طرف سے باہمی اتحاد جیسے اہم ترین کام کی ذمہ داری سونپ دینا خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات نہایت قابل اور مخلص تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ واپسی:

جنگِ صفین، مذاکرات اور دیگر مہمات و معاملات سے فارغ ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ ۱۲ رجب ۳۷ھ کو اپنے پایہ تخت کوفہ واپس پہنچے۔ اس سے قبل کوفہ میں طویل قیام کا موقع نہیں مل سکا۔ اب آپ کو ذرا فارغ دیکھ کر لوگوں نے کہا:

''امیر المؤمنین! کیا آپ قصرِ امارت میں قیام فرمائیں گے؟''

فرمایا: ''نہیں! کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کرتے تھے۔''[4]

x x x

---

① سیرت ابن ھشام: ۲/۲۲۳

② سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

③ تاریخ دمشق: ۴۶/۱۴۲

④ الاخبار الطوال: ص ۱۵۲

تحکیم کے لیے عہد نامہ

جنگ بندی کے ایک ہفتے بعد ۱۷ صفر سن ۳۷ ہجری کو حضرت علی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان یہ عہد نامہ تشکیل پایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''یہ عہد نامہ ہے علی بن ابی طالب، مُعاویہ بن ابی سفیان اور ان کے ساتھیوں کا، کتاب وسنت کے حکم پر رضامندی کے ساتھ:

- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تمام اہلِ عراق اور حضرت مُعاویہ کا فیصلہ تمام اہلِ شام پر لاگو سمجھا جائے گا، چاہے وہ حاضر ہیں یا غائب ہیں۔
- حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے حامی عبداللہ بن قیس، (ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) کو اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو (مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے) حَکَم (ثالث) بنانے پر راضی ہیں۔
- دونوں حَکَم حلف اٹھائیں گے کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ دیں گے اور جس چیز کا حکم کتاب اللہ سے نہ ملے، اسے سنتِ رسول میں تلاش کریں گے۔
- دونوں نمایندوں اور ان کے اہل وعیال کے جان ومال کا تحفظ کیا جائے گا۔
- فریقین کے درمیان جنگ بند ہے۔ بات چیت جاری رہے گی۔
- دونوں حَکَم عراق اور شام کے درمیان کوئی جگہ طے کریں گے۔
- فیصلے کے لیے ماہِ رمضان کے آخر تک وقت طے ہے...... لیکن دونوں حَکَم چاہیں تو اس سے پہلے یا بعد کا وقت بھی طے کر سکتے ہیں۔
- اس دوران لوگوں کی جانیں، اموال، اہل وعیال اور بچے، سب مامون رہیں گے۔ اسلحہ بند اور راستے کھلے رہیں گے۔''

اس عہد نامے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت حسن و حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت اَشعث بن قیس، حضرت سہل بن حُنَیف، حضرت رافع بن خَدِیج، اور حضرت عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم

نے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت حبیب بن مَسلمہ فہری، حضرت معاویہ بن حُدَیج، حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے دستخط کیے۔ ①

مذاکرات کی کامیابی کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سنجیدگی:

اس دستاویز پر شروع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ امیر المؤمنین لکھا گیا تھا، مگر جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اسے مٹانے پر اصرار کیا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوری وسعتِ ظرفی سے اس کی جگہ ''علی بن ابی طالب'' لکھوانے پر اکتفا کرلیا۔ ② اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مذاکرات کو کامیاب بنانے میں کتنے مخلص تھے اور اسی لیے وہ فریقِ ثانی کے قانونی اعتراضات کو کسی ''ڈیڈلاک'' کا سبب نہیں بننے دینا چاہتے تھے۔

اسی جذبے کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حَکَمین کو وصیت کی: ''تم دونوں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنا، جو قرآن کا حکم ہے اسے زندہ کرنا اور جس سے قرآن نے منع کیا ہے اسے مٹانا۔'' ③

جنگ بندی نامے کے مثبت اثرات، شرپسندوں میں پھوٹ:

کتاب اللہ پر ثالثی کا یہ فیصلہ سب کے لیے تسلی بخش تھا۔ عراق اور شام کی افواج اپنی اپنی چھاؤنیوں کو لوٹ گئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دارالخلافہ کوفہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے مرکز دِمشق واپس چلے گئے۔ عالمِ اسلام میں معمول کی زندگی پھر سے بحال ہوگئی۔ اس کے برعکس خود شرپسند عناصر میں پھوٹ پڑگئی اور رنج وحسرت سے ان کا برا حال ہوگیا۔ خود شیعی مؤرخ ابومخنف کے بیان کے مطابق جب یہ لوگ لشکرِ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ صفین جارہے تھے تو باہم شیر وشکر اور ایک دوسرے کے یار ومددگار تھے مگر جب تحکیم کا واقعہ پیش آیا تو واپسی میں یہ سب ایک دوسرے سے بغض وعداوت میں مبتلا ہو چکے تھے اور گالم گلوچ کررہے تھے۔ ④

ظاہر ہے یہ لڑنے جھگڑنے والے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد موجود صحابہ اور تابعین نہیں تھے بلکہ یہ وہی فسادی لوگ تھے جو مختلف اغراض ومفادات کے لالچ میں اکھٹے ہوکر خلافتِ اسلامیہ کو کمزور اور مسلمانوں کو منتشر کرنا چاہتے تھے۔ جب ان کے مفادات حاصل نہ ہوئے تو فطری طور وہ مایوسی اور تلملاہٹ کا شکار ہوکر باہم جھگڑ پڑے۔

ان عناصر کی سوچ نے متاثر مفکرین آج بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر برافروختہ ہیں اور اسے خلافِ حکمت گردانتے ہیں۔ بعض حضرات اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نادانی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مکاری کا نتیجہ بتاتے ہیں۔

---

① الاخبار الطوال، ص ۱۹۴ تا ۱۹۶؛ انساب الاشراف: ۲/۳۳۴ تا ۳۳۶؛ تاریخ الطبری: ۵/۵۴، ۵۵ عن ابی مخنف

② مسند احمد، ح: ۳۱۸۷؛ تاریخ الطبری: ۵/۵۳ بسند صحیح عن علی بن مسلم عن حبان بن ھلال عن مبارک بن فضالہ عن الحسن عن الاحنف

③ قال علیؓ: ان تحکما بما فی کتاب اللہ فتحیا ما احیا القرآن ولتمیتا ما امات القرآن. (مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۵۷، ط الرشد)

④ خرجوا مع علیؓ الی صفین وھم متوادون احباء، فرجعوا متباغضین اعداء، ما برحوا من عسکرھم بصفین حتی فشا فیھم التحکیم ولقد اقبلوا یتدافعون الطریق کلہ ویتشاتمون و یضطربون بالسیاط. (تاریخ الطبری: ۵/۶۳)



حالانکہ حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اور اکابر صحابہ کرام کا ثالثی نامے پر اتفاق اس آیت مبارکہ کی تعمیل میں تھا:

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا

(اگر اہلِ ایمان کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرادیا کرو۔)[1]

اسی میں مسلمانوں کی مصلحت اور بھلائی تھی۔ قرآنِ مجید تو حربی کفار کی طرف سے بھی صلح کی پیش کش کو قبول کرنے کی ہدایت کرتا ہے:

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا

(اور اگر وہ کافر صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس طرف مائل ہو جائیں۔)[2]

مگر افسوس کہ شر پسندوں کو یہ بھی گوارا نہیں ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے کلمہ گو مسلمان بھائیوں سے صلح کرلیں۔

بیرونی طاقتوں کی ناکام حسرتیں:

جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں مسلمانوں کو باہم دست و گریباں دیکھ کر طاغوتی طاقتیں عالمِ اسلام کو نئے زخم لگانے کے لیے مستعد ہونے لگیں۔ فارس و ایران میں کئی مفتوحہ علاقوں کے غیر مسلموں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کردی اور بعض علاقوں کے لوگ مرتد ہوگئے۔

ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بہترین سالار زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو بھیجا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ شریک بھائی تھے۔ انہوں نے جا کر تیزی سے بغاوت کے شعلے سرد کردیے اور ان علاقوں پر اسلام کا پرچم از سر نو نصب کردیا۔[3]

اس طرح طاغوتی طاقتیں اپنی حسرتوں پر دل مسوس کر رہ گئیں۔

☆☆☆

---

① سورۃ الحجرات، آیت: ۹

② سورۃ الانفال، آیت: ۶۱

③ تاریخ الطبری: ۱۳۷/۵

تحکیم کا واقعہ: کیا درست اور کیا غلط!!

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان تصفیے کے لیے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما صفین کی جنگ کے آٹھ ماہ بعد رمضان ۳۷ھ میں عراق اور شام کی سرحد ''اَذرُح'' کے قریب دُومۃ الجندَل کے مقام پر جمع ہوئے تھے تاکہ امت کے دونوں گروہوں کے درمیان تنازعے کا حل تلاش کیا جائے۔ جس اجتماع میں یہ گفتگو ہوئی اسے ''مجلسِ تحکیم'' کہا جاتا ہے اور ان دونوں حضرات کو حَکَمین۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ تحکیم کی مجلس میں کیوں نہ تشریف لے گئے؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تحکیم کے لیے شام سے عراق کی سرحد پر تشریف لے آئے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ گئے۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کے نئے مخالفین خوارج نے بڑے پیمانے پر بغاوت کی تیاری کر رکھی تھی۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ ایک دن کے لیے بھی کوفہ سے غائب ہوتے تو یہ فتنہ پرور لوگ خلافتِ اسلامیہ کا تختہ الٹ دینے کی کوشش کرتے۔ درج ذیل روایت سے اس صورت حال پر روشنی پڑتی ہے:

''جب رمضان ۳۷ھ کا چاند طلوع ہوا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ چار سو افراد کے ساتھ دِمَشق سے نکلے اور دُومۃ الجندَل پہنچے اور یزید بن حر العبسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ بھیج کر اپنی آمد کی اطلاع پہنچائی اور انہیں حسب قرارداد تشریف آوری کی دعوت دی۔ یزید بن حر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مل کر ان سے اس اجتماع میں شرکت کی درخواست کی اور کہا: ''آپ کی موجودگی اس معاملے کے سلجھنے، جنگ کے خاتمے اور فتنہ کی آگ بجھنے کا سبب ہوگی۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ابن حر! میں ان لوگوں کے سانس تھامے بیٹھا ہوں۔ میں انہیں چھوڑ کر یہاں سے نکل گیا تو اس شہر میں اہلِ شام سے جنگ سے بھی زیادہ بڑا فتنہ پھیل جائے گا۔ میں اپنی جگہ ابوموسیٰ کو بھیج رہا ہوں۔ لوگ ان کی تقرری پر راضی ہیں۔ عبداللہ بن عباس کو بھی بھیج رہا ہوں۔ وہ میرے نائب ہیں۔ جو معاملہ ان کے سامنے ہوگا وہ گویا میرے سامنے ہی ہوگا۔''

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے بصرہ سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بلوایا، اسی طرح ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھی بلوایا اور انہیں گھڑ سواروں کے ساتھ بھیج دیا۔ خود کوفہ میں ٹھہرے رہے۔[2]

---

[1] تاریخ الطبری: ۶۷/۵

[2] انساب الاشراف: ۳۴۶/۲ عن المدائنی، عن ابی الفضل التوخی عن میمون بن مهران، عن عمر بن عبدالعزیز، ط دار الفکر

اس اجتماع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھیجے گئے وفد میں چار سو گھڑ سوار تھے جن کے قائد حضرت شُریح بن ہانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، وفد میں پنج وقتہ نمازوں کے امام تھے۔

اِدھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی چار سو افراد آئے تھے، جن میں حضرت عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہما سرفہرست تھے۔ غیر جانب دار صحابہ میں سے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، مُغیرہ بن شُعبہ، عبدالرحمٰن بن عبدیغوث، حضرت عبدالرحمٰن بن حارث اور حضرت ابوجہم بن حذیفہ رضی اللہ عنہم بھی شریک تھے۔[1]

تحکیم کی مجلس میں کیا گفتگو ہوئی؟

معتبر روایات میں اس اجتماع کی گفت و شنید کا بہت مختصر احوال ملتا ہے۔ تفصیل کسی معتبر سند کے ذریعے ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ دوسری طرف ضعیف راوی اصل واقعے کو خرافات کی دھول میں چھپا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما نے اپنے فرائض کو درست طور پر انجام نہ دیا اور آخر میں ایک طوفانِ بدتمیزی پر مجلس ختم ہوئی۔ ان راویوں نے تحکیم کے واقعے میں ثالثوں کو شروع سے آخر تک قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ خلافت کے حق دار پر بحث کرتے دکھایا ہے۔ اگرچہ یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ مسئلۂ خلافت بھی زیرِ بحث آیا تھا اور یہ منصب کسی تیسرے فرد کے حوالے کرنے پر بھی غور ہوا تھا مگر یہ بات بعید ہے کہ حکمین کی پوری گفتگو میں بنیادی متنازعہ مسئلے پر بحث ہی نہ ہوئی ہو۔ پس یہ ظاہر ہے کہ راویوں نے گفتگو کی اصل اور مرکزی بحث کا بیشتر حصہ حذف کر کے اس کی جگہ فرضی باتیں شامل کر دی ہیں۔

تحکیم کی مجلس کا اصل مقصد اُمتِ مسلمہ کو متحد کرنا تھا اور چونکہ یہ اتحاد قصاصِ عثمان کے نفاذ کا متفقہ فقہی طریقہ کار طے کرنے پر موقوف تھا اس لیے تحکیم کا بنیادی موضوع یہی تھا کہ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت اور قاتلینِ عثمان کے خلاف کارروائی کا کوئی لائحہ عمل بالاتفاق طے پا جائے۔ اگرچہ اس گفتگو کی رُوداد کسی صحیح روایت میں منقول نہیں، مگر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بات چیت ابتداء میں اسی نکتے کے گرد دائر رہی ہوگی کہ قصاص کیسے لیا جائے۔ قصاصِ عثمان کے مسئلے نے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو اہلِ شام کے نزدیک ناقابلِ قبول بنایا ہوا تھا۔ اہلِ شام حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کی سرپرستی کا الزام عائد کر رہے تھے اور ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لازم تھا کہ اس الزام کی نفی کے لیے تمام باغیوں کو قصاصاً قتل کرتے یا انہیں شامی قیادت کے حوالے کر دیتے۔ جب تک وہ ایسا نہ کرتے، ان کی حیثیت اپنے تمام تر مناقب کے باوجود باغیوں کے سرپرست کی تھی لہٰذا انہیں شرعی حکمران تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے جو آئینی و فقہی اور سیاسی و سماجی رکاوٹیں تھیں، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے یقیناً انہیں مدلل طور پر پیش کیا ہوگا۔ بہرکیف حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اگر علم و فقاہت کے پیکر تھے تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سفارتی مہارت اور منطق و استدلال میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس لیے کوئی بھی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا۔

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۷۰، ۵۷۱؛ تاریخ الطبری: ۵/۶۷ تا ۷۱

اہلِ شام کی بہت بڑی تعداد کو یہ بھی یقین تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اقتدار کی خاطر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا ہے۔[1] اسی بناء پر صفین میں اہلِ شام نے پورے جوش وخروش سے اہلِ عراق کے خلاف تلواریں بے نیام کرنا جائز سمجھا تھا۔اس ذہن کے ساتھ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر کسی طرح تیار نہیں ہو سکتے تھے جبکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت وقیادت پر انہیں پورا اعتماد تھا۔غرض مسئلہ قصاص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور خلافت ہی کو اہلِ شام کے ہاں متنازعہ بلکہ نا قابلِ قبول بنادیا تھا۔حَکَمین کو بھی اس مسئلے کا کوئی حل نہیں مل سکا۔

ایسے میں متفقہ خلافت کے احیاء کے لیے حکمین نے ایک اور پہلو پر غور کرنا شروع کیا،وہ یہ کہ کسی ایسے تیسرے فرد کو خلیفہ مقرر کر دیا جائے جس کے فیصلے تمام متنازعہ امور میں قابلِ قبول ہوں۔عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عالمِ اسلام کی ایک محبوب ومقبول ہستی تھے جن پر اُمت کے اتفاق کی امید کی جاسکتی تھی لہٰذا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لَااَرَیٰ لِھٰذَا الْاَمْرِ غَیْرَ عَبْدِاللّٰہِ بِنِ عُمَر" (مجھے عبداللہ بن عمر کے سوا،اس کے لیے کوئی اور موزوں نہیں لگتا۔)

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بھی اس رائے سے اختلاف ظاہر نہ کیا۔مگر ان کی خواہش یہ تھی کہ اگر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو یہ منصب ملے تو وہ اپنی خوشی سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو منتقل کر دیں۔

تاہم عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں کوئی رغبت ظاہر نہ کی اور معذرت کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَااُعطیٰ وَلَااَقْبَلُھَا اِلَّا عَنْ رِضًی مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ."

(یہ عہدہ مجھے دیا جاسکتا ہے نہ میں اسے قبول کر سکتا ہوں،سوائے اس کے کہ اُمّتِ مسلمہ اس پر راضی ہو جائے۔)[2]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے امرِ خلافت سے معذرت کی وجوہ:

ممکن ہے کہ کسی کو خیال گزرے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اگر یہ پیش کش قبول کر لیتے تو اُمت متحد ہو جاتی۔لیکن اگر ہم درج ذیل حقائق پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کا فیصلہ بالکل درست تھا:

---

① امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ان اقواما شھدوا علیه بالزور عند اھل الشام انه شارک فی دم عثمان و کان ھذا مما دعاھم الی ترک مبایعته. "کچھ لوگوں نے اہل شام کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہیں۔اسی بات نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ترک کرنے پر ابھارا۔" (منہاج السنة: ۴/۴۰۶)

② یہ واقعہ دو صحیح الاسناد اور ایک حسن روایت میں منقول ہے: پہلی صحیح روایت میں ہے کہ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: انا قد راینا ان نبایعک." (ہماری رائے یہ ہے کہ ہم آپ سے بیعت کر لیں)

اسی روایت میں ہے: فھل لک علیٰ ان نعطیک مالاً و تدعھا لمن ھو احرص علیھا منک.

سند: بلاذری قال حدثنی احمد بن ابراھیم الدورقی، حدثنی ابو خیثمة، حدثنا وھب ابن جَرِیر، حدثنا ابی (جَرِیر بن حازم) قال سمعت یعلیٰ بن حکیم، یحدث عن نافع (انساب الاشراف: ۲/۳۴۵، ط دارالفکر بیروت)

دوسری صحیح روایت میں ہے کہ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ماتجعل لی ان صرفتھا الیک؟ (انساب الاشراف: ۲/۳۴۵) ان دونوں روایات کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

حسن روایت میں ہے: قال ابو موسیٰ: لا اریٰ لھٰذا الامر غیر عبداللّٰہ بن عمر، فقال عَمرو لابن عمر: انا نرید ان نبایعک.

"ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس معاملے کے لیے عبداللہ بن عمر کے سوا کسی کو مناسب نہیں سمجھتا، چنانچہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے (ابن عمر رضی اللہ عنہ سے) کہا، ہم آپ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔" (حلیة الاولیاء: ۱/۲۹۳، ط السعادة)

❶ یہ بات ثابت ہے کہ فریقین کا اصل تنازعہ خلافت کے استحقاق پر نہیں، قصاص پر تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فی الحال خلیفہ نہ ماننے کے باوجود (صحیح روایت کے مطابق) انہیں خلافت کا اہل ضرور تسلیم کرتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں، وہ مجھ سے بڑے عالم اور زیادہ فضیلت والے ہیں۔[1]

ان کا کہنا تھا: ''علی، قاتلینِ عثمان کو ہمارے حوالے کردیں، میں سرِ تسلیم خم کردوں گا۔''[2]

اب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن جاتے تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا؛ کیوں کہ فقہی پیچیدگی کے باعث قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ پر غالباً وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہٹ کر کوئی راہِ عمل نہ اپنا سکتے۔ اس لیے اہلِ شام کا وہی اعتراض پھر بھی باقی رہتا۔

❷ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی پیش کش سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اہلِ شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو پسند نہیں کرتے۔ ایسے میں کسی نئے شخص کا متفقہ خلیفہ بننا ممکن نہیں تھا بلکہ یہ خطرہ تھا کہ نئے شخص کی نامزدگی پر فریقین میں سے بہت سے لوگ مزید اعتراض کریں گے، اس طرح انتشار ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گا۔ امت دو کی جگہ تین یا چار ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔

❸ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ طبعی طور پر بھی سیاسی امور سے لاتعلق رہنا پسند کرتے تھے۔

❹ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق ہے، ان کے متعلق پھیلائے گئے شکوک وشبہات غلط ہیں، وہ خلیفۂ راشد ہیں اور فی الواقع ان سے بہتر کوئی سربراہ اُمت کو میسر نہیں آسکتا۔ ایسے میں ان کی جگہ لینا، ہرگز کسی برکت ورحمت یا اتفاقِ امت کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔

گفتگو کا آخری دور:

تحکیم میں بات چیت کا سلسلہ بندگلی میں پہنچ گیا تھا۔ یہ صورتحال حَکَمین کے لیے بھی تکلیف دہ تھی اور دیگر حاضرین کے لیے بھی۔ کیوں کہ ہر ایک اُمت کا خیر خواہ تھا اور تہہ دل سے چاہتا تھا کہ اُمت کے یہ دونوں نیک گروہ جن کی قیادت اکابر صحابہ کرام کے ہاتھ میں تھی، متحد ہو جائیں مگر اب وہ یہ تلخ حقیقت قبول کرنے پر مجبور تھے کہ امت میں فی الحال اتحاد نہیں ہوسکتا۔ اس نئی صورت حال میں اکابر کو بہر حال یہ تو طے کرنا تھا کہ اب فریقین کی حیثیت کیا ہوگی؟

ظاہر ہے جنگ بندی کی وجہ سے دونوں فریق متحارب نہیں رہے تھے مگر جس اتحاد کی اُمید کی جارہی تھی فی الحال اس کا بھی امکان نہ تھا۔ تو یہ سوال خود بخود پیدا ہورہا تھا کہ آئندہ باہمی معاملات پر فریقین کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس سوال کو اس مجلس میں طے کرکے اٹھنا حَکَمین کی ذمہ داری تھی۔ چونکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ علمی لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے، اس لیے حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آخر کار انہی سے دریافت کیا:

---

① تاریخ دمشق: ۱۳۲/۵۹؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۴۰/۳، وهذا الاسناد حسنه ابن حجر (فتح الباری: ۸۶/۱۳)

② بحوالہ بالا

مَا تَریٰ فِیْ ھٰذا الْاَمْر؟ (آپ اس معاملے میں کیا فرماتے ہیں؟)

جواب میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت واضح فرماتے ہوئے کہا:

"**اَرٰی اَنَّہٗ مِنَ النَّفَرِ الَّذِیْنَ تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَھُوَ عَنْھُمْ رَاضٍ.**"

"حضرت علی میرے علم کے مطابق ان ہستیوں میں سے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان سے اپنی وفات تک راضی تھے۔" (مطلب صاف تھا، یعنی جب نبی اکرم ﷺ ان سے راضی تھے تو اگر آپ بھی غیر مشروط طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت پر راضی ہوجاتے تو بہتر تھا۔)

ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ شرعی اعتبار سے یہ جواب کس قدر مضبوط، مدلّل اور لاجواب تھا۔

اب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے معاملے کے دوسرے پہلو کی وضاحت کے لیے دریافت کیا:

فَاَیْنَ تَجْعَلُنِیْ اَنَا وَمُعَاوِیَۃَ؟ (تو اس صورت حال میں آپ مجھے اور معاویہ کو کیا حیثیت دیتے ہیں؟)

(یعنی اگر ہم اپنے موقف پر برقرار رہیں تو ہماری کیا حیثیت ہوگی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعلق کس نوعیت کا ہوگا؟ آیا ہمیں آپ باغی اور متحارب گروہ شمار کریں گے یا ایک الگ حکومت وریاست کی حیثیت دیں گے؟)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر نہ صرف شرعی دلائل اور زمینی حقائق سے آگاہ بلند پایہ فقیہ کا کردار پیش کیا بلکہ ایک ذہین سفارت کار ہونے کا بیّن ثبوت بھی فراہم کیا۔ انہوں نے ایک طرف خلیفۂ راشد کے غالب مرتبے کا بھی دفاع کیا، اور دوسری طرف فریقِ ثانی کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا۔ ساتھ ہی دوستانہ تعلقات کا اشارہ بھی دے دیا۔ ان کے انتہائی نپے تلے اور جامع الفاظ یہ تھے:

"**اِنْ یَّسْتَعِنْ بِکُمَا فَفِیْکُمَا مَعُوْنَۃٌ وَاِنْ یَّسْتَغْنِ عَنْکُمَا فَطَالَ مَا اسْتَغْنٰی اَمْرُ اللّٰہِ عَنْکُمَا.**"[1]

"اگر حضرت علی تم سے تعاون طلب کریں تو تمہارے اندر تعاون کی صلاحیت ہے۔ اگر وہ تم سے بے نیاز رہیں تو بھی (کوئی بات نہیں) کہ بہت عرصہ (یعنی تمہارے اسلام لانے سے قبل) اللہ کا نظام تمہارے بغیر بھی چلتا رہا۔"

---

① تاریخ دمشق: ۱۷۵/۴۶، ترجمہ: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ.

وذکر ھذا الاسناد الامام البخاری واشار الی ھذہ الروایۃ. (**التاریخ الکبیر: ۳۹۸/۵**)

اس روایت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سفیر حضرت حُصین بن منذر رحمہ اللہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمہ اللہ نے اسے امام دارقطنی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (**العواصم من القواصم، ص ۱۸۰**) مگر علامہ ابن عربی رحمہ اللہ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ انہوں نے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی کس کتاب سے یہ روایت لی ہے۔ ابن عربی رحمہ اللہ پر ہم یہ شک نہیں کرسکتے کہ انہوں نے کوئی جعلی حوالہ دیا ہوگا، اس لیے اُمید ہے کہ یہ روایت امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہیں ضرور ذکر کی ہوگی۔ ساتھ ہی یہ توقع بھی ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی جلالتِ شان اور نقادانہ نگاہ کے مطابق اس روایت کو کسی مضبوط سند سے نقل کیا ہوگا۔ بہرکیف راقم کو امام دارقطنی رحمہ اللہ کی دستیاب کتب میں اب تک یہ روایت نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ ان کی جس کتاب سے ابن عربی رحمہ اللہ نے یہ روایت لی ہے اب وہ ناپید ہوگئی ہو اور مستقبل میں کبھی دریافت ہوجائے اور یوں اس روایت کا مضبوط حوالہ مل جائے۔

تاریخ دمشق میں بھی یہ روایت مذکور ہے، مگر سند طویل ہوجانے کے باعث درمیان کے بعض کمزور راۃ کی بناء پر ضعیف ہوگئی ہے مگر پھر بھی درایت کے لحاظ سے اسے ان دوسری ضعیف روایات پر ترجیح ہونی چاہیے جن میں مجلسِ تحکیم کو ایک تماشے کی طرح شروع ہوتے اور ایک ہنگامے پر انجام پذیر ہوتے دکھایا گیا ہے۔ ہمارا منہج شروع سے یہ چلا آرہا ہے کہ جہاں اسناد کے لحاظ سے یکساں حیثیت کی روایات میں تعارض ہوجائے تو ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں جو صحابہ کرام کی شان کے لیے انسب ہو۔

آخری اعلامیہ: مجلسِ تحکیم کے بعد فریقین کی حیثیت:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ گویا تحکیم کی مجلس کا مختصر اعلامیہ تھے جسے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی خاموش تائید حاصل تھی۔ اس کا حاصل یہی تھا کہ جب تک متنازعہ مسئلے کا حل طے نہیں ہو جاتا، تب تک فریقین دو الگ الگ علاقوں پر قابض رہیں گے۔ دو طرفہ تعلقات کی نوعیت آئندہ کے حالات پر منحصر ہوگی۔

اس مختصر اعلامیے کے بعد فریقین کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر دُومۃ الجَندَل سے اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ گئے۔ ①

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری تحکیم کے بے نتیجہ ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تحکیم کے بے نتیجہ ہونے کی وجہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی شخصیت نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ تنازعے کا حل مشکل ہونا، فریقین کا اپنے اپنے سابقہ موقف پر اصرار کرنا تھا۔" ②

غلط روایات کیسے مشہور ہوئیں؟

سازشی عناصر کو فریقین کے اختلافات برقرار رہنے کے باوجود اس قسم کے اعلامیے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ اس لیے جھنجلاہٹ سے ان کا برا حال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے غم و غصے کا سارا زور حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کر کے نکالا۔

اس مہم کے تحت پھیلائی گئی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نمائندے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سادہ لوح انسان تھے، جبکہ حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے نمایندے حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جھوٹے اور دغا باز شخص تھے۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے کہنے پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے مجمع عام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو برطرف کرنے کا اعلان کیا، جس کے بعد حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دھوکا بازی کرتے ہوئے غیر متوقع طور پر یہ آواز لگا دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو انہی کے نمایندے نے برطرف کر دیا ہے مگر میں مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو باقی رکھتا ہوں۔ اس دغا بازی پر وہاں موجود صحابہ اور تابعین میں باہم لعن وطعن، گالم گلوچ اور مار پیٹ ہوئی اور فریقین کے دل نفرت و عداوت سے بھر گئے۔ ③

---

① خلیفہ بن خیاط تحکیم کی گفتگو کا ذکر کیے بغیر نتیجے کے طور پر یہی بیان کرتے ہیں:
فَلَمْ يَتَّفِقِ الْحَكَمَانِ عَلٰى شَيْءٍ وَافْتَرَقَ النَّاسُ
"دونوں ثالث کسی بات پر اتفاق نہ کر سکے۔" (تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۲)

② عصر خلافۃ الراشدۃ لدکتور اکرم ضیاء العمری، ص ۴۷۲

③ تاریخ الطبری: ۵/ ۷۰، ۷۱ ان روایات کے ناقابلِ اعتبار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے اکثر طرق کا سرا ابومخنف پر جا کر ملتا ہے، جس کا حسب المعنی ہونا ظاہر ہے۔ ہاں طبری میں بعض روایات امام ابن شہاب زہری کے واسطے سے بھی مروی ہیں، جو خود بلاشبہ امام حدیث ہیں مگر امام زہری نے اس واقعے کا خود مشاہدہ نہیں کیا تھا اس لیے ان کی یہ روایت مرسل ہے اور ایسے اہم قضایا میں مرسل کافی نہیں جیسا کہ اہل اصول کے ہاں طے ہے۔ عن یحیی بن معین: مرسل الزهري ليس بشيء. (المراسیل لابن ابی حاتم، ص ۳)

اکابر صحابہ کرام نے واقعے کی تحقیق کی!

اس جھوٹے پروپیگنڈے کی گونج اکابر صحابہ کرام اور تابعین عظام تک بھی پہنچ گئی تھی، چنانچہ انہوں نے اس کی تحقیق کی تو پتا چلا کہ تحکیم کے اجتماع میں ایسی بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصاحب حضرت حُضَین ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے کہا: ''مجھے اس فیصلے سے آگاہ فرمایئے جس کا ذمہ دار آپ کو اور ابوموسیٰ اشعری کو بنایا گیا تھا۔ آپ نے اس معاملے میں کیا طے کیا تھا؟'' حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس بارے میں لوگوں نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکے ہیں، مگر اللہ کی قسم! بات اس طرح نہیں ہوئی جس طرح لوگوں نے کہی ہے۔''[1]

معلوم ہوا کہ اکابرِ اُمت نے جھوٹے پروپیگنڈے کی تردید کی تھی۔ نیز ان میں سے کسی سے بھی قضیۂ تحکیم کی بابت کوئی ایسی روایت منقول نہیں جو مذکورہ قسم کی مشکوک روایات کی تائید کرتی ہو۔

حکمین اور قوت نافذہ رکھنے والی عدالت یا مقتدر حکومت میں فرق:

یاد رہے کہ تنازعات دور کرنے کا اولین اور معیاری طریقہ متنازعہ امر کو غیر جانب دار اور قوتِ نافذہ رکھنے والی عدالت یا بااختیار مقتدر حکومت کے سامنے پیش کرنا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد عالمِ اسلام میں ملکی و بین الاقوامی اعلیٰ ترین عدالت فقط خلیفہ کی تھی اور قانونی و سیاسی لحاظ سے اس سے اونچا مرتبہ کوئی اور نہ تھا۔ اب چونکہ یہاں خود خلیفۂ راشد کو فریق بنا دیا گیا تھا اور اس سے بلند کوئی بارگاہ یا قوتِ نافذہ تھی ہی نہیں، جہاں قضیہ پیش کیا جا سکتا۔ لہٰذا ایسے معیاری طریقے سے تصفیے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جس سے مسئلہ قطعی طور پر حل ہو سکتا۔

---

[1] اس کے بعد انہوں نے اپنی اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی وہی گفتگو ذکر کی جو ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں۔

تاریخ دمشق: ۱۷۵/۴۶، ترجمۃ: عمرو بن العاص ؛ التاریخ الکبیر، امام البخاری: ۳۹۸/۵

یاد رہے کہ تحکیم میں بدمعاملگی پر پیش کی جانے والی مطاعنِ صحابہ سے آلودہ جو روایتیں سنداً کم ضعیف ہیں وہ تین ہیں:

- معمر عن الزہری: حتیٰ اختلفا وانبا. (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۰)

مگر یہ زہری سے مرسلاً منقول ہے اور نازک معاملات میں مراسیلِ زہری حجت نہیں۔ کان یحییٰ بن سعید القطان لایری ارسال الزہری وقتادۃ شیئا ویقول: ھو بمنزلۃ الریح. (الجرح والتعدیل: ۲۴۶/۱)

- زہری عن عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی ایک طویل روایت: جس میں ہے: وکان ذلک مکیدۃ من عمرو بن العاص. (تاریخ دمشق: ۱۱۷/۵۹) مگر اس کی سند میں ابوبکر بن ابی سبرۃ ہے جس پر حدیثیں گھڑنے کا الزام ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۲۸،۲۷)
پھر اس میں واقدی بھی ہے جو متروک ہے۔

- عن عمرو بن الحکم: لما التقی الناس بدومۃ الجندل. (تاریخ دمشق: ۱۷۲/۴۶)

اول تو روایت مرسل ہے۔ پھر اس کی سند میں بھی ابوبکر بن ابی سبرہ جیسا کذاب راوی ہے اور واقدی اور اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ ہیں جو متروک ہیں۔

غرض جب ان واقعات کے لیے پیش کی جانے والی نسبتاً بہتر روایات بھی ضعیف ہیں تو باقی روایات کا کیا حال ہوگا۔ اس کے بعد نصر بن مزاحم رافضی کی ان روایات کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی جو ''وقعۃ صفین'' میں پیش کی گئی ہیں۔



عقلاً، نقلاً اور عرفاً یہ ثابت ہے کہ ایسے ناگزیر حالات میں متحارب فریقین کی طرف سے مصالحتی نمائندے بھیجے جاتے ہیں جو مل کر فریقین کے لیے مسئلے کا قابلِ قبول حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کام اپنا موقف سمجھانا، دوسرے کا موقف سمجھنا اور مسئلے کا کوئی مناسب حل نکالنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ پس ناگزیر حالات میں حکمین کا طریقہ ہی اختیار کیا جا سکتا تھا اور ایسا ہی کیا گیا۔ مگر ثالثوں یا حکمین کی اصل حیثیت اتنی ہی ہوتی ہے کہ وہ صلح کا طریقہ تجویز کرنے کا اختیار رکھنے والے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کوشش میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی حل پر متفق نہ ہو سکیں۔ اور تقدیر کی بات کہ یہاں ایسا ہی ہوا۔ اس لیے کوئی شخص حکمین کو قوتِ نافذہ رکھنے والی عدالت پر قیاس کر کے یہ اعتراض نہ کرے کہ آخر حکمین کے مل بیٹھنے کے باوجود مسئلہ حل کیوں نہ ہوا۔

شام میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خود مختار حکومت کا قیام:

تحکیم کے بے نتیجہ ہونے سے، عراق اور شام کے ایک پرچم تلے آنے کے امکانات بظاہر ختم ہو گئے۔ لہٰذا دو ماہ بعد ذی قعدہ ۳۷ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ ایک حکمران کے طور پر اہلِ شام سے بیعت لی اور اپنی باضابطہ حکومت کا اعلان کر دیا۔[1]

☆☆☆

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۲؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵۵۲/۳، تدمری

سرحدی جھڑپیں

جنگِ صفین کے بعد بھی عالمِ اسلام کا اکثر علاقہ جو حجاز، یمن، عراق، فارس اور خراسان سے بلوچستان تک پھیلا ہوا تھا، خلافتِ راشدہ کے پرچم تلے تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی عمل داری صرف ایک صوبے یعنی شام تک محدود تھی۔ شام کے مغرب میں بھی مصر اور اس کے ماتحت سارا افریقہ خلافتِ راشدہ کے تحت تھا۔

صفر ۳۷ھ میں معرکۂ صفین کے بعد ہونے والی جنگ بندی، رمضان ۳۷ھ میں تحکیم کی مجلس تک برقرار رہی۔ اس مجلس میں فریقین کا کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہوا۔ بس گفتگو سے ایک دوسرے کے رجحانات اور صلح کے امکانات کا اندازہ لگایا گیا۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے آخری الفاظ نے ظاہر کر دیا کہ وہ اہلِ شام سے باوقار مصالحانہ تعلقات کا راستہ کھلا رکھیں گے۔ ذی قعدہ ۳۷ ہجری میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے شام میں اپنی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد نو ماہ تک سیاسی منظر نامے پر سکوت طاری رہا۔ فریقین میں کوئی جھڑپ ہوئی نہ صلح کی کوئی گفت وشنید۔

تاریخ سے واقف حضرات سے مخفی نہیں کہ جب بھی کوئی جنگ ختم ہوتی ہے تو امن کا زمانہ یکدم نہیں آجاتا اور فریقین کے درمیان باہمی معاملات، فوراً کسی پختہ مثبت سطح پر قائم نہیں ہو جاتے، بلکہ کچھ زمانہ ایسا گزرتا ہے جس میں جھڑپیں جاری رہتی ہیں، ہر ایک دوسرے کی طاقت اور اثر ورسوخ کا اندازہ لگاتا ہے، دوطرفہ تعلقات کی نئی نوعیت کو سمجھتا اور پھر اپنی حکمتِ عملی طے کرتا ہے۔ چونکہ اسلامی تاریخ میں ایسے حالات پہلی بار پیدا ہوئے تھے، اس لیے فریقین کو صلح کے کسی معاہدے تک آتے آتے خاصا وقت لگا۔ ویسے بھی جنگِ صفین میں عراقیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے شامی سپاہیوں کے قبائل کا غصہ یقیناً اتنی جلد ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا اس لیے شام میں رائے عامہ کا عراقی حکومت کے خلاف رہنا فطری بات تھی۔ اہلِ شام، اہلِ عراق کے مقابلے میں خود کو مظلوم تصور کرتے تھے۔[1]

---

[1] اس کشت وخون کے اثرات عوام ہی نہیں خواص میں بھی اگلی نسلوں تک باقی رہے۔ یہ خواص حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم تو نہیں کرتے تھے مگر ان سے محبت بھی نہیں کرتے تھے۔ حَریز بن عثمان (۸۰ھ-۱۶۳ھ) حمص کے سب سے بڑے محدث تھے۔ جن پر ناصبیت کا الزام بھی ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: "اللہ کی قسم! میں نے انہیں کبھی بُرا بھلا نہیں کہا۔" مگر وہ صاف کہتے تھے کہ میں ان سے محبت نہیں کرتا؛ کیوں کہ انہوں نے صفین میں ہماری قوم کے ایک گروہ کو قتل کیا۔ (قال: لاأحبہ لانہ قتل من قومی یوم صفین جماعۃ. سیر اعلام النبلاء: ۸۰/۷، ۸۱) ثور بن یزید شامی محدثین میں سے تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی سے بچتے تھے، جس مجلس میں ایسی باتیں ہوتیں وہ کونے میں بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے معاصر اس بات پر انہیں بہت تنگ کرتے تھے۔ (تاریخ ابن معین: ۲۲۳/۴، ط مرکز البحث العلمی) مگر ثور کے دادا صفین میں قتل ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اس صدمے کی وجہ سے اتنا ضرور کہتے تھے: میں ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جس نے میرے دادا کو قتل کیا۔ (وکان جد ثور بن یزید قد شھد صفین مع معاویۃ وقتل یومئذ فکان ثور اذا ذکر علیا قال لا احب رجلا قتل جدی. (طبقات ابن سعد: ۴۶۷/۷، صادر)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل اور اشرف ماننے کے باوجود اب بھی سابقہ موقف پر قائم تھے۔ فریقین میں کوئی معاہدہ بھی نہیں تھا اور ہر ایک بدستور دوسرے کو باغی تصور کرتا تھا۔ اسی لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ضروری سمجھتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ماتحت علاقوں کو زیرِ نگیں کرنے کی کوشش کریں۔ لہٰذا انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ماتحت علاقوں پر حملوں اور سرحدی خلاف ورزیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، جو لگ بھگ دو سال تک جاری رہا۔ اسی دوران ان کی افواج نے مصر پر قبضہ بھی کیا جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس کش مکش کے اہم واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

❶ شعبان ۳۸ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ اور بصرہ کی افواج کو ملا کر خوارج سے لڑائی کے لیے نکلے۔[1] بصرہ کے گورنر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلے گئے اور شہر فوج سے خالی ہو گیا۔ ایسے میں بصرہ میں موجود عثمانی تحریک کے کارکنوں نے موقع غنیمت سمجھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بصرہ پر قبضے کی دعوت دے ڈالی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عَمر والحضرمی کی قیادت میں ایک دستہ وہاں بھیج دیا۔ بصرہ کے نائب گورنر زیاد نے شہر سے فرار ہو کر اپنی جان بچائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو خوارج کے خلاف مصروفِ جہاد تھے، اس مصیبت کی اطلاع دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خبر ملتے ہی اپنے مشہور جرنیل جاریہ بن قُدامہ رضی اللہ عنہ کو بصرہ بھیج دیا۔ شامی حملہ آور بصرہ کی ایک عمارت ''دار سنبیل'' میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ جاریہ بن قُدامہ رضی اللہ عنہ نے انہیں وہیں گھیر لیا اور ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا۔ جب وہ نہ مانے تو عمارت پر آتش باری کی گئی جس سے تمام حملہ آور جاں بحق ہو گئے۔[2]

❷ ۳۹ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دو ہزار آدمی عراق کے سرحدی شہر ''عین التمر'' پر قبضے کے لیے روانہ کیے مگر مقامی لوگوں نے قلت کے باوجود ڈٹ کر مقابلہ کیا اور شامی فوج ناکام واپس ہوگئی۔[3]

❸ اسی سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چھ ہزار افراد کو اَنبار اور مدائن پر حملے کے لیے بھیجا۔ یہ فوج تاخت و تاراج کے بعد واپس ہوگئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے سعید بن قیس تعاقب میں گئے مگر حملہ آور بہت دور جا چکے تھے۔[4]

❹ اسی سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مَسعَدہ فزاری کو سترہ سو سپاہی دے کر جزیرۃ العرب بھیجا تاکہ وہ پہلے تیماء اور پھر مکہ و مدینہ کے لوگوں کو مطیع بنائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جزیرۃ العرب کے دفاع کے لیے مُسَیَّب ابن نجبہ فزاری رحمہ اللہ کو روانہ کیا جنہوں نے تیماء میں شامی فوج کو جا لیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد شامی پسپا ہو کر ایک قلعے میں محصور ہو گئے، جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو رحم کی درخواست کی۔ مُسَیَّب ابن نَجَبہ رحمہ اللہ نے نرمی سے کام لیتے ہوئے انہیں شام واپس جانے دیا۔[5]

---

① خوارج کے خلاف مہم کشی کی تفصیل آگے مستقل باب میں آرہی ہے۔

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۶، ۱۹۷؛ تاریخ الاسلام للذهبی: ۵۸۷/۳، سنة ۳۸ھ؛ تاریخ الطبری: ۱۱۰/۵
ویؤیده روایة صحیحة عن عبدالرحمن ابن ابی بکرة عن ابی بکرة رضی اللہ عنہ، فیه - فلما کان یوم حُرِّق ابن الحضرمیّ، حرّقه جاریة بن قدامة، قال: اشرفوا علیٰ ابی بکرة. (صحیح البخاری، ح: ۷۰۷۸، کتاب الفتن، باب قوله لا ترجعوا بعدی کفارًا......)

③ تاریخ الطبری: ۱۳۳/۵ ④ تاریخ الطبری: ۱۳۴/۵ ⑤ تاریخ الطبری: ۱۳۵/۵

❺ اسی سال حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ عراق کے سرحدی علاقوں: واقِصہ اور ثعلبیہ پر حملے کا حکم دیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ چار ہزار افراد کے ساتھ سرحدوں کے دفاع کے لیے پہنچ گئے اور تدمُر کے قریب حملہ آوروں سے ٹکر لے کر انہیں پسپا کر دیا۔[1]

❻ ۳۶ھ سے ۳۸ھجری تک حج کے موقع پر ہر سال فریقین میں سے ہر ایک مکہ اور مدینہ کے انتظامات سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا۔ جس کے دستے پہلے پہنچ جاتے وہی امیرِ حج کا تقرر کر دیتا۔ اس کش مکش سے لوگوں کو پریشانی ہوتی تھی۔ اس لیے امہات المؤمنین میں سے ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں کہا:

''ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھیں کہ ان لشکروں کو جو لوگوں کو خوفزدہ کر دیتے ہیں، اس وقت تک موقوف رکھیں جب تک اُمت آپ میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو جاتی۔''

ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سمجھانے کی ذمہ داری لے لی، بعض قریشی وانصاری حضرات کو سفیر بنا کر دونوں حضرات کو خطوط بھیجے گئے۔ نتیجے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ امارتِ حج سے دست بردار ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تیار ہو گئے تھے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اسے خلافِ مصلحت قرار دے کر انہیں روک دیا۔[2] غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ امارتِ حج طے کرنا شروع سے خلیفہ کا حق تھا، اسے ترک کرنا خلافت سے معزولی پر محمول کیا جا سکتا تھا اور منصبِ خلافت کی ساکھ متاثر ہو سکتی تھی۔

❼ ۳۹ھ میں حج کے موقع پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید بن شجرہ رضی اللہ عنہ کو حج کے انتظامات سنبھالنے کے لیے حجاز بھیجا۔ مگر وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقرر کردہ امیرِ حج حضرت قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ ان کے آڑے آئے۔ آخر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی کوشش سے یہ معاملہ صلح وصفائی کے ساتھ اس طرح طے پا گیا کہ امارتِ حج حضرت شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دی گئی۔[3]

❽ ۴۰ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے سالار بُسر بن ارطاۃ کو ایک بڑی فوج کے ساتھ یمن اور حجاز پر لشکر کشی کے لیے بھیجا۔ اس لشکر نے اہلِ حجاز کو سرنگوں کرنے کے بعد یمن تک یلغار کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گورنر عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بے دخل کر کے یمن پر قبضہ کر لیا۔ مگر کچھ دنوں بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سالار جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ تازہ دم فوج لے کر آئے تو شامی فوج مقابلے پر نہ ٹھہر سکی اور اسے یمن اور حجاز سے نکلنا پڑا۔ اس کے بعد عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بدستور یمن کے حاکم رہے۔[4]

---

① تاریخ الطبری: ۱۳۶/۵

② مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۰، عن الزہری. اسنادہ مرسل و رجالہ ثقات الی الزہری، ط المجلس العلمی پاکستان

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۸ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۸؛ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱/۸۶، ۱۱۵، ط دار الوعی
معتبر روایات سے یہ واقعات اسی قدر ثابت ہیں۔ کتبِ تواریخ میں ان واقعات کی بڑی تفصیل ملتی ہے، جنہیں ہم نے اس لیے نقل نہیں کیا کہ ان کے زیادہ تر راوی ضعیف ہیں جن میں ابو مخنف پیش پیش ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ان واقعات کی جزئیات میں مبالغہ آرائی یا جعل سازی کر دی گئی ہو۔

مصر کا قضیہ

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جنگِ صفین کے بعد اس شرعی دلیل کے تحت کہ ان کے نزدیک عراقی حکومت غیر آئینی تھی جس سے قتال شروع تھا،مختلف مہمات کے ذریعے اپنی آزاد حکومت کی توسیع کی کوششیں کرتے رہے مگر انہیں قطعاً کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ڈیڑھ برس بعد ۳۸ھ میں انہیں پہلی بار مصر پر قبضے کے ذریعے اپنی حکومت کی توسیع کا موقع ملا۔[1]

مصر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بہت مستحکم نہ تھی کیوں کہ جغرافیائی لحاظ سے مصر،شام وفلسطین کے ساتھ لگتا تھا اور وہاں اپنی فوج کو اہلِ شام کے مقابلے میں مضبوط رکھنا مشکل تھا۔نیز وہاں عثمانی تحریک کے لوگ بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کے لیے تیار نہ تھے۔اس بحرانی کیفیت کے باعث تین برسوں کے دوران مصر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تین حاکم:محمد بن ابی حذیفہ،قیس بن سعد رضی اللہ عنہ اور اَشتر نخعی یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مصر پر قبضہ اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں مصر شرپسندوں کی تحریک کا اہم مرکز بن چکا تھا۔مفسدین کا بڑا قافلہ مصر ہی سے مدینہ گیا تھا۔اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شرپسندوں کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے وہ ۳۵ھ کے آخر میں عُقبہ بن مالک کو اپنا نائب بنا کر مصر سے نکل پڑے تھے،ان کے جاتے ہی باغی تحریک کے رہنما محمد بن ابی حذیفہ نے دارالحکومت فُسطاط پر قبضہ کر کے عُقبہ بن مالک کو نکال دیا تھا۔ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ فلسطین پہنچے تھے کہ پیچھے بغاوت کی اطلاع ملی،وہ پلٹے مگر باغیوں نے انہیں مصر کی سرحد پر روک لیا۔اس کے بعد وہ عسقلان چلے گئے جہاں انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی۔وہ وہیں گوشہ نشین ہو گئے اور کچھ مدت بعد وہیں فوت ہو گئے۔[2]

---

[1] اس دور کی تاریخی روایات میں جہاں مصر کا ذکر آتا ہے،وہاں اس سے مراد وہ شہر ہوتا ہے جو قدیم مصر کے فرعونی پایۂ تخت "بابلیون" کے سامنے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں آباد کیا گیا تھا جس کا نام فسطاط تھا۔بعد میں یہی فسطاط مصر کا دارالحکومت بنا۔صدیوں بعد جب قاہرہ آباد ہوا تو یہ فسطاط قاہرہ کا ایک محلہ بن گیا،جس میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تعمیر کردہ مسجد اب بھی موجود ہے۔

[2] تاریخ ابن یونس المصری (م ۳۴۷ھ): ۱/ ۲۷۰، ۳۳۱، ط العلمیة

وسلیل اسم نقب ابن ابی سرح بمصر عقبة بن عامر وهو سهو والصحیح هو عقبة بن مالک کما نقل الذهبی فی تاریخ الاسلام: ۳۰۲/۳ فی ترجمة: محمد بن ابی حذیفة وراجع: تاریخ المدینة لابن شبه: ۱۱۵۳/۴؛ تاریخ الطبری: ۵۴۶/۴

بعض روایات کا یہ بیان درست نہیں کہ حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں محمد بن ابی حذیفہ نے مصر پر قبضہ کیا تھا۔محمد بن ابی حذیفہ کا ذکر پیچھے آ چکا ہے۔اس کی پرورش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی مگر یہ جوان ہو کر کسی قابلیت کے بغیر منصب حاصل کرنا چاہتا تھا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تجربہ کار بنانے کے لیے اسے مصر بھیجا مگر یہ وہاں سازشی تحریک سے متاثر ہو کر مصر کے گورنر حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا مخالف بن گیا اور جب حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے نکلے تو محمد بن ابی حذیفہ نے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مصر پر پہلا حملہ اور محمد بن ابی حذیفہ کا قتل:

اس دوران مدینہ منورہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بن چکے تھے۔ انہوں نے جس طرح دیگر باغیوں سے بیعت لے کر انہیں خدمات سپرد کیں، اسی طرح سیاسی مصلحت کے تحت محمد بن ابی حذیفہ کو بھی مصر کی گورنری پر برقرار رکھا۔ مگر یہ صورتحال حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے قابلِ برداشت نہ تھی کیونکہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین کو بہرحال کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ پس وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مصر کی سرحد ''عریش'' پر جا پہنچے۔ حریف کی پیش قدمی کی خبر سن کر محمد بن ابی حذیفہ نے بھی سرحد پر پہنچ کر عریش کے قلعے میں مورچہ بندی کر لی تھی۔ شامی فوج نے قلعے کا محاصرہ کر کے ایسی سنگ باری کی کہ مصری فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اس کے بعد محمد بن ابی حذیفہ کو ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ عریش کے بعد دریائے نیل تک صحرائی علاقہ تھا اور فسطاط میں دفاعی انتظامات غیر معمولی تھے۔ اس لیے شامی قائدین نے مزید پیش قدمی کو مناسب نہ سمجھا اور واپس چلے گئے۔ [1]

مصر میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی گورنری:

محمد بن ابی حذیفہ کے قتل کی خبر سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ انہوں نے مصر جا کر عوام سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لے لی، مگر ایک علاقے ''خِربتا'' کے دس ہزار افراد نے بیعت کو اس وقت تک مؤخر رکھنے کا اعلان کیا جب تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص نہیں لیا جاتا۔ ان میں حضرت مَسلمہ بن مُخَلَّد اور حضرت مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہما نمایاں تھے۔ قیس بن سعد رضی اللہ عنہما نے بصیرت سے کام لیتے ہوئے ان کی بیعت کو مؤخر رکھا اور کوئی سختی نہ کی۔ [2]

سبائی عناصر مصر پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے تھے مگر حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے تدبر و سیاست کی وجہ سے وہ یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے ''خِربتا'' کے شہریوں کو بیعت نہ کرنے کی چھوٹ دی ہوئی تھی۔ سبائی عناصر اسے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی مرکز سے غداری کا نام دینے لگے۔ اس طرح وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قیس بن سعد رضی اللہ عنہ سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کے من پسند رئیس اَشتَر نخعی کو وہاں کا حاکم بنا دیا جائے۔ [3]

---

① یہ ۳۶ھ کا واقعہ ہے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق میں جنگِ جمل جیسے مسائل کا سامنا کر رہے تھے۔ (تاریخ طبری: ۱۰۶/۵)
محمد بن ابی حذیفہ کے قتل کا یہ واقعہ اگرچہ واقدی سے منقول ہے مگر دیگر مؤرخین سے اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً ابن یونس المصری (م ۳۴۷ ہجری) بھی اسے ۳۶ھ کا واقعہ بتاتے ہیں۔ (تاریخ ابن یونس: ۴۴۱/۱)
ہشام کلبی کی روایت اس سے بالکل الگ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ محمد بن ابی حذیفہ کا قتل، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مصر پر قبضے کے بعد ہوا تھا یعنی ۳۸ھ میں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ کلبی کی روایت ناقابلِ اعتبار ہے۔ ۳۶ھ ہی صحیح ہے۔ (تاریخ طبری: ۱۰۶/۵)

② تاریخ الطبری: ۵۴۹/۴ ، البدایہ والنہایہ: ۴۸۷/۱۰

③ تاریخ الطبری: ۵۵۳/۴

اَشتر نخعی کی مصر روانگی اور اچانک موت:

یہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قابل بھتیجے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کو ایک بات سوجھی اور انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: ''آپ اَشتر کو مصر بھیج ہی دیں۔ اگر اس نے مصر کو سنبھال لیا تو آپ کی منشاء پوری ہوجائے گی۔ اگر نہیں، تو آپ کو اس سے نجات مل جائے گی۔'' اشتر نخعی کی تیز مزاجی اور خودسری سے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تنگ آچکے تھے۔ اس لیے انہیں بھی اَشتر کو مصر بھیجنا ہی بہتر لگا، چنانچہ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو مصر کی حکومت سے معزول کر کے اَشتر کو حاکم بنا کر روانہ کر دیا گیا۔[1] اَشتر مصر کی سرحد پر ساحلِ قلزم تک پہنچا جہاں اس کا استقبال ہوا۔ خاطر تواضع کرنے والوں نے اسے شہد کا شربت پلایا جس کے بعد اچانک اس کی موت واقع ہوگئی۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی تو فرمایا: '' لِلْيَدَيْنِ وَالْفَم. '' (منہ کے بل گر کر مرا)[3]

بعض لوگوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اَشتر کی موت میں ملوث قرار دیا ہے مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مصر پر قبضہ اور محمد بن ابی بکر کا قتل:

اَشتر نخعی کی موت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم بنا کر بھیجا۔ محمد بن ابی بکر ماضی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف گروہ میں پیش پیش رہے تھے، اس لیے ان کی شہرت اچھی نہیں رہی تھی، چنانچہ انہیں لوگوں کو مطمئن

---

① اس پورے واقعے کو ابوعمر محمد بن یوسف بن یعقوب الکندی (م ۳۵۵ ہجری) نے صحیح و متصل سند سے نقل کیا ہے: عن عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ: قال کنت اذا اردت ان لا یمنعنی علیٌ شیئا قلت بحق جعفر فقلت له: اسالک بحق جعفر الا بعثت الاَشتر الی مصر فان ظفرت فهو الذی تحب والا استرحت منه. قال سفیان وکان قد ثقل علیه وابغضه وقلاه، قال فولّاه وبعثه. (کتاب الولاة: ۲۱/۱)

② کتاب الولاة: ۲۱/۱ ، تاریخ الطبری: ۵۵۳/۴ ③ کتاب الولاة: ۲۱/۱

نوٹ: "للیدین والفم" بددعائیہ جملہ ہے، لہٰذا اس کے مقابلے میں نصر بن مزاحم رافضی کی وہ روایت متروک ہوگی جس میں اَشتر کی موت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے دعائیہ و تعریفی کلمات: ''لله مالک لو کان جبل. '' وغیرہ منقول ہیں۔ (کتاب الولاة: ۲۲/۱ ، سیر اعلام النبلاء: ۳۴/۴، ط الرسالة)

کتب اسماء الرجال میں اشتر نخعی کا ذکر:

اشتر نخعی کی شورش پسندی اور بددماغی کا ذکر پیچھے کئی جگہ آچکا ہے مگر اس کے باوجود اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے نقلِ روایت میں اسے ثقہ مانا ہے۔ (الثقات للعجلی: ۴۱۷/۱ ، الثقات لابن حبان، ح: ۵۳۳۸ ، تعجیل المنفعة، تر: ۹۲۴)

بظاہر غالباً یہ ہے کہ وہ حماقت کے باعث سبائیوں کا مہرہ بن گیا تھا ورنہ وہ بدعقیدہ نہ تھا البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں غلو کے باعث ان کے مخالفین کا سخت دشمن تھا۔ یہ غلو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ناگوار تھا کیونکہ اس سے مسلمانوں کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے اپنے سے دور بھیج دیا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس کا نام مالک بن الحارث تھا۔ وہ قبیلہ نخع کا بڑا معزز سردار تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا تھا۔ وہ جنگِ یرموک میں شریک ہوا جس میں اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اشتعال انگیزی کرنے والوں میں سے تھا، وہ ان کی طرف قافلے میں گیا اور شر پھیلایا۔ وہ زبردست مقرر اور شہ سوار تھا۔ وہ صفین میں شامل ہوکر اس موقع پر ممتاز ہوا۔'' حافظ ذہبی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں: ''عبداللہ بن سلمہ المرادی کہتے ہیں: عمر رضی اللہ عنہ نے اشتر کو دیکھا، میں پاس تھا۔ انہوں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر اس پر نگاہ جما کر کہا: اس کی وجہ سے مسلمانوں پر ایک مصیبت کا دن آئے گا۔'' (تاریخ الاسلام: ۳۳۶/۳ تدمری) امام احمد بن حنبل اس سے روایت لینے سے منع کرتے تھے۔ (اکمال تہذیب الکمال: ۳۵/۱۱)

درحقیقت اسماء الرجال کی کتب میں اشتر نخعی کا مقام مروان بن الحکم جیسے لوگوں کی طرح ہے جن میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی، پس ایک طبقے نے انہیں ثقہ مانا ہے اور ایک نے ناقابلِ اعتماد۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی برائیوں سے واقف تھے مگر اس کی عسکری صلاحیتوں اور اس کے قبیلے کی افرادی قوت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، ساتھ ہی ان لوگوں کے ایسے منفی رجحانات اور تشدد پسندانہ خیالات کی اصلاح بھی مقصود تھی جو تشیع سے آگے بڑھ کر رفض کا رنگ اختیار کر رہے تھے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیاسی و دعوتی حکمت عملی تھی جو بلاشبہ شرعی دائرے کے اندر تھی۔ اس لیے اشتر کو ساتھ رکھنے سے ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا۔

کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ انہوں نے مصر پہنچ کر اہل خربتا کو بیعت کے لیے ایک ماہ کی مہلت دی اور جب وہ اپنے غیر جانبدارانہ موقف پر قائم رہے تو ان سے جنگ شروع کر دی۔ یہ سن ۳۸ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس اقدام کے نتیجے میں مصر میں حالات بہت کشیدہ ہو گئے۔ ①

دس ہزار جنگجو جو حضرت مُعاویہ بن حُدَیج اور مَسلَمہ بن مُخَلَّد رضی اللہ عنہما کی کمان میں تھے، محمد بن ابی بکر سے مرعوب نہ ہوئے اور مقابلے پر ڈٹ گئے۔ ان ہم نواؤں کو ساتھ ملا کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو مصر پر قبضے کا بہترین موقع مل گیا۔ انہوں نے حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لشکر دے کر مصر بھیج دیا۔ محمد بن ابی بکر کے لیے بیک وقت اندرونی و بیرونی دو محاذوں پر لڑنا مشکل ہو گیا۔ جلد ہی حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں شکست دے کر مصر پر قبضہ کر لیا۔ ②

محمد بن ابی بکر اس کش مکش میں گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گئے۔ یہ ۳۸ھ کا واقعہ ہے۔ ③

---

① تاریخ الطبری: ۵۵۷/۴

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۹۲، ۱۹۳

③ تاریخ خلیفة، ص ۱۹۳ بسند صحیح

محمد بن ابی بکر کے قتل کی روایات کی جو تفاصیل ابومخنف سے منقول ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ محمد بن ابی بکر کو مردہ گدھے کے پیٹ میں ڈال کر جلا دیا گیا تھا۔ اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا غم زدہ ہو کر حضرت مُعاویہ اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کو عمر بھر لعنت اور بد دعائیں دیتی رہتی تھیں۔ (**تاریخ طبری: ۱۰۲/۵، ۱۰۵**)

مصر پر اہلِ شام کا حملہ کر کے قبضہ کرنا اور محمد بن ابی بکر کا قتل بلاشبہ ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی کے قتل پر غم گین ہونا بھی فطری سی بات ہے۔ تاہم ابومخنف کی روایات کا ہر جزو قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا بلکہ بعض بیانات خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف لعنت اور بد دعاؤں کی نسبت یقیناً ایک غلط اضافہ ہے۔ اسی طرح محمد بن ابی بکر کو مردہ گدھے کے پیٹ میں ڈال کر جلا دینا بھی مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

محمد بن ابی بکر کے حالات پر ایک نگاہ

محمد بن ابی بکر نیک و صالح اور عبادت گزار شخص تھے۔ ان کی والدہ مشہور صحابیہ اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا تھیں جن کا پہلا نکاح جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ جن سے محمد بن جعفر پیدا ہوئے۔ جعفر رضی اللہ عنہ جنگِ موتہ میں شہید ہوئے تو اسماء رضی اللہ عنہا کا دوسرا نکاح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (**سیر اعلام النبلاء: ۲۸۷/۲**)

حجۃ الوداع کے سفر میں ان کے ہاں محمد بن ابی بکر کی ولادت ہوئی تھی۔ اس بچے کو شیر خوارگی میں رخِ انور کی ایک ادنیٰ جھلک نصیب ہوگئی۔ محمد بن ابی بکر اڑھائی سال کے تھے کہ والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی۔ اب اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا اور یہ دونوں یتیم بچے: محمد بن جعفر اور محمد بن ابی بکر، ان کے ہاں پرورش پانے لگے۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی اس بھائی سے بے حد پیار کرتی تھیں۔

افسوس کہ ایسے نیک گھرانے کا یہ نوجوان شر پسندوں کے بہکاوے میں آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک میں شامل ہو گیا۔ تاہم آخری لمحات میں رجوع کی توفیق ہوگئی۔ ثقات کی روایت کے مطابق قاتلانہ حملے میں محمد بن ابی بکر قطعاً شامل نہیں تھے۔ (**الاستیعاب: ۱۳۶۶/۳، ۱۳۶۷**)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انہیں اپنے ساتھ رکھنا اور عہدہ دینا بھی اس بات کی علامت ہے کہ وہ قتل کے مجرم نہیں تھے۔ البتہ بغاوت کے سنگین جرم میں بہر حال وہ شریک ہوئے تھے اور آخر کار خود بھی افسوس ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس انجام پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں: "**عسی القتل خیرا لهم وتمحیصا**۔" (امید ہے کہ قتل ہونا ان کے لیے خیر اور گناہ سے پاکی کا ذریعہ بن جائے۔) (**سیر اعلام النبلاء: ۴۸۱/۳، ط الرسالة**)

قاسم بن محمد

محمد بن ابی بکر کے قتل کے بعد ان کے یتیم لڑکے قاسم کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پالا جس کی وجہ سے یہ قاسم بن محمد مدینہ کے نامور علماء و فقہاء میں شمار ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان کی روایت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "**وکان افضل اهل زمانه**"۔ (**صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الطیب بعد رمی الجمار**) عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: میں نے اس نوجوان سے زیادہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشابہ کوئی شخصیت نہیں دیکھی۔'' امام مالک رحمہ اللہ کہتے تھے: قاسم اس اُمت کے فقہاء میں سے تھے۔ (**تہذیب الکمال: ۴۳۰/۲۳**) قاسم بن محمد رحمہ اللہ، عموماً سجدہ ریز ہو کر یہ دعا کرتے تھے: **اللهم اغفر لابی ذنبه فی عثمان**۔ ''اے اللہ! حضرت عثمان کے بارے میں میرے باپ کا گناہ بخش دے۔'' (**وفیات الاعیان، ابن خلکان: ۵۹/۴، ط دار صادر**)

قاسم بن محمد، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت تک حیات تھے۔ ان کے کچھ حالات عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت کے ضمن میں آئیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے قتل کا سخت صدمہ ہوا اور فرمایا:

''میں انہیں بیٹا سمجھتا تھا۔ وہ بھائی بھی تھے اور بھتیجے بھی۔ اللہ سے امید ہے کہ وہ صبر کا اجر دے گا۔''[1]

مصر پر قبضے کے اثرات:

مصر پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا قبضہ خلافتِ علویہ کے لیے عظیم نقصان تھا کیوں کہ اس طرح ایک وسیع علاقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبضے سے نکل گیا اور شامی حکومت افریقہ تک پھیل گئی تھی۔ مگر دوسری طرف یہ اقدام مقامی مسلمانوں کے لیے امن کا باعث ہوا کیوں کہ وہاں سیاسی استحکام پیدا ہو گیا اور خانہ جنگی کی کیفیت ختم ہو گئی۔ ویسے بھی مصر زمینی طور پر شام سے ملا ہوا تھا، دونوں کے دفاع کی مضبوطی ایک ہاتھ میں ہونے پر منحصر تھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے مصر کو شام کے ساتھ ملانا ضروری تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مصر پر قبضے کے بعد انہوں نے ثابت کیا کہ وہ عالمِ اسلام کے مغربی حصے کو بخوبی سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس دور میں رومی مصر میں خفیہ طور پر مداخلت شروع کر چکے تھے اور وہاں سبائی گروہ بھی بدستور پنپ رہا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے وہاں نظام کی ابتری کو دور کیا اور غیر ملکی ایجنٹوں کا کھوج لگا کر ان کا سدباب کیا، چنانچہ ایک ایسا قبطی بھی اس دار و گیر میں پکڑا گیا جو یورپی طاقتوں کو خطوط لکھ کر مسلمانوں کی کمزوریوں اور راز کی باتوں سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس سے جو دولت برآمد ہوئی وہ ایک کروڑ تین لاکھ دینار (تقریباً ۱۲۵ ارب روپے) تھی، جسے بحکمِ سرکار ضبط کر لیا گیا۔[2]

ایک عام آدمی کے پاس اتنی دولت غیر ملکی عطیات ہی کا کرشمہ ہو سکتی تھی، تاکہ وہ اس سے مقامی لوگوں کے ضمیر اور ایمان کا سودا کرے اور فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکائے۔

☆☆☆

[1] معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصبهاني: ١٦٨/١

[2] البداية والنهاية: ٢٦٢/١٠

فریقین میں صلح

مصر پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے قبضے اور سرحدی جھڑپوں کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اہلِ شام سے کشادہ روئی اور نرم خوئی بدستور برقرار رہی۔ یہ ثابت نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شام کی سمت دوبارہ لشکر کشی کا عزم کیا ہو، حالاں کہ جزیرۃ العرب پر اہلِ شام کے حملے اور مصر پر ان کا قبضہ ایک نئی جنگ چھیڑنے کے لیے مضبوط وجہِ جواز بن سکتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جہاں داری کے اس رمز سے خوب آشنا تھے کہ حکمرانی کا معنیٰ ملک پر ایسی گرفت ہے کہ احکام کا نفاذ اختیار میں ہو۔ جہاں یہ اختیار قطعی طور پر ختم ہو جائے وہاں حکمرانی بھی باقی نہیں رہتی۔ پس اگر کوئی گروہ غیر معمولی طور پر طاقتور ہو کر اپنی مقبوضہ حدود میں سرکاری احکام کے نفاذ کی ہر کوشش کو بزورِ شمشیر ناکام بنا دے اور یہ معاملہ طول پکڑتا جائے تو ایسے میں معاملہ خروج سے ہٹ کر الگ ریاست کے قیام کی طرف جانے لگتا ہے، حکومت اور باغی گروہ کے بجائے یہ دو ریاستوں اور دو حکمرانوں کی کش مکش کا مسئلہ بننے لگتا ہے۔ پس اگر فریقِ ثانی اہلِ عدل وتقویٰ ہو تو اس سے بلاوجہ جنگ کی ضرورت نہیں۔ ہاں اپنی موجودہ سرحدوں کا دفاع بہر حال حکمران کی ذمہ داری رہے گی۔

اہلِ شام کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسی کے خطوط:

غور کریں تو ان سالوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیاسی حکمتِ عملی درج ذیل خطوط پر استوار دکھائی دے گی:

❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مصر پر اہلِ شام کے قبضے کے خلاف کوئی سخت ردِ عمل ظاہر نہیں کیا کیوں کہ وہ علاقہ واقعی ان کی استطاعت سے باہر ہو چلا تھا۔

❷ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شام پر دوبارہ حملے کا خیال ترک کر دیا کیوں کہ معاملہ اہلِ عدل کی ایک الگ ریاست بننے کی طرف جا رہا تھا۔

❸ ہاں اب تک اس ریاست سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا، اور سرحدی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی سرحدوں کا دفاع کیا اور اہلِ شام کی مداخلت کو کہیں بھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔

❹ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تو اہلِ شام سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑ سکتے تھے مگر صفین میں ہونے والے غیر معمولی افرادی نقصان سے وہ بڑے دل گرفتہ تھے جیسا کہ جنگ کے دوران بھی انہوں نے اس کرب کا اظہار فرمایا تھا۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے کسی المیے کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کا رویہ صبر وتحمل پر مبنی رہا۔

① لو علمتُ ان الامر یکون ھکذا ما خرجت من الکوفۃ. (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۵۲)

⑤ ایسا لگتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دور بین نگاہوں، غیر معمولی فقاہت وبصیرت اور عاقبت اندیش ذکاوت نے جنگِ صفین سے کوفہ لوٹتے وقت ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ فریقین میں زاویۂ نگاہ کا اختلاف طول کھینچے گا اور اس وقت قدرتی طور پر عالمِ اسلام میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکمران بننے کا اندازہ اور اس کے لیے کشادہ دلی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ایمان واخلاص، کردار وسیرت اور اُن کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ چنانچہ قرائن بتاتے ہیں کہ وہ صفین کے بعد ہی طے کر چکے تھے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی متوازی امارت سے وہ اب از خود کوئی تعرض نہیں کریں گے اور صلح ومفاہمت کو ترجیح دیں گے۔ گویا انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی اجتہادی خطا میں معذور تصور کر لیا تھا۔

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفادار اور مخلص حامیوں کی رائے اس حد تک وسیع نگاہی اور کشادہ دلی پر مبنی نہیں تھی، کیوں کہ صفین میں ان کے ہزاروں عزیز اور احباب اہلِ شام کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ فطری بات تھی کہ ان صدمات کے زخم اتنی جلد مندمل نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حکیمانہ انداز میں اپنے رفقاء کے دلوں پر مرہم لگانے اور ان کے اذہان میں لچک پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے مصاحبین کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صفین سے واپسی پر اپنے ساتھیوں سے ایسی باتیں کہنے لگے تھے جو پہلے کبھی نہیں کہتے تھے، آپ فرماتے تھے:

''مُعاویہ کی حکمرانی کو ناگوار مت سمجھو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر مُعاویہ تم سے رخصت ہو گئے، تو تم لوگوں کے سروں کو حنظل کے پھلوں کی طرح کندھوں سے کٹ کٹ کر گرتا دیکھو گے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ بیان سرسری نہیں بلکہ حالات پر ان کی وسیع نگاہ اور عواقب بینی کا مظہر تھا۔ وہ جان چکے تھے کہ شام میں قبائلی تعصب ابھرنے کے باوجود وہاں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے مناقب اور خصائل کے لحاظ سے سب سے معتدل شخصیت ہیں اور ان کے بعد کوئی شامی سیاست دان ان جیسی رواداری اور بردباری کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا ان کے بعد خانہ جنگی میں شدت آ سکتی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کر چکے تھے کہ اہلِ عراق کے طبعی انتشار وافتراق کے مقابلے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام کو جس طرح منظم کر رکھا ہے، اس کا نتیجہ عموماً سیاسی غلبے کی شکل میں ہی نکلتا ہے، لہٰذا مستقبل میں اُمت کا اقتدار انہی کے ہاتھوں میں چلے جانا کوئی بعید نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنے مصاحبین کا یہ ذہن بنانا چاہتے تھے کہ اگر کبھی ایسی صورتحال بن جائے تو اہلِ عراق اسے اپنی اَنا کا مسئلہ نہ بنائیں اور ایک قابل آدمی کو حکمران مان کر حالات سے سمجھوتہ کر لیں۔

---

[1] بسند صحیح واللفظ للخلال: " لاتکرھوا امارۃ معاویۃ، والذی نفسی بیدہ مابینہ و بین ان تنظروا الی جماجم الرجال تندر عن کواھلھا کانھا الحنظل الا ان یفارقکم معاویۃ." (السنۃ للخلال، ح: ۱۲۸۳؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۵۴، ط الرشد؛ تاریخ دمشق: ۱۵۱/۵۹)

مجلسِ تحکیم کے بے نتیجہ ہونے کے بعد جب ذوالقعدہ ۳۷ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کے مستقل حکمران کے طور پر رعایا سے بیعت لی[1] تو شام کا ایک الگ ریاست وحکومت کے طور پر تشخص مزید ابھر آیا۔

اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اذہان اور رائے عامہ کو کسی ایسے معاہدے کے لیے ہموار کرتے رہے جو دونوں ریاستوں کے لیے مستقل امن کا ضامن ہوتا ہے۔ جو لوگ شام پر حملہ کرنے کے لیے اصرار کر رہے تھے، آپ رضی اللہ عنہ اُن کی رائے کو مسترد کر کے خوارج کے سدباب کو ضروری قرار دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: ''کیا تم مُعاویہ اور اہل شام کی طرف پیش قدمی کرو گے اور ان دشمنوں کو اپنے اہل وعیال اور مال ودولت پر مسلط چھوڑ جاؤ گے؟''[2]

سرحدوں کے احترام کا معاہدہ:

اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس نرمی اور تحمل کے جواب میں اہلِ شام کی طرف سے مسلسل سرحدی جارحیت کا ارتکاب ہوتا رہا، حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری سال ۴۰ ہجری میں بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں شامی لشکر نے حجاز سے گزر کر یمن تک یلغار کی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف اپنے علاقے کے دفاع اور شامی لشکر کو پسپا کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو درج ذیل مراسلہ آن پہنچا:

''امابعد! اگر آپ پسند کریں تو عراق آپ کے پاس رہے اور شام میرے پاس، تاکہ امت کے درمیان تلوار چلنا بند ہو جائے اور مسلمانوں کا خون نہ بہے۔''[3]

مدعا یہ تھا کہ فریقین ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت نہ کریں۔ جس کے پاس جو علاقہ ہے، وہ اسی کے پاس رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگِ صفین کے بعد اسی حکمتِ عملی پر کاربند تھے اور تب سے اب تک انہوں نے ایک بار بھی شامی سرحد پر کوئی فوج نہیں بھیجی تھی۔

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۲، نصہ: وبایع اهل الشام لمعاویة بالخلافة فی ذی القعدة سنة سبع وثلاثین.
ونقل الذهبی: لم بایع اهل الشام معاویة بالخلافة فی ذی القعدة سنة ثمان وثلاثین کذا قال. وقال خلیفة وغیره انهم بایعوه فی ذی القعدة سنة سبع وثلاثین وهو اشبه لان ذالک کان اثر رجوع عمرو بن العاص من التحکیم. (تاریخ الاسلام للذهبی: ۵۵۲/۳، تدمری)
نوٹ: ان عبارات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ۳۷ ہجری میں ہی اپنی خلافت کی بیعت لے لی تھی مگر سعید بن عبدالعزیز تنوخی سے منقول ایک حسن روایت کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کی بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ۴۰ ہجری میں لی تھی۔ روایت یہ ہے:
سنة اربعین: وفی هذه السنة بویع معاویة بالخلافة بایلیاء وکان قبل یدعی بالشام امیرا. وحدثت عن ابی مسهر عن سعید بن عبدالعزیز قال: کان علیؓ یدعیٰ بالعراق امیر المؤمنین وکان معاویة یدعی بالشام الامیر، فلما قتل علیؓ دعا معاویة امیر المؤمنین. (تاریخ الطبری: ۱۶۱/۵)
پس درست بات یہی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ۳۷ ہجری میں مطلقاً حکمرانی کی بیعت لی (جسے بعض حضرات نے الخلافة سے تعبیر کر دیا) اس وقت حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق کی خلافت سے فرق رکھنے کے لیے صرف امیر کا لقب اختیار کیا اور امیر المؤمنین ہونے کا دعویٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کیا۔
② صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۶، باب تحریض علی قتل الخوارج. ط دار الجیل
ابومخنف نے کئی جعلی روایتیں پیش کر کے یہ سماں باندھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شام پر حملے کے لیے بے تاب تھے مگر لوگوں نے خوارج کے فتنہ وفساد کی دہائی دے کر انہیں پہلے اندرونی خطرے کی طرف متوجہ کیا۔ حالاں کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی صحیح روایت سے ان غلط روایات کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسے راوی واقعات کی اصل شکل بگاڑ کر انہیں کس حد تک خلافِ حقیقت انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔
③ تاریخ الطبری: ۱۴۰/۵، عن زیاد بن عبداللہ

جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی تدبیر کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بخوشی قبول کرلیا۔ یوں سرحدوں کے احترام کا معاہدہ ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے علاقے کے محصولات وصول کرکے اپنے ملک پر اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنی پیداوار سے اپنے ملک پر خرچ کرتے رہے۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری مہینوں میں دونوں طرف امن وامان رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک فریقین میں دوبارہ کوئی جھڑپ نہ ہوئی۔

امیر المؤمنین اور امیرِ شام:

اس دور میں شام کے سب سے بڑے عالم حضرت سعید بن عبدالعزیز تنوخی رحمہ اللہ عراق اور شام کی ان دو متوازی اسلامی حکومتوں کے مابین تعلقات کی نوعیت کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عراق میں امیر المؤمنین کہا جاتا تھا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو شام میں (صرف) ''امیر'' جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوگئی تب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کہہ کر پکارا گیا۔''[2]

قیصرِ روم کی دھمکی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے درمیان سیاسی اختلافات اپنی جگہ تھے مگر امت کی خیرخواہی اور دفاع کو دونوں ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے اور اس موقف پر دونوں حضرات متفق تھے۔

اس سلسلے میں صلح سے پہلے کا یہ واقعہ قابلِ غور ہے کہ قیصرِ روم عالمِ اسلام پر حملے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسلامی ریاست دو ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے تو اس نے ایک بہت بڑا لشکر لے کر شام کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو اسے ایک دھمکی آمیز مراسلہ لکھا جس میں تحریر تھا:

''اے ملعون! اگر تو واپس نہ لوٹا تو اللہ کی قسم! میں اور میرا چچازاد بھائی علی تیرے خلاف متحد ہوکر برسرِ پیکار ہوں گے، ہم تجھے تیری تمام سلطنت سے بھی نکال باہر کریں گے اور زمین کی وسعتوں کو تجھ پر تنگ کرکے دم لیں گے۔''

---

[1] تاریخ الطبری: ۵/۱۴۰، عن زیاد بن عبداللہ

صلح کا یہ واقعہ اسی ایک راوی نے نقل کیا ہے اور طبری کے سوا کسی مورخ نے اسے بیان نہیں کیا۔ طبری کی روایت بھی بہت مختصر ہے، جس سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کی لشکرکشی کے بعد اچانک یہ صلح کیسے ہوگئی؟ اس سوال کے جواب میں چند اسباب قرینِ قیاس معلوم ہوتے ہیں:

● حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے کامیاب دفاع کے بعد اہلِ شام نے مزید حملے بے سود تصور کیے ہوں۔ ● حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاقِ کریمانہ اور وسعتِ ظرفی سے متاثر ہوکر جنگ بندی پر آمادہ ہوئے ہوں۔ ● شام کی رائے عامہ مزید جنگ کے خلاف ہوگئی ہو۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ صلح کس مہینے میں ہوئی؟

مؤرخین کا اتفاق ہے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کو حجاز اور یمن کی مہم پر ۴۰ ہجری میں بھیجا تھا۔ یہ فوج یمن پر قابض بھی ہوئی تھی اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے فوج کی آمد پر پسپا ہوکر واپس شام چلی گئی تھی۔ اس تمام آمد و رفت، قیام اور مفتوحہ علاقے کے بندوبست پر کم از کم تین ماہ ضرور خرچ ہوئے ہوں گے۔ اگر مہم کا آغاز سال کے شروع یعنی محرم میں بھی مانا جائے تو شامی فوج کی واپسی پر ربیع الآخر شروع ہو چکا ہوگا۔ اگر اس کے بعد صلح کے لیے سفیروں کی آمد و رفت فوراً شروع ہوگئی ہو جب بھی کوئی معاہدہ مرتب ہوتے ہوتے ایک ڈیڑھ ماہ ضرور گزر گیا ہوگا۔ یعنی معاہدہ جمادی الاولیٰ میں یا اس کے بعد ہوا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری چار پانچ ماہ خانہ جنگی سے بالکل پاک رہے۔

[2] تاریخ الطبری: ۶/۱۶۱

شاہِ روم یہ خط پڑھ کر کانپ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مسلمان قائدین در حقیقت اغیار کے مقابلے میں اب بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں، چنانچہ وہ فوراً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو صلح کا پیغام دے کر اپنے لاؤ لشکر سمیت واپس ہو گیا۔[1]

اسلامی سیاست کے ایک اہم اصول کی بنیاد:

حضرت علی رضی اللہ عنہ آخر تک حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مصالحانہ پالیسی پر قائم رہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا یہ مبارک فقیہانہ فیصلہ بعد میں عالمِ اسلام کی دیگر خلافتوں کے لیے یہ گنجائش پیدا کر گیا کہ اگر کسی علاقے کا کوئی مسلم حاکم، اربابِ خلافت سے اختلافِ رائے کی بنا پر الگ ہو کر خود مختار حکومت قائم کر لے تو خلیفہ پر یہ واجب نہیں کہ وہ اس سے بہر صورت جنگ کرے۔ اگر مسلمانوں کی مصلحت اس میں ہو کہ اس کی خود مختارانہ حیثیت کو ایک زمینی حقیقت کے طور پر قبول کر لیا جائے اور عدمِ تعرض کی پالیسی اپنائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

خلافتِ بنو عباس اور خلافتِ عثمانیہ کے دور میں اکثر خود مختار مسلم سلاطین اسی شرعی گنجائش کے تحت برسرِ اقتدار رہے ہیں۔ عباسی اور عثمانی دور کی آزاد مسلم ریاستوں کی وفاداریاں عموماً مرکزِ خلافت سے قائم رہتی تھیں۔ مختلف ریاستوں کے آپس میں بھی معاہدے ہوتے تھے۔ حالات کبھی خراب ہوتے تھے جب مسلم حکمران باہم لڑ پڑتے تھے۔

اگر متعدد مسلم ریاستیں ایک مرکزی وفاقی ادارے کے تحت اتحاد و اتفاق کی شکل قائم کر کے اپنا اندرونی نظام قرآن و سنت کے عادلانہ اصولوں پر چلائیں اور ہمسایہ مسلم ریاستوں سے برادرانہ تعلق رکھیں تو فقط ریاستوں کا متعدد ہونا مسلمانوں کے سیاسی نظام میں کسی بڑے بحران کا باعث نہیں بن سکتا۔ ہاں جو حکام خلافت سے از خود ٹکرائیں یا جو ریاستیں اپنے غلط نظریات دوسروں پر مسلط کرنے، ہمسایوں کی سرحدات کو روندنے، بے گناہ لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور شرعی حدود پامال کرنے کی مرتکب ہوں ان کا معاملہ الگ ہے۔ انہیں سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۴۰۰، ترجمۃ: معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فقہی رائے پر اجماع

بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے گھر میں داخل ہو کر قاتلانہ وار کیا تھا۔ دوسرے وہ تھے جو صرف شورش میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر نادان اور جوشیلے لوگ تھے جو بہکاوے میں آ کر فساد میں شامل ہو گئے تھے۔ اصل قاتل چند افراد تھے۔ یہ مجرم جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابہ کے نزدیک قابلِ قصاص تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقے میں شامل نہ تھے بلکہ واردات کے فوراً بعد دور دراز کے علاقوں کی طرف فرار ہو کر روپوش ہو گئے تھے۔ اب متنازعہ مسئلہ ان باغیوں کا تھا جو قتل میں شریک نہ تھے اور بیعت کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقے میں شامل ہو چکے تھے۔ ان سے معاملہ کرنے میں اختلاف فقہی بھی تھا اور انتظامی بھی۔

اہلِ جمل اور اہلِ شام کا مطالبہ یہ تھا کہ ان سب سے بھی قصاص لینا ضروری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے جو شرعی دلائل تھے ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ باغی ہتھیار ڈالنے کے بعد مامون ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں واضح ترین دلیل ڈاکوؤں اور باغیوں کے متعلق قرآن مجید کا یہ حکم تھا:

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

”سوائے ان کے جو توبہ کر لیں اس سے پہلے کہ تم ان کے اوپر قابو پا لو، تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا“[1]

ایک موقع پر حارثہ بن بدر نامی ایک باغی پکڑے جانے سے پہلے ہتھیار ڈال کر حاضر ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے امان دیتے ہوئے یہی آیت پڑھی تھی۔[2]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک امان کا یہ حکم ہر قسم کے باغیوں کے لیے تھا۔ مگر احتیاطاً آپ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا کوئی ایسی دلیل مل سکتی ہے جس سے امان کا یہ حکم فقط ان باغیوں کے لیے مخصوص ثابت ہو جو مجتہد اور متاوّل ہیں نہ کہ ہر طرح کے باغیوں کے لیے۔ غالباً اسی لیے آپ لوگوں کو مسئلہ قصاص کے متعلق صبر اور انتظار کی تاکید کرتے رہے اور اسی لیے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں پر کوئی سزا جاری نہیں کی۔

تاریخی قرائن شہادت دیتے ہیں کہ تأمل کا یہ دور جنگِ صفین اور تحکیم تک تھا۔ اس وقت تک اہلِ شام کی طرف سے ان سب لوگوں سے قصاص لیے جانے کا مطالبہ ہوتا رہا جو مدینہ میں شورش کے لیے گئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یا ان کے کسی نمائندے کی جانب سے کبھی یہ موقف پیش کرنا منقول نہیں کہ شریعت میں اس کی گنجائش نہیں نکلتی۔

---

① سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۴ ② تفسیر الطبری (تفسیر جامع البیان): ۸/۳۹۳

مگر یہ بھی طے ہے کہ آخر کار یہ تأمل ختم ہوگیا تھا اور آخر میں اجماعِ اُمت اسی بات پر ہوا کہ ہتھیار رکھنے والے باغی چاہے مجتہد ہوں یا نہ ہوں، ان کے لیے امان ثابت ہے اور وہ قابلِ قصاص وضمان نہیں۔ ①

---

① اس تمام گفتگو کی دلیل کوئی تاریخی روایت نہیں بلکہ فقہاء کی عبارات ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ان کے شاگرد ابو مطیع رحمہ اللہ نے اصولِ دین اور عقائد سے متعلق جو سوالات پوچھے، ان کے جوابات کا مجموعہ "الفقہ الابسط" اسلامی عقائد کا قدیم ترین اور معتبر ترین ماٰخذ ہے۔ اس کی درج ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

قلت: الخوارج اذا خرجوا وحاربوا واغاروا، ثم صالحوا، هل يتبعون بما فعلوا، قال: لاغرامة عليهم بعد سكون الحرب ولاحد عليهم والدم كذلك لاقصاص فيه، قلت: ولم ذالك؟ قال: للحديث الذى جاء انه لما وقعت الفتنة بين الناس فى قتل عثمان رضی اللہ عنہ فاجتمعت الصحابة رضى الله عنهم علىٰ ان من اصاب دماً فلا قود عليه، ومن اصاب فرجا حراماً بتاويل فلا حد عليه، ومن اصاب مالاً بتاويل فلا تبعة عليه الا ان يوجد المال بعينه فيرد الىٰ صاحبه.

''میں نے پوچھا: باغی جب خروج کریں، لڑیں اور لوٹ مار کریں، پھر صلح کرلیں تو کیا ان کے افعال کا مؤاخذہ کیا جائے گا؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جنگ ختم جانے کے بعد ان پر کوئی تاوان ہے نہ کوئی حد۔ اسی طرح کسی خون کا کوئی قصاص بھی ان پر نہیں۔ میں نے عرض کیا: یہ کیوں؟ فرمایا: ''اس حدیث کی وجہ سے جس میں یہ وارد ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں میں فتنہ برپا ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اجماع کیا کہ جس نے کوئی خون بہایا ہو اس پر قصاص نہیں، جس نے تاویل کی وجہ سے عصمت دری کی ہو اس پر حد نہیں، اور جس نے تاویل کی وجہ سے مال لوٹا ہو اس پر کوئی جرمانہ نہیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ اپنا مال بعینہٖ پالے تو وہ مالک کو لوٹایا جائے گا۔'' (الفقه الابسط، ص ۲۰)

امام سرخسی رحمہ اللہ نفسِ مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: **"والاصل فيه حديث الزهرى: قال وقعت الفتنة واصحاب رسول الله ﷺ كانوا متوافرين، فاتفقوا علىٰ ان كل دم اريق بتاويل القرآن فهو موضوع، وكل فرج استحل بتاويل القرآن فهو موضوع وكل مال اتلف بتاويل القرآن فهو موضوع، وما كان قائما بعينه فهو مردود علىٰ صاحبه." (المبسوط، باب الخوارج: ۱۰/۱۲۸)**

حاصل کلام یہ ہے کہ خانہ جنگی کے بعد جبکہ صحابہ کرام بکثرت موجود تھے، سب نے گزشتہ حوادث کا شرعی دلائل کی روشنی میں جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہر وہ خون جو قرآن کی تأویل کرکے بہایا گیا ہو، اس کا قصاص نہیں لیا جائے گا، ہر وہ چیز جو تاویل کرکے ضایع کی گئی ہو اس کا ضمان واجب نہیں ہوگا، ہر وہ ناموس جسے تاویل کرکے مباح سمجھا گیا ہوگا اس کی وجہ سے حد جاری نہیں ہوگی۔

رہی یہ بات کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ یہ اجماع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں (بلکہ ان کی سرکردگی میں) ہوا تھا۔ تو "الفقہ الابسط" میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسے واضح طور پر قصاصِ عثمان کے مسئلے سے متعلق قرار دیا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں چھڑا تھا۔ نیز امام سرخسی کی عبارت پر غور کریں تو جملہ (وقعت الفتنة واصحاب رسول الله ﷺ كانوا متوافرين۔) اسے ثابت کررہا ہے، کیوں کہ دورِ صحابہ میں فتنے کے دو مراحل آئے تھے: پہلی بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جب جمل اور صفین کے سانحے ہوئے۔ دوسری بار یزید کے زمانے میں جب کربلا، واقعہ حرہ اور حصارِ کعبہ ہوا۔ پہلے دورِ فتن میں صحابہ کرام بکثرت تھے، دوسرے دورِ فتن میں جو بیس بائیس سال بعد ہوا تھا، یہ نفوسِ قدسیہ بہت کم رہ گئے تھے۔ ثابت ہوا کہ صحابہ کا مذکورہ مسئلے میں اجماع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا۔

فقہاء نے بھی جمہور کا مسلک یہی لکھا ہے کہ اگر باغی ہتھیار ڈال دیں تو انہیں معاف کردیا جائے گا اور مزید یہ کہ باغیانہ لڑائی کے دوران وہ جس جانی یا مالی نقصان کا باعث بنے اس کی کوئی سزا یا ضمان نہیں۔

اذا تاب اهل البغى ودخلوا الى اهل العدل لم يؤخذوا بشىء مما اصابوا يعنى بضمان ما اتلفوا من النفوس. (المبسوط للسرخسى: ۱۰/۱۲۷) وما اتلف اهل البغى من اموالنا ودمائنا حالة الحرب فانهم لايضمنون اذاتابوا وزالت منعتهم. (الفتاوىٰ الهندية اى عالمگیری (عربی): ۲/۲۸۴، دار الفكر) ہاں حالتِ معرکہ سے ہٹ کر انہوں نے کسی کو قتل کیا ہو تو بالاتفاق اس کی سزا دی جائے گی۔ **اذاقتل الباغى احداً من اهل العدل فى غير المعركة يقتل به. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۸/۱۴۳)**

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل جھڑپ کی حالت میں نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں گھر میں گھس کر شہید کیا گیا تھا اس لیے ان کے قاتل قابلِ سزا تھے۔ امام سرخسی اسی مسئلے کو دوسری جگہ اس طرح نقل کرتے ہیں: **"فاما سقوط الضمان فهو حكم ثبت باتفاق الصحابة بخلاف القياس على ماروى عن الزهرى: قال وقعت الفتنة الخ " (المبسوط: ۳۰/۱۴۲)**

اس مسئلے میں دیانۃً اور قضاءً کے فرق کو بیان کرنے کے لیے وہ لکھتے ہیں: ''امام محمد سے مروی ہے کہ: اگر وہ لوگ تائب ہوجائیں تو میں فتویٰ دوں گا کہ وہ ضمان دیں مگر میں انہیں اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔ انہوں نے ناحق اتلاف کیا ہے، پس اگر مطالبہ ساقط ہوجائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندے اور اللہ کے مابین بھی ضمان ساقط ہوجاتا ہے۔'' **(المبسوط: ۱۰/۱۲۸، كتاب السير، باب الخوارج، طلب اهل البغى الموادعة)**

ہمارا موضوع فقہ نہیں، اس لیے مدلل اور مفصل بحث کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں مختصراً اشارہ کردیا گیا ہے۔

باغیوں سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر اجماع کے نتائج:

اس اجماع سے یہ ثابت ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدینہ میں شورش برپا کرنے والوں سے قصاص نہ لینا بالکل درست تھا اور شرعاً بھی ان پر لازم تھا کہ وہ مسئلے کی حتمی تحقیق و تنقیح تک اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں توقف کرتے۔ اور امیر المؤمنین نے ایسا ہی کیا۔ یہ محض سیاسی مصلحت کا تقاضا نہ تھا بلکہ دینی، شرعی اور علمی ذمہ داری بھی یہی تھی۔

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قضاء کے مسائل کے سب سے زیادہ ماہر تھے اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس اجماع اور اجتہاد کے سربراہ وہی تھے۔ اور چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل اس اجماع سے پہلے ہی احتیاطی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے قصاص میں تاخیر پر مبنی چلا آرہا تھا، اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کی رائے شروع سے اسی طرف جارہی تھی کہ ہر طرح کے باغی ہتھیار ڈالنے کے بعد مامون ہوتے ہیں، مگر اس کی توثیق کے لیے صحابہ کا اجماع درکار تھا جس کے لیے حالات کا پُرسکون ہونا اور جذبات کا ٹھنڈا ہونا ضروری تھا۔ کیوں کہ جذبات کی حالت میں صحیح فتویٰ صادر نہیں ہوسکتا۔

یہ بھی امکان ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مفسد و غیر مجتہد باغیوں کے بارے میں اپنی رائے پر شروع سے پوری طرح شرحِ صدر ہو، مگر انہیں خدشہ ہو کہ عام لوگوں میں ابھی یہ بات سننے اور ماننے کی استعداد موجود نہیں۔ ابھی سے مسئلہ واضح کرنے سے بات بڑھ جائے گی اور مشتعل عوام شرعی دلائل کو سمجھے بغیر اس قسم کے فیصلے کو قصاصِ عثمان کی تحریک کے خلاف ایک سازش تصور کرلیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی لیے حالات کے پُرسکون ہونے اور جذبات کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کررہے ہوں۔

بہر کیف آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس فقہی رائے اور احتیاطی تدبیر کی سبھی نے اعلانیہ توثیق کردی جو آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں برپا ہونے والی شورش کے بارے میں پہلے دن سے عملاً اختیار کررکھی تھی اور جس کی وجہ سے آپ کے نزدیک قابلِ قصاص محض وہی لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گھر میں داخل ہوکر قتل کیا تھا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے دورِ اقتدار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد سے متفق:

تاریخی لحاظ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے دورِ اقتدار میں اس اجماعی فیصلے میں ہم رائے ہوگئے تھے کیوں کہ جب ان کی خلافت قائم ہوئی تو انہوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی من وعن پیروی کی اور اپنے بیس سالہ دور میں صرف دو چار ایسے افراد سے قصاص لیا جو براہِ راست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتلِ ناحق میں شامل تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تبدیل ہوچکا تھا اور تمام مفسدین کو قتل کرانے کی شرعی گنجائش اب وہ بھی نہیں مانتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت میں ملوث دو مشہور افراد: عمیر الضابئ ۷۵ھ تک اور کمیل بن زیاد ۸۳ھ تک عراق میں زندہ رہے۔ آخر حجاج بن یوسف نے انہیں اپنی صوابدید پر قتل کیا۔[1]

[1] تاریخ الطبری: ۶/۲۰۷، ۲۰۸، ۳۶۵

ظاہر ہے نہ تو حجاج حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ انصاف پسند تھا اور نہ ہی یہ حضرات عدل اور اتباعِ شریعت میں کسی سے کم تھے، اس لیے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا اور جسے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بعد میں اختیار کیا وہی شرعی طریقہ تھا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مطالبہ قبول نہ کرنے اور باغیوں کے خلاف کارروائی نہ کرنے کی بنیادی وجہ شرعی تھی اور وہ یہ کہ اکثر باغی براہِ راست سابق خلیفہ کے قتل میں ملوث نہ تھے۔ نیز وہ بیعت کر کے پُرامن شہری بن گئے تھے، ان پر از روئے شرع قصاص کی سزا لاگو نہیں ہو سکتی تھی۔

اگرچہ سیاسی مجبوریاں، قوت کی کمی، عدمِ یک جہتی اور حالات کی ہنگامہ خیزی بھی یقیناً سدِ راہ تھیں۔ لیکن اگر انہی چیزوں کو توقف کا اصل سبب قرار دیتے ہوئے شرعی مجبوری کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قاتلوں اور مجرموں سے دلی ہمدردی رکھنے کا جھوٹا الزام، پوری طرح دور نہیں ہو پاتا۔ یہ وسوسہ کسی نہ کسی گوشے میں باقی رہ جاتا ہے کہ جو حکمران اہلِ شام اور اہلِ نہروان کے زبردست لشکر سے لڑ سکتا تھا وہ دو تین ہزار افراد کو تہہ تیغ کیوں نہ کرا سکا۔

☆☆☆

خوارج سے کش مکش

خوارج، بنیادی طور پر ایسے لوگوں کا گروہ تھا جو شریعت پر عمل میں تشدد کے عادی تھے اور اپنی عبادت وریاضت پر گھمنڈ میں مبتلا تھے۔ان کی نگاہ میں اکابر صحابہ کا مقام بھی عام انسانوں سے کچھ زیادہ بلند نہیں تھا۔وہ قرآنِ کریم کے لفظی معنیٰ پر جوں کا توں عمل کرنے کو ہی اعلیٰ دین داری سمجھتے تھے۔انہیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ قرآنِ کریم کا مطلب ان کی سمجھ سے ہٹ کر بھی ہوسکتا ہے۔ان کی جامد عقل احکام کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

خوارج میں عام طور پر جوشیلے، جذباتی اور سخت مزاج لوگ شامل تھے۔خوارج کے بعض سرداروں نے حضور ﷺ کی صحبت بھی پائی تھی مگر اپنی بے ادبی کی وجہ سے کچھ فیض حاصل نہ کر پائے۔ایک بار ان کا سردار ''ذوالخویصرۃ'' رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود تھا،حضور ﷺ حاضرین میں رقم تقسیم کر رہے تھے۔اس بدبخت نے اعتراض کرتے ہوئے کہا:''اللہ سے ڈریں،انصاف سے کام لیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ناراض ہوکر فرمایا:''اگر میں انصاف نہ کروں تو پھر کون کرے گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت مانگی کہ اس بدتمیز کا سر قلم کردیا جائے،مگر آپ ﷺ نے منع کردیا اور فرمایا:''اس کے کچھ ساتھی ہوں گے جن کی نمازیں روزے دیکھ کر تمہیں اپنی نمازیں روزے کم لگیں گے،مگر یہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے پار نکل جاتا ہے۔''[1]

خوارج کے بعض لیڈر وہ تھے جن کا پہلے کسی فتنے سے تعلق نہیں رہا تھا جیسے عبداللہ بن وہب اور عُروہ بن اُدَیّہ۔[2]

ان کے بعض رئیس غلط فہمی اور نادانی کا شکار ہوکر اس تحریک میں شامل ہوئے اور بعد میں تائب ہوگئے جیسے شَبَث بن ربعی۔[3] بعض پکے سبائی تھے جیسے حُرقُوص ابن زہیر اور عبداللہ بن الکوّاء۔خارجیوں میں سبائیت کے اثرات کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق،حضرت عمر فاروق اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہتے تھے۔[4]

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۴۳۲، کتاب التوحید باب قولہ تعالیٰ :تعرج الملائکۃ ، صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۵، باب ذکر الخوارج
مؤرخین کے مطابق حرقوص بن زہیر ہی ذوالخویصرہ تھا جو پہلے سبائی اور بعد میں خوارج کا سرغنہ۔ (الاصابۃ: ۲/۴۴۳ ، اسد الغابۃ: ۱/۴۷۱)

② تاریخ الطبری، ۵/۵۵ ، تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۲،

③ تاریخ الطبری: ۴/۳۸۳،۳۸۴ ، الاعلام لخیر الدین الزرکلی، ۳/۱۵۴ ، تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۲

④ عن ابی وائل ان عبداللہ بن الکوّاء وشَبَث بن رِبعی وناساً معہما اعتزلوا علیا بعد انصرافہ من الصفین الی الکوفۃ لما انکر علیہم من سبّ ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما.(مستدرک حاکم،ح: ۴۷۰۲)

خوارج میں شامل کچھ لوگ وہی تھے جو جنگِ جمل کے بعد ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھیوں کو قیدی بنانے پر اصرار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''جن کے خون ہمارے لیے حلال ہیں ان کے اموال اور ان کے بیوی بچے ہمارے لیے ممنوع کیوں؟''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں بھی یہ لوگ شامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے سامنے خوارج کا ذکر آیا تو فرمایا: ''میں نے انہیں کہا تھا حضرت عثمان کو قتل مت کرنا، مگر وہ نہ مانے۔''[2]

یہ لوگ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جنگ بندی اور صلح کو مسترد کر کے انہیں کافر قرار دینے لگے تھے۔[3]

اپنے نظریات پر انہیں اتنا اصرار تھا کہ وہ اختلاف رکھنے والے ہر شخص کا خون بہانا درست سمجھتے تھے۔[4]

اب تک مسلمانوں کا نعرۂ تکبیر چلا آرہا تھا۔ خوارج نے ''لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ'' (اللہ کے سوا حاکمیت کسی کی نہیں) کو نعرہ بنالیا۔ اسے ''نعرۂ تحکیم'' کہا جاتا تھا۔[5]

یہ نعرہ سب سے پہلے خارجی سردار عُروہ بن اُدَیَّہ نے صفین کے میدان میں جنگ بندی کے وقت لگایا تھا اور پھر یہی ان کی پہچان بن گیا۔[6]

خوارج حروراء میں:

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جب صفین سے واپس روانہ ہوئے تو خوارج نے جو کہ اب تک لشکر میں شامل تھے، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی شان میں نازیبا باتیں شروع کر دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ برداشت نہ کر سکے اور سختی سے ان لوگوں کی بدگوئی پر تنقید کی۔ اس پر خارجی بھڑ گئے اور باقی لشکر سے الگ ہو گئے۔[7]

یہ دونوں قافلے الگ الگ چلتے رہے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں داخل ہوئے تو خوارج نے شہر سے دور ''حَرُوراء'' نامی مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔[8]

ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ وہ یہی چرچا کر رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کے دین میں انسانوں کی حاکمیت قبول کر لی ہے، حالاں کہ حاکمیت تو صرف اللہ کی ہے۔ اس کے سوا کسی کو حق نہیں کہ کسی معاملے میں کوئی فیصلہ دے۔

---

① عن میسرة ابی جمیلة قال: ان اول یوم تکلمت الخوارج یوم الجمل، قالوا: ما احل لنا دمائهم وحرم علینا ذراریهم واموالهم (مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۵۷، ط الرشد)

② مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۳۹۲، ط الرشد

③ تاریخ الطبری: ۵/۶۴، ۶۵

④ هم اطول الناس صلوةً واکثرهم صوماً غیر انهم اذا خلفوا الجسر اهراقوا الدماء. (مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۳۷۹۰۳، ط الرشد)

⑤ ان الحروریة لما خرجت وهو مع علی بن ابی طالب رضی الله عنه، قالوا: لا حُکمَ الا لِله. (صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۷)

⑥ تاریخ الطبری: ۵/۵۵

⑦ المستدرک للحاکم، ح: ۴۷۰۲ ⑧ تاریخ الطبری: ۵/۷۳، ۷۴

خوارج کی تردید: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکیمانہ طرزِ استدلال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے پروپیگنڈے کی تردید کے لیے اعلان کرایا کہ لوگ قرآنِ مجید کے نسخے لے کر ان کے پاس جمع ہوں۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے خود کلام پاک کا ایک بڑا نسخہ سامنے رکھ کر اسے تھپتھپایا اور آواز لگائی:

''اے کلام پاک! لوگوں سے بات کر''

لوگ حیران ہو کر کہنے لگے: ''امیر المومنین! یہ تو کاغذ اور سیاہی کا مجموعہ ہے، اس سے کیا پوچھ رہے ہیں؟''

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''باغیوں اور میرے درمیان بھی کتاب اللہ کا فیصلہ طے ہے، اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا. [1]

(اگر شوہر اور بیوی کے درمیان تمہیں جدائی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث اس مرد کے اور ایک ثالث اُس عورت کے خاندان سے بھیجو۔ اگر دونوں ثالث صلح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ فریقین میں اتفاق کرا دے گا۔)

تو کیا امتِ محمدیہ کے خون کا مسئلہ، ایک مرد اور عورت کے مسئلے سے بھی کم اہمیت رکھتا ہے!!''

لوگ قائل ہو گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحکیم کا فیصلہ درست کیا تھا۔ اب آپ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو خارجیوں سے بات چیت کرنے بھیجا۔ خارجیوں کے ایک رئیس عبداللہ بن الکواء نے ان کا استقبال کر کے کارکنوں کو ان کی بات سننے پر آمادہ کیا۔ تین دن گفت وشنید ہوئی۔ مگر وہ لوگ نہ مانے۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کچھ اور سفیر بھی گئے مگر خوارج نے بدتمیزی کی اور سفیر کی سواری کو زخمی کر دیا۔ [3]

جب یہ لوگ کسی طرح قائل نہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ خود تشریف لے گئے اور انہیں سمجھایا۔ [4]

خوارج سے معاہدہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا کہ اگر وہ حکومت کے تابع دار رہیں تو:

① انہیں مساجد میں آنے اور ذکر وعبادت سے نہیں روکا جائے گا۔

② مالِ غنیمت اور بیت المال سے انہیں حصہ دیا جائے گا۔

③ ان سے جنگ میں پہل نہیں کی جائے گی۔

اس معاہدے کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلامی معاشرے میں ایک پُرامن مخالف گروہ (اپوزیشن) کے وجود کی گنجائش رکھی اور ان کے شہری حقوق کو تسلیم کیا۔ [5]

---

① سورۃ النساء: ۳۵

② البدایۃ والنہایۃ: ۵۲۷/۱۰، مسند احمد، ح: ۶۵۶ بسند صحیح

③ تاریخ الطبری: ۹۱/۵

④ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۹۰۰، ط الرشد

⑤ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۹۳۰، ط الرشد

اکثر خوارج بغاوت پر اصرار ترک کر کے ان کے ساتھ کوفہ آ گئے۔[1] یہ یکم شوال سن ۳۷ ہجری کا واقعہ ہے۔[2]

تاہم چار ہزار خارجی اس کے بعد بھی اپنی ضد پر اڑے رہے۔

چونکہ ایک مسلح جماعت کا ملکی حدود میں اس طرح آزاد پھرنا بہرحال خطرے کا باعث تھا اور خدشہ تھا کہ یہ لوگ اپنی بدعقیدگی کی اشاعت کے لیے طاقت کے نشے میں ملک کا امن وامان تہہ و بالا نہ کریں؛ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ پیغام بھیجا: ''ہمارے اور تمہارے درمیان یہ طے ہے کہ تم ناجائز خونریزی نہیں کرو گے، قافلوں کو نہیں لوٹو گے، کسی ذمی پر ظلم نہیں کرو گے، اگر ان میں سے کوئی بھی حرکت کی تو پھر اعلانیہ جنگ ہوگی۔''[3]

خوارج کوفہ میں:

کوفہ واپس آنے کے بعد بھی خارجی خاموش نہ رہے۔ انہوں نے صرف ساتھ رہنے پر اتفاق کیا تھا، نظریے تبدیل نہیں کیے تھے۔ انہیں یہ غلط فہمی بھی ہوگئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے موقف کو مان گئے ہیں، چنانچہ کوفہ واپس آتے ہی انہوں نے مشہور کر دیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس دوبارہ اس لیے چلے آئے ہیں کہ انہوں نے اپنے کفر سے توبہ کر لی ہے۔ ایک شخص نے آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے براہِ راست پوچھ لیا:

''لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے اپنے کفر سے رجوع کر لیا ہے؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان افواہوں کی تردید کے لیے اسی روز ظہر کی نماز کے موقع پر لوگوں سے خطاب کیا، جس میں خارجیوں پر سخت تنقید کی۔ خارجی جو مسجد میں موجود تھے، برداشت نہ کر سکے اور ہنگامہ شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا اور حلق پھاڑ کر یہ آیت پڑھنے لگا:

وَلَقَدْ اُوحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ.[4]

(اور البتہ وحی کی گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آپ سے پہلوں کی طرف کہ اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی جواب میں آیت پڑھی:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ.[5]

(پس آپ صبر کریں، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یقین نہ کرنے والے آپ کو ہرگز ہلکا نہ محسوس کرنے پائیں۔)[6]

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۹۰۰، کتاب الجمل، باب ذکر فی الخوارج، عن ابی زرین بسند حسن ؛ تاریخ طبری: ۷۳/۵

② تاریخ الطبری: ۹۰/۵

③ البدایۃ والنھایۃ: ۵۶۹/۱۰ ؛ مسند احمد، ح: ۶۵۶

④ سورۃ الزمر، آیت: ۶۵

⑤ سورۃ الروم، آیت: ۶۰

⑥ مصنف ابن ابی شیبۃ، روایت نمبر: ۳۷۹۰۰، ۳۷۹۳۱، ط الرشد ؛ تاریخ طبری: ۷۴/۵ بسند حسن

نعرۂ تحکیم کا مسکت جواب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو خارجی تحکیم کے نعرے لگاتے ہوئے کہنے لگے:

''علی! تو نے اللہ کے دین میں انسانوں کو شریک کر ڈالا۔'' پھر نعرے لگائے: ''لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں، ہاں، لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ مگر ''کَلِمَةُ حَقٍّ اُرِیْدَ بِهَا الْبَاطِل.''

(یہ حق بات ہے جس سے باطل مراد لیا جا رہا ہے۔) اللہ کا حکم تمہارا منتظر ہے۔''[1]

حکمران کی ضرورت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد:

خارجی حکومتی نظام کے قائل تھے نہ حکمران کے۔ ان کے خیال میں یہ اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ اور اسلامی مساوات کے خلاف تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی حکومت نہیں ہونی چاہیے، حالاں کہ لوگوں کے لیے حاکم کا ہونا ضروری ہے چاہے وہ نیک ہو یا فاسق۔ تا کہ اس کی حکومت میں مؤمن اپنا عمل کرے اور کافر اپنے طور پر فائدہ اٹھائے۔''[2]

لوگ کہنے لگے: ''نیک حاکم کی بات تو ٹھیک ہے، فاسق حاکم کا کیا مطلب؟''

آپ نے فرمایا: ''اس کی حکومت کی وجہ سے تمہاری سڑکیں تو کھلی رہیں گی، بازار تو بحال رہیں گے۔[3]

خارجی چند دن کوفہ میں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے، اس دوران انہوں نے کوشش کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ کریں مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے صاف انکار کر دیا۔[4]

خوارج کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بدتمیزی:

ایک بار خوارج کے سرغنہ حُرقُوص بن زُہَیر اور زُرعہ بن بُرُج آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حُرقُوص نے کہا:

''اپنی خطا سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کر لیں، اور ہمارے ساتھ دشمن کی طرف پیش قدمی کریں تا کہ ہم ان سے اس وقت تک جنگ کریں جب تک ہم اللہ سے نہ جا ملیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہمارے اور ان کے درمیان تحریری معاہدہ ہو چکا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَاَوْفُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا.

(اللہ کے نام کا عہد و پیمان پورا کرو جب تم عہد کر چکو۔)

حُرقُوص نے کہا: ''مگر یہ معاہدہ تو گناہ ہے، اس سے آپ کو توبہ کرنی چاہیے۔''

---

① مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۳۰ ، تاریخ طبری: ۹۱/۵

② مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۰۷

③ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۳۱

④ انساب الاشراف، بلاذری: ۳۳۸/۲ ، ط دار الفکر

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔''

زرعہ بن برج نے کہا: ''خبردار علی! اللہ کی قسم! اگر تم اللہ کی کتاب کے بارے میں بندوں کو فیصلے کا اختیار دینے سے باز نہیں آئے تو میں تم سے اللہ کی رضا کے لیے لڑوں گا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بدبخت! مجھے لگتا ہے تو اس طرح مرے گا کہ آندھی تیرے ٹکڑے اُڑا لے جائے گی۔''

وہ بولا: ''مجھے بھی پسند ہے کہ ایسا ہی ہو۔''[1]

خوارج کی دعوت اور عوام کی ذہن سازی:

جب خارجیوں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی طرح بھی ان کے نظریات اور عزائم کا ساتھ دینے پر تیار نہیں تو انہوں نے حتمی طور پر الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک متوازی طاقت بننے کے لیے ضروری تھا کہ شہر سے نکل کر ایسی جگہ مرکز بنایا جائے جہاں حکومتی اثر ورسوخ کم سے کم ہو۔ اب تک ان کا کوئی باقاعدہ امیر بھی مقرر نہیں ہوا تھا کیوں کہ وہ خود ''حکومت'' اور ''حاکم'' کے تصور کی نفی کر کے صرف اور صرف ایک اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگاتے تھے۔ مگر اب جب تنظیم کو فعال بنانے کا ہدف سامنے آیا تو قواعد وضوابط بنانے اور اہم فیصلے کرنے کے لیے ایک بااختیار امیر کی ضرورت انہیں خود سمجھ آ گئی، لہٰذا بڑی لے دے کے بعد عبداللہ بن وہب کو امیر بنا لیا گیا۔ یہ ۱۰، شوال سن ۳۷ ہجری کا واقعہ ہے۔[2]

جماعت کے طے کردہ اہداف کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا:

''ہمارا ہدف دنیا والوں سے اللہ رحمٰن ورحیم کی اطاعت کرانا ہوگا..... لوگوں نے خواہشات نفس کی پیروی کی ہے اور کتاب اللہ کے حکم کو ٹھکرایا ہے، لہٰذا ان سے جہاد کرنا اہلِ ایمان پر فرض ہے۔ اب ان کی کھوپڑیوں پر تلواریں چلایئے..... اگر آپ کامیاب ہوگئے اور اللہ کی اطاعت کی جانے لگی تو یہی آپ کا ہدف ہے اور اللہ اجرِ عظیم دے گا اور آپ مارے گئے تو اللہ کی رضا اور جنت سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔''

طے کیا گیا کہ مدائن کے قریب نہر ''جوخا'' کے پار عسکری کیمپ لگایا جائے اور گردونواح کے شہریوں اور آبادیوں سے افرادی طاقت جمع کر کے حکومت سے کھلے میدان میں ٹکر لی جائے۔[3]

خوارج کوفہ سے خفیہ طور پر نکلتے ہیں:

اکثر خوارج کوفہ کے مختلف محلوں میں برسوں سے رہائش پذیر تھے۔ یکدم نکلنے میں سرکاری پکڑ دھکڑ کے علاوہ برادری کی روک ٹوک کا اندیشہ بھی تھا، اس لیے وہ ایک ایک، دو دو کر کے شہر سے نکلتے گئے۔ ساتھ ہی مختلف شہروں میں خطوط اور دعوت نامے بھی پھیلا دیے کہ حق کے غلبے کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔[4]

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۷۷، ۵۷۸

② انساب الاشراف، بلاذری: ۲/۳۵۹، ۳۶۰، ط دار الفکر

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۸۰، ۵۸۱

④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۸۱

خارجی جن کی تعداد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہوتے وقت آٹھ ہزار تھی، بڑھتے بڑھتے سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔[1]

یہ ایسا فتنہ تھا جس میں صرف وہی لوگ ثابت قدم رہ سکتے تھے جن کو اسلاف پر اعتماد تھا، ورنہ بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کا رجحان خوارج کی طرف ہو رہا تھا۔

ایک جلیل القدر تابعی ابوالعالیہ زیادی رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں مجھ پر ایسی ہیں کہ سمجھ نہیں آتا کون سی زیادہ بڑی ہے: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق دی۔ دوسری یہ کہ اللہ نے خارجی بننے سے بچایا۔''[2]

خوارج کی خون ریزی:

خوارج نے نہر ''جوخا'' کے پار عسکری چھاؤنی لگانے کے بعد گردونواح میں غارت گری کا طوفان برپا کر دیا۔ ایک طرف وہ اس قدر پرہیزگار تھے کہ کسی کا ایک دانہ بھی اس کی اجازت کے بغیر نہیں لیتے تھے، دوسری طرف اتنے نڈر تھے کہ جو اُن کے موقف اور نظریے سے اختلاف کرتا اس کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔[3]

خوارج کے ہاتھوں عبداللہ بن خباب رحمہ اللہ کا قتل:

بصرہ کے قریب ایک دیہات میں انہوں نے خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کے عالم فاضل بیٹے عبداللہ بن خباب رحمہ اللہ کو پکڑ لیا اور بڑی سختی سے پوچھا: ''کون ہو تم؟''

وہ بولے: ''عبداللہ بن خباب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کا بیٹا۔''

خارجیوں کے امیر نے کہا: ''شاید ہم نے آپ کو ڈرا دیا ہے۔'' وہ بولے: ''ہاں، واقعی۔''

خارجی بولے: ''آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنا دیں جو آپ نے اپنے والد سے سنی ہو۔''

وہ بولے: ''جی ہاں، میں نے اپنے والد سے یہ حدیث سنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ایک ایسا فتنہ آنے کو ہے جس میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا رہنے والا متحرک آدمی سے بہتر ہوگا اور متحرک آدمی دوزخ کی آگ میں جلے گا، جب اس فتنے میں مبتلا لوگوں سے سامنا ہو تو اللہ کا مقتول بندہ بن جانا، قاتل مت بننا۔''[4]

خوارج کہنے لگے: ہاں، ہم یہی حدیث معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اچھا آپ حضرت ابوبکر و عمر کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

انہوں نے جواب میں تعریفی کلمات کہے تو وہ بولے: ''اچھا حضرت عثمان کے ابتدائی دورِ حکومت اور ان کی حکومت کے آخری زمانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۵۷۸/۱۰

② مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۶۷، باب ماجاء فی الخوارج، ط المجلس العلمی پاکستان

③ تاریخ الطبری: ۱۸۲،۷۶/۵؛ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۸۸۷، ط الرشد

④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۵۹/۴؛ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۸۹۲، ط الرشد، مصنف عبدالرزاق، روایت نمبر: ۱۸۵۷۸، ط المجلس العلمی پاکستان

حضرت عبداللہ بن خباب رحمہ اللہ نے جواب دیا: ''وہ ابتدا میں بھی برحق تھے اور آخر میں بھی۔''

وہ بولے: ''اچھا علی کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ وہ تحکیم سے پہلے کیسے تھے اور بعد میں کیسے ہیں؟''

فرمایا: ''وہ اللہ کے دین کو زیادہ جاننے والے، دین کے بارے میں زیادہ محتاط اور اسے زیادہ نافذ کرنے والے ہیں۔''

خوارج یہ سن کر بپھر گئے، کہنے لگے: ''ارے! تم نے خواہشِ نفس کی پیروی کی، تم نے شخصیات کے ناموں کو معیار بنالیا، ان کے کاموں کو نظر انداز کر دیا۔ اللہ کی قسم! تمہیں تو ہم ایسے قتل کریں گے جیسے کسی کو آج تک قتل نہیں کیا ہوگا۔''[1]

اب یہ بد بخت انہیں اور ان کی بیوی کو پکڑ کر نہر کے کنارے کنارے چلے، اس دوران دو عجیب واقعات ہوئے۔ ایک یہ کہ قریب سے کسی غیر مسلم شہری کا خنزیر گزرا اور ایک خارجی نے تلوار کا وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر اس کے ساتھی غصے سے بے حال ہو گئے، کہنے لگے: ''غیر مسلم شہریوں کے خنزیر کو کیوں قتل کیا؟''[2]

خنزیر کا مالک آیا تو خارجیوں نے قیمت دے کر اس کی شکایت دور کر دی۔[3]

یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ بن خباب رحمہ اللہ کو ان سے کچھ انسانیت کی توقع ہوئی اور وہ بولے:

''میں تمہیں بتاؤں کہ اس خنزیر سے زیادہ کس کی اہمیت ہے؟''

خوارج بولے: ''کس کی؟''

فرمایا: ''میری۔ میں نے کبھی نماز قضا نہیں کی، کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔''[4]

خارجی مہر بلب رہے۔ آگے چلے تو نہر کے کنارے ایک کھجور کا درخت نظر آیا۔ صحابیِ رسول کے فرزند کو اس سے باندھ دیا گیا۔ اس دوران ایک خارجی نے اس درخت سے گرا ہوا کھجور کا ایک دانا اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ یہ دیکھ کر دوسرے خارجی اس پر برس پڑے اور بولے: ''تم نے ذمی کی کھجور کیوں لی، قیمت ادا کیے بغیر اسے کیسے حلال سمجھ لیا؟'' اسے کھجور منہ سے پھینکنا پڑی۔[5]

درخت سے بندھے عبداللہ بن خباب رحمہ اللہ یہ منظر دیکھ کر بول اٹھے:

''اگر واقعی ایسے پرہیزگار ہو جیسے تمہیں میں نے دیکھا ہے تو اس کے بعد مجھے تم سے کوئی خدشہ نہیں۔''

مگر خارجیوں کا ارادہ بدلا نہیں تھا، وہ آگے بڑھے، انہیں پکڑ کر نہر کے کنارے لٹایا اور جانور کی طرح ذبح کر دیا خون کی دھار پھوٹ کر نہر میں گری اور کچھ دیر تک وہاں خون کا ایک دائرہ سا بنا رہا۔

اب وہ خاتون کی طرف لپکے۔ وہ چلائیں: ''تم اللہ سے نہیں ڈرتے۔ میں تو ایک عورت ہوں۔''

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۳۷ ھجری، ذکر قتال الخوارج

[2] مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۸۹۳، ط الرشد

[3] تاریخ الطبری: ۸۲/۵

[4] مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۲۳، ط الرشد

[5] مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۲۳، ط الرشد



مگر ان ظالموں نے پیٹ چیر کر انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حضرت عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی بیوی کے بہتے خون سے نہر کا کنارہ سرخ ہوگیا۔ ظالموں نے ان کی لاشیں آگ میں جھونک دیں۔

قبیلہ عبدالقیس کا ایک خارجی جو موقع پر موجود تھا، یہ دل فگار منظر دیکھ کر سخت بددل ہوا۔ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر چپکے سے بھاگ گیا اور لوگوں کو یہ واقعہ سنایا۔ ①

خوارج کو آخری تنبیہ:

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اب تک خارجیوں کے خلاف سخت کارروائی سے اس لیے رکے ہوئے تھے کہ کسی کا نظریاتی اختلاف فوجی کارروائی کے لیے وجہِ جواز نہیں بن سکتا تھا۔ انہیں جب خوارج کے خلاف مسلح کارروائی کا مشورہ دیا گیا تھا تو انہوں نے کہا تھا: ''اس وقت تک ایسا نہیں کیا جائے گا جب تک وہ خونریزی، رہزنی اور بدامنی کا ارتکاب نہ کریں۔'' ②

مگر اب خوارج مسلمانوں کے خون میں عملی طور پر ہاتھ رنگنے لگے تھے جس کی روک تھام کے لیے مسلح کارروائی ضروری تھی۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اعلانِ جنگ سے پہلے خارجیوں کو پیغام بھیج کر مسلمانوں کے خون میں ملوث افراد کی سپردگی کا مطالبہ کیا تاکہ ان سے قصاص لیا جاسکے۔ خارجیوں نے اسے مسترد کرتے ہوئے جواب دیا:

''قتل کرنے میں ہم سب شریک ہیں، ہم قصاص کیسے دیں؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر دریافت کیا: ''کیا تم سب نے انہیں قتل کیا ہے؟''

جواب آیا: ''ہاں، بالکل''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ کہا: ''اللہ اکبر'' اب آپ رضی اللہ عنہ نے خارجیوں سے جنگ کا حتمی فیصلہ کرلیا۔ ③

---

① مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۵۷۸، ط المجلس العلمی پاکستان ؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۹۶ ؛ تاریخ طبری، ۵/۸۱، ۸۲ عن لوط بن یحییٰ ؛ الکامل فی التاریخ، سن ۳۷ھ ذکر قتال الخوارج ؛ اسد الغابۃ: ۲/۱۰۱، ترجمۃ: عبداللہ بن خباب

② مصنف عبدالرزاق، روایت نمبر: ۱۸۵۷۴، باب قتال الحروراء، ط المجلس العلمی پاکستان

③ مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۵۷۸، ط المجلس العلمی پاکستان ؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۹۲۳، ۳۷۸۹۳، ط الرشد

بعض لوگوں کا یہاں اعتراض یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک عبداللہ بن خباب کے بدلے خوارج کی پوری جماعت سے قتال پر تیار ہوگئے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بدلے تمام باغیوں سے قتال کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ اگر ایک فرد کے بدلے پوری جماعت کو قتل کرنا جائز ہے تو پھر قاتلینِ عثمان کا پورا گروہ اس سزا کا حق دار تھا اور اگر ایک فرد کے قتل کے بدلے پورے گروہ کا قتل جائز نہ تھا تو پھر عبداللہ بن خباب کے بدلے خوارج کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ ایک آدمی کے قتل میں شامل مہلک وار کرنے والے تمام افراد قابلِ قصاص ہیں مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے گروہ اور خوارج کے معاملے میں بنیادی اور واضح فرق یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باغیوں نے زیر ہونے سے پہلے ہتھیار ڈال دیے تھے، لہٰذا ارشادِ باری: إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (المائدہ، آیت: ۳۴) کے مطابق وہ باغی کے اطلاق سے نکل گئے تھے اور قضاءً انہیں امان مل گئی تھی۔ اور چونکہ ان کی اکثریت مہلک وار میں ملوث نہ تھی، لہٰذا ان سے قصاص لینا بھی جائز نہ تھا۔ جبکہ خوارج کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ سب کے سب شمشیر بکف اور آمادہ پیکار تھے۔ ان کی حالت اس آیت کے شرعی حکم کے تحت آتی تھی: إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچانے پھرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کردیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں زمین سے دور کردیا جائے" (سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۳)۔ اس لیے ان سے قتال ناگزیر ہوگیا تھا۔

خوارج کے خلاف جنگ کی دعوت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف سے یہ اطمینان تھا کہ وہاں متوازی ہی سہی مگر ایک اسلامی حکومت قائم ہے، جو شریعت کے نفاذ کی پابند اور صحیح العقیدہ ہے مگر خوارج کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ یہ لوگ بے گناہ انسانوں کا بے دریغ خون بہا کر اپنے لیے مہلت کی گنجائش ختم کر چکے تھے۔ ظاہری عبادت وریاضت کے ساتھ ان کی بے رحمی اور درندگی سے اسلام کا نام بدنام ہو رہا تھا۔ انہی خوارج میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے بہت سے لوگ شامل تھے جن کے خلاف ثبوت مہیا ہونے کا ماحول نہیں بن سکا تھا۔ عدالتی طور پر ان سے قصاص لینا خلافِ شرع ہوتا۔ مگر اب مسلح بغاوت کے ذریعے انہوں نے خود ہی اپنا خون حلال کر دیا تھا۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ ایسے عابد وزاہد لوگوں سے جنگ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ کچھ لوگ جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے، سوچ رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک طاقتور سیاسی حریف کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں، وہ شام پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مختلف خطابات میں ان تمام شکوک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش کی، آپ رضی اللہ عنہ نے خوارج سے فوری طور پر لڑنے کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے فرمایا:

''ان لوگوں نے ناحق خون بہایا ہے، لوگوں کی معاش پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ یہ تمہارے قریب کے دشمن ہیں، اگر تم کسی دوسرے دشمن سے لڑنے جاؤ گے تو خطرہ ہے کہ یہ خوارج تمہاری پشت پر حملہ آور ہوں گے۔''[1]

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کی ظاہری درویشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ میری اُمت میں ایک جماعت ظاہر ہوگی کہ تمہاری تلاوت ان کی تلاوت کے آگے کچھ نہیں ہوگی، تمہاری نمازیں ان کی نمازوں کے سامنے بے حیثیت ہوں گی، تمہارے روزے ان کے روزوں کے مقابلے میں ماند پڑ جائیں گے۔ یہ لوگ قرآنِ مجید پڑھتے ہوئے اسے اپنے حق میں تصور کریں گے جب کہ وہ ان کے خلاف دلیل ہوگا۔ وہ اسلام سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے پار ہو جاتا ہے۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا: ''اللہ کی قسم! اگر ان سے نمٹنے والے سپاہیوں کو معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کی زبان سے ان کے لیے کن کن بشارتوں کا وعدہ ہوا ہے تو وہ اس کارروائی میں شرکت سے ذرا بھی کوتاہی نہ کریں۔''

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی ایک ایسی خاص نشانی بتائی جس کی موجودگی سے یہ یقین ہو جاتا کہ احادیث میں بیان کی گئی نشانیوں سے یہی خارجی فرقہ مراد ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حدیث کے الفاظ دہرائے:

''ان میں ایک ایسا شخص ہے جس کا بازو تو ہے مگر کلائی نہیں، بازو کے آخر میں تھن جیسی چیز ہے جس پر سفید بال اُگے ہیں۔''

---

① مسند احمد، ح: ۷۰۶، بسند صحیح ؛ صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۶، باب التحریض علی قتال الخوارج ؛ البدایة والنهایة: ۵۹۲/۱۰

② صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۵، باب ذکر الخوارج

پھر پورے یقین سے فرمایا: ''اللہ کی قسم! مجھے توقع ہے کہ یہ وہی قوم ہے...... پس اللہ کا نام لے کر کوچ کرو۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا خوارج سے مناظرہ:

خوارج کے لشکر میں بھی چوبیس ہزار افراد شامل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے فیصلہ کن جنگ شروع کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی لشکر گاہ میں جانے کی اجازت مانگی۔ اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ اس طرح اگر ان کے کچھ لوگ الگ ہو گئے تو باقی ماندہ پر قابو پانا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ڈر ہے کہ وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائیں۔''[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ان شاء اللہ تعالیٰ، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا بہترین یمنی جوڑا پہنا اور تپتی دوپہر میں تنِ تنہا خوارج کی خیمہ گاہ میں جا پہنچے۔ وہاں ہر طرف سجدوں کے نشانات سے آراستہ پیشانیاں دکھائی دیں۔ ان لوگوں نے خوش آمدید کہہ کر آمد کا مقصد پوچھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اس لیے آیا ہوں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا موقف بیان کروں کیوں کہ وحی ان حضرات کی موجودگی میں نازل ہوئی تھی، تو وہی اس کی مراد بہتر سمجھتے ہیں۔''

یہ سن کر خوارج میں تکرار شروع ہوگئی، کچھ کہہ رہے تھے: ''انہیں بولنے کا موقع نہ دیا جائے۔''

مگر دوسروں نے کہا: ''ان کی بات ضرور سنی جائے گی۔''

لوگ چپ ہوئے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے یہ بتایئے کہ آپ حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد (علی رضی اللہ عنہ) میں کیا غلطی نظر آتی ہے؟''

وہ بولے: ''ان کی تین غلطیاں ہیں۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کیا؟''

بولے: ''پہلی یہ کہ انہوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں انسانوں کو فیصلے کا مجاز بنا دیا...... جبکہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ''حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''دوسری غلطی کون سی ہے؟''

بولے: ''علی (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) سے جنگ تو کی مگر کسی کو قیدی بنانے کی اجازت دی نہ مالِ غنیمت لوٹنے کی۔ اگر یہ حریف کافر تھے تو پھر (جانوں کی طرح) ان کا مال و متاع لوٹنا بھی حلال تھا۔ اور اگر یہ حریف اہلِ ایمان تھے تو علی (رضی اللہ عنہ) کے لیے ان کا خون بہانا بھی ناجائز تھا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اور کچھ!!''

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۶، باب التحریض علی قتال الخوارج

[2] مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۷۸، ط المجلس العلمی پاکستان
والاسناد حسن، عبدالرزاق ثقة، عکرمہ بن عمّار صدوق یغلط، ابو زمیل الحنفی صدوق۔



بولے: ''علی (رضی اللہ عنہ) نے اپنے نام سے امیر المؤمنین کا لفظ کیوں مٹایا؟[1] اگر وہ امیر المؤمنین نہیں تو پھر امیر الکافرین ہی ہوں گے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کے تینوں اعتراضات ٹھنڈے دل سے سننے کے بعد فرمایا:

''یہ بتائیے کہ اگر میں اللہ کی سچی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے آپ کے سامنے ایسی باتیں پیش کروں جن سے آپ کو انکار نہ ہو سکے تو کیا پھر آپ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں گے؟''

وہ بولے: ''ہاں، بالکل''

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پہلے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''آپ نے کہا کہ اللہ کے دین کے معاملے میں بندوں کو فیصلے کا مجاز بنانا غلط تھا۔ تو مجھے یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ تو خود قرآنِ مجید میں حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کے متعلق فرماتے ہیں:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُم .

''ایمان والو! تم احرام کی حالت میں شکار مت کرو، اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر شکار کو قتل کر دے تو اس کا فدیہ قتل کیے گئے جانور کی مثل ہوگا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو دیانت دار آدمی کریں گے۔ (کہ فدیے میں کیا اور کتنا دیا جائے)''[2]

اور اللہ تعالیٰ بیوی اور خاوند (کے جھگڑے) کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا

''اگر تمھیں ان کے درمیان جدائی کا خوف ہو تو ایک نمائندہ مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے بھیجو۔''[3]

---

① صفین کے معاہدۂ صلح میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''امیر المؤمنین'' لکھا گیا تھا مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اعتراض پر اسے مٹا دیا گیا؛ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ''امیر المؤمنین'' کا لفظ استعمال کرنا اہلِ شام کے موقف کے خلاف تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مطالبے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسودے سے ''امیر المؤمنین'' مٹا دیا؛ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یاد تھا کہ کفار نے صلح حدیبیہ کے وقت مسودے سے محمد رسول اللہ کا لفظ مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھوانے پر اصرار کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ امن کی مصلحت کی خاطر اسے منظور کر لیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو فرمایا تھا: ''اے علی! اسے مٹا دو۔ یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میں تیرا رسول ہوں۔ علی! اسے مٹا کر یوں لکھو: یہ وہ دستاویز ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی۔'' (مسند احمد، ح:۳۱۸۷ : تاریخ طبری:۵/۵۲ بسند صحیح)
جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح قیامِ امن کی خاطر امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مطالبے پر مسودے سے امیر المؤمنین کا لفظ مٹا دیا تو خوارج نے یہ بے تکا اعتراض شروع کر دیا کہ علی بن ابی طالب تو خود ہی امیر المؤمنین کے منصب سے دست بردار ہو گئے ہیں۔

② سورۃ المائدۃ، آیت: ۹۵

③ سورۃ النساء، آیت: ۳۵

اب میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں لوگوں کی جانوں کی حفاظت اور ان کے درمیان صلح وصفائی کی اہمیت زیادہ ہے یا ایک خرگوش کی جان کی جس کی قیمت چار درہم ہوتی ہے۔''

وہ بولے: ''اللہ کی قسم! انسانی جانوں کی حفاظت اور ان کے درمیان صلح زیادہ اہم ہے۔''

اس طرح ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی جانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حَکَم بنانے کی پیش کش قبول کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تصدیق کے لیے پوچھا:

''بتایئے میں نے یہ اعتراض دور کر دیا؟''

وہ بولے ''جی ہاں۔ بالکل''

اب آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ تو کی مگر کسی کو قیدی نہیں بنایا اور مال نہیں لوٹا تو یہ بتاؤ کہ کیا تم اپنی ماں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو قیدی بناتے؟ کیا ان کے بارے میں وہ حلال سمجھتے جو کسی اور کے بارے میں حلال تصور کرتے ہو۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم کافر ہو؛ کیوں کہ قرآنِ مجید میں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ.

''تمہاری مائیں تم پر حرام کر دی گئیں۔''①

اور اگر تم یہ کہو کہ ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماں مانتے ہی نہیں تب بھی تم کفر کرو گے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے:

اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهٗ أُمَّهٰتُهُمْ.

''نبی اہلِ ایمان سے ان کی جانوں کی بہ نسبت زیادہ حق دار ہیں اور نبی کی بیویاں اہلِ ایمان کی مائیں ہیں۔''②

اب تم دو گمراہیوں کے درمیان لٹکے ہوئے ہو۔ جسے چاہو پسند کر لو۔''

خارجی گنگ ہو کر یہ باتیں سن رہے تھے۔

آپ نے فرمایا: ''میں نے یہ اعتراض دور کر دیا کہ نہیں؟''

وہ بولے: ''جی بالکل!''

فرمایا: ''اچھا اب رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاہدے میں اپنے نام سے امیر المؤمنین مٹانے کا مسئلہ! تو دیکھو رسول اللہ ﷺ نے قریش کو حدیبیہ کے موقع پر باہمی تحریری معاہدے کی دعوت دی...... اور یوں لکھوایا...... یہ وہ فیصلہ ہے جو محمد رسول اللہ نے کیا۔ اس پر قریش کہنے لگے: اگر ہم آپ کو رسول اللہ مانتے تو آپ کو بیت اللہ سے ہرگز نہ روکتے، آپ سے جنگ نہ کرتے...... یہاں محمد بن عبداللہ لکھوایئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! یہاں محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ تو غور کریں رسول اللہ ﷺ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ (وہ فریقِ مخالف کے اعتراض پر معاہدے سے

① سورۃ النساء، آیت: ۲۳
② سورۃ الاحزاب، آیت: ۶

منصبِ رسالت کا ذکر حذف کرا دیتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت کا ذکر چھوڑ کر کونسا گناہ کر دیا؟)

یہ مثال دے کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''بتایئے میں نے یہ اعتراض دور کر دیا؟''

وہ بولے: ''جی بالکل''

خوارج کی اکثریت نادم ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا جمِ غفیر منتشر ہونے لگا۔ ان میں سے بیس ہزار افراد (جو زیادہ تر بعد میں شامل ہوئے تھے) وہاں سے نکل گئے، صرف چار ہزار افراد پیچھے رہ گئے۔[1]

معرکۂ نہروان:

نہروان کی خیمہ گاہ میں اب وہی خارجی رہ گئے تھے جو اپنے عقیدے کے لیے مرنے مارنے پر تیار تھے، وہ اپنے قائد عبداللہ بن وہب راسبی کی کمان میں اپنے پڑاؤ سے نکل کر نہر پر بنے ''دیز جان'' نامی پُل کے پار آ گئے۔[2]

خوارج نے طے کر لیا تھا کہ مزید کوئی گفت و شنید نہیں ہو گی، تلوار دونوں گروہوں کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔[3]

تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ یکے بعد دیگرے ان کی طرف سفیر بھیج کر انہیں سمجھانے کی پوری کوشش کرتے رہے مگر وہ نہ مانے اور آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سفیر کو ہی قتل کر ڈالا۔ تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوج کو حملے کی اجازت دی۔[4]

دونوں لشکر قریب آئے تو عبداللہ بن وہب نے حکم دیا: ''نیزے پھینک دو اور تلواریں سونت لو۔''

اِدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوار نیزے تان کر ان پر پل پڑے۔ خوارج بڑی بے جگری سے لڑے مگر جلد ہی ان کا زور ٹوٹ گیا اور تقریباً سب کے سب وہیں مارے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے صرف دو افراد شہید ہوئے۔[5]

مرنے والے خارجیوں میں بہت سے افراد وہ تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مدینہ منورہ میں فساد مچانے گئے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اس فتنے کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے جیسے حُرقوص بن زہیر۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سعادت بھی نصیب ہو گئی کہ ان کی شمشیرِ آبدار نے شرعی حدود میں رہتے ہوئے نہروان کے میدان میں ایسے بہت سے بدبختوں کا بھی صفایا کر دیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ برپا کرنے میں پیش پیش تھے۔

عجیب الخلقت آدمی کی تلاش:

جنگ کا ہنگامہ تھمتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا: ''لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے گروہ کی خبر دی تھی جو دین سے یوں نکل جائے گا جیسے تیر نشانے سے پار ہو جائے۔ اس گروہ کی ایک نشانی یہ بتائی تھی کہ ان میں ایک سیاہ فام

---

① مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۷۸، باب ماجاء فی الحروریۃ، رجالہ ثقات، ط المجلس العلمی پاکستان

② السنن الکبری للنسائی، ح: ۸۵۱۷، امام نووی نے امام نسائی کی روایت کے حوالے سے اس پُل کا نام ''دبرجان'' نقل کیا ہے۔ (شرح صحیح مسلم، للنووی: ۱۷۲/۷) جبکہ نسائی میں یہ نام ''دیز جان'' ہے۔ واللہ اعلم صحیح کونسا ہے؟

③ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۸۹۸، ط الرشد

④ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۲۷، ط الرشد

⑤ صحیح مسلم، روایت نمبر: ۲۵۱۶، باب تحریض علی قتل الخوارج

شخص ہوگا جس کی کلائی تھن کی طرح پھولی ہوئی ہوگی، اسے ڈھونڈ و۔ وہ انہی میں ہوگا۔''[1]

آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ حضور ﷺ نے خبر دی تھی کہ وہ مجھ سے مقابلے میں قتل ہوگا۔ [2]

لوگوں نے تلاش کیا مگر ناکام رہے تو بعض نادانوں کے منہ سے نکل گیا: ''ابن ابی طالب ہمیں ہمارے بھائیوں کے بارے میں دھوکہ دیتے رہے اور آخرکار ہم نے ان بے چاروں کو قتل کر ڈالا۔''[3]

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ رونے لگے، پھر فرمایا: ''تم اسے ڈھونڈو! اللہ کی قسم! نہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا نہ مجھے جھوٹی بات بتائی گئی تھی۔'' لوگوں نے پھر تلاش کیا مگر ایسا آدمی نہ ملا۔ آخرکار آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا سفید خچر منگوایا اور خود اس شخص کی لاش تلاش کرنے لگے۔ [4]

نہر کے کنارے ایک کھائی میں کھجور کے درخت تلے لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہاں خود لاشوں کو الٹتے پلٹتے رہے، آخر ان میں سے اُس عجیب الخلقت شخص کی لاش نکل آئی، جسے دیکھتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔''[5]

لوگوں کے شکوک دور ہوگئے اور انہیں اپنی لڑائی پر اجر وثواب ملنے کا یقین ہوگیا۔ [6]

جمل، صفین اور نہروان کے شرکاء میں واضح فرق:

جنگِ جمل اور صفین کے برخلاف یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ واضح طور پر اعلان فرما رہے تھے کہ ہمارے مقتولین جنت میں اور ان کے دوزخ میں ہوں گے۔ [7] جبکہ صفین کے اختتام پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

'' قَتْلانَا وَقَتْلاهُمْ فِي الْجَنَّة. '' (ہمارے اور ان کے مقتولین جنت میں ہوں گے۔) [8]

خوارج سے یہ جنگ شعبان سن ۳۸ ہجری میں ہوئی تھی۔ [9] یہ سردی کا موسم تھا۔ [10] صحیح روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مہم کے بعد کوفہ واپس چلے گئے اور اعلان فرمایا کہ اس سال مزید کوئی لشکر کشی نہیں کی جائے گی۔ [11]

---

① مسند احمد، ح: ٦٧٢

② البدایة والنهایة: ١٠/٦٠٣ بحواله مسند بزار

③ مصنف ابن ابی شیبة، روایت نمبر: ٣٧٩١٤، ط الرشد

④ البدایة والنهایة: ١٠/٦٠٣ بحواله بزار

⑤ المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ٧٦٦٦،١٥٣٧

⑥ مصنف ابن ابی شیبه، روایت نمبر: ٣٧٩١٤؛ مسند احمد، ح: ٦٠٢ بسند صحیح؛ البدایة والنهایة: ١٠/٦٠٢، تا ٦٠٣

⑦ البدایة والنهایة: ١٠/٦٠٣ بحواله بزار

⑧ مصنف ابن ابی شیبه، روایت نمبر: ٣٧٨٨٠، ط الرشد ⑨ تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ١٩٧

⑩ وذالک فی یوم شات (السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ٨٥١٧) عیسوی تقویم کے مطابق یہ جنوری ٦٥٩ء تھا۔

⑪ مصنف ابن ابی شیبه، روایت نمبر: ٣٧٩١٤، بسند صحیح

نوٹ: بعض ضعیف روایات میں مذکور ہے کہ جنگِ نہروان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ شام پر حملہ کرنے پر آمادہ تھے مگر آپ کے ساتھی نہ مانے مگر مذکورہ صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خوارج پر قابو پانے کے بعد بھی اہلِ شام سے لڑنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے یہ ضعیف روایات قابلِ اعتماد نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معتدل مزاجی:

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی معتدل مزاجی کا یہ عالم تھا کہ خوارج جیسے خون خوار دشمنوں کو بھی کافر یا منافق قرار نہیں دیا۔ کسی نے پوچھا: ''کیا یہ لوگ مشرک تھے؟'' فرمایا: ''شرک ہی سے تو وہ بچ کر بھاگے تھے۔''

پوچھا گیا: ''تو کیا انہیں منافق سمجھا جائے؟''

فرمایا: ''منافق تو اللہ کا ذکر بہت تھوڑا کیا کرتے ہیں۔'' (جبکہ خوارج ذِکر و عبادت میں ممتاز تھے)

سوال ہوا: ''تو پھر انہیں کیا سمجھا جائے؟'' فرمایا: ''یہ لوگ ہمارے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے۔''[1]

اس طرح ایک بار کسی نے خوارج کا ذِکر چھڑنے پر انہیں گالیاں دیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ایسے لوگوں کو گالی مت دو۔ ہاں اگر وہ عادل حکمران کے خلاف بغاوت کریں تو ان سے لڑو۔''[2]

اہلِ عراق اور اہلِ شام دونوں ایمان والے اور دین دار:

خوارج کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ کارروائی ان کے خلیفہ برحق ہونے کی بہت بڑی دلیل تھی، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دو مسلمانوں کے دو بڑے گروہ آپس میں جنگ نہ کریں جن کا موقف یکساں ہوگا، ان کے درمیان سے ایک گمراہ فرقہ نکلے گا جسے دونوں گروہوں میں سے وہ قتل کرے گا جو حق کے زیادہ قریب ہوگا۔''[3]

اس روایت سے جہاں سیدنا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی جماعت کی افضلیت اور متنازعہ امور میں ان کے اجتہاد کی صحت ثابت ہوتی ہے وہیں سیدنا مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما اور ان کی جماعت کا اہلِ ایمان وتقویٰ میں ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے، کیوں کہ روایت میں دونوں گروہوں کو حق پر یعنی دین دار کہا گیا ہے۔ ہاں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''حق سے قریب ترین'' کہہ کر ترجیح دی گئی۔ مطلب یہ ہوا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت بھی دین دار تھی۔

اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ حضرت علی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کا مقصد ایک ہی تھا، یعنی حق کو سربلند کرنا۔ البتہ فقہی و اجتہادی اختلاف اور شرپسندوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی وجہ سے وہ متفق نہ ہو سکے۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبۃ، روایت نمبر: ۳۷۹۴۲ بسند حسن، ط الرشد

[2] مصنف ابن ابی شیبۃ، روایت نمبر: ۳۷۹۱۶، ط الرشد

یاد رہے کہ خوارج کی بغاوت کو اجتہادی خطا نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ سراسر گمراہی تھی؛ کیوں کہ خطائے اجتہادی کا اطلاق ایسے لوگوں کی غلطی پر ہوتا ہے جنہیں امت فقہ و اجتہاد کے مقام پر تسلیم کرتی ہو۔ حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہم بلاشبہ اس مقام پر تھے جبکہ خوارج بالکل ظاہر بین اور کوزہ مغز لوگ تھے۔

[3] تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها اولى الطائفتين بالحق. (صحيح مسلم، ح: ۲۵۰۷، باب ذكر الخوارج ، سنن ابي داؤد، ح: ۳۶۶۷) "لاتقوم الساعة حتى تقتتل فئتان عظيمتان دعواهما واحدة، تمرق بينهما مارقة، يقتلها اولى الطائفتين بالحق." (مصنف عبدالرزاق، روایت نمبر: ۱۸۶۵۸، ط المجلس العلمی پاکستان)

محدثین نے ان احادیث کو باب قتال المسلمین اور قتال الخوارج میں ذکر کیا ہے اور شارحین نے مطلب یہ بتایا ہے کہ صفین میں دونوں گروہ اہلِ ایمان کے تھے اور دونوں مجتہد تھے، اگرچہ اجتہاد میں اصابت اور خطا کا فرق ضرور تھا۔

اصلاحِ عقائد

خوارج کی سرکوبی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لائے تو پھر عمر کے باقی دو برس وہیں گزارے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اب اہم ترین ہدف امت کی ایمانی، اعتقادی، علمی اور اخلاقی تربیت تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان نادان دوستوں کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی جو عبداللہ بن سبا کی تحریک سے متاثر ہو کر صراطِ مستقیم سے ہٹتے جا رہے تھے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں مبالغہ آرائی کرتے، انہیں تمام انسانوں سے افضل اور انبیائے کرام کی طرح معصوم تصور کرتے۔ بعض افراد تو انہیں اللہ کے برابر کرنے لگے تھے۔ ابن سبا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی رسول اللہ ہونے کا نظریہ عام کیا تھا جو بعد میں شیعوں کا عقیدۂ امامت بن گیا، اس کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نبی کے نائب، وارث اور جائز حکمران تھے اور ان کے بعد امامت وحکومت انہی کی اولاد میں چل سکتی تھی، باقی سب خلفاء غاصب تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس گمراہی کی تردید کرتے ہوئے ایک بار فرمایا:

"لوگو! رسول اللہ ﷺ نے اس حکومت کے بارے میں ہمیں کوئی وصیت نہیں فرمائی، بلکہ ہم نے خود اپنی رائے سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مانا، پس وہ سیدھے چلے اور ثابت قدم رہ کر چلے، پھر انہوں نے اپنی رائے سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا وہ ثابت قدم اور سیدھے رہے تو دین عروج پا گیا۔ پھر اب ایسے لوگ آئے ہیں جو اس دنیا کے طالب ہیں۔"[1]

ایک موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ایک بار رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلوایا اور ارشاد فرمایا: "تمہاری ایک بات عیسیٰ بن مریم جیسی ہے کہ یہودیوں نے تو ان سے اس قدر بغض رکھا کہ ان کی والدہ پر بہتان باندھ دیا اور نصرانیوں نے ان سے محبت کی وجہ سے انہیں اس مقام پر مان لیا جو اُن کا نہ تھا (یعنی انہیں خدا کا بیٹا کہا)۔"

یہ حدیث سنا کر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لوگو! غور سے سن لو میرے بارے میں انتہا پسندی کی وجہ سے دو قسم کے لوگ گمراہ ہوں گے: ایک وہ محبت اور تعریف کرنے والے لوگ جو میری ایسی مدح وتوصیف کریں گے جو میرے لیے درست نہیں۔ دوسرے وہ نفرت کرنے والے لوگ جن کی دشمنی انہیں مجھ پر الزام تراشی کے لیے آمادہ کرے گی۔

① دلائل النبوۃ للبیہقی: ۷/۲۲۳ بسند حسن، ط العلمیۃ

یاد رکھو! میں نہ پیغمبر ہوں، نہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ بس میں تو اپنی استطاعت کے مطابق کتاب وسنت پر عمل کرتا ہوں؛ لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے مطابق تمہیں جو حکم دوں اس کی تعمیل کرنا تمہاری لیے ضروری ہے، چاہے تم پسند کرو یا ناپسند۔''①

جاہل عقیدت مندوں میں یہ خیال پھیل چکا تھا کہ آپ کے پاس وحی سے حاصل شدہ ایسے علوم ہیں جو دنیا میں کسی کو نہیں دیے گئے۔ آپ اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے تھے:

''اللہ کی قسم! ہمارے پاس قرآن اور احادیث کے اس نوشتے کے سوا کچھ نہیں جو ہم تمہیں پڑھ کر سناتے ہیں۔''②

سبائیوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مخالف رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایسے غلط خیالات سے اپنی بیزاری کا کھل کر اظہار اس طرح فرمایا:

''اللہ کی پناہ کہ میں ان بزرگوں کے بارے میں خوش عقیدگی کے سوا کوئی بات دل میں رکھوں۔''③

یہی نہیں بلکہ آپ نے باقاعدہ یہ اعلان کیا:

''خبردار! اگر مجھے اطلاع ملی کہ کوئی مجھے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دے رہا ہے تو میں اسے اتنے کوڑے لگاؤں گا جتنے جھوٹی تہمت لگانے والے کو لگائے جاتے ہیں۔'' (یعنی اسی کوڑے جو حد قذف میں مقرر ہیں)④

بدعقیدگی کی پھیلانے میں سب سے بڑا کردار عبداللہ بن سبا کا تھا مگر یہ شخص اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا تھا۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گواہ مل گئے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق وعمر فاروق رضی اللہ عنہما کو برا بھلا کہہ رہا ہے، آپ نے اسے بلوالیا اور قتل کردینا چاہا مگر رفقاء نے درگزر کا مشورہ دیا، تب آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اچھا مگر میں جہاں رہوں یہ ہرگز وہاں نہ رہنے پائے۔''⑤

عبداللہ بن سبا نظروں میں تو آہی چکا تھا۔ اس نے چاہا کہ کسی سزا کا شکار ہونے سے پہلے خود ہی کوئی ہنگامہ خیز کام کر جائے۔ قرائن سے واضح ہوتا ہے کہ اس سے پہلے وہ بعض خصوصی مریدوں کو اس حد تک گمراہ کر چکا تھا کہ وہ نہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا، خالق اور قادرِ مطلق ماننے لگے تھے بلکہ اس عقیدے کا اعلان کرتے ہوئے قتل ہو جانا شہادتِ عظمیٰ تصور کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن خطبہ دینے منبر پر تشریف فرما تھے کہ اچانک عبداللہ بن سبا کھڑا ہو گیا اور چلایا:

''جناب! آپ دابۃ الارض ہیں (یعنی قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر نکلنے والے جانور ہیں۔)

---

① مسند احمد، ح: ۱۲۷۷

② و اللّٰہ ما عندنا کتاب نقرؤہ علیکم الا کتاب اللّٰہ وھذہ الصحیفۃ. (مسند احمد، ح: ۷۸۲ باسناد صحیح)

③ لسان المیزان: ۲۹۰/۳ بسند صحیح

④ لا اجد احدا یفضلنی علی ابی بکر وعمر الا جلدتہ حد المفتری. (تاریخ دمشق: ۳۸۳/۳۰)

⑤ تاریخ دمشق: ۹/۲۹، ترجمۃ: عبداللہ بن سبا

حضرت علی رضی اللہ عنہ چپ رہے تو وہ بولا: ''حضور! آپ بادشاہ ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جھلا کر کہا: ''اللہ سے ڈر!''

مگر عبداللہ بن سبا بولتا چلا گیا: ''آپ نے ہی مخلوق کو پیدا کیا ہے، آپ ہی رزق تقسیم کرتے ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اب برداشت نہ ہوا۔ حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

مگر مجمع میں موجود اس کے مرید جمع ہو کر ہنگامہ کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خیر خواہوں نے کہا:

''اگر آپ اسے یہاں شہری آبادی میں قتل کرائیں گے تو اس کے عقیدت مند بغاوت کر دیں گے۔''

یہ سن کر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لوگو! کیا تم مجھے اس سیاہ فام شخص کو سزا دینے پر مجبور نہیں پاتے جس نے اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھا ہے۔ اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ ایک جماعت اس کے قصاص کی دعوت لے کر میرے خلاف بغاوت برپا کرتی رہے گی، تو میں ایسے لوگوں (کی لاشوں) کے ڈھیر لگا دیتا۔''

اس اعلان اور وضاحت کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے ابن سبا کو شہر بدر کرنے کا حکم دیا، چنانچہ اسے ساباط مدائن بھیج دیا گیا۔[1]

اعلانیہ کفر کے مرتکب سبائیوں کو سزائے موت:

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد ابن سبا کے کچھ چیلے مسجد کے دروازے پر نعرہ بازی کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بلوا کر ڈانٹا اور کہا: ''تم ہلاک ہو جاؤ، تمہارا مقصد کیا ہے؟''

وہ بولے: ''آپ ہمارے رب ہیں، آپ ہمارے خالق اور رازق ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''دفع ہو جاؤ، میں علی بن ابی طالب ہوں۔ میرا باپ جانا پہچانا ہے، میری ماں جانی پہچانی ہے۔ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا زاد بھائی ہوں۔'' مگر وہ بدستور اسی عقیدے پر اڑے رہے۔

آپ نے فرمایا: ''تمہارا ستیاناس ہو، میں تمہاری طرح ایک بندہ ہوں، تمہاری طرح کھاتا پیتا ہوں، اگر میں اللہ کی اطاعت کروں گا تو وہ چاہے گا تو مجھے ثواب دے گا اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو مجھے اس کے عذاب کا خوف ہے۔ تم اللہ سے ڈرو اور باز آ جاؤ۔''

مگر یہ سب نصیحتیں بے سود رہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں مزید دو دن اصلاح کا موقع دیا مگر وہ نہ مانے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اب میں تمہیں بدترین طریقے سے قتل کروں گا۔''

یہ کہہ کر آپ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی جامع مسجد اور اپنی رہائش گاہ کے درمیان گہری خندقیں کھدوا کر ان میں آگ بھڑکانے کا حکم دیا، پھر ان مرتدوں کو پکڑ کر اس آگ میں پھینک دیا گیا۔[2]

---

① تاریخ دمشق: ۲۹/۵ تا ۷، ترجمۃ: عبداللہ بن سبا، باسناد حسن

② تاریخ دمشق: ۲۹/۵ تا ۷، ترجمۃ عبداللہ بن سبا؛ صحیح البخاری، ح: ۶۹۲۲، کتاب استتابۃ المرتدین، باب حکم المرتد
قال ابن حجر فی شرحہ: "ان علیا حرق قوماً ھم السبئیۃ اتباع عبداللہ بن سبا و کانوا یزعمون ان علیا ربھم۔" (فتح الباری: ۲۹۱/۱۲، ۲۹۲)

زندقہ اور ارتداد کی اس سنگین ترین شکل کو کہ بندے کو خدا اور معبود بنا دیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ عبرت ناک سزا کے ذریعے بالکل مسدود کر دینا چاہتے تھے۔ یہ ان کا اجتہادی فیصلہ تھا جس میں وہ اپنی جگہ برحق تھے۔ [1]

شرکیہ رسوم اور بدعات کا سد باب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شرک و بدعت اور نظریاتی کج روی کے ہر دروازے کو مسدود کرنے کے لیے ارشاد و نصائح کا سلسلہ جاری رکھا۔ شرکت و بدعت کی بیخ کنی کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے قبروں کو اونچا بنانے کی رسم کو ممنوع قرار دے دیا جو بعض جاہلوں نے از سر نو شروع کر دی تھی۔ یہ بھی پتا چلا کہ بعض لوگ زندیق ہیں جو اسلام کا دعویٰ کرنے اور مسلمانوں جیسے تمام حقوق وصول کرنے کے باوجود خفیہ طور پر گھروں میں بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالہیاج اسدی رحمہ اللہ اور بعض دوسرے رفقاء کو اس مہم پر مامور کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تم کو وہ کام سونپ رہا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سونپا تھا۔ وہ یہ کہ کوئی بھی مجسمہ دیکھو تو اسے توڑ ڈالو اور کوئی بھی اونچی قبر دکھائی دے تو اسے زمین کے برابر کر دو۔'' [2]

یوں مجسموں کی توڑ پھوڑ اور اونچی قبروں کو مسمار کرنے کے ذریعے شرک کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی گئی۔

اسی طرح بتوں کو پوجنے والے زندیقوں کو بھی پکڑا گیا اور جب وہ توبہ تائب نہ ہوئے تو انہیں قتل کر دیا گیا۔ [3]

اپنوں سے شکایات:

آپ رضی اللہ عنہ کی افواج اور آپ کے گرد جمع ہونے والے رؤساء میں زیادہ تر لوگ اہلِ عراق و فارس تھے، اگرچہ ان میں نیک و صالح اور بہادر اور ایثار پیشہ رجالِ کار بھی تھے مگر اہلِ شام سے مسلسل نبرد آزمائی نے انہیں تھکا دیا تھا اور ان میں سے بہت سے اپنی سرحدوں کی حفاظت سے بھی جان چرانے لگے تھے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے تھے جو حد سے زیادہ شدت پسند تھے اور وہ آپ رضی اللہ عنہ کے ان مدبرانہ اقدامات کو جن میں سیاسی لچک پائی جاتی تھی، بے دینی اور منافقت سے تعبیر کرتے تھے۔ خارجیت اور سبائیت کو اسی شدت پسندی کی وجہ سے پنپنے کا موقع ملا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض خطبات اور ملفوظات میں ایسے لوگوں سے سخت بیزاری ظاہر ہوتی ہے جو خانوادۂ رسالت سے محبت و عقیدت کا زبانی کلامی دم تو بھرتے تھے مگر عملی طور پر اطاعت کا مظاہرہ کرنے اور آپ رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ چاہتے تو ان پر جبر و تشدد کر سکتے تھے مگر آپ کو شریعت کا لحاظ تھا۔

---

① اگرچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے مطابق یہ سزا درست نہ تھی؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا تعذبوا بعذاب اللہ. (صحیح بخاری، ح ۶۹۲۲) نیز ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض کفار کو جلانے کا حکم دیا، پھر منع کر کے محض قتل کی ہدایت کی اور فرمایا کہ آگ کا عذاب دینا اللہ ہی کو زیب دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، ح: ۳۰۱۶) علامہ عینی نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ کا مذہب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مطابق ثابت کر کے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع فرمانا نہی تنزیہی پر محمول ہے۔ (عمدۃ القاری: ۲۶۴/۱۴)۔ یہی حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے۔ (فتح الباری: ۲۷۱/۱۲)

② مسند احمد، ح: ۲۲۸۷

③ مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۲۹۰۰۳، ۳۳۱۵۳، ط الرشد

آپ فرماتے تھے: ''میں خوب جانتا ہوں کہ تمہاری اصلاح کس طرح ہوسکتی ہے مگر اللہ کی قسم! میں تمہاری اصلاح کے لیے اپنے آپ کو نہیں بگاڑ سکتا۔''[1]

آپ رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے تھے:

''لوگ اپنے حکمرانوں کے ظلم سے ڈرتے ہیں مگر میرا یہ حال ہے کہ میں اپنی رعایا کے ظلم سے ڈرتا ہوں۔''[2]

۳۹ھ میں جب اہلِ شام نے سرحد پر حملہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو سرحدوں کے دفاع کی ترغیب دیتے ہوئے جو تقریر کی تھی، وہ آپ کے احساسات کی آئینہ دار ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے اس خطبے میں فرمایا:

''اے اہلِ کوفہ! جب تم یہ سنتے ہو کہ شام کے ہراول دستوں میں سے کسی دستے نے حملہ کر کے تمہارے کسی شہر کا راستہ بند کر دیا ہے تو تم میں سے ہر شخص خوف کے مارے اپنے گھر میں یوں گھس جاتا ہے جیسے گوہ خطرے کے وقت اپنے بل میں یا بجو اپنے بھٹ میں چھپ جائے۔ واقعی وہ شخص دھوکے میں ہے جسے تم دھوکہ دو۔ جو شخص تمہارے ذریعے کامیابی حاصل کرنا چاہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ٹوٹا ہوا تیر چلائے۔ تم میں ایسے آزاد مرد نہیں جو کسی کی فریاد سن لیں۔ نہ تم میں ایسے معتبر بھائی ہیں جن کی اعانت پر بھروسا کیا جاسکے۔''[3]

اختلاف سے نفرت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شدید تمنا تھی کہ امت متحد و متفق ہو جائے اور مسلمان ہر قسم کے اختلافات سے محفوظ رہیں۔ اس لیے آپ کی کوشش یہی رہتی تھی کہ حتی الامکان ایسی بات کہی جائے جس پر سب کا اتحاد ہو جائے۔ جب تک بات ناگزیر حد تک نہ پہنچ جاتی، آپ اختلاف نہ کرتے۔ دوسروں کو ان کی اجتہادی رائے پر چلنے دیتے۔ اپنے پیشرو خلفائے ثلاثہ کی اتباع کو راہِ نجات اور وسیلۂ اتحاد تصور کرتے۔ آپ اہلِ فقہ و اجتہاد سے فرماتے تھے:

''تم فیصلے کرتے رہو، جیسا کہ پہلے کیا کرتے تھے، یہاں تک لوگ ایک بات پر اجماع کر لیں یا میں اسی حال میں مر جاؤں جیسا کہ مجھ سے پہلے میرے رفقاء وفات پا گئے ہیں۔''[4]

☆☆☆

---

[1] والی لعالم بما یصلحکم و یقیم اودکم ولکنی لا اریٰ اصلاحکم بافساد نفسی۔ (نهج البلاغة: ۱/۵۳، المطبعة الادبیہ بیروت)

[2] الامم تخاف ظلم رعاتها واصبحت اخاف ظلم رعیتی۔ (نهج البلاغة: ۱/۹۱، المطبعة الادبیة بیروت، ۱۸۸۵ء)

[3] تاریخ الطبری: ۵/۱۳۳، سن ۳۹ھ

[4] عن عبیدة عن علی رضی اللہ عنہ، اقضوا کما کنتم تقضون، فانی اکره الاختلاف، حتیٰ یکون للناس جماعة او اموت کما مات اصحابی۔ (صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۷، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ)

استحکام کی کاوشیں اور فتوحات

عام طور پر مؤرخین کے بیانات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سارا زمانہ ہنگامے، فساد اور فتنوں میں گزر گیا اور ہر طرف بدامنی کا دور دورہ رہا، حالاں کہ یہ تاثر علی الاطلاق درست نہیں۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں عالمِ اسلام اندرونی طور پر سیاسی بحران کا شکار ضرور رہا مگر عام حالات امن و امان ہی کے تھے۔

اس دوران بڑی مہمات صرف تین ہی ہوئیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بذاتِ خود جانا پڑا، یعنی جمل، صفین اور نہروان۔ جمل ایک وقتی ہنگامہ تھا، اس کے سفر میں ڈیڑھ دو ماہ لگے اور لڑائی اتفاقیہ تھی جو ایک ہی دن میں ختم ہوگئی۔

صفین کی مہم میں آپ رضی اللہ عنہ کے تقریباً چار ماہ صرف ہوئے، جبکہ نہروان کی مہم میں چند دن لگے اور لڑائی چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوئی۔ ان چند مہینوں کے علاوہ حالات معمول کے مطابق رہے، ایسا نہ تھا کہ ڈاکو دن رات قافلوں کو لوٹ رہے ہوں، بیرونی حملہ آور ہر وقت سرحدوں کو عبور کر رہے ہوں اور لوگ اپنے گھروں میں غیر محفوظ ہو گئے ہوں۔

گزشتہ خلفائے راشدین کی طرح اس دور میں بھی سرحدوں کی نگرانی، کفار کے حملوں کی روک تھام، محروسہ علاقوں میں بغاوتوں کی سرکوبی اور اسلام کی شان و شوکت کی دھاک بٹھائے رکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے بڑے حوادث کے شور و غل میں یہ پہلو زیادہ نمایاں نہ ہو سکے۔ خلافتِ اسلامیہ تقسیم ہو جانے کے باوجود یمن، حجاز، عراق، ایران، خراسان اور مشرق کے وسیع علاقے پر محیط تھی اور اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے مستعد تھی۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صوبہ دار:

نظامِ حکومت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور قُثَم رضی اللہ عنہ کا بھرپور تعاون میسر تھا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے۔ عبیداللہ رضی اللہ عنہ یمن کے اور قُثَم رضی اللہ عنہ حجاز کے، جبکہ خراسان کا وسیع و عریض صوبہ عبدالرحمٰن ابن ابزیٰ رضی اللہ عنہ کے زیرِ نگرانی تھا۔ [2] ان کے علاوہ درجنوں اکابر صحابہ اور اَن گنت تابعین آپ کے جانثار تھے۔

---

① یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ بعض حضرات نے بلاتحقیق لکھ دیا ہے کہ آخری سالوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس صرف کوفہ اور اس کا نواحی علاقہ رہ گیا تھا۔ یہ دعویٰ مسلمہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ شام اور مصر ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود حجاز مقدس، یمن، عراق، الجزیرہ، ایران، خراسان اور بلوچستان جو عالمِ اسلام کا اکثر علاقہ تھا، آخر تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ کتبِ حدیث و تاریخ کو دیکھنے سے اور خاص کر صوبہ داروں کی فہرست پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی نفی کی کوئی دلیل نہیں۔ اس بارے میں دلائل متن میں آ رہے ہیں۔

② تاریخ الطبری: ۱۳۲/۵

فارس وکرمان اور پہاڑی علاقوں کی مہمات:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفاداروں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ شریک بھائی زیاد کا نام بھی نمایاں تھا۔ اہلِ شام سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اختلافات کے دنوں میں اہلِ فارس وکرمان نے خراج دینا بند کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے زیاد بن ابی سفیان نے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس مہم پر جا کر شورش پسندوں کی گوشمالی کی۔ اسی طرح بعض پہاڑی علاقوں کے قبائل نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور خراج دینے سے انکار کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے بصرہ کے حاکم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جا کر ان کو زیرِ نگین کیا۔ [1]

مَرْو کی مہم:

جنگ جمل کے بعد (۳۶ھ) میں مَرْو کا فارسی نژاد حاکم ماہُویہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنی وفاداریاں پیش کر کے تقرری کا پروانہ طلب کیا۔ آپ نے اس علاقے کے دہقانوں اور جنگ جوؤں کے نام رقعہ لکھ دیا جس میں بتایا گیا تھا کہ ماہُویہ کو خلافتِ اسلامیہ کی طرف سے ان کا ذمہ دار مقرر کیا گیا ہے۔

کچھ دنوں بعد مَرْو کے لوگوں نے بغاوت کر دی۔ حضرت علی نے خُلَید بن قُرہ (ابن طریف یربُوعی) کو وہاں بھیجا جنہوں نے حالات پر قابو پا لیا۔ [2]

نیشاپور کی مہم:

جنگِ صفین سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی واپسی کے کچھ دنوں بعد (۳۷ھ میں) مجوسیوں نے ایک بار پھر سر اٹھایا؛ کیوں کہ کسریٰ کے خاندان کی ایک شہزادی کابل سے خراسان کے اہم شہر نیشاپور آ گئی تھی اور مجوسی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے افسرِ فوج خُلَید بن کاس نے فوراً جا کر اس بغاوت کو فرو کیا اور باغیوں کو تتر بتر کر دیا جبکہ شہزادی گرفتار ہو گئی۔ [3]

قیدی شہزادی کی تکریم:

شہزادی کو کوئی گزند پہنچائے بغیر کوفہ لایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

''کیا تم میرے بیٹے حسن سے نکاح کرنا پسند کرو گی؟''

کہنے لگی: ''میں ایسے کسی شخص سے نکاح نہیں کروں گی جو کسی کا ماتحت ہو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خوبیاں بیان کیں مگر اس نے کہا:

''میں فقط آپ سے نکاح پر راضی ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''میں تو عمر رسیدہ ہوں۔''

---

① تاریخ الطبری: ۵/۱۳۷، ۱۳۸

② تاریخ الطبری: ۴/۵۵۸

③ الاخبار الطوال، ص ۱۵۳، ۱۵۴

شہزادی کسی اور سے نکاح پر رضامند نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر حاضرین میں سے ایک فارسی کہنے لگا:

''امیر المؤمنین! میں اس کا رشتہ دار ہوں، یہ لڑکی میرے نکاح میں دے دیجیے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ لڑکی اپنے فیصلے کی خود مالک ہے۔''

پھر شہزادی کو یہ کہہ کر عزت سے رخصت کر دیا:

''جہاں چاہو چلی جاؤ، جس سے مرضی نکاح کر لو۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔'' [1]

تلامذہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے مشرکین سے جہاد:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاص جانثار تھے۔ وہ اہلِ شام سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور کسی دوسرے محاذ پر اپنی وفاداری کا مظاہرہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ انہیں کفار سے جہاد کا موقع دیا جائے۔ ان کے پیشرو حضرت عَبِیدہ سَلمانی رحمہ اللہ نے حضرت علی سے عرض کیا:

''امیر المؤمنین! آپ کی فضیلت کے اعتراف کے باوجود ہمیں اس (اہلِ شام سے) قتال کے معاملے میں تردد ہے۔ دوسری طرف آپ اور مسلمانوں کے لیے مشرکین سے جہاد بھی ناگزیر ہے۔ پس آپ ہمیں کفار کی سرحدوں پر تعینات کر دیں تاکہ ہم ان سے جہاد کرتے رہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رَبیع بن خُثَیم کو امیر بنا کر ان حضرات کو قزوین اور ''رے'' کے سرحدوں پر بھیج دیا، اس لشکر کی روانگی کے لیے خصوصی طور پر جھنڈا تیار کیا گیا۔ [2]

مرتدین سے جہاد:

خلافتِ اسلامیہ کے ایک علاقے کے لوگوں نے مرتد ہو کر اپنے آبائی مذہب نصرانیت کو دوبارہ اختیار کر لیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مَعقِل بن قیس رحمہ اللہ کو بھیجا، جنہوں نے زبردست جنگ لڑ کر اُن مرتدین پر قابو پایا اور ان کے بہت سے افراد کو گرفتار کر لائے۔ [3]

بلوچستان اور سندھ میں پیش قدمی:

سن ۳۹ ہجری کے آغاز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بلوچستان اور سندھ میں مزید پیش قدمی ہوئی؛ کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک مکران کا علاقہ فتح ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ''قندابیل'' کا علاقہ تھا۔ علاقے میں پانی اور غذا کی قلت اور دیگر مشکلات کے سبب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزید پیش قدمی مؤخر کر دی تھی۔ [4] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

---

① الاخبار الطوال، ص ۱۵۳، ۱۵۴

② الاخبار الطوال، ص ۱۶۵ — یہ واقعہ جنگ صفین سے بعد کا معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ جنگ صفین میں عبیدۃ سلمانی اور دیگر تلامذہ ابن مسعود موجود تھے اور صلح کی کوشش کراتے رہے تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۰۵)

③ شرح معانی الآثار للطحاوی، ح: ۵۱۱۴، کتاب السیر، باب یکون الرجل بہ مسلمًا

④ عیون الاخبار لابن قتیبۃ: ۲/۲۱۷، ط العلمیۃ؛ تاریخ الطبری: ۴/۱۸۲

اپنے دورِ خلافت میں دو عشروں کے وقفے کے بعد اس مہم کو آگے بڑھایا۔

قندابیل اور قیقان کی مہم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے حارث بن مرۃ العبدی رضی اللہ عنہ مکران سے آگے بڑھ کر "قندابیل" کی حدود میں داخل ہوگئے، اور قیقان کے پہاڑوں میں یلغار کرتے چلے گئے۔ انہیں فتح نصیب ہوئی۔ ان کا بھیجا ہوا مالِ غنیمت کوفہ پہنچا تو وہ اتنا تھا کہ ایک ہی دن میں ایک ہزار غلام تقسیم کیے گئے۔ حارث رضی اللہ عنہ اس مہم سے واپس آ رہے تھے کہ دشمن نے ایک گھاٹی میں ناکہ بندی کر کے انہیں گھیر لیا۔ حارث رضی اللہ عنہ اپنے ہمراہیوں سمیت لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ ①

اندرونی لڑائیوں میں نصرانیوں کا کردار:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے لے کر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دور تک بہت سے فتنوں کے پسِ پردہ مقامی نصرانیوں کا ہاتھ بھی تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عراق اور شام کی عرب سے متصل سرحدوں پر آباد تھے۔ ان کے کچھ سازشی افراد بیرونی عیسائی طاقتوں کی پشت پناہی کے ساتھ خلافتِ اسلامیہ اور اتحادِ مسلمین کے خلاف کھڑی ہونے والی ہر تحریک میں حصہ ڈالتے اور ایسی ہر جماعت کی مدد کرتے۔

خِرّیت بن راشد کی سازشیں:

اس ضمن میں خِرّیت بن راشد کا تذکرہ اہم ہے جو قبیلہ بنو ناجیہ کا رئیس تھا اور جنگِ جمل سے جنگِ نہروان تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب تھا، مگر اس کے بعد سن ۳۸ ہجری میں اس نے اچانک سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بے دینی اور ملت فروشی کے الزامات عائد کرتے ہوئے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ وہ مسیلمہ کذاب کی طرح بڑا عیار سیاست دان تھا، ہر ایک سے اس کی مرضی کے مطابق بات کرتا تھا۔ خوارج سے کہتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تحکیم کو درست مان کر ناجائز کام کیا ہے۔ عام مسلمانوں سے کہتا کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کو مانتا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید اور مظلوم ہونے کا بھی اقرار کرتا۔ جو لوگ حکومت سے باغی بن کر محصولات دینا بند کرتے ان کو بھی شاباش دیتا اور جو مرتد ہو جاتے ان کی بھی حوصلہ افزائی کرتا۔ ②

خِرّیت بن راشد کے خلاف مہم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خِرّیت بن راشد کے درمیان طویل خط و کتابت ہوتی رہی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ عراق اور خلیج کے

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۱؛ فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الهلال

جغرافیہ سے دلچسپی رکھنے والے ہمارے دوست محترم عدنان الحق (مقیم سعودی عرب) کی تحقیق کے مطابق "قیقان" اور "قندابیل" سے مراد بلوچستان کے وہ علاقے ہیں جو سندھ کے ساتھ لگتے ہیں۔ یہاں سے "کیرتھر" کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو کر سندھ کی حدود سے جا ملتا ہے۔ اس دور میں اس پہاڑی خطے کو "قیقان" کہا جاتا تھا۔ پھر یہ مدت "گنداوہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ قندابیل کا موجودہ نام "جھل مگسی" ہے۔ تفصیل کے لیے یہ ویب سائٹ دیکھیے:

www.balochistan.gov

② تاریخ الطبری: ۱۲۵/۵

نصرانی اس کے پشت پناہ بن گئے۔ اس کی قوم بنوناجیہ کے بیشتر لوگ جو نصرانیت سے اسلام میں داخل ہوئے تھے دوبارہ نصرانی بن گئے۔ اَہواز کے عجمی قبائل بھی اس کے گرد جمع ہوگئے، اس کے علاوہ چوروں اور ڈاکوؤں کے گروہ بھی اس سے جا ملے۔[1] آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مَعقِل بن سِنان رضی اللہ عنہ کو ایک زبردست لشکر دے کر اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔[2]

اس جنگ میں حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ بھی تھے،[3] وہ یہ واقعہ اس طرح سناتے ہیں:

''میں اس لشکر میں تھا جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنوناجیہ کے خلاف بھیجا تھا۔ جب ہم ان لوگوں تک پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ تین گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ ہمارے امیر نے ایک گروہ سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' کہنے لگے: ''ہم نصرانی تھے، پھر مسلمان ہوگئے اور اب بھی اسلام پر قائم ہیں۔'' امیر نے کہا: ''تم ایک طرف ہو جاؤ۔'' پھر دوسرے گروہ سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' کہنے لگے: ''ہم نصرانی تھے اور اب بھی نصرانیت پر قائم ہیں۔'' امیر نے تیسرے گروہ سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' کہنے لگے: ''ہم نصرانی تھے، پھر مسلمان ہوگئے، پھر ہم نے دیکھا کہ نصرانیت سے بہتر دین کوئی نہیں، تو ہم دوبارہ نصرانی ہوگئے۔''

امیر نے کہا: ''اسلام قبول کرلو۔'' انہوں نے انکار کردیا۔ اس پر امیر نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''میں تین بار سر پر ہاتھ پھیروں گا۔ (جب تیسری بار ہاتھ پھیروں تو) تم حملہ کردینا۔''

پس مسلمانوں نے ایسا ہی کیا، ان کے جنگ جوؤں کو قتل کردیا، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا۔''[4]

یہ لڑائی نہایت خونریز تھی جس میں دشمنوں کا سرغنہ خِرّیت بن راشد فرار ہو کر روپوش ہوگیا اور اس کے ساتھ بچ نکلنے والا باغی گروہ تتر بتر ہوگیا۔[5]

☆☆☆

---

[1] تاریخ الطبری: ۱۲۲/۵ تا ۱۲۶

[2] تاریخ الطبری: ۱۳۲/۵

[3] ان کا نام عامر بن واثلہ ہے۔ تمام صحابہ کے بعد ۱۰۰ھ یا ۱۱۰ ہجری میں وفات پائی۔

[4] مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۲۹۰۰۸ ؛ السنن الکبری للبیہقی، ح: ۱٦۸۹۵

اس روایت کے بعد امام بیہقی امام شافعی کا یہ قول نقل کرتے ہیں: قد قاتل من لم یزل علی النصرانیۃ و من ارتد (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے بھی جہاد کیا جو نصرانیت پر قائم تھے اور ان سے بھی جو مرتد ہوگئے تھے۔)

[5] تاریخ الطبری: ۱۳۲/۵

سانحۂ شہادت

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اب تریسٹھ (63) برس کے ہو چکے تھے۔ انہیں عالمِ اسلام کی زمامِ اقتدار جن حالات میں ملی تھی، وہ ان کی فقاہت، استقامت، تدبیر، اولوالعزمی، توکل اور اخلاص کا بہت بڑا امتحان تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے ان سخت ترین آزمائشوں سے نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ پار ہوئے تھے۔

سن ۴۰ ہجری کے ایام تیزی سے گزرتے جا رہے تھے، سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود معاشرے میں فساد کا عنصر باقی ہے اور خود ان کے پیروکاروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو شریعت پر ان کی استقامت، ذاتی مفادات کی بار بار قربانی اور سیاسی مخالفین کے لیے وسعتِ ظرفی سے نالاں ہیں۔ عراق و فارس میں آباد یہ طبقہ قیصر و کسریٰ کی طرح مادی شان وشوکت والے حکمرانوں ہی سے مرعوب ہوتا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سادگی اور بے تکلفی ان کی نگاہ میں ایک عیب تھی۔ آپ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ اندرونی دشمن آپ کی تاک میں ہیں اور کسی بھی وقت قاتلانہ وار کر سکتے ہیں۔

انہی دنوں بنو مراد کے ایک شخص نے آپ کو اطلاع دیتے ہوئے کہا:

''اپنے لیے پہرے کا انتظام کرلیں، بنو مراد کے کچھ لوگ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: ''ہر آدمی کے ساتھ دو محافظ فرشتے ہوتے ہیں، جو اسے آفات سے بچاتے ہیں مگر جب مقدر کا لکھا آپڑتا ہے تو دونوں الگ ہو جاتے ہیں، بے شک موت خود ہی ایک زبردست ڈھال ہے۔''[1]

دنیا سے بے زاری اور شہادت کی آرزو:

حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے بھی دنیا کی دلچسپیوں سے لاتعلق تھے۔ اب جہانِ فانی سے اور زیادہ بے زار ہو چلے تھے۔ اپنی حیات کے آخری ایام میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''اے اللہ! میں ان لوگوں سے اُکتا گیا ہوں اور یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔ میں ان سے نالاں ہوں اور یہ مجھ سے نالاں ہیں۔ تو مجھے ان سے دور کر کے آرام دے اور انہیں مجھ سے آزاد کر کے راحت دے۔''

پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

''تم میں سے سب سے بدبخت کو کوئی نہیں روکے گا کہ وہ میری داڑھی کو خون سے رنگین کر دے۔''[2]

---

① طبقات ابن سعد: ۳۴/۳، ط صادر ② مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۷۰ بسند صحیح، ط المجلس العلمی پاکستان

انہی دنوں مشیروں نے تجویز دی کہ آپ اپنا جانشین مقرر کر دیں مگر آپ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر جاؤں گا جیسے رسول اللہ ﷺ (کوئی باضابطہ نائب مقرر کیے بغیر اُمت کو) چھوڑ گئے تھے۔''

رفقاء کو ڈر تھا کہ اس طرح مزید انتشار پھیل سکتا ہے، اس لیے عرض کیا:

''اس حال میں اپنے رب کے پاس جائیں گے تو کیا جواب دیں گے؟''

فرمایا: ''یہی کہوں گا اے میرے رب! آپ نے مجھے جب تک مناسب سمجھا ان لوگوں میں باقی رکھا، پھر جب آپ نے مجھے اُٹھا لیا تو آپ ہی ان کے ذمہ دار ہیں، چاہیں تو انہیں سدھار دیں چاہیں تو بگڑنے دیں۔''[1]

خوارج قتل کی سازش تیار کرتے ہیں:

نہروان کی جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کی عسکری طاقت فنا کر دی تھی مگر خارجی ذہنیت کے بہت سے لوگ مسلم معاشرے میں موجود تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سمیت اہم سیاسی مناصب پر فائز صحابہ سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہی اکابر صحابہ تمام خانہ جنگی کے ذمہ دار تھے اور انہیں قتل کر کے ہی اسلامی معاشرے کو محفوظ بنایا جا سکتا تھا۔ ان کے تین افراد: عبدالرحمٰن بن مُلجَم مرادی، برک بن عبداللہ تمیمی اور عَمرو بن بکر آمادہ ہو گئے کہ اسلامی سیاست کی تین اہم شخصیات کو ایک ہی وقت میں شہید کر دیا جائے۔

انہوں نے اپنی تلواروں کو زہر آلود کیا اور سترہ رمضان المبارک کو تینوں عظیم اسلامی شخصیات پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ عبدالرحمٰن بن مُلجَم کوفہ روانہ ہو گیا تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرے۔ برک بن عبداللہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر حملے کے لیے شام کی طرف نکل گیا اور عَمرو بن بکر نے حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ختم کرنے کے لیے مصر کا رخ کیا۔[2]

۱۷ رمضان المبارک کی صبح تینوں نے اپنے اپنے ہدف پر حملہ کیا، سیدنا امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے مگر بچ گئے۔ حملہ آور پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس دن بیماری کی وجہ سے حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو نماز فجر پڑھانے بھیج دیا تھا۔ وہ عَمرو بن بکر کی زہر آلود تلوار کی زد میں آکر شہید ہو گئے، قاتل یہاں بھی پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔[3]

عبدالرحمٰن بن مُلجَم اور شَبیب بن بَجرہ:

عبدالرحمٰن بن مُلجَم کو خلیفۃ المسلمین پر حملہ کرنا تھا۔ عبدالرحمٰن بذاتِ خود نہایت عبادت گزار اور پرہیزگار انسان تھا، قرآنِ مجید کا حافظ و قاری تھا مگر بعد میں گمراہ ہو کر خوارج کا سرگرم کارکن بن گیا تھا۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا عزم کر کے وہ سیدھا کوفہ پہنچا۔ وہاں ایک اور خارجی شَبیب بن بَجرہ کو بھی ساتھ ملایا

---

① مسند احمد، ح: ۱۰۷۸ بسند صحیح

② تاریخ الطبری: ۵/۴۳ عن موسیٰ بن عثمان

③ تاریخ الطبری: ۵/۱۴۱ ④ الوافی بالوفیات: ۱۸/۱۷۲، ط دار صادر

نوٹ: عبدالرحمٰن بن مُلجَم کا تعلق یمنی قبیلے حِمیَر کی شاخ بنو مراد سے تھا۔

سترہ رمضان المبارک کی شب، شب جمعہ تھی۔ دونوں مسجد میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تاک میں بیٹھ گئے۔[1]

قاتلانہ حملہ اور شہادت:

امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سحری سے فارغ ہو کر صبح کی نماز کے لیے منہ اندھیرے مسجد میں تشریف لائے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ کوفہ میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ آپ حسبِ معمول لوگوں کو نماز کے لیے بلاتے ہوئے آ رہے تھے، آپ کے لبوں پر یہ صدا تھی: ''اَلصَّلٰوۃ ...... اَلصَّلٰوۃ......''

آپ مسجد کی دہلیز پر پہنچے تھے کہ عبدالرحمٰن اور شَبِیب تلواریں سونتے آپ کی طرف لپکے اور نعرۂ تحکیم لگایا:

''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ......''

پھر چلائے: ''حاکمیت اللہ ہی کی ہے، اے علی! نہ تیری ہے نہ تیرے ساتھیوں کی۔''

یہ کہہ کر پہلے شَبِیب نے تلوار چلائی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ اتنے میں دوسری جانب سے عبدالرحمٰن نے سر پر زوردار وار کیا، تلوار پیشانی میں اتر گئی، آپ رضی اللہ عنہ لہولہان ہو گئے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے اسی حالت میں آواز لگائی: ''یہ بھاگنے نہ پائیں۔''

لوگ دوڑ کر آئے تو عبدالرحمٰن ابن مُلجَم اور شَبِیب ان پر حملہ آور ہوئے تاکہ راستہ بنا کر نکل جائیں۔ شَبِیب تو بھاگ نکلا، البتہ ابن مُلجَم پکڑا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بلوایا اور پوچھا: ''تجھے کس بات نے اس حرکت پر آمادہ کیا؟''

وہ اس سوال کو نظر انداز کر کے فخر سے بولا:

''ہزار کی تلوار خرید کر اس پر ہزار کا زہر لگایا۔ چالیس دن تک اس تلوار کو تیز کرتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ اس سے بدترین انسان قتل ہو۔ اگر پورے شہر کے لوگ اس کے وار کے نیچے آتے تو اللہ کی قسم! ان میں سے ایک بھی نہ بچتا۔''[2]

حملہ آور سے حسنِ سلوک کی تاکید:

لوگ اس بدبخت کو مار ڈالنا چاہتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے قضیے کو ملتوی کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

''اسے کھلاؤ پلاؤ، نرم بستر دو، قید میں اچھی طرح رکھو۔ اگر میں بچ گیا تو چاہوں گا تو معاف کر دوں گا، چاہوں گا تو بدلہ لوں گا۔ اور اگر میں مر گیا تو تم اسے بس تلوار کے ایک وار سے قتل کر دینا، اس کی لاش کو نقصان نہ پہنچانا، میں کل اللہ کی بارگاہ میں اس پر دعویٰ کروں گا۔''[3]

زہریلی تلوار کے زخم سے پورے جسم میں زہر پھیل رہا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کے بچنے کی اُمید نہ رہی تھی۔

---

[1] تاریخ الطبری: ۵/۱۴۳؛ واخرج الحاکم فیہ بعض المرویات باسنادہ قال: ذکر مقتل امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ، ۳/۱۵۴

[2] تاریخ الطبری: ۵/۱۴۴ تا ۱۴۶

[3] السنن الکبریٰ للبیہقی، ح ۱۶۷۵۹؛ تہذیب الآثار للطبری، ۳/۷۵، ط المدنی؛ تاریخ الطبری: ۴/۷۹؛ مستدرک حاکم، ح ۴۶۹۱

آخری وصیت:

آخری وقت میں اولاد کو کئی اہم نصیحتیں کیں، فرمایا:

''حسن! میں تمہیں اور اپنے سارے بچوں کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ مرتے دم تک اسلام پر ثابت قدم رہنا...... اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوط تھامے رہنا، منتشر مت ہونا۔ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا...... یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرنا...... پڑوسیوں کا خیال رکھنا، قرآنِ مجید پر عمل کرنے میں بڑھ چڑھ کر کوشش کرنا...... نماز کا بہت اہتمام کرنا کہ یہ تمہارے نبی ﷺ کی آخری وصیت تھی...... اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے رہنا...... زکوٰۃ ادا کرنا کہ یہ رب کے غصے کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا لحاظ کرنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں یہی تاکید فرمائی ہے۔ فقیروں، مسکینوں، غلاموں اور باندیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنا۔ لوگوں سے شائستہ کلامی برتنا، نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا، نیکیوں میں باہم تعاون کرنا اور گناہ یا دشمنی کے کاموں میں ساتھ مت دینا۔''[1]

آخری وقت میں آپ کے رفقاء نے پوچھا: ''اگر آپ شہید ہو جائیں تو کیا ہم حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیں؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''میں نہ تو اس کا حکم دیتا ہوں، نہ اس سے منع کرتا ہوں۔''[2]

شہادت اور تدفین:

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ مسلسل ''لا الہ الا اللہ'' کا ورد کرتے رہے یہاں تک کہ روح جسدِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ابھی ۱۷ رمضان المبارک کا سورج طلوع نہیں ہونے پایا تھا کہ ایمان وایقان، علم وحکمت، جہاد وسیاست اور شجاعت وعزیمت کا یہ آفتابِ عالم تاب دنیا کو تاریک چھوڑ کر چلا گیا۔

انّاللّٰہ و انا الیہ راجعون

تدفین دارالامارۃ کی عمارت کے اندر ہی کی گئی، کیوں کہ خدشہ تھا کہ خوارج موقع پا کر کہیں لاش کی بے حرمتی نہ کریں۔[3] نمازِ جنازہ صاحبزادے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔[4] خلافت کی مدت چار سال نو ماہ تھی۔[5]

رضی اللّٰہ عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

[1] تاریخ الطبری: ۱۴۷/۵، ۱۴۸

[2] لا آمر کم ولا انھٰکم. (تاریخ الطبری: ۱۴۶/۵، ۱۴۷؛ البدایۃ والنھایۃ: ۱۵/۵)

[3] تاریخ الطبری: ۱۵۱/۵، ۱۵۲

[4] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۹

[5] تاریخ الطبری: ۱۵۲/۵

سیرتِ علوی کے چند روشن پہلو

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ والا صفات بے شمار خوبیوں کا مرقع تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت پر عمل کیا کرتے تھے، رعایا پروری، پرہیز گاری اور خدا خوفی میں آپ اپنے تینوں سابق خلفائے راشدین کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ آپ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے۔ روزے کثرت سے رکھتے۔ قرآنِ مجید کی تلاوت آپ رضی اللہ عنہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی فرمائش پر آپ کے ایک رفیق نے آپ کی سیرت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"ان کی نگاہ دوررَس تھی، قُویٰ بہت مضبوط تھے، دوٹوک اور صاف بات کیا کرتے تھے۔ عدل وانصاف کے عین مطابق فیصلے فرماتے تھے...... ان کی ہستی سے علم کے چشمے جاری ہوتے تھے۔ دنیا اور اس کی رنگینیوں سے بے زار رہتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں اُن کا دل لگتا تھا۔ اللہ کی قسم! رات کو عبادت میں ان کے آنسو رکنے میں نہیں آتے تھے...... دیر تک سوچ بچار میں غرق رہتے، اپنی ہتھیلیوں کو پلٹ پلٹ کر خود سے باتیں کرتے...... معمولی سا بوسیدہ لباس پہنتے، بے تکلف اور عام لوگوں کی طرح رہتے...... مگر ہمیں اُن کے رعب کی وجہ سے ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی...... مسکراتے تو دانت سفید موتی کی لڑی کی طرح چمکتے، دینداروں کی عزت کرتے، غریبوں سے محبت کرتے۔ کوئی طاقتور ترین انسان بھی ناحق بات میں ان کی تائید کی امید نہیں کر سکتا تھا اور کوئی کمزور آدمی ان کے انصاف سے مایوس نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کی راتوں کے چند مناظر دیکھے ہیں، رات نے اپنی سیاہ چادر پھیلائی ہے، تارے ڈوبنے لگے ہیں اور سیدنا علی مسجد کی محراب میں اپنی داڑھی اپنے ہاتھ سے پکڑے ایک درد سے بے کل انسان کی طرح رو رہے ہیں، یوں تڑپ رہے ہیں جیسے انہیں سانپ یا بچھو نے ڈس لیا ہو۔ میرے کانوں میں آج بھی ان کی آواز گونج رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں: اے دنیا! کیا تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے؟ کیا مجھ سے کوئی توقع رکھتی ہے؟ جا میرے سوا کسی اور کو دھوکہ دے! میں تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں جس کے بعد دوبارہ تعلق کی کوئی گنجائش نہیں...... تیری عمر مختصر ہے...... تیری دی ہوئی کامیابی حقیر، تیرے خطرات بڑے بھیانک، ہائے! سامانِ سفر کتنا تھوڑا، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا سنسان!!"

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یہ سن کر زار و قطار رو دیے۔ (1)

(1) صفۃ الصفوۃ لابن جوزی: ۱/۱۲۲

ایک بار کوئی گورنر آپ کے پاس حاضر ہوا، کھانے کا وقت ہوا تو آپ نے مٹی کی ہانڈی منگوائی جس میں صرف ستو تھا، آپ نے پانی ملا کر خود بھی اسے نوش کیا اور گورنر کو بھی کھلایا۔ وہ حیرت سے بولا:

''امیر المؤمنین! آپ عراق میں رہ کر بھی یہ کھاتے ہیں، جبکہ یہاں کے عوام کا کھانا اس سے کہیں بہتر ہے؟''

فرمایا: ''میں پسند نہیں کرتا کہ میرے پیٹ میں حلال کے سوا کچھ اور جائے۔''[1]

علمی شان ایسی تھی کہ بڑے بڑے صحابہ کرام آپ کے فتووں پر اعتماد کرتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: ''حضرت علی سے پوچھو، وہ یہ مسئلہ میری بہ نسبت زیادہ جانتے ہیں کیوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر پر جایا کرتے تھے۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود عظیم ترین فقیہ ہونے کے باوجود فرمایا کرتے تھے: ''ہم میں سب سے اچھے مُنصِف علی ہیں۔''[3]

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ سیاسی اختلافات کے باوجود فتاویٰ کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتماد کرتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے آکر ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا: ''حضرت علی سے جا کر پوچھو، وہ زیادہ جانتے ہیں۔''[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ مشکل معاملات کو مثالوں اور قصوں کے ذریعے سمجھایا کرتے تھے۔ اشعار اور عربی حکایات کا اچھا خاصا ذخیرہ آپ رضی اللہ عنہ کے حافظے میں موجود تھا...... گزشتہ خلفاء کا ذِکر بڑے ادب سے کرتے اور ان سے جدائی پر رنج وافسوس ظاہر کرتے۔ ایک بار آپ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی۔ آپ رضی اللہ عنہ گھر تشریف لائے تو ساتھیوں سے فرمایا: ''واقعی مجھے تو اسی دن کھالیا گیا تھا جس دن سفید بیل کو کھایا گیا تھا۔''

لوگوں کی حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے بات آگے بڑھائی اور فرمایا:

''کسی جنگل میں تین بیل تھے: ایک سفید، ایک سرخ اور ایک سیاہ۔ تینوں میں بہت اتفاق تھا۔ ایک شیر اُن پر حملہ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا مگر تینوں مل کر اسے بھگا دیتے...... آخر ایک دن شیر نے سرخ اور کالے بیل کو کہا: ''اس جنگ میں ہمارے جھگڑے کا سبب یہ سفید بیل ہے، تم بیچ میں نہ آؤ اور مجھے اس سے نمٹنے دو۔ میں اس کو کھاؤں گا اور پھر ہم اور تم اس جنگل میں اتفاق سے رہیں گے کہ میرا اور تمہارا رنگ ملتا جلتا ہی ہے۔'' پس شیر نے سفید بیل پر حملہ کر کے اسے مار دیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے دونوں بیلوں پر حملے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ دونوں مل کر اسے بھگا دیتے آخر ایک دن اس نے سرخ بیل سے کہا: ''اس جنگل میں ہمارے جھگڑے کی بنیاد یہ کالا بیل ہے۔ تم اس کا ساتھ دینا چھوڑ دو تا کہ میں اسے کھا جاؤں۔ پھر ہم اور تم اتفاق سے رہیں گے کہ

---

1. حلیۃ الاولیاء: ۱/۸۲، ط السعادۃ
2. مسند احمد، ح: ۹۲۶، مسند علی رضی اللہ عنہ
3. ''اقضانا علیٌّ''. (صحیح البخاری، ح: ۴۴۸۱، کتاب التفسیر، باب قولہ: ما ننسخ من آیۃ)
4. فضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل، ح: ۱۱۵۳

ہمارا اور تمہارا رنگ ایک سا ہے۔“

سرخ بیل نے کالے بیل کا ساتھ چھوڑا تو شیر اسے ہڑپ کر گیا۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا شیر آرام سے رہا۔ مگر پھر ایک دن وہ سرخ بیل پر حملہ کرنے آ گیا...... سرخ بیل نے کہا: 'تم مجھے کھاؤ گے؟' شیر نے کہا: 'ہاں۔'

سرخ بیل نے کہا: ''اچھا مگر پہلے مجھے تین بار ایک اعلان کرنے دو'' شیر نے کہا: ''کرلو۔''

سرخ بیل نے آواز لگائی: 'سن لو مجھے اسی دن کھا لیا گیا تھا جس دن سفید بیل کو کھایا گیا تھا۔''

یہ حکایت سنا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''سن لو میں اسی دن سے کمزور ہو گیا تھا جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تھا۔''[1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا تعزیتی خطاب اور جانشینی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے اگلے دن سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مجمع عام میں ایک تقریر کی جس میں فرمایا:

''لوگو! کل تم سے ایسا شخص جدا ہو گیا جو علم میں پہلوں سے بڑھ کر تھا اور بعد والے اس کے مقام تک نہیں پہنچ سکیں گے...... بلاشبہ رسول اللہ ﷺ انہیں جب بھی پرچم دے کر کسی مہم پر بھیجتے تو وہ فتح یاب ہو کر ہی واپس آتے۔ یہ شخص دنیا سے اس حال میں گیا ہے کہ اس کے پاس سونا تھا، نہ چاندی...... ہاں، سات سو درہم تھے جو اپنے گھریلو خادموں کے لیے الگ جمع کر کے رکھے تھے۔''[2]

مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا، مگر اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں۔ تمام کتب سیر و تاریخ یہی بتاتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ امت پر چھوڑ دیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے تاثرات:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی تو بے اختیار رو پڑے اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر بولے: ''لوگوں نے آج علم و فضل اور خیر میں سے بہت کچھ گم کر دیا ہے۔'' اہلیہ محترمہ نے کہا: ''آپ ان سے جنگ کر چکے ہیں، مگر اب رو رہے ہیں۔'' فرمایا: ''تمہیں کیا پتا! آج علم و فضل کا کتنا بڑا سرمایہ کھو گیا ہے۔''[3]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کو تسلیم کرتے تھے اور ان کی رائے خلیفۂ رابع کے بارے میں وہ نہ تھی جو شام کے ان شدت پسندوں کی تھی جو ان کے بعد مروانی یا ناصبی کہلائے۔

بعض لوگ اس قسم کے کلمات کو محض دوغلی پالیسی اور سیاسی بیان کی حیثیت دیتے ہیں۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معاملہ عام سیاست دانوں کا نہیں صحابہ کرام کا ہے۔ ان کے اخلاص وللّٰہیت پر یقین کرنا پڑے گا جو قرآن مجید سے ثابت ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر تبصرہ، ان اخلاقِ کریمانہ کے تناظر میں دیکھا جائے جو

---

① مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۹۳۳ ② فضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل، ح: ۹۲۲ بسند صحیح

③ "ویلک ما تدرین ما ذا ذھب من علمہ وفضلہ." (تاریخ دمشق: ۵۸۳/۵۹) اسنادہ ضعیف لکن فی باب المناقب سعۃ

صحابہ کرام کا مایۂ امتیاز تھے تو اچنبھے کی کوئی بات نہیں رہتی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کش مکش کے پیچھے ان غلط اطلاعات اور جھوٹی گواہیوں کا بڑا دخل تھا جنہیں شرپسندوں نے شام میں پھیلایا تھا جو آج بھی ضعیف اسناد کے ساتھ کتب تاریخ میں موجود ہیں اور ناصبی حضرات آج بھی ان پر قطعیت کے ساتھ یقین کرتے ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیثیت اہلِ شام کے سیاسی قائد کی تھی اور سیاسی میدان میں پیش آنے والے معاملات بڑے نازک، پیچیدہ اور کثیر الجہت ہوتے ہیں۔ انسان بہت سوچ سمجھ کر ایک پہلو سے درست رائے قائم کرتا ہے مگر دوسری جہت سے اس کے اثرات منفی نکل آتے ہیں۔ اکثر اوقات سیاست دان اپنی رائے میں پوری طرح آزاد نہیں ہوتا بلکہ پیش آمدہ گھمبیر حالات، خصوصاً بحرانی دور کی صورتحال اس کے لیے قدم قدم پر فیصلوں کا دائرہ تنگ کرتی رہتی ہے۔ وہ رائے عامہ کا خیال رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے عوامی جذباتی لہر اور حاشیہ برداروں کی آراء سے مغلوب ہو جانے کی نوبت بھی آتی ہے۔ بسا اوقات اسے اپنی ذاتی رائے یا طبعی رجحان کو بالکل ایک طرف رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شامی عوام وسپاہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اشارے کو بھی حکم کا درجہ دیتے تھے مگر اس کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فیصلے کرتے ہوئے اپنے گرد وپیش کی فضا، امراء کی آراء اور عوامی رجحانات کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ نیز شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے صدمے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دی گئی جھوٹی شہادتوں نے خود انہیں بھی ایک جذباتی کیفیت سے دوچار کیے رکھا۔ غلط فہمیوں کی حقیقت پوش فضا، شرپسندوں کی خفیہ سازشوں اور شدت پسندوں کی غیر معتدل آراء نے انہیں امیر المؤمنین سے حالتِ محاربہ کی طرف دھکیل دیا تھا۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے تو ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محاربہ اور ساتھ ہی ان کے فضائل ومناقب کا اعتراف ہرگز نا قابلِ فہم نہیں رہتا۔ انہوں نے جو کچھ کیا، دین وایمان کا تقاضا سمجھ کر، قصاص کے حکمِ قرآنی کو نافذ کرنے کے لیے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے اس اجتہاد میں خطا ہو گئی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کی زبانی:

اگر روایاتِ حدیث میں فضائل ومناقب کے ابواب دیکھے جائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب (نہ کہ افضیلت) کی روایات تمام صحابہ کرام حتیٰ کہ شیخین حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے فضائل کی روایات سے بھی زیادہ محسوس ہوں گی۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شیخین سے بھی افضل تھے۔ حالاں کہ شیخین کے فضائل ومناقب کی روایات کے کم ہونے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسی روایات کی کثرت کی ایک خاص وجہ تھی، جس پر روشنی ڈالتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> **''صحابہ میں سے کسی کے حق میں مضبوط سندوں کے ساتھ اتنی احادیث مروی نہیں جتنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ آخر میں تھے اور ان کے زمانے میں اختلاف پڑ گیا اور بغاوت کرنے والوں نے ان کے خلاف بغاوت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین کی تردید کے لیے صحابہ نے**

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان مناقب کو بکثرت پھیلایا جو ان کے پاس محفوظ تھے۔ پس لوگ دو فرقے بن گئے۔ مگر ان میں بدعتی کم تھے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، سو ہوا۔ پس ایک اور گروہ ظاہر ہوا، جس نے ان سے جنگ کی۔ پھر معاملہ مزید گمبھیر ہو گیا۔ پس یہ لوگ ان کی تنقیص کرنے لگے اور منبروں پر ان کی لعنت کو رسم بنا لیا۔ اور خوارج نے بھی بغض کی وجہ سے ان لوگوں کا ساتھ دیا، اور مزید یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہنے لگے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی اس حکم میں ملا لیا۔

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق لوگوں کے تین گروہ بن گئے: اہل سنت۔ اور بدعتی خوارج میں سے۔ اور ان لوگوں میں سے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آمادۂ پیکار ہوئے یعنی بنو امیہ اور ان کے متبعین (میں سے ناصبی گروہ) پس اہلِ سنت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی، اسی وجہ سے ان کے نقل کرنے والے بکثرت ہو گئے کیوں کہ ان کے مخالفین بھی بکثرت تھے۔ ورنہ حقیقت میں خلفائے اربعہ میں سے ہر ایک کے فضائل اتنے ہیں کہ اگر انہیں انصاف کے ترازو کے ساتھ نقل کیا جائے تو اہلِ سنت کے عقیدے سے ہٹ کر کوئی بات ثابت نہیں ہوگی۔''[1]

☆☆☆

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک ناکام حکمران تھے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کا دورِ خلافت ناکامیوں کا دور تھا اور وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہے، وہ قاتلینِ عثمان سے قصاص لے سکے نہ امت کو متحد کر پائے۔ مگر یہ ایک بالکل سطحی تجزیہ ہے۔

دراصل آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے مسئلہ صرف قصاصِ عثمان لینے کا نہیں، پوری شریعت کی پیروی اور خلافتِ راشدہ کی بقا کا تھا، جسے سازشی عناصر داؤ پر لگانے کے لیے سرگرم تھے اور بدقسمتی سے اہلِ شام اور بہت سے عراقی ان کے جھانسے میں آ گئے تھے، یوں سبائی اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے بہترین سیاسی حکمتِ عملی سے ہر قسم کے شر پسند عناصر سمیت اسلام دشمن طاقتوں کی خفیہ جنگ کا نہایت فراست، تدبر اور پامردی سے مقابلہ کیا اور ان کو رفتہ رفتہ کمزور کیا۔ سبائیت کے مسلح بازو خارجیت کو نہروان میں خون کا غسل دے کر ایسے ہزاروں بدبختوں کو انجام تک پہنچایا جو باقی رہتے تو شاید پوری امت کو کسی اور ہی ڈگر پر چلا کر چھوڑتے۔

[1] لم یرد فی حق احد من الصحابة بالاسانید الجیاد اکثر مما جاء فی علی، و کانَ السبب فی ذلک انه تاخر ووقع الاختلاف فی زمانه وخروج من خرج علیه فکان ذالک سببا لانتشار مناقبه من کثرة من کان بینها من الصحابة رداعلیٰ من خالفه فکان الناس طائفتین لکن المبتدعة قلیلة، ثم کان من امر علی ما کان، فنجمت طائفة اخری حاربوه ،ثم اشتد الخطب فتنقصوه واتخذوا لعنه علی المنابر سنة ووافقهم الخوارج علی بغضه وزادوا حتی کفروه مضموما ذلک منهم الی عثمان فصار الناس فی حق علی ثلاثة: اهل السنة، والمبتدعة من الخوارج، والمحاربین له من بنی امیة واتباعهم، فاحتاج اهل السنة الی بث فضائله فکثر الناقل لذلک لکثرة من یخالف ذلک، والا فالذی فی نفس الامر ان لکل من الاربعة من الفضائل اذا حرر بمیز ان العدل لا یخرج عن قول اهل السنة والجماعة اصلا (فتح الباری: ۷/۷۱)

یہ درست ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں قاتلینِ عثمان کو بروقت عدالتی کٹہرے میں لا کران پر مقدمہ نہ چلایا جاسکا مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے قصاص کے معاملے کو ترک کر کے قاتلوں کو اپنے گرد جمع کیے رکھا۔ درحقیقت قتل میں براہِ راست شریک کسی ایک شخص کے متعلق بھی کوئی تاریخی گواہی نہیں ملتی کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ہو۔

ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ برپا کرنے والے باغی پانچ قسم کے تھے:

❶ کچھ عبداللہ بن سبا کی طرح پسِ پردہ تھے جن کے خلاف کوئی ثبوت یا سراغ نہ تھا۔ بغیر ثبوت کے ان پر سزا کیسے جاری کی جاتی؟ ❷ کچھ لوگ عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کی طرح غلط طور پر قاتل مشہور کر دیے گئے تھے۔ ❸ کچھ قاتل موقع پر مارے گئے تھے جیسے سُودان بن حُمران، کلثوم بن تُجَیب اور قُتَیرہ۔[1] ❹ کچھ قاتل زندہ مگر مفرور تھے۔ وہ شام و مصر کے سرحدی کوہستان میں روپوش رہے۔ ایک مدت تک ان کی کوئی اطلاع بھی نہ تھی۔ وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مکمل کنٹرول بھی نہ تھا بلکہ بہت جلد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی عمل داری میں شامل کر لیا۔ اس لیے مصر کے قاتلینِ عثمان کا معاملہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمے نہیں رہا۔[2]

ممکن ہے کہ کچھ قاتل بصرہ اور کوفہ کے بھی ہوں مگر ان کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگِ بصرہ میں قتل ہو کر اپنے انجام پہنچ گئے ہوں[3] اور کچھ مجرم خوارج میں شامل ہو کر جنگِ نہروان میں قتل ہو گئے ہوں۔ بہرکیف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر بلکہ تمام حدودِ مملکت میں بھی کسی ایسے شخص کی موجودگی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ وار کے ملزم کے طور پر نامزد ہو، کسی ضعیف روایت میں بھی منقول نہیں۔

❺ پانچویں قسم کے لوگ عام شورش پسند تھے۔ ان میں سبائی بھی تھے اور دوسرے جہلاء بھی۔ یہ براہِ راست قاتل نہ تھے۔ تعصب یا حماقت کے باعث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں شریک ہوئے مگر پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر کے شرعاً مامون ہو گئے۔ اہلِ شام ان سب کو قاتلِ قصاص سمجھتے تھے اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو الزام دیتے رہے۔ حالانکہ انہیں ساتھ ملائے رکھنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر شرعاً کوئی الزام نہیں آسکتا۔

سیاسی حکمت اور احتیاط کے تحت آپ رضی اللہ عنہ نے ایک مدت تک سبائیوں کی پردہ پوشی ضرور کی مگر نہروان میں ان کے عسکری بازو کو ٹھکانے لگانے کے بعد آپ نے بلا دھڑک ان کی بدعقیدگی کا غلاف چاک کر ڈالا اور ابن سبا سمیت تمام بدعقیدہ لوگوں سے کھل کر بیزاری کا اظہار کیا۔ انہیں باز رہنے کی بار بار تاکید کی۔ بعض مواقع پر ایسے زندیقوں اور بد دینوں کو سزائے موت دے کر نشانِ عبرت بھی بنایا۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۸۹/۴ تا ۳۹۲

② مصری گروہ میں سے کِنانہ بن بِشر قاتلوں میں تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۷۳/۳، ط صادر) مصر پر قبضے کے بعد (غالباً سن ۳۸ھ میں) حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے فلسطین کے گورنر نے اسے سزائے موت دی۔ (تاریخ دمشق: ۲۶۰،۲۵۹/۵۰؛ الاصابہ: ۴۸۶/۵؛ الاعلام للزرکلی: ۲۳۴/۵)

③ صرف حُرقوص بن زُہیر بچ کے نکل گیا تھا مگر وہ بھی بعد میں جنگِ نہروان میں مارا گیا۔

حکمران کی اصل کامیابی کیا ہے؟

رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سبائیوں اور خارجیوں کو بالکل ختم کیوں نہ کر سکے اور ان کی شر انگیزیاں بعد میں بھی کیوں جاری رہیں؟ تو دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی بھی قائد سے ایسی اُمیدیں وابستہ کرنا ایک محال کام کی توقع کرنے کے مترادف ہے۔ سبائیت ہو یا خارجیت، یہ سب نظریاتی فتنوں کی شکلیں ہیں جو زمانے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ دنیا کے ہر معاشرے میں ایسی تنظیمیں یا تحریکیں ہر دور میں موجود چلی آئی ہیں۔ ان سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانا ایسا ہی مشکل ہے جیسے گندم میں گھن پیدا ہونے کو روکنا۔ جہاں کھیت ہے وہاں کچھ موذی کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ ان چیزوں کو کبھی کبھار ایک حد تک برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔ جہاں ٹھنڈا سایہ ہو وہاں کچھ فاصلے پر کڑی دھوپ بھی ہوتی ہے اور گلاب اپنی لطافت و نزاکت کے باوجود کانٹوں کے درمیان نظر آتا ہے۔

ایک حکمران کے لیے اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں آئین اور قانون کا پابند ہو، ملکی سلامتی و امن و امان کے لیے کوشاں رہے، رعایا کے حقوق ادا کرتا رہے اور مخالفین کے بارے میں بھی آئین سے تجاوز نہ کرے۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے شرع کے دائرے میں رہتے ہوئے سیاست یا جنگ میں جو کامیابیاں حاصل کیں وہ کم نہ تھیں...... مگر جہاں عام آدمی کو ان کامیابیوں کا گراف بڑھانے کے لیے شریعت، اسوۂ رسول اور اسلامی آئین کے دائرے سے باہر قدم نکالنے میں مصلحت نظر آتی تھی وہاں آپ رضی اللہ عنہ مصلحت کو ترک کر کے شرع کی پاسداری کو اہم سمجھتے تھے۔ یہ بات قانون سے ناواقف لوگوں یا اس کی اہمیت نہ سمجھنے والوں کی نگاہ میں چاہے کم درجے کی سیاست ہو مگر ایک مثالی حکمران کے لیے یہی کامیابی کی معراج ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قانون و آئینِ شرع کی پابندی کرتے ہوئے اور فتوحات کے بعض مواقع سے دست کش ہوتے ہوئے بھی جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، ان مخدوش ترین حالات میں کوئی بہتر سے بہتر حکمران بھی اس سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اگر کوئی کہے کہ آپ رضی اللہ عنہ امت کو متحد نہ کر سکے تو ہم کہیں گے کہ اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں، بلکہ ان پر ہے جو فتنہ و فساد پھیلانے میں سرگرم رہے۔ آپ رضی اللہ عنہ پر جس قدر کوشش اور سعی کی ذمہ داری تھی، وہ آپ نے بخوبی انجام دی۔ اُمت کو سیاسی طور پر متحد نہ کر سکنے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے اتحاد کی بنیاد یعنی صحیح عقیدے اور شریعت کو ضرور بچا لیا تھا۔ آپ نے ایک طرف اسلام کے خلاف چھیڑی گئی نظریاتی واعتقادی جنگ کا حکمت و جرأت سے سامنا کیا اور دوسری طرف شامی بھائیوں سے سیاسی اختلاف کے باوجود آپ نے امت کی اکثریت کو راہِ حق سے بھٹکنے نہیں دیا۔ ایک اقلیت کے سوا پورے عالمِ اسلام میں لوگوں کا عقیدہ اور مسلک و مشرب وہی رہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کرام کا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذہب و مسلک کے لیے گزشتہ خلفاء کو معیار بنایا اور انہیں اپنا پیشرو قرار دیا۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے محبت کرنے والوں اور ان سے نفرت کرنے والوں میں ایک خطِ امتیاز آپ رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں کھینچا گیا اور آپ نے متعدد مواقع پر خود کو ان گزشتہ خلفاء کا مداح قرار دے کر بتا دیا کہ آپ کن کے ساتھ

ہیں اور اہلِ حق کون ہیں۔ چنانچہ اہلِ شام سیاسی اختلافات کے باوجود اعتقاد میں آپ سے الگ نہ تھے۔ سیاسی عدم اتحاد کے باوجود مسلک ومشرب کے معاملے میں آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو دنیا وآخرت کے لحاظ سے اپنے زمرے میں شامل قرار دیا، چنانچہ جمل کے تمام مقتولین کی نمازِ جنازہ آپ نے خود پڑھائی۔ صفین کے شہداء کے بارے میں فرمایا: قتلانا وقتلاھم فی الجنة. ''ہمارے اور ان کے مقتولین جنت میں ہیں۔''[1]

عقیدے اور نظریے کے بارے میں آپ رضی اللہ عنہ کی اس دوٹوک حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند برس الگ الگ رہ کر بھی پورا عالمِ اسلام ایک ہی سچے دین کا اس کی اصل حالت میں پیروکار رہا اور آپ کے بعد جلد ہی تمام مسلمان ایک بار پھر متحد ہو گئے اور ان کے سوادِ اعظم میں کوئی نظریاتی امتیاز زیادہ مدت تک پنپ نہ سکا۔

اس بحث کو ہم علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کے نہایت معتدل اور حقیقت پسندانہ تبصرے پر ختم کرتے ہیں:

''جب حضرت علی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین فتنے نے سر اٹھایا، جو عصبیت کا لازمی نتیجہ تھا، تو اس میں بھی صحابہ کرام کا طریقہ حق واجتہاد کا تھا۔ ان کی باہمی جنگ کسی دنیاوی غرض سے یا باطل کو ترجیح دینے کے لیے یا نفرت وعداوت کی وجہ سے نہیں تھی جیسا کہ بے ادب اور وہمی لوگ گمان کرتے ہیں اور بے دین وملحد لوگ بھی یہی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ درحقیقت حق میں ان کا اجتہاد مختلف تھا۔ اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق ہر کوئی دوسرے کو غلطی پر سمجھتا تھا اور وہ حق ہی کے لیے لڑتے تھے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اجتہاد صحیح اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد غلط تھا۔ تاہم جنگ پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی باطل کے ارادے سے قائم نہ تھے، بلکہ حق کی نیت سے قائم تھے۔ یہی حال اس زمانے کے عام مسلمانوں کا تھا کہ اپنی اپنی رائے کے مطابق سب حق پر قائم تھے، باطل کی طرف جھکا ہوا کوئی بھی نہ تھا۔ فرق اتنا تھا کہ کسی کا اجتہاد صحیح تھا اور کسی کا غلط۔ اور مجتہد کو غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے۔''[2]

☆☆☆

---

[1] مصنف ابن أبی شیبہ، روایت نمبر: ۳۸۸۸۰

[2] مقدمۃ ابن خلدون، باب: ۳، فصل: ۲۸

اُمت کے سوادِ اعظم کے بالمقابل فرقہ بندی

اُمت کے سوادِ اعظم کے مقابلے میں عراق اور شام میں کچھ تشدد پسند عناصر بہر حال موجود تھے۔ اہلِ شام کا متشدد طبقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سادات سے بغض رکھتا تھا۔ اہلِ عراق میں سے کچھ لوگ شامی صحابہ کو گمراہ اور بے دین کہتے تھے، کچھ نے بات بڑھا کر خلفائے ثلاثہ کو بھی مطعون کرنا شروع کر دیا۔ یہی غلو اور تشدد فرقہ بندی کی بنیاد تھا۔

شروع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تمام پیروکاروں کو "شیعانِ علی" کہا جاتا تھا مگر یہ کوئی الگ فرقہ نہیں بلکہ ایک سیاسی جماعت تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروکار تھی۔ احادیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کی کثرت دیکھ کر ان میں سے کچھ کا خیال یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا مشکل ہے۔ کچھ یہ کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب زیادہ ہیں لہٰذا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ جب کہ ایک بہت بڑی تعداد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانثار ہوتے ہوئے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان سے افضل مانتی تھی جیسا کہ جمہور علمائے اسلام کا قول ہے۔ اس جماعت کے اکثر لوگ اسی صحیح عقیدے اور نظریے سے وابستہ تھے جس کی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ زبان اور عمل سے تعلیم دیتے رہے۔ یہی عقیدہ غیر جانب دار صحابہ و تابعین کا تھا۔

جس طرح ان صحابہ و تابعین کو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سیاسی حامی تھے، شیعانِ علی کہا جاتا تھا، اسی طرح ان صحابہ و تابعین کو جو قصاصِ عثمان کے لیے اٹھے تھے، شیعانِ عثمان، عثمانی یا شیعانِ معاویہ کہا جانے لگا۔ جس طرح شیعانِ علی میں سے صحابہ اور کبارِ تابعین کا عقیدہ، ایمان اور تقویٰ شک و شبہے سے بالاتر ہے، اسی طرح عثمانی حضرات میں سے بھی صحابہ کرام اور تابعین عظام قرآن و سنت کے مطابق عقیدے و عمل کے پابند تھے۔[1]

شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان کے اکثر حضرات بعد میں بھی اعتقادی و نظریاتی طور پر اسی طرح قرآن و سنت کے پیرو کار رہے اور سابقہ اختلاف کو ایک مناسب محل میں رکھ کر ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔ دونوں طبقوں کے حضرات اور ان کے ساتھ غیر جانب دار طبقہ مل کر جمہور مسلمین کا طبقہ "اہلِ سنت والجماعت" کہلانے لگا۔

مگر کچھ لوگ اس خطِ مستقیم سے منحرف ہو کر سوادِ اعظم سے آہستہ آہستہ دور نکل گئے۔ ظاہر ہے کہ صراطِ مستقیم سے ابتدائی انحراف معمولی ہی ہوتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ بڑھ کر بڑی گمراہی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان میں سے متشدد لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

"شیعانِ علی" میں ایک مختصر گروہ ان بدعقیدہ لوگوں کا بھی تھا جو عبداللہ بن سبا کے سحر کا شکار تھا۔ ان بدعقیدہ شیعوں

① قال الامام ابن تیمیة: "وانّهم طائفة من الشیعة الاولیٰ یفضل علیّ علیٰ عثمان، ولم یُتهم احد من الشیعة الاولیٰ بتفضیل علیّ علیٰ ابی بکر وعمر، بل کانت عامة الشیعة الاولیٰ الذین یحبون علیاً یفضلون علیه ابابکر وعمر، لکن فیهم طائفة ترجحه علیٰ عثمان، وکان الناس فی الفتنة صاروا شیعتین: شیعة عثمانیة وشیعة علویة، ولیس کل من قاتل مع علیّ کان یفضله علیٰ عثمان، بل کان کثیر منهم یفضل عثمان علیه کما هو قول سائر اهل السنة." (منهاج السنة: ۱/۱۸۵)

سے خود کو الگ کرنے کے لیے، صحیح العقیدہ "شیعانِ علی" کو "شیعہ مخلصین"، "شیعہ متقدمین" یا "شیعہ اولیٰ" کہا جانے لگا جن میں بہت سے صحابہ، جلیل القدر تابعین اور بے شمار تبع تابعین شامل تھے۔ یہ شیعہ مخلصین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت ہوگئے، اس طرح مسلمان پھر یکجا ہوگئے۔ شیعانِ مخلصین علمی اور اصلاحی خدمات میں مشغول رہے، اس لیے علماء و محدثین میں ان کی بہت بڑی تعداد ملتی ہے۔

شدت پسند شیعانِ علی کی تین قسمیں:

اقلیتی شدت پسند گروہ رفتہ رفتہ ملت کے عمومی دھارے سے الگ ہوگیا۔ اس میں تین قسم کے لوگ تھے:

① **معمولی شدت پسند:** یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ سے افضل مانتے تھے مگر کسی صحابی پر لعن طعن نہیں کرتے تھے، یہ تفضیلیہ کہلائے۔ شیعوں کا زیدی فرقہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

② **گمراہ:** یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل ماننے کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو ظالم، غاصب اور کافر قرار دیتے تھے۔ یہ ابن سبا کے شاگرد تھے اس لیے "سبئیہ" یا "سبائی" کہلاتے تھے، یہ صحابہ کرام پر تبرا کرتے تھے، اس لیے "تبرئیہ" یا "تبرائی" بھی کہلاتے تھے۔ بعد میں ظاہر ہونے والے شیعی فرقے جیسے: اثنا عشریہ، اسماعلیہ وغیرہ اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

③ **انتہائی بدعقیدہ:** یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا، خالق اور رازق کہتے تھے، یہ عبداللہ بن سبا کے خصوصی مرید تھے۔ انہیں "شیعہ غلاۃ" کہا جاتا تھا۔ مست ملنگ قسم کے رافضی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

گمراہ شیعوں کی تعداد بڑھ گئی تو "شیعہ مخلصین" نے غیر جانب دار طبقے کے ساتھ مل کر اپنی الگ پہچان اور شناخت کے لیے "اھل السنۃ والجماعۃ" کا لقب اختیار کرلیا۔ شیعہ تفضیلیہ بھی انہی کے زمرے میں شامل ہوگئے۔ [1]

مروانیوں اور ناصبیوں کا تعارف:

عثمانیوں میں سے بھی کچھ تشدد پسند اور متعصب لوگ اُمت کے دھارے سے الگ ہوگئے۔ انہوں نے تحریکِ قصاصِ عثمان کے مخالف یا اس سے تعلق نہ رکھنے والے ہر شخص کے ایمان کو مشکوک سمجھنا شروع کردیا اور اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی صف میں شامل جلیل القدر صحابہ کی بھی رعایت نہ کی۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ظالم اور نااہل ثابت کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی ضرورت تھی لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید اور بنو ہاشم کی توہین بھی اس جماعت کا شعار بن گیا۔ یہ گروہ "ناصبی" یا "مروانی" کہلانے لگا۔ [2] بعض اموی اور ہاشمی اکابر باہمی احترام، ہدایا کے تبادلے، رشتے ناتوں اور میل ملاپ کے ذریعے تعصب اور تشدد کی اس فضا کو ختم کرنے کی کوششیں کرتے رہے مگر جس طرح عراق کا

---

① مختصر التحفۃ الاثنی عشریۃ، ص ۳ تا ۱۰

② جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اردگرد اشترنخعی جیسے انتہا پسندوں کو برداشت کر رہے تھے، اسی طرح حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی ایسے شدت پسندوں کو ساتھ ملائے ہوئے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ظالم و غاصب سمجھتے تھے۔

تشدد پسند گروہ، بنوامیہ کے سخت مخالف تھا اسی طرح اہلِ شام کا ناصبی گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں سے متنفر رہا۔[1] یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب دو گروہوں میں سیاسی کش مکش ہوتی ہے تو فریقین کے متشدد لوگ مخالف قیادت کے بارے میں منفی باتیں عام کرتے ہیں اور اسے کسی بھی طرح بدنام کر کے اپنی گروہ کی ساکھ کو مضبوط کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ خود ایسی باتیں گھڑتے ہیں، کچھ انہیں بڑے اخلاص اور خشوع وخضوع کے ساتھ پھیلاتے ہیں اور بہت سے لوگ ان بے پر کی باتوں پر پختہ یقین کر لیتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سیاسی اختلاف کو اپنے دائرے میں رکھتے ہیں اور مصدقہ باتوں کے سوا، کسی بات کا کوئی اثر نہیں لیتے۔

چنانچہ اہلِ عراق اور اہلِ شام کی کش مکش کو بڑھانے میں ایسے لوگ اگلے عشروں میں پوری طرح سرگرم رہے۔ اس دوران شیعی اور مروانی راویوں کی نشر کردہ بہت سی من گھڑت اور بہت سی مبالغہ آمیز باتیں اگلی نسل کے ذخیرۂ روایات

---

[1] شیعہ یا روافض کا ایک الگ فرقہ ہونا اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر ناصبیوں کو عوام تو کجا بعض اوقات خواص بھی نہیں پہچان پاتے اور ان کی شیعہ مخالف تحریرات پڑھ کر ان کے نہ صرف معتقد ہو جاتے ہیں بلکہ انہی کو صحابہ کرام کا سچا عاشق اور بہترین وکیل تصور کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعد میں یہی لوگ ناصبی علماء کی تحریر وتقریر میں گھلا ہوا بنو ہاشم اور ساداتِ کرام کی تنقیص کا زہر بھی پی جاتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اسے صحابہ کے دفاع کا ایک ناگزیر پہلو سمجھنے لگتے ہیں۔

نواصب کے تعارف اور اسلامی معاشرے میں ان کے آغاز اور فروغ کی وضاحت کے لیے امام ابن تیمیہ کی "منہاج السنۃ" کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ اگرچہ "منہاج السنۃ" روافض کے خلاف لکھی گئی تھی اور اس میں جہاں بھی ناصبیوں کا ذکر آیا ہے وہ ضمناً آیا ہے اور عموماً روافض کو الزامی جواب دینے کے لیے ناصبیوں کا حوالہ دیا گیا ہے مگر اس کے باوجود اس سے ناصبیوں کی اچھی خاصی قلعی کھل جاتی ہے۔ یہاں "منہاج السنۃ" کی ایسی چند عبارات پیش کی جارہی ہیں:

(1) ورعیۃ معاویۃ شیعۃ عثمان، وفیھم النواصب المبغضون لعلیّ، فتکون شیعۃ عثمان. "حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی رعایا عثمانی گروہ تھا، ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے ناصبی بھی تھے پس وہ شیعانِ عثمان تھے۔" (منہاج السنۃ: ۵/۲۶۶)

(2) فتبین ان ھؤلآء المنسوبین الی النصب من شیعۃ عثمان.
"پس اس سے ظاہر ہو گیا کہ یہ لوگ جو ناصبیت کی طرف منسوب ہوئے، شیعانِ عثمان میں سے تھے۔" (منہاج السنۃ: ۳/۳۹۰)

(3) النواصب الذین یفسقونہ انہ کان ظالما طالبًا للدنیا وانہ طلب الخلافۃ لنفسہ، وقاتل علیھا بالسیف وقتل علیٰ ذالک الوفا من المسلمین حتیٰ عجز عن انفرادہ بالامر وتفرق علیہ اصحابہ وظھروا علیہ فقتلوہ. "ناصبی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فاسق قرار دیتے ہیں کہ وہ ظالم اور دنیا کے طالب تھے انہوں نے خلافت اپنے لیے طلب کی اور اس کی خاطر تلوار چلائی اور اس بات پر ہزاروں مسلمان مروا دیے یہاں تک کہ وہ تنہا حکومت سنبھالنے سے عاجز آ گئے اور ان کے ساتھی بکھر کر ان کے مخالف بن گئے اور ان پر غالب آ کر انہیں قتل کر دیا۔" (منہاج السنۃ: ۲/۵۹)

(4) "وقد صنف لھم (ای للنواصب) فی ذلک مصنفات مثل کتاب المروانیۃ الذی صنفہ الجاحظ، وطائفۃ وضعوا لمعاویۃ فضائل ورووا احادیث عن النبی ﷺ فی ذلک، کلھا کذب ولھم فی ذلک حجج طویلۃ."
"ناصبیوں کے لیے کئی کتب لکھی گئی ہیں جیسے کتاب المروانیہ جسے جاحظ نے تصنیف کیا۔ اور ایک جماعت نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فضائل گھڑے اور اس بارے میں حضور ﷺ سے احادیث نقل کیں جو سب کی سب جھوٹ ہیں۔ اس باب میں ناصبیوں کے متعلق طویل دلائل ہیں۔" (منہاج السنۃ: ۴/۴۰۰)

شیخ صالح بن عبدالعزیز نے "عقیدۂ طحاویہ" کی شرح میں ناصبیت کی تشریح بہت اچھی طرح کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

النواصب ھم الذین یناصبون العداء للصحابۃ عقیدۃً فھم ضد الشیعۃ یعنی من مدحہ الشیعۃ ھم یناصبونہ، تجد انھم مدحوا علیا فھم یناصبون علیا العداء، ویتولون معاویۃ ویتولون یزید بن معاویۃ ضد الحسین.

"ناصبی وہ ہیں جنہوں نے صحابہ کو دشمنی کا نصب (ہدف) بنالیا ہے، پس یہ لوگ شیعوں کی ضد ہیں یعنی جس کی شیعہ تعریف کرتے ہیں، ناصبی اسے ہدفِ تنقید بنالیتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح کرتے ہیں تو ناصبی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دشمنی کا ہدف بنالیتے ہیں، اور ناصبی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے دشمنی کے لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔" (اتحاف السائل بما فی الطحاویۃ من المسائل: ۱۲/۴۵)

حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی مرحوم نے برصغیر میں ناصبیت کے علم بردار محمود احمد عباسی کی تردید میں جو تحقیقی کام کیا ہے، وہ ناصبیت کا پول اچھی طرح کھول دیتا ہے۔ قارئین کو مولانا مرحوم کی کتب "حادثۂ کربلا کا پس منظر"، "یزید کی شخصیت اہلِ سنت کی نظر میں" اور "ناصبیت تحقیق کے بھیس میں" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

میں ضم ہوگئیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جعلی یا مبالغہ آمیز روایات کی نشر واشاعت میں زیادہ حصہ ان متشدد اہلِ تشیع کا رہا جو رفض کی حدود میں پہنچ گئے تھے۔مگر ایک حد تک یہی کام مروانی گروہ کے لوگ بھی کرتے رہے۔اسی لیے جس طرح ائمہ جرح وتعدیل نے شیعی راویوں میں سے ایک جم غفیر کو ضعیف، متروک اور کذاب قرار دیا، اسی طرح مروانی یا ناصبیوں میں سے بھی بہت سوں کو نا قابلِ اعتماد اور مجروح شمار کیا ہے۔ ①

فرقہ بندی کی ابتداء کیسے ہوئی؟ حافظ ذہبی علیہ الرحمۃ کی وضاحت:

حافظ ذہبی علیہ الرحمۃ اس زمانے میں فرقہ پرستی کے آغاز کی وجوہ کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیچھے بکثرت لوگ ایسے چھوڑے جو ان سے محبت کرتے تھے اور اس میں غلو کرتے تھے اور انہیں فوقیت دیتے تھے، یا تو اس لیے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کرم، سخاوت اور جود وعطا کے ساتھ ان پر حکومت کی تھی یا اس لیے کہ یہ لوگ شام میں ان کی محبت کے ماحول میں پیدا ہوئے تھے، اسی طرح ان کی اولاد بھی اسی ماحول میں پلی بڑھی۔ان میں صحابہ کی ایک قلیل جماعت تھی جبکہ تابعین اور فضلاء کی ایک کثیر جماعت تھی۔ان لوگوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوکر اہلِ عراق سے جنگ کی تھی اور نصب (مخالفت) کی بنیاد پر ان کی نشوونما ہوئی۔ہم جذبات کی پیروی سے اللہ ہی کی پناہ مانگتے ہیں۔اسی طرح خوارج کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر اور ان کی رعایا کی نشوونما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے، ان کے حق میں کھڑے ہونے، ان کے مخالفین سے بغض رکھنے اور ان سے اظہارِ برأت پر ہوئی تھی۔ان میں سے کچھ لوگوں نے تشیع میں غلو بھی اختیار کرلیا۔یاالٰہی! ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو ایک ملک میں پلے بڑھے ہوں اور انہوں نے (اپنے اپنے ملکوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے) محبت یا بغض میں غلو کرنے والوں کے سوا کسی کو نہ دیکھا ہو؟ تو ایسی صورت میں انصاف اور اعتدال کا وجود

---

① شیعی راویوں میں عمارۃ بن جوین (تقریب التهذیب، تر: ۴۸۴۰) ابراہیم بن الحکم (میزان الاعتدال: ۱/۲۷) عبدالرحمٰن بن مالک بن مغول (میزان الاعتدال: ۲/۵۸۴) عمرو بن شمر جعفی (میزان الاعتدال: ۳/۲۶۸) اور عیسیٰ بن مہران (میزان الاعتدال: ۳/۳۲۴) جیسی بے شمار مثالیں ہیں جنہیں کذاب اور متروک کہا گیا ہے۔ناصبیوں پر بھی جرح ہوئی ہے جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

❶ عثمان بن خالد بن عمر: الاموی متروك. (تقریب التهذیب، تر: ۴۴۶۴)

❷ سعید بن مسلمۃ الاموی: ضعیف. (الضعفاء والمتروكون للنسائی: ۱/۵۳، ط دار الوعی)

❸ صلت بن دینار الازدی: متروك ناصبی. (تقریب التهذیب، تر: ۲۹۴۷)

❹ عوانۃ بن الحکم: كان عثمانیا فكان یضع الاخبار لبنی امیة. (لسان المیزان: ۴/۳۸۶، مطبعه نظامیه هند)

تاہم قرنِ اول وثانی کے ناصبی راویوں میں بعض ایسے تھے جنہیں ناصبیت کے باوجود قابلِ اعتماد سمجھا گیا، مثلاً:

❶ خالد بن عبداللہ القسری: صدوق لكنه ناصبی. (میزان الاعتدال: ۱/۶۳۳)

❷ عبداللہ بن شقیق: بصری ثقة، لكنه فيه نصب. (میزان الاعتدال: ۲/۴۳۹)

❸ ابوقلابہ البصری: ثقة، قال العجلی فيه نصب يسير. (تقریب التهذیب، تر: ۳۳۳۳)

جیسا کہ شیعی رواۃ میں بھی صدوق اور ثقہ موجود ہیں مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جعل سازی کا تناسب شیعی (رافضی) رواۃ میں ناصبیوں سے کہیں زیادہ ہے۔

کہاں ہوسکتا ہے؟ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا کیا جس میں حق ظاہر ہے اور فریقین کی حیثیت واضح ہے، ہم فریقین میں سے ہر ایک کے دلائل کو جانتے ہیں اور (حقیقت کو) دیکھ چکے ہیں۔ پس ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں اور (ان کے لیے) استغفار کرتے ہیں۔ ہم اعتدال کو پسند کرتے ہیں۔ ہم باغیوں کے عمل کو بھی کسی مناسب تاویل یا ایسی غلطی پر جوان شاء اللہ معاف کردی جائے گی محمول کر کے، ان کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔ ہم ویسے ہی کہتے ہیں جیسا کہ ہمیں اللہ نے سکھایا:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ

"اے ہمارے رب! بخش دے ہمیں، اور ان کو بھی کہ جنہوں نے سبقت کی ہم سے ایمان میں، اور ہمارے دلوں میں اے اللہ! کوئی کجی نہ رکھیو ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لائے۔ ①

ہم ان حضرات سے بھی راضی ہیں جو فریقین سے الگ رہے جیسا کہ سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، محمد بن مسلمہ، سعید بن زید رضی اللہ عنہم اور بہت سے لوگ۔ ہم دین سے نکل جانے والے خوارج سے برأت ظاہر کرتے ہیں جنہوں نے حضرت علی سے جنگ کی اور فریقین کو کافر قرار دیا۔"②

☆☆☆

رجال اور روایت کی قبولیت میں روافض اور ناصبیوں کا انوکھا منہج:

رجال اور روایات کو قبول یا مسترد کرنے میں بھی روافض اور ناصبیوں کا اپنا اپنا ایک منہج ہے جس کی بنیاد محض تعصب پر ہے۔ رافضیوں کے منہج میں راوی یا روایت کی مقبولیت کا اصل معیار "رفض" ہے۔ اگر کوئی راوی خلفائے ثلاثہ پر طعن کرتا ہے تو وہ ان کے ہاں مقبول ہے، چاہے وہ علم، حافظے، دیانت اور صداقت میں کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ کذاب اور دجال مشہور ہو۔

دوسری طرف ناصبیوں کے ہاں راوی کی مقبولیت کا اصل معیار "ناصبیت" ہے، اگر کوئی راوی چاہے بخاری و مسلم کا ہو مگر اس سے یزید، مروان یا حجاج بن یوسف وغیرہ کے خلاف کچھ منقول نظر آجائے تو وہ ان کے ہاں ناقابلِ اعتبار ٹھہرے گا اور یہ لوگ اسے ثقہ یا صدوق سے گرا کر ضعیف، کذاب، شیعی بلکہ رافضی ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ضعیف و متروک بلکہ ابو مخنف جیسا کذاب بھی کہیں یزید یا حجاج کے حق میں یا حضرت حسن و حسین یا حضرت علی رضی اللہ عنہم کے خلاف کچھ نقل کر گیا ہو تو یہ لوگ اس روایت پر نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح جھپٹتے ہیں اور اسے بخاری و مسلم کی روایات پر بھی ترجیح دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ الحمد للہ! جمہور علماء افراط و تفریط کے ان دونوں راستوں سے ہٹ کر معتدل اصولوں کے مطابق رجال اور روایات کو قبول یا مسترد کرتے ہیں۔

① سورة الحشر، آیت: ۱۰

② سیر اعلام النبلاء: ۱۲۸/۳، ط الرسالة

عبداللہ بن سبا کا انجام کیا ہوا؟

عبداللہ بن سبا کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ وہ انہی ملحدین میں شامل تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خالق ورازق کہہ رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں زندہ جلا ڈالا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری اور سنن ابوداؤد میں ہے۔[1]

مگر صحیح بخاری اور سنن ابی داؤد کی ان روایات میں عبداللہ بن سبا کا نام مذکور نہیں، صرف اتنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ زندیقوں کو جلا دیا تھا۔ کچھ حضرات قیاس کر کے کہتے ہیں کہ ابن سبا انہی میں ہوگا۔

دوسری طرف اہلِ تشیع کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت زندہ تھا اور مدائن میں تھا (جہاں اسے شہر بدر کر کے بھیجا گیا تھا)۔ شہادت کی اطلاع ملنے پر اس نے خبر دینے والے کو کہا:

كَذَبْتَ اِن جِئْتَنَا بِدِمَاغِهٖ بِسَبْعِيْنَ صُرَّةٍ وَ اَقَمْتَ عَلٰى قَتْلِهٖ سَبْعِيْنَ عَدْلًا، مَا صَدَّقْنَاكَ، لِعِلْمِنَا اَنَّهٗ لَمْ يَمُتْ وَلَمْ يُقْتَلْ، وَلَا يَمُوْتُ حَتّٰى يَمْلِكَ الْاَرْضَ.

(تو جھوٹ بولتا ہے۔ اگر تو ان کا بھیجا، ستر تھیلیوں میں لا دے اور ان کے قتل ہونے پر ستر عادل گواہ پیش کر دے، تب بھی ہم تیری تصدیق نہ کریں گے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہ مرے نہ قتل ہوئے۔ وہ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک پوری دنیا پر قابض نہیں ہو جاتے۔)[2]

اندازہ یہی ہے کہ عبداللہ بن سبا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک زندہ تھا۔ چونکہ وہ پسِ پردہ رہ کر سازشیں کرنے والا ماسٹر مائنڈ تھا، لہٰذا کسی کو خبر نہیں ہو سکی کہ کب اور کہاں مرا۔ اسی لیے تاریخ اس کے انجام کے متعلق خاموش ہے۔

☆☆☆

---

① صحيح البخاري، ح: ٦٩٢٢، كتاب استتابة المرتدين، باب حكم المرتد
سنن ابی داؤد، ح: ٤٣٥١، كتاب الحدود، باب الحكم في من ارتد ، لسان الميزان: ٣/٢٨٩

② فرق الشيعة، حسن بن موسىٰ نوبختي (م ٣١٠ هجري)، ص ٢٣
ابن سبا کے اس دعوے کے پیچھے یہودیوں کے اس عقیدے کی چھاپ صاف محسوس ہوتی ہے جس کے مطابق ایک دن مسیح دجال کا ظہور ہوگا اور وہ اپنے پیرو کاروں کے لیے ساری دنیا فتح کرے گا۔

اسباقِ تاریخ

- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ایک مہربان، خدا ترس اور عوام دوست حکمران کا بہترین نمونہ ملتا ہے۔ ان کی سیرت کا مطالعہ ہر اس قائد اور حاکم کو ضرور کرنا چاہیے جو اپنی آخرت کے لیے فکر مند ہو۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رہن سہن اور تمدن میں سابقہ پالیسی کو نرم کر کے عزیمت و رخصت اور جواز و عدم جواز کی حدود کو واضح کیا۔ اس طرح تہذیب و تمدن میں وہ راہِ اعتدال سامنے آ گئی جس پر تا قیامت مسلمان چل سکتے ہیں۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حزبِ اختلاف کے وجود کو برداشت کر کے اسلامی سیاست کے ایک اہم اصول کا عملی اطلاق کر دکھایا۔ انہوں نے عملی تعلیم دی کہ حزبِ اختلاف جب تک مسلح ہو کر بغاوت نہیں کرتی، صرف سیاسی احتجاج اور تنقید و اعتراض کی حد تک رہتی ہے، اسے چھوٹ دینی چاہیے۔ انتقام کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر دل عزیز حاکم ہوتے ہوئے بھی حزبِ اختلاف کے کھوکھلے الزامات کا کھلی کچہری میں سامنا کیا اور ہر بات کا جواب دیا۔ ایک کامیاب اور رعایا پرور حاکم کا کردار یہی ہوتا ہے۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قوتِ اقتدار کے باوجود سیاسی مخالف مسلمانوں کے خون میں ہاتھ رنگنے اور مدینہ منورہ کی بے حرمتی میں شریک ہونے سے خود کو اور دوسرے مسلمانوں کو حتی الامکان بچایا۔ اس پالیسی پر ثابت قدم رہنے میں اپنی جان جانے کی پروا بھی نہ کی۔ ایک طویل زمانے سے طاقت ہاتھ میں آتے ہی خونِ مسلم سے بے دریغ ہاتھ رنگنا حکمرانوں کا معمول چلا آ رہا ہے۔ اس تناظر میں سیرتِ صحابہ کا یہ باب لمحۂ فکریہ ہے۔
- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی معاشرے میں حزبِ اختلاف کے وجود کی گنجائش رکھی بشرطیکہ وہ پُر امن رہے اور فتنہ بلوہ نہ مچائے۔ اسی بناء پر آپ نے باغیوں کی بیعت قبول کی، خوارج کو مہلت دیتے رہے مگر جب وہ خونریزی پر آئے تو آپ نے انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا کر چھوڑا۔
- جنگِ جمل اور صفین مسلمانوں کی تاریخ کے دو ابتدائی بڑے سانحے، گھمبیر حادثے اور نہایت ہی تلخ تجربات تھے مگر قدرتِ الٰہیہ نے صحابہ کے مابین اس سیاسی کش مکش اور ان جنگوں سے مسلمانوں کی نفسیاتی، فکری اور عملی تربیت کا ایسا کام لیا جو کسی اور طرح ممکن نہ تھا۔ ان اختلافات اور مناقشوں کی وجہ سے سیاسی امور میں مسلمانوں کی ذہنی پختگی اور فکری و عملی تربیت کا جو سرمایہ مہیا ہوا وہ شاید جغرافیائی فتوحات کے کئی دروازے کھلنے سے بھی نصیب نہ ہوتا۔
- ان جنگوں میں مخالفین سے برتاؤ نے فقہی مسائل کے لیے دلائل فراہم کیے۔ باغیوں سے متعلق اکثر فقہی

احکام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت ہی سے لیے گئے ہیں۔ ائمہ مجتہدین نے مشاجرات کو اسی نگاہ سے دیکھا کہ ان میں ہمارے لیے راہِ عمل کیا نکلتی ہے، چنانچہ انہوں نے ان روایات سے درجنوں احکام اخذ کیے۔[1]

اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''اگر لڑائی کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسوہ سامنے نہ ہوتا تو کوئی نہ جان سکتا کہ مسلمانوں سے لڑائی کے متعلقہ احکام کیا ہیں۔''[2]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''مسلمانوں نے مشرکین سے قتال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اختیار کی۔ مرتدین سے قتال میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت اختیار کی اور باغیوں سے قتال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طریقہ اختیار کیا۔''[3]

جنگِ صفین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صداقت کا بھی بہت بڑا ثبوت بن گئی کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما گئے تھے: ''قیامت برپا ہونے سے پہلے پہلے مسلمانوں کی ایسی دو جماعتیں آپس میں لڑیں گی جن کا دعویٰ (یعنی دین) ایک ہی ہوگا۔''[4]

شارحین حدیث کے نزدیک اس پیش گوئی کا مصداق صفین میں شریک دونوں فریق ہیں۔ ایسی سچی خبریں نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

---

① ایسی عبارات بے شمار ہیں۔ شاید ہی فقہ کی کوئی بڑی کتاب ان سے خالی ہو۔ یہاں فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی اور فقہ حنبلی سے چند مثالیں پیش کی جا رہی ہے:

فقہ حنفی: ولا یسبی لهم ذریة ولا یقسم لهم مال، لقول علی رضی اللہ عنہ عنه یوم الجمل: ولا یقتل اسیر ولا یکشف ستر ولا یؤخذ مال وهو القدوة فی هذا الباب. (هدایة، جلد ثانی، کتاب السیر، باب البغاة)

ولا بأس بالقتال بسلاحهم وکراعهم عند الحاجة الیه، معناه اذا کان لهم فئة فیقسم علیٰ اهل العدل لیستعینوا به علیٰ قتالهم ولانه یجوز الامام ان یأخذ سلاح المسلمین عند الحاجة فهذا اولیٰ، وهو مأثور عن علی رضی اللہ عنہ ایضاً یوم البصرة. (الاختیار لتعلیل المختار: ۴/۱۵۲)

فقہ شافعی: قال الامام الشافعی رحمه الله تعالیٰ: والحرب یوم صفین قائمة ومعاویة یقاتل جادًا فی ایامه کلها منتصفا او مستعلیاً وعلیٌ یقول لاسیرٍ من اصحاب معاویة: لا اقتلک صبراً. (الام للشافعی: ۴/۲۳۷، ط المعرفة)

فقہ حنبلی: واجمعت الصحابة رضی الله عنهم علیٰ قتال البغاة، فان ابابکر رضی اللہ عنہ قاتل مانعی الزکوة وعلیٌ رضی اللہ عنہ قاتل اهل الجمل وصفین واهل النهروان. (المغنی لابن قدامة: ۴/۵۲۳)

ویجب علی الامام ان یراسلهم ای البغاة ویسألهم ما ینقمون منه لان ذالک طریق الی الصلح و وسیلة الی الرجوع الی الحق وقد رُوی ان علیاً راسل اهل البصرة قبل الجمل. (کشف القناع عن متن الاقناع للامام منصور بن یونس البهوتی الحنبلی: ۶/۱۶۲، ط العلمیة)

فقہ مالکی: الرابعة جواز قتال کل منع حقاً علیه وقاتل الصدیق رضی اللہ عنہ مانعی الزکوة بتاویل وقاتل علی رضی اللہ عنہ البغاة الذین امتنعوا من بیعته وهم اهل الشام. (الذخیرة لاحمد بن ادریس القرافی: ۱۲/۶، ط دار الغرب الاسلامی بیروت)

لم یتبع المنهزمین یوم الجمل ولا ذفف علی الجرحیٰ لانهم لم تکن لهم فئة ولا امام یرجعون الیه واتبع المنهزمین یوم صفین لان لهم امام وفئة. (المختصر الفقهی لابن عرفة: ۱۰/۱۷۴، مؤسسة خلف احمد)

② بغیة الطلب: ۱/۳۰۲

③ "اخذ المسلمون السیرة فی قتال المشرکین من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم" و "اخذوا السیرة فی قتال المرتدین من ابی بکر رضی اللہ عنہ واخذوا السیرة فی قتال البغاة من علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ". (الحاوی الکبیر شرح مختصر المزنی للامام الماوردیؒ (م ۴۵۰ھ)، ط العلمیة)

④ "لا تقوم الساعة حتیٰ تقتتل فئتان عظیمتان، یکون بینهما مقتلة عظیمة، دعوتهما واحدة". (صحیح البخاری، ح: ۷۱۲۱، کتاب الفتن، باب خروج النار؛ صحیح مسلم، ح: ۷۴۳۸، الفتن، باب اذا تواجه المسلمان بسیفیهما)

جمہور علمائے اسلام جنگِ جمل اور صفین میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مجتہدِ مصیب اور بالمقابل فریق کو مجتہدِ مخطی قرار دیتے آئے ہیں؛ اس لیے کہ:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ شرعی خلیفہ مقرر ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے تمام گروہوں پر ان کی اطاعت واجب تھی۔

② کچھ ایسی صحیح روایاتِ حدیث موجود تھیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا برحق ہونا واضح ہو جاتا تھا، مثلاً:

❶ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا: ''تقتلک الفئة الباغية.''[1]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین دونوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور جنگِ صفین میں انہی کے پرچم تلے شہید ہوئے تھے۔

❷ صحیح احادیث میں اولیٰ بالحق جماعت کے لیے بشارت ہے کہ وہی خارجیوں کو مغلوب کرے گی۔[2]

جنگِ نہروان کے بعد یہ حدیث بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقانیت کی گواہ بن گئی۔

مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے یہ دلائل کافی تھے مگر اس کے علاوہ بعض قرائن بھی اس کے مؤید بن گئے مثلاً:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس شام کے ایک قاضی آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آدابِ قضا کے بارے میں ان سے گفتگو کی۔ وہ قاضی صاحب جانے لگے تو اچانک انہیں کچھ یاد آیا۔ لوٹ کر کہنے لگے:

''میں نے خواب دیکھا ہے کہ سورج اور چاند آپس میں لڑ رہے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ستاروں کے لشکر ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تم کس کے ساتھ تھے؟'' قاضی صاحب نے کہا: ''سورج کے خلاف چاند کے ساتھ؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''نعوذ باللہ'' پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

"وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً"

(اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیوں کے طور پر پیدا کیا، پھر رات کی نشانی کو تو اندھیری بنا دیا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا)[3]

یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''چلے جاؤ! اللہ کی قسم تم آئندہ کبھی میرے تحت عہدے پر نہیں رہو گے۔''

بعد میں یہ قاضی صاحب جنگِ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔[4]

---

① صحیح مسلم، ح: ۷۵۰۶، کتاب الفتن، باب لاتقوم الساعة ؛ سنن الترمذی، ح: ۴۱۷۰، باب مناقب عمار رضی اللہ عنہ

② مسند الحمیدی، ح: ۷۴۴ ؛ مسند ابی داود طیالسی، ح: ۲۲۷۹ ؛ صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۷، ط دار الجیل

③ الاسراء: آیت ۱۲ ④ مسند الفاروق للحافظ ابن کثیر: ۵۴۸/۲ ؛ مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۰۷۰۵

اس روایت پر یہ اشکال نہ ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگر قاضی کو معزول کیا تھا تو اس سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی گورنری سے معزول کیوں نہ کر دیا۔ درحقیقت اس روایت میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہو کہ صفین کی جنگ ہوگی اور کن کن کے درمیان ہوگی۔ بس انہوں نے اتنا سمجھ لیا تھا کہ یہ قاضی صاحب کسی وقت کسی غلط جماعت کے ساتھ شامل ہو کر مصیب جماعت کے ساتھ لڑیں گے۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''نعوذ باللہ'' کہا اور احتیاطاً انہیں معزول کر دیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ روایت میں سنداً ضعف ہے۔ اگر کوئی اسے بالکل نظر انداز کر دے تو بھی جمہور اہل سنت کے مسلک کے مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ روایت فقط ایک ثابت شدہ بات کی تائید کے لیے پیش کی گئی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو بھی ایک زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب میں شک تھا۔[1]

ایک بار انہوں نے خواب دیکھا کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا ہوں، حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی تشریف فرما ہیں۔ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لایا گیا۔ دونوں کو ایک دروازے کے اندر لے جایا گیا اور دروازہ بند ہوگیا۔ پھر اچانک حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''ربِ کعبہ کی قسم! میرے حق میں فیصلہ ہوگیا۔'' پیچھے پیچھے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی باہر آئے اور فرمایا: ''ربِ کعبہ کی قسم میری بخشش کردی گئی۔''[2]

غرض مذکورہ صحیح احادیث پر غور کرنے اور کچھ دیگر مضبوط قرائن جمع ہوجانے کی وجہ سے کچھ مدت بعد جمہور علماء کا مشاجرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مجتہدِ مصیب ہونے پر اجماع ہوگیا۔ یہ بات بھی طے ہوگئی کہ حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم بھی اپنے طور پر اصلاح کے لیے کوشاں اور مجتہد تھے۔ اس لیے وہ گناہ گار نہیں بلکہ مجتہدِ مخطی ہیں اور مجتہد کی غلطی معاف ہے جبکہ اجتہاد پر اسے ایک اجر بھی ملتا ہے۔

ابعد کے کسی سیاسی قضیے کے بارے میں کسی متعین جماعت کے متعلق کوئی حدیث نہیں، اس لیے سارا دارومدار اپنے تجزیے، غور وفکر اور معلومات پر رہ جاتا ہے، جن کو ہم کتنا ہی مکمل سمجھیں وہ کسی پہلو سے ناقص ہوسکتی ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ جہاں تک ہوسکے اہلِ تقویٰ اور باکردار لوگوں خصوصاً اکابر اور اسلاف کے فیصلوں کو نیک نیتی پر اور ان کے اقدامات کو قومی خیر خواہی پر محمول کیا جائے۔ اگر ان کی کوئی واضح غلطی نظر آئے تو بھی اس کی وجہ سے ان پر طعن وتشنیع نہ کی جائے۔ اگر تبصرہ ضروری ہو تو مہذب انداز میں کیا جائے اور جتنا ممکن ہو حسنِ ظن کا فائدہ دیا جائے۔

احضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی تمام خوبیوں، عظمتوں اور جلالتِ شان کے باوجود بہرحال ایک انسان تھے۔ انہوں نے ایک اعلیٰ انسان کی زندگی گزاری۔ ان کا ایمان، عمل، اخلاق اور کردار ہمارے لیے روشن نمونہ ہیں۔ وہ خود ہمیشہ ایک اللہ پر بھروسہ کرتے رہے اور اسی سے مانگتے رہے۔ اسی سے مانگنے کی قولی وعملی تعلیم دیتے رہے۔ وہ خود مشکلات کا شکار ہوئے۔ تکالیف میں مبتلا ہوئے۔ غربت اور فقر وفاقے کی زندگی بسر کی۔ وہ اللہ کے بندے تھے جو خاک سے پیدا ہوئے اور آخر خاک میں دفن ہوئے۔ باقی ذات صرف ایک اللہ کی ہے۔ مشکلات دور کرنے والی وہی ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ دعائیں سننا، بگڑی بنانا اور مشکلات میں کام آنا اسی کو زیبا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کی پیروی کرتے ہوئے ہر حال میں اللہ سے مانگیں اور اس کے سچے دین پر عمل پیرا رہیں۔

---

① یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ لڑکے تھے اور مدینہ میں زیرِ تعلیم تھے، اس زمانے میں وہ امویوں کی عادت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن بھی کرجاتے تھے۔ آخر مدینہ میں انہیں حدیث پڑھانے والے ایک استاد نے انہیں سمجھایا تو نادم ہوئے اور توبہ کی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۱۱۷)
خواب کا یہ واقعہ غالباً توبہ تائب ہونے کے بعد کا ہے۔

② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن الجوزی، ص ۲۸۵
سنداً اس روایت پر بھی کلام ہوسکتا ہے مگر اسے بھی فقط مؤیدات کے طور پر پیش کیا گیا ہے نہ کہ اصل دلیل کے طور پر۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز یہ خواب نہ دیکھتے یا یہ روایت نہ ہوتی یا کوئی اس روایت کو بالکل مسترد کردے تب بھی مسئلہ اسی طرح ثابت رہے گا۔

مشاجراتِ صحابہ تکمیلِ شریعت کے لیے تھے:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ نے ''شریعت وطریقت کا تلازم'' کے ابتدائی اور ''الاعتدال فی مراتب الرجال'' کے آخری باب میں ''مشاجراتِ صحابہ'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ان ابواب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ راقم یہاں ان کا حاصلِ مطلب اپنے الفاظ میں پیش کر رہا ہے:

''صحابہ کرام کے درمیان ''مشاجرات'' درحقیقت اللہ کی طرف سے شریعت کی تکمیل کے لیے کرائے گئے تھے۔ کیوں کہ کسی بھی قانون کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اسے نافذ نہ کر دیا جائے، قانون کے نفاذ کے بعد ہی یہ عملی ثبوت مل سکتا ہے کہ وہ انسانوں کے لیے مفید ہے یا مضر۔ شرعی احکام اللہ کی طرف سے ہیں، اس لیے ان کا مفید ہونا ایک مسلمان کے لیے یقینی ہے۔ مگر عام انسان جب تک ان کے نفاذ کے اثرات کو نہ دیکھ لے وہ مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اللہ نے دنیا والوں کے سامنے ہر قسم کے شرعی احکام کا عملی نمونہ محفوظ فرما دیا۔ یہ شرعی احکام چار قسم کے ہیں:

① ایک وہ جنہیں کر کے دکھانا حضور ﷺ کی ذاتِ عالی کے شایانِ شان تھا۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے کام حضور اکرم ﷺ سے کرائے۔ تاکہ امت کو براہِ راست پیغمبر ﷺ سے عملی نمونہ ملے۔

② دوسری قسم کے احکام ایسی لغزشوں سے متعلق تھے جن کا صدور، ذاتِ نبوت سے ہونا بھی عصمتِ انبیاء کے منافی نہ تھا جیسے نماز میں بھول چوک ہو کر سجدہ سہو واجب ہونا، نماز قضا ہو جانا۔ ایسے احکام کی تکمیل بھی خود ذاتِ نبوت سے کرائی گئی اور اس کے لیے کبھی کبھار پیغمبر ﷺ کو سہو کرا دیا گیا، ایک آدھ مرتبہ نیند طاری کر کے نمازِ فجر قضا کرا دی گئی تاکہ امت کو خود پیغمبر ﷺ کی زندگی سے ایسے مسائل کا شرعی حکم معلوم ہو جائے۔

③ تیسری قسم کے احکام شرعی سزاؤں سے متعلق تھے، جیسے، شراب نوشی، چوری اور بدکاری کی سزائیں۔ چونکہ پیغمبر کی ذات معصوم ہوتی ہے اس لیے ایسے کاموں کا ارتکاب، ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے ممکن ہی نہ تھا۔ لہٰذا اللہ نے یہ کام حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں، بعض غیر معروف صحابہ سے کروادیے۔ حضور ﷺ کے حکم سے ان پر شرعی سزائیں جاری ہوئیں۔ دنیا کے سامنے عملی طور پر یہ نمونہ آگیا کہ سنتِ نبویہ میں ایسے جرائم کی یہ سزا مقرر ہے۔

ان جرائم کے مرتکب حضرات بذاتِ خود نہایت پاکباز تھے مگر اللہ کی تقدیر اور مشیت نے ان سے ایسے کاموں کو کروا دیا تاکہ شرعی احکام صرف زبانی اور تحریری ہی نہ رہیں بلکہ ان کا عملی ثبوت بھی موجود ہو۔ تاکہ شریعت کی تکمیل ہو سکے۔

④ چوتھی قسم کے شرعی احکام وہ ہیں جن کے نفاذ کے لیے حضور ﷺ کا پُرنور زمانہ مناسب نہ تھا؛ کیوں کہ یہ احکام فتنوں، فساد، اختلاف اور خانہ جنگی سے متعلق ہیں۔ اسلام میں ان مسائل کا حل اور ان سے متعلق ہدایات موجود ہیں مگر حضور اکرم ﷺ کے مبارک زمانے کے شایانِ شان نہ تھا کہ اس میں ایسے فتنے ظاہر ہوتے۔ اس لیے ان احکام کے عملی نفاذ کے لیے اللہ نے حضور ﷺ کی رحلت کے بعد کا وقت رکھا اور وہ بھی تب جب اسلام دنیا میں غالب اور مستحکم

ہو جائے، تا کہ اندرونی فتنوں سے اسلامی ریاست ایسی کمزور نہ ہو جائے کہ بیرونی طاقتیں اس پر چڑھ دوڑیں۔

اللہ کی تقدیر کے اس فیصلے کے مطابق، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ اختلافات رونما ہوئے، جن میں موقع بموقع فتنوں سے متعلق تمام شرعی احکام کا عملی نمونہ سامنے آتا چلا گیا۔ ان احکام کے نفاذ کے اثرات بھی دنیا کے سامنے آگئے کہ جلد ہی مسلمان متحد ہو گئے اور اسلامی فتوحات اور عروج کا دور ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

ا صحابہ کرام وہ سچے عاشق تھے جنہوں نے شریعت کی تکمیل کے لیے جہاں قدم قدم پر جان و مال کی قربانی دی، وہاں اپنی عزتیں بھی اللہ کی مشیت کی تکمیل کے لیے پیش کر دیں۔

اگر شریعت کی تکمیل کے لیے اللہ کی مشیت ان سے کسی خطا یا کسی جرم کا ارتکاب کراتی ہے جس کی پاداش میں ان میں سے کسی کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، کسی کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور کسی کو سنگسار کیا جاتا ہے، تو وہ اپنی خطا پر ندامت کے ساتھ ساتھ تقدیر کے اس فیصلے پر راضی برضا ہیں۔ وہ شکوہ نہیں کرتے کہ ہم جیسے نبی کے لاڈلوں کو سزا دی جارہی ہے اور سرِ عام رسوائی ہو رہی ہے۔ نہیں بلکہ وہ اس بے عزتی پر بھی صبر کیے ہوئے ہیں اور اللہ سے مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے پچیس برس بعد، ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے یہی عشاق اللہ کی تقدیر کے آگے بے بس ہو کر باہم نبرد آزما ہوتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں کٹ جاتے ہیں۔ ظاہر بین کے نزدیک یہ محض خونریزی ہے مگر اللہ کی مشیت یہاں حالتِ فتنہ اور خانہ جنگی کے شرعی احکام کا نفاذ کر کے دکھانا چاہتی تھی۔ صحابہ ان صدمات کو بھی جھیل جاتے ہیں۔ جان و مال کے ساتھ عزت و شہرت کی قربانیاں بھی دیتے ہیں اور اللہ کی تقدیر میں لکھے اتنے بڑے سانحوں پر بھی راضی برضا رہتے ہیں۔ حرف گیری کرنے والوں نے مشاجرات میں تلواروں کا چلنا اور لاشوں کا گرنا دیکھا اور صحابہ کو دنیا پرست اور اغراض پسند سمجھ کر گمراہ ہو گئے۔ اللہ والوں نے ان واقعات کے پیچھے اللہ کی حکمت اور مشیت کو دیکھا اور صحابہ کرام کے بارے میں وہی عقیدہ رکھا جو قرآن مجید نے بتایا ہے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

تکوینی حکمتیں۔ قرآن وسنت پر اعتقاد کی آزمائش:

اگر تکوینی حکمتوں کو نظر انداز کر کے ''مشاجرات'' کو دیکھا جائے تو یہ محض مصیبت اور آفت دکھائی دیں گے مگر تکوینی حکمتیں سامنے ہوں تو پھر ان میں بھی اللہ کی رحمتِ خاصہ کی جلوہ نمائی محسوس ہو گی۔

ایک حکمت یہ تھی کہ اہلِ ایمان کے ایمان کی آزمائش ہو جائے۔ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کا امتحان ہو جائے کہ ان واقعات کو دیکھنے یا جاننے کے بعد وہ صحابہ کے بارے میں وہی اعتقاد رکھیں گے جو قرآن وسنت میں مذکور ہے یا تشدد اور گمراہ لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنی اپنی کوئی رائے قائم کر لیں گے۔

واقعۂ افک بھی ایک امتحان تھا؟

غور فرمائیں کہ ایک طوفان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ''واقعۂ افک'' کی صورت میں پیش آیا تھا جو در حقیقت

یہ واقعہ اس بات کی جانچ تھا کہ 'قرآن کی صداقت' پر ایمان مضبوط ہے یا نہیں۔

کوئی سوچ سکتا ہے کہ بہت اچھا ہوتا اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا، کیونکہ اس واقعے سے تو بد باطن لوگوں کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بہتان طرازی کا ایک بہانہ مل گیا۔ اگر یہ سفر ہی نہ ہوتا، یا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں نہ جاتیں یا کم ازکم ان کا ہار نہ کھوتا اور وہ قافلے کے ساتھ ساتھ ہی چلی آتیں تو کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی۔ مگر یہ ہماری سوچ ہو سکتی ہے۔ اللہ جانتا تھا کہ کیا ہونا بہتر ہے۔ بس وہی ہوا جو اس کے نزدیک بہتر تھا۔ اگر چہ بظاہر واقعہ بہت تکلیف دہ تھا مگر اس واقعے سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مقام اور بلند ہو گیا۔ قرآن مجید میں ان کی پاکدامنی کے متعلق پورے دو رکوع نازل ہو گئے۔ یہ آیات تا قیامت لوگوں کے سامنے رہیں گی۔ ان آیات کو مان کر قیامت تک اہلِ ایمان پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عظمت، عفت اور صداقت کا اعتراف لازم ہو گیا۔ یہ ایک امتحان تھا اور اب بھی ہے۔ بہت سے لوگ اب بھی اپنی بدبختی کے باعث اس امتحان میں ناکام ہیں اور انہی جھوٹی باتوں پر یقین کرتے ہیں جو منافقین نے پھیلائی تھیں۔ ان کا حشر انہی کے ساتھ ہو گا۔

مشاجرات میں کس چیز کی آزمائش تھی؟

جنگِ جمل اور صفین بھی ایسے ہی دو امتحانات تھے۔ بلاشبہ یہاں نہ صرف شدید اختلاف ہوا بلکہ قتال تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ واقعات مختصر طور پر یا تفصیل کے ساتھ تا قیامت لوگوں کے سامنے رہیں گے۔ واقعۂ افک سے کچھ بڑھ کر یہاں دُہری آزمائش ہے۔ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے، آیات سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس واقعے کی حقیقت کیا ہے؟ کون مصیب ہے اور کون مخطی۔ البتہ صحیح احادیث میں مصیب جماعت کی نشانیاں بتا دی گئیں تھیں۔

دو اہم امتحان:

اب یہاں پہلا امتحان یہ ہے کہ آیا ان احادیث کو من وعن مان کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصابت اور فریقِ ثانی کی خطا کو تسلیم کیا جائے گا یا ان احادیث کو چھوڑ دیا جائے گا اور بلاوجہ کی تأویلات کر کے اپنی ذاتی آراء پر زور دیا جائے گا۔

دوسرا امتحان یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصابت کو ماننے کے ساتھ فریقِ ثانی کے متعلق قرآن وسنت کے مطابق رائے اختیار کی جائے گی یعنی ان کے مقام اجتہاد اور شرفِ صحبت کا لحاظ رکھا جائے گا یا انہیں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے گا یا اس سے بڑھ کر ان کے ایمان کی ہی نفی کر دی جائے گی۔

ذاتی آراء اور طبعی رجحانات کے پیچھے دوڑنے یا قرآن وسنت کے مطابق اعتدال اور انصاف کا راستہ اختیار کرنے کا یہ امتحان بھی آج تک اسی طرح باقی ہے۔ جو لوگ قرآن وسنت کی تمام نصوص اور ان کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر اور صحیح احادیث میں دور از کار تأویلات سے دامن بچاتے ہوئے معتدل رائے رکھتے ہیں، وہ اور ان کی پیروی کرنے والے اس امتحان میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس سے ہٹ کر جو شدت پسندی اختیار کر کے سنتِ مطہرہ کی نصوص سے

جس حد تک بے اعتنائی برتتا ہے، یا ان کی جس قدر غلط تاویلات کرتا ہے، وہ اسی قدر اس امتحان میں ناکام ہے۔

مشاجرات ایک پہلو سے مضر تھے اور ایک پہلو سے مفید:

مشاجرات جیسے صدمہ انگیز واقعات اگرچہ ایک پہلو سے نہایت مضر تھے مگر دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کے تحت ان کے وقوع میں اُمت کی بقااور استحکام کا سامان تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حوادث قرآن وسنت پر اُمتِ مسلمہ کے اعتقاد کو مضبوط بنانے کے لیے رونما ہوئے تو درست ہوگا۔ آزمائش ہی سے لوگ نکھرتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ آزمائشوں ہی سے اچھے اور بُرے الگ ہوتے ہیں۔ آزمائشیں ہی کھرے اور کھوٹے کی پہچان کراتی ہیں۔ آزمائشوں کے بعد شخصیت سے زنگ دور ہو جاتا ہے اور بھٹی سے نکل کر سونا کندن بن جاتا ہے۔

کھرے اور کھوٹے الگ ہوگئے:

ان آزمائشوں نے شک وشبہے میں پڑنے کے عادی، منافق اور بد دماغ لوگوں کو جمہور اُمتِ مسلمہ سے الگ کر دیا۔ وہ کسی فرقے کی شکل میں جمہور سے الگ نمایاں ہوگئے۔ اگر یہ زنگ اور یہ فاسد مادہ اُمتِ مسلمہ کے وجود میں گھلا ملا باقی رہتا تو اندر ہی اندر یہ زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ

(اللہ ایسا نہیں کر سکتا کہ وہ مؤمنوں کو اس حالت پر چھوڑے رکھے جس پر تم اس وقت ہو، جب تک وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے۔)[1]

اُمتِ مسلمہ کی اندرونی ساخت مضبوط ہوگئی:

یہ واقعات قوم کے لیے اجتماعی دھچکے اور صدمے تھے مگر ایسے دھچکوں اور صدموں سے قوموں کی اندرونی سخت مضبوط ہوتی ہے۔ ایک مثال سے اس بات کو سمجھیں۔ کچھ مدت پہلے بچوں کے لیے مٹی میں کھیلنا اور مٹی کھانا مضرِ صحت سمجھا جاتا تھا مگر اب جدید طبی تحقیق بتاتی ہے کہ جو بچے مٹی میں کھیل کر بڑے ہوتے ہیں اور مٹی کھاتے ہیں، بڑی عمر میں وہ قوتِ مدافعت میں دوسروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مٹی کے ساتھ جو جرثومے جسم میں داخل ہوتے ہیں، وہ جسم کو مختلف قسم کے مضر جرثوموں کا عادی بنا دیتے ہیں، پھر معمولی قسم کی نقصان دہ چیزیں انسان کو متاثر نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس جو بچے جراثیم سے بالکل محفوظ ماحول میں پرورش پاتے ہیں، وہ زندگی کے عملی میدان میں اتر کر باہر کے ماحول کے ایک معمولی جھونکے کے باعث نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جن بچوں کی تربیت نہایت لاڈ پیار سے ہوتی ہے اور انہیں سردی گرمی سے ہر طرح بچایا جاتا ہے، وہ بڑے ہو کر معمولی ٹھنڈ یا معمولی گرمی سے بیمار پڑ جاتے ہیں جبکہ بچپن میں سردی گرمی کا مقابلہ کرنے والے بچے بڑے ہو کر مضبوط قوتِ مدافعت کے حامل ہوتے ہیں۔

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت: ۱۷۹

امت مسلمہ نے بھی اپنے ابتدائی زمانے میں جو سختیاں برداشت کیں اور جو صدمے سہے، وہ اس کی قوتِ مدافعت کی مضبوطی کا باعث بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے اور آفات کے ہزارہا طوفانوں سے پالا پڑنے کے باوجود امت مسلمہ نہ صرف باقی ہے بلکہ دن بدن اس کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے۔

☆☆☆

کیا صحابہ کرام کے تنازعات ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' کے خلاف ہیں؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ صحابہ کرام کے تنازعات اور اختلافات نصِ قرآنی ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' کے خلاف ہیں، قرآن مجید تو کہتا ہے کہ وہ آپس میں بڑے رحیم وکریم ہیں جبکہ تاریخ میں مذکور یہ واقعات اس کے برعکس ہیں۔ اس لیے جس تاریخ میں ایسے تنازعات کا ذکر ہے، اسے دریا برد کردینا چاہیے۔

مگر اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ایسے واقعات صرف تاریخ میں ہیں۔ صحابہ کرام کے باہمی اختلاف اور ناراضی کے واقعات تو کتبِ حدیث میں بھی ہیں۔ عام صحابہ میں نہیں، امہات المؤمنین میں بھی کبھی کبھار ایسی نوبت آجاتی تھی جس کی مثالیں حدیث کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک دو واقعات خلفائے راشدین کی بھی باہمی خفگی کے مل جائیں گے۔ خود نبی اکرم ﷺ کا امہات المؤمنین میں سے بعض سے ناراض ہونا اور ایلاء تک کرلینا ثابت ہے۔ مگر ان میں سے کسی بات کو خلافِ محبت ومودت نہیں کہا جاسکتا۔

آپس میں کبھی کبھار شکر رنجی اور تکرار ہوجانا پیار ومحبت کے ہرگز خلاف نہیں۔ کونسا گھر ہے جہاں باپ بیٹے، میاں بیوی اور بہن بھائیوں میں کبھی کدورت اور خفگی نہ ہوئی ہو۔ مگر اس سے ان رشتوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح دوستوں بلکہ استادوں اور شاگردوں میں بھی اختلافِ رائے بلکہ بعض اوقات رنجش تک ہوجاتی ہے۔ بالخصوص جہاں تیز اور کھلے دماغ کے لوگ ہوں وہاں اختلافِ رائے ہونا لازمی ہے۔ صحابہ کرام کے ہاں ماحول بھی بے تکلفانہ تھا۔ کوئی کا تابع مہمل اور لکیر کا فقیر نہ تھا۔ جو جس بات کو درست سمجھتا تھا، خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ اسے برملا کہتا تھا۔ اگر ہم اپنے گھر کے افراد، بہن بھائیوں اور اپنے عزیزوں میں ایسے واقعات کو محبت کے خلاف نہیں سمجھتے، تو کیا وجہ ہے کہ صرف صحابہ کرام کو ان معاملات میں اس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ جیسے وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں۔

صحابہ کرام کے دل معصوم بچوں کی طرح پاک تھے۔ جس طرح بچے باہم لڑ جھگڑ کر تھوڑی دیر میں ہنسی خوشی کھیلنے لگتے ہیں اسی طرح صحابہ بھی کسی وقتی رنجش کے بعد جلد ہی شیر وشکر دکھائی دیتے تھے۔ نیز ان کے بہت سے اختلافات خالص علمی وفقہی نوعیت کے تھے جو ہمیشہ علماء وحکماء کے ہر طبقے میں ہوا کرتے ہیں۔

ایک دو معاملات میں اگر ان کے درمیان جنگ کی نوبت آئی ہے تو وہ بھی قرآنِ مجید میں ان کی بیان کردہ صفت کے خلاف نہیں کیوں کہ صحابہ کرام جہاں ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' تھے، وہاں ان کی ایک صفت ''لَا يَخَافُوْنَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَآئِمٍ'' بھی ہے۔ جو جس بات کو شرعی حکم سمجھتا تھا، اسے پورا کرنے کے لیے جان دینے اور جان لینے پر بھی تیار تھا۔ جس

ایمانی غیرت سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑی اور جس جذبے سے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلائی، اسی جذبے سے صحابہ کرام نے جمل وصفین میں زخم کھائے۔ جس طرح موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے ان واقعات کا نہ تو کوئی انکار کرسکتا ہے، نہ انہیں کسی منفی جذبے پر محمول کرسکتا ہے، اسی طرح صحابہ کرام کے مشاجرات کا انکار کرنا عبث اور انہیں غلط معنیٰ پر محمول کرنا ضلالت ہے۔ جس طرح وہ حقائق انبیائے کرام کی عصمت کے ہرگز منافی نہیں، اسی طرح یہ مناظر صحابہ کی عدالت سے قطعاً متصادم نہیں۔ بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ بیمار نہ ہو۔

سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خطاء اجتہادی پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کا ملفوظ:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر یاد آیا، ایک شخص نے ایک کم علم مگر ذہین مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جو جنگ ہوئی، اس میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل کس درجہ کا ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی خطاء ہے اور اس لیے وہ امرِ خفیف ہے۔ (حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہی ہمارے بزرگوں کا عقیدہ ہے۔) یہ سن کر وہ شخص کہتا ہے کہ جس درجہ کا شخص ہوتا ہے، اسی درجہ کی اس کی خطاء ہوگی، اس لیے اس خطا پر شدید سزا ہونی چاہیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ارے! یہ کیا تھوڑی سزا ہے کہ ایک صحابی پر ہم نالائق یہ حکم کریں کہ انہوں نے خطاء کی، ورنہ ہمارا کیا منہ تھا، ہم گندے ناپاک اور وہ صحابی۔

(حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے) فرمایا: واقعی عجیب وغریب جواب ہے۔[1]

سیاسی اختلافِ رائے کے وقت مناسب لائحۂ عمل؟

سیاسی وانتظامی معاملات ہمیشہ پہلودار ہوتے ہیں۔ سیاست گھر کی ہو یا محلے کی، صوبے کی ہو یا ملک کی، اس میں کسی بھی معاملے میں انسان کی رائے، مشورے اور فیصلے میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ کوئی شخص اس ضمانت کے ساتھ رائے نہیں دے سکتا کہ اس کا نتیجہ خواہش کے عین مطابق ہی نکلے گا، نہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے پورے اطمینان سے پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس کا ردِّعمل بالکل ویسا ہوگا جیسا ہم چاہتے ہیں۔ کسی بھی فیصلے کے وقت ہمارے پاس سو فیصد درست معلومات نہیں ہوتیں۔ نہ ہی ہم دوسروں کے خیالات، رجحانات اور عزائم کو پوری طرح جانتے ہیں، نہ اپنے اقدامات کا مستقبل دیکھ سکتے ہیں۔

سیاسی ذمہ داریوں اور قومی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اٹھائے جانے والے ہر قدم پر انسان یہی کرسکتا ہے کہ اپنی نیت اچھی رکھے، خود غرضی اور مفاد پرستی سے دور رہے، قوم کی بھلائی کے لیے غور وفکر اور مشورے کرے اور اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے وقت، زمانے اور حالات کے لحاظ سے مناسب ترین لائحہ عمل اختیار

[1] ملفوظات حکیم الامت تھانوی: ۱/۴۱، ۴۲، ملفوظ نمبر: ۱۷

کرے۔ اتنا کر کے قائد اپنی ذمہ داری سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی عہدہ برآ ہو جاتا ہے اور بندوں کے نزدیک بھی۔ مستقبل میں اگر اس اقدام کا نتیجہ مکمل یا جزوی طور پر منفی نکلتا ہے تو قائد پر اخلاقی لحاظ سے کوئی الزام صادر ہو سکتا ہے نہ شرعی لحاظ سے، جبکہ اس نے اپنے طور پر خلوصِ نیت، خیر خواہی، غور وفکر اور احتیاط کے تقاضے پورے کر دیے ہوں۔

سیاسی وانتظامی معاملات میں اختلافِ رائے کے باعث دونوں فریق مخلص اور قوم کے خیر خواہ ہونے کے باوجود بھی کبھی آپس میں ٹکرا سکتے ہیں۔ یہ ٹکراؤ اختلاف رائے سے بڑھ کر جنگ وجدال کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اکثر مواقع پر کسی تیسرے شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فریقین میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ ایسے میں انسان کو دو اختیار دیے گئے ہیں: اگر اس کے نزدیک معاملہ الجھا ہوا ہے تو الگ تھلگ رہے۔ اگر کسی ایک کا ساتھ دینے پر قومی فائدے کی امید ہے اور اس کا موقف برحق لگتا ہے تو اس کا ساتھ دے۔ جب سیاسی کشاکشی مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہو تب فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوتا، کیوں کہ عقیدے کا فرق خود حق وباطل کو واضح کر رہا ہوتا ہے، اس طرح اگر بدکردار اور صالح یا ظالم اور مظلوم کے درمیان تصادم ہو تب بھی فیصلہ زیادہ مشکل نہیں ہوتا، لیکن اگر سیاسی اختلاف کرنے والے گروہوں میں دونوں جانب عقیدے اور اخلاق وکردار کا معیار یکساں ہو تو معاملہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے مگر ایسے معاملات سے آنکھیں بند بھی نہیں کی جا سکتیں، یہ فطری امور ہیں جو معاشرے کو ہمیشہ پیش آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔

ایک سوال اس کش مکش سے براہ راست متعلق افراد یا اس کش مکش کے دور میں موجود لوگوں کو پیش آتا ہے، ایک سوال بعد والوں کو یا کش مکش سے غیر متعلق لوگوں کو درپیش ہوتا ہے۔ متعلق لوگوں کے سامنے یہ سوال رہتا ہے کہ اس سیاسی قضیے میں وہ کس کا ساتھ دیں؟ بعد والوں کو یہ الجھن ہوتی ہے کہ وہ ان گروہوں اور شخصیات کے بارے میں کیا رائے رکھیں؟ جنگِ جمل وصفین سے متعلقہ صحابہ وتابعین کا کردار اس بارے میں ہماری اطمینان بخش رہنمائی کرتا ہے۔

ساتھ دینے کے حوالے سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ اگر معاملہ ہمارے نزدیک الجھا ہوا ہے، یا ہمارے نزدیک اس میں صلاحیتوں کو کھپانا قوم کے لیے سودمند نہیں تو ہم ان معاملات سے الگ رہیں، اگر پہلے کسی گروہ میں شامل ہیں تو اب علیحدگی اختیار کر لیں، جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہم نے کیا اور جیسے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگِ جمل کے دوران علیحدگی کا فیصلہ کیا۔

لیکن اگر کسی ایک سیاسی گروہ کی قومی خیر خواہی، اخلاق وکردار، منشور اور دعوت پر ہم کو اعتماد ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ شرعی لحاظ سے بھی اس کا ساتھ دینا برحق ہے اور اس میں قوم کا نفع ہے، تو پھر ہم اس جماعت کے ہم قدم ہو جائیں، جیسے صحابہ کی بہت بڑی تعداد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم قدم رہی اور جیسے بہت سے حضرات نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اور بہت سے لوگوں نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا ساتھ دیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی فرشتہ آ کر نہیں بتائے گا کہ کون برحق ہے۔ دار ومدار شرعی دلائل کے تجزیے، اور غور وفکر کی استطاعت پر ہے، اسی کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔

دوسرا سوال سیاسی قضیے سے دور رہنے والے یا بعد والوں کو پیش آتا ہے کہ ان متخالف اور متحارب جماعتوں کے بارے میں کیا رائے رکھیں جو بظاہر باکردار، محبِ قوم وملت اور پابند شریعت نظر آتی ہیں؟ جنگِ جمل اور صفین کا جائزہ بتاتا ہے کہ بڑے اور قابلِ تکریم لوگوں کے حق میں ادب واحترام برقرار رکھا جائے۔ اسلامی قانون کو بدلنا یا چھپانا تو جائز نہیں، لہٰذا اس نقطۂ نگاہ سے علمی بحث میں کسی ایک فریق کی تصویب ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اسے سمجھنے سمجھانے کے لیے عقلی ونقلی دلائل پیش کرنا بھی اہلِ علم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر اسے ضرورت کی حد میں رہنا چاہیے۔ دل سے ہر فریق کی عزت کی جائے، ان کے اس جذبے کو سلام کیا جائے کہ انہوں نے جس موقف کو حق سمجھا اس پر ڈٹ گئے، ان کی خدا ترسی، قومی ہمدردی، پرہیزگاری اور شرافت ودیانت پر انگلیاں اُٹھا کر اپنی زبان وقلم کو آلودہ نہ کیا جائے۔

بلاضرورت مشاجرات کی بحث سے گریز کی تعلیم:

مشاجراتِ صحابہ کوئی ایسا محبوب مشغلہ نہیں کہ اسے بلاضرورت چھیڑا جائے۔ خصوصاً صحابہ کی عیب جوئی کی نیت سے اس میں غور وخوض کرنا تو ایمان کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے اسلاف مشاجرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب اور ان سے محاربہ کرنے والوں کے تخطیہ کا عقیدہ رکھنے کے باوجود عمومی طور پر عوام کو ان مسائل میں بحث سے منع کرتے تھے۔ چنانچہ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حسن بصری رحمہ اللہ سے صحابہ کرام کے باہمی قتال کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"قتال شهده اصحاب محمد ﷺ وغبنا، وعلموا وجهلنا، واجتمعوا فاتبعنا، واختلفوا فوقفنا."

یہ ایسی جنگ تھی جس میں اصحاب محمد ﷺ موجود تھے اور ہم غائب۔ وہ (ان حالات کو) جانتے تھے اور ہم نہیں جانتے۔ (جن امور میں) انہوں نے اجماع کیا ان میں ہم ان کی پیروی کرتے ہیں اور (جن امور میں) انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں ہم بھی توقف کرتے ہیں۔''[1]

x x x

متکلمِ اسلام امام ابوبکر باقلانی رحمہ اللہ کی ایک تصنیف کا درج ذیل اقتباس بھی قابلِ غور ہے:

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ''مشاجرات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

فرمایا: وہی جو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

(اور وہ لوگ جو کہ ان کے بعد آئے جنہوں نے کہا کہ: اے رب ہمارے! بخش دے ہمیں اور ان کو بھی کہ جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ نہ ہونے دیجیے۔)[2]

---

[1] تفسیر قرطبی: ۱۶/۳۲۲، سورۃ الحجرات [2] سورۃ الحشر، آیت: ۱۰

(یہی سوال) حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"میں وہی کہتا ہوں جو اللہ نے فرمایا:

عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ‌ لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ وَلَا يَنۡسَى‌ۡ.

(ان لوگوں کا علم میرے پروردگار کے پاس دفتر (اعمال) میں (محفوظ) ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔)[1]

اور بعض حضرات سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ‌ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ‌ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ.

"یہ (بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا اور تم سے ان کے لیے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔"[2]

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے بھی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

تلک دماء طهر الله یدی منها، افلا اطهر منها لسانی؟

(یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ نے میرے ہاتھ کو پاک رکھا تو کیا میں اپنی زبان کو ان سے پاک نہ رکھوں؟)

پھر فرمایا:

مثل اصحاب رسول الله ﷺ مثل العیون، وداء العیون ترک مسها.

اصحابِ رسول اللہ ﷺ کی مثال آنکھوں کی طرح ہے، آنکھوں کا علاج یہی ہے کہ انہیں ہاتھ نہ لگایا جائے۔)[3]

جن صحابہ سے خطائے اجتہادی ہوئی، ان سے دل میں نفرت یا بغض رکھنا ناجائز ہے۔ ان کی عزت و تکریم بہر حال ہے۔ درج ذیل واقعہ قابلِ غور ہے۔

امام ابوزُرعہ رازی کے پاس ایک شخص آ کر کہنے لگا: "مجھے مُعاویہ سے بغض ہے۔" ابوزُرعہ رازی نے پوچھا: "کیوں؟" کہنے لگا: "کیونکہ وہ حضرت علی سے ناحق لڑے۔" ابوزُرعہ رازی نے فرمایا:

"رَبُّ مُعَاوِيَةَ رَبٌّ رَحِيمٌ، وَخَصْمُ مُعَاوِيَةَ خَصْمٌ كَرِيمٌ، فَمَا دُخُولُكَ بَيْنَهُمَا."

مُعاویہ کا رب، رحیم رب ہے۔ مُعاویہ کا مدِ مقابل مہربان مدِ مقابل تھا۔ پس تو ان کے درمیان کیوں دخل دے رہا ہے۔"[4]

☆☆☆

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت: ۵۲ [2] سورۃ البقرہ، آیت: ۱۳۴

[3] الانصاف لابی بکر الباقلانی، ص ۶۶، ط المکتبۃ الازھریہ مصر

[4] فتح الباری ۸۱/۱۳، تاریخ دمشق: ۱۴۱/۵۹

مشاجرات کا دیگر اقوام کی مذہبی لڑائیوں سے تقابل

مشاجرات صحابہ کے صحیح خد وخال ہم امکان کی حد تک آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسی تاریخ نہیں کہ جس پر ہمیں غیر اقوام کے سامنے خجالت محسوس کرنے یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہو۔

دوسری اقوام کے مذہبی رہنماؤں نے مذہب کے نام پر جو جنگیں چھیڑیں ان کی تفصیل اتنی ہولناک ہے کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے مذہبی رہنما جب باہم نبرد آزما ہوئے تو انسانیت قعرِ زمین میں دفن ہوگئی۔ کلیسا کے نام نہاد ''مقدس باپوں'' نے اپنے ''مشاجرات'' میں جو قتلِ عام کیا، اس کی تفصیل تاریخ یورپ میں پڑھیے۔ سر دست فقط ایک جھلک مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے پیش خدمت ہے:

''اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں، ان کی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔ فرانس کا مشہور ہنگامہ ''بار تھیلی'' کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے، کہتے ہیں کہ نو دن تک پروٹیسلنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتلِ عام کا حکم نافذ رہا۔ لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کے، کلیسا کی کیتھولک بھیڑیں زندہ بچوں کو نکالتیں اور کتوں کے آگے ڈال کر پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشا دیکھتیں، پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہوگیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ کش مکش کے اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے، زندہ جلا دیے گئے، یا دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا، تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہنچتی ہے۔''[1]

ایک یورپ پر کیا موقوف ہے! ہندو، نصرانی، یہودی، بدھ مت سمیت دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کی مذہبی تاریخ نہایت خوفناک اور لرزہ خیز مظالم سے بھری نہ ہو۔

ہندوؤں کی مذہبی کتب کا بہت بڑا حصہ ان کے مذہبی پیشواؤں بلکہ خداؤں کی باہمی جنگوں، خونریزیوں، کمینہ

① دجالی فتنے کے نمایاں خد وخال، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، ص ۸۸، ط المیزان۔ تفصیل درج ذیل انگریزی مآخذ میں سے ملاحظہ فرمائیں:
The History of Prostestantism by Rev. J.A Wylie
The Masacre of Vlster Protestants in 1641
(Christopher Marlowe) ''Massacre at Paris''

تانیوں اور بعض مقامات پر شرمناک ہوس ناکیوں کے قصوں سے بھرا ہوا ہے۔ رامائن سے مہابھارت تک ساری کتھا دیکھ جائیں، جگہ جگہ میدانِ جنگ گرم دکھائی دے گا۔ پانڈووں اور کوروں کی معرکہ آرائیوں جیسے واقعات جابجا ملیں گے۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے نبرد آزما نظر آئے گا۔

مگر ہندوؤں کا یہ حال ہے وہ اپنے ان پیشواؤں کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ انہیں دیوتاؤں کا درجہ دے کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ حالاں کہ خود سیکولر ہندو محققین کے نزدیک یہ لوگ راجے اور پنڈت اور پجاری تھے مگر ان کے مداحوں نے ان کے حالات میں مافوق الفطرت افسانوں اور مبالغہ آمیز چیزوں کا اضافہ کرکے انہیں ''خدا'' کے مقام پر پہنچادیا، حالاں کہ ان میں سے بعض کے بیان کردہ حالات گھٹیا آدمیوں جیسے بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ خدانخواستہ ہم مسلمان اپنے بزرگوں کی شان میں اس قسم کا مبالغہ کریں۔ مگر ہندوؤں کی اپنے گھٹیا قسم کے پیشواؤں سے اندھی عقیدت دیکھ کر ان مسلمانوں کو ضرور غیرت اور شرم آنی چاہیے، جو جمل وصفین جیسی دو تین جنگوں کو دیکھ کر اپنی تاریخ کو باعثِ ننگ سمجھنے لگتے ہیں اور حد یہ ہے کہ ان بزرگوں کی برائی پر اتر آتے ہیں جن میں سے کوئی رسول اللہ ﷺ کا سسر ہے تو کوئی داماد۔ کوئی زوجہ محترمہ ہیں تو کوئی لختِ جگر۔ کوئی محافظ ہے تو کوئی کاتبِ وحی۔ کوئی خادم خاص ہے تو کوئی تلمیذ خاص۔ کوئی رازدارِ رسالت ہے تو کوئی امین الامت۔ افسوس کہ دلوں میں اتنی بھی وسعت نہیں ہوتی کہ ایسی بے مثال ہستیوں اور ان اعلیٰ ترین امتیوں میں سے بعض کی اِکادُکا لغزشوں کو نظر انداز کرکے ان سب کے بارے میں احترام کے جذبات قائم رکھیں۔

☆☆☆

خلافتِ راشدہ کا اختتامی دور

خلافتِ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما

اگر چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی جانشین کا تقرر کر کے نہیں گئے تھے مگر ان کی شہادت کے بعد عالمِ اسلام میں ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے زیادہ برگزیدہ اور عالی نسب شخصیت اور کوئی نہ تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس نواسے، سے اس قدر محبت تھی کہ کئی مواقع پر فرمایا: ''اے اللہ! میں حسن سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما اور اُس سے بھی محبت فرما جو حسن سے محبت کرے۔''[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ: حضرت حسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔[2]

اُمت کو ہادیٔ برحق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی بھی یاد تھی:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بدولت مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے۔''[3]

چنانچہ اکابرِ کوفہ کو توقع تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلمانوں کے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوگی، اس لیے وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بیعت پر فوراً متفق ہوگئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کی فرمائش پر پہلے تو سکوت اختیار کیا مگر پھر امت کی مصلحت دیکھتے ہوئے انہیں بیعت فرمانے لگے۔ سب سے پہلے حضرت قیس بن سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔ جو افواجِ کوفہ کے سپہ سالار تھے۔[4]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد جو پہلا خطاب کیا، اس کے ایک ایک لفظ سے عیاں تھا کہ وہ اُمتِ مسلمہ کے نہایت خیر خواہ اور اقتدار کے لیے خون بہانے سے سخت نالاں تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد لوگ مدائن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہوئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے خطاب کیا۔ اللہ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر فرمایا: ''جو کچھ ہونے والا ہے، وہ بہت قریب ہے۔ اور بے شک اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا چاہے لوگ اسے ناپسند کریں۔ اللہ کی قسم! جب سے میں نے نفع دینے اور نقصان پہنچانے والے کاموں میں فرق سمجھا ہے، تب سے مجھے ہرگز یہ پسند نہیں کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے رائی برابر ایسے کام کا ذمہ دار بنوں جس میں کسی کا ایک قطرہ خون بھی بہے۔''[5]

---

1. مسند احمد، ح: ۷۳۹۸ بسند صحیح
2. صحیح البخاری، ح: ۳۵۴۴، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
3. صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم للحسن بن علی، ان ابنی هذا سید
4. البدایۃ والنہایۃ: ۱۳۱/۱۱
5. فضائل الصحابۃ لاحمد بن حنبل، ح: ۱۳۶۴، ط الرسالۃ

کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ڈر کر صلح کی؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایلیاء (بیت المقدس) میں اہلِ شام سے اپنی خلافت کی بیعت لے لی تھی اور انہیں اب ''امیر المؤمنین'' کہا جانے لگا تھا۔ ①

عالمِ اسلام کی سیاست میں یہ ایک نئی تبدیلی تھی کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ وہ صرف ''امیر'' کہلاتے تھے۔

خلافت کے دو دعوے داروں کی موجودگی میں متحدہ خلافت کے احیاء کی تین صورتیں تھیں:

❶ شامی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے۔ ❷ شامیوں سے لڑ کر انہیں ایک خلافت کے تحت لانے کی کوشش کی جاتی۔ ❸ منصبِ خلافت کو ترک کر کے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لیا جاتا۔

شامیوں نے بیعت کرنا ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی کر لیتے، اس لیے پہلی صورت تو ممکن ہی نہ تھی۔ اب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی آزمائش تھی کہ وہ اس نازک وقت میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسے میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے طے کیا کہ وہ اُمت کو متحد کرنے کے لیے اپنے اقتدار کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اس فیصلے میں کسی کمزوری یا بزدلی کا دخل نہیں تھا۔ صحیح روایات کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ پوری طرح بااختیار اور طاقتور ہونے کے باوجود یہ حکمتِ عملی اختیار کر رہے تھے۔ جو روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی افواج کی کمزوری اور سرکشی سے بددل ہو کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا فیصلہ کیا تھا، وہ ضعیف راویوں کی ہیں۔ ہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فوج میں بعض جذباتی لوگ ایسے ضرور تھے جو اہلِ شام سے صلح کو پسند نہیں کرتے تھے مگر یہ لوگ معاملات پر غالب نہیں تھے۔ غالب طبقہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پکے وفاداروں ہی کا تھا، جن کی تعداد ہزاروں لاکھوں میں تھی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے شروع میں اپنے لائحہ عمل کا اظہار نہیں کیا تاکہ یکدم کوئی مخالف آواز بلند نہ ہونے پائے بلکہ احتیاطاً آپ نے بیعت لیتے ہوئے لوگوں سے یہ شرط لی: ''تم میری بات سنو گے اور مانو گے، جس سے میں صلح کروں اس سے صلح کرو گے، جس سے میں لڑوں تم اس سے لڑو گے۔''

عراقی سپاہیوں کا وہ گروہ جو اہلِ شام سے صلح کے حق میں نہیں تھا، بیعت کے ان الفاظ پر بڑا اسٹپٹایا اور کہنے لگا:

''حضرت حسن ہمارے مطلب کے آدمی نہیں، یہ تو لڑائی چاہتے ہی نہیں۔'' ②

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اصول پسندی اور ابن مُلجَم کا قتل:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل عبدالرحمٰن بن مُلجَم کو سزا کے لیے سامنے لایا گیا۔ اس نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: ''حسن! کیا آپ ایک پیش کش پر غور کریں گے؟ خدا کی قسم! میں نے جب بھی اللہ سے کوئی عہد کیا ہے، اسے نبھا کر

---

① تاریخ الطبری: ۵/۱۶۱ باسنادین ضعیفین لکن لمتیهما ما یشهد لصحته

② تاریخ الطبری: ۵/۱۶۲

چھوڑا ہے، میں نے حطیمِ کعبہ میں اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں علی اور مُعاویہ دونوں کو قتل کروں گا یا خود مارا جاؤں گا۔ اب اگر آپ پسند کریں تو مجھے موقع دیں کہ میں مُعاویہ کو نمٹادوں، پھر اگر میں بچ نکلا تو واپس آ کر خود کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔‘‘

مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے انکار کر کے اس کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کیا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ [1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اعلانِ صلح اور شر پسندوں کی مخالفت:

اس دوران حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو مراسلہ بھیج کر دعوت دی کہ وہ ان سے بیعت کر لیں اور جو چاہیں مطالبہ منوالیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس پر آمادہ ہو گئے اور اپنے چچازاد عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا:

’’میں نے کچھ سوچا ہے اور چاہتا ہوں کہ آپ اس میں میرا ساتھ دیں۔‘‘

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’کہیے! کیا سوچا ہے؟‘‘

فرمایا: ’’میں مدینہ چلا جاؤں اور حکومت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دوں۔ ہنگامے کے دن بہت طویل ہو چکے اور خون بہت بہہ چکا۔‘‘

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے مکمل تائید کرتے ہوئے فرمایا: ’’اللہ آپ کو پوری امت کی طرف سے جزائے خیر دے۔‘‘

اب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلوا کر اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے شروع میں اختلاف کیا مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ انہیں سمجھاتے رہے اور دلائل سے انہیں قائل کر لیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس پر راضی ہو گئے۔ [2]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اہلِ عراق سے خطاب اور شر پسندوں کی بدتمیزی:

کچھ دنوں بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اہل عراق کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے اتحاد پر آمادہ کرنے کے لیے ’’ساباط‘‘ کے مقام پر جمع کیا اور جلسۂ عام میں تقریر کی۔ آپ نے نہایت دردمندانہ انداز میں فرمایا:

’’میں آپ لوگوں کے حق میں ویسا ہی خیرخواہ ہوں جیسا اپنے لیے۔ میں نے ایک بات طے کر لی ہے۔ آپ میری بات کو مسترد نہ کریں۔ بلاشبہ امت کا متحد ہونا اس کے انتشار سے کہیں بہتر ہے۔‘‘ [3]

پھر فرمایا: ’’مشرق سے مغرب تک آج میرے اور میرے بھائی کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی پیغمبر کا نواسا ہو۔ پھر بھی میری رائے یہ ہے کہ تم مُعاویہ پر متفق ہو جاؤ۔‘‘ [4]

---

① تاریخ الطبری: ۱۴۸/۵، ۱۴۹

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ورثاء نے انتقام کے جوش میں ان کی وصیت کے برخلاف قاتل کے ہاتھ پاؤں کاٹے، آنکھیں پھوڑیں، بدترین لاتیں دے دے کر مارا اور آخر میں لاش کو جلا دیا، مگر ان روایات کی سند کمزور ہے۔ معتبر تاریخی مواد سے اتنا ہی ثابت ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا گیا تھا۔

② الاصابۃ: ۶۵/۲؛ تاریخ دِمَشق: ۲۶۷/۱۳، ترجمۃ: حسن بن علی رضی اللہ عنہما بسند صحیح

③ تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵ عن اسماعیل بن راشد؛ الاخبار الطوال، ص ۲۱۷

④ عن ابن سیرین ان الحسن بن علی رضی اللہ عنہما قال لو نظرتم ما بین جابرس الی جابلق ما وجدتم رجلا جده نبی غیری وغیر اخی، وانی اری ان تجتمعوا علیٰ معاویۃ، قال معمر، جابرس وجابلق، المشرق والمغرب.

(مجمع الزوائد روایت نمبر: ۷۰۷۳، بسند صحیح؛ السنن الکبریٰ للبیهقی، روایت نمبر: ۱۶۷۱۱)

ابھی آپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اردگرد موجود بہت سے لوگ جو خارجی اور سبائی رجحانات رکھتے تھے، یکدم بھڑ گئے اور بولے: ''حسن بھی اسی طرح کافر ہو گئے جیسے ان کا باپ۔'' ان میں سے کچھ آپ رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے، کسی نے کاندھے سے چادر اتاری۔ کسی نے پاؤں کے نیچے سے جائے نماز گھسیٹ لی، کچھ نے خیمے پر حملہ کر کے مال و متاع کو لوٹ لیا، یہاں تک کہ آپ کے قدموں کے نیچے سے قالین تک گھسیٹ کر لے گئے۔ [1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ:

کچھ دنوں بعد حسن رضی اللہ عنہ مدائن جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ نماز پڑھا رہے تھے کہ انہی شر پسندوں میں سے کسی نے خنجر سے آپ پر حملہ کر دیا۔ اچانک حملے سے آپ کی ران پر زخم آ گیا۔ وفاداروں نے حملہ آور کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ مدائن کے قصرِ ابیض میں ٹھہر گئے۔ زخم کا علاج ہوا اور آپ رضی اللہ عنہ شفایاب ہو گئے۔'' [2]

ان ظالموں کو دست درازی کے یہ مواقع اس لیے ملے تھے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی اپنے والد ماجد کی طرح پہرے کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھی جو ہزاروں کی تعداد میں تھے، باغی ہو گئے ہوں۔ صحیح روایات کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ قاتلانہ حملے یا مال و متاع لوٹے جانے کے باوجود آخر تک بااختیار اور طاقتور خلیفہ تھے۔ [3]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ لشکر کیوں ساتھ لے گئے تھے؟

کچھ دنوں بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ عراق سے شام کا رخ کیا۔ [4] عام تاثر یہ ہے کہ لشکر شام پر حملے کے لیے جا رہا تھا مگر درحقیقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ وہ تمام لوگ جو اُن سے صلح اور جنگ کے معاملات میں اطاعت کا وعدہ کر چکے ہیں، ایک بار یکجا ہو جائیں اور وہ ان سب کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماع میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داری سپرد کر دیں۔

درج ذیل روایات سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے:

① امام زہری سے مروی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ جنگ نہیں چاہتے تھے۔ [5]

---

① تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵ عن اسماعیل بن راشد ، الاخبار الطوال، ص ۲۱۷

② المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۳/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ ، تاریخ طبری: ۱۶۲/۵ ، الاخبار الطوال، ص ۲۱۷

③ بعض ضعیف روایتوں میں ہے کہ حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے جرنیل عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے عراق میں گھس کر مدائن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا تھا۔ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کے سوا کوئی راہ نہ پائی۔ (الاخبار الطوال، ص ۲۱۷ ، تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵)

بعض روایات میں یہ تاثر بھی دیا گیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بالکل بے آسرا تھے، سارا لشکر باغی ہو گیا تھا اور ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی تھی۔ ایسی باتیں غالباً اسی لیے مشتہر کی گئی تھیں تاکہ یہ تاثر دیا جائے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ دل سے صلح پر راضی نہ تھے، بس کمزوری کی وجہ سے ڈر کر صلح کر لی۔ یہ روایات بے سند یا ضعیف السند ہیں اور بخاری کی اس صحیح روایت سے متصادم ہیں جو آگے آ رہی ہے۔

④ صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی، ان ابنی ھذا سید

⑤ وکان الحسن لایری القتال (تاریخ الطبری: ۱۵۸/۵)

① حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بیعت کرتے ہوئے شروع ہی میں یہ شرط لی تھی کہ جس سے میں صلح کروں گا تم بھی اس سے صلح کرو گے۔[1] اس شرط کو بیعت کے الفاظ میں اس لیے شامل کیا گیا تھا کہ شروع سے ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ صلح کے خواہش مند تھے۔

② بیعت کے وقت بعض امرائے فوج نے یہ الفاظ کہنا چاہے:

"ہم آپ سے کتاب وسنت کی پیروی اور باغیوں (اہلِ شام) سے قتال کے عہد پر بیعت کرتے ہیں۔"

مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے الفاظ کو مسترد کر کے یہ الفاظ کہلوائے:

"عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ وَسُنَّۃِ نَبِیِّہٖ" (کتاب اللہ اور سنتِ نبویہ کی پیروی پر بیعت کرتا ہوں۔)

پھر فرمایا: "کتاب وسنت کی پیروی تمام شرطوں کو حاوی ہے۔"[2]

③ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سالار کو اسی لیے معزول کر دیا تھا کہ وہ شام پر حملے کے لیے بضد تھے، آپ نے ان کی جگہ حضرت عبید اللہ بن عباس کو سالار بنا دیا تھا۔[3]

⑤ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ایک لشکر جرار لے کر شام کی طرف جانا اور پھر فوراً وہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینا خود اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ لشکر کشی لڑائی کے ارادے سے نہیں تھی ورنہ اتنی بڑی طاقت کے ساتھ شام پر حملہ کرنے میں آپ رضی اللہ عنہ کو کیا باک ہو سکتا تھا۔

⑥ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بیان موجود ہے کہ انہوں نے امتِ مسلمہ کو مزید خون ریزی سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بڑی دردمندی کے ساتھ فرمایا تھا:

"اِنَّ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ قَدْ عَاثَتْ فِیْ دِمَائِھَا۔" "بلاشبہ یہ امت اپنے ہی خون میں لت پت ہو چکی ہے۔"[4]

ظاہر ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ امت کی باہمی خون ریزی کے نقصانات سے اس وقت بھی آگاہ تھے جب آپ کوفہ سے لشکر لے چلے تھے۔ اس لیے یقیناً آپ صلح کا فیصلہ بھی کوفہ میں ہی کر چکے تھے۔

صلح کا واقعہ "صحیح بخاری" میں:

اس مقصد کی شایانِ شان تکمیل کے لیے آپ نے حتمی اقدام کیا۔ خلافت کے چھٹے مہینے آپ رضی اللہ عنہ بے سروسامانی کے عالم میں نہیں بلکہ پورے لشکر سمیت شام کی سرحد پر گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک شامی قائدین کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے فیصلے کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس لیے اتنا بڑا لشکر دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے اور جنگ سے بچنے کے لیے مذاکرات میں پہل کی جس کی رائے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے:

① تاریخ الطبری: ۱۶۲/۵

② تاریخ الطبری: ۱۵۸/۵

③ تاریخ الطبری: ۱۵۸/۵ عن الزھری

④ صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی: ان ابنی ھذا سید

حضرت حسن رضی اللہ عنہ پہاڑوں جیسے لشکر لے کر آن پہنچے تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں نے حضرت حسن کے پاس ایسا لشکر دیکھا ہے جو اپنے مقابل کو مارے بغیر جانے والا نہیں۔''
حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے عمرو! بتاؤ اگر اس فوج نے اُس فوج کو اور اُن لوگوں نے اِن لوگوں کو مار ڈالا تو میرے پاس عوام کی دیکھ بھال کرنے والا کون رہے گا؟ کون ہوگا جو عوام کا اور خواتین کا خیال رکھے گا؟ کون ہوگا جو ان کی جائیدادوں کی خبر گیری کرے گا؟''

پس حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے قریش کے خاندان بنو عبد شمس کے دو (ممتاز) افراد: حضرت عبدالرحمٰن بن سَمُرہ اور حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہما کو بلایا اور فرمایا: ''آپ دونوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں، انہیں (صلح کی) پیش کش کریں، ان سے بات چیت کریں اور (مفاہمت کی) درخواست کریں۔'' یہ دونوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور بات چیت کر کے مفاہمت کی درخواست کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے فرمایا:

''ہم عبدالمطلب کی اولاد ہیں (جو سخاوت اور کرم نوازی میں نامور چلے آئے ہیں۔) اور ہم اس (دنیا کے) مال و دولت سے (بہت کچھ) خرچ کر چکے ہیں (یعنی لوگوں کو اپنی سخاوت کا عادی بنا چکے ہیں، اس کے علاوہ) بے شک یہ امت اپنے ہی خون میں لت پت ہے۔'' (یہ خون خرابا ختم کرنے کے لیے صلح ضروری ہے اور صلح برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ ہم لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتے رہیں، تاکہ صلح کے مخالف گروہ کا منہ بھی بند رہے اور لوگ صلح کے ثمرات سے خوش رہیں۔)

شام کے سفیروں نے کہا: ''جی ہاں! حضرت مُعاویہ آپ کو (اتنے عطیات اور اموال کی) پیش کش کر رہے ہیں اور آپ سے صلح کی درخواست کر رہے ہیں۔'' حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے (ان عطیات اور اموال کو لوگوں کی ضروریات کے مطابق محسوس کرنے کے بعد مزید اطمینان چاہنے کے لیے) فرمایا: ''تو پھر اس پیش کش کے پورا کرنے کی ضمانت کون لیتا ہے؟'' دونوں حضرات بولے: ''ہم اس کے ضامن ہیں۔''
حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد جس چیز کی بھی فرمائش کی (کہ صلح کے بدلے اس کی ضمانت دی جائے) دونوں حضرات نے اس کی ضمانت دی۔ چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ [1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح میں مال کی شرط اس لیے لگائی تھی کہ لوگ اپنی ضرورتیں لے کر ان کے پاس آتے رہتے تھے، اس کے علاوہ ان کے عقیدت مندوں میں سے کچھ صلح کے مخالف بھی تھے۔ انہیں مطمئن رکھنے کے لیے بھی انعام و اکرام کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری تھا۔ اسی مصلحت کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے گراں قدر وظائف جاری کروانا چاہتے تھے۔ ادھر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پہلے سے اس کے لیے تیار

[1] صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی: ان ابنی هذا سید

تھے، چنانچہ صلح ہوگئی۔ صحیح روایات کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خواہش کے مطابق ''دَارَا بْجِرد'' نامی علاقے کا خراج مستقل آمدنی کے لیے ان کے نام کردیا۔ اس کے علاوہ کوفہ کے بیت المال کی جملہ رقم پچاس لاکھ ان کے حوالے کردی۔ [1]

ضعیف و بے سند روایات میں ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے شرائطِ صلح پوری نہیں کی تھیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔

اعلانِ صلح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی شرکت:

اس کے بعد کوفہ سے کچھ دور شام جانے والی شاہراہ پر واقع قصبے ''نُخَیلہ'' میں ایک اجتماع منعقد کر کے صلح کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ [2] پھر ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا جس میں لوگ دور دور سے آئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پہلے دل شکستگی کی وجہ سے اس اجتماع میں شامل نہیں ہورہے تھے مگر بعد میں وہ بھی مدینہ سے تشریف لے آئے تھے۔ پہلے انہیں رنج تھا کہ اس فیصلے میں ان کی مشاورت ضروری نہیں سمجھی گئی لہٰذا انہوں نے اپنی بہن سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''آپ نے دیکھا لوگ کیا کر رہے ہیں! انہوں نے اس معاملے میں مجھے کوئی حیثیت نہیں دی۔''

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فوراً کہا: ''آپ کے شایانِ شان نہیں کہ آپ اس صلح سے دور رہیں جس کے ذریعے اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو جوڑ دیا ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سالے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ آپ ان حضرات کے پاس جایئے۔ وہ آپ کے انتظار میں ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ کے نہ جانے سے کہیں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوجائے۔'' سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اصرار کر کے انہیں روانہ کیا اور آخر وہ بھی شریک ہوئے۔ [3]

جب اکابرِ امت جمع ہوگئے اور صلح کی تمام شقیں طے پاگئیں تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اٹھیے اور اعلان فرما دیجیے کہ آپ نے امرِ خلافت مجھے سونپ دیا ہے۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا:

''سب سے بڑی عقل مندی تقویٰ اور سب سے بڑی حماقت گناہ ہے۔ یہ معاملہ جس میں میرا اور مُعاویہ کا اختلاف تھا، اس میں اگر میں برحق تھا تو میں نے امت کے امن وامان اور ان کے خون محفوظ رکھنے کے لیے

---

[1] تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵، ۱۶۰ ... روایت میں دینار یا درہم کی وضاحت نہیں ہے۔ بظاہر پچاس لاکھ دینار تھے؛ کیوں کہ ایک صحیح السند روایت میں ''خمس مائة الف الف درهم'' (پچاس کروڑ درہم) کا ذکر ہے۔ ﴿مستدرک حاکم، ح: ۴۸۰۸﴾ غالباً ایک دینار، سو درہم کے بقدر مالیت کا تھا لہٰذا پچاس لاکھ دینار طے کر کے پچاس کروڑ درہم ادا کردیے گئے۔

[2] معجم البلدان: ۲۷۸/۵

[3] صحیح البخاری، ح: ۴۱۰۸، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق؛ مصنف عبد الرزاق، ح: ۹۷۷۹؛ مجمع الزوائد، روایت نمبر: ۷۵۷۰
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ابتداء میں تذبذب طبعی خفگی کی بناء پر تھا، ظاہر ہے کہ صحابہ کرام اپنی جلالتِ قدر کے باوجود بشری احساسات سے عاری نہ تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ شورائے مقتدرہ کے رکن تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو یہ طے کر گئے تھے کہ امرِ خلافت درجہ بدرجہ انہی اکابر کے مشورے سے طے ہوگا جنہوں نے زیادہ سے زیادہ غزوات میں شرکت کی ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۳۴۲/۳) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اکثر غزوات میں شریک تھے۔ نیز عالمِ اسلام میں کا جو مقام تھا اس کے پیشِ نظر نہ صرف عام لوگوں کا بلکہ خود ان کا بھی یہ توقع کرنا بے جا نہ تھا کہ انتقالِ اقتدار پر ان سے مشاورت ضرور کی جائے گی مگر جب ایسا نہ ہوا تو انہیں وقتی طور پر خفگی ضرور ہوئی تاہم یہ بھی ان کی وسعتِ ظرفی تھی کہ خفگی پر قابو پا کر اس اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے۔

اپنا حق خود ترک کر دیا ہے، اور اگر کوئی دوسرا زیادہ حق دار تھا تو میں نے اس کا حق اسے دے دیا۔"

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۔[1]

(میں نہیں جانتا کہ شاید یہ تمہارے لیے آزمائش کا ذریعہ ہو اور ایک محدود وقت تک کا سرمایہ۔)[2]

انتقالِ اقتدار کی کارروائی کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خواص کے سامنے ایک تقریر کی، پھر کوفہ تشریف لے گئے اور لوگوں سے اپنے لیے بیعت لی۔[3]

خلافتِ راشدہ کا اختتام:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی منصبِ خلافت سے ازخود سبک دوشی کے ساتھ ہی اُمت کی تاریخ کا وہ مبارک ترین دور اختتام پذیر ہو گیا جسے "خلافتِ نبوت" یا "خلافتِ راشدہ" کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو دور شروع ہوا، جمہور علمائے اسلام اسے "خلافتِ عامہ" کہتے ہیں۔ اسے "خلافت" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی حکمرانوں نے منصب کا یہی عنوان دیا اور "امیر المؤمنین" کا لقب اسی طرح باقی رکھا۔ نیز شرعی قوانین، حدود و قصاص اسی طرح نافذ رہے اور اسلامی نظام مختلف ادوار میں کم و بیش کمزوریوں کے باوجود چلتا رہا۔ اسے "راشدہ" کی جگہ "عامہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اچھے، بُرے، متوسط ہر قسم کے حکمران آئے۔ جبکہ خلافتِ راشدہ کا معیار اس سے بہت بلند تھا۔

اس "خلافتِ عامہ" کو "ملوکیت" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، کیوں کہ رفتہ رفتہ اس میں طاقت کا مرکز حکمران کی ذات بن گئی اور حکومت حکمران کے گھر والوں کے لیے مخصوص کر دی گئی جیسا کہ بادشاہتوں کا طرز ہوتا ہے۔

شخصی اور خاندانی حکمرانی کے طرز نے خلافتِ عامہ کو تدریجاً ملوکیت کے مشابہ کر دیا۔ یہ اندازِ حکمرانی حدِ جواز میں ہونے کے باوجود اسلام کے اس مثالی شورائی نظام سے مختلف تھا، جو خلافتِ راشدہ کا مایۂ امتیاز تھا۔ خلافتِ راشدہ میں حکمران کے انتخاب کے پس پردہ خاندان یا قبیلے کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ افرادی قوت یا عسکری طاقت کے ذریعے اقتدار کے حصول کا وہاں کوئی سوال نہیں تھا۔ حکومت کے لیے جدوجہد بلکہ عہدوں کی طلب بھی مذموم شمار کی جاتی تھی۔ حکمران اور عہدے داروں کا انتخاب افضلیت، علم و فقاہت، معرفت و تقویٰ، غیر معمولی اہلیت اور اسلام کے لیے ایثار و قربانی کی نمایاں کارکردگی پر ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چاروں خلفائے راشدین الگ الگ خاندان کے تھے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی پہلی تقریر:

منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خاص حضرات کے سامنے ایک تقریر کی۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ایک بار عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حبیب بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس تقریر کا چشم دید حال یوں سنایا:

---

① سورۃ الانبیاء، آیت: ۱۱۱

② المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/ ۲۶؛ مستدرک حاکم، ح: ۴۸۱۳؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۰۶۹۸، ط الرشد

③ تاریخ الطبری: ۵/ ۱۶۲

جب لوگ بکھر گئے تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور فرمایا: ''اب کوئی اس معاملے میں بولنا چاہے تو سر اٹھا کر بات کرے، ہم اس امر (خلافت) کے زیادہ حق دار ہیں، اس سے اور اس کے باپ سے۔''①

راوی حبیب بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے (ابن عمر رضی اللہ عنہ سے) پوچھا: پھر آپ نے ان کی بات کا جواب دیا کہ نہیں؟ انہوں نے کہا: میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کے لیے حرکت کی۔ میں انہیں کہنا چاہتا تھا کہ اس امر (اقتدار) کا زیادہ حق دار وہ ہے جو تم سے اور تمہارے والد سے اسلام کی خاطر جنگ لڑ چکا ہے② لیکن میں اس وجہ سے کہتے کہتے رک گیا کہ کہیں اجتماعیت میں رخنہ نہ پڑ جائے اور خانہ جنگی نہ ہو جائے، میری بات کا کوئی اور مطلب نہ لے لیا جائے۔ پس میں نے جنت کے ثواب پر اکتفا کر لیا۔''

حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ محفوظ رہے اور بچ گئے۔''③

---

① من كان يريد ان يتكلم في هذا الامر فليطلع لنا قرنه فلنحن احق به منه ومن ابيه. (صحيح البخاري، ح: ۴۱۰۸، باب غزوة الخندق)
آج کل بعض حضرات یہاں ''منه ومن ابيه'' کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ سبائی گروہ کی طرف تھا، یعنی اگر سبائیوں میں سے کوئی شخص سوچتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ حکومت کا حق دار ہے تو ذرا سامنے آئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ اس ارشاد کا مطلب نہ سمجھ سکے اور بلاوجہ پیچ وتاب کھاتے رہے۔
مگر یہ تشریح نہایت بعید ہے: کیوں کہ اگر یہی بات ہوتی تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اتنا غصہ نہ آتا جس کا ذکر اس روایت میں ہے۔ ناممکن ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مجلس کے ماحول اور متکلم کے تاثرات اور لہجے کو دیکھ سن کر بھی صحیح مطلب نہ سمجھ پائیں اور خواہ مخواہ طیش میں آجائیں، حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سالار اور مقرب ہونے کے باوجود وہی مطلب سمجھیں جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سمجھے تھے، حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ان کے فہم پر اعتراض نہ کریں بلکہ اتنا کہیں کہ آپ نے صبر کر کے اچھا کیا مگر ہم چودہ صدیوں بعد فقط کتابی الفاظ سے صحیح مطلب اخذ کر لیں۔ اسی لیے شارحینِ حدیث میں سے کسی نے یہ مفہوم مراد نہیں لیا۔
شراحِ حدیث نے یہاں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اشارے میں دو احتمال ذکر کیے ہیں: ایک یہ کہ اشارہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔ دوسرا یہ کہ اشارہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔ سابقہ سیاسی کش مکش کو دیکھتے ہوئے پہلا احتمال بہت واضح ہے، اسی لیے حافظ ابن حجر نے دوسرے قول کو بعید قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قيل اراد عليا وعرض بالحسن والحسين، وقيل اراد عمر وعرض بابنه عبدالله، وفيه بُعدٌ لان معاوية كان يبالغ في تعظيم عمر. (کہا گیا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور انہوں نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما پر چوٹ کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور انہوں نے ان کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ پر چوٹ کی مگر یہ امکان بعید ہے کیوں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔) ﴿فتح الباری: ۷/۴۰۴﴾ رہا یہ سوال کہ آخر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسنین رضی اللہ عنہما کے مناقب جانتے ہوئے بھی خود کو ان حضرات سے زیادہ حق دارِ خلافت کیسے کہہ رہے تھے۔ اس کا جواب خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک خطبے سے ملتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا: ''میں تمہارا بہترین آدمی نہیں؛ کیوں کہ تم میں عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عمرو جیسے حضرات مجھ سے افضل ہیں۔'' (لكني عسيت ان اكون كاكم لعدوكم وانعمكم) مگر میں تمہارے دشمن کے لیے زیادہ تکلیف دہ اور تمہارے ساتھ زیادہ بھلائی کرنے والا ہوں۔'' (تاریخ دمشق: ۵۹/۱۶۳)
اسی لیے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی (کہ خلافت کے معاملے میں) قوت، تدبیر اور فہم میں بالاتر شخص کو قبولِ اسلام، دینداری اور عبادت میں سبقت رکھنے والے آدمی پر ترجیح حاصل ہے۔ اسی لیے انہوں نے مطلقاً کہا کہ وہ زیادہ حق دار ہیں۔ جبکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے اس کے برخلاف یہ تھی کہ کم فضیلت والے کی بیعت نہیں کی جانی چاہیے سوائے اس صورت کے جب فتنے کا خدشہ ہو، اسی لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کے بعد مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، پھر ان کے بیٹے یزید کی بیعت بھی کی اور اپنے بیٹوں کو اس کی بیعت توڑنے سے منع کیا، پھر عبدالملک کی بیعت بھی کر لی۔ (فتح الباری: ۷/۴۰۴)
حاصل یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود کو حضرت علی، حسنین یا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے زیادہ افضل واشرف نہیں کہتے تھے، البتہ ان کا خیال تھا کہ حکومت میں ہی بہتر چلا سکتا ہوں، اسی لیے وہ اس کی تگ ودو کرتے رہے۔ وہ اس کوشش میں بہرحال نیک نیت تھے اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ بلاشبہ وہ نہایت قابل اور عادل حکمران تھے۔

② مطلب یہ تھا کہ میں ان قدیم مہاجرین صحابہ میں ہوں جو بدر، احد اور خندق میں تمہارے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے جہاد کر چکے ہیں، تم لوگ اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ سابقہ خلافتوں میں ''سبقت فی الاسلام'' اور ہجرت، جہاد اور قربانیوں کو اہلیت کا مدار بنایا گیا تھا اس لحاظ سے میں تم سے زیادہ اہل ہوں۔

③ صحیح البخاری، ح: ۴۱۰۸، المغازی، باب غزوة الخندق

ایک غلط فہمی کا ازالہ: بعض مؤرخین اور شارحین حدیث کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر یزید کی ولی عہدی کے موقع (بقیہ اگلے صفحے پر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اقتدار منتقل کیا تو یہ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے کیا کہ ان میں قیادت وسیادت کی صلاحیت ہے اور وہ عادل، متقی اور اُمت کے خیر خواہ ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً ان سے صلح نہیں، جنگ کرتے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خوبیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انکار تھا نہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو۔ ہاں ان میں خلفائے راشدین کی صفات کی بہ نسبت جو فرق تھا، اسے بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

اہلِ مدینہ کی بیعت:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری اور اپنے اعلانِ خلافت کے بعد عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں اپنے نائبین کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں سے ان کی بیعت لیں۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''عام الجماعۃ والے سال حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کو مدینہ بھیجا کہ وہ اہلِ مدینہ سے ایک ایک قبیلہ کرکے ان کے پرچموں کی موجودگی میں بیعت لے۔ جب انصار کی حاضری کا دن آیا تو اس دن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)--- پر مدینہ منورہ میں کی تھی۔ (كشف المشكل من حديث الصحيحين لابن الجوزي: ۱/۱۶۷)

مگر یہ صرف قیاس ہے۔ روایت میں کہیں بھی مدینہ یا یزید کا ذکر نہیں۔ اس قیاس کے غلط ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرنے والے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ چھڑنے سے پہلے بالاتفاق ۴۲ھ میں فوت ہو چکے تھے۔ **(تقریب التهذيب، تر: ۱۱۰۶ ؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۳ ؛ تاريخ خليفة بن خياط، سن ۴۲ھ)**

یزید کے مداح چونکہ اس روایت کو یزید کی خلافت پر ''اجماع'' کی دلیل بنانا چاہتے ہیں، اس لیے انہوں نے یہ نئی بات نکالی ہے کہ حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۰ھ کے قریب ہوئی تھی، اس بارے میں وہ الاصابہ کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں: **لم يزل مع معاوية في حروبه و جهه الى آرمينية واليا فمات بها سنة اثنين و اربعين ولم يبلغ خمسين. (الاصابة: ۲/۲۲ عن ابن سعد)**

حالاں کہ عبارت میں صراحت ہے کہ وفات ۴۲ھ میں ہوئی۔ لم يبلغ خمسين سے مراد ان کی عمر ہے۔ مطلب یہ کہ اس وقت ان کی عمر پچاس برس سے کم تھی۔ جیسا کہ حافظ مزی نقل کرتے ہیں: **حبيب يوم توفي رسول الله ﷺ ابن اثنتي عشرة سنة. (تهذيب الكمال: ۵/۳۹۸)**

جب اس قصے کو نقل کرنے والے راوی حبیب بن مسلمہ خود ۴۲ھ میں یقینی طور پر فوت ہو چکے ہیں تو یہ واقعہ یزید کی ولی عہدی سے متعلق کیسے ہو سکتا ہے جو بلاشبہ کئی برسوں بعد ہوئی تھی۔ معجم کبیر طبرانی اور مجمع الزوائد کی درج ذیل روایت اس مسئلے کو حل کر دیتی ہے:

عن ابن عمر: لما كان يوم الذى اجْتُمِعَ فيه على معاوية بدُومَة الجَندَل، قالت لي حفصة: انه لايجمل بك ان تتخلف عن صلح يصلح الله به بين امة محمد ﷺ، انت صهر رسول الله ﷺ، وابن عمر بن الخطاب، فاقبل معاوية يومئذ على بختي عظيم فقال من يطمع في هذا الامر و يرجوه او يمد له عنقه قال ابن عمر فما حدثت نفسي بالدنيا قبل يومئذ ذهبت ان اقول: يطمع فيه من ضربك واباك الى الاسلام حتى ادخلكما فيه فذكرت الجنة ونعيمها فاعرضت عنه.

''ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب وہ دن آیا جس میں دُومۃ الجَندَل میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر اتفاق ہوا تو (ان دنوں میں) مجھے حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''آپ کو زیب نہیں دیتا کہ آپ اس صلح سے دور رہیں جس کے ذریعے اللہ نے امت محمدیہ کے درمیان اتفاق پیدا کر دیا ہے۔ آپ حضور اکرم ﷺ کے سالے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔'' پس حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ایک بڑے اونٹ پر سوار ہو کر آئے۔ فرمایا: ''کون ہے جسے اس امر کی حرص و امید ہے یا وہ اس کے لیے گردن اٹھانا چاہتا ہے؟'' ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''مجھے اس دن سے پہلے کبھی دنیا کی تمنا نہیں ہوئی تھی، میں کہنے لگا تھا کہ اس امر کی حرص اسے ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کی خاطر لڑائی کی یہاں تک کہ تمہیں اسلام میں داخل کرا دیا۔ پھر میں نے جنت اور اس کی نعمتوں کو یاد کیا اور اس خیال کو جانے دیا۔''

قال الهيثمي، رواه الطبراني ورجاله ثقات، والظاهر انه اراد صلح الحسن بن علي ووهم الراوي. (مجمع الزوائد، روایت نمبر ۹۰۵۷)

ابو بکر ہیثمی روایت کے راویوں کو ثقہ قرار دینے کے ساتھ یہ وضاحت کر رہے ہیں کہ یہاں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے صلح کا ذکر ہے۔ راوی کو وہم ہوا ہے (کہ دُومۃ الجندل کا ذکر کیا، ورنہ یہ صلح وہاں نہیں ہوئی تھی۔) اس سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر خلافت کا عہدہ لیتے ہوئے عراق میں کی تھی۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ ۴۱ھ کا واقعہ ہے۔ اسی لیے ۴۲ھ میں فوت ہونے والے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اس واقعے کے چشم دید گواہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کر سکے۔ اس واقعے کا یزید کی ولی عہدی کی بیعت سے کوئی تعلق نہیں۔

بنو سلمہ بھی آئے۔ بسر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا ان میں جابر ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں۔''

بسر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ لوگ واپس جائیں، میں ان کی بیعت قبول نہ کروں گا جب تک کہ جابر نہ آجائیں۔''

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پس کوئی شخص میرے پاس آیا اور کہا: ''ہم آپ کو اللہ کی قسم دیتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں اور بیعت کرلیں۔ تا کہ اپنا اور اپنی قوم کا خون محفوظ کرسکیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہمارے جوان مرد مارے جائیں گے اور ہماری اولاد باندیاں بنائی جائے گی۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے انہیں رات تک انتظار کرنے کا کہا۔ شام کو میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور یہ ماجرا سنایا۔ وہ بولیں: ''میرے بھتیجے! جاؤ بیعت کر کے اپنا اور اپنی قوم کا خون محفوظ کرلو۔ میں نے اپنے بھتیجے کو بھی یہی کہا تھا، وہ گیا اور اس نے بیعت کرلی ہے۔''[1]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے عہد کی پاسداری:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ جنہوں نے اختیار اور طاقت کے ہوتے ہوئے خلافت حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تھی، بعد میں بھی امت کے ایسے محبوب بزرگ رہے کہ ان کے اشارے پر ہزاروں گردنیں کٹنے کو تیار تھیں، مگر وہ امت کے مفاد کو مدنظر رکھنے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اہلیت کو تسلیم کرنے کی وجہ سے ان کے تابع دار رہے۔

اگر چہ کچھ لوگ انہیں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف اُکسانے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی طرف سے انکار کو ان کی کمزوری یا بزدلی قرار دیتے رہے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے اور غلط باتیں پھیلانے والوں کی تردید بھی کرتے رہے۔ صلح کے بعد کسی موقع پر حضرت جبیر بن نضیر نے ان سے پوچھا:

''لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ (اب بھی) خلافت کے خواہش مند ہیں؟''

آپ رضی اللہ عنہ نے پرزور انداز میں نفی کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] حدثنا ابو اسامة قال حدثني الوليد بن كثير عن وهب بن كيسان قال سمعت جابر بن عبدالله يقول: لما كان عام الجماعة بعث معاوية الى المدينة بسر بن ارطاة ليبايع اهلها على راياتهم وقبائلهم فلما كان يوم جاء ه الانصار جاء ه بنو سُلِمة فقال افيهم جابر؟ قالوا لا قال فليرجعوا فاني لست مبايعهم حتى يحضر جابر، قال فاتاني فقال: ناشدتك الله الا ما انطلقت معنا فبايعت فحقنت دمك ودماء قومك فانك ان لم تفعل قتلت مقاتلتنا و سبيت ذرارينا، قال: فاستنظرهم الى الليل، فلما امسيت دخلت على ام سلمة زوج النبي ﷺ فاخبرتها الخبر فقالت: يابن ام انطلق فبايع واحقن دمك ودماء قومك فاني قد امرت ابن اخي يذهب فيبايع. (مصنف ابن ابي شيبة، روايت نمبر: ۳۰۵۶۲ بسند صحيح متصل بل هو اصح مافي الباب، ط الرشد)

اس روایت کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر بیعت نہ کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرتا اور ان کے بال بچوں کو غلام بناتا تھا۔ ایسا عملاً کہیں ثابت نہیں۔ نہ ہی یہ منقول ہے کہ ہر شہر میں بیعت کے لیے لشکر بھیجے گئے ہوں۔ البتہ مدینہ میں لشکر بھیجنا اس صحیح روایت میں آیا ہے۔ جس کی توجیہہ دینا ضروری لازم ہے۔ اگر پہلی صدی ہجری کے مختلف واقعات مثلاً دورِ مشاجرات اور واقعہ حرہ وغیرہ کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اہلِ حجاز خصوصاً اہلِ مدینہ کو اہلِ شام کی ماتحتی میں کوئی رغبت نہ تھی۔ اس بات کا اندازہ اہلِ شام کو بھی اچھی طرح تھا۔ اسی لیے یہاں بیعت کے لیے خاص طور پر لشکر بھیجا گیا تا کہ کہیں اہلِ مدینہ پر کچھ رعب رہے اور وہ خود کو آزاد سمجھ کر الگ الگ آراء قائم نہ کرلیں اور افتراق وانتشار کی چنگاریاں دوبارہ نہ بھڑک اٹھیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے جو یہ کہا کہ اپنا اور اپنی قوم کا خون محفوظ کرلیں ورنہ جوان مارے جائیں گے اور اولاد باندیاں بنائی جائے گی، یہ خدشات تھے۔ حقیقت میں ایسا عملاً ہوا نہیں تھا۔ بہرکیف انہی خدشات کے پیشِ نظر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہی فرمایا کہ بیعت کر کے اپنا اور قوم کا خون محفوظ کرلو۔

''عربوں کے سر میرے لیے کٹنے کو تیار ہیں۔ وہ اس سے لڑیں گے جس سے میں لڑوں گا۔ وہ اس سے صلح کریں گے جس سے میں صلح کروں گا۔ میں نے خلافت کو اللہ تعالیٰ کی رضا پانے اور امتِ محمدیہ کا خون محفوظ رکھنے کی خاطر ترک کیا تھا۔ تو کیا اب میں دوبارہ اہلِ حجاز میں خون ریزی کراؤں؟''[1]

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی بیعت:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بعض مخلص امراء ورفقاء شروع میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کو تیار نہ تھے۔ ان میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہ سرِ فہرست تھے مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے تدبر اور نرمی سے کام لے کر انہیں راضی کرلیا تاکہ کم قیمت پر مسلمانوں میں اتحاد واتفاق ہوجائے۔ انہوں نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے پاس سفیر بھیج کر پوچھا: ''آپ کس کے حکم کے تحت لڑنے پر تلے ہیں، کیوں کہ جن کے آپ تابع دار تھے، وہ تو خود میری بیعت کرچکے ہیں۔''

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے دب جانا پسند نہ کیا۔ تب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک سادہ کاغذ پر مہر لگا کر لکھ دیا: ''جو آپ شرائط چاہیں اس پر لکھ دیں، مجھے سب قبول ہے۔'' عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اتنی کشادہ دلی کو خلافِ احتیاط تصور کیا اور فرمایا: ''قیس کے ساتھ رعایت مناسب نہیں۔''

یہ سن کر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ سوچیے تو سہی ہم ان پر اس وقت تک غالب نہیں آسکتے جب تک شام والوں کے بھی اتنے ہی افراد نہ مارے جائیں، پھر ان کے بغیر زندگی کا کیا مزہ۔ اللہ کی قسم! جب تک کوئی صورت ممکن ہے، میں قیس سے نہیں لڑوں گا۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے وہ مہر شدہ رقعہ بھیجا تو حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے اپنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں کے لیے ضمانت طلب کی کہ جو لوگ (گزشتہ جنگوں میں) ان کے ہاتھوں قتل ہوئے یا جو مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا، اس کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ اس معاہدے میں انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے مال کی خواہش بالکل نہیں کی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شرط کو قبول کرلیا۔ ان کے سب ساتھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حلقے میں شامل ہوگئے۔[2]

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی حکمتِ عملی میں نرمی اور دل جوئی کو ترجیح تھی، وہ دلی طور پر اُمت کے خیر خواہ تھے اور حتی الامکان طاقت کی جگہ مفاہمت کی سیاست کے قائل تھے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ صلح نامے میں یہ شرط بھی تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے مگر قدیم مآخذ کی کسی معتبر روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر یہ شرط طے پاگئی ہوتی تو آئندہ یزید کی ولی عہدی کے موقع پر لوگ یہ ضرور کہتے کہ یہ حق حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا تھا اور چونکہ ان کی وفات ہوچکی ہے اس لیے یہ حق ان کی اولاد کا ہونا چاہیے مگر اس وقت کسی نے یہ دلیل نہیں دی۔ غالباً یہ روایت اس لیے وضع کی گئی تھی تاکہ حضرت

① المستدرک للحاکم، ح: ۴۷۹۵ بسند صحیح
② تاریخ الطبری: ۱۶۵/۵

حسن رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لگایا جا سکے۔

حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی عراق سے روانگی اور آخری گفتگو:

خلافت سے دست برداری کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مدائن کے قلعے میں لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا:

''عراق والو! تم نے مجھ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ تم صلح اور جنگ میں میرا ساتھ دو گے۔ میں نے حضرت معاویہ سے بیعت کر لی ہے۔ اب تم ان کی سنو اور مانو۔''①

اس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوفہ گئے اور شہریوں سے رخصت ہونے سے قبل ایک پُر اثر تقریر کی جس میں لوگوں کو پڑوسیوں، مہمانوں اور بنو ہاشم کے حقوق کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔②

عراق کے فتنہ پرور لوگوں سے سادات کو بڑی تکالیف پہنچی تھیں مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے روانگی سے پہلے مثالی وسعتِ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان زیادتیوں کو معاف کر دیا اور فرمایا:

''عراق والو! میں نے تمہاری تینوں باتیں معاف کر دیں: میرے والد کا قتل، مجھ پر نیزے کا وار اور میرے سامان کی لوٹ مار۔''③

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سن کر بھی کچھ لوگوں کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح پر شرم دلانے لگے اور بولے: ''آپ مؤمنوں کے لیے باعثِ عار ہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: ''عار بہتر ہے نہ کہ نار۔''④

حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کا مدینہ منورہ میں قیام:

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر خاندان کے ساتھ ایک قافلے کی شکل میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔⑤

اس نقل مکانی میں کئی مصلحتیں تھیں: آپ اپنا دامن سیاسی جھمیلوں سے بچانا چاہتے تھے جو کہ کوفہ میں ممکن نہ تھا۔ آپ کو اپنے شدت پسند حامیوں اور خوارج سے خطرات بھی لاحق تھے، مدینہ منورہ آپ کے لیے محفوظ اور محبوب مقام تھا، جہاں آپ بقیہ زندگی یکسوئی سے بسر کرنا چاہتے تھے۔

---

① المعرفة والتاریخ: ۳/۳۱۷، ط الرسالة

② تاریخ الطبری: ۵/۱۶۵

③ تاریخ الطبری: ۵/۱۵۹، ۱۶۰ عن اسماعیل بن راشد ...... والد کا قتل معاف کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ قاتل کو معاف کر دیا بلکہ قاتل عبدالرحمن بن ملجم تو قصاصاً قتل کیا جا چکا تھا۔ غالباً حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ اس قتل کے پیچھے کارفرما سازش کی تحقیق کی جائے تو اہلِ عراق میں کئی لوگ خصوصاً خارجی اور سبائی اس کے پشت پناہ ثابت ہو جائیں گے اور حکمران بطورِ تعزیر ایسے لوگوں کو بھی سزا دے سکتا ہے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان سے درگزر کا معاملہ فرمایا۔ والد کا قتل معاف کرنے سے غالباً یہی مراد تھا۔

④ الاصابة: ۲/۶۴، تاریخِ آگ

⑤ تاریخ الطبری: ۵/۱۶۵

آپ کی باقی عمر مدینہ منورہ میں امت کی روحانی تربیت اور اصلاحِ عقائد میں گزری۔ آپ رضی اللہ عنہ شر پسند عناصر کی
سادات کرام کے بارے میں مبالغہ آرائیوں کی ہمیشہ نفی کرتے رہے۔ کسی نے پوچھا:

''آپ کے حامی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قیامت سے پہلے دوبارہ زندہ ہوں گے۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پُر زور تردید کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ کی قسم! وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ ہمارے گروہ کے لوگ نہیں، اگر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زندہ ہونے کا عقیدہ رکھتے تو ان کی ازواج دوبارہ نکاح نہ کرتیں، ان کی میراث تقسیم نہ ہونے پاتی۔''[1]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا حسنین کریمین سے حسن سلوک:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ عمر بھر حسنین کریمین کی خدمت اور اعزاز واکرام فرماتے رہے۔ ایک بار حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا:

''میں آپ کو ایسا عطیہ دوں گا جو اس سے پہلے کسی نے کسی کو نہ دیا ہوگا۔'' پھر انہیں دو لاکھ درہم دیے۔[2]

ایک بار حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہما اور (ان کے چچازاد) عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کو ایک ایک لاکھ درہم بھیجے۔[3]

تحائف دینے کا یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ہدیے قبول کرتے رہے۔[4]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی کردار کشی کی مہم:

چونکہ حضرت مُعاویہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کی صلح کے باعث شدت پسندوں کو مایوسی ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو "مُذِلُّ الْعَرَب" (عربوں کو ذلیل کرنے والا) کے الفاظ کے ساتھ طعنے دیے۔[5] اس کے علاوہ ایسی روایات بھی پھیلا دیں کہ آپ نے صلح محض عیش وآرام کے لیے کی تھی، زندگی نکاح پر نکاح کرنے اور طلاقیں دینے میں گزاری۔ کہا گیا کہ آپ نکاح کے چند دن بعد طلاق دے دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کا لقب ''مِطلاق'' یعنی کثرت سے طلاقیں دینے والا پڑ گیا۔[6]

یہ تمام روایات نہایت ہی ضعیف بلکہ اکثر منقطع یا بے سند ہیں، اگر سند ہے تو ان میں ہشام کلبی، ابن جعدبہ اور واقدی

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۶۳/۳، ط الرسالة
② تاریخ دمشق: ۱۹۳/۵۹
③ تاریخ دمشق: ۱۹۳/۵۹
④ تاریخ دمشق: ۱۹۳/۵۹
⑤ تاریخ الطبری: ۱۶۵/۵
⑥ البدایة والنهایة: ۱۹۷/۱۱، ۱۹۸

جیسے راوی ہیں جنہیں ائمہ جرح وتعدیل نے انتہائی ضعیف قرار دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ طلاق کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے نزدیک حلال کاموں میں سب سے نفرت انگیز کام شمار کیا ہے۔[1] کیا اللہ کے نبی کا پیارا نواسا جو ہر آن اللہ کی رضا کا متلاشی تھا، اللہ کے نزدیک نفرت انگیز کام کو اتنی کثرت سے کر سکتا تھا؟

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ عمر بھر مدینہ طیبہ میں رہے۔ سن ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں جب کہ آپ کی عمر ستاون (57) برس تھی، کسی نے آپ کو پراسرار انداز میں زہر دے دیا، جس کے اثر سے آپ رضی اللہ عنہ کچھ دنوں بعد وفات پا گئے۔ نمازِ جنازہ کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو آگے کیا جو بنو اُمیہ کے نامی گرامی فرد تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو جنت البقیع میں اپنی والدہ ماجدہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پہلو میں دفنایا گیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر مسجد نبوی میں جمع لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو! آج رسول اللہ ﷺ کا پیارا چل بسا۔''

یہ سن کر حاضرین میں سے کوئی بھی شخص اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔[2]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت اگرچہ مختصر رہا مگر اُمت پر ان کا یہ احسان ہمیشہ باقی رہے گا کہ انہوں بے مثال ایثار اور غیر معمولی حکمت وتدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُمت کو اتحاد کی راہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے ایسی قربانی دی جس پر مسلمانوں کی تاریخ کو ناز رہے گا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی اولاد تھے۔ خلافت کے منصب عالی پر فائز تھے۔ سپاہِ عراق ان کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھی۔ ان کی محبوبیت ومقبولیت مسلّم تھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود انہوں نے جھکنا قبول کر لیا۔ ان کی جگہ کوئی بھی حکمران ہوتا تو اپنے اقتدار پر کٹ مرتا۔ مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ، دنیوی بادشاہ نہیں، ان خلفائے راشدین کا تتمہ اور ان کا عکس تھے جن کا اقتدار ذات، غرض، نفس، خواہش اور مفاد جیسے مفاہیم سے ناآشنا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جس بے مثال ایثار وقربانی کا مظاہرہ کیا وہ ایک خلیفۂ راشد ہی کے بس کی بات تھی۔ انتشار وافتراق کے دور میں مسلمانوں کو متحد کرنے اور اہلِ فتنہ سے دامن بچانے کی بابت ان کا اُسوہ تا قیامت مسلمانوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

☆☆☆

---

[1] ابغض الحلال الی اللہ تعالیٰ الطلاق. (سنن ابی داؤد، ح: ۲۱۷۸، کتاب الطلاق، باب فی کراھیۃ الطلاق)

[2] البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۰/۱۱ تا ۲۱۲

نوٹ: مشہور ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے میں ان کی اہلیہ جعدہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کا ہاتھ تھا مگر یہ بات اسنادی حیثیت سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ جن روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے وہ بے سند یا مجہول وضعیف راویوں سے منقول ہیں۔ تفصیل ''باب ازالہ شبہات'' میں دیکھ لی جائے۔

خلافتِ راشدہ کے متعلق اسلامی عقیدہ

جمہور مسلمین کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے کہ خلافتِ راشدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک تھی، جب کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حکومت کے پانچ مہینے دورِ علوی ہی کا تتمہ تھے۔ ان کے بعد کا دور، خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں۔

یہ کوئی تاریخی بحث نہیں، عقیدے کا مسئلہ ہے، اسی لیے اس بحث کو کتبِ عقائد میں درج کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] اسلاف نے خلافتِ راشدہ کے خلفائے اربعہ میں محدود ہونے پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے بطورِ نمونہ کتبِ عقائد کی بعض عبارات پیش کی جا رہی ہیں:

● قال الامام الاعظم ابوحنیفۃ: "وافضل الناس بعد النبیین علیہم الصلوٰۃ والسلام ابوبکر الصدیق، ثم عمر بن الخطاب، ثم عثمان بن عفان ذو النورین ثم علی بن ابی طالب." (الفقہ الاکبر، ص ۴۱)

● وقال الامام احمد بن حنبل: "خیر الناس بعد رسول اللہ ﷺ ابوبکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علیّ." (العقیدۃ، احمد بن حنبل بروایۃ خلال، ص ۲۳)

● وقال الامام الشافعی: اقدم ابابکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علیاً فہم الخلفاء الراشدون. (نقلہ الامام السیوطی فی حقیقۃ السنۃ والبدعۃ، ص ۲۰۹)

● وقال امام الشافعیۃ اسماعیل بن یحییٰ المزنی تلمیذ الشافعی: "ویقال بفضل خلیفۃ رسول اللہ ﷺ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، فہو افضل الخلق واخیرہم بعد النبی ﷺ ونثنی بعدہ بالفاروق وہو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فہما وزیرا رسول اللہ ﷺ وضجیعاہ فی قبرہ وجلیسہ فی الجنۃ ونثلث بذی النورین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ثم بذی الفضل والتقیٰ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین." (شرح السنۃ، ص ۱۶)

● وقال الامام ابوجعفر الطحاوی: "ونثبت الخلافۃ بعد رسول اللہ ﷺ اولاً لابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ تفضیلاً لہ وتقدیماً علی جمیع الامۃ ثم لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ثم لعثمان رضی اللہ عنہ، ثم لعلی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، وہم الخلفاء الراشدون والائمۃ المہدیون." (العقیدۃ الطحاویۃ ص ۸۱)

● وقال الامام ابوالحسن الاشعری: "ہؤلاء ہم الائمۃ الاربعۃ المجمع علی عدلہم وفضلہم رضی اللہ عنہم اجمعین. وقد روی شریح النعمان قال حدثنا حشرج بن نباتہ عن سعید بن جہمان قال حدثنی سفینۃ قال قال رسول اللہ ﷺ الخلافۃ فی امتی ثلاثون سنۃ ثم ملک بعد ذلک. ثم قال لی سفینۃ: امسک خلافۃ ابی بکر وخلافۃ عمر، وخلافۃ عثمان ثم امسک خلافۃ علی بن ابی طالب." (الابانۃ فی اصول الدیانۃ لابی الحسن الاشعری، ص ۲۵۹)

● وقال الامام ابن تیمیۃ: انہم یؤمنون ان الخلیفۃ بعد رسول اللہ ﷺ ابوبکر، وعمر ثم عثمان ثم علی ومن طعن فی خلافۃ احد من ہؤلاء فہو اضل من حمارہ. (العقیدۃ الواسطیۃ، ص ۱۱۸، ط اضواء السلف)

بل اہل السنۃ یقولون بالحدیث الذی فی السنن "خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم تصیر ملکا." (منہاج السنۃ: ۴/۵۲۲)

● وقال امام المتکلمین ابوبکر الباقلانی: تحت قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (سورۃ النور: ۵۵) وکان من ذالک ما وعدہم اللہ تعالیٰ واستخلف الاربعۃ الائمۃ الخلفاء الراشدین. (تمہید الاوائل، ص ۱۸۵)

● وقال امام الحرمین جوینی: الخلفاء الراشدون لما ترتبوا فی الامامۃ فالظاہر ترتیبہم فی الفضیلۃ فخیر الناس بعد رسول اللہ ﷺ ابوبکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علی رضی اللہ عنہم اجمعین وقد قال علیہ السلام: سنۃ الخلافۃ بعد ثلاثون سنۃ ثم تصیر ملکا عضوضا، وکانت ایام الخلفاء ہذا القدر. (لمع الادلۃ فی قواعد اعتقاد اہل السنۃ، ص ۱۳۰)......

(بقیہ اگلے صفحے پر)

بعض حضرات خلافتِ راشدہ اور بعد کی حکومتوں کا موازنہ اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ تعمیری اور ترقیاتی کام کس دور میں زیادہ ہوئے اور زیادہ ممالک کس خلیفہ یا بادشاہ نے فتح کیے۔ حالاں کہ مثالی حکمرانی کے لیے ان چیزوں کو اوّلین معیار بنانا درست نہیں ہے۔ اگر کوئی اس نقطۂ نگاہ سے دیکھے تو سلطان محمود غزنوی کا دور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور سے بہتر قرار پائے گا کیوں کہ مملکت کی حدودِ اربعہ اور زمینی فتوحات کی پیمائش میں سلطان محمود غزنوی کی فوقیت بالکل ظاہر ہے۔ اسلامی تعلیمات پر نگاہ رکھنے والا اور فرقِ مراتب کے آداب سے واقف کوئی بھی شخص ایسا کبھی نہیں سوچ سکتا۔

خلافتِ راشدہ کی وجوہِ فضیلت:

خلافتِ راشدہ کی اصل وجوہِ فضیلت چار چیزیں تھیں:

① خلفائے راشدین حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب اور نطقِ رسالت سے ظاہر ہونے والے مناقب میں ممتاز ترین تھے۔

② انہیں سبقت فی الاسلام، ہجرت اور دین کی خاطر قربانیوں کے لحاظ سے سب پر فضیلت حاصل تھی۔

③ فقہ و اجتہاد میں بھی یہ خلفاء باقی اُمت سے فائق تھے۔

④ ان کے دورِ اقتدار میں نظامِ سیاست پوری طرح اسلامی شورائیت پر استوار تھا اور وہ تمام خصوصیات اعلیٰ ترین پیمانے پر موجود تھیں جو ایک بہترین اور قابلِ رشک اسلامی حکومت میں مطلوب ہیں۔

بلاشبہ خلفائے راشدین کی صفاتِ حسنہ ایک حد تک بعض اموی و عباسی خلفاء میں بھی موجود تھیں مگر بعد کی اسلامی حکومتوں کا طرزِ سیاست اس لحاظ سے خلافتِ راشدہ سے مختلف تھا کہ ان میں شخصی اور خاندانی نظام ایک امرِ لازم تھا۔ اس طرزِ عمل نے خلافتِ راشدہ کو خلافتِ عامہ اور ملوکیت سے الگ کر کے ایک حدِ فاصل قائم کردی اور صحیح حدیث "الخلافة ثلاثون سنة." نے اس پر مہرِ توثیق ثبت کردی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

● قال الامام الغزالی: "فاما الخلفاء الراشدون، فهم افضل من غيرهم، وترتيبهم في الفضل عند اهل السنة كترتيبهم في الامامة. وهم اجمعوا على تقديم ابي بكر، ثم نص ابوبكر على عمر، ثم اجمعوا بعده على عثمان، ثم على علي رضي الله عنهم." (الاقتصاد في الاعتقاد، ص ۱۳۲)

● وقال الامام النسفي: وافضل البشر بعد نبينا ابوبكر الصديق، ثم عمر الفاروق، ثم عثمان ذوالنورين، ثم علي رضي الله عنهم، وخلافتهم على هذا الترتيب ايضاً. (متن عقائد النسفي، ص ۳)

● قال العلامة التفتازاني في شرحه: خلافتهم اى نيابتهم عن الرسول في اقامة الدين بحيث يجب على كافة الامم الاتباع على هذا الترتيب ايضاً يعني ان الخلافة بعد رسول الله ﷺ لابي بكر ثم لعمر، ثم لعثمان، ثم لعلي رضي الله عنهم. (شرح العقائد النسفية، ص ۳۴۸)

بعض علمائے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو بھی خلفائے راشدین میں شمار کیا ہے۔ (عمدة القاری: ۱/۱۱۳) عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا الحاق بھی اسی صف میں کیا گیا ہے: الا عمر بن عبدالعزيز فانه ملحق بالخلفاء الراشدين وكذلك ابن الزبير. (الصواعق المحرقة لابن حجر هيثمي: ۲/۶۲۹)

علامہ ابن خلدون نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی کہا ہے: "فهو من الخلفاء الراشدين" (تاريخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰)

ان تمام حضرات نے لغوی مفہوم کے لحاظ سے دیگر حضرات پر یہ اطلاق کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نیک سیرت حکمران کو "راشد" کہا جا سکتا ہے۔ اس سے اصطلاحی خلافتِ راشدہ کے چار میں محدود ہونے کی نفی نہیں ہو جاتی لیکن اگر بالفرض ان حضرات میں سے کوئی اصطلاحی خلافتِ راشدہ کے مفہوم ہی میں توسیع کرنا چاہتا ہو تو ظاہر ہے کہ جمہور ائمہ اسلام کے اجماع کے مقابلے میں اس انفرادی رائے کا کچھ وزن نہیں ہو سکتا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ارشاد:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خلافت میرے بعد تیس سال تک رہے گی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بلافصل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور دو سال چار ماہ خلافت کی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور دس سال چھ ماہ خلافت کی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور بارہ سال سے چند روز کم خلافت کی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور چار سال نو ماہ خلافت کی۔ پھر امام حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور پانچ ماہ خلافت کی۔ اس حساب سے خلفائے اربعہ کی مدتِ خلافت انتیس (۲۹) سال سات (۷) ماہ ہوئی اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی پانچ (۵) ماہ خلافت سے تیس سال پورے ہو گئے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ صلح ۱۵ جمادی الاولیٰ ۴۱ ہجری میں وقوع پذیر ہوئی جس سے خلافتِ راشدہ کی مدت تیس سال پوری ہو گئی اور اس کے بعد امارت اور حکومت یعنی سلطنت اور بادشاہت شروع ہوئی۔''[1]



① تلخیص از '' ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء '': ۲/ ۳۵۲ تا ۳۵۴

دوسرا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ

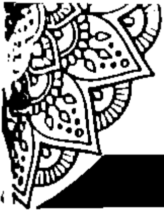
خلافت عامّہ

دورِ حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

عہدِ امن واستحکام

41 ھجری تا 60 ھجری

661ء تا 680ء



خاندان اور ابتدائی حالات

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قریش کے خانوادے، بنو اُمیہ کے نہایت باصلاحیت اور ہونہار فرد تھے۔آپ کے والد حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ اور والدہ ہند بنت عُتبہ رضی اللہ عنہا نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا جبکہ آپ اس سے پہلے سن ۷ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۂ قضا کے وقت خفیہ طور پر مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت باوقار اور مرعوب کن تھی۔طویل قد و قامت اور گوری رنگت والے نہایت خوبصورت انسان تھے۔[2] بچپن ہی سے آپ رضی اللہ عنہ میں قیادت کے جوہر اتنے نمایاں تھے کہ قیافہ شناس لوگ سر راہ ایک نظر دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھتے تھے:"اللہ کی قسم! یہ بچہ اپنی قوم کا رہنما بنے گا۔"[3]

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قریش کے گنے چنے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں شمار ہوتے تھے۔فتح مکہ کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مقرر ہوئے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے عرب رؤسا کے نام خطوط لکھواتے تھے اور وحی کی کتابت بھی کراتے تھے۔[4]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب رہا اور بکثرت احادیث سننے اور نقل کرنے کا موقع ملا۔ان سے ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) احادیث مروی ہیں۔[5]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمات سے خوش ہو کر دعائیں دیا کرتے تھے۔ایک بار یہ دعا دی:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ."

''اے اللہ! اسے ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنادے اور اس کے ذریعے ہدایت عام فرما۔''[6]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیاتِ مبارکہ میں ایسے اشارے دے گئے تھے جن سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اندازہ تھا کہ مستقبل میں مسلمانوں کی قیادت کی بھاری ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آپڑے گی۔ایک بار آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:''مُعاویہ! اگر تمہیں حکومت کا ذمہ دار بنایا جائے تو اللہ سے ڈرتے رہنا اور عدل و انصاف سے کام لینا۔''

---

① تاریخ دمشق لابن عساکر: ۵۷/۵۹؛ طبقات ابن سعد: ۴۰٦/۷، ط صادر۔ بوقتِ اسلام عمر کا اندازہ بوقتِ وفات ان کی عمر سے لگایا گیا ہے۔

② سیر اعلام النبلاء: ۱۲۱/۳، ط الرسالة

③ تاریخ دمشق لابن عساکر: ۵۷/۵۹

④ مسند احمد،ح: ۳۰۱۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۲۳/۳، ط الرسالة

⑤ اسماء الصحابة الرواة لابن حزم، ص ۵۵ ⑥ سنن الترمذی،ح: ۳۸۴۲، ابواب المناقب، بسند حسن

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے (جو بلاشبہ ایک پیش گوئی تھی) مجھے برابر یہ خیال رہا کہ مجھے حکومت کی آزمائش میں ضرور مبتلا کیا جائے گا اور آخر مجھے اس ذمہ داری سے سابقہ پڑ کر رہا۔''[1]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی فتوحات میں شریک رہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

شام کی فتح مکمل ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان اور ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما کو اس سرزمین میں اپنا نائب مقرر کیا۔ یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نگاہِ انتخاب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر پڑی جو صلاحیتوں میں اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز تھے۔ انہیں شام جیسی اہم ترین سرحد کا امیر بنانا جہاں ہر لمحے رومیوں کے حملے کا خطرہ موجود رہتا تھا، ان پر مکمل اعتماد کا ثبوت تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام کے اس جرنیل نے سمندری جہاد شروع کیا، رومیوں کو ناکوں چنے چبوائے اور متعدد علاقے فتح کیے۔[2]

صلح ہو یا جنگ، آپ ہر حال میں شرعِ اسلامی کے پابند تھے۔ ایک بار آپ کا رومیوں سے صلح کا معاہدہ چل رہا تھا، اس دوران آپ نے فوج کو سرحد پر جمع کرلیا اور صلح کی مدت ختم ہوتے ہی فوج کو دشمن کے علاقے میں داخل کر دیا۔ اتنے میں ایک صحابی حضرت عَمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تیزی سے آئے اور کہا: ''عہد کی خلاف ورزی مومن کا شیوہ نہیں۔''

پھر یہ حدیث یاد دلائی: ''جب دو قوموں میں صلح کا معاہدہ ہو تو کوئی فریق اسے نہ توڑے۔'' یعنی اس دوران صلح کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔ مقصد یہ تھا کہ جنگ بندی کے دوران فوج جمع کر کے حملے کی تاک میں رہنا اور مدت ختم ہوتے ہی سرحدی خلاف ورزی کرنا درست نہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ سنتے ہی فوراً افواج کو واپسی کا حکم دے دیا اور جو علاقے فتح کیے تھے، انہیں خالی کر دیا۔[3]

آئینِ الٰہی کی پابندی کی ایسی مثال صحابہ کرام ہی کے ہاں مل سکتی ہے۔

صحابہ کا آپ پر اعتماد:

خلفائے راشدین اور فضلائے صحابہ کو آپ کی صلاحیتوں پر نہ صرف پورا اعتماد تھا بلکہ آپ کا اندازِ سیاست دیکھ کر وہ داد دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''تمہیں قیصر و کسریٰ کی سیاست کے تذکرے کی کیا ضرورت، جبکہ تمہارے درمیان مُعاویہ موجود ہیں۔''[4]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''میں نے مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر امورِ سیاست کا ماہر اور کوئی نہیں دیکھا۔''[5]

---

① مسند احمد، ح: ۱۶۹۳۳، رجالہ ثقات

② اسد الغابۃ: ۲۰۱/۵

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲۵/۸

④ تاریخ الطبری: ۳۳۰/۵ بسند صحیح ⑤ تاریخ الطبری: ۳۳۷/۵ بسند صحیح

دورِ خلافت کا آغاز

جمادی الاولیٰ سن ۴۱ ہجری میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مسندِ حکومت پر بیٹھے تو عالم اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اُمت مسلمہ برسوں کی بحرانی کیفیت سے نکل آئی اور ان اسلام دشمن طاقتوں کو جو مسلمانوں کے سیاسی انتشار سے خوش تھیں، سخت مایوسی کا سامنا ہوا۔ مخلص مسلمانوں کے تمام طبقات سیاسی لحاظ سے یکجا ہو گئے۔ دِمَشق پہلی بار مسلمانوں کا دارالخلافہ بنا۔ اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک مرکزِ خلافت شام میں رہا۔ ①

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت مخلص مسلمان دو بڑے طبقوں میں بٹے ہوئے تھے: پہلا طبقہ شام والوں کا تھا، جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا وفادار تھا۔ دوسرا طبقہ عراق کے مسلمانوں کا تھا جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے یہ بیعت کر چکے تھے کہ آپ جس سے صلح کریں گے، ہم بھی اس سے صلح کرلیں گے۔

ان کے علاوہ غیر جانبدار بھی بکثرت تھے جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید، حضرت محمد بن مسلمہ، اسامہ بن زید، سلمہ ابن اکوع، عبداللہ بن عمر، ابوموسیٰ اشعری اور حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت کا منصب چھوڑ دیا تو عراق کے مخلص مسلمانوں نے بھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی۔ ان میں حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جیسے اکابر بھی تھے۔ غیر جانب دار اکابر نے عوام وخواص کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق دیکھا تو انہوں نے بھی بیعت کرلی۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مسند نشینی کے سال کو ''عام الجماعۃ'' (اجتماعیت اور اتحاد کا سال) کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی خیر و برکت کا باعث ہوئی۔ ②

یہ درست ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کرنا اور شام پر اپنی آزاد حکومت قائم رکھنا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خطائے اجتہادی تھی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب انہیں حکومت سپرد کر دی تو اس کے بعد انہیں بلاشبہ شرعی حکمران کی حیثیت مل گئی تھی۔ ③

شدت پسندوں کے بارے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل:

ایسے کچھ لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو درحقیقت شعوری یا غیر شعوری طور پر طاغوتی عناصر کے ہاتھوں مسلمانوں کو لڑانے کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ یہ تین گروہ تھے:

1. حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے۔

---

① تاریخ الطبری: ۵/۳۲۴. قال ابن حجر: فسمیت سنۃ الجماعۃ لاجتماع الناس وانقطاع الحرب. (فتح الباری: ۱۳/۶۳)

② تاریخ خلیفہ بن خیاط: تحت ۴۱ ھجری، تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی: ۱/۱۹۰، ط مجمع اللغۃ العربیۃ

③ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی فاروقی رحمہ اللہ ''صحابہ وخلفائے راشدین کے متعلق ضروری عقائد'' کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ابتداءً تو باغی تھے مگر حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی صلح وبیعت کے بعد بلاشبہ وہ خلیفہ برحق ہو گئے تھے۔'' (سیرت خلفائے راشدین، ص ۱۱)

❷ خارجی ذہنیت رکھنے والے متشدد مزاج لوگ جو اپنے سوا کسی کو مسلمان نہیں مانتے تھے۔

❸ شام کے شدت پسند اموی و مروانی جو قبائلی عصبیت کا شکار تھے۔

اہلِ شام کے تمام گروہ بلا استثناء پہلے ہی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں نے جن میں سبائی بھی گھلے ملے تھے، بادلِ نخواستہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی تا کہ خود کو محفوظ رکھیں۔خوارج نے بھی ایسا ہی کیا۔حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمتِ عملی کے ساتھ ان سب کو سنبھالا۔ تحمل، بردباری اور حسنِ تدبیر کے ساتھ انہیں اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور بلا ضرورت سختی سے اجتناب کیا۔

خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شکست کھا کر اپنی عسکری طاقت کھو دی تھی، مگر اب اندر ہی اندر وہ دوبارہ منظم ہو رہے تھے۔حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے عام لوگوں پر ہاتھ نہ ڈالا مگر ان میں سے جو لاقانونیت اور کھلی شرانگیزی کے مرتکب ہوئے انہیں لگام دینے میں دیر نہ کی۔یہی معاملہ سبائیوں کے ساتھ کیا گیا۔

☆☆☆

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اہداف

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے اوپر عائد ہونے والی اس ذمہ داری کا پوری طرح احساس تھا جو انہوں نے حکومت حاصل کر کے اپنے سر لی تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام کو جو بنو ہاشم کی عظیم قربانی اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور کے باعث متحد ہو چکا تھا، ایک مستحکم، پرامن اور ناقابلِ تسخیر طاقت بنا دیں۔ اس ضمن میں انہوں نے خلفائے راشدین کی سیرت کو سامنے رکھنے کے علاوہ دنیا کے مروجہ حکومتی نظاموں سے بھی استفادہ کیا اور ہر وہ صورت عمل میں لائے جس سے دولتِ امویہ ایک مسلم ریاست کے طور پر مضبوط تر ہو اور کوئی دشمن طاقت اس میں تزلزل پیدا نہ کر سکے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے اہم ترین کام یہ تھے:

① شریعت کی بالادستی برقرار رکھنا

② عرب قیادت کی تنظیم

③ بیرونی طاقتوں سے عالم اسلام کا دفاع اور نئی فتوحات

④ امن و امان کا قیام اور عدل و انصاف کی فراہمی

⑤ ملکی انتظامات کو بہتر اور جدید شکل دینا

⑥ بغاوتوں اور سازشوں کی اندرونی تحریکوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا

حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے سے لے کر وفات تک آپ رضی اللہ عنہ کی توجہ انہی اہداف کی تکمیل کی طرف مرکوز رہی۔ آیئے ان اہداف کے لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اقدامات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

☆☆☆

① شریعت کی بالادستی برقرار رکھنا

شریعت کی بالادستی جس طرح گزشتہ خلفاء کی زندگی کا منشور تھا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس کے قائل تھے۔ اس لیے آپ نے کبھی قصداً شریعت کے دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے زیرِ سایہ عالمِ اسلام کے ہر شہر میں کتاب وسنت ہی کو آئینی حیثیت حاصل تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین پر سر جھکا دیتے تھے۔ [1]

نصیحت پر فوراً عمل:

تین خلفائے راشدین پر قاتلانہ حملوں کے تجربات کے پیشِ نظر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے لیے پہرہ لگوایا کرتے تھے، اس وجہ سے ہر وقت ہر کوئی آپ سے نہیں مل سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک بار ایک صحابی ابومریم الازدی رضی اللہ عنہ آپ کے پاس گئے اور فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص کو اللہ لوگوں کا ذمہ دار بنائے اور پھر وہ اپنے اور مسلمانوں کی ضروریات اور مسائل کے درمیان پردے حائل کر لے تو اللہ اس کے مسائل اور اپنے درمیان پردے حائل کر دے گا۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ سنتے ہی ایک شخص کو مقرر کر دیا کہ وہ لوگوں کی ضروریات اور مسائل ان تک پہنچاتا رہے۔ [2]

قضیۂ قصاص میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی طرف رجوع:

شریعت کی بالادستی برقرار رکھنے کے ضمن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دلائل پر غور کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسی اجتہاد اور طرزِ عمل کی پیروی کی جو انہوں نے مسئلہ قصاص میں اختیار کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالف تحریک کے کارکنوں پر کوئی سزا جاری نہ کی بلکہ ان کے ساتھ عام معافی کا معاملہ کیا۔ [3] اس طرح یہ اجتہاد ہر لحاظ سے اجماع کی صورت اختیار کر گیا۔

آپ کے بیس سالہ دور میں ان تمام لوگوں کو جان و مال کا تحفظ حاصل رہا جو کسی سابقہ حکومت کے خلاف بغاوت

---

① حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ کا سیاسی اختلاف درست نیت سے تھا اور اس میں بھی شریعت کی مخالفت کا قصد ہرگز نہیں تھا۔ اس وقت بھی جو کچھ آپ نے کیا اپنی سوچ، سمجھ اور اجتہاد کے مطابق شرعاً واجب سمجھ کر کیا۔ اس لیے جمہور مسلمین اسے بھی خطائے اجتہادی کہتے ہیں نہ کہ بے دینی اور معصیت۔ (اور خطائے اجتہادی پر ثواب ملتا ہے۔)

② سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۴۸، کتاب الخراج والامارۃ، باب فی ما یلزم الامام من امر الرعیۃ والحجبۃ عنہ

③ البتہ خاص واردات قتل میں ملوث مہلک ضرب لگانے کے مرتکب افراد مثلاً: کنانہ بن بشر، ابوشمر، عبدالرحمٰن بن عبداللہ وغیرہ کو تحقیق کے بعد سزائے موت دی گئی تھی۔ (تاریخ دمشق ۵۰/۲۵۹، ۲۶۰؛ الاصابۃ: ۵/۳۸۶؛ جمہرۃ انساب العرب لابن حزم، ص ۴۳۵؛ مصنف ابن ابی شیبۃ: ۳۷۲۹۱، ط الرشد)

میں شریک رہے تھے مگر موجودہ حکومت کی بیعت کر چکے تھے۔ یہی شرعی مسئلہ تھا اور یہی حکمتِ عملی اور مصلحت بینی کا تقاضا تھا جسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے قبل خانہ جنگی کے جذباتی اور ہنگامی ماحول کے باعث سمجھ نہ پائے۔ مگر اب پورے عالمِ اسلام کی زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد وہی چیز ان کے لیے ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گئی۔

منصب خلافت پر ان کا تقرر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں سے صلح اور اس وعدے کے ساتھ ہوا تھا کہ جو لوگ (گزشتہ جنگوں میں) اہلِ عراق کے ہاتھوں قتل ہوئے یا جو مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا، اس کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔[1] اہلِ عراق اس سے قبل ایک مدت تک اہلِ شام کے نزدیک باغی شمار ہوتے رہے تھے اور یہی وہ واحد شرعی وجہ تھی جس کی بناء پر اہلِ شام اہلِ عراق کے خلاف اسلحہ استعمال کرنا جائز سمجھ رہے تھے۔

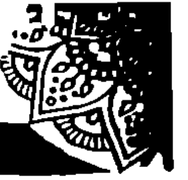
مگر مسندِ خلافت پر تقرری اور بیعتِ عامہ کے وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ گنجائش ماننا پڑی کہ سابقہ باغیوں سے رعایت کا معاملہ سیاسی مصلحت کا تقاضا بھی ہے اور شرعاً بھی درست ہے۔ بصورتِ دیگر وہ اپنے سے متحارب ان لوگوں کی جاں بخشی کا معاہدہ کبھی نہیں کر سکتے جن کے متعلق انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے افراد بھی شامل ہیں۔

اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ بھی سمجھ گئے کہ جس طرح اب وہ عراق کے ان لوگوں کو باغی نہیں کہہ سکتے جو اس سے پہلے اہلِ شام سے برسرِ پیکار رہے بلکہ اب ان کی جان و مال کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری بن گئی ہے، بالکل اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باغیوں کو بیعت کے بعد تحفظ دینے کے پابند تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یہ باغی چاہے آج بھی اہلِ عراق میں موجود ہوں، وہ اپنی سابقہ بغاوت کے باوجود شرعاً اسی طرح مامون ہیں جس طرح عراق کے وہ متحارب لوگ مامون مان لیے گئے ہیں جو اہلِ شام کے مقابل آئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس فقہی لحاظ سے کوئی وجہِ فرق نہیں تھی کہ ایک طرف وہ اس عراقی لشکر کو قابلِ معافی سمجھتے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اہلِ شام سے لڑا تھا۔ مگر دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باغیوں کو قابلِ سزا گردانتے۔ اگر وہ صفین میں اپنے خلاف لڑنے والوں کو جنہیں وہ اس وقت باغی سمجھتے ہوئے اپنی تلواروں کی زد میں لائے، اب بھی ناقابلِ معافی تصور کرتے تو انہیں صلح اور مفاہمت کی پالیسی کو ترک کر کے ایک بہت بڑے گروہ کو عدالتی کٹہرے میں لانا پڑتا جو عملاً ناممکن تھا۔ اگر ایسی کوشش کی جاتی تو یقیناً تمام مشرقی صوبے ان کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور جس خانہ جنگی سے بچنے کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مذاکرات کیے گئے تھے، اس کے شعلے نئی شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتے۔ اس کے نتیجے میں اُمت ناقابلِ تحمل نقصانات سے دوچار ہوتی۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امنِ عامہ کی ضرورت اور شرعی دلائل پر غور کرتے ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجویز کردہ اسی پالیسی کو اختیار کر لیا کہ سابق باغی جو بھی ہوں، وہ بیعت کے بعد مامون ہیں۔

[1] تاریخ الطبری: ۱۶۵/۵



وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ قصاص کا مسئلہ، بغاوت کے قضیے سے الگ ہے اور اس میں بھی صرف وہی لوگ قابلِ سزا ہوں گے جن کا مقتول پر مہلک وار کرنا ثابت ہو جائے۔ اس پالیسی کو اختیار کرنے کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنوں کی شکایات کا سامنا بھی کرنا پڑا؛ کیوں کہ عثمانی تحریک کے اکثر لوگ قصاصِ عثمان کے لیے بے تاب تھے اور تحریک کے سابقہ منشور کے مطابق وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے ہر شخص کو واجب القتل سمجھتے تھے۔ مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی جذباتی دلیل کی اب کوئی پروانہ کی۔

حکومت سنبھالنے کے بعد جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پہلی مرتبہ مدینہ منورہ گئے تو وہاں شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے آوازیں سنیں: ''یا امیر المؤمنیناہ! ......یاامیر المؤمنیناہ!''

یہ خلیفۂ ثالث کی صاحبزادی تھیں جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی تشریف آوری پر اپنے والد ماجد کے قتل اور تحریکِ قصاص کے سانحات کو یاد کر کے رو رہی تھیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا:

''میری بھتیجی! لوگوں نے ناگواری کے باوجود ہماری اطاعت قبول کی ہے اور ہم نے بھی اپنے غصے کو دبا کر ان سے بردباری کا معاملہ کر لیا ہے۔ اگر ہم تحمل چھوڑ دیں تو وہ بھی ہماری اطاعت ترک کر دیں گے۔ دیکھو! تمہارا امیر المؤمنین کی بیٹی بن کر رہنا بہرحال اس سے بہتر ہے کہ تم عام معمولی لوگوں میں سے ایک ہو جاؤ۔ پس آج کے بعد میں تمہیں حضرت عثمان کا ذکر کرتے ہرگز نہ سنوں۔''[1]

مطلب یہ تھا کہ ہماری حکومت میں تم بنو امیہ کی شہزادی ہو۔ اگر ہماری سخت پالیسی کے باعث حکومت ہی گر جائے تو تمہاری کیا حیثیت رہ جائے گی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مطالبۂ قصاص پر کمربستہ لوگوں کو موقع بموقع سمجھاتے رہتے تھے۔ جو جس طرح قائل ہو سکتا تھا، اسے اسی طرح مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے اور حتی الامکان دائرۂ شرع سے قدم باہر نہیں نکالتے تھے۔



---

[1] روی عنه انه لما قدم المدينة حاجّا، فسمع الصوت من دارِ عثمان: يا امير المؤمنيناه يا امير المؤمنيناه! فقال: ما هذا؟ قالوا: بنت عثمان تندب عثمان، فصرف الناسَ، ثم ذهب اليها. فقال: يا ابنة عمّ! ان الناس قد بذلوا لنا الطاعة على كرهٍ، وبذلنا لهم حلماً على غيظ. فان رددنا حلمنا، ردوا طاعتهم. ولان تكوني بنت امير المؤمنين خيرٌ من ان تكوني واحدة من الناس. فلا اسمعنك بعد اليوم ذكرتِ عثمان. (رواه ابن تيمية في منهاج السنة: ۴/۴۰۸)

۲ عرب قیادت کی ازسرِ نو تنظیم

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے دور میں عربوں کو اسلام کی محافظ قوم کے طور پر ازسرِ نو منظم کر دیا۔ انہوں نے اہلِ عجم کی طرف میلان نہیں رکھا بلکہ عربوں ہی کو قیادت وسیادت کا ذمہ دار بنایا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتظامی نقطۂ نظر میں فرق:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتظامی نقطۂ نظر میں یہ واضح فرق تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام کو ایک بین الاقوامی نظام کے طور پر آگے بڑھاتے ہوئے نومفتوحہ اقوام کے لیے حکومت وسیاست کے دروازے کھول دینا چاہتے تھے، تاکہ اسلام پر صرف عربیت کی چھاپ نہ لگنے پائے بلکہ یہ ایک بین الاقوامی دین کے طور پر متعارف ہو۔

اسلام کی اس عالمگیریت کو سامنے رکھتے ہوئے وہ عربوں کے مرکز حجاز کو چھوڑ کر کوفہ میں آباد ہوئے جو دیارِ عجم میں واقع تھا تاہم جزیرۃ العرب سے بھی زیادہ دور نہ تھا۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مقصد اور ہدف نہایت اعلیٰ وارفع اور دین کی روح کے قریب تر تھا جس میں کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقدیر کی بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جن لوگوں سے یہ کام لینا چاہتے تھے، وہ بین الاقوامی طور پر تو کجا مقامی لحاظ سے بھی منظم ہونے کے قابل نہ تھے بلکہ ان میں افتراق واختلاف کا مادّہ شدت سے سرایت کیے ہوئے تھا۔ ان تجربات کو دیکھ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی انتظامی حکمتِ عملی یہ رہی کہ عربوں ہی کو اس عالمی دین کے داعی اور محافظ کے طور پر متعارف ہونا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ بین الاقوامی طور پر غلبۂ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام کرنے والی جماعت نہایت منظم، متحرک اور فعال ہو۔ یہ خوبیاں عربوں میں سب سے زیادہ تھیں۔ پھر اس وقت کے اکابرِ امت یعنی صحابہ اور تابعین کی بڑی تعداد عربی النسل تھی۔ انہیں مجتمع رکھنا تمام کامیابیوں کی کلید تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دور میں نومسلموں کی حق تلفی ہوتی رہی اور انہیں استحصال کا نشانہ بنایا گیا۔ ہرگز نہیں۔ نومسلم تو کیا غیر مسلم یعنی ذمی بھی اسلام کے دیے ہوئے تمام حقوق سے مستفیض ہو رہے تھے اور قابلیت کے لحاظ سے ان پر معیشت وتجارت اور ملازمت کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا کاتب (سیکرٹری) ''سرجون'' ایک نصرانی تھا۔[1] مگر عمومی طور پر حکمتِ عملی یہ رہی کہ سیاسی وعسکری امور میں عربوں پر ہی بھروسہ کیا جائے۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۴۸/۵

عرب قیادت کی تنظیم کا موجودہ عرب نیشنل ازم سے فرق:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا عربوں پر اعتماد اور ان کی تنظیم نو ایک انتظامی پالیسی تھی۔ یہ عرب قومیت یا عرب نیشنل ازم کا موجودہ فلسفہ نہ تھا جس میں دین کو پسِ پشت ڈال کر فقط عرب ہونے کو قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اسلامی ریاست کو محفوظ رکھنے اور دین کو عام کرنے کے لیے ہی عربوں کو متحد اور منظم کرنا چاہتے تھے۔ وہ عرب سرداروں کو اس کی یاد دہانی کراتے رہتے تھے۔ آپ فرماتے تھے:

''اے قبائلِ عرب! اللہ کی قسم! جس دینِ مبین کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، اگر تم اس پر کار بند نہ رہو گے، تو بھلا دوسروں سے کیا اُمید رکھی جاسکتی کہ وہ اس دین کو سنبھالیں۔''[1]

بنو امیہ کی اجارہ داری: ایک ناگزیر صورتحال:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں عرب قیادت کے منظم ہونے کے ساتھ ساتھ بنو امیہ ناگزیر طور پر مزید ابھر کر سامنے آئے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیوں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ عربوں کے اتحاد کو جنگی مہمات اور فتوحات کے لیے استعمال کر رہے تھے اور یہ بات شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ جنگی قیادت میں بنو امیہ ہمیشہ سے پیش پیش تھے، غزوات اور اکثر جہادی مہمات میں وہ خود کو شمشیر کا دھنی ثابت کر چکے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود بھی اموی تھے اور ان کے کئی خاص رفقاء بھی۔ پس اس دور میں بنو امیہ کا نمایاں ہو کر سیاست میں غالب آجانا ایک فطری سی بات تھی۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ انتظامی پالیسی اتنی کارگر رہی کہ بنو امیہ نے ساٹھ ستر سال تک اسے کامیابی سے برتا۔ تاہم پھر بدلتے ہوئے حالات میں یہ پالیسی کارآمد نہ رہی جس کی وجہ سے مخالفین کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے زمانے کے لحاظ سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی پالیسی موزوں تھی جس پر اس دور کی عظیم الشان فتوحات گواہ ہیں۔

☆☆☆

---

[1] مسند احمد، ح: ۱۶۹۲۹

③ عالمِ اسلام کا دفاع اور نئی فتوحات

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک اہم ہدف عالمِ اسلام کے دفاع کے ساتھ فتوحات کے اس سلسلے کو دوبارہ آگے بڑھانا تھا جو خانہ جنگی کے سبب کئی برس سے رکا ہوا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جہادی سلسلہ ایک بار پھر پوری آب و تاب سے شروع ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ ایک نہایت کہنہ مشق سپہ سالار اور عسکری منصوبہ ساز تھے۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں رومیوں کو پے در پے شکستیں دی تھیں۔ اسلامی بحری فوج کا آغاز آپ ہی کی ہمت اور منصوبہ بندی کی بدولت ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ قُبرُص اور مالٹا جیسے اہم عسکری جزیروں کو رومیوں سے چھین چکے تھے۔[1]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکومت سنبھالتے وقت عالمِ اسلام جن بیرونی طاقتوں کے مدِ مقابل تھا، وہ تین تھیں:

● وہ بت پرست قومیں جو وسطِ ایشیا سے خراسان اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ درجنوں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ ان میں سے بعض قبائل بار بار شکست کھا کر مغلوب ہوتے مگر موقع ملتے ہی بغاوت کر دیتے۔ اس وقت بھی وہ آمادۂ پیکار تھے۔

● افریقہ کے غیر متمدن قبائل جن کی طاقت شمالی افریقہ میں زیادہ تھی۔ یہ بھی بار بار بغاوت کرتے تھے۔

● رومی سلطنت جسے زیرِ نگین کرنا سب سے زیادہ اہم تھا۔

مگر سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے وقتی مصلحت کے تحت رومیوں سے محدود وقت کے لیے صلح کر لی تاکہ پہلے یکسوئی سے دیگر محاذوں کو نمٹا دیا جائے۔[2] آپ نے حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر اور حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا حاکم مقرر کر دیا تھا جو مانے ہوئے سپہ سالار اور سیاست دان تھے۔[3]

ان دونوں حضرات نے عمدہ منصوبہ بندی کے ساتھ مشرق و مغرب میں اسلامی افواج کو آگے بڑھایا جن کے نتیجے میں خراسان اور افریقہ سے شورش پسندوں کا صفایا ہوا اور وہاں اسلامی افواج کے قدم جم گئے۔ ہندوستان کی سرحدوں: سندھ اور بلوچستان میں بھی کئی جہادی مہمات پیش آئیں اور فتوحات نصیب ہوئیں۔

اگلے اوراق میں ہم ان تمام خطوں کی فتوحات کا الگ الگ جائزہ لے رہے ہیں۔

☆☆☆

---

① فتوح البلدان، ص ۱۵۴، ط ہلال

② تاریخ خلیفہ خیاط، ص ۲۰۵ ③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۳، سن ۴۱ ھ

برصغیر میں جہاد

عام طور پر برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا ذکر ۹۲ ہجری میں محمد بن قاسم رحمہ اللہ کی مہم سے شروع کیا جاتا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سندھ کے ساحل دیبل پر چھاپہ مار حملہ کر چکے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کے دھاوے "قیقان" تک ہو رہے تھے۔[1]

برصغیر میں فوج کشی کی ضرورت اس لیے تھی کہ یہاں کے جنگجو اچانک حملے کر کے مسلم امراء اور سپاہیوں کو شہید کر دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس محاذ کے کمانڈر حضرت حارث بن مُرّہ رحمہ اللہ کئی معرکے جیت چکے تھے مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال سن ۴۲ھ میں انہیں اسی محاذ پر اکثر ساتھیوں سمیت شہید کر دیا گیا۔[2] ان کے بعد بصرہ کے گورنر حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے یہ مہم راشد بن عُمر وجدیدی کے سپرد کی۔ وہ ۴۲ھ میں افواج لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے اور مکران سے ہوتے ہوئے سندھ میں دور تک یلغار کرتے چلے گئے۔[3]

بنوں اور لاہور کی مہمات:

۴۴ھ میں امویوں کے نامور سالار حضرت مُہَلَّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ نے دوسری سمت سے پیش قدمی کی اور بنّہ (بنوں) کو فتح کیا۔[4] اس مہم میں مُہَلَّب بن ابی صُفرہ ایک موقع پر تنہا تھے کہ دشمن کے اٹھارہ گھڑسواروں نے اچانک یں گھیر کر شہید کرنے کی کوشش کی مگر حضرت مُہَلَّب نے اکیلے سب کو نمٹا ڈالا۔[5] اس کے بعد وہ یلغار کرتے ہوئے "الاہور" (لاہور) کے قریب جا پہنچے۔ یہاں ایک بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں ہندوؤں کو شکستِ فاش ہوئی اور حضرت مُہلَّب رحمہ اللہ شہر پر قبضہ کیے بغیر بھاری مقدار میں مالِ غنیمت لے کر لوٹے۔[6]

قِیقان (کوہِ کھیرتھر) کی دوسری مہم:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سَوّار رحمہ اللہ کو "قیقان" میں پیش قدمی کا حکم دیا۔ یہ بڑے سخی اور مشہور رئیس

---

① فتوح البلدان، ص ۴۱۲؛ معجم البلدان: ۴۲۳/۴۔ قیقان سے سندھ اور بلوچستان کے درمیان کھیرتھر کا پہاڑی علاقہ مراد ہے۔

② فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الهلال

③ فتوح البلدان، ص ۴۱۸؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۴، ۲۰۵

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۶

⑤ فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الهلال

⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۶۔ اکثر مؤرخین نے اس مہم کو نظر انداز کیا ہے اور بہت سوں نے لاہور کو "اہواز" سمجھ لیا ہے۔ یہ غلطی اتنی پختہ ہوئی کہ بعد کی تواریخ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کارناموں کے تحت لاہور کی مہم کہیں ڈھونڈے نہیں ملتی جبکہ قدیم تاریخوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ "معجم البلدان" کی عبارت ہے: غزا المهلب بن ابی صفرة فی سنة ۴۴ھ ایام معاویة ثغر السند فاتی بنة و لاهور وهما بین کابل و ملتان۔ (۵۰۱/۱، باب الباء والنون)

تھے۔فوج لے کر چلے تو اعلان کر دیا کہ کسی خیمے میں چولہا جلنے نہ پائے، سب کا کھانا پینا میرے ذمے ہے۔ایک شب انہیں خیمہ گاہ میں کہیں آگ جلتی دکھائی دی۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ ایک خاتون کو اولاد کی نعمت نصیب ہوئی ہے۔اس کے لیے حلوہ پکایا جارہا ہے۔یہ سن کر حکم دیا: ''تین دن تک میری طرف سے سب کو حلوہ کھلایا جائے۔''[1]

قیقان کا کوہستان بہت دشوار محاذ تھا پھر بھی حضرت عبداللہ بن سوّار نے یہاں کامیاب جہاد کیا اور واپسی پر بہت سے قیقانی گھوڑے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کیے۔یہاں ایک دن موقع پا کر قبائلی جنگجوؤں نے انہیں ان کے ساتھیوں سمیت گھیر کر شہید کر دیا۔[2]

سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سن ۴۸ ہجری میں حضرت سنان بن سلمہ رحمہ اللہ کو بلوچستان کی مہم کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔وہ اپنی مہمات میں مصروف تھے کہ نامور سالار راشد بن عمرو جدیدی رحمہ اللہ سن ۵۰ ہجری میں سندھ و بلوچستان میں جہاد کے دوران شہید ہو گئے[3]۔یوں مکران سمیت خاصا علاقہ پھر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔عبداللہ بن سوّار اور حارث بن مُرّہ رحمہما اللہ کے بعد ان تیسرے اسلامی سپہ سالار کی شہادت، بڑی فکر کی بات تھی۔حضرت سنان بن سلمہ اس صورتحال کے تدارک کے لیے بلوچستان آئے تو حریف بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ سامنے آدھمکا۔حضرت سنان بڑے اللہ والے بزرگ تھے۔انہوں نے اپنے مجاہدین کو قسم کھلا رکھی تھی کہ جو لڑائی سے بھاگا اس کی بیوی کو طلاق۔[4]

دشمن کی کثرت دیکھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہمت دلائی اور فرمایا: ''بشارت ہو! تمہیں دو میں سے ایک کامیابی ضرور ملے گی: یا جنت یا فتح۔'' پھر انہوں نے سات پتھر اُٹھائے اور مجاہدین کے سامنے آکر کہا:

''جب مجھے حملہ کرتے دیکھو تو تم بھی ٹوٹ پڑنا۔''

حضرت سنان رحمہ اللہ نے فوج کو تیار حالت میں رکھا۔جب سورج عین سر پر آیا تو تکبیر کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے چھ پتھر دشمن کی طرف پھینکے۔اس کے بعد مزید انتظار کیا، جب سورج ذرا ڈھلنے لگا تو ساتواں پتھر اچھالتے ہوئے نعرہ لگایا: ''حٰمٓ لا ینصرون۔'' پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے بت پرستوں پر حملہ آور ہو گئے۔

مسلمان بھی اپنے قائد کے پیچھے دشمن پر پل پڑے۔تھوڑی ہی دیر میں مشرکین کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، باقی بھاگ نکلے۔مسلمانوں نے بارہ میل (ساڑھے ۱۹ کلومیٹر) تک ان کا تعاقب کیا۔آخر فرار ہونے والے ایک قلعے میں جا چھپے۔مسلمانوں نے قلعے کو گھیرا تو مقامی لوگوں نے اندر سے کہلوایا: ''اللہ کی قسم! ہمیں تم نے نہیں مارا بلکہ چتکبرے گھوڑوں پر سوار سفید عمامہ پوشوں نے ہمیں مارا ہے۔'' مسلمانوں نے کہا: ''یہ اللہ کی نصرت تھی۔''

اس جنگ میں مسلمانوں کا صرف ایک فرد شہید ہوا۔بعد میں کسی سپاہی نے حضرت سنان بن سلمہ رحمہ اللہ سے دشمن

---

[1] فتوح البلدان، ص ۴۱۷ ۔ اس دور میں بیویوں کو جہاد میں ساتھ لے جانے کا رواج عام تھا۔یہ خواتین خیمہ گاہوں میں رہتیں اور اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی خدمت کیا کرتیں تاکہ جہاد کے ثواب میں حصہ ملے۔

[2] فتوح البلدان، ص ۴۱۷؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۸

[3] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۹، ۲۱۱ — [4] فتوح البلدان، ص ۴۱۷

پر حملے میں اتنے توقف کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ ایسے ہی کیا کرتے تھے۔''[1]

حضرت سنان بن سلمہ رحمہ اللہ نے اس مہم میں مکران کو بزورِ شمشیر دوبارہ فتح کیا اور اس پورے علاقے کو ازسرِ نو آباد اور منظم کیا۔ وہ دو سال تک یہاں ٹھہرے رہے اور یہاں بڑی خوبی سے حکومت کرتے رہے۔[2]

☆☆☆

خراسان کی مہمات

بصرہ کے پہلے گورنر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور دوسرے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے خراسان سے شورش پسندی کے خاتمے اور نئی فتوحات کا بیڑا اٹھائے رکھا۔ بصرہ کے ہیڈ کوارٹر سے شمالی اور وسطی و جنوبی افغانستان کے لیے الگ الگ جرنیل مقرر کیے گئے۔ شمالی افغانستان کی مہم حضرت قیس بن ہیثم اور حضرت عبداللہ بن خازم کے سپرد کی گئی۔ حضرت قیس نے بلخ کے باغیوں کی گوشمالی کی اور اُن کا آتش کدہ مسمار کر دیا۔ عبداللہ بن خازم نے ہرات اور بادغیس کے شورش پسندوں پر قابو پایا۔[3]

عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جہادِ کابل:

وسطی اور جنوبی افغانستان کے لیے مشہور صحابی عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ کو تعینات کیا گیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اس خطے کی فتح میں پیش پیش رہے تھے۔ تب انہوں نے کابل کو ایک معاہدے کے تحت فتح کیا تھا مگر اب کابل سے لے کر رُخّج (قندھار) تک تمام علاقہ پھر آزاد ہو چکا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ فوج لے کر کابل تک بڑھتے چلے گئے۔ ان کے ہمراہ کئی صحابہ کرام، درجنوں نامور تابعین اور عرب کے مشہور شہسوار شامل تھے جن میں حضرت عمر بن عبیداللہ، حضرت عبداللہ بن خازم، حضرت مہلب بن ابی صُفرہ، حضرت عَبّاد بن حُصَین، حضرت ہشام بن عامر، حضرت حسن بصری، حضرت صِلہ بن اَشیَم، حضرت زید العبدی اور قَطَری بن فُجاءَہ قابل ذکر ہیں۔[4]

صلہ بن اشیم رحمہ اللہ کا مجاہدہ:

حضرت صِلہ بن اَشیَم رحمہ اللہ بہت عبادت گزار انسان تھے۔ ان کے ایک رفیقِ سفر زید العبدی کہتے ہیں:

''ایک رات لشکر نے پڑاؤ ڈالا، نمازِ عشاء پڑھ کر سب لیٹ گئے۔ میں نے سوچا آج رات جاگ کر دیکھوں کا

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۱۲، ۲۱۳

② فتوح البلدان، ص ۴۱۸، ط الھلال

③ فتوح البلدان، ص ۳۹۶، ط الھلال

④ فتوح البلدان، ص ۳۸۴، ط الھلال

کہ صِلہ بن اَشیم کیسی عبادت کرتے ہیں؟ میں نے دیکھا کہ حضرت صِلہ بھی سب مجاہدین کی طرح لیٹ گئے، جب لوگ سو گئے تو وہ یک دم اُٹھ کر قریبی جنگل کی طرف چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے لگ گیا۔ دیکھا کہ انہوں نے وضو کیا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ ان کی نماز جاری تھی کہ یکا یک جنگل سے ایک شیر نکل آیا اور ان کے بالکل پاس پہنچ گیا۔ میں گھبرا کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ حضرت صِلہ اطمینان سے نماز پڑھتے رہے۔ میں نے سوچا شیر نے اب تک صِلہ کو نہیں دیکھا یا دیکھا ہوگا تو انہیں کوئی درخت سمجھ لیا ہوگا۔ اتنے میں حضرت صِلہ سجدے میں چلے گئے۔ میں نے سوچا اب تو شیر انہیں چیر پھاڑ کر ہی چھوڑے گا، مگر کچھ نہ ہوا۔ آخر حضرت صِلہ نے سلام پھیرا اور شیر کی طرف پلٹ کر فرمایا: ''اے درندے! اپنا رزق کہیں اور تلاش کر۔'' شیر یہ سن کر اتنی زور سے دھاڑتا ہوا واپس گیا کہ مجھے لگا پہاڑوں کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

حضرت صِلہ رحمۃ اللہ علیہ اس طرح نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ صبح کا دھندلکا نمایاں ہو گیا۔ تب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی، دیر تک دعا کرتے رہے۔ آخر میں فرمایا: ''اے اللہ! میں تجھ سے بس یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھے جہنم سے نجات دے دے۔ بھلا مجھ سے گناہ گار کو جنت کے سوال کی جرأت کہاں۔''

اس کے بعد حضرت صِلہ رحمۃ اللہ علیہ لشکر میں واپس لوٹ آئے۔ صبح میں نے ان کو ایسا ہشاش بشاش پایا جیسے وہ رات بھر نرم بستر پر سوتے رہے ہوں، جب کہ شب بیداری سے میری وہ حالت تھی کہ اللہ ہی جانتا ہے۔''[1]

اس طرح اللہ والوں کا یہ لشکر کابل کی طرف رواں دواں رہا۔ جب محاذ قریب آیا (اور پہاڑی گھاٹیاں شروع ہوئیں) تو امیرِ لشکر نے کہا: ''لشکر کا کوئی فرد اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔''

اب لشکر روانہ ہونے لگا تو حضرت صِلہ رحمۃ اللہ علیہ کا خچر ان کے سامان سمیت کہیں بھاگ چکا تھا۔ وہ وہیں رک کر نماز کی نیت باندھنے لگے۔ لوگوں نے کہا: ''جناب! لشکر روانہ ہو چکا ہے۔''

وہ چند قدم چلے پھر رک کر بولے: ''مجھے دو رکعت تو پڑھنے دو۔''

ساتھیوں نے کہا: ''لشکر نکلا جا رہا ہے۔''

بولے: ''میری سواری اور سامان ہلکے پھلکے ہیں (با آسانی لشکر سے جا ملوں گا)

اب انہوں نے دو رکعت پڑھ کر دعا کی: ''اے اللہ! تجھے قسم دیتا ہوں کہ میری سواری اور سامان لوٹا دے۔''

چند لمحوں میں ان کا خچر سامان سمیت ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔[2]

دو عرب مجاہدین نے دشمنوں کا منہ پھیر دیا:

سفر کے دوران ایک جگہ قبائلی جنگجوؤں سے زوردار معرکہ ہوا۔ حضرت صِلہ بن اَشیم رحمۃ اللہ علیہ اور ایک دوسرے تابعی حضرت ہشام بن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے، اس دن تنِ تنہا بڑھ چڑھ کر شمشیر زنی اور

① شعب الایمان للبیہقی، ح: ۲۹۴۱؛ الزھد والرقائق لعبداللہ بن المبارک، ح: ۸۶۳، ط العلمیۃ　② بحوالہ بالا

نیزہ بازی کے جوہر دکھائے اور دشمن کا منہ پھیر دیا۔ کفار پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ کہنے لگے:

''دو عرب سپاہیوں نے ہمارا یہ حشر کیا، اگر وہ سب ہم پر حملہ آور ہوتے تو ہمارا کیا حال ہوتا؟''

چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔

کسی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس معرکے کی خبر دیتے ہوئے ان کے شاگرد کی شکایت بھی لگائی اور کہا:

''ہشام نے اس دن خود کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر فرمایا: ''ہرگز نہیں، وہ تو اس آیت کا مصداق بننا چاہتے تھے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ. ①

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اپنی جان اللہ کو بیچ دیتے ہیں، اللہ کی رضا چاہنے کے لیے۔'' ②

سبحان اللہ! یہ تھا صحابہ کرام اور تابعین عظام کا جذبۂ جہاد۔

کابل کی وادی میں:

اس طرح کے ایمان افروز واقعات کے ساتھ یہ مبارک لشکر کابل پہنچا۔ کابل قدرتی طور پر پہاڑوں میں گھرا ہوا محفوظ ترین شہر تھا۔ شہر والے لڑنے مرنے پر تیار تھے، اس لیے فتح بہت مشکل تھی، مگر حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے سختی سے محاصرہ کر لیا، جو کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخر شدید سردی اور برف باری کا موسم شروع ہو گیا جو عربوں کے لیے نہایت دشوار گزار تھا مگر مسلمان ڈٹے رہے۔ سردی اور برف باری...... وہ بھی کابل کی...... اللہ اکبر!...... پورا موسم سرما اس حالت میں گزرا، محاصرہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ بہار اور موسمِ گرما گزر کر پھر سردی کے دن آ گئے۔ پھر بھی مسلمان نمازیں قصر میں پڑھتے رہے کیوں کہ مستقل قیام کی نیت نہ تھی۔ ③

محاذِ جنگ پر فقہ اور حدیث کی تعلیم:

محاصرے کے دوران حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ حدیث اور فقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس محاذ پر ان کے ساتھ حضرت حسن بصری، حضرت ابن حبیب اور حضرت ابن عبید رحمہم اللہ جیسے تابعین شاگردوں کے طور پر موجود تھے۔ یہ سب بیک وقت عالم بھی تھے اور مجاہد بھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں جنگ کے دوران صلوٰۃِ خوف پڑھا کر اس کی عملی مشق کرائی۔ ④ درسِ حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی جو بہت مشہور ہوئی:

''عہدہ طلب نہ کیا کرو۔ اگر تمہیں مانگ کر ملے گا تو وبال بن جائے گا اور اگر بن مانگے ملے گا تو اس بارے میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) تمہاری مدد کی جائے گی۔'' ⑤

---

① سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۷

② شعب الایمان للبیہقی بروایت نمبر: ۲۹۳۱ ؛ الزھد والرقاق، عبداللہ بن المبارک ؛ والزھد، نعیم بن حماد، روایت نمبر: ۸۶۳

③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۸۲۰۳،۵۰۹۹، ط الرشد ؛ السنن الکبری للبیہقی، ح: ۵۶۳۹، ۵۴۷۸، ط العلمیہ

④ السنن الکبری للبیہقی، ح: ۶۰۰۷، ۶۰۴۵ ⑤ مسند احمد، ح: ۲۰۶۳۹

موسم بہار آتا تو کابل کے گردونواح میں باغ پھلوں کے لد جاتے، مجاہدین اسلام کو اجازت تھی کہ ضرورت کے مطابق پھل کھا سکتے ہیں مگر اُٹھا کر ساتھ لے جانے یا پھل دار پیڑ کو نقصان پہنچانے کی سختی سے ممانعت تھی۔ ①

منجنیق کا استعمال:

جب کابل کسی طرح فتح ہونے میں نہ آیا تو عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ نے منجنیق استعمال کر کے شہر کی فصیل گرانے کا فیصلہ کیا۔ مسلمان عموماً قلعہ شکن آلات استعمال کرنے میں احتیاط کرتے تھے، کیوں کہ اس میں عام لوگوں کے زد میں آجانے کا امکان بھی ہوتا تھا مگر غزوۂ طائف میں رسول اللہ ﷺ منجنیق کام میں لاچکے تھے، اسی لیے اس کا جواز موجود تھا۔

منجنیق کی آزمائش نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ بھاری پتھروں کی بارش نے کابل کی ناقابل تسخیر فصیل میں ایک بڑا شگاف ڈال دیا۔ رات کو کابل کے جنگجو اس شگاف کو پر کرنے کے لیے موقع کی تاک میں رہے مگر اسلامی لشکر کے افسر حضرت عباد بن حُصَین رحمہ اللہ نے ساری رات مسلسل تیراندازی کر کے انہیں شگاف سے دور رکھا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ان کی اس دلیری پر فرمایا کرتے تھے: ''میں نے عَبّاد بن حُصَین کو دیکھنے سے پہلے کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ کوئی اکیلا آدمی ہزاروں کے برابر ہوسکتا ہے۔'' ②

فیصلہ کن جنگ:

صبح ہوئی تو شہر کا پھاٹک کھل گیا۔ شکست سامنے دیکھ کر کابل کے مشرک ایک سیلاب کی طرح باہر اُمنڈنے لگے۔ ان کے ساتھ ایک خوفناک جنگی ہاتھی بھی تھا جو سامنے آنے والے ہر شخص کو روندنے پر تلا ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن خازم یہ دیکھ کر بجلی کی طرح جھپٹے۔ ہاتھی ابھی دروازے سے ذرا باہر آیا تھا کہ انہوں نے اسے وہیں مار گرایا۔ ہاتھی پھاٹک کے ایک پٹ کے ساتھ اس طرح ڈھیر ہوگیا کہ مشرکین پھاٹک بند کرنے کے قابل نہ رہے۔ مسلمان انہیں دھکیلتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئے اور یوں کابل جیسا مستحکم اور محفوظ ترین شہر بزورِ شمشیر فتح ہوا جس کی مثالیں تاریخ میں کم یاب ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن عبید اللہ اور حضرت مُہَلَّب بن ابی صُفرہ رحمہما اللہ کو فتح کی خوشخبری کے ساتھ مرکز بھیج دیا۔ ③

مجاہدین کی دیانت داری:

کابل کی فتح میں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا، انواع واقسام کے ساز وسامان کے ڈھیر لگ گئے۔ بعض لوگ ان چیزوں کو چھینے جھپٹنے لگے۔ عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ نے فوراً ایک شخص کو کہا کہ وہ اعلان کردے: ''رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: جو لوٹ مار کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ لہٰذا جو چھینا جھپٹا ہے وہ واپس کر دو۔'' یہ اعلان سنتے ہی مسلمانوں

---

① السنن الکبری للبیہقی، ح: ۱۸۰۰۸

② مکارم الاخلاق لابن ابی الدنیا، ۱/ ۶۵، ح: ۱۸۴؛ فتوح البلدان، ص ۳۸۴، ط الھلال

③ فتوح البلدان، ص ۳۸۴، ط الھلال

نے سب چیزیں واپس رکھ دیں۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دستور کے مطابق انہیں برابر تقسیم کیا۔ [1]

درحقیقت اس دور کے اکثر مسلمان اتنے باضمیر تھے کہ فرمانِ نبوی پر فوراً سر جھکا دیتے تھے، یہی ان کی کامیابیوں کا سب سے بڑا راز تھا۔

کابل کے قیدی بچے اُمتِ محمدیہ کے نامور محدث بنے:

فتوحات میں قیدی اور غلام بننے والوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ غلام بچوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ کابل کی فتح سے جو غلام ہاتھ لگے ان میں چند لڑکے بہت باصلاحیت تھے۔ یہ لڑکے علمائے امت کے حلقوں میں بیٹھ کر آخر کار نامور محدث، مفسر اور مشائخ بنے۔ ان میں نافع مولیٰ ابن عمر، سالم بن عجلان، ابو ایوب سختیانی اور ابو حمید الطویل مہران علم وفضل میں بہت مشہور ہوئے۔ [2] ان میں مکحول بھی تھے جو نسلاً سندھی تھے مگر شام منتقل ہونے کے بعد مکحول الشامی مشہور ہو گئے اور عظیم محدث بنے۔ [3]

قندھار کی فتح:

کابل کی فتح کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن سمُرہ رضی اللہ عنہ نے بجستان (جنوبی افغانستان) کی طرف پیش قدمی کی اور بلاد شہروں، قلعوں اور قبائل کو مسخر کرتے ہوئے رُخّج (قندھار) اور بُست تک جا پہنچے۔ اسی یلغار میں انہوں نے زابل کے نواح میں زابل کو بھی فتح کیا۔ [4]

عبدالرحمٰن بن سمُرہ رضی اللہ عنہ کی وفات:

سن ۴۶ ہجری میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمُرہ رضی اللہ عنہ خراسان سے معزول ہوئے اور واپس بصرہ بلالیے گئے۔ وہ کابل کے بہت سے غلام اپنے ساتھ لیتے گئے، جنہوں نے بصرہ میں ان کی حویلی کے احاطے میں ایک مسجد تعمیر کی۔ اس کے چند برس بعد سن ۵۰ ہجری میں خراسان وبجستان کے اس عظیم فاتح کا انتقال ہوگیا۔ [5]

نئی شورش اور اس کا سدباب:

حضرت عبدالرحمٰن بن سمُرہ رضی اللہ عنہ کے بعد خراسان کے مقامی قبائل نے جگہ جگہ پھر بغاوت کر دی۔ کابل سے قندھار تک ایک بار پھر ان کی اجارہ داری ہوگئی۔ آخر نئے گورنر حضرت رَبیع بن زِیاد نے بُست کے مقام پر قبائلیوں کے راہنما کو جس کا لقب ''رتبیل'' تھا، شکست دی اور آگے بڑھ کر باغیوں کے بڑے مرکز قندھار کو دوبارہ زیرنگین کیا۔ [6]

---

[1] مسند احمد، ح: ۲۰۶۱۹

[2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۶، سن ۴۲ھ

[3] سبل السلام: ۱۹۷/۲؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۶

[4] فتوح البلدان، ص ۳۸۳، ط الھلال

[5] فتوح البلدان، ص ۳۸۳، ط الھلال

[6] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۸

رَبیع بن زِیاد کے بعد عبیداللہ بن ابی بکر نے آکر خراسانی و بجستانی قبائل کی تسخیر کا ادھورا کام آگے بڑھایا۔ اس دوران حریف سربراہ رُتبیل نے دولاکھ نقد اور دس لاکھ درہم سالانہ پر صلح کی پیش کش کی۔ عبیداللہ بن ابی بکر نے مثبت جواب دیا مگر حتمی معاہدے سے قبل عراق آکر زیاد سے ملاقات کی اور اس صلح کے بارے میں مشورہ کیا۔ زیاد نے اجازت دے دی۔ کیوں کہ قبائلیوں کی شورش پسندی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ یہی مناسب تھا کہ کسی طور ان سے جنگ بندی ہو جائے۔ چنانچہ یہ مصالحت طے پا گئی۔ ①

غُور اور اَشل کی فتح:

افغانستان کے وسط میں غُور کا صوبہ صحرائی بھول بھلیوں اور خوفناک پہاڑی دروں کی وجہ سے ہر فاتح کے لیے مشکل ترین مقام رہا ہے۔ سن ۴۷ ہجری میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے جرنیل حضرت حکم بن عَمرو غفاری رضی اللہ عنہ نے پہلی بار اس دشوار گزار علاقے کو فتح کیا۔ ②

سن ۵۰ ہجری میں انہوں نے کوہِ اَشل کے علاقے میں پیش قدمی کی۔ یہاں کے لوگ سونے کے برتن استعمال کرتے تھے۔ اسلامی فوج پُر پیچ درّوں سے گزرتی اور دشمن کو شکست دیتی پہاڑی راستوں میں آگے بڑھتی رہی۔ ایک جگہ مسلمان دشمن کے گھیرے میں آگئے۔ خوش قسمتی سے اس موقع پر دشمن کا ایک سردار گرفتار ہو گیا جس نے رہائی کے وعدے پر مسلمانوں کو واپسی کا محفوظ راستہ بتا دیا۔ اس طرح مالِ غنیمت کے بے شمار انبار لیے یہ لشکر سلامتی سے واپس آگیا۔

چونکہ اس فتح میں سونے چاندی کے سکے نہیں ملے تھے اس لیے گورنر مشرقی علاقہ جات زیاد بن ابی سفیان نے حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کو تاکید کی کہ سونے چاندی کی چیزیں مرکزِ خلافت کو بھیجنے کے لیے عراق روانہ کر دی جائیں۔ اس مہم کے بعد مَرْو میں حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی۔ ③

☆☆☆

---

① فتوح البلدان، ص ۳۸۵، ط الهلال

② تاریخ الطبری: ۲۲۹/۵

③ تاریخ الطبری: ۲۵۰/۵ تا ۲۵۲

کوہ اَشل کے بارے میں کتبِ تواریخ، کتبِ بلدان وجغرافیہ بالکل خاموش ہیں۔ طبری کی روایت میں اس مقام کا نام ''جبل الاشل'' مذکور ہے جو فارسی لفظ ''کوہ اشل'' کی تعریب معلوم ہوتی ہے۔ روایت میں یہاں کے باشندوں کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ: سلاحهم اللبود وآنيتهم الذهب. یعنی وہ اون کے موٹے نمدے اور سونے کے برتن استعمال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ''کوہ اشل'' موجودہ کوئٹہ کا علاقہ ہو جو برطانوی دور سے پہلے ''شال کوٹ'' کے نام سے موسوم تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ بارہ صدیوں میں ''کوہ اشل'' بگڑ کر ''شال کوہ'' اور پھر شال کوٹ بن گیا ہو۔ حکم بن عَمرو غفاری رضی اللہ عنہ کی مہم جوئیاں قریب قریب اسی خطے میں تھیں۔ ۴۷ھ میں وہ غور میں تھے جو کوئٹہ سے ۲۹۵ میل (۴۷۶ کلومیٹر) دور ہے۔ ۵۰ھ میں وہ کوہ اشل آئے۔ تین سال کے دوران اتنے فاصلے کے مختلف علاقوں میں مہمات انجام دینا کوئی بعید بات نہیں مگر آیا واقعی یہ کوہ اشل، کوئٹہ تھا یا نہیں؟ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اونی جبوں کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ اشل سرد علاقہ تھا۔ کوئٹہ بھی سخت سرد ہے، اس لیے اونی جبوں کا استعمال یقیناً ہوتا ہوگا مگر سونے کی کثرت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا کوہ اشل کے قریب سونے کی کوئی کان تھی؟ یا ثروت کی بناء پر وہ لوگ سونے چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے؟ آج کوئٹہ کے نواح میں سونے چاندی کی کانوں کی موجودگی ثابت نہیں۔ البتہ کرومائٹ، سنگِ مرمر اور قیمتی پتھر کا یہاں بڑا ذخیرہ ہے۔ سونے کے ذخائر چاغی کے قریب ''سینڈک'' میں بتائے جاتے ہیں مگر یہ علاقہ کوئٹہ سے دور ہے۔ بہر حال یہ امکان تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔

وسطِ ایشیا میں فتوحات کا آغاز

سیدنا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے سن ۵۱ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس حد بندی سے باہر اقدامی جہاد شروع کیا جس سے آگے اب تک کوئی اسلامی لشکر نہیں گیا تھا۔ یہ دریائے آمو تھا جس کے پار وسطِ ایشیا کا زرخیز اور معدنی وسائل سے مالا مال خطہ تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ڈیڑھ صدی بعد یہ سرزمین اسلامی تہذیب وتمدن کا ایسا گہوارہ بن جائے گی کہ علمائے اسلام کی صفِ اوّل میں جگہ پانے والے محدثین یہیں کی خاک سے نمودار ہوں گے۔

دریائے آمو کے اُس پار:

کچھ مدت پہلے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے جرنیل حضرت حکم بن عَمر وغفاری رضی اللہ عنہ عالمِ اسلام کی اس آخری سرحد تک پہنچے تھے۔ آمو دریا کا پانی سامنے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے دریا پار کیا، ان کے اشارے پر ان کے غلام نے دریا کا تازہ اور خوش گوار پانی اپنی ڈھال میں بھر کر انہیں پیش کیا۔ انہوں نے پانی پی کر دریا سے وضو کیا۔ مجاہدین کے قدم یہاں تک پہنچنے پر دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی اور صورتحال دیکھ کر واپس چلے گئے۔

اب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے رَبیع بن زیاد حارثی لشکر لے کر آئے اور دریا کے پار پہنچ کر کچھ سرحدی علاقوں میں جہاد کیا اور بکثرت مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔ یہ وسطِ ایشیا میں امتِ محمدیہ کا پہلا جہاد تھا۔ [1]

بخارا کی ملکہ موزے چھوڑ کر فرار:

سن ۵۳ ہجری میں عبیداللہ بن زیاد نے چوبیس ہزار سپاہی لے کر وسطِ ایشیا میں یلغار کی۔ اس سرزمین کو اہلِ عرب "مَاوَرَاءُ النَّهَر" اور اہلِ فارس ترکستان کہتے تھے۔ یہاں بڑے طاقتور ترک قبائل کی اجارہ داری تھی۔ سمرقند، ترمذ اور خیوا یہاں کے مشہور شہر تھے۔ ترکوں کا سب سے بڑا مرکز بخارا تھا، جس کے گرد صحرائی اور کوہستانی علاقہ تھا۔ عبیداللہ بن زیاد نے اونٹوں پر سفر کر کے یہ صحرا عبور کیا۔ ترک مقابلے پر آئے تو زوردار معرکہ ہوا۔ ترکوں کی مدد کے لیے بخارا کا خان اور ملکہ خود میدان جنگ میں آئے۔ آخر انہیں شکست ہوئی۔ خان اپنی ملکہ سمیت بھاگ نکلا۔ افراتفری میں فرار ہوتے ہوئے ملکہ اپنا موزہ وہیں چھوڑ گئی جو بعد میں دو سو درہم (تقریباً پچاس ہزار روپے) کا فروخت ہوا۔

ملکہ بہت چالاک تھی۔ اس نے بخارا شہر میں جا کر دم لیا اور عبیداللہ بن زیاد سے ایک خطیر رقم کے عوض صلح کر لی۔ صلح نامے کے تحت بخارا کو مسلمانوں کے لیے کھول دیا گیا۔ عبیداللہ بن زیاد نے خود جا کر اس قدیم تاریخی شہر کو دیکھا بھالا۔ گرد ونواح کے دوسرے ترکوں سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے عبیداللہ بن زیاد نے یہاں دو سال مہم جوئی کی اور بخارا کے مضافاتی علاقے: نَسَف اور بیکند فتح کر لیے۔ [2]

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۸/۵۶، تحت جریر بن عبداللہ

② الکامل فی التاریخ، سن ۵۳ ھ ؛ فتوح البلدان، ص ۳۹۷، ط الهلال ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۲۲

حضرت سعید بن عثمان غنی: بخارا اور سمرقند کے فاتح:

اس کے بعد حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سعید رحمہ اللہ کو وسط ایشیا کا والی مقرر کیا گیا۔ بخارا کی ملکہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہی تھی۔ وہ مسلمانوں کے جاتے ہی بدعہدی کرتی اور ان کے آتے ہی صلح کر لیتی۔ اس کی شہ پا کر ترک قبائل بار بار بغاوت اور شورش میں ملوث ہوتے تھے، اس لیے حضرت سعید بن عثمان رحمہ اللہ کو ان کے خلاف از سرِ نو فوج کشی کرنا پڑی۔ وہ مشہور اسلامی جرنیل مُہلَّب بن ابی صُفرہ کو ساتھ لے کر دریائے جیحوں (آمو) کے پار اُترے۔ اُدھر سے نَسف، سُغد اور کَش کے ترک قبائل ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر جرار لے کر آدھمکے، بخارا کی ملکہ ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ حضرت سعید بن عثمان رحمہ اللہ کسی باطل طاقت سے دبنے والے نہ تھے۔ وہ مجاہدین کو لے کر دریائے آمو سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ آخر بخارا کے سامنے ترکوں سے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دونوں فوجوں نے جان کی بازی لگادی مگر آخر میں ترکوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ بخارا کی ملکہ اپنی بدعہدی پر سخت پریشان تھی اور اسے امید نہ تھی کہ مسلمان اسے معاف کریں گے، مگر حضرت سعید بن عثمان رحمہ اللہ نے اس کی طرف سے صلح کی پیش کش کو فراخ دلی سے قبول کر کے اسے اس کے تمام حامیوں سمیت امان دے دی۔

بخارا کو اپنی تحویل میں لے کر حضرت سعید رحمہ اللہ ترکوں کے دوسرے بڑے مرکز سمرقند کی طرف بڑھے تو بخارا کی ملکہ نے اپنے سپاہی ان کے ساتھ کر دیے۔ حضرت سعید بن عثمان رحمہ اللہ نے تیزی سے جا کر سمرقند کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ حریف کی فوج بے شمار اور شہر کی فصلیں بڑی مضبوط تھیں مگر حضرت سعید رحمہ اللہ نے مرعوب ہوئے بغیر قسم کھائی کہ وہ شہر فتح کیے بغیر نہ لوٹیں گے۔ تین دن تک خون ریز جنگ ہوتی رہی۔ تیسرے دن سمرقند والوں نے اتنی زوردار تیر اندازی کی کہ حضرت سعید بن عثمان اور مُہلَّب بن ابی صُفرہ بھی نہ بچ پائے اور دونوں کی ایک ایک آنکھ شہید ہوگئی۔ اس کے باوجود مسلمان ڈٹے رہے۔ آخر ترک بھاگ کر شہر میں محصور ہو گئے۔

اس دوران حضرت سعید رحمہ اللہ کو خبر ملی کہ ترکوں کے کئی شہزادے اور رئیس ایک اور قلعے میں مورچہ بند ہیں۔ انہوں نے فوراً فوج کا ایک حصہ بھیج کر اس قلعے کو گھیر لیا۔ سمرقند کے ترکوں نے یہ دیکھا تو گھبرا گئے اور صلح کی درخواست کر دی، چونکہ ترکوں کی بدعہدی کا بارہا تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے حضرت سعید رحمہ اللہ نے تین شرائط پیش کیں:

① ترکوں کے پندرہ رئیس اور شہزادے ان کے پاس یرغمال رہیں گے۔

② شہر مسلمانوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔

③ شہر والے سات لاکھ درہم ادا کریں گے۔

ان شرائط پر سمرقند والوں سے صلح ہوگئی۔

حضرت سعید بن عثمان رحمہ اللہ نے واپسی میں ترمذ کا رخ کیا، یہاں بھی ایک ملکہ راج کر رہی تھی۔ اس نے بھی صلح کی

درخواست کی جو حضرت سعید رحمہ اللہ نے قبول کر لی۔ ملکہ نے شہرأن کے حوالے کر دیا۔ اس طرح وسطِ ایشیا کا بڑا حصہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کیصاحبزادے کے ہاتھوں فتح ہوا۔[1]

قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ کی شہادت:

دلچسپ اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس جہاد میں بنو ہاشم کے بزرگ حضرت قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ اس واقعے سے صاف معلوم ہوتا ہے بنو ہاشم بھی، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مانتے تھے۔ تبھی ان کے جھنڈے تلے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس جہاد کے ایک معرکے کے بعد جب مالِ غنیمت میں سے مجاہدین کو حصہ دیا جانے لگا تو لشکر کے امیر حضرت سعید بن عثمان رحمہ اللہ نے حضرت قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ کو اُن کی بزرگی کی وجہ سے ایک ہزار حصوں کی پیش کش کی (جو آج کل کے لاکھوں روپے بنتے ہیں) مگر حضرت قُثَم رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا اور فرمایا: ''ایسا نہ کریں بلکہ دستور کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (بیت المال کے لیے) الگ کر کے باقی مال غازیوں میں اُن کے حق کے مطابق تقسیم فرمائیں اور مجھے اور میرے گھوڑے کو (عام لوگوں کی طرح) ایک ایک حصہ ہی دیں۔''[2]

اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، خصوصاً بنو ہاشم کی بے لوثی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اللہ کی رضا کے لیے سر ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ انہیں دنیا کے مال و دولت کا کوئی شوق نہ تھا۔ قُثَم رضی اللہ عنہ اس جہادی سلسلے میں شروع سے آخر تک تمام جنگوں میں شریک رہے اور آخر میں سمرقند کے سخت ترین معرکے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔[3]

قُثَم رضی اللہ عنہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور ہم شکل تھے۔[4] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔ بعض اوقات اپنی سواری پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو پیچھے اور قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ کو آگے بٹھا لیتے تھے۔[5] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کو لحد میں رکھنے کی سعادت جن صحابہ کو حاصل ہوئی، یہ ان میں سے ایک تھے۔[6] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاونین میں ان کا خاص مقام تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ سے کوفہ روانہ ہوتے وقت انہی کو مدینہ کا حاکم بنا کر گئے تھے۔[7]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے بعض سالوں میں انہوں نے امارتِ حج کے فرائض بھی انجام دیے۔[8]

---

① فتوح البلدان، ص ۳۹۷، ۳۹۸، ط الهلال

② طبقاتِ ابن سعد: ۳۶۷/۷، ط صادر، ذِکر قثم بن عباس رضی اللہ عنہ

③ العبر فی خبر من غبر للذهبی، تحت ۵۶ھ ؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۰۳، تحت: ایام معاویة بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، سیر اعلام النبلاء: ۴۴۲/۳، ط الرسالة

④ المنتخب من ذیل المذیل للطبری، ص ۳۸، مؤسسة الاعلمی بیروت

⑤ مسند احمد، ح: ۲۷۰۶

⑥ سیرة ابن هشام: ۶۶۳/۲

⑦ الفتنة ووقعة الجمل، ص ۱۰۸ ⑧ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۱۹۸

افریقہ کی مہمات

عالم اسلام کے مغرب میں افریقہ کا وسیع براعظم تھا، جس کی شمالی پٹی جو بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ جاتی ہے، کئی مملکتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں یہاں کچھ فتوحات ہوئی تھیں مگر مسلمانوں کو یہاں ابھی تک استحکام نصیب نہیں ہوا تھا۔ یورپی بادشاہ اور قیصرِ روم یہاں کے کفار کی مدد کرتے تھے تاکہ وہ مسلمانوں کے آگے ڈٹے رہیں۔ قیصر کو افریقی سرداروں کی مسلمانوں سے مصالحت کا بڑا رنج تھا۔ اس لیے وہ بار بار انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر مصر میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے افریقہ کی فتوحات کے لیے اپنے خالہ زاد بھائی حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کو ذمہ دار بنایا۔ ①

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کی فتوحات:

حضرت عُقبہ رحمہ اللہ ایک بلند پایہ عسکری قائد، دلیر اور عابد وزاہد انسان تھے۔ انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے ہی سال افریقہ میں فوج کشی کی اور صحرائے اعظم کو عبور کرتے ہوئے لوبیا (لیبیا) تک جا پہنچے۔

لوبیا اور مراقیا کو فتح کر کے وہ لوٹے ہی تھے کہ پیچھے شکست خوردہ افریقیوں نے بغاوت کردی، حضرت عُقبہ رحمہ اللہ پھر پلٹے، دشمنوں کی بڑی تعداد کو قتل اور گرفتار کر کے بغاوت کی آگ ٹھنڈی کی۔

اگلے سال انہوں نے مزید پیش قدمی کی اور شدید لڑائی کے بعد ''غُدامس'' کو فتح کر ڈالا۔ ②

سن ۴۳ ہجری میں وہ باقی فوج کو روک کر صرف چار سو گھڑ سواروں، چار سو شتر سواروں اور پانی کے آٹھ سو مشکیزوں کا زادِ سفر لے کر جنوب میں سوڈان کے صحراؤں کی طرف نکل گئے اور ''بَرقہ'' کے نواح میں ''وَدّان'' کو فتح کر کے مقامی سردار کو گرفتار کرلیا۔ ③

عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وفات:

مصر کے گورنر حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سن ۴۲ ہجری میں عیدالفطر کے دن وفات پا گئے تھے۔ ④

مشاجرات میں شرکت کے باعث حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے کردار وشخصیت پر بھی سوالیہ نشان لگ جاتے ہیں اور اہلِ باطل ان کے جواب محض اپنی عقل یا ضعیف روایات لے کر انہیں ظالم اور منافق سمجھنے لگتے ہیں۔

حالاں کہ وہ عظیم صحابی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''العاص کے دونوں بیٹے: عَمرو اور ہشام مؤمن ہیں۔'' ⑤

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۴

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۵

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۶، معجم البلدان: ۳۶۶/۵

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۵

⑤ مسند احمد، ح: ۸۰۴۲ بسند حسن، طبقات ابن سعد: ۱۹۲/۴، ط صادر، مستدرک حاکم، ح: ۵۰۵۳ بسند حسن

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وہ قریش کے ہوشیار شخص اور دنیا کے مانے ہوئے مرد تھے۔ ذہانت، ہوشیاری اور دوراندیشی میں ضرب المثل تھے۔ پستہ قد تھے اور سیاہ خضاب لگاتے تھے۔'' ①

جب ان کی وفات کا وقت ہوا تو شدید گھبراہٹ کے عالم میں رونے لگے۔ ان کے بیٹے عبداللہ (بن عمرو) رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیوں رو رہے ہیں، کیا موت سے گھبراتے ہیں؟''

فرمایا: ''اللہ کی قسم! موت سے نہیں بلکہ موت کے بعد والی زندگی سے۔''

صاحبزادے نے کہا: ''آپ نے تو خیر کی زندگی گزاری ہے؟'' یہ کہہ کر صاحبزادے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور شام کی فتوحات میں شرکت کی باتیں یاد دلانے لگے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

''تم نے ان سب سے بڑھ کر فضیلت والی بات چھوڑ دی۔ وہ ہے لا الہ الا اللہ کی گواہی دینا۔ دیکھو! میری زندگی کے تین دور گزرے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کس دور میں کیا تھا۔ پہلے میں کافر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین میں سب لوگوں سے بڑھ کر تھا۔ اگر میں اس وقت مر جاتا تو یقیناً جہنمی ہوتا۔ پھر جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو میں ان سے حیاء کرنے میں سب لوگوں سے بڑھ کر تھا۔ میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نگاہ بھر کر نہ دیکھ سکا۔ میں جو کچھ ان سے کہنا چاہتا تھا، اس کا کھل کر اظہار نہ کر سکا۔ آخر وہ اللہ سے جا ملے۔ اگر میں بھی اسی دور میں مر جاتا تو لوگ کہتے: ''عمرو کو مبارک ہو۔ وہ اسلام لایا، خیر پر جما رہا اور مر گیا، اس کے لیے جنت کی امید ہے۔''

مگر اس کے بعد میں اقتدار اور اس قسم کی چیزوں میں الجھ گیا۔ معلوم نہیں اب وہ میرے لیے فائدہ مند ہوں گی یا نقصان دہ۔ پس میں مر جاؤں تو مجھ پر کوئی نہ روئے۔'' ②

ایک روایت میں ہے کہ صاحبزادے نے کہا: ''گھبراہٹ کیسی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو قریب کرتے اور امیر بناتے تھے۔'' فرمایا: ''بیٹا! ایسا تو تھا مگر میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں کہ اللہ کی قسم! مجھے نہیں معلوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھ محبت کی وجہ سے یہ معاملہ کرتے تھے یا دل جوئی کی خاطر۔ مگر میں دو آدمیوں کے بارے میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے رخصت ہوتے دم تک ان سے محبت تھی۔ ایک ابن سُمَیَّہ (عمار بن یاسر) اور ایک ابن اُم عبد (عبداللہ بن مسعود)۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھ لیا اور دعا کی:

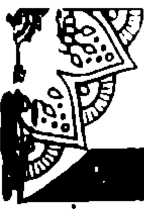
''یا اللہ! تو نے ہمیں حکم دیا اور ہم نے چھوڑ دیا۔ تو نے منع کیا اور ہم نے اس کا ارتکاب کیا۔ تیری مغفرت کے سوا ہمارے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں۔'' یہی کہتے کہتے ان کی روح خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ ③ ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون''

یہ تھے صحابہ کرام جو باہمی اختلافات میں بھی مخلص اور نیک نیت تھے، فکرِ آخرت ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ اس کا اعتراف کرنے اور نادم ہو کر توبہ واستغفار کرنے میں بھی سب سے بڑھ کر تھے۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۵۴/۳ تا ۵۷، ط الرسالۃ

② مسند احمد، ح: ۱۷۷۸۰ بسند حسن ③ مسند احمد، ح: ۱۷۷۸۱، اسنادہ صحیح علی شرط مسلم



مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کا جہاد:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی جگہ مَسلمہ بن مُخَلَّد رضی اللہ عنہ مصر اور شمالی افریقہ کے گورنر بنے۔ اس دوران ۴۵ھ میں قیصر نے ولیم نامی ایک امیر کو افریقہ بھیج کر لوگوں کو اپنی ماتحتی میں آنے کی دعوت دی۔ ایک افریقی سردار حبابہ نے آ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ بتایا تو انہوں نے مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کو افریقہ میں مزید فتوحات کی ذمہ داری دی۔ ①

وہ افریقہ کے جنگلات میں بڑھتے چلے گئے۔ اس دوران انہوں نے ایک پہاڑ پر کیمپ لگایا جہاں ایسی شدید بارشوں کا سامنا کرنا پڑا کہ اس جگہ کو "جبل المَمطُور" (بارشوں کا پہاڑ) کہا جانے لگا۔ ②

سن ۴۷ھ میں افریقہ کی مہم کے لیے حضرت رُوَیفع بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا۔ وہ طَـرَابُلُـس المغرب (ٹریپولی، لیبیا کے موجودہ دارالحکومت) تک پہنچے اور اسے فتح کر کے لوٹے۔ ③

بہار اور گرما میں جب سمندر معتدل ہوتا تو طرابلس کے ساحل پر رومیوں کے حملوں کا خطرہ بڑھ جاتا، البتہ سرما میں سمندر کی طغیانی کے سبب یہ خطرہ نہیں رہتا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ہر سال موسمِ بہار میں اضافی تازہ دم افواج طرابلس کے ساحل پر تعینات کر دیتے۔ جب موسم سرما آتا اور سمندر میں طغیانی ہوتی تو امیرِ لشکر تھوڑی فوج کے ساتھ وہیں رہ جاتا۔ باقی فوج واپس چلی جاتی۔ ④

سُوس کی فتح:

سن ۵۰ ہجری میں حاکمِ مصر حضرت مَسلمہ بن مُخَلَّد رضی اللہ عنہ کی طرف سے مُعاویہ بن حَدَیج رضی اللہ عنہ کو پھر جہاد کے لیے افریقہ بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان جیسے نامور قریشی حضرات تھے۔ رومی بادشاہ افریقہ پر اپنی بالادستی برقرار رکھنے کا خواہاں تھا۔ اس نے نجفور نامی ایک نواب کو تیس ہزار جنگجو دے کر مسلمانوں کی یلغار روکنے کے لیے بھیج دیا۔ جونہی رومی فوج افریقہ کے ساحل پر اتری حضرت مُعاویہ بن حُدَیج اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما گھڑ سواروں کا ایک بڑا دستہ لے کر ان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ساحلی شہر سُوس سے بارہ میل (ساڑھے ۱۹ کلومیٹر) دور ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ یہاں سے ساحل پر رومی فوج دکھائی دے رہی تھی۔ رومی سالار نجفور کو ان حضرات کے قریب آنے کی اطلاع مل گئی۔ وہ اتنا گھبرایا کہ اسی وقت جہاز میں چڑھ کر واپس بھاگ نکلا۔ فوج پیچھے رہ گئی۔

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب، مراکشی: ۸/۱

ان صحابی کا نام بعض کتب میں مُعاویہ بن خَدِیج مذکور ہے مگر حا کے ساتھ حَدَیج صحیح ہے۔ خَدِیج کسی راوی کا وہم ہے یا نسخوں کی غلطی ہے۔

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۷

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۸

④ فتوح البلدان، ص ۱۲۹، ط الهلال

اب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سواروں کو لے کر سیدھے سُوس شہر کے سامنے ساحل پر جا پہنچے۔ ایک طرف رومی فوج کھڑی تھی، دوسری طرف شہر کا دروازہ تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے وہیں صفیں درست کرا کے نمازِ عصر شروع کرادی۔

رومی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے اسے حملے کا بہترین موقع خیال کر کے گھڑ سواروں کو آگے بڑھایا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اطمینان سے نماز ادا کرتے رہے اور حریف کی اس بزدلانہ حرکت کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ دشمن کے قریب آنے سے ذرا پہلے وہ سلام پھیر کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور تکبیر کہتے ہوئے رومیوں پر پل پڑے۔ کچھ ہی دیر میں رومی سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہو گئے۔

ادھر حضرت مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ نے عبدالملک بن مروان کو ایک ہزار گھڑ سواروں کا دستہ دے کر ''جلولا'' نامی شہر کی جانب بھیجا جو قیروان سے چوبیس میل (ساڑھے ۳۸ کلومیٹر) دور ہے۔

عبدالملک نے محاصرہ کر کے منجنیقوں سے شدید سنگ باری کی مگر شہر فتح نہ ہوسکا۔ فصیل کمزور ہونے کے باوجود کہیں سے ٹوٹتی نہ تھی لہٰذا فتح میں تاخیر ہوتی جارہی تھی۔ اِدھر سپہ سالارِ اعلیٰ مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کا بھیجا ہوا بڑا لشکر بھی عبدالملک کے پاس پہنچ گیا تاہم کامیابی نہ ہوئی۔

عبدالملک بن مروان نے ایک دن جلولاء پر زوردار حملہ کیا۔ شہر والے کامیاب مزاحمت کرتے رہے۔ اسی دوران عبدالملک کو مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کا حکم موصول ہوا کہ مہم کو چھوڑ کر واپس آجاؤ۔ عبدالملک کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سپاہیوں کو پڑاؤ کی طرف واپسی کا اشارہ دے کر عبدالملک نے خود اپنے خیمے کا رخ کیا، کچھ دور پہنچ کر یاد آیا کہ کمان وہیں کسی درخت سے لٹکی رہ گئی ہے۔ واپس جا کر کمان اٹھائی، اس دوران اچانک شہر کی فصیل پر نگاہ پڑی تو حیرت کا جھٹکا لگا؛ کیوں کہ فصیل ایک جگہ سے منہدم ہو چکی تھی۔

عبدالملک نے فوراً آواز دے کر سپاہیوں کو واپس بلایا اور شہر پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ مسلمان زبردست لڑائی کے بعد شہر میں داخل ہو گئے اور اسے فتح کرلیا۔ ①

اس فتح میں اتنا مالِ غنیمت ہاتھ لگا کہ ہر مجاہد کو دو سو اور ہر گھڑ سوار کو چار سو درہم ملے۔ ②

ان فتوحات کے دوران حضرت مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ نے عبدالملک بن مروان کو ساتھ لے کر تیونس سے ۴۲ میل (۶۸ کلومیٹر) مغرب میں ساحل پر واقع ''بَنزِرت'' کا مشہور شہر بھی فتح کرلیا۔ ③

حضرت مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ اس مہم سے ایک سال بعد واپس لوٹے۔ ④

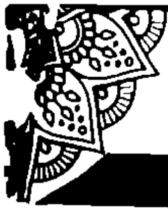
---

① البیان المغرب: ۸/۱ ، تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۱

② معجم البلدان: ۱۵۶/۲ ، جلولاء ، البیان المغرب لابن عذاری: ۸/۱

③ معجم البلدان: ۵۰۰/۱

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۱



افریقہ میں اوّلین اسلامی چھاؤنی، قیروان شہر کی تعمیر:

اب تک افریقہ میں مسلمانوں کے حملے حریف ریاستوں پر دباؤ بڑھانے اور ان کی شرپسندی کا زور توڑنے کے لیے تھے۔ مسلمانوں کی افواج یہاں آکر مستقل قیام نہیں کرتی تھیں اس لیے اب تک کئی جہادی مہمات کے باوجود افریقہ میں مسلمانوں کا کوئی شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ اس کا نقصان یہ ہو رہا تھا کہ اسلامی افواج کے جاتے ہی کوئی نہ کوئی شرپسند سردار لوگوں کو جمع کر کے بغاوت کر دیتا اور کچھ مدت بعد مسلم فوج کو دوبارہ آکر علاقہ فتح کرنا پڑتا۔

مسلمانوں کے یہاں آباد نہ ہو سکنے کی کئی وجوہ تھیں: ان علاقوں میں سینکڑوں میلوں تک مسلسل صحرا اور جنگلات پھیلے ہوئے تھے۔ آبادی کہیں کہیں تھی اور وہ بھی بہت کم۔ پھر ان میں ضروریاتِ زندگی کی فراہمی بہت مشکل تھی اس لیے مہذب انسانوں کا آباد ہونا بہت دشوار تھا۔ اس کے برعکس شام، مصر اور عراق و فارس کے علاقے پہلے سے آباد اور ضروریاتِ زندگی سے بھرپور تھے، اس لیے مسلمان وہاں آسانی سے شہر، قلعے اور چھاؤنیاں بنا چکے تھے۔

بہرحال افریقہ میں بغاوتوں کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے ایک اسلامی شہر بسانا ضروری تھا۔ اس عظیم کام کا بیڑا سنہ ۵۰ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپہ سالار حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے اٹھایا۔ حضرت عُقبہ کا تعلق قریش کے خاندان بنو فہد سے تھا۔ سن ۱۰ ہجری میں ولادت ہوئی تھی، اب وہ چالیس برس کے تجربہ کار انسان تھے۔ وہ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ بَرقہ کے نواح میں کیمپ لگائے ہوئے تھے اور حکام بالا کی ہدایات کے مطابق مہمات میں جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے افریقہ کے کئی شہر فتح کر لیے تھے اور اسلامی سرحدوں کو سوڈان تک پہنچا دیا تھا۔ ①

انہوں نے امرائے لشکر کے اجلاس میں کہا:

''افریقہ میں جب بھی کوئی ہمارا سپہ سالار فوج لے کر آتا ہے، یہ لوگ اسلام کے پرچم تلے آجاتے ہیں، مگر اسلامی فوج کے جاتے ہی بغاوت کر دیتے ہیں؛ اس لیے آپ حضرات یہاں ایک ایسا شہر آباد کریں جو ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا مرکزِ جہاد بن جائے۔''

سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ بعض حضرات نے رائے دی کہ یہ شہر ساحل پر تعمیر کیا جائے تاکہ سمندری سرحد کی حفاظت بھی ہوتی رہے مگر حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اس صورت میں ممکن ہے کہ قیصر اچانک چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کر لے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے ساحل سمندر سے تین دن کی مسافت پر بنایا جائے تاکہ دشمن کی بحری فوج آئے تو یکدم اس تک نہ پہنچ سکے۔''

سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ ②

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے اس منصوبے کے لیے ''السَّبخة'' جھیل کے قریب کا علاقہ پسند کیا۔ سن ۵۱ھ میں مسلمان

---

① الکامل فی التاریخ: ۱۳/۳، الاعلام للزرکلی: ۲۴۱/۴، معجم البلدان: ۴/۴۲۰

② البیان المغرب: ۹/۱ آج بھی بڑے شہر آباد کرنے میں یہ دفاعی احتیاط ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ وہ سرحد سے مناسب فاصلے پر ہوں۔

کام کا آغاز کرنے لگے تو مشکل یہ آن پڑی کہ وہاں کا گھنا جنگل درندوں، سانپوں اور بچھوؤں سے پٹا پڑا تھا، اندر قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ①

درندوں نے جنگل خالی کر دیا :

حضرت عُقبہ رحمہ اللہ نے لشکر کے چنیدہ افراد کو جمع کیا جن میں اٹھارہ صحابہ کرام شامل تھے۔ سب نے مل کر اس کام کی آسانی کے لیے دعا کی۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ سیدھا جھیل کی وادی میں پہنچے جہاں شہر آباد کرنا طے ہوا تھا۔ وہاں بلند آواز سے اعلان کیا:

''اے جنگل کے درندو! سانپو! اور بچھوو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔ آیندہ تم میں جو دکھائی دیا اسے مار دیں گے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے جھنڈوں سے درندے اور بلوں سے سانپوں اور بچھوؤں کے غول نکلنے لگے۔ جنگل خالی ہو رہا تھا۔ جانوروں نے اصحابِ رسول کی پکار پر لبیک کہا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لیے جا رہے تھے جو خود چل نہیں سکتے تھے۔ بھیڑیے اپنے بچوں کو منہ میں دبا کر بھاگ رہے تھے۔ سانپ اپنے بچوں کو ساتھ لپٹائے بلوں سے جا رہے تھے۔ حضرت عُقبہ رحمہ اللہ نے آواز لگائی: ''کوئی ان جانوروں کو ہاتھ نہ لگائے، انہیں جانے دو۔''

جنگل خالی ہو گیا تو ساتھیوں سے فرمایا: ''اب اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہو جاؤ۔''

مسلمان جنگل میں گئے تو وہاں کسی جانور کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ منظر دیکھ کر بربر قبائل کے اَن گنت لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ چالیس برس تک پھر اس علاقے کے اردگرد کوئی موذی جانور نظر نہیں آیا۔ ②

حضرت عُقبہ رحمہ اللہ کے حکم پر درختوں اور جھاڑیوں کو کاٹ کر ایک وسیع رقبہ صاف کر دیا گیا۔ پہلے ایک بڑی مسجد تعمیر کی گئی۔ پھر اس کے اردگرد مجاہدین کے مکانات بنائے گئے۔ ہر محلے میں ایک چھوٹی مسجد تعمیر کی گئی۔ شہر کی فصیل کا دائرہ ساڑھے چار میل (سوا سات کلومیٹر) رکھا گیا۔

شہر کی بنیاد پڑی تو لوگ ادھر کھنچے کھنچے آنے لگے۔ کچھ ہی عرصے میں یہ آبادی سے بھر گیا۔ اسے ''قَیرَوان'' کا نام دیا گیا۔ ③ یہ افریقہ میں مسلمانوں کی پہلی چھاؤنی اور پہلا شہر تھا۔ ④

حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ کا کام بھی کرتے رہے جس سے اس براعظم میں تیزی سے اسلام پھیلا اور بے شمار بربر اور دیگر قبائل اسلام میں داخل ہوئے۔ ⑤

---

① البیان المغرب: ۹/۱

② البیان المغرب: ۹/۱

③ یہ لفظ ''کاروان'' کی تبدیل شدہ شکل ہے۔

④ البیان المغرب: ۱۰۹/۱، تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۰

⑤ فتوح مصر والمغرب لابی القاسم المصری: ۳۵۲/۳

ابومہاجر دیناراور حسان بن نعمانؒ کی فتوحات:

چند سال بعد حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ واپس بلا لیے گئے تو ۵۴ ھ میں خالد بن ثابت فہمی اوران کے بعد ابومہاجر دینار رحمہ اللہ نے یکے بعد دیگرے افریقہ کے محاذ پر جہادی خدمات انجام دیں اور حضرت عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کی فتوحات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ [1]

سن ۵۷ ہجری میں یہاں حضرت حسان بن نعمان رحمہ اللہ کا تقرر ہوا۔اسی سال عابس بن سعد نے شمالی افریقہ کے شہر اُصطاذنہ پر حملہ کیا۔ [2] بربر قبائل نے جوالجزائر سے مراکش تک پھیلے ہوئے تھے،ان سے صلح کر لی اور خراج ادا کرنے لگے۔ حضرت حسان بن نعمان رحمہ اللہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک یہاں تعینات رہے۔ [3]

سن ۵۹ ہجری میں ابومہاجر دینار رحمہ اللہ نے شمالی افریقہ کے ساحل پر رومیوں کے قدیم تاریخی شہر ''قَرطاجَنَّہ'' پر یلغار کی۔ یہاں دن بھر گھمسان کی لڑائی ہوئی۔مسلمانوں نے پیچھے ہٹ کر رات کو اپنے زیر قبضہ افریقی شہر تونس (موجودہ تیونس) کے قریب ایک پہاڑ پر اپنی دفاعی لائن کو مضبوط کیا اور صبح سویرے کفار پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔مقامی لوگوں نے ہتھیار ڈال کر شہر ان کے حوالے کر دیا۔قرطاجنہ کے بعد ابومہاجر رحمہ اللہ نے ایک اور اہم مقام ''میلہ'' کو بھی فتح کیا۔ [4]

اس طرح سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں تقریباً پورے شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔

☆☆☆

سلطنتِ روما اور عالمِ اسلام

کسریٰ کی شان وشوکت خلافتِ اسلامیہ کی سطوت وعروج کے سامنے چند برسوں سے زیادہ نہیں ٹک سکی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ساسانیوں کا پایۂ تخت فتح ہوا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کا آخری کسریٰ بھی مارا گیا تھا۔تاہم قیصرِ روم ایشیا سے بے دخل ہونے کے باوجود یورپ میں پوری آن بان کے ساتھ موجود تھا۔ قُسطَنطِینِیہ اس کا مرکز تھا اور بحیرۂ روم کے کئی جزیرے اس کے قبضے میں تھے،جن کی چھاؤنیوں سے رومی افواج عالمِ اسلام کے ساحلوں پر تخت وتاراج کرتی رہتی تھیں۔حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قیصری سلطنت کا خاتمہ چاہتے تھے۔رومیوں کے پایۂ تخت قُسطَنطِینِیہ پر اسلام کا پرچم گاڑنا آپ کی شدید خواہش اور آپ کے منصوبوں کا اہم ترین حصہ تھا۔تاہم خلافت کے پہلے سال آپ کو اندرونی شورشوں پر قابو پانے اور دوسرے محاذوں پر قدم جمانے کے لیے فرصت درکار تھی،اس لیے آپ نے اس وقت رومیوں سے صلح کر لی تھی۔ [5]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۲۳
② معجم البلدان: ۱/۱۴۲
③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۲۳
④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، سن ۵۹ ھ ⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۵

عہد شکنی کرنے والوں سے بھی ایفائے عہد:

اس مصالحت کی ابتداء قیصر کی طرف سے ہوئی تھی۔ وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد پر خوفزدہ تھا، کیوں کہ برسوں سے وہ شام کے ساحلوں اور بحیرۂ روم کی موجوں میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی قوت وشوکت کا مظاہرہ دیکھتا آرہا تھا۔ ایسے جرنیل کے خلیفہ بننے پر وہ جتنا بھی بے چین ہوتا کم تھا۔ اس نے صلح کے لیے سالانہ ایک خطیر رقم ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ چونکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ رومیوں کی دھوکا بازی سے خوب واقف تھے، اس لیے شرط رکھی کہ ضمانت کے لیے رومی اپنے چند سرکردہ افراد یرغمال کے طور پر ان کے پاس رکھوائیں گے۔ قیصر نے کچھ افراد مسلمانوں کے حوالے کردیے جنہیں بعلبک کے قلعے میں رکھا گیا۔ یہ صلح دو سال تک جاری رہی۔

کچھ مدت بعد رومیوں نے اپنی عادت کے مطابق عہد شکنی کی اور صلح کا معاہدہ یک طرفہ طور پر توڑ دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چاہتے تو کسی دنیادار بادشاہ کی طرح اس موقع پر ان کے یرغمالیوں کو قتل کراسکتے تھے مگر آپ نے اپنے رفقاء کے ساتھ غور وفکر کرکے یہ فیصلہ صادر کیا کہ قیصر کی غلطی کے بدلے ان یرغمالیوں کا قتل جائز نہیں۔ آپ نے ان یرغمالیوں کو یہ تاریخ ساز فقرہ کہہ کر آزاد فرمادیا: "وَفَاءٌ بِغَدْرٍ خَيْرٌ مِنْ غَدْرٍ بِغَدْرٍ."

"عہد شکنی کے بدلے عہد شکنی سے بہتر ہے کہ عہد توڑنے والوں سے بھی ایفائے عہد کیا جائے۔" [1]

☆☆☆

رومیوں کے خلاف اہم مہمات

سن ۴۲ ہجری میں آپ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے خلاف مہمات کا آغاز کردیا اور پھر عمر بھر جنگ بندی نہ کی۔ اس کے لیے آپ نے ہر سال موسم سرما اور موسم گرما میں الگ الگ افواج کو رومیوں کی سرحدوں پر تعینات کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ یہ خاص افواج شام کے شمال میں ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) میں پڑاؤ ڈالے رہتی تھیں، اس سرزمین کا کچھ حصہ مسلمانوں اور کچھ رومیوں کے قبضے میں تھا۔ یہ خاص افواج ان بحری فوجوں کے علاوہ تھیں جو شام اور افریقہ کے ساحلوں پر رومی بحریہ سے نبرد آزما رہتی تھیں۔ چونکہ ایشیائے کوچک کے محاذ پر موسم سرما نہایت سخت ہوتا ہے اس لیے مؤرخین نے زیادہ تر انہی افواج کا ذکر کیا ہے جو موسم سرما کے لیے خصوصی طور پر بھیجی گئی تھیں۔

موسم سرما کی مہمات:

اس سلسلے کی پہلی مہم سن ۴۲ ہجری میں بُسر بن اَرطاۃ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ ہوئی اور خلیج قُسطَنطِنیہ تک گئی۔ اس فوج نے پورا موسم سرما محاذ پر گزارا۔ [2]

---

[1] فتوح البلدان، ص ۱۵۹، ط الهلال ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۶

[2] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۹۶ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۱۱/۳

سن ۴۴ اور ۴۵ ہجری کے سرما میں سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ مجاہدین کے قائد بن کر رومیوں کے مدمقابل رہے۔ ①

ان کے بعد حضرت مالک بن ہُبَیرہ اور حضرت عبدالرحمٰن القینی سن ۴۷ ہجری سے سن ۴۹ ہجری تک مختلف سالوں کے موسم سرما میں ایشیائے کوچک اور اناطولیہ کے محاذوں پر سینہ سپر رہے۔ ②

ایک موسم سرما میں یزید بن شَجرہ الرُّہاوی نے بھی قیادت کی۔ ③

جہاد کے لیے نکلنے والے یہ بڑے لشکر سرحد پر جا کر چھوٹے چھوٹے تیز رفتار گھڑ سوار دستوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ چالیس پچاس گھڑ سواروں کا ایک ایسا دستہ حضرت عبیدہ بن قیس کلابی رحمہ اللہ کی قیادت میں تھا جس نے ''شماسہ'' نامی قلعہ فتح کیا۔ یہاں سے ہر سوار کو غنیمت میں دو دو سو دینار ملے۔

انہی بزرگ کی قیادت میں خلیج قُسطَنطِینیہ کے ساحل پر ایک اور قلعہ بھی سرنگوں ہوا جسے ''مدن'' کہا جاتا تھا۔ ④

موسم گرما کی کارروائیاں:

اس دوران موسم گرما میں بھی رومیوں کے خلاف لشکر کشی ہوتی رہی جن کی قیادت حضرت عبداللہ بن قیس الفزاری اور حضرت مالک بن ہُبَیرۃ الیشکری رحمہما اللہ کرتے رہے۔ ⑤

تاہم گرمی کی مہمات میں سب سے بڑا کردار حضرت مالک بن عبداللہ خثعمی رحمہ اللہ کا تھا جو اپنے کارناموں کی وجہ سے ''مالک الصوائف'' (مہماتِ گرما والے مالک) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ ⑥

حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سرمائی مہم اور واپسی:

رومیوں کے خلاف ایک سرمائی مہم کے امیر حضرت جَرِیر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ ناقابلِ برداشت سردی کو مجاہدین کے لیے نقصان دہ دیکھ کر جلد واپس آ گئے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے باز پرس کی تو فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش نظر تھا کہ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ ارشاد آپ نے خود سنا ہے؟'' فرمایا: ''جی ہاں، میں نے خود سنا ہے۔'' ⑦

غرض اس مہم پر جانا اور وہاں قیام کرنا بہت مشکل اور بعض حالات میں جان لیوا امتحان تھا۔

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۷ ② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۸، ۲۰۹

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۲۳ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۱۱/۳

نوٹ: تاریخ ابن خلدون کے بعض نسخوں میں یہاں یزید بن شرۃ لکھا گیا ہے جو کتابت کی غلطی ہے۔

④ تاریخ دمشق: ۲۷۲/۴۰ ترجمۃ: عطیہ بن قیس ؛ المعرفۃ والتاریخ: ۳۹۸/۲، ط الرسالۃ...

قلعہ ''مدن'' کو ''مدین'' اور ''المدنی'' بھی کہا گیا ہے۔ اسی طرح قلعہ ''شماسہ'' کو ''سامسہ'' بھی کہا گیا ہے۔

⑤ تاریخ ابن خلدون: ۱۱/۳

⑥ اسد الغابۃ: ۲۸/۵ ؛ الاصابۃ، ۵۴۱/۵، ۵۴۲ تحت: مالک بن عبداللہ بن سنان الخثعمی

⑦ مسند حمیدی: ۳۵۲/۲، جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کی سرزمین پر سولہ مہمات روانہ کیں۔ ایک ایک لشکر باری باری سردی اور گرمی میں وہاں جاتا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی اپنے بیٹے یزید کو آخری وصیت یہ تھی کہ رومیوں کا گلا گھونٹ دو۔''[1]

ان تمام مہمات کا مقصد اپنی سرحدوں کا دفاع کرنا، دشمن پر دباؤ ڈالنا، اسے اقتصادی نقصان پہنچانا اور اس کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہنا تھا۔

قُسطَنطِینِیّہ پر بڑا حملہ:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال تک چھاپہ مار حملوں کی حکمت عملی آزمانے کے بعد آخر ۵۰ھ میں رومی پایہ تخت قُسطَنطِینِیّہ پر بڑے حملے کی تیاری کی۔[2] حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے چوبیس سالہ فرزند یزید کو لشکر کا سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر کیا۔[3] عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ رضا کاروں، عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ مصری فوج اور فَضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ شامی دستوں کے قائد تھے۔[4]

یزید نے ماضی کی کسی چھوٹی موٹی جنگی مہم میں بھی کوئی فتح حاصل نہیں کی تھی، اس لیے اتنی عظیم الشان مہم کی قیادت اس کے سپرد ہونا اور نامور جرنیلوں اور عمر رسیدہ صحابہ کو اس کے ماتحتوں کی حیثیت ملنا بعض اکابرِ اُمت کو ناگوار گزرا، خصوصاً اس لیے کہ علم وفضل اور صلاح وتقویٰ کے لحاظ سے بھی یزید بہت پیچھے تھا، مگر صحابۂ کرام کے اخلاص، انکسار اور اطاعت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس صورتحال پر قطعاً کوئی احتجاج نہ کیا۔ اگر کسی کے دل میں خفگی آئی تو اس نے پروانہ کی بلکہ اس خفگی پر توبہ استغفار کرتے ہوئے جہاد میں شرکت کی۔ امام سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یزید بن مُعاویہ کو لشکر کا امیر بنایا گیا تو ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو اس کے ساتھ جہاد پر نکلنا ناگوار گزرا۔ مگر پھر وہ اس پر سخت نادم ہوئے اور بعد میں اس کے ساتھ جہاد میں شریک ہوگئے۔''[5]

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ جہاد کے لیے نکلنے کی وجہ بیان فرماتے ہوئے کہتے تھے: ''اللہ کا ارشاد ہے: اِنْفِرُوا خِفَافاً وَ ثِقَالاً (جہاد کے لیے نکلو، سہولت سے ہو یا مشقت سے) میں انہی دو حالتوں میں سے ایک میں ہوں۔''[6]

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۴۳۵

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۱؛ تاریخ طبری نے ۴۹ھ اور بعض نے سن ۵۲ ہجری بھی بتایا ہے مگر قرائن سے ۵۰ھ راجح ہے۔

③ مسند احمد، ح: ۲۳۵۲۲؛ اسد الغابۃ: ۲/۱۲۱، ترجمۃ: خالد بن زید بن کلیب (ابی ایوب الانصاری)

④ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۷۹۲۵، ۱۸۰۶۰، ۱۸۱۹۵

⑤ عن محمد بن سیرین قال: استعمل یزید بن معاویۃ علی جیش فکرہ ابوایوب الانصاری الخروج معہ ثم ندم لندامۃ شدیدۃ فغزا معہ.
(شرح السیر الکبیر للسرخسی: ۲/۲۳۵ باب الشہید وما یصنع بہ)

⑥ مستدرک حاکم، ح: ۵۹۳۰

بڑے بڑے صحابہ کرام اور نامور تابعین اس حملے میں شرکت کے لے تیار ہوئے جن میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ①

اس لشکر کی روانگی سے قبل ۵۰ھ ہی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلادِ روم یعنی ایشیائے کوچک میں رومیوں کے خلاف ایک لشکر دے کر بھیج دیا اور تاکید کی وہ "طوانہ" کے مقام تک پیش قدمی کرتے چلے جائیں۔ غالباً اس لشکر کشی کا مقصد رومیوں کو مصروف رکھنا تھا تاکہ وہ قُسطَنطِینِیَّہ جانے والے لشکر کا راستہ نہ روک سکیں۔ سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کا لشکر ایشیائے کوچک میں "فرقدونہ" تک گیا، اس مقام پر موسم شدید اور آب وہوا ناموزوں تھی، اس لیے مجاہدین قحط، بخار، خارش اور دوسرے مصائب میں مبتلا ہوگئے۔ ②

سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ قُسطَنطِینِیَّہ والے لشکر کی واپسی تک اور اس کے بعد بھی یہیں جمے رہے اور محاذ پر ہی وفات پائی۔ ان کی جگہ عبداللہ بن مَسعدہ الفزاری رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی۔ ③

لشکرِ قُسطَنطِینِیَّہ کی کارگزاری:

قُسطَنطِینِیَّہ کے لیے جانے والا لشکر کئی ماہ کی مسافت طے کر کے ایشیائے کوچک سے ہوتا ہوا خلیج قُسطَنطِینِیَّہ تک جا پہنچا۔ راستے میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے۔ یزید بن مُعاویہ نے آکر مزاج پرسی کی اور کہا: "کوئی ضرورت ہے تو بیان کیجیے؟" فرمایا: "میں مرجاؤں تو مجھے غسل دے کر کفن پہنا کر دشمن کے ملک میں جتنا ممکن ہو اندر لے جانا۔ پھر لوگوں کو حکم دینا کہ وہ مجھے دفن کردیں۔" ④

امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت اس لیے کی تھی تاکہ وہ دشمن کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر جہاد کا زیادہ سے زیادہ ثواب لے سکیں۔ ⑤

آخر کار مسلمان آبنائے قُسطَنطِینِیَّہ عبور کر کے رومیوں کے اس ناقابلِ تسخیر پایۂ تخت پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں شدید جھڑپیں ہوئیں۔ حضرت عبدالعزیز بن زُرارۃ رحمہ اللہ روزانہ شہادت کی تمنا لے کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے اور زندہ واپس آنے پر الیہ اشعار کہتے تھے۔ ایک دن لڑائی کے دوران وہ رومیوں کی صفوں میں گھس گئے اور لاشوں

---

① تاریخ الطبری: ۵/۲۳۲

کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ جہادِ قسطنطنیہ میں شریک تھے؟

مشہور ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی اس جہاد میں شریک تھے مگر قدیم کتب حدیث یا تاریخ وطبقات میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں۔ پہلی بار آٹھویں صدی ہجری میں حافظ ابن کثیر نے اسے نقل کیا ہے اور وہ بھی کسی سند کے بغیر۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۴۷۷)

اس لیے اس واقعے کی کوئی اسنادی حیثیت نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ موضوع روایت ہو: کیوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کی ماتحتی میں جہاد کے لیے جانا ایک غیر معمولی واقعہ ہوتا اور ایسے قرن اول وثانی کا کوئی راوی تو ضرور نقل کرتا مگر تلاش بسیار کے باوجود ایسا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

② تاریخ دمشق: ۶۵/۳۰۵، تاریخ یعقوبی، ص ۲۰۰ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۲۳۵، حالات ۵۲ھ

④ شرح السیر الکبیر للسرخسی: ۲/۲۳۵ باب الشہید وما یصنع بہ، اسد الغابۃ: ۲/۱۲۱

⑤ شرح السیر الکبیر للسرخسی: ۲/۲۳۵ باب الشہید وما یصنع بہ

کے ڈھیر لگا دیے، آخر میں رومیوں نے انہیں گھیر لیا اور نیزوں کے وار کر کے شہید کر ڈالا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو رنج کے مارے فرمایا: ''اللہ کی قسم! عربوں کا جوان مرد چل بسا۔''

حضرت عبدالعزیز رحمہ اللہ کے والد نے حیران ہو کر کہا: ''کون؟ میرا فرزند یا آپ کا؟''

فرمایا: ''تمہارا''۔

باپ نے کہا: ''ہر جوان مرد نے موت کا پیالہ پینا ہے، چاہے جوانی میں پیے چاہے بڑھاپے میں۔''[1]

قُسطَنطِینِیہ کے سامنے کھلے میدان میں بھی معرکے ہوئے۔ ایک دن رومیوں کی ایک فوج بہت بڑی صف بنائے ہوئے مقابلے پر نکلی۔ مسلمانوں کی قیادت یہاں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ مصری دستوں پر عُقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ عنہ امیر تھے اور شامی دستوں پر حضرت فَضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ۔

رومیوں کی اس صف سے لڑنے کے لیے مسلمانوں کی بھی ایک بڑی صف تیار ہوئی۔ آمنا سامنا ہوتے ہی ایک مجاہد اکیلا رومیوں کی صف میں گھس گیا۔ اس کے ساتھی اسے روکنے کے لیے چلائے: ''نہ، نہ! لا الٰہ الا اللہ''

مگر اس نے کوئی پروا نہ کی، اور دادِ شجاعت دے کر کچھ دیر میں واپس آگیا۔ لوگوں نے حیران ہو کر کہا:

''سبحان اللہ! یہ تو خود کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔'' پھر اس اقدام کی ممانعت کی دلیل میں انہوں نے آیت پڑھی:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾

''اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو۔''

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ بحث سنی تو آیت کا درست مطلب سمجھاتے ہوئے فرمایا:

''بھائیو! یہ آیت ہم انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ نے اپنے دین کی مدد فرمائی اور اسلام کو غالب فرما دیا تو ہم نے چپکے چپکے آپس میں کہا: ہمارے کاروبار ضائع ہو گئے ہیں۔ چلو اب ہم اپنی جائیدادوں کی خبر لیں، ان کو ترقی دیں، امید ہے کہ اللہ ہماری مراد عطا فرما دے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یعنی خود کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم دنیا داری میں لگ جائیں اور جہاد چھوڑ دیں۔''[2]

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اسی محاذ پر کچھ دنوں بعد انتقال ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ آخری سانسیں لے رہے تھے تو لشکر کے امیر یزید بن مُعاویہ نے ان کی عیادت کی۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اس وقت فرمایا: ''اُمت کے لوگوں کو میرا سلام کہنا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث ایسی سنی ہے کہ اگر میری یہ حالت نہ ہوتی تو کبھی نہ بتاتا۔ وہ ارشاد یہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اس حالت میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۴۹ ہجری [2] سنن ابی داؤد، ح: ۲۵۱۲، کتاب الجهاد؛ السنن الکبری للبیهقی، ح: ۱۷۹۲۵

ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ''میں نے حضور ﷺ سے ایک بات سنی ہے جواب تک تم سے چھپاتا رہا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے اگر تم گناہ نہ کروگے تو اللہ ایسی مخلوق پیدا کردے گا جو گناہ کرے گی اور اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔''[1]

اس کے بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی۔ یزید بن مُعاویہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔[2]

مسلمان حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق رات کی تاریکی میں ان کا جسدِ خاکی لے کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ قُسطنطینیہ کی فلک بوس فصیل کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں خاموشی سے وہاں دفنادیا۔ تدفین کے بعد ان کی قبر سے ایک روشنی کی لہر نکلی اور آسمان تک چلی گئی۔ یہ عجیب منظر رومی سپاہیوں نے بھی دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ اگلے دن ان کے سفیر نے آکر پوچھا: ''یہ کون شخص ہے جسے تم نے دفنایا ہے؟''

جواب ملا: ''ہمارے رسول کے صحابی ہیں۔'' شہید کی یہ کرامت دیکھ کر بہت سے رومی مسلمان ہوگئے۔[3]

رومیوں کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ایسی عقیدت ہوگئی کہ وہ صدیوں تک نہ صرف ان کی قبر کی تعظیم وتکریم کرتے رہے بلکہ قحط سالی کے موقع پر وہ یہاں آکر دعائیں بھی کرتے تھے۔[4]

مسلمان ایک مدت تک قُسطنطِینیّہ کا محاصرہ کیے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر یزید بن مُعاویہ نے لشکر سمیت واپسی اختیار کی۔[5]

ایشیائے کوچک کی اہم فتوحات:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے اس کے بعد بھی موسم سرما اور گرما میں روم کی سرحدوں پر لشکروں کی روانگی کا سلسلہ جاری رہا۔ سن ۵۳ ہجری میں حضرت عبدالرحمٰن بن ام الحکم، سن ۵۴ ہجری میں حضرت محمد بن مالک، سن ۵۶ ہجری میں حضرت مسعود بن ابی مسعود، سن ۵۷ ہجری میں حضرت عبداللہ بن قیس، سن ۵۸ ہجری میں حضرت مالک بن عبداللہ خثعمی اور سن ۵۹ ہجری میں حضرت عَمرو بن مُرہ المہری رحمہ اللہ نے ان مہمات کی قیادت کی۔[6]

ان مہمات میں ایشیائے کوچک کے بعض قلعے باقاعدہ فتح کرکے وہاں مسلمانوں کی سرحدی چوکیاں بھی قائم کی گئیں۔ ان میں ایشیائے کوچک کے ایک قدیم رومی قلعے ''قیسارِیہ'' (یہ شام والا قیساریہ نہیں) کا محاصرہ سات سال تک جاری رہا۔ یہاں ایک لاکھ رومی، ایک لاکھ یہودی اور تیس ہزار سامری قوم کے لوگ تھے، حضرت عمر بن تمیم اس محاذ پر تعینات تھے۔ سات سال گزر گئے اور مسلمان اس کی فتح سے مایوس ہوچکے تھے کہ امیر لشکر کو ایک خفیہ سرنگ کا سراغ مل گیا جس سے اونٹ سوار بھی گزر جاتا تھا۔

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۵۳/۱۱ ..... حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ اور ماقبل کی حدیث یزید کو ایک حد تک ''ارجاء'' (گناہوں کے معاف ہوجانے کی غیر معمولی امید) میں مبتلا کرنے کا سبب بنی اور اسی وجہ سے اس نے وہ بہت سے کام کرڈالے جن کی وجہ سے اس پر تنقید کی گئی۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ..... در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

② البدایۃ والنہایۃ: ۲۵۲/۱۱ ③ شرح سیر الکبیر للسرخسی: ۲۳۵/۱ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۲۵۴/۱۱

⑤ تاریخ ابن خلدون: ۱۱/۳ ⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط، سن ۵۳ ھ تا ۵۹ ھ، ص ۲۱۹ تا ۲۲۶

اس سرنگ سے اسلامی فوج اندر داخل ہوگئی۔ حضرت عمرو بن تمیم قلعے کے مینار پر چڑھ گئے اور اعلان کیا:

"سن لو اقیسار یہ فتح ہوگیا ہے۔" لوگوں نے یہ سن کر نے ہتھیار ڈال دیے اور یہاں اسلامی پرچم لہرایا گیا۔ ①

روما کی سرحدوں کا ایک اہم قلعہ "کَمَخ" حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے ایک برس پہلے سن ۵۹ ہجری میں زیر نگین کیا گیا۔ اس کی فتح میں حضرت عمیر بن حُباب نامی ایک مجاہد کا جانثارانہ کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ وہ تیروں اور پتھروں کی بارش میں تنہا قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے اور اکیلے رومیوں کو مار مار کے فصیل سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد باقی فوج قلعے میں داخل ہوگئی۔ ② ان لشکروں میں بڑے بڑے عالم اور قاری شرکت کرتے تھے اور جہاد کے دوران قرآن وحدیث پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ ③

بحیرۂ روم کے جزیروں پر قبضے کی مہمات:

قُسطَنطِینیہ پر حملے کی ناکامی سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اسے فتح کرنے کے لیے اردگرد کے سمندری راستوں اور اہم جزیروں پر تسلط ضروری ہے چنانچہ سن ۵۲ ہجری میں قُسطَنطِینیہ سے لشکر کی واپسی کے اگلے ہی سال سیدنا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بحیرۂ روم میں یورپی جزیروں پر قبضے کی تگ و دو شروع کردی۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شام کے ساحل کو ان بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا جائے جو ان جزائر سے مسلسل کیے جاتے تھے۔

یہ اسلامی بحری فوج جُنادہ بن اُمیہ رضی اللہ عنہ جیسے بے مثال جہازراں کے ماتحت تھی۔ انہوں نے حسبِ منصوبہ سب سے پہلے رومیوں کے مضبوط عسکری مرکز جزیرۂ روڈس پر حملہ کیا۔ ساٹھ مربع میل (۹۶ کلومیٹر) کا یہ سرسبز و شاداب جزیرہ ایشیائے کوچک (ترکی) کے جنوب مغرب میں ہے۔ یہاں انگور، زیتون اور دوسرے پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت جُنادہ بن امیہ رضی اللہ عنہ سن ۵۳ ہجری میں یہاں حملہ آور ہوئے اور اسے فتح کر کے یہاں مسلمانوں کی چھاؤنی قائم کی جو ایک بہت مستحکم قلعے میں تھی۔ مسلمان یہاں سے بحیرۂ روم میں یورپی بحری بیڑوں پر نگاہ رکھتے۔ ان کے جاسوس پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے جو انہیں دشمن کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ جوں ہی دشمن کا کوئی جہاز سمندر سے گزرتا مسلمان اس پر ٹوٹ پڑتے اور کمک اور رسد لوٹ لیتے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول:

"كَانُوا اَشَدَّ شَيْءٍ عَلَى الْكُفَّار." "یہ سپاہی کفار کے لیے سخت ترین لوگ تھے۔" ④

اگلے سال جُنادہ بن امیہ رضی اللہ عنہ نے ایک اور جزیرے "ارواڈ" کو بھی فتح کرلیا۔ یہاں جہاد کرنے والوں میں مشہور قاری حضرت مجاہد بن جَبر المُقرِی بھی شامل تھے۔ انہوں نے یہاں قرآنِ مجید کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے نامور شاگرد قاری تُبیع بن عامر (کعب احبارؒ کے سوتیلے بیٹے) نے یہیں ان سے تعلیم حاصل کی۔ ⑤

① معجم البلدان: ۳/ ۴۲۱، ۴۲۲ ② الکامل فی التاریخ، سن ۵۹ ھ
③ تاریخ دمشق: ۴۰/ ۴۳، ۴۷، ۴۷، بترجمۃ: عطیہ بن قیس؛ فتوح البلدان، ص ۲۳۳
④ البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/ ۲۵۹؛ فتوح البلدان، ص ۲۳۳، ط الھلال
⑤ فتوح البلدان، ص ۲۳۳؛ معجم البلدان: ۱/ ۱۶۲

سن ۵۵ ہجری میں حضرت جُنادہ بن امیہ رضی اللہ عنہ نے جزیرۂ اقریطش (کریٹ) پر حملہ کیا تاہم یہاں قبضہ نہ کر سکے۔[1] ان مہمات کے دوران قوصرہ نامی جزیرہ فتح ہوا جو سسلی اور مہدیہ کے درمیان واقع ہے۔ یزید بن شجرہ رضی اللہ عنہ ایسی ہی ایک بحری فوج کی قیادت کرتے ہوئے ۵۸ھ کے ایک خون ریز معرکے میں شہید ہوئے۔[2]

حضرت عمرو بن یزید جہنی بھی ایسی بعض مہمات میں قیادت کرتے رہے۔[3]

حضرت عمر فاروق اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما نے چین اور حبشہ پر حملہ کیوں نہ کیا؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق اور معاویہ رضی اللہ عنہما نے خراسان، ہندوستان، وسط ایشیا، افریقہ، بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک میں تو جہادی سرگرمیوں کا دائرہ خوب پھیلایا مگر مشرق میں ترکوں کے اصل وطن چین اور مغرب میں افریقہ کے جنوبی علاقے حبشہ وغیرہ پر فوج کشی نہ کی۔ اس کی ایک وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا:

اُتْرُكُوا التُّرْكَ مَاتَرَكُوْكُمْ. ''ترکوں کو نہ چھیڑنا جب تک وہ تمہیں نہ چھیڑیں۔''[4]

اس طرح ایک روایت میں ہے:

اُتْرُكُوا الْحَبَشَةَ مَاتَرَكُوْكُمْ. ''حبشہ والوں کو نہ چھیڑنا جب تک وہ تمہیں نہ چھیڑیں۔''[5]

دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتادیا گیا تھا کہ قیامت سے پہلے ان قوموں کے ہاتھوں مسلمانوں پر سخت مصائب ٹوٹیں گے اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاط اور شفقت کے طور پر بلاضرورت ان قوموں سے جنگ مول لینے سے بچنے کی وصیت فرمائی تھی۔ یہی وجہ تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سمتوں میں فوج کشی نہ کی۔

ان دونوں قوموں پر فوج کشی نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں خود روم سے جنگیں جاری تھیں، لہٰذا چین میں داخل ہونے یا وسطی وجنوبی افریقہ میں گھسنے کا مطلب یہ تھا کہ شمالی افریقہ اور بحیرۂ روم سے افواج کم کی جائیں جو یقیناً خطرناک ہوتا۔ اسی لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''ان دو اونگھتی ہوئی قوموں کو مت جگانا۔''[6]

اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بلاوجہ ایسے حریف سے جنگ چھیڑنا خلافِ حکمت ہے جس پر قابو پانا مشکل ہو۔

اہلِ شام کے جہاد کا ذکر حدیث میں

اہلِ شام کے جہاد اور فتوحات کی طرف احادیث میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ ایک دن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث سنا رہے تھے: ''میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر ثابت قدم رہے گی۔ ان کا ساتھ چھوڑنے والے یا مخالفت کرنے والے ان کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آن پہنچے گا اور وہ اس وقت لوگوں پر فتح یاب ہوں گے۔''

---

① فتوح البلدان، ص ۲۳۳، ط الهلال ؛ معجم البلدان: ۱/۱۲۲

② طبقات ابن سعد: ۷/۴۳۶ ؛ تاريخ دمشق: ۶۵/۲۲۴، ترجمة: يزيد بن شجرة

③ الكامل في التاريخ، سن ۵۹ھ

④ سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۰۲، كتاب الملاحم، باب النهي عن التهييج الترك والحبشة

⑤ سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۰۲

⑥ " لا تبعثوا الرابضين ". (معجم البلدان: ۲/۲۳)



یہ سن کر ایک صاحب حضرت مالک بن یُخامر نے فوراً کہا: ”حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے میں نے سنا کہ وہ لوگ شام والے ہوں گے۔“ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے۔[1]

کیا یہ لڑائیاں ڈاکہ زنی تھیں؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک مسلمانوں نے ہندوستان، افریقہ اور بحیرۂ روم میں جو جنگیں لڑی تھیں، ان میں سے اکثر کا مقصد شہروں اور علاقوں کو باقاعدہ فتح کرنا نہیں تھا بلکہ ان میں سے زیادہ تر چھاپہ مار کارروائیاں تھیں جن کا مقصد حریف طاقتوں پر رعب قائم رکھنا، ان کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہنا، ان کی سرزمین کے نشیب وفراز سے آگاہی حاصل کرنا اور مالِ غنیمت حاصل کرنا تھا۔ ایسی مہمات کا ثمرہ بعد میں مستقل اور کامل فتح کی شکل میں نصیب ہوتا تھا۔

مستشرقین ان کارروائیوں کو ڈاکہ زنی قرار دیتے ہیں، حالاں کہ یہ بالکل غلط تعبیر ہے۔ یہ دو قوموں کے درمیان باقاعدہ سیاسی، نظریاتی وتہذیبی اختلاف کی بناء پر برپا ہونے والی عسکری کش مکش تھی، جس میں ہر فریق (جب تک اس کا دوسرے سے کوئی معاہدہ نہ ہو) مدمقابل قوم کو زک پہنچانے کی پوری کوشش کرتا ہے، اگر مسلمان رومیوں، افریقیوں اور ہندوستانیوں کے علاقوں میں مداخلت کرتے تھے تو یہ قومیں بھی مسلسل اسلامی سرحدوں پر حملے کرتی رہتی تھیں۔

☆☆☆

بعض عجیب واقعات

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کے عجیب واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ یمن میں ایک صحابی حضرت عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ عنہ کا اونٹ کھو گیا۔ وہ اس کی تلاش میں کسی صحرا میں گھوم رہے تھے کہ اچانک سامنے ایک شہر کے آثار دکھائی دیے جو درحقیقت شَدّاد کی بنائی ہوئی مصنوعی جنت تھی۔ حضرت عبداللہ بن قلابہ نے وہاں سے کچھ مشک، زعفران اور موتی اٹھالیے، جب وہ واپس چلے تو وہ شہر اوجھل ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن قُلابہ رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے کیا۔ انہوں نے حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کو بلاکر ان سے اس عجوبے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولے: ”یہ ستونوں والے بادشاہ (شداد) کی بنائی ہوئی جنت ”اِرم“ تھی۔ آپ کے دور کا ایک پست قد سرخ رنگت والا آدمی جس کے گال اور ابرو پر تل ہوگا، اسے دیکھ پائے گا۔ وہ اپنے اونٹ کی تلاش میں نکلا ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹے تو حضرت عبداللہ بن قلابہ پر نظر پڑ گئی۔ فوراً بولے: ”اللہ کی قسم! یہ وہی شخص ہے۔“[2]

① مسند احمد، ح: ۱۶۹۳۲

② تفسیر قرطبی: ۴۷/۲۰، تفسیر الرازی، سورۃ الفجر ..... یہ روایت سند کے لحاظ سے کمزور ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”عبداللہ بن قلابہ غیر معروف ہیں اور سند کے ایک راوی ابن لہیعہ ہیں۔ (جو ضعیف ہیں)“ (فتح الباری: ۴۰۲/۸)

ا قیصر نے ایک بار اپنی سلطنت کے دو خاص افراد بھیجے: ان میں سے ایک روم کا سب سے قوی الہیکل پہلوان تھا اور دوسرا سب سے دراز قامت انسان۔ قیصر نے پیش کش کی اگر آپ ان سے زیادہ طاقتور اور زیادہ دراز قد آدمی اپنی مملکت سے پیش کر سکتے ہیں تو ٹھیک۔ ورنہ آپ کو ہم سے تین سالہ جنگ بندی کرنا ہوگی۔

جب دونوں افراد دِمَشق آئے تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے مقابلے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے سابق سالار قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو بلوالیا۔ حضرت محمد بن حنفیہ عربوں میں طاقتور ترین انسان شمار ہوتے تھے اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ قد و قامت میں یکتا تھے۔

پہلے رومی پہلوان اور حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے درمیان زور آزمائی ہوئی۔ طے شدہ طریقے کے مطابق حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ فرش پر بیٹھ گئے۔ رومی پہلوان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کرنے کے لیے زور لگایا، مگر پوری طاقت آزما کر بھی وہ انہیں نہ ہلا سکا۔ اب حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کھڑے ہوئے۔ رومی بیٹھ گیا۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچا تو وہ اچھل کر دور جا گرا۔

اس کے بعد رومی لمبے آدمی اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے قد و قامت کی پیمائش کی گئی۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا قد اُس سے زیادہ نکلا۔ اس طرح قیصر کی جنگ بندی کی پیش کش مسترد ہوگئی۔ [1]

☆☆☆

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۳۶۰، ۳۶۱، تر: قیس بن سعد

④ امن وامان کا قیام اور عدل وانصاف کی فراہمی

پائیدار امن وامان کا قیام حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا چوتھا بڑا ہدف تھا، جسے پورا کرنے کے لیے رعایا کو عدل وانصاف فراہم کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس معاملے میں اتنے حساس تھے کہ وہ اپنی اور اپنے امراء کی مصلحتوں، ضرورتوں اور بعض اوقات عزت ومرتبے کو بھی نظر انداز کر کے عدل کے تقاضے پورے کرتے رہے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مدینہ منورہ میں کچھ زمین تھی اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے استحقاق کا دعویٰ کر دیا۔ اس سلسلے میں وہ دمشق جا کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے ملے۔ آپ نے ان کا دعویٰ سن کر بڑی خوش دلی سے فرمایا: ''اس بارے میں فُضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ (قاضی شہر) جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہوگا۔''

فُضالہ رضی اللہ عنہ نے فریقین کے بیانات سن کر حضرت عبدالرحمٰن کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خوشی سے قبول کیا اور اپنی زمین سے دستبردار ہو گئے۔[1]

مدینہ طیبہ کے گورنر مروان بن حکم نے حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے بیٹے کی تنخواہ اس لیے بند کر دی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالف تحریک سے متاثر رہے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو مروان کو لکھا:

''تم نے صہیب رضی اللہ عنہ کے بیٹے کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے معاملہ تو یاد رکھا مگر اس کے باپ کا نبی کریم ﷺ سے تعلق بھول گئے۔ صہیب کے فرزند کی تنخواہ جاری کرو۔ اس کی عزت کرو اور اچھا سلوک برتو۔''[2]

عدل وانصاف کا سایہ ہر شہری کے لیے عام تھا، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ دمشق میں عیسائیوں کا ایک گرجا مسجد سے ملا ہوا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مسجد کی توسیع کے لیے گرجا لینا چاہتے تھے مگر نصرانیوں نے اسے دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی سختی نہ کی اور ان کی مرضی کے خلاف مسجد کی توسیع نہ کرائی۔[3]

عدل وانصاف کی بالادستی کے لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے بڑے نامور صحابہ کرام کو جو علم وفقاہت، زہد وتقویٰ اور حکمت وتدبر میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ حق گوئی میں بھی نمایاں تھے، مختلف شہروں میں قاضی مقرر کیا۔ دارالخلافہ دمشق میں حضرت فُضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے۔[4]

---

① انساب الاشراف، بلاذری: ۵/ ۱۳۲، ط دار الفکر

② انساب الاشراف، بلاذری: ۵/ ۱۰۸، ط دار الفکر

③ فتوح البلدان، ص ۱۲۹، ط الهلال

④ اسد الغابۃ: ۴/ ۳۴۶، ط العلمیۃ

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں اور حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ بصرہ میں قاضی مقرر تھے۔ کوفہ میں قاضی حضرت شُریح رحمہ اللہ تھے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے اس منصب پر چلے آرہے تھے۔[1]

افسران کا محاسبہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں گورنروں اور قاضیوں سمیت اعلیٰ عہدیداروں کی کارکردگی کی جانچ پڑتال کا جو نظام قائم کیا گیا تھا، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اسی طرح برقرار رکھا، آپ بڑی باریک بینی سے اپنے ماتحتوں کا احتساب کیا کرتے تھے۔

اکثر عہدیدار بذاتِ خود نیک اور متقی تھے، لہٰذا انہیں آخرت میں جوابدہی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ایک بار فلسطین کے ایک افسر حضرت ابوراشد الازدی رحمہ اللہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔ آپ ان کا محاسبہ کرنے لگے اور بعض معاملات کی پوچھ گچھ کی۔ ابوراشد رو پڑے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا: ''مجھے قیامت کی باز پرس یاد آگئی ہے۔''[2] ایسے عادل خلیفہ اور ایسے خداترس افسران کے ہوتے ہوئے مملکت میں عدل وانصاف اور امن وامان کا دور دورہ بھلا کیوں نہ ہوتا۔

محکمہ شرطہ (پولیس)

امن وامان کو یقینی بنانے کے لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے محکمہ شرطہ (پولیس) کو جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوا تھا، مزید بہتر بنایا، چنانچہ خراسان سے مصر تک چور چکاری، ڈاکے اور بدامنی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ محکمہ پولیس کی نگرانی پہلے حضرت یزید بن حرہ، پھر حضرت قیس بن حمزہ اور پھر حضرت ذہل بن عَمرو کے سپرد رہی۔[3]

ضمیر کی آزادی

عدل وانصاف کی اس بہار کے باعث ہر طرف امن وامان تھا۔ لوگوں پر کوئی جبر وتشدد نہ تھا بلکہ انہیں خوشگوار اور محفوظ ماحول دیا گیا تھا جس میں ہر شخص کو اپنے مسائل بتانے، ضمیر کی آواز بلند کرنے اور رائے دینے کی اجازت تھی۔

ایک بار حاکم مدینہ مروان بن حکم نے مسجد نبوی میں حاضرین کو بتایا کہ اس بار آپ کی تنخواہوں اور عطیات کی رقم کچھ کم ہے مگر حضرت مُعاویہ کا حکم ہے کہ ہر صورت میں سب کو پوری پوری ادائیگی کی جائے۔ اس لیے یمن کے محصولات کی رقم سے یہ کمی پوری کردی جائے گی۔ یہ سن کر لوگوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا: ''وہ رقم یمن والوں ہی کا حق ہے۔ حضرت مُعاویہ سے کہیں کہ وہ ہمیں جزیے کی رقم سے یہ کمی پوری کر کے دیں۔''

مروان نے یہ رائے مان لی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچادی۔ انہوں نے بقیہ رقم کا انتظام کر دیا۔[4]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۲۷، ۲۲۸

② الاصابۃ: ۲۷۹/۳، تحت عبدالرحمن بن عبد

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۲۸

④ کتاب الاموال للقاسم بن سلام، ص ۳۳۰، ط دار الفکر

⑤ ملکی انتظامات کو بہتر اور جدید شکل دینا

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا پانچواں بڑا ہدف ملکی انتظامات کو بہتر اور جدید شکل دینا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا ذہن نہایت زرخیز تھا۔ آپ انتظامی امور میں ضروریات کے مطابق مفید اور بہتر اضافے کرتے اور جدتیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان نئے انتظامات کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

دیوان الخاتم: سرکاری تحریروں کی حفاظت کا محکمہ

اس سے پہلے سرکاری خطوط اور حکم نامے کھلے ورق کی شکل میں روانہ کیے جاتے تھے۔ ان میں تحریر کے نیچے خلیفہ یا امیر کی مہر کا ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو ایک لاکھ درہم یا دینار وصول کرنے کا رقعہ لکھ کر دیا۔ اس نے رقعے کی تحریر بدل کر سرکاری دفتر سے دو لاکھ وصول کر لیے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب حساب آیا تو آپ نے تحقیق کرائی۔ معلوم ہوا کہ اصل تحریر میں تبدیلی کر کے ایک کی جگہ دو لاکھ وصول کر لیے گئے۔ تب آپ نے آیندہ ایسی جعل سازی کے سدباب کے لیے ایک نیا طریقہ کار وضع کیا، جس کے تحت ہر سرکاری تحریر یا حکم نامے کو مہر بند لفافے میں (سیل کرا کے) بھیجا جانے لگا۔ جس دفتر میں سرکاری حکم ناموں کو سیل کیا جاتا تھا اسے "دیوان الخاتم" کا نام دیا گیا۔[1] اس دفتر کے انچارج حضرت عبداللہ بن عُمر وحمیری تھے۔[2]

حراسہ: سیکورٹی کا محکمہ

اس سے پہلے خلفاء کی حفاظت کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں ہوا کرتا تھا۔ دشمنوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی پہرہ نہ ہونے کی وجہ سے حملے میں زخمی ہوئے تھے۔ خود حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس قسم کی وارداتوں سے پورے عالم اسلام کی چولیں ہل جایا کرتی تھیں۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مزید نقصانات سے بچنے کے لیے نجی محافظ دستے (سیکورٹی، باڈی گارڈز) کا شعبہ قائم کیا، جس کا سربراہ حضرت ابو مخارق کو مقرر کیا۔[3] بعد میں ہر خلیفہ اور بادشاہ نے اس شعبے کو اپنے نظام کا حصہ بنایا۔

امیر اور قائد کی حفاظت کا انتظام خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ جنگِ بدر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۱۵۳، ط نزار

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۲۸　③ البدایۃ والنہایۃ: ۶۶۵/۱۱

بعض موقعوں پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے حفاظتی سپاہیوں کے طور پر موجود رہے تھے۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ انتظام سنت کے عین مطابق تھا۔

حجابہ...... خلیفہ سے ملاقات کا وقت دینے کی ذمہ داری

گزشتہ ادوار میں ہر شخص جب موقع پاتا خلیفہ سے مل لیا کرتا تھا۔ ان میں معمولی ضرورتوں والے لوگ بھی کرتے تھے اور وقت ضائع کرنے والے بھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وقت کی حفاظت اور نظام کی بہتری کے لیے ایک نئی ترتیب بنائی جس کے تحت لوگوں کو خلیفہ سے خصوصی ملاقات کے لیے اجازت اور وقت لینا ضروری قرار دیا گیا۔ اس کام کے ذمہ دار افسر کو حاجب اور اس انتظام کو ''حجابۃ'' کہا جاتا تھا۔ [1]

ترقیاتی وتعمیراتی کارنامے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی ملک کے استحکام ودفاع کے لیے ترقیاتی کام کرائے۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور کئی نئے قلعے بنوائے۔ شام کے ساحل پر خاص توجہ دی۔ ساحلِ شام پر رومیوں کے ایک شدہ قلعے ''جَبلہ'' کو آپ نے از سرِ نو تعمیر کرا کے فوج کا بڑا مرکز بنا دیا۔ ''لاذِقِیّہ'' اور ''اَنطر طُوس'' کو شہروں کی شکل آباد کرایا۔ [2] آپ کے دور میں مَرعَش کا قلعہ تعمیر ہوا جو مضبوطی میں ضرب المثل تھا۔ [3] ''مَرقِیّہ'' اور ''بُلُنیاس'' آبادی بھی آپ کا کارنامہ ہے۔ [4] آپ کی منظوری سے افریقہ میں قَیرَوان کا مرکزی عسکری شہر بسایا گیا۔ [5]

آپ سے پہلے جہاز سازی کے کارخانے صرف مصر میں تھے، آپ نے سن ۴۹ ہجری میں شام میں نئے کارخانے قائم کرنے کا حکم دیا، چنانچہ دور دراز سے انجینئر، کاری گر اور بڑھئی جمع کیے گئے اور اُردن کے ساحل عکا پر جہاز سازی کا کام زور و شور سے شروع ہوا۔ [6]

مصر میں آپ کے گورنر حضرت مَسلَمہ بن مُخَلَّد انصاری رضی اللہ عنہ نے (جو سن ۵۳ ہجری میں اس عہدے پر فائز ہو۔) بھرپور ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا اور فُسطاطِ مصر کو ایک نہایت بارونق اور خوبصورت خطہ بنا دیا جس میں مساجد مؤذنوں کی کثرت کی وجہ سے اذانوں کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ [7]

حضرت عطاء بن سائب نے خراسان کے قدیم شہر بلخ کی نہروں پر تین پل تعمیر کیے جو ''قناطرِ عطا'' کے نام مشہور ہوئے۔ [8]

---

① البدایة والنهایة: ۱۱/۳۶۵
② فتوح البلدان، ص ۱۳۵، ط الهلال ، معجم البلدان: ۱/ ۲۷۰
③ فتوح البلدان، ص ۱۸۸، ط الهلال
④ فتوح البلدان، ص ۱۳۵، ط الهلال
⑤ معجم البلدان: ۴/ ۴۲۰
⑥ فتوح البلدان، ص ۱۲۰، ط الهلال
⑦ معجم البلدان: ۴/ ۲۶۵ ⑧ فتوح البلدان، ص ۳۹۶، ط الهلال

عالمِ اسلام کے بعض شہروں میں کچھ جنگجو قومیں اور جماعتیں ایسی تھیں جو اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ان کی نشانہ بازی اور حربی صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور ان کی بہتر خبر گیری کے لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو دوسرے علاقوں میں منتقل کر دیا۔ اس اقدام کا ایک مقصد ان قوموں کے کچھ شر پسندوں پر نظر رکھنا بھی تھا۔ اسی سلسلے میں ''زَط'' (جٹ) اور ''سیابجی'' قوموں کے بہت سے لوگوں کو ''انطاکیہ'' اور آس پاس کے دیگر ساحلی شہروں میں لا کر بسایا گیا۔[1]

بَعلَبک، حِمص اور انطاکیہ میں آباد فارسی النسل لوگوں کو اردن کے ساحلوں: صُور اور عَکا پر لا کر آباد کر دیا گیا۔ بصرہ اور کوفہ کے عجمی تیر اندازوں اور بَعلَبک، اور حِمص کے فارسیوں کو انطاکیہ شہر میں بھیج دیا گیا۔ کچھ مصری لوگوں کو بھی ان ساحلوں پر منتقل کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے ساحلوں پر یورپی افواج کے حملوں کے وقت زبردست کارنامے دکھائے۔[2]

☆☆☆

---

① فتوح البلدان، ص ۱۶۲، ط الهلال

② فتوح البلدان، ص ۱۲۰، ۱۶۲، ط الهلال

⑥ بغاوتوں اور سازشوں کی سرکوبی

فتوحات اور ملکی انتظامات کے ساتھ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اندرونی سازشوں سے بھی پالا پڑا۔ ان فتنوں کی سرکوبی آپ کے اہداف میں اہم حیثیت رکھتی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے تمام شورشوں اور سازشوں پر بڑی خوبی کے ساتھ قابو پایا۔ شورش پسند عناصر تقریباً وہی تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف متحرک ہوئے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کے اتفاقِ رائے سے خلیفہ مقرر ہوئے تھے اس لیے حجاز، شام، مصر اور دیگر شہروں سمیت سارے عالمِ اسلام میں امن وامان اور سکون تھا، تاہم عراق کے دونوں بڑے شہر: کوفہ اور بصرہ بظاہر پُر امن ہونے کے باوجود ابھی تک باغی جماعتوں کے خفیہ کارکنوں کی آماجگاہ تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی ان دونوں شہروں پر خاص نگاہ تھی اور وہاں امن وامان کے قیام کو آپ عالمِ اسلام کی مشرقی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ نے وہاں باغیوں کو بالکل پنپنے نہ دیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پہلے کوفہ اور پھر بصرہ کے باغی گروہ اپنی طاقت کے ساتھ منظرِ عام پر آگئے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے پوری مستعدی سے ان دونوں شہروں کو فتنوں کا مرکز بننے سے بچایا جس کی تفصیل پیشِ خدمت ہے:

کوفہ میں خوارج کی بغاوتیں

سب سے پہلے کوفہ میں خارجی گروہ نے بدامنی کی۔ یہ گروہ چپکے چپکے رکن سازی کے ذریعے سینکڑوں افراد جمع کر چکا تھا چنانچہ ان کے کئی سردار یکے بعد دیگرے سرکاری افواج سے لڑنے نکلے۔ کئی خونریز جنگیں ہوئیں جن میں خوارج کے نامور سردار فَروَہ بن نوفل، عبداللہ بن ابی الحَوساء اور حَوثَرہ بن ذِراع مارے گئے۔ مگر یہ لوگ ایک سردار کے مرتے ہی دوسرے کو امیر بنا کر پھر برسرِ پیکار ہو جاتے۔

ان کی بڑھتی ہوئی شورش دیکھ کر آخر کار حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مشہور صحابی حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجا جن کی شجاعت، فراست اور سیاست کو سارا عرب مانتا تھا۔ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمت اور تدبیر کے ساتھ خوارج کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔ خوارج شَبیب بن بَجرہ[1]، معین بن عبداللہ، ابومریم اور ابولیلیٰ جیسے سرداروں کی قیادت میں جمع ہو ہو کر ٹکرائے مگر آخر کار ایک سال کے اندر اندر ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ تتر بتر ہو گئے۔

① نوٹ: یہ شبیب وہی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملے میں ابن مُلجم کے ساتھ تھا، اس وقت یہ روپوش ہو گیا تھا مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں باغی بن گیا۔ (الکامل فی التاریخ: ۱۱/۳) آخر ۴۹ھ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مقابلے میں کوفہ کے قلعہ گودام کے پاس مارا گیا۔ (تاریخ خلیفہ، ص ۲۰۹)

دو سال بعد سن ۴۳ ہجری میں خارجی گروہ مُستَوِرد بن علقمہ نامی سردار کی قیادت میں پھر منظم ہوگیا۔ مستورد نے طے کیا کہ یکم شوال ۴۳ ہجری کو جب شہر کے لوگ نمازِ عید کے لیے باہر جائیں تو اچانک حملہ کر کے شہر پر قبضہ کرلیا جائے مگر حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو بروقت یہ اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اس گھر پر جو سازش کا مرکز تھا، چھاپہ مارا۔ مُستَوِرد فرار ہوگیا۔ اس کی جماعت کے کچھ اہم لوگ پکڑے گئے۔ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ کوفہ والوں میں اب بھی خارجیت اور سبائیت کے اثرات موجود ہیں اور انہی میں سے کچھ لوگوں کی خفیہ حمایت سے شورش پسند لوگ پنپ رہے ہیں۔ ایسے لوگ حکمرانوں کی نرمی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور عوام کے لیے مصائب کا باعث بنتے ہیں۔ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ خون ریزی کے بغیر یہ فتنہ ختم ہوجائے اور شر پسند لوگ باز آجائیں۔

حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:

''لوگو! میں تمہارے لیے امن پسند کرتا ہوں، تکالیف اور مصائب سے تمہیں بچانا چاہتا ہوں مگر مجھے خطرہ ہے کہ میرے سلوک سے شر پسند لوگ بگڑ نہ جائیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں جاہلوں کے ساتھ شریف اور بھلے مانس بھی میری گرفت میں نہ آجائیں، لہٰذا اس سے پہلے کہ تمہارے خلاف کوئی عام کارروائی کرنی پڑے، تم اپنے جاہلوں کو روک لو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ جہالت اور منافقت کا بیج بو رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! ایسے لوگ چاہے عرب کے کسی قبیلے میں بھی ہوں میں انہیں مار ڈالوں گا اور انہیں بعد والوں کے لیے عبرت کا نمونہ بنادوں گا۔''

اس دھمکی سے لوگ ڈر گئے اور ان کے سرداروں نے اپنے اپنے قبیلوں کی ضمانت دی کہ وہ کسی بغاوت کا حصہ نہیں بنیں گے۔ اس وعدے کے مطابق جب سرداروں نے اپنے ماتحت لوگوں کو باغی ذہنیت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو خارجیوں کی دال گلنا بند ہوگئی۔ ان کا امیر مُستَوِرد اپنے خاص حامیوں کو لے کر علاقے سے دور نکل گیا۔

حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے لیے اب مناسب موقع تھا۔ انہوں نے مَعقِل بن قیس رحمہ اللہ کو اس کے تعاقب میں بھیج دیا۔ کئی خون ریز لڑائیوں کے بعد آخر کار خارجیوں کی بڑی تعداد ماری گئی۔ آخری جھڑپ میں مُستَوِرد نے آواز لگا کر مَعقِل بن قیس کو طاقت آزمائی کی دعوت دی۔ وہ شمشیر سونت کر نکلے۔ مُستَوِرد نے مَعقِل رحمہ اللہ کو نیزہ گھونپ کر شہید کردیا مگر گرنے سے پہلے مَعقِل رحمہ اللہ اپنی تلوار مُستَوِرد کی کھوپڑی میں اتار چکے تھے۔ مُستَوِرد کی موت کے ساتھ ہی خارجی شکستِ فاش کھا کر منتشر ہوگئے اور عراق کا امن وامان بحال ہوگیا۔ [1]

سبائی ٹولے کی سرگرمیاں

اندرونی شورشوں میں خارجی تو بالکل ناکام رہے، کیوں کہ ان کا طریقہ کار سازشی نہیں، کھلم کھلا انقلابی تھا، پہلے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں یکدم اُٹھے اور مارے گئے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی چند لڑائیوں کے بعد ان کا زور ٹوٹ گیا، مگر سبائی ٹولہ جو زیر زمین سازشوں کا عادی تھا، اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ الطبری: ۱۶۵/۵، ۱۶۶، ۱۷۳ تا ۱۷۹، ۱۸۱ تا ۲۱۰

کے زمانے میں ان لوگوں نے تقریباً دس برس تک زیرِ زمین سرگرمیاں جاری رکھیں۔اس دوران ان کا بڑا ہدف یہی تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، ان کے نائبین اوران کے خصوصی رفقاء کو جھوٹے الزامات کے ذریعے بدنام کیا جائے۔

یہ بالکل وہی طریقۂ واردات تھا جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنایا گیا تھا۔ یہاں بھی بعض حقیقی واقعات کو زہریلے اضافوں سے آلودہ کیا گیا۔بعض جعلی قصے گھڑے گئے۔ بعد میں انہی جعلی روایات کو اس گروہ کے اہلِ قلم نے تاریخ میں شامل کردیا۔

بصرہ اور کوفہ میں زیاد بن ابی سفیان کا تقرر

زیاد طائف کی ایک لونڈی سُمَیّہ کا بیٹا تھا۔اس کے والد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے مگر انہوں نے سُمَیّہ سے خفیہ نکاح کیا تھا، اس لیے یہ بات مشہور نہ تھی۔ بہرحال زیاد بن ابی سفیان حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا باپ شریک بھائی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اس کی عمر دس، گیارہ برس تھی، تاہم اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف ملنا ثابت نہیں لہٰذا اس کو صحابی شمار نہیں کیا جاتا۔ ذہانت، عقل وفہم، حسنِ انتظام، قوتِ فیصلہ، زورِ خطابت، انشاء پردازی اور ہمت و جوانمردی میں وہ ممتاز تھا۔ دفتری امور، خط وکتابت اور حساب وکتاب کا ماہر تھا، نوجوانی کا زمانہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کی خدمت میں گزارا اور ان کا کاتب (سیکرٹری) رہا۔[1] سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو بصرہ کا محصلِ زکوٰۃ بنایا، جہاں سے سرحدی علاقوں: شمالی وجنوبی افغانستان اور خراسان کی نگرانی کی جاتی تھی۔[2]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کے دنوں میں یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اوران کی جانب سے فارس کا گورنر رہا۔ زیاد کی کوششوں سے وہاں باغیانہ سرگرمیاں تھم گئیں اور امن وامان ہوگیا[3]۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب خلافت حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تو زیاد ایک سال تک فارس کے کسی قلعے میں محصور رہا اور بیعت نہ کی۔ ایک سال تک توقف کے بعد زیاد نے اظہارِ اطاعت کیا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام چلا آیا۔[4]

زیاد کی اصلاحات اور کارنامے:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۵ھ میں اسے بصرہ کا گورنر بنادیا۔اس وقت بصرہ کی انتظامی صورتِ حال غیر مستحکم تھی، زیاد نے حاکم بن کر کے یہاں کا نظم ونسق قابلِ رشک بنادیا۔خراسان کو چار ضلعوں میں تقسیم کر کے الگ الگ نائب مقرر کیے۔[5]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۴۹۶/۳، ۴۹۷، ط الرسالۃ

[2] الاصابۃ: ۵۲۸/۲ ، تھذیب الاسماء واللغات للنووی: ۱۹۹/۱، ط العلمیۃ

[3] تاریخ الطبری: ۱۳۷/۵، ۱۳۸

[4] تاریخ الطبری: ۱۶۷/۵ تا ۱۶۸

[5] تاریخ الطبری: ۲۱۶/۵، ۲۱۷

اس نے خبر رسانی کا نظام تیز ترین بنا دیا۔ بصرہ چونکہ خوارج اور سبائیوں کا مرکز رہا تھا جواب بھی زیرِ زمین موجود تھے اور ان کی شورش کا خطرہ تھا، اس لیے زیاد نے رات کا کرفیو نافذ کر دیا جو عشاء کی نماز کے دو گھنٹے بعد سے فجر تک جاری رہتا۔ اس دوران لوگوں کے باہر نکلنے پر سخت پابندی تھی۔ اس سے علاقے میں اتنا امن ہو گیا کہ کسی کی کوئی چیز راستے میں گر جاتی تو مدت تک کوئی نہ اٹھاتا۔ تنہا خاتون رات کو گھر کی کنڈی لگائے بغیر بے فکری سے سو جاتی۔ زیاد کا کہنا تھا کہ خراسان میں کسی کی رسی بھی گم جائے تو میں پتا لگا سکتا ہوں کس نے اٹھائی ہے۔

زیاد نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اعلیٰ مناصب دیے۔ حضرت عمران بن حُصَین، حضرت انس بن مالک، حضرت حکم بن عمرو، حضرت سَمُرَہ بن جندب اور حضرت عبدالرحمٰن بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہم کو کلیدی عہدوں پر مقرر کیا۔ شہر کے نظم و نسق کے لیے چار ہزار پولیس بھرتی کی۔ سرکاری محافظ پانچ سو رکھے۔ یوں بصرہ میں مکمل امن ہو گیا۔ [1]

سن ۵۰ ھ میں کوفہ کے گورنر حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو بصرہ کے ساتھ ساتھ کوفہ کا گورنر بھی بنا دیا۔ اس طرح پہلی بار کسی امیر کو ان دو شہروں کی ولایت ایک ساتھ ملی۔ زیاد نے بیک وقت ان دونوں اہم شہروں کے انتظامات اس طرح سنبھالے کہ موسم سرما بصرہ میں گزرتا اور گرما کوفہ میں۔ [2]



---

① تاریخ الطبری: ۲۲۲/۵، ۲۲۳

② تاریخ الطبری: ۲۳۴/۵




خلافتِ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دو اہم سیاسی قضیے

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں دو ایسے اہم سیاسی قضیے پیش آئے جن کی وجہ سے بہت سے لوگ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو طرح طرح کے الزامات دیتے ہیں:

① حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا قضیہ

② یزید کی ولی عہدی

عموماً ان قضیوں کو بالکل یک طرفہ طور پر دیکھا جاتا ہے۔ حالاں کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ تمام روایات اور تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان واقعات کو پڑھا اور دیکھا بھالا جائے تا کہ ان واقعات کی صحیح صورت حال سامنے آ سکے۔ اگلی سطور میں ہم ان دونوں قضیوں کو انصاف اور احتیاط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

① حُجر بن عدی رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کا قضیہ

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی کا سب سے کٹھن، صبر آزما اور اعصاب شکن امتحان کوفہ کے بعض ایسے بزرگوں کی مرکز گریزی کی شکل میں سامنے آیا جنہیں صحبتِ نبوی کا شرف بھی حاصل تھا۔ ان میں حضرت عَمر و بن حَمِق رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوانی کا لطف اٹھاتے رہنے کی دُعا دی تھی لہٰذا بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر بھی وہ جوان دکھائی دیتے تھے۔[1] ان کے رئیس حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ تھے جو علم و فضل اور زہد و عبادت میں ممتاز تھے۔ صحابہ کرام کے حلقے میں ان کا غیر معمولی احترام تھا۔[2] سازشی گروہ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر یہ حضرات کوفہ میں بدامنی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس کے ردِعمل میں کوفہ کے گورنر زیاد نے حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو ان کے کئی ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے کوفہ سے دِمَشق بھیج دیا۔ حضرت عَمر و بن الحَمِق رضی اللہ عنہ فرار ہو کر موصل کے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے تھے، جہاں سانپ کے ڈسنے سے ان کی وفات ہو گئی تھی۔ حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ گرفتار کر کے دارالخلافہ دِمَشق لے جائے گئے اور وہاں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے بغاوت کے الزام میں انہیں ان کے سات ساتھیوں سمیت سزائے موت دے دی گئی۔ یہ واقعہ سن ۵۱ ہجری کا ہے۔ صحابہ کرام اور اکابرِ امت کو اس واقعے پر شدید رنج ہوا تھا۔

جہاں تک اس سانحے کے اسباب و علل اور دیگر تفصیلات کا تعلق ہے ان کا بیشتر حصہ ضعیف راویوں سے منقول ہے۔ طبری میں ''ذکر مقتل حُجر بن عدی و اصحابه'' کے عنوان سے پچیس، تیس صفحات کا مواد موجود ہے۔ جس میں سے چند سطروں کے سوا سارا واقعہ ابو مخنف سے مروی ہے۔ ان روایات میں واقعے کو یکطرفہ شکل میں پیش کیا گیا ہے جسے پڑھ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف شدید جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

① معرفة الصحابة: ۲۰۰۶/۴ ؛ الاصابة: ۵۱۴/۴

② الاستیعاب: ۳۲۹/۱ ؛ اسد الغابه: ۶۹۷/۱ ؛ الاصابة: ۳۷/۲، حضرت حُجر بن عدی کو اکثر علماء نے صحابی کہا ہے اور بعض نے تابعی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا بیان ہے: ''ابن سعد اور حاکم نے مُصعَب الزبیری سے نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ اپنے بھائی ہانی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد بن کر حاضر ہوئے تھے۔ پھر لکھتے ہیں: ''امام بخاری، ابن ابی حاتم، خلیفہ بن خیاط اور ابن حبان نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے۔'' (الاصابہ: ۳۲/۲، ۳۳، ط العلمیۃ)
علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: كان حجر من فضلاء الصحابة. (الاستیعاب: ۴۶۲/۳) حافظ ذہبی فرماتے ہیں: له صحبة و وفادة. (سیر اعلام النبلاء: ۴۶۳/۳) یہی علامہ ابن اثیر کا کہنا ہے۔ (اسد الغابۃ: ۶۹۷/۱) بلاشبہ وہ دورِ صحابہ کی ایک جلیل القدر عالم، فاضل ہستی تھے جن کا وسیع حلقۂ اثر تھا۔ ان سے احادیث بھی منقول ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ہیں۔ ایک حدیث مرفوع بھی منقول ہے۔ (الاصابہ: ۳۳/۲، بیروت)
افسوس کہ بعض متشدد حضرات نے انہیں فتنہ، بدمعاش اور شریر قرار دے دیا ہے، صرف اس لیے کہ وہ امویوں کے مخالف تھے۔ ہم نے حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے قول کو راجح سمجھتے ہوئے حُجر بن عدی کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا ہے، اگرچہ تابعی ہونے کا قول بھی اپنی جگہ وزن رکھتا ہے۔ بہرکیف اس اختلاف سے قطع نظر، چاہے وہ صحابی ہوں یا تابعی، بہر صورت ایک جلیل القدر ہستی تھے۔ ان کی کردار کشی کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔

یہ روایات بتاتی ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو بالکل ناجائز اور ظالمانہ طور پر قتل کرایا تھا۔ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کا قصور بس یہ تھا کہ وہ منبر پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنروں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ''سب وشتم'' کرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی طرح ابن زیاد خطبے کو طویل کر کے نماز میں تاخیر کرتا تھا جس پر حضرت حجر رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا تھا۔ ان حرکات پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ان کے ساتھیوں سمیت قتل کرادیا جو ایک ظلمِ عظیم تھا۔

یہ ابومخنف کی روایات کا خلاصہ ہے۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبے کے اعتراف کے ساتھ ساتھ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے موقف کو بھی سمجھنا چاہیے۔

حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہم یہی حسن ظن رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا دینی اور شرعی فریضہ سمجھ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عمال کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ دوسری طرف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ہم اس کے سوا کچھ اور نہیں سوچ سکتے کہ انہوں نے شرعی اور قومی ذمہ داری سمجھتے ہوئے حضرت حجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو سزا دی تھی۔

ضعیف روایات اس واقعے کی ابتدا اور اس کے سبب کا ذِکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنروں کے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کے نتیجے میں یہ فتنہ پیدا ہوا۔ صحیح اور حسن روایات اس کی نفی کرتی ہیں۔ اصل حالات کیا تھے؟ آیئے! دستیاب تاریخی مواد کی روشنی میں ان کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیتے ہیں:

① واقعے کا پسِ منظر

کوفہ میں حکومت مخالف گروہ کے کارندے حاشیہ بردار بن کر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو ایک مدت سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکام کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ فطری بات ہے کہ کسی خاص مکتبِ فکر کے حلقے میں رہنے اور یک طرفہ باتیں سننے والوں کو اصل حقائق اور صحیح حالات کا پورا علم نہیں ہوسکتا۔ حضرت حجر رضی اللہ عنہ ایسے ہی بزرگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مبالغہ آمیز محبت رکھنے والے گروہ ''شیعانِ علی'' کے زیرِ اثر چلے آرہے تھے۔ یہ گروہ بنو ہاشم کی جگہ بنوامیہ کا اقتدار گوارا نہیں کرتا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت حجر کے گرد شیعانِ علی کی کئی جماعتیں لپٹی ہوئی تھیں، یہ لوگ انہیں تقویت دے رہے تھے اور ان کے ہاتھوں حالات میں شدت پیدا کر رہے تھے، یہ لوگ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے اور ان سے بے زاری کا اظہار کرتے تھے۔''[1]

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ حضرت حجر رضی اللہ عنہ لاشعوری طور پر دوسروں کے ہاتھوں استعمال ہو رہے تھے۔

② صلح سے بے زاری

اسی گروہ کے بھڑکانے کی وجہ سے حضرت حجر رضی اللہ عنہ شروع سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۲۳۰



سے بےزار تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے تاثرات یہ تھے:

''رسول اللہ کے بیٹے! کاش! میں یہ دیکھنے سے پہلے مرگیا ہوتا۔ آپ ہمیں عدل سے نکال کر ظلم میں لے آئے۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت حجر رضی اللہ عنہ کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

''میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ صلح کے خواہش مند ہیں اور جنگ سے بےزار ہیں۔ میں انہیں ان کی ناپسندیدہ چیز پر اُبھارنا اچھا نہیں سمجھتا۔''

حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ یہاں سے مایوس ہوکر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تھے اور انہیں بھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کی اور کوفہ میں اپنے حامیوں کی طرف سے مکمل عسکری تعاون کا یقین دلایا تھا مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ان کی سوچ سے بےزار تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

''ہم (حضرت مُعاویہ سے) بیعت کرچکے ہیں۔ عہد و پیمان ہوچکا ہے، اسے توڑنے کی کوئی گنجائش نہیں۔''[1]

غرض حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے عہد و پیمان توڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس لیے اس گروہ کے لوگ ان حضرات سے بھی بددل ہوگئے اور ان میں سے بعض منہ پھٹ لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ''یامذل المؤمنین!'' (اہلِ ایمان کو ذلیل کرنے والا) تک کہہ کر پکارا۔[2]

۳ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مکاتبت

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات تک اس گروہ کو کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی، مگر سن ۴۹ یا ۵۰ ہجری میں جونہی وہ دنیا سے رخصت ہوئے، سازشی گروہ ''حبِ علی'' کے نام سے ایک بار پھر پرپرزے نکالنے لگا۔ حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ جیسے چند بزرگوں کو وہ ایک بار پھر استعمال کرنے لگے۔ یہ بزرگ اپنی سادہ طبعی، غیر معمولی اخلاص اور ہر کسی سے حسنِ ظن کی وجہ سے اس گروہ کے لوگوں کو سادات کا عاشق اور مجاہد تصور کرتے تھے چنانچہ حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے ایک رفیق جَعدَہ بن ہُبَیرہ مخزومی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو (جو مدینہ منورہ میں تھے) کوفہ سے خط لکھ کر کہا:

''ہمارے تمام گروہ کی نگاہیں آپ پر مرکوز ہیں۔ وہ آپ کے ہم پلہ کسی کو نہیں سمجھتے، آپ کے بھائی حسن رضی اللہ عنہ نے جنگ کو ٹالنے کی جو کوششیں کیں، یہ لوگ اس سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنے دوستوں کے لیے نرم اور دشمنوں کے لیے سخت ہیں اور اللہ کے کام میں بےلچک ہیں۔ اگر آپ یہ چیز (خلافت) چاہتے ہیں تو ہمارے پاس آجائیں۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جواب میں انہیں سختی سے منع کیا، اس جذباتی سوچ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور فرمایا:

''میرے بھائی نے جو روش اپنائی تھی، میرے خیال میں اللہ ہی نے انہیں اس کی توفیق عطا کی تھی اور وہ اپنے اقدام میں بالکل درست تھے۔''

---

[1] الاخبار الطوال، ابو حنیفہ الدینوری، ص ۲۲۰

[2] الاخبار الطوال، ص ۲۲۱

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ بھی لکھا:

''جب تک میں زندہ ہوں، اللہ حضرت مُعاویہ کو کسی تکلیف میں مبتلا نہیں ہونے دے گا۔''[1]

❹ فتنہ پرور لوگوں کے حلقے کے اثرات

اس کے بعد تو حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو بالکل پُر امن ہونا چاہیے تھا مگر وہ ان فتنہ پرور لوگوں کے حلقے سے باہر نہ نکل پائے جن کا مقصد ہی شر انگیزی تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول یہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے، انہیں ظالم قرار دیتے، حکام اور امراء پر اعتراضات کرتے، کسی بھی بہانے ان کی تردید کے درپے رہتے، ان معاملات میں تشدد اور مبالغہ کرتے، شیعانِ علی کی حمایت کرتے اور دین میں انتہا پسندی اختیار کرتے۔[2]

گویا یہ مسلمانوں کا وہ سادہ لوح گروہ تھا جو دراصل سبائیوں کے ہاتھوں استعمال ہو رہا تھا۔ حضرت حُجر اور حضرت عَمرو بن حَمِق رضی اللہ عنہما حسنِ ظن اور غلط فہمی کی وجہ سے ان لوگوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ان بزرگوں کے اخلاص، علم، اور للّٰہیت میں کسی کو کوئی شک نہ تھا، مگر ان کی سرگرمیاں اُمت کی سلامتی کے لیے خطرناک تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ امت کے اکثر صحابہ و تابعین اور خود حضراتِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما، ان کے لیے محبت اور عزت و احترام کے جذبات رکھنے کے باوجود ان سرگرمیوں میں ان کی حمایت نہ کر سکے۔

❺ احتجاجی تحریک کا آغاز

آخر وہ وقت آگیا کہ ان لوگوں نے حکومت کے خلاف کھلم کھلا احتجاجی تحریک کا آغاز کیا۔ کوفہ کے گورنر حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نمازِ جمعہ کے خطبے میں حسبِ معمول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے رحمت اور ان کے قاتلوں کے خلاف بددعا کر رہے تھے کہ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ایسا زوردار نعرہ لگایا کہ آواز مسجد کے باہر تک گونج گئی۔ پھر حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کو کہنے لگے:

''اے شخص! بڑھاپے کی وجہ سے تجھے یہ بھی شعور نہیں کہ تو کس کی محبت میں مرا جا رہا ہے۔ ہمارے وظیفے جاری کرنے کا حکم دے کہ تو نے ہی انہیں روک رکھا ہے، حالاں کہ تجھے اس کا حق نہیں۔ تجھ سے پہلے کسی نے ہمارے وظیفوں کا لالچ نہیں کیا۔ تجھے امیر المؤمنین (حضرت علی رضی اللہ عنہ) پر تنقید کرنے اور مجرموں (بنواُمیہ) کی تعریف کا بڑا چسکا ہے۔''

حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے ان کی تلخ کلامی کو بڑی بردباری سے سنا اور چپ چاپ گھر تشریف لے گئے۔ ساتھیوں نے اصرار کیا کہ انہیں تنبیہ ضرور کرنی چاہیے مگر حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نہایت متحمل مزاج انسان تھے۔ فرمایا:

''میں خطا کرنے والے سے درگزر کیا کرتا ہوں۔''[3]

❻ زیاد کا کوفہ میں تقرر اور حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ سے معاملہ

سن ۵۰ ہجری میں حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے حاکم زیاد بن

---

① الاخبار الطوال، ص ۲۲۱، ۲۲۲ ② البدایۃ والنہایۃ: ۲۳۹/۱۱ ③ تاریخ الطبری: ۲۵۴/۵، ۲۵۵



ابی سفیان کو انتظامی معاملات میں غیر معمولی قابلیت دیکھ کر کوفہ کا بھی حاکم بنا دیا۔[1] اس دوران کوفہ میں حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے گرد باغی گروہ کے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے، وہ انہیں اپنا ''شیخ'' قرار دیتے تھے اور انہیں حکومت سے مقابلے پر اُبھارتے ہوئے کہتے تھے: ''آپ اس بات کے سب سے زیادہ لائق ہیں کہ ان حکام پر تنقید کریں۔''[2]

زیاد کے حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ سے پرانے تعلقات تھے، کیوں کہ ماضی میں دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریبی رفقاء میں شامل تھے۔ زیاد کو حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے رجحانات اور ان کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کی سرگرمیوں کا پورا علم تھا۔ اس کی کوفہ تقرری کا اہم ترین مقصد بھی یہی تھا کہ وہ حضرت حجر کو شورش پسندی سے روکے، ورنہ مشرقی سرحدوں کے اس اہم ترین شہر کا ایک بار پھر فتنہ وفساد کا مرکز بن جانا یقینی تھا۔

زیاد نے ابتدا میں حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے اکرام واعزاز میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور اپنے قریب کرنے کی پوری کوشش کی۔ زیاد کا کہنا تھا: ''آپ میرے اس تخت پر بیٹھا کیجئے، آپ کی تمام ضروریات کا میں ذمہ دار ہوں۔''[3]

مگر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل حکومت کے ساتھ بدستور جارحانہ رہا۔

کوفہ میں زیاد کا پہلا خطاب اور حضرت حجر رضی اللہ عنہ کی ناراضی کی بنیادی وجہ:

اپنے ابتدائی خطاب میں زیاد نے اہلِ کوفہ کو امن پسندی اور اطاعت وفرماں برداری کی تلقین کرتے ہوئے کہا:

''ہم نے آزما لیا اور ہماری آزمائش بھی ہوگئی۔ ہم ماتحت رہے اور حکومت بھی کر چکے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ بعد والوں کے حالات اسی اصول کے تحت سدھر سکتے ہیں جس سے پہلے والوں کے حالات درست رہے یعنی ایسی کامل فرمانبرداری جس میں ظاہر وباطن یکساں ہوں، غائب اور حاضر ایک جیسے ہوں، دل اور زبان یکجا ہوں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لیے ایسی نرم خوئی ہونی چاہیے جس سے کمزوری کا شبہ نہ ہو اور ایسی سختی ہونی چاہیے جس میں ظلم نہ ہو۔ اللہ کی قسم! میں آپ لوگوں کے بارے میں جس معاملے کا ذمہ دار بنوں گا اسے بہر حال پورا کر کے رہوں گا۔''

اس کے بعد زیاد نے اموی حکام کے دستور کے مطابق حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تعریف کی، ان کے قاتلین کو بددعا دی اور ان پر لعنت بھیجی۔ اس پر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور حسبِ عادت احتجاج کیا۔[4]

دراصل حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل مانتے ہیں اور امرائے بنوامیہ جب بھی قاتلینِ عثمان پر لعنت کرتے ہیں تو اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک عاشق ایسا یقین کرنے کے بعد قاتلینِ عثمان کے خلاف بددعا

---

1. تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۰
2. طبقات ابن سعد: ۲۱۸/۶، ط صادر ؛ تاریخ دمشق: ۲۱۷/۱۲ ترجمۃ: حُجر بن عدی
3. تاریخ دمشق: ۲۱۵/۱۲، ۲۱۶، ترجمۃ: حُجر بن عدی
4. تاریخ الطبری: ۲۵۵/۵، ۲۵۶، عن ابو عوانہ ؛ تاریخ دمشق: ۲۱۷/۱۲، ترجمۃ: حُجر بن عدی

برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو اس کا یقین تھا، اسی لیے وہ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کے خطبے میں بھی قاتلینِ عثمان کے لیے بددعا میں آڑے آتے رہے اور زیاد سے بھی ان کا یہی رویہ رہا۔

❶ زیاد کی طرف سے معاملہ سلجھانے کی کوشش اور فہمائش:

زیاد نے حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی یہ بدگمانی دور کرنے کی کوشش ضرور کی اور انہیں الگ بلا کر کہا: ''ابو عبدالرحمٰن! آپ جانتے ہیں مجھے حضرت علی سے کتنی محبت ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ کوئی ناگوار بات نہ کریں۔''[1]

مگر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کی بدگمانی دور نہ ہوئی، آخر زیاد نے دوبارہ کوشش کی اور اس بار واضح الفاظ میں دھمکی بھی دی۔ کہا:

''ایک مدت تک میں اور آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیسے (وفادار اور جانثار بن کر) رہے، یہ مجھے بھی معلوم ہے اور آپ کو بھی۔ مگر اب صورتِ حال کچھ اور ہے۔ آپ کی طبیعت کی تیزی سے میں واقف ہوں۔ آپ اپنی زبان پر قابو رکھیے اور اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیے۔ ان جاہلوں سے ہوشیار رہیے، کہیں وہ آپ کو اپنا ہم خیال نہ بنالیں۔ آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ میرے ہاتھوں آپ کے لہو کی ایک بوند بھی نہ بہنے پائے۔''

حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں سمجھ گیا ہوں۔'' مگر جب وہ اپنے گھر گئے اور شر پسند گروہ کے لوگوں نے ان سے مل کر زیاد سے ان کی ملاقات اور گفتگو کا حال سنا تو انہیں دوبارہ زیاد کے خلاف بھڑکا دیا اور کہا:

''اس نے آپ کے ساتھ کوئی خیر خواہی نہیں کی۔'' چنانچہ زیاد کا کہنا سننا اور ڈرانا دھمکانا بے سود رہا۔[2]

❷ زیاد کی بصرہ روانگی اور کوفہ میں حالات کا تغیر:

زیاد کا چھ ماہ کوفہ اور چھ ماہ بصرہ میں گزارنے کا معمول تھا۔ جب بصرہ جانے کا وقت آیا تو اسے سب سے زیادہ اندیشہ یہی تھا کہ پیچھے حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کسی شورش کا سبب نہ بن جائیں۔ حقیقت یہ بھی کہ اگر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ پُر امن رہتے تو باقی لوگوں سے کوئی زیادہ خطرہ نہ تھا؛ کیوں کہ اصل شر پسند لوگ تھوڑے ہی تھے، مگر حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا حلقۂ اثر بہت بڑا تھا، اس میں حضرت عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام، حضرت رِفاعہ بن شدّاد جیسے درجنوں جلیل القدر تابعین اور ہزاروں صحیح العقیدہ مخلص مسلمان شامل تھے۔ یہ سب ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر تھے۔ اگر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کسی قسم کا کوئی اقدام کرتے تو ڈر تھا کہ بہت سے لوگ سوچے سمجھے بغیر ان کی تقلید کر لیتے اور یوں مسلمانوں کی اجتماعیت بکھر کر رہ جاتی۔ اس طرح شہادتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ یا جنگِ جمل و صفین جیسا کوئی سانحہ دوبارہ رونما ہو سکتا تھا۔ اس لیے زیاد نے بصرہ جاتے ہوئے حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ سے تفصیلی بات چیت کی اور ابتدا میں کوشش یہ کی کہ انہیں منا کر اپنے ساتھ بصرہ لے جائے۔ زیاد نے کہا:

''آپ کے ساتھ میرا جو حسنِ سلوک ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ بصرہ تشریف لے چلیے۔ آپ کو پیچھے چھوڑ جانا مجھے اچھا نہیں لگتا، کیوں کہ ممکن ہے وہاں مجھے آپ کے بارے میں کوئی ایسی بات پہنچے

① تاریخ دمشق: ۲۱۴/۱۲ ② طبقات ابن سعد: ۲۱۸/۶، ط صادر



جو نا گوار ہو۔ آپ ساتھ رہیں گے تو ایسی کوئی بات میرے دل میں نہیں آ سکتی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ کے احساسات سے میں آگاہ ہوں اور میرے بھی بالکل یہی جذبات واحساسات تھے مگر جب میں نے دیکھا کہ اللہ نے حالات کی باگ ڈور حضرت مُعاویہ کے ہاتھ میں دے دی ہے تو میں اللہ تعالیٰ کو کوئی الزام نہیں دے سکتا، بلکہ میں اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کا معاملہ جس نتیجے پر پہنچا میں اسے بھی دیکھ چکا ہوں (یعنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اقتدار حضرت مُعاویہ کو سونپ دیا۔) خدارا! آپ ایسے معاملات کے ذمہ دار مت بنیے جن میں ذرا سا ملوث ہونا بھی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔'' (یعنی حکومت سے ٹکر لینا اور شورش پسندی کی سرپرستی کرنا اکثر جان سے ہاتھ دھونے کا سبب بنا کرتا ہے۔)

حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے مرض کا عذر پیش کر کے زیاد کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی۔[1]

زیاد کوفہ میں عَمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ کو نائب بنا کر خود بصرہ روانہ ہو گیا۔ پیچھے وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ شیعانِ علی کی جتھہ بندی بڑھنے لگی۔ حضرت حجر رضی اللہ عنہ جامع مسجد میں تشریف لاتے تو یہ لوگ کھلم کھلا ان کے ساتھ ہوتے۔[2]

حضرت عَمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ نے یہ رنگ دیکھ کر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا:

''ابوعبدالرحمٰن! جہاں تک میں جانتا ہوں آپ اپنے بارے میں امیر (زیاد) کو ضمانت دے چکے ہیں۔ پھر آپ کے ساتھ یہ گروہ کیسا ہے؟'' حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے قاصد کو ڈانٹ کر واپس کر دیا۔[3]

اب کوفہ کے بعض قراء بھی ان سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح شورش پسندوں کا زور اتنا بڑھ گیا کہ کوفہ کی ریاستی قوت بے بس ہو گئی۔ نائب حاکم حضرت عَمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ کا کوئی حکم نافذ نہیں ہو پاتا تھا۔[4]

⑩ حضرت حجر رضی اللہ عنہ کا احتجاج اور زیاد کی ہنگامی طور پر کوفہ کی واپسی

ایک دن خطبے کے دوران حضرت حُجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت عَمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ کو بھی ٹوکا اور کنکریاں ماریں۔[5] آخر حضرت عَمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ نے تنگ آ کر زیاد کو مراسلہ بھیج دیا:

''حضرت حُجر اور ان کے اصحاب نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ اب آپ جو بہتر سمجھتے ہیں کر لیں۔''

یہ بھی لکھا: ''اگر آپ کو کوفہ کی کوئی ضرورت ہے تو پھر جو کرنا ہے جلد کریں۔''

یہ پیغام ملتے ہی زیاد تیزی سے کوفہ آ گیا۔[6] زیاد کے آنے پر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ تین ہزار مسلح افراد کے ساتھ نکلے اور مسجد میں تشریف فرما ہوئے۔ زیاد نے مسجد میں خطبہ دینا چاہا، ابھی اتنا ہی کہا تھا: ''بے شک یہ امیر المومنین

---

① تاریخ دِمَشق: ۲۱۶/۱۲ ؛ بغیۃ الطلب: ۲۱۱۵،۲۱۱۴/۵، واخرجه الحاكم في المستدرك مختصراً، ح: ۵۹۷۲
② طبقاتِ ابن سعد، ۲۱۸/۶، ط صادر ؛ تاریخ دِمَشق: ۲۱۷/۱۲ ؛ بغیۃ الطلب: ۲۱۱۵/۵
③ طبقات ابن سعد: ۲۱۸/۶، ط صادر ؛ تاریخ دِمَشق لابن عساکر: ۲۱۸/۱۲ ؛ بغیۃ الطلب: ۲۱۲۱/۵
④ تاریخ دِمَشق: ۲۱۶/۱۲ ؛ بغیۃ الطلب: ۲۱۲۰/۵
⑤ تاریخ دِمَشق: ۲۱۴/۱۲ ⑥ طبقاتِ ابن سعد: ۲۱۸/۶، ط صادر ؛ تاریخ دِمَشق: ۲۱۶/۱۲، ۲۱۸،

کا حق ہے.....'' کہ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے ''جھوٹ جھوٹ'' کی آواز لگا کر بات کاٹ دی۔ پھر کنکروں کی مٹھی پھینک ماری۔ زیاد نے منبر سے اتر کر نماز ادا کی اور گھر چلا گیا۔[1]

⓫ مذاکرات کی آخری کوشش:

صورتِ حال نازک ہوگئی تھی۔ چنگاریاں کسی بھی وقت شعلوں میں بدل سکتی تھیں۔ زیاد نے ایک بار پھر مذاکرات کی کوشش کی اور تین صحابہ: حضرت عدی بن حاتم طائی، حضرت جَریر بن عبداللہ بجلی اور حضرت خالد بن عُرفُطہ رضی اللہ عنہم کو کوفہ کے شرفاء کے ایک وفد کے ساتھ حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں شورش پسند جماعت کی سرپرستی اور امراء کے خلاف زبان کھولنے سے باز آنے پر آمادہ کریں مگر جب یہ حضرات حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور مدعا بیان کرنے لگے تو حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات سننے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ آخر یہ حضرات واپس آگئے اور زیاد کو ماجرا سنایا، ساتھ ہی زیاد کو اس معاملے میں نرمی برتنے کی تلقین کی، مگر زیاد ایک سخت گیر اور بے لچک قسم کا منتظم تھا اور ایسے معاملات میں چشم پوشی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے کہا:

''اگر اب بھی میں ان سے نرمی کروں تو میں ابوسفیان کا بیٹا نہیں۔''[2]

⓬ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی گرفتاری کی کارروائی:

زیاد نے حتمی کارروائی سے پہلے کوفہ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''حمد وصلوٰۃ کے بعد! یاد رکھو! ظلم اور بغاوت کا انجام بہت برا ہے۔ یہ لوگ گروہ بندی کر کے مغرور ہوگئے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں پُرامن پایا تو بے باک ہوگئے۔ اللہ کی قسم! اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو میں بیماری کا علاج اسی کی دوا (یعنی علاج بالمثل) سے کروں گا۔''[3]

زیاد کے حکم پر پولیس افسر شداد ہلالی نے سپاہی حسین بن عبداللہ کو حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تاکہ انہیں قصرِ امارت میں لایا جائے۔ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے آنے سے انکار کر دیا۔ شداد ہلالی نے اب گرفتاری کے لیے نفری بھیج دی مگر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کر دیا۔[4]

ادھر زیاد نے کوفہ کے معززین کو جمع کیا اور ایک دھمکی آمیز تقریر کر کے انہیں حکم دیا کہ ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کو حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ سے الگ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ ترکیب کارگر رہی تھی اور شرفاء کوفہ کے سمجھانے بجھانے سے اکثر لوگوں نے حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب پولیس نے حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ فریقین میں جھڑپ ہوئی۔ متعدد افراد زخمی ہوئے۔ پولیس حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو تو گرفتار نہ

① تاریخ دمشق: ۲۱۴/۱۲، ترجمة: حُجر بن عدی
② طبقات ابن سعد: ۲۱۸/۶، ۲۱۹، ط صادر
③ تاریخ الطبری: ۲۵۶/۵
④ تاریخ الطبری: ۲۵۷/۵ ، طبقات ابن سعد: ۲۱۹/۶، ط صادر

کر سکی، تاہم ان کا حامی مجمع منتشر ہو گیا۔ اس دوران حضرت حُجر رضی اللہ عنہ فرار ہو کر اپنے قبیلے کِندَہ کے محلے میں روپوش ہو چکے تھے۔ زیاد نے پولیس کی ناکامی کے بعد مقامی قبائل پر مشتمل ایک جمعیت تیار کی اور اسے حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے پیچھے کندہ بھیجا۔ وہاں ایک اور جھڑپ ہوئی مگر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہونے والے کوفیوں کی سرشت میں بے وفائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ جلد ہی انہیں دغا دے گئے۔ جو باقی ماندہ قریبی ساتھی ان کے ساتھ تھے، انہیں حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے خطرے میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور خود اپنے پاس سے ہٹا دیا۔[1]

⑬ حضرت حجر رضی اللہ عنہ کی گرفتاری اور فردِ جرم کی دستاویز کی تیاری:

آخر ایک دن زیاد کو اتفاقی طور پر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کی پناہ گاہ کا پتا چل گیا۔ اس نے ایک معتبر شخص کو بھیج کر انہیں وہاں سے اپنے پاس حاضر ہونے کا کہا۔ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو زیاد کی سخت طبعی کا اندازہ تھا، وہ جانتے تھے کہ زیاد انہیں سزائے موت دیے بغیر نہیں رہے گا۔ اس لیے لوگوں کے مشورے سے انہوں نے حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنا کر بھیجا جنہوں نے زیاد کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کرے گا بلکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس معاملے کا فیصلہ کریں گے۔ زیاد نے اس کی ضمانت دے دی اور حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے خود کو حکومت کے حوالے کر دیا۔[2]

حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، اس لیے انہوں نے پُرامن گرفتاری دینے کے بعد خود بھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی اور زیاد سے کہا:

''میں حضرت مُعاویہ کی بیعت پر قائم ہوں۔ میں اس سے برگشتہ نہیں ہوا۔''

زیاد نے پہلے دربارِ خلافت میں حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کی بغاوت میں شرکت کا ثبوت پیش کرنا ضروری سمجھا۔ اس نے کوفہ کے ستر معزز افراد کو جمع کر کے ان سے حُجر رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں کے خلاف شہادتیں قلم بند کرائیں۔ ان معززین میں حضرت عَمرو بن حُرَیث، حضرت خالد بن ابی عُرفُطَہ، حضرت وائل بن حُجر اور حضرت کثیر بن شہاب رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔[3] اب زیاد نے گواہوں اور پھر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دارالخلافہ دِمَشق روانہ کر دیا۔[4] یہ بھی لکھ دیا کہ ان لوگوں کو آپ سے گفتگو تک جان کی امان دی گئی ہے۔[5]

⑭ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مقدمے پر غور و فکر

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے فردِ جرم پر شہادتوں کی دستاویز پڑھی گئی۔ ساتھ ہی گواہوں نے اپنے بیانات دیے۔[6]

حُجر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو دِمَشق کی مضافاتی وادی ''مرج عذراء'' میں ٹھہرایا گیا۔ یہ علاقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت حُجر رضی اللہ عنہ نے ہی فتح کیا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ملزمان سے ملنے آئے تو حُجر رضی اللہ عنہ نے ''یا امیر المؤمنین!''

---

① تاریخ الطبری: ۲۵۷/۵ تا ۲۶۲
② تاریخ دِمَشق: ۲۱۶/۱۲، تر: حُجر بن عدی
③ تاریخ الطبری: ۲۶۸/۵، ۲۶۹؛ طبقاتِ ابن سعد: ۲۱۹/۶
④ طبقاتِ ابن سعد: ۲۱۹/۶، صادر
⑤ بغیۃ الطلب: ۲۱۱۶/۵، ۲۱۱۸
⑥ طبقاتِ ابن سعد: ۲۱۹/۶، صادر

کہہ کر سلام کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ترش رو ہو کر کہا: ''میں اب بھی (تمہارے نزدیک) امیر المؤمنین ہوں؟''
حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے بیعت پر برقراری کا اعتراف کیا۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مطمئن نہ ہوئے۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس سزا دینے کا اختیار بھی تھا اور معافی کا بھی۔ سزا سے متعلق یہ حدیث نبوی موجود تھی:

مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّفَرِّقَ هٰذِهِ الْاُمَّةَ وَهِیَ جَمِیْعٌ فَاضْرِبُوْا بِالسَّیْفِ كَائِنًا مَا كَانَ.

(جو اس امت کو منتشر کرنا چاہے، جبکہ امت مجتمع ہو تو اسے تلوار سے مار دو، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔)[2]

دوسری طرف حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ، ان کا غلط فہمی کا شکار ہو کر تحریک میں شامل ہو جانا اور اب اپنی بیعت پر قائم رہنے کا اقرار انہیں شک کا فائدہ دے کر معافی کا حق دار بنا تا تھا۔ مگر ان کا میلان یہی تھا کہ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی جان بخشی کر دی جائے، تاہم انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں شر پسند دوبارہ ان کو سرپرست بنا کر شورش نہ کریں، چنانچہ انہوں نے زیاد کو یہ مراسلہ بھیجا: ''حُجر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں تمہارے بیان اور گواہوں پہ غور کرنے کے بعد کبھی مجھے لگتا ہے کہ انہیں قتل کرنا بہتر ہے اور کبھی سوچتا ہوں کہ معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔''[3]

اس کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے امراء اور عمائد کو بھی مشورے کے لیے جمع کیا۔ حضرت عمرو بن الاسود، حضرت ابو مسلم خولانی، یزید بن اسد اور حضرت عبداللہ بن محمد کی رائے یہ تھی کہ ان کو سزا دینا برمحل ہے، مگر معاف کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔[4] ان چار کے سوا باقی سب لوگوں نے زور دیا کہ ملزمان کو سزائے موت دی جائے۔[5]

اس دوران زیاد کا جواب بھی آ گیا۔ اس نے بھی سزا دینے پر اصرار کیا تھا اور لکھا تھا:

''مجھے تعجب ہے کہ آپ کو اس معاملے میں تردد کیوں ہے۔ اگر آپ کو اس شہر (کوفہ) کی ضرورت ہے تو حجر اور ان کے ساتھیوں کو میرے پاس واپس نہ بھیجیے گا۔''[6]

⑤ سزائے موت کا نفاذ:

تقدیر کی بات کہ آخر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے حلم اور تحمل کے برخلاف اسی رائے کو مان کر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی سزائے موت کا حکم جاری کر دیا۔ یہ لوگ مرج عذرا کے مقام پر قید اور اپنے بارے میں فیصلے کے منتظر تھے۔ وہیں ان کو سزائے موت دے دی گئی۔[7] قتل سے پہلے حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کا آخری عمل دو رکعت نماز تھا۔[8]
نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے کہا: ''میری بیڑیاں مت کھولنا، نہ غسل دینا۔ خون اور زنجیروں سمیت دفن کر دینا،

---

① مستدرک حاکم، ح: ۵۹۸۱ ؛ بغیة الطلب: ۲۱۱۹،۲۱۱۶/۵ بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حرمان کو رہا بھی کر دیا تھا اور فرمایا: لا اُحب ان اراهم (طبقات ابن سعد: ۲۱۹/۶) مگر دیگر روایات ان کا حرمان سے متاثر کرتی ہیں۔
② صحیح مسلم، ح: ۴۹۰۲، کتاب الامارة، حکم من فرق امر المسلمین
③ تاریخ الطبری: ۲۷۲/۵
④ تاریخ دمشق: ۲۲۳،۲۲۲/۱۲ ؛ بغیة الطلب: ۲۱۱۷/۵، بسند حسن
⑤ تاریخ دمشق: ۳۰۳/۱۲، بسند حسن لغیرہ
⑥ تاریخ الطبری: ۲۷۳،۲۷۲/۵
⑦ طبقات ابن سعد: ۲۱۹/۶، صادر
⑧ مستدرک حاکم، ح: ۵۹۸۱

کہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے اسی حالت میں ملوں گا۔" اس کے بعد وہ قتل کردیے گئے۔[1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سفارش نامہ:

حضرت حجر رضی اللہ عنہ کی گرفتاری کی خبر سے عراق سے حجاز تک ایک صدمے کی کیفیت طاری تھی۔ ان کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبدالرحمن بن حارث کو دمشق دوڑایا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے سفارش کرکے ان کی ساتھیوں سمیت جان بخشی کرائی جائے۔

عبدالرحمن بن حارث ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا مراسلہ لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو جلادوں نے سات کے سات قتل گاہ کی طرف جاچکے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا مراسلہ پڑھتے ہی ہرکارے دوڑائے کہ سب کی جان بخشی کردی جائے مگر جب تک ہرکارہ وہاں پہنچے، حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ سمیت سات فرد قتل کیے جاچکے تھے۔ باقی چھ پر اس وقت تک سزا جاری نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ رہا کردیے گئے۔[2]

روایاتِ صحیحہ اور ان سے ہم آہنگ ضعیف روایات کی روشنی میں حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے قصے سے متعلق یہ ایک حقیقت پسندانہ جائزہ تھا۔ اسے دیکھ کر ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ جعلی روایات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس معاملے میں بدنام کرنے کے لیے کیا کیا اضافے کیے گئے ہیں۔

ابومخنف کی ناقابلِ اعتماد روایات:

ابومخنف اور ہشام کلبی کی روایات میں بتایا گیا ہے کہ بچنے والے چھ افراد کو بڑے بڑے لوگوں کی سفارش کی بنا پر چھوڑ دیا گیا تھا، جو سات قتل ہوئے ان کا کوئی سفارشی نہ تھا۔ ان روایات میں یہ بھی ہے کہ جلاد ہر مجرم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیزاری کی تلقین کرتے تھے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم تھا کہ جو تبرا بازی کرے اسے چھوڑ دو۔

یہ بھی محض ابومخنف سے مروی ہے۔ اسی طرح بعض افراد کو تبرا نہ کرنے پر کوفہ بھیج کر زندہ دفن کرانے کی روایت بھی ابومخنف کی ترنگات میں سے ہے۔[3]

حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے قتل پر صحابہ اور تابعین کے تاثرات:

حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے قتل سے عالم اسلام میں سوگ کی سی حالت طاری ہوگئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان کی خیر خیریت پوچھتے رہتے تھے۔ جب قتل کی اطلاع ملی تو روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔[2] خراسان میں اسلامی سالار حضرت ربیع بن زیاد حارثی کو یہ خبر ملی تو اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ لوگوں کو جمع کرکے اپنی موت کی دعا کی۔ جس سے

---

[1] فقہ شیعہ کی تحریر و تصنیف میں مرفوع احادیث کے علاوہ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی استنباط کرتے ہیں۔ امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وھکذا ینبغی فی خصوص علی. (المبسوط: ۲: ۵۰) محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے جب پوچھا جاتا کہ کیا شہید کو غسل دیا جائے گا؟ تو وہ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے: لا تطلقوا عنی حدیدا ولا تغسلوا عنی دما ادفنونی فی وثاقی ودمی. (مصنف ابن ابی شیبہ ح: ۳۸۰۵ ۲ ط الرشد)

[2] طبقات ابن سعد: ۶: ۲۱۹، ۲۲۰، ط صادر [3] یہ ناقابل اعتبار روایات طبری: ۵: ۲۷۵ تا ۲۷۷ پر موجود ہیں۔

[4] تاریخ دمشق: ۱۲: ۲۱۰، تاریخ الاسلام للذہبی: ۴: ۱۹۲، تدمری

اٹھنے نہ پائے تھے کہ روح جسم سے پرواز کر گئی۔[1] حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل پر ان کی ہمشیرہ نے بھی نہایت کرب انگیز اور اشک آور اشعار کہے جو عربی ادب میں فصاحت و بلاغت کا شہ پارہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

تَرَفَّعْ اَیُّهَا الْقَمَرُ الْمُنِیْرُ   تَرَفَّعْ هَلْ تَرٰی حُجْرًا یَسِیْرُ

اے چمکتے چاند تو اور بلند ہو جا...... بلند ہو اور بتا کہ تو حجر کو چلتے دیکھ رہا ہے۔

یَسِیْرُ اِلٰی مُعَاوِیَةَ بْنِ حَرْبٍ   لِیَقْتُلَهٗ کَمَا زَعَمَ الْاَمِیْرُ

وہ مُعاویہ بن (ابی سفیان بن) حرب کے پاس جا رہے ہیں...... تاکہ وہ انہیں قتل کر دیں جیسا کہ امیر (زیاد) کا دعویٰ ہے۔

وَاَصْبَحَتِ الْبِلَادُ لَهٗ مُحُوْلًا   کَاَنْ لَّمْ یُحْیِهَا مُزْنٌ مَطِیْرُ

حُجر کے سارے شہر اب بنجر ہو گئے ہیں...... گویا انہیں کبھی برسنے والے بادل نے زندگی نہ بخشی ہو۔

اَلَا یَا حُجْرُ حُجْرَ بَنِیْ عَدِیٍّ   تَلَقَّتْکَ السَّلَامَةُ وَالسُّرُوْرُ

سنو اے حُجر، اے حُجر بنی عدی...... تمہیں (آخرت میں) سلامتی اور خوشی نصیب رہے۔

فَاِنْ تَهْلِکْ فَکُلُّ عَمِیْدِ قَوْمٍ   اِلٰی هُلْکٍ مِنَ الدُّنْیَا یَصِیْرُ

پس اگر تم فنا ہو گئے تو کیا ہوا کہ ہر قوم کے سردار کو...... دنیا سے فنا ہی کی طرف جانا ہے۔[2]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا کرب و افسوس:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خود بھی جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ سخت طبع مشیر ان کی ذاتی رائے پر غالب آگئے ورنہ بہتر یہ تھا کہ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیا جاتا یا زیادہ سے زیادہ قید رکھا جاتا۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سفیر عبدالرحمن بن حارث نے انہیں کہا: ''آپ نے حُجر بن عدی کو جیل میں کیوں نہ ڈال دیا کہ وہ طاعون (جیسے کسی مرض) کا شکار ہو کر وفات پا جاتے۔'' تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیوں کہ میرے لوگوں میں تم جیسے موجود نہ تھے۔''[3]

اسی طرح جب بنو اُمیہ کے ستون مروان بن حکم نے اس اقدام پر تنقید کرتے ہوئے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا:

''آپ کی فکر و نظر اور بردباری کہاں چلی گئی تھی جس کی آپ سے توقع کی جا رہی تھی؟''

تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا: ''اس لیے کہ تم میرے پاس نہیں تھے۔''[4]

---

① تاریخ الطبری: ۲۱۰/۳   حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''حجر بن عدی کے عابد و زاہد ہونے کی بڑی شہرت تھی اور قدرتی بات یہ ہے کہ جو شخص بھی پورے حالات سے ناواقف رہ کر صرف یہ سنے گا کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے وہ لامحالہ اس پر رنج اور افسوس کا اظہار کرے گا، لیکن یہ رنج و افسوس اس شخص کے خلاف حجت کیسے بن سکتا ہے جس کے سامنے چالیس قابل اعتماد گواہیاں گزر چکی ہوں اور وہ سب اس بات پر متفق ہوں کہ حجر بن عدی نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے۔ (حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۹۳)

② بغیة الطلب: ۲۱۲۳/۵؛ طبقات ابن سعد: ۲۲۰/۶

③ الاستیعاب: ۳۲۹/۱؛ تهذیب الکمال، ۴۲/۱۷، ۴۳، ط الرسالة

④ تاریخ دمشق: ۲۳۰/۱۲

مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ کہیں حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کو معاف کر دینے سے کشت و خون کا ایک نیا سلسلہ نہ شروع ہو جاتا۔ اس لیے وہ یہ بھی فرماتے تھے: ''ایک لاکھ افراد کے قتل ہونے سے ان کا قتل ہونا بہتر تھا۔''[1]

یعنی انہوں نے اپنے طور پر ملتِ اسلامیہ کو ایک نئی خانہ جنگی سے بچانے کے لیے ہی یہ تلخ فیصلہ کیا تھا، ورنہ حضرت حجر رضی اللہ عنہ سے انہیں کوئی ذاتی عناد تھا نہ ان کا مقام و مرتبہ ان سے مخفی تھا۔ سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کو مدتوں یاد کیا کرتے تھے۔ یہ فرض اور تعلق کا سخت امتحان اور قلب و روح کا بڑا گہرا صدمہ تھا۔[2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ناراضی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اعتذار:

اس سانحے کے بعد (۵۶ھ میں) جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے گئے اور مدینہ منورہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری دی تو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ان کے اس اقدام پر شدید غصے اور رنج کا اظہار کیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''امی جان! ایک آدمی کو قتل کر کے باقی لوگوں کو بچا لینا مجھے اسے چھوڑ کر سب کو تباہ کرنے سے بہتر لگا۔ امی جان! مجھے ڈر تھا کہ معاملہ بڑھ نہ جائے اور کوئی ایسا فتنہ نہ کھڑا ہو جائے جس میں خون ریزی ہوتی اور حلال و حرام کی حدیں مٹ جاتیں۔ آپ حضرت حُجر کا اور میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے آپ کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔''[3]

---

(1) البداية والنهاية: ۲۳۹/۱۱

(2) مستدرک حاکم، ح: ۵۹۸۰ ...... قال الراوی: وما دخلنا معه عليه (ای مع جرير علىٰ معاوية) الا ذكر قتل حُجر بن عدی۔

(3) تاريخ دمشق: ۲۲۹/۱۲ ؛ البداية والنهاية: ۲۴۲/۱۱ بسند حسن

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بعض اوقات حکمران کو ایسے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جہاں وہ فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کی مجبوریاں عدالتی ثبوتوں کے دائرے میں نہیں آسکتیں۔ اگر عدالتی لحاظ سے شواہد طلب کر کے اس کے فعل کا محاکمہ کیا جائے تو وہ غلط ثابت ہوگا مگر اس کے باوجود اگر اسے یقین ہو کہ یہ قدم نہ اٹھانے سے ملک کی سلامتی داؤ پر لگ جائے گی، تو ایسے میں جہاں وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں معذور ہوگا اسی طرح عنداللہ بھی اس کے معذور ہونے کی امید کی جاسکتی ہے، چاہے عندالناس وہ قابلِ اعتراض رہے۔

غالباً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی فقہی بحث نہیں کی اور اپنے فعل کے شرعی دلائل پیش نہیں کیے بلکہ دیانۃً انہیں جو محسوس ہو رہا تھا، اس کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا۔ چاہے خودام المومنین اور عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں یہ خدشات زیادہ وزن نہ رکھتے ہوں مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے جو ضروری سمجھا وہی کیا۔ اسی لیے انہوں نے گفتگو کا خاتمہ اس بات پر کیا کہ: ''آپ حضرت حجر کا اور میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔''

یہ وہ نکتہ تھا جس سے ام المومنین نے بھی اتفاق کیا اور فرمایا کہ میں نے آپ کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا یعنی قضاءً چاہے وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اقدام سے جتنا بھی اختلاف رکھتی ہوں مگر دیانۃً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو انہوں نے بھی گنجائش دے دی۔ عباسی حکمران مامون الرشید کا درج ذیل قول ایسی صورتحال پر ایک بلیغ تبصرہ ہے:

''حکمران بعض اوقات اپنے خاص ارکان کے ساتھ جو کچھ کر گزرتا ہے، اس بارے میں عوام ہرگز منصفانہ رائے اختیار نہیں کر سکتے، وہ دیکھتے ہیں کہ وزیر یا نائب السلطنت نے اتنی وفاداری کا مظاہرہ کیا کہ اس کے بوجھ سے حکمران کی گردن کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔ پس وہ بلا تکلف یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ حکمران نے جو کچھ کیا وہ صرف حسد یا بد مزاجی کی وجہ سے کیا، انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان ارکان کی بعض حرکات خود اپنے گھر کو ڈھانے کے مترادف تھیں۔ اب حکمران دو مجبوریوں میں گھر جاتا ہے: نہ تو وہ اس راز کو عوام پر کھول سکتا ہے، نہ ہی اس وزیر یا نائب السلطنت سے درگزر کر سکتا ہے۔ مجبوراً اسے کوئی ایسا فیصلہ کرنا پڑتا ہے جو بظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ حکمران جانتا ہے کہ عوام تو کجا خواص بھی اسے معذور نہیں سمجھیں گے۔ لیکن ضرورت کی حالت میں کسی کی نکتہ چینی کی پروا نہیں کی جاتی۔'' (البيان والتبيين للجاحظ : ۲۴۲/۳)

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ آج کل مختلف ممالک کے مسلم حکام اور افسران جس طرح شک و شبہے کی بنیاد پر مخالفین کو ماورائے عدالت قید و بند، تشدد اور قتل کا نشانہ بناتے ہیں، وہ بھی ٹھیک ہے اور اسلامی شریعت انہیں اس کی گنجائش دے رہی ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو ہم اس لیے حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ وہ مجتہد تھے۔ آج کل کا بھلا کونسا حاکم مجتہد ہے؟ اگر کوئی ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہے تو اسے کم از کم شرع اور قانون کے ماہرین سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مرض الوفات میں عبداللہ بن یزید ان کی عیادت کے لیے آئے۔ ان کے والد نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے بارے میں درگزر کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس بات کو یاد کر کے کہا:

''اللہ تمہارے والد پر رحمت فرمائے، انہوں نے حُجر بن عدی کے معاملے میں مجھے خیر خواہانہ مشورہ دیا تھا اور ان کے قتل سے منع کیا تھا۔''[1]

حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے اور ان کے قتل کے صدمہ انگیز واقعے سے متاثر ہو کر علماء نے انہیں شہید کا درجہ دیا خصوصاً اس لیے کہ وہ ایک تاویل کی بنا پر حکومت کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور اپنے طور پر حق کے لیے لڑ رہے تھے۔ پھر وہ اپنی بیعت کی تجدید کر کے گویا اپنی غلطی کا اعتراف کر چکے تھے۔ اس لیے ان کے کردار کی بلندی پر حرف نہیں آ سکتا۔ ان کا قتل ایک بڑا سانحہ تھا مگر شاید یہ ان کی لغزشوں کی معافی اور درجات میں بلندی کا سبب ہو۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت حُجر بن عدی چونکہ ایک عابد و زاہد انسان تھے، اور ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ انہوں نے حضرت مُعاویہ کی حکومت کے خلاف جو کچھ کیا، اس کا منشا طلبِ اقتدار تھا، اس لیے غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے خروج کا ارتکاب کسی تاویل کے ساتھ ہی کیا ہوگا، اس لیے ان کا ذکر بھی ادب و احترام کے ساتھ ہونا چاہیے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض علماء مثلاً شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موت کے لیے شہادت کا لفظ استعمال کیا۔''[2]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ سختی برتنا اپنے طور پر اسلامی ریاست کے امن و امان کو باقی رکھنے اور فتنہ و فساد سے حفاظت کے لیے تھا۔ لہٰذا اس قضیے کو بنیاد بنا کر ان پر طعن و تشنیع درست نہیں۔ اس دور کے اکابر نے بھی افسوس کا اظہار ضرور کیا تھا مگر کسی نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی کیوں کہ فیصلے کی لغزش اور ظلم و ستم کا فرق وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ دونوں سے راضی ہو اور ان کے درجات مزید بر مزید بلند فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

---

① تاریخ دمشق: ۲۳۱/۱۲، تعجیل المنفعۃ لابن حجر: ۳۶۸/۲، ط دار البشائر

② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۲۲۶، ۲۲۷



② یزید کی ولی عہدی

ہر دوراندیش حکمران کی طرح حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی چاہتے تھے کہ ملک اندرونی اور بیرونی طور پر مضبوط و مستحکم ہو۔اس لیے وہ نظام میں ایسی تبدیلیاں لانا ضروری سمجھتے تھے جن سے خانہ جنگی کا خطرہ ختم ہوجائے۔اسی لیے انہوں نے عربوں کی سیادت وقیادت کو منظم اور مستحکم کیا تھا اور اپنی قبائلی طاقت پر زیادہ اعتماد کیا جس کے باعث ناگزیر طور پر بنوامیہ کی بالادستی قائم ہوئی۔چونکہ عموماً انتقالِ اقتدار کا مرحلہ خانہ جنگی کا محرک بنتا تھا،اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خطرہ تھا کہ ان کی وفات پر کہیں پھر کوئی بحران نہ پیدا ہوجائے۔وہ انتقالِ اقتدار کو ایسے جھمیلوں سے دور رکھنا چاہتے تھے جو آراء کے تضاد اور مرکز گریزی کا سبب بنیں۔وہ دوسری مملکتوں کے انداز واطوار میں سے بعض چیزیں نظریۂ ضرورت کے تحت اختیار کرنے کے بھی قائل تھے اور اس کی شرعی گنجائش بھی تھی۔[1]

دریں حالات اپنی حکومت کے سولہویں سال (۵۶ ہجری میں) حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک غیر معمولی قدم اٹھایا اور اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین نامزد کردیا۔اگرچہ صحابہ کرام جیسی افضل شخصیات کی موجودگی میں ایک کم تر فرد کو جانشین بنانا عجیب تھا مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی حکومت کا اکثر دارومدار بنوامیہ اور اہلِ شام کی طاقت پر ہے۔پس اگر خاندان سے باہر کے کسی افضل شخص کو ولی عہد بنادیا گیا تو یہ لوگ قبائلی عصبیت کی بناء پر اسے برداشت نہیں کریں گے اور اُمت خانہ جنگی میں مبتلا ہوجائے گی۔[2]

---

① علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

''جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے ملے اور انہیں شاہانہ شان وشوکت اور کروفر کے ساتھ دیکھا تو کہا: ''اے مُعاویہ! یہ کسروی طور طریقے کیسے؟'' حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''امیر المؤمنین! ہم دشمنوں کی سرحدوں پر ہیں۔ان کے مقابلے میں ہمیں اپنی جنگی تیاری اور جہادی سجاوٹ ظاہر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہوگئے اور ان کی تردید نہیں کی؛ کیوں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک صحیح چیز اور ایک دینی مقصد بیان کرکے اپنے فعل کی دلیل دی تھی۔اگر بادشاہت کی برائی کا مطلب اسے مطلقاً چھوڑ دینا ہوتا تو یہ جواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطمئن نہ کرتا بلکہ وہ انہیں یہ سب کچھ چھوڑ دینے کا حکم دیتے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد ''کسروی طور طریقوں'' سے وہ انداز حکومت تھا جس کے فارسی حکمران عادی تھے جو بے دینی، ظلم، سرکشی اور حقوق کی پامالی اور اللہ سے غفلت پر مبنی تھی۔حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں بتادیا کہ مقصد، کسروی طور طریقے نہیں بلکہ مقصد اللہ کی رضا ہے۔''

(تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۲۵۴، مقدمۃ، فصل ۲۸ باب فی انقلاب الخلافۃ الی الملک)

② بعد کے حالات نے اس خدشے کو بالکل درست ثابت کیا، چنانچہ بعد میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو باقی تمام اُمتِ مسلمہ نے ان کی بیعت کرلی مگر اموی امراء نہ مانے اور ان کے خلاف شمشیر بکف ہوگئے۔انہوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی صحابیت، علم وفضل اور فضائل ومناقب کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے اپنی حکومت منانے پر اصرار جاری رکھا اور نوسالہ طویل خونریزی کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کرکے چھوڑا اور آخرکار اپنا اقتدار قائم کرکے ہی دم لیا۔

جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کے دو پہلو تھے:

ایک اپنے بعد کے لیے جانشین مقرر دینا تاکہ امت متحد اور متفق رہے۔ یہ بالکل درست تھا۔

دوسرا پہلو تھا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا۔ اس دوسرے پہلو میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے خطائے اجتہادی ہوئی، انتظامی رائے اور سیاسی تدبیر کے درجے میں یہ فیصلہ درست ثابت نہیں ہوا۔ تاہم وہ اپنے اس فعل میں نیک نیت، مخلص اور امت کے خیر خواہ تھے۔ ان کے پاس ایسے دلائل ضرور تھے جن کی بنا پر انہوں نے یہ قدم اٹھایا اور ان کا یہ فیصلہ بہر حال شرعی جواز کی حدود میں تھا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں اگلے خلیفہ کا اہلِ شام کے نزدیک مقبول ہونا بہت ضروری تھا ورنہ مرکز میں انتشار پیدا ہوتا اور پورا عالمِ اسلام متاثر ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے انتقالِ اقتدار کا اختیار اپنے پاس رکھا اور اپنے رفقاء کی مشاورت سے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ اگرچہ اس طرح بات ملوکیت یا موروثی حکومت کی طرف جا رہی تھی مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ اگر اصل مقصد یعنی شریعت کی بالادستی قائم رہے تو موروثی حکومت کی گنجائش ہے کیوں کہ اس کی ممانعت پر قرآن وسنت کی کوئی قطعی اور صریح نص موجود نہیں بلکہ "إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا"[1] اور "وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ"[2] جیسی قرآنی نصوص سے فی نفسہٖ ملوکیت اور موروثی حکومت کی رخصت ثابت ہوتی ہے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جو چیز حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو دوسروں کی جگہ یزید کو ولی عہد بنانے کا محرک بنی، وہ امت کے اتحاد واتفاق کی مصلحت تھی۔ بنواُمیہ کے اربابِ حل وعقد اس پر متفق تھے۔ اس وقت وہ اپنے علاوہ کسی پر راضی نہیں تھے۔ وہ قریش کا سب سے مضبوط گروہ تھے اور اہلِ ملت کی اکثریت انہی سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ترجیح دی اور افضل کی جگہ غیر افضل کو چنا، یہ اتحاد اور اتفاقِ رائے کے لیے ہی کیا جس کی شریعت میں بہت اہمیت ہے۔"[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ یزید خلافت کا اہل ہے۔ باپ کی بیٹے سے شدید طبعی محبت کے ساتھ ساتھ یزید کی دنیوی شرافت، اس میں شہزادوں جیسی خصوصیات، عسکری امور سے واقفیت، حکومتی نظم و نسق چلانے کی قابلیت اور اس کی ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت کی وجہ سے ان کی یہ رائے بنی...... اور ان کا گمان تھا کہ صحابہ کرام کے فرزندوں میں سے کوئی اس انداز سے ملکی انتظام نہیں سنبھال سکے گا۔"[4]

---

① بیشک اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ (سورۃ النمل، آیت: ۱۲)

② سلیمان علیہ السلام وارث بنے داؤد علیہ السلام کے۔ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۴۷)

③ تاریخ ابن خلدون: ۱/۲۶۳ مقدمہ

④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۳۰۸، دار ھجر۔

یزید کو ولی عہد بنانے کی وجوہ:

غالباً شروع میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یزید کی جانشینی کا کوئی خیال نہ تھا۔ایک بار حاکمِ عراق زیاد نے حضرت قَبیصہ بن جابر کو کسی کام سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دِمشق بھیجا۔انہوں نے دورانِ گفتگو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا:''آپ کے بعد خلافت کی ذمہ داری کون سنبھالے گا؟''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''معاملہ مسلمانوں کی جماعت کے درمیان رکھا جائے گا، یہ لوگ چن لیں گے قریش کے شریف النفس آدمی سعید بن العاص کو، یا حیاء و پرہیز گاری اور سخاوت میں قریش کے جوان عبداللہ بن عامر کو، یا شریف پیشوا حسن بن علی کو، یا قاریٔ قرآن، عالمِ دین اور حدودِ شریعہ کے سخت پابند مروان بن حکم کو، یا مردِ فقیہ عبداللہ بن عمر کو، یا ذہین و ہوشیار انسان عبداللہ بن زبیر کو۔''[1]

یہ واقعہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی زندگی (یعنی سن ۴۹ھ ہجری یا اس سے پہلے) کا ہے۔اس معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں بھی امرِ خلافت کو شورائیت سے طے کرنے کے سوا کوئی اور بات نہیں تھی، اور ان کے نزدیک خلافت کے حق دار دوسرے حضرات ہی تھے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کی جانشینی کا خیال حالات کی تبدیلی کے ساتھ بعد میں آیا، جسے غور وخوض کے بعد انہوں نے عملی جامہ پہنایا۔غالباً سوچ بچار کا یہ وقت سن ۴۹ ہجری سے ۵۲ ہجری تک تھا۔اس دوران حضرت حسن رضی اللہ عنہ دنیا سے رخصت ہوئے،ان سے محبت کے دعوے داران کی پالیسی کے برخلاف شورش پسندی کی طرف مائل ہوئے۔کوفہ میں بغاوت کا خطرہ ہوا اور ۵۱ھ میں حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ کی قیمتی جان اس کی نذر ہوئی۔شاید ان حالات کے باعث حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت کا معاملہ مسلمانوں کی شوریٰ کے سپرد کرنے پر اطمینان نہ رہا۔

اس دوران ۵۰ھ میں یزید نے قُسطَنطِینیَّہ کی مہم کی کمان کی اور ۵۱ھ میں امارتِ حج کی ذمہ داری نبھائی جس سے حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اطمینان ہوگیا کہ بیٹے میں قیادت کی صلاحیت ہے۔ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر انہوں نے یزید کو جانشین بنانے کا فیصلہ کرلیا اور اس بارے میں بعض امراء سے مشورہ بھی کیا۔

[1] تاریخ ابی زُرعه الدمشقی (م ۲۸۱ھ): ۱/۵۹۲، عن عبداللہ بن مبارک بسند صحیح. رجاله رجال البخاری و مسلم، الا احمد بن شبویه و هو ثقة ایضاً. ونقله الحافظ ابن کثیر فی البدایة والنهایة: ۱۱/۳۲۰

نوٹ: مشہور ہے کہ یزید کی ولی عہدی کا خیال ذاتی مفادات پر مبنی تھا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کے بہکانے پر یزید کی ولی عہدی کا فیصلہ کیا مگر یہ بات بالکل بے بنیاد ہے؛ کیوں کہ حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کی وفات سن ۵۰ھ میں ہوئی اور یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ سن ۵۶ھ میں شروع ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مکروفریب اور جبر وتشدد کے بل بوتے پر بیٹے کے حق میں استصواب رائے کرایا۔حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم جیسے اکابر کو ڈرایا دھمکایا، لالچ بھی دیا، ان کے سر پر شمشیر بکف جلاد کھڑے کر دیے کہ اگر یہ لبّیک کریں تو سر کاٹ دینا...... پھر مجمع عام میں جاکر جھوٹا اعلان کر دیا کہ ان حضرات نے بیعت کر لی ہے۔

اس قسم کی روایات انتہائی ضعیف ہیں جو ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔اس حصے کے آخر میں ہم باب ''دورِ صحابہ سے متعلق اہم شبہات کے جوابات'' کے ذیل میں ایسی روایات کی حقیقت بیان کریں گے۔ نیز حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کی گراں قدر تصنیف ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق'' کا مطالعہ کیا جائے جس میں اس قسم کے اعتراضات کا نہایت عمدہ محاکمہ کیا گیا ہے۔

طبری کی روایت ہے:

”جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کے لیے بیعت لینے کا ارادہ کیا تو زیاد کو خط لکھ کر مشورہ مانگا۔ زیاد نے عُبید بن کعب کو بلوا کر یہ ماجرا سنایا اور کہا: ”امیر المؤمنین کو اس معاملے میں لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ ہے اور وہ ان کی تائید چاہتے ہیں اور مجھ سے مشورہ مانگ رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مسئلہ اور بڑی ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ یزید میں کچھ لاابالی پن ہے اور وہ شکار کا بھی بہت شوقین ہے۔ تم امیر المؤمنین سے جا کر میری طرف سے یزید کے مشاغل سے آگاہ کر دو اور کہہ دو کہ وہ اس معاملے میں جلدی نہ کریں۔“ عُبید نے کہا: ”امیر المؤمنین کو اپنے بیٹے سے بددل کرنا مناسب نہیں، میں یزید سے جا کر ملتا ہوں، اسے بتاؤں گا کہ امیر المؤمنین اسے ولی عہد بنانے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ وہ ایسے مشاغل کو چھوڑ دے تاکہ لوگوں کو حرف گیری اور مخالفت کا بہانہ نہ ملے۔“ زیاد نے اس رائے کی تائید کی اور عُبید کو یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ عُبید کے سمجھانے سے یزید نے اپنے بہت سے معمولات ترک کر دیے۔“①

اکابرِ مدینہ کے یزید کی ولی عہدی پر تحفظات:

اکابرِ مدینہ کا عالمِ اسلام کی سیاست میں اہم ترین کردار تھا۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ہم آہنگ بنانے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے خاص طور پر عراق کے گورنر زیاد کو مدینہ منورہ بھیجا تاکہ وہ اہل مدینہ کو قائل کرے۔ زیاد نے تقریر کر کے لوگوں کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی مگر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور بولے:

”اے بنو امیہ! تم ہماری تین باتوں میں سے کسی کو اختیار کر لو: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سنت کو لے لو۔ یہ معاملہ ان سب کو پیش آیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے گھرانے میں اس منصب کے اہل موجود تھے مگر انہوں نے معاملہ مسلمانوں کی جماعت کے سپرد کر دیا۔ تم قیصری نظام لانا چاہتے ہو کہ جب ایک قیصر مرے تو دوسرا مسلط ہو جائے۔“②

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ مدت بعد یہی کام مروان کو سونپا جسے ۵۴ھ میں دوسری بار مدینہ کا گورنر بنایا گیا تھا۔ مروان نے یزید کی ولی عہدی کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا: ”یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سنتِ راشدہ ہے۔“

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے پھر اعتراض کیا③ اور کہا: ”یہ قیصر ہرقل کا طریقہ ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر اور برادری کو بھی چھوڑ کر بنو عدی کے ایک شخص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو فقط یہ دیکھ کر منتخب کیا کہ وہ اس کام کا اہل ہے۔“④

① تاریخ الطبری: ۳۰۳/۵ ② التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ بالسفر الثالث: ۷۱/۲، ح: ۱۷۸۷ عن محمد بن زیاد الجمحی، رجالہ ثقات
زیاد کی مدینہ آمد کا یہ واقعہ ۵۳ ہجری یا اس سے پہلے کا ہے؛ کیوں کہ ۵۳ ہجری میں زیاد کی وفات ہو گئی تھی۔ (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۹)
③ صحیح البخاری، ح: ۴۸۲۷، کتاب التفسیر، باب الذی قال لوالدیہ اف لکما .... قرائن سے ثابت ہے کہ یہ واقعہ ۵۴ ہجری کا ہے۔
④ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۰۵٦۷؛ السنن الکبری للنسائی: ۴۵۸/٦، ۱۱۴۲۷ باسناد مرسل عن محمد بن زیاد الجمحی (م ۱۲۰ھ)؛ تفسیر ابن ابی حاتم: ۲۲۴/۱۲ عن اسماعیل بن ابی خالد

یزید کی بیعت سے اکابرِ مدینہ کی لاتعلقی:

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے بھی یزید کی ولی عہدی سے بے رغبتی ظاہر کی۔ [1] اُمت کے افضل ترین افراد یعنی عشرۂ مبشرہ کے آخری دو بزرگوں: سعید بن زید اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی رائے بہت اہم تھی۔ خلافتِ راشدہ میں نافذ کردہ ایک ضابطے کے مطابق ان کے بغیر امرِ خلافت طے ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ [2] مگر ان دونوں اکابر نے بیعت میں قطعاً کوئی دلچسپی نہ لی۔ مروان خاصی دیر سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا منتظر رہا۔ [3] آخر ایک شامی سپاہی انہیں بلانے گیا۔ انہوں نے ''عن قریب آؤں گا'' کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔ [4] شامی سپاہی نے دھمکی دی کہ ''تم چلو ورنہ تمہاری گردن ماردوں گا۔'' مگر سعید بن زید رضی اللہ عنہ مرعوب نہ ہوئے [5] اور مروان کے پاس نہ گئے۔ [6] اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی گوشہ نشین رہے۔ [7]

بیعت سے اعراض کرنے والے اکابر کے دلائل:

ان اکابر کا یزید کی ولی عہدی قبول کرنے سے گریز کرنا بلاوجہ نہ تھا۔ ان کے نزدیک انتقالِ اقتدار کا یہ طرز درست نہیں تھا اگرچہ اولاد کو حکومت کا وارث بنانے کی ممانعت پر کوئی نصِ قطعی موجود نہ تھی مگر بعض شرعی احکام سے اس طرز کے نامناسب ہونے کا واضح اشارہ ملتا ہے مثلاً کسی عدالتی قضیے میں باپ کی گواہی بیٹے کے حق میں قبول نہیں کی جاسکتی، پس اُمت کے معاملے میں باپ کی طرف سے بیٹے کی قابلیت پر گواہی مشکوک ہوگی۔ باپ بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیوں کہ اس پر اُمت کے فقراء کا حق ہے، پس امت کی قیادت بھی امانت ہے جو بیٹے کو سونپ دینا کم از کم مشکوک ضرور ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسا کوئی عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ تھا بلکہ ان حضرات نے اپنی اولاد اور اقارب کو مناصب میں پیچھے اور قربانیوں میں آگے رکھا۔ یہ نیا طرز بادشاہت کے مشابہ تھا جس میں موروثی حکومت چلتی ہے اور اہلیت کا لحاظ کیے بغیر اقتدار نسل در نسل منتقل ہوتا ہے، لہٰذا خطرہ تھا کہ آگے چل کر اسلامی نظامِ سیاست پر بھی بادشاہت کی چھاپ نہ لگ جائے اور اُمت کی سیادت وقیادت پر نااہل لوگ مسلط نہ ہوجائیں۔

علاوہ ازیں یزید کا کردار بھی اس درجے کا نہ تھا کہ اُمت کا اعلیٰ ترین منصب اسے بلا تأمل سپرد کردیا جاتا جیسا کہ

---

[1] العلل ومعرفة الرجال لاحمد رواية ابنه عبدالله، تر: ۴۷۴۸ [2] عن عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ عن عمر رضی اللہ عنہ: قال: هذا الامر فی اهلِ بدر ما بقی منهم احدٌ، ثم فی اهلِ اُحُد مابقی منهم اَحَدٌ (طبقات ابن سعد: ۳۴۲/۳)

نوٹ: سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ مدینہ سے تین میل (پونے ۵ کلومیٹر) دور مضافاتی بستی عقیق میں سکونت پذیر تھے۔ وہیں دونوں کی وفات ہوئی تھی۔ (مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی دفن المیت) عقیق کے جغرافیائی تعین کے لیے دیکھیے: معجم البلدان: ۱۳۹/۴

[3] الآحاد والمثانی، ح: ۲۲۶، ط دار الرایة ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۵۰/۱ [4] التاریخ الاوسط للبخاری: ۱۱۲/۱

[5] تاریخ دمشق: ۸۸/۲۱ باسناد صحیح [6] المستدرک للحاکم، ح: ۵۸۵۳ بسند حسن

[7] عام غلط فہمی ہے کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یزید کی ولی عہدی کے اعلان سے قبل فوت ہوچکے تھے مگر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی تجہیز وتکفین اور غسل میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا شامل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ یزید کی ولی عہدی کے وقت زندہ تھے تو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھی اس وقت بقیدِ حیات ہونا خود ثابت ہوجاتا ہے۔ ملاحظہ کریں: مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۱۱۱۳۹، بسند صحیح ؛ السنن الکبری للبیهقی ح: ۱۴۶۹؛ وذکره البخاری فی الصحیح تعلیقاً باب غسل المیت ووضوئه بالماء والسدر.

خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دستِ راست زیاد کی بھی ذاتی رائے یہی تھی کہ یزید خلافت سنبھالنے کے قابل نہیں۔ ①

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی یزید کی ولی عہدی کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر اس ماحول کو پیشِ نظر رکھا جائے جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں۔ ظاہر ہے جس ماحول میں حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم وغیرہم جیسے جلیل القدر صحابہ، صلحائے امت اور مدبرین موجود ہوں، اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لیے نا اہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں۔" ②

ان حضرات کے اختلافِ رائے کے پیشِ نظر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خود مل کر انہیں حکمت و تدبیر کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش کی۔ ۵۶ھ میں وہ حج کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ اس وقت تک حضرت سعید بن زید اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما دونوں وفات پا چکے تھے۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی توجہ دیگر حضرات کی طرف تھی جن میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم اہم ترین تھے، مگر یہ تینوں یزید کی بیعت سے بچنے کے لیے مسجد الحرام میں پناہ لینے مکہ روانہ ہو گئے۔ ③ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے پیچھے مکہ پہنچے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا: "ابن عمر! آپ کہا کرتے تھے کہ آپ کو ایک رات بھی کسی حکمران کے بغیر گزارنا پسند نہیں۔ دیکھئے! اب آپ کہیں کچھ ایسا نہ کر بیٹھیں کہ مسلمانوں میں انتشار اور فتنہ و فساد پیدا ہو جائے۔"

انہوں نے جواب دیا: "بیٹے گزشتہ خلفاء کے بھی تھے، آپ کا بیٹا ان سے بڑھ کر نہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے وہ نہ سوچا جو آپ اپنے بیٹے کے لیے سوچ چکے ہیں، جہاں تک مسلمانوں میں انتشار اور فساد پھیلانے کی بات ہے تو میں ایسا کرنے والا نہیں۔ جب لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے تو میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا۔" ④

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا: "ایک ہی وقت میں دو، دو افراد کی بیعت کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ خود ہی تو یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ جب دو خلیفوں کی بیعت ہو تو دوسرے کو قتل کر دیا جائے۔" ⑤

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس فیصلے کے خلاف تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی ان سے بھی گفتگو ہوئی مگر کوئی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا۔ اس کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان حضرات کو ان کے حال پر چھوڑ کر شام تشریف لے گئے۔ ⑥

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے: "حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسین بن علی، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں چھوڑ دیا تھا۔" ⑦

① تاریخ الطبری: ۳۰۳/۵ ② حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۳

③ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱۰۳/۱ باسناد حسن، ط دار الوعی ④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۱۳، ۲۱۴

⑤ تاریخ خلیفۃ، ص ۲۱۳؛ المعجم الاوسط، ح: ۳۸۸۵ باسناد حسن؛ مجمع الزوائد، ح: ۹۰۱۱؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۱۴/۱۹

⑥ مجمع الزوائد، ح: ۹۰۰۹ ⑦ موسوعۃ اقوال امام احمد: ۱۵۸،۱۵۷/۴

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی وفات:

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی شام واپسی کے بعد مکہ سے مدینہ روانہ ہوئے مگر مکہ سے دس میل (۱۶کلومیٹر) دور ''کوہِ حُبْشِـیّ'' میں وفات پا گئے، انہیں مکہ لے جا کر دفنا دیا گیا۔[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اگلے سال حج پر تشریف لائیں تو قبر پر آ کر کہا: ''اگر میں ہوتی تو جہاں یہ فوت ہوئے تھے وہیں دفن کراتی۔''

پھر یہ اشعار پڑھے:

وَ كُنَّا كَنَدْمَانَىْ جَذِيْمَةَ حِقْبَةً.....مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰى قِيْلَ لَنْ يَتَصَدَّعَا

ہم جذیمہ کے دو رفیقوں کی طرح ایک طویل زمانے تک ساتھ رہے

یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَأَنِّي وَ مَالِكًا.....لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلَةً مَعَا

مگر جب ہم جدا ہوئے تو گویا میں اور (میرا رفیق) مالک

طویل مدت کے ساتھ رہنے کے باوجود گویا ایک رات بھی ساتھ نہیں رہے تھے۔[2]

عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کا اختلافِ رائے، نصیحت اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب:

دیگر حضرات کو بھی یزید کی ولی عہدی پر تحفظات تھے۔ مثلاً حضرت عَمرو بن حزم انصاری رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے دِمشق جا کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے یزید کی ولی عہدی کے بارے میں صاف صاف باتیں کیں، ان کا زور اس پر تھا کہ یزید کو ولی عہد نہ بنایا جائے۔ انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی:

''اللہ نے بندے کو جن کی ذمہ داری سونپی ہو، ان کے بارے میں وہ قیامت کے دن اس سے ضرور پوچھے گا۔''

یہ کہہ کر حضرت عَمرو بن حزم انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مُعاویہ! میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اچھی طرح سوچ لیں، اپنے بعد کس کو امتِ محمدیہ کا نگران بنا کر جا رہے ہیں۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قیامت کے دن کی جواب دہی کے خیال سے سرد موسم میں بھی پسینہ پسینہ ہو گئے۔ پھر اللہ کی حمد و ثنا کر کے فرمایا: ''آپ خیر خواہ انسان ہیں، اپنی رائے کا اظہار کر دیا اور خوب کھل کر کیا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس وقت یا تو میرا بیٹا موجود ہے یا دیگر صحابہ کے بیٹے۔ اور میرا بیٹا ان کے بیٹوں سے زیادہ اہل ہے۔''

اس کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔[3]

---

① التاریخ الاوسط للبخاری: ۱/۱۰۳ باسناد حسن، ط دار الوعی، تاریخ ابی زُرعة الدمشقی: ۱/۲۲۹

② سنن الترمذی، ح: ۱۰۵۵، ابواب الجنائز، باب ما جاء فی الرخصة فی زیارة القبور ..... ام المؤمنین نے یہ اس لیے فرمایا کہ شرعاً میت کی تدفین اسی علاقے کے قبرستان میں ہونی چاہیے جہاں وفات ہوئی ہو۔ دوسری جگہ منتقل کرنا مناسب نہیں۔ القتیل او المیت یستحب لهما ان یدفنا فی المکان الذی قتل او مات فیه فی مقابر اولئک القوم لما روی عن عائشة رضی الله عنها انها زارت قبر اخیها ..... الخ (البحر الرائق: ۲/۲۱۰)

③ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۳۱۷ بسند صحیح، ط دار المامون

مدبرِ عراق، اَحنف بن قیس کی رائے:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اختلاف رائے کی قدر کرتے تھے، تاہم اپنے طور پر وہ سمجھتے تھے کہ یزید کی تقرری میں بہتری ہے۔ آخر میں انہوں نے سرکاری عمائد کو دِمشق بلا کر ان سے بات کی۔ خراسان کے فاتح اور عراق کے مدبرِ اعظم اَحنف بن قیس رحمہ اللہ بھی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہ تھے، جب ان سے رائے لی گئی تو ان کا جواب تھا: ''یزید کے شب وروز اور ظاہر وباطن سے آپ زیادہ واقف ہیں۔ ہمارا کام ہے سننا اور ماننا۔ آپ کا کام ہے اُمت کی خیرخواہی کرنا۔''[1]

بہرکیف دِمشق میں مدعو کیے گئے شرکائے مجلس نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور پورے عالمِ اسلام میں گورنروں کے ذریعے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے لی گئی۔[2]

یزید کی ولی عہدی اور جمہور علماء کا مسلک:

یزید کی ولی عہدی کے بارے میں جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس مسئلے میں انہی حضرات کی رائے زیادہ درست اور زیادہ مناسب تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے۔ اگرچہ وقتی حالات کے تحت انعقادِ خلافت اس طرح بھی ہو جاتا ہے جیسے یزید کے معاملے میں ہوا۔ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یقیناً افضل یہ تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس قضیے کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار کو بھی اس کے لیے مقرر نہ کرتے چہ جائے کہ بیٹے کو...... لیکن انہوں نے افضل صورت کو ترک کر دیا۔''[3]

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب جمہور کے موقف کے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- **حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا لیکن ان کا عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ہی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس کی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظامِ شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔**

- **بلاشبہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یزید کا فسق وفجور کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں، اس لیے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جا سکتا تھا لیکن امت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت وتقویٰ بلکہ ملکی انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بدرجہا بلند مقام رکھتے تھے،**

---

(1) البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۷/۱۱ (2) العقد الفرید: ۱۱۸،۱۱۷/۵ عن المدائنی ؛ مُرُوج الذهب: ۲۱۹،۲۱۸/۳، ط الجامعۃ اللبنانیۃ

نوٹ: مشہور ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کے لیے صحابہ کی وفاداریاں رشوت دے کر خریدنے کی کوشش کی۔ ایسی اکثر روایات ضعیف بلکہ موضوع ہیں، البتہ صحیح سند کی ایک دو روایات ہیں مگر ان کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ان بزرگوں کو عطیات اور ہدیے دینے کا معمول تھا۔ یزید کی ولی عہدی والے سال بھی ہدایا ارسال کیے، کچھ مدت بعد جب یزید کی بیعت کا مطالبہ پیش کیا۔ (جس کا در حقیقت اس ہدیے سے کوئی تعلق نہ تھا) تو یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ وہ رقم دراصل سیاسی رشوت تھی جس کا مقصد اس تحریک میں ہم نوائی حاصل کرنا تھا۔ حالاں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نیت یہ نہیں تھی۔

(3) العواصم من القواصم، ص ۲۲۸، ط دار الجیل

اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلاشبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے۔ یہ درست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے (بشرطیکہ اس میں شرائط خلافت موجود ہوں) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو تمام امت میں اس منصب کا سب سے زیادہ لائق ہو۔

⑤ نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا شرعاً جائز تو ہے لیکن ایک طرف موضع تہمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے۔ اس لیے تمام خلفائے راشدین نے اس سے پرہیز کیا۔"[1]

ذاتی کردار کے لحاظ سے یزید کی اہلیت......!

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہو کر جن لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کو قبول کیا، ان کا موقف بھی شرعی حدود سے باہر نہیں تھا۔ ولی عہدی کی شرائط کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یزید کا عاقل، بالغ، مسلمان، تندرست اور قریشی ہونا ایسے حقائق ہیں جن پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک جہادی مہم کا قائد اور امیرِ حج بھی رہ چکا تھا جس سے اس میں جنگجوئی اور انتظام کی کسی نہ کسی درجے میں صلاحیت ثابت ہوتی تھی۔ پس اس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے یہ مان لینے کی گنجائش بھی موجود تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے۔

جہاں تک یزید کے شراب نوشی اور دوسری بدکاریوں میں ملوث ہونے کا سوال ہے، تو جو روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان حرکتوں کا عادی تھا وہ ضعیف اور درایتاً مشکوک ہیں۔[2]

ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ قائدانہ لیاقت اور دینی تصلب میں اس دور کے دیگر قابل اور صالح لوگوں سے خاصا پیچھے تھا۔ اس میں تدبر کی بھی کمی تھی۔ طبیعت میں عجلت پسندی، غیر مستقل مزاجی اور لاابالی پن واضح تھا، جیسا کہ خلیفہ بننے کے بعد اس کے متعدد فیصلوں نے ثابت کیا۔ نیز وہ تفریحی مشاغل میں محتاط حد سے زیادہ مشغول رہتا تھا۔[3]

---

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۴، ۱۵

② جیسا کہ بعض ضعیف روایات میں منقول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کے پینے پلانے سے آگاہ ہو کر اسے مشورہ دیا تھا کہ یہ مشغلہ لوگوں سے چھپ کر کیا کرو۔ ظاہر ہے ان روایات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ یہاں الزام صرف یزید پر نہیں ہے بلکہ ایک صحابی پر گناہِ کبیرہ کی اجازت دینے کا الزام عائد ہو رہا ہے۔ ہم شروع میں اسلاف کا یہ اصول پیش کر چکے ہیں کہ صحابی پر طعن کے لیے ضعیف روایت ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ دوسری طرف بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید چاہے عابد و زاہد نہ سہی مگر ضروری دین داری سے عاری بھی نہ تھا جیسا کہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے یزید کے بارے میں فرمایا تھا: "میں نے اسے نماز کا پابند، خیر کا طلب گار، فقہی مسائل پوچھنے والا اور سنت کا اہتمام کرنے والا پایا ہے۔" (ذکرہ الذھبی فی تاریخ الاسلام: ۵/۲۷۴، ت تدمری باسناد ضعیف منقطع، ونقلہ ابن المنظور فی مختصر تاریخ دمشق: ۲۸/۲۸، والحافظ فی البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/۶۵۳ بلا اسناد)

و نری البلاذری ھو یذکر ھذہ القضیۃ بسیاق آخر مفصل یتضح بہ شخصیۃ یزید وضوحاً کاملاً: "و کان یزید یصنع لابن الحنفیۃ ویسألہ عن القرآن والفقہ." (انساب الاشراف: ۳/۲۷۸، ط دار الفکر)

محمد بن حنفیہ کی یہ روایت اگرچہ سنداً حد درجے ضعیف ہے اور چھٹی صدی ہجری سے قبل کے کسی ماخذ میں اس کا حوالہ دستیاب نہیں، نیز اس کی سند میں بھی طویل انقطاع ہے مگر ہم اسے یزید کی ولایت کے ثبوت یا اس کے دورِ حکومت میں اس سے فسق کی نفی کے لیے پیش نہیں کر رہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ولی عہد بنتے وقت وہ ایسا کھلم کھلا بدکردار نہ تھا کہ اسے ولی عہد بنانے کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہوتی۔

③ تاریخ الطبری: ۵/۳۰۲

اگر یہ کردار کسی عام آدمی کا ہوتا تو شاید اس پر کسی کو بھی اعتراض نہ ہوتا، مگر چونکہ یزید کو مستقبل کے خلیفہ کی حیثیت سے دیکھا جارہا تھا اس لیے یہ عیوب بہت گراں محسوس ہوتے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اپنی صف میں شامل خواص جیسے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ، اَحنف بن قیس رحمہ اللہ اور زیاد بن ابی سفیان کا یزید کی ولی عہدی سے ذاتی طور پر متفق نہ ہونا غالباً یزید کے کردار میں اسی قسم کی کمی کی وجہ سے تھا۔ جبکہ اکابرِ مدینہ کا اعراض اس وجہ سے بھی تھا کہ وہ اسلامی شورائیت و محدودترا اور مسلمانوں کے سیاسی نظام کو موروثی حکومت میں تبدیل ہوتا دیکھ رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ یزید کی کمزوریاں یقیناً امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے پوشیدہ نہیں ہوں گی مگر انہیں امید ہوگی کہ ذمہ داری کا بوجھ پڑنے کے بعد ان عیوب کا ازالہ ہوجائے گا۔[1] انہیں یہ بھی یقین ہوگا کہ نظامِ مملکت میں شامل اعلیٰ صلاحیتوں کے امراء اور مشیروں کی رہنمائی یزید کو ہر قدم پر حاصل رہے گی جس کی وجہ سے وہ غلط اقدامات سے محفوظ رہے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود بھی یزید کو اپنے تجارب کی روشنی میں ایسی وصیتیں اور نصیحتیں کرتے رہتے تھے جن کو پیشِ نظر رکھ کر وہ ایک کامیاب حکمران بن سکتا تھا۔[2]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی دعا اور استخارہ:

آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں استخارے اور دعاؤں کا اہتمام بھی کیا تھا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے جمعے کے دن منبر پر یہ دعا کی تھی: ''یااللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یزید کو اس کی اہلیت کی وجہ سے ولی عہد بنایا ہے تو اس منصب کی تکمیل کردے جو میں نے اسے دیا ہے۔ اور اگر میں نے اسے اپنی محبت کی وجہ سے ولی عہد بنایا ہے تو اس کے لیے اس منصب کی تکمیل نہ فرما جو میں نے اسے دیا ہے۔''[3]

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے پورے اخلاص سے اور امت کی خیر خواہی کے تحت یزید کی ولی عہدی کا فیصلہ کیا تھا اور انہیں یزید کی کمزوریوں کے علم کے باوجود اطمینان تھا کہ وہ صحیح حکومت کرے گا جس کے لیے وہ ضروری انتظامات کرتے ہوئے اسے دعاؤں، گراں قدر نصائح اور قابل رفقاء کا توشہ دے کر جارہے

---

① جیسا کہ بعض شخصیات کے حالات میں دیکھا گیا کہ حکمرانی سے پہلے ناز و نعمت کی زندگی گزارتے رہے مگر قیادت کی ذمہ داری سر پر پڑتے ہی ان کے شب و روز بدل گئے۔ مثلاً: عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی۔

② اس قسم کی ایک نہایت اہم وصیت جو بیش قیمت نصائح کا مجموعہ ہے، ہم آئندہ نقل کریں گے۔

③ قال ابن کثیر: و رُوِینا عن معاویۃ انہ قال یوماً فی خطبتہ: " اللّٰھم ان کنت تعلم انی ولیتہ لانہ فیما اراہ اھل لذلک فاتمم لہ ما ولیتہ، و ان کنت ولیتہ لانی احبہ فلا تتمم لہ ما ولیتہ." (البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/۳۰۸، حوادث سنۃ ۵۶ھ)

نقلہ الحافظ ابن کثیر بصیغۃ " رُوِینا" ولم یذکر اسنادہ، وعلیک بروایۃ اخریٰ اخرجھا الذھبی:

"قال ابوبکر بن مریم عن عطیۃ بن قیس قال:" خطب معاویۃ فقال: اللّٰھم ان کنت عھدت لیزید لما رایت من فضلہ فبلغہ ما املت واعنہ وان کنت انما حملنی حب الوالد لولدہ وانہ لیس لما صنعت بہ اھلا فاقبضہ قبل ان یبلغ ذالک ."(تاریخ الاسلام ذھبی: ۴/۱۶۹، وبلفظہ نقل السیوطی فی تاریخ الخلفاء، ص ۱۵۶، ط مکتبۃ نزار)

وھذا الاسناد ایضاً منقطع، و لم اجد الروایتین فی کتب المتقدمین، فضعفھما ظاھر لانقطاع الاسناد، لکن ھذا من باب الفضائل والرقاق و فیھما مجال واسع.

تھے۔وہ بہرحال عالم الغیب نہ تھے کہ بعد کے المناک حالات کو دیکھ لیتے اور اپنے فیصلے کو تبدیل کر دیتے۔

یزید کی ولی عہدی، ایک ٹیسٹ کیس:

درحقیقت حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد بنانا ایک تجربہ یا ایک ''ٹیسٹ کیس'' تھا جس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ بعد کے نتائج سے ہوسکتا تھا۔امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس تجربے کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے تھے۔تجربے کو ناکام کہا جاسکتا ہے مگر اس کی بناء پر امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نیت پر شک کرنا، شرافت اور انصاف سے بعید ہے۔

بلاشبہ یہ تجربہ ناکام ہوا۔اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ ہوتے تو یقیناً اس قضیے کو وہیں ختم کر دیتے۔اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ انہی کے پوتے مُعاویہ بن یزید نے ایسا ہی کیا اور موروثی حکومت کے تجربے کو وہیں ختم کر کے اقتدارِ اُمت کی شوریٰ کو سونپ دیا۔(جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ ''مذہب امیر مُعاویہ دربارۂ خلافت'' کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت امیر مُعاویہ کا نظریہ خلافت کے متعلق یہ تھا کہ جس کسی کو مملکت کے انتظام کا سلیقہ دوسروں سے زیادہ ہو، گو اس سے افضل ہوں، تو دوسروں سے اس کا خلیفہ بنانا افضل ہے۔اس بات پر نظر رکھتے ہوئے یزید کو انہوں نے دوسروں سے افضل جانا۔اور اگر بالفرض دوسروں سے افضل نہ بھی جانا جاتا تو بھی اس سے زیادہ بات آگے نہیں بڑھتی کہ انہوں نے افضل کو چھوڑ دیا، جیسا کہ گزشتہ مقدمات میں واضح ہوگیا ہے کہ افضل کا خلیفہ بنانا افضل ہے نہ کہ واجب۔لیکن اتنی بات کے باعث ترکِ افضل کا گناہ ان پر نہیں تھوپا جاسکتا کہ امیر مُعاویہ کے ساتھ گالم گلوچ سے ہم پیش آئیں۔''[1]

☆☆☆

---

[1] انوار النجوم(اردو ترجمہ مکتوبات قاسمی)، ص ۱۷۴، ۱۷۵: مترجمہ مولانا پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی، فاضل دارالعلوم دیوبند

نوٹ: یادرہے کہ یہ گفتگو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کے کردار سے متعلق ہے۔حکمران بننے کے بعد یزید کا اپنے والد گرامی کی وصیتوں کو بھلا دینا اور فسق وفجور میں مبتلا ہونا ایک الگ بحث ہے۔جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ فسق میں ملوث تھا۔حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو اپنے روبرو خلیفہ کیا ہے یا نہیں؟ حضرت نے جواباً تحریر فرمایا: ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو خلیفہ کیا ہے۔اس وقت یزید اچھی صلاحیت میں تھا۔'' پھر اسی قسم کے ایک اور سوال کا جواب یوں تحریر فرماتے ہیں: ''یزید اوّل صالح تھا، بعد خلافت کے خراب ہوا۔'' (تالیفاتِ رشیدیہ، ص ۴۳۲)

خلیفہ بننے کے بعد یزید کی بعض زیادتیاں صحیح روایات سے ثابت ہیں۔یہ وہ اقدامات تھے جنہوں نے شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ، واقعۂ حرہ اور حصارِ مکہ جیسے سانحوں کو جنم دیا۔اگرچہ دورِ حکمرانی میں بھی یزید کا کسی متعین قسم کے فسق وفجور (شراب نوشی، ترکِ صلوٰۃ) کا مرتکب ہونا ضعیف روایات ہی میں مذکور ہے تاہم خود بعض مدنی صحابہ اور تابعین کے ایک بڑے مجمعے کا اس کے فسق پر یقین کرنا اور اسی یقین کی بناء پر اس کے خلاف خروج کرنا صحیح السند بلکہ متواتر ہے۔ان حضرات کے یقین پر ہم اپنے حسن ظن کو ترجیح نہیں دے سکتے۔یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے اسلام ''فسق یزید'' پر متفق رہے ہیں، اور اس کے فسق کی ضعیف روایات کو بھی قابلِ استدلال مانتے رہے ہیں۔اگرچہ یزید پر بعض جھوٹے الزامات بھی لگائے گئے اور ایسے الزامات کے دفاع میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سب سے پیش پیش رہے مگر وہ بھی فرماتے ہیں:

''مع انہ کان فیہ من الظلم ما کان ثم انہ الفعل هو وهم وفعل باهل الحرة امورا منكرة.'' ''اس کے باوجود یزید میں ظلم کا مادہ جو تھا، وہ تو تھا۔پھر یزید اور یہ حضرات نبرد آزما ہوئے۔اور اس نے حرہ والوں کے ساتھ برا سلوک کیا۔'' (منهاج السنة: ۱/۱۱۱)

نیز وہ فرماتے ہیں: ومن آمن بالله واليوم الآخر لايختار ان يكون مع يزيد ولا مع امثاله من الملوك اللذين ليسو بعادلين.

''جو بندہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی یزید اور اس جیسے غیر عادل حکمرانوں کے ساتھ ہونا پسند نہیں کرے گا۔'' (مجموع الفتاوىٰ: ۴/۴۸۴)

اس دور کے دو بڑے سانحے

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں دو ایسی عظیم شخصیات کی رحلت کے سانحے پیش آئے جن سے حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ امت تک پہنچا، یعنی: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

① سانحۂ وفات ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سن ۵۸ھ میں دنیا سے رحلت ہوئی۔[①] آخری سالوں میں آپ اکثر لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کا یہ شعر پڑھا کرتیں:

ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِيْ اَكْنَافِهِمْ .... وَبَقِيْتُ فِيْ خَلْفٍ كَجِلْدِ الْاَجْرَبِ

''ایسے لوگ گزر گئے جن کے زیر سایہ زندگی بسر ہوتی تھی۔ میں بعد کے لوگوں میں خارشی اونٹ کی طرح باقی ہوں۔''

پھر فرماتیں: ''اللہ لبید پر رحمت کرے اگر وہ ہمارے زمانے کا حال دیکھ لیتے تو کیا کہتے۔''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسلاف نسل در نسل نقل کرتے رہے۔ ہر ایک یہ کہتا تھا کہ اگر وہ حضرات ہمارے دور کو دیکھتے تو کیا فرماتے۔''[②]

۵۸ھ میں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں اور مرض شدت اختیار کر گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما عیادت کے لیے آئے۔ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر خوف کی کیفیت طاری تھی۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''آپ دنیا کے مصائب سے نکل کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے پیاروں کے پاس جا رہی ہیں۔ آپ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند بہترین ہی ہو سکتی ہے۔ جب آپ کا ہار گم ہوا، اس کی تلاش میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکے اور قافلے کو پانی کی نایابی سے پریشانی ہوئی تو اللہ نے تیمم کی سہولت نصیب فرما دی۔ آپ کی پاکیزگی اور بے گناہی کا ثبوت اللہ نے عرش سے نازل فرما دیا۔ کوئی مسجد نہیں جہاں آپ کے تقدس کی آیات تلاوت نہ کی جاتی ہوں۔''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے بے اختیار فرمایا:

''ابن عباس! ان باتوں کو چھوڑیے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ کاش! میں بھولی بسری ہو جاتی۔''[③]

---

① ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے متعلق مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی نے ایک عجیب بے سند روایت بیان کی ہے کہ: ''آپ مروان کی مخالفت کرتی تھیں، مروان نے ایک روز دھوکے سے دعوت کے بہانے بلا کر ایک گڑھے میں جس میں ننگی تلواریں اور خنجر وغیرہ رکھ دیے تھے، آپ کو گرا دیا تھا۔ آپ بہت ضعیف اور بوڑھی تھیں، زخمی ہوئیں اور انہی زخموں کے صدمے سے فوت ہو گئیں۔'' (تاریخ اسلام، اکبر شاہ نجیب آبادی: ۱/۶۵۷)

یہ واقعہ بالکل من گھڑت ہے۔ واقدی اور ابو مخنف جیسے کمزور راویوں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم نہیں مولانا نجیب آبادی نے کہاں سے یہ روایت لی۔ عقلاً بھی یہ بعید بات ہے اگر مروان کو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے کوئی رنجش تھی بھی تو اس بنا پر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے قتل کی جرأت کیسے کی جا سکتی تھی؟ درحقیقت مروان کی اتنی مجال ہو ہی نہیں سکتی تھی کیوں کہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے سامنے ادب اور تواضع سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

② سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۹۷، ط الرسالۃ　③ مسند احمد، ح: ۲۴۹۶، اسنادہ قوی

۱۷ رمضان المبارک کو تراویح اور وتر کی نماز ادا کرنے کے بعد آپ دنیائے فانی سے رحلت فرما گئیں۔ جہاں جہاں یہ خبر پہنچی لوگ دوڑے چلے آئے۔ بلا تاخیر نمازِ جنازہ کی تیاری کر لی گئی۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ نمازِ جنازہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔ وفات کے بارے میں ۵۸ھ کا قول راجح ہے۔ ①

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رحلت پر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بے ساختہ فرمایا:

"اللہ کی قسم! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد وہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ پسندیدہ تھیں۔" ②

② سانحۂ وفات حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

۵۹ھ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی وفات پا گئے۔ آپ صحابہ کرام میں سب سے زیادہ احادیث بیان کرنے والے عالم تھے۔ آپ سے منقولہ روایات کی تعداد "۵۳۷۴" ہے۔ آپ کا تعلق یمن کے قبیلہ دوس سے تھا۔

۸ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور خود کو ارشاداتِ نبوی کی حفاظت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ۵۹ھ میں بیمار ہوئے اور کچھ دنوں بعد وفات پا گئے۔ عمر ۷۸ برس تھی۔ ③

امت کے حق میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی یزید کو وصیت

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد امت کی بہت فکر تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ یزید امتِ مسلمہ کے لیے ایک مثالی حکمران ثابت ہو، امت اس پر متفق رہے، ہر طرف امن وامان ہو۔ کسی پر کوئی زیادتی ہو نہ حق تلفی۔ چونکہ اس بارے میں سب سے زیادہ ذمہ داری یزید ہی پر عائد ہوتی تھی، اس لیے آپ نے اسے بہت سی اہم وصیتیں کیں جن کا ہر جملہ سنہرے الفاظ میں نقل کرنے کے قابل ہے۔ یہ وصیتیں آپ کی حزم واحتیاط، فکر ونظر کی گہرائی، سیاسی تجربہ کاری اور امت کی خیر خواہی کی بہترین دلیل ہیں۔

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید سے کہا:

- اللہ سے ڈرتے رہنا۔ میں نے تمہارے لیے یہ امرِ خلافت طے کر دیا ہے۔ تم اس کے ذمہ دار بنا دیے گئے ہو۔
- اگر بھلائی سے رہو گے تو یہ میری سعادت ہوگی۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ تمہاری بدبختی ہوگی۔
- لوگوں سے نرمی کا معاملہ کرنا۔
- تمہیں اپنی توہین وتنقیص کی جو باتیں پہنچیں انہیں نظر انداز کر دینا۔
- شرفاء کے ساتھ سختی نہ برتنا۔ ان کی ہتکِ عزت سے بہت بچنا۔ انہیں اپنے قریب رکھنا۔

---

① ۵۷ھ کا قول مشہور مگر خلافِ تحقیق ہے۔

② مستدرک حاکم، ح: ۶۷۴۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۹۱/۲، ط الرسالۃ

③ البدایۃ والنہایۃ: ۳۶۲/۱۱؛ الاصابۃ: ۳۴۹/۷، ۳۶۲



ا جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آئے تو عمر رسیدہ، تجربہ کار، نیک اور پرہیزگار افراد سے مشورہ لینا۔ ان کی رائے کی مخالفت نہ کرنا۔

ا اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ کرنا؛ کیوں کہ صرف ایک ذہن میں آنے والی رائے صحیح نہیں ہوا کرتی۔

ا اپنے نفس کی اصلاح کا اہتمام کرنا، لوگ بھی تمہارے ساتھ درست چلیں گے۔

ا لوگوں کو کبھی کسی اعتراض کا موقع مت دینا کہ لوگ بری بات کو تیزی سے پھیلایا کرتے ہیں۔

ا نماز باجماعت کی پابندی کرتے رہنا۔

اگر ان نصیحتوں پر عمل کرو گے تو لوگ اپنے اوپر تمہارا حق سمجھیں گے اور تمہاری حکومت طاقتور رہے گی۔"[1]

☆☆☆

[1] البدایة والنهایة: ۱۱/۶۴۴، ۶۴۵

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری ایام اور وفات

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک اسی (80) برس سے اوپر ہو چکی تھی۔[1] پیرانہ سالی میں حکومتی کاموں کی مشقت نے آپ کو نڈھال کر دیا تھا اور آپ قاصدِ اجل کے قدموں کی چاپ محسوس کر چکے تھے۔ ایک دن خطبے میں فرمایا:

"اے لوگو! میں کاٹی جانے والی فصل کا ایک حصہ ہوں، میں تمہارا ذمہ دار بنا، میرے بعد بھی حکمران آئیں گے۔ میں ان سے بہتر ہوں، جیسا کہ جو مجھ سے پہلے گزرے وہ مجھ سے بہتر تھے۔ (حدیث میں) کہا گیا ہے کہ جو اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے۔ اے اللہ! میں تیری ملاقات کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی مجھ سے ملاقات کو پسند فرما اور اس میں برکت عطا کر۔"[2]

آپ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ کلائیاں سوکھی ٹہنی جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ فرماتے تھے: "بس دنیا اس سے زیادہ کچھ نہیں جو ہم نے چکھ لی اور برت لی۔ اللہ کی قسم! مجھے اختیار دیا جائے تو تین دن سے زیادہ تمہارے درمیان نہ رہوں۔"[3]

آپ رضی اللہ عنہ کو کھانسی میں خون آنے لگا تھا۔ آخری دنوں میں بستر پر لگ گئے تھے۔ آپ کی دو صاحبزادیاں آپ کو کروٹ دیتی تھیں اور آپ فرماتے تھے: "یہ اس شخص کو الٹ پلٹ رہی ہیں جو دنیا کو الٹنے پلٹنے میں ماہر تھا۔"

مرض کی اتنی شدت کے باوجود حکمرانی کا رعب داب قائم رکھنے کا اتنا خیال تھا کہ عام لوگوں پر اپنے صاحبِ فراش ہونے کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ جب لوگ تیمارداری کے لیے آئے تو گھر والوں سے کہا: "مجھے سرمہ اور تیل لگا کر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دو۔ کوئی آنے والا بیٹھنے نہ پائے۔ کھڑے کھڑے سلام کر کے چلا جائے۔"

لوگ اندر آئے، سلام کیا اور آپ کو ہشاش بشاش پا کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ امیر المؤمنین ٹھیک ٹھاک ہیں۔

ان کے جانے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار پڑھے:

وَتَجَلُّدِیْ لِلشَّامِتِیْنَ اُرِیْهِمِ ۔۔۔ اَنِّیْ لِرَیْبِ الدَّهْرِ لَا اَتَضَعْضَعُ

بدخواہوں کے سامنے میں توانا بنا رہتا ہوں تاکہ انہیں دکھاؤں کہ زمانے کی اذیت کے باوجود میں کمزور نہیں پڑا۔

وَاِذَا الْمَنِیَّةُ اَنْشَبَتْ اَظْفَارَهَا ۔۔۔ اَلْفَیْتَ کُلَّ تَمِیْمَةٍ لَا تَنْفَعُ

مگر جب موت اپنے پنجے گاڑ دے...... تو پھر تم ہر قسم کے تعویذ کو بے فائدہ پاؤ گے۔[4]

---

① البدایة والنهایة: ۳۵۹/۱۱

② تاریخ الاسلام للذهبی: ۳۱٦/۳، ت تدمری، مختصر تاریخ دمشق: ۷۹/۲۵

③ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۷۷۲۱ ④ تاریخ الطبری: ۳۲٦/۵

ایک سچے مؤمن کی طرح حضور ﷺ سے محبت وعقیدت آپ کے رگ وریشے میں بسی تھی۔ مرض الموت میں اہلِ خانہ سے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک کرتا پہنایا تھا وہ میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ ایک بار میں نے آپ ﷺ کے ناخن مبارک تراشے تھے وہ بھی ایک شیشی میں محفوظ رکھے ہیں، میں مرجاؤں تو اسی کرتے میں مجھے کفن دینا اور وہ کٹے ہوئے ناخن پیس کر میری آنکھوں اور منہ پر چھڑک دینا۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے مجھ پر رحم کرے۔“

خدا خوفی کا یہ عالم تھا کہ وفات سے پہلے آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال بیت المال میں داخل کر دینے کا حکم دیا تا کہ اگر نادانستہ بیت المال کی رقم میں کوئی کمی بیشی سرزد ہوگئی ہو تو اس کی تلافی ہو جائے۔ [1] آخری لمحات میں ورثاء سے کہا: ”اللہ بزرگ و برتر سے ڈرتے رہنا۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ اس کی حفاظت کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے اسے کوئی بچانے والا نہیں۔“ [2] کچھ دیر بعد آپ کی روح جسدِ خاکی کا ساتھ چھوڑ گئی۔

حضرت ضحاک بن قیس فہری رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ رضی اللہ عنہ دِمشق ہی میں دفن ہوئے۔ [3]

انّا للّٰہ و انا الیہ راجعون

آپ رضی اللہ عنہ نے بیس برس تک گورنری اور پھر بیس سال تک خلافت کی ذمہ داریاں انجام دی تھیں۔

ایک قول کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا سانحہ جمعرات ۲۲ رجب ۶۰ھ کو پیش آیا۔ [4]

جبکہ راجح قول کے مطابق تاریخ وفات ۴ رجب ہے۔ [5]

☆☆☆

① تاریخ الطبری: ۳۲۷/۵ ② تاریخ الطبری: ۳۲۷/۵ بسند صحیح

③ تاریخ الطبری: ۳۲۷/۵ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۳۵۸/۱۱

⑤ المعرفۃ والتاریخ: ۳۲۳/۳، ط الرسالۃ ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۲۹

تاریخ وفات کے متعلق ایک قول پندرہ رجب کا بھی ہے۔ درایت کے لحاظ سے ۴ رجب کا قول راجح ہے؛ کیوں کہ یہ طے ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت ولی عہد یزید دمشق سے دور حوارین میں تھا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ ۲۷ رجب کو یزید کا ہرکارہ بیعت کا حکم نامہ لے کر مدینہ پہنچ گیا تھا اور ۲۸ رجب کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ بیعت مسترد کر کے مدینہ سے نکل گئے تھے۔ (طبری: ۳۸۱/۵؛ انساب الاشراف: ۱۶۰/۳، ط دار الفکر) اب اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات ۲۲ کو مانی جائے تو مندرجہ ذیل امور فقط پانچ چھ دن میں واقع ماننا پڑیں گے: (۱) یزید تک وفات کی اطلاع پہنچنا (۲) اس کا حوارین سے دمشق آنا (۳) تعزیتی امور انجام دینا (۴) مسندِ خلافت سنبھال کر احکام جاری کرنا (۵) یزید کے قاصد کا دمشق سے مدینہ پہنچنا۔۔۔۔۔۔۔ اس دور کے وسائل کے لحاظ سے پانچ چھ دن میں یہ کام ممکن نہیں تھے: کیوں کہ اس دور میں عام قافلے ایک دن میں ایک منزل (۱۶ میل/ پونے ۲۶ کلومیٹر) اور تیز رفتار سوار دو منزل (لگ بھگ ۵۲ کلومیٹر) طے کرتے تھے۔ البتہ ڈاک کا سفر یومیہ تقریباً سو کلومیٹر تک ہو جاتا تھا؛ کیوں کہ ہر چوکی پر سواریاں اور سوار بدل جاتے تھے۔ حوارین دمشق کے شمال مشرق میں کم و بیش ایک سو کلومیٹر دور ہے۔ (حوارین: بین دمشق وتدمر وحمص. المعالم الاثیرۃ، ص ۱۰۵) عام رفتار پر محمول کیا جائے تو قاصد کو دمشق سے حوارین اور یزید کو حوارین سے دمشق تک پہنچنے میں تین دن ضرور لگے ہوں گے۔ یہ بھی بعید ہے کہ یزید نے دمشق پہنچتے ہی بیعت کے لیے ہرکارے دوڑا دیے ہوں۔ اس سے پہلے تعزیتی امور انجام دینے میں دو تین دن مصروفیت رہی ہوگی، اس کے بعد مسندِ خلافت سنبھال کر بیعت کا حکم نامہ مشتہر کیا گیا ہوگا۔ پھر دمشق کا مدینہ سے فاصلہ ۱۲۷۷ کلومیٹر (۷۹۱ میل) یعنی تقریباً ۴۸ منازل ہے۔ ڈاک گھوڑوں پر بلا توقف سفر کیا جاتا تب بھی قاصد کو مدینہ پہنچنے کے لیے بارہ تیرہ دن درکار تھے۔ اگر تمام امور کو معمول کی رفتار پر محمول کیا جائے تو ۴ رجب کی تاریخ راجح لگتی ہے۔ ہاں اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر کام انتہائی غیر معمولی رفتار سے ہوا، یزید کو ایک دن میں وفات کی اطلاع مل گئی، دوسرے دن وہ دمشق آ گیا اور آتے ہی بیعت کے لیے قاصد دوڑا دیے جو یومیہ سوا سو تا ڈیڑھ سو کلومیٹر سفر طے کرتے ہوئے مدینہ گئے تو پھر تاریخ وفات پندرہ رجب کی تاریخ بھی مانی جا سکتی ہے مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی کے وقت کو اپنی جگہ مانتے ہوئے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات ۲۲ رجب بہر حال بعید از قیاس ہے۔ ہاں اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی کی تاریخ میں متعدد اقوال ہوتے تو پھر گنجائش نکل سکتی تھی مگر ہمیں متعدد اقوال نہیں ایک ہی قول ملا ہے۔



کتبِ حدیث اور سیرتِ مُعاویہ رضی اللہ عنہ

کتب تاریخ پر اکتفا کیا جائے تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یقیناً ایک دنیادار بادشاہ محسوس ہوتے ہیں مگر کتب حدیث کے معتبر ذخیرے پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو وہ ایک باکردار، عالم فاضل، مخلص اور خداترس حکمران دکھائی دیتے ہیں۔

ذخیرۂ حدیث (جوامع، سنن، مسانید اور معاجم) میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ تصویر دیکھیے۔

برائیوں اور گناہوں سے نفرت:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود بھی گناہوں سے بچتے اور رعایا کو بھی ان چیزوں سے بچانے کی کوشش کرتے۔ آپ کے خطبات اس جذبے کے آئینہ دار ہیں۔ ایک بار فرمایا: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں سے منع کیا ہے، میں بھی ان سے منع کرتا ہوں: میت پر نوحہ وزاری سے، گانے سے، تصویروں سے، (عشقیہ اور ناجائز) شاعری سے، (مردوں کے لیے) سونے کے استعمال سے، درندوں کی کھالیں پہننے سے، نمود ونمائش سے اور (مردوں کو) ریشم سے۔''[1]

آپ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص نے اپنی لڑکی دوسرے کے نکاح میں دی اور اس کے مہر کے بدلے اس شخص کی لڑکی اپنے نکاح میں لے لی۔ اپنے گورنر کو حکم دیا کہ دونوں جوڑوں میں تفریق کرادو اور اپنے مراسلے میں لکھا: ''یہ عقد شغار ہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔''[2]

بعض اوقات لوگوں کو منکرات سے روکنے اور ان سے نفرت دلانے کے لیے اللہ کی قسمیں دے دے کر پوچھتے کہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان باتوں سے منع کرنا تمہیں معلوم ہے کہ نہیں۔[3]

سبائی راویوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں یزید کو شرابی اور آپ کو اس حرکت سے درگزر کرنے والا بتایا ہے، جو ایک بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ شراب نوشی کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے یہ فرمان نبوی سنایا کرتے تھے: ''جو شراب پیے اسے کوڑے لگاؤ، پھر پیے پھر کوڑے لگاؤ، پھر پیے پھر کوڑے لگاؤ۔ پھر پیے تو چوتھی بار میں اسے قتل کردو۔''[4]

فیشن، بناوٹ اور نمود ونمائش کی روک تھام:

آپ نمود ونمائش کو ناپسند فرماتے تھے اور ایسی حرکات کی بروقت روک تھام کردیتے تھے۔ عورتیں سیاہ رنگ کی پٹیاں

① مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۳۷۳، ط دار المامون، دمشق

② مسند احمد، ح: ۱۶۹۰۲؛ سنن ابی داؤد، ح: ۲۰۷۵، کتاب النکاح، باب فی الشغار ③ مسند احمد، ح: ۱۶۹۰۹؛

④ مسند احمد، ح: ۱۶۸۹۳؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۵۲۷۸، کتاب الحد فی الخمر، ط الرسالۃ

یاد رہے کہ چوتھی بار شراب پینے پر قتل کرنے کے حکم کو شارحین نے حقیقت پر نہیں تہدید یعنی خوف دلانے یا شراب کو حلال سمجھ کر پینے پر محمول کیا ہے۔

سروں پر باندھنے اور بالوں میں نقلی بال ملانے کا فیشن کرنے لگی تھیں۔ آپ نے اسے ''زُور'' یعنی جھوٹا پہناوا قرار دیا اور فرمایا: ''میرا خیال ہے یہ یہود کے سوا کسی کا طریقہ نہیں۔'' آپ نے لوگوں کو تلقین کی کہ اس سے احتراز کریں۔[1]

اس قسم کی بناوٹ کی ممانعت آپ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے خود سنی تھی اس لیے آپ یہ تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''رسول اللہ ﷺ نے ''زُور'' سے منع کیا تھا، جبکہ تم لوگ یہی بری شکل اختیار کرنے لگے ہو۔''

ایک دن ایک شخص لاٹھی کا سہارا لیے سر پر پٹی باندھے آیا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''غور سے سنو، یہی وہ بناوٹ ہے۔''[2]

کچھ لوگ فیشنی بال رکھنے لگے تھے، آپ نے اس پر پابندی لگا دی۔ ایک بار مدینہ منورہ تشریف لائے تو مسجد نبوی کے منبر پر اس قسم کے بالوں کا گچھا لے کر آپ نے لوگوں کو دکھایا۔ (یہ بال کسی فیشن زدہ شخص کے کاٹے گئے ہوں گے) اور فرمایا: ''میں کسی کو آئندہ یہ یہود جیسا کام کرتے نہ دیکھوں۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے بناوٹ کا نام دیا تھا۔''[3]

یہ بھی فرمایا: ''مدینے والو! تمہارے علماء کہاں گئے؟ رسول اللہ ﷺ کو میں نے کہتے سنا ہے کہ آپ نے اس سے منع کیا اور فرمایا: بنی اسرائیل کی عورتوں نے جب یہ فیشن شروع کیے تو ان پر عذاب آیا۔''[4]

دین کو اصل شکل پر برقرار رکھنے کا جذبہ:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ دین کو اس کی اصل شکل پر رکھنے کی تڑپ رکھتے تھے۔ بدعات کے سخت مخالف تھے۔ دین میں کسی کمی یا اضافے کو برداشت نہ کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ عصر کے بعد دو نفل پڑھنے لگے ہیں۔ آپ نے اپنے خطبات میں اس پر گرفت کی۔ فرمایا: ''تم لوگوں نے ایک نماز شروع کر رکھی ہے، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے، ہم نے انہیں یہ نماز پڑھتے نہیں دیکھا، بلکہ نبی اکرم ﷺ نے عصر کے بعد کے دو نفلوں سے منع کیا ہے۔''[5]

انسانی جان کی قدر و قیمت:

مشہور ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بڑی بے دردی سے لوگوں کو قتل کرا دیتے تھے، جبکہ آپ خود فرماتے تھے: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ سے ہر گناہ کی بخشش کی امید ہے مگر سوائے اس کے کہ آدمی کافر ہو کر مر جائے یا کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے۔''[6]

غیر اسلامی طور طریقوں سے گریز:

لوگوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو عجمی بادشاہت کے طور طریقوں کا حامل مشہور کر رکھا ہے، جبکہ آپ دنیا کے سب سے بڑے حکمران ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے غیر اسلامی آداب و تکلفات کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار آپ

① صحیح مسلم، ح: ۵۷۰۲، سنن نسائی مجتبیٰ، ح: ۵۲۴۶
② صحیح مسلم، ح: ۵۷۰۳، باب تحریم فعل الواصلہ والمستوصلہ
③ صحیح البخاری، ح: ۵۹۳۸، کتاب اللباس، باب الوصل فی الشعر
④ مسند احمد، ح: ۱۶۹۱۱
⑤ شرح معانی الآثار، ح: ۱۸۲۳
⑥ مسند احمد، ح: ۱۶۹۵۳



حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیٹھے رہے، حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں تنبیہ کی اور فرمایا: ''ایسا مت کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو یہ پسند کرے کہ لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھے۔''[1]

خوشامدیوں کی روک تھام:

بعض لوگوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خوشامد پسند حکمران قرار دے رکھا ہے جس کے پاس حق گو لوگوں کی کوئی جگہ نہ تھی۔ جس کے ہاں چاپلوسی کرنے والے ہی مقام پاتے تھے۔ حالاں کہ آپ رضی اللہ عنہ کو چاپلوسی سے نفرت تھی۔ خوشامدی لوگوں سے بچنے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ مدح وستائش سے منع کرتے تھے۔ یہ حدیث سنایا کرتے تھے:

'' اِيَّاكُمْ وَالتَّمَادُحَ فَاِنَّهُ ذِبْحٌ. ''

مدح سے بچنا یہ ذبح کر دیے جانے کے مترادف ہے۔[2]

حق گوئی کی حوصلہ افزائی۔ ضمیر کی آزادی:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں آزادیٔ اظہارِ رائے اور حق گوئی کا ماحول اگرچہ دورِ خلافتِ راشدہ جیسا نہ تھا مگر پھر بھی حق گو لوگ موجود تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان کی سخت باتوں کو خندہ پیشانی سے سنا کرتے تھے۔ بلکہ اگر کبھی لوگوں میں حق گوئی کا حوصلہ کم دیکھتے تو ڈرتے تھے کہ ظالم جابر حکمرانوں میں شمار نہ ہو جائے۔

ایک بار آپ رضی اللہ عنہ نے تقریر میں امتحان کے طور پر یہ جملہ کہہ دیا: ''یہ مال ہمارا ہے، جسے چاہیں دیں جسے چاہیں نہ دیں'' کوئی اعتراض نہ ہوا۔ دوسرے جمعے میں تقریر میں پھر یہی جملہ کہا۔ لوگ چپ رہے، تیسرے جمعے میں یہی جملہ کہا تو ایک شخص چیخ کر بولا: ''مال ہمارا ہے، اگر کوئی روکے گا تو ہماری تلواریں فیصلہ کریں گی۔'' حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نماز کے بعد اسے ساتھ لے گئے، اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور حاضرین سے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا تھا کہ عن قریب ایسے لوگ آئیں گے جن کی بات کی کوئی تردید نہیں کرے گا۔ وہ بندروں کی طرح دوزخ میں جھونکے جائیں گے۔'' میں نے دو جمعوں تک وہ بات کہی، کوئی تردید نہ ہوئی تو میں ڈرا کہ میں اس وعید کا مستحق تو نہیں۔ اس شخص نے اپنا ردِعمل ظاہر کر کے مجھے بچالیا۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ اُمید ہے اللہ ان ظالموں میں مجھے شمار نہیں کرے گا۔[3]

ایک بار حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے جمعے کے خطبے میں طاعون سے فرار ہونے کے بارے میں مشہور حدیث سنائی اور اس میں کوئی غلطی کر گئے، حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ خطبے کے دوران ہی کھڑے ہو گئے اور پکار کر کہا:

---

① شرح مشکل الآثار للطحاوی، ح: ۱۱۲۷، مسند ابی داود طیالسی، ح: ۱۰۳۲، مسند احمد، حدیث مُعاویہ رضی اللہ عنہ، ح: ۱۶۸۲۶

② مسند احمد، ح: ۱۶۸۴۶ باسناد صحیح، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۵۰/۱۹، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

③ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۳۸۲، ط دار المامون للتراث دمشق، باسناد صحیح



''تمہاری ماں ہند تم سے زیادہ علم رکھتی تھی۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے نماز کے بعد حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور امام کو خطبے کے دوران ٹوکنے پر تنبیہ کی، مگر جب ان کی باتیں سن کر یقین ہوگیا کہ واقعی حدیث سنانے میں لغزش ہوگئی ہے تو عصر کی نماز کے بعد منبر پر خود اعلان کیا: ''میں نے منبر پر آپ کے سامنے ایک حدیث بیان کی تھی، گھر جا کر معلوم ہوا وہ حدیث ویسے ہے جیسے حضرت عُبادہ بیان کرتے ہیں لہٰذا انہی سے استفادہ کیجئے۔ وہ مجھ سے بڑے عالم ہیں۔''[1]

حضرت مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ ایک بار حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس کسی کام سے گئے، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مِسْوَر! آپ جو حکام پر اعتراضات کیا کرتے ہیں ان کا کیا حال ہے؟''

انہوں نے پس وپیش کی تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا۔

''نہیں، آپ اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالیے۔''

حضرت مِسْوَر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے ان سے جو بھی شکایات تھیں سب کہہ دیں، کوئی بات نہیں چھوڑی۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں سن کر فرمایا: ''لغزشوں سے کوئی پاک نہیں ہوسکتا، آپ اپنے اندر بھی ایسی باتیں محسوس کرتے ہوں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے تو آپ تباہ ہوجائیں۔''

حضرت مِسْوَر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بالکل''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پھر بھلا آپ مجھے بھی اپنی طرح اللہ کے ہاں مغفرت کا حق دار کیوں نہیں سمجھتے۔ اللہ کی قسم! میں عوام کی اصلاح، شرعی حدود کے نفاذ اور جہاد کی جن خدمات میں مصروف ہوں وہ ان غلطیوں سے زیادہ ہیں۔ اور پھر میں اُس دین کا ماننے والا ہوں جس میں رب نیکیوں کو قبول کرتا اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔''

پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! مجھے جب بھی اللہ اور اللہ کے غیر میں سے کسی ایک کو چننے کا موقع درپیش ہوتا ہے تو میں اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں اختیار کرتا۔''

حضرت مِسْوَر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دلائل پر غور کرتا رہا، میں مان گیا کہ انہوں نے اس بات چیت میں مجھے لاجواب کردیا۔ اس کے بعد حضرت مِسْوَر رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر آنے پر ہمیشہ ان کے لیے دعائے خیر فرمایا کرتے تھے۔[2]

بے تکلف رہن سہن:

رہن سہن ایسا بے تکلف تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جب آرام فرما ہوتے تب بھی آپ کے ساتھی اردگرد بیٹھے بے تکلف بات چیت کررہے ہوتے۔ کسی پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔[3]

---

① جامع المسانید والسنن، ح: ۵۸۳۲ ، تاریخ دمشق: ۹۵/۲۶، ترجمہ: عبادۃ بن الصامت.

② سیر اعلام النبلاء: ۱۵۱/۳، ط الرسالۃ ③ مسند احمد، ح: ۱۶۹۵۲

شرعی جزئیات، سنن ومستحبات تک کا خیال:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ محض ایک دنیوی حکمران تھے، ان کی توجہ ریاست کی حفاظت وترقی پر تو تھی مگر ریاست کے اندر اسلام کے احیاء اور اسلامی شخصیت سازی پر نہیں۔ اس لیے وہ فقہی جزئی احکام اور سنتوں کو نظر انداز کر جاتے تھے۔ کتبِ احادیث میں مذکور حقائق اس تاثر کی نفی کرتے ہیں۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو سنت بلکہ مستحبات کی بھی پابندی کا خیال رہتا تھا۔ ایک صاحب نے ان کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی اور پھر اسی جگہ سنتیں شروع کر دیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے نماز کے بعد انہیں بلوایا اور یہ حدیث سنائی: ''لَا تُوْصِلْ صَلٰوۃً بِصَلٰوۃٍ حَتّٰی تَتَکَلَّمَ اَوْ تَخْرُجَ.''

(نماز کے ساتھ فوراً دوسری نماز مت ملاؤ، کوئی بات کرلو، یا وہاں سے ہٹ جاؤ۔)[1]

سنت کی اشاعت کا ولولہ:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سنت اور فقہ کے عالم تھے اور اس علم کی اشاعت کا زبردست ولولہ رکھتے تھے۔ دین کی تبلیغ کو مسلم حکمران کے فرائض میں تصور کرتے تھے، اس لیے موقع بموقع احادیث بیان فرما کر اپنا فریضہ ادا کیا کرتے تھے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو وضو کر کے دکھایا کرتے، بتاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح وضو فرمایا کرتے تھے۔ لوگ سر کے مسح میں عموماً غلطیاں کر جاتے ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ عملی طور پر انہیں دکھا کر سمجھاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس انداز میں ہتھیلیاں سر کے اگلے حصے پر رکھ کر انہیں مسح کرتے ہوئے پیچھے گدی تک لے جاتے اور کس طرح واپس پیشانی تک لے کر آتے۔[2]

ایک تابعی کہتے ہیں: ہم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے، اتنے میں اذان شروع ہوگئی۔ انہوں نے اَللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر سے لے کر اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہ تک ہر جملے کا اسی طرح جواب دیا۔

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کی جگہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ پڑھا، باقی کلمات کی جگہ انہی کو دہرایا۔ پھر فرمایا: ''اسی طرح میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے۔''[3]

خصوصی ایام کے بارے میں ترغیب اور اعتدال:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خصوصی ایام مثلاً: شب قدر، دس محرم وغیرہ کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ دوسروں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ اللہ کی خصوصی عنایات کے ان نادر مواقع سے فائدہ اٹھایا کریں۔ آپ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مروی ہے: ''شب قدر کو رمضان کی ستائیس ویں میں رات میں تلاش کرو۔''[4]

---

① السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۳۹۴۴، ط العلمیة

② مسند احمد بن حنبل، ح: ۱۶۸۵۴، ۱۶۸۵۵

③ السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۹۲۸ ؛ صحیح ابن حزیمة: ۲/۲۱۳ ؛ مسند احمد، ح: ۱۶۸۹۲، ۱۶۸۳۲، ۱۶۸۲۸

④ صحیح ابن حبان، ح: ۳۶۸۰

مگر اس قسم کی ترغیب میں آپ اعتدال کا پورا خیال رکھتے تھے، تا کہ ایک مستحب عمل کو سنتِ مؤکدہ یا واجب نہ سمجھا جانے لگے۔ ایک بار دس محرم کو آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ میں لوگوں سے خطاب کیا اور فرمایا: ''مدینہ والو! یہ عاشوراء کا دن ہے، اس کا روزہ تم پر فرض نہیں۔ ہاں میرا روزہ ہے۔ تم میں سے جو چاہے رکھے جو چاہے نہ رکھے۔''[1]

طالب علمانہ جذبہ:

عالم وفقیہ ہونے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ خود کو طالب علم سمجھتے تھے۔ عمر بھر سنتیں سکھاتے رہے۔ حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دعا نماز کے بعد پڑھتے تھے، لکھ بھیجو۔ انہوں نے دعا لکھی:

﴿لاالٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَحْـدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا یَنْفَعُ ذَالْجَدِ مِنْکَ الْجَدُّ.﴾

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یہ دعا یاد کر کے دوسروں کو بھی سکھانے لگے۔[2]

دینی مسائل کی تحقیق:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جب تک کسی فقہی مسئلے کی پوری تحقیق نہ کر لیتے اور پورے سلسلۂ سند سے واقف نہ ہو جاتے مطمئن نہ ہوتے۔ شرعی مسائل اور سنتوں کو سیکھنے اور عام کرنے کا اتنا ولولہ تھا کہ ایک خطبے کے دوران منبر پر ہی حضرت کثیر بن صَلت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ جا کر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ مسئلہ پوچھ کر آئیں۔[3]

ایک ایک مسئلے کے لیے اتنی تحقیق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے علمی و تحقیقی ذوق کی واضح عکاسی کرتی ہے۔

علمی و فقہی مہارت اور فضلائے صحابہ کا آپ کے علم پر اعتماد:

سنت پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نگاہ اس قدر گہری تھی کہ صحابہ کو بعض حدیثیں صرف آپ سے ملیں اور انہیں سب نے نہایت اعتماد سے قبول کیا، حتیٰ کہ بنو ہاشم کے اصحاب بھی حدیثِ رسول میں آپ پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ علمی وفقہی مہارت کا یہ حال تھا کہ حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہما جیسے بحرِ علم نے بعض سنتیں ان سے سیکھی تھیں۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر طواف کے دوران دیکھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما خانہ کعبہ کے چاروں کونوں کا استلام کر رہے ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو کونوں (حجرِ اسود اور رکنِ یمانی) کا استلام کیا تھا۔''[4]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک بار خود فرمایا: ''مجھے حضرت مُعاویہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قینچی سے اپنے بال مبارک ترشوائے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد حضرت مجاہد اور

---

1. شرح معانی الآثار، ح: ۳۲۹۸، باب صوم عاشوراء
2. صحیح البخاری، ح: ۶۶۱۵، کتاب القدر، باب لامانع لما اعطی اللّٰہ
3. شرح معانی الآثار، ح: ۱۸۰۵؛ مسند الشافعی: ۱/۳۶۲
4. مسند احمد، ح: ۱۶۸۵۸؛ غایۃ المقصد فی زوائد المسند للھیثمی: ۲/۹۳

عطاء رحمہ اللہ کہنے لگے: ”حضرت! یہ حدیث ہم نے کسی اور سے نہیں سنی۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے:

”معاویہ رضی اللہ عنہ ایسے نہیں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے بارے میں ان پر شک کیا جائے۔“[1]

اللہ کی حدود کا قیام، ریاست کی اولین ذمہ داری:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حدود اللہ کو معطل، دین کے نفاذ کو ترک اور سیاسی مفادات کے لیے ظلم کرنے والا مشہور کیا گیا ہے، جبکہ آپ ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے کہ اقامتِ دین ہی حکومت کی اساس ہے۔ اس اُمت کی حکومت و ریاست دین کی بنیاد پر ہی قائم رہے گی ورنہ نہیں۔ ایک بار اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے فرمایا:

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ امر خلافت قریش میں رہے گا۔ اللہ ان سے حکومت چھیننے کی کوشش کرنے والے ہر شخص کو منہ کے بل گرا دے گا مگر تب تک جب تک وہ اقامت دین پر جمے رہیں گے۔“[2]

خلافت کی اہمیت:

مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے لیے خلافت اور سربراہ کی موجودگی اور عوام کی اس سے وابستگی کو بہت اہم سمجھتے تھے اور یہ حدیث سنایا کرتے: ”جو کسی سربراہ کے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرا۔“[3]

فرقہ بندیوں کا علاج: شریعت کو تھامے رہنا

نئے فتنوں اور فرقہ بندیوں کے آثار آپ کی نگاہ میں تھے اور آپ کے نزدیک اس کا واحد حل یہ تھا کہ سب سے پہلے اس دین کے اوّلین داعی یعنی عرب، شریعت پر اس شکل میں عمل پیرا ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لے کر آئے تھے۔

ایک بار آپ رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یہود و نصاریٰ اپنے دین میں افتراق کا شکار ہو کر ۷۲ فرقے بن گئے اور یہ امت عنقریب ۷۳ فرقے بن جائے گی۔ ان میں سے ایک کے سوا سب جہنم میں جائیں گے۔ وہ ایک نجات یافتہ فرقہ مسلمانوں کی جماعت (سوادِ اعظم یعنی جمہور مسلمین) ہے۔“

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے دردِ دل کے ساتھ حاضرین کو مخاطب کر کے کہا: ”اللہ کی قسم! اے عرب قبائل والو! جس دین مبین کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، اگر تم اس پر کاربند نہ رہو گے، تو بھلا دوسروں سے کیا اُمید رکھی جا سکتی کہ وہ اس دین کو سنبھالیں۔“[4]

صحابہ کرام کا اعزاز و اکرام:

صحابہ کرام کے تمام طبقات کا خوب اکرام کرتے اور ان کی فضیلتوں کا اعتراف کرتے، کسی کی دل شکنی نہ ہونے

---

① مسند احمد، ح: ۱٦۸٦۳؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۰۹/۱۹

② صحیح البخاری، ح: ۷۱۳۹، کتاب الاحکام، باب الامراء من قریش

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۸۸/۱۹؛ مسند احمد، ح: ۱٦۸۷٦، باسناد صحیح

④ مسند احمد، ح: ۱٦۹۳۷

دیتے۔ایک بار انصار کی ایک مجلس میں تشریف لے گئے اور فرمایا: ”تمہاری فضیلت میں ایک اور حدیث نہ سنادوں! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: ”جو انصار سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے، جو انصار سے بغض رکھتا ہے اللہ بھی اس سے بغض رکھتا ہے۔“[1]

جہاد اور اقامتِ دین کی تڑپ:

جہاد اور اقامت دین حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی کا اہم ترین مقصد تھا، انہوں نے جوانی میں پرچمِ جہاد اُٹھایا اور درمیان میں فتنے کے چند برسوں کو چھوڑ کر وفات تک اس فریضے کی ادائیگی میں مشغول رہے۔ شمشیر وسنان اور لسان وقلم سے جہاد کرنے والوں کی آپ حوصلہ افزائی فرماتے۔اس بارے میں حضور ﷺ کے ارشادات سنایا کرتے۔ ان میں یہ حدیث بھی تھی: ”اس امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر ثابت قدم رہے گی، کسی کی مخالفت یا تکذیب اسے کچھ نقصان نہ دے گی۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر (قیامت) نہ آجائے اور وہ حق پر اس طرح قائم ہوں گے۔“[2]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جہاد کے سلسلے کو عروج دیتے ہوئے یورپ فتح کرنا چاہتے تھے، قُسطَنطِینیّہ کی مہم کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے بڑے بڑے صحابہ اور اپنی اولاد کو بھیجا۔اپنے رفقاء کو آپ رضی اللہ عنہ کی آخر وصیت یہ تھی:

”شُدُّوْا خِنَاقَ الرُّوْمِ، فَإِنَّكُمْ تَضْبِطُوْنَ بِذٰلِكَ غَيْرَهُمْ مِنَ الْأُمَمِ.“

”اہلِ روم کا گلا گھونٹ ڈالو؛ کیوں کہ تم ان کے ذریعے دوسری اقوام پر قابو پاسکو گے۔“[3]

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے جب تک اس مردِ جہاں آگاہ کی اس وصیت کو یاد رکھا ساری دنیا پر ان کا سکہ چلتا رہا مگر جب وہ اسے بھولے اور اہلِ یورپ کو سر اٹھانے کا موقع دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کی سطوت وشوکت کے بڑے بڑے قلعے زمین بوس ہوگئے۔

روایتِ حدیث میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا انداز:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حدیث میں سند کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔اس لیے احادیث سنانے میں آپ کا یہ معمول تھا کہ کسی واسطے کے حذف کا وہم تک پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہمیشہ اہتمام سے یوں کہتے تھے:

”سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“

(میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے۔)

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے تقریباً تمام روایات اسی طرح منقول ہیں۔[4]

---

① مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۲۳۵۶، ط الرشد ؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۲۷۳

② صحیح البخاری، ح: ۷۳۶۰، کتاب التوحید،باب قول اللّٰہ: انما قولنا لشیٔ

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۰

④ انظر مرویات معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فی "مسند احمد بن حنبل"من رقم: ۱۶۸۲۸ الیٰ رقم: ۱۶۹۳۰

فکرِ آخرت کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نقل کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے کہ کہیں کوئی غیر محتاط روایت نقل نہ ہو جائے۔ خود فرماتے تھے:

''کوئی ایسا نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ جیسا قرب رکھتا ہو اور پھر وہ مجھ سے بھی کم احادیث نقل کرتا ہو۔''[1]

علمی حلقوں میں بھی کہا جاتا تھا: ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بہت کم احادیث نقل کیا کرتے تھے۔''[2]

جعلی روایات کی روک تھام اور اس پر سرزنش:

اس دور میں سازشی گروہوں کے کارندے اور جاہل واعظ لوگوں میں من گھڑت احادیث پھیلانے لگے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان کی سختی سے تردید کرتے تھے۔ اگر کوئی ایسی روایت سننے میں آجاتی تو آپ کا ردِعمل شدید ہوتا تھا۔ جھوٹی احادیث پھیلانے کی مذمت کرتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ یہ حدیثِ نبوی سناتے: ''جو مجھ سے جان بوجھ کر جھوٹ منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔''[3]

جھوٹی روایات کی پہچان کا معیار:

کسی حدیث کے من گھڑت ہونے کی علامت آپ کے نزدیک یہ تھی کہ وہ قرآنی عقیدے اور نظریے کے مخالف ہو یا صحیح سند سے مروی نہ ہو یا اس سے نفس کو خوش کرنے والی خواہشات کی پاسداری ہو۔

چنانچہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ایک بار فرمایا:

''میں نے سنا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسی احادیث سنا رہے ہیں جو نہ کتاب اللہ میں ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ یہ تمہارے جاہل لوگ ہیں ان سے بچتے رہنا اور ان خواہشات سے بھی جو لوگوں کو گمراہ کر کے چھوڑتی ہیں۔''[4]

جعلی راویوں اور جاہل واعظوں پر سرکاری پابندی:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک عظیم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے جعلی روایات کا سلسلہ بند کرنے کے لیے جاہل واعظوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ آپ کے دور میں کسی کو سرکاری طور پر تقرری یا اجازت نامہ حاصل کیے بغیر عوامی مجالس میں روایتیں اور قصے سنانے کی اجازت نہ تھی؛ کیوں کہ اس طرح جاہل لوگ ہر طرح کی روایتیں پھیلا دیتے ہیں۔

حج کے موقع پر معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں بنو مخزوم کا ایک آزاد کردہ غلام لوگوں کو قصے اور واقعات سناتا پھرتا ہے۔

آپ نے اس سے پوچھا: ''تمہیں اس پر مقرر کیا گیا ہے؟'' بولا: ''جی نہیں!''

فرمایا: ''پھر بلا اجازت یہ کام کرنے کا کیا مطلب؟''

بولا: ''ہم تو وہ علم پھیلاتے ہیں جو اللہ نے دیا ہے۔''

---

① صحیح مسلم، ح: ۷۲۳۲، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القران، ط دار الجیل

② کان معاویۃ قلما یحدث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. (مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۰۴۷)

③ شرح مشکل الآثار، ح: ۳۹۵؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹/۳۹۲، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

④ صحیح البخاری، ح: ۷۱۳۹، کتاب الاحکام، باب الامراء من قریش

فرمایا: ''اگر میں تیری مجلس میں آگیا ہوتا تو تیری زبان کاٹ دی ہوتی۔''[1]

اس غلط فہمی کی تردید کہ اصلاحِ باطن کافی ہے:

اس دور میں بعض گمراہ فرقے زیرِ زمین تانے بانے بن رہے تھے۔ شاید ان کے زیرِ اثر لوگ اس دور میں یہ سوچ رکھنے لگے تھے کہ ظاہر کا شریعت کے مطابق ہونا ضروری نہیں، بس دل صاف ہونا چاہیے۔ اس باطل خیال کی تردید کرتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے ایک بار فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کو میں نے فرماتے سنا تمہارے عمل کی مثال برتن کی سی ہے، اس کی بالائی سطح عمدہ ہو تو نچلا حصہ بھی عمدہ ہوگا، اوپر سے گندا ہو تو اندر سے بھی گندا ہوگا۔''[2]

مطلب یہ تھا کہ ظاہر و باطن دونوں کو پاک اور شریعت کے مُطابق رکھنا چاہیے۔

علماء، طلبہ اور مؤذنین کی حوصلہ افزائی:

لوگوں کو مساجد میں علم و ذِکر کی مجالس میں دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ایک بار کسی حلقۂ ذِکر میں تشریف لے گئے اور قسم دے کر پوچھا کہ کیا صرف ذِکر کے لیے بیٹھے ہو؟ اثبات میں جواب ملا تو فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ بھی اسی طرح ایک مجلس ذِکر سے گزرے تھے اور قسم دے کر یہی پوچھا تھا اور پھر فرمایا تھا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں فرشتوں کے سامنے فخر فرمارہے ہیں۔''[3]

تقریباً ہر جمعے کو اہلِ علم کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے یہ حدیث سنایا کرتے تھے:

''جب اللہ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی فقاہت نصیب کردیتا ہے۔''[4]

مؤذن حضرات امت کا وہ طبقہ ہیں جن کی عظمت اور اہمیت کو اکثر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان حضرات کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ حدیث سناتے تھے: اِنَّ الْمُؤَذِّنِيْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ. ''مؤذن حضرات قیامت کے دن سب سے بلند گردنوں والے ہوں گے۔''[5]

دنیا سے اکتاہٹ، فکرِ آخرت اور عشقِ نبوی:

دنیا کی زیب و زینت اور آرزوؤں سے آپ رضی اللہ عنہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دل ہمیشہ فکرِ آخرت سے لبریز رہتا۔ اس بارے میں حضور ﷺ کی احادیث کو اکثر یاد کرتے اور ساتھیوں کو سناتے۔

ایک بار فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کو میں نے فرماتے سنا کہ دنیا میں امتحان اور فتنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔[6]

---

① انساب الاشراف: ۳۵/۵، ط دار الفکر

② مسند احمد، ح: ۱۶۸۹۹

③ صحیح مسلم، ح: ۷۰۳۲، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن

④ مسند احمد، ح: ۱۶۸۸۸، ۱۶۸۳۶؛ شرح مشکل الآثار، ح: ۱۶۸۳؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۲۱/۱۹

⑤ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۲۳۴۱، ط الرشد؛ السنن الکبری للبیہقی، ح: ۲۰۳۶، ط العلمیۃ

⑥ مسند احمد، ح: ۱۶۸۹۹



ایک بار خطبہ دینے منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ لوگوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی تو استغفار پڑھ کر رو دیے۔ پھر فرمایا: ''چہرے زیادہ ہیں مگر معرفت کے آثار کم۔ لوگ ایک دوسرے کے ہم عصر ہوتے ہیں۔ آدمی کی موت کی نشانی ہے کہ اس کے ہم عصر فنا ہو جائیں۔ جنگِ صفین میں میرے ساتھ متعدد اصحاب رسول تھے، آج روئے زمین پر ان جیسے لوگ کہیں نہیں۔''

یہ کہہ کر منبر سے اترے اور کچھ ہی دنوں بعد وفات پا گئے۔ ①

نبی اکرم ﷺ سے اتنا عشق تھا کہ جب عمر ۶۳ سال کی ہوئی تو آپ کی تمنا تھی کہ اسی عمر میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تاکہ اس غیر اختیاری سنت پر عمل ہو جائے۔ ②

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور آزادیٔ اظہارِ رائے:

بعض معترضین کا کہنا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیے گئے تھے اور زبانیں بند کر دی گئی تھیں، اظہارِ رائے کی ہرگز آزادی نہ تھی۔

یہ الزام اتنا بے وزن ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اکثر مخالفین بھی اس سے متفق نہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نرمی، تحمل، قوتِ برداشت، فیاضی اور بردباری ایسی صفات ہیں جن کو عام تاریخ نویسوں تو کیا، مخالف مؤرخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ذیل میں کچھ تاریخی روایات پیش کی جاتی ہیں:

ایک بار کوئی شخص سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو دیر تک برا بھلا کہتا رہا اور وہ خاموش رہے۔

لوگوں نے کہا: ''آپ اس پر بھی صبر کا مظاہرہ کریں گے؟''

فرمایا: ''میں لوگوں کے اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک آڑے نہیں آنا چاہتا جب تک وہ ہماری حکومت کے درمیان حائل نہ ہونے لگیں۔'' ③ (یعنی بغاوت پر آمادہ نہ ہوں)

ایک بار کسی شخص نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بے نقط سنا ڈالیں۔ حاضرین نے بعد میں کہا: ''آپ جواب دے دیتے تو اچھا ہوتا۔'' فرمایا: ''مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ میری قوتِ برداشت، میری رعایا کے کسی فرد کی غلطی کے مقابلے میں کم ثابت ہو۔'' ④

عوام کی خوشی اور اطمینان کو وہ ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے، اس لیے ان لوگوں کو دوست اور مقرب بناتے جو عوام کے

① "كثرت الوجوه وقلت المعارف وانما الناس قرون ومن فناء المرء فناء قرنه، لقدشهد معي صفين عِدّة من اصحاب محمد ﷺ ما اصبح على وجه الارض مثل عِدّتهم." (الآحاد والمثاني، عن عبادة بن نسي، روایت نمبر: ٥٠٠) اسناده منقطع لان عبادة بن نسي مات سنة ثماني عشرة (ومائة) وهو شاب. (اكمال تهذيب الكمال للمغلطائي: ٧/١٩٣، ط الفاروق الحديثة) قال الحافظ الذهبي "اظن رواياته عن الكبار منقطعة." (الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة: ١/٥٣٣، ٥٣٤)

② مسند احمد، حدیث نمبر: ١٦٩١٩

③ عيون الاخبار لابن قتيبة الدينوري: ١/٦٣، ط العلمية، الكامل في التاريخ: ٣/١٢٦، سن ٦٠ هـ

④ البداية والنهاية: ٨/١٣٥، ترجمه: معاوية رضي الله عنه

نزدیک ہر دل عزیز اور محبوب ہوتے۔ کسی نے دریافت کیا: ''آپ کے پسندیدہ ترین لوگ کون ہیں؟''
فرمایا: ''وہ جن سے عوام سب سے زیادہ محبت کریں۔''[1]

بعض اوقات لوگوں کی سخت کلامی اور بدتمیزی کا آپ رضی اللہ عنہ جواب دیتے تو وہ بھی تحمل، وقار اور خیر خواہی کا عمدہ نمونہ ہوتا۔ ابوجہم نامی ایک صاحب آپ سے درشت کلامی کرتے رہے، آپ سر جھکائے خاموش رہے۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال چکے تو فرمایا: ''حکمرانوں سے ہوشیار رہنا چاہیے، ان کا غصہ بچوں کی طرح ہوتا ہے اور پکڑ شیر کی مانند۔''
پھر ان صاحب کو انعام و اکرام سے نواز کر واپس بھیجا۔''[2]

اظہارِ رائے، راست بازی اور حق گوئی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ خوشامد اور مدح سرائی سے منع کرتے تھے۔ مروان بن حکم کے بھائی عبدالرحمٰن بن حکم کو شعر و شاعری میں منہمک دیکھا تو فرمایا:
''قصیدہ گوئی سے بچتے رہنا؛ کیوں کہ یہ بے حیا لوگوں کی کمائی ہے۔''[3]

یہ روایات پختہ شہادت دے رہی ہیں کہ سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خوشامد پسندانہ باتوں سے نفرت تھی، وہ ضمیر کی آزادی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کے دور میں عوام کا گلا گھونٹ کر نہیں رکھا گیا تھا جیسا کہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے بلکہ رواداری، درگزر اور نرمی کا ماحول تھا۔ خود اکابر صحابہ اس کی گواہی دیتے تھے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست میں درگزر اور چشم پوشی کا پہلو نمایاں تھا، اس کی ایک اہم وجہ بزرگ صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کی تھی۔[4]
انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی گورنری کے دور میں ایک حدیث سنائی جس پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عمل کیا اور ان کی گورنری کامیاب رہی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''مُعاویہ کو ایک جملے نے نفع پہنچایا جو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، وہ یہ کہ لوگوں کے بھیدوں کے پیچھے مت پڑو، ورنہ تم انہیں بگاڑ دو گے۔''[5]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ سے نصائح لیتے رہتے تھے۔ ایک بار ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو خط لکھ کر بطورِ نصیحت کوئی خاص حدیث طلب کی۔ انہوں نے جواباً لکھوایا: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا کہ جو شخص اللہ کی ناراضی والے کام کرتا ہے، اس کے مداح لوگ بھی اس پر نکتہ چینی کرنے والے بن جاتے ہیں۔''[6]

---

① تاریخ الطبری: ۳۳۵/۵ ؛ الکامل فی التاریخ، سن ۶۰ھ
② تاریخ دمشق: ۱۸۲/۵۹ ؛ المجالسۃ وجواهر العلم لابی بکر احمد الدینوری: ۲۰۸/۴، ط بحرین
③ تاریخ دمشق: ۳۱۵/۳۴ ؛ الکامل فی التاریخ: سن ۶۰ھ
④ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا بلکہ وہ ان کی شام کی گورنری کے دور میں فوت ہو گئے تھے، ان کے یہ تاثرات حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی شام کی گورنری سے متعلق ہیں مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اس رنگ سے خالی نہ تھی۔ نوٹ: ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ حکمران حالات پر نگاہ نہ رکھیں اور دشمنوں کی سازشوں سے بھی غافل ہو جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ غفلت بھی نہ ہو اور ایک ایک شخص کے پیچھے بھی نہ پڑا جائے۔ معمولی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے، البتہ سماج دشمن عناصر اور دشمنانِ ملتِ اسلامیہ پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ یہ اصول ہر قسم کے اداروں کے سربراہوں کے لیے کارآمد ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی عام شہریوں سے درگزر اور نرمی کا معاملہ تھا جبکہ دشمنوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔
⑤ کلمۃ نفع اللہ بہا معاویۃ سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: لا تفتشوا الناس فتفسدوهم. (المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۱۱/۱۹)
⑥ اخبار المکیین من تاریخ ابن ابی خیثمۃ، ص۲۹۷، ط دار الوطن

فن تاریخ کے مجدد اور عمرانیات کے بانی علامہ ابن خلدون حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حلم کے متعلق فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عرب رؤساء اور قبائلِ مضر کے ساتھ چشم پوشی اور درگزر کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، اذیت ناک اور ناگوار باتوں کو برداشت کر جاتے تھے اور ان پر صبر کرتے تھے۔ وہ بردباری کی اس انتہا پر تھے کہ کوئی دوسرا ان تک نہیں پہنچ سکتا۔"[1]

شیعہ مؤرخ مسعودی کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:

"امیر معاویہ کے بعد عبدالملک بن مروان اور اس جیسے کچھ لوگوں نے کوشش کی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اخلاق کو اپنا سکیں مگر ان جیسے تحمل، ان جیسی سیاسی مہارت، ان کی طرح حالات کے ادراک، ان جیسی لوگوں کی حسبِ مرتبہ خاطر مدارات اور ان جیسی حسبِ مراتب مہربانی کا اہتمام کوئی نہ کر سکا۔"[2]

شیعہ مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے:

"معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جہاں میرا کوڑا کام دے جائے وہاں تلوار استعمال نہیں کرتا اور جہاں زبان سے کام نکل آئے وہاں کوڑا حرکت میں نہیں لاتا۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان تعلق ایک بال سے بندھا ہو، تو میں اسے بھی نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ پوچھا گیا: وہ کیسے؟ فرمایا: جب وہ کھینچیں گے تو میں ڈھیلا چھوڑ دوں گا۔ جب وہ ڈھیلا چھوڑ دیں گے تو میں کھینچ لوں گا۔"[3]

معلوم ہوا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں اظہارِ رائے پر پابندی کا الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔

☆☆☆

---

① تاریخ ابن خلدون: ۵/۳

② مُرُوج الذهب: ۲۲۲/۳، ط الجامعة اللبنانية.

③ تاریخ یعقوبی، ص ۲۰۲

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی اصل حیثیت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی جو تصویر ہم نے معتبر روایات کی روشنی میں پیش کی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا دورِ حکومت بھی شریعت کی پابندی، عدل وانصاف، قومی ہمدردی، خداترسی، عوامی حقوق کی پاسداری اور ملت کی نگہبانی کے اعتبار سے ہمارے لیے قابلِ رشک ہے۔ یہ تصور درست نہیں کہ حضرات خلفائے راشدین کے دور کے تیس سال ختم ہونے پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت آتے ہی یکدم عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ فسق وفجور، ایثار کی جگہ خودغرضی اور ہمدردی کی جگہ اقرباء پروری نے لے لی۔

تاہم ہمارا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کا دور بالکل خلفائے راشدین کے دور کے مطابق تھا اور اس میں خیر و برکت، ایثار وقربانی اور سادگی وقناعت کا وہی معیار تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا بلکہ زمانے کے تغیر، حالات کی تبدیلی، لوگوں کی معاشی حیثیت میں ترقی، نومسلم آبادی کی کثرت، اکابر صحابہ کی رخصتی اور زمانۂ نبوت سے بُعد سمیت متعدد وجوہ سے نہ تو اسلامی معاشرہ بالکل اسی معیار پر تھا نہ نظامِ حکومت۔

یہ تغیر وتبدل بالکل فطری اور قدرتی تھا۔ چونکہ اس دور میں گزشتہ زمانے جیسی اعلیٰ ترین مراتب والی شخصیات نہ تھیں اس لیے سابقہ خیر وبرکت کی توقع بھی اس دور میں نہیں کی جاسکتی تھی۔

گزشتہ دور سے اِس دور کا یہ فرق نہ صرف قابلِ قبول تھا بلکہ بعد والوں کے لیے اس کا معیار قابلِ رشک اور اس کی برابری کرنا مشکل تھا۔ ہاں جن لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کے ورع وتقویٰ اور امانت واحتیاط کا مشاہدہ کیا تھا انہیں کمی ضرور محسوس ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ اس تغیر پر ناگواری کا اظہار بھی کر دیتے تھے تاہم جو بھی تبدیلی تھی وہ زمانے کا فطری تقاضا تھی اور حدِ جواز کے اندر ہی تھی۔

تبدیلی کی ایک بڑی وجہ:

ہماری نگاہ میں تبدیلی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ہی جو فتنے کا دور شروع ہوا، اس سے ملکی سیاست بری طرح درہم برہم ہوئی، عقائد ونظریات کی دنیا میں بھی خلفشار پیدا ہوا اور مسلمانوں میں باہم تلوار بھی چلی۔ ہمارے خیال میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان حالات سے نبٹنے کے لیے جو کچھ کیا، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک اس بحرانی حالت پر عام طریقے (نارمل پروسس) سے قابو نہیں پایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اُمت کے عام معمول اور شورائی طرزِ سیاست سے ہٹ کر جو غیر معمولی اقدامات کیے تھے، اس کا پسِ منظر کچھ ایسا ہی تھا۔

دورِ حاضر میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی جمہوری ملک میں سیاست بحران کا شکار ہو جاتی ہے تو ایسے میں کوئی

فوجی جرنیل برسر اقتدار آ کر مارشل لگا دیتا ہے اور ملک میں چند سالوں کے لیے ایمرجنسی نافذ ہو جاتی ہے، بعض حقوق بھی معطل ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی جمہوری مملکتوں میں ایسا بارہا ہوا ہے اور اکثر لوگ مارشل لاء کو پسند نہ کرنے کے باوجود قومی سلامتی کے لیے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات حالات واقعی ایسے ہوتے ہیں کہ مارشل لاء ملک کی بقاء کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دور میں حالات واقعی ایسے تھے یا نہیں؟ یہ الگ بحث ہے مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حالات کو اسی زاویے سے دیکھ رہے تھے اور ان کے ''ایمرجنسی'' اقدامات کے پیچھے بلاشبہ بقائے ملک وملت کی مثبت سوچ کارفرما تھی۔ پھر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ باوقار معاہدے کے ذریعے اقتدار میں آئے، اس لیے وہ آمر تھے نہ ان کا دورِ حکومت ڈکٹیٹرشپ تھا۔ بلاشبہ یہ عادلانہ خلافت تھی جس میں بڑی حد تک گزشتہ خلفاء کے محاسن موجود تھے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافتِ راشدہ میں کیوں شمار نہیں کیا جاتا؟

رہی یہ بات کہ ان خوبیوں کے باوجود ان کے دور کو خلافتِ راشدہ کیوں نہیں کہا جاتا، تو اس کی چار وجوہ ہیں:

❶ خلافتِ راشدہ ایک اصطلاح ہے، اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ پائے کی وہ نیابت ہے جو آپ کے قریب ترین مہاجر رفقاء نے انجام دی ہو۔ پہلے چاروں خلفاء صفِ اوّل کے مہاجر صحابہ تھے، اس لیے ان کا دور خلافتِ راشدہ کہلایا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس صف میں نہیں تھے، اس لیے خلافتِ راشدہ کی اِصطلاح ان پر منطبق نہیں ہوئی۔

❷ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا برسرِ اقتدار آنا، خلافتِ راشدہ میں انتقالِ اقتدار کے ''پروسس'' سے مختلف تھا۔ خلفائے راشدین اپنی رغبت کے بغیر جمہور اکابرِ اُمت کی رضا سے حکمران بنائے گئے، جبکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کوشش اور سعی کے ذریعے حکمران بنے۔ اکابرِ اُمت کا اتفاقِ رائے ہونے سے پہلے وہ اس کے لیے کوشاں تھے۔ بلاشبہ وہ اس کوشش میں نیک نیت اور اُمت کے خیرخواہ تھے مگر انتقالِ اقتدار کے ''پروسس'' کا یہ نمایاں فرق ان کے دور کو خلافتِ راشدہ سے الگ کر دیتا ہے۔ علامہ ابنِ خلدون اس بنیادی فرق کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

> ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں خلافت غلبے کی کوشش کے ذریعے حاصل کی گئی تھی، جس کی وجہ ان کے دور میں ابھرنے والی وہ گروہ بندی تھی جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل خلافت رضامندی اور اجتماع کے ساتھ تھی؛ اس لیے علماء نے دونوں حالتوں میں فرق کر دیا۔ پس مُعاویہ رضی اللہ عنہ غلبے کی کوشش اور گروہ بندی کی بناء پر بننے والے پہلے خلیفہ تھے۔''[1]

❸ خلفائے اربعہ نے اپنی اولاد کے لیے جانشینی کا طریقہ رائج نہیں کیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا آغاز فرمایا۔ یہ اقدام اگرچہ حدِ جواز میں تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا اعلیٰ نمونہ نہیں تھا بلکہ یہ طرزِ بادشاہت سے مشابہ تھا۔

---

① ان الخلافة لعهده كانت مغالبة لاجل ما قدمناه من العصبية التي حدثت لعصره اما قبل ذالك اختياراً واجتماعاً فميزوا بين الحالتين فكان معاوية اوّل خلفاء المغالبة والعصبية. (تاریخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰)

● صحیح احادیث میں وارد ہے: ''خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ ثَلٰثُوْنَ سَنَةً.'' ''خلافتِ نبوت تیس سال ہوگی۔''[1]
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیس سال بعد والی حکومت اپنی حیثیت اور معیار ... سے الگ ہوگی۔
خلافتِ راشدہ کی اصطلاح کو چاروں خلفاء تک محدود رکھنے کی یہ چار اہم ترین وجوہ ہیں۔
مگر یاد رہے'' خلافتِ راشدہ''ایک اصطلاح ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے علاوہ ہر خلافت یا ہر حکومت گمراہی پر مبنی ہوگی۔لغوی اعتبار سے ہر نیک سیرت خلیفہ کو راشد اور اس کے دور کو خلافتِ راشدہ کہا جاسکتا ہے۔
مگر چونکہ جمہور علمائے اُمت کے ہاں لفظ'' خلافتِ راشدہ'' عقائد میں بطور ایک اصطلاح کے رائج چلی آرہا ہے اور اس میں تبدیلی کی کوشش اُمت میں انتشار کا باعث بنے گی، لہٰذا ایسی کسی کوشش کو درست نہیں سمجھا جاسکتا۔

خلافتِ راشدہ اور خلافتِ مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین فرق کے متعلق اکابر علماء کے ارشادات:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین فرق کو یوں واضح فرماتے ہیں:
''اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے کا موازنہ بعد والوں سے کیا جائے تو نہ کوئی مسلمان حکمران ان سے بہتر گزرا، نہ عوام کسی زمانے میں اتنے بہتر رہے۔ ہاں اگر ان کا موازنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے سے کیا جائے تو مراتب فضیلت کا فرق ظاہر ہوجائے گا۔''[2]
علامہ عبدالعزیز فرہاری ملتانی رحمہ اللہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی حیثیت کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:
''عملِ خیر کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت ہوتی ہے۔ ہر درجہ اپنے سے بلند درجے کے لحاظ سے قابلِ اعتراض بن جاتا ہے۔اسی لیے مقولہ مشہور ہے کہ'' نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب حضرات کی برائیاں شمار ہوتی ہیں''۔ نبی اکرم ﷺ سے جو ارشاد منقول ہے کہ'' میں روزانہ ستر بار استغفار کرتا ہوں۔'' تو اس کی تشریح بعض اکابر نے اس طرح فرمائی ہے کہ آپ ﷺ کے درجات میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی تھی اور آپ جب بھی ترقی کا کوئی اگلا درجہ پاتے تو (گزشتہ درجہ اس کی بہ نسبت کمی کوتاہی پر مشتمل محسوس ہوتا لہٰذا اس) گزشتہ درجے پر استغفار کرتے۔جب یہ بات واضح ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے مباحات میں توسع سے کام نہیں لیا۔ان کی سیرت تنگ عیشی اور مجاہدے کے لحاظ سے حضور اکرم ﷺ کی سیرت سے مشابہ تھی۔
جہاں تک حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا لیکن مباحات میں توسع اختیار کیا۔حقوقِ خلافت کی ادائیگی میں وہ خلفائے راشدین کے درجے کے نہیں تھے۔تاہم ان حضرات کی برابری نہ کرسکنا ان کے لیے کسی اعتراض کا سبب نہیں۔''[3]

---

[1] سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۶، کتاب السنة، باب فی الخلفاء؛ سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۶، باب ماجاء فی الخلافة، بسند حسن
[2] منہاج السنة: ۲۳۲/۶
[3] النبراس علی شرح العقائد للفرهاری، ص ۵۱۰، ط رشیدیه

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ اس بحث کا خلاصہ نہایت جامعیت کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین کے عہدِ حکومت میں فرق تو بے شک تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اس معیار کی نہیں تھی، جو خلفائے راشدین کو حاصل تھا، لیکن جمہور امت کے نزدیک یہ فرق اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایک طرف تقویٰ ہو، دوسری طرف فسق و فجور، یا ایک طرف عدل ہو، اور دوسری طرف ظلم وجور بلکہ یہ فرق عزیمت و رخصت کا، تقویٰ اور مباحات کا، احتیاط اور توسع کا، اور اصابتِ رائے اور قصورِ اجتہاد کا فرق تھا۔''[1]

''حضرات خلفائے راشدین احتیاط، تقویٰ اور احساسِ ذمہ داری کے جس بلند معیار پر قائز تھے، بعد میں وہ معیار باقی نہ رہا۔ خلفائے راشدین عزیمت پر عامل تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے رخصتوں میں توسع سے کام لیا۔ وہ حضرات اپنی عمومی زندگی میں تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرتے تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مباحات کی حد تک خلافِ احتیاط باتوں کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔ مثلاً خلفائے راشدین نے عزیمت اور احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا باوجودیکہ ان کے صاحبزادوں میں خلافت کی شرائط پائی جاتی تھیں، اس کے برخلاف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹے کو ولی عہد بنادیا۔ خلفائے راشدین نے عزیمت اور احتیاط کے تحت اپنا طرزِ معیشت نہایت فقیرانہ بنایا ہوا تھا مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے رخصت واباحت پر عمل کیا اور ان کے مقابلے میں نسبتاً فراخیٔ عیش اختیار فرمائی۔ خلفائے راشدین کے احساس ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ وہ عوام کے ایک ایک فرد کی خبر گیری اس کے گھر جا جا کر کیا کرتے تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسی کوئی بات مروی نہیں۔ خلفائے راشدین کی اصابت رائے اور صحت اجتہاد کا یہ عالم تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اتباع کے ساتھ ان کے اتباع کا حکم فرمایا لیکن حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جمہور امت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سے متعدد اجتہادی غلطیاں سرزد ہوئیں۔''[2]

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت اپنی جگہ بہترین اور قابلِ تعریف تھا۔ اگر اس کا موازنہ خلفائے راشدین کے دور سے کیا جائے تو یقیناً یہ اس پائے کا نہیں تھا جیسا کہ خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام ان حضرات سے کم ہے لیکن بعد والوں کی بہ نسبت یہ دور بہت اعلیٰ وارفع تھا۔

☆☆☆

---

① حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۴۹، ۱۵۰

② حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۴۴

اسباقِ تاریخ

① اسلام کے سیاسی نظام میں انتقالِ اقتدار سے لے کر حکومت چلانے تک ایک ایسی روح کارفرما ہے جو حکام کی آمریت کی راہ مسدود کرتی ہے۔ یہ اسلامی روح عوامی نمایندگی، شورائیت، عوام وحکام کے باہم اعتماد اور حکام کی عوام کے سامنے جواب دہی پر مبنی ہے۔ عوام کو امیر کی اطاعت کا درس دیا گیا ہے مگر ساتھ ہی اسلامی طرزِ حکومت عوام کو حکام کے بارے میں اظہار رائے کا ایک متوازن موقع ضرور دیتا ہے اور اختلافِ آراء کا حق ان سے سلب نہیں کرتا۔ یہ اختلافِ رائے حزبِ اختلاف کی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے، یعنی حکام سے اختلافِ رائے کرنے والے لوگ مجتمع ہو کر ایک تنظیم بن جائیں۔

② صحابہ کرام کی موجودگی میں مسلمانوں کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہونا اور بعض مواقع پر کشت وخون بھی ہوجانا اگرچہ رنج وغم کا باعث ہے مگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت صاف نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح مسلمانوں کو باہمی اختلافات، سیاسی تنازعات اور آپس کی جنگوں تک کے لیے عملی طور پر ایک ضابطۂ اخلاق اور معیار مل گیا، اسی لیے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ (اپنے مسلم مخالفین سے) جنگ کے لیے نہ جاتے تو کسی کو یہ علم حاصل نہ ہوتا کہ مسلمانوں کے بارے میں ایسے قضایا میں عملی نمونہ کیا ہے؟''[①]

③ ان مشاجرات کے باعث نہ صرف خانہ جنگی کے دوران باغیوں سے برتاؤ بلکہ دو مسلم حکمرانوں کے درمیان ناچاقی اور تنازعات کے لیے بھی ایک ضابطۂ اخلاق ہمارے سامنے آگیا جب کہ غیر مسلم دنیا میں اس کے بعد بھی صدیوں تک ایسے قوانین کا کوئی تصور سامنے نہ آیا جو خانہ جنگی کے نقصانات کو محدود کرسکیں۔ اگر آج کل اس بارے میں کچھ آئین سازی ہے تو اکثر اس کا اثر کاغذوں تک ہی محدود رہتا ہے۔

④ اختلاف معاشرے کا ایک فطری عمل ہے، اسلام اس پر قدغن نہیں لگاتا بلکہ جیسا اسلام کا انداز ہے وہ جذبات کی ہر فطری لہر کو کچھ حدود وقیود کا پابند کرکے معاشرے کے لیے اسے مثبت اور مفید عنصر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حزبِ اختلاف بھی ہر ملک، ہر قوم، ہر محلے اور ہر ادارے کا ایک فطری عنصر ہے۔ اگر اسے خیرخواہی پر مبنی رہنے دیا جائے تو یہ اکثر بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے، یہ پیش آمدہ مسائل اور صورتِ احوال کے دوسرے پہلو سامنے لاتا ہے، غلطیوں کا

① بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب: ۳۰۲/۱

احساس دلاتا ہے، ایسا نہ ہو تو حکام کے پاس صرف خوشامدی اور جی حضوری لوگ رہ جاتے ہیں اور محاسبہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے خلفائے راشدین نے اسلامی تعلیمات کے مطابق حزبِ اختلاف کے وجود کو قبول کیا۔

⑤ اسلام نے حکمران کو مختلف قسم کے مخالف گروہوں سے نمٹنے کے لیے کچھ اصول وقواعد دیے ہیں جبکہ اکثر معاملات میں حکمران کے لیے صوابدیدی اختیارات کے استعمال کی گنجائش رکھی ہے۔

اسلامی معاشرے میں ایسے گروہوں کی پانچ شکلیں ہوسکتی ہیں:

❶ ایک وہ جس میں کافر مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر سرگرم ہوں، اس کی مثال منافقین ہیں جو حضور ﷺ کے دور میں ظاہر ہوئے۔ یہ شکل بعد کے زمانوں میں بھی ہوسکتی ہے مگر ایسے مسلمان نما کفار پر مشتمل گروہ کب کب اور کہاں کہاں پایا جارہا ہے، اس کا یقینی علم بہت مشکل ہے؛ کیوں کہ کسی کلمہ گو پر اعتقادی نفاق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ایسی جماعت اگرچہ نہایت ضرررساں ہے مگر حضور ﷺ نے عام حالات میں اسے بھی برداشت کیا، سوائے اس کے کہ کسی خاص فرد نے کھلم کھلا حد سے تجاوز کیا تو اسے سزا دی گئی۔ اب بھی جرم کا ثبوت ملنے پر ہی ایسے لوگوں پر سزا جاری کی جاسکتی ہے۔

❷ ایسے گروہ کی دوسری شکل یہ ہے کہ اس میں شامل اکثر لوگ کلمہ گو ہوں مگر باطل کے لیے استعمال ہو رہے ہوں اور اپنی نادانی سے حکومت کے خلاف غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسی ہی حزبِ اختلاف کا سامنا کرنا پڑا جس میں ان کے طرزِ عمل نے اسلامی روح کے عین مطابق دنیا کو یہ درس دیا کہ ایسی حزبِ اختلاف کو اپنا موقف سنانے کا موقع دیا جائے اور اُن کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی جائے، خصوصاً ایسے حالات میں جب حزبِ اختلاف کا مطالبہ صرف خلیفہ یا اس کے عمال کی معزولی ہو، یعنی تحریک حکومت کے خلاف ہو، ریاست کے خلاف نہیں۔ ایسے میں حکومت ہتھیار اُٹھانے کا آغاز نہ کرے اور حتی الامکان خانہ جنگی کو ٹالنے کی تدبیر اختیار کرے۔ عمائد قوم حکومت سے مطمئن ہوں تو حکومتی ڈھانچے اور نظام کو فریق مخالف کے مطالبے پر تحلیل بھی نہیں کیا جائے گا بلکہ کوئی تیسری راہ نکالنے کی تگ ودو کی جائے گی اور حزبِ اختلاف کو برداشت کیا جائے گا۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حزبِ مخالف کے مقابلے میں حد درجے نرم رویہ اختیار کرتے ہیں، اس بارے میں اہلِ شوریٰ کے مشورے سنتے ضرور ہیں مگر ان کو قبول نہیں کرتے؛ کیوں کہ یہ اسلام میں پہلی حکومت مخالف تحریک تھی، اسے سختی سے کچلا جاتا تو بعد والے حکام کو مخالفین پر ہر قسم کے ظلم وتشدد کا بہانہ مل جاتا۔

مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تحمل بہر حال صوابدیدی تھا، خود ان کے اردگرد موجود اکثر صحابہ کی رائے مختلف تھی اور وہ ایسے موقع پر تلوار اٹھانا بہتر سمجھتے تھے۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت کو دیکھ کر بعد والے ہر حکمران پر یہ لازم نہیں ہو جاتا تھا کہ وہ حزبِ اختلاف سے نرمی ہی برتے بلکہ بعض حالات میں وہ سختی کرسکتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طاقت بھی استعمال کی اور جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے خلاف حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی اٹھنے والی مخالفانہ

تحریک کو سختی سے کچلا تا کہ کہیں شہادتِ عثمان جیسا کوئی اور سانحہ پھر رونما نہ ہو۔

⑤ مخالف گروہ کی تیسری شکل صالح اور مخلص افراد کی ہے جو نظام کی اصلاح اور حصولِ عدل کے لیے کھڑے ہوں، دوسری طرف وہ حاکم بھی قوم کا خیر خواہ اور عادل ہو جس سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مثال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں حصولِ انصاف کے لیے مسلح طور پر کھڑے ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس تحریک کو گفت وشنید سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش فرمائی۔ اس دوران غلط فہمی کی بناء پر جنگ بھی چھڑ گئی جو جلد ختم ہوگئی جس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ صلاح وتقویٰ کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا اور عمرو بن جُرمُوز جیسے شر پسندوں کو دھتکارا اور ڈانٹا۔

④ چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی نیک وصالح اور صحیح العقیدہ قائد تاویل کے ساتھ کسی جائز مطالبے کو منوانے کے لیے کسی عادل حکمران کی اطاعت سے آزاد ہو جائے اور زمینی حقیقت کے طور پر ایک علاقے کا خود مختار حاکم بن جائے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اصولی واجتہادی اختلاف اسی قسم کا تھا۔ وہ اپنے حامیوں کے ذریعے قصاصِ عثمان کے لیے دباؤ ڈالتے رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک طرف طاقت کے اظہار کے ساتھ انہیں مطیع کرنے کی کوشش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ طاقت کا استعمال بھی جائز ہے۔ دوسری طرف مذاکرات بھی کیے۔ حتیٰ کہ عین جنگ کے دوران مذاکرات کی پیش کش کو مان کر جنگ بندی کر دی، مخالف قائدین کی کردار کشی نہیں کی۔ ان پر فسق و نفاق کے الزامات نہیں لگائے۔

⑤ پانچویں صورت یہ ہے کہ عادل حاکم کے خلاف ایسا گروہ مسلح ہو کر اٹھ کھڑا ہو جو الگ عقیدے اور نظریے کی طرف دعوت دے رہا ہو اور عام مسلمانوں کا خون حلال تصور کرتا ہو۔ یہ مثال خوارج جیسوں کی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں کھڑے ہوئے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل نے بتایا کہ ایسے گروہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ان کے خلاف پوری ریاستی طاقت استعمال کی جائے گی۔

⑥ شہادتِ عثمان سے شروع ہونے والے اس دورِ فتن میں صحابہ کرام کا طرزِ عمل ہمارے لیے نمونہ ہے کہ اہل اسلام کے مابین اختلافات میں بہترین طرزِ عمل کیا ہو سکتا ہے۔

⑦ جنگ صفین وتحکیم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے رویہ ثابت کرتا ہے کہ خلیفہ پر لازم نہیں کہ وہ مسلمانوں کے تمام ملکوں پر قبضہ کرے۔ اگرچہ افضل صورت تو یہی ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک حکمران کے تحت رہیں تا کہ اتحاد واتفاق قائم رہے۔ لیکن اگر سب کو ایک حکومت کے تحت لانے کی کوشش سے اتحاد واتفاق پارہ پارہ ہوتا ہو، خوں ریزی بڑھتی ہو، اور بلاوجہ جانیں رائیگاں جاتی ہوں تو متوازی مسلم حکومت کو قبول کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

⑧ صحابہ میں سے ہر ایک اپنے ان فیصلوں اور اقدامات میں امت کا خیر خواہ، مخلص اور اجر وثواب کا حق دار تھا، کوئی بھی شر کا خواہاں نہیں تھا۔ ہاں معلومات اور فیصلوں میں ان سے غلطی ہو سکتی تھی؛ کیوں کہ وہ عالم الغیب نہ تھے۔

⑨ ان واقعات میں امت کے ہر حکمران، قائد، سپہ سالار اور افسر کے لیے سبق ہے۔ اگر متنازعہ سیاسی وعسکری معاملات میں وہ مخلصانہ طور پر شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے، پورے غور وفکر، مشاورت اور حکمت کے ساتھ کوئی اقدام کرے تو پراُمید رہے کہ وہ ماجور ہوگا۔ پھر اگر نتیجہ غلط بھی نکلے تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا کہ بندہ اپنی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں، ہاں اپنی سکت بھر کوشش میں جو کوتاہی کرے گا وہ عنداللہ قابلِ الزام ہوگا۔

⑩ چونکہ دورِ صحابہ کے ان اختلافات کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکمیلِ شریعت کی حکمت کارفرما تھی، اس لیے مختلف حالات میں بعض صحابہ عزیمت پر عمل پیرا رہے اور بعض حضرات رخصت پر۔ اس طرح اُمت کے سامنے شرعی حدود اچھی طرح واضح ہوگئیں کہ کون سی صورت اعلیٰ، افضل اور عینِ مطلوب ہے اور کون سی صرف جائز اور مصلحتاً قابلِ برداشت ہے۔ مثلاً حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بعض فیصلے سیاستِ شرعیہ کے لحاظ سے عزیمت پر مبنی نہ تھے، محض جواز کی حد میں تھے۔ لیکن اس طرح اُمت کو ناگزیر حالات میں حدِ جواز پر عمل کرنے کی گنجائش مل گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قیامت تک ہر مسلم حکمران اور قائد کے لیے بہر صورت عزیمت پر عمل کرنا واجب ہوتا، اور کسی کے لیے رخصت پر عمل کی کوئی صورت نہ رہتی، حالاں کہ بعض اوقات انسان اس پر مجبور ہوتا ہے۔

x x x

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

اے رب ہمارے! بخش دے ہمیں، اور ان کو بھی کہ جنھوں نے سبقت کی ہم سے ایمان میں
اور ہمارے دلوں میں کوئی کجی نہ رکھیو ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لائے۔
اے ہمارے رب! بلاشبہ تو بہت مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔

(سورة الحشر، آیت: ١٠)

☆☆☆

تاریخ صحابہ......اہم حالات ایک جھلک

۳۳ھ تا ۶۰ھ......653ء تا 680ء

☆☆☆

۳۳ھ:

- ابن سبا کی خفیہ دعوت کا ظہور۔ کوفہ کے شر پسندوں کی جلاوطنی

☆☆☆

۳۴ھ:

- وفات ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ......صفر (اگست 654ء)
- وفات عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ......جمادی الاولیٰ (نومبر 654ء)
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ناکام قاتلانہ حملہ
- ابن سبا کا افواہیں پھیلانا
- کوفہ میں بغاوت کی کوشش......رمضان (مارچ 655ء)
- کوفہ سے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ برطرف......شوال (اپریل 655ء)
- کوفہ پر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا تقرر......شوال (اپریل 655ء)
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تحقیقی وفد......ذوالحجہ (اکتوبر 655ء)
- وفات کعب احبار رحمہ اللہ......(655ء)

☆☆☆

۳۵ھ:

- باغیوں کی مدینہ آمد اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مباحثہ......رجب (جنوری 656ء)
- باغیوں کی دوبارہ آمد......شوال (اپریل 656ء)
- باغیوں سے معاہدہ......یکم ذی قعدہ (یکم مئی 656ء)
- باغیوں کی چڑھائی اور مدینہ پر قبضہ......وسطِ ذی قعدہ (15 مئی 656ء)

- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت......۱۸ ذوالحجہ (17 جون 656ء)
- خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ......۲۴ ذی الحجہ (23 جون 656ء)

☆☆☆

۳۶ھ:

- وفات حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ......محرم (اوائل جولائی 656ء)
- ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا مکہ سے بصرہ کی طرف کوچ کرنا......اواخر محرم (اواخر جولائی 656ء)
- وفات سلمان فارسی رضی اللہ عنہ......ربیع الاول (اواخرِ اگست 656ء)
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے کوفہ کی طرف کوچ......۳۰ ربیع الآخر (25 اکتوبر 656ء)
- جنگِ جمل......۱۰ جمادی الآخرہ (5 دسمبر 656ء)
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صفین پہنچنا......ذی الحجہ (مئی 657ء)

☆☆☆

۳۷ھ:

- جنگ صفین......۷ صفر تا ۹ صفر (26 تا 28 جولائی 657ء)
- خوارج کا ظہور......ربیع الاوّل (اگست 657ء)
- تحکیم دُومۃ الجَندل......رمضان (فروری 658ء)

☆☆☆

۳۸ھ:

- موت اُشتر نخعی......(658ء)
- جنگ نہروان......شعبان (جنوری 659ء)
- خِرّیت بن راشد کی سرکوبی......(659ء)
- وفات صُہیب رومی رضی اللہ عنہ......شوال (مارچ 659ء)
- حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مصر پر قبضہ......(659ء)

☆☆☆

۳۹ھ:

- فارس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سالار زیاد بن ابی سفیان کی فتوحات (659ء)
- وفات ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا......رجب (نومبر 659ء)

۴۰ھ:

ا حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں صلح......(660ء)

ا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت......۱۷ رمضان (25 جنوری 661ء)

ا خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ......رمضان (اواخر جنوری 661ء)

☆☆☆

۴۱ھ:

ا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری......ربیع الآخر (اگست 661ء)

ا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت......ربیع الآخر (اگست 661ء)

ا عُقبہ بن نافع کی افریقہ میں فتوحات......(662ء)

ا وفات حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ 175 سال کی عمر میں......ذی قعدہ (مارچ 662ء)

☆☆☆

۴۲ھ:

ا عراق میں خوارج کی شورش......(662ء)

ا عبدالرحمٰن بن سَمُرہ رضی اللہ عنہ کا جنوبی افغانستان پر دھاوا......(663ء)

ا راشد بن عَمرو کا سندھ پر حملہ......ذی قعدہ (فروری 663ء)

ا زیاد کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کرنا......(663ء)

ا وفات حضرت عثمان بن طلحہ اور حضرت صفوان بن اُمیہ رضی اللہ عنہما......(663ء)

☆☆☆

۴۳ھ:

ا وفات محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ......صفر (مئی 663ء)

ا خارجی سرغنہ مستورد کا قتل......(663ء)

ا عبدالرحمٰن بن سَمُرہ رضی اللہ عنہ کی خراسان میں فتوحات......(663ء)

ا عُقبہ بن نافع کی سوڈان میں فتوحات......(663ء)

ا وفات عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ......رجب (اکتوبر 663ء)

ا وفات عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ......۳۰ رمضان (جنوری 664ء)

☆☆☆

۴۴ھ:

- فتح کابل...... ربیع الاول (جون 664ء)
- مُہلّب بن ابی صُفرہ کی سرحدِ ہندوستان میں فتوحات...... (جون 664ء)
- اسلامی افواج کی لاہور تک پیش قدمی...... (جون 664ء)
- وفات ام المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا...... جمادی الاولیٰ (اگست 664ء)
- حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت میں پہلا حج...... ذوالحجہ (فروری 665ء)
- وفات ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ...... ذوالحجہ (فروری 665ء)
- حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے زیاد کا نسب ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ثابت ہونے کا اعلان

☆☆☆

۴۵ھ:

- مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کی افریقہ میں فتوحات...... محرم (مارچ 665ء)
- زیاد کا بصرہ کی حکومت سنبھالنا...... (665ء)
- زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی وفات...... رجب (ستمبر 665ء)

☆☆☆

۴۶ھ:

- عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ کی وفات...... رجب (ستمبر 666ء)
- ربیع بن زیاد حارثی کی بحِستان میں کابل شاہ سے لڑائی اور فتح...... (666ء)
- عبداللہ بن سوّار کی قیقان میں شکست......

☆☆☆

۴۷ھ:

- جہاد خراسان وغور...... (667ء)
- رُوَیفع بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا مشرقی افریقہ میں طَرابُلس پر قبضہ...... (667ء)
- سِنان بن سلمہ کی قیقان (سندھ و بلوچستان) میں فتوحات...... (667ء)

☆☆☆

۴۸ھ:

- مروان کی مدینہ سے برخواستگی، سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر...... (668ء)

۴۹ھ:

- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات......(669ء) ایک قول ۵۰ھ کا ہے۔
- شبیب بن بجرہ خارجی کی شورش......(669ء)

☆☆☆

۵۰ھ:

- وفات ام المؤمنین صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا......صفر (مارچ 670ء)
- وفات کعب بن مالک رضی اللہ عنہ......ربیع الآخر......(اپریل 670ء)
- عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی وفات......جمادی الآخرہ (جون 670ء)
- مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی وفات......شعبان (اگست 670ء)
- زیاد کو کوفہ کی حکومت ملنا......(670ء)
- جہاد کوہ اشل......(670ء)
- جہاد قسطنطنیہ۔ یزید بن معاویہ کی قیادت............(670ء)
- افریقہ میں پہلے عسکری شہر قیروان کی تعمیر......(670ء)

☆☆☆

۵۱ھ:

- شہادت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ......محرم (جنوری 671ء)
- حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو سزائے موت......(671ء)
- وفات جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ......ذوالحجہ (دسمبر 671ء)
- یزید کی امارت میں حج......ذوالحجہ (دسمبر 671ء)

☆☆☆

۵۲ھ:

- وفات عمران بن حصین رضی اللہ عنہ......صفر (فروری 672ء)
- وفات کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ......جمادی الاولیٰ (مئی 672ء)
- وفات معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ......رجب (جولائی 672ء)
- وفات ابوبکرہ رضی اللہ عنہ......(672ء)

☆☆☆



۵۳ھ:

- زیاد بن ابی سفیان کی وفات......رمضان (اگست 673ء)
- جُنادہ بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کا روڈس پر جہاد......(673ء)
- وفات فَضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ قاضی القضاۃ دمشق......(673ء)

☆☆☆

۵۴ھ:

- سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی مدینہ سے معزولی، مروان کا دوبارہ تقرر......(674ء)
- عبیداللہ بن زیاد کا خراسان میں تقرر، بخارا پر پہلی لشکر کشی......(674ء)
- وفات اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ......رجب (جون 674ء)
- وفات حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ......(674ء)
- وفات حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ 120 سال کی عمر میں......رمضان (اگست 674ء)
- یزید کی ولی عہدی کے لیے مروان بن الحکم کی کوشش
- حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی وفات

☆☆☆

۵۵ھ:

- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی رحلت، محرم (دسمبر 674ء)
- وسط ایشیا میں سعید بن عثمان کی یلغار......ذی قعدہ (ستمبر 675ء)

☆☆☆

۵۶ھ:

- وفات ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا......محرم (دسمبر 675ء)
- وسط ایشیا میں سعید بن عثمان کی فتوحات، سمرقند کی فتح......ربیع الآخر (فروری 676ء)
- محاذِ سمرقند پر قُثم بن عباس رضی اللہ عنہ کی شہادت......ربیع الآخر (فروری 676ء)
- حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت میں دوسرا حج۔ یزید کی ولی عہدی کا اعلان......ذوالحجہ (اکتوبر 676ء)

☆☆☆

۵۷ھ:

- افریقہ میں حسان بن نعمان کا تقرر اور فتوحات......(676ء)



ا مروان مدینہ سے برخواست ۔ ولید بن عتبہ گورنر......شوال (اگست 677ء)

☆☆☆

۵۸ھ:

ا وفات عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ...... جمادی الآخرہ (اپریل 678ء)

ا وفات عُقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ عنہ، سابق حاکم مصر وسپہ سالار بحریہ......(اپریل 678ء)

ا وفات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا......۱۷ رمضان (۱۳ جولائی 678ء)

☆☆☆

۵۹ھ:

ا ابوالمہاجر دینار کی فتوحاتِ افریقہ، قرطاجنہ پر حملہ......(679ء)

ا وفات ابومحذورہ رضی اللہ عنہ مؤذن مکہ مکرمہ......(679ء)

ا وفات سعید بن العاص رضی اللہ عنہ......(679ء)

ا وفات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ......ذی قعدہ (اگست 678ء) دوسرا قول ۵۷ھ کا ہے۔

☆☆☆

۶۰ھ:

ا وفات سَمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ......محرم (اکتوبر 679ء)

ا وفات حضرت امیر مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ......

صحیح: ۱ [illegible] (11 [illegible] 680ء)

تیسرا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ

دورِ فتن

یزید بن مُعاویہ......تا......شہادتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

رجب ۶۰ھ......تا...... جمادی الاولیٰ ۷۳ھ

اپریل ۶۸۰......تا......اکتوبر 692ء

دورِ یزید بن مُعاویہ

رجب ۶۰ھ......تا......ربیع الاول ۶۴ھ

اپریل ۶۸۰ء......تا......اکتوبر ۶۸۳ء

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا جانشین چونتیس سالہ یزید، ان کی وفات کے وقت حمص کے مضافاتی قلعے "حَـوّارین" میں تھا۔ اس سانحے کی خبر سن کر وہ تیزی سے دارالخلافہ آیا، تب تک حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی تدفین بھی ہو چکی تھی۔ ①

یزید کا پہلا خطبہ:

یزید نے مملکت کے عمائد اور اہلِ دمشق سے تعزیتی خطاب کرتے ہوئے حمد و ثنا کے بعد کہا:

> **"مُعاویہ رضی اللہ عنہ بلاشبہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے تھے، اللہ نے ان پر انعام و اکرام کیا اور پھر اپنے پاس بلالیا۔ وہ بعد والوں سے بہتر اور پہلے والوں سے فروتر ہیں۔ میں انہیں اللہ کے یہاں معصوم قرار نہیں دیتا کہ وہی ان کا حال بہتر جانتا ہے۔ اگر ان کی بخشش ہوگی تو اللہ کی رحمت سے، اور اگر پکڑ ہوگی تو ان کی اپنی لغزش کی وجہ سے۔ ان کے بعد ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ میں نے خود اس کی کوشش نہیں کی مگر جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔ آپ اللہ کا ذکر اور استغفار کریں۔"** ②

بیعت کے لیے قاصدوں کی روانگی:

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری ایام میں کوفہ میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، بصرہ میں عبید اللہ بن زیاد اور مدینہ میں ولید بن عُتبہ گورنر تھے۔ یزید نے اس وقت انہی کو برقرار رکھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے پورے عالمِ اسلام میں امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع اور اپنی بیعتِ خلافت کے لیے قاصد اور نمائندے روانہ کر دیے۔ ③

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۶۲/۳...... حوارین دمشق سے تین چار دن کی پیدل مسافت پر ہے۔ (مسالک الابصار: ۷۲/۱)

② البدایۃ و النہایۃ: ۶۵۹/۱۱، واخرجہ ابن قتیبۃ اوّلہ: ان معاویۃ کان حبل من حبال اللہ . (عیون الاخبار: ۲۶۰/۲، ط العلمیۃ)
یزید کا یہ خطبہ ظاہر کرتا ہے کہ خلیفہ بنتے وقت وہ ایسا کھلم کھلا فاسق نہ تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور وہ برمحل، موزوں اور بلیغ خطابت کے فن سے واقف تھا۔

③ تاریخ الطبری: ۳۴۷/۵

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کیوں نہ کی؟

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی سے یہ موقف تھا کہ موروثی حکومت سے اجتناب کرتے ہوئے خلفائے راشدین کے دور کی وسیع البنیاد شورائیت کو اسی شکل میں واپس لانا چاہیے اور امت کی زمامِ اقتدار افضل فرد کے حوالے ہونی چاہیے۔ اسی لیے انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت سے بھی اجتناب کیا تھا۔ ان دونوں کا یزید کی بیعت کر لینا رخصت کے زمرے میں تو آ سکتا تھا مگر عزیمت کی بات یہی تھی کہ اس نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی جس کے سبب آگے چل کر متعدد مفاسد پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

اس کے لیے پہلا درجہ یہ تھا کہ یہ حضرات اپنے اختلافِ رائے پر برقرار رہ کر اسلامی سیاست کے صحیح مفہوم کو اجاگر کرتے، بیعت کر کے یزید کے حلقہ بگوشوں میں شامل نہ ہوتے۔

کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ شورش پر تلے ہوئے تھے؟

قرائن سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سوچ اور فکر ابتدا میں اتنی ہی تھی کہ وہ یزید سے بیعت نہ کریں اور اپنی دیانت دارانہ رائے کے خلاف کسی قول وفعل کے مرتکب نہ ہوں۔ ایسی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ حضرات کوئی شورش برپا کرنے پر تلے تھے۔ ورنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی اہلِ کوفہ کے خطوط ملنے لگے تھے جن میں انہیں کوفہ آ کر اُمت کی قیادت کی دعوت دی جاتی رہی تھی ① مگر کسی مستند روایت سے یہ ثابت نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس دعوت کو سراہا ہو بلکہ قرائن بتاتے ہیں کہ یزید کی تخت نشینی پر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور شاید وہ عمر بھر مدینہ میں ہی رہنا پسند کرتے تھے اور ایک فتوے کی حیثیت سے اپنی رائے پر قائم رہنا کافی سمجھتے۔ مگر جب انہیں جبری بیعت سے بچنے کے لیے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تو اس وقت وہ کوفہ جانے کے امکان پر غور کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ②

یزید کی پہلی سیاسی غلطی:

یزید کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ ان حضرات کو اپنی بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں بہت سے حضرات کو غیر جانب دار رہنے دیا اور ان کے احترام میں کوئی کمی نہ کی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی یزید کی بیعتِ ولی عہدی نہ کرنے والے اکابر کو ان کے ضمیر کے خلاف چلنے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ یزید کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ان بزرگوں پر فوری بیعت کے لیے دباؤ ڈالا اور اپنے والدِ گرامی کی وہ وصیت نظر انداز کر دی جس میں اسے شرفاء کے ساتھ سختی نہ برتنے اور اپنی رائے پر اصرار نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ ③

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/۷۰، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ
② انساب الاشراف: ۳/۱۵۵، ۱۵۶، ط دار الفکر
③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۲۴۴، ۲۴۵

اس وصیت کو فراموش کر کے یزید سے غلط فیصلہ سرزد ہوا جس نے مزید دشوار حالات کو جنم دیا جن سے نمٹنے میں یزید نے مزید غلط فیصلے کیے اور یوں حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔

مستند روایت کے مطابق یزید نے تخت نشین ہونے کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام رُزَیق کو مدینہ کے گورنر ولید بن عُتبہ کی طرف یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر کو فوراً اپنے پاس بلوائے اور ان سے بیعت لے۔ یہی قاصد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر بھی لے کر جارہا تھا۔

قاصد جب مدینہ پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔۔اس نے دربان سے اصرار کر کے گورنر ولید بن عُتبہ سے فوری ملاقات کی اور یہ اہم پیغام دے دیا۔[1]

عبداللہ بن زبیر اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی مدینہ سے مکہ روانگی:

ولید بن عُتبہ نے اسی وقت پہلے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قصرِ امارت میں بلوایا اور بیعت کا مطالبہ کیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''نہ تو یہ بیعت کا وقت ہے اور نہ مجھ سا آدمی یوں تنہائی میں بیعت کر سکتا ہے۔ آپ کل منبر پر بیٹھ کر بیعت لیں۔''

اسی دوران حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے۔ چوں کہ ولید بن عُتبہ نرم دل انسان تھا اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی دلیل سے مطمئن ہو چکا تھا اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر بھی بیعت کے لیے زور نہ ڈالا اور اس وقت دونوں حضرات کو جانے دیا۔ البتہ نگرانی کے لیے کچھ آدمی پیچھے بھیج دیے۔ یہ حضرات حکومت کا رویہ دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں ان پر سختی کی جائے گی جبکہ بیعت کرنا ان کے ضمیر کے خلاف تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ رات کے آخری پہر شہر سے نکل کر ایک غیر معروف راستے سے مکہ روانہ ہو گئے۔[2]

ولید کو صبح ان کی عدم موجودگی کا علم ہوا تو تیس یا اسی سواران کے تعاقب میں روانہ کیے مگر یہ ہاتھ نہ آئے۔[3]

ایک دو دن بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی خاندان سمیت مدینہ سے مکہ کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کی۔[4]

ان حضرات کے مکہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ شام سے نسبتاً قریب تھا۔ مکہ اس سے دوگنا مسافت پر اور پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس لیے یہاں حکام کا ان پر گرفت کرنا مشکل تھا۔ پھر حرم کی تقدیس کے پیش نظر حکومت سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ وہاں کوئی کارروائی کر کے بدنامی مول نہیں لے گی۔ ان پہلوؤں سے دیکھا جائے تو ان حضرات کا مدینہ کی بہ نسبت مکہ میں محفوظ ہونا آسانی سے سمجھ آجاتا ہے۔

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۲، وھب بن جریر عن جُویریہ بن حازم عن محمد عن رزیق ؛ العقد الفرید: ۱۲۵/۵ عن القاسم بن سلام ؛ المحاسن و المساوی لابراھیم البیھقی ، ص ۲۶ عن ابی معشر السندی، (قلمی نسخہ)

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۳۲، عن وھب بن جَریر عن جویریة بن اسماء عن شیوخ المدینة

③ انساب الاشراف، بلاذری: ۳۰۰/۵ ،ط دارالفکر ؛ تاریخ الطبری: ۳۴۱/۵ عن ابی مخنف

④ تاریخ الطبری: ۳۴۱/۵

حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی مدینہ سے روانگی سے قبل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ روانگی سے قبل الوداعی ملاقات کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھی گئے تھے۔ وہ ان کا ارادہ سن کر بولے: ''مت جایئے۔'' مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ قائل نہ ہوئے۔

انہوں نے گفتگو کے دوران ابن عمر رضی اللہ عنہ کو خطوط کے وہ پلندے بھی دکھائے جو اہلِ عراق نے انہیں بھیجے تھے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا: ''ان لوگوں کے پاس مت جایئے گا۔''

رخصت کرتے ہوئے ابن عمر رضی اللہ عنہ انہیں گلے لگا کر خوب روئے اور فرمایا:

''اے شہید! تجھے اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مکہ کے راستے میں عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ ملے، پوچھا: ''کہاں کا ارادہ ہے؟''

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ابھی تو مکہ جا رہا ہوں۔ پھر وہاں جا کر آئندہ کے لیے استخارہ کروں گا۔''[2]

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کی ترغیب کے باوجود اس وقت کوفہ جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا؛ کیوں کہ اگر وہ کوفہ جانا چاہتے تو مدینہ سے سیدھے وہاں چلے جانے میں نسبتاً کم مسافت طے کرنا پڑتی۔

مشہور روایت کے مطابق اتوار ۲۷ یا ۲۸ رجب کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے نکلے اور تیزی سے سفر کر کے جمعہ ۳ یا ۴ شعبان کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ یہاں آپ چار مہینے ۵ دن (۸ ذی الحجہ ۶۰ھ تک) مقیم رہے اور اس دوران حالات پر غور وفکر کرتے رہے۔[3]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تحریک کا اصل پسِ منظر:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے آغوشِ رسول میں پرورش پا کر اعلیٰ ایمانی واخلاقی اقدار کی گھٹی لی اور حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم کی نہ صرف بیش از بیش شفقتیں سمیٹیں بلکہ ان سے اکتسابِ فیض بھی کرتے رہے۔ وہ پوری اُمت میں سب سے عالی نسب اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے علم وعرفان، اور ان کی سیاست و فقاہت کے امین تھے۔ دینی بصیرت، علمی رسوخ اور دوراندیشی کے لحاظ سے وہ اُمت کے ممتاز ترین فرد تھے۔ پھر وہ کوئی ناتجربہ کار جوشیلے نوجوان نہیں بلکہ زمانے کے سرد وگرم چشیدہ تھے اور اس وقت وہ اپنی عمر کی چھٹی دھائی پوری کرنے والے تھے۔ ایسی ہستی کے بارے میں یہ گمان کر لینا بہت سطحی بات ہوگی کہ وہ محض یزید کی ذاتی کمزوریوں یا اس کے متعلق فسق وفجور کی شہرت کو بنیاد بنا کر بیعت سے اجتناب کر رہے ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی نگاہ اسلامی نظامِ سیاست میں پڑنے والے اس رخنے پر تھی جو بظاہر معمولی اور فی الحال

---

① فی آخره قال ابن عمر: "استودعک اللہ من مقتول." (مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۱۵۱۳۰ قال الهیثمی: رواه البزار والطبرانی فی الاوسط ورجال البزار ثقات ، المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۵۹۷ ، تاریخ دمشق: ۲۰۲/۱۴)

② انساب الاشراف: ۱۵۶،۱۵۵/۳، ط دار الفکر ③ تاریخ الطبری: ۳۸۱/۵ عن ابی مخنف؛ انساب الاشراف: ۱۶۰/۳

قابلِ تحمل لگتا تھا مگر وہ ایک غیر معمولی دوراندیش مُدبّر کی طرح مستقبل کو گویا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، جہاں اس معمولی انحراف کے اثرات، چند نسلوں بعد نہایت منفی انداز میں برآمد ہونے کو تھے۔

جس طرح دریا کے بند میں پڑنے والی دراڑ سے پانی رِستا دیکھ کر ایک تجربہ کار آدمی یقینی طور پر خطرہ محسوس کر لیتا ہے اور ساری مصروفیات چھوڑ کر اپنی پوری جان اس معمولی سے شگاف کو پُر کرنے میں لگا دیتا ہے اور ان لوگوں کے اعتراضات کی بالکل پروا نہیں کرتا جو خطرے کا پوری طرح اندازہ نہ لگا پانے کے باعث، اس کی تگا پو کو کارِ عبث سمجھ رہے ہوں، بالکل اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کل کے مضرات کو آج ہی پوری طرح بھانپتے ہوئے، جان کی پروا کیے بغیر، ایک موقف اختیار کر لیا اور پھر اس بارے میں کسی کی نصیحت وفہمائش کو خاطر میں نہ لائے۔

رہی یہ بات کہ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس فکر وسعی پر خروج یا بغاوت کا اطلاق ہو سکتا تھا؟ تو درحقیقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تحریک اپنے اُس آخری مرحلے تک پہنچ کر بھی جس میں جانثاری اور جانبازی کا رنگ نمایاں ہو چکا تھا، اس قدر محتاط اور حدِ اعتدال کے اندر تھی کہ اس پر خروج کا اطلاق کر دینا آسان نہیں۔

اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تجزیے اور اجتہاد کے مطابق ابھی یزید کی خلافت منعقد نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یزید کے لیے ولی عہدی کی جو بیعت لی گئی تھی، اس کی حیثیت محض ایک مشورے کی تھی اور اس سے یزید کی خلافت ثابت نہیں ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ اسلامی سیاست کے ماہرین میں سے ایک بلند پایہ ہستی قاضی ابویعلیٰ الفراء رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''خلافت محض ولی عہد بنا دینے سے منعقد نہیں ہو جاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منعقد ہوتی ہے۔''[1]

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ یزید مسندِ خلافت پر براجمان تو ہو چکا تھا مگر شام کے سوا کہیں بھی اسے مسلمانوں کی حمایت میسر نہ تھی۔ دمشق کے علاوہ عالمِ اسلام کی سیاست کے بڑے مراکز: مکہ، مدینہ، کوفہ اور بصرہ تھے۔ اہلِ حجاز کو یزید کی حکومت ہرگز گوارا نہ تھی۔ چند برس پہلے جب یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ درپیش ہوا تھا تو سب سے زیادہ تحفظات اکابرِ حجاز ہی کو لاحق تھے جیسا کہ اس وقت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی میں سرِ عام اس جدّت کو قیصر وکسریٰ کی رسم کہا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے بھی مجلسِ بیعت میں حاضر نہ ہو کر اپنی بیزاری ظاہر کر دی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی بیعت کو ٹالتے آ رہے تھے۔ اہلِ حجاز جوان اکابر کے عاشق

---

[1] قال: لان الامامة لا تنعقد للمعهود اليه بنفس العهد، وانما تنعقد بعهد المسلمين. (الاحكام السلطانية للفراء، ص ٩، ط العلمية)

قال الدكتور احمد جاد: ولا قيمة لعهد الامام لاحد من بعد بتولى منصب الخلافة مالم تزك اغلبية الامة هذا الترشيح وتبايعه على ذلك. (انظر حاشية "الاحكام السلطانية" للماوردى، ص ٢٢، ط دار الحديث القاهرة)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں: ''علماء کا راجح قول یہ ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے اور خلیفہ کے بعد امت کے اربابِ حل وعقد کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو ولی عہد ہی کو خلیفہ بنائیں اور چاہیں تو باہمی مشورے سے کسی اور کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ لہٰذا حضرت مُعاویہ کی وفات کے بعد یزید کی خلافت اس وقت تک منعقد نہیں ہو سکتی تھی جب تک امت کے اربابِ حل وعقد اسے منظور نہ کر لیں۔'' (حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ١٢٦)

تھے، یزید کو مسلمانوں کی رضا اور اتفاقِ رائے کے بغیر زبردستی مسلط ہو جانے والے حکمران کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ بعض جلیل القدر تابعین یزید کی بیعت سے بچنے کے لیے نقل مکانی کر گئے تھے۔[1] اُدھر عراق کے لوگ بھی یزید کی حکومت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے، اور ان کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو موصول ہونے والے خطوط یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یزید کی حکومت وہاں قائم نہیں ہو سکتی۔ خود یزید کے بعض گورنروں کو بھی یقین نہ تھا کہ یہ نئی حکومت قائم رہ پائے گی یا نہیں۔ ان کا اپنا دلی رجحان حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف تھا جیسا کہ کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، واضح طور پر فرماتے تھے: ''بحدل کے نواسے کی بہ نسبت ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے زیادہ محبوب ہیں۔''[2]

ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ خیال زمینی حقائق کے خلاف نہ تھا کہ یزید کی حیثیت ایک ایسے سیاست دان کی سی ہے جو اُمت کی رضا و رغبت کے بغیر جبراً مسلط ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی خلافت ابھی منعقد نہیں ہوئی لہٰذا اُس کا غلبہ ثابت ہونے سے پہلے پہلے ایک مثالی حکومت کے قیام کی سعی کر گزرنا، اُس خروج میں داخل نہیں ہوگا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ کسی بنی ہوئی حکومت کو توڑنا نہیں بلکہ ایک متنازعہ حکومت کے قیام کی کوشش کو روک کر مسلمانوں کو خلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق ایک متفقہ اور مقبول حکومت فراہم کرنے کی سعی ہوگی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے وہ فرامین نبویہ بھی تھے جن میں کسی برائی کو دل سے بُرا سمجھنے کو سب سے کم درجے کا ایمان بتایا گیا ہے اور حسبِ قدرت اسے ہاتھ یا زبان سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔[3]

حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے تجزیے کے مطابق ابھی قدرت و استطاعت موجود تھی، اس لیے مکہ پہنچنے کے بعد دونوں اس امر پر متفق ہو گئے کہ یزید کی حکومت کا قیام روکنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اگرچہ اس راستے میں سخت خطرات بھی تھے اور ان حضرات کو پورا اندازہ تھا کہ یہ جان کی بازی ہے مگر ان دونوں حضرات کی فقاہت فیصلہ دے رہی تھی کہ جان پر کھیل کر عزیمت کی یہ راہ اختیار کرنا کم از کم ان کے حق میں واجب ہو چکا ہے۔

مدینہ منورہ میں پکڑ دھکڑ، ولید بن عُتبہ کی معزولی اور عَمرو بن سعید کا تقرر:

ولید نے حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے نکل جانے کے بعد عبداللہ بن مطیع العدوی رضی اللہ عنہ اور مُصعَب بن عبدالرحمٰن بن عوف کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عقیدت مند تھے۔ اہلِ مدینہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے فریاد کی کہ وہ حکام کو اس طرح کی سختیوں سے روکیں۔

---

[1] عن شهر بن حوشب قال: لما جاءتنا بيعة يزيد، قلتُ لو خرجت الى الشام فتنحيتُ من شر هذه البيعة. (جامع معمر بن راشد، باب اشراط الساعة)

[2] لابن بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم احب الينا من ابن بنت بحدل. (المحن، ص ١٥٠ عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سُحنون)

یاد رہے کہ یزید کی والدہ کا نام میسون بنت بحدل تھا۔ یہ خاتون مشرف بہ اسلام ہوگئی تھیں مگر یزید کا نانا بحدل جو دمشق میں ایک گرجے کا متولی تھا، نصرانی رہا۔ (النصرانية وآدابها بين العرب الجاهلية، رزق الله بن يوسف، ص ٢١)

[3] من رای منکم منکرا فليغيره بيده، فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذالک اضعف الايمان. (صحيح مسلم، ح: ١٨٦، كتاب الايمان، باب كون النهي عن المنكر من الايمان؛ مسند ابي يعلي، ح: ١٠٠٩؛ سنن ابن ماجه ح: ٤٠١٣)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بے چین ہو کر ولید بن عتبہ سے ملے اور اسے کہا:

”اپنی حکومت کے استحکام کے لیے حق پر استقامت اختیار کرو، ظلم مت کرو۔ جنہیں گرفتار کیا ہے وہ بے قصور ہیں انہیں چھوڑ دو۔“ ولید بن عتبہ نے معذوری ظاہر کی کہ امیر المؤمنین یزید کا حکم یہی ہے۔

اہلِ مدینہ نے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی کی سفارش کو بھی ناکام جاتے دیکھا تو خود قید خانے پر حملہ کر دیا۔ اس کارروائی میں عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ آزاد ہو گئے اور فرار ہو کر مکہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔[1]

حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے مدینہ سے نکل جانے کی خبر سے یزید کی تشویش بڑھ گئی۔ اس نے بیعت لینے میں ناکامی کی ساری ذمہ داری ولید بن عتبہ پر ڈال دی اور اسے کمزور سمجھتے ہوئے معزول کر دیا۔ اس کی جگہ عَمرو بن سعید الاشدق کا تقرر کیا جو سختی میں مشہور تھا۔[2] وہ رمضان میں مدینہ پہنچا[3] اور آتے ہی قسم کھا کر مکہ معظمہ پر چڑھائی کا عزم ظاہر کیا جہاں یہ حضرات پناہ لیے ہوئے تھے[4] مگر عمرو بن سعید کے لیے فوری طور پر مکہ پر حملہ ممکن نہ تھا؛ کیوں کہ ماہِ شوال کی آمد آمد تھی اور حجاج کے قافلے مکہ کا رخ کرنے والے تھے۔ فرزندانِ توحید اس مقدس سرزمین پر، ایسے مبارک ایام میں، رحمت عالم ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسوں جیسی عظیم ہستیوں کے خلاف کارروائی کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ پس یزید کی حکومت کے پاس ماہِ ذوالحجہ کے اختتام اور حاجیوں کی واپسی تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق جانے کا عزم کیوں کیا؟

اس دوران حالات کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتے کرتے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ زبیر رضی اللہ عنہ جو موقع بموقع مشوروں میں مصروف رہتے تھے، اس نتیجے تک پہنچ گئے تھے کہ کسی مناسب مقام کو مرکز بنا کر اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانا چاہیے مگر جدوجہد کے مرکز کے تعین میں دونوں کی رائے الگ الگ تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ کو سب سے محفوظ اور مناسب سمجھتے تھے جو عالمِ اسلام کا ایمانی وروحانی مرکز تھا اور وہاں ان کے حامی قریشیوں کے علاوہ اہلِ صلاح وتقویٰ کی بڑی تعداد آباد تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی مکہ ہی کو مرکز بنائیں۔

لیکن جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس کوفہ سے مسلسل خطوط اور وفود آ کر اپنی پختہ حمایت کا یقین دلا رہے تھے، اس کے پیشِ نظر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق جانے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ آپ کے نزدیک تحریک میں عوام کے جان ومال کا تحفظ بہت اہم تھا۔ حجاز کی بہ نسبت عراق میں افرادی قوت زیادہ تھی، اس لیے وہاں کم نقصان کے ساتھ غلبے کی امید کی جاسکتی تھی۔

---

① انساب الاشراف، بلاذری: ۳۰۲/۵، ط دارالفکر

اس واقعے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کی حکومت اس وقت تک برائے نام ہی تھی۔ اور اہلِ شام کے سوا باقی لوگوں نے اسے عموماً قبول نہیں کیا تھا۔

② تاریخ الطبری: ۳۴۳/۵ ③ عمرو بن سعید بن العاص الاشدق قدم المدینة فی رمضان سنة ستین. (تاریخ الطبری: ۳۴۳/۵)

④ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۲۳ بسند جویریه بن اسماء

دوسرے آپ کو اپنی جان سے زیادہ حرمین کا تقدس عزیز تھا جس کی خاطر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صبر و تحمل کا کوہِ گراں بن کر جان دی تھی اور جس کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیارِ رسول کو چھوڑا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ اگر وہ موسمِ حج کے بعد بھی مکہ میں ٹھہرتے ہیں تو ان کے خلاف سرکاری کارروائی ضرور ہوگی جو چاہے کامیاب نہ ہو، مگر اس کے نتیجے میں مقدس سرزمین مسلمانوں کے خون سے داغ دار ہوگی۔ چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں قیام کے دوران عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے فرماتے تھے: ''اگر میں کہیں اور قتل کر دیا جاؤں تو یہ مجھے پسند ہے، مگر یہ گوارا نہیں کہ میری وجہ سے اس سرزمین کی عظمت پامال ہو۔''①

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنی جان کو لاحق اس خطرے سے بے خبر نہیں تھے جو اہلِ عراق کے مکرنے، حسبِ وعدہ حمایت نہ کرنے اور بنوامیہ کی طرف سے سختی برتنے کی صورت میں پیش آسکتے تھے۔②

پس وہ اہلِ عراق کی تلوّن مزاجی سے ناواقف نہیں تھے، انہیں اہلِ عراق پر ایسا اندھا اعتماد نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے عراق جانے میں کوئی جلدی نہ کی۔

اکابر کی اکثریت یزید سے بیعت پر آمادہ کیوں ہوئی؟

اس دوران یزید کی جانب سے بھی اپنی حکومت کا انعقاد ثابت کرنے اور جگہ جگہ بیعتِ خلافت لینے کا سلسلہ جاری تھا جسے دیکھتے ہوئے ایک دوسرے نقطۂ نگاہ کے مطابق اس کی خلافت منعقد ہو چکی تھی۔ مختلف شہروں میں گورنروں نے لوگوں سے بیعت لے لی تھی۔③

سوال یہ ہے کہ اگر یزید کی خلافت کا انعقاد خلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق نہیں ہوا تھا یا اس کا کردار قابلِ اعتراض تھا تو ان حضرات نے جن میں صحابہ کرام اور تابعین بھی شامل تھے، بیعت کیوں کی؟

---

① اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۲۴۲، رجالہ ثقات، ط دار خضر

② یہاں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک بار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی باندی خطوط کا ایک انبار لے کر آئی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے باندی کو حکم دیا کہ ٹب لے کر آئے اور اس میں پانی بھر دے۔ پھر وہ خطوط پانی میں ڈال دیے، ان کو کھول کر بھی نہ دیکھا۔ یزید بن احمر نے جو اس موقع پر موجود تھے، پوچھا: ''یہ کن کے خطوط ہیں؟'' فرمایا: ''اہلِ عراق کے، ایسے لوگوں کے جو حق کی طرف مائل نہیں ہوتے اور باطل سے رکتے نہیں۔ یاد رکھو! مجھے ان لوگوں سے اپنے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں مگر ان لوگوں سے ڈرتا ہوں ان کے بارے میں۔'' یہ کہہ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/۷۰، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ بسند صحیح)

مطلب یہ تھا کہ کہیں اہلِ عراق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو فریب نہ دے دیں۔ ظاہر ہے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے یہ خدشات حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مخفی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے باوجود جب ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق کی طرف کوچ پر مائل دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوئی فاتر العقل یا نادان انسان نہیں تھے، تو ماننا پڑتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل ضرور تھا جسے اپنا کر وہ اپنے مقاصد میں کامیابی کی امید کر رہے تھے۔ ہمارے خیال میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اہلِ عراق کی حمایت سے سیاسی نظام میں تبدیلی لانے کا عزم کرنے کے ساتھ ساتھ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ عراق والوں کی حمایت کا جوش عین وقت پر ٹھنڈا بھی پڑ سکتا ہے اور تحریک کے آغاز سے پہلے یزید کی حکومت عسکری طاقت کے ذریعے خلاف توقع قائم و مستحکم بھی ہو سکتی ہے اور ایسے میں نہ صرف حکام کے عتاب اور غیظ و غضب بلکہ خروج منھی عنہ کے اطلاق میں داخل ہونے کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ آگے آنے والے لحہ بلحہ بدلتے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ ایسے ناسازگار حالات میں متبادل لائحہ عمل کیا ہوگا۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

③ تاریخ الطبری: ۵/۳۴۷

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کچھ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دلائل اور اجتہاد سے متفق تھے اور کچھ نے شریعت کے ایک دوسرے حکم کی پیروی میں بیعت کر لی تھی۔ وہ حکم ہے اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھنا اور افتراق سے گریز کرنا۔ یہ حکم قرآن وحدیث کی متعدد نصوص میں موجود ہے۔ اس اہم حکم کو پورا کرنے کے لیے بعض حالات میں معمول سے ہٹ کر کسی کم تر یا غیر افضل صورت کو ناگواری کے باوجود اختیار کر لیا جاتا ہے۔ بیعت کرنے والے اکابر کا یہی خیال تھا۔

حمید بن عبدالرحمٰن کی روایت ہے کہ یزید کے خلیفہ بننے کے وقت وہ ایک صحابی کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا:

''تم کہتے ہو کہ یزید امت محمدیہ کا بہترین فرد نہیں، علم وفقاہت اور مرتبے میں سب سے اعلیٰ نہیں، میں بھی یہی کہتا ہوں۔ مگر اللہ کی قسم! میں امت محمدیہ کے متحد رہنے کو اس کے منتشر ہونے پر ترجیح دیتا ہوں۔''[1]

اکابر کی بیعت پر آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت یزید کی شہرت ویسی نہیں تھی جیسے بعد میں سانحۂ کربلا، وقعۂ حرہ اور حصارِ کعبہ جیسے اَن مٹ داغ اس کے دامن پر لگ جانے کے بعد ہوئی بلکہ تخت نشینی کے وقت تو وہ اپنے بعض عیوب کے باوجود ایک صحابی کا بیٹا، ایک نیک وصالح خاندان کا فرد اور ایک اعلیٰ نسب شہزادہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے بہت سے اکابر خدشات کو نظر انداز کر کے نیک امیدیں وابستہ کرنے کی گنجائش سمجھ رہے تھے۔

عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یزید کی بیعت پر کیا فرمایا؟

چنانچہ یزید کا نمائندہ بیعت لینے جب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس مکہ پہنچا تو انہوں نے حاضرین سے کہا:

''اللہ کی قسم! معاویہ اپنے سے پہلے خلفاء کی طرح نہیں تھے مگر ان کے بعد ان جیسا بھی کوئی نہیں آئے گا۔ یقیناً ان کا بیٹا یزید ان کے نیک کنبے کا فرد ہے۔ لہٰذا آپ سب اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہیے گا۔ یزید کی بیعت کر کے اطاعت کیجئے گا۔'' اس کے بعد خود بھی بیعت کر لی۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ اگر سب لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کر لوں گا[3] اسی لیے جب انہوں نے دیکھا کہ اکثریت نے بیعت کر لی ہے تو انہیں یزید کی مخالفت میں کامیابی کی امید کی بجائے اُمت کے افتراق اور خونریزی کا خطرہ محسوس ہوا، لہٰذا انہوں نے بھی بیعت کر لی۔[4] ظاہر ہے یہ بیعت رغبت اور مسرت کے ساتھ نہیں تھی، اسی لیے انہوں نے بیعت کے موقع پر یہ تبصرہ کیا تھا: اِنْ کَانَ خَیْرًا رَضِیْنَا، وَاِنْ کَانَ بَلَاءً صَبَرْنَا.

(اگر اس میں خیر ہوئی تو ہم راضی ہیں، آزمائش ہوئی تو صبر کریں گے۔)[5]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۱۷ بسند صحیح

② وان ابنه یزید بن معاویة لمن صالح اهله. (انساب الاشراف، بلاذری: ۲۹۰/۵، ط دارالفکر)

فی اسنادہ عبدالرحمن بن معاویة وعبدالرحمن بن معاویة الذی ینقل عنه المدائنی، هو عبدالرحمن بن معاویة الزیادی. (نظیره: المدائنی عن عبدالرحمن بن معاویة الزیادی: قال حج عبدالملک الخ، انساب الاشراف: ۲۶۲/۷) وهو رجل مجهول فالاسناد ضعیف لجهالته

③ السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۸۰۹، ط العلمیة، انساب الاشراف: ۳۰۱/۵، ذکر ما کان من امر الحسین بن علی، ط دارالفکر

④ السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۶۳۲، ط العلمیة

⑤ تاریخ خلیفة، بن خیاط، ص ۲۱۷ بسند صحیح

کیا یزید کی طرف سے رعایت کا معاملہ کیا جا رہا تھا؟

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یزید نے پوری طاقت اور اختیار رکھنے کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بڑی رعایت اور چشم پوشی کا برتاؤ کیا اور اسی لیے اس نے چار پانچ ماہ تک ان کی ''باغیانہ سرگرمیوں'' کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ مگر درحقیقت یہ رائے یزید کے حق میں ایک بے بنیاد خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔

یزید کی طرف سے کارروائی میں فقط ناگزیر حد تک تاخیر ہوئی اور اس کی بھی کچھ وجوہ تھیں:

پہلی بات یہ تھی کہ جب تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں تھے، تب تک یزید کی حکومت پوری طرح قائم و مستحکم نہیں ہوئی تھی اسی لیے جزیرۃ العرب پر اس کا بس نہیں چل رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دمشق کی سرکار چار پانچ ماہ تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی مؤثر کارروائی کا انتظام نہ کر پائی۔

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دونوں اکابر کے مدینہ سے مکہ پہنچنے کے دو ماہ بعد شوال میں موسم حج شروع ہو گیا تھا، یوں اگلے تین مہینوں میں بھی حاجیوں کے رش کی وجہ سے کارروائی ممکن نہ تھی۔

تاہم جونہی حاجی واپس ہوئے اور یزید کی حکومت کو سنبھالا ملا، تو ۶۱ھ میں یزید کے گورنر عَمرو بن سعید کے دو ہزار سپاہیوں نے مکہ پر حملہ کر دیا، یہ الگ بات ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ کے شہریوں کی مدد سے انہیں مار بھگایا۔[1]

اگر حکومت کو نواسۂ ابوبکر صدیق کا کچھ لحاظ ہوتا تو مکہ پر اس فوج کشی کا بھلا کیا مطلب تھا؟ اور اگر نواسۂ رسول سے رعایت کا برتاؤ سرکاری پالیسی ہوتی، تو یہ ''رعایت'' صرف چند ماہ تک مکہ اور جزیرۃ العرب ہی میں محدود نہ رہتی بلکہ کوفہ کی سرحد پر اور میدانِ کربلا میں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے اعزاز و اکرام کا برتاؤ کیا جاتا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف دو بار فوج کشی نہ کی جاتی بلکہ ان دونوں حضرات سے جبری بیعت کا مطالبہ کر کے انہیں اپنا گھر بار اور دیارِ رسول چھوڑنے پر مجبور ہی نہ کیا جاتا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نام یزید کا خط:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں ہی تھے کہ یزید نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ایک خط بھیجا جس سے ظاہر ہوتا تھا وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور اسے ان سے بغاوت کا قوی خدشہ ہے۔ اس مراسلے میں تنبیہ کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یزید نے لکھا تھا:

> **''حسین رضی اللہ عنہ کے پاس مشرق کے لوگ آ کر انہیں خلافت کی امید دلا رہے ہیں۔ آپ حالات سے باخبر تجربہ کار انسان ہیں۔ اگر حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تو قرابت داری کے بندھن ٹوٹ جائیں گے۔ آپ خاندان کے بڑے اور معزز آدمی ہیں، ان کو اس شورش پسندی سے روکیں۔''**

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۴۳/۵ ؛ الکامل فی التاریخ: ۱۳۲/۳ ، اس حملے کا ذکر صحیح بخاری (حدیث نمبر: ۱۰۴، کتاب العلم) میں بھی موجود ہے۔

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"مجھے امید ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی کسی ایسے کام کے لیے نہیں ہوگی جو آپ کو ناگوار ہو۔"[1]

الغرض دربارِ دمشق میں اضطراب کی فضا تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اہل کوفہ سے رابطہ دیکھ کر یزید کو خوف تھا کہ وہ بغاوت کرنے والے ہیں۔ اُدھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ یزید یا اس کے حکام ان کے موقف پر غور کیے بغیر انہیں بغاوت کا مرتکب سمجھ کر قتل بھی کرا سکتے ہیں۔ اس لیے اِس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے مل کر اپنا موقف پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عراق جا کر اپنے حامیوں کی مدد سے تبدیلی لانے کی کوشش کو سود مند سمجھا۔

اہلِ عراق کے خطوط:

اہل کوفہ کے لگاتار خطوط اور وفود آ رہے تھے اور اطلاعات یہ تھیں کہ پورا عراق یزید کے کنٹرول سے باہر ہے، صرف کوفہ میں ایک لاکھ مسلح آدمی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کے لیے تیار ہیں۔[2] اور یہ کہ لوگوں نے مقامی گورنر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جمعہ تک میں شریک ہونا ترک کر دیا ہے۔ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے وفادار ہیں اور ان کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔[3]

حالات کا یہ منظر نامہ بتا رہا تھا کہ اگر فوری طور پر عراق کا سفر نہ کیا گیا تو وہاں زبردست قتل و غارت شروع ہو سکتی ہے کیوں کہ وہاں کے کم حوصلہ اور عجلت پسند لوگ کسی بھی وقت اندھا دھند بغاوت برپا کر سکتے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ماجد کے طرزِ عمل کا برسوں مشاہدہ کیا تھا کہ انہوں نے نادان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑنے کی بجائے شفقت و محبت سے اپنے ساتھ ملا کر ان کی تربیت کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ایسے ہزاروں عقیدت مند مضطرب و بے قرار ہو کر آپ رضی اللہ عنہ کو بلا رہے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کے سوا ایسا کوئی نہ تھا جو ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر ان کی رہنمائی کرتا۔ اگر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ایک بے مقصد خانہ جنگی شروع ہو جانا بعید نہ تھا۔

---

① تاریخ دمشق: ۲۱۰/۱۴ ...... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مہم کا ہدف شروع سے مثبت تھا جس میں عوامی حمایت کے ذریعے اصلاحِ احوال کے لیے مذاکرات و مفاہمت سمیت ہر جائز صورت کے امکانات سامنے رکھے گئے تھے۔ امام ابن تیمیہ نے بھی یہی لکھا ہے: "والحسین ما خرج یرید القتال ولکن ظن ان الناس یطیعونہ (حسین رضی اللہ عنہ جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے، البتہ ان کا خیال تھا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں گے) ﴿منہاج السنۃ: ۴۲/۴﴾

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مراد یہی ہو سکتی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہدف فتنہ وفساد اور جنگ و جدل نہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے درمیان اس تحریک کے اہداف، لائحہ عمل اور عملی ترتیب پر بات ہو چکی تھی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس مہم کے خدوخال اچھی طرح معلوم تھے۔ اسی لیے وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نیت اور عزائم کے بارے میں پوری طرح مطمئن تھے اور چاہتے تھے کہ یزید کو بھی یقین دلا دیں کہ یہ کوئی مفسدانہ تحریک نہیں، اصلاحِ احوال کی مہم ہے۔ تاہم دیگر روایات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے انجام کے بارے میں خدشہ ضرور تھا: کیوں کہ کوفیوں کی سرشت اور حکام کی مسلسل بدگمانی دیکھتے ہوئے ضروری نہ تھا کہ لائحہ عمل کامیاب ہو۔ اگر اہلِ کوفہ کم ہمتی کا شکار ہو جاتے اور حکام پر جوشِ عتاب غالب آ جاتا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بچنا بہت مشکل تھا۔ اسی لیے دیگر صحابہ کی طرح وہ بھی انہیں سفرِ عراق سے منع کرتے رہے۔

اس مکتوب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل عراق کی طاقت کو ساتھ لینے سے پہلے حکومت پر اس تحریک کی ترتیب کو ظاہر کرنا سیاسی مصلحت کے خلاف تصور کرتے تھے۔ اسی لیے اس مکتوب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ابہام اختیار کیا اور ایسا کوئی واضح اشارہ نہیں دیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ بس یہ کوشش کی کہ یزید کو اطمینان ہو جائے تاکہ کہیں وہ جلد بازی میں کسی انتہائی اقدام پر نہ اتر آئے۔

② تاریخ الطبری: ۳۹۱/۵ بسند صحیح، کتب الیہ اھل الکوفۃ انہ معک مائۃ الف۔ ③ تاریخ الطبری: ۳۴۷/۵، بسند حسن

جبکہ ایک قائد کی موجودگی میں عوام کی تنظیم کر کے ان کے دباؤ کے ذریعے پُرامن طور پر یا کم نقصان کے بدلے مقاصد حاصل کیے جا سکتے تھے۔اس لیے آپ نے خطرہ مول لے کر عراق جانا ضروری سمجھا۔آپ امید کرتے تھے کہ وہاں آپ کو لوگوں کی رضا اور رغبت کے ساتھ اُمت کی قیادت کا موقع مل جائے گا، اُدھر اہلِ حجاز بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں حمایت کریں گے۔اتنی مضبوط عوامی تائید مل جانے کے بعد اہلِ شام پر جو دباؤ پڑے گا، اس کے باعث یا تو وہ مفاہمت کر کے نظام کی اصلاح پر تیار ہو جائیں گے اور بلا جنگ و جدل ایک مثالی حکومت قائم کی جا سکے گی۔ اور اگر اہلِ شام نہ مانے تو عراق اور حجاز کی مشترکہ طاقت کسی بڑے جانی و مالی اتلاف کے بغیر انہیں مغلوب کر لے گی۔

۶۰ ہجری کے کوفی:

۶۰ ھ میں جب حضرت حسین رضی رضی اللہ عنہ کوفہ جانے کا سوچ رہے تھے، تشیع اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔روافض کا اتنا چرچا تھا، نہ وہ کوئی الگ شناخت رکھتے تھے۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن لوگوں کی دعوت پر کوفہ جانا چاہتے تھے وہ صحیح العقیدہ مسلمانوں کے طور پر معروف تھے اور ان میں بعض بڑے نیک نام اور مخلص لوگ بھی تھے۔عام مسلمانوں سے ان کے نظریے کا فرق فقط اتنا تھا کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتے تھے۔تاہم بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ کوفہ کے ایسے بعض نیک اور مخلص لوگ بھی کسی سازش کے آلہ کار بن گئے تھے۔سازش بہت پختہ اور طے شدہ تھی اور اس کا مقصد مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع کرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔

سازشی عناصر کیا کرانا چاہتے تھے؟

سازشی عناصر جانتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ محض امت کی خیر خواہی کے لیے کوفہ تشریف لائیں گے۔دوسری طرف انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یزید اور اس کے حکام حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بدگمان ہیں اور انہیں شورش پسند یقین کیے ہوئے ہیں۔تیسرے یہ بھی عیاں تھا کہ کوفہ کے سادہ لوح عوام بنو ہاشم سے محبت ضرور کرتے ہیں مگر امتحان کے وقت یہ لوگ ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔سازشی عناصر کا لائحہ عمل یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کسی طرح کوفہ کا رخ کر لیں۔اس سے پہلے کوفہ میں کچھ نہ کچھ ہنگامہ آرائی کرا کے حکومت کو پختہ یقین دلا دیا جائے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء آمادۂ پیکار ہیں۔نتیجے میں حکومت کسی تدبر کا ثبوت دیے بغیر سخت کارروائی کر بیٹھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کر دیے جائیں۔ان عناصر کو یقین تھا کہ اگر حکومت کی طرف سے سخت کارروائی ہوئی تو اس وقت اہلِ کوفہ اپنی سرشت کے مطابق مدد میں پہلو تہی کریں گے اور کوئی بڑا سانحہ رونما ہو کر رہے گا۔

یہ درست ہے کہ ہمارے پاس سازش مرتب ہونے کا کوئی ایسا تاریخی ثبوت نہیں ہے جس میں لکھا ہو کہ فلاں نے اس قسم کا منصوبہ ترتیب دیا مگر بعد کے حیرت ناک واقعات کا تسلسل یہ بتاتا ہے کہ سب کچھ اتفاقاً نہیں ہوتا چلا گیا بلکہ پس پردہ کچھ ہاتھ تھے جو معاملے کو بدترین صورت تک لے جانا چاہتے تھے اور بلاشبہ وہ کوفہ ہی کے بعض لوگ تھے۔ اسی وجہ سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سانحۂ کربلا پر اہلِ کوفہ کو مطعون کیا کرتے تھے۔ہم اس سازش میں شریک

کسی فرد کا نام یقین سے نہیں لے سکتے مگر اندازہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے خطوط بھیجے تھے یہ انہی میں سے کچھ کی سازش تھی۔ اگرچہ خطوط بھیجنے والے کئی کوفی رؤساء نیک سیرت تھے اور خانوادۂ علی رضی اللہ عنہ سے سچی عقیدت رکھتے تھے۔ انہیں بلاثبوت اس سازش میں شریک نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر سازشی لوگ بھی ان میں ضرور شامل تھے۔ [1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

اکابرِ حجاز اہلِ کوفہ کی تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے جب سفر کا ارادہ کرتے ہوئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دیگر اکابر سے مشورے ہوئے تو سب نے کوفہ کو خطرناک قرار دے کر آپ کو حجاز ہی میں رہنے کا مشورہ دیا۔ ان خیر خواہوں میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہیں جب آپ کا عزم معلوم ہوا تو بے اختیار بولے:

''آپ کہاں جائیں گے؟ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے آپ کے والد کو قتل کیا، آپ کے بھائی کا ساتھ نہ دیا۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر میں ادھر اُدھر قتل بھی کر دیا جاؤں تو یہ مجھے پسند ہے، مگر یہ گوارا نہیں کہ میری وجہ سے اس سرزمین کی عظمت پامال ہو۔'' [2]

اس روایت سے چند اہم باتیں ثابت ہوتی ہیں:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حجاز میں اپنے مقصد کے لیے سازگار مواقع کی امید نہ تھی۔

انہیں ڈر تھا کہ حکومت انہیں ان کے موقف سے انحراف پر مجبور کرے گی۔ اپنی رائے پر ثابت قدمی کی پاداش میں قتل کا خدشہ بھی لاحق تھا۔

یہ خدشہ کسی اور جگہ چلے جانے میں بھی موجود تھا مگر آپ کو یہ گوارا نہ تھا کہ حرم میں خونریزی ہو۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے انتہائی مخلص تھے اور انہوں نے آپ کو کوفہ جانے سے خیر خواہانہ طور پر منع کیا تھا۔ اس کے برخلاف جن روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے پر اکسایا تھا، تاکہ حجاز پر خود قبضہ جما لیں وہ انتہائی ضعیف ہیں اور ثقہ راویوں کی روایت سے تعارض کے باعث ناقابلِ قبول ہیں۔

مسلم بن عقیل کی کوفہ روانگی:

جب خطوط اور وفود کا تانتا بندھ جانے سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ کوفہ جا کر آپ رضی اللہ عنہ کے نیک عزائم پورے ہو سکتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے وہاں جانا طے کر لیا مگر خود جانے سے قبل احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیا تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے وہاں کی صورتِ حال دیکھ بھال لیں۔ [3]

---

[1] ذہن میں رہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ بلانے میں ملوث سرکردہ لوگوں کے نام صرف ابومخنف اور ہشام کلبی کی روایات میں ہیں۔ ان میں بعض اعلیٰ مراتب مسلمانوں کے نام شامل ہونا بہرحال محلِ نظر ضرور ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ یہ نام بعد میں شامل کر لیے گئے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ حضرات مخلصانہ طور پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا رہے ہوں اور کچھ دھوکہ دینا چاہتے ہوں۔ آخر میں دھوکہ دینے والوں کی تدبیر غالب آ گئی ہو۔ (واللہ اعلم)

[2] اخبار مکۃ للفاکہی: ۲/۲۴۲ رجالہ ثقات، دار خضر

[3] تاریخ الطبری: ۵/۳۹۱ بسند صحیح عن حصین

مسلم بن عقیل سے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا رویہ:

مسلم بن عقیل کوفہ پہنچ کر شہر کے ایک مخلص مسلمان ہانی بن عروہ کے ہاں مہمان ہوئے۔ اہلِ کوفہ بڑی تعداد میں ان کے گرد جمع ہو گئے۔[1] کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ایک عالم فاضل صحابی تھے۔ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۴ حدیثوں کے راوی اور بہترین خطیب تھے۔[2] مسلم ابن عقیل کی آمد اور ان کی سرگرمیوں سے واقف ہونے کے باوجود نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی روک ٹوک نہ کی۔ کوفہ کے بعض سخت مزاج افسران نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی اس کشادہ روی پر تنقید کی اور انہیں کمزوری کا طعنہ دیا۔ انہوں نے فرمایا:

''اللہ کی اطاعت کی حدود میں رہ کر کمزور کہلانا مجھے پسند ہے، مگر یہ گوارا نہیں کہ اللہ کی نافرمانی کر کے طاقتور کہلاؤں۔''[3]

ابو مخنف کی روایت میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا مسلم بن عقیل کے اصحاب کے لیے یہ فقرہ بھی موجود ہے:

''میں شک وشبہے یا الزام کی بنیاد پر گرفت نہیں کروں گا۔ ہاں اگر یہ ظاہر ہوا کہ تم نے خلیفہ کی بیعت توڑ دی ہے اور سربراہ کی مخالفت کی ہے تو اللہ کی قسم! میں تلوار سے کام لینے میں کسر نہ چھوڑوں گا۔''[4]

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بھی مسلم بن عقیل اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سرگرمیوں کو فتنہ وفساد نہیں سمجھتے تھے۔[5] ظاہر ہے کہ وہ گورنر تھے۔ ان کے پاس ساری اطلاعات پہنچ رہی ہوں گی۔ اگر حقیقت میں مسلم بن عقیل کسی مسلح بغاوت کی تیاری کر رہے ہوتے تو یہ بات ان سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی اور وہ اس پر ضرور قدغن لگاتے۔

مسلم بن عقیل کا اطمینان بخش مراسلہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا عزمِ سفر:

مسلم بن عقیل نے ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھیج دی کہ بارہ ہزار افراد بیعت کر چکے ہیں، آپ تشریف لے آئیں۔[6]

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۱/۵ بسند صحیح عن حُصَین

② سیر اعلام النبلاء: ۴۱۱/۳، ۴۱۲

③ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۵ بروایت عَمّار الدُّهنی بسند حسن۔

④ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۵

⑤ یاد رہے کہ ابو مخنف کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل کو روسائے کوفہ کے نام جو آخری ہدایت نامہ دے کر بھیجا تھا اس میں صرف یہ درج تھا:
''حسین بن علی کی طرف سے اہل ایمان اور مسلمانوں کی جماعت کے نام۔ ہانی اور سعید آپ لوگوں کے خطوط میرے پاس لائے۔ آپ کے سفیروں میں سے یہ دونوں سب سے آخر میں آئے ہیں جو کچھ آپ حضرات نے لکھا ہے کہ ہماری رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں، آپ آیئے شاید اللہ آپ کے سبب ہمیں حق اور ہدایت پر جمع کر دے۔ تو میں نے اپنے چچازاد کو جن پر مجھے بھروسہ ہے اور وہ میرے اہل خانہ میں سے ہیں، آپ کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ آپ حضرات کا حال اور سب کی رائے مجھے لکھ کر بھیج دیں۔ اگر ان کی تحریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ کی جماعت کے افراد اور آپ کے اصحاب عقل وفضل اس بات پر متفق ہیں جس بات کے لیے آپ کے قاصد میرے پاس آئے ہیں اور جس بارے میں آپ کے خطوط کے مندرجات میں نے پڑھے ہیں، تو میں بہت جلد آپ کے پاس چلا آؤں گا ان شاء اللہ۔ عمر عزیز کی قسم! قوم کا رہنما وہی ہو سکتا ہے جو قرآن پر عمل کرنے والا، عدل کا نفاذ کرنے والا اور حق کا حامی ہو اور اللہ پر بھروسہ کرتا ہو۔ والسلام۔'' (تاریخ طبری: ۳۵۳/۵)
اس آخری خط میں بھی جنگ کی تیاری کا کوئی اشارہ تک نہیں۔ اس سے فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل کوفہ سے اپنی حمایت اور تائید چاہتے تھے۔

⑥ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۵ بروایت عمار الدُّهنی، بسند حسن

ایک روایت میں ہے: ''تمام کوفہ والے آپ کے ساتھ ہیں، آپ جونہی میرا خط پڑھیں تشریف لے آئیے۔''[1]

یہ مراسلہ گیارہ ذی قعدہ ۶۰ھ کو روانہ کیا گیا تھا۔[2]

کوفہ میں حالات کی تبدیلی: عبید اللہ بن زیاد کا تقرر:

مسلم بن عقیل کا مراسلہ پہنچنے میں تین چار ہفتے لگے اور اس دوران کوفہ کے حالات خاصے بدل گئے جن سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ بے خبر رہے۔ ہوا یہ کہ کوفہ کے بعض شدت پسند امراء نے مسلم بن عقیل کے بارے میں گورنر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی نرم خوئی کو ناپسند کیا۔ پہلے انہیں برا بھلا کہا، جب وہ اپنی کشادہ دلی پر قائم رہے تو یزید کو سارا حال نمک مرچ لگا کر لکھ بھیجا۔ اس نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جیسے پختہ عمر اور بصیرت مند انسان کو معزول کر دیا۔ اپنے حکم نامے میں عبید اللہ بن زیاد سے رضامندی اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ مسلم بن عقیل کو تلاش کرو، مل جائیں تو قتل کر ڈالو۔[3]

اس طرح عراق کے سارے معاملات ایک ایسے شخص کے اختیار میں آگئے جس کی افتادِ طبع کسی وقت کسی بھی ناگوار واقعے کو جنم دے سکتی تھی۔ عبید اللہ بن زیاد یزید کا حکم ملتے ہی بصرہ سے سیدھا کوفہ پہنچ گیا۔ مسلم بن عقیل اس وقت شہر کے ایک ممتاز سرکاری امیر ہانی بن عروہ کے ہاں قیام پذیر تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کو خبر مل گئی۔ اس نے ہانی کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ جب انہوں نے مسلم بن عقیل کا پتہ نہ بتایا تو سخت زدوکوب کے بعد قلعے میں بند کر دیا۔[4]

مسلم بن عقیل کا قتل:

اس موقع پر مسلم بن عقیل سے بھی ایک سخت لغزش ہوگئی جس نے واقعات کا رخ بالکل ہی موڑ دیا۔ وہ اپنے میزبان ہانی بن عروہ کو چھڑانے کے لیے چار ہزار مسلح افراد کے ساتھ میدان میں آگئے۔[5]

جب اس مجمعے کو لے کر وہ قصر امارت کی طرف بڑھے تو شروع میں عبید اللہ بن زیاد خوف زدہ ہو گیا مگر جلد ہی اہل کوفہ کی پرانی سرشت کا ایک بار پھر اظہار ہوا۔ مسلم بن عقیل ابھی آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ تیس تیس، چالیس چالیس افراد ان کا ساتھ چھوڑ کر دائیں بائیں نکلنے والی گلیوں میں فرار ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب مسلم بن عقیل عبید اللہ بن زیاد کے مقابلے میں آئے تو گنتی کے چند لوگ (تقریباً پچاس آدمی) ان کے ساتھ رہ گئے تھے۔[6]

---

① انساب الاشراف، بلاذری: ۱۶۷/۳، ط دار الفکر

② تاریخ الطبری: ۳۸۱/۵ عن ابی مخنف ؛ تاریخ الطبری: ۳۹۵/۵ عن ابی مخنف

③ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۵ عن عمار بسند حسن، اسی روایت میں ہے کہ یزید کو یہ معاملہ عبید اللہ بن زیاد کے سپرد کرنے کا مشورہ اس کے کاتب سرجون نے دیا تھا جو نصرانی تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معاملے کو انتہائی حد تک پہنچانے کے پس پردہ کیسے کیسے لوگ سرگرم تھے۔

④ تاریخ الطبری: ۳۴۸/۵ بروایت عمار بسند حسن

⑤ تاریخ الطبری: ۳۹۱/۵ بسند صحیح ؛ ۳۴۹/۵، ۳۵۰ بسند حسن

⑥ تاریخ الطبری: ۳۹۱/۵ بسند صحیح ؛ المحن، ص ۱۵۱ عن الامام قاسم بن سلام ؛ العقد الفرید: ۱۲۷/۵، ۱۲۸

جو چالیس پچاس افراد مسلم بن عقیل کے ساتھ رہ گئے تھے ان کی اکثریت کو عبیداللہ بن زیاد نے چالاکی اور دھونس سے کام لیتے ہوئے میدان سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد مسلم بن عقیل کو گرفتار کرنے کے لیے سپاہیوں کو آگے بڑھایا۔ اس جھڑپ میں مسلم بن عقیل زخمی ہو کر تاریکی میں فرار ہو گئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ شہر کی گلیوں کا راستہ بتانے کے لیے کوئی ایک فرد بھی ساتھ نہ تھا۔ خانوادۂ بنی ہاشم کا یہ چشم و چراغ زخمی حالت میں بھوکا پیاسا اکیلا کوفہ کی گلیوں میں بھٹکتا رہا۔

آخر ایک خاتون نے پانی پلایا اور یہ جان کر کہ وہ مسلم بن عقیل ہیں، پناہ دی۔ مگر اس عورت کا بیٹا عبیداللہ بن زیاد کے دست راست محمد بن اشعث کا ساتھی تھا۔ اس نے مخبری کر دی۔ مسلم بن عقیل اس گھر سے گرفتار کر لیے گئے۔ عبیداللہ بن زیاد نے انہیں بڑی بے دردی سے قتل کر کے لاش محل کی چھت سے نیچے پھینکوا دی۔ ہانی بن عروہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ①

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کوفہ جانے سے منع کیا:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان حالات سے بے خبر تھے۔ مسلم بن عقیل کی اطمینان دہی پر آپ رضی اللہ عنہ نے اہل و عیال سمیت کوفہ جانے کی تیاری کر لی تھی۔ یہ طے ہے کہ آپ ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں نکلے تھے۔ ②

جب آپ مکہ سے کوفہ کے لیے نکلنے لگے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اجازت چاہی تو وہ بولے:

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے آپ کے والد کو قتل کیا، جنھوں نے آپ کے بھائی کو زخم لگایا۔ اگر میرے اور آپ کے لیے عیب کی بات نہ ہوتی تو میں آپ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر روک لیتا۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔ فرمایا:

مجھے کہیں اور قتل ہو جانا، اللہ اور رسول کے مقدس شہروں میں خون ریزی برپا ہو جانے سے زیادہ عزیز ہے۔'' ③

جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری اور ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہم نے بھی عراق جانے سے روکا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر پیچھے آ چکا ہے کہ انہوں نے بھی منع کیا تھا۔ بعد میں وہ فرمایا کرتے تھے: ''حسین رضی اللہ عنہ نے نکلنے کے معاملے میں ہماری نہ چلنے دی۔ میری جان کی قسم! انہوں نے اپنے والد اور بھائی کے جو عبرتناک حالات دیکھے اور لوگوں کی ان سے جو بے وفائی دیکھی، اس کے بعد تو انہیں زندگی بھر کوئی نقل و حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی بلکہ انہیں اس صلح میں داخل ہو جانا چاہیے تھا جس میں سب داخل ہوئے تھے کہ اجتماعیت میں ہی خیر ہوتی ہے۔'' ④

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ بسند صحیح، ۳۵۰/۵ بروایت عمّار الدُھنی بسند حسن

② تاریخ الطبری: ۳۸۱/۵ عن ابی مخنف؛ انساب الاشراف: ۱۶۰/۳ ...... مشہور قول کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ مکرمہ سے روانگی ۸ ذوالحجہ ۶۰ھ کو ہوئی تھی۔ یہی دن کوفہ میں مسلم بن عقیل کی شہادت کا تھا۔ (انساب الاشراف: ۱۶۰/۳؛ تاریخ دمشق: ۲۱۲/۱۴)
مگر راجح یہ ہے کہ روانگی اس سے پہلے ہوئی جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے۔ بعض ''محققین'' نے یہ قیاس کر کے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بلا حج چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے، دس ذی الحجہ یا اس کے بعد روانگی کا دعویٰ کیا ہے جو محض ایک وہم ہے۔

③ لولا ان یزری بی وبک لنشبت یدی فی راسک. (مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۳۲؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۳۶۲، ط الرشد، بسند صحیح) المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۹/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیہ)

④ تاریخ دمشق: ۲۰۸/۱۴؛ تہذیب الکمال: ۴۱۶/۶

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''تقدیر کی بات کہ حسین رضی اللہ عنہ نے جلدی کر دی ورنہ اگر میں ان تک پہنچ جاتا تو ان کو نکلنے نہ دیتا۔ سوائے اس کے کہ وہ مجھے لاچار کر دیتے۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ منع کرنے کے باوجود کیوں نہ رکے؟

اتنے برگزیدہ حضرات اور مخلص احباب کے منع کرنے کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے پر کیوں اصرار تھا؟ کیا وہ اقتدار کے حریص تھے؟ ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے کوفہ جائے بغیر مقصد اور ہدف کے حصول کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ دوسرے حجاز میں انہیں حکام بنو امیہ سے خطرہ لاحق تھا کہ وہ موقع ملتے ہی انہیں بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش کریں گے۔ بیعت نہ کرنے کی صورت میں جو کش مکش ہوتی اس سے حرمین میں خوں ریزی کا خدشہ تھا۔ بلاشبہ دیگر صحابہ کے مشورے کے مطابق فتنے کے اس زمانے میں آپ رضی اللہ عنہ بیعت کر کے گھر میں بیٹھے رہتے تو شرعاً اس کی رخصت نکلتی تھی، یہی پرسکون اور محفوظ شکل تھی مگر آپ کو عضوِ معطل بن کر رہنا گوارا نہ تھا۔ اپنے اجتہاد کے مطابق کم از کم آپ پر عزیمت کی راہ اختیار کرنا واجب تھا تاکہ حکومت پر ایک خاندان کی اجارہ داری کا ماحول ختم کر کے اسلامی شورائیت کا نظام واپس لایا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سب کے منع کرنے کے باوجود آپ کا ضمیر مطمئن تھا۔ آپ کی نیت رضائے مولا اور فلاحِ امت کے سوا کچھ نہ تھی۔

خطوط ساتھ کیوں لیے؟

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے چلتے ہوئے وہ خطوط ساتھ لے لیے تھے جو کوفیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو لکھے تھے۔[2] وجہ غالباً یہ تھی کہ اگر اہلِ کوفہ وفاداری کا وعدہ پس پشت ڈال دیں تو انہیں وفاداری کے وعدوں والے یہ خطوط دکھا کر عار دلائی جاسکے۔

مشہور قول کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی ۸ ذی الحجہ کو ہوئی تھی مگر راجح یہ ہے کہ اس سے قبل ہوئی تھی۔[3]

---

① تاریخ دمشق: ۱۴/۲۰۳؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۴۹۷

② تاریخ دمشق: ۱۴/۲۰۲

③ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ ابوالعرب تمیمی کی روایت کے مطابق اموی گورنر عمرو بن سعید یوم الترویہ (۸ ذی الحجہ) سے ایک دن پہلے مکہ آگیا تھا اور اسی دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ سے نکل گئے تھے۔ (المحن، ص ۱۴۹) دوسری دلیل یہ ہے کہ راستے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بعض لوگ حج کے لیے آتے ہوئے ملے تھے۔ زہیر بن قین نامی شخص کا ذکر حصین بن عبدالرحمن کی صحیح روایت میں ہے جو حج کو جاتے ہوئے راستے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملا۔ (تاریخ طبری: ۵/۳۹۲) اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ سے دو منازل آگے ذات عرق پہنچے تو مشہور عرب شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی جو عراق سے حج کے لیے آرہا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس سے اہل کوفہ کے حالات پوچھے تو وہ بولا: ''لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنو امیہ کے ساتھ۔'' (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۱)
تیسری دلیل یہ ہے کہ مکہ سے کربلا تک پوری تیس منازل ہیں۔ اگر سفر کو طبعی رفتار یا معمولی تیزی پر محمول کیا جائے (جیسا کہ عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں یہی قرینِ قیاس ہے) تو ۶ یا ۷ ذی الحجہ کو چل کر ہی آپ ۶ یا ۷ محرم کو کربلا پہنچ سکتے تھے۔ اگر آپ ۸ ذی الحجہ کو چلتے تو ۸ محرم سے پہلے کربلا نہیں پہنچ سکتے تھے، اس صورت میں کربلا پہنچنے کے بعد کے ایسے متعدد واقعات کا انکار کرنا پڑے گا جو صحیح اور حسن روایات میں مذکور ہیں اور دو دن میں ان کا وقوع بہت مشکل ہے۔
محمود عباسی اور ان کے پیروکاروں نے یہاں الٹی گنگا بہائی ہے۔ پہلے قیاس آرائی کر کے یہ بے تکا دعویٰ کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی حج کے بعد ہی ہوئی تھی، پھر سفر کی منازل ناپ کر یہ طے کیا کہ ''حج کے بعد روانہ ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ عین دس محرم ہی کو کربلا پہنچ سکتے تھے، پس روایات میں مذکور کربلا کے واقعات اتنے کم وقت میں نہیں ہوسکتے لہٰذا وہ سب خرافات ہیں، کربلا میں فقط چند گھنٹے قیام کے بعد اہلِ قافلہ قتل ہو گئے ہوں گے۔'' یہ تحقیق نہیں تلبیس ہے۔

یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی کی اطلاع اور مروان کا ابن زیاد کو خط:

اس دوران حجاز کے حاکم عَمرو بن سعید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نکلنے کی خبر دارالخلافہ دِمَشق اور کوفہ روانہ کر دی تھی۔ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو لکھا تھا: ''حسین تمہاری طرف آ رہے ہیں۔''[1]

یہی خبر مروان بن حکم نے بھی ابن زیاد کو بھیجی تھی مگر ساتھ ہی اس مسئلے کو احتیاط سے حل کرنے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کا خیال رکھنے کی نصیحت کی تھی، مگر یہ کوئی سرکاری حکم نہیں محض مشورہ تھا۔ مروان نے لکھا تھا:

''یہ حسین رضی اللہ عنہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں۔ اللہ کی قسم! ہمیں حسین سے زیادہ کوئی محبوب نہیں۔ خبردار! جوش میں آ کر کچھ ایسا نہ کر بیٹھنا جس کی تلافی نہ ہو سکے اور لوگ اسے فراموش نہ کر سکیں۔''[2]

مروان کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے سنجیدہ و جہاں دیدہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا احترام کرتے تھے، مگر افسوس کہ عبید اللہ بن زیاد نے ایسے لوگوں کے مشورے پر کان نہ دھرا؛ کیوں کہ بڑوں کا احترام اس کے خمیر میں نہ تھا۔ وہ فوجی نظام میں ڈھلا ہوا ایک مشینی قسم کا انسان تھا۔ اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کوئی عقیدت تھی نہ مروان جیسے کہنہ سال اموی امیر کی بات اس کے نزدیک کوئی حیثیت رکھتی تھی۔

یزید کا خط عبید اللہ بن زیاد کے نام:

اس دوران یزید نے عبید اللہ بن زیاد کو ایک مراسلے میں لکھ بھیجا تھا:

''مجھے خبر ملی ہے کہ حسین کوفہ کی طرف آ رہے ہیں۔ حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے میں سارے زمانوں میں تمہارے زمانے کو، سارے شہروں میں سے تمہارے شہر کو اور سارے حکام میں سے تم کو امتحان آ پڑا ہے۔ ایسے ہی امتحانات میں پڑ کر لوگ ترقی پاتے ہیں یا غلاموں کی طرح پست درجہ ہو جاتے ہیں۔''[3]

یزید نے اسے مسلم بن عقیل کے قتل پر شاباش دیتے ہوئے یہ احکام بھی دیے تھے:

''جاسوس اور مسلح پہرے دار تعینات کر دو۔ جن لوگوں پر شک ہو انہیں گرفتار کر لو۔ جس پر کوئی الزام ہو اسے پکڑ لو مگر قتل اسی کو کرنا جو تم سے جنگ کرے۔ مجھے پیش آمدہ حالات کی اطلاع دیتے رہنا۔''[4]

---

[1] تاریخ دِمَشق: ۲۱۲/۱۴

[2] تاریخ دِمَشق: ۲۱۲/۱۴، تہذیب الکمال: ۴۲۲/۶

[3] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۵/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

[4] تاریخ الطبری: ۳۸۱/۵ عن ابی مخنف.

یہی مراسلہ ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ ابوحنیفہ دینوری نے بھی نقل کیا ہے۔ اس میں بھی پہلے مسلم بن عقیل کے قتل پر ابن زیاد کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"قد عملت عمل الحازم الجلید." اس کے بعد لکھا گیا تھا:

"وقد بلغنی ان الحسین بن علی قد فصل من مکۃ متوجھا الی ما قبلک، فادرک العیون علیہ وضع الارصاد علی الطرق وقم افضل القیام غیر الاقتال الامن قاتلک، واکتب الیّ بالخبر فی کل یوم. (الاخبار الطوال، ص ۲۴۲)

یہ روایت ابومخنف کی ہے مگر اسے مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس روایت کو تو یزید کے حامی بھی فخر کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

یزید کے مراسلے پر تبصرہ:

اس مراسلے سے ثابت ہوتا ہے کہ یزید کی طرف سے ابن زیاد کو قافلۂ حسینی پر ابتداءً دست درازی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی بلکہ ایسی کارروائی کو ناگزیر حالت کے ساتھ مشروط کیا گیا تھا۔ ممکن ہے یزید نے اپنے خیال میں اس تدبیر کو کافی سمجھا ہو، مگر حالات نے ثابت کیا کہ یہ ہدایات بالکل ناکافی تھیں۔ اسی مراسلے میں مسلم بن عقیل کے قتل پر ابن زیاد کی جو حوصلہ افزائی کی گئی تھی، وہ اس سخت مزاج شخص کو اس خبط میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی کہ حریف کا قلع قمع کرنے کی ذرا بھی گنجائش ملے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے اور یہ کہ قافلۂ حسینی سے رعایت نہیں برتنی چاہیے۔

اگر یزید اس کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کو یہ ہدایت دیتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو احترام کے ساتھ دمشق بھیج دیا جائے تو سازشی عناصر کی امیدیں بر نہ آتیں۔ بلاشبہ یزید کی یہ سنگین ترین غلطی تھی جس نے معاملے کو انتہائی حد تک بگڑنے دیا۔

عبید اللہ بن زیاد کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بے خبر رکھنے کی بھرپور کوشش:

مسلم بن عقیل کے قتل کے بعد عبید اللہ بن زیاد کی پہلی کوشش یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی صورت حال سے بالکل بے خبر رکھا جائے۔ اس نے کوفہ سے بصرہ اور شام تک تمام شاہراہوں پر اتنی سخت ناکہ بندی کرائی کہ تقریباً پورے مہینے کوئی شخص یہ علاقے عبور کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک نہ پہنچ سکا اور نہ ہی عرب سے آنے والا کوئی شخص پوچھ گچھ اور تلاشی کے بغیر عراق کی حدود میں داخل ہو سکا۔ مسلم بن عقیل ۸ ذی الحجہ کو قتل کیے گئے تھے اور اس سے دو تین دن قبل حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ سے نکلے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کوفہ میں اب نرم دل نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نہیں سخت گیر عبید اللہ بن زیاد مسلط ہے۔ اگر راستے بند نہ ہوتے تو کوفہ سے نکلنے والا کوئی خبر رساں انہیں جزیرۃ العرب کی سرحد کے آس پاس یہ اطلاعات دے دیتا مگر لاعلمی کی وجہ سے کاروانِ حسینی کے مسافر آگے بڑھتے چلے گئے۔ [1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ واپسی پر آمادہ اور برادرانِ مسلم بن عقیل کا آگے بڑھنے پر اصرار:

عراق کی سرحد کے قریب پہنچ کر آپ کو خبر ملی کہ مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کوفہ میں قتل کر دیے گئے ہیں۔ [2]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اندازہ لگایا کہ اب ان کو حکام کی طرف سے سخت سلوک اور عوام کی جانب سے بے وفائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا اور عبید اللہ بن زیاد آپ کو مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ جیسے سلوک کا نشانہ بنائے گا۔ اس لیے آپ کو یہی بہتر لگا کہ واپس حجاز چلے جائیں مگر مقدر میں جو لکھا ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے واپسی کا خیال

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حصین بسند صحیح

② تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمار، بسند حسن

ابو مخنف کی روایت کی مطابق یہ خبر بنو اسد کے ایک شخص نے آپ کو پہنچائی تھی اور آپ اس وقت زرود (موجودہ الخزیمیہ) کے مقام پر پہنچے تھے جو مکہ سے کوفہ کی راہ میں اٹھارہویں منزل ہے مگر امام قاسم بن سلام کی روایت کے مطابق آپ کو قتل مسلم کی اطلاع "شراف" میں ملی تھی جو مکہ سے کوفہ کی راہ میں چھبیسویں منزل (۶۴۳ کلومیٹر دور) ہے اور واقصہ سے چند میل آگے ہے۔ (المحن، ص ۱۵۳) سنداً امام قاسم بن سلام کی روایت راجح ہے۔

حصین کی روایت کے مطابق عبید اللہ بن زیاد نے واقصہ سے بصرہ اور شام تک ان راستوں کی نگرانی شروع کرا رکھی تھی۔ (تاریخ طبری: ۳۹۲/۵ بسند صحیح)

ظاہر کیا تو مسلم بن عقیل کے بھائیوں نے جو آپ کے ہمراہ تھے جوش میں آ کر کہا:

''اللہ کی قسم! ہم جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہیں لیں گے واپس نہیں جائیں گے چاہے خود سب قتل ہو جائیں۔''

یہ سن کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارے بغیر جینے کا کیا لطف۔''[1]

ان نوجوانوں نے یہ بھی کہا: ''آپ واپس کیوں لوٹ رہے ہیں جبکہ ہمارا بھائی وہاں مارا گیا ہے اور آپ کے پاس ان لوگوں کے خطوط موجود ہیں جن پر آپ کو وثوق ہے۔''[2]

آپ پھر کچھ پرامید ہوئے اور المغیثہ سے کچھ آگے ضلع کوفہ کی سرحد تک پہنچ گئے جہاں عبیداللہ بن زیاد کے حکم سے پہرے لگائے گئے تھے۔ یہیں ابن زیاد کے سالار حُر بن یزید سے ملاقات ہوئی۔[3]

حُر بن یزید کا مشورہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا دِمشق جانے کا فیصلہ اور اس کی وجوہ:

حُر بن یزید ایک شریف آدمی تھا۔ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کی۔ پوچھا:

''کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟'' جب آپ نے کوفہ کا ارادہ بتایا تو حُر نے سختی سے منع کیا اور کہا:

''واپس چلے جائیے۔ وہاں آپ کے لیے خیر کی کوئی امید نہیں۔''

ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس دِمشق جانے کا فیصلہ کیا، یہ فیصلہ اتنا اٹل تھا کہ آپ کسی تردد کے بغیر فوراً اس پر عمل پیرا ہو گئے اور شام کا راستہ اختیار کر لیا۔[4]

لائحہ عمل میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی فقاہت و بصیرت کی بدولت مسئلے کی نوعیت بدلتے دیکھ لی تھی۔ آپ سمجھ چکے تھے کہ یزید کی حکومت قائم و مستحکم ہو چکی ہے، لہٰذا ایک قائم شدہ حکومت کو ختم کرنے کی کوشش اب خروج اور بغاوت کے زمرے میں آئے گی، لہٰذا آپ نے شرعی حدود میں رہتے ہوئے متبادل راستے کو ترجیح دی اور چاہا کہ دِمشق جا کر یزید سے ملاقات کی جائے، شاید کہ روبرو مذاکرات سے اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ آپ کا یہ طرزِ عمل بتاتا ہے کہ یزید کی حکومت کے متعلق اپنی عزیمت پر مبنی رائے کے باوجود آپ ان صحابہ کے نقطۂ نگاہ کا بھی احترام کرتے تھے جنہوں نے شرعی گنجائش دیکھتے ہوئے یزید کی حکومت کو بعض بنیادی انتظامی کمزوریوں کے باوجود قبول کر لیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ جانے کا مقصد بھی حصولِ اقتدار نہیں بلکہ انہی کمزوریوں کی اصلاح تھا۔ کوفہ میں اپنے عقیدت مندوں کو جمع کر کے بھی غالباً آپ یہی کرنا چاہتے تھے مگر اب چونکہ صورت حال بالکل بدلی ہوئی تھی تو آپ نے

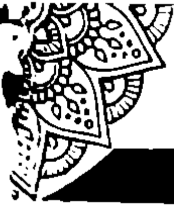
---

[1] تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن

[2] المحن، ص ۱۵۳ عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سُحنون...... ابومخنف کی روایت کے مطابق بعض رفقاء نے تسلی دیتے ہوئے یہ بھی کہا: ''بخدا آپ مسلم بن عقیل کی طرح نہیں۔ جب آپ کوفہ پہنچیں گے تو لوگ تیزی سے آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے۔'' (تاریخ طبری: ۳۹۸/۵)

[3] تاریخ طبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن
المغیثہ مکہ تا کوفہ کی ستائیسویں منزل (۱۹۵ کلومیٹر دور) تھا، جہاں سے قادسیہ تین میل (پونے پانچ کلومیٹر) دور شاہراہ کے دائیں جانب تھا۔

[4] تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن



براہِ راست یزید سے بات کرنا ضروری سمجھا کہ اسی میں امت کی فلاح تھی اور اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

اگر چہ یہ بات ظاہر تھی کہ دِمَشق اور کوفہ میں حکومتی پالیسی یکساں ہوگی اور حکومتی حلقے میں ہر جگہ آپ کو باغی گمان کیا جا رہا ہوگا، مگر ابن زیاد کی سخت مزاجی کو دیکھتے ہوئے اسے سمجھانا بہت مشکل تھا جب کہ یزید سے آپ کو یہ توقع تھی ابن زیاد جیسا سخت سلوک نہیں کرے گا اور کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم آپ کا موقف ضرور سنے گا۔ ①

آپ دِمَشق کے راستے پر تقریباً ۴۵ میل (ساڑھے ۷۲ کلومیٹر) سفر کر کے آخر کربلا تک جا پہنچے، جو کوفہ سے دِمَشق جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہاں دریائے فرات کا کنارہ قریب تھا جسے ''اَلطَّف'' کہا جاتا تھا۔ ②

ابن زیاد کیا چاہتا تھا اور کیوں؟

عبید اللہ بن زیاد چاہتا تو قافلۂ حسینی کو شام کی طرف جانے دیتا مگر افسوس کہ اس نے ذرا بھی مروت کا مظاہرہ نہ کیا اور کربلا میں اسے رکوا کر اصرار کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہیں گرفتاری دے کر اس کے پاس کوفہ حاضر ہوں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس پر دِمَشق کی طرف سے دباؤ تھا؟ یہ بات طے ہے کہ قافلۂ حسینی کے سرحدِ عراق پر پہنچنے کے بعد ۱۰ محرم تک کوفہ اور دِمَشق میں کوئی تازہ پیام رسانی ممکن نہ تھی۔ ③

دِمَشق سے موصولہ ہدایات کے مطابق اس کا فرضِ منصبی عراق کے حالات کو قابو میں رکھنا تھا۔ وہاں کے لوگ اس سے مرعوب ہو چکے تھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اب کوفہ سے دور جا رہے تھے۔ ایسے میں عبید اللہ انہیں جانے کی گنجائش کیوں نہیں دے رہا تھا؟ اُسے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ایک آزمائش سے جان چھوٹ رہی ہے۔

---

① حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حکومتی نظام میں اصلاحات کا موقف رکھنا اور یزید کے پاس یہی موقف لے کر جانے کا عزم کرنا، محض قیاس نہیں ہے بلکہ خود یزید کے اپنے بیان سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس لائحہ عمل پر روشنی پڑتی ہے۔ سانحہ کربلا کے بعد وہ کہا کرتا تھا: ''میرا کیا بگڑ جاتا اگر میں کچھ تکلیف گوارا کر لیتا اور حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں ٹھہرا لیتا اور جو وہ چاہتے ان کو اس کا اختیار دے دیتا کہ رسول اللہ ﷺ کی توقیر اور آپ ﷺ کے حق اور رشتہ داری کے احترام کا یہی تقاضا تھا۔ چاہے اس سے میری حکومت کی قوت اور شوکت کم ہو جاتی۔ (تاریخ طبری: ۵/۵۰۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود یزید کی بھی آخری معلومات یہی تھیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کچھ مطالبات لے کر نکلے تھے جن پر عمل کرنے سے بنو امیہ کی خاندانی حکومت کی قوت کم ہونا یقینی تھا۔ پس یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ مطالبات وسیع البنیاد شورائیت کے احیاء، موروثیت کے سد باب اور تقسیم اختیارات جیسے نکات پر مبنی ہوں گے ورنہ یزید کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ چاہے اس سے میری حکومت کی قوت و شوکت کم ہو جاتی۔

رہی یہ بات کہ یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ملاقات کیے بغیر یہ سب کیسے پتا چلا تو کوئی بعید نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے علی بن الحسین زین العابدین رحمہ اللہ نے جو سانحہ کربلا کے بعد کچھ دنوں تک یزید کے پاس رہے تھے، اسے یہ حقائق بتائے ہوں۔

② تاریخ الطبری: ۵/۳۹۲ عن حُصَین بسند صحیح، وذکر الحموی: الطَف طرف الفرات ای الشاطئی والطَف ارض من ضاحیة الکوفة فی طریق البریة فیها کان مقتل الحسین بن علی

یاد ہے کہ العذیب سے کربلا کی درمیانی منازل کا ذکر طبری نے بروایت ابو مخنف کیا ہے۔ العذیب کوفہ سے کم از کم ایک دن کی مسافت پر ہے۔ من الکوفة الی القادسیة خمسة عشر میلا ومن القادسیة الی العذیب ستة امیال. (المسالک والممالک: ۱/۴۷)

③ کوفہ اور دمشق کے مابین ۴۸۱ میل (۷۷۵ کلومیٹر) کا فاصلہ ہے۔ اگر کوئی تیز رفتار سوار روزانہ سو کلومیٹر بھی طے کرتا تو سات آٹھ دن میں دمشق پہنچتا۔ وہاں سے جوابی پیغام لانے میں مزید اتنا وقت لگتا۔ یعنی یزید کو تازہ حالت سے آگاہی اور کوئی حکم بھیجنے کے لیے مجموعی طور پر پندرہ سولہ دن درکار تھے جبکہ ابن زیاد نے قافلۂ حسینی کی آمد کے بعد کربلا کو مقتل بنانے میں پانچ دن بھی نہیں لگائے بلکہ دس محرم کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب شہید کیے جا چکے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبید اللہ بن زیاد نے یزید کے سابقہ مراسلے پڑھنے کے بعد خود کو ہر قسم کی کارروائی کا مجاز یقین کر لیا تھا اور حتمی کارروائی کے لیے کسی نئی ہدایت کا انتظار نہیں کیا تھا۔



ہم ابن زیاد کے رویے کو ایک جرنیل کی ضد اور ہٹ دھرمی ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ عبید اللہ بن زیاد نے نواسۂ رسول ﷺ کو ایک خطرناک باغی اور ایک بدترین مجرم شمار کیا تھا۔ شاید وہ اپنی انا کو تسکین دینا اور اپنا دبدبہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جس طرح مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو مجبور اور لاچار بنا کر قتل کیا تھا اسی قسم کا سلوک وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی کرنے کی ٹھانے ہوا تھا تاکہ سب پر حکام کی دہشت بیٹھ جائے اور لوگ صدیوں تک حکومت کے خلاف سر اٹھانے کا خیال تک ذہن میں نہ لائیں۔

اگر ابن زیاد صرف کوفہ میں شورش پسندی کی روک تھام چاہتا تو اس کے لیے بہت آسان تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی معزولی، اپنی تقرری، اہلِ عراق پر قابو اور مسلم بن عقیل کے دردناک انجام کی خبریں جلد از جلد پہنچنے دیتا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاعات پہلے مل جاتیں تو وہ راستے سے باآسانی واپس جا سکتے تھے۔ مگر ابن زیاد نے سرحدوں پر اتنی سخت ناکہ بندی کر دی تھی کہ مقامی دیہاتی بھی صوبے کی حدود سے نہیں نکل سکتے تھے چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک کوئی اطلاع نہیں پہنچ سکی اور وہ بے خبری کے عالم میں حدودِ عراق میں داخل ہو گئے۔ یہی ابن زیاد چاہتا تھا کہ انہیں آنے دے اور یکدم گرفتار کر لے۔ یہ ثابت کرے کہ میں اتنا بڑا سیاست دان ہوں کہ حسین رضی اللہ عنہ جیسے بڑے لیڈر کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ یہی وجہ تھی کہ عبید اللہ بن زیاد کی طرف سے سرحدی سپاہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ قافلۂ حسینی کو سیدھا کوفہ لے آئیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور کوفہ کی فوج کا افسر حر بن یزید طبعی نرمی اور شرافت کی وجہ سے آپ کو روکنے سے گریزاں رہا۔

عمر بن سعد کی کربلا روانگی:

اس صورت حال سے ابن زیاد سٹپٹا گیا۔ اس نے عمر بن سعد کو "رے" (تہران) کی گورنری کے وعدے کے ساتھ یہ مہم سونپ دی کہ وہ جا کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے نمٹ لے، یعنی انہیں کسی امان کے وعدے کے بغیر غیر مشروط طور پر گرفتار کر کے کوفہ لے آئے اور اگر وہ خود کو حوالے نہ کریں تو انہیں قتل کر دے۔ چوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسی باعظمت شخصیت پر ہاتھ ڈالنا، تاقیامت بدنامی مول لینے کے مترادف تھا اس لیے عمر بن سعد نے معذرت کی مگر ابن زیاد نے عہدہ چھیننے، گھر منہدم کرانے اور گردن اڑانے کی دھمکی دی۔ [1]

عمر بن سعد نے صبح تک کی مہلت مانگی اور رات بھر سوچتا رہا۔ دل و دماغ کی جنگ میں دماغ فتح یاب ہوا۔ صبح آ کر اس نے آمادگی ظاہر کی اور فوج کو ساتھ لے کر کربلا جا پہنچا۔ [2]

☆☆☆

---

[1] طبقات ابن سعد: ۱٦٨/٥، ط صادر

[2] تاریخ الطبری: ٥/٣٨٩ عن عمّار بسند حسن

یاد رہے کہ عمر بن سعد سے ملتا جلتا ایک نام عَمرو بن سعد ہے۔ دونوں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ عمر بن سعد یزید کی سرکاری فوج کا افسر تھا جبکہ عَمرو بن سعد رحمہ اللہ واقعہ حرہ میں یزیدی فوج سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے تھے۔

مقتلِ کربلا

میدانِ کربلا میں سرکاری فوج کے افسران عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حُصَین بن نُمَیر کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بات چیت ہوئی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کو اللہ اور دین کا واسطہ دیا اور کہا:

''مجھے امیر المؤمنین کے پاس جانے دو، میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔''①

یہ اتنا معقول اور واضح مطالبہ تھا جس پر حکام کے سارے گلے شکوے دور ہو جانے چاہییں تھے مگر عبید اللہ بن زیاد کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو غیر مشروط طور پر گرفتار کرنے کا حکم تھا اس لیے سالارانِ فوج نے جواب دیا:

''اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ آپ ابن زیاد کے فیصلے پر خود کو حوالے کر دیں۔''②

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا افواجِ کوفہ کو تین اختیارات دینا:

تمام راستے مسدود دیکھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دوسرے مرحلے میں حکام کے سامنے تین صورتیں رکھیں:

- جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔
- یزید کے پاس چلے جانے کا موقع دیا جائے۔
- کسی سرحد کی طرف نکل جانے دیا جائے۔

عمر بن سعد مان گیا۔ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو اطلاع دی مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور غیر مشروط گرفتاری دینے پر اصرار کیا۔③

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حُصَین بسند صحیح

یہاں ''امیر المؤمنین'' کا لفظ صحیح روایت میں ہے، اس لیے ہم نے ترجمے میں اسے من وعن نقل کر دیا ہے۔ مگر اس لفظ سے کوئی غلط فہمی یا الجھن نہ ہو۔ لفظ ''امیر المؤمنین'' سے یزید کے حکمران ہونے پر تو استدلال ہو سکتا ہے مگر اس کے صالح اور عادل ہونے پر استدلال درست نہ ہوگا۔ ''امیر المؤمنین'' کا لقب اگرچہ خلافتِ راشدہ میں شروع ہوا مگر بعد میں اسے اچھے بُرے بھی حکمران استعمال کرتے رہے۔ مامون اور معتصم جیسے بدعقیدہ خلفاء کو امام احمد بن حنبل جیسے ائمہ ''امیر المؤمنین'' کہتے تھے۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۴۰۰/۱۴ تا ۴۰۴)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا انہی معنوں میں تھا۔ البتہ یہ لفظ یہ ضرور ثابت کر رہا ہے کہ آخر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک زمینی حقیقت کے طور پر بطور تسلط یزید کی حکومت کے قیام کو مان لیا تھا۔ اگر یزید سے مذاکرات ہوتے اور وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شرائط مان جاتا تو غالباً اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بیعت سے بھی انکار نہ ہوتا جیسا کہ ''ہاتھ میں ہاتھ دینے'' کا لفظ اس کی دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یزید کی خامیاں چاہے فسق وفجور کے زمرے میں ہوں مگر کفر بواح کی حد تک نہ تھیں ورنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مفاکرت پر آمادہ نہ ہوتے۔

② تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حُصَین بسند صحیح

③ تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن

ابومخنف کے مطابق عبیداللہ بن زیاد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس پیش کش پر راضی ہونے لگا تھا مگر شمر بن ذی الجوشن نے اسے سمجھایا کہ غیر مشروط گرفتاری ہی درست اقدام ہے تاکہ فیصلہ حکومت کے اختیار میں رہے۔

شمر نے عبیداللہ بن زیاد سے کہا: ''اللہ نے دشمن کو آپ کے قابو میں دے دیا ہے، آپ اسے چھوڑ رہے ہیں؟''[1]

ابن زیاد کا پہلا فیصلہ بھی یہی تھا، چنانچہ یہ پیش کش مسترد کر دی گئی۔[2]

شمر کی رائے پر فیصلہ دینے سے عبیداللہ بن زیاد کا اپنا کردار بے داغ نہیں ہو جاتا۔ دراصل شمر نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی ورنہ وہ کوئی بچہ نہ تھا کہ شمر اسے بہکا لیتا۔

ایک بار پھر حسین رضی اللہ عنہ کو غیر مشروط گرفتاری دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر ایسا کرنا نہ صرف خانوادۂ نبوت کی عزت وآن بان کے خلاف تھا بلکہ یہ اس عظیم مقصد کو بھی اپنے ہی ہاتھوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پامال کر دینے کے مترادف تھا جس کے لیے جگرِ گوشۂ بتول نے اپنی اور اپنے خاندان والوں کی زندگیاں داؤ پر لگائی تھیں۔

اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔''[3]

گرفتاری کیوں نہ دی؟

بعض ''محققین'' کو اس پر حیرت ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید سے بیعت پر آمادہ تھے تو بھلا ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت سے انہیں انکار کیوں تھا؟ جبکہ عبیداللہ بن زیاد اپنی نہیں، یزید ہی کی اطاعت کی بیعت لینا چاہتا تھا۔

دراصل ان حضرات نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اصل ہدف کو نظر انداز کر کے انہیں میدانِ اقتدار کا ایک نادان قسمت آزما تصور کر رکھا ہے۔ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یزید سے بیعت پر آمادگی کو بھی اسی نگاہ سے دیکھتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ نواسۂ رسول محض اپنی جان بچانے کے لیے آخر میں اُسی چیز پر آمادہ ہو گئے جسے وہ شروع سے اب تک حرام قطعی سمجھ رہے تھے حالاں کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جان کی پروا ہوتی تو انہیں ابن زیاد کی چالیس گنا برتر فوج کے سامنے بہر حال جھک ہی جانا چاہیے تھا۔ سچ یہ ہے کہ جہاں اہلِ تشیع نے سادات کو عصمت کے مقام پر فائز کر کے حد سے بڑھا دیا ہے، وہاں ان کی تردید میں بعض غالی قسم کے ''محققین'' جگر گوشۂ بتول کو ان کے مقام سے گرانے کی تگ و دو میں ہیں۔ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو آج کل کے سیاست دانوں پر قیاس کر کے، ان کی تحریکِ عزیمت کو ایک پست زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے وہ فکرِ حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق جا بجا کج فکریوں کا شکار ہوئے ہیں۔

اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اعلیٰ مقاصد کو سامنے رکھیں تو ان کے ہر فعل کی توجیہ سمجھ آسکتی ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہدف سیاسی اصلاحات کا نفاذ تھا، اور آپ ان اصلاحات کے نفاذ کی شرط پر بیعت کرنا چاہتے تھے، چونکہ یہ اختیار صرف

---

[1] تاریخ الطبری: ۴۱۳/۵، ۴۱۴ عن ابی مخنف ؛ المحن، ص ۱۵۴ عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سُحنون

وشمر بن ذی الجوشن ابوہ صحابی، یروی احادیث عن ابیہ وعنہ ابو اسحق السبیعی قال الذھبی ولیس باھل للروایۃ فانہ احد قتلۃ الحسین رحمہ اللہ۔ (میزان الاعتدال: ۲۸۰/۲)

[2] المحن، ص ۱۵۴ عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سُحنون [3] تاریخ الطبری: ۳۳۹/۵ عن عمّار بسند حسن

یزید کے پاس تھا اس لیے آپ اسی سے براہِ راست مل کر بیعت کرنا چاہتے تھے۔ عبیداللہ بن زیاد کے پاس اصلاحات کا مطالبہ ماننے کا اختیار ہی نہیں تھا، اس لیے اس سے بیعت کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہو سکتا تھا، بالخصوص ایسے حال میں جبکہ وہ کسی تحفظ اور یزید کے پاس پہنچانے کی ضمانت دیے بغیر غیر مشروط بیعت لینے پر مصر تھا۔

جنگ کیسے چھڑی؟

بات چیت ختم ہو جانے کے بعد بھی عمر بن سعد جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا مگر عبیداللہ بن زیاد کوفہ میں بیٹھ کر پل پل کی خبریں لے رہا تھا۔ اس نے جویریہ بن بدر تمیمی کو یہ حکم دے کر بھیج دیا کہ عمر بن سعد کو کہو فوراً حسین اور ان کے ساتھیوں سے لڑائی شروع کرے ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ عمر بن سعد نے یہ دھمکی سنی تو جلدی جلدی ہتھیار پہنے اور جنگ شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ [1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے گفت و شنید کو لاحاصل دیکھا تو اپنی صف کی طرف واپس چل دیے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا، ہلکی سردی کا موسم تھا اس لیے آپ جبہ پہنے ہوئے تھے۔ عمر بن سعد کی فوج کے ایک شخص عمر طہوی نے آپ کی پشت پر تیر چلا دیا۔ یہ گویا جنگ کا اعلان تھا۔ تیر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جبے میں دونوں شانوں کے بیچ پیوست ہو گیا۔ [2]

اس دوران کوفہ کی گھڑ سوار فوج کے سالار حر بن یزید کا ضمیر جاگ اٹھا۔ فوج کو جنگ پر تیار دیکھ کر اس نے دیگر افسران کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم حسین رضی اللہ عنہ کی درخواست قبول نہیں کرو گے؟ اللہ کی قسم! اگر ایسی درخواست ترکستان اور دیلم کے کفار بھی تم سے کرتے تو اسے مسترد کرنا جائز نہ ہوتا۔''

مگر ان افسران پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تب حر نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا اور اسے حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کی طرف دوڑا دیا۔ یہ حضرات سمجھے کہ کوئی لڑنے آ رہا ہے۔ حر نے قریب آ کر اپنی ڈھال الٹ دی (جو صلح کا اشارہ تھا) اور سب کو سلام کیا۔ اس کے بعد ابن زیاد کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے دو کو قتل کیا اور خود بھی شہادت پائی۔ [3]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی توہین:

اب فریقین ہتھیار تھام کر آمنے سامنے آ گئے۔ ابن زیاد کے سپاہیوں نے لڑائی بھڑکانے کے لیے سادات کی توہین شروع کر دی۔ ایک بدبخت نے کھڑے ہو کر آواز لگائی: ''کیا تمہارے درمیان حسین ہیں؟''

جواب ملا: ''ہاں''۔ اس شخص نے کہا: ''انہیں دوزخ کی خوشخبری دو۔''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ رب معاف کرنے والا، مہربان اور رحیم ہے، جس کی اطاعت کی جاتی ہے۔''

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اچھا تو کون ہے؟'' بولا: ''میں حُویزہ کا بیٹا۔''

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حصین بسند صحیح

② تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حصین بسند صحیح، اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ تیر آپ کے موٹے جبے میں پھنس گیا اور کوئی گہرا زخم نہیں آیا تھا۔

③ تاریخ طبری: ۳۹۲/۵ عن حصین بسند صحیح

آپ رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ کہا: ''الٰہی! اسے دوزخ میں کھینچ لے۔''

اسی وقت اس شخص کی سواری بدک کر بھاگی اور اس کا پاؤں رکاب میں پھنسا رہ گیا، گھسٹتے گھسٹتے پورا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، رکاب میں صرف اس کا پاؤں باقی رہ گیا۔ ①

صاحبزادے عبداللہ کا قتل اور جنگ کا آغاز:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ ایک کوفی سپاہی نے انہیں دیکھ کر کہا:

''اسے تو میں ضرور قتل کروں گا۔''

دوسرے لوگوں نے سمجھایا بھی کہ اسے قتل کرنے سے تجھے کیا مطلب! مگر وہ اڑا رہا اور ہتھیار کھینچ کر عبداللہ پر چڑھ دوڑا۔ جب اس نے عبداللہ پر وار کیا تو وہ چلائے: ''ہائے چچا!''

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے آواز سنی تو بولے: ''ایسے شخص کی آواز پر لبیک جس کے مددگار کم ہیں اور دشمن بہت۔''

یہ کہہ کر آپ نے اس کوفی پر حملہ کیا اور اس کا ہاتھ کاٹ پھینکا۔ پھر دوسرا وار کرتے ہوئے اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوگئی۔ ②

اہل کوفہ کی بے ہمتی:

کوفہ کے کچھ لوگ جنگ کا نظارہ دیکھنے میدان جنگ کے قریب ٹیلوں پر پہنچ چکے تھے۔ وہ اشک بار ہوکر یہ مناظر دیکھ رہے تھے اور اللہ کی نصرت اترنے کی دعائیں کررہے تھے مگر ان کی بے ہمتی کا یہ عالم تھا کہ ذرا نیچے اتر کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے نہ گئے۔ کسی نے کہا: ''اللہ کے دشمنو! تم نیچے اتر کر ان کی مدد کو کیوں نہیں جاتے؟''

مگر وہ نہ تو کوئی جواب دے سکے، نہ ہی عملاً کچھ کر پائے۔ ③

اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ سو کے قریب افراد تھے۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پانچ بیٹوں اور بنو ہاشم کے سولہ افراد کے علاوہ بنوسلیم اور بنوکنانہ کا ایک ایک حلیف بھی تھا۔ ابن عمر بن زیاد نامی شخص بھی ان میں شامل تھا۔ ④

---

① مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۳۶۹، ط الرشد ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۶/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ
یہاں یہ ذہن میں رکھا جائے کہ ویسے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قضیے میں ہم صحیح اور حسن روایات ہی کو بنیاد بنا کر چل رہے تھے مگر بقدرِ ضرورت ضعیف روایات بھی لی تھیں تاکہ بعض ایسی جزئیات پر روشنی پڑ سکے جو کسی اور جگہ نہیں مل سکتیں۔ تاہم خاص لڑائی کے واقعے سے متعلق ہم نے صرف صحیح یا حسن روایات کو لیا ہے۔ کوئی ضعیف روایت ضمناً بھی شامل نہیں کی۔ آج کل بہت سے لوگ کربلا کی لڑائی کو محض شیعوں کا بنایا ہوا افسانہ قرار دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس بارے میں تمام روایات ابومخنف جیسے شیعہ راویوں سے مروی اور من گھڑت ہیں مگر ہم متن میں صحیح اور حسن روایات پر مشتمل روداد جنگ پیش کررہے ہیں جو ان نام نہاد محققین کے دعوے کی حتمی تردید کے لیے کافی ہے۔ یہ مختصر سہی مگر معتبر ہے۔ تفصیل کے خواہش مند حضرات ''البدایہ والنہایہ'' دیکھ سکتے ہیں۔

② المحن: ص ۱۵۴ عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سُحنون ...... یہ روایات واضح کررہی ہیں کہ خود کوفی لشکر نے لڑائی چھیڑی تھی، پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر پشت سے تیر چلایا گیا، پھر ان کے کم عمر بھتیجے پر حملہ کیا گیا۔ محمود عباسی کے پیروکار نے مستشرقین کا حوالہ دے کر دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کرکے خود جنگ چھیڑی تھی، مذکورہ روایات اس بے سند اور بے بنیاد دعوے کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

③ تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حُصَین بسند صحیح

④ تاریخ الطبری: ۳۹۲/۵ عن حُصَین بسند صحیح

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت:

آخر کار اس خونریز لڑائی میں سرکاری افواج کے ہاتھوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھی قتل ہو گئے۔ ان میں دس سے زیادہ نوجوان ان کے گھر کے تھے۔ ایک تیر آ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس معصوم بچے کو لگا جو ان کی گود میں تھا۔ حسین رضی اللہ عنہ اس کا خون پونچھتے جاتے اور کہتے جاتے: ''اے اللہ! ہمارے اور ان کے درمیان تو ہی انصاف کر، انہوں نے ہمیں اس لیے بلایا کہ ہماری مدد کریں اور اب یہ ہم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ نہ صرف انہیں قتل کر کے رہیں گے بلکہ ان کی لاش سے کپڑے اتارنے میں بھی توقف نہیں کریں گے۔ آپ نے گھر والوں سے کہا: ''مجھے ایسا معمولی کپڑا دے دو جسے چھیننا کوئی پسند نہ کرے، اسے میں لباس کے نیچے پہن لوں گا کہ کہیں میں عریاں نہ کر دیا جاؤں۔''

خواتین نے ایک پرانی چادر دے دی، آپ نے اسے پھاڑ کر لباس کے نیچے پہن لیا۔ پھر تلوار لے کر نکلے۔[2]

کچھ دیر کشت و خون کا ہنگامہ برپا رہا۔ آخر کار حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی بڑی دلیری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔[3]

قاتلوں نے اس چادر کے سوا آپ کے باقی کپڑے اتار لیے اور سر مبارک کو تن سے جدا کر دیا۔[4]

انا للہ وانا الیہ راجعون

شہدائے کربلا:

معرکۂ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ آل ابی طالب میں سے ''۱۸'' افراد شہید ہوئے۔

- ۱ چھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے: ❶ عباس ❷ جعفر ❸ عبداللہ ❹ عثمان ❺ محمد ❻ ابوبکر
- ۱ دو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے: ❶ عبداللہ ❷ علی اکبر
- ۱ تین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لڑکے تھے: ❶ قاسم ❷ ابوبکر ❸ عبداللہ
- ۱ تین عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لڑکے (مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے بھائی) تھے: ❶ جعفر ❷ عبدالرحمن ❸ عبداللہ
- ۱ دو حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے: ❶ عبداللہ بن مسلم ❷ محمد بن ابی سعید بن عقیل
- ۱ دو عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لڑکے تھے: ❶ عون ❷ محمد

عمر بن سعد کی فوج کے ۸۸ آدمی مارے گئے تھے۔[5] حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے علی (زین العابدین) اس وقت بیمار تھے، ان کی عمر ۲۳ سال تھی۔ عمر بن سعد نے سپاہیوں سے کہا: ''اس مریض کو کچھ نہ کہنا۔''[6]

---

① تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن ② المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۷/۳ ، تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۷/۳ ، تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن

④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۷/۳ ، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ ، تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار بسند حسن

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص: ۲۳۴، ۲۳۵ ، البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۵۵۱، ۵۵۲

⑥ التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ ،السفر الثانی: ۹۱۴/۲

قاتل کے فخریہ اشعار:

قاتل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر لے کر کوفہ کے قصرِ امارۃ پہنچا اور ابن زیاد کو خوشخبری دیتے ہوئے یہ فخریہ اشعار پڑھے:

اَوْقِرْ رِكَابِیْ فِضَّةً وَذَهَبَا ۔۔۔ فَاِنِّیْ قَتَلْتُ الْمَلِكَ الْمُحَجَّبَا

قَتَلْتُ خَیْرَ النَّاسِ اُمًّا وَ اَبَا ۔۔۔ وَخَیْرَهُمْ اِنْ یَنْسِبُوْنَ نَسَبَا

''میری سواری کو سونے چاندی سے لاد دے کہ میں نے اس بادشاہ کو قتل کر ڈالا جو پہرے میں رہتا تھا۔
میں نے دنیا کے بہترین والدین کی اولاد کو قتل کیا، جو نام ونسب کے شمار کے وقت سب سے اعلیٰ شمار ہوتا تھا۔''[1]

سرِ مبارک عبیداللہ بن زیاد کے سامنے:

سرِ مبارک کو ایک طشت میں رکھ کر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بالوں میں خضاب لگا ہوا تھا۔[2]

عبیداللہ بن زیاد کا دل پتھر کی مانند تھا۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چھڑی سے ان کے بالوں کو کریدتے ہوئے بولا:
''دیکھو! ابوعبداللہ کے بالوں میں سفیدی آگئی۔''[3] پھر چھڑی کو ہونٹوں پر رکھ کر کہا: ''دہن تو بڑا خوبصورت ہے۔''
اس وقت کوفہ کے بزرگ اور شرفاء مجلس میں موجود تھے۔ ان میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ بول اٹھے: ''بخدا! میں تمہیں غصہ دلاؤں گا۔ سنو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں بوسے دیتے دیکھا ہے جہاں تم نے چھڑی رکھی ہے۔''[4]

قافلۂ سادات عبیداللہ بن زیاد کے پاس:

عمر بن سعد نے لڑائی سے فارغ ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اہل عیال کو بھی عبیداللہ ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیا تھا۔[5]
عبیداللہ بن زیاد سنگ دل سہی مگر اس نے خواتین سے بدسلوکی نہ کی، انہیں ایک الگ گھر میں ٹھہرا کر ان کے کھانے پینے، خرچے اور لباس وغیرہ کا انتظام کرا دیا۔[6]
عبیداللہ بن زیاد نے اس معاملے کو بالکل ایک باغی گروہ کے قضیے کی طرح دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک بھی باغی کا اطلاق حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے مرد ساتھیوں پر ہی ہوتا تھا، گھر کے بچوں اور خواتین پر نہیں، اس لیے وہ انہیں کسی سزا کا حق دار نہیں سمجھتا تھا۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمار بسند حسن ۔ امام ابونعیم اپنی سند سے زبیر بن بکار کا قول نقل کرتے ہیں کہ شہیدِ کربلا پر قاتلانہ وار سنان بن انس نخعی نے کیا تھا جبکہ خولی بن یزید نے سرِ مبارک قلم کیا تھا اور وہی سر کو ابن زیاد کے پاس لے گیا اور یہ اشعار اسی نے سنائے تھے۔ (معرفۃ الصحابہ، ح: ۱۷۷۸) جبکہ ابو مخنف کی روایت کے مطابق اشعار پڑھنے والا یہ قاتل سنان بن انس نخعی تھا۔ (تاریخ طبری: ۴۵۴/۵)
② صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۳۷۴۸، کتاب المناقب، مناقب الحسن و الحسین
③ تاریخ الطبری: ۳۹۳/۵
④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۲۵/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ
⑤ تاریخ الطبری: ۳۹۰/۵ عن عمّار بسند حسن ⑥ تاریخ الطبری: ۳۹۳/۵ عن حُصَین بسند صحیح

حضرت زین العابدین اور عبیداللہ بن زیاد:

قافلے میں شامل خانوادۂ سادات کے تمام مرد شہید کر دیے گئے تھے۔ صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے علی بن حسین (جو زین العابدین کے لقب سے مشہور ہوئے) اس لیے زندہ رہ گئے تھے کہ وہ بیمار تھے اور لڑائی کے لیے خیمے سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔

جب وہ قافلے کی خواتین کے ساتھ کوفہ پہنچے تو عبیداللہ بن زیاد نے یہ سوچ کر کہ وہ بھی بغاوت میں شامل تھے، سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے بھی قتل کر دو۔ ان کی پھوپھی زینب بنت علی بڑی جرأت مند خاتون تھیں۔ وہ زین العابدین سے لپٹ گئیں اور بولیں: ''جب تک مجھے قتل نہ کر دو، اسے نہیں مار سکتے۔''

عبیداللہ بن زیاد نرم پڑ گیا اور انہیں چھوڑ دیا۔

پھر اس نے قافلۂ حسینی کا سامانِ سفر تیار کر کے انہیں یزید کے پاس دمشق بھیج دیا۔[1]

ابومخنف وغیرہ کی بعض روایات میں سادات سے عبیداللہ بن زیاد اور یزید کی سخت بدسلوکی کا ذکر ہے۔ مثلاً یہ کہ ان خواتین کو کوفہ سے دمشق تک برہنہ سر، پابہ زنجیر اونٹوں پر قیدیوں کی مانند بٹھا کر بھیجا گیا اور یزید نے سرِ دربار ان کی توہین کی اور مغرورانہ باتیں کیں مگر ایسی بدسلوکی کسی معتبر سند سے ثابت نہیں۔

قافلۂ سادات یزید کے ہاں:

جب سادات کا قافلہ دمشق پہنچا تو یزید نے بھی اس سانحے پر سخت افسوس ظاہر کیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کا بیان ہے:

''ہمیں یزید کے پاس لے جایا گیا، ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھ بھر آئی اور اس نے ہمیں وہ سب دیا جو ہم نے چاہا۔''[2]

یزید کے دربار میں نیلی آنکھوں والا ایک سرخ رنگت آدمی تھا، اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ایک کم عمر بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا: ''امیر المؤمنین! یہ لڑکی مجھے دے دیں۔''

یہ سن کر زینب بنت علی کہہ اٹھیں:

''اللہ کی قسم! نہ تجھے یہ حق ہے نہ یزید کو۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے دین کا منکر ہو جائے۔''

نیلی آنکھوں والے نے پھر یہی بات کہی۔ یزید نے کہا: ''خاموش رہو۔''[3]

تب فاطمہ بنت حسین نے کہا: ''اے یزید! کیا رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں قیدی بنائی جائیں گی؟''

یہ سن کر یزید بھی رو پڑا۔ اس کے ساتھ سبھی لوگ اس قدر روئے کہ آوازیں بلند ہو گئیں۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۰/۵ عن عمار بسند حسن

② سیر اعلام النبلاء: ۳۲۰/۳ بسند رجالہ ثقات

③ تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمار بسند حسن

اس موقع پر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔انہوں نے یزید سے کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر انہیں اس حال میں دیکھتے تو وہ جیسا سلوک کرتے ،آپ ویسا ہی سلوک کریں۔''

یہ سن کر یزید نے کہا:''انہیں حمام لے جا کر غسل کراؤ،ان کے لیے بڑا خیمہ لگاؤ۔''

لوگوں نے ایسا ہی کیا۔یزید نے ان کے لیے کھانا جاری کرایا، کپڑے فراہم کیے اور بکثرت عطیات دیے۔پھر کہا:

''اگر ابن زیاد کا حسین رضی اللہ عنہ سے رشتہ ہوتا تو ان کو قتل نہ کرتا۔''①

سادات سے یزید کے حسنِ سلوک کی گواہی ابو مخنف نے اپنی بعض روایات میں دی ہے اور حضرت فاطمہ بنت علی (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پوتی) کے حوالے سے درج ذیل واقعات نقل کیے ہیں:

ا یزید نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے کہا:''نعمان! ان لوگوں کی روانگی کا انتظام مناسب انداز میں کردیں۔ان کے ساتھ اہل شام کے کسی ایسے فرد کو بھیجیں جو دیانت دار اور صالح ہو،ساتھ میں کچھ گھڑ سوار اور خادم بھی ہوں جو ان سب کو مدینہ منورہ پہنچادیں۔''

پھر اس نے خواتین کے لیے حکم دیا کہ انہیں الگ مکان میں ٹھہرایا جائے جس میں ضرورت کی سب چیزیں موجود ہوں اور ان کے بھائی علی بن حسین بھی اس گھر میں رہیں جس میں یہ عورتیں ہوں۔

یہ خواتین جب یزید کے گھر گئیں تو آلِ معاویہ میں سے کوئی خاتون ایسی نہیں تھی جو روتی اور نوحہ کرتی ان کے پاس نہ آئی ہو۔تین دن سب نے وہاں سوگ منایا۔یزید صبح وشام کھانے پر علی بن حسین (زین العابدین) کو ضرور بلایا کرتا تھا۔②

ا جب یہ لوگ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئے تو یزید نے علی بن حسین کو بلوایا اور ان سے کہا:''ابن مرجانہ (عبید اللہ بن زیاد) پر اللہ کی لعنت ہو۔واللہ! اگر حسین رضی اللہ عنہ میرے پاس آتے تو مجھ سے جو مطالبہ کرتے میں پورا کردیتا۔ان کو جس طرح ممکن ہوتا قتل ہونے سے بچالیتا، چاہے اس میں میری اولاد میں سے کوئی مارا جاتا لیکن اللہ کو یہی منظور تھا جو آپ نے دیکھا۔آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوا کرے،لکھ بھیجا کریں۔''③

یزید نے بنو ہاشم کی خواتین سے فرداً فرداً معلوم کرایا کہ (ہنگامہ دار و گیر میں) کس سے کیا کچھ لوٹا گیا؟ خواتین نے جتنا کچھ بھی بتایا یزید نے اس سے دوگنا ان کو دیا۔④

ا یزید نے ہاشمی قافلے کو مدینہ منورہ پہنچانے کے لیے بھی نیک سیرت لوگ تعینات کیے۔ان کے سردار کو سادات کے بارے میں حسن سلوک کی وصیت کی۔چنانچہ وہ انہیں لے کر نکلا۔انہیں رات کو لے کر سفر کرتا اور آگے رکھتا تا کہ وہ اس کی نظروں سے ایک پل اوجھل نہ ہوں۔

① المحن لابی العرب التمیمی، ص ۱۳۴، ۱۳۵، عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سُحنون

② تاریخ الطبری: ۴۶۲/۵ عن ابی مخنف

③ تاریخ الطبری: ۴۶۲/۵ عن ابی مخنف

④ تاریخ الطبری: ۴۶۳/۵ عن ابی مخنف

جب وہ کہیں پڑاؤ ڈالتے تو یہ خدام ان سے دور ہٹ جاتے اور ان کے اردگرد پہرہ دیتے۔ انہیں ایسی جگہ ٹھہراتے جہاں وضو اور دیگر ضروریات میں کوئی زحمت نہ ہوتی۔ وہ ان کی ضروریات کا پورا خیال کرتے اور حسن سلوک کرتے ہوئے منزل بمنزل انہیں مدینہ لے آئے۔

ان کے اچھے برتاؤ سے متاثر ہو کر فاطمہ بنت علی نے قافلہ سالار کو زیور اتار کر حقِ خدمت کے طور پر پیش کیے اور صلے میں کمی پر معذرت بھی کی۔ اس نے جواب میں کہا:

”اگر دنیا کے لیے یہ حسن سلوک کیا ہوتا تو یہ زیور بلکہ اس سے کم بھی مجھے خوش کرنے کے لیے کافی ہوتا مگر میں نے صرف اللہ کی خاطر اور آپ کی رسول اللہ ﷺ سے رشتہ داری کی خاطر ایسا کیا ہے۔“[1]

☆☆☆

حضور ﷺ پوچھیں گے تو کیا جواب دو گے؟

جب یہ قافلہ مدینہ میں داخل ہوا تو استقبال کرنے والوں میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی چچازاد حضرت زینب بنت عقیل بھی تھیں۔ وہ رو رو کر یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

مَاذَا تَقُوْلُوْنَ اِنْ قَالَ النَّبِیُّ لَکُمْ　　مَاذَا فَعَلْتُمْ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ

”لوگو! تم کیا جواب دو گے جب پیغمبر ﷺ تم سے پوچھیں گے
کہ تم نے آخری امت ہو کر کیا کیا؟

بِعِتْرَتِیْ وَبِاَھْلِیْ بَعْدَ مُفْتَقَدِیْ　　مِنْھُمْ اُسَارٰی وَقَتْلٰی ضُرِّجُوْا بِدَمِ

میرے بعد میری اولاد اور گھر والوں سے کیا سلوک کیا؟
ان میں سے کچھ قیدی بنے، کچھ مقتول ہو کر خاک و خون میں لٹا دیے گئے۔

مَا کَانَ ھٰذَا جَزَائِیْ اِذْ نَصَحْتُ لَکُمْ　　اَنْ تُخْلِفُوْنِیْ بِسُوْءٍ فِیْ ذَوِیْ رَحِمِیْ

میں نے تمہاری جو رہنمائی کی تھی اس کا بدلہ یہ تو نہ تھا
کہ میرے بعد میرے اقارب سے بدسلوکی کرو۔“[2]

حضرت ابوالاسود الدؤلی (م ۶۹ھ) تک جب یہ اشعار پہنچے تو فرمایا: ”ہم یہی کہیں گے:[3]

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ.[4]

☆☆☆

---

① تاریخ الطبری: ۲۶۲/۵، ۲۶۳ عن ابی مخنف

② تاریخ الطبری: ۳۹۰/۵ عن عمّار بسند حسن ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۸/۳، ۱۲۵/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۸/۳ ؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۸۳

④ اے رب ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو نے ہمیں بخش نہ دیا اور تو نے رحم نہ کیا، تو ہم ہو جائیں گے خسارہ پانے والوں میں سے (الاعراف: ۲۳)

سانحہ کربلا کا ذمہ دار کون؟

یہ سوال بڑے شدومد سے اپنی جگہ برقرار ہے کہ آخر سانحہ کربلا کا ذمہ دار کون تھا؟ حضور اکرم ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے پچاس برس بعد ہی ان کے خاندان کو خاک وخون میں تڑپانے والے آخر کون تھے؟

واقعۂ کربلا کا بغور جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کو اس سانحے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے ذمہ دار کئی گروہ اور مختلف لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کی سازش، کسی کی نادانی، کسی کی ضد اور کسی کے جوشِ انتقام نے حالات کو یہاں تک پہنچایا کہ اُمت کے ہاتھ اپنے ہی نبی کی اولاد کے خون میں رنگے گئے۔ ذیل میں ہم ان ذمہ دار گروہوں یا افراد کا ذکر کرتے ہیں۔

اہلِ کوفہ:

اگر غور کیا جائے تو سانحۂ کربلا کی ذمہ داری سب سے پہلے اہلِ کوفہ پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ہزاروں وعدے کر کے بلایا اور پھر دھوکا دے کر اکیلا چھوڑ دیا۔ صحابہ کرام اور اکابرِ اُمت کے اس سانحے پر منقول تاثرات پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کو زیادہ غصہ اہلِ کوفہ پر ہی تھا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا:

''اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے، انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دھوکا دیا۔ ان پر اللہ کی لعنت ہو۔''[1]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی عراقی نے احرام کی حالت میں مچھر مارنے کا مسئلہ پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حاضرین کی طرف رخ کر کے کہا: ''اِسے دیکھو تو سہی! مجھ سے مچھر کے خون کا مسئلہ پوچھ رہا ہے جبکہ ان لوگوں نے نبی ﷺ کے فرزند کو قتل کیا ہے اور میں نے خود حضور ﷺ سے سنا ہے کہ یہ دونوں (حسن وحسین) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔[2]

جنگ کے دوران حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں: ''اے اللہ! تو ہی ہمارا اور ان لوگوں کا انصاف فرما۔ انہوں نے ہمیں بلایا کہ ہماری مدد کریں اور اب ہمیں قتل کر رہے ہیں۔''[3]

ان الفاظ کا مصداق عبیداللہ بن زیاد اور عمر بن سعد وغیرہ نہیں ہوسکتے؛ کیوں کہ انہوں نے آپ کو ہرگز نہیں بلایا تھا۔

---

① فضائل الصحابہ لاحمد بن حنبل، ح: ۱۳۹۲ ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸/۳ بسند صحیح

② صحیح البخاری، ح: ۵۹۹۴، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد و تقبیلہ

③ تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵ عن عمار بسند حسن

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کوفہ کے افسران اور سپاہیوں میں شیعانِ علی کے ایسے لوگ شامل تھے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھے تھے مگر اب وہ غداری کر کے ان کے خلاف شمشیر بکف ہو گئے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف حملے میں شریک شیعانِ علی:

تاریخی روایات سے کوفہ کی حملہ آور فوج میں درج ذیل شیعانِ علی کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے:

- **عمرو بن حجاج:** یہ وہ شخص تھا جس نے ہانی بن عروہ کی گرفتاری پر جا کر قصرِ امارت کے دروازے پر چڑھائی کی تھی۔[1]

یہی عَمر و بن الحجاج کربلا میں ابن زیاد کی فوج میں شامل ہو کر کہہ رہا تھا:

''لوگو! اس شخص کے قتل میں تردد مت کرنا جس نے دین چھوڑ دیا اور حاکم کی مخالفت کی۔''[2]

- **شمر بن ذی الجوشن:** جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھا اور اس لڑائی میں زخمی بھی ہوا تھا۔[3]

ابن زیاد کے لشکر کا نائب سالار یہی تھا اور اسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر مہلک وار کرنے کا حکم دیا تھا۔[4]

- **عبداللہ بن زہیر بن سلیم:** کوفہ کی فوج کا ایک حصہ عبداللہ بن زہیر بن سلیم کی قیادت میں تھا۔[5] یہ شخص مشہور شیعہ مؤرخ ابو مخنف لوط بن یحییٰ کا پڑنانا تھا۔[6]

- **قیس بن الاشعث:** فوج کا ایک حصہ قیس بن الاشعث کی کمان میں تھا۔[7] اس کے والد اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپہ سالار تھے۔[8]

- **سنان بن انس نخعی:** اس نے شمر کے حکم پر نیزے کا کاری وار کیا تھا، قبیلہ نخع سے تھا جس میں شیعانِ علی کا غلبہ تھا۔

- **خولی بن یزید الاصبحی:** اس نے سر مبارک تن سے جدا کیا تھا۔[9] یہ قبیلہ حمیر سے تعلق رکھتا تھا جو یمنی قبیلہ تھا جہاں سے عبداللہ بن سباء نے جنم لیا تھا اور وہاں تشیع کے اثرات گہرے تھے۔

رہی یہ بات کہ ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی کیوں ٹھان رکھی تھی؟ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور

---

① تاریخ الطبری: ۳۶۷/۵ عن ابی مخنف　② تاریخ الطبری: ۴۳۵/۵

③ تاریخ الطبری: ۴۸/۵؛ الاعلام للزرکلی: ۱۷۵/۳　④ تاریخ الطبری: ۴۵۳/۵ عن ابی مخنف؛ طبقات ابن سعد: ۴۶/۶

⑤ تاریخ الطبری: ۴۲۲/۵ عن ابی مخنف　⑥ تہذیب الکمال: ۲۱۹/۱۳

⑦ تاریخ الطبری: ۴۲۲/۵ عن ابی مخنف　⑧ سیر اعلام النبلاء: ۴۰/۲، ط الرسالۃ

⑨ سنان اور خولی کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خون میں ہاتھ رنگنا ثقات کی روایت میں ہے۔(المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۷/۳؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۴۴)
سنان حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے بعد ابن زیاد کے پاس گاتا ہوا آیا تھا: ''اوقر رکابی فضۃ و ذھبا'' (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۷/۳)
البتہ ان دونوں کے شیعہ ہونے کا کوئی باوثوق ثبوت نہیں ملا۔ سنان کے نخعی ہونے کی بناء پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ شیعانِ علی میں شامل ہو۔ اسی طرح خولی بن یزید کے قبیلہ حمیر سے ہونے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاید وہ شیعہ ہو؛ کیوں کہ ان دونوں قبائل: نخع اور حمیر میں تشیع کے اثرات غالب تھے۔

نوٹ: فوج میں شامل ان شیعانِ علی کے نام خود شیعہ مؤرخین نے نقل کیے ہیں۔ ہم نے مذکورہ تمام نام ابو مخنف کی روایات سے لیے ہیں جو ''تاریخ الطبری'' میں ہیں۔ شبث بن ربعی کو بھی ابو مخنف نے اسی فوج میں شمار کیا ہے (امام ابو داؤد اور امام ابن ماجہ نے شبث سے ایک ایک روایت لی ہے، ائمہ جرح و تعدیل نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔) اس کے علاوہ شیعوں کی اپنی کتب مثلاً: جلاء العیون اور احتجاج طبرسی میں ایسے مزید حوالے بھی مل سکتے ہیں۔ تاہم اگر ان میں کوئی ایسا نام ہو جسے ہمارے ائمہ جرح و تعدیل نے ثقہ قرار دیا ہے تو اس کی طرف قتل حسین کی نسبت کرنے میں اہل تشیع کو کاذب مانا جائے گا۔

ان کے رفقاء کو زخمی کر کے باندھ کر زندہ حالت میں بھی کوفہ لے جا سکتے تھے۔ انہیں قتل کر کے کیا حاصل ہوا؟ اگر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ڈر تھا کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ زندہ رہے تو کہیں ان کے راز فاش نہ ہو جائیں۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ اگر یہ خطوط عبید اللہ بن زیاد یا یزید تک پہنچ جاتے تو ان لوگوں کا بچنا مشکل تھا۔ انہیں سخت ترین سزا مل سکتی تھی۔ مگر غالباً لوٹ مار کے بہانے وہ خطوط ضائع کر دیے گئے؛ کیوں کہ تاریخ میں کوئی ایسی روایت نہیں کہ جنگ کے بعد وہ خطوط کہیں سامنے آئے ہوں اور ان کی بنا پر کوئی گرفتاریاں ہوئی ہوں۔ اس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر دھوکہ دینے والوں کے خلاف کوئی ثبوت نہ رہا۔ فتنہ پرور لوگ صاف بچ گئے اور ایک اعلیٰ مقصد کے لیے آنے والے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ خاندان سمیت شہید ہو گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

عمر بن سعد:

عمر بن سعد کا نام بھی حادثۂ کربلا کے ذمہ داروں سے خارج نہیں کیا جا سکتا[1]؛ کیوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر حملہ آور فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ شروع میں وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی کارروائی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا مگر عبید اللہ بن زیاد کی دھمکیوں اور ''رے'' کی گورنری کے لالچ نے اسے اس مہم پر آمادہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ اسے توقع ہو کہ وہ کشت و خون کے بغیر معاملہ سلجھا لے گا۔ ابو مخنف کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ عمر بن سعد نے آخر تک مسئلہ لڑائی کے بغیر سلجھانے کی کوشش کی۔[2] اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پیش کش کو قبول کر کے ابن زیاد کو لکھ دیا تھا: ''اللہ نے آگ کا شعلہ بجھا دیا، اختلاف دور کر دیا اور امت کے معاملے کو سلجھا دیا۔'' عبید اللہ بن زیاد نے آمادہ ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ میں نے قبول کیا۔ لیکن شمر نے اس کی رائے تبدیل کر کے پھر جنگ کا ماحول پیدا کر دیا۔[3]

ابو مخنف کا بیان ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر عمر بن سعد کو اتنا دکھ ہوا کہ روتے روتے اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔[4] بہر حال عمر بن سعد چاہے دل سے نہ سہی، مگر اس کارروائی میں شریک تو تھا بلکہ حملہ آور فوج کی کمان اسی کے ہاتھ میں تھی لہٰذا اسے ہرگز بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

---

[1] هو عمر بن سعد، ابوه سعد بن ابى وقاص صحابى من العشرة المبشرة بالجنة، ولد عمر بن سعد سنة ۲۳ من الهجرة. قال العجلى: مدنى ثقة كان يروى عن ابيه احاديث وروى الناس عنه وهو الذى قتل الحسين قلت كان امير الجيش ولم يباشر قتله. (الثقات للعجلى، نمبر: ۱۳۴۳، ط مكتبة الدار)

ولكن اكثر الناس لا يثقونه لشركته فى وقعة الكربلاء. ومرة نقل يحيىٰ بن سعيد القطان عنه حديثا فقام اليه رجل فقال: اما تخاف الله! تروى عن عمر بن سعد؟ فبكى وقال: لا اعود احدث عنه ابداً (تهذيب الكمال: ۲۱/۳۵۷، ۳۵۸) قال ابن ابى خيثمة: قلت ليحيىٰ بن معين: عمر بن سعد ثقة؟ قال كيف يكون من قتل الحسين ثقة! (التاريخ الكبير، ابن ابى خيثمة بالسفر الثانى: ۲/۹۴۵)

وسال بعض الناس عن الامام احمد بن حنبل عن عمر بن سعد؟ قال: لا ينبغى ان يحدث عنه لانه صاحب الجيوش وصاحب الدماء وهو الذى شهد مقتل الحسين بن على. (المنتخب من علل الخلال، ابن قدامه المقدسى، ص ۲۳۷)

[2] تاريخ الطبرى: ۵/۴۱۰ تا ۴۱۴ [3] تاريخ الطبرى: ۵/۴۱۴ عن ابى مخنف [4] تاريخ الطبرى: ۵/۴۵۲

عبیداللہ بن زیاد:

عبیداللہ بن زیاد کے بارے میں صحیح روایت شاہد ہیں کہ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ایک باغی مجرم کی حیثیت دی اور کسی رعایت کا مظاہرہ کیے بغیر ان کے خلاف کارروائی کا حکم دیا۔[1] حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر دیکھ کر بھی اس کا دل نہ پسیجا بلکہ اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے کوئی روز کا معمول انجام دیا گیا ہو۔ اس سانحے کا اصل ذمہ دار وہی تھا۔

یہاں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم یزید نے نہیں دیا تھا تو عبیداللہ بن زیاد یا عمر بن سعد کو اتنی جرأت کیسے ہوگئی کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کو یزید سے پوچھے بغیر قتل کرا دیں۔ خصوصاً عبیداللہ بن زیاد کو تو ضرور اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ اس اقدام سے حکومت خوش ہوگی یا ناراض۔ کیا وہ یزید کی ناراضی کا خطرہ مول لے سکتا تھا؟

غور کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ اسے یزید سے کسی ناراضی کا خدشہ نہیں تھا؛ کیوں کہ یزید نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی جگہ اسے کوفہ کی حکومت اسی لیے دی تھی کہ یزید کے خیال میں نعمان رضی اللہ عنہ کی نرم خوئی سے اہل عراق بے قابو ہو رہے تھے۔ پس عبیداللہ بن زیاد اپنی تقرری کا مقصد اس کے سوا اور کیا سمجھتا کہ یزید کو کوفہ کے لیے ٹھیک ٹھاک سخت آدمی چاہیے۔ چنانچہ ابن زیاد نے ویسی ہی سختی دکھائی جیسی اس کے خیال میں یزید کو مطلوب تھی، تا کہ اس کا عہدہ برقرار رہے بلکہ ترقی ہو۔ دوسرے الفاظ میں یزید کی طرف سے دیے گئے اعتماد اور اختیار نے ہی ابن زیاد کو حوصلہ بخشا کہ وہ اتنا گھناؤنا کام کرے کہ جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی۔ ابن زیاد کے گمان کے عین مطابق دار الخلافہ سے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی ہوئی نہ باز پرس۔ البتہ یزید نے ابن زیاد کے ظالمانہ اقدام پر خوشی ظاہر نہیں کی بلکہ کہا: ''ابن زیاد نے حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے میں جلد بازی کی، ان کو قتل کر دیا۔ اللہ اسے ہلاک کرے۔''[2]

سانحۂ کربلا اور یزید کا کردار:

مشہور یہی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید نے قتل کرایا تھا یعنی عبیداللہ بن زیاد کو اس کا حکم یزید ہی نے دیا تھا مگر کسی روایت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا ہو۔ ثابت شدہ بات اتنی ہے کہ عبیداللہ بن زیاد نے اپنے اختیار پر یہ ستم ڈھایا تھا۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

''اہل نقل کا اتفاق ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔''[3]

ابن صلاح فرماتے ہیں: ''ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ثابت شدہ بات یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے اس جنگ کا حکم جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سبب بنی، عبیداللہ بن زیاد حاکم عراق نے دیا تھا۔''[4]

---

① عبیداللہ بن زیاد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھتیجا اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا پوتا تھا، خوبصورت مگر بدسیرت تھا۔ امیر معاویہ نے ۵۵ ہجری میں جب ۲۲ سال کا تھا، اسے بصرہ کا حاکم بنایا، ترکستان کی مہمات میں اس کا بڑا کردار رہا۔ اس کی والدہ مرجانہ ایرانی تھی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵۴۵/۳، ط الرسالة)

② تاریخ الطبری: ۲۶۵/۵

③ منہاج السنة: ۵۵۷/۴ ④ فتاوی لابن الصلاح، ص ۲۱۶

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یزید کو سانحۂ کربلا سے بری الذمہ اور لاتعلق سمجھ لیا جائے۔ اگر مقتولینِ کربلا کا مقدمہ دنیا کی کسی عدالت میں پیش ہوتا تو یقیناً عدمِ ثبوت کی بناء پر یزید بری ہو جاتا مگر اخلاقی اور عرفی لحاظ سے عوام کی عدالت میں اس کا بری الذمہ ہونا ممکن نہ تھا۔ (اور آخرت کی عدالت کا فیصلہ اللہ کے علم میں ہے۔)

اگر یہ مان لیا جائے کہ یزید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرانا نہیں چاہتا تھا تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ عقل وخرد سے بالکل بے گانہ تھا؛ کیوں کہ اس پورے قضیے میں اس کی حکمتِ عملی بالکل غلط رہی۔ اگر وہ عبیداللہ بن زیاد کو صاف الفاظ میں اتنی ہدایت کر دیتا کہ بنو ہاشم کو عزت واحترام سے دِمشق بھیج دیا جائے، تو ہرگز یہ سانحہ رونما نہ ہوتا۔ عبیداللہ بن زیاد حکومت کا پکا وفادار تھا۔ وہ جان بوجھ کر یزید کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک حکمران کو ملک میں ہونے والے ہر اچھے برے کا ذمہ دار مانا جاتا ہے۔ اگرچہ قانونی لحاظ سے کسی گلی محلے میں ہونے والے قتل کے بدلے حکمران کو پھانسی دی جاتی ہے نہ کسی کی نمازوں اور نفلوں کا ثواب حکمرانوں کو ملتا ہے مگر جب لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو لٹتی ہے تو وہ حکمران ہی کو مجرم ٹھہراتے ہیں اور اس الزام تراشی میں وہ بالکل برحق ہوتے ہیں۔ باضمیر اور دردمند حکمران بھی ایسے میں خود کو ضمیر کی عدالت میں مجرم تصور کرتے ہیں اور فکرِ آخرت سے کانپ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کے فرات کے کنارے اونٹ بھی پیاسا مرے گا تو اس کا وبال میرے سر پر ہوگا۔

یزید اس سانحے کے وقت حکومت کے مقتدرترین عہدے پر تھا۔ مسلمانوں نے اسے ہدفِ تنقید بنانا ہی تھا اور وہ اس میں حق بجانب تھے۔ خاص طور پر اس لیے کہ یزید نے اس سانحے پر بس اظہارِ غم ہی کیا، عبیداللہ بن زیاد اور کوفہ کے حکام کو پیٹھ پیچھے برا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ بالفرض مان لیا جائے کہ عبیداللہ بن زیاد جیسے اعلیٰ افسر پر فردِ جرم اس لیے عائد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے طور پر ایک سرکاری آپریشن میں مصروف تھا اور ایک بغاوت کو کچل رہا تھا، اور اس بات سے قطع نظر کر لیا جائے کہ معاملہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے سے تھا، تب بھی یہ سوال باقی رہے گا باغیوں کے ساتھ سلوک کے جو شرعی اصول وضوابط ہیں، سرکاری افسران اور فوج نے کیا اس کا کوئی لحاظ کیا؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمجھوتے پر آمادہ تھے اور ان کا موقف سن کر خود اموی افسر حر بن یزید پکار کر کہہ رہا تھا کہ اگر ایسی پیش کش کفار بھی کریں تو انہیں اَمان دینا واجب ہے مگر اس کے باوجود انہیں ایسے بدترین سلوک کا نشانہ بنایا گیا جو کفار سے بھی روا نہیں ہے۔

پس میدانِ کربلا میں جو کچھ ہوا وہ یقیناً کھلا ظلم وستم تھا جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ ایسے ظلم کے مرتکب کو سرزنش کے طور پر کم از کم معطل تو کیا جا سکتا تھا تا کہ مظلوموں کے ورثاء اور صدمے سے بے حال عوام کو کچھ تسلی ہو جاتی مگر افسوس کہ یزید سے اتنا بھی نہ ہوا۔

پس اس تساہل کی وجہ سے لوگوں میں یزید کے خلاف جتنی بھی نفرت پھیلتی کم تھی؛ کیوں کہ اس کا مطلب عام لوگ یہی لے سکتے تھے کہ وہ قتلِ حسین پر راضی ہے۔ اسی وجہ سے عالمِ اسلام میں بنوامیہ کے خلاف نفرت پھیلی اور لوگ بار بار ان کے خلاف کھڑے ہوئے۔ خود یزید کو اس غلطی کا نتیجہ ایسی بدنامی کی صورت میں بھگتنا پڑا جس سے نجات ممکن نہ تھی۔

مسئلے کا حل کیا تھا؟

اب تک کے مطالعے سے یہ ثابت ہے کہ دوطرفہ سیاسی اختلاف موجود تھا، حکومت کو جو غلط فہمیاں تھیں ان کا ازالہ آمنے سامنے بات چیت ہی سے ہوسکتا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی جب کربلا کے میدان میں دیکھا کہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے بالکل بندگلی میں پہنچ گیا ہے تو یزید کے پاس چلے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ یزید نے بھی سانحہ رونما ہوجانے کے بعد بار بار اس حسرت کا اظہار کیا کہ کاش! وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلا لیتا اور ان کے مطالبات مان لیتا۔ اگر یزید واقعی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف سننے کے لیے انہیں عزت واحترام سے اپنے ہاں بلا لیتا یا ان سے روبرو بات چیت کے لیے خود حجاز کا سفر کر لیتا اور وسعتِ قلبی سے کام لیتا تو شاید مسئلہ حل ہوجاتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہی رہا تھا کہ براہِ راست بات چیت کر لیتے تھے۔ مذاکرات کے لیے کبھی خود تشریف لے جاتے، کبھی دوسروں کو مدعو کر لیتے۔ مگر یزید کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ بعد میں پشیمان ہو کر وہ کہا کرتا تھا:

"میرا کیا بگڑ جاتا اگر میں کچھ تکلیف گوارا کر لیتا اور حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں ٹھہرا لیتا اور جو وہ چاہتے، ان کو اس کا اختیار دے دیتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق اور رشتہ داری کے احترام کا یہی تقاضا تھا۔ چاہے اس سے میری حکومت کی قوت اور شوکت کم ہوجاتی۔ اللہ ابن مرجانہ پر لعنت کرے کہ اس نے حسین رضی اللہ عنہ کو دھتکارا اور (لڑنے پر) مجبور کیا حالاں کہ حسین رضی اللہ عنہ اسے پیش کش کر چکے تھے کہ وہ ان کا راستہ چھوڑ دے تاکہ وہ لوٹ جائیں مگر اس نے ایسا نہ کیا یا یہ کہ حسین رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں، یا کسی اسلامی سرحد پر چلے جائیں وہیں مرتے دم تک (جہاد میں مشغول) رہیں مگر ابن زیاد نے ایسا بھی نہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا، ان کی بات مسترد کر کے انہیں قتل کر ڈالا۔ اس نے انہیں قتل کر کے مسلمانوں کے نزدیک مجھے قابلِ نفرت بنا ڈالا۔ مسلمانوں کے دلوں میں میری دشمنی کا بیج بو دیا۔ نیک ہوں یا بدکار سب مجھ سے بغض رکھنے لگے؛ کیوں کہ حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت لوگوں کے نزدیک بہت بڑا سانحہ ہے۔ مجھے ابن زیاد سے کیا سروکار، اللہ اس پر لعنت کرے، اس پر اللہ کا غضب نازل ہو۔"[1]

بہر حال یزید کی یہ پشیمانی بے سود رہی۔ اسے توفیق نہ ہوئی کہ ابن زیاد، عمر بن سعد اور شمر وغیرہ کے خلاف کچھ کرتا۔ اس کا یہ ارادہ دل ہی میں رہا اور اس کا عملی طور پر کوئی اظہار نہیں ہوا۔[2] اس لیے یزید کی حسرت وندامت اس کے دامن کے داغ نہ دھو سکی بلکہ اس کے بعد اس نے پے در پے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پر فوج کشی کرائی، ان خونی مہمات میں اس کی فوج نے جو کچھ کیا، وہ اس کی بدنامی میں مزید اضافے کا سبب بنا۔

---

① تاریخ الطبری: ۵/۵۰۶، رواہ ابن جریر بھذا الاسناد قال ابو جعفر و حدثنی ابو عبیدہ معمر بن المثنی، ان یونس بن حبیب الجرمی حدثہ.

② یزید کی کاہلی کا یہ عالم تھا کہ عین جوانی کے باوجود اپنے پورے دورِ خلافت میں وہ پایۂ تخت دمشق اور اپنے گاؤں "حُوارین" سے باہر نہ نکلا۔ نہ کبھی حج یا عمرے کا سفر کیا نہ جہاد کا۔ اس کا تعلق عوام سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ شاہی مہمانوں اور درباریوں کے سوا کسی سے اس کا رابطہ نہ تھا۔ تمام نقشہ راحت پسند بادشاہوں کا سا تھا۔

سانحہ کربلا......اسباق تاریخ

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات علیم وحکیم اور قادر ومقتدر ہے۔ ہر چیز اس کی قضا وقدر اور لوح تقدیر کے مطابق ہے۔ کوئی واقعہ، حادثہ یا سانحہ اس کے امر کے بغیر انجام نہیں پاتا اور اس کے ہر امر میں کوئی گہری حکمت ضرور ہوتی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سانحۂ شہادت سے جہاں دل صدمے سے پارہ پارہ ہوتے ہیں وہاں قضا وقدر اور تکوینی حکمتوں کا عقیدہ ہمیں صبر و برداشت کا سبق دیتا ہے۔ اس حادثے کے پس پردہ کیا حکمتیں تھیں؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ تاہم غور وفکر سے چند حکمتیں بہت واضح دکھائی دیتی ہیں:

❶ اللہ جانتا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کو کمزور ایمان والے مسلمان مافوق الفطرت ہستیاں گمان کر لیں گے، انہیں غیب دان، حاجت روا اور مشکل کشا ماننے لگیں گے۔ واقعہ کربلا ان میں سے حق کے طالب کی آنکھیں کھولنے کے لیے ایک دلیل بن سکے گا کہ اگر حسین رضی اللہ عنہ غیب دان ہوتے تو کوفہ کا رخ نہ کرتے۔ اگر وہ حاجت روا اور مشکل کشا ہوتے تو اس طرح مظلومانہ حالت میں شہید نہ کر دیے جاتے بلکہ ان کے ایک اشارے سے تمام معاملات حل ہو جاتے۔

❷ یہ واقعہ انسان کو ہر حال میں صبر اور راضی بتقدیر رہنے کا عجیب درس دیتا ہے۔ اللہ نہ کرے کوئی سخت حادثہ پیش آئے، ناکامی بار بار دامن گیر ہو، قرض ناقابلِ برداشت ہو جائے، گھربار کو آگ لگ جائے، اپنے پیارے قتل ہو جائیں، بیماری لاچار کر دے، کچھ بھی ہو تو سوچ لیں کہ اللہ کی آزمائش ہے۔ اس کے امر کے سامنے حسین رضی اللہ عنہ جیسے عالی مرتبہ انسان کو قتل ہونا پڑا، تو ہم کیا چیز ہیں۔

❸ سیاسی معاملات اور امور کئی کئی پہلو اور درجنوں احتمالات رکھتے ہیں۔ بندہ شرعی حدود میں رہے تب بھی انتظامی لغزش کا احتمال ہوتا ہے۔ اَن گنت لوگوں کے حقوق کے لیے بندہ جواب دہ رہتا ہے۔ قدم قدم پر غلطی اور اللہ کے ہاں مواخذے کا خطرہ رہتا ہے۔ بہت کم حکمران ایسے ہوتے ہیں جو اپنا دامن بچا پاتے ہیں۔ بدنامی کا خوف الگ رہتا ہے۔ حاکم صحیح نیت سے صحیح رخ پر کام کرے تب بھی بعض اوقات عوام حکمران کی تدبیر ومصلحت نہیں سمجھ پاتے اور اسے بدنام کر کے چھوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ سادات ہمیشہ معزز ومحبوب، تاقیامت نیک نام اور سدا نیک شہرت رہیں۔ اس لیے حکمتِ الٰہیہ نے اس حادثے کو رونما کر کے اکثر سادات عالی شان کو سیاستِ زمانہ سے الگ کر دیا۔

❹ اللہ تعالیٰ کو سادات سے امت کی علمی و روحانی تربیت کا کام لینا تھا اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد

بنوفاطمہ کے بعض بزرگوں نے خروج کی کوششیں کیں مگر کوئی تحریک بارآور نہ ہوسکی اور رفتہ رفتہ یہ حضرات سیاسیات سے ہٹ کر پوری طرح علمی وروحانی خدمات میں مشغول ہوگئے جو اللہ کا امر تکوینی تھا۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ارشاد:

یہاں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا ارشاد یاد رکھنے کے قابل ہے:

''بنوہاشم ہی کے ذریعے اس دین کا آغاز ہوا تھا اور بنوہاشم ہی کی حکومت پر اس کا اختتام ہوگا۔ (جیسا کہ احادیث میں ظہورِ مہدی کو قربِ قیامت کی علامت بتایا گیا ہے) پس جب تم دیکھو کہ کوئی ہاشمی برسرِ اقتدار آگیا تو سمجھو کہ وقت کا اختتام ہے۔''[1]

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا کلمۂ حق اور یزید کی طرف سے روک ٹوک:

بیشتر صحابہ کے نزدیک موجودہ حالات میں بہتر صورت یہی تھی کہ کوئی سیاسی انقلاب لانے کی بجائے حق بات بیان کرنے پر اکتفا کیا جائے اور لوگوں کو احادیثِ نبویہ کی روشنی میں سچائی سے آگاہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کیا ہیں۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی انہی صحابہ میں شامل تھے۔

وہ شام میں رہائش پذیر تھے۔ اپنے محلے کی مسجد میں درسِ حدیث دیتے تھے اور اسی ضمن میں اعلائے کلمۂ حق کرتے ہوئے حکمرانوں کی بُرائیوں پر چوٹ بھی کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے:

''قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ بُرے لوگوں کو ترقی دی جائے گی، نیک لوگ پست کردیے جائیں گے۔''[2]

یزید کی طرف سے ان پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی اور انہیں حدیث سنانے سے روک ٹوک کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایک بار حدیث سنا رہے تھے کہ یزید کا سپاہی آکر سر پر کھڑا ہوگیا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے طلبۂ حدیث سے مخاطب ہوکر کہا: ''دیکھو! یہ اسی لیے آیا ہے تاکہ مجھے احادیثِ رسول سنانے سے روک دے۔''[3]

☆☆☆

---

① تاریخ دمشق: ۲۰۳/۱۳ بسند صحیح ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۷/۱۱
یہاں اقتدار سے مراد اُمت کی عمومی سیادت اور متفقہ خلافت ہے جو پورے عالمِ اسلام کو حاوی ہو۔ ورنہ الگ الگ علاقوں پر بنوہاشم کی حکومت مختلف زمانوں میں رہی ہے۔ بغداد کے عباسی خلفاء بھی ہاشمی تھے۔ اسی طرح افریقہ کی دولتِ ادریسیہ کے مسندنشین فاطمی النسل ہاشمی تھے۔ یمن میں گزشتہ صدی تک بنوہاشم کی حکومت کسی نہ کسی انداز میں رہی ہے۔

② سنن الدارمی، عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی السمرقندی م۲۵۵ھ، ح: ۴۹۳، ط دار المغنی،
قال المحقق حسین سلیم اسد: اسنادہ جید.

③ عن عبداللّٰہ بن ابی الھذیل ،حدثنی شیخ ،قال دخلت مسجداً بالشام ،فصلیت رکعتین ثم جلست ،فجاء شیخ یصلی الی الساریۃ ، فلما انصرف ثاب الناس الیہ فسألتہ من ھذا؟فقالوا: عبداللّٰہ بن عمرو ،فاتی رسول یزید بن معاویۃ فقال ان ھذا یرید ان یمنعنی ان أحدثکم . وان نبیکم ﷺ قال: اللّٰھم انی اعوذ بک من نفس لا تشبع، و قلب لا یخشع، ومن علم لا ینفع و من دعاء لا یسمع.
(مسند احمد، ح: ۶۲۶۱، ۶۲۶۵)

دورِ یزید کی مہمات

سانحۂ کربلا نے یزید کے دور کو اس طرح داغ دار کیا کہ اس کے زمانے کی دیگر مہمات پس منظر میں چلی گئیں۔ حالاں کہ اس دور میں بھی افریقہ، خراسان اور ترکستان میں مہمات کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں مرکزی عہدوں پر اکثر وہی جرنیل تھے جو حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور سے چلے آرہے تھے۔ ان میں مَسلمہ بن مُخَلَّد رضی اللہ عنہ، جُنادہ بن امیہ رضی اللہ عنہ، منذر بن جارود، سِنان بن سلمہ، عُقبہ بن نافع، زہیر بن القیس اور ابوالمہاجر دینار رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔ اندرونی مہمات میں سرکاری افواج نے جو زیادتیاں کیں وہ اپنی جگہ قابلِ مذمت ہیں مگر بیرونی محاذوں پر بعض پسپائیوں کے ساتھ بعض کامیابیاں بھی ہوئیں۔ ذیل میں ان واقعات کا ذکر کیا جارہا ہے۔

یورپ پر یلغار ملتوی:

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو وصیت کی تھی کہ رومیوں کا گلا گھونٹ کر رکھو[1] مگر یزید نے اپنی عسکری حکمتِ عملی میں رومیوں کے خلاف جہاد کو مؤخر کر دیا۔ اس نے خلیفہ بن کر اپنے پہلے خطاب میں کہا تھا:

''مُعاویہ رضی اللہ عنہ تمہیں سمندری مہمات کے لیے بھیجا کرتے تھے، میں نہیں بھیجوں گا۔ وہ موسم سرما میں بھی روم کی سرحدوں پر لشکر تعینات رکھتے تھے، میں موسم سرما میں کسی کو وہاں تعینات نہیں کروں گا۔''[2]

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے یونان کے جزیرے روڈس پر جُنادہ بن امیہ رضی اللہ عنہ مجاہدین کو لے کر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ یہ جزیرہ ۵۳ھ میں فتح کیا گیا تھا۔ مسلمان یہاں ایک بہت بڑے قلعے میں مورچہ بند رہتے تھے۔ وہ سمندر میں کارروائیاں کر کے یورپی بحری افواج کو زک پہنچاتے، ان کی نقل وحرکت اور منصوبہ بندیوں سے آگاہ رہتے اور کمک ورسد لوٹتے۔

روڈس میں آباد مسلمان بڑے زرعی رقبوں اور مال و جائیداد کے مالک بھی ہو گئے تھے۔ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس مورچے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان مجاہدین پر خطیر رقوم خرچ کرتے تھے، انہیں خوراک، لباس، اسلحے اور نقد پیسے سمیت ہر چیز بھیجا کرتے تھے۔[3] امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری ایام میں انہیں حکم بھیجا تھا کہ موسم سرما بھی وہیں گزاریں اور اس کے انتظامات کر لیے جائیں۔ ایسے میں کسی کو توقع نہیں تھی کہ واپسی کا سفر ہوگا۔

---

① تاريخ خليفة بن خياط، ص ۲۳۰

② البداية و النهاية: ۲۶۰/۱۱ ، سير اعلام النبلاء: ۳۷/۴ بسند حسن، ط الرسالة

③ البداية والنهاية: ۲۵۹/۱۱

کعب احبار رحمہ اللہ کے سوتیلے بیٹے تُبَیع بن عامر اس لشکر میں تھے، ان کا کہنا تھا کہ موسم سرما سے پہلے واپسی ہو جائے گی مگر کسی کو ان کی بات کا یقین نہیں تھا۔ ایک دن ایک کشتی جزیرے سے آ گئی۔ آنے والا یزید کا نمائندہ تھا۔ اس نے بتایا کہ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ وفات پا گئے ہیں۔ نمائندے نے نئے خلیفہ کی بیعت لی اور اطلاع دی کہ خلیفہ نے افواج کو واپسی کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ مسلمان روڈس خالی کر کے واپس چلے آئے۔[1]

بحیرۂ روم میں رومیوں سے مقابلے کے لیے دوسرا اہم ترین مرکز جزیرۂ قُبرُص تھا جو وسعت اور آبادی میں روڈس سے بڑھ کر تھا۔ وہاں مسلمانوں کی گنجان آبادی بھی تھی۔ اسے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ۳۳ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں فتح کیا تھا مگر یزید نے خلیفہ بنتے ہی یہ جزیرہ بھی خالی کرا دیا۔[2]

مؤرخین نے روڈس اور قُبرُص سے افواج واپس بلانے کی وجوہ بیان نہیں کیں۔ ممکنہ طور پر دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

① یزید کی خلافت متنازعہ تھی، لوگ دلی طور پر مطمئن نہیں تھے، عراق و حجاز قابو سے باہر تھے، ایسے میں انعقادِ خلافت طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اندرونی علاقوں میں اضافی فوج درکار تھی تاکہ مخالفین پر قابو پایا جا سکے۔

② یزید فوج سے مشقت کم کر کے افسران و سپاہ کا دل جیتنا چاہتا تھا۔

افریقہ میں عُقبہ بن نافع کی فتوحات:

یزید کے دور میں مشہور تابعی عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ افریقہ میں تعینات رہے۔ افریقی قبائل بڑے سرکش اور دغاباز تھے۔ بار بار بغاوت کرتے تھے۔ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عُقبہ رحمہ اللہ نے افریقہ کا بیشتر حصہ فتح کر لیا تھا۔ مصر اور افریقہ اس زمانے میں ایک ہی صوبہ شمار ہوتے تھے۔ افریقہ کی مہمات کا مرکز مصر تھا جہاں امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ گورنر تھے اور عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ انہی کے ماتحت کے طور پر جہاد کر رہے تھے۔

۵۵ھ میں امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر میں مُعاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کی جگہ مَسلَمہ بن مُخَلَّد رضی اللہ عنہ کا تقرر کر دیا، جنہیں اپنے آزاد کردہ غلام ابو مہاجر دینار رحمہ اللہ پر زیادہ اعتماد تھا۔ اس لیے عقبہ بن نافع رحمہ اللہ کی جگہ افریقہ کا محاذ ابو مہاجر رحمہ اللہ کے سپرد کر دیا گیا۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ جو مزید آگے بڑھنا چاہتے تھے، اس فرمان کے تحت محاذ سے واپس چلے آئے۔

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک افریقہ کا علاقہ ابو مہاجر رحمہ اللہ ہی کے تحت رہا۔ اس دوران بربر قبائل کی بغاوت سے کئی مفتوحہ علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ جب یزید نے حکومت سنبھالی تو عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کے سابقہ کارناموں کو

---

① المعرفة والتاريخ: ۳/۳۲۲، ط الرسالة

② فتوح البلدان، ص ۱۵۴، ط الهلال

روڈس اور قُبرُص سے انخلاء کا فیصلہ سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ یہ انتہائی اہم عسکری مقام تھے۔ اہلِ قُبرُص سے تو ایک معاہدے کے تحت مصالحانہ تعلقات رہے مگر روڈس سے مسلمانوں کے نکلتے ہی یونانیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک ہزار سال تک مختلف مسلم حکمران اس پر قبضے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں عثمانی ترکوں نے اسے فتح کیا مگر دو صدیوں بعد یونانیوں نے پھر اسے چھین لیا۔ اگر یزید اپنے والد گرامی کی حکمتِ عملی کے مطابق اس محاذ کو اہمیت دیتا اور یہاں سے انخلاء نہ کراتا تو پہلی صدی ہجری میں ہی یہ علاقہ مسلم ملک بن گیا ہوتا اور اسے "بیس کیمپ" بنا کر یورپ کی فتح مسلمانوں کے لیے آسان ہو جاتی۔

دیکھتے ہوئے ۶۲ھ میں انہیں براہ راست افریقہ کا والی بنا دیا اور مزید فتوحات کی اجازت دے کر روانہ کیا۔

جب وہ یزید کی طرف سے افریقہ میں دوبارہ تقرری کا حکم نامہ لے کر روانہ ہوئے تو مصر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، وہ بولے: ''امید ہے کہ آپ ایسے لشکر میں ہیں جس کے لیے جنت کی توقع ہے۔''[1]

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے مرکز قیروان کو جو بے توجہی کی وجہ سے ویران پڑ گیا تھا، دوبارہ آباد کیا۔ اس کے گرد چکر لگا کر دعا کی: ''الٰہی! اسے عبادت گزاروں اور اطاعت شعاروں سے بھر دے اور اسے اپنے دین کی عزت اور کافروں کی ذلت کا ذریعہ بنا۔''

پھر فوج کا ایک حصہ یہاں تعینات کر کے زہیر بن قیس کو ذمہ دار بنایا اور اولاد کو جمع کر کے کہا:

''میں نے اپنی جان اللہ کو بیچ دی ہے، میں نے قسم کھائی ہے کہ اب مرتے دم تک جہاد کرتا رہوں گا۔ معلوم نہیں اب پھر ملاقات ہو کہ نہیں۔''[2] یہ عزم اس لیے کیا کہ بربروں کی سرکشی ٹوٹنے میں نہ آتی تھی۔

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے اولاد کو آخری وصیت کے طور پر کہا: ''حدیث رسول ﷺ صرف ثقہ راویوں سے لینا۔ قرض مت لینا چاہے بوسیدہ کپڑے پہننا پڑیں۔ ایسی کوئی چیز لکھنے میں منہمک نہ ہونا جو قرآن مجید سے غافل کر دے۔''[3]

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے پہلے قلعہ لمیس پھر ''کوہ'' اور اس کے بعد شہر ''باغانہ'' کو فتح کیا۔ پھر ''بلاد الجرید'' کے علاقے پر قبضہ کرتے ہوئے ''زاب'' تک یلغار کی اور دشمنوں کو کچلتے ہوئے ''تاہرت'' تک جا پہنچے جہاں رومیوں اور افریقی بربروں کا لشکر جرار اکٹھا ہو چکا تھا۔ یہاں مجاہدین اسلام اور کفار کے مابین گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان ابتدا میں شکست کے قریب ہو گئے مگر آخر میں نصرت الٰہی شامل حال ہوئی، مسلمان فتح سے ہم کنار ہوئے اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس مہم جوئی کے دوران ''غمارہ'' کے عیسائی حاکم نے صلح کر لی۔

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ یہاں سے مراکش کے مشہور شہر طنجہ پہنچے جو بحیرۂ روم کے کنارے شمالی افریقہ کا آخری شہر اور مقامی بادشاہ یلیان کا پایۂ تخت تھا۔ مراکش کے تمام حاکم اس کو خراج دیتے تھے۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے محاصرے کے بعد صلح کے ساتھ یہاں قبضہ کر لیا۔ یلیان نے انہیں بیش قیمت تحائف دیے۔

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ اب خلیج عبور کر کے اندلس میں داخل ہونا چاہتے تھے اور پہلا حملہ ''جزیرۃ الخضراء'' پر کرنے کا منصوبہ طے کر چکے تھے کہ یلیان نے کہا: ''پس پشت بربر اور دوسرے دشمنوں کے ہوتے ہوئے سمندر عبور کر کے فرنگیوں سے جا ٹکرانا مناسب نہیں اس طرح کمک کا راستہ بند ہو سکتا ہے۔''

عُقبہ رحمہ اللہ نے پوچھا: ''یہاں اور کون سے کفار قبیلے ہیں؟'' یلیان نے کہا: ''سوس کے علاقے میں طاقت ور قبائل موجود ہیں جن کا کوئی دین نہیں۔ حیوانوں کی طرح ہیں۔ ان کے عقیدے مجوسیوں جیسے ہیں۔ وہ اللہ کو نہیں مانتے۔''

---

[1] مختصر تاریخ دمشق: ۱۱۱/۱۷، ۱۱۲ — غالباً اس فقرے میں اشارہ تھا کہ آپ کو شہادت کا مرتبہ ملے گا۔
[2] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲۳/۱ — [3] مختصر تاریخ دمشق: ۱۱۱/۱۷

عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ یہ سن کر واپس مڑ گئے۔ سوس کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ یہاں کوہِ زرہون کے پاس دو دریاؤں: ''سبو'' اور ''درعہ'' کے درمیان مراکش کا سب سے بڑا شہر ''ولیلی'' تھا جسے آج کل ''قصر فرعون'' کہا جاتا ہے۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے خون ریز جنگ کے بعد اسے بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد ''درعہ'' اور ''سوس'' کی طرف یلغار کی جہاں بربروں کی بے پناہ طاقت سے پالا پڑا۔ گھمسان کی جنگوں اور جان توڑ لڑائیوں کے بعد عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے ان کی قوت پاش پاش کر کے انہیں پسپا کر دیا۔ مسلمان تعاقب کے دوران ان کی لاشوں کے ڈھیر لگاتے چلے گئے اور بڑھتے بڑھتے صحرائے لِتونہ تک پہنچ گئے۔ راستے میں آنے والی مزاحمت کی ہر دیوار گرتی چلی گئی۔ عُقبہ رحمہ اللہ، افریقہ کے مغربی کنارے ''آسفی'' (مالیان) میں بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گئے جہاں سمندر کی سرکش موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے جانبازوں سمیت پانی میں گھس گئے۔ کچھ دیر بعد پلٹ کر ساتھیوں سے کہا: ''دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔'' سب دست بدعا ہوئے تو اس مستجاب الدعوات مجاہد نے والہانہ انداز میں کہا:

''الٰہی! اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو جہاں تک زمین ملتی جہاد کرتا چلا جاتا۔ یا اللہ! تو جانتا ہے ہم کسی غرور و سرکشی کی بناء پر یہاں تک نہیں آئے۔ ہم اسی مقصد کے لیے نکلے ہیں جو تیرے بندے ذوالقرنین کو مطلوب تھا کہ صرف تیری عبادت کی جائے اور تیرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ یا اللہ! ہم کفر کے مخالف اور اسلام کے محافظ ہیں۔ پس تو ہمارا حامی بن جا، ہمارے خلاف نہ ہو۔''

یہ دعا کرتے ہوئے عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ واپس ہوئے۔[1] غالباً اسی منظر سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے کہا:

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

واپسی کے سفر میں عُقبہ کا گزر ایک لق و دق صحرا سے ہوا، مسلمان پانی کی شدید قلت کا شکار ہو گئے تھے۔ قریب تھا کہ ساری فوج ہلاک ہو جاتی۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے دو رکعت نماز ادا کر کے اللہ سے پانی ملنے کی دعا کی۔ اچانک ان کے گھوڑے نے ایک جگہ جا کر اپنے سموں سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ عُقبہ رحمہ اللہ نے پکار کر سب کو جمع کیا، مجاہدین نے پانی پیا اور مشکیں بھر لیں۔ یہ جگہ آج بھی ''ماء الفرس'' (گھوڑے کا چشمہ) کے نام سے مشہور ہے۔[2]

چوں کہ اب مصر سے مراکش تک تمام شمالی افریقہ فتح ہو چکا تھا اس لیے بظاہر خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس لیے قیر وان سے آٹھ منازل دور ''طبنہ'' تک آ کر عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے افواج کو آگے روانہ کر دیا اور خود تھوڑے سے سپاہیوں اور خواص کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ اس دوران کُسیلہ نامی ایک نصرانی سردار نے جو عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کے ساتھ تابع دار بن کر چل رہا تھا، غداری کر دی اور مقامی لوگوں کو ملا کر اچانک حملہ کر دیا۔ بچ کر نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ

① الکامل فی التاریخ، سن ۶۲ھ، الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱/۱۳۸ ② الکامل فی التاریخ: ۶۲ھ، آثار البلاد و اخبار العباد، ص ۵۹

کے ساتھ ابومہاجر رحمہ اللہ زیرِ حراست چلے آرہے تھے؛ کیوں کہ عُقبہ کو اپنے پیچھے ان کی کارکردگی سے شکایت تھی مگر اس موقع پر عُقبہ رحمہ اللہ نے انہیں آزاد کر کے کہا: ''آپ یہاں سے نکل جائیں اور مسلمانوں کے پاس (قَیرَوان) جا کر ان کی قیادت سنبھالیے۔ میں شہید ہونے تک لڑوں گا۔'' ابومہاجر رحمہ اللہ بولے: ''مجھے بھی شہادت مطلوب ہے۔''

دونوں تلواروں کی میانیں توڑ کر آگے بڑھے اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ آخر کار لڑتے لڑتے دونوں نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کے ساتھ شہید ہونے والوں میں تین سو کے لگ بھگ جلیل القدر تابعین شامل تھے۔ [1]

دو صحابہ کرام محمد بن اوس الانصاری، یزید بن خلف عبسی رضی اللہ عنہما اور چند افراد گرفتار ہوگئے۔ مسلمانوں نے فدیہ دے کر انہیں بعد میں آزاد کرایا۔ یہ تمام واقعات ۶۲ھ اور ۶۳ھ کے ہیں۔ [2]

افریقہ میں بغاوت:

۶۳ھ کے اواخر میں ایک طرف یزید کا سپہ سالار مسلم بن عُقبہ مدینہ پر لشکر کشی کر رہا تھا اور دوسری طرف افریقہ میں ایک بار پھر بغاوت کی آگ پھیل رہی تھی۔ عُقبہ بن نافع کو شہید کرنے والے نصرانی سردار کُسَیلہ نے مقامی بربر قبائل کو جمع کر کے بہت سے اسلامی مقبوضات چھین لیے اور بڑھتے بڑھتے قَیرَوان تک آن پہنچا۔ یہاں کے امیر زُہَیر بن قیس کو کمک نہ مل سکی اور وہ شہر خالی کر کے ''بَرقہ'' چلے گئے۔ یوں محرم ۶۴ھ میں قَیرَوان نصرانیوں کے قبضے میں آگیا۔ [3]

خراسان اور وسط ایشیا کی مہمات:

مشرق کے محاذوں پر بھی فوجی مہمات جاری رہیں۔ معمول یہ تھا کہ موسم گرما میں اسلامی افواج دریائے آمو عبور کر کے مہمات پر جاتیں اور موسم سرما میں واپس آکر ''مَرْو'' میں قیام کرتیں۔ اس دوران خوارزم کے ایک نواحی شہر میں مقامی سردار جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو جاتے۔

ان کا زور توڑنے کے لیے ۶۲ھ میں مسلم بن زیاد نے، جسے یزید نے ۶۱ھ میں خراسان وسجستان کا والی مقرر کیا تھا، موسم سرما میں عرب کے چیدہ جرنیلوں کو ساتھ لے کر یلغار کی۔ اس چھ ہزار کے لشکر میں عمران بن فضیل، مُہَلَّب بن ابی صُفرہ، عبداللہ بن خازم، طلحہ بن عبداللہ الخزاعی، صِلہ بن اَشیم، حنظلہ بن عَرادہ اور یحییٰ بن یَعمر جیسے حضرات شامل تھے۔ اسلامی لشکر نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا جہاں مقامی سردار سازشوں کے لیے جمع تھے۔ انہوں نے گھبرا کر معافی مانگی اور ۵۰ کروڑ تک کے اموال دے کر جان بخشی کرائی۔ اس کے بعد مسلم بن زیاد نے غداری کی سزا دینے کے لیے سمرقند پر حملہ کیا۔ مقامی لوگوں نے یہاں بھی صلح کر لی۔ مسلم نے ایک لشکر خُجَندَہ کی طرف روانہ کیا جس نے دشمنوں کو شکست فاش دی۔ مسلم بن زیاد نے اپنے بھائی یزید بن زیاد کو وسطی وجنوبی افغانستان کا والی بنا دیا تھا۔ ۶۲ھ میں یہاں اہل کابل نے بغاوت کر دی اور ابوعبیدہ بن زیاد کو گرفتار کر لیا۔ یہ خبر ملتے ہی یزید بن زیاد لشکر لے کر کابل پہنچا مگر اسے شکست ہوئی۔

---

[1] الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱/۱۳۵ تا ۱۳۹؛ الکامل فی التاریخ، سن ۶۲ھ

[2] الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱/۱۳۹ [3] الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱/۱۴۰

مسلمان بڑی تعداد میں شہید ہوئے جن میں خود یزید بن زیاد، عُمر و بن قتیبہ، بُدَیل بن نعیم، عثمان بن آدم، یزید بن عبداللہ بن ابی ملیکہ اور صِلہ بن اَشیَم بھی شامل تھے۔ جب اس حادثے کی اطلاع مسلم بن زیاد کو ملی تو طلحہ بن عبداللہ کو جو طلحۃ الطلحات کے لقب سے مشہور تھے، کابل بھیجا۔ انہوں نے پانچ لاکھ درہم دے کر ابوعبیدہ بن زیاد کو آزاد کرالیا۔ ①

۶۲ھ میں عبداللہ بن اسد بن کرز نے قیساریہ کی سمت جہاد کیا۔ اسی سال موسم گرما کے جہاد میں حُصَین بن نُمَیر نے سوریا پر چڑھائی کی۔ اسی سال عبیداللہ بن زیاد نے مُنذِر بن جارُود کو قَندابیل کے محاذ پر تعینات کیا۔ منذر اس مہم میں فوت ہوگئے، ان کے بیٹے نے مہم جاری رکھی اور قَندابیل پر قبضہ کرلیا۔ عبیداللہ بن زیاد نے اس کے بعد سِنان بن سلمہ کو موقان کی مہم پر روانہ کیا۔ کچھ مدت بعد یزید بن مُعاویہ نے اس محاذ پر عبدالرحمٰن بن یزید ہلالی کو تعینات کر دیا۔ ②

مجموعی طور پر یزید کے دور اسلامی خلافت کا رقبہ کم ہوا، کیونکہ روڈس اور قبرص از خود خالی کر دیے گئے تھے جبکہ عُقبہ بن نافع نے جو علاقے فتح کیے تھے، وہ یزید کے آخری ایام میں دشمن نے واپس لے لیے تھے۔

ایک قابلِ غور نکتہ:

بعض حضرات کے خیال میں ان مُہمات کا سہرا یزید کے سر باندھنا درست نہیں، کیوں کہ یہ مہمات عُقبہ بن نافع جیسے بہادر امراء کی ذاتی قابلیتوں کا نتیجہ تھیں مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ دور دراز کے محاذوں کے جرنیل بھی بہرحال مرکز سے ہدایات اور مصارف لیتے تھے اور امراء کی تعیناتی اور مہم کی منظوری بھی خلیفہ کی جانب سے ہوتی تھی، اس لیے ان مہمات میں یزید کا حصہ ضرور ہے مگر اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سانحۂ کربلا سے لے کر وقعۂ حرہ تک ملک میں فوج کے ہاتھوں جو فساد ہوا، اس بارے میں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ امرائے فوج کی ذاتی سیاہ کاریاں تھیں اور یزید پر اس کا کوئی الزام نہیں۔ اگر جہاد، مہمات اور فتوحات کا خراجِ تحسین صرف افواج کو دینا اور سربراہِ حکومت کو لاتعلق سمجھنا خلافِ عقل ہے تو انہی افواج کے ہاتھوں برپا ہونے والے مظالم سے حکمران کو بالکل بری الذمہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔

تعمیری و ترقیاتی کام:

یزید کو حساب اور تعمیرات سے دلچسپی تھی۔ اس نے کچھ ترقیاتی کام بھی کرائے۔ جبلِ قاسیون کی وادی میں ایک چھوٹی سی نہر تھی جس سے کچھ اراضی سیراب ہوتی تھی۔ یزید نے وسعت دے کر اسے ساڑھے چار فٹ چوڑا اور ساڑھے چار فٹ گہرا کرادیا جس سے غوطہ کا وسیع علاقہ قابلِ کاشت ہوگیا۔ یہ نہر ''نہرِ یزید'' کہلانے لگی۔ ③

---

① الکامل فی التاریخ، سن ۶۱ھ ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۶ ② تاریخ خلیفۃ ص ۲۳۵، ۲۳۶ ؛ الکامل فی التاریخ، ۶۱ھ

③ تاریخ دمشق: ۳۶۹/۲ ، الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرۃ لابن شداد، القسم الثانی، الباب الاول

نوٹ: کہا جاتا ہے کہ یزید نے سب سے پہلے کعبہ کو ریشمی غلاف پہنایا۔ (تاریخ الخلفاء، ص۱۵۹) مگر یہ واقدی سے منقول ہے اور خلافِ تحقیق ہے۔ اصح مافی الباب روایت کے مطابق کعبہ کو سب سے پہلے ریشمی غلاف حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے پہنایا تھا۔ اسے امام عبدالرزاق صنعانی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔ (مصنف عبدالرزاق، ح:۹۰۸۷) اس طرح حافظ ذہبی لکھتے ہیں: عن ھشام بن عروۃ، قال اول من کسا الکعبۃ الدیباج عبداللہ بن الزبیر. (تاریخ الاسلام: ۲۴۳/۵ ت تدمری) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کارنامہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ (اخبار مکۃ للازرقی: ۲۵۳/۱) یہ بحث ریشمی غلاف پہنانے سے متعلق ہے ورنہ غلاف پہنانے کا رواج زمانہ جاہلیت میں بھی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین بھی اس پر عمل پیرا رہے۔ (اخبار مکۃ للازرقی: ۲۵۳/۱)

اہلِ مدینہ کا یزید کے خلاف خروج

سانحۂ کربلا کے بعد عالمِ اسلام میں پھیلنے والی بے چینی کی لہر کا زیادہ زور حجاز میں تھا جہاں ایک طرف مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے معرکہ آزما قائد اب تک یزید کی بیعت سے کنارہ کش تھے اور دوسری طرف اہلِ مدینہ جو خانوادۂ رسول کے عاشق تھے، اس حادثے پر سکتے کے عالم میں تھے۔ ان لوگوں نے شروع ہی سے یزید کی خلافت کو دلی رغبت سے قبول نہیں کیا تھا۔ اور اب حادثۂ کربلا نے ان کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ دیا تھا۔

اگرچہ یزید نے حادثۂ کربلا سے بچ جانے والے سادات سے اچھا سلوک کیا تھا اور خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے جانشین علی بن حسین زین العابدین رحمہ اللہ کی بڑی عزت کی تھی مگر اہلِ مدینہ قاتلینِ حسین کے بارے میں یزید کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنے پر مجبور تھے کہ حکمران اس ظلم کے پشت پناہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اہل مدینہ خانوادۂ رسول کے بارے میں حکام سے اندیشہ محسوس کرتے تھے، اسی لیے مِسْوَر بن مَخْرَمہ رضی اللہ عنہ نے علی بن حسین رحمہ اللہ سے کہا تھا:

''آپ کو میری کسی کام میں بھی ضرورت ہو تو فرمائیے۔'' وہ بولے: ''ایسی کوئی ضرورت نہیں۔''

مِسْوَر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار مجھے (امانتاً) دے دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ (حکمران) لوگ اسے آپ سے چھین لیں گے۔ آپ مجھے دے دیں تو واللہ! جب تک میری جان باقی ہے کوئی اس تلوار تک نہیں پہنچ سکتا۔''[1]

اکابرِ مدینہ کا وفد یزید کے پاس:

محرم ۶۱ھ میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔ سادات کا قافلہ یزید کے پاس پہنچا۔ اس نے انہیں عزت واحترام سے مدینہ بھیج دیا۔ اس کے بعد ۶۱ھ کے بقیہ ایام اور ۶۲ھ کا پورا سال پُر امن گزرے۔ اس دوران کہیں کوئی شورش نہ تھی۔ افریقہ، خراسان اور بلوچستان کے محاذوں پر اموی جرنیلوں کی مہمات جاری رہیں۔ یزید کی طرف سے بعض گورنروں کے تبادلے بھی ہوئے اور مکہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ساتھ ملانے یا ان پر قابو پانے کی بھی کوشش کی گئی۔[2]

اس کے ساتھ یزید سانحۂ کربلا سے اپنی متاثر شدہ ساکھ بحال کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ اسی لیے اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو جو سیاسی معاملات سے بالکل کنارہ کش تھے، شام آنے کی دعوت دی۔ ان کے بیٹے عبداللہ کو خدشہ تھا کہ یزید ان پر غلط اثر ڈالے گا اس لیے اس نے انہیں جانے سے منع کیا مگر وہ چلے گئے۔ یزید نے ان کا اعزاز واکرام کیا، انہیں متاثر کرنے کے لیے کبھی ان سے فقہ اور کبھی قرآن کے مسائل پوچھتا رہا۔[3]

① صحیح مسلم، ح: ۶۴۶۲، فضائل الصحابۃ، باب فضائل فاطمۃ رضی اللہ عنہا
② تفصیل آگے آئے گی۔ ③ انساب الاشراف: ۲۷۷/۳، ۲۷۸، ط دارالفکر

سانحۂ کربلا کے تقریباً دو سال بعد ۶۳ھ کے آغاز میں یزید نے مدینہ کے گورنر عثمان بن محمد کو حکم دیا کہ وہ مقامی شرفاء اور عمائد کا ایک وفد شام بھیج دے۔[1] حکم پر عمل ہوا اور اہلِ مدینہ کے کئی بزرگ شام پہنچ کر یزید کے مہمان بنے۔ ان میں عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ، مَعقِل بن سِنان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عَمرو بن حزم، مُنذِر بن زبیر (بن عوام)، عباس بن سہل (بن سعد) اور عثمان بن عطاء رحمہم اللہ نمایاں تھے۔ یزید دس دن تک ملنے نہ آیا۔ جب ملاقات ہوئی تو اس نے وقت دینے میں تاخیر کا عذر بیان کرتے ہوئے اپنی بیماری کا ذکر کیا اور کہا:

''پاؤں میں مسلسل درد ہے۔ مکھی بھی بیٹھ جائے تو پہاڑ محسوس ہوتا ہے۔''

اس کے بعد یزید نے ان حضرات کی بڑی خاطر مدارات کی اور عطایا و ہدایا دے کر رخصت کیا۔[2]

یزید نے عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک لاکھ درہم پیش کیے۔ ان کے آٹھ بیٹوں کو دس دس ہزار درہم کا عطیہ دیا۔[3] منذر بن زبیر بن عوام کو ایک لاکھ درہم کا ہدیہ پیش کیا۔[4] وفد کے باقی ارکان میں سے بھی جس نے جو مانگا یزید نے فوراً دے دیا۔[5]

اس اعزاز و اکرام کے باوجود شام کے دورے کے بعد مدینہ کے اکابر یزید سے سخت متنفر ہو کر واپس آئے اور آتے ہی یزید کے خلاف خروج کا اعلان کر دیا۔ یہ حضرات شام سے یہ معلومات لے کر واپس آئے تھے کہ یزید نماز ترک کرنے اور مے نوشی جیسے بعض کبیرہ گناہوں میں ملوث ہے۔[6]

ان حضرات کا یہ موقف جن روایات کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، وہ سنداً ضعیف ہونے کے باعث محلِ نظر ہو سکتی ہیں تاہم یہ حقیقت صحیح روایات اور تواتر سے ثابت ہے کہ ان حضرات نے یزید کے خلاف خروج کیا اور اس کی حکومت گرانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ خروج کرنے والے صحابہ اور تابعین کے نزدیک یزید کا بعض کبیرہ گناہوں میں ملوث ہونا یقینی تھا۔[7]

اہلِ مدینہ نے خروج کیوں کیا اور اُمت کی اکثریت اس میں کیوں شریک نہ ہوئی؟

مدینہ کے ان صحابہ اور تابعین کے نزدیک فاسق کی حکمرانی قبول کرنا جائز نہ تھا بلکہ اس کے خلاف مسلح جدوجہد ضروری تھی۔ ان کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد تھا: مَنْ رَاٰیٰ مِنْکُمْ مُنْکَراً فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِه.

''تم میں سے جو کوئی کسی گناہ کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ کی طاقت سے روک دے۔''[8]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۶

② تاریخ دمشق: ۲۶/ ۲۵۹ ③ تاریخ خلیفۃ، ص ۲۳۶، ۲۳۷

④ انساب الاشراف: ۵/ ۳۳۰ ؛ تاریخ الطبری: ۵/ ۴۸۰ ⑤ تاریخ دمشق: ۲۶/ ۲۵۹

⑥ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۶/ ۴۷۳ ؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۷ ؛ تاریخ الطبری: ۵/ ۴۸۰ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/ ۶۵۳

⑦ یزید سے حسن ظن رکھنے والوں کا خیال ہے کہ مدنی وفد کے حضرات کسی غلط فہمی یا بنوامیہ کے مخالف گروہ کے پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے تھے مگر ظاہر ہے یزید کے معاصر صحابہ اور تابعین کی ایک عالم فاضل جماعت کے یقین پر چودہ صدیاں بعد والوں کا اپنے ظن کو ترجیح دینا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

⑧ صحیح مسلم، ح: ۱۸۶، کتاب الایمان، باب کون النہی عن المنکر من الایمان ؛ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۱۰۰۹ ؛ سنن ابن ماجہ، ح: ۴۰۱۳

محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو ان الزامات پر یقین نہ تھا؛ کیوں کہ وہ شام جا کر یزید سے ملے تھے تو انہیں اس وقت یزید میں ایسی کوئی قابلِ اعتراض بات دکھائی نہ دی تھی۔ اس لیے جب عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ''یزید شراب پیتا ہے، نماز ترک کرتا ہے۔'' تو محمد بن حنفیہ نے جواب دیا: ''میں نے اس میں یہ باتیں نہیں دیکھیں جو آپ بیان کررہے ہیں، میں اس کے پاس رہا تھا۔ میں نے اسے نماز کا پابند، نیک کاموں کا طلب گار اور شرعی مسائل کا طالب پایا ہے۔''[1]

مگر تنہا محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی یہ صفائی، اس تأثر کو زائل نہ کرسکی جو اکثر اہل مدینہ کا تھا۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ صحابہ اور تابعین کی بڑی تعداد یزید کے خلاف کسی تحریک میں شامل ہونے سے گریزاں رہی۔ ظاہر ہے اس کا سبب کوئی لالچ، خوف یا دباؤ نہ تھا۔ جو لوگ قیصر و کسریٰ سے نہ دبے وہ یزید سے بھلا کیا ڈرتے۔ ان کے خاموش رہنے کی وجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات تھے جن میں حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور بغاوت کرنے سے منع کیا گیا ہے چاہے حکمران نیک و صالح ہوں یا فاسق و فاجر اور ظالم۔[2]

---

① تاریخ الاسلام للذهبی: ۵/۲۷۴ مدائنی عن طریق صخربن جویریة عن نافع ؛ البدایة والنهایة: ۱۱/۶۵۳، والسند ضعیف للانقطاع

② ایسی احادیث کا صحابہ کرام کو یقیناً اچھی طرح علم تھا، اس لیے ان کی اکثریت ہر حکمران کے دور میں بغاوت سے گریزاں رہی۔ دو احادیث یہ ہیں:

عن عوف بن مالک رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: شرار ائمتکم الذین تبغضونهم و یبغضونکم و تلعنونهم و یلعنونکم، قیل یارسول اللہ: افلا ننابذهم بالسیف؟ فقال: لا ما اقاموا فیکم الصلوة، واذا رأیتم من ولاتکم شیئا تکرهونه فاکرهوا عمله ولا تنزعوا یدامن طاعة. (صحیح مسلم: کتاب الامارة، باب خیار الائمة وشرارهم ؛ مسند احمد، ح: ۲۳۹۸۱)

عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہارے بدترین حکمران وہ ہوں گے کہ تم ان سے نفرت کرو اور وہ تم سے، وہ تم پر لعنت کریں اور تم ان پر، عرض کیا گیا: کیا ہم ان سے تلوار لے کر مقابلہ نہ کریں؟ فرمایا: جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم رکھیں ایسا نہ کرنا۔ جب تم اپنے حکمرانوں میں کوئی بری چیز دیکھو تو اس کے عمل کو برا سمجھو مگر ان کی اطاعت سے دست کش مت ہونا۔

عن عبادة بن الصامت قال دعانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناه فکان فیما اخذ علینا ان بایعنا علی السمع والطاعة فی منشطنا ومکرهنا، وعسرنا ویسرنا واثرة علینا، وان لاننازع الامر اهله، قال الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیه برهان. (صحیح البخاری کتاب الفتن، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ستروں بعدی امورا تنکرونها؛ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء)

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا اور ہم نے آپ سے بیعت کی پس جس بات کا آپ نے ہم سے عہد لیا اس میں یہ بھی تھا کہ ہم نے اس بات پر بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے خوشی کی حالت ہو یا ناگواری کی، تنگی ہو یا آسانی اور چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور ہم حکومت کو حکمرانوں سے نہیں چھینیں گے۔ فرمایا سوائے اس کے کہ تم ایسا کھلم کھلا کفر دیکھو کہ اس بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کھلی دلیل ہو۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ ''کفر بواح'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جب تک حکمرانوں کے فعل میں کسی تاویل کی گنجائش ہو، ان کے خلاف خروج جائز نہیں۔ (نیل الاوطار: ۷/۲۰۷ ط دارالحدیث)

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ ''کفرِ بواح'' کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''جس میں دوسرا احتمال نہ ہو، جیسے تم اسے بت کو سجدہ کرتے، اللہ یا رسول کو برا بھلا کہتے دیکھو وغیرہ۔ (شرح الاربعین النوویة، ص ۱۲۲)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''اگر کسی فتنے اور زیادتی کا ارتکاب کیے بغیر ظالم حکمران کو ہٹانا ممکن ہو تو ایسا کرنا واجب ہوگا، بصورتِ دیگر صبر کرنا واجب ہوگا۔ اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ فاسق کو ابتداً حکمران بنانا جائز نہیں لیکن اگر عادل ہونے کے بعد اس سے ظلم صادر ہو تو اس کے خلاف خروج کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے مگر صحیح قول یہ ہے کہ خروج منع ہے سوائے اس کے کہ وہ کفر کرے تو پھر خروج واجب ہو جائے گا۔ (فتح الباری: ۱۳/۸)

یہی حکم جبراً مسلط ہونے والے حکمران کا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جبراً مسلط ہونے والے حکمران کی اطاعت کرنے، اس کی قیادت میں جہاد کے واجب ہونے اور خروج کی جگہ اس کی اطاعت کے خیر ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے؛ کیوں کہ اس میں جانوں کی حفاظت اور جنگ و جدال سے.....

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

خروج کے بارے میں جمہور کا مسلک:

ان ارشاداتِ نبویہ کی بناء پر جمہور امت کا مسلک شروع سے یہ رہا ہے کہ حکمران چاہے فاسق و فاجر ہو مگر جب تک کھلم کھلا کفر کا مرتکب نہ ہو، اس کی بیعت نہ توڑی جائے۔

یزید کا فسق و فجور مشہور ہو جانے سے امت کی تاریخ میں ایسا پہلا موقع آیا جب مسلمانوں کو اس قضیے سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ شاید اس میں بھی اللہ کی تکوینی حکمت تھی کہ اس مسئلے میں عظیم ہستیوں کا طرزِ عمل اسی دور میں سامنے آجائے اور بعد والوں کے لیے تا قیامت رہنمائی کا کام دیتا رہے۔ پس یزید سے بیعت باقی رکھنے یا توڑنے میں صحابہ و تابعین کے دو طبقات بن گئے۔ اکثریت نے ان فرامین نبویہ کو پیشِ نظر رکھا جن میں نماز، جہاد اور معروف میں ہمیشہ امراء کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے، چاہے وہ حکمران اچھے ہوں یا بُرے۔ ان کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک وہ کھلم کھلا کفر کے مرتکب نہ ہونے لگیں۔ ①

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا محتاط موقف:

اس طبقے کے سب سے سرکردہ فرد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے جو علمی و فقہی لحاظ سے بلاشبہ اس وقت پورے عالم اسلام میں سب سے اونچا مرتبہ رکھتے تھے، ان کا طرزِ عمل دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک دلیل تھا، اس لیے اکثریت نے یزید کے فسق و فجور کی شہرت کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر سمجھا۔ ②

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر یزید کے خلاف تحریک کے قائد عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو منع بھی کیا۔ ان کے پاس گئے اور کہا: "میں صرف ایک حدیث سنانے آیا ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے جو شخص (حاکم کی) اطاعت سے دست کشی کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس (اپنے بچاؤ کے لیے) کوئی دلیل نہ ہو گی اور جو اس حال میں مرے کہ اس کی گردن میں (حاکم وقت کی) بیعت (کا پٹا) نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔" ③

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں اور خادموں کو بھی جمع کر کے اس لڑائی سے الگ رہنے کی تلقین کی اور کہا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بچاؤ ہے۔ یہی حدیث ان حضرات کی دلیل ہے۔ فقہاء نے صرف اس صورت کو مستثنیٰ کیا ہے جب حکمران سے کفرِ صریح ظاہر ہو۔ پس اس صورت میں اس کی اطاعت جائز نہیں بلکہ جسے قدرت ہو اسے حکمران سے مقابلہ کرنا واجب ہے۔ **(فتح الباری: ۱۲/۷)**

(حاشیہ صفحہ موجودہ)

① اس حکم میں مضمر مصلحتوں پر علماء نے مفصل بحث کی ہے۔ مثلاً ایک مصلحت فتنہ وفساد سے حفاظت ہے جو حکمران کو تبدیل کرنے کی کوشش کی صورت میں برپا ہو سکتا ہے۔ نیز مسلم معاشرے میں بہت سے معاصی کا ارتکاب عموماً اعلانیہ نہیں ہوتا لہٰذا کسی کا فسق و فجور یقینی شواہد سے معلوم ہونا آسان نہیں ہوتا۔ کسی کی طرف فسق کی نسبت جھوٹ بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ حکام کا مخالف گروہ ہر معاشرے میں ہوتا ہے اس لیے حکام اکثر الزامات کا نشانہ بنا کرتے ہیں۔ یہ الزامات صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ حزبِ اختلاف کے لیے حکمران کی بداعمالیوں کی خبریں مشتہر کر دینا مشکل نہیں ہوتا۔ پس اگر شریعت حکام کے ذاتی فسق و فجور کی شہرت کی وجہ سے خروج کا راستہ کھول دیتی تو ہر حکومت ہر وقت خطرے کی زد میں رہتی اور اسلامی معاشرے میں کسی حکومت کو استحکام نصیب نہ ہوتا۔

② کسی معتبر روایت سے یہ ثابت نہیں کہ یزید نے حرام کو حلال قرار دیا ہو یا شریعت کا انکار کر دیا ہو، اس لیے اس کے ذاتی کردار پر اگر انگلیاں اٹھ بھی رہی تھیں تب بھی یہ کفرِ بواح نہیں تھا۔ لہٰذا جمہور کے نزدیک اس کے خلاف خروج درست نہ تھا۔ اگرچہ خروج کرنے والے صحابہ و تابعین بھی مخلص اور مجتہد تھے، اس لیے ان پر کوئی الزام نہیں۔

③ صحیح مسلم، ح: ۴۸۹۹، کتاب الامارۃ، باب الامر بلزوم الجماعۃ عند ظہور الفتن، ط دار الجیل

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لیے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ ہم نے اس شخص (یزید) کی بیعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کوئی آدمی کسی حاکم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ (کی بیعت) کے طور پر بیعت کرے اور پھر اس کے خلاف لڑنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ تم میں سے کسی نے یزید کی بیعت توڑی اور اس (نئی حکومت کے) معاملے میں بیعت کی تو میرے اور اس کے درمیان اتمام حجت ہو چکا ہے۔''[1]

یہی مسلک جمہور صحابہ کا تھا۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بھی جو اہل مدینہ کے وفد کے ساتھ دِمشق جانے کے بعد یزید ہی کے پاس قیام پذیر ہو گئے تھے، اسی وجہ سے خروج میں شریک نہ ہوئے۔[2]

نعمان بن بشیر، عبداللہ بن مَسعدہ فزاری اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہم بھی اسی وجہ سے حکومتی عہدوں پر رہے۔[3]

اور یہی وجہ تھی کہ مختلف محاذوں پر جہاد میں مشغول درجنوں صحابہ اور سینکڑوں تابعین جو شجاعت، دینی حمیت اور تقویٰ میں مشہور تھے، کسی سیاسی کش مکش کا حصہ بنے بغیر اپنی اپنی مفوضہ مہمات میں مشغول رہے، ان حضرات میں مُنذِر بن جارُود، سِنان بن سلمہ، عبدالرحمن بن یزید ہلالی، صِلہ بن اَشیم، عُمرو بن قتیبہ، ہُذَیل بن نعیم، عثمان بن آدم اور عبداللہ بن اسد رحمہم اللہ جیسے حضرات تھے۔[4]

سکوت کا راستہ اختیار کرنے والے اکثریتی طبقے میں خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے وارث زین العابدین رحمہ اللہ بھی شامل تھے جو مدینہ میں رہتے ہوئے بھی خروج میں نہ شریک ہوئے۔[5]

تاہم مَعقِل بن سِنان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر مدینہ بھی اپنی جگہ دلائل

---

① صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۷۱۱۱، کتاب الفتن، باب اذا قال عند قوم ② تاریخ دِمَشق: ۲۶/۲۵۹، ترجمۃ: عباس بن سہل

③ اسد الغابہ، الاستیعاب، الاصابہ: انظر تراجم: نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعدہ رضی اللہ عنہ

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۶، ۲۵۱ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۴/۳۸۶ تا ۳۹۰، ط الرسالۃ

امکان اس بات کا بھی ہے کہ بہت سے حضرات اس لیے خروج میں شامل نہ ہوئے ہوں کہ یزید کا فسق و فجور ان کے نزدیک ثابت نہ ہو جیسے محمد بن حنفیہ کا یہی خیال تھا تاہم اصل اور یقینی وجہ وہی احادیث ہیں جن میں حکمرانوں کے خلاف خروج سے منع کیا گیا ہے چاہے وہ فاسق اور ظالم ہوں، تاوقتیکہ وہ کفرِ بواح کے مرتکب نہ ہوں۔

شیعیت کی تردید میں منہمک کچھ ''محققین'' کے نزدیک یزید کا عادل اور صالح ہونا، اسلام کے بنیادی عقیدے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک اگر اس کی نفی کر دی جائے تو ان تمام صحابہ کی عدالت کی نفی ہو جائے گی جو یزید کی ولی عہدی کے وقت بھی خاموش رہے اور اس کی حکمرانی کے پورے دور میں انہوں نے خروج میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ ان میں سے بعض حضرات تو دوسروں کو بھی خروج سے منع کرتے رہے۔ یہ ''محققین'' فرماتے ہیں کہ یزید کو فاسق ماننے سے ان تمام حضرات کا بے دین ہونا لازم آ جائے گا۔

یہ دلیل اپنی جگہ نہایت وزنی ہے بشرطیکہ رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کو سامنے سے ہٹا دیا جائے، جن میں فاسق اور ظالم حکمرانوں کی بیعت باقی رکھنے، ان کے پرچم تلے جہاد کرنے اور ان کے خلاف خروج سے گریز کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس جن حضرات کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی یہ احادیث ثابت نہیں ہیں، وہ اس دلیل کو پورے شرحِ صدر سے مان سکتے ہیں۔ اس کے بعد یزید کی عدالت پر مزید کسی دلیل کی ضرورت ہوگی نہ اس کے فسق کی تردید کے لیے کسی بحث کی۔

مگر جو حضرات ان صحیح احادیث کو مانتے ہیں (اور اہلِ علم میں کوئی نہیں جو ان کا انکار کرتا ہو) انہیں تو یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ حکمران کون تھا؟ اور صالح تھا یا فاسق؟ انہیں تو اللہ و رسول کے ارشاد کی پیروی میں بہر حال حکمران کی بیعت باقی رکھنی تھی۔

یہی مطلب تھا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد کا کہ ہم نے اس شخص (یزید) کی بیعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں کی ہے۔ پس کسی بھی دور میں اہل اللہ کے کسی حکومت کے خلاف حرکت میں نہ آنے بلکہ اس کے پرچم تلے جہاد کرنے کو بھی حکمران سے فسق کی نفی کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

رکھتے تھے۔ ان کے اجتہاد کے مطابق حکمران ذاتی فسق کی وجہ سے معزول کر دیے جانے کے لائق ہوتا تھا اور اس کے خلاف خروج واجب ہو جاتا تھا۔[1]

چونکہ یزید کے بارے میں اہلِ مدینہ کی یقینی معلومات یہی تھیں کہ وہ فسق و فجور کا عادی ہے، اس لیے یہ حضرات خروج پر مصر تھے۔ اس اجتہاد میں یہ بالکل نیک نیت تھے اور ان کی یہ لڑائی خالص اللہ کے لیے تھی۔

خروج کا آغاز:

اکابرِ مدینہ نے طے کیا کہ وہ حکومت کو خلافتِ راشدہ کے دور کی طرح مہاجرین و انصار کی رضامندی اور شورائیت کے اصول پر چلائیں گے نہ کہ موروثی نظام پر۔ اہلِ مدینہ نے ایک شہری حکومت ترتیب دی جس میں عام مہاجرین کی کمان مَعقِل بن سنان رضی اللہ عنہ کو سونپی گئی۔ قریش کے لیے عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو الگ امیر مقرر کیا گیا۔ انصار عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت آ گئے۔[2]

ان حضرات نے شہر کا انتظام سنبھال کر یزید کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان اور بنو امیہ کے دیگر افراد کو مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا۔[3]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرح دوسرے شہروں میں مقیم اکابر صحابہ، اس تحریک کی کامیابی کے متعلق پُر امید نہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو طائف میں مقیم تھے، اس تحریک سے متفق نہیں تھے۔ انہیں جب اس نئی حکومت کی اطلاع ملی تو فرمایا: ''ان کے دو دو امیر ہیں۔ یہ لوگ مارے جائیں گے۔''[4]

بہر کیف اہلِ مدینہ کے قائد عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ نے بڑی شدت کے ساتھ لوگوں کو اہلِ شام سے لڑائی پر ابھارا، موت پر بیعت لی کہ لڑتے لڑتے مر جائیں گے لیکن لڑائی سے فرار نہ ہوں گے۔ اس طرح گویا فنا و بقا کے معرکے کی تیاری کی گئی۔[5]



① بعد میں بھی علماء کا ایک طبقہ فاسق حکمران کے خلاف خروج کو جائز اور ایک طبقہ اسے واجب کہتا آیا ہے۔ (شرح عقائد نسفی، ص ۳٦۷؛ احکام القرآن للامام للجصاص الرازی: ۱/۸۵، ط العلمیہ)

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳٦

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳٦

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۷

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳٦ بسند صحیح

جنگِ حَرَّہ

یزید میں سپاہیانہ جوش وخروش کی کمی نہیں تھی۔ مگر وہ سربراہِ حکومت تھا جسے جوش وجذبے سے کہیں زیادہ تدبر، تحمل، اور انجام بینی کا ملکہ درکار ہوتا ہے۔ یزید کے مختلف فیصلے یہ ثابت کرتے رہے کہ وہ ان صفات سے عاری تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے معاملے میں بھی اس سے ایسی ہی غلطیاں اور بے اعتدالیاں صادر ہوئیں جس کا نتیجہ سانحۂ کربلا کی شکل میں نکلا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے بعد وہ بہت محتاط ہو جاتا اور صحابہ کرام کے متعلق آئندہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے ہزار بار سوچتا، مگر افسوس کہ جب اسے اہلِ مدینہ کے خروج سے سابقہ پڑا تو اس کی کیفیت نہایت جارحانہ ہوگئی۔ اور اس نے مدینہ منورہ اور ساتھ ہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سرکوبی کے لیے مکہ پر بھی حملے کا اٹل فیصلہ کرلیا۔ یہ سنتے ہی دِمَشق میں موجود صحابہ وتابعین نے یزید سے پرزور سفارش کی کہ یہ مہم ترک کردی جائے۔[1]

یزید صحابہ وتابعین کے مشوروں سے بے زار:

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے یزید کو اس جنگ سے باز رکھنے کے لیے یہاں تک کہہ دیا:

''ایسا کرکے تم اپنی جان کو ہلاک کروگے۔''[2] مگر یزید پر کوئی اثر نہ ہوا۔

صخر بن عبید مدنی رحمہ اللہ نے بھی بہت سمجھایا مگر یزید اپنی ضد پر اڑا رہا۔[3]

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے ہر کوشش بے سود دیکھ کر فرمایا: ''اس مہم کے لیے مجھے بھیج دیں، میں کافی ہو جاؤں گا۔''

مگر یزید کو مدینہ والوں کے لیے کوئی بردبار اور متحمل مزاج شخص نہیں بلکہ سنگ دل اور بدلحاظ آدمی درکار تھا۔ اس لیے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی پیش کش بھی رائیگاں گئی۔[4]

اموی امراء بھی مدینہ پر حملے سے نالاں: عبیداللہ بن زیاد کا صاف جواب

مدینہ اور مکہ پر حملے کا سوچتے ہی ہر کسی کا دل کانپ اٹھتا تھا اس لیے یزید کی تاکید کے باوجود اس کے وہ امراء بھی اس مہم کے لیے تیار نہ ہوئے جو سخت گیری میں مشہور تھے۔ عمرو بن سعید جیسے شخص نے جو دو سال قبل مکہ پر لشکر کشی کرچکا تھا، اس بار صاف انکار کردیا۔[5] آخر عبیداللہ بن زیاد کو یہ کام سونپنے کی کوشش کی گئی مگر وہ سانحۂ کربلا کی وجہ سے اپنی

---

① طبقات ابن سعد: ۱۴۵/۵ ط صادر ؛ تاریخ دِمَشق: ۴۷۴/۲۳

② لہ"قال عبداللہ بن جعفر: انما تقتل بھم نفسک." (طبقات ابن سعد: ۱۴۵/۵ ط صادر)

③ تاریخ دِمَشق: ۴۷۴/۲۳

④ قال: "یا امیر المؤمنین وجھنی اکفک." (تاریخ دِمَشق: ۴۷۴/۲۳)

⑤ تاریخ الطبری: ۴۸۳/۵

رُسوائی کا ذمہ دار یزید کو سمجھتا تھا جس کی خوشنودی کے لیے اس نے یہ مظالم ڈھائے تھے۔ چنانچہ اب وہ یزید کی خاطر مزید بدنامی مول لینے کی ہمت نہ کرسکا اور صاف جواب دیتے ہوئے کہا: ''اس فاسق (یزید) کے لیے میں یہ دونوں کام کبھی جمع نہیں ہونے دوں گا کہ رسول اللہ ﷺ کے نواسے کا قتل بھی میرے ذمے ہو، اور بیت اللہ پر حملہ بھی۔''①

سب کو ہچکچاتے دیکھ کر یزید نے مسلم بن عُقبہ جیسے سنگ دل آدمی کو یہ مہم سونپی ② اور اسے تاکید کی:

''تین دن تک اہلِ مدینہ کو اطاعت کی دعوت دینا، پھر بھی وہ نہ مانیں تو لڑنا۔ اگر تم غالب آجاؤ تو تین دن تک شہر کو لوٹنا۔ روپیہ پیسہ، عام استعمال کی اشیاء، اسلحہ اور سامانِ خورد ونوش فوج کا ہوگا۔ علی بن حسین (زین العابدین رحمہ اللہ) کا خیال رکھنا، ان کا اس بغاوت سے کوئی تعلق نہیں۔''③

اس فوج کی تعداد بارہ ہزار تھی۔④ یعنی یہ لشکر مدینہ والوں کی طاقت سے کہیں بڑھ کر تھا کیوں کہ وہاں لڑنے والے

---

① تاریخ الطبری: ۵/۴۸۳، ۴۸۴ باسناد حسن ورواه الطبری عن ابن حمید عن جریر عن مُغیرۃ

احوالِ رواۃ: ابن حُمَید یعنی محمد بن حمید الرازی (م ۲۴۸ھ) امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل کے شیخ ہیں، اگرچہ انہیں ضعیف کہا گیا ہے مگر امام احمد ان کی توثیق کرتے تھے۔ حافظ ذہبی کے بقول سند میں گڑبڑ کرتے تھے مگر ان پر متن گھڑنے کا شک نہیں ہوسکتا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۵۰۴)

جریر یعنی جَرِیر بن عبدالحمید ابوعبداللہ الضبی الکوفی (م ۱۸۸ھ) بخاری ومسلم کے صدوق راوی ہیں۔ (میزان الاعتدال: ۱/۳۹۴)

مُغیرہ بن مِقسَم (م ۱۳۶ھ) بخاری ومسلم کے ثقہ راوی ہیں، ابراہیم نخعی اور امام شعبی کے شاگرد ہیں۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۷۷۸ ت بشار)

② تاریخ الطبری: ۵/۴۸۴، ۴۸۵ عن واقدی و عن ابی مخنف

واقدی کی روایت کے مطابق مسلم بن عُقبہ کی عمر اس وقت ۹۰ سال سے اوپر تھی۔ (تاریخ دمشق: ۵۸/۱۰۵)

مگر ہمارے نزدیک واقدی کی یہ روایت محلِ نظر ہے۔ اول تو سند کا ضعف ظاہر ہے، دوسرے اتنے بوڑھے شخص کو ایک اہم عسکری مہم کا ذمہ دار بنانا بعید از قیاس بھی ہے۔ بنوامیہ کا ویسے بھی یہ وطیرہ تھا کہ وہ نوجوانوں کو بڑے عہدے دیا کرتے تھے، پس قرینِ قیاس یہ ہے کہ مسلم بن عُقبہ پیرِ فرتوت نہیں ہوگا۔ تاہم عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگ واقدی کی اس روایت کو نص کا درجہ دے کر من مانی قسم کی ''اشارۃ النص'' سے مسلم بن عُقبہ کو ''صحابی'' شمار کرنے لگے ہیں، صرف اس لیے کہ یزید کے اس جرنیل کی سیاہ کاریوں کو سندِ جواز بخشی جائے۔ ایک ضعیف راوی کا قول لے کر اس پر قیاسی قلعے تعمیر کرنا اور ایک بدنام شخص کے لیے صحابیت جیسا عظیم شرف ثابت کرنا اور پھر اس کے گھناؤنے ظلم وستم کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرنا تعصب کی انتہاء ہے۔

علمائے اسماء الرجال نے واقدی کی سند کی کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقط یہ تسلیم کیا ہے کہ مسلم بن عُقبہ کو ''ادراک'' تھا۔ اصطلاحِ علم الرجال میں ''ادراک'' کا مطلب فقط دور نبوت پانا ہوتا ہے۔ جب تک دیگر دلائل نہ ہوں اس سے صحابیت ثابت نہیں ہوتی۔ طبقاتِ صحابہ کی قدیم کتب: طبقات ابن سعد، معجم الصحابہ بغوی، الاستیعاب اور اسد الغابہ، نیز کتب اسماء الرجال مثلاً: الثقات لابن حبان، الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم، میں کہیں بھی مسلم بن عُقبہ کو صحابہ کی صف میں جگہ نہیں دی گئی۔ ابن عساکر نے ادراک کا ذکر کیا ہے مگر رؤیت کی نفی کی ہے: ادرک النبی ﷺ ولم یحفظ ان رآہ. (تاریخ دمشق: ۵۸/۱۰۲)

اکثر علماء نے مسلم بن عُقبہ کا ذکر اس قدر نفرت کے ساتھ کیا ہے کہ اسے اصل نام کی جگہ مسرف بن عُقبہ کہہ کر یاد کیا ہے۔

مسلم بن عقبۃ الذی یقال لہ مسرف بن عقبۃ، ادرک النبی ﷺ. (تاریخ الاسلام للذہبی: ۵/۲۳۳)

صحابیت کا دعویٰ حافظ ذہبی نے بھی نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر نے ''الاصابۃ'' میں مسلم بن عقبہ کا ذکر اس لیے کیا ہے تاکہ صحابہ کے خلاف اس کی سیاہ کاریاں سامنے آئیں۔ انہوں نے اسے صحابی ہرگز نہیں کہا۔ حیرت ہے کہ جو حضرات امام زہری جیسے ثقہ راوی کو بھی شیعہ قرار دے کر ان کی روایات کو ناقابلِ اعتبار کہتے ہیں، یہاں بڑے اعتماد سے واقدی جیسے راوی کی روایت لے کر قیاساً مسلم بن عقبہ کو صحابی مان رہے ہیں۔ مقامِ صحابیت پر اس سے بڑا طعن اور کیا ہوگا کہ یہ شرف ایک ظالم شخص کی طرف منسوب کردیا جائے۔

③ انساب الاشراف: ۵/۳۲۲، ۳۲۳، ط دار الفکر؛ تاریخ اسلام للذھبی: ۵/۲۵ ت تدمری. یہ روایت ضعیف سند سے مروی ہے مگر محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل کا اتفاق ہے کہ یزید نے یہ حکم دیا تھا، اس لیے یہاں یزید کی طرف منسوب یہ الفاظ نقل کردیے گئے ہیں۔

④ تاریخ خلیفۃ، ص ۲۳۷، ۲۳۸

صرف دو ہزار سرفروش تھے۔ [1]

مدینہ کے جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں چھلے ہوئے ٹیلوں کے سلسلے ہیں جنہیں ''حَـرّہ'' کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں آتش فشاں لاوے کے ابلنے سے یہ علاقہ جھلس گیا تھا۔ اس لیے یہ جگہ حرہ کہلاتی تھی۔ [2]

اہل مدینہ نے غزوۂ خندق کی طرز پر خندقیں کھود کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا تاکہ محاصرانہ طویل لڑائی لڑی جا سکے۔ [3] تاہم مشرقی سمت سے حرۂ واقم کا علاقہ کھلا تھا۔ اہلِ مدینہ لشکرِ شام کو روکنے کے لیے یہیں جمع ہوئے تھے۔ شامی سپاہی اسی سمت سے مدینہ کے سامنے پہنچے۔ [4]

گھمسان کی جنگ، عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کی سرفروشی:

شہر کے لوگوں کو لڑنے مرنے کے لیے تیار دیکھ کر شامی سپاہی ٹھٹک گئے، مدینہ منورہ کی حرمت بھی ان کے تذبذب کا باعث بنی۔ یہ دیکھ کر مسلم بن عُقبہ نے اپنا تخت دونوں لشکروں کی صفوں کے بیچ میں لا بچھایا اور آواز لگائی:

''اب مجھے بچانے کے لیے لڑو۔'' تب اہل شام نے زوردار حملہ کیا اور نہایت شدید جنگ شروع ہوگئی۔ [5]

عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں اپنے سات بیٹوں کو یکے بعد دیگرے دشمن پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیا۔ وہ سب بے جگری سے لڑ کر شہید ہوگئے۔ [6]

اس دوران اہل مدینہ کے ایک قبیلے بنو حارثہ نے سرکاری فوجوں کا ساتھ دیا اور انہیں پشت کی طرف سے مدینہ میں داخل ہونے کا راستہ دے دیا۔ جب مدینہ کے حریت پسندوں نے شہر کے وسط سے تکبیر کے نعرے سنے تو سمجھ گئے کہ دشمن شہر پر قابض ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ پسپا ہونے لگے۔ بعض صحابہ کرام اور ان کے غیور فرزند میدان میں جمے رہے اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔ [7] پسپائی کے دوران بہت سے لوگ اس خندق میں گرے جو شہر کے دفاع کے لیے کھودی گئی تھی۔ جو لوگ خندق میں گر کر زخمی ہوئے ان کی تعداد مقتولین سے بھی زیادہ تھی۔ [8]

عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں صرف پانچ افراد رہ گئے تھے۔ کسی نے کہا:

''واللہ! اب ہمارا کوئی اور ساتھی نہیں بچا، اب کس بھروسے پر لڑیں؟''

عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تیرا برا ہو، ہم تو موت کا عہد کر کے نکلے ہیں۔''

---

1. طبقات ابن سعد: ۱۴۶/۵، ط صادر
2. معجم البلدان: ۲۴۹/۲
3. تاریخ الطبری: ۴۸۷/۵ عن ابی مخنف ؛ تاریخ الطبری: ۴۹۵/۵ عن جویریہ بسند صحیح
4. تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۸
5. تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۸
6. تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۸
7. تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۸
8. تاریخ الطبری: ۴۹۵/۵ عن جویریہ بسند صحیح

یہ کہہ کر حریف پر ٹوٹ پڑے اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔[1] یہ جگر پاش واقعہ ۲۷ ذی الحجہ ۶۳ھ کو پیش آیا۔[2]

اہلِ مدینہ کے شہداء کی تعداد:

حرہ کے سانحے نے ایک آتشیں بگولے کی طرح مہاجرین وانصار کے مہکتے ہوئے گلستاں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے مروی ایک عمدہ روایت کے مطابق:

''حرہ کے مقتولین سات سو افراد تھے جو قرآن مجید کے حافظ وقاری تھے۔''[3]

جنگ میں شریک صحابہ کرام:

جنگِ حرہ میں کم از کم پانچ مدنی صحابہ کرام شامل رہے تھے۔ان میں سے تین میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ایک کو قیدی بنا کر قتل کیا گیا۔ایک کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔ایک صحابی کو جو جنگ میں شریک نہ تھے، بعد میں گھر سے بلوا کر شہید کیا گیا۔ان حضرات کے نام درج ذیل ہیں:

۱ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ ...... جو انصار کے سردار تھے، میدان میں قتل ہوئے۔[4]

۱ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ ...... یہ وہی صحابی ہیں جنہوں نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر مسیلمہ کذاب کو واصلِ جہنم کیا تھا۔یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظہ ام عمارہ رضی اللہ عنہا کے فرزند ہیں۔ان سے وضو کے سنت طریقے کی حدیث منقول ہے۔[5] یہ میدان میں قتل ہوئے۔

۱ حضرت ابوحلیمہ معاذ بن الحارث رضی اللہ عنہ ...... جن کی حسنِ قرأت کی بناء پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں تراویح کا امام مقرر کیا تھا[6] یہ بھی میدان میں قتل ہوئے۔

۱ بزرگ صحابی حضرت مَعقِل بن سِنان رضی اللہ عنہ ...... جو فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ بنو اشجع کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے، جنگ کے بعد وہ قیدی بنے۔یزید کے سپہ سالار مسلم بن عُقبہ نے انہیں قتل کرا دیا۔[7]

۱ حضرت عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ ...... یہ واحد صحابی ہیں جو جنگ سے زندہ بچ نکلے تھے۔[8]

---

① تاریخ دمشق: ۲۷/۴۳۰ ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۸ ② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۴۵ تا ۲۵۰

③ قتل یوم الحرۃ من حملۃ القرآن سبعمائۃ. (المعرفۃ والتاریخ: ۳/۳۲۵، ط الرسالۃ ؛ تاریخ دِمَشق: ۵۴/۱۸۳ ؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۳۰) روایت کی سند صحیح اور متصل ہے۔امام مالک کسی تعارف کے محتاج نہیں، بقیہ رواۃ کا حال ملاحظہ ہو:

محمد بن ضحاک (المدنی) ثقہ. (الثقات لابن حبان، تر: ۱۵۱۷۴)

ابراہیم بن المنذر الدنی (م ۲۳۶ھ) بخاری کے راوی ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۶۸۹)

یعقوب بن سفیان (م ۲۷۷ھ) ثقہ. (سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۱۸۰)

یاد رہے کہ واقدی نے عورتوں اور بچوں کو ملا کر مقتولین کی کل تعداد دس ہزار شمار کی ہے۔(المحن: ص ۱۸۴؛ وفاء الوفاء: ۱/۱۰۷، ط العلمیۃ) مگر یہ روایت واقدی کی وجہ سے ضعیف ہے۔اسی طرح خون کی ندیاں بہہ کر مسجد نبوی تک پہنچنے کی روایات جو بہت مشہور ہیں، اس حد تک ضعیف ہیں کہ انہیں موضوع کہا جا سکتا ہے۔

④ تاریخ دمشق: ۲۷/۴۳۰

⑤ رجال صحیح البخاری: ۱/۳۸۹ ⑥ تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۶۷۴۷

⑦ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۵۰ ⑧ طبقات ابن سعد: ۵/۱۴۷، ط صادر

ان پانچ حضرات کے علاوہ چھٹے صحابی حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ جو ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے، جنگ کے بعد گھر سے بلوا کر قتل کیے گئے۔[1]

مشہور شہدائے مہاجرین:

صحابہ کرام کے بیٹے اور رشتہ دار جو اس جنگ میں شہید ہوئے، سینکڑوں تھے جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حارث بن عبدالمطلب کے پوتے عبداللہ۔ حارث کے پڑپوتے فضل۔
- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابوبکر۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تین پوتے: ابوبکر، عبداللہ، سلیمان۔
- ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ماں شریک بھائی موسیٰ بن الحارث۔
- ام المؤمنین سودۃ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبدالرحمن۔ تین بھتیجے: ربیعہ، عمرو، عبداللہ۔
- ام المؤمنین سودۃ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عبدالرحمن بن حویطب اور ان کے بیٹے عبدالملک۔
- عشرۂ مبشرہ میں شامل حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے زید اور تین بھتیجے: ابان، عیاض، محمد۔
- عشرۂ مبشرہ میں شامل سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے: عُمیر اور عُمرو۔ تین بھتیجے: اسحاق، عمران اور محمد۔
- عشرۂ مبشرہ کے رکن حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے: عمر (یا عُمرو) اور پوتے ابوبکر۔
- مشہور صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ۔
- حضرت مِسْوَر بن مَخْرَمہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد۔
- حضرت عُتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبیداللہ۔
- بنو زمعہ کے وہب بن عبداللہ، یزید بن عبداللہ، ابوسلمہ بن عبداللہ، مقداد بن وہب، خالد بن عبداللہ۔

مجموعی طور پر قریش کے "۹۷" قیمتی افراد اس سانحے کی نذر ہوئے۔[2] **رحمهم الله رحمة واسعة**

مشہور شہدائے انصار:

- عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سات بیٹے، جن میں سے درج ذیل چھ کے نام محفوظ ہیں: عبدالرحمن، حارث، حکم، عاصم، یحییٰ، عبداللہ (آخری دو جڑواں تھے)
- قاری کثیر بن افلح رحمہ اللہ جن سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی کتابت کروا کر محفوظ نسخہ شائع کیا تھا۔[3]
- حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ۔

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۹ بسند صحیح

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۴۰ تا ۲۴۵؛ العبر للذهبی، حوادث ۶۳ھ؛ تاریخ الاسلام للذهبی: ۵/۲۹، ۳۰، تحت حوادث ۶۳ھ

③ العبر: ۱/۵۰، ط دار الکتب العلمیة

۱ حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کے دولڑکے: سہل اور محمد۔

۱ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پانچ بیٹے: سعید، سلیمان، زید، یحییٰ، عبداللہ۔

۱ حضرت عَمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے چار بیٹے: محمد، عبداللہ، جابر، مُعاویہ، عمارۃ۔ گھر کے دیگر افراد کو ملا کر تیرہ۔

۱ حضرت عَمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے تین پوتے: عبدالرحمٰن، عثمان، عبدالملک۔

۱ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد

۱ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پوتے اسماعیل۔

۱ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے: عبداللہ اور یحییٰ۔

۱ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے تین بیٹے: محمد، یحییٰ، عبداللہ۔

۱ حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پوتے نَوفل۔

۱ حضرت کعب بن عمرو رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد۔

۱ حضرت رِفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کے بیٹے حارث۔

۱ بنو حارثہ بن حارث کے عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن سہل، کنانہ بن سہل، عبداللہ بن اویس، سہل بن ابی امامہ۔

انصار کے کل ''۱۷۳'' افراد شہید ہوئے تھے۔[1] رحمهم الله رحمة واسعة

واقعۂ حرہ اسلامی تاریخ کا وہ عظیم سانحہ تھا جس میں مہاجرین وانصار کی آل اولاد کا ایک بہت بڑا اور نہایت گراں قدر حصہ یک لخت فنا ہو گیا۔ اسی لیے سعید بن مُسَیَّب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''پہلا فتنہ شہادتِ عثمان وقوع پذیر ہوا تو اس کے نتیجے میں اصحاب بدر میں سے کوئی باقی نہ رہا۔ پھر دوسرا فتنہ وقعۃ الحرہ برپا ہوا تو اصحاب صلح حدیبیہ میں سے کوئی نہ بچا۔ پھر تیسرا فتنہ (یعنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف اموی امراء کی بغاوت) واقع ہوا تو اس کے تھمنے سے قبل لوگوں میں کوئی رمق باقی نہیں رہی ہوگی۔''[2]

شامی لشکر کا اہلِ مدینہ پر ظلم، شہرِ رسالت مآب میں لوٹ مار:

اہل مدینہ کو شکست دے کر مسلم بن عُقبہ شہر میں داخل ہوا تو اس کے ذہن سے اہلِ مدینہ کے بارے میں حضور ﷺ کے وہ ارشادات محو ہو چکے تھے جن میں اہل مدینہ کی عزت وحرمت کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''جس نے اہل مدینہ کو ڈرایا، اللہ اسے ڈرائے گا، اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی۔''[3]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۴۰ تا ۲۴۵؛ العبر: ۵۰/۱، ط العلمیۃ

② صحیح البخاری، ح: ۴۰۲۵، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدراً
متعدد شراحِ بخاری مثلاً: علامہ کرمانی رحمہ اللہ اور علامہ کورانی رحمہ اللہ نے تیسرے فتنے کی تشریح یہی کی ہے کہ اس سے حجاج کا عبداللہ بن زبیر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنا مراد ہے اور قرائن سے بھی یہی راجح ہے۔ ملاحظہ ہو: (الکواکب الدراری: ۱۹۶/۱۵؛ الکوثر الجاری الی ریاض احادیث البخاری: ۱۵۶/۷)

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۳/۷، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

اگر اہل شام کی زور آزمائی صرف میدان جنگ میں مقابلے پر آنے والوں تک ہی محدود رہتی تو ایک درجے میں اس کی گنجائش سمجھی جاسکتی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے طور پر ایک بغاوت کو کچل رہے تھے، مگر سب سے افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ فتح کے بعد مسلم بن عُقبہ کی کمان میں شامی سپاہی تین دن تک شہر میں لوٹ مار کرتے رہے۔ ①

تین دن تک مسجدِ نبوی میں اذان و اقامت کہنے والا کوئی نہ تھا، فقط سعید بن مسیب رحمہ اللہ مسجد میں پڑے رہتے تھے، جب نماز کا وقت ہوتا تو روضۂ اطہر سے ایک ہلکا سا ترنم سنائی دیتا۔ ② صحیح بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ کے جو صحابہ لڑائی میں شریک نہ تھے وہ بھی اہل شام کی سفاکی کا شکار ہوئے۔ مشہور صحابی جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ جو اس وقت بہت بوڑھے اور بصارت سے محروم ہو چکے تھے، لڑائی میں شامل نہ تھے، ان کے گھر کو بھی لوٹا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اونٹ خرید کر انہیں قیمت میں جو دراہم یا دینار دیے تھے، ان میں سے کچھ ان کے پاس اب تک آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار کے طور پر محفوظ تھے مگر اس سانحے میں شامیوں نے ان سے یہ متاعِ عزیز بھی لوٹ لی۔ ③

اس سانحے کے دن یہی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے دو بیٹوں: محمد اور عبدالرحمن کا سہارا لیے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں ایک پتھر سے ٹھوکر لگی، تو وہ یکدم بولے: ''ہلاک ہو وہ شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دہشت زدہ کیا۔''

صاحبزادے بولے: ''ابا جان کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دہشت زدہ کرسکتا ہے؟''

صحابیِ رسول نے اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: جس نے اس انصار کے قبیلے کو دہشت زدہ کیا، اس نے میرے ان دونوں (پہلوؤں) کے درمیان کی شے (دل) کو دہشت زدہ کیا۔'' ④

مدینہ منورہ میں خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ جان و عزت کے خوف سے شہر سے نکل کر پہاڑوں اور جنگلوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ شامی سپاہی ایسے لوگوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ان میں نامور فقیہ صحابی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ ایک غار میں پناہ لیے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے انہیں دیکھ لیا اور جا کر کسی شامی سپاہی کو بتادیا۔ وہ تلوار سونتے غار کے دہانے پر آدھمکا اور آواز لگائی: ''باہر نکلو۔''

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی تلوار سنبھالی اور فرمایا: ''میں نہیں نکلوں گا۔ تو اندر آیا تو تجھے مار دوں گا۔''

---

① طبقات ابن سعد: ۵/۳۸، ط صادر، باسناد صحیح متصل، محمد بن سعد عن موسی بن اسماعیل (من رواۃ البخاری ومسلم) جویریۃ بن اسماء (من رواۃ البخاری ومسلم) عن نافع وھو شاھد عیان لوقعۃ الحرۃ. واخرجہ الطبرانی باسناد حسن نصہ: "فدخل مسلم بن عقبۃ المدینۃ وھرب منہ یومئذ بقایا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعبث فیھا واسرف فی القتل. (المعجم الکبیر: ۱۳/۹۲، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ)

② سنن الدارمی: ۱/۲۲۷، ط دار المغنی. قال المحقق الدارانی: رجالہ ثقات لکن سعید بن عبدالعزیز اصغر من ان یدرک ھذہ الحادثۃ او یسمع من سعید بن المسیب.

③ حدثنا شعبۃ، عن محارب سمعت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ یقول بعت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعیرا فی سفر فلما اتینا المدینۃ قال ائت المسجد فصل رکعتین، فوزن، قال شعبۃ اراہ، فوزن لی، فارجح، فما زال معی منھا شیء حتی اصابھا اھل الشام یوم الحرۃ. (صحیح البخاری، ح: ۲۶۰۳، کتاب الھبۃ، باب الھبۃ المقبوضۃ وغیر المقبوضۃ)

④ مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۸۲۷، سند کے تمام راوی ثقہ ہیں، فقط طالب بن حبیب میں معمولی ضعف ہے، قال ابن حجر: "صدوق یھم" (تقریب التھذیب، نمبر: ۳۰۰۷) وراجع: مسند احمد، ح: ۱۳۸۱۸ باسناد صحیح، وراجع: الآحاد والمثانی، ح: ۱۸۱۶

مگر جب شامی اندر گھسا تو ابوسعید رضی اللہ عنہ نے فکرِ آخرت سے مجبور ہو کر اپنی تلوار زمین پر پھینک دی اور فرمایا:

''لے! میرا اور اپنا گناہ سر لے کر جہنمی بن جا۔'' وہ شرمندہ ہو گیا اور بولا: ''کیا آپ ابوسعید خدری ہیں؟''

فرمایا: ''ہاں''...... وہ بولا: ''میرے لیے استغفار کریں۔'' فرمایا: ''اللہ تجھے معاف کرے۔''[1]

ایسا بھی نہیں تھا کہ مدینہ میں ہر ہر مکان کو لوٹا گیا ہو۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت زین العابدین اور دیگر کئی اکابر اور ان کے متعلقین محفوظ رہے۔ اس کے باوجود اتنی لوٹ مار ہوئی کہ شہر میں قحط کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اشیائے خورد ونوش کے عام آدمی کی دسترس کے باہر ہونے کے باعث لوگ مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے انہیں اہلِ مدینہ کے لیے شفاعتِ نبویہ کی بشارت سنائی تا کہ وہ نقل مکانی سے رک جائیں۔[2] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بعض متعلقین نے بھی نقل مکانی کی اجازت مانگی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں رہائش کے فضائل سنا کر انہیں بمشکل روکا۔[3]

کیا شامی سپاہی کافر تھے؟

یہ بات ظاہر ہے کہ شامی سپاہی کافر نہیں مسلمان ہی تھے۔ ان میں کچھ نیک وصالح افراد کی شمولیت کا امکان بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا جو اس مہم کو خلافتِ اسلامیہ کے استحکام کا ذریعہ سمجھ کر شریک ہوئے ہوں۔ جبکہ عام سپاہی تنخواہ، انعام اور غنیمت کے لیے آئے تھے۔ بظاہر لوٹ مار انہی عام سپاہیوں نے کی تھی جن کا مقصد ہی مادی مفاد تھا۔ جب انہیں لوٹ مار کی اجازت دے دی گئی تھی تو وہ پیچھے نہ رہے کیوں کہ وہ پہلے ہی اہل مدینہ کو باغیوں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ بہرحال یہ لوٹ مار نہایت افسوس ناک اور شرعاً بالکل ناجائز تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ شہرِ مدینہ کا ادب واحترام واجب تھا۔

---

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۳۹ بسند جید

رہی یہ بات کہ لوٹ مار کا حکم مسلم بن عقبہ نے اپنی جانب سے دیا تھا یا یہ یزید کا حکم تھا؟ جہاں تک راقم نے تلاش کیا ہے، یزید کی طرف سے اس اجازت کی نسبت کی روایت یا تو ابومخنف کی روایت میں ملی ہے۔ (تاریخ الطبری: ۴۸۴/۵ تا ۴۸۷؛ انساب الاشراف: ۳۲۲/۵، ۳۲۳) یا واقدی کی روایت میں۔ (طبقات ابن سعد متمم الصحابة طبقه خامسه ط دار الصدیق طائف: ۶۴/۲؛ تاریخ دمشق: ۱۰۶/۵۸)

مگر چونکہ ان روایات میں صحابہ پر کوئی طعن نہیں، اس لیے اسلاف کے علمی اصول کے مطابق یہ بلاشبہ قابلِ قبول ہیں۔

عقلی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو مسلم بن عقبہ کا یزید کی اجازت کے بغیر اتنی بڑی جرأت کرنا، بہت ہی بعید ہے؛ کیوں کہ کربلا میں جو ہوا، اگر وہ یزید کی مرضی کے خلاف تھا، تو اب یقیناً ہر سپہ سالار بغاوتیں کچلنے میں نہایت محتاط ہوگا۔ خصوصاً مدینہ منورہ کے بارے میں جتنی بھی احتیاط کی جاتی کم تھی، مگر مسلم بن عقبہ نے وہاں اس آزادی سے مظالم ڈھائے جیسا سے بھی عبیداللہ بن زیاد کی طرح مرکز سے کسی تادیبی کارروائی کا قطعاً کوئی ڈر نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جو اسلاف قتلِ حسین کا الزام یزید کے سر ڈالنے میں احتیاط کرتے تھے، وہ بھی مدینہ کی حرمت کی پامالی سے، اسے ہرگز بری الذمہ نہیں سمجھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے روایت میں نہایت محتاط ہونے کے باوجود یزید ہی کو ذمہ دار قرار دیا تھا، فرماتے تھے: هو الذی فعل بالمدینة ما فعل. ''اسی نے تو مدینہ میں وہ سب کچھ کیا تھا۔'' پوچھا گیا: اس نے کیا کیا تھا؟ فرمایا: نهبها. ''اس نے مدینہ کو لوٹا۔'' (السنة للخلال، ح: ۸۴۵ باسناد صحیح، ط دار الرایة)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جو حتی الامکان یزید پر روافض کی طرف سے لگائے جانے والے جھوٹے الزامات کا دفاع کرتے ہیں، اس بارے میں فرماتے ہیں:

فبعث الیهم جیشا وامره اذا لم یطیعوه بعد ثلاث ان ید خلها بالسیف و یبیحها ثلاثا.

''یزید نے مدینہ والوں کی طرف ایک لشکر بھیجا اور اسے حکم دیا کہ اگر وہ لوگ تین دن تک اطاعت کا اظہار نہ کریں تو تلوار کے زور پر مدینہ میں داخل ہو اور اسے تین دن تک لوٹے۔'' (مجموع الفتاویٰ: ۲۱۲/۳)

② عن ابی سعید مولی المهری انه جاء ابا سعید الخدری لیالی الحرة فاستشاره فی الجلاء من المدینة. (صحیح مسلم، ح: ۳۴۰۵، کتاب الحج)

③ صحیح مسلم، ح: ۳۴۱۱، کتاب الحج، باب الترغیب فی سکنی المدینة

مسلم بن عُقبہ کا زبردستی بیعت لینا:

فتح کے نشے میں چُور مسلم بن عُقبہ مدینہ منورہ میں داخل ہوا اور لوگوں سے یزید کی اطاعت پر بیعت لی۔ اس کارروائی میں بھی اُس نے بڑی سختی دکھائی۔ جن پر بغاوت میں ملوث ہونے یا لڑنے والوں کا ساتھ دینے کا شبہ تھا ان سب کو جمع کر کے اعلان کیا: ''اس بات پر بیعت کرو کہ تم یزید بن مُعاویہ کے غلام ہو۔ وہ تمہارے گھروں اور جان و مال کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے گا۔''[1]

عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھانجے تھے۔[2] وہ بھی مسلم بن عُقبہ کے پاس بیعت کے لیے آئے۔ اگرچہ وہ یزید بن مُعاویہ کے پرانے دوست تھے، پھر بھی مسلم بن عُقبہ نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا اور کہا:

''اس بات پر بیعت کرو کہ تم امیر المؤمنین کے غلام ہو۔ وہ تمہارے خون، تمہارے گھر والوں اور مال کے بارے میں کچھ بھی فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔''

عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ بولے: ''میں کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی پر بیعت کرتا ہوں۔''

مسلم بن عُقبہ نے حکم دیا کہ انہیں بھی قتل کر دیا جائے۔ مروان بن حکم نے لپک کر عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کو خود سے ثالیا اور جان بخشی کی سفارش کی مگر مسلم بن عُقبہ نے ایک نہ سنی اور عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرا کے دم لیا۔[3]

مسلم بن عُقبہ، مدینہ کے جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ کو بھی قتل کرنے کے درپے تھا مگر مروان بن الحکم نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ یہ ایک مجنون آدمی ہے، تب ان کی جان بچی۔[4]

اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا یزید کی بیعت کو ''بیعتِ ضلالت'' قرار دینا:

بیعت کے لیے ان لوگوں کو بھی بلوایا گیا تھا جو خروج میں بالکل شریک نہ تھے۔ اس پر ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سمیت مدینہ کے بزرگ صحابہ سخت رنجیدہ تھے اور ایسی جبری بیعت کو ''بیعتِ ضلالت'' قرار دیتے تھے۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی درج ذیل صحیح السند روایت قابلِ غور ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جب مسلم بن عُقبہ مدینہ آیا تو لوگوں سے بیعت لی، یہ وقعہ حرہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ مسلم بن عُقبہ کے پاس بنو سلمہ بھی آئے۔ وہ بولا: میں تم سے بیعت نہیں لوں گا جب تک جابر نہیں آجاتے۔ جابر فرماتے ہیں، میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چلا گیا تا کہ ان سے مشورہ لوں۔ وہ بولیں: میں یقیناً اسے بیعتِ ضلالت قرار دیتی ہوں، مگر میں نے اپنے بھائی عبداللہ بن ابی امیہ کو بھی حکم دیا ہے وہ اس کے پاس جائے اور بیعت کر لے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں پس میں نے بھی جا کر بیعت کر لی۔''[5]

---

[1] تاریخ خلیفۃ، ص ۲۳۹ عن جویریۃ بسند صحیح ؛ انساب الاشراف: ۳۳۵/۵ بسند صحیح ؛ تاریخ الطبری: ۴۹۵/۵ بسند صحیح

[2] اسد الغابۃ: ۲۲۶/۳ ؛ الاصابۃ: ۸۳/۴

[3] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۹ بسند صحیح

[4] تذکرۃ الحفاظ للذھبی: ۴۵/۱

[5] اخرجہ ابن حجر باسناد صحیح. (الاصابۃ: ۱۱/۴ ط العلمیۃ)

درحقیقت وقعۂ حرہ میں مسلم بن عُقبہ کا کردار اس قدر افسوس ناک تھا کہ اس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں، اسی وجہ سے اسلاف اسے ''مُسرِف بن عُقبہ'' کہہ کر یاد کرتے رہے۔[1]

کیا شامی لشکر نے عزتیں لوٹی تھیں؟

مشہور ہے کہ شام کے لشکر نے مدینہ کی مستورات کی عزتیں لوٹی تھیں۔ مگر قدیم تاریخی مآخذ: تاریخ طبری، طبقات ابن سعد، انساب الاشراف، بلاذری اور تاریخ خلیفہ میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں۔ واقدی اور ابومخنف نے بھی ایسی کوئی روایت نقل نہیں کی۔ یہ اضافہ یا تو المدائنی کی ایک روایت میں ملتا ہے جس میں مذکور ہے:

''وقعہ حرہ کے بعد، ایک ہزار عورتوں کے نکاح کے بغیر بچے ہوئے۔''[2]

دوسرے اسے امام بیہقی نے مُغیرہ بن مقسم (م۱۳۶ھ) سے یوں نقل کیا ہے:

''مُغیرہ کا گمان ہے کہ اس موقع پر ایک ہزار کنواری لڑکیوں سے زنا کیا گیا۔''[3]

عقلی لحاظ سے دیکھیے تو اس دور میں ایسا واقعہ ہونا بہت ہی بعید تھا کیوں کہ مسلمانوں کے لشکر بارہا کفار کے شہروں پر قابض ہوئے، وہاں بھی عورتوں سے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا تو ایک اسلامی شہر اور وہ بھی مدینہ منورہ میں ایسے اجتماعی گناہ کا مظاہرہ وہ کیسے کرتے!! ہاں اِکا دُکا بعض بدبختوں نے ایسی حرکات کی تھیں جیسا کہ ام الہیثم بنت یزید سے مروی ہے کہ ان کے سامنے ایک خاتون نے ''یوم الحرۃ'' کے دن اپنی عصمت لٹنے کا ذکر کیا تھا۔[4]

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ ایک گھر میں روپوش تھے۔ ایک شامی سپاہی نے وہاں گھس کر خاتونِ خانہ سے بدکاری کی کوشش کی تو عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔[5] غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ صرف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بلکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی جزوی طور پر عصمت دری کے واقعات کو مانا ہے۔[6]

بہرکیف عمومی عصمت دری ثابت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے حضرات کا موقف بھی بدل جاتا حالاں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وقعہ حرہ کے بعد بھی عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو مکہ جانے سے روک رہے تھے اور حکومت کی اطاعت کی تلقین کر رہے تھے۔[7]

---

① دلائل النبوۃ للبیہقی: ۴۷۵/۶، ط العلمیۃ؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۲۳/۳، ط الرسالۃ

② المنتظم لابن جوزی: ۱۵/۶ نقلاً عن کتاب الحرۃ المدائنی روایت کی سند ضعیف اور منقطع ہے۔

③ "زعم المغیرۃ انہ افتض فیھا الف عذراء." (دلائل النبوۃ: ۴۷۵/۶، ط العلمیۃ) روایت کی سند ضعیف اور منقطع ہے۔

④ المنتظم: ۱۵/۶؛ وفاء الوفاء: ۱۳۳/۱ عن خالد الکندی عن عمتہ ام الھیثم بنت یزید

⑤ دخل رجل من اھل الشام دار المرأۃ التی تواری فیھا ابن مطیع، فاعجبتہ فراودھا فامتنعت منہ فصرعھا فاطلع ابن مطیع علی ذالک فدخل فخلصھا منہ، وقتل الشامی. (الاصابۃ: ۲۲،۲۱/۵)

⑥ فصار عسکرہ فی المدینۃ النبویۃ ثلاثا یقتلون و ینھبون ویفتضون الفروج المحرمۃ. (مجموع الفتاوی ابن تیمیۃ: ۴۱۲/۳)
نیز دیکھیے: الاصابۃ: ۲۳۲/۶ ترجمۃ: مسلم بن عقبۃ؛ الوصیۃ الکبری لابن تیمیۃ: ۴۵

⑦ طبقات ابن سعد: ۱۴۴/۵ بسند حسن ط صادر

واقعۂ حرہ پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا تاثر:

واقعۂ حرہ پیش آیا تو بعض صحابہ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ تنبیہات یاد آ گئیں۔ ان کے نزدیک یزید بن مُعاویہ ان وعیدوں کا مصداق تھا۔ مدینہ منورہ کے ثقہ راوی ابوعبداللہ قراظ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یزید بن مُعاویہ کے بارے میں یہ کہتے سنا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اس شہر یعنی مدینہ کے باشندوں سے کسی برائی کا ارادہ کرے گا، اللہ اسے یوں گھلا دے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔''①

واقعۂ حرہ پر یزید کا تاثر:

واقعۂ حرہ پر یزید کی طرف سے مسلم بن عُقبہ کے مظالم کی مذمت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ ایک روایت میں ہے کہ اس نے اہلِ مدینہ کی تکالیف پر رنج وافسوس کا اظہار کیا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''جب یزید کو اس واقعہ (حرہ) کی خبر ملی تو اس نے کہا: 'ہائے میری قوم!' پھر ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کو بلایا اور کہا: 'اہلِ مدینہ پر جو گزری وہ تمہیں معلوم ہے۔ بتاؤ اس کی تلافی کی کیا صورت ہو؟' وہ بولے: 'غذا اور مالی امداد۔' یزید نے اہلِ مدینہ کے لیے خوراک کی رسد بھیجنے کا حکم دیا اور ان کے لیے مالی امداد جاری کر دی۔''②

---

① عبدالرزاق ،عن ابی معشر قال سمعت ابا عبدالله القراظ يقول سمعت اباهريرة يقول ليزيد بن معاوية :" ان رسول الله ﷺ قال:من اراد اهل هذه البلدة بسوء يريد المدينة اذابه الله تعالىٰ كما يذوب الملح فى الماء."(مصنف عبدالرزاق،ح:١٧١٥٦)

احوالِ رواۃ :عبدالرزاق۔ ائمہ بالاتفاق۔ ابومعشر نجيح بن عبدالرحمن السندى(م ١٧٠ھ) :صدوق عند احمد بن حنبل،وقال الثورى:صالح ،لين الحديث، وقال يحيىٰ بن معين:ضعيف يكتب حديثه. (تهذيب الكمال:٣٢٦/٢٩)

ابوعبدالله القراظ دينار (م ١١٠ھ) بالاتفاق ثقہ ہیں، مسلم ونسائی کے راوی ہیں، روایت متصل الاسناد ہے۔ اگر اس کا متابع ہو تو یہ صحیح لغیرہ ہوگی۔ فقط ابومعشر میں کچھ ضعف ہے مگر یہ ضعف ان کے حافظے میں فرق کے باعث ہے، کذب یا فسق کی وجہ سے نہیں۔ قال الترمذى:ابومعشر اسمه نجيح،مولىٰ بنى هاشم وقد تكلم فيه بعض اهل العلم من قبل حفظه. (سنن الترمذی، ح:٢١٣٠) انہیں سہو متون میں نہیں، اسناد میں ہوتا تھا۔

قال الامام احمد:كان بصيراً بالمغازى، كان صدوقا لكنه لا يقيم الاسناد.(موسوعة اقوال احمد بن حنبل،تر:٣٣٠٦)

بہرکیف ابومعشر محدثین کے ہاں مقبول ہیں، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ان کی روایات ہیں۔ اس اعتبار سے مذکورہ روایت کو حسن کہا جا سکتا ہے۔

② البداية والنهاية: ١١/٦٥٥، تحت ٦٤ھ ترجمة :يزيد بن معاوية

یہ روایت قدیم مآخذ میں کہیں نہیں ملی۔ حافظ ابن کثیر نے بھی سند بیان نہیں کی، فقط اتنا کہا ہے کہ مدائنی سے منقول ہے۔ اس کی سند کے صحیح ہونے کا کوئی ثبوت ہمارے سامنے نہیں مگر اس کی صحت اعلیٰ درجے کی بھی ہو، تب بھی کوئی سمجھ دار شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یزید اس طرح بری الذمہ ہو گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے زخم لگانے کے بعد مرہم رکھنے کی کچھ کوشش کی تھی۔ اور اگر یہ روایت ضعیف ہو تو بھی حافظ ابن کثیر پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا؛ کیوں کہ انہوں نے بھی اسے فقط یزید پر عائد کفر کے الزام کو دور کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ دراصل واقعہ حرہ کے متعلق ایک ضعیف روایت ظاہر کرتی ہے کہ یزید ایمان سے ہی محروم تھا۔ اس میں منقول ہے کہ یزید کو جب واقعۂ حرہ اور اہلِ مدینہ کے خلاف فتح کی خوشخبری ملی تو اس نے بہ فخر یہ اشعار پڑھے:

الا ليت اشياخى ببدر شهدوا ...... جزع الخزرج من وقع الاسل

''کاش اہدر میں (قتل ہونے والے) میرے بزرگ نیزوں کے وار سے خزرج (انصار) کی آہ وبکا دیکھتے۔'' **(انساب الاشراف:٣٣٣/٥)**

یہ اشعار ابن الزبعری نے غزوۂ احد میں مسلمانوں کی پسپائی پر پڑھے تھے۔ **(تاریخ طبری:٤٢٦/٢، بعد میں ابن الزبعری نے اسلام قبول کر لیا تھا۔)**

بلاذری نے اسے ''قالوا'' کی مبہم سند سے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی اشعار یزید نے واقعہ حرہ پر دہرائے تھے۔ اس روایت پر یقین کیا جائے تو یزید کا ایمان بھی ختم دکھائی دیتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس نے انصار مدینہ کے قتلِ عام کے ذریعے بدر میں قتل ہونے والے قریشی کافروں کا بدلہ لیا تھا۔ حالاں کہ یہ ایک انتہا پسندانہ سوچ ہے جو روافض کا شعار ہے، جمہور مسلمین نے یزید کی تکفیر کبھی نہیں کی، اس لیے حافظ ابن کثیرؒ اس روایت کی تردید ضروری سمجھتے تھے۔ ایسے میں انہیں واقعہ حرہ کے

(بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

ظلم، کفر یا منافقت:

یہ ثابت نہیں کہ یزید کا مدینہ یا مکہ پر لشکر کشی کا حکم دینا اور مسلم بن عُقبہ کا حملہ کرنا کسی کفر و نفاق کے جذبے پر مشتمل تھا بلکہ بظاہر یہ سب ہوسِ اقتدار کا کیا دھرا تھا۔ یعنی یہ لوگ کسی طرح اپنے اقتدار اور اپنی حکومت کی بالادستی کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے خلاف کھڑے ہونے والے بلاشبہ بڑے جلیل القدر، نیک اور بزرگ تھے، مگر حکومت کی نگاہ میں قانوناً باغی تھے جن کے خلاف تلوار استعمال کرنا حکمران اپنا آئینی حق سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سرکاری لوگ جس حد تک مظالم کے مرتکب ہوئے، انہیں اسی حد میں رکھنا چاہیے۔ ان مہمات میں جو افسوس ناک واقعات پیش آئے ان پر اہلِ ایمان کا غمزدہ ہونا فطری بات اور ان کی مذمت کرنا لازمی ہے، مگر ان سانحوں کو حکام کی تکفیر، بے دینی یا منافقت کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

بہرحال علمائے امت نے یزید اور اس کے حکام کے اس طرزِ عمل کو کبھی درست نہیں سمجھا بلکہ اس کی پرزور مذمت کی ہے۔ جو حضرات یزید یا اس کے حکام کے مظالم کا شکار ہوئے وہ انتہائی قابلِ احترام تھے۔ ان میں جو لڑتے ہوئے قتل ہوئے وہ ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر، نیک جذبے کے ساتھ، ایک شرعی تاویل کی بناء پر لڑ رہے تھے۔ اس لیے علمائے امت ان کے لیے مقامِ شہادت، اخروی درجات اور اجر و ثواب کی امید رکھتے ہیں۔

☆☆☆

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ﴾

بارے میں یزید کے تاثرات پر مدائنی کی ایک ایسی روایت مل گئی جو مذکورہ روایت کے برعکس تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس سے قطع نظر کہ اس کی اسنادی حیثیت کیا ہے، اسے پیش کردیا؛ کیوں کہ مقابلے میں دوسری روایت بھی تو نہایت ضعیف تھی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر یزید اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی گفتگو والی روایت نقل کرکے لکھتے ہیں: ''یہ روایت جھوٹے رافضیوں کی منقولہ بات کے برعکس ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یزید اہلِ مدینہ کے قتل پر خوش ہوا، اس کا دل ٹھنڈا ہوا، اور اس نے ابن الزبعری کے فخریہ شعر پڑھے۔'' **(البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۶۵۵)**

حافظ ابن کثیرؒ سے قبل امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی تردید کرچکے تھے کہ یزید نے مذکورہ فخریہ اشعار پڑھے ہوں۔ **(منہاج السنۃ: ۴/۵۴۹-۵۵۰)**

حافظ ابن کثیرؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کے اعتدال اور انصاف کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے یزید کی برائیوں کو اسی حد تک رکھا جس حد تک وہ ثابت تھیں مگر ان کے اس طرزِ عمل سے اگر کوئی یہ مطلب لینا چاہے کہ یہ حضرات یزید کے مداح تھے اور اسے ایک فرشتہ صفت حکمران سمجھتے تھے تو بددیانتی اور تعصب کی دوسری انتہاء ہوگی۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور یزید

ان تمام حوادث کے دوران صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام کی چار دیواری میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ کم از کم کائنات کے اس مقدس ترین گوشے میں وہ مامون رہیں گے۔ مکہ معظمہ میں سال کے چار ماہ حاجیوں اور باقی ایام میں عمرہ کے زائرین اور عبادت گزاروں کا ہجوم رہنے کی وجہ سے بھی یہ امید کی جاسکتی تھی کہ حکومت یہاں کوئی مسلح کارروائی کرنے کی کوشش کر کے بدنامی مول نہیں لے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا لقب "العائذ باللّٰہ" یا عائذ بیت اللّٰہ (اللہ کے گھر میں پناہ لینے والا) رکھ لیا۔[1]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا اٹل موقف جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تھا، اب بھی برقرار تھا کہ مسلم معاشرے میں انتقالِ اقتدار موروثیت نہیں شورائی پر استوار ہونا چاہیے جس میں مہاجرین وانصار اور افاضلِ اُمت کا اہم کردار ہو۔ اگرچہ جمہور صحابہ حالات کے پیشِ نظر اس مسئلے میں خلافِ افضل صورت کو برداشت کرنے کی گنجائش محسوس کرتے تھے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی علمی عبقریت اور اتباعِ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر معمولی جذبے کے باعث سیاسی نظام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ پیمانے پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہی موقف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا رہا تھا۔

یزید نے مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش کی تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر راتوں رات مدینہ چھوڑنا پڑا۔[2] جب وہ مکہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو یزید نے ولید بن عتبہ کو اس کوتاہی کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے برطرف کر دیا اور عَمرو بن سعید کا تقرر کیا۔[3]

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مکہ آنے کے بعد بھی بنوامیہ کے حکام کی طرف سے مسلح کارروائی کے خدشات ضرور لاحق تھے۔ چونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ کو خونریزی کے امکانات سے بھی بچانا چاہتے تھے، اس لیے یہاں مطمئن نہ رہے اور کوفہ جانے سے پہلے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''کہیں اور قتل ہو جانا مجھے پسند ہے مگر حرم میں خونریزی گوارا نہیں۔''[4]

اس کشیدہ فضا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہلِ عراق کی حمایت کے ذریعے نظامِ حکومت کی اصلاح کی کوشش میں

---

[1] تاریخ دمشق: ۲۸/۲۰۳، ۲۰۵؛ انساب الاشراف: ۵/۳۰۴، ط دار الفکر

[2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۳

[3] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۳

[4] اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۲۴۲ بسند صحیح، ط دار خضر

کامیابی کی امید لیے کوفہ روانہ ہو گئے اور وہاں ناساز گار حالات کا سامنا کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ ہی میں مقیم رہے۔ ان کی بلند پایہ شخصیت، محبوبیت اور مکہ مکرمہ کی حرمت کے علاوہ خود اپنی کمزوری کے پیش نظر حکام کچھ مدت تک ان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتے رہے۔ اس دوران عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسی پر اکتفا کیا کہ کوئی انہیں ان کے فتوے اور ضمیر کے خلاف بیعت کرنے پر مجبور نہ کرے۔ وہ حرم میں پناہ لے کر بہتر حالات کے منتظر رہے۔ وہ دن بھر خانہ کعبہ کا طواف کرتے، نوافل پڑھتے اور اکثر اوقات عبادت میں گزارتے۔ نہ وہ کسی کی مخالفت کرتے تھے نہ کوئی ان پر دار و گیر کرتا۔[1]

عمرو بن سعید کی مکہ پر فوج کشی:

تاہم حکومت برابر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر قابو پانے کی فکر میں تھی۔ ان کے مکہ پہنچنے کے صرف ایک ماہ بعد رمضان ۶۰ھ میں حجاز کے نئے اموی گورنر عمرو بن سعید نے مسجد نبوی کے منبر پر عوام سے پہلا خطاب کرتے ہوئے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر کڑی تنقید کی اور نہایت سختی سے کہا: ''اُس نے مکہ میں پناہ لی ہے تو کیا ہوا، اللہ کی قسم! ہم وہاں بھی اس پر حملہ کریں گے اور اگر وہ مکہ میں داخل ہو چکا ہے تو مکہ کو اس کے گرد جلا ڈالیں گے، چاہے کسی کی ناک کٹے تو کٹے۔''[2]

مدینہ یا مکہ میں موجود سرکاری اہلکاروں کی مختصر نفری عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسی مقبول اور محترم شخصیت کو نہیں پکڑ سکتی تھی۔ یہ کام ایک بڑی فوجی کارروائی کے بغیر ممکن نہ تھا اور یزید کی حکومت جو اس وقت خود ڈگمگا رہی تھی، اس کی متحمل نہیں تھی۔ اگر دمشق میں کوئی بڑی فوج جمع کر لی جاتی تب بھی یہ کام فوراً نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ مکہ جیسے غیر پیداواری علاقے میں کسی لشکر کا پڑاؤ ڈالنا کمک اور رسد کی طویل اور مضبوط لائن قائم کیے بغیر ممکن نہ تھا۔

یزید کی حکومت کو قدم جمانے اور عسکری کارروائیوں کی طاقت پکڑنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ پھر کارروائی کے لیے سوچ بچار، فیصلے اور تیاری میں بھی کچھ دن لگے۔ اس کے بعد حرم کے تقدس یا کسی شخصیت کے مقام و مرتبے کو سامنے رکھے بغیر عَمرو بن سعید نے اپنے کہے پر عمل کیا اور دو ہزار افراد کا ایک لشکر مکہ روانہ کیا۔ اس وقت ایک صحابی ابو شُرَیح رضی اللہ عنہ نے عَمرو بن سعید کو منع کرتے ہوئے بڑے دل نشین انداز میں کہا:

''یا امیر! اگر اجازت ہو تو ایک حدیث سناؤں جو رسول اللہ ﷺ سے بذات خود اپنے کانوں سے سنی، اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے دل میں اسے محفوظ رکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مکہ کو اللہ نے محترم بنا دیا ہے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کے لیے جائز نہیں کہ یہاں خون بہائے بلکہ یہاں کا درخت تک اکھاڑے۔''

صحابی کی اس نصیحت آمیز گفتگو اور حدیث رسول ﷺ کے جواب میں عَمرو بن سعید نے بڑی سختی سے کہا:

''ابو شُرَیح! میں تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ مکہ کسی گناہ گار، کسی مفرور قاتل اور کسی مفرور مجرم کو نہیں بچا سکتا۔''[3]

① تاریخ الطبری: ۵/۳۴۳ ، تاریخ دمشق: ۲۸/۲۰۷

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۳ ③ صحیح البخاری، ح: ۴۲۹۵، کتاب المغازی، باب منزل النبی ﷺ یوم الفتح

عمرو بن سعید کا لشکر مکہ پہنچا تو مکہ کے شہری عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دستِ راست عبداللہ بن صفوان کی قیادت میں جمع ہو گئے اور مقابلے میں بڑی پامردی دکھائی۔ آخر کار عَمرو بن سعید کا لشکر ناکام واپس آیا۔[1]

اس مہم کی ناکامی پر عمرو بن سعید کے مخالف امراء نے یزید کو یقین دلایا کہ عمرو بن سعید نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کارروائی میں کوتاہی کی ہے۔ چنانچہ یزید نے عَمرو بن سعید کو ہٹا کر دوبارہ حجاز میں ولید کا تقرر کر دیا۔[2]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کی منفی عکاسی؟:

مؤرخین نے صحیح اور ضعیف کا فرق کیے بغیر ایسی درجنوں غلط روایات کو قبول کر لیا جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک فتنہ پرور، طالبِ اقتدار اور عاقبت نااندیش قائد کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ حالاں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فسادی تھے نہ اقتدار کے حریص۔ انہوں نے یزید کی موت تک خلافت یا حکمرانی کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔[3]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح آپ کا مقصد بھی اُمت کی صحیح سیاسی رہنمائی تھا۔ آپ اپنی تقاریر میں فرماتے تھے:

''اللہ کی قسم! میری نیت اصلاح اور حق کی اقامت کے سوا کچھ نہیں۔''[4]

آپ نہ تو خود کو امیر یا خلیفہ کہلواتے تھے نہ اپنی حکمرانی کی دعوت دیتے تھے بلکہ آپ اس موقف کو عام کرتے تھے کہ امت مسلمہ میں اقتدار کا محور، شورائیت ہونا چاہیے اور مجلس شوریٰ کو نظام حکومت میں سب سے فعال اور بااختیار مقام ملنا چاہیے۔[5]

حجاز کے اکثر لوگ دل و جان سے آپ کے ساتھ تھے اور خود آپ سے بیعت لینے پر اصرار کرتے رہے تا کہ آپ حکمران کے طور پر حجاز کا نظام و نسق سنبھال لیں مگر آپ اتنے بے لوث تھے کہ انکار فرماتے رہے۔ مگر اس قسم کی خبروں نے یزید کو ضرور فکر مند کر رکھا تھا اور اسے اپنی ڈگمگاتی حکومت کے چھن جانے کا سخت خطرہ تھا۔[6]

یزید کی پیش کش:

مکہ پر ناکام حملے کے بعد یزید نے یکدم لچک دار رویہ اپنا لیا۔ اس نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ اور ہمام بن قَبِیصہ رحمہ اللہ کو مکہ بھیج کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پیش کش کی کہ وہ اگر بیعت کر لیں تو انہیں پورے حجاز کی ولایت دے دی جائے گی۔

---

[1] تاریخ طبری: ۳۴۳/۵ تا ۳۴۷...... اس لڑائی کی تفصیلات واقدی سے منقول ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن سعید نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی عمرو بن زبیر کو اپنے ساتھ ملا کر انہی کے ذریعے حملہ کرایا، عمرو بن زبیر شکست کھا کر گرفتار ہوئے، انہوں نے جن لوگوں کو زدوکوب کیا تھا، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عمرو کو قصاصاً انہی کے حوالے کر دیا، ان لوگوں نے اتنا سخت بدلہ لیا کہ عمرو بن زبیر فوت ہو گئے۔ واقدی کی یہ روایات متعدد نوع کے طعنِ صحابہ سے آلودہ ہیں اس لیے ہم انہیں قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے، ہاں اجمالاً عمرو بن سعید کا حملہ اور پسپائی ثابت ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ واقدی نے اس حملے کا سال ۶۰ھ بتایا ہے مگر یہ ناممکن تھا کیوں کہ رمضان ۶۰ ہجری میں عمرو بن سعید حجاز کا گورنر بنا تھا اور شوال میں موسم حج شروع ہو گیا تھا، عَمرو بن سعید خود حج کے لیے مکہ پہنچا تھا اور اس نے تب کوئی فوج کشی نہیں کی تھی۔ (المحن، ص ۱۴۹) ویسے بھی ۶۰ھ کے اختتام تک حاجیوں کی موجودگی میں مکہ پر حملہ بہت مشکل تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو غیر معمولی کشت و خون ہوتا اور اس کی بہت شہرت ہوتی۔ دیگر قرائن سے ظاہر ہے کہ واقدی کا بیان غلط ہے، یہ حملہ ۶۱ھ میں ہوا تھا۔ اور اس کی ناکامی پر عَمرو بن سعید کو معزول کر دیا گیا تھا۔

[2] تاریخ الطبری: ۴۷۷/۵ [3] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۷، ۲۵۸

[4] واللہ لا ارید الا الاصلاح واقامۃ الحق. (انساب الاشراف: ۳۱۵/۵، ط دار الفکر)

[5] یدعو ابن الزبیر قبل ذلک ان تکون شوریٰ بین الامۃ. (تاریخ خلیفۃ، ص ۲۵۸)

[6] ان اھل المکۃ ارادوا ابن الزبیر البیعۃ فابیٰ. (تاریخ خلیفۃ، ص ۲۵۲)

اور وہ اپنے خاندان کے کسی فرد کو جہاں کا چاہیں حاکم مقرر کرا سکتے ہیں۔

اگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مقصد حکومت حاصل کرنا ہوتا تو ان کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہ تھا، مگر وہ ایک اصول کی بنیاد پر یزید سے اختلاف کر رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ ①

بعض حضرات نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے انکار کو بے تدبیری پر محمول کیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا یزید سے بیعت نہ کرنا اپنے اجتہاد اور فتوے کی رو سے تھا اور اس وقت نہ صرف یہ کہ بیعت سے احتراز کی اصل وجہ یعنی اقتدار میں موروثیت اور ایک خاندان کی اجارہ داری جوں کی توں تھی بلکہ کربلا کے سانحے کے باعث حکومت کی کارکردگی پر مزید کئی سوالیہ نشان لگ چکے تھے جن میں یزید کو براہِ راست ملوث نہ بھی مانا جاتا، پھر بھی نرم سے نرم الفاظ میں اس کی حکومت کو نا کام ہی شمار کیا جا سکتا تھا۔

علاوہ ازیں یزید کے فسق و فجور کی خبریں بھی مشہور ہو چکی تھیں، خصوصاً حجاز میں ان خبروں کو یقینی حیثیت مل چکی تھی (اہل مدینہ کا خروج اسی یقین کی وجہ سے ہوا تھا)۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی اپنی مجتہدانہ رائے کی بناء پر فاسق حکمران کو بزورِ قوت برطرف کرنے کی کوشش واجب تصور کرتے تھے۔ اس لیے آپ کو یزید کی حکومت کا حصہ بننا گوارا نہ ہوا۔ ②

یزید کی قسم:

یزید جو بہر صورت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قائل کرنا چاہتا تھا، اس پیش کش کے مسترد کیے جانے پر سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے طیش میں آ کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تذلیل کا فیصلہ کر لیا اور قسم کھا لی کہ اب وہ ان کی بیعت اسی وقت قبول کرے گا جب انہیں ہتھکڑی اور گلے میں طوق پہنا کر لایا جائے۔ ③ یزید کے مشیر اسے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سخت سلوک سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ یزید کے بیٹے مُعاویہ نے بھی منع کیا اور کہا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ایسی ذلت کبھی قبول نہیں کریں گے۔ مُعاویہ نے اپنی تائید کے لیے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے بھی سفارش کروائی مگر یزید کا فیصلہ اٹل تھا۔ ④ یزید نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھا: ''میں تمہیں چاندی کی زنجیر، سونے کی بیڑیاں اور چاندی کی ہتھکڑیاں بھیج رہا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تم یہ پہن کر میرے پاس آؤ گے۔'' ⑤

یزید کی طرف سے عبداللہ بن مَسعدہ فزاری رضی اللہ عنہ اور ابن عِضاہ اشعری قید و بند کے یہ زیور لے کر مکہ روانہ ہوئے۔ یزید نے انہیں ایک ٹوپی دار جبہ (بُرنُس) بھی دیا تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو طوق و زنجیر پہنانے کے بعد اوپر سے یہ جبہ اوڑھا دیا جائے تاکہ ان کا پردہ رہے۔ ⑥

---

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۲ ② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۲

③ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۲ ، مجمع الزوائد، ح: ۱۲۰۸۳

④ طبقات ابن سعد متمم الصحابة طبقه خامسه: ۲/ ۴۳،۴۴

⑤ تاریخ دمشق: ۲۰۹/۲۸ بسند صحیح، عن هشام بن عروة عن ابیه، فی ترجمة عبد الله بن زبیر رضی اللہ عنہ

⑥ اخبار مکة للفاکهی: ۳۳۷/۲ ، تاریخ الطبری: ۴۷۶/۵ ، مستدرک حاکم، ح: ۶۳۳۷ ، حلیة الاولیاء: ۳۳۱/۱ بسند حسن



اگرچہ یزید کی طرف سے کہا گیا تھا کہ یہ اقدام محض خلیفہ کی قسم پوری کرنے کے لیے ہے مگر ظاہر ہے کہ اصل مقصد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کرنا ہی تھا۔ ورنہ اگر یزید چاہتا تو اس کے لیے قسم کا کفارہ دے دینا کیا مشکل تھا۔

یزید کے سفیر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملے۔ ابن عِضاہ نے کہا:

''خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی نصرت وحفاظت میں آپ کا کردار کسی سے پوشیدہ نہیں مگر امیر المؤمنین یزید کو غصہ اس بات پر آیا ہے کہ آپ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی وساطت سے بھیجی گئی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس لیے امیر المؤمنین نے قسم کھائی ہے کہ آپ کو ہلکی پھلکی ہتھکڑی لگا کر ان کے پاس حاضر کیا جائے۔''[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس ذلت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ''اللہ اس کی قسم پوری نہ ہونے دے۔''

پھر یہ اشعار پڑھے:

اِنّـی لَـمِـن نَبعَةٍ صمٌّ مَکاسِرُھا ۔۔۔ اِذَا تَنَاوَحَتِ الْقَصْبَاءُ وَالْعُشَر

''میں وہ شاخ ہوں جو جھکانے میں بہت سخت ہے چاہے بڑے بڑے درخت جھک جائیں۔''

وَلَا اَلِیْنُ لِغَیْرِ الْحَقِّ اَسْأَلُه ۔۔۔ حتّٰی یَلِیْنَ لِضِرْسِ الْمَاضِغِ الْحَجَر

''میں جس حق کا سوالی ہوں اس کے بغیر نرم نہیں پڑ سکتا، چاہے کسی چبانے والے کی ڈاڑھ میں پتھر نرم پڑ جائے۔''

یہ کہہ کر فرمایا: ''اللہ کی قسم! عزت کے ساتھ تلوار کا وار سہہ لینا، ذلت کے ساتھ کوڑے کھانے سے بہتر ہے۔''[2]

آخر میں فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں کبھی یزید کی بیعت کروں گا نہ اس کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں گا۔''[3]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سمجھوتے سے گریزاں کیوں رہے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ آخر میں یزید کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سمجھوتے سے کیوں گریزاں رہے؟

دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نزدیک اُن حالات میں یزید سے ملے بغیر نظام کی اصلاح کی کوئی اور ممکنہ صورت نہیں رہی تھی۔ اس کے علاوہ یزید کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر براہِ راست کوئی عتاب نہیں آیا تھا اس لیے وہ اس سے مناسب سلوک کی امید کر سکتے تھے۔ مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ براہِ راست یزید کے عتاب کی زد میں تھے۔[4]

نیز واقعۂ کربلا کے وقت یزید کے فسق وفجور کا مسئلہ ویسا ظاہر نہ تھا جیسا بعد میں موضوعِ بحث بنا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یزید کا فسق وفجور یقینی تھا اور جمہور کے برخلاف ان کا اجتہاد یہی تھا کہ فاسق آدمی حکمرانی کا اہل نہیں رہتا اور اس کے خلاف خروج ضروری ہوتا ہے اور اس پر ''خروج منہی عنہ'' کا اطلاق نہیں ہوتا۔

---

[1] اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۳۳۷، ط دار خضر ؛ انساب الاشراف: ۵/۳۰۸، ط دار الفکر

[2] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/۹۲ باسناد حسن

[3] خلیفہ بن خیاط، ص ۲۵۱ ؛ تاریخ الطبری: ۵/۴۷۲ بسند جید

[4] اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۳۳۷، ط دار خضر

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گرفتاری نہ دینے کے بعد مکہ معظمہ میں حالات ایسے بن گئے کہ شہر عملی طور پر ان کے عقیدت مندوں کی گرفت میں آ گیا۔ نواسۂ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گرد جانثاروں کے مسلح پہرے کی وجہ سے شہر میں ایک متبادل طاقت ابھر آئی اور مقامی اموی حاکم کا رعب داب جاتا رہا۔

مکہ میں یہ صورتحال تھی اور اُدھر ۶۳ھ میں اہلِ مدینہ نے اموی حاکم عثمان بن محمد کو شہر سے نکال کر اپنی شورائی حکومت قائم کر دی جس کی وجہ سے دمشق کا رابطہ مکہ سے بالکل کٹ گیا، اور مکہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عقیدت مندوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔[1] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ، مُصعَب بن عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن صفوان اور جبیر بن شیبہ کی چار رُکنی شوریٰ نے حالات کو سنبھال لیا۔[2] اہلِ حجاز پر قابو پانے کے لیے یزید نے لشکر بھیجا تو سانحۂ حرہ رونما ہوا جس نے عوام کو حکومت کے خلاف مزید مشتعل کر دیا۔

شامی لشکر کا حرم مکہ پر حملہ:

حرہ کی لڑائی کے تین دن بعد مسلم بن عُقبہ نے اپنے لشکر جرار کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ کیا۔ مگر وہ بیمار تھا۔ راستے میں مرض کی شدت بہت بڑھ گئی اور بچنے کی امید نہ رہی۔ سات محرم کو وہ ابواء کے قریب مر گیا۔[3] مرنے سے پہلے اس نے یزید کی ہدایت کے مطابق حُصَین بن نُمَیر کو بلا کر اپنی جگہ لشکر کا امیر مقرر کر دیا تھا اور اسے سختی سے کہا تھا: ''قریش سے ہوشیار رہنا اور ان سے منافقت کا معاملہ کرنا۔''[4] پھر اس نے حکم دیا: ''مکہ پہنچ کر مورچے بنانا، حملہ کرنا اور واپس ہو جانا۔ کسی قریشی کے مشورے پر کان نہ دھرنا۔''[5] اسے ڈر تھا کہ قریشی رؤساء اپنے اثر و رسوخ سے جنگ نہ رکوا دیں۔

حُصَین بن نُمَیر ۲۶ محرم ۶۴ھ کو شامی لشکر کے ساتھ مکہ پہنچ گیا۔[6] اُدھر اہلِ مکہ نے بھی اپنے دفاع کے لیے تیاری کر لی۔ کئی دنوں تک ناکام بات چیت کے بعد اتوار ۱۳ صفر ۶۴ھ کو جھڑپوں کا آغاز ہو گیا۔[7]

منذر بن زبیر رحمہ اللہ کی مکہ آمد اور والدہ محترمہ سے ملاقات:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عالم فاضل بھائی مُنذِر بن زبیر رحمہ اللہ عراق میں تھے۔ یزید کو ان سے بھی خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے عبیداللہ بن زیاد کو ان کی گرفتاری کا حکم نامہ بھیج دیا، مگر عبیداللہ بن زیاد اب یزید سے نالاں ہو چکا تھا لہٰذا اس نے مُنذِر بن زبیر رحمہ اللہ کو بھاگنے کا موقع دے دیا اور وہ مکہ کے محاصرے سے قبل عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کی آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔

---

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۱ ؛ تاریخ الطبری: ۳۹۳/۵ بسند حسن

② طبقات ابن سعد متمم الصحابه الطبقة الخامسة: ۳۹/۲

③ طبقات ابن سعد، جزء متمم الصحابة الطبقة الخامسة: ۶۷/۲ ؛ تاریخ الطبری: ۴۹۶/۵

④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳ باسناد حسن، ط مکتبة ابن تیمیة

⑤ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۵

⑥ طبقات ابن سعد، جزء متمم الصحابة الطبقة الخامسة: ۶۷/۲ ؛ الکامل فی التاریخ: ۲۲۱/۳

⑦ انساب الاشراف: ۳۳۷/۵، ط دار الفکر بسند حسن

مُنذِر بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنی والدہ محترمہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بہترین کپڑوں کا ہدیہ پیش کیا، انہوں نے ناراض ہو کر رد کر دیا۔ اب منذر بن زبیر رحمہ اللہ نے عام سا کپڑا پیش کیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے خوشی سے قبول کر لیا اور فرمایا: ''میں ایسے کپڑے پہنتی ہوں۔''[1]

مُنذِر بن زبیر رحمہ اللہ کی شجاعت اور شہادت:

مکہ کا محاصرہ ہوا تو مُنذِر بن زبیر رحمہ اللہ بھی حُصَین بن نُمَیر کے خلاف مزاحمت میں شریک ہو گئے۔ وہ مال دار اور سخی انسان تھے۔ سخاوت کی انتہاء یہ تھی کہ دن کو شامیوں سے مقابلہ کرتے اور شب کو ان کی ضیافت کا اہتمام کرتے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ چالیس سالہ نواسا جبلِ ابوقبیس اور کوہِ قُعَیقعان کی بلندی پر شامیوں کے خلاف شمشیر زنی کے جوہر دکھاتا اور ساتھ میں یہ رجز پڑھتا:

لَمْ يَبْقَ إِلَّا حَسَبِيْ وَ دِيْنِيْ   وَصَارِمٌ تَلْتَذُّ بِهٖ يَمِيْنِيْ

''میری نسبی شرافت اور دین کے سوا کچھ نہیں بچا......

اور سوائے اس تیز دھار تلوار کے جس سے میرے دائیں ہاتھ کو لذت ملتی ہے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مسجد الحرام کے صحن سے نگاہ اٹھا کر انہیں چیتے کی طرح لڑتے دیکھتے تو بے اختیار فرماتے:

هٰذَا رَجُلٌ يُقَاتِلُ عَنْ دِيْنِهٖ وَحَسَبِهٖ. (یہ ہے وہ شخص جو اپنے دین اور حسب و نسب کے لیے لڑ رہا ہے۔)

ایک دن ایک شامی نے مُنذِر رحمہ اللہ کو دعوتِ مبارزت دے ڈالی۔ دونوں خچروں پر سوار ہو کر نیزوں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ ہر ایک کا نیزہ دوسرے کے جسم سے پار ہو گیا۔ منذر رحمہ اللہ کے قتل پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو سخت صدمہ ہوا، مگر دل کو تھام کر فقط اتنا فرمایا: ''ابو عثمان بھی کام آ گئے۔''

مکہ کی ایک خاتون نے منذر بن زبیر رحمہ اللہ کی شہادت پر بے ساختہ کہا۔

قُلْ لِأَبِيْ بَكْرِ السَّاعِيْ بِذِمَّتِهٖ   وَ مُنْذِرٍ مِثْلِ لَيْثِ الْغَابَةِ الضَّارِيْ

''ابوبکر سے کہو جنہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔ اور مُنذِر سے جو جنگل کے خونخوار شیر کی طرح حملہ آور ہوئے،

شَدَا لِهٰذِيْ لَكُمَا أُمِّيْ وَمَا وَلَدَتْ   لَا تُوْصِلُنِيْ إِلَى الْمَخْزَاةِ وَالْعَارِ

تم پر میری ماں قربان وہ (تم جیسا) نہ جن سکی، (شاباش کہ) تم نے مجھے ذلت و خواری میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔''[2]

حُصَین بن نُمَیر کا محاصرہ سخت سے سخت تر:

حُصَین رفتہ رفتہ گھیرا تنگ کرتا گیا۔ ربیع الاول کا چاند طلوع ہوا تو وہ مسجد الحرام کی قریبی پہاڑیوں: جبلِ ابوقبیس

---

[1] تاریخ دمشق: ٦٠/ ٢٩٠   [2] تاریخ دمشق: ٦٠/ ٢٩٠

فائدہ: منذر بن زبیر رحمہ اللہ کی صاحبزادی فاطمہ بنت منذر مشہور محدثہ ہیں، کتب حدیث میں ان کی خاصی روایات موجود ہیں جن میں سے زیادہ تر انہوں نے اپنی دادی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے لی ہیں۔ صرف صحیح بخاری میں فاطمہ بنت منذر کی دس روایات ہیں۔

اور کوہِ قُعَیقِعان پر قابض ہو چکا تھا۔ یہاں سے ۳ ربیع الاول کو اس نے منجنیق کے ذریعے محصورین پر سنگ زنی شروع کر دی[1] جو اتنی شدید تھی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء طواف کرنے کعبہ کے قریب نہیں آسکتے تھے۔[2]

مِسْوَر بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مُصعَب بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کی شہادت:

اس دوران عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دستِ راست حضرت مِسْوَر بن مَخرَمہ رضی اللہ عنہ سنگ باری کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔[3] عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے مُصعَب بن عبدالرحمٰن جو فقاہت میں اعلیٰ مقام کے باعث قاضی بھی رہ چکے تھے، ایک تیر سے گھائل ہو کر جاں بحق ہو گئے۔[4]

خارجیوں کے کچھ گروہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے رہے تھے مگر اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں رائے رکھنے پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ خوارج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتے تھے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ خوارج نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اس موقف پر ناراضی کا اظہار کیا جس پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے صاف صاف کہا کہ تم گمراہ ہو چکے ہو۔

آخر کار خوارج کا سردار نافع بن اَزرق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو کم عقل ٹھہرایا، ان کا خیال تھا کہ وقتی مصلحت یہی تھی کہ خوارج کے سامنے اپنا موقف نہ بیان کیا جاتا اور انہیں بہلا پھسلا کر ساتھ شامل رکھا جاتا، مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اعتقادی مسائل میں صاف گوئی کے قائل تھے۔ اگر اس پر دل برداشتہ ہو کر کوئی ساتھ چھوڑ جائے تو انہیں اس کی پروا نہ تھی۔[5]

کعبہ شریف کی آتش زدگی:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مسجد الحرام کے صحن میں ایک بڑا خیمہ لگا رکھا تھا جس میں مکہ کی عورتیں مجاہدین کو پانی پلاتیں، کھانا کھلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ایک دن حُصَین بن نُمَیر نے پہاڑی کی بلندی سے اس خیمے کو دیکھ کر کہا: ''اس سے شیر نکل کر مسلسل حملہ کرتے ہیں گویا یہ ان کی کچھار ہے۔ کوئی ہے جو اس خیمے کو مٹا دے۔'' ایک شامی سپاہی نے کہا: ''یہ میں کر کے دکھاؤں گا۔''

رات کو اس نے اپنے نیزے کے آگے جلتی ہوئی شمع باندھی، گھوڑے کو ایڑ لگا کر ممکنہ حد تک پہاڑی کی ڈھلوان پر نیچے آیا اور خیمے پر نیزہ دے مارا۔ نشانہ صحیح لگا۔ خیمہ جلنے لگا تو ہوا کے تیز جھونکوں نے شعلوں کا رخ کعبہ کی طرف کر دیا۔ کعبہ کی عمارت (جو اس وقت ۲۷ فٹ اونچی تھی) مسلسل پتھر لگنے سے پہلے ہی شکستہ ہو چکی تھی۔ اب آگ لگنے سے

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۶۳۳/۱۱

② المحن، ص ۲۰۳

③ طبقات ابن سعد متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۶۷/۲

④ التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثالث: ۶۲/۲، ط الفاروق قاہرہ؛ المحن، ص ۲۰۳؛ انساب الاشراف: ۳۵۰/۵، ط دار الفکر

⑤ انساب الاشراف: ۳۱۷/۵، ط دار الفکر

پہلے غلافِ کعبہ سوختہ ہوا، پھر کعبہ کی دیواروں نے جو اینٹوں کے علاوہ ساج کی لکڑی سے بنی تھی، آگ پکڑ لی۔ ①

یہ حادثہ ہفتہ ۵ ربیع الاول کو وقوع پزیر ہوا۔ ②

کعبہ کی سوختگی نے فریقین کے دل دہلا دیے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ایک کونے میں جا کر گریہ وزاری میں مشغول ہو گئے۔ وہ کہہ رہے تھے: ''یارب! یارب! مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا حادثہ ہوگا۔''

لشکرِ شام کا ایک پریشان حال شخص دوڑ کر آیا اور زمزم کے کنارے کھڑے ہو کر چلایا:

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے، دونوں فریق ہلاک ہو گئے۔'' ③

یزید بن مُعاویہ کی وفات:

اسی دوران ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو ۳۸ سالہ یزید بن مُعاویہ ۳ سال ۷ ماہ ۲۲ دن کی حکومت کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس وقت وہ ''حوارین'' میں مقیم تھا۔ اس کے لڑکے مُعاویہ بن یزید نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ④



---

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/۲/۹۲ باسناد حسن متصل، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

سند: علی بن المبارک، زید بن المبارک، عبدالملک بن عبدالرحمن الذماری، قاسم بن معن، ہشام بن عروۃ، عروۃ بن الزبیر

احوالِ رواۃ:

- علی بن المبارک (ابوالحسن الصنعانی، م ۲۸۱ھ) ثقہ (ارشاد القاصی والدانی الی تراجم الشیوخ الطبرانی: ۱/۴۴۱، ط دار الکیان ریاض)
- زید بن مبارک (م ۲۱۱ھ) ثقہ۔ (الثقات لابن حبان: ۸/ ۲۵۱) قال ابو داؤد والنسائی ثقۃ. (تہذیب التہذیب: ۳/۴۲۵)
- عبدالملک بن عبدالرحمن الذماری (م ۱۹۱ھ) ثقہ. (تہذیب التہذیب: ۶/۴۰۱)
- قاسم بن معن: ثقۃ حجۃ. (سیر اعلام النبلاء: ۸/۱۹۰)

ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر کی ثقاہت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

واخرجہ خلیفۃ بن خیاط فی تاریخہ بسند صحیح الی ابن جریج (ص ۲۵۲) وراجع: المحن لابی العرب، ص ۲۰۳، ۲۰۴

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۵

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۲

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۵





یزید کے احوال کا خلاصۂ بحث

یزید کی ولی عہدی سے اس کے انتقال تک پیش آنے والے اہم تاریخی قضیوں کے متعلق گزشتہ صفحات میں ہم نے جو بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ:

ا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے امت کی بہتری کو سامنے رکھتے ہوئے نیک نیتی کے ساتھ یزید کو جانشین نامزد کیا تھا۔

ا خلیفہ بننے تک اس کا کردار ایسا قابلِ اعتراض ظاہر نہیں ہوا تھا جیسا بعد میں مشہور ہوا۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

"بلاشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں۔"[1]

ا یزید کو ولی عہد بنانا جواز کی حد میں تھا۔ اگرچہ امت میں اس سے بہتر اور حکمرانی کے زیادہ اہل افراد بھی موجود تھے۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں:

"اس (یزید) کو خلافت کا اہل تو سمجھا جاسکتا تھا، لیکن امت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو دیانت وتقویٰ اور ملکی انتظام کے اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بدرجہا بلند مقام رکھتے تھے۔"[2]

ا یزید کی تخت نشینی کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے شرعی تحفظات اور اجتہاد کی بناء پر اس سے بیعت نہ کی اور اس کی حکومت کو بننے سے روکنے کی جدوجہد کی۔ باقی صحابہ اور تابعین نے دیگر شرعی دلائل کی بناء پر اس کی بیعت کر لی، اگرچہ طبعی طور پر اہلِ شام کے سوا، اکثر مسلمان اس سے خوش نہیں تھے۔

ا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اور یزید کی حکومت کے دوران بھی اصل نکتۂ اعتراض یہ تھا کہ موروثی حکومت اسلامی شورائیت کی روح کے خلاف ہے، اس لیے نظامِ حکومت قابلِ اصلاح ہے، اسے دوبارہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز پر لے جانا ضروری ہے۔ یہ ان حضرات کا مخلصانہ اجتہاد اور فتویٰ تھا۔

ا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور جمہور صحابہ کرام کے نزدیک بھی افضل صورت وہی تھی جس کے داعی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ تھے مگر ان کے خیال میں تبدیلی کی کوشش سے مزید مفاسد کا خطرہ تھا۔ اس لیے موجودہ حکومت اور نظام سے (جو جواز کی حدود کے اندر تھا) وفاداری نبھانا لازم تھا۔

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۵ ② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۵

ایزید کے فسق وفجور کی شہرت اس کے خلیفہ بننے کے بعد ہوئی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو خلیفہ کیا۔ اس وقت یزید اچھی صلاحیت میں تھا۔''

نیز تحریر فرماتے ہیں: ''یزید اوّل صالح تھا۔ بعد خلافت کے خراب ہوا۔''[1]

ا یزید کے فسق وفجور پر یقین کرتے ہوئے اہلِ مدینہ نے اس کے خلاف خروج کیا۔ ان کے فقہی مسلک کے مطابق فاسق حکمران کو معزول کرنا واجب تھا۔ ان کے سامنے وہ احادیث تھیں جن میں گناہوں کو ہاتھ کی طاقت سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حضرات اپنے فیصلے میں مجتہد تھے اس لیے ان کی جدوجہد پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔

ا جمہور صحابہ وتابعین سمیت امت کی اکثریت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی وجہ سے یزید کی بیعت برقرار رکھی جن میں حکام کی بیعت توڑنے سے منع کیا گیا ہے چاہے وہ ظالم اور فاسق ہوں۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے جن کے خیال میں یزید کا فسق ثابت نہ تھا جیسے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ۔

ا یزید سے منسوب کفریہ اعمال اور زنا بالمحارم جیسے الزامات جو ضعیف راویوں سے منقول ہیں، درست نہیں۔ البتہ یزید کے فسق پر علماء کا اتفاق ہے اور اس کی سب سے بڑی اور ناقابلِ تردید دلیل مدینہ کے متعدد صحابہ اور تابعین کا خروج ہے جو فسقِ یزید پر پختہ یقین کیے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ نیز اس کا ظلم وستم بھی فسق کی ایک بڑی وجہ بنتا ہے۔

ا حکمران بننے کے بعد یزید سے بعض ناروا فیصلے صادر ہوئے جو کئی قومی المیوں، سیاسی بحرانوں، ظلم وستم، رعایا کی ناراضی اور سربراہ کی بدنامی کا سبب بنے مگران اقدامات سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی تعلق نہ تھا کیوں کہ وہ غیب دان نہ تھے۔ یہ سب ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔

ا یزید کے بڑے غلط سیاسی اقدامات یہ تھے:

❶ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت لینے پر مصر تھا۔ مصلحت یہ تھی کہ وہ انہیں عزت واکرام کے ساتھ ان کے فتوے اور ضمیر کے فیصلے کے مطابق زندگی گزارنے دیتا۔ حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''انہیں (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو) یزید کی بیعت نہ کرنے پر قتل کا اندیشہ بلکہ یقین تھا، حالاں کہ خلافت قائم ہوجانے کے بعد بھی ہر فرد پر بیعتِ خلیفہ فرض نہیں۔ صرف اتنا فرض ہے کہ بغاوت نہ کرے۔''[2]

یزید نے انہیں بیعت سے دست کش رہنے کی گنجائش نہ دی جس کی وجہ سے ان حضرات کو مدینہ چھوڑ کر مکہ میں پناہ لینا پڑی اور بعد میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا سفر کرنا پڑا۔

❷ اس نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جیسے دور اندیش، معاملہ فہم اور تجربہ کار لوگوں کی جگہ عبیداللہ بن زیاد، عمر و بن سعید اور مسلم بن عقبہ جیسے سخت گیر حکام کو آزمایا اور معاملات کی باگ ڈور انہی کے حوالے کردی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں کربلا، مدینہ اور مکہ میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوا۔

[1] تالیفات رشیدیہ، ص ۲۴۲ [2] احسن الفتاوی: ۲/۲۱۸؛ شرح مسلم للنووی: ۲/۷۸، دار احیاء التراث

③ یزید نے ان حکام کے مظالم اور زیادتیوں پر پسِ پشت مذمتی فقرے کہہ دینے سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی، یزید کے اس طرزِ عمل کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اس کی یہ غلطی نا قابلِ انکار ہے کہ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو اس سنگین جرم پر کوئی سزا نہیں دی۔''①

اس طرزِ عمل کے باعث حکومت بدنام ہوئی اور حکمران بھی۔ اور ہر طرف فساد اور بدامنی کا دور دورہ ہو گیا۔

یزید کے بارے میں اسلاف کی آراء:

یزید سے محبت کا اظہار اور اس کی تعدیل کبھی علمائے اسلام کا طریقہ نہیں رہا۔ یزید کے کردار کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ان کے عالی قدر شاگرد امام مہنّیٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ کی گفتگو قابلِ غور ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں پوچھا۔

انہوں نے فرمایا: ''وہی تو تھا جس نے مدینہ میں سب کچھ کیا۔''

میں نے کہا: ''اس نے کیا کیا؟'' فرمایا: ''مدینہ منورہ میں نبی ﷺ کے صحابہ کو قتل کیا اور بہت کچھ کیا۔''

میں نے پوچھا: ''اور کیا کیا؟'' فرمایا: ''مدینہ کو لوٹا۔''

میں نے کہا: ''کیا اس سے حدیث نقل کی جا سکتی ہے۔''

فرمایا: ''اس سے حدیث نقل نہ کی جائے۔ کسی کے لیے مناسب نہیں کہ اس کی کوئی حدیث لکھے۔''

میں نے پوچھا: ''وہ کون تھے جنہوں نے مدینہ میں وہ سب کچھ کیا؟''

فرمایا: ''اہلِ شام۔'' میں نے کہا: ''اور اہلِ مصر؟''

فرمایا: ''نہیں۔ اہلِ مصر تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قضیے میں ملوث ہوئے تھے۔''②

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یزید بن مُعاویہ نے بعض بُرے کاموں کا ارتکاب کیا، ان میں سے ''وقعہ حرہ'' بھی ہے۔''③

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے صاحبزادے نے کہا: ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم یزید سے محبت رکھتے ہیں۔'' امام صاحب نے فرمایا: 'کیا کوئی آدمی جس میں کچھ خیر ہو، یزید سے محبت رکھ سکتا ہے؟''④

---

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۵

② لنا مُهَنّى قال سألت احمد عن يزيد بن معاوية بن ابى سفيان ، قال هو بالمدينة ما فعل، قلت : وما فعل؟ قال: قتل بالمدينة من اصحاب النبى ﷺ و فعل. قلت : وما فعل؟ قال: نهبها، قلت : فيذكر عنه الحديث؟ قال: لا يذكر عنه الحديث ولا ينبغى لاحد ان يكتب عنه حديثاً . قلت لاحمد : ومن كان معه بالمدينة حين فعل ما فعل؟ قال: اهل الشام، قلت له : واهل مصر؟ قال: لا، انما اهل مصر معهم فى امر عثمان رضی اللہ عنہ (السنة لابى بكر بن الخلال، ح: ۸۴۵ باسناد صحيح)

③ راس الحسين لابن تيمية، ص ۲۰۵

④ المسائل والاجوبة لابن تيمية، ص ۸۰

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یزید ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ہم نہ برا بھلا کہتے ہیں، نہ ان سے محبت کرتے ہیں۔''[1]

شوافع کے نامور عالم شیخ ابن الحداد (ابوبکر احمد بن حسین) فرماتے ہیں:

''ہم مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں اور یزید کے باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔''[2]

یزید کے فسق پر علماء متفق ہیں:

علمائے اُمت یزید کے فسق پر متفق چلے آرہے ہیں۔ صفِ اوّل کے چند علماء کی آراء پیشِ خدمت ہیں:

حضرت علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے یزید کو ''فاسق، شر پسند، نشہ باز اور ظالم'' لکھا ہے۔[3]

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے بھی یزید کو کھلم کھلا فسق میں مبتلا لوگوں میں شمار کیا ہے۔[4]

علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یزید بلاشبہ فاسق تھا۔''[5]

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یزید فاسق تھا اور فاسق کی ولایت (حکومت کا انعقاد) مختلف فیہ ہے۔''[6]

علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ''یزید کے فاسق ہونے میں کوئی شک نہیں۔''[7]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۵/۵، ط الرسالۃ .... مگر حافظ ذہبی کے اس قول کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یزید پر ضرور تنقید کرنا اور اس کی جو برائیاں واقعی ثابت ہیں، انہیں بیان کرنا بھی منع ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس عبارت کے چند پیراگراف کے بعد خود یزید کا ذکر یوں کرتے ہیں: "وکان ناصبیا غلیظا، جلفا یتناول المسکر ویفعل المنکر افتتح دولته بمقتل الشهید الحسین و اختتمها بواقعة الحرة فمقته الناس لم یبارک فی عمره." (وہ ناصبی، سخت گیر اور تند خو تھا۔ نشے کا عادی اور ناجائز امور کا مرتکب تھا۔ اس کی حکومت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر حرہ کے سانحے پر ختم ہوئی، لہٰذا لوگوں نے اس سے نفرت کی۔ پس اس کی عمر میں برکت نہ ہوئی۔)

② اجتماع الجیوش الاسلامیۃ لابن قیم، ص ۲۶

③ وعلی القول بانه مسلم فهو فاسق شریر سکیر جائر. (الصواعق المحرقۃ: ۲/۶۳۲)

④ ردالمحتار علی الدرالمختار: ۳/۴۲۶، کتاب الطلاق، باب الرجعۃ، مطلب فی حکم لعن العصاۃ

⑤ ویزید فاسق بلاریب. (العرف الشذی، باب ماجاء فی حرمۃ مکۃ: ۲/۲۱۳، ط دار التراث العربی)

مولانا شیر محمد علوی نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نایاب رسالے ''شہادتِ حسین و کردارِ یزید'' کے شروع میں ''التمہید فی بیان فسق یزید'' کے عنوان سے یہ مقدمے میں اور مولانا محمد حبیب اللہ علوی نے اپنی شاہکار تصنیف ''مقامِ حسین ویزید'' میں یزید کے متعلق برصغیر کے متعدد جلیل القدر علماء اور اکابر دارالعلوم دیوبند کی آراء ان کی عبارات کے ساتھ پیش کردی ہیں۔ ان اکابر میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید، مولانا عبدالحیٔ لکھنوی فرنگی محلی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، قاری محمد طیب قاسمی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، مولانا عبدالشکور ترمذی اور مفتی جمیل احمد تھانوی سمیت متعدد اکابر شامل ہیں۔ (مکمل حوالوں اور عبارات کے لیے دیکھیے: شہادتِ حسین و کردارِ یزید، ص ۱۵تا۴۵۔ مقامِ حسین ویزید، ص ۹۸ تا ۱۱۰) ان سب کی عبارات کا حاصل یہی ہے کہ یزید بلاشبہ فاسق اور ظالم تھا۔

⑥ امداد الفتاویٰ: ۴/۴۶۵، ط دارالعلوم کراچی

⑦ لایزید لاریب فی کونه فاسقا. (معارف السنن: ۶/۸، ط ایچ ایم سعید کمپنی)

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ یزید کے کردار کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں یزید کے فاسق ہونے کے بارے میں کسی تردد کا شکار نہیں ہوں۔ فسق یزید کا بنیادی سبب اس کے دورِ امارت کے یہ تین واقعات ہیں......"

اس کے بعد شیخ الحدیث رحمہ اللہ واقعۂ کربلا کے مجرموں کو سزا نہ دینے، حرہ میں صحابہ کرام اور تابعین کے قتل اور پھر مکہ مکرمہ پر یزید کی لشکر کشی کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس شبہے کا نہایت جامع اور محققانہ جواب دیتے ہیں کہ یزید کی بدسیرتی کی تمام روایات تو شیعوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"باقی جہاں تک شیعہ فرقے کی خرافات اور بہتان طرازیوں کا تعلق ہے تو اس سے حضرات خلفائے ثلاثہ، حضرت معاویہ اور امہات المؤمنین میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم تک مستثنیٰ نہیں۔ روافض نے جب ان اکابر صحابہ کے خلاف ایک طومار تصنیف کر دیا ہے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس فرقے نے یزید کے متعلق کیا کچھ خرافات وہذلیات نہ وضع کی ہوں گی۔ تاہم متذکرہ تین واقعات تاریخی تسلسل میں متواتر ہیں اور اکابر اہل سنت نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ حلقۂ اہل سنت کو حضرات صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ حضرات اہل بیت اطہار (جس کے مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مطہرات، تمام بنات طاہرات، اور تمام بنین طیبین رضی اللہ عنہم ہیں) کے فضائل ومناقب کو پوری سرشاری اور ایمانی جذبے کے ساتھ بیان کرنا چاہیے۔ اور جو لوگ یزید کی مدح وتوصیف بیان کرتے ہیں، ان کا راستہ روکنا چاہیے۔"[1]

یزید کے دورِ خلافت کے بارے میں جو حقائق صحیح روایات کی روشنی میں ثابت ہوئے، وہ ہم نے قارئین کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ جن باتوں کا ذکر صرف ضعیف روایات میں ہے، اور وہ صحیح روایات سے متعارض ہیں ہم ان کی تردید کر چکے ہیں۔ علماء کی آراء بھی قارئین کے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا مشکل نہیں۔

☆☆☆

---

① ماہنامہ صفدر: مضمون مکتوب سلیم بسلسلۂ فسق یزید، ص ۱۵، ۱۶، شمارہ: ۵۸، دسمبر ۲۰۱۵ء

یاد رہے کہ متعدد جلیل القدر علماء یزید کے ایمان کو مشکوک جانتے تھے۔ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں: فنحن لا نتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ. (شرح عقائد نسفی، ص ۳۷۵) علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں: " لو سلم ان الخبیث کان مسلما فھو مسلم جمع من الکبائر ما لا یحیط بہ نطاق البیان. (روح المعانی ۱۳: ۲۲۹، العلمیہ)

اسی طرح سلفِ اوّل کے متعدد محدثین اور فقہاء یزید پر لعنت کے جواز کے بھی قائل تھے جیسا کہ علامہ ابن جوزی نے ایک کتاب "الرد علی المتعصب العنید لمن منع من ذم یزید" اسی موضوع پر لکھی ہے، جس کا اُردو ترجمہ مفتی محمد شعیب نے کیا ہے جو دار التقویٰ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ اس سے لعنت کے قائل طبقے کے دلائل بھی سامنے آ جاتے ہیں مگر جمہور کا مذہب احتیاط پر مبنی ہے تاکہ کہیں جاہل لوگ یزید پر لعنت کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کا راستہ نہ بنا لیں، اس لیے جمہور نے کفر یا نفاق کا حکم لگانے یا لعنت کرنے سے منع کیا ہے مگر فسق میں نہ کسی کو شک ہے نہ ہی کسی نے اس میں توقف کیا ہے۔ یزید پر لعنت کے عدمِ جواز پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: غایۃ یزید وامثالہ من الملوک ان یکونوا فساقا. "یزید اور اس جیسے بادشاہوں کے بارے میں حد یہ ہے کہ وہ فاسق تھے۔" (منہاج السنۃ: ۴/۵۶۷) معلوم ہوا کہ یزید پر لعنت سے منع کرنے والے علماء بھی اس کے فسق کو مانتے ہیں۔

مُعاویہ بن یزید

یزید کا نوجوان بیٹا مُعاویہ اخلاق و کردار اور سیاست و تدبر میں ہر لحاظ سے قیادت کے لائق تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس وقت بنو امیہ کا کوئی فرد شرافت اور عبادت گزاری میں اس کے برابر نہ تھا۔[1] یزید نے اس کو ولی عہد بنایا تھا۔[2]

اس کی ولادت ۴۳ھ میں ہوئی تھی۔ گوری رنگت، موٹی آنکھوں، اونچی ناک اور گھنگریالے بالوں کے ساتھ وہ نہایت حسین لگتا تھا۔ وہ ایک مدت سے بیمار تھا۔ منصبِ خلافت سنبھالنے کے باوجود ایک بار بھی ایوان میں نہ آسکا۔[3]

اسے سیاست میں حصہ لینے کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے سابقہ عہدے داروں کو جوں کا توں رہنے دیا۔ ایک قول کے مطابق چالیس دن اور دوسرے قول کے مطابق ڈیڑھ ماہ حکومت کر سکا۔[4]

مگر یہ مختصر سی مدت اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہے کہ اس نے نظامِ حکومت کو اس کی اصل شکل و ہیئت پر لانے کی پوری کوشش کی جو خلفائے راشدین کی اختیار کردہ اور اُمت کی پسندیدہ تھی۔ اس نے سیاسی بحران کے حل کا راستہ یہی نکالا کہ انتقالِ اقتدار کا معاملہ مکمل طور پر مسلمانوں کی رضامندی اور شورائیت پر چھوڑ دیا جائے جیسا کہ اکابر مدینہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ و عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا موقف بھی یہی چلا آ رہا تھا۔

---

① تاریخ دِمَشق: ۲۸۹/۲۷، ترجمة: عبد الله بن جعفر رضی اللہ عنہ

② طبقات ابن سعد: ۳۸/۵ صادر ؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۵ ؛ تاریخ دِمَشق: ۲۵۹/۲۷

③ تاریخ دِمَشق: ۲۹۹/۵۹

④ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۵ ز

کیا بنوامیہ کی تاریخ عباسی دور میں معاندانہ جذبات کے تحت گھڑی گئی؟

مُعاویہ بن یزید کے محاسن پڑھ کر دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ خاندانِ بنوامیہ میں اچھے، دین دار اور خدا ترس لوگ بھی بکثرت تھے، اس لیے تمام اموی خلفاء، شہزادوں اور اُمراء کو یکسر فاسق، بدکار اور ظالم تصور کر لینا بڑی ناانصافی ہوگی۔ دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ قدیم مسلم مؤرخین نے بنوامیہ کے بارے میں بھی عموماً وہی چیزیں نقل کی ہیں جو اسناداً ان تک پہنچی تھیں۔ یہ خیال تشدد پر مبنی ہے کہ بنوامیہ کی ساری تاریخ عباسی دور میں عجم کے درباری مؤرخین نے معاندانہ جذبات کے تحت گھڑی تھی۔ اگر ایسا ہی تھا تو یزید کے بیٹے مُعاویہ کی کردار کشی کیوں نہ کی گئی؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو سراپا محاسن کیوں بتایا گیا؟ بنوامیہ کی فتوحات کو ایک ایک جزء کی تفصیل کے ساتھ کیوں نقل کیا گیا؟ عبدالملک اور اس کے بیٹوں کے بہت سے کارنامے کیوں تاریخ کا حصہ بنائے گئے؟ بلکہ حجاج بن یوسف جیسے سخت گیر اموی حاکم کی بھی بہت سی خوبیاں اس تاریخ میں کیوں باقی رہنے دی گئیں؟ دوسری طرف دورِ بنوعباس میں مرتب ہونے والی انہی کتب میں عباسی حکمرانوں کے بہت سے معایب کس حکمت کے تحت نقل کر دیے گئے؟؟ ...... یہ حقائق گواہ ہیں کہ قدیم مؤرخین میں سے یعقوبی، مسعودی اور ابوالفرج اصفہانی جیسی اِکادُکا مثالوں کو چھوڑ کر اکثر حضرات غیر جانب دار تھے۔ ان سب پر علی الاطلاق بنوامیہ کے معایب گھڑنے کا الزام لگا دینا غلط ہے۔ ایک حد تک مخالفانہ پروپیگنڈا تو بنوامیہ ہی نہیں، بنوعباس بلکہ ہر دور میں ہر سلطنت کے خلاف اس دور کی حزبِ اختلاف نے ضرور کیا ہے۔ کسی بھی حکمران اور کسی بھی سلطنت کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے اور روایت سازی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بنوامیہ کے خلاف روایت سازی نسبتاً کچھ زیادہ ہوئی؛ کیوں کہ ان کا دور سخت سیاسی رقابت اور کش مکش کا تھا مگر یہ محض ایک خام خیالی ہے کہ بنوامیہ کے سارے معایب من گھڑت ہیں اور ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص گویا فرشتہ تھا لہٰذا اس کے متعلق ہر منفی بات دشمنوں ہی کی خانہ ساز ہوگی۔

مرض کی شدت میں جب اس کے بچنے کی امید نہ رہی اور بنوامیہ کے عمائد نے اصرار کیا کہ وہ اپنے بعد کے لیے کسی کو خلیفہ نامزد کرتا جائے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ①

جب امرائے شام نے اسے ولی عہدی کی ضرورت سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہا:

''اللہ مجھ سے اس بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرے گا البتہ تم اتنا کرنا کہ میں مر جاؤں تو ولید بن عتبہ نمازِ جنازہ پڑھائیں، جب تک خلافت کا مسئلہ حل نہ ہو تب تک ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نمازوں میں امامت کرتے رہیں۔'' ②

اس کی والدہ نے دودھ کا واسطہ دے کر اس پر زور دیا کہ وہ اپنے بھائی خالد بن یزید کو جانشین بنا دے مگر اس نے عجیب جواب دیا: ''میں زندگی میں بھی یہ بارِ گراں اٹھاؤں اور مر کر بھی!! میں ایسا نہیں کروں گا۔'' ③

یہ وہی جواب تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بسترِ مرگ پر اس قسم کے اصرار کے جواب میں دیا تھا:

''اَکْرَہُ اَنْ اَتَحَمَّلَهَا حَيًّا وَ مَيِّتاً.'' ④

اس فیصلے اور اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مُعاویہ بن یزید کم عمری کے باوجود نہایت مدبر اور دور اندیش انسان تھا۔ اگر زندگی وفا کرتی تو وہ بہت اچھا حکمران ثابت ہوتا۔

اس کی انگوٹھی کا نقش تھا: بِاللهِ يَثِقُ مُعَاوِيَة (مُعاویہ کو اللہ ہی پر بھروسہ ہے۔) ⑤

مُعاویہ بن یزید کی موت کی خبر، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حُصَین بن نُمَیر میں جنگ کا خاتمہ:

یزید بن مُعاویہ کی وفات ۱۴ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ یہ خبر سترہ دن میں یکم ربیع الآخر کو مکہ پہنچی جہاں حُصَین بن نُمَیر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حالتِ جنگ میں تھے۔ ⑥

دِمَشق میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے کچھ حمایتی اور خبر رساں موجود تھے جو انہیں فوراً ہر اطلاع پہنچا دیتے تھے۔ اس لیے یزید کی موت کی اطلاع حُصَین بن نُمَیر سے بھی پہلے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ملی تھی۔ انہوں نے فوراً اہلِ شام کو پکار کر کہا: ''آپ اب کس کی خاطر لڑ رہے ہیں؟ آپ کے سربراہ کی تو وفات ہوگئی ہے۔''

اہلِ شام کہنے لگے: ''اب ہم یزید کے جانشین کی خاطر لڑیں گے۔''

چالیس دن بعد مُعاویہ بن یزید کی وفات کی خبر بھی آن پہنچی۔ یہ خبر اور اس کی تفاصیل بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پہلے معلوم ہوگئیں۔ تب انہوں نے اہلِ شام سے کہا: ''یزید کے جانشین کی بھی وفات ہوگئی ہے۔''

---

① تاریخ دمشق: ۳۰۱/۵۹، ۳۰۲

② تاریخ دمشق: ۲۹۹/۵۹، ۳۰۲

③ "لا احملها حیا و میتا." تاریخ دمشق: ۳۰۳/۵۹

④ تاریخ دمشق: ۴۲۸/۴۴

⑤ تاریخ دمشق: ۳۰۳/۵۹

⑥ اخبار مکۃ للازرقی: ۱۹۷/۱، ط دار الاندلس بیروت

اہل شام نے کہا: ''اب ہم اس کے جانشین کی خاطر لڑیں گے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس نے کسی کو جانشین نہیں بنایا۔''

حُصَین بن نُمَیر کہنے لگا: ''اگر آپ جو کہہ رہے ہیں وہ درست ہے تو بہت جلد ہمیں بھی پتہ چل جائے گا۔''①

جب حُصَین بن نُمَیر کو سرکاری قاصد سے مُعاویہ بن یزید کی موت کی خبر ملی اور ساتھ ہی یہ تفصیل بھی کہ اب اُمت کا کوئی خلیفہ نہیں ہے، تو اس نے محاصرہ ختم کر کے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ خود آکر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملا۔ وہ حرم کے کبوتروں کا لحاظ کر رہا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر بولے: ''ان کی اذیت تمہیں برداشت نہیں مگر یہاں مسلمانوں سے لڑنے پر تلے ہو؟''

حُصَین نے نادم ہوکر کہا: ''اب میں آپ سے نہیں لڑوں گا۔ ہمیں طواف کا موقع دیں۔ ہم لوٹ جائیں گے۔''

ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ اور یہ اعلان کرا دیا کہ اہلِ شام میں سے جو چاہے وہ عام مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوجائے جو چاہے واپس چلا جائے۔②

حُصَین بن نُمَیر کی پیش کش اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی دوراندیشی:

بلاذری کی صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ واپسی سے پہلے حُصَین بن نُمَیر نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا:

''میں کل حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان آپ سے اس شرط پر بیعت کرلوں گا کہ آپ شام تشریف لے چلیں اور وہیں رہیں۔ ہم آپ کے دفاع میں آخری سانس تک لڑیں گے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

''میں اپنے ارکانِ شوریٰ سے پوچھے بغیر کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ ان سے گفتگو کر کے آپ کو بتادوں گا۔''

آپ نے اپنے مشیروں سے رائے مانگی تو وہ بولے: ''کیا آپ اللہ کے حرم اور اس کی امان کو ترک کردیں گے جہاں اللہ نے آپ کی نصرت کی ہے، اس کی بجائے آپ ایسے لوگوں سے مدد لیں گے جنھوں نے بیت اللہ پر حملہ کیا؟''

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے حُصَین کو پیغام بھیج دیا: ''میرے ساتھی شام جانے پر آمادہ نہیں ہیں۔''③

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کا اہلِ شام پر عدمِ اعتماد ایک فطری سی بات تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے یہ ساتھی تعداد میں دو ہزار بھی نہ تھے۔ اگر اس پیش کش کے پس پردہ کوئی فریب ہوتا تو شام جا کر سب کے سب مارے جاتے۔ اگر حُصَین بن نُمَیر مخلص بھی تھا تب بھی معلوم نہ تھا کہ امرائے دمشق کا رویہ کیا ہوتا؟ ہاں اگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت اتنا بڑا لشکر ہوتا جس کے ہوتے ہوئے شامی امراء قوت کے لحاظ سے مغلوب ہوتے تو پھر شام جانے میں کوئی

---

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۵۵

② تاریخ الطبری: ۵/ ۵۰۱ عن اسحٰق بن اسرائیل بسند ضعیف

③ انساب الاشراف: ۵/ ۳۵۱، ط دار الفکر

مضائقہ نہ ہوتا۔ بصورتِ دیگر احتیاط کی بات یہی تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ وہیں رہ کر امرائے شام کی حمایت حاصل کرتے اور آپ نے ایسا ہی کیا۔ مستقبل کے حالات نے گواہی دی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بالکل درست اور دوراندیشی پر مبنی تھا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے منسوب ہشام کلبی کا افسانہ:

ہشام کلبی کی روایت میں ہے کہ:

حُصَین نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پیش کش کی کہ وہ اس کے ساتھ شام چلے جائیں، شامی فوج اس کے ساتھ ہے اور وہاں بھی سب لوگ ان سے بیعت کر لیں گے۔ شرط یہ ہے کہ باہم خون ریزی میں اب تک جو لوگ مارے گئے ہیں ان کا خون معاف کر دیا جائے۔ یہ سن کر ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے چیختے ہوئے کہا: ''میں بھلا یہ خون معاف کر دوں! میں تو ایک ایک کے بدلے تمہارے دس دس کو قتل کر کے بھی چین سے نہ بیٹھوں گا۔''

حُصَین آہستہ گفتگو کر رہا تھا، بولا: ''آپ کو جو شخص سیاست دان، مہذب اور دانش مند سمجھتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ میں نرمی سے بات کر رہا ہوں اور آپ چیخ کر جواب دے رہے ہیں۔ میں خلافت پیش کر رہا ہوں، آپ قتل و غارت کی بات کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ساتھیوں سمیت لوٹ گیا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ بعد میں شرمندہ ہوئے اور اسے یہیں بیعت کرنے کا کہا مگر خود شام جانے پر پھر بھی تیار نہ ہوئے۔ پس حُصَین بھی واپس نہ آیا۔ [1]

یہ روایت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بے عقل اور مخالفِ شرع ثابت کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ اس کا راوی ہشام کلبی رافضی ہے۔ وہ خود بھی اسے یقین سے نہیں نقل کر رہا بلکہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب الفاظ کو شک کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے:

''فزعم بعض قریش انه قال: انا اهدر تلک الدماء ؟اما واللّٰه! لا ارضیٰ ان قتل بکل رجل منهم عشرة...... الخ''

سند کے لحاظ سے یہ بالکل ساقط ہے۔ عقلاً بھی اسے نہیں مانا جا سکتا کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے عالم فاضل، سنت کے عاشق اور خدا ترس صحابی ایک کے بدلے دس سے بھی زیادہ جانیں لینے پر تلے ہوں۔ یہ اسلام تو نہ ہوا، جنگل کا قانون ہوا جس کی توقع صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے تربیت یافتہ بھانجے سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اتنا ثابت ہے کہ حُصَین بن نُمَیر نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شام چلنے اور ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر انہوں نے معذرت کر لی تھی جس کی ٹھوس وجوہ موجود تھیں۔

☆☆☆

---

[1] تاریخ الطبری: ۵/۵۰۱، ۵۰۲ ...... یہ روایت بلاذری نے ایک دوسری سند سے بھی نقل کی ہے۔ (انساب الاشراف: ۵/۳۶۷، ط دار الفکر)
مگر اس سند میں ہیثم بن عدی ہے جسے متروک الحدیث اور کذاب کہا گیا ہے۔ (میزان الاعتدال: ۴/۳۲۴) لہٰذا اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ نہ ہی یہاں تعدد طرق سے روایت میں کوئی وزن پیدا ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ کذاب قسم کے راوی درجنوں بھی جمع ہو جائیں تو روایت میں قوت پیدا نہیں ہوتی۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص کا اظہارِ افسوس اور تنبیہ:

حُصین بن نُمیر کی واپسی کے کچھ دنوں بعد عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بعض رفقاء کے ساتھ عمرہ کرنے مکہ معظمہ آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ کعبہ سوختہ ہو چکا ہے، اور اس کی دیواروں کے پتھر نہایت خستہ وشکستہ حالت میں اُدھڑے ہوئے ہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ان کے رخساروں کو تر کرنے لگے۔ انہوں نے فرمایا:

''لوگو! اگر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تمہیں یہ بتادیتے کہ تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے سے قتال کرو گے اور اپنے رب کے گھر کو جلاؤ گے تو تم کہتے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بڑا جھوٹا کوئی نہیں۔ کیا ہم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کو قتل نہیں کردیا؟ کیا ہم نے اپنے رب کے گھر کو جلا نہیں دیا؟ اللہ کی قسم! تم ایسا کر چکے ہو۔ تم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے کو بھی قتل کیا۔ تم نے اللہ کے گھر کو بھی جلایا۔ پس اب تم اس کی سزا کے منتظر رہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عبداللہ بن عمرو کی جان ہے، اللہ ضرور تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے آپس میں لڑائے گا اور تمہیں خانہ جنگی کا مزا چکھائے گا۔''

یہ آخری الفاظ انہوں نے تین بار دُہرائے۔ پھر آواز کو مزید بلند کر کے فرمایا:

''کہاں ہیں نیکی کا حکم دینے والے؟ کہاں ہیں گناہوں سے روکنے والے؟ اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں عبداللہ بن عمرو کی جان ہے، اگر اللہ نے تمہیں گروہوں میں بانٹ کر لڑا دیا اور تمہیں خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا تو اس وقت زمین کی تہہ اس شخص کے لیے زمین کی سطح سے بہتر ہوگی جس نے نہ نیکی کا حکم دیا نہ گناہوں سے منع کیا۔''[1]



---

① اخبار مکة لابی الولید الازرقی: ۱/۱۹۶، ۱۹۷

ابوالولید الازرقی نہایت ثقہ محدث، فقیہ اور مؤرخ تھے۔ امام بخاری نے بھی ان سے روایت لے کر ''صحیح بخاری'' میں نقل کی ہے۔ فقہائے شافعیہ کی صفِ اول میں ان کا شمار ہے۔ انہوں نے براہِ راست امام شافعی سے فقہ اور حدیث کا علم حاصل کیا تھا۔ الازرقی نے ''اخبار مکۃ'' میں حتی الامکان صحیح اور حسن روایات جمع کی ہیں گرچہ اس میں بعض روایات ضعیف بھی ہیں مگر مجموعی طور پر اس کتاب کو محدثین کے ہاں قبولِ عام حاصل رہا ہے۔

مذکورہ روایت کی سند یہ ہے: ابو الولید حدثنی جدی احمد بن محمد، و ابراهیم بن محمد الشافعی، عن مسلم بن خالد، عن ابن خثیم، عن عبد اللّٰہ بن سعد انه دخل مع عبدالله بن عمرو بن العاص.

احوال الرواة:

● ابراهيم بن محمد الشافعي: م ۲۳۷ھ، ابن عم الامام الشافعي، ثقة. (سير اعلام النبلاء: ۱۱/۶۶)

● مسلم بن خالد: م ۱۸۰ھ، فقيه، صدوق، كثير الاوهام. (تقريب التهذيب، ترجمة نمبر: ۶۶۲۵)

● ابن خثيم (عبدالله بن عثمان بن خثيم، المعروف ابن خثيم المكى، م ۱۳۲ھ) صدوق. (تقريب التهذيب ترجمة نمبر: ۳۴۶۶)

● عبد اللّٰہ بن سعد: غالباً یہ وہ عبیداللہ بن سعد ہیں، جو یسار بن نمیر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایات لیتے تھے اور ان سے شریک بن عبداللہ نے روایات لی ہیں۔ انہیں ثقات میں شمار کیا گیا ہے۔ (الثقات لمن لم يقع فى الكتب الستة: ۷/۲۲) تاہم راقم کو شک ہے کہ یہ وہی عبیداللہ ہیں یا کوئی اور۔

اس روایت میں اگر سنداً کچھ ضعف ثابت ہو بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ یہ روایت ایک طرف کسی اسلامی اصول سے متصادم نہیں ہے، دوسری طرف اس دور کے تاریخی حوادث کے سیاق کے عین مطابق ہے۔ اس لیے اس کا درجہ بلاشبہ جید روایات میں ہے۔

خلافتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

۹ رجب ۶۴ھ......تا......۱۷ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ
3 مارچ 684ء......تا......5 اکتوبر 692ء



مناقبِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور رکنِ عشرۂ مبشرہ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر تھے۔ آپ کی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن تھیں۔ پس عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جو عالی نسبتیں حاصل تھیں، ان میں سے ہر ایک قابلِ رشک تھی۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قد درمیانہ، رنگت گندمی اور بدن دبلا پتلا تھا۔ ڈاڑھی سرخ اور ہلکی سی تھی۔ سر کے بال کندھوں کو چھوتے تھے۔ طبیعت میں غیرت وحمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ [1]

ولادت اور بچپن:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہجرت کے پہلے سال پیدا ہوئے تھے۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے آپ پہلے لڑکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لعابِ دہن اور کھجور کی گھٹی دی اور برکت کی دعا فرمائی۔ ان دنوں یہود نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ جادوٹونے کے ذریعے مسلمانوں میں لڑکوں کی پیدائش بند کرا چکے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت سے ان کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو گیا اور مسلمانوں کو بے حد خوشی ہوئی۔ [2]

روایات میں آتا ہے کہ جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو مدینہ کے مسلمانوں نے مسرت کے طور پر تکبیر کے نعرے بلند کیے جس سے سارا شہر گونج اٹھا۔ [3] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بابرکت نواسے کو اٹھا کر مدینہ منورہ میں گھمایا تاکہ یہود کی رسوائی ہو۔ [4]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو بیعت نہیں فرماتے تھے مگر جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے والد کے کہنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

① البداية والنهاية: ١٩٣/١٢؛ سير اعلام النبلاء: ٣٧٠/٣، ط الرسالة

② صحيح البخاري، ح: ٥٤٦٩، كتاب العقيقة، باب تسمية المولود؛ ٣٩٠٩، كتاب المناقب، باب هجرة النبي ﷺ

③ مستدرک حاکم، ح: ٦٣٣٠

④ طبقات ابن سعد، متمم الصحابة، الطبقة الخامسة: ٣٤/٢؛ البداية والنهاية: ١٨٨/١٢

بیعت کے لیے آئے تو آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے انہیں بیعت فرما لیا۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، عمر بن ابی سلمہ اور کئی دوسرے بچوں کو بھی لایا گیا تھا۔ باقی بچے تو جھجک رہے تھے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر بیعت کرنے لگے۔ حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا: "اِنَّهُ ابْنُ اَبِيْه." (ہے ناں اپنے باپ کا بیٹا!)

اس وقت ان کی عمر سات یا آٹھ سال تھی۔ [1]

آپ حضور ﷺ کے گھر اکثر آتے رہتے تھے کہ یہ آپ کی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مسکن تھا۔ [2]

دلیری اور قائدانہ صلاحیت:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بچپن سے بڑے بہادر اور قیادت کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔ ایک بار وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مدینہ کی گلیوں میں کھیل رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر بچوں کو ڈرانے کے لیے زور کی چیخ ماری، بچے ڈر کر بھاگ گئے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے الٹے پاؤں پیچھے ہٹتے ہوئے ساتھیوں کو پکارا:

''بھائیو! مجھے امیر بنا کر اس شخص پر حملہ کر دو۔''

ایک بار گلی میں کھیل رہے تھے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ اس وقت وہ خلیفہ تھے۔ بچے مرعوب ہو کر اِدھر اُدھر کھسک گئے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وہیں کھڑے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا بات ہے تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں بھاگے؟'' جواب دیا: ''امیر المؤمنین! نہ تو میں نے کوئی جرم کیا ہے جو آپ سے ڈروں اور نہ ہی راستہ ایسا تنگ ہے کہ میں ہٹ کر اسے آپ کے لیے کشادہ کروں۔'' [3]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ صرف ۱۳ سال کی عمر میں دورِ صحابہ کی سب سے بڑی لڑائی جنگِ یرموک میں شریک ہوئے تھے۔ آپ اپنے والد زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے۔ جب رومی پسپا ہو کر بھاگتے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ان کے زخمیوں کو ٹھکانے لگاتے۔ [4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ افریقہ فتح کرنے والے لشکر میں شامل تھے۔ آپ کی حیرت انگیز تدبیر کی وجہ سے ۲۰ ہزار مسلمان، ایک لاکھ بیس ہزار کفار پر غالب آگئے۔ آپ نے اس لڑائی میں خود چند سواروں کے ساتھ حملہ کر کے افریقی بادشاہ جُرجیر کو قتل کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیوں کی کارروائی روکنے کے لیے آپ نے جان کی بازی لگائی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ رضی اللہ عنہ نے جہادِ قُسطَنطِينِيَّہ میں بھی شرکت کی۔ [5] افریقہ کی مہمات میں قیادت کے جوہر دکھائے۔ ''سُوسہ'' کو فتح کیا۔ [6] حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ آپ کا بڑا اکرام کرتے۔ ایک بار آپ

---

① البداية والنهاية: ۱۸۸/۱۲ بحواله تاريخ دمشق

② سير اعلام النبلاء: ۳/۳۶۴، ۳۶۵، ط الرسالة، الاصابة: ۸۰/۳

③ يا امير المؤمنين! لم اجرم فاخالك، ولم تكن الطريق ضيقة فاوسع لك . (تاريخ دمشق: ۱۶۵/۲۸)

④ السنن الكبرىٰ للبيهقي، ح: ۱۸۱۶۷، صحيح البخاري، ح: ۳۹۷۵، كتاب المغازي، باب قتل ابي جهل

⑤ البداية والنهاية: ۱۸۷/۱۲ ⑥ البيان المغرب: ۱/۱۶، ۱۷



آئے تو کہا: ''مرحبا، رسول ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے، حواری رسول ﷺ کے بیٹے!'' اور ایک لاکھ کا عطیہ دیا۔ [1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے محبت:

صدیقۂ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بیٹا بنایا ہوا تھا، اسی لیے جب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی کنیت تجویز کرنے کے لیے مشورہ کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا تھا: ''تم اپنے بیٹے عبداللہ کے نام پر اپنی کنیت اُمّ عبداللہ کیوں نہیں رکھ لیتیں۔'' اس کے بعد سے وہ اُمّ عبداللہ کہلانے لگیں۔ [2]

جنگِ جمل میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اَشتر نخعی سے نبرد آزما ہوئے اور اپنی خالہ کی حفاظت کرتے ہوئے لہولہان ہو گئے۔ ۴۰ سے زیادہ کاری زخم لگے۔ بظاہر بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب ان کی جان بچ جانے کی اطلاع ملی تو خوشی سے سجدے میں گر گئیں اور خوش خبری دینے والے کو دس ہزار درہم انعام میں دیے۔

ان کے بھائی عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کہتے تھے: ''میں نے اپنے والد زبیر رضی اللہ عنہ اور خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی کے لیے اتنی دعائیں کرتا نہیں دیکھا جتنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے۔'' وہ یہ بھی کہتے ہیں: ''خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے زیادہ محبت عبداللہ بن زبیر سے تھی۔'' [3]

زہد و عبادت:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ زہد و عبادت میں اپنی مثال آپ تھے۔ نماز میں یکسوئی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو دنیا کی ہر چیز سے ذہنی و قلبی رشتہ کٹ جاتا۔ نوافل میں طویل طویل رکعتیں پڑھتے۔ قیام کے دوران بدن کو ذرا بھی حرکت نہیں ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لکڑی گاڑ دی گئی ہو۔ بعض اوقات اتنا لمبا سجدہ کرتے کہ چڑیاں آ کر پشت پر بیٹھ جاتیں۔ [4] ایک دن نماز پڑھ رہے تھے کہ چھت پر سے ایک سانپ گرا اور ان کے بیٹے کو لپٹ گیا۔ عورتیں چیخنے چلانے لگیں، آخر گھر کے دیگر افراد دوڑ کر آئے اور سانپ کو مار ڈالا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس دوران نماز میں منہمک رہے۔ انہیں ذرا بھی خبر نہیں ہوئی۔ سلام پھیرا تب لوگوں نے اس حادثے کی خبر دی۔ [5]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے نماز ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سیکھی تھی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے۔ (اسی لیے نماز میں اتنا خشوع و خضوع ہوتا۔) [6]

مکہ کے محاصرے کے دوران جب منجنیقیں پتھر برسا رہی تھیں تب بھی نماز کے دوران آپ کے اطمینان اور یکسوئی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ایک بار منجنیق کا پتھر مسجد الحرام کے ایک بالا خانے پر لگا جس سے ایک ٹکڑا اُڑ کر ان کے حلق

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۶۷، ط الرسالۃ

② مستدرک حاکم، ح: ۷۷۳۸، قال الذھبی صحیح؛ الجامع لابن وھب لعبداللہ بن وھب المصری م ۱۹۷، ص ۱۲۷؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۸/۲۳؛ مسند احمد، ح: ۲۵۵۳۰

③ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۶۷، ط الرسالۃ

④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۱۸۹

⑤ تاریخ دمشق: ۲۸/۱۷۴

⑥ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۱۸۹

اور ڈاڑھی کے درمیان سے گزر گیا۔ تب بھی یہ پورے انہاک سے نماز میں مشغول رہے، جسم کو جنبش تک نہ ہوئی۔ [1]

مجاہد کہتے تھے: ''ابن زبیر رضی اللہ عنہ جیسی عبادت کی طاقت کسی میں نہیں۔ ایک بار سیلاب نے کعبہ کو گھیر لیا تو وہ تیر کر طواف کرتے رہے۔ مشہور تھا کہ تین چیزوں میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں: عبادت میں، دلیری میں اور قوتِ بیان میں۔'' [2]

آپ کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا تھا اس لیے آپ ''حمامۃ المسجد'' (مسجد کے کبوتر) کے لقب سے مشہور تھے۔ [3]

علمی و انتظامی کمالات:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خصوصی توجہ اور تربیت نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو حدیث و فقہ کا بحرِ ذخار بنا دیا تھا۔ کئی مشہور فقہاء و محدثین مثلاً: طاؤس بن کیسان، عمرو بن دینار، ثابت البنانی، ابن ابی ملیکہ، وہب بن کیسان، ابواسحاق السبیعی، سعید بن میناء اور ابوالزبیر آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کے بھائی عروہ بن الزبیر، بھتیجے ہشام بن عروہ اور بھتیجی فاطمہ بنت منذر بن زبیر بھی آپ کے گہوارۂ تربیت سے فقہاء اور محدثین بن کر نکلے۔ [4]

کہا جاتا تھا کہ مدینہ منورہ میں عبداللہ نام کے چار حضرات فقہ میں سب سے بلند پایہ ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔ خصوصاً مناسکِ حج کے شرعی دلائل پر نگاہ اور جزئیات کے استخراج میں آپ کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ حج کے موقع پر آپ فرمایا کرتے تھے:

''حاجیو! ہم سے مسائل پوچھو کہ قرآن مجید ہمارے ہاں اترا کرتا تھا، ہم اس کے معانی سے آگاہ ہیں۔'' [5]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب اپنے زمانے میں اغلاط سے پاک، قرآن مجید کے نسخوں کی تیاری کا کام شروع کرایا تو اس کے ذمہ دار حضرات میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور دوسرے قاری صحابہ کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ [6] فصاحت و بلاغت اور فنِ خطابت میں آپ کا سکہ پورے عرب پر جما ہوا تھا۔ آواز بلند اور بارعب تھی۔ جب تقریر کرتے تو دور دور تک آواز جاتی اور وادیاں گونج اٹھتیں۔ [7]

سیاسی و انتظامی معاملات اور دنیاوی امور میں بھی آپ نہایت ہوشیار اور زیرک تھے۔ آپ کے پاس مختلف قبائل اور نسلوں کے غلام تھے جو الگ الگ زبانیں بولتے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہر ایک سے اس کی مادری زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ ان کی رفاقت میں رہنے والے ایک صاحب عمر بن قیس کہتے ہیں:

''میں جب انہیں دنیاوی معاملات میں مشغول دیکھتا تو (دنیا میں ان کی مہارت دیکھ کر) محسوس ہوتا کہ انہیں اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور جب آخرت کے متعلق ان کی حالت دیکھتا تو لگتا تھا کہ وہ پلک جھپکنے کے برابر بھی دنیا میں مشغول نہیں ہوتے۔'' [8]

---

[1] تاریخ دمشق: ۱۷۲/۲۸
[2] البدایۃ والنہایۃ: ۱۹۳/۱۱
[3] سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۶۷، ط الرسالۃ
[4] سیر اعلام النبلاء: ۳۶۴/۳
[5] سیر اعلام النبلاء: ۳۶۷/۳
[6] سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۷۰، ط الرسالۃ
[7] البدایۃ والنہایۃ: ۱۹۳/۱۱
[8] البدایۃ و النہایۃ: ۲۰۴/۱۱

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے:

''وہ کتاب اللہ کے حافظ وقاری تھے، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند تھے، اللہ کے مطیع تھے، اللہ کے ڈر سے گرمی میں (نفل) روزے رکھنے والے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری کے فرزند تھے، ان کی والدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی تھیں، ان کی خالہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں جو اللہ کے حبیب کی چہیتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں، ان کی قدر و قیمت کو وہی نظرانداز کرسکتا ہے جسے اللہ نے بصیرت سے محروم کردیا ہو۔'' ①

لمحۂ فکریہ:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر زیادہ سے زیادہ کوئی اعتراض ہوسکتا ہے تو وہ یہ کہ انہوں نے یزید کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد سے اس کی موت تک اس کی بیعت نہ کی جس پر خروج کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ اس اقدام میں مجتہد تھے جیسا کہ حضرت طلحہ وزبیر اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہم کا خروج اجتہادی تھا۔

نیز یہ یادر ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت خروج اسے قرار دیتی ہے جو ''امامِ عادل'' کے خلاف ہو۔ اور یہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مذہب تھا۔ پس اس زاویۂ نگاہ سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اقدام پر خروج کا اطلاق بھی نہیں ہوگا۔

جمہور کے نزدیک خروج میں امام عادل کی قید نہیں بلکہ حکمران کی بیعت سے گریز کرتے ہوئے مسلح طاقت کے ساتھ کسی علاقے پر قابض ہونا خروج ہی کہلائے گا مگر اس کے باوجود دورِ علوی اور دورِ یزیدی کا فرق اندھے کو بھی دکھائی دے گا۔ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بلاشبہ خلیفۂ راشد اور امامِ عادل تھے، جبکہ یزید میں امام عادل کی کوئی صفت نہیں تھی۔ اس لیے یزید کے خلاف مجتہدانہ خروج کی حیثیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف مجتہدانہ خروج سے مختلف ہوگی۔

پھر ان تمام باتوں کے باوجود خروج کا یہ اطلاق یزید کی موت تک ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت بلاشبہ شرعی تھی۔ جس طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی سبک دوشی کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خروج کے اطلاق سے نکل کر اُمت کے شرعی حکمران بن گئے تھے۔ اسی طرح عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی بعد میں شرعی خلیفہ بن گئے تھے۔

تعجب ہے ان لوگوں پر جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عزت و ناموس کے تحفظ کے دعوے دار ہیں مگر انہی ہستیوں کے محبوب، انہی کے تربیت یافتہ، اس ممتاز صحابی کو فسادی، نادان اور گمراہ کہتے ہوئے انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ کیا یزید کو معصوم ثابت کرنے کے لیے ایسا دوغلاپن ضروری ہے جس کا وار سیدھا ایسے جلیل القدر صحابی پر ہو؟ اور کیا کوئی ذی عقل شخص اس طرزِ عمل کو صحابہ کا دفاع مان سکتا ہے؟

اگر کوئی کہے کہ ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں یزید کا دفاع اس لیے کرتے ہیں کہ یزید کے دور میں سکوت اختیار کرنے والے جمہور صحابہ پر ضمیر فروشی کا الزام نہ آئے تو یہ عذر فضول ہے؛ کیوں کہ جمہور صحابہ کا سکوت بھی اجتہادی تھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا جدوجہد کرنا بھی۔

① صحیح البخاری، ح: ۴۶۶۴، ۴۶۶۵، ۴۶۶۶، کتاب التفسیر، باب ثانی اثنین؛ مستدرک حاکم، ح: ۶۳۳۱؛ حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۴

جب یہ طے ہے کہ جمہور صحابہ کے اجتہاد کے مطابق ظالم اور فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھنا شرعاً درست نہ تھا تو پھر یزید کے دور میں ان حضرات کے سکوت سے بھلا یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ ضمیر فروش اور بزدل تھے؟ اور اس سے یہ کیسے ثابت ہو جاتا ہے کہ یزید نیک، عادل اور فرشتہ صفت حکمران تھا؟ اور یہ کیسے طے پا جاتا ہے کہ اس کے جرائم کی روایات جو تواتر کی حد کو پہنچ چکی ہیں، سب کی سب جعلی ہیں۔ اور جب مسئلہ اجتہادی تھا تو پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ یا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شان پر کسی حرف گیری کی گنجائش بھی کہاں سے نکل سکتی ہے؟

اگر صحابہ کا دفاع یزید کے دفاع پر موقوف ہوتا تو چودہ صدیوں سے علمائے امت یزید کے فسق اور ظلم پر متفق نہ چلے آتے۔ کیا عقل باور کرتی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام احمد بن حنبل، علامہ ابن جوزی، امام ابن تیمیہ، حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر اور مجدد الف ثانی سے لے کر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تک ہمارے اسلاف جو صحابہ کی عدالت وصداقت کا عقیدہ ثابت کرنے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے، یزید کے بارے میں بے سوچے سمجھے ایسا موقف اپنائے ہوئے ہوں گے جو ان کے اپنے عقیدے کی جڑوں کو کاٹ رہا ہو، اور اُمت کے سوادِ اعظم کو چودہ صدیوں سے جاری، اس مذہبی خودکشی کا کبھی احساس ہی نہ ہوا ہو!!

☆☆☆

۶۴ھ کا خطرناک سیاسی بحران

۶۴ھ کے ایامِ عالمِ اسلام میں ایک نئے سیاسی بحران کو ابھرتا دیکھ رہے تھے۔ ۲۴ ربیع الآخر کو شام میں یزید کے جانشین مُعاویہ کی وفات ہوئی تو اس کے بعد کوئی نہ تھا جو زمامِ سیاست اپنے ہاتھوں میں لیتا۔ خود مُعاویہ بن یزید کی وصیت اور تاکید بھی یہی تھی کہ امت کے معاملات مسلمانوں کی باہم رضامندی اور شورائیت پر چھوڑ دیے جائیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی اسی بات کی دعوت دے رہے تھے۔ انہوں نے اب تک اہلِ حجاز کے اصرار کے باوجود خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ انتقالِ اقتدار اور حکومتی نظام میں اصلاحات پر زور دے رہے تھے۔

اہلِ مدینہ پہلے ہی اس نئے نظام کے خلاف تھے اور مہاجرین وانصار کی واضح نمائندگی چاہتے تھے۔ اس وقت وہ کسی بھی حکومت یا سربراہ کے بغیر تھے۔ شام اور عراق میں بھی یہی صورت حال تھی مگر نئے نظامِ حکومت کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اس سوال کے جواب میں ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔

گومگو کی اس کیفیت میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب بہت اہم تھا جو انہوں نے عراق کے بعض عمائد کو لکھا تھا اور اس بحرانی کیفیت میں صبر وتحمل کی تاکید کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ وہ اندھا دھند کسی کی پیروی کرنے اور امت میں جاری خلفشار کو بڑھانے سے احتراز کریں۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے مکتوب میں یہ حدیث درج کی:

"رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: قیامت سے پہلے اندھیری رات جیسے فتنے آئیں گے۔ آدمی صبح کو مومن ہوگا شام کو کافر، لوگ ذرا سے دنیاوی فائدے کے لیے اپنے ضمیر کو بیچ ڈالیں گے۔"[1]

ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نے جو مُعاویہ بن یزید کی وصیت کے مطابق دِمشق میں نمازوں کی امامت کرا رہے تھے، اس سلسلے میں اہلِ عراق کو مراسلہ لکھ کر کہا:

"آپ ہمارے بھائی ہیں، جب تک ہم اپنے لیے کوئی بات طے نہ کرلیں، آپ پہل نہ کیجئے گا۔"[2]

عبیداللہ بن زیاد خود بیعت لینے لگا:

مگر اس دوران میدان کو خالی دیکھ کر بصرہ کے حاکم، رُسوائے زمانہ عبیداللہ بن زیاد نے خود لوگوں سے بیعت لینے کی کوشش شروع کردی۔ عوام پہلے ہی اس کی سخت گیری سے پریشان تھے اور واقعۂ کربلا کے بعد وہ مزید بدنام ہوگیا تھا اس لیے کوئی بھی اس سے بیعت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابن زیاد نے کچھ ڈرا دھمکا کر اور کچھ وعدوں اور بہلاووں کے

① مسند احمد، ح: ۱۵۷۵۳ بسند صحیح ② تاریخ الطبری: ۵/۵۰۴ عن عمر بن شبہ

ذریعے ان سے بیعت لینے اور ان کا رہنما بننے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا:

"جب میں تمہارا گورنر بنا تو سرکاری وظیفہ پانے والے تمہارے شمشیرزن ستر ہزار تھے، اب اسی ہزار ہیں۔ پہلے تمہارے دفتری اہل کار نوے ہزار تھے، اب ایک لاکھ چالیس ہزار ہیں۔ میں نے تمہارا کوئی بدخواہ باقی نہیں چھوڑا جس کا تمہیں خوف ہو۔ تمہاری تعداد سب سے زیادہ ہے۔ تمہیں کسی کی پرواہ کیوں ہو تم خود اپنے لیے حکمران چن لو جو دین داری کے اعتبار سے اور اپنی جماعت کے فائدے کے لحاظ سے تمہارا پسندیدہ ہو۔ میں بھی اس کی ماتحتی قبول کرلوں گا۔ پھر اگر اہلِ شام نے کسی ایسے شخص کو چنا جس سے تم متفق ہوئے تو تم ان کے زمرے میں سب مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جانا۔ ورنہ جب تک تمہاری مرضی پوری نہ کی جائے تم اپنی سرزمین کے مالک رہنا۔ تمہیں تو دوسرے شہروں کی ماتحتی کی کوئی ضرورت نہیں مگر لوگ تمہارے بغیر نہیں چل سکتے۔"

اس تقریر سے ابن زیاد کا مقصد عراق میں کسی نئی افراتفری کو روکنا تھا یا خود عراق کا تاج وتخت سنبھالنا؟ اس بارے میں دو آراء ہوسکتی ہیں مگر ابن زیاد بہرحال اتنا ضرور چاہتا تھا کہ کسی بھی صورت میں اہلِ عراق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف مائل نہ ہوں؛ کیوں کہ وہ ان کا سخت مخالف تھا۔

ادھر عالمِ اسلام کی صورت حال یہ تھی کہ کچھ متعصب گروہوں کے سوا تقریباً تمام صحابہ کرام، تابعین، نیک وصالح لوگوں اور عوام کے نزدیک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی قیادت کے مستحق تھے۔ جبکہ عبیداللہ بن زیاد ان کی خلافت کے امکانات ختم کرکے عوام کو اپنی گرفت میں رکھنا چاہتا تھا۔

عراق کے امراء ابن زیاد سے سخت نالاں تھے مگر کیا کرتے! اس کا رعب داب سب پر چھایا ہوا تھا۔ آخر قبائلی سرداروں اور شہری عمائد نے اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیلا۔ انہوں نے ابن زیاد کی چاپلوسی کی اور کہنے لگے:

"امیر صاحب! اللہ کی قسم! آپ سے زیادہ مضبوط کوئی نہیں، اس لیے ہم تو آپ ہی سے بیعت کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ ①

اس کے ساتھ ہی عمائدِ شہر کے پرزور مطالبے پر ابن زیاد نے جیلوں سے قیدیوں کو آزاد کردیا جن میں بڑی تعداد خارجیوں کی تھی۔ ان سب نے بھی آکر ابن زیاد سے بیعت کرلی مگر یہ سب دکھاوا تھا۔ اصل مقصد قیدیوں کو رہا کرانا تھا۔ چنانچہ مجلسِ بیعت سے نکل کر جب یہ لوگ گھروں کو چلے تو قصرِ امارت کی دیواروں سے ہاتھوں کو پونچھتے جارہے تھے اور ساتھ ہی طنز کے طور پر کہہ رہے تھے: "یہ رہی ابن مرجانہ کی بیعت۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ ہم امت کے ساتھ جڑنے یا الگ رہنے میں اس کے حکم پر چلیں گے۔" ②

---

① تاریخ الطبری: ۵/۵۰۴، ۵۰۵ عن عمر بن شبہ

② تاریخ الطبری: ۵/۵۰۵؛ انساب الاشراف ۵/۴۱۹ باسناد جید، ط دارالفکر

ابن زیاد اہلِ بصرہ کی نمائشی بیعت سے مطمئن ہو چکا تھا۔ اس نے اب کوفہ والوں کی طرف سفیر بھیجا اور وہاں کے گورنر کے ذریعے ان سے بھی بیعت لینا چاہی مگر اہلِ کوفہ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر بصرہ والوں کی جرأت بھی بڑھ گئی اور انہوں نے بھی عبیداللہ بن زیاد کی سرِعام مخالفت شروع کر دی۔ بصرہ میں ہنگامے برپا ہونے لگے۔ ①

عبیداللہ بن زیاد نے دیکھا کہ بازی ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ حسبِ عادت مخالفت کرنے والوں کی گردنیں اڑا دے مگر خلیفہ کی پشت پناہی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی قوت کم رہ گئی تھی۔ کوئی سخت کارروائی کرنے سے عراق میں خانہ جنگی برپا ہو سکتی تھی جس میں ابن زیاد کے غالب آنے کے امکانات بہت کم تھے۔ سب لوگ اس کی جان کے درپے تھے۔ آخر جمادی الآخرہ ۶۴ھ میں وہ روپوش ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں اہلِ بصرہ قصرِ امارت میں گھس گئے اور اسے لوٹ لیا۔ بصرہ کے رئیس احنف بن قیس رحمۃ اللہ نے یہ افراتفری دیکھی تو حرکت میں آئے اور بیت المال، جیل خانے اور سرکاری دفاتر پر پہرے لگوائے۔ پھر لوگوں کو جمع کر کے ان کے اتفاق رائے سے شہر کا نظم و نسق چلانے کے لیے عبداللہ بن الحارث کو شہر کا ناظم بنا دیا۔ اس طرح وقتی طور پر ہنگامہ آرائی تھم گئی۔ ②

خراسان سمیت مشرق کے تمام صوبوں کو کوفہ اور بصرہ سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ یہاں کے سیاسی بحران سے خراسان میں بھی ہل چل مچ گئی۔ مقامی سرداروں نے اموی عمال کو نکال دیا۔ ہر علاقے پر خود مختار قسمت آزما قابض ہو گئے اور آپس میں تلواریں چلنے لگیں۔ ③

بصرہ کی یہ حالت تھی کہ نماز جمعہ پڑھانے کے لیے عارضی امیر پر بھی اتفاق نہ تھا۔ مقامی عمائد بڑے بحث و مباحثے، شور شرابے اور گرما گرمی کے بعد کسی کو امیر مقرر کرتے تھے اور چند ہفتوں بعد اسے ہٹا کر دوسرے کو لے آتے۔ پانچ چھ ماہ کی مدت میں چار بار یہ تبدیلی ہوئی۔ ④

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کیوں خلیفہ بنے؟

ان حالات میں امت کے لیے بلا تاخیر ایک خلیفہ و سربراہ کی تقرری نہایت ضروری ہو گئی تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ عمائدِ عرب کے اصرار کے باوجود اب تک اپنی خلافت کی دعوت دینے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے مگر اب پیش آمدہ منظرنامہ انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس بارِ گراں کو اٹھا لیں جو اُمت کی کمر توڑنے والا تھا۔ ویسے بھی اُمت میں اس وقت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ کے سوا اِن سے افضل کوئی نہ تھا۔ فیصلے میں مزید تاخیر کی جاتی تو خطرہ تھا کہ عبیداللہ بن زیاد جیسا کوئی شخص بزورِ شمشیر مسندِ خلافت پر قابض نہ ہو جائے۔

آخر ۹ رجب ۶۴ھ کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اُمت کے نئے خلیفہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے عوام

① تاریخ الطبری: ۵/۵۰۳
② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۸
③ تاریخ الطبری: ۵/۵۴۶ عن المدائنی بسند حسن
④ تاریخ الطبری: ۵/۵۲۷

وخواص سے بیعت لے لی۔[1] بیعت میں وعدہ تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ انہیں قرآن وسنت اور خلفائے راشدین کے راستے پر چلائیں گے۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے فرزند مُصعَب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبیداللہ سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں تھے۔[2]

عالمِ اسلام میں قبولیتِ عامہ:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ تھے جن کا مرکزِ خلافت، حرمِ مکہ تھا۔ ان کے نمائندے مکہ سے شام اور عراق روانہ ہو گئے تاکہ وہاں کے لوگوں سے بیعت لی جاسکے۔ اہلِ مدینہ تو پہلے ہی ان کے گرویدہ تھے۔ بیعت کے بعد وہاں عبیدۃ بن الزبیر کو امیر مقرر کر دیا گیا۔ مصر کے لوگوں نے بھی بیعت کر لی، وہاں عبدالرحمٰن بن جحدم فہری کو امیر بنا دیا گیا۔[3]

اہلِ بصرہ نے علاقائی بدامنی سے تنگ آکر خود ہی رابطہ کیا کہ ان پر کوئی امیر مقرر کر دیا جائے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فوری انتظام کے لیے بصرہ میں مقیم جلیل القدر صحابی، خادمِ رسول، انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ منصب سونپ دیا۔ وہ اہلِ بصرہ کی امامت کرنے لگے۔ جب امن وامان ہو گیا تو کچھ دنوں بعد عُمر و بن عبیداللہ کا تقرر کر دیا گیا۔ کوفہ میں طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے پوتے ابراہیم کو امامتِ صلوٰۃ کی ذمہ داری دے دی گئی۔ عبداللہ بن یزید انصاری کو دفتری امور کا نگران بنا کر بھیج دیا گیا۔ اس طرح عراق بھی خلافتِ زبیریہ کے تحت آگیا۔ یہ رمضان ۶۴ھ کا واقعہ ہے۔[4]

شام کے اکثر امراء کی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت:

شام میں بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عقیدت منداور حامی کم نہیں تھے۔ دِمَشق میں صحابیٔ رسول ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ جو سابق خلیفہ مُعاویہ بن یزید کی وصیت کے مطابق نمازوں کے امام تھے، خود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زبردست حامی تھے اور چاہتے تھے کہ بنوامیہ کے امراء بھی ان سے بیعت کر لیں۔[5]

اس دوران دِمَشق کے کچھ امراء نے بنوامیہ کے نامور سیاست دان ولید بن عُقبہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہی مگر اس نے انکار کر دیا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد فوت ہو گیا۔[6] اس طرح ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے قدم اور مضبوط ہو گئے۔ انہوں نے پہلے دِمَشق میں خفیہ طور پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے رائے عامہ ہموار کی اور پھر اعلانیہ طور پر ان کی بیعت کی دعوت دی۔ لوگوں نے ان کی پکار پر لبیک کہا اور بیعت کر لی۔[7] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی کوششوں کا علم ہوا تو بڑی قدر دانی کی اور انہی کو شام کا امیر مقرر کر دیا۔[8]

---

① تاریخ خلیفۃ، ص ۲۵۸ ② انساب الاشراف: ۵/۳۵۲، ط دار الفکر ③ تاریخ الطبری: ۵/۵۳۰

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۹؛ تاریخ الطبری: ۵/۵۳۲ تا ۵۳۰

⑤ انساب الاشراف، بلاذری: ۵/۱۳۲، ۵/۳۵۰، ۳۵۲، ۶/۲۶۶، ط دار الفکر

⑥ تاریخ الاسلام للذہبی: ۵/۲۶۷ عن المدائنی بسند حسن، ت تدمری

⑦ طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۲۰۱، ۲۰۲

⑧ طبقات ابن سعد متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۲۰۱، ۲۰۲؛ انساب الاشراف: ۶/۲۵۸، ط دار الفکر

شام کے دوسرے بڑے شہر حمص کے والی نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔ وہ جلیل القدر صحابی اور اُموی حکومت کے سرکردہ فرد تھے۔ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے بعد ان کا بھی خلافتِ زبیریہ کو قبول کر لینا اس بات کا بین ثبوت تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت بالکل درست اور شرعی ہے۔ ادھر قنسرین میں زُفر بن الحارث اور فلسطین میں ناتل بن قیس جیسے بااثر سردار بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حمایت میں کھڑے ہو کر وہاں گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ اُردن کے والی حسان بن مالک کے سوا تقریباً پورے شام میں چوٹی کے امراء نے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی۔ اس طرح ان کی خلافت کے شرعی طور پر انعقاد میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔

صرف بنوامیہ کے سابقہ حکمران خاندان اور ان کے بعض متعصب وفاداروں نے بیعت نہیں کی تھی جن میں عبیداللہ بن زیاد، مروان بن الحکم، عَمرو بن سعید الاشدق اور حسان بن مالک نمایاں تھے۔ [1]



اتحادِ امت کو پارہ پارہ کرنے والی سیاست

لگتا تھا کہ اب عالمِ اسلام میں مکمل امن وامان کے دن شروع ہونے کو ہیں مگر اچانک اموی سیاست دان مروان بن الحکم کی ایک سنگین غلطی نے حالات کو دوبارہ تشویش ناک بنا دیا۔ مروان کو اس غلط راہ پر ڈالنے والا عبیداللہ بن زیاد تھا۔ بصرہ اور کوفہ کی سیاست سے بے دخل ہونے کے باوجود وہ امت کی راہ میں فساد کے کانٹے بکھیرنے پر کمربستہ تھا۔

ان دنوں مروان بن الحکم نے شام میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مقبولیت کو ایک زمینی حقیقت کے طور پر مان لیا تھا۔ پھر جب اس نے نئی حکومت میں ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت بلند تر دیکھی تو خود مکہ جا کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ساتھ عَمرو بن سعید کو لے کر شام سے نکل پڑا۔ مگر ابھی سرحدی علاقے ''اَذرُعات'' پہنچا تھا کہ اسے فتنوں کا سوداگر عبیداللہ بن زیاد عراق کی سمت سے آتا ہوا مل گیا جو بصرہ میں اپنے خلاف عوامی ردعمل سے گھبرا کر کچھ مدت روپوش رہا تھا اور اب جان بچا کر دِمشق کی طرف آرہا تھا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ مروان نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کا فیصلہ کیا ہوا ہے، تو بڑا پریشان ہوا، کیوں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی عادلانہ حکومت میں اس کی کوئی پذیرائی ممکن نہ تھی۔ عبیداللہ بن زیاد نے سوچ رکھا تھا کہ کسی بھی طرح شام کو خلافتِ زبیریہ سے آزاد کر کے وہاں کی حکومت میں اپنا حصہ نکالا جائے۔ اس نے مروان کے فیصلے پر شدید غصے کا اظہار کیا اور اسے شرم دلاتے ہوئے کہا: ''تم قریش کے سردار ہو، بنوعبد مناف کے بزرگ ہو۔ بھلا تم ابن زبیر سے بیعت کرو گے؟ بخدا تم اس سے زیادہ خلافت کے حق دار ہو۔''

[1] تاریخ الطبری: ۵/۵۳۱؛ تاریخ خلیفۃ، ص ۲۵۹ ۔ حسان بن مالک یزید کے ماموں مالک بن بحدل کا بیٹا اور بنوکلب کا رئیس تھا۔ (مختصر تاریخ دمشق: ۶/۳۰۹) بنوامیہ کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کھڑا کرنے میں اس کا کوششوں کا بڑا دخل تھا، جس کی تفصیل عبرت آموز ہے۔ اس کش مکش کی ایک اہم مجلس ''یوم جیرون'' تھی جو دمشق میں ہوئی، بلاذری نے یہ ساری تفصیل لکھی ہے۔ (انساب الاشراف: ۶/۲۶۴ تا ۲۶۷)





مروان سوچ میں پڑ گیا اور پوچھا: ''پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

عبیداللہ بن زیاد بولا: ''تم واپس چلو اور اپنی خلافت کی دعوت دو۔ قریش اور ان کے متعلقین کو میں سنبھال لوں گا۔''

ایک مسئلہ اور درپیش تھا وہ یہ کہ بنوامیہ کے کچھ لوگ یزید کے دوسرے لڑکے خالد بن یزید کو خلیفہ دیکھنا چاہتے تھے۔

جب اس مسئلے پر بات شروع ہوئی تو عُمر و بن سعید نے مروان کو حل بتاتے ہوئے کہا:

''تم یزید کی بیوہ اُم خالد (فاختہ بنت ابی ہاشم بن عُتبہ) سے شادی کر لو، اور خالد کو اپنی کفالت میں لے لو۔''

مروان کو یہ منصوبہ پسند آیا۔ وہ عُمر و بن سعید اور عبیداللہ بن زیاد کے ساتھ شام واپس چلا آیا۔ وہ خود حلب سے ۸۰ میل (۱۲۸ کلومیٹر) دور ''تـدمُـر'' میں ٹھہر گیا تاکہ حالات کی رفتار دیکھ کر کوئی قدم اٹھائے۔ عبیداللہ بن زیاد سیدھا دِمشق جا پہنچا تاکہ بظاہر ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کا دوست بن کر خلافتِ زبیریہ کی جڑیں کاٹ ڈالے۔[1]

تعصب کی آگ:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف اس باغیانہ تحریک کو ''بغاوتِ اجتہادی'' کہنا محض ایک تکلف ہوگا، کیونکہ یہاں کوئی دینی مقصد یا شرعی تأویل کہیں نہیں دکھائی دیتی، جبکہ علاقائی تعصب واضح نظر آتا ہے جسے بعض مذہبی عنوانات سے ہوادی جارہی تھی۔ جب مُعاویہ بن یزید کی وفات کے بعد اہلِ اردن کے سوا تمام اہل شام نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت کرلی تو سابق حکومت کے کچھ وفادار آپس میں کہنے لگے: ''حکومت تو ہم اہل شام کے پاس چلی آرہی تھی، یہ حجاز میں کیوں منتقل ہوگئی؟ ہم اسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔''[2]

ان زعماء نے لوگوں میں ناصبیت کے رجحان کو اُبھارا اور مذہبی حوالے سے نئے سوالات اٹھائے۔ یزید کے ماموں زاد حسان بن مالک نے اُردُن کے لوگوں میں تعصب کی آگ لگانے کے بعد ان سے پوچھا:

''اُردن والو! تم عبداللہ بن زبیر اور مقتولینِ حرّہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

لوگوں نے آوازیں لگائیں: ''عبداللہ بن زبیر منافق ہے۔ مقتولینِ حرّہ جہنمی ہیں۔''

پھر حسان نے پوچھا: ''حرّہ میں قتل ہونے والے شامیوں اور یزید کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

لوگ پھر چیخے: ''یزید جنتی ہے۔ ہمارے مقتولین بھی جنتی ہیں۔''

حسان بن مالک نے کہا: ''اگر یزید حق پر تھا تو آج بھی اسی کے پیروکار حق پر ہیں۔ اگر عبداللہ بن زبیر کل باطل پر تھا تو آج بھی وہ اہلِ باطل میں سے ہے۔''

لوگوں نے کہا: ''سچ کہتے ہو۔'' اور حسان سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف لڑنے پر بیعت کرلی۔[3]

---

① طبقات ابن سعد، متمم الصحابة ،الطبقة الخامسة: ۲۰۲/۲ ، تاریخ الاسلام، ذهبی: ۱۳۵،۱۳۴/۵ بسند ابن سعد عن المدائنی عن خالد بن یزید بن بشیر عن ابیه، وعن مسلمة بن محارب

② تاریخ دِمَشق: ۲۴۸/۱۸

③ انساب الاشراف: ۲۶۴/۶ ،ط دار الفکر

ایمن الاسدی کے حکیمانہ اشعار:

اس موقع پر وہ لوگ سب سے بہتر رہے جو فتنے کی اس آگ سے دور رہے۔ مروان نے ایمن بن خُریم الاسدی کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں شرکت کی دعوت دی تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''میرے والد اور چچا بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے وعدہ لے چکے ہیں کہ میں کسی کلمہ گو کے خون میں ہاتھ نہیں رنگوں گا۔ اگر آپ مجھے جہنم سے خلاصی کا ضمانت نامہ لا دیں تو میں آپ کے ساتھ جنگ میں شرکت کرلوں گا۔''

مروان نے کہا: ''تم جیسے آدمی کی ہمیں ضرورت نہیں۔'' اس پر ایمن نے یہ حکیمانہ اشعار پڑھے:

وَلَسْتُ مُقَاتِلُ رَجُلٍ يُصَلِّي ... عَلٰى سُلْطَانِ آخَرِ مِنْ قُرَيْشِ

''میں کسی دوسرے قریشی کی حکومت کے لیے کسی نمازی (اہلِ قبلہ) سے جنگ ہرگز نہ کروں گا۔''

لَهُ سُلْطَانُهُ وَعَلَيَّ اِثْمِيْ ... مَعَاذَ اللّٰهِ مِنْ سَفَهٍ وَطَيْشِ

''کیوں کہ اس کو تو حکومت ملے گی اور مجھے گناہ۔ ایسی حماقت اور غصے سے اللہ کی پناہ۔''

اَاَقْتُلُ مُسْلِمًا فِيْ غَيْرِ ذَنْبٍ ... فَلَيْسَ بِنَافِعِيْ مَا عِشْتُ عَيْشِي

''کیا میں کسی مسلمان کو بلاقصور قتل کردوں؟ یہ کام تا حیات مجھے کوئی نفع نہ دے گا۔''[1]

ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اور مروان مدمقابل:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بنوامیہ کو لڑانے میں سب سے بڑا کردار عبیداللہ بن زیاد کا تھا۔ ایک طرف اس نے مروان کو خلافت کے دعوے پر آمادہ کیا۔ دوسری طرف دِمَشق پہنچ کر وہ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ سے دوستی کا ڈھونگ رچاتا رہا۔ پہلے اس نے ضحاک رضی اللہ عنہ کو بہکا کر خلافت کے دعوے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ یہ غلطی کرنے بھی لگے مگر پھر دوستوں کے مشورے پر سنبھل گئے۔

جب وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حمایت پر جمے اور لوگ ان سے جوق در جوق بیعت کرنے لگے تو ابن زیاد سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے ایک اور داؤ کھیلا اور انہیں مروان سے لڑنے پر ابھارا۔ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اس وقت دِمَشق جیسے محفوظ شہر میں تھے۔ عبیداللہ بن زیاد نے خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ کر انہیں سمجھایا کہ جب تک بنوامیہ کی قوت کو پاش پاش نہ کر دیا جائے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس نے انہیں کھلے میدان میں زور آزمائی کا مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''جو آپ کی طرح کا عظیم مقصد لے کر اٹھے وہ شہروں اور قلعوں میں نہیں بیٹھتا بلکہ باہر نکل کر گھڑ سوار جمع کرتا ہے۔ دِمَشق سے نکلئے اور اپنے لشکر تیار کر لیجیے۔''

اس بات نے ضحاک رضی اللہ عنہ کی حمیت پر چوٹ لگائی اور وہ فوج سمیت شہر سے نکل کر مَرْجِ راہط میں خیمہ زن ہو گئے۔ ابن زیاد خود ابھی تک دِمَشق میں تھا جب کہ مروان اور امرائے بنوامیہ ''تدمُر'' میں تھے۔

---

[1] انساب الاشراف: ۶/۲۶۷، ۲۶۸، ط دار الفکر

ضحاک رضی اللہ عنہ کو میدان میں نکال کر اس عیار نے مروان کو لکھا:

"لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دو اور ضحاک کی طرف لپکو۔ وہ تمہارے سامنے کھلے میدان میں آ گیا ہے۔"

مروان یزید کی بیوہ اُم خالد سے شادی کر کے قبائلی تعصب کی بنیاد پر ایک بڑا مجمع اپنے گرد اکھٹا کر چکا تھا اور اب وہ عبیداللہ بن زیاد کے اشارے کا منتظر تھا۔ یہ لوگ جن میں امرائے شام و بنوامیہ کی خاصی تعداد شریک تھی، جابیہ کے مقام پر جمع ہوئے۔[1]

"جابیہ" کی مشاورت:

جابیہ کی مجلس میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مذمت اور مروان کے فضائل و مناقب میں پر جوش تقاریر ہوئیں۔ ان لوگوں کی رائے کو بھی پورے شد و مد کے ساتھ مسترد کر دیا گیا جو یزید کے بیٹے خالد کو خلیفہ مقرر کرنا چاہتے تھے۔

اس مجلس میں بعض سمجھ دار لوگوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر متفق نہیں ہوتے تو اُمتِ مسلمہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متحد ہو سکتی ہے مگر اُموی زعماء نہ مانے۔ رَوح بن زِنباع نے فوراً کھڑے ہو کر کہا:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل اپنی جگہ مگر وہ کمزور آدمی ہے اور اُمتِ مسلمہ کا قائد کمزور شخص نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک عبداللہ بن زبیر کا تعلق ہے، اگرچہ وہ اسماء بنت ابی بکر کا بیٹا ہے مگر وہ منافق ہے۔ اس نے دو خلفاء: یزید اور اس کے بیٹے مُعاویہ سے بغاوت کی، خون ریزی کی، مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کی قیادت ایسے منافق کو نہیں دی جا سکتی۔ جہاں تک مروان بن حکم کا تعلق ہے، اسلام میں کوئی رخنہ ایسا واقع نہیں ہوا، جسے جناب مروان نے پُر نہ کیا ہو۔ انہوں نے امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر حملے والے دن ان کے دفاع میں لڑائی کی، انہوں نے جنگِ جمل میں علی بن ابی طالب سے لڑائی کی، یہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے طلحہ کو قتل کر کے عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لیا۔ تو کیا ہم چھوٹے سے بیعت کر لیں اور بڑے کو چھوڑ دیں؟"[2]

حسان بن مالک نے اپنی تقریر میں کہا: "میری بھی یہی رائے ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ خلافت ابن زبیر کے پاس جائے اور اہلِ بیت (بنواُمیہ) سے چھن جائے۔ مروان قریش کے بڑے اور عمر رسیدہ فرد ہیں۔ خلیفۂ مظلوم عثمان رضی اللہ عنہ کے چچازاد ہیں۔ سب سے پہلے قصاصِ عثمان کا مطالبہ اٹھانے والے ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی میراث انہی کا حق ہے۔ یہ ابن زبیر سے کہیں بہتر ہیں، جو بے دین ہے، جس نے خلافت سے سرکشی کی، جس نے کھلم کھلا اللہ کی نافرمانی کی۔"[3]

---

[1] طبقات ابن سعد، متمم الصحابة،الطبقة الخامسة: ۲/۲۰۲ تا ۲۰۴

تاریخ الاسلام للذهبی: ۵/۱۳۵، ۱۳۶، ت تدمری ؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۶۰

[2] انساب الاشراف: ۶/۲۶۷ ،ط دار الفکر [3] انساب الاشراف: ۶/۲۶۰ ،ط دار الفکر

بعض حضرات مروان کو صحابی قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں۔ وہ ذرا غور فرمائیں! مروان کے ان مناقب کی فہرست میں اس کے صحبتِ نبویہ سے شرف یاب ہونے کا کوئی ذکر ہے؟ حالانکہ اگر وہ واقعی اس سعادت سے شرف یافتہ تھا تو اس کے مداح اس کا اشارۃً ہی ذکر کر دیتے مگر یہاں اس کے مناقب یہ بیان کیے جا رہے ہیں کہ اس نے طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی کی۔ پس یہ ثابت ہے کہ مروان صحابی نہیں تھا۔ اس کے کردار کا نمایاں ترین پہلو تحریکِ قصاص میں متحرک ہونا تھا۔ جابیہ کانفرنس کے مناظر یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ۶۴ھ تک یزید کے حامی شامی زعماء میں ناصبیت کا ماحول عام ہو چکا تھا۔

اس کے بعد حاضرین کے اتفاق رائے سے مروان نے خلافت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ ذوالقعدہ ۶۴ھ کا واقعہ ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کو اس وقت چار ماہ گزر چکے تھے۔ [1]

مروان کی طرف سے دعوائے خلافت ہوتے ہی بنوامیہ کے بیشتر حامیوں نے فوراً اس کی بیعت کر لی اور کہا:

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ خلافت ہم سے باہر نہ جانے نہ دی۔'' [2]

مروان کے ناجائز دعوائے خلافت نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پوتے معاویہ بن یزید کی اس قربانی کو بے اثر کر دیا جو اس نے اقتدار کا معاملہ مسلم عوام کی رضا اور شورائیت پر منحصر کر کے پیش کی تھی۔ اس غلط قدم کی وجہ سے امت دوبارہ ایک نئی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئی جو دس سال تک رکنے میں نہ آئی۔ اس فساد کی سب سے زیادہ ذمہ داری عبیداللہ بن زیاد، حسان بن مالک اور مروان پر ہی عائد ہوتی ہے جنہوں نے بنوامیہ کی خاندانی اور اہلِ شام کی ملکی عصبیت کو ہوا دے کر مسلمانوں میں افتراق کی آگ دوبارہ بھڑکائی اور مسلمان ایک خلیفہ پر متفق ہونے کے بعد پھر بکھر گئے۔ بنوامیہ خلافت کو کسی اور خاندان میں تسلیم کرنے سے انکار کر کے کھلم کھلا ایک باغی گروہ کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

معرکۂ مَرْجِ راہط:

مروان اب پانچ ہزار کا لشکر لے کر مَرْجِ راہط پہنچا جہاں ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اپنے لشکر سمیت پہلے سے موجود تھے۔ مروان یہاں اسلحہ اور سپاہی جمع کرتا رہا۔ [3] اب عبیداللہ بن زیاد بھی خلافتِ زبیریہ کی حمایت کا ڈھونگ ختم کر کے دِمشق سے نکلا اور مَرْجِ راہط میں مروان کے شانہ بشانہ آ کھڑا ہوا۔ اس دوران منصوبے کے مطابق دِمشق میں بنوامیہ کے حامی یزید بن ابی نمس نے بغاوت کر دی اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے نائب کو شہر سے نکال دیا۔

ذی الحجہ ۶۴ھ کے درمیان فریقین میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی معیت میں ساٹھ ہزار اور مروان کے پرچم تلے تیرہ ہزار سپاہی تھے۔ فریقین طبعاً خونریزی کو ناپسند کرتے تھے، اس لیے بھرپور جنگ سے گریز کرتے رہے۔ بیس روز تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تب عبیداللہ بن زیاد کی شرانگیز فطرت کا ایک بار پھر اظہار ہوا۔ اس نے مروان سے کہا:

''یہ جنگ ہم دھوکے ہی سے جیت سکتے ہیں۔ انہیں صلح کی دعوت دو۔ جب وہ بےفکر ہو جائیں تو حملہ کر دو۔''

اس کے مشورے پر مروان نے ضحاک رضی اللہ عنہ کو جنگ بندی اور مذاکرات کی دعوت دی۔ ضحاک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مان گئے۔ ان کی بےفکری کے دوران ایک شب مروان نے گھڑسواروں کو لے کر زوردار حملہ کیا۔ زبیری لشکر میں افراتفری مچ گئی۔ تاہم ضحاک رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت بےجگری سے لڑے۔ ان کا قبیلہ بنوقیس اپنے پرچم کے ساتھ آخری دم تک ڈٹا رہا مگر آخرکار علَم بردار قتل ہوا۔ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے اور ان کا لشکر منتشر ہو گیا۔

---

① طبقات ابن سعد، متمم الصحابة، الطبقة الخامسة: ۲/۲۰۲ تا ۲۰۴
تاریخ الاسلام للذهبی: ۵/۱۳۵، ۱۳۶، ت تدمری ؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۶۰

② انساب الاشراف: ۶/۲۶۰، ط دار الفکر

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/۹۲ باسناد حسن معضل، ط مکتبة ابن تیمیة

مروان نے آواز لگائی: ''فرار ہونے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔''[1] مروان کے سامنے ضحاک رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر لایا گیا تو رنجیدہ ہو کر کہنے لگا: ''جب عمر گزر گئی اور ہڈیاں چور چور ہو گئیں تو میں فوجیں لڑانے اٹھ کھڑا ہوا۔''[2]

حافظ ذہبی کے مطابق جنگ کا آخری معرکہ محرم ۶۵ھ کے آغاز میں لڑا گیا تھا۔[3]

مَرْج راہط میں ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنو قیس کی بڑی تعداد تہہ تیغ ہو گئی تھی۔ شام میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا حامی اوران کی خلافت کا داعی یہی قبیلہ تھا۔ اس لیے جہاں جہاں شکست کی خبر پہنچی وہاں سے زبیریوں کے قدم اکھڑ گئے۔ یوں شام میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامیوں کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ حاکم حمص نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ وہ ضحاک رضی اللہ عنہ کی شکست کی خبر سن کر اہل وعیال سمیت شہر چھوڑ گئے مگر حمص کے نواح میں بنوامیہ نے انہیں ڈھونڈ نکالا اور قتل کر کے سر قلم کر دیا۔ اس طرح پورا شام باغیوں کے قبضے میں آ گیا۔[4]

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر ان کی اہلیہ نائلہ کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ یہ دیکھ کر ان کی دلیر صاحبزادی اُمّ ابان نے جرأت اور فخر کے ساتھ کہا: ''میں اس کی زیادہ حق دار ہوں۔'' سپاہیوں نے سر اُٹھا کر ان کی گود میں پھینک دیا۔[5]

مَرْج راہط میں امرائے شام کے باغیانہ اقدام کے ذریعے اقتدار پر قابض ہونے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی پوری ہو گئی: ''جب میری امت میں تلوار رکھ دی جائے گی تو قیامت تک چلے گی۔''[6]

اگرچہ اس پیش گوئی کے ظہور کی ابتداء تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے ہو چکی تھی مگر بعد کے ادوار میں اس کے مظاہر بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد اکثر و بیشتر طالع آزماؤں نے اسلامی طرزِ شورائیت کو بالکل ثانوی حیثیت دی اور حصولِ اقتدار کے لیے زیادہ تر تلوار پر بھروسہ کیا۔ ظاہر ہے تلوار کی یہ آزمائش مسلمانوں ہی پر ہوتی تھی۔ پس مسلم معاشرے میں اس کے بعد حصولِ اقتدار کے لیے جو کشت وخون شروع ہوا وہ کبھی رکنے میں نہ آیا۔

شکست کی وجوہ:

مَرْجِ راہط میں زبیریوں کی شکست کی کئی وجوہ تھیں:

- وہ دھوکے میں آ گئے۔ وہ ایک معاند دشمن کو اپنی طرح بااصول قیاس کر کے اس خیال میں تھے کہ وہ دغابازی

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۱۳۵/۵، ۱۳۶ عن المدائنی ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۶۰

② انساب الاشراف: ۲۶۹/۶، ط دار الفکر ③ تاریخ الاسلام للذھبی: ۴۱/۵

④ تاریخ الطبری: ۵۴۱/۵ ؛ انساب الاشراف، بلاذُری: ۲۶۹/۶ تا ۲۷۵، ۲۸۳، ط دار الفکر ؛ سیر اعلام النبلاء: ۴۱۲/۳، ط الرسالۃ ؛ طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ: ۲۰۴/۲ تا ۲۰۷ ؛ طبقات ابن سعد ۵۳/۶، ط صادر

⑤ انساب الاشراف: ۲۸۳/۶ ... نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہم عمر تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد مہاجرین میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور انصار میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے پیدا ہونے والے لڑکے تھے۔ (انساب الاشراف: ۲۸۳/۶) ان کے والد بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ انصار کے سردار تھے۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے سب سے پہلے انصاری وہی تھے۔ بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ معرکۂ عین التمر میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ (انساب الاشراف: ۲۴۴/۱)

⑥ اذا وضع السیف فی أمتی لم یرفع عنہا الی یوم القیامۃ. (سنن الترمذی، ح: ۲۲۰۲ حدیث حسن صحیح)

نہیں کرے گا۔ حالاں کہ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ پوری احتیاط برتتے اور مذاکرات کے دھوکے میں نہ آتے۔

❷ ضحاک رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخلص اور دلیر لوگ تھے جبکہ مروان کے ساتھی جنگجو ہونے کے ساتھ چالباز بھی تھے۔ فتح و شکست کے ظاہری مناظر میں چالبازی اکثر اخلاص اور اخلاق پر غالب آ جاتی ہے اور وقتی طور پر میدان مار لیتی ہے۔

❸ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامیوں نے شام کے مرکز دِمشق کو محفوظ رکھنے پر کوئی خاص توجہ نہ دی چنانچہ وہاں مروان کے حامی قابض ہو گئے۔ اس طرح سرکاری خزانہ باغیوں کی تقویت کے لیے استعمال ہوا۔

❹ حجاز سے ضحاک رضی اللہ عنہ کو کوئی مدد نہیں پہنچی۔ اگر بروقت کمک پہنچ جاتی تو ممکن تھا کہ مروان نرغے میں پھنس کر شکست کھا جاتا۔

☆☆☆

معرکہ مَرْجِ راہط پر تبصرہ

معرکہ ''مَرْجِ راہط'' امت مسلمہ کی تاریخ کا ایک المناک موڑ تھا۔ اس معرکے کے نتیجے میں امت مسلمہ جہاں ضحاک بن قیس اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ اور سینکڑوں جلیل القدر تابعین سے محروم ہوئی وہاں یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ امت کے بعض شرفاء اور چند قدآور اصحابِ شمشیر ہر قیمت پر حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کسی بھی صورت میں کوچۂ اقتدار سے الگ ہونا برداشت نہیں کر سکتے، چاہے اُمت انہیں حکمران دیکھنا پسند کرے یا نہ کرے۔ ان کی صفِ اوّل میں اموی امراء تھے جو اپنے خاندان کے سوا کسی کی بالادستی کے روادار نہ تھے۔ دوسری صف میں وہ شامی جرنیل تھے جو علاقائی تعصب میں مبتلا ہو کر اہلِ حجاز یا اہلِ عراق کا اقتدار قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

ان کے ساتھ بعض نہایت قابلِ احترام شخصیات بھی شامل ہو گئی تھیں جن کے اس فعل کو یقیناً کسی بدنیتی یا غلط جذبے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ہم بھی حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ یہ حضرات کسی علمی مغالطے، حالات کے غلط تجزیے، کسی فقہی تسامح یا غلط تاویل کا شکار ہو گئے تھے۔ بلاشبہ ایک وقت میں یہی لوگ امت کی سیاسی باگ ڈور سنبھالنے والا طبقہ تھے مگر اب ایک متفقہ شرعی خلیفہ کے مقابلے میں آ کر انہوں نے آئینی لحاظ سے باغیوں کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

شام اور بنوامیہ کے امراء کے اس طرزِ عمل کو ہم دورِ جاہلیت کی عصبیت پر محمول نہیں کرتے ہیں جیسا کہ بعض مؤرخین کا خیال ہے بلکہ اسلام نے جاہلیت کے نظریاتی تعصبات کو مٹا دیا تھا، اس لیے چند سیاسی مناقشوں کو چھوڑ کر عام طور پر بنوامیہ کے تعلقات بنو ہاشم اور اکابر صحابہ کے تمام خانوادوں کے ساتھ بہت اچھے تھے اور ان میں باہم رشتے ناتے مسلسل ہوتے رہے اور اکرام واحترام کا تعلق بھی باقی رہا۔

ہم بنوامیہ کے اچھے اور قابل خلفاء کو بلاوجہ مطعون کرنا غلط سمجھتے ہیں مگر اتنی بات ضرور تھی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف باغی تحریک کا حصہ بننے والے اموی وشامی امراء کے راہِ حق سے بھٹکنے میں غلط تاویلات کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔



خروج اگر کسی قابلِ غور تاویل پر مبنی ہوتو یہ غلطی باغیوں کو فاسق وفاجر نہیں بناتی مگر بہرصورت غلط سیاسی اقدام کے نتائج تو غلط ہی نکل سکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد جو فتنہ وفساد پھیلا، اس کی ذمہ داری اس خروج کے مرتکب لوگوں پر ہی عائد ہوگی نہ کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اوران کے حامیوں پر۔

امرائے بنوامیہ کس بنیاد پر باغی ہوئے؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے اس حریف گروہ کے پاس مضبوط دلائل تھے مثلاً یہ کہ:

ا وہ امت کے پرانے اہلِ حل وعقد اور مرکز کے اصحابِ سیف ہیں۔ ان کی رضامندی کے بغیر کسی کی خلافت منعقد نہیں ہوسکتی؛ اس لیے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت وخلافت منعقد نہیں ہوئی۔

ا مروان کا انتخاب جابیہ میں دارالخلافہ دِمشق اور شام کے سیاست دانوں نے کیا ہے۔ ان پر پہل کا حق کسی کو حاصل نہ تھا اور ان کا فیصلہ سارے عالمِ اسلام پر لازم ہوجاتا ہے؛ اس لیے باقی سب کو ان کی اطاعت کرنی چاہیے۔

ا پھر چوں کہ عالمِ اسلام میں وحدت ضروری ہے اور انتشار ناجائز ہے اس لیے مملکتِ اسلامیہ کو متحد رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو خلیفہ نہ ہوں اور ناجائز خلیفہ اور اس کے حامیوں کو بزورِ قوت مغلوب کردیا جائے۔ ①

اس ذہنیت کے ساتھ جابیہ کانفرنس کے شامی جرنیلوں نے ان مسلمانوں کا خون حلال مان لیا جو ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامی تھے۔ اور یہی نکتہ تھا جس پر اگلے کئی برسوں تک یہ دونوں فریق باہم ٹکراتے رہے اور اسے جائز سمجھتے رہے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت شرعی تھی:

مگر درحقیقت امرائے شام کے یہ دلائل بہت کمزور تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ رجب ۶۴ھ میں مسلمانوں کے متفقہ خلیفہ بن چکے تھے۔ ان کی بیعت حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم جیسی تھی جس میں کسی پر کوئی جبر واکراہ نہیں کیا گیا بلکہ معاملہ مسلمانوں کی رضامندی اور شورائیت سے طے پایا تھا۔ مسلمانوں کے پانچوں بڑے سیاسی مراکز: حجاز، کوفہ، بصرہ، دِمشق اور مصر کے اکثر امراء نے کسی دباؤ، خوف یا لالچ کے بغیر محض امت کے وسیع تر مفاد کو دیکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کو خلیفہ مان لیا تھا جس کے شرفِ صحابیت، اعلیٰ نسبی، علم وفضل، دیانت، تقویٰ، شجاعت اور سیادت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا۔ جب امتِ مسلمہ اپنا فیصلہ دے چکی تو اس کے چار ماہ بعد عبیداللہ بن زیاد اور حسان بن مالک کے یاد دلانے پر شام کے کچھ امرائے عساکر اور بنوامیہ کے چند سیاست دانوں کو اچانک خیال آیا کہ حکومت وریاست تو ان کی میراث ہے، یہ کسی اور کو کیسے مل سکتی ہے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی کردار کشی کی مہم:

بنوامیہ کے اس باغی گروہ کے پاس عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مسترد کرنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ تھا کہ وہ حکمران صحابہ کی آخری یادگار کو بدنام کریں اور اس کی کردار کشی میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔ اس انتہا پسندانہ ذہنیت کی

① اہل شام کی وکالت میں یہ دلائل عموماً مروانی حضرات بیان کرتے ہیں۔

وجہ یہ تھی کہ یزید کے دور کی سیاسی کمزوریوں نے بنو امیہ اور امرائے شام کے بہت سے لوگوں میں ایک قسم کی خودسری، بے باکی اور غرور پیدا کر دیا تھا۔ یہ لوگ حکومتی بالادستی کو قائم رکھنا ہی اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے تھے اور خود کو دین و دنیا کا ٹھیکے دار۔ چنانچہ یہ لوگ برملا حضراتِ صحابہ کرام کے بھی منہ آتے اور انہیں عام آدمی کی حیثیت دیتے۔

اموی حاکم عَمرو بن سعید اشدق کا حضرت ابو شُریح رضی اللہ عنہ کے آگے اپنے علم پر اترانا صحیح بخاری میں موجود ہے۔ ①

اہلِ تدبیر کی جگہ اصحابِ سیف پر انحصار، ایک غلط پالیسی:

دورِ صحابہ اور بعد کی سیاست میں ایک اہم فرق یہ بھی تھا کہ صحابہ میں بہت بڑی تعداد جامع الصفات بزرگوں کی تھی جو بیک وقت داعی، معلم، مجاہد، سپہ سالار، منتظم، قاضی، مفتی اور حاکم بننے کی خوبیوں سے مالا مال تھے۔ یہ صفاتِ کمال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ بابرکات میں بے مثال تربیت حاصل کرنے اور ایک طویل عرصے تک سخت ترین مجاہدوں سے گزرنے کا ثمرہ تھی۔ ان کے قلب و اذہان اور روح پر اللہ کی محبت و خشیت اور فکرِ آخرت کا غلبہ تھا اور وہ محاسبۂ نفس کا ہر لمحہ خیال رکھتے تھے؛ اس لیے ہر ذمہ داری کو بہترین طریقے سے انجام دیا کرتے تھے مگر بعد کے دور میں جامعیت کی ایسی مثالیں کم ہوتی چلی گئیں۔ اصحابِ سیف، اہلِ علم اور مدبرین و منتظمین الگ الگ شعبوں میں بٹ گئے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ صوبوں اور شہروں کی حکومتیں جرنیلوں کے بجائے ایسے معتدل مزاج، عالم فاضل اور معاملہ فہم افراد کے ہاتھوں میں دی جاتیں جن پر شاہ کی وفاداری سے زیادہ، دین داری اور عوامی مقبولیت کی صفت نمایاں ہوتی۔ ایسے لوگ ہر صوبے اور ہر شہر میں موجود تھے مگر ہم یزید کا دور آتے ہی دیکھتے ہیں کہ مقبول و محبوب لوگوں کو یکے بعد دیگرے ہٹایا گیا اور ابن زیاد، عمر بن سعید اور مسلم بن عُقبہ جیسے سخت گیر جرنیلوں کو قوم پر مسلط کر دیا گیا۔ بعد میں بنو امیہ اور بنو عباس کے بیشتر خلفاء نے اسی تدبیر کو کارگر سمجھا مگر یہ بھی تاریخ کی گواہی ہے کہ سوائے بعض مخصوص حالات کے، یہ طرزِ سیاست ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتا رہا۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ علیہ نے اپنے مقدمے میں ایک پورا باب اس موضوع پر تحریر کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اگرچہ کسی مملکت کے قیام کے دور میں اصحابِ سیف کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے مگر استحکام و ترقی کا زمانہ اصحابِ علم و قلم کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔ ②

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۲۹۵، کتاب المغازی، باب منزل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح

اسی صف کے ایک اور فرد عبیداللہ بن زیاد نے بزرگ صحابی حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کو بڑی بدتمیزی سے کہا تھا: "تم تو صحابہ کے گرے پڑے لوگ ہو۔" (الآحاد والمثانی، ح: ۱۰۹۲) عبیداللہ بن زیاد کی ولادت ۳۲ ہجری کی تھی۔ (کما ثبت بروایۃ الفضل بن دکین ان عبید اللہ بن زیاد کان لہ وقت قتل الحسین ثمان وعشرون سنۃ. تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۱۷۶، تدمری) جبکہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیعتِ رضوان سے مشرف صحابی تھے۔ یعنی اس گفتگو کے وقت عبیداللہ بن زیاد بالکل نوجوان تھا جب کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ ۷۰ برس کے لگ بھگ تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/۴۸۳، ط الرسالۃ) کوئی شریف آدمی کسی عام بوڑھے سے بھی اس طرح گفتگو نہیں کرتا جیسے اس بد بخت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر رسیدہ صحابی سے کی تھی۔ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے بھی اچھا جواب دیا تھا اور فرمایا تھا: "تجھے ماں نصیب نہ ہوا کیا صحابہ میں بھی کوئی گرا پڑا ہو سکتا ہے؟ وہ تو اپنی قوم کے بہترین اور شریف لوگ تھے۔" (الآحاد و المثانی، ح: ۱۰۹۲، مسند الشہاب لابن حکمون القضاعی، ح: ۸۰۲)

② ابن خلدون: ۱/۳۱۸، مقدمہ، الباب الثالث، الفصل الخامس والثلاثون

بلاشبہ بنوامیہ کی حکومت کا استحکام حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ اقتدار میں بخوبی ہو چکا تھا اس لیے یزید کے دور میں اہلِ تدبیر کو ترجیح دینے کا وقت تھا مگر یکسر الٹ حکمتِ عملی اختیار کر کے ہر جگہ ان شمشیروں پر بھروسہ کیا گیا جو دوست اور دشمن کا فرق نہیں جانتی تھیں حتیٰ کہ ان کی کاٹ سے صحابہ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ شمشیر بے تدبیر کی طاقت کا نشہ ان اہلِ اقتدار میں جس حد تک تھا، اس کا اندازہ عبیداللہ بن زیاد کی حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے گفتگو اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ سلوک سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ مسلم بن عُقبہ کے مدنی صحابہ وتابعین پر ظلم وستم میں بھی اسی کی جھلک عیاں ہوتی ہے۔ پھر حد یہ کہ یہ لوگ ان سیاہ کرتوتوں پر کبھی پچھتائے بھی نہیں۔

یزید بھی حکمران ہونے کے ناتے اپنے دور کے المیوں سے بری الذمہ نہیں مانا جا سکتا مگر بعد میں ان واقعات پر اس کا اظہارِ ندامت ثابت ہے مگر عبیداللہ بن زیاد کربلا کے واقعے پر ذرا بھی شرمندہ نہ تھا۔ جب وہ عراق سے جان بچا کر شام بھاگا تو راستے میں اسے متفکر دیکھ کر کسی ساتھی نے اندازہ لگایا اور کہا:

''شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ کاش! آپ نے حسین کو قتل نہ کیا ہوتا۔''

ابن زیاد بولا: ''بالکل نہیں، حسین تو مجھے قتل کرنے آرہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے ان کو قتل کر دینا بہتر سمجھا۔''①

مدینہ منورہ کی حرمت پامال کرنے والا مسلم بن عُقبہ مرتے وقت یہ کہہ رہا تھا: ''اے اللہ! میں نے توحید و رسالت کی گواہی دینے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں کیا جو مجھے مدینہ والوں سے جنگ کرنے سے زیادہ محبوب ہو اور آخرت کے لحاظ سے جس میں فائدے کی زیادہ امید ہو۔ اگر میں اتنا بڑا کام کر کے بھی دوزخ میں گیا تو یقیناً بدبخت ہوں گا۔''②

شرفاء کی توہین وتحقیر اور خودسری ومن مانی کے اس رویے کو، جس کی گھٹی یزید کے عہد میں دی گئی تھی، اگلے دور میں ایک مستقل سبق سمجھ کر بار بار دہرایا گیا۔ یزید کے بیٹے مُعاویہ کی موت کے بعد کے سیاسی بحران پر دِمشق کے محلے ''جیرون'' میں جو مشاورت ہوئی اس میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی کردار کشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔③

پھر جابیہ میں امرائے بنوامیہ اور شامی جرنیلوں کی مجلسِ مشاورت میں تعصب کا یہ نشہ مزید سر چڑھ کر بولتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد مَرْج راہط میں جنگ بندی اور مذاکرات کے معاہدے کے باوجود، ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے لشکر پر دھوکہ دہی سے اچانک حملہ کرنا اور پھر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے قریبی دوست حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ تک کو بلا پس و پیش سر عام قتل کر دینا یہ ثابت کر رہا تھا کہ اقتدار سے محروم ہو جانے والا یہ طبقہ، دوبارہ اقتدار میں آنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل قابلِ رشک تھا کہ مکہ پر اہلِ شام کے حملے اور سخت محاصرے کے دوران انہوں نے اپنے رفقاء کے اصرار کے باوجود شامی لشکر پر

---

① تاریخ الطبری: ۵/۵۲۲ عن عمرو بن الزبیر

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۶۳۳؛ تاریخ الطبری: ۵/۴۹۷؛ تاریخ الاسلام للذہبی: ۵/۳۳، ت تدمری

③ انساب الاشراف: ۶/۲۶۵، ط دار الفکر



شب خون مارنے کی اجازت نہیں دی تھی اور ایسی عسکری تدبیریں مسلمانوں پر آزمانے کو جائز نہیں سمجھا تھا، جس میں کسی بے گناہ کی جان جانے کا امکان ہو۔ ①

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ قرنِ اوّل کے امرائے بنوامیہ قومی مفادات کے احساس سے بے گانہ نہیں تھے۔ ہم اس حقیقت کا انکار نہیں کرتے کہ وہ سرحدوں کی وسعت وحفاظت اور ملت کی نگہبانی کے لیے عموماً مستعد رہے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیانہ تحریک میں ان کے مکروفریب نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ان کے نزدیک حصولِ اقتدار کے لیے کچھ بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس روش کو سیاسی تعصب کا مرض ہی کہا جاسکتا ہے۔

سیاسی تعصب کا روگ اور اس کے اگلے زمانے پر اثرات:

سیاسی تعصب کے مرض کے ساتھ شروع ہونے والی یہ باغی اموی تحریک کم از کم نو برس تک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف سرگرم رہی۔ ان نو برسوں میں اس تحریک کے کارکنوں اور نئے ابھرنے والے نوجوان قائدین کی تربیت انہی خطوط پر ہوئی۔ چنانچہ جب وہ برسرِ اقتدار آئے تو اس اصول نے ایک نئی شکل اختیار کی اور وہ یہ کہ نہ صرف اقتدار حاصل کرنے بلکہ اقتدار بچانے کے لیے بھی تمام حدود و قیود کو عبور کیا جاسکتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ اقتدار کو قبیلے سے اپنے خاندان، خاندان سے اپنے گھر اور گھر میں اپنی خاص محبوب بیوی کی اولاد میں محدود کرنے کا چلن شروع ہوا اور یوں موروثیت نے ایک مرض کی شکل اختیار کر لی۔ اس مرض کی جڑ ۶۴ھ کی باغی تحریک کے ساتھ ہی لگ گئی تھی جب مروان کے بعد خالد بن یزید اور اس کے بعد عَمرو بن سعید کو خلیفہ طے کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو نماز روزے اور سنت کے مطابق وضع قطع کا پابند نہ ہو مگر ان میں سے بہت سے لوگ حکومتی مسائل اور معاملات میں ظلم کے ارتکاب کو بھی ”قومی وسیاسی ضرورت“ کی تاویل کے ساتھ جواز کی حد میں داخل کر لیتے تھے اور اس کے لیے اپنے دل کا فتویٰ کافی سمجھتے تھے۔ انہیں یہی گمان تھا کہ وہ سب کچھ درست کر رہے ہیں اور اللہ بھی ان کے کاموں سے خوش ہے۔ اس سلسلے میں کوفہ کے جرنیل شمر بن ذی الجوشن کی مثال قابلِ غور ہے جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی کارروائی کی براہ راست کمان کی تھی اور جب سرکاری سپاہی نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے میں ہچکچا رہے تھے تو اسی نے آواز لگائی تھی:

”تمہارا بیڑا غرق! کس چیز کا انتظار کر رہے ہو مار ڈالو اسے۔“

اور تب جگر گوشۂ بتول کو قتل کر کے سر مبارک الگ کر دیا گیا۔ ②

یہی شمر بن ذی الجوشن عام زندگی میں پکا نمازی اور عبادت گزار تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر اشراق تک مسجد میں بیٹھا رہتا، پھر اشراق کے نوافل پڑھ کر دعا کرتا تھا: ”الٰہی! تو جانتا ہے میں کتنا شریف ہوں۔ مجھے معاف کر دے۔“

---

① وكان يدعى الى بيت الحجاج فيقول: البنات لا يصلح ولا نستحله. (انساب الاشراف: ۱۲۶/۷، ط دار الفكر)

② البداية والنهاية: ۵۴۸/۱۱

کسی نے کہا: ”اللہ تجھے کیوں معاف کرے گا؟ تو نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے کو شہید کرنے میں حصہ لیا تھا۔“

شمر بولا: ”تیرا ستیاناس! میں بھلا کیا کرتا۔ ہمارے حکام نے یہی حکم دیا تھا۔ ہم ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کرتے تو ہمارا حال پانی ڈھونے والے گدھوں سے بھی بدتر ہوتا۔“[1]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ شمر کے اس جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ عذر بالکل فضول تھا؛ کیوں کہ (حکام کی) اطاعت صرف نیک کاموں میں کی جانی چاہیے۔“[2]

اس ایک واقعے سے اس دور کے امراء کی عمومی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ منفی ذہنیت اس کے بعد برابر ترقی پذیر رہی۔ اور گزشتہ چودہ صدیوں میں اس مرضِ مزمن نے بارہا اُمت کو ہولناک تباہیوں سے دوچار کیا ہے۔

☆☆☆

مروان کا شام اور مصر پر قبضہ

مَرجِ راہط کے میدان میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامیوں کو شکست دے کر مروان بن الحکم نے بنوامیہ کی ایک نئی حکومت قائم کر دی مگر اب یہ حکومت اولادِ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی نہیں، حکم بن العاص کی نسل کی تھی۔ اگر چہ جابیہ میں بنوامیہ کی ذوالقعدہ ۶۴ھ میں منعقد ہونے والی تاریخ ساز کانفرنس میں مروان بن الحکم کے بعد خالد بن یزید اور اس کے بعد عَمرو بن سعید کو ولی عہد مقرر کر دیا گیا تھا مگر مروان نے حکومت پر گرفت مضبوط کرتے ہی خالد اور عَمرو بن سعید کی ولی عہدی منسوخ کر دی اور اپنے بیٹے عبدالملک اور اس کے بعد دوسرے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کر دیا۔[3] اس طرح موروثی حکمرانی کی جڑیں مزید گہری ہو گئیں۔

ذی القعدہ ۶۴ھ میں خلافت کا دعویٰ کرنے کے بعد مروان کو زندگی کے صرف نو ماہ مزید مل سکے۔ محرم ۶۵ھ میں اس نے مَرجِ راہط کی جنگ جیتی۔ پھر شام کے دیگر علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے مصر پر حملے کا منصوبہ بنایا اور وہاں کے شرفاء سے خفیہ ساز باز کی۔ مصر پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائب عبدالرحمٰن ابن جحدم کی حکومت تھی۔ مروان نے وہاں پہنچ کر دارالحکومت فسطاط کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر خندقیں کھود کر لڑتے رہے۔

جنگ کے آخری دن شہر میں مقیم عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔ لوگ جنگ کی وجہ سے ان کے جنازے میں بھی شرکت نہ کر سکے۔ انہیں ان کے گھر میں ہی دفنا دیا گیا۔ اسی دن اہلِ شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔

---

① تاریخ دمشق: ۱۸۹/۲۳

② میزان الاعتدال: ۲۸۰/۲

③ تاریخ الطبری: ۶۰۵/۵

مروان نے بیعت نہ کرنے والے ''۸۰'' افراد کو قتل کرا دیا جن میں دارِ عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرے میں شامل ایک بوڑھا اُکیدِر بن حمام بھی شامل تھا۔ یہ ۱۵ جمادی الآخرہ ۶۵ھ کا واقعہ ہے۔ مروان اپنے بیٹے عبدالعزیز کو مصر کا والی اور موسیٰ بن نصیر کو اس کا وزیر بنا کر واپس شام آ گیا۔ ①

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اہلِ مصر کی کمک کے لیے اپنے بھائی مُصعَب بن زبیر کو بھیج چکے تھے مگر مروان کے سالار عَمرو بن سعید نے انہیں شام کی سرحدوں پر ہی روک کر پسپا کر دیا۔ ②

حجاز میں مروان کی فوج کو شکست:

مروان اب حجاز پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے حُبَیش بن دَلجہ اور اپنے بھائی عبیداللہ بن حکم کو ۴ ہزار کا لشکر دے کر مدینہ منورہ پر قبضے کا ہدف دیا۔ اس لشکر میں حجاج بن یوسف اور اس کا باپ بھی تھا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بصرہ سے کمک منگوا کر اس فوج کو ربذہ کے مقام پر روک لیا۔ یکم رمضان ۶۵ھ کو دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں مروان کے بھائی عبیداللہ اور سالارِ فوج حُبَیش سمیت اکثر باغی تہ تیغ ہو گئے۔ حجاج بن یوسف اور اس کا باپ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ③

مروان کی وفات:

ابھی شکست کی خبر دِمَشق نہیں پہنچی تھی کہ ۶۳ سالہ مروان بن الحکم کا وقتِ اجل آن پہنچا۔ بنوامیہ کا یہ نامور سیاست دان ۳ رمضان ۶۵ھ کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ④ اس نے یزید بن مُعاویہ کی بیوہ اُم خالد سے شادی کی تھی۔ یزید کا بیٹا خالد اس کے گھر میں پل بڑھ رہا تھا مگر مروان کا سلوک اس سے اچھا نہ تھا۔ ایک دن اس نے خالد کو سب کے سامنے ماں کی فحش گالی دی۔ خالد نے اپنی والدہ کو بتایا۔ وہ آگ بگولا ہو گئی اور اس نے مروان کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔

رات کو جب مروان خواب گاہ میں محوِ استراحت تھا، خالد کی ماں نے کچھ لونڈیوں کو اندر بلایا۔ مروان کے منہ پر ایک بڑا تکیہ رکھ کر سب نے اپنا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ کچھ ہی دیر میں مروان دم گھٹ جانے کی وجہ سے فوت ہو گیا۔ ⑤ دنیا کو اپنی سیاست کے بل پر اِدھر سے اُدھر کرنے والا، گھریلو عورتوں کی سیاست کا نشانہ بن گیا۔

مروان بن الحکم کا شمار معاصرت کے لحاظ سے کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ نمازِ تہجد اور قرآنِ مجید کی تلاوت کا بڑا پابند تھا۔ ⑥ علم و ادب، شجاعت، عسکری مہارت، فقاہت اور سیاست و تدبر میں بلند پایہ انسان تھا مگر میدانِ سیاست کی غلطیوں نے اسے داغ دار کر دیا۔ تاریخ میں اس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ مروانی خلافت کا بانی تھا۔ اگر اس کے

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۲/۵، ت تدمری

② الکامل فی التاریخ: ۲۴۵/۳؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۳/۵، ت تدمری، ابن اثیر نے یہ واقعہ ۶۴ھ کے تحت لکھا ہے جبکہ یہ واقعہ ۶۵ھ کا ہے۔

③ تاریخ الاسلام للذھبی: ۴۴/۵

④ تاریخ خلیفۃ، ص ۲۶۲ ⑤ البدایۃ والنھایۃ: تحت حوادث ۶۵ھ؛ الثقات للعجلی: ۱۰۶،۱۰۵/۲، ط الدار

⑥ انساب الاشراف: ۲۶۰/۶، ط دار الفکر



دامن پر حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا دھبہ نہ ہوتا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شرعی خلافت کے مقابلے میں وہ بغاوت نہ کرتا تو شاید اسلامی تاریخ میں حسن بصری رحمہ اللہ اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ جیسے تابعین میں اس کا شمار ہوتا اور اسے نہایت عزت و احترام کے الفاظ سے یاد کیا جاتا مگر اعلیٰ صلاحیتوں کے غلط استعمال نے اسے اُن مقامات تک رسائی سے روک دیا، جو اس کے مثیل اور معاصر مگر محتاط افراد نے ان مہالک سے دامن بچا کر حاصل کر لیے۔ ①

☆☆☆

---

① **مروان محدثین کی نظر میں:**

اگرچہ مروان کی ولادت غزوۂ احد کے سال ہوئی تھی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت وہ آٹھ سال کا تھا اس کے باوجود اسماء الرجال کی تمام کتب میں اسے تابعی شمار کیا گیا ہے۔(**طبقات ابن سعد: ۳٦/۵ ط صادر ؛ الاستیعاب: ۱۳۸۷/۳ ؛ اسد الغابۃ: ۱۳۹/۵**)

بعض حضرات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالے سے مروان کو صحابی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا البتہ ایک جگہ اس کا احتمال مانا ہے مگر ساتھ ہی واضح کر دیا ہے کہ: لم أرَ من جزم بصحبتہ. ''میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس نے اس کی صحابیت کا یقین کیا ہو۔''(الاصابہ: ۲۰۳/٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ دوسری جگہ زیادہ واضح طور پر لکھتے ہیں: لاتثبت لہ الصحبۃ. ''اس کی صحابیت ثابت نہیں۔''(**تقریب التھذیب، تر: ٦۵٦۷**)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ مروان کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مروان بن الحکم: قال البخاری: لم یر النبی صلی اللہ علیہ وسلم. ''مروان بن حکم کے بارے میں امام بخاری کا کہنا ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی۔''

پھر حافظ ذہبی لکھتے ہیں: قلت: تابعی لہ تلک الافاعیل. ''میں کہتا ہوں وہ تابعی تھا اور اس کے کچھ وہ برے کام بھی تھے۔''(**المغنی فی الضعفاء: ٦۵۱/۲**)

اسی طرح میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں: ''میں کہتا ہوں کہ اس کے کچھ کام ہلاکت خیز تھے۔ ہم اللہ سے عافیت طلب کرتے ہیں۔''(**میزان الاعتدال: ۸۹/۴**)

صرف واقدی سے یہ منقول ہے کہ اسے رؤیتِ نبوی حاصل ہے۔(**التعدیل والتجریح لابی الولید الباجی: ۷۳۱/۲**)

مگر رطب و یابس جمع کرنے والے واقدی کے قول کو امام بخاری اور ان جیسے متعدد محدثین کی رائے پر کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے۔ علامہ عراقی لکھتے ہیں:

''امام ترمذی رحمہ اللہ نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ سے بذاتِ خود پوچھا: ''میں نے امام بخاری سے پوچھا: کیا مروان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا؟ انہوں نے فرمایا: نہیں۔''(قلت لہ مروان بن الحکم رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال: لا. (**تحفۃ التحصیل فی ذکر رواۃ المراسیل لابن العراقی: ۲۹۸/۱**)

بڑے بڑے محدثین کی صراحت کو ٹھکرا کر واقدی جیسے ضعیف راوی کے قول سے کسی کے لیے صحابیت جیسا عظیم شرف ثابت کر دینا تعصب کے سوا کچھ نہیں۔

مگر اس میں شک نہیں کہ کئی محدثین نے مروان کو روایتِ حدیث میں ثقہ مانا ہے اسی لیے صحیح بخاری میں اس کی متعدد روایات ہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے اس نے روایات نقل کی ہیں اور اس سے روایات لینے والوں میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ، عروۃ بن زبیر اور علی بن حسین رحمہما اللہ جیسے حضرات شامل ہیں۔(**الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۲۷۱/۸**) اس کی وجہ یہ ہے کہ مروان نے یہ روایات عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے سے پہلے بیان کی تھیں۔(**فتح الباری: ۳۳۲/۱**) اور غالباً اس وقت تک قیس بن ابی حازم کی وہ روایت زیادہ مشہور نہیں ہوئی تھی جس میں مروان کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث بتایا گیا ہے۔ اس لیے اس وقت تک اس کی حیثیت صحابہ کے صحبت یافتہ ایک عالم فاضل شخص کی تھی۔ اس لیے اس کے غلط کاموں کے باوجود یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے جان بوجھ کر حدیثِ نبوی میں کذب بیانی سے کام لیا ہوگا، جو پرلے درجے کی خیانت ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محدثین نے مروان کے بارے میں عروۃ بن زبیر رحمہ اللہ کی توثیق پر اعتبار کیا ہو جو مروان اور اس کے جانشینوں سے سخت سیاسی محاذ آرائی کے ماحول کے باوجود یہ فرماتے تھے: ''اخبرنی مروان بن الحکم و لا اخالہ یتھم علینا.'' (**التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمہ، السفر الثالث: ۳۱۷/۱**)

اس کے باوجود بعض محدثین مثلاً: امام مسلم اور ابن حبان مروان کو ثقہ نہیں مانتے جبکہ جمہور محدثین کے نزدیک راہِ اعتدال یہ تھی کہ روایت میں اسے متہم نہ سمجھا جائے اور اس کی جو سیاسی غلطیاں صحیح سند سے ثابت ہوں ان کا انکار بھی نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس یہ ایک انتہا ہوگی کہ اس کے غلط کاموں کا سرے سے انکار کر دیا جائے بلکہ مزید بزرگی دے کر اسے مرتبہ صحابیت پر فائز سمجھ لیا جائے۔

مختار: بنوثقیف کا کذاب

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مروان کی اس کش مکش کے دوران مکہ معظمہ میں ایک نیا طالع آزما عالم اسلام کو اپنی مٹھی میں لینے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس شخص کا نام مختار بن ابو عبید تھا۔ قبیلہ بنوثقیف سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تاریخ میں اسے مختار ثقفی کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے والد ابو عبید بن مسعود ثقفی رحمہ اللہ ایک بہادر تابعی تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں عراق کی سرحدوں پر اسلامی افواج کی قیادت کرتے ہوئے "جنگ جسر" میں شہید ہوئے تھے۔ کہنے کو تو مختار بھی تابعین کے دور میں تھا مگر علم وفضل اور دیانت وتقویٰ سے بالکل خالی تھا، تاہم اپنی چرب زبانی، ہوشیاری اور عیاری کے بل بوتے پر وہ قبیلہ بنوثقیف کے صف اول کے نوجوانوں میں شمار ہوتا رہا۔[1]

شروع سے اس پر اعلیٰ مناصب پانے کا خبط سوار تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت یہ نوجوان تھا اور اس کا چچا سعد بن مسعود مدائن کا حاکم تھا۔ اس وقت مختار کو یہ سوجھی کہ اگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا جائے تو بدلے میں کوئی بڑا منصب ضرور ہاتھ لگے گا۔ اس نے یہ منصوبہ اپنے چچا کے سامنے پیش کیا تو اس نے سختی سے جھڑک دیا۔[2]

یزید کے دور میں عبیداللہ بن زیاد نے اس کی شرانگیزیوں کی اطلاع ملنے پر سو کوڑے لگوائے اور شہر بدر کر کے طائف بھیج دیا تھا۔[3] کوڑوں کی اس سزا کے دوران اس کی ایک آنکھ جاتی رہی اس لیے باقی عمر یک چشم رہا۔[4]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور یزید کی کش مکش کے دوران یہ قسمت آزمانے مکہ آ گیا اور حصین بن نُمیر کے خلاف مزاحمت میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ اس کا خاص حربہ یہ تھا کہ اکابرِ اُمت کے پاس اٹھتا بیٹھتا اور خود کو ان حضرات کا مقرب مشہور کر کے لوگوں کی عقیدت ومحبت بٹورتا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ اس کا محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے پاس بھی آنا جانا تھا۔ وہ بہت دانا انسان تھے اس لیے اس کی مکاری کو تاڑ گئے تھے۔ لہٰذا اس سے محتاط رہتے تھے۔ البتہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شروع میں اس پر اعتماد کرتے رہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہوگئی تو کچھ مدت بعد یہ ان سے عراق جانے کی اجازت مانگنے لگا۔ اس

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳/۵۴۰، ط الرسالة
[2] تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵ عن موسیٰ بن عبد الرحمن
[3] سیر اعلام النبلاء: ۵۴۴/۳، ط الرسالة
[4] المحبر: ۳۰۳/۱

نے یقین دلایا کہ وہاں اس کی موجودگی خلافتِ زبیریہ کے لیے بہت مفید ہوگی۔ ①

تحریکِ توابین:

آخر کار مختار عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر رمضان ۶۴ھ میں مکہ سے نکلا اور کوفہ آ کر دم لیا۔ ②

ان دنوں وہاں ایک صحابی سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے ③۔ کوفہ میں آباد شیعانِ علی ان کے گرد جمع تھے اور رضا کاروں کے لیے سامانِ جنگ جمع کیا جا رہا تھا۔ یہ تمام لوگ واقعۂ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے پر شرمندہ تھے۔ ان میں کوفہ کے وہ سرکردہ افراد بھی تھے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھ کر حجاز سے عراق بلانے میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کو "حرکۃ التوابین" (توبہ کرنے والوں کی تحریک) کا نام دیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اعانت میں کوتاہی پر توبہ و استغفار کرتے ہوئے ان کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا یا خود لڑتے لڑتے مر جانا اس تحریک کا ہدف تھا۔ اس کے لیے منصوبہ بنایا گیا تھا کہ عراق سے رضا کاروں کا لشکرِ جرار تیار کر کے شام کی طرف پیش قدمی کی جائے اور وہاں پر قابض امرائے بنو امیہ خصوصاً عبیداللہ بن زیاد سے انتقام لیا جائے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت و عقیدت امتِ محمدیہ کے رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ اس لیے اس نعرے پر ہزاروں نوجوان حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ④

تحریکِ توابین کی سرگرمیاں اعلانیہ تھیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے گورنروں نے جان بوجھ کر اسے آگے بڑھنے دیا؛ کیوں کہ اس کی قوت ان کے حریف شامی امراء کے خلاف استعمال ہونے جا رہی تھی۔ اس طرح یہ تحریک خلافتِ زبیریہ کے حق میں تھی۔ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے بعد مسیب بن نجبہ فزاری، عبداللہ بن سعد، عبداللہ بن وال

---

① طبقات ابن سعد: ۵/ ۹۸ ط صادر ..... اہم نوٹ: "خلافتِ زبیریہ" کی اصطلاح بعض متاخرین علماء نے اختیار کی ہے، ہم نے تعبیر کی سہولت کے لیے اسے اختیار کر لیا ہے ورنہ خود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یا ان کے حامیوں نے اس خلافت کو "خلافتِ زبیریہ" یا کوئی اور ممتاز نام نہیں دیا تھا۔

② تاریخ الطبری: ۵/۵۷۷،۵۷۸

③ سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ کی صحابیت پر اسلاف کا اتفاق ہے۔ اصحابِ جرح و تعدیل کی متفقہ رائے یہی ہے۔ (التاریخ الکبیر للبخاری: ۱۳۶/۶، الاستیعاب: ۶۵۰/۲، ۶۵۱، سیر اعلام النبلاء: ۳۹۴/۳، ط الرسالۃ، الاصابۃ: ۱۴۴/۳، معجم الصحابۃ: ۱۵۶/۳)

صحیح بخاری میں ان کی مرفوع روایات ہیں مثلاً: عن سلیمان بن صُرَد کنت جالساً مع النبی ﷺ (ح: ۳۲۸۲) حدثنا اسرائیل، سمعت ابا اسحاق یقول سمعت سلیمان بن صُرَد یقول سمعت النبی ﷺ یقول حین اجلی الاحزاب. (ح: ۴۱۱۰) حدثنی عدی بن ثابت قال سمعت سلیمان بن صُرَد رجلاً من اصحاب النبی ﷺ قال استبّ رجلان الخ (ح: ۶۰۴۸)

یاد رہے کہ مروانیت سے متاثر بعض "جدید محققین" نے سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے کا اس لیے انکار کیا ہے کہ ایک صحابی کا کسی باغی تحریک کی قیادت کرنا بعید از قیاس ہے۔ مگر اول تو جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے نظائر کو دیکھتے ہوئے یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے۔ دوسرے حقیقت یہ ہے کہ حرکۃ التوابین کوئی باغی جماعت نہیں تھی بلکہ شرعی خلیفہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی وفادار تھی۔ اس کا ہدف شام کے امراء تھے جو شرعی خلافت کے باغی تھے۔ یہ درست ہے کہ اس تحریک میں بڑی تعداد شیعانِ علی کی تھی مگر اس وقت کے شیعانِ علی کی اکثریت صحیح العقیدہ تھی۔ صرف ان کا سبائی گروہ جو بعد میں رافضیت کی بنیاد بنا، بدعقیدگی میں مبتلا تھا مگر کچھ شر پسندوں کی وجہ سے کسی پوری تحریک کو باطل قرار دے دینا بھلا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ دنیا میں اہلِ حق کی ایسی کوئی تنظیم نہیں ہوگی جس میں اس قسم کے لوگ شامل نہ ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ہوتے ہوئے مدینہ میں منافقین اہلِ ایمان کے ساتھ گھل مل کر شر انگیزیوں میں مصروف رہے۔ پس بعد میں کسی بھی جماعت یا تحریک میں نہ تو ایسے لوگوں کا وجود بعید ہے اور نہ ہی ان کی موجودگی اس تحریک کے باطل ہونے کا ثبوت بن سکتی ہے۔

④ تاریخ الطبری: ۵/۵۵۲ تا ۵۶۰

اور رفاعہ بن شداد رحمہ اللہ جیسے کبار تابعین اس تحریک کے روٴساء تھے۔ [1]

مختار توابین کو اپنی طرف مائل کرتا ہے:

مختار جب کوفہ پہنچا تو وہاں تمام لوگ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے گرد جمع تھے اور خونِ حسین کا انتقام لینے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ تب مختار کو محسوس ہوا کہ اس نعرے کے ذریعے بہت جلد بے شمار افراد کو مٹھی میں لیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اس نے بھی اپنے طور پر سادات کا بدلہ لینے کی آواز لگانا شروع کردی مگر مسئلہ یہ تھا کہ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ پرانے بزرگ تھے، ان کے ہوتے ہوئے مختار کو کون گھاس ڈالتا۔

یہ دیکھ کر مختار نے اپنے فنِ کذب بیانی سے کام لیا اور کہنا شروع کیا: ''میں مہدیٔ زمانہ محمد بن حنفیہ کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنا وزیر، امین اور معتمد خاص بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔''

وہ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے جنگی منصوبے کو نا قابلِ عمل قرار دیتے ہوئے کہتا ہے: ''ان کا ارادہ تو بس یہ ہے کہ لڑنے نکلیں۔ خود قتل ہوں اور تمہیں بھی مروائیں۔ ان کو جنگ کا کوئی تجربہ ہے نہ اس میدان کا کوئی علم۔''

اس طرح کے دعووں کے ذریعے اس نے سلیمان بن صُرَد کے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملالیا، یوں شیعانِ علی کے دو گروہ بن گئے: اکثریت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی اور اقلیت مختار کے گرد۔ [2]

توابین کا انجام:

مختار نے یہ طے کیا تھا کہ وہ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر کوئی قدم اٹھائے گا؛ اس لیے وہ جنگ میں شرکت سے گریزاں رہا، تاہم زبانی طور پر توابین کے مقاصد کی تعریف کرتا اور انہیں حوصلہ دلاتا رہا۔

سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تیاری کی تو سولہ ہزار افراد نے ساتھ جانے کے لیے نام لکھوا دیے۔ عوام کا یہ جوش و خروش دیکھ کر کوفہ میں موجود قاتلینِ حسین کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ عمر بن سعد جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کاروائی کرنے والی فوج کا امیر تھا، ڈر کے مارے اپنے گھر کی بجائے قصرِ امارت میں ہی رات گزارتا تھا مگر اس تمام ہل چل کے باوجود ربیع الآخر ۶۵ھ میں جب سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ لڑائی کے لیے نکلنے لگے تو صرف چار ہزار کا مجمع ان کے ہم رکاب تھا۔ پھر بھی سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔

تجربہ کار لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ وہ اتنے تھوڑے مجمع کے ساتھ شام کی سخت جان افواج سے ٹکرانے کی غلطی نہ کریں مگر سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ نے جذبات کی شدت میں اس پر توجہ نہ دی۔

اس دوران کوفہ کے حکام کو اطلاع ملی کہ شام سے عبید اللہ بن زیاد ایک لشکر لے کر عراق پر حملے کے لیے آرہا ہے۔ اس لیے حاکمِ شہر عبد اللہ بن یزید نے سلیمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ یہیں رہ کر لڑیں، ہم اتنے میں جنگ کی تیاری کرلیں گے۔ جب دشمن یہاں آئے گا تو ہم مل کر مقابلہ کریں گے۔'' مگر سلیمان رضی اللہ عنہ نے اتنا انتظار بھی گوارا نہ کیا۔

[1] تاریخ الطبری: ۵/۵۶۰، ۵۶۱

۵ ربیع الآخر ۶۵ھ کو رضا کاروں کی فوج کوفہ سے نکلی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مرقد پر دعا اور گریہ وزاری کر کے شام روانہ ہوئی۔ اس جماعت کا خاص نعرہ "یَا لِثَارَاتِ الْحُسَین" (ہائے حسین کا انتقام) تھا۔ بعد میں یہی نعرہ مختار ثقفی نے پسند کیا۔

راستے میں "قرقیسیا" کے فصیل بند شہر میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامی زُفر بن حارث نے ان کا استقبال کیا اور خوب خاطر تواضع کی۔ زُفر بن حارث نے اتنی کم فوج کے ساتھ کھلے میدان میں شامی افواج سے ٹکرانے کو خطرناک قرار دیتے ہوئے کہا: "آپ ہمارے شہر میں ٹھہر کر مورچہ بندی کر لیں، اس صورت میں ہمارا اور آپ کا ہدف ایک ہوگا۔ شام سے آپ کے مقابلے میں بہت بڑی فوج روانہ ہو چکی ہے۔" سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ نے اس مخلصانہ اور صائب مشورے کو بھی قبول نہ کیا اور کہا: "یہ مشورہ تو ہمارے شہر والوں نے بھی دیا تھا لیکن ہم نہ مانے۔"

آخر زُفر بن حارث نے جنگ سے متعلق کچھ قیمتی مشورے دیتے ہوئے انہیں رخصت کیا۔

سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ انہی چار ہزار رضا کاروں کو لیے ہوئے شام کی سرحدوں پر "عین الوَرْدَہ" نامی مقام پر پہنچے تھے کہ شامی افواج سے سامنا ہو گیا۔ یہ ۲۶ ربیع الآخر ۶۵ھ کا واقعہ ہے، اس وقت اموی امراء کا سربراہ مروان بن الحکم زندہ تھا اور اسی نے یہ فوج بھیجی تھی۔ تین دن تک یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آخر کار شامی لشکر نے توابین کو شکست فاش دے دی۔ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ، مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن سعد اور عبداللہ بن وال رحمہم اللہ سمیت تقریباً سارے قائدین اور اکثر رضا کار کام آ گئے۔ صرف رفاعہ بن شدّاد رحمہ اللہ کچھ لوگوں کے ساتھ بچ کر واپس آ سکے۔[1]

سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کی عمر ۹۳ برس تھی۔[2] وہ بعض روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست نقل کرتے تھے۔[3]

شکست کی وجوہ:

سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کی شکست کی وجوہ بہت واضح ہیں:

1. وہ منصوبہ ساز آدمی نہیں تھے۔ محض توکل اور جوش وجذبے کے بل بوتے پر جنگ جیتنا چاہتے تھے۔
2. فوج کی تعداد کم تھی۔ صرف چار ہزار۔ جبکہ شامی افواج بیس ہزار کے لگ بھگ تھیں۔
3. میدان جنگ شام کے قریب اور کوفہ سے دور تھا۔ توابین کو کمک ملنا مشکل اور اہلِ شام کے لیے آسان تھا۔
4. سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کو نہ تو خود جنگوں کا تجربہ تھا نہ ان کی فوج میں کوئی نامور کمانڈر تھا جبکہ دوسری طرف حُصین بن نُمیر جیسا ہوشیار سپہ سالار تھا جس کی پشت پر عبیداللہ بن زیاد جیسا منصوبہ ساز اور تیز ترین انسان تھا۔
5. توابین میں خود باہمی تنظیم وتعاون کی کمی تھی۔ سولہ ہزار میں سے آٹھ ہزار کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ جانا اس کا ثبوت ہے۔
6. مختار ثقفی بظاہر تحریک کا ہمدرد مگر اندر سے مخالف تھا۔ بہت سے لوگ مختار کی وجہ سے اس جنگ میں شامل ہونے سے

---

① تاریخ الطبری: ۵/۵۸۳ تا ۶۰۵؛ تاریخ الاسلام للذهبی: ۵/۳۶ تا ۴۸؛ الکامل فی التاریخ، سن ۶۵ ھ

② جامع الاصول: ۱۲/۳۴۸؛ مستدرک حاکم، ح: ۶۲۵۵ ③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/۱۹۱، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

گریزاں رہے۔ جس سے توابین کی قوت کمزور پڑ گئی۔ یوں ان اسباب نے توابین کی شکست مقدر کر دی۔

مختار پر پرزے نکالتا ہے

سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے کوفہ سے روانہ ہوتے ہی پیچھے مختار کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ کوفہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائبین کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ شخص شہری امن وامان اور حکومت کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ چنانچہ حاکم کوفہ عبداللہ بن یزید نے اچانک چھاپہ مار کر اسے پکڑا اور شک کی بنیاد پر جیل میں ڈال دیا۔ [1]

باقی ماندہ توابین واپس آئے تو مختار جیل ہی میں تھا اور وہیں سے رابطے کر کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

مختار حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا سالا تھا۔ اپنی بہن کی کوشش اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی سفارش سے آخر اسے رہائی مل گئی۔ تاہم کوفہ کی انتظامیہ نے شہر کے دس معزز افراد سے ضمانت نامہ لکھوایا کہ یہ شخص باہر آ کر کسی حکومت مخالف سرگرمی میں ملوث نہیں ہوگا۔ اس بات پر مختار سے قسمیں لی گئیں۔

باہر آتے ہی مختار نے کہا: ''کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ! انہوں نے یقین کر لیا ہے کہ میں اپنی قسموں کو پورا کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے پہلے سے زیادہ تیزی سے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔'' [2]

وہ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کا خلا پر کرنے کے لیے فوراً آگے آیا۔ توابین کے باقی ماندہ افراد اور سادات کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی ایک تحریر گھڑ لی تھی جس میں اس کی مدد کا حکم تھا۔ وہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو مہدی اور خود کو ان کا نائب کہتا تھا۔ کچھ لوگوں کو اس کے دعوے پر شک تھا۔ انہوں نے ایک وفد حجاز بھیجا تاکہ تصدیق کریں۔

محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کا مختار کے بارے میں ارشاد:

محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے واضح الفاظ میں مختار کو اپنا نائب قرار نہ دیا البتہ یہ فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ اللہ اپنے مخلوق میں سے جس کے ذریعے چاہے ہمارے دشمنوں سے بدلہ لے۔''

مختار کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے اس کی قلعی نہ کھول دی ہو مگر جب وفد آیا تو اس نے اپنے طور پر محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے کلمات کا حاصل مطلب یہ بیان کیا: ''محمد بن حنفیہ نے ہمیں مختار کی نصرت کا حکم دیا ہے۔'' [3]

یوں مختار کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

کوفہ میں مختار کی سرگرمیاں بڑھتی دیکھ کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے وہاں عبداللہ بن مطیع کو رحمہ اللہ کو نیا حاکم مقرر کر دیا۔ انہوں نے نمازوں اور محصولات کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایاس بن مضارب کو محکمۂ پولیس کا ذمہ دار بنایا اور تاکید کی کہ عام لوگوں سے نرمی اور مشکوک افراد سے سختی کا معاملہ کرنا۔ [4]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۶۸۹/۱۱، ۶۹۰

[2] تاریخ الطبری: ۱۲/۶، ۱۳، ۱۴

[3] تاریخ الطبری: ۱۴/۶، البدایۃ والنہایۃ: ۲۰۵/۱۲

[4] تاریخ الطبری: ۱۰/۶، ۱۱

کراماتی کرسی:

مختار ثقفی لوگوں کو اپنا مرید بنانے کے لیے عجیب وغریب چالیں اپنا رہا تھا۔ اس سلسلے میں اسے جس سے مدد ملتی اس پر پیسے کی بارش کر دیتا۔ طفیل بن جعدہ نامی ایک مفلس آدمی کو پیسہ چاہیے تھا۔ وہ کسی تیلی کے پاس سے بہت پرانی کرسی اٹھا لایا جس پر اتنا تیل اور میل جما ہوا تھا کہ لکڑی اس تہہ میں چھپ گئی تھی۔ وہ مختار کو یہ کرسی دکھا کر کہنے لگا:

''میرے والد اس کرسی پر بیٹھا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس میں ایک خاص تاثیر ہے۔''

مختار نے کہا: ''واہ! یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔'' پھر کرسی کو منگوا کر دیکھا اور اس کے بدلے طفیل کو بارہ ہزار درہم دیے۔

اب مختار نے اس کرسی کے بارے میں پورا افسانہ گھڑ لیا اور مریدوں کے مجمعے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''گزشتہ قوموں کا کوئی ایسا معجزہ نہیں جو ہمیں نصیب نہ ہوا ہو۔ بنی اسرائیل کے پاس ایک تابوت تھا جس میں آلِ موسیٰ وہارون کے تبرکات تھے۔ ایسی چیز ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔''

یہ کہہ کر اشارہ کیا۔ کرسی جو غلاف میں لپٹی ہوئی تھی، لائی گئی۔ جب اس کا غلاف کھولا گیا تو کرسی پر نظر پڑتے ہی لوگ اس کے دعوے پر ایمان لے آئے۔ سبائی گروہ کے لوگ جوش کے مارے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر تکبیر کے نعرے لگانے لگے۔ کوفہ کے مشہور رئیس شَبَث بن ربعی نے لوگوں کو سمجھایا اور آواز لگائی: ''لوگو! کہیں کفر کا ارتکاب مت کر بیٹھنا۔'' مگر لوگوں نے ایک نہ سنی بلکہ شَبَث بن ربعی کو دھکے دے کر مسجد سے نکال دیا۔ [1]

مختار اپنے پاس آنے والے ہر مہمان کو اس کرسی کے فضائل سناتا۔ ساتھ ہی اس نے یہ دعویٰ بھی شروع کر دیا کہ جبرئیل علیہ السلام بھی اس کے پاس آتے ہیں اور اس کرسی پر بیٹھا کرتے ہیں۔

رفاعہ بن شداد رحمہ اللہ ایک دن مختار کے پاس گئے تو وہ انہیں دیکھتے ہی بولا:

''آپ کے آنے سے ذرا پہلے جبرئیل علیہ السلام اس کرسی سے اٹھ کر گئے ہیں۔''

رفاعہ بن شداد فرماتے ہیں: ''میں نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا اور دل میں کہا: مجھے اب کس بات کا انتظار ہے کہ اس کا سر دھڑ سے الگ نہ کر دوں۔ پھر رکا یک عمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کا سنایا ہوا فرمانِ نبوی یاد آ گیا کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے سے اپنی جان کے بارے میں مأمون ہو، پھر بھی وہ دوسرا شخص اسے قتل کر دے تو قیامت کے دن وہ شخص غداری کے جھنڈے کے نیچے کھڑا کیا جائے گا۔''

اس حدیث کو سوچ کر رفاعہ بن شَدّاد نے مختار کو دھوکے سے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ [2]

اللہ نے مختار کو ڈھیل دے رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت بڑھاتا رہا اور آخر کار ۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ کو اس نے کوفہ میں عام بغاوت کر دی۔ [3]

---

① تاریخ الطبری: ۶/۸۲، ۸۳

② مسند ابی داؤد طیالسی، حدیث نمبر: ۱۳۸۲ ③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۶۶، سن ۶۶ھ

کوفہ کے گورنر عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو بے دخل کر دیا گیا اور مختار کے مرید شہر پر قابض ہو گئے۔ اس دوران عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے وفادار سپاہی اور کئی مسلمان مزاحمت کرتے ہوئے قتل ہو گئے جن میں رفاعہ بن شداد رحمہ اللہ، اور عبد اللہ بن سعد بن قیس بھی شامل تھے۔ ①

قاتلینِ حسین کا انجام:

مختار نے حکومت سنبھال کر سب سے پہلے ان لوگوں کو چن چن کر قتل کرانا شروع کیا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل یا ان کے خلاف جنگ میں ملوث تھے۔ کوفہ پر اس کا قبضے ہوتے ہی قاتلینِ حسین میں سے کچھ فرار اور کچھ روپوش ہو گئے۔ شمر بن ذی الجوشن بصرہ کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ مختار کے آدمیوں نے کھوج لگا کر آخر اسے جا لیا۔ شمر لڑتا ہوا مارا گیا۔ ②

مختار نے کوفہ میں اعلان کیا: ''جو قاتلینِ حسین یہاں چھپے ہوئے ہیں، لوگ ان کے نام بتائیں، انہیں تلاش کریں اور قتل کریں۔ جب تک میں زمین کو ان سے پاک نہ کر دوں مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔''

اس اعلان پر شہر میں ہل چل مچ گئی۔ قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا گیا۔ مختار نے کسی کو زندہ جلا دیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تڑپتا چھوڑ دیا اور یوں اس کی جان نکلی۔ کسی کو تیروں سے چھلنی کرا دیا۔ مالک بن بشیر نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جبہ اتارا تھا، اسے ہاتھ پاؤں کٹوا کر مارا۔ خولی بن یزید نے سر مبارک کاٹا تھا، اس کے گھر پر چھاپہ مارا گیا تو وہ ٹوکرے کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ مختار نے اسے زندہ جلا دیا۔

قاتلانہ وار کرنے والا ایک اور بڑا مجرم سنان بن انس ہاتھ نہ آیا۔ مختار نے اس کا گھر منہدم کرا دیا۔ عمر بن سعد کو جان کی امان کی جھوٹی تسلی دے کر بلوایا اور سر قلم کرا دیا۔ اس کے بیٹے حفص نے باپ کا سر دیکھ کر انا للہ پڑھی۔ اسے بھی یہ کہہ کر قتل کرا دیا کہ یہ علی اکبر بن حسین کا بدلہ ہے۔ مختار نے ان دونوں کے کٹے ہوئے سر، محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے پاس مدینہ بھجوا دیے۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ③

مختار کا سپہ سالار ابراہیم بن مالک، اُشتر نخعی کا بیٹا اور بڑا معرکہ دان انسان تھا۔ مختار نے کوفہ میں بغاوت برپا کرنے اور قاتلینِ حسین سے مقابلے میں اسے بڑی خوبی سے استعمال کیا۔

مختار کی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے خط و کتابت:

مختار کی چالاکی کا یہ عالم تھا کہ کوفہ میں بغاوت کر کے بھی اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے تعلق نہ ٹوٹنے دیا بلکہ انہیں ایک مراسلہ لکھ بھیجا جس میں اپنے اس اقدام کی توجیہ یہ بیان کی کہ عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ آپ کے مخالفین کے حق میں نرم تھے اس لیے ان کی تابع داری کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ ④

① الکامل فی التاریخ، سن ٦٦ھ ؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ٥/٥٠

② البدایة والنهایة: ١٢/٢١ ؛ تاریخ الطبری: ٦/٥٢ تا ٥٥

③ البدایة والنهایة: ١٢/٢٣ تا ٢٨

④ تاریخ الاسلام للذھبی: ٥/٥٠



مدائنی کی روایت میں ہے کہ اس نے لکھا: ''عبداللہ بن مطیع آپ کا مخالف تھا اور عبدالملک بن مروان سے ساز باز کر رہا تھا جبکہ مجھے عبدالملک کے مقابلے میں آپ زیادہ محبوب ہیں۔''[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی سیاست دان تھے۔ مختار کی چال بازیوں کو خوب سمجھتے تھے مگر اس وقت بعض مصلحتوں کے پیش نظر اسے کوفہ کی حکومت کا پروانہ لکھ بھیجا۔[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی قوت سے شامی باغیوں کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔

مختار کا شام پر حملہ اور عبید اللہ بن زیاد کا قتل:

ذوالقعدہ ۶۶ھ میں مختار نے سپہ سالار ابراہیم بن مالک نخعی کو سات ہزار افراد کے ساتھ شام بھیجا تاکہ عبید اللہ بن زیاد کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس لشکر کو کامیابی کا یقین دلانے کے لیے اس نے کراماتی کرسی کو فتح کی ضمانت قرار دے کر لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اسے ایک غلاف میں لپیٹ کر خچر پر لادا گیا تھا اور دائیں بائیں سے سات سات آدمیوں نے اسے تھاما ہوا تھا۔[3] محرم ۶۷ھ میں اس لشکر نے موصل سے ۱۵ میل (۲۴ کلومیٹر) دور ''خازِر'' کے مقام پر افواجِ شام سے زوردار ٹکر لی۔ چوں کہ عبید اللہ بن زیاد اپنے ظلم وستم اور خاص کر سانحۂ کربلا کا سب سے بڑا مجرم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی شدید نفرت کا ہدف بنا ہوا تھا اس لیے اہلِ عراق ناقابلِ بیان حد تک جوش وخروش سے لڑے۔ اس کے ساتھ ابراہیم کی عسکری مہارت اور جنگی پینتروں نے شامی افواج کو ہراساں کر دیا۔ آخر ان کی صفیں تتر بتر ہوگئیں اور ان کی اکثریت لاشوں کے ڈھیر چھوڑتی ہوئی پسپا ہوگئی۔ ابراہیم خود حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور عبید اللہ بن زیاد تک جا پہنچا جو میدان میں اب بھی ڈٹا ہوا تھا۔ اس حملے میں عبید اللہ بن زیاد مارا گیا۔ اس کی لاش بعد میں اس تیز خوشبو کی وجہ سے پہچانی گئی جو وہ لباس پر لگایا کرتا تھا۔

حُصَین بن نُمیر اور شُرَحبیل بن ذوالکلاع جیسے نامور شامی جرنیل اس لڑائی کی نذر ہوگئے۔ حسنِ اتفاق سے یہ ۱۰ محرم ہی کا دن تھا۔ چھے سال پہلے اسی تاریخ کو عبید اللہ بن زیاد نے سادات کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔

ابراہیم نے عبید اللہ کا کٹا ہوا سر مختار کے پاس کوفہ بھیج دیا۔[4]

سنن ترمذی کی روایت ہے کہ مختار کے سامنے جب عبید اللہ بن زیاد کا سر رکھا گیا تو اچانک ایک سانپ آیا اور تین بار اس کی ناک میں گھسا، ہر بار کچھ دیر اندر رہا اور پھر منہ کے راستے سے نکلا۔[5]

نعوذ باللہ من غضبہ فی الدنیا والآخرۃ

---

① انساب الاشراف: ۶/۴۷۳، ط دار الفکر

② تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۵۰

③ تاریخ الطبری: ۵/۸۳

④ البدایۃ والنھایۃ: ۱۲/۳۵ تا ۳۸

⑤ سنن الترمذی، ح: ۳۷۸۰ بسند حسن صحیح

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مختار میں کشیدگی:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مختار کی حرکات پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اب تک وہ جان بوجھ کر اسے ڈھیل دیتے رہے تھے۔ مختار بھی ان سے دوہری چالیں چل رہا تھا۔ ایک طرف وہ کوفہ پر قابض ہو کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائبین کو عراق کے بڑے حصے سے بے دخل کر چکا تھا اور اپنے مریدوں کے سامنے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر سخت تنقید کیا کرتا تھا تاکہ لوگ اس کی مٹھی میں رہیں اور کسی دوسرے کی بزرگی سے متاثر نہ ہوں۔

دوسری طرف وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے فوری جنگ کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ اپنی قوت کو مزید بڑھائے اور پھر حجاز پر اچانک چڑھائی اس وقت کرے جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کمزور پڑ چکے ہوں۔ اپنی دشمنی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا:

''میں تو رضا و تسلیم کے عہد کے ساتھ آپ سے بیعت ہوا تھا اور آپ کا خیر خواہ تھا مگر جب آپ نے ہی مجھ سے بے اعتنائی برتی تو میں آپ سے دور ہٹ گیا۔ لیکن اگر آپ اب بھی اپنے سابقہ حسنِ سلوک پر قائم رہیں تو آپ مجھے بھی اپنا تابع دار تصور کیجئے۔''[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ مختار دھوکا دے رہا ہے تاہم انہوں نے اس کے دعوے کی قلعی کھولنے کے لیے عبدالرحمٰن بن حارث کو چالیس ہزار درہم دیے اور کہا:

''تم کوفہ روانہ ہو جاؤ، میں نے تمہیں وہاں کا گورنر مقرر کر دیا ہے۔'' وہ بولے: ''وہاں تو مختار قابض ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''مگر وہ دعویٰ تو یہی کر رہا ہے کہ وہ میرا تابع دار ہے۔''

مختار کو عبدالرحمٰن بن حارث کی آمد کی خبر ملی تو زائدہ بن قُدامہ کو سات سو گھڑ سواروں کا امیر بنایا اور ستر ہزار درہم دے کر ہدایت کی: ''عبدالرحمٰن بن حارث کو یہ رقم دے کر لوٹ جانے پر آمادہ کرنا۔ اگر وہ نہ مانے تو بزورِ شمشیر واپس کر دینا۔''

عبدالرحمٰن بن حارث کو جب راستے میں اس نئی صورتِ حال سے سابقہ پڑا تو خاموشی کے ساتھ زائدہ سے ستر ہزار درہم لے کر بصرہ چلے گئے جو ابھی تک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائبین کے پاس تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ مختار ہر قیمت پر اپنی آزاد حکومت کا خواہاں ہے اور اکابر کی سرپرستی میں حکومت کرنے کا اس کا دعویٰ محض ڈھونگ ہے۔[2]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مختار عربوں کے مقابلے میں اب عجمیوں کو ترجیح دینے لگا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اکثر عرب شرفاء اس کے مکر و فریب اور بدعقیدگی سے آگاہ ہو گئے تھے جبکہ ایرانی اور دوسری قوموں کے لوگ بڑے توہم پرست تھے اس لیے انہیں گمراہ کرنا اور بے وقوف بنانا مشکل نہ تھا۔ لہٰذا مختار انہی پر زیادہ اعتماد کر رہا تھا۔

☆☆☆

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۲/۱۲

② البدایۃ والنہایۃ: ۳۲/۱۲

دِمَشق کا نیا حکمران: عبدالملک

دِمَشق کے تخت پراب عبدالملک بن مروان براجمان تھا۔اس اکتیس سالہ نوجوان کی موجودہ اور سابقہ زندگی میں غیر معمولی فرق تھا۔باپ کی مسند سنبھالنے سے پہلے، وہ دن رات قرآن وحدیث اور فقہ جیسے علوم پڑھنے میں منہمک رہتا۔ نوافل اور تلاوت کی کثرت اس کے معمولات کا حصہ تھی۔[1] کبیرہ گناہوں ہی سے نہیں شک وشبہے کے معاملات سے بھی کوسوں دور رہتا تھا۔معرکۂ مَرْجِ راہط میں جب بنوامیہ کے تقریباً سب امراء اور جرنیل اپنا اقتدار بچانے کے لیے جمع ہوئے تھے تب بھی یہ جنگ میں شریک نہیں تھا؛ کیوں کہ اس کے نزدیک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی بھی اقدام مشکوک تھا اور احتیاط اسی میں تھی کہ ایسی جنگ میں شرکت نہ کی جائے[2] مگر اب جبکہ شام اور مصر کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی، وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شرعی خلیفہ ماننے پر تیار نہ تھا اور ہر قیمت پر ان کی حکومت ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی مصلحتیں انسان کی سوچ، کردار اور خیالات کو کس طرح بدل دیا کرتی ہیں۔

مختار کی ناکام چال، عبدالملک کا حجاز پر ناکام حملہ:

عبدالملک نے موقع پاتے ہی ایک لشکر حجاز روانہ کردیا جس کا پہلا ہدف مدینہ کے شمال میں واقع زرعی علاقہ وادی القریٰ تھا۔کوفہ میں مختار ثقفی کو یہ خبر ملی تو اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مدد کے بہانے حجاز میں اپنی افواج داخل کرنے کا منصوبہ بنایا۔اس نے فوراً قاصد دوڑا کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پیغام دیا:

''اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو امدادی افواج بھیج سکتا ہوں۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مدد کی سخت ضرورت تھی مگر وہ اس پیغام میں سازش کا امکان بھی نظرانداز نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے جواب بھیجا: ''اگر تم میرے تابع دار ہو تو مجھے یہ بات ہرگز بری نہیں لگے گی۔تم ایک لشکر وادی القریٰ بھیج دو تاکہ اہلِ شام کے مقابلے میں وہ ہماری مدد کرسکیں۔''

اس کے ساتھ ہی آپ نے عباس بن سہل رحمہ اللہ کو دو ہزار منتخب سپاہی دے کر مدینہ منورہ کی سرحدوں پر بھیج دیا اور ہدایت دی: ''اگر مختار کی فوج ہمارے تابع ہو تو ٹھیک۔ورنہ ان کے ساتھ احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ پیش آنا تاکہ اس دوران ہم ان سے نمٹنے کی تیاری کرلیں۔''

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۴۸/۴، ط الرسالۃ

② انساب الاشراف: ۲۷۰/۶، ط دار الفکر

ادھر مختار نے شُرَحْبیل بن وَرْس کو تین ہزار سپاہی دے کر جن میں سات سو عرب اور باقی عجمی تھے، حجاز بھیج دیا اور اسے پہلے مدینہ اور پھر مکہ پر قبضہ کا ہدف دیا مگر جب یہ لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو یہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے جرنیل عباس بن سہل رحمہ اللہ سے سامنا ہوا۔ عباس بن سہل رحمہ اللہ نے شُرَحْبیل سے پوچھا:

''کیا آپ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے تابع دار نہیں؟''

وہ بولا: ''کیوں نہیں، بالکل تابع ہیں۔''

عباس بن سہل رحمہ اللہ نے کہا: ''اگر ایسا ہی ہے تو ان کا حکم ہے کہ وادی القریٰ پہنچ کر شامیوں سے مقابلہ کریں۔''

شُرَحْبیل نے کہا: ''مجھے میرے آقا نے مدینہ پہنچنے کا حکم دیا ہے، وہاں پہنچ کر انہی سے پوچھوں گا کہ کیا کرنا ہے۔''

عباس سمجھ گئے کہ مختار کا مقصد حجاز پر قبضے کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت وہ مصلحت کا لحاظ کر کے چپ ہو گئے مگر رات کو موقع پا کر اچانک مختار کے لشکر پر دھاوا بول دیا۔ شُرَحْبیل مارا گیا اور لشکر کے بہت سے سپاہی بھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ باقی مجمع تتر بتر ہو گیا۔[1]

بصرہ پر قبضے کی ناکام کوشش:

مختار اس شکست کی خبر سے بڑا تلملایا۔ اس نے عراق کے دوسرے بڑے مرکز بصرہ میں اپنے داعی مُثَنّیٰ بن مُخَرِّبَہ کے ذریعے بغاوت کی کوشش کی مگر یہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے افسران بہت چوکس تھے، اس لیے بغاوت کامیاب نہ ہوئی۔[2]

محمد بن حنفیہ کو استعمال کرنے میں ناکامی:

مختار نے تقاریر کر کے اپنے مریدوں کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مزید ابھارا۔ ساتھ ہی اس نے حجاز کو فتح کرنے کے لیے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی بھرپور سرپرستی اور واضح اجازت کی ضرورت محسوس کی۔

اب تک محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے محتاط انداز میں قاتلینِ حسین کے خلاف مختار کی کارروائیوں کی حمایت کی تھی مگر وہ سرعام اس کی سرپرستی نہیں کر رہے تھے۔ مختار نے حجاز میں حالیہ لشکر کشی کے پس پردہ چھپے مزموم مقاصد پر پردہ ڈالتے ہوئے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو بہکانا چاہا اور صالح بن مسعود کے ہاتھ یہ خط بھیجا:

''میں نے آپ کی مدد کے لیے مدینہ کی طرف فوج بھیجی تھی مگر عبداللہ بن زبیر نے اس فوج کو فریب کا نشانہ بنا ڈالا۔ اب اگر آپ کی رائے ہو تو میں ایک دوسرا لشکر بھیج دیتا ہوں اور آپ بھی اہلِ مدینہ کو سفیر بھیج کر یہ بات بتا دیں۔''

مگر محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ اس کذاب کی چال میں آنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے جوابی خط میں لکھا:

''میرے نزدیک محبوب ترین کام اللہ کی اطاعت ہے۔ تم ظاہر و باطن میں اللہ کے فرماں بردار بن جاؤ اور یاد رکھو کہ اگر مجھے لڑنا ہوتا تو لوگ تیزی سے میرے گرد جمع ہو جاتے۔ میرے مددگار بکثرت ہیں مگر میں خود

[1] البدایة والنهایة: ۳۳/۱۲ ؛ تاریخ الطبری: ۷۱/۶ تا ۷۵، سن ۶۶ھ [2] تاریخ الطبری: ۶۶/۲ تا ۷۰، سن ۶۶ھ

ان سے گوشہ نشین ہو کر بیٹھا ہوں اور صبر و تحمل کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ میرے لیے فیصلہ فرما دے۔ وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

پھر آپ نے مختار کے سفیر کو کہا: "مختار سے کہو، اللہ سے ڈرے اور خون ریزی بند کرے۔"[1]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے درمیان دشمنی کی روایات جو بعض مؤرخین نے نقل کی ہیں، معتبر نہیں۔ محمد بن حنفیہ چاہتے تو پہلے ہی اپنے گرد لوگوں کو جمع کر کے حجاز کی حکومت حاصل کر لیتے مگر انہوں نے اپنی عابدانہ طبیعت اور علمی شان کے مطابق خود عزلت نشینی کی زندگی اختیار کی اور عہدوں کے طالب نہ بنے۔[2]

مختار کا دعوائے نبوت:

کوفہ پر قبضے اور عبیداللہ بن زیاد کو شکست دینے کے بعد مختار کی شہرت اور ہیبت میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا اور کہنے لگا کہ مجھ پر جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے ہیں۔[3]

اس نے پورے عراق میں اپنے داعی پھیلا دیے جو شرفائے شہر اور قبائل کے سرداروں کو بیعت کی دعوت دے رہے تھے۔ مختار کا کہنا تھا کہ جو اس سے بیعت کرے گا وہ اسے دنیا میں ہر چیز کی اور آخرت میں جنتی ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔ مختار نے خود بھی مراسلے لکھ کر ہر قوم کو اپنی بیعت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ جلیل القدر تابعی احنف بن قیس رحمہ اللہ بصرہ کے معزز ترین فرد تھے اور برملا مختار کو کذاب کہتے تھے۔ مختار نے انہیں درج ذیل خط لکھا:

"السلام علیکم! بنو مضر اور ربیعہ کا ستیاناس! اے احنف! تو اپنی قوم کو دوزخ کی طرف اس طرح لے جا رہا ہے کہ وہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ تقدیر کو میں نہیں بدل سکتا۔ معلوم ہوا ہے کہ تم مجھے کذاب کہتے ہو۔ مجھ سے

---

① تاریخ الطبری: ٦/٧٣، ٧٥؛ البدایۃ والنہایۃ: ٣٢/١٢

② مشہور ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے محمد بن حنفیہ کو اپنی بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش کی اور جب وہ نہ مانے تو انہیں قید کر دیا اور قتل کرانے یا زندہ جلانے کا منصوبہ بنایا۔ محمد بن حنفیہ نے مختار کو اطلاع بھیج کر مدد چاہی۔ اس نے ٧٥٠ چیدہ سوار بھیجے جنھوں نے دن دھاڑے مکہ میں گھس کر محمد بن حنفیہ کو آزاد کرا لیا۔ (تاریخ الطبری: ٦/٧٥، ٧٦، ٧٧)

مگر یہ روایت ابو مخنف کی ہے جس کا ضعف اور صحابہ سے تعصب مخفی نہیں، پس صحابہ پر جرح سے آلودہ یہ ضعیف روایت قبول کرنا خلاف اصول ہے۔ عقلاً بھی یہ ممکن نہیں کہ ٧٥٠ سوار پورے حجاز کو عبور کر کے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پایہ تخت میں جا گھسیں اور ان کی پوری فوج گم صم کھڑی رہ جائے۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے اپنے بیان سے بھی عیاں ہو رہا ہے کہ وہ قید میں نہیں بلکہ اپنی مرضی سے خلوت گزیں تھے۔ مختار نے ان کی خاطر کوئی لشکر کشی نہیں کی تھی۔ ان سے اجازت ضرور مانگی تھی مگر انہوں نے منع کر دیا تھا۔ اگرچہ محمد بن حنفیہ کے بیان پر مبنی روایت بھی ابو مخنف کی ہے اور یوں اسنادی حیثیت سے ضعیف ہے مگر درایت کے لحاظ سے قوی ہے جبکہ انہیں قید میں ڈالنے والی روایت ضعف کے ساتھ درایت کے لحاظ سے بھی مجروح ہے۔ دراصل اس قصے میں جو کچھ مواد ہے وہ ابو مخنف ہی سے منقول ہے اور اس کی اپنی روایات میں تعارض ہے اس لیے ان میں سے جرح صحابہ سے آلودہ اور درایت کے لحاظ سے بعید روایات خود بخود ساقط ٹھہریں گی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسا فقیہ اور متقی انسان صرف بیعت نہ کرنے پر محمد بن حنفیہ کو قتل کرانے بلکہ جلانے پر کیسے آمادہ ہو سکتا تھا۔ مختار کے ٧٥٠ سوار عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے تمام حفاظتی انتظامات کو بھلا کس طرح ناکام بنا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس دوسری روایت کو نقل کر کے کہا ہے: وفی صحتھا نظر ..... "اس کا صحیح ہونا محل نظر ہے۔" (البدایۃ والنہایۃ: ١٢/٣٦)

③ سیر اعلام النبلاء: ٣/٥٤١، ط الرسالۃ

پہلے انبیاء کو بھی اسی طرح جھٹلایا گیا۔ میں ان میں سے اکثر سے بہتر نہیں ہوں اس لیے اگر مجھے کاذب سمجھا گیا تو کیا ہوا۔"

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ مختار خود کو پیغمبر باور کرتا تھا اور بعض پیغمبروں پر فضیلت کا دعوے دار بھی تھا۔[1]

وہ مریدین کے سامنے عجیب و غریب پیشگوئیاں کرتا رہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اسے غیب کا علم ہو جاتا ہے۔ کسی واقعے کا پیشگی اندازہ ہو جاتا یا کسی حادثے کی خبر اسے جلد مل جاتی ہے تو اسے غیب کی خبر بتا کر لوگوں کی عقیدت بٹورتا۔

مختار اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مابین کھلی دشمنی:

جعلی نبوت کا ڈرامہ کرنے اور ہزاروں مریدوں کو ساتھ ملانے کے باوجود مختار اب تک عراق پر ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی گرفت مضبوط دیکھ رہا تھا۔ اسے حجاز پر فوج کشی میں بھی شکست فاش ہوئی تھی اور بصرہ میں بھی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ عبدالملک بن مروان، عبیداللہ بن زیاد کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے کسی بھی وقت حرکت میں آ سکتا ہے؛ اس لیے مختار کم از کم عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے تعلقات مزید کشیدہ نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ان سے راہ و رسم قائم رکھنے اور مالی امداد لینے کے لیے انہیں اپنے مراسلے میں لکھا:

"میں نے کوفہ کو مرکز بنا لیا ہے۔ اگر آپ مجھے یہاں حکومت کا موقع دیتے رہیں اور ایک لاکھ درہم بھیج دیں تو میں شام پر حملہ کر کے آپ کے مخالفین کا کام تمام کر سکتا ہوں۔"

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یہ مراسلہ پڑھ کر بولے:

"بنو ثقیف کے اس کذاب اور میرے درمیان فریب کا معاملہ آخر کب تک چلے گا۔"

پھر آپ نے مختار کی پیش کش مسترد کرتے ہوئے اسے واضح الفاظ میں لکھ بھیجا:

"اللہ کی قسم! میں تجھے ایک درہم بھی نہیں دوں گا۔"[2]

اس طرح مختار اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان برائے نام تعلق بھی ختم ہو گیا اور کھلم کھلا مخاصمت کا آغاز ہو گیا۔

مختار کو "کذاب" کیوں کہا جاتا تھا؟

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مختار کو کذاب اس لیے کہا تھا کہ اس بارے میں آپ کی والدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما یہ حدیث سنایا کرتی تھیں: "بے شک بنو ثقیف میں ایک شخص بڑا جھوٹا ہوگا اور ایک سخت خونخوار۔"[3]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اور اس دور کے اکابر کا یہی خیال تھا کہ بنو ثقیف کا کذاب یہی مختار ہے؛ اس لیے مختار کا لقب اس کی زندگی میں ہی "کذاب" مشہور ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ خود اپنی تقاریر میں کہا کرتا تھا: "اگر میں آل محمد کا انتقام نہ لوں تو

---

① تاریخ الطبری: ۶/۶۸ تا ۷۰

② انساب الاشراف: ۶/۴۴۷

③ "انَّ فِی ثَقِیْفٍ کَذَّاباً وَ مُبِیْراً" (صحیح مسلم، حدیث نمبر، ح: ۲۶۶۰، فضائل الصحابۃ، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا)

میں ویسا ہی کذاب ہوں جیسا مجھے لوگ پکارتے ہیں۔''[1]

عراق میں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی گورنری:

مختار کے ہاتھوں عبیداللہ بن زیاد اور حُصین بن نُمیر کے قتل سے اہلِ شام کی قوت کو سخت زک پہنچی تھی اور ان کا رعب و دبدبہ ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شام سے کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ اب مناسب وقت تھا کہ مختار کو اس کے انجام تک پہنچا دیا جاتا، کیوں کہ نبوت کے جھوٹے دعوے کے بعد اس کذاب کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ دیر کی گئی تو مختار کہیں بصرہ پر بھی قبضہ نہ کر لے اور پورا عراق ہاتھ سے نکل جائے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کام اپنے معرکہ آزما اور بلند ہمت بھائی مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کو سونپا۔ انہیں بصرہ کا گورنر مقرر کر دیا تا کہ وہ پورے عراق کو شورش، بدامنی اور بدعقیدگی کے اس طوفان سے پاک کریں۔ مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ عرب کے نامور شہسوار، وجیہ و جمیل، جنگ جوئی میں بے مثال اور سخاوت و فیاضی میں یکتائے زمانہ تھے۔[2]

مَذار کی فیصلہ کن جنگ:

کوفہ سمیت مختار کے زیرِ قبضہ تمام علاقوں کے نیک و صالح، شریف اور تعلیم یافتہ لوگ مختار سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ غلام، موالی، نوکر چاکر اور جاہل و بدقماش قسم کے لوگ مختار کے دعووں پر یقین کرتے تھے اور اس کی ہلاشیری کی وجہ سے ہر طرف اودھم مچاتے پھرتے تھے۔ عورتیں اور بچے تک محفوظ نہیں تھے۔ مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ بصرہ پہنچے تو قادسیہ سے محمد بن الاشعث اور کوفہ سے شَبَث بن رِبعی سمیت متعدد شرفائے عراق ان کی مدد کے لیے آ گئے۔ ستم رسیدہ مسلمان ان کے آتے ہی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ خراسان کے نامور فاتح اور جرنیل مُہَلَّب ابن ابی صُفرہ رحمہ اللہ بھی آن پہنچے۔ پہلے وہ آمادہ نہ تھے مگر محمد بن اَشعَث نے خود جا کر انہیں خواتین اور بچوں پر مختار کے گماشتوں کی زیادتیوں کا ماجرا سنایا تو وہ تیار ہو گئے اور بھاری مقدار میں رقم اور اسلحے کے ساتھ آ گئے۔

مختار نے مُصعَب بن زبیر کے عزائم کا اندازہ کرتے ہوئے بیس ہزار کا لشکر تیار کر کے بصرہ پر حملے کے لیے روانہ کر دیا جس کی قیادت اَحمر بن شُمیط اور ابو عَمرہ کیسان کر رہے تھے۔ مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ نے کھلے میدان میں نکل کر حریف کا مقابلہ کیا۔ یہ تاریخی جنگ واسط اور بصرہ کے درمیان بصرہ چار منازل آگے میسان کے قریب ''مَذار'' کے میدان میں لڑی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبیداللہ رحمہ اللہ، یہاں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کے پرچم تلے دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ یہیں ان کا مزار ہے۔[3]

---

① تاریخ الطبری: ٦/٥٧

② تاریخ الاسلام للذھبی: ٥/٥٧ ت تدمری ، سیر اعلام النبلاء: ٣/١٤١ ، ط الرسالۃ

③ معجم البلدان: ٥/٨٨

مُصعَب بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں نے بڑھ چڑھ کر شمشیر وسناں کے جوہر دکھائے۔ گھمسان کی جنگ کے بعد آخرکار مختار کے دونوں سالار اَحمر بن شُمَیط اور ابوعَمرہ مارے گئے اور باقی فوج تتر بتر ہو کر کوفہ کی طرف پسپا ہو گئی۔

مُصعَب بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے جنگ کو حتمی نتیجے تک پہنچانے کا برمحل فیصلہ کیا اور اپنی فوج کے ساتھ حریف کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ واسط کے مقام سے دریائے فرات عبور کیا اور فوج کا ساز وسامان حفاظتی دستوں کے ساتھ کشتیوں پر لاد کر دریائے فرات کے ساتھ ساتھ کوفہ کی طرف بڑھے۔

مختار نے حریف کو تعاقب میں کوفہ کی طرف بڑھتے دیکھا تو دریائے فرات کا پانی دائیں بائیں کی نہروں میں چھوڑ کر بند کے پھاٹک بند کرا دیے۔ مُصعَب بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کی کشتیاں دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت سے آ رہی تھیں۔ جب دریا کا پانی روک لیا گیا تو چند گھنٹوں بعد پانی کی سطح گرنے لگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دریا میں کیچڑ کے سوا کچھ نہ رہا۔ مُصعَب رحمۃ اللہ علیہ کے سپاہی کشتیوں سے اتر کر گھوڑوں پر سوار ہوئے، تیزی سے بند تک پہنچ کر پانی کا راستہ کھولا اور پھر سفر شروع کر دیا۔ اس طرح رمضان ۶۷ھ سے پہلے مُصعَب رحمۃ اللہ علیہ کی فوج کوفہ کے سامنے پہنچ گئی۔

مختار مجبور ہو کر اپنے حامیوں کے ساتھ میدان میں نکلا۔ یہاں ایک اور خون ریز جنگ ہوئی جس میں محمد بن اَشعث مختار کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاہم مختار کے حامیوں کے قدم جلد ہی اکھڑ گئے۔ ان کی شکست کے ساتھ مُصعَب رحمۃ اللہ علیہ کے جانبازوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔

مختار قصر امارت میں محصور ہو کر کچھ دنوں تک مورچہ بند لڑائی لڑتا رہا۔ اس کے اکثر ساتھی پہلے ہی منتشر ہو گئے تھے۔ مُصعَب بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے قلعے کی سخت ناکہ بندی کر رکھی تھی تاکہ مختار خوراک ورسد نہ ملنے کی وجہ سے ہتھیار ڈال دے مگر شہر کی بہت سی عورتیں مختار کی عقیدت مند تھیں۔ وہ خفیہ طور پر خوراک پہنچاتی رہیں۔ آخر مُصعَب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ راز معلوم ہو گیا اور انہوں نے قلعے کے اردگرد عورتوں کے آنے جانے پر پابندی لگا کر اس سلسلے کو بالکل مسدود کرا دیا۔ تب مختار کے ساتھی کمزور پڑ گئے۔ جب دانہ پانی بالکل بند ہو گیا تو وہ اپنے خاص ساتھیوں کے ساتھ لڑنے مرنے کا حلف اٹھا کر باہر نکلنے لگا۔

اس وقت اس کے اکثر عقیدت مند ہتھیار ڈالنے کا ارادہ کر چکے تھے اور اسے بھی یہی مشورہ دے رہے تھے مگر اس کا کہنا تھا کہ لڑتے لڑتے مرجانا ہی بہتر ہے۔ اسے یقین تھا کہ جو گل اس نے کھلائے ہیں ان کی وجہ سے اس کی جان بخشی نہیں ہو گی اس لیے وہ مریدوں کو بھی اپنے ساتھ ہی مروانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

قلعہ کے کھلنے سے پہلے وہ اپنے دست راست سائب بن مالک کے سامنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔ اس نے کہا: ''میں بھی عرب ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ ابن زبیر نے حجاز پر، نجدہ خارجی نے یمامہ پر اور عبدالملک بن مروان نے شام پر قبضہ جما لیا ہے تو میں نے سوچا عرب ہونے کے لحاظ سے میں بھی ان سے کم نہیں۔ اس لیے میں نے بھی شہروں پر قبضہ کر لیا۔''

یوں مختار نے خود مرنے سے پہلے اقرار کر لیا کہ اس کا اصل ہدف اقتدار کا حصول تھا اور سب کچھ اس نے اسی مقصد

کے لیے کیا۔

آخر کار وہ تلوار سونت کر ۱۹، افراد کے ساتھ قلعے سے باہر نکلا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ مُصعَب رحمہ اللہ قصر میں داخل ہوئے تو مختار کا سر کاٹ کر ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ یہ ۱۴ رمضان ۶۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مختار کی عمر ۶۷ برس تھی۔ [1]

یوں اس شریر اور بد طینت انسان سے امت کو نجات ملی اور مخلوق خدا نے سکھ کا سانس لیا۔ مختار کی اس بد کرداری کے باوجود اس کے ہاتھوں قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کا انجام کو پہنچنا ایک عجیب سی بات ہے۔ تاریخ کا یہ منظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا مصداق نظر آتا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔"

"بلاشبہ اللہ اس دین کی مدد گناہ گار و بد کردار آدمی کے ہاتھوں بھی کرا دیتا ہے۔" [2]

ابراہیم اور مُصعَب:

مختار کا سپہ سالار ابراہیم بن مالک اس وقت موصل میں تعینات تھا۔ وہ نہایت تجربہ کار جرنیل تھا۔ مختار کی اصل طاقت اس کے دم خم سے تھی۔ عبید اللہ بن زیاد کو اسی نے شکست دی تھی۔ وہ دیگر جہلاء کی طرح مختار کا اندھا معتقد نہیں تھا بلکہ سیاسی مقاصد کے تحت اس کے ساتھ رہا تھا۔ بد عقیدگی سے اس کی بے زاری کا ثبوت یہ ہے کہ جب مختار کا لشکر عبید اللہ بن زیاد سے مقابلے کے لیے جا رہا تھا اور لوگ مختار کی دی ہوئی اس کراماتی کرسی کے گرد لپٹ کر ہاتھ اٹھا کر دعائیں کر رہے تھے تو ابراہیم بن مالک کہہ رہا تھا: "الٰہی! ہمارے احمقوں کی حرکتوں کے سبب ہمیں ہلاک نہ کرنا۔ بخدا! یہ تو بنی اسرائیل کی رسم تھی۔ جب وہ اپنے بچھڑے کے گرد اسی طرح جمع ہوتے تھے۔" [3]

مختار کے مارے جانے کے بعد دِمشق میں عبد الملک اور کوفہ میں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ، دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ ابراہیم کو ساتھ ملا کر اپنی طاقت کو بڑھائے۔ عبد الملک بن مروان نے ابراہیم کو پیش کش کی کہ وہ اس کے ماتحت آکر عراق کا جتنا علاقہ فتح کرے گا وہ اسے دے دیا جائے گا۔ اُدھر سے مُصعَب رحمہ اللہ نے پیش کش کی کہ وہ ان کی صف میں آکر شام کا جتنا علاقہ فتح کرے گا وہ اس کا مانا جائے گا۔ ابراہیم نے عبد الملک کے مقابلے میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ترجیح دی اور کوفہ آکر مُصعَب رحمہ اللہ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ نے اسے کوفہ کا سپہ سالار بنا دیا۔ اس کی جگہ موصل اور الجزیرہ میں مُہَلَّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ کو تعینات کر دیا۔ [4]

☆☆☆

---

(1) تاریخ الطبری: ۵/۹۰ تا ۱۱۰، البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۵۵ تا ۶۲، ۷۱، ۷۲

(2) صحیح البخاری، ح: ۴۲۰۳، المغازی، باب غزوۃ خیبر، صحیح مسلم، ح: ۳۱۹، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم قتل الانسان نفسہ

(3) تاریخ الطبری: ۶/۸۲

(4) تاریخ الطبری: ۶/۱۱۰، ۱۱۱، البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۷۲، ۷۳، تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۶۶، ۶۷

خوارج کی شورش

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں ایک اور بہت بڑی قوت ان کے مدمقابل تھی۔ یہ خارجی گروہ تھا جو حجاز میں نجد و یمامہ سے بحرین تک اور عراق میں کوفہ و بصرہ سے فارس کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ خوارج بنو امیہ کے بھی دشمن تھے اور سادات کے بھی۔ ان کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عقیدت رکھنے والے لوگ گمراہ تھے جنہیں قتل کر دینا واجب تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف یزید کی لشکر کشی کے دوران ان کے سرداروں: نَجدہ بن عامر، نافع بن الازرق اور عبداللہ بن اباض نے کچھ مدت تک یہ سمجھ کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سمیت تمام اموی خلفاء کے مخالف ہوں گے مگر جب ان کی زبان سے ایسی کوئی بات نہ سنی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکے:

''آپ کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں ان کی زندگی میں بھی ان سے محبت کرتا تھا اور ان کی وفات کے بعد بھی کرتا ہوں۔''

خوارج یہ سن کر بھڑک گئے اور ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ ①

خوارج جزیرۃ العرب میں:

اس کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کی شورش اور بغاوتوں کا مسلسل سامنا رہا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مسندِ خلافت پر تشریف فرما ہوتے ہی خوارج ان کے مقابلے پر نکل آئے۔ اس وقت ان کے دو گروہ بن چکے تھے: پہلے گروہ کے سردار نافع بن ازرق نے عراق جا کر مورچہ بنالیا۔ دوسرا گروہ یمامہ میں ابوطالوت کے تحت سرگرم ہوگیا۔

ابوطالوت نے ۶۵ھ میں جزیرۃ العرب کے قافلوں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیا۔ ۶۶ھ میں ابوطالوت کی جگہ نَجدہ بن عامر ان کا سربراہ بن گیا۔ اس نے قبائلی سرداروں کو جگہ جگہ شکست سے دوچار کرنے کے بعد ۶۷ھ میں بحرین اور یمامہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ عراق کی مہمات اور شامی حکومت سے کش مکش میں اتنے مشغول تھے کہ نَجدہ کی کارروائیوں کی کوئی روک تھام نہ کرسکے۔

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۳ ...... خلیفہ بن خیاط کی روایت کے مطابق یہ واقعہ حُصَین بن نُمَیر سے لڑائی کے بعد کا ہے جبکہ بلاذری کی روایت کے مطابق جنگ کے دوران خوارج سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق اعتقاد کے مسئلے پر اختلاف واضح ہوگیا تھا جس کے باعث خوارج کا سب سے بڑا سردار نافع بن ازرق عین جنگ کے دوران انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی کوئی پروانہ کی۔ (انساب الاشراف: ۵/ ۱۷۱ ط دارالفکر)

بعض حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو سبائیوں کی حمایت سمجھتے ہیں اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خوارج کے بل بوتے پر قائم ہونے والی باغیانہ حکومت کہتے ہیں، حالاں کہ خوارج کا طبقہ زبیریہ کا حامی اور مطیع رہا مختصر مدت تک تھا۔ اگر کسی خلافت کے باطل ہونے کی دلیل یہی ہے تو بنوامیہ کے سب سے بہتر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت بھی باطل ٹھہرے گی کہ خوارج ان کے بھی مطیع اور حامی تھے۔

۶۹ھ میں نجدہ کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ باقاعدہ ایک سربراہِ مملکت کی طرح ۸۶۰، افراد کے ساتھ الگ پرچم لے کر حج کے لیے مکہ پہنچا۔ خوش قسمتی سے ۷۰ھ میں نجدہ کی جماعت میں پھوٹ پڑ گئی۔ کئی خارجی امراء اس کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے خود ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ①

عراقی خوارج کی شورش:

عراق کے خوارج نافع بن الازرق کی قیادت میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ نافع بن ازرق کی نسبت سے اس گروہ کو "الازارقہ" کہا جاتا تھا۔ نافع ۶۵ھ میں اہل بصرہ سے جنگ میں مارا گیا مگر اس کا گروہ باقی رہا۔ امیر بدلتے رہے اور سرکاری فوجوں کے مقابلے میں آ کر مرتے رہے۔ خوارج نے اس دوران اُہواز اور مضافاتی قصبوں پر تسلط جما لیا اور لوگوں سے جبری بھتے وصول کرنے لگے۔ ②

عراق میں خوارج کی شورش کے باعث بصرہ کی آبادی شدید خطرے کی زد میں تھی۔ اَحنف بن قیس رحمہ اللہ سمیت شرفائے بصرہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سب سے تجربہ کار سالار مُہلَّب بن ابی صُفرہ سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس فتنے سے نجات دلائیں۔ مُہلَّب ابن ابی صُفرہ ان دنوں خراسان میں تعینات تھے۔ انہیں عراق بلایا گیا اور خطیر اخراجات دے کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس مہم پر بھیجا گیا۔ انہوں نے کئی معرکوں کے بعد جس میں فریقین کا بھاری مالی نقصان ہوا، خوارج کو بصرہ اور اس کے مضافات سے مار بھگایا۔ خوارج کے "۴۸۰۰" افراد مارے گئے۔ وہ پسپا ہو کر فارس کی طرف چلے گئے۔ ③

تین سال تک امن رہا۔ ۶۷ھ میں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ نے مُہلَّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ کو آذربائی جان، الجزیرۃ اور موصل کا امیر مقرر کر دیا۔ ④ ان کے جاتے ہی خوارج نے موقع پا کر اس شدت سے باغیانہ کارروائیاں شروع کیں کہ پورے عراق میں حکومت ہل کر رہ گئی۔ ⑤

خوارج کو ایک جگہ قرار نہ تھا۔ ایک میدان میں شکست کھا کر نکلتے تو دوسری جگہ جا کر لوگوں پر طاقت آزمائی شروع کر دیتے۔ مدائن کے مقامی باشندوں پر انہوں نے وہ مظالم توڑے کہ زمین کانپ گئی۔ عورتوں اور بچوں کو بہیمانہ انداز میں قتل کیا۔ حاملہ خواتین کے شکم چیر ڈالے۔ اسی طرح ساباط میں بھی دہشت گردی کے روح فرسا مناظر دکھائے۔ ⑥

اصفہان میں انہیں شکستِ فاش ہوئی۔ ان کا سردار ابن ماحوز مارا گیا۔ خوارج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور ان کا

---

① الکامل فی التاریخ، سن ۶۵ھ، ذکر لجدۃ بن عامر ؛ تاریخ ابن خلدون: ۳۸۵/۳ تا ۳۸۷
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ الطبری، ۶۵ھ تا ۷۲ھ کے حالات

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۲، ۲۵۷ ؛ تاریخ الطبری: ۶۱۳/۵ تا ۶۱۵

③ تاریخ الطبری: ۶۱۵/۵ تا ۶۱۹ ؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۱/۵، حوادث سن ۶۵ھ

④ تاریخ الاسلام للذھبی: ۶۲/۵ سنۃ ۶۷ھ

⑤ تاریخ الطبری: ۱۱۹/۶، ۱۲۰

⑥ تاریخ الطبری: ۱۲۱/۶

تمام ساز وسامان حکومت کے قبضے میں آ گیا۔مگر یہ لوگ کسی عجیب مٹی کے بنے ہوئے تھے۔قیادت کے قتل ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ابن ماحوز کے بعد انہوں نے قَطَری بن فُجاءَہ نامی عرب جنگجو کو سردار بنالیا جس نے انہیں دوبارہ منظم کر کے اِدھر اُدھر لوٹ مار شروع کر دی۔آخر مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ نے ایک بار پھر مُہلّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ کو اس شورش سے نمٹنے کے لیے بھیجا۔مُہلّب پورے آٹھ مہینے تک قَطَری بن فُجاءَہ سے جنگیں لڑتے رہے۔[1]

طاعون جارف:

اُدھر بصرہ اور اس کے گرد ونواح میں طاعون کی وہ شدید وبا پھیلی جسے ''طاعون جارف'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔وبا کے تین دن بہت شدید تھے جن میں ہزاروں افراد فوت ہوئے۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ۷۰،۸۰ بچے اس کا نشانہ بنے۔بصرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔نمازِ جمعہ کے لیے جامع مسجد میں صرف سات افراد تھے۔مردوں کا کفن دفن کرنے اور جنازہ اٹھانے والے ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔حاکم بصرہ کی والدہ نے دم توڑا تو جنازے کو کاندھا دینے کے لیے صرف چار آدمی میسر آئے۔[2] اس سانحے نے مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی افرادی قوت کو بہت نقصان پہنچایا کیونکہ ان کے اکثر وفادار سپاہی بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔

عمرو بن سعید کا قتل:

دِمَشق میں عبدالملک بن مروان، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو سبوتاژ کرنے کے لیے موقعے کی تاک میں تھا۔وہ نئی نسل کا سیاست دان تھا۔موقع شناس بھی تھا اور منصوبہ ساز بھی۔اس نے بنو مروان کی حکومت کو ناقابلِ تسخیر بنانے کے لیے تمام اندرونی کانٹے نکال دیے تھے۔جابیہ کے اجتماع میں طے ہونے والے معاہدے کے مطابق مروان کے بعد خالد بن یزید اور پھر عَمرو بن سعید الاشدق کو حکمران بننا تھا مگر مروان نے حکومت سنبھال کر اپنے بیٹوں: عبدالملک اور عبدالعزیز کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔

خالد بن یزید طبعی شرافت کی وجہ سے خاموش تھا مگر عَمرو بن سعید بڑا بارسوخ اور بے باک انسان تھا۔اس نے واضح الفاظ میں عبدالملک سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی ولی عہدی کا اعلان کرے۔جب عبدالملک نے توجہ نہ دی تو وہ احتجاجاً دِمَشق کے قلعے پر قابض ہو گیا۔یہ ۶۹ھ کے اختتام کا واقعہ ہے۔

عبدالملک نے دیکھا کہ طاقت آزمانے سے مسئلہ طول پکڑ جائے گا۔اس نے ولی عہدی کا وعدہ کر کے عمرو بن سعید کو منالیا، پھر ایک دن موقع پا کر اپنے محل میں بلوایا اور دھوکے سے قتل کر دیا۔[3]

قتل کرنے سے پہلے عبدالملک نے اسے کہا: ''اگر مجھے گمان ہوتا کہ تم زندہ رہ کر میری رشتہ داری کا لحاظ رکھو گے تو

---

① تاریخ الطبری: ۱۲۳/۶ تا ۱۲۷، اسی دوران مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ عبدالملک بن مروان کی فوج کشی کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

② تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/ ۶۶، سن ۶۹ھ

③ تاریخ الطبری: ۱۴۰/۶ تا ۱۴۷؛ البدایۃ والنھایۃ: ۱۲/۱۲ تا ۲۰۵

میں تمہیں معاف کر دیتا مگر بات یہ ہے کہ ایک ریوڑ میں دو سانڈ جمع نہیں ہو سکتے، ان میں سے ایک دوسرے کو بھگا کر ہی دم لیتا ہے۔" یہ واقعہ ۷۰ھ کے آغاز کا ہے۔[1]

یوں بنو امیہ کا ایک بڑا سیاست دان تاریخ میں کوئی بڑا کام دکھانے سے پہلے ہی اپنوں کی تلوار کا نشانہ بن کر ہزاروں حسرتوں سمیت دنیا سے رخصت ہو گیا۔

خراسان کا حال:

عراق پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت قائم ہونے تک خراسان کے امراء کے درمیان خون ریزی جاری رہی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو حاکم خراسان عبداللہ بن خازم رحمہ اللہ نے ان کی حلقہ بگوشی قبول کر لی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پورے دور میں عبداللہ بن خازم رحمہ اللہ ہی خراسان کے امیر رہے۔

جنوبی افغانستان میں جسے سجستان کہا جاتا تھا، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالعزیز کو والی بنایا گیا تھا۔ عبدالعزیز کی آمد کے بعد مسلمانوں نے زَرَنج کے محاذ پر رتبیل سے ٹکر لی۔ اس جنگ میں رتبیل مارا گیا اور مجوسی پسپا ہو گئے۔[2]

یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں خراسان کے حالات کا مختصر تذکرہ تھا۔

☆☆☆

عبدالملک اور مُصعَب بن زبیر کی کش مکش

اندرونی حریف کو نمٹا کر عبدالملک نے پوری توجہ اپنے بیرونی حریف عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ پر مرکوز کر دی۔ عبدالملک جانتا تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی اصل طاقت عراق میں ہے، لہٰذا اس نے پہلے عراق میں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کو شکست دینے کا منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ اس لیے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ۷۰ھ میں رومیوں سے جن کے حملے کا اکثر دھڑکا لگا رہتا تھا، ہر ہفتے ایک ہزار دینار کی ادائیگی منظور کر کے صلح کر لی۔[3]

یہ پالیسی صحابہ کے تعامل سے متصادم تھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے تو ایسے وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مل کر رومیوں سے لڑنے کا جذبہ ظاہر کیا تھا جس سے مرعوب ہو کر رومی پسپا ہو گئے تھے۔ اس معاہدے کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "میں کہتا ہوں یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا رخنہ تھا جو داخل ہوا۔ جس کا سبب صرف باہمی اختلاف تھا۔"[4]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۶۶

② فتوح البلدان، ص ۳۸۵، ط الهلال

③ تاریخ الطبری: ۱۵۰/۶

④ قال الذهبی: "قلت هذا اول وهن دخل علی الاسلام، وما ذاک الا لاختلاف الکلمة." (العبر فی خبر من غبر: ۵۸/۱، ط العلمیة)

عبدالملک کی عراقی امراء سے ساز باز:

اب عبدالملک نے مُصعَب بن زبیر کے جرنیلوں سے ساز باز شروع کی۔ پہلے صفِ اول کے امراء، حاکم فارس مُہلّب بن ابی صُفرہ، حاکم خراسان عبداللہ بن خازم اور سپہ سالارِ کوفہ ابراہیم بن مالک کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر ان میں سے کوئی آمادہ نہ ہوا۔ [1]

پھر بھی عبدالملک جانتا تھا کہ عراقیوں کی طبیعت میں غداری کا مرض ہے، اوران میں سے زیادہ تر کو خریدا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ۷۱ھ میں اس نے اپنے ایک نمائندے کو خفیہ طور پر بصرہ بھیج کر اپنے لیے بیعت لینے کی مہم شروع کی۔ [2]

مُصعَب رحمہ اللہ اس وقت حجاز گئے ہوئے تھے۔ [3] ان کی غیر موجودگی میں بصرہ کے بہت سے امراء نے عبدالملک کی پیش کش قبول کر لی، تاہم مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کے وفادار امراء نے اس سازش کا بروقت تدارک کر لیا۔ ادھر مُصعَب رحمہ اللہ بھی آنا فانا بصرہ پہنچ گئے اور عبدالملک کی طرف مائل امراء کو سخت تنبیہ کی۔ [4]

عراقی امراء بک گئے:

عبدالملک عراقیوں کی وفاداریاں خریدنے میں لگا رہا اور آخر کار ان میں سے بہت سوں کو خفیہ خط و کتابت اور معاہدوں کے ذریعے اپنے دام میں پھانس لیا۔ [5] ان میں سے بعض نسلی لحاظ سے اموی تھے اور بعض بنوامیہ کے گزشتہ دورِ حکومت میں سرکاری عہدوں پر تھے۔ عبدالملک کے پرکشش وعدوں کے علاوہ یہ سابقہ تعلقات اور قبائلی رشتے بھی ان کی مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ سے بے وفائی کا محرک بن گئے۔

عبدالملک کی طرف سے مُصعَب رحمہ اللہ کے دست راست ابراہیم بن مالک کو بھی ایک مہر بند خط ملا تھا۔ ابراہیم نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے پڑھے بغیر یہ خط مُصعَب رحمہ اللہ کو پیش کر دیا۔ اس میں ابراہیم کو حکومتِ شام کے ساتھ مل جانے کے بدلے عراق کی گورنری دینے کی ضمانت دی گئی تھی۔ ابراہیم نے مُصعَب رحمہ اللہ کو بتایا کہ عبدالملک نے اس قسم کے خطوط عراق کے تمام امراء کو بھیجے ہیں۔ ساتھ ہی مشورہ دیا: ''میری مانیے تو ان امراء کو قتل کرا دیں۔''

مُصعَب رحمہ اللہ نے کہا: ''ایسا کیا تو ان امراء کے قبیلے ہمارے ساتھ مخلص نہیں رہیں گے۔''

ابراہیم نے کہا: ''اچھا تو پھر کم از کم ان امراء کو کسریٰ کے سفید قلعے میں قید کر دیں۔''

مُصعَب رحمہ اللہ نے طبعی شرافت اور مروت کی بناء پر اس اقدام کو بھی مناسب نہیں سمجھا مگر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ غداروں کے درمیان گھر گئے ہیں اور عن قریب کوئی بڑا سانحہ پیش آ کر رہے گا۔ [6]

---

① تاریخ الطبری: ۱۵۷/۶، ۱۶۷، ؛ انساب الاشراف: ۸۵/۷، ط دار الفکر

② تاریخ الطبری: ۱۵۳/۶ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳۵/۱۲

④ تاریخ الطبری: ۱۵۳/۶ بسند عمر بن شبہ ابو زید عن ابی الحسن المدائنی عن مسلمہ

⑤ انساب الاشراف: ۸۵/۷، ط دار الفکر

⑥ تاریخ الطبری: ۱۵۷/۶

۷۱ھ کے ان دنوں میں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کے لیے حالات بحران کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ایک طرف طاعون جارف سے ہونے والی ہلاکتوں نے ان کی قوت کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ جو افواج زیرِ فرمان تھیں ان کا بڑا حصہ فارس کے ازرقی خارجیوں سے مقابلے کے لیے مشرق میں جھونکنا پڑ رہا تھا۔ اپنے امراء کی غداری کا دھڑکا الگ تھا۔

عین اسی وقت بحرین میں نَجدہ بن عامر کی جگہ لینے والے ''ابوفُدَیک'' خارجی کا گروہ دردِ سر بن گیا تھا۔ مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کو ان ناگفتہ بہ حالات میں عراق سے فوج کم کر کے اس کی سرکوبی کے لیے سپاہی بھیجنا پڑے مگر جُواثیٰ میدان میں انہیں شکستِ فاش ہوئی۔[1] یوں مُصعَب اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طاقت کو ایک اور سخت دھچکا لگا۔

عبدالملک کا عراق پر فیصلہ کن حملہ:

آخر کار عبدالملک نے یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ عراقی فوج مُصعَب رحمہ اللہ سے غداری کر کے اس کی فتح کی راہ ہموار کر دے گی، ایک لشکرِ جرار لے کر دِمشق سے عراق کا رخ کیا۔

راستے میں الجزیرہ کا شہر ''قرقیسیا'' تھا جہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامی زُفر بن حارث تعینات تھے، عراق کی حفاظت کے لیے یہ شہر بہت اہم تھا۔ عبدالملک نے چالیس دن کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔[2] اور ۷۲ھ میں عراق کی سرحد پر ڈیرے ڈال دیے۔[3] یہ مقام دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر سوادِ عراق اور ضلع تکریت کی حدود کے درمیان واقع ہے۔ یہیں ''دَیرِ جاثلیق'' کا وہ تاریخی میدان تھا جہاں عبدالملک اور مُصعَب رحمہ اللہ کے مابین فیصلہ کن جنگ ہوئی۔[4]

مُصعَب رحمہ اللہ بھی اپنی فوج مرتب کر کے نکل پڑے اور ''باجُمَیرا'' میں آ کر پڑاؤ ڈالا۔[5] افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس وقت ان کے سپہ سالار ابراہیم بن مالک کے سوا تمام بڑے افسران اپنی وفاداریاں عبدالملک کو فروخت کر چکے تھے۔ خراسان میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائب عبداللہ بن خازم رحمہ اللہ کو اس فوج کشی کی اطلاع ملی تو بے چین ہو کر پوچھا: ''کیا مُصعَب کے ساتھ عمر بن عبداللہ ہیں؟'' جواب ملا: ''نہیں، وہ تو فارس میں تعینات ہیں۔''

پوچھا: ''کیا ان کے ساتھ مُہلَّب بن ابی صُفرہ ہیں؟'' جواب ملا: ''نہیں وہ تو موصل میں تعینات ہیں۔''

پھر پوچھا: ''کیا ان کے ساتھ عباد بن حُصَین ہیں؟'' جواب ملا: ''نہیں، وہ تو بصرہ میں ہیں۔''

عبداللہ بن خازم رحمہ اللہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا: ''اور میں یہاں خراسان میں ہوں۔'' پھر شعر پڑھا:

خُذِیْنِی فَجَرِّینِی جَعَارِ وَاَبْشِرِی ۔۔۔ بِلَحْمِ امْرِئٍ لَمْ یَشْهَدِ الْیَوْمَ نَاصِرُه

''لو مجھے پکڑ لو اور گھسیٹو اور ایسے شخص کی لاش کی خوش خبری لو جس کا آج کوئی مددگار موجود نہیں۔''[6]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۶۷، ۷۱ھ
② انساب الاشراف: ۳۱/۷ تا ۴۹
③ تاریخ الطبری: ۱۵۷/۶
④ الروض المعطار، ص ۲۵۱
⑤ تاریخ الطبری: ۱۵۷/۶
⑥ تاریخ الطبری: ۱۵۸/۶

مُصْعَب کی شہادت:

مُصْعَب بن زبیر رحمہ اللہ عمامہ باندھے ہوئے فوج کے سامنے آئے جو دو قطاروں میں کھڑی پیش قدمی کے لیے تیار تھی۔ آپ گہری نظروں سے دائیں بائیں سپاہیوں اور افسران کے چہروں پر لکھی تحریر پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں میں آپ نے نتیجہ نکال لیا۔ آپ کی نگاہ مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے فرزند عُروہ رحمہ اللہ پر پڑی۔ ان کو بلایا اور ان سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ سننے لگے۔ جب عروہ رحمہ اللہ نے عبیداللہ بن زیاد کی طرف سے سرنگوں ہونے کے مطالبے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لڑنے مرنے کے فیصلے کا ذکر کیا تو مُصْعَب رحمہ اللہ نے سواری کو ایڑ لگا دی اور یہ شعر پڑھا:

اِنَّ الْأُلٰی بِالطَّفِّ مِنْ آلِ هَاشِمٍ ۔۔۔ تَأَسَّوْا فَسَنُّوا لِلْكِرَامِ التَّأَسِّيَا

''بے شک مقامِ طف یعنی کربلا میں بنی ہاشم نے ایک روایت قائم کر دی اور شریفوں کے لیے راستہ طے کر دیا۔''

یہ سن کر عروہ رحمہ اللہ سمجھ گئے کہ مُصْعَب رحمہ اللہ شکست کی صورت میں فرار پر قتل ہونے کو ترجیح دیں گے۔[1]

آخر کار ۱۳ جمادی الاولیٰ ۷۲ھ کو ''دَیرِ جاثَلیق'' کے میدان میں وہ تاریخی اور حسرت ناک جنگ ہوئی جو خلافت زبیریہ کے خاتمے کا پیش خیمہ بن گئی۔[2]

عبدالملک نے اپنے لشکر کے دائیں اور بائیں بازو پر یزید بن مُعاویہ کے بیٹوں: عبداللہ اور خالد کو مقرر کیا تھا جبکہ ہراول دستے اپنے بھائی محمد بن مروان کی کمان میں دیے تھے۔[3]

جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو مُصْعَب بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنے سپہ سالار ابراہیم بن مالک کو شامی ہراول پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیا۔ ابراہیم نے زوردار حملہ کیا جس سے محمد بن مروان کے قدم اکھڑ گئے[4] اور شامی سردار مسلم بن عَمرو باہلی (قتیبہ بن مسلم کے والد) سمیت بہت سے مروانی مارے گئے مگر دوسری طرف ابراہیم بن مالک کو بھی زندہ بچ کر آنا نصیب نہ ہوا۔ مُصْعَب رحمہ اللہ کے باقی سردار عبدالملک سے ملے ہوئے تھے اور منصوبہ پہلے سے طے تھا۔ سپہ سالار ابراہیم کے دم توڑتے ہی عراقی گھڑ سوار دستوں کا سالار بھاگ نکلا۔ یہ دیکھ کر مُصْعَب رحمہ اللہ نے دوسرے سالار کو پکارا: ''ابوعثمان! تم اپنے گھڑ سواروں کو لے کر حملہ کرو۔''

جواب ملا: ''میں اپنے قبیلے کو بلاوجہ کیوں قتل کراؤں؟''

مُصْعَب رحمہ اللہ نے ایک اور سردار سے کہا: ''تم اپنا پرچم آگے بڑھاؤ۔''

وہ بولا: ''میں ان گندے ناپاک لوگوں کے پاس کیوں جاؤں؟''

ایک اور امیر کو حکم دیا تو اس نے کہا: ''جب کوئی اور حکم نہیں مان رہا تو میں کیوں مانوں؟''

---

[1] تاریخ دمشق: ۲۴۰/۵۸

[2] تاریخ الطبری: ۱۶۲/۶؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۶۴

[3] تاریخ الطبری: ۱۵۶/۶

[4] تاریخ الطبری: ۱۵۷/۶

مُصعَب رحمہ اللہ سمجھ گئے کہ انجام قریب ہے اور ان کے ساتھ زبردست دھوکا ہوا ہے۔ انہوں نے بے اختیار کہا:
''کاش! اس وقت ابراہیم زندہ ہوتا۔''
اس وقت ان کے کسی ہمدرد نے مشورہ دیا: ''آپ کسی قلعے میں مورچہ بند ہو جائیں اور مُہلّب بن ابی صُفرہ جیسے وفاداروں کو جمع کر کے دوبارہ حریف کے مقابلے میں تیاری کریں۔''
جواب میں مُصعَب رحمہ اللہ اسلحہ پہن کر یہ شعر پڑھتے ہوئے بقیہ ساتھیوں کے ساتھ میدان کارزار میں اترنے لگے:

عَلَامَ تَقُوْلُ السَّیْفُ یُثْقِلُ عَاتِقِیْ اِذَا اَنَا لَمْ اَرْکَبْ بِهِ الْمَرْکَبَ الصَّعْبَا

تم کیوں کہتے ہو کہ تلوار میرے کندھے کو بوجھل کر رہی ہے جبکہ میں اسے لے کر میدانِ کارزار میں نہیں اترا۔

سَاُحْمِیْکُمْ حَتّٰی اَمُوْتَ وَ مَنْ یَمُتْ کَرِیْمًا فَلَا لَوْمَ عَلَیْهِ وَلَا عَتْبَا

''میں تمہاری حفاظت مرتے دم تک کروں گا۔ اور جو عزت سے مرے اس پر کوئی الزام ہے نہ ملامت۔''
پھر اپنے بیٹے عیسیٰ سے کہا: ''تم فوراً اپنے ساتھیوں سمیت اپنے چچا کے پاس مکہ چلے جاؤ اور انہیں میرے ساتھ عراقیوں کی غداری کی اطلاع دو۔ میری پروانہ کرو۔ میں تو مارا ہی جاؤں گا۔''
عیسیٰ نے کہا: ''آپ بصرہ پہنچ جائیں وہاں آپ کے وفادار موجود ہیں۔ یا آپ بھی امیر المؤمنین کے پاس مکہ چلیں۔''
مُصعَب رحمہ اللہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں قریش کو موقع نہیں دوں گا کہ وہ مجھے ساتھیوں کو چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگنے کا طعنہ دیں۔ میں لڑتا رہوں گا۔ اگر میدانِ جنگ میں تلوار کی نذر ہو گیا تو کوئی رسوائی کی بات نہیں۔ بھاگنا میری فطرت میں نہیں ہے اور اگر تم بھی بھاگنے سے شرم محسوس کرتے ہو تو تم بھی جا کر دشمن پر حملہ کرو۔''
عیسیٰ نے یہ سنتے ہی حریف پر دھاوا بول دیا اور بے جگری سے لڑتا ہوا قتل ہو گیا۔ عبدالملک کی مُصعَب رحمہ اللہ سے پرانی دوستی تھی اس لیے وہ انہیں زندہ بچا لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی محمد بن مروان کو بھیج کر انہیں جان کی امان کی پیش کش کی۔ مُصعَب رحمہ اللہ نے جواب دیا: ''مجھ جیسا انسان معرکے سے فاتح بن کر واپس ہوتا ہے یا مغلوب ہو کر۔''[1]
دشمن اب سر پر پہنچ چکا تھا۔ مُصعَب رحمہ اللہ تخت سے اترے۔ تلوار سونت کر اپنی طرف آنے والے دشمنوں سے بھڑ گئے اور دیر تک لڑتے رہے۔ حریف نے انہیں پہلے تیروں کا نشانہ بنا کر چھلنی کیا۔ پھر مختار کذاب کے ایک مرید زائدہ بن قدامہ نے ''ہائے مختار کا انتقام'' کہہ کر نیزہ ان کے جسم میں اتار دیا۔ ایک شخص نے تلوار سے ان کا سر قلم کر دیا۔[2]
عبدالملک کو مُصعَب رحمہ اللہ کے قتل کی اطلاع ملی تو بے اختیار بولا: ''میری اور ان کی دوستی بہت گہری اور پرانی تھی مگر یہ سیاست بڑی بے وفا چیز ہے۔ مُصعَب! تمہارے جیسا بیٹا پھر کسی ماں کو کہاں نصیب ہوگا۔''[3]

---

① تاریخ الطبری: ۱۵۷/۶، ۱۵۸، ۱۵۹
② تاریخ دمشق: ۲۴۱/۵۸؛ تاریخ الطبری: ۱۵۹/۶
③ البدایة والنهایة: ۱۴۰/۱۲

مُصْعَب رحمہ اللہ کا سر کاٹ کر لانے والے شخص نے عبدالملک سے کہا: ''کاش! آپ ان کو نیزے اور شمشیر کے ساتھ پینترے بدل بدل کر دائیں بائیں حملہ آوروں کو گراتا دیکھتے۔ یہ منظر نگاہ اور دل کو دلیری اور ہمت سے لبریز کرنے کے لیے کافی تھا۔ جب ان کے ساتھی بھاگ گئے اور ان کو گھیرنے والے زیادہ ہو گئے تو وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے لڑ رہے تھے:

وَاِنِّیْ لِاَھْلِ الشَّرِّ بِالشَّرِّ مُرْصِدٌ　　وَاِنِّیْ لِذِیْ سَلْمٍ اَذَلُّ مِنَ الْاَرْضِ

''میں فتنہ باز آدمی کے حق میں برائی کی گھات لگاتا ہوں اور فرمانبردار کے لیے زمین سے زیادہ نرم ہو جاتا ہوں۔''

عبدالملک نے کہا: ''اللہ کی قسم! وہ ایسے ہی تھے۔''[1]

کوفہ کا قصرِ امارت: سروں کی نمائش گاہ:

اس سانحے کے ایک عینی گواہ عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں: ''میں نے زندگی میں عجیب ترین بات یہ دیکھی کہ ایک بار میں کوفہ کے قصرِ امارت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ عبیداللہ بن زیاد اس تخت پر براجمان ہے اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا کٹا ہوا سر ایک ڈھال پر اسے پیش کیا جا رہا ہے۔ کچھ زمانے بعد اسی جگہ یہ منظر دیکھا کہ مختار ثقفی تخت پر بیٹھا ہے اور عبید اللہ بن زیاد کا سر قلم کر کے اس کے پاس لایا گیا۔ کچھ مدت بعد اسی عمارت میں دیکھا کہ مختار ثقفی کا سر کاٹ کر مُصْعَب بن زبیر کو دیا گیا اور پھر اسی جگہ اسی تخت پر عبدالملک کو دیکھا اور مُصْعَب بن زبیر کا سر اس کے سامنے رکھا تھا۔[2]

قتل ہوتے وقت مُصْعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی عمر ۴۰ یا ۴۵ سال تھی۔[3]

وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سکینہ ان کے نکاح میں تھیں۔ وہ بڑے بہادر، فیاض اور بلند ہمت انسان تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''میں نے مُصْعَب رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی حاکم نہیں دیکھا جس پر انتشار کے دور میں امت جمع ہو سکتی۔ وہ ماتحت حکام کے محبوب تھے۔ سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی برتنے والے تھے۔''[4]

مُصْعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی شکست کی وجوہ:

مُصْعَب بن عمیر رحمہ اللہ کی شکست کی اہم وجوہ یہ تھیں:

1. ان کے بہترین سالار دور دراز تعینات تھے جبکہ کم ہمت اور غدار امراء نے انہیں گھیر رکھا تھا۔
2. مُصْعَب رحمہ اللہ دلیری اور غیرت میں بلند پایہ تھے مگر سیاست دانی، گٹھ جوڑ اور منصوبہ بندی میں ماہر نہ تھے۔

پورے لشکر میں ابراہیم بن مالک اس فن کا آدمی تھا جو جنگ کے دوران کام آ گیا۔ دوسری طرف عبدالملک حد سے زیادہ منصوبہ ساز اور چالاک انسان تھا، سیاست اور فنِ حرب دونوں کا ماہر تھا، اس لیے وہ غالب آ گیا۔

---

[1] تاریخ بغداد: ۱۰۷/۱۳، ط العلمیة
[2] تاریخ دمشق: ۲۴۴/۵۸، ۲۴۵
[3] تاریخ دمشق: ۲۵۰/۵۸
[4] تاریخ دمشق: ۲۳۹/۵۸

❸ مُصعَب رحمہ اللہ نے پورے تیاری نہ ہوتے ہوئے بھی صرف جذبے کے بل بوتے پر جنگ کو فیصلہ کن انداز میں لڑنے کی کوشش کی جبکہ افواج کا خوارج سے جنگوں کے لیے بکھرا ہونا، قابل افسران کی دوری اور موجودہ افسران کا حریف سے ساز باز کرنا ان کے علم میں تھا۔ اس حالت میں مصلحت کی بات یہی تھی کہ وہ کوفہ سے نہ نکلتے اور مورچہ بند ہوکر لڑتے اور افواج و قابل سالاروں کو فارس و خراسان سے بلا کر ان کی آمد تک فیصلہ کن جنگ کو ملتوی رکھتے۔

❹ مرکز سے انہیں کوئی کمک نہ ملی۔ اگر حجاز سے فوج آجاتی تو اہلِ شام کو دونوں طرف سے گھیرا جا سکتا تھا۔

❺ مختار کذاب کے عقیدت مند افسران اور فوجی مُصعَب رحمہ اللہ کے ہمراہ تھے اور اپنا بغض چھپائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بغاوت میں بھی شریک تھے اور مُصعَب کو قتل کرنے میں بھی۔

فتح کے بعد عراق میں عبدالملک کے نئے انتظامات:

اس فتح کے بعد عبدالملک نے کسی مزاحمت کے بغیر پورے عراق و فارس کو تحویل میں لے کر یہاں اپنے عمال مقرر کر دیے۔ کوفہ میں اپنے بھائی بِشر بن مروان اور بصرہ میں خالد بن عبداللہ کو گورنر مقرر کر دیا۔ فارس میں ازرقی خوارج سے نبرد آزما مُہلَّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ نے خاموشی سے اس نئی حکومت کی حلقہ بگوشی قبول کر لی۔ عبدالملک نے احتیاطاً انہیں اس محاذ سے ہٹا کر اہواز میں تعینات کر دیا۔[1]

تاہم خراسان کے والی عبداللہ بن خازم رحمہ اللہ نے عبدالملک کی بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ عبدالملک نے کسی تاخیر کے بغیر ان کے نائب بکیر بن وشاح کو خراسان کی حکومت کا لالچ دے کر وہاں بغاوت برپا کرادی۔ جس کے نتیجے میں عبداللہ بن خازم مرو کے قریب ان باغیوں سے لڑتے ہوئے قتل ہوگئے۔ یوں خراسان بھی عبدالملک کے زیر نگیں آ گیا۔[2]

مُصعَب رحمہ اللہ کی شہادت پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا تاریخی خطبہ:

مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کے قتل کی خبر مکہ پہنچی تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما خطاب کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے چہرے پر غم واندوہ کے گہرے اثرات تھے اور پیشانی عرق آلود تھی۔ آپ چند لمحوں تک خاموش رہے، پھر گویا ہوئے:

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کے قبضہ میں تخلیق و اختیار ہے۔ جو دنیا و آخرت کا مالک ہے۔ جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے رسوا کر دیتا ہے۔ بھلائی اس کے قبضے میں ہے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ لوگو! یاد رکھنا جو حق پر ہے وہ ذلیل نہیں ہو سکتا اگرچہ اکیلا ہو۔ اور شیطان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کبھی عزت نہیں دیتا چاہے سب لوگ ان کے حامی ہو جائیں۔ ہمیں عراق سے ایسی خبر ملی ہے جس نے ہمیں غم زدہ بھی کیا اور مسرور بھی، ہاں مُصعَب بن زبیر کے قتل کی اطلاع...... ان پر اللہ کی رحمت ہو۔ جس بات نے ہمیں غمگین کیا وہ یہ ہے کہ ایک

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲٦۸

② تاریخ الطبری: ۱۷۷،۱۷٦/٦

گہرا دوست بچھڑ گیا جس کی جدائی پر غم ہوا ہی کرتا ہے مگر عقل مند انسان اس کے بعد صبر کا سہارا لے لیتا ہے۔
جس بات نے ہمیں خوش کیا وہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں مُصْعَب کا قتل شہادت ہے۔ اس میں ان کے اور ہمارے لیے اللہ نے خیر رکھی ہے۔

سن لو! عراقیوں نے جو نفاق اور غداری کے عادی ہیں، ان کو دشمنوں کے حوالے کر دیا بلکہ ایک اونٹ کی قیمت سے بھی کم میں بیچ ڈالا۔ پھر مُصْعَب شہید کر دیے گئے مگر وہ شہید ہو گئے تو کیا ہوا۔ اُن کے باپ (زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ)، ان کے بھائی، چچا، ماموں سب شہید ہی تو ہوئے تھے۔ یہ سب بہترین صالح لوگ تھے۔ اگر آج مجھے مُصْعَب کی شہادت کا دکھ پہنچا ہے تو اس سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اپنے سامنے دیکھنے کا صدمہ بھی جھیل چکا ہوں۔ اپنے باپ زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ بھی دیکھ چکا ہوں۔ مُصْعَب میرے جواں ساتھیوں میں سے ایک تھا۔"

یہ کہتے ہوئے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو بہہ پڑے۔ پھر آپ نے فرمایا:

"اللہ کی قسم! ہم ناگہانی موت مرنے والے لوگ نہیں۔ ہم تو لڑ بھڑ کر نیزوں سے قتل ہوتے اور تلواروں کے سائے میں مرتے ہیں۔ یاد رکھنا! دنیا ایک ایسے بادشاہ کی طرف سے دی ہوئی ادھار چیز ہے جس کی بادشاہی کو زوال نہیں۔ لہٰذا اگر دنیا میرے پاس آئے تو میں اسے کسی شریر مغرور شخص کی طرح نہیں لوں گا اور اگر وہ میرے ہاتھ سے نکل جائے تو میں کسی کم عقل بدحواس آدمی کی طرح اس پر گریہ وزاری نہیں کروں گا۔"[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد ایک انصاری کے ہاتھ اہلِ عراق کو مراسلہ بھیج کر انہیں دوبارہ مرکز خلافت کی اطاعت کی دعوت دی مگر وہاں عبدالملک کے گورنر بشر بن مروان کو پتا چل گیا اور اس نے ان انصاری کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔[2]

☆☆☆

[1] تاریخ دمشق: ۵۸/۲۴۶ تا ۲۴۸

[2] انساب الاشراف: ۷/۱۳۸، ط دار الفکر

عبدالملک کی حجاز میں دخل اندازی

مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کا قتل نہ صرف عراق بلکہ حجاز سے بھی خلافتِ زبیریہ کے سقوط کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مدینہ منورہ پر بنو مروان کے جرنیل طارق بن عَمرو کا تسلط ہوگیا جس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائب طلحہ بن عبداللہ کو وہاں سے نکال دیا۔[1]

عبدالملک کے لیے اب راستہ بالکل صاف تھا اس نے عراق پر قبضے کے بعد دِمَشق واپس آتے ہی امرائے شام کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ پر لشکر کشی کے لیے ابھارا۔ تاہم حرم شریف کے تقدس کے خیال سے اکثر امراء اس مہم سے کتراتے دکھائی دیے۔[2]

حجاج بن یوسف کا ظہور:

عبدالملک کے ترکش میں ایک نیا اور کڑا تیر موجود تھا۔ یہ حجاج بن یوسف تھا۔ ۳۲ سال کا ایک کڑیل جوان جس کی طبیعت میں سختی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سال ۴۰ھ میں طائف میں پیدا ہوا تھا۔[3]

قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔ قرآن مجید کا قاری ہونے کے علاوہ احادیث سے بھی کچھ واقف تھا۔ فصاحت و بلاغت اور فنِ حرب میں یکتا تھا۔ تاہم اس میں دو خرابیاں ایسی تھیں جو اس کی تمام خوبیوں پر حاوی تھیں: ایک یہ کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت وحمایت میں انتہا پسندانہ ذہن رکھتا تھا۔ اگر اسے غلط فہمی کی بنا پر کسی بزرگ صحابی پر بھی شک ہوجاتا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد ونصرت سے گریزاں رہے تو ان کے خلاف سراپا غضب بن جاتا۔

دوسری خرابی یہ تھی کہ وہ سرکاری حکم کو عین دین وایمان کی طرح بجالاتا، اس سے سرتابی کفر سمجھتا اور اس کی تعمیل کروانے کے لیے لوگوں کو بے محابا قتل کراتا تھا۔ اگر اس کی زد میں کوئی بڑی سے بڑی بزرگ شخصیت بھی آجاتی تو اسے کوئی عار نہ ہوتی۔ یہ تقریباً وہی کردار تھا جو اس سے پہلے عبیداللہ بن زیاد نے یزید اور مروان کا حقِ نمک ادا کرنے کے لیے پیش کیا تھا۔ عبدالملک کو عبیداللہ بن زیاد کی جگہ حجاج بن یوسف مل گیا جو اس سے کہیں زیادہ سفاک تھا۔

حجاج ایک غریب خاندان کا فرد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد مزدور پیشہ تھے جو پتھر لادتے، مٹی ڈھوتے اور کنویں کھودتے تھے۔[4] وہ اور اس کا باپ طائف میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔[5] بعض عرب شعراء کے کلام سے معلوم

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۶۸
② البدایۃ والنہایۃ: ۱۲۳/۱۲
③ الاعلام للزرکلی: ۱۶۸/۲
④ الاخبار الطوال، ص ۳۲۳
⑤ العقد الفرید: ۲۷۵/۵، ط العلمیۃ

ہوتا ہے کہ حجاج صبح وشام گھروں میں جا کر بچوں کو پڑھاتا تھا۔اس زمانے میں اس کے مالی حالات بہت کمزور تھے۔[1]

آخر کار اس کا باپ اسے لے کر دِمشق آ گیا اور دونوں مروان بن الحکم کی فوج میں شامل ہو گئے۔رمضان ۶۵ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف دِمَشق سے آنے والی فوج میں حجاج اور اس کا باپ دونوں شامل تھے اور شکست کے بعد بمشکل جان بچا کر بھاگے تھے۔[2]

حجاج کے مزاج کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

''مصر کے قاضی سُلَیم بن عِتر رحمہ اللہ نہایت انصاف پسند، عابد وزاہد اور متقی انسان تھے۔انہوں نے حجاج کے والد سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس منصب سے معزول کرادے۔حجاج کے باپ کو قاضی صاحب کی یہ پرہیزگاری اور مناصب سے بے رغبتی اچھی لگی اور اپنے بیٹے سے تعریف کے پیرائے میں ان کا ذکر کر دیا۔حجاج بھڑک اٹھا اور بولا: ''ایسے لوگ ہماری حکومت کے لیے سب سے زیادہ مضر ہیں۔انہیں دیکھ کر لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو یاد کرتے ہیں،ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں،پھر حکمران کی اطاعت سے بدکتے اور بغاوت کرتے ہیں۔بخدا! مجھے اختیار ملا تو اس قاضی اور اس جیسوں کو قتل کر کے رہوں گا۔باپ نے کہا: ''بیٹا! لگتا ہے اللہ نے تجھے بدنصیب ہی پیدا کیا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اس کے باپ کا اندازہ بالکل درست تھا۔''[3]

عبدالملک کو حکومت ملی تو اس کے وزیر رَوح بن زِنباع کی سفارش سے حجاج بن یوسف کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ لشکر کی روانگی میں وقت کی پابندی کرائے۔حجاج نے یہ کام سنبھال کر خود اپنے محسن رَوح بن زِنباع کو بھی نہ بخشا۔جب دیکھا کہ لشکر کی روانگی کا وقت ہونے کے باوجود رَوح بن زِنباع کے خیمے میں دسترخوان لگا ہوا ہے تو کھانے میں مصروف لوگوں کی کوڑے سے خبر لی اور خیمہ نذرِ آتش کرا دیا۔رَوح نے حیران و پریشان ہو کر عبدالملک بن مروان سے فریاد کی۔عبدالملک نے حجاج سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا: ''یہ میں نے نہیں آپ نے کیا ہے۔میرا ہاتھ آپ کا ہاتھ ہے۔میرا کوڑا آپ کا کوڑا ہے۔آپ رَوح کو خیمے کے بدلے دو خیمے دے دیں مگر جو کام کرنے کی ذمہ داری آپ نے مجھ پر ڈالی ہے اس کے کرنے پر مجھے نہ ٹوکیے۔''[4]

اس دن سے حجاج بن یوسف، عبدالملک کی نظر میں آ گیا۔عبدالملک کی تجربہ کار نگاہوں نے پرکھ لیا کہ سخت ترین مواقع پر استعمال کرنے اور ناقابلِ شکست حریفوں کو جھکانے کے لیے حجاج بہت کارآمد ہوگا۔

جب عبدالملک دربار میں پوچھ رہا تھا: ''تم میں سے کون ابن زبیر کو نمٹائے گا؟'' اس وقت بڑے بڑے امرائے شام پس وپیش کر رہے تھے تب حجاج بن یوسف نے کہا: ''امیر المؤمنین! اس کام کے لیے میں حاضر ہوں۔''

---

① قال بعض الشعراء: زمان هو العبد المقر بذلة ...... يراوح صبيان القرى ويغادى. (العقد الفريد: ۲۷۵/۵؛ ديوان الحماسة ص ۲۳۵)

② تاريخ الاسلام للذهبی: ۴۳/۵ ③ البداية والنهاية: ۵۱۱/۱۲ ④ العقد الفريد: ۲۷۶،۲۷۵/۵، ط العلمية

عبدالملک نے اسے چپ کرا کے دوبارہ یہی آواز لگائی۔ حجاج نے دوبارہ خود کو پیش کیا اور ساتھ ہی کہا: ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں نے ابن زبیر کا جبہ اتار کر خود پہن لیا ہے۔'' یہ سن کر عبدالملک نے یہ مہم اسی کو سونپ دی۔ ①

عبدالملک نے پہلے اہلِ مکہ کو اطلاع بھیجی کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو ان سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ اس کے بعد حجاج نے دو ہزار افراد کے ساتھ جمادی الآخرہ ۷۲ھ (کے آواخر) میں یلغار شروع کی اور عبدالملک کی ہدایت کے مطابق مدینہ و مکہ کی شاہراہ کو چھوڑ کر شاہراہِ عراق سے چکر کاٹتے ہوئے ماہ شعبان میں طائف پہنچ گیا جہاں اس کا قبیلہ بنوثقیف اس کی مدد کے لیے موجود تھا۔ حجاج نے یہاں سے یکے بعد دیگرے مکہ کی طرف گھڑ سوار جتھے روانہ کیے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مقابلے کے لیے اپنے حامیوں کے دستے بھیجتے رہے۔ ان جھڑپوں میں حجاج کے سپاہی غالب آئے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی شکست کھا کر منتشر ہوتے رہے۔

آخر میں حجاج نے عبدالملک کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی عسکری قوت ختم ہو جانے کی خوشخبری دیتے ہوئے محاصرے کی اجازت اور امدادی فوج طلب کی۔ عبدالملک نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے حاکمِ مدینہ کو پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھیج دیا۔ شوال ۷۲ھ میں حجاج اپنی فوجِ قہر خیز کے ساتھ طائف سے نکلا اور یکم ذوالقعدہ کو مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ ②

مکہ کا محاصرہ:

اہلِ شام کے پاس افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں تھی، کمک بھی مل رہی تھی۔ خوراک و رسد کا انتظام بھی بہت مضبوط بنایا گیا تھا۔ مکہ سے مدینہ اور وہاں سے شام تک سپلائی لائن بحال تھی۔ جبکہ اہلِ مکہ کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس اناج کے ذخائر بھی محدود تھے۔ حجاج محاصرے کو طویل کرتا جا رہا تھا تاکہ اہلِ شہر بھوک پیاس سے عاجز آ کر سر تسلیم خم کر دیں۔ ③

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو تاکید کی کہ وہ ہر قیمت پر کوہ ابوقُبَیس اور کوہ قُعَیقِعان کی حفاظت کریں اور حریف کو ان پر قابض نہ ہونے دیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب تک دشمن کو ان پر قبضہ نہ کرنے دو گے تم سر بلند رہو گے۔'' مگر اہلِ مکہ کی مزاحمت دم توڑتی چلی گئی۔ حجاج کی افواج ان کو دھکیلتی ہوئیں آخرکار ان دونوں پہاڑوں پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گئیں۔ ④ اب منجنیقوں سے وادیٔ مکہ پر سنگ باری شروع ہو گئی۔ اس دوران حج کے ایام آ گئے اور حاجی مکہ میں جمع ہونے لگے۔ ان میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے اس حال میں بھی حج ملتوی نہ کیا تھا۔ ⑤

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے حاجیوں کو مسجد الحرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے کی عام اجازت دے رکھی تھی مگر سنگ باری نے کعبہ کے گرد طواف کو جان لیوا بنا دیا تھا۔ حاجیوں میں جابر بن عبداللہ، ابوسعید خُدری، سلمہ بن اَکوَع اور رافع بن خَدِیج رضی اللہ عنہم جیسے مدنی صحابہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف سے

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳ باسناد حسن متصل ؛ اخبار مکۃ للفاکھی: ۳۳۷/۲ ؛ تاریخ دمشق: ۲۳۱/۲۸

② تاریخ الطبری: ۱۷۴/۶، ۱۷۵ ③ البدایۃ و النھایۃ: ۱۷۸/۱۲

④ مستدرک حاکم، ح: ۶۳۳۹ ؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳ باسناد حسن متصل

⑤ الجامع لابن وھب، ح: ۱۳۲، ط دار الوفاء

بات چیت کر کے سنگ باری روکنے کی درخواست کی تا کہ حاجی مناسک حج پورے کر لیں۔[1] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی پُرزور سفارش کی۔ حجاج نے یہ بات مان لی۔[2] تاہم متحارب فریقوں نے اپنی حدود میں دوسرے کو گھسنے نہ دیا۔ حجاج اور اس کے ساتھی طوافِ زیارت کے لیے مسجد الحرام میں داخل نہ ہو سکے۔ دوسری طرف عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حریف کی ناکہ بندی کی وجہ سے عرفات نہ جا سکے۔[3]

حج کے لیے آنے والے بہت سے اعرابی مسلح تھے اور مکہ کے دفاع کے لیے رکنا چاہتے تھے مگر ان کی موجودگی میں جس قدر مزید خوراک کی ضرورت پڑتی وہ مہیا نہیں ہو سکتی تھی؛ اس لیے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں واپس جانے کا حکم دیا۔ ادھر ارکانِ حج پورے ہوتے ہی حجاج بن یوسف کی طرف سے منادی کرادی گئی کہ لوگ فوراً اپنے علاقوں کو لوٹ جائیں، حرم پر سنگ باری شروع ہونے کو ہے۔[4]

حاجیوں کے جاتے ہی کوہِ ابو قُبَیس اور کوہِ قُعَیقِعان پر نصب شامیوں کی پانچوں منجنیقیں چلنا شروع ہو گئیں اور صحن کعبہ ان کی زد میں آ گیا جہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے وفادار ساتھی موجود تھے۔ ان منجنیقوں کو چلانے کے لیے حبشہ سے لوگ منگوائے گئے تھے۔[5]

نئے ہجری سال ۷۳ھ کا آغاز ہوا تو یہ جنگ جاری تھی۔ ایک دن سنگ باری کے دوران اچانک بادل چھا گئے، گرج چمک کے ساتھ بجلی اس زور سے کڑکی کہ سنگ باری کا شور دب گیا۔ شامی سپاہیوں نے ڈر کر منجنیقوں کو بند کر دیا۔ حجاج یہ دیکھ کر تیزی سے آیا اور خود پتھر اٹھا کر منجنیق میں رکھا اور ڈانٹ کر سنگ باری جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس دوران یکے بعد دیگرے دو بار آسمانی بجلی ہولناک کڑکے کے ساتھ گری جس سے بارہ شامی سپاہی جل کر مر گئے۔ پورے لشکر میں دہشت پھیل گئی کہ یہ آسمانی عذاب ہے۔ حجاج نے کہا: ''ڈرو نہیں، یہ تہامہ کی بجلیاں ہیں۔ اب فتح نزدیک ہے۔''

اگلے دن بجلی گرنے سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کا بھی جانی نقصان ہوا جس سے اہلِ شام کا خوف دور ہو گیا اور وہ بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگے۔[6]

ایک بار بجلی گرنے سے ایک منجنیق کوئلہ بن گئی۔ سپاہی ڈرے تو حجاج نے کہا: ''یہ تو قبولیت کی علامت ہے۔ گزشتہ امتوں کی قربانی اس طرح قبول ہوتی تھی کہ آگ آ کر انہیں سوختہ کر دیتی تھی۔'' یہ سن کر سپاہی مطمئن ہو گئے۔[7]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس سنگ باری کے دوران پورے اطمینان سے صحن کعبہ میں ہی نماز ادا کرتے تھے۔ پتھر

---

① اخبار مكة للفاكهي: ۳۷۳/۲

② انساب الاشراف: ۱۱۹/۷، ط دار الفكر

③ البداية والنهاية: ۱۶۵/۱۲ ؛ انساب الاشراف: ۱۱۹/۷، ط دار الفكر

④ انساب الاشراف: ۱۱۹/۷، ط دار الفكر

⑤ البداية والنهاية: ۱۷۸/۱۲

⑥ تاريخ الطبري: ۱۸۷/۶

⑦ انساب الاشراف للبلاذري: ۱۲۳،۱۲۲/۷، ط دار الفكر

ان کے آس پاس آ کر گرتے مگر انہیں ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ ①

مسجد الحرام کی طرف اترنے والے راستوں پر شامی سپاہیوں سے جھڑپیں جاری رہیں۔ حبشہ کے کچھ لوگ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ وہ اس طرح بھالا مارتے تھے کہ کبھی نشانہ خطا نہ جاتا۔ تلوار بازی سے وہ ناواقف تھے۔ جب جھڑپ ہوتی تو ابن زبیر رضی اللہ عنہ خود شمشیر زنوں کے ساتھ حملہ پسپا کرتے۔ پھر حبشی فرار ہونے والے دشمنوں کو بھالوں کا نشانہ بناتے۔ ②

شامی لشکر کو دِمشق سے ستو، آٹے اور کعک (بسکٹوں) کے ذخائر مسلسل پہنچ رہے تھے۔ ③ اس کے ساتھ شامیوں کو انتظار تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گوداموں میں گندم، جو اور کھجوروں کے ذخائر ختم ہو جائیں مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خوراک کو بہت احتیاط سے ضرورت کے مطابق تقسیم کر رہے تھے۔ آپ کہتے تھے:

''جب تک غذا باقی ہے، ہمارے ساتھیوں کے حوصلے برقرار رہیں گے۔'' ④

محصورین فاقہ کشی کا شکار:

آخر محاصرے کی شدت اثر دکھانے لگی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی بھوک سے نڈھال ہونے لگے۔ خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے۔ زم زم کے پانی کے سوا ان کے لیے کوئی شے نہ تھی۔ ⑤

لوگوں نے سواری اور بار برداری کے جانور کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کر دیے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک گھوڑا بچ گیا تھا جو جنگ کے دوران تیز نقل و حرکت اور مورچوں کے معائنے کے لیے ضروری تھا مگر آخر کار ساتھیوں کے فاقے دیکھ کر ایک دن اسے بھی ذبح کر دینا پڑا۔ جب کچھ نہ رہا تو مردار جانور کھانے کی نوبت آ گئی۔ ⑥

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حالتِ جنگ میں بھی اصول کے اس قدر پکے تھے کہ آپ سے بار بار کہا گیا کہ حریف پر شب خون ماریں مگر آپ فرماتے تھے: ''شب خون درست نہیں۔ اسے ہم حلال نہیں سمجھتے۔'' ⑦

چوں کہ بظاہر اب فتح کی کوئی امید باقی نہیں تھی اس لیے ان کے اکثر ساتھیوں نے جان بچانے کی صورت پر غور شروع کر دیا۔ بعض نے مکہ سے خفیہ طور پر کسی اور محفوظ مقام پر جانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے فرمایا: ''تب تو میں اسلامی تاریخ کا بدترین سربراہ کہلاؤں گا، جس نے قوم کو لڑایا۔ جب وہ مارے گئے تو ان کی لاشیں چھوڑ کر خود بھاگ گیا۔''

① انساب الاشراف: ۱۲۱/۷، ط دار الفکر

② انساب الاشراف: ۱۱۹/۷، ۱۲۰، ط دار الفکر

③ انساب الاشراف: ۱۱۸/۷، ط دار الفکر

④ انساب الاشراف: ۱۲۱/۷ ...... یہی وجہ تھی کہ آپ نے پورے چھ ماہ تک شامی لشکر کا مقابلہ کیا۔ آپ کی اس احتیاطی تدبیر کو آپ کے مخالف راویوں نے ایک طعنے کے طور پر عام کر دیا اور یہ باتیں پھیلائیں کہ عبداللہ بن زبیر نہایت حریص، بخیل، تنگ دل اور کم ظرف انسان تھے، جو اپنے لوگوں کو بھی پیٹ بھر کر کھلانے کی بجائے چند لقموں کے لیے ترساتے تھے۔ تاریخی ذخائر میں قارئین کو ایسی کئی روایات دکھائی دیں گی جو سنداً ضعیف اور متناً مبنی بر کذب ہیں۔

⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۱۷۸/۱۲

⑥ انساب الاشراف: ۱۲۰/۷، ۱۲۱، ط دار الفکر ⑦ انساب الاشراف: ۱۲۶/۷، ط دار الفکر

کسی نے رائے دی کہ آپ کعبے کے اندر داخل ہو جائیں۔ فرمایا: ''کعبے کا اندرونی حصہ حجاج کے نزدیک بیرونی حصے ہی جیسا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بل میں چھپی لومڑی کی طرح پکڑا جاؤں۔ میں تلوار سے لڑتے لڑتے مروں گا۔''

ان کے ایک بھائی حمزہ نے کہا: ''آپ کعبہ کی چھت پر چڑھ جائیں ہم نیچے آپ کے گرد پروانہ وار لڑ کر آپ سے پہلے جانیں دے دیں گے۔'' جواباً آپ نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

فَلَسْتُ بِمُبْتَاعِ الْحَيَاةِ بِسُبَّةٍ وَلَا مُرْتَقٍ مِنْ خَشْيَةِ الْمَوْتِ سُلَّماً

''میں زندگی کو کسی ذلت کے عوض نہیں خریدوں گا اور نہ ہی موت سے ڈر کر کسی سیڑھی پر چڑھوں گا۔''①

بچاؤ کی آسان اور بہترین صورت دشمن سے مذاکرات تھے مگر جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا گیا تو آپ نے سختی سے انکار کر دیا۔ دراصل مذاکرات کا حاصل عبدالملک کی باغیانہ حکومت کو تسلیم کرنا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے [illegible] بات ناقابلِ تصور تھی، کیوں کہ آپ کی اب تک کی جدو جہد کا مرکزی نکتہ ہی اس قسم کے نظامِ حکومت کا خاتمہ [illegible] عبدالملک ایک شرعی خلافت کو سبوتاژ کرنے کا مجرم تھا۔ اس کے سامنے سر جھکا کر اس کی حکومت کو سندِ جواز [illegible] جاتی۔ اس کی بجائے آپ رضی اللہ عنہ اپنی جان دے کر غلط کاروں کو تا قیامت غلط کاروں ہی کی حیثیت میں تاریخ کا [illegible] دینا پسند کرتے تھے۔ اس لیے جب آپ کو کسی نے صلح کی رائے دی اور کہا کہ بدلے میں حجاج آپ کو کسی شہر کی ولایت دے دے گا تو آپ نے فرمایا: ''میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرح عزت کی موت کیوں نہ مروں۔''②

دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ کو اہلِ شام کی طرف سے اپنے خاص ساتھیوں کے حق میں جان کی امان کے وعدوں پر اطمینان نہ تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ حریف قابو پانے کے بعد انتقام ضرور لے گا۔ اس لیے آپ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ تمہیں کعبہ کی آغوش میں بھی پالیں تو ذبح کر کے چھوڑیں گے۔''③

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے تنہا رہ جانے کی وجوہ:

محاصرے کو اب ساڑھے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اہلِ مکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دل و جان سے چاہتے تھے اور انہیں اپنے حق پر ہونے کا یقین بھی تھا۔ بات بھی یہی تھی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شرعی خلیفہ تھے جن کے مقابلے میں عبدالملک اور حجاج بن یوسف باغیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے اہلِ مکہ کئی ماہ تک شدید تکلیف اٹھا کر بھی پامردی سے شہر کا دفاع کرتے رہے تھے مگر جب وہ زخموں، فاقوں اور تھکن سے لاچار ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحمت میں کسی کامیابی سے بالکل مایوس ہو گئے تو خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ادھر حجاج کی جانب سے اعلان کرایا جا رہا تھا:

''لوگو! خود کو کیوں ہلاک کرتے ہو؟ جو محاصرے سے نکل کر ہمارے پاس آ جائے وہ مامون ہے۔''④

---

① نسب الاشراف: ۱۲۷/۷ وذکر الطبرانی هذه المقالات اختصاراً. (المعجم الکبیر: ۹۲/۱۳ باسناد حسن)

② نسب الاشراف: ۱۳۷/۷، ط دار الفکر

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳، ط باسناد حسن؛ البدایة والنهایة: ۱۷۸/۱۲

④ تاریخ الطبری: ۱۸۸/۲؛ البدایة والنهایة: ۱۷۹/۱۲؛ تاریخ الاسلام للذهبی: ۴۴۵/۵

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جان بچانے کی شرعی گنجائش کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جو چاہے حجاج سے امان حاصل کر کے اس کے پاس چلا جائے۔ جب آپ کے ساتھی عبداللہ بن زبیر نے کہا:

''آپ پسند کریں تو ہم آپ کے لیے امان لے لیں؟''

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم چاہو تو خود اپنے لیے امان حاصل کر لو، مجھے ضرورت نہیں۔''

آپ کے بیٹے زبیر آپ کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے۔ آپ نے ان سے بھی کہا:

''بیٹا! چاہو تو تم بھی چلے جاؤ، تمہارا زندہ رہنا مجھے تمہارے قتل ہو جانے کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔''

مگر زبیر نے کہا: ''اگر میں آپ پر نازل ہونے والی مصیبت میں شریک ہوئے بغیر آپ کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا تو مجھ سا کون ہوگا۔''①

[...]ب اکثر جان بلب لوگ اضطراری طور پر دفاعی مورچوں کو چھوڑ کر جان بخشی کی درخواست لیے حجاج بن [...]ف پاس جانے لگے۔ ان میں زیادہ تر مکہ کے عام شہری تھے اور باقی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سپاہی اور [...]۔ اس طرح تقریباً دس ہزار افراد جنگ کے دائرے سے نکل کر حجاج کے پاس آ گئے۔ آخری دنوں میں عبداللہ [بن ز]بیر رضی اللہ عنہ کے دو صاحب زادے: حمزہ اور خبیب بھی نکل آئے۔ حجاج نے سب کو جان کی امان دے دی۔②

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ غلطی پر یا عزیمت پر؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شرعی و اخلاقی لحاظ سے غلطی پر تھے۔ یہ جنگ صرف ان کی ذاتی رائے اور قومی دھارے سے علیحدگی پر اصرار کی وجہ سے لڑی جا رہی تھی۔ اگر وہ غلطی پر نہ ہوتے تو اس وقت اکیلے دکھائی نہ دیتے۔ کم از کم ان کے بیٹے ضرور ساتھ ہوتے۔

حالاں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ راہِ حق میں قربانیاں دیتے ہوئے بعض اوقات آزمائش اتنی سخت ہو جاتی ہے کہ اکثر لوگ عزیمت کے معیار پر پورے نہیں اتر پاتے اور رخصت پر عمل کرتے ہیں۔ گنتی کے اِکا دُکا افراد ہی اس وقت جان، عزت اور آبرو کی پرواہ کیے بغیر سچے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ انہی تاریخی ہستیوں میں ایک ہیں جن کے موقف کی صداقت سورج کی طرح روشن اور واضح تھی۔ ان کا ساتھ چھوڑنے والے اپنی جگہ معذور تھے کہ وہ شکست کو سامنے دیکھ رہے تھے اور ان کی مزید مزاحمت کا مطلب قتل ہونے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے پہلے انہوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مذاکرات کی ترغیب دے کر ان کی جان بچانا چاہی مگر جب وہ نہ مانے تو یہ لوگ خود سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ شاید انہیں امید ہو کہ بالکل اکیلے رہ جانے کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی ہتھیار ڈال دیں گے مگر ایسا نہ ہوا؛ کیوں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نواسا اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تربیت یافتہ بھانجا اللہ کے سوا کسی کے سامنے سر جھکانا نہیں جانتا تھا۔

① انساب الاشراف: ۱۳۹/۷، ط دار الفکر

② تاریخ الطبری: ۱۸۸/۶، البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۱۷۹، تاریخ الاسلام للذہبی: ۴۴۵/۵

شہادت کی تیاری:

دوراندیش قائد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جنگ کا نتیجہ اور اپنا انجام معلوم تھا۔ عواقب اندیشی کا یہ عالم تھا کہ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ دشمن قتل پر ہی اکتفا نہیں کرے گا بلکہ نشانِ عبرت بنانے کے لیے لاش کی نمائش بھی کرے گا۔ ①

پیر ۱۶ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ کو حجاج بن یوسف، حریف کی قوتِ مزاحمت کو دم توڑتا دیکھ چکا تھا۔ اب وہ اپنے سپاہیوں کو جمع کر کے کہہ رہا تھا: ''فتح سامنے ہے، ابن زبیر کے ساتھ گنتی کے چند افراد رہ گئے ہیں وہ بھی بھوکے اور لاچار۔''

حجاج بن یوسف کے حکم پر شامی سپاہی بے خوف وخطر وادئ مسجد الحرام میں اتر گئے اور حجون سے مسجد الحرام کے دروازوں تک پھیل گئے۔ ②

ادھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی والدہ سے کہہ رہے تھے: ''امی! مجھے ڈر ہے کہ قتل ہونے کے بعد شامی سپاہی میرے ناک کان کاٹیں گے اور لاش کو لٹکا کر بے حرمتی کریں گے۔''

بہادر ماں نے کہا: ''جب بکری ذبح ہو جائے تو کھال اترنے کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو اور اللہ سے نصرت طلب کرو۔'' ③

آخری شب:

اس رات عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھتیجے عبدالرحمن بن زید آکر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملے اور پیش کش کی کہ وہ ان کے لیے امان لے کر انہیں محفوظ طور پر حجاج کے پاس لے جا سکتے ہیں مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ ④

منگل ۱۷ جمادی الاولیٰ کی صبح کاذب کے وقت حجاج کے سپاہی وادی میں اتر کر مسجد الحرام کو گھیر چکے تھے۔ ہر دروازے پر پانچ پانچ سو سپاہی کھڑے کر دیے گئے تھے تا کہ موقع پاتے ہی اندر گھس کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر قابو پا لیا جائے۔ بابِ کعبہ کے سامنے والے دروازے پر حمص کے، بابِ بنی شیبہ پر دمشق کے، بابِ صفا پر اُردن کے، بابِ بنی جمع پر فلسطین کے اور بابِ بنی سہم پر قنسرین کے دستے کھڑے کر دیے گئے تھے۔ حجاج خود مروہ کی طرف ابطح کے گوشے میں کارروائی کی نگرانی کے لیے کھڑا تھا۔ ⑤

ادھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پوری رات نوافل پڑھتے رہے تھے۔ صبح کاذب کے وقت تلوار کے پٹے سے کمر باندھ کر بیٹھے بیٹھے کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ پھر حسبِ معمول نمازِ فجر کے لیے خود بخود بیدار ہو گئے۔ ⑥

---

① انساب الاشراف: ۱۲۸/۷، ط دار الفکر
② انساب الاشراف: ۱۲۳/۷، ط دار الفکر
③ انساب الاشراف: ۱۲۳/۷، ط دار الفکر
④ انساب الاشراف: ۱۲۵/۷، ط دار الفکر
⑤ تاریخ الطبری: ۱۹۰/۶
⑥ تاریخ الطبری: ۱۹۱/۶



والدہ محترمہ سے آخری ملاقات اور اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہا کے تاریخی الفاظ:

نمازِ فجر سے پہلے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی والدہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔ وہ مسجد الحرام سے متصل ایک محفوظ مکان میں قیام پذیر تھیں اور یہی جگہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مستقل قیام گاہ تھی۔ ①

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر اب سو سال ہو چکی تھی، بصارت جواب دے چکی تھی مگر بصیرت اُسی طرح سلامت تھی جیسا کہ اُس دن جب وہ مکہ کے گھر سے اپنے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ رخصت کر رہی تھیں۔ ②

اب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور نواسے میں وہ گفتگو ہوئی جس کا حرف حرف آبِ زر سے لکھنے اور حرزِ جان بنانے کے قابل ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سلام کر کے والدہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور فرمایا: ''امی جان! میں الوداع کہنے آیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ آج زندگی کا آخری دن ہے۔'' ③

والدہ نے پوچھا: ''جنگ کی صورت حال کیا ہے؟''

آپ نے کہا: ''دشمن ارد گرد آ چکا ہے۔'' پھر ہنس کر کہا: ''موت بڑی راحت کی چیز ہے۔''

والدہ نے کہا: ''بیٹا! شاید تم میرے لیے بھی موت کی تمنا کرو مگر میں چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے دو میں سے ایک بات دیکھ لوں: تم فتح یاب ہو جاؤ اور میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ یا تم قتل ہو جاؤ اور میں اس پر ثواب کی امید کروں۔'' ④

بیٹے نے عرض کیا: ''امی جان! لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ بس مٹھی بھر آدمی رہ گئے ہیں جن کی مزاحمت تھوڑی دیر کی مہمان ہے۔ دوسری طرف دشمن آمادہ ہے کہ میں جو مانگوں وہ دے دے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟''

ماں نے کہا: ''بیٹا! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم حق وصداقت پر ہو اور اسی کی دعوت دیتے ہو تو اس پر جمے رہو؛ کیوں کہ اسی کی خاطر تمہارے ساتھیوں نے جانیں دی ہیں۔ اور اگر تمہاری یہ جدوجہد دنیا کے لیے تھی تو تم بدترین انسان ہو؛ کیوں کہ تم نے خود کو بھی ہلاکت میں ڈالا اور جو لوگ تمہاری خاطر مارے گئے ان کا خون بھی رائیگاں گیا اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ میں ہوں تو حق وصداقت پر، لیکن چوں کہ میرے ساتھی دشمنوں سے جا ملے ہیں اس لیے میں بھی کمزور پڑ گیا ہوں، تو بیٹا! یہ شرفاء اور اولیاء اللہ کی سوچ نہیں۔ تم دنیا میں ہمیشہ نہیں رہو گے۔ ایسے میں لڑ کر مرنا بہتر ہے۔'' ⑤

پھر فرمایا: ''بیٹا موت کے ڈر سے اپنے دین کی ایک بات کو بھی مت چھوڑنا۔'' ⑥

---

① حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۱ عن عروۃ بن الزبیر باسناد حسن

② "وھی یومئذ بنت مائۃ سنۃ." (مستدرک حاکم، ح: ۶۳۳۹)

نوٹ: مسند احمد (ح: ۲۶۹۷۴) میں ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نابینا ہو چکی تھیں جبکہ مستدرک حاکم میں ہے: "لم یسقط لھا سن ولم یفسد لھا بصر ولا سمع." (مستدرک حاکم، ح: ۶۳۳۹) مسند احمد کی روایت کے تمام رجال ثقہ ہیں جبکہ مستدرک کی یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ اس لیے بڑھاپے میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے نابینا ہو جانے کی روایت راجح ہے۔

③ تاریخ الطبری: ۶/۱۸۹ ④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/۹۲ باسناد حسن، حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۱ باسناد حسن

⑤ تاریخ الطبری: ۶/۱۸۸، ۱۸۹ ⑥ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/۹۲ باسناد حسن، حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۱ باسناد حسن

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے والدہ محترمہ کے یہ حوصلہ افزا کلمات سن کران کے سر کو چوما اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! میری سوچ بھی یہی تھی لیکن میں نے یہ چاہا کہ آپ کی رائے بھی معلوم کرلوں۔ آپ نے میرے عزم و ارادے کو مزید مستحکم کردیا ہے۔ امی جان! آپ دیکھ لیجئے گا، آج میں شہید کردیا جاؤں گا۔ آپ غم سے بے حال نہ ہونا۔ معاملہ اللہ کے سپرد کردینا؛ کیوں کہ آپ کے بیٹے نے شعوری طور پر کوئی گناہ نہیں کیا۔ کبھی بے حیائی کا مرتکب نہیں ہوا، اللہ کے حکم سے تجاوز نہیں کیا، کسی کو امان دے کر بدعہدی نہیں کی، کسی مسلمان یا ذمی پر ظلم نہیں کیا، کسی ماتحت عہدے دار کی زیادتی کو گوارا نہیں کیا، اللہ کی رضا پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دی۔''

پھر فرمایا: ''الٰہی! تو مجھے خوب جانتا ہے کہ میں نے یہ کلمات اپنی تعریف کے لیے نہیں بلکہ امی کو تسلی دینے کے لیے کہے ہیں۔'' اس کے بعد ماں سے دعاؤں کی درخواست کی۔

وہ بولیں: ''یا اللہ! تو اس کی لمبی راتوں میں شب بیداری، مدینہ اور مکہ کی تپتی دوپہروں میں روزہ داری، عبادت میں آہ و بکا اور ماں باپ کی خدمت کی وجہ سے اس پر رحم فرما۔ اس کا معاملہ میں نے تیرے سپرد کردیا ہے۔ جو تیرا فیصلہ ہے اس پر میں خوش ہوں۔ پس میرے بچے عبداللہ کی وجہ سے مجھے صبر و شکر کرنے والوں کا ثواب عطا فرما۔''[1]

پھر ماں نے کہا: ''بیٹا! ذرا میرے اور قریب آؤ، میں تمہیں رخصت کروں۔'' یہ کہہ کر بیٹے کو بوسہ دیا اور گلے سے لگا لیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ململ کے کرتے کے نیچے زرہ پہن رکھی تھی۔ ماں نے اس کی سختی محسوس کی تو کہا:

''جان پر کھیلنے والے یہ نہیں پہنا کرتے۔ ایسا لباس پہن کر جاؤ جس میں آدمی چست اور بہادر دکھائی دے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فوراً زرہ اتار دی اور آستینیں چڑھا لیں۔ بہادر ماں نے انہیں یہ کہتے ہوئے رخصت کیا:

''صبر کرنا، اللہ کی قسم! تمہارے باپ ابوبکر صدیق اور زبیر ہیں اور تمہاری دادی صَفِیَّہ بنت عبدالمطلب ہیں۔''[2]

پھر فرمایا: ''میرے پیارے بچے! اپنے موقف پر کٹ مرو۔''[3]

اس کے بعد یہ برگزیدہ خاتون نماز اور دعا میں مشغول ہوگئیں۔[4]

حرم میں آخری نماز، مستحباتِ نماز کا پورا خیال:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ماں سے رخصت ہو کر مسجد الحرام میں آئے۔[5] مؤذن کو اذان کا حکم دے کر وضو کیا۔ دو سنتیں نہایت اطمینان سے ادا کیں۔[6] مسجد کے دروازے پر شامی سپاہی اسلحہ تانے کھڑے تھے۔ اس تشویش ناک صورتحال میں خلیفہ کے ساتھی جلد از جلد نماز سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا: امیر المؤمنین! نماز پڑھایئے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے نہایت اطمینان سے فرمایا: ''صبح ہو لینے دو۔''

① تاریخ الطبری: ۱۸۸/۲، ۱۸۹۔
② تاریخ الطبری: ۱۹۰/۲
③ اخبار مکۃ للفاکہی: ۳۳۷/۲، باسناد صحیح، ط دار خضر
④ انساب الاشراف: ۱۲۲/۷، دار الفکر
⑤ حلیۃ الاولیاء: ۳۳۱/۱ عن عروۃ بن الزبیر باسناد حسن
⑥ تاریخ الطبری: ۱۹۱/۲

چند لمحوں بعد مکرّر سہ کرر یہی درخواست کی گئی۔ آپ نے دوبارہ یہی جواب دیا۔

جب ٹھیک وہ مستحب وقت ہوا جس میں آپ روزانہ نمازِ فجر پڑھاتے تھے تو آپ آگے بڑھے۔[1]

نمازِ فجر پڑھاتے ہوئے آپ نے نہایت اطمینان سے ''سورۃ القلم'' کی تلاوت کی۔[2]

آپ کے اندازِ قرأت، رکوع وسجود اور تکبیرات میں عام معمول سے ذرا بھی فرق نہیں تھا۔[3]

جان نثاروں سے آخری خطاب:

سلام پھیر کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حطیم میں آ گئے اور اپنی سفید رنگ کی میان سے شمشیر کھینچ لی۔[4]

اب وقت کا یہ صاحبِ عزیمت اپنے جاں نثار ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا جو سب زرہوں میں ملبوس تھے۔ خودوں اور عماموں سے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''رات میں نے خواب دیکھا کہ آسمان کا دروازہ کھلا اور میں اس میں داخل ہو گیا۔ بخدا! میں دنیا سے اکتا چکا ہوں۔ عمر ۷۲ سال ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج میں شہید ہو جاؤں گا۔ الٰہی! میں تجھ سے ملاقات پسند کرتا ہوں، تو بھی مجھ سے ملنا پسند کر لے۔''

اس وقت آپ کا دل چاہا کہ شہادت سے پہلے آخری بار اپنے ان وفاداروں کے چہروں کو ایک بار دیکھ لیں جو امتحان کی سب سے جاں کاہ گھڑی میں بھی ساتھ تھے۔ فرمایا: ''ذرا مجھے اپنے چہرے تو دکھاؤ۔''

سب نے خود کھسکا کر اپنے چہرے نمایاں کیے۔ آپ نے انہیں جہاد اور شہادت کی ترغیب دی۔ ان کا حوصلہ بڑھایا اور فرمایا: ''دوستو! تلواروں کی ضرب سے نہ ڈرنا۔ اپنی شمشیروں کی حفاظت چہروں کی طرح کرو کہ شمشیریں چھن جانے سے آدمی لاچار عورت کی طرح رہ جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے مدمقابل کی طرف متوجہ رہے۔ میری پروانہ کرنا۔ مت پوچھنا کہ میں کہاں ہوں۔ میں سب سے آگے ہوں گا۔[5] اللہ کی قسم! میں ہمیشہ صفِ اوّل ہی میں لڑتا رہا ہوں۔''[6]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا آخری معرکہ:

صبح کا اجالا پھیلتے ہی وادی میں حجاج بن یوسف کی آواز گونجی: ''دروازوں پر جم جاؤ، ابن زبیر بھاگنے نہ پائے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یہ سن کر بولے:

''یہ بدنسب مجھے اپنے اور اپنے باپ جیسا تصور کرتا ہے جو میدانِ جنگ سے نکل بھاگے تھے۔''[7]

---

① اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۳۴۷ باسناد صحیح، ط دار خضر

② تاریخ الطبری: ۶/۱۹۱

③ اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۳۴۷ باسناد صحیح

④ اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۳۴۷ باسناد صحیح

⑤ تاریخ الطبری: ۶/۱۹۱، البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۸۳، واخرج الطبرانی ھذہ الخطبۃ مختصراً باسناد حسن. (المعجم الکبیر: ۱۳/۹۲)

⑥ حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۱ عن عروۃ بن الزبیر باسناد حسن

⑦ انساب الاشراف: ۷/۱۲۵، ط دار الفکر ..... یہ ۶۵ھ کی اس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو مدینہ کے قریب ہوئی تھی جس میں حجاج اور اس کا باپ جان بچا کر بھاگ نکلے تھے۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۴۳)

شامی سپاہیوں نے مسجد الحرام کے مختلف دروازوں سے اندر گھسنے کی کوشش کی مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے جاں نثار ہر دروازے پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ڈٹے ہوئے تھے۔ کچھ جانثار مسجد کی چھت سے اینٹیں برسا کر حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ صحنِ مسجد میں دونوں ہاتھوں میں شمشیریں سونتے تیار کھڑے تھے۔ سب سے پہلے ایک حبشی مسجد الحرام میں گھسا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے تلوار کا وار کر کے اس کا پاؤں زخمی کر دیا۔

حبشی چیخا: ''ہائے فاحشہ کی اولاد!'' عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بولے: ''برباد ہو جا کالے، اسماء رضی اللہ عنہا کو فاحشہ کہتا ہے!!''

یہ کہہ کر ایسا حملہ کیا کہ حبشی کے تمام ساتھی مسجد سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بے نظیر شجاعت:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جس دروازے کا رخ کرتے وہاں حریف سپاہیوں کی شامت آ جاتی اور وہ الٹے پاؤں واپس بھاگتے۔ حمص کے ایک سپاہی کا بیان ہے:

''سب سے پہلے ہمارا دستہ ہلہ بول کر مسجد میں گھسا مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اکیلے ہمیں مار بھگایا اور تعاقب کرتے ہوئے تنہا مسجد سے باہر نکل آئے، ان کی زبان پر یہ شعر تھا:

اِنِّیْ اِذَا اَعْرِفُ یَوْمِیْ اَصْبِرُ ۔۔۔ اِنَّمَا یَعْرِفُ یَوْمَهُ الْحُرُّ

(میں جب اپنا یوم موعود پہچان لوں تو استقامت کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ شریف آدمی ہی اپنے ایسے دن کو پہچانتا ہے)

اِذْ بَعْضُهُمْ یَعْرِفُ ثُمَّ یُنْكِرُ

جبکہ بعض لوگ ایسے مواقع پر جان بوجھ کر انجان بن جاتے ہیں۔

یہ سن کر میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! آپ واقعی ایسے کھرے اور شریف انسان ہیں۔''[2]

باب بنی مخزوم اور باب بنی سہم سے اُردن اور حمص کے الگ الگ دستوں نے حملے کیے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں پسپا کر دیا۔[3] پھر اپنے ساتھیوں سے پوچھا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل، اہلِ مصر کس طرف ہیں؟''

ساتھیوں نے باب بنی جمح کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے با آواز بلند فرمایا:

حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ.

(آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور جن مومنوں نے آپ کا اتباع کیا، وہ کافی ہیں۔)

آپ نے اس سمت حملہ کیا اور مصری سپاہیوں کو پسپا کرتے ہوئے انہیں ''دارِ اُمّ ہانی'' تک پہنچا دیا۔[4]

کئی بار آپ ان سپاہیوں کا تعاقب کرتے ہوئے وادی میں آنے والے راستے ''ابطح'' تک دوڑے آئے اور

---

[1] حلیة الاولیاء: ۱/۳۳۱ عن عروة بن الزبیر باسناد حسن، واخرجه الطبرانی ایضاً (المعجم الکبیر: ۱۳/۹۲ باسناد حسن)،

[2] تاریخ الطبری: ۶/۱۹۰، واخرجه ابو نعیم مختصراً باسناد حسن. (حلیة الاولیاء: ۱/۳۳۲)

[3] المعجم الکبیر: ۱۳/۹۲ باسناد حسن

[4] اخبار مکة للفاکهی: ۲/۳۳۷ باسناد صحیح، ط دار خضر

وہاں تن تنہا حریف کے مقابلے میں کھڑے رہے مگر کسی کو پاس آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ کی زبان پر یہ مصرع تھا:

لَوْ كَانَ قِرْنِيْ وَاحِداً لَكَفَيْتُهُ

اگر میرا مدمقابل ایک آدمی ہوتا تو میں کافی تھا۔

یہ سن کر عبداللہ بن صفوان رحمہ اللہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہزار بھی ہوں تو آپ ان کے لیے کافی ہیں۔''[1]

عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ بھی مردانہ وار لڑ رہے تھے، ان کے لبوں پر یہ اشعار تھے:

اَنَا الَّذِیْ فَرَرْتُ یَوْمَ الْحَرَّةِ   وَالْحُرُّ لَا یَفِرُّ اِلَّا مَرَّةٌ

''میں وہی ہوں جو جنگِ حرہ میں بچ نکلا تھا مگر (جنگ کی) تپش سے بھاگ نکلنے کا موقع ایک ہی بار ملتا ہے۔''

فَالْیَوْمَ اَجْزِیْ فَرَّةً بِكَرَّةٍ

پس آج میں پلٹ کر حملے کر کے بھاگنے کی تلافی کر رہا ہوں۔[2]

حجاج نے دیکھا کہ اس کے سپاہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مٹھی بھر ساتھیوں پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو وہ غضب ناک ہو کر خود پیدل دوڑا آیا اور اپنے سپاہیوں کو مسجد کی طرف ہانکا، ساتھ ہی اپنے پرچم بردار کو آگے بڑھانے لگا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے علم بردار کو آگے بڑھایا اور دشمن پر شدید حملہ کر کے اسے پسپا کر دیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خود مسجد حرام میں آ کر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز ادا کرنے لگے۔ ادھر دشمن نے دوبارہ ہلہ بولا اور باب بنی شیبہ کے پاس عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے علم بردار کو قتل کر کے پرچم چھین لیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اتنے میں نماز مکمل کی اور پھر دشمن سے مزاحمت شروع کر دی۔[3]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت:

شامی سپاہیوں کے دھاووں کا سلسلہ جاری رہا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی ایک ایک کر کے کٹتے گئے۔ جب سب شہید ہو گئے تو دشمنوں نے بیک وقت ہر طرف سے اندر داخل ہو کر آپ کو رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان گھیر لیا۔[4]

اس دوران آپ کے ماتھے پر ایک اینٹ آ کر لگی۔[5] اینٹ لگتے ہی تیزی سے خون بہنے لگا، چہرہ اور منہ تر بتر ہو گیا۔

---

① تاریخ الطبری: ۱۹۰/۲، ۱۹۱

② انساب الاشراف: ۱۲۷/۷

③ انساب الاشراف: ۱۲۵/۷، ط دار الفکر

④ طبرانی عن ابراہیم بن اسحٰق کی روایت کے مطابق یہ سنگ باری سے شکستہ شدہ مسجد کی چھت کا کوئی ٹکڑا تھا جو اچانک آ گرا تھا۔ (المعجم الکبیر: ۹۱/۱۳) جبکہ طبرانی عن قاسم بن معن کی روایت کے مطابق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے کچھ ساتھی مسجد کی چھت سے دشمن پر اینٹیں برسا رہے تھے، انہی میں سے ایک اینٹ نشانہ خطا ہو کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر جا لگی۔ (المعجم الکبیر: ۹۲/۱۳) طبرانی عن قاسم بن معن کی روایت حسن ہونے کے باعث راجح ہے مگر اس سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام اہل شام سے ساقط نہیں ہو جاتا جیسا کہ بعض لوگ اینٹ لگنے کی یہ روایت لے کر دعویٰ کرتے ہیں کہ ''عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اہل شام نے نہیں ان کے اپنے ساتھیوں نے قتل کیا تھا۔'' اولاً تو گھمسان کی جنگ میں ایسی غلطی ہرگز بعید نہیں۔ ثانیاً اس روایت سے فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اینٹ لگنے سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تھے۔ اس کے بعد کی روایت ثابت کرتی ہے کہ اہل شام نے انہیں حملہ کر کے شہید کیا تھا اور سر مبارک قلم کیا تھا۔

⑤ حلیۃ الاولیاء: ۳۳۲/۱

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں یہ رزمیہ شعر پڑھا:

فَلَسْنَا عَلَى الْاَعْقَابِ تَدْمىٰ كُلُومُنَا ۔۔۔ وَلٰكِنْ عَلَى الْاَقْدَامِ تَقْطُرُ الدِّمَا

''ہم وہ نہیں کہ جن کے زخموں کا خون ایڑیوں پر گرے، ہمارا خون قدموں پر آ کر گرتا ہے۔''①

آپ پر غشی طاری ہونے لگی اور آپ لڑکھڑا کر گر گئے۔ زبانِ مبارک سے یہ نکلا:

اَسْمَاءُ اِنْ قُتِلْتُ لَا تَبْكِيْنِيْ ۔۔۔ لَمْ يَبْقَ اِلَّا حَسَبِيْ وَ دِيْنِيْ

(اسماء! اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو مجھ پر مت رونا کہ میری عالی نسبی اور میرے دین کے سوا کچھ باقی رہنے والا نہیں)

وَصَارِمٌ لَانَتْ بِهٖ يَمِيْنِيْ

اور سوائے اس تلوار کے جسے میرا دایاں ہاتھ با آسانی چلاتا ہے۔②

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر ایک شامی سپاہی نے آپ کو بے بس دیکھ کر فوراً حملہ کر دیا۔ آپ بائیں کہنی کے بل ذرا اُٹھے اور دائیں ہاتھ سے تلوار کا ایسا وار کیا کہ حملہ آور کے دونوں پاؤں کٹ گئے۔ اتنے میں بہت سے حریف سپاہی آپ پر پل پڑے۔ آپ اس حالت میں جب تک سکت رہی، تلوار چلاتے رہے۔③

آپ بے دم ہو گئے تو شامیوں کے دو غلام یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے: ''غلام کا کام اپنے آقا کی حمایت ہے۔''

دونوں نے پے در پے وار کر کے آپ کو شہید کر ڈالا۔④ انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ سانحہ ۱۷ جمادی الآخرہ سن ۷۳ھ کو پیش آیا۔ آپ کے ساتھ جو جاں نثار شہید ہوئے ان میں آپ کے بیٹے عُروہ، بھائی حمزہ، بھتیجے مُعاویہ بن مُنذِر، عَمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے بیٹے عُمارہ، صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کے فرزند عبداللہ اور مشہور صحابی عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔⑤

---

① المعجم الكبير: ۹۲/۱۳ باسناد حسن ؛ حلية الاولياء: ۳۳۱/۱ باسناد حسن ؛ مجمع الزوائد: ۲۵۵/۷ ؛ تاريخ الطبرى: ۱۹۲/۶

② حلية الاولياء: ۳۳۲/۱ ؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۲۰۸۵

③ البداية والنهاية: ۱۸۴/۱۲

④ المعجم الكبير: ۹۲/۱۳ باسناد حسن ؛ حلية الاولياء: ۳۳۱/۱ باسناد حسن ؛ مجمع الزوائد: ۲۵۵/۷

قال الحافظ ابن حجر العسقلاني: "قال الهيثمي: فيه عبدالملك بن عبدالرحمن الذماري وثقه ابن حبان وضعفه ابو زرعة وغيره. قلت: قد اخطأ الامام الهيثمي، هذا عبدالملك بن عبدالرحمن الشامي، واما عبدالملك بن عبدالرحمن الذماري فهو رجل آخر، وقد اوضح هذا الفرق الحافظ ابن حجر، فقال: " وقد فرق ابو حاتم والبخاري بين الشامي والذماري وكلاهما يروى عنه عمرو بن علي، قلت: والصواب التفريق بينهما، فاما الشامي فهو المكنىٰ بابي العباس، وهو الذي يروى عن الاوزاعي وابراهيم بن ابي عبلة، وهو الذي قال فيه البخاري منكر الحديث وتبعه ابوزرعة، وقال فيه ابو حاتم ليس بالقوي، وضعفه عمرو بن علي، واما الذماري فهو المكنىٰ بابي هشام واسم جده ايضاً هشام، وهو الذي قال فيه ابو حاتم: شيخ، ولم يذكر فيه البخاري جرحاً ولا تعديلاً، وذكره ابن حبان في الثقات، ووثقه عمرو بن علي." (تهذيب التهذيب: ۴۰۱/۶)

⑤ انساب الاشراف، بلاذرى: ۱۳۴/۷، ط دار الفكر

عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن صفوان رحمہ اللہ کے سر بھی کاٹے گئے اور شام بھیج دیے گئے۔ (اخبار مكة للفاكهى: ۳۳۹/۲ باسناد صحيح)

مکہ معظمہ میں کہرام:

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو معلوم تھا کہ بیٹے کا انجام یہی ہوگا۔ انہوں نے خوشبو لگا کر کفن تیار کر رکھا تھا اور مسجد حرام کے دروازوں پر چند باندیوں کو کھڑا کر دیا تھا تاکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے شہید ہوتے ہی اطلاع دے دیں۔ ①

جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ زخموں سے چور ہو کر گرے تو ایک باندی یہ دیکھ کر مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیوانہ وار چلائی: "ہائے امیر المومنین!" ②

یہ سنتے ہی پورا مکہ معظمہ آہوں اور سسکیوں سے گونجا۔ ③

ساتھ ہی شامی لشکر نے فتح کی خوشی میں تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جو حج کے بعد ابھی تک مکہ میں تھے، یہ شور سنا۔ انہیں وہ دلکش دن یاد آ گیا جب مدینہ منورہ میں حواریٔ رسول، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے گھر نومولود کی آمد پر صحابہ کرام نے نعرۂ تکبیر لگایا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ منظر یاد کر کے بے ساختہ بولے: "ان کی ولادت پر تکبیر کا نعرہ بلند کرنے والے جلیل القدر لوگ ان کے قتل پر یہ نعرہ لگانے والوں سے کہیں بڑھ کر تھے۔" ④

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے نعش کو کفنانے دفنانے کے لیے اپنے پاس منگوانے کی کوشش کی مگر تب تک حجاج بن یوسف ان کا سر قلم کرا چکا تھا جسے وہ عبدالملک کے ملاحظے کے لیے دِمشق بھیج رہا تھا جب کہ باقی جسم کو اس نے شارع عام پر لٹکانے کا حکم دے دیا تھا۔ ⑤ مکہ معظمہ کی وادی میں اترنے والی گھاٹی "ثَنِیَّۃ کَداء" پر ایک کھمبا نصب کر کے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لاڈلے کی سر کٹی لاش کو اس پر اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ ⑥

یہی مشیتِ الٰہیہ تھی۔ یہی نظامِ تکوین تھا۔ جس طرح غارِ ثور کے دونوں ہم نشین، سفر و حضر سے مرقد و حشر تک ایک ہوئے، اسی طرح دونوں کے نواسے بھی حیات سے شہادت تک وہ یکساں شان سے دکھا گئے کہ دنیا کو کہنا پڑا۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

حجاج کا لاش کے ساتھ بے رحمانہ سلوک:

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حجاج سے مطالبہ کیا کہ لاش کو کفنانے دفنانے کی اجازت دے دی جائے مگر اس نے لاش کے گرد سخت پہرہ لگوا دیا اور کہا: "جب تک میں زندہ ہوں یہ یہیں لکڑی پر لٹکا رہے گا۔" ⑦

① انساب الاشراف: ۱۲۸/۷، ط دار الفکر
② تاریخ الطبری: ۱۹۲/۶ ...... غالباً یہ باندی مسجد الحرام سے متصل پہاڑیوں پر کھڑی تھی اس لیے اس کی آواز دور تک پھیل گئی۔
③ تاریخ دمشق: ۱۲۰/۱۲
④ انساب الاشراف بلاذری: ۱۳۰/۷، ط دار الفکر
⑤ انساب الاشراف: ۱۲۸/۷ ط دار الفکر
⑥ صحیح مسلم، ح: ۶۶۶۰ باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا واخرجہ الامام احمد فی مسندہ بلفظ: "لما قتل الحجاج ابن الزبیر وصلبہ منکوساً، فبینا ھو علی المنبر اذ جاءت اسماء ومعھا امۃ تقودھا وقد ذھب بصرھا." (ح: ۲۶۹۷۳) ورجالہ کلھم ثقات
⑦ انساب الاشراف، بلاذری: ۱۲۹/۷ ط دار الفکر

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو فرمایا:

''اللہ اس خونخوار کو ہلاک کرے، مجھے اپنے بیٹے کو دفنانے کا موقع بھی نہیں دیا۔''[1]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا دُکھ دیکھ کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے اور تعزیت کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ جسم کوئی چیز نہیں، روحیں تو اللہ کے پاس چلی جاتیں ہیں۔ پس آپ صبر فرمائیں۔''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''بھلا میں کیوں صبر نہ کروں گی۔ آخر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر بھی کاٹا گیا تھا اور ایک فاحشہ عورت کے پاس بھیجا گیا تھا۔''[2]

صحبتِ نبویہ سے مشرف آخری خلیفہ، فاتحِ افریقہ، دورِ صحابہ کے آخری حکمران اور قریش کے اس رجلِ عظیم کی نعش ''ثَنِیَّۃ کَداء'' کی گھاٹی پر لٹکی رہی۔ قریشی شرفاء سمیت لوگ جوق در جوق یہ دردناک منظر دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔[3] تیسرے دن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سواری پر یہاں تشریف لائیں۔ ایسا دل فگار موقع بھی اس سراپا صبر خاتون کا حوصلہ پست نہ کرسکا۔ بے ساختہ فرمایا: اَمَا آنَ لِهٰذَا الرَّاكِبِ اَنْ يَنْزِلَ؟

''ابھی تک اس شہ سوار کے اترنے کا وقت نہیں آیا؟''[4]

حجاج کی بدتمیزی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی بے مثال حق گوئی:

حجاج بن یوسف کو یہ جملہ پہنچا تو غصے سے بے حال ہوگیا؛ کیونکہ اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کو اس لیے لٹکایا تھا تاکہ وہ خوب رسوا ہوں مگر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے ایک بلیغ جملے نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ حجاج نے فوراً آدمی دوڑایا کہ اسماء رضی اللہ عنہا کو لے آؤ۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی نے یہ ذلت قبول کرنے سے انکار کردیا۔

حجاج نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلوایا:

''خود آتی ہو تو ٹھیک، ورنہ میں ایسے لوگ بھیجوں گا جو تجھے بالوں سے گھسیٹ لائیں گے۔''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہلوادیا: ''ہاں ہاں! انہی کو بھیجو جو بالوں سے گھسیٹ کر لے جائیں۔''

حجاج یہ جواب سن کر طیش سے بل کھاتا، پاؤں پٹختا ہوا، خود تیزی سے ان کے پاس آیا اور بولا:

''دیکھ لیا ناں! میں نے تیرے گمراہ بیٹے کا کیا حشر کیا۔''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''میں نے تو بس یہی دیکھا کہ تو نے اس کی دنیا برباد کی اور اس نے تیری آخرت۔''

اس دوٹوک فقرے نے حجاج جیسے زبان آور کو گنگ کردیا۔ اسے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

---

[1] انساب الاشراف: ۷/۱۲۸، ط دار الفکر

[2] اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۳۵۱، ط دار خضر

[3] صحیح مسلم، ح: ۶۶۲۰

[4] حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۲ باسناد صحیح

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے پھر فرمایا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو اسے دو دوپٹے والی کی اولاد کہہ کر عار دلاتا تھا۔ ہاں اللہ کی قسم! میں ہی ہوں دو دوپٹے والی مگر تو مجھے کون سے دوپٹے کی شرم دلا سکتا ہے۔ اس دوپٹے کی جس میں کھانا باندھ کر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کرتی تھی جب وہ غار میں روپوش تھے، یا اس دوپٹے کی جو ہر شریف عورت گھر کے کام کاج کی وجہ سے باندھا کرتی ہے۔''[①]

سچائی کے اس نشتر نے حجاج کو اندر تک کاٹ ڈالا۔ عرب کا یہ خطیبِ اعظم جواب میں بمشکل اتنا کہہ پایا:

''یہ تو منافق تھا۔''

اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''منافق نہیں روزہ دار، تہجد گزار اور نیکوکار تھا۔''

حجاج سے پھر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ زچ ہو کر چیخا: ''بڑھیا! جا چلی جا، تیرا دماغ خراب ہے۔''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بولیں: ''اللہ کی قسم! میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔''[②]

پھر حجاج کے منہ پر اسے خوار کر دینے والی ایک حدیث یوں سنائی: ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد خوب یاد ہے کہ بنو ثقیف سے ایک کذاب اور ایک مبیر (خون خوار) ظاہر ہوگا۔ کذاب کو ہم دیکھ چکے اور خون خوار تو ہی ہے۔''[③]

حجاج اس حدیث کا انکار نہ کر سکا اور یہ کہتے ہوئے مڑ گیا: ''میں خون خوار ضرور ہوں مگر منافقوں کا خون خوار۔''

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فوراً بولیں: ''نہیں بلکہ منافقوں کا سردار۔''[④]

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کا صبر اور وفات حسرتِ آیات:

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا لاش کے پاس دیر تک دعا میں مشغول رہیں، آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ تک نہ گرا۔ پھر یہ فرماتی ہوئی لوٹ گئیں: ''لوگ باطل کے لیے جان گنواتے ہیں۔ بیٹا! تو نے حق کے لیے جان دی ہے۔''[⑤]

بیٹے کی شہادت کے پانچویں یا دسویں دن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بھی دنیائے فانی سے رحلت فرما گئیں۔[⑥]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے تاثرات:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنی اونٹنی پر سوار اس گھاٹی سے گزرے۔ اونٹنی رک گئی اور اس کھمبے سے بے تابانہ سر رگڑنے لگی جس پر شہید کی نعش لٹکی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور بے اختیار گویا ہوئے:

''السلام علیک ابا خبیب! اللہ تم پر رحمت کرے، دیکھو! اللہ گواہ ہے میں نے (بطورِ شفقت) تمہیں اس (پُرخطر راستے)

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۲۶۰ باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا، واخرجہ الامام احمد فی مسندہ مختصراً، ح: ۲۶۹۶۷

② حلیۃ الاولیاء: ۳۳۳/۱ باسناد صحیح، تاریخ دمشق: ۲۲۷/۲۸

③ صحیح مسلم، ح: ۲۲۶۰ باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا

④ انساب الاشراف: ۱۳۰/۷، ط دار الفکر و اخرجہ الحمیدی فی مسندہ اختصاراً، ح: ۳۲۸، ط دار السقا

⑤ تاریخ دمشق: ۲۳۷/۲۸

⑥ تاریخ الطبری: ۱۹۰/۶

سے منع کیا تھا۔ اللہ کی قسم! جہاں تک میں جانتا ہوں تم بلاشبہ بہت روزے رکھنے والے، بکثرت نوافل پڑھنے والے اور بہت صلہ رحمی کرنے والے انسان تھے۔ اللہ کی قسم! جس امت کا بدترین آدمی تم جیسا ہو وہ امت تیر ہی خیر ہوگی۔''[1]

مطلب یہ تھا کہ تمہارے قاتل تم جیسے نیک انسان کو بدترین قرار دے رہے ہیں۔ پس امتِ محمدیہ کے برے کہلانے والے اگر تم جیسے فرشتہ صفت ہوتے ہیں تو امت کے نیک کہلانے والے لوگ کس درجے کے ہوں گے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی نعش نمازِ جنازہ اور تکفین کے بغیر پھینک دی گئی:

حجاج بن یوسف عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو رسوا کرنے کے لیے ان کی لاش کی سرعام نمائش کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ امتِ مسلمہ کی نیک ہستیاں وہاں آکر ان کی تعریف و توصیف کر رہی ہیں تو ان کی لاش کو کھمبے سے اتروایا اور ورثاء کے حوالے کرنے کی بجائے یہودیوں کے قبرستان میں پھینکوا دیا۔[2]

نمازِ جنازہ اور کفن دفن کی اجازت اس کے بعد بھی نہیں دی گئی۔ یہ ظلم کی انتہا تھی۔

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کی عبدالملک سے ملاقات:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد ان کے بھائی عروہ رحمہ اللہ ایک تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر دمشق روانہ ہو گئے؛[3] کیوں کہ انہیں حجاج سے اپنے گھرانے کی جان و مال اور عزت کی پامالی کا شدید خطرہ لاحق تھا۔ اس کے علاوہ بھائی کی لاش کفنانے دفنانے کی اجازت بھی چاہیے تھی۔ انہیں عبدالملک سے نرم سلوک کی توقع تھی؛ کیوں کہ وہ ان کا پرانا دوست تھا۔ مگر عروہ کے نکلتے ہی حجاج نے عبدالملک کی طرف خط بھیج دیا کہ عروہ کو گرفتار کر کے واپس بھیجا جائے۔

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ عبدالملک کے پاس پہنچے اور اس کی حکمرانی قبول کر کے اپنے لیے امن کی ضمانت لی۔ ساتھ ہی بھائی کے قتل کی خبر دے کر درخواست کی کہ لاش کو کفن دفن کی اجازت دی جائے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حجاج کا خط آن پہنچا جسے پڑھ کر عبدالملک کو معلوم ہوا کہ حجاج عروہ کو گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ عبدالملک نے سپاہیوں کو کہا:

''عروہ کو ہتھکڑی لگا دو۔'' وہ بولے: ''میں اس طور پر آپ کے پاس نہیں آیا (بلکہ مامون ہوں)۔''

عبدالملک بولا: ''حجاج کی بات تو ماننا ہی پڑے گی۔'' عروہ رحمہ اللہ غصے سے کھڑے ہو گئے اور بولے:

''جسے تم قتل کر دو، وہ ذلیل نہیں۔ ذلیل وہ ہے جس پر تم حکومت کرو۔''

عبدالملک یہ سن کر نادم ہو گیا۔ ہتھکڑی کھلوا دی اور حجاج کو ہدایت بھیجی:

''عروہ کو کوئی گزند نہ پہنچانا، یہ مامون ہیں۔ لاش ان کی والدہ کے حوالے کر دو۔''[4]

---

[1] صحیح مسلم، ح: ٦٦٦٠، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرها

[2] صحیح مسلم، ح: ٦٦٦٠

[3] عروہ بن زبیر رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی اور عظیم محدث تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایات کا بڑا حصہ ان سے منقول ہے۔ صحاح ستہ مع موطا امام مالک میں عروہ رحمہ اللہ کی ١٢٥٩ ایسی روایات ہیں جو ام المؤمنین سے لی گئی ہیں۔ صرف صحیح بخاری میں ایسی ٢٧٧ روایات ہیں۔

[4] انساب الاشراف: ١٣١/٧، ط دار الفکر

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک ماہ بعد تدفین:

عروہ رحمہ اللہ ایک ماہ بعد گھر واپس پہنچے۔ بھائی کی بے گور و کفن نعش اب ان کے حوالے کی گئی۔ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے نماز جنازہ پڑھ کر اپنے قابلِ فخر بھائی کو حجون کے قبرستان میں دفن کر دیا۔[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی قبر سے ایک مدت تک مشک کی خوشبو آتی رہی جو آپ کے برحق ہونے کا کھلا ثبوت تھی۔[2]

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

شرافت و عالی نسبی، جرأت و بسالت، علم و فقاہت اور تقویٰ و معرفت کے اس پیکر کے خاکِ مکہ میں گم ہوتے ہی صحابہ کرام کی سیادت و قیادت کا شاندار دور اختتام پذیر ہو گیا، وہ دور جس پر زمانہ رشک کرتا رہے گا...... وہ دور جس کی ابتداء صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہوئی اور انتہاء انہی کے نواسے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر۔

☆☆☆

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی شہادت پر مسلمانانِ عالم کا رنج و غم:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی الم ناک شہادت پر پورا عالمِ اسلام رنج و غم میں ڈوب گیا، لوگوں نے آنسو بہائے اور شعراء نے اشعار کی صورت میں اپنے دُکھی جذبات کا اظہار کیا۔ نعیم بن مسعود شیبانی نے کہا:

اَلا اِنَّ الدِّیْنَ مِنْ بَعْدِ مُصْعَبٍ　　وَبَعْدَ اَخِیْهِ قَدْ تَنَکَّرَ اَجْمَعُ

''سن لو! مُصعَب اور ان کے بھائی کے بعد دین سارا کا سارا اَجنبی ہو گیا۔''

فَصَمَّتْ الْآذَانَ مِنْ بَعْدِ مُصْعَبٍ　　وَمِنْ بَعْدِ عَبْدِاللّٰهِ وَالْاَنْفُ اَجْدَع

''پس میں نے مُصعَب اور ان کے بھائی عبداللہ کے بعد کان بند کر لیے ہیں اور ناک کٹ چکی ہے۔''

فِیْ کُلِّ عَامٍ مَرَّتَیْنِ عَطَاؤُهٗ　　وَغَیْثٌ لَنَا فِیْهِ مَصِیْفٌ وَمَرْبَعُ

''وہ ایسے جوان مرد تھے کہ ہر سال دو بار عطیات دیتے تھے۔ وہ ایسی بارش تھے کہ اسی میں ہماری خزاں اور بہار تھی۔''

عَلٰی ابْنِ حَوَارِیِّ النَّبِیِّ تَحِیَّةٌ　　مِنَ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ یُعْطِیْ وَیَمْنَعُ

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری کے بیٹے پر اللہ کی طرف سے سلام ہوں کہ اللہ ہی عطا کرتا ہے اور وہی بند کرتا ہے۔''[3]

☆☆☆

---

① انساب الاشراف: ۱۳۱/۷، ط دار الفکر
اس روایت میں یہ ذکر کہ غسل والدہ نے دیا تھا غالباً کسی راوی کا وہم ہے؛ کیوں کہ اوّل تو یہ روایت سنداً ضعیف ہے اور دیگر روایات کے مطابق حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تب تک فوت ہو چکی تھیں۔ پھر دوسرے دیگر بھائیوں اور بیٹوں کے ہوتے ہوئے ضعیف اور نابینا والدہ کو غسل کی زحمت دینا عقلاً بھی بعید ہے۔
لاش کو دفن کرنے کی اجازت دلوانے میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حجاج سے سفارش کا بھی بڑا دخل تھا۔ (اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/ ۳۵۱، ط دار خضر)

② البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۱/۱۲

③ اخبار مکۃ للفاکھی: ۳۵۲/۲؛ تاریخ دمشق: ۲۵۵/۲۸

عمر بن معمر ذہلی نے کہا:

لَعَمْرُکَ مَا اَبْقَیْتُ لِی النَّاسِ حَاجَةً   وَلَا کُنْتُ مَلْبُوْسَ الْهَوٰی مُتَذَبْذَبَا

''تمہاری قسم! میں نے لوگوں کے سامنے کوئی حاجت نہیں رکھی۔ نہ میں نے ہوس کا جامہ پہنا اور نہ متذبذب ہوا۔''

غَدَاةَ دَعَانِیْ مُصْعَبٌ فَاَجَبْتُهٗ   وَقُلْتُ لَهٗ اَهْلاً وَسَهْلاً وَمَرْحَبَا

''اس صبح جب مجھے مُصْعَب نے بلایا تو میں نے فوراً جواب دیا اور کہا: خوش آمدید''

اَبُوْکَ حَوَارِی النَّبِیِّ وَسَیْفُهٗ   وَاَنْتَ بِحَمْدِاللّٰهِ مِنْ خَیْرِنَا اَبَا

''آپ کے والد نبی ﷺ کے حواری اور ان کی شمشیر تھے، آپ اللہ کے فضل سے نسب میں ہم سب سے بہتر ہیں۔''

وَذَاکَ اَخُوْکَ الْمُهْتَدِیْ بِضِیَائِهٖ   بِمَکَّةَ یَدْعُوْنَا دُعَاءً مُثَوِّبَا

''وہ آپ کے بھائی جو حضور ﷺ کی ضیاء سے ہدایت یافتہ ہیں، وہ مکہ میں ہمیں پکارتے جس کا جواب لبیک ہوتا۔''

فَاِنْ یَکُ هٰذَا الدَّهْرُ اَوْدٰی بِمُصْعَبٍ   وَاَصْبَحَ عَبْدُاللّٰهِ شِلْوًا مُلَحَّبَا

''پس اگر اس زمانے نے مُصْعَب کو بھی ہلاک کر دیا اور عبداللہ بن زبیر بھی ٹکڑے ٹکڑے لاش بن گئے۔''

فَکُلُّ امْرِئٍ حَاسٍ مِنَ الْمَوْتِ جُرْعَةً   وَاِنْ حَادَ عَنْهَا جُهْدَهٗ وَتَهَیَّبَا

''تو آدمی کے ذمے ہے کہ موت کا پیالہ پی لے، اگرچہ اس کی کوشش اور ہیبت ضائع ہوگئی ہو۔''[1]

☆☆☆

سُوَید بن منجوف سدوسی نے کہا:

اَلَا قُلْ لِهٰذَا الْعَاذِلِ الْمُتَعَصِّبِ   تَطَاوَلَ هٰذَا اللَّیْلُ بَعْدَ مُصْعَبِ

''سنو! اس ملامت کرنے والے متعصب سے کہہ دو، مُصْعَب کے بعد یہ رات بڑی طویل ہوگئی ہے۔''

وَبَعْدَ اَخِیْهِ عَائِذَ الْبَیْتِ اِنَّنَا   رُمِیْنَا بِجِذْعٍ لِعَرَانِیْنَ مُوْعِبِ

''اس کے بھائی کے بعد جو بیت اللہ کا مکین تھا، ہمیں ایسی ذلت کا نشانہ بنایا گیا جو تمام شرفاء کو حاوی ہوگئی۔''

فَصِرْنَا کَشَاءٍ غَابَ عَنْهَا رِعَائُهَا   مُعَطَّلَةٍ جُنْحَ الظَّلَامِ لِاَذْؤُبِ

''پس ہم بکریوں کے اس ریوڑ جیسے ہو گئے جس کے رکھوالے گم ہوں اور وہ اندھیری شب میں بھیڑیوں کے سامنے کھلا پڑا ہو۔''

فَاِنِّیْ لَبَاکٍ مَا حَیِیْتُ عَلَیْهِمَا   وَمُثْنٍ ثَنَاءً لَسْتُ مِنْهَا بِمُعْتِبِ

''اب میں جب تک زندہ ہوں، ان دونوں پر روتا رہوں گا اور ان کی مدح کرتا رہوں گا۔ اور میں اس سے کبھی باز نہیں آؤں گا۔''

---

[1] تاریخ دمشق: ۲۵۶/۲۸



هُمَا مَا هُمَا كَانَا لِذِي الدِّيْنِ عِصْمَةً ۔۔۔ فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا مِنْ بَقَاءٍ لِمَطْلَبِ

''وہ دونوں جو بھی تھے، دین والوں کی عصمت تھے، پس اب اس کے بعد کیا کوئی مقصد باقی رہ سکے گا۔''

أَرَى الدِّيْنَ وَالدُّنْيَا جَمِيْعاً كَأَنَّمَا ۔۔۔ هَوَتْ بِهِمَا بِالْأَمْسِ عُنْقَاءُ مُغْرِبُ

''میں دیکھ رہا ہوں کہ دین اور دنیا گویا سبھی کچھ..... کل ان دونوں کے ساتھ عنقاء ہو گئے ہیں جو نایاب ہے۔''

فَزَادَهُمَا مِنِّي صَلَاةٌ وَرَحْمَةٌ ۔۔۔ وَحَرَّةٌ ثُكْلٍ دَائِمٍ بِتَنَحُّبِ

''پس میری طرف سے ان کا توشہ دعائے رحمت اور بچھڑنے کی وہ تپش ہے جو آہوں کے ساتھ ہمیشہ رہے گی۔''[1]

☆☆☆

قیس بن ہیثم رضی اللہ عنہ نے جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مُصعَب رحمہ اللہ کے دوست تھے، اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:

فَقَدْنَا مُصْعَبًا وَأَخَاهُ لَمَّا ۔۔۔ نَفَتْ سَمَاءُ هُمَا الْمَحُوْلَا

'' ہم نے مُصعَب اور اس کے بھائی کو کھو دیا...... جب بے مروّت آسمان نے ہی ان کا ساتھ نہ دیا۔''

وَكُنَّا لَا يُرَامُ لَنَا حَرِيْمٌ ۔۔۔ نُسَحِّبُ فِي مَجَالِسِنَا الذُّيُوْلَا

''ہم وہ تھے کہ ہمارے گھر کے متعلق (بُرا) سوچا بھی نہ جاتا تھا۔ ہم اپنی محفل میں چادریں گھسیٹتے پھرتے تھے۔''

إِذَا أَمِنَ الْجَنَابُ وَإِنْ فَزِعْنَا ۔۔۔ رَكِبْنَا الْخَيْلَ وَاجْتَنَبْنَا الشَّلِيْلَا

''یہ تب تھا جب حالات پُرامن ہوتے۔ اور اگر ہم خطرے کی حالت میں ہوتے، تو گھوڑے پر سوار ہو جاتے اور چھوٹی زرہ پہننے کا تکلف بھی نہ کرتے۔''

وَنَرْمِيْ بِالْعَدَاوَةِ مَنْ رَمَانَا ۔۔۔ وَنُوْطِئُهُمْ وَطْأً ثَقِيْلَا

''جو ہمیں نشانہ بناتا ہم بھی اسے دشمنی کا نشانہ بناتے تھے، اور ایسے لوگوں کو بڑے زور سے کچل دیتے تھے۔''

فَيَا لَهْفِيْ وَلَهْفُ أَبِيْ وَأُمِّيْ ۔۔۔ لَقَدْ أَصْبَحْتُ بَعْدَهُمَا ذَلِيْلَا

''ہائے میرا اور میرے والدین کا غم! ان دونوں (مُصعَب اور عبداللہ بن زبیر) کے بعد تو میں ذلیل ہو گیا۔''

وَيَا لَهْفَا عَلٰى مَا فَاتَ مِنِّي ۔۔۔ أَلَا أَصْبَحْتُ فِي الْقَتْلٰى قَتِيْلَا

''اور ہائے افسوس! اس (سعادت) پر جو مجھ سے چھوٹ گئی۔ کاش! میں بھی ان شہداء کے ساتھ شہید ہو جاتا۔''[2]

☆☆☆

---

① اخبار مکۃ للفاکھی: ۳۵۹/۲ ، تاریخ دمشق: ۲۵۷،۲۵۶/۲۸

② تاریخ دمشق: ۲۵۶،۲۵۵/۲۸ ۔

قیس بن ہیثم کو اکثر علماء نے صحابہ میں شمار کیا ہے، اگرچہ ان سے کوئی روایت مروی نہیں ہے۔ امام بخاریؒ سے بھی یہی مروی ہے کہ وہ صحابی تھے۔ علامہ ابن عبدالبر اور ابونعیم اصبہانی نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے انہیں تابعی قرار دیا ہے۔

(الاصابۃ: ۳۸۴/۵ ، الاستیعاب: ۱۳۰۲/۳ ، معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم الاصبہانی: ۲۳۲۳/۴)

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق، حجاج اور اس کا گروہ باغی تھے:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے دور کے برحق خلیفہ تھے اور ان کے خلاف صف آراء شامی امراء بلاشک وشبہ باغی تھے۔ جمہور علماء کا مسلک یہی ہے۔ امام ابن حزم الظاہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مروان نے امیر المومنین عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور خلافت کا دعویٰ کیا۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سیرت ذکر کرنے سے قبل یہ عنوان لگایا ہے:

" ترجمة امیر المؤمنین عبداللّٰه بن زبیر رضی اللّٰه عنه"[2]

پھر لکھتے ہیں: ''ان کی بیعت ۶۴ھ میں مکمل ہوگئی تھی اور لوگوں کو ان کے دور میں خیر نصیب تھی۔''[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تقریباً بیس (۲۰) صفحات میں ان کے مناقب نقل کیے ہیں، اس دوران فرماتے ہیں:

''وہ عالم تھے، عبادت گزار تھے، بارُعب اور باوقار تھے، بکثرتِ صوم وصلوٰۃ کے عادی تھے۔ شدید خشوع والے تھے۔ سیاست میں نہایت مضبوط تھے۔''[4]

آخر میں فرماتے ہیں:

''وہ صفاتِ حمیدہ کے مالک تھے، ان کا حکومت کے لیے کھڑا ہونا اللہ عزوجل کے لیے تھا۔ پھر معاویہ بن یزید کی موت کے بعد تو لامحالہ وہی خلیفہ تھے۔ وہ مروان بن حکم سے بہتر تھے جس نے ان کی خلافت پر اجتماعیت قائم ہونے، ہر سمت ان کی بیعت ہوجانے اور ان کی حکومت مستحکم ہوجانے کے بعد ان سے نزاع کیا۔''[5]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مظلوم تھے۔ حجاج اور اس کے ساتھی ان کے خلاف بغاوت کے مرتکب تھے۔''[6]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے مگر وہ علم، شرف، جہاد اور عبادت میں بہت بڑے تھے۔''

پھر فرماتے ہیں:

'' وہ اپنے زمانہ میں قریش کے شہ سوار تھے اور ان کے جنگی کارنامے مشہور ہیں۔''[7]

---

① "قام علیٰ امیر المؤمنین عبداللہ بن الزبیر وادعی الخلافة."(جمهرة انساب العرب لابن حزم،ص ۸۷)

② البدایة والنهایة: ۱۲/۱۸۶

③ البدایة والنهایة: ۱۲/۱۸۷، ط دار هجر

④ البدایة والنهایة: ۱۲/۲۰۳

⑤ البدایة والنهایة: ۱۲/۲۰۶

⑥ شرح مسلم للنووی، ح: ۲۵۴۵

⑦ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۶۳،۳۶۴

حجاج کا اہل مکہ سے خطاب:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اہلِ مکہ کا رنج وغم سے برا حال تھا۔ حجاج کو ان کا شہید سے یہ تعلق برداشت نہ ہو سکا۔ زورِ خطابت اور چرب زبانی سے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور جلسۂ عام منعقد کر کے کہا:

''مکہ والو! معلوم ہوا ہے ابن زبیر کی موت پر تم رنجیدہ ہو۔ مانا کہ وہ امت کا نیک فرد تھا مگر پھر اس نے خلافت کا لالچ کر کے اور اہلِ خلافت سے لڑکر اللہ کی اطاعت کا راستہ چھوڑ دیا تھا۔ آدم جیسا افضل جسے ملائکہ نے سجدہ کیا اور جو جنت کا باسی تھا، وہ اللہ کی نافرمانی کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا تو سوچو! عبداللہ بن زبیر آدم سے افضل تو نہیں تھا۔ اس نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا تھا۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حاضرین میں موجود تھے، یہ خرافات برداشت نہ کر سکے اور باآواز بلند بول اٹھے:

''تم نے جھوٹ کہا، جھوٹ کہا، جھوٹ کہا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کتاب اللہ کو نہیں بدلا، ایسا وہ کر سکتے تھے نہ تم۔[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تو قرآن پر عمل پیرا تھے، حق پر عمل کرنے والے تھے۔''[2]

حجاج بھنا کر بولا: ''چپ ہو جاؤ۔ تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ تمہارا دماغ چلا گیا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں گرفتار کر کے گردن اڑا دی جائے، تمہاری لاش گھسیٹی جائے اور بچے اس کا تماشا دیکھیں۔''[3]

☆☆☆

---

① طبقات ابن سعد: ۱۸۳/۴، باسناد صحیح، ط صادر

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۸۵/۱۲

③ طبقات ابن سعد: ۱۸۳/۴، باسناد صحیح، ط صادر

الاسناد: محمد بن سعد قال اخبرنا مسلم بن ابراهیم، قال حدثنا الاسود بن شیبان، قال حدثنا خالد بن سمیر

احوالِ رواۃ:

- **خالد بن سمیر:** ابوداؤد اور نسائی کے راوی: قال النسائی ثقة، وذکره ابن حبان فی الثقات. (تهذیب الکمال: ۹۰/۸)
- **الاسود بن شیبان:** مسلم، ابوداؤد، نسائی کے راوی، م ۱۶۰ھ قال یحییٰ بن معین: ثقة. وقال ابوحاتم: صالح الحدیث. (تهذیب الکمال: ۲۲۵/۳)
- **مسلم بن ابراهیم:** بخاری و مسلم کے راوی (م ۲۲۱ھ) قال یحییٰ بن معین: ثقة مامون. (تهذیب الکمال: ۴۹۰/۲۷)

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور پر ایک نظر

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا عہدِ حکومت تاریخ صحابہ کا آخری باب تھا۔ اس پونے نو سالہ دور میں تعمیری وترقیاتی کام زیادہ نہ ہو سکے۔ البتہ خانہ کعبہ کو بنیادِ ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرنا ان کا مشہور اور یادگار کارنامہ ہے۔

عظیم کارنامہ: بنیادِ ابراہیمی پر تعمیر کعبہ:

مکہ کے پہلے محاصرے میں جو یزید کے دور میں شروع ہوا تھا، منجنیقوں کی سنگ باری اور پھر آتش زدگی نے کعبہ کو خستہ و شکستہ کر دیا تھا۔ مسندِ خلافت سنبھالتے ہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ضروری سمجھا کہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ انہوں نے اپنی خالہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو بنیادِ ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا یعنی حطیم کا حصہ جو قریش نے کعبہ سے باہر چھوڑ دیا تھا، اسے کعبہ کی چار دیواری کے اندر لے لیا جائے۔ اس کے علاوہ قریش نے بابِ کعبہ کو اونچا کر دیا تھا تاکہ صرف معزز لوگ اندر جا سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ کعبہ میں داخلہ سب کے لیے آسان ہو، سطحِ زمین کے ساتھ کعبہ کے دو دروازے ہوں۔ لوگ ایک سے داخل ہوں دوسرے سے نکل جائیں اور سب کو کعبہ کی برکات نصیب ہوں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارادے پر عمل اس لیے نہیں کیا کہ نو مسلم قریشی کعبہ کی توڑ پھوڑ سے کسی غلط فہمی یا بد اعتقادی کا شکار نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''تمہاری قوم نو مسلم نہ ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے ابراہیمی نقشے کے مطابق تعمیر کراتا۔''[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسی حدیثِ نبوی کے مطابق کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ حطیم کو چار دیواری میں لے آئے۔ دروازے دو رکھے اور وہ بھی زمین کے برابر۔[2]

کاش! آپ رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ زندہ و تابندہ رہتا مگر مکہ کی دوسری جنگ میں شامی فوج کی سنگ باری نے کعبہ کو دوبارہ شکستہ کر دیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر جب عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو حجاز کا گورنر بنایا تو اس نے کعبہ کی تعمیر میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ترمیم کا حال عبدالملک کو لکھ بھیجا۔ اس نے جواب میں لکھا: ''ہمیں ابن زبیر کے شر سے کوئی تعلق نہیں۔''

چنانچہ عبدالملک کے حکم کے مطابق حجاج بن یوسف نے خستہ حال کعبہ کو منہدم کرا کے دوبارہ قریش کے نقشے کے مطابق بنوا دیا۔ تب سے آج تک کعبہ اسی نقشے کے مطابق قائم چلا آ رہا ہے۔[3]

---

① صحیح مسلم، ح: ۳۳۰۸، ۳۳۱۰، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ

② صحیح البخاری، ح: ۱۲۶، کتاب العلم ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۶۹۲

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے کعبہ شریف کو ریشمی غلاف پہنایا۔ ان کے حکم سے بیت اللہ کو اس قدر خوشبو لگائی جاتی تھی کہ پورا حرم مہک اٹھتا تھا۔[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ایک یادگار اقدام یہ بھی تھا کہ انہوں نے اسلام کی تاریخ میں پہلی بار مکہ کو دارالخلافہ بنایا اور یوں مذہبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اسے سیاسی اہمیت بھی بخشی۔ ان سے پہلے کسی نے مکہ کو پایہ تخت بنایا تھا نہ بعد میں۔ اگرچہ اس اقدام سے انہیں نقصانات ہوئے مگر انہوں نے حرم کے لیے سیاسی مرکز کا اعزاز برقرار رکھا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر بخل کے الزام کی حقیقت:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ انداز جہاں داری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں مقرب لوگوں کو نوازنے اور امراء پر عطیات کی بارش کرنے کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ اگرچہ وہ ذاتی طور پر بہت مال دار تھے مگر ذاتی رقم ہو یا سرکاری، وہ اسے نچلی سطح پر خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ عوام کو پہنچانے کے قائل تھے۔ آپ کی اس مالی احتیاط کو مخالفین نے بخل کا نام دیا اور اس بارے میں طرح طرح کے قصے کہانیوں کو مشہور کر دیا جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگرچہ بعض مؤرخین نے ان روایات کو نقل کر دیا ہے مگر ان کا ضعیف و مشکوک ہونا ظاہر ہے۔ مثلاً منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بخل کی مذمت کیا کرتے تھے۔[2] ان روایتوں کے بعض راوی مثلاً لیث بن ابی سلیم ضعیف و متروک ہیں۔ بعض روایات میں مناسب تاویل کی گنجائش ہے۔

اسی طرح بعض شعراء کے اشعار میں اس جلیل القدر صحابی کی ہجو کرتے ہوئے ان کو کنجوس قرار دیا گیا ہے۔[3] مگر ظاہر ہے شعراء تو کسی کو بھی نہیں بخشتے، ان کی ہجو سے اُمت کے بہترین لوگ بھی محفوظ نہیں تھے۔

ایسی ضعیف، متروک اور بے سند روایات کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سخاوت پر شعراء کا خراج تحسین بھی موجود ہے۔ قحط سالی میں نابغہ بن جَعدہ شاعر نے آ کر فریاد کی تو آپ نے سات اونٹنیاں اور ایک اونٹ اور اجناس میں گندم، جو، کھجور اور کپڑے دے کر رخصت کیا۔[4] ایک سفر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے مفلسی کی فریاد کی۔ انہوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا جو سفر میں ہمراہ تھے۔ انہوں نے اسے مالا مال کر دیا۔[5]

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص نے کسی سخی کی تعریف میں اشعار پڑھے تو انہوں نے فرمایا:

''یہ تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی ہو سکتے ہیں۔''[6]

۷۰ھ میں ان کے بھائی مُصعَب رحمہ اللہ نے ۲۰ ہزار بکریاں اور ایک ہزار اونٹ قربان کر کے اہلِ حجاز میں تقسیم کیے۔ ظاہر ہے یہ اہتمام عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سرپرستی ہی میں ہوا تھا جس سے اہلِ مکہ بہت خوش ہوئے۔[7]

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۲۳۳/۵

② تاریخ الاسلام للذھبی: ۴۴۴/۵، ت تدمری

③ انساب الاشراف: ۱۴۰/۷، ط دار الفکر

④ تاریخ دمشق: ۱۹۲/۲۸

⑤ تاریخ دمشق: ۱۹۳/۲۸

⑥ تاریخ دمشق: ۱۹۳/۲۸

⑦ البدایة والنهایة: ۱۳۰/۱۲؛ تاریخ الطبری: ۱۵۰/۶

خلافتِ زبیریہ کے سقوط کے اسباب:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت آٹھ سال دس ماہ قائم رہی۔ اس کے سقوط کے پس پردہ، اللہ کی مشیت کے بعد کچھ ظاہری اسباب بھی نظر آتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

① عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا دور فتنوں سے بھرپور تھا۔ خوارج، مختار ثقفی اور ان سے بڑھ کر اہلِ شام ان کے سخت مخالف تھے۔ خلافتِ زبیریہ کی ساری توانائی اور قوت بیک وقت ان حریفوں سے نمٹنے میں صرف ہوتی رہی۔

② اس دور کی سیاست قبائل کے امراء کو خوش کرنے اور ان کا دل جیتنے کے ساتھ چلا کرتی تھی۔ خلافتِ زبیریہ کے مخالفین اس مد میں کھلا خرچ کرتے تھے۔ مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیاست برت رہے تھے جسے اس دور کے سیاسی زعماء ناپسند کرتے تھے۔ اس کی بجائے انہیں اہلِ شام کی لین دین پر مبنی سیاست مرغوب تھی۔

③ مرکزِ خلافت کا صوبوں سے مربوط تعلق نہ تھا بلکہ صوبہ دار اپنے معاملات خود طے کرتے تھے۔ خاص مواقع کے سوا مرکز سے ہدایات کم جاری ہوتی تھیں۔ خودمختاری کے اس ماحول میں امراء کے لیے آسان تر تھا کہ جب حریف کا دباؤ بڑھے یا پرکشش مراعات ملیں تو اس کی صف میں چلے جائیں۔

④ مرکز سے صوبوں کو فوجی کمک میسر نہیں آتی تھی بلکہ خود مرکز کو قدم قدم پر عراق سے کمک منگوانا پڑتی تھی۔ حجاز کبھی بھی ایسا پیداواری خطہ نہیں رہا کہ یہاں پندرہ بیس ہزار سپاہی بھی رکھے جاسکتے۔ اگر رکھے جاتے تو خوراک کے ذخائر کم پڑ جاتے اور رسد کے قافلے روز منگوانا پڑتے۔ اس لیے آخری حملے تک مکہ میں حفاظت کے لیے کوئی بڑی فوج تھی نہ مدینہ میں۔ خلافتِ زبیریہ کی چھاؤنیاں عراق میں تھیں جس کے سرنگوں ہوتے ہی حجاز بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

⑤ مرکز کے دونوں اہم شہروں: مکہ اور مدینہ کی کوئی فصیل تھی نہ قلعہ۔ اس لیے جب بھی دشمن حملہ کرتا مزاحمت مشکل تر ہوتی۔

⑥ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مرکزِ خلافت مکہ باقی عالمِ اسلام سے الگ تھلگ تھا جس کی وجہ سے یہاں نقل وحمل، خوراک ورسد، مواصلات واطلاعات وخبر رسانی سمیت تمام امور دیر سے انجام پاتے تھے۔ حریف یہی کام جلد کر کے سبقت لے جاتے تھے۔

⑦ بنو ہاشم کے بعض بزرگوں مثلاً: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے آپ رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی تھی اور اس تمام مدت میں غیر جانب دار رہے تھے۔ اس سے بھی آپ کی مقبولیت کو نقصان پہنچا اور حامیوں میں کمی ہوئی۔

⑧ عراق میں مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی مہمات کے دوران مختار اور اس کے بکثرت مرید قتل ہوئے۔ اس کے ردِعمل میں وہاں اندرونی طور پر ایک نیا مخالف گروہ تیار ہوگیا جس نے عین میدانِ جنگ میں دھوکا دے کر مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کو شہید کرایا اور پھر یہی لوگ عبدالملک کے دست وبازو بن گئے۔

⑨ خلافتِ زبیریہ نے شام کی باغیانہ حکومت سے صرف دفاع پر اکتفا کیا، اس کے خاتمے کو اہم ہدف نہیں بنایا بلکہ شام کی سرحدوں کا احترام کیا، وہاں کبھی کوئی عسکری کارروائی کی نہ اندرونی طور پر شام میں کوئی بغاوت کرائی۔ جبکہ اہلِ

شام، خلافتِ زبیریہ کے خاتمے پر تُلے رہے اور اسے ہر طرح سے نقصان پہنچاتے رہے۔

⑩ خلافتِ زبیریہ نے اپنی دعوت کو عام کرنے کے لیے کوئی نظام نہیں بنایا۔ ذرائع ابلاغ، داعیوں، شاعروں اور خفیہ نمائندوں کے ذریعے پورے عالمِ اسلام میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی گئی تھی۔ اگرچہ اس خلافت کو اس کے بغیر ہی مقبولیت حاصل تھی مگر جب حریف اس دور کے ذرائع ابلاغ استعمال کر کے خلافتِ زبیریہ کے خلاف ذہن سازی کرنے لگا تو بہت سے لوگ حریف کے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر رہ گئے۔

⑪ شامی حریف بہت منصوبہ ساز اور سیاست کے ماہر تھے۔ فیصلے دل سے نہیں، دماغ سے کرتے تھے۔ جنگی نظام میں بھی ماہر تھے۔ ان کے جرنیل بھی بڑے تجربہ کار تھے۔ اِدھر منصوبہ سازی کی کمی تھی۔ فیصلے دل کے ہوتے تھے۔ جنگی نظام بھی حریف کی بہ نسبت کمزور تھا اور جرنیل اتنے تجربہ کار نہیں تھے۔ اگرچہ علماء، صالحین، اولیاء اور نیکوکار لوگوں کی اکثریت دلی طور پر خلافتِ زبیریہ کی حامی تھی مگر کش مکش کے وقت صرف ان کی دعائیں کام نہیں آسکتی تھیں۔

⑫ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا اپنا اندازِ سیاست یہ تھا کہ بہترین عملی نمونہ پیش کیا جائے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی تگ و دو نہ کی جائے۔ جو لوگ اپنی خوشی سے ساتھ دیں انہیں استغناء کے ساتھ قبول کیا جائے۔ جو پس و پیش کریں ان سے واسطہ نہ رکھا جائے۔ مگر اس طرزِ عمل کے دائرے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ جیسی شخصیات بھی آجاتی تھیں جو برسوں سے خلفاء اور حکام کی طرف سے دل داری اور اعزاز و اکرام کے عادی رہے تھے۔ چنانچہ بعض ایسی ہستیاں جن کا اعزاز و اکرام کر کے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خاطر خواہ حمایت مل سکتی تھی اس طرزِ سیاست کی وجہ سے قریب نہ آسکیں۔

اُمت کا قابلِ فخر سرمایہ:

فتح و شکست کے عارضی مناظر سے قطعِ نظر کرتے ہوئے، یہ حقیقت اپنی جگہ طے ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی مُصعَب بن زبیر رحمہ اللہ کی سیرت اُمتِ مسلمہ کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔ ان کے حالات پڑھ کر آج بھی رگوں میں ایمانی لہو جوش مارتا ہے اور آنکھیں نم ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔

ان حضرات نے اولوالعزمی، ہمت و بسالت اور قربانی و جانثاری کے ذریعے خانوادۂ صدیقی کی ایسی لاج رکھی کہ ان شاء اللہ بروزِ حشر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت صَفِیّہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ان سپوتوں پر ناز ہوگا۔ کیا ہی کمال کی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں جہاں دیگر بے شمار پہلو مماثل تھے، وہاں دونوں کے نواسے بھی ایک جیسے تھے۔ ہمت میں بھی، جدوجہد میں بھی اور شہادت میں بھی۔ ان کی زندگی بھی ایک جیسی تھی اور موت بھی۔

اللہ تعالیٰ اُمت کے ان محسنوں پر تاقیامت لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

☆☆☆

عہدِ صحابہ اور بعد کی سیاست کا موازنہ

خلافتِ زبیریہ کے خاتمے پر جو درحقیقت صحابہ کرام کی قیادت کے مبارک دور کا اختتام تھا، ہم ذرا رک کر گزشتہ چالیس برس کے حالات کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔ تاریخ کا یہ دور ۳۴ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش سے شروع ہوا اور ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہوا۔

چوں کہ اس دور کی سیاست میں صحابہ کرام کا اہم کردار تھا اس لیے یہ تاریخ، عقیدے اور نظریے کی تاریخ بن جاتی ہے۔ اسے عام اَدوار کی طرح سرسری نہیں سمجھا جاسکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس دور کے واقعات نقل کرنے کے لیے محدثین کے طرز پر تحقیق اور چھان بین کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ الحمدللہ! ہم نے تاریخ کا یہ نازک اور اہم حصہ قواعدِ محدثین کا لحاظ رکھتے ہوئے پوری احتیاط سے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس مطالعے کے نتیجے میں جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے عبرت ونصیحت کے کئی پہلو روشن ہوتے ہیں اور غور وفکر کے کئے دروازے کھلتے ہیں۔

اس چالیس سالہ زمانے میں ہمیں پانچ حکمران صحابہ، یعنی: حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسن بن علی، حضرت امیر مُعاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم مختلف ادوار میں مسلمانوں کی قیادت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان حضرات کا طرزِ سیاست، مختلف اوقات میں ان کے فیصلے، حالات سے نبرد آزما ہونے میں ان کی حکمت عملی، غیر منصوص سیاسی مسائل کے لیے ان کی فقاہت اور قوتِ استنباط، مخالفین سے معاملات میں ان کی حزم واحتیاط، یہ تمام چیزیں ہمارے لیے رہنما قواعد وضوابط مہیا کرتی ہیں۔ بعد کے فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے قرآن وحدیث کے بعد صحابہ کرام کے انہی آثار کو سامنے رکھتے ہوئے شرعی مسائل خصوصاً سیاستِ اسلامیہ کے آداب اور اصول مرتب کیے ہیں۔ مسلمانوں نے جب بھی ان آداب اور اقدار کی پیروی کی وہ دنیا میں سربلند رہے۔

اسلام امن وسلامتی، قومی فلاح اور ترقی وخوشحالی کا ضامن ہے۔ مسلمان جب بھی اجتماعی طور پر کسی بحران کا شکار ہوئے ہیں، اس کے پیچھے اسلامی تعلیمات اور صحابہ کرام کی سیرت سے عمومی انحراف کا بہت بڑا دخل تھا۔ کوئی مرض کسی سبب کے بغیر پیدا نہیں ہوتا اور جب تغیر یا نقصان عمومی ہو تو سبب بھی اسی درجے کا ہوگا۔

اپنی تاریخ میں جگہ جگہ مسلمانوں کے حالات ابتر دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ نعوذ باللہ اسلام میں کوئی کمی ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ کمی اس اجتماعی شعور یا رائے عامہ میں ہوتی ہے جسے تمام مسلمان یا ان کے بعض گروہ اختیار کر چکے ہوتے ہیں یا کمزوری قیادت کے اس فیصلے میں ہوتی ہے جس میں اسلامی تعلیمات سے شعوری یا نادانستہ انحراف کے علاوہ بھی

تجربے اور بصیرت کے لحاظ سے کچھ رخنہ رہ جاتا ہے، جسے ہم سیاسی غلطی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

دورِ صحابہ کے بعد بھی ایک طویل مدت تک ہم بیشتر مسلم حکمرانوں کو پابندِ صوم وصلوٰۃ دیکھ سکتے ہیں۔ مگران میں سے کئی بڑے حکمرانوں خصوصاً حکومتوں کے بانیوں کی زندگیاں عموماً دو حصوں میں بٹی دکھائی دیتی ہیں: اقتدار سنبھالنے سے پہلے اور اقتدار سنبھالنے کے بعد۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد اکثر نامور حکمران قوم کے خیر خواہ ثابت ہوتے رہے۔ مگر حصولِ اقتدار کے مرحلے میں ہم اکثر و بیشتر طالع آزماؤں کو ہر طرح کی زیادتی پر کمربستہ دیکھتے ہیں۔

یہ دورِ صحابہ کے بعد کے حکام کا عمومی رجحان تھا جبکہ بعض حکمرانوں کی زندگیاں اس کے برعکس تھیں، یعنی حکمرانی سے پہلے ان کی شہرت اتنی بُری نہ تھی مگر مسندِ اقتدار پر آ کر انہوں نے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اور مظالم کے مرتکب ہوئے جیسے یزید بن معاویہ۔ مگر ایسی مثالیں کم ہیں۔

اکثر ہمیں سیاسی غلطیوں اور مظالم کا سلسلہ انتقالِ اقتدار کے مرحلے میں دکھائی دیتا ہے۔

ایسے میں لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام نے انتقالِ اقتدار کے نازک مرحلے کو طے کرنے کے لیے کوئی حل پیش کیا تھا یا نہیں؟ اگر کیا تھا تو اُمت نے اس سے کس حد تک فائدہ اٹھایا اور آئندہ کس قدر اٹھا سکتی ہے؟

اصولِ استیناس: رضا و رغبت:

غور کریں تو اسلامی تعلیمات میں ہمیں ایک بہت اہم اصول واضح دکھائی دیتا ہے جو ''انتقالِ اقتدار'' کے مرحلے کو لاحق اَن گنت فتنوں اور آفتوں کو دور کر دیتا ہے۔ یہ اصول ہے ''استیناس'' یعنی لوگوں کو مانوس کر کے ان کی رضا و رغبت کے ساتھ ان کی امامت وقیادت کے معاملات طے کرنا۔

''استیناس'' اس لیے ضروری ہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں بد دلی، شکوہ وشکایت، انتشار اور افتراق پیدا ہوگا جو کسی بھی قوم، معاشرے اور ادارے کے لیے نہایت مہلک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی امامت بھی سب سے زیادہ عالم اور قاری کو سونپنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر اس صفت میں کئی لوگ برابر ہوں تو زیادہ پرہیزگار کو یہ موقع دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اگر ان صفات میں کئی لوگ برابر ہوں تو پھر سب سے عمر رسیدہ کو آگے کرنے کا حکم ہے۔

نماز کی امامت کا مسئلہ طے کرنے میں اس قدر باریک بینی کیوں برتی گئی؟ تاکہ اجتماعی عبادت حاضرین کے ''استیناس'' اور اطمینانِ قلبی کے ساتھ ہو، نفرت وکدورت کا ماحول نہ ہو، افتراق نہ پھیلے اور یہی وجہ ہے کہ مقتدیوں کی رضا و رغبت کے خلاف امامت کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہی رمز ہے کہ خود امارت اور عہدے طلب کرنے کی مذمت کی گئی ہے؛ کیوں کہ جب ایک منصب کے طلب گار کئی لوگ ہوں گے تو یقیناً دلوں میں کدورت، نفرت، اور پھوٹ پیدا ہوگی۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ نے قبائل کے اسلام لانے پر اکثر و بیشتر انہی کے سابقہ سرداروں کو امیر برقرار رکھا کیوں کہ لوگ انہی سے مانوس اور مطمئن تھے۔ یہی راز تھا کہ آپ ﷺ نے ''اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ.'' (حکام قریش سے ہوں گے) کا فرمان سنایا؛ کیوں کہ عربوں میں سب سے محترم قبیلہ یہی تھا اور مجموعی طور پر جزیرۃ العرب کا معاشرہ

انہی کی سیادت سے مانوس تھا لہٰذا اُس دور میں انہی کی قیادت سب کے "استیناس" اور اتحاد کے باعث بن سکتی تھی۔

شورائیت:

اسلامی سیاست کا دوسرا اہم ترین ستون شورائیت ہے کیوں کہ اکثر و بیشتر حالات میں "استیناس" اسی پر منحصر ہوتا ہے۔ پس استیناس کے لیے شورائیت لازمی ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ ہمیشہ صحابہ کرام سے مشورہ کرتے رہے اور اس کی قولی ہی نہیں عملی تعلیم بھی دیتے رہے۔ اسلام سے پہلے "حصولِ اقتدار" اور "انتقالِ اقتدار" کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی بزورِ شمشیر حکومت بنانا اور چلانا۔ اگر کوئی حکمران بنتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کا گروہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے چاہے کردار و اخلاق کے لحاظ سے وہ کیسا ہی ہوتا۔ اس لیے وہ اکثر و بیشتر اپنی من مانی کرتا تھا۔

خلافتِ راشدہ میں:

اسلام نے اس فرسودہ طرز کو ختم کر کے ایسا نظامِ سیاست اور ایسا عمومی شعور بخشا کہ لوگ گفتگو اور مشاورت کے ذریعے موزوں ترین شخص کو امام بناتے رہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کسی عسکری قوت، کسی جبر و تشدد اور کسی خانہ جنگی کے بغیر صرف ایک مجلس میں بحث کے بعد خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے شوریٰ میں کوئی بحث نہیں ہوئی مگر ان کا قیادت کے لیے اہل ترین فرد ہونا اتنا واضح تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی تردد کے بغیر انہی کو جانشین مقرر کیا اور کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔ یہ مسلمانوں کے سیاسی شعور کا نقطۂ عروج تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مقام و مرتبے میں قریب قریب معلوم ہوتے تھے۔ ان دونوں کی اپنی کسی کوشش کے بغیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے اہل چھ بہترین آدمیوں میں ان کے نام سرفہرست رکھے اور امت کو خصوصی رائے شماری کا طریقہ بتایا۔ بعد میں شہریوں سے عمومی رائے بھی لی گئی اور اُمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر متفق ہوگئی۔ کوئی خانہ جنگی نہ ہوئی۔

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی مسلمانوں نے باہمی مشورے سے خلیفہ مقرر کر لیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو جانشین نہیں بنایا مگر عراق کے اہلِ حل وعقد نے انہی کو منتخب کیا۔

امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی مگر سیاسی اختلاف اور جنگ کے باوجود ایک بااصول حزبِ مخالف کا نمونہ پیش کیا۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت آئی تو انہوں نے امت کو خونریزی سے بچانے کے لیے امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سونپ دی اور یوں انتقالِ اقتدار پرامن طریقے سے ہی ہوا۔

شورائیت سے شخصی حکومت تک سفر:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا دور اسلامی فتوحات، عدل وانصاف اور تعمیر و ترقی کے لحاظ سے قابلِ رشک تھا مگر خلافتِ راشدہ کی بہ نسبت کچھ تغیرات بھی اسی دور میں رونما ہونے لگے تھے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد آنے والی تبدیلیاں یکدم اور بلاسبب نہ تھیں بلکہ گزشتہ حوادث کے ماحول میں اس کی دھیرے دھیرے آب یاری ہوئی تھی۔ جب شام میں



تحریکِ قصاصِ عثمان نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف آواز اٹھائی تو اموی شرفاء اس کی صفِ اول میں تھے کیوں کہ مقتول خلیفہ کے اموی ہونے کی حیثیت سے یہ حضرات خود کو ان کا وارث اور مقدمہ قتل کا مدعی قرار دیتے تھے۔

تحریکِ قصاص کے علمبردار حضرات کے نیک نیت، مخلص، مجتہد اور مغفور و ماجور ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مگر یہ بھی ایک فطری اصول ہے کہ سیاسی غلطیاں کبھی بانجھ نہیں ہوتیں، بالخصوص جب نوبت جنگ تک پہنچ جائے، تو اس کے اثرات بہت دور تک مرتب ہوتے ہیں۔ جنگِ صفین سے ماقبل اور مابعد شامیوں میں اہلِ عراق وحجاز کے خلاف جو تعصب پھیلا اور شر پسند عناصر نے اسے جس طرح منظم انداز میں پھیلایا، وہ رنگ لا کر رہا جس کی وجہ سے بنوامیہ کے شدت پسند لوگوں میں بنوہاشم کے خلاف منفی جذبات عام ہو گئے۔ اسی قسم کا ردعمل عراقیوں میں بھی ہوا اور ان کے بہت سے لوگوں نے بنوامیہ کو بلا استثناء بنوہاشم کا دشمن سمجھ لیا۔ یہ بھی ایک انتہا پسندانہ سوچ تھی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اقتدار سے دست برداری کو جہاں اکثر مسلمانوں نے قربانی اور ایثار کا اعلیٰ نمونہ تصور کیا، وہاں شام کے ایک طبقے نے اسے اپنی شمشیروں کا خراج تصور کر کے حکومت کو اپنا حتمی حق سمجھ لیا۔ یقیناً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت وقرابت کی وجہ سے تمام مسلمانوں کی طرح بنوامیہ کے اکثر شرفاء بھی بنوہاشم کی عزت وتوقیر کرتے تھے اور وہ ان سے رشتے ناطے اور مالی عطیات کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس عزت واحترام کے باوجود بنوہاشم میدانِ سیاست سے باہر رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی گوشہ نشینی کے بعد تقریباً ۹۲ سال تک کوئی ہاشمی عظیم الشان اسلامی سلطنت کے کسی حصے کی صوبہ داری یا کسی اور اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہوا۔ اگرچہ بنوہاشم نے خود بھی عہدوں کی حرص نہیں کی بلکہ پورے استغناء کے ساتھ عزلت نشین رہے، ان میں سے بعض کوئی عہدہ لیے بغیر اموی پرچموں تلے جہاد کرتے رہے مگر اموی خلفاء نے بھی انہیں بااختیار دیکھنا سیاسی مصالح کے خلاف سمجھا۔ اس صورتحال نے شورائیت واستیناس کا دائرہ تنگ کر دیا۔ ان صوبوں میں جو خانہ جنگی کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامی یا غیر جانبدار تھے، اکثر وبیشتر اموی خاندان یا عثمانی تحریک کے سرکردہ افراد ہی کو تعینات کیا جاتا رہا تاکہ حکومتی گرفت مضبوط رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ عہدوں پر اشرافِ اُمت کا ایک مخصوص طبقہ آگے آتا چلا گیا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مجبوریاں:

عام طور پر لوگ اس معاملے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو قصوروار ٹھہراتے ہیں حالاں کہ اس دور کے حالات، حوادثِ گزشتہ کے پس منظر اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مجبوریوں پر بھی غور کرنا چاہیے۔ صفین کی جنگ میں اہلِ شام کے تیس چالیس ہزار افراد کام آئے تھے۔ ان مقتولین کے تیس چالیس ہزار گھرانوں کے افراد کو شمار کیا جائے تو وہ لاکھوں بنتے ہیں۔ اہلِ عراق سے سیاسی صلح کے باوجود، معاشرے کی نچلی سطح پر دو عشرے قبل کی اس جنگ کے زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ جنگ سے پہلے کی تحریکِ قصاص اور جنگ کے بعد کی جھڑپوں اور کشیدگی کے ماحول نے عراق میں ہاشمی اور شام میں اموی عصبیت کو جگا دیا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح اور حکومت سے دست برداری کے

باوجود اہلِ عراق کا ایک طبقہ دوبارہ ہاشمی خلافت کے احیاء کا متمنی تھا۔ ایسے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بنو ہاشم کی سیاست سے لاتعلقی ہی کو اُمت کے لیے بہتر سمجھتے تھے تاکہ دوبارہ کسی خانہ جنگی کا خطرہ نہ رہے۔ نیز ان حالات میں انہیں عثمانی تحریک کے رہنماؤں یا بنوامیہ ہی پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا، کیوں کہ ان کی حکومت انہی کی سرفروشی اور جانثاری کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جب انقلاب کے ذریعے کوئی جماعت کو چہ اقتدار میں آتی ہے تو ملک کا نظم ونسق انقلابی رہنماؤں اور صفِ اول کے کارکنوں ہی کے ہاتھوں میں آتا ہے۔ قصاصِ عثمان کی تحریک جو بنیادی طور پر حصولِ انصاف کا ہدف لے کر کھڑی ہوئی تھی، اس نے اہلِ عراق کے خلاف ایک انقلابی جماعت کا کردار ادا کیا۔ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس انقلابی جماعت کی نیک نیتی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہلیت کو دیکھتے ہوئے اُمت کو خونریزی سے بچانے کی خاطر مستعفی ہوگئے تو خود بخود اقتدار انقلابیوں کی صفِ اول کو منتقل ہوگیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اسی صف اول سے کام لینے پر مجبور تھے۔ یہی تھے جنہیں بہرحال حکومت کا وفادار یقین کیا جاسکتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حکومت سنبھالتے ہی کوفہ میں مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ اور مصر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو گورنر بنایا۔ یہ دونوں حضرات اموی نہیں بلکہ عثمانی تحریک کے قائدین تھے۔ بصرہ میں تعینات کیے گئے عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی اسی تحریک کے رہنما اور بنوامیہ کی بالائی پیڑھی بنوعبدشمس سے تعلق رکھتے تھے۔ حجاز میں پہلے مروان بن الحکم کا اور ۴۸ھ میں سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا گیا۔ یہ دونوں اموی تھے۔ ۵۴ھ میں دوبارہ مروان کا تقرر کر دیا گیا۔ ۵۷ھ میں اس کی جگہ ایک اور اموی امیر ولید بن عتبہ کا تقرر ہوا جو یزید کے دور تک اسی عہدے پر رہا۔

۵۰ھ میں مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ شریک بھائی زیاد کو پورے عراق کی حکومت دے دی۔ اپنی موت تک وہ اس عہدے پر رہا۔ ۵۳ھ میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے بیٹے عبیداللہ کو خراسان کا گورنر بنا دیا گیا۔ ۵۵ھ میں عبیداللہ بن زیاد کو خراسان سے ہٹا کر بصرہ کا گورنر بنا دیا گیا اور خراسان کی گورنری سعید بن عثمان کو دے دی گئی، وہ بھی اموی تھے۔ جبکہ کوفہ کے حکام تبدیل ہوتے رہے۔[1]

ان منصب داروں کی قابلیت پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے اکثر نیک سیرت، متقی، عالم فاضل اور مجاہد تھے۔ ان میں بڑی تعداد صغار صحابہ یا کبارِ تابعین کی تھی بلکہ مُغیرَہ بن شُعبَہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسے اکابر صحابہ بھی اپنی وفات تک ان گورنروں میں شامل رہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مرکزی عہدوں میں واضح نمائندگی بنوامیہ یا عثمانی تحریک کے سرکردہ حضرات کی تھی۔ اس صورتحال نے کچھ مدت بعد بنوامیہ کی خالص خاندانی حکومت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عبث اور لاحاصل ہے۔ لیکن اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا مجبوریوں پر غور کیا جائے تو انہیں معذور سمجھا جاسکتا ہے۔

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۳ تا ۲۲۵
اگرچہ دیگر صوبوں میں دوسروں کو بھی اعلیٰ مناصب ملتے رہے بلکہ متوسط عہدوں پر تو اکثر دیگر قبائل کے افراد ہی کو نمائندگی دی گئی تھی۔



اسی قسم کی مجبوریوں کی وجہ سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایسے امراء اور حاشیہ بردار بھی ناگزیر طور پر شامل تھے جو بنو ہاشم کی مقبولیت و محبوبیت کو اموی اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی مجلس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع دی تو ایک شخص نے بے ساختہ کہا:

''جَمْرَةٌ اَطْفَأَهَا اللّٰه.'' (وہ تو ایک چنگاری تھی جسے اللہ نے بجھا دیا۔)''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اُمتِ مسلمہ کے لیے رجالِ کار کی ایک بہت بڑی جماعت چھوڑ کر گئے تھے جن میں صحابہ کرام بھی تھے اور تابعین بھی۔ ان میں سپہ سالار بھی تھے اور سیاست دان بھی۔ وزیر بھی تھے اور مشیر بھی۔ مگر عمومی طور پر وہ بھی عصبیت کا نشانہ بنائے گئے اور ان میں چند ایک کو مستثنیٰ کر کے کسی کو نئی حکومت میں جگہ نہیں مل سکی۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات وہ زبانی طعن و تشنیع کی زد میں بھی آجاتے تھے۔

حضرت عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بصرہ کے گورنر بنائے گئے تھے، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں ان سے ملنے آئے۔ ان کی پُرانی عادت تھی کہ خلفاء کو 'ایھا الامیر' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ حضرات خلفائے راشدین کو بھی وہ اسی طرح مخاطب کرتے رہے تھے۔ مگر دربارِ دمشق میں ''امیر المؤمنین'' کی جگہ ان کا ''ایھا الامیر'' کہنا برداشت نہ ہوا۔ بعض افراد نے اس پر غضب ناک ہو کر حضرت عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ کو بھری مجلس میں ''منافق'' کہہ ڈالا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس پر عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ سے معذرت کرتے ہوئے اعتراف فرمایا کہ اہلِ شام دورِ فتنہ سے گزرنے کے باعث اپنے قائدین کے حق میں متعصب ہو گئے ہیں۔[2]

اس تعصب کا لازمی نتیجہ تھا کہ بنو امیہ اعلیٰ حکومتی عہدوں پر علوی خلافت کے عہدے داروں کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ (اِکا دُکا استثنائی مثالیں ہو سکتی ہیں) اس ماحول کی وجہ سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بنو امیہ پر انحصار کریں۔ بنو امیہ پر انحصار ناگزیر ہونے کے باعث حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بعض عہدے ایسے لوگوں کو دینے پر بھی مجبور ہوئے جن کے متعلق بعد میں تجربات نے یہ ثابت کیا کہ وہ ان عہدوں کے لائق نہیں تھے جیسا کہ عبید اللہ بن زیاد۔ ۵۳ھ میں وہ صرف بیس اکیس سال کا تھا کہ اس کے باپ زیاد کی وفات ہو گئی۔ عبید اللہ فوراً دمشق پہنچا

---

[1] ابوداؤد کی اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شام میں ایک طبقہ تشدد مزاج لوگوں کا بھی تھا، وہاں یہی روایت بتاتی ہے کہ ایسی حرکات پر تنقید کرنے والے بھی وہاں ہمیشہ موجود رہے۔ جیسا کہ اس شخص کے ان الفاظ پر اسی مجلس میں تشریف فرما ایک مہمان حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ نے سخت احتجاج کیا۔ (مسند احمد، ح: ۱۷۲۲۸؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۶۹/۲۰، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ؛ سنن ابی داوٗد، ح: ۴۱۳۳، باب فی جلود النمور والسباع، قال الالبانی: صحیح)

[2] حدثنا اسحٰق بن ابراھیم، انا عبدالرزاق، انا معمر، عن الزھری قال: سلّم عثمان بن حُنَیف علیٰ معاویۃ رحمہ اللّٰہ، فقال: السلام علیک ایھا الامیر! وعندہ رھط من الشام، فقالوا: " من ھذا المنافق الذی قصر فی تحیۃ امیر المؤمنین؟" فقال عثمان لمعاویۃ: " ان ھؤلاء قد عابوا علیّ شیئا انت اعلم بہ، لما انی قد حییت بھا ابا بکر، وعمر و عثمان رحمھم اللّٰہ " فقال معاویۃ: " انی لاخالہ قد کان بعض الذی یقول، ولکن اھل الشام حین وقعت الفتنۃ قالوا: واللہ لنعرفن دیننا، ولا نقصر تحیۃ خلیفتنا، وانی لاخالکم یا اھل المدینۃ تقولون لعامل الصدقۃ: امیر." (المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۹/۹ باسناد صحیح)

اور حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے منصب طلب کیا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے خراسان کا گورنر بنا دیا۔ دو سال بعد اسے بصرہ کی حکومت دے دی۔[1] ۵۹ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اَحنف بن قیس کی رائے پر عبیداللہ بن زیاد کو معزول کر دیا۔ مگر بنواُمیہ میں اس کا کوئی متبادل نہ ملا چنانچہ چند دن بعد اسے دوبارہ اسی عہدے پر بحال کر دیا۔[2]

دیگر اموی امراء کی طرح یہ نوجوان بھی زبردست شمشیر زن اور جنگجو تھا مگر خوبیِ اخلاق اور حسنِ سیرت سے محروم تھا۔ لوگ اس کی تندمزاجی سے نالاں تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل وانصاف اور حکمت واعتدال کی وجہ سے ایسے شدت پسند لوگ ان کی زندگی میں پابند رہے۔ مگر ان کے بعد ایسے لوگوں کی اجارہ داری میں اضافہ ہو گیا اور یزید کے دور میں ان کی بے لگامی نے کئی حوادث اور سانحات کو جنم دیا۔ یوں سیاست میں ایک خاص طبقے کی بالادستی قائم ہو گئی جس کے باعث بہت سے لوگ اسلامی سیاست کی اقدار سے دور ہو گئے۔

اِمارۃُ الصِبیان:

شارحینِ سنت کے مطابق یہی وہ دور تھا جسے احادیث میں ''امارۃ الصبیان'' (لڑکوں کی حکومت) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''عرب کے لیے قریب آجانے والے شر سے ہلاکت ہوگی جو کہ لڑکوں کی حکومت ہے، اگر لوگ ان کی مانیں تو وہ انہیں آگ میں لے جائیں۔ اگر نہ مانیں تو وہ ان کی گردنیں کاٹ دیں۔''[3]

ایک بار حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو اس کے منہ پر کہا: میں نے حضور صادق ومصدوق ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ: ''میری امت کی ہلاکت قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی۔'' مروان نے یہ سن کر کہا: ''ان لڑکوں پر اللہ کی لعنت۔'' اس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم چاہو تو نام لے کر تمہیں بتا دوں کہ فلاں بن فلاں مراد ہے۔''[4]

---

① تاریخ الطبری: ۲۹۹، ۲۹۶، ۲۹۵/۵ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ص ۳۴۴

③ عن ابی ہریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال ویل للعرب من شر قد اقترب، امارۃ الصبیان، ان اطاعوہم ادخلوہم النار وان عصوہم ضربوا اعناقہم. (مصنف ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۵۱، ط الرشد) اسنادہ صحیح متصل

④ سمعت الصادق والمصدوق یقول: ہلاک امتی علیٰ یدی غلمۃ من قریش، قال مروان: لعنۃ اللّٰہ علیہم غلمۃ، فقال ابوہریرۃ: ان شئت ان اُسمّیہم بنی فلان و بنی فلان. (صحیح البخاری، ح: ۳۶۰۵، المناقب، علامات النبوۃ؛ ح: ۷۰۵۸ کتاب الفتن باب ہلاک امتی) یہی روایت مسند احمد میں کہیں مختصر اور کہیں مفصل مذکور ہے۔ ہر جگہ مرفوع روایت ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"وفی ہذا الحدیث ایضاً حجۃ لماتقدم من ترک القیام علی السلطان ولو جار، لانہ ﷺ اعلم اباہریرۃ باسماء ہؤلاء واسماء آبائہم ولم یامرہم بالخروج علیہم مع اخبارہ ان ہلاک الامۃ علیٰ ایدیہم لکون الخروج اشد فی الہلاک واقرب الی الاستئصال من طاعتہم فاختار اخف المفسدتین وایسر الامرین. تنبیہ: یتعجب من لعن مروان الغلمۃ المذکورین مع ان الظاہر انہم من ولدہ فلعل اللّٰہ اجری ذالک علیٰ لسانہ لیکون اشد فی الحجۃ علیہم لعلہم یتعظون."

اس حدیث میں بھی اس بات کی دلیل ہے جو پیچھے گزری کہ سلطان ظالم ہو تب بھی اس کے خلاف خروج ترک کیا جائے؛ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایسے لوگوں اور ان کے آباء کے نام تک بتا دینے کے باوجود ان کے خلاف خروج کا حکم نہیں دیا؛ کیوں کہ خروج ان کی اطاعت کی بہ نسبت زیادہ ہلاکت اور تباہی کا باعث ہوگا۔ پس آپ نے دو خرابیوں میں سے ہلکی خرابی اور دو کاموں میں سے آسان کام کو اختیار کیا۔ تنبیہ: مروان کا ان لڑکوں پر لعنت کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے حالاں کہ یہ ظاہر ہے کہ ایسے لڑکے اس کی اولاد میں سے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے اس کی زبان پر یہ بات اس لیے جاری کرا دی کہ ان لوگوں پر پورے شد ومد سے حجت قائم ہو جائے اور ممکن ہے کہ وہ نصیحت پکڑیں۔" (فتح الباری: ۱۱/۱۳)

ایک دوسری روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میری امت کی ہلاکت قریش کے بے وقوف لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی۔ ①

ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "۶۰ھ اور لڑکوں کی حکومت سے اللہ کی پناہ مانگو۔" ②

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک جگہ یہ بھی مروی ہے:

"میرے اس تھیلے میں ایک ایسی حدیث ہے تم سے بیان کردوں تو تم مجھے سنگسار کردو۔"

پھر دعا کی: اَللّٰھُمَّ! لَا اَبْلُغَنَّ رَاْسَ السِّتِّیْن. (یا الٰہی! میں ۶۰ھ کے آغاز تک نہ پہنچنے پاؤں۔)

لوگوں نے پوچھا: "۶۰ھ کیا ہے؟"

فرمایا: "لڑکوں کی حکومت، عہدوں کی فروخت، پولیس کی کثرت، جان پہچان کی وجہ سے گواہی اور امانت غنیمت بن جائے، زکوٰۃ تاوان بن جائے اور کچھ نوجوان قرآن کو راگنی بنالیں اور خون ارزاں ہوجائے۔" ③

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن ابی شیبہ کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کیا ہے: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بازار میں چلتے ہوئے فرماتے تھے: الٰہی! میں ۶۰ھ اور لڑکوں کی حکومت تک پہنچنے نہ پاؤں۔" ④

پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس میں اشارہ ہے لڑکوں کی پہلی حکومت ۶۰ھ میں ہوگی اور یہ اس طرح ہوا کہ یزید بن مُعاویہ اس سال خلیفہ بنا۔" ⑤

---

① ھلاک امتی علی یدی غلمان سفھاء من قریش. (صحیح ابن حبان، ح: ۶۷۱۲، قال المحشی: اسنادہ صحیح علی شرط الشیخین)
اس طرح یہ وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ یہ قریشی لڑکے ہلاکت کا باعث کیوں ہوں گے۔ یعنی وہ علم ودانش اور حسنِ کردار سے محروم ہوں گے۔ عاقبت نااندیشی اور خودرائی کی بناء پر غلط فیصلے کرکے اُمت کو سخت نقصانات سے دوچار کریں گے۔

② تعوذوا باللہ من راس السبعین ومن امارۃ الصبیان. (کنز العمال، ح: ۳۰۸۵۴)

③ المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۱۳۹۷، رجالہ ثقات الا علیّ بن زید بن جدعان، قال ابن حجر: ضعیف وقال الذھبی لیس بالثبت، (تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۴۷۳۴)

④ "ان ابا ھریرۃ یمشی فی السوق و ھو یقول: اللّٰھم لا تدرکنی سنۃ ستین ولا امارۃ الصبیان." (فتح الباری: ۱۳/۱۰)

⑤ جن روایات میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ۶۰ھ ہجری کا ذکر منقول ہے، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے، مرفوع حدیث نہیں۔ تاہم ایسی بات اپنے اندازے سے نہیں کہی جاسکتی تھی، اس لیے قیاس یہی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سن کر کہا ہوگا۔
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:
"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں نے صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے سنا ہے: ھلکۃ امتی علی یدی غلمۃ من قریش. میری امت کی تباہی قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی۔ اور غالباً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حکام کے زمانے کی تعیین بھی سنی تھی اس لیے دعا فرماتے تھے: "اللّٰھم لا تدرکنی سنۃ ستین ولا امارۃ الصبیان الٰہی! مجھے ۶۰ھ اور لڑکوں کی حکمرانی تک زندہ نہ رکھنا۔" (فتح الباری: ۱۳/۱۰)
غرض حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور بیشتر شارحین حدیث نے ان روایات کو یزید کے دور پر محمول کیا ہے۔ صحیح احادیث میں "امارۃ الصبیان" (لڑکوں کی حکومت) کو فتنے اور فساد کا منبع قرار دیا گیا ہے۔ شارحین ان روایات کو ۶۰ھ والی مرسل روایات سے ملا کر ان کا اطلاق یزید کے دور پر کرتے ہیں؛ کیوں کہ اس دوران عبید اللہ بن زیاد اور عمر بن سعد جیسے نوجوانوں کے ہاتھوں المناک واقعات پیش آئے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان روایات کی تشریح میں فرماتے ہیں:
"وفی ھذا اشارۃ الی ان اول الاُغیلمۃ کان فی سنۃ ستین وھو کذلک فان یزید بن مُعاویہ استخلف فیھا. "اس میں اشارہ ہے کہ ان چھوکروں میں پہلا یزید تھا جو اکثر اوقات شہروں کی حکومت سے بڑوں کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے رشتہ دار کم عمر افراد کو مقرر کردیتا تھا۔" (فتح الباری: ۱۳/۱۰)

۷۰ھ کے فتنوں کی طرف احادیث میں اشارہ:

بعض احادیث میں ۷۰ھ کے فتنوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ۷۰ھ کے آغاز اور لڑکوں کی حکومت سے اللہ کی پناہ مانگو۔ [1]

تاریخ سے ثابت ہے کہ ۷۰ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے مقابلے میں عبدالملک بن مروان کی باغیانہ حکومت مضبوط ہونے لگی تھی۔ اسی سال عبدالملک نے رومیوں سے صلح کر کے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے جرنیلوں کو اپنے ساتھ ملانے کی وہ سازشیں شروع کیں جو ۷۱ھ میں عراق سے خلافتِ زبیریہ کے خاتمے، ۷۲ھ میں مکہ کے محاصرے اور ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر منتج ہوئیں۔ [2]

یقیناً اس دور میں جو خانہ جنگیاں ہوئی ان میں نوجوان متشدد مزاج قریشی امراء کا ہاتھ تھا۔ احادیث میں اس دور کے پرفتن ہونے کی طرف واضح اشارات موجود ہیں اور ان فتنوں سے خبردار کرتے ہوئے ان میں حصہ لینے کے بجائے گوشہ نشینی، یکسوئی اور پرہیزگاری کی زندگی گزارنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

بعض حضرات ''امارة الصبیان'' کا اطلاق ان اموی حکام پر کرنے سے اس لیے انکار کرتے ہیں کہ ''صبیان'' کا مطلب ہے ''بچے'' اور یزید، عبیداللہ بن زیاد وغیرہ بچے نہیں پورے جوان تھے۔ یہ بالکل سطحی شبہ ہے۔ حدیث میں ان جوانوں کو مجازی طور پر ''صبیان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عرف اور محاورے میں بڑوں کی موجودگی میں چھوٹوں کو ''بچہ'' کہنا عام بات ہے۔ تجربہ کار اور قابل ہستیوں کے ہوتے ہوئے اناڑی اور نااہل کو بھی ''بچہ'' قرار دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت حسین، حضرت انس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم جیسے حضرات کی موجودگی میں یزید اور ابن زیاد بچے ہی تھے، چاہے وہ دیکھنے میں کڑیل جوان کیوں نہ ہوں۔

اگر حدیث کے الفاظ کو حقیقی معنیٰ یعنی نابالغ لڑکوں پر محمول کیا جائے تو بات اپنے محل سے بہت دور جا پڑے گی کیوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار نابالغ لڑکے کو ۲۹۵ھ میں حاکم بنایا گیا۔ یہ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ تھا جو اس وقت تیرہ سال کا تھا۔ جبکہ تمام شارحینِ حدیث متفق ہیں کہ ''امارة الصبیان'' کی احادیث کا تعلق پہلی صدی ہجری اور اموی زمانے سے ہے۔ [3]

---

① حدثنا یحییٰ ابن ابی بکیر، حدثنا کامل ابو العلاء، قال سمعت اباصالح، عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعوذوا باللہ من رأس السبعین ومن امارة الصبیان. (مسند احمد، ح:۸۳۲۰)

احوال الرجال: ابو صالح ذکوان، ثقة ثبت. (تقریب التهذیب، تر: ۱۸۴۱)

ابو العلاء کامل: صدوق. (تقریب التهذیب، تر: ۵۶۰۳) یحییٰ بن ابی بکیر: ثقة. (تقریب التهذیب، تر: ۷۵۶۱)

ورواہ ابن ابی شیبہ فی مصنفہ (ح:۳۷۲۳۵، ط الرشد) اسنادہ صحیح متصل: وکیع عن کامل عن ابی صالح عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، ورجال ھذا الاسناد کلھم ثقات.

② تاریخ الطبری: ۶/۱۵۰، ۱۵۷، ۱۷۶؛ انساب الاشراف: ۵/۳۶۳، ط دار الفکر

③ یہ حدیث: تعوذوا باللہ من رأس السبعین ومن امارة الصبیان. (مسند احمد، ح: ۸۳۲۰) اسے پوری طرح ثابت کر رہی ہے۔



امارۃ الصبیان میں ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی توہین:

یزید کے بعض گورنروں نے صحابہ کرام کی توہین وتذلیل کو عادت بنالیا تھا۔ ان میں عبیداللہ بن زیاد سب سے آگے تھا۔ اس نے ایک بار ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو برسرِ دربار ہانک لگائی:

اِنَّ مُحَمَّدِیَّکُم هٰذَا الدَّحْدَاحُ.

''یہ ہے تمہارا ٹھگنا موٹا محمدی......'' (العیاذ باللّٰہ)

حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ اس کی بات سمجھ گئے (مگر صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے اس کے موٹا اور ٹھگنا کہنے کو نظر انداز کردیا تاہم اس نے ''محمدی'' کہہ کر جو طنز کیا تھا، اسے وہ برداشت نہ کرسکے) اور ارشاد فرمایا: ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے پیدا ہونے تک باقی رہوں گا جو مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر عار دلائیں گے۔''

عبیداللہ بن زیاد (بات بدل کر) کہنے لگا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت آپ کے لیے زینت ہے نہ کہ عیب۔''[1]

عائذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ کی توہین:

عبیداللہ بن زیاد کی سخت گیری دیکھ کر بعض بزرگ صحابہ نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ انہی کو لتاڑنے لگا۔ حضرت عائذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ جو بیعتِ رضوان سے مشرف بزرگ صحابی تھے، از راہِ نصیحت عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے اور فرمایا:

''میرے بچے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بدترین حکمران وہ ہوتے ہیں جو سخت گیر ہوں۔ تم ان میں شامل ہونے سے بچو۔''

اس پیار بھری نصیحت اور ارشادِ نبوی کے جواب میں عبیداللہ بن زیاد نے اکڑ کر جواب دیا:

''بیٹھ جاؤ۔ تم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کچرا ہو۔''

صحابی نے فرمایا: ''صحابہ میں بھی کوئی کچرا ہوگا؟ کچرا وہ لوگ ہیں جو ان کے علاوہ اور ان کے بعد والے ہیں۔''[2]

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابن زیاد کا برتاؤ:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ عبیداللہ بن زیاد کی آمد اور اس کے کردار کا چشم دید حال یوں بیان کرتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں عبیداللہ بن زیاد گورنر بن کر ہمارے پاس آیا۔ وہ ایک نادان اور کم عمر لڑکا تھا جو خون بہانے میں بڑا بے باک تھا۔ ہمارے ہاں عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ان دس حضرات میں سے ایک تھے جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معلم بنا کر بصرہ بھیجا تھا۔ وہ جمعے کے دن عبیداللہ کے گھر تشریف لے

---

① سنن ابی داؤد، ح: ۴۷۴۹، کتاب السنة، باب فی الحوض

② صحیح مسلم، ح: ۴۸۳۶، کتاب الامارة، باب فضیلة الامام العادل

عائذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ ۶۱ ہجری میں یعنی یزید کے دور میں فوت ہوئے تھے۔ (الاستیعاب: ۲/۷۹۹، دار الجیل)

عبیداللہ بن زیاد اگرچہ حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں بصرہ کا گورنر بن گیا تھا مگر غالب گمان یہی ہے کہ اسے بزرگ صحابہ سے بدتمیزی کی یہ امت یزید کے دور میں ہی ہوئی ہوگی جب اسے بصرہ کے ساتھ کوفہ یعنی پورے عراق، ایران، خراسان اور الجزیرہ کا حاکم بنا دیا گیا۔

گئے۔ اور اسے کہا: "اپنے طرزِ عمل سے باز آجاؤ۔ بدترین حاکم وہ ہوتے ہیں جو سخت گیر ہوں۔"

عبیداللہ یہ سن کر کہنے لگا: "تم اصحابِ رسول ﷺ کے گرے پڑے لوگوں کے سوا بھلا کیا ہوا"

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کیا صحابہ میں سے بھی کوئی گرا پڑا ہوسکتا ہے۔ وہ خاندانی اور شریف لوگ تھے۔ گواہ رہنا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ کوئی بھی حاکم ایک رات بھی رعایا کے ساتھ غبن کرتے ہوئے گزارے تو اللہ اس پر جنت کو حرام کردیتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ نکلے اور مسجد میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہم ان کے اردگرد تھے اور ان کے چہرے پر وہ اذیت محسوس کررہے تھے جو انہیں عبیداللہ بن زیاد سے پہنچی تھی۔ ہم نے کہا:

"اللہ آپ پر رحم کرے! آپ کو سب لوگوں کے سامنے اس احمق کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی!"

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "میرے پاس رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث محفوظ تھی، میں نے چاہا کہ موت سے پہلے پہلے اسے اعلانیہ بیان کرجاؤں۔ کاش! کہ عبیداللہ بن زیاد کے گھر میں سارے اہلِ بصرہ سما سکتے۔ وہ سب وہاں جمع ہوجاتے تاکہ میری اور اس کی گفتگو سب سنتے۔"

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ عبیداللہ بن زیاد عیادت کے لیے آیا اور کہنے لگا: "کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے لیے کچھ کریں؟"

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے کہا: "تم واقعی کروگے؟"

کہنے لگا: "ہاں بالکل۔"

فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ تم نہ میری نماز جنازہ پڑھنا، نہ میری قبر پر آنا۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے بیچ میں حائل نہ ہونا۔"[1]

یزید سے مُعاویہ بن یزید تک:

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے پوری نیک نیتی سے یزید کو ولی عہد بنایا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی سیاست میں موروثی نظامِ حکومت کے مضرات داخل ہوجانے کا خطرہ ظاہر کرتے ہوئے حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں اس فیصلے پر تنقید بھی کی تھی۔ تاہم جنگ وجدل کی راہ سے گریز کیا۔

---

[1] رواہ ابن ابی عاصم فی "الاحاد و المثانی، ح: ۱۰۹۲" و ابن ھارون الرویانی (م ۳۰۷ھ) فی "مسند الرویانی، ح: ۱۱۱۸" و ابن حکمون القضاعی (م ۴۵۴ھ) فی "مسند الشھاب، ح: ۸۰۲"
مسند الرویانی میں یہ روایت حسن بصری کی جگہ وہب بن کیسان سے مختصر طور پر مروی ہے۔ شیخ البانی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔
نوٹ: عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی وفات کے متعلق تین اقوال ہیں: ۵۷ھ، ۶۰ھ، ۶۱ھ۔ غالب گمان ہے کہ ان کی وفات ۶۱ھ میں ہوئی، یعنی یزیدی دور میں۔ اور غالباً یہ واقعہ یزید ہی کے دور کا ہے؛ کیوں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں حکام غالباً ایسی سرکشی کا مظاہرہ نہیں کرسکتے تھے۔

یزید کا اقتدار شروع ہوا تو آراء کا یہ اختلاف پھیل گیا اور خانہ جنگی کا ماحول بننے لگا۔ تاہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے آخری عمل نے واضح کر دیا کہ وہ انتقالِ اقتدار یا نظام کی اصلاح اُمت کے "استیناس" کے ذریعے ہی چاہتے تھے۔ اس لیے اہلِ کوفہ کو خلافِ توقع اربابِ اقتدار کی صف میں دیکھنے کے بعد انہوں نے خود بھی یزید سے مل کر گفت وشنید کے ذریعے معاملات طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جسے عبید اللہ بن زیاد نے انجام پذیر نہ ہونے دیا۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے فتوے کی بناء پر یزید کی بیعت میں توقف ضرور کیا مگر خود خلافت کا اعلان نہیں کیا اور امت کو باہم خانہ جنگی میں ملوث ہونے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اگرچہ یزید نے رعایت برتے بغیر ان کے خلاف لشکر کشی کرائی جو بے نتیجہ رہی۔

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو جانشین بنانے کا جو تجربہ کیا، وہ زمینی حقائق کے لحاظ سے بعد میں ناموزوں ثابت ہوا۔ چنانچہ ان کے پوتے مُعاویہ بن یزید نے موروثی حکومت کے "پونے چار سالہ ٹیسٹ کیس" کو ختم کر کے نظامِ اقتدار پھر سے امت کی شورائیت کے سپرد کر دیا۔

عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور اموی امراء کا ٹکراؤ:

مصر سے خراسان تک پوری امت نے بلا توقف اس نادر موقعے سے فائدہ اٹھایا اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لیا۔ اس خلافت کے لیے کوئی فوج کشی ہوئی نہ کسی کو خریدا گیا۔ ہر جگہ رضا و رغبت سے بیعت ہوئی۔ یہ وقت امت کی تاریخ میں نہایت فیصلہ کن تھا۔ امت دوبارہ استیناس اور شورائیت کے نظام پر آ رہی تھی۔

اس وقت بنو امیہ اور امرائے شام میں سے بعض سیاست دانوں نے سخت تعصب کا ثبوت دیتے ہوئے اس خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور معاملے کو بزورِ شمشیر حل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا ان کا موقف یہ تھا کہ خلافت کوئی بزور طاقت ہم پر مسلط کر سکتا ہے تو کر کے دکھائے، ہم گفت وشنید، مذاکرات یا دلیل کی قوت پر یقین نہیں کر سکتے بلکہ ہم تلوار کے زور اور سیاسی داؤ پیچ کے بل بوتے پر حکومت چھین سکے تو ضرور چھینیں گے۔

یہ اسلامی سیاست کے اصولِ استیناس اور اصولِ شورائیت سے کھلا انحراف تھا۔ ایک طرف عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ، انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور اَحنف بن قیس رحمہ اللہ جیسے اساطین سمیت پوری اُمت تھی اور دوسری طرف مروان، عبید اللہ بن زیاد اور عمرو بن سعید جیسے چند امراء۔ اگر یہ لوگ مرکز کے ماتحت آ جاتے تو اسلام کی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا اور فتوحات وخوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا مگر ان کی غلط سوچ کے نتیجے میں وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جو بظاہر عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک چلی مگر درحقیقت وہ آج تک چلی آ رہی ہے۔ کیوں کہ رائے عامہ اور عوامی رضا ورغبت کو نظر انداز کر کے طاقت اور مکر وفریب کے ذریعے حکومت چھیننا اور بزورِ قوت راج کرنا دورِ جاہلیت کا وطیرہ تھا۔ اس میں جو حب جاہ، ہوس مال، اخلاقیات کی پامالی، جانوں کا ضیاع اور قوموں کا انتشار ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اسلام ان خرابیوں میں سے ہر ہر چیز سے منع کرتا ہے تو ان کا مجموعہ بننے والے اقدام کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے۔

مگر افسوس کہ ایسا ہی ہوا۔ جب ان سیاست دانوں نے تلوار کے ذریعے اقتدار چھیننے اور قائم کرنے کی نیو ڈال دی تو بعد میں اکثر و بیشتر مسلم سیاست دانوں نے اسی طرزِ فرسودہ کی اقتداء کی اور اسی کو کامیاب سیاست کا ذریعہ سمجھا۔

سیاسی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں کی جڑ:

تلوار کی اہمیت سے انکار نہیں مگر اسلام کا پیغام یہ ہے کہ تلوار غیر مسلم سے اقدامی ودفاعی جہاد، اپنی سرحدوں کی حفاظت یا مجبوری میں بقدرِ ضرورت اندرونی باغیوں کی سرکوبی کے لیے استعمال ہوگی۔

ایک صالح وعادل حکمران کی قائم شدہ شرعی حکومت کو بزورِ شمشیر چھیننے کی اسلامی نظامِ سیاست میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ مگر پہلی صدی ہجری میں جب اُمت کے بعض سیاست دانوں نے صحابہ کرام کے اقتدار کی شمع گل کر کے اپنی حکومت قائم کی تو اس کے ساتھ ہی اسلامی سیاست کے سنہرے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ سنہرا دور جو اندرونی شورشوں، اغیار کے پھیلائے ہوئے فتنوں، بعض خانہ جنگیوں اور کچھ سیاسی غلطیوں کے باوجود اسلامی سیاست کے حوالے سے راہبر ورہنما تھا۔ کیوں کہ اس میں اسوہ وہ جلیل القدر انسان تھے جن کے سینوں پر ''رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ'' کے تمغے جگمگا رہے تھے۔

جب امت کے سیاست دانوں نے استیناس، شورائیت اور رضا ورغبت کی اسلامی سیاست کو ترک کر کے طاقت اور عسکریت کی سیاست کو اپنایا تو معاشرہ وسیع البنیاد صالح قیادت، عوامی نمائندگی، عدل وانصاف، حقوق کی فراہمی، حق گوئی کی آزادی اور رفاہی خدمات جیسے مطلوب مقاصد کی طرف اس طرح گامزن نہ رہا جیسے پہلے تھا۔ اخلاق واقدار کا اُجالا اور امن وامان کا سایہ بھی ویسا نہ رہا۔ حکام عوام سے اور عوام حکام سے شاکی رہے۔ معاشرے میں ایک گھٹن پیدا ہوگئی جس سے طبقاتی وگروہی کش مکش بار بار جنم لیتی رہی۔ خفیہ سازشوں، مسلسل بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اسلامی معاشرے کا لازمہ بن گیا جیسے دیگر معاشروں اور دیگر قوموں میں چلا آتا تھا۔

موروثی نظام کو سیاست کا اصول بنا دینا مزید خرابی کا باعث بنا۔ اگرچہ چند مثالیں ہمیں اس کے خلاف بھی ملتی ہیں مگر عمومی اصول یہی بن گیا کہ باپ کے بعد بیٹا، بھائی یا قریب ترین رشتہ دار جانشین ہوگا۔ یہ آمریت و بادشاہت کا اصول تھا جس کی اسلامی سیاست میں پیوند کاری کردی گئی۔ اگرچہ آمریت وشاہی نظامِ حکومت وموروثی اقتدار کے کچھ فوائد بھی ہیں مگر یہ طرزِ اقتدار ایک محدود رقبے اور خاص رنگ ونسل کے گروہوں کے لیے کارآمد ہے جو رعایا اور مملکت کے دائرہ کار کو محدود تر کرتا ہے اور بڑی بڑی سلطنتوں کو منطقی طور پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے۔

اسلام کا ہمہ گیر نظام، اس کا جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر وحدتِ ملی کا نظریہ اور خلافتِ اسلامیہ کا اعلیٰ تصور، اس محدود اور تنگ نظر نظامِ اقتدار کے ساتھ کوئی میل نہیں کھاتا۔ اگر خلافتِ اسلامیہ کو عالم گیر طور پر باقی رکھنا مطلوب تھا تو اس نظام سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ مگر اگلی نسل کے سیاست دانوں نے اصولِ موروثیت کو اُمت کے وسیع تر مفاد پر ترجیح دی اور اس کی پروانہ کی کہ اس سے وحدتِ قومی کس قدر متاثر ہوگی۔

نتیجہ وہی نکلا جو اس سے قبل بڑی بڑی سلطنتوں کے آمرانہ نظام کا نکلا تھا۔ جب حکمران خاندان سے باہر کے عالی ہمت، بارسوخ، بہادر اور طاقتور مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ وہ اس نظام کے ہوتے ہوئے کبھی بھی حکمران نہیں بن سکتے اور اس آئینِ جہانبانی میں ان کے خاندان کی نمائندگی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو انہوں نے بھی تلوار ہی کے بل پر یہ گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری صدی ہجری ہی میں اسلامی خلافت کی عالمگیریت کا خاتمہ ہوگیا اور جگہ جگہ آزاد خود مختار حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ طاقتور امراء مرکز کی گرفت سے بزورِ قوت نکل کر عالمِ اسلام کے اطراف و جوانب میں اپنی حکومتیں قائم کرتے رہے۔ یوں خلافت کا ادارہ برائے نام رہ گیا اور صوبے دار ''سلاطین'' بن کر ہر طرف چھا گئے۔ پھر ان کی باہمی لڑائیاں اور موروثیت کے مرض کے باعث پیدا شدہ ان کے اندر کی خانہ جنگیاں ایک مستقل داستان ہیں۔ اگر اسلامی نظامِ سیاست کی روح کو سمجھ کر استیناس، شورائیت اور رضا و رغبت کی فضا قائم رکھی جاتی تو یقیناً خلافتِ اسلامیہ اتنی جلد اس قدر محدود اور کمزور نہ ہوتی۔

یاد رہے کہ ہم اس نئے نظامِ سیاست کے بانی حضرات کی ذاتی شرافت یا نیت پر کوئی حملہ نہیں کر رہے۔ مروان، عبد الملک اور اس طرح کے کئی افراد، سیرت و کردار اور اخلاق و اوصاف میں بعد والوں سے بہت بہتر تھے مگر سیاسی امور میں ان سے جو غلطیاں ہوئیں وہ اثر دکھائے بغیر نہ رہیں۔ انہوں نے امت کو جو سیاسی نظام دیا، اس کے نتائج بعد میں اچھے نہیں نکلے۔

بہر کیف پہلی صدی ہجری میں جو کچھ ہوا، مشیتِ الٰہیہ میں وہی لکھا تھا۔ تکوینی طور پر طے تھا کہ اُمتِ مسلمہ پر پہلی صحابہ کی موجودگی ہی میں ہر طرح کے حالات آئیں، خلافتِ راشدہ، خلافتِ عامہ، امارت و ملوکیت، جہاد اور خانہ جنگی ہر طرح کے امتحانات کا نمونہ اسی ابتدائی دور میں گزر جائے۔ اسی لیے تدریجاً حالات تبدیل ہوتے چلے گئے۔

حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی رحمہ اللہ اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''خلافت کو امارت و ملوکیت میں تبدیل ہونے کے لیے قدرتی طور پر ان مراحل سے گزرنا ضروری تھا جن سے خلافتِ عثمانی اور خلافتِ مرتضوی گزری۔ لہٰذا جو فتنے اور حوادث ان حضرات کے عہدِ برکت میں ظہور پذیر ہوئے، ان کا ہونا قانونِ فطرت کے عین مطابق تھا۔ تعمیر ہو یا تخریب، عادۃ اللہ ہر انقلاب میں تدریج کی مقتضی ہے۔ خلافتِ نبوت کے ختم ہونے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ یک دم اپنے آپ فنا ہو جاتی، اور دوسری صورت یہ تھی کہ بتدریج اس میں ضعف آنے لگتا اور آخر اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ کر ختم ہو جاتی۔ عادۃ اللہ چونکہ اس عالم میں دوسرے طریق پر جاری ہے لہٰذا ختم خلافتِ خاصہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ اس کی عمرِ طبعی تقدیرِ الٰہی میں پہلے سے تیس سال مقرر تھی، اور اسی مدت میں ختم ہونا تھا۔''[1]

---

[1] ناصبیت تحقیق کے بھیس میں، ص ۳۴۹

عہدِ صحابہ میں اتنی زیادہ خانہ جنگیاں کیوں ہوئیں؟

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر عہدِ صحابہ میں جس کا دورانیہ ۱۱ھ سے ۷۳ھ تک (۶۳ سال) رہا اتنی زیادہ خانہ جنگیاں کیوں ہوئیں جبکہ بعد میں کسی دور میں اندرونی طور پر اتنا کشت وخون نہیں ہوا۔ آخر دورِ صحابہ کے یہ برگزیدہ مسلمان کیسے تھے جو آپس میں اس قدر لڑتے بھڑتے رہے؟

یہ سوال دراصل غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قدر خانہ جنگیاں ہوئی نہیں تھیں جس قدر تاریخ کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ زیادہ زمانہ امن وامان ہی کا رہا۔ اس تاثر کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ خبروں کے مجموعے سے بنتی ہے اور خبر عموماً وہ بات ہوتی ہے جو معاشرے کے عام معمول سے ہٹ کر ہو۔ اس لیے خبروں میں منفی باتوں کو زیادہ جگہ ملتی ہے۔ اگر کسی شہر میں لاکھوں آدمی نمازی ہوں تو یہ بات نہ خبر بنتی ہے نہ تاریخ کا حصہ۔ لیکن دس آدمی بھی چوری ڈاکے یا قتل وبدکاری کے مرتکب ہوں تو یہ خبر بن جاتی ہے۔ روزانہ لاکھوں لوگ دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کوئی خبر نہیں بنتی۔ اگر ایک شخص بھی فراڈ یا غبن کرتا ہے تو خبر بن جاتی ہے۔ پھر جو باتیں نمایاں شخصیات کے متعلق ہوں یا غیر متوقع اور عجیب ہوں ان کو خبر یا تاریخ میں زیادہ جگہ ملتی ہے۔ عام آدمی کسی کو گالی دے تو خبر نہیں ہو گی۔ وزیر اعظم کی زبان سے ایسے گھٹیا الفاظ نکلیں تو خبر بن جائے گی۔

دورِ صحابہ امن، اخلاق، محبت اور خیر خواہی کا زمانہ تھا۔ صحابہ کی ان صفات اور اس دور کے قابلِ رشک واقعات کی تفاصیل الگ کتب مثلاً: الاصابۃ، الاستیعاب، اسد الغابہ، سیر اعلام النبلاء، حلیۃ الاولیاء اور حیاۃ الصحابہ میں موجود ہیں۔ مگر تاریخ میں زیادہ تر خبروں (خلاف معمول چیزوں) کو جمع کیا گیا ہے اس لیے تاریخ میں خانہ جنگیوں کے اوراق زیادہ ہیں ورنہ ان کا وقت مختصر ہی تھا۔

خلافتِ راشدہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۱۱ھ) کی خلافت سے شہادتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۳۵ھ) تک چوبیس برسوں میں کوئی ایسی خانہ جنگی نہیں ہوئی جس میں اہلِ حق باہم برسرِ پیکار ہوں۔

دورِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں مسیلمہ کذاب اور مرتدین کا فتنہ پہلی خانہ جنگی کی شکل میں کھڑا ہوا مگر یہ واضح طور پر حق وباطل کا ٹکراؤ تھا۔ یہ تمام لڑائیاں ایک سال کے اندر نمٹ گئی تھیں۔ اس کے بعد ۱۲ھ سے ۳۵ھ تک بالکل امن رہا۔ ابن سبا کی خفیہ تحریک چلی مگر کہیں مسلح ٹکراؤ یا خانہ جنگی نہ ہوئی۔ اپنی شہادت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باہم تلوار نہ چلنے دی۔

اہلِ حق کا پہلا باہمی ٹکراؤ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ۳۶ھ میں جنگِ جمل کے موقع پر ہوا۔ ایسا دوسرا سانحہ صفین میں پیش آیا۔ ان دونوں جنگوں کے لیے سفر وقیام، گفت وشنید، قتال اور تحکیم سمیت تمام امور میں زیادہ سے زیادہ ۸ ماہ

خرچ ہوئے تھے۔ جبکہ تلوار چلنے کا وقت جنگِ جمل میں چند گھنٹے اور صفین میں تین دن تھا۔ دورِ علوی میں خوارج سے مذاکرات اور جنگوں سمیت سارے معاملات میں زیادہ سے زیادہ چار ماہ لگے۔ کوفہ او شام کی افواج کے مابین سرحدی خلاف ورزیوں کی مدت ایک سال ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ۲۰ سالہ دور مجموعی طور پر پرامن رہا۔ غور کریں تو ان پچاس برسوں میں خانہ جنگیوں کا اصل دورانیہ زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی سال بنے گا۔ صحابہ کرام کی حکومت وسیاست کا اصل دورانیہ پچاس سالوں پر مشتمل تھا یعنی ۱۱ھ سے ۶۰ھ تک۔

۶۰ھ سے ۷۳ھ تک کے ۱۳ سالہ دور میں قیادت وسیادت زیادہ تر تابعین کے ہاتھوں میں تھی۔ ان تیرہ سالوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ان میں خانہ جنگیوں کا دورانیہ غیر معمولی تھا۔ یزید کے پونے چار سالہ دور میں کربلا، حرہ اور دوبار مکہ پر حملے کی شکل میں چار خانہ جنگیاں ہوئیں جن میں مجموعی طور پر لگ بھگ ایک سال خرچ ہوا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں امرائے شام، مختار ثقفی اور خوارج مرکزِ خلافت سے لڑتے رہے اس لیے اس دور کا بڑا حصہ خانہ جنگی کی نذر ہوگیا مگر اس کے ذمہ دار وہی لوگ تھے جنھوں نے ان کی خلافت کو قبول نہیں کیا تھا۔

اس ۹ سالہ دور میں پانچ سال شورش اور بدامنی کے تھے۔ جبکہ ۶۷ھ سے ۷۰ھ تک چار برس میں چند چھوٹی موٹی بغاوتوں کے سوا مجموعی طور پرامن رہا۔

جغرافیائی طور پر غور کریں تو فتنوں اور خانہ جنگیوں کے زیادہ مناظر عراق یعنی کوفہ، بصرہ اور کبھی کبھار فارس وخراسان میں دکھائی دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر دورِ صحابہ میں باقی مقامات اکثر ایام میں مامون ہی رہے۔

عراق کے سوا باقی علاقوں کا جائزہ لیں تو اس چالیس سالہ مدت میں مصر میں دو بڑی جنگیں ہوئیں: ایک حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی محمد بن ابی بکر کے خلاف۔ دوسری مروان کی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گورنر کے خلاف۔

حجاز میں پانچ جنگیں ہوئیں:

1. عمرو بن سعید کا مکہ پر حملہ
2. مدینہ پر مسلم بن عُقبہ کا حملہ
3. مکہ پر حُصین بن نُمیر کا حملہ
4. مدینہ کے باہر مُصعَب بن زبیر کا شامی لشکر سے مقابلہ
5. مکہ پر حجاج بن یوسف کا حملہ

جزیرۃ العرب کے اطراف، بحرین وغیرہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں خوارج کا زور رہا مگر ''جُوانی'' کے ایک معرکے کے سوا کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی۔ شام میں دو جنگیں: صفین اور مَرْجِ راہط برپا ہوئیں۔

بہرحال ان لڑائیوں میں بڑی شخصیات کی شرکت نے مسئلے کو نازک بنادیا اور پھر مبالغہ آمیز واقعات کے اضافے نے ان قضایا کو زیادہ آلودہ کردیا ہیں۔ ہم ان واقعات کو پچاس ساٹھ صفحات میں سمیٹ دیتے مگر کمزور روایات پر جرح

اور صحیح بات کو سامنے لانے کی تحقیق نے ہمارے لیے بھی خامہ فرسائی کا سفر طویل کر دیا۔

اگر غور کیا جائے تو عہدِ صحابہ کے بعد اُمت پر فتنہ وفساد کے جوادوار مسلط ہوئے ہیں ان کا دورانیہ زیادہ طویل اور ان میں جانی و مالی نقصان کا تناسب کہیں زیادہ تھا، کیوں کہ بعد کے متحارب فریق خونِ مسلم کی بابت احتیاط پر عمل پیرا نہ تھے۔ جبکہ دور صحابہ میں عمومی ماحول احتیاط کا تھا۔

اپنی تاریخ سے ہٹ کر اگر ہم یورپ، ہندوستان اور چین کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ان میں خون ریزیوں، خانہ جنگیوں، محلاتی سازشوں، بغاوتوں اور قتل عام کا ایک ایسا بھیانک اور لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتا ہے جس کے سامنے عالم اسلام کی تاریخ کی بڑی سے بڑی خون ریزی بھی ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ دور کیوں جائیے! دو تین صدیاں بیشتر اقوام یورپ کا نئی دنیا امریکہ میں باہم کشت وخون دیکھ لیں اور مقامی لوگوں کے قتل عام کے اعداد و شمار ملاحظہ کرلیں جو بلامبالغہ کروڑوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں روشن خیال یورپ اور تہذیب نو کے علَم بردار امریکا کی وہ بہیمیت کسی سے ڈھکی چھپی ہے جس میں شہروں کے شہر گولہ باری اور بمباری کی نذر ہوئے اور ایٹمی حملے سے ہیروشیما اور ناگاسا کی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

مگر افسوس کہ مستشرقین اور اعدائے اسلام اپنے سیاہ کرتوتوں کو چھپانے کے لیے ہماری تاریخ کے چند واقعات اور چند سانحوں کو لے کر نہ صرف ہماری پوری تاریخ کو سیاہ کر کے دکھاتے ہیں بلکہ صحابہ کرام کی کردار کشی کر کے پورے اسلام ہی کو مشکوک بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆☆☆

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کے موجود ہوتے ہوئے تلوار بار بار کیوں چلتی رہی، معاملات افہام وتفہیم کے ذریعے کیوں حل نہ ہوتے رہے؟ انتقالِ اقتدار کا عمل پر امن انداز میں کیوں انجام نہ پا تا رہا؟ جب اسلام میں اس کے لیے نظام موجود ہے تو قرنِ اول کے مسلمان اس سے لاپرواہ کیوں رہے؟

یہ سوالات اسلام کے سیاسی نظام اور تاریخِ صحابہ کے بارے میں کم علمی کی پیداوار ہیں۔ گزشتہ اوراق میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اُس دور کے مسلمان امن اور مذاکرات کے لیے ہر وقت ہر جگہ کوشاں رہے۔ وہ جانتے تھے کہ امن وامان ہر حالت میں ہر انسان کی ضرورت اور ہر معاشرے کا بنیادی حق ہے۔ صحابہ کرام اور جلیل القدر تابعین کا موقف یہی تھا کہ انتقالِ اقتدار پُرامن انداز میں ہونا چاہیے، کیوں کہ اسلام حرصِ اقتدار، حبِ جاہ، دنیا کے لیے لڑنے اور فساد کی مذمت کرتا ہے۔ اسلام کے اصول وقواعد وضوابط ہر جگہ فساد کی نفی کرتے ہیں اور جسم وجان کی صحت سے لے کر پورے معاشرے اور اندرونی و بیرونی سیاست میں امن وسلامتی کی ضمانت دیتے ہیں۔ اسلام انسانی جان کی قدر و قیمت کو جو اہمیت دیتا ہے وہ قرآن وحدیث میں بڑی وضاحت سے موجود ہے۔ اسلام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اہل ذمہ (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں) کے تحفظِ جان ومال کو بھی برابر اہمیت دیتا ہے، اس لیے ایک اسلامی معاشرے

اور اسلامی ریاست میں مسلمانوں کا خون بے دریغ بہتے رہنا، اسلام کے راستے کے منافی ہے جسے سچے مسلمان کبھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

حقیقت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تک حکمران صحابہ کا یہی نقطۂ نظر تھا۔ اس لیے وہ از خود دوسرے مسلمانوں کی جان لینے سے حتی الامکان اجتناب کرتے رہے جیسا کہ صحیح روایات کی روشنی میں ہم ہر جگہ تفصیل سے اس پر بات کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود اگر بعض جگہ اہلِ حق کی تلواریں بے نیام ہوئی ہیں تو اس کا مقصد صرف بغاوت کا ازالہ تھا جس کی شریعت نے بھی بدرجہ مجبوری اجازت دی ہے اور عقلی لحاظ سے بھی اس کی ضرورت ظاہر ہے؛ کیوں کہ اگر اندرونی دشمنوں سے دفاع کے لیے کسی بھی حال میں حکمران کے پاس طاقت کے استعمال کا اختیار نہ ہو تو کوئی حکومت کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اسے کسی بھی وقت ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اگر ہمیں دورِ صحابہ میں کہیں خانہ جنگی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں جن میں بعض اوقات جلیل القدر شخصیات بھی شرکت کرتی نظر آتی ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان واقعات کو مشکوک، ضعیف، مبالغہ آمیز اور من گھڑت تاریخی روایات کو ہٹا کر دیکھیں، اس طرح اس کش مکش کے متعلق بیشتر اعتراضات اور شکوک کا خود ہی ازالہ ہو جائے گا۔

ہم اس حقیقت کا انکار نہیں کر رہے کہ دورِ صحابہ میں خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ ہم یہ بتا رہے ہیں کہ ان خانہ جنگیوں کی روایات میں حقیقت کم اور داستان سرائی زیادہ ہے۔ جو ہوا وہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اور پھر یہ تمام کش مکش اضطراری حالات میں ہوئی۔ ان لڑائیوں کے بھڑکانے میں ایک حد تک گمراہ اور شر پسند عناصر کی سازشیں بھی کارفرما تھیں۔ پھر اس سے کہیں بڑھ کر ان واقعات کی مسخ شدہ خبر نگاری کے لیے ایسے لوگ غیر معمولی طور پر متحرک رہے۔ ضروری ہے کہ ہم تاریخ کو حزم و احتیاط سے دیکھیں اور ہر گری پڑی روایت پر یقین نہ کریں۔

☆☆☆

دورِ صحابہ کی سیاسی کش مکش کا خلاصۂ بحث

ان جنگوں کی حیثیت اور ان میں قابلِ احترام ہستیوں کی شمولیت کی توجیہات پر ہم ہر جگہ تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ قارئین کے سامنے ایک بار پھر اسے خلاصے کے طور پر بیان کر دیتے ہیں:

- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والی تحریک سازشی عناصر کی کارستانی تھی، خونِ مسلم کا احترام اور مدینہ منورہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے از خود مقابلے سے احتراز کیا اور وصیتِ نبوی کے مطابق خلافت سے سبک دوش نہ ہوئے۔ آخر کار باغیوں نے انہیں شہید کر ڈالا۔
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کے خاتمے کے لیے بصرہ گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے اتحاد کا اعلان ہو چکا تھا کہ عبداللہ بن سبا کی سازش نے دونوں جماعتوں کو لڑا دیا۔ یہ لڑائی غلط فہمی کا نتیجہ تھی جس پر دونوں طرف کی قیادت کو عمر بھر افسوس رہا۔
- حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت قبول کرنے میں توقف تھا کیوں کہ اہلِ شام قصاصِ عثمان کے لیے بے تاب تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حق دار تو مانتے تھے مگر قصاص لینے تک بیعت کو موقوف رکھنے کے قائل تھے۔ یہ توقف ان کی خطائے اجتہادی تھی جس میں وہ نیک نیت اور ماجور تھے۔ تاہم اس کا سیاسی نقصان ہو کر رہا کہ عراق اور دِمشق دو متحارب طاقتوں کی شکل میں صفین میں ٹکرائے۔ غیر معمولی جانی اتلاف کے بعد دونوں قائدین نے امن کی ضرورت محسوس کر کے جنگ بندی کر لی مگر مذاکرات کا سلسلہ "تحکیم دُومۃ الجَندَل" پر بلانتیجہ ختم ہو گیا۔ کچھ مدت تک سرحدی جھڑپوں کے بعد فریقین نے سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کر لیا۔ اس کے چند ماہ بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خوارج نے شہید کر دیا۔
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ حکومت کے بعد کسی مجبوری کے بغیر صرف امت کے مفاد کے لیے ۴۰ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سپرد کر دی اور اگلے ۲۰ سال تک امت متحد اور مامون رہی۔
- حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد ایک جانشین کا تقرر کر دیا۔ یہ ان کا اجتہادی فیصلہ بالکل درست تھا مگر جانشین کے لیے اپنے بیٹے کو نامزد کرنا خطائے اجتہادی تھی جس میں وہ نیک نیت اور ماجور تھے مگر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلے۔ اس کے باوجود اکثریت نے یزید کی ولی عہدی اور خلافت کو تسلیم کر لیا تھا تا کہ خانہ جنگی نہ ہو۔
- حضرت حسین رضی اللہ عنہ موروثی طرزِ حکومت کے جڑیں پکڑنے کا خطرہ محسوس کر کے اصلاحِ احوال کی کوشش کے لیے

سرگرم ہوئے مگر اہلِ کوفہ کی غداری اور یزید کی فوج کے ظلم کا نشانہ بن گئے۔

- عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا موقف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مطابق تھا۔ طویل مدت تک حرم میں پناہ گزین رہنے کے باوجود انہوں نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔
- یزید کی ولی عہدی کا ''ٹیسٹ کیس'' شرعاً جواز کی حد میں تھا مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے نتائج کو خود دیکھنے کے لیے زندہ نہ تھے۔ تجربہ ناکام ثابت ہوجانے پر ان کے پوتے معاویہ بن یزید نے نظامِ اقتدار پھر سے اُمت کے سپرد کردیا۔ اس ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امتِ مسلمہ کے عوام وخواص کی اکثریت نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کرلی۔ وہ مسلمانوں کے شرعی خلیفہ بن گئے۔
- مروان اور اس کے بیٹے عبدالملک نے اس خلافت شرعی کو قبول نہ کیا اور شام پر قابض ہوکر بزورِ شمشیر اپنی خاندانی خلافت قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور آخرکار خلافت زبیریہ کا خاتمہ کردیا۔
- قرنِ اوّل میں اہلِ حق کے مابین سیاسی کش مکش کے علاوہ خوارج اور سبائی گماشتوں اور مختار ثقفی جیسے لوگوں سے تقریباً ہر حکمران کو واسطہ پڑتا رہا۔ ان کی سرکوبی کے لیے جو بھی کوششیں ہوئیں ان کے برحق ہونے میں کوئی شک نہیں۔

☆☆☆

تاریخ صحابہ: دورِ فتن کی ایک جھلک

۶۰ھ......تا......۷۳ھ

680ء......تا......692ء

۶۰ھ

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات......تحقیقی قول 4 رجب، (11 اپریل 680ء) مشہور قول 22 رجب
- یزید کی دمشق آمد اور تخت نشینی......رجب (اپریل 680ء)
- بیعت کے لیے یزید کے قاصد کی مدینہ آمد......رجب (مئی 680ء)
- عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی مدینہ سے روانگی......اواخر رجب (مئی 680ء)
- عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی مکہ آمد......اوائل شعبان (مئی 680ء)
- ولید بن عتبہ کی حجاز سے معزولی اور عمرو بن سعید کا تقرر......رمضان (جون 680ء)
- کوفہ سے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی معزولی، عبیداللہ بن زیاد کا تقرر
- عمرو بن سعید امیرِ حج مقرر
- مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی شہادت......۸ ذی الحجہ (10 ستمبر 680ء)
- حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ سے کوفہ روانگی......۷ ذی الحجہ (9 ستمبر 680ء)

۶۱ھ

- سانحۂ کربلا......۱۰ محرم (11 اکتوبر 680ء)
- مسلم بن زیاد خراسان کا والی مقرر......(681ء)
- عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی گرفتاری کے لیے مکہ پر عمرو بن سعید کا ناکام حملہ
- عمرو بن سعید امارتِ حجاز سے معزول، ولید بن عتبہ کا دوبارہ تقرر......یکم ذی الحجہ (28 اگست 681ء)
- امیر حج، ولید بن عتبہ......(681ء)
- وفات عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ......(681ء)

۶۲ھ

ا یزید کے پاس اہلِ مدینہ کے وفد کی آمد.....محرم (ستمبر 681ء)

ا عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کی افریقہ کے محاذ پر تقرری.....(آغاز 682ء)

ا مسلم بن زیاد کی وسطِ ایشیا میں فتوحات.....(682ء)

ا کابل کے محاذ پر شکست، یزید بن زیاد شہید.....(682ء)

ا عبداللہ بن اسد کا قیساریہ پر جہاد.....(682ء)

ا امیر حج ولید بن عُتبہ.....(682ء)

ا وفات مسلم بن مخلد رضی اللہ عنہ حاکم مصر، وفات علقمہ بن قیس نخعی رحمہ اللہ، وفات ابومسلم خولانی رحمہ اللہ، وفات بُریدہ بن حُصَیب اسلمی رضی اللہ عنہ مَرو میں، وفات عَمرو بن حزم انصاری رضی اللہ عنہ

۶۳ھ

ا ولید بن عُتبہ معزول۔ عثمان بن محمد حجاز کا امیر مقرر.....اوائل سال (682ء)

ا عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ کی بحر اوقیانوس کے ساحل تک فتوحات.....(682ء)

ا اہلِ مدینہ کا یزید کی اطاعت سے انکار۔ اموی گورنر عثمان بن محمد کا انخلاء۔(683ء)

ا مکہ بنوامیہ کے قبضے سے باہر۔ حج عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی امارت میں.....(9 اگست 683ء)

ا افریقہ میں عُقبہ بن نافع رحمہ اللہ اور ابومہاجر دینار رحمہ اللہ کی شہادت.....(683ء)

ا مدینہ پر شامی افواج کا حملہ۔ سانحۂ حرہ.....۲۷ ذی الحجہ (28 اگست 683ء)

شہادت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ

ا افریقہ میں بربروں کی بغاوت، کئی علاقوں پر قبضہ.....ذی الحجہ (اگست 683ء)

ا وفات مسروق بن اجدع رحمہ اللہ، فقیہ کوفہ.....(683ء)

۶۴ھ

ا قَیروان پر افریقی باغیوں کا قبضہ.....محرم (ستمبر 683ء)

ا حُصَین بن نُمَیر کی مکہ پر یلغار اور محاصرہ.....۲۶ محرم (24 ستمبر 683ء)

ا شہادت حضرت مِسوَر بن مَخرَمَہ رضی اللہ عنہ (683ء)

ا کعبہ شریف کی آتش زدگی.....۵ ربیع الاول (یکم نومبر 683ء)

ا وفاتِ یزید بن مُعاویہ.....۱۴ ربیع الاول (10 نومبر 683ء)

ا وفات مُعاویہ بن یزید.....۲۴ ربیع الآخر (20 دسمبر 683ء)

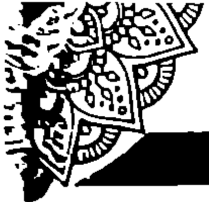
- مکہ کا محاصرہ ختم......دس جمادی الاولیٰ (5 جنوری 684ء)
- عراق میں شورش، عبیداللہ بن زیاد روپوش...... جمادی الاولیٰ (جنوری 684ء)
- خلافتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لی گئی......۹ رجب (3 مارچ 684ء)
- مختار ثقفی کی مکہ سے کوفہ روانگی......رمضان (مئی 684ء)
- مروان بن الحکم کی بغاوت، اپنی متبادل خلافت کا اعلان......ذی قعدہ (جون 684ء)
- مَرْجِ راہط میں اموی اور زبیری افواج میں جھڑپیں......ذوالحجہ (جولائی 684ھ)
- عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا کعبہ شریف کو بنیادِ ابراہیمی پر تعمیر کرانا......(684ھ)
- وفات ولید بن عتبہ......(684ھ)
- وفات ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا......(684ھ)

٦٥ھ

- مَرْجِ راہط میں بنوامیہ کی فتح اور شام پر قبضہ......آغاز محرم (اگست 684ء)
- شہادت حضرتِ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ......آغاز محرم (اگست 684ء)
- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی شہادت......محرم (ستمبر 684ء)
- توابین کی کوفہ سے شام کی طرف پیش قدمی......۵ ربیع الآخر (20 نومبر 684ء)
- توابین کو شکست......شہادتِ سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ......۲۶ ربیع الآخر (11 دسمبر 684ء)
- مروان کے مصر پر حملے کے دوران شہر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وفات......(684ء)
- مروان کا مصر پر قبضہ......۱۵ جمادی الآخرہ (28 جنوری 685ء)
- حجاز میں شامی لشکر کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں شکست......یکم رمضان (11 اپریل 685ء)
- مروان بن الحکم کی وفات......تین رمضان (14 اپریل 685ء)
- ابوطالوت خارجی کی عرب میں مار دھاڑ (685ء)

٦٦ھ

- مختار کا کوفہ پر قبضہ، قاتلینِ حسین کی سرکوبی......ربیع الاوّل (اکتوبر 685ء)
- مختار کا شام پر حملہ، عبیداللہ بن زیاد قتل، شامی افواج کو شکست......ذوالقعدہ (جون 686ء)
- مختار کی حجاز میں پیش قدمی کی ناکام کوشش......(686ء)
- نجدہ بن عامر خارجی کی غارت گری......(686ء)
- فارس و عراق میں ازرقی خوارج کی دہشت گردی......(686ء)



ا وفات حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ......(686ء)

٦٧ھ

ا کوفہ میں مختار کا محاصرہ اور قتل......١٤رمضان ٦٧ھ......(3اپریل687ء)

ا وفات عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ......جمادی الاولیٰ (نومبر686ء)

ا وفات ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ......(686ء)

٦٨ھ

ا طائف میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وفات بعمر 71برس......ربیع الآخر (اکتوبر687ء)
دوسرے قول کے مطابق ٦٩ھ میں

ا وفات زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ، وفات ابوشریح الخزاعی رضی اللہ عنہ......(687ء)

ا وفات ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ......شوال (اپریل688ء)

٦٩ھ

ا نَجدہ بن عامر خارجی کا اپنے مخالف خارجیوں کے ہاتھوں خاتمہ......(688ء)

ا بصرہ میں طاعون جارف سے اموات کی کثرت......(688ء)

ا وفات اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا......(688ء)

ا وفات جابر بن سَمُرہ رضی اللہ عنہ......(688ء)

ا وفات ابوالاسود الدؤلی رحمہ اللہ خادم حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ......شوال (مارچ689ء)

٧٠ھ

ا وفات عاصم بن عمر بن الخطاب رحمہ اللہ......ربیع الآخر (ستمبر689ء)

ا عبدالملک کی عراق کی طرف پیش قدمی، خراب موسم کی وجہ سے واپسی......جمادی الآخرہ (نومبر689ء)

ا عَمرو بن سعید الاشدق کا قتل......(689ء)

ا عبدالملک کی رومیوں سے صلح......(689ء)

٧١ھ

ا عبدالملک کی زُفر بن الحارث کے خلاف فتح، قَرقیسیا پر قبضہ......(690ء)

ا وفات حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ، وفات عمر بن اخطب رضی اللہ عنہ، وفات عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ

٧٢ھ

ا وفات حضرت اَحنف بن قیس رحمہ اللہ......ربیع الآخر (ستمبر691ء)



ا دَیرِ جاثلیق کا معرکہ، مُصعَب بن زبیر رحمۃ اللہ شہید......۱۳ جمادی الاولیٰ (۱۱۲ اکتوبر، 691ء)

ا وفات حضرت عَبِیدہ سُلمانی رحمۃ اللہ......رجب (نومبر 691ء)

ا حجاج بن یوسف کی مکہ پر فوج کشی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف محاصرہ، یکم ذوالقعدہ (25 مارچ 692ء)

ا وفات حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ......ذوالقعدہ (مارچ 692ء)

ا وفات مَعبد بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ، وفات عبداللہ بن سائب رحمۃ اللہ

ا ولادت ہشام بن عبدالملک......(692ء)

۷۳ھ

ا مکہ پر حجاج کا قبضہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید......۱۷ جمادی الاولیٰ (5 اکتوبر 692ء)

ا حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی وفات......۲۷ جمادی الاولیٰ (15 اکتوبر 692ء)

ا حجاج بن یوسف کا کعبہ کو قریش کے نقشے کے مطابق تعمیر کرانا......(692ء)

ا وفات عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ، وفات ثابت بن ضحاک انصاری رضی اللہ عنہ

☆☆☆

چوتھا باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمَہ

پہلی صدی ہجری میں

امت کی علمی، فکری، اصلاحی و اخلاقی تربیت کا فریضہ انجام دینے والے

امت کے محسنین

گزشتہ صفحات میں ہم نے ۳۵ھ سے ۷۳ھ تک اُمت کی تاریخ کے ایک اہم دور کا مطالعہ کیا ہے۔ اس دور میں بیچ کے چند سالوں کو چھوڑ کر زمامِ اقتدار حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت امیر مُعاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم جیسی عظیم شخصیات کے ہاتھوں میں رہی۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں ان بزرگوں کے حالات کو تاریخی ترتیب سے خاصی تفصیل کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس دور میں جب کہ اُمت کو وجود میں آئے ہوئے ایک صدی بھی نہیں ہوئی تھی، اللہ کے امرِ تکوینی کے تحت مسلمانوں کو کچھ کڑی آزمائشوں سے گزارا گیا۔ اس دور میں یہ حضرات جہاں سیاسی وعسکری لحاظ سے امت کے قائد ورہنما تھے وہاں دینی، ایمانی اور روحانی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے پیشوا تھے۔ اور اُمت کو اُمت کے طور پر زندہ رکھنے اور مستحکم بنانے میں اس دور کے اندر ان حضرات کی قیادت و رہنمائی کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ یہ ہستیاں نہایت غیر معمولی اور جامع الصفات تھیں اس لیے بیک وقت میدانِ جہاد، میدانِ سیاست اور اصلاح وارشاد کے فرائض انجام دے سکتی ہیں۔

تاہم اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ بعد میں وقت اور اہلِ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے باعث مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور دینی رہنمائی کے مراکز الگ الگ ہو جائیں گے۔ عسکری مہمات کی قیادت، اندرونی بغاوتوں کی سرکوبی، سرحدوں کے بندوبست، سیاسی سازشوں کے ادراک اور رعایا کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کرنے والے افرادسازی کا کام نہیں کرسکیں گے۔ پس اللہ کی مشیتِ کاملہ نے صحابہ کرام کے اس دور میں جبکہ اکابر صحابہ بھی موجود تھے، کچھ حضرات کو سیاست سے ہٹ کر مسلمانوں کی دینی، ایمانی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے چن لیا۔ ان حضرات نے اپنی زندگیاں افرادسازی کے لیے وقف کردیں تاکہ اُمت کے لیے عقیدے اور علم وعمل میں پختہ رجالِ کار کی فراہمی کا وہ مبارک سلسلہ بند نہ ہو جو رسول اللہ ﷺ نے شروع کیا تھا اور جو بعثتِ نبوی کا بنیادی مقصد تھا۔ پس اس طرح یہ افرادسازی حقیقت میں اُمت کی نشوونما کے لیے ایسی ہی ضروری تھی جیسے فصل کے لیے پانی۔

ان نفوسِ قدسیہ کا بارگاہِ رسالت سے اخذ کردہ فیض آگے تابعین کو پہنچا اور تابعین نے اخلاص، بے غرضی، للّٰہیت، زہد وعبادت اور تقویٰ وطہارت کے جملہ اوصاف سے آراستہ ہوتے ہوئے اس سلسلے کو اسی انداز میں آگے بڑھایا۔ اس طرح اُمت کی تشکیل کی ابتداء ہی میں تعلیم وتعلم، درس وتدریس، دعوت وارشاد، حق گوئی وراست بازی اور ایمان وایقان کی وہ محفلیں سج گئیں جو سلسلہ بسلسلہ آج تک مختلف شکلوں میں چلتی آرہی ہیں۔ کہیں یہ دینی مدارس کی صورت

میں زندہ ہیں کہیں مکاتب کی شکل میں۔ کہیں اس سلسلے کے رجالِ کار تزکیہ واحسان کے مراکز چلا رہے ہیں اور کہیں صحیح عقیدے کی آبیاری اور افکارِ باطلہ کی تردید میں تن من دھن کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ کہیں کچھ سرفروش کفار کے مقابلے میں سینہ تانے جہاد فی سبیل اللہ کی روایت زندہ وتابندہ کیے ہوئے ہیں اور کہیں کچھ بندگانِ خُدا گوشہ تنہائی میں بیٹھے تصنیف وتالیف اور علمی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ یہ جو کچھ ہے اور جس شکل میں بھی ہے، درحقیقت انہی نفوسِ قُدسیہ کا فیض ہے۔ ان کی قربانیاں نہ ہوتیں تو اُمتِ مُسلمہ کی شخصیت اس قدر مضبوط بنیادوں پر کبھی تعمیر نہ ہوتی۔

درحقیقت صحابہ کرام کی زندگیوں کا ہر ہر گوشہ نصیحت کے متعدد پہلو لیے ہوئے ہے۔ بس دیکھنے کے لیے اک شے درکار ہے اور وہ ہے ایمانی بصیرت۔ ایمانی بصیرت تبھی نصیب ہوتی ہے جب اللہ، اس کے حبیب اور حبیب کے پیارے صحابہ سے محبت ہو۔ اگر یہ محبت ہوگی تو سیرتِ صحابہ کا ہر گوشہ آبِ حیات بن کر کام آئے گا۔ اگر خدانخواستہ کوئی اس محبت سے محروم ہے تو پھر اس کے لیے ہزارہا صفحات بھی محض ایک دماغ سوزی کے سوا کچھ نہیں۔

لیجیے! اب ان محسنینِ امت میں سے چند سرکردہ افراد کا تذکرہ پیش کیا جارہا ہے۔ ان میں زیادہ تر صحابہ کرام ہیں تاہم چند ایک ایسے جلیل القدر تابعین بھی ہیں جو اکابرِ صحابہ کے فیض یافتہ تھے اور اصاغرِ صحابہ کے ہم قدم تعمیرِ امت کا کام کرتے رہے۔[1]



[1] ان میں خلفائے راشدین سمیت حکمران صحابہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ ان کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیے جاچکے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں سے وہ ہستی ہیں جنہیں سب سے زیادہ احادیث اُمت تک پہنچانے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ سے منقولہ روایات کی تعداد ''۵۳۷۴'' ہے۔

آپ کا تعلق یمن کے قبیلہ دوس سے تھا۔ وہاں بکریاں چراتے تھے۔ جب یمن میں اسلام پھیلا تو مختلف قبائل اسلام سیکھنے مدینہ آنے لگے۔ یہ بھی اپنے قبیلے کے ساتھ ۸ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور خود کو ارشاداتِ نبوی کی حفاظت کے لیے وقف کرتے ہوئے مدینہ ہی میں بس گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال سے اوپر تھی۔ گورے چٹے، دراز قد، کشادہ سینے والے بارعب آدمی تھے۔ عمر رسیدہ ہوئے تو ڈاڑھی پر سرخ مہندی کا خضاب لگانے لگے۔ طبیعت کے نرم، فیاض، سادہ مزاج اور غیور آدمی تھے۔ اصحابِ صفہ کے ساتھ بیٹھے احادیث یاد کرتے رہتے تھے۔ [1]

اپنی والدہ کے بڑے خدمت گزار تھے۔ انہیں یمن سے اپنے ساتھ مدینہ لائے تھے اور ایک مکان میں ٹھہرا دیا تھا۔ وہ اسلام نہیں لائی تھیں۔ یہ انہیں دعوتِ اسلام دیتے اور وہ انکار کرتی رہتیں۔ ایک دن جواب میں والدہ نے کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ یہ روتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور ماجرا سنا کر استدعا کی کہ میری والدہ کی ہدایت کے لیے دعا کریں۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دعا کا اثر دیکھنے کے لیے فوراً گھر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ اندر سے غسل کا پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد والدہ نے دروازہ کھولا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر بتایا کہ ان کے دل میں ہدایت کی روشنی اتر چکی ہے۔ [2] تاریخ میں انہیں اُمّ ابی ہریرہ، اُمیمہ یا میمونہ رضی اللہ عنہا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ [3]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دن بھر اصحابِ صفہ کے ساتھ خدمتِ نبوی میں رہتے۔ علم حاصل کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ باقی صحابہ کا کوئی نہ کوئی روزگار اور کنبہ قبیلہ تھا۔ صفہ والے پردیسی اور فقراء تھے، خود کو علمِ دین اور دعوت کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ اہلِ مدینہ ان کے لیے مسجد کے ایک ستون پر کھجوریں لٹکا دیا کرتے تھے یا کچھ اور صدقہ وخیرات بھیج دیتے۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۵۸۶/۲ تا ۵۸۸، ط الرسالۃ

② صحیح مسلم، ح: ۶۵۵۱، فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

③ الاصابۃ: ۳۲۷/۸

وہ سب میں برابر تقسیم ہو جاتا۔ کبھی کبھار فاقے سے بھی رہنا پڑتا تھا۔ بھوک کی وجہ سے بعض اوقات مسجدِ نبوی میں پوری پوری صف گر جاتی تھی۔ یہ ساری سختیاں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی جھیلیں۔ خود فرماتے ہیں کہ کبھی غشی طاری ہو جاتی اور مسجد میں حجرۂ رسول اور منبر کے درمیان گر پڑتا، لوگ مرگی کا دورہ سمجھتے تھے جبکہ فاقے سے یہ حالت ہوتی تھی۔ [1]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی معاشی تنگی کی وجہ سے ان کی والدہ کو بھی فقر وفاقے کی آزمائش میں مبتلا رہنا پڑا۔ ایک بار یہ ایسی ہی بھوک کی حالت میں گھر سے نکل کر مسجد میں آئے۔ دیکھا صفہ والے ساتھی بھی بھوکے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو آپ نے ایک تھال کھجوروں کا لے کر ان میں دو دو تقسیم کر دیں اور فرمایا:

"یہ کھا کر اوپر سے پانی پی لو۔ آج کے دن گزارا ہو جائے گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک کھجور کھائی اور دوسری سنبھال کر رکھ لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کیا:

"یہ والدہ کے لیے رکھ لی ہے۔ ان کا بھی فاقہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شفقت سے فرمایا:

"تم یہ دونوں کھا لو۔ والدہ کے لیے ہم سے مزید دو کھجوریں لے جانا۔" [2]

ایسے میں بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بھی ظاہر ہوتے۔ ایک بار فاقے کی حالت میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ بیتِ نبوی میں صرف دودھ کا ایک پیالہ تھا جو کسی نے ہدیہ بھیجا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کہ سارے اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سوچتا ہوا گیا کہ ان سب کو بلانے کے بعد میرے لیے کیا بچے گا۔ بہرحال تعمیل کرتے ہوئے اصحابِ صفہ کو بلا لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کے ذمے لگایا کہ سب کو پلائیں۔ تمام حاضرین نے سیر ہو کر دودھ پیا مگر اللہ کی شان! پیالہ ویسا کا ویسا بھرا رہا۔

آخر میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسکرا کر فرمایا: "اب تو میں اور تم ہی باقی رہ گئے۔"

یہ کہہ کر پیالہ انہیں دیا۔ وہ پیتے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہتے رہے: "اور پیو۔ اور پیو"

یہاں تک کہ انہیں کہنا پڑا کہ اب تو مزید پینے کی بالکل گنجائش نہیں رہی۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دودھ خود نوش فرمایا۔ [3]

ایسا نہیں تھا کہ وہ فکرِ روزگار سے بالکل آزاد ہوں بلکہ ایک مدت تک وہ حضرت عُتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کی بہن بسرۃ بنت غزوان رضی اللہ عنہا کے گھر کا پانی بھر کر لایا کرتے تھے، اس کے بدلے دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ بعد میں جب اللہ نے انہیں فارغ البال کر دیا تو انہی بسرۃ بنت غزوان رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح ہوا۔ [4]

---

(1) سنن الترمذی، ح: ۲۳۶۷، ابواب الزهد، باب ما جاء في معيشة اصحاب النبي ﷺ؛ حلية الاولياء: ۳۷۸/۱، ط السعادة
(2) طبقات ابن سعد: ۳۲۸/۴، ط صادر
(3) صحيح البخاري، ح: ۶۴۵۲، باب كيف كان عيش النبي ﷺ واصحابه؛ سنن الترمذي، ح: ۲۴۷۷
(4) تاريخ دمشق: ۳۶۵/۶۷

انہیں بلیوں سے بڑی محبت تھی۔ یمن میں جب اپنے کنبے کی بکریاں چرایا کرتے تھے تو ایک بلی کا بچہ بڑے شوق سے پالا ہوا تھا، اس سے کھیلا کرتے تھے۔ مدینہ میں بھی یہ شوق کچھ نہ کچھ باقی تھا۔ حضور ﷺ اسی مناسبت سے انہیں ''اَبَاہِرّ'' (بلی والے) کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ پیار بھرا لفظ ایسا مشہور ہوا کہ ان کا اصل نام بالکل چھپ گیا۔ کنیت ابوہریرہ پڑ گئی۔ انہیں خود بھی یہ کنیت اتنی پسند تھی کہ لوگوں کو فخر سے بتاتے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ کنیت دی ہے، تم یہ نہ رکھنا۔ ایک صدی بعد جب علماء نے ان کے اصل نام کی تحقیق کرنا چاہی تو ہر کسی سے الگ الگ نام سنا۔ یوں اس بارے میں تیس کے قریب اقوال بن گئے۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ جاہلیت میں نام عبد شمس تھا، اسلام لائے تو عبداللہ رکھا گیا۔[1]

ان کے حافظے کی پختگی بھی حضور اکرم ﷺ کا ایک معجزہ تھا۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا تھا:

''اپنی چادر پھیلاؤ۔'' انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔

حضور ﷺ نے احادیث سنا کر فرمایا: ''چادر کو اپنے سینے سے ملالو۔''

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد انہیں کوئی فرمانِ رسول کبھی بھولتا نہیں تھا۔[2]

اللہ نے ان کے درسِ حدیث میں بڑی برکت دی۔ ان سے روایات نقل کرنے والے صحابہ اور تابعین کی تعداد آٹھ سو تک شمار کی گئی ہے۔ مدینہ کے گورنر مروان کو آپ رضی اللہ عنہ سے بڑی عقیدت تھی۔ مسجدِ نبوی میں مروان کا کاتب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے درس حدیث میں بیٹھ کر روایات لکھا کرتا تھا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایات دہراتے تو ایک لفظ کا فرق بھی نہ ہوتا تھا۔[3]

بعض لوگ ان کی کثرتِ روایت پر اظہارِ حیرت کرتے تو یہ فرماتے:

''ہمارے مہاجر بھائی تجارت کیا کرتے تھے اور انصاری بھائی زراعت۔ جبکہ میں صفہ کے فقیروں میں سے ایک تھا۔ پیٹ کو سہارا دینے والے چند لقموں پر گزارا کر کے خدمتِ نبوی میں پڑا رہتا تھا۔ میں اس وقت بھی موجود ہوتا جب دوسرے غائب ہوتے۔ وہ سب باتیں سنتا جو دوسرے نہ سن پاتے۔''[4]

علمی مشغولیت کے ساتھ کثرت سے ذکر کیا کرتے تھے۔ روزانہ کا معمول ایک سو بیس تسبیحات کا تھا۔ ایک تھیلی میں کھجور کی گٹھلیاں جمع کر رکھی تھیں، انہی پر تسبیح پڑھا کرتے تھے۔[5]

حکومت اور سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کچھ مدت کے لیے بحرین کے عامل بنائے گئے تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سیاسی اختلاف میں غیر جانب دار رہے۔ مدینہ منورہ

---

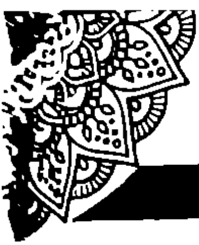
[1] سیر اعلام النبلاء: ۲/۵۸۶ تا ۵۸۸، ط الرسالۃ

[2] صحیح مسلم، ح: ۶۵۵۵؛ حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۸۱

[3] سیر اعلام النبلاء: ۲/۵۹۸، ط الرسالۃ

[4] صحیح مسلم، ح: ۶۵۵۲، ۶۵۵۵، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی ھریرۃ

[5] سنن ابی داؤد، ح: ۲۱۷۴، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اھلہ



والا اپنا گھر اپنے آزاد کردہ غلاموں کو عطیہ کر دیا تھا۔ خود شہر سے باہر ذوالحلیفہ کے دیہات میں رہنے لگے تھے۔ ۵۹ھ میں بیمار ہوئے۔ مرض کی شدت میں کسی نے روتے دیکھا تو حال احوال پوچھا۔ فرمایا:

''تمہاری اس دنیا کے چھوٹنے پر نہیں رو رہا، اپنے سفر کی طوالت اور سامانِ سفر کی کمی پر رو رہا ہوں۔ ایک پہاڑ کی چوٹی پر ہوں جس کے نشیب میں ایک طرف جنت ہے، ایک طرف جہنم۔ پتا نہیں جنت میں گروں گا یا جہنم میں۔''

کچھ دنوں بعد وفات پا گئے۔ حاکمِ مدینہ ولید بن عتبہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ رضی اللہ عنہ بقیع میں مدفون ہوئے۔ عمر ۷۸ برس تھی۔ ①

رضی اللہ عنہ وارضاہ

☆☆☆

① البدایہ والنہایہ: ۱۱/۳٦۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۱۰ تا ۲۲۲، ط الرسالۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ خیر القرون کے ان علمائے کبار میں سے ہیں جن کے احسانات علومِ اسلامیہ کے ہر شعبے اور ہر شاخ پر ہیں۔ انہیں حبر الامت کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں۔ ہجرت سے پہلے شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کی قید کے دنوں میں پیدا ہوئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھٹی دی، منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا۔ آپ کی والدہ ام فضل لبابہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا، ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی والدہ، یہ تینوں خواتین آپس میں سگی بہنیں تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت تین سال کے تھے۔ ان کے خاندان نے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ اس وقت تک ان کے والد عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام ظاہر بھی نہیں کیا تھا۔[1]

ذو القعدہ ۷ھ میں عمرۂ قضا کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ۱۲ کلومیٹر دور "سرف" کے مقام پر ان کی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا۔ اس نکاح کے انتظامات میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ پیش پیش تھے۔[2] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس وقت دس برس کے تھے۔

اگلے سال فتح مکہ کے بعد ۸ھ کے اواخر میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے خاندان سمیت مدینہ منورہ منتقل ہوگئے۔ اس وقت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی عمر گیارہ سال تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں تقریباً اڑھائی سال استفادے کا موقع ملا۔ قریبی رشتہ داری کی وجہ سے ہر وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو سکتے تھے۔[3]

اس مختصر سی مدت میں ہی ان کی علمی جستجو اور طالب علمانہ ذوق کا اندازہ ہوگیا۔ کبھی کبھی اپنی خالہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رات کو بھی ٹھہر جاتے تاکہ معمولاتِ نبویہ کا مشاہدہ کریں۔ اس دوران ہر ممکن خدمت بھی انجام دیتے اور دعائیں لیتے۔ ایک بار اسی طرح بیتِ نبوی میں ٹھہرے ہوئے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے لئے ایک برتن میں پانی ڈال کر رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دریافت فرمایا: "پانی کس نے رکھا ہے؟"

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "عبداللہ ابن عباس نے۔"

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۳۱، ۳۳۲، ط الرسالۃ

② سنن نسائی مجتبیٰ، ح: ۳۲۷۳، سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۹ ط الرسالۃ ③ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۳۲، ط الرسالۃ

رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْل. (اے اللہ! اسے فقہِ دین اور علمِ تفسیر عطا فرما۔)[1]

ایک بار معمولاتِ نبویہ دیکھنے کے لیے خالہ کے گھر رکے اور تہجد کے وقت حضور ﷺ کے ساتھ ہی اٹھ گئے۔ حضور اکرم ﷺ نوافل کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ اقتداء کے لیے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ نے انہیں کھینچ کر اپنے برابر کھڑا کر دیا۔ جب حضور ﷺ نے نماز شروع کی تو یہ پھر ذرا سا پیچھے ہٹ گئے۔

جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: "یہ کیا کیا؟"

انہوں نے عرض کیا: "اَوَ يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يُّصَلِّيَ حِذَائَکَ وَاَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟"

(کسی کو کہاں زیب دیتا ہے کہ آپ کے برابر کھڑے ہو کر نماز پڑھے جبکہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔)

حضور ﷺ نے اس ذہانت اور فہم سے خوش ہو کر دعا دی: "اے اللہ! ان کے علم اور سمجھ میں اضافہ فرما۔"[2]

حضور اکرم ﷺ کی وفات کے وقت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تیرہ برس کے تھے۔ اس لیے انہیں پوری طرح استفادے کا موقع نہیں ملا تھا مگر علومِ نبوت کی جستجو دل میں جاگ چکی تھی۔ اس لیے ایک ایک صحابی کے پاس جا کر احادیث یاد کرنا شروع کیں۔ خود فرماتے تھے:

"جب حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا تو میں نے ایک انصاری ساتھی سے کہا:

"آؤ! صحابہ سے احادیث سیکھیں، آج وہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔"

ساتھی نے کہا: "تعجب ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کو مستقبل میں تمہاری ضرورت پڑے گی اور لوگ تمہارے پاس احادیث اور مسائل معلوم کرنے آئیں گے؟"

اس ساتھی نے اس کام کو کوئی اہمیت نہ دی اور میں اس دھن میں لگ گیا، صحابہ کرام سے احادیث معلوم کرتا رہتا تھا۔ بعض اوقات کسی صحابی کے بارے میں مجھے معلوم ہوتا کہ ان کے پاس کوئی حدیث ہے۔ میں ان کے دروازے پر جاتا، وہ سو رہے ہوتے تو میں دروازے پر سر کے نیچے چادر رکھ کر بیٹھ جاتا یا لیٹ جاتا، جب وہ باہر نکلتے تو کہتے: "اے رسول اللہ کے چچازاد! آپ کس ضرورت کے تحت یہاں تشریف لائے؟ مجھے بلوا کیوں نہیں لیا؟" میں کہتا: "حاضر ہونا میری ذمہ داری ہے۔" پھر حدیث معلوم کرتا۔

آخر وہ زمانہ آیا کہ اس انصاری ساتھی نے دیکھا کہ لوگ میرے اردگرد جمع ہیں اور مجھ سے احادیث و مسائل دریافت کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس ساتھی نے کہا: "یہ نوجوان زیادہ سمجھدار ثابت ہوا۔"[3]

---

① فضائل الصحابة لاحمد بن حنبل، ح: ۱۸۵۸؛ صحيح البخاري، ح: ۱۴۳، كتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء

② مسند احمد، ح: ۳۰۶۰ الرسالة

③ الإصابة: ۱۲۵/۴، ط العلمية

جن صحابی سے کچھ سیکھتے ان کا ویسا ہی ادب کرتے جیسا کوئی اپنے اساتذہ کا کیا کرتا ہے۔ایک بار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سواری کی لگام تھام لی۔انہوں نے فرمایا:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد! ایسا نہ کریں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

هٰكَذَا اُمِرْنَا اَنْ نَفْعَلَ بِعُلَمَائِنَا.

''ہمیں اپنے علماء کا ایسا ہی احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اسی وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کو چوم کر فرمایا:

هٰكَذَا اُمِرْنَا اَنْ نَفْعَلَ بِاَهْلِ بَيْتِ نَبِيِّنَا.

''ہمیں خاندانِ نبوت کے ساتھ ایسی ہی تعظیم کا حکم دیا گیا ہے۔''[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ عنفوانِ شباب میں تھے۔اس کے باوجود خلیفۂ ثانی انہیں خصوصی مجلسوں میں اکابر صحابہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔پیچیدہ مسائل میں ان کی رائے اور فیصلے کو اہمیت دیتے تھے۔ان کے والد گرامی حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر ایک بار فرمایا:

''میں دیکھتا ہوں کہ امیر المؤمنین تمہیں خلوت میں بلاتے ہیں،تم سے مشورہ لیتے ہیں اور اکابر صحابہ پر تمہیں ترجیح دیتے ہیں۔میں تمہیں چار باتوں کی نصیحت کرتا ہوں: کبھی ان کا راز فاش نہ کرنا۔کبھی وہ تم سے جھوٹ سننے نہ پائیں۔ان کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرنا۔ان کی خیر خواہی کی بات ان سے کبھی مت چھپانا۔''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ہر ایک بات کو ہزاروں نصیحتوں سے زیادہ اہمیت دی اور خلفائے راشدین کے مشیرِ خاص رہے۔[2]

ایک بار کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے گلہ کیا کہ''آپ ابن عباس کو شریک کرتے ہیں،ہمارے بچوں کو نہیں؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''وہ نوجوان ہونے کے باوجود پختہ فکر،ذہین اور دور اندیش ہے۔''[3]

اکابر صحابہ ان کی صلاحیتوں کے قائل تھے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے:''اگر وہ ہمارے ہم عمر ہوتے تو ہم میں سے کوئی ان کی برابری نہ کرسکتا۔''یہ بھی فرماتے:''قرآن مجید کے بہترین مفسر ابن عباس ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اِنَّهٗ لَغَوَّاصٌ. ''وہ علم کے سمندر سے موتی نکالنے والے ہیں۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:''عبداللہ بن عباس حج کے مسائل سب سے زیادہ جانتے ہیں۔''

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:''میں نے ابن عباس جیسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔''

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے:''عبداللہ بن عباس علم کا سمندر تھے۔''

---

1. الاصابۃ: ۱۲۷/۴
2. عیون الاخبار لابن قتیبۃ الدینوری: ۷۳/۱، ط دار الکتب العلمیۃ
3. الاصابۃ: ۱۲۷/۴

مسروق رحمہ اللہ کہتے تھے: ''جب میں ان کا چہرہ دیکھتا تو کہہ اٹھتا: یہ حسن و جمال میں بے مثال ہیں۔ وہ گفتگو کرتے تو میں انہیں سب سے فصیح و بلیغ پاتا۔ جب حدیث بیان کرتے تو میں پکار اٹھتا کہ سب سے بڑے عالم ہیں۔''

اعمش رحمہ اللہ نے انہیں سورۂ نور کی تفسیر بیان کرتے سنا تو بے ساختہ بولے:

''اگر روم و فارس والے یہ بیان سن لیتے تو اسلام قبول کر لیتے۔''①

آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی معتمد مشیر رہے۔ دورِ خلافت میں جہادِ افریقہ میں شریک ہوئے۔ وہاں کے بادشاہ جُرجیر سے بات چیت کے لیے آپ کو بھیجا گیا۔ آپ کی عالمانہ باتوں اور فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر جُرجیر کہہ اٹھا: ''آپ عرب کے یکتائے روزگار عالم ہیں۔''②

۳۵ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے گھر کے محاصرے کے دوران انہی کو ہی امیرِ حج مقرر فرمایا۔③

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ ان کے دستِ راست رہے اور بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ علمائے بصرہ کہتے تھے کہ ہم نے انہیں حدیث، فقہ، تفسیر، شعر، ریاضی، علمِ میراث، سیرت و تاریخ سمیت تمام علمی کمالات میں بے نظیر پایا۔④

بصرہ میں آپ نے درس حدیث کا حلقہ قائم کیا، رمضان المبارک میں آپ کے پاس دورۂ فقہ کے لیے ذی استعداد طلبہ کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ مہینہ گذرنے سے پہلے آپ انہیں فقیہ بنا دیتے تھے۔⑤

درس کا انداز بڑا ہی دل آویز ہوا کرتا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث سنتا تھا۔ وہ اس عالمانہ اور والہانہ انداز سے حدیث سناتے کہ اگر وہ اجازت دیتے تو میں ان کے سر کو بوسہ دے دیتا۔''⑥

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ مدینہ تشریف لے گئے اور سیاسی امور سے لاتعلق ہو کر خود کو علومِ دینیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں آپ کا حلقۂ درس اتنا مقبول ہوا کہ ہر طرف سے شاگرد ٹوٹے پڑتے تھے۔

ان کے ایک شاگرد فرماتے تھے: ''وہ چند باتوں میں تمام لوگوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان سے پہلے جس قدر احادیث منقول ہوئی تھیں انہیں ان کا علم تھا۔ علمِ فقہ میں بھی ان کو برتری تھی۔ حلم اور بردباری میں، علمِ انساب میں اور تاویل و تفسیر میں سب سے فائق تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے فیصلوں کو ان سے زیادہ کوئی

---

① الاصابۃ: ۱۲۸/۳

② الاصابۃ: ۱۳۱/۳

③ تاریخ الطبری، ۳۵ھ

④ اسد الغابۃ: ۲۹۱/۳، ط العلمیۃ

⑤ الاصابۃ: ۱۲۹/۳

⑥ الاصابۃ: ۱۲۹/۳

نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک دن بیٹھتے تھے اور سوائے فقہ کے اس دن کچھ بیان نہیں کرتے تھے، ایک دن ان کا موضوع سخن صرف تفسیر ہوا کرتا تھا، ایک دن ان کی مجلس کا موضوع صرف اشعار ہوا کرتے تھے، ایک دن ان کا موضوع تاریخ عرب ہوتا تھا۔ ①

آخری چند سالوں میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے سیاسی اختلاف کی بناء پر آپ طائف منتقل ہو گئے اور وہیں ۶۸ھ میں انتقال فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۱ برس تھی۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ②

سیاسی معاملات میں آپ کا محتاط اور فعال کردار گزشتہ اوراق میں خاصی تفصیل سے سامنے آچکا ہے۔ اس لیے اس پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

رضی اللّٰہ عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① اسد الغابہ: ۲۹۱/۳

② الاصابہ: ۱۲۵/۴ تا ۱۳۲

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ کے ان جلیل القدر علماء وفقہاء صحابہ میں سے ایک ہیں جن کی سیرت و حالات اور افعال واقوال کو حجت مانا گیا ہے۔نسب کے لیے یہی شرف کافی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دوسرے سال پیدا ہوئے تھے۔ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بارہ سال کے تھے۔گھر کا ماحول دین پر مرمٹنے کا تھا۔عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پوری طرح اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

لڑکپن ہی سے آپ کی ذہانت اور فقاہت کے جوہر کھلنے لگے تھے۔ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے سوال کیا کہ وہ کون سا درخت ہے جو مؤمن بندے کے مشابہ ہے، ہمیشہ تازہ رہتا اور پھل دیتا رہتا ہے؟

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سمیت سبھی خاموش رہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''وہ کھجور کا درخت ہے۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے۔بعد میں اپنے والد کو دل کی بات بتائی تو وہ بولے:

''اگر تم جواب بتادیتے تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوتی۔''[2]

علمی مزاج کے باوجود مجاہدانہ جوش وخروش میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔غزوۂ بدر اور اُحد دونوں میں شریک ہونے کے لیے اپنا نام پیش کیا۔بدر میں ان کی عمر تیرہ اور اُحد میں چودہ سال تھی اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبول نہ کیا۔ غزوۂ خندق میں پندرہ سال کے ہو چکے تھے اس لیے شرکت کی اجازت مل گئی۔[3] اس کے بعد ہر غزوے میں شریک ہوتے رہے۔صلح حدیبیہ میں بھی شامل تھے۔[4] اٹھارہ سال کی عمر میں موتہ کی ہولناک لڑائی میں شرکت کی۔[5]

فتح مکہ کے وقت بیس سال کے بھرپور نوجوان تھے اس لیے مکمل اسلحہ زیب تن کر کے صف اول میں شامل ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ میں داخل ہونے کا اعزاز بھی پایا۔[6]

① طبقات ابن سعد: ۱۴۲/۴ ط صادر، ترجمۃ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

② صحیح البخاری، ح: ۱۳۱، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم

③ صحیح ابن حبان، ح: ۴۷۲۷

④ صحیح البخاری، ح: ۴۱۸۶، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ

⑤ صحیح البخاری، ح: ۴۲۶۱، کتاب المغازی، باب غزوۃ موتۃ

⑥ صحیح البخاری، ح: ۴۲۸۹، کتاب المغازی، باب دخول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اعلیٰ مکۃ

اس کے بعد غزوات اور مختلف سرایا میں شامل رہے۔[1]

نوجوانی میں گھڑ دوڑ کے بھی شوقین تھے، حضور ﷺ مدینہ میں گھڑ دوڑ کے مقابلے کراتے تھے، عبداللہ بن عمر کا ان مقابلوں میں شرکت کرنا بھی ثابت ہے۔[2]

شکل وصورت میں اپنے والد سے بہت ملتے جلتے تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ بلند قامت اور بھاری بھرکم تھے۔ ڈاڑھی ایک مشت تھی اور زلفیں کندھوں تک۔ اکثر سادہ اور کبھی کبھار بیش قیمت لباس زیب تن کرتے۔ کرتا، شلوار اور سیاہ عمامہ عام لباس تھا۔[3]

عبادت وریاضت کے لحاظ سے بھی آپ کی زندگی قابلِ رشک تھی۔ نوجوانی ہی سے زاہدانہ طبیعت پائی تھی۔ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو عام طور مسجد ہی میں رہتے اور وہیں سو جاتے۔ ایک بار ایک ڈراؤنا خواب دیکھا اور اپنی بہن ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو سنایا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے تعبیر پوچھی تو آپ نے فرمایا: ''عبداللہ اچھا آدمی ہے اگر رات کو نوافل بھی پڑھے تو خوب ہو۔'' اس کے بعد انہوں نے کثرتِ نوافل اور تہجد کو لازم کر لیا۔[4]

اپنے والد کے دورِ خلافت میں انہوں نے مجاہد کی زندگی گزاری، یرموک اور مصر کی جنگوں میں شریک رہے۔[5]

جوانی کے ساتھ ہی ان کی دینی بصیرت نمایاں ہوتی جارہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاتلانہ حملے میں زخمی ہونے کے باوجود آخری وقت تک جانشین کا اعلان نہ کیا تو لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والد کی ہیبت کے سبب عام طور پر ان کے سامنے چپ ہی رہتے تھے مگر یہ دیکھ کر ہمت کر کے ان کے پاس گئے اور کہا:

''اگر آپ کے اونٹوں یا بکریوں کا چرواہا ریوڑ کو یونہی چھوڑ کر چلا آئے تو آپ یہی سمجھیں گے کہ اس نے سب کچھ ضائع کر دیا ہے۔ تو لوگوں کی نگہبانی کہیں زیادہ اہم معاملہ ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کا وزن محسوس کر لیا۔[6]

اس گفتگو کے بعد انہوں نے اپنے خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ رکنی شوریٰ ترتیب دی۔[7]

خلیفہ دوم کے فرزند ہونے کے باوجود وہ از خود عہدوں سے کنارہ کش رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں انہیں قاضی بنائے جانے کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ البتہ ایک عام مجاہد کی حیثیت سے ۲۷ھ میں افریقہ اور ۳۰ھ میں خراسان وطبرستان کی مہمات میں شریک رہے۔[8] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں پیش پیش رہے اور انہیں ہمت دلاتے رہے کہ وہ باغیوں کا مطالبہ نہ مانیں اور خلافت سے ہرگز دست بردار نہ ہوں۔[9]

---

① الاستیعاب: ۹۵۱/۳

② صحیح البخاری، ح: ۴۲۰، کتاب الصلوٰۃ، باب هل یقال مسجد بنی فلان

③ طبقات ابن سعد: ۱۴۵/۴، ۱۷۴، ۱۷۵ ط صادر

④ صحیح البخاری، ح: ۱۱۲۱، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل قیام اللیل

⑤ اسد الغابۃ: ۳۳۶/۳، ط العلمیۃ

⑥ صحیح مسلم، ح: ۴۸۱۸، کتاب الامارۃ، باب الاستخلاف وترکہ ⑦ صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰، کتاب المناقب، باب قصۃ البیعۃ

⑧ فتوح البلدان، ص ۲۲۴، ط الهلال، تاریخ الطبری: ۲۶۹/۴ ⑨ طبقاتِ ابن سعد: ۲۶/۳، صادر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے والد کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ کے ساتویں رکن تھے۔ اپنی شرافتِ نسبی، حضور ﷺ سے رشتہ داری اور علم وتقویٰ کے لحاظ سے وہ بہت بلند مقام پر تھے۔ اور ایک محبوب ومقبول ترین خلیفہ کے بیٹے تھے، اس لحاظ سے وہ اُمتِ مسلمہ کی سیاست میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے تھے اور مسلمانوں کی خاصی تعداد آپ کی خلافت پر متفق ہو سکتی تھی مگر آپ نے کبھی ایسا نہ سوچا۔ فتنہ باز لوگ چاہتے تھے کہ آپ بھی سیاست کے اکھاڑے میں آجائیں۔ کبھی کبھار مخلص حضرات یہ پیش کش کرتے مگر آپ کی پاک بازی اور دوراندیشی نے ہمیشہ ایسی ترغیبات کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ابن عمر رضی اللہ عنہ عمر بھر کسی بھی سیاسی کش مکش کا حصہ بننے سے دور رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کچھ لوگوں نے انہیں ترغیب دی کہ وہ خلیفہ بن جائیں اور کہا:

''آپ امیر بن امیر ہیں، ہم سے بیعت لے لیں۔''

مگر آپ کا جواب تھا: ''میں اپنے لیے ایک مچھر کا خون بھی نہیں بہنے دوں گا۔''[1]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں کسی نے ان سے کہا: ''سب لوگ ختم ہو چکے ہیں، آپ صحابیِ رسول اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ میدان میں کیوں نہیں آتے؟''

فرمایا: ''اللہ نے بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ اس لیے میدان میں نہیں آتا۔''

کسی نے کہا: ''اللہ تو کہتا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ.

''اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا رہ جائے۔''[2]

فرمایا: ''یہ اس وقت کا حکم تھا جب کفار مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ یہی فتنہ تھا جسے روکنے کے لیے جہاد کا حکم ہوا۔ تو بے شک ہم لڑتے رہے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور اللہ ہی کا دین باقی رہ گیا۔ تم لوگ اس لیے لڑنا چاہتے ہو کہ فتنہ پیدا ہو اور اللہ کا دین ختم ہو جائے۔''[3]

آپ تفسیر، حدیث اور فقہ کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ سے منقول احادیث کی تعداد ۲۶۳۰ ہے۔ قرآن مجید کو بہت غور وتدبر کے ساتھ سیکھا تھا۔ سورۃ البقرہ کے علوم حاصل کرنے میں چودہ سال لگائے تھے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ تقریباً ۶۳ برس زندہ رہے۔ اس طویل مدت میں آپ کا زیادہ تر مشغلہ روایتِ حدیث اور افتاء ہی کا تھا۔ اسی لیے کبھی کوئی منصب قبول نہ کیا کہ کہیں اس مبارک مشغلے میں کمی نہ آجائے۔

ہر سال حج کے لیے جاتے تھے اور عمرے کا سفر بھی ہوتا رہتا تھا۔ موسمِ حج میں پوری دنیا سے طلبۂ حدیث آتے جن میں جلیل القدر تابعین بھی ہوتے، آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔[4]

① ''انک سید الناس وابن سید فاخرج لنبایعک الناس.'' (طبقات ابن سعد: ۱۵۱/۴، ط صادر)

② سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۹۳

③ صحیح البخاری، ح:۴۵۱۳، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، باب قولہ: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

④ اسد الغابہ: ۳۳۶/۳

مدینہ میں آپ کی مجلس مستقل حلقۂ درس کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے کسی نہ کسی مناسبت سے کوئی نہ کوئی حدیث یا آیت سناتے رہتے تھے۔ صرف زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر آپ سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ آپ کی زندگی ہزارہا احادیث پر مشتمل ایسی ایک چلتی پھرتی تصویر تھی جسے کچھ دیر دیکھ لینا سالہا سال درسِ حدیث سننے کے برابر تھا۔ صحابہ و تابعین برملا کہتے تھے کہ ان کا کوئی کام سرِ مو سنتِ نبویہ سے ہٹ کر نہیں ہوتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی کیفیات کی پابندی کوئی بھی ان جیسی نہیں کر سکا۔ ①

ان کے خاص شاگرد نافع رحمہ اللہ جنہوں نے ان سے تیس برس تک استفادہ کیا، اپنے شاگردوں کو کہتے تھے کہ اگر تم عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو سنن و آثار کی تلاش اور پیروی میں منہمک دیکھتے تو انہیں دیوانہ سمجھتے۔ ②

اس دور کے نیک لوگ دعا کیا کرتے تھے کہ الٰہی! ہماری زندگیوں میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کو زندہ رکھ کہ ان سے زیادہ سنت کا واقف کار اور کوئی نہیں۔ ③

احادیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں من وعن سنانا ضروری سمجھتے تھے۔ کسی نے حدیث سنائی:

"مثل المنافق کشاۃ بین ربیضتین..... (منافق اس بکری جیسا ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان ہو۔)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً ٹوک دیا اور کہا: "کشاۃ بین غنمین." حالاں کہ ربیضتین اور غنمین کا مطلب ایک ہی ہے یعنی دو ریوڑ۔ ④ اسی لیے محدثین ان کی روایت پر پورا اعتماد کرتے تھے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تقریباً پندرہ برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا پورا دور آپ کے سامنے تھا۔ کم از کم تیس برس اپنے والد ماجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحبت پائی۔ ان کے بعد بارہ برس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی استفادہ کیا۔ جب آپ کے علوم کا چرچا ہوا تو حضرت نافع رحمہ اللہ نے آپ کے ساتھ تیس برس گزارے اور اس علم کو جذب کیا۔ پھر امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے لگ بھگ بارہ سال حضرت نافع رحمہ اللہ سے استفادہ کیا۔ یہ تینوں بزرگ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، نافع اور امام مالک رحمہما اللہ زندگی بھر مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے جہاں کا علم سب سے زیادہ خالص تھا۔ اس لیے محدثین ان کی سند کو سلسلۃ الذہب (طلائی زنجیر) کہا کرتے ہیں۔

علماء کا اتفاق ہے کہ کتبِ حدیث میں سب سے اعلیٰ سند یہ ہے: "مالک عن نافع عن ابن عمر."

مؤطا مالک جسے صحیح بخاری کے بعد صحتِ متن و سند میں دوسرا درجہ حاصل ہے، زیادہ تر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایات پر مشتمل ہے جن میں سے بہت بڑا حصہ اسی سند پر مشتمل ہے۔

① سیر اعلام النبلاء: ۳/۲۱۱ تا ۲۱۳، ط الرسالۃ

② عن نافع: لو رأیت ابن عمر یتبع آثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقلت: ھذا مجنون." (مستدرک حاکم، ح: ۶۳۷۶)

③ طبقات ابن سعد: ۴/۱۴۴، ط صادر، تذکرۃ عبداللہ بن عمر

④ مسند احمد، ح: ۴۸۷۲

حدیث کے ساتھ فقہ اور افتاء میں بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ فقہ مالکی کا زیادہ تر دارومدار آپ ہی کے فتاویٰ پر ہے۔ امام مالک فرماتے تھے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ساٹھ سال تک فتاویٰ دیتے رہے۔۔ ان فتاویٰ اور فقہی آراء کو جمع کریں تو ایک بڑا مجموعہ مرتب ہو جائے گا۔ ان کا بڑا حصہ مؤطا مالک اور مسند احمد میں موجود ہے۔ بعض اکابر کی رائے تھی کہ اکیلے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایات اور فتاویٰ پورے دین کے علم کے لیے کافی ہیں۔ [1]

آپ کو شعروادب اور تاریخ میں دلچسپی نہیں تھی۔ علومِ دینیہ ہی آپ کے لیے راحتِ جان تھے۔ باقی شعروادب آپ کی نگاہ میں نہیں جچتے تھے، تاہم کبھی کبھار بر سبیلِ تذکرہ کوئی شعر آپ کی زبان پر آ بھی جاتا تھا۔ [2]

رات کا بڑا حصہ نوافل پڑھا کرتے تھے۔ [3] روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ [4]

ثواب کمانے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے تھے۔ گھر سے وضو کر کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر مسجد کی طرف جاتے کہ ہر قدم پر اجر کا وعدہ ہے تو جتنے زیادہ قدم ہوں گے اتنا زیادہ ثواب ملے گا۔ [5]

ہر سال بلاناغہ حج کرتے تھے، حتیٰ کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف حجاج بن یوسف کے حملے کے دوران آنے والا حج بھی نہیں چھوڑا۔ [6] یہ سوچ کر پہلے عمرے اور پھر حج کا احرام بھی باندھ لیا کہ اگر حرم تک پہنچنے میں ناکامی ہوئی تو صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرہ کیے بغیر احرام کھول دینے سے مشابہت ہو جائے گی۔ [7]

سنت کی پابندی میں آپ عاشقانہ اور والہانہ ذوق رکھتے تھے۔ [8] حج کے لیے جاتے تو راستے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں پڑاؤ ڈالا بالکل اسی جگہ پر اترتے۔ جہاں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، یہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ [9]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعوت قبول کیا کرتے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی دعوت قبول کیا کرتے تھے چاہے نفلی روزہ ہی کیوں نہ ہو، میزبان کے ہاں کھانا نہ کھاتے مگر حاضری ضرور دے دیا کرتے تا کہ سنت ادا ہو جائے۔ [10]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں آپ نے ان سے بیعت کر لی تھی مگر عملاً غیر جانب دار رہے۔ مگر بعد میں آپ نے جو حالات دیکھے، ان کے تحت آپ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ فتنہ وفساد کے وقت غیر جانب داری سے بہتر ہے کہ

---

① عن یحییٰ بن یحییٰ قلت لمالک: "أسمعت المشایخ من اخذ بقول ابن عمر لم یدع من الاستقصاء شیئا ؟" قال نعم (الاصابۃ: ۱۵۹/۴)

② المبسوط للسرخسی: ۶/۴، ط المعرفۃ

③ صحیح البخاری، ح: ۱۱۲۲، باب فضل قیام اللیل

④ وفیات الاعیان: ۴۴۰/۱ ؛ اسد الغابۃ: ۳۳۶/۳

⑤ طبقات ابن سعد: ۱۵۴/۴، ط صادر

⑥ اخبار مکۃ للفاکھی: ۳۴۳/۲، ط دار خضر

⑦ صحیح البخاری، ح: ۱۸۰۶، کتاب المناسک، باب اذا احصر المعتمر ؛ ح: ۱۸۱۳، باب من قال لیس علی المحصر بدل

⑧ مستدرک حاکم، ح: ۶۳۷۶

⑨ الاصابۃ: ۱۶۰/۴

⑩ صحیح مسلم، ح: ۳۵۸۹، کتاب النکاح، الامر باجابۃ الداعی

خلیفۂ برحق کا ساتھ دیا جائے۔ اس لیے آپ فرماتے تھے:

''میں نے ہاتھ روک کر رکھا، اور آگے نہ بڑھا مگر حق کے لیے لڑنے والا افضل ہے۔''[1]

ایک بار آپ نے قرآن مجید کی آیت: فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ.[2] کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے کسی بات کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ میں نے باغی گروہ سے قتال نہیں کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا تھا۔''[3]

آپ رضی اللہ عنہ کی اصابتِ رائے کا یہ حال تھا کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو جنگِ جمل کے بعد اپنی خطائے اجتہادی پر سخت نادم تھیں، ایک بار عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگیں: ''ابوعبدالرحمٰن! آپ کو کیا ہوا تھا کہ آپ نے مجھے اس سفر سے منع نہ کیا؟'' انہوں نے عرض کیا: ''میں نے دیکھا کہ زبیر رضی اللہ عنہ آپ کی رائے پر غالب آ چکے تھے۔''

ام المؤمنین نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اگر آپ مجھے منع کر دیتے تو میں کبھی (اس سفر پر) نہ نکلتی۔''[4]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت کی مجلس میں آپ شریک تھے۔ چونکہ آپ امت کو فتنہ وفساد سے بچانا چاہتے تھے اس لیے یزید کے دور میں کچھ توقف کے بعد اس کی بھی بیعت کر لی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے اس لیے رکے رہے کہ ان کے اور عبدالملک کے مابین جنگ جاری تھی اور نتیجہ غیر واضح تھا۔ آپ کسی کی طرف جھکاؤ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور اس کش مکش کو فتنہ تصور کرتے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے عبدالملک مروان سے بیعت کر لی۔ عبدالملک بن مروان آپ کا احترام کرتا تھا۔ اس نے حجاج بن یوسف کو تاکید کی تھی کہ حج کے مناسک میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کرنا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر آپ سخت غمگین ہوئے۔ حجاج نے ان کے معائب بیان کرنا شروع کیے تو آپ برداشت نہ کر سکے اور عام مجمعے میں حجاج کے منہ پر اس کی تردید کی۔ اس حق گوئی نے حجاج کو ان سے متنفر کر دیا۔ ۷۳ھ کے حج میں آپ کسی نامعلوم آدمی کا زہریلا نیزہ لگ جانے سے زخمی ہوئے اور یکم محرم ۷۴ھ کو اسی زخم سے انتقال کر گئے۔ عام خیال یہ تھا کہ قتل کی سازش حجاج نے کی ہے۔[5]

وفات سے پہلے اپنے بیٹے سالم کو کہا: ''بیٹا! میں مرجاؤں تو مجھے حدودِ حرم سے باہر دفن کرنا، مجھے گوارا نہیں کہ جس جگہ سے ہجرت کر چکا ہوں، وہاں دفن کیا جاؤں۔''

صاحبزادے کہنے لگے: ''ابا جان! ممکن ہوا تو ضرور کروں گا۔''

آپ ناراض ہو کر بولے: ''میری بات سن کر تم کہہ رہے ہو کہ ممکن ہوا تو کروں گا۔''

---

[1] كففت يدي فلم اقدم والمقاتل على الحق افضل. (الاستيعاب: ۳/۹۵۱)

[2] پھر ان میں سے اگر ایک جماعت زیادتی کرے دوسری پر تو لڑو اس جماعت سے جو زیادتی کر رہی ہے۔ (سورۃ الحجرات، آیت: ۹)

[3] مستدرک حاکم، ح: ۳۷۲۲، قال الذهبي: على شرط البخاري و مسلم.

[4] "اما انك لو نهيتني ما خرجت." (الاستيعاب: ۳/۹۱۰، رواه ابن عبدالبر باسناده ؛ تاريخ دمشق: ۳۱/۱۱۰)

[5] سير اعلام النبلاء: ۳/۲۰۲ تا ۳۲۲، ط الرسالة

وہ بولے: ''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ حجاج زبردستی کرے گا اور وہی جنازہ پڑھائے گا۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

آپ کی وفات ہوگئی تو حجاج نے دخل اندازی کی اور وصیت کے خلاف آپ کو حدودِ حرم ہی میں دفن کرادیا۔[1]

رضی اللہ عنہ وارضاہ

☆☆☆

دورِ فتن اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا نقطۂ نظر

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دورِ فتن کے سیاسی معاملات میں کس کے ساتھ تھے؟ وہ کسے قصوروار اور کسے برحق تصور کرتے تھے؟ یہ سوالات آج کل بڑی شدت سے اٹھائے جا رہے ہیں۔ چونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت غیر متنازعہ رہی ہے اور ہر طبقہ ان کی عزت کرتا اور ان کے اقوال وفتاویٰ سے استفادہ کرتا آیا ہے، اس لیے ہر طبقے کی کوشش یہی رہی ہے کہ انہیں اپنا ہم فکر ثابت کیا جائے۔ چنانچہ بعض حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اموی حکام کو بے دین یا منافق سمجھتے تھے۔ بعض حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بنوامیہ کی حکومت خلافتِ راشدہ سے کم نہ تھی اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حسرت تھی کہ کاش! بنوامیہ کے مخالف باغیوں سے جہاد کی سعادت مل جاتی۔ غرض ہر کسی کی طے شدہ رائے ہے جسے صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے پیش کرتا ہے۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم غیر جانبداری کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی فکر ونظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ لہٰذا ہم ان متضاد دعووں اور ان کے دلائل کی تردید میں پڑنے کی بجائے حقائق جاننے کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سیاسی تصورات کا جائزہ لیتے ہیں۔ کوشش ہوگی کہ حتی الامکان صحیح الاسناد روایات پر بھروسہ کیا جائے۔ ہم اس گفتگو کا آغاز صحابہ کرام کی ایک مشترکہ مجلس کے واقعے سے کرتے ہیں جس سے نہ صرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بلکہ بعض دیگر اکابر صحابہ کے سیاسی تصورات پر بھی روشنی پڑتی ہے:

ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت اکٹھی ہوئی جس میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم تھے۔ انہوں نے دورِ فتن کا تذکرہ کیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اگر میں نے وہ زمانہ پالیا تو مجھے معلوم ہوگا کہ اس سے نجات کی راہ کیا ہے۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے وہ زمانہ پایا تو مجھے نجات کی راہ معلوم نہیں ہوگی۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں اس زمانے میں ہوا اور مجھے کوئی ایسی تلوار مل گئی جو بتائے کہ یہ مؤمن ہے، اور وہ کافر، تب تو لڑوں گا ورنہ نہیں۔'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

---

[1] طبقات ابن سعد: ۱۸۷/۴ ط صادر

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ’’مجھے وہ زمانہ ملا تو میں اپنی تلوار اٹھا کر کاندھے پر رکھوں گا، پھر اُمت کی بڑی جماعت میں شامل ہو جاؤں گا، پھر وہ تلوار چلاؤں گا یہاں تک کہ (مخالف جماعت) بکھر جائے۔‘‘[1]

حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے دور میں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کش مکش میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جنگِ جمل اور صفین کے اثرات نے اُمت کو دو متحارب طبقوں میں بانٹ دیا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس دور ان اس طبقے میں شامل رہے جو فریقین میں سے کسی کے ساتھ نہ تھا۔[2] اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حضرات کی عملی تائید میسر نہ ہونے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قوت وشوکت کو نقصان پہنچا۔[3]

جب اہلِ عراق اور اہلِ شام کا اختلاف عروج پر پہنچا تو جنگِ صفین برپا ہوئی، اس کے بعد صلح کی کوشش کے لیے مجلسِ تحکیم منعقد ہوئی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس موقع پر غیر جانبدار وفد میں شامل ہو کر مجلسِ تحکیم میں گئے۔[4] جب تحکیم کی گفتگو بے نتیجہ رہی تو اُمت کے اکابر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا مشورہ کرنے لگے۔ بلاشبہ وہ اس مرتبے پر تھے کہ اُمت انہیں خلیفہ چن لیتی۔ مگر اللہ نے انہیں جتنا بڑا مقام دیا تھا اتنا ہی اعلیٰ ظرف بھی عنایت کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک مثالی اسلامی حکومت یا خلافت کا مفہوم ایسا نظام تھا جس میں اُمت اپنی خوشی اور اتفاقِ رائے سے کسی کو حکمرانی کے لیے پسند کرلے۔ مسلمانوں کی ناگواری کے باوجود حکمرانی حاصل کرنے کی کوشش کرنا ان کے نزدیک ایک غلط طریقہ تھا، جسے وہ نہ تو اپنے لیے پسند کرتے تھے نہ دوسروں کے لیے۔

---

[1] مسند الحارث: ۲/۷۵۹، روایت نمبر: ۷۵۵، اسنادہ صحیح مرسل

[2] عام خیال یہی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرے سے بیعت نہیں کی تھی؛ کیوں کہ علاوہ غیر جانب دار تھے۔ بیعت کرنے والوں میں مراحلین کا نام نہیں ملتا، جبکہ واقدی کی ایک روایت میں بیعت نہ کرنے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا گیا ہے۔ (تاریخ طبری: ۴/۴۳۰، ۴۳۱)
تاہم غالب ظن یہ ہے کہ جن روایات میں مہاجرین وانصار کی عمومی بیعت کا بلا استثناء ذکر ہے، ان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔
بایعہ طلحة والزبیر وسعد بن ابی وقاص وسعید بن عمرو بن نفیل وعمار بن یاسر واسامة بن زید وسهل بن حُنَیف وابو ایوب الانصاری ومحمد بن مسلمه وزید بن ثابت وخزیمة بن ثابت وجمیع من کان بالمدینة من اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ (طبقات ابن سعد: ۳/۳۱ صادر) عن محمد بن الحنفیة: دخل المهاجرون والانصار فبایعوه، ثم بایعه الناس. (تاریخ الطبری: ۴/۴۲۷) حتی قتل عثمان رضی اللہ عنہ بایع الناس علیّ بن ابی طالب. (مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۰ بسند صحیح مرسل) فبایعته العامة (تاریخ طبری: ۴/۴۳۳) فقال الجمهور: علی بن ابی طالب، نحن به راضون. (تاریخ طبری: ۴/۴۳۲)
رہی واقدی کی روایت تو اس کی قوت کچھ زیادہ نہیں۔ اس لیے غالب ظن ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے نفسِ بیعت کرلی تھی مگر عملی طور پر نصرت سے کنارہ کش رہے جیسا کہ اور بھی بہت سے صحابہ اور تابعین نے احتیاطاً یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ امام ابوبکر ابن العربی لکھتے ہیں:
کانت العثمانیة تخلف عنه من الصحابة جماعة منهم سعد بن ابی وقاص و محمد بن مسلمة وابن عمر واسامة بن زید وسواهم من نظرائهم. قلنا: اما بیعته فلم یتخلف عنها واما نصرته فتخلف عنها قوم منهم من ذکرتم لانها کانت مسئلة اجتهاد
’’عثمانی (ناصبی) کہتے ہیں کہ حضرت علی کی بیعت سے صحابہ کی ایک جماعت نے گریز کیا جن میں سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید اور ان کے علاوہ ان جیسے حضرات تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ بیعت سے تو پیچھے نہیں رہے تھے، ہاں نصرت سے کچھ لوگوں نے گریز کیا جن میں وہ بھی ہیں جن کا تم نے ذکر کیا اس لیے کہ یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔‘‘ (العواصم من القواصم، ص ۱۵۰)

[3] اگرچہ یہ حضرات اپنی قطعی رائے کی وجہ سے معذور تھے؛ کیوں کہ یہ ان احادیث کو دیکھ رہے تھے جن میں فتنے کے وقت گوشہ نشینی کا حکم دیا گیا ہے۔

[4] البدایة والنهایة: ۱۰/۵۷۰، ۵۷۱؛ تاریخ الطبری: ۵/۶۷ تا ۷۱

اسی لیے جب تحکیم کی مجلس میں انہیں خلافت کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے فرمایا:

"وَلَا أُعطیٰ وَلَا اَقْبَلُهَا اِلَّا عَنْ رِضًی مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ."

(یہ عہدہ مجھے دیا جاسکتا ہے نہ میں اسے قبول کرسکتا ہوں، سوائے اس کے کہ امتِ مسلمہ اس پر راضی ہوجائے۔)[1]

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "قریب تھا کہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے حضرات کی موجودگی کے باوجود اس دن ان کی بیعت منعقد ہوجاتی۔ اور اگر ان کی بیعت کی جاتی تو دو فرد بھی ان پر اختلاف نہ کرتے۔"[2]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اچھی حکمرانی کا معیار:

دراصل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا نظریہ یہی تھا کہ حکمرانی مثالی طریقے سے قائم ہونی چاہیے۔ اس میں اقتدار کی سعی اور طلب کا تاثر نہیں ہونا چاہیے۔[3] نیز وہ یہ بھی ذہن رکھتے تھے کہ سیاسی امامت، اُمت کے افضل اور بہترین فرد کو ملنی چاہیے تاکہ اختلافِ رائے کا امکان کم سے کم ہو جیسا کہ نماز کی امامت میں شرعی مسئلہ یہی ہے۔[4]

اسی لیے جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کوشش اور تدبیر میں غالب آکر حکمران بنے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اُمت کی مصلحت کی خاطر اقتدار چھوڑا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس تبدیلی پر خوش نہیں تھے[5] مگر انہوں نے اُمت کو فساد سے بچانے کے لیے بیعت کرلی۔[6]

یہی نہیں بلکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے خلافت کے افتتاحی خطبے میں گزشتہ حکمران پر جو تعریض کی گئی تھی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس پر برافروختہ ہونے کے باوجود خاموش رہے تاکہ اتفاق میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو۔[7]

---

[1] حلیة الاولیاء: ۱/۲۹۴ باسناد صحیح، ط السعادة

[2] کاد ان تنعقد البیعة له یومئذ مع وجود مثل الامام علی، وسعد بن ابی وقاص، ولو بویع لما اختلف علیه اثنان. (سیر اعلام النبلاء: ۳/۲۲۷)

[3] یعنی افضل طریقہ یہی ہے کیوں کہ کئی احادیث میں منصب طلب کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ اگرچہ ہنگامی حالات میں اس کی گنجائش بھی ہے جیسا کہ: "اجعلنی علی خزائن الارض" کے تحت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ مع شرائط تفصیل سے لکھا ہے۔ (معارف القرآن، سورۂ یوسف، آیت: ۵۵)

[4] قال الحافظ ابن حجر: ورأی ابن عمر بخلاف ذالک وانه لا یبایع المفضول الا خشی الفتنة.
"ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اس کے برخلاف یہ تھی کہ کم فضیلت والے کی بیعت نہیں کی جانی چاہیے سوائے اس صورت کے جب فتنے کا خدشہ ہو۔"
(فتح الباری: ۷/۴۰۴)

[5] صحیح البخاری، ح: ۴۱۰۸، کتاب المغازی، باب غزوۃ خندق

[6] قال ابن حجر: ولهذا بایع بعد ذالک معاویة ثم ابنه یزید، ونهی بنیه عن نقض بیعته.
"اسی لیے انہوں نے اس کے بعد معاویہ اور پھر ان کے بیٹے یزید کی بیعت کرلی اور اپنے لڑکوں کو اس کی بیعت توڑنے سے منع کیا۔"
(فتح الباری: ۷/۴۰۴)

[7] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس خطبے میں فرمایا تھا: "اب کوئی اس معاملے میں بولنا چاہے تو سر اٹھا کر بات کرے، ہم اس امر (خلافت) کے زیادہ حق دار ہیں اس سے اور اس کے باپ سے۔" ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کے لیے حرکت کی۔ میں انہیں کہنا چاہتا تھا کہ اس امر (اقتدار) کا زیادہ حق دار وہ ہے جو تم سے اور تمہارے والد سے اسلام کی خاطر جنگ لڑ چکا ہے لیکن میں اس وجہ سے کہتے کہتے رک گیا کہ کہیں اجتماعیت میں رخنہ نہ پڑ جائے اور خانہ جنگی نہ ہوجائے، میری بات کا کوئی اور مطلب نہ لے لیا جائے۔ پس میں نے جنت کے ثواب پر اکتفا کرلیا۔"
(صحیح البخاری، ح: ۴۱۰۸، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی مگر سیاسی معاملات سے بالکل یکسو رہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پھر بھی ان سے خدشہ تھا کہ کہیں وہ حکمرانی کی کوئی کوشش نہ کر بیٹھیں۔ انہوں نے اپنے اطمینان کے لیے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیجا تاکہ ان کے دل کو ٹٹولیں۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ان سے ملے اور فرمایا: ''ابوعبدالرحمٰن! آپ کو کس چیز نے لوگوں کے سامنے آکر ان کی بیعت لینے سے روک رکھا ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ آپ اس منصب کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا جو بات آپ کہہ رہے ہیں، اس پر سب متفق ہیں؟''

وہ کہنے لگے: ''ہاں! سوائے کچھ لوگوں کے۔''

فرمایا: ''اگر ہجر کے تین نصرانی بھی اختلاف کریں تو مجھے اس منصب کی کوئی ضرورت نہیں۔''[1]

اس تمام دور میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا سیاسی نظریہ یہی رہا کہ باغیوں سے قتال نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض بھی کرتے تھے۔ ایک شخص نے آکر کہا: ''آپ ایک سال حج اور ایک سال عمرہ کرتے ہیں۔ آپ نے جہاد چھوڑ ہی دیا۔ حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے اس کی کتنی ترغیب دی ہے۔''

فرمایا: ''اسلام کے پانچ ارکان ہیں: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان، پانچ نمازیں، رمضان کے روزے، زکوٰۃ کی ادائیگی اور بیت اللہ کا حج۔''

وہ کہنے لگا: ''آپ نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. [2]

فرمایا: ''اس آیت پر عار دلایا جانا اور نہ لڑنا مجھے پسند ہے۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ مجھے یہ آیت پڑھ کر عار دلائی جائے جس میں اللہ فرماتے ہیں: **وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا.** [3]

وہ شخص کہنے لگا: اللہ کا فرمان ہے: **وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ.** [4]

---

[1] لو لم يبق الا ثلاثة اعلاج بهجر لم يكن لي فيها حاجة. (طبقات ابن سعد: ۱۶۴/۴، ط صادر باسناد صحیح)

[2] اگر اہلِ ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرادو۔ پھر ان میں سے اگر ایک زیادتی کرے دوسرے پر تو تم لڑو اس سے جو زیادتی کرے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر لوٹ آئے تو ان کے درمیان صلح کراؤ عدل کے ساتھ اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (سورۃ الحجرات، آیت: ۹)

[3] اور جو کوئی بھی کسی مومن کو قتل کرے جان بوجھ کر تو اس کا بدلہ ہے جہنم، اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ (سورۃ النساء، آیت: ۹۳)

[4] اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے، اور دین کل کا کل اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے۔ (سورۃ الانفال، آیت: ۳۹)

فرمایا: ''ہم نے یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کرلیا جب مسلمان تھوڑے تھے۔ آدمی کو اس کے دین کی وجہ سے آزمائش میں ڈالا جاتا تھا۔ لوگ اسے قتل یا قید کردیتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمان بکثرت ہوگئے اور فتنہ نہ رہا۔''

وہ کہنے لگا: ''آپ حضرت عثمان اور علی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

فرمایا: ''علی اور عثمان کے بارے میں میرا قول بھلا کیا ہوسکتا ہے! عثمان کو اللہ نے معاف کردیا مگر تمہیں یہ گوارا نہیں کہ اللہ انہیں معاف کرے۔ علی تو رسول اللہ ﷺ کے چچازاد ہیں اور داماد ہیں۔ اور یہ رہا ان کا گھر، تم دیکھ سکتے ہو۔''[1]

ایک روایت کے مطابق کسی نے باغیوں سے جنگ میں حصہ نہ لینے پر آپ کو آیت "وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ" سنا کر تنقید کا نشانہ بنایا تو آپ نے فرمایا: ''تمہیں معلوم بھی ہے فتنہ کیا ہے؟ محمد ﷺ مشرکین سے قتال کرتے تھے اور مشرکین کے دین میں داخل ہونا فتنہ تھا۔ وہ تمہاری طرح بادشاہت کے لیے قتال نہیں تھا۔''[2]

یزید کی ولی عہدی کے متعلق آپ کی رائے:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یزید کی ولی عہدی کی اُس کوشش کے ہم نوا نہیں تھے جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری دور میں شروع کی تھی۔ کیوں کہ یزید نہ تو اُمت کے افضل افراد میں شامل تھا نہ ہی اس کی نامزدگی اکابرِ اُمت کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ نامزدگی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے تھی اور وہ چاہتے تھے کہ باقی حضرات ان کی تائید کریں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی فقہی رائے وہی تھی کہ غیر افضل شخص کی بیعت اس صورت میں کی جاسکتی ہے جب نہ کرنے میں فتنہ وفساد کا خطرہ ہو۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی ان کی طرف سے مخالفت کا خطرہ تھا۔ انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ ان کا انکار اہلِ حجاز کو ان کے خلاف کھڑا نہ کردے اور کوئی بغاوت نہ برپا ہوجائے جو سخت کشت وخون پر منتج ہو۔ چنانچہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے حجاز گئے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس وقت حج کے لیے مکہ جاچکے تھے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے پر مسجد نبوی کے منبر پر گفتگو کی اور ان کے منہ سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہاں تک نکل گیا: ''اللہ کی قسم! اگر وہ بیعت نہیں کریں گے تو میں انہیں قتل کردوں گا۔''[3]

بعد میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ انہوں نے اپنے تحمل وبرباری کے برخلاف غصے میں ایک سخت جملہ کہہ دیا ہے۔ مگر یہ بات تیزی سے پھیل کر مکہ پہنچ گئی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مکہ میں حضرت عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ یہ خبر سن کر کہنے لگے:

''کیا میں مُعاویہ کو چھوڑ دوں گا کہ وہ آپ کو قتل کریں؟ اللہ کی قسم! اگر صرف میں اور میرے گھر والے باقی رہ گئے تب بھی آپ کی حفاظت کے لیے لڑتے رہیں گے۔''

---

① یعنی بیعت رسول سے متصل گھران کا ہے، اس سے بڑھ کر قربت کیا ہوگی۔ صحیح البخاری، ح: ۴۶۵۰، کتاب التفسیر، باب قوله: وقاتلوهم حتی،

② صحیح البخاری، ح: ۷۰۹۵، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ الفتنة من قبل المشرق

③ واللہ لیبایعن او لاقتلنه. (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۳ باسناد صحیح)؛ طبقات ابن سعد: ۱۸۳/۴ باسناد صحیح متصل ط صادر

جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے مکہ کے قریب پہنچے تو عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ استقبال کرنے والوں کے ساتھ ان سے ملے اور پوچھا: ''کیا آپ ہی نے کہا ہے کہ ابن عمر نے آپ کے بیٹے کی بیعت نہ کی تو آپ انہیں قتل کر دیں گے؟ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں بھلا عبداللہ بن عمر کو قتل کروں گا؟ اللہ کی قسم! میں انہیں قتل نہیں کروں گا۔''[1]

اس کے بعد وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اور انہیں یزید کو ولی عہد مان لینے کی ترغیب دی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے تو میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا۔''[2]

دورِ یزید میں:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب یزید تخت نشین ہوا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اگر یہ خیر ہے تو ہم راضی ہیں۔ مصیبت ہے تو صبر کریں گے۔''[3]

اس دور میں انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو منع کیا کہ وہ کوفہ نہ جائیں کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ اس طرح کوئی نیا کھڑا ہو جائے گا۔[4]

انہوں نے یزید کی بیعت کو اس وقت تک ٹالا جب تک انہیں شرعی گنجائش ملی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یزید کے گورنر ولید بن عقبہ نے انہیں بلوا کر کہا: یزید کی بیعت کریں۔''

انہوں نے کہا: ''جب لوگ بیعت کر چکیں گے تو میں بھی کرلوں گا۔''

ایک شخص نے کہا: تم چاہتے ہو کہ لوگ اختلاف اور قتال کرتے کرتے ختم ہو جائیں، جب تمہارے سوا کوئی نہ بچے تو باقی لوگ تمہاری بیعت کرلیں؟ فرمایا: جو تم نے کہا، میں وہ نہیں چاہتا مگر جب لوگ بیعت کرلیں گے اور میرے سوا کوئی نہ بچے گا تو میں بھی بیعت کرلوں گا۔ اور یہ لوگ (بنوامیہ) ان سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔''[5]

---

[1] فخرج الیہ عبداللہ بن صفوان فقال انت الذی تزعم انک تقتل عبداللہ بن عمر، فقال: انا اقتل ابن عمر؟ انی واللہ لااقتلہ (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۵ باسناد صحیح)
یہاں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ قابلِ غور ہیں، انہوں نے جواباً جھوٹ نہیں بولا، تردید نہیں کی کہ میں نے تو ایسا نہیں کہا بلکہ یہ کہا ''میں انہیں قتل نہیں کروں گا۔'' مقصد یہ ہے یہ بالکل سچ تھا۔ سابقہ جملے ان کی زبان سے حالتِ غضب میں نکلے تھے۔ ایسے کسی اقدام کا عزم نہیں تھا۔ اگر بالفرض تھا تو وہ اس سے رجوع کر چکے تھے۔ پس یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ معاذ اللہ انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ یہ شرعی احتیاط اور ذہانت کی عمدہ مثال ہے کہ غلط بیانی کیے بغیر دوسروں کو مطمئن کر دیا۔

[2] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۳، ۲۱۴ باسناد صحیح

[3] ان کان خیراً رضینا، وان کان بلاء صبرنا۔'' (طبقات ابن سعد: ۱۸۲/۴ صادر؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۷ بسند صحیح)

[4] المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۵۹۷، رجالہ ثقات؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۳۰؛ تاریخ دمشق: ۲۰۲/۱۴؛ سیر اعلام النبلاء ۲۹۲/۳ عن الشعبی

[5] البدایۃ والنہایۃ ۴۶۹/۱۱، حافظ ابن کثیر اس کے بعد نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے بیعت کو مؤخر کیا، جب دوسرے شہروں سے یزید کی بیعت کی خبر آ گئی تو انہوں نے بھی بیعت کر لی۔ فلما جاءت البیعۃ من الامصار بایعا مع الناس (البدایۃ والنہایۃ: ۴۹۹/۱۱)

جنگِ حرہ سے پہلے انہوں نے اپنے متعلقین کو اسی لیے حکومت کے خلاف اٹھنے سے منع کیا۔[1]

دراصل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے وہ احادیث تھیں جن میں حکمرانوں کے خلاف خروج سے منع کیا گیا ہے چاہے وہ فاسق اور ظالم ہوں، تاوقتیکہ وہ کفرِ بواح کے مرتکب نہ ہوں۔ اسی لیے ان کا مسلک یہ تھا کہ کوئی حکمران اگر اُمت کی رضا و رغبت کے بغیر کسی بھی طریقے سے ریاست کو کنٹرول کر چکا ہو تو زمینی حقیقت کے مطابق وہ حکمران ثابت ہو جاتا ہے اور ایسے میں شرعاً اس کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور ایسی کوشش کرنے والا گروہ بہرحال باغی ہی ثابت ہوگا۔[2]

کسی نے ان سے تمام علم نقل کرانے کی درخواست کی تو فرمایا: ''علم تو بہت ہے مگر اگر ہو سکے تو یہ کرلو کہ اللہ سے اس حال میں ملو کہ تمہاری پشت پر لوگوں کے خون کا بوجھ نہ ہو، تمہارے پیٹ میں لوگوں کا مال نہ ہو، تمہاری زبان لوگوں کی بے عزتی سے محفوظ ہو اور تم نے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑ رکھا ہو تو ایسا ضرور کرو۔''[3]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور بنوامیہ کی کش مکش کے دور میں:

اس دوران ابتداء میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ذاتی عمل سیاسی تنازعات سے لاتعلقی ہی کا تھا۔

البتہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''الفئۃ الباغیۃ'' سے قتال میں حصہ نہ لینے پر افسوس کرتے تھے۔

اس بارے میں تین طرح کی روایات ہیں:

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ''الفئۃ الباغیۃ''، اہلِ شام کا گروہ تھا (جب وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کھڑے ہوئے تھے)۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ''الفئۃ الباغیۃ''، حجاج بن یوسف کا گروہ تھا۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ''الفئۃ الباغیۃ''، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا گروہ تھا۔

ان میں سے پہلی صورت مراد لیں تو اس پر کوئی اشکال نہیں کیوں کہ جمہور علماء کا مذہب یہی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اہلِ شام باغی تھے۔

دوسری صورت مراد لیں تب بھی کوئی اشکال نہیں کیوں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہو چکنے کے بعد حجاج بن یوسف اور اس کے آقا یعنی مروان اور عبدالملک یقیناً باغی تھے۔

تیسری صورت مراد لیں تو اس میں اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کس بناء پر باغی قرار دیے جا سکتے ہیں۔

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۱۱۱، کتاب الفتن، باب اذا قال عند قوم شیئا

② یہی جمہور فقہاء کا مسلک ہے۔

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۲۲/۳، ط الرسالۃ

لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو مسئلہ بالکل صاف ہے کہ یہ الگ الگ اوقات کی آراء ہیں۔
یزید کے مقابلے میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اقدام کو خروج اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک یزید کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور اُمت نے جنگ وجدل سے بچنے کے لیے طوعاً وکرہاً اسے حکمران مان لیا تھا۔ مگر یہ خروج امامِ عادل کے نہیں، امام جائر کے خلاف تھا جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد میں جائز اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد میں ناجائز تھا۔ ان کا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو باغی کہنا اس خاص زمانے کے لحاظ سے تھا۔[1]



[1] یہ مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ باب ''ازالۂ شبہات'' میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ذیل میں پیش کیا جائے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں سے ایک ہیں جن کی ذات برکات سے پھوٹنے والی نورانی کرنیں آج تک رہروانِ راہِ ہدایت کی رہنما ہیں۔ ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے ننھیالی قبیلے بنونجار سے تھا۔[1]

دس سال کے تھے کہ مدینہ منورہ میں حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی۔[2] حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ اُم سُلیم انہیں خدمتِ اقدس میں لے گئیں، اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! اس بچے کو اپنی خدمت کے لیے قبول فرمائیے۔''[3]

ذہانت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنے سے قبل وہ لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے۔[4]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے دس برس تک رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت کی سعادت حاصل کی۔[5] آپ ﷺ اس ننھے خادم سے مزاح بھی فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے: یَا ذَا الْاُذُنَیْن! (اے دو کانوں والے!)[6]

انس رضی اللہ عنہ کمسن ہونے کے باوجود خادم خاص کی حیثیت سے غزوۂ بدر،[7] غزوۂ اُحد[8] اور غزوہ خیبر میں شریک رہے۔[9] ان غزوات کے چشم دید واقعات آپ تفصیل سے نقل کرتے تھے۔

کم سنی کے باوجود احساسِ ذمہ داری کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے راز پوری طرح محفوظ رکھتے تھے۔ ایک بار حضور ﷺ نے انہیں کوئی پیغام دے کر کسی کے پاس بھیجا۔ بعد میں ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا ان سے پوچھتی رہیں کہ کیا پیغام تھا مگر انہوں نے زبان نہ کھولی اور کہا: ''میں بارگاہِ رسالت کا راز افشا نہیں کر سکتا۔''[10]

اتباعِ سنت کا اتنا شوق تھا کہ ایک بار حضور ﷺ کے ساتھ کسی ضیافت میں شریک ہوئے۔ دیکھا کہ حضور ﷺ کدو کے ٹکڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑی رغبت سے تناول فرما رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اس وقت سے کدو میرا پسندیدہ کھانا بن گیا۔''[11]

---

① طبقات ابن سعد: ۷/۱۷، دار صادر
② صحیح مسلم، ح: ۵۳۰۹، الاشربۃ، استحباب ادارۃ الماء واللبن
③ صحیح مسلم، ح: ۶۵۳۱، فضائل الصحابۃ، فضائل انس رضی اللہ عنہ
④ عن انس قال: اخذت ام سلیم بیدی مقدم النبی ﷺ فاتت بی رسول اللہ ﷺ فقالت یا رسول اللہ ھذا ابنی وھو غلام کاتب (طبقات ابن سعد: ۷/۱۹)
⑤ صحیح مسلم، ح: ۵۳۰۹، الاشربۃ، استحباب ادارۃ الماء واللبن
⑥ سنن ابی داؤد، ح: ۵۰۰۲، کتاب الادب، باب فی المزاح، قال الالبانی صحیح
⑦ قیل لانس بن مالک اشھدت بدراً؟ قال: واین اغیب عن بدر لا ام لک. (مستدرک حاکم، ح: ۶۴۴۲؛ البدایۃ والنہایۃ: ۵/۲۱۵)
⑧ صحیح البخاری، ح: ۵۸۱۱، کتاب المناقب، مناقب ابی طلحۃ رضی اللہ عنہ
⑨ صحیح البخاری، ح: ۲۸۹۳، کتاب الجہاد، باب من غزا بصبی للخدمۃ
⑩ مسند احمد، ح: ۱۳۴۲۹ ⑪ صحیح مسلم، ح: ۵۴۳۶، کتاب الاشربۃ، باب جواز اکل المرق

حضور ﷺ انہیں دعائیں دیا کرتے تھے۔ایک بار فرمایا:

''اے اللہ! انس کے مال اور اولاد میں اضافہ فرما اور اس کو برکت والا بنا۔''[1]

بارگاہِ نبوت کی دعاؤں کی برکت سے بڑے ہو کر آپ بہت خوش حال ہو گئے۔اولاد بھی بکثرت ہوئی۔آپ کے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی تعداد ایک سو سے زائد ہو گئی تھی۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ بحرین میں زکوۃ کی وصولی کے لیے مقرر ہوئے اور ان کی وفات تک وہیں رہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ واپس مدینہ طیبہ آئے۔عراق کی جنگوں میں حصہ لیا۔تُستر کے محاذ سے ایرانی سردار ہُرمزان کو گرفتار کر کے مدینہ لے کر آئے۔عراق کی فتح کے بعد بصرہ منتقل ہو گئے اور تمام عمر وہیں رہے۔[3]

بصرہ میں آپ کا ایک باغ تھا۔اللہ کی شان کہ یہ باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیتا تھا اور اس سے مشک جیسی خوشبو مہکتی تھی۔[4]

حضرت جَرِیر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ جیسے عمر میں بڑے صحابہ بھی نہ صرف آپ کا احترام بلکہ آپ کی خدمت بھی اس لیے کیا کرتے تھے کہ آپ ''خادمِ رسول'' تھے۔[5]

حضرت انس رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے۔ایک مرتبہ قحط سالی میں آپ سے درخواست کی گئی کہ بارانِ رحمت کے لیے دعا فرمائیں۔آپ نے وضو کر کے دو رکعتیں پڑھیں اور دعا کی۔آن کی آن میں بادل آئے اور موسلا دھار بارش نے تمام زمین کو سیراب کر دیا۔[6] حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی ایک ایک سنت پر عمل کرتے تھے۔آدابِ نماز کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی نے آپ کی نماز دیکھی تو بے ساختہ کہہ اٹھے:

''حضور ﷺ کی نماز جیسی نماز حضرت انس سے بڑھ کر کسی کو پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔''[7]

حضرت انس رضی اللہ عنہ عام طور پر سیاسی امور سے الگ ہی رہے، تاہم بعض مواقع پر انہوں نے کچھ اہم خدمات انجام دیں۔حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں انہیں بصرہ کی مجلسِ شوریٰ کا رُکن بنایا گیا۔[8]

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل زندگی میں بہت کچھ دیکھا۔آپ اس عمر میں بھی عبادت میں بڑا مجاہدہ کرتے تھے۔راتوں کو نوافل میں اس قدر طویل قیام کرتے تھے کہ پاؤں پر ورم آ جاتا تھا۔[9]

---

1. صحیح مسلم، ح: ٦٣٧٦، فضائل الصحابۃ، فضائل انس رضی اللہ عنہ
2. صحیح مسلم، ح: ٦٣٧١
3. سیر اعلام النبلاء: ٣/ ٤٠١، ٤٠٢، ط الرسالۃ
4. سنن ترمذی، ح: ٣٨٣٣، قال البانی: صحیح
5. سیر اعلام النبلاء: ٣/ ٤٠١، ط الرسالۃ
6. سیر اعلام النبلاء: ٣/ ٤٠٠، ترجمۃ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ
7. سیر اعلام النبلاء: ٣/ ٤٠٠، ترجمۃ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ
8. تاریخ الطبری: ٥/ ٢٢٢
9. سیر اعلام النبلاء: ٣/ ٤٠٥، ترجمۃ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ

رافضی اور ناصبی رجحانات سے آپ بے زار تھے، فرماتے تھے: ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ عثمان اور علی کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے ہمارے دلوں میں تو ان دونوں کی محبت جمع کر رکھی ہے۔''[1]

۶۰ھ کے بعد کے ہنگامہ خیز دور کی آزمائشیں بھی سہیں، حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر آپ نے کوفہ کے قصرِ امارت میں عبیداللہ بن زیاد کے سامنے رکھا ہوا دیکھا۔[2] ۶۶ھ کے طاعون میں آپ کی اولاد سے ۷۰ افراد جاں بحق ہوئے۔[3] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا خوب اکرام کیا گیا اور اعزاز کے طور پر انہیں جامع مسجد بصرہ کی امامت سونپ دی گئی۔[4]

مگر جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے صحابہ کرام کی سیادت کا دور جبراً ختم کیا گیا اور حجاج بن یوسف کو اس سیاہ کارنامے پر عراق کا گورنر بنایا گیا تو آزمائشوں کا سخت ترین دور شروع ہو گیا۔ حجاج بن یوسف کا سلوک حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ اتنا توہین آمیز تھا کہ مجبور ہو کر انہوں نے عبدالملک کو شکایتی مراسلہ بھیجا، جس پر عبدالملک نے حجاج کو ان سے معذرت کرنے کا حکم دیا۔[5]

عبدالملک کی اس تنبیہ پر حجاج نے معذرت کی اور اپنا رویہ نرم کر لیا۔[6]

اس کے باوجود انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے لیے حجاج کی دیگر حرکات سوہانِ روح رہیں۔ حجاج نمازیں پڑھانے میں اتنی تاخیر کر دیتا تھا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''نماز کے سوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی کوئی بات باقی نہیں دکھائی دیتی تھی مگر اب تو نمازیں بھی ضائع ہونے لگیں۔''[7]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۰۰، ترجمۃ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ

② صحیح البخاری، ح: ۳۷۴۸، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن رضی اللہ عنہ والحسین رضی اللہ عنہ

③ سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۰۵، ترجمۃ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ ④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۹

⑤ قال الحاکم: اخبرنی محمد بن یعقوب الحافظ، انبأ محمد بن اسحاق، ثنا زیاد بن ایوب و ابو کریب، قالا حدثنا ابوبکر بن عیاش عن الاعمش، قال: کتب انس بن مالک الیٰ عبدالملک بن مروان "یا امیر المومنین! انی قد خدمت محمداً صلی اللہ علیہ وسلم عشر سنین، وان الحجاج یعدلنی من حوکۃ البصرۃ، فقال عبدالملک: اکتب الی الحجاج یا غلام، فکتب الیہ: ویلک قد خشیت ان لا یصلح علی یدک احد، فاذا جاءک کتابی ھذا فقم حتیٰ تعتذر الی انس بن مالک. (مستدرک حاکم، ح: ۶۴۵۴ باسناد صحیح)

احوالِ رواۃ:

- محمد بن یعقوب (محمد بن محمد بن یعقوب نیسابوری (م ۳۶۸ھ) قال الذھبی: الصدوق. (تاریخ الاسلام: ۸/۲۹۵، بشار)
- محمد بن اسحاق بن خزیمۃ النیسابوری: قال الدارقطنی: اماما، ثبتاً معدوم النظیر. (موسوعۃ اقوال الدارقطنی: ۲/۵۴۳) قال الذھبی: الحافظ الحجۃ امام الائمۃ. (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۳۶۵)
- زیاد بن ایوب: (مولد ۱۶۶ھ، وفات ۲۵۲ھ) صحیح بخاری کے راوی، بالاتفاق ثقہ۔ (تقریب التھذیب، تر: ۲۰۵۶)
- ابو کریب محمد بن العلاء: (مولد: ۱۶۰ھ، وفات ۲۴۷ھ) بخاری و مسلم کے راوی بالاتفاق ثقہ۔ (تقریب التھذیب، تر: ۶۲۰۴)
- ابوبکر بن عیاش: (مولد: ۱۰۰ھ، وفات ۱۹۳ھ) بخاری و مسلم کے راوی بالاتفاق ثقہ۔ (تقریب التھذیب، تر: ۷۹۸۵)
- الاعمش: (مولد: ۶۰ھ، وفات ۱۹۳ھ) بخاری و مسلم کے راوی۔ بالاتفاق ثقہ۔ (تقریب التھذیب، تر: ۲۶۱۵)

⑥ الاخبار الطوال، ص ۳۲۴، ط داراحیاء الکتب العربی، والاسناد ضعیف

⑦ مسند احمد، ح: ۱۳۱۶۸؛ صحیح البخاری، ح: ۵۳۰، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب تضییع الصلوٰۃ عن وقتہا

لوگوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حجاج بن یوسف کے سلوک کی شکایت کی۔انہوں نے صبر کی تلقین کی اور فرمایا:"میں نے تمہارے پیغمبر ﷺ سے سنا ہے کہ تم پر کوئی زمانہ ایسا نہ آئے گا کہ اگلا زمانہ اُس سے زیادہ برا نہ ہو،یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو۔"①

آخری زمانے میں دنیا سے بیزار ہو چکے تھے۔فرماتے تھے کہ عمر اتنی ہوگئی ہے کہ میں جینے سے اکتا گیا ہوں۔②

اپنے آقا ﷺ کی یاد اور خواب میں زیارت ہی آپ کے غم وحزن کا سہارا تھی۔ایک بار فرمایا:

"کوئی رات ایسی نہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نہ ہوتی ہو۔" یہ کہہ کر زار وقطار رونے لگے۔③

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ۹۳ھ میں ایک سو تین سال کی عمر میں رحلت فرمائی اور بصرہ سے چھ میل (ساڑھے ۹ کلومیٹر) دور مدفون ہوئے۔بصرہ میں وفات پانے والے آپ آخری صحابی ہیں۔آپ کے عشقِ نبوی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ کے کچھ بال عمر بھر محفوظ کر کے رکھے اور وصیت کی کہ میری وفات کے بعد یہ بال میری زبان کے نیچے رکھ دیے جائیں۔چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔④

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے عمر بھر قرآن وحدیث کی اشاعت کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔فتاویٰ بھی دیتے تھے۔اس لیے آپ کو مقری، محدث اور مفتی کہا جاتا تھا۔⑤

سیرت ومغازی سے بڑی دلچسپی تھی۔آپ نے نبی کریم ﷺ کا مدنی دور ہی دیکھا تھا مگر آپ نے مکی دور کے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔دراصل نبی اکرم ﷺ کے احوال کی جستجو کرتے ہوئے آپ نے دوسرے صحابہ سے سن کر ایسی بہت سی روایات بھی جمع کر لی تھیں جن کے آپ چشم دید راوی نہ تھے۔آپ سے ۲۲۸۶ احادیث منقول ہیں جن میں سے ۱۸۰ کی صحت پر بخاری ومسلم متفق ہیں۔۸۰ میں بخاری اور ۹۰ میں مسلم متفرد ہیں۔

رضی اللہ عنہ وارضاہ

☆☆☆

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۰۶۸، کتاب الفتن: باب لایاتی زمان الا الذی بعدہ شر منہ

② طبقات ابن سعد: ۷/۲۰، دار صادر

③ طبقات ابن سعد: ۷/۲۰، دار صادر

④ الاصابہ: ۱/۲۷۶؛ الاستیعاب، ترجمۃ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۹۶، ط الرسالۃ

اویس بن عامر القرنی رحمہ اللہ

اویس بن عامر القرنی رحمہ اللہ یمن کے باشندے اور قبیلہ مراد کی شاخ قرن سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ تھے جنہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کا زمانہ پایا مگر زیارت وملاقات کی سعادت نہ پاسکے۔ ان کا تعلق امت کے اس طبقے سے تھا جنہوں نے عبادت وریاضت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ انہوں نے ساری زندگی گمنامی اور گوشہ نشینی میں گزاری۔ تاہم ان کی جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ انہیں ''خیر التابعین'' کا لقب خود بارگاہِ رسالت سے ملا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''پیشوا، درویش، اپنے زمانے کے سید التابعین۔''

پھر فرماتے ہیں: ''وہ اللہ کے ولی تھے، خداترس اور مخلص بندوں میں سے تھے۔'' [1]

حضور نبی اکرم ﷺ کو اپنے اس امتی کی بزرگی اور کرامات کا علم تھا۔ آپ نے بعض صحابہ کو ان کی خاص خاص نشانیاں بتا کر تاکید کی تھی کہ ان سے ملاقات ہوجائے تو ان سے دعائے مغفرت کرائیں۔ ایک بار حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تابعین میں سے بہترین انسان اویس نامی ایک شخص ہیں۔ بنو مراد کی شاخ قرن سے تعلق ہے۔ اپنی والدہ کے بڑے خدمت گار ہیں۔ انہیں برص کی بیماری تھی۔ اللہ سے دعا کی تو اللہ نے وہ بیماری دور کردی صرف ناف کے پاس ایک درہم کے برابر اس کا نشان باقی ہے۔ اگر وہ کسی بات کے ہونے پر اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر کے دکھائے گا۔'' حضور ﷺ نے پیش گوئی کے طور پر یہ بھی فرمایا: ''تمہارے پاس اہلِ یمن کی طرف سے کمک آئے گی اویس ان میں شامل ہوں گے۔ اگر تم سے ہوسکے تو ان سے بخشش کی دعا کرانا۔'' [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سالہا سال اویس قرنی رحمہ اللہ کے منتظر رہے۔ جب بھی کسی مہم کے لیے یمن سے امدادی دستے آتے تو معلوم کراتے کہ ان میں اویس کون ہیں۔ آخر ایک بار اویس رحمہ اللہ سے آمنا سامنا ہو ہی گیا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں پہچان لیا۔ نام ونسب کے بعد ایک ایک کر کے وہ نشانیاں دریافت کیں جو حضور ﷺ نے بتائی تھیں۔ جب تصدیق ہوگئی کہ وہی ہیں تو ان سے دعائے مغفرت کرائی۔

پھر ان سے پوچھا: ''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''کوفہ۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ان کا اعزاز واکرام ہو، لہٰذا فرمایا: ''میں وہاں کے گورنر کے نام کوئی پروانہ لکھ دوں؟''

---

① سیر اعلام النبلاء: ۴/۱۹، ۲۰، ط الرسالۃ

② صحیح مسلم، ح: ۶۶۵۴، فضائل الصحابہ، باب من فضائل اویس القرنی ؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۷۱۹

انہوں نے کہا: ”نہیں! میں گمنام لوگوں میں رہنا پسند کرتا ہوں۔“

اویس قرنی رحمہ اللہ کوفہ چلے گئے۔ اندازہ یہی ہے کہ وہ ایک گمنام مجاہد کی طرح کوفہ سے بھیجے جانے والے لشکروں میں شامل ہوتے رہے کیوں کہ یمن سے ان کا نکلنا اسی لیے تھا۔ جہاد کے علاوہ وہ ذکر و عبادت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوفہ سے آنے والے حاجیوں سے ان کا حال پوچھتے رہتے تھے، کوفہ کے جو لوگ اویس رحمہ اللہ کو جانتے تھے وہ بتاتے تھے کہ وہ اسی طرح غربت اور تنگ دستی میں گزر بسر کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں دوسروں کو بھی تاکید کرتے کہ اویس سے دعائے مغفرت کرائیں۔ ①

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ان تاکیدات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ والوں کی زیارت کرنا، دینی و ایمانی استفادے کے لیے ان کی خدمت میں جانا اور ان کی دعائیں لینا سنت ہے اور اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تاکید پر بعض حضرات کوفہ میں حضرت اویس رحمہ اللہ سے جا کر ملتے اور دعائیں کراتے۔ ان میں سے کبھی کوئی ان کی خدمت بھی کر دیتا۔ اسیر بن جابر رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر ان سے ملاقات کی اور ان کی دعائیں لینے کے بعد انہیں ایک عمدہ جوڑا پہنا دیا۔ اویس قرنی رحمہ اللہ جب یہ جوڑا پہن کر نکلتے تو ان کی خلافِ معمول حالت دیکھ کر لوگ حیران ہوتے کیوں کہ عموماً وہ خستہ حال رہا کرتے تھے۔ ②

اگر چہ کوفہ میں ان کی زندگی گوشہ نشینی میں گزرتی رہی مگر مشک کی خوشبو کہاں چھپ سکتی ہے۔ رفتہ رفتہ بہت سے لوگ ان کے مقام سے واقف ہو گئے۔ وہ ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ اویس قرنی رحمہ اللہ طبعی طور پر کم گو اور خاموش مزاج تھے۔ اس لیے ان کی مجلس میں وعظ و نصیحت یا روایتِ حدیث کا معمول نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھار کسی کو کچھ نصیحت کر دیتے تھے جس کا موضوع عموماً دنیا کی بے ثباتی اور فکرِ آخرت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مجلس میں اللہ کے ذکر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اندازہ یہی ہے کہ یہ ذکر تلاوتِ قرآن اور مسنون اذکار کی شکل ہی میں ہوا کرتا تھا۔ ③

اویس قرنی رحمہ اللہ جنگِ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ④

رحمه الله رحمة واسعة

① صحیح مسلم، ح: ٦٦٥٦، فضائل الصحابه، باب من فضائل اویس القرنی، ط دار الجیل

② صحیح مسلم، ح: ٦٦٥٦، فضائل الصحابه، باب من فضائل اویس القرنی، ط دار الجیل

③ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۵۵۵ تا ۵۵۷، تدمری ؛ سیر اعلام النبلاء: ۴/۲۰ تا ۲۴، ط الرسالة

④ سیر اعلام النبلاء: ۴/۳۱، ط الرسالة

نوٹ: اویس قرنی رحمہ اللہ کے بارے میں بہت سی ضعیف اور موضوع روایات بہت مشہور ہیں جن میں ان کے عجیب و غریب حالات بیان کیے گئے ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ”سیر اعلام النبلاء“ میں ان پر جرح کی ہے۔ صحیح روایات یا معمولی ضعیف روایات سے جو کچھ ثابت ہے ہم نے وہی بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے مدینہ حاضر ہونے اور ماں کی تاکید کی وجہ سے ملاقات کیے بغیر واپس چلے جانے کا قصہ بہت مشہور ہے مگر یہ قصہ صحیح روایات تو کجا ضعیف روایات میں بھی نہیں ملتا۔ بظاہر یہ قصہ بہت بعد میں وضع کیا گیا ہے۔ اکثر لوگ ان کے بارے میں مشہور کیے گئے ہر واقعے پر یقین رکھتے ہیں مگر دوسری طرف ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ان کے وجود ہی کا انکار کرتا ہے۔ حالاں کہ ان کی فضیلت صحیح مسلم کی صحیح روایت سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ دوسرا نقطہ نظر بھی تحقیق کی بجائے متشددانہ ذہنیت پر مبنی ہے۔

اَحنف بن قیس رحمہ اللہ

اَحنف بن قیس رحمہ اللہ ان کبارِ تابعین میں سے ایک ہیں جو زمانۂ رسالت میں موجود تھے مگر شرفِ صحبت نہ پا سکے۔ ان کا وطن بصرہ تھا۔ قبیلہ بنو تمیم کے سردار تھے۔ ان میں ایک کامیاب قائد اور قومی رہنما کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ وہ دور اندیش، معاملہ فہم، ذہین محتاط، بہادر، فصیح و بلیغ، جنگجو، فیاض، ہمدرد اور خدا ترس آدمی تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں وہ مدینہ آئے اور سال بھر ان کی تربیت میں رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں خوب دیکھا بھالا اور غیر معمولی صفات کا مالک پایا۔ آخر انہیں والیٔ بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے خصوصی مشیر کی ذمہ داری دے کر واپس بصرہ بھیج دیا۔ اس کے بعد سے ان کے مرتبے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔[1]

انہیں اہلِ بصرہ کے سیاسی نمائندے اور قومی ترجمان کی حیثیت حاصل رہی۔ دربارِ خلافت میں اہلِ بصرہ کی آواز پہنچانے کے لیے ان سے بہتر اور کوئی نہ تھا۔ اس کے علاوہ مختلف مشوروں کے لیے مدینہ حاضر ہوتے رہتے تھے۔[2]

ایرانی پایۂ تخت مدائن کی فتح کے باوجود بار بار شورشیں ہو رہی تھیں جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حیران تھے۔ اَحنف بن قیس رحمہ اللہ مسئلے کی تہہ تک پہنچ گئے اور کہا کہ جب تک یزدگرد موجود ہے یہ شورشیں ہوتی رہیں گی۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران پر عام فوج کشی کا حکم دیا اور کئی فوجیں الگ الگ سمتوں میں روانہ کیں۔ اَحنف بن قیس رحمہ اللہ کو اس مہم کا سربراہ بنایا گیا۔ اس مہم کے نتیجے میں یزدگرد شکست پر شکست کھاتا اور پسپا ہوتا ہوا ترکستان کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور پورے ایران وخراسان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب خراسان میں بغاوتیں ہوئیں تو اَحنف بن قیس رحمہ اللہ نے ہی دوبارہ جا کر ان علاقوں کو از سرِ نو فتح کیا اور باغیوں کو کچل کر رکھ دیا۔[4]

ان کارناموں نے اَحنف رحمہ اللہ کو ایک قومی رہنما کی حیثیت دے دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی انہیں بڑی عزت حاصل رہی۔ اہم قومی معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ مگر جب عبیداللہ بن زیاد بصرہ کا گورنر بنا تو اس نے سخت ناقدری کرتے ہوئے اَحنف رحمہ اللہ کو عضوِ معطل بنا دیا۔ تاہم جب یہ بات

---

① طبقات ابن سعد: ۷/۹۴ ط صادر

② سیر اعلام النبلاء: ۴/۸۹، ط الرسالۃ

③ الکامل فی التاریخ، سن ۲۱ھ تا ۲۲ھ

④ الکامل فی التاریخ: ۲/۱۹۹

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر واضح ہوئی تو ان کی تنبیہ پر عبید اللہ بن زیاد نے ان کا مقام بحال کر دیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان پر اتنا بھروسہ تھا کہ یزید کی ولی عہدی کے متعلق مشورے کے لیے انہیں بصرہ سے دمشق بلوایا تھا۔ اَحنف بن قیس رحمہ اللہ کے خیال میں یزید کی ولی عہدی خلافِ مصلحت تھی، انہوں نے اس رائے کا اظہار بھی کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ سرکاری طور پر جو بھی فیصلہ ہو منظور ہوگا۔[1]

یزید کے دور میں اَحنف رحمہ اللہ کا کوئی کردار دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور انہوں نے گوشہ نشینی میں گزارا تھا۔ البتہ جب یزید کی موت پر عراق میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو اَحنف رحمہ اللہ میدان میں آئے اور ہنگاموں کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔[2] عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اَحنف رحمہ اللہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ نامور سردار مُہلّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ کو انہوں نے ہی خوارج کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار کیا۔[3]

اَحنف رحمہ اللہ نے عراق میں مختار ثقفی کذاب کے خلاف لوگوں کو بیدار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔[4]

عبد الملک نے شام میں خروج کیا تو اس نے آپ کو ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی مگر آپ اس کی باتوں میں نہ آئے اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے وفادار رہے۔[5]

آپ اُمت کے حکماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کی وفات پر بڑے بڑے لوگوں نے کہا کہ آج عقل و تدبر کی موت ہوئی ہے۔[6] حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: میں نے کسی قوم کے سردار کو اَحنف سے افضل نہیں پایا۔[7]

ان کی قوتِ برداشت، صفتِ حلم اور بردباری ضرب المثل تھی۔ ایک بار ایک شخص سے تنازعہ ہو گیا۔

اس نے کہا: ''اگر آپ ایک کہیں گے تو میں دس سناؤں گا۔''

اَحنف نے متانت سے جواب دیا: ''اگر تم دس سناؤ گے تو مجھ سے ایک بھی نہیں سنو گے۔''[8]

مجاہدے کا یہ حال تھا کہ سخت سردی بلکہ برف باری میں بھی وضو کا پورا اہتمام فرماتے، تیمم پر اکتفانہ کرتے۔ خراسان کی ایک مہم میں شب کو غسل واجب ہو گیا۔ سپہ سالار ہونے کے باوجود کسی کو نہ جگایا۔ خود کانٹے دار جھاڑیوں سے گزر کر پانی کی تلاش میں نکلے۔ اس دوران پیر زخمی ہو گئے مگر پروانہ کی۔ ایک جگہ برف کھود کر پانی نکالا اور اسی سے غسل کیا۔[9]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۷/۱۱

[2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۸

[3] تاریخ الطبری: ۶۱۵/۵

[4] تاریخ الطبری: ۶/ ۲۸ تا ۷۰

[5] طبقات ابن سعد: ۹۶/۷ ط صادر

[6] تہذیب التہذیب: ۱۹۱/۱، ط دکن

[7] طبقات ابن سعد: ۹۵/۷ ط صادر

[8] سیر اعلام النبلاء: ۹۳/۴، ط الرسالۃ

[9] سیر اعلام النبلاء: ۹۲/۴، ط الرسالۃ

سیاسی ذمہ داریوں کے باوجود ذکر و عبادت میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی بکثرت نفلی روزے رکھا کرتے تھے، کسی نے اپنی جان پر رحم کرنے کا کہا تو فرمایا: ''ایک بہت لمبے سفر کی تیاری کر رہا ہوں۔''

تنہائی کا موقع ملتے ہی قرآن مجید لے کر بیٹھ جاتے۔ اپنی نیکی اور پاک بازی پر ذرا بھی غرور نہ تھا۔ خود کو گناہ گار ہی سمجھتے۔ زار و قطار روتے ہوئے دعا کرتے ہوئے کہتے:

''الٰہی! اگر معاف کر دے تو تیری مہربانی۔ سزا دے تو میں اسی کا حق دار ہوں۔''

رات کو طویل نوافل پڑھتے تھے۔ نفس کا کڑا محاسبہ کرنا ان کا معمول تھا۔ کوئی غلطی ہو جاتی تو انگلی شمع کی لو پر رکھ کر نفس کو جہنم کی آگ یاد دلاتے اور کہتے: ''آخر یہ کام کیوں کیا؟''[1]

لوگوں کے جھگڑوں کو حکمتِ عملی کے ساتھ حل کر دینے میں ان جیسا اور کوئی نہ تھا۔ ایک بار کچھ لوگ ایک قتل کے سلسلے میں دیت کا مسئلہ طے کرنے آئے۔ آپ نے مدعی فریق کو حق دیا کہ وہ جس طرح راضی ہوتا ہے بتا دے، فیصلہ ان کی مرضی پر ہوگا۔ ان لوگوں نے کہا: ''ہم دوگنی دیت لیں گے۔''...... آپ نے فرمایا: ''جیسے تمہاری مرضی۔''

کچھ دیر کے سکوت کے بعد آپ نے کہا: ''دیکھو! اللہ نے (ایک آدمی کے قتلِ خطا میں) ایک ہی دیت واجب کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک دیت رکھی ہے۔ عربوں میں بھی یہی رواج چلا آرہا ہے۔ آج تم دوسروں سے دوگنی دیت لینے کی طرح ڈال رہے ہو۔ مجھے خدشہ ہے کہ کل کلاں دوسرے لوگ بھی تم سے دوگنی دیت طلب کریں گے۔''

یہ بات مدعی فریق کو سمجھ آگئی، وہ لوگ ایک دیت لے کر جھگڑا ختم کرنے پر راضی ہو گئے۔[2]

نہایت باوقار اور وضع دار تھے۔ فرماتے تھے: ''کبھی بن بلائے حاکم کے پاس نہیں گیا، کبھی دو افراد کے درمیان بھی نہیں بیٹھا جب تک انہوں نے خود مجھے شامل نہ کیا ہو۔ اور جو شخص بھی مجھ سے مل کر گیا میں نے اس کا ذکرِ خیر ہی کیا۔''[3]

خود بھی سخی تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں درہم دیکھ کر پوچھا:

''کس کا ہے؟'' وہ بولا: ''میرا۔''

فرمایا: ''تیرا اُس وقت ہوگا جب اسے کسی اجر و ثواب کے کام میں یا کھانے میں خرچ نہ کر دے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سقوط سے ایک سال پہلے ۷۲ھ میں آپ کوفہ میں قیام کے دوران وفات پا گئے۔[4] تدفین میں شریک ایک صاحب کہتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ان کی قبر اندر سے تاحدِ نگاہ کشادہ ہو گئی ہے۔[5]

ان کی مجالس میں علم و حکمت کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ فضول باتیں سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اہلِ محفل کو ہدایت کرتے تھے: ''ہماری مجلس کو خواتین اور کھانے پینے کی باتوں سے آلودہ مت کرو۔''

---

(1) طبقات ابن سعد ۷/ ۹۵، ۹۶، ۹۷ ط صادر

(2) سیر اعلام النبلاء ۴/ ۹۳، ط الرسالة

(3) سیر اعلام النبلاء ۴/ ۹۴، ط الرسالة

(4) تاریخ الاسلام للذهبی ۵/ ۳۵۳، ت تدمری

(5) سیر اعلام النبلاء ۴/ ۹۵، ط الرسالة

ے اقوال حکمت کے موتی ہوا کرتے تھے جنہیں قدر دان چن کر لے جاتے تھے۔ایک ایک جملے میں صدیوں کے تجربات سمٹے ہوتے تھے۔نمونے کے طور پر چند اقوال پیشِ خدمت ہیں:

حکمران کا کام وزراء اور مصاحبین کے بغیر نہیں چل سکتا۔وزراء اور مصاحبین مہربانی اور نصیحت کے بغیر نہیں چل سکتے۔مہربانی اور نصیحت اس وقت تک اثر نہیں کرتی جب تک اس کے پیچھے دوراندیشی اور پاکیزہ کردار نہ ہو۔

تین قسم کے آدمی تین طرح کے لوگوں سے انہی جیسا برتاؤ نہیں کر سکتے: شریف ، گھٹیا لوگوں سے۔نیک آدمی بدکاروں سے۔بردبار آدمی احمقوں سے۔

ادب کی جڑ زبان ہے۔

کردار کے بغیر قول کا، معلومات کے بغیر نظارے کا، سخاوت کے بغیر مال و دولت کا، وفاداری کے بغیر ساتھی کا، تقوے کے بغیر علمِ دین کا، حسنِ نیت کے بغیر صدقہ و خیرات کا اور صحت و امن کے بغیر زندگی کا کوئی فائدہ نہیں۔

جس کی غلطیاں گنی چنی ہوں وہ کامل انسان ہے۔(یعنی معصوم تو صرف پیغمبر ہی ہو سکتے ہیں۔)

جو شخص لوگوں سے ناگوار سلوک میں تیزی دکھاتا ہے، لوگ بھی اس کے بارے میں سنی سنائی باتیں پھیلانے میں تیزی دکھاتے ہیں۔

حاکم کو غضب ناک ہونا زیب نہیں دیتا۔بااختیار آدمی کا غصہ تلوار چلنے اور پھر ندامت کا باعث بن جاتا ہے۔[1]

رحمه الله رحمة واسعة

☆☆☆

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۸۳/۶، ۸۴، ط الرسالۃ



قاضی شُرَیح بن الحارث رحمہ اللہ

قاضی شُرَیح بن الحارث رحمہ اللہ اسلامی تاریخ کے مشہور ترین قاضی اور کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ان کا تعلق یمن میں آباد ہونے والے فارسی قبیلے کندہ سے تھا۔وہ دورِ رسالت میں پیدا ہوئے تھے تاہم انہیں شرفِ صحبت حاصل نہیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یمن سے مدینہ آ گئے۔ [1]

انہیں اکابرِ صحابہ کی صحبت نصیب ہوئی تھی۔حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے بزرگ صحابہ سے تحصیلِ علم کا موقع ملا تھا۔شعبی، ابن سیرین اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ جیسے فقہاء ان کے شاگرد تھے۔ [2]

اگرچہ وہ بلند پایہ محدث بھی تھے مگر ان کا خاص فن فقہ تھا۔وہ قرآن وسنت کی روشنی میں مشکل سے مشکل مسائل کا حل نکال لیا کرتے تھے۔اپنی ذہانت کی وجہ سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مشکل قضیے میں ان کے فیصلے سے متاثر ہو کر انہیں اپنے دورِ خلافت میں کوفہ کا قاضی بنا دیا۔انہوں نے یہ ذمہ داری اس خوبی سے نبھائی کہ اس دور سے عبدالملک بن مروان کی خلافت تک اسی منصب پر رہے۔یہ تقریباً ساٹھ برس کی مدت بنتی ہے۔اس دوران بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے اور کتنی حکومتیں تبدیل ہوئیں مگر قاضی شُرَیح کو سب کا اعتماد حاصل رہا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں ''اقضی العرب'' (عربوں کا سب سے بڑا قاضی) کہا کرتے تھے۔ [3]

وہ فیصلے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی رعایت نہیں کرتے تھے بلکہ ثبوت اور شہادتوں کے پیشِ نظر شریعت کے مطابق فیصلہ دیتے تھے۔اس بارے میں وہ اپنی ذاتی رائے کو بالکل خاطر میں نہ لاتے تھے۔بلکہ اگر ثبوت ایسے شخص کے خلاف جاتا جو ان کے نزدیک حق پر یا بے گناہ ہوتا تب بھی وہ مقدمے کا فیصلہ دلائل اور شہادتوں ہی کی بناء پر کرتے تھے۔یہی انصاف کا بلند ترین درجہ ہے اور اسی کو آئین کی حقیقی بالادستی کہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب کوفہ کو دارالخلافہ بنایا تو یہاں ایک بار وہ خود مدعی کی حیثیت سے قاضی شریح رحمہ اللہ کی عدالت میں پیش ہوئے۔مقدمہ یہ تھا کہ ان کی زرہ کہیں گر گئی اور کسی یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔وہ یہودی اب اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ وہ زرہ ان کی ہے۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/۱۰۰، ط الرسالۃ

② تذکرۃ الحفاظ: ۱/۴۷، ۴۸، ط العلمیۃ

③ اخبار القضاۃ لابی بکر وکیع البغدادی: ۲/۱۹۳ تا ۲۰۰، الاستیعاب: ۲/۷۰۱، ۷۰۲، تھذیب الاسماء واللغات: ۱/۲۴۳

مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو قاضی شریح رحمہ اللہ نے یہودی سے پوچھا: ''تم کیا کہتے ہو؟''
اس نے کہا: ''زرہ میری ہے؟''
قاضی شُرَیح رحمہ اللہ نے ثبوت مانگا تو وہ بولا: ''ثبوت یہ ہے کہ یہ میرے قبضے میں ہے۔''
قاضی شُرَیح رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ زرہ آپ سے گر گئی تھی؟''
انہوں نے اپنے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ اور غلام قنبر کو گواہوں کے طور پر پیش کیا۔
قاضی شریح رحمہ اللہ نے کہا: ''قنبر کی گواہی تو قبول ہے مگر حسن رضی اللہ عنہ کی نہیں۔''
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا آپ نے حدیث نہیں سنی کہ حسن و حسین نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔''
قاضی شریح رحمہ اللہ نے کہا: ''سنی ہے مگر میں باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قابلِ قبول نہیں سمجھتا۔''
چونکہ ملکیت کا ثبوت دو گواہوں کا نصاب پورا ہونے سے طے ہوتا تھا، اس لیے قاضی شُرَیح رحمہ اللہ نے ایک گواہ کو ناکافی قرار دیتے ہوئے مقدمہ خارج کر دیا۔ اس فیصلے سے یہودی اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود کہہ دیا:
''زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی ہے اور یہ دین سچا ہے جس کا قاضی حکمران کے خلاف فیصلہ دیتا ہے اور وہ بے چوں چراں اس فیصلے کو مان لیتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر اتنے خوش ہوئے کہ زرہ یہودی کو ہدیہ کر دی۔ [1]

ایک قاضی اور منصف کے لیے قانون سے گہری واقفیت اور امانت و دیانت کے ساتھ ساتھ ذہانت اور فراست بھی بہت ضروری ہے کیوں کہ بہت سے مقدمات کی گرہ انہی سے کھلتی ہے۔ قاضی شریح رحمہ اللہ ان صفات سے مالا مال تھے۔ کئی واقعات سے اس کی گواہی ملتی ہے۔ ایک بار دو عورتیں ایک بلی کے بچے کے بارے میں تنازعہ لے کر آگئیں۔ ایک کا کہنا تھا یہ میری بلی کا بچہ ہے۔ دوسری کہتی تھی یہ میری بلی کا بچہ ہے۔ قاضی شریح رحمہ اللہ نے ایک عورت کو حکم دیا کہ اپنی بلی کو اس بلونگڑے کے پاس چھوڑ دے۔ اگر بلی نے اسے پیار کیا، دودھ پلایا اور خوشی کا اظہار کیا تو یہ بچہ اسی کا ثابت ہوگا۔ اگر اس کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ بھاگنے لگی تو بچہ اس کا نہیں ہوگا۔ حکم پر عمل کیا گیا تو حقیقت سامنے آ گئی اور فیصلہ کر دیا گیا۔ [2]

ان کی ہوشیاری کا ایک اور دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار شہر میں وبا پھیلنے کی وجہ سے وہ کچھ دنوں کے لیے آبادی سے دور چلے گئے۔ وہاں کھلی جگہ پر طویل نوافل ادا کرنے کا معمول بنا لیا۔ ایک لومڑی ان کے پیچھے پڑ گئی۔ جب بھی یہ نوافل کی نیت باندھتے، وہ عین سامنے آدھمکتی اور اچھل کود کر کے ان کی توجہ منتشر کرتی۔ آخر ایک دن انہوں نے اپنی جائے نماز پر لکڑی کا ایک کھونٹا کھڑا کر کے اسے اپنے کپڑے پہنا دیے۔ خود اوٹ میں چھپ گئے۔ جب لومڑی

[1] اخبار القضاۃ: ۲/۲۰۰
[2] اخبار القضاۃ: ۲/۳۹۳

حسب معمول آئی اور اچھلنے کودنے لگی تو یہ چپکے چپکے پیچھے سے گئے اور اسے دبوچ لیا۔

تب سے اہلِ عرب قاضی شُریح رحمہ اللہ کو ''ادھیٰ من الثعلب'' (لومڑی سے زیادہ چالاک) کہنے لگے۔ ①

قاضی شُریح رحمہ اللہ کی طبیعت میں صبر وتحمل اور شکر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جب بھی کوئی دنیاوی تکلیف آتی تو اناللہ پڑھنے کے بعد چار بار الحمدللہ کہتے۔ فرماتے تھے:

''ایک بار الحمدللہ اس لیے کہتا ہوں کہ اس سے بڑی مصیبت نہیں آپڑی۔ دوسری بار اس لیے کہ صبر کی توفیق مل گئی، تیسری بار اس لیے کہ اناللہ کی توفیق ملی۔ چوتھی بار اس لیے کہ مصیبت دینی نہیں دنیاوی ہے۔'' ②

قاضی شریح رحمہ اللہ نے ایک سو دس سال عمر پائی اور عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں ۸۰ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ③

رحمه الله رحمة واسعة

نوٹ: اس دور میں امتِ مسلمہ کی علمی، ایمانی واخلاقی تربیت کرنے والی شخصیات میں امہات المؤمنین خصوصاً ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ دونوں نے لگ بھگ نصف صدی تک یہ خدمت انجام دی۔ مگر چونکہ ان کے حالات حصہ اوّل میں ''امہات المؤمنین'' کے ضمن میں آچکے ہیں۔ اس لیے یہاں اعادے کی ضرورت نہیں۔

---

① تهذيب الكمال: ۴۴۴/۱۲

② سير اعلام النبلاء: ۱۰۵/۴، ط الرسالة

③ سير اعلام النبلاء: ۱۰۶/۴، ط الرسالة

پانچواں باب

تاریخ اُمّتِ مُسلِمہ

ازالۂ شبہات

تاریخ صحابہ کرام سے متعلق اہم شبہات کے جوابات

یہ اوراق عام قارئین کے لیے نہیں، بلکہ ان حضرات کے لیے ہیں جو صحابہ کی تاریخ کے حوالے سے کسی شبہے یا کسی علمی ونظریاتی الجھن کا شکار ہوں۔ ان اوراق میں انہیں اس دور سے متعلق اہم سوالات اور مشہور شبہات کے جوابات مل جائیں گے۔ عام قارئین اسے چھوڑ کر "تاریخ امت مسلمہ" حصہ سوئم کا مطالعہ شروع کریں۔

اہم گزارش

ان اوراق میں تاریخ کے مطالعے کے دوران پیش آنے والے ان شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے جو تاریخ کے طلبہ اور قارئین نے متعدد مواقع پر ہم سے پوچھے ہیں۔ میری کتب اور کالموں کے قارئین اور میرے تاریخی لیکچرز کے شرکاء نے مجھ سے سینکڑوں سوالات کیے ہیں۔ اکثر سوالات ان اعتراضات یا غلط تحقیقات سے جنم لیتے رہے ہیں جو قریبی دور کے بعض ''متجد دین'' نے پیش کیے۔ عوام میں ان کی شہرت ہوگئی اور وہ اس بارے میں پوچھ گچھ پر مجبور ہوئے۔ بالمشافہ گفتگو کے علاوہ لاتعداد سوالات بذریعہ ڈاک، ای میل یا بواسطہ فیس بک پوچھے گئے۔ یہاں ان سب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان غلط فہمیوں اور شبہات کو دور کرنے کے لیے ان شاء اللہ یہ صفحات کافی ہوں گے۔ جوابات بھی حوالوں کے ساتھ دیے ہیں۔ سوالات میں اگر کتب کے حوالہ جات پیش کیے گئے تو ہم نے وہ بھی حواشی پر ڈالنے کا پورا اہتمام کیا ہے، البتہ اگر حوالے مختلف مطابع کے تھے، تو ہم نے انہیں اپنے پیشِ نظر نسخوں کے مطابق کر دیا ہے تاکہ قارئین کو مراجعت کے وقت مختلف مطابع کے نسخے دیکھنے کی زحمت نہ ہو۔ چونکہ قارئین کی نظریاتی وایمانی تربیت ہماری اس کاوش کا اہم ترین ہدف ہے، اس لیے اس باب کو ہم نے غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اس ہدف کو پورا کرتے ہوئے یہ باب کچھ طویل ہوگیا مگر یہ طوالت ناگزیر تھی۔ کیونکہ ہمارا اصل مقصد یہی ہے کہ قارئین کو علمی ونظریاتی لحاظ سے مضبوط کیا جائے تاکہ اغیار کا کوئی فکری ونظریاتی مغالطہ ان پر اثر انداز نہ ہو۔

یہ امر مسلّم ہے کہ صحابہ کرام کے مناقشات، اختلافات اور مشاجرات کا ذکر ترک کرنا ہی اولیٰ ہے مگر جب ان واقعات کی ایک ایک جزئی کو لے کر بانگ دُہل تحریر وتقریر میں صحابہ کی کردارکشی کی جارہی ہو، یا خلافتِ راشدہ اور مشاجرات کے باب میں اُمت کے سوادِ اعظم کی اجماعی آراء پر جارحانہ حملے کیے جا رہے ہوں، پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا اور سوشل میڈیا پر ان کی بھرمار ہو اور متاثر ہونے والے لوگ صحیح جوابات کی تلاش میں بے چین ہوں تو ایسے میں مہر سکوت توڑ کر جواب دینا لازم ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ''منہاج السنۃ''، علامہ ابن حجر مکی الہیثمی رحمہ اللہ کی ''تطہیر الجنان''، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ''ازالۃ الخفاء''، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی ''ہدایۃ الشیعہ'' اور حضرت مفتی محمد تقی عثمانی کی ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق'' اسی نوع کا شاہکار کام ہے۔ مولانا عبدالشکور لکھنوی فاروقی، مولانا قاضی مظہر حسین (چکوال)، مولانا محمد نافع (محمدی شریف، جھنگ)، استاذ مرحوم

مولانا عبدالستار تونسوی اور استاذ گرامی مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ کی تو متعدد تالیفات وتصنیفات اسی ضرورت کے پیش نظر منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ لہٰذا مجھے اطمینان ہے کہ ''ازالۂ شبہات'' کا یہ مجموعہ پیش کرنا کوئی ''طرزِ نو'' کوئی ''فتنہ'' یا کوئی ''بدعت'' نہیں۔

شروع میں خیال تھا کہ ہر واقعے سے متعلق سوالات اور شبہات کو ''تاریخ امتِ مسلمہ'' میں اسی دور کے ساتھ ذکر کر دیا جائے مگر دوستوں سے مشورے کے بعد یہ بہتر معلوم ہوا کہ سوالات وجوابات اور ازالۂ شبہات کا یہ باب الگ رکھا جائے تاکہ تاریخی واقعات کا تسلسل متاثر نہ ہو اور جو حضرات پہلی بار تاریخ پڑھ رہے ہیں اور ان کے ذہن میں ایسے سوالات ہیں ہی نہیں، انہیں کوئی الجھن نہ ہو۔ وہ سوال وجواب کا یہ باب چھوڑ کر اگلے دور کے حالات پر چلے جائیں۔

ان اوراق میں شبہات کے حل کو زمانی ترتیب سے لایا گیا ہے۔ پہلے حضرت عثمان غنی، پھر حضرت علی المرتضیٰ، پھر حضرت مُعاویہ اور آخر میں حضرت حسین وعبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے دور سے متعلق غلط فہمیوں کی تردید کی گئی ہے۔

ان غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم نے خالص علمی انداز اپنایا ہے۔ اپنے طبعی میلان، جذبات یا رجحانات کو بنیاد نہیں بنایا۔ اپنے قیاس اور اندازے کے ذریعے کسی منقول بات کو مسترد کر دینا عوام کا کام ہے۔ اس کے لیے کسی قابلیت یا مطالعے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی انتہائی جاہل شخص کسی بڑے سے بڑے باخبر آدمی کی بات کو یہ کہہ کر رد کر سکتا ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، میں نہیں مانتا۔ ظاہر ہے یہ کوئی علمی طریقہ نہیں۔ اس طرح دنیا میں کوئی مسئلہ بھی طے نہیں ہو سکتا بلکہ فساد، افتراق اور تنازعہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کسی منقول بات کو قیاس، اندازے اور عقل کے ذریعے اس وقت ضرور مسترد کیا جا سکتا ہے، جب وہ بات ناممکنات میں سے ہو۔ مثلاً کوئی کہے کہ رات کو سورج نکل آیا، یا پچیس رمضان کو عید کا چاند دکھائی دیا۔

اگر کوئی بات ممکنات کے دائرے میں ہے، تو اس صورت میں ہم بلا وجہ اس کی تکذیب نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر اس کی بات میں شک کا کوئی پہلو ہے، تو پہلے خود اس خبر دینے والے کو دیکھا بھالا جائے گا۔ اگر اس کا ضعف ثابت ہو جائے تو شک کا پہلو پختہ ہو جائے گا۔ پھر اگر وہ کسی قابلِ احترام شخصیت پر طعن ہے تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔

اس لیے ہم نے جلیل القدر شخصیات سے متعلق ہر مشکوک اور متنازعہ روایت کو پہلے سند کے لحاظ سے ضعیف ثابت کیا ہے، پھر عقلی طور پر اس کی کمزوریاں ظاہر کی ہیں۔ یہی علمی طریقہ ہے۔

تاریخ کے زیادہ تر شبہات ضعیف یا جعلی روایات سے جنم لیتے ہیں، اسی لیے اکثر شبہات کے جوابات میں ہم نے روایات کا ضعف یا جعلی پن ثابت کر کے اعتراض کی بنیاد کو ختم کر دیا ہے۔ کیوں کہ یہ اصول طے ہے کہ ضعیف مواد کے ذریعے محترم شخصیات کو ہدفِ طعن نہیں بنایا جا سکتا۔ قارئین یہ بھی ملحوظ رکھیں کہ ہم نے وجہِ اعتراض بننے والی روایات کی تاویل یا تردید کے دوران ایسے مؤلفینِ کتب یا ناقلین کو نشانۂ اعتراض نہیں بنایا جو ثقہ، صالح اور امانت دار مشہور ہیں۔ کیوں کہ مؤلفین وناقلین مؤرخ ہوں یا محدث، اپنی اپنی شرائط کے مطابق روایات جمع کرتے رہے تھے۔ وجہِ اعتراض

بننے والی روایات صحیح بخاری وصحیح مسلم میں بھی ہیں۔جن روایات سے غلط استدلال کیا جاتا ہے،عموماً خرابی ان میں نہیں بلکہ قاری کے زاویۂ نگاہ میں ہوتی ہے۔بعض روایات ضعیف ہوتی ہیں مگر تاویل ان میں بھی ہوسکتی ہے۔

ہاں جس روایت میں کوئی تاویل نہ ہوسکے اور وہ سنداً بھی ضعیف ہو،وہاں ہم نے عقلاً ونقلاً اس کی تردید ہی کی ہے اور غلط استدلال کرنے والوں کو مسکت جوابات دیے ہیں۔

اسی علمی طریق کار کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ہم نے صحیح سند سے ثابت شدہ بات کو کہیں بھی اپنے اندازوں اور تصورات کا نشانہ بنا کر نہیں ٹھکرایا، چاہے وہ صدمہ انگیز، ناگوار یا خلاف توقع ہو۔کیوں کہ ایک ثابت شدہ واقعہ، چاہے ناگوارِ خاطر بھی ہو، اسے مان لینا ہی سلیم الطبع انسانوں کا کام ہے۔وہ جانتے ہیں کہ آنکھیں بند کرنے سے سچائی نہیں بدل سکتی۔

صحیح خبریں اور صحیح روایات ہمیں ماضی وحال کی سچائیوں تک پہنچاتی ہیں۔ان کا انکار کرنا حقائق کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔دنیا کے کسی بھی واقعے کے بارے میں ایک اتفاقی رائے اپنانے کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم معتبر اسناد سے منقول مواد کو قبول کریں اور مشکوک ذرائع کے مواد کو نظر انداز کردیں۔

اگر صحیح مواد کو بھی اپنی رائے اور قیاس سے مسترد کردینے کی گنجائش نکال لی جائے تو پھر کہیں بھی کسی بھی بات پر اتفاقِ رائے ممکن نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس کا لازمی مطلب یہ نکلے گا کہ روایات کی قبولیت یا تردید میں اصل مدار عقل پر ہے نہ کہ نقل پر۔یہ اصول مان لینے کے بعد ہر شخص کے لیے گنجائش نکل آئے گی کہ وہ چاہے تو اپنے ذوق اور خیال کی بنیاد پر ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی معقول قرار دے کر قبول کرلے اور اس کے یقینی ہونے پر اصرار کرے اور اپنے اندازے کی بنیاد پر صحیح ترین روایت کو بھی مسترد کردے۔ایسے میں ہر شخص کی اپنی اپنی رائے ہوگی اور اپنا اپنا دین ومذہب۔یہی طرزِ فکر ابتداء میں اختلافِ رائے اور انتہاء میں فرقہ بندیوں کی بنیاد بنتا ہے۔اسی لیے ہمارے اسلاف تفسیر، حدیث اور فقہ میں بھی روایت کو درایت اور منقول کو معقول پر ترجیح دیتے ہیں۔تاریخ میں بھی ہمیں اسی پر کاربند رہنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر کسی متنازعہ مسئلے میں فریقِ مخالف سے بھی اصول پسندی کی امید رکھنا محض ایک خوش فہمی ہوگی۔

یہ بھی یاد رکھا جائے کہ ہم نے اکثر وبیشتر انہی کتب کی ضعیف، ناقابلِ اعتماد اور جعلی روایات کو واضح کیا ہے جو اسلامی کتب خانے میں پائی جاتی ہیں۔ہمیں ان ہزاروں جعلی روایات سے جو مختلف فرقوں اور مذاہب کے لوگوں نے اپنے سینکڑوں رسائل وکتب میں بھر دی ہیں، کوئی سروکار نہیں؛ کیوں کہ ان کا بطلان ایک عام شخص پر بھی واضح ہونا کوئی مشکل نہیں۔بس تھوڑی سی سمجھ درکار ہے۔کسی ایک فرقے کی کتب کے مندرجات چاہے خود اس فرقے کے نزدیک حرفِ آخر ہوں مگر دوسروں سے ان کی صحت تسلیم کرنے پر اصرار بھلا کہاں درست ہوسکتا ہے اور کسی تاریخی مسئلے کی تحقیق ایسے متنازعہ مواد کے ذریعے بھلا کیسے ہوسکتی ہے؟

ظاہر ہے کوئی بھی مسئلہ اگر واقعی علمی طور پر حل کرنا ہے تو ایسا فقط اس صورت میں ہوسکتا ہے جب متفقہ مآخذ کو سامنے رکھ کر کچھ متفقہ اصولوں کے مطابق بات کی جائے۔یہی وہ نکتہ ہے جس پر آنے سے تعصب اور فرقہ بندیوں کے مارے

لوگ ہمیشہ کتراتے ہیں۔ بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینے سے حقائق نہیں بدل جاتے۔ کائنات کے سب سے بڑے اور اجلے حقائق وہی ہیں جو قرآنِ مجید اور سنتِ محمدیہ میں مذکور ہیں۔ الحمدللہ! ہر دور میں مسلمانوں کی اکثریت کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر اعتماد کرتی آئی ہے۔ ہم کوئی بھی علمی بحث کریں گے تو سب سے پہلے انہی کو سامنے رکھیں گے۔ اگر تاریخی بحث ہے تو قرآن وسنت کے بعد مسلمانوں کے سوادِ اعظم میں رائج کتبِ تواریخ کو لیں گے۔ اور ان کی روایات کو بھی قرآن وسنت کے اصول اور منہج کے مطابق دیکھیں گے۔

اب اگر کوئی فرقہ قرآن کی صحت وحفاظت میں شک کرتا ہے اور قرآن کی حجیت ہی اس کے نزدیک مشکوک ہے، اسی طرح وہ کتبِ حدیث کی تعریف پر ہی متفق نہیں ہوتا بلکہ اس کی حدیث بھی الگ ہے، اور تاریخ میں بھی من گھڑت روایات پر مبنی اس کے الگ مآخذ ہیں جنہیں پیش کر کے وہ انہیں منوانے پر اصرار کرتا ہے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

ایسے لوگوں کے لیے وہی کہا جا سکتا ہے جو قرآن مجید کا ارشاد ہے اور جسے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بڑی اچھے سیاق میں پیش فرمایا ہے۔ وہ جنگِ جمل کا واقعہ تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:[1]

> ''یہ خلاصہ ہے ان روایات کا جو ابو جعفر ابن جریر رحمہ اللہ نے اس فن کے ائمہ سے نقل کیں۔ اس میں وہ حدیثیں نہیں ہیں جو شیعہ یا دیگر فرقوں کے غرض پرست لوگوں نے صحابہ کے خلاف گھڑ لی ہیں، نہ ہی وہ جعلی خبریں ہیں جو یہ لوگ نقل کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں کو واضح حق کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں:
>
> ''ہمارے لیے ہماری تاریخی کتب ہیں اور تمہارے لیے تمہاری تاریخی کتب''
>
> ہم جواب میں انہیں کہتے ہیں:
>
> سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ.[2]
>
> ''ہم تم کو سلام کرتے ہیں۔ ہم نادان لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔''

☆☆☆

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۴۷۳

[2] سورۃ القصص، آیت: ۵۵

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق شبہات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں افسرانِ حکومت کون تھے؟

﴿سوال﴾ مشہور ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بن کر صرف اپنے اعزہ واقارب کو عہدے دیے اور بنواُمیہ کے سواسب پر ترقی کے راستے بند کر کے اقرباء پروری کا ثبوت دیا۔ اگر یہ غلط ہے تو بتایا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اہم افسرانِ حکومت کون کون تھے؟

﴿جواب﴾ یہ بات بالکل غلط ہے کہ صرف بنوامیہ کو مناصب دیے جاتے تھے اور باقی خاندانوں پر ترقی کے راستے بند تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مختلف قبائل اور خاندانوں کے لوگوں کو بکثرت عہدے دیے گئے۔ حقیقت جاننے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے اہم عہدیداروں کی فہرست پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے کہ ان میں ہر قبیلے کے لوگ تھے یا نہیں؟

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے افسران کی فہرست بترتیب حروف تہجی

نمبر شمار	نام	قبیلہ	جائے تقرری
۱	اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ	بنوعدی، کندی	والی آذربائیجان
۲	ابوالاعور عمرو بن سفیان رضی اللہ عنہ	سلمی	والی اُردن
۳	ابوالدرداء رضی اللہ عنہ	انصاری	قاضی دِمشق
۴	ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ	اشعر	والی کوفہ
۵	جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ	بجیلہ	والی قَرقیسیا
۶	جابر بن عمرالمزنی	مزنی	محصل خراج، عراق
۷	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	بنومازن	سالارآذربائیجان
۸	حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ	بنوفہر	سالارقنسرین
۹	حکیم بن سلامۃ	حزامی	والی موصل
۱۰	حبیش	بنواسد	والی ماسبذان

۱۱	خنیس بن خبیش	اوس	نامعلوم
۱۲	خالد بن العاص	بنومخزوم	والی مکہ
۱۳	خارجہ بن حذافہ عدوی ؓ	بنوعدی	محاسب مصر
۱۴	زید بن ثابت ؓ	بنوخزرج	قاضی مدینہ منورہ
۱۵	شُریح بن الحارث	کندی	قاضی کوفہ
۱۶	سبرۃ بن عمرو ؓ	عنبری	والی یمامہ
۱۷	سعد بن ابی وقاص ؓ	بنوزہرۃ	والی کوفہ ۲۴ھ
۱۸	سعید بن العاص ؓ	بنوامیہ	والی کوفہ ۳۰ھ
۱۹	سلمان بن ربیعہ ؓ	باھلی	سالار آرمینیا
۲۰	سماک بن مَخرَمہ انصاری ؓ	بنواسد	نامعلوم
۲۱	سائب بن الاقرع ؓ	بنوثقیف	والی اصفہان
۲۲	سعید بن قیس ؓ	بنوعدی	والی رے
۲۳	عبداللہ بن سوار العبدی ؓ	بنوعبد	والی بحرین
۲۴	عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ؓ	بنوعامر	والی مصر
۲۵	عبداللہ بن عمرو الحضرمی	بنوکندۃ	والی مکہ
۲۶	عبداللہ بن عامر ؓ	بنوعبدشمس	والی بصرہ
۲۷	عبداللہ بن قیس	بنوفزارہ	نامعلوم
۲۸	عبداللہ بن ابی ربیعہ ؓ	بنومخزوم	والی جند
۲۹	عبداللہ بن مسعود ؓ	بنوہذیل	قاضی وخازن کوفہ
۳۰	عبداللہ بن ارقم ؓ	بنوزہرۃ	ناظم بیت المال
۳۱	عبدالرحمٰن بن خالد ؓ	بنومخزوم	والی حمص
۳۲	عتیبہ بن النہاس	العجلی	والی حلوان
۳۳	عثمان بن ابی العاص ؓ	بنوثقیف	والی بحرین ویمامہ

۳۴	عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ	جہنی، انصاری	والی مکہ
۳۵	علقمہ بن حکیم کنانی	بنو کنانہ	والی فلسطین
۳۶	علی بن ربیعہ	بنو عبد شمس	والی مکہ
۳۷	عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ	بنو سہم	والی مصر، اسکندریہ
۳۸	کعب بن سُور	ازدی	قاضی بصرہ
۳۹	قعقاع بن عَمر و رضی اللہ عنہ	بنو تمیم	سالارِ کوفہ
۴۰	قاسم بن ربیعہ	بنو ثقیف	والی طائف
۴۱	مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ	بنو امیہ	والی شام
۴۲	مروان بن حکم	بنو امیہ	والی بحرین/کاتب
۴۳	مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ	بنو ثقیف	والی کوفہ، آذر بائیجان
۴۴	مالک بن حبیب	یربوعی	والی ماہ
۴۵	نسیر العجلی	انصاری، عجلی	والی ہمدان
۴۶	ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ	بنو امیہ	والی کوفہ
۴۷	یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ	تمیمی	والی صنعاء یمن[1]

یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے اہم عہدوں پر فائز ۴۷ افراد کی فہرست ہے، ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اعزہ واقارب صرف چھ ہیں، ان میں بنوامیہ سے تعلق رکھنے والے رشتہ دار چار ہیں:

❶ حضرت ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ (ماں شریک بھائی) ❷ حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما (چچازاد)

❸ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ (چچازاد) ❹ مروان بن حکم (چچازاد)

بنوامیہ سے باہر کے رشتہ دار صرف دو ہیں:

❶ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ...... (ماموں زاد بھائی۔ قبیلہ کے لحاظ سے عبشمی)

❷ حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ...... (رضاعی بھائی۔ قبیلہ کے لحاظ سے بنو عامری)

---

① تاریخ الطبری: ۴/۳۳۰، ۳۳۱ ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۷۸ تا ۱۸۰ ؛ عصر الخلافۃ الراشدہ لدکتور اکرم ضیا عمری، ص ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۷۳ نیز اسد الغابۃ اور الاصابۃ میں مذکورہ ناموں کے تحت حالات دیکھیے۔

نوٹ: اس فہرست میں کہیں کہیں ایک عہدے کے لیے ایک سے زائد نام ہیں مثلاً: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا نام بھی مصر کے حاکم کے طور پر درج ہے اور عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا بھی۔ یہ فرق زمانے کے لحاظ سے ہے۔ یعنی پہلے یہ عہدہ ایک شخص کے پاس تھا۔ پھر دوسرے کو دیا گیا۔

ان چھ کو چھوڑ کر باقی اکتالیس اہم عہدیدار سب پرائے ہیں۔

ملحوظہ:

فتح مکہ سے لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کے دور کا جائزہ لیں تو دکھائی دے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے پہلے بنوامیہ کے عہدے دار بکثرت تھے، جو ان کے زمانہ خلافت میں تدریجی طور پر کم ہوتے گئے۔

گزشتہ ادوار کا جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حکومتی مشینری میں بنوامیہ کے دس افراد تھے:

❶ حضرت عثمان بن عفان ❷ حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان ❸ حضرت یزید بن ابی سفیان ❹ حضرت ابوسفیان بن حرب ❺ حضرت عتاب بن اسید ❻ حضرت ولید بن عُقبہ ❼ حضرت خالد بن سعید بن العاص ❽ حضرت عَمر و بن سعید بن العاص ❾ حضرت ابان بن سعید بن العاص ❿ حضرت سعید بن سعید بن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اس لیے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ عہدیدار قریش کے کسی قبیلے میں بنوامیہ سے زیادہ موجود نہیں تھے، کیوں کہ بنوامیہ تعداد میں بڑھ کر تھے اور شرافت وسیاست رکھتے تھے۔''[1]

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ تعداد میں عہدیدار خاندانِ بنوامیہ سے مقرر کیے تھے، جس کی وجہ بنوامیہ کی فطری فکری، سیاسی وانتظامی قابلیت تھی، اسی لیے وہ ایک صدی سے عرب کی سیاست میں ممتاز تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس صلاحیت کو پوری طرح استعمال کیا۔

ان دس اموی عہدیداروں میں سے آخری یعنی سعید بن سعید رضی اللہ عنہ غزوۂ طائف سن ۸ ہجری میں شہید ہوگئے تھے، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلافت کے وقت باقی نو اموی عمال ملے جن کو انہوں نے آخر تک برقرار رکھا۔

ان حضرات میں سے خالد بن سعید بن العاص، عَمرو بن سعید بن العاص اور ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہم جنگ اجنادین میں شہید ہوگئے۔ ادھر عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ بھی وفات پاگئے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ اموی عہدیداروں سے پانچ افراد ملے:

❶ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

❷ حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

❸ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

❹ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ

❺ حضرت ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرکزی شوریٰ میں شامل رہے، بقیہ حضرات عسکری مہمات کی قیادت کرتے رہے۔ پھر ان پانچوں میں سے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ طاعون سے سن ۱۸ ہجری میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور

[1] منہاج السنۃ: ۱۹۲/۶

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ عمر رسیدگی کی وجہ سے فعال نہیں رہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بنو امیہ کے ایک اور نوجوان حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو بھی عہدیدار بنا دیا۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے دور میں بنو امیہ کے صرف تین عمال ملے، حضرت مُعاویہ، حضرت ولید بن عُقبہ اور حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہم۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان تینوں کو برقرار رکھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان کی شہادت تک شام کے گورنر رہے، جو دورِ فاروقی سے شام کے گورنر تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ نے صرف ترقی دے کر انہیں پورے شام کا حاکم بنا دیا تھا۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ ترقی بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دی تھی اور انہیں پورے شام کی ذمہ داری دے دی تھی۔[①]

ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو ۲۵ھ میں ترقی دے کر کوفہ کا گورنر بنایا۔ ۲۹ھ میں انہیں برطرف کر دیا اور ان کی جگہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا۔ ۳۴ھ میں بعض شرپسندوں کے احتجاج پر انہیں بھی معزول کر دیا۔ غرض یہ کہ یہ تینوں اموی صحابی پہلے ہی سے حکومتی عہدوں پر تھے۔[②]

اسی طرح آپ کے رضاعی بھائی حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے مصر کے علاقے صعید کے والی تھے۔[③] آپ نے انہیں صرف ترقی دی اور ۲۷ھ میں پورے مصر کا گورنر بنایا۔[④]

یعنی ان کے اختیارات میں صرف اضافہ کیا تھا ورنہ وہ سرکاری افسر پہلے سے چلے آرہے تھے۔

صرف دو رشتہ دار ایسے تھے جو آپ نے نئے منتخب کیے: اوّل آپ کے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ جنہیں ۲۹ھ میں بصرہ اور فارس کا گورنر بنایا۔[⑤] دوم کاتبِ دیوانِ خلافت مروان بن حکم۔

آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت حکومت میں آپ کے صرف چار رشتہ دار تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم۔

فتح مکہ سے لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کے دور کا یہ تفصیلی جائزہ بتا رہا ہے کہ پہلے بنو امیہ کے عہدے دار بکثرت تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں وہ زیادہ نہیں بلکہ عدد کے لحاظ سے کم ہوئے تھے۔



کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش صحابہ نے برپا کرائی تھی؟

﴿سوال﴾ حدیث و تاریخ کی کئی صحیح اور حسن روایات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت صحابہ کرام نے برپا کرائی تھی اور اس کی بنیادی وجہ صحابہ میں اقتدار کی کش مکش تھی۔ بنو امیہ اقتدار پر غلبہ پانا چاہتے تھے اور باقی صحابہ بنو امیہ کے اقتدار سے حسد کرتے تھے۔ یہ ثابت ہے کہ ملک کے پانچ چھ نمایاں ترین عہدے آخری پانچ چھ

---

① خلیفہ بن خیاط، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات کے تحت لکھتے ہیں: لم جمع الشام کلھا لمعاویۃ بن ابی سفیان. (تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۵۵)
② تاریخ خلیفہ بن خیاط، سن ۲۵، ۲۹، ۳۴ھ
③ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۴، ط الرسالۃ
④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، سن ۲۷ھ
⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط، سن ۲۹ھ

سالوں میں ایک ہی خاندان یا برادری کے پاس تھے۔ ۲۹ھ میں جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں زاد عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا گورنر بنایا تو عالم اسلام کی صورتحال یہ ہوئی کہ پورے ملک پر عملاً ایک گھرانے کی اجارہ داری تھی۔ کیوں کہ بصرہ کی گورنری کا مطلب ایک شہر کی نہیں بلکہ پورے فارس، خراسان اور سرحدات ہندوستان تک کی ولایت تھی۔ کوفہ کی گورنری کا مطلب پورے عراق اور وسط ایشیا کا کنٹرول تھا جہاں سعید بن العاص الاموی رضی اللہ عنہ گورنر تھے۔ شام کی گورنری کا مطلب پورے اردن، لبنان، فلسطین اور ایشیائے کوچک کی حکومت تھا جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ بھی اموی تھے۔ مصر کی گورنری کا مطلب پورے افریقہ کی حکومت تھا جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی گورنری تھی۔ جزیرۃ العرب کے چند چھوٹے صوبوں یعنی: مکہ، یمن اور بحرین کو چھوڑ کر اس دور کا پورا عالم اسلام یہی تھا۔

مزید یہ کہ یہ سب عہدے دار طلقاء میں سے تھے یعنی فتح مکہ کے موقع پر جنہیں معافی دے کر اسلام میں داخل کیا گیا۔ مزید برمزید یہ کہ آخری صف کے ان حضرات کو آگے لانے کے لیے بعض اکابر صحابہ کو معزول کیا گیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے ان کی جگہ لینے والے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے آخری صف کے صحابی تھے۔ اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:

هذا مما نقموا علىٰ عثمان ان عزل سعد بن ابی وقاص عن الکوفة وولّى هذا.[1]

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ بھی کم عمر صحابہ میں تھے[2] اسی طرح حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو لایا گیا۔ وہ بھی فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کرنے والے صف آخر کے صحابی تھے۔ اور اس سے پہلے ایک بار مرتد ہونے کی وجہ سے ان کی شہرت اچھی نہ تھی۔[3] ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی جگہ بصرہ پر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا گیا، وہ بھی نوجوان تھے۔[4] اکابر صحابہ کی موجودگی میں ان صغار صحابہ کا تقرر لوگوں کے لیے اچنبھے کا باعث بنا۔

حکم بن العاص کو بھی طلقاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان صاحب کو بعض مشکوک حرکات کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر بدر کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایسے شخص کو واپس بلانا اور دیوانِ خلافت کا انتظام اسی کے بیٹے مروان کو دے دینا بھی لوگوں میں تشویش کا باعث بنا۔[5] فقط عام لوگ نہیں بلکہ محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ جیسے لوگ جو اکابر صحابہ کے بیٹے تھے اس صورتحال سے ناراض ہوئے۔[6]

---

[1] یہ ان کاموں میں سے ہے جن کی بنیاد پر لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوئے کہ انہوں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے ہٹا کر ان (ولید بن عقبہ) کو حاکم بنا دیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۱۴، ۴۱۵ ط الرسالة)

[2] سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۴۵، ط الرسالة

[3] حسن المحاضرة فی تاریخ مصر والقاهرة: ۱/۵۷۹، ط دار احیاء الکتب العربیة

[4] تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۸

[5] طبقات ابن سعد ۵/۳۶ ط صادر ؛ الاستیعاب: ۱/۳۵۹ ؛ اسد الغابة، ترجمه نمبر: ۱۲۱۷، ۴۸۴۸، ط العلمیه

[6] تاریخ الاسلام للذهبی: ۳/۲۰۲، ترجمة: محمد بن ابی حذیفه ؛ الاستیعاب: ۳/۱۳۶۶، ترجمة محمد بن ابی بکر

اور یہی وجہ تھی کہ (طبری کی روایت کے مطابق) جبلہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سرعام کہا:

''تم نے اپنے اقارب کو عہدے دے دیے ہیں، مروان کو، معاویہ کو، عبداللہ بن عامر کو اور عبداللہ بن ابی سرح کو جس کا خون حلال ہونے کے بارے میں قرآن نازل ہوا جس کا خون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا ہے'' ①

بعض حدیثی روایات بھی ثابت کرتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خاندان کا تسلط بنو ہاشم کو بھی ناپسند تھا، اسی لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کوڑے مارنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

" وَلِّ حارَها مَنْ تَوَلّٰى قَارَها." ②

''اس کام کی تپش وہی برداشت کرے جسے اس کی ٹھنڈک ملی ہو۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح یوں کی ہے:

"والضمير عائد الى الخلافة والولاية ،اى كما ان عثمان واقاربه يتولون هنيء الخلافة ويختصون به ،يتولون نكدها وقاذوراتها ومعناه ليتول هذا الجلد عثمان بنفسه او بعض خاصة اقاربه الادنين ." ③

یعنی حکومت کے خوشگوار کاموں کا لطف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اقارب ہی اٹھا رہے ہیں تو اس کے ناخوشگوار کاموں کا بوجھ بھی وہی اٹھائیں، ایسے کاموں کی زحمت ہمیں نہ دیں۔

یہی روایت ابوداؤد میں بھی بسندِ صحیح نقل کی گئی ہے اور شارحینِ حدیث نے مذکورہ الفاظ کی تشریح بھی کی ہے۔ ④

مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ نے اس کی تشریح یوں کی ہے:

اى ولِّ شدائدها ومكروهاتها من تولى منافعها وهم بنو امية. ⑤

اس پسِ منظر سے اور مذکورہ روایات سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بنوامیہ کا بڑھتا ہوا اقتدار صحابہ کرام کو ناپسند تھا۔ اسی لیے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوئے۔ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قیادت کی ذمہ داری صحیح انجام نہیں دی اور اپنی غلط پالیسیوں سے خود ایسے حالات پیدا کیے کہ ان کے خلاف شورش کھڑی ہوئی۔

﴿جواب﴾ یہ بات درست ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں اکثر بڑے صوبوں کی گورنری ان کے اعزہ واقارب کے پاس تھی مگر اس کا یہ مطلب نکالنا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے فرائض میں کسی خیانت کے مرتکب تھے، ایک الزام اور تہمت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عظیم مناقب کے پیشِ نظر ان کی امانت ودیانت شک وشبہ سے بالاتر

---

① تاریخ الطبری: ۴/ ۳۶۶

② صحیح مسلم، ح: ۴۴۵۴، کتاب الحدود ؛ سنن ابی داود، ح: ۴۴۸۰، کتاب الحدود

③ شرح صحیح مسلم للنووی: ۱۱/ ۲۱۹، ط احیاء التراث

④ عون المعبود: ۱۲/ ۱۱۷، ط العلمیه

⑤ اس کے سخت اور مکروہ امور کو بھی وہی انجام دیں جنہوں نے اس کے منافع حاصل کیے۔ (بذل المجهود: ۱۷/ ۳۵۲، ط العلمیه)

ہ،اس لیے انہوں نے جو بھی اقدامات یا انتظامات کیے، اس کے پیچھے اُمت کی بھلائی مقصود تھی نہ کہ ذاتی یا خاندانی
بات۔ ہر انسان اہم کاموں کے لیے انہی لوگوں کو چنتا ہے، جن پر اسے زیادہ بھروسہ ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی
ن کے نوجوانوں پر زیادہ اعتماد تھا، اس لیے انہوں نے ان میں سے بعض کو اعلیٰ عہدے دیے یا بعض کو برقرار رکھا
بھی کو ترقی دی۔ ایسے کاموں میں خلیفہ کو اختیار ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو پھر اسے خلیفہ بنانا بے مطلب ہے۔

یہ ایک انتظامی معاملہ تھا جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نیت بالکل صاف تھی۔ انہوں نے یہ اعلیٰ خدمات اگر اپنے
ہی لوگوں کو دی تھیں تو صرف اس لیے کہ ان کی نگاہ میں یہ حضرات امورِ سیاست کو انجام دینے کے پوری طرح اہل
ان مناصب کے بہترین حق دار تھے۔ محمد بن ابی حذیفہ یا محمد بن ابی بکر اگر اس صورتحال سے نالاں ہوئے تو یہ ان کی
ذاتی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شورش پسند گروہ میں شامل ہو گئے۔ اگر ایسے لوگوں سے شرپسندوں نے اپنی تحریک کو
نے میں مدد لی، اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ شورش
دوں نے اس صورتحال کو غلط رنگ دے کر لوگوں کو مشتعل کیا۔ مگر یہ کہنا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے خلاف شورش کے
دار خود تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ نعوذ باللہ نااہل یا خائن تھے، ایک جھوٹا دعویٰ ہے۔

یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آخر میں قوم کو اختیار دے دیا تھا کہ جس شہر کے لوگ جسے چاہیں اپنا حاکم
لیں۔ اس کے باوجود بعض شہروں کے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے مقرر کردہ حکام کو برقرار رکھنے کا اعلان
۔[1] اس کے بعد بھلا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیا الزام رہ جاتا ہے!!

صحیح مسلم کے حوالے سے نقل کردہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے جملے: ''ول حارھا من تولی قارھا.'' سے بھی یہ نتیجہ
نا درست نہیں کہ صحابہ کرام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دشمن تھے۔ ہاں اسے اختلافِ رائے مانتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے
بعض صحابہ مخلصانہ طور پر یہ رائے رکھتے تھے کہ ایک خاندان کا غلبہ اُمت کی مصلحت کے لحاظ سے مناسب نہیں۔

طبری کے حوالے سے جبلہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کا جو ذکر ہے، یہ واقدی کی روایت ہے جس
ضعف ظاہر ہے۔ مگر اس روایت کو مان لیں تب بھی یہی ثابت ہوگا کہ اس دور میں اظہارِ رائے کی پوری آزادی تھی۔
اخلاص کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان گورنروں کا تقرر کیا تھا، اسی اخلاص کے ساتھ بعض صحابہ کرام یہ دوسری
ئے رکھتے تھے اور پوری دیانت داری کے ساتھ بعض اوقات اپنا موقف پیش کر دیتے تھے۔

کسی موقع پر اس حوالے سے کسی صحابی کی زبان سے کوئی سخت جملہ نکل گیا ہو تو یہ بھی کوئی انہونی بات نہیں، وہ
بہرحال بشر تھے جن پر کبھی رنج وغم یا غصے جیسی کیفیات غالب آتی رہتی ہیں۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ ایسے واقعات کو
کر حضرات صحابہ کی بزرگی وجلالتِ شان کے خلاف آراء قائم کی جائیں اور انہیں ہدفِ تنقید بنایا جائے کیوں کہ یہی
حضرات دین کی سند ہیں ان کی عظمت وشرافت اور امانت ودیانت کے تصور کے بغیر دین برقرار نہیں رہ سکتا۔

[1] تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۱۱۱۴/۳

اقرباء پروری کے الزام کے دفاع میں چند اہم نکات:

① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے عہدیداروں میں ان کا کوئی بیٹا یا داماد شامل نہ تھا، حالاں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر ستر، اسّی کے درمیان تھی اور آپ کے بیٹوں میں سے بعض جوان اور بعض ادھیڑ عمر ہو چکے تھے۔ سب کے سب نہایت لائق اور قابل تھے۔ آپ کے نو بیٹے تھے، دو بیٹوں: عبداللہ اور عبدالملک نے کم سنی میں وفات پائی تھی، باقی سات لڑکے: عبداللہ اصغر، عمرو، خالد، ابان، عمر، ولید اور سعید جوان ہوئے اور علم وفضل کی بلندیوں کو پہنچے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں کبھی ان کو آگے لانے کی کوشش نہیں کی۔

بعد میں حضرت سعید رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابان رحمہ اللہ نے عبدالملک بن مروان کے دور میں حکومتی عہدوں پر فائز ہو کر شہرت پائی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بقیہ پانچ بیٹوں کو دنیا جانتی تک نہیں اور جن کو جانتی ہے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اتنے گم نام رہے کہ اس دور کی تاریخ میں ان کا نام کسی واقعے میں برسبیلِ تذکرہ بھی بمشکل ملے گا۔ کیا اپنی اولاد کو پیچھے رکھنے کی شعوری کوشش کے بغیر ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ اتنے بڑے حکمران کے صاحبزادوں کے ناموں تک سے واقف نہ ہوں؟ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سات بیٹیاں تھیں مگر اپنے کسی داماد کو آپ رضی اللہ عنہ نے کوئی حکومتی عہدہ نہیں دیا۔ عام لوگ آج تک آپ کے دامادوں کے ناموں سے انجان ہیں۔

② اہلِ تشیع کو تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا کیوں کہ پھر اس صورت میں ان کے پاس ناصبیوں کے اس الزام کا کوئی جواب نہیں رہ جاتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں بنو ہاشم کو کیوں عہدے دیے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبیداللہ بن عباس، حضرت قُثَم بن عباس، حضرت تمام بن عباس رضی اللہ عنہم اور اپنے لے پالک محمد بن ابی بکر میں سے ہر ایک کو گورنر بنایا، اس پر کسی صحابی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔[1]

درحقیقت اہلِ تشیع کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض درست ہے نہ ناصبیوں کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر۔ جمہور علمائے دین یہ مانتے ہیں کہ اعزہ واقارب اگر قابل ہوں تو انہیں ضرورت کے وقت کوئی عہدہ دینا غلط نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے جن رشتہ داروں کو عہدے دیے اس کے پیچھے ذاتی مفاد یا اقربا پروری کا جذبہ قطعاً نہیں تھا۔

③ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جن اقارب کو عہدے دیے یا ان کے اختیارات بڑھائے، تاریخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے توقع سے بڑھ کر اچھی کارکردگی دکھائی۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کا گورنر بن کر جو فتوحات حاصل کیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔

اسی طرح عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے مصر اور افریقہ کی آمدن میں غیر معمولی اضافہ کر کے دکھایا اور جہاد کے سلسلے کو بھی آگے بڑھایا جس کی ایک مثال غزوۃ ذات الصواری ہے۔[2]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۰، ۲۰۱

② ان فتوحات کی تفصیل تاریخ خلیفہ اور تاریخ الطبری میں ۲۷ ھجری سے ۳۳ ھجری کے حالات کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

ؓ صحابہ کرام سیاست کو دین سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک یہ مخلوق کی خبر گیری سے اللہ کو راضی کرنے کا ذریعہ تھا۔یہ خدمت تھی نہ کہ مال وجاہ کی دوڑ۔پس قومی وملی خدمات میں اقارب کو شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ ان میں قابلیت بھی ہو۔حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ''سورۂ طٰہٰ'' کی آیت:۲۹:'' وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ.(اور میرے لئے بنادے ایک مددگار میرے گھر والوں سے)کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس دعا میں موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا،اس کے ساتھ ایک قید ''من اہلی'' کی بھی لگادی کہ یہ وزیر میرے خاندان واقارب میں سے ہو،کیوں کہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات واخلاق دیکھے بھالے اور طبائع میں باہم الفت ومناسبت ہوتی ہے جس سے اس کام میں مدد ملتی ہے بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق دیکھ کر لیا گیا ہو،محض اقرباء پروری کا داعیہ نہ ہو۔اس زمانے میں چونکہ عام طور پر دیانت واخلاص مفقود اور اصل کام کی فکر غائب نظر آتی ہے،اس لیے کسی امیر کے ساتھ اس کے خویش وعزیز کو وزیر ونائب بنانے کو مذموم سمجھا جاتا ہے اور جہاں دیانت داری پر پورا بھروسہ ہو تو کسی صالح واصلح خویش کو کوئی عہدہ سپرد کردینا کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ مہماتِ امور کی تکمیل کے لیے زیادہ بہتر ہے۔رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین عموماً وہی حضرات ہوئے جو بیتِ نبوی کے ساتھ رشتہ داریوں کے تعلقات بھی رکھتے تھے۔''[1]

☆☆☆

ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو فسق کے باوجود گورنر کیوں بنایا گیا؟

﴿سوال﴾ بہت سے لوگ ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو گورنر بنانے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ وہ شخص تھے جن کے بارے میں سورۃ الحجرات کی یہ آیات نازل ہوئی تھیں:

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا

''اے ایمان والو!اگر تمہارے پاس کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو۔''

اس کے شانِ نزول کے بارے میں محدثین اور مفسرین نے بتایا ہے کہ حضور ﷺ نے ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو ایک قبیلے سے زکوۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔انہوں نے واپس جاکر حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ وہ قبیلہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔حضور ﷺ نے یہ سن کر اس قبیلے سے جہاد کی تیاری کی مگر بعد میں اصل حقیقت پتا چلی کہ اس قبیلے کے لوگ مسلمان ہی ہیں۔ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو غلط فہمی ہوئی تھی اور انہوں نے غلط خبر دی تھی۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2] اس سے پتا چلا کہ ولید رضی اللہ عنہ فاسق تھے۔پھر انہیں عثمان رضی اللہ عنہ نے گورنر کیوں بنایا؟

---

[1] معارف القرآن: ۶/۷۸

[2] مسند احمد، ح ۱۸۴۲۹، ط الرسالۃ ؛ السنن الکبری للبیہقی، روایت نمبر: ۱۷۹۷۵، ۱۷۹۷۶، ط العلمیۃ

﴿جواب﴾ اس اعتراض کے جواب میں پہلے اس پر غور کیا جائے کہ ولید رضی اللہ عنہ اس واقعے سے پہلے فاسق چلے آرہے تھے یا ان کا بلاتحقیق کسی قبیلے پر تہمت لگا دینا ان کے فسق کا سبب بنا۔ اگر کہا جائے کہ اس حرکت کی وجہ سے وہ فاسق بنے تو یہ غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے غلط فہمی میں اس قبیلے پر الزام لگایا تھا۔ اور غلط فہمی بڑے بڑے اولیاء کو ہو جاتی ہے، یہ کسی کے نزدیک بھی فسق کی وجہ نہیں بن سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ پہلے سے فاسق چلے آرہے تھے تو یہ بھی غلط ہوگا کیوں کہ وہ ایسے کردار کے ہوتے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں زکوٰۃ کی وصولی کا ذمہ دار نہ بناتے جو بڑی احتیاط، امانت اور دیانت کا کام ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں افسر نہ بناتے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت سے متعلق پیش کردہ تفسیری احادیث میں اکثر کی سند کمزور ہے۔ ہاں بعض صحیح السند روایات میں بھی یہ قصہ مختصراً آیا ہے مگر ان میں کہیں صاف الفاظ میں یہ نہیں کہا گیا کہ ولید فاسق تھے، بلکہ ان سے فقط یہ پتا چلتا ہے یہ آیت ان کے واقعے میں نازل ہوئی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ فاسق سے مراد کون تھا؟ تو اس کا سب سے اچھا جواب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے یوں دیا ہے: **"یہ بھی ممکن ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کسی شریر شخص نے اس استقبال کے متعلق غلط خبر دی ہو، اور اسے اقدام وہجوم (حملے) کی شکل میں دکھایا ہو۔ اس پر خدا (تعالیٰ) نے فاسق کا اطلاق اسی شخص پر کیا۔"**[1]

پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کی امانت ودیانت کا پتا نہ ہو تو اس پر یقین کر کے کسی کو غدار، بے ایمان یا مجرم نہ مان لیا جائے۔ آیت سے متعلقہ صحیح روایات کا بھی بے تکلف مطلب یہی ہے اور ان کے الفاظ میں یہ مطلب لینے کی پوری گنجائش ہے۔ اس میں حضرت ولید رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں۔ لہٰذا انہیں گورنر بنانے میں کوئی حرج نہ تھا۔

☆☆☆

کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ سے بدسلوکی کی؟

﴿سوال﴾ کیا عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ستایا اور انہیں جلاوطن کر کے ربذہ بھیج دیا تھا؟ اور کیا یہ درست ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر اتنا تشدد کیا تھا کہ ان کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں؟

﴿جواب﴾ دونوں الزامات بے بنیاد ہیں۔ صحیح روایت کے مطابق حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں ٹھہرانا چاہتے تھے، وہ خود اپنی خوشی سے ویرانے میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ ان کی اہلیہ فرماتی تھیں: اللہ کی قسم! عثمان نے ابوذر کو نہیں نکالا بلکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا "جب مدینہ کی آبادی سلع پہاڑ تک پہنچ جائے تو وہاں سے نکل جانا۔" چونکہ مدینہ کی آبادی سلع پہاڑ تک پھیل گئی تھی اس لیے وہ مدینہ سے نکل گئے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر تشدد کی روایت بے سند اور روافض کی خانہ ساز ہے۔[3]

---

[1] ترجمان القرآن: ۳۸۲/۳، سورۃ الحجرات [2] مستدرک حاکم، ح: ۵۴۶۸، علی شرط البخاری ومسلم

[3] تاریخ یعقوبی، ص ۱۷۴، اس کا واحد ناقل مؤرخ یعقوبی خود شیعہ ہے اور بلا سند اس واقعے کو نقل کرتا ہے، چنانچہ اثنا عشری عالم ابن المطہر الحلی نے "منہاج الکرامۃ" میں جب یہ الزام دہرایا تو علامہ ابن تیمیہ نے اس کا صاف جواب یہی دیا کہ یہ روایت بے اصل ہے۔ (منہاج السنۃ: ۲۵۵/۶)

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو زدوکوب کرانے کی حقیقت:

﴿سوال﴾ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو زدوکوب کرایا اور کیا دونوں حضرات میں دشمنی تھی؟

﴿جواب﴾ یہ مبالغہ آمیز باتیں ہیں۔ حقیقت فقط اتنی ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خلاف کی جانے والی سازش کی تحقیق کے لیے مصر بھیجا تھا۔ وہاں وہ کچھ دن زیادہ رک گئے اور اسی دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف گروہ سے الزامات سن سن کر شاید کچھ متاثر بھی ہو گئے۔ [1]

اس کے بعد جب وہ مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو ایک مجلس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کچھ تنقید بھی کی جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعض عقیدت مند سخت ناراض ہوئے۔ [2] آخر عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے چاہا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے براہِ راست ان الزامات کی بابت پوچھا جائے۔ یہ دونوں حضرات امیر المؤمنین کے گھر پہنچے تو انہوں نے مشغولیت کی وجہ سے دربان بھیج کر انہیں واپس جانے کا کہا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ واپس ہو گئے مگر حضرت عمار رضی اللہ عنہ واپس نہ گئے۔ اس پر دربان نے ان پر ہاتھ اٹھالیا۔ [3]

ظاہر ہے کہ اس فعل میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رضامندی نہ تھی۔ جس روایت میں دربان کے ہاتھوں زدوکوب کا ذکر ہے اسی میں یہ وضاحت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو فرمایا: ''میں نے دربان کو مارنے پیٹنے کا نہیں کہا تھا۔'' نیز یہ پیش کش کی کہ میں حاضر ہوں، عمار رضی اللہ عنہ چاہیں تو مجھ سے بدلہ لے لیں۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام شبہات کے تسلی بخش جواب دے کر سب کو مطمئن کر دیا۔ [4]

چنانچہ عمار رضی اللہ عنہ نے محاصرے کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا اور غم زدہ ہو کر بلوائیوں سے کہا:

''تم لوگوں نے ایسے شخص پر پانی بند کر رکھا ہے جس نے رومہ کا کنواں خرید کر وقف کیا۔'' [5]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے محاصرہ کرنے والوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے منع کیا تھا۔ [6]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے راضی تھے۔

---

[1] ان عمارا قد استماله قوم بمصر وقد انقطعوا الیه منهم عبدالله بن السوداء و خالد بن ملجم وسُودان بن حُمران و کنانة بن بشر (تاریخ الطبری: ۳۴۱/۴) روایت بہرحال ضعیف ہے؛ کیوں کہ راوی یزید فقعسی مجہول الحال ہے۔

[2] مستدرک حاکم، ح: ۵۶۵۸، عن ابی الغادیة، رجاله ثقات

[3] مصنف ابن ابی شیبه، روایت نمبر: ۳۷۶۹۱، ط الرشد، اسناده حسن، فیه عفان بن مسلم، هو ثقة. (تقریب التهذیب نمبر: ۴۶۲۵) وفیه ابومحصن حُصَین بن نُمَیر الواسطی، رمی بالنصب، وثقه ابوزرعة. قال ابن معین: صالح. قال ابوحاتم: لاباس به. (تهذیب الکمال: ۵۴۷/۶) وحُصَین بن عبدالرحمن ثقة قبل الاختلاط. (تقریب التهذیب نمبر: ۱۳۶۹) وروایة ابن نُمیر عنه بعد الاختلاط. وفیه رجل من بنی فهر. قال البخاری: جهیم الفهری (التاریخ الکبیر: ۲۵۱/۲) وثقه ابن حبان، قال: جهیم الفهری یروی عن عثمان وسعد وعمار روی عنه حُصَین بن عبدالرحمن. (الثقات لابن حبان، نمبر: ۲۰۸۴)

[4] ایضاً

[5] رواه محب الطبری، انظر الریاض النضرة فی مناقب العشرة: ۹۸/۳ عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ، ولم اجده فی کتب المتقدمین.

[6] حتی اذا کان یوم احیط بعثمان سمعت رجلا وهو یقول: الا، لا تقتل هذا، فنظرت الیه فاذا هو عمار (المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۶۳/۲۲)

کیا صحابہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مابین کشیدگی رہی تھی؟

﴿سوال﴾ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام کے مابین سخت کشیدگی تھی اور کیا بعض صحابہ بغاوت میں شامل تھے؟

﴿جواب﴾ صحیح وحسن روایات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والوں میں کسی صحابی کا نام نہیں ملتا۔ ضعیف روایات سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بعض غیر معروف صحابہ یا ایسے لوگ جن کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر زبانی تنقید یا دارِ عثمان کے محاصرے میں بھی ملوث ہوئے۔ صحیح روایات میں اکثر صحابہ کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع ہی ثابت ہے۔ ہاں اِکاّدُکاّ بعض اصحاب کی جانب سے ایک دو جگہ زبانی تنقید منقول ہے یا دفاع میں کماحقہ حصہ نہ لینے کا ثبوت ملتا ہے [1] مگر اس سے ان پر کوئی الزام نہیں آتا۔ وہ بہرکیف بشر تھے۔ نیک انسانوں میں بھی تکرار ہوسکتی ہے اور حالتِ فتنہ میں کوئی اقدام کرنے نہ کرنے میں تذبذب بھی ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف اور قتل کی سازش میں شریک تھے؟

﴿سوال﴾ بعض روایات کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کے ابتدائی ایام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے مشورے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کی، سمجھایا، اللہ کے شدید عذاب سے ڈرایا اور کوشش کی کہ وہ اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور اپنے نائبین کو بے لگام نہ چھوڑیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے الزامات کو قبول نہیں کیا۔ ان روایات کی سنداً و متناً کیا حیثیت ہے؟ [2]

﴿جواب﴾ یہ روایات صرف واقدی کی ہیں جو ضعیف راوی ہیں۔ ان روایات کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ یہ مانا جاسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ازراہِ نصیحت کچھ گفت وشنید کی تھی۔ صحابہ کرام میں خیرخواہانہ بنیاد پر باہم تکرار ہوجانے کا انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ طبعی وبشری عوارض کے تحت ایسا ہوجاتا تھا۔ لیکن اگر ان روایات سے کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطاکار و گناہ گار تھے یا یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کا تختہ الٹنا چاہتے تھے تو یہ بات دیگر معتبر روایات سے متصادم ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فساد کی سرپرستی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود برأت ظاہر کی تھی، جیسا کہ صحیح سند کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''میں نے نہ انہیں قتل کیا، نہ کسی کو اس پر آمادہ کیا۔'' [3]

اتنی بات ضرور ہے کہ سبائی پروپیگنڈے کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ شک ہورہا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہیں اس جرم میں شریک تو نہیں۔ بعض صحابہ کو بھی یہ شک ضرور ہوا تھا، چنانچہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اللہ کی قسم دے کر پوچھا:

---

① مستدرک حاکم، ح: ۵۶۵۸ ؛ طبقات ابن سعد: ۳/۲۶۰، ط صادر، فیها نقل عن الثقات ان عماراً رضی اللہ عنہ نال من عثمان رضی اللہ عنہ لکن الروایات لا تخلو عن بعض العلل.

② تاریخ الطبری: ۳۳۶/۴

③ طبقات ابن سعد: ۶۸/۳، ط صادر

"کیا آپ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا تھا؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جو غلہ اگاتی اور مخلوق کو پیدا کرتی ہے، میں نے نہ انہیں قتل کیا، نہ اس کا حکم دیا، نہ اس سانحے سے مجھے خوشی ہوئی۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں ان کے قتل کو ناپسند کررہا تھا، مگر میں بے بس تھا۔"[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنے صاحبزادوں کو ان کی حفاظت پر مقرر رکھنا کھلی دلیل ہے کہ خلیفۂ ثالث برحق تھے اور مظلوم تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے حامی تھے اور ان کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع نیکی کا کام تھا۔

غرض یہ روایات واقدی اور اسی صف کے ضعیف ترین راویوں کی ہیں جو مشاجرات صحابہ کے باب میں بالکل ساقط اور زمینی حقائق کے لحاظ سے ناقابل اعتبار ہیں۔

☆☆☆

کیا ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قتل میں شریک تھیں؟

﴿سوال﴾ بعض حضرات ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عداوت کا چرچا کرتے ہوئے مصنف عبدالرزاق کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر آنے پر فرمایا: "یالیتنی کنت نسیامنسیا، واللہ ما انتھکت من عثمان شیئاً الا قد انتھک منی مثلہ حتی لو وددت قتلہ لقتلت."

"کاش! میں بھولی بسری ہو چکتی، اللہ کی قسم! میں نے ان کی جو بے عزتی کی، اس کے برابر وہ میری بے عزتی کر چکے تھے۔ اگر میں انہیں قتل کرنا پسند کرتی تو قتل کر دیتی۔"[2]

﴿جواب﴾ یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے مگر اس کے اصل مفہوم کو سمجھنا چاہیے۔ اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون پر آمادگی نہیں اس سے برأت اور ان کے قاتلوں سے سخت بے زاری ظاہر ہو رہی ہے۔

روایت کے جن ابتدائی الفاظ کو لے کر اشکال کیا جارہا ہے پہلے ان کا مطلب سمجھنا ضروری ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

"واللہ ما انتھکت من عثمان شیئاً الا قد انتھک منی مثلہ."

ترجمہ: "اللہ کی قسم! میں نے ان سے جو زیادتی کی، اس کے مثل وہ میرے ساتھ کر چکے۔"

ان الفاظ کا صحیح مطلب جاننے کے لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تعلقات کو دیکھیے تو باہمی میں باہمی اختلافات اور تنازعات کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جیسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں ام المؤمنین کا

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۶۷۳، عن زید بن ارقم، ۳۷۶۷۱، ۳۷۶۷۲، عن ابن عباس، ط الرشد

[2] مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد، ح: ۲۰۹۶۷، باب مقتل عثمان رضی اللہ عنہ، ط المجلس العلمی پاکستان

اعزاز واکرام کیا جاتا تھا، ویسے ہی دورِ عثمانی میں بھی رہا بلکہ وظائف وسرکاری عطیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔

معترضین کوئی ایک روایت لا کر دکھائیں جس سے دونوں ہستیوں کے مابین کوئی معمولی سا اختلاف یا رنجش ثابت ہو سکے۔ جب یہ ثابت نہیں تو روایت کا مطلب عام محاورے کے مطابق ''بالفرض'' پر محمول کیا جائے گا یعنی اگر ہمارے درمیان بالفرض والحال کوئی اونچ نیچ ہوئی ہو، یا کسی معمولی بات پر طبعی ناراضی وغیرہ کی نوبت آئی ہو، تو وہ معاملہ بھی برابر سرابر ہے، ایسی صورتِ حال نہیں کہ ایک طرف سے دوسرے پر زیادتی ہوتی رہتی ہو اور دوسرا مجبور ہو کر ظلم سہتا رہتا، چپکے چپکے انتقام کے درپے اور بدلے کی تاک میں ہوتا۔ جیسا کہ اس کے بعد کے الفاظ شاہد ہیں: ''حتی لو وددت قتله لقتلت. ''اگر میں انہیں قتل کرنا چاہتی تو قتل کر دیتی۔''

اہل علم جانتے ہیں کہ ''لو'' دو جملوں پر داخل ہوتا ہے: شرط اور جزا۔ لو شرط کی نفی کی وجہ سے جزا کی نفی کا فائدہ دیتا ہے یعنی پہلی بات نہیں ہو سکی اس لیے دوسری بھی نہ ہو سکی، جیسے ''لو کان بعدی نبیًا لکان عمر. ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے، چونکہ میرے بعد نبوت ممکن نہیں اس لیے عمر رضی اللہ عنہ بھی نبی نہ ہو سکے۔

یہ قاعدہ ملحوظ رکھ کر معنی دیکھیے تو یہی ہوگا کہ میں قتل کرانا چاہتی تو کر دیتی مگر میں نے چاہا ہی نہیں، اس لیے قتل بھی نہیں کرایا۔ مطلب یہ ہے کہ میں کوئی بے بس عورت نہیں ہوں۔ ام المومنین ہوں، میری ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی، اگر ہوتی تو میں اپنے ہزاروں روحانی بیٹوں کو کہہ کر پہلے ہی انہیں قتل کرا دیتی۔ مجھے خفیہ سازشوں کی کیا ضرورت۔

الغرض ام المومنین کا مطلب یہی ہے کہ کوئی سابقہ کش مکش تھی ہی نہیں، جس کی وجہ سے آج میں ان کے خلاف کوئی سازش کرتی۔ اب اسی روایت کے بقیہ الفاظ دیکھیں، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔

''پھر ام المومنین نے فرمایا: اے عبید اللہ بن عدی! تمہیں ان لوگوں کے بعد جنہیں تم جانتے ہو (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دشمن جیسا کہ اگلے الفاظ میں صراحت ہے) کوئی شخص دھوکے میں نہ ڈالے (یعنی اس کی ظاہری عبادت وزہد سے متاثر نہ ہونا) اللہ کی قسم! میں نے کبھی اصحابِ رسول کے اعمال کو کم نہیں سمجھا، یہاں تک کہ قرآن پڑھنے والے وہ لوگ ظاہر ہوئے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن زنی کی (یعنی ان کی ظاہری عبادت گزاری دیکھ کر صحابہ کی عبادت وریاضت کم لگنے لگی جیسا کہ خود حدیث میں ہے کہ اس گروہ کی نمازیں اور روزے تمہاری نمازوں اور روزوں سے بڑھ کر لگیں گے مگر وہ دین سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر ہدف سے پار نکل جاتا ہے۔ کما فی صحیح بخاری) ان لوگوں نے ایسی قراءت کی جس کی مثال نہیں تھی، ایسی نمازیں پڑھیں جن کی کوئی نظیر نہ تھی، ایسے روزے رکھے جن کی کوئی مثال نہیں تھی اور ایسی خوبصورت باتیں کہیں کہ ہم ویسی نہیں کہہ سکتے تھے، مگر جب میں نے ان کے کردار پر غور کیا تو وہ لوگ صحابہ کے قریب بھی نہیں پہنچے تھے۔ پس اب جب تم کسی بندے کی اچھی باتیں سنو تو اتنا کہہ دو: عمل کرتے رہو۔ اللہ تمہارا عمل دیکھے گا اور رسول اور اہل ایمان بھی۔ اور تم کو کوئی کم عقل نہ بنانے پائے۔''

غرض روایت مجموعی طور پر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی زبانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے برأت اور ان کے قاتلوں سے سخت بے زاری ثابت کر رہی ہے۔ بد دیانت مؤرخین ام المؤمنین کے اظہارِ برأت پر مشتمل بیان کے سیاق و سباق کو بدل کر اسے اقبالِ جرم بنا رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر علمی خیانت اور کیا ہوگی؟

آخری بات یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش کے جھوٹے الزام سے یہ کہہ کر اظہارِ برأت کیا تھا:

"معاذ اللہ! میں مسلمانوں کا خون بہانے اور اُن کے خلیفہ کو قتل کرنے اور حرام کو حلال کرنے کا حکم کیسے دے سکتی ہوں۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خطوط لکھنے کے الزام سے برأت کے لیے قسم کھا کر فرمایا تھا:

"میں نے اس بارے میں سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے کچھ نہیں لکھا۔"[1]

پس یہ ظاہر ہے کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر ایسی تہمتیں تفرقہ بازی پھیلانے کے لیے گھڑی گئی تھیں۔

☆☆☆

کیا حواریِ رسول حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سازش میں شریک تھے؟

﴿سوال﴾ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سازش میں کسی نہ کسی درجہ میں ضرور شریک تھے ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حمایت سے وہ آخر تک کنارہ کش کیوں رہے، عین وقت پر مدینہ سے باہر کیوں نکل گئے؟

﴿جواب﴾ یہ محض ایک وسوسہ ہے۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے باغیوں کی پہلی بار آمد پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سفیر بن کر ان کے اعتراضات کے جوابات دیے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے اپنے لختِ جگر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے پہرے کے امیر منتخب کیے گئے۔ آخر تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے مابین نامہ و پیام باقی رہا۔

رہی بات محاصرے کے بعد مدینہ سے باہر نکلنے کی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ باغیوں کی نگاہوں سے دور رہ کر عرب قبائل کی قوت کو جمع کیا جائے اور ان کے ذریعہ باغیوں کو مرعوب کیا جائے، چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا پیغام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ملا تھا کہ آپ فرمائیں تو اکیلا آکر مدافعت کروں اور فرمائیں تو بنی عَمرو بن عوف کا انتظار کروں جو میرے پاس آکر ساتھ دینے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں وہیں ٹھہر کر انتظار کا حکم دیا تھا۔[2]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے خلاف تحریک چلانا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی سازش میں شریک نہیں تھے، بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی و تابعدار تھے۔

☆☆☆

① تاریخ المدینة لابن شبة: ۱۲۲۴/۴؛ تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۷۶ بسند صحیح
② تاریخ دمشق: ۳۷۴/۳۹ بسند حسن، ترجمة: عثمان

کیا حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ باغیوں کے سرپرست تھے؟

﴿سوال﴾ بعض لوگ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر باغیوں کی سرپرستی کا شک ظاہر کرتے ہیں اور یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ محاصرے کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گھر سے جھانک کر تین بار پوچھا:

"**افیکم طلحۃ؟**" (کیا یہاں طلحہ موجود ہیں؟)

کوئی جواب نہ ملا۔ چوتھی بار پوچھا تو طلحہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا:

"میں تمہیں یہاں کیوں دیکھ رہا ہوں؟ ہمیں توقع نہ تھی کہ تم ایسی جماعت میں ہو گے۔ تین بار میرا سوال سن کر بھی تم خاموش رہے۔" پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے فضائل یاد دلائے۔[1]

کیا اس سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا باغیوں کا حامی ہونا ثابت نہیں ہو رہا؟

﴿جواب﴾ اس روایت میں کوئی ایسی بات نہیں جو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل یا سازش میں شریک ثابت کرے۔ بعض روایات کے مطابق اس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اسی طرح پوچھا تھا:

"**افیکم علی؟**" (کیا علی یہاں ہیں؟)[2]

تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی قتل کی سازش میں شریک تھے؟

یہ بھی تو ممکن ہے یہ حضرات اس شرم کی وجہ سے نمایاں نہ ہونا چاہتے ہوں کہ امیر المؤمنین کو نرغے میں دیکھ کر بھی ہم بے بس ہیں۔ یا اس صدمہ انگیز حالت میں کوئی جوابی حکمتِ عملی طے نہ کر پانے کے غم کے باعث چپ ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشر ہونے کے ناطے وقتی طور پر وہ فتنے کے ماحول اور افواہوں سے متاثر ہو گئے ہوں۔ اس کا یہ مطلب نکالنا بالکل غلط ہے کہ یہ حضرات باغیوں کے سرپرست تھے۔

مذکورہ روایات ہی سے ثابت ہے کہ اُس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی فضیلتوں کی یاددہانی سے سب کے ضمیر کو جھنجوڑنا چاہتے تھے، جن میں سے بعض واقعات کے بڑے گواہ حضرت علی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما جیسے اکابر تھے۔

مثلاً: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک فضیلت یہ تھی کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرا پہاڑ پر تشریف فرما تھے، اچانک پہاڑ لرزنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھوکر مار کر فرمایا: "ٹھہر جا تیرے اوپر نبی، صدیق اور شہید کے سوا کوئی نہیں۔"

اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہاڑ پر ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے علاوہ حضرت علی اور طلحہ رضی اللہ عنہما بھی تھے۔[3] اسی لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بار بار پوچھا کہ طلحہ یہاں ہیں۔ علی یہاں ہیں؟ تاکہ وہ ان فضائل کی گواہی

---

① مسند احمد، ح: ۵۵۱، ۵۵۲ اسناد صحیح

② تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۳/۱۳۰۲؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳/۴۵۹، تدمری؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۲۵، ط نزار؛ الثقات لابن حبان: ۲/۲۶۱؛ تاریخ دمشق: ۳۹/۳۱۸؛ الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ: ۳/۶۵، ط العلمیۃ

③ سنن الترمذی، ح: ۳۶۹۶، بسند صحیح، مناقب عثمان رضی اللہ عنہ

دیں۔ چنانچہ انہی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کھل کر گواہی دی۔ [1]

اگر وہ سازش میں شریک ہوتے تو فضائلِ عثمان رضی اللہ عنہ کی گواہی کیوں دیتے۔ سازش کے لیے تو ویسے بھی سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اگر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سازش کر سکتے تھے تو جھوٹ کیوں نہ بول سکے، سچ بول کر اپنی ہی سازش اور پروپیگنڈے کو بے اثر کیوں ہونے دیا؟

☆☆☆

﴿سوال﴾ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ "ان اشد الصحابة علیٰ عثمان." صحابہ کرام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سب سے سخت مخالف طلحہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ طلقاء کی دوستی نے خراب کیا۔ [2] نیز طبری میں ہے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ محاصرے کے دنوں میں چالیس دن تک مسجد نبوی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ امامت کرتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بغاوت کے سرغنہ تھے۔

﴿جواب﴾ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ مذکورہ دونوں روایات بھی اس کی دلیل نہیں بن سکتیں۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت "اشد الصحابة....." اوّل تو ہمارے نزدیک سند کے لحاظ سے بھی محلِ کلام ہے کیوں کہ اس کے ایک راوی جعفر بن سلیمان الضبعی صدوق مگر "شیعی" ہیں۔ [3]

اگر روایت کو سنداً درست تسلیم کر لیا جائے تب بھی "اشد" کا یہ مطلب کیسے نکل سکتا ہے کہ وہ بغاوت میں شریک اور اس کے قائد تھے۔ "اشد" سے سمجھانے میں سختی کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ کیا دو بے تکلف دوست خیر خواہی میں بھی کبھار غصہ نہیں کرتے؟ کیا انہیں باہم دشمن تصور کر لیا جاتا ہے؟ یہ تو باہم اخلاص کی علامت ہے نہ کہ دشمنی کی۔ دیگر روایات شاہد ہیں کہ یہی "اشد الصحابة علیٰ عثمان" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دشمنوں کو ڈانٹتے ہیں اور ملعون قرار دے کر بھگا دیتے ہیں [4] بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر حملے کے وقت وہ زرہ پہن کر دفاع کے لیے آتے ہیں۔ [5] ثابت ہوا کہ وہ بعض انتظامی امور میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے ہمدرد تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب "اشد الصحابة علیٰ عثمان" کا یہ حال تھا تو باقی صحابہ بھی یقیناً خیر خواہ تھے۔

رہا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا محاصرے کے ایام میں مسجد نبوی میں نماز پڑھانے کا مسئلہ جسے سائل نے تاریخ طبری میں واقدی کی روایت بتایا ہے۔ ہم اس روایت کی طبری میں موجودگی کی تصدیق نہیں کر سکے، تاہم سائل کے حوالے کو مان

---

① مسند احمد، روایت نمبر: ۵۵۱

② ان اشد الصحابة علی عثمان طلحة وانما افسد عثمان رضی اللہ عنہ بطانة استبطنها من الطلقاء. (تاریخ المدینة لابن شبة: ۳/ ۱۱۲۹)

③ دیکھیے میزان الاعتدال: ۱/ ۴۰۸

④ تاریخ الطبری: ۴/ ۳۵۰

⑤ عن عبدالرحمن ابن ابی لیلیٰ قال: رایت طلحة یوم الدار برامبهم وعلیه قباء فکشفت الریح عنه فرایت بیاض الدرع من تحت القباء. (تاریخ المدینة لابن شبة: ۴/ ۱۱۶۹)

کر ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ روایت ہو بھی تو واقدی کا ضعف ظاہر ہے۔ بلکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا امامت کرنا صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو بھی بغاوت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے بھی مسجد نبوی میں نمازیں پڑھائیں، حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے امامت کا حکم دینا منقول ہے۔[1] ان کے بیٹے امامہ بن سہل کا نمازیں پڑھانا بھی مذکور ہے۔[2] یحییٰ بن آدم فرماتے ہیں کہ غالباً ان دنوں کے بعد دیگرے مختلف حضرات امامت کرتے رہے۔[3] ایک روایت کے مطابق نمازِ عیدالاضحیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔[4]

پس ظاہر ہے کہ یہ سب حضرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی میں انہی کے حکم کی تعمیل میں نمازیں پڑھا رہے تھے، لہٰذا اسے بغاوت کی سرپرستی پر محمول کرنا بالکل غلط ہے۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اشتر نخعی کا ہاتھ پکڑ کے اسے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے اور انہیں کہا کہ یہ لوگ آپ کی بات مانتے ہیں، آپ انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے منع کریں۔ اس پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں ایسے خون کو کیسے روک سکتا ہوں جسے اللہ نے بہانا طے کر لیا ہو۔[5] کیا اس سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا منفی کردار ثابت نہیں ہوتا؟

﴿جواب﴾ اس روایت کی سند ضعیف اور منقطع ہے کیونکہ اسے سعید بن ابی عروبہ نے قتادہ بن دعامہ سے نقل کیا ہے یہ دونوں حضرات اگرچہ ثقہ ہیں مگر قتادہ بن دعامہ کی ولادت ۶۰ھ کی ہے۔[6] وہ اس روایت کو کسی نامعلوم راوی کا نام حذف کر کے پیش کر رہے ہیں۔ پس زیرِ بحث مسئلہ میں یہ روایت دلیل نہیں بن سکتی۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ طبری میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدافعت اور محاصرہ کرنے والوں کو ہٹانے پر آمادہ کرنے کے لیے قسم دی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ”بخدا! اس وقت تک نہیں جب تک بنوامیہ حق نہیں دیں گے۔“[7]

اس سے ظاہر ہے کہ وہ سازش میں شریک تھے، یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے۔

---

① تاریخ المدینۃ،عمر بن شبہ: ۱۲۱۸/۴

② تاریخ المدینۃ، عمر بن شبہ: ۱۱۱۰/۳ ، فتح الباری: ۱۸۹/۲

③ تاریخ المدینۃ، عمر بن شبہ: ۱۲۱۷/۴

④ شرح معانی الآثار،ح: ۶۲۶۰، باب اکل لحوم الاضاحی

⑤ مصنف ابن ابی شیبہ،ح: ۳۷۷۱۰، ط الرشد

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۰/۵، ط الرسالۃ

⑦ عن حکیم بن جابر قال قال علیّ لطلحۃ انشدک اللّٰہ الا رددت الناس عن عثمان، قال لا واللّٰہ حتی تعطی بنو امیۃ الحق من انفسھا
(تاریخ الطبری: ۴۰۵/۴ بسند صحیح)

﴿جواب﴾ اس سے فقط اتنا ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ کچھ وقت کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع پر تیار نہیں ہوئے، اس سے بغاوت میں شرکت ثابت نہیں ہوتی۔ شاید اس وقت ان کے ذہن میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی یا وہ کسی ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے، مگر یہ حالت مستقل نہیں تھی۔ محاصرے سے پہلے ان کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے فکرمند ہونا، سبائیوں کو ڈانٹ کر بھگانا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سنگ باری کے بعد گھر میں مزاج پرسی کے لیے جانا ثابت ہے۔

ممکن ہے اس کے بعد وہ مخالفین کی پھیلائی ہوئی باتوں سے کچھ متاثر ہو کر محاصرے کے دوران خلیفہ سوئم کی اعانت سے رک گئے ہوں جیسا کہ مذکورہ روایت میں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کا سیاسی پالیسی میں اختلافِ رائے ہونا کوئی بعید نہیں۔ غالباً رائے کے درجے میں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنے اعزہ واقارب کو اعلیٰ عہدے دینے سے متفق نہ تھے اور محاصرے کے دوران اس رائے میں شدت آگئی۔

مگر یہ بھی ثابت ہے کہ کچھ دنوں بعد یہ غلط فہمی دور ہوگئی اور انہیں دوبارہ یہ یقین ہوگیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُمت کے حق میں نہایت مخلص ہیں۔ اس بارے میں ایک روایت قابلِ ذکر ہے جس کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہ کرام کو پیغام بھیجا: ''میرے نزدیک تم میں سے سب سے امانت دار اور بہتر وہ ہے جو اپنا ہاتھ روک کر رکھے مگر کچھ لوگ میرے گھر میں جمع ہیں اور اپنی جان نچھاور کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کا خون بہنا گوارا نہیں۔ پس آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ لوگوں کا معاملہ اب آپ کے حوالے ہے۔ آپ اس بارے میں وہی کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالیں۔ پھر زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر انہیں بھی یہ بات بتادیں۔'' ان حضرات نے امیر المؤمنین کی اس رائے کو پسند کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملنے کی کوشش کی مگر ان کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ دروازہ بند کر کے اندر بیٹھے تھے، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ پھر یہ حضرات حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے یہ رائے سن کر کہا: ''امیر المؤمنین نے انصاف کی بات کی ہے۔''

اب یہ حضرات سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ وہ یہ سن کر رو پڑے۔''[1]

اس کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا اپنے بیٹے کو پہرے کے لیے بھیجنا اور خود بھی دفاع کے لیے پہنچنا ثابت ہے۔ تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو اتنا ہی ثابت ہوگا کہ ابتدا میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، پھر غالباً سازشی عناصر کے پروپیگنڈے کے سبب بدگمان ہوگئے، اس لیے محاصرہ ہٹوانے سے انکار کرنے لگے۔ پھر جب غلط فہمی دور ہوگئی تو دیگر روایات کے مطابق شرمسار ہوئے، دفاع کے لیے گئے۔ پھر ان کی المناک شہادت پر افسوس کیا اور قاتلین کو نہ صرف لعنت وملامت کی بلکہ ان کے خلاف تحریک بھی چلائی اور اسی میں اپنی جان دے دی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

---

① تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۴/۱۲۰۴، ۱۲۰۵

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آخری دنوں میں یہ بھی فرماتے تھے: ولان یلیھا ابن ابی طالب احب الی من ان یلی غیرہ۔ ''خلافت کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملنا مجھے کسی اور کے خلیفہ بننے سے زیادہ پسند ہے۔'' (تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۴/۱۲۰۹، عن الاصمعی)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

الذی کان منہ فی حق عثمان تمغفل وتالیب فعلہ باجتھاد ثم تغیر منہ عند ما شاھد مصرع عثمان فندم علیٰ ترک نصرتہ.

''حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں جو ہوا، وہ کوتاہی اور تنقید تھی، انہوں نے اجتہاد سے ایسا کیا، پھر جب شہادتِ عثمان کو دیکھا تو ان کا خیال بدل گیا اور وہ ان کی (کماحقہٗ) نصرت نہ کر سکنے پر شرمسار ہوئے۔''[1]

☆☆☆

﴿سوال﴾ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد جنگِ جمل میں اپنی شہادت سے قبل اشعار پڑھے تھے............نَدِمْتُ نَدَامَةَ الْکُسَعِی......(میں کسی نامی شخص کی طرح شرمسار ہوا ہوں) پھر دعا کی: اَللّٰھم خُذْ مِنّی لِعُثمان حتیٰ تَرْضٰی. ''اے اللہ! مجھ سے عثمان کا بدلہ لے لے تاکہ تو راضی ہو جائے۔''[2]

یہ روایت مضبوط سند سے ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بغاوت میں شریک بلکہ اس کے سرپرست تھے۔

﴿جواب﴾ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بغاوت میں شریک تھے یا باغیوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ یہی الفاظ اس سے زیادہ مضبوط سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہیں۔ جنگِ جمل کے موقع پر وہ بھی یہی فرما رہے تھے: ''اَللّٰھم خُذْ مِنّی لِعُثمان حتیٰ تَرْضٰی.''[3]

تو کیا یہ سمجھا جائے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شہادتِ عثمان میں شریک تھے۔

درحقیقت ان الفاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جان نہ بچا پانے پر ندامت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ حضرات بغاوت یا قتل میں شریک تھے۔ ندامت اس پر تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد جس طرح کی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی، اتنے مسلمانوں کی موجودگی میں وہ قتل کر دیے گئے، اس پر آخرت میں پکڑ نہ ہو جائے، حضرت علی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما دونوں نے اسی وجہ سے دعا کی کہ اللہ جو بدلہ لینا چاہے، دنیا میں لے کر پاک صاف کر دے۔

☆☆☆

تاریخ الخلفاء اور تاریخِ دمشق کی بعض روایات پر بحث:

﴿سوال﴾ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں حافظ ابن عساکر کے حوالے سے امام زہری کی ایک بہت طویل روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کا قضیہ تفصیل سے بیان کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سنگین الزامات عائد کیے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ ان کا اپنے اقارب

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱/۳۵، ط الرسالۃ

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۴۳ ③ مستدرک حاکم، ح: ۵۶۲۷، بسند صحیح، باب معرفۃ الصحابہ

اور اعزہ کو عوام پر مسلط کر دینا اور ان کے ظلم و ستم کی روک تھام نہ کرنا ان کے خلاف نفرت پھیلنے کی وجہ بنا۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے انصاف کی تاکید کے باوجود ان کا اپنی غلط روش پر بضد رہنا مزید بگاڑ کا سبب بنا۔ یہ دعویٰ بھی ہے کہ مروان نے مصری وفد کو قتل کرانے کی سازش کی جو خط کے ذریعے پکڑی گئی تو مصری قافلے نے مروان کی حوالگی کا مطالبہ کیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آڑے آگئے۔ اس روایت میں یہاں تک مذکور ہے:

فلم یبق احد من اھل المدینۃ الا حنق علی عثمان وزاد ذلک من کان غضب لابن مسعود وابی ذر وعمار بن یاسر حنقًا وغضبًا.

”مدینہ کا کوئی فرد ایسا نہ رہا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر غضبناک نہ ہو، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابوذر رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کی بدسلوکی کی وجہ سے، یہ ناراضگی اور بھی بڑھ گئی۔“

اسی روایت میں یہ وضاحت بھی ہے کہ قاتلوں کو خود محمد بن ابی بکر عقبی دیواروں کو پھلانگ کر گھر میں لائے تھے۔ اس روایت کی کیا حیثیت ہے؟[1]

﴿جواب﴾ یہ روایت سرسری نگاہ میں بھی مشکوک ہے جبکہ تحقیق کرنے سے اس کا باطل ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مشکوک ہونے کی پہلی وجہ روایت کی غیر معمولی طوالت ہے۔ ایک ہی روایت تین چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سند سے واقعات نقل کرنے والے قدیم مؤرخین مثلاً ابن سعد، طبری اور بلاذری وغیرہ کے مجموعوں کو دیکھئے تو اتنی طویل روایات کم ہی ملیں گی۔ عام طور پر ایسی طویل روایات مرکب اسناد کی ہوتی تھیں، یعنی راوی کئی راویوں کے بیانات کو ملا ایک مسلسل واقعہ بیان کر دیتا تھا۔ مگر یہاں سند بھی مرکب نہیں ہے۔

شک کی دوسری وجہ سند کا سعید بن مسیب رحمہ اللہ پر موقوف ہونا ہے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی روایات بکثرت ہیں مگر ان کا میدان فقہ و حدیث تھا لہٰذا ان کی مرویات بھی سنن و احکام ہی سے متعلق ہیں۔ اخبار و حوادث کی مرویات ان سے منقول نہیں۔ ایسے شخص سے اگر کبھی شاذ و نادر کوئی واقعہ منقول بھی ہو تو وہ اختصار پر مبنی ہوگا نہ کہ حد سے زیادہ طویل۔

بالفرض اگر اتنا بڑا محدث اور فقیہ شہادتِ عثمان جیسے حساس واقعے کو اس طرح جزئیات سمیت مفصل بیان کرتا تو اس روایت کی شہرت پہلی دوسری صدی ہجری ہی میں ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر کسی محدث تو کجا کسی مؤرخ نے بھی اسے اپنی کتب میں نقل نہیں کیا، واقدی اور ابومخنف جیسے رطب و یابس پیش کرنے والوں نے بھی یہ روایت نقل نہیں کی۔ صدیوں تک اہلِ علم کا اسے نظر انداز کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ محض ایک من گھڑت روایت ہے جس کی وضع بھی غالباً تیسری ہجری میں ہوئی ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں بعض غیر محتاط راویوں نے اسے زبانی نقل کرنا شروع کیا اور چھٹی صدی ہجری میں علامہ ابن عساکر رحمہ اللہ نے جب اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا مجموعہ جمع کرنا شروع کیا، تو اس جعلی روایت کو اس میں جگہ مل گئی۔ جن حضرات کو تاریخ دمشق میں علامہ ابن عساکر کے منہج کا علم ہے، انہیں حیرت نہیں

① ملاحظہ ہو: تاریخ دمشق: ۳۹/۴۱۵ تا ۴۱۹، تاریخ الخلفاء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۶، ط نزار

ہونی چاہیے؛ کیوں کہ علامہ ابن عساکر رحمہ اللہ کا منہج یہ تھا کہ سند کے ضعف بلکہ موضوع ہونے کا بھی لحاظ کیے بغیر، جو کچھ سنداً منقول مل جائے، اسے نقل کرلیا جائے۔ مگر اس پر حیرت ضرور ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''تاریخ الخلفاء'' جیسے مختصر انتخاب میں اسے نقل کرتے ہوئے سند کے معیار کو کیوں مدنظر نہیں رکھا۔ اللہ ان کے تسامح کو معاف فرمائے۔

بعد کے مؤرخین نے علامہ سیوطی رحمہ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے اس روایت کو نقل کردیا۔ یوں یہ روایت مشہور ہوگئی۔ جبکہ یہ روایت سند اور متن دونوں لحاظ سے کم از کم محلِ نظر تو ضرور تھی۔

اب آپ روایت کی سند پر نگاہ ڈالیے۔

ابو بکر وجیهه بن طاهر...... ابو حامد بن الحسن...... محمد بن عبدالله بن حمدون...... احمد بن محمد الحسن...... محمد بن یحییٰ الذهلی...... هشام بن عمارُ...... محمد بن عیسیٰ القاسم بن سمیع دِمَشقی...... محمد بن عبدالرحمن بن ابی ذئب...... محمد بن شهاب الزهری...... سعید بن المسیب

اس سند میں محمد بن عیسیٰ القاسم بن سمیع (م ۲۰۴ھ) سے اگرچہ امام ابوداؤد اور امام نسائی نے روایت لی ہے مگر وہ قدرے ضعیف راوی ہیں اور مدلس بھی ہیں۔ [①]

یہاں انہوں نے تدلیس یہ کی ہے کہ یہ روایت محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب جیسے ثقہ راوی کی طرف منسوب کردی، حالانکہ انہوں نے خود ان سے نہیں سنی تھی۔ یہ بات خود محمد بن عیسیٰ کے بیٹے نے واضح کی اور بتایا:

لم یسمع ابی حدیث مقتل عثمان من ابن ابی ذئب، انما هو فی کتاب ابی عن قاص. [②]

(میرے والد نے شہادتِ عثمان کی روایت ابن ابی ذئب سے نہیں سنی بلکہ یہ ان کی کتاب میں کسی قصہ گو سے منقول ہے۔)

پھر اسی سند میں ''احمد بن محمد الحسن (السکن) م ۳۰۴ھ'' بھی ضعیف ہیں، جن حضرات نے انہیں بہت گنجائش دی تو انہوں نے ''لین'' کہا ہے۔ [③] جبکہ ابوالشیخ اصفہانی نے ''طبقات المحدثین'' میں ان کے متعلق لکھا ہے:

''یحدث بالبواطیل فترکوا عنه.'' [④]

(وہ باطل روایات نقل کرتے تھے، پس محدثین نے ان سے روایات لینا ترک کردیا۔)

اس روایت کا کچھ حصہ عمر بن شبّہ نے بھی نقل کیا ہے مگر آخر میں بتادیا ہے کہ یہ روایت گڑبڑ سے بھرپور ہے۔ [⑤]

---

① طبقات المدلسین لابن حجر العسقلانی، ص ۵۱، ط المنار
② الکامل فی ضعفاء الرجال: ۴۸۸/۷
③ تاریخ الاسلام للذهبی: ۱۳۵،۱۳۴/۲۳، ت تدمری
④ طبقات المحدثین باصبهان والواردین علیها، لابی الشیخ الاصبهانی (م ۳۶۹ھ): ۱۰۱/۴، ط موسسة الرسالة
⑤ هذا حدیث کثیر التخلیط منکر الاسناد لایعرف صاحبه الذی رواه عن ابن ابی ذئب. (تاریخ المدینة لابن شبة: ۱۳۰۲/۴)

متن میں گڑبڑ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ان دیگر صحیح، حسن اور نسبتاً کم ضعیف روایات کے مجموعے سے متعارض ہے جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کے اسباب بالکل مختلف بیان کیے گئے ہیں اور صحابہ کو حضرات عثمان رضی اللہ عنہ کا وفادار اور تابع دار بتایا گیا ہے۔ ان معتبر روایات میں یہ بھی واضح ہے کہ محمد بن ابی بکر قاتلوں کو گھر میں نہیں لائے تھے بلکہ وہ نادم ہو کر چلے گئے۔ اسی طرح قاتل دیوار پھاند کر نہیں بلکہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔

☆☆☆

تاریخِ دمشق کی ایک اور روایت کا جواب:

﴿سوال﴾ ابن عساکر نے ایک اور طویل روایت یزید بن حبیب کی سند سے نقل کی ہے جس سے دیگر الزامات کی تائید کے علاوہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ باغیوں کے گروہوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خفیہ ملاقاتوں کے ذریعے ہدایات دیتے رہے۔[1] اس کا کیا جواب ہے۔

﴿جواب﴾ اس کی سند میں ابن لَہِیعہ ہے جس کا ضعف سب پر ظاہر ہے۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان سے منکر روایات بکثرت مروی ہیں اور وہ ضعیف راویوں کی روایات کے ساتھ تدلیس کرتے تھے جو تدلیس کی بدترین قسم ہے۔[2]

پھر اس روایت کا متن ثقات کی روایات کے مجموعے کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ روایت کسی بھی لحاظ سے قابلِ اعتبار نہیں۔

☆☆☆

کیا فساد کا بیج حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بویا تھا؟

﴿سوال﴾ یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پروپیگنڈے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے اور بغاوت کرانے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ ملوث تھے۔ ان کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں حکومت مصر سے معزول کر دیا تھا، اس لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ناراض تھے، اسی وجہ سے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بہن کو طلاق دی۔

تین روایات سے یہ واقعات ثابت ہیں:

پہلی روایت (خلاصہ)...... جب پہلی بار باغی مدینہ منورہ آئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کو بھیج کر ان سے شکایات دور کرنے اور اصلاحات کا وعدہ کیا مگر باغیوں کے جانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مروان کے بہکاوے میں آ کر مسجد میں بر سر منبر یہ کہا کہ مصر سے آنے والے لوگوں کو میرے متعلق غلط شکایات پہنچی تھیں۔

یہ سن کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا آپ اللہ سے ڈریں۔ آپ نے ہلاک کرنے والے گناہ کیے ہیں اور

---

[1] ملاحظہ ہو، تاریخ دمشق: ۳۹/۳۲۵

[2] طبقات المدلسین، ص ۵۴، ط المنار

ہم بھی آپ کے ساتھ شامل رہے۔اب آپ بھی توبہ کریں، ہم بھی توبہ کریں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بولے: ''جب سے میں نے تمہیں معزول کیا ہے، تمہیں جوئیں کاٹ رہی ہیں۔''

کسی اور نے آواز لگائی ''آپ توبہ کریں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قبلہ رخ ہو کر توبہ کی، اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فلسطین چلے گئے اور چرواہوں تک کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکاتے رہے۔ [1]

دوسری روایت (خلاصہ)......عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت علی، حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کو فرداً فرداً بغاوت پر اُکسایا...... پھر حاجیوں کو راستے میں ملے، انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کارستانیاں سنا کر مشتعل کیا، جب دار عثمان کا محاصرہ ہوا تو فلسطین چلے گئے، وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی اطلاع کے منتظر رہے۔ایک دن کہہ رہے تھے: تعجب ہے ابھی تک عثمان کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی......اس دوران کسی سوار نے آکر خبر دی کہ عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے گئے ہیں، تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں جب کسی زخم کو کریدتا ہوں تو اسے پھاڑ کر چھوڑتا ہوں۔ میں عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سب کو بھڑکاتا رہا، یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹی پر بکریوں کے چرواہوں تک سے مل کر ان کو بھڑکاتا رہا۔''

اپنی معزولی کے سبب ناراض ہو کر ہی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بہن کو طلاق دی تھی۔ [2]

تیسری روایت: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو بولے: میں اللہ کا ایسا بندہ ہوں کہ وادی سباع میں ہوتے ہوئے عثمان کو قتل کر ڈالا۔ پھر بولے: ''اگر اب خلافت علی رضی اللہ عنہ کو ملی تو وہ حق کو دیکھ بھال کر اسی پر چلیں گے، وہ میرے نزدیک خلافت کا والی بننے والے ناپسندیدہ ترین فرد ہیں۔''

پھر جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو بہت پریشان ہوئے۔ پھر پتا چلا کہ مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے شام میں علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کر دیا ہے تو شام جانے کے لیے اپنے بیٹوں: عبداللہ اور محمد سے مشورہ کیا۔ عبداللہ نے گوشہ نشینی کا مشورہ دیا مگر محمد نے سیاسی میدان میں اترنے کا کہا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بولے: عبداللہ نے ایسا مشورہ دیا ہے جو دنیا میں نقصان دے گا اور آخرت میں کام آئے گا۔ محمد نے ایسا مشورہ دیا ہے جو دنیا بنادے گا آخرت کو خراب کر دے گا۔اس کے بعد وہ شام جا کر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ [3]

یہ روایات پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ وہ صحابہ کے بارے میں کیا ذہن قائم کرے۔ کیا واقعی کوئی صحابی ایسے ہو سکتے ہیں؟ کیا واقعی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مال و جاہ کے لیے جان بوجھ کر اپنی آخرت تباہ کرنے پر تل گئے۔

---

[1] تاریخ الطبری: ۴/۳۵۹، ۳۶۰

[2] تاریخ الطبری: ۴/۳۵۷

[3] تاریخ الطبری: ۴/۵۶۰

﴿جواب﴾ یہ تمام وساوس مذکورہ تین روایات سے پیدا ہوئے ہیں، تینوں ہی بے بنیاد ہیں اور علمی وتحقیقی میزان میں کئی وجوہ سے قابل قبول نہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ تینوں روایات واقدی کی ہیں۔ سنداً نا قابلِ قبول ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ واقدی یا اس کے بزرگ کسی راوی نے جھوٹی روایات گھڑ کے عبداللہ بن سبا کے کرتوت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ قتل عثمان، جنگِ جمل، صفین اور مشاجراتِ صحابہ میں واقدی کی روایات رکیک ترین خود ساختہ مواد سے بھری پڑی ہیں، یہ مواد کو ذرا بھی قابل اعتبار نہیں سمجھنا چاہیے۔ امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "وہ حدیثیں گھڑنے میں مشہور ہے۔"[1]

دوسری بات یہ ہے کہ واقدی کے سوا کسی اور راوی نے یہ مواد نقل نہیں کیا۔ کوئی اور روایت چاہے ضعیف ہی سہی، ان باتوں میں واقدی کا ساتھ نہیں دیتی۔ اگر یہ باتیں حقائق پر مبنی ہوتیں تو اس دور کے دیگر راویوں کو کیوں پتا نہ چلیں؟

سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ واقدی کی یہ روایات دیگر معتبر تاریخی روایات کے برعکس ہیں۔ واقدی کی روایات بتا رہی ہیں کہ محاصرے پر اکسانے والے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے اور اکسانے کا کام انہوں نے اردگرد کے جنگلوں اور دیہات میں کیا۔ یعنی حملہ کرنے والے حجاز کے چرواہے اور گنوار تھے۔ جبکہ صحیح روایات سے ثابت ہو رہا ہے کہ مصر اور کوفہ کے شرپسند مدینہ میں گھسے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ حسن اور کم ضعیف روایات کے مطابق ان شرپسندوں کو عبداللہ بن سبا نے تیار کیا تھا۔ ان روایات کی موجودگی میں واقدی کی مذکورہ روایات ایک گپ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

واقدی کی روایات یہ بھی بتا رہی ہیں کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی برطرفی سے مشتعل ہو کر یہ فساد پھیلایا حالاں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کسی کو عہدے سے برطرف کرنا کوئی ایسی وجہ ہو ہی نہیں سکتی جس پر کوئی صحابی آپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور سے اکابر صحابہ کرام کی معزولیوں اور تقرریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ خود حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی اس ترتیب کے مطابق مختلف عہدوں پر رہے اور سبکدوش کیے گئے یا ان کا تبادلہ کیا گیا۔ وہ فوجی نظم وضبط کے پابند انسان تھے۔ ہمیشہ قائدین کے اشارے پر چلتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں محصولات کے آرام دہ عہدے سے ہٹا کر فوجی قیادت کے پرخطر منصب پر مقرر کرنا چاہا تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے مزاج وطبیعت کی ترجمانی یوں فرمائی تھی: "میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ہوں، آپ جہاں چاہیں دے ماریں۔"[2]

---

[1] امام ابن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "واقدی کی کتب جھوٹ سے لبریز ہیں۔"
امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اسے کذاب کہتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"میں نے واقدی سے ایک حرف بھی نہیں لیا۔" (سیر اعلام النبلاء، ۹/۴۶۳، ط الرسالۃ، ترجمۃ: محمد بن عمر الواقدی)
واقدی کی روایات کی صحیح حیثیت کے متعلق ہم اس حصے کی ابتداء میں مفصل کلام کر چکے ہیں۔

[2] انی سہم من سہام الاسلام وانک بعد اللہ الرامی بہا والجامع لہا، فانظر اشدہا واخشاہا وافضلہا فارم بہ۔
(تاریخ دمشق: ۷۲/۲، ترجمۃ: ابی بکر الصدیق؛ تاریخ الطبری: ۳۷۹/۳، بروایت سیف عن ابی اسحاق)

صحابہ کا مزاج یہی تھا کہ خلیفہ جہاں چاہیں لگادیں، جہاں سے چاہیں ہٹادیں، اسی نظم وضبط کا نتیجہ تھا کہ مٹھی بھر صحابہ کرام نے قیصر وکسریٰ کی عظیم مملکتوں کو چند سالوں میں فتح کرلیا۔ اگر یہ حضرات خدانخواستہ ایسے ضدی اور خودسر ہوتے کہ سربراہِ حکومت کی طرف سے تقرری اور معزولی کے احکام پر بپھر جایا کرتے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اسلام یوں آناً فاناً دنیا کے تین براعظموں میں پھیل جاتا۔ تمام تاریخی کتب شاہد ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے سالار کو معزول کیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ولید بن عقبہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم جیسے حضرات کو عہدوں سے برطرف کیا اور متبادل افراد کا تقرر کیا۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس پر کسی کو طبعی گرانی ہوئی ہو، مگر کسی نے کبھی چوں چراں نہ کی۔ مگر صحابہ تو کیا کسی بھی منظم اور کامیاب جماعت کے اخلاق سے بعید ہے کہ وہ ایسی معمولی باتوں پر اپنی قیادت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوجاتے ہوں۔

حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرف یہ دعویٰ منسوب کرنا کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: ''آپ نے ہلاک کرنے والے گناہ کیے ہیں اور ہم بھی ان میں آپ کے ساتھ شریک رہے ہیں...... آپ بھی توبہ کریں، ہم بھی توبہ کریں گے۔'' ایک مضحکہ خیز افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا...... کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لگائے گئے تمام الزامات کا جھوٹا ہونا اور اس بارے میں صحابہ کرام کی جانب سے امیر المؤمنین کا بھرپور دفاع، مستند روایات سے ثابت ہے...... دفاع کرنے والوں میں خود حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے۔

یہ بھی طے ہے کہ باغی ان جوابات سے مطمئن ہو کر واپس لوٹ گئے تھے...... اس کے بعد کسی کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عار دِلانے کی کیا گنجائش رہ جاتی تھی...... خصوصاً عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جن کی فہم وفراست مثالی تھی، ایسی بے بنیاد بات کر کے اور خود کو بھی گناہ گاروں میں شمار کر کے اپنی بے عزتی کیوں کراتے۔

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ واقدی کے مطابق عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصری وفد کی واپسی کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عار دلائی، توبہ کرائی، پھر ان کے خلاف تحریک شروع کی، پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر چرواہوں تک سے خود مل کر انہیں بھڑکایا اور پھر محاصرہ ہوتے ہی فلسطین چلے گئے اور اس اشتعال انگیزی کا نتیجہ دیکھنے کے منتظر رہے۔

یہ ساری باتیں تضادات اور ناممکنات کا مجموعہ ہیں؛ کیوں کہ اگر بالفرض حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے عار دلانے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے توبہ کرلی تھی تو پھر حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ان کے خلاف تحریک چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ نعوذ باللہ! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توبہ ڈھونگ تھی یا یہ مان لیا جائے کہ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ان کی توبہ پر یقین نہ تھا لہٰذا وہ اس کے بعد بھی اپنی ضد اور عداوت کی وجہ سے خفیہ تحریک چلاتے رہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ اتنی مختصر مدت میں انہوں نے اتنی بڑی خفیہ تحریک کیسے چلالی۔ مصری وفد کی واپسی رجب ۳۵ھ میں اور باقاعدہ شورش شوال ۳۵ھ میں ہوئی تھی۔ کوئی اتنے کم وقت میں مختلف شہروں، بستیوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں گھوم پھر کر ہر ہر شخص کا ذہن بدلنے میں کیسے کامیاب ہوسکتا ہے۔ کیا اس زمانے میں ذرائع ابلاغ اور مواصلات اتنے تیز رفتار تھے کہ

انسان اتنی سی مدت میں قوم کے لوگوں سے فرداً فرداً رابطہ قائم کرلے، ہر ایک کو پیغام پہنچا دے اور سب کا ذہن بدل کر حکومت کے خلاف بغاوت برپا کردے۔ ایسا کرشمہ تو آج کل بھی ناممکن ہے، مہینوں بلکہ برسوں کی ذہن سازی، ارکان سازی اور اپنے منشور کی دعوت کے بعد یہ مرحلہ آتا ہے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ واقدی کے بقول عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خود اپنی زبان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید ہوتے ہی یہ دعویٰ کردیا کہ اس زخم کو پھاڑنے والا میں ہوں، یہ سارا کیا دھرا میرا ہے۔

غور فرمایئے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی خفیہ سازش کے محرک (ماسٹر مائنڈ) ہوتے تو کیا حتی الامکان خود کو پوشیدہ نہ رکھتے! کیا ماسٹر مائنڈ اتنے احمق ہوا کرتے ہیں کہ اپنی سازشوں کی قلعی اتنی آسانی سے کھول دیں؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا اظہارِ غم اور حزنیہ اشعار پڑھنا دیگر روایات میں موجود ہے۔ اسی ضمن میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے الفاظ تھے:

تَكُونُ حَرْبٌ ،مَنْ حَكَّ فِيهَا قُرْحَةً نَكَأَهَا.

"جنگ ہو کر رہے گی، جس نے زخم کو کریدا ہے، وہ اسے پھاڑ کر رہے گا۔"[1]

مطلب یہ تھا کہ جن سازشیوں نے فتنے کا آغاز کیا ہے وہ آگے مسلمانوں میں باقاعدہ جنگ بھی کروا کے چھوڑیں گے۔ ان الفاظ کو کسی راوی نے قصداً یا سہواً بگاڑ کر یوں کردیا:

"إِذَا حَكَكْتُ قُرْحَةً نَكَأْتُهَا.

"جب میں کسی زخم کو کریدتا ہوں تو اسے پھاڑ کر چھوڑتا ہوں۔"[2]

اس طرح پوری روایت میں تحریف کر کے اس عظیم صحابی کی سیرت کو داغدار کیا گیا۔ صاف پتا چلتا ہے کہ کسی راوی نے عبداللہ بن سبا کا سراغ مٹانے کے لیے یہ کہانیاں گھڑی یا نقل کی ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف قتل کی سازش میں تھوڑی بہت شرکت بھی کی ہوتی تو وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کی مہم میں پیش پیش نہ ہوتے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ایسے آدمی کو سزا دینے کے درپے ہوتے، اپنا مشیر خاص ہرگز نہ بناتے۔

اگر کوئی کہے کہ حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے میں مخلص نہ تھے بلکہ انہوں نے محض سیاسی مفادات کے لیے باہم گٹھ جوڑ کرلیا تھا، تب بھی ایک بہت بڑا سوال باقی رہے گا وہ یہ کہ اگر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سازشِ قتل میں شریک ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ضرور کہتے کہ قاتلینِ عثمان

---

[1] تاریخ الطبری: ۵۵۹/۴

[2] تاریخ الطبری: ۳۵۷/۴

کا سرغنہ آپ کے شانہ بشانہ ہے، پہلے اس سے انتقام لیجیے؟ کیوں کہ حضرت مُعاویہ اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا نعرہ تو بہرحال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے ہی کا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس معاملے میں حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو کبھی کوئی الزام نہ دینا ثابت کرتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی قتل عثمان سے بری تھے۔

☆☆☆

عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ قتل میں شامل تھے یا نہیں؟

﴿سوال﴾ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ وار کرنے والوں میں عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

﴿جواب﴾ یہ بالکل غلط ہے۔ عمرو بن حَمِق رضی اللہ عنہ مشہور صحابی تھے۔ اسماءِ رجال اور طبقات کی تمام کتب میں انہیں صحابی شمار کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی جوانی میں برکت کی دعا دی تھی جس کی وجہ سے اسّی سال کی عمر میں بھی ان کے تمام بال سیاہ تھے۔[1]

ان سے کتب حدیث میں بعض مرویات بھی موجود ہیں، چنانچہ ''مسند بزار'' میں ان سے ارشادِ نبوی مروی ہے:

''جس نے کسی کو پناہ دے کر پھر قتل کر دیا وہ قیامت کے دن غداری کا جھنڈا اٹھائے ہوگا۔''[2]

ان کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا محض افسانہ ہے، اس بارے میں فقط ایک روایت ملتی ہے جو واقدی کی ہے۔ اس روایت کو پڑھیے کہ اس میں کسی انسان کا فعل دکھایا گیا ہے یا درندے کا!!! اس میں کہا گیا ہے کہ عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سینے پر چڑھ کر جبکہ وہ دم توڑ رہے تھے، نیزے کے نو زخم لگائے تھے اور کہا تھا:

''تین اللہ کی رضا کے لیے اور چھ اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لیے۔''[3]

اس گئے گزرے دور میں بھی کوئی انسان ہوش و حواس کی حالت میں یہ تصور نہیں کرسکتا کہ وہ ایک زخمی، تڑپتے اور دم توڑتے بیاسی سالہ بزرگ کو یوں اندھادھند کاٹ ڈالے۔ کیا صحابہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے؟؟

بعد والوں میں سے جس نے بھی یہ روایت نقل کی ہے تو اس نے واقدی کا حوالہ دیا ہے یا بے سند ذکر کر دی ہے جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ واقدی سے نقل کی ہے، واقدی کا ضعف ظاہر ہے۔ ایسی روایت سے کسی صحابی کے خلاف استشہاد کرنا اصولاً غلط ہے۔ عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے شانہ بشانہ رہے تھے۔ اگر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں اپنا رفیق کیوں بناتے؟

---

① معرفة الصحابه لابی نعیم: ۲۰۰۶/۳

② السنن الکبری للنسائی، ح: ۸۶۸۶ ، سنن ابن ماجه، ح: ۲۶۸۸ ، مسند احمد، ح: ۲۱۹۹۲

③ تاریخ الطبری: ۳۹۳/۴

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل کو بھی جہنمی کہا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شرف یقیناً حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے زیادہ تھا، ان کے قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منظورِ نظر کیسے ہو سکتے تھے؟ معلوم ہوا کہ عَمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے بری ہیں۔

☆☆☆

کیا عبدالرحمٰن بن عُدَیس رضی اللہ عنہ قتل یا بغاوت میں شریک تھے؟

﴿سوال﴾ عبدالرحمٰن بن عُدَیس البلوی رضی اللہ عنہ بھی ایک صحابی ہیں۔ ان سے ایک دو احادیث بھی منقول ہیں۔ بعض علماء نے انہیں بیعت رضوان میں شامل شمار کیا ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مصر سے آنے والے باغی قافلے کے سرغنہ تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرے اور قتل میں شریک تھے۔ کیا یہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ اس بارے میں روایات میں جو کچھ مذکور ہے، وہ سب ضعیف مواد ہے۔ فتنے میں عبدالرحمٰن بن عُدَیس رضی اللہ عنہ کے شامل ہونے کی روایات کا بڑا حصہ واقدی سے مروی ہے۔ محمد بن سعد سمیت تیسری صدی ہجری اور بعد کے اکثر مؤرخین حضرات نے یہ مواد واقدی ہی سے لیا ہے۔

ہاں! ایک اور راوی سیف بن عمر نے بھی انہیں باغی جماعت میں شریک بتایا ہے مگر وہ بھی ضعیف ہیں۔ محققین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش میں ان حضرات کی شرکت کو شک کے الفاظ (قیل) کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: نسبه بعض المتاخرين...... ''ان کی طرف یہ بات متاخرین نے منسوب کی ہے۔''[1]

بعض محدثین ان کے باغی جماعت میں شریک ہونے پر یقین کر کے ان سے روایت لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ محمد بن یحییٰ الذہلی فرماتے تھے:

''عبدالرحمٰن بن عُدَیس فتنے کا سرغنہ تھا اس لیے اس سے روایت لینا حلال نہیں۔''[2]

مگر درحقیقت کسی صحیح روایت سے ان دونوں حضرات کی قتل بلکہ فساد میں شرکت بھی ثابت نہیں ہوتی۔

☆☆☆

اہم تنبیہ: فتنے سے متاثر ہونے کے باعث کسی صحابی کی عدالت مجروح نہیں ہو سکتی:

اگر بعض صحابہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں شریک ہونا کسی صحیح روایت سے ثابت ہو جائے، تو بھی اس سے ان حضرات کی عدالت مجروح نہیں ہوتی؛ کیوں کہ اتنے بڑے فتنے میں بشری عوارض کی بناء پر وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے تھے۔ علمائے اسلام صحابہ کی معصومیت کے قائل نہیں۔ بعض صحابہ سے خطائیں یقیناً ہوئی ہیں۔ بعض صحابہ سے

---

① معرفة الصحابة لابی نعیم الاصبهانی: ۱۸۵۲/۴

② دلائل النبوة للبیهقی: ۳۹۳/۶، ط دار الکتب العلمیة

بعض معاصی کا صدور بھی ثابت ہے۔

ہم یقیناً اس بات کے مکلف نہیں کہ محض عقیدت کی وجہ سے ان کی کسی ثابت شدہ غلطی کی تردید کردیں اور اسی لیے ہم حدود وقصاص سے متعلقہ ان صحیح احادیث کو یقیناً مانتے ہیں جن میں بعض صحابہ کی جنایات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ان پر حد جاری ہوئی۔ مگر اس سے بھی ان حضرات کی عدالت مجروح نہیں ہوتی۔ شرعی سزا کا جاری ہونا اور اسلام کے لیے ان کی خدمات اور نیکیاں ہر غلطی کا کفارہ بن جانے کے لیے کافی ہیں۔ دیانۃً بھی ہمیں ان کی برأت کا یقین ہے کہ غلطی پر توبہ واستغفار میں وہ پہل کرنے والے تھے۔ مقتلِ عثمان اور جنگِ جمل وصفین جیسے فتنوں کی زد میں آنے والے تمام صالحین کے بارے میں ہم یہ گمان رکھنے کے مکلف ہیں، انہوں نے جو کچھ کیا غلط فہمی مگر نیک نیتی کے ساتھ کیا۔ پھر حالتِ فتنہ وشورش کی وجہ سے قضاءً ان پر کوئی سزا جاری نہیں ہوسکتی تھی جیسا کہ اس پر صحابہ وتابعین کا اجماع ہو چکا تھا۔ [1]

قرآن وحدیث کی نصوص میں شرفِ صحابیت پانے والوں کے لیے مغفرت اور رضائے الٰہی کے وعدے ثابت ہیں، اس لیے ان حضرات کے بارے میں ہم کلمۂ خیر کہنے کے سوا کچھ اور کہنے کے روادار نہیں۔



محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کیوں تھے؟

﴿سوال﴾ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پیش پیش افراد میں اولادِ صحابہ میں سے محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ بھی شامل تھے۔ ان کو کیا شکایت تھی اور کیا محمد بن ابی بکر قتل کی واردات میں شریک تھے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اس مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ محمد بن ابی بکر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے حجۃ الوداع کے موقع پر پیدا ہوئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغی گروہ میں شامل تھے۔ شمولیت کی وجہ وہ غلط فہمیاں تھیں جو سبائی گروہ نے پھیلا دی تھیں، یہ ان سے متاثر ہوگئے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں خلیفہ اوّل کا بیٹا ہونے کے ناطے حکومت میں حصے داری کی خواہش تھی جو بغاوت میں شرکت کر کے پوری ہوسکتی تھی۔

اس کے علاوہ انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر غصہ بھی تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان پر کسی کا حق تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جبراً ان سے وصول کر کے حق دار کو دلوایا اور ان کی کوئی رعایت نہ کی، جس پر یہ بھڑک گئے۔ [2]

سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا: ''محمد بن ابی بکر کو کس چیز نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ابھارا؟''

---

[1] قال ابو حنيفة: لما وقعت الفتنة بين الناس في قتل عثمان رضي الله عنه فاجتمعت الصحابة رضي الله عنهم على ان من اصاب دماً فلا قود عليه، ومن اصاب فرجا حراماً بتاويل فلا حد عليه، ومن اصاب مالاً بتاويل فلا تبعة عليه الا ان يوجد المال بعينه فيرد الى صاحبه. (الفقه الابسط، ص ۲۰)

[2] تاريخ الطبرى: ۳/۴۰۰

انہوں نے جواب دیا: ''غضب اور لالچ نے۔''[1]

تاہم معتبر روایات کے مطابق محمد بن ابی بکر قتل میں ہرگز شامل نہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے گھر میں ضرور گئے تھے مگر پھر نادم ہو کر لوٹ آئے تھے۔[2]

رئیسِ قریش عُتبہ بن ربیعہ کے پوتے اور حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن ابی حذیفہ کو صحبتِ نبویہ نصیب نہیں ہوئی تھی (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت عمر چند برس تھی۔) باپ نے جنگ یمامہ میں شہادت پائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس یتیم کو اپنی پرورش میں لے لیا، جیسا کہ وہ قریش کے دوسرے، بہت سے یتیموں کی کفالت کیا کرتے تھے۔[3]

محمد بن ابی حذیفہ کی جوانی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور آچکا تھا۔ محمد بن ابی حذیفہ نے ان سے گورنر کا عہدہ طلب کیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مشفقانہ انداز میں یہ کہہ کر انکار فرما دیا کہ تم ابھی اس قابل نہیں ہو۔

محمد بن ابی حذیفہ نے کہا: ''تو پھر مجھے کمانے کے لیے باہر جانے کی اجازت دیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سامانِ سفر اور کافی رقم دے کر رخصت کیا۔ مصر پہنچ کر محمد بن ابی حذیفہ کے دل میں جلن رہی کہ مجھے حکومت میں حصے دار کیوں نہیں بنایا گیا۔[4]

حالاں کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حد درجے احتیاط تھی کہ اپنے لے پالک بیٹے کو مانگنے پر بھی عہدہ نہیں دیا، کیوں کہ اس میں اسلام کا مفاد نہ تھا۔

محمد بن ابی حذیفہ نے اسی ضد اور غصے کے باعث سبائی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت شروع کر دی، حاکمِ مصر حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ شوال سن ۳۵ ہجری میں حضرت عُقبہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو نائب بنا کر مصر سے مدینہ روانہ ہوئے تو پیچھے سے محمد بن ابی حذیفہ نے بغاوت کر دی اور پایۂ تخت فسطاط پر قبضہ کر لیا۔[5]

غرض کچھ ذاتی بغض و عناد، کچھ عہدوں کے لالچ اور کچھ سبائی تحریک کے اثرات نے ایسے نوجوانوں کو خراب کیا۔

☆☆☆

کیا خلیفۂ ثالث کی بقیع میں تدفین پر ہنگامہ ہوا تھا؟

﴿سوال﴾ کیا جبلہ بن عمرو رضی اللہ عنہ یا ابن بجرہ ساعدی نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جنۃ البقیع میں دفن ہونے سے روک دیا تھا؟ اور کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تدفین پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا اور کیا انہیں حَشِّ کوکب میں دفن کیا گیا تھا اور کیا یہ جگہ یہود کا قبرستان تھی؟[6]

---

[1] تاریخ الطبری: ۴۰۰/۴

[2] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۴

[3] سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۸۰، ط الرسالۃ

[4] تاریخ الطبری: ۳۹۹/۴

[5] سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۸۱، ط الرسالۃ

[6] الاصابہ: ۱/۳۵۷؛ تاریخ المدینۃ لابن شبہ: ۱/۱۱۲

﴿جواب﴾ یہ تمام باتیں ناقابلِ قبول ہیں کیوں کہ ان کی اسناد بہت ہی کمزور اور ضعیف یا مجہول راویوں پر مشتمل ہیں۔ ان کا جعلی ہونا اس سے ظاہر ہے کہ قبرستان بقیع پر کبھی کسی فرد کی اجارہ داری نہیں رہی۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک دو صاحبان وہاں قبضہ جما کر بیٹھ جاتے اور مردے ان کی مرضی سے دفن ہوتے۔ جب قبرستان کسی کی جائیداد تھا ہی نہیں تو کوئی شخص، کسی بھی مسلمان کو وہاں دفن ہونے سے کیسے روک سکتا تھا؟ اور اگر مان لیا جائے کہ ایک دو افراد نے سبائی پروپیگنڈے کا شکار ہو کر کوئی تُو تکار کر دی تھی تو اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں کیا فرق پڑتا ہے؟

بلاشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جس جگہ دفن کیا گیا تھا وہ ''حَشِّ کَوکَب'' کہلاتی تھی مگر یہ جگہ یہود کا قبرستان ہرگز نہیں تھی، بلکہ برسوں سے بقیع ہی کا حصہ چلی آرہی تھی۔ باقی قبرستان مدت ہوئی بھر چکا تھا، خالی جگہ اسی اضافی زمین میں تھی جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود خرید کر بقیع میں شامل کیا تھا، اور ان کی اپنی خواہش بھی وہیں دفن ہونے کی تھی۔[1]

اس جگہ کو یہود کا قبرستان قرار دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تدفین بقیع سے باہر تصور کرنا بالکل غلط ہے۔

☆☆☆

کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک میں اصل ہاتھ عجمیوں کا تھا؟

﴿سوال﴾ ماضی قریب کے کئی مصنفین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ شہادتِ عثمان کے اصل ذمہ دار عجمی اور ایرانی تھے۔ کیا یہ بات تحقیق کے مطابق ہے؟

﴿جواب﴾ یہ بات خلافِ تحقیق ہے۔ دستیاب روایات کو دیکھا جائے تو اس تحریک میں سرکردہ لوگ تمام کے تمام عرب تھے۔ کسی عجمی کا نام آج تک سامنے نہیں آیا۔ خود عبداللہ بن سبا بھی یمن کا یہودی النسل عرب تھا البتہ اس کی ماں حبشیہ تھی، بہرحال نسب چونکہ باپ سے چلتا ہے اس لیے اسے بھی عرب ہی کہا جائے گا۔ ہاں قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے پیچھے قیصرِ روم کی پشت پناہی تھی کیوں کہ مصر جو باغی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہیں قیصر نے جاسوسی کا نیٹ ورک قائم کر رکھا تھا جس پر بے دریغ رقم خرچ کی جارہی تھی۔[2] اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش پسندوں کے حرکت میں آتے ہی قیصر بذاتِ خود لاؤ لشکر لے کر عالمِ اسلام کی سرحدوں پر آدھمکا تھا۔[3]

جہاں تک عجمیوں یعنی ایرانیوں کا تعلق ہے، ممکن ہے وہ پس پردہ کام کرتے رہے ہوں مگر کوفہ، بصرہ اور مصر سے مدینہ آکر دارِ عثمان کا محاصرہ کرنے والوں اور بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہونے والے سبائیوں میں عجمیوں کی شمولیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ممکن ہے وہ قلیل تعداد میں شامل ہوں یا یہ وہ موالی ہوں جو آخر میں بھیڑ کی شکل میں باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے، بہرحال سرکردہ لوگ سب عرب تھے۔

---

① مجمع الزوائد روایت نمبر: ۱۴۵۵۸، قال الهيثمي رواه الطبراني ورجاله ثقات

② البداية والنهاية: ۱۰/۶۲۲، دار هجر

③ تاريخ الطبري، سن ۳۵ھ

کیا بغاوت میں شامل لوگوں کو کافر مانا جائے گا؟

﴿سوال﴾ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں شامل افراد کا اخروی انجام کیا ہوگا؟ کیا اُنہیں کافر اور جہنمی مانا جائے گا؟

﴿جواب﴾ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں جو لوگ شریک تھے، وہ مجموعی طور پر منافقین اور دشمنانِ اسلام کا ٹولہ تھے جیسا کہ خود ایک حدیث میں ان کے لیے ''منافقون'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک صحیح روایت میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد منقول ہے:

یا عثمان! ان ولاک اللّٰہ ھذا الامر یوماً فارادک المنافقون ان تخلع قمیصک الذی قمصک اللّٰہ فلا تخلعہ، یقول ذلک ثلاث مرات:

''اے عثمان! اگر اللہ تمہیں کسی دن یہ منصب عطا کرے پھر منافقین چاہیں کہ اللہ نے تمہیں جو کرتا پہنایا ہے اسے اتار دیں تو تم مت اتارنا۔''[1]

اس کا صاف مطلب ہے کہ مجموعی طور پر یہ گمراہ، بدقماش اور منافق قسم کے لوگوں کا گروہ تھا۔ اس میں اگر اکا دکا کچھ شریف لوگ نادانی کی وجہ سے شامل ہو بھی گئے تھے، تو ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ مذکورہ حدیث میں انہیں مستثنیٰ کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مگر اس کے باوجود اسلاف نے احتیاطاً اس ٹولے کے کسی فرد کا نام لے کر یقینی طور پر اس کے کافر یا جہنمی ہونے کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں ایسے لوگ گمراہی، فساد اور گناہِ کبیرہ میں ضرور ملوث ہوئے۔ ان سے نفرت اور بے زاری ظاہر کرنا ضروری ہے، سوائے اس کے کہ جس کی توبہ ثابت ہو چکی ہو۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''خوارج جہنم کے کتے ہیں جو دین سے نکل گئے۔ مگر اس کے باوجود ہم انہیں بتوں اور صلیب کے پجاریوں کی طرح ہمیشہ کا جہنمی یقین نہیں کرتے۔''[2]

علامہ صفدی رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل عبد الرحمٰن بن مُلجَم کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''روافض کے نزدیک وہ آخرت کا بدبخت ترین انسان ہے۔ ہم اہلِ سنت اس کے لیے جہنم کی توقع رکھتے ہیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ اسے معاف فرما دے، اس کا حکم حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہم، حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ، خارجہ بن حذافہ (جنہیں خوارج نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سمجھ کر قتل کیا) اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں جیسا ہے۔ ہم ان سے برأت ظاہر کرتے ہیں، اللہ کے لیے ان سے بغض رکھتے ہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔''[3]

---

① سنن ابن ماجہ، ح: ۱۱۲، قال الالبانی: صحیح

② سیر اعلام النبلاء: ۱۲۸/۳، ط الرسالۃ

③ الوافی بالوفیات للصفدی: ۱۲۷/۱۸، ط دار احیاء التراث

اہم تنبیہات

❶ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اگر بعض نیک وصالح شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج میں شریک ہو گئے ہوں تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ مرکزِ اسلام مدینہ سے دوری کے سبب اس فتنے کی پیش گوئی یا خروج کے بارے میں احکامات سے آگاہ نہ ہوں، یا انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں احادیث کا علم نہ ہو اور وہ غلط فہمی کا شکار ہو کر خروج میں شامل ہو گئے ہوں۔ ایسے حضرات کے بارے میں ہم امید کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ انہیں توبہ کی توفیق ہو گئی ہو گی، جیسا کہ قرونِ اولیٰ کے اکثر مسلمانوں کی شان تھی۔ یہ بھی ممکن ہے وہ فساد میں شریک نہ ہوں مگر سازشی گروہ نے اپنی ''حقانیت'' کا سکہ جمانے کے لیے انہیں جماعت کا سرپرست اور امیر مشہور کر دیا ہو۔

❷ بغاوت میں شامل بہت سے لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہے۔ معتبر روایات کے مطابق باغیوں میں سے بہت سے لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سخت نادم ہوئے تھے اور اکابر صحابہ کے سامنے ندامت کا اظہار بھی کیا تھا۔[1] غالباً یہ وہی لوگ ہوں گے جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس تحریک کا حصہ بنے ہوں گے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہو گا۔

---

① تاریخ الطبری: ۳/۳۹۲

دورِ خلافتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق شبہات

﴿سوال﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہلِ شام نے بیعت نہیں کی تھی، پھر انہیں بالا جماع خلیفہ کہنا کیسے درست ہوگا؟ ائمہ مجتہدین میں امام ابوحنیفہ کے سوا کوئی اور ہے جس نے انہیں خلیفہ مانا ہو؟

﴿جواب﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کے لیے اہلِ مدینہ کا اجماع کافی تھا جیسا کہ اس سے قبل خلفائے ثلاثہ پر اجماع کے لیے مدینہ کے اربابِ حل وعقد کا اتفاق کافی سمجھا گیا تھا اور ان کی بیعت کے ساتھ ہی پوری اُمت پر بیعت لازم ہوگئی تھی۔ یہ دعویٰ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سوا دیگر ائمہ مجتہدین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو نہیں مانا، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ ائمہ مجتہدین کے اقوال اس بارے میں واضح ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مقدم رکھو، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ، پس یہ خلفائے راشدین ہیں۔''[1]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا: ''کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہے؟''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اختیار نہ ہوتے ہوئے ناحق حدودِ شرعی قائم کرتے تھے، (چور کا ہاتھ) کاٹتے تھے، زکوٰۃ وصول کرتے اور تقسیم کرتے تھے؟ میں ایسی بات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ ہاں وہ ایسے خلیفہ تھے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ راضی تھے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھیں، ان کے ہمراہ جنگیں لڑیں، جہاد کیا، حج کیا، وہ انہیں امیر المؤمنین کہتے تھے، ان سے راضی تھے، منحرف نہ تھے، پس ہم ان کے تابع ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی اتباع سے ان شاء اللہ ہمیں ثواب ملے گا جیسا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔''[2]

ایک بار امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کہا گیا: ''کیا آپ حدیثِ سفینہ[3] سے استدلال کرتے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا: ''اس میں کیا رکاوٹ ہے؟'' کہا گیا: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت مشورے اور اختیار کے بغیر قائم ہوئی تھی۔''

فرمایا: ''اس بارے میں بحث مت کرو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حج میں لوگوں کے امیر تھے، حدود قائم کرتے تھے، غنیمت

---

① قدّموا ابابکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علیا، فهم الخلفاء الراشدون. (حقیقة السنة والبدعة للامام السیوطی، ص ۲۰۹)

② قلت له: خلافة علیّ ثابتة؟ قال: سبحان الله! یقیم علیٌّ الحدود، ویقطع ویأخذ الصدقة ویقسمها بلا حقّ وجب له؟ اعوذ بالله من هذه المقالة، نعم الخلیفة رضیه اصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، وصلّوا خلفه وغزوا معه وجاهدوا وحجّوا وکانوا یسمونه امیر المؤمنین راضین بذلک، غیر منکرین فنحن تبع لهم ونحن نرجو من الثواب باتباعنا لهم ان شاء الله مع ما امرنا الله به والرسول صلی اللہ علیہ وسلم. (السنة لابی بکر الخلال، ح: ۶۱۳)

③ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے فرمانِ نبوی مروی ہے کہ خلافت تیس سال ہوگی۔ (سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۶) اس سے چار خلفاء کی خلافت پر استدلال کیا جاتا ہے۔

تقسیم کرتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خلیفہ نہ ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ انہیں ''امیر المؤمنین'' کہتے ہوں۔''[1]

غرض یہ ثابت ہے کہ ائمہ مجتہدین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ مانتے تھے۔ اس کا انکار محض ضد اور عناد ہے۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ یہ بات نا قابلِ فہم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کی تفتیش پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ کم از کم محمد بن ابی بکر کو تو پتا ہو گا کہ قاتل کون تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے معلوم کر کے اس بنیاد پر کارروائی کیوں نہ کی؟

﴿جواب﴾ ہم اس امکان کو مسترد نہیں کرتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعض افراد کے نام بطورِ قاتل بتائے گئے ہوں۔ محمد بن ابی بکر اور اَشتر نخعی وغیرہ سے ایسی معلومات مل سکتی تھیں۔ مگر ان کی حیثیت اطلاع سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ قصاص جاری کرنے کے لیے یا تو مجرم کا اعترافِ جرم درکار تھا یا شرعی شہادت۔ یہ دونوں چیزیں ناپید تھیں۔ محمد بن ابی بکر کی گواہی کسی پر قصاص جاری کرنے کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے کہ معتبر روایات کے مطابق وہ قاتلانہ حملے سے پہلے شرمندہ ہو کر موقعِ واردات سے باہر نکل گئے تھے۔[2]

جن لوگوں نے قتل کی کارروائی کی ان میں سے کچھ وہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں کے ہاتھوں مارے گئے اور باقی دور دراز علاقوں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آس پاس کوئی قاتل باقی نہیں تھا۔ عقلاً بھی یہ ممکن نہیں کہ ایک خلیفہ کو قتل کرنے کے بعد مجرم اسی علاقے میں محفوظ رہیں۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی عام آدمی کو قتل کرنے کے بعد بھی مجرم نامعلوم ٹھکانے کی طرف فرار اور روپوش ہو جاتے ہیں۔ پس یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک خلیفہ کے قاتل فرار نہ ہوتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ و تابعین کے درمیان مزے سے گھومتے پھرتے رہتے۔

ذخیرۂ حدیث کی صحیح روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اصل قاتل واردات کے بعد مدینہ سے بھاگے اور شام و مصر کے سرحدی کوہستان میں روپوش ہو گئے تھے۔[3]

---

[1] قيل له: تحتج بحديث سفينة؟ قال: وما يدفعه؟ قيل له: خلافة عليّ عن غير مشورة ولا امر؟ قال: لاتكلم في هذا، عليّ يحج بالناس، ويقيم الحدود، ويقسم الفيء، لايكون خليفة واصحاب رسول الله ﷺ ينادونه يا امير المؤمنين. (السنة لابی بکر الخلال، ح: ۶۱۷)

[2] تاریخ طبری میں محمد بن ابوبکر کے رجوع کی ایک سے زائد روایات ہیں: فخرج وتركه. (۳۸۴/۴) فنكل ورجع. (۳۹۱/۴)

[3] فطعنه احدهما بمشقص في اوداجه وعلاه الآخر بالسيف فقتلوه، ثم انطلقوا هراباً، يسيرون بالليل ويكمنون بالنهار حتى اتوا بلداً بين مصر والشام، قال فكمنوا في غار، قال فجاء نبطي من تلك البلاد معه حمار، قال فدخل ذباب في منخر الحمار، قال فنفر حتى دخل عليهم الغار وطلبه صاحبه فرآهم فانطلق الى عامل معاوية، قال فاخبره بهم قال فاخذهم معاوية فضرب اعناقهم.

(مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۲۹۱، ط الرشد، بسند صحيح او حسن، رجاله رجال البخاری الا جهيم الفهری، لكن وثقه ابن حبان.)

مذکورہ روایت کے مطابق دنیا ان کے حال سے اس وقت مطلع ہوئی جب ایک دیہاتی اپنے گم شدہ گدھے کی تلاش میں اس غار تک پہنچا تو یہ مشکوک لوگ نظر آ گئے۔ دیہاتی نے علاقے کے حاکم کو جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نائب تھا، اطلاع دی۔ اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر دی۔ انہوں نے مجرموں کو حراست میں لیا اور (تحقیق و تفتیش کے بعد) قصاصاً قتل کر دیا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں میں سے ایک کا نام ابوعمرو تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی نام کی تھوڑی بہت مشابہت کی وجہ سے حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کو بھی غلط طور پر قاتل مشہور کر دیا گیا ہو جیسا کہ واقدی کی روایت میں ہے۔

نوٹ: یہ واقعہ یقیناً جنگِ صفین کے ایک ڈیڑھ سال بعد ۳۸ھ کا ہے؛ کیوں کہ فلسطین اور مصر پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت تبھی قائم ہوئی تھی۔

ان مجرموں کا مدینہ سے نکل بھاگنا درج ذیل حقائق کو ثابت کر دیتا ہے:

● مجرموں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پورا خطرہ تھا کہ وہ ان سے قصاص لینے میں کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔

● حضرت علی رضی اللہ عنہ قتل کی تحریک میں کسی بھی طرح شریک نہ تھے، ورنہ مجرموں کو فرار ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آس پاس رہنے کو اپنے لیے محفوظ سمجھتے۔

● حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اردگرد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی قاتل نہ تھا جیسا کہ ان کے مخالفین کا دعویٰ تھا۔

غرض اصل مجرم مفرور اور روپوش تھے اور مستزاد یہ کہ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک دن بھی اطمینان کا نہیں ملا۔ پورت بھی غلغلہ رہا کہ نہ صرف مہلک وار کرنے والے قاتلوں سے قصاص لیا جائے بلکہ بلوہ کرنے والے اڑھائی تین ہزار کو بھی سزائے موت دی جائے۔ دریں حالات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معذوری و مجبوری انتظامی لحاظ سے بھی ظاہر ہے اور شرعی اعتبار سے بھی۔ جو مجرم ان کے علاقے سے باہر نکل کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ انتظام خطے میں روپوش تھے اور دنیا ان سے بے خبر تھی، انہیں عدالت میں کیسے لایا جاتا!! حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی ان کی خبر ایک اتفاقی واقعے کی وجہ سے مل گئی۔ ورنہ ممکن تھا کہ مزید کئی برس گزر جاتے، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ مجرم ہمیشہ پردۂ خفا میں رہتے۔

ماءِ حوأب کی روایت کی حقیقت کیا ہے؟

﴿سوال﴾ مشہور ہے کہ بصرہ جاتے ہوئے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا گزر حوأب نامی چشمے سے ہوا جہاں ان پر کتے بھونکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے کہ تم میں سے کسی پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔ ام المؤمنین کو وہ حدیث یاد آگئی اور واپسی کا ارادہ کر لیا مگر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سمیت پچاس افراد نے قسم کھا کر کہا کہ یہ حوأب نہیں۔ یہ اسلام کی تاریخ کی پہلی جھوٹی قسم تھی۔ [1]

طبری میں ایک بدو سے منقول طویل روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب مکہ سے بصرہ جا رہی تھیں تو مجھ سے راستے میں ایک تیز رفتار اونٹ چار سو یا چھ سو درہم کا خریدا۔ ماء حوأب سے گزرے تو کتے بھونکنے لگے۔ لوگوں نے جگہ کا نام پوچھا، میں نے ''ماءِ حوأب'' بتایا۔ یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے اونٹ کو بٹھا دیا اور کہا: ''اللہ کی قسم! میں ہی حوأب کے کتوں والی ہوں، مجھے واپس روانہ کرو۔'' مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے آواز لگا کر علی بن ابی طالب تعاقب میں پہنچنے والے ہیں۔ یہ سن کر سب روانہ ہو گئے۔ [2]

اسی طرح ابن شہاب زہری سے مروی ہے کہ جب ام المؤمنین نے واپسی کا عزم کیا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس نے یہ جگہ ماءِ حوأب بتائی اس نے جھوٹ کہا، اس پر اتنا اصرار کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پھر بصرہ روانہ ہو گئیں۔ [3]

---

[1] مروج الذهب: ۳/۱۰۲، ۱۰۳، ط الجامعة اللبنانية
[2] تاريخ الطبري: ۴/۴۵۷ [3] تاريخ الطبري: ۴/۴۶۹

کیا یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا؟ نیز کچھ لوگ واقعہ ماءِ حوأب کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ درست بات کیا ہے؟

جواب: یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا تھا جیسا کہ بیان کیا گیا۔ یہ سب ضعیف روایات ہیں۔ مسعودی شیعہ ہے۔ روایت بھی بے سند ہے، اس لیے مزید جرح کی ضرورت نہیں۔ طبری نے بدو سے اونٹ خریدنے والی جو روایت نقل کی ہے، اس کے ایک راوی اسماعیل بن موسیٰ الفزاری کو غالی شیعہ کہا گیا ہے۔ [1] اس کا آخری راوی ایک مجہول اعرابی ہے۔ پس یہ ضعیف ہے۔ زہری واقعے کے عینی شاہد نہیں۔ اس لیے روایت منقطع بھی ہے۔ اور اس کا ضعف بہت بڑھ جاتا ہے۔ ایسی ایک روایت امام طبری نے ابو مخنف سے نقل کی ہے جس کا رافضی ہونا سب پر عیاں ہے۔

مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ماءِ حوأب سے گزرنے کا انکار کرنا بھی غلط ہے۔ صحیح احادیث سے نفسِ واقعہ دوسرے انداز میں ثابت ہے جو درج ذیل ہے۔ صحیح ابن حبان میں ہے:

"جب حضرت عائشہ روانہ ہوئیں تو بنی عامر کے کسی چشمے سے گزر ہوا، وہاں ان لوگوں کو رات نے آلیا۔ پس ام المؤمنین نے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی تو پوچھا: یہ کونسا چشمہ ہے؟ لوگوں نے کہا، حوأب۔ فرمایا: میرا خیال ہے مجھے واپس جانا چاہیے۔ لوگوں نے کہا: ٹھہریے اللہ آپ پر رحمت کرے۔ آپ آگے بڑھیں۔ مسلمان آپ کو دیکھیں گے تو اللہ ان کے درمیان صلح کرادے گا۔ فرمایا: میرا خیال ہے واپس ہی جانا چاہیے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا تھا: "تم میں سے ایک کا کیا حال ہوگا جب اس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔"" [2]

صحیح سند سے یہ واقعہ مسند احمد، مسندِ ابی یعلیٰ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے۔ معتبر اسناد کی ان روایات میں نہ تو صحابہ کا جھوٹی قسمیں کھانا مذکور ہے نہ دیگر رکیک باتیں۔ صرف رسول اللہ ﷺ کا ایک عمومی ارشاد منقول ہے اور ماءِ حوأب سے ام المؤمنین کے گزر، واپسی کے خیال اور دیگر صحابہ کی طرف سے اصلاح بین الناس کی یاد دہانی کا ذکر ہے۔

صحیح روایات سے ثابت واقعے سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر کچھ بھی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیوں کہ:

1. مذکورہ فرمانِ نبوی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو صراحتاً ایسے سفر سے روکا نہیں گیا تھا۔ صرف ایک پیش گوئی کی گئی تھی اور اُس میں بھی ابہام تھا کہ اس کا مصداق کون ہوگی۔

ہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو گمان ضرور ہوا کہ ممکن ہے حضور ﷺ کی مراد انہی کو روکنا ہو۔ مگر یہ گمان اس

---

[1] میزان الاعتدال: ۲۵۱/۱

[2] صحیح ابن حبان، روایت نمبر: ۶۷۳۲

مسند احمد میں ہے: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ لوٹ رہی ہیں؟ شاید اللہ آپ کے ذریعے لوگوں میں صلح کرادے۔"

(مسند احمد، ح: ۲۴۶۵۴ بسند صحیح، نیز ح: ۲۴۲۵۴)

مزید دیکھیے: مسند ابی یعلی، ح: ۴۸۶۸، الفتن لنعیم بن حماد، ح: ۱۸۸، مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۷۱، ط الرشد؛ مسند مسند بن راھویہ، ح: ۱۵۶۹، کشف الاستار، ح: ۳۲۷۵، مجمع الزوائد، ح: ۱۲۰۲۵، قال الھیثمی: رواہ احمد وابو یعلی والبزار، ورجال احمد رجال الصحیح۔

...ت تبدیل ہوگیا جب دیگر صحابہ نے سفر کے فوائد کی طرف اشارہ کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی مزید غور کیا تو ...سلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور مظلوم کو انصاف دلانے کی اہمیت جو بکثرت احادیث سے ثابت ہے ایک حدیث کے ...مکانی مطلب سے زیادہ وزنی محسوس ہوئی۔ اس لیے آپ رضی اللہ عنہا نے سفر برقرار رکھا۔ اگر حدیث میں صریح ممانعت ...ہی تو ام المؤمنین اسے ضرور سمجھ لیتیں اور مدینہ واپس جانے کا فیصلہ برقرار رکھتیں۔

● حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گزرنے پر کتوں کے بھونکنے کا کوئی منفی مطلب لینے کی گنجائش نہیں۔ کتوں کا ...بھونکنا کسی مسافر کے غلط کار ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا۔ وہ کسی بھی راہ گیر یا قافلے وغیرہ پر بھونکا کرتے ہیں، یہ معمول کی ...ت ہے۔ اگر وہ اس موقع پر بھونکے ہوں تو اس کی وجہ وہ قافلہ ہوگا نہ کہ کوئی خاص فرد۔ اتنے بڑے قافلے میں ام ...مؤمنین رضی اللہ عنہا جو ویسے بھی پردے اور ہودج میں تھیں، نمایاں ہو ہی نہیں سکتی تھیں کہ انہیں دیکھ کر کوئی جانور مشتعل ہوتا۔

...ہاں یہاں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی اپنی خدا خوفی ضرور قابلِ داد ہے کہ انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہی تو اس ارشاد ...ی کی مصداق نہیں جس میں ایک عورت پر ماءِ حوآب کے کتوں کے بھونکنے کا ذکر ہوا ہو۔ انہیں لگا کہ کہیں ارشادِ نبوی ...یہ کے طور پر نہ ہو، کہیں اس میں ممانعت مراد نہ ہو۔ بعد رفقاء کے سمجھانے سے یہ خیال تبدیل ہوگیا۔

● اس ارشاد میں روئے سخن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بلکہ کسی بھی خاص خاتون کی طرف نہ تھا۔ بلکہ روایت کے ...سیاق سے بعض شارحین نے یہ سمجھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود بھی اس پیش گوئی کا مصداق معلوم نہ تھا۔[1]

سیف بن عمر سے مروی ایک تاریخی روایت کے مطابق اُمّ زِمْل سلمیٰ بنت مالک نامی ایک عورت کسی غزوے میں ...بندی بن کر آئی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باندی بنی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھر میں تشریف لائے تو یہ بھی موجود ...تھی اور دیگر ازواج بھی جمع تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم عورتوں میں سے ایک حوأب کے کتوں کو مشتعل کرے ...گی۔'' ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بعد میں احسان کرتے ہوئے سلمیٰ کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور ...میں جب فتنۂ ارتداد ابھرا تو یہ مرتد ہوکر اپنی قوم کی سردار بن گئی اور مسلمانوں سے جنگ شروع کر دی۔ اپنی مہمات کے ...دوران یہ 'ظفر' سے 'حوأب' کے درمیان سفر کرتی تھی۔ جب حوأب سے گزرتی تو کتے اسے دیکھ کر بھونکا کرتے تھے۔[2]

پس ممکن ہے کہ یہ ارشادِ نبوی اُمّ زِمْل ہی کے بارے میں ہو۔ چونکہ مجلس میں اکثر امہات المؤمنین تھیں، اس ...لیے بعض نے اس ارشاد کو اپنے لیے سمجھا ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اسی لیے ماءِ حوأب سے گزرتے ہوئے اپنے ...بارے میں گمان ہوا ہو کہ یہ ارشاد انہی سے متعلق ہے۔ عین ممکن ہے، وہ مراد نہ ہوں بلکہ اُمّ زِمْل مراد ہو۔ واللہ اعلم!

---

[1] ...علماء نے اس قصے کی مختلف روایات کا موازنہ کر کے نتیجہ نکالا ہے کہ اس ارشاد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متعین طور پر نہیں جانتے تھے مگر بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ...کو بذریعہ وحی بتا دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "انہ سیکون بینک وبین عائشۃ شیء" (شرح مشکل الآثار، ح: ۵۶۱۱، ۵۶۱۲، ۵۶۱۳)

[2] تاریخ طبری: ۲/۲۶۳، ۲۶۴؛ معجم البلدان للحموی: ۲/۳۱۴ مادہ حوأب یہ تاریخی روایت اگرچہ ضعیف السند ہے مگر ہم شروع میں ...وضاحت کر چکے ہیں کہ ضعیف روایات اگر عظیم شخصیات پر طعن یا دیگر علتوں سے خالی ہوں تو وہ قابلِ قبول ہوں گی۔ لہٰذا اس مسئلے میں یہ روایت ضمناً استفادے کے ...قابل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بحث کا دارومدار اسی ضعیف روایت پر رکھ کر صحیح روایات کو جعلی کہا جائے۔ بحث کا اصل مدار صحیح روایات پر ہونا چاہیے۔

● جمہور علماء اور شارحینِ حدیث کی رائے یہ ہے کہ ''حدیثِ ماءِ حواب'' کا مصداق ام المؤمنین رضی اللہ عنہا ہی تھیں[1] اور مقصد اس پورے قافلے کو متنبہ کرنا تھا کیوں کہ اس قافلے کے بصرہ پہنچنے کے بعد حالات ایسے بنتے چلے گئے کہ جنگِ جمل برپا ہو کر رہی، جس کا نتیجہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت اور خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی جان کو خطرہ لاحق ہونے کی صورت میں نکلا۔ حدیث میں اس فتنے سے خبردار کرنا مطلوب تھا جس کے لیے یہ سفر تمہید بنا۔ تاہم سفر کرنے والوں کی نیت دین کی سربلندی اور شریعتِ مطہرہ کی حفاظت کے سوا کچھ نہ تھی اور جو کچھ ہوا اجتہاد کے تحت ہوا، اس لیے ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس حدیث کو ان کی بے دینی، فسق یا گمراہی کی دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

قیس بن ابی حازم کی ثقاہت پر اعتراض:

﴿سوال﴾ حدیث ماءِ الحواب کی جن روایات کو صحیح کہا جا رہا ہے، ان کا راوی قیس بن ابی حازم ہے جو ''منکر الحدیث'' ہے۔ یحییٰ بن سعید کی طرف سے قیس کے بارے میں ''منکر الحدیث'' ہونے کی جرح موجود ہے اور وہ بھی اسی وجہ سے کہ وہ حدیث ماء الحواب نقل کرتا تھا۔ پس کیا اس روایت کو صحیح کہنا ایک علمی خیانت نہیں۔۔؟

﴿جواب﴾ بلاشبہ قیس بن ابی حازم پر یحییٰ بن سعید نے ''منکر الحدیث'' ہونے کا حکم لگایا ہے مگر اس کا مطلب نہ تو آج کل کا 'منکرِ حدیث' ہونا ہے، نہ ہی یہ محدثین کی عام اصطلاح کے مطابق ان کے ضعف کی طرف اشارہ ہے۔ بلکہ اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ راوی ایسی روایات بھی لاتا ہے جو دوسرے راوی نقل نہیں کرتے۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی راوی کو 'منکر الحدیث' کہنا دو معنوں میں ہوتا ہے: ایک یہ کہ راوی کی اکثر روایات عجیب و غریب قسم کی ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ بعض منفرد اور الگ قسم کی روایات پیش کرتا ہے۔

پہلی صورت میں راوی ضعیف اور مشکوک ہو جاتا ہے۔ جبکہ دوسری صورت میں وہ ضعیف ثابت نہیں ہوتا۔

شیخ عبداللہ بن یوسف الجدیع لکھتے ہیں:

> **''منکر الحدیث کی اصطلاح کے استعمال میں ایک استثنائی صورت بھی ہے جو خاص توجہ کے لائق ہے، وہ یہ کہ: بعض قدیم علماء نے یہ اصطلاح استعمال کر کے مراد یہ لی ہے کہ راوی اس روایت میں منفرد ہے اور وہ ایک الگ روایت پیش کر رہا ہے۔ بعض ائمہ نے یحییٰ بن سعید القطان کے قیس بن ابی حازم کو منکر الحدیث قرار دینے کو اسی پر محمول کیا ہے۔''**[2]

اسی لیے حافظ ابن حجر نے بھی قیس بن ابی حازم کے بارے میں یحییٰ بن سعید القطان کے قول 'منکر الحدیث'، کا مطلب بتایا ہے: ''الفرد المطلق'' (مطلقاً بعض منفرد روایات کا راوی)[3]

---

① جہاں تک راقم نے دیکھا ہے، بھی شارحین حدیث کی یہی رائے ہے۔

② تحریر علوم الحدیث: ۱/۶۱۶، ط موسسۃ الریان بیروت ③ تہذیب التہذیب: ۳۸۹/۸، ط نظامیہ دکن

امام احمد بن حنبلؒ نے متعدد ثقہ راویوں کو انہی معنوں میں ''منکر الحدیث'' کہا ہے، مثلاً وہ حسین بن الحسین الاشقر کے بارے میں فرماتے ہیں: ''منکر الحدیث و کان صدوقاً.''[1]

آخر امام احمد بن حنبلؒ انہیں ''منکر الحدیث'' کہنے کے ساتھ ہی سچا کس طرح کہہ رہے ہیں؟

اسی لیے کہ یہاں ''منکر الحدیث'' کا دوسرا معنیٰ مراد ہے نہ کہ پہلا۔

بالفرض اگر مان لیا جائے کہ یحییٰ بن سعید نے ''منکر الحدیث'' کہہ کر قیس بن ابی حازم پر ضعف کا حکم لگایا ہے تو بھی ایک شخص کی طرف سے لگائے گئے اس شاذ حکم کی کوئی حیثیت نہیں کیوں کہ جمہور کے نزدیک قیس ابن ابی حازم جلیل القدر تابعی اور ثقہ راوی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم نے بھی ان سے روایات لی ہیں۔ ان کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: ''ثقة.''[2]

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ کے الفاظِ توثیق یہ ہیں: ''العالم ،الثقة ،الحافظ''[3]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ''ثقة ، حجة.''[4]

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ فرماتے تھے: اجود التابعین اسناداً قیس. ''تابعین میں سب بہتر سند قیس کی ہے۔''

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ فرماتے تھے: ''کوفہ میں قیس سے بڑھ کر صحابہ سے روایت نقل کرنے والا کوئی نہ تھا۔''

ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عشرۂ مبشرہ میں سے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر باقی سب کی صحبت پائی اور ان سے روایت نقل کی۔[5]

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ یہ بھی فرماتے تھے کہ قیس کی ثقاہت پر اجماع ہے اور جس نے ان پر جرح کی اس نے خود ہی کو تکلیف دی۔[6]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ قیس کو افضل التابعین قرار دیتے تھے۔[7]

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ کوفہ میں رہتے ہوئے بھی قیس بن ابی حازم اس دور کی سیاسی کش مکش میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے ،قصاصِ عثمان کی آواز بلند کرنے والوں کے ساتھ تھے یعنی وہ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ وزبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے حامی تھے۔ اس لیے انہیں ''عثمانی'' کہا جاتا تھا۔[8] ایسے بزرگ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ماءِ حوأب کی روایت یقیناً معتبر ہونی چاہیے کیوں کہ وہ شیعوں کے شدید مخالف ہیں۔ ان پر کچھ جرح ہوئی بھی ہے تو شیعی اثرات کی وجہ سے نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت اور عثمانیت میں شدت کی بناء پر۔ بہت سے محدثین کوفہ

---

[1] موسوعة اقوال احمد بن حنبل: ۲۶۵/۱

[2] تقریب التهذیب، ترجمه نمبر: ۵۵۶۶

[3] سیر اعلام النبلاء: ۱۹۸/۴ ط الرسالة

[4] میزان الاعتدال: ۳۹۲/۳

[5] میزان الاعتدال: ۳۹۲/۳، ۳۹۳

[6] سیر اعلام النبلاء: ۱۹۸/۴ ط الرسالة

[7] موسوعة اقوال الامام احمد: ۱۸۷/۳

[8] ''کان کوفیا عثمانیا وذلک نادر.'' (تاریخ الاسلام للذهبی لتدمری: ۳۵۸/۶ ؛ بشار: ۱۱۵۹/۲)

نے ان سے روایت ترک کردی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی۔ کیوں کہ کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سیاسی مخالف کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ①

یادرہے کہ کسی بھی راوی کے ثقہ یا ضعیف ہونے کا فیصلہ اسماء الرجال کی کتب سے کیا جاتا ہے نہ کہ اپنے ذوق سے۔ اگر جرح وتعدیل کا اختیار آج کے لوگوں کو دے دیا جائے تو ہمارے بہترین راوی بلکہ بعض ائمہ مجتہدین بھی مجروح ہوسکتے ہیں۔ ثقہ راویوں بلکہ نامور فقہاء ومحدثین میں سے بھی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس پر کسی نہ کسی نے جرح کی ہے۔ لہٰذا ثقاہت یا ضعف کا فیصلہ کسی ایک آدھ نقاد کی رائے سے نہیں ہوگا بلکہ جمہور کی ان آراء سے ہوگا جنہیں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ جیسے حضرات نے مرتب کیا ہے۔

☆☆☆

جنگِ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل فریق کی حیثیت؟

﴿سوال﴾ بعض روایات میں ہے کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حق پر نہ ہونے کی پیش گوئی والی حدیث سن کر میدانِ جنگ سے نکل گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث یاد دلادی تھی "لتقاتلنه وانت ظالم ." (تم علی رضی اللہ عنہ سے قتال کروگے جب کہ تم ظالم ہوگے) یہ سن کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے نہ لڑنے کی قسم کھائی اور واپس جانے لگے مگر ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر روک لیا کہ آپ لڑائی کے لیے آئے ہی نہیں، آپ تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے آئے ہیں۔ اس مشورے پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے قسم کا کفارہ دے دیا اور وہیں رک گئے۔ اس روایت کی اسنادی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت کا ظالم ہونا ثابت نہیں ہوجاتا؟

﴿جواب﴾ اس روایت کی اکثر اسناد ضعیف ہیں البتہ مستدرک کی ایک روایت کو حافظ ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے۔ ②

مگر درحقیقت "لتقاتلنه وانت ظالم." کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نعوذ باللہ گناہگار اور نافرمان تھے۔ "ظالم" سے مراد صرف یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ان کا موقف اور اقدام درست نہ تھا جسے فقہی اصطلاح میں خروج کہا جائے گا مگر چونکہ وہ اور ان کے ساتھی صحابہ مجتہد تھے، اور یہ خطا بہر حال اجتہادی تھی۔

یادرہے کہ عربی میں "ظلم" کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کا اصل مطلب چیز کو اپنی جگہ سے آگے پیچھے کرنا ہے۔ اس میں معمولی غلطی بھی شامل ہوسکتی ہے اور شرک جیسا عظیم جرم بھی۔ یہ اُردو والا "ظلم" نہیں جس کا معنیٰ محدود ہے۔

① حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ومنهم من لم يحمل عليه في شيء من الحديث وحمل عليه في مذهبه، وقالوا: كان يحمل على علي. (سير اعلام النبلاء: ۴/۱۹۹، ط الرسالة)
یادرہے کہ قیس بن ابی حازم سے صحیح مسلم میں ۱۴، ابوداؤد میں ۳، ترمذی میں ۱۸، نسائی میں ۲، ابن ماجہ میں ۱۴ روایات منقول ہیں۔ صحاح ستہ میں ان کی سب سے زیادہ روایات امام بخاری نے لی ہیں یعنی صحیح بخاری میں قیس کی ۲۱ روایات ہیں۔ اسی طرح ائمہ اربعہ نے بھی ان کی روایات کو قبول کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ان کی ایک، کتاب الآثار لابی یوسف میں ایک اور مسند امام شافعی میں چار، اور مسند احمد میں ۱۷ روایات نقل کی گئی ہیں۔

② مستدرک حاکم، ح: ۵۵۷۴، مستدرک میں اس صحیح روایت سے قبل اسی مضمون کی ایک اور روایت ہے جسے حافظ ذہبی نے محل نظر قرار دیا ہے۔ نیز اس کے بعد اسی مضمون کی مسلسل تین روایات ہیں مگر حافظ ذہبی نے وہاں سکوت کیا ہے۔ مزید دیکھیے: مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۸۲۷

حدیث کے الفاظ کا صحیح مطلب صرف اتنا ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کسی وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیاسی اختلاف کریں گے جس میں صحیح رائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہوگی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ فرمان نبوی بھول گیا تھا۔ جب یاد آیا تو خدا خوفی کی انتہا کی وجہ سے علاقہ ہی چھوڑ کر جانے لگے۔ بعد میں صاحبزادے نے ٹھہرنے اور بات چیت جاری رکھنے کی گنجائش بتائی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ صلح کی بات چیت کے لیے تین دن رکے رہے۔ اسی بات چیت کے نتیجے میں اتحاد بھی ہوگیا۔ بعد میں جب سبائیوں کی سازش کے نتیجے میں جنگ شروع ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ اس علاقے سے نکل گئے۔

غرض حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیاسی لائحہ عمل میں اختلاف تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا مقصد ایک ہی تھا کہ امت کو متحد کیا جائے۔ اس دوران ان میں جو کشمکش ہوئی اس کے باعث ان کی نیت پر شک درست نہیں۔ یہ اجتہاد تھا جس میں وہ خطا کر کے بھی ان شاء اللہ اجر و ثواب کے مستحق ہوئے۔ جو لوگ حالتِ خطا میں لڑتے ہوئے قتل ہوئے وہ بھی مغفور ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد برپا ہونے والے ایسے فتنوں کا ذکر کیا تھا تو بعض صحابہ کرام نے پوچھا تھا:

''ہم فتنوں کے اس دور میں ہوئے تو کیا ہلاک ہو جائیں گے؟''

جواب میں ارشاد ہوا: ''میرے صحابہ کے (کفارے کے) لیے قتل کافی ہو جائے گا۔''[1]

☆☆☆

حضرت طلحہ، زبیر اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے جلالتِ قدر کے باوجود لغزش کیسے ہوگئی؟

﴿سوال﴾ عظیم المرتبت صحابہ سے اپنی تمام تر جلالتِ قدر کے باوجود قصاصِ عثمان کے قضیے میں لغزش کیسے ہوگئی؟

﴿جواب﴾ فقہی مسئلے میں لغزش ہو جانا عجیب ضرور ہے مگر محال نہیں۔ علمِ کلی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور کامل شرعی علم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ صحابہ میں سے اعلیٰ مقام کے حامل حضرات بھی بعض اوقات فقہی یا انتظامی مسائل میں تأمل، تذبذب یا خطا کا شکار ہوئے ہیں۔ بعد میں علم ہو جانے پر انہوں نے اس خاص مسئلے میں اپنی خطا کا قولاً یا فعلاً اعتراف بھی کیا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض نئے مسائل میں ایک طرف ایک خلیفہ راشد تھے اور دوسری طرف تمام صحابہ۔ مگر رائے خلیفہ راشد ہی کی درست تھی۔ اس کی چند نظیریں پیشِ خدمت ہیں:

1. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کے وقت کسی کو علم نہ تھا کہ مرقد مبارک کی جگہ کے متعلق کوئی حدیث ہے یا نہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا مسجد میں دفن کیا جائے، کوئی کہتا تھا صحابہ کے ساتھ بقیع میں تدفین کی جائے۔ فقط حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ حل کیا اور ارشادِ نبوی سنایا: ماقبض نبی الا دفن حیث قبض. ''نبی کی تدفین وہیں ہوتی ہے جہاں وفات ہوئی ہو۔''[2]

---

[1] حسب اصحابی القتل (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱/۱۵۰)

[2] مسند ابی یعلیٰ، روایت نمبر: ۲۲

❷ جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کے وقت حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم سبھی کی رائے اس کے خلاف تھی۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ واحد فرد تھے جو لشکر کو بھیجنے پر مصر تھے۔ انجام کار حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے ہی درست ثابت ہوئی۔[1]

❸ یہ تو پھر انتظامی یا سیاسی مصلحت کے اختلافات تھے مگر مانعینِ زکوٰۃ سے قتال کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے شروع میں فقہی لحاظ سے بھی عدمِ جواز کی تھی۔ وہ حدیث ''اُمرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا لاالٰہ الاالله.'' سے استدلال کرتے ہوئے کہتے تھے کہ کسی کلمہ گو کا زکوٰۃ نہ دینا اس کے خلاف لشکر کشی کی وجہِ جواز نہیں بن سکتا۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جواب میں فرماتے تھے: ''واللّٰہ لاافرقن بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ ولاقاتلن من فرق بینھما.'' (میں نماز اور زکوٰۃ میں فرق نہیں کروں گا۔ جو ایسا کرے گا اس سے جنگ کروں گا۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت نہ سمجھتے ہوئے بھی عمل میں خلیفہ کے ساتھ اشتراک کر لیا۔ وہ فرماتے تھے:

''فقاتلنا معه، فرأینا ذلک رشداً.''

ہم جنگ میں ان کے ساتھ ہو گئے، پس ہم نے دیکھا کہ یہی صحیح رائے تھی۔[2]

❹ قرآن مجید کی جمع وتدوین کے بارے میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت اختلاف تھا۔ وہ اسے بدعت تصور کر رہے تھے۔ مگر انجام کار ان پر اپنی رائے کی غلطی واضح ہو گئی۔[3]

❺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فقاہت اور جلالتِ قدر میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ایک بار ایک ایسی حاملہ خاتون کو بدکاری کے الزام میں سنگسار کرنے کا حکم دیا جس کا شوہر چار سال بعد گھر لوٹا تھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور کہا کہ وضعِ حمل تک انتظار کیجیے۔ جب بچے کی ولادت ہوئی تو اس کے دانت بھی آچکے تھے اور وہ ہو بہو اپنے والد کی طرح تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت اپنے فقہی فیصلے کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے فرمادیا:

''لو لا معاذ لھلک عمر.''[4]

غرض بعض صحابہ کا کسی فقہی مسئلے میں غلط رائے قائم کر لینا یا باہم اختلاف کرنا کوئی انہونی بات نہیں۔ یہ اختلاف انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی۔ ایک آدھ صحابہ کا بھی ہو سکتا ہے اور متعدد کا بھی۔ ظاہر ہے، دورِ صحابہ میں کتبِ حدیث کے ذخائر جمع ہوئے تھے نہ فقہ مدون ہوئی تھی۔ صحابہ میں سے کسی کے بارے میں سارا ذخیرۂ حدیث حفظ یا جمع

---

① تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۰۱، وکذا فی الطبری وابن خلدون والبدایة والنهایة

② مسند احمد، ح: ٦٧ بسند صحیح، ط الرسالة

③ صحیح البخاری، ح: ۴۷۰۱، ۴۷۰۲، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن

④ السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۵۵۵۸؛ المبسوط للسرخسی، باب العدة: ٦/٣٥، ط دار المعرفة
بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے اختلاف کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:
لو لا علیّ لھلک عمر. اسے امام الماوردی (۴۵۰ھ) نے نقل کیا ہے اور اسی کو اشہر قرار دیا ہے۔ (الحاوی الکبیر للماوردی: ۱۲/۱۱۵)

کرنے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ جس صحابی کے حافظے میں جس قدر احادیث تھیں وہ انہی پر غور کر کے فیصلہ کرتا تھا۔ حالات کو خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنا بھی مسئلے کی تخریج میں اختلاف کا سبب بن جاتا تھا۔ احادیث کو سمجھنے اور ان سے احکام کا استخراج کرنے میں بھی سب کی صلاحیت یکساں نہیں تھی۔ فقاہت اور مجتہدانہ صلاحیت میں ان میں سے کوئی بھی خلفائے راشدین کے برابر نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ اکثر غیر معمولی قسم کا اختلاف رائے اسی وقت ہوا جب عدالت یا سیاست سے متعلق کسی بالکل نئے مسئلے سے سابقہ پڑا۔ چونکہ ایسے میں کسی صحابی کے سامنے حضور ﷺ یا اکابر صحابہ کا عملی واجماعی نمونہ موجود نہیں تھا، اس لیے مسئلے کو مختلف حضرات نے اپنی اپنی نگاہ سے دیکھا اور ایک رائے قائم کر لی۔ اگر کوئی سابقہ نمونہ ہوتا تو ایسا سخت اختلافِ رائے نہ ہوتا۔

قصاصِ عثمان بھی ایسا ہی ایک نیا مسئلہ تھا جس میں اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فکر ونظر درست کام کر رہی تھی۔ جن حضرات نے ان کی فقہی رائے کو غلط سمجھا ان کی نیک نیتی اور اُمت کے لیے خیر خواہی میں کوئی شک نہیں، ان نئے مسائل میں بھی ان حضرات کو جو سمجھ آیا اسے پوری نیک نیتی سے کر گزرے اور اس میں جان ومال تک کی بازی لگا دی، (اس لیے وہ اپنے اس عمل میں ماجور اور بالکل مغفور ہیں۔) مگر جیسے جیسے مسائل کی تنقیح ہوتی چلی گئی یہ بات واضح ہوتے ہوتے یقین کے درجے کو پہنچ گئی کہ آئینی وفقہی طریقہ وہی تھا جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنایا۔ اسی لیے فقہ اسلامی جو آج تک پوری طرح محفوظ چلی آ رہی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب کرتی ہے۔ صحابہ کرام نے اس مسئلے کی تنقیح میں بہت زیادہ وقت نہیں لگایا بلکہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے کچھ عرصے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور ہی میں اس پر اجماع امت ہو گیا کہ قصاصِ عثمان اور باغیوں کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ کتاب وسنت کے عین مطابق تھا۔ ①

☆☆☆

کیا جنگِ جمل میں لڑائی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے شروع کی؟

﴿سوال﴾ مستدرک حاکم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ روکنے کی کوشش کی اور اپنے اصحاب کو رکنے کا حکم دیا۔ وہ رکے رہے۔ مگر ادھر سے زبیر رضی اللہ عنہ نے تیر اندازوں کو حملے کا حکم دیا۔ وہ خود جنگ شروع کرنا چاہتے تھے۔ جب تیر چلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب رک نہ سکے اور جنگ چھڑ گئی۔ ②

امام طحاوی نے بسند صحیح نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگ کرنے سے رکے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے جنگ کا آغاز کیا، تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان سے جنگ کی۔ ③

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جنگ سبائیوں نے نہیں، اصحابِ جمل نے خود چھیڑی تھی؟

---

① الفقہ الابسط للامام ابی حنیفۃ، ص ۴۰ ؛ المبسوط للامام السرخسی: ۱۰/۱۲۸، کتاب الخوارج

② ثم ان الزبیر قال للاساورۃ: کانو معہ ،قال ارموھم بالرشق و کانہ اراد ان ینشب القتال فلما نظر اصحابہ الی الانتشاب لم ینتظروا وحملوا. (مستدرک حاکم، روایت نمبر: ۵۵۹۳)

③ لکف عن طلحۃ والزبیر واصحابھم و دعاھم حتیٰ بدؤا فقاتلھم. (شرح معانی الآثار، ح: ۵۱۱۲ باسناد صحیح)

﴿جواب﴾ طحاوی کی روایت سنداً صحیح ہے مگر اس میں "بدؤا" کی ضمیر جمع مذکر غائب کا مرجع اصحابِ حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما ہیں، نہ کہ خاص حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما۔ اصحابِ طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما میں سبائی بھی گھلے ملے تھے، جنہوں نے تیر چلا کر جنگ کروائی۔ اس لیے راوی جو جنگ کے عینی شاہد تھے، یہی دیکھ رہے تھے کہ لڑائی کی ابتداء اصحابِ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی طرف سے ہو رہی ہے۔ انہوں نے یہی بات نقل کر دی۔

پس اس صحیح السند روایت کا ان تاریخی روایات سے کوئی تعارض نہیں جن میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ گروہ سبائیوں کا تھا جو لشکرِ اصحابِ جمل میں خلط ملط ہو گیا تھا۔

ہاں مستدرک حاکم کی مذکورہ روایت میں یہ صراحت ہے کہ تیر چلانے کا حکم حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا، مگر یہ روایت حجت نہیں بن سکتی۔ اس کا ایک راوی الحسین بن یحییٰ المروزی مجہول الذات ہے۔ پھر اس میں یحییٰ بن سعید خود ثقہ ہیں مگر اپنے چچا سے روایت کر رہے ہیں جو مجہول ہیں کیوں کہ یحییٰ بن سعید کا نسب ہی مختلف فیہ ہے۔

اس طرح روایت بہت ضعیف ہو جاتی ہے۔ اس لیے ناقابل قبول ہے۔

☆☆☆

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن جرموز کو قتل کیوں نہ کرایا؟

﴿سوال﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل ابن جرموز کو جہنمی تو کہا مگر قصاصاً قتل کیوں نہ کرایا؟

﴿جواب﴾ اس کی وجہ یہ تھی کہ شرعاً ایسے مقتول کا قصاص نہیں لیا جاتا جو کسی جنگ یا بغاوت کے دوران بحالتِ معرکہ قتل کر دیا گیا ہو۔ کیوں کہ اس میں مجرم کو شک اور تاویل کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو اپنی جان بچانے کے لیے ہتھیار چلایا تھا۔ پس مجرم دیانۃً قابلِ عتاب تھا مگر قضاءً قابلِ قصاص نہ تھا۔[1]

☆☆☆

کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عثمان بن حنیف کی ڈاڑھی اکھڑوادی تھی؟

﴿سوال﴾ ایک روایت میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب بصرہ پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گورنر عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ پر غلبہ حاصل کر لیا تو انہیں قتل کرنے کا حکم دیا، پھر کسی نے سفارش کی کہ یہ صحابی ہیں تو قتل کا حکم واپس لے لیا مگر ان کی ڈاڑھی، سر، ابرو اور پلکوں کے بال اکھڑوا دیے اور چالیس کوڑے لگوائے۔[2] کیا یہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ یہ بالکل من گھڑت روایت ہے۔ اس کا راوی ابومخنف کذاب ہے۔[3]

☆☆☆

---

① یہ باریک فقہی فرق ہے۔ مسئلے کی تفصیل درج ذیل کتب میں باب البغاۃ اور ابواب القصاص والدیات کے تحت دیکھی جاسکتی ہے:
السیر الصغیر للامام محمد بن الحسن الشیبانی، المبسوط للعلامۃ السرخسی، ردالمحتار علی الدر المختار لابن عابدین الشامی

② تاریخ الطبری: ۳/۳۶۹ ③ ابومخنف کے سوا کسی راوی نے یہ افسانہ نقل نہیں کیا۔

کیا امام شعبی کا یہ قول درست ہے کہ جنگِ جمل میں فقط چار صحابہ شریک تھے؟

﴿سوال﴾ امام شعبیؒ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ:

لم يشهد الجمل من اصحاب النبي غير علي وعمار وطلحة والزبير، فان جاؤوا بخامس فانا كذاب.

"جنگِ جمل میں اصحابِ رسول میں سے علی، عمار، طلحہ اور زبیر کے سوا کوئی شریک نہیں ہوا تھا۔ اگر لوگ پانچواں صحابی ثابت کر دکھائیں تو میں کذاب ہوں۔"[1]

کیا ان کا یہ قول ثابت ہے؟ اگر ہاں تو کیا یہ حقیقت پر مبنی ہے؟

﴿جواب﴾ امام شعبیؒ کا یہ قول سنداً تو ثابت ہے مگر اسے من وعن حقیقت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، محمد بن ابی بکر، سہل بن حُنیف رضی اللہ عنہ اور دیگر بھی شریک ہوئے تھے۔"[2]

پس امام شعبیؒ کے اس قول کا محمل کچھ اور ہوگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ امام شعبیؒ کی مراد یہ تھی کہ مہاجرین میں سے یہی چار حضرات شریک ہوئے تھے۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے صغار صحابہ یا انصاری حضرات کی طرف ان کا اشارہ نہیں تھا۔[3] واللہ اعلم۔ بہر کیف اس قول کو من وعن قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

☆☆☆

اہلِ جمل اور اہلِ شام کے اقدامات کو گناہ اور معصیت کیوں نہیں کہا جا سکتا؟

﴿سوال﴾ قرآن وحدیث میں اپنے حکمرانوں کی اطاعت کی بہت تاکید آئی ہے۔ ایک آیت میں ہے کہ اولوالامر کی اطاعت کرو۔ بہت سے مفسرین نے یہاں "اولوالامر" سے حکمران مراد لیے ہیں۔ پھر احادیث میں تو بہت ہی واضح آیا ہے کہ حکمرانوں کی، امراء کی، اطاعت کرو۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کتاب الامارۃ ہی میں اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی تقریباً سبھی مسلمان مانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ شرعی طور پر بن گئے تھے۔

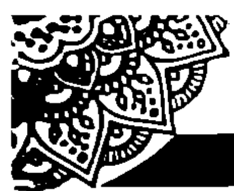
اس کے بعد لازمی بات ہے کہ جو حضرات ان کے خلاف کھڑے ہوئے، ان کا عمل ناجائز تھا۔ اور یہ ناجائز، مکروہ کی حد تک نہیں ہو سکتا، کیونکہ جتنی نصوصِ شرعی امیر کی اطاعت پر آئی ہیں، وہ بہت جلی ہیں اور اس کی مخالفت پر وعید بھی سخت ہے۔ اس لیے اطاعت واجب ہوئی۔ اس کا خلاف حرام ہوا، یعنی اسے بغاوت اور معصیت کہے بغیر چارہ نہیں۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۸۲، ط الرشد؛ السنة لابی بکر الخلال، ح: ۷۲۹

[2] البداية والنهاية: ۱۰/۴۷۳

[3] حاشية البداية والنهاية: ۱۰/۴۷۳، ط دار هجر



پھر حضرت عائشہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کی بغاوت کو معصیت کیوں نہیں کہا جاتا۔ اہلِ سنت اس بارے میں تعصب کیوں برتتے ہیں؟ غلط کو غلط کیوں نہیں کہتے۔ اور حق کا اقرار کیوں نہیں کر لیتے؟ مسئلے کی وضاحت بڑے علماء کی عبارات کی روشنی میں فرمایئے۔

﴿جواب﴾ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اہلِ سنت تعصب سے کام لیتے ہیں اور غلط کو غلط نہیں کہتے۔ یہ حضرات حق کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ بھی احسن انداز میں اعتدال کے ساتھ جس میں تمام شرعی نصوص کی رعایت کی جاتی ہے۔

شریعت کی نگاہ میں ہر بغاوت پر گناہ اور فسق کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ ہے اور وہ یہ ہے کہ بغاوت کرنے والے اہلِ علم وفضل اور صالحین ہوں اور انہیں کوئی علمی مغالطہ ہو گیا ہو۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

اہلِ سنت، اہلِ تشیع، معتزلہ وغیرہ سب کے ہاں متفقہ اصولی بات ہے کہ شرعی مسائل میں اگر کسی مجتہد سے اجتہاد میں غلطی ہو گئی ہو اور چاہے باقی سب فقہاء اس کے غلط ہونے پر متفق ہوں اور چاہے وہ حلال وحرام کا مسئلہ ہو مگر اس عمل کو گناہ یا فسق نہیں کہا جائے گا، ہاں اسے غلطی اور خطاء ضرور کہا اور سمجھا جائے گا مگر اجتہاد کی وجہ سے اسے "خطائے اجتہادی" سے تعبیر کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر ذبح کیے جانے والے جانور پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر ذبح کرنا یا ایسے جانور کا گوشت کھانا نصِ قطعی کی بناء پر گناہِ کبیرہ ہے، قرآنِ مجید کا صریح حکم ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ.

(اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور بلاشبہ یہ گناہ کی بات ہے۔)[1]

لیکن امام شافعی رحمہ اللہ اپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھتے تھے۔[2] اب شرعی دلائل کو دیکھتے ہوئے نہ صرف حنفی، مالکی اور حنبلی فقہاء نے امام شافعی رحمہ اللہ کے اس اجتہاد کو غلط کہا ہے بلکہ خود جمہور شوافع بھی اپنے امام کے اس مسلک کی تردید کرتے ہیں اور اسے کمزور قول قرار دیتے ہیں، مگر نہ ہی شوافع اور نہ کسی حنفی، مالکی یا حنبلی نے کبھی یہ کہا ہے کہ امام شافعی کا یہ عمل فسق اور گناہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج بھی اگر کوئی شافعی المسلک بھائی اپنے امام کے قول پر عمل کرتے ہوئے ایسا ذبیحہ کھالے تو چاہے اکثر علماء اسے غلط کہیں گے اور فی الواقع بھی دلائل شرعی کے اعتبار سے یہ گناہِ کبیرہ اور فسق ہی ہے مگر چونکہ وہ شخص نہایت دیانت داری سے اجتہاد کرنے والے ایک عظیم المرتبت امام مجتہد کی تقلید کر رہا ہے اس لیے نہ تو اس امام کو اور نہ ہی اس کی پیروی کرنے والے کو فاسق کہا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے سخت اجتہادی اختلافات کی مثالیں شیعہ، معتزلہ اور خوارج وغیرہ کی فقہ میں بھی موجود ہیں اور وہاں کسی کو اشکال نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک اپنے دائرے کے اس اختلاف کو اجتہادی ہی تصور کرتا ہے اور اپنے امام یا بزرگ پر کبھی فسق کا عنوان چسپاں نہیں کرتا۔

---

① سورۃ الانعام، آیت: ۱۲۱ ② المجموع شرح المهذب للنووی: ۴۱۰/۸، ط دار الفكر

سیاست بھی شرعی احکام کا ایک شعبہ ہے۔ یہاں بھی اجتہادی مسائل اسی طرح پیش آتے ہیں جیسا کہ دیگر شرعی ابواب میں پیش آتے ہیں۔ کسی حکمران کے خلاف بغاوت کرنا کب جائز ہے یا کب ناجائز؟ اس بارے میں جہاں بہت سے واضح شرعی احکام دیے گئے ہیں، وہاں بعض شرعی نصوص کو سمجھنے میں مجتہدین کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ پھر یہ مسائل حالات اور معلومات پر بھی منحصر ہوتے ہیں۔

اگرچہ بغاوت کرنا عام حالات میں گناہِ کبیرہ اور فسق ہے لیکن اگر کوئی شخص جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے، اپنے دیانت دارانہ اجتہاد کی رو سے اور حالات کو کسی خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور اپنے پاس موجود خبروں اور معلومات پر یقین رکھنے کی بناء پر کسی وقت کسی مسلم حکمران کے خلاف خروج کو جائز سمجھ لے (بشرطیکہ وہ خوارج کی حد تک نہ چلا جائے، حکومت کے وفاداروں کی تکفیر پر نہ اُتر آئے اور عوام کے جان و مال کو حلال تصور نہ کرنے لگے) تو اس بناء پر وہ فاسق نہیں ہوتا بلکہ اس کی غلطی کو خطائے اجتہادی کہا جاتا ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''اور باغی اگر اہلِ بدعت میں سے نہ ہوں تو وہ فاسق نہیں بلکہ ان کی تاویل غلط ہے، اور امام اور اہلِ عدل بھی ان سے جنگ کرنے میں برحق ہیں۔[1] ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے احکام شرعیہ میں مجتہد فقہاء کا اختلاف ہو جائے۔''[2]

لیکن یہاں یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ جس طرح باقی دینی مسائل میں اجتہاد کا دروازہ ایسا چوپٹ نہیں کھولا گیا کہ غلام احمد پرویز جیسے لوگ بھی حلال و حرام بلکہ اسلام اور کفر کے واضح احکام میں ردوبدل کرنے لگیں بلکہ اجتہاد کی نہایت کڑی شرائط ہیں جن پر صفِ اوّل کے چند علماء پورے اتر سکتے ہیں، اسی طرح خروج کے معاملے میں بھی صاحبِ اجتہاد ہونے کی نہایت کڑی شرائط ہیں جو کسی شخص میں موجود ہونا آسان نہیں مگر مشاجرات میں صحابہ کرام کے تمام طبقات میں اہلِ اجتہاد یقیناً موجود تھے، اس لیے ان کی بغاوت فسق نہیں خطائے اجتہادی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور جو کچھ بعض سے حربِ حضرت امیر (علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) یا کچھ اور بشریت سے تقصیر ہوئی، وہ خطاء اجتہادی تھی۔ اور جو امر بخطأ اجتہادی سرزد ہوتا ہے، وہ بصورت معصیت ہے نہ خود معصیت۔''[3]

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے مختلف مقامات پر اس بحث پر متعدد پہلوؤں سے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔

ایک مقام پر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

① باغیوں کے علاوہ باقی لوگ جو مسلم حکمران کے وفادار ہوں، انہیں فقہی اصطلاح میں ''اہلِ عدل'' کہا جاتا ہے۔

② والبغاۃ اذا لم یکونوا من اہل البدع لیسوا بفاسقین وانما ہم یخطئون فی تاویلہم والامام واہل العدل مصیبون فی قتالہم فہم جمیعا کالمجتہدین من الفقہاء. (المغنی لابن قدامۃ المقدسی: ۸/۵۳۶، ط مکتبۃ القاہرۃ)

③ ہدایۃ الشیعۃ، ص ۲۹، دار الاشاعت کراچی

''ہم نے حضرت حُجر بن عدی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کی سرگرمیاں نفس الامر میں بغاوت کے تحت آتی تھیں، اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس میں وہ معذور تھے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت حُجر بن عدی اس بغاوت کی بناء پر فسق کے مرتکب ہوئے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ بغاوت کرنے والا اگر صاحبِ بدعت نہ ہو اور نیک نیتی کے ساتھ معتد بہ دلیل وتاویل کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے خلاف خروج کرے تو اگرچہ اس پر احکام تو اہلِ بغی ہی کے جاری ہوں گے، لیکن اس بناء پر اسے فاسق بھی نہیں کہا جائے گا جیسا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کی۔ اس میں جمہور اہلِ سنت کے نزدیک حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ اہلِ بغی کا سا معاملہ کر کے ان کے خلاف جنگ کی۔

اس جنگ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بہت سے رفقاء شہید بھی ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کی شہادت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا چنداں قصور بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ امام برحق تھے۔ لیکن اس بناء پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو مرتکبِ فسق قرار نہیں دیا گیا بلکہ انہیں مجتہدِ مخطئ کہا گیا۔'' [1]

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''تحفہ اثناء عشریہ'' کی ایک عبارت پر جو اسی موضوع سے متعلق مگر ذرا پیچیدہ ہے، تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب کی یہ عبارت اور اس نوع کی بعض دوسری عبارتیں بنظرِ غائر پڑھنے کے بعد میں ان کا موقف یہ سمجھا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چونکہ نہایت مضبوط دلائل سے منعقد ہو چکی تھی اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ان کے خلاف قتال کرنا بلاشبہ غلط تھا اور دنیوی احکام کے اعتبار سے بغاوت کے ذیل میں آتا تھا جو نفس الامر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ یعنی فسق ہے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان سے لڑنا جائز اور برحق تھا۔ لیکن چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہوں یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، دونوں سے یہ عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ شبہ اور تاویل کی بناء پر صادر ہوا تھا اور بہر حال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر مبنی سہی، لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لیے اخروی احکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل غلطی کے ذیل میں آتا ہے اس لیے ان پر طعن جائز نہیں۔'' [2]

حضرت مفتی صاحب مدظلہ ایک دوسرے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہوں یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، دونوں سے یہ عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں، بلکہ شبہ اور تاویل کی بناء پر صادر ہوا تھا اور بہر حال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر

---

① حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۲۲۵، ۲۲۶

② حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۲۳۹، ۲۴۰

مبنی سہی لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لیے اُخروی احکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے اس لیے ان پر طعن کرنا جائز نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے ذبح کر دینا اور پھر اسے کھانا دلائلِ قطعیہ کی بناء پر گناہِ کبیرہ ہے، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے اجتہاد میں اسے جائز سمجھا۔ اس لیے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائلِ شرعیہ کی رُو سے گناہِ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بناء پر صادر ہوا، اس لیے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا۔"[1]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے "مقام صحابہ" میں اس قضیے کو ہر پہلو سے حل فرمادیا ہے۔ اسی ضمن میں وہ اہلِ سنت کا مذہب یوں بیان فرماتے ہیں:

"مشاجرات میں اگرچہ ایک فریق خطاء پر، دوسرا حق پر تھا، اور علمائے اُمت کے اجماع نے ان مشاجرات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حق پر ہونا اور ان کے بالمقابل جنگ کرنے والوں کا خطاء پر ہونا پوری صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان کر دیا لیکن قرآن وسنت کی نصوصِ مذکورہ کی بناء پر اس پر بھی سب کا اجماع واتفاق ہوا کہ جو فریق خطاء پر بھی تھا، اس کی خطاء بھی اوّلاً اجتہادی تھی جو گناہ نہیں بلکہ اس پر ایک اجر ملنے کا وعدہ حدیثِ صحیح میں مذکور ہے۔ اور اگر قتل وقتال اور جنگ کے ہنگاموں میں کسی سے واقعی کوئی لغزش اور گناہ ہوا بھی ہے تو وہ اس پر نادم وتائب ہوئے جیسا کہ اکثر حضرات سے ایسے کلمات منقول ہیں۔"[2]

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ اس مسئلے پر مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں:

"جمہور اہلِ سنت مانتے ہیں کہ حضرت علی المرتضٰی کے خلاف حضرت مُعاویہ کا اقدام شرعاً غلط اور معصیت تھا لیکن چونکہ اس کی بنیاد اجتہادی خطاء پر تھی، اس لیے ہم ان کو معذور سمجھتے ہیں بلکہ ان کو اجتہاد کے ایک اجر کا مستحق جانتے ہیں۔"[3]

رہی یہ بات کہ ایک غلطی اگر مجتہد کرے تو اسے گناہ نہیں ہوتا بلکہ اجر ملتا ہے اور اگر وہی غلطی کوئی عام آدمی کرے تو اسے گناہ ہوتا ہے کیا یہ بے انصافی نہیں؟ اس کے جواب میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

"اس کی مثال بالکل ایسی ہے اگر کوئی سند یافتہ ڈاکٹر کسی مریض کو کسی غلط فہمی کی بناء پر غلط دوا دے دے اور اس سے اس مریض کا کام تمام ہوجائے تو اگر یہ ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشے کی بجا آوری میں دیانت داری سے وہ دوا دی تھی تو دنیا کا کوئی قانون اسے مجرم قرار نہیں دیتا، اس کے برخلاف اگر وہی دوا کوئی غیر سند یافتہ

---

① ماہنامہ البلاغ کراچی، ذی الحجہ ۱۳۹۰ ہجری، ص ۷۲

② مقام صحابہ، ص ۹۵، ۹۶

③ شریعت وطریقت کا تلازم، ص ۲۴۹، ط مکتبۃ الشیخ کراچی، ط ۱۹۹۳ء

عطائی کسی مریض کو دے دے اور اس سے اس کی موت واقع ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس پر گرفت کرتا ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے کہ غلطی سے دنیا کا کوئی انسان محفوظ نہیں ہے۔ البتہ اس کے ذمہ یہ ضروری تھا کہ غلطی سے بچنے کے جتنے اسباب و وسائل ہو سکتے ہیں، ان کو پوری طرح اختیار کرے۔ جو شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، اس کے لیے اسباب یہ ہیں کہ وہ فنِ طب کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان سے سند لے، اس کے بعد اگر اس سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو یہ ایسی غلطی ہے جس سے کوئی انسان محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اسی طرح ایک عالم کے لیے ظاہری وسائل یہ ہیں کہ وہ قرآن و سنت کا پورا علم باضابطہ حاصل کرے، ماہر اساتذہ سے اس کی تربیت لے، اس کے بعد وہ غلطی کرے گا تو یہ ایک ماہر ڈاکٹر کی غلطی کی طرح قابلِ ملامت نہ ہوگی، اس کے برخلاف جس شخص میں اجتہاد کی اہلیت نہیں ہے اس کی مثال عطائی کی سی ہے کہ اس کی غلطی قابلِ ملامت اور موجبِ گرفت ہے۔''①

اکابر کی مذکورہ عبارات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اہلِ سنت مسئلے کی شرعی حیثیت بھی ہمیشہ پوری صفائی سے بیان فرماتے ہیں، روافض کی طرح تقیے سے کام نہیں لیتے۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ اجتہادی غلطی اور کھلی نافرمانی میں کیا فرق ہے اور کون لوگ اجتہاد کے اہل ہو سکتے ہیں اور کون نہیں، اور یہ کہ خروج اور بغاوت پر ہمیشہ فسق کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتیں استثنائی بھی ہیں جن میں سب سے بڑی اور واضح مثال صحابہ کرام کی اس قسم کی لغزشوں کی ہے، پس انہیں معصیت اور گناہ نہیں کہا جاتا اور شرعی و عقلی دلائل کے لحاظ سے یہ نہایت عادلانہ اور منصفانہ موقف ہے۔



واقعہ جمل کی ایک نئی تعبیر:

﴿سوال﴾ انٹرنیٹ پر تاریخ کا کورس کرانے والے ایک صاحب جنگِ جمل وغیرہ کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ حضرت علی ؓ، حضرت طلحہ ؓ و زبیر ؓ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ خفیہ طور پر آپس میں شروع سے ملے ہوئے تھے۔ فتنہ پرور سبائیوں کو دھوکے میں رکھنے کے لیے یہ دونوں جماعتیں آپس میں اختلاف کا اظہار بھی کرتی رہیں تاکہ سبائی کسی ایک جماعت کے ساتھ مطمئن رہیں اور پھر دونوں جماعتیں موقع پاتے ہی مل کر انہیں مار ڈالیں۔

حضرت علی ؓ نے اسی لیے حضرت طلحہ ؓ و زبیر ؓ کو مکہ جانے کی اجازت دی تھی۔ اسی لیے وہ ان کے مکہ سے بصرہ جانے کے بعد بھی خاصے دن رُکے رہے اور اتنے دنوں بعد روانہ ہوئے کہ اس دوران حضرت طلحہ ؓ و زبیر ؓ بصرہ کے سبائیوں کو نمٹا چکے تھے۔ حضرت علی ؓ نے ہی انہیں خفیہ ٹاسک دے کر بصرہ بھیجا تھا تاکہ جن لوگوں پر وہ حکومتی مصلحتوں کے تحت خود ہاتھ نہیں ڈال سکتے، انہیں یہ حضرات نمٹا دیں۔

جنگِ صفین کے بارے میں یہ محقق صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت علی ؓ سبائیوں کو صفین کے میدان میں پہنچا کر

① فتاویٰ عثمانی: ۱/۱۸۲، ۱۸۳

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مروانا چاہتے تھے۔ وہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اندر سے ملے ہوئے تھے۔ مگر یہ سارے انتہائی خفیہ معاملات تھے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریبی صحابہ کو بھی یہ حقائق معلوم نہ ہو سکے، راویوں کو بھلا کیسے معلوم ہو سکتے تھے۔ اس لیے راویوں نے وہی کچھ لکھا جو بظاہر دیکھا تھا۔ اصل حقیقت کچھ اور تھی۔

آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ یہ تاریخی تحقیق صحیح ہے یا نہیں؟ اسے ماننے میں حرج کیا ہے؟ کیوں کہ یہ صحابہ کی عظمت اور کرداری کی بلندی کے زیادہ قریب ہے۔

﴿جواب﴾ صحابہ کی عظمت اور بلند کرداری کو کیا چودہ صدیوں بعد پہلی بار انہی محقق صاحب نے سمجھا ہے۔ اس سے پہلے کیا پوری اُمتِ مسلمہ سو رہی تھی؟ یہ تمام باتیں محض قیاسات ہیں۔ ان کو ''تحقیق'' کیسے کہا جا سکتا ہے؟ تحقیق کے جو اصول وضوابط مقرر ہیں کیا وہ یہاں پورے ہو رہے ہیں؟

ہاں اس قیاس کے دلچسپ اور دل پسند ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مگر یہ صحیح حدیث اور تاریخی روایات سے جگہ جگہ ٹکراتا ہے جن سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کی ان دو جماعتوں کے درمیان مقاصد پر نہ سہی، طریقِ کار پر سخت اختلاف ضرور تھا۔ اگر ان کے درمیان تمام باتوں پر اتفاق تھا تو پھر ''اجتہادی اختلاف'' کس مسئلے پر تھا؟ علمائے اہلِ سنت ایک فریق کو مصیب اور ایک کو مخطی کیوں قرار دیتے ہیں؟ صحیح احادیث میں اس دور کے فریقین کو واضح الفاظ میں ''فِئَتَان'' (دو گروہوں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر کوئی اختلاف نہ تھا تو پھر ''فِئَتَان'' کیوں کہا گیا؟[1]

حدیث میں اس دور کو ''عِنْدَ فُرْقَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْن'' (دورِ افتراق) کہا گیا ہے؟

اگر کوئی اختلاف نہ تھا تو ''فُرْقَةٍ'' سے تعبیر کیوں کیا گیا؟[2]

حدیث میں ''تَـقْـتَـتِلُ فِئَتَانِ عَظِیْمَتَانِ'' کا لفظ آیا ہے۔ یعنی دو بڑی جماعتوں میں باقاعدہ قتال ہوگا اور ان میں سے ایک فریق کو ''اَوْلـیٰ الطَّائِفَتَیْنِ بِالْحَقِّ'' (زیادہ حق پرست) کہا گیا ہے۔ اگر جنگ فقط سبائیوں سے ہوتی رہی تھی تو حدیث میں واضح طور پر کہا جاتا کہ ایک جماعت حق پرست اور دوسری بے دین ہوگی۔[3]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ ''لَـتُـقَـاتِـلَـنَّـهٗ وَاَنْتَ ظَالِمٌ'' کہ تم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک دن لڑو گے اور تمہاری زیادتی ہوگی۔[4] کیا اس حدیث کا انکار کر دیا جائے گا؟

اگر کوئی اختلاف نہ تھا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جنگ بندی کی دستاویز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''امیر المؤمنین'' کا لفظ مٹانے پر زور کیوں دیتے رہے؟[5]

---

[1] "لا تقوم الساعة حتی تقتتل فئتان عظیمتان." (مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۵۸)

[2] صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۷

[3] تمرق مارقة عند فرقة من المسلمین یقتلها اولی الطائفتین بالحق. (صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۷) "لا تقوم الساعة حتی تقتتل فئتان عظیمتان دعواهما واحدة، تمرق بینهما مارقة، یقتلها اولی الطائفتین بالحق." (مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۵۸)

[4] مستدرک حاکم، ح ۵۵۷۳ باسناد صحیح ، مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۸۲۷ [5] مسند احمد، ح: ۳۱۸۷

محقق موصوف'' کا یہ کہنا کہ دونوں جماعتیں اختلاف کا مظاہرہ کر کے سبائیوں کو دھوکے میں ڈال رہی تھیں، محض ایک وہم ہے۔ یہ وہم اس لیے پیدا ہوا ہے کہ ''محقق صاحب'' سبائیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حاوی سمجھ رہے ہیں۔ (جیسا کہ فرقہ مروانیہ کا مذہب یہی ہے۔) جبکہ درحقیقت جمہور مسلمین کے مقابلے میں سبائی کوئی اتنی بڑی طاقت نہ تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسی دور از کار تدابیر کرنا پڑتیں۔ اگر ہتھیار ڈالنے والے باغیوں کو قتل کرنے کی شرعاً گنجائش ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ فقط حجاز کے صحابہ وتابعین کے ذریعے سبائیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکتے تھے۔ اسی طرح انہیں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو بصرہ بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ بصرہ میں ان کے گورنر عثمان بن حُنیف رضی اللہ عنہ فوج کے ساتھ موجود تھے۔ انہیں ایک حکم نامہ بھیج دیا جاتا تو وہ بصرہ کے سبائیوں کو جو فقط سات آٹھ سو تھے، خود نمٹا دیتے۔

اگر صحابہ کی دونوں جماعتوں میں سرے سے کوئی اختلاف اور کوئی غلط فہمی نہ تھی اور سبائیوں سے قصاص لینے کے طریقِ کار پر بھی دونوں متفق تھیں اور وہ طریقِ کار بھی طے شدہ تھا کہ دونوں جماعتیں یکے بعد دیگرے عراق پہنچ کر اجتماعی طاقت سے سبائیوں کو گھیر لیں گی تو پھر ایسا ہوا کیوں نہیں؟ اس کی بجائے عراق پہنچ کر دونوں جماعتیں فقط سبائیوں کے ہنگامہ برپا کردینے سے آپس میں کیوں لڑ پڑیں؟ انہیں تو ہنگامہ ہوتے ہی چن چن کر سبائیوں کو مار دینا چاہیے تھا؟ پس یہ ''قیاسی تحقیق'' اشکالات کو ختم نہیں کرتی بلکہ شرعاً، قیاساً و عقلاً نئے سوالات پیدا کر دیتی ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قیاسِ فاسد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین کوئی اختلاف نہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں اکثر سبائی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ انہی کو مروانے کے لیے شام لے گئے تھے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو ماہ تک پڑاؤ ڈال کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مذاکرات کی کیا ضرورت تھی۔ صفین میں راتوں رات سبائیوں کے خیموں کو گھیر کر ان کا کام تمام کیوں نہ کر دیا گیا؟ اس کی بجائے وہاں حضرت عمار بن یاسر، حضرت خزیمہ بن ثابت، حضرت عبیداللہ بن عمر، حضرت ذوالکلاع حمیری اور حضرت حوشب ذی ظلیم رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے حضرات اور محدثین کی روایت کے مطابق ستر ہزار افراد کیوں قتل ہو گئے؟ سبائی تو اتنے زیادہ نہیں تھے۔

یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ اصل معاملات راویوں کو معلوم ہی نہیں تھے۔ اگر اس دور کے لوگوں کو اصل حالات معلوم نہ ہو سکے، تو کیا چودہ صدیوں بعد ''اصل حالات'' ان ''محقق صاحب'' کو ''وحی'' کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں؟

اگر یہ کہا جائے کہ جمل وصفین میں صحابہ کو متحارب ماننا اسلامی عقیدے کے خلاف ہے تو کیا چودہ صدیوں میں گزرنے والے ہزاروں فقہاء، محدثین، مناظر اور متکلم علماء جو ان واقعات کو اسی طرح مانتے آئے ہیں، غلط عقیدے پر تھے؟ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح تاریخی واقعات مشہور ہیں، ان پر عقلی اشکالات پیدا ہوتے ہیں، تو کیا اس نئی کہانی سے مزید سخت عقلی اشکالات جنم نہیں لے رہے؟

اگر اس طرح کی وہمی باتوں کی گنجائش ہو تو ہر شخص سیرت وتاریخ کے ہر واقعے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ مثلاً کوئی مروانی حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی عقیدت میں یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جنگِ اُحد سے پہلے

ہزم لا چکے تھے۔ اُحد اور خندق میں انہوں نے مشرکین کی قیادت اس لیے کی تا کہ انہیں لے جا کر مروا دیں۔

اس کے برعکس کوئی رافضی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ تو فتح مکہ کے موقع پر بھی دل سے اسلام نہیں لائے تھے بلکہ ان کا مقصد فقط اپنے خاندان کو تحفظ دینا تھا۔

شیعہ سنی اتحاد کا علم بردار کوئی شخص یہ ''تحقیق'' بھی لاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گہرے دوست تھے اور انہی کو اصل خلیفہ مانتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی مرضی سے اسے دنیا پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ ہر کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منظوری سے کرتے تھے، یہ باتیں خفیہ تھیں، اس لیے کوئی راوی نقل نہ کر سکا۔

اس کے برعکس محقق صاحب کی طرح کوئی یہ کہانی بھی بنا سکتا ہے کہ چوتھے خلیفہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہی کے لیے خفیہ وصیت کی تھی مگر علی رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا۔ اسی لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی اور اسی لیے وہ ان کے نام کے ساتھ ''امیر المؤمنین'' قبول نہ کرتے تھے۔

الغرض ایسی ''وہمی تحقیقات'' کی کوئی انتہاء نہیں ہو سکتی۔ انہیں ماننا تواتر سے منقول تاریخی روایات، دورِ فتن سے متعلق احادیث، مشاجرات کے متعلق متکلمینِ اسلام کی آراء اور باغیوں سے متعلقہ فقہی مذاہب سبھی کے انکار کے مترادف ہے۔ کوئی صاحبِ علم اور کوئی عقلِ سلیم کا مالک انہیں قبول نہیں کر سکتا۔ ایسی کوششوں سے ''اتحادِ اُمت'' کا راستہ کھلے گا یا فرقہ بندیوں میں ایک نئی فرقہ بندی کا راستہ ہموار ہو جائے گا؟ ہر شخص خود سوچ سمجھ سکتا ہے۔

☆☆☆

جنگِ صفین سے متعلق سوالات

﴿سوال﴾ جنگِ صفین میں صحابہ کی دو بڑی جماعتوں نے ایک دوسرے کو قصداً بے دریغ قتل کیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا اچانک یا اتفاقیہ طور پر ہوگیا تھا۔ کیوں کہ جس طرح افواج کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع کر کے سرحدوں پر لایا گیا، پھر دو تین ماہ تک فریقین آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے رہے، وہ سب ایک منظم تیاری کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پھر جنگ بھی تین دن تک جاری رہی۔ یہ بھی کوئی اتفاقیہ بات نہیں ہوسکتی۔ آغاز کی طرح جنگ کا اختتام بھی سوچ سمجھ کر کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان کا قتلِ عمد تو گناہ کبیرہ بلکہ اکبرالکبائر ہے۔ اس کے باوجود یہاں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان قتل ہوتے رہے۔ آخر دونوں جماعتوں کے پاس اس خونریزی کا شرعی جواز کیا تھا؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ سب کچھ سبائیوں کا کیا دھرا تھا، تو کیا ہم یہ مان لیں کہ معاذ اللہ فریقین ہوش وحواس سے بیگانہ اور فاتر العقل تھے کہ سبائیوں کے کہنے میں آکر ایک انتہائی حرام فعل اور گناہِ کبیرہ کو تین دن تک کرتے رہے۔ یہ کیسے مانا جائے کہ جن لوگوں کی سیاست نے قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں مسخر کرلیں وہ اتنے بھولے بھالے ہوگئے کہ سبائی انہیں لڑاتے رہے۔ اچھا اگر مان لیا جائے کہ سبائی ہی سب کچھ کرا رہے تھے تو کیا سبائیوں کے بہکانے کی وجہ سے وہ سب مرفوع القلم ہوگئے تھے؟ نیز اگر یہ لڑائیاں بے سوچے سمجھے اچانک ہوگئی تھیں تو فریقین کے عمل کو اجتہاد اور انہیں ماجور کس بناء پر کہا جائے گا؟ اجتہاد تو وہ ہوتا ہے جس میں خوب سوچ سمجھ کر شرعی دلائل کو دیکھ کر کوئی قدم اٹھایا جائے؟ اگر کسی کے بہکاوے میں آکر کچھ مسلمان ایک دوسرے کو غلط فہمی کی وجہ سے ماردیں تو کیا یہ اجتہاد اور باعثِ اجر کام مانا جائے گا؟

﴿جواب﴾ فریقین کی باہمی لڑائی میں سبائیوں کا عمل دخل لگائی بجھائی، غلط اطلاعات مشتہر کرنے اور بعض اوقات صلح کی بات چیت کے دوران ہنگامہ کرانے کی حد تک تھا۔ حالات کی باگ اکابر صحابہ کے ہاتھ میں تھی۔ وہی فریقین کے قائد تھے۔ نعوذ باللہ وہ نہ تو کم عقل تھے نہ ہی مرفوع القلم۔ انہوں نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر کیا۔ اسی لیے اُمت ان کے اقدامات کو ''اجتہاد'' قرار دیتی ہے۔ رہی یہ بات کہ فریقین کے پاس اس اقدام کی شرعی وجہ کیا تھی؟ تو فریقین کی دلیل یہ آیت تھی: فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ.[1]

اس میں اللہ نے بغاوت کرنے والی جماعت کو بزورِ شمشیر زیر کرنا مشروع قرار دیا ہے۔

چونکہ اکثر مسلمانوں کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوچکی تھی لہٰذا ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

[1] ''اگر زیادتی کرے ایک جماعت دوسری پر تو تم زیادتی کرنے والی جماعت سے قتال کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلے کی طرف لوٹ آئے۔'' (سورۃ الحجرات: ۹)

یت سے احتراز کر کے کسی علاقے پر قابض حضرات کی حیثیت ''الفئۃ الباغیہ'' کی ہوگئی تھی۔ ①

دوسری طرف اہلِ شام، اہلِ عراق کو ''فئہ باغیہ'' کی حیثیت دے رہے تھے کیوں کہ ان کے پاس یہ اطلاعات تھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمرانی سابق خلیفہ کے قاتلوں کے بل بوتے پر قائم ہوئی ہے۔ اس لیے وہ اس حکمرانی کو شرعی حکومت کی بجائے فئہ باغیہ کی حکومت سمجھتے تھے۔ غرض فریقین کا ایک دوسرے سے قتال اسی بناء پر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو خروج کا مرتکب سمجھ رہے تھے۔ اور چونکہ خروج کرنے والی جماعت سے قتال شرعاً جائز بلکہ بعض اوقات ناگزیر ہوجاتا ہے، اس لیے فریقین اسی موقف کے تحت صفین میں نبرد آزما ہوئے۔ پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ فریقین کے پاس قتال کی کوئی شرعی وجہ نہ تھی بلکہ علتِ قتال موجود تھی جو فریقین کے نزدیک ''خروج'' تھی۔ ②

البتہ جمہور علمائے اسلام کا اجماع ہے کہ اس قضیے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی رائے درست تھی۔ ③

---

① کیوں کہ شرعی اصطلاح میں خروج یا بغاوت کا مفہوم یہی ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت شرعی حکمران کی اطاعت سے احتراز کرے اور کسی علاقے پر قابض ہوجائے۔ قال النسفی: البغاۃ خرج قوم مسلمون عن طاعۃ الامام ،وغلبوا علیٰ بلد، دعاھم الیہ ، وکشف شبھتھم ، وبدأ بقتالھم. (کنز الدقائق، ص ۳۹۰، کتاب السیر ،باب البغاۃ، ط دار البشائر)

وفی الدر المختار: فاذا خرج جماعۃ مسلمون عن طاعتہ وغلبوا علیٰ بلد دعاھم الیہ وکشف شبھتھم. فان تحیزوا مجتمعین حل لنا قتالھم بتفریق جمعھم. (رد المحتار علی الدر المختار لابن عابدین الشامی: ۴/۲۶۴)

② یہ علت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود بیان فرمائی تھی: انما ھم قوم زعموا انا بغینا علیھم وزعمنا انھم بغوا علینا فقاتلنا. ''ان حضرات نے سمجھا کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، اس بناء پر ہم لڑے۔'' (منہاج السنۃ: ۵/۲۴۵)

ہم کے خیال میں حدیث "لاتقوم الساعۃ حتیٰ تقتتل فئتان عظیمتان دعواھما واحدۃ. (مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۵۸)" میں فریقین کا دعویٰ ایک ہونے کا بے تکلف مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کو خروج کا مرتکب تصور کرتے تھے۔

③ علماء کا اجماع ہے کہ ان محاربات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مجتہدِ مصیب تھے اور ان پر امام واجب الاطاعت کا اطلاق ہوتا تھا۔ ان کے مخالفین سے خطائے اجتہادی ہوئی جس پر خروج کا اطلاق ہوتا تھا۔ بعض جلیل القدر اساطینِ اُمت کی آراء مندرجہ ذیل ہیں جن سے اس مسئلے کا جمہور کے نزدیک اجماعی ہونا ثابت ہوجائے گا:

جنگِ جمل وصفین کے متحارب فریقین کے بارے میں عباراتِ اکابر:

__علامہ ابو منصور اسفرائینی رحمہ اللہ:__

وقالوا فی صفین ان الصواب کان مع علی رضی اللہ عنہ وان معاویۃ واصحابہ بغوا علیہ بتاویل اخطئوا فیہ ولم یکفروا بخطئھم.

''علمائے اسلام جنگِ صفین کے بارے میں کہتے ہیں کہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے تاویل کے ساتھ ان پر خروج کیا تھا جس میں ان سے خطا ہوئی مگر اس خطاء کی وجہ سے ان کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔'' (الفرق بین الفِرَق، ص ۳۴۲)

__قاضی ابن عیاض المالکی رحمہ اللہ:__

● وعند الجمھور ان علیا واصحابہ مصیبون فی ذبھم عن الامامۃ وقتالھم من نازعھم.

• جمہور کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی خلافت کا دفاع کرنے اور ان لوگوں سے قتال کرنے میں برحق تھے جنہوں نے ان سے نزاع کیا۔''

(اکمال المعلم بفوائدِ مسلم، شرح صحیح مسلم: ۸/۲۲۲)

● وقولہ تقتلہ الفئۃ الباغیۃ، فیہ حجۃ بینۃ للقول ان الحق مع علیّ وحزبہ وان عذر الآخر بالاجتھاد.

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ ''عمار رضی اللہ عنہ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔'' اس قول کی واضح دلیل ہے کہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت کے ساتھ تھا اگرچہ دوسرا فریق بھی اجتہاد کی وجہ سے معذور تھا۔'' (اکمال المعلم بفوائد مسلم: ۸/۴۵۹)

__امام الحرمین ابو المعالی رحمہ اللہ:__

• قال امام الحرمین فی فضل علی رضی اللہ عنہ: ''کان اماماحقا، ومقاتلوہ بغاۃ.....''

حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ برحق تھے اور ان سے لڑنے والے باغی تھے۔ (کتاب الارشاد، ص ۴۳۳) .... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بے بس تھے یا بااختیار؟

﴿سوال﴾ ہمارا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قصاص اس لیے نہ لیا کہ ان کے پاس طاقت نہ تھی، وہ بے بس اور مجبور تھے۔ سبائی ان پر حاوی تھے۔ اہلِ جمل اور اہلِ شام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد جمع سبائیوں کا تسلط ختم کرنے کی خاطر اور انہیں منافقوں کے گھیرے سے نکالنے کے لیے اُٹھے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لاچار، بے بس اور مجبور ہونے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

امام ابوبکر البیہقی رحمہ اللہ:

● واستدل لنا ببراءة علیّ من قتل عثمان بما جریٰ له من البیعة، ثم بما کان له من السابقة فی الاسلام والهجرة والجهاد فی سبیل الله والفضائل الکثیرة والمناقب الجمة التی هی معلومة عند اهل المعرفة ان الذی خرج علیه و نازعه کان باغیاً علیه، وکان رسول الله ﷺ قد اخبر عمّار بن یاسر بان الفئة الباغیة تقتله فقتله هؤلآء الذین خرجوا علیٰ امیر المؤمنین فی حرب صفین.

''ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے بری ہونے کی دلیل میں وہ واقعات پیش کرتے ہیں کہ جن کے مطابق ان کی بیعت کی گئی تھی (اگر وہ قاتل ہوتے تو صحابہ ان کی بیعت نہ کرتے) پھر اس کے ساتھ ساتھ انہیں اسلام لانے، ہجرت کرنے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے میں سبقت حاصل تھی، ان کے بہت سے فضائل اور بکثرت مناقب ہیں جو اہل علم ومعرفت کو معلوم ہیں، یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جو بھی ان کے خلاف کھڑا ہوا اور ان سے جھگڑا، وہ باغی تھا، اور رسول اللہ ﷺ اس کی خبر دے چکے تھے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو باغی گروہ قتل کرے گا، پس انہیں انہی لوگوں نے قتل کیا جو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صفین میں کھڑے ہوئے۔'' **(الاعتقاد والهدایة الی سبیل الرشاد علیٰ مذهب السلف واصحاب الحدیث: ص ۳۷۴، ط دار الآفاق)**

❷ وصحیح عن علیّ رضی الله عنه انه قاتلهم قتال اهل العدل مع اهل البغی.

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سند صحیح ثابت ہے کہ انہوں نے ان لوگوں سے جو قتال کیا، وہ اہل عدل کا باغیوں سے قتال تھا۔'' **(الاعتقاد: ص ۳۷۵)**

❸ وکل من نازع امیر المؤمنین علی بن ابی طالب فی امارته فهو باغ، علیٰ هذا عهدت مشایخنا، وبه قال ابن ادریس الشافعی: قال الشیخ: ثم لم یخرج من خرج علیه ببغیه عن الاسلام فقد کان رسول الله ﷺ قال: لا تقوم الساعة حتیٰ تقتتل فئتان عظیمتان تکون بینهما مقتلة عظیمة ودعواهما واحد.

'' جس نے بھی امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں ان سے نزاع کیا، وہ باغی تھا۔ میں نے اپنے مشائخ کو اسی عقیدے پر پایا ہے اور یہی بات امام محمد بن ادریس الشافعی نے کہی ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خروج کرنے والے اپنی بغاوت کے سبب اسلام سے نہیں نکل گئے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ فرما گئے تھے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دو بڑی جماعتیں باہم قتال نہ کریں، ان کے درمیان بہت بڑی جنگ ہوگی، دونوں کا مذہب ایک ہوگا۔ **(الاعتقاد: ص ۳۷۵)**

امام النووی رحمہ اللہ قال فی شرح حدیث عمار:

● "وفیه حجة لاهل السنة ان علیا کان مصیبا فی قتاله والآخرون بغاة، لاسیما مع قوله ﷺ یقتلهم اولیٰ الطائفتین بالحق۔"

"اس حدیث میں اہل سنت (کے اس عقیدے) کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قتال کرنے میں مصیب تھے اور دوسرے لوگ باغی تھے، خصوصاً نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں کہ ان (خوارج) کو فریقین میں سے وہ جماعت قتل کرے گی جو حق کے قریب تر ہوگی۔" **(شرح مسلم، کتاب الزکوٰة بباب اعطاء المؤلفة)**

❷ "هذه الروایات صریحة فی ان علیا رضی اللہ عنہ کان هو المصیب المحق والطائفة الاخریٰ اصحاب معاویة رضی اللہ عنہ کانوا بغاة متاولین۔"

(یہ روایات اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی مصیب اور برحق تھے اور دوسری جماعت یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی تاویل کے ساتھ بغاوت کرنے والے تھے۔) **(شرح مسلم، کتاب الزکوٰة بباب اعطاء المؤلفة)**

حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ: ولامعنیٰ لوقوف محمد بن جریر الطبری عن تعیین المحق من الفئتین مع قوله ﷺ تقتل عمارا الفئة الباغیة، ومن هنا بوب المصنف رحمه الله علی هذا الحدیث، فقال "البغاة" لما بیناه من مذهب اهل الحق ان الفئة المقاتلة لعلیّ هی الباغیة وان کانت متاولة طالبة للحق فی ظنها غیر ملومة بل ماجورة علی الاجتهاد ولاسیما الصحابة منهم فان الواجب تحسین الظن بهم.

" فریقین میں سے برحق کی تعیین کے متعلق ابن جریر طبری کے توقف کا کوئی مطلب نہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ اسی لیے مصنف نے اس حدیث پر باب قائم کرنے میں البغاۃ کہا ہے جیسا کہ ہم اہل حق کا مذہب بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والی جماعت ہی باغی تھی اگرچہ وہ تاویل کر رہی تھی، اپنے خیال میں حق کی طلب گار تھی، اس کی مذمت نہیں کی جائے گی بلکہ اجتہاد پر اسے اجر ملے گا۔ خصوصاً ان میں سے صحابہ کرام کو کیوں کہ ان سے حسن ظن واجب ہے۔" (طرح التثریب: ۲۷۸/۷)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی لوت کے لیے ان کا یہ قول دیکھ لینا کافی ہے جو کہ انہوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے
قصاص جلد لینے کا مطالبہ سن کر جواب میں فرمایا تھا: ”كَيْفَ اَصْنَعُ بِقَوْمٍ يَمْلِكُوْنَنَا وَلَانَمْلِكُهُمْ.“
(ہم ایسے لوگوں کا کیا کر سکتے ہیں جو ہمارے مالک ہیں۔ ہم ان کے مالک نہیں۔)[1]

حاشیہ صفحہ موجودہ: [1] تاریخ الطبری: ۴۳۷/۳

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

امام ابوبکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ:

لقاتل علی بن ابی طالب الفئة الباغية بالسيف ومعه من كبراء الصحابة واهل بدر ... وكان محقافي قتاله لهم لم يخالف فيه احد الا الفئة الباغية التي قابلته واتباعها. وقال النبي ﷺ لعمار: تقتلك الفئة الباغية. وهذا خبر مقبول من طريق التواتر حتىٰ ان معاوية لم يقدر علىٰ جحده.

”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغی گروہ کے ساتھ تلوار سے قتال کیا اور ان کے ساتھ اکابر صحابہ اور بدری حضرات بھی تھے۔۔۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے جنگ کرنے میں برحق تھے، کسی ایک نے بھی اس مسئلے میں ان کی مخالفت نہیں کی سوائے باغی گروہ اور اس کے پیروکاروں کے جنہوں نے آپ رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کیا، اور نبی ﷺ نے عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا تھا کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ یہ حدیث متواتر طریقے سے مشہور تھی یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس کا انکار نہ کر سکے۔“
(احکام القرآن للرازی: ۲۳۲/۳، ط العلمیة)

امام ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ:

[1] فلم يخرجهم عن الايمان بالبغي بالتاويل ولاسلبهم اسم الاخوة بقوله بعده: انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم، الحجرات، وقال ﷺ في عمار: تقتله الفئة الباغية. (العواصم من القواصم، ص ۱۷۲، ۱۷۳)

اس ے کی گئی بغاوت نے انہیں (اہلِ شام کو) ایمان سے نہیں نکالا اور نہ ہی ان سے ”بھائیوں“ کا نام سلب کیا جیسا کہ اللہ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا: ”بے شک مومن آپس میں بھائی ہیں پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔“ اور آپ ﷺ نے عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔

[2] وقال ابن العربي في تفسيره: قوله تعالىٰ: وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا. هذه الآية اصل في قتال المسلمين وعمدة في حرب المتأولين، وعليها عول الصحابة، واليها لجأ الاعيان من اهل الملة. واياها عنى النبي ﷺ بقوله يقتل عمارا الفئة الباغية، وقوله في شان الخوارج: يخرجون علىٰ خير فرقة من الناس، او علىٰ حين فرقة. والرواية الاولىٰ اصح، لقتلهم ادنىٰ الطائفتين الى الحق، وكان الذي قتلهم علي بن ابي طالب ومن كان معه، فتقرر عند علماء المسلمين وثبت بدليل الدين انّ علياً رضی اللہ عنہ كان اماماً، وان كل من خرج عليه باغ.

(یہ آیت مسلمانوں سے قتال اور تاویل کرنے والوں سے جنگ (کے مشروع ہونے کی) اصل دلیل ہے۔ اس پر صحابہ نے اعتماد کیا، اسی سے ملت کے بزرگوں نے استدلال کیا۔ نبی ﷺ کے ارشاد کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا اور خوارج کے بارے میں آپ کے فرمان کہ لوگوں کے انتشار کے وقت ایک گروہ نکلے گا جسے دونوں میں سے حق کے قریب تر جماعت قتل کرے گی، سے یہی (باغیوں سے جنگ) مراد ہے۔ اور ان (خوارج) کو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا، پس علمائے اسلام کے نزدیک یہ بات ثابت ہو گئی اور دینی دلیل سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اور جو بھی ان کے خلاف کھڑا ہوا وہ باغی تھا۔) (احکام القرآن لابی بکر ابن العربی، سورة الحجرات)

امام ابن رشد المالکی رحمہ اللہ:

قال ابن الرشد في مسئلة معركة الجمل: [3] والذي يقول ائمة اهل السنة واهل الحق: ان عليا رضی اللہ عنہ ومن اتبعه كان على الصواب والحق، وان طلحة والزبير كانا على الخطا الا انهما رايا ذلك باجتهادهما فكان فرضهما ما فعلاه، اذ هما من اهل الاجتهاد.

”جو بات ائمہ اہلِ سنت اور اہلِ حق نے کہی ہے، یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے پیروکار مصیب اور برحق تھے۔ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما خطا پر تھے مگر یہ ان کی اجتہادی رائے تھی، پس ان پر وہی واجب تھا جو انہوں نے کیا، کیوں کہ وہ مجتہد تھے۔“ (البیان والتحصیل: ۳۶۱/۱۶)

[4] وقال قائل من انهم اجتهدوا فاصاب علي، واخطا طلحة والزبير هو الصحيح الذي يلزم اعتقاده، فلعلي اجران لموافقة الحق باجتهاده ولطلحة والزبير اجر واحد لاجتهادهما.

”یہ بات جو ہم نے کہی ہے کہ ان سب نے اجتہاد کیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ مصیب ہوئے اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے خطا کی، یہی صحیح بات ہے جس کا اعتقاد لازم ہے۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ دو گنے اجر کے حق دار ہیں؛ کیوں کہ ان کا اجتہاد حق کے مطابق ہو گیا۔ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لیے بھی اپنے اجتہاد کے سبب ایک اجر ہے۔“ (البیان والتحصیل: ۳۶۱/۱۶)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

یعنی وہ ہم پر مسلط ہیں۔ ہمارا ان پر کوئی قابو نہیں چلتا۔ معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قصاص نہ لینا بے بسی کے باعث تھا۔ اسے آپ کس دلیل سے فقہی مسئلہ قرار دے رہے ہیں؟

﴿جواب﴾ جب اسلامی فقہ بھی کہتی ہے کہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، وہی دین اور شریعت کا تقاضا تھا اور اسی پر فقہائے امت کا اجماع ہوا تو اِسے بے بسی کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے گا کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

حافظ شمس الدین الذھبی رحمہ اللہ:

وکان قاتل تلک الطائفة امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ، فهو صاحب الحق بلاشک، ولذلک اخبر علیه الصلوٰة والسلام بان عماراً تقتله الفئة الباغية، وكان عليّ السابق الى الامامة فمن نازعه فمخطئ، ماجور مجتهد......

"اس جماعت (خوارج) سے قتال امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے کیا۔ پس بلاشک وہی برحق تھے اور اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ اور علی رضی اللہ عنہ امامت میں بھی بڑھ کر تھے جس نے ان سے نزاع کیا وہ خطا کار مگر ماجور تھا (کیوں کہ وہ) مجتہد تھا۔" (المقدمة الزهراء، ص ۱۳)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس قضیے میں جمہور سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے یہ رائے رکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یقیناً برحق اور اصحابِ شام یقیناً خروج کے مرتکب تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان سے لڑنا جائز تھا مگر خلافِ اولیٰ تھا۔ (کچھ اسی طرح کی رائے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ہے جنہوں نے "ازالۃ الخفاء" میں طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس قضیے میں عزیمت پر عمل کرنے والے وہ تھے جو گوشہ نشین رہے۔) بہرحال جمہور ان سے متفق نہیں، اگلی سطور میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے پر مشتمل عبارات کو ان کی خاص رائے کے پس منظر میں پڑھا جائے۔ اگرچہ رائے کا یہ فرق بہت معمولی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

● فاصحاب معاوية ان كان قد بغوا قبل القتال لكونهم لم يبايعوا عليا فليس في الآية الامر بقتال من بغى ولم يقاتل.

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب اگرچہ جنگ سے پہلے ہی بغاوت کر چکے تھے؛ کیوں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی تھی مگر آیت میں ایسے لوگوں سے قتال کا حکم نہیں ہے جو بغاوت کریں مگر جنگ نہ کریں۔" (منهاج السنة: ۵۰۳/۴)

● فاتفق اهل السنة على انه لاتفسق واحدة من الطائفتين وان قالوا في احداهما انهم بغاة لانهم كانوا متاولين مجتهدين والمجتهد لا يكفر ولا يفسق.

"اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ فریقین میں سے کسی کو فاسق نہیں کہا جائے گا اگرچہ اہل سنت فریقین میں سے ایک کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ باغی تھے، اس لیے کہ وہ تاویل کرنے والے مجتہد تھے اور مجتہد کو نہ کافر قرار دیا جا سکتا ہے نہ فاسق۔" (منهاج السنة: ۳۹۲/۴)

● وقال ایضا في شرح حديث: تقتله الفئة الباغية يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار. "وهذا يدل على صحة امامته ووجوب طاعته وان الداعي الى طاعته داع الى الجنة والداعي الى مقاتلته داع الى النار وان كان متاولا، وهو اصح القولين لاصحابنا وهو الحكم بتخطئة من قاتل عليا وهو مذهب الائمة الفقهاء الذين فرعوا على ذالک قتال البغاة المتاولين."

"یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے صحیح ہونے، ان کی اطاعت کے واجب ہونے اور ان کی اطاعت کی طرف دعوت دینے والے کے جنت کی طرف بلانے اور ان سے جنگ کی طرف دعوت دینے والے کے جہنم کی طرف بلانے کی دلیل ہے اگرچہ وہ لوگ تاویل کرنے والے ہوں۔ ہمارے اصحاب (حنابلہ) کے دو اقوال میں سے یہی صحیح ترین قول ہے۔ اور یہ اس بات کا فیصلہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والے خطا کار تھے۔ یہی ائمہ فقہاء کا مذہب ہے جنہوں نے اس سے تاویل کرنے والے باغیوں سے جنگ کے مسائل اخذ کیے ہیں۔ (مجموع الفتاوى: ۴۳۷/۴)

● مع ان عليا اولى بالحق من فارقه ومع ان عمارا قتلته الفئة الباغية كما جاءت به النصوص فعلينا ان نؤمن بكل ما جاء من عند الله ونقر بالحق كله ولا يكون لنا هوى. ولا نتكلم بغير علم. بل نسلک سبل العلم والعدل وذلک هو اتباع الكتاب والسنة. فاما من تمسک ببعض الحق دون بعض فهذا منشا الفرقة والاختلاف.

"اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی بہ نسبت جنہوں نے انہیں چھوڑا، حق کے قریب تر تھے۔ اور یہ بھی ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ کو باغی جماعت نے قتل کیا تھا جیسا کہ نصوص میں آیا ہے۔ پس ہم پر واجب ہے کہ ہم ہر اس چیز پر ایمان رکھیں جو اللہ کی طرف سے ہے اور حق بات کا پورے طور پر اقرار کریں۔ اس میں ہماری نفسانیت شامل نہ ہو، نہ ہی ہم بغیر علم کے کلام کریں بلکہ علم اور عدل کی راہ پر چلیں، یہی کتاب وسنت کی اتباع ہے۔ رہا وہ شخص جو حق کی کچھ بات مانے اور کچھ نہیں تو یہی فرقہ بندی اور اختلاف کا باعث ہے۔" (مجموع الفتاوى: ۴۴۹/۴، ۴۵۰) .... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جس طرح قصاص دلوانے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، وہ درست نہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ از روئے شرع اس سے معذور تھے۔ اس شرعی رکاوٹ کا انکار کرنے کی گنجائش صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے جب اس حکم شرعی اور اجماع شرعی کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

علامۃ الزیلعی رحمہ اللہ:

واما ان الحق كان بيد عليّ في نوبته فالدليل عليه قول النبي ﷺ لعمار: تقتلک الفئة الباغية ولاخلاف انه كان مع عليّ وقتله اصحاب معاوية .قال امام الحرمين في الارشاد: وعلي رضی اللہ عنہ كان اماماً حقا في ولايته ومقاتلوه بغاة. وحسن الظن بهم يقتضي ان يظن بهم قصد الخير وان اخطاؤه، واجمعوا على ان علياً مصيبا في قتال اهل الجمل وهم طلحة والزبير وعائشة ومن معهم، واهل صفين وهم معاوية وعسكره وقد اظهرت عائشة الندم كما اخرجه ابن عبدالبر في كتاب الاستيعاب عن ابن ابي عتيق وهو عبدالله بن محمد بن عبدالرحمن بن ابي بكر قال قالت عائشة لابن عمر ياابا عبدالرحمن! ما منعک ان تنهاني عن مسيري؟ قال رايت رجلا غلب عليک يعني ابن الزبير. قالت: اما والله لو نهيتني ما خرجت.

"رہی یہ بات کہ اس موقع پر حضرت علی برحق تھے، اس کی دلیل حضور ﷺ کا حضرت عمار کے لیے یہ ارشاد ہے کہ تجھ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ حضرت علی کے ساتھ تھے اور انہیں حضرت معاویہ کے ساتھیوں نے قتل کیا تھا۔ امام الحرمین "الارشاد" میں لکھتے ہیں: علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں امام برحق تھے اور ان کے مدمقابل باغی تھے مگر ان سے حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ یہ گمان رکھا جائے کہ انہوں نے بھلائی کا قصد کیا تھا مگر غلطی کر گئے۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ جمل سے جو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھی تھے اور اہل صفین سے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کا لشکر تھا، قتال کرنے میں مصیب تھے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ندامت ظاہر کی تھی جیسا کہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں ابن ابی عتیق یعنی عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کہا: "ابو عبدالرحمٰن! آپ کو کیا ہوا تھا کہ آپ نے مجھے اس سفر سے منع نہ کیا؟" انہوں نے عرض کیا: "میں نے دیکھا کہ وہ صاحب یعنی زبیر رضی اللہ عنہ آپ کی رائے پر غالب آ چکے تھے۔" ام المومنین نے فرمایا: "اللہ کی قسم! اگر آپ مجھے منع کر دیتے تو میں کبھی (اس سفر پر) نہ نکلتی۔" (نصب الرایۃ: ۶۹/۴، ۷۰)

امام شمس الدین القرطبی رحمہ اللہ:

تقرر عند علماء المسلمين وثبت بدليل الدين انّ علياً رضی اللہ عنہ كان اماماً، وان كل من خرج عليه باغ، وان قتاله واجب حتى يفيء الى الحق.

پس علمائے اسلام کے نزدیک طے ہو چکا اور شرعی دلیل سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علی خلیفہ تھے اور ان کے خلاف کھڑا ہونے والا ہر کوئی باغی تھا اور اس سے جنگ واجب تھی جب تک وہ حق کی طرف نہ لوٹ آئے۔ (الجامع لاحکام القرآن، سورۃ الحجرات)

علامہ مرغینانی صاحب الہدایۃ رحمہ اللہ:

لم يجوز التقلد من السلطان الجائر كما يجوز من العادل ،لان الصحابة رضي الله عنهم تقلدوه من معاوية رضی اللہ عنہ والحق كان بيد عليّ رضی اللہ عنہ في نوبته.

"پھر جائر حکمران (جو قانونِ شرع کے مطابق حاکم نہ بنا ہو) سے بھی عہدہ لینا جائز ہے جیسا کہ عادل حکمران سے، اس لیے کہ صحابہ کرام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عہدے قبول کیے تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں حق (آئینی حکومت کا) انہی کے ہاتھ میں تھا۔" (ھدایہ، کتاب ادب القاضی)

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ

لم ينقل عن السلف المجتهدين والعلماء الصالحين جواز اللعن على معاوية رضی اللہ عنہ واحزابه ،لان غاية امرهم البغي والخروج على الامام وهو لايوجب اللعن.

"اسلاف مجتہدین اور علمائے صالحین سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت پر لعنت کا جواز منقول نہیں، کیوں کہ ان کا معاملہ زیادہ سے زیادہ بغاوت اور خروج کا تھا، اور یہ بات لعنت کو واجب نہیں کرتی۔" (شرح عقائد نسفی، ص ۳۷۳)

ابن الوزیر القاسمی رحمہ اللہ:

وقد سمى رسول الله ﷺ اصحاب معاوية مسلمين في حديث الحسن . وكذلك ثبت بالتواتر عن رسول الله ﷺ ان اصحاب معاوية بغاة كما جاء في حديث عمار.

"حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسلمان قرار دیا ہے۔ اسی طرح تواتر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی ثابت کہ اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ باغی تھے جیسا کہ حدیث عمار میں ہے۔" (العواصم والقواصم: ۱۷۰/۲)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)



انکار کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ اسلامی فقہ اور شریعت کا حکم کچھ اور تھا جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ انجام نہ دے پائے۔ اگر دیکھا جائے تو فقہی احکام اس بارے میں اتنے واضح ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں۔ [1]

پس قصاص میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پس و پیش کا یہ مطلب نکالنا بالکل غلط ہوگا کہ وہ بالکل بے بس اور مجبور محض تھے۔

حاشیہ صفحہ موجودہ:

① لا غرامۃ علیہم بعد سکون الحرب و لا احد علیہم و الدم کذلک لا قصاص فیہ. (الفقہ الابسط للامام ابی حنیفۃ، ص ۴۰)

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

علامہ علاء الدین الکاسانی رحمہ اللہ:

قال فی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ و کان قتیل اهل البغی علیّ ما قال النبی ﷺ: تقتلک الفئۃ الباغیۃ.

''حضور ﷺ نے عمار بن یاسر کے بارے میں فرمایا اور وہ باغیوں ہی کے ہاتھوں قتل ہوئے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: تم کو باغی گروہ قتل کرے گا۔'' (بدائع الصنائع: ۱/۳۲۳، فصل فی احکام الشہید)

حافظ ابن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ:

● هذا مقتل عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ مع امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ. قتلہ اهل الشام وبَانَ بذلک وظهر سرّ ما اخبر به الرسول ﷺ من انه تقتله الفئة الباغية وبان بذلک ان علیاً محق وان معاوية باغٍ.

''یہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا قصہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے جنہیں اہل شام نے قتل کیا۔ اس سے ظاہر ہوگیا اور وہ راز کھل گیا جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے اس طرح دی تھی کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ برحق اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی تھے۔'' (البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۲۶)

● وهذا الحديث من دلائل النبوة حيث اخبر صلوات الله وسلامه عليه عن عمّار انه تقتله الفئة الباغية وقد قتله اهل الشام في وقعة صفين، وعمار مع عليّ واهل العراق..... وقد كان عليّ احق بالامر من معاوية ولا يلزم من تسمية معاوية بغاة تكفيرهم، كما يحاوله جهلة الفرقة الضالة من الشيعة وغيرهم، لانهم وان كانوا بغاة في نفس الامر، فانهم كانوا مجتهدين فيما تعاطوه من القتال وليس كل مجتهد مصيبا.

''یہ حدیث نبوت کے دلائل میں سے ہے جس کی خبر حضور ﷺ نے عمار کے بارے میں دی تھی کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا اور انہیں اہل شام نے صفین کی جنگ میں قتل کیا جب کہ عمار حضرت علی اور اہل عراق کے ساتھ تھے۔ اور حضرت علی معاویہ سے بڑھ کر حکمرانی کے حق دار تھے مگر معاویہ کو باغی کہنے سے ان کی تکفیر لازم نہیں آتی جیسا کہ گمراہ فرقوں مثلاً: شیعہ وغیرہ کا خیال ہے؛ اس لیے کہ اگرچہ وہ واقعی باغی تھے مگر وہ اپنے قتال کرنے میں مجتہد تھے البتہ ہر مجتہد مصیب نہیں ہوتا۔'' (البدایۃ والنہایۃ: ۴/۵۳۸)

● کان علیٌّ واصحابه ادنی الطائفتين الی الحق من اصحاب معاوية، واصحاب معاوية كانوا باغين عليهم كما ثبت في صحيح مسلم عن رسول الله ﷺ قال لعمار تقتله الفئة الباغية. (البداية والنهاية: ۹/۱۹۳)

(دونوں جماعتوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب ان کے خلاف بغاوت کے مرتکب تھے۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔)

علامہ ابن حجر الہیثمی رحمہ اللہ:

● کان له اجر واحد علیٰ اجتهاده و اما علی رضی الله عنه فكان له اجران، اجر علیٰ اجتهاده واجر علیٰ اصابته.

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے ان کے اجتہاد کی بناء پر ایک اجر ہے۔ اور جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے، ان کے لیے دہرا اجر ہے۔ ایک ان کے اجتہاد پر، دوسرا اجتہاد کی درستگی پر۔'' (الصواعق المحرقۃ: ۲/۶۲۳)

● وفئة معاوية وان كانت هي الباغية لكنه بغي لا فسق به لانه انما صدر عن التاويل يعذر به اصحابه.

(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت اگرچہ باغی تھی مگر یہ بغاوت تھی نہ کہ فسق، اس لیے کہ یہ ایک تاویل کی بناء پر صادر ہوئی تھی جس میں ان کے اصحاب معذور تھے۔) (الصواعق المحرقۃ: ۲/۶۲۷)

● فكل من قاتله من هؤلاء بغاة عليه، لكن من عدا الخوارج، وان كانوا مخطئين هم مثابون لانهم فقهاء مجتهدون.

پس ان میں جو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کے مرتکب ہوئے، وہ باغی تھے مگر خوارج کو مستثنیٰ کر کے باقی ماجور تھے اگرچہ وہ خطئی تھے؛ کیوں کہ وہ فقہاء مجتہدین تھے۔ (مختصر تطہیر الجنان، ص ۲۹)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہاں انہیں جو پریشانیاں اور الجھنیں لاحق تھیں ان کا ہم انکار نہیں کرتے۔ سبائیوں کی شر انگیزی بھی یقیناً جاری تھی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بے اختیار تھے۔ وہ مسلمانوں کے خلیفہ اور فوج کے سربراہ تھے۔ جنگِ جمل،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

کمال الدین ابن الہمام الحنفی رحمہ اللہ: "وانما کان الحق معه فی تلک النوبة لصحة بیعته وانعقادها فکان علی الحق فی قتال اهل الجمل و وقتال معاویة بصفین وقوله علیه السلام لعمار ستقتلک الفئة الباغیة، وقد قتله اصحاب معاویة یصرح بانهم بغاة"

بے شک حق علی کی باری میں انہی کے ساتھ تھا؛ کیوں کہ ان کی بیعت صحیح اور منعقد تھی، پس علی اہلِ جمل اور معاویہ سے صفین میں لڑائی میں برحق تھے۔ حضور ﷺ کا حضرت عمار کے لیے ارشاد تھا کہ تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا جس سے یہ صریح طور پر ثابت ہو گیا کہ وہ باغی تھے۔ (فتح القدیر: ۷/۲۶۳، ط دار الفکر)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: قال فی شرح حدیث عمار:

● وفی قوله ﷺ: تقتل عمارا الفئة الباغیة" دلالة واضحة علی ان علیاً ومن معه کانوا علی الحق وان من قاتلهم کانوا مخطئین فی تاویلهم۔ ""حضور ﷺ کے اس ارشاد کہ "عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔" واضح دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حق پر تھے اور ان سے قتال کرنے والے اپنی تاویل میں غلطی پر تھے۔" (فتح الباری: ۶/۶۱۹، ط دار المعرفة بیروت)

● وفی حدیث "تقتل عمارا الفئة الباغیة" علی ان علیاً کان المصیب فی تلک الحرب لان اصحاب معاویة قتلوه۔
"حدیث "عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا" اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس جنگ میں مصیب تھے؛ کیوں کہ عمار رضی اللہ عنہ کو معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا تھا۔" (فتح الباری: ۱۳/۸۵)

● وفی هذا الحدیث علم من اعلام النبوة وفضیلة ظاهرة لعلیّ وعمار ورد علی النواصب الزاعمین ان علیاً لم یکن مصیبا فی حروبه۔
"اس حدیث میں نبوت کا ایک معجزہ اور حضرت علی اور عمار رضی اللہ عنہ کی کھلی فضیلت ہے اور اس میں ناصبیوں کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگوں میں مصیب نہیں تھے۔" (فتح الباری: ۱/۵۴۳)

● ذهب جمهور اهل السنة الی تصویب من قاتل مع علیّ لامتثال قوله تعالی: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا الآیة ففیها الامر بقتال الفئة الباغیة، وقد ثبت ان من قاتل علیا کانوا بغاة وهولاء مع هذا التصویب متفقون علی انه لا یذم واحد من هولاء بل یقولون اجتهدوا فاخطؤا
"جمہور اہلِ سنت کا مذہب ان لوگوں کی تصویب ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا کی پیروی کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر لڑے تھے، جس میں باغی جماعت سے قتال کا حکم ہے، اور یہ ثابت ہے کہ جنہوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی وہ باغی تھے مگر جمہور اہلِ سنت اس تصویب کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ فریقین میں سے کسی کی مذمت نہیں کی جائے گی بلکہ کہا جائے گا کہ انہوں نے اجتہاد کیا مگر خطا کی۔" (فتح الباری: ۱۳/۶۷)

● وصحة علیّ ومن معه ما شرع لهم من قتال اهل البغی حتیٰ یرجعوا الی الحق۔ "اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی دلیل وہ تھی جس میں باغیوں سے قتال شروع کیا گیا ہے جب تک کہ وہ حق کی طرف نہ لوٹ آئیں۔" (فتح الباری: ۱۳/۲۸۸)

امام غزالی رحمہ اللہ: "ولم یذهب الی تخطئة علیّ ذو تحصیل اصلاً"
سمجھ داروں میں سے کسی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہرگز خطا کا مرتکب قرار نہیں دیا۔ (احیاء علوم الدین: ۱/۱۱۵)

علامہ محمود الآلوسی رحمہ اللہ:

"واهل السنة الا من شذ یقولون ان علیا کرم الله تعالیٰ وجهه فی کل ذلک علی الحق، لم یفترق عنه قید شبر وان مقاتلیه فی الوقعتین کانوا باغین ولیسوا کافرین، خلافاً للشیعة."

"اہلِ سنت میں سے کچھ شاذ لوگوں کے سوا سب یہی کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان تمام معاملات میں برحق تھے، ایک بالشت بھی اس سے دور نہ تھے اور یہ کہ مقاتلین خاطی اور باغی تھے مگر شیعوں کے عقیدے کے برخلاف وہ کافر نہ تھے۔" (الاجوبة العراقیة: ۱/۳۸)

علامہ عبدالعزیز فرہاروی ملتانی رحمہ اللہ:

"وعند اهل السنة اجمعوا علی ان من خرج علی علیّ کرم الله وجهه خارج علی الامام الحق، الا ان هذا البغی الاجتهادی معفو عنه.

"اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کھڑے ہونے والے امام برحق پر خروج کے مرتکب ہوئے مگر یہ اجتہادی بغاوت قابلِ معافی ہے۔"
(الناهیة عن طعن امیر المؤمنین معاویة: ۱/۴۷)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)



جنگِ صفین اور جنگِ نہروان کی قیادت انہوں نے ہی کی تھی۔ ان کے گرد اکثریت جانثاروں اور دین داروں کی تھی نہ کہ منافقوں کی۔ مہاجرین و انصاران سے بیعت کر چکے تھے۔ ① گورنروں کا تقرر وہ اپنی مرضی سے کرتے رہے اور اکثر جگہ انہوں نے صحابہ ہی کو متعین کیا۔ ② اگر سبائی ان پر مسلط ہوتے تو اکثر صوبوں کی گورنری صحابہ کو نہ ملتی۔

حاشیہ صفحہ موجودہ: ① دخل المهاجرون والانصار فبايعوه، ثم بايعه الناس. (تاريخ الطبرى: ۴/۴۲۷)

جاء المهاجرون والانصار فبايعوه فبايعه الناس. (السنة للخلال روایت نمبر: ۶۱۷) ا فبايعته العامة. (تاريخ طبرى: ۴/۴۳۳)

فقال الجمهور: على بن ابى طالب، نحن به راضون. (تاريخ طبرى: ۴/۴۳۴) فبايع الناس كلهم. (تاريخ الطبرى: ۴/۴۳۵)

② کوفہ میں ابوموسیٰ اشعری، پھر قرظہ بن کعب انصاری، پھر ابومسعود انصاری، مکہ میں ابوقتادہ انصاری پھر قُثَم بن عباس، یمن میں عبیداللہ بن عباس، بصرہ میں عثمان بن حنیف، پھر عبداللہ بن عباس گورنر بنائے گئے۔ یہ سب صحابہ تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین (انساب الاشراف: ۲/۲۳۰؛ تاریخ خلیفہ، ص ۲۰۰، ۲۰۱)

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

ملا علی القاری الهروی رحمہ اللہ

● وقد قال ﷺ: اذا ذكر اصحابى فامسكوا اى عن الطعن فيهم، فان رضا الله تعالىٰ فى مواضع من القرآن تعلق بهم، فلابد ان يكون مآلهم الىٰ التقوىٰ ورضا المولىٰ وجنة المأوىٰ، وايضا لهم حقوق ثابتة فى ذمة الامة، فلا ينبغى لهم ان يذكروهم الا بالثناء الجميل والدعاء الجزيل، وهذا مما لا ينافى ان يذكر احدٌ مجملا او معينا بان المحاربين مع علىّ ما كانوا من المخالفين، و بان معاوية وحزبه كانوا باغين علىٰ ما دلّ عليه حديث عمار: تقتلك الفئة الباغية، لان المقصود منه بيان الحكم المميز بين الحق والباطل، والفاصل بين المجتهد المصيب والمجتهد المخطئ مع توقير الصحابة وتعظيمهم جميعاً فى القلب لرضا الرب.

''حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میرے صحابہ کا ذکر ہو تو رک جاؤ۔'' مراد ہے کہ ان پر طعن سے رک جاؤ؛ کیوں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا انہیں نصیب ہونا کئی جگہ وارد ہے۔ یقیناً ان کا مقام تقویٰ، اللہ کی رضا اور جنت ہے۔ امت پر ان کے بڑے حقوق ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر تعریف و توصیف اور دعائے خیر کے ساتھ ہی ہونا چاہیے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر طور پر یا معین طور پر یوں بھی نہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے والے غلط نہ تھے، یا یہ کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت والے باغی تھے، جس پر حدیث عمار ''تقتلك الفئة الباغية'' دلیل ہے؛ کیوں کہ دل میں تمام صحابہ کی توقیر و تعظیم اور رضا مندی کے باوجود یہاں مقصد صحیح اور غلط، مجتہد مصیب اور مجتہد مخطی میں فرق بتانا ہے۔'' (مرقاة المفاتيح: ۸/۳۳۹۷، كتاب الفتن، ط دار الفكر)

● واستدل به علىٰ احقية خلافة على وكون معاوية باغيا لقوله عليه السلام: ويحك ياعمار تقتله (ياتقتلك) الفئة الباغية.

''اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے باغی ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔'' (شرح مسند ابى حنيفة ص ۲۲۵)

امام ابن حزم الظاهری رحمہ اللہ

● فقطعنا علىٰ صواب على رضى الله عنه وصحة امامته وانه صاحب الحق وان له اجرين، اجر الاجتهاد واجر الاصابة. وقطعنا ان معاوية رضى الله عنه ومن معه مخطئون مجتهدون ماجورون اجرا واحدا. (الفصل فى الملل والاهواء والنحل: ۴/۱۲۵)

ہم قطعی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب اور ان کی خلافت کے صحیح اور ان کے برحق ہونے اور ان کے لیے دو گنے اجر کے قائل ہیں۔ ایک اجر اجتہاد کا اور ایک اجر درست ہونے کا۔ ہم قطعی طور پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کو مجتہد مخطی اور ماجور مانتے ہیں جنہیں ایک اجر ملے گا۔

● وكذلك انذر عليه السلام بان عمار اتقتله الفئة الباغية فصح ان عليا هو صاحب الحق، و كان علىّ السابق الى الامامة، فصح بعدُ صاحبها و ان من نازعها فيها فمخطئ، فمعاوية رحمه الله مخطئ ماجور مرة لانه مجتهد. (الفصل فى الملل والاهواء والنحل: ۴/۷۳)

نبی علیہ السلام نے اسی طرح خبردار کر دیا تھا کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی برحق تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے میں سبقت کر چکے تھے، پس ثابت ہوا کہ وہی اس عہدے کے حامل تھے اور جس نے اس بارے میں ان سے نزاع کیا، وہ مخطی تھا۔ پس مُعاویہ رضی اللہ عنہ، اللہ ان پر رحمت کرے، ایک درجہ اجر رکھتے ہیں؛ کیوں کہ وہ مجتہد تھے۔

مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمہ اللہ

''اہلِ سنت کے ضروری عقائد'' کے تحت لکھتے ہیں: ''دوم جنگِ صفین: جس میں ایک جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لڑائی کے بارے میں اہلِ سنت کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ خلیفۂ برحق تھے اور حضرت مُعاویہ یا ان کے ساتھ والے خاطی اور باغی مگر اس خطا پر ان کو بُرا کہنا جائز نہیں؛ کیوں کہ وہ بھی صحابی ہیں، صاحبِ فضائل ہیں، اور ان کی یہ خطا غلط فہمی کی وجہ سے تھی اور غلط فہمی کے اسباب موجود تھے۔ (سیرت خلفائے راشدین، ص ۱۷۸، کتب خانہ مجیدیہ)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

جنگِ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یقیناً نیک لوگوں کا مجمع تھا جنہیں خوارج سے جنگ پر ابھارتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے: ''اللہ کی قسم! اگر خوارج سے لڑنے والے سپاہیوں کو معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کی زبانی ان کے لیے کن کن بشارتوں کا وعدہ ہوا ہے۔ تو وہ اس کارروائی میں شرکت کرنے سے ذرا بھی کوتاہی نہ کریں۔'' یہ بشارت سن کر اہلِ عراق نے بڑی جانثاری کے ساتھ خوارج کی عسکری قوت کو پاش پاش کیا۔[1] اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج سبائیوں پر مشتمل ہوتی تو خوارج کو تہس نہس کیوں کرتی اور ان بشارتوں کی حق دار کیسے بنتی؟

حاشیہ صفحہ موجودہ:

① صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۵، باب ذکر الخوارج ؛ ح: ۲۵۱۶، باب التحریض علی قتال الخوارج

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ:

''اور معاویہ رضی اللہ عنہ کا محاربہ حضرت امیر (علی) رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو ہوا تو اہلِ سنت اس کو کب بھلا اور جائز کہتے ہیں، ذرا کوئی کتاب اہل سنت کی دیکھی ہوتی، اہل سنت ان کو اس فعل میں خاطی کہتے ہیں مگر معاویہ رضی اللہ عنہ اس خطاء کے سبب ایمان سے نہیں نکل گئے جیسا کہ تمہارے اور تمہارے اسلاف کا زعم ہے۔'' (ھدایۃ الشیعۃ، ص ۳۰، ط دار الاشاعت)

مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ:

فالوجه عندي ان الكلام في حق الامير معاوية رضي الله عنه . ثم الى قوله : تقتله الفئة الباغية. و صرح صاحب الهداية في كتاب القضاء ان الامير معاوية كان بغى على علي رضي الله عنه.

میرے نزدیک توجیہ یہ ہے کہ یہ کلام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، آپ ﷺ کے ارشاد: ''تقتلہ الفئۃ الباغیۃ'' تک۔ اور صاحب ہدایہ نے تصریح کی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ (فیض الباری شرح البخاری: ۲/۱۹۳)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ:

''باغی پر لعنت جائز نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس صلح سے پیشتر اگرچہ بظاہر باغی تھے مگر خطائے اجتہادی کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قصداً کسی گناہِ کبیرہ کے مرتکب تھے۔'' (خلافتِ راشدہ، ص ۲۱۱)

مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ قال فی شرح حدیث عمار:

- اس سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت کا باغی ہونا معلوم ہوتا ہے۔'' (تقریر صحیح بخاری: ۲/۱۶۶)
- ''ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت خطا پر تھی مگر ان پر اعتراض نہیں اس لیے کہ یہ خطائے اجتہادی تھی اور خطائے اجتہادی میں کوئی گرفت نہیں ہوتی بلکہ ثواب ملتا ہے اور اگر مصیب ہو تو دو ثواب ملتے ہیں لہٰذا وہ بھی مثاب ہوئے۔ (ایضاً: ۱۶۷)
- قال والدی رحمہ اللہ: عقيدتنا ان سيدنا عليا رضي الله عنه كان على الحق وسيدنا معاوية رضي الله عنه و جماعته كانت على خطأ لكن لا يعترض عليهم لانه كان خطأ اجتهاديا. (الكنز المتواری: ۴/۱۶۷، كتاب الصلوة، باب التعاون في بناء المسجد)

مولانا محمد نافع رحمہ اللہ محمدی شریف جھنگ:

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت کے لیے اس مسئلہ میں یہ چیز بھی پیشِ نظر تھی کہ فریقِ مقابل ہمارے نزدیک ''اہل البغی'' میں سے ہے۔ فلہٰذا جب تک یہ لوگ حق کی طرف رجوع نہ کریں ان کے خلاف قتال لازم ہے۔ (سیرت علی المرتضیٰ، ص ۳۰۴، ۳۰۵ ؛ سیرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، ص ۲۱۳)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر باغی کا اطلاق (بروایت الفئۃ الباغیۃ) اس دور تک ہے جب تک حضرت علی المرتضیٰ کے ساتھ ان کی مصالحت علاقائی تقسیم کے اعتبار سے نہیں ہوئی تھی۔ (سیرت علی المرتضیٰ، ص ۳۶۴)

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی:

''اس حدیث کو ایک طرح سے اس بات کی صریح دلیل قرار دیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک باغی جماعت کا حکم تھا۔ (انعام الباری: ۳/۱۹۱)

|||||

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بااختیار ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت یہ بھی ہے کہ آخر تک مشرقی علاقوں میں مہمات بھیجنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اہل فارس و کرمان نے خراج دینا بند کیا تو چار ہزار عراقی سپاہیوں نے جا کر شورش پسندوں کو دبایا۔ ایسی ہی ایک مہم پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی فوج لے کر گئے۔ ①

ایک مہم مرتدین کے خلاف بھیجی گئی جس کی قیادت حضرت مَعقِل بن قیس رحمہ اللہ نے کی۔ ②

اسی طرح بلوچستان اور سندھ میں مزید پیش قدمی بھی ہوئی۔ حارث بن مُرّۃ العبدی رضی اللہ عنہ نے مکران، قندابیل (جھل مگسی) اور قیقان (کوہِ کھیرتھر) میں غیر معمولی فتوحات حاصل کیں۔ ③

خِرّیت بن راشد نامی بے دین شخص نے عجمی اور نصرانی قبائل کو ملا کر بغاوت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مَعقِل بن سِنان رضی اللہ عنہ کو ایک زبردست لشکر دے کر اس کی جمعیت پارہ پارہ کر ڈالی۔ ④

رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مفسدین کے بارے میں یہ کہنا: ''كَيْفَ اَصْنَعُ بِقَوْمٍ يَمْلِكُوْنَنَا وَلَا نَمْلِكُهُمْ.'' اس کا راوی سیف بن عمر محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہے۔ ضعیف روایت کو ہمیشہ اس شرط کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے کہ وہ صحیح روایات سے ثابت شدہ محکم معلومات سے متصادم نہ ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلیفہ شرعی ہونا جمہور اہلِ اسلام کے ہاں عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ثبوت مضبوط روایات سے ہے۔

پس اس سے متصادم ضعیف روایت کو یا بالکل مسترد کر دیا جائے گا یا اس کی مناسب توجیہ کی جائے گی۔ ہماری نگاہ میں یہ ارشاد مجازی معنیٰ پر محمول ہے۔ جیسا کہ جب کسی پر امن شہر میں چوری ڈاکے کی وارداتیں شروع ہو جائیں تو کہہ دیا جاتا ہے: شہر میں ڈاکوؤں کا راج ہے۔ یہ ایک مجازی تعبیر ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ حکومت کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبائیوں کو علی الاطلاق غالب مانا جائے تو ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت شرعاً منعقد ہی نہیں مانی جا سکتی۔ دوسری طرف اہلِ شام بھی یقیناً اس صورت میں غالب عناصر یعنی سبائی لیڈروں سے مذاکرات کرتے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے۔ صفین میں جنگ بندی کی بات سبائیوں سے کی جاتی۔ ۳۹ھ میں سرحدوں کے احترام کا معاہدہ بھی انہی سے کیا جاتا، ۴۱ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بجائے سبائی قیادت سے صلح کر کے عراق کی حکومت لیتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ سبائی پسِ پردہ رہ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اشاروں پر چلا رہے تھے تو بھی غلط ہے کیوں کہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ صفین میں اہلِ شام کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ بندی دراصل سبائیوں کے

① تاریخ الطبری: ۱۳۷/۵، ۱۳۸
② شرح معانی الآثار، ح: ۵۱۱۳، کتاب السیر، باب یکون الرجل به مسلمًا
③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۱، فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الهلال
④ تاریخ الطبری: ۱۲۲/۵ تا ۱۳۲

کے ساتھ جنگ بندی تھی۔ ۳۹ھ میں سرحدوں کے احترام کا معاہدہ دراصل سبائی مملکت سے کیا گیا تھا، جس کے تخت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نمائشی طور پر بیٹھے تھے۔ ۴۱ھ کا اتحاد بظاہر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اور درحقیقت سبائیوں سے تھا، انہی کو منا کر عراق کی حکومت حاصل کی گئی تھی۔ اس طرح تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اہلِ شام خود سبائیوں کے قلع قمع میں مخلص نہ تھے بلکہ یہ سب اقتدار کی دوڑ تھی۔ اگر اہلِ شام سبائیوں کے جانی دشمن تھے اور عراقی حکومت سبائی چلا رہے تھے تو اہلِ شام کو کسی بھی موقع پر حکومتِ عراق سے مذاکرات نہیں کرنے چاہیے تھے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر سبائیوں یا قاتلینِ عثمان کا کنٹرول ہوتا تو یہ اکابر موقع ملتے ہی بھاگ کر شام کیوں نہ چلے گئے؟ صفین میں تو دوسرے پڑاؤ تک جانا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ساداتِ کرام بے بسی کی وجہ سے سبائیوں کے گھیرے سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے تو پھر اہلِ شام پر لازم تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر سادات کو ان کے چنگل سے نکالتے۔ انہوں نے صلح کیوں کر لی؟

حقیقت یہ کہ سوال میں پیش کردہ خیالات بہت کمزور ہیں جن پر یقین کریں تو نہ صرف حدیث و تاریخ کا ذخیرہ مسخ ہوتا ہے بلکہ صحابہ کرام کے کردار پر کئی بدنما سوالیہ نشانات لگ جاتے ہیں جن سے یہ حضرات بالکل بری ہیں۔

☆☆☆

لشکرِ علوی میں دس ہزار سبائیوں کا قصہ اور اس کا جواب:

﴿سوال﴾ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں پورے دس ہزار سبائی تھے اور وہ قصاص لینے سے مانع تھے۔ جب بھی قصاص کا معاملہ درپیش ہوتا وہ آڑے آجاتے۔ ''البدایہ والنہایہ'' میں ہے کہ ابودرداء اور ابوامامہ رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ پیغام لے کر گئے کہ وہ قاتلینِ عثمان سے قصاص لیں تو میں سب سے پہلے بیعت کرلوں گا۔ جب یہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور یہ مطالبہ کیا تو ایک بڑا مجمع باہر نکل آیا اور کہنے لگا: ''ہم سب قاتلینِ عثمان ہیں، جو چاہے ہم سے نمٹ لے۔''[1]

دوسری روایت ''الاخبار الطوال'' میں ہے جس میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابومسلم خولانی کے ہاتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں یہ بھی تحریر تھا:

''دوسری بات جس سے آپ مشکوک بن گئے ہیں وہ آپ کا قاتلینِ عثمان کو پناہ دینا ہے، وہ آپ کے دست و بازو، مددگار اور رازدار ہیں۔ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ آپ ان کے خون سے برأت ظاہر کرتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو آپ ان کے قاتلین کو ہمارے حوالے کردیں، ہم انہیں عثمان کے بدلے قتل کریں گے اور سب سے پہلے آپ کی (بیعت) کی طرف لپکیں گے۔ بصورتِ دیگر ہمارے پاس آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تلوار کے سوا کچھ نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم قاتلینِ عثمان کو بحر و بر میں

[1] فخرج الیھما خلق کثیر فقالوا کلنا قتلۃ عثمان، فمن شاء فلیرمنا. (البدایۃ والنھایۃ: ۱۰/۵۰۸، ط ھجر)

ڈھونڈیں گے اور انہیں قتل کریں گے یا ہماری روحیں پرواز کر جائیں گی۔''[1]

ابومسلم خولانی یہ مراسلہ لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور فرمایا: ''بے شک عثمان مظلوم قتل ہوئے ہیں۔ آپ ان کے قاتل ہمارے حوالے کر دیں۔ آپ ہمارے امیر ہوں گے۔''[2]

اگلے دن جب وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس مسجد میں گئے تو دیکھا کہ دس ہزار افراد اسلحہ پہنے کھڑے ہیں اور آواز لگا رہے ہیں کہ ہم سب قاتلینِ عثمان ہیں۔ ابومسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں آپ کے ساتھ ایسی قوم دیکھ رہا ہوں کہ اس کے ہوتے ہوئے آپ کے بس میں کچھ نہیں۔ میرا گمان ہے کہ انہیں پتا چل گیا ہے کہ میں کس کام کے لیے آیا ہوں۔ پس انہوں نے اس خوف سے کہ کہیں آپ انہیں میرے سپرد نہ کر دیں، ایسا کیا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: ''میں اس معاملے کی ناک اور آنکھ کو پھوڑ چکا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کا آپ کے یا کسی اور کے حوالے کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔''[3]

ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل ناسمجھ یا بالکل عاجز تھے جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف واضح اور درست تھا۔

﴿جواب﴾ آپ کی شروع میں پیش کردہ ''البدایہ والنہایہ'' کی روایت بلاسند ہے۔ اس لیے اس کی کوئی اسنادی حیثیت نہیں ہو سکتی، بلکہ اس میں ابودرداء رضی اللہ عنہ کا ذکر ثابت کرتا ہے کہ روایت جعلی ہے؛ کیوں کہ یہ واقعہ ۳۶ ہجری کا بتایا جا رہا ہے جبکہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ اس سے چار سال قبل ۳۲ھ میں وفات پا چکے تھے۔[4]

دوسری روایت آپ نے ''الاخبار الطوال'' کی پیش کی۔ وہ بھی بلاسند ہونے کی وجہ سے نہایت ضعیف ہے۔ عین ممکن ہے یہ بالکل من گھڑت ہو۔ یاد رہے کہ روافض نے بہت سی روایات اسی لیے گھڑی تھیں تا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کو سبائیوں کے دم پر قائم باور کرا کے لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصل حامی روافض ہی ہیں۔

تاہم اگر مذکورہ روایات کو مان لیا جائے تو ان کی صحیح توجیہ بھی ممکن ہے۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سبائیوں کے آگے بے بس تھے۔ ہاں! حضرت ابومسلم خولانی رحمہ اللہ کو یہ گمان ہوا ہوگا، مگر ضروری نہیں کہ ان کا گمان درست ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جواب سے ظاہر ہے کہ وہ اس معاملے کو پوری بصیرت کے ساتھ سمجھ چکے تھے اور جو کچھ کر رہے تھے سوچ سمجھ کر کر رہے تھے۔ دس ہزار افراد کا ایک جوشیلا نعرہ لگا دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ سب سبائی، سب

---

[1] واخری انت بها ظنین، ایوائک قتلته فهم عضدک ویدک وانصارک وبطانتک وبلغنا الک تبتهل من دمه، فان کنت صادقا فامکنا من قتلته ،نقتلهم به،ونحن اسرع الناس الیک ،والا فلیس لک ولاصحابک عندنا الا السیف ،فوالله الذی لا اله غیره لنطلبن قتلة عثمان فی البر والبحر حتیٰ نقتلهم اوتلحق ارواحنا، والسلام. (الاخبار الطوال، ص ۱٦۲)

[2] "ان عثمان رضی اللہ عنہ قتل مظلوما،فادفع الینا قتلته وانت امیرنا." (الاخبار الطوال، ص ۱٦۳)

[3] فلما کان من الغد دخل الی علی وهو فی المسجد فاذا هو بزهاء عشرة آلاف رجل قد لبسوا السلاح وهم ینادون کلنا قتلة عثمان، فقال ابومسلم لعلی:انی لأری قوما مالک معهم امر ،واحسب انه بلغهم الذی قدمت له ،ففعلوا ذلک خوفا من ان تدفعهم الی. قال علی. انی ضربت انف هذا الامر وعینه فلم ار یستقیم دفعهم الیک ولا الی غیرک. (الاخبار الطوال، ص ۱٦۳)

[4] ان کی وفات کے متعلق دو اقوال ہیں: مشہور قول ۳۲ ہجری کا ہے، دوسرا قول ۳۱ ہجری کا ہے۔ (طبقات ابن سعد: ۳۹۲/۷، ط صادر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل اور سب ہی قابلِ قصاص تھے۔ مدینہ میں شورش کرنے والے زیادہ سے زیادہ اڑھائی تین ہزار تھے۔ پھر ان میں سے بھی اصل قاتل چند ایک ہی تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بعد میں وہ دس ہزار ہو جائیں۔ بالفرض اس ہزار افراد کو سبائی مان بھی لیا جائے تب بھی ہم جانتے ہیں کہ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج ایک لاکھ تک تھی، یہ کیسے ممکن ہے کہ دس ہزار افراد باقی ۹۰ ہزار مخلص مسلمانوں پر غالب ہوں۔

صاف بات ہے کہ یہ دس ہزار افراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عام وفادار سپاہی تھے (ان میں کچھ سبائی بھی ہوں تو اس کا انکار نہیں) ان کا یہ نعرہ لگانا اہلِ شام کے مطالبے کا ایک الزامی جواب تھا۔ یعنی اگر اہلِ شام چند قاتلوں کی بجائے تمام سابقہ باغیوں، ان کے تمام حامیوں اور متعلقین کو بھی قابلِ قصاص سمجھتے ہیں تو پھر انہیں دو تین ہزار افراد سے نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پورے لشکر سے لڑنا ہوگا، کیوں کہ وہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کمان میں ایک قوم اور یک جان ہیں۔

☆☆☆

حدیث وتاریخ سے متصادم ایک قیاسی رائے کی تردید:

﴿سوال﴾ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سبائیوں کا تسلط جنگِ جمل اور صفین کے دوران تھا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے تسلط سے آہستہ آہستہ آزاد ہوتے گئے تھے اسی لیے انہوں نے اپنی صوابدید پر سبائیوں کی نئی شکل خوارج کے خلاف جنگِ نہروان لڑی اور کامیاب رہے۔ اہلِ شام سے اتحاد میں یہی منافق رکاوٹ تھے، اس میں اہلِ شام کی کوئی غلطی نہ تھی۔ پس نہروان میں خوارج کے ختم ہوتے ہی اہلِ شام اور اہلِ عراق ایک ہو گئے۔ ثابت ہوا کہ صرف سبائی اور خوارج اتحاد میں رکاوٹ تھے اہلِ شام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ صحابہ کے مشاجرات کے بارے میں کفِ لسان، سکوت اور توقف شرعاً مطلوب ہے، جس کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس طرح کی مناسب توجیہ کو عام کریں۔

﴿جواب﴾ اہلِ شام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں دین و مذہب کا اختلاف یقیناً نہیں تھا، اصولِ اسلام اور جذبۂ اعلائے دین میں وہ متفق تھے۔ اسی طرح سبائیوں کی شرانگیزی سے بھی انکار نہیں۔ انہی کی غلط اطلاعات پر یقین کر کے اہلِ شام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اہلِ شام اور اہلِ عراق میں فقہی اختلاف بھی اپنی جگہ موجود تھا، اسی وجہ سے اس کش مکش کو اجتہادی اختلاف کہا جاتا ہے۔[1]

جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ جنگِ نہروان سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سبائیوں کے قبضے میں تھے اور اس جنگ میں سبائیوں سے جان چھڑاتے ہی ان کا اہلِ شام سے اتحاد ہو گیا تو یہ توجیہ کئی اعتبار سے غلط ہے۔

گزشتہ سوال کے جواب میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے لے کر اپنی شہادت تک با اختیار حکمران تھے، اسی لیے انہیں خلیفۂ راشد مانا جاتا ہے۔ اگر مذکورہ نئی توجیہ کو مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ ان کی خلافت کا انعقاد جنگِ نہروان کے بعد ہوا، حالاں کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

---

[1] اس فقہی اجتہادی اختلاف کی کافی شافی وضاحت خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے تحت ہو چکی ہے۔

توجیہ کا یہ جزو بھی خلافِ حقیقت ہے کہ جنگِ نہروان کے فوراً بعد اہلِ شام سے صلح ہوگئی۔ ذخیرۂ حدیث وتاریخ کا معتبر حصہ شہادت دیتا ہے کہ اہلِ شام سے کش مکش جنگِ نہروان کے دوران بھی جاری رہی اور اس جنگ کے بعد بھی دو سال تک اہلِ شام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدودِ مملکت میں مداخلت کرتے رہے۔ ①

اگر اہلِ شام کا خانہ جنگی میں کوئی حصہ نہ تھا تو انہیں مشکل مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ مگر اس کے برعکس ۳۶ھ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مشرق میں مصروف تھے، اہلِ شام نے ان کے مغربی صوبے مصر کی سرحد پر حملہ کیا۔ ② شعبان ۳۸ھ میں عین اس وقت جب خلیفۂ راشد خوارج سے جہاد میں مشغول تھے، اہلِ شام نے موقع پا کر ان کے اہم مرکز بصرہ پر قبضے کی کوشش کی جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جرنیل جاریہ بن قُدامہ رضی اللہ عنہ نے ناکام بنایا۔ ③

اس کے بعد دو سال تک اہلِ شام سے سرحدی جھڑپیں وقتاً فوقتاً جاری رہیں۔ ۴۰ھ میں جا کر جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ یہ بھی کوئی باقاعدہ اتحاد یا انضمام نہیں تھا۔ اس کی حیثیت متنازعہ سرحدات کے احترام کی تھی۔ چنانچہ آخر تک دونوں ملکوں کی آمدن، حسابات اور سیاسی وعسکری انتظامات الگ الگ تھے۔ ④

اگر اہلِ شام سے کوئی اختلاف نہ تھا اور بیچ میں صرف سبائی رکاوٹ تھے تو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگِ نہروان میں خوارج کو شکست دینے کے بعد (بقولِ مدعی) سبائیوں سے آزاد ہوگئے تو انہیں چاہیے تھا کہ کسی پس وپیش کے بغیر شام چلے جاتے۔ یا اہلِ شام انہیں آزاد دیکھ کر ان کے پاس چلے آتے اور ان کی بیعت کر لیتے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہونے پر شام میں فوراً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی الگ خلافت کا اعلان ہوگیا۔ ⑤ ظاہر ہے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسا اپنی صوابدید پر کیا تھا نہ کہ سبائیوں کے دباؤ میں آکر۔ پس یہ ثابت ہے کہ ہر کام سبائیوں کے اشارے پر نہیں ہو رہا تھا۔ ان اقدامات کی اصل وجہ عراقی اور شامی اکابر میں غیر معمولی اجتہادی وسیاسی اختلاف تھا۔ حالات کے بگاڑ میں بعض شدید غلط فہمیوں کو بھی دخل تھا جنہیں شر پسند لوگوں نے غلط اطلاعات، تعصب اور جذباتی پن کے ذریعے تقویت دی تھی۔

مشاجرات ایک حقیقت ہیں۔ کوئی عمر بھر ان سے لاعلم رہے، ان کا ایک حرف بھی نہ پڑھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یہ طرزِ عمل نہایت عجیب ہے کہ کفِ لسان، سکوت اور توقف کا عنوان لگا کر ان مسائل کی بال کی کھال اتاری جائے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ صرف متواتر تاریخ بلکہ عقائد، فقہ اور حدیث کے ذخیرے پر بھی پانی پھر جائے اور اسے دین کی خدمت سمجھا جائے۔ حقائق کا انکار عبث ہے۔ ہاں ان اختلافات کی صحیح توجیہات موجود ہیں جو بیان کی جا چکی ہیں۔

☆☆☆

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ طبری، البدایۃ والنہایۃ، الکامل فی التاریخ اور تاریخ الاسلام ذہبی میں ملاحظہ ہوں سن ۳۸، ۳۹، ۴۰ ہجری کے حالات

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۸؛ تاریخ الطبری: ۱۴۰/۵

③ تاریخ الطبری: ۱۶۱/۵ ④ تاریخ الطبری: ۱۰۶/۵

⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۶، ۱۹۷؛ صحیح البخاری، ح: ۷۰۷۸، کتاب الفتن، باب قولہ لا ترجعوا بعدی کفارًا

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر صرف قاتلینِ عثمان پر مشتمل تھا؟

﴿سوال﴾ انٹرنیٹ پر تاریخ کا کورس کرانے والے ایک صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ شام پر حملہ قاتلینِ عثمان نے کیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ محض اس لیے ان کے ساتھ چلے گئے تھے کہ حالات زیادہ خراب نہ ہوں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں یہی قاتلینِ عثمان اور منافقین تھے اور امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ انہی سے لڑے تھے۔ غور فرمائیے کہ یہ کس حد تک درست ہے؟

﴿جواب﴾ یہ توجیہ بظاہر اچھی لگتی ہے؛ کیوں کہ اس کا یہ پہلو بظاہر مثبت ہے کہ صحابہ کے مابین سرے سے جنگ ہوئی ہی نہیں تھی، بلکہ ایک طرف خالص شر پسند تھے اور دوسری طرف خالص اہلِ حق۔

مگر دوسری طرف اس توجیہ کو مان لینے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ اور اس کی مؤید روایات کا انکار ہو جائے کیوں کہ اس سے لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اکثریت فسادیوں اور منافقوں کی تھی، حکم انہی کا چلتا تھا، حتیٰ کہ وہ محاذِ جنگ بھی اپنی مرضی سے طے کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ محض کٹھ پتلی تھے۔ ایسی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد تو کجا، خلیفہ ہی نہیں ٹھہریں گے کیوں کہ حکمرانی کے لیے اختیار شرط ہے۔[①]

یہ نئی رائے نہ صرف متواتر تاریخ بلکہ ذخیرۂ حدیث کے بھی خلاف ہے۔ ان صحیح احادیث پر غور کریں:

بالاتفاق جنگِ صفین کی پیش گوئیوں اور بعد میں اہلِ عراق اور اہلِ شام کی صلح پر محمول کیا ہے، تو واضح دکھائی دیتا ہے کہ ان روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جنگوں میں شریک دونوں فریقوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ "فی اُمتی" "من اُمتی" اور "من المسلمین" فرمایا ہے۔[②]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں لشکر اہلِ ایمان و تقویٰ کے تھے۔ ان میں اگر کچھ لوگ شر پسند تھے بھی، تو ان کی تعداد اتنی معمولی تھی کہ ارشادِ نبوی میں انہیں مستثنیٰ کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

---

① "...فان بايع الناس ولم ينفذ حكمه فيهم لعجزه عن قهرهم لا يصير اماما."
"اگر خلیفہ کی بیعت کر لیں مگر اس کا حکم اس وجہ سے نافذ نہ ہو کہ وہ لوگوں پر قابو پانے سے عاجز ہو تو وہ خلیفہ نہیں رہے گا۔"
(مجمع الانهر في شرح ملتقى الابحر للامام شيخي زاده داماد آفندي: ۱/۶۹۹، ط دار احياء التراث)
قال الماوردي: "وان كان اهل البغي قد نصبوا لانفسهم اماما دخلوا في بيعته وانقادوا لطاعته، فالامام المنصور في ايديهم خارج من الامامة... من خلافه." (الاحكام السلطانية، ص ۳۸، ط دار الحديث القاهرة)

② "ابني هذا سيد و لعل الله ان يصلح به بين طائفتين من المسلمين." (صحيح البخاري، ح: ۲۷۰۴، كتاب الصلح)
"تكون في امتي فرقتان فتخرج من بينهما مارقة يلي قتلهم اولاهم بالحق." (صحيح مسلم، ح ۲۵۰۸، باب ذكر الخوارج، ط دار الجيل)
"...في امتي فئتان عظيمتان دعواهما واحدة" (التمهيد لما في الموطا من المعاني والاسانيد، لابن عبدالبر: ۲۳/۳۲۸، ط المغرب)
"تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها اولى الطائفتين بالحق." (صحيح مسلم، ح: ۲۵۰۷)
"لا تقوم الساعة حتى تقتتل فئتان عظيمتان من المسلمين دعواهما واحدة ولاهما بالحق تطلب فبينما هم كذلك اذ مرقت منهم مارقة ... من الدين كما يمرق السهم من الرمية" (مسند الحميدي، ح: ۷۶۶)
"لا تقوم الساعة حتى تقتتل فئتان عظيمتان ويكون بينهما مقتلة عظيمة دعواهما واحدة" (صحيح مسلم، ح: ۴۳۸)

جنگ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی ثابت ہے کہ: ''قتلانا و قتلاهم فی الجنة.''[1]

یعنی فریقین کے مقتولین جنتی ہیں۔ اس سے دونوں فوجوں کا عادل، متقی اور جنتی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر عراقی فوج کی اکثریت سبائی، بے دین اور منافق ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسا ہرگز نہ فرماتے۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائب حضرت ابو مسعود کوفی رضی اللہ عنہ کا خطبہ بھی سامنے رکھنا چاہیے جس میں انہوں نے لوگوں کو جنگِ صفین کے لیے نکلنے کی ترغیب دی تھی۔[2] یہ بھی مستند روایات سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے مختلف حصے نامور صحابہ اور تابعین کی قیادت میں تھے، اسماء الرجال کی کتب میں وضاحت ہے کہ جلیل القدر صحابہ اور تابعین نے عملاً جنگ میں شرکت کی تھی۔[3] پھر جنگ بندی کا واقعہ تو صحیح بخاری میں ہے جس کے مطابق جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ بندی کا اعلان کیا تو ان کا حکم مانا گیا اور سارے عراقی لشکر نے جنگ روک دی۔[4] تاریخی روایات کے مطابق فقط اَشتر نخعی اور قراء نے جو بعد میں خوارج بنے، اعتراض کیا مگر حکم سے سرتابی وہ بھی نہ کر سکے؛[5] کیونکہ اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفاداروں کی تھی، اس لیے اقلیتی شرپسند جماعت کی نہ چل سکی۔ اگر اکثر عراقی فوج ''باغیوں'' کی ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکم کیسے نافذ ہو سکتا تھا؟

غرض یہ کہنا بالکل بے بنیاد ہے کہ شام پر حملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرضی کے بغیر قاتلینِ عثمان نے کیا تھا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ محض لڑائی رکوانے ساتھ گئے تھے۔ یہ دور کی کوڑیاں درحقیقت خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ صحابہ کا مقام اتنا بلند اور دلائلِ قطعیہ کی بدولت اتنا محفوظ ہے کہ اس کے دفاع کے لیے ایسے سفسطی قیاسات، بودے دلائل اور فضول توجیہات کا سہارا لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆☆☆

---

① مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۸۸۰، ط الرشد

② مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۳۷۷۸۴ بسند حسن، ط الرشد

③ تاریخ الاسلام ذهبی: ۳/۵۶۵ : تاریخ خلیفة ص ۱۹۳، ۱۹۶، الثقات لابن حبان: ۳ / ۴۰۰، الاصابة: ۲/ ۳۹۴، طبقات ابن سعد: ۶ / ۲۸، الاصابه: ۳/ ۲۵۴، اسد الغابة: ۱/ ۴۴۸، التاریخ الاوسط: ۱/ ۹۷، الاستیعاب: ۱ / ۷۷

④ صحیح البخاری، ح: ۴۱۸۹، کتاب المغازی، باب غزوة الحدیبیة، مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۳۷۹۱۴، ط الرشد

⑤ انساب الاشراف، بلاذری: ۲/ ۳۳۴، تاریخ الطبری: ۵/ ۵۴، ۵۵

حدیث عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ پر چند شبہات

﴿سوال﴾ جنگ صفین میں حضرت عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس بارے میں طبری، متدرک حاکم اور مسند ابی یعلیٰ میں ایک مفصل روایت ہے جس کے مطابق عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں یہی حدیث یاد دلاتے ہوئے کہا:
''اباجان! آپ نے اس شخص کو قتل کر دیا حالاں کہ ان کے بارے میں حضور ﷺ نے کچھ فرمایا تھا۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا فرمایا تھا؟ صاحبزادے نے کہا: کیا آپ اس وقت ہمارے ساتھ نہ تھے جب ہم مسجد نبوی تعمیر کر رہے تھے۔ لوگ ایک ایک اینٹ اٹھا کر لاتے تھے۔ عمار دو دو اینٹیں اٹھا کر لاتے تھے۔ اس وجہ سے ان پر غشی طاری ہوگئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سُمَیّہ کے بیٹے! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ روایت حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو سنائی تو انہوں نے ایک ناموزوں جملہ کہا یعنی:
''تم پاگل بڈھے ہو، اپنے پیشاب میں پھسل کر دن بھر حدیثیں سناتے رہتے ہو۔''
پھر کہنے لگے: ''عمار کو انہی لوگوں نے قتل کیا ہے جو انہیں لے کر آئے تھے۔''[1]

کیا یہ روایات درست ہیں؟۔ ان کی اسناد کا معیار کیا ہے؟ اِن سے اہلِ شام کا ''خروج'' ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف مذکورہ نامناسب جملے کی نسبت درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بلاشبہ صحیح حدیث ''تقتلک الفئة الباغیة'' سے عمار رضی اللہ عنہ کے قاتلوں پر ''خروج'' کا اطلاق ثابت ہے۔ نیز جنگِ صفین میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا شامی فوج کے ہاتھوں قتل ہونا، ان کی شہادت پر حضرت مُعاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی گفتگو اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اہلِ شام کو ''الفئة الباغیة'' ماننے سے انکار بھی ثابت ہے۔

مگر سوال میں جو روایات پیش کی گئی ہیں، وہ محلِ نظر ہیں۔ طبری کی روایت کی سند میں عطاء بن مسلم ضعیف ہیں۔[2] یہی عطاء بن مسلم مستدرک والی روایت میں بھی ہیں۔ مسند ابی یعلیٰ والی مذکورہ روایت کی سند میں اسماعیل بن موسیٰ الفزاری ''صدوق شیعی'' ہیں، مگر کمزور پہلو یہ ہے کہ ان پر رفض کی تہمت بھی ہے۔[3]

پھر ان روایتوں کی سب سے کمزور بات یہ ہے کہ عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث یاد

---

① تاریخ طبری: ۴۱/۵ ، مستدرک حاکم، ح: ۵۶۶۰ ، مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۳۵۱
② میزان الاعتدال: ۷۶/۳
③ تقریب التہذیب، ترجمہ نمبر: ۴۹۲

دلاتے ہوئے کہا: ''کیا آپ اس وقت ہمارے ساتھ نہ تھے جب ہم مسجد نبوی بنا رہے تھے۔''

حالاں کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کی تعمیر کے کئی سال بعد اسلام لائے تھے۔ ان کا مسجد نبوی کی تعمیر میں شرکت کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ان روایتوں کا بعض جعلی اضافوں پر مشتمل ہونا واضح ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منسوب رکیک فقرے ''دُحِضْتَ فی بولک.'' کو اضافہ ہی سمجھنا چاہیے۔ ①

صحیح الاسناد روایات، ایسے ناموزوں جملے اور رکیک الفاظ سے پاک ہیں۔ یہ صحیح روایتیں ملاحظہ ہوں:

❶ عبداللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں صفین سے واپسی پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے اور عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے درمیان چل رہا تھا کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابا جان! کیا آپ نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا: سمیہ کے بیٹے افسوس کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔''

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا:

''آپ سن نہیں رہے یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم ہمیشہ ناگوار باتیں لاتے رہتے ہو۔ کیا عَمار کو ہم نے قتل کیا ہے؟ انہیں تو ان لوگوں نے مروایا ہے جو اُن کو لے کر آئے۔'' ②

❷ حنظلہ بن خویلد کہتے ہیں کہ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا کہ دو آدمی حضرت عَمار رضی اللہ عنہ کے سر کے بارے میں جھگڑتے ہوئے آئے۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ میں نے انہیں قتل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک دوسرے کے بارے میں دلی تسلی رکھے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا تھا کہ انہیں (حضرت عَمار رضی اللہ عنہ کو) باغی گروہ قتل کرے گا۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا ''تو پھر آپ ہمارے ساتھ کیوں ہیں؟''

وہ بولے ''میرے والد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ جب تک تیرے والد زندہ رہیں ان کی اطاعت کرنا ان کی حکم عدولی نہ کرنا۔ اس لیے (والد محترم کے حکم کے تحت) میں آپ کے ساتھ ہوں مگر میں لڑائی میں شرکت نہیں کر رہا۔'' ③

---

① یا یہ اضطراری کیفیت میں صادر ہونے والا ایک جملہ سمجھا جائے گا۔

نوٹ: علامہ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کی شرح بخاری دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس روایت کے مختلف طرق کو جمع کر دیا ہے اور ایک وقیق بحث کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مسجدِ نبوی کی ابتدائی تعمیر کا واقعہ نہیں بلکہ یہ جدید تعمیر تھی جو عام الوفود میں اس وقت ہوئی تھی جب اسلام کے ہر طرف پھیلنے اور اسلام قبول کرنے والوں کی بکثرت آمد کے سبب مسجد تنگ پڑ گئی تھی۔ (فتح الباری، ابن رجب: ۳/۳۰۲، ۳۰۳، ط دار الحرمین قاہرہ)

ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کی تحقیق کو مانا جائے تو پھر یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث کب سنی؟ کیوں کہ انہوں نے ۷ھ میں اسلام قبول کیا تھا جبکہ عام الوفود ۹ھ ہے۔

② مسند احمد، ح: ۶۴۹۹، ۶۹۲۶ باسناد صحیح

③ مسند احمد، ح: ۶۲۹۵، ۶۵۳۸، ۶۹۲۹ باسناد صحیح، ط الرسالۃ ؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۴۵، ط الرشد

﴿سوال﴾: کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو الفئۃ الباغیۃ والی روایت کا علم نہ تھا؟ اگر تھا تو پھر اپنی غلطی کی توجیہ کیوں کی؟ کیا یہ توجیہ درست تھی؟

﴿جواب﴾: حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس روایت سے بخوبی آگاہ تھے۔ ایک بار حضرت عمار رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس دوران دعا فرمائی: ''الٰہی! عمار کی موت ہمارے ہاتھوں نہ ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔''[1]

اور یہی وجہ تھی کہ صفین کے میدان میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد جب انہیں یہ حدیث یاد دلائی گئی تو انہوں نے اس روایت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کے معنیٰ میں دوسرا احتمال پیش کیا اور توجیہ کی۔

مسند احمد کی صحیح روایت ہے کہ جب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ قتل ہوئے تو عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا: ''عمار قتل ہو گئے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔''

عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھتے ہوئے گھبرا کر اٹھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' کہا: ''عمار قتل ہو گئے؟'' حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمار قتل ہو گئے تو کیا ہوا۔'' وہ بولے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔'' حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا عمار کو ہم نے قتل کیا ہے؟ انہیں تو علی اور ان کے اصحاب نے مروایا ہے۔ وہ ان کو لائے اور ہمارے نیزوں کی زد میں ڈال دیا۔''[2]

اگرچہ جمہور علماء اس توجیہ کو درست نہیں سمجھتے، مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حالات کو جس طرح دیکھ رہے تھے اور جیسا پریشانی، اضطراب اور جذبات کا وقت تھا اس کے لحاظ سے انہیں ایسا سوچنے یا کہہ دینے میں معذور سمجھا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ شرعاً کسی مسلمان گروہ سے قتال کے جواز کی دو ہی صورتیں ہیں: ● وہ ڈاکو یا رہزن ہوں۔ ❷ باغی ہوں۔ یہاں فریقین میں سے کسی کے لیے بھی (نعوذ باللہ) پہلی صورت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس دوسری صورت متعین ہو جاتی ہے۔ یعنی صفین کی جنگ اس نکتے پر مبنی تھی کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کو ''باغی'' سمجھتا تھا اور ہر ایک کے لیے جنگ کی واحد وجہِ جواز یہی تھی۔ اس کے سوا شرعاً کوئی وجہِ جواز نہیں بن سکتی۔

اہلِ عراق کے نزدیک اہلِ شام باغی تھے؛ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بن چکے تھے، خلیفہ کی اطاعت سے انکار کرنا اور ایک علاقے پر قابض ہونا خروج تھا۔ اس لیے خلیفہ کے ساتھ مل کر باغیوں سے لڑنا مشروع تھا۔ اہلِ شام کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ (خلافت کی اہلیت رکھنے کے باوجود) خلیفہ مقرر نہیں تھے بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج میں ملوث تھے اور ان سے بغاوت کرنے والوں کی مدد سے اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔[3] پس اہلِ شام جو سابق خلیفہ کے

---

① مجمع الزوائد، روایت نمبر: ۱۵۶۱۳

② مسند احمد، ح: ۱۷۷۷۸، مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۱۷۵ باسناد صحیح، مصنف عبدالرزاق، ح: ۲۰۴۲۷، مستدرک حاکم، ح: ۲۶۶۳

③ قال الامام ابن تیمیۃ: "وکان ھذا مما دعاھم الیٰ ترک مبایعتہ لما اعتقدوا انہ ظالم وانہ من قتلۃ عثمان وانہ آوی قتلۃ عثمان لموافقتہم علیٰ قتلہ (منہاج السنۃ: ۴/۴۰۶)

حامی اوران کے قصاص کے لیے کھڑے تھے، اہلِ عراق کو باغی سمجھتے تھے۔غالباًان کے پیشِ نظر یہ حدیث بھی ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''ان کے قدموں کے نیچے سے ایک فتنہ ظاہر ہوگااوراس موقع پر عثمان اوران کے پیروکار ہدایت پر ہوں گے۔''[1]

جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کواپنی معلومات اوراپنے زاویہ نگاہ سے دکھائی دینے والے حالات کے تحت پختہ یقین تھا کہ ہم برحق اور اہلِ عراق باغی ہیں،تو حدیثِ عمار سن کروہ اپنے محسوسات ومشاہدات تبدیل نہ کر سکے اورانہوں نے ''الفئۃ الباغیۃ'' کے لفظ کوانہی لوگوں پر محمول کیا جنہیں وہ پہلے سے ''باغی'' یقین کیے ہوئے تھے اوراسی لیے ان کے ذہن میں حدیث کے اصل مطلب کی جگہ یہ دور کا احتمال آ گیا کہ ''عمار کوقتل کرنے والے سے مراد وہ گروہ ہے جوقتل کی وجہ بنا ہے'' گویاان کی شہادت کے اصل ذمہ دار وہی لوگ ہیں جن کے ہمراہ وہ میدانِ جنگ میں آئے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف ایک اورتاویل بھی منسوب کی ہے۔وہ یہ کہ ''الفئۃ الباغیۃ'' سے مراد ''قصاص طلب کرنے والی جماعت'' ہے۔قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے تاویل کر کے اس لفظ (الباغیۃ) کو ''طلب'' کے معنیٰ پر محمول کرلیا۔وہ اس سے پہلے (ایک اورتاویل کے طور پر) یہ بھی کہہ چکے تھے کہ ''عمار کواسی نے قتل کیا ہے جوانہیں لے کرآیا۔'' تاکہ وہ خود سے اس صفت (الفئۃ الباغیۃ) کوزائل کریں۔پھروہ اس دوسری تاویل کی طرف چلے گئے۔''[2]

☆☆☆

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی تاویل کے متعلق علمائے اُمت کی آراء:

﴿سوال﴾ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اس تاویل (عمار رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ اوران کے اصحاب نے مروایا ہے) کے بارے میں علمائے اُمت کی کیارائے ہے؟

﴿جواب﴾ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اس تاویل کوعلمائے اُمت نے قبول نہیں کیا۔فقط مروانی (ناصبی) گروہ اس تاویل کو درست قرار دیتا تھا۔نیز آج کل کچھ ''متجددین'' اس تاویل کی تصویب کے لیے کوشاں ہیں مگر چودہ صدیوں سے جمہور کی اس بارے میں ایک ہی رائے ہے جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جی ہاں! نبی ﷺ کے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد ''تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا'' کی اہلِ شام نے جوتاویل کی وہ باطل تاویل ہے۔انہوں نے کہا کہ ہم نے عمار کوقتل نہیں کیا بلکہ انہیں اسی نے قتل کیا جوانہیں لایااورہمارے نیزوں کے سامنے ڈال دیا۔یہ ایسی باطل تاویل ہے جوکہ لفظ کی حقیقت کے بھی خلاف ہےاور

---

① مسند احمد، روایت نمبر: ۱۸۰٦۷: ۲۰۸/۲۹ بسند صحیح

② " لکن معاویۃ تاوّلہ علی الطلب،وقد کان قبل ذالک قال:انما قتلہ من جاء بہ، لینفی عن نفسہ ھذہ الصفۃ، ثم رجع الیٰ ھذ الوجہ الآخر."(اکمال المعلم بفوائد مسلمؒ :۳۵۹/۸)

اس کے ظاہر کے بھی۔ کیوں کہ عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل تو وہی تھا جس نے انہیں قتل کیا نہ کہ وہ جس نے ان سے مدد لی تھی۔‘‘[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’مجھے نہیں معلوم کہ ائمہ اربعہ یا اہلِ سنت ان جیسی ہستیوں میں سے کوئی ایک بھی اس قول کا قائل ہو۔ ہاں مگر بہت سے مروانیوں (ناصبیوں) اوران کے ہم نوالوگوں کا یہ قول ہے۔‘‘[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے قول کے جواب میں فرمایا تھا کہ پھر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا ہوگا جب انہیں (جہاد کے لیے) نکالا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ایسا الزامی جواب ہے جس کا کوئی جواب نہیں، یہ ایسی حجت ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔‘‘[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ انہیں اس نے قتل کیا ہے، جو انہیں ہماری تلواروں کے سامنے لایا ہے، نہایت بعید تاویل ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر امیر کو ان مجاہدین کا قاتل ماننا پڑے گا جو اللہ کے راستے میں شہید ہوں، کیوں کہ وہی انہیں دشمنوں کی تلواروں کے سامنے لے گیا۔‘‘[4]

☆☆☆

حدیث کے الفاظ ’’الناكبة عن الطريق‘‘ کی بنیاد پر مسلکِ جمہور پر اشکال:

﴿سوال﴾ حدیث میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والی الفئۃ الباغیۃ کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ راہِ حق سے برگشتہ ہوں گے۔ ’’تقتله الفئة الباغية، الناكبة عن الطريق.‘‘[5] اہلِ شام اہلِ ایمان اور مجتہد تھے۔ اس حدیث کا اطلاق بھلا ان پر کیسے ہوسکتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ الفئۃ الباغیۃ وہی جماعت ہوگی جو بے دین، گمراہ، فاسق وفاجر، ملحد اور کافر تھی۔ صحابہ ایسے نہ تھے لہٰذا ان کا کوئی گروہ الفئۃ الباغیۃ کا مصداق نہیں بن سکتا۔

[1] "نعم التاويل الباطل تاويل اهل الشام قوله صلى الله عليه وسلم لعمار تقتلك الفئة الباغية، فقالوا نحن لم نقتله انما قتله من جاء به حتى اوقعه بين رماحنا، فهذا هو التاويل الباطل المخالف لحقيقة اللفظ وظاهره. فان الذى قتله هو الذى باشر قتله، لا من استنصر به." (الصواعق المرسلة: 1/184، 185)

[2] وهذا القول لا اعلم له قائلا من اصحاب الائمة الاربعة ولا نحوهم من اهل السنة، ولكن هو قول كثير من المروانية ومن والاهم. (منهاج السنة: 4/206)

[3] وقد اجاب على عن قول معاوية بان قال: فرسول الله صلى الله عليه وسلم اذن قتل حمزة حين اخرجه. وهذا من على الزام لا جواب عنه وحجة لا اعتراض عليها. (التذكرة باحوال الموتى وامور الآخرة، باب، جاء ان عثمان لما قتل، دار المنهاج، رياض)

[4] قول معاوية انما قتله من قدمه الى سيوفنا، تاويل بعيد جدا، اذ لو كان كذلك لكان امير الجيش هو القاتل للذين يقتلون فى سبيل الله، حيث قدمهم الى سيوف الاعداء. (البداية والنهاية: 7/221)

[5] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ح: 15634

﴿جواب﴾ اوّل تو ''الناكبة عن الطريق'' کے اضافے والی روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی مسلم بن کیسان الاعور متروک ہے۔[1] یہ اضافہ ان صحیح روایات میں قطعاً نہیں جن سے جمہور استدلال کرتے ہیں۔

پھر اگر کسی عالم نے استدلال کی تقویت کے لیے ضمناً ''النـــاكبة'' والی روایت لے لی ہو تو اس سے صحیح روایات کا مجموعی مفہوم اور اس پر قائم اجماعی مذہب متاثر نہیں ہوتا اور اس سے جمہور کے اس مسلک پر کہ اہلِ جمل اور اہلِ شام باغی تھے، کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ جمہور علماء نہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات نعوذ باللہ بے دین اور گمراہ تھے اور نہ ہی ''الناكبة عن الطريق'' کا لفظ کسی کے گمراہ یا بے دین ہونے میں صریح ہے۔ بلکہ اس کا لغوی مطلب ہے ''راہ سے ہٹا ہوا۔'' اس مفہوم کا اطلاق اجتہادی غلطی پر بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا مطلب کبیرہ گناہ، الحاد یا فسق ہو۔

یہ بڑی عجیب منطق ہے کہ ایک حدیث کے الفاظ میں دوسرے معنیٰ کا پورا احتمال ہوتے ہوئے بھی اس کا مطلب کھینچ تان کر ایسا متعین کر دیا جائے جو اسلام کے خلاف ہو۔ پھر اس مفہوم پر اصرار کرتے ہوئے جمہور علماء کے مذہب ہی کو گمراہی قرار دے دیا جائے جبکہ انہوں نے صحیح تاویل کے ساتھ صحیح معنیٰ مراد لیا ہے نہ کہ کوئی خلافِ اسلام مفہوم۔

☆☆☆

بخاری کے الفاظ ''يَدْعُوهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُونَهُ اِلَى النَّارِ'' پر اشکال:

﴿سوال﴾ چلیے ''الناكبة عن الطريق'' والی روایت ضعیف سہی مگر بخاری میں ''الفئة الباغية'' کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جہنم کی طرف بلاتی ہوگی ''ويح عمار، تقتله الفئة الباغية، يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار'' اہلِ شام مؤمن اور اصحابِ اجتہاد تھے۔ ''دعوت الی النار'' کا اطلاق بھلا ان پر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ''الفئة الباغية'' وہی جماعت ہوگی جو دوزخ کی طرف بلانے والی ہوگی یعنی کافر، فاسق اور بے دین۔

﴿جواب﴾ صحیح بخاری ماشاء اللہ بارہ صدیوں سے محدثین اور شراحِ حدیث کے ہاتھوں میں ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حدیث کا یہ مفہوم سمجھ میں نہ آسکا جو آں جناب نے سمجھا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس روایت کا اطلاق اہلِ شام ہی پر ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان میں صحابہ کرام بھی تھے تو ان پر ''دعوت الی النار'' کا اطلاق کیسے درست ہو سکتا ہے؟ تو اس کے کئی جوابات موجود ہیں۔ کسی ایک کو بھی سمجھ لیں تو صحابہ کے دین و ایمان پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

① پہلا اور بے تکلف جواب یہ ہے کہ فصیح و بلیغ کلام میں ہر جگہ حقیقی معنیٰ نہیں بلکہ بارہا مجازی معنیٰ بھی مراد ہوتا ہے۔ یہاں ''الجنة'' سے مجازاً امن و امان، اور اتحاد و اتفاق ہے۔ پُر امن جگہ کو ''جنت'' سے تعبیر کرنا عام بات ہے۔

بہشت آنجاست کہ آزارے نباشد .... کسے را با کسے کارے نباشد

اور جنگ کو ''النار'' (آگ) سے تعبیر کرنا بھی عام ہے: كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ.[2]

---

① میزان الاعتدال: ۱۰۶/۴

② ''یہ جب بھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔'' (سورۃ المائدۃ، آیت: ۶۴)

پس مطلب بالکل صاف ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ایسی چیز کی طرف دعوت دے رہے تھے جس سے امن وامان قائم ہوتا، یعنی اہلِ شام بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے تو مسلمان متحد ہو جاتے، جنت جیسا پرسکون ماحول میسر آ جاتا۔ مگر اہلِ شام کا بیعت سے انکار کرنا، جنگ کا باعث بن رہا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ اقدام مجتہدانہ تھا مگر اس کا نتیجہ آتشِ جنگ بھڑکنے کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔ اور آخر میں یہی ہوا۔ ''یدعوھم الی الجنة ویدعونه الی النار'' کا یہ بے تکلف مطلب سمجھ لینے کے بعد صحابہ کے دین وایمان بلکہ اجتہاد پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔

② دوسرا جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا ہے اور اہلِ علم کے ہاں بہت مشہور ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اگر کہا جائے کہ عمار رضی اللہ عنہ کا قتل صفین میں ہوا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور جنہوں نے قتل کیا وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے ساتھ صحابہ کی بھی ایک جماعت تھی، تو یہ کہنا کیسے جائز ہوگا کہ وہ لوگ جہنم کی طرف بلا رہے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات (اہلِ شام بھی اپنے طور پر تو) یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ جنت کی طرف بلا رہے ہیں۔ وہ سب اس معاملے میں مجتہد تھے، ان پر اپنے خیال کی پیروی میں کوئی ملامت نہیں۔ تو جنت کی طرف بلانے سے مراد جنت کے سبب کی طرف بلانا ہے، اور وہ تھا حکمران کی اطاعت۔ اسی طرح عمار رضی اللہ عنہ انہیں علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی طرف بلا رہے تھے، اور وہ حکمران تھے جن کی اطاعت اس وقت واجب تھی۔ اور وہ حضرات (اہلِ شام) اس کے خلاف بلا رہے تھے، لیکن وہ اس تاویل کی وجہ سے معذور تھے جو ان پر ظاہر تھی۔''[1]

③ تیسرا جواب یہ ہے کہ ''یدعوھم الی الجنة ویدعونه الی النار'' کا اضافہ اس حدیث میں ثابت نہیں۔[2]

---

① فتح الباری: ۱/۵۴

② اس مسئلے میں احادیث دو قسم کی ہیں: ایک حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی۔ دوسری صحابہ کی ایک بڑی جماعت کی۔
ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایات مرسل ہیں، انہوں نے خود تصریح کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے الفئة الباغیة والی روایت نہیں سنی۔ اس کے باوجود کبھی وہ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے یہ روایت سناتے ہیں اور کبھی درمیانی واسطے (حضرت ابوقتادہؓ) کا نام لے کر۔ سند میں اس فرق کے علاوہ ان کی روایت کے متن میں بھی فرق ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث دو طرح سناتے ہیں۔
کبھی یوں سناتے ہیں: تقتله الفئة الباغية، يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار.
مگر اکثر یوں سناتے ہیں: ''تقتله الفئة الباغية.'' یعنی وہ ''يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار'' کا اضافہ اکثر اوقات نقل نہیں کرتے۔
نیز صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت بھی اس حدیث کو اس طرح نقل کرتی ہے کہ کہیں بھی ''يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار'' نہیں آتا۔
اس طرح حقیقت میں یہ دو حدیثیں ہیں: ایک ''تقتل عمارا الفئة الباغية.'' جسے صحابہ اس کثرت سے نقل کر رہے ہیں کہ یہ خبر متواتر بن جاتی ہے۔
دوسری ''يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار.'' والی روایت جو مراسیلِ صحابہ میں شمار ہوتی ہے اور اس کا متن متواتر نہیں۔
شارحینِ حدیث نے زیرِ بحث مسئلے میں ان روایات کو اصل مدار بنایا ہے جس میں ''يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار'' والے الفاظ نہیں ہیں۔ ان روایتوں کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی سند اعلیٰ اور مرفوع ہے۔ حاصل یہ کہ اکثر صحابہ سے اور خود ابوسعید خدری سے بھی اکثر جگہ الفئة الباغية والی روایت اس طرح منقول ہے کہ اس میں ''يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار'' والا یہ جملہ نہیں ہے۔
ہماری تلاش کے مطابق یہ روایت ۲۰ سے زائد صحابہ سے منقول ہے اور کتبِ حدیث میں تقریباً ڈھائی سو مقامات پر مذکور ہے۔ استیعاب یہاں ممکن نہیں۔ تاہم ایک جھلک پیشِ خدمت ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

عام محدثین "ویح عمار، تقتلہ الفئۃ الباغیۃ، یدعوھم الی الجنۃ ویدعوھم الی النار." کے الفاظ کو ثابت مانتے ہیں، مگر وہ ان کی مناسب تاویلات کرتے ہیں جو پیچھے گزر چکی ہیں۔ پس حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کے متعلق کوئی ایسی بات لازم نہیں آتی جو اسلامی عقائد کے خلاف ہو۔ ہاں ان کی خطا ثابت ہوتی ہے جو اسلامی اصول کے خلاف نہیں؛ کیوں کہ یہ اسلامی عقیدہ نہیں کہ صحابہ کرام خطاؤں سے معصوم تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

1. **عن ام سلمۃ** رضی اللہ عنہا: (صحیح مسلم، ح: ۷۵۰۶،۷۵۰۸، کتاب الفتن؛ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۶۹۹۰؛ مصنف عبدالرزاق، ح: ۲۰۴۲۶؛ مسند احمد، ح: ۲۶۳۸۲، ۲۶۵۶۳، ۲۶۶۵۰، ۲۶۶۸۰؛ مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۷۰۳؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۲۱۷، ۸۴۹۰، ۸۴۹۱، ۸۴۹۲، ۸۴۹۳؛ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۸۵۱؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۶۳/۲۳)
2. **عن ابی سعید الخدری** رضی اللہ عنہ: (صحیح مسلم، ح: ۷۵۰۳ بلفظ: تقتلک فئۃ باغیۃ، کتاب الفتن؛ مسند احمد، ح: ۱۱۰۱۱، ۱۱۲۲۱؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۴۹۴، ۸۴۹۵؛ مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۲۲۸۲، ۲۳۴۷؛ مسند احمد، ح: ۱۱۱۶۶)
3. **عن ابی قتادۃ** رضی اللہ عنہ: (مسند احمد، ح: ۲۲۶۰۹، ۲۲۶۱۰؛ الآحاد والمثانی، ح: ۱۸۷۰؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۴۹۵)
4. **عن ابی ہریرۃ** رضی اللہ عنہ: (سنن الترمذی، باب مناقب عمّار)
5. **عن عمرو بن العاص** رضی اللہ عنہ: (مسند ابن الجعد، ح: ۱۱۷۵، ۱۲۲۲، ۱۶۲۱؛ مسند احمد، ح: ۱۷۷۶۶؛ مسند اسحق بن راھویہ، ح: ۱۸۷۷، ۱۹۱۸؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۵۱، ۳۷۸۶۷؛ مصنف عبدالرزاق، ح: ۲۰۴۲۷؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۳۰/۱۹)
6. **عن عبداللہ بن عمرو** رضی اللہ عنہ: (مسند احمد، ح: ۶۴۹۹، ۶۵۳۸، ۶۹۲۶، ۶۹۲۹؛ مسند البزار، ح: ۲۳۶۸؛ مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۸۴۵؛ السنن الکبریٰ للنسائی، روایت نمبر: ۸۴۹۶، ۸۴۹۷، ۸۴۹۸؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۱/۱۹)
7. **عن عمرو بن حزم** رضی اللہ عنہ (مسند احمد، روایت نمبر: ۱۷۷۷۸)
8. **عن خزیمۃ بن ثابت ذوالشہادتین** رضی اللہ عنہ: (مصنف ابن ابی شیبہ، روایت نمبر: ۳۷۸۷۵؛ مسند احمد، روایت نمبر: ۲۱۸۷۳؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۸۵/۴)
9. **عن عبداللہ بن ابی الہذیل** رضی اللہ عنہ: (مسند طیالسی، روایت نمبر: ۶۸۳؛ مسند احمد، روایت نمبر: ۱۰۱۷؛ مسند الحارث، روایت نمبر: ۱۰۱۸)
10. **عن زید بن ابی اوفی** رضی اللہ عنہ: (الآحاد والمثانی، روایت نمبر: ۲۷۰۷؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲۰/۵)
11. **عن انس بن مالک** رضی اللہ عنہ (المعجم الاوسط، روایت نمبر: ۶۳۱۵)
12. **عن عمّار بن یاسر** رضی اللہ عنہ: (المعجم الاوسط، روایت نمبر: ۷۵۲۶)
13. **عن عثمان بن عفان** رضی اللہ عنہ (المعجم الصغیر، روایت نمبر: ۵۱۶)
14. **عن ابی رافع** رضی اللہ عنہ: (المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۲۰/۱)
15. **عن ابی ایوب** رضی اللہ عنہ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۶۸/۴)
16. **عن زیاد بن المفرد و ابی الیسر** رضی اللہ عنہما (المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۶۶/۵)
17. **عن ابی الیسر** رضی اللہ عنہ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۲۰/۱۹، ۱۲۱)
18. **عن حذیفۃ وابی مسعود** رضی اللہ عنہما: (مسند البزار، روایت نمبر: ۲۹۴۸)
19. **عن معاویۃ بن ابی سفیان** رضی اللہ عنہ: (المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۹۶/۱۹)

الفئۃ الباغیۃ والی روایت کو ان مقامات پر کہیں بھی دیکھ لیں اس میں "یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار" کے الفاظ نہیں ہوں گے۔
صحیح بخاری کے علاوہ "یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار." والا اضافہ صرف دو جگہ پایا گیا ہے:

1. مسند احمد، روایت نمبر: ۱۱۸۶۱ عن ابی سعید مرسلاً
2. صحیح ابن حبان، روایت نمبر: ۷۰۷۸، ۷۰۷۹ عن ابی سعید مرسلاً

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

المارقہ، الفئۃ الباغیۃ اور خوارج کا مصداق کون؟

﴿سوال﴾ "الفئۃ الباغیۃ" کا مصداق درحقیقت خوارج ہیں۔ ''کنز العمال'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے خارجی سردار کو فرمایا تھا: ''یقتل فی الفئۃ الباغیۃ۔'' ①

دیگر روایات میں خوارج کو ''المارقۃ'' بھی کہا گیا ہے یعنی دین سے نکل جانے والے۔ ②

المارقۃ اور الفئۃ الباغیۃ کا مطلب قریب قریب ہے۔ پس جس طرح ''المارقۃ'' خوارج تھے اسی طرح ''الفئۃ الباغیۃ'' بھی وہی تھے۔ حافظ ابن حجر، امام نووی اور ملا علی قاری وغیرہ اہلِ شام پر اس کا اطلاق کس بنیاد پر کرتے ہیں؟

﴿جواب﴾ اکابرِ اسلام یہ اطلاق متواتر احادیث، فقہی قواعد اور ثابت شدہ واقعات کے تحت کرتے ہیں، جن کا انکار ممکن نہیں، سوائے اس کے کہ تاریخ وحدیث کی صحیح روایات کو بھی نا قابلِ اعتماد قرار دے دیا جائے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

چونکہ یہ دونوں روایات مرسل ہیں اور مرفوع روایات میں یہ الفاظ نہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً اصل حدیث میں یہ الفاظ نہیں تھے۔ بعض محققین کے مطابق بخاری شریف کے اصل قدیم نسخوں میں یہ حدیث اس طرح تھی: ''ویح عمار، یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار۔''
یہ ایک الگ حدیث تھی جسے الفئۃ الباغیۃ یعنی اہلِ شام کے مسئلے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بعد میں نسخوں میں اختلاف کی وجہ سے دو حدیثیں خلط ملط ہو گئیں۔ نقل کی غلطی کی وجہ سے ''تقتلہ الفئۃ الباغیۃ'' بھی اسی کے بیچ میں مندرج ہو گیا اور روایت یوں بن گئی:

ویح عمار، تقتلہ الفئۃ الباغیۃ، یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار۔

بخاری کی سب سے قدیم شرح میں جو اندلس کے نامور محدث ابن بطال رحمہ اللہ (م ۴۴۹ھ) نے پانچویں صدی ہجری میں لکھی، اس حدیث کے الفاظ کو یونہی نقل کیا ہے: "ویح عمار، یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار۔" (شرح بخاری، ابن بطال: ۵/۲۷)
اسی لیے مشہور محدث امام حمیدی (م ۴۸۸ھ) نے بھی بخاری اور مسلم کی روایات کے مجموعے ''الجمع بین الصحیحین'' میں ان زائد الفاظ (تقتلہ الفئۃ الباغیۃ) کو نقل نہیں کیا۔ حمیدی اس حدیث کو یوں بیان کرتے ہیں: "ویح عمار، یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار"...... پھر فرماتے ہیں:
''اس حدیث میں ایک مشہور اضافہ ہے جسے امام بخاری نے روایت کے دونوں طرق میں ذکر نہیں کیا۔ (یعنی ہر جگہ حدیث کو ''تقتلہ الفئۃ الباغیۃ'' کے بغیر بیان کیا ہے) شاید بخاری کے نزدیک یہ الفاظ ثابت نہیں تھے، یا ثابت تھے مگر انہوں نے کسی وجہ سے حذف کر دیے۔ اس اضافے کو اس حدیث میں ابو بکر برقانی اور ابو بکر اسماعیلی نے تخریج کیا ہے۔ ابو مسعود دمشقی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے یہ اضافی الفاظ نقل نہیں کیے۔ انہیں عبدالعزیز بن مختار اور خالد بن عبداللہ الواسطی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ عبدالوہاب کی روایت جسے امام بخاری نقل کر رہے ہیں، ان الفاظ سے خالی ہے۔'' (الجمع بین الصحیحین: البخاری و مسلم: ۲/۴۶۲)
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:
''جان لو کہ ان زائد الفاظ (تقتلہ الفئۃ الباغیۃ) کو حمیدی نے 'الجمع' میں ذکر نہیں کیا اور کہا ہے کہ بخاری نے انہیں سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔'' پھر آگے فرماتے ہیں: ''مجھے یہ لگتا ہے کہ بخاریؒ نے ان الفاظ ''الفئۃ الباغیۃ'' کو جان بوجھ کر حذف کیا ہے، ایسا ایک باریک نکتے کی وجہ سے کیا، وہ یہ کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ اضافی الفاظ نبی اکرم ﷺ سے نہیں سنے۔ (یعنی حدیث اتنی ہی سنی ہے کہ **"ویح عمار، یدعوھم الی الجنۃ ویدعونہ الی النار"** پس اس سے ثابت ہوا کہ یہ الفاظ (الفئۃ الباغیۃ) اس روایت میں بعد میں درج کیے گئے ہیں۔ اور وہ روایت جو (الفئۃ الباغیۃ) کے الفاظ کو بیان کرتی ہے، بخاری کی شرط پر نہیں ہے۔ اس روایت کو بزار نے داؤد بن ابی ہند عن ابی نضرۃ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے اور مسجد (نبوی) کی تعمیر اور صحابہ کے ایک ایک اینٹ اٹھانے کا ذکر کرتے ہوئے اس میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ: مجھے میرے بعض ساتھیوں نے یہ بتایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابن سمیہ! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' (فتح الباری: ۱/۵۴۲)

حاشیہ صفحہ موجودہ:

① کنز العمال، روایت نمبر: ۳۱۵۷۲؛ جامع الاحادیث، روایت نمبر: ۳۳۴۷۰

② المعجم الاوسط، روایت نمبر: ۷۶۵۹

"الفئة الباغية" (باغی گروہ) کا ایک ہی جماعت میں منحصر ہونا لازمی نہیں۔ باغی گروہ متعدد ہو سکتے ہیں۔ جو بھی شرعی خلیفہ کی اطاعت سے انکار کر کے کسی علاقے پر قابض ہوگا اس پر باغی کا اطلاق درست ہوگا۔ اہلِ شام کی بغاوت کا ثابت ہونا حدیثِ عمار پر منحصر نہیں۔ اگر یہ حدیث سامنے نہ بھی ہوتی تو حدیث و تاریخ کی متعدد صحیح روایات سے جنگِ صفین کے جو حالات ثابت ہیں وہ بلا شبہ خروج کی فقہی تعریف کے ذیل میں آتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل سے پہلے بھی صحابہ و تابعین کا ایک بڑا مجمع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اہلِ شام سے قتال کرتا رہا؛ کیوں کہ بغاوت کی شرعی تعریف ہی مسئلے کو واضح کر چکی تھی۔

جہاں تک خوارج کا تعلق ہے، ان کے باغی ہونے سے بھلا کسے انکار ہے۔ اگر انصاف کے دائرے میں رہتے ہوئے انہیں حدیثِ عمار کے الفاظ کا مصداق بنانے کی گنجائش ہوتی تو علمائے اسلام کو اس میں کوئی باک نہ ہوتا۔ مگر ہمارے اسلاف کا یہ طرز رہا ہے کہ وہ دشمن کے حق میں بھی علمی خیانت سے دامن بچاتے تھے۔ ان پر یہ واضح تھا کہ حدیث عمار کا مصداق وہ لوگ ہوں گے جو عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کریں گے اور صحیح روایات سے ثابت ہے کہ یہ قتل شامی افسر ابو غادیہ جہنی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ بس ان صحیح روایات کو نظر انداز کر دینا اور "الفئة الباغية" اور "المارقة" کے الفاظ میں معنوی مناسبت دیکھ کر قیاس کے ذریعے صرف خوارج کو باغی قرار دینا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہی لحاظ سے خوارج بھی باغی تھے جیسا کہ ان کے باغیانہ افعال سے واضح تھا۔ نیز ان کی بغاوت تاویل یا اجتہاد سے خالی تھی، اس لیے وہ صرف باغی نہیں، گمراہ اور گناہ گار بھی تھے۔ اس لیے انہیں "مارقة" کہا گیا ہے، نہ کہ "الفئة الباغية"۔ نیز جہاں انہیں مارقہ کہا گیا ہے وہاں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ان کا ظہور اُمت کی دو بڑی جماعتوں میں جنگ کے بعد ہوگا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ "مارقہ" سے ایک الگ جماعت مراد ہے۔[1]

یاد رہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث میں خوارج کے لیے "الفئة الباغية" کے الفاظ صرف "کنز العمال" کی اسی روایت میں منقول ہیں۔ کنز العمال میں اسے "السنۃ لابن ابی عاصم" سے نقل کیا گیا ہے مگر ابن ابی عاصم نے وضاحت کی ہے کہ اس کا ایک راوی اسحٰق بن ادریس البصری متروک ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ محدثین نے اس روایت کے باقی الفاظ کو تو قابلِ قبول کہا ہے مگر "يقتل في الفئة الباغية" کے الفاظ کو ثابت نہیں مانا۔[2] لہٰذا یہ روایت مذکورہ موقف کو ثابت کرنے کے لیے بالکل بے وزن ہو جاتی ہے۔

تاہم اگر اس روایت کے تمام الفاظ کو من وعن ثابت مان لیں تب بھی جمہور علماء کے موقف کو مسترد نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ "الفئة الباغية" (باغی گروہ) کو ایک ہی جماعت میں منحصر کر دینے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ ظاہر ہے باغی گروہوں کا کسی بھی دور میں متعدد ہونا محال نہیں۔

---

① تقتل فئتان عظیمتان دعواهما واحدة، فبينهما كذلك اذ مرقت منهم مارقة تقتلها اولى الطائفتين بالحق. (المعجم الاوسط، ح: ۷۶۵۹ ؛ مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۵۸) ② السنة، ابن ابی عاصم، روایت نمبر: ۹۱۱

"الفئۃ الباغیۃ" پر "الف لام" کو لے کر ایک اشکال:

﴿سوال﴾ کیا شارحین حدیث نے یہ نہیں سوچا کہ "الفئة الباغية" میں الف لام کی موجودگی بلا وجہ نہیں۔ اسے دیکھیں تو حدیث کا درست ترجمہ یہ نہیں کہ: "عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" بلکہ الف لام کے ساتھ اس کا درست ترجمہ یہ ہے: "عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔" (صحیح ترجمے میں باغی گروہ معرفہ ہے جبکہ غلط ترجمہ نکرہ کے مطابق کیا جاتا ہے۔)

ارشاد نبوی کے الفاظ بتارہے ہیں کہ وہ ایک متعین اور خاص باغی گروہ ہے۔ جس وقت یہ حدیث سنائی گئی اس وقت عالم اسلام میں کوئی باغی گروہ نہیں تھا، سوائے ان منافقین کے جو مدینہ میں رہ کر خفیہ سازشیں کیا کرتے تھے۔ (یہ فرمان نبوی بخاری شریف کی روایت کے مطابق مسجد نبوی کی تعمیر اور مسلم کی روایت کے مطابق غزوہ خندق کے وقت ارشاد فرمایا گیا تھا) اس لیے یہاں "الفئة الباغية" سے مراد یقیناً کوئی ایسا گروہ تھا جو حضور اکرم ﷺ کے علم اور ذہن میں تھا۔ اس کی کوئی پہچان بتائے بغیر اسے الفئة الباغية کہہ کر بیان کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگلے دور میں بغاوت میں مشہور و معروف رہے گا اور جانا پہچانا ہوگا۔ جب بھی "الفئة الباغية" کا لفظ بولا جائے گا تو وہی بلا تکلف ذہن میں آئے گا۔ اس کی پہچان ہی بغاوت ہوگی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کا مقصد اصلاح اور امت کی خیر خواہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ حضرات باغیانہ صفات والے نہ تھے۔ متقی پرہیزگار تھے۔ سرکشی اور بغاوت سے اجتناب کرتے تھے۔ اس لیے ان پر "الفئة الباغية" کا اطلاق بہت مشکل ہے۔

دوسری طرف اگر غور کیا جائے تو صحابہ کرام کے دور اقتدار میں باغی گروہ کی حیثیت سے جو لوگ سرگرم رہے وہ عبداللہ بن سبا کی جماعت اور قاتلینِ عثمان کی پارٹی تھی، اسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں خوارج کی شکل بھی اختیار کی اور پھر پہلی صدی ہجری کے اواخر تک وہ جگہ جگہ بغاوتیں کرتے رہے۔ حدیث کے ظاہری الفاظ میں جس طرح باغی گروہ کا بلا تکلف ذکر کیا گیا ہے وہ انہی لوگوں پر بے ساختہ منطبق ہوتا ہے۔ امت کا سب سے بڑا اور مستقل باغی گروہ ہر دور میں یہی لوگ رہے ہیں اگرچہ ان کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔

﴿جواب﴾ خوارج اور سبائیوں کی گمراہیوں اور فتنہ و فساد سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ بار بار بغاوت اور سرکشی کا کھلا مظاہرہ بھی کرتے رہے ہیں۔ مگر اہلِ شام سے کش مکش کو جس میں تین دن تک جنگ ہوئی، کس شرعی دلیل کی بناء پر خروج نہ مانا جائے؟ جبکہ کتبِ فقہ میں اسے خروج کی اہم نظیر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اگر ایک خلیفۂ راشد سے جنگ بھی "خروج" نہیں تو پھر خروج کی کیا تعریف ہے؟

سوال یہ نہیں کہ کونسا گروہ شرپسند، منافق اور گمراہ تھا اور کونسا دین دار، متقی و پرہیزگار؟ یقیناً سبائی اور خوارج شرپسند تھے۔ اور صحابہ و تابعین، چاہے عراقی ہوں یا شامی، دین دار اور متقی تھے۔ مگر سائل نے جو دعویٰ کیا ہے وہ تبھی ثابت ہوسکتا ہے جب خروج کی کوئی ایسی نئی فقہی تعریف ڈھونڈی جائے کہ اس کا اطلاق اہلِ شام کے اقدامات پر نہ ہوسکے۔

نیز یہ بھی ثابت کرنا ضروری ہوگا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قتل اہلِ شام نے نہیں کیا۔

"الفئة الباغية" پر الف لام کی قیاسی بحث بظاہر بہت اچھی ہے مگر یہ ثقہ راویوں کی روایات سے متصادم ہے۔ اگر اسے مانا جائے تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل ابو غادیہ رضی اللہ عنہ کو سبائی ماننا پڑے گا جب کہ وہ شامی صحابی تھے۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ قتلِ عمار ابو غادیہ الجہنی رضی اللہ عنہ نے کیا اور "الفئة الباغية" سے مراد اہلِ شام ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ حدیث میں "الفئة الباغية" کا الف لام عہدی بھی جس خاص گروہ کو ظاہر کر رہا ہے وہ اہلِ شام ہی تھے۔

"الفئة الباغية" پر الف لام اس لیے بھی تو آ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم اور ذہن میں اہلِ شام کے خروج کا نقشہ واضح تھا۔ اسلامی تاریخ میں پہلا بڑا خروج یہی تھا جو جنگِ صفین سے ۴۰ھ تک جاری رہا۔ ۴۰ھ کے درمیان سرحدوں کے احترام کا معاہدہ ہوا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ان کی شہادت تک نہیں کی گئی۔ یہ کش مکش اس وقت ختم ہوئی جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دست برداری پر آمادہ ہوئے اور اُمتِ مسلمہ پانچ سال مدت بعد متحد ہوئی۔

سبائی شر پسند، گمراہ اور منافق تھے مگر وہ کبھی کھل کر میدان میں نہیں آئے۔ خوارج کی طاقت بھی چند ہزار سے زیادہ نہ تھی جو چند ماہ میں فنا کر دی گئی۔ مگر اہلِ شام کا گروہ بہت بڑا تھا اور اس قضیے میں خونریزی بھی زیادہ اور طویل مدت تک ہوئی۔ نیز چونکہ دونوں گروہ دین دار تھے، اس لیے اچھے لوگ بکثرت قتل ہوئے، اس لحاظ سے یہ قضیہ زیادہ حزن انگیز بن گیا تھا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا تھا: ''قیامت برپا ہونے سے پہلے دو بڑی جماعتیں آپس میں لڑیں گی۔ ان کے مابین زبردست خونریزی ہوگی۔ ان کا دعویٰ ایک ہی ہوگا۔''[1]

☆☆☆

﴿سوال﴾ حضرت عمار رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے اور انہیں قتل کرنے والے ابو غادیہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو قتل کر دیا ہو؟ پس نہ ابو غادیہ رضی اللہ عنہ قاتلِ عمار تھے نہ اہلِ شام "الفئة الباغية"۔

﴿جواب﴾ یہ واقعہ حالتِ جنگ کا ہے اور اس دوران ابو غادیہ رضی اللہ عنہ کی اپنی روایت سے ثابت ہے کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ کس پر وار کر رہے ہیں کیوں کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے خود پہنا ہوا تھا۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ جان بوجھ کر قتل کیا تھا پھر بھی جنگ میں بعض صحابہ کے ہاتھوں دوسرے صحابہ کی شہادت ثابت ہو جانے کا انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ جنگ تھی تو لامحالہ ایسا ہونا ہی تھا۔ اگر جنگ کا انکار نہیں کیا جا سکتا تو شہادتوں کے جزئی واقعات کا انکار کرنے سے کیا حاصل۔ پس اس دلیل کے ساتھ ابو غادیہ جہنی کے ہاتھوں قتلِ عمار کا انکار کرنا تا کہ اہلِ شام کو ایک صحابی کے قتل سے بری ثابت کیا جائے، ایک فضول تاویل ہے۔ اگر قتلِ عمار سے اہلِ شام کو بری قرار دے بھی دیں تو صفین کے باقی ہزاروں مقتولین کے بارے میں کیا کہیں گے جن میں کتنے ہی صحابہ اور تابعین تھے۔ کیا سبھی کو سبائیوں نے مارا تھا؟

جو تاویل باقی مقتولین کے لیے برمحل ہے وہی جمہور علماء حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں بھی کرتے ہیں

① صحیح البخاری، ح: ۷۱۲۱، کتاب الفتن، باب خروج النار؛ صحیح مسلم، ح: ۲۲۱۴، کتاب الفتن

یعنی حضرت عمار رضی اللہ عنہ سمیت صفین کے تمام مقتول صحابہ وتابعین اجتہاد کے تحت ہونے والی ایک جنگ کے شہداء ہیں۔
اس جنگ میں قاتلوں کو گناہ گار مانا جائے گا نہ مقتولین کو۔ ان شاء اللہ سب ہی ماٗ جور اور مغفور ہیں۔

☆☆☆

کیا ''الفئۃ الباغیۃ'' کا مطلب ''قصاص طلب کرنے والی جماعت'' لیا جا سکتا ہے؟

﴿سوال﴾ ''الفئة الباغية'' سے مراد ''قصاص طلب کرنے والی جماعت'' ہے۔ کیوں کہ اس کا مادہ ''البغی'' ہے جس کا مطلب ''طلب کرنا'' ہے۔ یعنی اہلِ شام قصاصِ عثمان طلب کر رہے تھے جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ اس لحاظ سے حدیث میں ان پر ''الفئة الباغية'' کا اطلاق قابلِ مذمت نہیں بلکہ قابلِ تعریف ہے۔ چاہیے تھا کہ اسی تاویل کو اختیار کیا جاتا جو عظمتِ صحابہ کے لیے مناسب ترین ہے مگر اس کی بجائے اکثر شارحینِ حدیث نے اہلِ شام کو حقیقت میں باغی مان کر صحابہ کے مقام سے ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علمائے اہلِ سنت میں رفض کے جراثیم ہمیشہ موجود رہے ہیں۔

﴿جواب﴾ "الفئة الباغية" کی اس تاویل میں ذرا بھی وزن ہوتا تو شارحینِ حدیث شامی صحابہ کو اعتراض سے بچانے کی خاطر اسے ضرور قبول کر لیتے۔ علمائے اُمت میں رفض کے جراثیم ہرگز نہیں مگر وہ کبھی فرضی اور فاسد تاویلات کے قائل نہیں رہے۔ ان کا مقصد اسلام کی حفاظت رہا ہے۔ یہی صحابہ کا مقصدِ حیات تھا۔ علمائے اُمت کے نزدیک دفاعِ صحابہ کی اہم ترین غرض یہی ہے کہ اسلام کی حفاظت ہو کہ ہم تک سنتِ نبویہ پہنچنے کا پہلا واسطہ یہی حضرات ہیں۔

تاویلاتِ فاسدہ سے خود اسلام اور سنتِ نبوی کے صحیح مفاہیم خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ جب مقصد دین کی حفاظت ہے تو اگر کسی موقع پر بعض صحابہ کے کسی فعل کی تاویلِ فاسد سے خود اسلام میں رخنہ پڑتا ہو تو وہاں ان کے فعل کی تاویل نہیں کی جائے گی بلکہ ان کی غلطی کو مانا جائے گا۔ اگر ہر جگہ ہر صحابی کی غلطی کی ایسی فاسد تاویل کرنا فرض ہوتی کہ نفسِ واقعہ ہی کو بدل دیا جائے اور غلطی، غلطی ہی نہ رہے تو متعدد صحیح احادیث میں بعض صحابہ سے سرقہ، زنا اور شربِ خمر وغیرہ سرزد ہونے اور ان جرائم پر قطعِ ید اور رجم کے اجراء کو بھی کسی بعید معنیٰ پر محمول کرنا لازم ہوتا کیوں کہ یہ جرائم کبیرہ گناہ ہیں۔ ایسی صورت میں صحابہ کا دفاع کرتے ہوئے اُمت پر یہ موقف اختیار کرنا فرض ہوتا کہ کسی صحابی سے کبھی کوئی ایسا فعل ہوا ہی نہیں کہ جس پر حد جاری ہوتی۔

نتیجہ کیا نکلتا؟ ایسی تاویلات سے بعض صحابہ کا وقتی دفاع تو ہو جاتا مگر دوسری طرف حدودِ شرعیہ کا انکار ہو جاتا اور باطل فرقوں کے لیے احادیث میں فاسد تاویلات اور من مانی موشگافیوں کا دروازہ کھل جاتا۔

حدیث ''الفئة الباغية'' صحیح، متواتر اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اس کا اطلاق ایسی جماعت پر ہوا جو اپنے تمام فضائل ومناقب اور نیک نیتی کے باوجود، غلط فہمی کی بناء پر خروج کی مرتکب تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ان کے خلاف ریاستی طاقت کا استعمال کر کے خروج کی شرعی سزا بھی پورے شرحِ صدر کے ساتھ جاری کر چکے



تھے۔ ان کا یہ اقدام تا قیامت مسائلِ خروج کے لیے ضابطہ مان لیا گیا تھا اور یوں اُمت کو حدود و قصاص کی طرح خروج وبغاوت کی تعریف اور مسائل سمجھنے کے لیے بھی ایک معتبر ماٗخذ نصیب ہوا۔

اس تناظر میں علمائے راسخین کے نزدیک یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناجائز تھا کہ وہ حدیث "الفئۃ الباغیۃ" کی ایسی تاویل قبول کرتے جو شرعی اصطلاح کو پامال کردے اور فریقِ مخطی کی خطا کو جواز بلکہ سندِ تعریف بخش دے۔

لہٰذا اس مطلب کو جمہور علماء نے نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا بلکہ اسے حدیث کے واضح مفہوم میں تحریف اور باطل و فاسد قرار دیا۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ اس مطلب کو مسترد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ تحریف ہے۔ اس لیے کہ یہاں (لفظ الباغیۃ سے) قصاص طلب کرنا مراد لینا نامناسب ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے قاتلوں کی مذمت کے طور پر فرمائی ہے، کیوں کہ حدیث میں لفظ 'ویح' آیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ 'ویح' کا لفظ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جس کا وہ مستحق نہ ہو، اس پر ترس کھاتے ہوئے، حسرت کے طور پر ''ویح'' کہا جاتا ہے۔ جامع الصغیر میں امام احمد اور امام بخاری سے بسندِ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً منقول ہے: ''ویح عمار تقتله الفئة الباغية، يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار.'' یہ بالکل ایسا ہی ہے جس طرح کتاب اللہ میں ''البغی'' کا لفظ جہاں مطلق آیا ہے، وہاں اس سے یکہ صحیح اور فوراً ذہن میں آجانے والا معنیٰ مراد ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ. اور ارشاد ہے: فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى [1]

پس ایک شرعی (اصطلاحی) لفظ کو لغوی معنیٰ پر محمول کر لینا، انصاف سے بعید ہے۔ یہ ظلم کی طرف میلان ہے جو کسی شے کو اس کے مقام سے ہٹانے کا نام ہے۔'' [2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ حدیثِ عمار کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ حدیث صحیح ہے۔ بعض حضرات نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ باغی 'طالب' کے معنیٰ میں ہے مگر اس بات کی کوئی حیثیت نہیں۔'' [3]

امام قرطبی رحمہ اللہ "الفئة الباغية" کو طالبِ قصاص کے معنیٰ میں لینا تاویلِ فاسد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس پہلی تاویل کے فاسد ہونے کی وضاحت یہ ہے کہ اگرچہ ''البغی'' کا لغوی معنی طلب کرنا ہے مگر لغت اور شریعت میں اس کا استعمال زیادتی اور فساد کے لیے ہوتا ہے۔ اسی لیے ابوعبید اور دیگر ماہرینِ لغت نے لکھا ہے: البغی ''زیادتی'' کے معنیٰ میں ہے۔''

---

① سورة النحل، آيت: ٩٠، سورة الحجرات، آيت: ٩

② مرقاة المفاتيح: ٩/ ٣٧٨٥، كتاب الفضائل باب المعجزات، ط دار الفكر ③ المنتقى من منهاج الاعتدال، ص ٢٥١

وہ لفظ "البغی" پر مختصر لغوی بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"البغی کا حال الصلوٰۃ اور الدابۃ جیسے اسمائے عرفیہ (عرفاً ایک خاص معنیٰ میں مستعمل اسماء) جیسا ہے۔ جب انہیں کوئی سنتا ہے تو اس کا ذہن عرفی معنیٰ کی طرف جاتا ہے نہ کہ اصل لغوی مطلب کی طرف جو کہ متروک ہو چکا ہوتا ہے۔ اور لفظ کے اسی عرفی معنیٰ پر محمول ہونے کی وجہ سے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات اور اس دور کے معاصر لوگوں نے اس تاویل (یعنی باغیہ سے مراد طالب ہے) کو تحریف سمجھا تھا۔

چلیے ہم عرف کو چھوڑ کر مان لیتے ہیں کہ لفظ باغیہ میں طلب اور فساد دونوں کا احتمال موجود ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں "الفئۃ الباغیۃ" کا ذکر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے قاتلوں کی مذمت کے طور پر کیا ہے۔ اگر "البغی" سے مراد محض طلب کرنا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔ حدیث کا سیاق وسباق ان دونوں باتوں کو (عمار رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے قاتلوں کی مذمت) ظاہر کر رہا ہے۔ حدیث کے تمام طرق کو جمع کر کے غور کر لیں۔ یہی ثابت ہوگا۔

نیز اگر یہاں "البغی" سے "طلب کرنا" مراد لیا جائے تو فقط عمار رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو باغی یعنی طالبِ قصاص قرار دینا ایک لاحاصل بات ہوگی۔ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی بھی تو قصاصِ عثمان کے طلب گار تھے بشرطیکہ وہ اس کے لیے فارغ ہو سکتے اور اس پر قدرت رکھتے۔ مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب نے اختلاف اور جلد بازی کر کے انہیں اس کام سے روک دیا، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے کہ جس حلقے میں لوگ داخل ہوئے ہیں آپ بھی اس میں شامل ہو جائیں، ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو تلاش کر کے ان پر کتاب اللہ کا فیصلہ نافذ کریں گے۔ مگر ان حضرات نے ان کی بات پر توجہ نہ دی اور اس پر نہ چلے۔ تقدیر غالب آ چکی تھی اور گھر میں شہید کیے جانے والے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے سبب عظیم المیہ رونما ہوتا تھا۔"[1]

☆☆☆

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے امیر المؤمنین کو حذف کرنے پر اصرار کیوں کیا گیا؟

﴿سوال﴾ صفین میں جنگ بندی کا معاہدہ لکھتے ہوئے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ امیر المؤمنین کا لفظ مٹانے پر زور دیا تھا۔[2] کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اہل اور اس منصب کے قابل نہیں مانتے تھے؟

﴿جواب﴾ ایک ہے حکمران بننا اور ایک ہے حکمرانی کی اہلیت ہونا۔ اسی طرح ایک ہے کسی کو حکمرانی کے قابل ماننا، دوسرا ہے کسی کو اپنا حکمران تسلیم کرنا۔ دونوں میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ حکمران بننے کی اہلیت بیک وقت کئی افراد

---

① المفهم لما اشكل من تلخيص مسلم، كتاب الفتن واشراط الساعة: ۲۵۵/۷

② مسند احمد، ح: ۳۱۸۷؛ البداية والنهاية: ۵۲۵/۱۰، ۵۲۶؛ تاريخ الطبري: ۵۳/۵



میں ہو سکتی ہے مگر ایک ملک کا آئینی حکمران ایک وقت میں ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ جیسے دورِ خلافتِ راشدہ میں عشرۂ مبشرہ میں سے ہر ایک خلافت کی اہلیت رکھتا تھا مگر ان میں سے خلیفہ یکے بعد دیگرے صرف چار کو مانا گیا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اہل مانتے تھے جیسا کہ ابو مسلم خولانی کی روایت میں ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضرت علی مجھ سے افضل اور خلافت وحکومت کے مجھ سے زیادہ حق دار بھی ہیں۔''[1]

مگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فی الحال خلیفہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اگر خلیفہ تسلیم کرتے تو ان کی اطاعت کو واجب سمجھتے۔ وہ فقط اس زمینی حقیقت کو تو مان رہے تھے کہ علی رضی اللہ عنہ خلافت کے اہل ہیں۔ مگر وہ حالات کو جس زاویے سے دیکھ رہے تھے، اس کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ فی الحال شرعی حکمران یا امیر المومنین نہیں تھے اور ان کی گروہ بندی کو حکومت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، فی الوقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا اور انہیں اپنا سربراہ مان لینا درست نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اہلِ شام کو اعتماد میں لیے بغیر خلافت کا تحقق نہیں ہوسکتا تھا اور اہلِ شام اسی وقت اعتماد کر سکتے تھے جب قصاصِ عثمان لے لیا جاتا۔ یہی اصل تنازعہ تھا۔

پس حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک ماہر وکیل کی طرح صلح نامے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''امیر المومنین'' کا لفظ مٹوادیا تا کہ اہلِ عراق کو یہ دلیل نہ مل جائے کہ کاغذی کارروائی جیسے اہم معاملے میں ''امیر المومنین'' کا لفظ قبول کرنا بیعت کے قائم مقام ہو گیا ہے اور اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی حکم سے اختلاف بیعت توڑنے کے مترادف ہوگا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کسی کو اس آئینی اعتراض کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

یہ تھا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا زاویۂ نگاہ۔ باقی فی الواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے یا نہیں؟ اس بارے میں جمہور علمائے اسلام کی ایک ہی رائے ہے کہ وہ بلاشک وشبہ خلیفہ مقرر ہو چکے تھے اور ان کے بارے میں اہلِ شام کا تجزیہ درست نہیں تھا۔ پھر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی رائے کا احترام کیا اور صلح کے مسودے میں اپنے نام سے ''امیر المومنین'' کا لفظ ہٹانا گوارا کرلیا تا کہ کسی طرح امن وامان بحال ہو سکے۔

☆☆☆

صفین میں جنگ بندی اور واقعہ تحکیم کی رکیک تاریخی روایات کی حیثیت؟

﴿سوال﴾ صفین میں جنگ بندی اور تحکیم کی روایات طعنِ صحابہ اور منفی باتوں سے لبریز ہیں۔ سنداً یہ کیسی ہیں؟

﴿جواب﴾ اسنادی حیثیت سے یہ سب ناقابلِ اعتماد ہیں۔ ان روایات کی حالت ملاحظہ ہو:

① طبری میں ایک جگہ صفین میں حضرت مُعاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فریب دینے کے لیے قرآن مجید نیزوں پر اٹھا کر صلح کی پیش کش کرنا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صلح کے پیغام کو دھوکے پر مبنی کہنا مذکور ہے۔[2]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۴۰/۳، ط الرسالۃ، قال المحشی رجالہ ثقات؛ فتح الباری: ۸۶/۱۳ بسند حسن

② تاریخ طبری: ۴۸/۵ تا ۵۶، تحت ۳۷ ہجری

طبری میں ایک اور مقام پر دُومۃ الجندل میں مجلسِ تحکیم کے دوران حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو دھوکا دینے کا واقعہ بڑی تفصیل سے منقول ہے۔[1]

مگر یہ روایات ابو مخنف کی ہیں جو متعصب رافضی راوی ہے۔

② طبری میں ایک تفصیلی روایت ابن شہاب زہری کے واسطے سے بھی مروی ہے جس میں بھی صفین میں قرآن مجید نیزوں پر بلند کر کے دھوکا دینے اور پھر تحکیم کے وقت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو فریب دینے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔[2] مگر ابن شہاب کی اس سند میں ایک راوی سلیمان بن یونس بن یزید مجہول ہیں۔ یہ امام زہری کے شاگرد یونس بن یزید الایلی کے بیٹے ہیں مگر خود ان کے حالات کہیں مذکور نہیں۔ اس لیے سند کا ضعف واضح ہے۔ پھر زہری نے اس حادثے کا خود مشاہدہ نہیں کیا تھا، اس لیے ان کی یہ روایت مرسل ہے اور ایسا اہم قضیہ میں مرسل کافی نہیں جیسا کہ اہل اصول کے ہاں طے ہے۔[3]

③ اس واقعے کی ایک اور روایت ابن عساکر نے اپنی سند کے ساتھ زہری تک نقل کی ہے، مگر یہ بھی مرسل ہے۔ پھر اس میں ابوبکر بن سبرہ ہے، جو حدیثیں گھڑتا تھا۔[4] مزید یہ کہ اس سند میں واقدی بھی ہے جو متروک ہے۔

④ اس سلسلے کی ایک طویل روایت احمد بن ابراہیم سے منقول ہے جس میں اسی قسم کی گھڑی گڑھی باتیں ہیں۔[5]

اس روایت کا ضعف ظاہر ہے کہ اس میں ایک راوی "ابن جُعْدُبَة" (یزید بن عیاض) ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ نے جھوٹا اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے متروک قرار دیا ہے۔[6]

دار قطنی رحمہ اللہ کہتے ہیں وہ ضعیف و متروک ہے۔[7] امام بخاری رحمہ اللہ اسے منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔[8]

یحییٰ ابن معین رحمہ اللہ کا کہنا ہے اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ اسے "اکذب" قرار دیتے تھے۔[9]

⑤ انساب الاشراف میں اس واقعے کو ابو خیثمہ سے بھی نقل کیا گیا ہے[10] مگر اس سند میں بھی ابن جُعْدُبَہ ہے۔

⑥ یہ قصہ انساب الاشراف میں ابو مخنف سے بھی نقل کیا گیا ہے[11] جس کا ضعف محتاجِ بیان نہیں۔

---

① تاریخ الطبری: ۶۷/۵ تا ۷۱
② تاریخ الطبری: ۵۷/۵، ۵۸
③ المراسیل لابن ابی حاتم: ص ۳ ؛ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۲۶/۱
④ تهذیب التهذیب: ۲۷/۱۲
⑤ انساب الاشراف: ۳۴۳/۲ تا ۳۴۵، ط دار الفکر
⑥ تقریب التهذیب، ترجمہ نمبر: ۷۷۶۱
⑦ موسوعة اقوال الدارقطني: ۷۲۲/۲
⑧ التاریخ الکبیر: ۳۵۱/۸
⑨ الکامل فی ضعفاء الرجال: ۱۴۱/۹
⑩ انساب الاشراف: ۳۳۱/۲ تا ۳۳۳، ط دار الفکر
⑪ انساب الاشراف: ۳۴۸/۲ تا ۳۵۲، ط دار الفکر




⑦ایک مختصر روایت انساب الاشراف میں بلاذری نے اپنے شیخ بکر بن ہیثم سے نقل کی ہے۔[1]
مگر بکر بن ہیثم مجہول الحال راوی ہیں۔ان کے حالات کہیں منقول نہیں ملے۔
⑧ایک اور روایت مُرُوجُ الذہب میں ''مسعودی'' نے نقل کی ہے جو خود شیعی ہے اور روایت بھی بلاسند ہے۔[2]
غرض جنگ بندی اور تحکیم کے متعلق طعنِ صحابہ اور دیگر منفی باتوں پر مشتمل روایتوں میں سے کوئی ایک بھی صحیح السند نہیں۔پھر ان تمام ضعیف روایات میں جزئیات کا اختلاف بے پناہ اور اضطرابات اتنے زیادہ ہیں کہ تطبیق مشکل بلکہ ناممکن ہے۔جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بعض جعل ساز خبر نگاروں نے اصل واقعے کو چھپا کر کئی اضافے کیے ہیں۔ اس لیے ہر روایت دوسری سے ٹکرا رہی ہے۔سچ اور جھوٹ کا بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ سچ یکساں ثابت ہوتا ہے اور جھوٹ ہر جگہ شکل بدلتا ہے۔



عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ناراض ہونا ثابت ہے یا نہیں؟

﴿سوال﴾ کیا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے؟ طبری نے ۴۰ھ کے ضمن میں روایت نقل کی ہے کہ ابوالاسود دؤلی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مراسلہ لکھ کر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ پر جو بصرہ کے گورنر تھے، بیت المال کی رقم غبن کرنے کا الزام لگایا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے الزام کی تحقیق کے لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھ گچھ کی۔انھوں نے صاف انکار کر دیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ان سے جزیے کی رقم کا حساب مانگا تو انہوں نے حساب دینے سے انکار کر دیا اور بیت المال میں جو کچھ تھا سمیٹ کر مکہ چلے گئے۔[3]
یہ روایت کس حد تک قابلِ قبول اور ثابت ہے۔

﴿جواب﴾ یہ روایت بالکل بے سروپا ہے۔اس کی سند میں ابومخنف کذاب موجود ہے۔
طبری نے اس کے ساتھ ہی دوسری روایت ابوزید کی نقل کی ہے جس میں ابومخنف کی روایت کی تردید ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بصرہ ہی میں تھے۔ان کی وفات کے بعد مکہ جا کر مقیم ہو گئے تھے۔جاتے ہوئے انہوں نے بصرہ سے اپنے گھر کا مال ومتاع اور بیت المال سے قلیل مال لیا تھا اور وضاحت کر دی تھی کہ یہ میری تنخواہ ہے۔[4]



---

① انساب الاشراف: ۳۳۰/۲،ط دار الفکر
② مُرُوج الذہب: ۱۴۶،۱۴۵،۱۳۹،۱۳۸/۳
③ تاریخ الطبری: ۱۴۳/۵
④ ومالاً من بیت المال قلیلاً وقال ہی ارزاقی. (تاریخ طبری: ۱۴۳/۵)
نوٹ:یہ روایت بھی اگرچہ ضعیف ہے مگر اس کی سند کا ضعف ابومخنف کی روایت سے کم ہے۔

مجتہد اور باغی کی حیثیت جمع کیسے ہوگئی؟

﴿سوال﴾ علماء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل آنے والوں کو مجتہد وماجور بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی مخطی اور باغی بھی۔ یہ موقف کھلے تضاد پر مبنی ہے۔ یا تو انہیں مجتہد کہیں یا باغی۔ اجتہاد ایک عظیم دینی خدمت ہے جبکہ بغاوت ایک سراسر ناجائز کام ہے۔ آپ لوگ بیک وقت دو متضاد حیثیتوں کو کیسے مانتے ہیں؟ اور خطا پر کوئی شخص ماجور کیسے ہوسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ اجتہاد کا مطلب کیا ہے؟ فقہی بصیرت رکھنے والا کوئی شخص، شرعی دلائل اور ممکنہ معلومات کے تحت کسی نئے مسئلے کے حل کی ممکنہ صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرلے۔ اس میں اس کی فکر ونظر مغالطے کا شکار بھی ہوسکتی ہے، معلومات کی کمی بھی اجتہاد پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ کوئی عقل مند یہ اصرار نہیں کرسکتا کہ ہر مجتہد کا ہر اجتہاد ہمیشہ درست ہی ہوگا۔ اسی لیے فقہائے اسلام کے ہاں اصول طے ہے: المجتہد یصیب ویخطی۔

جب یہ بات ثابت ہوچکی تو اگلی بات سمجھنا بھی آسان ہے۔ وہ یہ کہ اجتہاد غلط ہوجانے کی صورت میں مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی حکم ضرور لاگو ہوگا۔ مثلاً نماز فاسد ہوجانا، یا روزہ خراب ہوجانا، یا ادائیگی حج سے محروم رہ جانا۔ مثال کے طور پر اگر ہوائی جہاز میں نماز کا وقت آجائے اور دو مسافر فقہاء میں اختلاف ہوجائے کہ جہاز پر نماز پڑھیں یا نہیں۔ اس بارے میں کوئی سابق فتویٰ سامنے نہ ہو۔ اب ایک فقیہ نماز پڑھ لے اور دوسرا فقیہ یہ سوچ کر بیٹھا رہے کہ نماز میں سجدہ ضروری ہے، اور سجدہ نام ہے "وضع الجبھۃ علی الارض" (زمین پر پیشانی رکھنے کا)۔ یہاں زمین نہیں ہے تو سجدہ بھی نہیں ہوسکتا اور سجدے کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ ایئرپورٹ پر اترنے کا انتظار کرتا رہے اور نماز کا وقت نکل جائے۔ اب اگر بعد میں دیگر فقہاء بالاتفاق کہہ دیں کہ جہاز کی سطح زمین کی سطح کے حکم میں ہے، اس لیے نماز وہیں پڑھ لینی چاہیے تھی اور اس مسئلے پر اتفاق ہوجائے تو جس فقیہ نے شرعی دلائل پر غور کرتے ہوئے دورانِ پرواز نماز ادا نہیں کی کیا وہ گناہ گار ہوگا؟ اس نے اپنے ایمان اور اپنی دینی سمجھ کے مطابق جسے درست سمجھا، وہی کیا۔ پس اس عمل کو اجتہاد کہا جائے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی مانا جائے گا کہ اس کی نماز قضا ہوگئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ "یا تو اس فقیہ کو نماز قضا کرنے والا کہیں یا مجتہد۔ نماز قضا کرنا اور اجتہاد جمع کیسے ہوگیا؟" تو کیا یہ اعتراض کچھ وزن رکھے گا؟

پس اسی طرح "مجتہد اور باغی" کو متضاد قرار دینا بھی بالکل بے بنیاد اعتراض ہے۔ یہ بات بھی سمجھ لی جائے مجتہد مخطی کو خطا پر ماجور نہیں کہا جاتا، بلکہ اجتہاد پر ماجور کہا جاتا ہے۔ خطا کا حکم یہ ہے کہ عام حالت میں اسے گناہ گار ہونا چاہیے مگر یہاں اسے دلائل کے اشتباہ کے باعث "معذور" قرار دیا جائے گا۔

جہاں تک اہلِ شام یا اہلِ جمل کا تعلق ہے، ان کے مجتہد ہونے کی کوئی اور دلیل نہ ہو تب بھی اس پر ان دونوں فریقوں کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ ارشادات واقدامات گواہ ہیں جو محدثین اور فقہاء نے محفوظ کیے ہیں۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فریق مخالف کے خلاف فوجی طاقت بھی استعمال کررہے ہیں جو باغیوں کے خلاف استعمال کی جاتی

ہے۔ساتھ ہی فریقِ مخالف کے مقتولین کو بھی جنتی قرار دے رہے ہیں، جو ان کے ماجور اور مجتہد ہونے کا اعلان ہے۔جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود کسی باغی کو مجتہد مان رہے ہیں تو ہمیں بھی چاہیے کہ ان کے ارشادات کو حقیقت پر محمول کریں نہ کہ تقیہ پر جو کہ سادات کی صفتِ جرأت وحق گوئی کے بالکل منافی ایک گھناؤنی تہمت ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھا جائے کہ اہلِ سنت والجماعت مجتہد کا اطلاق فریقین کی قیادت پر کرتے ہیں جس میں زیادہ تر صحابہ کرام تھے۔جہاں تک عام سپاہیوں کا تعلق ہے، ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے، اللہ کی رضا کی خاطر لڑنے والے بھی تھے اور تعصب کے باعث برسرِ پیکار ہونے والے بھی۔ان میں سے ہر شخص فقیہ اور عالم بھی نہیں تھا کہ وہ اجتہاد کر سکتا۔لہٰذا فریقین میں سے ہر شخص پر مجتہد کا اطلاق نہیں ہوگا۔پس لشکرِ شام میں جو لوگ تعصب یا نادانی کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے، ان پر فقط بغاوت کا اطلاق ہوگا، اجتہاد کا نہیں، اس لحاظ سے انہیں ماجور بھی نہیں کہا جائے گا۔البتہ چونکہ وہ مجتہدِ مخطی کی تقلید کر رہے تھے، اس لیے ان کی خطا ان شاء اللہ قابلِ معافی ہوگی۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو بڑے سلیقے کے ساتھ واضح کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ اگرچہ مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں خاموش رہنا اور فریقین کے لیے استغفار کرنا اور ان سے محبت رکھنا ہی پسندیدہ ہے، تاہم یہ عقیدہ بھی واجب نہیں کہ (فریقین کی) فوجوں میں سے ہر ایک شخص علماء کی طرح مجتہد اور تاویل کرنے والا ہی تھا، بلکہ ان میں گناہ گار بھی تھے، غلط کار بھی تھے، اور کسی نفسانی جذبے کی بناء پر اجتہاد میں کوتاہی کرنے والے بھی تھے مگر جب بہت سی حسنات کے درمیان کوئی بُرائی ہو تو وہ کم وزن اور قابلِ معافی ہوتی ہے۔اہلِ سنت ان سب کے بارے میں اچھا قول اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے دعائے رحمت اور استغفار کرتے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی گناہوں سے یا خطائے اجتہادی پر قائم رہنے سے معصوم نہیں سمجھتے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا باقی لوگوں سے گناہ اور خطاء پر برقرار رہنا ممکن ہے۔مگر وہ ایسے ہی ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْھُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِھِمْ.[1]

(یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کے نیک کاموں کو قبول کریں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے۔)

اعمال کے فضائل کا مدار اپنے نتائج اور انجام پر ہوتا ہے نہ کہ صورت پر۔''[2]

یہ بھی ظاہری بات ہے کہ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں متشدد لوگ اور کچھ سبائی شامل تھے، اسی طرح اہلِ شام میں بھی وہ گروہ موجود تھا جس نے فتنے کی آگ بھڑکائی اور لوگوں کو یقین دلایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کے سرپرست ہیں۔ایسے لوگوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ فتنے کی جڑ، نہایت بد بخت اور سخت گناہ گار تھے۔

☆☆☆

---

① سورۃ الاحقاف: ۱۶ ② مجموع الفتاویٰ لابن تیمیۃ: ۴/۴۳۴

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے کیوں نہ جنگ سے گریز کیا؟

﴿سوال﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ بعد میں جنگ کے نقصانات دیکھ افسوس کرتے رہے۔ انہیں پہلے یہ بات سمجھ کیوں نہ آگئی کہ جنگ لڑنے سے لازمی طور پر لوگ مریں گے اور مسلمانوں کا خون بہے گا۔ یہ تو بالکل ظاہری بات تھی کہ اس جنگ میں کفار سے مقابلہ نہیں تھا، اس لیے مسلمان ہی نشانہ بننے تھے۔ تو اس انجام کو سوچ کر انہوں نے پہلے ہی جنگ سے گریز کیوں نہ کیا؟ اگر جنگ بندی برحق تھی تو پہلے جنگ کیوں کی اور اگر جنگ درست تھی تو جنگ بندی کیوں کی؟

﴿جواب﴾ جنگ کا فیصلہ ہو یا صلح کا، یہ سب حکمران کے صوابدیدی فیصلے ہوتے ہیں۔ حکمران امت کی بھلائی اور فائدے کے لحاظ سے جنگ میں فائدہ سمجھے تو اسے جس طرح کفار سے لڑنے کا اختیار ہے، اسی طرح شرعی نصوص نے اسے باغیوں سے لڑنے کا بھی اختیار دیا ہے اور مصلحت ہو تو ان سے صلح بھی کی جاسکتی ہے۔ پیش آمدہ حالات کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گمان پہلے یہی تھا کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی بہت بڑے خون خرابے کے بغیر بزورِ قوت مغلوب کر کے مسلم ریاست کو متحد کرلیں گے۔ بعد میں یہ اندازہ درست ثابت نہ ہوا۔ جب آپ نے دیکھا کہ بہت بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا خون ضائع ہو چکا ہے اور اپنی فوج میں بھی جنگ سے اکتاہٹ کے آثار بھی محسوس کیے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پیش کش کو ناگزیر حالت میں قبول کرلیا تاکہ جنگ کی جگہ مذاکرات سے مسئلہ حل ہوجائے۔ [1]

ان مختلف فیصلوں اور اقدامات سے اُمت کے لیے بڑی سہولت پیدا ہوگئی۔ اسلامی سیاست کی لچک اور وسعت کا عملی نمونہ سامنے آگیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے مختلف فیصلے نہ فرماتے تو مسلمانوں کے لیے تاقیامت باہمی تنازعات اور سیاسی بحرانوں سے نمٹنے کے لیے کوئی عملی نمونہ سیرتِ طیبہ میں سامنے ہوتا نہ سیرتِ صحابہ میں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدامات سے خروج کی تعریف بھی سمجھ آگئی۔ خروج کرنے والوں سے ابتداءً مذاکرات کرنے اور افہام وتفہیم سے معاملے کو حل کرنے کی پوری کوشش کرنے کی تعلیم بھی مل گئی۔ جنگِ صفین سے ناگزیر حالات میں فوجی طاقت سے کام لینے کی گنجائش بھی نکل آئی۔ بعد کے اقدامات سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حکمران کو ملکی مصلحت کے تحت سیز فائر کا معاہدہ کرنے، مسئلے کے حل کے لیے ثالث مقرر کرنے اور سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کرنے سمیت اصلاحِ احوال کی مختلف صورتوں کا اختیار ہے۔ اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے عمل سے اُمت کی مصلحت کے لیے اقتدار چھوڑ دینے کی گنجائش بھی ثابت ہوگئی۔ ان حالات میں اسلامی سیاست کے رہنما اصول قدم قدم پر موجود ہیں۔

---

[1] عن ابی حنیفة عن موسیٰ بن ابی کثیر عن علی رضی اللہ عنہ انہ قال لابی موسی رضی اللہ عنہ حین حکمہ: احکم ولو بحز عنقی، فانہ لن یصول بھم احد الا صال بالسھم الاخیث، ولوددت انی معی مکانھم الف فارس من بنی فراس بن غنم ولاجتماع ھؤلاء علی باطلھم اشد من اجتماعکم علیٰ حقکم. (کتاب الآثار لابی یوسف، روایت نمبر: ۹۲۹ بسند صحیح)

عن عاصم بن کلیب عن ابیہ، قال: انی لخارج من المسجد اذ رأیت ابن عباس حین جاء من عند معاویة فی امر الحکمین وفیہ، فقال ابن عباس: ھل علمتم ان اھل الشام سألوا القضیة فکرھناھا وابیناھا، فلما اصابتکم الجروح وعضکم الالم ومنعتم ماء الفرات انشأتم تطلبونھا. ولقد اخبرنی معاویة انہ اتی بفرس بعید البطن من الارض لیھرب علیہ، ثم اتاہ آت منکم فقال: انی ترکت اھل العراق یموجون مثل موج الناس لیلة النفر بمکة. (مصنف ابن ابی شیبة، روایت نمبر: ۳۷۸۷۳ بسند صحیح، ط الرشد)

خلیفہ کو معزول کرنے کا مطالبہ نہ ہو تو خروج کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے؟

﴿سوال﴾ اہلِ شام یا اہلِ بصرہ بھلا بغاوت کے مصداق کیسے ہوسکتے ہیں؟ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں خلافت قائم کرنے کا دعویٰ تو کیا نہیں تھا؟ وہ تو فقط ایک جائز مطالبہ لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ان پر خروج کا الزام لگانا بالکل غلط ہے۔

﴿جواب﴾ جمہور فقہاء کی رائے میں کسی علاقے پر کنٹرول قائم کرنے والے لوگ چاہے خلیفہ کی معزولی کا مطالبہ نہ کریں اور چاہے جائز مطالبہ لے کر ہی کھڑے ہوں تب بھی ان کا عمل ''خروج'' کہلائے گا۔ خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ اور عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں معزول کرنے کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ میں اپنی بیعت پر قائم ہوں۔[1] مگر انہوں نے ایک مسلح جماعت کے ساتھ ایک چھوٹے سے علاقے میں حکومتی مشینری کو بے بس کر دیا تھا، اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر خروج کا اطلاق کیا اور ان کے مقام کا لحاظ کیے بغیر انہیں ان کے متعدد رفقاء سمیت سزائے موت دی تاکہ ملک کا نظم وضبط متاثر نہ ہو۔[2]

پس یہ بات تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی تسلیم نہیں رہی کہ خروج کے لیے خلیفہ کے اقتدار کو چیلنج کرنا شرط ہے۔ یہی نظریہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے جانشین دیگر اموی خلفاء کا تھا۔ عبدالملک بن مروان کے دور میں عراقی جرنیل عبدالرحمٰن بن اَشعَث نے یہ کہہ کر حکومت کی اطاعت سے انکار کر دیا کہ حجاج بن یوسف کو عراق کی گورنری سے معزول کیا جائے۔ عبدالرحمٰن بن اَشعَث کے ساتھ صفِ اوّل کے علماء وفقہاء تھے جو کہتے تھے:

''اللہ کی قسم! ہم نے امیر المؤمنین کے اقتدار سے انحراف نہیں کیا۔ ہم انہیں معزول نہیں کرنا چاہتے۔ مگر ہمیں امیر المؤمنین پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے ہمارے اوپر حجاج کو گورنر مقرر کیوں کیا؟ پس اسے معزول کر دیجیے۔''[3]

یہ مطالبہ بالکل جائز تھا؛ کیوں کہ حجاج بن یوسف کی سخت گیری، ظلم وستم اور خلافِ شرع کاموں سے صحابہ بھی سخت نالاں تھے۔[4] اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا،[5] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث ہوا، انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس ظالم سے نالاں تھے،[6] سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے اس نے بدتمیزی کی۔[7] وہ ایک لاکھ بیس ہزار افراد کا قاتل تھا۔[8]

---

① مستدرک حاکم، ح: ۵۹۸۱ ② طبقاتِ ابن سعد: ۲۱۹/۶، صادر

③ "واللّٰہ ماخلعنا امیر المؤمنین، ولا نرید خلعه، ولکنا نقمنا علیه استعماله الحجاج، فاعزله عنا." (طبقاتِ ابن سعد: ۱۶۴/۷)

④ صحیح مسلم، ح: ۶۶۶۰؛ مسند احمد، ح: ۲۶۹۷۴

⑤ صحیح البخاری، ح: ۹۶۶، ۹۶۷، کتاب الجمعة، باب ما یکره من حمل السلاح فی العید والحرم؛ طبقات ابن سعد: ۱۸۷/۴

⑥ صحیح البخاری، ح: ۷۰۶۸، کتاب الفتن، باب لایاتی زمان الاالذی بعده شر منه

⑦ صحیح البخاری، ح: ۷۰۸۷؛ صحیح مسلم، ح: ۴۹۳۲، کتاب الامارة، باب تحریم رجوع المهاجر الیٰ استیطان وطنه

⑧ عن هشام بن حسان قال: احصوا ما قتل الحجاج صبراً فبلغ مائة الف وعشرین الف قتیل. (سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۰، باب ماجاء فی ثقیف کذاب ومبیر) قال الالبانی: صحیح

خود اس دور کے اموی شہزادے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ یہ مظالم دیکھ کر فرماتے تھے:

"شام میں ولید، عراق میں حجاج بن یوسف، یمن میں اس کا بھائی محمد بن یوسف، مصر میں قرۃ بن شریک اور حجاز میں عثمان بن حیان مری۔ اللہ کی زمین ظلم سے بھر چکی ہے۔"①

ایسے ظالم کی معزولی کا مطالبہ جس قدر بجا تھا وہ سب پر عیاں ہے مگر عبدالملک نے مطالبہ کرنے والوں کی کوشش کو خروج اور بغاوت ہی تصور کیا اور فوجی کارروائی کرائی جس میں ہزاروں آدمی مارے گئے یہاں تک کہ ابن اشعث کی تحریک ختم ہوگئی، وہ مفرور ہو کر قتل ہوا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ جیسے عظیم فقیہ اور محدث کو اسی خروج کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ فقہاء کی غیر جانب داری اور انصاف پسندی ملاحظہ ہو کہ یہاں بھی شخصیات کی بجائے شریعت کو کسوٹی بنا کر ابنِ اشعث اور اس کے رفقاء کی مہم پر "خروج" کا اطلاق کیا، حالانکہ ان رفقاء میں امام شعبی، سعید بن جبیر، حسن بصری، مالک بن دینار، نضر بن انس بن مالک، ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود، عطاء بن سائب، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور عبداللہ بن شداد رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر تابعین، فقہاء اور محدثین شامل تھے اور یہ حضرات خلیفہ کے اقتدار کے مخالف نہ تھے۔②

پس خروج کی تعریف میں خلیفہ کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی شرط شامل کر دی جائے تو عبدالملک اور اس سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام آئے گا کہ انہوں نے غیر باغی پر باغی کی سزا جاری کی۔

درحقیقت یہ مسئلہ اس وقت تک جواب نہیں پا سکتا جب تک خروج کی کوئی تعریف طے نہ کر لی جائے۔ تعریف طے کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ ہم اپنے دلی رجحان یعنی جانب داری اور تعصب کو مدار بنائیں اور ایسی تعریف تیار کریں جس کا اطلاق اہلِ شام اور اہلِ جمل پر نہ ہو سکے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر جانبداری کے ساتھ کتبِ فقہاء کو دیکھیں کہ صحیح ترین تعریف کون سی ہے، چاہے اس کا اطلاق اہلِ شام اور اہلِ جمل پر ہو یا نہ ہو۔

اب کتبِ فقہاء بلکہ کتبِ عقائد اور شروحِ حدیث کو دیکھنے کے بعد کم از کم اس حقیقت کا تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ان میں خروج اور بغاوت کے احکام کا اہم ترین مستدل جنگِ جمل اور جنگِ صفین ہی کو بنایا گیا ہے، اس کے بعد بھی اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ان واقعات میں فریقِ ثانی پر خروج کا اطلاق نہیں ہوتا تھا تو یہ دعویٰ کتبِ عقائد، کتبِ فقہ اور شروحِ حدیث کے پورے ذخیرے سے اعتماد اٹھا دینے کے مترادف ہوگا۔

دیگر مسائل کی طرح اس قضیے میں بھی راہِ نجات یہی ہے کہ ہم اسلاف پر اعتماد کریں۔ ان کی آراء قرآن وسنت کے عین مطابق ہیں۔ تحقیق کر کے ہر منصف مزاج عالم اسی نتیجے پر پہنچے گا۔

☆☆☆

---

① سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۲۷

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸ ؛ البدایۃ و النہایۃ: ۱۲/۳۳۶ تا ۳۳۸ ؛ تاریخ الاسلام للذہبی، وفیات: ۸۱ھ تا ۱۰۰ھ ؛ الاصابۃ: ۵/۱۲، ترجمۃ: عبداللہ بن شدّاد

﴿سوال﴾ خروج اور بغاوت کی تعریف متعین کرنے کا حق جس طرح پُرانے فقہاء کو تھا، ہمیں بھی ہے۔ اگر ہم صحابہ کے دفاع کے لیے کوئی ایسی تعریف اختیار کرلیں یا خود وضع کرلیں جس کا اطلاق اہلِ شام اور اہلِ جمل پر نہ ہوسکے تو کیا یہ اتحادِ اُمت کے لیے بہتر نہ ہوگا؟ اگر کوئی ایسا کرے تو اس پر کیا الزام عائد ہوسکتا ہے اور ایسا کرنے سے بھلا کیا خرابی پیدا ہوسکتی ہے اور ہمارے علماء و مفتیان اس بارے میں پیش رفت کیوں نہیں کرتے؟

﴿ج﴾ کسی فقہی اصطلاح یا تعریف کو وضع کرنا اور اس پر اتفاق ہو جانا کوئی کھیل نہیں۔ اُمت کے صفِ اوّل کے فقہاء نسل در نسل تحقیق کے بعد اس منزل پر پہنچتے ہیں۔ فقہ سے مناسبت نہ رکھنے والے بعض علماء کو پہلے بھی مشاجرات کے متعلق ائمہ مجتہدین کی رائے پر اشکال ہوا تھا مگر ائمہ مجتہدین اور فقہاء کا فیصلہ اپنی جگہ وہی رہا اور اسی پر امت کا اجماع ہوا۔ اللہ نے ہر فن کے رجال پیدا کیے ہیں۔ خروج کی تعریف وضع کرنے اور اس کا مصداق طے کرنے کا میدان بھی ائمہ مجتہدین کا تھا، یہاں انہی کی رائے معتبر ہوگی۔ دوسری صف کا کتنا ہی بڑا عالم اس میں دخل دے کر کوئی نئی رائے ظاہر کرے گا تو ٹھوکر کھائے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جس طرح یہ علم (اسماء الرجال) اس کے ماہرین کے لیے خاص ہے جو اس کے طرق اور معارف کو جانتے ہیں، اسی طرح ''علمائے احکام (فقہاء) ہی اس علم (فقہ) کے راستوں کو خصوصیت کے ساتھ جانتے ہیں، اسی لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہر فن کے ماہر کو اس کا حق دیا کرتے تھے، اسی لیے وہ یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کو پہلے فن (اسماء الرجال) کا ماہر تسلیم کرتے تھے، رجال کی معرفت میں انہیں بڑا درجہ دیتے تھے اور ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جبکہ یحییٰ بن معین رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کے بارے میں (کبھی) ایسا کلام (بھی) کر دیتے تھے جو درست نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ باغیوں سے قتال کی بحث میں پڑ گئے، پس امام شافعی رحمہ اللہ پر اعتراض لے کر امام احمد رحمہ اللہ کے پاس آن پہنچے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے باغیوں سے قتال کی بحث کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے قتال کا ذکر کیا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے انہیں جواب دیا: ''بھلا اس مسئلے میں اس کے سوا کچھ اور کہنا بھی ممکن ہے؟''

اور غالباً یہ بھی فرمایا: ''جس فن میں آپ کو اچھی طرح مہارت نہیں، آپ اس میں کلام نہ کریں۔''[1]

پس علماء و مفتیان کرام کوئی ایسی نئی تعریف وضع نہیں کر سکتے جس کا اطلاق مشاجرات میں اہل جمل اور اہلِ شام پر نہ ہو سکے۔ اگر کوئی ایسا سوچے گا تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان حضرات کو خروج کے اطلاق سے نکالنے کے لیے شرعی دلیل کیا دی جائے؟ ان واقعات کا کیسے انکار کیا جائے جو کتب حدیث میں بھی ہیں؟ سب بڑا سوال یہ آ کھڑا ہوگا کہ اگر اہلِ جمل اور اہلِ شام پر بغاوت کی تعریف صادق نہیں آتی تھی تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کیسے بے گناہ ہوسکتے ہیں؟ پھر تو ان کے پاس قتال کا شرعی جواز یقیناً کوئی نہیں رہتا۔ ایسے میں ایک غیر شرعی اقدام کر کے وہ اپنی

① تلخیص کتاب الاستغاثة لابن کثیر: ۱/۱۷، ط مکتبة الغرباء الاثریة (وهو تسهیل "الاستغاثة، الرد علی البکری" لابن تیمیة)

پوری جماعت سمیت کبیرہ گناہ کے مرتکب اور قتلِ ناحق کے مجرم ٹھہریں گے۔ (جیسا کہ معتزلہ کے ایک گروہ کا مذہب ہے۔) اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد اور گمان پر عمل کرتے ہوئے اہلِ جمل اور اہلِ شام کو (جو فی الواقع باغی نہ تھے) باغی سمجھ لیا تھا تو لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اجتہاد غلط تھا اور مشاجرات میں وہ مجتہدِ مخطی جبکہ اہلِ جمل اور اہلِ شام مجتہد مصیب تھے۔ یہ اہلِ سنت کے اجماع کے خلاف ہے۔

ائمہ اربعہ کی فقہ کی تمام کتب میں بغاۃ کے احکام کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اُسوہ مانا گیا ہے اور اہلِ جمل اور اہلِ شام کو بغاۃ سمجھتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں سے احکام کا استنباط کیا گیا ہے۔ لیکن نئے زاویۂ نگاہ سے معاملے کو دیکھا جائے تو پھر فقہ کے ان تمام ابواب کا انکار کر کے نئے سرے سے انہیں مدون کرنا پڑے گا۔

پھر بات یہیں نہیں رُکے گی۔ صحابہ کو ہر غلطی اور خطا سے پاک ثابت کرنے کے پُرخلوص جذبے سے آراستہ کچھ حضرات لامحالہ ایک قدم آگے بڑھا کر زیادہ اصرار کے ساتھ کتبِ فقہ کے ان ابواب کو بھی ازسرِنو مرتب کرنا چاہیں گے جن میں حدِ سرقہ، حدِ شربِ خمر اور حدِ قذف کے بعض صحابہ یا صحابیات پر جاری ہونے کا ذکر ہے۔

کیونکہ اگر ہم مان لیں کہ بعض صحابہ کو مخطی ماننا بھی توہینِ صحابہ کے راستے کھولتا ہے تو پھر ہمارے ایمان کا تقاضا ہوگا کہ بعض صحابہ سے کبائر کے صدور کی روایات کا زیادہ شدت کے ساتھ انکار کریں کیونکہ اگر بعض صحابہ کو خطائے اجتہادی کا مرتکب کہنا بے ادبی ہے تو معصیت کا مرتکب ماننا زیادہ سخت بے ادبی ہوگی اور ماننا پڑے گا کہ یہ کہیں زیادہ توہینِ صحابہ کا ذریعہ ہے۔ پس ''کتاب الحدود'' کی تمام احادیث کا انکار ایمان کا بنیادی تقاضا ٹھہرے گا، ان احادیث پر مشتمل ابوابِ فقہ کا انکار بھی عین ایمان سمجھا جائے گا۔ یوں ذخیرۂ سنت اور فقہی تُراث کو اپنے ہاتھوں ڈبونے کی روایت چل پڑے گی۔ اتحادِ اُمت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔

☆☆☆

بغاۃ کی ایک شاذ تعریف پر بحث:

﴿سوال﴾ ماضی کے بعض فقہاء ایک ایسی تعریف پیش کر چکے ہیں جس کے مطابق اہلِ جمل اور اہلِ شام حضرت علی کے خلاف بغاوت کے مرتکب نہیں ٹھہرتے۔ دیکھیے، ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے بغاۃ کی تعریف میں یہ شرط رکھی ہے کہ وہ امام کو برطرف کرنا چاہتے ہوں: '' ورامو ا خلعه.''[1]

اسی طرح خروج کی تعریف علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر آل سعدی رحمہ اللہ نے یوں بیان کی ہے:

من خرج علی الامام یرید ازالته عن منصبه فهو باغ.

جو حکمران کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اس کے منصب سے برطرف کرنا چاہتا ہو، پس وہ باغی ہے۔[2]

---

[1] الکافی فی فقه الامام احمد لابن قدامة المقدسی (م ۶۲۰ھ): ۴/۵۵، دار الکتب العلمیة

[2] منهج السالکین وتوضیح الفقه فی الدین، ص ۲۴۳، دار الوطن

اسی طرح ''فتاویٰ عالمگیری'' میں باغی جماعت کی تعریف میں یہ شرط بھی لکھی ہے:

''ویدعون الولایۃ.''[1]

یعنی جولوگ اقتدار کا دعویٰ کریں وہ باغی ہیں۔

ابن قدامہ حنبلی بہت بڑے فقیہ ہیں۔ساری دنیا ان کی فقاہت کالوہا مانتی تھی۔فتاویٰ عالمگیری کو مفتیانِ کرام کی ایک پوری جماعت نے مل کر مدون کیا۔یہ سب حضرات اس تعریف پر متفق ہوگئے۔اس سے ہمارا دعویٰ پوری طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ خروج کا اطلاق تبھی ہوگا جب کوئی خلیفہ یا شرعی حکمران کے مقابلے میں خلافت یا حکمرانی کا دعوے دار بنے۔جمل وصفین میں یہ صورتحال ہرگز نہیں تھی،اس لیے وہاں یہ اطلاق بھی نہیں ہوگا۔اس تعریف کو اختیار کرنے میں کیا حرج ہے؟

﴿جواب﴾ درحقیقت ایسے نازک مسائل میں شاذ آراء کو معیار بنانا یقیناً انصاف کی بات نہیں۔ایسی تعریف تبھی معتبر ہوگی جب وہ اسلاف کی فقہی تراث کے مطابق ہو نہ کہ مخالف۔ الّا یہ کہ قرآن وسنت کی قطعی نصوص اس شاذ تعریف کی تائیداور مقبولِ عام تعریف کی تردید کرتی ہوں۔ظاہر ہے یہاں ایسی صورت نہیں ہے۔

ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ کا مقام اپنی جگہ بہت بلند ہے مگر ان کی پیش کردہ تعریف کو خود جمہور حنابلہ نے بھی نہیں لیا۔ ابن قدامہ رحمہ اللہ تو ساتویں صدی ہجری کے عالم ہیں۔ان سے ایک صدی قبل مشہور حنبلی فقیہ ابوالخطاب الکلوذانی رحمہ اللہ (م۵۱۰ھ) نے بغاۃ کی تعریف یوں کی تھی:

''کل طائفۃ کانت لھم منعۃ وشوکۃ وخرجوا عن قبضہ الامام و راموا خلعہ اومخالفتہ بتاویل محتمل فھم بغاۃ.

ہر وہ جماعت جس کے پاس قوتِ مزاحمت اور طاقت ہو اور وہ حکمران کے بس سے باہر ہوگئی ہو اور وہ کسی قابلِ احتمال تاویل کے ساتھ حکمران کو ہٹانے یا اس کی مخالفت پر آمادہ ہو تو وہ باغی ہے۔''[2]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ''راموا خلعہ او مخالفتہ'' میں سے شقِ ثانی کو چھوڑ کر شقِ اوّل کو تعریف کا جزو بنالیا اور بعض حنبلی فقہاء نے ان کی عبارت کو جوں کا توں لے بھی لیا مگر جمہور حنابلہ نے ایسا نہیں کیا اور اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ ''راموا خلعہ'' کی قید احترازی نہیں ہے۔چونکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باغی لوگ حکمران کو ہٹانا چاہتے ہیں،اس لیے تعریف میں یہ لفظ شامل کرلیا گیا۔مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔پس بغاوت کے لیے یہ شرط نہیں۔چنانچہ امام ابن تیمیہؒ کے دادا امام عبدالسلام الحرانی رحمہ اللہ بغاۃ کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں:

اذا خرج قوم لھم شوکۃ و منعۃ علی الامام بتاویل سائغ فھم بغاۃ.

---

① الفتاوی الھندیۃ: ۲/۲۸۳،ط دارالفکر

② الھدایۃ علی مذھب الامام احمد(۱/۵۴۴) موسسۃ غراس

"جب کوئی جماعت مناسب تاویل کے ساتھ اس حالت میں امام کے خلاف اٹھ کھڑی ہو کہ اس کے پاس قوتِ مزاحمت اور طاقت ہو، تو وہ باغی ہے۔"[1]

اسی طرح امام برہان الدین حنبلی رحمہ اللہ نے بغاۃ کی تعریف یوں بیان کی ہے:

هم القوم الذين يخرجون عن طاعة الامام بتاويل سائغ ولهم منعة وشوكة.

یہ وہ لوگ ہیں جو حکمران کی اطاعت سے کسی مناسب تاویل کے باعث نکل جائیں اور ان کے پاس قوتِ مزاحمت اور طاقت ہو۔[2]

غرض جمہور حنابلہ نے "حکمران کو برطرف کرنے" کی شرط نہیں لگائی جیسا کہ باقی تینوں فقہی مذاہب بھی اس قسم کی قید سے خالی ہیں۔ اسی طرح فقہائے احناف کے فقہی مآخذ میں بھی بالعموم یہ قید نہیں پائی جاتی۔[3] اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے ان سب حضرات نے اہلِ جمل اور اہلِ صفین ہی کے معاملے کو سامنے رکھ کر اس شرط کی گنجائش نہیں سمجھی۔

عقلاً بھی دیکھا جائے تو اگر ملک کے کسی صوبے میں کوئی پارٹی مرکزی حکومت کے اختیار سے نکل کر اپنی مکمل اجارہ داری قائم کر لے اور وہ باقی صوبوں سے مرکزی حکومت کی برطرفی کا مطالبہ کیے بغیر اپنے صوبے میں مرکزی حکومت کا اختیار نہ چلنے دے اور اصرار کرے کہ جب تک اس کے فلاں فلاں (چاہے سو فیصد جائز) مطالبات نہیں مان لیے جاتے، وہ مرکزی حکومت کی ماتحتی قبول نہیں کرے گی تو کیا اسے خروج سے تعبیر نہیں کیا جائے گا؟ کیا یہ ایسا شدید سیاسی بحران نہیں ہوگا جس پر مرکزی حکومت ریاستی طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے؟ ملک تو کجا کوئی عام ادارہ بھی اس کا تحمل کر سکتا کہ ادارے کے کسی شعبے کے عہدے دار مرکزی انتظامیہ کی اطاعت سے دست بردار ہو جائیں اور مرکزی انتظامیہ کو اپنے معاملات میں دخل دینے سے روک دیں، چاہے وہ کچھ جائز مطالبات ہی پیش کر رہے ہوں اور ادارے کے بڑے کی برطرفی کا مطالبہ نہ کر رہے ہوں مگر بہر حال ایسی صورتحال نہایت خطرناک سمجھی جائے گی اور اگر ہنگامی بنیادوں پر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو یقیناً یہ صورتحال پورے ادارے کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہوگی۔

پس بعض حنبلی فقہاء کا خروج کی تعریف میں "رامو اخلعه" کی قید بڑھانا، اور فتاویٰ عالمگیری میں "ويدعون الولاية" کی عبارت قیدِ احترازی نہیں قیدِ اتفاقی ہے۔ اگر کوئی ثابت کر دے کہ یہ قیدِ احترازی ہے تو پھر یہی کہا جائے گا کہ یہ ایک تفرد ہے جس کے نہ تو عقلی مؤیدات میسر ہیں نہ نقلی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جمہور حنابلہ اور جمہور احناف کے علاوہ شوافع اور مالکیہ نے بھی اس شرط کو اختیار نہیں کیا۔

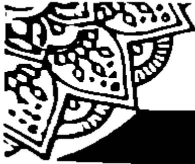
اس تعریف کے تفرد کو واضح کرنے کے بعد اب ہم بغاوت اور بغاۃ کی معروف تعریفات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

---

[1] المحرر فی الفقه علیٰ مذهب الامام احمد بن حنبل عبدالسلام ابن تیمیة الحرانی: ۱۶۶/۲، مکتبة المعارف ریاض

[2] المبدع فی شرح المقنع، برهان الدین ابو اسحاق ابراهیم: ۷/ ۲۶۹، دار الکتب العلمیة

[3] فقہ حنفی میں بغاۃ کی مقبول تعریفات آگے بیان کی جا رہی ہیں۔



شیخ عبدالقادر عودۃ مرحوم نے اس بارے میں چاروں فقہی مذاہب کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے:

فالمالكيون يعرفون البغي بانه الامتناع عن طاعة من ثبتت امامته في غير معصية بمغالبته او تاويلاً ،ويعرفون البغاة بانهم فرقة من المسلمين خالفت الامام الاعظم او نائبه لمنع حق وجب عليها او لخلفه.

(مالکیہ بغاوت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ یہ تاویل کے ساتھ جائز کاموں میں ایسے شخص کی اطاعت سے بطورِ مغالبہ رکنے کا نام ہے جس کی حکمرانی ثابت ہو چکی ہو۔وہ باغیوں کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو حکمران یا اس کے نائب کے کسی واجب شدہ حق کو روک کر حکمران یا اس کے نائب کی مخالفت کریں۔)

ويعرف الحنفيون البغاة ويستخرجون منها تعريف البغي بانه الخروج عن طاعة الامام بغير حق والباغي بانه الخارج عن طاعة امام الحق بغير حق.

(حنفیہ باغیوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں اور اسی سے بغاوت کی تعریف ثابت کرتے ہیں کہ یہ حکمران کی اطاعت سے ناحق باہر نکل جانے کا نام ہے اور باغی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ شرعی حکمران کی اطاعت سے ناحق نکلنے والا ہے۔)

ويعرف الشافعيون البغاة بانهم المسلمون مخالفو الامام بخروج عليه وترك الانقياد له او منع حق توجه عليهم بشرط شوكة لهم وتاويل ومطاع فيهم ،وهم الخارجون عن الطاعة بتاويل فاسد لا يقطع بفساده ان كان لهم شوكة بكثرة او قوة وفيهم مطاع ، فالبغي اذن عند الشافعيين هو خروج جماعة ذات شوكة ورئيس مطاع عن طاعة الامام بتاويل فاسد.

(شافعیہ باغیوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ایسے مسلمان ہیں جو حکمران کے خلاف کھڑے ہو کر اور اس کی اطاعت ترک کر کے یا اس کا حق جو ان پر عائد ہے روک کر اس کی مخالفت کریں بشرطیکہ کہ ان کے پاس قوت ہو اور ان میں کوئی ایسا شخص ہو جس کی وہ اطاعت کرتے ہوں۔یہ لوگ ایسی فاسد تاویل کی وجہ سے جس کا فساد قطعی نہ ہو، اطاعت سے نکل جاتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس کثرت یا طاقت کی وجہ سے دفاعی صلاحیت ہو اور ان کا کوئی پیشوا ہو۔پس شوافع کے نزدیک اپنے دفاع کی طاقت رکھنے والی کسی جماعت کا جس کا کوئی پیشوا ہو، کسی فاسد تاویل کی وجہ سے حکمران کی اطاعت سے نکل جانا بغاوت ہے۔)

ويعرف الحنابلة البغاة بانهم الخارجون عن امام ولو غير عادل بتاويل سائغ ولهم شوكة ولو يكن فيهم مطاع فالبغي عند الحنابلة لا يختلف في تعريفه كثيراً عند الشافعية.

(حنابلہ کے نزدیک باغیوں کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی مناسب تاویل کے باعث حکمران کی

اطاعت سے نکل جائیں چاہے وہ غیر عادل ہو، اور ان لوگوں کے پاس دفاع کی صلاحیت ہو، چاہے ان میں کوئی پیشوا نہ ہو۔ پس حنابلہ کے ہاں بغاوت کی تعریف شوافع کی تعریف سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔)[1]

☆☆☆

یہ تو تھا شیخ عبدالقادر عودہ کا بیان، جسے ہم نے اختصار اور جامعیت کے پیش نظر پہلے ذکر کر دینا مناسب سمجھا۔ اب فقہی مذاہب کے اصل مآخذ کی کچھ عبارات ملاحظہ ہوں۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واذا كانت لاهل البغى جماعة تكبر و يمتنع مثلها بموضعها الذى هى به بعض الامتناع حتىٰ يعرف ان مثلها لا ينال الا حتّى تكثر نكايته واعتقدت ونصبت اماما و اظهرت حكما وامتنعت من حكم الامام العادل فهذه الفئة الباغية.

(جب اہلِ بغی کی کوئی جماعت بڑی ہو جائے اور اتنی بڑی جماعت کسی ایسے علاقے میں جہاں وہ ٹھہری ہوئی ہے اس حد تک قوتِ مدافعت حاصل کر لے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس جیسی جماعت پر گرفت اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک اسے بکثرت چوٹیں نہ لگائی جائیں اور وہ جماعت (باہم) عہد و پیمان کر کے ایک حاکم طے کر لے اور حکم نافذ کرے اور امام عادل کے حکم کی تعمیل سے احتراز کرے تو یہی الفئۃ الباغیۃ ہے۔)[2]

فقہ شافعی کے شارح امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ نے بہت عمدہ سیاق میں مسئلے کو واضح فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

والقدر الذى يجب الاكتفاء به، ذكر الامام العادل والخروج عن طاعته الواجبة.

(تعریفِ خروج میں) جس قدر بات پر اکتفاء واجب ہے وہ ہے امام عادل کا ذکر کرنا اور اس کی اطاعتِ واجبہ سے نکل جانا۔

پھر فقہاء کی بیان کردہ جزئیات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

وقد قال الفقهاء: البغاة هم الذين يستجمعون اوصافاً: احدها: التمسك بتاويل مظنون يزعمون انه حامل علىٰ خروج الامام والانسلال عن متابعته، هذا لابد منه، والثانى: ان يرجعوا الىٰ شوكة ومنعة، فهذان معتبران.

(فقہاء کہہ چکے ہیں کہ بغاۃ وہ ہیں جن میں کچھ اوصاف جمع ہو جائیں۔ ایک ان کا کسی ظنی تأویل کو پکڑنا اور وہ گمان کرتے ہوں کہ یہ وجہ حکمران پر خروج کرنے اور اس کی اطاعت سے نکل جانے کا باعث ہے۔ یہ شرطِ لازم ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مزاحمت اور دفاع کے قابل ہو جائیں۔ پس یہ دو شرائط معتبر ہیں۔)[3]

---

[1] التشريع الجنائى الاسلامى مقارنا بالقانون الوضعى (عبدالقادر عودة) دار الكتاب العربى بيروت،

[2] الام: ۲۳۰/۴، وهكذا نقله تلميذ الامام الشافعى اسماعيل بن يحيىٰ المزنى (مختصر المزنى، ص ۳۶۴)

[3] نهاية المطالب فى دراية المذاهب: ۱۲۶/۱۷، ط دار المنهاج

امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی اس مسئلے پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔ وہ مسئلے کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ویعتبر فیھم ثلاثة شروط: الشوکة، والتأویل، ونصب الامام فیما بینھم.

''ان لوگوں میں تین شروط معتبر ہیں، قوتِ مزاحمت۔ تأویل۔ اور اپنا ایک حاکم کا مقرر کرنا۔''

الشرط الاوّل: الشوکة: وھو ان یجتمع قوم ذو نجدة علیٰ مخالفة الامام ....

''پہلی شرط شوکت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلح جماعت حکمران کی مخالفت پر جمع ہو جائے۔''

پھر فرماتے ہیں:

ثم لایخفی ان الشوکة لا تتم ما لم یکن فیھم واحد مطاع.

''پھر یہ بات مخفی نہیں کہ قوتِ مزاحمت اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک ان میں کوئی ایسا شخص نہ ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔''[1]

امام یحییٰ عمرانی شافعی رحمہ اللہ بغاوت اور بغاۃ کی تعریف میں ملحوظ شرائط یوں بیان فرماتے ہیں:

''احدھا: ان یکونوا طائفة فیھم منعة یحتاج الامام فی کفھم الی عسکر فان لم یکن فیھم منعة وانما ھم عدد قلیل لم یتعلق بھم احکام البغاة.

''پہلی شرط یہ ہے کہ وہ لوگ ایسی قوتِ مدافعت والی جماعت بن جائیں کہ حکمران انہیں روکنے کے لیے فوج کا محتاج ہو۔ اگر ان میں قوتِ مدافعت نہیں اور وہ تھوڑے لوگ ہیں تو ان پر بغاۃ کے احکام لاگو نہیں ہوتے۔''

الشرط الثانی: ان یخرجوا من قبضة الامام، فان لم یخرجوا من قبضته لم یکونوا بغاة.

''شرطِ ثانی یہ ہے کہ وہ حکمران کے بس سے باہر ہوں۔ اگر وہ حکمران کے بس سے باہر نہیں تو وہ باغی نہیں۔''

الشرط الثالث: ان یکون لھم تاویل سائغ مثل ان تقع لھم شبھة یعتقدون عنھا الخروج علی الامام او منع حق لھم وان اخطئوا فی ذلک.

''تیسری شرط یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی مناسب تاویل ہو مثلاً انہیں کوئی ایسا شبہ لگ گیا ہو جس کی وجہ سے وہ امام کے خلاف کھڑے ہونے یا اس کے کسی حق کو روکنے کا اعتقاد رکھتے ہوں، چاہے ان کی یہ تاویل غلط ہو۔''

وھل من شرطھم ان ینصبوا اماما؟ ففیه وجھان: احدھما ان ذلک من شرطھم لان

---

① الوسیط فی المذھب: ۶/۴۱۵، ۴۱۶، دار السلام قاهره

یاد رہے کہ بعض فقہاء مثلاً علامہ کاسانی نے بغاۃ کی تعریف میں یہ شرط لگا دی ہے کہ وہ مسلمانوں کی تکفیر کریں اور ان کے جان و مال کا احلال کریں۔ (فطلعة من الخوارج یستحلون القتال والدماء والاموال، البدائع والصنائع: ۷/۱۴۰) مگر چاروں مذاہب کے جمہور فقہاء نے متعدد مقامات پر واضح کیا ہے کہ یہ شرط لگانے والوں نے خوارج اور بغاۃ کے مسائل کو خلط ملط کر دیا ہے اور دونوں کو ایک تصور کر لیا ہے۔ جبکہ دونوں کی تعریف اور احکام میں فرق ہے۔ پہلا فرق یہی ہے کہ بغاۃ مسلمانوں کی تکفیر نہیں کرتے اور میدانِ جنگ کے سوا ان کا قتل جائز نہیں سمجھتے، پس محض بغاوت سے فسق لازم نہیں آتا بلکہ بغاۃ مجتہد اور معذور ہو سکتے ہیں جیسا کہ اہلِ جمل و صفین اور اہلِ حرہ جبکہ خوارج کے لیے سخت وعیدیں ہیں، وہ ہرگز مجتہد نہیں ہو سکتے بلکہ بلاشبہ فاسق اور مبتدع ہوتے ہیں۔

الشافعی رحمہ اللہ قال: وان ینصبوا اماما والثانی: وھو المذھب، ان لیس من شرطھم ان ینصبوا اماما لان الاحکام اھل البصرۃ واھل النھروان مع علیؓ وارضاہ احکام البغاۃ ولم ینصبوا اماما. واما ما ذکرہ الشافعی رحمہ اللہ، فانما ذکرہ لان الغالب من امرھم انھم ینصبون اماما.

''اور کیا باغی ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اپنے مابین کوئی حاکم مقرر کریں؟ اس بارے میں دو آراء ہیں:

ایک شرط یہ ہے، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ کوئی امام مقرر کرلیں۔

دوسری رائے جو کہ (شوافع کا) مذہب بھی ہے، یہ ہے کہ یہ شرط نہیں کہ وہ اپنے لیے کوئی حاکم مقرر کریں؛ کیوں کہ حضرت علیؓ کے مقابلے میں اہلِ بصرہ (اہلِ جمل) اور اہلِ نہروان پر باغیوں کے احکام جاری ہوئے تھے حالانکہ انہوں نے کوئی حاکم مقرر نہیں کیا تھا۔ رہی وہ بات جو امام شافعی رحمہ اللہ نے ذکر کی تو وہ انہوں نے اس لیے ذکر کی کہ عموماً باغی اپنا کوئی حاکم مقرر کیا کرتے تھے۔ (یعنی یہ قید احترازی نہیں)''[1]

بغاۃ کے مسئلے میں حضرات فقہائے احناف کی تعریف سب سے زیادہ جامع، مانع اور عقلی ونقلی دلائل کے سب سے زیادہ مطابق ہے۔ فقہ حنفی کے بیشتر مآخذ میں بغاۃ کی تعریف ''بغاوت'' کی تعریف کے ذیل میں یوں پیش کی گئی ہے:

اذا تغلب قوم من المسلمین علیٰ بلدٍ وخرجوا من طاعۃ الامام.

''مسلمانوں کی جماعت جو کسی شہر پر غلبہ حاصل کرلے اور حکمران کی اطاعت سے نکل جائے۔''[2]

فاذا خرج جماعۃ مسلمون عن طاعتہ وغلبوا علیٰ بلدٍ دعاھم الیہ وکشف شبھتم. فان تحیزوا مجتمعین حل لنا قتالھم حتیٰ نفرق جمعھم.

''اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت حکمران کی اطاعت سے نکل جائے اور وہ کسی شہر پر قبضہ کرلے تو حکمران اسے اطاعت کی دعوت دے اور اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ لوگ اجتماعی طور پر کہیں مورچہ بند ہوجائیں تو ان سے جنگ درست ہوگی یہاں تک کہ ہم ان کی جمعیت منتشر کردیں۔''[3]

علامہ عینی رحمہ اللہ نے تعریف یوں کی ہے: ''اھل البغی ھم الخارجون علیٰ امام الحق بغیر الحق.''

''باغی وہ لوگ ہیں جو شرعی حکمران کے خلاف ناحق اٹھ کھڑے ہوں۔''[4]

قارئین ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ فقہائے احناف کی تعریف سب سے زیادہ عام فہم، آسان اور واضح ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے فقہ حنفی کا مرکز کوفہ تھا لہٰذا حضرت علیؓ کی علمی تراث سے احناف سب سے زیادہ مستفید ہوئے۔

دورِ حاضر کے جید فقہاء نے ان ساری تعریفات کا خلاصہ یوں نکالا ہے:

---

[1] البیان فی مذھب الامام الشافعی: ۱۲/ ۱۲ تا ۱۸ دار المنھاج جدۃ

[2] ھدایۃ، ج ۲ باب البغاۃ. وقال النسفی: خرج قوم مسلمون عن طاعۃ الامام وغلبوا علی بلد. (کنز الدقائق، کتاب السیر باب البغاۃ)

[3] رد المحتار علی الدر المختار لابن عابدین الشامی: ۴/ ۲۶۲

[4] البنایۃ شرح الھدایۃ لبدر الدین العینی: ۷/ ۲۹۸، العلمیۃ

البغاة هم الخارجون من المسلمين عن اطاعة الامام الحق بتأويل ولهم شوكة.
(کسی تاویل کے باعث شرعی حکمران کی اطاعت سے نکلنے والے مسلمان جن کے پاس قوتِ مزاحمت ہو۔)[1]

فقہی تعریفات کو دیکھنے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کا اطلاق اہلِ جمل اور اہلِ شام پر بہت واضح ہے اور فقہی دلائل کو دیکھیں تو یہ بھی مخفی نہیں رہے گا کہ یہ تعریفات اہلِ جمل اور اہلِ شام کے قضایا ہی سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کی کوشش پورے فقہی ذخیرے پر پانی پھیرنے کے مترادف ہوگی۔ اجماعِ اُمت کی مخالفت کرنے اور فقہ وحدیث کے ابواب کو ٹھکرانے سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ ابنِ قدامہ، عبدالرحمٰن آل سعدی اور فتاویٰ عالمگیری کی بیان کردہ بغاۃ کی تعریف کو قابلِ اصلاح یا قابلِ تاویل سمجھا جائے۔ اس بحث کو ہم امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے ایک فتوے پر ختم کرتے ہیں۔ وہ ایک استفتاء کے جواب میں حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ نقل کر کے فرماتے ہیں:

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت رضی اللہ عنہ علی سے قتال جائز نہ تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والا مخطی تھا چاہے تاویل کے ساتھ ہو، یا بغیر تاویل کے بغاوت کرنے والا ہو۔ اور یہی ہمارے اصحاب کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول ہے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والے پر مخطی کا حکم لگاتا ہے۔ یہی ائمہ مجتہدین کا مذہب ہے جنہوں نے اسی بنیاد پر تاویل کرنے والے باغیوں سے قتال کا مسئلہ اخذ کیا ہے۔ اور اسی طرح جب یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ پر اعتراض کیا کہ انہوں نے باغیوں سے قتال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت سے استدلال کیوں کیا[2] اور کہا: ''کیا امام شافعی رحمہ اللہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو باغی قرار دے رہے ہیں؟'' تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے کہا: ''آپ پر افسوس! امام شافعی رحمہ اللہ کے لیے اور کس چیز کی گنجائش تھی جسے وہ اس مقام پر رکھتے؟'' مطلب یہ تھا کہ اگر امام شافعی رحمہ اللہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کی اقتداء نہ کرتے تو ان کے پاس باغیوں سے قتال کے مسئلے میں خلفائے راشدین کی سنت میں سے کچھ بھی نہ ہوتا۔''[3]

بہر حال اگر کوئی شخص اپنے زعم میں اسلام کی بہتر خدمت اور عقائد کی زیادہ حفاظت کے لیے اس فقہی تراث کو مسترد کرنے کے درپے ہے تو اسے خروج کی کوئی نئی تعریف طے کرنا پڑے گی۔ لیکن کیا اس طرح سب کے لیے گنجائش نہیں نکل آئے گی کہ وہ دیگر مسائل میں موشگافیاں کریں اور کسی بھی دینی حکم کی تعریفات تک بدل ڈالیں؟

---

① الموسوعة الفقهية الكويتية: ۱۳۰/۸

② امام شافعی کا یہ استدلال ان کی شہرہ آفاق تصنیف ''کتاب الام'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (كتاب الام: ۲۲۹/۴، ط المعرفة)

③ وهو دليل على انه لم يكن يجوز قتال عليّ، وعلىٰ هذا فمقاتله مخطئ وان كان متأولاً او باغ بلا تأويل وهو اصح القولين لاصحابنا، وهو الحكم بتخطئة من قاتل علياً، وهو مذهب الائمة الفقهاء الذين فرّعوا على ذلك قتال البغاة المتأولين، وكذالك انكر يحيى بن معين على الشافعي استدلاله بسيرة عليّ في قتال البغاة المتأولين، قال: ايجعل طلحة والزبير بغاة؟ رد عليه الامام احمد فقال: ويحك، واي شيء يسعه ان يضع في هذا المقام يعني ان لم يقتد بسيرة عليّ في ذالك لم يكن معه سنة الخلفاء الراشدين في قتال البغاة. (مجموع الفتاوىٰ لابن تيمية: ۴۳۸/۴)

☆☆☆

اسلاف نے عظمتِ صحابہ کا عقیدہ رکھنے کے باوجود بعض صحابہ پر خروج کا اطلاق کیسے کر دیا؟

﴿سوال﴾ اسلاف اور اکابر علماء ایک طرف تو عظمتِ صحابہ اور عدالتِ صحابہ کا جھنڈا اُٹھائے دکھائی دیتے ہیں، دوسری طرف انہوں نے اہلِ شام اور اصحابِ جمل پر بغاوت کا اطلاق کرنے میں کوئی حیا محسوس نہیں کی۔ یہ کیسا دوغلا پن ہے آج کل کے گئے گزرے مسلمان کو بھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ وہ صحابہ کے بارے میں ایسی بات کرے تو اتنے بڑے بڑے علماء ایسا کیوں لکھ گئے؟ کیا علماء کو طبعی طور پر یہی پسند تھا کہ ایک فریق کو "بغاۃ" بنا کر چھوڑا جائے؟

﴿جواب﴾ یہ الزام بالکل غلط ہے۔ ہر مسلمان طبعی طور پر یہی چاہے گا کہ صحابہ میں سے کسی پر کسی حال میں "خروج" بلکہ کسی بھی غلطی کا اطلاق نہ ہو۔ قرونِ اولیٰ سے طبعی طور پر یہی پسندیدہ ہے۔ اسی لیے جہاں تک ممکن ہوا، اسلاف نے کسی ادنیٰ صحابی کی لغزش کی بھی کوئی معقول توجیہ بیان کرنے کوشش کی ہے۔ یقیناً اسلاف کو یہ بات کہیں زیادہ ناگوار معلوم ہوتی ہوگی کہ بعض صحابہ پر "خروج" کا اطلاق کیا جائے۔ صحابہ سے دلی اور عملی محبت میں وہ ہم سے بہت آگے تھے، مگر مسئلہ اس دین کی حفاظت کا تھا جس کے لیے خود صحابہ قربانیاں دیتے رہے۔ اس دین کا ایک اہم شعبہ اسلامی ریاست ہے جس کا قیام جتنا ضروری ہے، اسی قدر اس کا استحکام بھی ضروری اور مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس استحکام کے لیے لازم ہے کہ ملک کو بغاوتوں، شورشوں اور علیحدگی پسندی کی تحریکوں سے بچانے کے لیے کوئی ضابطہ موجود ہو۔ اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ خروج یا بغاوت کی کوئی تعریف متعین کی جاتی تا کہ اسے دیکھ کر ہمیشہ یہ طے کیا جا سکتا کہ حکمران کی طرف سے کس قسم کا انکار خروج ہے اور کس قسم کا محض تنقید یا احتجاج۔ کس قسم کی مخالفت پر ریاستی طاقت اور فوجی قوت استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور کہاں نہیں۔

مثلاً مقامِ افتاء پر فائز حضرت علقمہ بن قیس رحمہ اللہ جیسے تابعین جو خود جنگِ صفین میں علوی لشکر کا حصہ تھے، لازمی طور پر اس مسئلے سے دوچار تھے کہ بغاوت کے احکام کے لیے قانون سازی کس طرح کی جائے۔ اگرچہ بغاوت کی سزا کے لیے نصِ قرآن مجید کی آیت فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ ان حضرات کے سامنے تھی مگر سنتِ نبویہ بلکہ دورِ خلفائے ثلاثہ میں بھی اس کے واضح عملی نظائر نہ تھے جنہیں دیکھ کر خروج کی صحیح تعریف اور اس کے جزئی احکام طے کیے جاتے۔

ایسے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اندرونِ ملک مخالفین سے جو جنگیں لڑیں اور ان میں جو لائحہ عمل اختیار کیا، وہی بغاوت کی تعریف اور احکام اخذ کرنے کے لیے سب سے معتبر ماخذ سمجھا گیا؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بالاتفاق خلفائے راشدین کا طرزِ عمل سب سے قوی دلیل ہے۔ بعد والے زمانے میں ان جیسا کوئی نہ تھا جس سے ایسے نازک ترین صورت میں استدلال کیا جا سکتا۔

پس دورِ علوی میں اندرونِ ریاست جنگوں کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے بغاوت کی تعریف طے کر دی۔ تعریفوں کے الفاظ میں فرق ہے مگر حاصل تقریباً ایک ہی ہے یعنی کسی علاقے پر قبضہ اور حکمران کی اطاعت کا انکار۔




پس فقہاء اگر شخصیات کے احترام کو دیکھتے اور اہلِ شام پر جو پورے صوبے پر قابض تھے، بغاوت کا اطلاق نہ کرتے تو تا قیامت کسی اسلامی ملک میں کسی شہر یا قلعے پر قابض کسی باغی کے خلاف حکومتی کارروائی کی گنجائش نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہر جگہ یہی سوال آ کھڑا ہوتا کہ خیر القرون میں ایک پورے صوبے پر قابض جماعت پر بغاوت کا اطلاق نہیں ہو سکا اور ان کے خلاف طاقت کا استعمال ناجائز تھا تو اب کسی ایک شہر یا چند قلعوں کا حکومت کی اطاعت نہ کرنا کیسے بغاوت مانا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہ کہہ کر مسئلے کی حقیقت بدلنے کی گنجائش ہرگز نہ ہوتی کہ وہ حضرات صحابہ وتابعین تھے اس لیے ان کی بات اور تھی اور وہ احتراماً بغاوت کے اطلاق میں داخل نہیں کیے جا سکتے تھے۔

اس لیے کہ شرعی احکام میں اللہ نے کسی بشر کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف عملاً بعض صحابہ پر بعض حدود نافذ کیں بلکہ قولاً بھی فرمادیا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔[1]

اُن سزاؤں اور یہاں اہلِ شام کی صورتحال میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ یہ کہ وہ انفرادی لغزشوں کے معاملات تھے اور یہ ایک جماعت کی غلطی تھی۔ مگر شریعت میں کوئی ایسا اصول بھی نہیں جس میں انفرادی غلطی قابلِ تعزیر ہو اور جماعتی غلطی قابلِ تصویب ہو۔ اگر بالفرض یہ علت نکال کر کہ اہلِ شام مقدس شخصیات تھے جن کے احترام کا حکم خود اللہ نے دیا ہے، انہیں فردِ بغاوت سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو قیامت تک یہ طے ہو جاتا کہ اگر کوئی بدقماش شخص حکومت کے خلاف سر اٹھائے تو یہ بغاوت ہوگی لیکن کوئی بزرگ شخصیت چاہے کسی پورے صوبے کو ہاتھ میں لے لے، اسے بغاوت کہنا شرعاً غلط ہوگا۔ پھر یہ نہ کہا جا سکتا کہ بغاوت سے استثناء صرف صحابہ کا تھا؛ کیوں کہ اس کے جواب میں فوراً یہ کہا جا سکتا تھا کہ جو حیثیت صحابہ کی آپس میں تھی، وہی حیثیت بعد والوں کی ایک دوسرے کے لیے ہے اور استثناء کی علت احترام وتقدس ہے جو یہاں ان بزرگ کی جماعت کو حاصل ہے۔

ظاہر ہے قرآنی آیت: ''فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِيْ'' کے تحت مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف قتال کی صرف ایک ہی صورت میں گنجائش ہے، یعنی جب وہ بغاوت کرے۔ اگر قرنِ اول کی نیک جماعتوں کو اصولِ احترام وتقدس کے تحت اس اطلاق سے نکال دیا جاتا تو تا قیامت بغاوتوں کا ایک ایسا دروازہ کھل جاتا کہ کوئی مسلمان مملکت چند سالوں کے لیے بھی نہ ٹھہر پاتی۔ ایک ایسا بدترین نظام وجود میں آتا کہ ساری دنیا تماشا دیکھتی۔ آسمانی شریعت سے محروم اور صرف عقل وتجربے کی بنیاد پر چلنے والی حکومتیں بھی اسلامی حکومتوں سے بدرجہا مستحکم ہوتیں؛ کیوں کہ ان کے پاس مخالفین کو روکنے اور تابع بنانے کا اختیار ہوتا۔ جب کہ عالمِ اسلام کی کسی چھوٹی سی حکومت کے پاس بھی یہ ضمانت نہ ہوتی کہ وہ چند سالوں میں مزید لاتعداد ٹکڑوں میں نہیں بٹے گی۔ احترام اور تقدس کے اصول سے فائدہ اٹھا کر اگر ہر ملک میں متعدد بزرگ اپنے اپنے شہروں کو قبضے میں لے کر حکومت کرتے تو مفتیانِ اسلام، قاضیانِ عدلیہ اور کوئی بھی خدا ترس حکمران انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا؛ کیوں کہ قرنِ اول میں طے شدہ اصول کو توڑا جاتا تو حکومت غیر اسلامی قرار پاتی۔

[1] صحيح البخاري، ح: ٦٧٨٧، كتاب الحدود، باب إقامة الحدود على الشريف والوضيع

اس کے دو ہی نتیجے نکل سکتے تھے: یا تو عالم اسلام پہلی صدی ہجری میں ہی نا قابلِ شمار اکائیوں میں بٹ جاتا۔ یا حکمرانوں کو یہ ماننا پڑتا کہ اسلام کے ساتھ سیاست چلانا ناممکن ہی۔ پس کوئی بھی حکمران تقدس کے حامل باغیوں کو کچل کر کوئی مضبوط حکومت تبھی بنا پاتا جب پہلے وہ حکومت اور مذہب کی علیحدگی کا اعلان کر دیتا۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اہلِ شام پر بغاوت کا اطلاق کرنے اور ان کے خلاف طاقت کے استعمال کو جائز سمجھنے سے قابلِ احترام شخصیات کا بغاوت سے مستثنیٰ نہ ہونا طے نہ ہو گیا ہوتا، تو خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ہرگز گنجائش نہ ہوتی کہ وہ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے خلاف کچھ کر سکتے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی بزرگی کا لحاظ کیے بغیر انہیں اور ان کے ساتھیوں کو سزائے موت اسی لیے دی تاکہ ملک میں انتشار نہ ہو۔ غرض بغاوت کی یہ تعریف جس کا اطلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں، سیاسی حریفوں پر ان کے تقدس یا عدم تقدس کا لحاظ رکھے بغیر ہوا، اور اسی کے مطابق پھر ان سے معاملہ کیا گیا، سیاسی نظام کا ایک فطری تقاضا تھا جسے فقہاء نے ان تمام عواقب کا اندازہ کر کے جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، بروقت سمجھا اور طے کیا۔ خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بلکہ تمام اموی و عباسی خلفاء نے اسی کو اختیار کیا۔ یہ اس امت پر اللہ کی بہت بڑی رحمت تھی کہ یہ احکام و آداب اسی وقت وضع ہو گئے اور آئندہ اسلامی نظام پر چلنے کے خواہاں ہر حکمران کو ایسے نازک معاملات کے لیے ایک نہایت مناسب و معتدل لائحہ عمل نصیب ہو گیا جس میں افراط ہے نہ تفریط۔ نہ ہی ایسی سختی ہے کہ شہری بدک جائیں اور نہ ایسی نرمی کہ ملک کے تار و پود بکھرتے چلے جائیں۔

آخر میں اپنی مخصوص رائے پر زور دینے والے متجددین سے گزارش ہے کہ اس نکتے پر غور فرمائیں کہ اہلِ جمل اور اہلِ شام کو خروج کے اطلاق سے باہر ماننے سے کیا لازم آئے گا؟

یہی کہ اہلِ جمل اور اہلِ صفین سے خروج صادر ہوئے بغیر لشکرِ علوی نے ان سے قتال کیا۔ اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ حضرت علی، حضرت حسنین کریمین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عمار بن یاسر اور ان کے ساتھ جنگ کی قیادت کرنے والے متعدد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سبھی نے شرعی دائرے سے باہر ہو کر قتال کیا تھا یعنی یہ سب عمداً قتلِ ناحق کے مرتکب اور اکبر الکبائر میں ملوث ہوئے۔ پس نتیجے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر آنے والے شامی حضرات تو مظلوم اور برحق ثابت ہو جائیں گے مگر ان کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء قتلِ ناحق کے مرتکب ہو کر فاسق و فاجر اور ظالم ثابت ہوں گے یا ان کے شرفِ صحبت کی رعایت کی جائے گی تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہنے کی گنجائش نکلے گی کہ ان سے خطائے اجتہادی ہوئی تھی۔ یہ من وعن مروانیوں کے نظریات ہیں۔ ان میں سے متشدد لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو فاسق و فاجر اور ظالم یا احمق مانتے ہیں جبکہ کچھ حضرات رعایت فرما کر کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطائے اجتہادی صادر ہوئی تھی۔ یہ نظریہ اجماعِ اُمت سے کھلم کھلا متصادم ہے۔ جمہور علماء نے خروج کی جو تعریف مقرر کی ہے، اس کے لحاظ سے بغاوت اور خطائے اجتہادی کا اطلاق بلاشبہ اہلِ جمل و صفین پر ہوتا ہے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر۔ نیز ان حضرات کو مجتہد، معذور، مغفور بلکہ ماجور بھی مانا جاتا ہے۔ اب سوچ لیں کہ کونسا راستہ

صحابہ کی عدالت اور وقار کے زیادہ مناسب ہے اور کونسا گمراہ فرقوں کی رائے سے قریب تر۔

اگر کوئی صحابہ کے درمیان یکساں توازن رکھنے کی کوشش میں یہ جدید نظریہ اپنا رہا۔ ہے تو وہ غور کر لے کہ ایک فریق تو پھر بھی خطئی ثابت ہوگا۔ فرق یہ ہوگا کہ نسبتاً زیادہ جلیل القدر صحابہ خطئی مانے جائیں گے اور ساتھ ہی اجماع کی مخالفت بھی لازم آئے گی۔ بس اس نئے نظریے کو اپنانا بارش سے بچ کر پرنالے میں کھڑے ہونے کے مترادف ہے۔

☆☆☆

اکابر مشاجرات کے متعلق سکوت کا حکم بیان کر کے اس بحث میں دخل کیوں دیتے ہیں؟

﴿سوال﴾ صحابہ کرام کے بارے میں علمائے اہلِ سنت کا زاویہ فکر نا قابلِ فہم اور دوغلے پن پر مبنی ہے۔ ایک طرف حافظ ابن حجر عسقلانی، ملا علی قاری، امام نووی، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، امام رازی، علامہ آلوسی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہم اللہ جیسے علماء کی کتب میں جگہ جگہ یہ کہا گیا ہے کہ حدیث کا حکم ہے کہ صحابہ کے اختلافات اور مشاجرات کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، اس میں کلام نہ کیا جائے کہ عقیدۂ تقدیر کی طرح یہ ہلاکت خیز مقام ہے، "مزلۃ الاقدام" ہے۔ اس سے بچو۔ مگر جگہ جگہ وہ خود اس معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں، پوری پوری بحثیں کرتے ہیں اور آخر میں پھر کہتے ہیں کہ یہ حضرات مجتہد تھے، اس پر بحث نہ کی جائے۔ خطائے اجتہادی سے اوپر کوئی بات ہرگز نہ کی جائے۔ مگر پھر بھی علماء حد سے تجاوز کر کے اجتہاد سے بھی آگے یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ فلاں خطئی تھا اور فلاں مصیب۔ میرا مدعا یہ ہے یا تو سکوت اور توقف والے مذہب پر چلیں، ان مسائل پر کبھی زبان یا قلم کو حرکت ہی نہ دیں جیسا کہ حدیث کا حکم ہے۔ یا فقط اجتہاد تک بات کر کے اور فریقین کو مصیب کہہ کر بحث ختم کر دیں۔ اگر گستاخیاں کرنی ہی ہیں تو پھر دورُخی سہ رُخی چھوڑ کر روافض کی طرح سیدھا سیدھا اسی کو اپنا مذہب بنائیں۔ یہ دورُخی پالیسی سمجھ سے باہر ہے۔

﴿جواب﴾ یہاں سب سے پہلے آپ ہی پر سوال عائد ہوتا ہے کہ آپ اس بحث کو کیوں چھیڑ رہے ہیں؟ آپ کے سوال سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمیشہ سکوت اختیار کرنا فرض ہے، اسی لیے آپ اس پر زور دے رہے ہیں۔ تو سب سے پہلے آپ کو اپنا سوال واپس لے کر اپنے مذہب سکوت پر عمل کرنا چاہیے۔

جہاں تک اہلِ سنت والجماعت کے مذہب کا تعلق ہے، ان کے ہاں عام حالات میں سکوت لازم ہے مگر ضرورتاً اس بحث کی اجازت بھی ہے۔ اہلِ سنت کی کوئی دورُخی یا سہ رُخی پالیسی نہیں ہے۔ ان کی ہر بات کا اپنا محل ہے۔ اسے اس مقام پر رکھ کر دیکھا جائے تو اس کی ضرورت اور صحیح حیثیت سمجھ آسکتی ہے۔

علماء نے جہاں مشاجرات میں کلام کرنے سے منع کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ضرورتاً بھی اس بارے میں لب کشائی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ عقائد کی تعلیم، حدیث کی تدریس اور تشریح، یا کسی کج فکر شخص کے اعتراضات کی تردید کے لیے اس پر کلام بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کہیں صحابہ کے مشاجرات کی بحث چھڑ گئی ہو جیسا کہ آج بھی اس

معاملے پر تحریری اور لسانی معرکے جاری ہیں، تو اس بارے میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر بیان کرنے کے لیے قلمی یا لسانی کوشش لازم ہے۔ بصورتِ دیگر باطل نظریات کو رد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ اسلاف نے مشاجراتِ صحابہ کی بحث کو "مزلۃ الاقدام" کہا ہے مگر اس کا بھی ایک محمل اور موقع ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے راقم اپنے استاذ مرحوم حضرت مفتی محمد مجاہد شہید کے ایک فتوے کا اقتباس نقل کر رہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس موضوع میں سلف کی تحقیقات سے بے نیاز ہو کر راہِ شذوذ اختیار کی جائے تو یہ موضوع مشکل، خطرناک اور مزلۃ الاقدام ہے۔ اور اگر سلف پر اعتماد کرتے ہوئے "اتبعوا السواد الاعظم" کی راہ اپنائی جائے تو نہایت سلامتی کے ساتھ یہ پل صراط عبور ہو سکتا ہے، اس لیے دیگر عقائد کے ساتھ اس موضوع میں بھی ان حضرات کی رائے کو اس شرحِ صدر کے ساتھ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں جتنے پہلوؤں کی رعایت ضروری ہے، ان تمام کی رعایت ان حضرات نے قرآن وسنت کے مزاج کے عین مطابق فرمائی ہے، حتمی حیثیت دے کر اس موضوع پر کچھ کہا سوچا جا سکتا ہے۔"[1]

☆☆☆

﴿سوال﴾ ایک "محقق" فرما رہے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ دونوں ۱۰۰ فیصد مصیب تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ شرعی اور فقہی لحاظ سے مصیب تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ انتظامی اور سیاسی لحاظ سے مصیب تھے۔ فقہی تقاضا یہ تھا کہ قاتلینِ عثمان کو رعایت دی جائے؛ کیوں کہ شرعی ثبوت مہیا نہ تھے۔ انتظامی اور سیاسی تقاضا یہ تھا کہ شرعی ثبوت نہ ہوں تب بھی شر پسندی میں ملوث مشکوک لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ کیا یہ رائے درست ہے؟

﴿جواب﴾ اس رائے کو تبھی اختیار کیا جا سکتا ہے جب پہلے یہ مان لیا جائے کہ اسلامی شریعت پر پوری طرح عمل کرنے سے انتظامی وسیاسی امور اچھی طرح انجام نہیں دیے جا سکتے۔ یہ سیکولر نظریہ ہے، اسلامی نظریہ ہرگز نہیں۔

نیز اس سوچ کا لازمی مطلب یہ نکلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انتظامی لحاظ سے کمزور تھے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ جس قدر مشکل حالات کا انہوں نے تدبر اور حکمت کے ساتھ مقابلہ کیا، اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملے گی۔

پھر یہ رائے اختیار کرنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اتنی زد نہیں پڑتی جتنی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر۔ اس رائے کا حاصل یہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ شرعی دائرے سے قدم باہر رکھنے پر تیار نہ تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ انتظامی وسیاسی مصالح کے تحت جان بوجھ کر اس دائرے سے باہر چلے گئے تھے۔ یہ بھی محض ایک جھوٹ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حتی الامکان شرعی دائرے کے اندر رہ کر انتظام کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے جان بوجھ کر شریعت کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان سے اجتہادی خطا صادر ہوئی۔

---

[1] فتویٰ از حضرت مفتی محمد مجاہد شہید (جامعہ امدادیہ فیصل آباد) بابت مشاجراتِ صحابہ، ص ۱۲، غیر مطبوعہ، اصل جامعہ امدادیہ کے شعبہ الافتاء کے ریکارڈ میں اور نقل راقم کے پاس ہے۔ اس فتوے پر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی تصویب بھی ہے۔



کیا معلوم العاقبہ حضرات پر نامعلوم العاقبہ کوئی حکم لگا سکتا ہے؟

﴿سوال﴾ صحابہ ''معلوم العاقبہ'' تھے۔ ان کا انجام معلوم ہے اور طے ہے یعنی جنۃ الفردوس۔ ہم نامعلوم العاقبہ ہیں۔ پتا نہیں جنت میں جانا ہوگا یا دوزخ میں۔ ''معلوم العاقبہ'' کا معاملہ ''نامعلوم العاقبہ'' طے نہیں کر سکتا۔ پھر بعد والوں نے اپنی عاقبت کو جانے بغیر ان جنتی حضرات کے بارے میں کیوں حکم لگا دیا؟

﴿جواب﴾ ''معلوم العاقبہ'' اور ''نامعلوم العاقبہ'' کا فلسفہ بنیادی طور پر غلط ہے؛ کیوں کہ ہم صحابہ کی عاقبت کے بارے میں خدانخواستہ کوئی حکم نہیں لگا رہے۔ محض جمہور ائمہ اہلِ سنت کے اقوال کو نقل کر رہے ہیں اور جمہور کے قول کی اصابت کو واضح کر رہے ہیں۔ جمہور کے اقوال میں متحارب فریقین کی عاقبت پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا بلکہ فریقین کو مغفور وماجور مانا گیا ہے۔ ''معلوم العاقبہ'' اور ''نامعلوم العاقبہ'' کا سوال تو وہاں اٹھایا جائے جہاں کوئی شخص کسی صحابی کی عاقبت پر حملہ کر رہا ہو، انہیں گناہ گار یا اس سے زیادہ کچھ کہہ رہا ہو۔

اچھا چلیے! ہم ایک لمحے کے لیے اسی اصول کو مان لیتے ہیں۔ مگر بات وہیں رہے گی؛ کیوں کہ اس طرح یہ بات تو طے ہو جاتی ہے کہ ''معلوم العاقبہ'' حضرات ''معلوم العاقبہ'' کے معاملے پر رائے دے سکتے ہیں۔ تمام علماء کے نزدیک حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ دورِ مشاجرات کے ''معلوم العاقبہ'' حضرات میں سب سے افضل اور سب سے بڑے فقیہ تھے۔ انہی کا فیصلہ تھا کہ اہلِ شام باغی ہیں، اسی شرعی دلیل کی بنیاد پر انہوں نے ناگزیر حالات میں تلوار بے نیام کی۔ ہم ''نامعلوم العاقبہ'' لوگ صحابہ میں چوتھی عظیم ترین، برگزیدہ اور بلاشک وشبہ ''معلوم العاقبہ'' ہستی کی رائے کو ٹھکرانے کی جسارت نہیں کر سکتے، پس ہم انہی کی پیروی کر رہے ہیں اور چودہ صدیوں میں ائمہ مجتہدین، فقہاء اور محدثین کی ایک پوری قطار ہم سے آگے اسی نظریے کے ساتھ کھڑی ہے۔ (جبکہ دوسرے نظریے والوں کے پاس ایسی کوئی قطار نہیں، بلکہ وہ نظریہ ایک صدی کے اندر اندر اپنی بنیادوں کی کمزوری کے باعث ختم ہو چکا تھا۔)

پھر جمہور ائمہ کی قطار میں شامل ہستیاں چاہے فرداً فرداً ''معلوم العاقبہ'' نہیں مگر ان کے اجتماعی نظریات کی پیروی ''معلوم العاقبہ'' ہے؛ کیوں کہ احادیث میں اجماعِ امت کی پیروی ہی کو ذریعہ نجات اور اس سے رُوگردانی کو سببِ ہلاکت بتایا گیا ہے۔[1] پس ''نامعلوم العاقبہ'' لوگوں کے لیے اپنی ''عاقبت'' سنوارنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ جمہورِ اُمت کے پیچھے چلیں، انفرادی آراء لانے والوں کی پیروی نہ کریں۔ اس لیے ہم جمہور کے پیچھے کھڑے ہیں۔

☆☆☆

---

① فاذا رأیتم اختلافا فاتبعوا السواد الاعظم. (سنن ابن ماجة، ح: ۳۹۸۵۰)

لایجمع اللّٰه هذه الامة، او قال أمتی، علی الضلالة ابداً، واتبعوا السواد الاعظم، فانه من شذ شذ فی النار. (المستدرک للحاکم، ح: ۳۹۲)

فان ید الله علی الجماعة فان الشیطان مع من فارق الجماعة یرکض. (سنن النسائی مجتبیٰ، ح: ۴۰۲۰)

فعلیکم بالسواد الاعظم. (السنة لابن ابی عاصم، ح: ۸۰) علیکم بالجماعة. (شعب الایمان للبیهقی، ح: ۱۰۵۷۴)

دونوں فریق مصیب کیوں نہیں؟

﴿سوال﴾ صحابہ کرام کے حق میں احترام اور انصاف کی بات تو تب تھی کہ مشاجرات میں فریقین کو مصیب کہا جاتا اور سب کو برابر رکھا جاتا۔ ایک کی تصویب اور دوسرے کی غلطی ظاہر کرنا کونسا انصاف ہے؟

﴿جواب﴾ فریقین کو مصیب کہنا بھی مسئلے کا حل نہیں۔ اُس دور میں بھی بعض معتزلہ اور ان کے ساتھ کچھ اشاعرہ نے حدیثِ متواتر (حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ) کو نظر انداز کر کے بحث ختم کرنے کے لیے کہا کہ فریقین مصیب تھے۔[1]

مگر بحث پھر بھی ختم نہیں ہوئی۔ سوال پیدا ہوا کہ آخر دونوں کیوں اور کیسے مصیب ہیں؟ اب اس کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ فریقین میں سے ہر ایک مخلص تھا اور اپنے طور پر حق کے لیے لڑ رہا تھا۔ مگر اس دلیل کی کمزوری واضح ہے؛ کیوں کہ اکثر و بیشتر معاملات میں لوگ باہم الجھتے ہیں تو ہر ایک اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہا ہوتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ حقیقت میں کون درست اور کون غلط ہے؟ یہ تو دلائل سے ہی پتا چل سکتا ہے اور جب مسئلہ شرعی ہو تو دلائل بھی شریعت سے لیے جائیں گے۔ چنانچہ جب حدیثِ متواتر (حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ: تقتلک الفئة الباغیة) اور خوارج سے قتال کرنے والی مشہور روایات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مصیب اور اہلِ شام کو مخطی ثابت کر دیا تو ائمہ مجتہدین نے بھی اسی پر فیصلہ دے دیا اور خوارج، نواصب اور روافض جیسے گمراہ فرقوں کے سوا جمہور مسلمین اسی پر متفق ہو گئے۔

☆☆☆

یہ کیوں نہ کہا جائے کہ کوئی ایک نامعلوم گروہ مصیب ہوگا؟

﴿سوال﴾ اگر فریقین کو مصیب ماننا ممکن نہیں تو پھر یہ کہا جائے کہ ہم نہیں جانتے کہ کون مصیب تھا؟ کوئی ایک مصیب ہوگا جس کا فیصلہ اللہ کے ذمے ہے، ہمارے ذمے نہیں۔

﴿جواب﴾ قدیم زمانے میں یہ رائے بھی پیش کی گئی تھی۔ فرقہ کرامیہ اور بعض ڈھیلے ڈھالے ناصبی اسی کے قائل تھے۔ امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ جو لوگ یہ رائے پیش کرتے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ ناصبیت ہوتی ہے۔ امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلے کو بہت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے، جس کی ہر ہر سطر بغور پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ ایک استفتاء کے جواب میں حدیث عمار کے کئی طرق نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس مسئلے میں تیسرا قول یہ ہے کہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان سے محاربہ کرنے والوں میں سے) کوئی ایک غیر متعین فریق مصیب تھا۔ یہ قول فرقہ کرامیہ کی مانند اہلِ بصرہ، اہلِ حدیث اور اہلِ کلام کے قول کے مشابہ ہے جو کہتے ہیں کہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیک وقت) دونوں خلیفہ تھے۔ یہ لوگ (بیک وقت) دو خلفاء کی بیعت کو جائز سمجھتے ہیں۔ مگر امام احمد رحمہ اللہ سے صریح الفاظ میں ان لوگوں کی رائے کی تغلیط

---

[1] قال الامام ابن تیمیة: والقول الثانی: أن کلا منهما مصیب، وهذا بناء علی قول من یقول ان کل مجتهد مصیب وهو قول طوائف من اهل الکلام من المعتزلة و الاشعریة. (مجموع الفتاوی: ۴/۴۳۸)

منقول ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں توقف کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا: ایسا شخص اپنے پالتو گدھے سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے ایسے شخص سے قطعِ تعلق کا حکم دیا اور اس سے نکاح کرنے سے بھی منع فرمایا۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ائمہ اہلِ سنت میں سے کوئی ایک بھی اس بات میں تردد نہیں کرتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ برحق تھے۔ اس میں ائمہ اہلِ سنت نے کوئی شک وشبہ نہیں کیا۔ پس فریقین میں سے کسی غیر متعین کو مصیب قرار دینا، اس بات کو جائز ٹھہرانے کے مترادف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی اور زیادہ برحق ہو۔ یہ ایسی بات ہے جسے وہی شخص کہہ سکتا ہے جو گمراہ اور بدعتی ہو اور اس میں کچھ نہ کچھ ناصبیت ہو چاہے وہ اپنی بات کی تاویل کرتا ہو۔''[1]

یاد رہے کہ حضرت علی کے پوتے حسن بن محمد (بن حنفیہ) رحمہ اللہ نے بھی پہلی صدی ہجری میں ''ارجاء'' (معاملے کو مؤخر کرنا) کے عنوان سے یہی رائے پیش کی تھی کہ فریقین کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ ان کا کہنا تھا:

''مجھے سب سے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے قصے کو مؤخر رکھا جائے۔ نہ ان سے وابستگی ظاہر کی جائے نہ ان کی مخالفت کی جائے۔''[2]

کچھ لوگوں نے اسے پسند کیا، مگر یہ نظریہ ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد بن گیا۔ آخر میں حسن بن محمد رحمہ اللہ نے دیکھا کہ ان کے موقف کی وجہ سے ایک نئے گروہ کا اضافہ ہو گیا ہے، تو نادم ہو کر فرمایا: ''کاش! میں اس سے پہلے مر گیا ہوتا۔''[3]

جس طرح عثمانیت آگے چل کر مروانیت اور ناصبیت بن گئی اور تشیع ترقی کر کے ''رافضیت'' میں تبدیل ہو گیا، اسی طرح یہ ''ارجاء'' جو ابتداء میں بظاہر ایک نہایت ''صلحِ کُل نظریے'' کی شکل میں ظاہر ہوا تھا، آگے چل کر ایک مستقل فرقہ ''مرجئہ'' بن گیا جس کا کہنا تھا کہ کوئی کتنی ہی خونریزی کر لے، اس پر کوئی الزام نہیں۔ بڑے سے بڑا گناہِ کبیرہ بھی یقیناً بخشا جائے گا۔ بس توحید کا قائل ہونا کافی ہے۔[4]

غرض مشاجرات کے متعلق جتنی اور جس جس قسم کی آراء ذہن میں آنا ممکن ہیں، وہ پہلی صدی ہجری ہی میں سامنے آ چکی تھیں۔ جمہور سے ہٹ کر کئی نظریات تھے جو رائج ہو چکے تھے مثلاً: فریقین کافر تھے۔ فریقین فاسق تھے۔ فریقین مصیب تھے۔ فریقین میں سے ایک کافر اور دوسرا مومن تھا۔ فریقین میں سے ایک فاسق اور دوسرا نیک وصالح تھا۔ فریقین میں سے دونوں خطا کار تھے۔ فریقین کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، ان کا معاملہ اللہ کے حوالے۔ یہ سب

---

① وفیھا قول ثالث بان المصیب واحد لا بعینہ ... وھذا القول یشبہ قول المتوقفین فی خلافۃ علیّ من اھل البصرۃ واھل الحدیث واھل الکلام کالکرامیۃ الذین یقولون: کلاھما کان اماما ویجوزون عقد الخلافۃ لاثنین. لکن المنصوص عن احمد تبدیع من توقف فی خلافۃ علیّ وقال: ھو اضل من حمار اھلہ وامر بھجرانہ ونھی عن مناکحتہ، ولم یتردد احمد ولا احد من ائمۃ السنۃ فی انہ لیس غیر علیّ اولیٰ منہ بالحق ولا شکوا فی ذالک فتصویب احدھما لا بعینہ تجویز ان یکون غیر علیّ اولیٰ منہ بالحق وھذا لا یقولہ الا مبتدع ضال فیہ نوع من النصب وان کان متأولاً. (مجموع الفتاوی: ۴/۴۳۸)

② تاریخ دمشق: ۱۳/ ۳۸۰، ۳۸۱ ③ تاریخ دمشق: ۱۳/۳۸۰، ۳۸۱

④ الملل والنحل للشھرستانی: ۱/۱۳۹ تا ۱۴۵، ط مؤسسۃ الحلبی

یسے نظریات ہیں جو قرآن وسنت کے خلاف ہیں اور ان میں سے ہر نظریے نے ایک نیا فرقہ پیدا کیا۔ خوارج نے
دنوں کو کافر اور معتزلہ نے دونوں کو فاسق کہا، روافض نے علویوں کو مؤمن اور شامیوں کو کافر کہا، ناصبیوں نے اہلِ شام
کو مؤمن اور اہلِ عراق کو فاسق سمجھا۔ جن لوگوں نے بحث ختم کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ ہم کچھ نہیں جانتے، وہ بھی
بحث بند نہ کرا سکے بلکہ ''فرقہ مرجۂ'' کی بنیاد رکھ دی جس نے صحیح اور غلط کا سوال اور آخرت میں پکڑ کا ڈر ہی ختم کر دیا۔

☆☆☆

بعد والوں کو کس نے حق دیا ہے کہ کسی صحابی کو مصیب اور کسی کو مخطی کہیں؟

﴿سوال﴾ صحابہ میں سے کسی کو مخطی یا کسی مصیب کہنے کا حق بعد والوں کو کس نے دیا۔ یہ حق یا تو اللہ کو ہے یا رسول اللہ ﷺ کو۔ چونکہ یہ واقعات نزولِ وحی ختم ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہوئے تھے، اس لیے اس معاملے میں نہ اللہ کا کلام سامنے ہے نہ رسول اللہ ﷺ کچھ فرمائیں گے، لہٰذا ہم کسی کو مصیب یا مخطی نہیں کہہ سکتے۔ صحابہ عمل میں برابر ہیں اور بعد والے ان سے بہت کم تر۔ انہیں یہ حق نہیں کہ کسی کو مخطی اور کسی کو مصیب کہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے کہ صحابہ میں سے کسی کو مصیب اور کسی کو خاطی کہنے کا اختیار بعد والوں کو نہیں بلکہ اللہ یا رسول اللہ ﷺ ہی کو یہ اختیار ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی معاملے میں غلط یا صحیح بتانے کے لیے ہمیشہ رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس رہنمائی فرمائیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ارشادات اس بارے میں تا قیامت کافی ہیں۔ چنانچہ مشاجرات کے مسئلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات خصوصاً حدیثِ عمار بن یاسر، حدیثِ قتالِ خوارج اور حدیث ''الخلافة ثلاثون سنة'' سے مصیب اور مخطی کا صاف پتا چل جاتا ہے۔[1]

یہ کوئی انوکھی مثال نہیں۔ صحابہ کرام کے مابین بہت سے مسائل میں اختلاف ہوا۔ بہت سے مسائل میں بعض صحابہ سے فقہی غلطیاں بھی ہوئیں۔ پھر ائمہ مجتہدین نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ اس بارے میں فلاں صحابی مصیب تھا اور فلاں مخطی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سونا چاندی جمع کرنے کو حرام قرار دیتے تھے مگر فقہائے اُمت کا اجماعی فتویٰ اس کے خلاف ہے۔[2] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وضو میں پاؤں دھونے کی جگہ مسح کرنے کے قائل تھے۔[3] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آگ سے پکی ہوئی چیزوں کے استعمال کو ناقضِ وضو سمجھتے تھے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ان سے اختلاف تھا۔[4] بعد میں تمام فقہاء نے یہ فیصلہ دیا کہ اس بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مصیب تھے۔ بعض صحابہ کا مسلک یہ تھا کہ غسل تبھی واجب ہوتا ہے جب انزال ہو۔ مگر اکثر صحابہ کا مسلک یہ تھا کہ انزال نہ ہو تب بھی جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔ بعد میں تمام مجتہدین کا اجماع ہو گیا کہ دوسری رائے درست تھی۔[5]

---

[1] پہلے سبق میں ہم پیچھے اسی مسلسل بحث کر چکے ہیں کہ معمولی فہم رکھنے والا بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ متعصب نہ ہو۔
[2] صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب ما ادی زکوٰتہ فلیس بکنز [3] المبسوط للسرخسی ۸/۱
[4] سنن الترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء فی الوضوء مما غیرت النار [5] سنن الترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء فی الماء من الماء

ظاہر ہے ائمہ مجتہدین کو حضور ﷺ نے خود آ کر نہیں بتایا کہ کونسے صحابی مصیب ہیں اور کون سے مخطی۔ بلکہ ائمہ مجتہدین نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور دیگر شرعی وعقلی دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلے دیے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ بعد میں کسی کو یہ حق نہ تھا کہ وہ کسی صحابی کو مخطی اور کسی کو مصیب قرار دیں تو اسے چاہیے کہ طہارت اور نماز سے لے کر کھانے پینے تک تمام معاملات میں جہاں جہاں صحابہ کا اختلاف ہوا ہے، وہاں توقف کرے، نہ کسی کو صحیح سمجھے نہ غلط۔ بلکہ ایسا سوچنا بھی گستاخی تصور کرے، اور رسول اللہ ﷺ سے صحیح یا غلط کا سوال پوچھنے کے لیے یوم حشر کا انتظار کرے۔

مگر اہلِ سنت خیالی دنیا میں نہیں، حقیقی دنیا میں بستے ہیں۔ وہ قیامت کا انتظار نہیں کرتے بلکہ اسی دنیا میں جس طرح صحابہ کے دیگر مختلف فیہ فقہی مسائل میں مخطی اور مصیب کا فیصلہ کرتے ہیں، اسی طرح مشاجرات کو بھی وہ ایک اہم اجتہادی قضیہ سمجھتے ہوئے شرعی دلائل کی بناء پر مصیب اور مخطی کا حکم لگاتے ہیں اور زیادہ اہمیت کے ساتھ لگاتے ہیں؛ کیوں کہ دیگر مسائل کا تعلق فقہی جزئیات سے ہے جن میں غلطی سے انسان کے عمل کا نقصان ہے، مگر یہ اعتقادی مسئلہ ہے اور یہاں غلط نظریہ اپنا لینے سے انسان کا عقیدہ خراب ہو جائے گا۔

☆☆☆

علمائے اہلِ سنت کی تعبیر میں تضاد کیوں ہے؟

﴿سوال﴾ اہلِ سنت کے اسلاف کہیں تو کہتے ہیں فریقین نے اجتہاد کیا اور فلاں مصیب تھا اور فلاں مخطی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہتے۔ مگر یہی حضرات دوسرے مقامات پر مجتہد مصیب اور مجتہد مخطی کے سے آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ فلاں شرعی خلیفہ تھا، فلاں نے خروج کیا، فلاں نے بغاوت کی، وغیرہ۔ یہ کیسا تضاد ہے؟

﴿جواب﴾ مجتہدِ مصیب اور مجتہدِ مخطی کا حکم لگانے اور ایک فریق کو شرعی خلیفہ اور دوسرے پر بغاوت کا اطلاق کرنے میں کوئی تضاد نہیں۔ پہلی تعبیر اجمالی ہے اور دوسری میں اصابت یا خطا کی نوعیت واضح کی گئی ہے۔ کسی بھی واقعے کی تعبیر کے لیے بعض الفاظ عمومی ہوتے ہیں اور بعض خصوصی، جو مسئلے کی نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً کہیں کوئی افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے تو اسے "سانحہ" کہا جائے گا۔ اس کی نوعیت واضح کرنے کے لیے اسے ایکسیڈنٹ، خودکشی، قتل وغیرہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ کسی نے کوئی غلطی کی ہے تو اسے قصوروار کہا جائے گا۔ لازماً اس قصور کی کوئی نہ کوئی وضاحت بھی ہوگی، مثلاً ڈیوٹی سے غیر حاضری، تاخیر، عہدے کا غلط استعمال وغیرہ۔

مشاجرات میں بھی مصیب اور مخطی سے جس چیز کی عمومی وضاحت ہو رہی ہے، فطری طور پر اس کے پسِ منظر میں خطا اور صواب کی کوئی حقیقی نوعیت بھی تو ہے۔ وہ یہ نہیں کہ ایک فریق کی نماز درست ہوگئی تھی اور دوسرے کی نہیں بلکہ وہ یہی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شرعی خلیفہ اور واجب الاطاعت تھے جبکہ فریق ثانی نے اپنے اخلاص اور نیک نیتی کے باوجود جو طریق کار اختیار کیا، وہ شرعاً بغاوت اور خروج کے زمرے میں تھا۔ درحقیقت مصیب اور مخطی کا فیصلہ جس حدیث

متواتر کے ذریعے ہوا ہے، اسی حدیث میں ''الفئۃ الباغیۃ'' کا لفظ موجود ہے۔ یعنی اہلِ شام پر خطی کا اطلاق بعد میں اور اس حدیث کی رو سے ''الفئۃ الباغیۃ'' کا اطلاق پہلے ہوا ہے۔ اب اگر شرعی مسئلے اور اعتقادِ صحیح کی وضاحت کے لیے علمائے اہلِ سنت کبھی ضرورتاً اس کی وضاحت کر دیتے ہیں تو اس میں کونسی بات اُصولِ اسلام کے خلاف ہے جبکہ عموماً ایسی بحث سے ماقبل یا مابعد فریقین کے اجتہاد، اخلاص اور فضائل و مناقب کی بھی وضاحت کر دی جاتی ہے۔

☆☆☆

ظاہری بغاوت، صوری بغاوت یا حقیقی بغاوت؟

﴿سوال﴾ زمانہ قریب کے بعض اکابر کی تحریرات میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ صورتاً بغاوت تھی، یا وہ بظاہر باغی تھے، یا صورتاً باغی تھے۔ جس کا مطلب ہے وہ حقیقت میں بغاوت نہیں تھی؟ جبکہ اکثر علماء اور اسلاف نے کہیں بھی صورتاً کی قید نہیں لگائی بلکہ ہر جگہ مطلقاً بغاوت لکھا ہے۔ تو اس تضاد میں کون صحیح ہے اور کون غلط؟ پھر یہ بھی بتائیے کہ اگر صورتاً بغاوت تھی تو ان حضرات پر حقیقی باغیوں کے احکام کیوں جاری ہوئے اور جنگِ جمل اور صفین سے حقیقی باغیوں کے احکام کیسے مستنبط کیے گئے جبکہ وہ حقیقی باغی تھے ہی نہیں؟

﴿الجواب﴾ ان دونوں تعبیرات میں کوئی تضاد نہیں۔ عام تعبیر میں جہاں صورتاً کی قید نہیں، وہاں مراد یہ ہے کہ شرعی اصطلاح کے لحاظ سے فی الواقع یہ بغاوت تھی، اسی لیے فریقِ مقابل پر بغاۃ کے شرعی احکام جاری بھی ہوئے اور انہی جنگوں سے فقہاء نے حقیقی بغاوت کے شرعی مسائل کا استنباط بھی کیا۔

جہاں تک صورتاً بغاوت یا بظاہر بغاوت کی تعبیر ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصطلاحی بغاوت کا انکار کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کے اقدامات میں ''روحِ بغاوت'' موجود نہ تھی، فقط اس کا ڈھانچا تھا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک نماز صالحین کی ہے جو پورے خشوع و خضوع، توجہ اور یکسوئی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اس میں نماز کی پوری روح موجود ہوتی ہے جو خشیت پیدا کرتی ہے اور انسان کو گناہوں سے روک دیتی ہے۔ دوسری نماز عام لوگوں کی ہے جس میں نماز کی شرائط اور ارکان تو پورے ہو جاتے ہیں مگر خشوع و خضوع نہیں ہوتا۔ اس نماز کو اصطلاحاً نماز ہی کہا جائے گا، پڑھنے والے پر نمازی کے تمام شرعی و فقہی احکام بھی جاری ہوں گے، مگر اہلِ نظر اسے صورتِ نماز قرار دیں گے نہ کہ حقیقی نماز۔ اگرچہ اس طرح نماز ذمے سے اتر جاتی ہے۔

اسی طرح مشاجرات میں ایک فریق پر ''صورتِ بغاوت'' کا اطلاق، ان معنوں میں کیا جا رہا ہے کہ بغاوت عام طور پر ہوسِ اقتدار، لوٹ مار اور مار دھاڑ جیسی بُرائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان بُرائیوں کو ہم بغاوت کی روح کہہ سکتے ہیں۔ مگر صحابہ کرام کے معاملے میں ایسا قطعاً نہیں تھا۔ وہاں نہ کوئی لوٹ مار تھی نہ سرکشی، حرصِ دنیا تھی نہ ہوسِ اقتدار۔ وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے فکرِ آخرت سے مجبور ہو کر اللہ کو راضی کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ پس وہاں بغاوت کی فقط

ظاہری شکل تھی جس پر شرعی احکام تو لاگو ہوتے تھے مگر روحِ بغاوت مفقود تھی۔

پس مشاجرات کے متعلق اصطلاحی بغاوت کی عام تعبیر بھی غلط نہیں، اور ''صوری'' یا ''ظاہری'' بغاوت کی تعبیر بھی اپنے معنوں میں درست ہے بلکہ موقع محل کے لحاظ سے عوام کو سمجھانے کے لیے زیادہ مفید ہو سکتی ہے، بشرطیکہ فقہی اصطلاحی بغاوت کا انکار نہ کیا جائے۔

☆☆☆

حدیثِ عَمار اگر صحیح تھی تو اُسی وقت اتفاق کیوں نہ ہو گیا؟

﴿سوال﴾ حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ کا واقعی صحیح حدیث ہونا کسی طرح سمجھ نہیں آتا۔ اگر بہت سے صحابہ نے اسے سنا تھا تو حق اور ناحق کا فیصلہ فوراً ہو جاتا اور سب کا اتفاق ہو جاتا۔ آخر جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے، جب ان سب صحابہ نے جو اس حدیث کے راوی بتائے جاتے ہیں، آ کر کیوں اعلان نہ کر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا برحق ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

﴿جواب﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ روایت کرنے والے اکثر صحابہ نہ تو جنگِ صفین میں شریک تھے نہ ہی انہیں یہ علم تھا کہ عمار رضی اللہ عنہ اس لڑائی میں شہید ہوں گے۔ نہ ہی یہ ممکن تھا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر انہیں فوراً پہنچ جاتی اور وہ میدانِ جنگ میں حاضر ہو جاتے۔ یاد رہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قتل جنگ کے تیسرے روز بعد از مغرب ہوا تھا اور اسی شب آخری پہر میں جنگ رک گئی تھی۔[1] تو بھلا کیسے ممکن تھا کہ حدیث عمار کے تمام راوی اس مختصر سے وقت میں صفین پہنچ جاتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تائید کرتے۔

ہاں یہ ثابت ہے کہ بعض جلیل القدر صحابہ مثلاً: حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ جو موقع پر موجود تھے مگر جنگ میں کسی کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، اہلِ شام کے ہاتھوں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر ملتے ہی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔[2] اسی طرح شامی فوج کی بھی بعض نمایاں شخصیات مثلاً: حضرت زبید بن عبد الخولانی رحمہ اللہ شامی لشکر کے ایک حصے کے امیر تھے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آملے تھے۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت ہُنَی رحمہ اللہ (جو ثقہ راویانِ سنت میں شمار ہوتے ہیں) بھی شامی لشکر میں تھے، وہ خود فرماتے ہیں: ''ہمیں یقین تھا کہ عمار کبھی ہمارے ہاتھوں شہید نہ ہوں گے؛ کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو ہم ویسے ہی ثابت ہوں گے جیسا کہ اہلِ عراق ہمیں سمجھتے ہیں۔'' جب عمار رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت ہُنَی رحمہ اللہ نے شامی قیادت کو جا کر حدیثِ عمار یاد دلائی اور پھر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔[4]

☆☆☆

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۵۲۷ تا ۵۴۳ — [2] المعجم الکبیر للطبرانی: ۴/۸۵ ؛ مسند احمد، ح: ۲۱۸۷۳

[3] فلما قتل عمّار تحول الیٰ عسکر علیّ. (الاصابۃ: ۲/۵۰۲ ترجمۃ: (زبید بن عبد) کان معہ رایۃ بنی خولان بصفین مع معاویۃ بن ابی سفیان، فلما قتل عمّار بن یاسر انکفا الیٰ علیّ. (تاریخ ابن یونس المصری، ص ۱۸۵)

[4] طبقات ابن سعد: ۳/۲۵۳

حدیثِ عمار اگر صحیح ہے تو اہلِ شام نے اپنی غلطی کیوں نہ مانی؟

﴿سوال﴾ اگر واقعی حدیثِ عمار ثابت تھی تو اہلِ شام نے اپنی غلطی کیوں نہ مان لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کیوں نہ کرلی؟ اہلِ شام میں سے حدیثِ عمار کے دو راوی صحابہ یعنی: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور خود عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سمیت ہزاروں صحابہ اور لاکھوں تابعین نے کیوں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت جاری رکھی؟

﴿جواب﴾ بات عجیب ضرور ہے کہ شامی قیادت پر کیوں اپنی غلطی ظاہر نہیں ہوئی، مگر ناممکن نہیں۔ ہم ان کی نیت پر کوئی شک کیے بغیر یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ایسے ہنگامے، اضطراب اور افراتفری کا وقت تھا کہ طبائع پر جذبات غالب تھے، اسی لیے شامی قیادت نے اپنے موقف سے رجوع نہیں کیا بلکہ حدیثِ عمار کی ایک تاویل کرلی کہ عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہیں جو انہیں لائے اور مروا دیا۔[1] چونکہ تحریکِ قصاصِ عثمان میں شامل عام شامی لوگ عسکری ڈسپلن کے ایسے پابند تھے کہ آنکھیں بند کرکے قیادت کے پیچھے چل دیتے تھے،[2] اس لیے انہوں نے اس تاویل کو بے چوں چرا مان لیا، چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد بھی فریقین میں اتفاق نہ ہوسکا۔

یہاں پر یہ اصولی بات یاد رکھی جائے کہ اہلِ علم کے ذمے ہرگز نہیں کہ وہ مرجوح مذہب کے دلائل تلاش کریں۔ ان کے ذمے فقط یہ ہے کہ جو بات شرعی دلائل سے راجح ثابت ہوچکی ہے، اس پر فیصلہ دیں اور جہاں ضرورت ہو، وہاں دلائل بھی نقل کردیں۔ اگر کوئی مرجوح رائے اتنی کمزور ہے کہ اس کی شرعی دلیل مہیا ہی نہیں تو علماء کے ذمے نہیں کہ وہ اس کی بھی دلیل گھڑیں۔ جو شخص ان کے فیصلے کو نہیں مانتا، اسی کے ذمے ہے کہ ان کے خلاف دلیل دے۔

اہلِ سنت والجماعت بالاتفاق اس قضیے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کو راجح سمجھتے ہیں اس لیے وہ ان کے حق میں بکثرت دلائل پیش کرچکے ہیں۔ اس کے برعکس اہلِ شام نے غلطی کی تھی، اس لیے اہلِ علم نے اس کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھی کہ اس غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے دلائل اکٹھے کرتے؛ کیوں کہ ایسا کرنا تحریف فی الدین کے زمرے میں آتا ہے، بلکہ صفِ اوّل کے ائمہ اہلِ سنت نے اہلِ شام کی اس واحد تاویل کی غلطی بھی کھلے لفظوں میں واضح کردی جو اہلِ شام نے خود کو حدیثِ عمار کے اطلاق (الفئۃ الباغیۃ) سے بچانے کے لیے کی تھی۔

ہاں! اہلِ علم پر یہ واجب تھا کہ وہ شامی قیادت کے شرفِ صحبت کو ملحوظ رکھتے، چنانچہ انہوں نے اہلِ شام کی غلطی

[1] نصہ: "انما قتله علیّ واصحابه جاؤا به حتی القوه بین رماحنا." (مسند احمد، ح: ۱۷۷۷۸ باسناد صحیح)
مستدرک حاکم، ح: ۲۶۶۳ بلفظه. قال الذهبی: "علیٰ شرط البخاری و مسلم." و هو اصح الاسانید عند اهل الاصول.

[2] قیادت کے حکم کو آنکھیں بند کرکے ماننے کی یہ عادت بنو مروان کے دور میں اس قدر ترقی کرگئی کہ بہت سے سرکاری لوگ حاکم کے کہنے پر کھلم کھلا گناہ کرتے ہوئے بھی آخرت میں جواب دہی سے بالکل بے فکر رہتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یزید وغیرہ کے حالات دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ حکمران جو کچھ بھی کرے اللہ کے ہاں معاف ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ شیعانِ عثمان (مروانیوں، ناصبیوں) کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اس غلط اعتقاد کی تشریح یوں کرتے ہیں:
"کانت فیهم طاعة مطلقة لولیّ امرهم، فانهم کانوا یرون ان الله علیهم اوجب طاعة ولیّ امرهم مطلقاً وان الله لا یؤاخذ علیٰ سیئاته."
"ان (مروانیوں) میں اربابِ اقتدار کی علی الاطلاق اطاعت کرنے کا چلن تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ نے ان پر حکمران کی بہرصورت اطاعت واجب کردی ہے اور اللہ حکمران کے گناہوں پر اس کا مؤاخذہ نہیں کرے گا۔" (منہاج السنۃ: ۶/۲۲۰) نوٹ: عبارت کا ماقبل دیکھ کر جانچا جاسکتا ہے کہ یہ مروانیوں ہی کا ذکر ہے۔

کو اجتہادی تصور کیا اور انہیں معذور و مغفور قرار دیا۔

سوال میں مذکور یہ دعویٰ کوئی وزن نہیں رکھتا کہ ''الفئۃ الباغیۃ'' والی حدیث سننے اور حضرت عمار کے قتل ہونے کے بعد بھی ہزاروں صحابہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت جاری رکھی تھی۔ کتب حدیث، کتب تواریخ اور اسماء الرجال کے ذخیرے کو چھانیں تو بمشکل بیس پچیس صحابہ ایسے ملیں گے جو جنگِ صفین یا بعد کی جھڑپوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے ہوں یا ان کی افواج میں شامل ہوں، یا جنہوں نے زبانی کلامی ہی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے موقف کو درست مانا ہو اور اس کی وکالت کی ہو۔

یہ اصولی بات ہے کہ صحابہ علم وفضل اور امانت و دیانت میں اعلیٰ درجے پر تھے۔ ہم ان کے متعلق یہی گمان رکھنے کے مُکلف ہیں کہ جس بات کی شرعی دلیل ہمارے سامنے واضح ہے، ان پر بھی واضح ہوگی اور وہ اسی کے قائل ہوں گے۔ پس کسی صحابی کو شرعی دلیل، راجح مذہب یا مجتہدِ مصیب کا مخالف تبھی مانا جائے گا جب اس کے اپنے قول یا فعل سے صحیح مسئلے کی مخالفت کا واضح ثبوت مل رہا ہو۔ صحیح مسئلے کی حمایت مذکور نہ ہونا مخالفت کی دلیل نہیں مانا جائے گا۔

چونکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے چند صحابہ کا مجتہدِ مصیب کی مخالفت کرنا بلاشبہ ثابت ہے اور کسی تاویل کے ذریعے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال نہیں کیا؛ کیوں کہ ایسا کہنا متواتر روایات کے خلاف ہوگا، اس لیے جمہور نے انہیں مجتہدِ مصیب کا مخالف مانا ہے۔ اور ساتھ ہی ان کے شرفِ صحبت کے احترام میں انہیں مجتہدِ مخطی قرار دیا ہے۔

مگر شام میں رہنے بسنے والے باقی سینکڑوں یا ہزاروں صحابہ سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے موقف کی قولی یا عملی تائید ہرگز ثابت نہیں۔ یہ سب وہ حضرات تھے جو قصاصِ عثمان کی تحریک کے عام کارکنوں کی طرح جذبات سے مغلوب نہیں تھے۔ اسی لیے وہ احتیاطاً جنگوں سے بھی الگ رہے۔ غالب ظن ہے کہ دلیلِ شرعی پر غور کر کے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مجتہدِ مصیب ہونا سمجھ آ گیا ہوگا اور جو لوگ شرعی دلائل پر غور وفکر کی استعداد نہ رکھتے ہوں گے انہوں نے فرمانِ نبوی ''اقضاھم علیؓ'' کے پیشِ نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتماد کیا ہوگا اور تقلیداً ان کے موقف کو درست مان لیا ہوگا۔ جیسا کہ آج بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصابت کو ماننے کے لیے اتنا دیکھنا اور سوچنا کافی ہو جاتا ہے۔

بعض صحابہ مثلاً: عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا نام شامی لشکر میں غلط طور پر شامل کر لیا گیا ہے، کتب اسماء الرجال و تواریخ سے اس کی قطعاً تصدیق نہیں ہوتی۔ ہاں ایسے صحابہ بکثرت ہیں جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ خلیفہ بننے کے بعد جہادی مہمات میں جاتے رہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کش مکش کے دور میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی قولی یا عملی حمایت کرنے والے صحابہ بلاشبہ بہت کم تھے۔ ان پر ہزاروں تو کجا سینکڑوں کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔

ثبوت کے لیے اتنا ہی دیکھ لینا کافی ہوگا کہ فریقین کے درمیان سب سے بڑی لڑائی صفین کی تھی، جس میں دونوں گروہوں نے اپنی ساری طاقت لگا دی تھی۔ اس جنگ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ معروف اور کبار صحابہ میں

سے بمشکل پانچ چھ کے نام ملتے ہیں۔[1] صغار صحابہ میں سے بھی بمشکل دس پندرہ کے نام ملتے ہیں۔[2] ان میں سے بھی اکثر غیر معروف صحابہ تھے جن میں سے کئی ایسے ہیں جن کی صحابیت ہی مختلف فیہ ہے۔[3]

اگر کوئی زیادہ چھان بین کرے اور ہر طرح کی کمزور روایات اور متعارض و مرجوح اقوال بھی جمع کر لے تو اس فہرست میں کچھ اضافہ ہو جائے گا مگر اس سے نفسِ مسئلہ میں بھلا کیا فرق پڑے گا۔ ہزاروں صحابہ کی شامی لشکر میں شمولیت پھر بھی ثابت نہیں ہو سکتی، اور یہ ایسی چیز نہیں کہ ایسے معرکۃ الآراء مسئلے میں اسے قیاساً مان لیا جائے۔

مگر یہاں پر حد یہ ہے کہ نہ صرف قیاساً ہزاروں صحابہ کو فریقِ مخطی میں شامل مانا جا رہا ہے بلکہ قیاس در قیاس کرتے ہوئے ان ہزاروں کو حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ میں تاویل کرنے والا بھی تصور کیا جا رہا ہے۔ پھر اسی وہمی بنیاد پر یہ رائے قائم کی جا رہی ہے کہ حدیث عمار رضی اللہ عنہ کا وہ مطلب ہے ہی نہیں جس پر جمہور اہلِ سنت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ سبحان اللہ!

حقیقت یہی ہے کہ شامی صحابہ کی اکثریت ان معاملات سے الگ ہی رہی، کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آنا اور پھر مسلمانوں سے لڑنا طبعی طور پر ہر مسلمان کے لیے ناگوارِ خاطر تھا، اس لیے تمام محتاط لوگ اس سے مجتنب رہے، فقط وہی لوگ اس مہم میں شریک ہوئے جو قصاصِ عثمان کے مسئلے پر جذبات سے مغلوب ہو چکے تھے۔ جنگِ صفین سمیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑی جانے والی دیگر مہمات میں لوگوں کی عدمِ دلچسپی بلکہ کراہت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو گی کہ خود بنو امیہ کے قریبی صفِ اول کے لوگ بھی اس کش مکش سے کنارہ کش ہی رہے۔

اموی دور کے مشہور فاتح موسیٰ بن نُصیر کے والد نُصیر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام اور ان کے لشکر کے اعلیٰ افسران میں سے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ان پر بہت احسانات تھے۔ جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے جنگِ صفین میں شرکت کا حکم دیا تو انہوں نے صاف معذرت کر لی اور اس جنگ میں شرکت کو اپنے ضمیر کے خلاف قرار دیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان پر جبر نہ کیا اور ان سے راضی رہے۔[4]

حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں گورنر تھے، بنواُمیہ کے نہایت معتمد تھے، مگر جنگِ صفین کے زمانے میں حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ طائف میں عزلت نشین رہے۔[5]

---

① مثلاً: عقبة بن عامر الجهني. (الاصابة: ۴/۴۲۹) عبدالله بن عمرو بن العاص. (اسد الغابة: ۳/۳۴۵) عمرو بن العاص. (اسد الغابة: ۴/۲۳۲)

② مثلاً: مسلمه بن مُخلَّد. (سير اعلام النبلاء: ۳/۴۲۴) عبدالرحمن بن خالد، حبيب بن مسلمه، بسر بن ارطاة، ابو الاعور السلمي. (تاريخ خليفه بن خياط، ص ۱۹۵، ۱۹۶) عبيد الله بن عمر بن الخطاب. (الاصابة: ۵/۴۱، ۴۲)

③ مثلاً: ابو غاديه جهني. (المعجم الكبير للطبراني: ۲۲/۳۶۳) ذوالكُلاع الحميري. (الاصابة: ۲/۳۵۹) حوشب ذي ظليم الحميري. (الاستيعاب: ۱/۴۱۰) حمل بن سعدانه. (الاصابة: ۲/۱۰۸) عبادة بن اوفى. (مختصر تاريخ دِمَشق: ۱۱/۳۰۱) زُمل بن عَمْرو. (الاصابة: ۲/۴۹۹) شرحبيل بن سمط. (الاصابة: ۳/۲۶۲) عَمْرو بن سبيع. (الاصابة: ۴/۵۲۲) يزيد بن اسد. (الاصابة: ۶/۵۰۲)

④ نفح الطيب: ۱/۲۳۰، البيان المغرب: ۲/۲۲

⑤ البداية والنهاية: ۱۱/۳۵۸، سير اعلام النبلاء: ۳/۲۹، الاستيعاب: ۴/۱۴۴۶

عبداللہ بن ابی سرح فلسطین کے شہر عسقلان میں یکسو رہے۔[1] مروان بن الحکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کاتب خاص رہا۔ وہ قصاصِ عثمان کے بارے میں نہایت پرجوش ہونے کے باوجود جنگِ صفین سے لاتعلق رہا۔[2]

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جنگ میں بادلِ نخواستہ شامل ہوئے مگر عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد بالکل الگ ہوگئے۔ پھر عمر بھر اس جنگ میں شرکت پر نادم رہے۔[3]

وہ تمام صحابہ جو شام یا ان علاقوں میں آباد تھے جن پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کنٹرول تھا، ان کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے موقف کے خلاف آواز نہ اٹھانا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ کے منکر تھے یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاویل کو درست اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کو غلط سمجھتے تھے۔ ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کا مخالف ہونا تب ثابت ہوسکتا ہے جب وہ قتلِ عمار کے بعد بھی عملاً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مہمات میں شامل رہے ہوں یا کم از کم انہوں نے قتلِ عمار کے بعد قولاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کی مخالفت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وکالت کی ہو۔

درحقیقت قتلِ عمار سے پہلے بھی شام میں گنتی کے چند صحابہ کے نام ملتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف عملاً یا قولاً متحرک رہے تھے۔ اکثریت تو خاموش اور عملاً غیر جانب دار تھی۔ شرعاً ان پر نہ تو یہ لازم تھا کہ وہ اپنے گھر بار، درس و تدریس، زراعت اور کاروبار کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاقے میں چلے جاتے۔ اسی طرح جو صحابہ شام میں عدلیہ، مالیات یا دیگر شعبوں میں ملازم تھے، ان پر بھی شرعاً واجب نہ تھا کہ ملازمتیں چھوڑ دیتے۔[4] نہ ہی یہ مناسب تھا کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے؛ کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی دین کا غلبہ چاہتے تھے، اپنے علاقے میں انہوں نے شریعت ہی کو نافذ کر رکھا تھا نہ کہ (نعوذ باللہ) کسی کفریہ آئین کو۔ اگر شامی صحابہ ان کے خلاف کھڑے ہوتے تو شامی فوجیں انہیں کچلنے کی کوشش کرتیں، فتنے کی آگ بجھنے کی بجائے مزید بھڑک اٹھتی اور کشت و خون کا دائرہ بہت دور دور تک پھیل جاتا۔ باہمی نفرتوں میں مزید اضافہ ہوتا اور کبھی نہ ختم ہونے والی دیواریں بیچ میں حائل ہوجاتیں، اس لیے ان حضرات

---

① تاریخ ابن یونس المصری (م ۳۴۷ھـ): ۱/۲۷۰، ۴۴۱، ط العلمیة ؛ تاریخ المدینة لابن شبہ: ۴/۱۱۵۳ ؛ معتزل عن علیّ ومعاویة. (البدایة والنهایة: ۱۰/۶۵۰)

② مروان بن الحکم: فاتّه علیّ فبایعه والصرف الی المدینة واقام بها حتی استخلف معاویة. (تاریخ الاسلام ذهبی: ۵/۲۳۴)

③ مسند احمد، ح: ۶۵۳۸ ؛ طبقاتِ ابن سعد: ۴/۲۶۶، ۲۶۷، ط صادر

④ شرعی مسئلہ یہی ہے، فقہاء کی چند عبارات مندرجہ ذیل ہیں:

لان الباغی صار سلطانا بحکم القهر، الا تری ان تقلد القضاء منه یجوز. (المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی: ۸/۱۷)

فان کثیراً من العلماء تقلدوا الاعمال و القضاة من معاویة مع انه کان جائراً. (المحیط البرهانی فی الفقه النعمانی: ۸/۱۸)

ویجوز تقلده من الجائر کما یجوز من العادل لان الصحابة رضی الله عنهم تقلدوا القضاء من معاویة بعد ان اظهر الخلاف لعلی کرم الله وجهه مع ان الحق کان مع علیّ وتقلدوا من یزید مع فسقه وجوره والتابعون تقلدوا من الحجاج مع کونه اظلم زمانه. (درر الحکام فی شرح غرر الاحکام: ۲/۳۰۵)

ویجوز تقلید القضاء من السلطان العادل والجائر و من اهل البغی، لان الصحابة رضی الله عنهم تقلدوه من معاویة والحق کان بید علیّ رضی الله تعالیٰ عنهما فی نوبته والتابعین تقلدوه من الحجاج وکان جائراً افسق اهل زمانه. (البحر الرائق: ۶/۲۹۸)

نے بھی مناسب سمجھا کہ جہاں تک ہو سکے، ملائمت سے کام لے کر اتفاق کی صورت نکالی جائے یا خاموشی سے حالات بہتر ہونے کا انتظار کیا جائے۔ اس لیے انہوں نے سیاسی مناقشات سے یکسوئی میں عافیت سمجھی اور اتحاد و اتفاق کا وقت آنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران قرآن وحدیث کی روشنی میں حق بات موقع بموقع واضح کرتے رہے جیسا کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا کردار اس بارے میں مشہور ہے۔ [1]

☆☆☆

حدیثِ عمار صحیح ہے تو اکثر صحابہ غیر جانبدار کیوں رہے؟

﴿سوال﴾ اگر حدیثِ عمار کا مصداق اہلِ شام تھے اور قتلِ عمار رضی اللہ عنہ کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی تو اس کے بعد بھی اکثر صحابہ کیوں غیر جانب دار رہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگوں میں شامل کیوں نہ ہوئے؟ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصابت کی دلیل کے طور پر پیش کی جانے والی احادیث صحیح ہیں اور ان کا مطلب وہی ہے جو آپ حضرات بیان کرتے ہیں تو پھر تمام صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیوں نہ ہو گئے؟ آخر ان کے لشکر میں صحابہ کی ایک محدود تعداد ہی کیوں تھی؟ امام ابن سیرین کا مشہور قول تو آپ کے علم میں ہو گا کہ مشاجرات میں شریک تمام صحابہ کی تعداد تیس سے بھی کم تھی۔ تو آخر سب یا اکثر صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیوں نہ تھے؟

﴿جواب﴾ تعجب کی بات ہے کہ جب یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں فلاں احادیثِ صحیحہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کی اصابت خوب واضح ہو رہی ہے تو فوراً کہا جاتا ہے کہ "فلاں فلاں اقوال کے مطابق مشاجرات میں فقط چھبیس تیس حضرات ہی شریک تھے؟ پس اگر یہ احادیث درست ہیں تو سب صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ کیوں نہ دیا؟"

اس وقت ان اقوال کی اسنادی حیثیت کو دیکھے بغیر اور ان پر وارد شدہ قوی اعتراضات کو نظر انداز کر کے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ اقوال اٹل ہیں؛ کیوں کہ اس وقت مقصد فقط یہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کو کمزور کیا جائے۔

مگر جب امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حامیوں کا ذکر آتا ہے تو یہ اقوال فراموش کر کے بلا دلیل ارشاد ہوتا ہے کہ "سینکڑوں ہزاروں صحابہ، نصف اُمت، لاکھوں تابعین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کے مخالف تھے۔" اور اس بلا دلیل دعوے کے بعد پوچھا جاتا ہے کہ "آخر ایسا کیوں تھا؟" جو بات ہوئی ہی نہیں، اس کی وجہ کیا بتائی جائے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ انتظام علاقوں یعنی: شام و مصر کے اکثر صحابہ کی خاموشی کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ رہے باقی عالمِ اسلام یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیرِ انتظام علاقے میں بسنے والے صحابہ، تو سابقہ جواب سے اس سوال کا اصولی جواب بھی واضح ہو جاتا ہے، یعنی جب تک ان میں سے کسی کے قول یا فعل سے یہ ثبوت نہ مل جائے کہ وہ حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ کا کچھ اور مطلب لیتا تھا اور مجتہدِ مصیب کے اجتہاد کو غلط سمجھتا تھا، تب تک اسے مجتہدِ مصیب کا مخالف

---

[1] دیکھیے تراجم دیکھیے: سیر اعلام النبلاء : عُبادۃ بن الصامت: ۲/ ۵ تا ۱۱، عبداللہ بن عمرو بن العاص: ۳/ ۷۹ تا ۹۴، ط الرسالة

ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔اسی طرح بہت سے لوگوں کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگوں میں شرکت نہ کرنا بھی ثابت نہیں کرتا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق نہیں مانتے تھے؛ کیوں کہ شرعاً ہر مسلمان پر لازم نہیں کہ وہ خلیفہ برحق کی عملی نصرت کرے بلکہ اس کی اطاعت کے عمومی حلقے میں شامل رہنا اور اس کی مخالفت نہ کرنا کافی ہے۔

اُمت مسلمہ کا اصول چلا آرہا ہے کہ جو بات قوی دلائلِ شرعیہ سے ثابت ہو اور وہ اُمت کا اجماعی مسئلہ بھی ہو تو ماضی کے علماء وفقہاء، مجتہدین اور صالحین میں سے ہر فرد کو عموم میں شامل کر کے اسی مسئلے کا قائل مانا جاتا ہے سوائے اس صورت کے کہ کسی عالم، کسی فقیہ یا کسی مجتہد سے واضح طور پر اس کی مخالفت ثابت ہو۔

آخر ہم یہ کیوں مانتے ہیں کہ دورِ صحابہ میں سب کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے اوّلین حق دار تھے؟ کیا ایک ایک صحابی اور تابعی کی اس بارے میں گواہی منقول ہے؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ فرامینِ نبویہ میں اس کے قوی دلائل موجود ہیں اور تواتر کے ساتھ اُمت مسلمہ کا اجماعی مذہب یہی ہے۔اگرچہ بعض روایات میں یہ منقول ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کی خلافت سے متفق نہیں ہوئے اور وہ خود کو خلافت کا بہتر حق دار سمجھتے تھے۔مگر ظاہر ہے کہ ایک یا چند افراد کے بلا دلیل اختلاف سے اجماعی مسئلے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔[1]

اب اگر کوئی "جدید محقق" کہے کہ "سوا لاکھ صحابہ اور کئی لاکھ تابعین میں سے فقط تیس چالیس صحابہ اور پچاس ساٹھ تابعین ہی کے بارے تصریح منقول ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور یہ کہ فقط پندرہ بیس صحابہ اور چالیس پچاس تابعین نے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مناقب کی روایات نقل کی ہیں، اور فقط تیس چالیس صحابہ اور دو تین سو تابعین ہی نے ان سے عہدے قبول کیے تھے، اور فقط آٹھ دس ہزار صحابہ اور بیس تیس ہزار تابعین ہی نے ان کے ماتحت لشکروں میں شمولیت کی تھی، جبکہ صحابہ وتابعین کی اکثریت کے بارے میں نام بنام قطعاً کوئی تصریح منقول نہیں کہ انہوں نے بیعت کی ہو۔اسی طرح اکثریت سے ان کے مناقب بھی منقول نہیں، اکثریت سے ان کی خلافت کی وکالت بھی منقول نہیں، اکثریت نے ان کے عہدے قبول نہیں کیے اور اکثریت ان کے ساتھ لشکروں میں شامل نہیں ہوئی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دلائل پر مشتمل احادیث اکثر صحابہ وتابعین کے نزدیک درست نہ تھیں اور اکثریت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اوّلین حق دار خلافت نہیں سمجھتی تھی۔" تو بتائیے کہ اس خرافاتی دلیل کا کوئی وزن ہوگا؟

اس سے بھی زیادہ واضح ایک اور مثال لے لیں۔صحابہ کرام کے مابین مصحفِ قرآنی پر اختلاف تھا کہ کونسا نسخہ صحیح ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنے مصحف کی صحت پر اصرار تھا اور کچھ صحابہ وتابعین ان کے ہم نوا تھے، جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کو اپنے مرتب کردہ نسخے کی صحت پر اعتماد تھا، اسی لیے سرکاری طور پر اسی کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔حدیثی اور تاریخی روایات کا تواتر بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد

---

[1] اگرچہ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے معمولی نزاع کے بعد خلافتِ صدیقی کو مان لیا تھا۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں ہی مصحفِ عثمانی کی صحت پر متفق ہوگئی تھی مگر یہ بھی تاریخی تواتر سے ثابت ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعض عراقی تلامذہ انہی کے مصحف کو ترجیح دیتے رہے، جس کے خلاف حجاج بن یوسف نے مہم چلائی اور اس کی سخت ترین مخالفت کی۔ [1]

پھر بھی چوتھی صدی ہجری تک مصحفِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کسی نہ کسی شکل میں باقی تھا۔ آخر ۳۹۸ھ میں شوافع کے امام شیخ ابوحامد الاسفرائینی کے فتوے پر اس کے آخری نسخے کو بھی تلف کر دیا گیا۔ [2]

بہرکیف چونکہ اجماعِ اُمت مصحفِ عثمانی پر ہے، اس لیے چاہے ہمارے پاس ایسی روایات موجود نہ ہوں جن میں صحابہ، تابعین اور علماء وفقہاء میں سے ایک ایک کا نام لے کر تصریح کی گئی ہو کہ وہ مصحفِ عثمانی کا قائل تھا، مگر پھر بھی ہم ان حضرات کی امانت، دیانت اور فقاہت پر اعتماد کرتے ہوئے یہ ماننے کے مکلف ہیں کہ انہوں نے یا تو اپنے اپنے طور پر اس معاملے کے تمام پہلوؤں اور شرعی دلائل کا جائزہ لے کر یا خلیفہ راشد پر اعتماد کے باعث ان کی تقلید کر کے راجح مذہب ہی کو اپنایا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک جمِ غفیر سے مصحفِ عثمانی کی مخالفت منقول ہوتی۔ ہم صرف اس شخص کو مستثنیٰ کر سکتے ہیں جس کے متعلق صراحتاً ثابت ہو کہ اس کی رائے اس اجماع سے ہٹ کر تھی جیسا کہ خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یا ان کے چند رفقاء۔ باقی کو ہم قیاساً اس صف میں کھڑا نہیں کر سکتے۔

پس اگر آج کوئی شخص یہ کہے کہ **"اگر مصحفِ عثمانی راجح تھا تو سوا لاکھ صحابہ اور کئی لاکھ تابعین میں سے اس کی تائید میں چند سو صحابہ اور دو تین ہزار تابعین کے صریح الفاظ دکھایئے اور اگر آپ سر توڑ کوشش کر کے بھی فقط پندرہ بیس صحابہ اور تیس چالیس تابعین سے زیادہ کی تائید کے ثبوت نہ پیش کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اکثریت کو مصحفِ عثمانی پر اعتماد ہی نہ تھا یا کم از کم یہ اجماعی مسئلہ ہرگز نہ تھا، لہٰذا آج بھی مصحفِ عثمانی اور مصحفِ ابن مسعود کو برابر کی حیثیت ملنی چاہیے؛ کیوں کہ اس بارے میں خود صحابہ اور تابعین دو بڑے حصوں میں تقسیم تھے۔"** تو کیا اس دلیل کا کچھ وزن ہوگا؟

ظاہر ہے یہ دلیل نہیں، ایک قیاسِ فاسد ہے، بلکہ ایک احمقانہ وہم ہے۔ یہ اعتراض کرنے والا بھول رہا ہے جو مسئلہ تواتر کے ساتھ اجماعی مذہب چلا آ رہا ہو، کسی کو اس کا ماننے والا ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا مخالف ثابت کرنے کے لیے دلیل چاہیے۔ ورنہ اگر ایسے احمقانہ قیاسات کو اصول بنالیا جائے تو اُمتِ مسلمہ کے تمام اجماعی عقائد کو ایک ایک کر کے توڑا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ کوئی احمق یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "برصغیر کے اکثر علماء مرزا قادیانی کو نبی مانتے تھے؛ کیوں کہ برصغیر میں ایک صدی میں کئی لاکھ علماء گزرے ہیں جن میں سے فقط چند ہزار سے مرزا قادیانی کی زبانی یا تحریری تردید ثابت ہے۔ لہٰذا باقی لاکھوں علماء مرزا قادیانی کے مؤید تھے۔"

ظاہر ہے یہ سب فاسد قیاسات ہیں۔ یہی حیثیت اس قیاس کی ہے کہ اگر حدیثِ عمار صحیح ہوتی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

① سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۳، کتاب السنۃ، باب فی الخلفاء

② تاریخ الاسلام ذھبی: ۲۳۶/۲۷



کا مصیب ہونا یقینی ہوتا تو اکثر صحابہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کرنا کیوں منقول نہیں۔ اللہ ایسی جہالتوں سے اپنی پناہ میں رکھے اور اصولِ اہل سنت والجماعت کے اجماعی نظریات پر استقامت نصیب فرمائے۔

☆☆☆

حدیثِ عمار صحیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نصِ صریح کے ہوتے ہوئے جنگ بندی کیوں قبول کی؟

﴿سوال﴾ اگر حدیثِ عمار اہلِ شام کے باغی ہونے پر نصِ صریح ہے تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نصِ صریح کے باوجود جنگ بندی اور تحکیم کو کیوں قبول کرلیا؟ نصِ صریح سے ثابت شدہ باغیوں سے تو صلح جائز ہو ہی نہیں سکتی۔

﴿جواب﴾ بغاۃ کے شرعی احکام میں یہ کہاں ہے کہ باغیوں سے مذاکرات، جنگ بندی اور معاہدے نہیں ہو سکتے؟ فقہ اسلامی کے مطابق شرعاً یہ سب کچھ جس طرح کفار کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح بدرجۂ اولیٰ باغیوں کے ساتھ جائز ہے۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اہلِ شام سے مذاکرات، جنگ بندی اور تحکیم کو قبول کرنے پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

بعد کے محدثین پر تصویبِ علی رضی اللہ عنہ واضح ہوگئی اور معاصر ہزاروں تابعین پر نہیں، یہ کیسے؟

﴿سوال﴾ چلیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بڑے صحابہ چند ہی تھے، صغار صحابہ بھی کم تھے مگر تابعین تو بہرحال ہزاروں تھے جیسا کہ ان جنگوں میں ہزاروں افراد کی شرکت ثابت ہے۔ پھر ان لشکروں میں نمازیں پڑھانے والے امام اور علماء تابعین بھی ہوں گے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حدیثِ عمار اور خوارج سے قتال کرنے والی روایات دیکھ کر بعد کے محدثین اور علماء پر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب قطعی طور پر واضح ہوگئی مگر خود اس زمانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حامی علماء پر ان کی صداقت واضح نہ ہوسکی۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک تقریباً تین سال گزرے، کیا اتنے عرصے میں شامی حضرات ان احادیث کو نہ جان سکے اور نہ سمجھ سکے؟

﴿جواب﴾ عہدِ مشاجرات، دورِ فتن اور دورِ حوادث تھا۔ حادثے جس انداز میں پیش آتے ہیں، وہ عموماً غیر متوقع اور عجیب ہوتے ہیں مگر ناممکن ہرگز نہیں۔ دورِ فتن میں جو حوادث پیش آئے وہ بھی عجیب تھے۔ کیا مدینہ منورہ میں صحابہ اور تابعین کی کثیر جمعیت کے ہوتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل عجیب نہیں؟ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت پر بھی مسلمانوں کا متفق نہ ہونا اور اہلِ شام کا بیعت سے انکار کردینا عجیب نہیں؟ کیا اتنی برگزیدہ جماعتوں کا تلواریں لے کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑنا عجیب نہیں؟ یقیناً یہ سب عجیب بلکہ عجیب تر ہے اور چاہے کسی کو سمجھ آئے یا نہ آئے مگر یہ حقائق ہیں۔ پھر جب واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ان واقعات کے کچھ اسباب بھی سامنے آجاتے ہیں جن سے حیرت کچھ کم ہوجاتی ہے مگر حادثے کے غیر متوقع ہونے کا تاثر تو بہرصورت باقی رہتا ہے۔ اپنی زندگی میں پیش آمدہ حادثوں کو دیکھیے تو بھی ہمیں حیرت ہوتی ہے حالانکہ وہ خود ہم پر بیتے ہوتے ہیں۔ آج کل جا بجا خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں، کسی روڈ

ایکسیڈنٹ کی وڈیو دیکھیے تو کیا حیرت نہیں ہوتی؟ حالانکہ سارا منظر ریکارڈ ہوتا ہے، پھر بھی سراغ رساں بہت سے حادثات کی ہر ہر جزئی اور ہر کڑی کی وضاحت نہیں کر سکتے۔ کچھ اسباب معلوم ہو جاتے ہیں مگر سلسلۂ اسباب آخر میں کہاں تک پہنچتا ہے، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اہلِ ایمان ایسے مواقع پر ''واللہ اعلم'' کہہ کر بحث بند کر دیتے ہیں۔ مگر ''واللہ اعلم'' کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ حادثے کے وقوع اور ریکارڈ شدہ باتوں کی نفی کر دی جائے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے فاترالعقل ہی سمجھا جائے گا۔ یہ تو بنیادی اور اُصولی بات ہے جو ان تمام معاملات میں ملحوظ رہنی چاہیے۔

اب ہم اَصل سوال کی طرف آتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک اہلِ شام نے اپنی غلطی کیوں تسلیم نہیں کی؟ دراصل اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ عظیم حوادث سے گزرے تھے جن کے باعث کئی عشروں تک شامیوں اور عراقیوں کے مابین نفرت اور جذبات کی ایک خلیج حائل رہی اور احادیثِ نبویہ کا نہ تو تبادلہ اس طرح ہو سکا جیسا کہ اتفاق اور اعتماد کی فضا میں ہو سکتا تھا، نہ ہی ان پر غور و فکر کر کے اجماع کا ماحول بن سکا۔ (1)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب کی اکثر احادیث عراق، یمن اور حجاز کے محدثین کے پاس تھیں اور شامی راوی عموماً ان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے اس لیے اس زمانے میں حق واضح نہ ہو سکا، حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ کے طرق اس طرح جمع نہ ہو سکے جیسے بعد میں جمع ہو کر انہوں نے حدیثِ متواتر کی شکل اختیار کر لی۔ اسی طرح خوارج کے قتال سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقانیت کے ثبوت پر مشتمل احادیث عراق و حجاز میں تو عام ہوئیں جبکہ شامی کئی عشروں تک ان کے راویوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ متعدد شامی محدثین عراقیوں بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات نقل کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ (2)

مگر آہستہ آہستہ شکوک و شبہات کے یہ بادل چھٹ گئے اور جب سنت کا ذخیرہ عام ہوا تو اس کی روشنی میں ہر شے اجلی اور واضح دکھائی دینے لگی، چنانچہ سوادِ اعظم نے اس قضیے کا یہی فیصلہ کیا کہ فریقین مجتہد تھے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مصیب تھے اور ان پر خلیفۂ واجب الاطاعت کا اطلاق ہوتا تھا جبکہ اہلِ شام و اصحابِ جمل مخطی تھے اور ان پر خروج کا اطلاق ہوتا تھا۔ ماجور اور مغفور بھی تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ دورِ فتن کے اندھیرے میں جن کا رُخ غلط تھا، اور وہ اپنی غلطی کو درست سمجھتے ہوئے لاعلمی کی حالت میں دنیا سے گزر گئے، وہ کافر یا فاسق تھے۔

جیسے اندھیری اور طوفانی شب میں قبلہ مشتبہ ہو جانے کے باعث کوئی امام تحرّی کر کے لوگوں کو غلط رخ پر نماز پڑھا دے اور شب کے آخر تک وہ اسی غلطی پر جما رہے اور اسی رُخ پر تہجد پڑھتا رہے اور پھر اسی شب میں اس کا انتقال

---

(1) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب کی بعض صحیح احادیث سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ وغیرہ جیسے صحابہ بھی ناواقف تھے اور سالوں بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے انہوں نے یہ روایات سنیں۔ (مسند احمد، ح: ۱۶۲۹؛ صحیح مسلم، ح: ۶۳۷۲)

(2) شام میں مروانیوں اور ناصبیوں کا ایک پورا گروہ تھا جو مناقب علی رضی اللہ عنہ کی روایت کا انکار کرتا تھا۔ بعد میں آنے والے اموی خلفاء بھی اس فضا سے کسی نہ کسی حد تک متاثر تھے اور اپنے سیاسی حریفوں کی روایات حدیث پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ مثلاً اموی خلیفہ عبدالملک حطیم کے کعبہ کا حصہ ہونے کی صحیح حدیث کا اس لیے انکار کرتا تھا کہ یہ روایت اس کے سیاسی حریف حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے نقل کی تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے قتل کے بعد بھی وہ اس پر مصر رہا اور کعبہ کو منہدم کرا کے قریش کی قدیم تعمیر کے مطابق بنوا دیا۔ بعد میں دیگر ذرائع سے اسے تصدیق ہوگئی کہ یہ حدیث واقعی صحیح تھی تب وہ اپنے کیے پر نادم ہوا۔
(صحیح مسلم، ح: ۳۳۱۰، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ و بنائھا)

ہو جائے تو دن کا سورج دیکھ کر یہ تو یقیناً کہا جائے گا کہ امام کا رُخ قطعاً غلط تھا مگر یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ اس کی نماز نہیں ہوئی، اسے اجر نہیں ملا۔ چہ جائے کہ اسے فاسق یا کافر کہا جائے۔ یہ ایک عام شخص کی مثال ہے، جبکہ صحابۂ کرام کا مقام بدرجہا بلند ہے جن کے متعلق قرآن وسنت میں بکثرت فضائل ومناقب وارد ہیں۔ پس ان کا احترام واجب سمجھتے ہوئے مشاجرات میں اُسی معتدل موقف کو اپنانا چاہیے جو جمہور اہلِ سنت والجماعت نے اختیار کیا ہے۔

☆☆☆

مشاجرات میں ایک کی تصویب اور دوسرے کی خطا کو یقینی کیوں مانا جاتا ہے؟

﴿سوال﴾ اگر مشاجرات کا مسئلہ اجتہادی ہے تو پھر اس میں ایک فریق کی اصابت اور دوسرے کی خطا ظنی ہی ہوگی؛ کیوں کہ اجتہاد کا مطلب ہے کہ فریقین کے پاس دلائل تھے۔ پھر ایک کی خطاء یقینی کیسے مان لی گئی؟ مجتہدین نے بھی اصول یہی لکھا ہے کہ اجتہادی مسائل میں ہم جس مجتہد کی پیروی کرتے ہیں اور اسے مصیب سمجھتے ہیں اس کا مصیب ہونا بھی ظنی ہے اور مخالف مجتہد کو اگر ہم خطاء پر مانتے ہیں تو اس کا مخطی ہونا بھی ظنی ہے۔ پھر مشاجرات میں اہلِ سنت ایک فریق کے مصیب اور دوسرے کے مخطی ہونے کا یقین کیوں رکھتے ہیں؟ اور اگر یہ قطعی مسئلہ ہے تو پھر دوسرے فریق یعنی اہلِ شام کو مجتہد نہیں کافر کہنا چاہیے؛ کیوں کہ دلائلِ قطعیہ سے ثابت مسئلے کا مخالف تو کافر ہو جاتا ہے؟

﴿جواب﴾ آپ کے اعتراض کا آخری حصہ اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اہلِ سنت اس مسئلے کو اسلام کے قطعی اور بنیادی اعتقادات یعنی ضروریاتِ دین میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ قطعی عقیدہ یا ضروریاتِ دین میں سے ہونا اور چیز ہے اور کسی اجتہادی مسئلے میں کسی مجتہد کی غلطی کا قطعی طور پر ثابت ہو جانا الگ بات ہے۔

قطعی عقائد وہ ہوتے ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن میں سے کسی کے انکار سے انسان کافر ہو جاتا ہے، جیسا کہ اللہ، رسولوں، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان لانا اور ارکانِ اسلام کا اقرار کرنا، حضور ﷺ کی رسالت اور ختمِ نبوت کو ماننا یہ قطعی عقائد ہیں۔ انہیں جاننا اور ماننا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔ مگر مشاجرات کے مسائل کا کسی کو علم ہی نہ ہو تب بھی وہ مسلمان ہے۔ البتہ مشاجرات کا ہونا ایک یقینی بات ہے اور فریقین کے اتنے سخت اختلاف میں ایک فریق کی رائے کا درست ہونا اور ایک کا غلط ہونا بھی لازمی چیز ہے۔

پس کسی بات کے بنیادی وقطعی عقائد میں داخل ہونے اور کسی اجتہادی معاملے میں کسی مجتہد کی غلطی کے قطعی طور پر ثابت ہو جانے میں فرق ہے۔ مشاجرات میں اہلِ سنت کے مذہب کا تعلق پہلی صورت سے نہیں، دوسری صورت سے ہے اور اسے یقینی یا قطعی مسئلہ انہی خاص معنوں میں کہا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مشاجرات سے لاعلمی سے ایمان اور اسلام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر کوئی اس قضیے میں الگ رائے رکھے تو اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔

یہ مسئلہ اگرچہ ضروریاتِ دین میں سے نہیں مگر اسے اہلِ سنت نے عام ظنی مسائل کے مقام سے بہت بلند رکھا ہے

اور اسے غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے کتب عقائد میں جگہ دی ہے؛ کیوں کہ اس میں لغزش کی بناء پر اُمت مسلمہ میں خوارج، نواصب، روافض، اور معتزلہ جیسے فرقے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا اس بارے میں افراط وتفریط سے محفوظ موقف کو پیش کرنا ضروری سمجھا گیا اور اس معتدل موقف سے انحراف کرنے والے کو بدعتی اور اہلِ سنت سے خارج قرار دیا گیا۔

رہی یہ بات کہ دیگر اجتہادی مسائل کی طرح یہاں ایک کی خطاء اور دوسری کی اصابت ظنی کیوں نہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر اصابت یا خطاء دلیلِ ظنی سے نہیں، حدیثِ متواتر اور سنتِ مشہورہ سے ثابت ہے۔ پھر اس پر اہلِ سنت کا اجماع ہو چکا ہے۔ مجتہدین کے اختلافات میں ایک کی اصابت اور دوسرے کی خطاء کا احتمال اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کسی ایک صورت پر اجماع نہ ہوا ہو۔ چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں علماء اختلاف کے بعد ایک بات پر اجماع کر چکے ہیں تو وہاں مخالف رائے کی غلطی بھی قطعی اور یقینی مانی جاتی ہے نہ کہ ظنی۔ چاہے وہ رائے کسی صحابی کی ہو۔ البتہ جو لوگ اجماع سے قبل اختلاف کی حالت میں گزر چکے ہوں گے ان پر بھی طعن جائز نہیں۔

ایک مثال سے بات کو سمجھئے کہ کوئی لشکر چلا جا رہا ہو، رات کو نماز کا وقت آئے تو بارش، طوفان اور اندھیرے کی وجہ سے قبلے کی سمت متعین کرنا ممکن نہ رہے، ایسے میں لشکر کے مختلف امام اپنے اپنے طور پر تحرّی اور سوچ بچار کر کے الگ الگ رُخ متعین کر لیں اور لوگ الگ الگ جماعتیں بنا کر ان کے پیچھے نماز ادا کر لیں تو اب یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان سب کا رُخ قبلے کی طرف ہے۔ مگر چونکہ ان کی طرف سے قبلے کا تعین ایک شرعی دلیل یعنی "تحرّی" پر مبنی ہے، لہٰذا یقیناً ان سب کی نماز ادا ہو جائے گی اور سب کو تحرّی اور سوچ بچار کی کوشش کا ثواب بھی ملے گا۔ لیکن جب دن کو سورج نکل آئے اور معلوم ہو جائے کہ مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر، تو اس وقت طے ہو جائے گا کہ کس کا اندازہ غلط تھا اور کس کا صحیح۔ شک کی گنجائش نہیں رہے گی بلکہ سب یقین کے ساتھ کہیں گے کہ فلاں امام کا رُخ صحیح تھا اور فلاں کا غلط۔

مشاجرات میں بھی یہی صورت تھی کہ فتنوں، ہنگاموں، مفسدین کی شرانگیزیوں اور متشدد لوگوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی وجہ سے ایک مدت تک فضا مکدر رہی اور مسلمانوں کی قیادت کی سمتیں بھی مختلف رہیں۔ مگر بعد میں مسئلہ واضح ہو گیا اور مسلمان ایک موقف پر جمع ہو گئے۔ علامہ ابن خلدون مشاجرات اور صحابہ کے ایک طبقے کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے اختلاف کے ماحول کا مختصر ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> **"مگر ان کے بعد قرنِ ثانی کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے انعقاد، اس کے تمام مسلمانوں پر لازم ہونے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدامات کی اصابت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم رائے حضرات کی غلطی پر متفق ہو گئے۔"[1]**

☆☆☆

[1] الا ان اهل العصر الثانی من بعدهم اتفقوا علی انعقاد بیعة علیّ ولزومها للمسلمین اجمعین و تصویب رایه فیما ذهب الیه وتعیین الخطا من جهة معاویة ومن کان علیٰ رایه. (تاریخ ابن خلدون: ۱/۲۱۷)

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی نہایت مفید تحقیق

اس بحث کا اختتام ہم حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی ایک تحریر سے کرتے ہیں جس میں وہ اس نازک بحث کو نہایت نفیس انداز میں یوں حل فرماتے ہیں:

''بعض اوقات ایک مجتہد کوئی موقف اس لیے اختیار کرتا ہے کہ معارض دلائل اس پر واضح نہیں ہوتے، اس لیے وہ مجتہد معذور ہوتا ہے لیکن بعد میں دلائلِ قطعیہ سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کی نسبت سے تو مسئلہ ظنی تھا مگر بعد کے لوگوں کے لیے ان کا تخطیہ قطعی ہو جاتا ہے گو ضروریاتِ دین میں سے نہ ہونے کی بناء پر اس کا خلاف موجب کفر نہ ہو۔

كمافي شوادر مذهب بعض الصحابة كمذهب ابى ذر في الاكتناز، مذهب ابن عباس في مسح الرجلين ومذهب ابن عمر في جواز الصرف وغيره.

اس کی دوسری تعبیر یوں بھی ممکن ہے کہ ظنی کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ جس کا خلاف اب بھی شرعاً جائز ہو۔ جیسا کہ اکثر مسائلِ فقہیہ۔

دوسرے وہ جس کا خلاف اب شرعاً جائز نہ ہو۔ دوسری قسم قریب بہ قطعی ہوتی ہے۔ **كالامثلة السابقة**

احقر کو ایسا لگتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اختلاف اصلاً اجتہادی تھا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ظنی تھا۔ لیکن بعد میں وضوحِ دلائل اور اہلِ سنت کے اتفاق کے بعد وہ یا تو قطعی ہو گیا، یا ظنی قسم دوم جس کا خلاف جائز نہیں۔''[1]



---

[1] اصلاحی نوٹ از حضرت مفتی محمد تقی عثمانی، بر تحویل حضرت مفتی محمد مجاہد شہید (جامعہ امدادیہ فیصل آباد) بابت مشاجرات صحابہ، ص ۴۷، غیر مطبوعہ

اہم تنبیہات

① جمہور علمائے اسلام کی کتب میں جہاں بھی اہلِ شام یا اہلِ جمل کے لیے ''باغی'' کا لفظ آیا ہے وہ فقہی اصطلاح کے طور پر ہے، یعنی: ① جو شرعی حکمران کی اطاعت نہ کرے۔ ② کسی علاقے پر قابض ہو جائے۔

شرعاً ''باغی'' کی تعریف کا حاصل یہی ہے۔ یہ بھی نا قابلِ انکار ہے کہ اصحابِ جمل اور اہلِ شام خلیفہ کی اطاعت سے رکے اور ایک علاقے پر ان کا قبضہ بھی رہا۔ پس جمہور علماء ان حضرات پر ''باغی'' کے اطلاق سے اسی قدر مراد لیتے ہیں، اور اُسی زمانے تک مراد لیتے ہیں جب تک یہ قضیہ اس شکل میں باقی رہا۔ اسلام سے بغاوت، بے دینی، ناجائز خونریزی، لوٹ مار، فسق و فجور یا عدالت کے منافی کوئی بات ہرگز مراد نہیں۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی اس امر کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

''واضح رہنا چاہیے کہ جن لوگوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے باغی، یا امامِ جائر کا لفظ استعمال کیا ہے، ان کی مراد بھی خود ان کی تصریح کے مطابق صرف یہی ہے کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح سے قبل نفس الامر کے اعتبار سے برسرِ حق نہ تھے۔ ورنہ چوں کہ ان کی یہ بغاوت تاویل کے ساتھ تھی، اس لیے وہ مجتہدِ مخطی تھے۔''[1]

② عام اردو محاورے اور عرف کے لحاظ سے ''باغی'' کا لفظ بولا جائے تو اس سے ایک فسادی، سرکش اور سفاک شخصیت ذہن میں آتی ہے۔ اس معنی میں کسی بھی صحابی کی طرف باغی ہونے کی نسبت کرنا پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

علمی و فقہی مذاکرے میں جہاں مسئلے کی تنقیح مقصود ہوتی ہے، وہاں یہ لفظ ناگزیر حالت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہماری اس تاریخی کاوش میں بھی ایسے مباحث میں یہ لفظ ناگزیر طور پر آیا ہے۔ راقم کو اب تک تلاش کے باوجود اس کا کوئی متبادل لفظ جو فقہی مفہوم کو بھی پوری طرح ادا کر دے، نہیں ملا۔ بغاوت کی جگہ ''خروج'' کا لفظ نسبتاً خفیف لگتا ہے مگر ''باغی'' کی جگہ ''خارجی'' استعمال نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ اس کا نہایت قبیح ہونا واضح ہے۔ بعض حضرات نے ہمیں لفظ ''منحرف'' استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے مگر جہاں تک غور کیا گیا، یہ بھی فقہی اصطلاح کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔

اگر اہلِ علم کسی متبادل لفظ پر اتفاق کر لیں تو آئندہ ایڈیشن میں وہی استعمال کیا جائے گا۔ بہرکیف مسئلے کی تنقیح اور علمی و اعتقادی مذاکرے سے ہٹ کر صحابہ کے متعلق عام گفتگو یا تحریر میں اس لفظ کے استعمال سے بچنا ہی احتیاط کا تقاضا ہے؛ کیوں کہ عوام جنہیں صحابہ کی عظمت کے بارے میں پہلے ہی شکوک و شبہات میں مبتلا کیا جا رہا ہے، مغالطے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ صحابہ کی عدالت، تقویٰ، رشد و ہدایت نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان اسلام کا واسطہ اور ذریعہ ہیں۔ انہیں دین سے برگشتہ تصور کر لینا، ضلالت کی جڑ ہے۔ اللہ ہم سب کو راہِ اعتدال پر استقامت نصیب فرمائے۔

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۹، ۱۴۰ کا حاشیہ

خلافتِ راشدہ موعودہ کے متعلق بعض اشکالات

کیا علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ خلافتِ راشدہ کو خلفائے اربعہ میں محدود نہیں مانتے تھے؟

﴿سوال﴾ خلافتِ راشدہ کا تیس سال ہونا فقط ایک روایت میں ہے جو خبرِ واحد ہے؛ کیوں کہ یہ فقط ایک صحابی حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور اس کی سند میں گڑبڑ ہے۔اس کے راوی سعید جمہان ثقہ نہیں۔اس لیے علامہ ابن خلدون خلافت کے تیس سال میں منحصر ہونے کے قائل نہیں،اور اسی لیے انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا ہے:

''فهو من الخلفاء الراشدين.''(حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے ہیں۔)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا چار خلفاء میں منحصر ہونا کوئی اجماعی عقیدہ نہیں ہے۔یہ غلط عقیدہ حدیثِ سفینہ یعنی حدیثِ ''ثلاثون سنة'' کی بناء پر قائم کیا گیا ہے،علامہ ابن خلدون نے اسے بھی غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے:''اس بارے میں''خلافت تیس سال تک'' والی حدیث کو نہ دیکھا جائے؛ کیوں کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔''[1]

﴿جواب﴾ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے یہاں لغوی مفہوم مراد لے کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خلفائے راشدین میں شمار کیا ہے جیسا کہ ان کی مکمل عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

فهو من الخلفاء الراشدين ومن كان تلوه في الدين والفضل من الخلفاء المروانية ممن تلاه في المرتبة كذلك وكذلك من بعدهم من خلفاء بني العباس.''[2]

''پس وہ(مُعاویہ رضی اللہ عنہ) بھی خلفائے راشدین میں سے ہیں،اور جو بھی دین اور فضیلت میں ان کا تابع ہوا،اور خلفائے مروانیہ میں سے جو ان کے نقشِ قدم پر چلا ہو،وہ مرتبے میں اسی طرح ہے،اور اسی طرح بعد میں خلفائے بنی عباس میں سے بھی جو ایسے تھے(وہ اسی شمار میں ہوں گے)۔''

یعنی ابن خلدون رحمہ اللہ بنواُمیہ اور بنوعباس کے ہر نیک سیرت حکمران کو خلفائے راشدین میں شمار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ اصطلاحی خلافتِ راشدہ نہیں ہوسکتی،لغوی ہی ہوگی۔

اصطلاحی خلافتِ راشدہ کے متعلق وہ خود بتاتے ہیں کہ علماء نے اسے خلفائے اربعہ تک محدود رکھا ہے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو اس لیے اس میں شامل نہیں کیا کہ ان کی حکومت عصبیت سے پیدا شدہ مقابلے کے ذریعے وجود

---

[1] "ولا ينظر في ذلك الى حديث الخلافة لثلاثين سنة فانه لم يصح." (تاريخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰)

[2] تاريخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰

میں آئی تھی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ غلبے کی کوشش کے ذریعے اقتدار میں آنے والے پہلے حکمران ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں خلافت غلبے کی کوشش کے ذریعے حاصل کی گئی تھی، جس کی وجہ ان کے دور میں ابھرنے والی وہ گروہ بندی تھی جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل خلافت رضامندی اور اجتماع کے ساتھ تھی؛ اس لیے علماء نے دونوں حالتوں میں فرق کر دیا۔ پس مُعاویہ رضی اللہ عنہ غلبے کی کوشش اور عصبیت کی بناء پر بننے والے پہلے خلیفہ تھے۔''[1]

یہی نہیں بلکہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے مقدمۂ تاریخ میں ''خلافت'' کے ''ملوکیت'' میں بدل جانے پر ایک مفصل باب تحریر کیا ہے جس میں پوری تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد بنوامیہ کے دور میں خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ اس بحث کے دوران فرماتے ہیں:

> ''تم نے دیکھا کہ کس طرح خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی مگر خلافت کا یہ مفہوم باقی رہا کہ وہ دین اور دینی احکام کی محافظ اور راہِ حق کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ اس زمانے میں تغیر فقط حکمران ہی میں ہوا جس پر دین کا دار و مدار تھا۔ پھر (یہی تغیر بڑھتے بڑھتے) عصبیت اور شمشیر میں تبدیل ہوگیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، مروان اور اس کے بیٹے (عبدالملک) سے لے کر بنوعباس کے ابتدائی حکمرانوں میں ہارون الرشید اور اس کے بعض بیٹوں تک یہی صورتحال رہی۔ اس کے بعد خلافت کا معنیٰ بالکل ختم ہوگیا اور فقط اس کا نام ہی رہ گیا۔ حکمرانی خالص بادشاہت بن گئی۔''[2]

اسی بحث کے دوران وہ مروان اور عبدالملک کی کچھ خوبیوں کے ذکر کے باوجود انہیں بادشاہ قرار دیتے ہیں:

> ''اسی طرح مروان اور اس کے بیٹے کا حال ہے اگرچہ وہ ملوک تھے۔''[3]

وہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تعریف کرتے ہوئے انہیں ''خلفائے اربعہ'' کی سنت زندہ کرنے والا بتاتے ہیں اور ان کے بعد والوں کو دنیاوی اغراض پوری کرنے والا بادشاہ قرار دیتے ہیں۔[4] اس کے علاوہ بھی ان کی ایسی عبارات ہیں جو واضح کرتی ہیں کہ ان کے نزدیک اصطلاحی اور موعودہ خلافتِ راشدہ ''خلفائے اربعہ'' ہی کی تھی۔[5]

---

① ان الخلافة لعهده كانت مغالبة لاجل ما قدمناه من العصبية التي حدثت لعصره اما قبل ذالك اختياراً واجتماعاً فميزوا بين الحالتين فكان معاوية اوّل خلفاء المغالبة والعصبية. (تاريخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰)

② فقد رايت كيفَ صار الامر الىٰ الملك وبقيت معانى الخلافة من تحرّ ى الدين ومذاهبه والجرى علىٰ منهاج الحق، ولم يظهر التغير الا فى الوازع الذى كان ديناً، ثم انقلب عصبية وسيفاً، وهكذا كان الامر لعهد معاوية ومروان وابنه عبدالملك والصدر الاوّل من خلفاء بنى العباس الى الرشيد وبعض ولده، ثم ذهب معانى الخلافة ولم يبق الا اسمها وصارت الامر ملكا بحتا.

③ وكذالك كان مروان بن الحكم وابنه وان كانوا ملوكا (تاريخ ابن خلدون: ۱/۲۵۸)

④ وتوسطهم عمر بن عبدالعزيز فنزع الى طريقة الخلفاء الاربعة والصحابة جهده ولم يمهل، ثم جاء خلفهم واستعملوا طبيعة الملك فى اغراضهم الدنيوية. (تاريخ ابن خلدون: ۱/۲۵۸)

⑤ والخلافة من سنن الخلفاء الراشدين من آبائه واخذ بسير الخلفاء الاربعة اركان الملة. (تاريخ ابن خلدون: ۱/۲۷)

پس علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کا موقف جمہور اہلِ سنت کے عقیدے سے متصادم نہیں ہے۔

لیکن چلئے مان لیجئے کہ ان کا مطلب خلافتِ راشدہ کے اصطلاحی مفہوم ہی کو مسترد کرنا تھا، تو سوچیے جمہور محدثین، شارحین اور متکلمین کے مقابلے میں تنہا کسی عالم کی رائے کا کتنا وزن ہوسکتا ہے؟ اگر واقعی علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ حدیث "ثلاثون سنة" کا انکار کرتے ہیں تو یہ انکار خود غلط ہے بلکہ یہ انکار خود ان کی اپنی تحقیق کے خلاف ہے؛ کیوں کہ وہ "مقدمہ تاریخ" میں خود حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ سے استدلال کر چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

(اس لیے کہ کامل عدل تو خلافتِ شرعیہ میں تھا جس کی مدت کم تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "میرے بعد خلافت تیس سال ہے۔ پھر کاٹنے والی بادشاہت آجائے گی۔)[1]

جب علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ ایسی حدیث کو "لایصح" قرار دے رہے ہوں جس سے وہ خود استدلال کرتے ہیں تو ہمیں ان کی آراء کے ظاہری تضاد کو چھوڑ کر فنِ حدیث کے ماہرین سے فیصلہ لینا پڑے گا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

محدثین کے جمِ غفیر نے اس حدیث کو بڑی اہمیت کے ساتھ نقل کیا ہے[2] اور جلیل القدر ائمہ نے اسے "کتب عقائد" میں درج کیا ہے[3] جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس روایت کو قابلِ استدلال مانتے تھے۔

جن حضرات نے اس علت کی وجہ سے کہ اس کے راوی سعید بن جمہان رحمہ اللہ اعلیٰ پائے کے ثقہ نہیں ہیں، "صحیح" کے درجے پر نہیں رکھا، وہ حضرات بھی یہ مانتے ہیں کہ یہ حدیث "حسن" کے درجے سے کم نہیں؛ کیوں کہ سعید بن جمہان رحمہ اللہ بہر حال صدوق مانے گئے ہیں۔[4] اسی لیے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس روایت کو "حسن" کہا ہے۔[5]

اس حدیث کو "خبرِ واحد" کہنا بھی غلط ہے؛ کیوں کہ یہ حدیث حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے:

خِلافَةُ نُبُوَّةٍ ثَلاثُونَ عَاماً، ثُمَّ يُؤْتِي اللّٰهُ الْمُلْكَ مَنْ يَشَآءُ.

(خلافتِ نبوت تیس سال ہے، پھر اللہ جسے چاہے حکومت دے۔)

حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے خود یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سنائی تھی اور انہوں نے بھی اس کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ فرمایا تھا:

قَدْ رَضِينَا بِالْمُلْكِ. (ہم بادشاہت پر راضی ہیں۔)[6]

---

[1] "اذ العدل المحض هو في الخلافة الشرعية وهو قليلة اللبث، قال صلی اللہ علیہ وسلم: الخلافة بعد ثلاثون سنة ثم تعود ملكا عضوضا."
(تاریخ ابن خلدون: ۱/۲۶۱)

[2] سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۶، ۴۶۴۷ ، سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۶ ، سنن النسائی الکبری، ح: ۸۰۹۹ ، شرح مشکل الآثار للطحاوی، ح: ۳۳۴۹ ، مسند ابی داؤد الطیالسی، ح: ۱۲۰۳ ، الاعتقاد للبیهقی، باب تسمیة الخلفاء ، صحیح ابن حبان، ح: ۶۶۵۷ ، الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۱۱۳ ، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱/۵۵ ، مسند احمد بن حنبل، ح: ۲۱۹۲۹

[3] ملاحظہ ہو: الشریعة للآجری (باب ذکر خلافة ابی بکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنهم) ، شرح اصول اعتقاد السنة لابن منصور الرازی (سیاق ما روی فی ترتیب الخلافة بین الاربعة) ، شرح السنة للبغوی (باب فضل الصحابة)

[4] تقریب التهذیب، ترجمہ نمبر: ۲۲۷۹

[5] سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۶، وقال الالبانی صحیح

[6] دلائل النبوة للبیهقی: ۶/۳۴۲، ط العلمیة ، الخصائص الکبری للسیوطی: ۲/۱۹۷

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کی رائے آجانے کے بعد بھی محدثین اور شارحینِ حدیث نے یہ بات تسلیم نہیں کی کہ یہ حدیث ناقابلِ اعتناء ہے۔اس کے برعکس انہوں نے علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کی رائے کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔

ابن خلدون رحمہ اللہ فنِ حدیث کے ماہرین میں شمار نہیں ہوتے۔جب کوئی شخص اپنے میدان سے ہٹ کر رائے زنی کرتا ہے تو وہ لغزش کا شکار ہوسکتا ہے۔یہاں بھی ان کی لغزش بالکل کھلی ہوئی ہے۔ان کے دفاع میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''لا یصح'' کا معنیٰ ان کے نزدیک بھی ''من گھڑت'' نہیں تھا۔بلکہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کا معنیٰ فقط یہ تھا کہ اس کا درجہ صحیح کے درجے سے کم ہے۔اس کے باوجود ان کا اس حدیث کو ''لا ینظر'' کہنا نہ صرف جمہور کی اجتماعی رائے کے مقابلے میں کسی طرح درست نہیں بلکہ وہ خود جگہ جگہ اپنی اس رائے کے خلاف تحقیقات پیش کر چکے ہیں۔

☆☆☆

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلفائے راشدین میں شامل ہونے کی ایک دلیل کا جواب:

﴿سوال﴾ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ صحابی بھی تھے اور انہیں حکومت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے ملی تھی۔تو پھر انہیں خلفائے راشدین ہی میں شمار کرنا چاہیے؛ کیوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اقتدار دینا ایسا ہی تھا جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا تھا۔جب ایک خلیفہ نے اپنی خوشی سے دوسرے کو حکومت سونپ دی اور اُمت اس پر متفق ہوگئی تو اس نئے حکمران کی حیثیت وہی ہوگی جو پہلے والے خلیفہ کی تھی۔لہٰذا فرقِ مراتب کے لحاظ کے باوجود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی خلفائے راشدین کی اسی صف میں جگہ ملنی چاہیے جس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور ماقبل خلفاء تھے۔

﴿جواب﴾ فرقِ مراتب کے علاوہ یہاں انتقالِ اقتدار کی نوعیت کا بھی کھلا فرق ہے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نائب کا انتخاب کرنے میں بالکل آزاد تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے خلافت کا کوئی مطالبہ تھا نہ خلیفہ کے سامنے دو میں سے ایک راستہ اختیار کرنے کا کوئی سوال۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اُمت کا بہترین فرد سمجھتے ہوئے خود اپنی صوابدید پر یہ ذمہ داری سونپی اور اُمتِ مسلمہ کی بھی اس بارے میں دوسری رائے نہیں تھی۔

اس کے برعکس حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بالمقابل ایک متوازی غیر آئینی حکومت تھی۔دونوں حکومتوں کے سربراہوں کی خواہش یہی تھی کہ اُمت مسلمہ ایک خلیفہ پر متفق ہو جائے مگر ایسے میں اُمتِ مسلمہ کے نمائندہ اکابر صحابہ کو یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ اُمت کے بہترین فرد کا انتخاب کرتے۔ورنہ سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے حضرات، امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے تھے۔اور خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت کسی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔

پس مسئلہ اپنی صوابدید پر بہترین جانشین کی تقرری کا نہیں، دو میں سے ایک چیز کو اختیار کرنے کا تھا:

● اہلِ شام کو خلافت سپرد کر دینا.......... ❷ حالتِ افتراق اور خانہ جنگی کا خدشہ مول لینا

شرعی و عقلی اصول ہے کہ بعض اوقات کسی بڑے فتنے سے بچنے کے لیے کسی کم درجہ جائز چیز کو مصلحتاً قبول کر لیا جاتا ہے، اسی کو ''اِخْتِیَارُ اَهْوَنَ الْبَلِیَّتَیْن'' کہا جاتا ہے۔ یہاں اگر اہلِ شام کو حکومت سپرد نہ کی جاتی تو مسلمانوں میں افتراق باقی رہتا اور آئندہ مزید کشت وخون کا امکان بھی تھا؛ کیوں کہ اہلِ شام کسی طرح بھی اہلِ عراق کی سیادت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ پس حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے پیروکاروں نے قیامِ امن اور اتحادِ امت کی خاطر ٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر اہلِ شام کا مطالبہ قبول کر لیا تھا۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے جذبۂ ایثار کی تحسین کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا:

اِنَّ ابْنِیْ هٰذَا سَیِّدٌ وَ لَعَلَّ اللّٰهُ اَنْ یُصْلِحَ بِهٖ بَیْنَ طَائِفَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْن.

(میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اس کی بدولت مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے۔)[1]

وہاں اس صلح کے ماحول کے متعلق: ''هُدْنَةٌ عَلٰی دَخَن.'' (ناگواری کے ساتھ صلح) کی بھی وضاحت فرما دی۔[2]

اس ارشادِ نبوی کے مطابق یہ صلح خیر اور ناگواری دونوں پہلو لیے ہوئے تھی۔ خیر اس لیے تھی کہ اس کے باعث باہمی جنگ کے خطرات ختم ہو گئے تھے اور مسلمان سیاسی طور پر ایک بار پھر متحد ہو گئے۔ ناپسندیدہ پہلو جس کا محسوس ہونا فطری بات تھی، یہ تھا کہ خلافت اپنے بہترین حق دار سے سلب ہو گئی تھی۔ اسی پہلو اور امت کی بڑی تعداد کو پہنچنے والے طبعی رنج کی وجہ سے حدیث میں اسے: ''جَمَاعَةٌ عَلٰی اَقْذَاءٍ.'' (کدورت کے ساتھ اجتماعیت) سے بھی تعبیر کیا گیا۔[3]

یہاں معاملے کا یہ پہلو بھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ اکثر جلیل القدر علماء نے خلفائے راشدین کے بعد کے حکمرانوں کو حقیقی خلفاء تسلیم نہیں کیا اور فقط ناگزیر حالت کی وجہ سے ان کے لیے خلیفہ کا لقب استعمال کرنا جائز سمجھا ہے۔

---

① صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح

② عن حذیفة بن الیمان قال: قلت یا رسول الله هل بعد هذا الخیر شر؟ قال: فتنة وشر، قال قلت یارسول الله، هل بعد هذا الشر خیر؟ قال: یا حذیفة! تعلم کتاب الله و اتبع ما فیه، ثلاث مرار. قال قلت: یا رسول الله! هل بعد هذا الشر خیر؟ قال: هدنة علی دخن و جماعة علی اقذاء فیها او فیهم. قلت: یا رسول الله! الهدنة علی الدخن ما هی؟ قال: لاترجع قلوب اقوام علی الذی کانت علیه.

(سنن ابی داؤد، ح: ۴۲۴۶، کتاب الفتن، باب ذکر الفتن بسند حسن)

وفی صحیح البخاری: فهل بعد هذا الخیر شر؟ قال: نعم. قلت: وهل بعد ذلک الشر خیر؟ قال: نعم وفیه دخن. قلت: وما دخنه؟ قال: قوم یهدون بغیر هدیی تعرف منهم وتنکر. (ح: ۳۶۰۶، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام)

واخرجه الامام مسلم فی صحیحه (ح: ۴۸۹۰، کتاب الامارة، باب الامر بلزوم الجماعة)

③ سنن ابی داؤد، ح: ۴۲۴۶، کتاب الفتن، باب ذکر الفتن، بسند حسن.

قال الامام ابن تیمیة: " والخیر الثانی اجتماع الناس لما اصطلح الحسن ومعاویة لکن کان صلحا علیٰ دخن وجماعة علیٰ اقذاء فکان فی النفوس ما فیها اخبر رسول الله ﷺ بما هو الواقع." (منهاج السنة: ۱/۵۶۰، ۵۶۱)

معنی الخبر عندنا ان من بعد الثلاثین سنة یجوز ان یقال لهم خلفاء ایضا علی سبیل الاضطرار، وان کانوا ملوکا علی الحقیقة.

(صحیح ابن حبان: ۱۵/۳۶، ط الرسالة)

مشہور محدث، شارحِ حدیث اور ماہرِ اسماء الرجال امام ابن حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) حدیث ''الخلافة ثلاثون سنة'' اور بارہ خلفاء کی حدیث کی تشریح کے دوران فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تیس سال بعد والوں کو اضطراری طور پر خلفاء کہا جا سکتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں ملوک تھے۔''①

امام عمر النسفی رحمہ اللہ جن کا متنِ عقائد درسِ نظامی کے نصاب میں شامل ہے، لکھتے ہیں:

''میرے بعد خلافت تیس سال تک ہے، پھر بادشاہت اور امارت کا دور ہوگا۔''②

ان ائمہ کے اس قول کی ایک بڑی وجہ ماحول کا یہی فرق تھا جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے اسے ''دَخَن'' اور ''اَقذاء'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری کے بعد کا دور ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد والوں میں سے اکثر کا طرزِ حکومت بادشاہوں کے طرز پر تھا، اگرچہ وہ خلفاء کہلاتے ہیں۔''③

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ امام ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ کی سند سے (جس کے تمام رجال ثقہ یا صدوق ہیں) خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں:

''میں پہلا بادشاہ اور آخری خلیفہ ہوں۔''④

مطلب یہ تھا کہ میری حکومت میں بادشاہت سے مشابہت بھی ہے اور خلافت کے اوصاف بھی ہیں۔ اس کے بعد فقط بادشاہت رہ جائے گی۔

☆☆☆

بانی حکمران صحابہ خلیفہ راشد ہیں تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد کیوں نہیں؟

﴿سوال﴾ ایسا لگتا ہے کہ علماء حضرات کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے خدا واسطے کا بیر ہے اور چوٹی کے اکابر اہلِ سنت بھی اندر ہی اندر سے کسی حد تک شیعہ ہیں۔ ورنہ اب تک حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ راشد ہونے پر اجماع ہو چکا ہوتا۔ صحابہ کرام سارے راشد ہیں جنہیں ''الراشدون'' کا لقب قرآن مجید نے دیا ہے۔ پس جو بھی صحابی خلیفہ بنے گا، نصِ قرآنی کی رو سے اسے خلیفہ راشد ماننا چاہیے۔ پہلے چار حضرات جنہیں خلفائے راشدین کہا جاتا ہے، وہ بھی

---

① معنی الخبر عندنا ان من بعد الثلاثین سنة یجوز ان یقال لهم خلفاء ایضا علی سبیل الاضطرار، وان کانوا ملوکا علی الحقیقة. (صحیح ابن حبان: ۳۶/۱۵، ط الرسالة)

② والخلافة ثلاثون سنة ثم بعدها ملک وامارة. (متن عقائد النسفی، ص ۴)

③ واما معاویة ومن بعده فکان اکثرهم علی طریقة الملوک ولو سموا خلفاء. (فتح الباری: ۲۱۲/۱۳)

④ انا اول الملوک وآخر الخلیفة. (البدایة والنهایة: ۴۲۹/۱۱)

صحابہ ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں۔ ان میں کوئی نبی اور اُمتی جیسا فرق نہیں۔ اگر فرقِ مراتب کا مسئلہ ہے تو پہلے چار خلفاء میں سے بھی ہر بعد والا پہلے سے کم مرتبہ تھا۔ اگر دور اور ماحول کے فرق کو دیکھیں تو پہلے چاروں میں خلفاء میں سے بھی ہر ایک کے دور کی خیر و برکت بعد والے میں نہیں تھی۔ پھر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ یہ امتیاز کیوں ہے؟ کیا یہ رافضیت کے جراثیم نہیں جو اہلِ سنت میں سرایت کیے ہوئے ہیں؟

﴿جواب﴾ منصف مزاج شخص کے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ''خلافتِ راشدہ'' علمائے اہلِ سنت کی ایک قدیم اصطلاح ہے۔ ہر اصطلاح کچھ قیود رکھتی ہے۔ اہلِ سنت کے اجماع کے مطابق وہ قیود پہلے چار خلفاء کی خلافت میں پائی جاتی ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اقتدار میں نہیں پائی جاتی۔ اس پر اہلِ سنت کا اجماع ہے اور کتبِ عقائد اس کی گواہ ہیں۔ البتہ خلافتِ راشدہ کے چار خلفاء میں منحصر ہونے کے اجماعی عقیدے کو روافض، خوارج اور نواصب نہیں مانتے۔ سائل بھی اسے تسلیم نہیں کر رہا۔ اس قسم کے شبہات کے تحقیقی جوابات پیچھے گزر چکے ہیں اور ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہر صحابی راشد ہے اور لغوی لحاظ سے ہر اچھے خلیفہ کو خلیفۂ راشد کہا جا سکتا ہے۔ مگر اسے شرعی اصطلاح یا عقیدہ نہیں بنایا جا سکتا؛ کیوں کہ اصطلاح جن شرائط پر قائم ہے وہ ہر حکمران صحابی میں نہیں پائی جاتیں۔

اب ہم یہاں سائل سے بطورِ الزام یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ علمائے اہلِ سنت کی اصطلاح کو توڑ کر آپ خلافتِ راشدہ کی اصطلاح کس اصول پر قائم کرنا چاہتے ہیں؟ آیا اس اصول پر کہ ''ہر حکمران صحابی خلیفۂ راشد ہے؟'' تو پھر اس صورت میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ''خلافتِ راشدہ'' میں شامل کریں گے یا نہیں؟

اگر شامل کریں گے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تادمِ آخر جس گروہ سے لڑتے رہے، وہ یہی بنوامیہ کا گروہ تھا۔ یزید تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے دوبار جنگ کر چکا تھا، اسے آپ کیا حیثیت دیں گے؟ مروان کو کیا کہیں گے؟

یزید اور اس کے بیٹے کی موت کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے۔ رجب ۶۴ھ میں تمام صوبوں میں ان سے بیعت بھی کر لی گئی۔ اب وہ خلیفۂ راشد تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان کے مخالفین کی پوزیشن کیا مانی جائے گی؟

اور اگر کوئی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس لیے خلیفۂ راشد نہ مانے کہ ان کی خلافت پورے عالمِ اسلام پر قائم نہیں ہوئی تھی تو اس دلیل کے مطابق اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ کا بھی انکار کرنا پڑے گا جو شام پر قابض نہ ہو سکے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ راشد نہ مان کر بھلا کوئی اہلِ سنت کیسے رہ سکتا ہے؟

اور اگر کوئی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس لیے خلیفۂ راشد نہ مانے کہ وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے جانشین یزید سے لڑے (جو غیر صحابی ہونے کے باعث حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خاکِ پا بھی نہ تھا) تو یہ دلیل زیادہ شدت کے ساتھ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جائے گی جن کا محاربہ اپنے سے بدرجہا افضل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رہا۔

غرض یہ نئی اصطلاح کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسے متعارف کرانے سے امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا دفاع نہیں ہوگا بلکہ خدشہ ہے کہ ایسی کوشش کئی تباہ کن سوالات کھڑے کر دے گی۔ یہی ایک سوال کچھ کم نہیں کہ آیا چودہ صدیوں سے

اہلِ سنت ایک باطل عقیدے پر کیسے اجماع کیے رہے؟ اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ اہلِ سنت اہلِ باطل ہیں جیسا کہ سائل کو بھی ان کے رافضی ہونے کا شک ہے۔ یہ سوچ اہلِ سنت کے چودہ صد سالہ وجود کے انکار کے مترادف ہے۔

اگر کوئی اس احمقانہ سوچ میں مبتلا ہے کہ عقائد میں ایک آدھ ''اچھی'' ترمیم کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ ''اچھی'' ترمیم سوادِ اعظم سے خروج کے مترادف نہیں بلکہ اسلام کی تقویت کا باعث ہے، تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ تمام فرقے شروع میں ایک آدھ ''خوبصورت'' ترمیم لے کر اسی دعوے کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے کہ اس طرح اسلامی عقائد زیادہ محفوظ اور مضبوط ہو جائیں گے۔ مگر ہر ترمیم نے متعدد ایسے مباحث کھڑے کر دیے کہ جن کے باعث ایک نیا فرقہ وجود میں آ گیا۔ پس اس نئی بحث کا فائدہ نہ تو کسی صحابی کو ہو سکتا ہے نہ مسلمانوں کو۔ اس مسئلے کو اٹھانے والے بھی صحابہ کے دفاع کے دعوے میں مخلص نہیں لگتے؛ کیوں کہ دفاعِ صحابہ کا فریضہ تو بحمد اللہ اکابرِ اسلام صدیوں سے بخوبی انجام دیتے آ رہے ہیں۔ اس نئی اصطلاح کو متعارف کرنے پر مصر حضرات شدید تعصب میں مبتلا محسوس ہوتے ہیں۔

☆☆☆

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے متعلق شبہات

حضرت مُعاویہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کی صلح کے بارے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟

﴿سوال﴾ مروی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے مخالف تھے اور انہوں نے صلح کے موقع پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کہا تھا: ''میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مُعاویہ کی بات کی تصدیق اور حضرت علی کی بات کی تکذیب نہ کریں۔''[1] اس میں راوی عوانہ بن الحکم (م ۱۴۷ھ) ثقہ مانے جاتے ہیں، ان سے سننے والے زیاد بن عبداللہ (م ۱۸۳ھ) بھی صدوق ہیں، ان سے سماع کرنے والے عثمان بن عبدالرحمٰن بھی قابلِ قبول ہیں۔ تو کیا یہ روایت سنداً صحیح ہوگی؟ یا اس میں کوئی علت ہے؟

﴿جواب﴾ یہ روایت انقطاع کے باعث ضعیف ہے کیونکہ عوانہ بن الحکم کی عمر اگر سو سال بھی مانی جائے تو وہ ۴۱ھ میں ہونے والے اس واقعے کے بعد ہی پیدا ہوئے تھے اور واقعے کے گواہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ پھر اسی روایت کی آخری کڑی عثمان بن عبدالرحمٰن بن مسلم الخزاعی (م ۲۰۳ھ) اگرچہ نیک اور صالح تھے مگر ضعیف روایات قبول کرنے کے عادی تھے۔ اسی بناء پر وہ ''طرائفی'' (عجیب قصے سنانے والے) مشہور ہو گئے تھے۔[2] پس یہ روایت ضعیف ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اُمت کے خیر خواہ تھے۔ یہ گمان کرنا کہ وہ اُمت کو کشت وخون پر آمادہ کرنا چاہتے تھے، غلط ہے۔ ایسی روایات مبالغہ آرائی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ یا تو انہیں بالکل مسترد کیا جائے یا پھر ان کی مناسب تاویل لازم ہے مثلاً یہ کہ جس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ رائے دی، اُس وقت اہلِ شام کی حیثیت وہی تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں تھی، یعنی خلیفہ کی اطاعت ترک کرنے کے باعث ان پر ''الفئۃ الباغیۃ'' کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ابتداء میں رائے یہ بنی کہ ان پر غلبہ پانے کی کوشش کی جائے؛ کیوں کہ خلیفہ کو بغاۃ سے جنگ کا اختیار ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ثابت ہے کہ (اگر واقعی ان کی یہ رائے تھی تب بھی آخر کار) انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کر لیا تھا۔ روایات شاہد ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کے تابع دار رہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان پر مہربان تھے۔ انہیں ہدیے پیش کرتے تھے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما ان کے ہدیے قبول کرتے تھے۔[3]

ایک بار حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ کوفہ کو مرکز بنا کر ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔

---

[1] تاریخ الطبری: ۵/۱۶۰

[2] الکامل فی ضعفاء الرجال: ۲/۲۹۵ [3] تاریخ دمشق: ۵۹/۱۹۳

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جواب تھا: ''ہم بیعت کر چکے ہیں، معاہدہ ہو چکا ہے۔ اسے توڑنے کی کوئی گنجائش نہیں۔''[1]

☆☆☆

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مال کی شرط کیوں لگائی؟

﴿سوال﴾ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح میں مال کی شرط کیوں رکھی تھی؟ کیا انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو نظر انداز کر دیا تھا ''اللہ اس شخص سے قیامت کے دن بات بھی نہ کریں گے جو کسی حاکم سے بیعت صرف دنیا کی خاطر کرے، اگر دنیا مل جائے تو وفاداری کرے، نہ ملے تو غداری کرے۔''[2]

﴿جواب﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی دنیا سے بے رغبت اور آخرت کے طلب گار تھے۔ انہوں نے مال و دولت کا مطالبہ دنیاوی غرض سے نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ شرط صرف اس لیے لگائی تھی کہ وہ بنو ہاشم تھے جن کی سخاوت مشہور تھی۔ پھر کئی برس سے وہ حکمران خانوادے کے ممتاز فرد تھے۔ لوگ اپنی ضرورتیں لے کر ان کے پاس آتے ہی رہتے تھے۔ ان کی روحانی سیادت اور عقیدت مندوں کا حلقہ اسی طرح برقرار تھے۔ ایسے میں انہیں ہر وقت لوگوں پر خرچ کرنا پڑتا تھا جس کے لیے خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ صلح کا مخالف گروہ بھی ان کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ اسے مطمئن رکھنے کے لیے بھی انعام و اکرام کا سلسلہ جاری رکھنا ضروری تھا۔ امت کی اسی مصلحت کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے گراں قدر وظائف جاری کروانا چاہتے تھے۔[3]

☆☆☆

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے وعدہ پورا نہیں کیا؟

﴿سوال﴾ مروی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کی شرائط کو پورا نہیں کیا تھا۔ طبری کی روایت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو سادہ کاغذ پر مہر لگا کر بھیج دیا کہ جو چاہیں شرائط لکھ دیں۔ اُدھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ پہلے ہی کچھ شرائط لکھ کر بھیج چکے تھے۔ جب انہیں سادہ کاغذ ملا تو اس پر مزید شرائط تحریر کر دیں مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کی بجائے کاغذ اپنے پاس ہی رکھا اور بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات پر ان مزید شرائط کا مطالبہ کیا مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان شرائط کو پورا نہیں کیا۔[4] کیا یہ درست ہے؟

﴿ج﴾ اگر اس روایت کو مان لیا جائے تب بھی اصولاً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں آتا، کیونکہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پہلی لکھی ہوئی شرائط پر دستخط کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ معاہدہ بار بار تبدیل نہیں ہوتا۔ پس جب انہوں نے پہلے رقعے کی شرائط کو مان لیا تو وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسی کے پابند تھے۔

---

① الاخبار الطوال: ص ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، سند ضعیف ہے نکارت اور طعن صحابہ سے مخلوط ہونے کے باعث ناقابل قبول ہے۔

② ورجل بایع اماماً لا یبایعه الا لدنیاه ان اعطاه مایرید وفا له والا لم یف له. (صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۲، کتاب الاحکام من بایع رجلا)

③ تاریخ الطبری: ۵/۱۵۹، ۱۶۰ ؛ صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح؛ مصنف ابن ابی شیبہ ح: ۳۸۰۸، رجالہ کلھم ثقات

④ تاریخ الطبری: ۵/۱۶۳



یہ بھی ملحوظ رہے کہ مذکورہ روایت اسناداً کمزور ہے کیوں کہ اس کے ایک راوی یونس بن یزید ایلی ہیں جو ابن شہاب زہری سے ایسی باتیں نقل کرنے میں مشہور ہیں جو کوئی اور نقل نہیں کرتا۔ نیز زہری یہ نہیں بتاتے کہ انہوں نے کس سے یہ بات نقل کی ہے۔ وہ خود اس واقعے کے سترہ سال بعد ۵۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا روایت خود ضعیف ہو جاتی ہے۔

اب دیگر روایات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے صلح پچاس لاکھ ادا کرنے کی شرط پر ہوئی تھی۔ [1] اور صحیح روایت کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے **خمس مائۃ الف الف درھم** (پچاس کروڑ درہم) رقم ادا کر دی۔ [2] اس کے باوجود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو صلح نامے کی خلاف ورزی کا مرتکب کیسے کہا جا سکتا ہے؟

مشہور شیعہ مؤرخ ابوحنیفہ دینوری ہی کی بات مان لیں جو لکھتے ہیں:

"حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی میں حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو ان کی طرف سے اپنے حق میں کوئی بری بات دیکھنے کی زحمت نہ ہوئی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے جو عہد کیے تھے ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ کبھی نہ بدلا۔" [3]

غرض حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر صلح نامے کو پورا نہ کرنے کا الزام ضعیف روایات میں ہے اور بالکل غلط ہے۔

☆☆☆

کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ طلاقوں پر طلاقیں دیتے تھے؟

﴿سوال﴾ کیا یہ تاریخی روایات درست ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نکاح پر نکاح کرتے اور بکثرت طلاقیں دیا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کا لقب "مِطلاق" یعنی کثرت سے طلاقیں دینے والا پڑ گیا۔ [4]

﴿جواب﴾ یہ روایات مشکوک ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کے باعث شر پسندوں کو سخت مایوسی ہوئی تھی، لہٰذا انہوں نے اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے ایک طرف تو آپ رضی اللہ عنہ کو مُذِلّ العرب (عربوں کو ذلیل کرنے والا) جیسے طعنے دیے۔ [5] دوسری طرف آپ کے متعلق ایسی روایات پھیلا دیں کہ آپ نے ساری عمر بس نکاح پر نکاح کرنے اور طلاقیں دینے میں گزاری تھی اور صلح بھی محض عیش و آرام کے لیے کی تھی۔

یہ تمام روایات نہایت ضعیف بلکہ اکثر منقطع یا بے سند ہیں۔ متصل یعنی مکمل سند والی روایات صرف دو ہیں: ایک بلاذری کی۔ دوسری ابن عساکر کی۔ باقی سب منقطع ہیں جن میں درمیانی واسطوں کا پتا لگانا ممکن نہیں۔

بلاذری کی روایت کے مطابق...... عباس بن ہشام کلبی نے ہشام کلبی سے اور اس نے اپنے باپ محمد بن سائب

---

① تاریخ الطبری: ۱۶۰،۱۵۹/۵ ② مستدرک حاکم، ح: ۴۸۰۸

اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ طبری کی روایت میں یہ واضح نہیں کہ پچاس لاکھ دینار طے ہوئے تھے یا درہم۔ اگر درہم طے ہوئے تھے تو مطلب ہوگا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے سو گنا زیادہ رقم ادا کی۔ اگر دینار طے ہوئے تھے تو مطلب ہوگا کہ دینار کی جگہ اس کی مالیت کے بقدر دراہم ادا کر دیے۔ بہر صورت طے شدہ رقم ادا کر دی گئی تھی۔

③ الاخبار الطوال، ص ۲۲۵ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۹۸،۱۹۷/۱۱ ⑤ تاریخ الطبری: ۱۶۵/۵

کلبی سے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ۹۰ نکاح کیے تھے۔وہ نکاح کرتے اور طلاق دیتے، یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا کہ بہت سے قبائل سے ہماری دشمنیاں پڑ جائیں گی۔ [1]

اس روایت کا پورا سلسلہ ہی شیعی مؤرخین کا ہے۔اس کا ضعف بلکہ من گھڑت ہونا ظاہر ہے۔

بلاذری کے بعد کسی مؤرخ نے پانچ صدیوں تک اس بارے میں کوئی روایت پیش نہیں کی۔

پانچ صدیوں بعد ابن عساکر نے تاریخ دِمشق میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بکثرت نکاح کرنے اور بکثرت طلاقیں دینے سے متعلق متعدد روایات جمع کر دیں [2] مگر سب محمد بن عمر واقدی سے مروی ہیں اور سب کی سند منقطع ہے۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بعض مؤرخین نے سند حذف کر کے انہی روایات کو براہِ راست واقدی کے شاگرد محمد بن سعد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔مگر عجیب بات یہ ہے کہ محمد بن سعد کی ''الطبقات الکبریٰ'' ان روایات سے خالی ہے۔اس کی بجائے یہ روایات کئی صدیوں بعد تہذیب الکمال، سیر اعلام النبلاء اور البدایہ والنہایہ میں ملتی ہیں اور وہ بھی منقطع اسناد کے ساتھ۔ان روایات پر ایک نگاہ ڈالیے۔''تاریخ دِمشق'' میں ہے:

❶ **كان الحسن احصن تسعين امرأة.**

''حسن رضی اللہ عنہ نے نوے (۹۰) عورتوں سے نکاح کیا تھا'' [3]

اس کے راوی ابن جعدبہ یعنی یزید بن عیاض کو کاذب اور متروک قرار دیا گیا ہے۔ [4]

روایت میں نکاح کی جگہ ''اَحصَنَ'' کا لفظ بھی قابل توجہ ہے، شاید مفہوم میں نکاح کے علاوہ متعہ کو بھی شامل کرنے کے لیے یہ لفظ لایا گیا ہے۔

یہی روایت ''سیر اعلام النبلاء'' میں مدائنی سے بسند منقطع مذکور ہے۔ [5] اصل روایت ابن جعدبہ ہی کی ہے۔

❷ **قال عليّ: يا اهل الكوفة! لا تزوجوا لحسن بن علي فانه رجل مطلاق.**

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوفہ والو! حسن سے (اپنی بیٹیوں کا) نکاح مت کراؤ، وہ بکثرت طلاق دینے والا ہے۔'' [6]

حافظ ذہبیؒ نے اسے دو جگہ نقل کیا ہے۔ایک جگہ اسے جعفر بن محمد کی سند سے نقل کیا ہے مگر یہ سند منقطع ہے۔ [7]

---

① انساب الاشراف: ۲۵/۳ ط دار الفكر
② تاريخ دِمشق: ۲۲۹/۱۳
③ تاريخ دِمشق: ۲۲۸/۱۳، ۲۲۹ عن المدائني عن ابن جعدبه
④ تقريب التهذيب، تر: ۷۷۶۱
⑤ سير اعلام النبلاء: ۲۶۷/۳، ط الرسالة
⑥ تاريخ دِمشق: ۲۴۹/۱۳ عن محمد بن عمر والدى
⑦ سير اعلام النبلاء: ۲۹۲/۳، ط الرسالة

دوسری جگہ اسے واقدی سے نقل کیا ہے۔[1] واقدی کا ضعف ظاہر ہے۔

❸ "كان حسن بن علي مطلاقا للنساء."

''حسن بن علی بکثرت عورتوں کو طلاق دینے والے تھے۔''[2]

مذکورہ روایت انہی الفاظ میں ''تہذیب الکمال'' میں مذکور ہے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ان روایات کو واقدی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔[4]

غرض کلبی خانوادے جیسے متعصب رافضیوں، ابن جعدبہ جیسے کذاب اور واقدی جیسے ضعیف راویوں کو دیکھ لینے کے بعد اس قسم کی روایات کو کسی تاریخی حقیقت کا درجہ دینے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔

ضعیف اور من گھڑت روایات میں حسن رضی اللہ عنہ کے نکاحوں کے بارے میں ایک قول ستر کا، دوسرا دو سو پچاس کا اور تیسرا تین سو کا بھی ہے۔ پہلا قول ''نہج البلاغۃ'' کے شارح ابن ابی الحدید (م ۶۵۵ھ) سے منقول ہے۔ غالی شیعہ اور معتزلی ہونے کی وجہ سے ان کے بیان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔[5]

دوسرا اور تیسرا قول ابوطالب مکی نے ''قوت القلوب'' نامی تصوف کی کتاب میں ذکر کیا ہے جس کا کوئی معتبر حوالہ نہیں دیا گیا۔ اس میں یہاں تک لکھا گیا ہے کہ وہ ایک ساتھ کبھی چار، چار نکاح کرتے اور چار چار کو یکدم طلاقیں دیتے، حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا کہ حسن کو رشتے مت دیا کرو۔ وہ بکثرت طلاقیں دینے والا ہے۔[6]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام روایات نہایت ہی ضعیف بلکہ اکثر منقطع یا بے سند ہیں، اگر سند ہے تو ان میں ہشام کلبی، ابن جعدبہ اور واقدی جیسے راوی ہیں جو رجال کی کتب میں حد درجے ضعیف مانے گئے ہیں۔

بلکہ غور کیا جائے تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی کہ یہ روایات ''متعہ'' کو اماموں کی سنت ثابت کرنے کے لیے مشہور کی گئی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ابغض الحلال الی اللّٰہ'' (اللہ کے نزدیک حلال کاموں میں سب سے نفرت انگیز کام) شمار کیا ہے۔[7]

طلاق محض ایک ضرورت کے تحت جائز کی گئی ہے۔ مگر طلاق کا نشانہ بننے والی عورتوں سے پوچھیے کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔ دلوں سے کیسی بددعائیں نکلتی ہیں۔ ایسا غیر شریفانہ کام، حضرت حسن رضی اللہ عنہ جیسے شریف آدمی مسلسل کیسے کر سکتے تھے؟ کیا ان کے نزدیک عورتوں کی حیثیت کھلونے جیسی تھی جو بار بار بدلے جاتے ہوں۔

کہا جاتا ہے لوگ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خود اتنے رشتے دیتے تھے تاکہ انہیں سادات سے تعلق پر فخر کا موقع ملے۔ لیکن اگر اُس معاشرے میں محبت کا اظہار اسی طرح ہوتا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پہلے ان کے والد گرامی رضی اللہ عنہ زیادہ

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/۲۶۷، ط الرسالة

② تاریخ دمشق: ۱۳/۲۵۱ عن الواقدی

③ تهذیب الکمال: ۶/۲۳۷ عن محمد بن سعد عن الواقدی بسند منقطع

④ البدایة والنهایة: ۱۱/۱۹۷، ۱۹۸

⑤ البدایة والنهایة: ۱۷/۳۵۲

⑥ قوت القلوب: ۲/۳۰۹، ط العلمیة

⑦ سنن ابی داؤد، ح: ۲۱۸۰، کتاب الطلاق، باب فی کراهیة الطلاق

حق دار تھے کہ لوگ ان سے نسبت کے لیے انہیں اَن گنت رشتے دیتے۔

اگر بالفرض نسبت وعزت کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اتنے رشتے دیے گئے تھے تو پھران خواتین اوران کے قبائل کے نام تاریخ میں مشہور کیوں نہیں؟ یہ خواتین امت کی نہایت محترم، نامور اور معزز شخصیات شمار ہونی چاہییں تھیں، اس اعزاز کی وجہ سے ان میں سے چالیس پچاس کے نام ونسب تو محفوظ ہوتے مگر تاریخ وحدیث وانساب کے تمام ذخائر کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا مختلف اوقات میں صرف چھ خواتین سے نکاح ثابت ہے:

❶ عائشہ خثعمیہ ❷ بنت الاشعث ❸ ام اسحٰق بنت طلحہ ❹ ام کلثوم بنت فضل بن عباس ❺ ہند بن سہیل ❻ خولہ بنت منظور۔ ان چھ کے سوا ان کی کسی اور زوجہ کا نام تک نہیں ملتا۔[1]

اگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اتنے نکاح کیے ہوتے تو ان کی اولاد زیادہ نہ سہی، بیویوں کی تعداد سے نصف تو ہوتی۔ مگر ان کے صرف دس بچے تھے جو انہی مذکورہ چھ ازواج سے تھے۔

☆☆☆

کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے قتل میں امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کا ہاتھ تھا؟

﴿سوال﴾ کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ان کی اہلیہ جعدہ بنت الاشعث نے زہر دے کر قتل کیا تھا۔ اور کیا ایسا امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید کے کہنے پر کیا گیا تھا؟

﴿جواب﴾ یہ کہانی اتنی کمزور ہے ابومخنف، واقدی اور اس دور کے کسی شیعہ مؤرخ نے بھی اسے نقل نہیں کیا۔ طبری سمیت اس دور کی تمام تواریخ اس الزام سے خالی ہی رہیں۔ واقدی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زہر خورانی سے وفات کا واقعہ ضرور نقل کیا ہے مگر کسی پر اس کا الزام عائد نہیں کیا۔ اس طرح اس دور کے اکثر راویوں نے زہر سے وفات کا واقعہ تو نقل کیا ہے مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید پر کوئی الزام نہیں لگایا۔[2] ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر اگلی بات سمجھیے:

① حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے کا الزام سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں شیعہ مؤرخ مسعودی (م ۳۴۶ھ) نے ''مُرُوجُ الذہب'' میں نقل کیا۔ اس روایت کی کوئی سند بیان نہیں کی۔[3]

② تقریباً اسی زمانے میں ابوالفرج اصبہانی (م ۳۵۶ھ) نے ''مقاتل الطالبیین'' میں یہ قصہ نقل کیا ہے، انہوں نے بھی یہ روایت بلاسند بیان کی ہے۔[4]

---

① تاریخ دِمَشق: ۲۵۱/۱۳ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۰۸/۱۱ ؛ المحبر: ۴۴۲/۱، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۲۲

② البدایۃ والنہایۃ: ۴۳/۸ ؛ تاریخ دِمَشق: ۲۸۴/۱۳ ؛ تہذیب التہذیب: ۳۰۱/۲ ؛ تہذیب الکمال: ۲۵۳/۲

③ مُرُوجُ الذہب: ۱۸۲/۳، ط الجامعۃ اللبنانیۃ

④ مقاتل الطالبین، ص ۶۰، ط دار المعرفۃ البتہ اس سے پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زبان میں لکنت کا ذکر کیا ہے اور اس کی جو سند بیان کی ہے، اس میں مفضل بن صالح ضعیف ہیں۔ (تقریب التہذیب، نمبر: ۶۸۵۴)
اگر زہر خورانی کا واقعہ بھی انہی سے نقل کیا ہو تب بھی سند ضعیف ہی ہوگی، ورنہ روایت بلاسند شمار ہوگی۔ دونوں صورتوں میں اس کا وزن کچھ بھی نہیں ہے۔ اصبہانی خود بھی شیعہ تھے۔ (الاعلام، زرکلی: ۲۷۸/۴) اس لیے ان کی روایت اس مسئلے میں قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔

③ اسی دور میں المطہر بن طاہر (۳۵۵ھ) نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر الزام عائد کیا ہے اور سند نقل نہیں کی۔[1]

④ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے سند کے ساتھ اسے نقل کیا ہے مگر اس میں زہر دلانے کا الزام صرف یزید پر لگایا ہے، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر نہیں۔[2]

یہ واحد سند جو علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ سے ہمیں ملتی ہے، شدید ضعیف ہے۔ اس میں محمد بن سلام جمحی (۱۵۰ھ۔ ۲۳۲ھ) فرقہ قدریہ کا شاعر ہے، بعض نے اسے صدوق کہا ہے تاہم ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے شعر نقل کرلیا جائے مگر حدیث نہیں۔[3] اسی سند میں ابوعبداللہ یمانی مجہول ہیں۔ ابوعبداللہ یمانی دو ہیں: ایک وہب بن منبہ جو ۱۰۰ ہجری میں فوت ہوگئے تھے۔ دوسرے ابوعبداللہ یمانی المثنیٰ جن کی وفات ۱۴۹ھ کی ہے۔ سند میں ابوعبداللہ یمانی، محمد بن سلام سے روایت لے رہے ہیں جن کی ولادت ۱۵۰ھ کی ہے۔ یہ دونوں راوی اپنی وفات کے بعد کیسے روایت لے سکتے تھے؟ پس یہ ابوعبداللہ یمانی تیسری صدی کے کوئی مجہول راوی ہیں جن کا ذکر اسماء الرجال میں نہیں۔

یہ کہانی سنانے والے اصل راوی ابن جَعْدَہ بھی مجہول الحال ہیں۔ کیا یہاں جَعْدَہ بنت الاشعَث کا کوئی بیٹا مراد ہے؟ وہ ضعیف ہے یا ثقہ؟ اور کیا کوئی اپنی ماں کے متعلق ایسی بات مشتہر کرسکتا ہے؟ اس طبقے کے ایک راوی یحییٰ بن جَعْدَہ ہیں مگر ان کے تلامذہ میں محمد بن سلام کا کہیں ذکر نہیں۔ اس لیے یہ واحد سند بھی بوجوہ مشکوک اور ضعیف ہے۔

⑤ ان حضرات کے بعد ساتویں صدی ہجری کے حکیم بن ابی اصیبعہ (م ۶۶۸ھ) نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر یہی الزام نقل کیا ہے۔[4] انہوں نے حوالہ طبری کا دیا ہے، جبکہ طبری میں یہ بات موجود نہیں۔

⑥ ساتویں صدی ہجری کے ابوالفداء نے ایک قول کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اور ایک قول کے مطابق یزید کو مجرم قرار دیا ہے۔[5]

⑥ امام سیوطی رحمہ اللہ نے بھی یہ الزام یزید کی طرف منسوب کیا ہے۔[6]

بہرحال یہ سب چوتھی، پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے لوگ ہیں۔ پہلے یہ روایت کہاں تھی؟ معلوم ہوا کہ یا تو اسے بعد میں گھڑا گیا ہے، یا یہ اتنی کمزور تھی کہ کسی مؤرخ نے چار صدیوں تک اسے قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔

اسی لیے علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''یہ جو منقول ہے کہ حضرت مُعاویہ رحمہ اللہ نے انہیں ان کی اہلیہ جَعْدَہ بنت الاشعَث کے ذریعے زہر دلوایا تھا، یہ شیعوں کی روایات ہیں۔ حضرت مُعاویہ رحمہ اللہ اس سے بہت بلند تھے۔''[7]

① البدء والتاریخ للمطهر بن الطاهر المقدسی: ۵/۶، ط مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، مصر
② المنتظم لابن جوزی: ۵/۲۲۶، اسی روایت کو علامہ ابن اثیر نے ''اسد الغابہ'' اور ''الکامل فی التاریخ'' میں مختصراً نقل کیا ہے۔
③ میزان الاعتدال: ۳/۵۶۷، ۵۶۸؛ الاعلام للزرکلی: ۶/۱۴۶
④ عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ۱/۱۷۴، ط مکتبۃ الحیاۃ
⑤ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۸۳ ⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۱۴۷، ط نزار
⑦ ومایـنقل من ان معاویۃ دس الیهم السم مع زوجه جَعْدَه بنت الاشعث فهو من احادیث الشیعۃ حاشا لمعاویۃ من ذلک. (تاریخ ابن خلدون: ۲/۶۴۹)

عقلی لحاظ سے غور کریں تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے قتل میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ مدینہ میں یکسوئی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان سے نہ ہی خروج کا خطرہ تھا نہ کسی اور سازش کا۔ انہیں قتل کرا کے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھلا اپنے مخالفین کو اشتعال انگیزی کا موقع کیوں دیتے۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ بات ڈھکی چھپی نہ تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بہت سے نادان لوگوں کو بغاوت سے روکے ہوئے ہیں۔ انہیں قتل کرانے سے تو حکومت ہی کو سراسر نقصان ہوتا۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو کیا، کوئی بھی سمجھ دار حکمران ایسی کارروائی کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی ساداتِ بنی ہاشم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آتے جاتے رہے اوران سے عطیات لیتے رہے۔ [1]

اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مجرم ہوتے تو بنو ہاشم ان سے اچھے تعلقات کیوں رکھتے؟

یہ تمام حقائق بتاتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے میں خاندان بنوامیہ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

☆☆☆

کیا قتل میں جَعْدَہ بنت الاشعث ملوث تھیں؟

﴿سوال﴾ چلیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید اس جرم میں ملوث نہ تھے مگر کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اہلیہ جَعْدَہ بنت الاشعث واقعی اس جرم کی مرتکب تھیں؟

﴿جواب﴾ حقیقت یہ ہے کہ روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ الزام جَعْدَہ بنت الاشعث پر بھی عائد نہیں کیا جا سکتا۔ جن روایات میں یہ الزام جَعْدَہ پر لگایا گیا ہے وہ بے سند ہیں یا سنداً نہایت کمزور ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

① بعض مؤرخین نے اس الزام پر مشتمل روایات کو محمد بن سعد اور واقدی کے حوالے سے نقل کیا ہے مگر یہ روایات خود واقدی کی کتب اور محمد بن سعد کی طبقات ابن سعد میں موجود نہیں۔ اس طرح ان دونوں مؤرخین کی طرف ان روایات کی نسبت مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہ نسبت اگر درست ہو تب بھی واقدی کا ضعف اور تعصب کس سے مخفی ہے!!

② سب سے پہلے یہ الزام چوتھی صدی ہجری میں مسعودی شیعی نے ایک بے سند روایت پیش کر کے لگایا ہے۔ [2]

③ پھر اسی صدی کے دوسرے شیعہ مؤرخ ابوالفرج اصبہانی نے یہی الزام دہرا دیا۔ یہ روایت بھی بلا سند ہے۔ [3]

④ اسی صدی ہجری کی ''البدء والتاریخ'' میں بھی بلا سند ہے۔ [4]

⑤ پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے یہ روایت قتادہ اور ابوبکر بن حفص کی منقطع سند سے نقل کی ہے جو بالترتیب دوسری اور تیسری صدی ہجری کی شخصیات ہیں۔ منقطع سند کا ضعف ظاہر ہے۔ [5]

⑥ اگلی صدی میں ابن جوزی رحمہ اللہ نے یہ روایت محمد بن سُلاَّم جیسے قدری اور چند مجہول راویوں سے لی ہے۔ [6]

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۷۷/۱۱ ② مروج الذھب: ۱۸۲/۳، ط اللبنانیۃ ③ مقاتل الطالبین، ص ۲۰

④ البدء والتاریخ للمطہر بن طاہر ۵/۶ ⑤ الاستیعاب: ۳۸۹/۱ ⑥ المنتظم لابن جوزی: ۲۲۶/۵

⑦ساتویں صدی ہجری میں ابن اثیر نے ''اسد الغابہ'' اور ''الکامل'' میں یہی روایت بلا سند نقل کی ہے۔[1]

⑧عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں یہ روایت طبری کے حوالے سے ہے مگر طبری میں یہ روایت موجود نہیں۔[2]

⑨ساتویں صدی ہجری کی ''المختصر فی اخبار البشر'' میں بھی یہ روایت بلا سند ہے۔[3]

⑩آٹھویں صدی ہجری کی ''البدایہ والنہایہ'' میں یہ روایت بالا سناد ہے۔[4] سند یوں بیان کی گئی ہے: محمد بن سعد، یحییٰ بن جمال، ابوعوانہ، مُغیرَہ، ام موسیٰ۔ اس میں یحییٰ بن جمال مجہول ہیں۔ پھر سند میں بہت بڑا انقطاع ہے۔

⑪اسی سند سے سیر اعلام النبلاء، میں نقل کی گئی ہے۔[5]

⑫حافظ مِزّی (م: ۷۴۲ھ) نے اسے یحییٰ بن حماد، ابوعوانہ، مُغیرَہ، ام موسیٰ کی سند سے نقل کیا ہے۔[6] یحییٰ بن حماد کی وفات ۲۱۵ ہجری کی ہے۔[7] مؤلف اور ان کے درمیان پانچ صدیوں کا انقطاع ہے۔ پھر اسی روایت کو محمد بن سلام کے حوالے سے نقل کیا ہے[8] جن کی وفات سن ۲۳۲ ہجری میں ہے۔[9] یہاں بھی انقطاع ہے۔

⑬نویں صدی ہجری کی تاریخ الخلفاء میں یہی روایت بلا سند ہے۔[10]

⑭نویں صدی ہجری میں حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) نے اسے ابومُعاویہ، مُغیرَہ، ام موسیٰ کی سند سے نقل کیا ہے۔[11] ابومُعاویہ کئی ہیں جو دوسری تیسری صدی ہجری کے ہیں ان کے اور علامہ ابن حجر کے مابین چھ سات صدیوں کا انقطاع ہے۔

خلاصہ یہ کہ جَعدَہ بنت الاشعَث پر اس الزام کی روایات یا بلا سند ہیں یا منقطع اور ضعیف۔ کوئی ایک سند بھی علل سے خالی نہیں۔ اس طرح سند اور اصولِ روایت کے لحاظ سے یہ الزام نہایت کمزور پڑ جاتا ہے۔

اب درایت کے اصول کے تحت سوچیے کہ:

❶ جَعدَہ ایک صحابی حضرت اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ یہ بزرگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے سالار تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ بندی میں ان کا بہت اہم کردار تھا۔ اسی لیے یہ سبائیہ وخوارج کی نگاہوں میں خار بن کر کھٹکتے تھے۔ ان گروہوں کی عادت تھی کہ اپنے مخالفین کی کردار کشی کے لیے جعلی روایتیں پھیلاتے تھے اور ان کی ماؤں، بیٹوں اور بیٹیوں تک کو نہیں بخشتے تھے۔

---

① اسد الغابہ: ۱۳/۲، الکامل فی التاریخ: ۵۸/۳

② عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ۱۷۴/۱، ط مکتبۃ الحیاۃ، یہ بھی ساتویں صدی ہجری کی تالیف ہے۔

③ المختصر فی اخبار البشر: ۱۸۳/۱

④ البدایۃ والنہایۃ: ۴۳/۸

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۴/۳، ط الرسالۃ

⑥ تہذیب الکمال: ۲۵۲/۶

⑦ تقریب التہذیب، نمبر: ۷۵۳۵

⑧ تہذیب الکمال: ۲۵۳/۶

⑨ تاریخ الاسلام للذہبی تدمری، ۳۲۳/۱۷، بشار: ۹۱۷/۵

⑩ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۱۴۷

⑪ تہذیب التہذیب: ۳۰۰/۲، ط نظامیہ دکن

پس عین ممکن ہے حضرت اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت جَعدَہ کو بھی اس لیے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس ناپاک جسارت میں یہ بھی بھلا دیا گیا کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عزت وناموس ہیں۔

خاتونِ خانہ کی نیک نامی پورے خاندان کی عزت اور اس پر طعنہ زنی پوری برادری کی بدنامی کا باعث ہوتی ہے۔ ہر شخص دیکھ بھال کر ایسی بیوی ڈھونڈتا ہے جو خدمت گار اور قابلِ اعتماد ہو۔ سوچیے کہ کیا ہم اور آپ کسی بدذات، کم ظرف اور فریبی عورت کو بیوی بنا کر گھر میں رکھنا پسند کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو سوچئے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ جیسی عالی مرتبت شخصیت نے کسی پست طبیعت، لالچی اور مکار خاتون کو شریک حیات بنا کے زندگی بسر کی ہوگی۔ اگر جَعدَہ کوئی سازشی اور کم ظرف عورت تھی تو اس کے اخلاق کا چند ماہ میں پتا چل ہی جاتا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اسے طلاق دے سکتے تھے۔ یا زہر کا اثر ظاہر ہونے کے بعد تو آپ بتا ہی سکتے تھے کہ یہ عورت دھوکہ باز ہے تاکہ باقی خاندان اس کے شر سے بچا رہتا۔ مگر اسے آخر تک نکاح میں رکھنا اور اس کے خلاف کچھ نہ کہنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اپنی زوجۂ محترمہ پر اعتماد کا ثبوت ہے۔

❷ یہ بھی غور فرمائیے کہ آخر حضرت اَشعَث بن قیس رضی اللہ عنہ جیسے نامور صحابی کی بیٹی ایسی گری ہوئی حرکت کیوں کرے گی؟ عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کو قتل کر کے اپنی جان کا خطرہ اور بدنامی کیوں مول لے گی؟

اس زمانے میں عدلیہ اور قضا کے عہدوں پر بڑے بڑے صحابہ اور تابعین فائز تھے، عدلیہ آزاد تھی۔ ایسے میں جَعدَہ کے پاس کیا ضمانت تھی کہ سادات اس کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کریں گے اور قاضی حضرات مقدمہ قتل کی تفتیش کر کے قصاص نہ لیں گے۔ غور کریں تو یہی سوال جَعدَہ بنت الاشعَث سے الزام کی نفی کر دیتا ہے۔

ان جعلی روایات میں کہا گیا ہے کہ جَعدَہ نے یزید سے شادی کے لالچ میں یہ حرکت کی تھی جس کے لیے اسے یزید یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یا دونوں نے آمادہ کیا تھا۔ اس روایت کو مان کر کہا جا سکتا ہے کہ جَعدَہ کو جان کے تحفظ کی ضمانت انہوں نے دی ہوگی۔

مگر اس پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ صرف جان کے تحفظ کی ضمانت اتنے خطرناک اقدام پر کسی کو آمادہ نہیں کر سکتی جب تک کوئی بہت بڑا لالچ نہ ہو۔ اگر یہ لالچ یزید کا رشتہ تھا تو جَعدَہ کو اس نکاح میں بھلا کیوں دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ان کے شوہر حضرت حسن رضی اللہ عنہ تو عرب وعجم کے سردار تھے۔ جَعدَہ کو اس سے بلند تر مرتبہ اور کیا مل سکتا تھا جو وہ یزید کی زوجیت میں جانے کے خواب دیکھتیں۔

❸ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود بنو ہاشم حضرت جَعدَہ کو اس الزام سے بری اور پاکباز ونیک سیرت مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عباس نے جَعدَہ سے نکاح کر لیا تھا۔[1]

① طبقات ابن سعد: ۳۱۵/۵، ط صادر

اگر وہ اس حرکت میں ملوث ہوتیں تو بنو ہاشم ان سے رشتہ کرنا پسند نہ کرتے بلکہ ان کے خلاف مقدمہ چلوا کے سزا دلواتے یا کم از کم بنوامیہ سے احتجاج ضرور کرتے مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت سادات میں سے کسی نے کبھی بنوامیہ پر یہ الزام لگایا نہ بعد ازیں۔

☆☆☆

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قاتل کون تھا؟

چونکہ اس مسئلے میں کوئی روایت صحیح نہیں بلکہ اکثر روایات بالکل بے سند ہیں، اس لیے قیاساً یہ عقدہ حل کرنے کی گنجائش ہے کہ یہ کس کی کارستانی تھی؟ اگر تفتیشی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو ایسے واقعات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ:

❶ مقتول کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ کسے ہوا؟ ❷ تفتیش کو غلط رخ کون دے رہا ہے؟

آیے! پہلے سوال پر غور کریں۔

سب جانتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے آس پاس شیعانِ مخلصین اور بدنیت شیعہ دونوں قسم کے لوگ آخر تک رہے۔ شیعانِ مخلصین آپ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح پر مطمئن تھے۔ جبکہ بدنیت قسم کے ساتھی اس پر چیں بجبیں تھے اور جلد از جلد باغیانہ تحریک شروع کر کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ممانعت کی وجہ سے وہ ان کی زندگی میں یہ تحریک شروع نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ بھی لوگ اٹھا سکتے تھے۔ تو عین ممکن ہے انہی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کھانے میں زہر ملا دیا ہو۔ تاکہ ان کے بعد باغیانہ تحریک شروع کی جا سکے۔ اس امکان کو مزید دو باتوں سے تقویت ملتی ہے:

① ایک یہ کہ ان لوگوں نے پہلے بھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جب وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر رہے تھے۔[1]

نیز جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کا اعلان کیا تو اس سرکش گروہ نے آپ کے خیمے پر حملہ کر کے مال و متاع لوٹ لیا، یہاں تک کہ آپ کے قدموں کے نیچے سے قالین تک گھسیٹ کر لے گئے۔[2]

بالکل قرینِ قیاس ہے کہ انہی لوگوں نے جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے آس پاس تھے، ایک بار پھر انہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہو اور اس بار کامیاب ہو گئے ہوں۔

② حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کے حالات پر غور کریں تو مسئلہ مزید واضح ہو جائے گا کہ اصل قاتل کون لوگ تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو عراق میں باغیانہ تحریک تیزی سے شروع ہو گئی۔ اسی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر زیاد کو کچھ سختی کرنی پڑی۔ اور اسی سلسلے میں باغیوں کے ساتھ حضرت عَمرو بن حَمِق رضی اللہ عنہ اور حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ جیسے بعض مخلص بزرگوں کی قیمتی جانیں بھی ضائع ہوئیں جو غلط فہمی کی وجہ سے اس

---

① تاریخ الطبری: ۱۶۲/۵ عن زهری، المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۳/۳ ② تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵ عن اسماعیل بن راشد

تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

پس اصل قاتل غالباً یہی سبائی لوگ تھے۔ انہی لوگوں نے غلط روایات پھیلا کر تفتیش کو غلط رخ دیا۔ اصل مجرموں کو چھپا کر بے قصور افراد کو قاتل مشہور کر دیا۔ ''چور مچائے شور'' کی کہاوت ایسے ہی مواقع پر بولی جاتی ہے۔

☆☆☆

کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوش ہوئے؟

﴿سوال﴾ مروی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سے خوش ہوئے تھے؟ ان کی خوشی دیکھ کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا: خوش مت ہوں۔ آپ بھی ان کے بعد زیادہ نہیں جئیں گے۔[1] اسی طرح مسعودی نے ایک روایت پیش کی ہے کہ جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر ملی تو ان کی مجلس مسرت کے باعث تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھی۔[2] کیا یہ سچ ہے؟

﴿جواب﴾ پہلی روایت ابوحنیفہ دینوری شیعی نے نقل کی ہے اور وہ بھی بلا سند۔ لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

دُوسری روایت کا جھوٹا ہونا اس طرح ظاہر ہے کہ مسعودی اسے ابن جَرِیر طبری کے حوالے سے نقل کر رہے ہیں جبکہ ابن جَرِیر طبری نے خود اپنی تاریخ میں یہ روایت قطعاً نقل نہیں کی۔ دوسرے مسعودی خود شیعی ہیں۔ پھر اس سند میں محمد بن حمید الرازی ہیں۔ ان کو بھی ضعیف مانا گیا ہے۔[3]

نیز اسی سند میں علی بن مجاہد بھی ہیں جو متروک ہیں۔[4]

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ روایتیں شیعوں کی خانہ ساز اور بالکل بے وزن ہیں۔

---

① الاخبار الطوال، ابوحنیفہ دینوری، ص ۲۲۲

② مُرُوجِ الذھب: ۱۸۵/۳، ط الجامعۃ اللبنانیۃ

③ تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۵۸۳۴

④ تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۴۷۹۰

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق شبہات

ایک طبقہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی کردارکشی پر بڑا زور صرف کرتا آیا ہے۔عباسی تحریک کے دوران بنوامیہ کی مخالفت ایک سیاسی مہم کے طور پر کی گئی۔اس دور میں بہت سی روایات وضع کر کے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی جس سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت کے متعلق بکثرت شبہات پیدا ہو گئے۔دوسری طرف ایک طبقہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دفاع میں اتنا آگے نکل گیا کہ وہ ذخیرۂ حدیث وتاریخ کی ایسی صحیح روایات کے بھی انکار یا ان کی غلط تاویلات پر تُل گیا جن سے ان کی یا ان کے رفقاء کی کوئی لغزش ثابت ہوتی ہو۔اسی عصبیت کی بناء پر اس طبقے نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دینا شروع کر دی اور ایسے متعصبانہ نظریات اپنائے جو صحیح احادیث سے متصادم ہیں۔ان اوراق میں ہم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر لگائے گئے غلط الزامات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ساتھ ہی یہ کوشش بھی ہوگی کہ ہم اس دفاع میں متعصب گروہ کی اندھادھند پیروی سے مجتنب رہیں اور ہر معاملے کو صحیح روایات اور علم اسماء الرجال کی روشنی میں دیکھیں بھالیں۔

یاد رہے کہ ہم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر لگائے گئے تمام اعتراضات کا نہیں بلکہ مشہور شکوک وشبہات ہی کا جائزہ لے رہے ہیں اس کے باوجود موضوع کی وسعت کی وجہ سے یہ باب قدرتی طور پر کچھ طویل ہو جائے گا۔یہاں درجِ ذیل اصولی باتیں شروع سے ذہن نشین کر لیں کہ:

ا صحیح روایات سے ثابت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے کچھ اقدامات، جو جمہورِ علمائے امت کے نزدیک درست نہیں تھے، خطائے اجتہادی پر محمول کیے جاتے ہیں۔

ا کچھ شبہات بعض صحیح روایات کو سرسری پڑھنے اور ان کا اصل مطلب نہ سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ہم تجزیہ کر کے ان کا اصل مطلب پیش کریں گے تاکہ غلط شبہات کا ازالہ ہو جائے۔

ا زیادہ تر اعتراضات ضعیف اور من گھڑت روایات پر یقین کر لینے کا نتیجہ ہیں۔ہم علم اسماء الرجال کی روشنی میں پہلے ان روایات کا صحیح مقام اور درجہ متعین کریں گے۔سنداً ضعف ثابت ہونے کے بعد ان پر عقلی جرح ہوگی۔

ان میں سے ہر اعتراض کے ذیل میں کئی کئی ضمنی سوالات موجود ہیں جنہیں ہم وہیں نقل کریں گے۔

الزامات کی مختصر فہرست:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور کردہ شبہات کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

① ان کا اقتدار ناجائز اور غیر آئینی تھا۔

② حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکام قانون سے بالاتر تھے۔ بلا وجہ یا معمولی باتوں پر لوگوں کو سخت ترین سزائیں دیتے تھے جیسے حاکمِ بصرہ عبداللہ بن عُمرو بن غَیلان اور زیاد بن ابی سفیان۔ ان کے بعض گورنر اور افسران عیش پسند تھے جیسے مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ۔

③ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مخالفین کے سر کٹوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ بعض صحابہ کے سر بھی قلم کرائے جیسے عمّار بن یاسر اور عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہما کے سر کاٹے گئے۔

④ مخالفین کو زہر دے کر ختم کرایا جیسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن بن خالد رحمہ اللہ۔

⑤ حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ جیسے عابد و زاہد بزرگ کو بلا جواز قتل کرادیا۔

⑥ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی رسم شروع کرائی۔

⑦ اپنے سیاسی مفاد کے لیے زیاد بن سُمَیّہ کے نسب کو بدل ڈالا۔ اسے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا قرار دے کر اپنا بھائی بنالیا۔ جس کی اسلام میں بالکل گنجائش نہیں۔

⑧ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے حکام مالی بدعنوانی میں ملوث تھے۔ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود اس بدعنوانی میں سرپرستی کرتے تھے۔ انہوں نے غنیمت کے مال سے سونا، چاندی اور نفیس چیزیں اپنے لیے الگ کرنے کا حکم دیا۔ سرکاری مال ذاتی مصارف پر خرچ کرتے تھے۔

⑨ قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کا نعرہ لگا کر امت کو ورغلایا، جب خود حکمران بن گئے تو قصاص کو فراموش کردیا۔

⑩ انہوں نے شریعت کو بدل دیا، بدعتیں ایجاد کیں۔ ذمی کو دیت کا نصف حصہ اس کے ورثاء کے بجائے اپنے لیے مختص کردیا۔ مسلمان کو ذمی کا وارث قرار دیا۔ خطبہ کھڑے ہو کر نہیں بیٹھ کر دیتے تھے۔ وفات کے وقت بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ٹکڑے کرا دینے کی وصیت کی۔ حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر امت کو فساد کی راہ پر ڈال دیا۔

⑪ یزید کو ناجائز طور پر اپنا ولی عہد مقرر کر کے امت کو تباہ کیا۔ یزید کی غلط کاریوں کی ذمہ داری انہی پر ہے۔

اب ہم ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی بعض ذیلی سوالات کے جوابات بھی عرض کریں گے۔

☆☆☆

① کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اقتدار ناجائز تھا؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اقتدار کو ناجائز اور غیر شرعی قرار دیا جاتا ہے۔ آیئے! ہم غور کرتے ہیں کہ کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت آئینی اور شرعی تھی یا نہیں۔

❶ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو منصبِ خلافت سونپ دیا تھا۔ ①
اس تاریخی حقیقت کو اہلِ تشیع بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے امت کی قیادت سونپی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفاداروں کے علاوہ ان حضرات نے بھی اس فیصلے کو قبول کیا جو جمل اور صفین میں کنارہ کش رہے۔ لہٰذا اس سال کو جس میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، ''عام الجماعۃ'' (اجتماعیت کا سال) کہا گیا۔ ②

❷ فقہائے اسلام ''امام'' کے لیے جو شرائط اور صفات بتاتے ہیں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان پر پورے اترتے تھے، وہ مسلمان، عاقل، بالغ، باشعور، تندرست، دین دار، انصاف پسند، بہادر، حواسِ خمسہ کے مالک، قریشی النسب، فقیہ و مجتہد اور بہترین قوتِ فیصلہ سے آراستہ تھے۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا ذکر منصبِ خلافت کے لیے کیا جاتا ہے۔ ③

علامہ ماوردی رحمہ اللہ کے مطابق خلافت کے انعقاد کی دو صورتیں ہیں:
ایک یہ کہ اہل حل وعقد مل کر کسی کو خلیفہ چن لیں۔ دوسرے یہ کہ سابق خلیفہ کسی کو نامزد کر دے۔ ④
حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت دوسری طرح قائم ہوئی۔ انہیں ایک خلیفہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے یہ منصب سونپا تھا۔
اکثر فقہاء خلافت کے انعقاد کے لیے چار طریقے بیان کرتے ہیں:

① خلیفہ فوت ہو جائے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح وفات سے پہلے کسی کا نام تجویز کر دے۔
② خلیفہ فوت ہونے سے پہلے یہ معاملہ شوریٰ کے حوالے کر دے، جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا۔
③ اربابِ حل وعقد خود جمع ہو کر کسی کو چن لیں، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چنا گیا۔
④ خلیفہ اپنی زندگی میں کسی کو خلافت کا منصب سونپ کر خود دستبردار ہو جائے۔

---

① امام بخاری نے یہ واقعہ پوری تفصیل سے نقل کیا ہے۔ (صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن رضی اللہ عنہ: ابنی ھذا سید.)
② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۲؛ الاخبار الطوال، ص ۲۱۸، ۲۲۰
③ مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ للقلقشندی: ۱/۳۱، ۳۷، ط الکویت؛ الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص ۱۹، ۲۰
④ الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص ۲۱، ۲۲

ظاہر ہے یہ چوتھی صورت فقہاء نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سونپنے اور اس پر صحابہ کے اتفاق سے اخذ کی ہے، ورنہ اس سے قبل امت میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔

غرض فقہی قواعد کے لحاظ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا آئینی حکمران ہونا واضح ہے۔ اس کے بعد ان کی خلافت کو خلافِ قانون کہنا بالکل بے وزن ہو جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ آئینی حکمران بننے سے قبل انہوں نے حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے متعلق جو سیاسی موقف اختیار کیا اور عراقی خلافت کے متعلق جو جدوجہد کی اسے نیک نیتی پر محمول کرنے کے باوجود مبنی برصواب نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر بعد میں انہیں شرعی حکمران کی حیثیت مل جانا بھی ایک متفقہ مسئلہ ہے۔ اس کا انکار تعصب کے سوا کچھ نہیں۔

❸ صحابہ کرام اور تابعین عظام انہیں امام مانتے رہے اور انہیں ''امیر المؤمنین'' سے مخاطب کرتے رہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ''امیر المؤمنین'' کہنے والوں کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

- حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ①
- حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ②
- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ③
- حضرت معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ ④
- حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ⑤
- حضرت عمرو بن حزم الانصاری رضی اللہ عنہ ⑥
- حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ ⑦
- حضرت عبید بن اوس رضی اللہ عنہ ⑧
- حضرت عمرو بن مرۃ رضی اللہ عنہ ⑨
- حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ⑩
- حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ ⑪

---

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۳/۵ ؛ الادب المفرد للامام البخاری، ص ۳۸۶، ط دار البشائر بیروت
زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنی فقاہت کی وجہ سے صحابہ کرام میں ممتاز تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مراسلے میں ''امیر المؤمنین'' کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔

② شعب الایمان، ح: ۷۷۰۶

③ صحیح البخاری، فضائل الصحابۃ، باب ذکر معاویۃ رضی اللہ عنہ، ح: ۳۷۶۵ ؛ مستخرج ابی عوانۃ ۳۳۳/۹، ط الجامعۃ الاسلامیۃ

④ اتحاف الخیرۃ المھرۃ: ۶۵/۸ بحوالہ مسند ابی یعلیٰ، ط دار الوطن

⑤ المعجم الصغیر للطبرانی، ح: ۱۱۶۷

⑥ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۳۶۷

⑦ معرفۃ السنن والآثار للبیہقی: ۲۰/۱۲، ط دار الوفاء، قاہرۃ

⑧ جامع الاحادیث: ۱۰۶/۳۸

⑨ مجمع الزوائد، ح: ۹۳۸

⑩ معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم، ح: ۲۱۰

⑪ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۳۸/۱

ا حضرت یزید بن جاریہ انصاری رحمہ اللہ انصار کی ایک پوری جماعت کے ساتھ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور انہیں امیر المؤمنین کہا۔[1]

ا حضرت عُریان بن ہیثم رحمہ اللہ [2]

ا حضرت ہَوذہ رضی اللہ عنہ [3]

ا حضرت مَعن بن علی رحمہ اللہ [4]

ا حضرت نُمَیر بن اوس رحمہ اللہ [5]

ا تابعین کی ایک جماعت [6]

ا رؤسائے قریش [7]

ا انصار مدینہ [8] ...... ا عام لوگ [9]

اس لیے یہ بالکل غلط ہوگا کہ کوئی غیر آئینی حکمران کہہ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مرتبہ کم کرنے کی کوشش کرے۔

خلافت صرف تیس سال تک ہونے کا کیا مطلب ہے؟

عموماً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی کو غیر اسلامی ثابت کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے:

''اَلْخِلَافَةُ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا.''

(میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی۔ اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔)[10]

یہ حدیث اپنی جگہ ثابت اور صحیح ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تیس سال بعد آنے والی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت غیر اسلامی تھی۔ اگر یہی مطلب لیا جائے کہ تو لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ:

ا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دنیا کے سب سے بڑے رہبر اور قائد ہیں، کیا وہ اتنا کمزور نظام حکومت تشکیل دے کر گئے جو نصف صدی بھی قائم نہ رہ سکا؟ اور کیا وہ جانشینوں کی ایسی ناپختہ جماعت چھوڑ گئے جن کی زندگیوں میں ہی اسلامی نظام رخنہ پذیر ہوگیا؟

ا حدیث کا یہ مطلب مانا جائے تو یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اسلامی حکمران یا خلیفہ کا تقرر تمام فقہاء کے نزدیک واجب

---

[1] مسند احمد، ح: ۱٦۸۷۱
[2] مصنف عبدالرزاق، ح: ۲۰۸۲۹، ط المجلس العلمی
[3] المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/۱۵۰، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ
[4] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹/۳٦۲
[5] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹/۳۹۱
[6] اخبار مکۃ للازرقی: ۱/۱۷۲
[7] اخبار مکۃ للازرقی: ۱/۲۷۰
[8] مسند احمد، ح: ۱٦۸۷۱
[9] السنن الکبری للنسائی، ح: ۷۷۲۱
[10] صحیح ابن حبان، ح: ٦٦۵۷

ہے اس کے لیے حضور اکرم ﷺ کی نمازِ جنازہ تک مؤخر کردی گئی تھی، کیا اتنا اہم فریضہ حضور ﷺ کے تیس برس بعد ہی نازل کردیا گیا؟ اور کیا اس فریضے سے اُمت اب تک غافل رہی؟ بلکہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد بھی موجود رہے، کیا اس فریضے سے بے پرواہ رہے؟ ظاہر ہے ان باتوں کا جواب اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔

تیس سال سے مراد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے:

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کا یہ مطلب نہیں کہ تیس سال بعد اسلامی حکومت ختم ہوجائے گی بلکہ "ثَلاثُوْنَ سَنَۃً" کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکمرانی کا بہترین، مثالی اور قابلِ تقلید نمونہ تیس برسوں تک ہوگا۔ اسی لیے اسے "خلافتِ راشدہ" کہا جاتا ہے۔ اسلامی سیاست کے رہنما اصول مہیا کرنے والی خلافت یہی تیس سالہ ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد اسلامی حکومت سرے سے ناپید ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تیس سالہ خلافت کو محققین نے "الخلافۃ علی منہاج النبوۃ" (نبوی طرز پر خلافت) یا "خلافۃ النبوۃ" (نبوی خلافت) کہا ہے۔[1]

یعنی یہ تیس سالہ خلافت بھی حضور اکرم ﷺ کی سنت کی طرح تا قیامت ایک ضابطے اور رہنما کا کام دے گی۔

"الخلافۃ ثلاثون سنۃ" کی حدیث، جرح کرنے والوں کی نظر میں:

جمہور محدثین، فقہاء اور متکلمین "الخلافۃ ثلاثون سنۃ." کی روایت کو صحیح قرار دیتے ہیں، تاہم مناسب ہوگا کہ ان حضرات جو اس روایت پر جرح کرتے ہیں، ان کی رائے بھی دیکھ لی جائے۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "بعض علماء نے اس حدیث کی سند پر تنقید کر کے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ھذا حدیث لایصح (یہ حدیث صحیح نہیں ہے)." اور بعض دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مجمل ہے اور اس میں تیس سال کے بعد ایک عمومی حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ ہر ہر فرد کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا عہدِ حکومت اس سے باتفاق مستثنیٰ ہے۔"[2]

بارہ خلفاء کی حدیث:

دوسری طرف بعض صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ تیس سال کے بعد بھی خلفاء کا سلسلہ جاری رہے گا۔

① عن جابر بن سَمُرَہ رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ ﷺ: الناس تبع لقریش انَّ ھٰذا الامر لاینقضی حتی

---

[1] فتح الباری: ۱۳/۲۱۲، عمدۃ القاری: ۲۴/۲۸۲، مرقاۃ المفاتیح: ۹/۳۸۶۴

[2] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۴۷

نوٹ: علامہ ابن عربی کا اس حدیث کو غیر صحیح قرار دینا خلافِ تحقیق ہے۔ جمہور محدثین اور متکلمین کے نزدیک اس کی صحت مسلم ہے اور اہلِ سنت کے عقیدے کا اس پر مدار ہے۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "اھل السنۃ یقولون بالحدیث الذی فی السنن: خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم تصیر ملکا." (منہاج السنۃ: ۴/۵۲۲) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الشریعۃ للآجری: باب ذکر خلافۃ ابی بکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنھم، شرح اصول اعتقاد السنۃ لابن منصور الرازی: سیاق ماروی فی ترتیب الخلافۃ بین الاربعۃ، شرح السنۃ للبغوی، باب فضل الصحابۃ

يمضى فيهم اثنا عشر خليفة كلهم من قريش.

''لوگ قریش کے تابع ہیں۔ یہ معاملہ (خلافت) ختم نہ ہوگا جب تک لوگوں میں بارہ خلفاء نہ گزریں، سب قریشی ہوں گے۔''[1]

❷ لايزال الاسلام عزيزاً الىٰ اثنى عشر خليفة.

''یہ دین سربلند رہے گا، یہاں تک کہ اس میں بارہ خلفاء گزریں گے جو قریشی ہوں گے۔''[2]

❸ عن جابر بن سَمُرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ: لايزال الدين قائما حتى يكون اثنا عشر خليفةً من قريش.''[3]

جابر بن سَمُرہ رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو عامر بن سعد، سماک، سعید الہمدانی، عبدالملک بن عمیر، امام شعبی رحمہم اللہ اور دوسرے بہت سے تابعین نے نقل کیا ہے۔

❹ عن سَمُرَة بن جُندُب رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ: اثنا عشرة خليفةً كلهم تجتمع عليه الامة.

''بارہ خلفاء ایسے ہوں گے جن پر امت جمع ہو جائے گی۔''[4]

پس ''الخلافة ثلثون سنة.'' کی روایت کو صحیح مانتے ہوئے، اس کا مطلب بارہ خلفاء کی حدیث کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ دونوں حدیثوں کے درمیان ظاہری تعارض کو دور کرنے کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اسلامی خلافت صرف چار خلفاء پر ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا جس میں بارہ ایسے نامور خلفاء کا ظہور طے ہے جن پر پوری امت کا اتفاق ہو اور ان کے دور میں اسلام سربلند اور غالب ہو۔ ان خلفاء میں سے کئی گزر چکے ہیں اور کچھ بعد میں آئیں گے۔

گزرنے والے بہترین خلفاء میں سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی، سیدنا علی المرتضیٰ، سیدنا حسن اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے ساتھ سیدنا مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا نام کسی طرح ترک نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ ان کے دور میں مسلمان جس طرح متحد رہے اور فتح مند رہے، اس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے۔

''ثم تكون ملكا.'' کا مطلب؟

رہی یہ بات کہ ''الخلافة بعدى ثلثون سنة'' والی حدیث میں ''ثم تكون ملكا.'' (اس کے بعد بادشاہت آئے گی) کے الفاظ بھی ہیں، تو یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس کے بعد جو دور شروع ہوا، اس میں ''بادشاہت'' کی علامات نمایاں تھیں۔ شورائیت محدود ہوگئی تھی اور ایک خاندان یعنی بنوامیہ کا غلبہ ہوگیا تھا، اسی لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافتِ راشدہ کے معیار پر نہیں سمجھا جاتا۔ خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرق تسلیم تھا، اس لیے

---

① صحيح مسلم، ح: ٣٨٠٩، باب الخلافة فى قريش
② صحيح مسلم، باب الخلافة فى قريش
③ مسند احمد، ح: ٢٠٨٠٥ بسند حسن
④ سنن ابى داؤد، ح: ٤٢٧٩، كتاب المهدى

اگر کوئی انہیں بادشاہ قرار دیتا تو وہ اس پر بُرا نہیں مناتے تھے۔ ایک بار حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث سنائی:

خِلافَةُ نُبُوَّةٍ ثَلاثُوْنَ عاماً، ثُمَّ یُؤتِی اللّٰهُ الْمُلْکَ مَنْ یَشَآءُ.

(خلافتِ نبوت تیس سال ہے، پھر اللہ جسے چاہے حکومت دے۔)

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قَدْ رَضِینَا بِالْمُلْکِ (ہم بادشاہت پر راضی ہیں۔)[1]

مسند احمد میں ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے کہا:

''اَتَقُوْلُ الْمُلْکُ؟ فَقَدْ رَضِینَا بِالْمُلْکِ.''

(کیا تم کہتے ہو یہ بادشاہت ہے؟ تو ہم بادشاہت پر ہی راضی ہیں۔)[2]

تاہم خلافت میں بادشاہانہ خواص کی یہ آمیزش نہ تو حکومت کے جائز اور شرعی ہونے کے منافی ہے، نہ اس سے اسلامی حکومت ہونے کی نفی ہوتی ہے۔ نیز جن حالات میں یہ انقلاب آیا ان میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بڑی حد تک مجبور ومعذور بھی تھے۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حکمرانی کا یہ طبعی تقاضا ہے کہ اس اعزاز میں حکمران منفرد ہو اور ایک ہی کو ترجیح اور برتری ملے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس لازمی شے کو اپنی ذات اور اپنی قوم سے کیسے ہٹا سکتے تھے، کیوں کہ یہ ایک قدرتی بات تھی جو گروہ بندی سے پیدا ہوتی ہے۔ بنوامیہ اس نتیجے کو بھانپ گئے تھے۔ ان کے وہ پیروکار بھی اسی پر متفق ہوگئے جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرح حق کی پیروی کے لیے نہیں بلکہ (عصبیت کی بناء پر) ان کی حمایت کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور ان کی خاطر قربانیاں دی تھیں۔ اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کسی اور طریقے سے لوگوں کو آمادہ کرتے اور حکمرانی کے لازمی اثر کو نظر انداز کرتے ہوئے لوگوں کی مخالفت کرتے تو اتحاد واتفاق یکدم فنا ہوجاتا، جو انہوں نے بڑی مشکل سے قائم کیا تھا۔''[3]

نیز شخصی اور خاندانی حکومت قائم کرنے کے باوجود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت میں کوئی برائی نہ تھی جیسا کہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ مذکورہ بحث کے آخر میں فرماتے ہیں:

''ان تمام باتوں پر حکومتی رجحانات آمادہ کرتے ہیں جو گروہ بندی کے لازمی نتائج ہیں۔ اگر حکومت حاصل ہوجائے اور بالفرض ایک ہی شخص حکومت پر قابض ہوجائے اور وہ اسے صحیح طریقے پر چلائے اور حق و صداقت کی راہ نہ چھوڑے تو اس شخص پر اور اس حکومت پر بھلا کیا الزام ہے؟ دیکھیے حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومتیں شخصی تھیں، یہ دونوں بنی اسرائیل کے بادشاہ تھے۔''[4]

---

[1] دلائل النبوۃ للبیہقی: ۴۴۲/۶، ط العلمیۃ؛ الخصائص الکبریٰ للسیوطی: ۱۹۷/۲

[2] مسند احمد، ح: ۲۰۵۰۳، ۲۰۵۰۵ وفی اسناد هما علی بن زید (بن جدعان) ضعیف. (میزان الاعتدال: ۱۲۷/۳)

[3] مقدمہ ابن خلدون، باب: ۳، فصل: ۲۸ [4] مقدمہ ابن خلدون، باب: ۳، فصل: ۲۸

اس بحث کے نتیجے میں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت خلافتِ عامہ میں یقیناً داخل ہے اور اس کے شرعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ علامہ ابنِ حجر ہیثمی رحمہ اللہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کے خلافت یا ملوکیت ہونے کا مسئلہ حل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اگرچہ ان کی خلافت صحیح تھی مگر اس پر ملوکیت کی مشابہت غالب آ گئی تھی، کیونکہ وہ بہت سے معاملات میں خلفائے راشدین کے طریقے سے نکل گئی تھی۔ پس اسے خلافت کہنا اس لیے درست ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری اور اہلِ حل وعقد کے اتفاق کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق اور صحیح تھی۔ اور اسے ملوکیت کہنا اس لیے درست ہے کہ ان کے عہدِ حکومت میں کچھ ایسے امور واقع ہوئے تھے جن کا منشأ غلط اجتہاد تھا، جس کی بنیاد پر مجتہد گناہ گار تو نہیں ہوتا مگر اس کا رتبہ ان لوگوں سے بہرحال گھٹ جاتا ہے جن کے اجتہادات صحیح اور حقیقت کے مطابق ہوں جیسا کہ خلفائے راشدین اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم۔

لہٰذا جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ملوکیت کا اطلاق کرتا ہے، اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی حکومت میں مذکورہ اجتہادات واقع ہوئے تھے۔ جو اسے خلافت قرار دیتا ہے، اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری اور اہلِ حل وعقد کے اتفاق کے بعد وہ خلیفۂ برحق اور واجب الاطاعت تھے اور اطاعت کے لحاظ سے ان کو لوگوں پر وہی حقوق حاصل تھے جو خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو حاصل تھے۔ لیکن یہ بات ان کے بعد آنے والوں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی کیونکہ وہ اجتہاد کے اہل نہیں تھے۔ بلکہ بعض تو کھلم کھلا گنہگار اور فاسق تھے جنہیں کسی بھی اعتبار سے خلفاء میں شمار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ ملوک ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔''[1]



''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی ایک روایت پر اشکال اور اس کا جواب:

﴿سوال﴾ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی ایک روایت سے ثابت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج اُمت سے جبراً بیعت لیتی تھی اور بیعت نہ کرنے والے جوانوں کو قتل کرتی اور خواتین کو باندیاں بناتی تھی۔

اس روایت کے مطابق عام الجماعۃ والے سال حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کو اہلِ مدینہ سے بیعت لینے بھیجا مگر جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیعت پر آمادہ نہیں تھے، اس لیے وہ بیعت کرنے نہ گئے۔ اس پر بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ نے ان کے قبیلے کی بیعت کو مسترد کر دیا اور کہا کہ جابر آئیں گے تو بیعت قبول ہوگی۔

لوگ پریشان ہو کر جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور قسم دے کر کہا کہ: ''ہمارے ساتھ تشریف لے جا کر بیعت کر لیں ورنہ ہمارے جوان مرد مارے جائیں گے اور ہماری اولاد باندیاں بنائی جائیں گی۔''

[1] الصواعق المحرقۃ: ۶۲۹،۶۲۸/۲

جابر رضی اللہ عنہ پھر بھی تیار نہ ہوئے بلکہ پہلے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا۔انہوں نے بیعت کرنے کا مشورہ دیا مگر اسی خوف سے کہ اپنی جان بچائی جائے۔ ①

﴿جواب﴾ اس میں شک نہیں کہ یہ روایت سنداً صحیح ہے۔مگر اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ اشکال ہو۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اگر چہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی منظوری سے قائم ہوئی تھی مگر اس کے پیچھے قوت اور طاقت کارفرما تھی اور کوشش کے ذریعے یہ حکومت حاصل کی گئی تھی، اس لحاظ سے یہاں انتقالِ اقتدار خلفائے راشدین کی سنت کے مطابق نہ تھا (جن میں سے ہر ایک خلافت کو ایک بارگراں سمجھ کر اس سے بچنا چاہتا تھا مگر اُمت کی طرف سے انتخاب یا گزشتہ خلیفہ کے حکم پر وہ بادلِ نخواستہ یہ ذمہ داری اٹھانے پر مجبور ہوا۔)

جب شورائی خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نکل کر اہلِ شام کے پاس گئی تو بہت سے اکابرِ اُمت کو طبعی رنج ہوا۔تاہم وہ خانہ جنگی اور افتراق پر امن اور اتحاد کو ترجیح دیتے تھے،اس لیے مصلحتاً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو انہوں نے بھی قبول کرلیا۔(اس میں شک نہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی قابل وعادل حکمران تھے۔)

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جہاں دیدہ شخص تھے اور جانتے تھے کہ عراق اور حجاز میں ان کی خلافت دفعِ فتنہ کی مصلحت کے تحت قبول کی گئی ہے اور بہت سے حضرات کی ناگواری اب بھی قائم ہے۔اس لیے انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ اہلِ مدینہ ان کی بیعت سے احتراز کرسکتے ہیں۔اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کو فوج دے کر مدینہ بھیجا گیا۔

رہی یہ بات کہ بیعت کے لیے مردوں کو قتل اور عورتوں کو باندیاں بنایا گیا، یہ نہ تو اس روایت میں مذکور ہے نہ کسی اور روایت سے ثابت ہے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جو یہ کہا گیا کہ اپنا اور اپنی قوم کا خون محفوظ کرلیں ورنہ جوان مارے جائیں گے اور اولاد باندیاں بنائی جائیں گی، یہ کسی عام شخص کا خدشہ تھا (جس کا نام بھی روایت میں موجود نہیں) جس نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو مار دھاڑ کرنے والے عام دنیادار بادشاہوں پر قیاس کرلیا تھا۔عوام میں ایسی افواہوں کا پھیلنا اور لایعنی اندیشوں کا مشہور ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔البتہ یہ خدشہ واقعی تھا کہ اگر اہلِ مدینہ نے یا اہم شخصیات نے بیعت نہ کی تو کچھ شر پسند لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر نئی حکومت کے جوازِ حیثیت کے بارے میں بدگمانیاں پھیلا سکتے ہیں جس کا نتیجہ مسلمانوں میں کشت وخون کی شکل میں نکل سکتا تھا۔اگر ایسا ہوتا تو انسانی جانیں ضائع ہوتیں۔غالباً ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسی خدشے کے باعث فرمایا کہ بیعت کر کے اپنا اور قوم کا خون محفوظ کرلو۔پس اس روایت میں کوئی بات قابلِ اشکال نہیں۔

☆☆☆

---

① حدثنا ابو اسامة قال حدثني الوليد بن كثير عن وهب بن كيسان قال سمعت جابر بن عبدالله يقول : لما كان عام الجماعة بعث معاوية على المدينة بسر بن ارطاة ليبايع اهلها على راياتهم وقبائلهم فلما كان يوم جاء له الانصار جاء له بنو سلمة فقال أفيهم جابر قالوا لا . قال فليرجعوا فاني لست مبايعهم حتى يحضر جابر ،قال فاتاني فقال :ناشدتك الله الا ما انطلقت معنا فبايعت فحقنت دمك ودماء قومك فانك ان لم تفعل قتلت مقاتلتنا و سبيت ذرارينا . قال :فاستنظرهم الى الليل.فلما امسيت دخلت على ام سلمة زوج النبي ﷺ فاخبرتها الخبر فقالت: يابن ام! انطلق فبايع واحقن دمك ودماء قومك فاني قد امرت ابن اخي يذهب فيبايع. (مصنف ابن ابي شيبه، ح: ٣٠٥٦٢)

② نائبین کو قانون سے بالاتر رکھنے کا الزام؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُن کے حکام اور نائبین ظالم تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں قانون سے بالاتر قرار دیا۔ وہ بلا وجہ یا معمولی باتوں پر لوگوں کو سخت ترین سزائیں دیتے تھے۔

ابن غیلان کے ظلم کا واقعہ:

اس سلسلے میں ایک مثال یہ دی جاتی ہے کہ حاکمِ بصرہ عبداللہ بن عَمرو بن غیلان کو جمعے کے خطبہ کے دوران کسی شخص نے کنکر مار دیا۔ ابن غیلان نے اسے گرفتار کر کے ہاتھ کٹوا دیا، حالاں کہ شرعی لحاظ سے یہ ایسا جرم نہ تھا کہ ہاتھ کاٹا جاتا۔ جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے فریاد کی گئی تو انہوں نے فرمایا: ''میرے گورنروں سے قصاص لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔''

مگر اس الزام کی حقیقت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن غیلان کے واقعے میں طبری کی عبارت کا ترجمہ:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عمرو بن غیلان کو بصرہ سے معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا۔ وجہ یہ بنی کہ عبداللہ بن عَمرو بن غیلان بصرہ کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص جبیر بن ضحاک نے جو بنوضبہ میں سے تھا، ان کو کنکر دے مارا، ابن غیلان نے اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ بنوضبہ نے آ کر کہا کہ ہماری برادری کے ایک فرد سے جو ہوا سو ہوا، گورنر نے بھی اسے مناسب سزا دی مگر اندیشہ ہے کہ اب یہ خبر امیر المؤمنین تک پہنچے گی اور وہاں سے کوئی عذاب کسی خاص فرد یا خاندان پر ٹوٹ پڑے گا اس لیے آپ مناسب سمجھیں تو خود امیر المؤمنین کے نام پر ایک خط لکھ کر ہمیں دے دیں، ہم اپنے لوگوں میں سے کسی کے ہاتھ بھیج دیں گے، آپ اس میں یہ لکھ دیں کہ ہاتھ (چوری وغیرہ کے جرم کے) شبہ میں کاٹا گیا ہے، جرم واضح نہیں ہے۔ گورنر نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھ کر انہیں دے دیا۔ یہ خط سال یا چھ ماہ تک پڑا رہا۔

اس کے بعد گورنر نے خود خط لکھ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ بتایا۔ بنوضبہ بھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: عبداللہ نے ہمارے ایک بھائی کا ہاتھ ناحق کٹوا دیا اور یہ ان کا خط آپ کے نام موجود ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خط پڑھ کر فرمایا: ''میرے گورنروں سے قصاص لینا درست نہیں، اس کا کوئی راستہ نہیں، ہاں تم کہو تو دیت دلوا دوں۔'' وہ راضی ہو گئے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال سے دیت دلوا دی اور ابن غیلان کو معزول کر دیا۔''[1]

---

① تاریخ الطبری: ۲۹۹/۵، ۳۰۰

واقعے پر غور کرنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بنوضبہ کے جس شخص نے گورنر ابن غیلان کو دوران خطبہ کنکر مارا وہ شرپسند گروہ کا فرد تھا۔ اگر یہ محض ایک حماقت ہوتی تو ہاتھ کٹوانے کی سزا پر اس کی برادری خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع دے کر احتجاج کرتی مگر چونکہ اس کا جرم تھا ہی سنگین اس لیے برادری والے یہ سوچ کر گھبرا گئے کہ اگر خلیفہ کو حقیقت کا پتا چلا تو وہ ہم سب کو باغی شمار کر کے کوئی سخت کارروائی شروع نہ کر دیں۔ برادری والوں نے ہوشیاری سے کام لیا اور گورنر ابن غیلان سے مل کر یہ تحریر لکھوالی کہ اس شخص کا ہاتھ ''شبہے'' میں کاٹا گیا ہے۔ ابن غیلان نے ان کی چالاکی نہ سمجھی اور تحریر لکھ دی۔

یاد رہے کہ شبہے میں سزا جاری کر دینا، ایک شرعی اصطلاح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص پر کوئی الزام عائد ہو مگر اس کا ثابت ہونا یقینی نہ ہو بلکہ اس میں کچھ شبہ ہو تو قانوناً ملزم کو شبہے کا فائدہ دیتے ہوئے اصل شرعی سزا ساقط ہو جاتی ہے۔ اگر ایسی صورت حال میں کوئی قاضی یا حاکم ملزم کے بارے میں نرم فیصلہ کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ملزم کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے سزا معاف کر دی گئی یا سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ اگر پوری سزا جاری کر دی جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے ملزم کو ''شبہے میں سزا دی ہے۔''

یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ شبہے میں سزا جاری کر دینا قاضی یا منصف کی سخت غلطی شمار ہوگی مگر پوری دنیا کا قانون یہ ہے کہ اگر جج غلطی سے کسی کو سزا سنا دے تو اس غلطی کی وجہ سے خود قاضی یا جج کو سزا نہیں دی جائے گی کیوں کہ جس طرح شبہے کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے اسی طرح منصف کو بھی ملتا ہے۔ منصف کو غلط فیصلے پر اعلیٰ عدالت تنبیہ کر سکتی ہے، عہدے سے برخاست بھی کر سکتی ہے مگر یہ جائز نہیں کہ غلط فیصلے کی پاداش میں اس سے قصاص لیا جائے کیوں کہ منصف بھی انسان ہے، اس کے سامنے آنے والے معاملات اکثر کئی کئی پہلو رکھتے ہیں، صحیح فیصلے میں اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ فیصلے کی ہر غلطی پر اگر جج کو قابلِ سزا بنا دیا جائے تو اس منصب کو قبول کرنے کے لیے کوئی تیار نہ ہوگا۔

مذکورہ مسئلے میں ابن غیلان صرف گورنر نہیں، منصف اور قاضی بھی تھے...... جیسا کہ اس دور میں عموماً ایسا ہوا کرتا تھا کہ عالم فاضل منتظمین کو قضا کے اختیارات بھی دیے جاتے تھے...... جس شخص نے خطبے کی حالت میں انہیں کنکر مارا تھا، اس نے درحقیقت حکومتی رِٹ کو چیلنج کیا تھا...... ابن غیلان نے اس حرکت کو اسی نگاہ سے دیکھا تھا کیوں کہ اس سے پہلے بارہا باغی ایسی حرکات کے ذریعے اپنی تحریکیں شروع کر چکے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیوں نے ابتدا اسی انداز میں کی تھی کہ مسجد نبوی میں ان پر کنکر پھینکے تھے، گویا یہ حرکت باغیوں کا شعار اور حکومت سے اعلانِ جنگ کی علامت بن گئی تھی۔

اس صورتِ حال کے تحت ابن غیلان نے اس شخص کو نمونۂ عبرت بنانا ضروری سمجھا...... باغی کی انتہائی سزا تو قتل ہے مگر اس شخص کی حرکت اس درجے کی نہ تھی اس لیے قتل کی جگہ ہاتھ کٹوا کر اپنے لحاظ سے ایک مناسب اقدام کیا۔ ملزم کی قوم کو اس کی سرکشی کا پورا اندازہ تھا، اسی وجہ سے اپنے اوپر کوئی افتاد آنے سے ڈرتے تھے اس لیے جب اس پر سزا

جاری ہوئی تو انہوں نے اس شخص کی حمایت نہیں کی بلکہ بڑی ہوشیاری سے اپنے تحفظ کے لیے گورنر سے ایک تحریر لے لی جس میں اس معاملے کو شبہے کا فائدہ دیا گیا تھا۔ بعد میں اس تحریر کو لے کر ان لوگوں نے ابن غیلان ہی کو ملزم بنا دیا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی کہ آپ کے گورنر نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہے کی وجہ سے کاٹ دیا ہے۔ ان سے قصاص دلوائیں (ہاتھ کے بدلے اُن کا ہاتھ کاٹا جائے)۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے معاملہ جس طرح پیش ہوا انہوں نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ چونکہ فقہاء نے یہ اصول لکھ دیا ہے کہ شبہے کی بنا پر سزا دینے پر حاکم سے قصاص نہیں لیا جائے گی۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے قصاص لینے سے معذوری ظاہر کر دی، مگر ساتھ ہی لوگوں کی تسلی کے لیے گورنر ابن غیلان کو معزول کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو مزید مطمئن کرنے کے لیے کہا کہ وہ اپنی پسند کا حاکم مقرر کر لیں۔ پھر ان کے مشورے پر عبید اللہ بن زیاد کا تقرر کر دیا۔ اگر معاملہ اصل شکل میں سامنے آتا تو غالباً حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ابن غیلان کو معزول نہ فرماتے۔[1]

اگر دیکھا جائے تو اس سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی منصف مزاجی اور حسنِ تدبیر کا ثبوت ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے گورنر کے سخت فیصلے کی تائید نہیں کی مگر اس کی بنا پر وہ خلافِ قانون اس سے قصاص بھی نہیں لے سکتے تھے اس لیے نہایت مناسب فیصلہ کیا کہ مظلوم کو دیت دلوا دی اور گورنر کو معزول کر دیا مگر افسوس کہ کچھ لوگوں نے اسے گورنروں کے ظلم وستم اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے لاقانونیت کی سرپرستی کا نام دے کر مشہور کر دیا۔

زیاد بن ابی سفیان کے ظلم کی حقیقت:

حکام کے ظلم وستم کے پروپیگنڈے کے ذیل میں دوسرا واقعہ زیاد بن ابی سفیان کا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کوفہ کا گورنر بنتے ہی کئی افراد کے ہاتھ کٹوا دیے۔ حقیقت جاننے کے لیے ''طبری'' کی اصل روایت کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

زیاد جب کوفہ آیا تو منبر پر چڑھ کر اللہ کی حمد وثنا بیان کی، پھر کہا: ''مجھے بصرہ میں یہ ذمہ داری سونپی گئی...... میں نے سوچا کہ وہاں کی پولیس کے دو ہزار افراد لے کر یہاں آؤں مگر پھر خیال آیا کہ آپ لوگ اہل حق ہیں۔ آپ کی حق پرستی نے کئی بار باطل کو پسپا کیا ہے...... اسی لیے میں صرف اپنے اہل وعیال کو لے کر یہاں آ گیا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ لوگوں نے مجھے جتنا گرایا اللہ نے اتنا ہی بلند کیا۔ لوگوں نے جسے ضائع کیا اللہ نے اسے محفوظ رکھا۔''

زیاد خطبے سے فارغ ہو کر منبر پر ہی تھا کہ لوگوں نے اسے کنکر مارنا شروع کر دیے...... اس دوران زیاد وہیں بیٹھا رہا، پھر اپنے کارندوں کو بلا کر حکم دیا کہ مسجد کے سب دروازے بند کر دیں۔ پھر کہا:

''ہر شخص اپنے ساتھ والے آدمی کو پکڑ لے...... کوئی یہ نہ کہے کہ میں اپنے پاس والے کو نہیں جانتا۔''

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۰۰/۵؛ البدایة والنهایة: ۲۸۱/۱۱ — یہ واقعہ سن ۵۵ ہجری کے حالات کے آغاز میں ''تاریخ طبری'' میں تفصیل سے، جبکہ ''البدایہ والنہایہ'' اور ''الکامل'' وغیرہ میں قدرے اختصار سے نقل کیا گیا ہے۔

پھر زیاد مسجد کے دروازے پر اپنے لیے کرسی رکھوا کر وہاں بیٹھ گیا اور چار چار افراد کو بلوا کر قسم لیتا رہا کہ ہم میں سے کسی نے پتھر نہیں مارا۔ جس نے قسم کھائی اسے چھوڑ دیا، جس نے قسم نہ کھائی اسے روک لیا۔ یہ سب تیس یا اسی آدمی تھے۔ ان سب کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔''[1]

یہاں زیاد کے طرزِ عمل کو ظالمانہ کہنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ آیا جن لوگوں نے اسے کنکر مارے کیا وہ کوئی عام لوگ تھے؟ کیا یہ وہی لوگ نہ ہوں گے جنھوں نے حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ سابق گورنر کو کنکر مارے تھے؟ کیا یہ وہی گروہ نہ تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی کے منبر پر کنکر مار کر اپنی بغاوت کا اظہار کیا تھا؟ ظاہر ہے کسی عام آدمی کو کیا پڑی کہ گورنر کو مسجد میں سرِ عام سنگ باری کا نشانہ بنائے، یقیناً یہ شر پسند لوگ تھے جو کھل کر اپنی مرکز گریزی اور سرکشی کا اظہار کر رہے تھے۔ زیاد سے پہلے دیگر نرم خو گورنر درگزر کر کے انہیں اچھی خاصی مہلت دے چکے تھے۔ مہلت کی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ زیاد کو کوفہ میں مقرر کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اب شر پسندوں کو مزید چھوٹ نہ دی جائے۔ اس نے ''گربہ کشتن بروزِ اوّل'' کے بمصداق پہلے ہی موقع پر باغیوں کو نشانۂ عبرت بنا دیا۔ کوئی اور دنیادار حاکم ہوتا تو ان کے سر قلم کرا دیتا مگر زیاد نے ایک حد تک رعایت کرتے ہوئے صرف ہاتھ قطع کرانے پر اکتفا کیا۔ اس میں بھی اتنی گنجائش دی کہ جس نے بھی قسم کھا کر اس حرکت سے برأت ظاہر کی زیاد نے اسے چھوڑ دیا۔ جس نے خود اپنی زبان سے اس جرم کا اقرار کیا اسی کو سزا دی گئی۔

اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ مجرم علانیہ سرکشی پر آمادہ تھے اور اتنے ڈھیٹ تھے کہ شر پسندوں سے اپنی وابستگی پر فخر کرتے تھے اور اس کے لیے ہر سزا جھیلنے کو بھی تیار تھے۔

دنیا کی کوئی بھی حکومت ایسی سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر حاکم کی جوابی کارروائی ناجائز مانی جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جب بھی کہیں کسی ملک، کسی تنظیم یا کسی ادارے میں شورش ہو تو مقتدر حضرات اسے نظر انداز کرتے رہیں اور جب پانی سر سے اُونچا ہو جائے تو خود گوشہ نشین ہو کر سارا اختیار مخالفین کو سونپ دیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ زیاد قید یا جرمانے جیسی کوئی سزا دیتا تو زیادہ مناسب ہوتا مگر شاید زیاد کے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہ تھا؛ کیوں کہ زبانی سرزنش اور قید و بند کے نسخے سابقہ گورنر آزما چکے تھے۔ زیاد کی سزا کو سخت ضرور کہا جا سکتا ہے مگر بالکل بے جا نہیں۔

☆☆☆

سَمُرَہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے مظالم کی حقیقت کیا ہے؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے جرنیل حضرت سَمُرَہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے بارے میں درج ذیل روایات مشہور کی گئیں:

1. جب زیاد بن ابی سفیان نے انہیں بصرہ میں نائب مقرر کیا تو انہوں نے آٹھ ہزار افراد کو قتل کرا دیا۔ کسی سے پوچھا گیا: سَمُرَہ نے وہاں کن کن کو قتل کیا؟ جواب ملا: سَمُرَہ کے مقتولین کو بھلا کیسے شمار کیا جا سکتا ہے!!''

[1] تاریخ الطبری: ۲۳۵/۵

حضرت سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ''آپ ڈرتے نہیں کہ ان میں کوئی بے گناہ بھی شامل نہ ہو گیا ہو۔''
وہ بولے: ''اتنے ہی اور قتل کر دوں تب بھی کوئی پروا نہیں۔''[1]

❷ حضرت سمُرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دن صبح سویرے ایک قوم کے ۴۷ قاری حضرات کو قتل کر دیا۔[2]

❸ ان کے گھڑ سوار راہ چلتے لوگوں کو مارتے چلے جاتے تھے۔[3]

غور کریں تو حضرت سمُرہ رضی اللہ عنہ کے خلاف مذکورہ تینوں روایتیں سنداً بے حد ضعیف ہیں۔

پہلی روایت میں اسحٰق بن ادریس ہے جسے امام بخاری ''متروک'' ابوزرعہ ''واہی'' اور یحییٰ بن معین ''کذاب، یضع الاحادیث.'' کہتے ہیں۔[4] دوسری میں نوح بن قیس شیعی ہے۔[5] تیسری روایت میں جعفر الصدفی مجہول ہے۔ جبکہ عوف (عوف الاعرابی م ۱۴۶ھ) ثقہ مانے جانے کے باوجود قدری اور شیعی مشہور ہیں۔[6] نیز انہوں نے ایک صدی قبل کے واقعے کو براہِ راست بیان کیا ہے۔ درمیانی راوی غائب ہیں۔ اس طرح سند یقیناً منقطع اور ضعیف ہو جاتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ تینوں روایتیں خوارج کی پیداوار ہیں۔ سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ خوارج کے خلاف شمشیرِ بے نیام تھے۔ ان کا قول تھا: ''فلک کے نیچے بدترین لوگ وہ ہیں جو مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں اور ان کا خون بہاتے ہیں۔''

ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ ان کا یہ قول نقل کر کے فرماتے ہیں: ''اسی لیے خوارج اور ان کے ہم خیال لوگ حضرت سمُرہ رضی اللہ عنہ پر الزامات لگاتے ہیں اور ان کے متعلق بدگوئی کرتے ہیں۔''[7]

☆☆☆

﴿سوال﴾ طبری کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ ظلم کرتے تھے اور وہ بھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے۔ کیوں کہ جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کیا تو سمُرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ مُعاویہ پر لعنت کرے! اگر میں اللہ کی اطاعت اس طرح کرتا جیسے مُعاویہ کی کرتا رہا تو اللہ مجھے عذاب نہ دیتا۔''[8]

﴿جواب﴾ یہ روایت معتبر نہیں کیوں کہ اسے عمر بن شبہ ''بلغنی عن جعفر بن سلیمان'' کے صیغے سے بیان کر رہے ہیں، اس طرح درمیان کا واسطہ مجہول ہو جاتا ہے۔

دوسری علت یہ ہے کہ جعفر بن سلیمان اگرچہ صدوق شیعی ہیں جن سے امام مسلم نے بھی روایت لی ہے مگر ان کی

① تاریخ الطبری: ۵/۲۳۶، ۲۳۷
② تاریخ الطبری: ۵/۲۳۷
③ تاریخ الطبری: ۵/۲۳۷
④ میزان الاعتدال: ۱/۱۸۴
⑤ میزان الاعتدال: ۴/۲۷۹
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۶/۳۸۴، ط الرسالۃ
⑦ اسد الغابۃ، ترجمۃ: سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ
⑧ تاریخ الطبری: ۵/ ۲۹۱، سن ۵۳ ھ

...ات ۷۸ھ کی ہے[1] اگر عمر سو سال بھی مانی جائے تب بھی مذکورہ قصہ ان کی ولادت سے پہلے کا ہے۔ پس سند منقطع ہو روایت ضعیف ہے۔ بلا شبہ یہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفین کی اڑائی ہوئی بات ہے جسے ایک صدوق راوی نے ...ی رجحانات کی وجہ سے آگے نقل کر دیا۔

☆☆☆

حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ پر عیاشی اور بدکاری کے الزامات:

کذاب راویوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کی بے انتہاء کوشش کی ہے۔ انہیں خاص طور پر عیاشی اور بدکاری جیسے گھناؤنے الزامات کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

تاریخ طبری میں حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے جس میں ان پر بدکاری کی تہمت کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ کس طرح چار افراد نے اپنے گھر کی کھڑکی سے انہیں مباشرت کرتے دیکھا اور ان کے خلاف گواہی دی۔

اس قصے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ پر مقامی لوگوں نے بدکاری کا الزام عائد کیا تھا جو تحقیقات سے غلط ثابت ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے الزام لگانے والوں کو حدِ قذف کے مطابق کوڑے لگوائے۔[2]

ظاہر ہے کہ گناہ کا الزام کسی شریف ترین شخص پر بھی لگ جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ ایسا غلط فہمی سے بھی ہو جاتا ہے، مگر یہ ظلم ہی ہوگا کہ کوئی شخص چند ضعیف روایات کو اٹھا کر ان کے بل بوتے پر کسی صحابی کے دامن کو داغ دار کرنے کی کوشش کرنے لگے، بالخصوص جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عادل حاکم کی عدالت میں انہیں بری کر دیا گیا تھا۔

ہم نفسِ واقعہ یعنی الزام لگنے کا انکار نہیں کر رہے مگر طبری وغیرہ کی ان روایتوں میں منقول اس واقعے کی تفصیل میں کئی باتیں مشکوک بلکہ نا قابلِ یقین ہیں۔ طبری میں دو روایتیں ہیں: پہلی میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ ام جمیل نامی بدکردار عورت کے پاس بکثرت جایا کرتے تھے۔ دوسری میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اس دور میں عورتیں بدکاری کیا کرتی تھیں، ان میں سے ام جمیل نامی ایک عورت علاقے کے شرفاء اور امراء سے تعلقات رکھتی تھی اور حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ اس کے پاس جاتے رہتے تھے۔[3] (نعوذ باللہ)

یہ دونوں ناپاک روایات سنداً و متناً نا قابلِ قبول ہیں۔ یہ واقعہ ۱۷ھ کے تحت نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ نکلے گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جبکہ امراء اور شرفاء صحابہ کرام ہی تھے، یہ گھناؤنا کام ہو رہا تھا جسے آج بھی شریفوں کے کسی محلے میں برداشت نہیں کیا جاتا۔

متن کے طعنِ صحابہ سے آلودہ مندرجات کے علاوہ پہلی روایت میں خود واقدی کی موجودگی اس کے شدید ضعف

---

[1] تقریب التهذیب، ترجمہ نمبر: ۹۴۲

[2] شرح مشكل الآثار: ۱۲/۳۶۲، ط الرسالة ، شرح معاني الآثار، ح: ۴۱۳۴ ، مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۳۵۶۴ ، السنن الكبرى للبيهقي، ح: ۱۷۰۴۳؛ وقال البخاري: جلد عمر أبا بكرة و شبل بن معبد و نافعاً بقذف المغيرة ثم استتابهم. (اخرجه البخاري في صحيحه تعليقاً، ح: ۲۶۴۸)

[3] تاريخ الطبري: ۴/۶۹ تا ۷۲

کے لیے کافی ہے۔مزید جرح کی ضرورت ہی نہیں۔[1]

دوسری روایت بھی شدید ضعیف ہے کیوں کہ اس کی سند متعدد ضعفاء وکذاب راویوں پر مشتمل ہے۔سَرِی،شعیب اور سیف بن عمر تینوں ہی ضعیف ہیں۔نیز ''محمد ، والمُهَلَّب وطلحة وعمرو باسنادهم'' نے سند کو نہ صرف خلط ملط بلکہ بعض راویوں کو مجہول بھی کر دیا ہے۔ایسی بے سروپا روایات پر یقین کرنا نہ صرف اصولِ روایت و درایت، بلکہ ہمارے ایمان کے بھی خلاف ہے۔



③ صحابہ کرام کے سر کٹوانے کا اعتراض

الزام ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے مخالفین کے سر کاٹنے کی رسم شروع کی، بڑے بڑے صحابہ کے سر کٹوا دیے۔اس کی دلیل میں عَمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کے قتل کے واقعات سنائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ دہشت ناک عمل حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ہی نے شروع کیا۔

عَمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا سر کٹوانے کی حقیقت:

عَمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل اور سر کٹوانے کے بارے میں درج ذیل روایت پیش کی جاتی ہے:

''حنظلہ بن خویلد کہتے ہیں کہ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا کہ دو آدمی حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے سر کے بارے میں بحث کرتے آرہے تھے اور دونوں میں سے ہر ایک کہہ رہا تھا میں نے انہیں قتل کیا ہے۔''[2]

یہ روایت پیش کر کے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا سر کٹوایا تھا تبھی قاتل ان کی موجودگی میں یہ بحث کر رہے تھے تاکہ سر کاٹنے کا انعام لیں۔حالاں کہ روایت میں صرف یہ ذکر ہے کہ وہ دونوں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے مقتول کے اسلحے کے استحقاق میں جھگڑ رہے تھے۔اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا سر کاٹنے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم یا رضامندی شامل ہو۔حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قتل میدان جنگ میں ہوا تھا، سر بھی وہیں کاٹا گیا تھا اور بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ خود قاتل کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کسے قتل کر رہا ہے۔

واقدی نے اس روایت کو یوں بیان کیا ہے: وحدثنی محمد بن يعقوب بن عتبة عن ابيه.

یہ راوی محمد بن یعقوب خود مجہول الحال ہے۔(اگرچہ اس کے والد یعقوب بن عُتبہ کو ثقہ مانا گیا ہے) اس طرح سند

---

① پہلی روایت کا واقدی سے مروی ہونا تاریخ کے طلبہ کو طبری کی عبارت میں ذرا مبہم محسوس ہوگا؛ کیوں کہ باب ''ذکر خبر عزل المغيرة عن البصرة'' کے بعد ''قال وفي هذه السنة'' سے بات شروع کر دی گئی ہے مگر غور کیا جائے تو باب سے پہلے مسلسل واقدی کی روایات کے ٹکڑے نقل کیے جا رہے ہیں مثلاً قال الواقدي وفي عمرته هذه ..... قال: وحدثني كثير بن عبدالله ..... قال: وفيها تزوج عمر بن الخطاب.
پس یہ روایت یقیناً واقدی ہی سے مروی ہے۔

② مسند احمد، ح: ۶۶۹۵، باب عبدالله بن عمرو

میں مزید ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے کی معتبر روایت ملاحظہ ہو:

’’صفین کے دن عمار رضی اللہ عنہ پہلے دستے میں پیدل آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے بیچ میں آئے تو ایک شخص نے نیزہ مار کر انہیں گرا دیا۔ تو ان کا خود ڈھلک گیا۔ پھر اس نے وار کیا تو دیکھا وہ عمار رضی اللہ عنہ کا سر تھا۔‘‘[1]

☆☆☆

عمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کا سر کٹوانے کی حقیقت:

عمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کے قتل اور سر کاٹنے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ملوث ہونے میں درج ذیل روایات پیش کی جاتی ہیں اور استدلال کیا جاتا ہے کہ اسلامی سیاست میں سب سے پہلے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ غلط رسم جاری کی۔

یاد رہے کہ اس بارے میں روایات دو قسم کی ہیں: معتبر (حسن یا صحیح) اور ضعیف۔ معتبر روایات سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ سر کاٹ کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔ ان میں یہ ہرگز ذکر نہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا حکم دیا تھا، یا اس کو پسند کیا تھا، ان میں یہ بھی ذکر نہیں کہ عَمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کو قتل کیوں کیا گیا تھا؟ سر کیوں کاٹا گیا تھا؟

پہلے ان معتبر روایات کو دیکھ لیں:

1 عن هُنَیدَة الخزاعی :اوّل رأس اهدی فی الاسلام رأس عَمْرو بن الحَمِق اهدی الی معاویة.

’’اسلام میں پہلا سر عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کا کاٹا گیا، جسے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا گیا۔‘‘[2]

اس سند میں شریک بن عبداللہ القاضی، صدوق مگر کمزور حافظے والے تھے اور بکثرت غلطیاں کرتے تھے۔[3]

ان پر تدلیس کا الزام بھی ہے۔[4] اس لیے روایت حسن ہے۔

2 ہُنَیدَہ کی یہی روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے تین واسطوں کی نقل کی ہے۔ یوسف بن یعقوب اور ابوبکر بن عیاش ثقہ ہیں، جبکہ تیسرے جواد الضبی کے احوال نہیں مل سکے۔ اس میں ان الفاظ کی زیادتی ہے:

بعث به زیاد الی معاویة...... یعنی یہ سر زیاد نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا۔[5]

3 امام ابو العرب تمیمی نے اس سلسلے میں یہ روایت نقل کی ہے:

عبدالملک بن ہذیل، عن اسماعیل بن اسحٰق القاضی، عن سفیان بن عیینہ، عن علی بن مدینی، عن عمارۃ الدُہنی:

---

[1] مستدرک حاکم، ح: ۵٦۵۸، رجالہ ثقات۔
دوسری روایت خود حملہ کرنے والے ابو غادیہ جہنی سے منقول ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ قتل کر دینے کے بعد پتا چلا کہ یہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہیں۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/۳٦۳، ط مکتبۃ ابن تیمیہ)

[2] مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳٦۰۱۹، ط الرشد

[3] تقریب التہذیب، تر: ۲۷۸۷

[4] طبقات المدلسین، ص ۳۳

[5] التاریخ الاوسط: ۱/۱۳۱، الاصابۃ: ۴/۵۱۵ ط العلمیۃ

اوّل راس حمل فی الاسلام راس عَمْرو بن الحَمِق الی معاویة

"پہلا سر جو اسلام میں کاٹ کر اٹھایا گیا عَمْرو بن حَمِق رضی اللہ عنہ کا تھا جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا گیا۔"[1]

❹ یہی روایت واقدی سے بھی مروی ہے جس کا ضعف ظاہر ہے۔[2]

❺ ایک اور روایت بھی ہے جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے درمیان کے واسطوں کو حذف کر کے یوں پیش کیا ہے:

محمد بن زکریا الغلابی نے اخبارِ زیاد نامی کتاب میں اپنی سند کے ساتھ شعبی سے نقل کیا ہے:

لم یحمل الیٰ رسول اللّٰه ولا الیٰ ابی بکر ،ولا الیٰ عمر ولاالیٰ عثمان ولا الیٰ علیّ، واوّل من حمل راسه عمرو بن الحَمِق حمل الیٰ معاویة.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے پاس کوئی سر کاٹ کر نہیں لے جایا گیا۔ سب سے پہلے عمرو بن حَمِق رضی اللہ عنہ کا سر تھا جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تک لے جایا گیا۔"[3]

بہر حال سر کے قلم ہونے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیجے جانے کی بات مجموعی لحاظ سے ثبوت کے درجے کو ضرور پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے اس حد تک تو یہ بات قابل قبول ہے۔

مگر ان روایات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس فعل کو رسم کے طور پر جاری کیا تھا، بلکہ ان سے اتنا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اس کام کا حکم دیا تھا۔

☆☆☆

کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تھا؟

جن روایات میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو براہِ راست اس قتل میں ملوث بتایا گیا ہے، ان کی حالت ملاحظہ ہو:

● طبری میں ابومخنف اور مجالد بن سعید نے عَمْرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کے قتل کے واقعے کو تفصیل سے نقل کیا ہے جس کے آخر میں صراحت ہے کہ حضرت عَمْرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کا یہ قتل حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہوا تھا:

"فکتب الیه معاویة: انه زعم انه طعن عثمان بن عفان تسع طعنات بمشا قص کانت معه وانا لا نرید ان نعتدی علیه، فاطعنه تسع طعنات کما طعن عثمان. فاخرج فطعن تسع طعنات فمات فی الاولیٰ منهن اوالثانیة."

---

① المحن، ص ۱۳۶ بسند حسن ، اسد الغابة: ۲۰۵/۴

سند میں عبدالملک بن بذیل کو من الراسخین فی العلم کہا گیا ہے: (تاریخ الاسلام للذهبی تدمری: ۹۱/۲۶ ؛ بشار: ۵۸/۸)
اسماعیل بن اسحٰق قاضی کو العلامة الحافظ کہا گیا ہے، ان پر کوئی جرح منقول نہیں ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳۳۹/۱۳، ط الرسالة)
باقی رواۃ کا ثقہ ہونا ظاہر ہے۔

② طبقات ابن سعد: ۲۶/۶، ط صادر

③ التلخیص الحبیر لابن حجر العسقلانی: ۲۸۸/۴، ط العلمیة

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ اس (عمرو بن الحمق) کا دعویٰ ہے کہ اس نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو نو بار بھالے کا زخم لگایا۔ ہم ان پر زیادتی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کو نو بار اسی طرح بھالا مارو جیسے انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو مارا تھا۔ پس انہیں نکال کر نو بار بھالا مارا گیا۔ وہ پہلے یا دوسرے وار میں جاں بحق ہو گئے۔''[1]

❷ اسی واقعے کو بلاذری نے بلا سند نقل کیا ہے۔[2]

❸ ابومخنف نے یوسف بن یزید سے لمبا چوڑا قصہ نقل کیا ہے کہ عَمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کو کس طرح قتل کیا گیا اور بعد میں ان کے ایک عقیدت مند نے اسی طرح ان کے قاتل کے سر پر وار کیا۔[3]

ان روایات میں یا تو ابومخنف اور ہشام بن محمد جیسے کذاب ہیں یا مجالد بن سعید جس کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''لیس بشیء'' اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یحییٰ بن سعید انہیں ضعیف قرار دیتے تھے۔ کسی کو ان کی روایات کی تلاش میں جاتے دیکھا تو فرمایا: ''تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے۔''

ابن معین اور ابوحاتم کہتے ہیں: ''ان سے دلیل نہیں دی جا سکتی۔''

ابوسعید اشج فرماتے ہیں ''یہ شیعہ تھے۔''

دارقطنی کہتے ہیں: ''ضعیف تھے۔''[4]

عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہونے کا الزام یا تو واقدی کی روایت میں ملتا ہے (جس میں دورِ عثمان رضی اللہ عنہ کے آخر میں بحث گزر چکی) یا ابومخنف و مجالد بن سعید کی ان روایتوں میں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ کسی معتبر راوی سے یہ بات ہرگز منقول نہیں۔

جب یہ الزام ہی غلط ہے تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص میں ان پر نو وار کرنے کا حکم جاری کرنا اور ان کا پہلے یا دوسرے وار سے مر جانا بھی افسانہ ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے سند میں ابومخنف اور ہشام بن محمد کلبی کی موجودگی کافی ہے۔

عمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کے جاں بحق ہونے اور سر کاٹنے کی اصل وجہ؟ معتبر روایت میں

معتبر روایت کے مطابق عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ حادثاتی طور پر جاں بحق ہوئے تھے۔ ایک معتبر روایت دیکھیے:

عبدالملک بن هذیل، عن اسماعیل بن اسحق القاضی، عن سفیان بن عیینه، عن علی بن مدینی، عن عَمّار الدهنی: "ارسل معاویة لیؤتیٰ به قال فلدغ فمات فخشیت الرسل ان

---

[1] تاریخ الطبری: ۲۶۵/۵

[2] انساب الاشراف: ۲۷۲/۵، ط دار الفکر

[3] تاریخ الطبری: ۲۵۷/۵، ۲۵۸

[4] سیر اعلام النبلاء: ۲۸۳/۲، ۲۸۷، ط الرسالة

تتهم به فحذوا رأسه وحملوه."[1]

''عمار دُہنی کا بیان ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس لائے جانے کا حکم دیا، وہ سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو گئے تو قاصد ڈر گئے کہ کہیں ان پر (قتل کا) الزام نہ لگ جائے۔ وہ عمرو رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر اٹھا لے گئے۔ (گویا انہیں مقابلے میں قتل ہو جانے والا ظاہر کیا۔)''

یہ سند حسن کے درجے سے کم نہیں۔ اس روایت کے مطابق واقعے کی حقیقت اتنی تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کی گرفتاری کا حکم دیا تھا، وہ بھی اس لیے کہ وہ کوفہ میں حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی باغی تحریک کا حصہ بن گئے تھے۔ (گرفتاری کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے۔) وہ بچنے کے لیے موصل کے کسی پہاڑ کے غار میں روپوش ہو گئے۔ جب حکومتی کارندے ان تک پہنچے تو وہ سانپ کے ڈسنے سے وفات پا چکے تھے۔ حکومتی کارندوں نے ان کا سر قلم کر دیا۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ یہ روایت نقل کر کے کہتے ہیں:

هذا اصح مما مرّ فانه ذلک من رواية الكلبي."

''گزشتہ روایات کے مقابلے میں یہ روایت درست ترین ہے، بے شک وہ (نیزے کے نو وار کر کے قتل کرنے والی روایت) ابن کلبی (شیعہ) کی روایت ہے۔''[2]

یہی علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن سکن کے حوالے سے لکھا ہے کہ گرفتاری کے بعد وہ خوف سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس پر لوگ ڈرے کہ ان پر (قتل کی) تہمت نہ لگ جائے، لہٰذا ان کا سر کاٹ کر لے گئے۔[4]

ابن حبان لکھتے ہیں:

"هرب الى الموصل فدخل غارا، فنهشته حية، فقتلته، وبعث الى الغار في طلبه، فوجدوه ميتا."

''وہ موصل کی طرف فرار ہوئے اور ایک غار میں گئے۔ انہیں سانپ نے ڈس لیا، وہ فوت ہو گئے۔ ان کی تلاش میں لوگ غار کی طرف بھیجے گئے، تو انہیں مردہ پایا۔''[5]

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے بھی اپنی سند سے یہ واقعہ اسی طرح لکھا ہے۔[6]

---

① المحن، ص ۱۳۶؛ اسد الغابة: ۲۰۵/۳، ط العلمية

② تاريخ الاسلام للذهبي تدمری: ۸۹/۳؛ بشار: ۴۲۴/۲

③ الاستيعاب: ۱۱۷۳/۳

④ الاصابة: ۵۱۵/۴

⑤ الثقات لابن حبان: ۲۷۵/۳

⑥ تلقيح فهوم اهل الاثر لابن الجوزی، ص ۳۳۰

ابن قتیبہ دینوری نے بھی واقعہ اسی شکل میں بیان کیا ہے۔[1]

ابو یوسف الفسوی نے بھی یہی نقل کیا ہے۔[2]

غور فرمائیے کہ اصل بات کیا ہے اور اسے کیا بنا دیا گیا ہے۔

کیا یہ پہلا سر تھا؟

اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ بعض راویوں کا یہ کہنا کہ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا سر تھا جو کاٹ کر بھیجا گیا، یہ ان کا اپنا تجزیہ ہے۔ اس بارے میں اور بھی آراء موجود ہیں۔ مثلاً:

- سب سے پہلا واقعہ ابوجہل کا سر کاٹنے کا ہے جسے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تھا۔[3]
- سب سے پہلے کعب بن اشرف یہودی کا سر کاٹ کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تھا۔[4]
- سب سے پہلے ابوعزّہ جُمَحی مشرک کا سر کاٹ کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تھا۔[5]
- ایک رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے ایسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا۔ صحیح سند کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایک رومی سردار کا سر پیش کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسے کفار کی مشابہت کی وجہ سے پسند نہیں کیا اور کہا:

"اس بارے میں خط بھیج دینا اور اطلاع دے دینا کافی ہے۔"[6]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسے حرام سمجھتے ہوں گے، کیوں کہ سنت سے اس کی گنجائش مل رہی ہے۔ ہاں انہوں نے اس گنجائش پر عمل مناسب خیال نہیں کیا کہ یہی طرزِ عمل کفار مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں تو مسلمانوں کو الگ سلوک کرنا چاہیے۔

مسلمانوں میں سے سب سے پہلے کس کا سر کاٹا گیا:

یہ تو کفار کے سروں کی بات تھی۔ مسلمانوں کے سروں کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ انہیں قلم کرانے کی ابتداء کس دور میں ہوئی تھی۔

- ایک رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر بھیجا گیا۔ جیسا کہ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

رأیت الحسین بن علیّ اوّل رأس حمل فی الاسلام.

"سب سے پہلے جو سر کاٹا گیا، وہ حسین بن علی کا سر تھا۔"[7]

---

1. المعارف لابن قتیبۃ: ۱/۲۹۲
2. المعرفۃ والتاریخ: ۲/۸۱۳، ط الرسالۃ
3. عمدۃ القاری فی شرح البخاری: ۸/۱۸۰، ط دار احیاء التراث العربی
4. عمدۃ القاری فی شرح البخاری: ۱۳/۷۱ ؛ سمط النجوم العوالی للعصامی: ۲/۱۲۳، ط العلمیۃ
5. عمدۃ القاری فی شرح البخاری: ۱۷/۱۳۳ ؛ التلخیص الحبیر: ۴/۲۸۷، ط العلمیۃ
6. السنن الکبریٰ للنسائی، باب حمل الرؤوس، ح: ۸۶۲۰ بسند صحیح ؛ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۸۳۵۱، ط العلمیۃ
7. المعجم الکبیر للطبرانی: ۳/۱۲۴



ایک رائے یہ ہے کہ پہلی مثال حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سر کی ہے جو عَمرو بن جُرموز نے کاٹ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے دوزخ کی وعید سنائی تھی۔ ①

اب غور فرمالیں کہ اگر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا سر اپنے سامنے دیکھنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بے قصور تھے تو حضرت عَمرو بن حَمِق رضی اللہ عنہ کا سر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچنے سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر الزام کیوں کر آ سکتا ہے، جبکہ ایسا کوئی حکم دونوں حضرات نے نہیں دیا تھا۔

حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہم کے واقعات میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ تینوں نے اس فعل کا حکم نہیں دیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ پہلے دو حضرات کی اس فعل پر ناراضی مذکور ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی ناراضی مذکور نہیں۔ لیکن کوئی بات ذکر سے رہ جائے تو لازمی نہیں کہ وہ ہوئی نہ ہو۔

اگر قیاس کیا جائے تو یہی سمجھ آتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ جیسے بردبار اور شفیق حکمران نے اسے پسند نہیں کیا ہوگا۔ کیوں کہ یہ واقعہ ۵۱ھ کا ہے، اس کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تقریباً نو سال حکومت کرتے رہے اس دوران ان کے کتنے ہی دشمن قتل ہوئے جن میں کفار بھی تھے اور باغی بھی۔ ان میں سے کسی کے سر کا آپ کی خدمت میں ملاحظے کے آنا منقول نہیں۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی رسم جاری کی ہوتی یا اس پر رضامندی کا اظہار کیا ہوتا تو بہت سے سروں کا آپ کو بھیجا جانا منقول ہوتا۔

پس کسی منصف مزاج انسان کو اس کے بعد زیب نہیں دیتا کہ وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر سر کٹوانے کی رسم جاری کرنے کا الزام عائد کرے۔

آمنہ بنت شرید پر ظلم کا افسانہ:

بعض روایات میں قصے کو مزید طول دیا گیا ہے۔ اس واقعے کو ایک دردناک افسانے کی شکل دے کر بیان کیا گیا ہے اور امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے دور کا ہٹلر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان روایات میں ہے کہ عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ گرفتار نہ ہو سکے تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی بیوی آمنہ بنت شرید کو قید کر دیا۔ جب حضرت عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا گیا تو انہوں نے اسے گشت کرایا۔ پھر نہایت بے رحمی سے ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا۔

● سب سے پہلے یہ افسانہ تیسری صدی ہجری کے ایک کذاب راوی عباس بن البکار الضبی (م ۲۲۲ھ) نے اپنی تصنیف ''اخبار الوافدات من النساء علی معاویۃ'' میں نقل کیا تھا۔ ②

اس تصنیف میں ضعیف اور بہت سے من گھڑت قصے بھرے ہیں۔ مصنف نے اس کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی

---

① کنز العمال، ح: ۳۶۶۱۵ ؛ البدایہ والنہایۃ، سن ۳۶ھ

② اخبار الوافدات من النساء علی معاویۃ بن ابی سفیان، ص ۱۵

کوشش کی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس خواتین کا آنا جانا بکثرت تھا۔ وہ پسندیدہ عورتوں سے بے تکلف گپ شپ لگاتے تھے اور مخالفین کی عورتوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بناتے تھے۔ مصنف نے ایک اور کتاب ''اخبار الوافدین من الرجال علی معاویة'' بھی تصنیف کی ہے۔ وہ بھی معیار، مواد اور مقصد کے لحاظ سے اسی قسم کی ہے۔

عباس بن بکار کے متعلق ابن عدی کہتے ہیں: وہ منکر احادیث کو ثقہ راویوں کی طرف منسوب کرتا تھا۔[1]

امام دارقطنی اسے کذاب کہتے ہیں۔

امام عقیلی فرماتے ہیں: ''اس کی روایات وہم اور منکر باتوں سے بھری پڑی ہیں۔''

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''میزان الاعتدال'' میں اس کی باطل اور منکر روایات کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں۔[2]

❷ عباس بن بکار کے بعد عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کے سر کو گشت کرانے اور آمنہ بنت شرید پر ظلم توڑنے کا یہ واقعہ بلاذری (م ۲۷۰ھ) نے بلا سند نقل کیا ہے۔[3]

صاف پتا چل رہا ہے کہ بلاذری نے اسے اپنے پیشرو عباس بن بکار سے نقل کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ بلاذری نے اس کی سند نقل کیوں نہیں کی تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بلاذری خلیفہ متوکل عباسی کے درباری تھے۔ متوکل علمائے اہل سنت کا مداح اور اہل بدعت سے نالاں تھا۔[4] شاید اسی لیے بلاذری عموماً شیعہ راویوں کے نام سند سے حذف کر کے، اکثر ''قالوا'' اور کہیں کہیں ''رُوِیَ'' کہہ کر ایسی روایات نقل کیا کرتے تھے تاکہ عتاب سے بچے رہیں۔

❸ اسی قصے کو شیعہ مؤرخ یعقوبی نے بلا سند بیان کیا ہے۔[5]

❹ چھٹی صدی ہجری میں یہ روایت ابن عساکر نے ابو زکریا، عبداللہ بن مُغیرَہ قرشی، حکم بن موسیٰ، یحییٰ بن حمزۃ، اسحاق بن ابی فروۃ، یوسف بن سلیمان عن جدتہ میمونہ سے نقل کی ہے۔[6]

یہ پوری سند کمزور ترین کڑیوں پر مشتمل ہے۔ یحییٰ ابن حمزہ کو قدری فرقے کا کہا گیا ہے۔ اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروۃ متروک ہے۔[7]

❺ ''تاریخ دِمَشق'' کی پہلی روایت کو اسی سند سے اگلی صدی میں علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[8]

ظاہر ہے، اس سے روایت کا ضعف کچھ کم نہیں ہوگیا۔ اگلی صدی میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایۃ والنہایۃ'' میں اس واقعے کو بلا سند ہی نقل کر دیا ہے۔ بظاہر انہوں نے ''تاریخ دِمَشق'' یا ''اسد الغابۃ'' (لابن اثیر) ہی سے لیا ہے۔

---

① الکامل فی ضعفاء الرجال: ۷۰۶/۲

② میزان الاعتدال: ۳۸۲/۲

③ انساب الاشراف: ۲۷۳/۵، ط دار الفکر

④ سیر اعلام النبلاء: ۳۳/۱۲، ط الرسالۃ

⑤ تاریخ یعقوبی، ص ۲۰۱

⑥ تاریخ دمشق: ۳۰/۶۹، ترجمۃ: آمنہ بنت شرید

⑦ تقریب التہذیب، تر: ۳۶۸

⑧ اسد الغابۃ: ۲۰۵/۳

⑥ ایک اور روایت کے مطابق آمنہ بنت شرید نے حضرت عَمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر اپنی گود میں دیکھا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بددعائیں دیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے دربار میں بلا کر ڈانٹا اور آخر دِمشق سے نکال دیا۔ وہ کوفہ چلی گئیں۔ ①

اس روایت کی سند موجود نہیں۔ صرف اتنا مذکور ہے کہ اسے ابوالحسن علی بن محمد شابشتی نے ذِکر کیا ہے۔ شابشتی ۳۸۸ھ میں فوت ہوئے تھے۔ وہ مصر کی عبیدی شیعہ حکومت کے درباری تھے۔ ② اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس روایت کا وزن کیا ہوگا جو چوتھی صدی ہجری کے ایک شیعہ دربار کے رکن نے نقل کی ہے اور اس سے پہلے کے راوی سراسر مجہول ہیں۔ غرض یہ ایک انتہائی کمزور روایت ہے جو اُمت کی تاریخ میں پہلی بار تیسری اور پھر چھٹی صدی ہجری میں سامنے آتی ہے۔ اس سے پہلے اسے واقدی، ابومخنف، مسعودی، یعقوبی، محمد بن سائب کلبی وغیرہ جیسے متعصب شیعہ بھی بیان نہیں کرتے۔ تو یہ کیسے درست ہوگا کہ صرف بڑی کتب کے نام دیکھ کر ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ایسی گئی گزری زہر آلود روایات بلاتحقیق قبول کرلیں۔

☆☆☆

④ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر حریفوں کو زہر دلوانے کا الزام

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بھی مشہور کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو زہر دے کر ختم کرادیتے تھے۔ اس سلسلے میں درج ذیل واقعات پیش کیے جاتے ہیں:

① انہوں نے مالک بن حارث الاشتر نخعی کو زہر دلوا کر مارا۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے مصر کا گورنر بننے جارہا تھا۔ راستے میں ایک غیر مسلم کاشتکار کے پاس ٹھہرا۔ کاشتکار نے شہد میں زہر ملا کر پلادیا، جس سے اَشتر کی موت واقع ہوگئی۔ ③ یہ کام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کروا سکتے تھے۔

② انہیں اپنے گورنر حضرت عبدالرحمن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی عوام میں مقبولیت سے خطرہ محسوس ہوا تو اپنے نصرانی طبیب ابن اثال کے ذریعے انہیں زہر دلوا کر قتل کرادیا۔ ④

③ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی جَعْدَہ بنت الاشعث کے ذریعے زہر دلوا کر قتل کرایا۔ ⑤ اور اس کام کے بدلے یزید نے جَعْدَہ بنت الاشعث سے نکاح کا وعدہ کیا تھا۔ کام کرانے کے بعد وہ مکر گیا۔ ⑥

حقیقت یہ ہے کہ ان الزامات کے ثبوت کے لیے پیش کیا جانے والا مواد بالکل غیر معتبر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

---

① تاریخ دمشق: ۶۹/ ۴۰، ۴۱
② الاعلام للزِرکلی: ۴/ ۳۲۵
③ تاریخ الطبری: ۴/ ۵۵۳
④ تاریخ الطبری: ۵/ ۲۲۷
⑤ اسد الغابہ: ۲/ ۱۳، الکامل فی التاریخ، سن ۴۹ھ
⑥ المنتظم: ۵/ ۲۲۶

اَشتر نخعی کو زہر دلوانا:

اَشتر نخعی کو زہر دلوانے کی روایت ابو مخنف کی ہے جو متروک ہے۔ پھر اگر اسے مان بھی لیا جائے تو تاریخی روایات تواتر سے ثابت کرتی ہیں کہ یہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں پیش پیش اور فساد کی آگ بھڑکانے میں سب سے آگے تھا۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے تنگ آگئے تھے۔ اس کا یہ انجام کچھ غلط نہ تھا۔

عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے کی حقیقت:

حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے کا واقعہ طبری نے جس سند سے نقل کیا ہے اس میں ایک راوی علی (علی بن محمد) ہیں جن کے قابل اعتبار ہونے نہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ دوسرے مسلمہ بن محارب جو مجہول الحال ہیں یعنی ان کی ذات تو معروف ہے، حالات نامعلوم ہیں۔ گویا مجموعی طور پر سند کمزور ہے۔

پھر اس الزام کے جھوٹے ہونے کا ثبوت خود طبری کی اگلی روایت سے مل جاتا ہے۔ الزام پر مشتمل روایت طبری میں سن ۴۶ ہجری کے تحت ہے۔ اس کے بعد سن ۴۸ ہجری کے حالات میں طبری نے کئی جہادی مہمات کا حال اور ان کے سپہ سالاروں کے نام لکھ کر بتایا ہے: وعلی جمیعھم خالد بن عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید....

"ان سب کے سپہ سالار اعلیٰ خالد تھے جو عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے بیٹے تھے۔"[1]

اگر عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہ کو زہر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے دلوایا ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ مقتول کے صاحبزادے پھر بھی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے وفادار رہتے، ان کے لیے سر ہتھیلی پر رکھ کر جنگیں لڑتے۔

اگر کوئی کہے کہ خالد بن عبدالرحمٰن کو اصل سازش کا علم نہیں ہوگا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایک ڈیڑھ صدی بعد مسلمہ بن محارب کو سازش کا پتا کیسے چل گیا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ بیٹے کو جو فوج کا سالار تھا، اتنی بڑی حقیقت کا علم نہ ہو۔

یاد رہے کہ اس زہر دلانے والی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت خالد بن عبدالرحمٰن برابر قاتل کی کھوج میں رہے اور آخر حمص جا کر اسے ٹھکانے لگا دیا۔ یہ قاتل نصرانی تھا۔ اس کا نام ابن اُثال تھا۔ قانون کو ہاتھ میں لینے پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے خالد بن عبدالرحمٰن کو کچھ دن تنبیہ کے لیے حراست میں رکھا اور پھر کسی سزا کے بغیر چھوڑ دیا۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خالد بن عبدالرحمٰن اپنے باپ کے قتل میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ملوث نہیں سمجھتے تھے، ورنہ ابن اُثال کی بجائے وہ سیدھا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ہدف بنانے کی کوشش کرتے۔

رہی یہ بات کہ پھر اصل سازش کس کی تھی؟ تو ممکن ہے قیصر نے اس نصرانی طبیب کی مدد سے یہ کارروائی کرائی ہو تاکہ حضرت سیف اللہ خالد رضی اللہ عنہ سے کھائی گئی شکستوں کا بدلہ ان کی اولاد سے لیا جاسکے۔ واللہ اعلم۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ان کی اہلیہ جَعدَہ بنت الاشعث کے ذریعے زہر دلوانے کا الزام بھی غلط ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پیچھے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں شبہات کے تحت گزر چکی ہے۔

[1] تاریخ الطبری: ۲۲۱/۵

⑤ حضرت حُجر ابن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں سوالات

﴿سوال﴾ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر رضی اللہ عنہ کو بغاوت کے الزام میں قتل کیوں کیا؟ اوّل تو وہ ایک صحابی یا دوسرے قول کے مطابق کم از کم ایک عابد وزاہد تابعی ضرور تھے، ثانیاً وہ گرفتاری دے چکے تھے اور باغی قیدی کا قتل جائز نہیں۔

﴿جواب﴾ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ کسی کی بزرگی کے باعث شرعی سزا ساقط نہیں ہوجاتی۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے حضرت حُجر کو سزا دینے پر اعتراض کے جواب میں لکھا ہے: ''جہاں تک عبادت وزہد کا تعلق ہے، تو وہ اس بات کی وجہِ جواز نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کی جائے۔''[1]

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ باغی قیدی کا قتل اس وقت ناجائز ہے جب اس کی پارٹی کی قوت اور جمعیت ختم ہوگئی ہو اور اسے زندہ رکھنے میں کسی فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اسی طرح (باغی) قیدی کو قتل نہیں کرتے جب کہ اس کا گروہ باقی نہ رہا ہو۔ اگر اس کا گروہ موجود ہو تو کوئی حرج نہیں کہ ان کے قیدی کو قتل کردیا جائے اس لیے کہ ان کا شر ختم نہیں ہوا بلکہ وہ مجبور ہوگیا ہے۔ اگر چھوٹ گیا تو اپنے گروہ سے جا ملے گا۔ پس جب حکمران اسے قتل کرنے میں مصلحت سمجھے تو کوئی حرج نہیں کہ اسے قتل کردے۔''[2]

''عالمگیری'' میں ہے کہ ان میں سے جو قیدی بنایا جائے تو اسے قتل کرنا جائز نہیں جب کہ معلوم ہو کہ وہ کسی مضبوط گروہ سے نہ ملے گا۔ لیکن اگر معلوم ہو کہ اگر اسے قتل نہ کیا تو وہ کسی مضبوط گروہ سے جا ملے گا تو حاکم اسے قتل کرسکتا ہے۔''[3]

حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کی جمعیت موجود تھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خدشہ تھا کہ ان کو زندہ رکھا تو لوگ ان کے گرد جمع ہو کر فتنہ پھیلائیں گے، چنانچہ وہ مالک بن ہُبیرہ سے فرماتے تھے: ''حُجر بن عدی باقی رہے تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی طرف ابھاریں گے اور یہ بات مسلمانوں کے لیے حجر کے قتل کی بہ نسبت کہیں زیادہ فتنے کا باعث بنے گی۔''[4] یہ بھی فرمایا: ''تمہارا چچازاد حُجر قوم کا رئیس ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اگر میں انہیں چھوڑ دوں تو مجھ پر میرا ملک تنگ کردیں گے۔''[5] ایک بار کہا: ''ان کا ساتھ دینے والے ایک لاکھ افراد کو قتل کرنے کی بہ نسبت مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ انہیں قتل کردوں۔''[6]

---

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۹۳

② "وکذلک لایقتلون الاسیر اذا لم یبق لهم فئة. وان کانت له فئة فلا باس بان یقتل اسیر هم لانه ما اندفع شره ولکنه مقهور. ولو تخلص انحاز الی فئته فاذا رأی الامام المصلحة فی قتله فلا باس بان یقتله." (المبسوط للسرخسی: ۱۰/۱۲۵، دار الفکر بیروت)

③ "ومن اسر منهم فلیس للامام ان یقتله اذا کان یعلم ان لولم یقتله لم یلتحق الی فئة ممتنعة اما اذا کان یعلم انه لو لم یقتله یلتحق الی فئة ممتنعة فیقتله." (الفتاوی الهندیة المعروف بفتاوی عالمگیری: ۲/۲۸۳، ط دار الفکر)

④ "ان حُجر بن عدی لو قد بقی خشیت ان یکلفک واصحابک الشخوص الیه وان یکون ذلک من البلاء علی المسلمین ماهو اعظم من قتل حجر." (تاریخ الطبری: ۵/۲۷۸)

⑤ ان ابن عمک حجراً رأس القوم و اخاف ان خلیت سبیله ان یفسد علی مصری. (تاریخ الطبری: ۵/۲۷۳)

⑥ قتله احب الی من ان اقتل معه مائة الف." (البدایة والنهایة: ۱۱/۲۳۹)

حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے واقعۂ قتل میں ابومخنف کی کذب بیانیاں:

﴿سوال﴾ حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے قصے میں ابومخنف نے بڑی تفصیل بیان کی ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ یہ روایات طبری میں موجود ہیں۔

﴿جواب﴾ ان روایات میں جگہ جگہ جعل سازی سے کام لے کر واقعے کی شکل مسخ کی گئی ہے۔ چند اہم غلط بیانیاں درج ذیل ہیں۔ ابومخنف بتاتا ہے کہ:

☆ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ خلافت کو آلِ علی ہی کا حق تصور کرتے تھے۔

☆ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے خلاف چارج شیٹ میں زیاد نے یہ بھی لکھوایا تھا کہ انہوں نے کھلم کھلا ارتکاب کفر کیا ہے۔

☆ زیاد نے اپنے من مانے الفاظ پر شہادتیں دلوائی تھیں۔

☆ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ملزمان سے ملے بغیر اوران کی بات سنے بغیر فیصلہ سنایا تھا۔

☆ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی پیش کش تھی کہ جو ملزم حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تبرا اور لعنت کرے اسے چھوڑ دیا جائے۔

☆ زیاد نے حضرت حجر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں کوفہ کے شرفاء پر شدید تشدد کیا تھا۔

☆ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے چھ ملزمان کو امراء کی سفارشوں پر چھوڑ دیا تھا۔ حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے لیے مالک بن ہُبیرہ نے سفارش کی مگر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مسترد کردی۔

یہ اضافے ایسے ہیں کہ ان میں اکثر کی تردید صحیح روایات سے ہوجاتی ہے۔ بعض چیزیں اسلامی عقائد کے خلاف ہیں مثلاً خلافت کو آلِ علی کے لیے مخصوص سمجھنا۔ بعض چیزیں عظیم المرتبت شخصیات کے معروف اخلاق کے خلاف ہیں۔ اس لیے ضعیف روایات کے بل بوتے پر انہیں قابلِ قبول ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ مشہور قول کے مطابق صحابی تھے۔ دوسرے قول کے مطابق جلیل القدر تابعی تھے۔ ادھر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں۔ ایک جلیل القدر شخصیت نے دوسرے بزرگ کو قتل کرادیا۔ اب ہم کسے صحیح قرار دیں اور کسے گمراہ کہیں؟

﴿جواب﴾ ہم حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبے کا انکار کرسکتے ہیں نہ ان کے اقدامات پر کسی گمراہی کا عنوان چسپاں کرنا درست ہوگا۔ ان کے مقام کو دیکھتے ہوئے ان کی لغزش کو اجتہادی غلطی کہنا ہی موزوں ہے۔

اسی طرح حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس قضیے میں جو فیصلہ کیا اپنے طور پر امت کی مجموعی فلاح اور سلامتی کو مدنظر رکھ کر کیا۔ مگر وہ فرشتے یا نبی نہ تھے کہ ان سے غلطی کا صدور ممکن نہ ہو۔ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں معصوم عن الخطاء ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قضیے میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا آخری حکم نامہ ظاہر کرتا ہے کہ



انہوں نے اپنے پہلے فیصلے کو مرجوح سمجھا تھا اور آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سفارشی مراسلہ ملنے پر اس فیصلے سے رجوع کر کے حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی سزائے موت معاف کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ مگر تب تک تقدیر کا فیصلہ نافذ ہو چکا تھا اور حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ پر سزائے موت جاری ہو چکی تھی۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ہمیشہ احساس رہا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سفیر نے پوچھا: ''آپ نے حُجر بن عدی کو جیل میں کیوں نہ ڈال دیا؟'' تو آپ نے فرمایا: ''کیوں کہ میرے لوگوں میں تم جیسے موجود نہ تھے۔''[1] مروان بن حکم نے تنقید کی کہ ''آپ کی فکر ونظر اور بردباری کہاں چلی گئی تھی؟'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''تم میرے پاس نہیں تھے۔''[2] آپ رضی اللہ عنہ عمر بھر حضرت حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کو یاد کیا کرتے رہے۔[3]

وفات کے وقت آپ نے یزید بن اسد کو دعا دی جنہوں نے آپ کو حجر رضی اللہ عنہ سے درگزر کا کہا تھا اور ان کے بیٹے عبداللہ کو فرمایا: ''اللہ تمہارے والد پر رحم کرے، وہ خیر خواہ تھے، انہوں نے مجھے حُجر بن عدی کے قتل سے منع کیا تھا۔''[4]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس احساسِ ندامت اور اعترافِ خطا سے ان کی عظمت اور وسیع الظرفی ثابت ہوتی ہے۔ پس یہ بالکل نازیبا ہوگا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پورے بیس سالہ دورِ حکومت کے مثالی عدل وانصاف، امن وامان اور فتوحات وترقی کے ان گنت ابواب کو نظر انداز کر کے صرف اِکا دُکا فیصلوں کی وجہ سے انہیں ہدفِ ملامت بنالیا جائے اور ان کے دورِ حکومت کو ظالمانہ دورِ حکومت کا نام دے دیا جائے۔

غلطی تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے بھی ہوئی تھی کہ بنو جذیمہ کے ان افراد کو مار ڈالا تھا جو ایمان کا اظہار کرنے کے لیے ''اَسْلَمْنَا'' کی جگہ ''صَبَأْنَا'' (ہم برگشتہ ہوئے) کا لفظ کہہ گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے براءت تو ظاہر فرمائی مگر ان کو فاسق یا ظالم قرار نہیں دیا۔[5]

غلطی حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی ہوئی تھی کہ دورانِ جنگ ایک شخص کو کلمہ طیبہ پڑھنے کے باوجود قتل کر دیا کہ شاید وہ مکاری کر رہا ہے۔[6] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر غصے کا تو اظہار کیا مگر ان کو کوئی سزا نہیں دی، کیوں کہ دونوں واقعات میں ارادہ نیکی کا کیا گیا تھا، مگر گمان یا معلومات کی غلطی کی وجہ سے فعل غلط ہو گیا۔ ایسے معاملات سے انسان کو سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ غلطیوں سے ہمیشہ بچنا ناممکن ہے۔

اس لیے ان سب حضرات کے اقدامات کو اجتہاد پر محمول کر کے ان کے متعلق اچھا گمان رکھنا چاہیے۔

☆☆☆

---

① الاستیعاب: ۳۲۹/۱ ط دار الجیل ؛ تھذیب الکمال: ۴۲/۱۷، ۴۳، ط الرسالۃ

② تاریخ دمشق: ۲۳۰/۱۲

③ مستدرک حاکم، ح: ۵۹۸۰ ... وما دخلنا معہ علیہ (ای مع جریر علیٰ معاویۃ) الا ذکر قتل حُجر بن عدی.

④ تاریخ دمشق: ۲۳۱/۱۲ ؛ البدایۃ والنھایۃ: ۲۴۲/۱۱ بسند حسن

⑤ صحیح البخاری، ح: ۴۳۳۹، کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ خالد بن الولید

⑥ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم القتل الکافر بعد ان قال لا الہ الا اللہ.

⑥ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی مہم

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر سب سے شدید اعتراض یہ ہے کہ ان کے دور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سادات کی توہین و تنقیص کی مہم چلائی گئی۔ ان کے گورنر جمعے کے خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بذاتِ خود اس شر انگیزی کی سرپرستی کرتے تھے اور صحابہ کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اس گناہ میں شریک ہوں۔

مذکورہ اعتراض کا جواب دینے سے قبل ہم تین اصولی باتیں ذکر کر دینا چاہتے ہیں:

❶ سب وشتم کا مطلب:

''سب'' اور ''شتم'' اکثر گالی دینے یا ڈانٹنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ بددعا دینا اور لعنت ملامت کرنا بھی اس میں شامل ہے۔[1] اردو میں ہم اسے برا بھلا کہنے، یا درشت کلامی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ''القاموس الجدید'' میں ہے: سبٌّ: گالی دینا، برا کہنا، عیب لگانا، آڑے ہاتھوں لینا۔ شتم: گالی دینا۔[2]

تاہم ضروری نہیں کہ سب وشتم کرنے میں ہر شخص کا معیار ایک ہو۔ بازاری لوگ اس میں فحش گالیاں بھی دے ڈالتے ہیں جبکہ شریف اور شائستہ لوگ محتاط الفاظ میں برا بھلا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ نیز جس شخص کو ''سب وشتم'' کیا جائے، اس کے لحاظ سے بھی صورتحال بدل جاتی ہے۔ ایک منفی لفظ کسی عام آدمی کے لیے شاید گالی نہ سمجھا جائے، مگر وہی لفظ کسی بڑی شخصیت کے لیے گالی مانا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی گنوار کو ''جاہل'' یا کسی چپراسی کو ''احمق'' کہہ دیا جائے تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔ مگر کسی لیڈر پر یہی الفاظ چسپاں کیے جائیں تو اس کے مداح اسے بدگوئی بلکہ گالی شمار کریں گے۔ البتہ اس کے مخالفین اسے ''اظہارِ حقیقت'' سے تعبیر کریں گے، ان کی نگاہ میں یہ بدگوئی نہیں ہوگی۔

سب وشتم سے ملتا جلتا لفظ ''نال منہ'' ہے۔ اس کا مطلب برا بھلا کہنا، غیبت کرنا یا الزام لگانا ہے۔[3]

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سب وشتم کا مطلب ہر جگہ برا بھلا کہنا یا گالیاں دینا نہیں ہوتا۔ بلکہ عربی زبان میں بعض اوقات معمولی اعتراض، تنقید یا تنبیہ کو بھی لفظ ''سبّ'' سے تعبیر کر دیتے ہیں۔[4] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ

---

① الشتم قبیح الکلام و لیس فیہ قذف۔ (تاج العروس للزبیدی: ۳۲/۴۵۳، تھذیب اللغۃ لابی منصور الازھری: ۱۱/۲۲۵)
الشتم تقبیح امر المشتوم بالقول والسب ھو الاطناب فی الشتم۔ (الفروق اللغویۃ للعسکری، ص ۵۲)

② القاموس الجدید، عربی اردو، ص ۳۵۶، ۳۰۶

③ فلان نال من عرض فلان اذا سبہ نال منہ وعابہ وقطعہ بالغیبۃ والبھتان۔ (تھذیب اللغۃ: ۱۵/۲۶۷، ۸/۶۷)

④ تبوک کے سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تاکید کی تھی کہ کل تبوک کے چشمے پر پہنچ کر کوئی مجھ سے پہلے اس کے پانی کو نہ چھوئے، دو صحابہ نے قافلے سے آگے نکل کر پانی کو چھو لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو انہیں ''سبّ'' کیا۔ فسألھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ھل مسستما من مائھا شیئا؟ قالا: نعم، فسبھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم (صحیح مسلم، ح: ۶۰۸۶، کتاب الفضائل باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ظاہر ہے یہاں (نعوذ باللہ) گالیاں دینا نہیں بلکہ تنبیہ کرنا ہی مراد ہے۔

دوسرے طبقے کے لیڈر پر معمولی تنقید کرے مگر اس لیڈر کے مداح اسے سب وشتم سے تعبیر کریں۔ پس صحابہ کے ایک دوسرے کے متعلق الفاظ کو اگر کہیں کسی راوی نے شتم، نال اور یسب جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہو تو فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے معنیٰ لعنت بھیجنا یا گالم گلوچ نہیں لیا جائے گا جب تک کہ کسی صحیح روایت کے صریح الفاظ سے یہ ثابت نہ ہو۔ عام طور پر اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کسی معاملے میں اختلاف کی وجہ سے ایک نے دوسرے پر تنقید کی۔ اگرچہ بشر ہونے کے ناطے کبھی برا بھلا کہنے کی نوبت آجانا بھی ممکن ہے۔ مگر عام مواقع پر سب وشتم سے گالیاں دینا مراد نہیں لیا جائے گا۔ سوائے اس کے کہ کسی معتبر روایت میں ایسے الفاظ کی صراحت ہو۔

❷ جنگ کے زمانے میں جراحات اللسان:

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر آپس میں برسرِ پیکار تھے اور کبھی میدانِ صفین اور کبھی سرحدی جھڑپوں میں باہم تلوار چل رہی تھی تو اس دور میں فریقین کے مابین ''جَرَاحاتُ اللِّسان'' کا جاری رہنا، ایک بدیہی بات ہے۔[1] معمولی لڑائی جھگڑے میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ دو افراد چپ چاپ بیٹھے رہیں اور پھر یک دم ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں۔ پہلے زبان حرکت میں آتی ہے۔ اختلافِ رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر جب زبانی کلامی بات طے نہیں ہوتی تب دست درازی ہوتی ہے۔ ملکوں کی لڑائیوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے مگر ذرا سلیقے کے ساتھ۔ پہلے اختلاف کا اظہار زبانی وتحریری ذرائع سے ہوتا ہے۔ سفیروں کے ذریعے گفتگو ہوتی ہے۔ جب جنگ ناگزیر ہو جائے تو اپنے اپنے حامیوں کی جانثاری کو پختہ کرنے کے لیے فریقِ مخالف کی غلطی کو بھرپور انداز میں واضح کیا جاتا ہے تاکہ اپنے لوگ جان لیں کہ وہ حق کے لیے لڑ رہے ہیں جبکہ فریقِ مخالف حق کی مخالفت کر رہا ہے۔ جنگ کے بعد بھی یہ ماحول کسی نہ کسی حد تک باقی رہتا ہے۔ البتہ عوام کی لڑائی اور حکمرانوں کی جنگوں میں یہ واضح فرق ہمیشہ رہا ہے کہ عوام لڑائی سے پہلے، اس کے دوران اور اس کے بعد بھی ایک دوسرے کو بے نقط سناتے ہیں۔ جبکہ حکمرانوں کا اندازِ کلام جنگ وجدال میں بھی مختلف ہوتا ہے۔ كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَام. (بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے)

حکمران اپنے مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے اختلاف کا اظہار بھی شائستہ اور مناسب انداز میں کرتے ہیں۔ تنقید بھی باوقار پیرائے میں کیا کرتے ہیں۔ (کوئی بہت ہی گرا پڑا حاکم ہوگا جو مخالف کو مغلظات بکنے پر اتر آتا ہو۔) مگر ان کے نائبین اور افسران کبھی ان کی محبت وعقیدت میں ڈوب کر اور کبھی خوشامد کے طور پر مخالفین کی مذمت کھلے الفاظ میں کرتے ہیں۔ عادل اور نیک سیرت حکمران اسے بھی پسند نہیں کرتے مگر ہر موقع پر وہ ایسے درباریوں اور نائبین کا مواخذہ بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں نائبین بددل ہو کر حریف سے نہ جا ملیں۔

---

① قال الامام ابن تيمية في رد دعوى الروافض: واما ماذكره من لعن عليّ فان التلاعن وقع من الطائفتين كما وقعت المحاربة وكان هؤلآء يلعنون رؤوس هؤلآء في دعائهم وهؤلآء يلعنون رؤوس هؤلآء في دعائهم، وقيل: ان كل طائفة كانت تقنت على الاخرى، والقتال باليد اعظم من التلاعن باللسان، وهذا كله سواء ذنبا كان او اجتهادا مخطئا او مصيبا فان مغفرة الله ورحمته تتناول ذلك بالتوبة والحسنات الماحية والمصائب المكفرة وغير ذالك. (منهاج السنة: ۴/ ۴۶۸)

یہ عام حکمرانوں کی بات ہے جبکہ صحابہ کرام اخلاق وشرافت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے ماحول میں بھی ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حسنِ کلام، اخلاق اور شائستگی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس دوران دونوں حضرات سے کوئی ایک فقرہ بھی ایسا منقول نہیں جسے گالی گلوچ کہا جا سکے۔

پھر جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ شرف وعظمت میں بڑھے ہوئے تھے، اسی طرح اخلاق وانصاف کا معیار بھی ان کے ہاں زیادہ بلند دکھائی دیتا ہے، چنانچہ نہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ بلکہ اُن کے اعلیٰ افسران بھی اپنے مخالفین کے حق میں کوئی ایسا جملہ سننے کے روادار، نہ تھے جو جادۂ شریعت سے سرِ مو متجاوز ہو۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے آواز لگائی ''خدایا! شام والوں پر لعنت فرما۔'' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''شام والوں کو برامت کہو۔ ان میں ابدال (جلیل القدر اولیاء) موجود ہیں۔''①

جب جنگِ صفین میں کسی نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے سامنے کہا: ''شام والے کافر ہوگئے ہیں۔'' تو انہوں نے تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''ہمارا اوران کا نبی ایک ہے اور قبلہ بھی ایک ہے، مگر وہ لوگ فتنے کا شکار ہیں۔''②

تاہم اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض افسران وسپاہ اور عوام کو (چاہے وہ کسی بھی صف میں ہوں) جنگ کے زمانے میں زبانوں پر قابو نہیں (نہ ہی ہر کسی سے اتنی اخلاقی بلندی کی توقع کی جاسکتی ہے) پس اگر ان سے ایک دوسرے کے بڑوں کے خلاف بدگوئی ثابت ہو تو اس سے صحابہ کرام کے اخلاق پر کوئی جرح ثابت نہیں ہوتی۔③

یہ اس دور کی ''جَرَاحَاتُ اللِّسَان'' کا پسِ منظر تھا جب جنگیں جاری تھیں۔

④ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بن جانے کے بعد کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ساداتِ کرام پر سب وشتم ہوتا تھا؟

ایک طبقہ کہتا ہے کہ خود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے نائبین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ساداتِ کرام پر سب وشتم کے مرتکب تھے، جمعے کے خطبوں میں بھی یہ بدگوئی ہوتی تھی اور ان کی مجالس بھی اس برائی سے آلودہ رہتی تھیں۔

دوسری طرف کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے افسران اور ہم مجلسوں میں سے بھی کوئی اس برائی کا مرتکب نہ تھا بلکہ بنوامیہ کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ یا ساداتِ کرام کو برا بھلا کہنا قابلِ برداشت نہ تھا۔

ہماری نگاہ میں دونوں آراء افراط وتفریط پر مشتمل ہیں۔ حدیث کی صحیح وحسن روایات اور اسی طرح صحیح تاریخی روایات سے جس قدر بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ: ''بعض اموی متشدد گورنر سب وشتم کرتے تھے جب کہ محتاط حضرات اس سے احتراز کرتے تھے۔ سب وشتم کوئی سرکاری پالیسی یا لازمی حکم نہ تھا کہ ہر گورنر پر لازم ہوتا۔''

---

① مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد، ح: ۲۰۴۵۵، ط المجلس العلمی پاکستان

② مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۴۱، ط الرشد

③ کان ثور بن یزید شهد جده صفین وقتل یومئذ فکان ثور اذا ذکر علیا قال لا احب رجلا قتل جدی. (طبقات ابن سعد: ۷/۴۵۷)

مروان بن الحکم کا سب وشتم کرنا ثابت ہے یا نہیں؟

﴿سوال﴾ جب مروان بن الحکم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا گورنر تھا تو کیا اس دور میں اس کا سب وشتم کرنا ثابت ہے؟ اور کیا یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اس کا حکم دیا ہو؟

﴿جواب﴾ یہ ہرگز ثابت نہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اس فعلِ شنیع کا حکم دیا ہو۔ البتہ خود مروان کا اس حرکت میں ملوث ہونا ثابت ہے۔ درج ذیل صحیح اور حسن روایات اس کی دلیل ہیں:

❶ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کو مروان بن حکم نے کہا: ''ہمارے آقا یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جس قدر دفاع آپ کے آقا یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا، اتنا کسی نے نہیں کیا۔''

حضرت زین العابدین نے پوچھا: ''پھر تم انہیں منبروں پر برا بھلا کیوں کہتے ہو؟''

مروان نے کہا: ''ہماری حکومت اس کے بغیر نہیں چلتی۔'' (روایت کی سند صحیح ہے۔)[1]

❷ عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص فرماتی ہیں کہ مروان بن الحکم حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے آرہا تھا، ان کے پاس حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے جو مروان کے قاضی تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اسے واپس لوٹا دو۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''سبحان اللہ! قریش کا بڑا آدمی اور شہر کا حاکم آپ کی عیادت کے لیے آرہا ہے۔ کیا اس کے آنے کا حق یہ ہے کہ آپ اسے لوٹا دیں!''

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اچھا اسے آنے دو۔''

جب مروان اندر داخل ہوا اور سعد رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو چہرہ اپنی بیٹی عائشہ کی چارپائی کی طرف پھیر لیا۔

---

① حدثنا ابن الاصبھانی قال انا شریک عن محمد بن اسحاق، عن عمر بن علی بن الحسین عن علی بن الحسین قال لی مروان بن الحکم، ماکان فی القوم احدٌ ادفع عن صاحبنا یعنی عثمان بن عفان من صاحبکم یعنی علی بن ابی طالب، قلت: فما بالکم تسبونہ علی المنابر، قال: لا یستقیم الامر الا بذاک (التاریخ الکبیر السفر الثانی: ۲/۷/۱۹)

احوالِ رواۃ: ● ابن الاصبھانی، محمد بن سعید: (م ۲۰۰ھ) بخاری ومسلم کے راوی، ثقہ (تقریب التھذیب، تر: ۵۹۱۱)

❷ شریک بن عبداللہ نخعی: (م ۱۷۷ھ) مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد کے راوی۔ امام بخاری نے تعلیقاً روایت لی ہے۔ صدوق (تقریب التھذیب، تر: ۲۷۸۷)

❸ محمد بن اسحاق: (م ۱۵۰ھ) مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد کے راوی، امام بخاری نے تعلیقاً روایت لی ہے۔ صدوق (تقریب التھذیب، تر: ۵۷۲۵) نوٹ: محمد بن اسحاق شریک سے عمر میں بڑے اور ان کے شیخ ہیں مگر ان سے روایت بھی لیتے ہیں۔

❹ عمر بن علی بن الحسین: (م ۱۲۰ھ) مسلم، نسائی ترمذی کے راوی، ثقہ (تھذیب الکمال ۲۱/۴۶۶)

❺ علی بن الحسین، امام زین العابدین: کسی تعارف کے محتاج نہیں

بعض علماء نے شریک اور محمد بن اسحاق میں معمولی ضعف مانا ہے مگر ان دونوں کی روایت امام مسلم نے لی ہے۔ پس ان کی موجودگی صحیح سند کے منافی نہیں، اس لحاظ سے روایت کا درجہ صحیح سے کم نہیں، حافظ ذہبی نے اس سند کو ''قوی'' شمار کیا ہے۔ (تاریخ الاسلام: ۳/۴۶۱، تدمری)

اسی روایت کو ابن عساکر نے ابوبکر بن ابی خیثمہ سے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا اس میں بھی کوئی ضعیف راوی نہیں۔ (تاریخ دمشق: ۴۲/۴۳۸)

یہی روایت امام بلاذری نے عن شریک عن محمد بن اسحاق عن عمر بن علی کی سند سے یوں نقل کی ہے۔ قال مروان لعلی بن الحسین: ماکان احد اکف عن صاحبنا من صاحبکم قال: فلم تشتمونہ علی المنابر فقال: "لا یستقیم لنا ھذا الا بھذا." (انساب الاشراف: ۲/۱۸۴)

پھر ان پر کپکپی طاری ہوگئی اور وہ بولے: ''اے مروان! تیرا بُرا ہو۔ یہ لوگ یعنی اہلِ شام اس کے باوجود کہ تم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرتے ہو، تمہارے مطیع ہیں۔''

یہ سن کر مروان غصے سے اٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔ (روایت کی سند صحیح ہے۔)[1]

❷ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں مروان نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کہا: تم اہلِ بیت ملعون ہو۔ جواب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیرے باپ حکم پر اللہ کے نبی نے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اُس کی پشت میں تھا۔'' (روایت کی سند حسن ہے۔)[2]

❸ عمیر بن اسحٰق کہتے ہیں مروان ۶۰ ہجری میں مدینہ میں ہمارا امیر تھا، وہ جمعوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرتا تھا۔'' اس کے بعد روایت میں تفصیلی قصہ ہے کہ مروان نے قاصد بھیج کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گالیاں دلوائیں، حسن رضی اللہ عنہ نے صبر کیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو مروان کو کہلوایا کہ تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنتی کہا ہے۔[3]

---

① "فلما دخل مروان وابصره سعد، تولی بوجهه نحو سریرابنته عائشة،فارعد سعد وقال: ویلک یامروان انه طاعتک یعنی اهل الشام علی نم علی بن ابی طالب، فغضب مروان فقام وخرج مغضبا." (التاریخ الکبیرلابن ابی خیثمة ،السفر الثالث: ۲/۷۳، اسنادہ متصل صحیح)

ہال رواۃ: ● عائشہ بنت سعد: ثقہ۔ ۱۱۷ھ میں بعمر ۸۴ برس فوت ہوئیں۔ (تقریب التھذیب، تر: ۸۶۳۴ ؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۷/ ۳۹۲

ابراہیم بن مسار: صحیح مسلم کے راوی، ۱۵۰ھ میں وفات پائی، ثقہ۔ (تھذیب الکمال: ۲۸/ ۵۸۳، ۵۸۴) ● یعقوب بن جعفر بن ابی کثیر: نسائی کے ہاں مجہول۔ (تقریب التھذیب، تر: ۷۸۱۴) ● ابراہیم بن المنذر: امام بخاری کے استاد، ثقہ۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۶۸۹، ط الرسالۃ)

② طبقات ابن سعد، متمم الصحابة، الطبقة الخامسة: ۱/ ۴۰۲، ط مکتبة الصدیق ؛ واخرجه ابن عساکر فی تاریخ دمشق: ۵۷/ ۲۴۳

اس روایت کو بعض حضرات نے اس بناء پر مسترد کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی کو بددعا دیتے بھی تھے تو اس کی شدید سرکشی کی وجہ سے۔ کسی شخص کی پیدائش اور اس کے برائی کرنے سے ہی پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بددعا اور لعنت کیسے دے سکتے ہیں۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد لعنت کرنا نہیں بلکہ ملعون ہونے کی پیش گوئی کرنا مراد ہے۔

ابن سعد نے اسے اخبرنا عفان بن مسلم، قال حدثنا حماد بن سلمه، قال اخبرنا عطاء بن سائب عن ابی یحییٰ کی سند سے نقل کیا ہے۔

عفان بن مسلم صحیحین کے، حماد بن سلمہ مسلم کے اور عطاء بن سائب بخاری کے راوی ہیں، تینوں ثقہ ہیں، مگر تینوں کا حافظہ آخر میں کچھ نہ کچھ کمزور ہو گیا تھا (تقریب التھذیب، التراجم: ۴۶۲۵، ۱۴۹۹، ۴۵۹۲) ابو یحییٰ الاعرج (زیاد) بھی ثقہ ہیں۔ (تہذیب الکمال: ۹/ ۵۲۶) اس لیے روایت کا درجہ حسن سے کم نہیں۔

③ عن عمیر بن اسحٰق قال کان مروان بن الحکم امیرا علینا بالمدینة ستین فکان یسب علیا کل جمعة علی المنبر. (طبقاتِ ابن سعد، متمم الصحابة، الطبقة الخامسة: ۱/ ۳۹۹ ؛ تاریخ الاسلام للذھبی، ط تدمری: ۵/ ۲۳۱ ؛ بشار: ۲/ ۷۰۶ ؛ تاریخ دمشق: ۵۷/ ۲۴۳)

الاسناد: ابو بکر محمد بن عبدالباقی، عن ابی محمد الجوهری، عن ابی عمرو بن حیویة، عن احمد بن معروف، عن حسین بن فهم، عن محمد بن سعد، اسماعیل بن ابراهیم الاسدی، عن عبدالله بن عون، عن عمیر بن اسحق.

یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ سند کی کمزوری کی وجوہ درج ذیل ہیں:

ابن سعد اسے ابن عون کے واسطے سے عمیر بن اسحٰق سے نقل کرتے ہیں یعنی واقعے کے اصل راوی عمیر بن اسحٰق ہیں۔ ان کی ثقاہت پر اصحابِ جرح وتعدیل کو اطمینان نہیں۔ وہ مدینہ کے بتائے جاتے تھے مگر مدینہ کے اہلِ علم ان کی روایت قبول نہیں کرتے تھے۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال: ۶/ ۱۳۳ ؛ طبقات ابن سعد: ۷/ ۲۲۰، ط صادر) ان کی روایات کو صرف عبداللہ بن عون نے نقل کیا ہے، کسی اور نے نہیں۔ اسی لیے محدثین کے ہاں یہ غیر معروف شخصیت ہیں، لہٰذا جرح وتعدیل کے امام یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں: عمیر بن اسحق لایساوی شیا وہ کسی شمار میں نہیں۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال: ۶/ ۱۳۳)

ابن عساکر کی طویل سند میں مذکور حسین بن الفہم (م ۲۸۹ھ) کے بارے میں دارقطنی فرماتے ہیں: ''لیس بالقوی.'' (تذکرة الحفاظ: ۲/ ۱۸۳)

حسین بن الفہم کے شاگرد احمد بن معروف ہیں، ان کی روایات بکثرت تاریخ بغداد، تاریخ دمشق اور دیگر کتب میں ملتی ہیں مگر خود ان کی توثیق یا جرح کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے سکوت اختیار کیا ہے۔ ابوعمرو بن حیویہ ثقہ مگر ہر قسم کی روایات نقل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ایک کی جگہ دوسری روایت بیان کر دیتے تھے۔ واقدی کی روایات کی اشاعت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ (لسان المیزان: ۵/ ۲۱۴)

یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ مروان کے سب وشتم کی ایسی ضعیف روایات اور بھی بہت ہیں۔ چونکہ مذکورہ بالا روایات سے بات ثابت ہو جاتی ہے، اس لیے باقی روایات کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مجموعی طور پر ان روایات سے یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ مروان اور اس کے پیروکار حضرت علی رضی اللہ عنہ، اہلِ بیت اور حسنین کریمین پر سب وشتم چوٹ اور طعن وتشنیع کرتے رہتے تھے۔ وہ ایسے الزامات بھی لگاتے تھے جن کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ ان سے یہ حضرات بالکل بری ہیں مگر ''نظریہ ضرورتِ سیاسی'' کے تحت وہ اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا کرتے تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اپنے متعصب گروہ کو اسی طرح وہ اپنے گرد جمع رکھ سکتے ہیں۔ غالباً انہیں ڈر تھا کہ اگر اپنا گروہ بھی اہلِ بیت کا مداح ہو گیا تو وہ قوت بکھر جائے گی جس کے بل پر حکومت قائم کی گئی ہے۔

☆☆☆

کیا مروان کا اہلِ بیت پر سب وشتم کرنا عقلاً ناممکن ہے؟

﴿سوال﴾ مروان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرنا عقلاً ممکن نہیں کیوں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سمدھی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دو صاحبزادیاں مروان کے بیٹوں: عبدالملک اور مُعاویہ کے نکاح میں آئی تھیں۔ [1]

۶۳ھ میں جب اہلِ مدینہ بنواُمیہ کے خلاف کھڑے ہوئے تو مروان کی جان بچانے اور اسے اپنے گھر میں پناہ دینے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ تھے۔ [2] حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما مروان کے پیچھے مدتوں مدینہ منورہ میں نماز پڑھتے رہے اور کبھی نمازیں نہ لوٹائیں۔ [3] اگر ان حضرات میں ایسی دشمنی ہوتی کہ اِدھر سے منبر پر باپ کو گالی دی جاتی اور اُدھر سے لعنت بھیجی جاتی تو یہ رشتہ داریاں کیسے ہوتیں؟ اگر مروان زبانِ نبوت سے ملعون قرار پایا ہوتا تو سادات کا اس کے گھرانے سے رشتے ناتے رکھنا کیسے ممکن تھا؟

﴿جواب﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کا مروان کے بیٹوں کے عقد میں آنا زیادہ ضعیف بلکہ بے سند روایات میں منقول ہے جبکہ مروان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کا ذکر بعض صحیح روایت میں بھی ہے جو ابھی پیچھے گزری ہیں۔

اگر عقلی بنیاد پر ہی ہر روایات کو مسترد کیا جائے تو یہاں سائل کے دعوے کے برعکس کوئی زیادہ وثوق کے ساتھ ان بے سند روایات کا انکار کر سکتا ہے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کا مروان کے بیٹوں کے ساتھ نکاح مذکور ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ناممکن تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹیاں انہیں گالیاں دینے والوں کے نکاح میں جانا قبول کر لیتیں۔

حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے مروان کے پیچھے نماز پڑھنے یا حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے مروان کو پناہ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مروان کوئی فرشتہ تھا۔ یہ تو ان حضرات کی اتباعِ شریعت تھی کہ فرمانِ نبوی: ''صَلُّوْا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ'' (ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو) [4] کا لحاظ کرتے ہوئے مروان کے پیچھے بھی نماز پڑھتے رہے۔ یہ ان

[1] جمهرة انساب العرب لابن حزم، ص ۳۸، ۸۷ [2] تاریخ الطبری: ۵/۴۹۳ عن ابی مخنف
[3] سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۷۸، ط الرسالة [4] سنن الدارقطنی، ح: ۱۷۶۸، ط مؤسسة الرسالة

کی وسعتِ ظرفی تھی کہ ایسے شخص کو بھی مصیبت کے وقت پناہ دی۔ کور عقل ہے وہ جو یہ سمجھے کہ خانوادۂ نبوت کا لطف وکرم فقط دوستوں تک محدود ہوگا۔ اگر اس قسم کے قیاس کو مانا جائے تو کوئی احمق یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ابو جہل کی سیاہ کاریوں کی ساری روایات مشکوک ہیں؛ کیوں کہ ابوجہل کی بیٹی جویریہ سے عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا تھا۔[1] حجاج بن یوسف کے مظالم (جو کتبِ حدیث کی صحیح اور حسن روایات میں منقول ہیں[2]) بھی جعلی ہیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک پوتی حجاج بن یوسف کے نکاح میں تھی۔[3] کوئی نام نہاد محقق یہ دعویٰ بھی کرسکتا ہے کہ مختار کذاب، فتنہ باز نہیں بلکہ بہت بڑا ولی اللہ تھا کیونکہ اس کی بہن صفیہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی۔[4]

یہ سب فضول قیاس آرائیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بُرے لوگوں کی بُرائیاں بھی اپنی جگہ ثابت ہیں اور بُروں کی اولاد یا رشتے داروں سے اچھے لوگوں کے رشتے ناتوں کا انکار کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اس زمانے میں آج کل جیسی تنگ دلی اور تنگ نظری نہیں تھی کہ ایک شخص کی بُرائی کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو مطعون سمجھ لیا جائے۔ نہ ہی کسی شخص کے فسق و فجور یا مظالم کے باعث شرعاً اس کے ساتھ رشتہ داری بنانا یا نبھانا منع ہوجاتا ہے۔ ہاں ظلم اور فسق میں شریک ہونا یقیناً منع ہے۔ مخالفین سے اس طرح کے رشتے ناتے کرانے میں یہ مصلحت بھی ملحوظ ہوتی کہ مخالفین پر اچھے اثرات ڈالے جائیں اور انہیں تعصب سے نکال کر راہِ اعتدال کے قریب لایا جائے۔

☆☆☆

کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے تمام گورنر سب وشتم کرتے تھے؟

﴿سوال﴾ مروان کے سب وشتم کرنے سے باقی گورنروں کے بھی اس بُرائی میں ملوث ہونے کا امکان ثابت ہوجاتا ہے۔ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سب گورنر اس فعلِ بد کے مرتکب نہیں تھے؟

﴿جواب﴾ تاریخی روایات ہی ثابت کرتی ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے محتاط گورنر اس فعلِ شنیع سے بچتے تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ عمیر بن اسحٰق کی سند سے نقل کرتے ہیں: ''مروان حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جمعے میں سب وشتم کرتا تھا۔ پھر اسے معزول کر کے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا۔ پس وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم نہیں کرتے تھے۔''[5]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب وشتم کرنا بعض گورنروں کا ذاتی فعل تھا۔ اگر یہ سرکاری پالیسی یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم ہوتا تو سبھی گورنر ایسا کرتے۔

☆☆☆

---

① الاصابۃ: ۴۲/۸

② صحیح مسلم، ح: ۲۶۶۰، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرها، واخرجه الامام احمد فی مسنده مختصراً، ح: ۲۶۹۹۷، سنن ابی داؤد، ح: ۳۶۲۳ باسناد صحیح، سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۰ قال البانی صحیح

③ جمهرة انساب العرب، لابن حزم، ص ۳۸

④ تهذیب الکمال: ۲۱۲/۳۵ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۴۷، ط الرسالة

کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کراتے تھے؟

اب تک کی گفتگو "مسئلہ سب وشتم" کی تمہید تھی۔ اصل سوال جسے بڑی شدت سے اٹھایا جاتا ہے، یہ ہے کہ کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرتے اور دوسروں سے کراتے تھے۔

اجمالی جواب یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا بزبانِ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنا کسی معتبر (صحیح یا حسن) روایت سے ثابت نہیں۔ اور اگر کسی ضعیف روایت میں ایسا کچھ منقول ہو تو وہ ہمارے لیے قابلِ استدلال ہی نہیں۔

اب ہم ان روایات کا جائزہ لیں گے جن کے ذریعے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو براہِ راست سب وشتم کے جرم کا مرتکب بتایا جاتا ہے۔

● **صحیح مسلم کی روایت:**

اس دعوے کی سب سے مشہور دلیل مسلم شریف کی روایت ہے۔ اس میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں:

مَا یَمْنَعُکَ اَنْ تَسُبَّ اَبا التُّرَاب؟ (آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیوں نہیں کرتے؟)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس کی وجہ بتاتے ہیں:

فقال: اَمَا مَا ذَکَرْتُ ثَلاثاً قَالَھُنَّ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ فَلَنْ اَسُبَّہٗ.....الخ

"تین ایسی باتیں ہیں جو (علی رضی اللہ عنہ کے لیے) رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھیں، ان کی وجہ سے میں ان کی تنقیص ہرگز نہیں کروں گا، ان میں سے ایک بات بھی مجھے نصیب ہو جائے تو مجھے وہ سرخ اونٹوں سے زیادہ پیاری ہوگی:

پہلی بات: رسول اللہ ﷺ کو میں نے اس وقت فرماتے سنا جب آپ ﷺ نے کسی غزوے پر جاتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے نائب کے طور پر پیچھے چھوڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم کو یہ بات پسند نہیں کہ تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہو جو حضرت ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔"

دوسری بات: میں نے خیبر کی جنگ کے دن حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا: "کل میں پرچم ایسے شخص کو دوں گا جو

اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہوں۔'' ہم سب انتظار میں رہے کہ وہ شخص کون ہوگا۔ پھر آپ نے فرمایا: ''علی کو بلاؤ''۔ انہیں بلایا گیا تو ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک ان کی آنکھوں پر لگایا اور پرچم انہیں دے دیا۔ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح نصیب کی۔

تیسری بات — جب آیت مبارکہ نازل ہوئی:

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا وَ اَبْنَاءَ كُمْ. ''آپ فرمائیے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنوں کو۔''

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور فرمایا:

''الٰہی! یہ میرے گھر والے ہیں۔''[1]

عام طور پر اس روایت کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کی ترغیب دے رہے تھے۔ ایسا وہی شخص سوچ سکتا ہے جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نرمی و بردباری اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حق گوئی اور جرأت سے ناواقف ہو۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنا مقام دیتے تھے کہ ان کی شہادت پر بے اختیار کہہ اٹھے:

''علی کی وفات سے علم اور فقہ رخصت ہوگئے۔''[2]

وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء سے اصرار کر کے ان کے مناقب سنا کرتے اور زار و قطار روتے ہوئے فرماتے:

''اللہ ان پر رحم کرے وہ واقعی ایسے تھے۔''[3]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برائی کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔[4]

زندگی کے آخری خطبے میں فرمایا:

''میرے بعد جو آئیں گے میں ان سے بہتر ہوں جیسا کہ جو مجھ سے پہلے تھا وہ مجھ سے بہتر تھا۔''[5]

دوسری طرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا کردار یہ تھا کہ وہ صحابہ کرام کی اس صفِ اوّل سے تعلق رکھتے تھے جسے عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عرب کے شیر شمار ہوتے تھے۔ قادسیہ کے سپہ سالار اور مدائنِ کسریٰ کے فاتح تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خود کو تمام سیاسی معاملات سے محض اس لیے یکسو کر لیا تھا تاکہ ان کی زبان اور شمشیر کسی مسلمان کے خلاف استعمال نہ ہو۔

ایسے بلند کردار اور محتاط انسان کو اگر کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی توہین جیسے ناپاک کام کی ترغیب دیتا تو ان کی غیرت

[1] صحیح مسلم، ح: ۶۲۴۲، کتاب المناقب، فضائل علی رضی اللہ عنہ
[2] تاریخ دمشق: ۵۸۳/۴۲
[3] تاریخ دمشق: ۵۸۳/۴
[4] تاریخ الطبری: ۳۳۵/۵
[5] سمط النجوم العوالی: ۶۷/۲، الکامل فی التاریخ: ۱۱۹/۳

ایمانی کو ضرور جوش آتا اور وہ کوئی سخت ترین جواب دیتے مگر چونکہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منشأ کو جانتے تھے جو توہین ہرگز نہ تھی، اس لیے انہوں نے پرسکون انداز میں ایک علمی جواب دیا اور ٹھوس وجوہ بیان فرمائیں، جنھیں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔

اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہلوانا ہوتا تو وہ چپ چاپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے طویل مناقب نہ سنتے بلکہ درمیان ہی میں انہیں خاموش کرا کے اپنے مطلب کی بات کہلوانے کی کوشش کرتے، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور اس مبارک مجلس میں کہے سنے گئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مناقب ساری اُمت تک پہنچے۔

روایتِ مسلم کی مناسب توجیہ:

اب رہی یہ بات کہ آخر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کو یہ کیوں کہا کہ ''آپ کو حضرت علی پر تنقید سے کیا چیز مانع ہے؟'' اس دور کے حالات اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زندگی پر غور کرنے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔

بات یہ تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق فتح کرنے کے بعد کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی کچھ مدت وہیں گورنر تعینات رہے۔ ۲۵ھ میں معزول ہو کر واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ شہادتِ عثمان کے بعد آپ رضی اللہ عنہ شہری آبادی سے تین میل (پونے ۵ کلومیٹر) دور عقیق نامی مقام پر عزلت نشین ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی کا ساتھ نہ دیا۔

اس دوران کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنے والے ناصبی و خارجی بہت طاقتور ہو گئے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع تھی اور وہ اس پر افسوس کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ ابوبکر بن خالد بن عُرفُطَہ نامی تابعی کوفہ سے آئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تم لوگوں کے سامنے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ کیا تم بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کرتے ہو؟''

وہ بولے: ''اللہ کی پناہ۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں سعد کی جان ہے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ فرماتے سنا (اس کے بعد) اگر میرے سر پر آرا رکھ کر کہا جائے کہ علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کرو تو میں تب بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کہوں گا۔''[1]

ایسا لگتا ہے کہ ایسے لوگ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بھی اپنا ہم خیال مشہور کر رہے تھے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ تو معلوم تھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنے والے آدمی نہیں مگر وہ ان سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ فتنوں کے ایسے شدید دور میں جبکہ حدِ اعتدال پر رہنا مشکل ہو رہا ہے اور بہت سے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں افراط و تفریط کر رہے ہیں، آپ کو یہ ملکہ کیسے حاصل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیتے ہوئے بھی آپ

---

① مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۷۷، ح: ۷۷۷ بسند حسن

سے اب تک ان کے خلاف کچھ سننے میں نہیں آیا؟

امام نووی رحمہ اللہ کی تشریح:

شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس جملے'' آپ کو ابوتراب پر تنقید سے کیا چیز مانع ہے؟'' میں یہ تصریح نہیں کہ انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی کا حکم دیا ہو۔ وہ تو بس ان سے نکتہ چینی نہ کرنے کی وجہ پوچھ رہے تھے یا وہ یہ کہہ رہے تھے: ''کیا آپ شرعی احتیاط کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں یا کسی خوف کی وجہ سے یا کوئی اور سبب ہے۔ اگر اس کی وجہ شرعی احتیاط اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ادب ہے تو آپ بالکل درست اور اچھا کر رہے ہیں اور اگر کوئی اور وجہ ہے تو اس کی حیثیت الگ ہوگی۔' شاید حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کے ساتھ رہتے تھے جو (حضرت علی رضی اللہ عنہ پر) تنقید کرتے تھے مگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایسا نہیں کرتے تھے مگر وہ ان لوگوں کو روکنے یا سمجھانے سے بھی عاجز تھے، اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ سوال پوچھ لیا۔''[1]

ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حضراتِ صحابہ کرام کے آپس میں پرانے تعلقات تھے، وہ باہم بے تکلف دوست تھے۔ صاف دل اور بے باک تھے۔ ایسے دوست جب باہم مل بیٹھتے ہیں تو کبھی ہنسی مذاق میں ایک دوسرے پر چوٹ بھی کر جاتے ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ویسے بھی بڑے خوش مزاج تھے، انہوں نے چاہا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ان کی محتاط اور غیر جانبدرانہ پالیسی کی وجوہ معلوم کرلیں۔ اگر یہ سوال کسی اجنبی شخصیت سے ہوتا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ذرا تکلف سے پوچھتے مگر یہاں بات دو بے تکلف دوستوں کے درمیان تھی۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ہلکی سی چوٹ لیے ہوئے ایسا جملہ بولا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ روایتِ حدیث میں اپنی محتاط روش کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کیے بغیر نہ رہ سکے۔

❷ ابوزُرعہ دمشقی کی طرف منسوب عبارت کا جواب:

معترضین مندرجہ ذیل روایت بھی پیش کیا کرتے ہیں:

لما حج معاویة اخذ بید سعد بن ابی وقاص وادخله الدار الندوة فاجلسه معه علی سریره ثم ذکر علی بن ابی طالب فوقع فیه ، فقال ادخلتی دارک واجلستی علی سریرک ثم وقعت فی علیّ تشتمه......

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حج کیا تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر دارالندوہ میں لے گئے، اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کر کے ان پر تنقید شروع کردی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بولے: آپ مجھے اپنے گھر لائے، اپنے تخت پر بٹھایا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی میں لگ گئے، ان

[1] شرح صحیح مسلم للنووی: ۱۵/۱۷۵

پر آپ سب وشتم کر رہے ہیں۔''[1]

یہ روایت بھی چھٹی صدی ہجری میں پہلی بار ابن عساکر نے نقل کی ہے۔ متقدمین کے ہاں اس کا کوئی نام ونشان نہیں۔ پھر اس کی سند میں عبداللہ بن ابی نجیح ہے جس پر عقیدۂ تقدیر کے انکار کا الزام ہے۔ اس کے علاوہ وہ مدلس بھی ہے۔[2] مزید یہ کہ وہ عَمرو بن عبید کا حلقہ بگوش تھا جو معتزلہ کا امام تھا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جھوٹی احادیث گھڑا کرتا تھا جیسے ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم مُعاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اسے قتل کر دو۔''[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ علیہ نے اسے ابو زُرعہ دمشقی کے حوالے سے نقل کیا ہے مگر ابو زُرعہ کی تاریخ میں یہ روایت نہیں ملتی۔ اس روایت کی کوئی حیثیت ہوتی تو یہ پانچ صدیوں تک کہاں تھی؟ کسی محدث اور مؤرخ نے اسے نقل کیوں نہ کیا؟ چھٹی صدی ہجری میں ابن عساکر اسے نقل کرتے ہیں اور وہ بھی ایک کمزور ترین سند سے تو اسے آنکھیں بند کر کے کیوں قبول کر لیا جائے؟ اگر ان مؤرخین کی ہر روایت قابل قبول ہے چاہے اس کی سند کمزور ہو چاہے اس میں صحابہ کرام پر طعن ہو تو اس انبار میں حضرت علی، حضرت حسن وحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بنو ہاشم سے متعلق بھی نہایت رکیک روایات مل جائیں گی تو پھر انہیں کیا حیثیت دی جائے گی؟

☆☆☆

③ مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو سب وشتم کا حکم دینے کی روایت:

طبری کی ایک روایت کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سن ۴۱ ہجری میں حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجتے ہوئے کچھ ہدایات دیتے ہیں اور اس ضمن میں کہتے ہیں:

''حضرت علی کو برا بھلا کہنے، حضرت عثمان کے لیے دعائے رحمت اور بخشش مانگنے، حضرت علی کے رفقاء کو عیب لگانے اور انہیں دور بھگانے اور حضرت عثمان کے حامیوں کو سراہنے اور قریب کرنے میں کوئی کسر مت چھوڑنا۔''[4]

پھر یہی روایت بتاتی ہے کہ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کوفہ کی گورنری کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے رحمت واستغفار، ان کے ساتھیوں کی وکالت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کی عیب جوئی اور لعنت، ہمیشہ کرتے رہے۔[5]

مگر آپ اس روایت کی سند دیکھیے تو اس سے استدلال کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی، کیوں کہ اس کی سند میں شروع سے آخر تک کذاب، روایت ساز یا مجہول لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ سند یہ ہے:

① البداية والنهاية: ۱۱/۵۰، ذكر شئ من فضائل امير المؤمنين على رضی اللہ عنہ ؛ تاريخ دمشق: ۴۲/۱۱۹
② تقريب التهذيب ترجمه نمبر: ۳۶۶۲
③ موسوعة اقوال الامام احمد بن حنبل: ۲/۲۹۵، ط عالم الكتب
④ تاريخ الطبرى: ۵/۲۵۴، سن ۵۱ هـ
⑤ تاريخ الطبرى: ۵/۲۵۴

کلبی سے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ۹۰ نکاح کیے تھے۔ وہ نکاح کرتے اور طلاق دیتے، یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا کہ بہت سے قبائل سے ہماری دشمنیاں پڑ جائیں گی۔ [1]

اس روایت کا پورا سلسلہ ہی شیعی مؤرخین کا ہے۔ اس کا ضعف بلکہ من گھڑت ہونا ظاہر ہے۔

بلاذری کے بعد کسی مؤرخ نے پانچ صدیوں تک اس بارے میں کوئی روایت پیش نہیں کی۔

پانچ صدیوں بعد ابن عساکر نے تاریخ دِمَشق میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بکثرت نکاح کرنے اور بکثرت طلاقیں دینے سے متعلق متعدد روایات جمع کر دیں [2] مگر سب محمد بن عمر واقدی سے مروی ہیں اور سب کی سند منقطع ہے۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بعض مؤرخین نے سند حذف کر کے انہی روایات کو براہِ راست واقدی کے شاگرد محمد بن سعد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ محمد بن سعد کی ''الطبقات الکبریٰ'' ان روایات سے خالی ہے۔ اس کی بجائے یہ روایات کئی صدیوں بعد تہذیب الکمال، سیر اعلام النبلاء اور البدایہ والنہایہ میں ملتی ہیں اور وہ بھی منقطع اسناد کے ساتھ۔ ان روایات پر ایک نگاہ ڈالیے۔ ''تاریخ دِمَشق'' میں ہے:

❶ **كان الحسن احصن تسعين امرأة.**

''حسن رضی اللہ عنہ نے نوے (۹۰) عورتوں سے نکاح کیا تھا'' [3]

اس کے راوی ابن جعدبہ یعنی یزید بن عیاض کو کاذب اور متروک قرار دیا گیا ہے۔ [4]

روایت میں نکاح کی جگہ ''اَحــصــنَ'' کا لفظ بھی قابل توجہ ہے، شاید مفہوم میں نکاح کے علاوہ متعہ کو بھی شامل کرنے کے لیے یہ لفظ لایا گیا ہے۔

یہی روایت ''سیر اعلام النبلاء'' میں مدائنی سے بسند منقطع مذکور ہے۔ [5] اصل روایت ابن جعدبہ ہی کی ہے۔

❷ **قال عليّ: يا اهل الكوفه! لا تزوجوا لحسن بن على فانه رجل مطلاق.**

''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوفہ والو! حسن سے (اپنی بیٹیوں کا) نکاح مت کراؤ، وہ بکثرت طلاق دینے والا ہے۔'' [6]

حافظ ذہبیؒ نے اسے دو جگہ نقل کیا ہے۔ ایک جگہ اسے جعفر بن محمد کی سند سے نقل کیا ہے مگر یہ سند منقطع ہے۔ [7]

---

① انساب الاشراف: ۲۵/۳ ط دار الفکر

② تاریخ دِمَشق: ۲۴۹/۱۳

③ تاریخ دِمَشق: ۲۴۸/۱۳، ۲۴۹ عن المدائنی عن ابن جعدبه

④ تقریب التهذیب، تر: ۷۷۶۱

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۶۷/۳، ط الرسالة

⑥ تاریخ دِمَشق: ۲۴۹/۱۳ عن محمد بن عمر والقدی

⑦ سیر اعلام النبلاء: ۲۶۲/۳، ط الرسالة

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ مطالبہ نہ مانا۔ تب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مطالبہ کیا کہ اس طرح سب وشتم نہ کیا جائے کہ ان کو آواز پہنچے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ مطالبہ مان لیا، مگر اسے پورا نہ کیا۔''[1]

الکامل کی اس عبارت کا کچھ حصہ تو طبری کی روایت کے مفہوم پر مشتمل ہے اور دو باتیں اضافی ہیں:

ا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم مطلقاً بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا، جب یہ پورا نہ ہوا تو پھر مطالبہ کیا کہ چلیے اتنی آواز سے سب وشتم ہو کہ میں نہ سنا کروں۔

ا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔

نہ صرف یہ دو باتیں بلکہ ابن اثیر کا نقل کردہ باقی قصہ بھی کسی معیارِ تحقیق پر پورا نہیں اترتا کیوں کہ ابن اثیر نے اسے بلا سند بیان کیا۔

☆☆☆

❻ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ:

''اَنْ لَا یُسَبَّ عَلِیًّا بِحَضْرَتِہٖ.'' (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی موجودگی میں سب وشتم نہ کیا جائے۔)[2]

مگر اس روایت کی سند میں مجالد (مجالد بن سعید) ہیں جن کو یحییٰ بن سعید نے ضعیف کہا ہے۔ عبدالرحمٰن مہدی ان سے روایت نہیں لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ان کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ آخری عمر میں ان کا حافظہ بگڑ گیا تھا، ایسی روایات سناتے تھے جو دوسرے محدثین نہیں سناتے تھے۔[3]

غرض حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اپنی سماعت سے شتم علی رضی اللہ عنہ کو دور رکھنے کی شرط لگانا کسی طرح ثابت نہیں۔ نہ ہی یہ ثابت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سب وشتم کراتے ہوں۔

☆☆☆

❼ طبری میں ہے کہ: فَکَانَ اِذَا قَنَتَ لَعَنَ عَلِیًّا وَابْنَ عَبَّاسٍ وَالْاَشْتَرَ وَحَسَنًا وَحُسَیْنًا.

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دعائے قنوت پڑھتے تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ، اَشتر اور حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ پر لعنت کیا کرتے تھے۔''[4]

مگر یہ روایت ابو مخنف کی ہے جس کا کذاب ہونا سب کو معلوم ہے۔

❽ ''العقد الفرید'' میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے گئے تو مدینہ میں منبرِ رسول پر چڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنا چاہی، لوگوں نے کہا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس پر احتجاج کریں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو وہ بولے: ''اگر تم نے علی رضی اللہ عنہ پر لعنت کی تو میں مسجد سے نکل

---

① الکامل فی التاریخ، سن ۴۱ھ

② العبر فی خبر من غبر للذھبی: ۱/۳۵، ط العلمیۃ

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۸۲/۶، ط الرسالۃ

④ تاریخ الطبری: ۷۱/۵

جاؤں گا، کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا۔" حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ رک گئے۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے کر پورے عالمِ اسلام میں یہ حرکت شروع کرادی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس پر ناراض ہو کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو ناصحانہ مراسلہ لکھا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔[1]

یہ واحد روایت ہے جس میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے پورے عالمِ اسلام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم شروع ہونے کا ذکر ہے۔ مگر صاحب العقد الفرید (۲۴۶ھ۔۳۲۸ھ) نے اس کی کوئی سند نقل نہیں کی۔ بے سند باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوسکتی، خاص کر جب معاملہ صحابہ کرام کا ہو تو وہاں لازماً مضبوط سند درکار ہوتی ہے۔

اگر ضعیف روایات پر بحث کا مدار رکھا جائے تو جس طرح ایسی روایات میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرنا منقول ہے تو اسی طرح بعض ضعیف روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وغیرہ پر سب وشتم کرنا بھی منقول ہے۔ فقط ایک مشہور مثال دیکھ لیں:

قال ابو مخنف، حدثنی عبدالرحمن بن جندب الازدی عن ابیہ، ان علیا قال: عبادا للہ! امضوا علیٰ حقکم و صدقکم قتال عدوکم، فان معاویۃ و عَمرو بن العاص و ابن ابی معیط وحبیب بن مسلمۃ و ابن ابی سرح و الضحاک بن قیس لیسوا باصحاب دین و لا قرآن، انا اعرف بھم منکم، قد صحبتھم اطفالا و صحبتھم رجالا، فکانو شر اطفال و شر رجال.

"ابو مخنف نے کہا مجھ سے عبدالرحمٰن بن جندب الازدی نے اپنے باپ سے نقل کر کے بیان کیا کہ حضرت علی نے کہا: اللہ کے بندو! اپنے حق، اپنی سچائی اور اپنے دشمن سے قتال پر گامزن رہو۔ بے شک مُعاویہ، عمرو بن العاص، ابن ابی معیط، حبیب بن مسلمہ، ابن ابی سرح اور ضحاک بن قیس نہ دین والے ہیں نہ قرآن والے، میں انہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں: میں بچپن میں بھی ان کے ساتھ رہ چکا ہوں اور جوانی میں بھی۔ یہ بدترین بچے اور بدترین مرد ہیں۔"[2]

ایسی ضعیف روایات نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں قابلِ قبول ہیں نہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔

☆☆☆

⑨ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ عاشقانِ علی رضی اللہ عنہ کو ترابی کہہ کر چڑاتے تھے۔ صَعصَعَہ بن صُوحانؒ ان کے پاس گئے۔ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو انہیں جگہ دینے کا یوں کہا: "وَسِّع لہ علیٰ ترابیۃ فیہ۔" (ترابی کو جگہ دے دیں۔) اس پر صَعصَعَہ رحمہ اللہ نے کہا: "اللہ کی قسم! میں ترابی ہوں۔ اسی سے پیدا ہوا، اسی میں جاملوں گا۔ اسی سے اٹھایا جاؤں گا۔ آپ آگ کی چنگاریوں میں سے ایک چنگاری ہیں۔"[3]

یہ روایت بھی بے سند ہے۔ العقد الفرید کے سوا کہیں مذکور نہیں۔ علمی میزان میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

① العقد الفرید: ۱۱۳/۵، ط العلمیۃ ② تاریخ الطبری: ۴۸/۵، ۴۹ ③ العقد الفرید: ۱۱۵/۵

☆☆☆

سنن ابن ماجہ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی روایت کا جواب

﴿سوال﴾ سنن ابن ماجہ میں مروی ہے کہ:

عن ابن سابط وهو عبدالرحمن عن سعدبن ابی وقاص ،قال قدم معاوية فی بعض حجاته،فدخل عليه سعد،فذكروا علياً ، فنال منه ،فغضب سعد وقال :تقول هذا لرجلٍ سمعت رسول الله ﷺ يقول :من كنت مولا ه فعليٌ مولاه ،وسمعته يقول:انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ ،وسمعته يقول لاعطين الراية اليوم رجلاً يحب الله ورسوله .

”حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کسی حج کے موقع پر آمد ہوئی، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے۔ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کی۔ اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ غضب ناک ہو گئے اور بولے: تم یہ بات اس شخص کے بارے میں کہہ رہے ہو جس کے متعلق میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جس کا میں دوست، اس کا علی دوست، اور میں نے آپ کو فرماتے سنا کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون اور جس کے متعلق میں نے سنا کہ میں یہ پرچم آج اس شخص کو دوں گا جسے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہو گی۔“[1]

اس روایت کو شیخ البانی نے صحیح قرار دیا ہے۔ اسے مسلم شریف کی روایت کے ساتھ ملائیں تو بات پوری ہو جاتی ہے یعنی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم ہی کیا تھا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے غضب ناک ہوئے تھے۔ پس آپ کی تمام توجیہات اور تاویلات باطل ہیں اور یہ ثابت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سب وشتم خود بھی کیا کرتے تھے۔

﴿جواب﴾ اس روایت کو صحیح قرار دینا، درست نہیں۔ کیونکہ اس کی سند منقطع ہے۔ اس کے راوی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن سابط ثقہ مگر ”کثیر الارسال“ تھے۔[2] ان کا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت ہونا بہت مشکل ہے، تہذیب الکمال میں بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ابن سابط کا حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔[3] اگرچہ یہ قول ”قیل“ سے نقل کیا گیا ہے مگر یہی قوی ہے کیونکہ: اوّل تو ان کی حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اس کے سوا کوئی اور روایت ہے ہی نہیں۔ ثانیاً خود اس روایت کے الفاظ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ابن سابط نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ سنا ہو، یا خود اس موقع پر موجود ہوں اور چشم دید واقعہ نقل کر رہے ہوں۔ روایت کے الفاظ سے (غضب سعدٌ) وغیرہ سے ظاہر ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنا یہ واقعہ اپنی زبان سے نقل نہیں کیا، ورنہ وہ صیغۂ متکلم استعمال کرتے۔

---

① سنن ابن ماجة، ح: ۱۲۱ ، كتاب الايمان : فضل علی بن ابی طالب

② تاريخ الاسلام للذهبی تدمری:۷/۴۱۳ ، بشار:۳/۲۷۲ ، ③ قيل :لم يسمع منه. (تهذيب الكمال:۱۷/۱۲۳، ۱۲۴)

پس اصل راوی کوئی اور ہے۔ ابن سابط کا اصل راوی ہونا اس لیے مشکل ہے کہ ان کی وفات ۱۱۸ھ میں ہوئی۔[1] ان کی ولادت کا سن محفوظ نہیں۔ اگر انہیں طویل العمر مثلاً ۷۵ سال کا مانا جائے تو ان کی ولادت ۴۳ھ کی ہوگی۔

اب غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زندگی میں آخری بار حج کے لیے ۵۰ھ میں تشریف لائے تھے۔[2] ابن سابط کی عمر اگر ۷۵ سال بھی مانی جائے تو وہ اس وقت سات سال کے ہوں گے۔ پھر وہ مکی تھے۔ جبکہ ان اکابر کی ملاقات مدینہ میں ہوئی تھی۔ حج کے دنوں میں ایک کم عمر بچہ بھلا مکہ سے مدینہ جا کر اکابر کی مجلس میں کیسے شریک ہوگا؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زیارت کا شوق بھی وجہ نہیں بن سکتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود ہی مکہ تشریف لانے والے تھے۔ اس لیے اس روایت کو متصل السند ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ غالب احتمال ہے کہ درمیان میں راوی رہ گیا ہے اور اس نے بات کو مبالغہ کے طور پر بیان کیا ہے۔

اگر روایت کو صحیح مان لیا جائے جیسا کہ شیخ البانی مرحوم کا کہنا ہے، تب بھی اس سے صحابہ کی عدالت اور ان کی منصوص شان پر کوئی حرف نہیں آتا۔ عقلاً، شرعاً، عرفاً اور اخلاقاً ایسے میں روایت کی صحیح تاویل لازم ہوگی۔ ''نال منہ'' کے الفاظ کو گالم گلوچ اور بُرا بھلا کہنے پر نہیں بلکہ اسی قسم کی تنقید پر محمول کیا جائے گا جیسا کہ ایک شریف لیڈر سیاسی اختلاف کے ماحول میں اپنے مخالف لیڈر کے متعلق کرتا ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کو ایک بار پھر دیکھ لیں۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے جو کلام مذکور ہے، اس کے الفاظ یہ تھے:

مَا یَمْنَعُکَ اَنْ تَسُبَّ اَبَا التُّرَاب؟ (آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کیوں نہیں کرتے؟)[3]

ان الفاظ میں خود کوئی مذمت نہیں، بلکہ ایک سوال ہے۔ اس سوال میں کئی پہلو ہو سکتے ہیں، اچھے بھی، بُرے بھی۔ مناسب پہلوؤں کے امکانات اور بہتر توجیہات ہم پیش کر چکے ہیں۔

ہم اس بات کا انکار نہیں کر رہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے ایک دوسرے پر تنقید نہ کی ہو۔ مگر اسے آج کل کی غلیظ سیاست میں جاری مخالفین کی شرمناک قسم کی کردار کشی پر محمول کر کے یہ سمجھنا کہ صحابہ کے باہمی اختلافات نفسانیت، انانیت، خود غرضی اور مفاد پرستی پر مبنی ہوں گے اور اس میں شرافت اور اخلاق واقدار کی حدود بے محابا پامال کی جاتی ہوں گی، پرلے درجے کی کورچشمی ہے۔ درحقیقت ان حضرات کی کبھی کبھار ہونے والی شکر رنجیاں اور باہمی تنقیدات بھی ہر پہلو سے للہیت، اخلاص اور بےنفسی پر مبنی تھیں اور اختلافی کش مکش بھی اخلاق اور حلم و بردباری کی حدود میں رہتی تھی۔

☆☆☆

---

① تاریخ الاسلام للذھبی تدمری: ۷/۲۱۳، بشار: ۳/۲۷۲

② مشاجرات کے دوران حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حجاز تشریف نہیں لے جا سکے۔ اپنے دورِ خلافت میں ان کے دو حج ۴۴ھ اور ۵۰ھ میں ہوئے۔ تیسرا حج ایک قول کے مطابق ۵۱ھ میں کیا جبکہ تحقیقی قول ۵۶ھ کا ہے۔ اس تیسرے حج تک حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات ہو چکی تھی۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یہ ملاقات ۴۴ھ یا ۵۰ھ کی ہے۔ اگر ۵۱ھ کا قول مان لیں تب بھی ہمارے جواب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

③ صحیح مسلم، ح: ۲۲۷۲، کتاب المناقب، فضائل علی رضی اللہ عنہ

سنن ابی داود کی روایت سے سب وشتم پر استدلال اور اس کا جواب:

﴿سوال﴾ ثابت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا بنو ہاشم پر طنز کر گزرتے تھے اور حضرت مُعاویہ چپ رہتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ مسند میں بسند صحیح نقل کرتے ہیں:

مِقدام بن مَعدی کَرِب رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ''کیا تمہیں پتہ ہے کہ حسن بن علی فوت ہو گئے؟'' یہ سن کر حضرت مِقدام رضی اللہ عنہ نے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اتراھا مصیبۃ؟'' (تم اس بات کو مصیبت سمجھتے ہو؟) انہوں نے فرمایا: ''میں اسے مصیبت کیوں نہ سمجھوں جبکہ حضور ﷺ نے انہیں اپنی گود میں رکھ کر فرمایا: یہ (حسن) ہیں میرے، اور حسین ہیں علی رضی اللہ عنہ کے۔''[1]

یہی روایت امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس اضافے کے ساتھ نقل کی ہے کہ: مِقدام رضی اللہ عنہ کے ساتھ بنواسد کا ایک آدمی بھی آیا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر دی تو وہ بولا:

''جمرۃ اطفاھا اللہ'' (وہ تو ایک چنگاری تھی جسے اللہ نے بجھا دیا۔)

اس پر حضرت مِقدام رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو کہا: ''میں اس وقت تک یہاں سے نہ ہٹوں گا جب تک تمہیں غصہ نہ دلادوں اور وہ کچھ سناؤں جو تمہیں ناگوار ہے۔''

اس کے بعد حضرت مِقدام رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے کچھ کاموں پر کڑی تنقید کی جس پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے معلوم تھا کہ میں تم سے نہیں بچ سکتا۔''[2]

روایت کے آخر میں ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنے والے بنواسد کے اس شخص کو رخصت کرتے وقت انعام واکرام بھی دیا تھا۔ اس روایت میں کہیں مذکور نہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس بدزبان کو ڈانٹ ڈپٹ کی ہو۔ ثابت ہوا کہ وہ خود اپنی مجلس میں سادات کرام پر طعن تشنیع کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

﴿جواب﴾ اس قسم کی باتوں کی مناسب توجیہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا: ''اتراھا مصیبۃ؟'' کہنا ضروری نہیں کہ استفہام انکاری ہو۔ بلکہ غالبًا یہ استفہام تقریری تھا، یعنی وہ خود بھی اسے صدمہ سمجھتے تھے

---

[1] مسند احمد، ح: ۱۷۱۸۹، رجالہ ثقات: سند میں فقط بقیۃ بن الولید ایسے راوی ہیں جن پر جرح کی گئی ہے اور انہیں تدلیس کا عادی بتایا گیا ہے مگر مجموعی طور پر وہ ثقہ ہیں۔ امام بخاری نے تعلیقًا اور بقیہ تمام اصحاب صحاح ستہ نے ان سے روایت لی ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: صدوق کثیر التدلیس عن الضعفاء۔ (تقریب التہذیب، تر: ۷۲۹) حافظ ذہبی فرماتے ہیں: وثقہ الجمہور فیما سمعہ من الثقات.
امام نسائی فرماتے ہیں جب وہ حدثنا یا اخبرنا کہیں تو ثقہ ہیں۔ (اور مذکورہ روایت میں وہ حدثنا کہہ رہے ہیں)
ابن حبان کہتے ہیں: ''فرایتہ ثقۃ مامونا، عبداللہ بن مبارک انہیں صدوق کہتے ہیں اور امام احمد انہیں اسماعیل بن عیاش سے زیادہ پسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ کئی علماء کا کہنا ہے کہ جب وہ ثقات سے روایت کریں تو ثقہ ہیں۔ (میزان الاعتدال: ۱/۳۳۱)

[2] سنن ابی داؤد، ح: ۴۱۳۱، باب فی جلود النمور والسباع، قال الالبانی: صحیح، ورواہ الطبرانی فی المعجم الکبیر: ۲۰/۲۶۹
ابوداؤد کی روایت میں ''اتراھا مصیبۃ'' کا قائل ''رجل'' کو قرار دیا گیا ہے، (فقال لہ رجل) تاہم مسند احمد اور طبرانی میں رجل کی جگہ ''فقال لہ معاویۃ'' ہے۔

اور حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔

اسدی کو تنبیہ نہ کرنے کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ ایک طویل مدت تک شام کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مدِ مقابل رہے تھے، ہزاروں افراد جنگوں میں عراقیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ اس لیے اہلِ شام میں سے متشدد لوگ اس تمام خونریزی کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ڈال کر ان کی توہین و تنقیص کرتے تھے۔ ایسے لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اردگرد بھی تھے جن سے انہیں سیاسی و انتظامی نوعیت کے کام لینا پڑتے تھے۔ اس لیے وہ کبھی مصلحت کی بناء پر ایسی باتوں کو برداشت کر لیتے تھے۔ مذکورہ واقعے میں بھی اسی ماحول کے باعث انہوں نے اس متشدد مزاج اسدی کو تنبیہ نہیں کی۔ باقی رہا انعام و اکرام سے نوازنا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فیاض انسان تھے۔ دربار میں آنے والے ہر شخص کو نوازتے تھے۔ یہ سرکاری پروٹوکول تھا جو ہر مہمان کو دیا جاتا تھا۔ البتہ اس پروٹوکول میں فرقِ مراتب ضرور ہوتا تھا۔

ابوداؤد کی اسی روایت میں واضح ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسدی کو بنوامیہ کے حق میں تعصب کا مظاہرہ کرنے کے باوجود کم انعام دیا جبکہ حضرت مقدام رضی اللہ عنہ کے منہ سے سخت تنقید سننے کے باوجود انہیں سب سے زیادہ انعام دیا۔ اس سے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حق پسندی اور عالی ظرفی ظاہر ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شام ایسے حق گو اور جرأت مند صحابہ سے خالی نہ تھا جو موقع بموقع مروانیوں اور ناصبیوں کی غلط حرکات کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے تھے اور ساداتِ کرام کی عظمت کا دفاع کرتے تھے [1] اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایسے حضرات کی غیر معمولی قدر کرتے تھے۔ اگرچہ بعض مجبوریوں اور مصلحتوں کے تحت متشدد قسم کے لوگوں کی اپنے ہاں آمد و رفت بھی برداشت کر لیتے تھے۔ تاہم ایک دو روایات کو دیکھ کر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان کی مجلس میں اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں اور وہ ہمیشہ خاموش رہتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہوگا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ تسامح برتتے تھے۔ ثابت ہے کہ کبھی وہ ایسے لوگوں کو تنبیہ بھی کر دیتے تھے۔ جیسا کہ ایک بار بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ نے زید بن عمر رحمہ اللہ کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کی۔ زید رحمہ اللہ یہ سن کر بسر رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دونوں کو الگ کیا اور بسر رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ کر کہا:

''تم علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتے ہو جبکہ وہ زید کے نانا ہیں۔'' [2]

غرض یہ ثابت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کو سرزنش بھی فرماتے تھے۔

☆☆☆

---

[1] مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ شام میں رہنے والے صحابہ میں سے ہیں، بیعتِ رضوان سے مشرف تھے، حمص میں سکونت پذیر تھے، ۸۷ھ میں وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے، عمر ۹۰ سال سے اوپر تھی۔ (معجم الصحابہ للبغوی: ۲۹۹/۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۴۲۷/۳؛ تھذیب الکمال: ۴۵۹/۲۸)

[2] تاریخ الطبری: ۳۳۵/۵ ... یہ زید بن عمر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا تھیں۔ اس لحاظ سے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نواسے تھے۔ (تاریخ الاسلام للذھبی تدمری: ۵۸/۴؛ بشار: ۴۱۱/۲)

کیا مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ سب وشتم کرتے تھے؟

حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کا مرتکب بتا کر سب سے زیادہ بدنام کیا گیا ہے۔ چونکہ ایسی کئی روایات ذخیرۂ حدیث میں بھی ہیں، اس لیے معترضین کا اپنے دعوے کی صحت پر اصرار بہت بڑھ جاتا ہے۔ معترضین کے اہم سوالات درج ذیل ہیں:

﴿سوال﴾ مسند احمد، طبرانی اور مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کی تو زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے اور فرمایا: قد علمت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان ینھیٰ عن سب الموتیٰ فلم تسب علیا وقد مات ...... ''آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوت شدگان کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے، تو آپ علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کیوں کہہ رہے ہیں جب کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔''[1]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرتے تھے۔

﴿جواب﴾ یہ روایت ضعیف ہے کیوں کہ اس میں راوی ابوالحجاج (ابوایوب) مولیٰ بنی ثعلبہ مجہول الحال ہے، حافظ ابن حجر بھی ان کے بارے میں پوری تلاش کے بعد صرف یہ معلوم کر پائے ہیں کہ ان کی کنیت ابوایوب ہے۔ ان کے بارے میں تقریباً ایک صفحے کی بحث کے بعد لکھتے ہیں:

ولم یستفد من ذلک کله معرفة حال حجاج ابی ایوب مولیٰ بنی ثعلبة.

(ان سب باتوں سے حجاج ابوایوب مولیٰ بنی ثعلبہ کا حال معلوم نہیں ہو پاتا۔)[2]

پس اس مجہول راوی کی وجہ سے سند ضعیف اور روایت مشکوک ہے۔

قارئین ایک بار پھر غور کرلیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جہاں متن میں کسی صحابی کی توہین کا پہلو نکلتا ہو وہاں اکثر وبیشتر سند میں کچھ سقم نکل ہی آتا ہے۔ ثابت ہوا ہے کہ مشکوک مواد اکثر مشکوک سند ہی سے منقول ہوتا ہے۔ جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایسا اکثر مواد جعل سازوں نے اپنی اغراض کے تحت ہماری تاریخ اور سیرتِ صحابہ میں داخل کیا ہے تاکہ اپنے گروہوں کو تقویت دی جائے اور اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کیا جاسکے۔

☆☆☆

---

① مسند احمد، ح: ۱۹۲۸۸، ۱۹۳۱۶؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۶۸/۵، ط مکتبة ابن تیمیة؛ مصنف ابن ابی شیبه، ح: ۱۱۹۸۶، ط الرشد؛ حلیة الاولیاء: ۲۳۶/۷

اعلم ایها القاری العزیز! ذُکر فی بعض طرق هذه الروایة " شعبة عن مسعر عن زیاد بن علاقة " لکن یتضح بالنظر الیٰ الاسانید الاخریٰ ان بعض الرواة حذف ذکر" حجاج مولیٰ بنی ثعلبة " المجهول بین مسعر و زیاد، فضعف الروایة ثابت فی کل حال.

② تعجیل المنفعة لابن حجر العسقلانی: ۴۱۳/۲، ط دار البشائر، بیروت

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی سرپرستی کا الزام:

﴿سوال﴾ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنروں کی موجودگی میں سب وشتم ہونا اوران کا اس کی خاموش سرپرستی اور تائید کرنا صحیح روایات سے ثابت ہے، مثلاً مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ایک شخص قیس بن علقمہ نے آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ چپ رہے۔ آخر سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے انہیں عار دلائی:

"الا اریٰ اصحاب النبی ﷺ یسبون عندک ثم لاتنکر ولاتغیر

"میں یہ دیکھ رہا ہوں آپ کی موجودگی میں اصحابِ رسول کی مذمت کی جاتی ہے، مگر آپ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔"[1]

دوسری روایت کے مطابق مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ کی سب سے بڑی مسجد میں تھے اور دائیں بائیں لوگوں کا مجمع تھا۔ اس دوران سعید بن زید رضی اللہ عنہ آئے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں پاس بٹھالیا۔ اتنے میں کوفہ کا ایک شخص آیا اور مغیرہ رضی اللہ عنہ کی طرف منہ کر کے کسی کو برا بھلا کہنے لگا۔

"حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "یہ کسے برا بھلا کہہ رہا ہے؟"

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "حضرت علی کو۔"

سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے مغیرہ بن شعبہ! میں نہ سنوں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو تمہارے سامنے برا بھلا کہا جائے۔ تم نہ منع کرتے ہو نہ تمہیں کوئی تغیر ہوتا ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کی ایسی بات کی گواہی دے کر رہا ہوں جسے میرے کانوں نے سنا اور دل نے محفوظ رکھا۔ میں آپ ﷺ کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیوں کہ میں (بروزِ قیامت) ان سے ملوں گا تو وہ مجھ سے پوچھ گچھ کریں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے:

ابوبکر فی الجنة، وعمر فی الجنة، وعثمان فی الجنة، و علی فی الجنة، و طلحة فی الجنة، و الزبیر فی الجنة، و عبدالرحمن فی الجنة، و سعد بن مالک فی الجنة."

اس کے بعد کہا: "وتاسع المؤمنین فی الجنة." (نواں مسلمان بھی جنت میں۔)

اب مسجد گونج اٹھی۔ لوگوں نے قسم دے کر پوچھنا شروع کیا: "اے صحابیِ رسول! نواں آدمی کون ہے؟"

فرمایا: "تم نے اللہ کی قسم دے دی اس لیے بتا رہا ہوں کہ اللہ کی قسم نواں شخص میں ہوں۔"[2]

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کو شہ دیتے تھے۔

﴿جواب﴾ یہ دونوں روایات فقط اتنا ثابت کرتی ہیں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید سن کر خاموش رہے۔ مگر اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بردبار اور متحمل مزاج تھے۔ اس لیے انہوں

---

[1] فضائل الصحابة لاحمد بن حنبل، ح: ۲۲۵، ۹۰؛ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۵۰، کتاب السنة باب فی الخلفاء، بسند صحیح

[2] مسند احمد، ح: ۱۶۲۹

نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنے والے کو بیچ میں نہ ٹوکا، مگر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سمجھے کہ وہ اس کی باتوں کو خوشی سے سن رہے ہیں۔اس لیے انہیں غصہ آنا فطری بات تھی۔

اگر اسے ایک معمول فرض کرلیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بولنے پر کوئی سزا نہیں دیتے تھے۔ بلاشبہ ناصبی، خارجی یا ان سے متاثرہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کھلم کھلا تنقید کیا کرتے تھے۔مگر جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں حالات کو پرامن رکھنے کے لیے اپنی صف میں شامل اُشتر نخعی جیسے متشدد مزاج لوگوں سے نرمی برتی تھی، اسی طرح حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ جن کا تقرر ہی کوفہ میں حالات پر قابو پانے کے لیے ہوا تھا، شدت پسندوں کے خلاف کسی سخت کارروائی سے حتی الامکان احتراز کیا کرتے تھے، چاہے وہ اپنی صف کے ہوں یا اغیار کے۔غالباً وہ اس قسم کی بدگوئی کو اس لیے برداشت کرلیا کرتے تھے کہ کہیں فتنہ اور تفرقہ بڑھنے کی نوبت نہ آئے۔حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جیسے بعض اکابر کو یہ مصلحت پسندی گوارا نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے سکوت پر اعتراض کیا۔

بہر کیف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یا حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کی مجالس میں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے خلاف کسی نے کچھ کہا ہو، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں اُشتر نخعی جیسے لوگ اہلِ شام کے خلاف بدگوئی کرتے ہوں تو اسے ان عظیم ہستیوں کی مصلحت بینی اور نرم خوئی پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ (نعوذ باللہ) کم ظرفی پر۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں بھی منافقین اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے تھے مگر بارگاہِ نبوت کا لطف وکرم ایسا عام تھا کہ ایسے لوگوں سے بھی سختی نہ برتی گئی، عام طور پر چشم پوشی سے ہی کام لیا گیا۔عبداللہ بن اُبی کی ناپاک گفتگو پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مشتعل ہو کر اجازت چاہی کہ جاکر اس کا سر قلم کردیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ لوگ کہیں گے محمد اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرادیتا ہے۔ ①

☆☆☆

عبداللہ بن ظالم سے مروی سب وشتم کی روایات:

﴿سوال﴾ ایک حقیقت پر آپ کب تک پردہ ڈالیں گے۔یہ دیکھیے، امام نسائی نے کیا نقل کیا ہے:

لما قدم معاوية الكوفة اقام المُغِيرَة بن شعبة الخطباء يتناولون عليا رضي الله عنه فاخذ بيدي سعيد بن زيد، فقال: الاترىٰ هذا الظالم الذي يأمر بلعن رجلٍ من اهل الجنة؟ فاشهد على التسعة انهم في الجنة ولو شهدتُ على العاشر.

جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کوفہ آئے تو حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے خطیبوں کو کھڑا کیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کریں۔راوی عبداللہ بن ظالم کہتے ہیں کہ سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ

① سنن الترمذی، ح: ۳۳۱۵، تفسیر القرآن، سورة المنافقین

پکڑا اور کہا: تم اس ظالم کو نہیں دیکھ رہے جو ایسی ہستی پر لعنت کا حکم دے رہا ہے جو جنتی تھے۔ میں نو افراد کے بارے میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ جنتی ہیں اور اگر دسویں کے متعلق بھی یہی گواہی دے دوں تو مجھے کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (مراد خود تھے۔ اس کے بعد عشرہ مبشرہ والی مشہور حدیث سنائی۔)[1]

اور مزید دیکھ لیں۔ مسندِ احمد میں ہے:

عن عبداللّٰہ الظالم المازنی، لما خرج معاویۃ من الکوفۃ استعمل المُغِیرَۃ بن شعبۃ، قال فاقام خطباء یقعون فی علیؓ قال وانا الیٰ جنب سعید بن زید بن عَمْرو بن نفیل قال فغضب فقام فاخذ بیدی، فتبعتہ فقال: الا تریٰ الی ھذا الرجل الظالم لنفسہ الذی یأمر بلعن رجلٍ من اھل الجنۃ ؟ فاشھد علی التسعۃ انھم فی الجنۃ ولو شھدتُ علی العاشر لم آثم......

”حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کوفہ سے نکلے تو مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کو عامل بنا گئے۔ انہوں نے خطیبوں کو کھڑا کر دیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنے لگے۔ راوی عبداللہ بن ظالم کہتے ہیں کہ میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑا تھا، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں ان کے پیچھے چلا۔ انہوں نے کہا: تم اپنے نفس پر ظلم کرنے والے اس شخص کو نہیں دیکھ رہے جو ایسی ہستی پر لعنت کا حکم دے رہا ہے جو جنتی تھے۔ میں نو افراد کے بارے میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ جنتی ہیں اور اگر دسویں کے متعلق بھی کہہ دوں تو مجھے کوئی گناہ نہ ہوگا۔“[2]

یہ روایت سننِ ابی داؤد، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ کہیں مختصر ہے، کہیں مفصل، کسی جگہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ دونوں کا نام ہے۔ کسی جگہ صرف حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔ کسی جگہ دونوں، یا کسی ایک کا نام چھپا کر ان کی شخصیت کو ”فلان“ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سنن ابی داؤد میں ہے:

لما قدم فلان الی الکوفۃ اقام فلان خطیبا فاخذ بیدی سعید بن زید فقال: الا تریٰ الیٰ ھذا الظالم واشار الی الخطیب فاشھد علی التسعۃ انھم فی الجنۃ و لو شھدت علی العاشر لم اثم.[3]

مگر شارحین نے وضاحت کر دی ہے کہ فلاں سے کون کون حضرات مراد ہیں، چنانچہ سنن ابی داؤد کی شرح میں ہے:

”لما قدم فلان الی الکوفۃ اقام فلان خطیباً: قال فی الفتح الودود: ولقد احسن

---

[1] السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۱۵۱

[2] مسند احمد، ح: ۱۶۴۴

[3] سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۸، باب فی الخلفاء

ابو داوٗد فی الکنایۃ عن اسم معاویۃ و مُغیرَۃ بفلانٍ ستراً علیھما فی مثل ھذا المحل لکونھما صحابیین.

(ابوداؤد نے بہت اچھا کیا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے ناموں کی جگہ ''فلاں'' کا کنایہ اختیار کیا تا کہ ان کی پردہ پوشی ہو کیونکہ وہ دونوں صحابی ہیں۔)[1]

بہر حال یہ روایات پوری طرح بتا رہی ہیں کہ سب وشتم ہوتا تھا اور اس میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی سرپرستی بھی شامل تھی۔اس کے بعد بھی اگر کوئی اس حقیقت کو نہ مانے تو اس کو ہم ضدی کہیں گے۔

﴿جواب﴾ ہم نے بڑی سنجیدگی سے سائل کے پیش کردہ حوالوں کے علاوہ بھی اس روایت کے مختلف طرق سامنے رکھ کر ہر ایک کی سند کا جائزہ لیا ہے۔سب کا راوی عبداللہ بن ظالم ہے جو مجہول ہے۔یہ بات اگرچہ عجیب ہے کہ ایک مجہول راوی کی روایت کئی جلیل القدر محدثین جیسے حضرات کیونکر نقل کر گئے مگر اہلِ علم جانتے ہیں کہ کسی مشکوک یا ضعیف روایت کا کتبِ حدیث میں منقول ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔

غالباً امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے عبداللہ بن ظالم کی مشکوک حیثیت کو پہچان لیا تھا اور اس لیے انہوں نے اس روایت کو نہیں لیا۔امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عبداللہ بن ظالم کی سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت صحیح نہیں ہے۔[2]

عبداللہ بن ظالم کا اصل نام کہیں حیان بن غالب بتایا جاتا ہے کہیں مالک بن ظالم اور کہیں کچھ اور۔کتب حدیث میں ان سے بس دو روایات منقول ہیں:

ایک یہی جس میں مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق سب وشتم کا الزام ہے۔

دوسرے ارشادِ نبوی: **عن عبداللّٰہ بن ظالم عن سعید بن زید ذکر رسول اللّٰہ ﷺ فتنا کقطع اللیل المظلم اراہ.**[3]

ان کی شخصیت کے تعین نے ابن حجر رحمہ اللہ کو بھی پریشان رکھا۔''تقریب التھذیب'' میں وہ لکھتے ہیں:

''عبداللہ بن ظالم کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ''لین'' قرار دیا ہے۔''[4]

''لسان المیزان'' میں فرماتے ہیں: ''عبداللہ بن ظالم جو ہلال بن یساف کے شیخ ہیں، غیر معروف ہیں۔[5]

اور ''تعجیل المنفعۃ'' میں اس شخصیت پر طویل تبصرہ کر کے بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔لکھتے ہیں:

---

① عون المعبود: ۲۶۱/۱۲، ط العلمیۃ

② حدثنی آدم بن موسیٰ قال سمعت البخاری قال: عبداللہ بن ظالم عن سعید بن زید عن النبی ﷺ ولا یصح. (الضعفاء الکبیر للعقیلی: ۲/۲٦۷)

③ مسند احمد، ح: ۱٦۳۸

④ تقریب التھذیب ترجمہ نمبر: ۳۳۰۰

⑤ عبداللہ بن ظالم شیخ لھلال بن یساف لایعرف. (لسان المیزان: ۷/۲۹۲)

"مالک بن ظالم نے ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے قریشی غلاموں کی روایت نقل کی ہے اوران سے سماک بن حرب نے۔ الحسینی نے ان کا ذکر کیا ہے مگران کا کوئی حال نہیں بتایا۔ صحیح اسے قرار دیا ہے کہ یہ عبداللہ بن ظالم ہیں۔ اور ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ظالم کو ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے۔ نسائی نے تفسیر میں مالک بن ظالم کی سند سے جو نقل کیا ہے وہ اس کتاب کی شرط کے مطابق نہیں۔ مگر حسینی نے اپنا عذر یہ بیان کیا ہے کہ مزی نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ (ابن حجر فرماتے ہیں) میں نے تہذیب التہذیب میں ان کا اضافہ کیا ہے۔ ابن حبان نے انہیں ثقہ قرار دے کر ان کی روایت اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ حاکم نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ بخاری و مسلم نے ان کی روایت نہیں لی؛ کیوں کہ اس سند میں شعبہ اور سفیان کے مابین اختلاف ہے۔ پھر حاکم نے روایت کو سفیان کی سند سے نقل کیا ہے، کبھی وہ راوی کو عبداللہ بن ظالم کہتے ہیں کبھی مالک بن ظالم۔ اور ابوعوانہ عن سماک کی سند سے انہیں ثقات میں شامل کر دیا ہے تو وہاں کہا ہے مالک بن ظالم۔ اور عبداللہ بن ظالم کے حالات میں مذکور نہیں کہ انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کوئی روایت لی ہو یا ان سے سماک نے کچھ نقل کیا ہو۔ بخاری نے دونوں کے حالات میں یہی لکھا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ یہ دو افراد ہوں۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ذہبی نے میزان میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی منقول ہے کہ انہیں مالک بن عبداللہ بن ظالم کہا گیا ہے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ انہیں عبداللہ بن ظالم کہا گیا ہے مالک بن ظالم نہیں۔ ازدی سے منقول ہے کہ اس (عبداللہ بن ظالم) کی روایت کی متابعت نہیں کی جاتی۔"[1]

یہ تو سند کی بات ہے، جس میں ایک راوی عبداللہ بن ظالم کا نویں صدی ہجری تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ کون ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسی شخصیت جو علم حدیث اور اسماء الرجال کے ذخیرے پر چھائی ہوئی ہے، اس بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قاصر ہے۔

اب متن کو دیکھئے تو اس روایت کے مختلف طرق میں باہم سخت تضاد ہے جو خود اس کے ضعف کی واضح دلیل ہے۔

- کہیں یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کوفہ آئے تو یہ واقعہ ہوا...... کہیں یہ کہ وہ کوفہ سے نکلے تو یہ ہوا۔
- کہیں یہ کہ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے خود خطبہ دیا...... کہیں یہ کہ انہوں نے خطیبوں کو کھڑا کیا۔
- کہیں یہ کہ سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور راوی دونوں مسجد میں بیٹھے تھے جب ایسا ہوا...... کہیں یہ کہ سعید بن زید رضی اللہ عنہ اس وقت گھر میں تھے۔ راوی نے جا کر انہیں اطلاع دی کہ ایسا ہو رہا ہے۔
- کہیں سعید بن زید رضی اللہ عنہ خود عبداللہ بن ظالم سے کہتے ہیں تم اس ظالم کو نہیں دیکھ رہے؟ کہیں عبداللہ بن ظالم کہتے ہیں آپ اس ظالم کو دیکھئے۔ کہیں سعید رضی اللہ عنہ کو کسی اور نے بتایا اور انہیں یقین نہ آیا، پوچھا کہ واقعی ایسا ہوا ہے۔

[1] لسان الميزان لابن حجر: ٢/٢٢٦

ا کہیں یہ کہ ہے یہ ایک بار کا واقعہ ہے اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو اس پر تعجب ہوا۔ کہیں یہ کہ مُغیرَہ رضی اللہ عنہ ایسا کیا کرتے تھے، یہ ان کی عادت تھی۔

ان تضادات کے ہوتے ہوئے یہ روایت مشکوک ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ اصول درایت کو لیں تو روایت کے کچھ حصے کو مشکوک ہی مانا جائے گا۔ کیوں کہ یہ بات کسی طرح عقل میں نہیں آتی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کوفہ کی جامع مسجد میں خطیبوں کو ایک مہم کے طور پر مقرر کریں کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کو لعنت ملامت کریں اور سوائے سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے کوئی شخص احتجاج بھی نہ کرے۔

اگر معاملہ واقعی بالکل اسی طرح کا ہوتا تو کوفہ کے کئی ثقہ راوی اسے نقل کرتے۔ صرف عبداللہ بن ظالم جیسا مجہول آدمی ہی اسے کیوں نقل کر رہا ہے؟

ایسا لگتا ہے کہ اس حدیث کو عشرہ مبشرہ کے ناموں کی وجہ سے قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔ اس روایت میں نو یا دس صحابہ کا عشرہ مبشرہ ہونا ایک ساتھ منقول ہے اس لیے اکثر محدثین اس مفید حصے کے لیے اسے قبول کرتے چلے گئے۔

تاہم امام بخاری اور امام مسلم نے اسے نہیں لیا کیوں کہ عبداللہ بن ظالم ان کے نزدیک مشکوک تھا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس روایت کا اتنا حصہ ہی قابلِ قبول ہے جس میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ نو یا دس حضرات کے لیے بزبانِ رسالت جنت کی بشارت نقل کرتے ہیں۔ کیوں کہ کئی مقامات پر کتبِ حدیث میں یہ روایت تقریباً انہی اسناد سے مروی ہے مگر ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی توہین کی مہم چلنے کا کوئی ذکر نہیں۔ [1]

پس اس روایت کے بعض طرق میں حضرت مُعاویہ اور حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہما پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی توہین کی مہم چلانے کا الزام کسی بعد والے شخص کا اضافہ ہے۔ سند کی کمزوری اور خلافِ درایت ہونے کی وجہ سے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کسی روایت کو بہت سے محدثین کے نقل کر دینے یا اس کو صحیح قرار دینے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ روایت من وعن قابلِ استدلال ہے، جو اسے پڑھے اس کے ظاہر پر آنکھ بند کر کے عمل کر لے۔ مثلاً صحاح ستہ کی درج ذیل صحیح روایت ثقہ راویوں سے منقول ہے اور کئی محدثین نے نقل کی ہے:

اِشربوا من اَبوالھا و اَلبانھا. (ان اونٹنیوں کا پیشاب بھی پیو اور دودھ بھی۔) [2]

اب اگر کوئی اس سے تاریخی استدلال کرتے ہوئے نقل کر دے کہ اس معاشرے میں اونٹوں کا پیشاب دودھ میں ملا کر بڑے لطف سے پیا اور پلایا جاتا تھا تو کیا یہ درست ہوگا؟

---

① سنن ابن ماجہ، ح: ۱۳۳، فضائل العشرۃ، قال الالبانی صحیح
سنن الترمذی، ح: ۳۷۵۷، قال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح
مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۲۳۲؛ مسند احمد: ح ۱۶۴۵؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۱۹۴۸، ط الرشد

② صحیح البخاری، ح: ۶۸۰۲، کتاب الحدود، باب المحاربین؛ صحیح مسلم، ح: ۴۴۷۷؛ سنن ابی داؤد: ح ۴۳۶۴ بسند صحیح؛ سنن الترمذی، ح: ۱۸۴۵ بسند حسن صحیح

اور اگر کوئی اس سے فقہی استدلال کرتے ہوئے پیشاب کو حلال سمجھ لے تو یہ استدلال صحیح ہوگا؟

جس طرح حدیث سے فقہی استدلال وسیع النظر فقیہ کا کام ہے جو تمام روایات کو سامنے رکھ کر اس کا درست مطلب بتائے اسی طرح کسی حدیث سے تاریخی استدلال بھی اتنا آسان کام نہیں۔ کسی روایت کو پڑھ کر چاہے اسے متعدد مؤرخین نے نقل کیا ہو، فوراً کوئی مطلب نکال لینا درست نہیں۔ بلکہ یہ کام محقق علماء کا ہے کہ وہ واقعے کو دیگر روایات و آثار و قرائن کی روشنی میں دیکھ کر اس کا مطلب بتائیں، یا اس سے استدلال کی حیثیت طے کریں۔

مذکورہ واقعے کو اگر حضرات صحابہ کے اس عمومی کردار کی روشنی میں دیکھا جائے جو قرآن مجید اور روایاتِ صحیحہ میں مذکور ہے تو اس واقعے کے اضافی حصے کی تردید لازمی ہے۔ نعوذ باللہ کہ ہم صحابہ کے بارے میں ایسے پست اخلاق کا تصور کریں۔ صحابہ کرام کے بارے میں قرآنِ مجید کی گواہی ہے: رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں۔) تو ماننا پڑے گا کہ اختلاف کے وقت بھی وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ اور اخلاقی حدود کے پابند رہا کرتے تھے۔ قرآنی نصوص کے علاوہ اس کی تائید بے شمار صحیح احادیث اور تاریخی واقعات سے ہوتی ہے جو سیرت نبوی اور سیر الصحابہ کی کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

☆☆☆

بعض مؤرخین نے حضرت مُغِیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے سب و شتم کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ امام طبری نے ان کے خطبے کے الفاظ یہ پیش کیے ہیں:

”و کانت مقالته...... اللّٰهم ارحم عثمان بن عفان، وتجاوز عنه واجزه باحسن عمله فانّه عمل بكتابک واتبع سنة نبیک ﷺ جمع كلمتنا وحقن دمائنا وقتل مظلومًا. اللّٰهم فارحم انصاره واوليائه و محبيه والطالبين بدمه، ويدعو على قتلته.“

”حضرت مُغِیرَہ کا کلام یہ تھا: اے اللہ! عثمان بن عفان پر رحم فرما اور ان سے درگزر فرما، انہیں ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے کہ وہ تیری کتاب پر عمل کرتے تھے، تیرے نبی ﷺ کی سنت کی پیروی کرتے تھے، انہوں نے ہماری اجتماعیت کو قائم رکھا، ہمارے خون محفوظ رکھے اور مظلوم شہید کیے گئے۔ اے اللہ! ان کے مددگاروں اور دوستوں، ان سے محبت کرنے والوں اور ان کے خون کا بدلہ لینے والوں پر رحم فرما...... اور وہ (مُغِیرَہ رضی اللہ عنہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے خلاف بددعا کرتے تھے۔“[1]

یہ بھی یاد رہے کہ یہ ایک متعصب رافضی راوی ابو مخنف کی روایت ہے۔ اس خطبے میں وہ سب و شتم کہاں ہے جس کا چرچا کیا جاتا ہے؟ حدیث و تاریخ کے ریکارڈ میں اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے کسی گورنر کی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کا کوئی

---

[1] تاریخ الطبری: ۲۵۳/۵ عن ابی مخنف

ایسا ثبوت موجود ہے جس کے جملے بھی محفوظ ہوں تو وہ صرف یہی ہے۔ اس ایک بیان کے سوا کسی اور خطاب کا کوئی جملہ کہیں منقول نہیں جسے دیکھ کر معلوم کیا جائے کہ آیا وہ سب وشتم کس قسم کا ہوتا تھا۔ سنجیدہ تنقید تھی یا گالم گلوچ! سیاسی اختلافِ رائے کا اظہار تھا یا برا بھلا کہنا! یہ خطبہ نقل کرنے والا خود رافضی مؤرخ ہے اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے بیان کے سخت الفاظ کو چھوڑ کر نرم الفاظ نقل کر دیے ہوں گے۔

اس خطبے کو دیکھیے اور بتایئے اس کے کسی بھی لفظ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر گالم گلوچ کا نام دیا جاسکتا ہے؟ اس میں تو صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے حامیوں کے حق میں دعائے خیر اور قاتلینِ عثمان کے لیے بددعا ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر جمعے کے خطبوں میں قاتلین عثمان کے لیے بددعا کرتے تھے، تو یہ جملے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے گروہ کو بہت کڑوے لگتے تھے۔ اسی طرح بعض مخلص شیعانِ علی بھی یہ گمان کرتے تھے کہ یہاں قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ساداتِ کرام ہیں، کیوں کہ جنگِ صفین کے دوران اہلِ شام کا یہی دعویٰ تھا کہ یہ حضرات قاتلوں کے سرپرست ہیں۔ بہرحال اس ماحول میں اس قسم کی بددعاؤں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ''سب وشتم'' کا نام دے دیا گیا جس سے بہت سی غلط فہمیاں پھیلتی اور پھیلائی جاتی رہیں۔

☆☆☆

صحیح بخاری ومسلم کی دو روایات، ایک مشہور اعتراض کا جواب

﴿سوال﴾ صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر سب وشتم کرتے تھے۔ روایت یہ ہے:

ان رجلا جاء الى سهل بن سعد فقال هذا فلان لامير المدينة يدعو عليا عند المنبر قال فيقول ماذا قال يقول له ابو تراب الخ.

''ایک شخص نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے پاس آکر کہا یہ فلاں امیر مدینہ منبر کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کر رہا ہے۔'' حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے پوچھا ''کیا کہہ رہا ہے؟'' وہ بولا: ''علی رضی اللہ عنہ کو ابوتراب کہہ رہا ہے۔'' حضرت سہل رضی اللہ عنہ یہ سن کر ہنس دیے اور فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ نام انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اور علی رضی اللہ عنہ کو یہ نام سب سے زیادہ پسند تھا۔'' راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''اس کا سبب کیا تھا؟'' بولے: ''علی رضی اللہ عنہ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے، پھر نکلے اور مسجد میں جا کر سو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے) پوچھا: آپ کے چچازاد کہاں گئے؟'' بولیں: ''مسجد کی طرف'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے تو دیکھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چادر جسم سے الگ پڑی ہے، پشت پر مٹی لگ رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کمر سے گرد جھاڑ کر دو بار فرمایا: ''اے ابوتراب! (مٹی والے) اب تو اٹھ جاؤ'' [1]

[1] صحيح البخاري، ح: ٣٧٠٣، كتاب فضائل الصحابة، باب مناقب علي رضي الله عنه

اس روایت سے مدینہ کے گورنر کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جمعہ کے خطبے میں برسرِ منبر برا بھلا کہنا ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ صحابہ کے دور کا واقعہ ہے جس میں خلیفہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

﴿جواب﴾ روایت کے الفاظ کو غور سے پڑھیے۔ ان میں کہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے حکم کا ذکر ہے؟ قطعاً نہیں ہے۔ عبارت سے فقط یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مدینہ کا کوئی حاکم مسجد نبوی میں منبر کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طنز کر رہا تھا۔ یہ ''امیر المدینۃ'' کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ آخر کس دلیل سے یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا ہوگا اور ان کے حکم سے ہی ایسا کر رہا ہوگا؟ صحابہ کرام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بعد بھی تین عشروں تک موجود تھے۔ خود جن صحابی کا ذکر اس روایت میں ہے، یعنی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ، ان کی وفات ۹۱ھ میں ہوئی۔ اتنی طویل مدت میں مدینہ منورہ میں ایک درجن سے زائد گورنر تبدیل ہوئے۔ ان میں عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جیسے نیک و صالح بھی تھے اور حجاج بن یوسف جیسے جابر بھی۔ یہاں کون مراد ہے؟ روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

پھر اس روایت سے اتنا معلوم ہو رہا ہے کہ امیرِ مدینہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''ابوتراب'' کہہ کر یاد کیا تھا۔ یہ امکان موجود ہے کہ مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طنز ہو جیسا کہ بعض حکامِ بنوامیہ کی عادت تھی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ بنوامیہ کے بعض حکام کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم ثابت ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مروان کا اس فعل میں ملوث ہونا ہم بسندِ صحیح نقل کر چکے ہیں۔ مگر ہم مدلل طور پر اس پروپیگنڈے کی تردید بھی کر چکے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کا حکم دیتے تھے یا یہ کوئی سرکاری پالیسی تھی۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائبین نہ صرف سب و شتم کرتے تھے بلکہ صحابہ کو اس کا حکم بھی دیتے تھے۔ روایت دیکھیں:

اُستُعمِل علی المدینۃ رجل من آل مروان، قال فدعا سھل بن سعد فامرہ ان یشتم علیا الخ.

''آلِ مروان سے ایک شخص مدینہ منورہ میں عامل مقرر ہوا۔ اس نے حضرت سہل رضی اللہ عنہ کو بلا کر حکم دیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کریں۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ اس حاکم نے کہا: ''اگر آپ نہیں مانتے تو اتنا کہہ دیں ابوتراب پر اللہ کی لعنت ہو۔''

حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضرت علی کو ابوتراب سے زیادہ کوئی اور نام پسند نہ تھا۔ جب انہیں اس نام سے پکارا جاتا تھا تو وہ خوش ہوتے تھے۔''

اس شخص نے پوچھا: ''ان کا نام ابوتراب کیوں رکھا گیا؟ ہمیں یہ قصہ بتایئے۔''

(تو حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے وہی قصہ سنایا جو صحیح بخاری کی روایت میں گزرا)[1]

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۶۳۸۲، فضائل الصحابۃ، فضائل علی رضی اللہ عنہ



اس روایت کو گزشتہ روایت سے ملائیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کے گورنروں کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنا بلکہ لعنت کرنا اور کروانا ثابت ہو رہا ہے۔

﴿جواب﴾ صحیح مسلم کی اس روایت سے فقط اتنا ثابت ہو رہا ہے کہ مدینہ کے کسی گورنر نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت کرانا چاہی۔ مگر یہ گورنر کون تھا؟ اور اسے کس خلیفہ نے مقرر کیا تھا؟ اس کا ذکر اس روایت میں ہے نہ صحیح بخاری کی گزشتہ روایت میں۔ صحیح بخاری میں تو تقرر کا ذکر ہی نہیں۔ صحیح مسلم میں بھی اُستعمل صیغۂ مجہول ہے، یعنی تقرر کیا گیا تھا۔ یہ بھی واضح نہیں کہ دونوں واقعے ایک ہی گورنر کے ہیں یا الگ الگ کے۔

جس گورنر کا تقرر ہوا اسے صحیح بخاری کی روایت میں ''فلان لامیر المدینة'' اور مسلم کی روایت میں ''رجل من ال مروان'' کہا گیا ہے۔ ''رجل من ال مروان'' میں لغوی لحاظ سے دو احتمال ہیں:

1. ایک یہ کہ مروان کی نسبی اولاد مراد ہو۔
2. دوسرے یہ کہ آلِ مروان سے مراد ''مروانی گروہ'' کا کوئی شخص ہو۔ [1]

اگر ''رجل من آل مروان'' سے مروان کی اولاد کا کوئی شخص مراد لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟ تمام تواریخ دیکھ لیں، ثابت ہوگا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مروان کے بیٹوں یا پوتوں مثلاً: عبدالملک، عبدالعزیز، ولید، سلیمان، ہشام وغیرہ میں سے کوئی بھی مدینہ منورہ کا امیر نہیں رہا۔ اس دور میں مروان بن حکم کے علاوہ فقط سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ مدینہ کے گورنر رہے۔ ان دونوں کے نسب چھان لیں تو ان کے آباؤ اجداد میں اوپر دور دور تک کوئی مروان نہیں ملے گا۔

غرض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا کوئی حاکم ایسا نہیں جس پر ''رجل من آل مروان'' کا اطلاق کیا جا سکے۔

اسی طرح یزید کے دور میں مدینہ کے گورنروں کے نام و نسب دیکھیے تو دورِ یزید میں ولید بن عتبہ، عمرو بن سعید بن العاص اور عثمان بن محمد (بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ) مختلف اوقات میں مدینہ کے امیر رہے۔ ان میں سے بھی کسی کے آباؤ اجداد میں کوئی ''مروان'' نہیں گزرا کہ اس کی اولاد پر آل مروان کا اطلاق ہو سکے۔ اس لیے حدیث میں ذکر کردہ ''شتم علی'' کا واقعہ یزید کے دور میں بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

یزید کے بعد حجاز ۶۳ھ سے ۷۳ھ تک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ماتحت رہا۔ انہیں یا ان کے گورنروں کو بھی آل مروان نہیں کہا جا سکتا۔ ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے کا الزام ان کے مخالفین نے بھی کبھی نہیں لگایا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حجازِ مقدس عبدالملک بن مروان کے زیرِ نگین ہوا تو مدینہ منورہ میں ۷۳ ہجری میں حجاج بن یوسف ثقفی کو اور ۷۵ھ میں یحییٰ بن حکم بن مروان کو گورنر مقرر کیا گیا۔

---

[1] جیسا کہ قرآن میں فرعون کے گروہ والوں کو آل فرعون کہا گیا ہے۔ ''مروانی'' وہی لوگ تھے جنہیں بعد میں ''ناصبی'' کہا جانے لگا۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم میں مروان کا کردار نمایاں تھا، اس لیے شروع میں یہ گروہ اسی کے نام سے موسوم ہوا۔

۱ یحییٰ کے بعد ۸۳ھ تک یہاں ابان بن عثمان (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فرزند) گورنر رہے۔ پھر ہشام بن اسماعیل مخزومی کا تقرر ہوا جو عبدالملک کی وفات کے دو سال بعد تک (۸۶ھ تک) اس منصب پر رہا۔

ان چاروں میں سے ابان بن عثمان، حجاج بن یوسف (بنو ثقیف) اور ہشام بن اسماعیل (بنو مخزوم) پر نسباً آل مروان کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ابان بن عثمان رحمہ اللہ ویسے بھی بڑے عالم فاضل اور نیک سیرت تھے۔ ان سے ایسی حرکت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بالفرض وہ مراد ہوتے تو راوی "رجل من بنی امیہ" کہتا "رجل من آل مروان" نہیں۔

۱ ان کے بعد ۸۷ھ سے ۹۳ھ تک عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مدینہ کے گورنر رہے۔ ①

یہ تھا ۴۰ھ سے ۹۳ھ تک مدینہ منورہ کے گورنروں کا جائزہ۔ ہم نے ان گورنروں کے نام ونسب اس لیے پیش کیے ہیں کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ جن کا ذکر صحیح بخاری ومسلم کی ان روایات میں ہے، سن ۹۱ ہجری میں فوت ہوئے تھے۔ ان کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے وہ آخری انصاری صحابی تھے۔ ②

غرض سن ۴۱ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے سے لے کر حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی وفات تک مدینہ پر جتنے امیر مقرر ہوئے ان میں اگر کسی کو نسباً آل مروان کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف دو ہیں: ایک یحییٰ بن الحکم بن مروان، دوسرے عمر بن عبدالعزیز بن مروان۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس حرکت کو سخت ناپسند کرتے تھے، مدینہ کے گورنر بن کر وہ اس گناہ سے گریزاں رہے ③ اور خلیفہ بنتے ہی انہوں نے یہ مکروہ حرکت بند کرادی۔ ④

پس اگر آلِ مروان سے مراد مروان کی نسبی اولاد ہو تو اس کا اطلاق فقط یحییٰ بن الحکم بن مروان پر ہوسکتا ہے جو عبدالملک بن مروان کا چچا تھا اور اسی کے دور میں مدینہ کا امیر بنایا گیا تھا۔ ⑤

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ روایت کے مبہم الفاظ، **اُستُعمِلَ رجل من ال مروان**" اور "**امیر المدینة**" واضح طور پر اشارہ دے رہے ہیں کہ راوی بہت احتیاط ملحوظ رکھ رہا تھا یا خوف کا شکار تھا۔ ایسا خوف عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ولید کے دور میں ہی لوگوں پر چھایا تھا کیوں کہ ان کے گورنر حجاج بن یوسف سے سب ڈرتے تھے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ نقل کرنے والے تابعی ابوحازم رحمہ اللہ جو سن ۱۰۰ ہجری میں فوت ہوئے، اسی دور کے تھے۔ ان کی روایت کے الفاظ صاف بتارہے ہیں کہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ پر گزرنے والے واقعے کو ان کے شاگرد

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۳ تا ۳۱۱

② الاعلام للزرکلی: ۱۴۳/۳؛ حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر والقاهرۃ: ۲۰۷/۱

③ العاشر من المشیخة البغدادیة لابی طاهر السلفی: ۶۲/۱

④ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۱۸۲؛ الکامل فی التاریخ: ۹۹/۴

⑤ البدایہ والنہایہ: ۲۶۵/۱۲؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۹۳

۱ واضح رہے کہ یہ یحییٰ، مروان بن الحکم کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا چچازاد بھائی تھا۔ اگر صحیح بخاری ومسلم کی روایت کے واقعات ایک ہی گورنر کے ہوں تو پھر صحیح بخاری میں امیر المدینہ سے بھی یہی مراد ہوگا۔ عبدالملک نے اسے ۷۵ھ میں گورنر بنایا اور اگلے سال برطرف کردیا۔ برطرفی کی کوئی وجہ تاریخ میں مذکور نہیں۔ ممکن ہے ایسی ہی حرکات کی وجہ سے صحابہ اور تابعین کے احتجاج پر اسے معزول کیا گیا ہو۔

ابوحازم نے اپنے الفاظ میں نقل کیا ہے: فابیٰ سھل ، ضحک، فقال سھل کے الفاظ سے پتا چل رہا ہے کہ تمام الفاظ شاگرد کے ہیں، صاحبِ واقعہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ بات کو اُستُعْمِل اور امیر المدینۃ جیسے مبہم الفاظ میں بھی ابوحازم رحمہ اللہ نے ہی ڈھالا ہے، بظاہر انہیں احتیاط اس لیے کرنی پڑی کہ ان پر عبدالملک کے گورنروں کی تنقیص کا الزام نہ لگ جائے۔

اگر ''آلِ مروان'' میں ''آل'' سے نسبی اولاد نہیں بلکہ ''مروانی گروہ'' یا مروان بن الحکم کے نائبین مراد لیے جائیں تب بھی یہ واقعہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا نہیں، دولتِ بنومروان کا ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ یہ واقعہ مروان بن الحکم کے کسی گورنر کا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہاں ذکر مدینہ کے گورنر کا ہے اور مروان کو مدینہ میں کوئی گورنر تعینات کرنے کا موقع نہیں ملا کیوں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اس کی حکومت صرف شام تک محدود رہی تھی۔

اس طرح تقریباً یہ طے ہوجاتا ہے کہ یہ واقعہ عبدالملک بن مروان یا اس کے بیٹے ولید کے دور کا ہے۔

امام بخاری نے ''التاریخ الکبیر'' میں ایک صحیح روایت نقل کی ہے جو اس مسئلے کو حل کرنے میں مزید مدد دے سکتی ہے:

''مجھے ابن منصور (اسحق بن منصور) نے کہا کہ ہم سے وہب (بن جَرِیر) نے بیان کیا کہ مجھے میرے والد (جَرِیر بن حازم) نے سنایا کہ میں نے یعلیٰ بن حکیم سے سُنا، وہ نافع سے نقل کرتے ہیں کہ ہشام بن اسماعیل نے یزید بن اُمیہ ابوسنان الدؤلی کو جو غزوۂ اُحد کے دنوں میں پیدا ہوئے تھے، آمادہ کرنا چاہا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کریں۔ انہوں نے فرمایا: ''میں ان پر سب وشتم نہیں کروں گا۔ لیکن اگر تم چاہو تو میں کھڑا ہو کر ان کے بابرکت دور کے حالات اور ان کی مہمات ذکر کردیتا ہوں۔''[1]

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ ہشام بن اسماعیل، عبدالملک بن مروان کے دور میں مدینہ کا گورنر تھا۔ امام بخاری کی مذکورہ روایت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرانے میں بڑا بے باک تھا۔ پس غالب گمان یہ ہے کہ صحیح بخاری کی روایت میں جس ''امیر المدینہ'' اور صحیح مسلم کی روایت میں جس ''رجل من آلِ مروان'' کا ذکر ہے، وہ یہی ہے۔ آلِ مروان سے نسبی اولاد نہیں بلکہ فکری اور نظریاتی اولاد مراد ہے۔

اب ایک بار پھر دیکھ لیں کہ مذکورہ روایتوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے پتا چلے کہ گورنر کو خلیفۂ وقت نے اس ناپاک حرکت کا حکم دیا تھا۔ بلکہ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس گورنر نے ذاتی تعصب وعناد کی وجہ سے یہ حرکت کی تھی۔

اگر صحیح بخاری ومسلم کے دونوں واقعات ایک ہی گورنر کے ہیں (جیسا کہ غالب گمان ہے) تو کہا جاسکتا ہے کہ پہلے اس نے مسجد میں خود یہ حرکت کی اور پھر حضرت سہل رضی اللہ عنہ کو بلوا کر انہیں بھی اس برائی میں شریک کرنا چاہا اور ان کے منہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ''لعنت'' کروانا چاہی اور انداز بھی ایسا اختیار کیا کہ پستی کی حد کردی۔ یعنی اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کسی اور طرح نہیں کرسکتے تو کم سے کم ان پر لعنت ہی کردو۔ یعنی اس بدبخت کے نزدیک

---

[1] التاریخ الکبیر للبخاری: ۸/۳۱۹

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کا یہ خفیف درجہ تھا۔ نعوذ باللہ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اموی حاکم نہایت جاہل تھا، ورنہ اسلامی تعلیمات سے واقف کوئی شخص عام مسلمان کو بھی لعنت کا نشانہ نہیں بناتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اس نے اسی متعصبانہ ماحول میں گردش کرنے والی جھوٹی روایات پر یقین کیا جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سبائیوں کا لیڈر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل وغیرہ مشہور کیا جا چکا تھا۔ اگر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا علم ہوتا تو وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے اس کے قلبی روگ کو سمجھ لیا اور بڑے تحمل وتدبر کے ساتھ اسے لعنت ملامت کرنے کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب سننے کا شوق دلایا۔ اسی روایت کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً اس شخص کو اپنی جہالت کا احساس ہو گیا تھا، اسی لیے اس نے خود درخواست کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب سنے۔

بہر کیف معترضین چونکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے سخت بدگمان ہیں، اس لیے انہوں نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی طویل عمر کو نظر انداز کر کے فرض کر لیا کہ یہ واقعہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں ہوا ہوگا۔ حالاں کہ حضرت سہل بن سعد ۹۱ھ میں فوت ہوئے تھے۔ اس دوران کئی خلفاء اور گورنر تبدیل ہو چکے تھے۔ اس لیے پورا پورا امکان تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے والے امیر کا تقرر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے نہ کیا ہو۔ بلکہ یہ ان کے دور کا واقعہ ہی نہ ہو۔ اور ہم نے تحقیق سے یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔ مگر معترضین نے اس امکان کو نظر انداز کر کے محض قیاس کرتے ہوئے اس شرارت کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ذمے لگا دیا اور بات کا بتنگڑ بناتے ہوئے مشہور کر دیا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے مدینہ کا گورنر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتا اور دلواتا تھا۔

☆☆☆

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکام پر توہینِ علی رضی اللہ عنہ کا الزام

﴿سوال﴾ کتبِ حدیث میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے گورنر توہینِ علی کا برسرِ منبر ارتکاب کیا کرتے تھے۔ روایت ملاحظہ ہو:

اعن ابی عبداللہ الجدلی قال دخلت علی ام سلمة رضی اللہ عنہا، فقالت لی: أیسب رسول اللہ ﷺ؟ قلت معاذ اللہ او سبحان اللہ او کلمة نحوھا قالت سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: من سب علیا فقد سبنی.

''ابوعبداللہ جدلی کہتے ہیں: میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا۔ وہ بولیں: ''کیا رسول اللہ ﷺ کو تمہارے ہاں برا بھلا کہا جاتا ہے؟'' میں نے کہا: ''معاذ اللہ!''

ام المؤمنین نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے جس نے علی کو برا کہا اس نے مجھے برا کہا۔''[1]

﴿جواب﴾ اس روایت کی سند بعض طرق میں صحیح اور بعض میں حسن ہے مگر اس میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منبر پر برا بھلا کہا جاتا ہے بلکہ یہاں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، ابوعبداللہ جدلی کو ''فیکم'' فرما رہی ہیں، یعنی تمہارے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے تمہارے ہاں سے ان کی مراد اہلِ کوفہ تھے؛ کیوں کہ ابوعبداللہ جدلی کوفہ کے تھے۔[2] اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں کچھ لوگ یہ حرکت کرتے تھے۔ اس حد تک بات ہمیں بھی تسلیم ہے کہ یہ حرکت ہوتی تھی۔ مگر کون کرتا تھا؟ کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر؟ یہ اس روایت میں ہرگز منقول نہیں۔ اور کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس کا حکم دیتے تھے؟ یہ بھی کسی صحیح روایت میں مذکور نہیں۔

☆☆☆

---

① مسند احمد، ح: ۲۶۷۴۸ ، مستدرک حاکم، ح: ۴۶۱۵، قال الذهبی: صحیح ، السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۴۲۲ ، مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۲۱۱۳، ط الرشد ، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۲۲/۲۳، ط مکتبة ابن تیمیة، بسند حسن

② تهذیب الکمال: ۲۴/۳۴

﴿سوال﴾ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ایک دوسری سند سے بھی منقول ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں منبروں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرایا جاتا تھا۔ اس روایت میں ہے:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک بار ابوعبداللہ الجدلی آئے تو ام المؤمنین نے ان سے پوچھا:

ایُسَب رسول اللّٰہ فیکم علی مناہر؟

''کیا تمہارے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبروں پر سب وشتم کیا جاتا ہے؟''

وہ بولے: ''سبحان اللہ! بھلا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے سب وشتم کیا جاسکتا ہے؟''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کیا علی بن ابی طالب اور ان کے چاہنے والوں کو برا بھلا نہیں کہا جاتا؟ میں گواہ ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی سے محبت رکھتے تھے۔''[1]

ظاہر ہے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۵۹ ہجری میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہوئی تھی، اس لیے ان روایات میں جس سب وشتم کا ذکر ہے وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) ہی میں تھا۔

﴿جواب﴾ اس سارے دعوے کی بنیاد جس قیاس پر ہے؟ وہ درست نہیں یعنی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ۵۹ھ میں وفات ہونے کا قول غلط ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا یزید کے دور میں بھی زندہ تھیں۔ یزید کے افسر مسلم بن عقبہ نے مدینہ پر ۶۴ھ کے شروع میں حملہ کیا تھا۔ درج ذیل روایت بتاتی ہے کہ اس وقت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں۔

''جب مسلم بن عقبہ مدینہ آیا تو لوگوں سے بیعت لی، یہ وقعہ حرہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس کے پاس بنوسلمہ بھی آئے۔ تو وہ بولا: میں تم سے بیعت نہیں لوں گا جب تک جابر نہیں آجاتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چلا گیا تاکہ ان سے مشورہ لوں۔ وہ بولیں: میں یقیناً اسے بیعت ضلالت قرار دیتی ہوں، مگر میں نے اپنے بھائی عبداللہ بن ابی امیہ کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اس کے پاس جائے اور بیعت کرلے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پس میں نے بھی جا کر بیعت کرلی۔''[2]

بلکہ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف اموی لشکر کے حملے تک بقیدِ حیات تھیں۔ روایت درج ذیل ہے۔ راوی عبیداللہ ابن القبطیہ کہتے ہیں:

''حارث بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان اور ان کے ساتھ میں بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوا اور ان سے اس لشکر کے بارے میں پوچھا جسے دھنسایا جائے گا۔ یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی بات ہے۔''[3]

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی، روایت نمبر: ۵۸۳۲ ؛ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۰۱۳ ؛ المقصد العلی فی زوائد ابی یعلیٰ: ۱۸۹/۳

[2] الاصابہ: ۱۱/۴ سند ابن عیینہ عن الولید بن کثیر عن وھب بن کیسان عن جابر بن عبد اللّٰہ ہے۔ جو کم از کم حسن ہے۔

[3] صحیح مسلم، ح: ۲۸۸۲، اموی لشکر نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف تین بار چڑھائی کی تھی: ۶۱ھ، ۶۴ھ اور ۷۳ھ میں۔

اس لیے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے متعلق سن ۵۹ ھ کے قول پر یقین کر کے دوسرے لوگوں کے جرائم کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا ظلم ہے۔ غالب اندازہ یہی ہے کوفہ کے منبر ومحراب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے کی رسم یزید کے دور میں شروع ہوئی۔ یزید کا گورنر عبیداللہ بن زیاد شیعانِ علی کا سخت مخالف، بدمزاج اور ظالم انسان تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ شیعانِ علی کو جلانے اور تڑپانے کے لیے اسی نے یہ حرکت محراب ومنبر میں شروع کرادی ہو۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا اس وقت حیات تھیں، لہٰذا اس پر تنقید کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس تشریح کے مطابق مذکورہ دونوں احادیث بھی اپنی جگہ درست قرار پاتی ہیں اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا۔ [1]

☆☆☆

کیا برسرِ منبر توہین خوارج کا فعل تھا؟

﴿سوال﴾ کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برسرِ منبر توہین کا ارتکاب خوارج کرتے تھے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مراد وہی تھے کیوں کہ "علی المنابر" کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ جامع مسجد کا وہ منبر مراد نہ تھا جہاں گورنر خطبہ دیتا تھا۔ ایسا ہوتا تو علی المنبر کہا جاتا، علی المنابر نہیں۔ آخر کوفہ میں صرف ایک ہی مسجد نہ تھی۔ دورِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ میں کوفہ کی آبادی ایک لاکھ تھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں صرف بصرہ اور اس کے گرد ونواح

① حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت کئی اسناد سے مروی ہے۔ اگر ان سب کو ملایا جائے تو اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اموی دور میں کوفہ کے منبر ومحراب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کیا جاتا تھا، اسی لیے مؤرخین نے دورِ بنوامیہ میں اس رسم کو ایک متواتر حقیقت کے طور پر مانا ہے۔ (لوامع الخلفاء: ۶۸/۱ ؛ الکامل فی التاریخ: سن ۹۹ ھجری ؛ تاریخ ابن الوردی: ۱۷۲/۱ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۲ ؛ سمط النجوم العوالی: ۳۲۶/۳) یہ الگ بات ہے کہ بعض تشدد مؤرخین نے اسے براہِ راست حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر تھوپ دیا ہے۔ (المختصر فی اخبار البشر: ۱۸۶/۱) حالانکہ یہ خلافِ تحقیق ہے۔

شراحِ حدیث بھی اس پر متفق ہیں کہ اموی دور میں سب وشتم ہوتا تھا۔ "ثم کان من امر علی ما کان، فنجمت طائفة اخری حاربوه، ثم اشتد الخطب فتنقصوه واتخذوا لعنه علی المنابر سنة ووافقهم الخوارج علی بغضه وزادوا حتی کفروه مضموما ذلک منهم الی عثمان فصار الناس فی حق علی ثلاثة: اهل السنة، والمبتدعة من الخوارج، والمحاربین له من بنی امیة واتباعهم. (فتح الباری: ۷۱/۷) وما احسن عمر بن عبدالعزیز حیث جعل مکان سب اهل البیت الصادر من بنی امیة فوق المنابر هذه الآیة الشریفة. (مرقاة المفاتیح: ۱۰۳۲/۳) وهو الذی ازال ما کان یذکر به علیا علی المنابر فان بنی امیة کانوا یلعنون علیا علی المنابر. (شرح البخاری للسفیری: ۳۱۰/۱)

نوٹ: متن میں مذکور دونوں روایات میں سے پہلی سنداً صحیح یا کم از کم حسن ہے۔ دوسری روایت میں ضعف ہے۔ اسی طرح جن دیگر اسناد سے یہ روایت منقول ہے ان میں غالباً کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں۔ وجوہِ ضعف یہ ہیں: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات نقل کرنے والا ہر جگہ ایک ہی شخص ابوعبداللہ الجدلی ہے جسے بعض نے ثقہ مانا ہے مگر اس پر تشیع کا الزام بھی ہے۔ (تقریب التهذیب، تر: ۸۲۰۷) بلکہ ابن سعد نے اسے "شدید التشیع" (متشدد شیعہ) اور حافظ ذہبی نے "شیعی بغیض" کہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مختار کذاب کی فوج کا افسر تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۲۲۸/۶ ط صادر ؛ میزان الاعتدال: ۵۴۴/۴)

یہ روایت ابوعبداللہ الجدلی سے "علی المنابر" کے اضافے کے ساتھ صرف سدی نے نقل کی ہے۔ تشیع کا الزام سدی پر بھی ہے۔ (تقریب التهذیب، تر: ۴۶۳) ابن معین انہیں قدرے ضعیف اور ابوحاتم ناقابلِ استدلال کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال: ۲۳۶/۱) ان میں سے بعض روایتوں کی سند میں ہمیں عبیداللہ بن موسیٰ دکھائی دیتے ہیں جنہیں اگرچہ ثقہ مانا گیا ہے۔ (تقریب التهذیب، تر: ۴۳۴۵) اور اگرچہ صحیح بخاری میں بھی ان کی روایتیں ہیں مگر ان پر بھی تشیع کا الزام ہے اور امام احمد بن حنبل فرماتے تھے: حدث باحادیث سوء. (انہوں نے بری روایات نقل کیں۔) (سیر اعلام النبلاء: ۵۵۶/۹، ط الرسالة)

غرض ان دیگر اسناد میں ایسے راوی موجود ہیں جو شیعہ تھے یا ان پر تشیع (اور بعض پر شدید تشیع) کا الزام تھا، چاہے بعض نے انہیں صدوق مانا ہو مگر تشیع کے پس منظر میں ان کی روایات محلِ نظر ضرور ہوں گی۔ البتہ اگر اس الزام کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد کے اموی حکام تک محدود رکھا جائے تو اس میں اشکال نہیں؛ کیوں کہ: (۱) ایسے معاملات میں ضعیف روایات بھی قابلِ قبول ہیں۔ (۲) صحیح روایات سے بھی بعض اموی عمال کا سب وشتم کرنا ثابت ہو چکا ہے۔

ازواج سرکاری وظائف پانے والے لوگ ایک لاکھ چالیس ہزار اور شمشیر زن ۸۰ ہزار تھے۔[1] گویا شہر اور مضافات کی آبادی چار پانچ لاکھ ضرور ہوگی۔ اتنی ہی آبادی کوفہ کی ہوگی۔ ایسے شہروں میں یقیناً درجنوں مساجد اور درجنوں منبر ہوں گے، انہی میں ناصبیوں اور خارجیوں کی مساجد بھی ضرور ہوں گی جن کے منبروں پر یہ حرکت ہوتی ہوگی۔

﴿جواب﴾ یہ توجیہ اچھی ہے بشرطیکہ قیاس کے ساتھ کوئی حوالہ بھی ہوتا۔ خوارج کا عام مجالس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنا تو ایک حقیقت ہے۔ مگر ان کا منبروں پر یہ حرکت کرنا کسی تاریخی حوالے کا محتاج ہے جو آپ نے پیش نہیں کیا۔ قیاساً یہ بات کمزور ہے۔ محض قیاس سے اسے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اس دور میں منبر فقط جامع مساجد میں ہوتے تھے اور خوارج کے پاس اس دور میں کوئی مستقل شہر تھا نہ کوئی جامع مسجد۔ ''علی المنابر'' کے لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوفہ میں کئی جامع مساجد تھیں جن کے کئی منبر تھے۔ پہلی صدی ہجری میں کوئی شہر اتنا وسیع نہیں تھا کہ وہاں متعدد جامع مساجد کی ضرورت ہوتی۔ ایک ہی جامع مسجد ہوتی تھی اور سامعین کی کثرت کی وجہ سے اسی میں کئی منبر ہوا کرتے تھے۔ خطیب کی آواز دور تک نقل کرنے کے لیے یہ منابر مخصوص فاصلے کے ساتھ رکھے جاتے تھے اور خطیب کے نائبین ان پر بیٹھ کر خطبے کے کلمات آگے نقل کرتے تھے۔[2]

اگر کسی شہر میں جامع مساجد متعدد ہوں بھی تو جمعے کے انعقاد کا انتظام صرف حکومت کے تحت ہوتا تھا۔ خوارج اموی حکام کے مخالف تھے، حکومت انہیں کسی منبر پر مسلط ہونے اور اپنی خرافات کی اشاعت کا موقع کیسے دے سکتی تھی۔[3]

پس منابر پر سب وشتم خوارج کے ذمے لگانا کمزور قیاس ہے۔ شواہد کے مطابق یہ کام بعض اموی گورنروں کا ہی تھا۔

خلاصۂ بحث:

کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سب وشتم کرتے ہوں یا اس کا حکم دیتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہے کہ بعض اُموی گورنر (غیر صحابہ) برسرِ منبر ایسا کرتے تھے یا یہ کہ کبھی کبھار عام مجلس میں بعض لوگ ایسا کرگزرتے تھے۔ اگر ایسا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ہوتا تو کبھی تنبیہ کرتے اور کبھی مصلحتاً چشم پوشی فرماتے۔

---

① تاریخ الطبری: ۵/۵۰۴، ۵۰۵ عن عمر بن شبہ

② لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد سے قبل بڑے اجتماعات میں جہاں امام، خطیب، مؤذن یا استاذ حدیث کی آواز تمام لوگوں تک پہنچنا مشکل ہوتا تھا، نقلِ صوت کا یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ (جس کی ایک جھلک تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔) کتب حدیث وفقہ میں اس کے نظائر بکثرت ملیں گے مثلاً: لخطب عمر بن عبدالملک علیٰ رؤوس المنابر. (نیل الاوطار: ۷/۱۰۷) حدثنا اللیث بن سعد عن ابن شہاب انہ کان قاعداً علیٰ منبر عمر بن عبدالعزیز فی امارتہ علی المدینۃ ومعہ عروۃ بن الزبیر. (التمھید لما فی الموطا من المعانی والاسانید: ۸/۱۲) وقولہ یسمع الخطبۃ ای من المنابر بالعلیٰ مرت. (ردالمحتار: ۲/۱۵۳، ط دار الفکر) وھذا اصل فی الاعتلاء علی المنابر عند کثرۃ المطر. (المنتقی شرح الموطا للامام الولید الباجی: ۱/۳۳۳) ظاہر ہے نماز استسقاء ایک جگہ ہوا کرتی تھی، اس میں منابر کا مطلب وہی ہے جو جامع مسجد میں منابر کا ہے۔

③ اس دور میں عام خوارج معاشرے میں گھلے ملے رہتے تھے جبکہ ان کے مسلح گروہ جنگلوں اور دیہاتوں میں ٹھکانے بناتے تھے۔ ان کا کوفہ کے محراب ومنبر پر خطبے دینا تبھی ممکن تھا جب وہ شہر پر بزور قوت قبضہ کرلیتے مگر کوفہ پر وہ کبھی قبضہ نہ جماسکے۔ ۶۷ھ میں جا کر وہ پہلی بار بحرین اور یمامہ پر قابض ہوئے۔ عراق میں عبدالملک بن مروان کے دور میں انہوں نے بہت ہنگامہ مچایا مگر بڑے شہروں میں سے کسی پر مستقل قبضہ نہ کرسکے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے الکامل فی التاریخ: ۶۵ھ، ذکر نجدۃ بن عامر، تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۸۴ تا ۱۸۷، تاریخ طبری: ۶/۱۷۴، تاریخ طبری، سن ۶۵ھ تا ۷۶ھ کے حالات

صحیح اور ضعیف روایات کا فرق رکھے بغیر بحث کرنے والوں سے سوال:

صحیح اور ضعیف روایات کا فرق رکھنے کا اصول ملحوظ رکھا جائے تو ہر تحقیق کرنے والا اسی نتیجے تک پہنچے گا جو ہم نے مذکورہ بالا سطور میں بیان کیا۔ تاہم اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عقیدت میں شدت برتتے ہوئے کوئی یہ کہے کہ ہم اس اصول کے قائل نہیں بلکہ ضعیف روایات بھی ہمارے نزدیک ہر طرح قابلِ اعتماد ہیں اور چونکہ بعض ضعیف روایات حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اس مہم میں بذاتِ خود ملوث بتاتی ہیں، اس لیے یہ الزام ان پر بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

ایسے حضرات سے ہم گزارش کریں گے کہ انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے پھر درج ذیل روایت پر بھی یقین کیجئے۔

ابو مخنف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے بتاتا ہے:

> ''حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نماز فجر ادا کرتے تو دعائے قنوت پڑھتے اور کہتے: اے اللہ! مُعاویہ، عَمرو بن العاص، ابوالاعور سلمی، حبیب، عبدالرحمٰن بن خالد، ضحاک بن قیس اور ولید پر لعنت کر۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی تو پھر جب وہ دعائے قنوت پڑھتے تو اس میں حضرت علی، ابن عباس، اَشتر اور حسن و حسین پر لعنت کیا کرتے تھے۔''[1]

اگر صحابہ کے مشاجرات میں کوئی ضعیف اور واہی تباہی روایات کو ماننے لگے تو یہ روایت بتا رہی ہے کہ سب سے پہلے لعنت ملامت کا سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شروع کیا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے ردِعمل میں یہی کام کیا۔ صحیح و ضعیف کا فرق نہ ماننے والوں کو اس پر بھی یقین کر لینا چاہیے۔ مگر ہم صحابہ کے درمیان باہم لعنت و ملامت کی ایسی روایات کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ ہم حضرت علی اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو ایسا مانتے ہیں نہ حضرت مُعاویہ، عمرو بن العاص، مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہم اور ان کے دیگر رفقاء کو۔ کیوں کہ ہم یہ اُصول شروع میں طے کر کے چلے ہیں کہ ایسے معاملات میں صحیح اور صریح روایات کی گواہی درکار ہوگی۔ ضعیف روایات اس بارے میں ناقابلِ قبول ہیں۔

☆☆☆

سب وشتم کی روایات، ایک قیاسی دلیل اور اس کا جواب:

﴿سوال﴾ اموی دور میں سب وشتم کی صحیح روایات بھی ہمارے نزدیک جھوٹ ہیں۔ پہلی صدی ہجری میں جسے حضور ﷺ نے خیر القرون (بہترین صدی) کہا ہے، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی بندہ کھلم کھلا مجمع عام میں کسی صحابی کو بُرا بھلا کہتا اور سننے والے چپ چاپ رہتے کیوں کہ آج کل کے گئے گزرے دور میں بھی کوئی حکومتی عہدیدار یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ عوام کی بھیڑ میں کسی صحابی کو برا بھلا کہے۔ اگر اس دور میں ایسی بدگوئی ہوتی تو سامعین میں سے کوئی نہ کوئی اٹھ کر حاکم کو طمانچہ ضرور لگاتا بلکہ ایسے حاکم کو تو گھسیٹ کر باہر پھینک دیا جاتا۔

[1] "وكان اذا صلى الغداة يقنت فيقول: اللهم العن معاوية وعمرواً واباالاعور السلمي وحبيبا وعبدالرحمن بن خالد والضحاک بن قيس والوليد، فبلغ ذلک معاوية فكان اذا قنت لعن عليا وابن عباس والاشتر وحسناً وحسيناً. (تاريخ الطبري: ۵/۷۱)

﴿جواب﴾ صحیح روایات کی تردید میں یہ قیاسی دلیل بہت کمزور ہے، جس کی بنیاد یہ غلط فہمی ہے کہ بنواُمیہ کے پورے دور کو یکساں طور پر ہر لحاظ سے ایک مثالی دورِ حکومت سمجھ لیا گیا ہے۔ حالاں کہ واضح تاریخی شواہد موجود ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد اسلامی حکومت کی خصوصیات کم ہوتی چلی گئی تھیں۔ یزید کے دور میں آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خون بہانے اور مقاماتِ مقدسہ کی حرمت پامال کرنے سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح عبدالملک اور اس کی اولاد کے دور میں اظہارِ رائے اور حکام کے احتساب کی وہ آزادی قطعاً نہیں رہی تھی جو صحابہ کے عہدِ حکومت میں تھی، اس زمانے میں حجاج بن یوسف دو عشروں تک عالمِ اسلام پر مسلط رہا جس کے سامنے زبان ہلانا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ صحابہ کرام تک اس کی ایذاء رسانی سے محفوظ نہ تھے۔

یہ غلط ہے کہ اُمت مسلمہ اور اس کے اکابر نے یہ سب کچھ خوشی سے برداشت کیا۔ البتہ وہ لوگ احتجاج میں ہمارے شورے کے پابند نہیں تھے کہ بدگوئی کرنے والے حاکم یا خطیب کو طمانچہ مارتے یا گھسیٹتے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت سعید بن زید اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کا اس قسم کی بدزبانی پر احتجاج صحیح روایات میں مذکور ہے۔ اگر یہ حضرات شرعاً خروج کی گنجائش سمجھتے تو شاید وہ بھی کر گزرتے مگر خروج کی ممانعت کی احادیث دیکھ کر صبر سے کام لیتے رہے۔ جن صحابہ اور تابعین نے اپنے اجتہاد کے مطابق کچھ کرنے کی گنجائش سمجھی انہوں نے جان کی بازی تک لگادی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور اہلِ حرہ کی جدو جہد کا اہم مقصد ایسی ہی زیادتیوں کی روک تھام تھا۔ حجاج بن یوسف کے خلاف سعید بن جبیر اور امام شعبی رحمہما اللہ جیسے بزرگوں کا لڑنا بھی تاریخ میں موجود ہے۔ یہ سخت ترین احتجاج نہیں تو اور کیا تھا۔

بنوعباس کی تحریک کے ساتھ عوامی ہمدردیاں صرف اس لیے وابستہ نہیں ہوئیں کہ وہ بنوہاشم کی تحریک تھی بلکہ اس کی ایک بڑی وجہ بنومروان کا ایسا طرزِ حکومت تھا جس نے عوام و حکام کے درمیان فاصلے قائم کیے اور محبت کی جگہ نفرت کو جنم دیا۔ آخر تین براعظموں پر محیط دولتِ بنوامیہ ایک صدی بھی پوری نہ کر پائی اور دیکھتے ہی دیکھتے زمیں بوس ہوگئی۔

بنومروان کو یہ غلط فہمی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف باتوں سے اپنے گروہ کو زیادہ سے زیادہ متعصب بنا کر ہی وہ اپنی حکومت مستحکم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب سے واقف تھے، پھر بھی محض سیاسی مفاد کے لیے ان کی تنقیص اور عیب جوئی کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کی ضد میں متشدد اہلِ تشیع حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتے تھے۔

ایسے میں محدثین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو پوری اہمیت کے ساتھ نقل کیا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی وہ قابلِ احترام مقام دیا جس کے وہ شرعاً حق دار تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے کو کج فکر بنانے کی مہم دھری رہ گئی، ناصبیت اور شیعیت پنپ نہ سکی اور صحیح اسلامی فکر ہی کو غلبہ نصیب رہا۔

☆☆☆

سب وشتم کی حقیقت۔ خلاصہ کلام

سب وشتم کے متعلق تمام تاریخی وحدیثی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بنوامیہ اور قصاصِ عثمان کی تحریک میں شامل متشدد لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قاتلینِ عثمان کے سرپرست کی حیثیت دیتے تھے اور اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی کرتے تھے۔ دوسری طرف اہلِ عراق کے متشدد لوگ بھی اسی طرح حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف بدکلامی کرتے تھے۔ مگر طعن وتشنیع کے اس سلسلے کا براہِ راست الزام صحابہ کرام پر تھوپنا اور اسے ایک مہم سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ میں نقطۂ نظر کا جو شدید اختلاف تھا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بغاوت کا مجرم سمجھتے تھے، اور اس کا اظہار بھی فرماتے تھے۔ دوسری طرف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے میں مداہنت برت رہے ہیں، اس لیے برغلط ہیں۔ نقطۂ نظر کے اس شدید اختلاف کا اظہار دونوں کی نجی مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے ذاتی خصائل واوصاف اور فضائل ومناقب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ نہیں تھے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان نجی مجلسوں میں ان کے منہ سے کوئی ایک آدھ لفظ غیر محتاط بھی نکل جاتا ہو، لیکن اس رائی پر یہ پربت آخر عدل وانصاف کی کون سی منطق سے کھڑا کیا جاسکتا ہے کہ ''وہ علانیہ خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔''[1]

رہی عام لوگوں کی بات، تو ان میں یقیناً بہت سے متشدد تھے، ان میں سے ایک طرف روافض، دوسری طرف خوارج اور تیسری طرف مروانی اور ناصبی تھے۔ ان لوگوں کی حرکتوں کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ذمے لگانا درست ہے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاقِ عالیہ کی کئی مثالیں ہم پیش کرچکے ہیں۔ دوسری طرف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے صبر وتحمل اور کشادہ ظرفی کو اہل تشیع بھی ماننے پر مجبور ہیں۔ مسعودی لکھتا ہے: ان کے حلم کی پیروی کی کوشش بعد والوں نے بھی کی مگر کوئی ان کے پائے تک نہ پہنچ سکا۔[2] یعقوبی لکھتا ہے: ''وہ بردبار بھی تھے اور ہوشیار بھی، کہتے تھے کہ اگر لوگوں سے میرا تعلق بال جیسا باریک ہو تو میں اسے بھی ٹوٹنے نہیں دیتا۔''[3]

---

① حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۹۱

② مُروج الذهب: ۳/۲۲۲، ط الجامعة اللبنانية ③ تاریخ یعقوبی، ص ۲۰۳

تو کیا ایسے سمجھ دار اور کشادہ ظرف انسان کے بارے میں کوئی دشمن بھی یہ گمان کرسکتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی حریف کے خلاف بدزبانی کی مہم چلاتا ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور تک حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کسی مہم کے طور پر شروع نہیں کی گئی تھی اور ان کے گورنروں کے جس فعل کو سب وشتم سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ کسی بھی صحیح روایت سے گالم گلوچ کی حد تک ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں! یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں حکومت کے پاس اپنا موقف واضح کرنے کے لیے موجودہ ذرائع ابلاغ تو تھے نہیں اس لیے جس طرح جمعے کے خطبوں اور جامع مساجد کے منابر کو سرکاری اعلانات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اسی طرح ان منبروں پر گورنر گزشتہ واقعات کے متعلق اپنا موقف بھی واضح کرتے تھے، شہادتِ عثمان، جنگِ جمل وصفین اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیاسی اختلاف کا ذکر بھی ضمناً آجاتا تھا اور قاتلینِ عثمان اور ان کے حامی گروہ کی مذمت بھی کی جاتی تھی؛ کیوں کہ عثمانی تحریک کے بہت سے لوگ براہِ راست حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا الزام لگاتے تھے اور اموی حکام اس تحریک کے سرخیل تھے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدت مندوں کا یہ خیال کرنا ایک فطری بات تھی کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت کی جارہی ہے۔ یہی وہ سب وشتم تھا جسے راویوں نے نقل کیا۔ اور اسی لیے یہ مشہور ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی مہم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کے حکم سے شروع ہوئی۔

☆☆☆

⑦ کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے سیاسی مفاد کے لیے زیاد کا نسب تبدیل کرایا؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض بھی ہے کہ انہوں نے زیاد کو جس کا نسب نامعلوم تھا، غیر شرعی طور پر اپنا بھائی قرار دے دیا تاکہ اس کے ذریعے اپنی حکومت مضبوط کریں اور سیاسی مفادات حاصل کریں۔ زیاد ایک لونڈی سُمَیّہ کا بیٹا تھا، اُس کا باپ نامعلوم تھا۔ چونکہ زیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کا بہترین کمانڈر تھا اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے زبردستی اسے بھائی قرار دے کر اپنا معاون بنالیا۔ انہوں نے اس حدیث کی پروا بھی نہ کی جس میں مذکور ہے کہ: ''الولد للفراش. ''یعنی بچہ اس کی طرف منسوب ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہوا۔

مگر یہ اعتراض صرف بدگمانی کی پیداوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے زمانۂ جاہلیت میں طائف کی اس لونڈی سُمَیّہ سے ایک قسم کا نکاح کیا تھا جو جاہلیت میں مروّج تھا۔ اگرچہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور شرعی لحاظ سے اس کو نکاح نہیں کہا جاسکتا مگر اس دور کے معاشرے میں یہ نکاح درست تھا۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور سُمَیّہ کے اس تعلق سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ اس تعلق کی شہرت نہ ہوسکی۔ بنواُمیہ کے بعض لوگ اس حقیقت سے واقف تھے مگر عام لوگوں کی نگاہوں میں زیاد کا باپ نامعلوم شخص تھا اس لیے اسے اس کی ماں کی طرف منسوب کر کے زیاد بن سُمَیّہ یا باپ کی طرف منسوب کر کے زیاد ابن ابیہ کہا جاتا تھا۔

زیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ کے دور میں فارس کا گورنر رہا، اس کی کوششوں سے وہاں باغیانہ سرگرمیاں تھم گئیں اور امن وامان ہوگیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب اقتدار حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا تو ایک سال تک توقف کے بعد زیاد نے بھی اس خلافت کو قبول کرلیا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام چلا آیا۔ ①

زیاد کا نسب مشکوک ہونا ایک فرد کا نجی معاملہ تھا اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں کوئی دخل نہیں دیا، دو سال یونہی گزر گئے۔ سن ۴۴ ہجری میں ایک ایسا واقعہ ان کے سامنے آیا کہ وہ زیاد کے نسب کی تحقیق کرانے پر مجبور ہوگئے۔ ہوا یہ تھا کہ بنوعبدقیس کا ایک شخص دارالخلافہ دِمَشق آیا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک گورنر سے ملا۔ گورنر اور زیاد میں کچھ اختلافات چلے آرہے تھے۔ گورنر نے دوران گفتگو عبدقیس کے اس شخص سے کہا:

① تاریخ الطبری: ۵/۱۷۶ تا ۱۷۸

''ابن سُمَیّہ (زیاد) میرے کاموں پر تنقید کرتا ہے، میرے مقرر کیے گئے افسران پر اعتراض کرتا ہے۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ قریش کے کچھ لوگوں سے حلف اٹھواؤں گا کہ ابوسفیان نے کبھی سُمَیّہ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''[1]

یہ باتیں زیاد کو پتا چل گئیں کہ گورنر نے نہ صرف اس کے نسب پر تنقید کی ہے بلکہ اس کے لیے باقاعدہ ایک مہم چلانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ایک مشہور انسان تو کجا عام فرد کے لیے بھی یہ بڑی تکلیف دہ بات ہوتی ہے کہ لوگ اس کے نسب پر شک کریں۔ زیاد کو جو دکھ ہوا ہوگا اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو کبھی ایسی صورت حال سے دوچار ہوا ہو۔ اس نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو جا کر خبر کی۔ وہ اس گورنر کی اس بات سے اتنے ناراض ہوئے کہ اپنے ہاں ان کی آمد ورفت پر پابندی لگادی۔ آخر گورنر نے ان کے بیٹے یزید کے ذریعے ملاقات کی صورت نکالی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر گورنر کو سخت انداز میں کہا:

''کیا آپ نے زیاد کے بارے میں کچھ کہا ہے؟...... سن لیں کہ پورا عرب جانتا ہے کہ میں زمانہ جاہلیت میں بھی عرب کا معزز ترین فرد تھا (کہ قریش کے سردار کا بیٹا تھا) اسلام نے میری عزت اور بڑھائی ہے۔ میرے ساتھیوں میں بھی کوئی ایسی کمی نہیں تھی جسے زیاد نے آ کر پورا کردیا ہو یا میری ذلت کو اس نے عزت میں بدل دیا ہو۔ ہاں میں نے اس سے وہی سلوک کیا جس کا وہ حق دار تھا۔ (مطلب یہ تھا کہ میں زیاد کے ساتھ مہربانی اس لیے نہیں کرتا کہ مجھے کوئی غرض ہے، بلکہ وہ خود اس نوازش کا مستحق ہے۔)

گورنر نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور کہا: ''میں وہی بات زبان سے نکالوں گا جس میں زیاد کی خوشی ہو۔''

اس کے بعد جا کر زیاد سے معافی تلافی کرلی۔[2]

اس واقعے سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوگیا کہ زیاد کے نسب کے بارے دیگر لوگ بھی شکوک کا شکار ہوں گے اور اس کے مخالفین اس قسم کی طعنہ زنی کر کے اس کا مقام مجروح کرسکتے ہیں۔ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے ایک اخلاقی ذمہ داری تصور کرتے ہوئے زیاد کے نسب سے تہمت دور کرنے میں تاخیر درست نہ سمجھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب تک تو کچھ نہ کچھ بڑے لوگ موجود تھے جو زیاد کے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اولاد ہونے کے گواہ تھے، مگر کچھ برسوں بعد یہ لوگ فوت ہوجاتے تو زیاد کی عزت پر ہمیشہ کے لیے دھبہ لگا رہ جاتا۔

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے نہایت احتیاط کا ثبوت دیتے ہوئے اس وقت ایسا کوئی اعلان نہیں کیا کہ زیاد ان کا بھائی اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہے؛ کیوں کہ اس کا شرعی ثبوت موجود نہ تھا۔ اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے پہلے ان لوگوں کی تلاش شروع کروائی جن کے سامنے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے زیاد کی والدہ سُمَیّہ سے نکاح کا اقرار کیا تھا اور زیاد کو اپنا بیٹا مانا تھا۔

---

① یعنی زیاد ابوسفیان کی اولاد ہرگز نہیں بلکہ اس کا باپ نامعلوم ہے۔ اس گورنر کا نام ''تاریخ طبری'' میں ابن عامر بتایا گیا ہے۔ قرائن سے ظاہر ہے کہ یہ عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ تھے۔

② تاریخ الطبری: ۵/۲۱۴، ۲۱۵ عن عمر بن شبہ

آخر دس مرد و خواتین ایسے مل گئے جنہوں نے اس حقیقت کو حلفیہ بیان کیا، ان میں زیاد بن اسماء، مالک بن ربیعہ، منذر بن زبیر، مستورد بن قدامہ باہلی، ابن ابی نصر ثقفی، زید بن نفیل ازدی، شعبۃ بن علقمہ مازنی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت جویریہ بنت ابی سفیان اور بنو عمرو بن شیبان اور بنو مصطلق کے دو آدمی شامل تھے۔

ان سب نے گواہی دی کہ انہوں نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی زبان سے سنا ہے کہ زیاد ان کا بیٹا ہے۔ منذر بن زبیر رحمہ اللہ نے یہ کہا کہ انہوں نے یہ بات براہِ راست حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے نہیں سنی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی تھی۔ [1]

اس قسم کے معاملے میں شرعی شہادت کے لیے دو افراد کی گواہی کافی ہے مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے احتیاط کی بنا پر دس افراد کی پختہ شہادتوں کو سامنے رکھا اور جب یہ حقیقت ثابت ہوگئی تو اسے تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ زیاد ان کا بھائی اور ان کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ اس طرح مدتوں بعد زیاد کو ایک شدید ذہنی اذیت سے نجات ملی اور اس کے نسب پر لگا داغ دور ہوا۔

درحقیقت یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اخلاقی بلندی تھی کہ انہوں عالمِ اسلام کا سربراہ اور دنیا کا سب سے بڑا حکمران ہوتے ہوئے بھی ایک مشکوک نسب والے شخص کے بارے میں شرعی گواہی تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنا بھائی مان لیا۔ ورنہ خود سوچیں آج کل کون ہے جو کسی ایسے شخص کو خاندان کا حصہ بنالے جس کے نسب پر اُنگلیاں اٹھتی رہتی ہوں۔ کون ہے جو ایک بے نسب نوجوان کو بھائی مان کر اپنی جائیداد میں حصہ دار تسلیم کرلے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی ملامت کی پروانہ کرتے ہوئے ایک مظلوم شخص کو اس کا حق دلوایا اور معاشرے سے کٹے ہوئے فرد کو رشتوں کی زنجیر میں پرو دیا تو یہ ان کی وسعتِ ظرفی تھی، کوئی جرم نہ تھا۔

رہی یہ بات کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام پہلے کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب طبری کی روایت میں خود موجود ہے کہ اپنے ایک گورنر کی حرکت سے انہیں خیال آیا کہ زیاد کے نسب کی تحقیق ضروری ہے ورنہ لوگ اس پر حرف گیری کرتے رہیں گے اور کل کلاں حقیقت کے ثبوت اکٹھے کرنا ممکن نہ ہوگا۔

جن لوگوں کے خیال میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام ناجائز تھا وہ بتائیں کہ کیا ان دس بزرگوں نے محض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کہنے پر جھوٹی گواہی دے دی ہوگی؟ ایمان واخلاق کا اس قدر انحطاط شاید ہمارے معاشرے میں تو ہو مگر اس دور کے مسلمانوں سے اس کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک یہ اعتراض ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سیاسی مفادات کے لیے یہ چال چلی تھی تو اس کی تردید کے لیے یہی دیکھ لینا کافی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام کب کیا؟ سن ۴۱ھ تک زیاد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلینے پر مطمئن نہیں تھا۔ وہ فوج اور خزانے کے ساتھ فارس کے ایک قلعے میں مورچہ بند رہا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان دنوں اسے اپنا بھائی ثابت کرنے کی کوشش کرتے تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے زیاد کی بغاوت ختم

[1] الاصابہ فی تمییز الصحابۃ: ۵۲۸/۲

کرنے اور اسے وفادار بنانے کے لیے یہ "چال" چلی ہے مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

پھر زیاد ان سے بیعت ہوا، اور کسی عہدے اور منصب کے بغیر ان کے پاس رہنے لگا۔ دو سال گزر گئے۔ تب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنا بھائی قرار دیا، جبکہ اس کی کوئی ریاست تھی نہ فوج اور خزانہ کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کا لالچ ہوتا۔

رہا یہ خیال کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کی ذاتی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور اسے پختہ وفادار بنانے کے لیے ایسا کیا ہوگا تو یہ بھی بے وزن بات ہے؛ کیوں کہ جب ایک شخص پہلے سے ان سے بیعت تھا تو وہ اسے جو بھی ذمہ داری سونپتے وہ اس کو پورا کرنے کا پابند تھا بلکہ اسے خوشی ہوتی کہ اسے کوئی منصب ملا ہے۔ بھائی بنا کر سر پر چڑھا لینے سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو کیا فائدہ تھا!!! اس طرح تو الٹا اپنے ماتحت پر ان کی گرفت کمزور ہو سکتی تھی۔

جہاں تک اس مشہور حدیث کا تعلق ہے: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاش. یعنی "بچے کا نسب اس سے ثابت ہوگا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا ہے۔" تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا اقدام اس حدیث کی خلاف ہرگز نہیں۔ حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کسی شخص نے کسی شادی شدہ عورت سے بدکاری کی ہو اور پھر اس عورت کے پاس بچے کی ولادت ہوگئی ہو تو بچے کا نسب عورت کے شوہر سے جوڑا جائے گا، اگر وہ بدکار شخص دعویٰ کرے کہ یہ میرا بیٹا ہے یعنی میری بدکاری کی پیداوار ہے تو اس بیان کو اقرارِ جرم کے مترادف قرار دے کر اسے بدکاری کی سزا دی جائے گی، جیسا کہ حدیث کے اگلے الفاظ: "وَلِلْعَاهِرِ حَجَرٌ." (بدکار کے لیے پتھر ہے) سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر بچہ اس کا ثابت نہ ہوگا۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں سُمَیّہ سے جو تعلق رکھا تھا اس دور میں اس پر بدکاری کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "ابوسفیان اپنے کسی کام سے طائف گئے ہوئے تھے، وہاں انہوں نے سُمَیّہ سے اس قسم کا نکاح کیا جس طرح سے نکاح دورِ جاہلیت میں رائج تھے۔ اس تعلق سے زیاد پیدا ہوا، سُمَیّہ نے بھی زیاد کو ابوسفیان کی طرف منسوب کیا۔ خود حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے بھی اس رشتے کا خفیہ طور پر اعتراف کیا۔"[1]

علامہ ابن اثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "جو لوگ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو معذور مانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو اپنے خاندان سے قرار دینے کا اعلان اس لیے کیا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں نکاح کی بہت سی اقسام تھیں، جن کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، ان میں سے ایک صورت یہ تھی کہ لوگ کسی پیشہ ور عورت سے صحبت کرتے تھے جب وہ حاملہ ہوتی اور بچے کی ولادت ہو جاتی تو وہ جس شخص سے چاہتی بچے کا نسبت جوڑ دیتی۔ جب اسلام آیا تو یہ نکاح حرام ہوگیا مگر جاہلیت کی رسموں کے مطابق جو بچہ کسی کی طرف منسوب ہو چکا تھا، اسلام کے بعد بھی اسی کی طرف منسوب رکھا گیا اور نسب کے ثبوت میں (جائز و ناجائز کا) فرق نہیں کیا گیا۔"[2]

---

① تاریخ ابن خلدون: ۹/۳ ② الکامل فی التاریخ تحت ۴۴ھ

معلوم ہوا کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے سُمَیّہ سے بدکاری نہیں ایک خاص قسم کا نکاح کیا تھا جو دورِ جاہلیت میں غیر قانونی نہ تھا۔ اسلام نے اس قسم کے نکاح کو تو حرام قرار دے دیا مگر اس سے پیدا ہونے والے بچوں کو لاوارث یا ناجائز اولاد قرار نہیں دیا۔ زیاد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے قبل پیدا ہو چکا تھا اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل اس نکاح کا خصوصی مجالس میں اقرار کر چکے تھے، اس لیے زیاد اسی دور میں ان کا قانونی بیٹا بن چکا تھا۔ ان کے اسلام لانے کے بعد زیاد سے ان کے رشتے میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔

مسئلہ اگر پیدا ہوا تھا تو صرف اس لیے کہ انہوں نے اس حقیقت کو بس خاص خاص لوگوں سے بیان کیا تھا، لہٰذا عام لوگ زیاد کے نسب سے ناواقف رہے اور طرح طرح کی باتیں بناتے رہے، ان میں سے جو لوگ زیاد کے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی اولاد ہونے کی نفی کرتے تھے، وہ لاعلمی کی بنا پر ہی ایسا کہتے تھے۔ چونکہ دورِ جاہلیت کے نکاحوں کے بارے میں شرعی موقف انہیں بھی معلوم تھا اس لیے وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ''حضرت ابوسفیان نے سُمَیّہ سے بدکاری کی تھی، لہٰذا بدکاری سے ہونے والے بچے کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔'' بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے تو سُمَیّہ کی شکل تک نہیں دیکھی۔ یعنی زیاد جائز بچہ ہے مگر کسی اور کا ہوگا۔ زیاد کے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہونے کی مخالفت میں ان کے ماں شریک بھائی حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ مگر وہ بھی اس رشتے کی تردید کرتے ہوئے وجہ یہی بیان کرتے تھے:

واللہ ماعلمتُ سمیۃ رأت ابا سفیان قط. (اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ سُمَیّہ نے کبھی ابوسفیان کو دیکھا ہو۔)[1]

یہی اعتراض ان گورنر (ابن عامر) کو تھا جس نے اس نسب کی تردید کے لیے مہم چلانے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا: ''میں نے طے کیا ہے کہ قریش کی ایک جماعت سے حلف دلواؤں گا کہ ابوسفیان نے سُمَیّہ کو کبھی نہیں دیکھا۔''[2]

جن شعراء نے زیاد کو اس بارے میں ہدفِ تنقید بنایا تھا، ان کا اصل اعتراض یہی تھا۔ عبدالرحمٰن بن حکم نے کہا تھا:

وَاَشْهَدُ اَنَّهَا حَمَلَتْ بِزِيَادٍ   وَصَخْرٌ مِنْ سُمَيَّةَ غَيْرُ دَانِ

''میں گواہ ہوں کہ جب زیاد سُمَیّہ کے شکم میں آیا تو ابوسفیان سُمَیّہ کے قریب بھی نہ تھے۔''

اور ابن مفرغ نے کہا تھا:

شَهِدْتُ بِاَنَّ اُمَّكَ لَمْ تُبَاشِرْ   اَبَا سُفْيَانَ وَاضِعَةَ الْقِنَاعِ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری ماں کبھی اوڑھنی اتار کر ابوسفیان سے ہم آغوش نہیں ہوئی۔''[3]

معلوم ہوا کہ ان سب اعتراض کرنے والوں کے نزدیک بھی اگر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور سُمَیّہ کے مابین زمانہ جاہلیت کا مروجہ تعلق ثابت ہو جاتا تو وہ بھی زیاد کو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا جائز بیٹا مان لیتے۔ ورنہ انہیں اس بات کی تکرار کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ سُمَیّہ سے نہیں ملے۔ وہ صاف صاف یوں کہتے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اگر سُمَیّہ سے

① الاستیعاب: ۵۲۶/۲ ② تاریخ الطبری: ۲۱۳/۵ ③ الاستیعاب: ۵۲۸/۲

ملے بھی تھے تو یہ تعلق زنا تھا اور زنا سے کوئی رشتہ داری ثابت نہیں ہوتی۔

پس اگر ان کے نزدیک بھی ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا سُمَیہ سے تعلق ثابت ہو جاتا تو وہ زیاد کو ان کا قانونی بیٹا مان لیتے جیسا کہ اسلام نے اس کی گنجائش رکھی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے علماء سے یہ فتویٰ نہیں لیا کہ اس قسم کے قبل از اسلام نکاحوں کے پیدا شدہ بچے کا نسب ثابت ہوگا کہ نہیں کیوں کہ یہ تو پہلے سے طے شدہ بات تھی کہ نسب ثابت ہوجائے گا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ واقعہ اس طرح ہوا بھی تھا یا نہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے حقیقت حال سے آگاہ دس معتبر لوگوں نے جن میں بعض صحابہ کرام بھی شامل تھے، جب گواہی دے دی کہ واقعی ایسا ہوا تھا تو شرعاً یہ نسب ثابت ہوگیا۔

یہ تھا پورے واقعے کا اصل پس منظر جسے معترضین نظر انداز کیے رہے۔

☆☆☆

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو خود اکابر صحابہ نے غلط قرار دیا تھا اور اس پر تنقید کی تھی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بھی زیاد کو بھائی نہ مانا اور پردہ کرتی رہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی اس اقدام پر معترض رہیں۔ سب سے بڑھ کر زیاد کے ماں شریک بھائی ابوبکرہ رضی اللہ عنہ اس پر برہم رہے اور عمر بھر زیاد سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی اور وہ برملا کہتے تھے کہ زیاد نے ماں پر زنا کی تہمت لگوادی ہے۔ خود بنوامیہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو طعنے دیتے رہے۔

اس بارے میں اتنا جاننا کافی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر لوگوں کی تنقید کے اکثر واقعات جس سند سے مروی ہیں وہ ہشام بن محمد کلبی اور محمد بن سائب کلبی کی ہے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا زیاد سے پردہ کرنا یعنی اسے بھائی نہ ماننا، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا زیاد سے عمر بھر بات نہ کرنے کی قسم کھانا اور اسے ماں پر زنا کی تہمت کے مترادف قرار دینا اور بنواُمیہ کے امراء کا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر طعن وتشنیع کرنا اسی سند سے مروی ہے۔ ①

یہ درست ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا شروع میں زیاد کو "ابن ابی سفیان" کے نام سے پکارنے سے احتراز کرتی رہیں جس کی وجہ احتیاط ہوگی۔ ② مگر بعد میں وہ اسے "زیاد بن ابی سفیان" کہنے لگیں، جیسا کہ ان کے ایک مکتوب سے ظاہر ہے جو "من عائشة ام المؤمنين الى زياد بن ابى سفيان" سے شروع ہوتا ہے، زیاد نے یہ خط خوش ہو کر عام مجمع میں سب کو سنایا تھا۔ ③ ہاں بعض صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے اور زیاد کے اس نسب سے اتفاق نہ تھا۔ ④

---

① الاستیعاب: ۵۲۵/۲

② تاریخ دمشق: ۱۷۷/۱۹، تاریخ ابن خلدون: ۱۰۰۹/۳ ③ تاریخ دمشق: ۱۷۷/۱۹

④ مسند احمد، ح: ۱۴۵۴؛ صحیح مسلم، ح: ۶۳، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من رغب عن ابیہ
حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ حدیث: "من ادعى الى غير ابيه وهو يعلم انه غير ابيه فالجنة عليه حرام" کی تلاوت کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، ح ۴۳۲۶)

یہ ان کی اپنی رائے اور اپنا اجتہاد تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد توسع پر مبنی تھا اور حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کا احتیاط پر۔ دیگر معترضین کی طرح حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس سُمَیّہ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے تعلق کا کوئی ثبوت نہ تھا مگر ان کی اس لاعلمی سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں آسکتا، جو دس معتبر گواہیاں اس نسب کے ثبوت پر جمع کر چکے تھے۔

اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے قابل غور پہلو

یہ تو دلائل کی بحث تھی مگر اب ذرا اس مسئلے پر اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے نگاہ ڈالیے اور ذرا سوچیے! آج کوئی یورپی مرد و عورت اسلام قبول کرلیں جو پہلے امریکی رسم و رواج کے مطابق گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کے طور پر رہتے رہے ہوں اور اس تعلق سے ان کا بچہ بھی ہو...... اسلام لانے کے بعد وہ بہت اچھے مسلمان ثابت ہوں۔ ان کا لڑکا آگے چل کر عالم فاضل بن کر امت کی خدمت میں مشغول ہو جائے...... تو یہ خاندان سراہنے کے قابل ہوگا یا ملامت کے۔ اب اگر کوئی اس لڑکے کو "حرامی" اور اس کے نومسلم والدین کو زناکار مشہور کرے تو اس حرکت کو ہم کیا نام دیں گے!!

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بارے میں زیاد کو بدنام کرنے کے لیے ٹھیک ٹھاک روایت سازی کی گئی تھی، چونکہ زیاد نے شورش پسند عناصر کو آہنی ہاتھوں سے کچلا تھا اس لیے یہ عناصر اسے بدنام کرنے کے لیے ایسی روایات گھڑتے رہے جن سے زیاد کا نسب مشکوک رہے، لوگ اسے ناجائز اولاد مانیں، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی بدنام ہوں اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس معاملے میں شریعت کی حدود پار کرنے والے کہلائیں۔

اہم نکتہ:

یاد رہے کہ استلحاقِ زیاد کی تمام بحث میں صحیح اور صریح روایت صرف ایک ہے یعنی صحیح مسلم کی۔

عن ابی عثمان لما ادّعی زیاد لقیت ابا بکرة فقلت له ماهذا الذی صنعتم؟ انی سمعت سعد بن ابی وقاص یقول سمع اذ نای من رسول اللہ ﷺ وهو یقول: من ادعی ابا فی الاسلام غیر ابیه وهو یعلمه انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام. فقال ابو بکرة: وانا سمعته من رسول اللہ ﷺ. [1]

اس روایت سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ زیاد کا استلحاق ہوا تھا اور ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سمیت اس دور کے بعض بزرگ حضور اقدس ﷺ کے مذکورہ ارشاد کی روشنی میں اس اقدام سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اس کے سوا طبری، البدایہ والنہایہ، تاریخ ابن اثیر، تاریخ دِمشق، تاریخ ابن خلدون وغیرہ میں جتنی تفصیلات اس مسئلے میں ہیں نیز شروحِ حدیث میں جو اس موضوع پر کلام کیا گیا ہے، سب کا مدار ضعیف روایات پر ہے۔ [2]

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۲۸، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من رغب عن ابیه، واخرجه البخاری مختصراً، ح: ٦٧٦٦

② مثلاً آپ اس موضوع پر علامہ ابن اثیر کی الکامل (سن ۴۴ ہجری کے حالات) دیکھیں تو انہوں نے زیاد کے معاملے کی بے حد تفصیل بیان کی ہے جس کا بیشتر حصہ پہلے کی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ ممکن ہے یہ مواد المدائنی وغیرہ کے ان رسائل سے لیا گیا ہو جو اب عرصۂ دراز سے نایاب ہیں۔ چونکہ ابن اثیر نے اس کی کوئی سند بیان نہیں کی، اس لیے اس مواد کی تحقیق کرنا بہت مشکل ہے۔ اندازہ یہی ہے کہ یہ سارا ضعیف مواد ہے۔

ہم شروع میں یہ لکھ چکے ہیں اور درمیان میں بھی بار بار اس اصول کو دہرا چکے ہیں کہ ضعیف روایات کو لے کر اصحاب رسول کے کردار پر حرف گیری درست نہیں، چنانچہ اُصولی بات یہاں بھی یہی ہے کہ ضعیف اور بے سند روایات کے اس پلندے کو یا تو بالکل ترک کر دیا جائے اور استلحاقِ زیاد کے معاملے پر بالکل سکوت اختیار کیا جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس مجموعۂ رطب و یابس سے صحابہ کرام کے عمومی کردار سے مطابقت رکھنے والے اجزاء کو مانا جائے۔ تیسری صورت کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ اس خار دار جنگل سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور زیاد کے بارے میں کانٹے چن چن کر انہیں تاریخی حقائق کے نام پر کتب میں سجا دیا جائے۔

جن حضرات نے ایسا کیا ہے، ان کا طرزِ عمل ہمارے لیے دلیل نہیں بن سکتا کیوں کہ اللہ کی توفیق سے ہم اس بحث میں روایات کی کمزوری کو پرکھ کر صحیح بات ثابت کر چکے ہیں۔

☆☆☆

⑧ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مالی بدعنوانی کے مرتکب تھے؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر سرکاری خزانے (بیت المال) کی رقم میں بدعنوانی کا الزام بھی مشہور کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ سرکاری خزانے کو ذاتی جاگیر بنائے ہوئے تھے، عمدہ مالِ غنیمت اپنے لیے جمع کر لیتے، پھر دولت کے ان ذخائر سے سیاسی شخصیات کی وفاداریاں خریدتے جیسے دورِ حاضر کے بدعنوان سیاستدان کیا کرتے ہیں۔

اس دعوے کی دلیل میں یہ شواہد پیش کیے جاتے ہیں:

حکم بن عَمرو رضی اللہ عنہ اور اَشل کے مالِ غنیمت کا قصہ:

سن ۵۰ ہجری میں امیرِ عراق زیاد بن ابی سفیان کے حکم سے حضرت حکم بن عَمرو غفاری رضی اللہ عنہ خراسان میں جہاد کرتے ہوئے ''اَشل'' پہنچے تو وہاں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا، خصوصاً سونے چاندی کے ذخائر، کیوں کہ ان لوگوں کے برتن تک سونے چاندی کے تھے۔ اس موقع پر انہیں زیاد کا مراسلہ ملا جس میں لکھا تھا: ''امیر المومنین نے حکم دیا ہے کہ سونا اور چاندی ان کے لیے الگ کر لیا جائے، مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کیا جائے۔''

چونکہ شرعی قاعدے کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے کو اور باقی مجاہدین کو ملتا تھا لہٰذا حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس حکم کو شریعت کے اس قاعدے کے خلاف تصور کیا اور زیاد کو جواب میں لکھا:

''اللہ کی کتاب تمہارے خط سے پہلے مجھے مل چکی ہے، اللہ کی قسم! زمین و آسمان اگر کسی شخص پر تنگ ہوں اور وہ شخص اللہ سے ڈرتا ہو تو اللہ اس کے لیے ضرور راستہ نکال دیں گے۔''

پھر حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔[1]

---

[1] مستدرک حاکم، ح ۵۸۶۹ ؛ المعرفۃ والتاریخ ۳/۲۵۰، ط الرسالۃ ؛ تاریخ الطبری ۵/۲۵۰ تا ۲۵۲




اس روایت سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مالِ غنیمت کو سرکاری خزانے کی بجائے اپنی جیب میں ڈالتے تھے اور مجاہدین کو بھی ان کا حق نہیں دیتے تھے، جس کی وجہ سے حضرت حکم بن عَمرو رضی اللہ عنہ جیسے اصحاب بھی ان سے نالاں تھے۔ لیکن اس روایت پر غور کریں تو یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا؛ کیوں کہ:

ا یہ صرف ایک خاص واقعے کا ذکر ہے، اس سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے کسی گورنر کے عمل کو بطورِ عادت اور پالیسی کے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی پالیسی مالِ غنیمت کے بارے میں خلفائے راشدین کے طرزِ عمل اور قرآنِ پاک کی تعلیم کے عین مطابق تھی، چنانچہ گورنر ابن زیاد کی تقرری کے وقت اسے جو خاص ہدایات دیں ان میں ایک یہ بھی تھی: ''**وقاسمهم علی کتاب الله**.'' (اللہ کی کتاب کے مطابق مال تقسیم کرو۔)[1]

ا اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے سونا چاندی اپنی ذات کے لیے الگ کرنے کا حکم دیا ہو۔

''مستدرک حاکم'' کے الفاظ ہیں: ''**فان امیر المؤمنین کتب ان یصطفی له البیضاء الصفراء ولاتقسم بین المسلمین ذهبا ولافضة.**''

''المعرفۃ والتاریخ'' میں ہے: ''**ان امیر المؤمنین کتب ان استصفی کل صفراء وبیضاء.**''

تقریباً یہی عبارت طبری میں ہے۔[2]

تینوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے کہ 'امیر المؤمنین نے حکم دیا کہ ان کے لیے سونا چاندی جمع کرلیا جائے۔''

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ جس طرح مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مرکزی بیت المال میں جاتا ہے اس کی مد میں اس بار مالِ غنیمت کا سونا چاندی دار الخلافہ بھیج دیا جائے، تاکہ اسے بیت المال میں جمع کردیا جائے۔

اس غیر معمولی حکم کی وجہ بتانے سے روایات خاموش ہیں لیکن امکانی وجوہ کئی ہوسکتی ہیں مثلاً......:

اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی شدید ضرورت ہو۔ ممکن ہے ٹکسال میں سکے ڈھالنے کے لیے یہ دھاتیں کم پڑگئی ہوں۔ ہوسکتا ہے فوری طور پر کوئی قرضہ ادا کرنا ہو۔ یا کوئی بڑی جہادی مہم شروع کرنے کا ارادہ ہو......

یہ قصہ سن ۵۰ ہجری کا ہے، اس سال کی دو بڑی مہمات مشہور ہیں:

اسی سال حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے قُسطَنطِنیَّہ کی فتح کے لیے یزید کی سرکردگی میں بہت بڑا لشکر روانہ کیا تھا اور

---

① تاریخ الطبری: ۵/۲۹۶

② مستدرک حاکم، ح: ۵۸۶۹ ؛ المعرفة والتاریخ: ۳/۲۵، ط الرسالة ؛ تاریخ الطبری: ۵/۲۵۰ تا ۲۵۲

نوٹ: طبری میں ہے: "ان امیر المؤمنین کتب الیّ ان اصطفی له کل صفراء وبیضاء والروائع ولاتحرکن شیئا حتی تخرج ذلک." اس میں "والروائع" (یعنی نفیس چیزیں) کا اضافہ محلِ نظر ہے۔ یہ اضافہ حاکم اور الفسوی کی روایات میں نہیں جن کی اسناد کے رجال ثقہ ہیں۔ طبری کی سند میں ایک راوی حاتم بن قبیصہ، سلیمان بن عبدالملک کے دور میں بخارا کے حاکم تھے۔ ﴿الکامل فی التاریخ: سن ۹۸ ھ﴾ مگر ان کی جرح یا تعدیل مسکوت عنہ ہے۔ (الجرح والتعدیل، ابن ابی حاتم: ۳/۲۶۰ ؛ المعجم الصغیر لرواۃ ابن جریر: ۱/۹۷).
اس سے سند میں کمزوری آجاتی ہے اور اضافی الفاظ جو ثقہ راویوں نے نقل نہیں کیے، مشکوک ہوجاتے ہیں۔

اسی سال افریقہ میں اسلامی افواج کے لیے چھاؤنی کے طور پر نئے شہر قیروان کی تعمیر شروع ہوئی تھی۔[1] اسکی ضروریات کے لیے فوری رقم کا انتظام سونے چاندی کے ذریعے ہی ہوسکتا تھا۔ غالباً اسی لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت سے سونے چاندی کو الگ کرنے کا حکم دیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی کے بارے میں یہ بات کوئی متعصب انسان ہی سوچ سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی امانت اور بیت المال کی رقم کو اپنی ذات کے لیے منگوا رہے ہوں گے۔

رہی یہ بات کہ مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے ہی سونے چاندی کو الگ کر کے بیت المال میں داخل کرنے سے بہرحال شرعی ضابطے کی خلاف ورزی اور مجاہدین کی حق تلفی تو ہو رہی تھی؛ کیوں کہ شریعت چار حصے مجاہدین کے اور پانچواں حصہ بیت المال کا قرار دیتی ہے...... تو قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت کی مجموعی مقدار کا علم تھا اور سونے چاندی کی مقدار کا بھی کیوں کہ اتنی بات تو انہی روایات سے ثابت ہوتی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت میں سونے چاندی کے غیر معمولی ہونے کا علم تھا تب ہی انہوں نے سونا چاندی دمشق طلب کیا۔ اپنے بیس سالہ دورِ خلافت میں انہوں نے اس سے پہلے ایسا کیا نہ اس کے بعد۔ اگر وہ سونے چاندی کو بہرحال جمع کرنے کے شوقین ہوتے تو ہر سالارِ فوج کو یہی حکم دیتے کیوں کہ کچھ نہ کچھ سونا چاندی تو ہر جہاد میں ہاتھ آتا تھا کہ وہ زمانہ ہی سونے چاندی کے سکوں کا تھا۔ بیس برس میں ان کا صرف اس ایک موقع پر سونا چاندی طلب کرنا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ اس جہاد میں عام معمول سے بڑھ کر سونا چاندی ملا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس علاقے والے برتن تک سونے چاندی کے استعمال کرتے تھے جو مسلمانوں کا مالِ غنیمت بنے۔

جب قرائن بتا رہے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس مہم میں سونے چاندی کی غیر معمولی مقدار کا علم ہو چکا تھا تو ساتھ ہی یہ امکان پختہ ہو جاتا ہے کہ جس شخص نے انہیں مالِ غنیمت کی کثرت کا حال لکھ کر بھیجا، اسی نے مالِ غنیمت کی کل مقدار اور سونے چاندی کے تناسب کا حال بھی لکھ بھیجا ہوگا۔ یہ تفصیل بتانے والا سپہ سالار حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کا کوئی منشی، کاتب، خزانچی یا کوئی اور امیر ہوسکتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے زیرک اور جہان دیدہ سیاست دان سے یہ ہرگز بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے سالاروں پر نظر رکھنے کے لیے ان کے قریبی ساتھیوں سے خفیہ طور پر اطلاعات لیتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ذریعے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت کی صحیح مقدار اور اس میں سونے چاندی کے تناسب کا علم ہو جانا ذرا بھی بعید نہیں۔

اب چونکہ اس جہاد میں یہ تناسب ایک بٹا پانچ (۱/۵) بن رہا تھا، اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس پانچویں حصے کو جو صرف سونا چاندی تھا، اپنے پاس منگوالیا تاکہ اسے سرکاری خزانے میں شامل کر کے فوری ضروریات پوری کریں۔ اس میں شریعت کی کوئی خلاف ورزی تھی نہ کسی کی حق تلفی۔

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط ۲۱۰، ۲۱۱

رہی یہ بات کہ پھر حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس حکم کو اللہ کی کتاب سے متصادم کیوں سمجھا اور اس پر عمل کیوں نہ کیا؟
تو دراصل ان کے خیال میں مالِ غنیمت کو اس کی اصل حالت میں ایک بٹا پانچ (1/5) پر تقسیم کرنا ضروری تھا، جیسا کہ عام معمول یہی تھا یعنی سونا چاندی، اناج، مویشی، لباس اور اسلحے سمیت ہر قسم کی چیز کے چار حصے پہلے مجاہدین کو ملتے اور پھر ہر قسم کی چیز کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں جاتا۔ وطن سے دور مجاہدین کو ویسے بھی نقد رقم درکار ہوگی اور یہ ضرورت سونے چاندی سے پوری ہوسکتی تھی کہ اس دور کے سکے یہی دھاتیں تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم ماننے سے اس معمول پر عمل نہیں ہو رہا تھا جبکہ حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ پرانے معمول کو من و عن پورا کرنا لازم تصور کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم ماننے میں مجاہدین کی دل شکنی کا بھی اندیشہ تھا، جسے ایک ہمدرد اور مشفق قائد کبھی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حکم کی تعمیل سے معذوری ظاہر کر دی۔

غرض یہ دو صحابہ کی رائے کا اختلاف تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی جگہ درست تھے کہ ان کے سامنے مرکز میں نئی جہادی مہمات اور شہروں کی تعمیرات شروع کرنے جیسی ضروریات تھیں۔ اور حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنی جگہ درست تھے کہ ان کے سامنے مجاہدین کی ضروریات تھیں۔ حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ قابل تعریف تھے کہ جس بات کو اپنے خیال میں کتاب اللہ کے خلاف سمجھا اس سے انکار کر دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی جگہ ٹھیک تھے کہ وہ مالِ غنیمت کا پانچواں ہی مانگ رہے تھے اگرچہ اس کی وصولی کا طریقہ عام معمول کے خلاف تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وسعتِ ظرفی:

آخر میں اس واقعے کا اختتامی ٹکڑا بھی پڑھتے جائیں تاکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دلوں پر چھایا ہوا غبار دور ہو۔ ابن عساکر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کے اس رویے کی اطلاع پہنچی تو لوگوں نے ایسے سپہ سالار کو حکم عدولی کی سخت سزا دینے کا مشورہ دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹ کر حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کی تعریف کی اور کہا:

بَلْ اَحْسَنَ وَ اَجْمَلَ وَ اَصَابَ (ہاں انہوں نے اچھا کیا، بہتر کیا اور بالکل ٹھیک کیا۔) ①

سرکاری محکموں میں نہیں بلکہ دینی تحریکوں اور اداروں میں بھی آج ایسے مقتدر حضرات کتنے ہوں گے جو اپنے حکم کے جواب میں ماتحت کی طرف سے حکم عدولی کی اطلاع سن کر بھی ناراض نہ ہوں اور اس کے فعل کو صرف اس لیے سراہیں کہ وہ نیک نیت ہے، اللہ کی خوشنودی کو ترجیح دینے کی خاطر اس حکم سے انکار کر رہا ہے۔

اس واقعے سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو وسعتِ ظرفی ثابت ہو رہی ہے وہ ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے۔

☆☆☆

---

① تاریخ دمشق: ۵۹/ ۷۰

کیا حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ کی موت کے ذمہ دار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے؟

﴿سوال﴾ یہ بات ثابت ہے کہ حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کے بعد دل گرفتہ ہو کر اپنی موت کی دعا کی تھی جو قبول ہوئی تھی۔[1] وہ اس مہم سے واپس آتے ہوئے راستے میں "مَرْو" کے مقام پر وفات پا گئے تھے۔[2]

ظاہر ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ذہنی دباؤ کا شکار ہوئے تھے، اس لیے ان کی موت کے ذمہ دار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

﴿جواب﴾ یہ بات ہرگز نہیں تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم کو تو انہوں نے پوری بے باکی سے نظر انداز کر کے مالِ غنیمت عام طریقے سے فوج میں بانٹ دیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس پر خوش ہوئے تھے۔ پھر دل گرفتہ ہونے کا کیا سوال رہا۔ درحقیقت ان کے ذہنی دباؤ اور مایوسی کی وجہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حکم نہیں بلکہ زیاد کا وہ مکتوب تھا جو اس نے ان کی حکم عدولی کی اطلاع ملنے پر غصے کی حالت میں لکھا تھا جس کے الفاظ یہ تھے:

"اللہ کی قسم! میں زندہ رہا تو تمہیں عبرتناک سزا دے کر رہوں گا۔"[3]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"صحیح بات یہ ہے کہ جب انہیں زیاد کا عتاب آمیز مکتوب ملا تو اپنے لیے بددعا کی، پس ان کی وفات ہوگئی۔"[4]

لہٰذا اس پورے قضیے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سرکاری مال ذاتی مصارف پر خرچ کرتے تھے؟

﴿سوال﴾ صحیح مسلم کی ایک طویل روایت میں عبدالرحمٰن بن عبدرب الکعبہ اپنا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جو مسجد الحرام میں حکام کی اطاعت سے متعلق حدیث سنا رہے تھے۔

عبدالرحمٰن نے ان سے کہا: هذا ابن عمك معاوية، يأمرنا ان نأكل اموالنا بيننا بالباطل ونقتل انفسنا، والله عز وجل يقول: "يا ايها الذين آمنوا لا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منكم، ولا تقتلوا انفسكم، ان الله كان بكم رحيما."

"یہ آپ کے چچا زاد معاویہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق کھائیں اور اپنوں کو قتل کریں جبکہ اللہ فرماتے ہیں: اے ایمان والو! آپس کے مال ناحق مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تجارت ہو باہمی رضامندی سے اور خود کو قتل نہ کرو۔ بے شک اللہ تم پر بڑا مہربان ہے۔"

---

① "اللهم ان كان لي عندك خير فاقبضني اليك." (الاستيعاب: ۳۵۷/۱)

② المعرفة والتاريخ: ۲۵/۳ بسند صحيح، ط الرسالة

③ تاريخ الطبري: ۱۵۰/۵

④ الاصابة: ۹۳/۲



فسکت ساعة ثم قال اطعه فی طاعة اللّٰہ واعصه فی معصیة اللّٰہ.

(یہ سن کر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا: اللہ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کرو۔ اللہ کی نافرمانی میں ان کی بات نہ مانو۔)[1]

صحیح ابن حبان میں یہ الفاظ بھی ہیں: ونھریق دمائنا......(وہ حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنا خون بہائیں۔)[2]

یہی واقعہ سنن ابی داؤد میں مختصراً ہے، اس میں راوی کے سوال میں ہے:

ھذا ابن عمک معاویة یامر ان نفعل کذا و کذا. (وہ ہمیں ایسا ویسا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔)[3]

کیا ان روایتوں سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ دوسروں کا مال لوٹنے، ناحق خرچ کرنے اور مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے۔

﴿جواب﴾ اس شبہے کا اصولی جواب یہ ہے کہ استفتاء میں کسی کے بارے میں کوئی واقعہ سنا دینے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ ایسا حقیقت میں ہوا بھی ہو۔ مثلاً کسی مفتی کے پاس استفتاء آئے: ''جناب مہتمم صاحب ہمیں مدرسے کا مال ناحق ہڑپ کرنے کا حکم دیا کرتے ہیں۔ کیا ہمارے لیے ان کی بات ماننا جائز ہے: العارض، فلاں بن فلاں''

تو مفتی یہ نہیں دیکھے گا کہ مہتمم صاحب یہ کام کرتے ہیں یا نہیں۔ صورتِ مسئلہ کی تحقیق مفتی کا کام نہیں۔ وہ تو صورتِ مسئلہ دیکھ کر جائز اور ناجائز کا حکم بتا دے گا۔ یہ کام اس کا نہیں کہ وہ واقعات کے ثبوت اور عدمِ ثبوت پر بحث کرے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس طرح علماء کو آدابِ افتاء کی تعلیم دے دی۔ مفتی حضرات کا کام یہ نہیں کہ اپنی معلومات کی وجہ سے استفتاء میں پیش کردہ صورتِ مسئلہ کا انکار کریں یا اس کی تحقیق شروع کرا دیں۔ مثلاً آج کسی مفتی کا دوست انہیں کہے: میرے چچا نے چچی کو تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے۔ مفتی یہی کہے گا کہ طلاق مغلظہ ہو گئی ہے۔ وہ یہ نہیں کہے گا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے چچا بھلا ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔

اگر اس دور کے حالات کا جائزہ لیں تو امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بیس سالہ پرامن، عادلانہ اور فتوحات سے بھرپور دور کے بارے میں یہ خیال کرنا ایک غلط فہمی ہی ہو سکتا ہے کہ اس میں لوٹ مار ہو رہی تھی اور وہ بھی خلیفہ کے حکم سے۔

اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ معصوم نہیں تھے تو عبدالرحمٰن بن عبدرب الکعبہ بھی کوئی فرشتے نہ تھے کہ انہیں غلط فہمی نہ ہو جاتی۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ ان عبدالرحمٰن کے حالات میں صرف اتنا ملتا ہے کہ یہ ایک تابعی تھے۔ یہ اسی ایک روایت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ایک اور روایت ان کی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے۔ اس کے سوا ان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے یہ سوال کس کی باتوں پر یقین کر کے پوچھا۔

اگر کوئی گمان کرے کہ عبدالرحمٰن، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے امیر یا افسر ہوں گے اور انہیں اندر کی باتوں کا پتا ہوگا تو

---

① صحیح مسلم، ح: ۴۸۸۲، الامارة، باب الوفاء ببیعة الخلفاء؛ مسند احمد، ح: ۶۵۰۳؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۱۰۹

② صحیح ابن حبان، ح: ۵۹۲۱ ③ سنن ابی داؤد، ح: ۴۲۴۸ باب ذکر الفتن

یہ گمان بے وزن ہوگا کیونکہ اگر وہ ایسے کسی عہدے پر ہوتے تو وہ ایک معروف تابعی ہوتے۔ ان کا غیر معروف ہونا خود ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اس دور کے ایک عام شہری تھے۔ ایسے حضرات سنی سنائی باتوں کو ایک حقیقت مان کر کوئی سوال پوچھ لیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہوگی کہ ہم ان کے سوال کو ثابت شدہ حقیقت کا نام دے دیں۔

☆☆☆

قارئین! یہ تھا اس روایت کا بلا تکلف مطلب۔ اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

تاہم امام نووی رحمہ اللہ نے اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے ایک اور جواب دیا ہے۔ اہلِ علم شرح مسلم کی عربی عبارت کا مطالعہ فرمالیں۔[1] راقم اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔

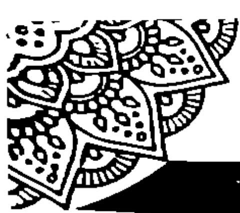
یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں جنگ کا ماحول تھا گویا فتنے کا زمانہ تھا۔ ایسے میں لوگوں کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ کس کی اطاعت کریں اور کس کی مخالفت۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس وقت فتنے کے دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ لائحہ عمل بتا رہے تھے جو یہ تھا کہ ایسے میں انسان سب سے زیادہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔ پھر جو جماعت اسے برحق لگتی ہے اس میں شامل ہو جائے اور پھر جس امیر سے وفاداری ظاہر کی ہے اس کی اطاعت کرے۔ جب راوی عبدالرحمٰن ان کے پاس پہنچے تو اس وقت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ یہ حدیث سنا رہے تھے:

”اس امت کے ابتدائی دور میں عافیت ہے اور عن قریب اس کے پچھلے دور میں آزمائش آئے گی اور عجیب وغریب حالات پیش آئیں گے۔ ایک فتنہ ایسا آئے گا کہ ایک فریق دوسرے کو قیدی بنائے گا، ایک فتنہ ایسا آئے گا کہ مؤمن کہے گا اب میری ہلاکت ہے، مگر وہ فتنہ گزر جائے گا۔ پھر ایسا فتنہ آئے گا کہ مؤمن کہے گا: بس یہی ہے ہلاکت، یہی ہے۔ تو جو دوزخ سے بچنا اور جنت میں جانا چاہے تو اسے موت اس حال پر آنی چاہیے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اور اسے ایسے لوگوں کے پاس چلے جانا چاہیے جن کے پاس جانا اسے پسند ہو۔ اور جس نے کسی امام سے بیعت کی اور اسے اپنے ہاتھ کی یقین دہانی اور دل کی رضامندی دے دی ہو تو جب تک ممکن ہو اس کی اطاعت کرے۔ اگر اس امیر کا کوئی دوسرا مخالف آجائے جو اس سے مقابلہ کرے تو اس دوسرے کی گردن مار دو۔“

یہ حدیث سن کر راوی عبدالرحمٰن کو محسوس ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کرنے کے باعث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باطل پر ہیں، لہٰذا ان کا عوام سے محصولات لینا اور فوج پر خرچ کرنا سب مالِ باطل کھانے میں شامل ہے اور اسی طرح ان کی سرحدوں پر پہرا دینا اور لڑنا یہ خود کو ہلاک کرنے کے حکم میں ہے۔ چنانچہ اس نے انہی الفاظ میں کہا کہ آپ کے بھائی معاویہ رضی اللہ عنہ تو ہمیں ان ناجائز چیزوں کا حکم دیتے ہیں تو اس بارے میں ہم کیا کریں؟

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کا جو اصولی اور مختصر جواب دیا وہی مناسب تھا یعنی حاکم چاہے کوئی بھی ہو، خلافِ شرع میں اس کی اطاعت غیر مشروط کا حکم نہیں بلکہ جائز چیزوں ہی میں اس کی بات مانی جائے گی ناجائز میں نہیں۔ غرض

[1] شرح مسلم، نووی: ۱۲/ ۲۳۴ ط دار احیاء التراث



جیسا سائل کا گمان تھا، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کے مطابق جواب دے دیا۔

☆☆☆

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اتنے عطیات کہاں سے دیتے تھے؟

﴿سوال﴾ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی مالی بدعنوانی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ مال و دولت نچھاور کر کے بڑے بڑے رئیسوں اور شخصیتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا کرتے تھے۔ چونکہ وہ خاندانی لحاظ سے غریب تھے اور ان کی اپنی آمدنی اتنی نہ تھی کہ اتنی رقوم خرچ کر سکتے تو ظاہر ہے کہ وہ بیت المال ہی کو ذاتی جاگیر بنا کر یہ رقمیں صرف کرتے تھے۔

﴿جواب﴾ یہ الزام بالکل غلط ہے۔ نجی مقصد کے لیے سرکاری رقم لینے کی صراحت پر مشتمل کوئی صحیح روایت پیش کرتے تو اس پر غور کیا جا سکتا تھا مگر درحقیقت کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں جس میں یہ وضاحت ہو کہ خرچ کیا جانے والا مال سرکاری خزانے سے نکالا گیا تھا۔ یہ صرف ایک قیاس ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بیت المال کے سوا ذریعۂ آمدن کوئی اور نہیں تھا۔ عقلی لحاظ سے پورا پورا امکان ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سرکاری تنخواہ کے علاوہ تجارت و زراعت اور دیگر حلال ذرائع سے لاکھوں کروڑوں کماتے ہوں۔ آخر جو شخص سرحدِ چین سے مراکش تک سلطنت چلا سکتا ہے، وہ کچھ ماتحت رکھ کر کوئی ذاتی کاروبار کیوں نہیں چلا سکتا۔ اگر ایسا کاروبار پچیس تیس برس سے چل رہا ہو اور اللہ اس میں برکت دیے جا رہا ہو (جیسا اللہ کا اپنے نیک بندوں سے معاملہ ہوتا ہے) تو ذاتی ملکیت میں لاکھوں کروڑوں کا آ جانا کون سی ناممکن بات ہے؟ لہٰذا یہ محض بدگمانی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ذاتی مقاصد کے لیے اتنی سخاوت سرکاری خزانے ہی سے کرتے تھے۔

نیز یہ بھی ایک قیاس ہی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا افسران، بزرگوں اور امراء کو بڑے بڑے ہدیوں سے نوازنا کوئی ذاتی مد اور نجی مقصد سے تھا۔ جو مثالیں دی جاتی ہیں، درحقیقت ان میں قومی مقاصد ہی کے لیے رقوم دی گئی تھیں۔ اس طرح رقوم خرچ کرنا اسلامی نظامِ معیشت کا حصہ تھا جو دورِ خلفائے راشدین میں بھی اسی طرح رائج تھا۔ اسلامی نظامِ معیشت کا ہدف یہ ہے کہ دولت کو زیادہ سے زیادہ تقسیم کیا جائے تاکہ وہ نچلی سطح تک ہر جگہ پہنچے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ رئیسوں، امیروں اور اعلیٰ شخصیتوں کو اگر ہزاروں، لاکھوں دیا کرتے تھے تو یہ رقم صرف ان حضرات کی جیب میں نہیں بلکہ ان سے وابستہ سینکڑوں لوگوں تک جاتی تھی۔

اس کی دو صورتیں ہوا کرتی تھیں: کبھی یہ رقم فوج کے افسروں اور خاندانوں کے بزرگوں کو بطورِ امانت دی جاتی تھی۔ اس کے اصل حق دار وہ ہزاروں لوگ ہوتے تھے جنہیں ''مقاتلین'' کہا جاتا تھا۔ یہ پیشہ ور افواج یا ان کے علاوہ ضرورت پر طلب کیے جانے والے رضا کار سپاہی ہوتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی ان کے قبائلی سربراہ کرتے تھے اور اس مد میں مرکز نے انہیں رقوم دی جاتی تھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے یہ نظام اسی طرح چلا آ رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس طرح رقوم تقسیم کرتے، چنانچہ جنگِ جمل کے بعد بصرہ آ کر انہوں نے بیت المال کی ساتھ

لاکھ درہم سے زائد رقم اپنے ساتھیوں میں تقسیم کی تھی۔ ①

رقوم دینے کی دوسری صورت عطایا اور ہدایا کی ہوتی تھی جس میں شخصیات کے مقام ومرتبے کے لحاظ سے رقم میں کمی بیشی کی جاتی تھی۔ یہ رقوم جس شخصیت کو دی جاتی تھی وہ اس کا مالک ہوجاتا تھا مگر اس زمانے میں بھلائی، صدقہ خیرات اور سخاوت کا دور دورہ تھا اس لیے وہ رقوم اسی طرح موقع بموقع خرچ ہوکر نچلے طبقے تک پہنچ جاتی تھیں۔

بلاشبہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس طرح اعلیٰ شخصیتوں کو نوازتے تھے مگر یہ اعلیٰ شخصیتیں تھیں کون؟ صحابہ کرام اور تابعین عظام جن میں خود بنوہاشم کے بزرگ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے۔ اگر وہ رقوم دینا ناجائز مد سے اور شرعاً غلط ہوتا تو پھر لینے والے بھی الزام کی زد میں آئیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس طرح ہدایا میں رقوم کا دینا بھی جائز تھا اور لینا بھی۔ چاہے وہ سرکاری خزانے سے ہوتا؛ کیوں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اسے اپنی عیاشی پر نہیں مسلمان قومی رہنماؤں کے اعزاز واکرام پر خرچ کررہے تھے۔ یہ ایک طے شدہ مد تھی نہ کہ کوئی بدعنوانی۔ اس کا باقاعدہ حساب وکتاب لکھا جاتا تھا۔ اگر یہ ہدیے دینا غیر شرعی ہوتا تو امت کے سینکڑوں بزرگ جن کی روایتوں پر دین کا دارومدار ہے، انہیں قبول نہ کرتے۔

آج اگر کوئی حکمران کسی قومی محسن یا بزرگ شخصیت کو سرکاری خزانے سے ایک بڑی رقم دے کر اسے فکرِ معاش سے بے پرواہ کردے تاکہ وہ قومی خدمت میں مشغول رہے، تو اس پالیسی کی تعریف کی جاتی ہے۔ اسی طرح مخالفین کو چپ کرانے اور ملک کے بدخواہ عناصر کی وفاداریاں معاوضے پر خریدنے کی مد بھی ہر ریاست کے نظام میں ہوتی ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کو سرکاری خزانے سے ہر سال کروڑوں کا فنڈ دیا جاتا ہے، جس کے ذریعے ایسی کارروائیاں کی جاتی ہیں، قومی دشمنوں کو مال دے کر رام کیا جاتا ہے۔ اسے کوئی بدعنوانی نہیں کہہ سکتا کیوں کہ یہ سب خرچے ایک پالیسی، ایک ضابطے، اندراج اور آڈٹ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اگر بعض مخالفین کو اس طرح رقوم دے کر خاموش کیا ہو کہ ملک کا امن اور امت کا اتحاد برقرار رہے تو سرکاری رقوم کا اس سے بہتر استعمال کیا ہوسکتا تھا۔ کون عقل مند یہ مشورہ دے گا کہ دولت خزانے میں جمع رہے چاہے ملک میں خانہ جنگی شروع ہوجائے۔

جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہم بیت المال سے جو خرچ کرتے تھے اس کا حساب کتاب تھا نہ اندراج، بس مالِ مفت، دلِ بے رحم والی صورت تھی، وہ حکومتوں کے نظام سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ تو ایک عجوبہ ہی ہوتا کہ چین سے لے کر بحراوقیانوس تک ایک حکومت کسی حساب کتاب، رقوم کے اندراج اور دفتری ریکارڈ کے بغیر چل رہی ہو۔ ہر ہر کونے میں ہر وقت جزیے، خراج، غنائم، خمس، زکوٰۃ وعشر جیسے معاملات جاری ہوں۔ سینکڑوں افسران، ہزاروں ماتحتوں، لاکھوں ملازموں اور سپاہیوں کی تنخواہوں کی ادائیگیاں ہورہی ہوں، گورنروں، کمانڈروں اور عاملین کو آئے دن ہدایات بھیجی جارہی ہوں، ان کے جواب ملاحظہ کیے جارہے ہوں، مگر کسی

① تاریخ الطبری: ۵۳۱/۴

چیز کا کوئی نظام نہ ہو۔ گویا لوگوں نے اس دور کی سب سے بڑی حکومت کو فٹ پاتھ پر لگا چائے کا ٹھیا سمجھ لیا ہے، جہاں ایک صندوقچی میں آمدن آتی ہے۔ ایک آدھ کاپی میں ضروری لین دین لکھ لیا جاتا ہے۔ چند یار دوست مفت چائے پی جائیں تو بھی خیر ہے۔ کوئی فقیر اللہ کے نام پر مانگ لے تو دو چار روپے اسے بھی پکڑا دیں۔ اس طرح تو ایک این جی اوز کا دفتر بھی نہیں چلتا، چہ جائے کہ کوئی حکومت پوری آن بان سے اس طرح چلتی رہی ہو۔

☆☆☆

⑨ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے قاتلینِ عثمان سے قصاص کیوں نہیں لیا؟

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے قصاصِ عثمان کا نعرہ لگا کر امت کو ورغلایا، جب خود حکمران بن گئے تو قصاصِ عثمان کو فراموش کر دیا اور قاتلینِ عثمان کو قتل یا گرفتار نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قصاصِ عثمان کے مطالبے میں پوری طرح مخلص تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں خاصے دنوں تک قصاص لینے کے طریقہ کار کے بارے میں صحابہ کا اختلاف رہا۔ یہ اختلاف فقہی بھی تھا اور انتظامی بھی۔

فقہی اختلاف یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق صرف وہ لوگ قصاص میں قتل کیے جانے چاہیے تھے جو گھر میں گھس کر حملہ آور ہوئے تھے۔ باقی لوگ جو بغاوت چھوڑ کر نئی حکومت سے بیعت ہو گئے تھے، قابلِ معافی تھے۔ حضرت مُعاویہ، ام المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی رائے یا اجتہاد کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کے مرتکب اور ان کے گھر کا محاصرہ کرنے والے سبھی لوگ قصاصاً قتل کیے جانے کے مستحق تھے۔

انتظامی اختلاف یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص سے پہلے مسلمانوں کو پُر امن اور متحد کرنا چاہتے تھے تاکہ اطمینان سے اصل قاتلوں کو عدالتی کارروائی سے گزارا جائے۔ حضرت مُعاویہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کی رائے کے مطابق قصاص لینے کا کام فوری طور پر کرنا چاہیے تھا۔

یہ اختلاف دونوں طرف سے دیانت داری، حسنِ نیت اور خلوص پر مبنی تھا۔ یہی جمہور علمائے اُمت کا طرزِ عمل ہے کہ وہ صحابہ کرام کے اختلاف کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہیں جبکہ گمراہ فرقے اسے دنیاداری، حبِ جاہ اور حبِ مال کا رنگ دیتے ہیں۔

صحابہ کا یہ اختلاف اجتہادی تھا اور مجتہد کی رائے تبدیل بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی رائے ایک مدت تک یہی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کرنے والے سبھی لوگ قابلِ قصاص ہیں۔ مگر بعد میں ان کا عمل ثابت کرتا ہے کہ ان کا اجتہاد تبدیل ہو گیا تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کے قائل ہو گئے تھے، یعنی ان کے

نزدیک بھی وہی لوگ قابلِ قصاص ٹھہرے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھس کر ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔

رہے عام باغی جو صرف ہنگامے میں شریک تھے، اور پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت ہو کر پُر امن شہری بن گئے تھے، ان پر سزا کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوفہ کے دو مشہور افراد: کُمیل بن زیاد اور عمیر الضابی جو عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بیس سالہ خلافت میں مامون رہے۔ آخر حجاج بن یوسف نے ۷۵ھ میں عمیر کو اور ۸۳ھ میں کمیل کو قتل کیا۔ [1]

وہ مجرم جو قاتلانہ حملے کے مرتکب تھے چند گنے چنے افراد تھے جیسے: کِنانہ بن بِشر، سُودان بن حُمران، جَبلہ، الموت الاسود وغیرہ (شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے ذیل میں ہم ان افراد کے ناموں پر الگ الگ بحث کر چکے ہیں) ان میں سے بعض تو موقع پر ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جانثاروں کے ہاتھوں مارے گئے تھے جیسے سُودان بن حُمران۔ کچھ کو غلط طور پر قاتل مشہور کیا گیا تھا وہ اس معاملے میں شریک نہ تھے جیسے عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ۔ یہ مسئلہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔

بہر حال تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے قاتلوں کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کوشش کے نتیجے میں کچھ لوگ گرفتار اور قتل بھی ہوئے۔ [2] قاتلوں کی یہ جماعت شام اور مصر کی سرحد پر کسی غار میں روپوش تھی۔ کسی دیہاتی نے انہیں دیکھ کر حکومت کو خبر دے دی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں گرفتار کیا اور پھر سر قلم کرا دیے۔ ان میں سے ایک کا نام ابوعمرو تھا۔ [3] ایک کِنانہ بن بِشر تھا۔ فلسطین کے گورنر نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے اسے سزائے موت دے دی۔ [4] مجرموں میں ایک شخص ابوشمر تھا جو کعبہ پر حملہ کرنے والے یمنی حکمران ابرہہ کی اولاد سے تھا۔ وہ بھی گرفتار ہوا اور اسے سزائے موت دی گئی۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن عبداللہ نامی ایک مجرم کو بھی قتل کیا گیا۔ [5]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حمص کے قریب جلیل کے قصبے میں ایک قید خانہ اس مقصد کے لیے خاص کر رکھا تھا جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک میں شرکت کے الزام میں گرفتار شدہ افراد کو قید رکھا جاتا تھا اور تحقیق و تفتیش کی جاتی تھی کہ آیا وہ قتل میں شامل تھے یا نہیں۔ [6]

ان کوششوں کے باوجود اگر بعض مجرم بچ گئے ہوں تو یہ ناممکن نہیں۔ کیوں کہ اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے

---

① تاریخ الطبری: ۵/۳۳۳، ۳۳۴ بسند صحیح

② تاریخ الطبری: ۶/۲۰۷، ۲۰۸، ۲۶۵

③ مصنف ابن ابی شیبۃ، روایت نمبر: ۳۷۶۹۱، رجالہ ثقات، رجالہ رجال البخاری الا جھیم الفھری وثقہ ابن حبان. ط الرشد

④ تاریخ دِمَشق: ۵۰/۲۵۹، ۲۶۰؛ الاصابۃ: ۵/۴۸۶

⑤ جمھرۃ انساب العرب، ابن حزم: ۲/۲۳۵

⑥ "کان معاویۃ یحبس فی موضع منہ من یظفر بہ ممن ینبز بقتل عثمان رضی اللہ عنہ." (معجم البلدان: ۲/۱۵۸)

نوٹ: اگرچہ ان تمام روایات میں یہ صراحت نہیں کہ آیا یہ مجرم براہِ راست قاتل تھے یا محض مددگار اور معاون، مگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی فقاہت سے امید یہی ہے کہ انہوں نے شرعی حدود میں رہ کر صرف اصل قاتلوں سے قصاص لیا ہوگا۔ نیز اگر وہ مددگاروں اور معاونین کو بھی قتل کر رہے ہوتے تو پھر سینکڑوں لوگوں کے قتل کا ذکر تاریخ میں ہوتا؛ کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا گھیراؤ کرنے والے تو اڑھائی تین ہزار سے کم نہ تھے۔

گورنر قاتلوں کی تلاش کرنے میں سعی بسیار سے کام لے رہے تھے تو ادھر عبداللہ بن سبا بھی ایک خفیہ تنظیم کا ماسٹر مائنڈ اور منافقین کا رئیس اعظم تھا۔ شناخت مٹانے، بھیس بدلنے اور نام ونسب تبدیل کرنے میں اس یہودی سے بڑھ کر ماہر اور کون ہوسکتا ہے؟ اندازہ یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکومت سنبھالتے ہی ابن سبا روپوش ہوگیا تھا۔ غالباً اس نے اپنے اہم ساتھیوں کو بھی زیرِ زمین چلے جانے کا حکم دے دیا ہوگا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہما کی صلح کے ساتھ ہی عبداللہ بن سبا اور کئی اہم شورش پسند چہرے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوجاتے ہیں۔

☆☆☆

⑩ شریعت کو بدلنے اور بدعات کی ترویج کا الزام

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فقیہانہ بصیرت کے تحت جو اجتہادی فیصلے کیے ان کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا اور بدعت کہہ کر مشہور کیا گیا۔ ان میں سے کئی چیزیں تو ایسی ہیں جن کی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کسی معتبر سند سے ثابت نہیں۔ اسی لیے انہیں خواہ مخواہ ان کے ذمے لگا کر ان کی تنقیص کرنا ظلم ہے۔ ہمیں بھی ان فیصلوں کی توجیہات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ ثابت ہی نہیں۔ مثلاً ان کی طرف منسوب ہے کہ:

❶ انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا، جبکہ شرعاً نہ کافر مسلمان کا وارث بن سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا۔

❷ یہ الزام بھی ہے کہ انہوں نے معاہد (ذمی) کی دیت نصف کردی اور باقی نصف دیت خود لینا شروع کردی، جبکہ شرعاً اس کی پوری دیت ہوتی ہے جو پوری اس کے ورثاء کو ملتی ہے۔

یاد رہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ضعیف سند سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں جسے سب سے پہلے چھٹی صدی ہجری میں ابن عساکر نے ابوعروبہ، محمد بن یحییٰ، ابوالیمان، عن شعیب عن الزہری کی سند سے پیش کیا ہے۔[1]

زہری کی ولادت سن ۵۸ ہجری کی ہے یعنی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے دو سال پہلے پیدا ہوئے۔[2] وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے کسی فیصلے یا فتوے کے خود گواہ نہیں بن سکتے۔ انہوں نے یہ روایت کس سے لی؟ کچھ معلوم نہیں۔ اس طرح یہ روایت مرسل ہے۔ زہری کی مرسل روایتوں کو اصحابِ نقد بے وزن مانتے ہیں۔

پھر ابن عساکر رحمہ اللہ اسے ابوعروبہ سے نقل کرتے ہیں جو سن ۳۱۸ ہجری میں فوت ہوئے۔ علامہ ابن عساکر رحمہ اللہ کی ولادت سن ۴۹۹ ہجری کی ہے۔ درمیانی دو صدیوں میں یہ روایت کس کس راوی نے آگے بڑھائی اور اس میں کیا کچھ اضافے کیے، اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ پھر انہی ابوعروبہ کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ "کان غالیا فی التشیع." "وہ متعصب شیعہ تھے، بنوامیہ سے سخت عداوت رکھتے تھے۔"[3]

---

① تاریخ دمشق: ۵۹/۲۰۳

② الاعلام للزرکلی: ۷/۹۷

③ تاریخ الاسلام للذهبی، تدمری ۲۳/۵۲۱؛ بشار: ۷/۳۹

لہٰذا بنوامیہ کے خلاف ان سے منقول کوئی روایت مشکوک ہی مانی جائے گی۔

③ اسی طرح حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازوں کے لیے اذان اور اقامت شروع کرانے کا ذمہ دار بھی بتایا جاتا ہے۔ یہ روایت بھی نہایت کمزور سند سے ہے۔ ابن عساکر رحمہ اللہ اسے بھی ابوعروبہ سے نقل کرتے ہیں۔ پھر اس میں معاذ بن ہشام دستوائی ہیں جو صدوق مگر وہمی ہیں، یحییٰ ابن معین کے بقول وہ حجت نہیں۔ [1]

سند کی انتہا "قَتادہ بن دِعامہ عن سعید بن المسیب" پر ہے۔ قتادہ بن دِعامہ ثقہ مانے گئے مگر عقیدۂ تقدیر میں الگ رائے رکھتے تھے۔ تدلیس کے عادی تھے۔ [2] امام علی بن مدینی نے "قتادۃ عن سعید بن المسیب" والی تمام احادیث کو نہایت ضعیف قرار دیا ہے کہ ان کے خیال میں دونوں راویوں کے درمیان کئی رجال غائب تھے۔ [3]

اس لیے ان فقہی فیصلوں کی نسبت حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف درست نہیں۔

☆☆☆

ہاں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے بعض فتاویٰ اور احکام ایسے ہیں جو صحیح سند سے ثابت ہیں اور ان سے اس دور کے اکابر کو اختلاف رہا مگر اس کے باوجود حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ وہ فقیہ و مجتہد تھے۔ جب کوئی شے ان کے نزدیک دلیل شرعی سے ثابت ہوتی تھی تو کسی کی مخالفت کی پروا کیے بغیر اس پر عمل پیرا ہونا کم از کم ان پر واجب تھا۔ اس حقیقت کو خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سمجھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: "مُعاویہ تو وتر کی ایک رکعت پڑھتے ہیں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام عائد کیے بغیر فرمایا:

"اصاب انه فقيه." وہ ٹھیک کرتے ہیں کیوں کہ وہ فقیہ ہیں۔ [4]

اگر دیکھا جائے تو اس قسم کے فقہی اختلافات صحابہ کرام، تابعین و تبع تابعین سے لے کر دورِ حاضر تک فقہاء اور مفتیانِ عظام کے درمیان ایک معمول کی چیز ہیں۔ ہر ایک اپنے لحاظ سے کسی شرعی دلیل کے تحت عمل کرتا اور فتویٰ دیتا آیا ہے۔ اگر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اس بنا پر قابلِ الزام ہیں تو اہلِ علم میں سے شاید ہی کوئی اس الزام کی زد سے بچے۔ دراصل حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے یہ اجتہادات کوئی عجیب بات تھے ہی نہیں مگر جس شر پسند گروہ نے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے فقہی فیصلوں کو بدعت کہہ کر مشہور کیا وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو کیوں بخشتا۔ اس لیے شر پسند گروہ کے راویوں نے یہ زہر تاریخ میں گھول دیا۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اگر کرتے بھی تھے تو کسی عذر کی وجہ سے۔ وہ ان کو سنت قرار دیتے تھے نہ دوسروں کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ مثلاً بیٹھ کر خطبہ دینا اس لیے اختیار کیا کہ جسم کے ثقل اور پاؤں میں

---

① میزان الاعتدال: ۱۳۳/۴

② سیر اعلام النبلاء: ۲۷۱/۵، ط الرسالۃ

③ تہذیب التہذیب: ۳۵۶/۸

④ صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب ذکر مُعاویہ رضی اللہ عنہ

درد کی وجہ سے وہ زیادہ دیر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔[1]

یہ یقیناً ان کے آخری دور کا عمل ہوگا جب بڑھاپا بھی لاحق تھا اور امراض بھی ہوں گے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں (اہلِ علم) سے اجازت لے کر یہ رخصت اختیار کی تھی۔[2]

☆☆☆

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے منسوب وصیت کی حقیقت:

﴿سوال﴾ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ وصیت بہت مشہور ہے کہ آپ نے مرض الموت میں یزید کو پاس بلا کر کہا:

"بیٹا! میں نے عرب کی گردنوں کو تمہارے لیے جھکا دیا ہے اور اتنا کچھ جمع کر دیا ہے جو کسی نے نہ کیا ہوگا۔ امرِ خلافت تمہارے لیے مضبوط ہو چکا ہے۔ مجھے اندیشہ نہیں کہ اب چار افراد کے سوا کوئی اس کے بارے میں تم سے اختلاف کرے گا: حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔ ان میں سے عبداللہ بن عمر کو عبادت نے تباہ کر دیا ہے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے سوا کوئی بیعت کیے بغیر نہیں رہا تو وہ بھی کر لیں گے۔ رہے حسین بن علی تو عراق والے انہیں تمہارے خلاف کھڑا کر کے ہی چھوڑیں گے، اگر وہ تمہارے خلاف کھڑے ہوں اور تم ان پر قابو پالو تو درگزر کرنا کہ ان سے رشتہ داری بھی ہے، ان کا بڑا حق ہے۔ رہا ابوبکر کا بیٹا تو وہ جیسا دوسروں کو کرتا دیکھے گا ویسا وہ بھی کرے گا کہ وہ عورتوں اور عیاشی ہی کو سوچتا ہے۔ مگر وہ شخص جو شیر کی طرح حملہ کرے گا اور لومڑی کی طرح چکما دے گا وہ عبداللہ بن زبیر ہے، اس پر قابو پالو تو چھوڑنا نہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔"[3]

کیا یہ روایت سنداً معتبر ہے؟ کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے آخری وقت میں یزید کو یہ ہدایات دی تھیں؟

﴿جواب﴾ اس روایت کی سند میں دو انتہائی ضعیف راوی: ہشام کلبی اور ابو مخنف موجود ہیں۔ اس میں یزید کو وصیت سنانے کا ذکر نہایت مضحکہ خیز ہے کیوں کہ یزید حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت حاضر نہ تھا بلکہ نمازِ جنازہ کے بھی بعد پہنچا تھا۔[4] بھلا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اسے یہ وصیت و نصیحت کیسے کر سکتے تھے۔

طرہ یہ کہ اس وصیت میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی ہے۔ حالاں کہ وہ تو اس سے چار سال پہلے وفات پا چکے تھے، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ وصیت میں ان کا تذکرہ بھلا کیسے کر سکتے تھے!!

مزید تماشا یہ ہے کہ راوی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو کوئی پچیس تیس سالہ آوارہ جوان تصور کیے ہوئے تھا جسے عورتوں اور عیاشی کے سوا کوئی کام نہ تھا، نعوذ باللہ! حالاں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اگر

---

① مصنف ابن شیبہ روایت نمبر: ۳۵۸۹۲،۵۱۹۳، ط الرشد

② تاریخ دمشق: ۲۰۲/۵۹؛ البدایہ والنہایہ: ۱۳۸/۸، ترجمۃ مُعاویہ رضی اللہ عنہ، عن ابی الملیح، وفی سندہ ضعف

③ تاریخ الطبری: ۳۲۲/۵، ۳۲۳

④ البدایۃ والنہایۃ: ۴۵۹/۱۱؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۶۲/۳ بسند حسن، ط الرسالۃ

اس وقت زندہ ہوتے تو ان کی عمر کم وبیش ۸۰ برس ہوتی کیوں کہ وہ ۲ھ میں بدر کی جنگ میں شامل تھے۔ تب ان کی عمر ۲۰،۲۲ سال ضرور ہوگی۔ اس حساب سے ۶۰ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت انہیں لگ بھگ ۸۰ برس کا ہونا چاہیے تھا۔ کیا ایسے بزرگ کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ عورتوں اور عیاشی ہی کو سوچتا ہے جبکہ وہ ہیں بھی صحابی۔ بلاشبہ راوی نے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھرانے کو بدنام کرنے کی بھونڈی حرکت کرتے ہوئے اپنے خیالات حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کردیے ہیں۔

اس وصیت پر مزید غور کریں تو جعل سازی کے اور ثبوت بھی ہیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو یزید کی ولی عہدی تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ کھلے دل سے ان کا موقف سنا، ان پر کوئی سختی نہیں کی۔ تو کیا وہ ان کے بارے میں اتنی سخت وصیت کر سکتے تھے کہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں۔ اگر انہیں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ختم کرنا ہی تھا تو اپنی زندگی میں کیوں نہ کر گئے۔ کیا انہیں اس کا وقت نہیں ملا تھا؟ حالاں کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا موقف چار پانچ سال تک ان کے سامنے رہا۔ کیا اتنا وقت کسی باغی کی گرفتاری اور سرکوبی کے لیے کافی نہ تھا؟ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی قلعہ تھا نہ فوج۔ اگر بیعت میں پس وپیش ایسا جرم تھا جس پر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ انہیں قتل کرادینا چاہتے تھے تو انہیں کس نے روکا تھا۔ اگر وہ اپنے بیٹے کے لیے تمام خطرات کو دور کرنے اور اس کے لیے حکومت کی راہیں ہموار کرنے کے شائق تھے تو ایسے بڑے خطرے کو باقی کیوں چھوڑ رہے تھے؟ یہ مہم یزید کے سر کیوں ڈال کر جا رہے تھے؟ کیا وہ خود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ڈرتے تھے؟ یا یزید کو لاؤ لشکر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ مل رہا تھا؟ غرض اس جھوٹی روایت کی حقائق سے کوئی مطابقت نہیں۔ اس کا جعلی ہونا ظاہر ہے۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ ایک روایت میں ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ضحاک بن قیس فہری رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا:

"یزید کو میرا اسلام کہنا اور یہ وصیت پہنچا دینا کہ اہلِ حجاز سے حسنِ سلوک کرنا۔ اہلِ عراق اگر روزانہ حاکم بدلنے کا مطالبہ کریں تو بھی مان لینا کہ ایک کو برطرف کرنا، تمہارے خلاف ایک لاکھ شمشیروں کے بے نیام ہونے سے بہتر ہے۔ شام والوں کے بارے میں خیر کی وصیت کرتا ہوں، انہیں اپنا معاون بنانا، ان کا حق پہچاننا۔ مجھے قریش میں سے صرف تین افراد سے خدشہ ہے: حسین، عبداللہ بن عمر اور ابن زبیر۔ ابن عمر کو تو عبادت نے بے جان کر دیا ہے۔ حسین کم عقل آدمی ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے ذریعے نمٹا دے گا جنہوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی کو بے آسرا چھوڑا۔ ان سے رشتہ داری بھی ہے، بڑا حق بھی ہے۔ محمد ﷺ کی قرابت داری بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اہلِ عراق انہیں خروج پر آمادہ کیے بغیر چھوڑیں گے نہیں۔ اگر تم ان پر قابو پالو تو درگزر کرنا؛ کیوں کہ اگر یہ معاملہ میرے سامنے ہوتا تو میں بھی ان سے درگزر کرتا۔ رہے ابن زبیر تو وہ چھپ جانے والی گوہ کی طرح ہیں۔ اگر وہ

تمہارے سامنے ظاہر ہوں تو ان سے مقابلہ اس وقت تک کرنا جب تک وہ خود صلح کی درخواست نہ کریں۔
اگر وہ ایسا کریں تو تم قبول کر لینا۔ لوگوں کا خون بہانے سے جہاں تک ہو سکے، بچنا۔"[1]

کیا حضرت مُعاویہ کی وصیت کی اس روایت کو ہم قابلِ اعتماد مان سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بھی ابو مخنف سے مروی ہے۔ سند تو ضعیف ہے ہی، بعض مندرجات بھی مشکوک ہیں۔ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی زبانی کم عقل کہلوایا گیا ہے۔ حالاں کہ حضرت مُعاویہ، حضرت حسین کا بہت اکرام کرتے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خروج پر کمر بستہ ظاہر کیا گیا ہے۔ آگے ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق شبہات کے جوابات میں یہ واضح کریں گے کہ انہیں خروج پر کمر بستہ مشہور کرنے والی ایک روایت بھی صحیح السند نہیں بلکہ تمام کی تمام شیعی راویوں سے منقول ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر روایات ابو مخنف ہی کی ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔

☆☆☆

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۲۳/۵

⑪ یزید کی ولی عہدی سے متعلقہ اعتراضات

یزید کی ولی عہدی ایک بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ بن چکا ہے، اس حوالے سے کئی طرح کے شبہات پیدا کر کے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کیا جارہا ہے۔ ہم ان شبہات کو الگ الگ ذکر کر کے ان کے جواب دیں گے۔

کیا یزید کی ولی عہدی کی تحریک ذاتی مفادات پر مبنی تھی؟

﴿سوال﴾ کیا یہ سچ نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کی تحریک حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے اٹھائی تھی اور وہ بھی ذاتی مفاد کی بنا پر تا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا قرب پا کر کوفہ کی گورنری دوبارہ حاصل کریں۔

چنانچہ تاریخ طبری میں روایت ہے کہ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر بڑھاپے کی وجہ سے کوفہ کی گورنری سے استعفاء دے دیا جو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے منظور کر لیا اور ان کی جگہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کرنا چاہا۔ حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات بری لگی۔ انہوں نے دوبارہ منصب پانے کے لیے یزید سے مل کر اسے خوش کرنے کی کوشش کی اور اسے ولی عہد بننے کی ترغیب دی۔ یزید نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے اس تجویز کا ذکر کیا۔ انہوں نے حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کو بلوا کر اس تاکید کے ساتھ دوبارہ کوفہ کا گورنر بنا دیا کہ وہ لوگوں کو یزید کی بیعت کے لیے آمادہ کریں۔[①]

﴿جواب﴾ یہ روایت بوجوہ ناقابلِ قبول ہے:

● اس کی سند میں علی بن مجاہد ہے جو متروک ہے، یحییٰ بن معین نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے، وہ روایت کے لیے من گھڑت سند بھی بنا لیتا تھا۔[②] اس لیے یہ روایت انتہائی ضعیف ہے۔

● اکثر مؤرخین کے نزدیک حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ سن ۵۰ ہجری میں وفات پا گئے تھے۔[③]

ایک قول سن ۵۱ ہجری کا اور ایک قول ۴۹ھ کا بھی ہے۔[④]

اس پر اتفاق ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ کا گورنر بنایا تو وہ اپنی وفات تک وہاں کے گورنر رہے۔[⑤]

① تاریخ الطبری: ۳۰۲،۳۰۱/۵ ② تقریب التهذیب، تر: ۴۷۹۰؛ میزان الاعتدال: ۱۵۲/۳؛ تهذیب الکمال: ۱۱۸/۲۱

③ فتح الباری: ۱۶۸/۱؛ اسد الغابة: ۴۰/۳؛ الاعلام للزرکلی: ۲۷۷/۷؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۲/۳، ط الرسالة؛ تهذیب التهذیب: ۱۰/ ۲۳۵؛ تهذیب الکمال: ۳۷۴/۲۸؛ الاصابة: ۱۵۷/۶

④ تاریخ الطبری: ۲۵۵/۵، سن ۵۱ھ؛ الاصابة: ۱۵۷/۶

⑤ ثم بلغ معاویة بعد ان اجتمع الناس علیه ثم ولاه بعد ذلک الکوفة فاستمر علیٰ امرتها حتیٰ مات سنة خمسین عند الاکثر.(الاصابة: ۱۵۷/۶) ولی المُغیرة الکوفة سنة احدیٰ واربعین وهلک سنة احدیٰ وخمسین، فجعلت الکوفة والبصرة لزیاد بن ابی سفیان۔ "وہ سن ۴۱ ہجری میں کوفہ کے والی بنے اور سن ۵۱ ہجری میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد کوفہ اور بصرہ دونوں زیاد کے ماتحت دے دیے گئے۔" (تاریخ الطبری: ۲۵۵/۵)

دوسری طرف یزید کی ولی عہدی کی بات سن ۵۶ھ میں شروع ہوئی تھی۔[1]
صحیح بخاری میں صراحت ہے کہ مدینہ میں یزید کی ولی عہدی کا اعلامیہ گورنر مروان بن الحکم نے سنایا تھا۔[2]
یہ بات طے ہے کہ مروان سن ۴۹ ہجری سے ۵۳ ہجری تک مدینہ منورہ کا گورنر نہیں تھا۔ اس دوران گورنری حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ مروان پہلے سن ۴۱ ہجری تا ۴۸ ہجری گورنر رہا اور پھر سن ۵۴ ہجری تا ۵۸ ہجری۔[3]
۴۱ھ سے ۴۸ ہجری تک ولی عہدی کا مسئلہ چھیڑا ہی نہیں گیا تھا، اس لیے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق جب یہ اعلان مدینہ میں گورنر مروان نے سنایا تو یہ مروان کی امارتِ مدینہ کے دوسرے دور یعنی سن ۵۴ ہجری کے بعد ہی کسی سال میں ہوسکتا تھا۔ اور مؤرخین نے لکھ دیا ہے کہ وہ سن ۵۶ ہجری تھا۔

اب پورے معاملے پر غور کریں کہ جب حضرت مُغیرَہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ سن ۵۰ ہجری میں وفات پا گئے تھے تو ۵۶ ہجری میں وہ یہ تجویز کیسے دے سکتے ہیں۔

یہ تأویل بے سود ہے کہ تجویز سن ۵۰ ہجری میں دی ہوگی اور اس پر عمل سالوں بعد ہوا ہوگا؛ کیوں کہ اسی روایت میں مُغیرَہ رضی اللہ عنہ کے کوفہ جا کر مہم چلانے اور دِمَشق وفد بھیجنے کا بھی ذکر ہے گویا روایت خود یہ بتا رہی ہے کہ انہوں نے صرف تجویز نہیں دی بلکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق ولی عہدی کے لیے راہ بھی ہموار کی اور اس کے لیے وفد بھیجے۔ حالاں کہ معتبر روایات کے مطابق ولی عہدی پر مشورہ اور اس کا اعلان سب سن ۵۶ ہجری میں ہوا تھا۔ غرض اس روایت کو گھڑنے والے نے تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر جگہ جگہ مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس روایت کے مطابق حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے بڑھاپے کی وجہ سے خود استعفاء پیش کیا تھا جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں خود عہدے کی خواہش نہ تھی۔ اگر انہیں معزول کیا گیا ہوتا تو کہانی میں یہ باتیں ڈالنے کی گنجائش تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان سے ناراض تھے اور انہیں دوبارہ کوفہ کی گورنری کی طلب تھی پس وہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو خوش کر کے یہ مطلب نکالنا چاہ رہے تھے مگر جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ سے کوئی شکایت ہی نہیں تھی اور حضرت مُغیرَہ رضی اللہ عنہ نے بھی عہدے سے خود استعفاء دیا تھا تو پھر انہیں یکدم دوبارہ گورنری کی خواہش کیوں ہوتی۔ کیا وہ چھوٹے بچے تھے جو دسترخوان سے اٹھ گئے تھے اور پھر کسی دوسرے کو بیٹھتا دیکھ کر دوبارہ شامل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ (نعوذ باللہ)

بالفرض وہ دوبارہ منصب چاہتے بھی تھے تو کسی ناٹک کی کیا ضرورت تھی۔ اگر استعفاء پیش کر کے انہیں دوبارہ یہ خدمت سنبھالنے کا خیال آ ہی گیا تھا تو وہ یہ بات صاف صاف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے کہہ سکتے تھے۔ اس وقت تک

---

① تاریخ الطبری: ۵/۳۰۰، الکامل فی التاریخ: تحت ۵۶ھ، البدایہ والنہایہ: ۱۱/۳۰۲
② صحیح البخاری، ح: ۴۸۲۷، کتاب التفسیر، باب والذی قال لوالدیہ
③ دیکھیے: تاریخ الطبری، تاریخ خلیفہ، الکامل فی التاریخ اور البدایہ والنہایہ میں ان سالوں کے حالات

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے وہاں سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر نہیں کیا تھا۔ وہ تو خوش ہوتے کہ ایک ذمہ دار آدمی دوبارہ اپنا منصب سنبھالنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ یہ تمام پہلو ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ روایت پوری ہی من گھڑت ہے۔

''الکامل فی التاریخ'' کی بلا سند اور وضعی روایت:

''الکامل فی التاریخ'' میں اس واقعے کو کسی سند کے بغیر کئی اضافوں کے ساتھ بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کو اتفاقی طور پر پتا چل گیا تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ انہیں معزول کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر جھوٹ موٹ بیمار بنتے ہوئے استعفاء دیا۔ پھر یزید کی ولی عہدی کی تحریک شروع کی۔ جبکہ ان کا مقصد صرف اپنا سیاسی قد وکاٹھ بڑھا کر عہدہ پکا کرنا تھا۔

یہ اضافی باتیں ابن اثیر الجزری سے پہلے کہیں نہیں ملتیں۔ ابن اثیر الجزری کا اندازِ تاریخ نگاری یہ ہے کہ وہ واقعے کی ایک مکمل اور مربوط تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس میں صحیح وضعیف کا لحاظ کیے بغیر ہر قسم کا مواد چن لیتے ہیں اور کسی چیز کی سند بیان نہیں کرتے۔ پس کسی علمی بحث میں اس قسم کی روایات کا کوئی وزن نہیں ہوسکتا۔

کیا حضرت مُعاویہ اور مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہما نے امت کو فساد میں ڈالا تھا؟

﴿سوال﴾ حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول درج ذیل روایت سنداً ومتناً کیا مقام رکھتی ہے جس میں حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اصلح امر الناس اربعة وافسده اثنان.''

یعنی امت کے معاملات کو چار حضرات (خلفائے راشدین) نے درست کیا اور دو آدمیوں (حضرت مُعاویہ اور مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہما) نے خراب کیا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ نے امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کی خلافت کی امید دلانے کے بعد نجی مجلس میں لوگوں سے کہا:

الی قد وضعت رجل معاوية فی غرز بغی لا یزال فیه الیٰ یوم القیامة.

میں نے مُعاویہ کا پاؤں گمراہی کی ایسی کھائی میں ڈال دیا ہے کہ وہ تا قیامت نہ نکلے گا۔ [1]

﴿جواب﴾ یہ روایت نہایت مشکوک ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں یہ پہلی بار دو اسناد سے ''تاریخ دِمشق'' میں ملتی ہے۔ شروع کی پانچ صدیوں کے علمی ذخائر میں یہ کسی سے منقول نہیں پائی گئی۔

❶ اس کی پہلی سند میں......

ایک راوی احمد بن علی بن محمد ابو سعود (۴۵۳ھ تا ۵۲۵ھ) حدیث سے ناواقف شمار ہوتے ہیں۔ [2]

ایک راوی ابو علی محمد بن وشاح الرسی (م ۴۶۳ھ) رافضی اور معتزلی تھا۔ [3]

---

① پہلی روایت مع سند تاریخ دمشق: ۲۸۶/۳۰، ۲۸۷، دوسری روایت مع سند تاریخ دِمشق: ۶۵/۲۱۰

② لم یکن یعرف شیئا من الحدیث، وکان یعظ ویذکر. (تاریخ الاسلام للذھبی تدمری: ۱۲۸/۳۶؛ بشار: ۴۲۶/۱۱)

③ فیه رفض. (میزان الاعتدال: ۵۸/۴)

اسے ''الرسی'' لکھنا غالباً سہو کاتب ہے صحیح لفظ ''الزینبی'' ہے۔ اگر الرسی کو صحیح مانا جائے تو اس شخصیت کو مجہول ماننا پڑے گا۔

ایک راوی عیسیٰ بن علی بن عیسیٰ (۳۰۲ھ تا ۳۹۱ھ) کو خطیب بغدادی نے صحیح الکتاب اور ثبت السماع کہا ہے مگر بعض حضرات نے فلسفیانہ علوم میں انہماک کے باعث ان پر جرح کی ہے۔[1] یہ طائع للہ کے درباری تھے [2] جو خود اثنا عشری شیعہ خاندان بنی بویہ کے ماتحت حکومت کرتا تھا۔

☆ایک راوی ابوالسکین زکریا بن یحییٰ (م ۲۵۱ھ) کو ابن حبان اور خطیب بغدادی نے ثقہ قرار دیا ہے [3] مگر دارقطنی اسے متروک کہتے ہیں۔[4]

ایک راوی زحر بن حصن (م ۲۰۱ھ یا ۲۱۰ھ) مجہول الحال ہیں۔[5]

● دوسری سند میں ایک راوی ابوبکر المؤدب کے حالات نامعلوم ہیں۔ ابن عساکر نے اپنی معجم میں صرف ان کا نام لکھا ہے اور چند اشعار نقل کیے ہیں، جرح یا تعدیل نہیں کی۔[6]

ایک راوی ''ابوعمرو بن یوہ'' بالکل مجہول ہیں۔ ایک راوی سری ابن اسماعیل (م ۱۹۶ھ) متروک ہیں۔[7]

پھر یہ روایت آخر میں ایک مجہول راوی پر ختم ہوتی ہے جسے "بعض من سمع المغیرۃ" کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔

غرض اس روایت کی دونوں اسناد نہایت کمزور ہیں۔ ایسی ساقط الاعتبار روایتوں کو لے کر نہ تو مغیرہ بن شعبہ جیسے صحابی کے بارے میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ امت کو تا قیامت گمراہی کے گڑھے میں ڈال گئے ہوں اور اس پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہوں۔ نہ حسن بصری رحمہ اللہ سے یہ توقع ہے کہ وہ اس طرح صحابہ کے معائب بیان کرتے ہوں گے۔

☆☆☆

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کی ولی عہدی کے لیے رشوت دیتے رہے؟

﴿سوال﴾ بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے لیے صحابہ کی وفاداریاں رشوت کے بل پر خریدنے کی کوشش بھی کی۔ مثلاً انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک لاکھ کی رشوت پیش کی تاکہ وہ بیعت کر لیں۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اس پر ناراض ہوئے اور بیعت سے انکار کر دیا۔

''طبقات ابن سعد'' میں یہ روایت صحیح سند سے یوں نقل کی گئی ہے:

ان معاویہ بعث الی ابن عمر بمائۃ الف ،فلما اراد ان یبایع لیزید ،قال اری ذاک اراد، ان دینی عندی اذاً لرخیص.

---

[1] حافظ ذہبی کے بقول: لقد شانتہ ھذہ العلوم ومازانتہ. (سیر اعلام النبلاء، ۱۶/ ۵۵۰، ط الرسالہ)

[2] الاعلام للزرکلی: ۱۰۶/۵

[3] میزان الاعتدال: ۷۹/۲

[4] لیس بالقوی، متروک. (اکمال تھذیب الکمال: ۷۳/۵)

[5] حافظ ذہبی کہتے ہیں: "لایعرف." (میزان الاعتدال: ۷۹/۲)

[6] معجم ابن عساکر، ترجمہ نمبر ۱۳۸۲

[7] تقریب التھذیب، تر: ۲۲۲۱

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک لاکھ بھیجے۔ پھر جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ یزید (کی ولی عہدی کی) بیعت لیں تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:
میرا خیال ہے کہ انہوں نے اسی کا ارادہ کیا تھا؟ اگر ایسا تھا تب تو میرا دین میری ہی نگاہ میں بڑا سستا ہے۔ [1]

یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے واقعی رشوت دی تھی۔ یا کم از کم ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ہدیے کو سیاسی رشوت ہی تصور کیا تھا۔ ان کے الفاظ "اریٰ ھٰذا اراد." (میرا خیال ہے ان کا مقصد یہی تھا) سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

﴿جواب﴾ بعض اوقات صحیح روایات میں بھی تعارض ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بارے میں ہمیں ایک اور صحیح روایت دکھائی دیتی ہے جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا تاثر الگ انداز میں نقل کیا گیا ہے۔ روایت درج ذیل ہے:

ان معاویة بعث الیٰ ابن عمر مائة الف درهم،فلما دعا معاویة الیٰ بیعة یزید بن معاویة،قال:أترون هذا اراد؟ان دینی اذا عندی لرخیص.فلما مات معاویة واجتمع الناس علی یزید بایعه.

نافع کہتے ہیں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک لاکھ درہم بھیجے۔ پھر جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کی طرف دعوت دی تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے (حاضرین سے کہا) "کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا مقصد یہی تھا؟ اگر ایسا تھا تب تو میرا دین میری ہی نگاہ میں بڑا سستا ہو گیا۔" جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے اور لوگ یزید پر متفق ہو گئے تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کر لی۔ [2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں بلکہ ان کے ملنے جلنے والے لوگوں کو یہ خیال ہو رہا تھا کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے وہ رقم رشوت کے طور پر دی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی غلط فہمی کی نفی کرتے ہوئے کہا: أترون هذا اراد؟ (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مُعاویہ کا مقصد یہی تھا؟)

اس کے بعد اس خیال کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو وہ رشوت دینے والے ہوئے اور میں رشوت لینے والا۔ گویا میں نے اپنا دین ایک لاکھ درہم میں بیچ کر اس کی بڑی سستی قیمت لگائی۔

اب سوال یہ ہے کہ الگ الگ تاثر دینے والی ان دونوں صحیح روایات میں سے کس کو ترجیح دی جائے۔ اس کے لیے ہم دونوں کی سند دیکھتے ہیں۔

---

① طبقات ابن سعد، ۱۸۲/۴، ط صادر ② السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ۱۶۶۳۲، ط العلمیة۔
اس روایت کو الفسوی نے لرخیص تک نقل کیا ہے، فلما مات سے بایعه تک کے الفاظ ان کی روایت میں نہیں۔ (المعرفة والتاریخ: ۴۹۲/۱)

''طبقات ابن سعد'' کی روایت کی سند یہ ہے: عارم بن الفضل، سلیمان بن حرب، حماد، ایوب اور نافع۔

امام بیہقی کی روایت کی سند یہ ہے: یعقوب بن سفیان، سلیمان بن حرب، حماد، ایوب اور نافع۔

سلیمان بن حرب، حماد، ایوب اور نافع دونوں سندوں میں مشترک ہیں۔ یہ سب بالاتفاق ثقہ ہیں۔

دونوں اسناد میں فرق صرف یہ ہے کہ سند کے شروع کے راوی طبقات میں عارم بن الفضل ہیں اور بیہقی میں یعقوب بن سفیان۔ اب دیکھ لیا جائے کہ دونوں میں سے کون زیادہ ثقہ ہے؟ یعقوب بن سفیان یا عارم بن الفضل،

یعقوب بن سفیان پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ثقہ راوی تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ثقہ حافظ۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی رائے ہے: الحافظ، ثقة، خير، صالح۔ [1]

عارم بن فضل (م ۲۲۴ھ) کے بارے میں اصحابِ جرح وتعدیل کا کہنا ہے کہ یہ ثقہ ہیں مگر آخری عمر میں ان کا حافظہ بگڑ گیا تھا، روایات کو خلط ملط کرنے لگے تھے۔ [2]

امام ابو داؤد کے نزدیک آخری آٹھ سالوں میں اور امام ابو حاتم کے نزدیک آخری چار سالوں میں ان کا حافظہ خراب رہا۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ حافظے کی خرابی کی وجہ سے ان کی روایات میں بکثرت منکر باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ [3]

محدثین نے یہ اصول طے کیا ہے کہ جن حضرات نے ان کے حافظے کے خرابی سے پہلے ان سے روایات نقل کی تھیں، انہی سے عارم کی مرویات قابلِ قبول ہیں۔ جن حضرات نے اس کے بعد ان سے استفادہ کیا تھا، ان سے منقول عارم کی روایات قبول نہ کی جائیں، اور اگر کسی راوی کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ اس نے عارم سے روایت حافظے کی خرابی سے پہلے سنی تھی یا بعد میں تو احتیاط اسی میں ہے کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ [4]

اب چونکہ یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ یہ روایت عارم کے اختلاطِ حافظہ سے پہلے کی ہے یا بعد کی، اس لیے اسے متروک نہیں، مشکوک ضرور سمجھا جائے گا۔

طبقات ابن سعد میں عارم بن فضل کی روایت کو ابن سعد خود نقل کر رہے ہیں۔ ان کے اور عارم کے درمیان کوئی اور واسطہ نہیں ہے۔ مگر عارم کی وفات ۲۲۴ھ کی ہے اور محمد بن سعد کی پیدائش ۱۶۸ھ کی۔ پس یقیناً درمیان میں کوئی گمنام راوی چھوٹ گیا ہے۔ وہ راوی کون ہے؟ اس بارے میں تمام کتب خاموش ہیں۔ جب تک اس کا پتا نہیں چل جاتا روایت کو صحیح السند قرار دینا بھی محلِ نظر رہے گا۔

اسند کی اس کمزوری کو سمجھ لینے کے بعد یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اس مسئلے میں یعقوب بن سفیان کی روایت زیادہ قابلِ اعتماد ہے جسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ عارم کی روایت کا متن ''شذوذ'' سے خالی نہیں۔ یعنی راوی ثقہ ہونے کے

---

[1] تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۷۸۱۷

[2] میزان الاعتدال: ۸۰۷/۳ یاد رہے کہ عارم بن فضل کا اصل نام ''محمد بن الفضل السدوسی'' ہے۔

[3] الشذا الفیاح من علوم ابن الصلاح لابی اسحٰق الابناسی م ۸۰۲ ھجری: ۷۷۱/۲، ط مکتبۃ الرشد

[4] تھذیب الکمال: ۲۹۰/۲۶؛ الشذا الفیاح من علوم ابن الصلاح: ۷۷۱/۲

باوجود اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی روایت سے ہٹ کر بیان کر رہا ہے۔ یعقوب بن سفیان بیان کرتے ہیں: **اتُرون هذا اراد**...... عارم اسے یوں نقل کرتے ہیں: **اریٰ ذاک اراد.**

یعقوب بن سفیان کی روایت کو ایک بار پھر پڑھ لیں تو معلوم ہوگا کہ نہ ہی اس میں کسی رشوت دینے کا ذکر ہے نہ ہی اس میں یہ تاثر ملتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی بدگمانی تھی بلکہ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ان بزرگوں کو عطیات اور ہدیے دینے کا پرانا معمول تھا جس کے شواہد میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے حالات کی کئی روایات گزر چکی ہیں۔ یزید کی ولی عہدی کی تحریک والے سال بھی انہوں نے ان حضرات کو اسی طرح معمول کے مطابق ہدیے ارسال کیے۔

کچھ مدت بعد جب یزید کی بیعت کا مطالبہ پیش کیا۔ (جس کا درحقیقت اس ہدیے سے کوئی تعلق نہ تھا) تو ان حضرات کے حلقۂ اثر میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ وہ رقم دراصل سیاسی رشوت تھی جس کا مقصد اس تحریک میں ہمنوائی حاصل کرنا تھا۔ ان بزرگوں نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور کہا: تم لوگ کیا یہ سمجھ رہے ہو کہ حضرت مُعاویہ نے اس (سیاسی) غرض سے رقم بھیجی تھی (جسے میں نے قبول کیا تھا) اگر ایسا ہی ہے جیسے تم گمان کرتے ہو تو پھر میں نے اپنے دین کا دام بہت کم لگایا۔

اگر ابن عمر رضی اللہ عنہ کو اس ہدیے پر کوئی اعتراض ہوتا یا وہ اسے سیاسی رشوت سمجھتے تو واپس کر دیتے۔ اگر یہ بات بعد میں سمجھ آئی تھی تو بعد میں لوٹا دیتے مگر کسی روایت میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ مذکورہ روایات ہی میں مذکور ہے کہ:

فلما مات معاوية واجتمع الناس علي يزيد، بايعه...... ''جب حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے، اور لوگ یزید پر متفق ہو گئے تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یزید سے بیعت کر لی۔''[1]

اس طرح یہ روایات خود ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اس معاملے پر عدمِ اعتراض کا ثبوت دیتی ہیں۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت نہ کی تو انہیں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک لاکھ درہم بھیجے، انہوں نے منع کر دیا۔ فردها وقال لا ابيع ديني بدنياى......'' کہا میں اپنے دین کو اپنی دنیا کے بدلے نہ بیچوں گا۔'' اس سے صاف پتا چل رہا ہے کہ وفاداریوں کی قیمت لگائی گئی تھی۔[2]

﴿جواب﴾ یہ روایت نا قابلِ قبول ہے۔ اسے ساتویں اور نویں صدی ہجری کے حضرات زبیر بن بکار سے روایت کر رہے ہیں جو ۲۵۶ ہجری میں فوت ہوئے۔ درمیان میں بہت بڑا انقطاع ہے۔ پھر زبیر بن بکار اُسے ابراہیم بن محمد بن عبدالعزیز الزہری سے نقل کرتے ہیں، ان ابراہیم کے بارے میں ابن عدی کہتے ہیں ان کی اکثر احادیث منکر ہیں،

---

① السنن الكبرى للبيهقي، ح: ١٦٦٣٢، ط العلمية

② الاصابه: ٣/٢٧٦؛ اسد الغابة: ٣/٣٦٢

حافظ ذہبی رحمہ اللہ واہی قرار دیتے ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں انہی کے مشورے سے امام مالک رحمہ اللہ کو کوڑے مارے گئے تھے۔[1] اتنی کمزور سند سے صحابہ کرام پر جرح کیسے درست ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

کیا حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کے لیے زبردستی کی تھی؟

﴿سوال﴾ کتب تاریخ میں منقول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے لیے جبر و تشدد سے بھی کام لیا تھا۔ وہ صحابہ سے بات زبردستی منوانے کے لیے شام سے مدینہ آئے تو یزید کی بیعت نہ کرنے والے اکابر صحابہ ڈر کر مدینہ سے مکہ کی طرف نکل گئے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے پیچھے مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے، اکابر صحابہ کے سروں پر ننگی تلواریں مسلط کر کے بیعت لینے کی کوشش کی تھی۔ جب انہوں نے پھر بھی بیعت نہ کی تو باہر جا کر جھوٹ موٹ اعلان کر دیا کہ یہ حضرات بیعت کر چکے ہیں۔ اس بارے میں روایت درج ذیل ہیں:

● سب سے مشہور روایت جویریہ اسماء کی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مکہ کے قریب پہنچے تو راستے میں اپنے سیکورٹی آفیسر سے کہا: کسی کو میرے ساتھ مت چلنے دو، سوائے اس کے کہ جسے میں خود ساتھ لوں۔ یہ کہہ کر خود اکیلے آگے چلے۔ مکہ مکرمہ کے قریب وادیٔ ''اَراک'' کے وسط میں پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ ملے۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں مرحبا کہا، سواری پیش کر کے ساتھ لیا۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر، پھر حضرت عبداللہ بن عمر اور پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے ملے، ہر ایک کو سواری پیش کی اور خوش گوار باتیں کیں۔ انہی کے درمیان مکہ پہنچے۔ وہاں ہر صبح انہیں مدعو کر کے اعزاز و اکرام فرماتے۔ مناسک ادا کرنے تک ان سے یزید کی ولی عہدی پر کوئی بات نہ کی۔ یہ حضرات آپس میں کہنے لگے: بھائیو! اس شخص کی خاطر مدارات سے دھوکہ نہ کھانا، یہ تمہاری محبت یا عزت کی وجہ سے یہ آؤ بھگت نہیں کر رہا بلکہ اپنے اسی مقصد کی خاطر کر رہا ہے، اس کے لیے جواب کی تیاری کر لو۔ ایک دن حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو بیعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور خطبہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ حسن سلوک ہی کرتا رہا ہوں، یزید تمہارا بھائی ہے، وہ بھی تمہارے بارے میں اچھی سوچ رکھتا ہے۔ تم ہی اس کا نام خلافت کے لیے پیش کر دو۔ پھر حکومت کے سارے امور آمدن خرچ، امراء کا تقرر اور برخواستگی سب تمہارے ہاتھ میں رہے گا۔

یہ سب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو متکلم بنا کر لائے تھے۔ انہوں نے یہ موقف پیش کیا کہ یا تو آپ رسول اللہ ﷺ کی طرح کسی کو بھی جانشین مقرر کر کے نہ جائیں۔ ہم لوگ خود ہی اپنا خلیفہ چن لیں

---

[1] میزان الاعتدال: ۱/۵٦

گے۔ یا آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح خاندان سے باہر کے آدمی کا نام طے کر دیں یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح چھ افراد کی شوریٰ کو اختیار سونپ جائیں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ان میں سے کسی بات پر آمادہ نہ ہوئے اور جلادوں کو شمشیریں ان کے سر پر لے کر کھڑے ہونے کا حکم دیا کہ اگر یہ میری تردید کریں تو گردنیں اڑا دینا۔ پھر ان کو لے کر مجمع عام میں آئے اور اعلان کیا کہ انہوں نے بیعت کر لی ہے، چنانچہ سب لوگوں نے بیعت کر لی۔ [1]

﴿جواب﴾ یہ روایت اگرچہ بہت مشہور ہے اور تقریباً ہر مؤرخ نے اسے یقینی سمجھ کر اپنی تاریخ کا حصہ بنایا ہے مگر تحقیق کی جائے تو یہ سند کے لحاظ سے بہت ہی کمزور ہے کہ جویریہ اسے ''اشیاخ اہل المدینہ'' سے نقل کرتے ہیں یعنی اصل راوی بعض مجہول لوگ ہیں، ان کی ثقاہت کیسی تھی اور حافظہ کیسا؟ کچھ معلوم نہیں تو روایت کو یقینی کیسے مانا جائے۔

پھر اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو خود اصل واقعے میں بعض جعلی اضافوں کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ مثلاً:

1 اگر یہ حضرات خوف زدہ اور مرعوب ہو کر نکلے تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ لاؤ لشکر کے ساتھ ان کے پیچھے تھے تو ان حضرات نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے قریب تر آ جانے پر راستہ بدلنے یا چھپنے کی کوشش کیوں نہ کی۔

2 حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو کیسے پتا چلا کہ یہ حضرات یقینی طور پر راستے میں اتنی دیر بعد ملیں گے۔

اس لیے یہ روایت قابل استدلال نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ طبری کی روایت ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے آ کر پہلے حضرت حسین، پھر ابن زبیر، پھر ابن عمر اور پھر عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم کو الگ الگ بلوایا، ہر ایک کو کہا کہ تمہارے ساتھی تو بیعت کے لیے تیار ہیں، تم انہیں تیار نہیں ہونے دیتے۔ ہر ایک نے یہ جواب دیا کہ میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں، دوسرے تیار ہو جائیں تو میں بھی تیار ہوں۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ہر ایک کو یہ تاکید کر کے رخصت کرتے رہے کہ ان باتوں کا دوسروں سے ذکر نہ کرنا۔ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے بڑی سخت گفتگو ہوئی۔ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں قتل کی دھمکی دی اور انہوں نے ان کو دوزخ کی وعید سنائی۔ [2] اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے جبراً بیعت لی تھی۔

﴿جواب﴾ یہ روایت بھی بالکل ضعیف ہے۔ اسے ابن عون ''حدثنی رجل بنخلة'' کہہ کر نقل کرتے ہیں، یہ ''رجل'' کون ہے؟ ثقہ ہے یا کذاب، عادل ہے یا بد دیانت،، کچھ پتا نہیں، اس لیے اسے قبول کرنا درست نہیں۔

غرض دھونس اور دھاندلی کے ذریعے بیعتِ ولی عہدی لینے کی روایات سند کے لحاظ سے بالکل ضعیف اور ناقابل استدلال ہیں۔ ان روایات میں نہ صرف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر جھوٹ اور مکاری کی تہمت ہے بلکہ خود ان اکابرِ مدینہ پر بھی الزام ہے کہ وہ سر پر تلواریں دیکھ کر جان کے خوف سے چپ رہے اور امتِ محمدیہ کو دھوکے میں پڑنے دیا۔

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۶، ۲۱۷　② تاریخ الطبری: ۳۰۴/۵

صحیح روایات میں واقعہ اس طرح ہے کہ ان حضرات نے اپنا اختلافی موقف پیش کر دیا تھا، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی جبر نہیں کیا۔ ایک صحیح روایت کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مکہ پہنچ کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی رہائش گاہ پر بلوایا اور فرمایا: ''ابن عمر! آپ کہیں کچھ ایسا نہ کر بیٹھیں کہ مسلمانوں میں انتشار اور فتنہ و فساد پیدا ہو جائے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ''گزشتہ خلفاء نے اپنے بیٹوں کے لیے وہ نہ سوچا تھا جو آپ اپنے بیٹے کے لیے سوچ چکے ہیں۔ باقی جب لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے تو میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے اور فرمایا: ''اللہ آپ پر رحم فرمائے۔''[1]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ ایک ہی وقت میں دو، دو افراد کی بیعت کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ ہی نے تو حدیث نبوی سنائی تھی جب زمین میں دو شخص خلیفہ بنیں تو دوسرے کو قتل کر دو۔''[2]

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ان کا اصل اعتراض یزید کی ذات پر نہیں، نظام پر ہے۔ انہوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ لوگوں کے سامنے ان حضرات کے موقف کو عدمِ اعتراض اور اطاعت کی صورت میں بیان کر دیا جائے، اس لیے آپ نے مجمع عام میں فرمایا: ''لوگوں کی باتیں افواہیں ہوتی ہیں۔ مجھے ان حضرات کے بارے میں جو باتیں پہنچی تھیں میں نے ان کو جھوٹا پایا ہے، انہوں نے سنا، اطاعت کی۔ یہ اس صلح میں داخل ہیں جس میں امت داخل ہوئی۔''[3]

اس اعلان کو جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر لوگوں نے ان کے متعلق شورش پسندی کی افواہ اُڑا رکھی تھی تو وہ جھوٹ ہی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ یہ لوگ خلافت کے مطیع تھے۔ یہ بھی سچ تھا کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دور سے اس صلح میں داخل تھے جس میں ساری اُمت داخل تھی۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ''توریہ'' اور ''کنایہ'' سے کام لیا، اور ذو معنیٰ بات کی، جس سے لوگوں نے اپنے اپنے حساب سے مطلب اخذ کر لیا۔ کسی مصلحت اور ضرورت کے لیے شرعاً ایسے کلام کی گنجائش ہے اور یہاں مصلحت تھی مسلمانوں کو افتراق سے بچانا۔



کیا عبدالرحمٰن ابن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو دھمکایا گیا تھا؟

﴿س﴾ یزید کی ولی عہدی میں صحابہ کرام پر دباؤ ڈالنے اور ناجائز ذرائع استعمال کرنا اس طرح بھی ثابت ہے کہ خلیفہ بن خیاط کی روایت کے مطابق بیعت نہ کرنے پر عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے تلخ کلامی ہوئی، حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دھمکایا بھی اور یہ بھی کہا: ''اہل شام سے بچ کر رہنا کہ کہیں قتل نہ کر دیے جاؤ۔''

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۳، ۲۱۴، سند: وھب بن جریر عن جریر بن حازم، عن نعمان بن راشد، عن الزھری عن ذکوان تمام راوی بخاری و مسلم کے ہیں۔

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۳؛ مجمع الزوائد، ح: ۹۰۱۱؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹/۳۱۴، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

③ فلم معاویۃ حین ابوا علیہ فقال الا ان حدیث الناس ذات غور وقد کان بلغنی عن ھؤلاء الرھط احادیث وجدتھا کلھا زورا وقد سمعوا و اطاعوا ودخلوا فی الصلح ما دخلت فیہ الامۃ. (حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۰، ۳۳۱، وھذا اصح مافی الباب سندًا ومعنًی ط السعادۃ)

اسی روایت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات میں ان حضرات کی یزید کی بیعت کرنے کا کوئی ذکر نہیں مگر آگے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اعلان میں ہے: "سمعوا، واطاعوا، وبایعوا."[1]
یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جھوٹ موٹ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ بیعت کر چکے ہیں۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

﴿جواب﴾ واقعے کی صحیح شکل وہی ہے جو ہم نے "حلیۃ الاولیاء" کے حوالے سے اوپر نقل کی ہے اور وہ روایت اصح مافی الباب ہے۔ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے اس کی سند میں نعمان بن راشد صدوق مگر حافظے کے کمزور ہیں۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے تعلیقاً روایت لی ہے مگر ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے:

"صدوق فی حدیثه وهم کثیر." (سچے ہیں مگر ان کی روایت میں بکثرت وہم ہے۔)

امام احمد رحمہ اللہ کے بقول وہ مضطرب الحدیث (روایت میں گڑبڑ کرنے والے) اور منکر روایات کے راوی ہیں۔ ابن معین، نسائی اور ابوداؤد بھی انہیں ضعیف کہتے ہیں۔[3] ممکن ہے کہ ان سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ کچھ سے کچھ نقل ہو گئے ہوں۔ پس اس روایت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف استدلال درست نہیں۔

☆☆☆

کیا یزید کے غلط کاموں کی ذمہ داری حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ہے؟

بلاشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے جانشین یزید کے دور میں حادثۂ کربلا، سانحہ حرہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ معظمہ پر فوج کشی کے دردناک واقعات رونما ہوئے اور یہ حقیقت ہے کہ ان حالات سے نبرد آزما ہونے میں یزید سے بعض غلط فیصلے صادر ہوئے۔ مگر یہ سب حالات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیش آئے۔ جب انہوں نے یزید کا تقرر کیا تھا تو اپنے دور کے سیاسی منظرنامے کو سامنے رکھ کر اور آئندہ کے حالات کا اندازہ کر کے یہ اقدام اُٹھایا تھا۔ یہ سن ۵۶ ہجری کی بات ہے، اس کے پانچ برس بعد جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تب یہ سانحے پیش آئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ ان کے بعد ایسے حادثات رونما ہوں گے یا یزید کچھ خلافِ حکمت فیصلے کر گزرے گا یا زیادتیوں کا مرتکب ہوگا۔

انہوں نے اپنے طور پر نیک نیتی اور اُمت کی خیرخواہی کے تحت یزید کی جانشینی کا فیصلہ کیا تھا، اگر نتائج ان کی امید کے برخلاف نکلے تو ہم ان کی نیت پر حملہ نہیں کر سکتے۔ خود ہمارے ساتھ ایسا بارہا ہوتا ہے کہ ہم زندگی کا کوئی اہم فیصلہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور پورے نیک جذبے سے کرتے ہیں مگر بعد میں نتائج برعکس نکلتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ نامناسب تھا۔ اب یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ اس تجربے سے سبق حاصل کر کے آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے مگر کوئی ہمیں اس فیصلے کی بنا پر خائن، بدنیت، بدکردار یا احمق مشہور کر دے تو ہمارے احساسات کیا ہوں گے۔

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۳

[2] تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۷۱۵۴ [3] میزان الاعتدال: ۲۵۶/۴

اس قسم کے فیصلے تو دیگر اکابر صحابہ سے بھی ہوئے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف بھیجے جانے والے ابتدائی لشکر کا امیر حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو بنایا تھا۔ وہ حکمتِ عملی کے برخلاف رومیوں کے علاقے میں زیادہ آگے بڑھ گئے اور حریف کے نرغے میں آ کر بری طرح شکست سے دوچار ہوئے۔ بمشکل چند افراد کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ سکے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں ہٹا کر حضرت ابوعبیدہ، حضرت مُعاویہ اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم کو اس مہم پر تعینات کیا جو فتح یاب ہوتے چلے گئے۔[1]

اب اگر کوئی کہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر مسلمانوں کے لیے ہلاکت کا انتظام کیا تھا تو کیا اسے ایک درست تبصرہ کہا جائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ کو ایران کی ابتدائی مہم کا امیر مقرر کیا تھا جو ایک تابعی تھے۔ بڑے بڑے صحابہ کرام ان کے ماتحت ہو کر محاذ پر گئے۔ حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے جو حکمتِ عملی اختیار کی وہ مسلمانوں کی شکستِ فاش کا باعث بن گئی۔[2]

مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غلط آدمی کا تقرر کیا تھا، یا انہیں افراد کی پہچان نہ تھی، یا اس شکست کی ذمہ داری اصل میں ان پر ہے!!

غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔ انسان کے بس میں بہترین تدبیر اور کوشش ہے، جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ تک سب نے اپنے وقت کے لحاظ سے جس موقع پر جو مناسب سمجھی، اختیار کی۔

☆☆☆

① تاریخ الطبری: ۳۸۸/۳

② تاریخ الطبری: ۴۴۶/۳

حضرت حسین رضی اللہ عنہ، یزید بن مُعاویہ اور واقعۂ کربلا

﴿سوال﴾ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تحریک کو بغاوت یا خروج کہا جاسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ اوّل تو جمہور علمائے اسلام میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ علامہ ابن العربی جیسی ایک آدھ ہستی نے ایسا کہا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک شاذ قول ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حالات کو دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو بھی وہی بات ثابت ہوگی جس کے جمہور علماء قائل ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تحریک میں کشت وخوں سے حتی الامکان احتراز اور بقائے امن کا پہلو غالب تھا۔ قرائن شاہد ہیں کہ وہ ایک ایسے محتاط منصوبے پر عمل پیرا تھے جس میں خروج یا بغاوت کے اطلاق سے بھی بڑی حد تک تحفظ تھا جو افتراق اور خانہ جنگی کا سبب بنا کرتا ہے۔

اس بارے میں درج ذیل قرائن پر غور کرنا ضروری ہے:

① حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہیں بھی پہل کرتے ہوئے لوگوں کو ہتھیار اٹھانے کی ترغیب نہیں دی۔ اگر وہ محض اقتدار کے بھوکے ہوتے اور بہر صورت لڑائی پر تلے ہوتے تو سب سے پہلے اہلِ حجاز کو اس کے لیے دعوت دیتے، اکابر صحابہ کو ہمنوا بناتے، بنو ہاشم کو قائل کرتے، مدینہ اور مکہ میں حکومت کے خلاف فضا ہموار کرتے اور اپنے گرد زیادہ سے زیادہ مجمع اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے۔ ظاہر ہے لڑائی کے لیے یہ کوششیں ناگزیر تھیں۔

مگر کسی ایک روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تیاری کی ہو، اس کے لیے خواص کے سامنے کوئی دلائل پیش کیے ہوں یا عوام کو آمادہ کرنے کے لیے کہیں کوئی تقریر کی ہو۔

اگر آپ ایسا کرتے تو مدینہ یا مکہ ہی سے آپ کو اتنے لوگ مل جاتے کہ حجاز پر باقاعدہ آپ کی حکومت قائم ہو جاتی؛ کیوں کہ اس وقت تک یہاں بنو امیہ کا بس نہیں چل رہا تھا مگر آپ نے حرمین شریفین کے تقدس کو سیاسی مفاد پر ترجیح دی اور یہاں قیام کے پورے دورانیے میں سکوت اختیار کیے رکھا۔

② اگر مان لیا جائے کہ آپ جنگ وجدل کے ذریعے ہی حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس کام کی ابتداء عراق سے ہی کرنا چاہتے تھے تو وہاں جانے سے پہلے اہلِ کوفہ کو شہر پر قبضہ کرنے اور اموی افسران کو بھگا دینے کا حکم

جاری کر دینا کیا مشکل تھا۔ اس کے لیے آپ کا پہلے سے کوفہ میں ہونا ضروری نہیں تھا۔ آپ کا کام تو حکم دینا تھا جو باہر رہ کر زیادہ محفوظ انداز سے ہو سکتا تھا۔ اور بالفرض اگر آپ اپنی موجودگی ہی میں تختہ الٹوانا چاہتے تھے تو ایک مضبوط جتھہ لے کر مکہ سے نکلتے جو وقت پڑنے پر آپ کی حفاظت کرتا اور اہلِ کوفہ کو بغاوت میں مدد دیتا۔

③ آخری درجے کی تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ ایک دو افراد کے ساتھ خفیہ طور پر کوفہ میں داخل ہوتے اور روپوش ہو کر جنگ کی قیادت کرتے۔ مگر آپ نے ایسا بھی نہیں کیا۔ پورے خاندان کو لے کر اس طرح نکلے کہ خفیہ سفر اور کہیں روپوشی کا امکان ہی نہ تھا۔ جو شخص ایک قائم شدہ سلطنت کی بنیادیں ڈھانے کے لیے جنگ برپا کرنا چاہتا ہو، وہ ایسی تدبیر ہرگز نہیں کر سکتا۔ یہ قرائن آپ رضی اللہ عنہ کے "جنگ و جدل" پر تلے ہونے کی نفی کر رہے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ تجزیہ مزید پختہ ہو جاتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کسی بنی ہوئی حکومت کو گرانے وہاں نہیں جا رہے تھے۔

غالباً خواتین اور بچوں کو ساتھ لے جانے میں یہ حکمت بھی ملحوظ ہوگی کہ اگر راستے میں حالات کا پانسہ پلٹ جائے اور عراق میں بنوامیہ کی حکومت غیر متوقع طور پر مستحکم ہو جائے تو ایسے میں بھی مذاکرات کا دروازہ کھلا رہے اور مخالفین اگر آپ کو کسی باغی فوج کا سربراہ گمان کرتے ہوں تو قافلے کی حالت ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہو۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ خروج یا بغاوت کا اطلاق تب ہوتا ہے جب:

❶ کوئی گروہ ایک قائم شدہ حکومت کی اطاعت سے برگشتہ ہو جائے۔ ❷ کسی علاقے پر قابض ہو جائے۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہ تو کسی قائم شدہ حکومت کے خلاف کھڑے ہوئے تھے، نہ ہی آخر تک کسی علاقے پر قابض ہوئے تھے۔ بلکہ آخر تک آپ کے گرد مٹھی بھر افراد تھے۔ کوفہ پر بھی کسی وقت آپ کے حامی قابض نہیں ہوئے۔

اس لیے خروج کا اطلاق بھلا کیسے ہو سکتا ہے!! زیادہ سے زیادہ اسے ارادۂ خروج کہا جا سکتا ہے۔

اور بالفرض اگر خروج ثابت ہو بھی جائے تب بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں عائد ہوتا، اس لیے کہ وہ مجتہد تھے اور یہ اقدام خطائے اجتہادی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خروج قابلِ الزام نہیں بلکہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر کیسے الزام تراشی جائز ہو سکتی ہے۔

اور اس میں بھی آخر الامر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے مفاہمت کی پیش کش ثابت ہے۔ جس کے بعد ان پر خروج کا اطلاق کرنے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں رہتی بلکہ ظلم و زیادتی کا سارا وبال ان پر آپڑتا ہے جنھوں نے مفاہمت کی پیش کش مسترد کر کے جگر گوشۂ بتول کو مشقِ ستم بنایا۔

---

① بعض حضرات اس میں امام عادل کی بھی شرط لگاتے ہیں، علامہ عینی رحمہ اللہ نے تعریف یوں کی ہے: أهل البغي هم الخارجون على إمام الحق بغير الحق۔ "باغی وہ لوگ ہیں جو شرعی حکمران کے خلاف ناحق اٹھ کھڑے ہوں۔" (البناية شرح الهداية لبدر الدين العيني: ۲۹۸/۷، العلمیہ) یعنی اگر امام عادل نہ ہو تو اس کے خلاف خروج کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا اور اہل سنت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو یزید کو امام عادل کہتا ہو جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
ومن آمن بالله واليوم الآخر لا يختار ان يكون مع يزيد ولا مع امثاله من الملوك الذين ليسوا بعادلين.
"جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ بھی یزید اور اس جیسے غیر عادل حکمرانوں کے ساتھ ہونا پسند نہ کرے گا۔" (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۴۸۴/۴)




شروع میں یزید کی بیعت سے احتراز اور آخر میں مفاہمت پر آمادگی کی وجہ؟

﴿سوال﴾ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا آخر میں یزید سے مفاہمت پر آمادہ ہو جانا ثابت ہے تو اس کی کیا وجہ تھی؟ اگر بیعت جائز تھی تو پہلے کیوں آمادہ نہ ہوئے؟ اگر نا جائز تھی تو بعد میں آمادہ کیوں ہو گئے؟ کیا یہ بزدلی نہیں تھی؟

﴿جواب﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہر اقدام کی پختہ وجوہ تھیں۔ ابتداءً ان کے نزدیک یزید کی حکومت کا قیام ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ایک بہتر اور متفقہ حکومت بنانے کی جدوجہد کرنا خروج کی وعید میں داخل نہ تھا بلکہ یہی عزیمت کی بات تھی۔ لہٰذا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عراق میں ایک مثالی حکومت کے قیام کی کوشش کرنا چاہتے تھے اسی لیے یزید کی بیعت نہیں کی۔ مگر جب عراق پہنچ کر حالات کو بدلا ہوا پایا اور یزید کی حکومت کے قیام واستحکام کا یقین ہو گیا تو خروج کی وعید سے بچنا ہی بہتر سمجھا۔

نیز حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک موقف رکھتے تھے جس کا حاصل اسلامی سیاست کو شورائیت کی طرز پر لوٹانا اور ملت کو موروثی نظام سے بچانا تھا۔ عراق جانے کا یہی مقصد تھا۔ اگر شروع میں یزید کی بیعت کر لی جاتی تو اس مہم کا جواز ہی ختم ہو جاتا۔ جب عراق پہنچ کر آپ نے دیکھا کہ عوام کو ساتھ لے کر سیاسی نظام کی اصلاح کا منصوبہ روبہ عمل لانے کا وقت ہاتھ سے نکل گیا ہے تو آپ نے اصل ہدف اور مقصد کے حصول کے لیے متبادل حکمتِ عملی اختیار کر لی، یعنی یزید سے براہِ راست بات چیت کر کے اسے اصلاحات پر راضی کرنا اور اصلاحات نافذ کرنے کی شرائط پر بیعت کرنا۔ یہ بزدلی نہیں، حکمتِ عملی کی تبدیلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے عبیداللہ بن زیاد کے ہاتھ پر غیر مشروط بیعت کی پیش کش قبول نہ کی اور اس کی بجائے موت کو ترجیح دی؛ کیوں کہ ایسا کرنے سے مقصد بالکل ضایع ہو جاتا۔

اگر آپ دبنے یا جھکنے والے ہوتے تو مٹھی بھر افراد کے ساتھ عبیداللہ بن زیاد کی چار ہزار فوج کے آگے ڈٹنے کی بجائے ہتھیار ڈال دیتے۔ مگر آپ نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کی روح کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان دے دی۔

☆☆☆

ساٹھ کوفیوں کا افسانہ اور واقعہ کربلا کا انکار:

﴿سوال﴾ دورِ حاضر کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ کربلا میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ مکہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ساٹھ کوفی چلے تھے۔ کوفہ کے قریب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حالات مخالف دیکھ کر واپسی کا ارادہ کیا تو انہی کوفیوں نے اصرار کر کے آپ کا ارادہ بدلا۔ پھر آپ نے دمشق کا رُخ کیا تو یہی کوفی تھے جنھوں نے اپنا بھانڈا پھوٹ جانے کے ڈر سے آپ کو کربلا میں اچانک حملہ کر کے شہید کیا۔ عبیداللہ بن زیاد کی بھیجی گئی سرکاری فوج آپ کی حفاظت کے لیے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ ان لوگوں کے پہنچتے پہنچتے آپ شہید کر دیے گئے۔ عمر بن سعد وغیرہ کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ باتیں کس حد تک درست ہیں؟

﴿جواب﴾ واقعۂ کربلا کی یہ نئی شکل محض قیاسِ خام اور اوہام پر مبنی ہے؛ کیوں کہ:

① حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کا اختلاف اور عمر بن سعد کی کمان میں جانے والی سرکاری فوج کے ہاتھوں آپ کی شہادت صحیح روایات سے ثابت ہے۔ ان کا انکار وہی کر سکتا ہے جو اپنے اوہام کا غلام ہو اور کسی اصول کا قائل نہ ہو۔

② مکہ سے ساٹھ کوفیوں کے ساتھ چلنے کی روایت جسے بہت زور و شور سے بیان کیا جاتا ہے، نہایت ضعیف بلکہ بے سند ہے۔ سات صدیوں تک کسی مؤرخ نے ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی۔ سات صدیوں بعد فقط حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسے بلا سند نقل کیا ہے۔ یہ عبارت ''البدایہ والنہایہ'' (تحت ۶۰ھ، صفة مخرج الحسین) میں منقول ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسے یوں ذکر کیا ہے:

فخرج متوجها الی العراق فی اهل بیته و ستین شیخا من اهل الکوفة. ①

نسخوں میں الفاظ کا فرق ہے۔ ایک دوسرے نسخے کی عبارت یہ ہے:

فخرج متوجها الیهم فی اهلِ بیته وستین شخصا من اهل الکوفة صحبته. ②

اوّل تو یہ روایت بے سند ہے۔ نیز اگر اس روایت کو مان لیں تو بھی یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی واپسی میں رکاوٹ یہی لوگ تھے۔ مدعی اپنے موقف کی دلیل میں ابو مخنف کی روایت کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں:

فقال له بعض اصحابه انک والله ما انت مثل مسلم بن عقیل ولو قدمت الکوفة لکان الناس اسرع الیک. ③

مگر اس عبارت میں کوئی اشارہ تک نہیں کہ یہ مشورہ دینے والے کوفی رفقاء تھے۔ اس کے برعکس معتبر روایات میں وضاحت ہے کہ یہ اصرار آپ کے چچا زاد بھائیوں نے کیا تھا۔ عمار الدہنی کی بسندِ حسن روایت میں ہے:

''جب آپ رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو مسلم بن عقیل کے بھائیوں نے جو آپ کے ہمراہ تھے، جوش میں آ کر کہا: ''اللہ کی قسم! ہم جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہیں لیں گے واپس نہیں جائیں گے، چاہے خود سب قتل ہو جائیں۔'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارے بغیر جینے کا کیا لطف۔'' ④

ساداتِ کرام کے قتل کی ذمہ داری ان ساٹھ کوفیوں پر ڈال کر سرکاری فوج، عبید اللہ بن زیاد اور عمر بن سعد کو بالکل بے قصور بلکہ ساداتِ کرام کا محافظ شمار کرنا، ایک قیاسِ فاسد اور وہم کے سوا کچھ نہیں۔ کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی اس دعوے کو ثابت نہیں کرتی۔ جبکہ حُصین بن عبدالرحمٰن کی صحیح السند اور عمار دُہنی کی حسن روایتیں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ایک بے سند روایت میں تخیل کو ٹھونس کر پوری کہانی گھڑ لینا اور صحیح روایات کا انکار کر دینا تعصب کی انتہاء ہے۔

---

① البدایة والنهایة: ۵۰۷/۱۱۔ یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل بیت اور کوفہ کے ساٹھ شیوخ سمیت عراق کی طرف روانہ ہوئے۔

② البدایة والنهایة: ۱۷۸/۸ مطبوعہ موقع یعسوب
یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کا رخ کر کے اپنے گھر والوں اور کوفہ کے ساٹھ شیوخ سمیت نکلے جو آپ کے ساتھ ہو گئے تھے۔

③ تاریخ طبری: ۳۹۸/۵ (ان کے بعض ساتھیوں نے کہا: واللہ! آپ مسلم بن عقیل کی طرح نہیں۔ آپ کوفہ پہنچ گئے تو لوگ تیزی سے آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے۔)

④ تاریخ طبری: ۳۸۹/۵ عن عمّار

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شروع میں مذاکرات پر آمادگی کیوں نہ ظاہر کی؟

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید سے بات چیت پر بالکل آخر میں کیوں آمادہ ہوئے؟ شروع میں ہی دمشق جا کر اصلاحات کے مطالبات کیوں نہ پیش کر دیے، آخر اس میں کیا رکاوٹ تھی؟

﴿جواب﴾ رکاوٹ یہ تھی کہ حکمران اپنے طور پر نظام میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کا طرزِ حکومت بالکل ٹھیک تھا۔ ایسی حکومت پر جب تک کوئی دباؤ نہ پڑے، وہ اصلاحات پر آمادہ نہیں ہوتی۔ صورتحال کا یہ پہلو بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ حکومت حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بداعتماد تھی۔ اس کا پہلا اور آخری مطالبہ یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ غیر مشروط بیعت کرلیں۔ پس اگر ان حالات میں امرائے بنوامیہ کے سامنے نظام میں تبدیلی کی زبانی کلامی عرض ومعروض کی جاتی تو اس کا کوئی وزن نہ ہوتا۔ اس کی جگہ اگر اپنے حامیوں کے ایک بڑے جتھے کے ساتھ مطالباتِ اصلاحات رکھے جاتے تو اس کا ٹھیک ٹھاک دباؤ پڑتا۔ حامیوں کے اجتماع کے لیے عراق میں ماحول زیادہ سازگار دکھائی دے رہا تھا۔ اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پہلے وہیں گئے۔ مگر وہاں پہنچ کر جب یہ دیکھا کہ اہلِ عراق حکومت سے دب گئے ہیں تو آپ آخری صورت کے طور پر یزید سے بات چیت کر کے مشروط بیعت کے لیے تیار ہو گئے۔

☆☆☆

کیا جتھہ بندی کر کے حکومت پر دباؤ ڈالنا جائز ہے؟

﴿سوال﴾ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جتھہ بندی کر کے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے تو یہ کونسا جائز تھا؟ شریعت میں اس کی اجازت کہاں ہے؟ شریعت تو ہر حال میں حکام کی اطاعت کا حکم دیتی ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو چاہیے تھا کہ آنکھیں بند کر کے یزید کی اطاعت کرتے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خلافِ شرع کوشش کے مرتکب ہوئے تو یزید یا اس کے حکام پر لازم تھا کہ انہیں خلافِ شرع کوشش سے روکتے۔ پس اس روک ٹوک کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہی درست تھا۔

﴿جواب﴾ یقیناً اسلام ہمیں حکام کی اطاعت کا حکم دیتا ہے مگر یہ اطاعت مطلق نہیں، بلکہ مقید ہے۔ مسلمان جائز کاموں میں حکام کی اطاعت کا پابند ہے، ناجائز کاموں میں نہیں۔ اگر حکام غلطیاں کریں تو اسلام حکم دیتا ہے کہ ان کی غلطی کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور کلمۂ حق بلند کیا جائے۔ کلمۂ حق بلند کرنے میں اگر فردِ واحد کی آواز مؤثر نہ ہو تو حکمت وتدبیر اور اجتہاد کے ذریعے مختلف اجتماعی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں جیسا کہ دورِ حاضر میں علمائے حق حکومت کے غلط اقدامات کے خلاف عوام کو جمع بھی کرتے ہیں، جلسے جلوس اور ریلیاں بھی نکالتے ہیں۔ یہ سب چیزیں شرعی جواز کے دائرے کے اندر ہیں اور مقصد کی درجہ بدرجہ بلندی کے اعتبار سے ایسی کوششیں مستحسن بلکہ بعض اوقات واجب بھی ہو جاتی ہیں۔

حکام کے لیے بھی اسوۂ خلفائے راشدین یہی ہے کہ حزبِ اختلاف کو (جب تک کہ اس کی کوشش مسلح بغاوت کی شکل اختیار نہ کر جائے) برداشت کیا جائے۔ اس کے مطالبات پر توجہ دی جائے۔ اگر مطالبات کو ماننا شرعاً واجب نہ ہو بلکہ مباح ہی کے درجے میں ہو، تب بھی لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ان پر توجہ دینی چاہیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ انہوں نے حزبِ مخالف کے وجود کو حتی الامکان گوارا کیا اور خونریزی سے دامن بچایا۔ مخالفین کے جو مطالبات قبول کرنا شرعاً جائز تھا، انہیں بلاتوقف مان لیا۔ ان کے کہنے پر اپنے گورنر تک تبدیل کر دیے۔ اگر وہ لوگ کوئی ایسا مطالبہ کرتے جو شرعاً مطلوب ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ردِ عمل کہیں زیادہ فراخ دلانہ ہوتا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یقیناً جتھہ بندی کی کوشش کی تھی مگر کسی مذموم مقصد کے لیے نہیں بلکہ ایسے اہم ہدف کے لیے جس کے بغیر اسلامی سیاست کا رُخ غلط سمت میں پھر جاتا۔ ایسے میں تو حکام کو زیادہ تحمل اور وسعتِ ظرفی سے ان کی بات سننی اور ماننی چاہیے تھی مگر تعصب اور تکبر نے انہیں اس توفیق سے محروم رکھا اور حضرت حسین کے موقف پر توجہ دیے بغیر انہوں نے شرعی حدود سے کھلم کھلا تجاوز کر کے انہیں شہید کیا۔ پس الزام اموی حکام پر ہی عائد ہوتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا دامن الحمد للہ کسی بھی خلافِ شرع امر کے ارتکاب سے پاک ہے۔

☆☆☆

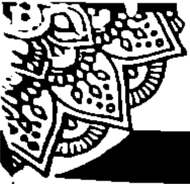
کیا کربلا میں جنگ کی ابتداء حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوئی؟

﴿سوال﴾ محمود احمد عباسی نے "خلافتِ معاویہ ویزید" میں واقعۂ کربلا کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ لڑائی کی ابتداء آلِ حسین کے افراد نے کی تھی اور کوفی فوج صرف اسلحہ اتروانے کے لیے گھیرا ڈالے کھڑی تھی۔ کیا یہ صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ محمود عباسی نے اسلامی تاریخ سے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ایک مستشرق کا بے سند تبصرہ نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس حُصَین بن عبدالرحمٰن کی صحیح السند اور عمار دُہنی کی حسن روایتوں سے ثابت ہے کہ ابتداء کوفہ کی سرکاری فوج نے کی تھی۔ عباسی صاحب اور ان کے پیروکاروں کی کہانیاں جو چودہ صدیوں بعد لکھی گئی، محض وہم کی پیداوار ہیں۔

اگر ایسی کہانیوں کو مان لیا جائے تو کل کلاں کوئی شخص تمام پختہ و ناپختہ روایات کو مسترد کر کے واقعۂ کربلا کا سرے سے انکار کرتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ "خیر القرون میں ایسا سانحہ ممکن ہی نہ تھا بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو زہر کھا کر انتقال کر گئے تھے، جن عناصر نے ان کے بھائی کو زہر دیا تھا، وہی ان کی موت کا سبب بنے۔"[1]

① میں نے یہ بات بالفرض کے طور پر لکھی تھی مگر چند دن پہلے موصول ہونے والے ایک کتابچے کو دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس میں محقق صاحب نے واقعۂ کربلا کا سرے سے انکار کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت پہلے جہادِ قسطنطنیہ میں یزید کی قیادت میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے اور ایوب میں دفن ہوئے تھے۔ جہالت اور تعصب انسان کو کہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جہادِ قسطنطنیہ میں شرکت کرنا بھی کسی پختہ سند سے ثابت نہیں۔ البدایہ والنہایہ کا ایک حوالہ ہے جس کی سند ناپید ہے۔ ایسی بے سند باتوں پر قیاس کے قلعے تعمیر کرنا اور اسے تحقیق قرار دینا آج کل عام ہے۔



یزید کے ہاتھوں سر مبارک کی بے حرمتی ثابت ہے یا نہیں؟

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کی یزید کے ہاتھوں بے حرمتی بہت مشہور ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ اس بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔ کل پانچ روایات ہیں، ہر ایک کا حال ملاحظہ ہو:

① معجم کبیر طبرانی میں لیث بن سعد سے مروی ہے کہ سر مبارک یزید کے سامنے آیا تو اس نے شعر پڑھے:

نُفَلِّقُ هَاماً مِنْ رِجَالٍ اَعِزَّةٍ   عَلَيْنَا وَكَانُوْا اَعَقَّ وَاَظْلَمَا

(ہم ان لوگوں کی کھوپڑیاں پھاڑ دیتے ہیں جو ہم سے سختی برتیں اور وہ نافرمان اور ظالم ہوں۔)

اور چھڑی سے دہن مبارک کو کریدا۔ یزید کے ساتھ ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے انہوں نے اس پر احتجاج کیا۔[1]

''مجمع الزوائد'' میں اس روایت کے رجال کو ثقات کہا گیا ہے،[2] مگر اس کے راوی امام لیث بن سعد رحمہ اللہ ۹۴ھ میں پیدا ہوئے تھے[3] وہ حادثے کے چشم دید گواہ نہیں ہو سکتے۔ اس طرح روایت میں انقطاع ہے۔

② دوسری روایت بھی معجم کبیر طبرانی میں ہے جو دو طرق سے مروی ہے۔ پہلے میں ایک راوی مجہول الحال ہے۔ دوسری سند انتہائی ضعیف ہے۔

③ تیسری روایت امام ابن ابی الدنیا کی ہے جسے حافظ ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے، اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ ایک راوی سالم بن ابی حفصہ ضعیف ہے۔ امام نسائی اسے غیر ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں وہ واقعات میں الٹ پھیر کرتا تھا اور روایات میں اسے وہم ہوتا تھا۔[4] پھر وہ تشیع میں سخت متعصب تھا۔[5]

④ چوتھی ابو مخنف سے مروی ہے کہ سر حسین کو دیکھ کر یزید نے مذکورہ فخریہ اشعار (نُفَلِّقُ هَاماً) پڑھے، ابو مخنف سے یہ بھی منقول ہے کہ یزید نے سر مبارک دیکھ کر دہنِ مبارک کو چھڑی سے کریدا جس پر ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے نکیر کی۔[6] اس روایت کا ضعف ظاہر ہے کیوں کہ ابو مخنف کذاب مشہور ہے۔

⑤ پانچویں روایت بھی ابو مخنف کی ہے جو لیث بن سعد کی روایت کے مطابق ہے۔[7] ضعف ظاہر ہے۔

---

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۴/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ ② المجروحین لابن حبان: ۳۴۳/۱، ط دار الوعی

③ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۴۸ ④ سیر اعلام النبلاء: ۱۳۷/۸

⑤ ابن سعد کہتے ہیں: کان یتشیع تشیعا شدیداً. جریر بتاتے ہیں کہ ان صاحب کی بنی امیہ سے نفرت کا یہ حال تھا کہ طواف میں تلبیہ یوں پڑھا کرتے تھے: لبیک مھلک بنی امیۃ لبیک ''اے بنو امیہ کو ہلاک کرنے والے! میں حاضر ہوں۔'' (طبقات ابن سعد: ۳۳۶/۶ ط صادر)
اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں بنو امیہ کی مخالفت کے جذبات کس قدر شدید تھے۔ راقم کا تاثر یہ ہے کہ اسی ماحول کے باعث بعض راویوں نے بنو امیہ کے متعلق خبروں میں جعل سازی یا مبالغہ آمیزی کی اور بعض نے سیاق و سباق کو بدنما پیرایہ دے دیا مگر سارے راوی ایسے نہ تھے۔ خصوصاً جن حضرات کو اُمت میں اسلاف کے علوم و فنون اور حالات کا امین سمجھا گیا ہے، ان میں عموی طور پر دیانت غالب تھی، اس لیے انہوں نے واقعات میں ہیر پھیر نہیں کیا بلکہ انہیں جوں کا توں پیش کر دیا اور ان میں سے بعض عبقری شخصیات نے تو راویوں کی کمزوریوں کی نشان دہی بھی کر دی۔ دیکھیے محمد بن سعد نے یہاں سالم بن ابی حفصہ کے تشیع کو کس قدر وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اس لیے اگر محمد بن سعد یا ان کے معاصر مؤرخین کی کتب میں کمزور یا مشکوک روایات ملیں تو انہیں مؤلف حضرات کی خیانت کی بجائے ایسے بعض راویوں کی بے احتیاطی پر محمول کیا جائے گا جو فتنے کے دور سے گزرنے کے باعث اعتدال سے دور ہو گئے تھے۔

⑥ تاریخ الطبری: ۴۶۵/۵، ابو مخنف عن قاسم بن بخیت ⑦ تاریخ الطبری: ۴۶۵/۵



خلاصہ یہ ہے کہ ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں جس سے یزید کا سر مبارک کی بے حرمتی کرنا ثابت ہوتا ہو۔

تاہم اگر فقط ضعیف روایات کے مجموعے سے یہ بات مروی ہوتی اور کوئی صحیح روایت اس کے مخالف نہ ہوتی تو فنِ تاریخ کے لحاظ سے اسے قبول کرنے میں حرج نہ تھا۔ مگر ایک صحیح روایت میں صورتحال اس کے برخلاف منقول ہے:

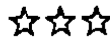
''مُعاویہ بن ابی سفیان کے آزاد کردہ غلام نے بتایا کہ جب حسین رضی اللہ عنہ کا سر لایا گیا تو اسے یزید کے سامنے رکھ دیا گیا تو میں نے اسے روتے دیکھا، وہ کہہ رہا تھا:

''اگر ابن زیاد کا حسین رضی اللہ عنہ سے کوئی رشتہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتا۔''[1]

اس کے علاوہ یزید کا سادات کو دیکھ کر پرنم ہو جانا اور ان سے حسن سلوک کرنا بھی تاریخی روایات سے ثابت ہے۔

پس سادات سے اچھا سلوک کرنے کے ساتھ عقلاً بہت بعید ہے کہ وہ سر مبارک کی بے حرمتی کرتا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن صحابہ مثلاً ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سرِ مبارک کی بے حرمتی پر ٹوکنا ضعیف روایات میں منقول ہے وہ حضرات اس زمانے میں شام میں تھے ہی نہیں۔[2]



---

① تاریخ طبری: ۳۹۳/۵

② منہاج السنۃ: ۵۵۷/۴

یاد رہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''راس الحسین'' میں تفصیلی بحث کر کے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر کربلا سے دمشق جانا ثابت نہیں۔ مگر جہاں تک ہم نے روایات کا جائزہ لیا ہے، راجح یہی لگتا ہے کہ سر مبارک دمشق لے جایا گیا تھا اور یزید کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس نے سر مبارک دیکھ کر اس کی توہین نہیں کی تھی بلکہ آب دیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی دلیل یہی صحیح روایت ہے جو حُصَین بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے۔

امام ابن تیمیہ اس صحیح روایت کے آخری حصے کو صرف اس لیے مسترد کرتے ہیں کہ یہ آخری ٹکڑا جس مولیٰ مُعاویہ سے منقول ہے اس کا نام نہیں لیا گیا، لیکن اگر ان دیگر روایات کو دیکھ لیا جائے جن میں اس مولیٰ مُعاویہ کو متعین کر دیا گیا ہے تو پھر یہ اشکال نہیں رہتا۔ یہ مولیٰ مُعاویہ قاسم بن عبدالرحمٰن دمشقی ہیں۔ اصحابِ جرح و تعدیل کے نزدیک یہ صدوق مانے جاتے ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''الامام محدث دِمَشق.''

نیز ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے چالیس بدری صحابہ کی زیارت کی ہے۔ وہ خود کہتے تھے کہ ایک سو صحابہ سے مل چکا ہوں۔ یحییٰ بن معین انہیں ثقہ قرار دیتے تھے۔ ان کی زہد و ریاضت کا یہ حال تھا کہ جہاد قسطنطنیہ میں شریک تھے۔ سب کو روزانہ لشکر سے دو دو روٹیاں ملا کرتی تھیں۔ یہ ایک روٹی تناول کرتے اور دوسری صدقہ کر دیتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۹۴/۵، ط الرسالۃ)

اس لیے ان کی زبانی سر مبارک کا یزید تک پہنچنا صحیح سند سے ثابت ہو جاتا ہے۔ ہاں راستے میں اس کی نمائش کرنا یا یزید کا اس کی توہین کرنا کسی صحیح سند سے منقول نہیں۔

یزید اور حدیثِ مدینۃ قیصر

﴿سوال﴾ یزید کی مغفرت تو صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:[1]

"اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْنَ مَدِیْنَةَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ."

"میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر جہاد کے لیے جائے گا، بخش دیا جائے گا۔"

حضرت امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یزید قیصری پایۂ تخت قُسْطَنْطِینِیّہ پر حملہ کرنے والے پہلے اسلامی لشکر کا امیر تھا۔ اس لیے اس کی مغفرت اس حدیث کے مطابق یقینی ہے۔ پھر اسے عزت واحترام نہ دینے کا کیا جواز ہے؟

﴿جواب﴾ اوّل تو اس حدیث کا مصداق یزید اور اس کے لشکر کو قرار دینا کوئی قطعی بات نہیں۔ ایک احتمال ہے۔ اس احتمال کو تعصب کی بناء پر یقینی بنالیا گیا ہے۔ از راہِ انصاف اس بارے میں چند امور قابلِ غور ہیں:

❶ حدیث میں یزید کا نام لے کر مغفرت کی بشارت نہیں دی گئی۔ اس روایت کو عشرۂ مبشرہ کے جنتی ہونے جیسی روایات کے ہم پلہ نہیں مانا جاسکتا جن میں دس صحابہ کو نام بنام جنت کی خوش خبری دی گئی ہے۔

نیک اعمال کی عام بشارتوں سے کسی خاص فرد کے لیے مغفرت کا یقینی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ مثلاً حدیث میں نمازی کے بلا حساب کتاب جنت میں داخلے کی خوش خبری ہے مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ زید پنج وقتہ نمازی ہے، لہٰذا وہ جنتی ہے۔

❷ حدیث میں قُسْطَنْطِینِیّہ نہیں بلکہ "مدینة قیصر" کا لفظ آیا ہے، یعنی قیصر کا پایۂ تخت۔ قیصر کا یورپی پایۂ تخت قُسْطَنْطِینِیّہ تھا اور ایشیائی پایۂ تخت حمص۔ اس لیے یہ احتمال موجود ہے کہ اس بشارت کا مصداق وہ لشکر ہو جس نے حمص فتح کیا تھا۔ یہ مہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں انجام پائی تھی۔[2]

❸ حدیث کی بشارت "اَوَّلُ جَیْشٍ" یعنی رومی پایۂ تخت پر جہاد کرنے والے پہلے لشکر کے لیے ہے۔ یہ ثابت ہے کہ قُسْطَنْطِینِیّہ کی مہم کا پہلا لشکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گیا تھا۔[3]

---

① صحیح البخاری، ح: ۲۹۲۴، کتاب الجہاد، باب قتال الروم

② حمص کی فتح میں نامور صحابہ شریک تھے۔ یہ ایک یادگار واقعہ تھا۔ اس شہر کی فصیل سر نہیں ہو رہی تھی۔ آخر صحابہ کرام نے جمع ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا جس سے حمص کی عمارتوں میں دراڑیں پڑ گئیں، عیسائیوں نے ڈر کر فوراً شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ (فتوح الشام للازدی، ص۱۲۲، ۱۲۳ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۹/۶۴۹، دار ہجر)

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۲۴۳۔ اس لشکر نے اس جگہ خیمے لگائے تھے جہاں اب استنبول کا مشرقی حصہ آباد ہے۔ اگرچہ اس مہم میں جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی مگر جہادی مہم کے لیے جانے پر بھی غزوہ کا اطلاق ہوتا ہے، جنگ نہ ہو تب بھی جہاد کا پورا اجر و ثواب ملتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی آخری مہم غزوہ تبوک میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی اسے ایک اہم جہاد اور بڑا حملہ شمار کیا جاتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے اس حملے کو قُسْطَنْطِینِیّہ کا پہلا جہاد نہ مانا جائے۔ ہاں اگر کوئی حدیث کے لفظ "یغزون" سے فاتحانہ جہاد مراد لے تو پھر اس کا مصداق فقط سلطان محمد فاتح کا لشکر ہوگا جس نے ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں قُسْطَنْطِینِیّہ فتح کیا تھا۔ یزید سے قبل اور بعد میں قُسْطَنْطِینِیّہ پر ہونے والے باقی سارے حملے اس بشارت سے خارج ہو جائیں گے۔ اور اگر مدینۂ قیصر سے مراد حمص ہو تو پھر اس صورت میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا لشکر ہی اس بشارت کا مصداق ہوگا جس نے پہلے ہی حملے میں "مدینۂ قیصر" فتح کر لیا تھا۔

پس اگر مان لیا جائے کہ ''مدینۃ قیصر'' سے قُسطَنطِینِیَّہ ہی مراد ہے تب بھی یہ بشارت یزید کے لیے ثابت نہیں ہو سکتی؛ کیوں کہ یزید جو اس وقت چھ سال کا تھا، یقیناً اس پہلے جہاد میں شریک نہ تھا۔

ان تمام پہلوؤں سے قطع نظر کر کے اگر یزید کے لشکر کو اس حدیث کی بشارت کا مصداق مان لیا جائے تب بھی یزید کا معاملہ زیادہ سے زیادہ زیرِ مغفرت مانا جا سکتا ہے۔ اس کا یقینی طور پر مغفور ہونا ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ:

اعمالِ صالحہ پر بشارتیں اپنی جگہ بالکل درست ہوتی ہیں مگر ان کے ساتھ دو شرعی ضابطے ملحوظ ہوتے ہیں:

① ایک یہ کہ نیک عمل کی فضیلت و مغفرت حاصل ہونے کے بعد اسے سنبھالنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے بعد برے اعمال کرے تو اللہ کے ضابطے کے مطابق وہ فاسق اور مجرم ٹھہرے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں مقبول ہیں اور ہمارے گناہ معاف ہیں جیسا کہ مرجئہ کہتے ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص کوئی نیکی اس کی تمام شرائط کے ساتھ اس طرح ادا کرے کہ وہ فاسد کرنے والے عیوب سے خالی ہو، اور وہ شخص نیکی کو کفر، ارتداد اور بُرے اخلاق کے ذریعے ضائع نہ کرے، یہاں تک کہ مؤمن ہونے ہی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو تو ایسے شخص کی نیکی کو اللہ ضائع نہیں کرے گا، بلکہ اسے قبول کر کے ثواب عطا کرے گا۔''[1]

اسی لیے اگر کوئی شخص حج کر کے آئے اور اس کے بعد شراب خوری، ترکِ نماز اور حرام کاریوں میں ملوث ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ حاجی کی مغفرت کا وعدہ صحیح حدیث میں ہے، اس لیے یہ شخص اب بھی مغفور ہے۔

② دوسرا شرعی ضابطہ یہ ہے کہ حقوق العباد کسی بھی طرح معاف نہیں ہوتے۔ بڑی سے بڑی نیکی سے بھی ان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

ایسی بہت سی نیکیاں ہیں جن پر مغفرت اور جنت کی بشارتیں احادیث میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ مثلاً: احادیث میں ہے کہ پنج وقتہ نمازوں سے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درختوں سے پتے گر جاتے ہیں۔[2] نمازِ عید کے موقع پر اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر تمام روزہ داروں کی معافی کا اعلان فرماتے ہیں۔[3] شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔[4] حاجی کے بارے میں وعدہ ہے کہ وہ اس طرح بخشا بخشایا لوٹتا ہے جیسے نومولود بچہ۔[5] مگر بشارتوں کا یہ مطلب نہیں کہ جس نے یہ نیکی کر لی وہ اب کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اگر ہم جنگ قُسطَنطِینِیَّہ میں یزید کو شریک دیکھ کر اسے یقینی طور پر مغفور کہیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی بھی حاجی یا مجاہد کو ہم بخشا بخشایا تصور کر لیں چاہے وہ بعد میں جی بھر کے حقوق اللہ اور حقوق العباد ضائع کرتا رہے۔

---

① ولانقول ان حسناتنا مقبولة و سيآتنا مغفورة ،ولكن نقول من عمل حسنة بجميع شرائطها خالية عن العيوب المفسدة ولم يبطلها بالكفر والردة والاخلاق السيئة حتىٰ خرج من الدنيا مؤمنا فان الله تعالىٰ لا يضيعها بل يقبلها منه و يثيبه عليها (الفقه الاكبر، ص۴۷)

② مسند احمد، ح: ۲۱۵۵٦

③ شعب الايمان، ح: ۳۴۴۴، باسناد ضعيف

④ مصنف ابن ابی شيبة، ح: ۱۹۴٦۷

⑤ صحيح البخاری، ح: ۱۵۲۱، باب فضل الحج المبرور،

شہادت سے بڑا عمل کیا ہوگا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں قتل ہونا ہر گناہ کا کفارہ بن جاتا ہے۔''[1] یہ بھی فرمایا: جنت کے سو درجات اللہ نے مجاہدین کے لیے تیار کیے ہیں۔[2]

یہ بھی ارشاد فرمایا: جو اللہ کے راستے میں سفر کرے، پھر مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے، چاہے وہ گھوڑے یا اونٹ سے گر کر مرے یا حشرات کے ڈسنے سے، یا بستر پر یا طبعی موت سے مرجائے تو وہ شہید ہے اور جنتی ہے۔''[3]

پھر رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کرنا اور پھر اس میں جان دے دینا یقیناً غزوۂ قُسطَنطِینِیّہ میں شرکت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ جہاد میں قتل ہونے والے ہر فرد پر بھی یقینی مغفرت کا حکم نہیں لگایا، نہ دوسروں کو اس کی اجازت دی۔ بلکہ بعض کو تو واضح طور پر جہنمی کہا۔

ایک جہاد کے بعد صحابہ نے کہا: ''فلاں شخص شہید ہو گیا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''وہ دوزخ میں ہے۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے آخری لمحات میں زخموں کی تکلیف سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔[4]

حضور ﷺ کے ساتھ جہاد میں جان دے کر بھی ایک شخص ایک گناہ کی وجہ سے عذاب کا مستحق ہو گیا۔ یزید نے جہادِ قُسطَنطِینِیّہ کی قیادت کر کے ایک بڑی نفل نیکی تھی، اس کے علاوہ بھی اس کی ہزاروں نفل اور فرض نیکیاں ہوں گی مگر اس کے بھیجے ہوئے بے لگام لشکر نے مدینہ میں جو کچھ کیا، اسے دیکھتے ہوئے حضور ﷺ ہی کا یہ ارشاد بھی سامنے رکھیے:

''جو مدینہ میں کوئی ظلم کرے یا یہاں ظلم کرنے والے کو ٹھکانہ دے، اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔ اس کا کوئی فرض قبول ہے نہ نفل۔''[5] ایک حدیث میں ہے: ''جس نے اہلِ مدینہ کو ڈرایا، اللہ اسے ڈرائے گا، اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔ اس کا کوئی فرض قبول ہے نہ نفل۔''[6]

یزید نے اہلِ مدینہ کے ساتھ جو کچھ کرایا اور حضور ﷺ نے ایسے شخص کی فرض و نفل نیکیوں کے مردود ہونے کی جو وعید سنائی، کیا اس کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بے دھڑک یزید کے قطعی مغفور اور اس کی نیکیوں کے یقیناً مقبول ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا: اگر میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ فرمایا: ''ہاں بشرطیکہ تم اللہ کی راہ میں صبر کر کے، ثواب کی امید لے کر منہ پھیرے بغیر آگے بڑھ کر شہید ہوئے۔''

کچھ دیر بعد پھر انہی صحابی سے فرمایا: ''تم نے کیا سوال کیا تھا؟'' انہوں نے سوال دہرایا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

① سنن الترمذی، ح: ۱۶۴۰ بسند صحیح

② صحیح البخاری، ح: ۲۷۹۰، کتاب الجہاد، باب درجات المجاهدین

③ سنن ابی داؤد، ح: ۲۴۹۹، کتاب الجہاد، باب فیمن مات غازیا

④ مسند ابن الجعد، روایت نمبر: ۲۹۳۰؛ مسند ابی یعلیٰ، ح: ۷۵۴۴؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۹۶/۱، ط ابن تیمیة

⑤ من احدث فیها حدثاً او آویٰ محدثا فعلیه لعنة اللّٰه والملائكة والناس اجمعین، لایقبل منه صرف ولا عدل. (صحیح البخاری ح: ۱۸۷۰)
حافظ ابن حجر اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:
فعند الجمهور الصرف الفريضة والعدل النافلة ...... والمراد بالحدث والمحدث الظلم والظالم. (فتح الباری: ۸۶/۴)

⑥ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۳/۷

''ہاں اگر تم صبر کر کے، ثواب کی امید لے کر، منہ پھیرے بغیر آگے بڑھتے ہوئے شہید ہوئے تو تمام گناہ معاف ہو جائیں گے سوائے قرض کے۔ یہ مجھے جبرئیل علیہ السلام کہہ گئے ہیں۔''[1]

کسی کا قرض ادا نہ کرنا مالی حق تلفی اور حقوق العباد میں کوتاہی ہے۔ جہاد اور شہادت جیسے عظیم اعمال بھی اس گناہ کو معاف نہیں کرتے۔

پس ہم یزید کی شراب نوشی اور ترکِ نماز کی روایات سے یہ کہہ کر قطعِ نظر کر بھی لیں کہ اگر کسی نے خفیہ طور پر ایسے گناہ کیے ہوں تو وہ اس کا اور اللہ کا معاملہ ہے، چاہے تو سزا دے، چاہے تو معاف کر دے، ہمیں ان سے کیا غرض۔ مگر یزید سے جو حقوق العباد پامال ہوئے کیا وہ کسی کا قرض دبا لینے سے کہیں بڑھ کر نہ تھے؟۔ ان پر بھلا کون پردہ ڈال سکتا ہے!

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے قتل ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باوجود فرمایا: ''وہ جہنمی ہے۔'' دیکھا گیا تو اس نے مالِ غنیمت سے کچھ خیانت کی تھی۔[2]

مالِ غنیمت اُمت کی اجتماعی امانت تھی، اس میں معمولی سی کوتاہی نے اس شخص کو جہنمی کر دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کر کے قتل ہوا۔ سوچیے! اُس جرم کا کیا انجام ہوگا جو ایک حکمران سے سرزد ہو، جس کی وجہ سے صحابہ اور ساداتِ کرام سمیت سینکڑوں بے قصور لوگ خاک و خون میں غلطاں ہوئے ہوں۔ یہ قصور تو بہر حال ثابت ہے کیوں کہ:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو روکنے کے لیے کوفہ سے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی جگہ عبید اللہ بن زیاد کا تقرر کس نے کیا تھا؟

ابن زیاد کو کس نے اتنا حوصلہ بخشا تھا کہ اس نے بے خوف و خطر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خاندان سمیت قتل کرا کر چھوڑا، اور جیسا کہ اسے یقین تھا اس سے کوئی پوچھ گچھ تک نہ ہوئی؟ مدینہ منورہ کی حرمت کیوں پامال کی گئی؟ وہاں لوٹ مار کا کیا جواز تھا؟ صحابہ اور ان کی اولاد سے ذرا بھی رعایت کیے بغیر ان کی لاشوں کے ڈھیر کس کی فوج نے لگائے؟

اہلِ مدینہ پر ہیبت و دہشت طاری کر کے ان سے جبراً یہ جملے کس مقصد کے لیے کہلوائے گئے کہ ''ہم یزید کے غلام ہیں چاہے وہ آزاد کرے چاہے بیچ دے۔'' ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا یزید کی اس بیعت کو بیعتِ ضلالت کیوں کہتی رہیں؟ اہلِ مدینہ پر زندگی اتنی تنگ کس نے کی کہ وہ شہر چھوڑنے کی تیاری کرنے لگے؟ یزید نے کربلا اور حرہ کے مجرموں سے کیوں باز پرس نہ کی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں قتل ہو کر بھی اگر حقوق العباد معاف نہیں ہوتے تو یزید کو کس شرعی اصول کے تحت بخشا بخشایا مانا جا سکتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اہلِ مدینہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے گا، اللہ اسے یوں گھلا دے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔''[3] یزید مدینہ پر حملے کے دنوں میں بیمار ہوا اور چند ہفتوں میں گھل گھل کر مر گیا۔ کیا یہ بھی کوئی فضیلت تھی؟ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وعید اس کے حق میں ثابت ہوئی تھی؟

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۱۸۸۵، باب فضل الشهادة

[2] صحیح البخاری، ح: ۳۰۷۴، کتاب الجهاد، باب القليل من الغلول

[3] صحیح مسلم، ح: ۳۳۴۴، کتاب الحج، باب من اراد اهل المدينة بسوء

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''جو اہلِ مدینہ کو ڈرائے اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔''[1]

یہ حدیث حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وقعۂ حرہ کے موقع پر سنائی تھی، یعنی ان کے نزدیک شامی اس کا مصداق تھے۔ تو اگر شہر کو لوٹنے والے سپاہی اس کے وعید کے مستحق تھے تو کیا فوج بھیجنے والا اس سے بالکل بری ہوگا؟

یہ بات بھی ظاہر ہے جس فعل پر حدیث میں لعنت وارد ہوئی ہو وہ گناہِ کبیرہ ہوتا ہے، اور گناہِ کبیرہ کے مرتکب کے فاسق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ پس فسقِ یزید اس طرح بھی ثابت ہے۔

پھر یہ مسئلہ حقوق العباد کا تھا اس لیے یہ ذاتی فسق نہیں رہتا بلکہ ظلم کی حد میں داخل ہے، اس لیے یزید عادل کے زمرے میں نہیں رہتا بلکہ لامحالہ ظالموں کی صف میں شامل ہوتا ہے۔ اگر یزید ایک صحابی کا بیٹا، ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا اور حج بیت اللہ یا جہادِ قُسْطَنطِینِیہ کر چکا تھا تو کیا اس کی وجہ سے وہ اللہ کی شریعت سے بھی بالاتر ہوگیا تھا؟ اور کیا ان نسبتوں اور نیکیوں کے بعد اس کا ہر کام جائز بلکہ قابلِ تعریف ہوگیا تھا؟

یہ تمام سوالات ہر دور میں علمائے امت کے سامنے رہے، اس لیے سوائے مروانیوں کے، کسی نے یزید کی حمایت کا پرچم نہیں اٹھایا۔ جسے بھی اپنی آخرت کی فکر ہوگی وہ اس بارے میں کم از کم احتیاط ضرور کرے گا۔

علامہ قسطلانی کا غلط حوالہ:

ایک صاحب جنہیں کتب کی عبارتیں زبانی یاد ہونے کا زعم تھا، راقم سے مسئلہ یزید پر بحث کرتے ہوئے فرمانے لگے: علامہ قسطلانی جیسے عظیم محدث اور شارحِ حدیث "اوّل جیش من اُمتی" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کان اوّل من غزامدینة قیصر یزید بن معاویة. وفی هذاالحدیث منقبة لمعاویة لانه اوّل من غزاالبحر، ومنقبة لولده لانه اوّل من غزامدینة قیصر.''

راقم نے پوچھا: ''آپ نے یہ عبارت کہاں دیکھی؟''

فرمانے لگے: ''صحیح بخاری پر مولانا احمد علی سہارنپوری رحمہ اللہ کے حاشیے میں۔''

راقم نے بخاری شریف منگوا کر انہیں دکھائی۔ اس کے حاشیہ میں مولانا سہارنپوری نے لکھا تھا:

''مدینة قیصر ای ملک الروم. قال القسطلانی: کان اوّل من غزامدینة قیصر، یزید بن معاویة، ومعه جماعة من سادات الصحابة کابن عمروابن عباس وابن الزبیروابی ایوب الانصاری وتوفی بها ابوایوب سنة اثنین وخمسین من الهجرة. انتهیٰ.''

اس کے بعد مولانا سہارنپوری نے لکھا:

''وفی الفتح قال المُهَلَّب: وفی هذاالحدیث منقبة لمعاویة لانه اوّل من غزاالبحر ومنقبة لولده لانه اوّل من غزامدینة قیصر. وتعقبه ابن التین وابن المنیر بماحاصله انه لایلزم من

① اتحاف الخیرة المهرة للبوصیری، ح: ۲۶۷۳، ط دارالوطن ۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۳/۷، ط ابن تیمیة

دخولـه فـي ذلـك العموم ان لايخرج بدليل خاص اذلايختلف اهل العلم ان قوله ﷺ : مغفورلهم،مشروط بان يكونوا من اهل المغفرة حتىٰ لوارتد احد ممن غزاها بعد ذالك لـم يدخل في ذالك العموم اتفاقا.فدل علىٰ ان المراد مغفورلمن وجد اشتراط المغفرة فيه منهم. انتهىٰ."

راقم نے یہ عبارات دکھا کر کہا:

"آپ نے عبارت رٹ تو لی مگر یا تو سمجھے نہیں یا جان بوجھ کر خیانت کر رہے ہیں۔علامہ قسطلانی نے صرف یہ ذکر کیا ہے کہ یزید اس جنگ میں صحابہ کے ساتھ شریک ہوا تھا۔اس حدیث کی بناء پر یزید کو کسی منقبت کا حق دار قرار دینے والے علامہ قسطلانی نہیں ،المُہَلَّب بن احمد ہیں۔علامہ سہارنپوری نے مُہلّب کی یہ عبارت حافظ ابن حجر کی فتح الباری سے لی ہے۔حافظ ابن حجر نے بھی مُہلّب کی یہ عبارت تائید کے لیے نہیں تردید کے لیے نقل کی ہے،اسی لیے اس کے بعد ابن التین اور ابن المنیر کا محاکمہ نقل کیا ہے جو اس مُسلّمہ اصول پر مشتمل ہے کہ کسی عمل پر مغفرت کی عمومی بشارت منقول ہونے سے وہ عمل کرنے والا ہر ہر فرد لازماً اس بشارت کا مستحق نہیں بن جاتا بلکہ شرائطِ مغفرت کو توڑنے والا اس بشارت سے نکل جاتا ہے۔

وہ صاحب یہ کہہ کر تشریف لے گئے:"شاید مولانا سہارنپوری نے عبارت میں ترمیم یا تحریف کی ہو۔علامہ قسطلانی کی پوری عبارت پیش نہیں کی۔اس میں تو وہی بات لکھی تھی جو میں بتا رہا ہوں۔"

راقم کے پاس اس وقت علامہ قسطلانی کی شرح "ارشاد الساری" موجود نہیں تھی۔چند دن بعد حاصل کی اور حدیث "مدینہ قیصر" کی تشریح دیکھی،حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ لوگ تعصب کی بناء پر کس قدر غلط بیانی کرتے ہیں۔

علامہ قسطلانی کی پوری عبارت درج ذیل ہے:

"كـان اوّل مـن غـزا مدينة قيصر يزيد بن معاوية ،ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عـمـروابـن عـبـاس وابـن الـزبيـروابـي ايـوب الانـصـاري وتوفي بها ابوايوب سـنة اثنين وخمسين من الهجرة.

واستـدل بـه الـمُهَـلَّـب عـلـىٰ ثبـوت خلافة يزيد،وانه من اهل الجنة،لدخوله في عموم قوله:مغفورلهم.

واُجيب بان هذا جار علىٰ طريق الحمية لبني امية.ولايلزم من دخوله في ذالك العموم ان لايـخـرج بـدلـيـل خـاص اذلاخـلاف ان قـولـه عـلـيـه الصلوٰة والسلام: "مغفورلهم" مشـروط بـكونه من اهل المغفرة حتىٰ لوارتد واحد ممن غزاهابعد ذالك لم يدخل في ذالك العموم اتفاقاً.قاله ابن المنير.

وقد اطلق بعضهم فيما نقل المولیٰ سعدالدين، اللعن علیٰ يزيد،لمانه كفر حين امر بقتل الحسين،واستبشاره بذلک،واهانة اهل بيت النبی ﷺ مما تواتر معناه، وان كان تفاصيلها احاد،فنحن لانتوقف فی شانه بل فی ايمانه ، لعنة الله عليه وعلیٰ انصاره،واعوانه. اه.

ومن يمنع يستدل بانه عليه الصلوة والسلام نهیٰ عن لعن المصلين ومن كان من اهل القبلة."

(ترجمہ) قیصر کے شہر پر پہلا حملہ کرنے والا یزید بن مُعاویہ تھا۔ اس کے ساتھ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کی جماعت تھی۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ وہیں ۵۲ھ میں فوت ہوئے۔ مُہلّب نے اس حدیث سے یزید کی خلافت کے ثابت ہونے اور اس کی جنتی ہونے پر استدلال کیا ہے کہ وہ نبی ﷺ کے قول "مغفورلہم" میں داخل ہے۔

اسے جواب دیا گیا ہے کہ بنوامیہ کے حق میں تعصب کی بناء پر یہ قول کیا گیا ہے۔ [1]

کسی کے اس عموم میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی خاص وجہ سے اس بشارت سے خارج نہ ہوجائے؛ کیوں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضور ﷺ کا قول "مغفورلہم" اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ بندہ مغفرت کے قابل بھی ہو۔ اگر کوئی شخص اس جہاد کے بعد مرتد ہوگیا ہو تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ اس عمومی بشارت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ بات ابن المنیر نے کہی ہے۔

بعض حضرات نے مولانا سعدالدین (تفتازانی) سے منقول بات کی وجہ سے یزید پر لعنت کو بھی جائز کہا ہے کیوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دینے اور اس پر خوش ہونے اور اہلِ بیت کی تذلیل کرنے کی وجہ سے وہ کافر ہوگیا جیسا کہ یہ باتیں تواترِ معنوی سے ثابت ہیں اگرچہ ان کی تفصیلات اخبارِ آحاد ہیں۔ پس ہم یزید کے حال میں نہیں، اس کے ایمان میں توقف کرتے ہیں۔ اللہ کی لعنت ہو اس پر اور اس کے انصار اور مددگاروں پر۔ اور جو حضرات (لعنت سے) منع کرتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ نبی ﷺ نے نمازیوں اور اہلِ قبلہ پر لعنت سے منع کیا ہے۔" [2]

قارئین! علامہ قسطلانی رحمہ اللہ کی عبارت اپنے معنیٰ میں بالکل واضح ہے۔ یزید کے مسئلے میں وہ جمہور کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کی کسی عبارت سے یزید کی حمایت کا کوئی پہلو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

---

① مُہلّب اندلس کے شہر المریہ کے باشندے تھے۔ بخاری کے ابتدائی شارحین میں سے ہیں۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوئے۔ ان کے وطن میں پانچویں صدی ہجری کے اوائل تک بنوامیہ کی حکومت رہی تھی، اس لیے وہاں کے بعض علماء بنوامیہ کے حق میں تعصب سے کام لیتے تھے۔

② ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری للقسطلانی: ۵/۱۰۴، ۱۰۵، کتاب الجهاد، باب ما قيل فی قتال الروم. ط المكتبة الامیریة



یزید کی ولایت پر انوکھا استدلال:

﴿سوال﴾ یزید کی پھوپھی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، والد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، دادا حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، دادی ہند رضی اللہ عنہا، پورا گھرانہ صحابہ اور صحابیات کا تھا۔ اس کے بیٹے معاویہ اور خالد وغیرہ بھی نیک تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود یزید بھی نہایت نیک وصالح تھا۔ دوسری طرف سادات کرام اور بنو ہاشم سے یزید اور اس کے خاندان کے قریبی تعلقات رہے۔ زین العابدین اور محمد بن حنفیہ جیسے سادات نے یزید اور اس کے جانشینوں کے خلاف خروج میں کبھی حصہ نہیں لیا بلکہ اموی خلفاء سے وفاداری کی زندگی گزاری۔ یزید، مروان، عبدالملک وغیرہ کی اولادوں کے حسنین کریمین کی اولادوں سے رشتے ناتے اور شادی بیاہ بھی ہوتے رہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کربلا یا حرہ میں جو کچھ ہوا، یا تو وہ جھوٹے افسانے ہیں یا اگر کوئی ظلم ہوا تھا تو یزید اس سے پاک تھا۔ اسی طرح مروان اور عبدالملک بھی اولیاء واتقیاء تھے، ان سب کا کردار اچھا تھا۔ یہ سب اسلامی ہیرو تھے۔ تبھی ان سے سادات کے اتنے اچھے تعلقات تھے۔

﴿جواب﴾ یہ پوری تقریر مفروضوں پر مبنی ہے۔ سائل درج ذیل کھلے حقائق کو بالکل نظر انداز کر رہا ہے:

❶ کسی خاندان کے اشرف اور افضل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس خاندان یا قبیلے کا ہر ہر فرد شریف، متقی اور دین دار ہو۔ اگر یہ خیال کچھ وزن رکھتا تو سب سے پہلے نوح علیہ السلام کا بیٹا، ابراہیم علیہ السلام کا باپ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابولہب اس بات کے حق دار تھے کہ وہ کافر ومشرک نہیں بلکہ مومنین صالحین ہوتے۔

مگر قرآن نے ان کے کفر کا برملا اظہار کر کے یہ حقیقت قطعیت کے ساتھ بتا دی کہ کائنات کے افضل ترین لوگوں کے قریبی رشتے دار فاسق وفاجر بلکہ کافر ومشرک بھی ہو سکتے ہیں، ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، چاہے تو حبشہ کے بلال رضی اللہ عنہ اور روم کے صہیب رضی اللہ عنہ کو عطا کر دے، نہ چاہے تو پدرِ ابراہیم علیہ السلام اور پسرِ نوح علیہ السلام بھی محروم رہ جائیں۔

❷ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی خاندان میں ایک یا چند یا بہت سے بُرے لوگوں کے پیدا ہونے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ اس کے ہر فرد کو علی الاطلاق بُرا سمجھ لیا جائے۔

❸ کسی نیک مرد یا عورت کا کسی خاندان میں نکاح ہو جانے سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ اس خاندان کے دادوں، پردادوں سے لے کر پوتوں پڑپوتوں تک میں کبھی کوئی فاسق وفاجر نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی فاسق وفاجر شخص کا کسی گھرانے میں نکاح ہو جائے تو اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس برادری میں سبھی لوگ فساق وفجار ہوں گے۔

❹ اسلام میں قطعاً ایسا کوئی حکم نہیں کہ نیک لوگ بُرے باپ دادا کی اولاد سے نکاح نہیں کر سکتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حُیَیّ بن اخطب جیسے اسلام دشمن شخص کی بیٹی صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے۔ کیونکہ وہ مومنہ اور صالحہ تھیں اور اسلام میں ہر شخص کو خود اپنے عمل اور کردار کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور اسلام اسی لحاظ سے اس کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآنِ مجید کا اصول ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی.[1]

[1] کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ (سورۃ النجم، آیت: ۳۸)

یزید یا اس جیسے لوگوں کے بارے میں جمہور کا موقف مذکورہ چار اصولوں پر قائم ہے۔ اصحاب جرح وتعدیل اور محدثین نے ہر فرد کو اس کے اپنے عمل اور کردار کی روشنی میں جانچا ہے اور فیصلہ دیا ہے کہ ''یزید فاسق تھا، وہ روایتِ حدیث کا اہل نہیں تھا، عادل نہیں ظالم تھا۔'' بھلا یہ کونسا معیار ہے کہ اگر یزید کی پھوپھی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں یا اس کے والد صحابی تھے یا اس کے بیٹے نیک تھے، تو خود اس کی ثابت شدہ برائیوں کا بھی سرے سے انکار کر دیا جائے۔ اور یہ بھی محض جہالت ہے کہ اگر یزید بُرا تھا تو یہ حکم اس کی اولاد اور باپ دادا پر بھی جاری ہوگا۔ یہ بھی صریح تعصب ہے کہ اگر اس کی آل اولاد اور باپ دادا کو ظالم نہیں سمجھا گیا تو پھر یزید بھی عادل ہوگا۔

جس طرح روافض بغض میں اندھے ہو کر یزید کی بُرائیوں کے باعث اس کے باپ دادا تک کو کوستے ہیں، اسی طرح ناصبی تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر یزید کے بڑوں چھوٹوں کی دین داری سے یزید کے صالح ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ اس استدلال کے مطابق تو مشہور اسلام دشمن یہودی سردار حُیَیّ بن اخطب کو بھی اُمّ المؤمنین حضرت صَفِیَہ رضی اللہ عنہا کا والد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سسر ہونے کے باعث مومن وصالح ہونا چاہیے اور ان تمام روایات کو سبائی روایات قرار دیا جانا چاہیے کہ جن کے مطابق وہ یہودی تھا اور حالتِ کفر پر قتل ہوا تھا۔

آلِ یزید، آلِ مروان اور آلِ عبدالملک کے بنو ہاشم سے رشتے ناتوں سے بھلا یزید کی برأت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ وہ خیر القرون تھا اور اس میں خیر اور نیکی کا غلبہ تھا۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ سمیت اکثر قبائل کے اکثر لوگ نیک اور دین دار تھے۔ مگر خود تاریخ وحدیث کا ذخیرہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ کچھ مثالیں اس کے خلاف بھی تھیں اور کچھ لوگ بُرے بھی تھے۔ مگر لوگوں میں اتنی سمجھ بوجھ ضرور تھی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے پیشِ نظر کسی خاندان کے چند برے لوگوں کی وجہ سے اس خاندان اور آل ونسل کے ہر فرد کو بُرا سمجھنے اور ان سے رشتے ناطے توڑنے کی حماقت نہیں کی۔ اسی وجہ سے ان کے مابین تعلقات رہے۔ پھر خصوصاً بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے بہت سے سمجھ دار لوگوں نے اس نیت سے بھی باہم رشتے کیے کہ چند افراد کے تعصب کا خمیازہ پورے پورے قبیلوں کو نہ بھگتنا پڑے اور جہاں تک ہو سکے باہمی حسنِ سلوک کے ذریعے کشیدگی کی فضا کو کم کیا جائے۔ مگر اس کا یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کا تعصب اور جن سے زیادتیوں کا ارتکاب ثابت ہے، انہیں بے قصور مان لیا جائے۔

اگر ہمارے متجددین کے زورِ استدلال کا یہی حال رہا تو کوئی بعید نہیں کہ کچھ دنوں بعد کوئی یہ دعویٰ بھی کر دے کہ ابن اُبَی بن سلول منافق نہیں، بہت بڑا مسلمان تھا کیونکہ اس کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی اور عاشق رسول تھے اور اس کی بیٹی جمیلہ رضی اللہ عنہا بھی صحابیہ تھیں، لہٰذا اس کی معایب کی روایات صحابہ کے خلاف سازش کے سوا کچھ نہیں۔

اور عین ممکن ہے کوئی صاحب ابو عامر راہب جیسے شیطان کو بھی یہ کہتے ہوئے ولایت کے مرتبے پر فائز کر دیں کہ غسیل الملائکہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی اس کے لختِ جگر تھے اور جمیلہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا جیسی صحابیہ اس کی بہو تھیں، بس اس کے خلاف منقول روایات دشمنانِ اسلام کی گھڑی ہوئی ہیں۔

اور کوئی بعید نہیں کہ کوئی صاحب یہ دعویٰ بھی کر دیں کہ مختار کذاب کے معائب کی تمام تاریخی روایات من گھڑت ہیں۔ نہ تو وہ کذاب تھا، نہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا کیونکہ اس کے والد حضرت ابوعبید ثقفی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپہ سالار تھے جو ایرانیوں سے جہاد میں شہید ہوئے تھے اور مختار کی بہن حضرت صَفِیّہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں۔[1] اگر مختار کذاب ہوتا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی کہ وہ ایک کذاب کی بہن کو بیوی بناتے۔ غرض شخصیات کو جانچنے کا یہ انوکھا معیار نہ صرف پوری تاریخ بلکہ علم رجال کو بھی بدل ڈالے گا۔ اس قسم کے بودے دلائل پر یقین کیا جائے تو تاریخ کی بدترین شخصیات بھی، کوثر و تسنیم سے دُھلی دُھلائی بن جائیں گی۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مخالفین سے اس طرح کے رشتے ناتے کرانے میں یہ مصلحت ملحوظ ہوتی تھی کہ مخالفین پر مثبت اثرات ڈالے جائیں اور انہیں عداوت کی جگہ عدل کا سبق پڑھایا جائے۔ جو لوگ سیاسی مصلحت کے لیے یہ تعصب باقی رکھنا چاہتے تھے وہ ایسے رشتوں کی مخالفت بھی کرتے تھے۔

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔ اس سے پہلے یزید کا بیٹا خالد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بہن رملہ سے شادی کر چکا تھا۔ اسے حجاج بن یوسف کے اس نکاح کی خبر ملی تو اس نے عبدالملک بن مروان کو اس رشتے کی مخالفت پر آمادہ کرنا چاہا۔ عبدالملک نے پوچھا: آخر اس میں حرج کیا ہے؟ خالد بن یزید نے کہا: ''جب سے میں نے رملہ بنت زبیر سے نکاح کیا ہے، میرے دل سے آلِ زبیر کی مخالفت چلی گئی ہے۔'' یہ سنتے ہی عبدالملک یوں چونکا جیسے کسی نے اسے نیند سے جگا دیا ہو۔ اس نے فوراً حجاج بن یوسف کو تاکیدی حکم بھیجا کہ وہ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو طلاق دے دے۔ حجاج نے اپنے آقا کے حکم کی بے چوں و چراں حکم کی تعمیل کی۔[2]

رہی بات حضرت زین العابدین، محمد بن حنفیہ اور عمائدِ بنوہاشم کے بنواُمیہ کے خلاف خروج نہ کرنے کی، تو اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان حضرات نے اپنے خاندان پر ہونے والے مظالم کا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اُمت کو افتراق سے بچانے کے لیے سیاسی معاملات سے یکسر کنارہ کش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ مظلوم اور مسکین بن کر جینا، اقتدار کی اس کش مکش میں شریک ہونے سے بہتر ہے جس میں لوگوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے خون میں رنگے جا رہے ہیں۔ مظلوموں کی کنارہ کشی کو بھلا ظالموں کی برأت کی دلیل کیسے بنا جا سکتا ہے؟ یہ بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ جو لوگ سادات کرام پر زیادتیوں میں براہِ راست یا بالواسطہ ملوث تھے، بہت جلد اللہ کی پکڑ میں آ گئے۔ یزید عین جوانی میں اس طرح دنیا سے رخصت ہوا کہ حکومت اس کے خاندان ہی سے نکل گئی۔ عبیداللہ بن زیاد، شمر، عمر بن سعد سمیت ایک ایک ظالم اپنے انجام کو پہنچا۔[3]

☆☆☆

---

[1] تہذیب الکمال: ۲۱۲/۳۵ [2] البدایۃ والنہایۃ: ۵۱۷/۱۲ [3] ان کے انجام کی تفصیل پیچھے تیسرے باب میں آ چکی ہے۔

ملا علی قاری پر یزید کی حمایت کا الزام:

﴿سوال﴾ ملا علی قاری یزید کو عادل اور صالح سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کی مذمت پر مشتمل تمام روایات جعلی ہیں۔ ومن ذالک الاحادیث فی ذم معاویة وذم عمرو بن العاص وذمّ بنی امیة و مدح المنصور والسفاح وکذا ذم یزید والولید ومروان بن الحکم۔ ①

﴿جواب﴾ معلوم ہوتا کہ آپ ملا علی قاری کی اس کتاب کا نام اور اس کا موضوع تک نہیں سمجھ سکے۔ ملا علی قاری نے یہ کتاب واقعات کی توثیق یا تردید کے لیے مرتب نہیں کی بلکہ اس کتاب کا مقصد ان روایات کی تردید ہے جنہیں واعظین اور قصہ گو قسم کے حضرات مرفوع حدیث یعنی خود رسول اللہ ﷺ کا فرمایا ہوا ارشاد کہہ کر نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں کی فضیلت یا فلاں کی مذمت میں یہ فرمایا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے درحقیقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور مذکورہ حضرات کی مذمت کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا بلکہ روافض نے ایسی جھوٹی روایات مشتہر کردی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو جہنمی اور کافر کہا ہے، اس لیے ملا علی قاری نے تردید کی کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسا کچھ بھی منقول نہیں۔

ظاہر ہے کہ روافض نے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ تک کے بارے میں خرافات گھڑ گھڑ کے نقل کی ہیں تو یزید بھلا کس شمار میں تھا!! چنانچہ انہوں نے یزید کے بارے میں بھی احادیث گھڑ لیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یزید کی مذمت میں فلاں فلاں بات ارشاد فرمائی۔ ملا علی قاری جیسے علماء کی انصاف پسندی قابلِ داد ہے کہ انہوں نے یزید کی برائیوں کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اس سے تعصب نہیں برتا اور اس کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب احادیث کا جھوٹا ہونا واضح کردیا۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ یزید برا نہیں تھا۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام لے کر اس کی مذمت میں کچھ نہیں کہا، لیکن کروڑوں اربوں فاسق وفاجر بلکہ کافر ومشرک ایسے ہیں جن کی رسول اللہ ﷺ نے مذمت نہیں کی، تو کیا اس سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ وہ لوگ اچھے ہیں۔

تاریخی روایات کے مطابق ہلاکو خان نہایت ظالم شخص تھا۔ اب کوئی واعظ ہلاکو خان سے دشمنی نکالنے کے لیے یہ خودساختہ بات کہہ دے کہ حضور ﷺ نے ہلاکو خان کو جہنمی دجال فرمایا تھا، اور یہ اطلاع ملنے پر کوئی محدث اپنی تصنیف میں وضاحت فرمادیں کہ ہلاکو خان کی مذمت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان منقول نہیں، بلکہ اس کی مذمت کی روایات جعلی ہیں، تو کیا اس کا یہ مطلب نکلے گا کہ ہلاکو خان نیک آدمی تھا۔ اگر اب بھی بات سمجھ نہیں آئی تو ملا علی قاری کی اسی عبارت سے ذرا آگے دیکھ لیں، فرماتے ہیں: **وکذا کل حدیث فی مدح بغداد وذمها.**

اب کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بغداد میں نہ تو کوئی قابلِ مدح بات ہے، نہ قابلِ مذمت۔ اس کی مذمت کرنے والا بھی جھوٹا ہے اور اس کی تعریف کرنے والا بھی؟۔ ایسا استدلال کرنے والے کو محقق کہا جائے گا یا غائب دماغ!!

① الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعة، ص ۴۷۷ مؤسسة الرسالة بیروت

یزید کے بارے میں ملا علی قاری کی اپنی رائے وہی تھی جو جمہور علمائے اسلام کی تھی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان (ظالم حکام کی صفات) میں سے بعض کو اشارے میں بیان کرتے تھے اور ان (حکام) سے اپنی جان کے خوف کے باعث صراحت نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ان کا کہنا تھا: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں سنہ ساٹھ اور لڑکوں کی حکومت سے، وہ یزید بن مُعاویہ کی خلافت کی طرف اشارہ کرتے تھے کیونکہ وہ سنہ ساٹھ ہجری میں ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دعا قبول کر لی، پس وہ یزید کی خلافت سے ایک سال قبل وفات پا گئے۔ [1]

نیز وہ یزید کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''واقعہ حرہ اسلامی تاریخ میں مشہور ہے جو یزید بن مُعاویہ کے دور میں پیش آیا جب مدینہ کو یزید کے اس شامی لشکر نے لوٹا جسے اس نے مدینہ کے صحابہ اور تابعین سے قتال کے لیے بھیجا تھا۔ [2]

کیا اس کے بعد بھی کوئی اس مفروضے کو مان سکتا ہے کہ ملا علی قاری یزید کو عادل اور صالح قرار دیتے تھے؟

☆☆☆

یزید کے دفاع میں علامہ ابن العربی کی بے بنیاد دلیل:

﴿سوال﴾ علامہ ابو بکر ابن العربی نے ''العواصم من القواصم'' میں یزید کے فسق کی تردید کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''اگر کہا جائے یزید شرابی تھا تو ہم کہیں گے یہ بات صرف دو گواہوں کے ذریعے ثابت ہو سکتی ہے، پس کس نے اس پر گواہی دی ہے۔'' کیا ابن العربی کی اس دلیل کا کوئی جواب ہے؟

﴿جواب﴾ یہ دلیل بڑی نرالی ہے۔ اگر اسے مانا جائے تو تاریخ ہی نہیں سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ میں مذکور اکثر بدترین لوگوں کی برائیوں کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ اگر یہاں یزید کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس پر حدِ شرعی جاری کرنے کا مسئلہ ہوتا تب تو علامہ ابن عربی یزید کے وکیل بن کر دو گواہوں کا مطالبہ کر سکتے تھے مگر تاریخی واقعات کے ثبوت میں دو چشم دید گواہ طلب کرنا بالکل غلط ہے۔ اگر اسے معیارِ دلیل مان لیا جائے تو:

- کوئی رافضی کہہ سکتا ہے کہ: اگر واقعی عبداللہ بن سبا سازشی تھا تو اس کی کسی فتنہ انگیزی پر دو گواہ پیش کیے جائیں۔
- کوئی خارجی کہہ سکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات طبعی تھی۔ اگر کسی نے قتل کیا تھا تو دو عینی گواہ کون تھے؟
- بی جے پی والے کہہ سکتے ہیں کہ نریندر امودی تو بڑا معصوم ہے۔ اس پر گجرات کے قتلِ عام میں ملوث ہونے کے دو عینی گواہ لایئے جو شہادت دیں کہ قتلِ عام کا حکم مودی نے دیا تھا۔
- کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ بغداد پر حملے کا حکم ہلاکو خان نے نہیں دیا تھا، کیونکہ اس کے دو عینی گواہ دستیاب نہیں۔

---

[1] وكان ابوهريرة رضي الله عنه يكنى عن بعضه ولا يصرح به خوفا على نفسه منهم كقوله اعوذ بالله من راس الستين وامارة الصبيان يشير الى خلافة يزيد بن معاوية لانها كانت سنة ستين من الهجرة واستجاب الله تعالى دعاء ابي هريرة فمات قبلها بسنة (مرقاة المفاتيح: ۱/۳۳۵، كتاب العلم، ط دار الفكر)

[2] كانت الوقعة مشهورة في الاسلام في ايام يزيد بن معاوية لما انتهب المدينة عسكره من اهل الشام الذين ندبهم لقتال اهل المدينة من الصحابة والتابعين. (مرقاة المفاتيح: ۸/۳۴۰۲، كتاب الفتن، ط دار الفكر)

غرض علامہ ابن العربی کا یہ استدلال اس قدر بے بنیاد ہے کہ اسے مان کر ہر دور کے ہر بدترین شخص کو پاک باز اور دودھ کا دُھلا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جمہور علمائے امت نے علامہ ابن العربی کی عظیم علمی خدمات کے اعتراف اور ان سے استفادے کے باوجود ان کے اس منفرد اور کمزور قول کو کبھی قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔

☆☆☆

کیا یزید کا اظہارِ افسوس یا قتل کا حکم نہ دینا بری الذمہ ہونے کی دلیل ہے؟

﴿سوال﴾ یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں کہ یزید نے کربلا یا واقعۂ حرہ میں مظالم کا حکم دیا ہو۔ اس لیے جو کچھ ہوا اس میں یزید کی مرضی شامل نہ تھی۔ اس کا اظہارِ افسوس ثابت کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے وہ بری ہے۔

﴿جواب﴾ یزید مطلق العنان حکمران تھا۔ اس کی طرف سے یہ عذر بھلا کیسے کافی ہو سکتا ہے کہ اس کی طرف سے ظلم وستم کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ایسے سنگین اور نازک معاملات میں غلط حکم نہ دینا کافی نہیں بلکہ صحیح ہدایات دینا ضروری تھا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ایک جگہ منقول ہے کہ: ''بازار میں جہاں عورتوں کا ہجوم ہو وہاں گناہ سے بچنے کے لیے عدمِ قصدِ نظر کافی نہیں بلکہ قصدِ عدمِ نظر ضروری ہے۔''

یعنی وہاں گناہ سے بچنے کے لیے یہ کافی نہیں کہ بندہ کہہ دے میرا عورتوں کو دیکھنے کا ارادہ نہیں تھا، بس نظر پڑ گئی؛ کیوں کہ جہاں پہلے ہی غیر محرم دکھائی دینے کا خطرہ ہے، وہاں سنبھل کر جانا چاہیے۔ یہ ارادہ اور کوشش کرنا ضروری ہے کہ نگاہ جھکی رہے گی۔ اس کے بعد بھی نگاہ پڑ جائے تو معاف ہے۔ یہی ضابطہ ہر جگہ ہے۔ قتل کا حکم نہ دینے سے یزید کی برأت ثابت نہیں ہوتی جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ اس نے فوج کو صحیح ہدایات دے دی تھیں۔

عقلاً ونقلاً دونوں طرح یہ ثابت ہے کہ یزید کی طرف سے صحیح اور واضح ہدایات جاری نہیں کی گئیں۔

نقلاً اس طرح کہ ایسا کسی ضعیف روایت میں بھی مذکور نہیں کہ یزید نے حکم دیا ہو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے اچھا سلوک کیا جائے، انہیں دمشق بھیج دیا جائے۔ مدینہ میں لوٹ مار نہ ہو، مسلمانوں کی عزت وآبرو کا خیال رکھا جائے۔

اگر کوئی کہے کہ ''یزید نے ایسی ہدایات ضرور دی ہوں گی مگر وہ تاریخ میں منقول نہیں۔'' تو عقل اس قیاس کو نہیں مان سکتی؛ کیوں کہ اگر یزید نے یہ ہدایات دی ہوتیں تو فوج جو اس کی وفادار تھی، اس حد تک اس کی نافرمانی نہیں کر سکتی تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ان کے اصحاب سمیت قتل ہی کر ڈالتی یا محض اپنی مرضی سے مدینہ کو لوٹ لیتی۔ [1]

---

[1] یزید کی طرف سے جاری کردہ جو آخری ہدایات تاریخ میں منقول ہیں ان میں عبید اللہ بن زیاد کو مسلم بن عقیل کا کام تمام کرنے پر شاباش دی گئی تھی اور سرحدوں پر جاسوس اور نگران متعین کرنے کی تاکید کے ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ شک کی بناء پر دشمن کو حراست میں لے لینا مگر جنگ اسی سے کرنا جو تم سے جنگ کرے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ایسے امتحانات سے لوگ ترقی پاتے ہیں یا غلاموں کی طرح پست درجہ ہو جاتے ہیں۔ (**معجم کبیر للطبرانی: ۳/۱۱۵ ؛ تاریخ الطبری: ۵/۳۸۱**) اس حکم نامے میں یہ وضاحت بالکل نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبے کا خیال رکھا جائے اور ان سے مذاکرات کا دروازہ کھلا رکھا جائے بلکہ ان مراسلوں کا مجموعی تاثر یہ نکلتا ہے کہ حالات سے نبرد آزما ہونے کی پوری ذمہ داری ابن زیاد پر ڈالی جا رہی ہے اور اسی ذمہ داری کے بقدر اسے مکمل اختیار بھی دیا جا رہا ہے۔ پس ابن زیاد کو حکومت کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے جو سمجھ میں آیا، وہ جائز یا ناجائز کی پروا کیے بغیر اسے کر گزرا۔

نیز اگر یزید نے ایسی ہدایات دی ہوتیں تو وہ ان سانحوں کے فوراً بعد ان کے مرتکب افسران سے سخت باز پرس کرتا کہ میری واضح ہدایات کے باوجود تم نے ایسا ظلم کیوں ڈھایا؟ مگر یزید سے ایسی کوئی بات منقول نہیں۔ جو اس کا ثبوت ہے کہ اسے خود بھی اعتراف تھا کہ اس نے صحیح ہدایات جاری نہیں کی تھیں۔ ورنہ جہاں وہ یہ کہہ رہا تھا کہ "اللہ ابن مرجانہ کا بُرا کرے" وہاں یہ بھی کہتا کہ "میں نے تو اسے خونریزی سے منع کیا تھا۔" جب اس نے اہلِ مدینہ کی تباہی کا سن کر کہا تھا: "ہائے میری قوم!" وہاں یہ بھی کہہ دیتا کہ "میرے منع کرنے کے باوجود مسلم بن عقبہ نے ایسا کیوں کیا؟"

یزید کا ابن زیاد اور اس جیسے مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ اس کو اپنے قصور کا احساس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر ان افسران سے باز پرس کی گئی تو یہی کہیں گے کہ "آپ نے جو مہم سپرد کی تھی ،ہم نے اسے اپنی حد تک بہترین طور پر انجام دیا ہے۔ اگر واقعی آپ کے ذہن میں یہ تھا کہ اس کارروائی کو فلاں فلاں حدود کے اندر رہتے ہوئے انجام دینا ہے تو یہ آپ کا فرض تھا کہ ہمیں پہلے آگاہ کر دیتے۔"

ظاہر ہے کہ یزید کے پاس ان کی دلیل کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ اس لیے اس نے اپنے حکام کو پس پشت چند لعنت ملامت کے کلمات کہنے پر ہی اکتفا کیا اور باز پرس کی کوشش نہ کی کہ کہیں اپنی کوتاہی زیادہ بے نقاب نہ ہو جائے۔

غرض عقلاً ونقلاً دونوں طرح یہ ثابت ہے کہ یزید نے اس قدر نازک معاملے کو سرسری انداز میں لیا اور اسے حل کرنے کی قرار واقعی کوشش نہیں کی۔ ایک سنجیدہ اور ذمہ دار حکمران ہرگز ایسی بے تدبیری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یزید نہایت لاپرواہ حکمران تھا اور اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اس کی یہ لاپرواہی ایک ایسے عظیم المیے کو جنم دے گی جس کے اثرات حکمران کے لیے ہمیشہ کی عار اور حکومت کے لیے مہلک ثابت ہوں گے۔

☆☆☆

کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خون معاف تھا؟

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ معرکہ میں قتل ہوئے تھے، قتل کرنے والے تاویل کے ساتھ ایک بغاوت کو فرو کر رہے تھے، اس لیے ان سے قصاص مشروع نہ تھا جیسے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص مشروع نہیں سمجھا گیا۔ پس یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کا مواخذہ نہ کرنے پر کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟

﴿جواب﴾ شرعی مسئلہ جس پر صحابہ کا اجماع ہوا تھا، یہ تھا کہ باغیوں سے لڑائی کے دوران فریقین کا جو جانی و مالی نقصان ہوا ہے وہ ناقابلِ ضمان ہوگا اور اس پر کوئی عدالتی مواخذہ نہیں ہوگا۔

اب مذکورہ اشکال اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو باغی مانا جائے۔ بغاوت کا اطلاق ہونے کے لیے علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ چند عورتوں، چند بچوں اور چند مردوں کے ساتھ کس خطۂ زمین پر قابض تھے؟ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی آخری پیش کش کے ذریعے جس میں یزید کے پاس جانے کا موقع دینے کی درخواست تھی، اپنی پوزیشن اتنی صاف کر دی تھی کہ کوئی دشمن بھی

انہیں باغی نہیں کہہ سکتا تھا اور اسی لیے آخری لمحات میں سرکاری افسر حر بن یزید نے فوج کو چھوڑ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صف میں شمولیت اختیار کر لی؛ کیوں کہ مظلوم اور ظالم کا فرق بالکل واضح ہو چکا تھا۔

مگر اس کے بعد بھی سرکاری فوجیوں نے قافلۂ حسینی کو اپنی چیرہ دستی کا نشانہ بنایا۔ اسے معرکہ نہیں کہا جا سکتا جس میں ایک طرف چار ہزار سپاہی تھے اور دوسری طرف گنتی کے چند افراد۔ یہ ایک جم غفیر کا چند بے قصور افراد پر اجتماعی حملہ تھا۔

ایسے میں اضطراری طور پر مظلوم افراد کی طرف سے بھی ہتھیار چل جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملے کے وقت ان کے چند غلام قاتلوں سے بھڑ گئے تھے اور لڑتے لڑتے قتل ہو گئے تھے، نیز عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما بھی انہیں بچانے آئے تھے اور شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان کی مزاحمت یقیناً اضطراری تھی اور اس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو "حالتِ جنگ" کا قتل شمار کر کے قصاص سے خارج نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھیوں پر ایک بڑی جماعت کا حملہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔ یہاں بھی مزاحمت اضطراری تھی جس کی وجہ سے معاملہ قتلِ عمد اور قصاص کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ لڑتے ہوئے شہید نہیں ہوئے بلکہ سجدے میں ان کا سر قلم کیا گیا جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے بلا مزاحمت قتل کیا گیا۔ پس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح مظلومانہ تھی۔ یہ دونوں مقدمے بلا شبہ قتلِ عمد کے تھے جن میں حملہ کرنے والے یقیناً ظالم اور قابلِ قصاص تھے۔

حملہ آوروں کو تاویل کا فائدہ یہاں نہیں مل سکتا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو باغی قرار دینے کی تاویل بالکل باطل اور خیالِ فاسد ہے جس کا کوئی وزن نہیں۔ کچھ فاسد تاویلات تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے ذہنوں میں بھی تھیں۔ کیا ان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون معاف ہو سکتا تھا!!

☆☆☆

حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر پانی کی بندش ہوئی تھی یا نہیں؟

﴿سوال﴾ محمود عباسی اور مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے سانحۂ کربلا کے بارے میں ابو مخنف کی روایات کا عقلی دلائل کی روشنی میں جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء پر تین دن تک پانی بند رکھنے کا واقعہ محض افسانہ ہے۔ ابو مخنف نے یہ کہانی گھڑنے کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کربلا پہنچنے کی تاریخ بھی غلط بتائی ہے۔ اگر مکہ اور کربلاء کی درمیانی منازل اور سفر کی ممکنہ رفتار کو ملحوظ رکھا جائے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ چھ یا سات محرم کو کربلا پہنچ ہی نہیں سکتے تھے تو تین دن پانی بند رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ نیز بعض تاریخی روایات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا شہادت سے پہلے غسل کرنا بھی منقول ہے۔ اگر پانی بند ہوتا تو غسل کیسے فرماتے؟

﴿جواب﴾ ہمارے نزدیک یہ بحث بے مقصد ہے۔ کسی شخص کو بھوکا پیاسا رکھ کر قتل کیا گیا ہو، یا کھلا پلا کر۔ بات

تو ایک ہی ہے۔ اگر پانی ملنا ثابت ہوجائے تو کیا اس سے شہدائے کربلا کی مظلومیت کم ہوجائے گی ؟ کیا اس طرح یزید، ابن زیاد اور دوسرے حکام رحم دل اور عادل ثابت ہوجائیں گے۔

جب کوئی فوج محصورین پر پانی کی بندش کرتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محصور افراد کو زندہ گرفتار کرلیا جائے۔ وہ بھوک پیاس سے اتنے نڈھال ہوجائیں کہ لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیں، جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔ اگر کسی فوج نے یہ زحمت نہیں کی اور براہِ راست حملہ کردیا تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ بہر صورت کشت وخون پر تلی ہوئی ہے۔

پس پانی کی بندش کا واقعہ ثابت نہ ہونے سے یزیدی حکام اور افواج کی سیاہ کاریوں میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی بلکہ ایک پہلو سے ان کا جرم اور شدید ہوجاتا ہے۔

☆☆☆

جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل شیعہ تھے تو یزید اور ابن زیاد پر الزام کیوں؟

﴿سوال﴾ بہت سے علمائے کرام نے لکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل خود شیعہ تھے۔ ایسے میں یزید اور ابن زیاد وغیرہ کو الزام دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ جن علماء نے ایسا لکھا ہے انہوں نے یزید اور اس کے حکام کی زیادتیوں کی نفی نہیں کی۔ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ یزید کی فوج میں شیعانِ علی بھی شامل تھے۔ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدد کا وعدہ کیا مگر امتحان کی گھڑی میں وہ یزید کے گورنر عبید اللہ بن زیاد کی سختیاں دیکھ کر ڈر گئے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے غداری کرکے سرکاری فوج کے ساتھ اشتراک کرلیا۔ اس سے سرکاری فوج، سپہ سالار، گورنر اور یزید کی پاکی کہاں ثابت ہوتی ہے؟

اگر کوئی گروہ اہلِ حق سے غداری کرکے ان کے دشمنوں سے جاملے اور وہ دونوں طاقتیں مل کر اہلِ حق کے خون کی ندیاں بہادیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف غداری کرنے والے گناہ گار تھے۔ جس اصل دشمن نے دباؤ، دھونس یا لالچ کے ذریعے انہیں اپنے ساتھ ملایا اور جس کی سربراہی یا قیادت میں یہ ظلم ہوا وہ متقی پرہیزگار تھے!!

دراصل بعض علماء نے مناظرانہ اسلوب کی تحریر یا تقریر میں ان اہلِ تشیع کو جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام اہلِ سنت پر لگاتے ہیں، الزامی جواب دینے کے لیے ضرور یہ بیان کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شیعوں نے شہید کیا اور اس کے ثبوت میں کتبِ تواریخ اور شیعی مآخذ سے ایسی عبارتیں پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یزیدی فوج میں شامل فلاں فلاں شخص شیعہ تھا اور سادات نے اسی لیے اہلِ کوفہ کو بار بار ملامت بھی کی تھی۔

لیکن اگر آج کل کے کوئی ''محقق صاحب'' ان علماء کی تحریر وتقریر کا یہ مطلب نکالنے لگیں کہ ان کے نزدیک ''شیعانِ یزید'' تمام جرائم سے بالکل بری تھے اور سارا قصور شیعانِ علی کا تھا، تو اس سے بڑھ کر بددیانتی اور کیا ہوگی۔ اور اگر واقعی کسی عالم نے یزید اور اس کے حکام کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی بھی ہے تو یہ کھلے حقائق کا انکار ہے۔ اگر کسی عالم کی بات آنکھیں بند کرکے ماننی ہے تو پھر قدیم جلیل القدر علمائے ربانیین زیادہ حق دار ہیں کہ ان کی تحقیق مانی جائے۔



امام طبری، علامہ ابن جوزی، حافظ ابن کثیر اور حافظ ذہبی رحمہم اللہ سے لے کر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ تک سبھی علماء نے واقعہ کربلا کا جو حال بیان کیا ہے، اس کے مطابق بلاشبہ حکام اور سرکاری فوج سادات کے قتل کے ذمہ دار ثابت ہوتے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کی واضح تصریحات کے خلاف اگر کسی ''محقق'' نے کچھ لکھ دیا ہے تو وہ قابلِ ترک ہے نہ کہ قابلِ تقلید۔

اور اگر بات کسی کی تقلید کر کے نہیں بلکہ تحقیق کے لحاظ سے ماننی ہے تو صحیح وحسن روایت کو قبول کرنا اور ان سے معارض ضعیف روایات کو مسترد کرنا تحقیق کا اٹل اصول ہے۔ صحیح اور حسن روایات سے ثابت ہے کہ یزید کو عراق کی حکومت بچانا تھی، اس نے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت وہاں سے معتدل مزاج گورنر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ایک گستاخِ صحابہ اور بدنامِ زمانہ شخص عبیداللہ بن زیاد کو وہاں مقرر کیا اور حکم دیا کہ کسی بھی طرح اس معاملے پر قابو پا کر دکھاؤ۔ اس کے بعد ابن زیاد کے حکم سے عمر بن سعد کا فوج لے کر جانا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مذاکرات کا موقع تک نہ دینا، حملہ کر کے انہیں خاندان سمیت شہید کر دینا اور پھر نعش کے کپڑے تک اتار لینا، اس کے بعد یزید کی طرف سے اس قیامتِ صغریٰ پر محض زبانی افسوس پر اکتفا کرنا اور ابن زیاد سمیت کسی مجرم کے خلاف کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کرنا اور اس کے بعد اسی کرّ وفر کے ساتھ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پر لشکر کشی کرانا، یہ تمام باتیں ایسے ثقہ راویوں سے ثابت ہیں جن کی روایات کو بخاری ومسلم سمیت بڑے بڑے محدثین نے قبول کیا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل میں بعض شیعانِ علی کے شریک ہونے کے متعلق یہ اصولی بات یاد رکھیں کہ کسی صحیح سند میں یہ ہرگز منقول نہیں بلکہ یہ محض ضعیف اسناد کا مواد ہے۔ (اگرچہ ضرورتاً اس ضعیف مواد کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس سے اسلامی عقائد پر کوئی زد نہیں پڑتی۔)

دوسرے یہ بات جان لی جائے کہ ان ضعیف روایات سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو فوج حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے لڑنے گئی تھی اس میں شامل شیعانِ علی ماتحت افسران یا عام سپاہیوں کی حیثیت سے تھے۔ محاذ کی کمان عمر بن سعد کے ہاتھ میں تھی، عمر بن سعد عبیداللہ بن زیاد کے حکم پر چل رہا تھا اور عبیداللہ بن زیاد کی لگام یزید کے ہاتھ میں تھی جو اس نے بالکل کھلی چھوڑ رکھی تھی۔ سپاہی اور افسران حکام کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ دوست یا دشمن کا انتخاب کرنا ان کا نہیں حکام کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جنگ شروع کرنے یا ختم کرنے کا اختیار بھی حکام کو ہوتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے قافلے کو نمٹانے کا فیصلہ عبیداللہ بن زیاد نے کیا تھا۔ اس لیے اصل مجرم حکومت تھی اور شیعانِ علی میں سے کچھ یا بہت سے لوگ اس جرم میں حکومت کے شریکِ کار تھے۔ یہ صحیح اور حسن روایات اور تاریخی تواتر سے ثابت ہے۔

جہاں تک اہلِ حق کا تعلق ہے، وہ اس جرم سے اس وقت بھی بری تھے اور تب سے اب تک اس ظلم میں شریک ہر فرد سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں چاہے وہ شیعانِ علی میں سے ہو یا شیعانِ یزید میں سے۔

☆☆☆

شیعانِ علی سرکاری فوج میں کیسے آ گئے؟

﴿سوال﴾ شیعانِ علی سرکاری فوج کا حصہ کیسے بن گئے۔ کیا انہیں اسی وقت بھرتی کیا گیا تھا یا صورتحال کچھ اور تھی؟

﴿جواب﴾ کوفہ کی آبادی میں پہلے سے شیعانِ علی کی اکثریت تھی۔ ان میں سے بہت سے سرکاری فوج میں ملازم تھے۔ مختلف تاریخی روایات کے مطابق اہلِ کوفہ میں سے سولہ، اٹھارہ یا تیس ہزار تک افراد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کا وعدہ کیا تھا بلکہ حُصَین بن عبدالرحمن کی صحیح السند روایت کے مطابق وہ ایک لاکھ افراد تھے۔

اس وقت کوفہ کی کل آبادی زیادہ سے زیادہ تین چار لاکھ تھی۔ ان میں لگ بھگ ایک لاکھ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوفہ کے جوانوں اور جنگجوؤں کی اکثریت حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عہدِ وفا کر چکی تھی۔ ظاہر ہے ان میں خاصی تعداد فوج کے افسران اور سپاہیوں کی بھی ہوگی۔ جب کربلا کے لیے فوج ترتیب دی گئی تو ایسے لوگ بھی اس میں شامل ہوئے جو کل تک عاشقِ سادات بنے ہوئے تھے۔ مگر اب انہیں سرکاری حکم کے سامنے دَم مارنے کی مجال نہ ہوئی اور وہ حکومت کے جرم میں برابر کے شریک بن گئے۔

☆☆☆

کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ کے شیعانِ علی سے واقف نہ تھے؟

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک باطل فرقے کے لوگوں سے مدد طلب کرنے کیوں گئے تھے؟ عربوں کی جگہ انہوں نے عجمیوں پر بھروسہ کیوں کیا؟ کیا عرب مسلمان ان کی مدد کے لیے تیار نہیں تھے؟ اور اگر واقعی نہیں تھے اور صرف ایک باطل فرقہ انہیں مدد کا جھانسا دے رہا تھا، تو کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ایک باطل فرقے کا مقصد پورا کرنے نکلے تھے چاہے شعوری طور پر چاہے غیر شعوری طور پر؟

﴿جواب﴾ کیا یہ ممکن ہے کہ کوفیوں کے عقیدے کو آج کے ''محققین'' جان لیں مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہ جانتے ہوں؟ سچ یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن کے پاس جا رہے تھے وہ عمومی طور پر صحیح العقیدہ تھے؛ کیوں کہ اس دور کے اکثر شیعانِ علی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن سمیت تمام صحابہ کا احترام کرتے تھے۔ عام مسلمانوں سے ان کا کوئی اصولی اختلاف نہ تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو اتنا کہ ان میں بہت سے لوگ (نہ کہ سب) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتے تھے۔[1] انہیں دعوت دینے والے شیعانِ علی عجمی نہیں اکثر عرب تھے۔ عجمی اگر ہوں گے تو اِکا دُکا اور غیر معروف جن کے نام تک تاریخ میں محفوظ نہیں۔ کوفہ اور بصرہ میں زیادہ آبادی عربوں ہی کی تھی۔ مگر غیر مستقل مزاجی یہاں کی مٹی میں رچی ہوئی تھی۔ اس لیے سادات کو یہاں اچھے اعوان و انصار میسر نہ آ سکے۔

شیعانِ علی کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدد سے پہلوتہی کرنا اور اس سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے میں کوتاہی کرنا یقیناً باعثِ شرم تھا۔ مگر ''شیعانِ علی'' ہونا بدعقیدگی کے ہم معنیٰ ہرگز نہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے ''شیعانِ عثمان'' یا ''شیعانِ مُعاویہ'' ہونا بدعقیدگی کے مترادف نہیں۔ ہاں! ان جماعتوں میں سے جو تشدد اختیار

کر کے ناصبی یا رافضی بنا، اہلِ حق نے اس سے صاف صاف اظہارِ براءت کر دیا۔[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ عالم الغیب نہ تھے کہ مستقبل کو دیکھ لیتے مگر جہاں تک ظاہری اسباب اور ظاہری حالات کا تعلق ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان سے واقف تھے۔ وہ اہلِ کوفہ کے بھلے بُرے کو خوب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی اکثریت اسی طرح صحیح الاعتقاد ہے جیسے اہلِ مکہ یا اہلِ مدینہ کی۔ مگر وہ حرمین شریفین کو خونریزی سے بچانا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے حجاز میں حامی جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ ہزاروں ساتھی انہیں وہاں بھی میسر آ سکتے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی رائے یہی تھی کہ مکہ میں رہ کر جدوجہد کی جائے مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "اگر میں کہیں اور قتل کر دیا جاؤں تو بہتر ہے، مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ میری وجہ سے اس سرزمین کی عظمت پامال ہو۔"[2]

☆☆☆

کربلا میں لڑنے والی فوج کوفہ کی تھی یا دِمَشق کی؟

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والی فوج کوفہ کی تھی یا شام کی؟ اگر کوفہ کی تھی تو یزید پر الزام کیوں؟

﴿جواب﴾ کیا کوفہ اور شام دو الگ الگ ملک تھے؟ یا ایک ہی حکومت اور ایک ہی حکمران کے تحت تھے؟ اور کیا کوئی کارروائی حکومت کی طرف تبھی منسوب ہوتی ہے جب دارالحکومت سے خصوصی فوج جا کر اس میں شریک ہو؟ کیا حکمران کی طرف سے ماتحت حکام کو اختیارات دینا اور ان کی فوج سے کام لینا، کارروائی کی نسبت حکمران کی طرف کرنے کے لیے کافی نہیں؟ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قافلے پر حملے کے لیے دِمَشق سے پچاس ساٹھ ہزار سپاہی کربلا آتے، تب ہی یزید کا ظلم ثابت ہوتا؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے چھوٹے سے قافلے کی بہ نسبت کوفہ کی چھاؤنی میں کئی گنا زیادہ فوج پہلے سے موجود تھی۔ حکومت کا مقصد پورا کرنے کے لیے یہ سپاہی بہت کافی تھے، اس لیے شام سے فوج بلانے کی کوئی ضرورت سرے سے نہیں تھی۔ اس بے تکی دلیل سے بھلا یزیدی حکومت کی براءت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟

☆☆☆

---

① ولیس کل من قتل مع علیٰ کان یفضله علیٰ عثمان، بل کان کثیر منهم یفضل عثمان علیه کما هو قول سائر اهل السنة." (منهاج السنة: ۱/۱۸۵)
اس معمولی اختلاف کو اکثر متکلمین نے بدعت بھی شمار نہیں کیا بلکہ اس کی گنجائش رکھی ہے۔ کوفہ کے نامور محدثین اور فقہاء کی بہت بڑی تعداد یہی عقیدہ رکھتی تھی مگر ان میں سے کسی کو بدعتی یا گمراہ شمار نہیں کیا گیا بلکہ وہ اہلِ سنت کے صفِ اوّل کے امام مانے گئے ہیں۔ امام ابن حجر الہیثمی فرماتے ہیں:
اعلم ان الذی اطبق علیه عظماء الملة وعلماء الامة ان افضل هذه الامة ابوبکر الصدیق ثم عمر. ثم اختلفوا: فالاکثرون ومنهم الشافعی واحمد وهو المشهور عن مالک، ان الافضل بعدهما عثمان، ثم علیّ رضی الله عنهم. وجزم الکوفیون ومنهم سفیان الثوری بتفضیل علیّ علیٰ عثمان. وقیل بالوقف عن التفاضل بینهما. وهو روایة عن مالک. (الصواعق المحرقة: ۱/۱۶۹)
دیگر علماء کی عبارات بھی یہی بتاتی ہیں: لایکون رافضیا مبتدعا بتفضیل علیّ علیٰ عثمان. (لوامع الانوار البهیة علامة السفارینی الحنبلی: ۲/۳۵۵)
واتفق اهل السنة علیٰ ان افضلهم ابوبکر ثم عمر رضی الله عنهما. وقال بعض اهل السنة من اهل الکوفة بتقدیم علیّ علیٰ عثمان، والصحیح المشهور تقدیم عثمان رضی اللہ عنہ (التوضیح عن توحید الخلاق: ۱/۸۶، سلیمان بن عبدالله بن محمد بن عبدالوهاب)
وقد نازع بعض اهل السنة فی افضلیة عثمان علیٰ علیّ فجزم بتفضیل علیّ علیٰ عثمان ولکن الذی علیه الائمة الاربعة واتباعهم هو الاوّل. (الدرر السنیة فی اجوبة النجدیة: ۱/۲۱۵)

② اخبار مکة للفاکهی: ۲/۲۴۲، رجاله ثقات، ط دار خضر



یزید کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موازنہ

﴿سوال﴾ کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یزید قاتلینِ حسین کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنے میں معذور تھا؟ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی قاتلینِ عثمان سے قصاص نہیں لیا تھا۔ جس طرح وہ معذور تھے اسی طرح یزید بھی معذور تھا۔

﴿جواب﴾ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجتہد بلکہ مجتہدین کے امام تھے، ان کا فیصلہ اجتہادی تھا، اس پر کوئی حرف گیری درست نہیں چاہے ہمیں اس کے دلائل معلوم نہ ہوں۔ پھر وہ صحابی تھے، ان سے حسنِ ظن واجب ہے۔ یزید مجتہد تھا نہ صحابی۔ اسے نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھنا پڑے گا جیسا کہ محدثین نے صحابہ کے سوا سب کو پرکھا ہے، کسی تابعی کی بھی رعایت نہیں کی۔ یہ فرقِ مراتب کی اصولی بات تھی اور سلیم طبائع کے لیے اتنا فرق جان لینا کافی ہے۔

لیکن اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور یزید دونوں کو برابر رکھ کر دیکھا جائے تب بھی صورتِ مسئلہ میں فرق واضح ہے۔ مثلاً:

① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اہلکاروں نے نہیں کیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل یزید کے اہلکاروں نے یعنی یزید کے گورنر کے حکم سے اس کے سپاہیوں نے کیا تھا۔

② حضرت علی رضی اللہ عنہ یقیناً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے بری ہیں۔ انہوں نے عملاً بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بچانے کی کوشش کی، اپنی اولاد کو پہرے کے لیے بھیجا جو دفاع کرتے ہوئے زخمی ہوئے۔ پھر قتلِ عثمان میں شرکت سے برأت کی قسم کھائی۔ اس لیے ان کی برأت یقینی ہے۔

یزید کا قتلِ حسین سے بری ہونا ایک امکانی بات ہے۔ حسنِ ظن کے دائرے کو بہت وسیع کیا جائے تو اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ جن لوگوں سے رعایت برت رہے تھے، وہ سابقہ باغی تھے جو بیعت کر کے شرعاً مامون ہو چکے تھے مثلاً: اَشتر نخعی اور محمد بن ابی بکر، ان سے قصاص لینا از روئے شرع بھی درست نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اصل قاتل یا تو موقع واردات پر قتل ہو چکے تھے جیسے سُودان بن حُمران یا قُتَیر ہ۔ یا مبہم اور نامعلوم تھے جیسے جَبَلہ اور الموت الاسود۔ یا فرار ہو کر شام ومصر چلے گئے تھے جیسے: کِنانہ بن بِشر۔ بالفرض اگر کوئی قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اردگرد تھا تو اس کے خلاف شرعی گواہی دستیاب نہ تھی ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص چھوڑنے والے نہ تھے۔

جہاں تک قاتلینِ حسین کا تعلق ہے وہ حکومتی عہدے دار، گورنر، سپہ سالار، نائب سالار اور فوج کے سپاہی تھے اور بالکل متعین تھے۔ ان میں سے کسی نے قتلِ حسین میں شرکت سے برأت بھی ظاہر نہیں کی۔ ان میں سے کوئی اسے جرم

نہیں سمجھتا تھا۔ ابن زیاد خود کہتا تھا: ''حسین مجھے مارنے آرہے تھے۔ اچھا کیا کہ میں نے انہیں مار دیا۔''[1]

شمر برملا کہتا تھا: ''اگر ہم حکم کی تعمیل نہ کرتے تو ہمارا حال گدھوں سے بدتر ہوجاتا۔''[2]

سرِ حسین کاٹنے والا خود فخریہ شعر پڑھتا ہوا قصرِ امارت پہنچا تھا۔[3]

یہ شخص بڑے فخر کے ساتھ حجاج بن یوسف جیسے سخت مزاج اموی حکام کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا واقعہ سناتا تھا مگر کبھی کسی نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا۔[4]

اس لیے یہاں قاتلوں کی نامزدگی کا مسئلہ کوئی نہ تھا۔ افراد بالکل واضح تھے۔ یعنی سب سے اوپر عبیداللہ بن زیاد جس نے فوج کشی کا حکم دیا۔ پھر عمر بن سعد جو فوج لے کر گیا۔ پھر شمر جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر حملے کی قیادت کی۔ پھر سنان بن انس اور خولی بن یزید جنہوں نے قتل کیا اور سر اتارا۔ یزید کو ان سے باز پرس میں کیا مشکل تھی؟

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ افتراق کا تھا کہ خلافت سنبھالتے ہی پہلے جنگِ جمل، پھر جنگِ صفین پھر خوارج وغیرہ سے پالا پڑا۔ اہلِ شام سے سرحدوں کی حفاظت کا مسئلہ ہمیشہ سر پر رہا۔ ان کے آخری سال ۴۰ھ میں جا کر صلح ہوئی اور سرحدیں مامون قرار دی گئیں۔ ایسے میں ان کے لیے اکثر وقت حالات پُر آشوب ہی رہے۔

یزید کے لیے پریشانیاں ایسی نہیں تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پورا عالمِ اسلام اسے ہموار کر کے دے گئے تھے۔ سانحۂ کربلا کے بعد بھی دو سال تک عالمِ اسلام میں سکوت رہا، کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ وقعہ حرہ چوتھے سال میں جا کر ہوا۔ اس دوران یزید کے لیے کیا مشکل تھی کہ مجرموں کو اگر وہ مجرم سمجھتا تھا تو ان کا محاسبہ کرتا؟

☆☆☆

کیا یزید رو دھو کر بری الذمہ نہیں ہو گیا؟

﴿سوال﴾ کیا سانحۂ کربلا پر یزید کا اظہارِ رنج و غم اور سادات کا اعزاز و اکرام اسے بری کرنے کے لیے کافی نہیں؟

﴿جواب﴾ حکمران عدل و انصاف فراہم کرنے اور ظالموں کو انجام تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ اظہارِ رنج و غم کر کے وہ شخص تو بری ہو سکتا ہے کہ جو بے اختیار ہو۔ ایک مطلق العنان حکمران جب تک اپنی ذمہ داری پوری طرح انجام نہ دے وہ عنداللہ بری ہو سکتا ہے نہ عندالناس۔ تاریخی حقائق اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں کہ یزید اس سانحے سے بری الذمہ نہیں تھا بلکہ اس کا ماحول پیدا کرنے میں اس کی سیاسی غلطیوں کا پورا پورا دخل تھا۔ مثلاً:

---

① تاریخ طبری: ۵۲۲/۵

② تاریخ الاسلام للذھبی تدمری: ۱۲۶/۵ ؛ بشار: ۶۴۴/۲

③ تاریخ طبری: ۳۸۹/۵ عن عمار بسند حسن

④ ثنا ابوبکر بن عیاش حدثنی اسلم المنقری، قال دخلت علی الحجاج فدخل سنان بن انس قاتل الحسین، فاذا شیخ آدم فیہ حناء، طویل الانف فی وجھہ برش فاوقف فی حیال الحجاج فنظر الیہ الحجاج فقال: انت قتلت الحسین؟ قال: نعم، قال: وکیف صنعت؟، قال: دعمتہ بالرمح، وھبرتہ بالسیف ھبراً، فقال لہ الحجاج: اما انکما لن تجتمعا فی دار. (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۱/۳)

❶ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو مسلم بن عقیل سے نرمی برتتا دیکھ کر اس نے معاملے کا تمام اختیار عبید اللہ بن زیاد کو دے دیا تھا تا کہ سختی سے کام لیا جائے۔

❷ ابن زیاد نے آتے ہی مسلم بن عقیل کو قتل کرا دیا۔ یہ اطلاع یزید کو مل گئی تھی اور اس پر ابن زیاد کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی تھی۔ یزید کو کیا یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ ابن زیاد کے ہاتھوں ایک حریف کا صفایا ہو چکا ہے، اور اب دوسرے کا انجام بھی ایسا بلکہ اس سے زیادہ سخت ہو سکتا ہے۔ اور اگر واقعی وہ یہ اندازہ نہ لگا سکا تو اس سے بڑھ کر غبی کون ہوگا؟

❸ اگر یزید کو معاملہ نرمی سے نمٹانا ہوتا تو ابن زیاد کو اوّل تو بھیجتا ہی نہیں۔ یا اسے سرزنش ضرور کرتا کہ مسلم بن عقیل کو تم نے قتل کیوں کیا؟ یا کم از کم اسے یہ تنبیہ کر دیتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا نہ کرنا۔

❹ جب یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی کی اطلاع سنی تو عبید اللہ بن زیاد کو اتنا ہی لکھا کہ وہ آرہے ہیں، اہم معاملہ ہے، اسے نمٹا کر ترقی پاؤ گے یا معزول ہو جاؤ گے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟

❺ اگر یہ مطلب ہوتا کہ ان کا اعزاز و اکرام کرنا تو عبید اللہ بن زیاد کو کہاں جرأت ہوتی کہ وہ اپنے آقا کے حکم سے سرتابی کرتا۔ مالک و مملوک ایک دوسرے کے اشارے خوب پہچانتے ہیں؛ اس لیے عبید اللہ بن زیاد نے وہی کیا جو اس کے خیال میں یزید کی منشا تھی یعنی دوسرے دشمن کو بھی اسی طرح عبرت کا نشانہ بنانا جیسا پہلے کو بنایا گیا تھا۔

❻ ''ایسے معاملات میں پڑ کر لوگ ترقی پاتے ہیں یا معزول ہو جاتے ہیں'' سے یزید کی مراد نرمی کرنا ہوتی تو پھر سانحۂ کربلا کے بعد وہ ابن زیاد کو معزول کر دیتا مگر اس نے ابن زیاد کو اسی طرح عراق کی گورنری پر برقرار رکھا۔ ایسے میں زبانِ خلق تو یہی کہے گی کہ ابن زیاد نے یزید کی منشاء پوری کر دی تھی۔

❼ رہا یزید کا سادات کا اکرام کرنا تو اس سے یہ داغ دھل نہیں جاتا۔ یہ دنیادار بادشاہوں کی سیاست کا مروجہ دستور تھا جو پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اصل حریف نمٹ جائے تو اس کے ورثاء کی خوب ناز برداریاں کی جاتی ہیں تا کہ ان کے حامی ٹھنڈے پڑ جائیں اور کوئی نئی شورش نہ کھڑی ہو جائے۔ انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شہید کر کے نہایت شان و شوکت سے اس کی تدفین کی، پوری فوج نے سلامی دی۔ کیا اس طرح انگریزوں کا دامن پاک ہو گیا؟

❽ یزید کے رونے دھونے کو فطری اور طبعی مانا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ سیاست میں لوگ اپنے سگے بھائی کو قتل کرا دیتے ہیں۔ باپ دل پر پتھر رکھ کر بیٹے کو مروا دیتا ہے۔ بیٹا باپ کو قتل کر کے تخت سنبھال لیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے بھی یہ لوگ گوشت پوست کے حساس انسان ہی رہتے ہیں، اس لیے طبعی طور پر رنجیدہ بھی ہوتے ہیں، آنسو بھی بہاتے ہیں مگر پھر بھی وہ سیاسی فیصلے اسی عقلی قوت کے ساتھ کرتے ہیں جس کے پیچھے ملک گیری اور اقتدار کا قوی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ رو دھو کر بھی وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس سے کرسی مضبوط ہو، چاہے کچھ اور عزیز اس کی بھینٹ چڑھ جائیں۔

❾ یزید سانحۂ کربلا پر یقیناً غم زدہ ہوا اور گریہ وزاری سے خود کو نہ روک سکا مگر جب واقعہ حرہ پیش آیا تو اس نے کربلا سے بڑھ کر سختی کا ثبوت دیا۔ کربلا میں پچاس ساٹھ شہید ہوئے، حرہ میں سات سو نفوسِ قدسیہ کی لاشیں گریں اور مدینہ کی

حرمت پامال ہوئی۔ گھر لوٹے گئے، لوگ شہر سے بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

❿ یزید نے ایک بار پھر ''ہائے میری قوم'' کا نعرہ لگایا اور باقی ماندہ کے لیے خوراک بھی بھیج دی۔

⓫ مگر اس کے فوراً بعد مکہ پر اسی طرح چڑھائی کی، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے برگزیدہ صحابی کو زنجیروں میں جکڑ کر طوق پہنا کر سامنے لانے کی قسم کھائی۔

ان حقائق کے سامنے ہوتے ہوئے بھلا یزید کو بالکل بری الذمہ اور معصوم کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

☆☆☆

یزید اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں مماثلت کا شبہ اور اسلامی اصولِ حکمرانی پر ایک نگاہ

﴿سوال﴾ خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد کے لیے پورے عالمِ اسلام سے بیعت لینا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا بلکہ مرکز کے عمائد کی بیعت کافی سمجھی گئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اہلِ شام کے نزدیک منعقد نہیں ہوئی تھی مگر علماء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شرعی خلیفہ ہونے کی دلیل یہی دیتے ہیں کہ ان پر دارالخلافہ کے عمائد متفق ہوگئے تھے لہٰذا ان کی خلافت پورے عالمِ اسلام پر لازم ہوگئی تھی اور ان کی بیعت نہ کرنے والوں پر نہ صرف باغی کا اطلاق درست تھا بلکہ خلافت کو بچانے اور مملکتِ اسلامیہ کو متحد رکھنے کے لیے ان سے قتال بھی جائز ہوگیا تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یزید کی خلافت بھی پہلے دن سے منعقد ہوگئی تھی؛ کیوں کہ کم از کم دارالخلافہ دمشق میں سب نے اسے بطورِ خلیفہ قبول کرلیا تھا۔ اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حکومت مخالف سرگرمیوں پر نہ صرف خروج کا اطلاق بالکل واضح ہوجاتا ہے بلکہ ان کے خلاف طاقت کا استعمال بھی جائز ٹھہرتا ہے۔ پس ایسے میں یزید بلکہ عبیداللہ بن زیاد کو بھی موردِ الزام ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

﴿جواب﴾ یزید اور عبیداللہ بن زیاد غالباً معاملے کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہوں گے اور اس کے مطابق یزید کی خلافت کا پہلے روز سے انعقاد ثابت ہوجاتا ہے چاہے اس کی اہلیت کم درجے کی ہو اور چاہے افاضل صحابہ کی موجودگی میں اسے بادلِ نخواستہ قبول کیا گیا ہو۔ مگر کیا افاضلِ صحابہ کا موقف بھی یہی تھا؟ اس پر غور کرنا چاہیے۔

معاملے کو گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف واضح ہوجائے گا۔ بلاشبہ عام تعامل یہی تھا کہ امامت کے انعقاد کے لیے سیاسی مرکز کے عمائد کا اتفاق کافی ہوتا تھا اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اسی پر عمل رہا۔ مگر یہ تعاملِ صحابہ اس اصول پر مبنی تھا کہ خلیفہ کی بیعت، اُمت کے ان بہترین افراد یعنی مہاجرین وانصار کی رضا پر منحصر ہے جنہوں نے ابتدائی دور میں اسلام کے لیے قربانیاں دیں، جنہوں نے ہجرت کی اور جو فتح مکہ سے قبل مشکل مہمات میں رسول اللہ ﷺ کے شانہ بشانہ رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خدشے کے تحت کہ کہیں صفِ اوّل میں قربانیاں دینے والے مہاجرین وانصار کو بعد میں نظر انداز نہ کردیا جائے اور ہوشیار لوگ اقتدار پر تسلط حاصل نہ کرلیں، اس بات کو ایک باقاعدہ ضابطے کی شکل میں طے کردیا تھا۔ انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ درجِ ذیل اصول لاگو کیا تھا:

"یہ امرِ خلافت اس وقت تک اہلِ بدر پر منحصر رہے گا جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ پھر غزوۂ احد والوں پر منحصر رہے گا جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی باقی ہے۔ پھر فلاں غزوے والوں پر، پھر فلاں غزوے والوں پر۔ امرِ خلافت میں طلقاء (فتح مکہ کے دن آزاد کیے گئے افراد)، ان کی اولاد اور فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں کا ذرا بھی حصہ نہیں ہوگا۔"[1]

دورِ رسالت سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تک عشرۂ مبشرہ، اخیارِ صحابہ اور مذکورہ مراتب کے زیادہ تر لوگ مدینہ منورہ میں تھے۔ ان کی فقاہت، دیانت اور سیاسی بصیرت پر ساری اُمت کا پہلے سے اعتماد چلا آرہا تھا۔ ان میں سے بعض چوٹی کے حضرات مثلاً: حضرت سعید بن زید، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم کا کوئی حکومتی عہدہ نہ تھا مگر اپنے مراتب ومناقب کی وجہ سے یہ پوری اُمت کا نمائندہ مجمع تھا، لہٰذا انہی کی بیعت ساری اُمت کی بیعت کے قائم مقام تسلیم کی جاتی تھی۔

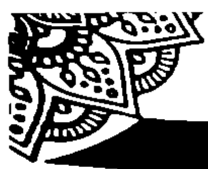
پس انتقالِ اقتدار کا اصول یہ تھا کہ اقتدار کو آئینی حیثیت ملنے کے لیے اُمت کے ان عالی مرتبت افراد کا اتفاق ضروری ہے جنہیں اسلام میں پہل کا شرف حاصل ہو اور جن کی قربانیاں نسبتاً زیادہ ہوں، چاہے وہ سیاسی مرکز میں ہوں یا باہر ہوں۔ خلفائے راشدین کے دور میں ایسا مجمع زیادہ تر مدینہ میں تھا، اس لیے ان کی بیعت کافی تھی۔ بعد میں یہ صورتحال نہ رہی اس لیے جہاں جہاں جو جو افاضلِ اُمت موجود تھے ان کی رضامندی ضروری تھی۔

مگر اہلِ شام نے اس اصول کو نظر انداز کر دیا اور باور یہ کرایا کہ مدینہ میں خلفاء کی بیعت کا انعقاد سیاسی مرکز کے امراء اور فوجی رؤساء کے اتفاق سے ہوا۔ لہٰذا اصول یہ ہے کہ اگر حکومتی عہدے دار اور عسکری ذمہ دار متفق ہو جائیں تو شرعی اقتدار ثابت ہو جاتا ہے چاہے اُمت کے بہترین لوگ اس سے متفق نہ ہوں۔ ان کے نزدیک یہی حکمت کی بات تھی کہ جن لوگوں کے پاس عسکری قوت ہو، مسئلے کا دارومدار انہی کی رائے پر رکھا جائے۔ بصورتِ دیگر فوجی رؤساء ناراض ہو کر بغاوتیں کریں گے اور اُمت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ جبکہ افضل، اشرف اور بزرگ ترین افراد کی رائے کو ترک کر دینے میں خانہ جنگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ بدمزگی ہوگی جسے برداشت کر لیا جائے گا۔

اسی دوسرے زاویۂ نگاہ کی وجہ سے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی میں حضرت سعید بن زید، حضرت سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم اور خود اپنے رفقاء میں سے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ اور اَحنف بن قیس رحمہ اللہ کے اختلافِ رائے کو نظر انداز کر کے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کرا دیا۔ یہی یزید اور اس کے گورنروں کا نقطۂ نظر تھا کہ امرائے دِمشق کی بیعت پورے عالمِ اسلام پر لازم اور واجب ہوگئی ہے۔

---

[1] عن عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ عن عمر رضی اللہ عنہ قال: هذا الامر في اهل بدر ما بقي منهم احد، ثم في اهل احد ما بقي منهم احد، و في كذا وكذا، وليس فيها لطليق ولا لولد طليق ولا لمسلمة الفتح شيء (طبقات ابن سعد: ۳/۳۴۲؛ جامع الاحاديث للسيوطي، ح: ۳۱۵۶۸؛ كنز العمال، ح: ۳۶۰۴۶، واخرجه الحافظ في الفتح الباري: ۱۳/۲۰۷)



مگر غور کیا جائے تو یہ رائے اسلامی سیاست کی آفاقیت سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اس اصول کو اپنانے کی وجہ سے اُمت شورائیت، استیناس اور عوامی ہم آہنگی کے فوائد سے محروم ہوگئی اور آگے چل کر عسکری مراکز کے عہدے داروں کو اُمت پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا پورا اختیار مل گیا چاہے ان کا کردار اچھا ہو یا بُرا۔ اسی کمزوری کی وجہ سے سیاست اہلِ شمشیر کے گھر کی لونڈی بن گئی اور شریعت کے ترجمان طبقے کے اثرات محدود تر ہوتے گئے۔

اس دوسری رائے کی وکالت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناگزیر حالات میں عارضی طور پر اس کی گنجائش ہوسکتی ہے اور ہمارا حسنِ ظن ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے علم وفہم کے مطابق اسے ناگزیر حالات ہی میں اپنایا تھا۔ مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خلافتِ راشدہ کی طرح ایک آئیڈیل اسلامی نظام تھا۔ اسی لیے علماء وفقہاء نے یزید کے دور میں حضرت عبداللہ بن عمر اور متعدد فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مصالحانہ طرزِ عمل سے استدلال کر کے ایسے حالات کے متعلق یہ تعلیم تو دی کہ اُمت کی رضا کے بغیر برسرِ اقتدار آنے والے حکمران کے خلاف خروج نہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں خونریزی نہ ہو مگر یہ کسی نے نہیں کہا کہ یہی طرزِ سیاست مثالی ہے اور یہی خلفائے راشدین کی نیابت ہے بلکہ اس کے برخلاف فقہاء اور شارحینِ حدیث واضح طور پر اسے ''ملوکیت'' سے تعبیر کرتے رہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد دراصل اسی ''ملوکیت'' کے ابھرتے ہوئے آثار کے خلاف تھی۔ وہ مثالی اسلامی طرزِ حکومت کے احیاء کے داعی تھے۔ ان کے نزدیک خلیفہ کا انتخاب بزرگانِ اُمت کی آزادانہ رائے سے ہونا چاہیے تھا۔ نیز ان کے خیال میں حکمران کی عوام میں مقبولیت بہت اہم تھی؛ کیوں کہ نامقبول شخص کا حکمران بن جانا قومی انتشار اور ملک کے زوال کا سبب بنتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ امت کے حقیقی نمائندوں کی رضا کو انتقالِ اقتدار کی اہم شرط سمجھتے تھے اور اس سے استثناء کی ان کے نزدیک ایک ہی شکل تھی وہ یہ کہ حکمران مسلمانوں کی پسند ناپسند کا خیال کیے بغیر طاقت کے بل پر اپنا سکہ جما کر پورے ملک پر مسلط ہو جائے۔ ایسی صورت میں فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے ازراہِ مصلحت اس کی حکومت کو اضطراراً منعقد ماننا اور اسے برطرف کرنے کی کوششیں ترک کر دینا بہتر تھا۔

اس پس منظر میں یزید کا موازنہ خلفائے راشدین کے ساتھ قطعاً نہیں کیا جا سکتا جو اپنے فضائل ومناقب کی بناء پر دورِ رسالت ہی سے مسلمانوں میں بے حد مقبول ومحبوب چلے آرہے تھے۔ ان کی خلافت کے انعقاد کے لیے عمائدِ مدینہ کے اتفاق کو کافی مان لیا جانا باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بعض صحابہ اپنے شبہات کی بناء پر ان کی بیعت اور اطاعت سے کنارہ کش ہوئے مگر وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب کا اقرار کرتے تھے۔ انہوں نے جن شبہات کی بناء پر ان سے اختلاف کیا وہ بھی بعد میں غلط ثابت ہوئے؛ اس لیے جمہور علمائے اُمت کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ملک کے ایک صوبے میں مسترد ہو جانے کے باوجود شرعاً ثابت تھی۔

یزید کو خلفائے راشدین جیسی مقبولیت کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہ تھا۔ صحابہ کی موجودگی میں اُمت یزید کو بادلِ نخواستہ تو حکمران مان سکتی تھی، بخوشی نہیں۔ ایسے میں یہ واضح تھا کہ یزید طاقت کے ذریعے اپنی حکومت کو قائم کرنے کی کوشش

کرے گا جو موروثیت کا رنگ لینے کی وجہ سے اُمت کے لیے مزید ناپسندیدگی کا باعث ہوگی، چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد اور فقاہت کی بناء پر جہاں تک شرعی گنجائش دیکھی وہاں تک یزید کی حکومت کے قیام کو روکنے کی کوشش کی۔ جن صحابہ کرام نے انہیں کوفہ جانے سے روکنے کی کوشش کی، غالباً ان کے نزدیک یزید کی حکومت بطورِ تسلط ثابت ہوچکی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے نزدیک سیاسی مرکز میں کسی حکمران کی بیعت ہوجانے سے انتقالِ اقتدار ثابت ہوجاتا ہو۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ چونکہ بیعت نہ کرنے سے افتراق اور خانہ جنگی کا اندیشہ تھا؛ اس لیے ان صحابہ نے یزید سے بیعت کرلی۔

ان تمام باتوں کے بعد آخر میں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ چاہے یزید کی حکومت روزِ اوّل سے منعقد ہوگئی ہو اور چاہے اہلِ دِمَشق کا اتفاق ہی اس کی حکمرانی کے لیے کافی ہو، مگر اس کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام پر خروج کا اطلاق نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ خروج کی شرعی تعریف کے اطلاق کے لیے صرف بیعت سے انکار کافی نہیں بلکہ کسی علاقے پر قبضہ بھی شرط ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالمقابل اہلِ جمل بصرہ پر اور اصحابِ صفین شام پر قابض تھے۔ اس لیے وہاں خروج کا اطلاق ہوگیا۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں ریاستی طاقت استعمال کرنے میں حق بجانب تھے۔ مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کسی علاقے پر قابض نہیں ہوئے تھے۔ کربلا میں خود سرکاری فوج نے انہیں محصور کیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آخر میں وہ مصالحت کی پیش کش بھی کرچکے تھے۔ ایسے میں فقہ کی کوئی شق ایسی نہیں جس کا حوالہ دے کر انہیں باغی ثابت کیا جاسکے اور سرکاری فوج کے اقدام کا کوئی جواز مہیا کیا جاسکے۔

ارادۂ خروج اور عملاً خروج میں فرق ہے۔ ریاستی طاقت کا استعمال عملی خروج کی صورت میں جائز ہوتا ہے نہ کہ ارادۂ خروج پر۔ یہی فرق کوفہ کے پہلے گورنر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے ملحوظ رکھا اور مسلم بن عقیل کے گرد لوگوں کے اجتماع پر کوئی کارروائی نہ کی مگر عبید اللہ بن زیاد نے شرعی حدود کو پامال کردیا اور کربلا میں ظلم وستم کا بازار گرم کرکے چھوڑا۔

☆☆☆

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوشش کس لحاظ سے قابلِ ستائش ہے؟

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد کا عملی فائدہ تو کچھ نہ ہوا۔ ان کی مہم قابلِ مذمت ہونی چاہیے۔ اسے کس لحاظ سے قابلِ ستائش کہا جاسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ ستائش کے مختلف پہلو ہیں مگر ہمارے نزدیک سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کی قربانی دے کر اُمت کو سیاسی بے داری کی طرف لانے کی کوشش کی۔ سیاسی سفر کے لحاظ سے اُمت ملوکیت کے نئے تجربے کی طرف جارہی تھی اور یہ بات ایک اصولِ موضوعہ کے طور پر طے ہورہی تھی کہ عسکری عہدے دار اُمت کے اہل اربابِ حل وعقد ہیں اور انہیں مطلقاً یہ اختیار حاصل ہے کہ اُمت کے بہترین افراد کی رائے کو نظر انداز کرکے انتقالِ اقتدار کا عمل انجام دے دیں۔ یہ سوچ بعد میں پتھر پر لکیر بن گئی اور عام رواج یہی چل پڑا۔ حکمران کے تقرر کے

لیے دینی واخلاقی حالت کو مدار بنانے اور اس پر اُمت کے بہترین اور افضل لوگوں کا اتفاقِ رائے حاصل کرنے کا دستور ختم ہوگیا اور فقط عسکری مرکز کے امراء کی بیعت کو تمام ملک میں نافذ مانا جاتا رہا۔

اس تبدیلی کے آغاز ہی میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جان کی قربانی دے کر اُمت کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ خلفائے راشدین، عشرۂ مبشرہ اور اکابر صحابہ جیسے عظیم المرتبت رجال جن کے عالی مقامات کی گواہی نطقِ رسالت نے دی تھی اور جن پر اُمت کا اتفاق حاصل کرنے کے لیے کسی خاص دوڑ دھوپ کی ضرورت نہ تھی، اب پیدا نہیں ہوں گے۔ نیز اصاغر صحابہ کا دور بھی گزرنے کو ہے جو اپنے پیشرو حضرات سے کم رتبہ ہونے کے باوجود باقی ساری اُمت سے بدرجہا افضل ہیں۔ اس نئی صورتحال میں اُمت کو چاہیے کہ وہ اسلامی سیاست کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول طے کرے کہ اصحابِ شوریٰ کون ہوں گے؟ کن کی بیعت پوری اُمت کی بیعت کے قائم مقام ہوگی؟ اور حکمران یا مجلسِ حکومت ساز کو چننے کا اختیار کن کے پاس ہوگا؟



مجلس شوریٰ کا تعین کیسے کیا جائے؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ملوکیت کے راستے میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے یہ سوالات چھوڑ گئے جن پر غور کرنے کی ضرورت آج کہیں زیادہ ہے۔ قدیم اسلامی علمی ذخائر میں خلافت، امامت، شوریٰ اور اہلِ حل وعقد جیسی اصطلاحات بکثرت استعمال ہوئی ہیں۔ اہلِ حل وعقد کی تعریف میں کئی اقوال موجود ہیں۔ مثلاً: ایک قول کے مطابق اہلِ شوریٰ سے مراد اہلِ اجتہاد ہیں۔ یعنی مجلسِ شوریٰ چوٹی کے فقہاء پر مشتمل ہوگی۔[1] ایک قول کے مطابق: ''وہ علماء اور رؤساء ہیں۔''[2] ایک قول یہ ہے کہ علماء، رؤساء اور قوم کے ممتاز لوگ مراد ہیں۔[3]

مگر اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا کہ اہلِ حل وعقد یا مجلسِ شوریٰ کا تعین کیسے کیا جائے گا۔ حکمران کو منتخب کرنے والے مجاز ادارے کی تشکیل کون کرے گا؟ اس سوال کو حکمران طبقہ خود عملی طور پر حل کرتا رہا، وہ اس طرح کہ یہ حق حکمران خاندان کا ہے۔ چنانچہ اسی کے افراد اور انہی کے معتمد لوگ اہلِ حل وعقد بنے رہے اور وہی مجلسِ حکومت ساز مانے گئے۔ اُمت کے علمی نمائندوں اور مذہبی بزرگوں کو اس معاملے میں دخل دینے کا حق دوبارہ نہیں دیا گیا۔

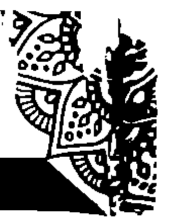
اگرچہ آیاتِ قرآنیہ، سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ میں کہیں کوئی حتمی نص نہیں ملتی کہ مجلسِ شوریٰ کس طرح بنائی جائے مگر یہ بہت واضح ہے کہ نیک وصالح، عالم فاضل، تجربہ کار، دیانت دار اور ایثار پیشہ افراد کو ترجیح دینا شرعاً وعقلاً مطلوب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور کی مشاورتوں کا حال دیکھا جائے تو ایسی ہی

---

① المجتهدين من أمة محمد ﷺ (فتح الباري لابن حجر: ۱۳/۳۰۶)

② من العلماء المجتهدين والرؤساء (البحر الرائق: ۶/۲۹۹)

③ من العلماء والرؤساء ووجوه الناس (منهاج الطالبين وعمدة المفتين في الفقه للنووي، ص ۲۹۲)



ہستیاں پیش پیش تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اذان، امامتِ صلوٰۃ اور جہاد جیسی اجتماعی ذمہ داریوں میں بھی ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو آگے رکھا۔ غالباً اس بابرکت دور میں مجلسِ شوریٰ کی تشکیل کے مستقل اصول وضوابط طے کرنے کی ضرورت اس لیے نہ سمجھی گئی کہ ہر طرف خیر ہی خیر تھی، صحابہ کرام کی کثرت تھی۔

اگر خلفائے راشدین کے بعد شورائیت کا معاملہ محدود تر نہ ہوتا جاتا اور طاقت کے بل پر حکومتیں قائم کرنے کا سلسلہ نہ چل پڑتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ اہلِ علم وفضل پہلی صدی ہجری میں ہی ایسا آئین اور ایسے اصول وضوابط طے کر لیتے جن کے مطابق انتقالِ اقتدار کی مجاز مجلسِ شوریٰ کے ارکان کا چناؤ پوری امت میں سے کیا جاتا اور اس طرح انتقالِ اقتدار بہترین اور مقبول ترین لوگوں کی طرف ہونے کا وہ شرعی ہدف جو دورِ خلافتِ راشدہ کا مایۂ امتیاز ہے، جاری رہتا اور اُمت موروثیت اور تلوار کے بل پر حکومت کی تباہ کاریوں سے بچ جاتی۔ یہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقصد تھا۔

☆☆☆

کیا یزید کو مجتہد نہیں مانا جاسکتا؟

﴿سوال﴾ یزید تابعی، صحابی زادہ اور خلیفہ تھا، اس لیے مجتہد بھی ہوگا۔ لہٰذا اس کے سارے افعال کو اجتہاد پر محمول کر کے اس سے حسنِ ظن کیوں نہ رکھا جائے؟

﴿جواب﴾ اجتہاد یا مجتہد ایک فقہی اصطلاح ہے۔ لغوی لحاظ سے مباح معاملات میں اپنی رائے سے کوئی صورت اختیار کرنے کو بھی اجتہاد کہہ دیا جاتا ہے اور ایسا اجتہاد ہر کوئی کر سکتا ہے۔ مگر یہاں بات اصطلاحی اجتہاد کی ہو رہی ہے جس کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ تابعی یا صحابی زادہ ہونے سے آدمی مجتہد نہیں بن جاتا بلکہ اگر نااہل اجتہاد کی کوشش کرے تو یہ خود ایک جرم عظیم ہے۔ حدیث میں ہے:

''قاضی تین قسم کے ہیں: دو قسم کے دوزخی، ایک جنتی۔ جو آدمی جان بوجھ کر ناحق فیصلہ کرے وہ دوزخی ہے۔ جو قاضی لاعلمی کی وجہ سے لوگوں کے حقوق ضایع کرتا ہو وہ بھی دوزخی ہے۔ جو قاضی برحق فیصلہ کرے وہی جنتی ہے۔''[1]

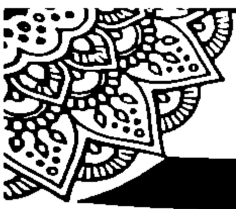
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی روایت کو مرسلاً اس طرح نقل کیا ہے: ''قاضی تین قسم کے ہیں: دو قسم کے دوزخی، ایک جنتی۔ وہ دو جو کہ دوزخی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو جان بوجھ کر ظلم کرے، پس وہ دوزخی ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو اجتہاد کرے مگر غلطی کر جائے، وہ بھی دوزخی ہے۔ جنتی وہ ہے جو اجتہاد کرے اور حق تک پہنچے۔''

راوی (قتادہ) کہتے ہیں میں نے (اپنے استاد) ابوالعالیہ سے پوچھا: ''اس کا کیا قصور جس نے اجتہاد کیا مگر غلطی کر گیا؟'' وہ بولے: ''اس کا جرم یہ ہے کہ جب اس کے پاس علم نہیں تھا تو وہ قاضی کیوں بنا۔''[2]

---

① القضاۃ ثلاثۃ: قاضیان فی النار وقاض فی الجنۃ، رجل قضی بغیر الحق فعلم ذاک فذاک فی النار، وقاض لایعلم فاھلک حقوق الناس فھو فی النار وقاض قضی بالحق فذلک فی الجنۃ: (سنن الترمذی، ح: ۱۳۲۲، قال الالبانی: صحیح)

② مسند ابی الجعد، روایت نمبر: ۹۸۹



امام ابوبکر الرازی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''حضور ﷺ کی اس وعید کو ان لوگوں کے حق میں قرار دیا جائے گا جو ایسے مسئلے میں اجتہاد کریں جس میں (دوسرے فریق کی) دلیل قائم اور حجت ثابت ہو چکی ہو پھر یہ لوگ خطا کر جائیں جیسا کہ خوارج اور ان جیسے لوگ۔ پس وہ دوزخی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''اس خارجی نے بھی اجتہاد کیا تھا مگر وہ دوزخی ہے۔''[1]

اجتہاد کی حدود پر روشنی ڈالتے ہوئے امام ابوبکر جصاص رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اجتہاد اسی وقت تک جائز ہے جب تک کوئی نص یا اجماع نہ مل جائے۔ جب نص یا اجماع مل جائے تو اجتہاد کا جواز ساقط ہو جاتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنین کے مسئلے میں اجتہاد کی گنجائش سمجھتے تھے، یہاں تک کہ جب انہیں حمل بن مالک نے حدیث کی نص بتائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریب تھا کہ ہم ایسے مسئلوں میں اپنی رائے سے فیصلے کر دیتے، جبکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت موجود ہے۔ اسی طرح ہر مجتہد کا حال ہے۔ اس کے اجتہاد کا جواز اس کی نظر میں بھی نص اور اجماع کے نہ ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔ جب وہ اجتہاد کرے اور پھر کوئی نص یا اجماع اپنی رائے کے خلاف پالے تو اپنے اجتہاد کو ترک کر کے نص اور اجماع کی پیروی کرے گا۔ اسی طرح کسی بھی قضیے میں صحابہ کے اجتہاد اور اس میں اختلاف رائے کی گنجائش (ان کے نزدیک بھی) شرط کے ساتھ مشروط تھی اور وہ یہ کہ اس (اجتہاد) کے بعد (اس کے خلاف) کوئی اجماع نہ ہو جائے۔''[2]

مجتہد کی صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''آدمی اجتہاد کا اہل تبھی ہو سکتا ہے جب وہ کتاب اللہ، سنت ثابتہ (احادیث صحیحہ مشہورہ) اور اخبار آحاد کا عالم ہو۔ محکم اور منسوخ کو جانتا ہو۔ عام اور خاص کا عالم ہو۔ حقیقت اور مجاز کی دلالتوں کا فرق جانتا ہو۔ ہر چیز کو اس کے محل اور اپنے مقام پر رکھ سکتا ہو۔ اس کے ساتھ وہ عقلی احکام اور ان کی دلالتوں سے بھی آگاہ ہو اور اس کی جائز اور ناجائز حدود کو سمجھتا ہو۔ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد والوں کے اجماعی فیصلوں کو جانتا ہو۔ استدلال کی قسموں اور شرعی قیاس سے واقف ہو۔ اس میں عقلی قیاس کافی نہیں؛ کیوں کہ شرعی قیاس عقلی قیاس سے الگ ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جو صحابہ اور تابعین سے نسل در نسل رائج چلا آ رہا ہے اور بعد والے اسے پہلے والوں سے لیتے آئے ہیں۔ اس کا طریقہ اس کے جاننے والے قابل فقہاء سے سیکھا جائے۔

اسی لیے نئے مسائل میں کلام کرنے والے ان لوگوں نے جو قیاس شرعی سے واقف نہیں، قیاس عقلی پر بھروسہ کرتے ہوئے غلطیاں کی ہیں۔ پس انہوں نے جری ہو کر جہالتوں اور فحش امور کا ارتکاب کیا ہے۔''

① الفصول فی الاصول للامام ابی بکر الجصاص الرازی: ۵۷/۴، ۵۸ ② الفصول فی الاصول: ۲۴۶/۳

پس جس شخص میں مذکورہ صفات ہوں، اس کے لیے نئے قضیوں میں اجتہاد کرنا اور اصول سے فروعی مسائل اخذ کرنا جائز ہے۔ اگر وہ عادل (متقی اور امانت دار) ہے تو فتویٰ دے سکتا ہے۔

اگر یہ تمام شرائط جمع ہو جائیں مگر وہ عادل نہ ہو تو اس کا فتویٰ قابلِ قبول نہیں ہوگا جیسا کہ اس سے روایتِ حدیث مقبول نہیں اور اگر گواہی دے تو گواہی بھی قبول نہیں۔"[1]

امام رازی رحمہ اللہ کے اس کلام سے بخوبی سمجھ آتا ہے کہ مجتہد کو قرآن وسنت اور اصولِ فقہ میں رسوخ حاصل ہونا اور فقہاء کی خدمت میں بیٹھ کر قیاس شرعی کی تربیت لینا ضروری ہے۔ اس علمی مہارت کے ساتھ ہی اس کا تقویٰ، عدالت اور امانت ودیانت سے متصف ہونا بھی لازمی ہے۔ ان سخت شرائط کے مقابلے میں یزید کا جو کردار تھا، اسے ائمہ جرح و تعدیل نے یوں بیان کیا ہے:

"وہ ناصبی، سخت گیر، تند خو، نشے کا عادی اور ناجائز امور کا مرتکب تھا۔ اس کی حکومت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر حرہ کے سانحے پر ختم ہوئی، لہٰذا لوگوں نے اس سے نفرت کی، پس اس کی عمر میں برکت نہ ہوئی۔"[2]

یزید کے مثبت کردار کی جو زیادہ سے زیادہ گواہی ملتی ہے وہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کا یہ بیان ہے:

"میں نے اسے نماز کا پابند، خیر کا طلب گار، فقہی مسائل پوچھنے والا اور سنت کا اہتمام کرنے والا پایا ہے۔"[3]

اگرچہ یہ بیان ایک ضعیف و منقطع سند سے منقول ہونے کی وجہ سے خود متنازعہ ہے، لیکن اگر اسے مان بھی لیا جائے تو یہ خوبیاں ایک عام مسلمان میں بھی ہوتی ہیں۔ ان کی بناء پر یزید کو مجتہد اور اس کے افعالِ شنیعہ کو اجتہاد کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اگر اجتہاد کی گنجائش اتنی وسیع کر دی جائے تو کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو بھی مجتہد ثابت کر سکتا ہے۔

☆☆☆

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خروج پر کمر بستہ ظاہر کرنے والی روایات کی اسنادی حیثیت کیا ہے؟:

﴿سوال﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خروج پر کمر بستہ ہونا کیا کوئی تاریخی حقیقت ہے یا افسانہ؟ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ صحیح روایات سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر یہ ضعیف روایات ہیں تو کیا ضعیف روایات کی بناء پر کسی صحابی کی طرف ایسی بات منسوب کی جا سکتی ہے جسے شریعت نے منع کیا ہو، یعنی خروج، تفرقہ اور خونریزی۔ اور اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف خروج کی نسبت بے ادبی ہے تو اہلِ جمل اور اہلِ شام کی طرف اس کی نسبت کیسے درست ہے؟

---

[1] الفصول فی الاصول: ۲۷۳/۴

[2] وكان ناصبيا، فظا، غليظا، جلفا، يتناول المسكر ويفعل المنكر افتتح دولته بمقتل الشهيد الحسين واختتمها بواقعة الحرة. (سير اعلام النبلاء: ۳۷/۴، ط الرسالة)

[3] فرأيته مواظباً على الصلوة متحريا للخير يسأل عن الفقه، ملازماً للسنة. (تاريخ الاسلام للذهبي تدمري: ۲۷۴/۵؛ بشار: ۷۳۱/۲) اسناده ضعيف منقطع، نقله ابن المنظور بلا سند (مختصر تاريخ دمشق: ۲۸/۲۸) ولم اجده في تاريخ دمشق، ونقل البلاذري رواية اخرى تظهر اعتماد ابن الحنفية على يزيد. (انساب الاشراف: ۲۷۶/۳) اسنده بصيغة "قالوا" فصير الرواية ضعيفة جداً بجهالة الرواة

﴿جواب﴾ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خروج پر کمر بستہ ہونا کسی صحیح روایت میں منقول نہیں۔ ہمیں کتب تاریخ میں ایسے فقط تین نمونے ملے ہیں جن میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی زبانی اپنے استحقاقِ حکومت اور عزم خروج کا ذکر ہے:

① **پہلا نمونہ:** یہ اہلِ عراق کے نام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ایک خط ہے جس میں ہے:

''اللہ نے محمد ﷺ کو اپنی مخلوقات میں برگزیدہ کیا، نبوت سے ان کا اکرام کیا، رسالت کے لیے ان کو چنا، جب وہ اس کے بندوں سے خیر خواہی کر چکے اور پیام پہنچا چکے تو اللہ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ ہم ان کے اہل اور وصی ہیں، ان کے ولی اور وارث ہیں۔ ان کی جگہ کے سب سے زیادہ حق دار ہم تھے مگر ہماری قوم نے خود کو ہم پر ترجیح دی۔ ہم اس پر راضی ہو گئے۔ افتراق کو ناپسند اور امن و عافیت کو پسند کیا۔ حالانکہ ہم جانتے تھے کہ جنہوں نے اس معاملے (سربراہی) کا ذمہ لیا ہے ان کی بہ نسبت ہم زیادہ حق دار ہیں۔ ان لوگوں نے اچھے کام کیے اور اصلاح کی کوشش کی، حق کو تلاش کیا، اللہ ان پر رحم کرے، ہماری اور ان کی مغفرت کرے۔ میں نے اپنا قاصد تمہاری طرف یہ خط دے کر بھیجا۔ میں تمھیں کتاب اللہ اور سنتِ نبویہ کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ بے شک سنت مردہ کردی گئی ہے اور بدعت زندہ کردی گئی ہے۔ تم میری بات سنو اور حکم مانو۔ میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔''[1]

② **دوسرا نمونہ:** ابومخنف دوسری جگہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقریر میں یہ الفاظ پیش کرتا ہے:

''اے لوگو! اگر تم پرہیز گار بنو اور حق داروں کے لیے حق تسلیم کر لو تو یہ اللہ کو زیادہ راضی کرنے والی بات ہے۔ ہم اہل بیت اس امر (خلافت) کے ان لوگوں سے زیادہ حق دار ہیں جو اس چیز کا دعویٰ کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں اور جو تم میں سے ظلم و ستم کا برتاؤ کرتے ہیں۔''[2]

③ **تیسرا نمونہ:** حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر میں کہا:

''رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جو کسی ظالم سلطان کو دیکھے جو حرام کو حلال کر بیٹھا ہو، اللہ کا عہد توڑ چکا ہو، سنت رسول ﷺ کی مخالفت کرتا ہو، اللہ کے بندوں سے گناہ اور ظلم کا معاملہ کرتا ہو، پھر وہ قول و فعل سے اس سلطان پر تنقید نہ کرے تو اللہ کو حق ہے کہ ایسے آدمی کو اس کے ٹھکانے (جہنم) میں ڈالے۔ سنو! ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کو لازم کیا، رحمان کی اطاعت چھوڑی، فساد پھیلایا، حدود پامال کیں، غنیمت کو ہڑپ کر گئے، حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیا۔ میں دوسروں سے زیادہ (خلافت کا) حق دار ہوں۔ میرے پاس تمہارے خطوط آئے۔ تمہارے سفیر بیعت کا اقرار لے کر آئے کہ مجھے کسی کے حوالے نہ کرو گے اور میرا ساتھ نہ چھوڑو گے۔''[3]

---

① تاریخ الطبری: ۵/۳۵۷ عن ھشام کلبی عن ابی مخنف ..... حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس مراسلے کو مشکوک قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: وعندی فی صحۃ ھذا عن الحسین نظر، والظاھر انہ مطرز بکلام مزید من بعض رواۃ الشیعۃ. ''میرے نزدیک اس مراسلے کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت مشکوک ہے۔ بظاہر اس میں بعض شیعی راویوں کا اضافی کلام شامل ہے۔'' (البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۴۹۲)

② تاریخ طبری: ۵/۴۰۲ عن ابی مخنف ③ تاریخ طبری: ۵/۴۰۳ عن ابی مخنف

ان تین نمونوں کے علاوہ ابومخنف ہی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف ایک وصیت منسوب کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ انہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے خروج کا یقین تھا۔ (طبری: ۵/۳۲۲۔ یہ وصیت پیچھے گزر چکی ہے) غرض عزم خروج کا ثبوت کسی صحیح روایت سے نہیں ملتا۔ چار روایات ہیں اور چاروں ابومخنف کذاب کی۔



دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خروج پر کمر بستہ دکھانے والا یہ تمام مواد صرف ایک شخص ابو مخنف سے منقول ہے جو متعصب رافضی اور کذاب ہے۔ غور کریں کہ خط کشیدہ الفاظ میں روافض کا خاص عقیدہ نمایاں ہے کہ سادات کے سوا حکمرانی کسی کا حق نہیں، جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور سادات اس عقیدے سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔

رہی یہ بات کہ ان ضعیف روایات کی بناء پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف خروج یا ارادۂ خروج کی نسبت کیسے درست ہے؟ اگر درست نہیں تو اکابر اور اسلاف یہ نسبت کیوں کرتے چلے آئے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اصولاً طے ہے کہ ضعیف روایات سے منقول کوئی بات صحابہ کے حق میں اس وقت نا قابلِ قبول ہوگی جب وہ توہین آمیز ہو۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوشش جمہور علمائے اسلام کی نگاہ میں ایک اجتہادی سعی تھی۔ یہ کوئی منفی رنگ لیے ہوئے ''الزام'' نہ تھا کہ اسے ضعیف روایات میں منقول دیکھ کر اس کا انکار کر دیا جائے۔ البتہ جو لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کو ایک ناجائز اور قابلِ طعن اقدام کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی اہلِ سنت ہونے کے دعوے دار ہیں، ان پر لازم ہے کہ اس طعن کو ثابت کرنے کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خروج یا عزمِ خروج کسی صحیح روایت سے ثابت کریں۔ ضعیف روایات سے ایک عظیم صحابی پر طعن کرنا اصولاً غلط ہے۔

جہاں تک اہلِ جمل اور اہلِ شام کے خروج کا تعلق ہے وہ ایسی صحیح روایات سے ثابت ہے جن سے فقہاء نے احکام مستنبط کیے ہیں۔ اس لیے ان کا خروج ثابت ہے۔ اگر ان کا انکار کیا جائے تو فقہ کے وہ مسائل بے بنیاد ماننا پڑیں گے جن کا مدار انہی جنگوں سے متعلقہ روایات پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ہر خروج گناہ، باعثِ الزام اور سببِ طعن نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر باغی مجتہد اور تاویل کرنے والا ہو اور اس پر یہ واضح نہ ہو کہ وہ باغی ہے، بلکہ وہ اعتقاد رکھتا ہو کہ وہ حق پر ہے، اگرچہ وہ خطا پر ہو تو اسے باغی کہنا اسے گناہ گار کہنے کے مترادف نہیں، چہ جائے کہ اسے فاسق سمجھا جائے۔

اور جو حضرات تاویل کرنے والے باغیوں سے قتال کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان سے قتال کے حکم کے باوجود، ہمارا ان سے قتال کرنا، ان کی بغاوت کے نقصان سے بچنے کے لیے ہے، انہیں سزا دینے کے لیے نہیں۔ بلکہ یہ زیادتی کی روک تھام کے لیے ہے۔''[1]

اسی لیے علمائے اُمت اہلِ جمل اور اہلِ صفین کے اقدامات کو باعثِ طعن نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے خروج کو مجتہدانہ اور نیک نیتی پر مبنی قرار دیتے ہیں اور اس کے مرتکبین کو مغفور و ماجور تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خروج یا عزمِ خروج اگر صحیح روایات سے ثابت ہوتا تو بھی وہ اجتہادی عمل اور باعثِ اجر ہی کہلاتا۔

☆☆☆

① الفتاوی الکبری لابن تیمیة: ۴۵۷/۴، ط دار الکتب العلمیة

یزید اور روایتِ حدیث

﴿سوال﴾ محدثین نے یزید سے احادیث بھی نقل کی ہیں جس سے اس کا عادل ہونا ثابت ہوتا ہے؟ مثلاً یزید نے اپنے والد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے خلفائے ثلاثہ کے تخت نشین ہونے کا حال مختصراً نقل کیا ہے، جس کے آخر میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت ہوئی۔ انہیں ظلم وتشدد کے ساتھ قتل کیا گیا۔ پس اہلِ شام کے ساتھ میں نے بھی ان کے خون کا بدلہ لینے کی آواز لگائی، فوج بھی کم تھی اور اموال بھی، مگر اللہ نے میری مدد کی، عرب میری طرف رجوع کرنے لگے......''[1]

﴿جواب﴾ یزید بن مُعاویہ سے اس طرح کی ایک آدھ روایت بطورِ تاریخی واقعے کے نقل کی گئی ہے۔ سوال میں پیش کردہ روایت کتبِ تاریخ میں منقول ایک تاریخی واقعہ ہے۔ یزید سے یہ واقعہ اس کے بیٹے خالد نے سنا اور اس سے بعض راویوں نے۔ تاریخی چیز نقل کرنے سے راوی کا عادل ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں عدالت شرط نہیں۔[2]

ویسے متعدد محدثین نے کتبِ حدیث میں بھی تاریخی روایات نقل کی ہیں، مگر مذکورہ روایت کی سند میں یزید کی موجودگی کی وجہ سے حدیث کی کسی کتاب میں تاریخی واقعے کے طور پر بھی اسے کہیں نقل نہیں کیا گیا۔ ہاں اسماء الرجال کی بحث میں جہاں یزید کا مقام متعین کرنا ضروری تھا وہاں بعض ائمہ نے یہ روایت پیش کر دی ہے۔

یہی حال یزید سے سنی سنائی دوسری دو چار مرویات کا ہے کہ محدثین نے حتی الامکان ان سے احتیاط برتی ہے؛ کیوں کہ یزید سے روایت لے کر کوئی بھی اپنی ساکھ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عدالت جو ثقاہت کی اہم شرط ہے، اس میں مفقود تھی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول اس بارے میں کافی ہے۔

ان سے پوچھا گیا کہ کیا یزید بن مُعاویہ سے روایت لی جاسکتی ہے؟

فرمایا: ''لَایُذْکَرُ عَنْهُ حَدِیْث'' (اس سے کوئی حدیث نہ نقل کی جائے۔)[3]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یزید نے اپنے والد سے روایت لی ہے اور اس سے اس کے بیٹے خالد نے۔ اس کی عدالت مجروح

---

① تلخیص المتشابه فی الرسم للخطیب البغدادی، ص ۵۰۸، ۵۰۹، ط طلاس دمشق

② بلکہ وہ غیر مسلموں سے بھی لی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج. (صحیح البخاری، ح: ۳۴۶۱)

③ سالت احمد عن یزید بن معاویة بن ابی سفیان؟ فقال: هو الذی فعل بالمدینة ما فعل، قتل من اصحاب رسول الله ونهبها. قلت: فیذکر عنه الحدیث؟ قال: لا یذکر عنه حدیث، وسالته عن یزید بن عبدالملک بن مروان؟ فقال هذا افضل من ذاک یعنی یزید بن معاویة، قتل یذکر عنه الحدیث؟ قال: نعم. (المنتخب من علل الخلال، ابن قدامه المقدسی، ص ۲۳۷)



ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ اس سے روایت لی جائے۔"[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مسئلے کو مزید واضح کرتے ہوئے عدالتِ یزید کی مکمل نفی اس طرح کرتے ہیں:

"یزید کی کوئی ایسی روایت نہیں جس پر اعتماد کیا جائے۔ یحییٰ بن عبدالملک بن ابی غنیہ جو ایک ثقہ راوی ہیں، کہتے ہیں کہ ہم سے نوفل بن ابی عقرب نے جو کہ ثقہ ہیں، کہا کہ میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس بیٹھا تھا کہ کسی نے یزید بن مُعاویہ کا ذکر کیا اور کہا: امیر المؤمنین یزید۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کہا: تم امیر المؤمنین یزید کہتے ہو! اور اسے بیس کوڑے لگانے کا حکم دیا۔"[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی یہ روایت صحیح سند سے نقل کی ہے اور اس طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ یزید کی عدالت کی دلیل کے طور پر محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب کی جانے والی (ضعیف و منقطع السند) روایت اصحابِ جرح و تعدیل کے نزدیک ہرگز قابلِ استدلال نہیں۔ ورنہ یہ ائمہ اسے کوئی اہمیت دیتے ہوئے یزید کو عادل مان لیتے اور فیصلہ دیتے کہ یزید سے روایت لینا جائز ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وضاحت کرتے ہیں کہ اسماء الرجال میں کی کتب میں یزید کا ذکر اس لیے نہیں لایا جاتا کہ علمِ حدیث میں اس کی کوئی حیثیت ہے بلکہ یہ ذکر لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ وہ یزید نامی دیگر ثقہ راویوں کو حکمران یزید نہ سمجھ بیٹھیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں نے یہاں یزید کا ذکر اسے یزید بن مُعاویہ نخعی سے الگ بتانے کے لیے کیا ہے۔"[3]

☆☆☆

یزید کی حدیث دانی، محدثین کی زبانی:

﴿سوال﴾ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یزید نے اپنے والد سے یہ حدیث نقل کی تھی: من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین. اسی طرح وضو کی ایک روایت بھی نقل کی ہے۔[4]

اسی طرح امام عبدالرزاق صنعانی نے مُصنَّف میں عبدالرحمٰن بن یزید عن ابیہ سے روایت نقل کی ہے:

ارقاءَ کم ارقاءَ کم، اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون، وان جاؤوا بذنب لا تریدون ان تغفروہ، فبیعوا عباداللہ ولا تعذبوا عباداللہ ولا تعذبوھم.[5]

---

① میزان الاعتدال: ۳/۴۴۰

② قال ابن حجر فی ترجمۃ یزید بن معاویۃ بن ابی سفیان: "لیس لہ روایۃ تعتمد وقال یحیی بن عبدالملک بن ابی غنیۃ احد الثقات ثنا نوفل بن ابی عقرب ثقۃ قال کنت عند عمر بن عبدالعزیز فذکر لہ رجل یزید بن معاویۃ فقال امیر المومنین یزید، فقال عمر تقول امیر المومنین یزیدا وامر بہ فضرب عشرین سوطا (تھذیب التھذیب: ۱۱/۳۶۱)،

③ تھذیب التھذیب: ۱۱/۳۶۱

④ البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/۶۳۸، تاریخ دمشق: ۶۵/۳۹۵

⑤ مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۷۹۳۵، ط المجلس العلمی

اس میں عن ابیہ کا اطلاق یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ حدیث خلیفہ یزید بن مُعاویہ کی ہے۔
سند یہ ہے: عبدالرزاق، سفیان الثوری، عاصم بن عبیداللہ، عبدالرحمن بن یزید عن ابیہ (یزید بن مُعاویہ) یزید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو ثقہ راوی مانا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے باپ اور ثوبان سے روایت لی ہے۔ ان کے شاگردوں میں عاصم بن عبیداللہ شامل ہیں۔[1]

اب یہ کیسے ممکن ہے کہ بیٹا عبدالرحمٰن تو محدث اور ثقہ ہو۔ اور باپ یزید نااہل اور فاسق ہو۔ اور ذرا دیکھئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''التاریخ الکبیر'' میں عبدالرحمٰن بن یزید سے اسی روایت کا ٹکڑا یوں نقل کیا ہے:

عبدالرحمن بن یزید بن مُعاویہ عن ثوبان رضی اللہ عنہ، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المسئلة. روی عنه عباس بن عبدالرحمن. وروی عاصم بن عبیدالله عن عبدالرحمن بن یزید عن ابیه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ارقائکم ارقائکم.[2]

یہ روایات یزید کے ایک عظیم الشان خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہرِ حدیث اور محدث ہونے کا واضح ثبوت ہیں۔ پس یزید کو عادل کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا؟ کیا یہ تعصب کی انتہاء اور شیعوں کی اندھی پیروی نہیں؟

﴿جواب﴾ آپ کے دعوے کی ساری عمارت چار حوالوں پر قائم ہے: تین حوالے ابن عساکر، ابن کثیر اور امام بخاری کے، کہ انہوں نے اپنی تواریخ میں یزید سے ایک ایک روایت نقل کی ہے۔ چوتھا حوالہ ایک باقاعدہ حدیث کی کتاب کا ہے یعنی مصنف عبدالرزاق کا کہ اس میں بھی یزید سے ایک حدیث لی گئی ہے۔ یہی چوتھا حوالہ زیادہ اہم ہے، لہٰذا پہلے ہم اسی چوتھے حوالے میں پیش کی گئی روایت کی حیثیت واضح کرتے ہیں۔

اس روایت کا راوی عاصم بن عبیداللہ بالاتفاق ضعیف اور کمزور حافظے والا ہے۔ اس کی روایات میں گڑبڑ بکثرت ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال ملاحظہ ہوں:

یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عاصم بن عبیداللہ ضعیف ہے۔'' ایک باران سے چار رواۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''عاصم اور ابن عقیل ان چاروں میں سب سے زیادہ ضعیف ہیں۔''

ابراہیم بن یعقوب جوزجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وہ ضعیف ہیں۔ یحییٰ (بن معین) نے ان کے حافظے (کی خرابی) کی بناء پر ان پر نکتہ چینی کی ہے۔''

یعقوب ابن شیبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اگرچہ لوگوں نے ان سے روایات لی ہیں مگر ان کی روایات میں ضعف ہے اور انہوں نے کئی منکر روایات نقل کی ہیں۔''

ابوحاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان کی روایات میں اضطراب (گڑبڑ) ہے۔ ان کی کوئی روایت قابلِ اعتماد نہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وہ منکر حدیثیں نقل کرتے ہیں۔''

---

[1] الثقات لابن حبان: ۵/۱۱۵؛ تهذیب التهذیب: ۶/۳۰۰

[2] التاریخ الکبیر للبخاری: ۵/۳۶۴

ابوبکر بن خزیمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں ان کی حدیث سے حجت نہیں پکڑتا کیوں کہ ان کا حافظہ خراب ہے۔''
امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ متروک اور مغفل (لاپروا) ہیں۔ ①

یزید کی روایت کے اس راوی کا حال ملاحظہ کرنے کے بعد یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اس نے سند میں بھول چوک کردی ہو۔ یہ حدیث کسی اور سے مروی ہو، اس نے یزید کی طرف منسوب کردی ہو۔

اگر مان بھی لیں کہ یہ حدیث یزید ہی کی ہے تو اس سے یزید کی شان کو چار چاند نہیں لگ جاتے۔ دو چار روایات بیان کردینے سے کوئی شخص ماہر حدیث اور محدث نہیں بن جاتا۔ ہاں اس پر راوی کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر راوی ہونا اور عادل وصالح ہونا لازم وملزوم نہیں۔ راوی ثقہ بھی ہوسکتا ہے اور ضعیف وکذاب بلکہ دجال اور بے دین بھی۔ ائمہ جرح وتعدیل نے اسی لیے راویوں کے مراتب مقرر کیے ہیں۔ کسی شخص کا راویٔ حدیث ہونے کی وجہ سے معتبر اور عادل ہونا اس وقت مانا جاسکتا ہے جب محدثین نے اسے ثقہ اور اس کی نقل کردہ حدیث کو ''صحیح'' تسلیم کرلیا ہو۔ بصورت دیگر فقط روایتِ حدیث سے کسی شخص کی شان بلند نہیں ہوجاتی جبکہ اس کا کردار مجروح ہو۔ ایک فاسق وفاجر اور ظالم شخص اگر کوئی حدیث سنادے تو یہ اس کے پاک باز، متقی اور نیک ہونے کی دلیل نہیں بن جاتی۔

کسی روایت کو محدثین کے ہاں کتبِ حدیث میں بطور صحیح یا حسن روایت کے نقل کرنا الگ بات ہے۔ (چنانچہ بخاری ومسلم کے راویوں کی شان یقیناً ارفع ہے۔) مگر اسماء الرجال، کتبِ جرح وتعدیل، کتب العلل یا کتب تاریخ میں کسی راوی کا ذکر آجانا اور اس کی کچھ روایات کو بطورِ مثال نقل کردینا بالکل الگ بات ہے۔ پہلی صورت یقیناً راوی کی شان بلند کرتی ہے۔ مگر دوسری صورت ہرگز باعثِ فخر نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کہ اسے ثقہ بھی مانا گیا ہے۔

کتب اسماء الرجال، کتب العلل اور کتبِ تاریخ میں ابومخنف اور نصر بن مزاحم جیسے دجال راویوں کے حالات اور مرویات بھی منقول ہیں۔ کیا اس سے وہ ثقہ محدث شمار ہونے لگیں گے جبکہ انہی کتب میں ان لوگوں کی حیثیت کے بارے میں صاف صاف لکھ دیا گیا ہے کہ وہ رافضی اور کذاب ہیں۔

یہی معاملہ یزید بن معاویہ کا ہے۔ کتب اسماء الرجال، کتب العلل یا کتبِ تاریخ میں اس کا ذکر اور اس کی مرویات کا کوئی نمونہ منقول ہونا اس کی ثقاہت کا ثبوت نہیں بن سکتا؛ کیوں کہ محدثین بالاتفاق اسے متروک الحدیث مان چکے ہیں۔ اسی طرح مُصنَّف عبدالرزاق میں یزید کی روایت آجانا بھی اس کی عدالت وثقاہت کی دلیل نہیں کیوں کہ مُصنَّف میں صحیح وضعیف ہر قسم کی روایات کو جمع کیا گیا ہے، بعض جگہ متروک اور کذاب راویوں سے بھی روایت لی گئی ہے، مثلاً: مُصنَّف میں امام عبدالرزاق نے جابر بن یزید جعفی کی کم وبیش تیس روایات نقل کی ہیں، جس کے متعلق حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں نے جابر سے بڑا جھوٹا کوئی نہیں دیکھا۔ ②

---

① تھذیب الکمال: ۵۰۳/۱۳، ۵۰۵
② الکامل فی ضعفاء الرجال: ۳۲۸/۲

مُصَنَّف عبدالرزاق میں یزید کی روایت کے راوی عاصم بن عبیداللہ کا حال آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ وہ بالاتفاق ضعیف ہے۔ ایسی مثالیں بکثرت ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ محض مصنف عبدالرزاق یا اس معیار کی کسی کتب حدیث میں کسی روایت کا منقول ہو جانا راوی کے عادل، ثقہ یا صالح ہونے کی دلیل نہیں۔

رہی یہ بات کہ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تواریخ میں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے التاریخ الکبیر میں یزید کا حدیث سنانا نقل کیا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات نے اسے یزید کے حالاتِ زندگی کے ایک پہلو کے طور پر نقل کیا ہے۔ اس سے فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ یزید کبھی حدیث بھی سنا دیا کرتا تھا۔ ایسی کچھ احادیث ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہیں اور عموماً سنی سنائی جاتی ہیں۔ ایسا آدمی اگر فاسق و فاجر ہو تو اس حدیث کو سنا دینے سے وہ عادل اور ثقہ ثابت نہیں ہو جائے گا چاہے اس کے منہ سے ایسی روایت ادا ہو کر بطورِ خبر مشتہر ہو جائے۔

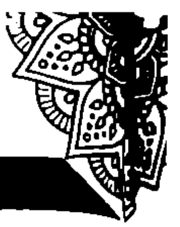
مثلاً آج کل کوئی سیاسی لیڈر اپنے خطاب میں کہہ دے: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **طلب العلم فریضة** علم حاصل کرنا فرض ہے۔ اخبارات میں یہ خبر چھپ جائے کہ موصوف نے یہ حدیث پڑھی۔ بعد میں کوئی مؤرخ اس خبر کو لیڈر صاحب کی سوانح کا حصہ بھی بنا دے۔ تو اس سے موصوف کا محدث یا عادل و صالح ہونا ثابت نہیں ہو جائے گا۔ یزید بھی اسی طرح کبھی کبھار کوئی حدیث سنا دیتا تھا۔ بعض دیگر بدنام خلفاء بھی کبھی کبھار کوئی حدیث نقل کر دیتے تھے، مثال کے طور پر امام طبرانی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں راوی صالح بن نباتہ کہتے ہیں کہ میں نے امیر المؤمنین مامون کو سنا کہ وہ اپنے والد سے سنی ہوئی فلاں حدیث نقل کر رہے تھے۔ ①

اب پختہ تاریخی روایات سے یہ ثابت ہے کہ مامون الرشید آخری سالوں میں تشیع اور اعتزال کی ترویج پر شدت سے کمر بستہ ہو گیا تھا۔ اس نے اعتزال کی اشاعت کے لیے ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی تھی اور اپنی موت سے چند دن قبل اس نے شام کے محاذِ جنگ سے خصوصی حکم بھیج کر امام احمد بن حنبل ؒ جیسے جلیل القدر عالم کو محض اس لیے گرفتار کرا دیا تھا کہ وہ مسئلہ خلقِ قرآن میں سرکاری موقف کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

اب اگر مامون الرشید کی محبت میں از خود رفتہ ہو کر کوئی صاحب یہ نئی تحقیق پیش کر دیں کہ ''مامون کے خلاف اعتزال اختیار کرنے اور ائمہ اسلام پر جبر و تشدد کرانے کی تمام تاریخی روایات اسلام دشمن راویوں کی خرافات ہیں ورنہ ''حضرت مامون الرشید رحمہ اللہ'' تو ایک بہت عظیم محدث تھے جن کی روایات امام طبرانی نے بھی نقل کی ہیں اور جب اتنے بڑے محدث کی طرف سے مامون الرشید کی توثیق ہو چکی ہے تو اس کے مقابلے میں مؤرخین کا پیش کردہ وہ مواد جس میں اس کے اعتزال کا ذکر ہے، ہفوات کے سوا کچھ نہیں۔'' تو بتائیے اس ''نئی تحقیق'' کا کوئی وزن ہو سکتا ہے؟

مگر فی زمانہ تحقیق کے نام پر ہوائے نفس اور خام جذبات کی پیروی کا چلن جس طرح عام ہو چکا ہے اسے دیکھتے ہوئے کوئی بعید نہیں کہ کل کلاں کوئی ''محقق'' صاحب ایک قدم آگے بڑھ کر کچھ اس قسم کا دعویٰ بھی فرما دیں کہ:

① المعجم الصغیر للطبرانی، ح: ۵۳۲، ط دار عمار بیروت



''اس تمام قضیے میں ''عظیم محدث امیر المؤمنین مامون الرشید'' ہی برحق تھے جبکہ احمد بن حنبل ایک باغی تھا جو کفار کے بہکاوے میں آکر اس عظیم مجاہد کی مخالفت پر تل گیا تھا تاکہ اس مجاہد اسلام کو جو اس وقت کفر سے جہاد کر رہا تھا، شکست ہو جائے اور کفار دنیائے اسلام پر قبضہ کر لیں۔ مگر امیر المؤمنین نے بروقت کارروائی کر کے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔''

ظاہر ہے جب تمام علمی میراث کو ٹھکرا کر ایسے ہی بودے دلائل کے ذریعے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں یزید کو صالح، محدث، جنتی اور صاحبِ مناقب ثابت کیا جا رہا ہے تو پھر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بلکہ کسی بھی بڑے سے بڑے بزرگ کی کیا اوقات رہ جاتی ہے! تاریخ کو اگر اس طرح اپنی خواہشات کے تابع بنا لیا جائے تو سعید بن جبیر، امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ سے لے کر ٹیپو سلطان تک سبھی کو گمراہ، نادان اور خواہش پرست ثابت کیا جا سکتا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں حجاج بن یوسف، عبدالملک، منصور، مامون اور میر صادق جیسوں کو مسلمانوں کا محسن بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے اور افسوس کہ ایسا فی الواقع کیا جا رہا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دو چار احادیث سنا کر کوئی شخص محدث، ثقہ، صالح اور عادل نہیں ہو جاتا چاہے وہ یزید ہو یا مامون الرشید۔ اس طرح کی دو چار حدیثیں تو آج بھی بعض لیڈر حضرات اسٹیج پر سنا دیا کرتے ہیں۔

یزید کا روایت کا اہل ہونا تب ثابت ہوتا جب یہ روایت صحیح یا حسن احادیث کے مجموعوں میں نقل کی جاتی، یا اس پر محدثین صحیح یا حسن کا حکم لگاتے۔ یا کم از کم اصحابِ جرح تعدیل وضاحت کرتے کہ یزید ثقہ ہے۔ مگر صحاحِ ستہ تو کجا مصنف عبدالرزاق کی مذکورہ ایک روایت کو چھوڑ کر کسی بھی مجموعۂ حدیث میں یزید کی کوئی بھی روایت نہیں لی گئی بلکہ محدثین نے صراحت کی ہے کہ وہ روایت کا اہل نہیں۔[1]

خود حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جو (یزید کے حالات کے تحت لکھ رہے ہیں کہ اس نے اپنے والد سے حدیث: من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین. نقل کی تھی) ساڑھے تیرہ ہزار احادیث پر مشتمل عظیم الشان ذخیرۂ سنت ''جامع المسانید والسنن'' مرتب کیا ہے۔ قارئین اسے کھنگال سکتے ہیں کہ اس میں بھی یزید کی کوئی روایت موجود نہیں۔

حد یہ ہے کہ اسی مجموعے میں ''من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین.'' کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے تین جگہ نقل کیا گیا ہے[2] مگر ایک جگہ بھی اسے یزید والی سند سے پیش نہیں کیا گیا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ محدثین یزید سے روایت لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے جس محدث نے اپنی تاریخ میں ضمناً یزید کی کوئی حدیث نقل کی، اس نے بھی اپنے مجموعۂ حدیث میں اس کی روایت ہرگز نہیں لی۔

---

① المنتخب من علل الخلال، ابن قدامه المقدسی: ۱/۲۳۷ ؛ میزان الاعتدال: ۴/۴۴۰

② ایک جگہ عن رجاء بن حیوۃ عن معاویہ۔ دوسری جگہ عن زیاد بن زیاد عن معاویہ۔ تیسری جگہ عن محمد بن کعب عن معاویۃ (جامع المسانید والسنن ۸/۴۳، ۷۴)

یہی حافظ ابن کثیرؒ یزید کی روایتِ حدیث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میں کہتا ہوں: یزید نے کوئی ایسی چیز روایت کی ہی نہیں جس میں اس کی طرف احتیاج ہوتی۔ الحمدللہ!''①

ہاں امام عبدالرزاق رحمہ اللہ واحد شخص ہیں جنہوں نے مجموعۂ حدیث میں یزید کی روایت لی ہے مگر ایسا سہواً بھی ہوسکتا ہے۔ اور قرینِ قیاس یہ ہے ان سے تسامح ہی ہوا ہے۔ شاید امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اسے یزید بن مُعاویہ نامی دیگر راویوں میں سے کوئی ایک گمان کرلیا ہو۔ ورنہ یہ بات عجیب ہے کہ غیر شیعہ سینکڑوں محدثین میں سے کوئی ایک بھی اپنے حدیثی مجموعوں میں یزید کی روایات نہ لے اور فقط ایک ایسا محدث اس کی روایت لے لے جو شیعی رجحان کے حامل کے طور پر مشہور ہو۔② حالانکہ شیعی ہونے کے لحاظ سے تو وہ یزید سے جس قدر بھی کراہت کرتے ہوں، وہ قرینِ قیاس ہے مگر پورے ذخیرۂ حدیث میں فقط یہی ایک محدث ہیں جو حدیثی مجموعے میں یزید کی سند سے ایک روایت لے لیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک عجیب ترین بات ہے۔ پس اس کی وجہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

اگر غور کریں تو پورا امکان بنتا ہے کہ ان سے چوک ہوگئی ہو اور انجانے میں وہ اپنے مبغوض ترین شخص سے روایت لے بیٹھے ہوں۔ عبدالرزاق کے منہج کو پرکھنے والوں پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ان کوشش زیادہ سے زیادہ روایات جمع اور نقل کرنے کی تھی۔ تاہم اس توسع کے باوجود یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ جو گنجائش صحیح وغیر صحیح روایات جمع کرنے والے غیر شیعی محدثین میں سے کسی نے روا نہیں رکھی، عبدالرزاق شیعی ہوکر بھی قصداً وہ گنجائش رکھ لیں۔

یہ بات بھی مسلّم ہے کہ عبدالرزاق کثرتِ روایت میں تو مشہور تھے مگر تحقیق اور نقدِ رجال میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا؛ اس لیے ناقدینِ حدیث نے تحقیقِ رجال میں کہیں بھی ان کے اقوال نقل نہیں کیے۔ ایسے غیر نقاد محدث سے بعید نہیں کہ ان سے کبھی ایک آدھ مقام پر رجال کو پہچاننے میں بھول چوک ہوجائے۔ اس سند میں دیکھا جائے تو کسی غیر نقاد محدث کو غلطی لگنے کا پورا امکان ہے؛ کیونکہ اس میں یزید بن مُعاویہ کا لفظ صراحت کے ساتھ نہیں۔ سند یوں ہے:

عبدالرزاق عن الثوری عن عاصم بن عبداللہ بن عاصم عن عبدالرحمن بن یزید عن ابیہ

سند کے الفاظ ایسے ہیں کہ سرسری نگاہ میں کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہاں ''عن ابیہ'' سے کون مراد ہے۔ البتہ بعد میں ناقدینِ حدیث نے دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ عبدالرحمٰن تو اسی یزید بن مُعاویہ اموی کے بیٹے ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی نے عبدالرزاق کی اس حدیث کو نہیں لیا۔

یہ ساری بحث اس پہلو سے تھی کہ عبدالرزاق سے چوک ہوئی ہے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ انہوں نے قصداً اس کی گنجائش نکالی ہے تو یہ تمام محدثین سے ہٹ کر ایک شاذ عمل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کا شاذ عمل حجت نہیں بن سکتا۔

① ''قلت: لم یرو شیئا یحتاج فیہ الیہ وللہ الحمد.'' (التکمیل فی الجرح والتعدیل: ۲/۳۷۶، ط مرکز النعمان یمن)

② یاد رکھیں کہ شیعی سے مراد یہاں پر رافضی نہیں۔ یہ اس قسم کے شیعہ تھے جنہیں متکلمین نے گمراہ یا بدعتی شمار نہیں کیا اور محدثین نے ان سے احکام میں بھی روایات لی ہیں۔ یہاں فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ جب عام اہلِ سنت بھی یزید سے نفرت کرتے ہیں اور پکے اہلِ سنت محدثین بھی یزید سے روایت لینا جائز نہیں سمجھتے تو کسی بھی قسم کے شیعہ محدث کو تو یزید سے عام اہلِ سنت کی بہ نسبت زیادہ نفرت ہوگی۔ اسے یزید سے روایت لینے میں بھلا کیا دلچسپی ہوگی۔

آخر میں عرض ہے کہ عبدالرحمٰن بن یزید کے ثقہ ہونے سے اس کے باپ یزید کا ثقہ ہونا لازم نہیں آتا۔ باپ اور بیٹے دونوں کا حال یکساں ہونا کوئی لازمی امر نہیں۔ کبھی فاسق باپ کا بیٹا صالح ہوتا ہے اور بسا اوقات عالم فاضل باپ کا بیٹا جاہل اور نکما نکلتا ہے۔ راویوں میں بھی ایسے لوگ بکثرت ملیں گے کہ باپ کو ناقابلِ اعتماد مانا گیا مگر بیٹے کو ثقہ، صدوق اور حجت تسلیم کیا گیا۔ یا اس کے برعکس باپ حجت اور ثقہ تھا اور بیٹا ضعیف اور کذاب۔ شرعی، عقلی، عرفی اور اخلاقی اصول یہی ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے سائل کی یہ دلیل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔

☆☆☆

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نگاہ میں یزید کا مقام:

﴿سوال﴾ ابن شوذب جیسے ثقہ محدث سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ یزید کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لیے دعائے رحمت کرتے تھے۔[1] اس سے ثابت ہوا کہ اسلاف یزید کے قدر دان تھے۔

﴿جواب﴾ ابن شوذب کی اس روایت میں دُہرا ضعف ہے: اوّل تو یہ منقطع الاسناد ہے۔ دوسرے یہ روایت ابراہیم بن ابی عبد سے منقول ہے جو ایک مجہول راوی ہے، دو وجوہِ ضعف جمع ہو جانے کے بعد اس روایت کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بالمقابل نسبتاً بہتر سند کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یزید کو امیر المؤمنین کہنے والے کو انہوں نے بیس کوڑے لگوائے۔[2]

---

① قال ابن شوذب سمعت ابراهيم بن ابي عبد يقول سمعت عمر بن عبدالعزيز يترحم على يزيد بن معاوية. (لسان الميزان: ٦/ ٢٩٣)

② ذكر الذهبي: قال محمد بن ابي السري عن يحيىٰ بن عبدالملك بن ابي غنية عن نوفل بن ابي الفرات قال كنت عند عمر بن عبدالعزيز فذكر له رجل يزيد بن معاوية فقال امير المومنين يزيد، فقال عمر تقول امير المؤمنين يزيد وامر به فضرب عشرين سوطا. (تاريخ الاسلام للذهبي تدمرى: ٥/ ٢٧٥ ؛ بشار: ٢/ ٧٣١)

رجال کے متعلق ائمہ جرح وتعدیل کی آراء یہ ہیں:

محمد بن ابی السری: قال الذهبي: حافظ وثقة. (الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة: ٢/ ٢١٣) قال الامام احمد العبد الصالح. (طبقات الحنابلة لابن ابي يعلىٰ: ١/ ٣٣٢، ط المعرفة)

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں اور امام احمد بن حنبل نے ''فضائل الصحابہ'' میں ان سے روایت لی ہے۔

یحییٰ بن عبدالملک: (م ١٩٠ھ) بخاری ومسلم کے راوی ہیں۔ انہیں امام احمد بن حنبل نے صالح اور امام ابوداؤد نے ثقہ قرار دیا ہے۔ (تاريخ الاسلام للذهبي تدمرى: ١٢/ ٤٥٧ ؛ بشار: ٤/ ١٠٠٢، ط بشار ؛ تقريب التهذيب، ترجمه نمبر ٧٥٩٨)

ابوفرات: (م ١٠٥ هجری) معتبر ہیں۔ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کی مرویات لی ہیں، قال الحافظ الذهبي: ماعلمت به باسا. (تاريخ الاسلام للذهبي تدمرى: ٩/ ٣١٤ ؛ بشار: ٣/ ٩٩٧)

رجال کے احوال سے ظاہر ہے کہ یہ درمیانے درجے کے ثقات کی روایت ہے۔

ونقل ابن الحجر العسقلاني هذه الرواية باسناد آخر قال: قال يحيى بن عبدالملك بن ابي غنية احد الثقات ثنا نوفل بن ابي عقرب ثقة قال كنت عند عمر بن عبدالعزيز (تهذيب التهذيب: ١١/ ٣٩١)

اس سند میں **نوفل بن ابی عقرب** (م ١٢٠ هجری) ہیں جو بخاری ومسلم کے راوی ہیں اور ثقہ ہیں۔ تاريخ الاسلام للذهبي تدمرى ٧/ ٥١٨ ؛ بشار: ٣/ ٣٥٠ ؛ تقريب التهذيب، ترجمه نمبر: ٧٢١٨)

نوٹ: بعض کتب اسماء الرجال کے بعض نسخوں میں یحییٰ بن عبدالملک <u>بن ابی غنیۃ</u> کی جگہ <u>بن ابو عتبۃ</u> لکھ دیا گیا ہے۔ درست لفظ ''ابن ابی غنیہ'' ہے۔

کیا امام احمد رحمہ اللہ کی ''کتاب الزہد'' میں یزید کی روایت ہے؟

﴿سوال﴾ علامہ ابن العربی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ''کتاب الزہد'' میں یزید بن مُعاویہ کی روایت پیش کی ہے اور انہیں تابعین سے قبل صحابہ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کا ایک زاہدانہ وصوفیانہ خطبہ پیش کیا ہے:

عن یزید بن معاویة فی ''کتاب الزهد'' انه کان یقول فی خطبته: اذا مرض احدکم مرضا فاشفی ثم تماثل، فلینظر الیٰ افضل عمل عنده فلیلزمه.

(کتاب الزہد میں یزید سے منقول ہے کہ اس نے اپنے خطبے میں کہا: ''تم میں سے کوئی بیمار ہو، پھر شفا پا جائے تو اپنے اچھے عمل پر غور کرے اور اسے لازم پکڑ لے۔'') [1]

علامہ ابن عربی رحمہ اللہ اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں:

هذا یدلّ علیٰ عظیم منزلته عنده حتیٰ یدخله فی جملة الزهاد من الصحابة والتابعین.

(یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک یزید اتنا عظیم المرتبہ تھا کہ انہوں نے اسے زہاد صحابہ وتابعین میں شمار کر لیا۔) [2]

اس سے بڑھ کر یزید کی عظمت کا اور کونسا ثبوت چاہیے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان کے مداح ہیں۔

﴿جواب﴾ امام احمد رحمہ اللہ پر یہ ایک جھوٹی تہمت ہے کہ انہوں نے یزید کی روایت لی ہے اور اس کی مدح کی ہے۔ امام رحمہ اللہ تو یزید کے متعلق فرماتے تھے: ''لَا یُذْکَرُ عَنْهُ حَدِیث'' (اس سے کوئی حدیث نہ نقل کی جائے۔) [3]

درحقیقت علامہ ابن العربی یہاں شدید وہم کا شکار ہوئے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ''کتاب الزہد'' میں ایسی کوئی روایت سرے سے موجود نہیں جس میں حکمران یزید کے خطبے کا ایک شوشہ بھی ہو۔ [4]

علامہ ابن العربی کا یہ دعویٰ کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یزید کو زاہد صحابہ اور تابعین میں شمار کیا ہے، اس وہم پر قائم ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے زاہد صحابہ وتابعین سے منقول روایات میں یزید کی روایت بھی نقل کی ہے۔ مگر روایت کی سند میں فقط ''یزید بن مُعاویہ'' کا لفظ آجانے سے روایت حکمران یزید کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی جب تک کہ سند یا متن میں اس پر کوئی مضبوط قرینہ نہ مل جائے؛ کیوں کہ یزید بن مُعاویہ نامی دیگر راویانِ حدیث بھی تو ہیں جن میں ''یزید بن مُعاویہ نخعی'' راوی ہونے کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں اور عابد وزاہد ہونے کی حیثیت سے بھی۔

اب آپ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ''کتاب الزہد'' اٹھائیں اور ایک ایک روایت دیکھتے چلے جائیں۔ آپ کو معلوم

---

① العواصم من القواصم، ص ۲۴۵، ط دار الجیل

② العواصم من القواصم، ص ۲۴۵، ط دار الجیل

امام احمد بن حنبل کی ''کتاب الزهد'' محمد عبدالسلام شاہین کے حواشی کے ساتھ ''دار الکتب العلمیة بیروت'' سے شائع ہوئی ہے۔ عام ملتی ہے۔ اگر کسی کو کچھ شک ہو تو اسے اچھی طرح کھنگال لے۔ غالباً ابن العربیؒ نے لکھتے وقت کتاب کا نسخہ سامنے نہیں رکھا تھا بلکہ حافظے پر اعتماد کیا تھا، اس لیے وہم کا شکار ہو گئے۔

③ المنتخب من علل الخلال، ابن قدامه المقدسی، ص ۲۳۷

ہوگا کہ وہ جہاں جہاں ''یزید بن مُعاویہ'' کی روایات لائے ہیں، ان میں بیشتر کی سند یا متن میں ایسے واضح قرائن موجود ہیں جن سے پتا چل جاتا ہے کہ یہاں حکمران یزید کی بات نہیں ہورہی۔ مثلاً:

ایک روایت میں مذکور ہے کہ یزید بن مُعاویہ نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ان کی صاحبزادی درداء کا رشتہ مانگا مگر انہوں نے انکار کردیا۔ [1]

ظاہر ہے یہ یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کا ذکر نہیں ہورہا؛ کیوں کہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۲ھ کی ہے اور یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کی ولادت ۲۶ ہجری کی ہے۔ یعنی یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کی عمر چھ سال تھی جب ابوالدرداء رضی اللہ عنہ وفات پاگئے تھے۔ یہ ممکن نہیں کہ یزید نے چھ سال کی عمر میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا رشتہ مانگا ہو۔ پس یہ یزید بن معاویہ نخعی ہی ہیں۔

''کتاب الزہد'' میں امام احمد بن حنبل نے یزید بن مُعاویہ کی بعض جو دوسری روایات نقل کی ہیں وہاں سند میں ''النخعی'' کی وضاحت خود ہی کردی ہے۔ [2]

پس جہاں پر سند یا متن میں یزید نامی متعدد اشخاص میں سے کسی کی تعیین کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہوگا، وہاں بھی اسے یزید نخعی کی طرف منسوب کیا جائے گا؛ کیوں کہ انہی سے امام احمد نے دیگر روایات لی ہیں۔

یا زیادہ سے زیادہ اس کی گنجائش ہوگی کہ توقف کیا جائے گا۔ یہ تو محض تعصب بلکہ دھاندلی ہے کہ کوئی قرینہ نہ ہوتے ہوئے بھی اسے زبردستی حکمران یزید کی طرف منسوب کردیا جائے۔

☆☆☆

کیا ''الترغیب والترہیب'' میں یزید کی روایت ہے؟

﴿سوال﴾ ''الترغیب والترہیب'' حدیث کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں امام ابوداؤد کی مراسیل سے امیر یزید بن مُعاویہ کی یہ حدیث نقل کی گئی ہے:

''عن یزید بن معاویة رضی اللہ عنہ انه کتب الی اهل البصرة : سلام علیکم، اما بعد فان رجلاً سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زماما من شعر من مغنم، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سألتنی زماما من نار، لم یکن لک ان تسألنیه ولم یکن لی ان اعطیه. رواه ابو داؤد فی المراسیل ایضاً''

کیا یزید کے علم وتقویٰ کے ثبوت کے لیے یہ حدیث کافی نہیں۔ [3]

﴿جواب﴾ ''الترغیب والترہیب'' میں ''مراسیل ابی داؤد'' کے حوالے سے ''یزید بن مُعاویہ'' نامی راوی کی جو روایت

---

[1] خطب یزید بن معاویة الی ابی الدرداء ابنته الدرداء، فرده. (الزهد لاحمد بن حنبل، ح: ۷۶۱ ؛ حلیة الاولیاء: ۱/۲۱۵، ط السعادة)

[2] " عن یزید بن معاویة النخعی. ان الدنیا جُعلت قلیلاً فما بقی منها الا قلیل قلیل. " (الزهد لاحمد بن حنبل بروایت نمبر: ۲۱۴۲)

[3] الترغیب والترهیب، ح: ۲۱۰۵، کتاب الجهاد

نقل کی گئی ہے، اسے ''یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان'' کی روایت قرار دینا محض ایک دعویٰ ہے۔ یزید بن مُعاویہ نام کے دیگر معروف راوی موجود ہیں جن کی روایات محدثین کے ہاں مقبول ہیں۔ ایسے میں یہاں ''یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان'' کی تخصیص کس دلیل سے کی جارہی ہے؟ یہاں یزید کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' بھی مروی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ یہ یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان نہیں بلکہ یزید بن مُعاویہ البکائی رضی اللہ عنہ ہیں جو صحابی ہیں۔

ویسے بھی یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کی آراء کو دیکھتے ہوئے بہت ہی بعید ہے کہ کوئی محدث اپنی ساکھ برباد کرنے کا خطرہ مول لے کر اس کی روایت نقل کرے۔

☆☆☆

کیا عالی نسبی کے باعث بُرائیاں کالعدم ہو جاتی ہیں؟

﴿سوال﴾ جب یہ طے ہے کہ امیر یزید حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے فرزند ہیں، اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں اور اس رشتے سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم امیر محترم کے سگے پھوپھا ہیں اور پھر امیر یزید مسلمانوں کے خلیفہ رہے تو ان مراتبِ عالیہ کو دیکھنا ہی اس بات کو جاننے کے لیے کافی ہے کہ ان کی برائیوں کی شہرت غلط ہے۔

﴿جواب﴾ اعلیٰ مراتب اور اعلیٰ رشتوں کے ہونے سے بُرائی کا وزن گھٹ نہیں جاتا بلکہ بُرائی مزید شدید ہو جاتی ہے اور اس پر پکڑ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اُمہات المؤمنین کو مخاطب کر کے ارشادِ باری ہوا:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کسی کھلی بے ہودگی کا ارتکاب کرے گی، اس کا عذاب بڑھا کر دوگنا کر دیا جائے گا۔''[1]

جب کسی شخص کی کوئی بُرائی تواتر سے ثابت ہو تو اس شخص کے حسب نسب کی بناء پر بُرائی کی نفی نہیں ہوگی بلکہ اس میں مزید شدت آجائے گی۔ اگر حسب نسب ہی بلند کرداری کا معیار ہے تو یزید کی بہ نسبت ابولہب کا رشتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ قریبی تھا۔ مگر اس کا حسب نسب دھرا رہ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ہونا بھی کچھ کام نہ آیا۔ کیا کوئی ابولہب کی ثابت شدہ بُرائیوں کا اس بناء پر انکار کر سکتا ہے کہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فلاں فلاں قریبی رشتوں کا شرف حاصل تھا؟ پس اگر یزید سے (نواصب کے سوا) ساری اُمت مسلمہ بیزار چلی آرہی ہے تو بجا ہے۔ یزید جیسے کام اگر بعد کی صدیوں کا کوئی حکمران کرتا تو شاید اتنا غم وغصہ پیدا نہ ہوتا مگر چونکہ اس نے خیر القرون میں، اتنی مبارک نسبتوں کے ہوتے ہوئے اور ایسے عظیم منصب پر فائز ہو کر وہ سب کچھ کیا، اس لیے اسے وہی بدنامی ملی جس کا وہ مستحق تھا۔

☆☆☆

[1] سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۰

یزید کے عادل ہونے کی ایک نرالی دلیل:

﴿سوال﴾ یہ ثابت ہے کہ امیر یزید کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے اہتمام سے جانشین بنایا۔ یہ مساوی ہے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے یزید کی تعدیل کے۔ جب ایک عظیم صحابی نے ایک تابعی کی تعدیل و توثیق کردی تو بعد والے چاہے لاکھ اس پر جرح کریں وہ جرح مردود ہی ہوگی۔

﴿جواب﴾ ارشادِ نبوی ہے:

اِنَّ الْعَبْدَ لَیَعْمَلُ عَمَلَ اَھْلِ النَّارِ وَاِنَّہٗ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ ،وَیَعْمَلُ عَمَلَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاِنَّہٗ مِنْ اَھْلِ النَّار وَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْمِ.

(بے شک انسان جہنمیوں جیسے اعمال کرتا ہے جبکہ وہ جنتی ہوتا ہے اور کوئی شخص جنتیوں جیسے عمل کرتا ہے جبکہ وہ دوزخی ہوتا ہے۔ اعمال کا دارومدار اختتام پر ہے۔)[1]

اس حدیث میں ایک اصول بتایا گیا ہے کہ اعمال کا انحصار خاتمے پر ہوتا ہے۔ بے شمار لوگ عمر بھر بُت پرست یا فاسق و فاجر رہے مگر مرنے سے پہلے انہیں ایمان اور عملِ صالح نصیب ہوگیا۔ وہ اللہ کے ہاں بھی صالحین ہی میں شمار ہیں اور لوگ بھی ان کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص عمر بھر ولی رہے مگر آخر میں فاسق و فاجر ہوجائے تو اس کا شمار فاسقوں ہی میں ہوگا۔ یزید کی حالت آخری چار سالہ دور میں بلاشبہ خراب تھی۔ اس کا آخری عمل جس کے دوران اس کی وفات ہوئی، وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی کے خلاف مسجد الحرام پر فوج کشی تھی۔[2]

پس حدیث میں بتائے گئے اسی اصول کے مطابق علمائے اُمت نے یزید کا مقام "ظالم" اور "فاسق" متعین کیا ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعدیل اپنی حیاتِ مستعار میں اپنے حسنِ ظن کے مطابق تھی۔ بعد والے حالات ان کے پیشِ نظر نہیں تھے۔ انہیں علم غیب حاصل نہ تھا جو وہ یزید کے مرنے تک کے حالات سے واقف ہوں۔

یزید کے بُرے کام، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سامنے آئے۔ ان کاموں کو وہی لوگ جانتے تھے جو اس دور میں تھے یا اس کے بعد آئے۔ پس یزید کے کردار کے بارے میں انہی کی رائے معتبر ہوگی جو یزید کے ابتدائی درمیانی اور آخری تمام حالات سے واقف تھے۔ ان حضرات کی آراء کیا تھیں، وہ اسماء الرجال کی کتب میں محفوظ ہیں جس کے کچھ نمونے ہم پیش کرچکے ہیں۔

☆☆☆

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۶۶۰۷، کتاب القدر

[2] صحیح البخاری، ح: ۱۰۴، ح: ۱۸۳۲

اہم تنبیہ: یزید بن مُعاویہ نام کے پانچ راوی

بعض حضرات یزید بن مُعاویہ نامی کچھ رجال کے حالات پیش کر کے یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کے ثقہ ہونے کا ثبوت دینا چاہتے ہیں اور کتبِ حدیث میں ان کی روایات کو یزید کی روایات بتاتے ہیں، نیز ماہرینِ اسماءالرجال کی تعدیل کے وہ الفاظ جو یزید بن مُعاویہ نامی دیگر حضرات کے متعلق ہیں، انہیں اس یزید پر منطبق کرتے ہیں، حد یہ ہے کہ بعض دھوکہ باز ان عبارات کو لے کر یزید کو صحابی ثابت کرنے کی بھی کوشش کر ڈالتے ہیں۔ یہ بدترین خیانت ہے۔

یاد رکھیں کہ کتبِ اسماءالرجال میں "یزید بن مُعاویہ" نامی پانچ حضرات مشہور ہیں:

① **یزید بن معاویة البکائی** رضی اللہ عنہ: یہ صحابی ہیں۔ انہیں یزید بن مُحَجّل بھی کہا جاتا ہے۔[①]

② **یزید بن معاویة بن الاسود** رضی اللہ عنہ: یہ بھی صحابی ہیں، غزوۂ خیبر یا غزوۂ طائف میں شہید ہوئے۔[②]

③ **یزید بن معاویة النخعی**: یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور ثقہ ہیں، بڑے عابد و زاہد تھے۔ جہاد میں شہید ہوئے۔ صحیح بخاری میں جہاں یزید بن مُعاویہ کے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاں وعظ سننے کے لیے جانے کا ذکر ہے، وہاں یہی یزید نخعی مراد ہیں۔ انہی کو یزید بن معاویہ العبسی کہا جاتا ہے۔ عبداللہ بن مبارک یا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی "کتاب الزہد" میں یزید بن مُعاویہ کا نام آنے سے بعض لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ یزید اتنا عابد و زاہد تھا کہ "کتاب الزہد" میں اس کا ذکر ہے، حالاں کہ وہ یزید بن مُعاویہ نخعی کا ذکر ہے نہ کہ یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کا۔[③]

④ **یزیدبن معاویة العامری**: ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔[④]

⑤ **یزید بن معاویة، ابوشیبة الکوفی الخراسانی**: یہ ابوزرعہ کے بقول صالح راوی ہیں۔[⑤]

کتبِ حدیث میں مصنف عبدالرزاق کی مذکورہ روایت (یا امکاناً اس جیسی کسی اور ایک آدھ روایت کو مستثنیٰ کر کے) یزید بن مُعاویہ کے نام سے جو بھی روایات ہیں وہ ان دیگر حضرات کی ہیں نہ کہ یزید بن مُعاویہ بن ابی سفیان کی۔



① الاصابة لابن حجر: ۵۲۸/۲ ؛ توضیح المشتبه لابن ناصرالدین: ۲۲۶/۹

② الاصابة: ۵۲۷/۲

③ صحیح البخاری، ح: ۶۴۱۱، کتاب الدعوات، باب الموعظة ساعة بعد ساعة ؛ فتح الباری: ۲۲۸/۱۱ ؛ النکت علی کتاب ابن الصلاح لابن حجر: ۷۷۹/۲ ؛ تاریخ ابن معین بروایة الدوری، تر: ۴۳۳۹ ؛ العلل ومعرفة الرجال بروایة عبداللہ بن احمد لاحمد بن حنبل، ترجمہ نمبر: ۳۰۰۵ ؛ الثقات للعجلی، ترجمہ نمبر: ۲۰۳۶، ط الدار

④ الثقات لابن حبان، ترجمہ نمبر: ۶۱۵۱

⑤ الضعفاء والمترکون لابن الجوزی، تر: ۳۸۰۵، نیز ملاحظہ ہو: توضیح المشتبه: ۲۲۶/۹ ؛ تهذیب التهذیب: ۳۶۰/۱۱

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کا جائزہ

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب سیاسی غلطیاں

﴿سوال﴾ شاہ معین الدین ندوی نے اپنی "تاریخ اسلام" میں لکھا ہے کہ مروان کو خلافت کے دعوے پر ابھارنے میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک سیاسی غلطی کا بڑا عمل دخل تھا۔ شاہ صاحب "ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک سیاسی غلطی اور اس کا نتیجہ" کا عنوان لگا کر اس کے تحت لکھتے ہیں:

"اس وقت تقریباً کل دنیائے اسلام میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہوگئی تھی کہ عین اس وقت انہوں نے ایک فاش غلطی کی کہ بنوامیہ کی اکھڑی ہوئی حکومت پھر قائم ہوگئی۔ یاد ہوگا کہ انہوں نے مکہ اور مدینہ سے بنوامیہ کو نکلوادیا تھا لیکن واقعہ حرہ کے بعد یہ لوگ پھر لوٹ آئے تھے۔ یزید کی موت کے بعد ان کی ہمت اتنی پست ہو چکی تھی کہ مروان بن حکم اموی تک جو مدینہ کا حاکم تھا، ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر بیعت کے لیے آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو بنوامیہ سے اتنی نفرت تھی کہ انہوں نے انجام کو سوچے بغیر کل بنی امیہ کو بھی جس میں مروان اور اس کا لڑکا عبدالملک بھی تھا، مدینہ سے نکلوادیا۔ اس وقت عبدالملک چیچک میں مبتلا تھا، اس لیے مروان کے لیے مدینہ چھوڑنا مشکل تھا لیکن ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی ٹکنے نہ دیا اور مروان کو اسی حالت میں عبدالملک کو لے کر نکل جانا پڑا۔ بعد میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے اس کی تلاش میں آدمی دوڑائے لیکن وہ نکل چکے تھے۔ اس واقعہ نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور بنی امیہ دونوں کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اگر اس وقت بنوامیہ کو ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے روک لیا ہوتا تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔"[1]

کیا شاہ صاحب کی یہ تحقیق درست ہے؟

﴿جواب﴾ سب سے پہلے شاہ صاحب کی اس عبارت میں پیش کردہ روایت کی سند دیکھنا ضروری ہے۔ اسلام کی تاریخ کے پورے ذخیرے میں یہ روایت اس افسانوی شکل میں صرف ایک شیعہ مؤرخ احمد بن اسحٰق یعقوبی (متوفی ۲۹۲ھ) کی تاریخ میں دکھائی دیتی ہے جو تیسری صدی ہجری کا آدمی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بنوامیہ کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا تھا مگر یہ واقعہ کب اور کن حالات میں پیش آیا تھا اور آیا اس جلاوطنی میں مروان شامل تھا یا نہیں؟ یہ محل نظر ہے۔ صحیح اور ضعیف روایات کا فرق نہ کرنے کی وجہ سے اصل حقیقت چھپ کر رہ گئی ہے اور لوگوں نے

[1] تاریخ اسلام: ۱/ ۳۸۱، بحوالہ تاریخ یعقوبی: ۲/ ۳۰۴ راقم کو دستیاب تاریخ یعقوبی کا قلمی نسخہ ایک جلد کا ہے جس میں یہ واقعہ ص ۲۱۱ پر ہے۔

واقعات کی نت نئی شکلیں بنا کر آراء قائم کر لی ہیں۔ بنوامیہ کے مدینہ سے انخلاء کے متعلق قدیم ذخیرے میں صرف چھ روایات ملتی ہیں: ان میں سے تین روایات شاہ صاحب کی مؤید بن سکتی ہیں، پہلے ہم انہی تین کو پیش کرتے ہیں:

① واقدی روایت ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کے دورِ حکومت میں مروان اور عبدالملک کو مدینہ سے نکالا گیا تھا۔ [1]

② یعقوبی کی روایت ہے جس کی کوئی سند نہیں اور جسے شاہ معین الدین ندوی نے پیش کیا ہے، درج ذیل ہے:

''ابن زبیر نے بنوامیہ کو مدینہ سے نکال دیا۔ مروان نکلنے لگا تو اپنے لڑکے عبدالملک کے پاس آیا وہ چیچک میں مبتلا تھا۔ مروان نے کہا: ''بیٹا! ابن زبیر نے مجھے نکال دیا ہے۔'' عبدالملک نے کہا: ''آپ کو مجھے ساتھ لے جانے سے کیا چیز روک رہی ہے؟'' مروان بولا: ''تمہیں کیسے ساتھ لے جاؤں، تمہارا تو یہ حال ہے؟'' عبدالملک نے کہا: ''مجھے روئی میں لپیٹ کر لے جائیں۔ یہ ایسا حکم ہے کہ ابن زبیر نے اس کے انجام پر غور نہیں کیا۔'' پس مروان عبدالملک کو ساتھ لے کر نکلا۔ ابن زبیر نے بعد میں انجام پر غور کیا تو جانا کہ یہ رائے غلط تھی۔ انہوں نے ان کو لوٹانے کے لیے لوگ بھیجے مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔ [2]

③ مدائنی کی بلاسند روایت ہے: مروان مدینہ میں ہی رہا یہاں تک کہ ابن زبیر نے یزید کی موت اور حُصَین بن نُمَیر کی واپسی کے بعد عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ بنی امیہ کو نکال دیا جائے، انہوں نے مروان اور بنوامیہ کو نکال دیا، پس مروان شام پہنچا تو مُعاویہ بن یزید کی بیعت ہو چکی تھی۔ [3]

---

① "واخرج بنی امية و مروان بن الحكم الی الشام و عبد الملک يومئذٍ ابن ثمان و عشرين." (تاریخ طبری: ۵/۵۳۰)

② "واخرج ابن الزبير بنی امية من المدينة، واخذ مروان بالخروج، فاتی عبد الملک ابنه، وهو عليل مجدرٌ فقال له يا بنی! ان ابن الزبير قد اخرجنی قال فما يمنعک ان تخرجنی معک؟ قال كيف اخرجک وانت علی هذا الحال؟ قال لفنی فی القطن، فان هذا رائی لم يتعقبه ابن الزبير، فخرج واخرج عبد الملک، وتعقب ابن الزبير الرائی، فعلم انه اخطاء فوجه يردهم ففاتوه. (تاریخ يعقوبی، ص ۲۱۱، باب ايام مروان بن الحكم)

③ لم يزل مروان بالمدينة حتیٰ كتب ابن الزبير بعد موت يزيد و شخوص حُصَين بن النُمَير السكونی الی ابن مطيع فی تيسير بنی امية فسيره وسيرهم فورد الشام و معاوية بن يزيد قد بويع. (انساب الاشراف: ۶/۲۵۷، ترجمة مروان بن الحكم، ط دارالفكر)

ملحوظہ: یادر ہے کہ مروان کے بارے میں ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے: ثم وُلی امرة المدينة لمعاوية ثم لم يزل بها الیٰ ان اخرجهم ابن الزبير فی اوائل امرة ''وہ حضرت مُعاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم بنایا گیا، پھر وہیں رہا یہاں تک کہ ابن زبیر نے ان لوگوں کو وہاں سے نکال دیا۔'' (الاصابہ: ۶/۲۵۸)

مگر ابن حجر رحمہ اللہ کے اس بیان میں کچھ تسامح ہے؛ کیوں کہ واقعۂ حرہ سے قبل اور اس کے کئی ماہ بعد بھی مدینہ پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت نہ تھی۔ پس اس وقت ان کے حکم سے وہاں سے بنوامیہ اور مروان کا اخراج ممکن نہ تھا۔ واقعۂ حرہ کی روایات متفق ہیں کہ اس وقت بنوامیہ کا اخراج اہل مدینہ نے خود کرایا تھا۔ اس میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حکم کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ پھر ابن حجر رحمہ اللہ نے یہاں اپنے الفاظ میں واقعے کا ذکر کیا ہے۔ کوئی سند بیان نہیں کی۔ ان کے مقام کے پیش نظر ہم یہ گمان نہیں کر سکتے کہ انہوں نے بے سند روایات پر اعتماد کیا ہوگا۔ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے واقدی کی روایت کو مدار بنایا ہے۔ (جو طبری ۵/۵۳۰ پر ہے)

ایسا لگتا ہے کہ اپنی جلالتِ شان کے باوجود ان سے تسامح ہو گیا ہے۔ اگر وہ ان روایات کو سامنے رکھتے جو آگے آ رہی ہیں تو یہ تسامح سرزد نہ ہوتا۔ تاہم ابن حجر رحمہ اللہ کی اس عبارت سے بڑی حد تک ہماری تائید ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ وہ بھی واقعۂ حرہ سے پہلے ہی مروان کے اخراج کے قائل ہیں، اس کے بعد نہیں۔ یعنی وہ مانتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بن کر مروان کا اخراج نہیں کیا۔ یہ طے ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت یزید بلکہ اس کے بیٹے مُعاویہ کے بھی بعد شروع ہوا۔ پس اس وقت مروان کو اس کے بیٹے سمیت مدینہ سے نکالنے کا جو افسانہ یعقوبی نے نقل کیا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی اس کے قائل ہرگز نہیں۔

ان تینوں روایات میں سے پہلی واقدی کی ہے جس کا ضعف ظاہر ہے۔ دوسری یعقوبی نے بلاسند نقل کی ہے، تیسری المدائنی سے اسی طرح بلاسند منقول ہے۔ گویا تینوں روایتیں بالکل ساقط الاعتبار ہیں۔

وہ روایات جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مروان کو مدینہ سے نہیں نکالا

❶ مدائنی کی ایک طویل روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنوامیہ کی مجلس میں نئے خلیفہ کی تقرری کے بارے میں مروان، حسان بن مالک، ضحاک بن قیس اور دیگر اموی امراء کی مجلس مشاورت ''جابیہ'' کے مقام پر ہوئی۔

"فارسل الضحاک الی مروان، فاتاه هو و عَمْرو بن سعيد الاشدق و خالد و عبد الله ابنا يزيد فاعتذر اليهم وقال: اكتبوا الى حسان حتىٰ ينزل الجابية و نسير اليهم و نستخلف احدكم."

''ضحاک رضی اللہ عنہ نے مروان کو پیغام بھیجا۔ وہ اور عمرو بن سعید الاشدق، خالد بن یزید اور عبداللہ بن یزید ان کے پاس آگئے۔ ضحاک رضی اللہ عنہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ حسان کو بھی لکھو کہ وہ جابیہ آجائے، ہم بھی وہیں چلیں گے اور تم میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنالیں گے۔''

پھر مجلس مشاورت میں اختلاف ہوگیا جس کے بعد ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے کھلم کھلا بیعت لی اور لوگوں نے اس خلافت کو تسلیم کرلیا **"فتظهر البيعة لابن الزبير ففعل وتبعه الناس."**

ان سب باتوں کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ضحاک کو شام کا نائب بنایا اور بنوامیہ کو مکہ اور مدینہ سے نکالنے کا حکم جاری کیا۔ **''وبلغ ابن الزبير فكتب الضحاک بامرة الشام ونفى مَن بمكة و المدينة من الامويين.''** [1]

اس روایت سے صاف پتا چل رہا ہے کہ جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بنوامیہ کو حجاز سے نکال رہے تھے تو مروان شام میں تھا۔ [2]

❷ دوسری روایت واقدی سے مروی ہے اس لیے ضعیف ہے مگر اس کے مؤیدات موجود ہیں۔

واقدی کی اس روایت کے مطابق اہلِ مدینہ نے یزید کی بیعت توڑنے کے بعد پہلے تو مدینہ میں مقیم بنوامیہ کو کچھ

---

① طبقات ابن سعد، جزء متمم الصحابه، الطبقة الخامسة: ۲/۱۹۸ تا ۲۰۵، ط مكتبة الصديق الطائف ؛ تاريخ الاسلام للذهبي تدمری: ۵/۱۳۴ ؛ بشار: ۲/۶۴۷ عن المدائنی

اس پوری بحث میں صرف المدائنی کی یہ روایت ہے جس کی سند مضبوط ہے اور یہ واضح الفاظ میں بتاتی ہے کہ جب عبداللہ بن زبیر نے مدینہ سے بنوامیہ کا اخراج کیا تو مروان اس وقت شام میں تھا۔ یہ روایت اصح مافی الباب اور حسن ہے، ابن سعد نے مدائنی کے دو طرق سے نقل کی ہے۔ متن یکساں ہے:

(الف) ابن سعد، عن المدائنی عن مسلمة بن محارب عن حرب بن خالد. حرب بن خالد بالاتفاق ثقہ ہے۔ مسلمہ بن محارب کو بھی ابن حبان نے ثقہ شمار کیا ہے۔ اس طرح یہ روایت حسن ہے۔ (ب) ابن سعد عن المدائنی عن خالد بن يزيد (بن بشر) عن ابيه. اس طریق میں خالد بن یزید ضعیف ہے مگر دونوں طرق کو ملانے سے سند میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

② یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے بنوامیہ کو صرف مدینہ ہی سے نہیں بلکہ مکہ سے بھی نکالا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ اب تک صرف بنوامیہ کے عمائد بیعت سے گریزاں ہیں تو انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ یہ قبیلہ اپنی قوت اور سیاسی جوڑ توڑ کی صلاحیت کی بدولت ان کے مرکز میں کسی بھی وقت بغاوت کرا سکتا ہے۔ پس خلافت کو بچانے کے لیے وہ اس اقدام پر مجبور ہو گئے۔

دنوں تک صرف محاصرے میں رکھا کیوں کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ یزید کی حکومت کے عملے سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر پر قبضے کے لیے ان کو بے بس کرنا ضروری تھا۔ تاہم ان میں سے کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ ان میں مروان بن الحکم اور اس کا بیٹا عبدالملک شامل تھے۔ کچھ دنوں بعد اہل مدینہ نے محاصرہ ختم کر کے ان لوگوں کو اس شرط پر چھوڑ دیا کہ وہ مدینہ پر حملے کے لیے آنے والی شامی فوج کو ایسی معلومات نہیں دیں گے جس سے شہر پر قبضہ آسان ہو جائے بلکہ اس لشکر کو واپس کرنے کی کوشش کریں گے۔ بنوامیہ آزاد ہو کر نکلے اور مسلم بن عُقبہ کے اس لشکر سے جا ملے جو شہر پر چڑھائی کرنے آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے مسلم بن عُقبہ کو مدینہ منورہ کے کمزور دفاعی انتظامات کی تفصیل بتائی اور حملے کی منصوبہ بندی میں اس کا ساتھ دیا۔

اس کے بعد واقدی نے بتایا ہے کہ مروان بن الحکم جنگ حرہ میں مسلم بن عُقبہ کا ساتھ دینے کے بعد شام چلا گیا اور یزید کے پاس ہی رہا۔ یزید کے جانشین مُعاویہ کی موت کے وقت بھی مروان وہیں تھا اور اس نے اس حادثے پر حزنیہ اشعار پڑھے تھے۔ [1]

اس روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بنوامیہ کی مدینہ سے جلا وطنی کے وقت مروان مدینہ میں نہیں شام میں تھا۔ [2]

❸ تیسری روایت عوانہ بن الحکم کی ہے، اس میں ہے:

''عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں اپنے عامل کو لکھا کہ وہ بنوامیہ کو وہاں سے نکال دے، پس وہ لوگ اپنے بال بچوں اور عورتوں سمیت وہاں سے نکال دیے گئے۔ وہ دِمَشق آئے جہاں مروان بن حکم موجود تھا۔'' [3]

① طبقات ابن سعد: ۳۸/۵ ط صادر ...... واقدی کی روایت کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

" فلما ولب اهل المدينة ايام الحرة اخرجوا عثمان بن محمد و بنى امية من المدينة فاجلوهم عنها الى الشام واخذوا عليهم الايمان الا يرجعو اليهم وان قدروا ان يردوا هذا الجيش الذى قد وجه اليهم مع مسلم بن عقبة المرى ان يفعلو فلما استقبلوا مسلم بن عُقبه سلموا عليه وجعل يسالهم عن المدينة واهلها فجعل مروان يخبره ويحرضه عليهم. (طبقات ابن سعد :۳۸/۵ ط صادر)

② واقدی کی یہ روایت اس کی سابقہ روایت کے برخلاف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے مانا جائے یا گزشتہ روایت کو؟ چونکہ واقدی کی یہ روایت مدائنی کی حسن روایت سے مؤید ہو کر نسبتاً وزنی ہے اور درایت کے لحاظ سے بھی مضبوط ہے؛ کیوں کہ ایک بار بے گھر ہونے کے بعد فتنے اور خانہ جنگی کے ماحول میں بھلا مروان دوبارہ مدینہ میں اہل وعیال سمیت کیسے آباد ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے مدینہ کی بہ نسبت شام ہی محفوظ جگہ تھی۔ اس کے برعکس واقدی کی سابقہ روایت کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی، پس اُس کا کوئی وزن نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ دونوں روایات کو ملانے سے یہ ثابت ہوگا کہ بنوامیہ کا مدینہ منورہ سے انخلاء دوبار ہوا تھا: پہلی بار انخلا اہل مدینہ نے کرایا تھا۔ ان لوگوں میں مروان بن الحکم بھی شامل تھا۔ یہ وقعہ حرہ سے پہلے ۶۳ھ کا واقعہ ہے۔ اہل مدینہ نے جب پہلی بار بنوامیہ کو شہر سے نکالا تھا تو اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں ان لوگوں سے جوابی کارروائی کا خطرہ تھا۔ ان کے اس اقدام سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا کوئی تعلق نہ تھا۔

③ وكان عبد الله بن زبير رضى الله عنه كتب الى عامله بالمدينة ان ينفى بنى امية من المدينة، فنفوا بعيالاتهم و نسائهم الى الشام فقدمت بنو امية دمشق و فيها مروان. (تاريخ الطبرى: ۵۳۱/۵)

اس روایت کی سند میں ہشام کلبی ہے لہٰذا یہ بھی ضعیف ہے مگر اپنے ضعف کے باوجود یہ کم از کم یعقوبی اور مدائنی کی بے سند روایات سے بہتر ہے۔ چونکہ اس کے مؤیدات میں ایک حسن روایت بھی موجود ہے اس لیے اسے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن اگر کسی کو اعتراض ہو تو اسے اور اس سے پہلے منقول واقدی کی روایت کو بھی چھوڑ دے؛ کیوں کہ ہمارے موقف کے ثبوت کے لیے مدائنی کی وہ ایک حسن روایت ہی کافی ہے۔ یہ دو ضعیف روایات صرف تائید کے لیے لائی گئی ہیں۔

اس روایت میں واضح ہے کہ بنو امیہ جلاوطن ہو کر شام آئے تو مروان پہلے سے دِمشق میں تھا۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے جلاوطن نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنی مرضی سے وہاں سے جا چکا تھا۔

نتیجہ

مذکورہ بحث سے ثابت ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کا پیش کردہ واقعہ بے حقیقت ہے۔ یہ سنداً ثابت ہے نہ درایتاً درست ہے۔ یہ روایت ان دیگر روایات سے متصادم ہے جن کی سند بہتر ہے۔ پھر یہ ایک جلیل القدر صحابی کے اخلاق، کردار اور ذہنی سطح پر جرح کے مترادف ہے۔ بے سند روایتوں سے ایسا کوئی استدلال روا نہیں۔

☆☆☆

کیا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں صحابہ بھی تھے؟

﴿سوال﴾ کہتے ہیں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں مروان کا ساتھ دینے والوں میں بعض صحابہ بھی شامل تھے، پس اگر مروان کو باغی مانا جائے تو یہ سب عظیم الشان شخصیات بھی اس زمرے میں آتی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ ہم نے جہاں تک اس معاملے کی تحقیق کی ہے تو ایسی شخصیات میں صرف دو حضرات کو صحابی کہا گیا ہے: ایک مالک بن ہُبَیرہ السکونی رضی اللہ عنہ [1] دوسرے عبداللہ بن مَسعَدہ الفزاری رضی اللہ عنہ [2]

ایک اور صاحب رَوح بن زِنباع کے بارے میں صحابیت کا قول ہے مگر درست نہیں۔ ان کے والد ضرور صحابی تھے۔ یہ خود فوجی جرنیل، خطیب اور عالم فاضل آدمی تھے۔ [3]

ابن حجر علیہ الرحمہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بعض نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے مگر ان کی صحبت ثابت نہیں۔ درست یہ ہے کہ وہ عہد نبوی میں پیدا ہوئے۔'' [4]

یہی تحقیق ابن عساکر کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی روایت صرف شام میں سکونت پذیر صحابہ سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں۔ [5]

بہر کیف عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مہم جوئی میں کسی کی شرکت کو درست اور مبنی بر صواب نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ ایک طے شدہ شرعی خلیفہ کے مقابلے میں خروج تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ رجب ۶۴ھ میں خلیفہ مقرر ہو گئے تھے۔ عراق، حجاز، شام اور مصر سمیت پورے عالم اسلام میں ان کی بیعت کر لی گئی تھی۔ اس کے چار ماہ بعد دس ذی قعدہ میں مروان نے اپنے لیے بیعت لی اور مقابلے کی تیاری کی۔ اس لیے اسے خروج کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

---

① الاصابہ: ۵/۵۶۱، ۵۶۲؛ الاستیعاب: ۳/۱۳۶۱

② الاعلام للزِرکلی: ۴/۱۳۷؛ الاصابہ: ۴/۲۳۰؛ الاستیعاب: ۳/۹۸۷

③ الاعلام للزِرکلی: ۳/۳۴؛ الاستیعاب: ۲/۵۰۲

④ الاصابہ: ۲/۴۲۰

⑤ تاریخ دِمشق: ۱۸/۲۴۶

اس میں بعض صحابہ کی شرکت اگر صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو اسے غلط جذبے یا بدنیتی پر نہیں بلکہ تاویل کی غلطی پر محمول کیا جائے گا جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی جنگ خطائے اجتہادی پر مبنی تھی۔

تاہم اتنا فرق ضرور ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے موقف کی تأویل تھی جبکہ یہاں باغیوں کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف اصل حریف صحابہ نہیں تھے بلکہ بنوامیہ کے بعض امراء تھے۔

☆☆☆

خروج بالتاویل سے گناہ یا فسق لازم نہیں آتا:

یہ ذہن نشین رہے کہ اگر کوئی شخص عام زندگی میں نیک وصالح ہو تو خروج کی غلطی سے اس کا فاسق وفاجر ہونا لازم نہیں آجاتا۔ اگر اس کا خروج کسی تاویل پر مبنی ہو تو شریعت اسے گناہ گار نہیں ٹھہراتی کیوں کہ وہ حالات کو کسی خاص پہلو سے اور شرعی دلائل کو کسی خاص زاویے سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسے کوئی دوسری راہ سمجھ نہیں آرہی ہوتی۔ اس لیے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والے نیک وصالح لوگوں کے بارے میں یہی گمان رکھا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ خروج میں غلطی ایک سیاسی لغزش ضرور ہوتی ہے جس سے معاشرے میں فساد اور بدامنی کو فروغ ملتا ہے۔ اس لیے اسلام نے خروج کی حوصلہ شکنی کی ہے اور معاصی کے سوا حکمرانوں کی حتی الامکان اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔

☆☆☆

کیا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنفیہ علیہ الرحمۃ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟

﴿سوال﴾ طبقات ابن سعد میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنفیہ علیہ الرحمۃ کو اپنی بیعت پر مجبور کیا تھا؟ ان کو قید کیا تھا، قتل کی دھمکی دی تھی، بنوہاشم کو زندہ جلا دینے کے لیے لکڑیاں جمع کر لی تھیں۔ قریب تھا کہ انہیں جلا دیا جاتا کہ اچانک عراق سے مختار ثقفی کے گھڑ سواروں نے پہنچ کر انہیں بچا لیا[1]۔ کیا یہ ثابت ہے؟

﴿جواب﴾ یہ واقعہ بہت کمزور اسناد سے مروی ہے:

سند کا دارومدار واقدی پر ہے جس کا ضعف ظاہر ہے۔ نیز واقدی نے یہ واقعہ مرکب سند سے بیان کیا ہے جس کی وجہ سے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ واقعے کا کونسا حصہ کس راوی نے نقل کیا ہے۔ ان راویوں میں اسحاق بن یحییٰ بن طلحہ بھی موجود ہے[2] جسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ متروک الحدیث، منکر الحدیث اور ''لیس بشیء'' (بے وقعت) کہتے ہیں۔[3]

انیز اسے ابومخنف نے نقل کیا ہے۔[4] اس کا ضعف بلکہ کذب بھی ظاہر ہے۔

---

① طبقات ابن سعد: ۵/۱۰۱، ط صادر

② طبقات ابن سعد: ۵/۱۰۰ ط صادر

③ موسوعۃ اقوال احمد: ۱/۱۷۳　④ تاریخ طبری: ۶/۷۵ تا ۷۷



الیعقوبی شیعہ مورخ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے اور وہ بھی بلاسند۔ [1]

اسے شیعہ مؤرخ مسعودی نے بھی بلاسند نقل کیا ہے۔ [2]

البلاذری نے اسے ''قالوا'' سے (بلاسند) بیان کیا ہے۔ یہ طویل روایت رطب ویابس سے بھرپور ہے۔ [3]

غرض سند کے لحاظ سے اس واقعے کی کوئی حیثیت نہیں۔

عقلی لحاظ سے دیکھیے تو مختار کے آدمیوں کا مکہ میں گھس جانا کوئی آسان نہ تھا۔ جب یزید کا بھیجا ہوا لشکر حُصین بن نُمیر کی قیادت میں تین ماہ تک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مزاحمت کو نہ توڑ سکا اور مکہ پر قبضہ نہ کرسکا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مختار کے بھیجے ہوئے گھڑسوار آناً فاناً مکہ میں گھس کر قیدیوں کو رہا کرالیتے۔ معلوم ہوا کہ یہ واقعہ الف سے یا تک بالکل من گھڑت ہے۔ حافظ ابن کثیر علیہ الرحمۃ نے بھی اسے مشکوک قرار دیا ہے۔ [4]

یادرہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان پر کبھی معمولی دباؤ بھی نہیں ڈالا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا محمد بن حنفیہ علیہ الرحمۃ سے اتنی شدت کیسے برت سکتے تھے۔

☆☆☆

بعض صحابہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کیوں نہ کی؟

﴿سوال﴾ ایک اہم سوال یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور محمد بن حنفیہ علیہ الرحمۃ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کیوں نہ کی؟ بعد میں عبدالملک بن مروان سے بیعت کیوں کرلی؟

﴿جواب﴾ اس بارے میں بنیادی بات یہ یادرکھیے کہ شرعی لحاظ سے ان تین بزرگوں کے بیعت نہ کرنے کے باوجود خلافت زبیریہ کا انعقاد یقیناً ہوگیا تھا؛ کیوں کہ بیعت کے لیے تمام عمائدِ امت کا اتفاق شرط نہیں۔ نہ ہی ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ امام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرے بلکہ شرعاً اتنا کافی ہے کہ بغاوت اور خیانت نہ کرے، حکومت کے خلاف کسی سرگرمی میں ملوث نہ ہوجائے۔ [5] حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

''خلافت قائم ہوجانے کے بعد بھی ہر ہر فرد پر بیعتِ خلیفہ فرض نہیں۔ صرف اتنا فرض ہے کہ بغاوت نہ کرے۔'' [6]

---

[1] تاریخ یعقوبی، ص ۲۱۴

[2] مُرَوّج الذهب: ۲۷۶،۲۷۵/۳، ط الجامعة اللبنانية

[3] انساب الاشراف: ۲۷۶/۳ تا ۲۸۷، ط دار الفکر

[4] البداية والنهاية: ۳۶/۱۲

[5] امام نووی لکھتے ہیں: ہر شخص پر یہ واجب نہیں کہ وہ خلیفہ کے پاس جائے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر بیعت کرے بلکہ واجب صرف یہ ہے کہ جب اہل حل وعقد کسی کی امامت پر متفق ہوجائیں تو اس کی اطاعت کی جائے۔ اختلاف نہ کیا جائے اور اجتماعیت کا ماحول نہ توڑا جائے۔
(شرح صحیح مسلم: ۷۸/۱۲، ط احیاء التراث، وکذا قال العینی فی عمدۃ القاری: ۲۵۸/۱۷، ط دار احیاء)

[6] احسن الفتاوی: ۲۱۸/۶، ط ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

لہٰذا ان بزرگوں کا بیعت میں توقف کرنا کوئی قابلِ تنقید بات نہیں تھی۔ یہ ثابت ہے کہ وہ کسی حکومت مخالف سرگرمی میں شامل نہ تھے۔ اتنا کافی تھا۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے بیعت میں توقف کیوں کیا تھا؟ تو دراصل ان حضرات کا موقف تھا کہ جب امت کسی ایک خلیفہ پر جمع ہوگی تب ہم بیعت کریں گے۔

اس موقف کی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات خود کو سیاسی مناقشوں سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک شام کے بعض امراء نے بیعت نہیں کی تھی بلکہ مروان اور پھر عبدالملک کے گرد جمع ہو کر بغاوت شروع کر دی تھی۔ اب اگر یہ حضرات فریقین میں سے کسی ایک سے بیعت کرتے تو ان کی ذات کو لے کر عالم اسلام میں ایک نئی بحث شروع ہو جاتی۔

اس وقت ان حضرات کا شب و روز کا مشغلہ پوری اُمت کو حدیث سکھانا، فتاویٰ دینا، اخلاقی تربیت کرنا اور منکرات سے روکنا تھا۔ ان کی غیر جانب دار حیثیت باقی رہتی تب ہی ان سے علمی و روحانی فائدے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ اگر یہ سیاسی طور پر ایک طرف ہو جاتے تو بہت سے لوگ ان کی تعلیمات پر اعتماد نہ کرتے اور ان کا فیض محدود ہو جاتا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے قبل بھی یہ تینوں بزرگ سیاسی مسئلوں سے کنارہ کش تھے تاہم کسی نہ کسی سے بیعت کیے رہے۔ یزید کی بیعت بھی خانہ جنگی سے بچنے کے لیے کر لی مگر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں انہیں مصلحت یہی نظر آئی کہ جب تک خانہ جنگی ختم نہ ہو جائے، بیعت میں توقف ہی کیا جائے۔ کیوں کہ اس وقت ان کی حیثیت پوری امت کے روحانی سرپرستوں جیسی بن چکی تھی جن کا کسی ایک کے حق میں کھڑا ہونا خود ان کی حیثیت کو متنازعہ بنا دیتا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے استغناء اور بے نیازی پر مبنی سیاسی پالیسی کو بھی ان حضرات کے توقف کی ایک اہم وجہ کہا جا سکتا ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حریف مختار اور عبدالملک ان بزرگوں کی خاطر مدارت کرتے رہتے تھے۔ شاید ان کے احسانات اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا استغناء دیکھتے ہوئے ان حضرات کو یہی بہتر لگا کہ فی الحال ان کی بیعت میں توقف برقرار رکھیں۔ اس وجہ سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مزید شکایت ہوئی اور دکھ پہنچا اور انہوں نے کچھ سخت رویہ بھی اپنایا مگر قید و بند یا سزا کی حد تک نہیں۔ اس سے تعلقات میں مزید سرد مہری پیدا ہوگئی۔

بہر حال اس کے باوجود یہ حضرات عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب بیان کرتے رہے، ان کے مخالفین کی بیعت سے اجتناب کرتے رہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بعض مواقع پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مشوروں میں بھی شریک رہے۔[1] ابن عباس رضی اللہ عنہ کے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کرنے کی وجہ پر خود انہی کے اس بیان سے روشنی پڑتی ہے جو صحیح بخاری میں ہے۔ روایت میں ہے ابن ملیکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ملے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> ''آپ کو حیرت نہیں ہوئی کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ خلافت کے امیدوار بن کر کھڑے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں اس منصب کے لیے دل میں (اپنا اور) ان کا موازنہ کروں۔ میں نے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم سے کبھی ایسا موازنہ نہیں کیا۔ وہ اس منصب کے لیے یقیناً سب سے بہتر تھے۔ میں نے جب (موازنہ کیا تو دل میں) کہا:

[1] صحیح مسلم، ح: ۳۳۰۹، کتاب الحج، باب نقض الکعبة



وہ نبی ﷺ کے پھوپھی کی بیٹے ہیں، زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، ابوبکر کی اولاد، خدیجہ کے بھتیجے، عائشہ کے بھانجے ہیں۔ (اس لیے خلافت کے ہر لحاظ سے حق دار ہیں) مگر پھر میں نے دیکھا کہ وہ تو مجھ سے بے اعتنائی برت رہے ہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کرتے (کہ میں ان کا مقرب اور حامی ہوں) میں نے دل میں کہا: مجھے توقع نہیں تھی کہ میں ان کو اپنی طرف سے یہ (حمایت) پیش کروں گا اور وہ اسے ترک کریں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ بھلائی چاہتے ہیں۔ پس اگر کوئی چارہ نہ ہوا تو مجھے کسی غیر کی جگہ اپنے چچازاد (بنوامیہ) کے زیر کفالت رہنا پسند ہوگا۔''[1]

دوسری روایت میں ابن ملکیہ کا بیان ہے:

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ رنجش تھی۔ میں ایک صبح ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا: ''کیا آپ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے لڑنا اور حرم محترم کو حلال کرنا چاہتے ہیں؟'' بولے: ''اللہ کی پناہ! اللہ نے یہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور بنوامیہ کے نصیب میں لکھا ہے۔ میں تو وہاں قتال کو کبھی حلال نہیں کہوں گا۔''

پھر فرمایا: ''لوگ مجھ سے کہتے ہیں ابن زبیر سے بیعت ہو جاؤ۔ (میں کہتا ہوں) وہ اس منصب کے لیے بھلا کیوں موزوں نہ ہوں گے۔ ان کے والد حواریٔ رسول، زبیر رضی اللہ عنہ تھے، نانا غار کے ساتھی ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، والدہ دو دوپٹوں والی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ہیں، خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں، پھوپھی حضور ﷺ کی زوجہ خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ نبی ﷺ کی پھوپھی صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا ان کی دادی ہیں۔ پھر وہ اسلام کی تاریخ میں پاک باز اور قرآن کے قاری ہیں۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ (ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا حلقہ) مجھ سے حسن سلوک کرتے تو ایک قریبی عزیز سے حسن سلوک کرتے۔ اگر میری کفالت کرتے تو میرے ہم پلہ اور معزز لوگ ہوتے۔ مگر ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے بنواسد کے معمولی گروہوں کے سرداروں کو مجھ پر ترجیح دی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ابوالعاص کا لڑکا (عبدالملک) پیش قدمی کرتا آ رہا ہے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ پشت پھیر کر بھاگ رہے ہیں۔''[2]

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا بہتر حق دار مانتے تھے مگر ان کی بے اعتنائی سے دل برداشتہ تھے۔ مذہبی اختلاف نہ تھا بلکہ ایک طبعی رنجش تھی۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ بیعت نہ کرنے والے اکابر کی نظر میں بھی متحارب فریقین میں سے خلافت کے اوّلین حق دار یہی تھے۔ یہ ان حضرات کی دیانت اور اخلاص کا ثبوت ہے۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا مگر پھر رُک گئے؛ کیوں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ اس بارے میں محتاط ہو کر فرما رہے تھے: ''میں افتراق کی حالت میں کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دوں گا اور اجتماعیت قائم ہونے پر بیعت سے گریز نہ کروں گا۔''[3]

---

① صحیح البخاری، ح: ٤٦٦٦، کتاب التفسیر، باب ثانی اثنین ② صحیح البخاری، ح ٤٦٦٥

③ "لا اعطی صفقة یمینی فی فرقة و لا امنعها فی جماعة و الفة" (انساب الاشراف ٣٥٢/٥، ط دار الفکر)

یہ دعویٰ غلط ہے کہ ان بزرگوں (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ) نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں عبدالملک کا ساتھ دیا تھا یا اس سے بیعت کر لی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یہ تینوں کسی سے بھی بیعت نہیں ہوئے۔ بالکل غیر جانب دار رہے تھے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں ۶۸ھ کے دوران وفات پا گئے تھے۔[1]

محمد بن حنفیہ علیہ الرحمۃ نے عبدالملک سے بیعت کی تھی مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد۔[2] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں حجاج بن یوسف کے شدید دباؤ اور دھمکیوں کے باوجود انہوں نے عبدالملک کی بیعت نہ کی۔[3]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہی عبدالملک سے بیعت کی؛[4] کیوں کہ جب کوئی خلیفہ نہ رہا اور عبدالملک جبراً پورے عالمِ اسلام کا حکمران بن گیا تو یزید کی طرح اس کی بیعت بھی درست تھی۔ اگر یہ حضرات عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں عبدالملک کو شرعی خلیفہ سمجھتے تو اسی وقت اس سے بیعت کر لیتے۔

☆☆☆

کیا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے حدیث میں وعید تھی؟

﴿سوال﴾ مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث سنائی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یلحد بمکۃ کبش من قریش اسمہ عبد اللہ، علیہ مثل نصف اوزار الناس."

''ایک قریشی جوان مکہ میں بے دینی اختیار کرے گا، نام عبداللہ ہوگا، نصف بنی نوع انسان کے گناہ اس کے سر ہوں گے۔''[5]

اس روایت کو لے کر بعض لوگ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو فسادی قرار دیتے ہیں۔ اس کا کیا جواب ہے؟

﴿جواب﴾ یہ روایت ضعیف بلکہ من گھڑت ہے۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس کی سند میں کلام ہے۔''[6]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''یہ حدیث بالکل منکر ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ راوی یعقوب قمی میں تشیع پایا جاتا ہے، اس جیسوں کی تنہا روایت قابل قبول نہیں۔ اگر درست مان بھی لیں تو اس میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مراد نہیں ہو سکتے؛ کیوں کہ وہ نیک صفات سے آراستہ تھے۔''[7]

☆☆☆

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۷۷

② انساب الاشراف: ۳/۲۹۲، ط دار الفکر ③ طبقات ابن سعد: ۵/۱۱۰، ط دار صادر

④ صحیح البخاری، ح: ۷۲۰۵، کتاب الاحکام، کیف یبایع الامام الناس ۔ سیر اعلام النبلاء: ۳/۲۳۱، ط الرسالۃ،

⑤ مسند البزار: ۲/۳۱

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۷۵، ط الرسالۃ ⑦ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۲۰۶



کیا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک ابن زبیر رضی اللہ عنہ باغی اور اموی امراء برحق تھے؟

﴿سوال﴾ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یہ تمنا ظاہر کرتے تھے کہ کاش! انہیں باغیوں سے جنگ کی توفیق بھی مل گئی ہوتی۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ باغی گروہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جماعت ہے۔ صحیح روایت میں ہے:

''زہری کہتے ہیں کہ مجھے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے حمزہ نے خبر دی کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی عراقی شخص نے آکر کہا: ابوعبدالرحمٰن! میں آپ کی سیرت پر چلنے کا مشتاق ہوں اور لوگوں کے انتشار کے دور میں آپ کی پیروی کرتا ہوں اور جہاں تک ممکن ہو، شر سے بچتا ہوں مگر قرآن مجید کی ایک محکم آیت نے میرا دل پکڑ لیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں بتایئے۔ دیکھئے تو اللہ عزوجل فرما رہے ہیں: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ. [1]

تو آپ مجھے اس آیت کے متعلق بتایئے۔'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہیں اس آیت سے کیا کام۔ یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ چل پڑا، یہاں تک کہ ہم سے اوجھل ہو گیا، تب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: مجھے کسی چیز کا اتنا افسوس نہیں جتنا اس آیت کے حکم پر عمل نہ کرنے کا کہ میں نے اس فئہ باغیہ سے قتال نہیں کیا جیسا کہ مجھے اللہ عزوجل نے حکم دیا تھا۔ (ان کے بیٹے) حمزہ نے پوچھا کہ ''الفئۃ الباغیۃ'' سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اس پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عبداللہ بن زبیر، جس نے ان لوگوں سے بغاوت کی، انہیں ان کے گھروں سے نکالا اور ان سے عہد شکنی کی۔ [2]

(جواب) اس اعتراض کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا جواب: اس روایت میں پانچ علتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ حجت نہیں بن سکتی:

① بیہقی نے اسے تین اسناد سے روایت کیا ہے۔ روایت کا مدار تینوں اسناد میں زہری پر ہے۔

تینوں اسناد یہ ہیں:

(ا) ابوعبداللہ الحافظ...... ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الزاہد...... احمد بن محمد بن المہدی بن رستم...... بشر بن شعیب بن ابی حمزۃ...... ابیہ (شعیب بن ابی حمزۃ)...... الزہری...... حمزۃ بن عبداللہ بن عمر

---

① اگر اہلِ ایمان کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر ان میں سے اگر ایک زیادتی کرے دوسری پر تو تم لڑو اس سے جو کہ زیادتی کر رہی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر لوٹ آئے تو ان کے درمیان صلح کراؤ عدل کے ساتھ اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ عدل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (سورۃ الحجرات، آیت ۹)

② "ما وجدت فی نفسی من شیء فی امر هذه الآیة ما وجدت فی نفسی انی لم اقاتل هذه الفئة الباغیة کما امرنی الله عزوجل" قال حمزة: فقلنا له: من تری الفئة الباغیة؟ فقال ابن عمر: "ابن الزبیر بغی علی هؤلاء القوم فاخرجهم من دیارهم ونکث عهدهم"
(السنن الکبری للبیهقی، ح ۱۶۷۰۲، ط العلمیة)

(۲) ابوالحسین بن الفضل القطان...... عبداللہ بن جعفر بن درستویہ...... یعقوب بن سفیان...... حجاج بن ابی منیع جدہ (عبیداللہ بن ابی زیاد، مولیٰ بنی امیہ)...... الزہری...... حمزۃ بن عبداللہ بن عمر

(۳) یعقوب...... محمد بن یحییٰ بن اسماعیل...... ابن وہب...... یونس...... الزہری حمزۃ بن عبداللہ بن عمر

اب غور کریں تو ''**ومن تری الفئۃ الباغیۃ؟ قال ابن عمر: ابن الزبیر، بغیٰ علیٰ ھولاء القوم فاخرجھم من دیارھم ونکث عھدھم۔**'' کا اضافہ صرف روایت نمبر دو میں ہے، یعنی زہری سے فقط عبیداللہ بن ابی زیاد نے یہ نقل کیا ہے۔ یونس اور شعیب بن ابی حمزۃ، نے زہری سے ایسا کچھ بھی نہیں سنا۔

یعنی دو راوی متنازعہ الفاظ کو بیان نہیں کرتے۔ یہ اضافہ فقط ایک راوی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ الفاظ ثابت ہیں تو باقی دونوں راویوں نے انہیں یاد کیوں نہ رکھا؟ یہ سوال روایت کے اس حصے کو محلِ نظر بنا دیتا ہے۔

② جس راوی نے یہ الفاظ یاد رکھے ہیں یعنی عبیداللہ بن ابی زیاد الرصافی، وہ خاندانِ بنوامیہ کا فرد ہے یعنی اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی بیوی کا رضاعی بھائی ہے۔[1]

اگرچہ اسے ثقہ مانا گیا ہے مگر بعض اوقات ثقہ حضرات بھی سیاسی تعصب کی بناء پر اپنے مخالفین کی جانب کمزور باتیں منسوب کرنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے بنوامیہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سخت مخالف رہے تھے، ان کی زندگی میں وہ انہیں کھلے عام منافق کہتے تھے۔[2] اس لیے کوئی بعید نہیں کہ اس اموی نے یہاں روایت میں کمزور مواد کی آمیزش کر دی ہو۔ جیسا کہ دیگر ثقات کی روایت سے اس کا اختلاف اس شبہے کو تقویت دیتا ہے۔

③ مستدرک حاکم میں بھی یہ روایت ہے مگر عبیداللہ بن ابی زیاد کے اضافی الفاظ وہاں بھی منقول نہیں۔[3]

④ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے کبھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے لڑنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ انہوں نے حجاج کے منہ سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی کردارکشی کو برداشت نہیں کیا تھا بلکہ اس کے منہ پر شہید کی خوبیوں کا اظہار کیا تھا۔[4]

یہ کیسے ممکن ہے کہ ساری عمر مسلمان کے خون سے دامن بچانے والا نہایت متقی شخص، زندگی کے آخری دنوں میں مسجد الحرام میں کی گئی اس خونریزی میں حصہ دار بننے کی تمنا کرنے لگا ہو جسے عام مسلمان بھی گناہِ عظیم تصور کرتا ہے۔

⑤ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس قسم کی گفتگو ان کے دو شاگردوں: حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی باسنادِ صحیح مروی ہے مگر ان میں یہ الفاظ منقول نہیں بلکہ اس کے برعکس بنوامیہ کو باغی قرار دیا گیا ہے۔

① تاریخ دمشق: ۳۶۴/۳۷

② تاریخ الطبری: ۵۳۶/۵

③ مستدرک حاکم، ح: ۳۷۲۲، رواۃ: ابوعبداللہ محمد الاصبہانی، احمد بن مھدی، بشر بن شعیب بن ابی حمزۃ ابیہ، الزہری، حمزۃ بن عبداللہ بن عمر۔ قال الذہبی علی شرط البخاری ومسلم۔
نیز حدیث نمبر ۸۵۹۸ باسناد مثلہ ولوں میں قال حمزۃ فقلنالہ الخ کا اضافہ منقول نہیں۔
وقال الحاکم ھذا باب کبیر قد رواہ عن عبداللہ بن عمر جماعۃ من کبار التابعین۔

④ طبقات ابن سعد ۱۸۳/۴ ط صادر، باسناد صحیح؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۸۵/۱۲



سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق وہ حجاج بن یوسف سے نہ لڑنے پر افسوس کرتے تھے۔[1]

حبیب ابن ابی ثابت رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پرچم تلے باغیوں سے لڑنے کا موقع کھودینے پر افسوس کرتے تھے۔[2]

---

① عن سعید بن جبیر قال لما حضر ابن عمر رضی اللہ عنهما الموت قال: "انی لم اقاتل هذه الفئة الباغیة التی نزلت بنا یعنی الحجاج" (قیام اللیل، محمد بن نصر المروزی: ۲۲/۱ ؛ وصایا العلماء عن حضور الموت، ابن زبر الربعی م۳۷۹ھ)

احوال الرواۃ: **عبداللہ بن احمد بن ربیعة** (ابن زبر الربعی کے والد م ۳۲۹ھ) قال الذهبی: الامام، العالم، المحدث، الفقیه، قاضی دمشق. حدث عنه ابوسلیمان محمد ولده والدارقطنی (سیر اعلام النبلاء: ۳۱۵/۱۵، ط الرسالة) **محمد بن عبداللہ المنادی** (۱۷۱ھ ۲۷۲ھ) صدوق (تقریب التهذیب تر: ۶۱۱۳) **روح بن عبادة** (م ۲۰۷ھ) ثقہ صحاح ستہ کے راوی (تقریب التهذیب تر: ۱۹۶۲) **عوام بن حوشب** (م۱۴۸ھ)، ثقة، احد الاعلام. (تقریب التهذیب تر: ۵۲۱۱) **عیاش عامری**: ثقة مسلم، نسائی کے راوی (تقریب التهذیب تر: ۵۲۷۱) **سعید بن جبیر** (م ۹۵ھ) احد ائمة الاعلام، ثقه، فقیه صحاح ستہ کے راوی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳۲۱/۴، ط الرسالة؛ تقریب التهذیب تر: ۲۲۷۸)

اس طرح یہ سند بھی متصل ہے جس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ عبداللہ بن احمد بن ربیعہ پر خطیب بغدادی نے "جرح مبہم" کی ہے جس پر حافظ ذہبی کی "تعدیل مفسر" اصولاً راجح مانی جائے گی۔ اس روایت کو امام ابن ابی الدنیا نے بھی اسی سند سے پیش کیا ہے۔ (المحتضرین: ۱۵۷)

② ماآسی علیٰ شیئ الا انی لم اقاتل مع علی رضی اللہ عنہ الفئة الباغیة. (مستدرک حاکم روایت نمبر: ۶۳۶۰)

وروی الطبرانی عن حبیب بن ابی ثابت عن ابن عمر قال: لم اجدنی آسی علی شیء الا انی لم اقاتل الفئة الباغیة مع علی. (المعجم الکبیر المجلدان الثالث عشر والرابع عشر، ح: ۱۳۸۲۳، ۱۴۵/۱۳) قال الهیثمی: رواه الطبرانی باسانید واحدها رجاله رجال الصحیح.

احوال الرواۃ:

❶ **احمد بن عمرو ابوبکر البصری** (م ۳۰۰ھ): ذکره ابن حبان فی الثقات، قال الذهبی: الشیخ، المحدث، الثقة. (۵۰۲/۱۳)

❷ **محمد بن طفیل** (۲۲۲ھ) ثقة. (تهذیب الکمال: ۴۱۲/۲۵، ۴۱۳)

❸ **شریک بن عبداللہ** (م ۱۸۰ھ) قاضی الکوفة روی له البخاری (تعلیقاً) ومسلم وابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة. وثقه ابن معین وقال هو اثبت من ابی الاحوص. قال الذهبی: قلت مع ان ابا الاحوص من رجال الصحیحین. قال النسائی: لیس به بأس. قال ابن المبارک: شریک اعلم بحدیث بلده من الثوری. (سیر اعلام النبلاء: ۲۰۲/۸، ط الرسالة) قال الحافظ ابن حجر: "صدوق یخطی کثیرا تغیر حفظه منذ ولی القضاء بالکوفة، وکان عادلاً فاضلا، عابدا شدیدا علی اهل البدع. (تقریب التهذیب تر: ۲۷۸۷)

❹ **فطر بن خلیفه:** (م بعد ۱۵۰ھ) روی له البخاری وابوداوٗد والترمذی والنسائی وابن ماجة. قال الذهبی: "الشیخ، العالم، المحدث، الصدوق" ..... وثقه احمد بن حنبل ... وقال احمد العجلی: ثقة حسن الحدیث فیه تشیع یسیر. وقال الامام احمد مرة: ثقة صالح الحدیث، حدیثه حدیث رجل کیس الا انه یتشیع. (سیر اعلام النبلاء: ۳۰/۷ تا ۳۲، ط الرسالة)

فطر پر اگر کوئی جرح ہے تو صرف "شیعی" ہونے کی مگر ظاہر ہے اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی حمایت و محبت یا "تقدیم علی رضی اللہ عنہ علی عثمان رضی اللہ عنہ" کے سوا کچھ نہیں۔ یہ جرح ایسی نہیں جو عدالت وثقاہت کے منافی ہو ورنہ بخاری و مسلم کا بھی ایک حصہ متروک ماننا پڑے گا جو صدوق شیعی راویوں سے منقول ہے۔

❺ **حبیب بن ابی ثابت** (م۱۱۹ھ): روی له البخاری ومسلم وابوداوٗد والترمذی والنسائی وابن ماجة قال الذهبی: الامام الحافظ فقیه الکوفة. (سیر اعلام النبلاء: ۲۸۹/۵، ط الرسالة) وثقه یحییٰ ابن معین، والعجلی والنسائی. (تهذیب الکمال: ۳۶۰/۵ تا ۳۶۳)

اس روایت پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ حبیب بن ابی ثابت مدلس ہیں اور اسے مذکورہ روایت میں "عن" سے نقل کر رہے ہیں، اسی طرح طبقات ابن سعد کی ایک روایت میں حبیب بن ابی ثابت اسے بلغنی سے نقل کر رہے ہیں۔ اس لیے روایت متصل ثابت نہیں ہوگی۔

اخبرنا الفضل بن دکین قال حدثنا عبدالعزیز بن سیاه، قال حدثنی حبیب بن ابی ثابت قال بلغنی عن ابن عمر فی مرضه الذی مات فیه قال: ما اجدنی آسی علی شیء من امر الدنیا الا انی لم اقاتل الفئة الباغیة. (**الطبقات الکبریٰ لابن سعد:** ۱۸۶/۴، ط صادر)

مگر یہ اعتراض اس لیے بے وزن ہے کہ امام طبرانی نے یہی واقعہ ایک دوسری سند کے ساتھ حبیب بن ابی ثابت سے سمعت کی تصریح کے ساتھ نقل کیا ہے:

سمعت ابن عمر قال، ماآسی علی شیء فاتنی الا الصوم والصلوة وترکی الفئة الباغیة الا اکون قاتلتها ونسخالتی علیاً البیعة (المعجم الکبیر، المجلدان الثالث عشر والرابع عشر: ح: ۱۳۸۲۴، ۱۴۵/۱۳)

اسی لیے علامہ محمود آلوسی اس روایت کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"انی لم اقاتل هذه الفئة الباغیة کما امرنی اللہ تعالی، یعنی بها معاویة ومن معه الباغین، علی علیٍّ کرم اللہ وجهه (روح المعانی: ۳۰۳/۱۳)

دوسرا جواب: عبید اللہ بن ابی زیاد کی روایت کو من وعن درست مان لیا جائے تب بھی فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایک وقت میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے بن گئی تھی کہ باغی گروہ کا اطلاق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جماعت پر ہوتا ہے۔ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ مستقل رائے تھی بلکہ دیگر روایات شاہد ہیں کہ ان کی رائے جلد ہی بدل گئی تھی۔

دراصل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے دو پہلو تھے: ایک اصولی اور ایک فرعی۔ اصولی یہ کہ باغیوں سے لڑنا چاہیے۔ فرعی یہ کہ اس وقت باغی گروہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ہے، جس سے لڑنا چاہیے۔ یہ ایک مثال تھی نہ کہ کوئی قاعدہ کلیہ۔ معمولی عقل رکھنے والا شخص بھی ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ شرع میں جب بھی اور جہاں بھی باغی گروہ کا ذکر ہوگا، اس کا اطلاق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گروہ پر ہوگا۔ پس اگر مدعی کا دعویٰ مان بھی لیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مثال اس دور کے خاص حالات کے پیشِ نظر دی ہوگی۔

حالات یہ تھے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یزید کے مقابلے میں مکہ میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی جس کے خلاف یزید نے دو مرتبہ فوج کشی کرائی تھی۔ پہلے حملے میں عالم اسلام پر یزید کا تسلط اور بیعت کا سلسلہ مکمل نہیں ہوا تھا، مگر دوسرے حملے کے وقت وہ مکہ کے سوا تمام شہروں اور صوبوں پر قابو پاچکا تھا۔ اس لیے ایک زمینی حقیقت کے طور پر وہ حکمران بن چکا تھا جس کے خلاف خروج عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (اور بعد میں جمہور کے) فتوے کی رو سے درست نہیں تھا۔ اس لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ظالم حکمرانوں کے خلاف صالحین کی مسلح کوشش کو "خروج" ہی تصور کرتے تھے اور اسے اُمت کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔

پھر حالات بدلے۔ یزید اور اس کے بیٹے مُعاویہ کی موت کے بعد ایک سیاسی خلا پیدا ہوا۔ عالم اسلام میں کوئی خلیفہ نہیں تھا۔ انہی دنوں مروان نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

"ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں، آپ عرب کے سردار اور سردار کے بیٹے ہیں۔"

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اہلِ مشرق کا کیا کروں گا؟" (یعنی تم اہلِ شام اگر بیعت کر بھی لو تو اہلِ عراق کا کیا ہوگا؟)

مروان نے کہا: "آپ ان سے لڑیں یہاں تک کہ وہ بیعت کرلیں۔"

فرمایا: "اللہ کی قسم! مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میں ستر سال حکومت کروں اور میری وجہ سے ایک جان جائے۔"[1]

اس سیاسی خلاء کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے تیزی سے پُر کیا۔ سب سے پہلے حجاز ان کے قبضے میں آیا۔ انہوں نے بنوامیہ کو مدینہ سے نکال کر شام بھیج دیا؛ کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ وہ اپنی عداوت کی وجہ سے کبھی ان کے وفادار نہیں بنیں گے اور ان کے خلاف سازشیں کرتے رہیں گے۔[2]

---

① طبقات ابن سعد: ۴/۱۶۹ط صادر، باسناد صحیح، اس روایت پر صرف یہ اشکال ہے کہ مروان اس وقت شام میں تھا نہ کہ مدینہ میں مگر غور کریں تو یہ امکان موجود ہے کہ یہ گفتگو خط وکتابت یا سفیر کی زبانی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی حج کے اجتماع میں ملاقات ہوگئی ہو۔

② وکان عبد اللّٰہ بن زبیر رضی اللّٰہ عنہ کتب الی عاملہ بالمدینۃ ان ینفی بنی امیۃ من المدینۃ، فنفوا بعیالاتھم و نسائھم الی الشام فقدمت بنو امیۃ دمشق و فیھا مروان. (تاریخ الطبری: ۵/۵۳۱)

اگر قواعدِ شرعیہ کو دیکھیں تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اب خروج کے اطلاق سے نکل چکے تھے؛ کیوں کہ ان کی بیعت سارے عالم اسلام نے کر لی تھی۔ مقابلے میں خلافت کا کوئی دعوے دار نہ تھا۔ البتہ چار ماہ بعد اچانک مروان نے خلافت کا دعویٰ کر دیا۔ اس وقت کچھ لوگوں کے سوا سب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکے تھے۔ [1]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بھی ایک سیاسی طالع آزما کی نگاہ ہی سے دیکھتے تھے۔ جیسا وہ خود پسند کرتے تھے کہ حکمرانی کے لیے سعی نہ کی جائے، ویسا ہی وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے توقع رکھتے تھے۔ اس سے بڑھ کر جب بنو امیہ کو حجاز سے نکالا گیا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ناگوار محسوس کیا اور ان کی یہی رائے بنی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جماعت بھی ایک باغی گروہ ہی کے زمرے میں آتی ہے اور بنو امیہ کے ساتھ مل کر ان سے لڑنا چاہیے تھا۔ (جس روایت میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو باغی قرار دینے کا ذکر ہے، وہ اسی وقت پر محمول ہوگی۔)

مگر یہ بھی ثابت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے بہت جلد بدل گئی، یعنی وہ بنو امیہ کو جائز حکمران ماننے اور ان کے ساتھ مل کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے لڑنے کو بھی غلط تصور کرنے لگے۔

اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف حجاج بن یوسف کی آخری جنگ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک زندہ رہے اور اس وقت وہ مکہ ہی میں تھے۔ اگر وہ حجاج کو برحق سمجھتے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنا چاہتے تو بلا تامل بنو امیہ کی فوج میں شامل ہو جاتے مگر ایسا ہرگز نہ ہوا۔ اس کے برخلاف یہ ثابت ہے کہ انہوں نے اس موقع پر بھی غیر جانب داری کو ترجیح دی۔ درجِ ذیل روایت اس کی دلیل ہے:

''عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے فتنے کے دور میں دو شخص عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

''لوگ اختلاف میں ہیں، آپ عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور صحابیٔ رسول ہیں، آپ کیوں (میدان میں) نہیں نکلتے؟''

فرمایا: ''میری گوشہ نشینی کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔''

وہ کہنے لگے: اللہ کا فرمان ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

فرمایا: ''ہم قتال کر چکے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور دین اللہ ہی کا نافذ ہو گیا مگر تم اس لیے قتال کرتے ہو کہ فتنہ پیدا ہو اور غیر اللہ کا دین غالب ہو۔'' [2]

ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ انہوں نے حجاج بن یوسف کی فوج کو بھی باغی اور فسادی شمار کیا۔

''حبان سلمی کہتے ہیں جب حجاج (بن یوسف، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے) حرم میں داخل ہوا تو اس وقت میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آیت: ''وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا'' کے بارے میں سوال کیا۔

---

① قال الحافظ ابن حجر: "وقد بايع الضحاك بن قيس بها لابن الزبير وكذا نعمان بن بشير بحمص وكذا ناتل بفلسطين ولم يبق على رای الامويين الا حسان بن بحدل وهو خال يزيد بن معاوية وهو بالاردن فيمن اطاعه (فتح الباری: ۱۳/ ۷۲)
ثم نقل الحافظ عن ابی زرعة الدمشقی: بويع لمروان بن الحكم بايع له اهل الاردن وطائفة من اهل دمشق وسائر الناس زبيريون. (فتح الباری: ۱۳/ ۷۲)

② صحیح البخاری، ح: ۴۵۱۳، كتاب التفسير، سورة البقرة، باب وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تم نے باغی جماعت کو اور اس جماعت کو جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے، پہچان لیا ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اگر میں اس جماعت کو پہچان لیتا جس کے خلاف بغاوت کی گئی ہے تو اس کی نصرت کے لیے تم یا کوئی اور مجھ سے سبقت نہیں لے سکتا تھا مگر بھلا بتاؤ جب دونوں جماعتیں ہی باغی ہوں تو (کیا کیا جائے!!) ایسے میں لوگوں کو ان کی دنیا پر لڑتے چھوڑ دو اور اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ جب اجتماعیت قائم ہو جائے تو اس میں داخل ہو جاؤ۔''[1]

مروان، عبدالملک بن مروان اور حجاج کے بارے میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے اس لیے بنی کہ حالات نے ان کے سامنے نئی کروٹ لی تھی۔ مروان نے شام میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائب ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کو مذاکرات کے دھوکے میں رکھ کر فریب کے ذریعے حملہ کر کے شکست دی۔ اس کے سپاہیوں نے ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام کو قتل کر کے شام پر قبضہ کیا۔[2]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پورے عالم اسلام کو ایک ملک مانتے تھے، لہٰذا ان کا ذہن یہ بنا کہ جب تک کوئی گروہ پورے ملک پر قابض نہ ہو، تمام متحارب گروہ باغی سمجھے جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں مروان یا عبدالملک کی بیعت نہیں کی تھی؛ کیوں کہ ان کی نگاہ میں اموی حکومت بھی ایک باغی اور متحارب گروہ تھی۔

پھر آخری ایامِ حیات میں ان کی رائے مزید بدلی، جب انہوں نے حجاج کے ہاتھوں ایام حج میں حرم پر حملے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کی نعش کی بے حرمتی کے مناظر دیکھے تو ان کی نگاہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بجائے حجاج کے باغی ہونے کا پہلو راجح ہو گیا، اسی لیے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے منقول روایت کے مطابق انہوں نے وفات سے پہلے ارشاد فرمایا: ''مجھے دنیا کی کسی چیز کی حسرت نہیں سوائے گرمیوں کے روزے اور شب بے داری چھوٹنے کے اور یہ کہ میں نے اس باغی گروہ سے قتال نہیں کیا جس نے ہم پر چڑھائی کی، یعنی حجاج۔''[3]

نیز ان پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ حالات کے یہاں تک پہنچنے میں اس امر کا دخل ضرور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کی ویسی نصرت نہیں کی گئی جیسی کہ ایک خلیفۂ راشد ہونے کے لحاظ سے ان کا حق تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''مجھے کسی چیز کا افسوس نہیں

---

[1] اخرج سعید بن المنصور و ابن المنذر عن حبان السلمی، قال: سالت ابن عمر عن قوله: وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا، وذالک حین دخل الحجاج الحرم، فقال لی: عرفت الباغیة من المبغیة علیها؟ فوالذی نفسی بیده لو عرفتُ المبغیة ما سبقتنی انت ولا غیرک الی نصرها افرأیت ان کانت کلتاهما باغیتین فدع القوم یقتتلون علی دنیاهم وارجع الی اهلک. فاذا استمرت الجماعة فادخل فیها. (الدرالمنثور، سیوطی: ۵۶۱/۷)

[2] فتح الباری: ۷۲/۱۳، ۷۳؛ البدایه والنهایة، سن ۶۴ھ، ۶۵ھ

[3] "انی لم اقاتل هذه الفئة الباغیة التی نزلت بنا، یعنی الحجاج." (قیام اللیل لمحمد بن نصر المروزی: ۶۲/۱؛ وصایا العلماء عن حضور الموت، ابن زبر الربعی م ۳۷۹ھ)



سوائے نماز روزہ چھوٹنے پر اور باغی گروہ سے قتال نہ کرنے پر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت فسخ کرنے پر۔"[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی مگر پھر عملاً غیر جانب دار ہو گئے تھے۔ (غالباً اسی روش کو وہ بیعت فسخ کرنے سے تعبیر کر رہے تھے، ورنہ الگ سے کسی روایت میں یہ مذکور نہیں کہ انہوں نے بیعت توڑی ہو۔) انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک بڑی جماعت غیر جانب دار نہ رہتی تو مخالفین کا غلبہ روکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک صحیح روایت کے مطابق انہوں نے اس پر افسوس کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے اس کے سوا کسی چیز پر افسوس نہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر باغی گروہ سے قتال نہیں کیا۔"[2]

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی روایت سے ثابت ہوا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا آخری قول عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جماعت کے باغی ہونے کا نہیں تھا بلکہ آخری قول کے مطابق وہ حجاج اور اس کے آقاؤں یعنی مروان اور عبدالملک کو باغی گروہ سمجھتے تھے۔ جبکہ حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ کی روایت سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نبرد آزما جماعتوں کو بھی باغی تصور کرتے تھے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ کی روایتوں میں کوئی تعارض نہیں؛ کیوں کہ باغی گروہ مختلف زمانوں میں متعدد ہو سکتے ہیں۔ خود مفتی کا فتویٰ اور تجزیہ بھی بدل سکتا ہے۔ پس حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک وقت میں باغی کا اطلاق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گروہ پر، دوسرے وقت میں بعض تلامذہ کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متحارب جماعت پر اور آخری لمحات میں بعض شاگردوں کے سامنے حجاج کی فوج پر کیا۔



حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی آراء کو الگ الگ مواقع پر محمول کرنے کی دلیل کیا ہے؟

﴿سوال﴾ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا "الفئۃ الباغیۃ" کا قول ایک ہی وقت کا ہے، اسے الگ الگ مجالس اور مختلف زمانوں کے اقوال پر محمول کرنا درست نہیں۔ جب بیہقی کی اصح روایت میں اس کا مصداق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ثابت ہو چکے ہیں تو طبرانی اور دیگر کتب اور رواۃ کی روایات کو راوی کے وہم یا غلط بیانی پر ہی محمول کرنا پڑے گا۔ آخر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اقوال الگ مواقع اور اوقات کے ہیں؟

﴿جواب﴾ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ان اقوال کا الگ الگ مجالس اور مواقع پر ہونا، خود انہی روایات سے ثابت ہے۔ ان میں سے ایک بیہقی کی روایت ہے جس کا آغاز یوں ہے:

"زہری کہتے ہیں کہ مجھے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے حمزہ نے خبر دی کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی عراقی شخص نے آ کر کہا: ابو عبدالرحمٰن! میں آپ کی سیرت پر چلنے کا مشتاق ہوں۔" اس روایت کا اختتام یوں ہے: "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

---

① عن عبداللّٰه بن حبیب بن ابی ثابت عن ابیه سمعت ابن عمر قال: ماآسی علی شیء فاتنی الا الصوم والصلوٰۃ وترکی الفئة الباغیة الا اکون قاتلتها واستقالتی علیاً البیعة. (المعجم الکبیر بالمجلدان الثالث عشر والرابع عشر، ح: ۱۳۸۲۵، ۱۴۵/۱۳)

② عن حبیب بن ابی ثابت عن ابن عمر قال: لم اجدنی آسی علی شیء الا انی لم اقاتل الفئة الباغیة مع علیّ. (المعجم الکبیر بالمجلدان الثالث عشر والرابع عشر، ح: ۱۳۸۲۴، ۱۴۵/۱۳)

نے فرمایا: ''تمہیں اس آیت سے کیا کام۔ یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ چل پڑا، یہاں تک کہ ہم سے اوجھل ہوگیا، تب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''مجھے کسی چیز کا اتنا افسوس نہیں جتنا اس آیت کے حکم پر عمل نہ کرنے کا، کہ میں نے اس فئہ باغیہ سے قتال نہیں کیا جیسا کہ مجھے اللہ عزوجل نے حکم دیا تھا۔''

ان کے بیٹے حمزہ نے پوچھا: ''الفئۃ الباغیۃ'' سے آپ کی مراد کیا ہے؟'' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عبداللہ بن زبیر جس نے ان لوگوں سے بغاوت کی، انہیں ان کے گھروں سے نکالا اور ان سے عہد شکنی کی۔''[1]

روایت کا سیاق وسباق بتارہا ہے کہ یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بنو اُمیہ کے اخراج سے کچھ ہی زمانے بعد کا قصہ ہے اور اس وقت یہ بحث عام تھی کہ حق پر کون ہے اور باغی کون؟ مؤرخین کے مطابق یہ ۶۴ھ کا واقعہ ہے۔

یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ صحت مند تھے یا کم از کم ایسی حالت نہیں تھی جسے سکرات، حالتِ نزع، وقتِ اخیر یا مرض الموت کہا جاسکے۔ نیز اس وقت وہ کسی مجلس میں تھے اور ان کے گرد متعدد حضرات موجود تھے۔[2] مجلس ایسی تھی جس میں غیر معروف اور اجنبی لوگ بھی آکر سوالات کرسکتے تھے۔ اسی لیے نامعلوم عراقی شخص نے آکر یہ سوال کیا۔[3] اس وقت وہ کسی کھلی جگہ پر تھے اسی لیے سوال کرنے والا اعراقی جب وہاں سے رخصت ہوا تو چلتے چلتے بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہوا۔[4]

اب اس کے مقابلے میں سعید بن جبیر کی روایت دیکھیے تو صاف پتا چلتا ہے کہ یہ بستر مرگ کے الفاظ ہیں:

عن سعيد بن جبير قال لما حضر ابن عمر رضي الله عنهما الموت قال: "انى لم اقاتل هذه الفئة الباغية التى نزلت بنا، يعنى الحجاج."[5]

حبیب بن ابی ثابت کی روایت بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ یہ گفتگو مرضِ وفات میں ہوئی۔

اخبرنا الفضل بن دكين قال حدثنا عبدالعزيز بن سياه ،قال حدثنى حبيب بن ابى ثابت قال بلغنى عن ابن عمر فى مرضه الذى مات فيه قال: ما اجدنى آسى على شىء من امر الدنيا الا انى لم اقاتل الفئة الباغية.[6]

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقى، ح: ١٦٧٠٦، ط العلمية ② كما دل عليه لفظ: "اقبل علينا عبدالله بن عمر فقال ماوجدت فى نفسى الخ."

③ كما دل عليه لفظ الرواية "اذجاءه رجل من اهل العراق." ④ كما دل عليه لفظ الرواية "فانطلق حتىٰ توارى عنا سواده."

⑤ وصايا العلماء عن حضور الموت لابن زبر الربعى م٣٧٩ هجرى ؛ قيام الليل، محمد بن نصر المروزى: ٦٢/١

اس روایت پر صرف یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ ''يعنى الحجاج'' راوی سعید بن جبیر کے الفاظ ہیں نہ کہ عبداللہ بن عمر کے، پس سعید بن جبیر کی رائے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی مگر اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں؛ کیوں کہ قابل شاگرد اپنے استاد کی منشاء کو خوب سمجھتے ہیں۔ نیز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ: "التى نزلت بنا" خود اس مفہوم کو متعین کردیتے ہیں؛ کیوں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سالہا سال سے مکہ میں تھے۔ انہوں نے کسی پر چڑھائی نہیں کی تھی۔ یہ حجاج ہی کی فوج تھی جس نے باہر سے آکر حجاز چڑھائی کی تھی۔

⑥ الطبقات الكبرىٰ: ١٤١/٣، ط العلمية رہی یہ بات کہ اس میں یہ وضاحت نہیں کہ الفئۃ الباغیۃ سے کون مراد ہے تو دوسری روایت اس مطلب کو پورا کردیتی ہے۔ عن حبيب بن ابى ثابت عن ابن عمر قال: لم اجدنى آسى على شىء الاانى لم اقاتل الفئة الباغية مع علىّ. ((المعجم الكبير بالمجلدان الثالث عشر والرابع عشر، ح: ١٣٨٢٤)) قال الهيثمى: رواه الطبرانى باسانيد واحدها رجاله رجال الصحيح. (مجمع الزوائد، ح: ١٢٠٥٠)



ظاہر ہے کہ ایسے حال میں مریض کا ایسی عام مجلس میں بیٹھنا جہاں ہر قسم کے لوگ آکر سوال کریں، ہرگز قرینِ قیاس نہیں۔ پس بیہقی کی روایت الگ دور کی ہے اور سعید بن جبیر اور حبیب بن ابی ثابت کی روایات الگ دور کی۔

یہاں اصح السند روایت کا دیگر روایات سے کوئی تعارض ہے ہی نہیں کہ ایک کو قبول کر کے باقی کو محض سند میں انقطاع یا معمولی ضعف کی بناء پر مسترد کر دیا جائے بلکہ ہر روایت کا اپنا اپنا محل ہے۔

☆☆☆

﴿سوال﴾ حبیب بن ابی ثابت مدلس ہیں اور اس روایت کو "عن" سے نقل کر رہے ہیں، اسی طرح طبقات ابن سعد کی روایت میں حبیب بن ابی ثابت واقعے کو "بلغنی" سے نقل کر رہے ہیں۔ اس لیے روایت متصل نہیں ہوگی۔

﴿جواب﴾ یہ اعتراض اس لیے بے وزن ہے کہ امام طبرانی نے یہی واقعہ ایک دوسری سند کے ساتھ حبیب بن ابی ثابت سے سمعتُ کی تصریح کے ساتھ نقل کیا ہے:

عن عبداللّٰہ بن حبیب بن ثابت عن ابیہ قال: سمعتُ ابن عمر قال: ماآسی علی شيء فاتنی الا الصوم والصلوٰۃ وترکی الفئة الباغية الاکون قاتلتها واستقالتی علیاً البیعة۔[1]

☆☆☆

﴿سوال﴾ حبیب کا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں، اس لیے یہ روایت ضعیف اور منقطع ہے۔

﴿جواب﴾ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ حبیب بن ابی ثابت کے مشائخ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا نام واضح طور پر مذکور ہے، کسی نے اس میں کوئی شک ظاہر نہیں کیا۔[2]

☆☆☆

---

① المعجم الکبیر، المجلدان الثالث عشر والرابع عشر، ح:۱۳۸۲۵۔

احوالِ رواۃ:

❶ محمود بن محمد الواسطی: (م۳۰۷ھ) قال الذہبی: محدث کبیر۔ (تاریخ الاسلام للذہبی تدمری: ۲۲۲/۲۳، ۲۲۳؛ بشار: ۱۲۶/۷) الحافظ، المفید، العالم۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲۴۲/۱۴، ط الرسالۃ)

❷ زکریا بن یحییٰ بن صبیح زحمویہ: (م۲۳۵ھ) ابن حبان نے انہیں ثقات میں شمار کیا ہے اور نقل کیا ہے: وکان من المتقنین فی الروایات۔ (الثقات لابن حبان: ۲۵۳/۸؛ تعجیل المنفعۃ: ۵۵۱/۱)

❸ سنان بن ہارون: (م۱۸۰ھ) ان کی توثیق معمولی درجے کی ہے: قال ابوحاتم: شیخ۔ قال ابن عدی: ارجو انہ لاباس بہ۔ یحییٰ بن معین کہتے تھے: سنان احسن حالاً من سیف۔ بعض نے یحییٰ بن معین سے ان پر یہ جرح نقل کی ہے: لیس حدیثہ بشیء۔ (میزان الاعتدال: ۲۳۵/۲)
امام دارقطنی کہتے ہیں: یعتبر بہ۔ (موسوعۃ اقوال دارقطنی: ۳۰۵/۱)
عبداللہ بن احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ: سنان بن ہارون اوثق من سیف۔ (موسوعۃ اقوال احمد: ۱۳۰/۲)

❹ عبداللہ بن حبیب بن ابی ثابت: مسلم، نسائی کے راوی۔ (تقریب التہذیب، ترجمہ نمبر: ۳۲۷۰)
پس یہ روایت حسن سے کم نہیں۔ اس میں سمعتُ کی تصریح ثابت کرتی ہے کہ روایت متصل ہے اور عن یا بلغنی کسی راوی کے وہم کا کرشمہ ہے۔

② تہذیب الکمال: ۳۵۹/۵

و قال البخاری: حبیب بن ابی ثابت: سمع ابن عباس وابن عمر۔ (التاریخ الکبیر: ۳۱۳/۲؛ میزان الاعتدال: ۴۵۱/۱)

کیا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو غلط کار سمجھتے تھے؟

﴿سوال﴾ صحیح روایت میں منقول ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش لٹکتی دیکھ کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:
اَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ كُنْتُ اَنْهَاكَ عَنْ هٰذَا. (بخدا میں تمہیں اس سے منع کرتا تھا۔) ①
اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا موقف برحق نہ تھا، وہ باغی تھے، مروان اور عبدالملک ہی برحق خلفاء تھے؟

﴿جواب﴾ درحقیقت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا انہیں منع کرنا بطورِ شفقت اور ہمدردی کے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس جدوجہد کا حاصل کچھ نہ نکلے گا اور بنو مروان کی عسکری طاقت ان کی حکومت کو پارہ پارہ کر کے سخت انتقام لے گی۔

یاد رہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا تھا: اما و اللّٰه لامة انت اشرها لامة خير.

''بخدا جس امت کا بدترین فرد تم جیسا ہو، وہ امت بہترین ہے۔'' ②

بعض لوگ اس کا مطلب یہ نکالتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو امت کا بدترین فرد مانتے تھے۔ حالاں کہ یہ ایک بلیغ کلام ہے جو بطورِ انکار کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے ابن زبیر! اہل شام نے تمہیں اس لیے قتل کر کے لٹکا دیا ہے کہ ان کے خیال میں تم امت کے بدترین آدمی ہو۔ تو اگر تم جیسا صحابی، نمازی، روزہ دار، نیک اور متقی آدمی بدترین ہے اور باقی سب تم سے بہتر ہیں تو امت کے ہر فرد کو انتہائی نیک اور پوری امت کو سراپا خیر ہونا چاہیے۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جس امت کا بدترین کہلانے والا انسان حقیقت میں اتنا نیک و پاکباز ہوگا، اس امت کے نیک مانے جانے والے انسان کتنے بلند ہوں گے۔ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا:

وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ ۔۔۔ بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

''ان میں اس کے سوا کوئی برائی نہیں کہ ان کی تلواریں لشکروں سے لڑ لڑ کر کند ہو گئی ہیں۔''

☆☆☆

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے

﴿سوال﴾ ایک روایت سے ثابت ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حریص اور لالچی تھے۔ اس روایت کے مطابق حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا تھا: ''حرص اور لالچ تمہیں کسی مشکل میں ڈال کر ہی چھوڑیں گے۔ کاش! کہ میں اس وقت تمہارے پاس ہوں اور تمہیں بچا سکوں۔''
جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا محاصرہ ہوا تو وہ کہتے تھے: ''مُعاویہ نے مجھے یہی کہا تھا، کاش! وہ زندہ ہوتے۔'' ③

---

① صحيح مسلم، ح: ٢٥٤٥ فضائل الصحابة باب ذكر كذاب ثقيف و مبيرها

② صحيح مسلم، ح: ٢٥٤٥ فضائل الصحابة باب ذكر كذاب ثقيف و مبيرها

③ ان الشح والحرص لن يدعاك حتى يدخلاك مدخلا ضيقا فوددت انى حضرت عندك فاستنقذك فلما حصر ابن الزبير قال: هذا ما قال لى معاوية وددت انه كان حيا. (انساب الاشراف: ٥/٤٧، ط دارالفكر)

اس کی سند ہے: معلمانی عن مسلمہ بن علقمۃ، عن خالد عن ابی قلابۃ۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ ثابت ہوا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ساری جدوجہد ہوسِ اقتدار کی وجہ سے تھی اور اسی لیے وہ مشکل میں پھنسے اور آخرکار اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔

﴿جواب﴾ اوّل تو اس روایت کا صحیح السند ہونا محلِ نظر ہے۔ اس کے راوی مسلمہ بن علقمہ کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کی آراء مختلف ہیں۔ یحییٰ بن معین نے انہیں ثقہ اور ابوحاتم نے صالح الحدیث کہا ہے۔[1] جبکہ امام احمد نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔[2] یحییٰ بن سعید بھی ان کی روایات سے مطمئن نہ تھے۔ امام ساجی کے بقول وہ منکر روایات نقل کرتے تھے اور قدری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی ان کی بدعت کے سبب ان سے کوئی روایت نہیں لیتے تھے۔[3]

دوسرے یہ کہ اس کے اصل راوی ابوقلابہ الجرمی (عبداللہ بن زید) ہیں جو یقیناً ثقہ ہیں مگر تمام محدثین تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں تدلیس کا عیب ہے۔[4] حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ''وہ بذاتِ خود ثقہ ہیں مگر جن سے ملاقات ہوئی، ان سے بھی اور جن سے نہیں ملے ان سے بھی تدلیس کرتے ہیں۔''[5]

یہ اصول طے ہے کہ مدلس کی وہ روایت جو ''عن'' سے مروی ہو، مشکوک ہوتی ہے۔ اس روایت میں بھی ابوقلابہ یہ وضاحت نہیں کرتے کہ انہوں نے یہ مواد کسی اور سے لیا ہے یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خود کچھ کہتے سنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا حالتِ محاصرہ میں یہ قول کہ 'معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہی کہا تھا، کاش! وہ زندہ ہوتے۔'' ثابت کرتا ہے کہ یہاں کوئی راوی لازمی طور پر بیچ میں چھوٹ گیا ہے؛ کیوں کہ ابوقلابہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ محصور نہیں تھے جو ان کے منہ سے یہ بات سن سکتے۔ جس شخص نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے، وہ کوئی اور ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف مذکورہ قول اسی نے منسوب کیا ہے۔ پس سند کا انقطاع ثابت ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اگر ان ائمہ جرح وتعدیل کی آراء سے قطعِ نظر روایت کو صحیح اور متصل مان بھی لیا جائے تو یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ظن تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر صحابی کا دوسرے صحابی کے بارے میں ہر ظن درست ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا: ''مجھے اجازت دیں کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔'' مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گمان کی تردید فرمائی۔[6]

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض صحابہ نے گمان کیا تھا کہ انہیں ناز و نعمت اور آسائش و آرام نے جہاد سے روک لیا ہے۔ مگر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اس خیال کی تردید کی۔[7]

---

[1] تھذیب الکمال: ۵۲۲/۲۷

[2] میزان الاعتدال: ۱۰۹/۳ [3] اکمال تھذیب الکمال: ۱۹۰/۱۱

[4] اسماء المدلسین للسیوطی، ص ۲۹ [5] میزان الاعتدال: ۲/ ۴۲۵، ۴۲۶

[6] دعنی اضرب عنق ھذا المنافق، قال انہ قد شھد بدراً (صحیح البخاری، ح ۴۲۷۴، کتاب المغازی، باب فتح مکۃ)

[7] صحیح مسلم، ح ۷۱۹۲، کتاب التوبۃ، باب حدیث توبۃ کعب بن مالک

ہم حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سیرت اوران کی تربیت کرنے والی عظیم شخصیات کومدنظر رکھتے ہوئے ان کی نیت کوخالص اوران کی جدوجہد کوللہ فی اللہ سمجھتے ہیں۔ان کا آخر دم تک لڑنا بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے کیے پر ہرگز نادم نہ تھے۔ورنہ ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کا موقع موجود تھا۔

☆☆☆

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے ابتدائی چار ماہ میں بیعت کیوں نہ کی؟

﴿سوال﴾ آپ کا جواب بڑی حد تک تشفی کا باعث ہوا ہے مگر ایک اشکال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اگر عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ عبداللہ بن زبیر کی بیعت فقط اس لیے نہیں کر رہے تھے کہ اِدھر خلافت زبیریہ تھی اور اُدھر خلافت بنومروان اور یہ حضرات فریق نہیں بننا چاہتے تھے، تو سوال یہ ہے کہ خلافتِ زبیریہ کے ابتدائی چار ماہ تک دوسرا فریق مقابلے میں نہ تھا۔اس دوران ان حضرات نے بیعت کیوں نہ کی؟ تاخیر کیوں کرتے رہے؟

﴿جواب﴾ بیعت میں تاخیر کوئی عجیب بات نہیں۔حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کئی ہفتے بعد کی تھی۔[1] زیاد بن ابی سفیان نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک سال بعد کی تھی۔[2]

عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ کے بیعت نہ کرنے کی کئی وجوہ اس دور کے سیاسی تناظر میں واضح دکھائی دیتی ہیں، جن میں سب سے زیادہ قوی وجہ (جو ان حضرات کے عمل اور قول سے جھلکتی ہے) یہ تھی کہ یہ حضرات سیاست سے ہی بے زار ہو چکے تھے۔گزشتہ خانہ جنگی اور سیاسی کش مکش نے انہیں رنجیدہ اور دل گرفتہ کر دیا تھا، اسی لیے دو تین عشروں سے یہ حضرات عزلت نشین تھے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ابتدائی چار ماہ یقیناً متفقہ خلافت کے ملے تھے اور اس دوران کوئی شہر بنوامیہ کے قبضے میں نہیں رہا تھا مگر عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ جیسے جہاں دیدہ اور دوراندیش حضرات غالباً اس وقت بھی یہ خطرہ پوری شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ بنوامیہ کبھی بھی حکومت کو کسی غیر کے پاس نہیں رہنے دیں گے اور جلد ہی تیاری کر کے دوبارہ آمادۂ پیکار ہوں گے اور عبداللہ بن زبیر کی خلافت کو بہت جلد ختم کر کے چھوڑیں گے۔یہ خطرہ خود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بھی تھا کہ بنوامیہ اپنی قوت اور سیاسی جوڑ توڑ کی صلاحیت سے کسی بھی وقت بغاوت کرا سکتے ہیں، پس خلافت کو بنوامیہ کی سازشوں سے بچانے کے لیے وہ انہیں حجاز سے نکالنے پر مجبور ہوئے۔[3]

پس عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ نے اس درمیانی وقفے میں بھی اپنی سابقہ یکسوئی اور غیر جانب داری کا طرزِ عمل باقی رکھا۔اور یہ بات ثابت ہے کہ آگے چل کر وہ خدشات درست ثابت ہوئے جو ان کو لاحق تھے۔یہ الگ بات ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ غیر معمولی استقامت کے ساتھ بنومروان کی شدید مخالفت اور

---

① الکامل فی التاریخ: ۳/۹۰۸

② تاریخ الطبری: ۵/۱۶۷ تا ۱۶۸ ③ تاریخ الطبری: ۵/۵۳۱



حملوں کے سامنے ساڑھے آٹھ سال تک جمے رہے مگر بنو مروان نے بھی جب تک حکومت چھین نہ لی، چین سے نہ بیٹھے۔ اس کش مکش میں دونوں طرف سے مسلمان مارے جاتے رہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم فکرا کابر نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی ایک جماعت کے ساتھ کھڑے ہوں اور اس صف میں ان کی موجودگی کو جواز بنا کر ان کے عقیدت مند اپنا اور دوسرے مسلمانوں کا خون بہائیں۔ انہیں اس پر آخرت میں مواخذے کا خدشہ تھا۔

مگر یہ بھی ثابت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے زندگی کے آخری ایام میں جب عین حج کے موقع پر اپنی آنکھوں سے حجاج بن یوسف کو حرم میں آمادۂ پیکار دیکھا تو انہیں اپنی غیر جانب داری پر سخت افسوس ہوا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مسجد الحرام میں مظلومانہ شہادت نے ان کی رائے یکسر بدل دی اور وفات سے پہلے انہوں نے واضح طور پر حجاج کی فوج کو باغی قرار دیا اور ان باغیوں کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہونے پر حسرت ظاہر کی۔ یہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ اگر عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنیفہ رحمۃ اللہ نے آخر تک عبداللہ بن زبیر سے بیعت نہیں کی تو اس سے ان پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا؛ کیوں کہ ہر ہر فرد پر امام کی بیعت کرنا واجب نہیں۔ واجب فقط یہ ہے کہ خروج نہ کرے۔[1]

حضرت سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت یہی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔[2] تاہم انہوں نے لوگوں کو متفق ہوتا دیکھ کر اپنا دعوائے خلافت ترک کر دیا تھا اور کوئی شورش کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے اگر کوئی امام کی بیعت میں تاخیر کرے یا سرے سے بیعت نہ کرے تو اس پر شرعاً کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ وہ خروج نہ کرے۔

☆☆☆

کیا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خطبے سے نکالا تھا؟

﴿سوال﴾ ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خطبے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نکلوا دیا تھا اور وہ بھی اس خیال سے کہ اس سے بنو ہاشم میں غرور و سرکشی پیدا ہوتی تھی۔[3] کیا یہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ یہ روایت بالکل من گھڑت ہے۔ سند میں ایک راوی ہیثم بن عدی کذاب مشہور ہے۔[4] اسی طرح بعض مؤرخین نے یہ روایت عامر بن صالح سے نقل کی ہے جو متروک ہے، یحییٰ بن معین اسے کذاب کہتے تھے۔[5]

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے عاشقِ رسول کے بارے میں کون مان سکتا ہے کہ وہ ایسی ایمان سوز حرکت کے مرتکب ہوں گے۔

---

① شرح مسلم، نووی اور احسن الفتاویٰ کے حوالے سے یہ بات پیچھے بتائی جا چکی ہے۔

② سیر اعلام النبلاء: ۱/۲۷۷، ط الرسالۃ۔ اگرچہ اسناد ایہ واقعہ ضعیف ہے۔

③ انساب الاشراف: ۵/۳۱۷، ط دار الفکر

④ میزان الاعتدال: ۴/۳۲۴

⑤ تقریب التھذیب، ترجمہ نمبر: ۳۰۹۶

﴿سوال﴾ عبداللہ بن زبیر کی شہادت اور شامی فوج سے لڑائی کی روایات سب واقعۂ کربلا کی طرح افسانہ ہیں کیوں کہ یہ سب شیعہ راویوں، خاص کر واقدی سے منقول ہیں۔علماء نے شیعوں سے متاثر ہو کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خواہ مخواہ برحق اور مظلوم ثابت کرنے کے جوش میں ان جھوٹی روایات پر یقین کر لیا ہے جبکہ حقیقت میں ان روایات کی کوئی اسنادی بنیاد ہے ہی نہیں۔اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

﴿جواب﴾ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔واقعہ کربلا کی بھی صحیح اور حسن روایات موجود ہیں اور جو ضعیف روایات ان سے متعارض نہیں وہ بھی اصولاً قابلِ قبول ہیں۔اسی طرح عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شامی افواج سے جنگ اور شہادت کے واقعات بھی فقط واقدی سے منقول نہیں بلکہ صحیح اور حسن روایات میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔صحیح مسلم، کتاب الفضائل میں بھی اس کی ایک مفصل روایت منقول ہے۔[1] اخبار مکۃ للفاکہی میں بھی ایک صحیح السند روایت موجود ہے۔[2] نیز ابونعیم اصبہانی نے حلیۃ الاولیاء میں اس واقعے کی چار روایات نقل کی ہیں جن کی اسناد میں کوئی بھی شیعہ راوی قطعاً نہیں، وہ یہ ہیں:

① پہلی روایت میں یزید اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی کش مکش سے بات شروع کر کے، حجاج بن یوسف کے مکہ پر حملے تک کی روداد مختصراً بیان کی گئی ہے اور شہادت کی صبح ماں بیٹے کی گفتگو مفصل نقل کی گئی ہے۔پھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا اپنے جانثاروں سے خطاب، دشمنوں کا مسجد الحرام میں گھسنا، اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔[3] یہ روایت حسن کے درجے سے کم نہیں۔[4]

---

① صحیح مسلم، ح: ۶۶۶۰، فضائل الصحابۃ، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا

② اخبار مکۃ للفاکہی: ۳۳۷/۲، حدثنا عبدالجبار بن العلاء، قال ثنا بشر بن السری، قال ثنا نافع بن عمر، عن ابن ابی ملیکۃ
عبدالجبار مسلم، ترمذی اور نسائی، بشر بن السری بخاری و مسلم، نافع بن عمر مسلم ابوداود و نسائی اور ابن ابی ملیکہ (عبیداللہ بن عبداللہ) بخاری و مسلم کے راوی ہیں، اس طرح یہ روایت صحیح کے درجے سے کم نہیں۔

③ حلیۃ الاولیاء: ۳۳۱/۱

④ سند یہ ہے: سلیمان بن احمد ثنا علی بن المبارک، ثنا یزید بن المبارک، ثنا عبدالملک بن عبدالرحمن الذماری، ثنا القاسم بن معن، عن ھشام بن عروۃ، عن ابیہ

احوالِ رواۃ:

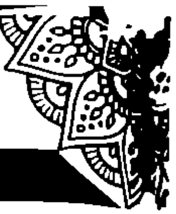
● سلیمان بن احمد: ابوالقاسم الطبرانی صاحب معاجم ہیں، جن کی ثقاہت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

❷ علی بن المبارک (ابوالحسن الصنعانی، م ۲۸۱ھ) ان کا اصل نام علی بن محمد بن عبداللہ بن مبارک ہے۔علامہ عراقی نے انہیں ثقہ بتایا ہے۔ابوطیب المنصوری فرماتے ہیں: ''مقبول'' (ارشادالقاصی والدانی الی تراجم الشیوخ الطبرانی، ابوالطیب بن صلاح المنصوری: ۴۴۱/۱، ط دارالکیان ریاض)

❸ زیدبن مبارک (م ۲۱۱ھ): ''یزید بن مبارک'' تصحیف ہے۔صحیح نام زید بن مبارک ہے۔ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔(الثقات: ۸/ ۲۵۱، ط نظامیہ دکن) قال ابوحاتم صدوق. (الجرح والتعدیل: ۵۷۳/۳، ط دکن) قال ابوداؤد والنسائی ثقة. (تھذیب التھذیب: ۴۲۵/۳)

❹ عبدالملک بن عبدالرحمن الذماری (م ۱۹۱ھ)۔ان سے مشابہ نام عبدالملک بن عبدالرحمن شامی ہے جنہیں امام بخاری نے منکر الحدیث اور ابوحاتم نے لیس بالقوی کہا ہے جبکہ الذماری کو ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے، عمرو بن علی نے بھی انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔(تھذیب التھذیب: ۳۰۱/۶)

❺ قاسم بن معن (عبداللہ بن مسعود کے پڑپوتے) ثقہ، حجت اور امام زمانہ تھے۔۱۰۰ھ کے بعد پیدا ہوئے۔۱۷۵ھ میں وفات ہوئی۔ہشام بن عروہ اور عائشہ بنت سعد سے بھی روایات لی ہیں۔(سیر اعلام النبلاء: ۱۹۰/۸) ☆ان کے بعد ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر کی ثقاہت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔



② دوسری روایت میں دشمن کو مسجد سے پسپا کرنے اور رجزیہ اشعار ''لو كان قرنی واحدلكفيته۔ '' اور ''لسنا على الاعقاب...... '' پڑھنے کا ذکر ہے۔[1]

یہ بھی حسن سند سے مروی ہے۔[2]

③ تیسری روایت میں حجاج کی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے گفتگو تفصیل سے نقل کی ہے۔[3]

اس کی سند صحیح ہے۔ تمام رجال ثقہ ہیں۔[4]

④ اس میں دشمنوں کے مسجد میں گھسنے، انہیں پسپا کرنے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر اینٹ لگنے اور ''اسماء ان قتلت لاتبكینی. '' والا شعر پڑھنے کا ذکر ہے۔[5] سنداً یہ ضعیف ہے[6] مگر تاریخی واقعے کی حیثیت سے اس درجے کی روایات اہلِ علم کے ہاں قابلِ قبول رہی ہیں؛ کیوں کہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو شرعاً قابلِ انکار ہو۔

---

① حلية الاولياء: ۱/۳۳۳

② سند یہ ہے۔ حدثنا فاروق بن عبدالكبير الخطابی، ثنا عبدالعزيز بن معاوية العتابی، ثنا جعفر بن عون عن هشام بن عروة عن ابيه

احوالِ رواۃ:

❶ فاروق بن عبدالکبیر (م ۳۶۰ھ) بصرہ کے طویل العمر محدث تھے جن سے لوگ دور دراز سے سفر کر کے روایت لینے آتے تھے۔ ان پر کوئی جرح نہیں کی گئی۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ما بہ بأس. (سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۱۴۰)

❷ عبدالعزیز بن معاویۃ العتابی (م ۲۸۴ھ) صدوق ہیں۔ سو برس کے قریب عمر پائی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۳۸۲)

❸ جعفر بن عون (۲۰۶ھ) بخاری و مسلم کے شیخ اور نہایت ثقہ راوی ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۹/ ۴۴۰)

❹ ان کے بعد ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر کی ثقاہت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

③ حلية الاولياء: ۱/ ۳۳۳

④ سند یہ ہے: حدثنا ابوبكر الطلحی، ثنا ابو حُصَين الوادعی، ثنا احمد بن يونس، ثنا ابو المحياة يحيىٰ بن يعلىٰ التيمی، عن ابيه

احوالِ رواۃ: ❶ ابوبکر طلحی: عبداللہ بن یحییٰ بن معاویہ (م ۳۶۰ھ) ثقہ. (الروض الباسم فی تراجم شيوخ الحاكم: ۱/ ۶۴۴)

❷ ابو حُصَين الوادعی: محمد بن الحسین بن حبیب، ثقہ. (موسوعة اقوال الدارقطنی: ۲/ ۵۶۷)

❸ احمد بن یونس، احمد بن عبداللہ بن یونس (م ۲۲۷ھ) بخاری و مسلم کے ثقہ راوی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۴۵۷)

❹ یحییٰ بن یعلیٰ تیمی: یحییٰ بن یعلیٰ بن حرملہ (م ۱۸۰ھ) بخاری و مسلم کے راوی، ثقہ (تقریب التهذيب، متر: ۷۶۷۶)

❺ یعلیٰ بن حرملة: امام بخاری بتاتے ہیں کہ یہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت لیتے ہیں۔ (التاريخ الكبير: ۸/ ۴۱۶) ذکرہ ابن حبان فی الثقات (الثقات: ۵/ ۵۵۶)

⑤ حلية الاولياء: ۱/ ۳۳۲

⑥ سند یہ ہے: سليمان بن احمد ثنا علی بن المبارك، ثنا زيد بن المبارك، ثنا صاحب لنا اخبرنی ابراهيم بن اسحق قال سمعت ابی اسحاق، يقول انا حاضر قتل ابن الزبير.

احوالِ رواۃ: ❶ سلیمان بن احمد (طبرانی) علی بن مبارک، زید بن مبارک: تعارف پیچھے آچکا ہے کہ تینوں ثقہ یا صدوق ہیں۔

❷ صاحب لنا: کوئی مجہول شخص ہے۔

❸ ابراهيم بن اسحق: ابن عساکر نے یہ روایت نقل کرتے ہوئے انہیں ابراہیم بن اسحٰق بن ابی اسحاق سے موسوم کیا ہے۔ (تاریخ دِمَشق: ۲۸/ ۲۲۵)

❹ ابو اسحق: ابن عساکر نے یہی روایت اسی سند سے نقل کرتے ہوئے انہیں اسحٰق بن ابی اسحاق سے موسوم کیا ہے۔ (تاریخ دِمَشق: ۲۸/ ۲۲۵)

امام طبرانی کی معجم کبیر میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ وہاں ابو اسحاق کو اسحاق بن ابی اسحاق لکھا گیا ہے۔ (المعجم الكبير بالمجلدات الثالث عشر والرابع عشر: ۱۴/ ۱۸۰) ابراہیم بن اسحاق اور اسحاق بن ابی اسحٰق متعدد ہیں مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس روایت کے سلسلۂ اسناد میں موزوں ہو۔ امام ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا ہے: ''فيه جماعة لا اعرفهم. '' یہ سند تین راویوں کی مجہولیت کے باعث ضعیف ہو جاتی ہے۔

مروان بن الحکم کی صحابیت اور کردار پر سوالات؟

﴿سوال﴾ مروان بن الحکم کو صحابہ میں شمار کرنا چاہیے کیونکہ مروان کی ولادت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ بعض علماء کے نزدیک ۲ھ، بعض کے نزدیک غزوۂ اُحد کے ایام (۳ھ) اور بعض کے نزدیک غزوۂ خندق کے دنوں (۵ھ) میں مکہ میں ولادت ہوئی تھی۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مروان بن الحکم کے ترجمے میں لکھا ہے:

''وھو صحابی عند طائفة کثیرة.''

یعنی اکثر علماء کے نزدیک مروان کی صحابیت ثابت ہے۔

(جواب) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''طائفة کثیرة'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب ہے ''بہت سے لوگ''۔ اس سے اکثریت کا مفہوم اخذ کرنا غلط ہے۔ ان الفاظ میں یہ بھی صراحت نہیں کہ اہلِ سنت مراد ہیں یا ناصبی۔ علماء مراد ہیں یا جہلاء۔ اگر کسی کا یہ دعویٰ ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے دور تک ''اکثر اہلِ سنت علماء'' مروان کو صحابی قرار دے چکے تھے تو از راہِ کرم اس دور تک کے چند اہلِ سنت علماء کی کتب کا حوالہ ہی پیش کر دیں جنہوں نے مروان کو صحابی کہا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی دور میں بھی علمائے اہلِ سنت نے مروان کے صحابی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جس **طائفة کثیرة** کا ذکر کیا ہے، وہ اتنے غیر اہم لوگ تھے کہ ان میں سے کسی کا نام بھی معروف نہیں۔ مزید یہ کہ ان کے پاس لے دے کے مروان کی صحابیت کی ایک ہی دلیل تھی جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ہی نقل کی ہے (اور بعد میں اس کی تردید بھی خود ہی کی ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے)۔ دلیل یہ ہے:

''لانه ولد فی حیاة النبی ﷺ. وروی عنه فی حدیث صلح الحدیبیة، وفی روایة صحیح البخاری عن مروان والمِسوَر بن مخرمة.''

(اس لیے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی حیات میں پیدا ہوا۔ اس سے صلح حدیبیہ کے متعلق روایت منقول ہے، بخاری میں مروان اور مِسوَر بن مَخرَمہ سے روایت منقول ہے۔)[2]

مگر کسی شخص کا نبی اکرم ﷺ کی حیات میں پیدا ہونا یا مرسلاً کوئی روایت نقل کر دینا صحابی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا جب تک کہ رؤیت وصحبت ثابت نہ ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جن روایات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ مرسل ہیں۔ ان روایات میں سے بعض صلح حدیبیہ سے متعلق ہیں اور بعض غزوۂ حنین سے۔

[1] الاستیعاب: ۱۳۸۷/۳؛ الاصابہ: ۲۰۳/۶ [2] البدایہ والنہایة سن ۶۵ھ، ترجمة: مروان بن الحکم



صلح حدیبیہ کی روایت کے الفاظ دیکھئے:

اخبرنی عروۃ بن الزبیر، انہ سمع مروان بن الحکم والمِسْوَر بن مخرمۃ، یخبران خبراً من رسول اللہ ﷺ من عمرۃ الحدیبیۃ، فکان فیما اخبرنی عروۃ عنھما، انہ لما کاتب رسول اللہ ﷺ سھیل بن عمرو یوم الحدیبیۃ علیٰ مدۃ القضیۃ.....[1]

اسی طرح دوسری روایت (جو غزوۂ حنین سے متعلق ہے) کے الفاظ پر غور کریں:

زعم عروۃ ان مروان بن الحکم ومِسْوَر بن مخرمۃ اخبراہ ان رسول اللہ ﷺ قام حین جاءہ وفد ھوازن مسلمین.[2]

یہاں سند میں انقطاع اور ارسال کا پورا امکان دکھائی دے رہا ہے۔ نیز امام بخاری نے کتاب الشروط میں صلح حدیبیہ کے واقعے کی ایک طویل روایت مروان اور مِسْوَر بن مَخْرَمَہ سے نقل کی ہے۔ مگر وہ بھی منقطع ہے۔ دیکھئے:

اخبرنی الزھری قال اخبرنی عروۃ الزبیر عن المِسْوَر بن مخرمۃ ومروان یصدق کل واحد منھما حدیث صاحبہ قالا: خرج رسول اللہ ﷺ زمن الحدیبیۃ.....[3]

ان تینوں روایت میں نقلِ واقعہ کے جو صیغے استعمال ہوئے ہیں ان میں ہرگز یہ صراحت نہیں کہ راوی واقعات کے عینی شاہد ہیں بلکہ صیغوں میں پورا پورا احتمال موجود ہے کہ انہوں نے کسی سے سنا ہوا واقعہ نقل کیا ہے۔

قرائن ثابت کر دیتے ہیں کہ ایسا ہی تھا۔ مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ کی ولادت ۲ھ کی ہے مگر وہ مدنی تھے[4] اور ان روایات کی بناء پر جن میں انہوں نے حضور ﷺ سے سماعت کی صراحت کی ہے، ان کے صحابی ہونے پر اتفاق ہے۔[5]

مگر حنین اور صلح حدیبیہ کے عینی شاہد نہ ہی وہ تھے نہ مروان۔ دونوں سنے ہوئے واقعات نقل کر رہے تھے۔ مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ کی طرح مروان کی ولادت بھی ۲ھ مان لی جائے تب بھی ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے وقت دونوں چار سال اور ۸ ہجری میں غزوۂ حنین کے وقت دونوں چھ سال کے ہوں گے۔ صلح حدیبیہ مکہ سے باہر ہوئی تھی اور اس وقت مروان کے والد نے بھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ چار سالہ مروان خود حاضرِ خدمت ہو کر صلح نامے کی شقوں پر بات چیت کا شاہد بنتا۔ اسی طرح مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے وقت چار سال کے تھے، وہ معاہدے کے شاہد ہرگز نہ تھے۔ غزوۂ حنین میں بھی ان کی اور مروان کی شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ

---

1. صحیح البخاری، ح: ۴۱۸۰، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ
2. صحیح البخاری، ح: ۲۳۰۷، کتاب الوکالۃ، باب اذا وھب شیئا
3. صحیح البخاری، ح: ۲۷۳۱، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجھاد؛ ح: ۱۶۹۴، کتاب الحج، باب من اشعر وقلد بذی الحلیفۃ
4. سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۹۲، ۳۹۳، ط الرسالۃ
5. سمعت رسول اللہ ﷺ وھو یخطب الناس فی ذلک علی منبرہ ھذا وانا یومئذ محتلم فقال: ان فاطمۃ منی. (صحیح البخاری، ح: ۳۱۱۰، کتاب فرض الخمس، باب ما ذکر من درع النبی ﷺ؛ صحیح مسلم، ح: ۲۴۴۹، فضائل الصحابۃ، باب فضائل فاطمۃ؛ سنن ابی داؤد، ح: ۲۰۶۹، کتاب النکاح، باب ما یکرہ ان یجمع بینھن من النساء)

نبی اکرم ﷺ اتنے کم عمر بچوں کو جہاد پر ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے۔ غزوات میں بارہ تیرہ سال کے بچوں کو بھی واپس بھیج دیا جاتا تھا، فقط بالغ لڑکوں کو ساتھ لیا جاتا تھا۔ اب مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ کی صحبت تو ان سے منقول دیگر متصل اور مرفوع روایات کے بناء پر ثابت ہو جاتی ہے مگر مروان فقط صلح حدیبیہ یا غزوۂ حنین کی ان منقطع السند روایات کی بناء پر کیسے صحابی ثابت ہوگا؟ جب وہ شریکِ واقعہ ہی نہ تھا تو وہ ان واقعات کے بارے میں اپنا مشاہدہ کیسے بیان کر سکتا تھا۔

اب آپ صحیح بخاری کی اس روایت کو دیکھئے تو سارا مسئلہ صاف ہو جائے گا، اس روایت کی سند دیگر اسناد کے ابہام کو صاف کر کے یہ بتا دیتی ہے کہ مِسْوَر بن مَخْرَمَہ رضی اللہ عنہ اور مروان نے یہ واقعات دیگر صحابہ سے سنے ہیں۔

حدثنا يحيىٰ بن بكير، حدثنا الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب، قال اخبرني عروة بن الزبير انه سمع مروان والمِسْوَر بن مَخْرَمَةَ رضي الله عنهما يخبران عن اصحاب رسول الله ﷺ، قال: لما كاتب سهيل بن عمرو...... الخ [1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی یہ سند نقل کر کے دیگر اسناد کے ابہام دور کر دیے اور ساتھ ہی مروان کی صحابیت کی مزعومہ واحد دلیل کو یوں مسترد کیا: ''یہی برمحل ہے، کیونکہ مروان اور مِسْوَر رضی اللہ عنہ حدیبیہ کے دن کم سن تھے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں نے یہ واقعہ صحابہ کرام سے سنا ہے۔'' [2]

علامہ عینی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''یہ روایت مرسل ہے، اس لیے کہ یہ دونوں اس واقعے میں موجود نہ تھے...... جہاں تک مروان کا تعلق تو اس کا نبی ﷺ سے سماع ثابت ہے نہ ہی صحبت؛ کیونکہ جب نبی ﷺ نے اس کے والد حکم کو شہر بدر کیا تھا تو یہ بھی طائف چلا گیا تھا جبکہ وہ بے عقل بچہ تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ طائف ہی میں رہا، یہاں تک کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ان دونوں کو واپس بلا لیا...... جہاں تک مِسْوَر رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے، نبی ﷺ سے ان کا سماع ثابت ہے مگر جب وہ اپنے باپ کے ساتھ فتح مکہ کے بعد آئے تو بچے تھے اور یہ قصہ تو اس سے بھی دو سال پہلے کا ہے۔'' [3]

پس صلح حدیبیہ کے متعلق مروان کی روایات مرسل ہیں جو اس کی صحبت یا رؤیت یا سماع کی دلیل نہیں بن سکتیں۔

---

(1) صحيح البخاري، ح: ٢٧١١، كتاب الشروط، باب مايجوز من الشروط في الاسلام

واخرجه النسائي باسناد: عن يعقوب بن ابراهيم الدورقي، عن يحيىٰ بن سعيد، عن ابن المبارك، عن معمر، عن الزهري، عن عروة، عن المِسْوَر بن مخرمة و مروان بن الحكم يخبران عن اصحاب رسول الله ﷺ: قال: لما كاتب سهيل بن عمرو، الخ

(السنن الكبرىٰ للنسائي بروايت نمبر: ١١٧٣٨)

(2) "وهذا هو الاشبه، فان مروان ومسور أكانا صغيرين يوم الحديبية، والظاهر انهما اخذاه عن الصحابة (البداية والنهاية: ٦/٢٣٤، ٢٣٨)

(3) وهو مرسل لانهما لم يحضرا القصة... اما مروان فانه لا يصح له السماع من النبي ﷺ ولا صحبة لانه خرج الى الطائف طفلا لا يعقل لما نفى النبي ﷺ اباه الحكم، وكان مع ابيه بالطائف حتىٰ استخلف عثمان فردهما... اما المِسْوَر فصح سماعه من النبي ﷺ لكنه انما قدم مع ابيه وهو صغير بعد الفتح، وكانت هذه القصة قبل ذالك بسنتين. (عمدة القاري، كتاب الشروط، باب مايجوز من الشروط في الاسلام)

صحابی کی معرفت کے طریقے:

یاد رہے کہ علمائے اصول نے کسی کے صحابی ہونے کی معرفت کے درج ذیل طریقے بیان کیے ہیں:

ا اس کا صحابی ہونا تواتر سے ثابت ہو جیسے خلفائے راشدین۔

ا اس کا صحابی ہونا تواتر کی حد تک نہ ہو مگر مشہور ہو یعنی کئی صحابہ اور تابعین اسے صحابی مانتے ہوں ... جیسے عمران بن حُصین، جَریر بن عبداللہ، عُکّاشہ بن مِحصَن رضی اللہ عنہم

ا اِکا دُکا صحابہ نے اسے صحابی کہا ہو جیسے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حُمَمہ الدوسی کے صحابی ہونے کی گواہی دی تھی۔

ا زمانۂ رسالت کے قریبی دور میں کسی عادل اور متقی شخص نے خود صحابی ہونے کا دعویٰ کیا ہو اور صحابہ سے اس کی تردید منقول نہ ہو۔[1]

ان میں سے کوئی بات مروان پر منطبق نہیں ہوتی، خود اس نے بھی کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ شرفِ صحبت رکھتا ہے، احوالِ صحابہ پر لکھی گئی کسی کتاب میں مروان کو صحابی شمار نہیں کیا گیا۔ صحابہ کے تعارف پر چار کتب کو سب سے زیادہ معتبر مانا جاتا ہے: طبقات ابن سعد، الاستیعاب، اسد الغابہ اور الاصابہ۔ طبقات ابن سعد میں مروان کو تابعین میں شمار کیا گیا ہے۔[2] الاستیعاب میں ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے صاف لکھا ہے کہ مروان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی کیونکہ اس کے باپ کو جلاوطن کیا گیا تو یہ بھی ساتھ ہی طائف چلا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک وہیں مقیم تھا۔[3] اسد الغابہ میں متعارف کرائے گئے صحابہ میں بھی مروان شامل نہیں۔ الاصابہ میں بھی اسے صحابی نہیں کہا گیا۔

☆☆☆

کیا حافظ ابن حجر مروان کو صحابی مانتے تھے؟

﴿سوال﴾ مروان کی صحابیت کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مروان کو صحابی مانتے تھے؟

﴿جواب﴾ یہ بے بنیاد دعویٰ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بیان درج ذیل ہے:

''مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ، عثمان بن عفان کا چچازاد۔ کہا جاتا ہے کہ اسے رؤیہ نصیب ہوئی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو جس نے اس (مروان) کے بارے میں کلام کیا ہے اس کی رائے قبول نہیں کی جائے گی۔''[4]

حافظ ابن حجر نے یہاں مروان کی ''رؤیہ'' کا فقط ایک امکانی قول نقل کیا ہے۔ کوئی فیصلہ نہیں سنایا۔

اسی طرح ''الاصابہ'' میں بھی انہوں نے فقط احتمال پیش کیا ہے اور ساتھ ہی واضح کر دیا ہے:

لم ار من جزم بصحبته ...... میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس نے اس کی صحابیت کا یقین کیا ہو۔[5]

---

① الاصابۃ: ۱/۱۵۱ (المقدمۃ لدکتور عادل احمد)، ۱/۱۶۰ (الفصل الثانی فی الطریق الی معرفۃ کون الشخص صحابیا)

② طبقات ابن سعد: ۵/۳۶، ط صادر

③ الاستیعاب: ۳/۱۳۸۷

④ یقال لہ رؤیۃ فان ثبتت فلا یعرج علی من تکلم فیہ. (فتح الباری: ۱/۴۴۳)

⑤ الاصابہ: ۶/۲۰۳

اس ساری بحث کے بعد دیکھئے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی آخری رائے کیا تھی؟

وہ تقریب التہذیب میں پوری وضاحت سے لکھتے ہیں: "لاتثبت له الصحبة." (اس کی صحابیت ثابت نہیں) [1]

پس حافظ ابن حجر کی طرف مروان کی صحابیت کا قول منسوب کرنا، دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

اب اس مسئلے میں دیگر ائمہ کی آراء بھی ملاحظہ فرمالیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ "میزان الاعتدال" میں لکھتے ہیں:

"مروان بن الحکم کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے کچھ کام ہلاکت خیز تھے۔ ہم اللہ سے عافیت طلب کرتے ہیں۔" [2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ مروان کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مروان بن الحكم: قال البخاري: لم ير النبي صلی اللہ علیہ وسلم."

(امام بخاری کا کہنا ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی۔)

پھر حافظ ذہبی رحمہ اللہ اپنی رائے یوں لکھتے ہیں:

قلت: تابعي له افاعيل. (میں کہتا ہوں وہ تابعی تھا اور اس کے کچھ برے کارنامے بھی تھے۔) [3]

علامہ عراقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"امام ترمذی رحمہ اللہ نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ سے بذاتِ خود پوچھا: قلت لـه: مروان بن الحكم رأى النبي صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال: لا. (کیا مروان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا؟ انہوں نے فرمایا: نہیں۔) [4]

---

(1) تقريب التهذيب، ترجمه نمبر: ٦٥٦٧

(2) "وله اعمال موبقة، نسأل الله السلامة، رمى طلحة بسهم وفعل ما فعل." (ميزان الاعتدال: ٤/٨٩)

مروان کے جن ہلاکت خیز کاموں کی طرف حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے ان میں بعض صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ مثلاً:

- مروان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کرنا منقول ہے۔ (التاريخ الكبير لابن ابی خيثمة، السفر الثالث: ٢/٤٧ بسند صحيح)
- اسی طرح مروان کا حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو جنگِ جمل کے دوران قتل کرنا بھی صحیح سند سے ثابت ہے۔ مروان کے اس فعل پر حافظ ذہبی رحمہ اللہ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قلت: قاتل طلحة في الوزر بمنزلة قاتل عليّ."

"حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا قاتل گناہ گار ہونے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل کے ہم پلہ ہے۔" (سیر اعلام النبلاء: ١/٣٦، ط الرسالة)

حافظ ابن حجر نے بھی مروان کے اس جرم کی روایت نقل کر کے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ واخرجه ابو القاسم البغوي بسند صحيح من الجارود بن ابی سبرة قال: لما كان يوم الجمل نظر مروان الى طلحة، وقال: لم اطلب ثاري بعد اليوم، فنزع له بسهم فقتله. (الاصابة: ٣/٤٣٢، ط العلمية)

حافظ ابن کثیر نے اسی کو مشہور قول کہا ہے، اگرچہ انہوں نے اس بات کو "اقرب" قرار دیا ہے کہ تیر کسی نامعلوم فرد کی جانب سے مارا گیا تھا۔ (البداية والنهاية: ١٠/٤٧٦) لیکن اگر صحیح روایت کو قیاس پر ترجیح دینے کا اصول نہ چھوڑا جائے تو مروان کا یہ جرم ثابت ہے۔ رہی یہ بات کہ مروان سے اس کا قصاص کیوں نہیں لیا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ باغیوں سے جنگ اور ہنگامہ وداروگیر میں ہونے والے خون کا قصاص قضاءً مشروع نہیں۔ یہی وجہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل سے قصاص نہ لینے کی تھی۔

- مروان نے شرعی خلیفہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مقابلے میں بغاوت کی اور تمام صوبوں میں ان کی بیعت اور گورنروں کی تقرری کے چار ماہ بعد خود خلافت کا دعویٰ کر دیا۔ مروان کی اس باغیانہ تحریک میں اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں حضرت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جیسی باقیاتِ صحابہ کی شہادت ہوئی۔ اسی باغیانہ تحریک کے تسلسل میں اس کے بیٹے عبد الملک کی فوج کشی میں عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید کیے گئے اور کعبہ کی حرمت پامال کی گئی۔ یہ مروان کے وہ "افاعیل" ہیں جن کی طرف حافظ ذہبی اشارہ کر رہے ہیں۔

(3) المغني في الضعفاء: ٢/٦٥١

(4) تحفة التحصيل لابن العراقي: ١/٢٩٨

یہی رائے امام المحدثین ابوزرعہ رحمہ اللہ کی تھی۔ ان کا کہنا تھا: مروان نے نبی ﷺ سے کچھ نہیں سنا۔[1]

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ مروان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مروان بن ابی العاص الاموی المدنی۔ اس کی صحبت ثابت نہیں۔"[2]

الغرض مروان کو جمہور علماء نے صحابی نہیں مانا۔ ہاں! کچھ لوگ بعض مرسل روایات کو متصل تصور کر کے ایسا سمجھ رہے تھے۔ ہم اس قول کا بطلان واضح کر چکے ہیں، اسی لیے جمہور نے اس رائے کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔

☆☆☆

امام بخاری نے مروان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا:

﴿سوال﴾ مروان بن الحکم کا ذکر کرتے ہوئے امام بخاری نے "رضی اللہ عنہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مروان کو صحابی سمجھتے تھے۔ روایت یہ ہے:

حدثنا یحییٰ بن بکیر، حدثنا اللیث، عن عقیل، عن ابن شهاب، قال اخبرنی عروة بن الزبیر انه سمع مروان والمِسوَر بن مَخرَمَة رضی اللہ عنہما[3]

اس میں مروان اور مسور بن مخرمہ کا ذکر کر کے دونوں کو ایک ساتھ صحابی مانا گیا ہے اور رضی اللہ عنہما کہا گیا ہے۔

﴿جواب﴾ یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ امام بخاری ایسے صحابی کا ذکر کرتے ہوئے جن کے والد بھی صحابی ہوں، بسا اوقات "رضی اللہ عنہما" کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔[4]

چونکہ مسور رضی اللہ عنہ کے والد مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے،[5] اس لیے امام بخاری نے صحابی باپ بیٹے کا نام آنے پر "رضی اللہ عنہما" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ دیگر مقامات پر امام بخاری ہی کی عبارت سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔

ان المسور بن مخرمة رضی اللہ عنهما ومروان اخبراه.[6]

یہاں یقینی طور پر یہ مسور رضی اللہ عنہ اور ان کے والد مخرمہ ہی کے لیے ہے جبکہ مروان کو "رضی اللہ عنہ" کے بغیر الگ ذکر کیا گیا ہے۔ اور فقط اسی ایک جگہ نہیں، صحیح بخاری میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مروان کا انفرادی ذکر ہو اور "رضی اللہ عنہ" کا صیغۂ ادب استعمال کیا گیا ہو۔[7]

---

① تحفة التحصیل لابن العراقی: ۱/۲۹۸

② مروان بن الحکم بن العاص الاموی المدنی ولا یثبت له صحبة. (اوجز المسالک: ۱/۳۸۳، ط دار القلم دمشق)

③ صحیح البخاری، ح: ۲۷۱۱

④ چند مثالیں دیکھیے: عن ابن عمر رضی اللہ عنہما (ح: ۸) عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما (ح: ۱۲۰۱۰)، عن براء بن عازب رضی اللہ عنہما (ح: ۳۹۹)
عن ابن عباس رضی اللہ عنہما (صحیح البخاری، ح: ۶۹۷)

⑤ مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے۔ (الاصابة: ۲/۴۱)

⑥ صحیح البخاری، ح: ۲۵۸۳، باب من رأی الهبة الغائبة جائزه

⑦ مثلاً ح: ۵۰۹، ۷۶۴، ۹۵۶، ۱۵۶۳، ۲۸۳۲، ۳۶۰۵، ۳۷۱۷،

پس یہ گمان غلط ہے کہ یہاں امام بخاری نے مروان کو صحابی سمجھ کر رضی اللہ عنہما کہا ہے۔ جبکہ دوسرے مقام پر امام بخاری خود وضاحت فرماتے ہیں کہ مروان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تک نہیں۔ [1]

☆☆☆

مروان کے والد حکم بن ابی العاص کا کردار کیسا تھا؟

﴿سوال﴾ مروان بن الحکم کے والد حکم بن ابی العاص کو بعض لوگ منافق قرار دیتے ہیں اور بعض ایک بزرگ صحابی قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں درست بات کیا ہے؟

﴿جواب﴾ ہم نے جہاں تک دیکھا بھالا ہے، یہ شخصیت بھی مروان ہی کی طرح مشکوک ہے۔ فنِ رجال کے ائمہ میں سے کسی نے بھی حکم بن ابی العاص کا ذکر تعظیم و تکریم سے نہیں کیا بلکہ احتیاط برتتے ہوئے فقط رؤیت یا ادنیٰ صحبت کا قول کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے الحکم کے متعلق بداعتمادی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وجہ سے اسلاف میں سے کسی نے الحکم کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' کا اضافہ کرنے کی بھی جرأت نہیں کی اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

حکم بن ابی العاص کی شخصیت کے متعلق حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حکم بن ابی العاص بن امیہ، الاموی، ابو مروان، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا چچازاد۔ کنیت ابو مروان تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہے۔ صحبت کا تھوڑا سا حصہ ملا۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شہر بدر کر کے طائف بھیج دیا تھا؛ کیوں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے پھرنے کے انداز کی اور بعض حرکات و سکنات کی نقل اتارتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برا بھلا کہا اور دور بھگا دیا۔ پس وہ وادئ وج میں جا کر مقیم ہو گیا۔ [2] ایک جماعت نے امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اسی لیے تنقید کی کہ انہوں نے اپنے چچا حکم سے نرمی برتی، اسے ٹھکانہ دیا اور مدینہ بلا کر ایک لاکھ کا عطیہ دیا۔ حکم کی مذمت میں کچھ احادیث بھی مروی ہیں جو صحیح السند نہیں، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''کیا بات ہے مجھے حکم کی اولاد اپنے منبر پر بندروں کی طرح کودتی دکھائی گئی۔'' اسے علاء بن عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ [3] اس باب میں کچھ اور احادیث بھی ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ میں نے ابن زبیر سے سنا ہے، وہ کہتے تھے: ''ربِ کعبہ کی قسم! حکم بن ابی العاص اور اس کی اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملعون قرار دی گئی ہے۔'' [4] حکم کے بیس بیٹے اور آٹھ بیٹیاں تھیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز افشاء کیا

---

① تحفة التحصيل لابن العراقي: ۱/۲۹۸

② یہ طائف کی ایک وادی ہے۔

③ رواه الهيثمي في مجمع الزوائد، ح: ۹۲۳۶، وقال: رجاله رجال الصحيح، غير مُصْعَب بن عبدالله بن زبير وهو ثقة.

④ ان حكم بن ابي العاص وولده ملعونون على لسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم.
حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے تاریخ الاسلام (۳/ ۳۶۸، تدمری؛ ۲/ ۱۹۸، بشار) میں یہ روایت نقل کر کے کہا ہے: اسناده صحيح.



کرتا تھا۔اس لیے آپ ﷺ نے اسے دور بھگا دیا۔وہ ۳۱ ہجری میں فوت ہوا۔"[1]

علامہ ابن اثیر الجزری حکم بن العاص کے معائب کی متعدد روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"حکم پر لعنت کیے جانے اور اسے شہر بدر کرنے کی روایات بہت سی ہیں۔انہیں ذکر کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔مگر اتنی بات تو طے ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی بُردباری اور ناگوار باتوں پر صبر کے باوجود اسے جو سزا دی وہ اس کی کسی بہت سخت حرکت کی بناء پر دی تھی۔"[2]

اسلاف کی تمام عبارتوں کو سامنے رکھنے کے بعد غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر حکم بن ابی العاص کے لیے نفسِ صحبت کا ثبوت مذمت سے مانع ہے تو دوسری طرف کی روایات کے پیشِ نظر مدح وتوصیف بھی خلافِ احتیاط ہے؛ کیوں کہ نفسِ صحبت تو ذوالخویصرۃ جیسے خوارج کو بھی نصیب ہوئی تھی مگر اس کا نام ادب سے نہیں لیا جاتا۔

یہی احتیاط اسلاف نے ملحوظ رکھی ہے۔الحکم کے بارے میں جو روایات تھیں،انہیں من وعن نقل کر دیا۔جو روایات ضعیف یا موضوع تھیں،ان کی طرف اشارہ کر دیا اور جو صحیح تھیں،ان کی حیثیت بھی واضح کر دی۔الحکم کی مذمت یا تعظیم وتوقیر،دونوں سے انہوں نے احتراز کیا۔ہم بھی اسی کو بہتر سمجھتے ہیں۔[3]

☆☆☆

مروان کا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل میں حصہ:

﴿سوال﴾ مروان کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا قاتل کہا جاتا ہے،مگر اس بارے میں بعض بنیادی اشکالات ہیں،مثلاً:

مروان کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی؟اگر کہا جائے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں حصے دار کے طور پر مشہور ہوگئے تھے،اس لیے مروان ان کے خلاف تھا،تو یہ کوئی وجہ نہیں بن سکتی؛کیوں کہ اس پروپیگنڈے سے مدینہ کے باہر والے تو متاثر ہو سکتے تھے۔مروان کو اس جھوٹ پر کیسے یقین ہوسکتا تھا؟اگر مروان حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتا تو یہ کام عام دنوں میں زیادہ آسانی سے ہوسکتا تھا۔پوشیدہ قتل کے کئی طریقے آسانی سے آزمائے جاسکتے تھے۔جنگ کے دن سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں ان کو قتل کرنے کا خطرہ کوئی کیوں مول لیتا؟

اگر مروان نے تمام احتیاطیں پسِ پشت ڈال کر مجمع عام میں یہ ظلم ڈھا ہی دیا تھا تو صحابہ اور تابعین نے اس کو کیوں چھوڑ دیا؟اتنے بڑے صحابی کے قاتل سے بدلہ کیوں نہ لیا گیا؟

﴿جواب﴾ مروان کا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا عجیب یا غیر متوقع ضرور ہے مگر کسی چیز کے خلافِ توقع ہونے اور ناممکن ہونے میں بڑا فرق ہے۔اگر کوئی عجیب خبر مصدقہ ذرائع سے ہم تک پہنچے تو اکثر اس پر یقین کرنا پڑتا ہے۔مروان

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۰۸/۲، ط الرسالۃ۔ حافظ ذہبی نے "تاریخ الاسلام" میں،حافظ ابن حجر نے "الاصابہ" میں اور حافظ ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" سن ۶۵ھ کے تحت الحکم بن ابی العاص کے متعلق جو لکھا ہے اسے بھی دیکھ لیا جائے۔

② اسد الغابۃ: ۳۸/۲

③ یاد رہے کہ حکم بن ابی العاص بن بشر ثقفی جو دورِ فاروقی میں بحرین کے عامل تھے،الگ شخص ہیں،ان کی صحبت بھی مختلف فیہ ہے۔(الاستیعاب: ۳۵۸/۱)

کا یہ فعل ایک سے زائد صحیح السند روایتوں سے ثابت ہے۔[1] اس کے ساتھ معمولی ضعیف روایات کو ملایا جائے تو وہ اتنی ہیں کہ یہ واقعہ خبرِ مشہور کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔[2]

تاریخی حیثیت سے کسی بھی خبر کے ثبوت کے لیے جو اعلیٰ معیار درکار ہے وہ یہاں موجود ہے۔ اگر اس معیار پر ثابت واقعے کو بھی ہم محض اپنے ذہن میں آنے والی عقلی وجوہ کی بناء پر مسترد کر دیں تو پھر دوسروں کو بھی اختیار ہوگا کہ جو روایت انہیں خلافِ توقع لگے وہ اسے جھوٹ مانیں، چاہے وہ صحیح السند ہو اور ہم اس کے ثابت شدہ ہونے پر مصر ہوں۔

مروان کے لیے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا محرک یہ تھا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو سبائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل مشہور کر دیا تھا، چنانچہ ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے انہوں نے آوازیں لگائیں: ''طلحہ بن عبید اللہ کہاں ہیں؟ ہم نے عثمان کو قتل کر دیا ہے۔''[3] مروان یقیناً اس پروپیگنڈے سے متاثر تھا۔ یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ مروان سبائیوں کے جھانسے میں نہیں آ سکتا تھا۔ جب مروان نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل کے وقت خود یہ کہہ دیا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا بدلہ ہے[4] تو اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ وہ سبائی پروپیگنڈے کا شکار ہو چکا تھا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ قاتلانہ حملے کے لیے میدانِ جنگ غیر موزوں موقع تھا یا یہ خیال کرنا کہ مروان کو ایسا کرنا ہوتا تو وہ جنگ کے بعد اس کا بہتر موقع پا سکتا تھا، محض ایک گمان ہے۔ تاریخی روایت کے مطابق خود مروان کا یہی خیال تھا کہ اسے حالتِ جنگ کی افراتفری سے بہتر موقع پھر نہیں ملے گا۔[5]

اس کی دو وجوہ تھیں: ایک یہ کہ حالتِ جنگ کے قتل پر شرعی عدالت سزا جاری نہیں کرتی۔ حملہ آور کو شک کا فائدہ ملنے کی وجہ سے قضاءً اس مقدمے کو خارج سمجھا جاتا ہے۔ مروان کو فقہی و قانونی نکات کا خوب علم تھا لہٰذا تیر چلانے سے پہلے کہا:

''میں آج کے بعد اپنا انتقام نہیں لے سکوں گا۔''[6]

---

① رمیٰ مروان بن الحکم یوم الجمل طلحة بسهم. (مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۷۷۰ باسناد صحیح، ط الرشد)

وعن قیس بن ابی حازم قال: رأیت مروان بن الحکم حین رمی طلحة یومئذ بسهم. (رواه ابن سعد، والطبرانی و الحاکم. قال الهیثمی: رجاله رجال الصحیح ؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۴۸۲۲، وصحح اسناده ابن حجر ؛ الأصابة: ۴۳۲/۳، ط العلمیة)

② حدثنا محمد بن ظفر الحافظ عن الحسین بن عیاش، عن یحییٰ بن عیاش، عن الحسین بن یحییٰ المروزی عن غالب بن حلبس الکلبی ابو الهیثم عن جویریة بن اسماء عن یحییٰ بن سعید عن عمه ..... رمیٰ مروان بن الحکم طلحة بن عبید الله بسهم فشک شاکه بجنب فرسه فقبض به الفرس حتیٰ لحقه فذبحه فالتفت مروان الیٰ ابان بن عثمان و هو معه فقال لقد کفیتک احد قتلة ابیک. (مستدرک حاکم، ح: ۵۵۹۳)

حدثنا من سمع جویریة بن اسماء عن یحییٰ بن سعید عن عمه ان مروان رمیٰ طلحة بسهم فقتله. (تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۸۱)

عن ابی عبدالرحمن القرشی عن حماد بن زید عن قرة بن خالد عن ابن سیرین ..... رمیٰ طلحة بسهم فاصاب ثغرة نحره قال فاقر مروان انه رماه. (تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۸۵) رجاله کلهم ثقات. ای محمد بن سیرین وقرة بن خالد و حماد بن زید، الا ان ابن سیرین لم یحضر وقعة الجمل لانه وُلد سنة ۳۳ هـ (الاعلام، زرِکلی: ۱۵۴/۲ ؛ طبقات ابن سعد: ۱۹۳/۷ ط صادر)

③ این طلحة بن عبیدالله، قد قتلنا ابن عفان. (تاریخ طبری: ۳۱۹/۴، عن سعید بن عبدالرحمن ابن ابزیٰ عن ابیه)

④ حدثنی جویریة بن اسماء، عن یحییٰ بن سعید عن عمه ..... رمیٰ مروان طلحة بسهم ثم التفت الی ابان بن عثمان وقال قد کفیناک بعض قتلة ابیک. (تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۱۸۵)

⑤ عن الجارود بن ابی سبرة نظر مروان بن الحکم الی طلحة بن عبید الله یوم الجمل فقال لااطلب بثاری بعد الیوم. (تاریخ خلیفه، ص ۱۸۱)

⑥ بحواله بالا



دوسرے یہ کہ جنگ کے وقت ہر ایک کی توجہ صرف اپنے مدِ مقابل کی طرف ہوتی ہے، اگر کوئی دور مار ہتھیار سے کسی کو نشانہ بنادے تو اس کا پتا چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پس مروان اس وقت کو قاتلانہ وار کے لیے غنیمت اور عدالتی باز پرس سے خارج سمجھ رہا تھا۔ اور یہی بنیاد تھی مروان سے قصاص نہ لینے کی کہ قضاءً یہ مقدمہ نا قابلِ سماعت تھا۔ چنانچہ جرم کے باوجود، عدالت میں اس پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔

☆☆☆

کیا مروان کی غلطیاں اجتہادی کہی جاسکتی ہیں؟

﴿سوال﴾ کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مروان کا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کرنا اجتہاد پر مبنی تھا؛ کیوں کہ وہ فقیہ اور عادل راوی تھا؟

﴿جواب﴾ مروان کے بارے میں ایک رائے یہ رہی ہے کہ اس نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو تاویلاً قتل کیا تھا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ اسماعیلی کا قول نقل کیا ہے۔ مگر جمہور سے ایسا ہرگز منقول نہیں؛ کیوں کہ ہر تاویل اجتہادی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تاویل فقط غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جرم سرزد ہوجانے سے مجرم کو شک کا فائدہ تو مل جاتا ہے اور وہ جرم کی عدالتی سزا سے بچ جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی غیر عورت کو اپنی بیوی سمجھ کر مباشرت کرلے تو اس پر حدِ زنا لاگو نہیں ہوگی۔ مگر اس قسم کی غلط فہمی پر مبنی تاویل کو اجتہاد قرار دینا اور اس کے مرتکب کو مجتہد بلکہ ماجور تصور کرنا درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء نے مروان کے ان افعال پر نکیر کی ہے اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں مروان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ جیسے تعظیمی الفاظ کا استعمال نہیں دکھائی دیتا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے ہر شخص کا بھی ہر فعل اجتہادی ہونا ضروری نہیں بلکہ اس سے بھی غلط فہمی اور شک وشبہے کی بنیاد پر کوئی فعل سرزد ہوسکتا ہے۔ ایسی شخصیت اگر محترم اور جلیل القدر ہو تو بجائے اس کے کہ اس کے عمل کو کھینچ تان کر شرعی دلائل کے تحت لایا جائے، یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ کام نیک نیتی کے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا ہوکر کیا گیا۔ پس اگر اس سے نصوص کے خلاف کوئی کام سرزد ہو تو اسے اجتہاد نہیں گناہ اور معصیت ہی کہا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ محض ارتکابِ گناہ سے کسی معروف نیک شخص کو یقینی طور پر فاسق یا غیر عادل نہیں کہا جاسکتا جب تک گناہ پر اصرار یا اہلِ علم کی زبانی اس کی تفسیق ثابت نہ ہو۔ مروان کے ہاتھوں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل کے متعلق ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے سبائی سازش کی پیدا کردہ غلط فہمی کی وجہ سے ایسا کیا ہوگا مگر غلط فہمی یا نیک نیتی سے کیا گیا کوئی غلط کام جائز نہیں ہوجاتا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مروان کی جنگ بھی شرعی دلائل کو دیکھتے ہوئے یقیناً بغاوت تھی۔ اگرچہ ہر جنگ آزما کی طرح مروان کے پاس بھی اپنی مہم جوئی کی وجوہ اور تاویلات ہوں گی مگر اسے اجتہاد کے دائرے میں لانا مشکل ہے۔ اس میں عصبیت اور ملک گیری کا عنصر زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

☆☆☆

اگر مروان بُرا تھا تو اس کی روایتِ حدیث صحیح بخاری اور موطا میں کیوں ہے؟

﴿سوال﴾ اگر مروان کا کردار اچھا نہ تھا تو امام مالک رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ جیسے محتاط محدثین نے اس سے روایات کیوں لیں جو معمولی فاسق سے بھی روایات نہیں لیتے تھے؟

﴿جواب﴾ یہ سوال بہت اہم ہے جس کا جواب سمجھنا اصولِ حدیث کے فہم پر موقوف ہے۔ مگر ہم اسے عام فہم کرنے کے لیے چند تمہیدات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں سمجھ لیا جائے تو ان شاء اللہ یہ مسئلہ خوب واضح ہو جائے گا۔

❶ کسی بھی راوی کی حیثیت کے بارے میں محدثین اور اصحابِ جرح وتعدیل میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس سے روایت لینے یا نہ لینے پر بھی الگ الگ آراء ہو سکتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر صحیح روایت ہر محدث کی نگاہ میں صحیح ہو۔ ایسی متعدد روایات ہیں جو ایک محدث یا فقیہ نے صحیح قرار دے کر نقل کیں یا ان سے استدلال کیا اور دوسرے محدث یا فقیہ نے انہیں یہ حیثیت نہیں دی اور ان سے استدلال نہیں کیا۔

❷ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ جیسے اساطینِ حدیث کو کسی راوی سے روایت کرتا دیکھ کر ویسے تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ راوی معتمد ہے لیکن اگر ایسے کسی راوی کے متعلق ائمہ جرح وتعدیل کی ایک پوری جماعت کی آراء منفی ہوں تو وہاں ان آراء کو یکسر نظر انداز کر دینا انصاف کی بات نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے کہ اس راوی کی وہ روایت تو قابلِ قبول ہے جو امام بخاری یا امام مسلم نے خوب دیکھ بھال کر (بعض شرائط یا بعض مصلحتوں کے تحت) لے لی ہے مگر اس راوی کی روایت کسی اور جگہ ملے گی تو محلِ نظر ضرور ہوگی؛ کیوں کہ راوی پر اچھی خاصی جرح ہو چکی ہے۔[1]

❸ اسی طرح یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ خود صحیح بخاری کی اپنی روایات میں باہم تقابل کیا جائے تو تمام روایات کا درجۂ صحت من وعن یکساں نہیں ہے، بلکہ رواۃ کے فرق کی وجہ سے ان میں بھی فرقِ مراتب ہے، بعض صحت کے اعلیٰ درجے پر ہیں، بعض متوسط اور بعض معمولی درجے پر۔ یہی حال صحیح مسلم اور موطا امام مالک کا ہے۔

❹ کتبِ حدیث میں قرنِ اوّل کے صدوق شیعی راویوں اور صدوق ناصبی راویوں کی روایات بھی لی گئی ہیں، حالانکہ ان میں سے بعض اعتدال سے متجاوز تھے اور ان پر بدعت کا حکم لگتا تھا۔ مگر چونکہ اس دور میں صدق وامانت کا چلن عام تھا، اس لیے انہیں ثقہ مانا جاتا اور ان کی روایات لے لی جاتی تھیں۔[2]

---

① اسی لیے ہمارے مخدوم مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ اپنے درس میں اکثر فرماتے تھے کہ صحیح بخاری کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہر ہر روایت صحت کے اتنے اعلیٰ ترین درجے پر ہے کہ باقی کتب حدیث میں کوئی روایت صحت کے اس مرتبے پر نہیں بلکہ تعارض کے وقت ہر ہر روایت کی پوری سند اور تمام رجال کا موازنہ کر کے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کہاں صحیح بخاری کی روایت راجح ہے اور کہاں کوئی دوسری روایت۔

② چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ❶ عبداللہ بن شقیق العقیلی((م ۱۰۸ھ)) ثقة، فیه نصب. (تقریب التهذیب، تر: ۳۳۷۳)

❷ لمازة بن زبّار ابولبید (م ۱۱۰ھ) صالح الحدیث، قال ابن معین: لریٰ انه کان یشتم علیاً رضی اللہ عنہ. (تاریخ الاسلام: ۷/۲۳۰، ۲۳۱)

❸ حریز بن عثمان (م ۱۶۷ھ): کان متقنا ثبتا لکنه مبتدع. کان ینال من علی رضی اللہ عنہ. (میزان الاعتدال: ۱/۴۷۵)

❹ عبداللہ بن زید ابوقلابة البصری (م ۱۰۴ھ) ثقة، فاضل، کثیر الإرسال. قال العجلی: فیه نصب یسیر. (تقریب التهذیب، تر: ۳۳۳۳)

❺ ازهر بن عبداللہ الحرازی: (م ۱۲۰ھ) تابعی حسن الحدیث لکنه ناصبی ینال من علیّ رضی اللہ عنہ. (میزان الاعتدال: ۱/۱۷۳)

صحیح البخاری میں بھی ایسے راویوں کی روایات ہیں۔ مثلاً اس میں شیعہ راوی عبید اللہ بن موسیٰ الفزاری کی ۴۳ روایات ہیں۔ عبید اللہ بن موسیٰ کی توثیق یقیناً کی گئی ہے مگر ایک پوری جماعت نے ان پر سخت جرح بھی کی ہے۔[1]

❺ اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے آخر ایسے شخص سے روایت کیوں لی؟ اور اگر لی ہے تو پھر اس شخص کے بارے میں تشیع کا الزام بھلا کیوں تسلیم کیا جائے؟

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید امام بخاری رحمہ اللہ کو یہ معلوم نہ ہو کہ باقی ائمہ جرح وتعدیل نے عبید اللہ بن موسیٰ پر تشیع کا الزام عائد کیا ہے۔ آخر امام بخاری رحمہ اللہ انسان تھے، ان سے حالات جاننے میں غلطی ہو سکتی ہے۔

یہ جواب امکان کے دائرے میں تو ہے مگر اس پر یقین کرنا مشکل ہے کہ جو بات تمام ائمہ جرح وتعدیل کو معلوم تھی، وہ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے نقاد سے کیسے چھپی رہ گئی۔

اس کا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کو عبید اللہ بن موسیٰ کے متعلق ائمہ جرح وتعدیل کی آراء اچھی طرح معلوم تھیں مگر وہ الزامات پر مشتمل ان آراء کو غلط سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک باقی ائمہ کو عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی تھی۔

یہ جواب عقلاً وقیاساً ٹھیک ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ کسی راوی کے بارے میں ائمہ فن الگ الگ آراء قائم کر سکتے ہیں۔

مگر اس جواب سے یہ طے کر لینا کہ فی الواقع اکیلے امام بخاری کی رائے سو فی صد درست تھی اور ائمہ جرح وتعدیل کی پوری جماعت ایک غلط بات پر اتفاق کر چکی تھی، تعصب ہو گا سوائے اس کے کہ کھلے دلائل اس کے مؤید ہوں۔

---

① امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان سے روایت لینے کے باوجود انہیں ان کی بدعت کے باعث ناپسند کرتے تھے۔ (وحدث عنه احمد بن حنبل قليلاً، كان يكرهه لبدعةٍ فيه. (سير اعلام النبلاء: ۹/۵۵۴)

وہ یہ بھی فرماتے تھے: ''انہوں نے بُری روایات نقل کیں۔ (حدث باحاديث سوء. (سير اعلام النبلاء: ۹/۵۵۶) امام ابوداؤد رحمہ اللہ ان سے روایت لینے کو جائز قرار دینے کے باوجود فرماتے تھے کہ: وہ جلے بھنے شیعہ ہیں۔ عن ابي داؤد، كان شيعياً محترقاً، جاز حديثه. (سير اعلام النبلاء: ۹/۵۵۵)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے: وہ شیخین (ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ) کو افضل سمجھتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین پر طعن کرتے تھے یعنی تفضیلی شیعہ تھے۔

(ورواية عبدالله مثل هذا دال علىٰ تقديمه للشيخين ولكنه ينال من خصوم علىّ. (سير اعلام النبلاء: ۹/۵۵۶)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''انہوں نے (شیخ القراء امام) حمزہ کوفی رحمہ اللہ کی صحبت اختیار کی اور ان کے اخلاق اپنائے مگر یہ منحوس تشیع انہوں نے امام حمزہ رحمہ اللہ کے شہر والوں سے لیا جو اس بدعت پر قائم تھے۔''

(صحب حمزة، وتخلق بآدابه إلّا في التشيع المشؤوم، فانه اخذه عن اهل بلده المؤسس على البدعة. سير اعلام النبلاء: ۹/۵۵۵)

ابن مندہ رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق عبید اللہ بن موسیٰ کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ وہ معاویہ نامی کسی شخص کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔

" لم يدع احداً اسمه معاوية يدخل داره." (سير اعلام النبلاء: ۹/۵۵۶)

یہ سب بتانے کا مقصد نعوذ باللہ صحیح بخاری کی صحت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہرگز نہیں بلکہ مقصد یہ بتانا ہے کہ صحیح بخاری کی روایات اور اس کے راویوں میں فرق مراتب موجود ہے۔ امام بخاری نے جو روایات امام حمیدی، امام مسدد یا محمد بن مثنیٰ جیسے ائمہ سے سماعت کی ہیں، ان کا درجہ عبید اللہ بن موسیٰ سے سماع کردہ روایات سے یقیناً اعلیٰ ہو گا؛ کیوں کہ عبید اللہ بن موسیٰ کا تشیع ظاہر ہے۔

اہم نوٹ: مروان کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے بطور تقابل شیعی رواۃ میں اشعر نخعی کی مثال بھی ملحوظ رہے جسے مروان کی طرح فتنہ انگیز پس منظر رکھنے کے باوجود اکثر ائمہ جرح وتعدیل نے ثقہ سمجھا ہے۔ (تهذيب الكمال: ۲۷/۱۲۷) جو توجیہ ایک کے لیے ہو گی وہی دوسرے کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔

دراصل اس سوال کا صاف اور اصولی جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ عبید اللہ بن موسیٰ کے حالات کو جانتے تھے، دیگر ائمہ نے ان کے تشیع کے متعلق جو کہا ہے، وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے روایات فقط اس لیے قبول کی ہیں کہ وہ تشیع میں غالی نہ تھے اور نقلِ روایت میں محتاط اور صادق سمجھے جاتے تھے۔

☆☆☆

ان پانچ تمہیدات کے بعد یہ معما اصولی طور پر حل ہو جاتا ہے آخر امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ نے مروان سے روایت کیوں لی جبکہ مروان پر متعدد سنگین الزامات ہیں؟

یہاں بھی یہ کہنا کمزور ہوگا کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی رائے میں مروان اس لیے ثقہ تھا کہ ان حضرات کو مروان کی طرف منسوب الزامات کی روایات پہنچی ہی نہ ہوں۔ یہ کہنا کچھ وزن رکھے گا کہ شاید انہیں ایسی روایات میں کچھ علتیں محسوس ہوئی ہوں، جس کی بناء پر انہوں نے ایسی روایات کو درجۂ صحت پر تسلیم نہ کیا ہو اور ان کے نزدیک مروان پر عائد الزامات مثلاً: حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا قتل اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم ثابت نہ ہو۔[1]

مگر ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ قرینِ قیاس جواب یہی ہوگا کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ مروان کے حالات کو جانتے تھے، اس کے غلط کاموں سے بھی خوب واقف تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مروان سے روایات فقط اس لیے قبول کی ہیں کہ وہ نقلِ روایت میں محتاط اور صادق سمجھا جاتا تھا اور ناصبیت میں غلو نہیں کرتا تھا۔

یہی بات ثقہ سمجھے جانے والے ان دوسرے ناصبی اور شیعہ راویوں پر بھی منطبق ہوتی ہے جن کے بارے میں ائمۂ جرح وتعدیل نے ''یسب علیاً'' یا ''ینال من معاویة'' کا عیب بیان کیا ہے۔ یقیناً اس سے مراد گالم گلوچ نہیں بلکہ تنقید اور موقف پر نکتہ چینی ہے۔ ورنہ گالم گلوچ اور بے ہودہ گوئی تو کسی عام مؤمن کے بارے میں کی جائے تو وہ بھی فسق ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔''[2]

---

① یہ اور شاید یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے مروان کے حضرت طلحہ کو قتل کرنے کی روایت کو ''خبر مشہور'' تو قرار دیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ''اقرب'' اسے کہا ہے کہ حضرت طلحہ کسی نامعلوم شخص کے چلائے ہوئے تیر سے شہید ہوئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۴۷۶)

مگر دوسری طرف حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر جیسے نقاد حضرات قیس بن ابی حازم جیسے تابعی کی صحیح السند روایات کو لے کر مروان کو حضرت طلحہ کا قاتل سمجھنے میں کسی شک کا اظہار نہیں کرتے۔ اور اسی لیے جمہور محدثین مروان سے روایت لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی مروان کے بارے میں ابن حبان کا قول نقل کرتے ہیں: ''معاذ اللہ! ہم مروان بن الحکم سے اپنی کتب میں کوئی حجت پکڑیں۔''

قال ابن حبان: معاذالله! ان نحتج بمروان بن الحکم فی شیء فی کتبنا. (اوجز المسالک: ۱/۲۸۳ ط دار القلم دمشق)

ابن حبان نے مروان کی روایت کو ''ناقابلِ استدلال'' کہہ کر ہمارے زیر بحث قضیے کے بھی بعض جوابات کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ یعنی مروان کی مرویات چاہے نقل کی جاتی رہی ہوں مگر وہ حجت اور قابلِ احتجاج نہیں۔ اسی لیے بعض حضرات نے اس مسئلے کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ: ''مروان کی مرویات حلال و حرام کے مسائل میں نہیں لی گئیں۔'' بعض نے کہا ہے کہ مؤطا مالک اور صحیح بخاری میں مروان سے منقول روایات ''تعاملِ اہلِ مدینہ'' کو بیان کرنے کی حیثیت سے ہیں نہ کہ اصلاً مروان کی روایت سے استدلال کے لیے۔ بعض نے کہا ہے کہ مروان کی مرویات کو مؤیدات کے طور پر ان مسائل میں پیش کیا ہے جن کی اصل دلیل دیگر روایات ہیں۔ مروان کی روایات کی حیثیت فقط توابع کی ہے، توابع میں ضعیف روایت سے بھی مدد لے لی جاتی ہے۔

② قتال المسلم اخاہ کفر وسبابه فسوق. (سنن الترمذی، ح: ۲۶۳۴، ابواب الایمان)



مروان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم یقیناً ثابت ہے مگر اس قسم کے عیب میں ملوث سمجھے جانے والے دیگر ثقہ راویوں کی طرح مروان کے بارے میں یہی قرینِ قیاس ہے کہ اس کا ''سب وشتم'' گالم گلوچ نہیں بلکہ سیاسی تنقید تھا۔

پس اس بحث سے یہ الجھن بھی دور ہو جاتی ہے کہ آخر محدثین قرنِ اوّل وثانی کے بعض اہلِ تشیع اور بعض ناصبیوں کی روایت کیوں قبول کرلیا کرتے تھے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ قرنِ اوّل وثانی میں بدعت اور تعصب میں ایسا غلو نہیں تھا اور صدق عام تھا۔ اس لیے محدثین اس کی گنجائش سمجھتے تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''میں نہیں جانتا کہ اس دور میں کوئی شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کی جماعت کی تکفیر کرتا ہو، اور نہ ہی کوئی ایسا ناصبی تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت کو کافر کہتا ہو بلکہ وہ فقط تنقید کرتے اور ناراضی رکھتے تھے۔ مگر آج ہمارے زمانے کے شیعہ جہالت اور دشمنی کے باعث صحابہ کی تکفیر کرتے ہیں، ان سے اظہار برأت کرتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ انہیں ہلاک کرے۔''[2]

☆☆☆

مروان کی مرویات کے متعلق حافظ ابن حجر کا بصیرت افروز تبصرہ:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس پیچیدہ مسئلے پر بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ، عثمان بن عفان کا چچازاد۔ کہا جاتا ہے کہ اسے رؤیہ نصیب ہوئی۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو جس نے اس (مروان) کے بارے میں کلام کیا ہے اس کی رائے قبول نہیں کی جائے گی۔ عروۃ بن زبیر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ مروان کو حدیث کے معاملے میں مشکوک نہیں سمجھا جاسکتا۔ مروان کے صدق پر اعتماد کرتے ہوئے سہل بن سعد ساعدی نے بھی جو صحابی ہیں، اس سے روایت نقل کی ہے۔ اہلِ علم نے مروان پر اس لیے تنقید کی ہے کہ اس نے جنگِ جمل میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو تیر مار کر قتل کیا تھا۔ پھر اس نے خلافت کی طلب میں تلوار اٹھائی یہاں تک کہ جو ہوا سو ہوا۔ جہاں تک طلحہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا تعلق ہے، مروان نے ایسا تاویل کے ساتھ کیا تھا جیسا کہ اسماعیلی اور دوسرے لوگوں نے کہا ہے۔ رہا اس کے بعد کا معاملہ تو سہل بن سعد، عروۃ، علی بن الحسین اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث جیسے لوگ اس سے روایت نقل کرتے رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مروان سے روایت امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے؛ کیوں کہ مروان اس وقت مدینہ میں ان کا امیر تھا اور یہ اس کے عبداللہ بن زبیر سے اختلاف ظاہر ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ واللہ اعلم۔ امام مالک اور دوسروں نے اس کی حدیث اور رائے پر اعتماد کیا ہے، سوائے امام مسلم کے۔''[1]

---

① فتح الباری: ۱/۴۴۳

② فما علمت فی ذالک الزمان شیعیاً کفر معاویۃ وحزبہ ولا ناصبیا کفر علیا وحزبہ، بل دخلوا فی سب وبغض، ثم صار شیعۃ زماننا یکفرون الصحابۃ ویبرؤون منھم جھلا وعدوانا ویتعدون الی الصدیق، قاتلھم اللہ۔ (سیر اعلام النبلاء ۵/۳۷۴)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے کلام کی تشریح:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی یہ عبارت بڑی لطیف ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ:

ا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہاں اس اشکال کا جواب دے رہے ہیں کہ جب مروان کا ماضی قابلِ اعتراض تھا تو صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں اس سے روایت کیسے لے لی گئی؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک اسے رؤیت نصیب ہوئی تھی، پس ایسے لوگ اسے صحابی تصور کر کے اس کی روایت لیتے ہوں گے اور شرفِ صحابیت کے بعد اس کی عدالت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں رہتی، قطعِ نظر اس کے کہ اس کا حال کیسا تھا۔ مگر حافظ ابن حجر نے اس رائے کو ''اگر ثابت ہو جائے'' کہہ کر بیان کیا ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان نزدیک بھی صحبت ثابت نہیں تھی۔ صرف اس کا احتمال تھا۔

ا دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ مروان کا ماضی جیسا بھی ہو، مگر عروہ بن زبیر رحمہ اللہ جیسے امام المحدثین اسے روایت کے معاملے میں قابلِ اعتماد سمجھتے تھے اسی لیے محدثین نے ان کی توثیق پر اعتبار کر کے مروان سے روایت لے لی۔

ا تیسرے جواب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ مروان ایک دور میں مدینہ کا امیر تھا (اور امراء کو قاضی کی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی) اس دور میں اس نے علمائے مدینہ کی مخالفت کے بغیر جو فیصلے کیے وہ نافذ ہو گئے، ان فیصلوں کو اہلِ مدینہ کے تعامل کی حیثیت حاصل ہو گئی، اس لیے محدثین نے ان کو فتاویٰ کی حیثیت سے نقل کر دیا۔

ا ساتھ ہی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ مروان سے یہ روایات جس زمانے میں لی گئیں تب تک اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف غاصبانہ لڑائی شروع نہیں کی تھی۔ بعد میں اس نے جو غلط کام کیے ان کی وجہ سے اس سے لی گئی سابقہ روایات پر اثر نہیں پڑے گا۔

یہ ایسا ہی ہے کہ کسی ثقہ محدث کا آخری عمر میں حافظہ خراب ہو جائے تو اس کے بعد اس کی روایات مشکوک ہو جاتی ہیں مگر اس سے پہلے اس سے جو روایات منقول ہوئیں ان کو بہر حال معتبر مانا جاتا ہے۔

ا یہ بھی بتا دیا کہ مروان کو غلط کاموں میں بعض علماء نے تاویل کا فائدہ دیا ہے، اس لیے اس سے روایت لے لی۔

ا آخر میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ مروان کی توثیق متفق علیہ نہیں بلکہ امام مسلم جیسے حضرات اسے ثقہ نہیں مانتے اور اس سے روایت نہیں لیتے۔ امام مسلم کی احتیاط کی وجہ مروان کے ''افاعیل'' ہی ہو سکتے ہیں۔ [1]

مروان کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی رائے:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی عبارت کے بعد آخر میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ایک عبارت پر نگاہ ڈالیے۔ انہوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کے مروان سے روایت لینے کی جو توجیہ کی ہے، وہ سب سے زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے اور اس

---

[1] یہی وجہ ابن حبان کی اس رائے کی ہے کہ مروان کی روایت قابلِ استدلال نہیں۔ (اوجز المسالک، شیخ المحدث محمد زکریا المهاجر المدنی: ۱/۳۸۳، ط دار القلم دمشق)

کے بعد کسی قسم کا کوئی اشکال سرے سے باقی نہیں رہتا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہاں! بخاری میں مروان سے البتہ روایت آئی ہے، باوجودیکہ وہ نواصب میں سے تھا بلکہ اس بدبخت گروہ کا سرغنہ اور سربراہ تھا لیکن اس روایت میں بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی روایت کا مدار امام زین العابدین رحمہ اللہ پر رکھا ہے اور انہی پر روایت کو ختم کیا ہے۔ اگر امام ہی مروان سے خود روایت کریں تو پھر امام بخاری کو اس سے بچنے اور احتراز کرنے کا کب حق ہے؟ اس کے باوجود امام بخاری نے تنہا مروان سے کسی بھی جگہ روایت نہیں کی بلکہ مسوّر بن مخرمہ یا دوسروں کو اس کے ساتھ لائے ہیں اور یہ بات پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی منافق یا بدعتی نقلِ حدیث میں اہلِ حق کے ساتھ موافق ہو تو اس کی روایت لینے میں کوئی قباحت نہیں اور پھر بخاری میں اس کی صرف دو روایتیں ہیں: ایک حدیبیہ کے قصے میں، دوسری سعی طائف و بنی ثقیف، اور یہ دونوں جگہیں بھی عقیدہ و عمل سے متعلق نہیں۔ ایسے ہی صحاح کی دوسری کتب میں بھی مروان سے اسی قسم کی اور اتنی ہی روایت ہے۔''[1]

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے اس وقیع کلام پر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ قارئین اس قدر وضاحت کے بعد اچھی طرح سوچ سمجھ سکتے ہیں کہ مروان کے بارے میں کیا رائے رکھی جائے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے کن حدود میں رہتے ہوئے اس سے روایت لی۔

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ، اردو، ص ۱۳۹، ۱۴۰، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی

صحابہ کرام کے متعلق آخری چند حروف

قارئین کرام! تاریخِ اُمتِ مُسلِمہ کے حصہ دوم کے پہلے صفحے سے اب تک راقم کی پوری کوشش رہی ہے کہ تاریخ کا یہ باب اس انداز میں آپ کے سامنے لایا جائے کہ صحابہ کرام کے متعلق اُمت کے اجماعی موقف کا بخوبی دفاع ہوجائے۔ مشاجرات چونکہ تاریخ کا ایک حصہ ہیں، اس لیے ناگزیر طور پر انہیں ذکر کیا گیا اور پھر اس ضمن میں پیش آنے والی عام غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے بعض جگہ تاریخی واقعات کے اہم اعتقادی وفقہی پہلوؤں کو بھی واضح کرنا پڑا۔ پھر خاص شبہات کے ازالے کے لیے یہ آخری باب الگ سے پیش کیا گیا۔ مقصد ایک ہی تھا کہ تاریخ کے ضمن میں صحابہ کرام کے متعلق جو اعتراضات اور اشکالات ہیں وہ دور ہو جائیں۔

پھر بھی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کوشش کامیاب رہی۔ عین ممکن ہے کہ بعض صاحبان کے تمام اشکالات اور شبہات دور ہوگئے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں کچھ اشکالات اس طرح بیٹھے ہوئے ہوں کہ وہ کسی بھی طرح دور نہ ہوتے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کسی بات سے کوئی صاحب کسی نئے شبہے میں مبتلا ہوگئے ہوں۔ مگر پھر بھی وہ چاہتے ہوں کہ کوئی اصولی بات ایسی ہو جو ان کے دل کو مطمئن کردے۔

ایسے دوستوں کی خدمت میں راقم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی کتاب مقام صحابہ سے کچھ منتخب سطور پیش کررہا ہے۔ اُمید ہے کہ ہر قسم کی الجھنوں کے لیے یہ الفاظ نسخہ شفا ثابت ہوں گے۔

حضرت علام تحریر فرماتے ہیں:

"تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عدل وثقہ ہونے پر بھی اجماع واتفاق ہے اور اس پر بھی کہ درمیان میں پیش آنے والے مشاجرات میں خوض نہ کیا جائے یا سکوت اختیار کریں یا پھر ان کی شان میں کوئی ایسی بات کہنے سے پرہیز کریں جس سے ان میں سے کسی کی تنقیص ہوتی ہو۔ اسی کے ساتھ ان سب حضرات کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ صحابہ کرام، انبیائے کرام کی طرح معصوم نہیں۔ ان سے خطائیں اور گناہ سرزد ہوسکتے ہیں اور ہوئے ہیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود اور سزائیں جاری فرمائی ہیں۔ احادیث نبویہ میں یہ سب واقعات ناقابلِ انکار ہیں۔[1]

---

[1] اسی طرح بہت سے واقعات تاریخ میں بھی ہیں۔ کتبِ حدیث میں مذکور ایسے بہت سے واقعات سنداً مضبوط ہونے کی وجہ سے ناقابلِ انکار ہیں۔ جبکہ تاریخ میں مذکور ایسے بہت سے واقعات اسناداً ضعیف ہیں۔ ضعیف روایات کو مسترد کیا جاسکتا ہے، جبکہ صحیح روایات کو تاویل کے ساتھ قبول کیا جائے اور ان میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے پیش کردہ یہ ۹ نکات ہمیشہ ملحوظ رکھے جائیں۔ امید ہے جو شخص روایات وآثار کے پرخطر جنگل طے کرنے سے قبل ان نکات کو حرزِ جاں بنالے گا وہ ان شاء اللہ کبھی صحابہ کرام کی طرف سے بداعتماد نہیں ہوگا۔ نہ ہی وہ محدثین، سیرت نگاروں یا مؤرخین کے ایمان کو مشکوک سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوگا۔

مگر اس کے باوجود عام افرادِ امت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو یہ چند وجوہ خاص امتیاز حاصل ہے:

❶ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان کو ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی، خلافِ شرع کوئی کام یا گناہ ان سے صادر ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا۔ ان کے اعمالِ صالحہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دینِ اسلام پر اپنی جانیں اور مال و اولاد سب کو قربان کرنا اور ہر کام پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مرضیات کے اتباع کو وظیفۂ زندگی بنانا اور اس کے لیے ایسے مجاہدات کرنا جس کی نظیر پچھلی اُمتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمالِ صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا، اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے۔

❷ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور ادنیٰ گناہ کے صدور کے وقت ان کا خوف و خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا جاری کرنے کے لیے پیش کر دینا اور اس پر اصرار کرنا روایاتِ حدیث میں معروف و مشہور ہیں۔ بحکمِ حدیث توبہ کر لینے سے گناہ مٹا دیا جاتا ہے اور ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔

❸ قرآنی ارشاد کے مطابق انسان کی حسنات بھی اس کی سیئات کا خود بخود کفارہ ہو جاتی ہیں۔

❹ اقامتِ دین اور نصرتِ اسلام کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عسرت و تنگ دستی اور مشقت و محنت کے ساتھ ایسے معرکے سر کرنا کہ اقوامِ عالم میں ان کی نظیر نہیں۔

❺ ان حضرات کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان واسطہ اور رابطہ ہونا کہ باقی امت کو قرآن و حدیث اور دین کی تمام تعلیمات انہی حضرات کے ذریعے پہنچی، ان میں خامی و کوتاہی رہتی تو قیامت تک دین کی حفاظت اور دنیا کے گوشے گوشے میں اشاعت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کے اخلاق و عادات، ان کے حرکات و سکنات کو دین کے تابع بنا دیا تھا۔

اوّل تو ان سے گناہ کا صدور ہی نہ ہوتا تھا۔ اور اگر عمر بھر میں کبھی شاذ و نادر کسی گناہ کا صدور ہو گیا تو فوراً اس کا کفارہ توبہ و استغفار اور دین کے معاملے میں پہلے سے زیادہ محنت و مشقت اٹھا کر کر دینا ان میں معروف و مشہور تھا۔

❻ حق تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا اور دین کا واسطہ اور رابطہ بنایا تو ان کو یہ خصوصی اعزاز بھی عطا فرمایا کہ اسی دنیا میں ان سب حضرات کی خطاؤں سے درگزر اور معافی اور اپنی رضاء و رضوان کا اعلان کر دیا اور ان کے لیے جنت کا وعدہ قرآن میں نازل فرما دیا۔

❼ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ہدایت فرمائی کہ ان سب حضرات سے محبت وعظمت علامتِ ایمان ہے اور ان کی تنقیص و توہین خطرۂ ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا سبب ہے۔

❶ ان کے درمیان جو باہمی اختلافات اور مقاتلہ کی نوبت آئی، ان مشاجرات میں اگرچہ ایک فریق خطاء پر تھا اور دوسرا حق پر۔ اور علمائے امت کے اجماع نے ان مشاجرات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حق پر ہونا اور ان کے بالمقابل جنگ کرنے والوں کا خطاء پر ہونا پوری صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان کر دیا، لیکن ساتھ ہی قرآن وسنت کی نصوصِ مذکورہ کی بناء پر اس پر بھی سب کا اجماع ہوا کہ جو فریق خطاء پر بھی تھا اس کی خطاء بھی اولاً اجتہادی تھی جو گناہ نہیں، بلکہ اس پر ایک اجر ملنے کا وعدہ حدیثِ صحیح میں مذکور ہے۔ اور اگر قتل و قتال اور جنگ کے ہنگاموں میں کسی سے واقعی کوئی لغزش اور گناہ ہوا بھی ہے تو وہ اس پر نادم اور تائب ہوئے جیسا کہ اکثر حضرات سے ایسے کلمات منقول ہیں۔ خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے ان کی مدح وثناء اور ان سے اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کا بھی اعلان فرمادیا ہے جو عفو ودرگزر سے بھی اونچا مقام ہے۔

❷ اگر کسی خاص معاملے میں یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ خطائے اجتہادی ہی نہیں، واقعی گناہ کی بات ہے، تو ظاہر ان حضرات کے خوفِ خدا وفکرِ آخرت سے یہ ہے کہ انہوں نے اس سے توبہ کرلی، خواہ اس کا اعلان نہ ہوا ہو اور لوگوں کے علم میں نہ ہو۔ اور اگر بالفرض یہ بھی نہ ہو تو ان کے حسنات اور دین کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ ان کی وجہ سے معافی ہوجانا قریب بہ یقین ہے۔[1]

☆☆☆

[1] مقام صحابہ، ص ۹۴، ۹۵، ۹۶

گزشتہ شخصیات کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیم

قارئین کرام! یادرکھیں کہ اس زندگی میں گزشتہ لوگوں کے متعلق ہر سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔
حق تعالیٰ نے انبیائے بنی اسرائیل کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

(وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ان کے لئے وہ کچھ ہے جو انہوں نے کمایا۔اور تمہارے لئے وہ کچھ ہے جو تم نے کمایا۔اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا اُس کے بارے میں جو وہ کرتے رہے۔)[1]

پس جہاں نیک شخصیات کے متعلق کسی سوال کا جواب، سوچ بچار، تحقیق وتفتیش اور اہلِ علم سے استفسار کے باوجود نہ ملے تو قرآن مجید کا یہ ارشاد سامنے رکھ کر بحث کا دروازہ بند کردیں اور ان حضرات کے بارے میں اس آیتِ کریمہ میں تعلیم کردہ دعا کو کثرت سے پڑھیں جس کا پڑھنا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اہلِ ایمان ہونے کی علامت ہے:

وَالَّذِیْنَ جَآءُ وْ مِنْ بَعْدِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

(اور وہ لوگ جو کہ ان کے بعد آئے، جنہوں نے کہا کہ اے رب! ہمارے بخش دے ہمیں، اور ان کو بھی کہ جنہوں نے سبقت کی ہم سے ایمان میں، اور ہمارے دلوں میں اے اللہ! کوئی کجی نہ رکھیو ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لائے، بے شک اے ہمارے رب تو بہت مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔)[2]

---

① سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۳۴
② سورۃ الحشر، آیت: ۱۰

چند عام سوالات کے جوابات

اُمت کی تاریخ میں زوال زیادہ کیوں ہے؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اکثر ساتھی پوچھا کرتے ہیں:

''اسلام کی تاریخ میں جگہ جگہ زوال کیوں دکھائی دیتا ہے۔ مسلمانوں کا سنہرا زمانہ بہت کم اور تاریک ایام اتنے زیادہ کیوں ہیں؟''

اس کے جواب میں عرض ہے کہ قوموں کی تعمیر، ترقی اور شکست وریخت کی مثال ایک عمارت کی طرح ہے۔ نئی سے نئی اور مضبوط سے مضبوط عمارت بھی آخر کمزور پڑ جاتی ہے، رنگ وروغن اڑ جاتا ہے۔ اس کی نئی حالت اور چمک دمک کا دور ہمیشہ مختصر ہوتا ہے لیکن اگر بنیاد اور اسٹرکچر مضبوط ہو تو عمارت بے رنگ وروپ ہو کر اور بظاہر بوسیدہ وشکستہ دکھائی دے کر بھی صدیوں قائم رہتی ہے۔ صدیوں بعد تک جب ہم کسی قلعے کو قائم اور سربلند دیکھتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں:

''اس کی بنیادیں کتنی گہری ہیں۔''

اس کے برعکس کمزور عمارت کا دورِ عروج ہی اس کا کل دورانیہ ہوتا ہے۔ آج نئی بنوائی۔ پانچ دس سال ٹھاٹھ سے گزارے پھر ایک ہی سیلاب یا معمولی سے زلزلے کا شکار ہو کر نیست ونابود ہو گئی۔

اسلام کا دورِ زوال ہمیں اس لیے بکثرت دکھائی دیتا ہے کہ اسلام کی عمارت مضبوط اور اسٹرکچر پائیدار ہے۔ اکثر ادوار میں یہ عمارت بے نقش ونگار، اور ٹوٹی پھوٹی دکھائی دیتی ہے مگر ہزاروں زلزلے سہہ کر بھی باقی ہے۔ نہ اس کی چھت گری ہے نہ دیواریں نہ ستون۔ جب کسی نے دل وجان سے کام کیا تو ایک بار پھر اس کا رنگ وروپ نکھر آیا بلکہ نئے مینار اور نئے گنبد قائم ہو گئے۔ مگر جب اس کا کوئی خبر گیر نہ تھا تب بھی یہ خستہ وبوسیدہ حالت میں اپنے پناہ گزینوں کے سروں پر نہیں گری بلکہ انہیں زمانے کی ہزاروں آفات سے بچایا۔ سخت حالات کی حوصلہ شکن برسات میں انہیں اپنی آغوش میں رکھا۔ پس یہ حالات اس عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کی دلیل ہیں نہ کہ کمزوری کی۔

ہاں! اس سے ہم مسلمانوں کی کوتاہی اور کمزوری ضرور پتا چلتی ہے مگر ظاہر ہے کسی کے عمل کی خرابی کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

☆☆☆



عروج وزوال کے سات فطری مراحل

جب آپ کوئی نیا کام شروع کرتے ہیں، کوئی نئی طرز کا ادارہ بناتے ہیں یا کوئی نیا کاروبار چلاتے ہیں تو اس میں سات مراحل ضرور آتے ہیں:

① بنیاد رکھنا ② مقامی مخالفت کا سامنا کرنا ③ استحکام

④ بیرونی مخالفت کا سامنا ⑤ ترقی اور عروج کا دور ⑥ خفیہ سازشوں کا دور

⑦ اندرونی انتشار اور خاتمہ...... یا دوبارہ استحکام وعروج

اس بات کو ذرا تفصیل سے سمجھیے۔

① بنیاد رکھنے کا دور:

پہلا مرحلہ اس ادارے یا کاروبار کی بنیاد رکھنے کا ہوتا ہے۔ آپ ایک ہدف طے کرتے ہیں، مثلاً آپ نے خوب روپیہ کمانا ہے، یا آپ خدمتِ خلق کر کے نیک نامی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اسمبلی کے ممبر بننا چاہتے ہیں۔ اس ہدف کے مطابق آپ اپنے کام کی حد بندی کرتے ہیں۔ اس کے لیے ابتدائی وسائل جمع کرتے ہیں جو شروع میں بہت محدود ہوتے ہیں۔ کام کے ساتھیوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔

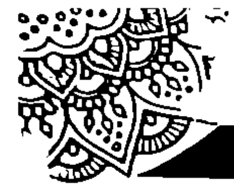
کام کی بنیاد رکھنے کا یہ مرحلہ بہت صبر آزما اور پرمشقت مرحلہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے اکثر منصوبے اسی پہلے مرحلے میں زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ اس وقت کام کی کامیابی دو چیزوں پر منحصر ہوتی ہے:

الف: اہداف کا واضح اور اعلیٰ ہونا ب: کام کرنے والوں کا باہمت، مستقل مزاج اور کام سے مخلص ہونا

اہداف جتنے واضح اور اعلیٰ ہوں گے کام اتنا پائیدار ہوگا اور ساتھی جس قدر عمدہ صفات والے ہوں گے کام اسی قدر ترقی کرے گا۔

② مقامی مخالفت کا سامنا

جب کام کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو ساتھ ہی اسے کھلم کھلا مقامی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں گھر اور برادری والے برافروختہ ہوتے ہیں کہیں مقامی سردار اور چودھری۔ کہیں مارکیٹ کے دوسرے تاجر اور صنعت کار راہ میں روڑے ڈالتے ہیں، کہیں حکومت اور پولیس۔ بعض جگہ مٹھی گرم کر دینے سے رکاوٹ دور ہو جاتی ہے اور کسی جگہ مار پیٹ اور تھانہ، کورٹ اور کچہری کی نوبت بھی آجاتی۔ بعض کام اس دوسرے مرحلے پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ ہاں اہل ہمت



کا قافلہ یہاں سے بھی گزر جاتا ہے۔

③ دورِ مقامی استحکام

مخالفت برداشت کر لینے کے بعد کام مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہ ''دورِ مقامی استحکام'' کہلاتا ہے۔ مقامی مخالف قوتیں بھی مان جاتی ہیں کہ اس کام کو آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ استحکام کے دور میں دستیاب وسائل کو اچھی طرح استعمال میں لایا جائے تو مقامی مخالف جو پہلے ہی نفسیاتی طور پر مرعوب ہوتے ہیں، میدان سے ہٹنے لگتے ہیں۔

④ بیرونی مخالفت

اس کے بعد کام پھیلتا ہے تو نئے میدانوں میں نئے حریف ملتے ہیں۔ کہیں سرکاری مشینری مزاحمت کرتی ہے تو کہیں بیرونی ممالک۔ کبھی جنگ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

یہ مرحلہ بھی ہمت اور حوصلے کا بھرپور امتحان لیتا ہے۔ اگر ہمت وحوصلہ شکستہ ہو جائے تو کام وہیں ختم ہو جاتا ہے یا محدود رہ جاتا ہے۔ اگر کام کو جاری رکھنے کا ہمت وحوصلہ پھر بھی باقی ہو، تو آخر کار امتحان کا یہ کٹھن دور بھی گزر جاتا ہے۔

⑤ بیرونی استحکام اور دورِ عروج:

اب کام دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہے، اسے بیرونی میدانوں میں بھی استحکام نصیب ہوتا ہے اور یوں اس کا دورِ عروج شروع ہو جاتا ہے۔ عروج کے دور میں وسعت بھی نصیب ہوتی۔ نئی شاخیں کھلتی ہیں، نئے عہدے دار بھرتی ہوتے ہیں۔ نئے علاقے اپنے دائرۂ کار میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔

⑥ خفیہ سازشیں:

کام کا عروج اور ترقی دیکھ کر بیرونی دشمن جلنے کڑھنے لگتے ہیں۔ ایسے میں اندرونی طور پر بھی کچھ لوگ رشک اور کچھ لوگ حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ایسی فیکٹری ہماری کیوں نہیں، ایسی شہرت ہمیں کیوں نہ ملی۔ ایسے عہدے پر ہم کیوں نہیں۔ یہ لوگ بظاہر ساتھ ہو کر بھی اندرونی طور پر مخلص نہیں رہتے بلکہ جلن کے مارے چپکے چپکے کچھ نہ کچھ نقصان پہنچانے میں لگے رہتے ہیں۔ ادھر بیرونی دشمن باہر سے پیچ وتاب کھا رہا ہوتا ہے۔

اگر کام مضبوط ہو تو عموماً اس قسم کی چیرہ دستیوں سے کچھ نہیں بگڑتا لیکن کبھی کبھی ایک دیاسلائی پوری فیکٹری کو نذرِ آتش کر دیتی ہے۔ کبھی معمولی بات بھی بہت بڑے فتنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے غفلت ہرگز مناسب نہیں ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دونوں بدخواہ قوتوں میں رابطہ ہو جاتا ہے۔ تب دونوں مل کر بڑا نقصان پہنچانے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ یہ بہت خطرے کی بات ہوتی ہے۔

⑦ انجام یا تسلسل

سازشوں کے بعد انجام چار طرح کا ہو سکتا ہے:

(الف) سازشوں پر جلد قابو پالیا جائے تو دورِ زوال کی نوبت جلد نہیں آتی۔

(ب)ان پر قابو نہ پایا جاسکے تو دورِ زوال اور اندرونی انتشار شروع ہوجاتا ہے۔
(ج)اسبابِ زوال بڑھتے رہیں تو ایک نہ ایک دن یہ اندرونی امراض مکمل خاتمے کا سبب بن جاتے ہیں۔
(د)دورِ زوال میں ان کمزوریوں کو دور کردیا جائے تو پہلے استحکام اور پھر عروج کا دور شروع ہوجاتا ہے۔
پھر یہ سلسلہ اسی طرح گردش کرتا رہتا ہے۔

وسعت اور مرکز کی قوت میں تناسب:

وسعت کا مرکز کی طاقت کے ساتھ ایک خاص تناسب ہوتا ہے۔ جب تک مرکز کی طاقت اور کام کی وسعت میں تناسب برقرار رہے، وسعت ترقی اور خوشحالی کا باعث بنتی ہے مگر یہ تناسب نہ رہے تو وسعت سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسائل اس کام سے تعلق رکھنے والے حساس اور ہوشیار لوگوں کو علیحدگی پر ابھارتے ہیں۔ یہ صورت حال اداروں اور مملکتوں کی تقسیم در تقسیم کا باعث بن جاتی ہے۔

اہلِ خرد ایسے وقت میں رضا کارانہ طور پر یا مناسب لین دین کے ساتھ تقسیم کو قبول کر لیتے ہیں۔ شاخوں کو خود مختار اداروں میں تبدیل ہونے دیتے ہیں۔ صوبوں کے اختیارات بڑھا کر انہیں اپنی جگہ پھلنے پھولنے کا موقع دے دیتے ہیں۔ مگر بعض اوقات اربابِ اختیار انتظامی سکت نہ رکھتے ہوئے بھی کسی تقسیم کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر انتظامی کمزوریاں دور نہ ہوں اور تقسیم کا موقع بھی نہ دیا جائے تو ایسے میں توڑ پھوڑ کا عمل شروع ہوتا ہے اور کسی انقلاب کے ذریعے تقسیم عمل میں آتی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک پانچ کلو کی گنجائش والے شاپر میں دس کلو وزن ڈال دیا جائے، لازمی طور پر اگر شاپر کو اضافی سہارا مہیا نہ کیا گیا تو وہ پھٹ کر رہے گا۔

یا یوں سمجھیں کہ اگر ایک کھیت کے مالک کے پاس ذرائع آمدن کثیر ہیں تو وہ آس پاس کی زمینیں خرید خرید کر اپنا زرعی رقبہ بڑھاتا رہتا ہے لیکن اگر وہ تنگ دست ہوجائے تو اسے وہی زمینیں بیچنا پڑتی ہیں۔ اگر وہ زیادہ کمزور پڑ جائے تو دوسرے اس کی زمینوں پر قبضہ بھی کر سکتے ہیں۔ پس وسعت اور طاقت میں تناسب نہ ہو، تو وسعت ایک حد پر جا کر انتشار پر منتج ہوتی ہے۔ اداروں، خاندانوں، ملکوں اور قوموں کے عروج و زوال میں یہ ترتیب ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔

☆☆☆

فطری وآفاقی اصولِ عروج وزوال کی روشنی میں امتِ محمدیہ کا مقام

اگر ہم مذکورہ فطری وآفاقی اصولوں کو سامنے رکھ کر امتِ محمدیہ کی تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ:

ا حضور اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی مکی دور میں دعوتِ اسلام کا زمانہ امت کی بنیاد کا دور تھا۔

اس زمانے میں پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے ایسے پختہ عقیدے، ایسے سچے نظریے، ایسی اعلیٰ صفات اور ایسے عمدہ اہداف پر امت کی بنیاد رکھی کہ ڈیڑھ ہزار سال گزرنے پر بھی اس بنیاد میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔

ا مکی اور مدنی دور میں قریش کی مخالفتوں کا سلسلہ مقامی رکاوٹوں کا زمانہ تھا۔ اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس صبر واستقامت اور جس حیرت انگیز ایمانی جذبے کے ساتھ مخالفت کے ان طوفانوں کا سامنا کیا، وہ تا قیامت اس امت کے لیے باعثِ رہنمائی ہے۔

ا صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک استحکام کا دور تھا۔ اس زمانے میں پورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیرنگیں آگیا۔ اسلام کو سیاسی طور پر ایسا استحکام نصیب ہوا کہ قیصر وکسریٰ بھی اسے مٹانے سے عاجز آگئے۔

ا حضور اکرم ﷺ کے آخری دو سالوں سے خلافتِ راشدہ کے ابتدائی چند سالوں تک بیرونی طاقتوں سے کش مکش کا زمانہ تھا جس میں غزوۂ تبوک، جیش اسامہ، جنگ یرموک اور جنگ قادسیہ جیسی مہمات پیش آئیں۔

ا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں شام اور فارس کی فتح کے بعد سے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری سالوں تک عروج کا زمانہ تھا۔ اسلام کا پیغام افریقہ کے تپتے صحراؤں سے کوہ ہندوکش کی برف پوش چوٹیوں تک پہنچ گیا تھا۔

ا اس عروج کے بعد اندرونی وبیرونی عناصر میں حسد کا پیدا ہونا، خفیہ سازشوں کا جال پھیلنا اور فتنوں کا سر اٹھانا فطرت کے قانون کے تحت لازمی تھا۔ چھ سات سالوں میں امت اس مرحلے سے بھی بخوبی گزر گئی۔ ایک محدود طبقے کے سوا کوئی بھی عقیدے کی خرابی میں مبتلا نہ ہوا۔ اسلامی سرحدوں کا ایک انچ بھی دشمن کے قبضے میں نہ گیا۔

ا اندرونی سازشوں کا کامیاب مقابلہ کر کے ۴۱ھ میں امت پھر متحد ہوگئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا۔

اس طرح قوموں کے عروج وزوال اور استحکام کے اکثر اسباق امت نے صحابہ کی موجودگی ہی میں پڑھ لیے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ امت کی بنیاد کبھی متزلزل نہ کی جاسکی۔ ہاں اس کے استحکام کو ضرور نقصان پہنچتا رہا، عروج وزوال کے دورانیے قانونِ فطرت کے تحت آتے رہے، اندرونی کمزوریاں اور کردار وعمل میں انحطاط بھی باعثِ نقصان بنتا



رہا، خفیہ سازشوں کے طوفاں بھی کئی بار اٹھائے گئے۔ اپنے اخلاقی امراض کے ازالے اور سازشوں کی روک تھام میں کوتاہی ہوئی تو دورِ زوال بھی ہم پر چھایا مگر مجموعی طور پر امت نے اپنا وجود برقرار رکھا، اس کا معیارِ دین جو قرآن و سنت سے محفوظ رہا، دین کی اصل شکل برقرار رہی، امت کا سوادِ اعظم ایمان و عقیدے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے پر گامزن رہا۔

ا بنوامیہ کی خلافت کے ابتدائی ساٹھ ستر سالوں میں مرکز مضبوط تھا اس لیے وسعت کے باوجود کسی قسم کی کوئی انتظامی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ آخری پندرہ بیس سالوں میں مرکز کمزوری کا شکار ہوا تو علیحدگی اور تقسیم کی طرف رجحان پیدا ہونے لگا۔ بنوامیہ نے اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، اپنی گرفت ہر جگہ برقرار اور ایک خلافت کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ آخر عباسی انقلاب کے ذریعے ان کی حکومت ختم ہوگئی۔

ا بنوعباس کے دور میں جب تک مرکز مضبوط رہا، کسی تقسیم کی ضرورت نہیں پڑی، مگر بعد میں مرکز کی کمزوری کی وجہ سے صوبوں میں خودمختاری کا عمل شروع ہوا اور دو صدیوں کے اندر اندر کئی خودمختار مملکتیں وجود میں آگئیں۔

ا ممالک کی تقسیم، مسلمانوں کے سیاسی مرکز کی کمزوری کا لازمی نتیجہ تھی مگر جہاں تک دینی، ایمانی اور علمی شعبوں کا تعلق ہے، ان کی بنیاد بہت اعلیٰ تھی اس لیے ان کا استحکام ہر دور میں بے مثال ثابت ہوا۔ امت مجموعی صفات کے لحاظ سے ہمیشہ زندہ رہی۔ دورِ زوال میں بھی اس نے اپنا وجود نہ کھویا اور دوبارہ عروج و ترقی کی استعداد برقرار رکھی۔ یہ وہ خاصیت ہے جو صرف امتِ محمدیہ کو نبی خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و ہمہ گیر تعلیمات اور ان کے صحابہ کی ان تھک قربانیوں کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔



منصوبوں، تحریکوں، ریاستوں اور اداروں کی جینیٹک خصوصیات

دنیا میں جب بھی کسی کاروبار، کسی ادارے، کسی سلطنت یا کسی نظریے کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کوشش کی ایک خاص قوت اور طاقت ہوتی ہے۔ اس میں کچھ خاص صفات ہوتی ہیں جنہیں آپ جینیٹک خصوصیات سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ صفات ابتداء ہی میں طے کر دیتی ہیں کہ اس کام کی عمر، اس کی قوت، اس کا پھیلاؤ اور اس کا نفع یا نقصان کس حد تک ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص گلاب کا پودا لگاتا ہے تو وہ اس کے سائے تلے آرام کا فائدہ کبھی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ایک شخص کا ہدف بس اپنا پیٹ بھرنا ہے اور وہ اس کے لیے سڑک پر ٹافیوں کی ریڑھی لگاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ وہ دریائے سندھ پر ڈیم بنا دے۔ بس ڈرائیونگ کا ثمرہ کا نتیجہ دنیا پر ایٹمی جنگ مسلط کرنے کی شکل میں نہیں نکل سکتا۔ غرض کوشش کی ابتداء میں موجود صفات ہی اس کے نفع وضرر کی شرح طے کر دیتی ہیں۔

ان صفات کی ہم معیار کے لحاظ سے درجہ بندی کریں تو ایسی کوششوں کی سات درجہ بندیاں ہوسکتی ہیں:

① ای گریڈ: (ناکام کوشش)

جس کی بنیاد ہی نہ رکھی جا سکے۔ کام شروع ہی نہ ہو۔ بندہ سوچتا ہی رہ جائے۔

② ڈی گریڈ: (کمزور کوشش)

بنیاد تو ہو مگر کمزور۔ جھٹکا لگتے ہی زمین بوس ہو جائے۔ بکثرت ایسا ہوتا ہے۔

③ سی گریڈ: (عام سی کوشش)

جو شروع ہو کر مخالفانہ جھٹکے بھی برداشت کر لے اور کچھ عرصے قائم رہ کر اپنی الگ پہچان بھی بنا لے مگر عروج کی چوٹی تک نہ پہنچ سکے۔ اکثر کوششیں جو مکان، دکان، کارخانے، کاروبار، ادارے، صنعت وحرفت، علم وفن، یا حکومت و سلطنت کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں، اسی معیار کی ہیں۔

④ بی گریڈ: (بہتر کوشش)

جو قائم رہنے کے ساتھ اپنی الگ پہچان بھی بنا لے اور کچھ عرصے کے لیے اسے عروج بھی ملے مگر مخالفتوں اور سازشوں کا شکار ہونے کے بعد اس کا پہلا زوال ہی اس کے مکمل خاتمے کا ذریعہ بن جائے۔



❺ **اے گریڈ:** (کامیاب کوشش)

جو عروج کے بعد زوال پر قابو پالے اور ایک طویل دورانیہ گزار کر جائے۔

❻ **اے ون گریڈ:** (بہت کامیاب کوشش)

جو عروج وزوال سے بار بار ہم کنار ہو کر بھی ظاہری طور پر برقرار رہے۔ چاہے اندرونی طور پر معیار اور اہداف کے لحاظ سے بدل جائے۔

❼ **ایکسیلینٹ:** (حیرت انگیز اور کامیاب ترین کوشش)

جو عروج وزوال سے بار بار گزر کر نہ صرف ظاہری طور پر برقرار رہے بلکہ اندرونی طور پر بھی اس کے معیارات اور اہداف اپنی اصل پر برقرار رہیں۔

اگر قوموں کی تاریخ میں دیکھیں تو ہمیں صرف امتِ محمدیہ ہی ایسی دکھائی دے گی جسے "اے ون گریڈ" سے بھی آگے "ایکسیلنٹ" شمار کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ یہی وہ امت ہے جو عروج وزوال کی گردش سے بار بار گزر کر بھی نہ صرف صورتاً قائم ہے بلکہ آج بھی اس کا عقیدہ، شریعت اور شرعی مآخذ روزِ اوّل کی طرح محفوظ ہیں۔

☆☆☆

اللہ کے تکوینی نظام کو سمجھنا ضروری ہے

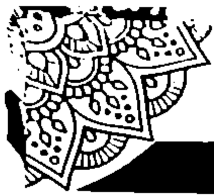
ہمیں اللہ کے تکوینی نظام کو سمجھنا چاہیے۔ جس طرح انسان بحیثیتِ فرد اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے عمل کو جانچا جائے، اسی طرح قوموں کا اجتماعی وجود بھی اللہ کے نظامِ امتحان سے گزرا کرتا ہے۔ یہ امتحان تب ہی ہوسکتا ہے جب اس پر مختلف قسم کے حالات آئیں، آسان بھی، مشکل بھی۔

کوئی انسان ایسا نہیں جسے دنیا میں ہر وقت خوشیاں ہی خوشیاں نصیب ہوں، کبھی کوئی کٹھن صورتحال اسے پیش ہی نہ آئی ہو، ہر کام اس کے ایک اشارے پر ہوتا چلا جاتا ہو۔ کبھی وہ بیمار نہ پڑا ہو، کبھی کوئی بری خبر نہ ملی ہو۔ تمام حالات اس کی مرضی کے مطابق ہی ہوں۔

اسی طرح کوئی امت یا کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہوسکتی جس کے حالات ہمیشہ اچھے ہی رہیں، وہ عروج کی سمت ہی پرواز کرتی رہے۔ اگر بالفرض کوئی ایسا شخص تصور کرلیں جو ہمیشہ خوشیوں کے جھولے جھولتا رہا ہو، تو سوچیے! ایسے خوش نصیب کی زندگی میں ہمارے لیے کوئی سبق ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

اسی طرح اس قوم کے حالات میں بھی ہمیں کوئی سبق نہیں مل سکتا جو ہمیشہ مزے ہی کرتی رہی ہو۔ جسے کبھی شکست یا ناکامی نہ ہوئی ہو۔

جب ہم شکست وزوال کے مناظر دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسے باہمت لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے مایوس نہ



ہوتے ہوئے بد سے بدترین حالات کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا اور دنیا میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کر کے گئے۔ ایسے لوگ مشکلات اور بدتر حالات کی پیداوار تھے جو آج ہمارے لیے قابل رشک اور ہماری تاریخ کے لیے باعثِ فخر ہیں۔

اللہ نے موسم بھی رنگا رنگ بنائے ہیں۔ اگر سارا سال ہمارا پسندیدہ موسم رہتا تو بھی ہم اکتا جاتے۔ بہار کے مزے کچھ دنوں کے ہوتے ہیں تب ان کی قدر ہوتی ہے۔ سارا سال بہار رہتی تو کوئی بھی بہار کو یاد نہ کرتا۔

اللہ کے نظام میں ہر طرح کے موسم ہیں، ہر موسم کے اپنے اپنے فوائد ہیں۔ بلاشبہ بہار میں مسرتوں کا عروج ہے مگر خود یہ بہار بھی دوسرے سخت موسموں کی پیداوار ہے۔ خزاں رسیدہ پتے کھاد بن کر گلشن میں نئی بہار کو جنم دیتے ہیں۔ موسم سرما، نشو ونما کے عمل کو وقتی طور پر منجمد کر کے قدرت کے عملِ صنائی کو آرام دیتا ہے، اس آرام کے بعد ایک تازہ دم مزدور کی طرح قدرت کے مختلف عوامل سرگرم ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہار کی ہریالی چھا جاتی ہے۔

پھر موسم گرم ہوتا ہے تو رزق کے دانے پکتے ہیں۔ برسات ہوتی ہے تو زمین پورے سال کے لیے پانی کا ذخیرہ محفوظ کر لیتی ہے۔ پھر اسی طرح خزاں، سرما اور بہار۔

قوموں کی زندگیاں بھی اسی طرح استحکام اور عروج وزوال کے موسموں سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ قانونِ قدرت ہے، اس سے الجھنے کی بجائے اس کے پس پردہ حکمتوں کو سمجھنا چاہیے۔

عروج وزوال قوموں کے سفرِ مسلسل کی علامت ہے۔ جو شخص ایک جگہ بیٹھا ہے اسے کوئی عروج مل رہا ہے نہ زوال۔ مگر جو شخص بھی کسی دشوار سفر پر نکلے گا اسے عروج وزوال کا سامنا ضرور ہوگا؛ کیوں کہ دشوار راستہ اونچا نیچا ہوتا ہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ راستے میں کھائیاں بھی آسکتی ہیں اور دشوار گزار چوٹیاں بھی۔ آگے بڑھنے کے لیے کبھی کھائی بھی عبور کرنا پڑے گی۔ کبھی چوٹی پر چڑھنا ہوگا۔ پھر چوٹی پر جا کر مسافر وہیں نہیں بیٹھ جائے گا بلکہ اپنی منزل کی سمت چلے گا۔ چاہے اس کے لیے کسی مزید بلند چوٹی تک جانا پڑے یا راستہ اسے نشیب میں لے جائے۔ مگر جس طرح پہاڑ کی چوٹی ہمیشہ مختصر ہوتی ہے، اسی طرح دورِ عروج ہمیشہ کم ہی دکھائی دے گا؛ کیوں کہ عروج کا مطلب وہ نکتہ ہے جس کے بعد زوال شروع ہو۔ سورج سارا دن چمکتا ہے مگر اس کے نصف النہار کا دورانیہ چند منٹ ہی ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سورج کی چمک اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ پس عروج وزوال کی داستان سے بددل ہونا کوئی سمجھ داری کی بات نہیں۔ اپنی زندگی ہو یا قوم کی سرگزشت۔ صرف عروج کو تلاش کرنا اور زوال کے صفحات پڑھ کر خود پر مایوسی طاری کر لینا اہلِ دانش کا کام نہیں۔

☆☆☆

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
	حرف الف	
1	آثار البلاد واخبار العباد	زکریا القزوینی
2	ابجد العلوم	صدیق حسن خان قنوجی
3	ابوالحسن الاشعری	حماد بن محمد الانصاری
4	ابوبکر الصدیق وبنوہ	محمود عبدالفتاح شرف الدین
5	ابوحنیفہ حیاتہ وعصرہ	محمد ابوزہرۃ
6	اتحاف الخیرۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ	شہاب الدین بوصیری الکنانی
7	اتحاف السائل بمافی الطحاویۃ من مسائل، شرح العقیدۃ الطحاویۃ	صالح بن عبدالعزیز آل شیخ
8	اتحاف المہرۃ بالفوائد المبتکرۃ من اطراف العشرۃ	ابن حجر عسقلانی
9	اتعاظ الحنفاء باخبار الائمۃ الفاطمیین الخلفاء	تقی الدین المقریزی
10	اجتماع الجیوش الاسلامیۃ	ابن قیم الجوزیۃ
11	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	ابوعبداللہ المقدسی البشاری
12	احسن الفتاویٰ	مفتی رشید احمد لدھیانوی
13	احکام القرآن	الجصاص الرازی
14	احیاء علوم الدین	ابوحامد الغزالی
15	اخبار ابی حفص عمر بن عبدالعزیز	ابوبکر محمد بن الحسین الآجری
16	اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ	الحسین بن علی الصیمری
17	اخبار العلماء باخبار الحکماء	ابوالحسن علی بن یوسف القفطی
18	اخبار المکیین من تاریخ ابن ابی خیثمہ	ابوبکر ابن ابی خیثمہ
19	اخبار الوافدات من النساء علی معاویۃ بن ابی سفیان	عباس بن بکار
20	اخبار بنی عبید وسیرتہم	محمد بن علی صنہاجی القلعی
21	اخبار الدولۃ العباسیۃ	مصنف: نامعلوم، محقق: عبدالعزیز الدوری
22	اخبار القضاۃ	ابوبکر وکیع بغدادی
23	اخبار مکۃ (تاریخ مکۃ)	ابوعبداللہ الفاکہی
24	اخبار مکۃ وماجاء فیہا من الآثار	ابوالولید الازرقی
25	اخلاق جلالی	جلال الدین دوانی
26	اردو دائرہ معارف اسلامیہ	جماعت مؤلفین
27	ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری	احمد بن محمد القسطلانی

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
		﴿حرف الف﴾	
۶۸۲ھ	1	دار صادر، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۷ھ	1	دار ابن حزم	۱۴۲۳ھ-۲۰۰۲ء
۱۴۱۸ھ	1	الجامعة الاسلامیة بالمدینة المنورة	۱۳۹۳ھ-۱۹۷۳ء
معاصر	1	مکتبة الآداب قاہرہ	مذکور نہیں
۱۳۹۴ھ-۱۹۷۴ء	1	دار الفکر العربی	۱۹۷۴ء
۸۳۰ھ	8	دار الوطن ریاض	۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۸۵۲ھ	19	مجمع الملک فہد: المدینة المنورة	۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء
۸۴۵ھ	3	لجنة احیاء التراث الاسلامی، مصر	مذکور نہیں
۷۵۱ھ	1	دار عالم الفوائد	۱۴۳۱ھ
۳۸۰ھ	1	دار صادر، بیروت	۱۴۱۱ھ-۱۹۹۱ء
۱۳۲۲ھ	10	ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی	۱۴۲۵ھ
۳۷۰ھ	3	دار الکتب العلمیة	۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء
۵۰۵ھ	4	دار المعرفة، بیروت	مذکور نہیں
۳۶۰ھ	1	موسسة الرسالة، بیروت	۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء
۴۳۶ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۵ھ-۱۹۸۵ء
۶۴۶ھ	1	دار الکتب العلمیة	۲۰۰۵ء
۲۷۹ھ	1	دار الوطن	۱۹۹۷ء
۲۲۲ھ	1	موسسة الرسالة، بیروت	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء
۶۲۸ھ	1	دار الصحوة القاہرہ	مذکور نہیں
تیسری صدی ہجری	1	دار الطلیعة، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۶ھ	3	عالم الکتب، بیروت	۱۳۶۶ھ-۱۹۴۷ء
۲۷۲ھ	5	دار خضر، بیروت	۱۴۱۴ھ
۲۵۰ھ	2	دار الاندلس للنشر، بیروت	مذکور نہیں
۹۰۸ھ	1	شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور	۱۳۰۲ھ
	24	دانش گاہ، پنجاب	۱۹۶۴ء تا ۱۹۹۳ء
۹۲۳ھ	10	المطبعة الکبریٰ الامیریة، مصر	۱۳۲۳ھ

28	ارشاد القاصی والدانی الی تراجم الشیوخ الطبرانی	ابو الطیب نائف بن صلاح المنصوری
29	اسد الغابہ	ابن اثیر الجزری
30	اسماء المدلسین	جلال الدین سیوطی
31	اصول السنہ (السنۃ)	امام احمد بن حنبل
32	اصول مذہب الشیعۃ الامامیۃ الاثنی عشریۃ عرض ونقد	دکتور ناصر بن عبداللہ القفاری
33	اضواء علی الہند (تاریخ الاسلام فی الہند)	عبد المنعم النمر
34	اعتقاد اہل السنہ (شرح اصول اعتقاد اہل السنہ والجماعۃ)	ہبۃ اللہ بن الحسن ابو القاسم الطبری الرازی اللالکائی
35	اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین	امام فخر الدین رازی
36	اعلام الموقعین عن رب العالمین	ابن القیم الجوزیہ
37	اقاویل الثقات فی تاویل الاسماء والصفات	مرعی بن یوسف المقدسی الحنبلی
38	اقتضاء الصراط المستقیم	احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ الحرانی
39	اکمال المعلم بفوائد مسلم (شرح صحیح مسلم)	قاضی عیاض یحصبی السبتی
40	اکمال تہذیب الکمال	علاؤ الدین مغلطائی
41	الآحاد والمثانی	ابو بکر ابن ابی عاصم الشیبانی
42	الابانہ عن شریعۃ الفرقۃ الناجیہ	ابن بطہ العکبری
43	الاحتجاج (احتجاج طبرسی)	ابو منصور الطبرسی
44	الاحکام السلطانیہ	ابو الحسن الماوردی
45	الاحکام السلطانیہ	ابو یعلی الفراء
46	الاخبار الطوال	ابو حنیفہ الدینوری
47	الاختیار لتعلیل المختار	عبداللہ بن محمود الموصلی، ابو الفضل الحنفی
48	الاخنائیہ	احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ الحرانی
49	الادب المفرد	امام محمد بن اسماعیل البخاری
50	الارشاد فی معرفۃ علماء الحدیث	ابو یعلی خلیلی القزوینی
51	الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی	شہاب الدین الدرعی السلاوی
52	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	ابن عبد البر قرطبی
53	الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ	ملا علی قاری
54	الاشراف فی منازل الاشراف	ابن ابی الدنیا
55	الاصابہ فی تمییز الصحابہ	ابن حجر العسقلانی



[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
معاصر	1	دارالکیان، ریاض	مذکورنہیں
۶۳۰ھ	8	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۹۱۱ھ	1	دارالجیل	مذکورنہیں
۲۴۱ھ	1	دارالمنار، سعودیہ	۱۴۱۱ھ
معاصر	3	دارالنشر	۱۴۱۴ھ
۱۹۹۱ء	1	دارالعہد الجدید، مصر	۱۹۶۰ء
۴۱۸ھ	4	دارطیبۃ، ریاض	۱۴۰۲ھ
۶۰۶ھ	1	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	مذکورنہیں
۷۵۱ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۰۳۳ھ	1	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۶ھ
۷۲۸ھ	2	دارعالم الکتب، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۵۴۴ھ	8	دارالوفاء، مصر	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۷۶۲ھ	12	الفاروق الحدیثۃ	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
۲۸۷ھ	6	دارالرایۃ، ریاض	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۳۸۷ھ	3	دارالرایۃ للنشر، سعودیہ	۱۴۱۸ھ
پانچویں صدی ہجری	2	مطابع النعمان النجف الاشرف	۱۳۸۶ھ۔۱۹۶۶ء
۴۵۰ھ	1	دارالحدیث، قاہرہ	
۴۵۸ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۲۸۲ھ	1	داراحیاء الکتب العربی	۱۹۶۰ء
۶۸۳ھ	5	مطبع حلبی، قاہرہ	۱۳۵۶ھ۔۱۹۳۷ء
۷۲۸ھ	1	دارالخراز، جدۃ	۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء
۲۵۶ھ	1	دارالبشائر الاسلامیہ، بیروت	۱۴۰۹ھ۔۱۹۸۹ء
۴۴۶ھ	3	مکتبۃ الرشد، الریاض	۱۴۰۹ھ
۱۳۱۵ھ	3	دارالکتاب	مذکورنہیں
۴۶۳ھ	10	دارالجیل، بیروت	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۱۰۱۴ھ	1	موسسۃ الرسالۃ	مذکورنہیں
۲۸۱ھ	1	مکتبۃ الرشد، الریاض	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۰ء
۸۵۲ھ	8	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۵ھ

56	الاصنام	ہشام بن محمد الکلبی
57	الاضداد	ابوبکر ابن الانباری
58	الاعتصام	ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی
59	الاعتقاد والھدایۃ الی سبیل الرشاد علی مذہب السلف واصحاب الحدیث	ابوبکر بیہقی
60	الاعتماد فی الاعتقاد۔شرح العمدۃ فی عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ	ابوالبرکات النسفی
61	الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرۃ،	ابن شداد الحلبی
62	الاعلام	خیرالدین الزرکلی
63	الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ	شمس الدین السخاوی
64	الاغانی	ابوالفرج اصفہانی
65	الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ ﷺ والثلاثۃ الخلفاء	ابوالربیع الحمیری
66	الاکمال فی ذکر من لہ روایۃ فی مسند الامام احمد سوی من ذکر فی تہذیب الکمال	شمس الدین الحسینی الشافعی الدمشقی
67	الام (کتاب الام)	محمد بن ادریس الشافعی
68	الامام الشافعی	محمد ابوزہرہ
69	الامامۃ والسیاسۃ	ابن قتیبۃ الدینوری
70	الاموال	ابن زنجویہ
71	الانتصار للصحب والآل من افتراءات السماوی الضال	ابراہیم بن عامر الرحیلی
72	الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء	ابن عبدالبر المالکی
73	الانساب	عبدالکریم بن محمد السمعانی
74	الانصاف فیما یجب اعتقادہ ولا یجوز الجہل بہ	ابوبکر ابن الباقلانی
75	الانوار الکاشفۃ لما فی کتاب ''اضواء علی السنۃ'' من الزلل والتضلیل والمجازفۃ	عبدالرحمن بن یحییٰ الیمانی
76	الاوائل	ابوہلال العسکری
77	امالی القالی	ابوعلی القالی
78	امام ابوحنیفہ کی تدوینِ قانونِ اسلامی	ڈاکٹر حمید اللہ
79	امتاع الاسماع	تقی الدین مقریزی
80	امداد الفتاوی	مولانا اشرف علی تھانوی
81	انساب الاشراف	احمد بن یحییٰ البلاذری
82	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
83	انوار النجوم (اردو ترجمہ مکتوبات قاسمی، از مولانا محمد قاسم نانوتوی)	مولانا انوار الحسن شیرکوٹی



۲۰۴ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۳۲۸ھ	1	المکتبۃ العصریہ، بیروت	۱۴۰۷ھ-۱۹۸۷ء
۷۹۰ھ	1	دار ابن عفان، السعودیہ	۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء
۴۵۸ھ	1	دار الآفاق، بیروت	۱۴۰۱ھ
۷۱۰ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ فی التراث، مصر	۱۴۳۳ھ-۲۰۱۲ء
۶۸۴ھ	3	منشورات وزارۃ الثقافۃ، سوریا	۱۹۹۳ء
۱۳۹۶ھ	8	دار العلم للملایین	۲۰۰۲ء
۹۰۲ھ	1	دار الکتب العلمیہ، بیروت	مذکور نہیں
۳۵۶ھ	24	دار الفکر، بیروت	مذکور نہیں
۶۳۴ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۰ھ
۷۶۵ھ	1	جامعۃ الدراسات الاسلامیۃ کراچی	مذکور نہیں
۲۰۴ھ	8	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء
۱۳۹۴ھ-۱۹۷۴ء	1	دار الفکر العربی	۱۹۷۸ء
۲۷۰ھ	1	مکتبۃ النیل، مصر	۱۳۲۲ھ-۱۹۰۴ء
۲۵۱ھ	1	مرکز الملک فیصل، سعودیہ	۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء
معاصر	1	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۳ھ-۲۰۰۳ء
۴۶۳ھ	1	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	مذکور نہیں
۵۶۲ھ	13	دائرۃ المعارف العثمانیہ، دکن	۱۳۸۲ھ-۱۹۶۲ء
۳۰۳ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ	مذکور نہیں
۱۳۸۶ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء
۳۹۵ھ	1	دار البشیر	۱۴۰۸ھ
۳۵۶ھ	4	دار الکتب المصریۃ	۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء
۲۰۰۲ء	1	اردو اکیڈمی، سندھ	۱۹۸۳ء
۸۴۵ھ	15	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء
۱۳۳۳ھ-۱۹۴۳ء	6	مکتبۃ دار العلوم کراچی	۱۴۳۱ھ-۲۰۱۰ء
۲۷۹ھ	13	دار الفکر، دمشق	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۶ء
۱۴۱۹ھ-۱۹۹۹ء	1	مجلس نشریات اسلام، کراچی	مذکور نہیں
۱۳۹۶ھ-۱۹۷۶ء		ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور	مذکور نہیں

84	اہل سنت والجماعت	سید سلیمان ندوی
85	اوجز المسالک الی موطا امام مالک	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
86	ایثار الحق علی الخلق	عز الدین الیمنی
87	ایضاح الدلیل فی قطع حجج اہل التعطیل	بدر الدین الکنانی الحموی الشافعی
88	ایضاح شواہد الایضاح	ابو علی القیسی
	﴿حرف ب﴾	
89	البحر الرائق شرح کنز الدقائق	ابن نجیم المصری
90	البحر المحیط فی التفسیر	ابو حیان اندلسی
91	البدء والتاریخ	المطہر بن الطاہر المقدسی
92	البلدان (کتاب البلدان)	احمد بن اسحاق یعقوبی
93	البنایہ شرح الہدایہ	بدر الدین عینی
94	البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب	ابن عذاری المراکشی
95	البیان فی مذہب الامام الشافعی	یحییٰ العمرانی الیمنی
96	بحوث فی تاریخ السنۃ المشرفۃ	اکرم ضیاء عمری
97	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع	علاؤ الدین ابو بکر الکاسانی
98	بذل المجہود فی حل ابی داؤد	مولانا خلیل احمد سہارنپوری
99	بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب	کمال الدین ابن العدیم
	﴿حرف ت﴾	
100	الاجوبۃ الفاضلۃ لاسئلۃ العاشرۃ الکاملۃ (مع تعلیقات شیخ عبد الفتاح)	مولانا عبد الحی لکھنوی
101	التاریخ الاسلامی	دکتور محمود شاکر
102	تحفۃ التحصیل فی ذکر رواۃ المراسیل	ابو زرعۃ ابن العراقی
103	تنویر الایمان اردو ترجمہ تطہیر الجنان	مولف۔ ابن حجر ہیثمی (مترجم: مولانا عبد الشکور)
104	التاریخ الاسلامی العام	علی ابراہیم حسن
105	التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی حتی سقوط غرناطہ	دکتور عبد الرحمن علی الحجی
106	التاریخ الاوسط	محمد بن اسماعیل البخاری
107	التاریخ الکبیر (مع حواشی محمود خلیل)	محمد بن اسماعیل البخاری
108	التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثالث	ابو بکر احمد ابن ابی خیثمۃ
109	التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثانی	ابو بکر احمد ابن ابی خیثمۃ



[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱۳۷۳ء	1	مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی	۱۹۹۷ء
۱۴۰۲ھ	17	دارالقلم، دمشق	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۳ء
۸۴۰ھ	1	دارالکتب العلمیہ	۱۹۸۷ء
۷۳۳ھ	1	دارالسلام للطباعۃ والنشر، مصر	۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء
قبل ۶۰۰ھ	1	دارالغرب الاسلامی	۱۴۰۸ھ-۱۹۸۷ء
		﴿حرف ب﴾	
۹۷۰ھ	8	دارالکتاب الاسلامی	مذکور نہیں
۷۴۵ھ	10	دارالفکر بیروت	۱۴۲۰ھ
۳۵۵ھ	6	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، مصر	مذکور نہیں
۲۹۳ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۲ھ
۸۵۵ھ	13	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۰ھ-۲۰۰۰ء
۶۹۶ھ	2	دارالثقافۃ، بیروت	۱۹۸۳ء
۵۵۸ھ	13	دارالمنہاج، جدۃ	۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء
معاصر	1	بساط، بیروت	۱۹۷۲ء
۵۸۷ھ	7	دارالکتب العلمیہ	۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء
۱۳۴۶ھ	20	دارالکتب العلمیۃ	مذکور نہیں
۶۶۰ھ	12	دارالفکر	مذکور نہیں
		﴿حرف ت﴾	
	1	حلب	مذکور نہیں
۲۰۱۴ء	22	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۵ھ-۱۹۹۵ء
۸۲۶ھ		مکتبۃ الرشد، الریاض	مذکور نہیں
۹۷۴ھ	1	المکتبۃ العربیہ لاہور	مذکور نہیں
بیسوی صدی عیسوی		مکتبۃ النہضۃ المصریۃ	۱۹۶۳ء
معاصر	1	دارالقلم، دمشق	۱۴۰۲ھ-۱۹۸۲ء
۲۵۶ھ	2	دارالوعی، دارالتراث، حلب، قاہرہ	۱۳۹۷ھ-۱۹۷۷ء
۲۵۶ھ	8	مطبعۃ عثمانیہ، حیدرآباد دکن	مذکور نہیں
۲۷۹ھ	3	الفاروق الحدیثۃ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ-۲۰۰۶ء
۲۷۹ھ	2	الفاروق الحدیثۃ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ-۲۰۰۶ء

110	التبصیر فی الدین وتمیز الفرقۃ الناجیۃ من الفرق الہالکین	طاہر بن محمد الاسفرائینی
111	التحریر والتنویر	شیخ محمد بن طاہر العاشور
112	التحفۃ المقدسیۃ فی مختصر تاریخ النصرانیۃ	ابو محمد عاصم المقدسی
113	التذکرۃ الحمدونیۃ	ابن حمدون بہاؤ الدین البغدادی
114	الترغیب والترہیب	عبد العظیم المنذری
115	التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی	عبد القادر عودۃ
116	التعدیل والتجریح لمن خرج لہ البخاری فی الجامع الصحیح	ابو الولید الباجی
117	التفسیر الوسیط	وہبۃ الزحیلی
118	التقریب والتیسیر	یحییٰ بن شرف النووی
119	التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال ابن الہمام	ابن امیر حاج ابن الموقت الحنفی
120	التقیید والایضاح شرح مقدمۃ ابن صلاح	زین الدین العراقی
121	التکمیل فی الجرح والتعدیل ومعرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل	ابن کثیر دمشقی
122	التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر	ابن حجر العسقلانی
123	التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید	ابن عبد البر القرطبی
124	التنبیہ والاشراف	ابو الحسن علی المسعودی
125	التنبیہ والرد علی اہل الاہواء والبدع	ابو الحسین الملطی العسقلانی
126	تاج العروس من جواہر القاموس	مرتضیٰ الزبیدی
127	تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندوی
128	تاریخ دمشق (۷۴ متن، ۶۰ فہارس)	حافظ ابن عساکر
129	تاریخ سندھ	عبد الحلیم شرر
130	تاریخ سندھ (تحقیق: ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا)	میر معصوم شاہ بکھری
131	تاریخ ابن خلدون ومقدمہ	عبد الرحمن ابن خلدون
132	تاریخ ابن معین (روایۃ الدوری)	یحییٰ بن معین
133	تاریخ ابن یونس المصری	ابو سعید ابن یونس المصری
134	تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی	ابو زرعۃ الدمشقی
135	تاریخ اسلام	اکبر شاہ نجیب آبادی



۴۷۱ھ	1	عالم الکتب، لبنان	۱۴۰۳ھ۔ ۱۹۸۳ء
معاصر	30	تونس	۱۹۹۷ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۵۶۲ھ	30	دار صادر، بیروت	۱۴۱۷ھ
۶۵۶ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ
۱۳۷۴ھ	2	دار الکتاب العربی، بیروت	مذکور نہیں
۴۷۴ھ	3	دار اللواء، الریاض	۱۴۰۶ھ۔ ۱۹۸۶ء
	1	دار الفکر	۱۴۲۲ھ
۶۷۶ھ	1	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۴۰۵ھ۔ ۱۹۸۵ء
۸۷۹ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۳ھ۔ ۱۹۸۳ء
۸۰۶ھ	1	مکتبۃ السلفیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۸۹ھ۔ ۱۹۶۹ء
۷۷۴ھ	4	مرکز النعمان، یمن	۱۴۳۲ھ۔ ۲۰۱۱ء
۸۵۲ھ	4	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۹ھ۔ ۱۹۹۹ء
۴۶۳ھ	24	وزارۃ عموم الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ المغرب	۱۳۸۷ھ
۳۴۶ھ	1	دار الصاوی، قاہرہ	
۳۷۷ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ، مصر	مذکور نہیں
۱۲۰۵ھ	40	دار الہدایۃ	مذکور نہیں
۱۹۷۴ء	2	دار الاشاعت	مذکور نہیں
۵۷۱ھ	80	دار الفکر	۱۴۱۵ھ۔ ۱۹۹۵ء
۱۹۲۶ء	1	دل گداز پریس، لکھنؤ	۱۹۱۷ء
۱۰۴۴ھ	1	مرکز تحقیقات، اصفہان	مذکور نہیں
۸۰۸ھ	8	دار الفکر بیروت	۱۴۰۸ھ۔ ۱۹۸۸ء
۲۳۳ھ	4	مرکز البحث العلمی بمکۃ المکرمۃ	۱۳۹۹ھ۔ ۱۹۷۹ء
۳۴۷ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ
۲۸۱ھ	1	مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق	مذکور نہیں
بیسویں صدی عیسوی	3	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۷ء

136	تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام (تحقیق بشار) اکثر مقامات پر تاریخ الاسلام تدمری نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر بشار نسخہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ''ت تدمری'' اول الذکر کی اور ''ت بشار'' ثانی الذکر کی علامات ہیں۔	شمس الدین الذہبی
137	تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام (تحقیق تدمری)	شمس الدین الذہبی
138	تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی
139	تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس	حسین بن محمد الدیار بکری
140	تاریخ الطبری (تاریخ الرسل والملوک)	ابن جریر الطبری
141	تاریخ العرب وحضارتہم فی الاندلس	دکتور خلیل ابراہیم السامرائی
142	تاریخ الفکر الدینی الجاہلی	محمد ابراہیم الفیومی
143	تاریخ المدینۃ	عمر بن شبۃ
144	تاریخ اندلس	مولانا ریاست علی ندوی
145	تاریخ برصغیر	پروفیسر ایم اے جمیل
146	تاریخ بغداد، وذیولہ	خطیب ابوبکر البغدادی
147	تاریخ دعوت وعزیمت	سید ابوالحسن علی ندوی
148	تاریخ دمشق	ابن القلانسی، حمزۃ بن اسد
149	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	محمد لطفی جمعہ
150	تاریخ مکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام والمدینۃ الشریفۃ والقبر الشریف	ابن ضیاء المکی الحنفی
151	تاریخ ہند	ڈاکٹر مقصود چودھری
152	تاریخ یعقوبی	احمد بن اسحاق یعقوبی
153	تالیفات رشیدیہ	مولانا رشید احمد گنگوہی
154	تبییض الصحیفۃ بمناقب ابی حنیفۃ	جلال الدین السیوطی
155	تتمۃ صوان الحکمۃ	ابن فندمہ
156	تجارب الامم وتعاقب الہمم	ابن مسکویہ
157	تحریر علوم الحدیث	عبداللہ بن یوسف الجدیع
158	تحفۃ الفقہاء	ابوبکر علاؤ الدین السمرقندی
159	تحفۂ اثنا عشریۃ (اردو)	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ترجمہ مولانا خلیل الرحمن نعمانی المظاہری



[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۴۷۸ھ	15	دارالغرب الاسلامی	۲۰۰۳ء
۴۷۸ھ	52	دارالکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۳ء
۹۱۱ھ	1	مکتبہ نزار	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۹۶۶ھ	2	دارصادر	مذکورنہیں
۳۱۰ھ	11	دارالمعارف مصر، دارالتراث بیروت	۱۳۸۷ھ
معاصر	1	دارالکتاب الجدیدۃ، بیروت	۲۰۰۰ء
۱۴۲۷ھ	1	دارالفکر العربی	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۲۶۲ھ	4	سید حبیب جدۃ	۱۳۹۹ھ
بیسوی صدی عیسوی	1	مکی دارالکتب، لاہور	۲۰۰۳ء
۱۹۷۷ء	1	جمیل پبلیکشنز، کراچی	۱۹۸۶ء
۴۶۳ھ	24	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ
۱۴۱۹ھ	8	مجلس نشریات اسلام، کراچی	مذکورنہیں
۵۵۵ھ	1	داراحسان، دمشق	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
بیسوی صدی عیسوی	1	موسسۃ ہنداوی، مصر	۲۰۱۲ء
۸۵۴ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۴ء
۱۹۸۶ء	1	مقصود اینڈ سنز، کراچی	1985
۳۹۴ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۱۳۲۳ھ	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۹۱۱ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۵۶۵ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۴۲۱ھ	7	سروش، تہران	۲۰۰۰ء
	2	موسسۃ الریان، بیروت	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۵۴۰ھ	3	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
	1	عالمی مجلس تحفظ اسلام، پاکستان	مذکورنہیں

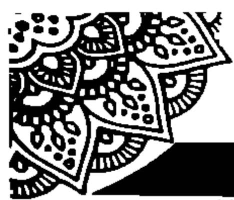
صلاح الدین علائی الدمشقی	تحقیق منیف الرتبہ لمن ثبت لہ شریف الصحبہ	160
جلال الدین سیوطی	تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی	161
حافظ ذہبی	تذکرۃ الحفاظ (طبقات الحفاظ)	162
قاضی عیاض بن موسیٰ المالکی	ترتیب المدارک وتقریب المسالک	163
مولانا ابوالکلام آزاد	ترجمان القرآن	164
محمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی محمد بن علی الشوکانی	تطہیر الاعتقاد	165
ابن حجر العسقلانی	تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال ائمۃ الاربعۃ	166
محمد بن نصر المروزی	تعظیم قدر الصلوٰۃ	167
ابن ابی حاتم الرازی	تفسیر ابن ابی حاتم	168
حافظ ابن کثیر دمشقی	تفسیر ابن کثیر	169
شہاب الدین محمود آلوسی	تفسیر الآلوسی (تفسیر روح المعانی)	170
امام فخر الدین الرازی	تفسیر الرازی (مفاتیح الغیب)	171
ابن جریر الطبری	تفسیر الطبری (جامع البیان)	172
شمس الدین الانصاری القرطبی	تفسیر القرطبی (الجامع لاحکام القرآن)	173
ابواسحٰق الثعلبی	تفسیر ثعلبی	174
عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی	تفسیر عبدالرزاق	175
مولانا ظہور۔الباری الاعظمی	تفہیم البخاری	176
ابن حجر عسقلانی	تقریب التہذیب	177
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی	تقریر بخاری شریف	178
علی محمد خان	تقویم عہد نبوی	179
مولانا عبدالقدوس ہاشمی	تقویم تاریخی	180
مفتی محمد تقی عثمانی	تکملہ فتح الملہم	181
خطیب ابوبکر البغدادی	تلخیص المتشابہ فی الرسم	182
حافظ ابن کثیر الدمشقی	تلخیص کتاب الاستغاثۃ (الاستغاثۃ، الرد علی البکری لابن تیمیہ)	183
عبدالرحمن ابن الجوزی	تلقیح فہوم الاثر فی عیون التاریخ والسیر	184
ابوبکر باقلانی	تمہید الاوائل وتلخیص الدلائل	185
ابن جریر الطبری	تہذیب الآثار	186
محی الدین شرف النووی	تہذیب الاسماء واللغات	187



۶۷۱ھ		دارالعاصمۃ، الریاض	۱۴۱۰ھ
۹۱۱ھ	2	دارطیبہ	مذکورنہیں
۷۴۸ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۵۴۴ھ	8	مطبعہ فضالۃ، المغرب	۱۹۸۳ء
	3	اسلامی اکادمی، لاہور	مذکورنہیں
۱۱۸۲ھ۔۱۲۵۰ھ	1	مطبعۃ سفیر الریاض	۱۴۲۴ھ
۸۵۲ھ	2	دارالبشائر، بیروت	۱۹۹۶ء
۲۹۴ھ	2	مکتبۃ الدار، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۶ھ
۳۲۷ھ	3	مکتبۃ نزار، سعودی عرب	۱۴۱۹ھ
۷۷۴ھ	9	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ
۱۲۷۰ھ	16	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں
۶۰۶ھ	32	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۲۰ھ
۳۱۰ھ	24	دارہجر	۱۴۲۲ھ
۶۷۱ھ	10	دارالکتب المصریۃ، قاہرہ	۳۸۴ھ۔۱۹۶۴ء
۴۲۷ھ	10	داراحیاء التراث العربی	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۲ء
۲۱۱ھ	3	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ
معاصر	۳	دارالاشاعت، کراچی	مذکورنہیں
۸۵۲ھ	1	دارالرشید، سوریا	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۱۴۰۲ھ	4	مکتبۃ الشیخ، کراچی	مذکورنہیں
۱۹۹۷ء	1	ڈاکٹر نور محمد یوسف زئی، کراچی	۲۰۰۷ء
	1	ادارۂ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد	۱۹۸۷ء
معاصر	2	مکتبہ دارالعلوم کراچی	
۴۶۳ھ	1	طلاس للدراسات والنشر، دمشق	۱۹۸۵ء
۷۷۴ھ	1	مکتبۃ الغرباء الاثریۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۴۱۷ھ
۵۹۷ھ	1	شرکۃ دارالارقم، بیروت	۱۹۹۷ء
۴۰۳ھ	1	موسسۃ الکتب الثقافیۃ، لبنان	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۷ء
۳۱۰ھ	3	مطبع المدنی، قاہرہ	مذکورنہیں
۶۷۶ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں

نمبر	کتاب	مصنف
188	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی
189	تہذیب الکمال	ابوالحجاج المزی
190	تہذیب اللغۃ	ابومنصور الازہری الہروی
191	توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار	امیر عزالدین صنعانی
192	توضیح المشتبہ فی ضبط اسماء الرواۃ وانسابہم والقابہم وکناہم	ابوبکر ابن ناصرالدین
	﴿حرف ث﴾	
193	الثقات (معرفۃ الثقات من رجال اہل العلم والحدیث)	ابوالحسن احمد بن صالح العجلی الکوفی
194	الثقات لابن حبان	ابن حبان البستی
195	الثقات ممن لم یقع فی الکتب الستۃ	القاسم بن قطلوبغا
196	ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب	ابومنصور الثعالبی
	﴿حرف ج﴾	
197	الجامع لابن وہب	عبداللہ ابن وہب
198	الجرح والتعدیل	ابن ابی حاتم الرازی
199	الجہاد	ابوبکر ابن ابی عاصم الشیبانی
200	الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
201	الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ	عبدالقادر محی الدین الحنفی
202	الجوہرۃ النیرۃ علی مختصر القدوری	ابوبکر بن علی الحدادی الزبیدی
203	الجوہرۃ فی نسب النبی واصحابہ العشرۃ	محمد بن ابی بکر البری التلمسانی
204	جامع الاحادیث	جلال الدین سیوطی
205	جامع الاصول فی احادیث الرسول	مجد الدین ابن اثیر الجزری
206	جامع المسانید والسنن	حافظ ابن کثیر
207	جامع المسائل	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
208	جامع بیان العلم وفضلہ	ابن عبدالبر
209	جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس	ابوعبداللہ الیورقی
210	جمع القرآن حفظا وکتابۃ	دکتور علی بن سلیمان العبید
211	جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم الظاہری
212	جوامع السیرۃ النبویۃ	ابن حزم ظاہری

۸۵۲ھ	12	مطبعہ نظامیہ، حیدرآباد دکن	۱۳۲۶ھ
۷۴۲ھ	35	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء
۳۷۰ھ	8	داراحیاء التراث العربی	۲۰۰۱ء
۱۱۸۲ھ	۲	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء
۸۴۲ھ	10	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۹۹۳ء
		{حرف ث}	
۲۶۱ھ	2	مکتبۃ الدار، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۵ھ-۱۹۸۵ء
۳۵۴ھ	9	مطبعہ نظامیہ، دکن	۱۳۹۳ھ-۱۹۷۳ء
۸۷۹ھ	8	مرکز النعمان، یمن	۱۴۳۲ھ-۲۰۱۱ء
۴۲۹ھ	1	دار المعارف، قاہرہ	مذکورنہیں
		{حرف ج}	
۱۹۷ھ	1	دار الوفاء	۱۴۲۵ھ-۲۰۰۵ء
۳۲۷ھ	9	داراحیاء التراث العربی	۱۹۵۲ء
۲۸۷ھ	2	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۹ھ
۷۲۸ھ	6	دار العاصمۃ، ریاض	۱۴۱۴ھ
۷۷۵ھ	2	میر محمد کتب خانہ، کراچی	مذکورنہیں
۸۰۰ھ	2	المطبعۃ الخیریۃ	۱۳۰۰ھ
۶۴۵ھ		دار الرفاعی، ریاض	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	13	دکتور حسن عباس زکی	مکتبہ شاملہ
۶۰۶ھ	12	مکتبۃ دار البیان	۱۳۹۲ھ-۱۹۷۲ء
۷۷۴ھ	10	دار خضر، بیروت	۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸ء
۷۲۸ھ	6	دار عالم الفوائد	۱۴۲۲ھ
۴۶۳ھ	2	دار ابن الجوزی، السعودیۃ	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء
۴۸۸ھ	1	الدار المصریۃ، قاہرہ	۱۹۹۶ء
	1	مجمع الملک فہد، المدینۃ المنورۃ	مذکورنہیں
۴۵۶ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء
۴۵۶ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	مذکورنہیں



	حرف ح	
213	الحاوی الکبیر شرح مختصر المزنی	امام علی بن محمد الماوردی
214	الحجۃ علی اہل المدینۃ	محمد بن الحسن الشیبانی
215	الحسنۃ والسیئۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
216	الحیوان (کتاب الحیوان)	عمرو بن بحر، ابوعثمان الجاحظ
217	حسن المحاضرۃ	جلال الدین سیوطی
218	حقیقۃ السنۃ والبدعۃ	جلال الدین السیوطی
219	حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء	ابونعیم اصبہانی
220	حیاۃ الصحابۃ (عربی)	مولانا محمد یوسف کاندھلوی
	حرف خ	
221	الخراج (کتاب الخراج)	قاضی ابویوسف
	حرف د	
222	دراسات تاریخیۃ	اکرم ضیاء عمری
223	دلائل النبوۃ	ابوبکر البیہقی
224	الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ	ابن حجر عسقلانی
225	دیوان الحماسۃ	ابوتمام
226	دول الاسلام	شمس الدین الذہبی
227	دولۃ الاسلام فی الاندلس	محمد عبداللہ عنان المصری
228	الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب	ابن فرحون المصری
229	الدراری فی الذراری (تذکرۃ الآباء وتسلیۃ الابناء)	ابن عدیم الحلبی
230	الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب	ابن فرحون المصری
231	الدولۃ الفاطمیۃ	محمد علی محمد الصلابی
	حرف ذ	
232	الذریۃ الطاہرۃ	ابوبشر الانصاری الدولابی
	حرف ر	
233	الرحلۃ فی طلب الحدیث	ابوبکر خطیب بغدادی
234	الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمن مبارک پوری
235	الرد علی من قال بفناء الجنۃ والنار	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی



﴿حرف ح﴾			
۴۵۰ھ	19	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۱۸۹ھ	4	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۳ھ
۷۲۸ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں
۲۵۵ھ	1	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۲۴ھ
۹۱۱ھ	2	داراحیاء الکتب العربیۃ	۱۳۸۷ھ۔۱۹۶۷ء
۹۱۱ھ	1	مطابع الرشید	۱۴۰۹ھ
۴۳۰ھ	12	السعادۃ	۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء
۱۳۸۴ھ	5	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
﴿حرف خ﴾			
۱۸۲ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ، مصر	
﴿حرف د﴾			
معاصر	1	المجلس العلمی، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۴۵۸ھ	7	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۰۵ھ
۸۵۲ھ	2	دارالمعرفۃ، بیروت	مذکورنہیں
۲۲۱ھ	1	مکتبۃ البشریٰ	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۷۴۸ھ	2	دارصادر، بیروت	۱۹۹۹ء
۱۴۰۶ھ	5	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۷۹۹ھ	2	دارالتراث، قاہرہ	مذکورنہیں
۶۶۰ھ	1	دارالہدایۃ	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۷۹۹ھ	1	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	مذکورنہیں
معاصر	1	مؤسس اقرأ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
﴿حرف ذ﴾			
۳۱۰ھ	1	الدارالسلفیۃ، کویت	۱۴۰۷ھ
﴿حرف ر﴾			
۴۶۳ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۳۹۵ھ
۲۰۰۶ء	1	المکتبۃ السلفیۃ، لاہور	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۷۲۸ھ	1	داربلنسیۃ، الریاض	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۶ء

236	الرسائل	عمرو بن بحر، ابوعثمان الجاحظ
237	الرفع والتکمیل	مولانا عبدالحیٔ لکھنوی
238	الروض الانف (تحقیق: عمر عبدالسلام سلامی)	ابوالقاسم السہیلی
239	الروض الباسم فی تراجم شیوخ الحاکم	نایف بن صلاح المنصوری
240	الروض المعطار فی خبر الاقطار	ابوعبداللہ محمد الحمیری
241	الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ	محب الدین الطبری
242	رأس الحسین	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
243	رجال الکشی (اختیار معرفۃ الرجال) جدید نسخہ	مؤلف: محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (م ۳۵۰ھ) ترتیب وتہذیب: ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ)
244	رجال الکشی (اختیار معرفۃ الرجال) قدیم نسخہ	مؤلف: محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (م ۳۵۰ھ) ترتیب وتہذیب: ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ)
245	رحمۃ للعالمین ﷺ	قاضی سلمان منصور پوری
246	رد المحتار علی الدر المختار	محمد امین ابن عابدین الدمشقی
247	رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ	امام ابوداؤد سجستانی
248	رسالۃ طرق حدیث من کنت مولاہ	حافظ ذہبی
249	رفع الاستار	عز الدین محمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی
250	روضۃ الاخیار المنتخب من ربیع الابرار	محی الدین الخطیب ابوالقاسم
251	ریاض النفوس	ابوبکر عبداللہ المالکی
	حرف ز	
252	الزہد (کتاب الزہد)	احمد بن حنبل
253	الزہد الکبیر	ابوبکر بیہقی
254	الزہد والرقائق (کتاب الزہد)	عبداللہ بن مبارک
255	زاد المعاد فی ہدی خیر العباد	ابن قیم الجوزیہ
256	زہر الاکم فی الامثال والحکم	نور الدین الیوسی
	حرف س	
257	السنۃ	عبداللہ بن احمد بن حنبل



۲۵۵ھ	4	مکتبہ خانجی، قاہرہ	۱۳۸۳ھ۔۱۹۶۴ء
۱۳۰۴ھ	1	مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۰۷ھ
۵۸۱ھ	7	دار احیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
معاصر	2	دار العاصمہ للنشر، الریاض	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۹۰۰ھ	1	موسسۃ ناصر للثقافۃ، بیروت	۱۹۸۰ء
۶۹۳ھ	4	دار الکتب العلمیہ	مذکور نہیں
۷۲۸ھ	1		
	1	موسسۃ النشر الاسلامی۔ قم، ایران	۱۴۲۷ھ
	1	دانش گاہ، مشہد	
۱۹۳۰ء	2	مرکز الحرمین الاسلامی، فیصل آباد	۲۰۰۷ء
۱۲۵۲ھ	6	دار الفکر، بیروت	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۲۷۵ھ	1	دار العربیۃ، بیروت	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۱۱۸۲ھ	1	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۰۵ھ
۹۴۰ھ	1	دار القلم العربی، حلب	۱۴۳۳ھ
بعد ۴۶۰ھ	2	دار الغرب الاسلامی	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۲ء
		حرف ز	
۲۴۱ھ	1	دار الکتب العلمیہ	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۳۵۸ھ	1	موسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت	۱۹۹۶ء
۱۸۱ھ	1	دار الکتب العلمیہ	مذکور نہیں
۷۵۱ھ	5	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء
۱۱۰۲ھ	3	الشرکۃ الجدیدۃ۔ المغرب	۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء
		حرف س	
۲۹۰ھ	2	دار ابن القیم، دمام	۱۴۰۶ھ

258	السنن الکبریٰ للنسائی	احمد بن شعیب النسائی
259	السنن الصغیر	ابوبکر البیہقی
260	السنن الکبریٰ للبیہقی	ابوبکر البیہقی
261	السیرۃ الحلبیۃ	برہان الدین حلبی
262	السیرۃ النبویۃ	ابوالحسن علی الندوی
263	السیرۃ النبویۃ	ابن حبان البستی
264	السیرۃ النبویۃ	محمد علی محمد الصلابی
265	السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ محاولۃ لتطبیق قواعد المحدثین فی نقد روایات السیرۃ النبویۃ	دکتور اکرم ضیاء العمری
266	السیرۃ النبویۃ من البدایۃ والنہایۃ	حافظ ابن کثیر
267	السیرۃ والدعوۃ فی العہد المدنی	احمد غلوش
268	السیف المسلول علی من سب الرسول	تقی الدین بن عبد الکافی السبکی
269	سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد	محمد بن یوسف الصالحی الشامی
270	سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی	عبد الملک العصامی المکی
271	سنن ابن ماجہ	محمد ابن یزید، ابن ماجہ قزوینی
272	سنن ابی داؤد	ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی
273	سنن الترمذی	محمد بن عیسیٰ الترمذی
274	سنن الدارقطنی	ابوالحسن الدارقطنی
275	سنن الدارمی	عبداللہ بن عبد الرحمن الدارمی
276	سنن سعید بن منصور	سعید بن منصور شعبۃ الخراسانی
277	سنن نسائی (المجتبیٰ)	احمد بن شعیب النسائی
278	سوالات الآجری لابی داؤد	ابوداؤد السجستانی
279	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین الذہبی
280	سیرت ابن اسحٰق	محمد بن اسحٰق بن یسار المدنی
281	سیرت ابن ہشام	عبد الملک بن ہشام
282	سیرت النبی	علامہ شبلی نعمانی
283	سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم	مفتی محمد شفیع
284	سیرت خلفائے راشدین	مولانا عبد الشکور لکھنوی فاروقی
285	سیرت عمر بن عبد العزیز	عبداللہ بن عبد الحکم المصری



۳۰۳ھ	12	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۱ھ-۲۰۰۱ء
۴۵۸ھ	4	جامعۃ الدراسات الاسلامیہ، کراچی	۱۴۱۰ھ-۱۹۸۹ء
۴۵۸ھ	10	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۳ھ-۲۰۰۳ء
۱۰۴۳ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۷ھ
۱۹۹۹ء	1	دوحہ، قطر	۱۴۰۰ھ
۳۵۴ھ	2	الکتب الثقافیۃ، بیروت	۱۴۱۷ھ
معاصر	1	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۲۹ھ-۲۰۰۸ء
معاصر	2	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء
۷۷۴ھ	4	دار المعرفۃ، بیروت	۱۳۹۵ھ-۱۹۷۶ء
معاصر	1	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۴ء
۷۵۶ھ	1	دار الفتح، عمان، اردن	۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء
۹۴۲ھ	12	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳ء
۱۱۱۱ھ	4	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸ء
۲۷۳ھ	2	دار احیاء الکتب العربیہ	مذکور نہیں
۲۷۵ھ	4	المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت	مذکور نہیں
۲۷۹ھ	5	مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ	۱۹۷۵ء
۳۸۵ھ	5	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۴ء
۲۵۵ھ	4	دار المغنی، السعودیۃ	۱۴۱۲ھ
۲۲۷ھ	2	دار السلفیہ، ہند	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۲ء
۳۰۳ھ	8	مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء
	1	الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۹۹ھ-۱۹۷۹ء
۷۴۸ھ	25	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵ھ-۱۹۸۵ء
۱۵۱ھ	1	دار الفکر، بیروت	۱۳۹۸ھ-۱۹۷۸ء
۲۱۳ھ	2	مطبع مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ	۱۳۷۵ھ-۱۹۵۵ء
۱۹۱۴ء	7	دینی کتب خانہ، لاہور	۱۹۷۵ء
۱۳۹۶ھ-۱۹۷۶ء	1	دار الاشاعت، کراچی	مذکور نہیں
۱۹۶۲ء	1	کتب خانہ مجیدیہ، ملتان	مذکور نہیں
۲۱۴ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۴ھ-۱۹۸۴ء

286	سیرت ومناقب عمر بن عبد العزیز	ابن الجوزی
	﴿حرف ش﴾	
287	شذرات الذہب فی خبر من ذہب	ابن عماد الحنبلی
288	شریعت وطریقت کا تلازم	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
289	الشذا الفیاح من علوم ابن الصلاح	لابی اسحق الابناسی
290	الشریعة	ابو بکر الآجری البغدادی
291	الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ	القاضی عیاض بن موسیٰ الیحصبی
292	الشماریخ فی علم التاریخ	جلال الدین سیوطی
293	الشمائل المحمدیة (شمائل الترمذی)	محمد بن عیسیٰ الترمذی
294	الشیعة والتشیع	احسان الٰہی ظہیر
295	شرح عقائد نسفی	سعد الدین تفتازانی
296	شرح الاربعین النوویة	محمد بن صالح العثیمین
297	شرح التبصرة والتذکرة، الفیة العراقی	الحافظ زین الدین العراقی
298	شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیة	ابو عبد اللہ الزرقانی المالکی
299	شرح السنة	ابو محمد ابن الفراء البغوی
300	شرح السنة	اسماعیل بن یحییٰ المزنی
301	شرح صحیح مسلم (المنہاج)	امام شرف النووی
302	شرح عقود رسم المفتی	علامہ ابن عابدین شامی
303	شرح مشکل الآثار	ابو جعفر الطحاوی
304	شرح معانی الآثار	ابو جعفر الطحاوی
305	شرح نخبة الفکر	ملا علی قاری
306	شرف المصطفیٰ	ابو سعد الخرکوشی
307	شعب الایمان	ابو بکر بیہقی
308	شہادتِ امام حسین وکردارِ یزید (اردو ترجمہ از مولانا انوار الحسن شیرکوٹی)	مولانا محمد قاسم نانوتوی
	﴿حرف ص﴾	
309	الصحاح تاج اللغة	ابو نصر الجوہری الفارابی
310	الصواعق المحرقة علی اہل الرفض والضلال والزندقة	ابن حجر ہیثمی

٥٩٧ھ	1	دارالکتب العلمیہ	١٤٢٢ھ-٢٠٠١ء
		﴿حرف ش﴾	
١٠٨٩ء	11	دار ابن کثیر دمشق	١٤٠٦ھ-١٩٨٦ء
١٤٠٢ھ-١٩٨٢ء	1	مکتبۃ الشیخ، کراچی	١٩٩٣ء
٨٠٢ھ	2	مکتبۃ الرشد	١٤١٨ھ-١٩٩٨ء
٣٦٠ھ	5	دار الوطن سعودیہ	١٤٢٠ھ-١٩٩٩ء
٥٤٣ھ	2	دار الفکر	١٤٠٩ھ-١٩٨٨ء
٩١١ھ	1	مکتبۃ الآداب	مذکورنہیں
٢٧٩ھ	1	دار احیاء التراث العربی	مذکورنہیں
١٣٠٧ھ	1	ادارہ ترجمان السنہ، لاہور	١٤١٥ھ-١٩٩٥ء
٧٩٢ھ	1	مکتبۃ البشریٰ، کراچی	١٤٣٠ھ
١٣٢١ھ	1	دار الثریا للنشر	١٣٩٦ھ-١٩٧٦ء
٨٠٦ھ	2	دارالکتب العلمیہ	١٤٢٣ھ-٢٠٠٢ء
١١٢٢ھ	12	دارالکتب العلمیہ	١٤١٧ھ-١٩٩٦ء
٥١٦ھ	13	المکتب الاسلامی دمشق	١٤٠٣ھ-١٩٨٣ء
٢٦٣ھ	1	مکتبۃ الغرباء الاثریہ، السعودیہ	١٤١٥ھ-١٩٩٥ء
٦٧٦ھ	6	دار احیاء التراث العربی، بیروت	١٣٩٢ھ
١٢٥٧ھ	1	مکتبۃ البشریٰ	١٤٣٠ھ
٣٢١ھ	16	مؤسسۃ الرسالۃ	١٤١٥ھ-١٩٩٤ء
٣٢١ھ	5	عالم الکتب	١٤١٤ھ-١٩٩٤ء
١٠١٤ھ	1	دار الارقم، بیروت	مذکورنہیں
٣٠٧ھ	2	دار البشائر الاسلامیہ، مکہ	١٤٢٣ھ
٣٥٨ھ	14	مکتبۃ الرشد	١٤٢٣ھ-٢٠٠٣ء
١٢٩٧ھ	1	تحریک خدام اہل سنت والجماعت، لاہور	مذکورنہیں
		﴿حرف ص﴾	
٣٩٣ھ	6	دار العلم، بیروت	١٤٠٧ھ-١٩٨٧ء
٩٧٤ھ	2	مؤسسۃ الرسالۃ	١٤١٧ھ-١٩٩٧ء

311	صب العذاب علیٰ من سب الاصحاب	علامہ محمود آلوسی
312	صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل البخاری
313	صحیح مسلم	مسلم بن الحجاج القشیری
314	صفۃ الصفوۃ	عبدالرحمن ابن جوزی
315	صفۃ النفاق وذم المنافقین	ابوجعفر ابوبکر الفریابی
316	صفۃ جزیرۃ الاندلس	ابوعبداللہ الحمیری
	﴿حرف ض﴾	
317	الضعفاء الکبیر	ابوجعفر العقیلی المکی
318	الضعفاء والمتروکون	احمد بن شعیب النسائی
319	الضعفاء والمتروکون	عبدالرحمن ابن الجوزی
	﴿حرف ط﴾	
320	الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ	تقی الدین تمیمی
321	طبقات المحدثین باصبهان والواردین علیها	ابی الشیخ الاصبهانی
322	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الخامسۃ	محمد بن سعد
323	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الرابعۃ	محمد بن سعد
324	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) نوٹ: اکثر مقامات پر طبقات ابن سعد دار صادر کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔	محمد بن سعد
325	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ)	محمد بن سعد
326	طبقات الاطباء	ابن ابی اُصیبعہ
327	طبقات الامم	قاضی ابن ساعد الاندلسی
328	طبقات الاولیاء	ابن ملقن المصری
329	طبقات الحنابلۃ	ابوالحسین ابن ابی یعلیٰ
330	طبقات الصوفیۃ	عبدالرحمن السلمی نیشاپوری
331	طبقات الفقہاء	ابواسحٰق شیرازی
332	طبقات الفقہاء الشافعیۃ	ابن الصلاح
333	طبقات المدلسین (تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس)	ابن حجر عسقلانی
334	طبقات المفسرین	جلال الدین سیوطی
335	طبقات المفسرین	احمد بن محمد الادنہوی

۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء	اضواء السلف، ریاض	1	۱۳۴۲ھ
۱۴۲۲ھ	دار طوق النجاۃ	9	۲۵۶ھ
۱۳۷۴ھ۔۱۹۵۴ء	دار الجیل	5	۲۶۱ھ
۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء	دار الحدیث قاہرۃ، مصر	2	۵۹۷ھ
۱۴۰۸ھ ۱۹۸۸ء	دار الصحابۃ للتراث، مصر	1	۳۰۱ھ
۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء	دار الجیل، بیروت	1	۹۰۰ھ
	{حرف ض}		
۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء	دار المکتبۃ العلمیۃ بیروت	4	۳۲۲ھ
۱۳۹۶ھ	دار الوعی، حلب	1	۳۰۳ھ
۱۴۰۶ھ	دار الکتب العلمیۃ	3	۵۹۷ھ
	{حرف ط}		
	مکتبہ شاملہ	1	۱۰۱۰ھ
۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	4	۳۶۹ھ
۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء	مکتبۃ الصدیق، طائف	2	۲۳۰ھ
۱۴۱۶ھ	مکتبۃ الصدیق، طائف	1	۲۳۰ھ
۱۹۶۸ء	دار صادر	8	۲۳۰ھ
۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء	دار الکتب العلمیۃ	8	۲۳۰ھ
	مکتبہ شاملہ	1	۶۶۸ھ
۱۹۱۲ء	بیروت	1	۴۶۲ھ
۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	1	۸۰۴ھ
مذکور نہیں	دار المعرفۃ، بیروت	2	۵۲۶ھ
۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء	دار الکتب العلمیہ	1	۴۱۲ھ
۱۹۷۰ء	دار الرائد العربی، بیروت	1	۴۷۶ھ
۱۹۹۲ء	دار البشائر الاسلامیہ، بیروت	2	۶۴۳ھ
۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء	مکتبۃ المنار	1	۸۵۲ھ
۱۳۹۶ھ	مکتبۃ وہبہ قاہرہ	1	۹۱۱ھ
۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء	مکتبۃ العلوم والحکم، سعودیہ	1	گیارہویں صدی ہجری

حرف ع		
336	العاشر من المشیخہ البغدادیہ	ابوطاہر السلفی
337	العبر فی خبر من غبر	حافظ شمس الدین الذہبی
338	العرش	حافظ ذہبی
339	العرف الشذی شرح سنن الترمذی	مولانا انور شاہ کشمیری
340	العقائد النسفیہ	عمر بن محمد ابوحفص النسفی
341	العقد الفرید	ابوعمر ابن عبدربہ
342	العقیدۃ الطحاویہ (مع تعلیقات الالبانی)	ابوجعفر الطحاوی
343	العقیدۃ الواسطیہ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ الحرانی
344	العقیدۃ الواسطیہ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ الحرانی
345	العلل ومعرفۃ الرجال	احمد بن حنبل
346	العلو للعلی الغفار	حافظ ذہبی
347	العنایہ شرح الہدایہ	محمد بن محمد ابن الشیخ البابرتی
348	العواصم من القواصم	ابوبکر ابن العربی
349	العواصم والقواصم	ابن الوزیر القاسمی
350	العیون والحدائق فی اخبار الحقائق (جزء خلافۃ الولید بن عبدالملک) مع تجارب الامم وتعاقب الہمم لابن مسکویہ	نامعلوم
351	عارضۃ الاحوذی بشرح صحیح الترمذی	ابن العربی المالکی
352	عصر الخلافۃ الراشدۃ۔ محاولۃ لنقد الروایۃ التاریخیۃ وفق مناہج المحدثین	اکرم ضیاء عمری
353	عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب	ابن عنبہ جمال الدین الحسینی
354	عمدۃ القاری	بدرالدین عینی الحنفی
355	عمل الیوم واللیلۃ	ابراہیم بن بُدیح، ابن السنی
356	عہد نبوی کے میدان جنگ	ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی
357	عون المعبود شرح سنن ابی داؤد	شرف الحق صدیقی عظیم آبادی
358	عیون الاخبار	ابن قتیبہ الدینوری
359	عیون الانباء فی طبقات الاطباء	ابن ابی اصیبعہ
360	عیون الرسائل والاجوبۃ عن المسائل	شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمن آل شیخ



	{حرف ع}		
مذکور نہیں	مکتبہ شاملہ	1	۵۷۶ھ
مذکور نہیں	دارالکتب العلمیہ	4	۷۴۸ھ
۱۴۲۴ء،۲۰۰۳ھ	عمادۃ البحث العلمی، الجامعۃ الاسلامیہ، المدینۃ المنورۃ	1	۷۴۸ھ
۱۴۲۵ھ-۲۰۰۳ء	دارالتراث العربی	5	۱۳۵۳ھ
۱۴۳۰ھ-۲۰۰۹ء	ضمیمہ شرح العقائد النسفیہ مطبوعہ المکتبۃ البشریٰ	1	۵۳۷ھ
۱۴۰۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت	8	۳۲۸ھ
۱۴۱۴ھ	المکتب الاسلامی، بیروت	1	۳۲۱ھ
۱۹۹۹ء	اضواء السلف، ریاض	1	۷۲۸ھ
۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء	اضواء السلف	1	۷۲۸ھ
۱۴۲۲ھ	دارالخانی، ریاض	3	۲۴۱ھ
۱۴۱۶ھ-۱۹۹۵ء	مکتبہ اضواء السلف، ریاض	1	۷۴۸ھ
مذکور نہیں	دارالفکر	10	۷۸۶ھ
۱۳۹۷ھ-۱۹۸۷ء	دارالجیل، بیروت	1	۵۴۳ھ
۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	9	۸۴۰ھ
۱۸۷۱ء	لیڈن، ہالینڈ	1	نامعلوم
مذکور نہیں	دارالکتب العلمیہ	13	۵۴۳ھ
۱۴۳۰ھ-۲۰۰۹ء	مکتبۃ العبیکان	1	معاصر
۱۹۶۹ء	مطبعہ حیدریہ، نجف	2	۸۲۸ھ
مذکور نہیں	داراحیاء التراث العربی	25	۸۵۵ھ
مذکور نہیں	دارالقبلۃ للثقافۃ الاسلامیہ بیروت	1	۳۶۴ھ
۱۹۸۲ء	ادارہ اسلامیات، لاہور	1	۱۴۲۳ھ-۲۰۰۲ء
۱۴۱۵ھ	دارالکتب العلمیہ	14	۱۳۲۹ھ
۱۴۱۸ھ	دارالکتب العلمیہ	4	۲۷۶ھ
مذکور نہیں	دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت	1	۶۶۸ھ
مذکور نہیں	مکتبۃ الرشد، ریاض	2	۱۲۹۳ھ

	حرف غ	
361	الغایۃ فی شرح الہدایۃ فی علم الروایۃ	شمس الدین السخاوی
362	غایۃ المقصد فی زوائد المسند	نور الدین الہیثمی
	حرف ف	
363	الفاروق	علامہ شبلی نعمانی
364	الفتاویٰ الکبریٰ	احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ الحرانی
365	الفتاویٰ الہندیہ (فتاویٰ عالمگیری)	لجنۃ الفقہاء من الہند
366	الفتنۃ ووقعۃ الجمل	سیف بن عمر تمیمی
367	الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیۃ	ابن الطقطقی، محمد بن علی ابن طباطبا
368	الفرق بین الفرق	ابو منصور عبد القاہر الاسفرائینی البغدادی
369	الفروق اللغویۃ	ابو ہلال العسکری
370	الفصل فی الملل والاہواء والنحل	ابن حزم الظاہری
371	الفصول فی الاصول	امام ابوبکر الجصاص الرازی
372	الفصول فی السیرۃ	حافظ ابن کثیر
373	الفقہ الابسط	امام ابوحنیفہ
374	الفقہ الاسلامی وادلتہ	وہبۃ الزحیلی
375	الفقہ الاکبر	امام ابوحنیفہ
376	الفقہ الاکبر	امام ابوحنیفہ
377	الفقہ المیسر فی ضوء الکتاب والسنۃ	مجموعۃ من المؤلفین
378	الفقہ علی مذاہب الاربعہ	عبد الرحمن الجزیری
379	الفہرست	ابن ندیم بغدادی
380	فتاویٰ ابن الصلاح	ابن الصلاح
381	فتاویٰ رشیدیہ	مولانا رشید احمد گنگوہی
382	فتاویٰ عثمانی	مفتی محمد تقی عثمانی
383	فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی
384	فتح الباری	ابن رجب حنبلی
385	فتح القدیر	کمال الدین ابن الہمام سیواسی
386	فتح القدیر	محمد بن علی الشوکانی



	﴿حرف خ﴾		
۲۰۰۱ء	مکتبہ اولاد الشیخ للتراث	1	۹۰۲ھ
۱۴۲۱ھ ۲۰۰۱ء	دار الکتب العلمیہ	4	۸۰۷ھ
	﴿حرف ف﴾		
۱۹۹۱ء	دار الاشاعت	1	۱۹۱۴ء
۱۴۰۸ھ ۱۹۸۷ء	دار الکتب العلمیہ، بیروت	6	۷۲۸ھ
۱۳۱۰ھ	دار الفکر	6	نحو ۱۱۰۰ھ
۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء	دار النفائس	1	۲۰۰ھ
۱۴۱۸ھ ۱۹۹۷ء	دار القلم العربی، بیروت	1	۷۰۹ھ
۱۹۷۷ء	دار الآفاق الجدیدہ، بیروت	1	۴۲۹ھ
مذکور نہیں	دار العلم والثقافۃ، المصر	1	۳۹۵ھ
مذکور نہیں	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	5	۴۵۶ھ
۱۴۱۴ھ ۱۹۹۴ء	وزارۃ الاوقاف الکویتیۃ	4	۳۷۰ھ
۱۴۰۳ھ	موسسۃ علوم القرآن	1	۷۷۴ھ
۱۴۱۹ھ ۱۹۹۹ء	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	1	۱۵۰ھ
مذکور نہیں	دار الفکر، دمشق	10	۲۰۱۵ء
۱۹۹۹ء	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	1	۱۵۰ھ
۱۴۱۹ھ ۱۹۹۹ء	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	1	۱۵۰ھ
۱۴۲۴ھ	مجمع الملک فہد	1	معاصرین
۱۴۲۴ھ ۲۰۰۳ء	دار الکتب العلمیہ	5	۱۳۶۰ھ
۱۴۱۷ھ ۱۹۹۷ء	دار المعرفۃ، بیروت	1	۴۳۸ھ
۱۴۰۷ھ	مکتبۃ العلوم والحکم	1	۶۴۳ھ
۲۰۰۳ء	دار الاشاعت	1	۱۳۲۳ھ
۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء	مکتبہ معارف القرآن، کراچی		معاصر
۱۳۷۹ھ	دار المعرفۃ، بیروت	13	۸۵۲ھ
۱۴۱۷ھ ۱۹۹۶ء	دار الحرمین، قاہرہ	9	۷۹۵ھ
مذکور نہیں	دار الفکر	10	۸۶۱ھ
۱۴۱۴ھ	دار ابن کثیر	6	۱۲۵۰ھ



387	فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث	شمس الدین السخاوی
388	فتح مصر	جمال عبدالہادی
389	فتح نامہ سندھ (چچ نامہ)	ابوحامد الکوفی
390	فتنہ مقتل عثمان	محمد بن عبداللہ غبان الصبحی
391	فتنہ استشراق	علامہ شمس الحق افغانی
392	فتوح البلدان	احمد بن یحییٰ البلاذری
393	فتوح الشام الازدی	محمد بن عبداللہ الازدی
394	فتوح الشام للواقدی	محمد بن عمر الواقدی
395	فتوح مصر والمغرب	عبدالرحمن بن عبدالحکم ابوالقاسم المصری
396	فجر الاسلام	احمد امین
397	فرق الشیعہ	حسن بن موسیٰ النوبختی
398	فضائح الباطنیۃ	امام غزالی
399	فضائل الصحابۃ	امام احمد بن حنبل
	{حرف ق}	
400	القاموس الجدید (عربی سے اردو)	وحید الزمان کیرانوی
401	قاعدۃ فی المؤرخین	تاج الدین السبکی
402	قصۃ الحضارۃ	ولیم جیمس ڈیورآنٹ، تعریب: دکتور زکی نجیب
403	قصۃ العرب فی اسبانیا (دی اسٹوری آف مورس ان اسپین) تعریب: علی جازم بک	اسٹینلے۔لین پول
404	قصص من التاریخ	علی الطنطاوی
405	قضایا المرأۃ فی المؤتمرات الدولیۃ	دکتور فؤاد بن عبدالکریم
406	قواعد فی علوم الحدیث (اعلاء السنن جزء:۱۸)	مولانا ظفر احمد عثمانی
407	قوت القلوب	ابوطالب المکی
	{حرف ک}	
408	کیف نقرأ تاریخ الآل والاصحاب	عبدالکریم بن خالد الحربی
409	الکاشف فی معرفۃ من لہ روایۃ فی الکتب الستۃ	حافظ ذہبی
410	الکافی فی فقہ الامام احمد	ابن قدامۃ المقدسی
411	الکامل فی التاریخ	ابن اثیر الجزری
412	الکامل فی اللغۃ والادب	ابوالعباس المبرد



۹۰۲ھ	4	مکتبۃ السنۃ، مصر	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۳ء
معاصر	1	دار الوفاء	۱۹۹۹ء
۶۱۳ھ	1	مجلس مخطوطات فارسیہ دکن	۱۹۳۹ء
معاصر	2	عمادۃ البحث العلمی، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴ھ-۲۰۰۴ء
۱۴۰۳ھ	1	صدیقی ٹرسٹ، کراچی	
۲۷۹ھ	1	دار و مکتبۃ الہلال بیروت	۱۹۸۸ء
۱۶۵ھ	1	بپٹسٹ مشن کلکتہ	۱۸۵۴ء
۲۰۷ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء
۲۵۷ھ	1	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ	۱۴۱۵ھ
۱۳۷۳ھ	1	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۹۳۳ء
تیسری صدی ہجری	1	مکتبہ حیدریہ، نجف	مذکور نہیں
۵۰۵ھ	1	موسسۃ دار الثقافۃ، کویت	مذکور نہیں
۲۴۱ھ	2	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء
		﴿حرف ق﴾	
۱۹۹۵ء	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۴۱۱ھ-۱۹۹۰ء
۷۷۱ھ	1	دار البشائر، بیروت	۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء
۱۹۸۱ء	42	دار الجیل، بیروت	۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء
۱۹۳۱ء	1	کلمات عربیۃ، قاہرہ	۱۹۳۴ء
۱۴۲۰ھ	1	دار المنارۃ، سعودیہ	۱۴۲۷ھ
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۱۳۹۴ھ	1	دار الفکر	۱۴۲۱ھ-۲۰۰۱ء
۳۸۶ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵ء
		﴿حرف ک﴾	
معاصر	1	دار الکتب المصریۃ	۱۴۲۷ھ-۲۰۰۶ء
۷۴۸ھ	2	دار القبلۃ، جدۃ	۱۴۱۳ھ-۱۹۹۲ء
۶۲۰ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء
۶۳۰ھ	10	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء
۲۸۵ھ	4	دار الفکر العربی، قاہرہ	۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء

413	الکامل فی ضعفاء الرجال	ابواحمد ابن عدی
414	الکفایہ فی علم الروایۃ	خطیب البغدادی
415	الکنیٰ والاسماء	مسلم بن حجاج نیشاپوری
416	الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری	شمس الدین الکرمانی
417	الکوثر الجاری الی ریاض احادیث البخاری	احمد بن اسماعیل الکورانی
418	کتاب الآثار	قاضی ابویوسف
419	کتاب الاذکیاء	عبدالرحمن ابن الجوزی
420	کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ (کتاب ولاۃ مصر)	ابوعمر الکندی
421	کتاب سُلیم بن قیس الہلالی (تحقیق: باقر انصاری)	سُلیم بن قیس الہلالی
422	کشف اسرار الباطنیۃ واخبار القرامطہ	محمد بن مالک یمانی
423	کشف الاستار عن زوائد البزار	نورالدین ہیثمی
424	کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون (مع ایضاح المکنون)	حاجی خلیفہ کاتب چلپی
425	کشف المشکل من حدیث الصحیحین	عبدالرحمن ابن الجوزی
426	کنز الدقائق	عبداللہ بن احمد حافظ الدین النسفی
427	کنز العمال	علامہ علی متقی برہان پوری
	{حرف ل}	
428	لباب الانساب	ابن فندمہ البیہقی
429	لباب النقول فی اسباب النزول	جلال الدین سیوطی
430	لسان العرب	ابن منظور الافریقی
431	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی
432	لوامع الانوار البہیۃ	ابوالعون السفارینی الحنبلی
	{حرف م}	
433	المامون	شبلی نعمانی
434	المبدع فی شرح المقنع	برہان الدین ابن مفلح
435	المبدع فی شرح المقنع	برہان الدین ابواسحاق ابراہیم
436	المبسوط	محمد بن احمد ابوسہل السرخسی
437	المتفق والمفترق	خطیب بغدادی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۳۶۵ھ	9	الکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۴۶۳ھ	1	المکتبۃ العلمیۃ، المدینۃ المنورہ	مذکور نہیں
۲۶۱ھ	2	عمادۃ البحث العلمی الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۷۸۶ھ	25	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
۸۹۳ھ	11	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۲۹ھ۔۲۰۰۸ء
۱۸۲ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	مذکور نہیں
۵۹۷ھ	1	مکتبۃ الغزالی	مذکور نہیں
۳۵۵ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
نامعلوم	1	انتشارات دلیل ما، تہران	۱۴۲۸ھ
۴۷۰ھ	1	مکتبۃ الساعی، ریاض	مذکور نہیں
۸۰۷ھ	4	موسسۃ الرسالۃ	۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء
۱۰۶۷ھ	6	دارالکتب العلمیہ	۱۹۴۱ء
۵۹۷ھ	4	دارالوطن، الریاض	مذکور نہیں
۷۰۱ھ	1	دارالبشائر الاسلامیہ	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۹۷۵ھ	16	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
		{حرف ل}	
۵۶۵ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۹۱۱ھ	1	دارالکتب العلمیۃ بیروت	مذکور نہیں
۷۱۱ھ	15	دارصادر، بیروت	۱۴۱۴ھ
۸۵۲ھ	7	مطبعہ نظامیہ، حیدرآباد دکن	۱۳۹۰ھ۔۱۹۷۱ء
۱۱۸۸ھ	1	موسسۃ الخافقین	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
		{حرف م}	
۱۹۱۴ء	1	دارالمصنفین اعظم گڑھ، یوپی	۱۸۸۹ء
۸۸۴ھ	8	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۸۸۴ھ	8	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء،
۴۸۳ھ	30	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۴۶۳ھ	3	دارالقادری، دمشق	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء

[illegible]	[illegible]	[illegible]
438	المجالسۃ وجواہر العلم	ابوبکر الدینوری المالکی
439	المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین	ابن حبان البستی
440	المجموع شرح المہذب	محی الدین شرف النووی
441	المحاسن والمساوی	ابراہیم بن محمد بیہقی
442	المحبر	محمد بن حبیب الہاشمی ابوجعفر البغدادی
443	المحتضرین	ابن ابی الدنیا
444	المحرر فی الفقہ علی مذہب الامام احمد بن حنبل	عبدالسلام ابن تیمیۃ الحرانی
445	المحن	ابوالعرب التمیمی
446	المختار من نوادر الاخبار	محمد بن احمد بن اسماعیل المقری الابیاری
447	المختصر الکبیر فی سیرۃ الرسول	عبدالعزیز ابن جماعۃ الکنانی
448	المختصر فی اخبار البشر	ابوالفداء
449	المختصر فی علم التاریخ	محی الدین الکافیجی
450	المراسیل	ابن ابی حاتم
451	المرقبۃ العلیا فیمن یستحق القضاء والفتیا (تاریخ قضاۃ الاندلس)	ابوالحسن المالقی
452	المزہر فی علوم اللغۃ وانواعہا	جلال الدین سیوطی
453	المسائل والاجوبۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
454	المستدرک علی الصحیحین	حاکم نیشاپوری
455	المسلمون وکتابۃ التاریخ	دکتور عبدالعلیم عبدالرحمن خضر
456	المصاحف	ابوبکر ابن ابی داؤد سجستانی
457	المصفی شرح الموطا مع المسوی	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
458	المعارف	ابن قتیبۃ الدینوری
459	المعالم الاثیرۃ فی السنۃ والسیرۃ	محمد بن محمد حسن شراب
460	المعجم الاوسط	ابوالقاسم الطبرانی
461	المعجم الصغیر	ابوالقاسم الطبرانی
462	المعجم الکبیر	ابوالقاسم الطبرانی
463	المعجم الکبیر المجلدان: الثالث عشر والرابع عشر	ابوالقاسم الطبرانی
464	المعرفۃ والتاریخ	یعقوب بن سفیان الفسوی
465	المعین فی طبقات المحدثین	حافظ شمس الدین الذہبی



سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۳۳۳ھ	10	جمعیۃ التربیۃ الاسلامیۃ، بحرین	۱۴۱۹ھ
۳۵۴ھ	3	دار الوعی، حلب	۱۳۹۶ھ
۶۷۶ھ	1	دار الفکر	مذکور نہیں
۳۲۰ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۲۴۵ھ	1	دار الآفاق، بیروت	مذکور نہیں
۲۸۱ھ	1	دار ابن حزم، بیروت	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۵۲ھ	2	مکتبۃ المعارف، ریاض	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۳۳۳ھ	1	دار العلوم، الریاض	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
ساتویں صدی ہجری	1	دار کنان، بغداد	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۷۶۷ھ	1	دار البشیر، عمان	۱۹۹۳ء
۷۳۲ھ	4	المطبعۃ الحسینیۃ المصریۃ	مذکور نہیں
۸۷۹ھ	1	عالم الکتب	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۳۲۷ھ	1	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۳۹۷ھ
۷۹۲ھ	1	دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۸ء
۷۲۸ھ	1	الفاروق الحدیثۃ	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۳۰۵ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۰ء
معاصر	1	المعہد العالمی للفکر الاسلامی	۱۹۸۹ء
۳۱۶ھ	1	الفاروق الحدیثۃ، مصر	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۱۷۶ھ	اوّل و دوم یکجا	مطبع فاروقی، دہلی	۱۲۹۳ھ
۲۷۶ھ	1	الہیئۃ المصریۃ العامۃ، قاہرہ	۱۹۹۲ء
معاصر	1	دار القلم، دمشق	۱۴۱۱ھ
۳۶۰ھ	10	دار الحرمین، قاہرہ	مذکور نہیں
۳۶۰ھ	2	دار عمار، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۳۶۰ھ	25	مکتبۃ ابن تیمیۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۳۶۰ھ	2	دکتور سعد بن عبد اللہ	مذکور نہیں
۲۷۷ھ	3	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
۷۴۸ھ	1	دار الفرقان، اردن	۱۴۰۴ھ

[illegible]	[illegible]	[illegible]
466	المغنی فی الضعفاء	شمس الدین الذہبی
467	المفصل فی تاریخ العرب	الدکتور جواد علی
468	المقالات والفرق	سعد بن عبداللہ الاشعری القمی
469	المقتبس من انباء الاندلس	ابن حیان القرطبی
470	المقصد العلی فی زوائد مسند ابی یعلی	نور الدین الہیثمی
471	المکتبۃ الاسلامیۃ	عماد علی جمعۃ
472	الملل والنحل	محمد بن عبدالکریم الشہرستانی
473	المنتخب من ذیل المذیل	محمد بن جریر الطبری
474	المنتخب من علل الخلال	ابن قدامہ المقدسی
475	المنتظم فی تاریخ الملوک والامم	عبدالرحمن ابن الجوزی
476	المنتقی شرح الموطا	ابو الولید سلیمان بن خلف الباجی الاندلسی
477	المنتقی من السنن المسندۃ	ابن الجارود نیسابوری
478	المنتقی من منہاج الاعتدال	حافظ ذہبی
479	المنمق فی اخبار قریش	محمد بن حبیب الہاشمی ابو جعفر البغدادی
480	المواعظ والآثار بذکر الخطط والآثار (الخطط المقریزی)	تقی الدین المقریزی
481	الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب	جماعۃ من المؤلفین۔ تحقیق: مانع بن حماد الجہنی
482	الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	لجنۃ من الفقہاء
483	الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی	ابو سعید المصری
484	الموقظۃ فی علم مصطلح الحدیث	حافظ ذہبی
485	مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ	احمد بن علی القلقشندی
486	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	سید ابو الحسن علی ندوی
487	مجلۃ السیرۃ	مقالہ پروفیسر نثار احمد
488	مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر	عبدالرحمن شیخی زادہ داماد آفندی
489	مجمع الزوائد ومنبع الفوائد	نور الدین ہیثمی
490	مجمل اصول اہل السنۃ	الشیخ ناصر عبدالکریم العقل
491	مجموع الفتاویٰ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
492	محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء	ابو القاسم الراغب الاصفہانی
493	مختصر التحفۃ الاثنی عشریۃ (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی)	لخصہ وہذبہ: علامۃ العراق محمود الآلوسی



[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۷۴۸ھ	2	مکتبہ شاملہ	
۱۴۰۸ھ	20	دارالساقی	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
۲۲۹ھ	1	مطبع حیدری، تہران	۱۳۴۱ھ
۴۶۹ھ	1	المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیہ، قاہرہ	۱۳۹۰ھ
۸۰۷ھ	4	دارالکتب العلمیہ	مذکور نہیں
معاصر	1	سلسلۃ التراث الاسلامی	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۵۴۸ھ	3	موسسۃ الحلبی	مذکور نہیں
۳۱۰ھ	1	موسسۃ الاعلمی بیروت	۱۹۳۹ء
۶۲۰ھ	1	دارالرایۃ	مذکور نہیں
۵۹۷ھ	19	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۷۴ھ	7	مطبعۃ السعادۃ، مصر	۱۳۳۲ھ
۳۰۷ھ	1	موسسۃ الکتب الثقافیہ بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۷۴۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۲۳۵ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۹۸۵ء
۸۴۵ھ	4	دارالکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۸ھ
معاصرین	2	دارالندوۃ العالمیہ	۱۴۲۰ھ
	45	وزراۃ اوقاف والشؤون الاسلامیہ، کویت	۱۴۲۷ھ
معاصر	16	مکتبہ شاملہ	
۷۴۸ھ	1	مکتبۃ المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۱۲ھ
۸۲۱ھ	3	مطبعۃ حکومۃ الکویت	۱۹۸۵ء
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	1	مکتبۃ الایمان، قاہرہ	مذکور نہیں
معاصر	...	زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی	رمضان ۱۴۲۴ ہجری
۱۰۷۸ھ	2	دار احیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۸۰۷ھ	10	مکتبۃ القدسی، قاہرہ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۷۲۸ھ	35	مجمع الملک فہد	۱۴۱۶ھ۔۱۹۹۵ء
۵۰۲ھ	2	شرکۃ دارالارقم، بیروت	۱۴۲۰ھ
۱۳۴۲ھ	1	المطبعۃ السلفیۃ، قاہرہ	۱۳۷۲ھ

494	مختصر تاریخ دمشق	ابن منظور الافریقی
495	مختصر سیرۃ الرسول	شیخ محمد بن عبدالوہاب
496	مختصر قیام اللیل	محمد بن نصر المروزی (اختصرہ المقریزی م ۸۴۵ھ)
497	مختصر المزنی	ابوابراہیم المزنی
498	مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان	عبداللہ بن اسعد الیافعی
499	مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان	سبط ابن الجوزی
500	مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان	سبط ابن الجوزی
501	مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح	ملاعلی قاری الہروی
502	مروج الذہب ومعادن الجوہر	علی بن الحسین المسعودی
503	مرویات غزوۃ خندق	دکتور ابراہیم بن محمد المدخلی
504	مسالک الابصار فی ممالک الامصار	شہاب الدین العدوی القرشی
505	مستخرج ابی عوانۃ	ابوعوانۃ یعقوب بن سفیان الاسفرائنی
506	مسند احمد	امام احمد بن حنبل
507	مسند ابن ابی شیبۃ	ابوبکر ابن ابی شیبۃ
508	مسند ابن الجعد	علی ابن الجعد الجوہری
509	مسند ابی داؤد طیالسی	ابوداؤد، سلیمان بن داؤد طیالسی
510	مسند ابی عوانۃ	ابوعوانۃ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی
511	مسند ابی یعلی	ابویعلی تمیمی الموصلی
512	مسند البزار (البحر الذخار)	ابوبکر العتکی البزار
513	مسند الحارث (بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث)	الحارث ابن ابی اسامۃ ونورالدین ہیثمی
514	مسند الحمیدی	عبداللہ بن الزبیر الحمیدی
515	مسند الرویانی	ابوبکر محمد بن ہارون الرویانی
516	مسند الشامیین	ابوالقاسم الطبرانی
517	مسند الفاروق	حافظ ابن کثیر
518	مسند الشافعی	محمد بن ادریس الشافعی
519	مسند الشہاب	ابوعبداللہ ابن حکمون القضاعی
520	مشاہیر علماء الامصار	ابن حبان البستی
521	مصطلح الحدیث	محمد بن صالح العثیمین



سن وفات	جلدیں	مطبع	سن طباعت
۷۱۱ھ	29	دارالفکر، دمشق	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
۱۲۰۶ھ	1	وزارۃ الشؤون الاسلامیہ سعودی عرب	۱۴۱۸ھ
۲۹۴ھ	1	حدیث اکادمی فیصل آباد	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۲۶۴ھ	1	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۷۶۸ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۵۴ھ	23	الرسالۃ العالمیۃ، دمشق	۲۰۱۳ھ۔۱۴۳۴ھ
۶۵۴ھ	23	الرسالۃ العالمیۃ، دمشق	۱۴۳۴ھ۔۲۰۱۳ء
۱۰۱۴ھ	9	دارالفکر، بیروت	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۲ء
۳۳۶ھ	5	الجامعۃ اللبنانیۃ	۱۹۶۳ء
معاصر	1	عمادۃ البحث العلمی بجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴ھ
۷۴۹ھ	27	المجمع الثقافی، ابوظبی	۱۴۲۳ھ
۳۱۶ھ	20	الجامعۃ الاسلامیۃ، السعودیۃ العربیۃ	۱۴۳۵ھ۔۲۰۱۴ء
۲۴۱ھ	45	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۱ء
۲۳۵ھ	2	دارالوطن، ریاض	۱۹۹۷ء
۲۳۰ھ	2	موسسۃ نادر، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۲۰۴ھ	4	دار ہجر، مصر	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۳۱۶ھ	5	دارالمعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۷ھ	13	دارالمامون للتراث، دمشق	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۲۹۲ھ	18	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۲۰۰۹ء
۲۸۲ھ۔و۸۰۷ھ	2	مرکز خدمۃ السنۃ، المدینۃ	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۲ء
۲۱۹ھ	2	دارالسقا، سوریا	۱۹۹۶ء
۳۰۷ھ	2	موسسۃ القرطبۃ، القاہرۃ	۱۴۱۶ھ
۳۶۰ھ	4	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۴ء
۷۷۴ھ	2	دارالوفاء، المنصورہ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۲۰۴ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۰۰ھ
۴۵۴ھ	2	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۶ء
۳۵۴ھ	1	دارالوفاء، المنصورہ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۴۲۱ھ	1	مکتبۃ العلم	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء

522	مصطلح الحدیث	محمد بن صالح العثیمین
523	مصنف ابن ابی شیبہ نوٹ: مصنف ابن ابی شیبہ کا پرانا نسخہ ۱۵ جلدوں میں ہے اور اس میں احادیث نمبر بھی جدید نسخے سے الگ ہیں یعنی مکتبۃ الرشد کے جدید نسخے میں کل احادیث نمبر ۳۷۹۴۳ ہیں جبکہ ۱۵ جلد والے نسخے میں کل حدیث نمبر ۳۹۰۹۸ ہیں۔	ابوبکر ابن ابی شیبہ
524	مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد	عبدالرزاق بن ہمام
525	مع الاثنی عشریۃ فی الاصول والفروع	ڈاکٹر علی بن حمید السالوس
526	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی
527	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع
528	معاملۃ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی	ڈاکٹر ادوار غالی الذہبی
529	معاویہ بن ابی سفیان	محمد علی محمد الصلابی
530	معجم ابن الاعرابی	ابوسعید ابن الاعرابی
531	معجم الادباء (ارشاد الاریب الی معرفۃ الطبیب)	یاقوت الحموی
532	معجم الادباء (الارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب)	یاقوت الحموی
533	معجم البلدان	یاقوت الحموی
534	معجم الصحابہ	ابوالقاسم البغوی
535	معجم شیوخ الطبری	اکرم بن محمد الاثری
536	معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع	ابوعبید البکری الاندلسی
537	معرفۃ السنن والآثار	ابوبکر البیہقی
538	معرفۃ الصحابۃ	ابونعیم الاصبہانی
539	معرفۃ القرآء الکبار	حافظ ذہبی
540	مغازی	محمد بن عمر الواقدی
541	مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب	ابن واصل الحموی
542	مقاتل الطالبین	ابوالفرج الاصبہانی
543	مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین	ابوالحسن الاشعری
544	مقام حسین و یزید	مولانا محمد حبیب اللہ علوی
545	مقام صحابہ	مفتی محمد شفیع عثمانی



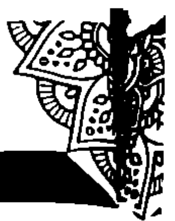
۱۴۲۱ھ	1	مکتبۃ العلمیۃ قاہرہ	۱۴۱۳ھ۔ ۱۹۹۳ء
۲۳۵ھ	7	مکتبۃ الرشد ریاض	۱۴۰۹ھ
۲۱۱ھ	11	المجلس العلمی، پاکستان	۱۴۰۳ھ
معاصر	1	دار الفضیلۃ ریاض	۱۴۲۴ھ۔ ۲۰۰۳ء
۱۴۱۷ء۔ ۱۹۹۷ء		دار الاشاعت، کراچی	۲۰۰۷ء
۱۳۹۶ھ۔ ۱۹۷۶ء	8	ادارۃ المعارف، کراچی	مذکور نہیں
معاصر	1	مکتبۃ غریب	۱۹۹۳ء
معاصر	1	دار الاندلس، مصر	۱۴۲۹ھ ۲۰۰۸ء
۳۳۰ھ	3	دار ابن الجوزی السعودیۃ	۱۴۱۸ھ۔ ۱۹۹۷ء
۶۲۶ھ	7	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ۔ ۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	5	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ۔ ۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	7	دار صادر، بیروت	۱۹۹۵ء
۳۱۷ھ	5	مکتبۃ دار البیان، کویت	۱۴۲۱ھ۔ ۲۰۰۰ء
معاصر	1	الدار الاثریۃ، اردن	۱۴۲۶ھ۔ ۲۰۰۵ء
۳۸۷ھ	4	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۳ھ
۳۵۸ھ	15	دار الوفاء، قاہرۃ	۱۴۱۲ھ۔ ۱۹۹۲ء
۳۳۰ھ	7	دار الوطن للنشر، ریاض	۱۴۱۹ھ۔ ۱۹۹۸ء
۷۴۸ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔ ۱۹۹۷ء
۲۰۷ھ	3	دار الاعلمی	۱۴۰۹ھ۔ ۱۹۸۹ء
۶۹۷ھ	5	دار الکتب والوثائق القومیۃ، قاہرہ	۱۳۷۷ھ۔ ۱۹۵۷ء
۳۵۶ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۲۴ھ	2	المکتبۃ المصریۃ	۱۴۲۶ھ۔ ۲۰۰۵ء
معاصر	1	مجلس دعوۃ الحق، پاکستان	مذکور نہیں
۱۳۹۶ھ۔ ۱۹۷۶ء	1	ادارۃ المعارف، کراچی	۲۰۰۵ء

نمبر	کتاب	مصنف
546	مقدمہ زہر الربی علی السنن النسائی المجتبیٰ	جلال الدین سیوطی
547	مکتوبات مجدد الف ثانی (اردو ترجمہ: از مولانا سید زوار حسین شاہ)	شیخ احمد سرہندی
548	من کلام ابی زکریا یحییٰ بن معین بروایہ طہمان	یحییٰ بن معین
549	مناقب ابی حنیفہ وصاحبیہ	حافظ شمس الدین الذہبی
550	مناقب ابی حنیفہ کردری	محمد ابن شہاب الکردری
551	مناقب ابی حنیفہ مکی	موفق بن احمد المکی اخطب خوارزم
552	منہاج السنۃ النبویۃ	احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام ابن تیمیہ الحرانی
553	منہاج الطالبین وعمدۃ المفتیین فی الفقہ	امام شرف النووی
554	منہاج المحدثین فی القرن الاول الہجری وحتیٰ عصرنا الحاضر	علی عبد الباسط مزید
555	منہج السالکین وتوضیح الفقہ فی الدین	عبد الرحمن بن ناصر آل سعدی
556	موطا امام مالک	امام مالک بن انس
557	موجز التاریخ الاسلامی	احمد محمود العسیری
558	موسوعۃ اقوال احمد بن حنبل (جمعہ لجنۃ من المؤلفین)	احمد بن حنبل
559	موسوعۃ اقوال الدارقطنی فی رجال الحدیث وعللہ (جمعہ لجنۃ من المؤلفین)	ابو الحسن الدارقطنی
560	موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ والمنہج التربیۃ	ابو سہل محمد بن عبد الرحمن المغراوی
561	میزان الاعتدال فی نقد الرجال	شمس الدین الذہبی
	﴿حرف ن﴾	
562	النبراس علیٰ شرح العقائد	عبد العزیز فرہاری ملتانی
563	النجوم الزاہرۃ فی احوال ملوک مصر والقاہرۃ	یوسف بن تغری بردی
564	النکت علیٰ مقدمۃ ابن الصلاح	بدر الدین الزرکشی الشافعی
565	النکت علیٰ کتاب ابن الصلاح	ابن حجر العسقلانی
566	ناصبیت تحقیق کے بھیس میں	مولانا عبد الرشید نعمانی
567	نبیٔ رحمت ﷺ	سید ابو الحسن علی ندوی
568	نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجر عسقلانی
569	نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق	الشریف الادریسی الطالبی
570	نسب قریش	مصعب بن عبد اللہ الزبیری
571	نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب	شہاب الدین المقری
572	نقوش رسول نمبر جلد دوئم مقالہ: سیرت النبی تو قیت کی روشنی میں	مولانا اسحاق النبی علوی (رام پور، بھارت)



[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۹۱۱ھ	1	دارالمعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۱۰۳۴ھ	3	ادارہ مجددیہ، کراچی	مذکور نہیں
۲۳۳ھ	1	دارالمامون، دمشق	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	1	لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ دکن	۱۴۰۸ھ
۸۲۷ھ	2	مکتبہ نظامیہ دکن	۱۳۲۱ھ
۵۶۸ھ	2	مکتبہ نظامیہ دکن	۱۳۲۱ھ
۷۲۸ھ	9	جامعۃ الامام محمد بن سعود	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۶۷۶ھ	1	دارالفکر	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۵ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۱۳۷۶ھ	1	دارالوطن	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۲ء
۱۷۹ھ	6	موسسۃ زاید بن سلطان الامارات	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
معاصر	1	مکتبۃ الملک فہد	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۲۴۱ھ	4	دارالنشر، عالم الکتب	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۳۸۵ھ	2	عالم الکتب	۲۰۰۱ء
معاصر	10	المکتبۃ الاسلامیہ، قاہرہ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	4	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۳۸۲ھ۔۱۹۶۳ء
		حرف ن	
بعد: ۱۲۳۹ھ	1	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ	مذکور نہیں
۸۷۴ھ	16	دارالکتب، قاہرہ	مذکور نہیں
۷۹۴ھ	3	اضواء السلف، الریاض	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۸۵۲ھ	2	عمادۃ البحث العلمی، السعودیہ	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء	1	دارالتقویٰ، لاہور	
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	1	مجلس نشریات اسلام	مذکور نہیں
۸۵۲ھ	1	دارالحدیث، قاہرہ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۵۶۰ھ	2	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۹ھ
۲۳۶ھ	1	دارالمعارف، قاہرہ	مذکور نہیں
۱۰۴۱ھ	8	دارصادر، بیروت	۱۹۹۷ء
	13	مدیر: محمد طفیل۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور	دسمبر ۱۹۸۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
573	نہایۃ الارب فی فنون الادب	شہاب الدین النویری
574	نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب	احمد بن علی القلقشندی
575	نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب	ابوالمعالی امام الحرمین جوینی
576	نہج البلاغۃ	سید شریف رضی
577	نوادر الخلفاء (اعلام الناس بما وقع للبرامکۃ مع بنی عباس)	محمد دیاب الاطلیدی
578	نور البصر فی سیرۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی
579	نیل الاوطار	محمد بن علی الشوکانی الیمنی
	حرف و	
580	الوافی بالوفیات	صلاح الدین الصفدی
581	الوسیط فی المذہب	ابوحامد الغزالی
582	الوفیات	ابن قنفذ
583	وسیلۃ الاسلام بالنبی علیہ الصلوٰۃ والسلام	ابن قنفذ القسنطینی
584	وصایا العلماء عند حضور الموت	ابن زبر الربعی
585	وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ	علی بن عبداللہ السمہودی
586	وفیات الاعیان	ابن خلکان
587	وقعۃ صفین	نصر بن مزاحم
	حرف ہ	
588	الہدایہ فی شرح بدایۃ المبتدی	برہان الدین مرغینانی
589	ہدیۃ العارفین	اسماعیل بن میر سلیم البابانی البغدادی
	حرف ی	
590	الیہود فی العالم القدیم	دکتور مصطفیٰ کمال عبدالعلیم
591	الیواقیت والدرر شرح شرح نخبۃ الفکر	علامہ عبدالرؤف مناوی



سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۳۳ھ	33	دارالکتب والوثائق القومیة، قاہرہ	۱۴۲۳ھ
۸۲۱ھ	1	دارالکتاب اللبنانین	۱۴۰۰ھ_۱۹۸۰ء
۴۷۸ھ	20	دارالمنہاج	۱۴۲۸ھ_۲۰۰۷ء
۴۳۶ھ	4	المطبعة الادبیة، بیروت	۱۸۸۵ء
چوتھی صدی ہجری	1	دارالکتب العلمیة	۱۴۲۵ھ_۲۰۰۴ء
۱۹۶۳ء	1	معہد الخلیل الاسلامی	مذکور نہیں
۱۲۵۰ھ	8	دارالحدیث، مصر	۱۴۱۳ھ_۱۹۹۳ء
		{حرف و}	
۷۶۴ھ	29	داراحیاء التراث	۱۴۲۰ھ_۲۰۰۰ء
۵۰۵ھ	7	دارالسلام، قاہرہ	۱۴۱۷ھ
۸۱۰ھ	1	دارالآفاق الجدیدة، بیروت	۱۴۰۳ھ_۱۹۸۳ء
۸۱۰ھ	1	دارالغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۰۳ھ_۱۹۸۳ء
۳۷۹ھ	1	دارابن کثیر، دمشق	۱۴۰۶ھ_۱۹۸۶ء
۹۱۱ھ	4	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۹ھ
۶۸۱ھ	7	دارصادر	۱۹۹۴ء
۲۱۲ھ	1	دارالجیل، بیروت	۱۴۱۰ھ_۱۹۹۰ء
		{حرف ہ}	
۵۹۳ھ	4	داراحیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۱۳۹۹ھ	2	داراحیاء التراث العربی، بیروت	مذکور نہیں
		{حرف ی}	
معاصر	1	دارالقلم، دمشق	۲۰۰۱ء
۱۰۳۱ھ	2	مکتبة الرشد، ریاض	۱۹۹۹ء

تاریخ امت مسلمہ کے چھ حصے ایک نظر میں

مبادیاتِ تاریخ، انبیائے سابقین علیہم السلام اور ان کی معاصر سلطنتیں، ماقبل از اسلام دنیا کی حالت سیرتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم، عہدِ خلافتِ راشدہ، دورِ فتوحات (خلافتِ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تا خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ)، امہات المومنین، عشرہ مبشرہ اور اکابر صحابہ کا تعارف، اسباقِ تاریخ

تاریخ روایات کی تحقیق و تنقیح کے اصول، دورِ مشاجرات، خلافتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، خلافتِ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، خلافتِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، عہدِ یزید، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جدوجہد، سانحہ کربلا و سانحہ حرہ، خلافت و شہادت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، دورِ فتن سے حاصل شدہ اسباق، پہلی صدی ہجری میں امت کی علمی و اخلاقی تربیت کرنے والے مشاہیر صحابہ و تابعین کا تعارف، اہم شبہات کے جوابات

خلافت بنوامیہ و بنوعباس، خلافت عباسیہ کی معاصر آزاد مسلم حکومتیں ائمہ اربعہ او رعظیم مجددین و مصلحین کے کارنامے، فرقوں کے آغاز اور ظہور کی تاریخ، باطل فرقوں کی حکومتیں، اہم شبہات کے جوابات

تاریخ صقلیہ، صلیبی جنگیں، یورشِ تاتار، دولتِ ایوبیہ، دولتِ ممالیک، تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام، تاریخ برصغیر، سلطنتِ عثمانیہ، دورِ تاسیس واستحکام، دولتِ اسلامیہ اندلس، دورِ تاسیس تا دورِ مرابطین وموحدین، امت مسلمہ کی فکری ونظریاتی رہنمائی کرنے والے ائمہ مجددین، فقہاء اور صوفیاء کی جدوجہد کا تذکرہ

زوال وسقوط دولت اسلامیہ اندلس سلطنت عثمانیہ دورِ عروج تا سقوط خلافت سلطنتِ مغلیہ ہندوستان، بابر تا بہادر شاہ ظفر

برطانوی استعمار کی حکومت، تحریکاتِ آزادی، تحریک پاکستان، عالم اسلام کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، غیر مسلم دنیا کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، مسلم تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کے علمی وفنی کارناموں پر ایک نظر